زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

شخصیات نمبر ۲

۵۹ ، ۶۰

اکتوبر ۱۹۵۶ء

مرتب

محمد طفیل

سالانہ قیمت
۲۰ روپے

قیمت موجودہ پرچہ
۸ روپے

ادارہ فروغ اردو — لاہور
(ایبک روڈ۔ انارکلی)

مکاتیب نمبر

نقوش نے کئی اہم موضوعات پر نمبر چھاپے ہیں۔ جو اپنی اپنی حیثیت میں ضرور باقی رہیں گے۔ جن میں غزل نمبر، شخصیات نمبر اور افسانہ نمبر خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ادھر ایک سال سے ہم "مکاتیب نمبر" مرتب کر رہے ہیں۔ ہزاروں اہم اور تاریخی خطوط (غیر مطبوعہ) جمع کئے جا چکے ہیں۔ جن میں سرسید، حالی، اکبر، اقبال، مولانا محمد علی، ڈپٹی نذیر احمد، حکیم اجمل خاں، محسن الملک، وقار الملک، شبلی، سلیمان ندوی اور ابوالکلام آزاد ایسے تمام زندہ اور مرحوم مشاہیر کے بیسیوں ہی ادبی اور سیاسی خطوط ضروری حواشی کے ساتھ مرتب کئے جا چکے ہیں۔

ہمارا ارادہ ہے کہ خطوط کی شکل میں جتنا سرمایہ ادھر اُدھر بکھرا پڑا ہے وہ سب کا سب ایک جگہ جمع ہو جائے۔ تاکہ تمام علمی و ادبی اور سیاسی دستاویزیں یک جا ہو کر [illegible] والے حضرات کے بھی کام آ سکیں۔

اگر سرمایہ اکٹھا نہ کیا گیا تو اس بات کا ڈر ہے کہ آئندہ تلف ہی نہ ہو جائے سنہ ۴۷ء کے ہنگاموں میں ہمارا اکثر قیمتی اور نایاب سرمایہ ضائع ہو چکا ہے۔ ویسے بھی علم و ادب کے انفرادی سرمائے سے اجتماعی سرمایہ اردو ادب کے تمام طالب علموں کے لئے مفید بھی ہو گا۔ اور اس طرح محفوظ بھی ہو جائے گا۔

مجھے خدا کے فضل اور آپ کے تعاون سے پوری امید ہے کہ ہم پانچ ہزار سے کچھ زیادہ ہی نادر خطوط جمع کر لیں گے۔

میرے تمام احباب نے اس اہم خدمت کے سلسلے میں مجھ سے بھرپور تعاون فرمایا ہے۔ احباب کے تعاون ہی سے ہم نے ہزاروں نادر خطوط جمع کر لئے ہیں۔ جس پر ادارۂ نقوش کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ ملتجی ہوں کہ آپ کے پاس بھی جتنے زندہ اور مرحوم مشاہیر کے خطوط ہوں وہ سب (بذریعہ رجسٹری) مرحمت فرما دیں۔ میں اس نمبر کی تکمیل کے بعد وہ تمام خطوط بصد شکریہ واپس کر دوں گا۔ اگر اصل خطوط دینے میں تامل ہو تو ان کی نقل ہی عنایت فرما دیں۔

تمام اہم خطوط کو فوٹو آفسٹ سے شائع کیا جا رہا ہے۔

محمد طفیل

ترتیب

(۱)

شخصیت	شخصیت نگار	
۱ — داغ دہلوی	جوش ملسیانی	٭ ۷۰۹
۲ — اکبر الہ آبادی	عبدالماجد دریا بادی	۷۱۶
۳ — وقار الملک	مولانا غلام رسول مہر	۷۲۲
۴ — نواب عماد الملک	ڈاکٹر عبدالحق	۷۳۰
۵ — ڈاکٹر ضیاء الدین احمد	محمد حسین خان زبیری	۷۳۸
۶ — مولوی چراغ علی	غلام مجتبیٰ	۷۶۸
۷ — نظام رامپوری	شاد عارفی	۷۷۹
۸ — شاد عظیم آبادی	سید حسن امام	۷۸۳
۹ — نصیر حسین خیال	شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی	۷۸۶
۱۰ — امداد امام اثر	سید حسن امام	۷۹۳
۱۱ — حبیب الرحمٰن شروانی	مالک رام	۸۰۲
۱۲ — علامہ عبداللہ العمادی	ابوالخیر مودودی	۸۱۲
۱۳ — پنڈت برج نرائن چکبست	نجم الدین شکیب	۸۲۲
۱۴ — مولانا احسن مارہروی	جمیل زبیری	۸۲۹
۱۵ — دیا نرائن نگم	ثاقب کانپوری	۸۳۷
۱۶ — سائل دہلوی	مالک رام	۸۴۳
۱۷ — چودھری افضل حق	شورش کاشمیری	۸۵۳
۱۸ — سیماب اکبر آبادی	نثار اٹاوی	۸۵۹
۱۹ — میرزا یگانہ چنگیزی	سید اعظم حسین اعظم	۸۶۶
۲۰ — رضا علی وحشت	اظہر قادری	۸۷۱
۲۱ — سلطان حیدر جوش	وحید احمد	۸۷۸
۲۲ — اختر شیرانی	نیر واسطی	۸۸۳
۲۳ — ابو سعید بزمی	ادیب بزمی	۹۰۱
۲۴ — رشید جہاں	صدیقہ بیگم سیوہاروی	۹۰۷
۲۵ — مجاز	ابو اللیث صدیقی	۹۱۳
۲۶ — مولوی محمد داؤد عباسی	محمود احمد عباسی	۹۲۰
۲۷ — مجذوب	رضا انصاری	۹۳۷

٭ شخصیات نمبر حصہ اول صفحہ ۷۰۰ پر تمام ہوا تھا۔ اس حصہ دوم کو صفحہ نمبر ۷۰۱ سے شروع کیا گیا ہے۔

(۲)

۲۸ - ڈاکٹر رام بابو سکسینہ — اثر لکھنوی — ۹۲۹
۲۹ - جوش ملسیانی — پنڈت ہری چند اختر — ۹۵۱
۳۰ - تلوک چند محروم — جگن ناتھ آزاد — ۹۵۶
۳۱ - عبدالرزاق ملیح آبادی — شاہد خان — ۹۶۰
۳۲ - ڈاکٹر عابد حسین — ضیاء الحسن فاروقی — ۹۷۵
۳۳ - عرشی رامپوری — عشرت رحمانی — ۹۸۲
۳۴ - سید امتیاز علی تاج — شوکت تھانوی — ۹۹۱
۳۵ - صوفی غلام مصطفےٰ تبسم — محمود نظامی — ۹۹۵
۳۶ - مسعود حسن رضوی — علی عباس حسینی — ۹۹۹
۳۷ - علی عباس حسینی — کشور جہاں زیدی — ۱۰۰۳
۳۸ - حامد علی خاں — محمد عبداللہ قریشی — ۱۰۰۷
۳۹ - رئیس احمد جعفری — ارشد تھانوی — ۱۰۱۵
۴۰ - شبلی بی کام — قمر تسکین — ۱۰۱۸
۴۱ - شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی — بدر الاسلام فضلی — ۱۰۲۷
۴۲ - ڈاکٹر غلام جیلانی برق — محمد عثمان — ۱۰۳۰
۴۳ - اے آر خاتون — زبیدہ خاتون — ۱۰۴۰

(۳)

۴۴ - ڈاکٹر سید اعجاز حسین — سید احتشام حسین — ۱۰۴۵
۴۵ - سید احتشام حسین — ڈاکٹر محمد حسن — ۱۰۵۲
۴۶ - اختر حسین رائے پوری — دیوندر ستیارتھی — ۱۰۶۲
۴۷ - اختر اورینوی — شکیلہ اختر — ۱۰۷۲
۴۸ - حیات اللہ انصاری — مسیح الحسن رضوی — ۱۰۸۶
۴۹ - اوپندر ناتھ اشک — کوشلیا اشک — ۱۰۹۵
۵۰ - حفیظ ہوشیارپوری — ناصر کاظمی — ۱۱۰۶
۵۱ - ن۔ م۔ راشد — عطاء اللہ سجاد — ۱۱۱۰
۵۲ - احمد علی — سید علی اکبر قاصد — ۱۱۱۵
۵۳ - اختر انصاری — عزیز عرفی — ۱۱۲۰
۵۴ - ش۔ ر۔ عارفی — طاہرہ اختر — ۱۱۳۲
۵۵ - سید عبدالحمید عدم — شاد امرتسری — ۱۱۳۷
۵۶ - جذبی — انور عظیم — ۱۱۴۴
۵۷ - شکیلہ اختر — صوفیہ فضلی — ۱۱۵۳

(۴)

۵۸ ـ مولانا محمد علی جوہر — ضیاء الدین احمد برنی ۱۱۵۹
۵۹ ـ مولانا حسین احمد مدنی — رشید الوحیدی ۱۱۶۹
۶۰ ـ سید ابوالاعلیٰ مودودی — نعیم صدیقی ۱۱۷۴
۶۱ ـ علامہ مشرقی — غلام جیلانی برق ۱۲۰۳
۶۲ ـ عطاء اللہ شاہ بخاری — شورش کاشمیری ۱۲۱۴
۶۳ ـ ایس اے رحمٰن — اثر صہبائی ۱۲۱۸
۶۴ ـ حمید نظامی — شورش کاشمیری ۱۲۲۶
۶۵ ـ شورش کاشمیری — محمد وارث کامل ۱۲۳۰

(۵)

۶۶ ـ حیدرآباد کی چند شخصیتیں — تمکین کاظمی ۱۲۳۷
۶۷ ـ علی گڑھ کی چند شخصیتیں — خلیل الرحمٰن اعظمی ۱۳۱۳
۶۸ ـ بہار کی چند شخصیتیں — شاہ ولی الرحمٰن کاکوی ۱۳۳۰
۶۹ ـ سرحد کی چند شخصیتیں — سید فارغ بخاری ۱۳۵۳

استدراکیہ

۷۰ ـ سر سید احمد خاں — محمد اسمٰعیل پانی پتی ۱۳۷۹
۷۱ ـ خان بہادر مولوی بشیر الدین — محمد الدین مارہروی ۱۳۹۲
۷۲ ـ نواب محسن الملک — ڈاکٹر سید محمود ۱۳۹۶
۷۳ ـ امیر مینائی — اسمٰعیل احمد مینائی ۱۳۹۶
۷۴ ـ سر تیج بہادر سپرو — ڈاکٹر سید اعجاز حسین ۱۴۰۷
۷۵ ـ عبدالرزاق کانپوری — ابوالخیر مودودی ۱۴۷۷
۷۶ ـ لالہ سری رام — ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ۱۴۱۰
۷۷ ـ سید علی بلگرامی — غلام بھیکن ۱۴۱۳
۷۸ ـ منشی سجاد حسین — ممتاز حسین جونپوری ۱۴۲۱
۷۹ ـ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی — مانی جائسی ۱۴۲۵
۸۰ ـ محمد دین فوق — محمد عبداللہ قریشی ۱۴۸۸
۸۱ ـ عشرت لکھنوی — خواجہ شمس الدین ۱۴۲۹
۸۲ ـ اصغر گونڈوی — صغیر احمد صدیقی ۱۴۸۲
۸۳ ـ تاجور نجیب آبادی — محمد وارث کامل ۱۴۴۰
۸۴ ـ صفی لکھنوی — ممتاز حسین جونپوری ۱۴۴۳
۸۵ ـ دل شاہجہانپوری — شبنم رومانی ۱۴۴۷
۸۶ ـ فلک پیما — میاں بشیر احمد ۱۴۵۸
۸۷ ـ مالک رام — مختار الدین احمد آرزو ۱۴۶۱
۸۸ ـ احسان دانش — محمد وارث کامل ۱۴۶۸

طلوع

۱۹۵۵ء میں شخصیات نمبر کی پہلی جلد پیش کی گئی تھی اور اب ۱۹۵۶ء میں دوسری جلد۔ اس وقفے میں جتنے بھی دن رات گزرے ہیں، اُن میں اِس نمبر کی ترتیب و تدوین سے فارغ نہیں رہا۔

جس طرح پہلی جلد کے بعد، دوسری جلد کا اعلان کرکے میں نے آج سرخروئی حاصل کی ہے اسی طرح اب تیسری جلد کا بھی عزم ہے تاکہ میری جدوجہد کے باوجود، جو نمایاں شخصیتیں رہ گئی ہیں، وہ سب آجائیں۔

اس ضخیم نمبر میں ایک دو مطبوعہ مضمون بھی شامل ہیں۔ لکھنے والوں سے زیادہ دیر انتظار نہ ہوا، ادھر پرچہ جلد مکمل نہ ہو سکا۔ دونوں کی مجبوریوں سے آپ درگزر فرمائیں۔

اس پرچے میں چند ایک مضمون، اصل موضوع سے ہٹ گئے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو کسی جلد میں بھی نہیں رکھے جا سکتے۔ مگر میں نے ان کی شمولیت بعض وجوہ سے ضروری سمجھی — ترتیب وہی ہے جو پہلے حصے کی تھی۔

نقوش کا آئندہ شمارہ عام نمبر ہوگا — اس کے بعد مکاتیب نمبر!

محمد طفیل

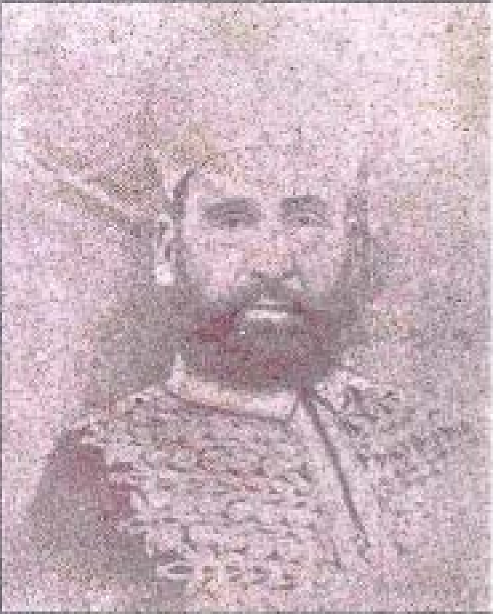

داغ دہلوی

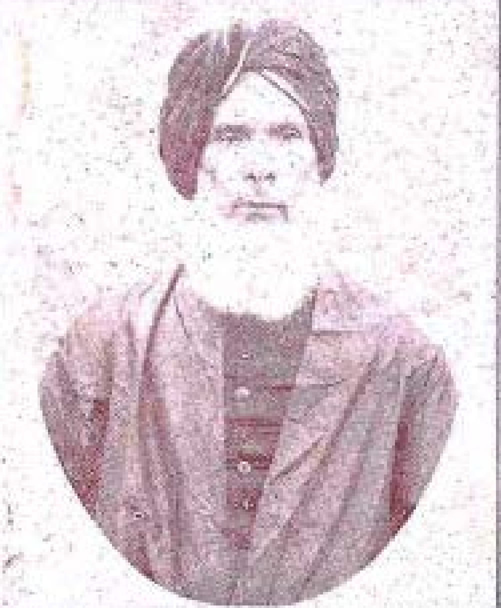

امیر مینائی

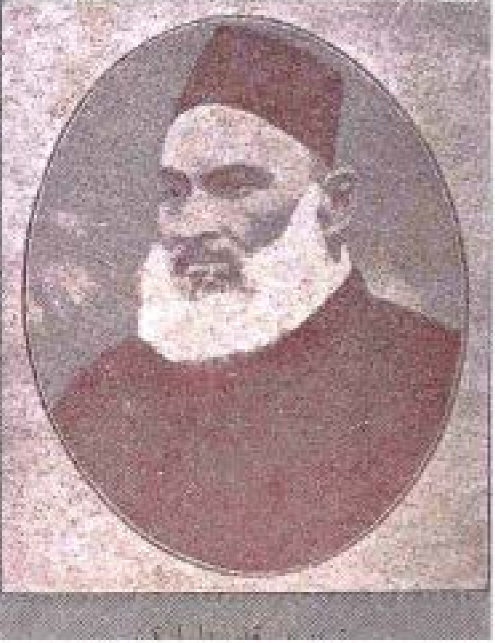

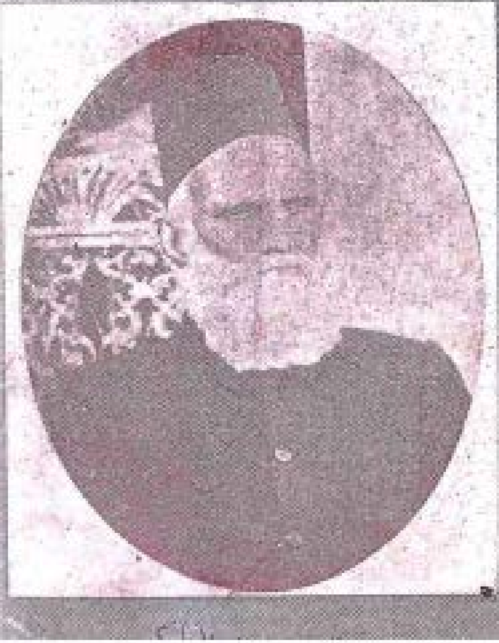

اکبر الہ آبادی

شاد عظیم آبادی

سید امداد امام اثر

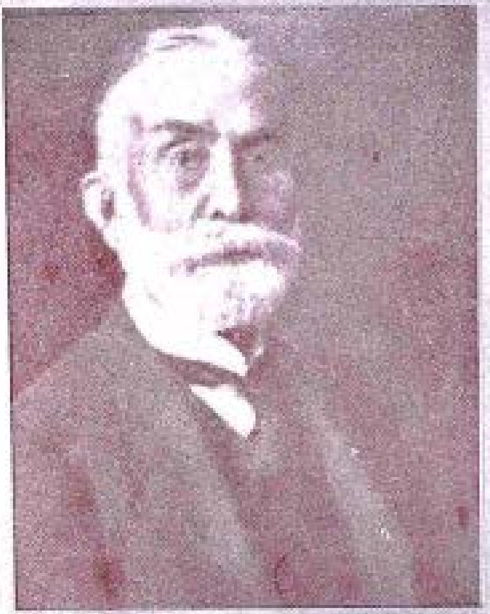

عماد الملک حسین بلگرامی

سید علی بلگرامی

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

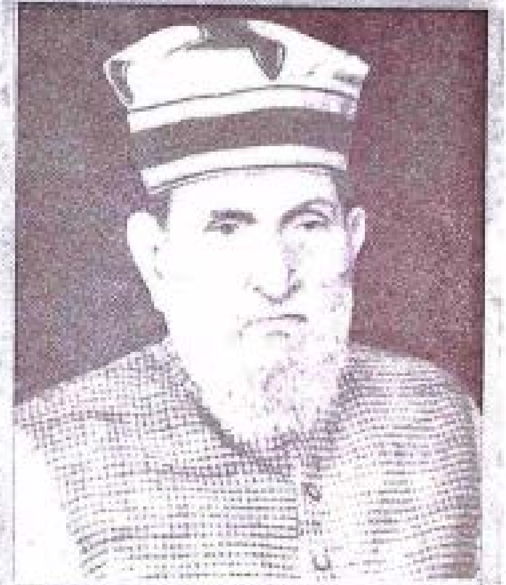

سائل دہلوی

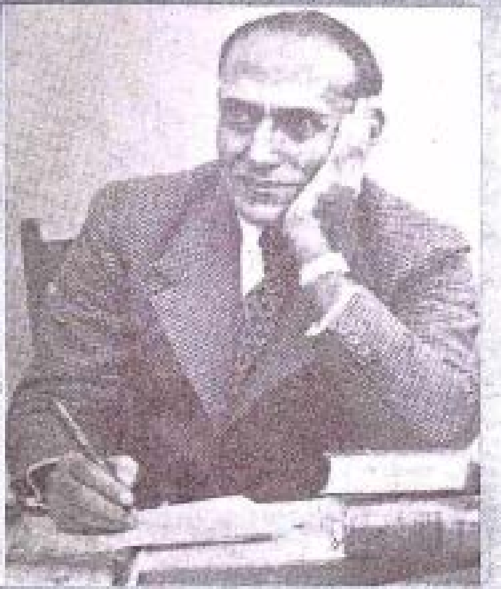

سلطان حیدر جوش

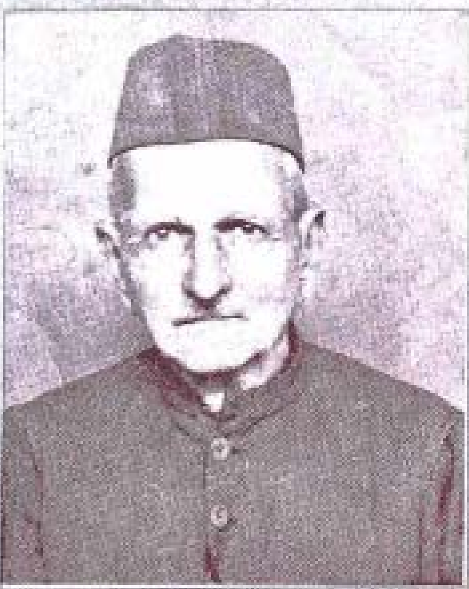

دل شاہجہاں پوری

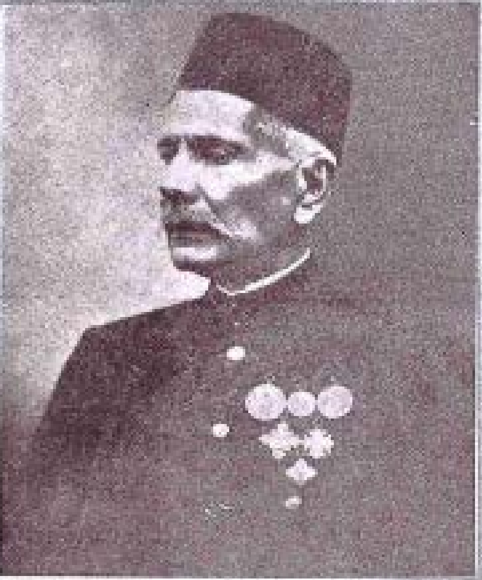

صفی لکھنوی

مولانا محمد علی جوہر

امتیاز علی تاج

مالک رام

عرشی رامپوری

سیماب اکبر آبادی

مسعود حسن رضوی

جوش ملسیانی

تلوک چند محروم

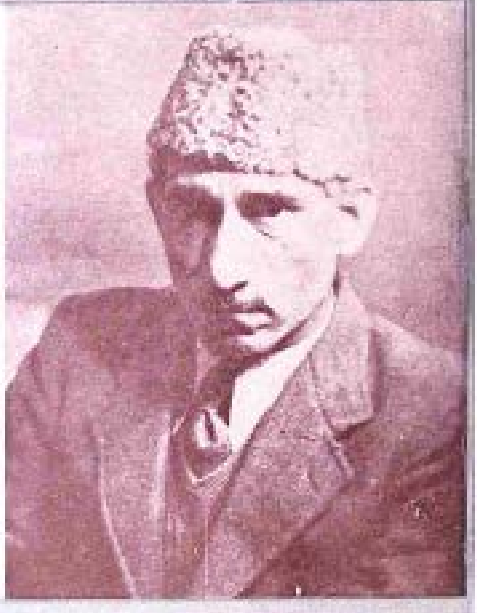

صوفی تبسم

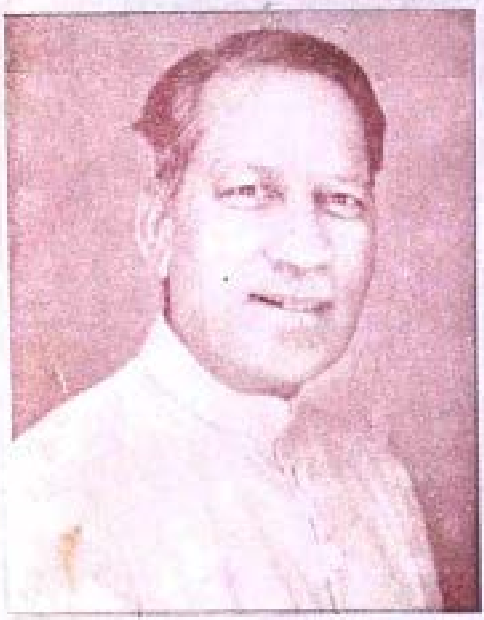

علی عباس حسینی

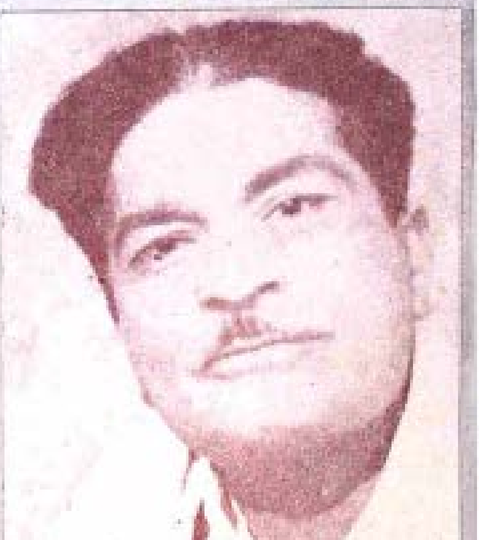

اختر شیرانی

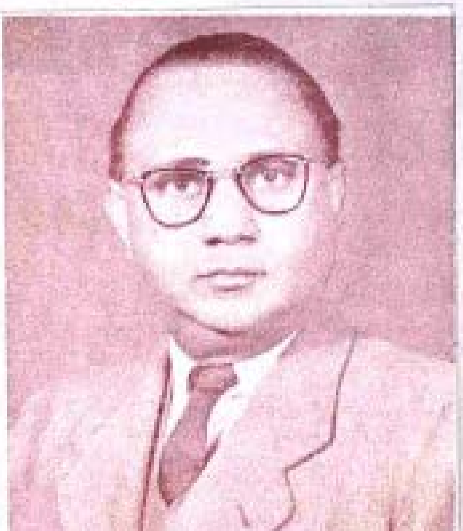

اختر انصاری

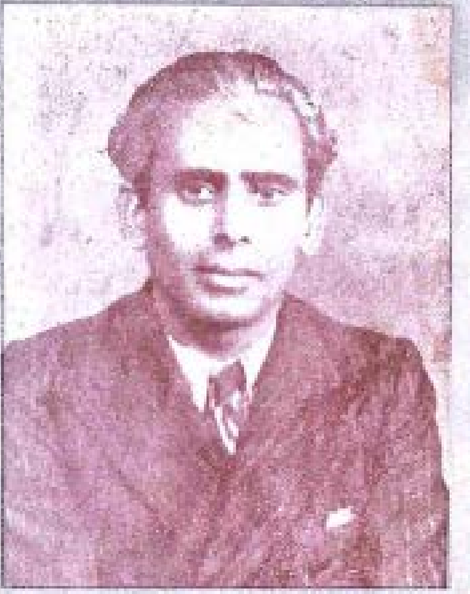

حفیظ ہوشیارپوری

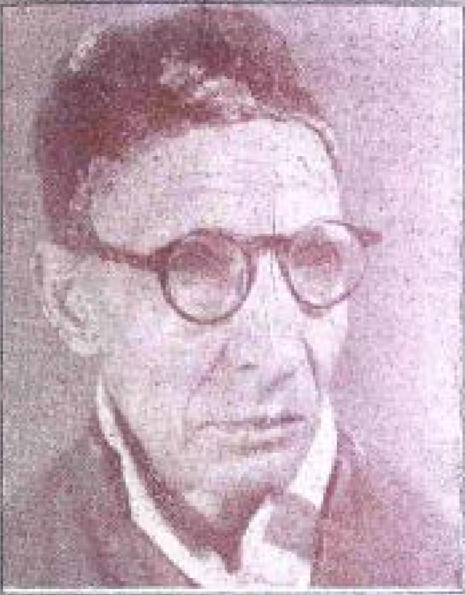

شاد عارفی

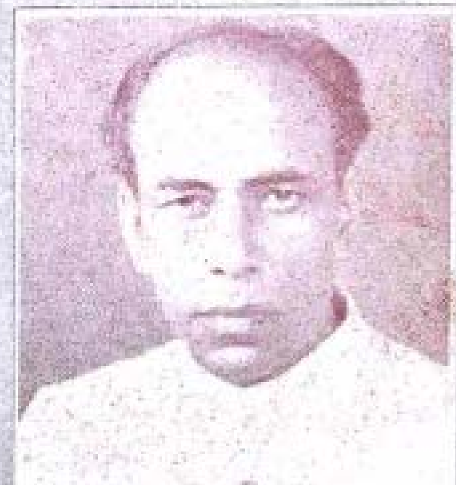

معین احسن جذبی

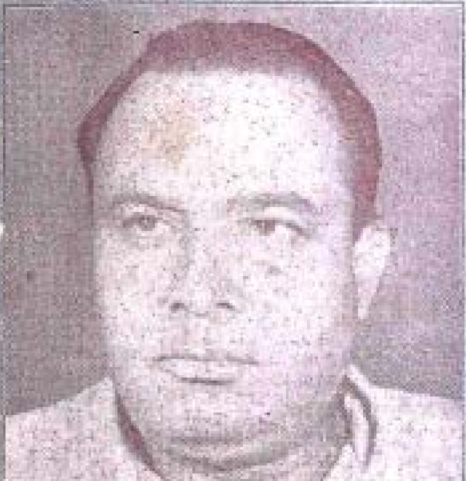

عبدالحمید عدم

(۱)

رفتید، ولے نہ از دلِ ما

(فیضی)

داغ دہلوی

جوش ملسیانی

صدی سے سات آٹھ سال پہلے جس نوجوان شاعر کی گرمیِ کلام کا چرچا دلّی میں گھر گھر ہونے لگا اور جس کے بعض غیر فانی اشعار کی مقامی شعرا اور اساتذہ اور خود بادشاہ ظفر نے وجدانی کیفیت میں آ کر داد دی وہ داغ دہلوی تھے۔ جو آگے چل کر خان بہادر بلبلِ ہندوستان ناظم یار جنگ امیر الدولہ فصیح الملک استادِ حضور بندگانِ عالی آصف جاہ نظام دکن کے القاب سے ملقب ہوئے۔ اور جنہوں نے اپنی گراں مایہ شاعری، حسنِ اخلاق اور وسیع المشرب ہونے کی وجہ سے اتنی قدر و عزت پائی کہ اردو نظم کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

یہ نواب شمس الدین والیِ ریاست فیروز پور جھرکہ کے فرزند تھے۔ سنہ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ صغر سنی ہی میں یتیم ہو گئے۔ تو ان کی والدہ ان کو لے کر قلعہ معلّی میں جاگزیں ہو گئیں۔ ان دنوں کی پریشانیاں اور یہ مصائب ایسے تھے۔ کہ اگر آپ کی تعلیم ناقص رہ جاتی تو تعجب نہ تھا۔ لیکن آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کی تعلیم میں اعلیٰ درجے کی کوشش فرمائی۔ یہاں دن رات یہ شہزادوں کی صحبت میں رہے اور بیگمات کی گودوں میں پرورش پا کر سنِ بلوغ کو پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان نہایت معتبر، نہایت مستند اور ٹکسالی تسلیم کی گئی۔ انہیں خود بھی اس امتیازی خصوصیت پر ناز تھا۔ دیکھئے یہ شعر انہوں نے کس وثوق سے کہا ہے ؎

غیروں کا اعتراض و تصرف غلط ہے داغ
اُردو ہی وہ نہیں جو ہماری زبان نہیں

اسی زمانے میں ان کا کہا ہوا یہ شعر ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

مرزا غالب کو کسی نے سنایا تو وجد میں آ گئے۔ شطرنج کی بازی چھوڑ کر دیر تک کیفیت کے عالم میں رہے اور پوچھا کہ یہ شعر کس نے کہا۔ بہ حیثیت شاعر جب انہیں بادشاہ ظفر کے سامنے پیش کیا گیا تو ان کی عمر بیس سال کے قریب تھی۔ قلعہ معلّی کے شاہی مشاعرے میں خاص خاص شعرا ہی شامل ہوتے تھے۔ عام لوگوں کو یہاں آنے کی اجازت نہ تھی۔ مصرعِ طرح یہ تھا۔ ع

کوئی دشمن نہیں ہے اپنا دشمن آپ ہم نکلے

اس زمین میں مرزا غالب کی غزل بھی ہے۔ اساتذہ پڑھ چکے تو داغ کو حضور میں پیش کیا گیا۔ تعارف ہو چکا۔ تو انہوں نے بھی طرح کی زمین میں اپنی غزل سنانی شروع کی۔ اس غزل کا ایک شعر یہ ہے ؎

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی ‏ ‏ ‏ کسی کا اس طرح یا رب نہ دنیا میں بھرم نکلے

یہ شعر سن کر تمام اہل دربار جھوم اٹھے۔ شاہ ظفر نے بھی داد دی اور فرمایا۔ کیا اچھی طبیعت پائی ہے۔

انہیں دنوں میں ان کا یہ شعر بھی تمام ارباب ذوق کی زبان پر تھا ؎

لگ گئی چپ تجھے اے داغ حزیں کیوں ایسی ‏ ‏ ‏ مجھ کو کچھ حال تو کم بخت سناتا اپنا

اسی طرح یہ مطلع بھی جس میں دل بے تاب کی چار تشبیہیں ایک جگہ جمع کر دی ہیں بہت مقبول ہوا ؎

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں ‏ ‏ ‏ کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دل بے تاب نہیں

اگرچہ وہ بہت زندہ دل۔ بہت شگفتہ مزاج۔ بہت بذلہ سنج اور شوخ طبیعت کے آدمی تھے مگر ان کے ایمان شخصیت کے سب سے بڑے محور ان کی زندگی بخش شاعری۔ ان کی ڈھلی ہوئی اور بے تکلف ٹکسالی زبان اور اس ٹکسالی زبان میں ان کا تغزل یا معاملہ بندی یہی چیزیں ہیں جو ان کی عظمت و شہرت کے لئے پر پرواز ثابت ہوئیں۔ انہی کی بدولت وہ صاحب طرز کہلائے اور انہی کے ذریعہ اتنی قدر و عزت پائی۔ اگر اس قدر و عزت کے اسباب میں اور باتیں بھی شامل ہیں مثلاً قلعہ معلّیٰ میں رہنے کی وجہ سے درباری آداب سے آگاہی۔ ان کے اخلاق حمیدہ جو انہوں نے دلی کی پرانی تہذیب اور شرافت سے سیکھے۔ ان کا وسیع المشرب ہونا۔ مگر یہ دوسرے درجے کی باتیں ہیں۔ بنیادی باتیں وہی ہیں جن کا ابھی ذکر ہوا۔

دلی ان کو عمر بھر نہیں بھولی۔ اس کی یاد میں ہمیشہ بے چین رہے۔ غدر کے مصائب اور دلی کی تباہی سے بیزار ہو کر بادلِ ناخواستہ اسے چھوڑنا پڑا۔ اس عالم میں جو غزل کہی اس کا ایک ایک شعر ان کے مجروح احساسات کا ترجمان ہے۔ یہ مطلع اسی غزل کا ہے ؎

یوں مٹا جیسے کہ دنیا سے گیا ہو کوئی ‏ ‏ ‏ تھا مرا نام و نشاں نام و نشانِ دہلی

اس مطلع کا پہلا مصرع دلی کی تباہی کا مکمل بیان اور اسی ضمن میں اپنی بربادی کی مکمل شرح ہے۔ اسی پر آشوب زمانے میں ان کا بہت سا ابتدائی کلام بھی تلف ہو گیا۔ دلی سے نکلے تو آنولہ ضلع بریلی میں وہاں کے ایک رئیس کے ہاں دو سال قیام پذیر رہے۔ انہوں نے حضرت داغ کی اتنی خاطر مدارات کی کہ ان کے آلام و افکار بہت حد تک دور ہو گئے۔ آخر انہی کی وساطت سے رام پور پہنچے اور نواب یوسف علی خاں کی ادب نوازی و شرفا پروری سے مستفیض ہو کر فکر معاش سے فارغ ہو گئے۔

رام پور ان دنوں دلی اور لکھنؤ کا خلاصہ بنا ہوا تھا۔ دن رات شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ اسیر۔ امیر مینائی۔ جلال لکھنوی۔ خواجہ قلق۔ تسلیم لکھنوی۔ منیر شکوہ آبادی یہ سب مشاہیر رام پور میں جمع تھے۔ داغ نے یہاں آکر اس شگفتہ گل زار کو اور بھی پُر بہار بنا دیا اور وہ یہاں خوب چمکے۔ نواب کلب علی خاں کے عہد میں بھی رام پور کی ادبی شان بڑھتی ہی چلی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت داغ کی شاعرانہ توقیر و منزلت بھی چار چند ہو گئی۔

غزل تو ان کا خاص میدان تھا ہی۔ باقی اصنافِ سخن پر بھی حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ قصائد میں بھی زبان کا وہی رنگ ہے۔ جو ان کی غزل

لکھا ہے ۔ دلی کی تباہی پر جو شہر آشوب لکھا ۔ اسے پڑھ کر تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر

نہایت دردناک پیرائے میں واقعہ نگاری کا یہ کمال انیس و دبیر کے ہاں کے سوا اور کہیں نہ ملے گا ۔ قوت بیانیہ کا جو اظہار اس مسدس میں پایا جاتا ہے اسے دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے ۔ کہ اگر وہ غزل کو چھوڑ کر نظم کی طرف متوجہ ہوتے تو اس میدان میں بھی مرد میدان مانے جاتے ۔

مرزا غالب نے آموں پر ایک نظم کہی ہے ۔ انہوں نے بھی کہی ہے ۔ اس میں بھی زبان کی حلاوت اور حسن بیان ان کی قوت بیانیہ کا شاہکار ہے ۔ ان کے دوست میر نثار علی شہرت جب ایک مدت کے بعد ان سے ملے تو انہوں نے کہا کہ میں اگر آپ کے پائے کا شاعر ہوتا تو غزل کو چھوڑ کر اردو شاعری کا رخ نظم ہی کی طرف پھیر دیتا ۔ اس کے جواب میں حضرت داغ نے جو کچھ فرمایا وہ سننے کے قابل ہے ۔

کہنے لگے ۔ تم سچ کہتے ہو لیکن کیا کروں ۔ جو کام اپنے ذمے لے رکھا ہے وہی پورا نہیں ہوتا ۔ انہوں نے پوچھا ۔ وہ کام کیا ہے ۔ فرمانے لگے کہ جس طرح کان سے جواہر نکلتے ہیں اسی طرح قلعہ معلےٰ اور دہلی میں سے اردو زبان نکلی ہے ۔ جس کے محاورے لعل و یاقوت کی طرح چمکتے ہیں ۔ کوشش یہ ہے کہ دلی کی شستہ زبان تمام ہندوستان میں پھیل جائے ۔ اور ہر شہر میں ایسی ہی اردو زبان بولی جائے ۔ جیسی دہلی میں بولی جاتی ہے ۔ مگر مجھے اس کوشش میں بہت کامیابی ہوئی ہے ۔ مگر ابھی اس امر کی تکمیل نہیں ہوئی ۔ دو آدمی خاص اس امر کے لئے متعین کر رکھے ہیں کہ ہر روز کی ڈاک میں ہندوستان کے شہروں سے جو غزلیں اصلاح کے لئے آئیں وہ بعد اصلاح روانہ کر دی جایا کریں ۔ اگر تمام ہندوستان کی زبان دہلی کے مطابق ہو جائے تو یہ بھی بہت بڑا کام ہے ۔ شہرت صاحب گو اپنے خیالات کے پکے تھے ۔ لیکن داغ صاحب کی یہ جوابی بات انہیں بہت پسند آئی اور مان لیا کہ وہ بہت بڑا کام کر رہے ہیں ۔

اصلاح کا ذکر چلا ہے تو اس کی کچھ تفصیل بھی سن لیجئے ۔ شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے کم نہ تھی ۔ ان کے نام اور پتے رجسٹر میں درج رہتے تھے ۔ ذات پات کی تمیز انہوں نے کبھی گوارا نہیں کی ۔ ان کے شاگردوں میں بہت سے ہندو شعرا شامل تھے ۔ وہ صاحب دیوان بھی ہوئے اور استاد بھی کہلائے ۔ مثلاً پنڈت نیر نرائن پرشاد مہر گیاوی جن کو نواب سائل نے جانشینی داغ کی سند بھی عطا کی تھی ۔ اس اعزاز میں انہوں نے حضرت داغ کے دو تین اور شاگرد بھی شامل کر رکھے تھے اور اس طرح بے خود دہلوی کی رنجش مول لی تھی ۔ منشی حب لال رعد گیاوی ۔ نادر [illegible] اور راقم الحروف بھی اسی برادری میں شامل ہیں ۔

شاگردوں کی اتنی کثیر تعداد ان کی شاعرانہ شخصیت کا روشن ثبوت ہے ۔ ان میں بہت سے اصحاب فارغ الاصلاح تھے ۔ بہت سے ایسے تھے جو خود ہی اپنے آپ کو فارغ الاصلاح سمجھ بیٹھے تھے ۔ پھر بھی ہر روز پندرہ بیس اصلاح طلب خطوط ڈاک میں پہنچتے تھے ۔ بڑی بات یہ تھی کہ اصلاح کا کام ہمیشہ خود ہی کرتے تھے اور اپنے ان فارغ الاصلاح پختہ گو شاگردوں پر جو شرف ملاقات حاصل کرنے کے لئے آتے اور ہفتوں ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے ۔ یہ کام ہرگز نہ چھوڑتے تھے ۔ وہ مزید غزل کے اشعار پڑھتے جاتے اور یہ اصلاح لکھواتے جاتے تھے ۔ جو شعر ناقص ہوتا اسے قلم زد کرنے کے لئے کہہ دیتے اور جو اچھا ہوتا اسے سن کر کہہ دیتے کہ آگے پڑھو ۔ دو ڈیڑھ گھنٹے میں اس کام سے فارغ ہو جاتے تھے ۔ ایک دو لفظوں ہی کی تبدیلی سے شعر میں روح پھونک دیتے تھے ۔ مثلاً میرا ایک شعر یہ تھا ؎

خدا پہ آیا مرا دل نہ پری پہ آیا
پہ بتوں پہ نہیں معلوم کیوں کر آیا

مصرع ثانی میں پہلا لفظ بدل کر "ان" رکھ دیا (ان بتوں پہ) اس تبدیلی سے ایک تو متروک لفظ خارج ہو گیا ۔ دوسرے اس لفظ کی تکرار بھی اس مصرعہ میں بار گوش تھی وہ بھی نہ رہی ۔ تیسرے یہ کہ اس تبدیلی سے کافی رنگ پیدا ہو کر مصرع کی شان ہی کچھ اور ہو گئی ۔

اس کلام میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ جب رامپور چھوڑ کر حیدرآباد پہنچے تو نواب میر محبوب علی خاں آصف تخلص کی غزل بھی [illegible]

ہیں بہ غرض اصلاح آنے لگی۔ اس میں قابلِ ترمیم ٹکڑے کو قلم زد نہیں کرتے تھے۔ ترمیم کے الفاظ کو اوپر لکھ دیتے تھے۔ آدابِ شاہی کا تقاضا بھی یہی تھا یہ کلام ہمیشہ تنہائی میں بیٹھ کر کرتے تھے۔ پھر اصلاح شدہ کاغذ سر بہ مہر کر کے چوب دار کے حوالے کر دیتے تھے۔ کسی اور شاگرد کو یہ معلوم نہ ہو سکتا کہ اصل غزل کیا ہے اور اصلاح کیا ہے۔ بعض دفعہ دن میں چار پانچ بار چوب دار سر بہ مہر لفافہ لاتا اور اسی طرح سر بہ مہر واپس لے جاتا۔ ان کے بعد یہ خدمت حضرت جلیل کے سپرد ہوئی۔ تو وہ قابلِ ترمیم ٹکڑے کو قلم زد کرنے لگے۔ اس پر آصف صاحب نے جب یہ کہا کہ جلیل اصلاح دینا نہیں جانتے۔ تو وہ بھی حقیقتِ حال سے آگاہ ہو کر متنبہ ہو گئے۔

نظام حیدر آباد کبھی کبھی رات کو خود بھی ان سے ملنے کے لیے آ جاتے تھے۔ دربار میں بھی ان کو بیٹھنے کی اجازت تھی۔ اور یہ اعزاز خصوصی تھا۔ جو بہت کم اشخاص کو نصیب ہوتا تھا۔

پختگی کا یہ عالم تھا کہ رام پور میں ایک مشاعرے کا اہتمام انہی کے سپرد تھا۔ درباری مصروفیتوں کی وجہ سے طرحی غزل کہنے کا موقع نہ ملا۔ مشاعرہ منعقد ہوا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ پڑھنے والوں کے اچھے اشعار کی داد بھی دے رہے ہیں۔ مہمانوں کی خاطر و مدارات اور مشاعرہ کے حسنِ انتظام کی بھی نگرانی فرما رہے ہیں اور طرحی غزل بھی کہہ رہے ہیں۔

پڑھنے کا انداز اگرچہ تحت اللفظ تھا۔ مگر بہت دل کش تھا۔ اس زمانے میں دیکھنے والوں نے ریاض خیر آبادی کے سوا کسی شاعر کو اس ٹھسک سے پڑھتے نہیں دیکھا۔

ہر صاحبِ کمال کے حاسد ضرور ہوتے ہیں۔ ان کے کلام پر بھی ان کی زندگی میں اعتراض ہوتے رہے۔ وسطِ ہند کے ایک شخص نے اپنا نام پردے میں رکھ کر اودھ اخبار میں بہت سے اعتراض شائع کیے۔ مگر ان کی مرنجاں مرنج طبیعت کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا کہ خاموش رہیں۔ فرماتے تھے کہ کوئی اس طرح خوش ہوتا ہے تو ہو لینے دو۔ یہی وجہ ہے کہ ان اعتراضات کا دندان شکن جواب ان کے قابل شاگرد نسیم بھرت پوری نے اپنے جذبات سے اثر پذیر ہو کر کتابی صورت میں شائع کیا اور معترض کی خوب خبر لی۔ اس کتاب کا نام تازیانہ تھا۔ اور مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے بالکل اسم بامسمّٰی تھی۔ صرف ایک مثال سن لیجیے۔ داغ صاحب کا مطلع یہ تھا ؎

دیکھ لے گا یہ مزا حشر میں ہو جائے گا　　آپ جو حکم کریں گے وہی ہو جائے گا

معترض کا قول یہ تھا کہ حکم کریں گے کی جگہ یہاں حکم دیں گے کہنا چاہیے۔ نسیم صاحب نے سعدی کا یہ قطعہ بطور سند پیش کر دیا ؎

خواجہ را بندۂ پری رخسار　　چوں بیاید بہ بازی و خندہ
چہ عجب گر چو خواجہ حکم کند　　وے کشد بار ناز چوں بندہ

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ داغ صاحب نے صبر و قرار کے لیے فعل واحد استعمال کیا تھا۔ معترض نے کہا کہ جمع کا فعل آنا چاہیے۔ نسیم صاحب نے جواب میں دو مثالیں پیش کر دیں۔

۱۔ آپ کو وسطِ ہند کی آب و ہوا موافق نہیں ہے۔
۲۔ وہاں کا آب و دانہ قسمت میں تھا۔

اس کے بعد یہ بھی لکھا کہ اصول و قواعد یا زبان کی کسی بات پر اعتراض ہو تو سنا جا سکتا ہے۔ جس شخص نے بیگمات کی گودوں میں پرورش پائی اور شہزادوں کی صحبت میں رہ کر جوان ہوا۔ وسطِ ہند کے رہنے والوں کو اس کی زبان پر اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

کلام کا بہت سا حصہ سہلِ ممتنع ہے۔ زبان کی بے تکلفی اور بیان کی صفائی کے لیے یہ ایک مطلع بطور مثال کافی ہے ؎

حضرتِ دل آپ ہیں جس دھیان میں　　مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

کوئی خاص بات نہیں بتائی اور سب کچھ بتا دیا ہے۔

چھوٹے چھوٹے لفظوں سے بہت بڑا فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہ شعر دیکھئے ؎

تمہیں انصاف سے اے حضرت ناصح کہہ دو
لطف ان باتوں میں آتا ہے کہ اُن باتوں میں

یہاں اِن اور اُن کا استعمال کتنا نادر ہے۔ اسی قسم کی اور بیسیوں خوبیاں ان کے کلام میں موجود ہیں۔ جن پر نقد و تبصرہ اس مضمون کے موضوع سے خارج ہے۔

اچھے شعر کی داد دینے میں بہت فراخ دل تھے۔ بہت سے اساتذہ کو دیکھا ہے کہ مشاعرے میں مہر بلب ہو کر بیٹھے رہتے ہیں اور کسی کو داد نہیں دیتے۔ اگر کوئی شاعر کسی کو مخاطب کر کے شعر پڑھتا ہے۔ تو ذرا سا سر ہلا دیتے ہیں اور بس۔ مگر حضرت داغ اچھے شعر کو سن کر بے تاب ہو جاتے تھے۔ اور مکرر پڑھواتے تھے۔ اگرچہ نو مشق شاعروں کی حوصلہ افزائی بھی اسی عادت کا ایک حصہ تھی۔ مگر پھر بھی شاگردوں کو یہ تاکید تھی کہ صرف اصلاح شدہ غزل ہی مشاعرے میں پڑھا کریں اور ایسی ہی چیز رسالوں میں بھیجا کریں۔

طبیعت بہت انصاف پسند اور منکسر المزاج واقع ہوئی تھی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت ریاض خیرآبادی اپنے استاد حضرت امیر مینائی کی بیمار پرسی کے لئے حیدرآباد آئے اور کئی مہینے وہاں ٹھہرے۔ کبھی کبھی حضرت داغ کی خدمت میں بھی نیاز مندانہ سلام کے لئے حاضر ہونے کا معمول رہا۔ ایک دن حاضر ہوئے تو حضرت داغ کے پاس چند احباب بھی بیٹھے تھے۔ رسمی گفتگو کے بعد داغ صاحب نے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ ریاض صاحب نے اظہار معذرت کیا اور کہا آپ کے سامنے کیا پڑھوں۔ داغ صاحب نے احباب سے کہا کہ یہ ہم میں سے کسی کو بھی اپنا مخاطب نہیں سمجھتے۔ ریاض صاحب نے یہ چبھتی ہوئی طنز سن کر کہا کہ آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ میں اپنے استاد کے سامنے بھی نہیں پڑھتا۔ آپ کا بھی ویسا ہی احترام کرتا ہوں۔ مگر یہ عذر قبول نہ ہوا۔ مزید اصرار پر ریاض صاحب نے مختصر سی زمین میں ایک غزل سنا دی۔ اس کے دو تین شعر یہ ہیں ؎

جیتے مر کر تو زمیں بھی نہیں
اب ٹھکانا مرا کہیں بھی نہیں
آہ کے ہمرہ اشک کیسے چلتے
آسماں بھی نہیں زمیں بھی نہیں
چپ ہیں وہ کس کے بھری محفل
منہ سے ہاں بھی نہیں نہیں بھی نہیں
لو گرا کے تجھ کو اے دل سرد
جرعۂ آب آتشیں بھی نہیں

داغ صاحب نے بہت داد دی۔ بہت خوش وقت ہوئے۔ چند یوم کے بعد ریاض صاحب پھر ملاقات کے لئے آئے تو فرمایا۔ کہ وہ زمین مجھے پسند آئی تھی۔ میں نے بھی غزل کہی ہے۔ مگر تمہاری غزل کے سامنے پست معلوم ہوتی ہے۔ فرمائش اور اصرار پر غزل سنانے لگے۔ ریاض صاحب لکھتے ہیں کہ غزل بلند پایہ تھی۔ مگر پھر بھی یہ فرمایا کہ مجھے پسند نہیں۔ یہ کہہ کر کاغذ میرے سامنے پھاڑ ڈالا۔

اس واقعہ کا آخری حصہ غلط ہو یا درست۔ پھر بھی ان کی انصاف پسندی اور فراخ دلی کا یہ پورا ثبوت پیش کرتا ہے۔

اپنے ہم عصروں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مثال میں یہ شعر کافی ہے ؎

اے داغ چلو دلی سے بہت دور لکھنؤ
تھے امیر احمد و تسلیم جہاں سے

اسی سلسلے میں حضرت امیر مینائی کا یہ شعر بھی قابل ذکر ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ ان کے ہم عصروں کا برتاؤ بھی ان کے ساتھ بہت مخلصانہ تھا۔

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مطلع ہے
بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

آن سے نکلا ۔ شان سے نکلا ۔ اس زمین میں حضرت داغ کی ایک غزل ہے ۔ حضرت امیر نے اس غزل کی تعریف بھی زوردار الفاظ میں کی تھی ۔ احباب کو اس کا مطلع بھی سنایا تھا اور فرمایا تھا کہ اس مطلع کا جواب نہیں ہو سکتا ۔ وہ مطلع یہ ہے :

خار حسرت بیان سے نکلا
دل کا کانٹا زبان سے نکلا

حیدرآباد میں ایک مشاعرہ تھا ۔ یہ خود تو شامل نہیں ہو سکے ۔ ان کے کئی شاگرد شامل مشاعرہ تھے ۔ ان کے خواجہ تاش سید ظہیر کا ایک معرکے کا کلام تھا ۔ انہوں نے اصرار کیا کہ مجھے پڑھوا دیا جائے ۔ مگر بار بار کہنے پر بھی مہتمم مشاعرہ نے احتراماً انہیں نہ پڑھوایا ۔ اور کہا کہ آپ کے بعد کوئی اور شاعر پڑھنا گوارا نہ کرے گا ۔ مشاعرہ خراب ہو گا ۔ انہوں نے مزید اصرار کیا ۔ مگر شنوائی نہ ہوئی ۔ تو غصے میں دونوں غزلیں چاک کر ڈالیں اور چل دیئے ۔ مشاعرے میں سناٹا چھا گیا ۔ مہتمم مشاعرہ نے باقی شعرا کی منت خوشامد کی اور ان کو پڑھوایا ۔ داغ صاحب کو اس کا علم ہوا ۔ تو اگلے دن ان سب شاگردوں کو ڈانٹا اور کہا کہ جب ظہیر صاحب نے غزل نہیں پڑھی اور اٹھ کر چلے گئے تو پھر تم نے یہ بے ادبی کیوں گوارا کی ۔ تم بھی اٹھ کر چلے آتے ۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں اور مشاہیر کا کتنا احترام کرتے تھے ۔

رام پور میں ان کی شاعرانہ شخصیت کا یہ عالم تھا ۔ کہ ہر مشاعرے پر چھا جاتے تھے ۔ حضرت امیر مینائی خود کہا کرتے تھے کہ غزل پر محنت کرنے سے کیا ہو ۔ مشاعرہ تو داغ ہی کے ہاتھ رہے گا ۔ نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور نے بارہا ایسا کیا ۔ کہ خفیہ طور پر چند آدمی یہ معلوم کرنے کے لئے مقرر کر دیئے ۔ کہ مشاعرہ ختم ہونے پر جب حاضرین رخصت ہوں ۔ تو ان کی گفتگو مشاعرہ کے متعلق سنیں اور دیکھیں کہ وہ راستہ چلتے چلتے کس شاعر کی تعریف کرتے اور کس کے اشعار کو دہراتے ہیں ۔ ان کی رپورٹ بھی ہمیشہ حضرت داغ ہی کے حق میں ہوتی تھی ۔ اور لوگ انہی کے اشعار کو مزے لے لے کر پڑھتے پائے جاتے تھے ۔ حیدرآباد میں بھی ان کے کلام کی مقبولیت کا یہی عالم تھا ۔ اخیر عمر میں تو وہ پھیکا شعر بھی کسی مشاعرے یا کسی صحبت میں پڑھ دیتے تھے ۔ تو اس پر بھی خاصی واہ وا ہو جاتی تھی ۔

حیدرآباد میں ان کی ابتدائی تنخواہ ۴۵۰ تھی ۔ پھر ایک ہزار ہوئی ۔ پھر ڈیڑھ ہزار ۔ مگر ہر ایک ترقی روز اول ہی سے شمار کی گئی ۔ ایک دفعہ انہیں پندرہ ہزار روپیہ اسی ترقی کے حساب میں ملے تھے ۔ آئے دن کے انعامات و اکرامات اس کے علاوہ تھے ۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی سرپرستی میں بھی بہت کچھ خرچ کرتے تھے ۔ ایک دفعہ نظام حیدرآباد نے یہ سنا کہ داغ سات ہزار کے مقروض ہیں ۔ انہوں نے یہ قرضہ ادا کرنے کے لئے کل رقم بھیج دی ۔ ان کی منہ بولی بیٹی لاڈلی بیگم کا بھی وظیفہ مقرر تھا ۔ یہ لڑکی دراصل ان کی سالی کی بیٹی تھی ۔ جو بعد میں نواب سائل دہلوی سے بیاہی گئی اور ابھی تک بقید حیات ہے ۔

شاگردوں کی کثیر تعداد میں جیسے بیخود دہلوی ۔ بیخود بدایونی ۔ نوح ناروی ۔ نواب سائل ۔ رسا رامپوری ۔ نسیم بھرت پوری ۔ احسن مارہروی ۔ طپش مارہروی ۔ مہر گیاوی ۔ نواب عزیز یار جنگ ۔ حضرت اقبال ۔ وفا گلاؤٹھی ۔ ناطق گلاؤٹھی ۔ احسن سنبھلی ۔ مبارک عظیم آبادی ۔ متین مچھلی شہری ۔ وجاہت جھنجھانوی ۔ نادر دہلوی ۔ رعنا اکبرآبادی ۔ ثاقب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود نظام دکن شامل ہوں ۔ تو اس سے بڑھ کر ان کی شاعرانہ عظمت کا ثبوت اور کیا ہو گا ۔ کلام اس قدر مقبول ہوا کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی ان کے صدہا اشعار لوگوں کی زبان پر ہیں ۔ چار دیوان شائع ہوئے ۔ گلزار داغ ، آفتاب داغ اور مہتاب داغ تو ان کی زندگی ہی میں منظر عام پر آ گئے تھے ۔ اور تمام دنیائے ادب سے خراج تحسین وصول کر چکے تھے ۔ مثنوی فریاد داغ ان کے علاوہ ہے ۔ چوتھا دیوان یادگار داغ ان کے بعد حضرت احسن مارہروی نے مرتب و اشاعت کیا ۔ اس کے علاوہ فصیح اللغات بھی ان کی زیر نگرانی مرتب ہو رہی تھی ۔ مگر عمر نے وفا نہ کی اور سنہ ۱۳۲۲ھ یا فروری سنہ ۱۹۰۵ء میں دنیا سے رخصت ہوئے ۔ مزار حیدرآباد ہی میں ہے ۔

ان کی وفات پر جو ماتمی مضامین شائع ہوئے ۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صدمہ تمام دنیائے ادب میں شدت سے محسوس کیا گیا۔ بہت سے رسالوں اور اخباروں نے زوردار مضامین لکھے ۔ تمام مشہور شعرائے وقت نے ماتمی نظمیں اور قطعات تاریخ دردناک پیرائے میں کہے ان میں حضرت اقبال ۔ حضرت مضطر خیرآبادی اور حضرت ریاض خیرآبادی کی ماتمی نظمیں خاص طور پر قابل ذکر اور بہت بلند پایہ ہیں ۔ نواب میرزا داغ (۱۳۲۲ھ) کے انتقال پر بیش تر احباب کے قطعات تاریخ میں بطور توارد پائے جاتے ہیں ۔ راقم الحروف نے دس بارہ شعر کا ایک قطعہ تاریخ کہا تھا ۔ اس کا آخری مصرع جس میں مادۂ تاریخ ہے یہ تھا ۔ ع

بلبل ہندوستاں آج اپنے گلشن میں نہیں
۲۲ ۱۳ ھ

اکبر الہ آبادی

عبدالماجد دریابادی

تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا لکھوں
گفتنی درج گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی!

اکبر کا یہ الہامی شعر دوسروں کے حق میں جس حد تک بھی صحیح ہو، خود ان کے حق میں تو بہرحال صحیح نہیں۔ ان کے درج گزٹ معاملات و حالات گفتنی یقیناً ہیں، باقی جو گزٹ سے بالکل باہر ہیں وہ بھی چاہے سب کے سب مثالی معیاری مشرقی نہ ہوں، پھر بھی ناگفتنی کہے کے لائق تو کسی طرح بھی نہیں۔

یہ بھی تو فرما گئے ہیں ؎

اکبر کی برائی اچھائی پوچھو اس کے محلہ والوں سے
ہاں شعر وہ اچھا کہتے ہیں، دیوان تو ان کا دیکھا ہے

لیکن محلہ والوں کی شہادت انشاءاللہ ان کی صفائی ہی میں گزرے گی۔ استغاثہ کو وہاں سے زور نہ ملے گا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ خوب سمجھ لیجئے کہ جن حضرت اکبر کو ہم آپ جانتے پہچانتے ہیں وہ اپنی پبلک زندگی میں ایک شاعر تھے اور خالص شاعر۔ اول بھی شاعر اور آخر بھی شاعر۔ جو سید اکبر حسین وکیل تھے اور پھر منصف ہوئے، سب جج ہوئے، عدالت خفیفہ کے جج ہوئے، ڈسٹرکٹ اور سیشن جج ہوئے اور ہائی کورٹ کی ججی کی منزل تک پہنچتے پہنچتے رہ گئے۔ ان سے ہم کو آپ کو کوئی سروکار نہیں۔ ان سے اگر کچھ واسطہ ہے بھی تو بالواسطہ، اور بہت گھوم پھر کر۔ —— سننے والے کہتے ہیں کہ ان کی سرکاری زندگی کا بھی رخ روشن ہی رہا، صاف اور بے داغ رہا، کام جو کچھ کیا دیانت سے کیا، محنت سے کیا، قابلیت سے کیا، فہم سلیم کے ساتھ کیا۔ فرض کو فرض سمجھ کر کیا۔

شاعر کی ذاتی زندگی کو، شاعر کی شخصیت کو جب جانچا جائے گا تو اسے اسی کے پیمانہ سے ناپا جائے گا۔ یہ نہ ہو گا کہ جانچ ہو رہی ہے ہوں ہم شاعر کی اور عینک لگا لیں پبلک لیڈر والی، عالم دین والی، مرشد وقت والی۔

حضرت اکبر کے کلام سے واقفیت بلکہ گرویدگی اپنے بچپن ہی سے تھی۔ اس وقت سے کہ جب شعر سمجھنے کی معمولی سی تمیز بھی نہ تھی۔ لیکن پھر سیتاپور (اپنا وطن ثانی) رہا۔ ۱۹۰۸ء میں یہ ہوا کہ اکبر صاحب یا صاحبزادہ سید عشرت حسین ڈپٹی کلکٹر ہو کر سیتاپور آ گئے۔ ہماری ہی کوٹھی کے ایک حصہ میں آ کر اترے اور ہم لوگوں سے خوب خلا ملا ہو گیا۔ میں اس وقت لکھنؤ کالج میں پڑھنے آ چکا تھا۔ پھر بھی سیتاپور آمد و رفت کثرت سے رہا کرتی اور عشرت صاحب (یعنی صاحبیت "اور میں میں مجھ سے بہت بڑے ہونے کے باوجود مجھ پر بہت مہربان ہو گئے۔ بالکل بے تکلف" اور اس طرح حضرت اکبر سے وثوق واقفیت کی بنیاد اسی وقت سے پڑ گئی۔ براہ راست تعارف پہلی بار اپریل ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ میں بی۔ اے کا امتحان دینے الٰہ آباد گیا اور وہیں عشرت منزل حضرت اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا ——— پہلی ملاقات کا منظر آج تک لوح حافظہ میں منقوش ہے۔ حضرت اکبر آرام کرسی پر تشریف فرما تھے (عموماً یہی طریقۂ نشست تھا) سامنے حقہ لگا ہوا تھا۔ میں ادب سے جا کر ایک چھوٹی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس محبت و شفقت سے ملے کہ جیسے اپنے ہی خاندان کا کوئی شفیق بزرگ ملتا ہے۔ میرے عقائد اس وقت اسلام سے بالکل ہٹے ہوئے تھے اور یہ قدرتاً اکبر جیسے دیندار شخص کے لئے یقیناً کشیدگی کا باعث ہو سکتا تھا اور پھر سن میں بھی اتنا فرق کہ وہ ۶۶ سال کے بزرگ سال خوردہ اور میں عمر کے بیسویں سال میں۔ اس پر بھی کوئی چیز اکبر کے حسن اخلاق و شفقت بزرگانہ میں حائل نہ ہو سکی اور پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھ سے ہر طرح بے تکلف ہو گئے۔

اس وقت سے لے کر وقت رحلت (ستمبر ۱۹۲۱ء) تک کوئی ۱۰ سال کی مدت ہوتی ہے، اس پورے کال کو اچھا خاصہ قرب اس باکمال سے نصیب رہا۔ سال میں دو چار بار شرف نیاز ضرور حاصل ہو جاتا۔ زیادہ تر لکھنؤ ہی میں اور دو بار الٰہ آباد میں اور ایک بار پرتاب گڑھ میں بھی حاصل ہوا اور خط و کتابت تو کثرت سے رہتی۔ یہاں جو کچھ عرض ہو گا عمر کے اس دور سے متعلق مشاہدہ یا براہ راست تجربہ ہی پر مبنی ہو گا۔ ہاں اس کے قبل کی بابت جو کچھ عرض ہو گا وہ دوسروں ہی کی روایات و بیانات سے ماخوذ ہو گا۔

جسمانی حیثیت سے حضرت اکبر بہت ہی لاغر اور کچھ خمیدہ سے تھے۔ سر چھوٹی، بڑی آنکھوں پر عینک لگی ہوئی۔ داڑھی کچھ چھدری سی جس کے اکثر بال سفید۔ چہرہ میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو انہیں عوام سے ممتاز کرتی۔ آنکھوں میں ذرا چمک البتہ تھی۔ لباس بالکل معمولی قسم کا پہنتے۔ سواری میں خش گاڑی رہتی۔ اور اسی کو اپنے رہنے کے ایک علامت امارت کی سمجھئے کہ یہی عشرت منزل انہی کی بنوائی ہوئی تھی۔ ایک لق و دق اور خوشنما قطع حویلی۔ کسی زمانہ میں دوستوں کے قہقہوں اور بچوں سے معمور، خوب آباد اور پررونق تھی لیکن اب اکثر اوقات ویران سی ہو گئی تھی۔ نہ دعوتیں نہ جلسے نہ مشاعرے، نہ ملنے جلنے والوں کا ہجوم۔ بس کبھی کبھی دو چار کوئی آ جاتے۔ کھانا بھی اوسط درجہ کا کھاتے، نہ بہت امیرانہ اور نہ بالکل غریبانہ۔ کھانے کی مقدار بہت کم ہوتی اور زیادہ روغنی اور ثقیل غذاؤں سے بڑی احتیاط رکھتے۔ چائے وغیرہ کے بھی شوقین نہ تھے ——— جوانی کی تصویروں میں البتہ دیکھا کہ خاصے وجیہ تھے اور چہرہ بھرا ہوا رکھتے تھے اور اس دور میں کھانا اور لباس بھی ذرا پر تکلف رہتا۔

عام طور پر افسردہ و غمگین ہی رہا کرتے۔ ایک بڑے ہونہار اور چہیتے لڑکے ہاشم کا ۱۹۱۳ء میں عین اس وقت جب وہ سن و آغاز ہو چکا تھا انتقال ہوا اور اس کی ماں "حضرت اکبر کی محبوب بیوی" اس سے قبل ہی رحلت کر چکی تھیں۔ یہ چھوٹی بیگم تھیں۔ بڑی بیگم سے کبھی نہ بنی جس شخص کی [illegible] سے ان سے علیحدگی رہی۔ اسباب اور اندرونی حالات کا اللہ ہی کو علم ہے بہرحال یہ زندگی بھی حضرت اکبر کے لئے کوفت کا باعث تھے۔ یہ خانگی صدمہ [illegible] پھر اس پر بھی دل جلا دینے کے لئے خود ہی کیا کم تھا کہ بڑے صاحبزادہ اور اب بس ایک باقی رہ گئے تھے ان کے عادات و اطوار اور پھر عقائد نے حضرت اکبر کو اور بھی فکر و تشویش میں ڈال رکھا تھا۔ [illegible] شیعہ گھرانے کا تھا اور اکبر اپنی ذات سے سخت قسم کے سنی۔ برابر اس طرف سے فکرمند و افسردہ ہی رہا کرتے۔

آخر میں صحت بھی بہت گر گئی تھی اور روز بیمار رہنے لگے تھے۔ طبیعت بڑی حساس واقع ہوئی تھی۔ گرمی سردی شور و غل ہر چیز کا اثر بہت زیادہ لیتے۔

اور معمولی اور بے ضرر غذاؤں سے بھی شدید نقصان کا وہم قائم کر لیتے۔ طبیب کو علاج میں خاصی دقت ہوتی۔ یہ اس کے تجویز کیے ہوئے نسخے میں برابر ترمیم کراتے کہ دیکھئے فلاں دوا مجھے موافق نہیں آئے گی۔

ان ذاتی حالات کے علاوہ ملکی و قومی انتشار بھی حضرت اکبر کی جمعیت خاطر کو پراگندہ کیے ہوئے تھا۔ دیکھ رہے تھے کہ مسلمان اپنے قدیم عقائد کو خیرباد کہہ کر "تجدد"، "روشن خیالی"، نیچریت اور فرنگیت کے سیلاب میں بہتے چلے جا رہے ہیں، اور ان کے سے ذکی الحس شخص کو اس سے قلق ہونا بالکل قدرتی تھا۔ پھر سیاسی حیثیت سے بھی نہ انہیں یہ گوارا تھا کہ مسلمان بدستور انگریزوں کی سیادت و بالادستی قبول کیے پڑے رہیں اور نہ وہ حکومت سے مقابلے کے گاندھی جی کے اصول اور کانگریس کے طریق کار سے متفق تھے اور مسلم لیگ بھی جیسی کہ وہ اس وقت تھی کچھ ان کی مرضی کے مطابق نہ تھی۔ یہ سارا سماں دیکھ کر وہ اندر ہی اندر کڑھتے اور گھٹ گھٹ کر رہتے۔ کھل کر کچھ کہنے کی یا اعلانیہ میدان عمل میں آ جانے کی نہ ہمت اپنے میں پاتے اور نہ اسے کچھ زیادہ مفید یا مناسب ہی سمجھتے۔ کوئی دوسرا ان کے خیالات و جذبات کی ترجمانی میں کچھ لکھ دیتا تو اس سے بہت خوش ہوتے۔ اور جب اس کی ہمت نہ رکھتے تو خود بس اشارے کنایے اپنی شاعری میں کرتے رہ جاتے اور کلام کے چہرے پر مزاح و ظرافت کا نقاب اسی غرض و مقصد سے ڈالے رہتے۔ کہہ بھی تو گئے ہیں ؎

مدعا مبہم تھا جو ایسی چل رہی تھیں رہ غبار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

ظرافت و شوخی کچھ تو اصلی و طبعی رنگ بھی تھا اور کچھ اس لیے بھی اختیار کیا کہ اس کی آڑ میں دل کی بھڑاس نکالنے کا پورا موقع مل جائے گا۔ وہی مرشد معنوی کی ہدایت پر عمل کہ "سرّ دلبراں" بیان کرنا ہو تو پیرایہ "حدیث دیگراں" کا اختیار کرو۔

غرض ان کی مستقل افسردگی اور سخت قلبی اضطراب و دلگیری ذاتی و قومی حالات کے مجموعہ کا نتیجہ تھی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو مزاج میں جھلاہٹ اور طبیعت میں چڑچڑا پن ضرور پیدا ہو جاتا۔ اکبر کے ہاں یہ کچھ نہ ہوا۔ البتہ ایک مستقل اداسی رہنے لگی اور غم غلط کرنے کا ایک نسخہ انہوں نے اپنی ظریفانہ شاعری کو بنایا۔ جلسوں اور صحبتوں میں گفتگو بہت زیادہ نہ کرتے کہ دوسروں کو بولنے کا موقع ہی نہ ملے اور نہ ایسے خاموش رہتے کہ بس دوسرے ہی بولتے رہیں اور یہ چپکے سنتے ہی رہ جائیں۔ گفتگو میں خود بہت کم ہنستے، دوسروں کو اکثر ہنساتے رہتے۔ ظرافت گویا ان کے گھر کی کنیز تھی اور قافیے جیسے ہاتھ باندھے سامنے حاضر رہتے۔ شعر برجستہ اور فی البدیہہ کہہ ڈالتے۔ گفتگو عام تذکروں و وقتی چیزوں کے علاوہ جب اپنی مرضی کے مطابق کرتے تو یا تو اپنا کلام سناتے اور یا پھر توحید و معرفت کا ذکر چھیڑ دیتے۔ آخر زمانہ میں ان کا سب سے دل پسند موضوع یہی تھا۔ بیکار طول طویل گفتگو سے گھبراتے۔ بات مختصر کہتے۔ گفتگو کا بیشتر حصہ یا عارفانہ و حکیمانہ ہوتا اور یا پھر شعر و ادب کے کسی نکتہ پر مشتمل۔ مخاطب کی دلجوئی کا بڑا لحاظ رکھتے اور بحث و مباحثہ مذہبی کیا معنی سیاسی بھی حتی الامکان کسی قسم کا پیدا نہ ہونے دیتے۔ بلکہ جب دیکھتے کہ مناظرانہ رنگ آیا ہی چاہتا ہے تو کوئی لطیفہ یا چٹکلہ درمیان میں لا کر بات وہیں ختم کر دیتے۔

مذہبی عقائد میں بڑے پختہ تھے۔ معاصر علما میں سب سے زیادہ قائل و معتقد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے تھے۔ عام عقیدت بھی دیوبند سے زیادہ تھی۔ عملاً بھی مذہب کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ نماز اول وقت پڑھنے کا خاص اہتمام رکھتے اور وقت آنے کے منتظر و مشتاق رہا کرتے۔ بار بار گھڑی دیکھتے جیسے کوئی عازم سفر اسٹیشن جانے کے لئے گھڑی دیکھتا رہتا ہے۔ اپنے ملازموں وغیرہ کو ساتھ لے کر حتی الامکان چھوٹی سی جماعت کا بھی التزام رکھتے بلکہ نئے ملازم سے سامنے رکھتے ہوئے کہہ بھی دیتے کہ بھئی نماز میرے ساتھ پڑھنا ہوگی۔ میں نے اپنے الحاد سے نکلنے کے بعد جب جب بھی دو چار نمازیں ان کے ساتھ پڑھی ہیں تو بے انتہا خوش ہوئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دولت خداداد ان کو مل گئی ہے۔ نماز کے بعد پھر تلاوت قرآن مجید کے شائق نہیں عاشق تھے۔ دو وقت پابندی کے ساتھ قرآن پڑھتے۔ ایک بعد نماز فجر، دوسرے بعد نماز ظہر۔ عربی کی باضابطہ استعداد کچھ زیادہ نہ رکھتے تھے۔ مجھے جو کچھ عربی آتی

تلاوتِ قرآن کی حلاوت سے آگاہی اور اب بھی آیاتِ قرآنی کا مفہوم با لطف سمجھ لینے لگا ہوں۔

مذہبیت کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار دہلی بستی نظام الدین اولیا میں جا کر خواجہ حسن نظامی کے مہمان ہوئے۔ درگاہ کے دروازے ہی پر غالب کی تربت تھی۔ خواجہ صاحب نے بتایا۔ ان کے ساتھ فاتحہ پڑھتے چلے۔ مگر کچھ ہی دور چل کر رک گئے اور بولے کہ میں نہیں جاؤں گا۔ یہ تو وہی ہے جو جنت کے متعلق یہ شعر کہہ گیا ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ایسے شخص کی قبر پر میں فاتحہ نہیں پڑھوں گا۔ اللہ میاں اس کے ساتھ جو بھی چاہیں معاملہ کریں۔"

تصوف کے بڑے معتقد تھے لیکن ان کا تصوف بھی خالص اسلامی طرز کا تھا۔ پیرزادوں اور درگاہ کے مجاوروں والا چادر گاگر، عرس، سماع سب سے بچتے اور ملفوظات و کرامات کے بھی کچھ زیادہ قائل نہ تھے۔ بس توحید ہی کا رنگ غالب تھا اور اسی کا اعتقاد برابر مستحکم رہا۔ اپنے دورانِ قیام میں درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء پر روزانہ حاضری دیتے لیکن کسی بدعتی تماشے نیاز وغیرہ میں شرکت نہ کرتے۔ بس تربت کے پاس بیٹھ کر کلام مجید پڑھا کرتے۔ بزرگوں کے قصص و حکایات بھی بیان نہ کرتے، بلکہ میں ان کے آخری زمانہ میں جب میں حلقۂ تصوف میں داخل ہوا اور صوفیا کی حکایات زیادہ بیان کرنے لگا تو اکبر صاحب انہیں بڑی حیرت ہی سے سنتے اور کبھی ایسے ایسے ٹیڑھے سوال کر دیتے کہ بیان کرنے والا جھینپ کر رہ جاتا۔ ایک روز میں فریدالدین عطارؒ کی مثنوی "منطق الطیر" کا کوئی مقام جھوم جھوم کر سنا رہا تھا، پوچھ بیٹھے "ان صاحب کا مذہب کیا تھا؟" میں بے چارہ داد و تحسین کے بجائے یہ سوال سن کر جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

اس سے بھی بڑھ کر سنئے۔ میں نے مثنوی مولانا روم کا مطالعہ کیا تھا اور اس سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ مثنوی ہی کا ذکر و فکر ہر وقت کا مشغلہ تھا اور اسی نشے سے چوبیس گھنٹے سرمست رہتا تھا۔ یہی تذکرے حضرت اکبر کے سامنے شروع کر گئے۔ ایک بار سنا، کچھ ہلکی سی داد دی۔ دوبارہ سنا، چپ ہو گئے۔ تیسری بار جب پھر یہی تذکرہ میں نے چھیڑا تو بول اٹھے "کیوں صاحب اللہ میاں بڑے ہیں یا آپ کے مولانا روم صاحب؟" میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر جواب دیا کہ "ظاہر ہے صاحب اللہ میاں بڑے ہیں" بولے کہ "آپ کی زبان سے ہر بار مولانا روم ہی کی بڑائی نکلی۔ اللہ میاں کی بڑائی ایک بار بھی نہ سنی۔ اس لئے پوچھا تھا۔" پھر بولے کہ "اس طرح سوچئے کہ اللہ میاں اپنی قدرت و حکمت سے آپ کو مولانا روم تک لے گئے یا مولانا روم نے آپ کو خدا تک پہنچا دیا؟" —— غیرت توحید اس درجہ غالب تھی کہ اس کے آگے ہر عقیدت، ہر محبت دب کر رہ گئی تھی۔

حمد اور انتہا یہ ہے کہ نعتیہ مضامین کا سننا بہت دیر تک گوارا نہ کرتے اور بحث اس میں بھی توحید کی لا دیتے۔ ایک روز فضائل و مناقبِ رسول کا تذکرہ جاری تھا، دو چار منٹ تک تو دلچسپی ہی سے سنتے رہے پھر بول اٹھے "جی ہاں! ہمارے اللہ میاں کی کاریگری کا کیا کہنا۔ دیکھئے ایسا جامع کمالات رسول پیدا کر دیا" —— توحید کے بعد دوسرے نمبر پر حبِ رسولؐ کا مرتبہ تھا۔ یہی ذکر خود بھی کرنا چاہتے اور دوسروں سے بھی سننا چاہتے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس سے دلچسپی رکھنے والے لوگ ہی انہیں کتنے اور کہاں ملتے۔

اس سے خیال یہ نہ ہو کہ اکبر کوئی خشک قسم کے انسان تھے۔ جی نہیں، گفتگو بڑی دلچسپ کرتے اور علمی، ادبی، سیاسی، معاشرتی ہر عنوان پر گفتگو فرما لیتے۔ انگریزی کی استعداد اچھی خاصی تھی اور علاوہ انگریزی اخبارات کے ادبی انگریزی کتابیں بھی پڑھتے رہتے۔ بیشک بڑے کتب بینوں میں ان کا شمار نہ تھا، یعنی یہ نہ تھا کہ ہر وقت کتاب کے کیڑے بنے رہتے لیکن یہ بھی نہ تھا کہ اس مذاق سے کورے ہوں۔ مطالعہ میں اکثر فلسفی کتابیں رکھتے خصوصاً روحانی فلسفے کی اور اس بارے میں مدد انہیں اپنے صاحبزادہ سے مل جاتی۔ عشرت صاحب کیمبرج کے گریجویٹ تھے اور اپنا [illegible]

کی نئی نئی فلسفیانہ کتابوں سے اپنے دماغ کو برابر باخبر رکھتے۔ پروفیسر میک ٹگرٹ (Mc Taggart) وغیرہ کی کتابیں میں نے پہلے پہل انھی کے ہاں دیکھیں۔ مذہب اور تصوف کی تائید میں خوب خوب نکتے ان لوگوں کے ہاں سے پیدا کیا کرتے۔ شاید [illegible] صاحب ہی نے برکلے (Berkeley) کے مکالمات کا اردو میں ترجمہ کیا۔ برکلے کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ "موجودیت" تحلیل ہو کر "معلومیت" پر پڑتی ہے اور اس کے سوا وجود کا وجود بے معنی ہے۔ اکبر اس فلسفہ کو سن کر بڑے خوش ہوئے اور فرمایا کہ "یہی تو ہمارے صوفیہ شروع سے کہتے آ رہے ہیں کہ سارے موجودات کا وجود بس علم باری ہی ہے"۔ — ایسے ایسے نکتے دن رات پیدا کرتے رہتے۔ پڑھتے کم تھے، سوچتے زیادہ تھے اور کتابی معلومات سے کہیں زیادہ تکیہ اپنے ذہن و دماغ پر رکھتے۔

گاندھی جی سے کچھ زیادہ حسن ظن نہیں رکھتے تھے اور نہ ان کی تحریک ترک موالات کے کچھ زیادہ قائل تھے۔ میرے دل و دماغ پر اس وقت گاندھی جی کی عقیدت و عظمت پوری طرح چھائی ہوئی تھی اور علی برادران تو ان کی صرف سیاسی رہنمائی اور سوجھ بوجھ کے قائل تھے لیکن میں انھیں روحانی پیشوا کے درجہ پر رکھنے لگا تھا۔ جولائی ۱۹۲۰ء میں، عین تحریک خلافت و ترک موالات کے شباب کے وقت، حضرت اکبر سے ملا اور لگا گاندھی جی کی روحانیت اور روحانی عظمت کے قصے بیان کرنے۔ کچھ دیر بعد حضرت اکبر فرمانے لگے ہاں کیوں صاحب! ان کی انجمن میں شریک ہونے کے لئے پہلی شرط تو توحید الٰہی کی ضرور ہوگی؟ — اس کا جواب ہی کیا تھا۔

گفتگو میں نازک موقعوں پر لطیفہ گوئی سے خوب کام نکال لیتے۔ مثلاً [illegible] میں یوپی کے چیف سیکرٹری مسٹر [illegible] تھے، بڑے صاحب اثر و اقتدار، فارسی کے ماہر اور اردو سے بھی واقف تھے۔ اکبر صاحب سے ملنے گئے تو ان سے بولے کہ "اب مسلمانوں نے بھی آزادی کے لئے بڑا ایجی ٹیشن شروع کر دیا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟" اکبر کو کھلا جواب خلاف مصلحت نظر آیا، [illegible] سے بولے کہ "میں تو اور کچھ نہیں جانتا، اتنا جانتا ہوں کہ 'آدم زاد' میں جب تک 'دم' ہے 'آزاد' کہاں ہو سکتا ہے۔ 'آزاد' تو جبھی ہوگا جب 'دم' نکل جائے گا"۔ انگریز حاکم کہاں تو غصہ میں تھا کہاں اس ادبی لطیفہ پر ہنس پڑا۔

دوسروں کو چاہے وہ ان کے خورد ہی کیوں نہ ہوتے روکتے ٹوکتے نہیں، عموماً لطیف و شستہ پیرایہ اختیار کرتے۔ لکھنؤ میں ایک بار ایک جواں عمر سرکاری عہدہ دار ملنے آئے اور یہ حریت نسواں کے بڑے علمبردار تھے، اکبر صاحب کا مسلک دوسرا۔ آزادی نسواں کے مطالبہ کی تردید میں فرمایا کہ لوگ سید احمد خاں کو بڑا آزاد خیال مصلح بتاتے ہیں لیکن عورتوں کی آزادی سے تو وہ بھی پناہ مانگتے تھے۔" وہ صاحب تیزی میں بول اٹھے کہ "سرسید کی رائے اس معاملہ میں تو بہت قابل ترمیم تھی"۔ اکبر صاحب بغیر رکے اور اپنے سلسلۂ بیان کو اسی طرح جاری رکھتے ہوئے بولے: "آپ نے سچ کہا، سرسید کی رائے اس معاملہ میں کیا بہت سے معاملات میں قابل ترمیم تھی اور رائے و خیال کیا معنی وہ خود ہی قابل ترمیم تھے۔ دیکھئے زمانہ نے انھیں ترمیم کر دیا۔ وہ رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ آپ کو پیدا کر دیا۔"

عقائد میں اتنے پختہ و متشدد ہونے کے باوجود مذہبی بحث و مباحثہ کیا معنی مذہبی تبلیغ بھی براہ راست اور کھلم کھلا نہ کرتے۔ بس اشاروں کنایوں میں کر جاتے۔ میرا دور الحاد تھا، ایک روز فرمایا "کیوں صاحب آپ نے تو کالج میں عربی لی تھی؟ اور عربی تو ایک اعلیٰ زبان ہے، کہیں نہ اس سے مناسبت قائم رکھئے۔ جہاں اتنی انگریزی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں، وہاں چند منٹ کے لئے قرآن مجید کو بھی کھول کر بیٹھ جایا کیجئے۔ ادب کی بہترین کتاب تو اسے یورپ والے بھی تسلیم کرتے ہیں۔ بس اس کے ادب کا خیال کر کے دو چار صفحے اس کے روز پڑھ لیا کیجئے۔ جن آیتوں میں شبہ پیدا ہوتا ہو انھیں جانے دیجئے اور سمجھئے کہ وہ آپ کے لئے نہیں۔ کبھی نہ کبھی کسی آیت کا مضمون تو آپ کے دل کو بھی کھینچے گا۔ بس ایسی آیت جب آ جائے تو اس کو دو چار بار دہرا لیا کیجئے۔ اور آپ کے لئے کوئی قید وضو وغیرہ کی بھی نہیں"۔ — یہ ایک نمونہ ہے ان کے حکیمانہ انداز تبلیغ کا۔ خود اسلام

لکھنؤ کی عاقبت اسی طریقہ پر سدھار گئے۔

شیعہ عقائد سے بالطبع بیزار تھے۔ لیکن اس کے باوجود شیعوں میں ان کے ملنے والے اور مخلصین کثرت سے تھے۔ عزیز لکھنوی کو دل سے عزیز رکھتے تھے پھر راجہ صاحب محمود آباد وغیرہ سے بھی شیر و شکر تھے اور لکھنؤ جب آجاتے تو عشرت اور دیگر شیعہ شعراء سے خوب خلا ملا رہتا ۔ اور یہی حال ہندوؤں کے ساتھ تھا۔ ہندو احباب ان کے الہ آباد و لکھنؤ میں بکثرت تھے۔

اقبال کے فن اور جوش سے پوری طرح متفق نہ تھے۔ ان کا ترانہ حجازی نیا نیا نکلا تھا اس کا ذکر چلا۔ بولے، اقبال جوان آدمی ہیں "سارا جہاں ہمارا" کہہ گئے۔ میں اس سن میں یہ ترنگ کہاں سے لا سکتا ہوں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ سارا جہاں کیسا کچھ بھی ہمارا نہیں "جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گماں ہمارا"

اور پھر اسی بحر اور مصرع لگا کر اس کو قطعہ بنا دیا ؎

کالج میں ہو چکا جب امتحاں ہمارا　　سیکھا زباں سے کہنا ہندوستاں ہمارا
رفتار کم سمجھ کر اقبال بول اٹھے　　ہندوستاں کیسا سارا جہاں ہمارا
لیکن یہ سب غلط ہے کہنا یہی ہے لازم　　جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گماں ہمارا

اکبر پر ایک الزام یہ چلا ہوا ہے کہ ان کی جزرسی حدِ بخل تک پہنچی ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ جن لوگوں کا سابقہ ان سے چوبیس گھنٹہ کا رہتا تھا انہیں کچھ اس کی اصلیت دریافت ہوئی ہو۔ لیکن اپنے تجربے کی حد تک تو کہہ سکتا ہوں کہ الزام غلط ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اکبر مسرف نہ تھے اور شاہ خرچ فیاض اور عالی حوصلہ تو مشکل ہی سے کہے جا سکتے ہیں لیکن ان کے بخل کی کوئی شہادت میرے علم میں نہیں۔ عزیزوں کے مرنے پر برابر خرچ ہی کرتے رہتے تھے۔ دوست احباب کی دعوتیں کرتے رہتے اور مجھے تو الہ آباد یا پرتاب گڑھ جب طلب فرماتے تو کرایہ کے نام سے کوئی رقم ضرور بھیج دیتے۔

ذہانت و شوخی بلا کی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ مضمون یا نہ الفاظ نہ قافیے کوئی چیز انہیں سوچنا ہی نہیں پڑتی تھی۔ سب کی سب پرا باندھے ہوئے حاضر ہیں۔ رنگِ کلام شروع ہونے کے ساتھ ساتھ عارفانہ شروع ہی سے تھا۔ آخر عمر میں شوخی رفتہ رفتہ گھٹتی گئی اور معرفت اسی نسبت سے بڑھتی گئی۔ آخر عمر کے رنگ کا نمونہ یہ ہے ؎

ذہن شاعر رہا ٹھکانے کا　　رنگ بدلا گیا زمانے کا
شوخیِ عقل رہ گئی شک میں　　کٹ گئی عمر معرفت یک میں
کر دیا دل کو اس دوئی نے تباہ　　ورد ہے لا الٰہ الا اللہ

یہ نمونہ قطعہ کا تھا۔ غزل کے شعر بھی آخر عمر میں تمام تر اسی رنگ کے ہو گئے تھے ؎

زمیں تو کھو دیا کر گئی ہے کسپ میں شامل　　مگر اس آسماں کی کچھ پرانی شان باقی ہے
بہت آرام سے ہم کر گیا تعلیم مغرب نے　　بس اتنی ہی کسر سمجھو جو کچھ ایمان باقی ہے
سوا اس کے جو کچھ تھا ہو گیا سرکار میں داخل　　خدا کا نام باقی ہے ہماری جان باقی ہے
ہوئے شکے سے بیگانہ ترقی اس کو کہتے ہیں　　فرشتے ہو گئے رخصت فقط شیطان باقی ہے

طبیعت میں ابھی برسوں سے سیری نہیں پائی
یہی ہے کٹ گئے ہیں پاؤں لیکن دل باقی ہے

وقارالملک

مولانا غلام رسول مہر

سرسید مرحوم کے رفیقانِ خاص محض اپنے ہی عہد میں بے مثال نہ تھے بلکہ ان جیسی شخصیتیں کسی بھی عہد میں بہت ہی کم ملیں گی۔ محسن الملک، وقار الملک، حالی، شبلی، نذیر احمد، اعظم یار جنگ، ان میں سے کون سی شخصیت ہے، جو علم و فضل، مکارمِ اخلاق، وسعتِ فکر اور جذبۂ خدمتِ ملک و ملت میں انتہائی اونچے مقام پر فائز نہیں؟ لیکن ان میں سے وقار الملک محاسن کی فراوانی اور فضائل کی جامعیت کے اعتبار سے بہت ممتاز ہیں۔ میں نے شخصیتوں کے اس نظامِ شمسی پر جب کبھی غور کیا ان میں سے دو کو بالکل یگانہ اور نادر پایا: ایک مولانا حالی اور دوسرے نواب وقار الملک۔ مولانا حالی بہت ہی پاکیزہ صفات انسان تھے۔ سراپا سوز و گداز، سراپا محبت و شفقت اور سراپا ایثار و انکسار، تاہم ان کا حلقۂ عمل صرف علم و ادب اور شعر و سخن تک محدود تھا۔ وقار الملک کا دائرۂ کار بہت زیادہ وسیع تھا۔ انہوں نے ہر مقام پر حسنِ عمل کے جو نقوش چھوڑے، ان کی آب و تاب اب تک ہر صاحبِ بصیرت کا دامنِ نگاہ اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور جب تک فضائل کے اعلیٰ معیار اس دنیا میں قائم ہیں، وہ آب و تاب ماند نہیں پڑ سکتی۔

ان کے انتقال پر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے "معارف" میں لکھا تھا:

> نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبر و سیاست کا ماتم کیا۔ مولانا نذیر احمد کے مرنے پر ظرافت نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا۔ مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے نقصان کا نوحہ کیا۔ مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخن وری اور نکتہ سنجی پر آنسو بہائے، لیکن نواب وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور اولوالعزمانہ اخلاق کی گم شدگی پر فریاد۔

یہ احساسات بے شائبۂ ریب بالکل بجا اور درست تھے۔

میں نے نواب وقار الملک کو دسمبر [illegible] میں پہلی اور آخری مرتبہ دیکھا تھا، جب میں غالباً آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ [illegible]

میں اسلامیہ ہائی سکول کا سنگِ بنیاد رکھنے کی غرض سے جالندھر سے آئے تھے۔ اُس زمانے میں جالندھر اور ہوشیارپور کے درمیان ریلوے لائن نہ تھی اور انہیں جالندھر میں ٹھہر کر گھوڑے گاڑی کے ذریعے سے ہوشیارپور جانا تھا۔ ہزاروں اکابر کے علاوہ طلبہ بھی استقبال کے لیے سٹیشن پر پہنچے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے سب سے مصافحہ کیا۔ میرے ناچیز ہاتھوں کو بھی یہ شرف حاصل ہوا۔ وہ منظر سینتالیس سال گزر جانے کے باوجود اب تک اسی طرح آنکھوں کے سامنے تازہ ہے گویا کل پیش آیا تھا۔

قد زیادہ لمبا نہ تھا۔ جسم چوڑا اور گٹھا ہوا۔ اسی وجہ سے وہ قدرے پست قامت نظر آتے تھے۔ رنگ سانولا، سر منڈا ہوا، چہرہ گول، مونچھیں ترشی ہوئیں، داڑھی متوسط اور بالکل سفید۔ اس وقت اُن کی عمر ستر کے قریب تھی۔ میں نے جب انہیں دیکھا تو سر پر سرخ ترکی ٹوپی تھی، سبز سی گرم شیروانی اور پتلون پہن رکھی تھی۔ جو بھی ان سے مصافحہ کرتا، بڑے تپاک، حسنِ اخلاق اور محبت و شفقت سے ملتے، لیکن چہرے پر متانت کا غلبہ تھا اور تبسم کی کوئی جھلک نمایاں نہ تھی۔

اُس زمانے کے استقبال ویسے شاندار نہ ہوتے تھے، جن کی رسم ہمارے ملک میں ترکِ موالات کے دور سے پڑی اور تکلفات میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن جالندھر میں وقار الملک کا استقبال بہت غیر معمولی جوش و سرگرمی سے کیا گیا۔ دور تک اور دیر تک اُن پر پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔

واضح رہے کہ اس وقت مجھے وقار الملک کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے مقامِ بلند کے متعلق کچھ علم نہ تھا لہٰذا تقریبِ استقبال میں شامل ہونے کی خوش نصیبی کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ ہوش سنبھالا تو زندگی کے جن واقعات کو اپنے لیے سرمایۂ فخر سمجھتا رہا ہوں، اُن میں ایک یہ واقعہ بھی ہے۔

وقار الملک ۱۹ محرم ۱۲۵۷ھ (۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء) کو پیدا ہوئے۔ مشتاق حسین نام رکھا گیا۔ والد کا نام فضل حسین تھا، ذات کمبوہ، وطن سنبھل۔ والدہ امروہہ کی تھیں۔ مشتاق حسین صرف چھ مہینے کے تھے، جب ان کے والد نے وفات پائی۔ والدہ یتیم بچے کو لے کر امروہہ چلی گئیں اور یہی مقام مشتاق حسین کا وطن بن گیا۔ جو آگے چل کر وقار الدولہ، وقار الملک نواب مشتاق حسین خاں بہادر انتصار جنگ بننے والے تھے۔

چھ سال کی عمر میں قرآن ختم کیا۔ کچھ عربی اور فارسی پڑھی۔ ۱۸۵۸ء میں دس روپے ماہانہ پر محرر ہو گئے۔ پھر انکم ٹیکس کی محرری اور وال باقی نویسی کی۔ بعدازاں منصفی میں سررشتہ دار بن گئے۔ تحصیل داری کا امتحان بھی پاس کر لیا، لیکن ایک واقعے کے باعث جس کا ذکر آگے آئے گا، ملازمت سے استعفا دے دیا اور سرسید کی سفارش پر ریاست حیدرآباد میں چار سو روپیہ ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ وہاں سے بھی ایک مرتبہ بعض مقامی کشمکشوں کے باعث ملازمت سے جواب مل گیا تھا۔ دوبارہ بلائے گئے اور تھوڑی ہی دیر میں صوبہ اورنگ آباد کے صوبہ دار، پھر معتمدِ عدالت و کوتوالی بنے۔ سر آسمان جاہ بہادر کی وزارت میں پوری ریاست کا کاروبار عملاً انہی سے متعلق ہو گیا۔ ۱۸۹۲ء میں پنشن لے کر وطن واپس آ گئے اور قوم کے تعلیمی و سیاسی کاموں میں حصہ لیتے رہے۔ انہی کی کوشش سے مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ نواب محسن الملک کی وفات پر علی گڑھ کالج کے سکرٹری بن گئے۔ انہی کے عہدِ نظامت میں مسلم یونیورسٹی کی تجویز بروئے کار آئی۔ جولائی ۱۹۱۲ء میں ضعف اور علالت کے باعث استعفا دے دیا، لیکن قوم کے سیاسی مقاصد سے دلچسپی آخری دم تک جاری رہی۔ ۲۷ اور ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کی درمیانی شب میں پونے دس بجے وفات پائی اور امروہہ ہی میں دفن ہوئے۔

یہ حالاتِ زندگی کا سرسری مرقع ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ ان کے حالات تفصیلاً لکھوں، بلکہ اُن اولوالعزمانہ اخلاق کی چند جھلکیاں دکھانا چاہتا ہوں، جو وقار الملک کی عظمت کا سرچشمہ تھے اور جن کی بنا پر حق شناسوں کے نزدیک ان کا ماتم قوم کا ماتم قرار پایا۔

وقار الملک نے ۱۸۶۱ء میں دس روپے ماہوار کی مدرسی سے مستقل زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت کسی کو اندازہ ہو سکتا تھا کہ اس وجود میں خدا نے کیسی نادر صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔ سرسید علی گڑھ میں صدر الصدور کے عہدے پر مامور تھے، جب وقار الملک کو سررشتہ دار عدالت کی حیثیت میں ان کے تحت کام کرنا پڑا۔ سرسید علی گڑھ سے تبدیل ہو کر بنارس گئے تو وقار الملک کی سروس بک میں انہوں نے جو دو لفظ لکھے، وہ اس عظیم الشان انسان کے گوناگوں اوصاف کا پہلا اعتراف تھا۔ فرماتے ہیں:

> منشی مشتاق حسین سررشتہ دار عدالت ہذا نہایت ذکی، نہایت محنتی، نہایت کارگزار، نہایت فہیم اور نہایت عمدہ نویس و خوش خط افسر ہے۔ اس افسر کی دیانت داری پر مجھ کو ایسا یقین ہے جیسا کہ اپنی موت پر..... جس عہدے پر یہ شخص نوکر ہے، اس سے بہت زیادہ بڑے عہدے کی نہایت عمدہ لیاقت اس میں موجود ہے۔

واضح رہے کہ سرسید عموماً متوازن رائے کے آدمی تھے اور ان کی طبیعت میں احتیاط بہت تھی، تاہم وہ وقار الملک کے یگانہ اوصاف سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کوئی بھی وصف "نہایت" کی صفت کے بغیر بیان نہ کیا، حالانکہ اس وقت تک وقار الملک معمولی سررشتہ دار تھے، اور سررشتہ داری کے محدود دائرے میں ان کی تمام قابلیتیں ٹھیک ٹھیک بروئے کار نہ آ سکتی تھیں۔

علی گڑھ کے جج بریلے صاحب بھی وقار الملک کی لیاقت و محنت کے بہت معترف تھے۔ وہ تبدیل ہوئے تو ان کی جگہ مسٹر مارشل جج مقرر ہو کر آئے۔ انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ مسٹر بریلے کی ہر رائے سے اختلاف کریں گے یہاں تک کہ ہر اس شخص کو برا سمجھیں گے جو مسٹر بریلے کی نظروں میں اچھا تھا۔ چونکہ بریلے کی نظروں میں وقار الملک معزز تھے لہٰذا مارشل صاحب نے موصوف کی سروس بک میں بے وجہ خراب ریمارک درج کر دیے۔ وقار الملک کو اپنی راستی کا یقین تھا لہٰذا مارشل صاحب سے کہا کہ یا تو ریمارک واپس لے لیجیے یا اس کے وجوہ بتائیے۔ مارشل صاحب نے کوئی توجہ نہ کی تو وقار الملک نے باقاعدہ درخواست پیش کر دی، جس میں لکھا:

۱۔ عدالت کے تمام وکلاء، پورے عملہ اور حاضرین سے میرا حال دریافت کیا جائے۔

۲۔ میں نے اب تک جو کام کیا ہے، اس کا جائزہ لیا جائے۔

۳۔ میری تحریر کردہ کیفیتوں سے جن لوگوں کو نقصان پہنچا ہے انہیں بلا کر میرے چال چلن کی صفائی کی تصدیق کر لی جائے۔ یہ طریقہ اگرچہ میرے لیے خطرناک ہے، لیکن تحقیقات کی غرض سے میں اس پر بھی راضی ہوں۔

مارشل صاحب اس پر رضامند نہ ہوئے تو وقار الملک نے کلکٹر کے سامنے درخواست پیش کر دی اور اس میں لکھا: تحقیقات سے جج کا اعتراض خود ظاہر کرتا ہے کہ ریمارک صحیح نہیں، تاہم آپ بھی میرے پیش کردہ ذریعوں کے مطابق پوری چھان بین کریں۔ ہر طرح اطمینان ہو جائے تو یہ ریمارک میری سروس بک سے خارج کر دیا جائے۔

مشہور مثل ہے: "آن را کہ حساب پاک است، از محاسبہ چہ باک"۔ وقار الملک اپنی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں اس کا عملی نمونہ بنے ہوئے تھے۔ ان کا عہدہ جج کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا، تاہم سچی بات میں جج کا مقابلہ کرتے وقت ایک لمحے کے لیے بھی تامل نہ کیا اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب انگریزوں کے سامنے کسی کو ایک حرف بھی زبان پر لانے کا حوصلہ نہ تھا۔

۱۸۶۸ء میں وہ مسٹر کاون کلکٹر کے ماتحت کام کر رہے تھے۔ جب نماز کا وقت آتا، مقررہ معمول کے مطابق دفتر سے اٹھ کر مسجد میں چلے جاتے۔ کاون صاحب کو ان کا یہ طریقہ پسند نہ آیا۔ اس نے منع کیا تو انہوں نے کہا کہ نماز ادا کرنا مجھ پر فرض ہے، میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ البتہ اس کی وجہ سے کام میں کوئی خلل پیدا ہو تو آپ مجھ سے جواب طلب کر سکتے ہیں۔ کاون کام سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف نماز کا مخالف

تھا۔ مجبور ہو کر وقار الملک نے درخواست دے دی کہ یا تو ادائے نماز کے لئے تھوڑی سی غیر حاضری معاف کر دی جائے۔ یا غیر حاضری کے وقت کی تنخواہ کاٹ لی جائے یا چھ مہینے کی رخصت دی جائے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی صورت منظور نہ ہو تو اس درخواست کو میرا استعفا سمجھا جائے

یعنی پندرہ سال کی ملازمت سے دست بردار ہونے پر وہ بے تکلف تیار ہو گئے، لیکن نماز میں تاخیر گوارا نہ کی۔

سر سید کو یہ حالات معلوم ہوئے تو وقار الملک کو لکھا:

> نماز جو خدا کا فرض ہے، اس کو ہم اپنی شامتِ اعمال سے جس خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں، لیکن کوئی شخص اگر کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سُنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے، جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے، جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تو پھر لمبا اور گڑگڑانا اور صرف رخصت ہی دیں، تنخواہ کاٹ لیں کہنا واہیات تھا۔ تڑاق پڑاق استعفا دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے عظیم الشان قادرِ مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا، اور آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری میسر نہ آتی۔ فاقہ مر جاتے، نہایت اچھا ہوتا۔

چھ مہینے کی رخصت ہی کے زمانے میں سر سید نے سر سالار جنگ وزیر اعظم حیدر آباد کو لکھا اور وقار الملک کے لئے حیدر آباد میں چار سو روپے ماہانہ کی ملازمت کا انتظام ہو گیا۔ لطف یہ کہ جس انگریز افسر نے نماز پر جھگڑا کر کے رخصت اور استعفے تک نوبت پہنچائی تھی اس نے آپ کی کارگزاری کے متعلق نہایت اچھی رائے دی اور اس میں اقرار کیا کہ وہ پابندی سے نماز پڑھتے تھے، مجھے تکلیف ہوتی تھی۔ وہ اپنی عادت بدلنے پر راضی نہ ہوئے، میں اس صورت کو قبول نہ کر سکتا تھا۔ اچھا ہوا کہ انہیں دوسری جگہ ملازمت مل گئی۔

حیدر آباد میں وہ بہت جلد ترقی کر کے محکمۂ عدالت و کوتوالی کے معتمد بن گئے اور ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہو گئی۔ عدالت و کوتوالی کے صدر المہام یعنی وزیر متعلقہ نواب بشیر الدولہ تھے، جنہیں بعد میں آسمان جاہ کا خطاب ملا اور وہ مدار المہام بن گئے تھے۔ وقار الملک نے بہت جلد ان کا خاص اعتماد حاصل کر لیا۔ اس زمانے میں میر محبوب علی خاں نظام حیدر آباد کم سن تھے اور انتظام ریاست کے لئے کونسل آف ریجنسی بنی ہوئی تھی، جس کے صدر امیر کبیر نواب شمس الامراء تھے۔ وہ نظام کے قریبی رشتہ دار ہوتے تھے۔ بشیر الدولہ ان کے بھتیجے تھے۔ شمس الامراء کو ایک طرف سر سالار جنگ وزیر اعظم سے کاوش تھی، دوسری طرف بھتیجے سے مقدمہ بازی کا سلسلہ جاری تھا اور وہ ہر اس شخص کے مخالف تھے جو بشیر الدولہ اور سالار جنگ کے نزدیک معتمد علیہ تھا۔ اسی وجہ سے وقار الملک ان کے عتاب کا ہدف بن گئے۔ ایک موقع پر وقار الملک رخصت لے کر وطن جاتے ہوئے گوالیار ٹھہرے اور وہاں کے انگریز ریذیڈنٹ کو بشیر الدولہ کا ایک ذاتی پیغام پہنچا دیا۔ اسی بنا پر شمس الامراء کو ناراضگی کے اظہار کا بہانہ مل گیا اور سالار جنگ کو ریاست کے عمومی مصالح کی بنا پر یہی مناسب معلوم ہوا کہ وقار الملک کو ملازمت سے برخاست کر دیں۔

وقار الملک کے لئے یہ واقعہ سراسر تعجب انگیز تھا، لیکن کچھ مدت بعد ایک دوست کے ذریعے سے سالار جنگ کی مجبوریوں کا علم ہوا تو بے تکلف لکھ دیا کہ میں اپنے فائدے کے لئے شمس الامراء اور سالار جنگ کے درمیان کسی کشمکش کا باعث نہیں ہو سکتا۔ مجھے اپنی برطرفی بدل و جان منظور ہے۔

نواب بشیر الدولہ کو جب یہ علم ہوا کہ وقار الملک صرف ان کے ایک ذاتی کام کی وجہ سے عتاب میں آئے اور ملازمت گنوائی تو فوراً پیغام

بھیجا کریں اتنی ہی تنخواہ پر اپنی جاگیر میں ملازم رکھتا ہوں۔ وقار الملک نے لکھ دیا کہ مجھے یہ منظور نہیں۔ اگر سالار جنگ کے یہاں کوئی اور مجھے مصروف کرتا تو میں یہ پیشکش قبول کر سکتا تھا۔ جب انہی کی وجہ سے مجھے نوکری ملی اور انہی نے موقوف کیا تو میری محبت اس امر کی مقتضی نہیں کہ میں حیدرآباد میں دوسری جگہ تعلق قبول کروں۔

وقار الملک ملازمت پر آمادہ نہ ہوئے تو نواب بشیر الدولہ نے لکھ بھیجا کہ آپ گھر میں بیٹھے رہیں۔ پانسو روپیہ ماہانہ وہاں بھیجا جائے گا۔ وقار الملک نے یہ پیشکش بھی قبول نہ کی اور لکھ دیا کہ میں نے نواب ممدوح کی کوئی ایسی بڑی خدمت انجام نہیں دی۔ جس کے معاوضے میں ان کا اس قدر نقصان جائز سمجھوں۔ آخر بشیر الدولہ نے وقار الملک کی صاحبزادی کے نکاح کی تقریب پر چار ہزار روپے کی رقم نیوتے کے طور پر بھیج دی۔ وقار الملک نے ایک عزیز دوست کی وساطت سے ضروری سمجھا کہ سالار جنگ سے استصواب کے بغیر یہ رقم قبول نہ کریں۔ وہاں سے جواب آیا کہ روپیہ واپس کر دو۔ چنانچہ وقار الملک نے بے تامل واپس کر دیا۔ اس عزیمت عمل پر سر سالار جنگ نے لکھا کہ مولوی مشتاق حسین نے جو کچھ کیا وہ کسی دوسرے سے نہ ہو سکتا تھا۔ امید ہے کہ ایک دن وہ اپنے اس عمل نیک کا صلہ حاصل کریں گے۔

ان واقعات کے بعد سالار جنگ نے خود لکھا کہ میں چار سو روپے ماہ بماہ آپ کو بھیجتا رہوں گا۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔ حالات بدل جائیں گے تو آپ کو نعم البدل حاصل ہوگا اور اس امداد کو "صیغۂ راز" رکھیں۔

وقار الملک کو سالار جنگ کا یہ خط ملا تو چار سو روپے کی پیشکش کے سلسلے میں دو باتیں عرض کیں: اوّل یہ کہ روپے کی مقدار کم کر دی جائے اس لئے کہ میں کفایت سے گزارہ کر سکتا ہوں۔ دوسرے اسے قرض سمجھا جائے۔ زمانہ میری مساعدت کرے گا تو یہ قرض ادا کر دوں گا۔

سالار جنگ نے چند ہی روز میں سررشتۂ مال کا دستور العمل وقار الملک کے پاس اصلاح و نظر ثانی کے لئے بھیج دیا۔ اس طرح ذاتی امداد سرکاری کارگزاری کی شکل اختیار کر گئی۔ اس وقت وقار الملک نے چار سو روپے ماہانہ کی رقم بہ اطمینان خاطر قبول کی۔

وقار الملک اخلاقی جرأت میں ضرب المثل تھے۔ جس زمانے میں سالار جنگ اعظم دولت آصفیہ کے مختار کل تھے۔ نواب بشیر الدولہ عدالت اور کوتوالی دونوں کے صدر المہام یا وزیر تھے اور وقار الملک ان کے ماتحت معتمدی (سکرٹری شپ) کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ سالار جنگ نے ایک معاملے کے متعلق وقار الملک کے سامنے اپنی رائے ظاہر کی اور فرمایا کہ اسی رائے کو اپنی رائے کے طور پر نواب بشیر الدولہ کے روبرو پیش کر دیں۔ وقار الملک اگرچہ سالار جنگ کے ممنون تھے۔ اپنی ملازمت اور ترقی کو انہی کا احسان سمجھتے تھے لیکن صاف کہہ دیا کہ میری رائے یہ نہیں۔ سالار جنگ کو یہ امر بہت ناگوار گزرا۔ وقار الملک گھر واپس آئے تو فوراً ملازمت سے استعفا پیش کر دیا اور حیدرآباد سے روانگی کے لئے تیار ہو گئے۔ سالار جنگ نے انہیں بلا کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کہا کہ واقعی اپنی رائے آپ پر ٹھونسنے کا مجھ کو کوئی حق نہ تھا۔

سالار جنگ وفات پا چکے تھے اور بشیر الدولہ سر آسمان جاہ کی مدار المہامی کا زمانہ تھا۔ وقار الملک وقتاً فوقتاً ان سے صاف صاف کہتے رہتے تھے کہ میں کسی خدمت میں حتی الامکان کوتاہی نہ کروں گا لیکن مجھے ریاست میں ملازمت نواب سالار جنگ کی وجہ سے ملی اور میری عقیدت کا مرجع انہی کا خاندان ہے۔

سر آسمان جاہ بہت نیک دل، نیک مزاج اور شریف انسان تھے۔ بعض اوقات لوگ تملق و خوشامد سے کام لے کر ان سے ایسے احکام جاری کرا لیتے جو انتظامی نقطۂ نگاہ سے مناسب نہ تھے۔ وقار الملک نے ایک عرضداشت ان کی خدمت میں پیش کی۔ اس میں صاف صاف لکھ دیا:

> جن کو ہم بد اور دشمن سمجھتے ہیں ان کو بھی خدمتوں پر رکھا جاتا ہے۔ یہ اعلیٰ حضرت کی کریم النفسی تو ہے یا یہ کہ
> ان کی خوشامدوں کا خیال کیا جاتا ہے یا طبیعت کی کمزوری ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اوّل قوت و انتظام
> ضعیف ہوتا ہے دوم سرکاری اسرار باہر نکلتے ہیں سوم دوسرے عہدہ داروں پر برا اثر پڑتا ہے۔ یہ

خلافِ وضعِ حکومت ہے اور انصاف کے خلاف ہے۔

وقار الملک سرسید کے بہت معتقد تھے۔ اور اُن کی بڑی عزت کرتے تھے۔ تاہم بیسیوں معاملات میں انہوں نے سرسید کی رائے سے بے تکلف اختلاف کیا۔ یہاں تک کہ ایک معاملے میں سرسید نے ان کے اختلاف پر ناراض ہو کر لکھ دیا:

> مجھ کو یقین تھا کہ آپ خدا کے الہام پر بھی اپنی رائے سے منحرف ہونے والے نہیں۔ جیسا کہ میں نے خود آپ کو لکھا تھا کہ کوئی توقع برخلاف اس کے اگر میں کرتا تو میری حماقت تھی۔

کالج کے انتظامات سنبھال لینے کے بعد وقار الملک نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا، جس کا اندازہ غالباً عام لوگوں کو نہیں۔ سرسید کے زمانے میں حالات مختلف تھے اور وہ کالج کی ترقی کے پیشِ نظر انگریز پرنسپل اور انگریزی سٹاف کی دلجوئی میں بہت مبالغہ فرماتے تھے۔ محسن الملک کے زمانے میں انگریزی سٹاف تقریباً مطلق بن گیا اور انتظامی معاملات میں سکرٹری یا ٹرسٹی بڑی حد تک بے دست و پا رہ گئے۔ وقار الملک نے چارج لیتے ہی ٹرسٹیوں کی حیثیت بحال کرنے کی کوشش کی۔ اس پر پرنسپل اور انگریزی سٹاف نے ایکا کر کے استعفوں کی دھمکی دے دی۔ یوپی کے گورنر نے انگریزی سٹاف کی تائید کی اور خاصی نازک صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ وقار الملک نے ٹرسٹیوں کو ہم رائے بنا کر فیصلہ کرایا کہ جب تک انگریز پرنسپل اور انگریزی سٹاف انتظامی معاملات میں ٹرسٹیوں کی مختاری تسلیم نہ کرے گا اور ملازم کی حیثیت میں نہ رہے گا، وہ اطمینان سے نہ بیٹھیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بڑی دانش مندی، تدبر لیکن پوری استقامت سے اس معاملے میں کوششیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ گورنر نے اپنی رائے بدل لی اور سٹاف وقار الملک کی رائے کے مطابق کام جاری رکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ کالج کو انگریزی اثرات سے محفوظ کرنے کی یہ پہلی زبردست اور کامیاب کوشش تھی۔

وقار الملک کی سکرٹری شپ کے زمانے میں کالج کی مذہبی فضا بہت خوشگوار ہو گئی۔ انہوں نے ایک موقع پر طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ نماز کی خوبی یا اس کا وجوب یا اس سے اخلاق کی اصلاح کا بیان مقصود نہیں لیکن:

> یہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس امر کی نگہبانی کہاں تک میری اپنی ذمہ داریوں میں سے عظیم الشان ہے۔ آپ یہاں کس غرض سے آتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ تعلیم، اخلاق کی اصلاح اور آداب حاصل کرنے کے لئے۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کی توجہ امورِ دینی کی طرف مائل کروں۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں کہ زمانہ تغیر پذیر ہے۔ پرانوں کی جگہ نئے آتے ہیں۔ قومی عمارت کے پرانے ستون رخصت ہوتے جاتے ہیں اور اب یہ بار آپ کو اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑے گا۔ یہ زمانہ آپ کی تحصیل کا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ آپ اس آئندہ وقت کے لئے تیار ہوں۔ کوشش کیجئے اور سخت کوشش کہ آپ مسلمانوں کے اعلیٰ درجے کا نمونہ ثابت ہوں۔ وہ روش اختیار کیجئے اور ایسے پاک و صاف مذہبی طریقے پر چلئے کہ اسلام آپ پر بھروسا کرے۔ حقیقت میں آپ کسی طرح قومی لیڈر نہیں ہو سکتے اگر آپ اسلامی شعار کے پابند نہیں۔

وقار الملک سے پیشتر نماز میں غیر حاضری پر جرمانے کا قاعدہ جاری تھا۔ موصوف نے نماز کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے یہ قاعدہ منسوخ کیا اور طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> اس طرح نماز کا استہزا ہوتا ہے۔ مگر یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ غیر حاضریٔ مسجد کے لئے اب کوئی سزا نہیں۔ سزا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو صاحب حاضرِ مسجد نہ ہوں گے اور نماز کی پابندی نہ کریں گے ان کو کالج سے علیحدہ ہو جانا پڑے گا۔ میں یہ کسی طرح جائز نہیں رکھتا کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرے۔

وقار الملک اپنے ماتحت ملازموں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کوئی فوت ہو جاتا تو اس کے متعلق پوری معلومات بہم پہنچاتے۔ اگر وہ غریب ہوتا تو کفن کا بندوبست کرتے۔ اس کے لڑکوں کے لئے وسائل معاش کا خیال رکھتے۔ غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کا انتظام کرا دیتے۔ بیواؤں کے لئے وظائف مقرر کراتے۔

جب وہ ورنگل کے صوبہ دار تھے، ایک موقع پر دورہ کرتے ہوئے ایک گاؤں سے گزرے، جہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے گاؤں کے قریب پہنچتے ہی سواری روک لی اور اپنے تمام ساتھیوں کو اجازت دے دی کہ جو چاہے آگے چلا جائے۔ خود وضو کر کے صبح سات بجے گاؤں میں داخل ہوئے۔ تمام مریضوں کی دیکھ بھال کی۔ ان کی تیمارداری اور علاج کا انتظام کرایا۔ ساڑھے تین بجے فارغ ہو کر جائے قیام پر پہنچے۔

ایک دورے میں ایک اہلکار جو ساتھ تھا کسی مقام پر بے پتا ہو گیا۔ وقار الملک نے منزل پر پہنچ کر پولیس اور سواروں کو چاروں طرف روانہ کر دیا۔ شام کے چار بجے تک اس کا پتا نہ مل سکا۔ وقار الملک نے اس وقت تک کھانا نہ کھایا۔

جب وہ حیدر آباد میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے تو عوام اور اکابر سے ملاقات کے لئے الگ الگ جگہیں مقرر کر رکھی تھیں۔ جہاں عوام سے ملاقات کرتے تھے، وہ جگہ کوٹھی کے صحن میں پھاٹک کے قریب تھی۔ ایک شامیانہ نصب کرا دیا تھا اور نشست گاہیں خاص پُر تکلف تھیں۔ جہاں اکابر سے ملاقات کرتے تھے، وہاں لکڑی کی معمولی کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی عوام سے ملاقات کی جگہ پہنچ جاتے اور سب سے آزادانہ ملتے۔ ہر ایک کی بات توجہ سے سنتے۔ اس اثنا میں کوئی بڑا عہدہ دار آ جاتا تو فرماتے کہ ملاقات کی جگہ میں بیٹھے۔ عوام سے فارغ ہو کر بڑے لوگوں سے ملتے۔

وقار الملک کو اگرچہ بڑے عہدوں پر رہنے کا موقع ملا اور وہ خاصی بڑی تنخواہ پاتے تھے لیکن ان کی آمدنی کا بیشتر حصہ عزیزوں اور غریبوں کی امداد یا قومی کاموں میں صرف ہوتا۔ خود عموماً تنگ دست رہتے اور سادگی میں گزارہ کرتے۔

وہ وقتاً فوقتاً اعلیٰ حضرت نظام کی پیشی میں جایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر اعلیٰ حضرت نے ان کا چشمہ دیکھا تو فرمایا: مولوی صاحب! چشمے کا فریم تو بہت خراب ہے۔ وقار الملک نے عرض کیا:

> پیر و مرشد! اگر اتفاق سے یہ چشمہ کہیں رہ جائے تو لوگ اسے واپس دے دیں گے کیونکہ اس کی قیمت صرف چھ آنے ہے اور یہ مشتاق حسین کی آنکھیں ہیں۔

اعلیٰ حضرت نے نہایت قیمتی اور اعلیٰ درجے کا فریم بنوا کر وقار الملک کو مرحمت فرمایا۔ اسے انہوں نے کبھی استعمال نہ کیا اور ایک عزیز یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھا۔

مستند بیان ہے کہ محسن الملک نے حیدر آباد میں اپنے لئے کوٹھی بنوائی تو اس کا فرنیچر ولایت سے تیار ہو کر آیا، جس پر ستر ہزار روپے خرچ ہوئے۔ وقار الملک کو اپنا مکان بنوانے کی بھی استطاعت نہ ہوئی۔ سر آسمان جاہ کی تحریک پر اعلیٰ حضرت نے انہیں ایک کوٹھی عنایت فرما دی۔

جب وہ سر آسمان جاہ کے ساتھ علی گڑھ آئے تھے تو ان کی پتلون میں پیوند لگے ہوئے تھے۔

اُن کی طبیعت میں انکسار بہت تھا۔ اس سلسلے میں میں صرف ایک واقعہ پیش کروں گا۔ حیدر آباد میں کسی مسجد کے ایک نابینا کا کھانا ان کے ہاں سے مقرر تھا۔ ایک مرتبہ شدت سے بارش ہوئی۔ ملازم رات کا کھانا نابینا کو پہنچا نہ سکا۔ وقار الملک کو بڑی دیر میں معلوم ہوا تو خود اٹھے اور پیدل کھانا نابینا کے پاس لے کر گئے۔ وہ بھوکا بیٹھا تھا۔ بہت بگڑا اور خفا ہوا کہ آدھی رات کو روٹی لے کر آیا ہے۔ جا ہم نہیں کھاتے۔ وقار الملک نے بڑی خوشامد اور منت سماجت سے اسے راضی کیا اور کھانا کھلا کر واپس آئے۔ تاہم اس پر قطعاً ظاہر نہ ہونے دیا کہ خود کھانا لے کر آئے تھے۔

دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر بے اختیار اشکبار ہو جاتے۔ ایک مرتبہ علالت کے باعث پہاڑ پر چلے گئے۔ وہاں سنا کہ ان کی صوبہ داری میں بارش نہ ہونے کے باعث عوام کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اور غریبوں کے فاقے ہو رہے ہیں۔ فوراً پہاڑ سے واپس آئے۔ جمعہ کی نماز کے بعد

ایک چھپر کے نیچے بیٹھے ہوئے اطرافِ حاذق کی پہاڑیاں دیکھ رہے تھے، جو مختلف اقساموں سے بھری ہوئی تھیں۔ کاغذات اٹھاتے، پڑھتے اور روتے جاتے۔ دو گھنٹے میں خدا کی رحمت سے ابر آیا۔ اس قدر پانی برسا کہ چھپر ٹپک پڑا اور وقار الملک بھیگ گئے۔ پھر اُٹھے۔

یہ وقار الملک کے فضائل و مکارم کی صرف چند جھلکیاں ہیں، جو سرسری طور پر پیش کر دی گئی ہیں۔ انہیں سامنے رکھ کر خود فرمائیے کہ وہ کس درجہ نادر و یگانہ شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کے انتظامی کارناموں پر بحث کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ بے شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ دولت آصفیہ پچاس برس تک جس نظام حکومت پر چلتی رہی، اس کی تربیت اور اجرا میں سب سے بڑا حصہ وقار الملک ہی کا تھا۔ انہوں نے حکومت کو خود سری کی بلندیوں سے اُتار کر حقوقِ جمہور کی نگہبانی و پاس داری کی راہ پر لگایا اور اپنے حسنِ عمل سے وہ نمونہ پیش کیا، جس کی مثالیں کسی بھی ملک میں بہت ہی کم ملیں گی۔ سرسید کے رفیقوں میں ایسے جامع اوصاف کا آدمی دوسرا کوئی نہ تھا۔

نواب عماد الملک (مولوی سید حسین بلگرامی)

ڈاکٹر عبدالحق

اٹھارویں صدی میں ہندوستان کو ایک نئی قوم اور ایک نئی تہذیب سے سابقہ پڑا۔ یوں تو یورپ سے سب سے پہلے پرتگالی آئے اس کے بعد ولندیزی اور فرانسیسی لیکن ان کا کوئی زیادہ اثر ملک پر نہیں ہوا۔ پرتگالی ہندوستان میں دو مقصد سے آئے تھے۔ مسالوں کی تجارت سے روپیہ کمانے اور عیسائی مذہب پھیلانے۔ ان دونوں مقصدوں کے حصول میں انہوں نے بڑے ظلم و جبر اور سفاکی سے کام لیا۔ ان کی یادگار اب ان کے کچھ الفاظ اور کچھ دیسی عیسائی اور کچھ دوغلے ہندوستان میں باقی رہ گئے ہیں۔ ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کا کوئی قابل ذکر نشان باقی نہیں رہا۔ البتہ انگریزوں کے قدم یہاں ایسے جمے کہ وہ آکاس بیل کی طرح سارے ملک پر چھا گئے۔

اس سے قبل جتنے فاتح ہندوستان میں آئے وہ شمال مغرب کی طرف سے داخل ہوئے۔ مگر یہ یورپی قومیں سمندر کے راستے تجارت کے بھیس میں داخل ہوئیں اور تجارت کی کوٹھیاں بناتے بناتے قلعے بنانے اور لشکر جمع کرنے لگیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنت دہلی میں انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بادشاہ صرف نام کا بادشاہ رہ گئے۔ صوبے خود مختار ہو گئے۔ یہ کبھی آپس میں لڑ مرتے، کبھی غیروں کی مدد سے ایک دوسرے پر چڑھ بیٹھتے کبھی مل کر غیروں سے جا بھڑتے اور کبھی غداری کر کے خود اپنی جڑ کاٹنے پر آمادہ ہو جاتے۔ انگریز ان حالات کا ایک شاطر کی طرح مطالعہ کرتا رہا اور کبھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ کبھی ایک کے ساتھ ہو گیا اور دوسرے کو شکست دی اور اس کمک کے معاوضے میں مصارف کے نام سے گراں قدر رقم لی اور کچھ حصہ ملک کا بھی ہتھیا لیا۔ کبھی کسی کو کمزور ہوتا دیکھ کر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور اس کے حریفوں سے مل کر اس کے علاقے پر چڑھائی کر دی اور بندر بانٹ کے قدیم اصول پر اچھا حصہ اپنے لئے رکھ لیا اور منہ بھرائی کے طور پر ایک ایک ٹکڑا ساتھیوں کے سامنے ڈال دیا۔ کبھی بادشاہ سے فرمان حاصل کر کے متصرفہ علاقے کے قبضے کو جائز قرار دے لیا۔ ہمارے اسلاف ان فرنگیوں کو کبھی خاطر میں نہ لاتے۔ ان کا لباس، کھانا پینا، رہنا سہنا، عادات و اطوار ان کی زبان غرض ان کی ہر بات ان کی نظروں میں ناپسند اور ناشائستہ تھی۔ ہمارے ایک لغت نویس نے فرنگی کی عجیب و غریب تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"یکے از جانوران دریائی کہ گاہ گاہ بر ساحل نمودار می شود"

اس میں "گاہ گاہ بر ساحل نمودار می شود" کا ٹکڑا خاص طور پر قابل غور ہے۔ ہمارے بزرگ زیادہ سے زیادہ ان کی تعریف یہ کر سکتے کہ کاریگر اچھے ہیں، بندوق

توپ، گھڑیاں وغیرہ خوب بنانا جانتے ہیں۔ صاحبِ علم ہیں۔ وہ بھی مسلمانوں سے خوش نہ تھے اور اپنا وفادار خیال نہیں کرتے تھے بلکہ باغی سمجھتے تھے۔ ان کا ایسا سمجھنا کچھ بے جا نہ تھا اس لئے کہ سلطنت انھوں نے مسلمانوں سے لی تھی۔ اس لئے مسلمانوں سے بدگمان تھے اور بدگمان رہے۔ انھوں نے ابتدا میں جس مکر و فریب، جعلسازی، اندرونی سازشوں اور حکمتوں سے اپنا تسلط بڑھایا اور خاص کر اسلامی حکومتوں سے جو معاندانہ برتاؤ کیا اس نے مسلمانوں کے دلوں میں ان کی طرف سے نفرت پیدا کر دی۔ ان کے پیچھے اول درجے میں پارسی اور دوسرے درجے میں ہندو تھے۔ مسلمانوں کو اپنے اعتقادات، تہذیب، روایات اور علم و فضل پر ناز تھا۔ وہ اس ملک کے فاتح اور حاکم رہے تھے۔ انھوں نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی جس نے ملک کی کایا پلٹ دی اور باوجود زوالِ سلطنت کے انھوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا اور انگریز کے سامنے نہیں جھکے۔ وہ اسے حقیر اور نجس سمجھتے رہے۔

ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے احوال اور حالات کی رو سے اپنی تنظیم کرنا اس کارزارِ حیات میں سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے۔ ہندو اس راز کو سمجھتے تھے۔ وہ اپنے ملک میں ایسے کئی دور دیکھ چکے تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ انھوں نے اس کی پروا نہ کی اور بالآخر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ مسلمانوں میں دو چار ہی خاندان ایسے تھے جنھوں نے اس کشمکش کے ابتدائی دور میں زمانے کے تیور پہچانے اور اپنی حیثیت اور وقار قائم رکھنے کے لئے بڑھے اور زمانے کا ساتھ دینے میں کچھ پس و پیش نہ کیا۔ ان میں ایک مولوی سید حسین بلگرامی کا خاندان تھا جس نے ہوا کا رخ دیکھ کر انگریزی حکومت کا تقرب حاصل کیا۔

بلگرام اودھ کا نہایت مردم خیز قصبہ ہے۔ اس خاک سے ایسے جلیل القدر عالم و فاضل اٹھے جن کے نام اپنے تبحر اور علم و فضل کی وجہ سے علمی دنیا میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ سید حسین کے دادا سید کرم حسین کو انگریزی توسل حاصل ہوا اور وہ بہ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ (۱۲۴۳-۱۲۵۴ھ) سرکار اودھ کی طرف سے سفیر ہو کر کلکتے کے گورنر جنرل لارڈ بنٹنک کے دربار میں پہنچے۔ ان کی اولاد سید زین الدین حسین والد سید حسین اور سید اعظم الدین حسین نے وارن ہیسٹنگز کے بنا کردہ مدرسہ عالیہ میں علومِ مشرقی کی تکمیل کی اور ایسے زمانے میں جبکہ انگریزی پڑھنا حرام سمجھا جاتا تھا انگریزی بھی سیکھی۔ یہ پہلے مسلمان شریف زادے تھے جو اس بدعت کے مرتکب ہوئے اور باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل کی۔

سید حسین کے چچا اعظم الدین حسین نے انگریزی حکومت میں بڑا اعزاز اور اعتماد حاصل کیا اور بڑی ذمہ داری کی خدمات پر مامور رہے۔ ابتدا میں لارڈ ہارڈنگ کے اے ڈی کانگ اور ترجمان رہے۔ اس کے بعد وہ سندھ میں حکومت کی طرف سے بعہدہ پولیٹیکل ایجنٹ ایران، سندھ و افسر اعلیٰ جہازرانی دریائے سندھ متعین ہوئے۔ یہ عہدہ انگریزوں کے لئے مختص تھا مگر ایرانی و سندھی اپنے ملک میں انگریز کا آنا پسند نہ کرتے تھے۔ سندھ میں سیدوں اور پیروں کی بے حد تعظیم و تکریم کی جاتی ہے اس لئے وہاں کے لوگ ان کا بہت احترام کرتے۔ ہاتھ چومتے اور قدم چھوتے۔ نواب عماد الملک فرماتے تھے کہ وہ کبھی کسی کے سامنے انگریزی کتاب نہ پڑھتے تاکہ لوگوں کو بدگمانی نہ ہو۔ اکثر سندھی ان کی خدمت میں تعویذ لینے کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ ان سے جب کبھی کوئی عربی شعر یاد آتا یا آیت قرآنی تو وہ کاغذ پر لکھ کر ایک ٹوکری میں ڈال دیا کرتے تھے۔ جب لوگ تعویذ مانگنے آتے وہ اس ٹوکری میں سے نکال نکال کر دے دیا کرتے۔ کچھ عرصے کے بعد کسی بدنفس نے افواہ پھیلا دی کہ یہ شخص دراصل انگریز ہے، مسلمان بنا ہوا ہے۔ آدمی ان کے گرد سے چھٹنے لگے، لوگوں کو یقین آگیا اور شورش برپا ہو گئی۔ اس سے ان کو جان کا خطرہ ہو گیا اور وہ راتوں رات جہاز میں بیٹھ کر نکل بھاگے۔ اس کے بعد وہ ڈپٹی کلکٹری و مجسٹریٹی کے عہدے پر بہار میں [illegible] کی خدمت پر مامور ہوئے۔ دو بار لیجسلیٹو کونسل بنگال کے ممبر نامزد ہوئے۔ حکومت نے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب عطا کیا۔

سید اعظم الدین حسین کے دوسرے بھائی سید زین الدین حسین نے محکمۂ مال میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۴۰ء میں ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس ملازمت کے دوران میں انھیں ایک مدت تک اضلاع بہار و بنگال میں رہنے کا اتفاق ہوا چنانچہ مولوی سید حسین کی ولادت [illegible] ضلع گیا کے قصبہ صاحب گنج میں ہوئی۔ سید صاحب [illegible] میں پنشن لے کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

مولوی سید حسین کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ ابھی چھ سات برس کے تھے کہ ان کو عربی شروع کرائی گئی۔ وہ کہتے تھے کہ عربی تعلیم کی ابتدا [illegible]

سے ہوئی تھی کہ حساب اور اقلیدس بھی عربی میں پڑھی تھی۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں وہ فارسی عربی کی تحصیل سے فارغ ہو کر بھاگلپور پہنچے اور بعد ازاں کلکتے کے انگریزی مدارس میں تعلیم پاتے رہے۔ ۱۸۶۱ء میں میٹرکیولیشن کی سند حاصل کی۔ ۱۸۶۶ء میں درجہ اول میں آنرز کے ساتھ بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ اپنے اثر سے کسی معقول سرکاری ملازمت میں منسلک کر دیں۔ لیکن نوجوان سید نے جو کالج کے کمروں سے تازہ تازہ نکلا تھا اپنے علمی ذوق کی بنا پر اس پیشے کو پسند کیا جو تمام سرکاری سررشتوں میں کم حیثیت سمجھا جاتا ہے اور ایک صدی گزرنے پر بھی اب تک ناقدردانی کا شکار ہے۔ اس نے ڈپٹی کلکٹری پر معلمی کو ترجیح دی اور کیننگ کالج لکھنؤ میں عربی زبان کی پروفیسری قبول کر لی اور اس طرح انہیں لکھنؤ میں مستقل طور پر رہنے کا موقع مل گیا۔

اس دوران میں ان کو لکھنؤ کی معاشرت اور وہاں کی تہذیب و آداب و اشغال اور مذہبی رجحانات دیکھنے کا اچھا موقع ملا اور وہاں کے علماء و فضلا کی صحبتوں سے مستفید ہوئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ شعر و سخن اور خاص کر مرثیہ گوئی کا مرکز تھا۔ ان تمام باتوں کا ایک قابل تعلیم یافتہ نوجوان پر اثر ہونا ضروری تھا۔ پروفیسری کے زمانے میں انہیں لکھنؤ ٹائمز کی ایڈیٹری کے فرائض بھی انجام دینے پڑے۔ یہ اخبار تعلقہ داران اودھ کے مفاد و اغراض کی حمایت کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں گورنمنٹ نے ضبط ریاست کی تجویز نکالنی چاہی۔ اس سے تعلقہ داران اودھ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے تعلقہ دار اس تجویز کے سخت مخالف تھے۔ اخبار پائنیر نے جو نیم سرکاری اخبار سمجھا جاتا تھا، اس تجویز کی تائید میں پر زور آرٹیکل لکھے۔ لکھنؤ ٹائمز کے نوجوان ایڈیٹر نے ان مضامین کا جواب لکھا اور گورنمنٹ کی تجویز پر سخت نکتہ چینی کی۔ ایسی نکتہ چینی اور وہ بھی تعلقہ داران اودھ کے اخبار میں، حکومت کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ پروفیسر سید حسین معرض عتاب میں آ گئے اور انہیں ایڈیٹری سے دست بردار ہونا پڑا۔ اب ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ نواب سر سالار جنگ بہادر لارڈ نارتھ بروک کی ملاقات کے لئے کلکتہ تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے لکھنؤ وارد ہوئے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کی مہمانداری اسی شان سے کی جیسی خود مختار والیان ملک کی کی جاتی تھی۔ کل مقامات صوبجات ہند کو حکم پہنچ گیا تھا کہ ان کو اپنا مہمان سمجھیں۔ چنانچہ اسی غرض سے ریذیڈنٹ وقت مسٹر سانڈرس ہم رکاب تھے۔ لکھنؤ میں نواب صاحب جنرل ایل بیرو چیف کمشنر کے ہاں فروکش ہوئے۔ جنرل بیرو نے تعلقہ داران اودھ و دیگر امرائے شہر سے ملاقات کرائی۔ نیز ان سے پروفیسر سید حسین کا تعارف بھی نواب صاحب سے کرایا اور ان کی علمی و ادبی قابلیت کی بہت کچھ تعریف کی۔ نواب سر سالار جنگ بہادر بہت مردم شناس اور قدردان تھے اور ان اصلاحات کے پیش نظر جو وہ حیدرآباد کی ریاست میں کرنا چاہتے تھے ان کی یہ تمنا تھی کہ ہندوستان کے قابل اور تجربہ کار اشخاص کو اپنی ریاست میں کھینچ لیں چنانچہ سید حسین سے ملنے کے بعد ان کو ریاست کی ملازمت کی ترغیب دی اور وعدہ لیا کہ جب حیدرآباد واپس پہنچوں تو تم ضرور آؤ اور مجھ سے ملو۔ لیکن وہ حیدرآباد نہ گئے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ فطرتاً ان کے مزاج میں استغنا تھا اور اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ دوسری وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ ریاست کی نوکری کو انگریزی سرکار کے مقابلہ میں کم درجہ اور ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ نواب سر سالار جنگ کو اس کی بڑی شکایت تھی اور جب وہ اس قسم کی کوئی بات سنتے تھے تو انہیں بہت رنج ہوتا تھا کیونکہ انہوں نے اپنی ریاست کو منظم اور باضابطہ بنانے میں بڑی محنت اور تدبر سے کام لیا تھا اور اس کام میں انہیں ایسی ایسی مشکلات سے مقابلہ کرنا پڑا جن کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آخر خود نواب صاحب ہی نے اصرار کر کے بلا بھیجا۔ اس کے بعد بھی لیت و لعل کرتے رہے اور آخر ۱۸۷۳ء میں حیدرآباد گئے اور تب بھی [illegible] کی رخصت لے کر۔ حیدرآباد پہنچے تو نواب سر سالار جنگ نے ان کے حال پر اس قدر شفقت اور عنایت فرمائی کہ وہ ہمیشہ کے لئے انہیں کے ہو گئے۔

ابتدا میں نواب صاحب نے انہیں اپنا پرسنل اسسٹنٹ و مددگار پیشی بنایا۔ یہ خدمت بڑے اعتماد کی تھی۔ ریاستوں کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کا معاہدہ تھا کہ وہ کسی انگریز کو بغیر اجازت گورنمنٹ آف انڈیا ملازم نہیں رکھ سکتے۔ اس وقت حیدرآباد میں انگریزی معتمد یا سکرٹری ایک انگریز مسٹر [illegible] تھا۔ گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی جو دیسی ریاستوں کا سخت مخالف تھا اور کئی ریاستوں کو ہڑپ کر چکا تھا۔ اس نے اس بنا پر کہ حیدرآباد کنٹنجنٹ کے مصارف کی رقم [illegible] سے وصول نہیں ہوتی تھی ریاست کے زرخیز علاقہ برار پر عارضی قبضہ کر لیا تھا۔ حضور نظام، ان کے امراء اور اہل حیدرآباد کو اس کا بہت صدمہ تھا اور یہ داغ ایسا تھا جو دولت آصفیہ کے دل پر آخر دم تک ہرا رہا اور ہر چند اس داغ کے مٹانے کی کوشش کی گئی مگر زبردست مارے اور رونے نہ دے کا معاملہ تھا کامیابی نہ ہوئی۔

سرسالار جنگ نے اس امر کا آغاز کیا۔ ان کی سب سے بڑی یہ آرزو تھی کہ یہ علاقہ انگریزی گورنمنٹ سے واپس لے لیا جائے۔ ان باتوں سے انگریزی گورنمنٹ بگڑی ہوئی تھی۔ نواب سالار جنگ نے غدر کے زمانے میں انگریزی حکومت کے بچانے میں جو بے نظیر مدد کی تھی وہ ایسا بڑا احسان تھا کہ انگریز ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے جھجکتے تھے ورنہ کبھی کے ختم کر دیے جاتے۔ برار اور اسی قسم کے دیگر اہم معاملات کے متعلق مراسلت انگریزی میں ہوتی تھی اور سیکرٹری [illegible] انگریزی حکومت کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ نواب بہ اقتضائے ضعیف ان پر برٹش گورنمنٹ کا عتاب نازل ہوا اور ان کو حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ مولوی سید حسین ان کے شریک معتمد و جائنٹ سیکرٹری رہے گویا شریک جرم تھے۔ حیدرآباد میں جب یہ افواہ پھیلی کہ مولوی سید حسین بھی معرض عتاب میں ہیں اور چند روز کے بعد نکال دیے جائیں گے تو نواب سالار جنگ نے حکم فرمایا کہ سید حسین کے نکالے جانے سے پہلے میں خود اپنے عہدے سے استعفا دے دوں گا۔ اس سے نواب صاحب کی کمال قدردانی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ مولوی سید حسین کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان پر کامل اعتماد کرتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ کوئی انگریزی مراسلہ اس وقت تک جاری نہ کیا جائے جب تک مولوی سید حسین کی نظر سے نہ گزر جائے۔

۱۸۸۳ء میں نواب صاحب نے یورپ کا سفر کیا تو مولوی سید حسین ان کے ہم رکاب تھے۔ واپسی پر مولوی صاحب کو اپنا پرائیویٹ سیکرٹری اور معتمد صیغۂ متفرقات مقرر فرمایا جس میں سررشتۂ تعلیم اور بعض چھوٹے چھوٹے محکمے شامل تھے۔ ۱۸۸۴ء میں جب حضور نظام میر محبوب علی خاں مسند نشین ہوئے اور سر لائق علی، عماد السلطنت، مدار المہامی پر سرفراز ہوئے تو ایک کونسل آف اسٹیٹ کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد اہم معاملات حکومت میں مشورہ دینا تھا۔ اس مجلس کے معتمد (سیکرٹری) مولوی سید حسین قرار پائے۔ اس کونسل کے میر مجلس خود بہ نفس نفیس اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں تھے۔ اس سال جشن نوروز میں ان کو علی یار خاں معتمن جنگ کا خطاب عطا ہوا اور ۱۸۸۷ء میں بہ تقریب جشن نوروز عماد الدولہ اور ۱۸۹۰ء میں سالگرہ مبارک کی تقریب پر عماد الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

کرنل مارشل کی علیحدگی کے بعد ۱۸۸۹ء ۱۹۰۲-۱۳۰۳ھ میں مولوی صاحب اعلیٰ حضرت کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے دست مبارک سے اردو زبان میں، ایک رقعہ مولوی صاحب کو لکھا جس کے الفاظ یہ ہیں:

> "نواب عماد الملک بہادر۔ آپ کو واسطے خدمت خانگی پرائیویٹ سیکرٹری کی مقرر کیا ہوں
> جو اس خدمت کے واسطے کسی کو نہ سمجھا۔ ایسا قابل شخص انگریزی فارسی اردو اور ریاست
> کا تعلق رکھنے والا۔ اور جو اس خدمت کی کارروائی ہوگی وہ آپ کے پاس لکھ کر بھجوا دوں گا
> یا خود کہوں گا۔ مگر آپ کل دس بجے صبح میں آ کر نذر دینا۔"

(دستخط یا محبوب)

(ربیع الثانی ۱۳۰۳ھ روز دو شنبہ شب سہ شنبہ)

چند سال کے بعد ۱۹۰۲ء میں وہ اس عہدے سے کنارہ کش ہو کر وہ صرف ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن) ممالک محروسہ سرکار عالی کے عہدے پر فائز ہوئے اور آخر تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ اگرچہ بعض اوقات اس سے بڑے مناصب پر سرفراز کیے گئے لیکن انہوں نے نظامت تعلیمات کو کبھی نہ چھوڑا اور ہر حال میں اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں بالطبع تعلیم اور علم و ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ دوسرے وہ یہ سمجھتے تھے کہ بڑے عہدوں پر للچائی ہوئی نظریں پڑتی ہیں اور اقتدار کے بھوکے سازشوں اور ساز باز کی مدد سے ان کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اہلیت و قابلیت کوئی نہیں دیکھتا۔ نظامت تعلیمات ایک معمولی عہدہ ہے تنخواہ بھی زیادہ نہیں اور قوت و اقتدار بھی واجبی ہی سا ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسرے یہ عہدہ دوسرے فوائد سے بھی محروم ہے۔ باوجود اس کے نواب عماد الملک کا وقار بوجہ علم و فضل اور اعلیٰ سیرت کے ایسا تھا کہ ان کے اعلیٰ افسر اور بڑے بڑے امرا و وزرا ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ تقریباً ۳۲ سال تک دوسری خدمات کے ساتھ بلا وقفہ اس عہدے پر رہے۔ ریاست حیدرآباد میں باقاعدہ

تعلیم کی بنیاد آپ ہی نے رکھی اور سررشتۂ تعلیم کی جدید تنظیم آپ ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ مدارس اور طلبہ میں بہت کافی اضافہ ہوا۔ علاوہ اس [illegible] تعلیمی کے [illegible] اور محنت سے حیدرآباد میں علمی ذوق کو بہت فروغ ہوا۔ صنعت و حرفت کے مدارس بھی ریاست میں آپ ہی نے قائم کئے۔ دیسی صنعت کے بڑے قدردان تھے۔

حیدرآباد میں ان کے علمی ذوق کی دو بڑی قابل یادگاریں ایسی ہیں جن کی افادیت اور اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔ ایک کتب خانۂ سرکارِ عالی اور دوسرا دائرۃ المعارف۔ اس کتب خانے کے لئے مطبوعہ کتب کے علاوہ نادر اور کمیاب قلمی کتابیں ایسی جمع کیں کہ اس کا شمار اس برِ عظیم کے بہترین کتب خانوں میں ہو گیا۔ یہ نادر مخطوطات زیادہ تر عربی زبان کی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں کہ جن کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں نہیں۔ قلمی کتاب کی دوسری چیزوں کی طرح کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی۔ یہ قدردانی پر ہے۔ بعض وقت سودا کرنے میں اصل کتاب ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور اس کا پچھتاوا عمر بھر رہتا ہے۔ نواب عمادالملک کتاب کے بڑے قدردان تھے اور اس قدردانی کا نتیجہ تھا کہ جب کوئی ایسی کتاب آ گئی تو بغیر حجت خریدتے اور منہ مانگی قیمت دیتے۔ اس فیاضی کی بدولت کتاب فروش یا جن کے پاس کوئی اچھی یا نادر کتاب ہوتی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ جو لوگ کتاب کی قدر و قیمت سے واقف نہیں ہیں وہ اس کو بہت فضول اور اسراف سے منسوب کرتے اور طعن کرتے کہ نواب صاحب سرکاری روپیہ ان چیزوں پر ضائع کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار انہوں نے چار پانچ عربی کتابیں آٹھ ہزار روپے میں خریدیں اور جب رقم کی منظوری کے لئے مسل مدارالمہام سرکارِ عالی نواب وقارالامراء کی خدمت میں پیش ہوئی تو کسی صاحب نے چپکے سے کہہ دیا کہ سرکار، مولوی سید حسین صاحب کی عادت ہے کہ وہ کتابیں خریدنے میں سرکار کا مال روپیہ بیدردی سے خرچ کرتے ہیں اور جو قیمت مانگتا ہے دے دیتے ہیں۔ نواب عمادالملک کو بھی اس کی سن گن پہنچ گئی۔ انہوں نے مدارالمہام سے کہا کہ کتابیں واپس فرما دی جائیں۔ میں انہیں خود خرید لوں گا اور یورپ بھیج کر اس سے چار گنی قیمت وصول کر لوں گا۔ مدارالمہام نواب وقارالامراء نے جو بہت بامروت، با اخلاق اور سیر چشم امیر تھے بہت معذرت کی اور فوراً رقم ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ ایک ایسا ہی واقعہ میرے سامنے پیش آیا۔ نواب عمادالملک نے کچھ کتابیں خریدیں اور رقم کی منظوری کے لئے ہوم آفس کو لکھا۔ سررشتۂ تعلیمات ہوم آفس کے ماتحت ہے۔ اس وقت ہوم سیکرٹری افضل العلماء نواب حمید اللہ خاں فرزند مولوی مسیح اللہ خاں تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ بعض کتابیں جو مطبع نول کشور سے چند روپے میں مل سکتی ہیں ان کی قیمت ڈیڑھ ڈیڑھ اور دو دو سو روپے لکھی ہے تو انہیں تعجب ہوا اور لکھا کہ کتابیں ملاحظہ کے لئے بھیج دی جائیں۔ نواب عمادالملک نے لکھا کہ کتابیں کسی کے پاس نہیں جائیں گی جسے دیکھنا ہو یہاں آ کر دیکھے۔ ہوم سیکرٹری صاحب نے بے چون و چرا منظوری دے دی۔ نام کے افضل العلماء صاحب کیا جانیں کہ ایک کتاب جو بازار میں دو چار روپے میں مل جاتی ہے وہی کتاب اگر مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہو یا اس کا کوئی قدیم صحیح نسخہ مل جائے تو اس کی قدر و قیمت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح نواب عمادالملک نے نایاب کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ سرکاری کتب خانہ میں جمع کر دیا۔

علمی لحاظ سے نواب صاحب کا دوسرا بڑا کام دائرۃ المعارف کا قیام ہے۔ اس کا مطبع بھی ہے۔ اس ادارے نے عربی کی بہت سی نادر کتابیں طبع و شائع کی ہیں۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جن کے قلمی نسخے کمیاب تھے اور وہ ایک سے زیادہ دنیا میں کسی دوسری جگہ نہیں پائے جاتے تھے۔ اس کی قدر اور شہرت ہندوستان سے زیادہ عرب ممالک اور علمائے یورپ میں ہوئی۔ اس ادارے کا قیام ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۸ء) میں ہوا۔ اس وقت پانچ سو روپے ماہانہ اس کے مصارف کے لئے منظور ہوئے۔ اس کے بعد نواب صاحب کی تحریک پر اعلیٰ حضرت نے ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۱ء) میں اسے ایک لاکھ روپیہ اور ایک سال بعد پانچ لاکھ روپے عطا فرمائے۔ بھارت کے ناجائز قبضے کے بعد ریاست حیدرآباد پر جو آفات نازل ہوئیں ان میں دو ایسی ہیں جن کا صدمہ کبھی نہیں بھول سکتے۔ ایک عثمانیہ یونیورسٹی کی تخریب اور دوسری دائرۃ المعارف کا خاتمہ۔ افسوس نواب عمادالملک کی یہ بے نظیر علمی یادگار ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ لیکن اس نے جو قابل قدر کام کیا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا اور کبھی نہیں مٹ سکتا۔

نواب صاحب کو عربی زبان سے بے حد محبت تھی۔ دائرۃ المعارف اسی محبت کا نتیجہ تھا۔ مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

مجھے ایک مدت تک بالالتزام ان کی روزانہ صحبتوں میں شریک ہونے کی عزت حاصل رہی ہے اور ان کے

طالب علمانہ مناظروں میں شریک ہو کر میں نے ان کے علم و فضل سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی سلسلے میں مجھے ان کی واقفیت عامہ، ان کے مذاق اور ان کے اسلوب زندگی کا اندازہ کرنے کا بخوبی موقع ملا۔ شعرا کے کلام کا مطالعہ کرنے میں چند روز میں ان کے ساتھ شریک رہا اور نظر آیا کہ جیسی محققانہ و مبصرانہ نظر کلام عرب پر ان کی پڑتی ہے بہت کم کسی کی پڑتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ میں نے انہیں ادب عربی میں یکتائے روزگار پایا۔ جاہلیت عرب کے سادے اور خالص عربی مذاق کے دلدادہ ہیں۔ شعرائے جاہلیت کے کلام پر سر دھنتے ہیں اور مولدین کے کلام کو بالکل نہیں پسند کرتے۔“

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں آپ نے جامعہ عثمانیہ کے ذکر کے دوران میں عربی زبان کی تعلیم کی خاص طور پر تاکید کی تھی۔ فرماتے ہیں:

”دوسرا امر جس کی طرف کارپردازان جامعہ عثمانیہ کی توجہ مبذول ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے مسلمان طلبہ بطور دوسری زبان تعلیمی کے عربی کے اختیار کرنے پر مجبور کئے جائیں۔ اگر فقط اردو انگریزی پر اکتفا کیا گیا تو بجز ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دوسری یونیورسٹیوں کے کامیاب طلبہ سے آپ کے کامیاب طلبہ پیچھے رہ جائیں گے اور آپ کی ساری محنت اکارت جائے گی۔ طلبہ کو وہ پایۂ فضیلت نصیب نہ ہوگا جس کی ان کو اور ہم کو اور ان کی قوم کو ضرورت ہے۔ عربی زبان کو مختلف حیثیتوں سے ہم مسلمانوں پر حق تقدم حاصل ہے۔“

اس کے بعد اس کی تفصیل بیان کی:

”میں نے اورنگ آباد میں کالج قائم کرنے کی تجویز کی تھی۔ نواب صاحب کی تائید و تحریک سے جلد منظوری حاصل ہو گئی۔ قیام کالج کے بعد آپ نے غریب طلبہ کے لئے وظیفے مقرر کئے جنہوں نے عربی زبان لی تھی اور ہر سال بغیر یاد دہانی یا تقاضے کے وقت پر میرے پاس چیک آجاتا تھا۔“

مولوی حبیب الرحمان خان شیروانی (نواب صدر یار جنگ) نے مرحوم نواب صاحب کے علم و ادب کے شغف کے متعلق اپنی ایک تقریر میں یہ واقعہ بیان فرمایا:

”جس سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس گجرات میں منعقد ہوئی وہاں پرانی علمی کتابوں کی تباہی دیکھ کر میں نے ایک اپیل شائع کی کہ روپے کی امداد دے کر ان کتابوں کے خریدنے اور محفوظ کرنے کا انتظام کیا جائے۔ نواب عماد الملک بہادر مرحوم نے اپیل پڑھ کر خط لکھا کہ اپیل پڑھ کر کتابوں کی تباہی پر میں رو رہا ہوں۔ افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس روپیہ نہیں، اس لئے ایک ہزار روپے کا چیک پیش کرتا ہوں۔ یہ تھی مرحوم کی کریم النفسی اور علم کی شیفتگی۔“

اسی طرح نواب اسحاق خان مرحوم سیکرٹری مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ نے امیر خسرو کی تصانیف کی اشاعت کا اعلان کیا تو نواب عماد الملک بہادر نے بہت مسرت کا اظہار کیا اور مالی امداد کا بھی وعدہ فرمایا۔ اس قسم کے علمی و ادبی کاموں کی امداد کے لئے وہ بغیر طلب اور تقاضے کے آمادہ ہو جاتے تھے۔

وہ اس قسم کے تمام علمی کاموں میں بڑی خوشی اور فیاضی سے مدد دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں نواب صاحب نے نواب محمد اسحاق خاں آنریری سیکرٹری مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کو خط لکھ کر امیر خسرو کی تصانیف کی نشر و اشاعت کی طرف توجہ دلائی جس کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:

”نہایت وثوق کے ساتھ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ہندوستان میں کوئی مصنف ایسا نہیں گزرا ہے جس کی تصانیف اس درجہ لائق حفاظت و اشاعت ہوں جیسا کہ امیر خسرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر آپ کی کوشش سے

اس مشہور زمانہ عدیم النظیر حضرت کا پورا کلام نظم و نثر جمع ہو کر چھپ گیا تو یہ قوم کی ایک بڑی عظیم الشان خدمت ہوگی جس کا فیض غیر محدود ہوگا اور جو اس کے کرنے والوں کے نام کو بھی زندہ جاوید بنا دے گی۔

میں دولت مند نہیں ہوں۔ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں اس کام کے لئے اس کو وقف کر دیتا۔

بایں ہمہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اس کام میں مالی مدد دوں گا اور اپنے احباب سے بھی کچھ رقم وصول کر کے بھیجوں گا۔ کام شروع کرنے کے لئے خود ایک ہزار روپے اس وقت دیتا ہوں اور بوقت ضرورت ایک ہزار اور دوں گا۔"

اس کے بعد نواب اسحاق خاں بالکل آمادہ ہو گئے۔ نواب عماد الملک نے دو ہزار دیئے، سرکار عالی سے ساڑھے سات ہزار، نواب سالار جنگ سے ایک ہزار، مولوی انوار اللہ خاں صاحب (فضیلت جنگ) سے پانسو، کل گیارہ ہزار جمع کر کے بھیجے۔

اسی طرح وہ اہل علم کی مدد کرتے تھے اور جب کبھی ان کے علم میں آجاتا کہ فلاں عالم کوئی مفید علمی کام کر رہا ہے تو سفارش کر کے حکومت سے امداد دلانے میں دریغ نہ کرتے۔

مولانا محمود الحسن ٹونکی مرحوم ایک عالم متبحر تھے۔ علوم اسلامیہ پر ان کی نظر بہت وسیع اور گہری تھی۔ بہت روشن خیال اور نہایت زندہ دل اور خوش مزاج بزرگ تھے۔ وہ مصنفین اسلام پر ایک کتاب کیا انسائیکلوپیڈیا لکھ رہے تھے۔ ایک جلد مصر میں طبع ہوئی تھی اور وہاں کے علماء نے بہت پسند فرمایا تھا۔ دوسری جلد کی نوبت ابھی نہ آئی تھی کہ جنگ عظیم کی آفت نازل ہوئی اور وہ مسودہ تلف ہو گیا۔ میں نے نواب عماد الملک بہادر سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فوراً اعلیٰ حضرت حضور نظام کو لکھ کر منظوری حاصل کی اور مولانا کو حیدرآباد طلب فرما کر اس کام پر مامور کر دیا اور ایک معقول تنخواہ ان کے لئے مقرر ہو گئی اور ایک مختصر سا عملہ بھی دے دیا گیا۔ یہ بہت وسیع اور عظیم الشان کام تھا۔ مولانا دن رات اس میں مصروف رہتے تھے۔ چند حصے دائرۃ المعارف میں طبع بھی ہوئے۔ باقی مسودات عثمانیہ یونیورسٹی کے ادبی انبار میں پڑے سڑ رہے ہیں جن کا اب کوئی قدر داں نہیں۔ اس تصنیف کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب اس کے بعض حصے ڈاکٹر کرنکو کی نظر سے گزرے جو عربی علوم کے محقق فاضل تھے تو انہیں یقین نہ آتا تھا کہ اتنا بڑا اور ایسا مشکل کام ایک فرد واحد کا کیا ہوا ہے۔

اسی طرح جب مولوی عبدالجبار خاں ملکاپوری نے دکن کی مبسوط تاریخ لکھنی شروع کی تو نواب صاحب نے سفارش کر کے دولت آصفیہ سے کچھ ہزار روپے منظور کرائے۔

مولوی عبداللہ خاں نے بعض بہت مفید علمی کتابیں چھپوا کر شائع کیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور کتب خانۂ آصفیہ میں رہتے تھے۔ نواب صاحب نے ان کی سرپرستی فرمائی اور سرو آزاد اور ماثر الکرام جیسی کتابوں کی اشاعت پر اپنی جیب سے مختلف اوقات میں کئی ہزار روپے عنایت کئے اور اعلیٰ حضرت سے سفارش کر کے تاحیات پچاس روپے وظیفہ مقرر کرا دیا۔

ایسے ہی ایک دو صاحبوں کا جو علمی یا مذہبی کام کر رہے تھے میں نے ان سے ذکر کیا اور انہوں نے اعلیٰ حضرت سے سفارش کر کے منصب (یعنی دوامی وظیفہ) مقرر کرا دیا۔

طالب علموں کی اکثر مدد کرتے رہتے تھے۔ اگر کسی تعلیم کے خواہش مند اور طالب علم کی سفارش کی جاتی تو تعلیمی وظیفہ مقرر کر دیتے۔ ایک روز مجھ سے فرمانے لگے کہ دلی سے ایک نوجوان عبدالرؤف کا خط آیا ہے جو ابھی ابھی انگلستان سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر آئے ہیں لیکن بوجہ کم استطاعتی پریکٹس شروع نہیں کر سکتے۔ انہوں نے مجھ سے مالی مدد طلب کی ہے۔ میں نے کہا یہ نوجوان میرن صاحب کے نواسے ہیں۔ ان کو اس کا علم نہ تھا۔ لیکن وہ اس نوجوان کے حسن تحریر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً لکھ بھیجا کہ تمہیں کس قدر رقم کی ضرورت ہے اطلاع دو کہ اس کا انتظام کر دیا جائے۔ وہ بھی ایسے خوددار

شریف النفس تھے کہ جواب میں لکھا۔ یہاں حسب دل خواہ انتظام ہو گیا ہے۔ آپ زحمت نہ فرمائیں۔ ایک روز مجھ سے پوچھنے لگے کہ ایسا معلوم ہوا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کی تعلیم فیسوں کے روپے پر جاری ہے۔ میں نے کہا ہاں فلاں فلاں مقام پر جائیں گے۔ یہ سننے کے بعد کئی سو روپے ان کے سفر خرچ کے لئے بھیج دیے۔

نواب صاحب کا ادبی ذوق اعلیٰ درجے کا تھا۔ فارسی اور عربی کے جید عالم تھے فرنچ خوب جانتے تھے اور انگریزی زبان پر حیرت انگیز قدرت تھی۔ وہ ایرانیوں سے فارسی میں اور عربوں سے عربی میں بلاتکلف گفتگو کرتے تھے۔ جب امیر حبیب اللہ خان ہندوستان آئے اور ان کے پروگرام میں علی گڑھ کالج کا معائنہ بھی تھا تو نواب محسن الملک نے امیر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے فارسی سپاس نامہ نواب عماد الملک بہادر ہی سے لکھوایا تھا۔ عربی ادب کے ذوق کے متعلق شرر صاحب کی رائے لکھ چکا ہوں کہ وہ جاہلیت کے شعراء کے سادہ اور پرجوش کلام کے بہت مداح تھے اور متاخرین کا کلام پسند نہیں کرتے تھے۔ فارسی میں وہ شیخ سعدی کے بہت قائل تھے اور شیخ کی عاشقانہ شاعری کو حافظ کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے۔ اردو میں لکھنؤ کی شاعری بہت ناپسند تھی۔ انہیں لفظی صنائع سے جس پر لکھنوی شاعری کا دارومدار تھا اور عامیانہ خیالات سے بہت چڑ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہماری زبانوں (اردو، فارسی، عربی) میں نثر تھی ہی نہیں وہ ایک قسم کی شاعری یا نیم شاعری تھی۔ حالی نے اردو کو متین نثر عطا کی جو علمی اور ادبی مضامین ادا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ میر انیس کی شاعری کے بہت مداح تھے اور ان کے کلام کے بعض اشعار جنہیں وہ ان کا شاہکار سمجھتے تھے زبانی یاد تھے اور کبھی کبھی سناتے تھے لیکن کہتے تھے کہ میر صاحب بھی بعض اوقات لفظی رعایت اور صنائع بدائع سے دامن نہ بچا سکے۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ میں نے میر صاحب سے پوچھا کہ آپ لفظی رعایتوں اور صنائع بدائع کو پسند کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا "نہیں!" لیکن آخر لکھنؤ میں رہتا ہے۔ انگریزی زبان میں متعدد رسالے اور مضامین اور نظمیں جو انہوں نے مختلف اوقات میں لکھیں کتاب کی صورت میں شائع ہو گئی ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کا وہ فاضلانہ مقالہ بھی ہے جو انہوں نے "اصطلاحات علمیہ" پر تحریر فرمایا تھا۔ یہ آج سے تقریباً چالیس پچاس برس پہلے لکھا گیا تھا مگر اب بھی پڑھنے کے قابل ہے اور اس میں جو نکات اصطلاحات کے وضع یا ترجمہ کرنے یا اپنے قدیم الفاظ کو کام میں لانے کے متعلق بیان کئے ہیں اور انگریزی اصطلاحات کو بجنسہٖ اختیار کرنے کے خلاف جو بحث کی ہے اور اس مسئلہ کے متعلق بعض مختلف آراء پر جو تنقید فرمائی ہے اس کا مطالعہ اب بھی ہمارے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ نواب صاحب کی انگریزی انشاپردازی کے نہ صرف ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ بلکہ اہل زبان بھی معترف تھے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا ایک وفد آغا خان کی سرکردگی میں لارڈ منٹو کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کا بہت اہم اور تاریخی وفد تھا جس میں ملک کے متعدد صاحب اثر اور ذی وجاہت مسلمان شریک تھے۔ یہ وقت مسلمانوں کے لئے بہت نازک تھا۔ تقسیم بنگال کے بعد مسلمانوں میں عام طور پر مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وفد کی تجویز نواب محسن الملک کے فکر رسا کا نتیجہ تھی جو اپنے وقت کے نہایت دوربین و روشن خیال سیاست دان تھے۔ انہی نے آغا خان کو گھیرا اور نواب عماد الملک کو بلا کر وہ ایڈریس لکھوایا جو وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا جانے والا تھا۔

سیاست میں وہ سر سید احمد خان کے پیرو تھے۔ جب سر سید نے انڈین نیشنل کانگرس کی بعض وجوہ کی بنا پر مخالفت کی تو اس کی تائید میں ایک بہت پرزور تحریر انگریزی زبان میں لکھ کر شائع کی۔ وہ انگریزی حکومت کو ملک کے حق میں باعث خیر و برکت سمجھتے تھے۔ پرانے لوگ اکثر اسی خیال کے تھے انہوں نے اپنے زمانے کی طوائف الملوکی اور دیسی حکومتوں کی بدنظمی اور ابتری، ناانصافی، رشوت خوری، ظلم و جبر دیکھے تھے۔ انگریزوں نے ریلیں جاری کیں، تار گھر ڈاک خانے بنائے، عدالتیں قائم کیں، لوٹ مار اور ظلم و جبر کا انسداد کیا، تعلیم پھیلائی اور مدرسے اور کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں۔ سفر کی آسانیاں پیدا ہو گئیں، انصاف ہونے لگا، امن و امان قائم ہو گیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ انگریزوں سے بہت خوش تھے اور ان کی عقل و دانش اور انتظام و انصاف کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ان بزرگوں کو ملک کے اقتصادی اور سیاسی حالات سے کچھ بحث نہ تھی اور نہ وہ ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہ تو کیا جسٹس رانا ڈے تک نے اپنے ایک خطبے میں انگریزوں کی آمد کو مشیت ایزدی اور ملک کے حق میں باعث خیر فرمایا تھا۔ ابتدا میں گوکھلے اور گاندھی

بھی یہی کہتے تھے۔ شروع شروع میں انڈین نیشنل کانگرس کا بھی یہی خیال تھا۔ اس وقت کانگرس والے صرف اتنا چاہتے تھے کہ انہیں حکومت میں ذمہ داری کے عہدے ملیں اور حکومت کے نظم و نسق میں ان کا بھی دخل رہے۔ حالات کے مطالعہ اور اقتصادی اور سیاسی امور میں غور کرنے اور عملی تحریکوں میں حصہ لینے سے ان کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ ہمارے بزرگ جو زمیندار قسم کے تھے اپنے پرانے خیال سے نہ ہٹے۔ ان میں بہت کم ایسے تھے جنہوں نے ملکی معاملات کو غور سے دیکھا ہو اور ان میں بصیرت حاصل کی ہو۔ دوسری قسم کے لوگ جو انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور ان کو مسلمانوں کا بدخواہ سمجھتے تھے ان کی نفرت کچھ تو مذہبی تعصب پر مبنی تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ مسلمانوں کی حکومت اور وقار کو ان سے نقصان پہنچا تھا۔ یہ بات بہت دیر میں سمجھ میں آئی کہ انگریزی حکومت سے اصل نقصانات کیا پہنچے اور بعض اسے آخر تک نہ سمجھے۔ اس بارے میں نواب عماد الملک کا ذاتی خیال اس ایک جملے سے ظاہر ہوگا کہ جس زمانے میں وہ انڈین لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ ہمیں حکومت میں "جنٹلمین" کی ضرورت ہے۔ یہ وہی پرانا خیال ہے جس کا اظہار ہمارے بزرگ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مقابلے کے امتحان میں ایسے غیرے کامیاب ہو کر آجاتے ہیں اور ہم پر حاکم بنا دیے جاتے ہیں جو شریفانہ اطوار و آداب سے عاری ہوتے ہیں۔ نواب عماد الملک کو خاندانی شرافت کا بڑا خیال تھا اور اسے بہت اہمیت دیتے تھے۔ قصباتی شرفا اس معاملے میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ گو انہیں بلگرام میں رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا تھا تاہم قصباتی شرفا کی خو بو ان میں موجود تھی۔ ایک دن اتفاق سے میں ان کے ہاں گیا تو دیکھا ایک صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب وہ رخصت ہو کر چلے گئے تو کہنے لگے یہ شخص شریف نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے کہا بظاہر تو ایسا نہیں معلوم ہوتا اور تعلیم یافتہ ہیں۔ کہنے لگے بعض الفاظ کا تلفظ غلط کر رہا تھا۔ مجھے یہ سن کر کسی قدر تعجب ہوا اور سوچنے لگا کہ شرافت کی پرکھ بھی عجیب ہے۔ ایک مولانا حالی تھے جو کہہ گئے ہیں ؎

کچھ اور آدمی بن کر تم اے میر و مرزا
نہیں پوچھتے یاں حسب اور نسب کچھ

میں نے مولانا سے پوچھا "کچھ اور آدمی بن کر" سے کیا مراد ہے۔ فرمایا "مزدور"۔ دونوں اشراف ہیں اور قصباتی ہیں۔ ایک نہ صرف وقت کے تقاضے کو بلکہ انسانیت کے تقاضے کو بھی سمجھتا تھا اور دوسرا قدیم رسم و راہ اور وضع کا پابند تھا۔ جہاں تھا وہیں رہا۔

امیرانہ شان سے رہتے تھے لیکن اس میں تصنع نہ تھا۔ عالی شان کوٹھی تھی اور اسی مناسبت سے اس کا فرنیچر اور سامان تھا۔ مزاج میں بہت نفاست تھی۔ صفائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ریاست میں ان کا کوئی بہت بڑا عہدہ نہ تھا۔ لیکن زمانۂ ملازمت میں اور خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کی تہ داری اور وقار ایسا تھا کہ تمام عہدہ دار اور امرا و وزرا ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے اور اس طرح ملتے تھے جیسے کوئی خورد کسی بزرگ سے ملتا ہے۔

ان کی امیرانہ شان و معاشرت اور ظاہری رکھ رکھاؤ اور رعب داب کو دیکھ کر لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے گھبراتے تھے لیکن وہ بہت متواضع بھی بامروت اور منکسر المزاج تھے۔ خاص کر اہل علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے۔ ایسے وقت میں کوئی بڑا شخص آجاتا تو ملنے سے صاف انکار کر دیتے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ ان کے فرزند نواب عقیل جنگ ان سے ملنے آئے۔ اس وقت نواب صاحب کے پاس مولوی ہاشم ندوی بیٹھے ہوئے تھے جو نواب صاحب کے کتب خانے کی ترتیب وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ نواب عقیل جنگ نشست کے کمرے میں آتے ہی مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "کیا نیچے آپ کا جھٹکا کھڑا ہے (جھٹکا دکن میں ایک ادنیٰ قسم کی سواری ہے)؟" یہ سنتے ہی نواب صاحب سخت برہم ہوئے اور کہنے لگے، "تم اہل علم کی توہین کرتے ہو، تم بھول گئے تمہارا باپ ایک زمانے میں جھٹکوں پر چڑھتا تھا؟" غرض اس بری طرح ڈانٹا کہ وہ پانی پانی ہو گئے۔ عقیل جنگ کا منشا طعن کرنا نہ تھا۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کا جھٹکا پورٹیکو میں ڈیوڑھی کے عین سامنے کھڑا تھا جس سے آنے جانے والوں اور دوسری سواریوں کو زحمت ہوتی تھی۔ غرض یہ کہ اس معاملہ میں نواب عماد الملک بہت

گفت سمجھتے۔ وہ علم کی قدر کرتے تھے خواہ وہ صاحبِ علم کیسا ہی خستہ حال اور پھٹے پرانے کپڑوں ہی میں ہو۔ وہ خود بڑے صاحب علم تھے اور باوجود اس مرتبہ پر پہنچنے کے ان کے مزاج میں وہی انکسار و سادگی موجود تھی اور ساری علمی گفتگو میں ان کا انداز بحث بالکل ویسا ہی ہوتا تھا جیسے ایک طالب علم [illegible] اس وقت وہ وزیر و منصب کا بالکل خیال نہیں کرتے تھے۔

اردو زبان و ادب سے انھیں خاص لگاؤ تھا چنانچہ حیدرآباد آنے کے دوسرے ہی سال [illegible] میں ایک ماہانہ اردو رسالہ "[illegible]" جاری کیا۔ یہ رسالہ دو سال تک جاری رہا۔ اس میں مستند مضامین شائع ہوتے [illegible] انگریزی [illegible] تعلیم یافتہ حضرات [illegible] بہت [illegible] انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں اور انگریزی میں خط و کتابت کرتے ہیں [illegible] تھے۔ ایسے لوگوں سے جن کی زبان اردو ہے یا جو اردو زبان جانتے تھے انگریزی میں بات نہیں کرتے تھے [illegible] جب کبھی ایسے شخص سے ملاقات ہوتی جو اردو نہیں جانتا تھا [illegible] یا انگریز تو اس سے اس کی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ ایک بار ایک صاحب جو پہلے برٹش انڈیا میں ایک اعلیٰ عہدہ پر تھے اور بعد میں حیدرآباد میں وزیر ہو گئے تھے نواب صاحب سے ملنے آئے اور مستقل انگریزی ہی میں گفتگو کرنی شروع کی۔ نواب صاحب نے فرمایا۔ میری زبان انگریزی نہیں اور نہ آپ کی ہے۔ کوئی انگریز آتا ہے تو میں اس سے ضرور انگریزی میں بات چیت کرتا ہوں ورنہ میں انگریزی زبان میں بات چیت کرنا پسند نہیں کرتا ہوں۔ وہ صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور معذرت کرنے لگے۔

وہ ہندوستان کے نظام تعلیم کو اس وجہ سے بھی ناپسند کرتے تھے کہ اس کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ ان کی رائے میں یہ طریقہ نہ صرف حصول علم میں مانع ہے بلکہ اس کا اخلاق پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جامعہ عثمانیہ کے طرز تعلیم کے حامی تھے کہ اس میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ چنانچہ ان خیالات کا اظہار انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت، حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ حیدرآباد دکن ۱۹۱۱ء میں کیا ہے۔ جس کا مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

> "ہمارے ملک کے مدارس میں ابتدا سے انگریزی شروع کر دی جاتی ہے جو ہمارے لئے ایک اجنبی اور غیر مانوس زبان ہے؟ بچے اور لڑکے مجبور کئے جاتے ہیں کہ تمام ابتدائی مضامین مثل حساب، جغرافیہ، تاریخ وغیرہ کے اسی غیر مانوس زبان کے ذریعہ سیکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی زبان سے کم و بیش ناواقف رہ جاتے ہیں اور انگریزی بھی اچھی طرح نہیں آتی۔ بیشتر تعداد طلبہ کو دس بارہ سال اسکول ہی کی حدود کے اندر صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اس عرصہ دراز میں ان کو کیا حاصل ہوتا ہے ...... انگریزی قدرے قلیل سیکھ لیتے ہیں۔ انگریزی میں حساب کے معمولی سوالات کا جواب دے سکتے ہیں ...... جغرافیہ جانتے ہیں اقطاع دنیا کے نام جانتے ہیں، خاص خاص ملکوں کے مشہور و معروف شہروں، دریاؤں، پہاڑوں کے انگریزی نام بتا سکتے ہیں اور نقشے میں ان کو نشان دے سکتے ہیں۔ یورپ خصوصاً انگلستان کی تاریخ کسی قدر جانتے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ سے بھی ایک حد تک واقف ہیں اور آپ کو بتا سکتے ہیں کہ [illegible] سلطنت [illegible] اورنگ زیب ایک [illegible] متعصب اور ظالم بادشاہ تھا۔ اپنی زبان سے [illegible] بول لیتے ہیں مگر اپنی قومی زبان اور روز مرہ کے [illegible] حالات سے بالکل نابلد ہیں۔ کالج میں چار پانچ سال تعلیم پانے کے بعد ان کی حالت میں زیادہ تغیر نہیں ہوتا۔ بجز اس کے کہ [illegible] مغربی دنیا کے [illegible] ہو جاتے ہیں۔ [illegible] مغربی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے قومی اخلاق اور پاکیزہ تہذیب چھوڑ کر مغربی اخلاق اختیار کر لیتے ہیں۔ آپس میں گفت و شنید، بات چیت، سوال و جواب سب انگریزی زبان ہی میں [illegible] ہے۔ کھانا پینا انگریزی قسم کا پسند کرتے ہیں [illegible] کے سامنے [illegible] اپنی زبان میں [illegible] کرتے ہیں تو [illegible]

لغات کی بھرمار کر دیتے ہیں۔ بعضوں کو نماز نہیں آتی، سر سے یاد نہیں۔ ایک صاحب کو میں نے سنا ہے کہ قرآن مجید تک معلوم نہ تھا کہ کیا شے ہے اور کس کا نام ہے۔"

کالجوں میں انگریزی ذریعہ تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں:

"اگر یہی طریقہ قائم رہا تو ہماری آبائی زبان یعنی اردو ایک جاہلانہ زبان رہ جائے گی اور عام طور پر ہمارے ہم قوم و ہم وطن علوم جدیدہ سے ہمیشہ نا آشنا رہیں گے ..... مگر اس مبارک عثمانیہ یونیورسٹی یعنی جامعہ عثمانیہ کالج میں خاص اردو زبان واسطۂ تعلیم علوم و فنون قرار دی گئی ہے حسب امید کامیابی ہوئی تو عجیب سمت چلنے کا اور ہماری زبان قلیل عرصے میں دولت علمیہ سے مالا مال ہو جائے گی۔"

جب ۱۹۱۳ء میں انجمن ترقی اردو کا کام مجھے تفویض ہوا تو میں نے صدارت کے لیے نواب صاحب کا نام پیش کیا۔ انجمن کی مجلس انتظامی نے بالاتفاق منظور کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ہر اعتبار سے کوئی دوسرا شخص ان سے بہتر ہمیں انجمن کی صدارت کے لیے نہیں مل سکتا تھا۔ انجمن کو ان سے علاوہ اعلیٰ عملی مشورے کے ہر قسم کی مدد ملی۔ مثلاً میں نے ایک دن عرض کیا کہ اگر آپ ہز ہائی نس آغا خاں سے انجمن کی امداد کی تحریک فرمائیں تو امید ہے کہ معقول عطیہ مل جائے کیونکہ وہ قومی اور علمی کاموں کی امداد میں بہت فیاض ہیں۔ انھوں نے فوراً کاغذ قلم لے کر فارسی زبان میں خط لکھ دیا۔ مگر آغا خاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس زمانے میں آغا خاں یورپ میں تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد سید راس مسعود نے انگلستان کا قصد کیا۔ میں نے ان سے کہا آغا خاں بھی آج کل وہیں تشریف رکھتے ہیں ذرا ان کو یاد دلا دیجیے گا۔ حضرت نے نواب عماد الملک کے خط کا جواب تک نہ دیا۔ سید صاحب جب واپس آئے تو کہا۔ آغا خاں سے ملا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ فلاں تاریخ کو بمبئی پہنچنے والا ہوں وہاں ملنے۔ چنانچہ اس تاریخ کو میں اور سید صاحب بمبئی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ پونا تشریف لے گئے ہیں اور یہ کہہ گئے ہیں کہ پونے آ کر ملئے۔ میں نے سید صاحب سے کہا۔ بس آپ تشریف لے جائیے۔ مجھے معاف رکھیے۔ وہ گئے۔ ہز ہائی نس آغا خاں تپاک سے ملے۔ انجمن کا مسودہ ملاحظہ فرمایا۔ اپنے کارندۂ خاص کو بلایا۔ حکم دیا کہ انجمن کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ کے حساب سے دس ہزار کا عطیہ ہماری طرف سے دیا جائے۔ اس نے فوراً یہ حکم اپنی یادداشت میں ٹانک لیا۔ اس کے بعد کئی بار یاد دہانی کی گئی جواب ندارد۔ بڑے آدمیوں کے وعدے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے وعدے کے ایفا میں بھی اتنی ہی دیر لگتی ہے۔ میرے پاس ایسے بہت سے شاندار وعدے موجود ہیں۔ اس دنیا میں تو ان کی کچھ پوچھ گچھ نہ ہوگی۔ ایک روز داور حشر کے آگے پیش کرنے پڑیں گے۔

اسی طرح جب میں حیدرآباد سے وطن (رخصت پر) جانے لگا تو نواب صاحب سے عرض کی کہ اگر مناسب ہو تو انجمن کی امداد کے سلسلے میں ایک خط نواب صاحب رامپور (نواب حامد علی خاں) کے نام عنایت فرمایا جائے۔ آپ نے ایک خط فرماں روائے ریاست رامپور کے نام لکھ کر دیا جس میں انجمن کے کاموں کا مفصل ذکر تھا۔ میں نے یہ خط لے جا کر نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ چند سطریں پڑھ کر اپنے معتمد خاص کے حوالے کر دیا۔ میں نے چاہا کہ انجمن کے متعلق کچھ عرض کروں لیکن انھوں نے نواب عماد الملک کی توصیف و ثنا شروع کر دی۔ وہ ان کا نام بڑے ادب سے لیتے تھے اور ان کی باتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کو نواب عماد الملک سے خلوص ہے۔ وہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے مجھ سے بار بار کہتے رہے کہ کسی طرح آپ انہیں یہاں لائیے مجھے بے حد مسرت ہوگی میری بڑی تمنا ہے کہ وہ کچھ دن میرے پاس آ کر رہیں۔ میں نے کہا ان کی حالت یہ ہے کہ جب سے معذور ہوئے ہیں انہیں اٹھنے بیٹھنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ جب کسی سے ملاقات کرنی ہوتی ہے تو اپنے خاص کمرے سے پہیے دار کرسی پر باہر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا یہاں آنا محال ہے۔ کہنے لگے آپ کسی طرح انہیں بمبئی تک لے آئیے میں بمبئی پہنچ کر نہایت آسائش و آرام کے ساتھ یہاں لے آؤں گا۔ غرض میں وہاں تین چار روز رہا۔ بہت خوشی سے ملتے۔ بلکہ بعض اوقات دور ہی سے دیکھ کر بڑے تپاک سے آئیے آئیے مولوی صاحب آئیے کہتے اور دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے لیکن انجمن کا معاملہ کبھی زبان تک نہ آنے دیتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غیر ضروری اور بے جا کاموں پر ہزاروں روپے

صرف کر دیتے ہیں۔

اورنگ آباد سے مجھے اکثر سرکاری کام سے یا محکمۂ تعلیم یا یونیورسٹی کی کمیٹیوں میں شرکت کے لئے حیدرآباد آنا پڑتا تھا۔ قیام حیدرآباد کے دنوں میں نواب صاحب سے ملنا رہتا تھا۔ ایک روز جو میں گیا تو چلتے وقت مجھ سے پوچھنے لگے کیا امپیریل بنک آپ کی قیام گاہ کے قریب ہے؟ میں نے کہا جی ہاں قریب ہی ہے۔ فرمایا یہ خط بنک میں بھجوا دیجئے گا۔ آخر زمانے میں وہ چلتے وقت کسی ایسے ملنے والے سے جو قابلِ اعتماد ہو اور جس سے تکلف نہ ہو رخصت کے وقت یہ پوچھ لیتے تھے کیا ڈاک خانہ آپ سے قریب ہے؟ اور جو وہ کہتا کہ قریب ہے تو وہ اپنے خط دے دیتے تھے کہ ڈاک میں ڈلوا دیجئے گا۔ میں نے مکان پر آ کر خط بنک میں بھجوا دیا۔ دوسرے دن بنک نے مجھے اطلاع دی کہ نواب عماد الملک نے دو ہزار کا چیک انجمن کے نام بھیجا تھا جو انجمن کے حساب میں درج کر دیا گیا ہے۔ دوسرے دن جو میں ملنے گیا تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ فرمایا اس کا اعلان نہ کرنا اور نہ کسی اخبار یا رپورٹ میں لکھنا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ رقم انجمن کے حساب میں درج ہوگی تو سالانہ رپورٹ میں بھی ذکر آئے گا اور جیسے اور عطیات کا اعلان کیا جاتا ہے اس کا بھی کیا جائے گا۔ آپ جو منع فرماتے ہیں اس میں کیا مصلحت ہے۔ کنگ کوٹھی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا وہ کہے گا مجھے کیوں نہیں دیا۔ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ حضور نظام میر عثمان علی خان کی عادات و خصائل سے واقف ہیں وہ سمجھ گئے ہوں گے۔

رسالہ اردو کو بالالتزام پڑھتے تھے۔ بعض اوقات بعض مضامین کے متعلق رائے یا مشورہ دیتے اور کبھی کبھی الفاظ کی صحت و غلطی کے متعلق رائے لکھ بھیجتے۔

جب نواب یوسف علی خان سالار جنگ ثالث عہدہ مدار المہامی پر سرفراز ہوئے تو اس خیال سے کہ یہ نوجوان ہیں اور نظم و نسق ریاست کا تجربہ نہیں رکھتے نواب عماد الملک ان کے مشیر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں آپ نے ایک گشتی مراسلہ جاری فرمایا جس میں ممالک محروسۂ سرکار عالی کے تمام عہدہ داروں کو ہدایت کی کہ اردو مراسلوں میں بلاوجہ انگریزی الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔

انہیں جھوٹ سے سخت نفرت تھی اور جھوٹے کو کبھی منہ نہیں لگاتے تھے۔ ہمارے ہاں شرفاء مروت میں آ کر یا بعض قرب کی خاطر یا اس خیال سے کہ دل شکنی نہ ہو گول کر جاتے یا جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یا ایسے کام کی حامی بھر لیتے ہیں جو وہ نہیں کر سکتے یا اس کا کرنا ان کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ کذب یا پشیمانی ہوتا ہے۔ نواب عماد الملک کا مسلک بالکل صاف تھا۔ جب وہ کسی کام کو نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے یا اسے اپنے اصول اور وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ انہوں نے حیدرآباد آنے کے بعد جو مخزن الفوائد رسالہ نکالا تھا اس میں ان کا ایک مضمون "راستی و راست بازی" شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر ان کی سیرت سامنے آ جاتی ہے۔ وہ راست گفتاری اور صاف گوئی میں نیک نام نہیں بدنام تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان نے بسبیل تذکرہ اپنے مصاحبوں اور اعلیٰ ارکان ریاست سے جو اس وقت حاضر تھے پوچھا کہ لوگوں کا میری نسبت کیا خیال ہے۔ ان صاحبوں نے عرض کیا کہ رعایا حضور کی فیاضی، رحمدلی، قدردانی، سیاست و تدبر، کاروانی اور عالی دماغی کے بے حد مداح ہے۔ غرض ہر ایک نے تعریف کے پل باندھ دئیے۔ نواب عماد الملک خاموش بیٹھے رہے۔ آخر اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ مولوی صاحب آپ نے کچھ نہیں کہا۔ نواب صاحب نے کہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ شراب پیتے رہتے ہیں۔ کام کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے۔ سرکاری کاروائیاں کئی کئی مہینے پڑی رہتی ہیں۔ ریاست کا انتظام خراب ہو رہا ہے۔ یہ سننا تھا کہ دربار میں سناٹا چھا گیا۔ اعلیٰ حضرت فوراً اٹھ کر اندر چلے گئے۔ جن لوگوں نے ہمارے سابق بادشاہوں کے حالات پڑھے ہیں انہیں معلوم ہے کہ ان کے حضور میں خفیف سے اختلاف میں بھی جان کی خیر نظر نہیں آتی تھی۔ یہی حال دولت آصفیہ کے فرمانرواؤں اور ان کے پیشرو بادشاہوں کے درباروں کا تھا۔ ایسی جسارت تو کجا خفیف سے خفیف اختلاف کی بھی مجال نہ تھی۔ اہل دربار مولوی صاحب کی یہ صاف بیانی سن کر رنگ

رہ گئے اور ڈر رہے تھے کہ دیکھئے اعلیٰ حضرت قدر قدرت کا کیا عتاب نازل ہوتا ہے۔ دوسرے روز اعلیٰ حضرت نے نواب عماد الملک کو یاد فرمایا۔ جب حاضر ہوئے تو فرمایا "آپ کو سب کے سامنے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔" نواب صاحب نے عرض کیا کہ "حضور نے سب کے سامنے دریافت فرمایا تھا۔ اگر میں سب کے سامنے ایک بات کہتا اور خلوت میں دوسری تو یہ جھوٹ اور منافقت ہوتی۔" اعلیٰ حضرت جب اندر سے باہر تشریف لائے تھے تو ان کی ایک مٹھی بند تھی۔ نواب صاحب کا جواب سننے کے بعد اعلیٰ حضرت نے مٹھی کھولی اور الماس کی ایک بیش قیمت انگوٹھی عطا فرمائی۔ نواب صاحب کے فرزند نواب مہدی یار جنگ نے مجھے وہ انگوٹھی دکھائی تھی۔

اب آپ اس شریف النفس اور ہر دلعزیز فرمانروا کے فرزند اور جانشین آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں کا حال سنئے کہ اس نے نواب صاحب کی راست گوئی کا کیا صلہ عطا فرمایا۔ کوئی راجہ، یہ مجھے یاد نہیں رہا کہ مہاراجہ پٹیالہ یا مہاراجہ بیکانیر، ریاست کے مہمان تھے۔ اعلیٰ حضرت نے ان کے اعزاز میں اپنے گھر میں ایک ڈنر دیا۔ کھانے کے بعد باتوں باتوں میں مسئلہ ازدواج پر بحث چھڑ گئی۔ اسی میں کہیں اعلیٰ حضرت نے یہ کہہ دیا کہ اسلام میں اس بارے میں بہت سہولت اور آزادی ہے۔ نواب صاحب نے فوراً ٹوکا کہ یہ صحیح نہیں ہے اسلام نے اس معاملے میں ایسی کڑی شرائط رکھی ہیں کہ آدمی ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا۔ شاہ دکن کو اختلاف کی تاب کہاں، سخت برہم ہوئے اور طیش میں آکر فرمایا کہ آپ یہاں سے چلے جائیے۔ نواب صاحب فوراً اٹھ کر چلے آئے۔ دوسرے روز علی الصبح اعلیٰ حضرت کے معتمد پیشی [illegible] جنگ، نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے کہ آپ ریاست حیدر آباد سے چلے جائیے اور آپ کو کونسل آف اسٹیٹ کی ممبری کی جو تنخواہ اب تک ملتی رہی ہے وہ بھی واپس کر دیجئے۔ نواب صاحب نے کہا کہ وہ رقم بطور امانت بنک میں جمع ہے۔ میں اس کا ایک حبہ بھی اپنے تصرف میں نہیں لایا۔ وہ آج ہی واپس کر دی جائے گی۔ اور اسی روز حیدر آباد کو الوداع کہہ کر علی گڑھ تشریف لے گئے۔ یہ شخص حکومت کے فرمانرواؤں کا وہ نمونہ ہے۔ متلون، مغلوب الغضب، متکبر، بے اصول۔ گھڑی میں فرشتہ اور گھڑی میں شیطان۔ یہی شخص انہیں یوں لکھتا ہے: "عماد الملک بہادر فخر الاماثل والاقران۔ آپ کے ساتھ ہم کلامی و ہم طعامی ہو کر ایک زمانہ گزر گیا ہے، لہٰذا کل صبح دس بجے شریک بریک فاسٹ ہوں تو باعث مسرت ہے۔" ایک خط میں نواب صاحب کے انڈیا کونسل سے مستعفی ہونے پر لکھتے ہیں "ایسی باوقعت خدمت سے دفعتہً استعفا دے دینا تمام مسلمانان ہند کے لئے ایک بدقسمتی کا باعث ہے کیونکہ آپ جیسا مدبر، صاحب رائے، تجربہ کار، واقف اسرار بمشکل دوسرا شخص اس خدمت پر مقرر ہونا محالات سے معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔" یہ وہ الفاظ ہیں جن سے وہ اپنی ریاست کے بڑے سے بڑے امیر یا وزیر کو مخاطب نہیں کرتے۔ وہی شخص ان کو جو ان کے استاد بھی تھے، دربار سے نکال دیتا ہے اور دربار ہی سے نہیں حیدر آباد سے خارج البلد کر دیتا ہے۔

دوسرے روز جب صاحب ریذیڈنٹ کو معلوم ہوا تو وہ اعلیٰ حضرت سے ملے اور بہت افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ نواب عماد الملک معمولی شخص نہیں۔ مسلمانان ہند کے دلوں میں ان کی بڑی عزت و وقعت ہے اور حکومت ہند بھی ان کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ان کے ساتھ جو ناروا برتاؤ ہوا ہے اس سے لوگوں میں آپ کی طرف سے بہت ناراضی اور بدگمانی پیدا ہو گی۔ چنانچہ فوراً ان کو واپسی کا فرمان بھیجا گیا۔ وہ اس واقعہ سے بہت آزردہ خاطر ہو گئے تھے اور آنا نہیں چاہتے تھے لیکن اپنے فرزندوں اور احباب کے اصرار پر واپس آ گئے۔ جس روز حیدر آباد پہنچے تو اعلیٰ حضرت نے فوراً ملاقات کے لئے طلب فرمایا۔ نواب صاحب نے کہلا بھیجا کہ میں تھکا ہوا ہوں اس وقت نہیں آ سکتا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے جب بہت اصرار کیا تو وہ کنگ کوٹھی گئے۔ دور ہی سے بلند آواز میں جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے، "مائی ڈیئر، مائی ڈیئر" کہہ کر استقبال کیا۔

انجمن کی معتمدی کے ابتدائی زمانے میں میں نے ایک عرضداشت بغرض امداد انجمن پیشگاہ اعلیٰ حضرت میں پیش کی تھی۔ بارہ سو سالانہ

دوبارہ منظور ہوئی۔ نواب صاحب کو اس کا علم ہوا تو بہت ناخوش ہوئے اور مجھے لکھا: "اسے قبول نہ کیجئے، انکار کر دیجئے۔ ریاست کے خزانہ پر صاحب کا حق نہیں ہے۔" اس وقت میں دارالعلوم ندوۃ العلما کا ناظم تھا۔ میں نے اسے خلاف مصلحت خیال کیا کیونکہ آئندہ بہت سی توقعات تھیں۔

حیدرآباد اس برعظیم کی سب سے بڑی اور باعظمت ریاست تھی۔ اس کی تہذیب اور روایات خاص تھیں۔ لوگ خوش حال تھے۔ سر سالار جنگ کے زمانے سے اس کے نظم و نسق میں بتدریج ترقی ہوتی گئی اور بیسویں صدی میں ہر اعتبار سے عروج کو پہنچ گئی۔ شخصی سلطنتیں سازشوں کا گھر ہوتی ہیں۔ یہ جنس یہاں خوب پھولتی پھلتی ہے۔ سر سالار جنگ بڑے مدبر تھے۔ وہ ریاست کے ہر شعبے پر نظر رکھتے تھے اور ہر عہدہ دار سے اس کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق کام لیتے اور ہر ایک کے کردار اور کام پر ایسی نظر رکھتے تھے کہ کسی کو اپنی حد سے تجاوز کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد چشم نگراں اٹھ گئی اور سازشوں کا دروازہ کھل گیا۔ آپس کی کشمکش اور رقابت سے طرح طرح کی ریشہ دوانیوں کا آغاز ہوا اور حریف ایک دوسرے کو گرانے کے لئے کذب و افترا، بہتان اور اس سے بھی بدتر حربے استعمال کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ سازشوں کا یہ جال ایسا پیچ در پیچ تھا کہ ماحول کے اثر یا ذاتی تعلقات کی بنا پر اس میں بعض ایسے اشخاص بھی پھنس جاتے تھے جن کا کوئی ذاتی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ نواب عماد الملک کو اس قسم کی بعض سازشوں میں الجھانے کی بہت کوششیں کی گئیں لیکن وہ اپنے اصول پر قائم رہے اور ان کا دامن اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی اس آلائش سے پاک صاف رہا۔

پاک ہیں آلائشوں سے چند شخص مثل نگاہ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

انھوں نے اپنے ذاتی رسوخ اور اقتدار سے کبھی اقربا نوازی اور یار فروشی کا کام نہیں لیا۔ ایک بار اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کسی وجہ سے اپنے پیشی کے سکرٹری نواب سرور جنگ سے ناخوش ہو گئے اور نواب عماد الملک کو لکھا کہ میں سرور جنگ کی جگہ آپ کے فرزند محمد ہاشم کو مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ نواب صاحب نے لکھا کہ وہ اس کام کے اہل نہیں۔ مناسب یہ ہوگا کہ حضور سرور جنگ ہی کو ان کی سابقہ خدمت پر بحال فرما دیں۔ معتمد پیشی کی خدمت کے سامنے صدر المہامی بھی پیچھے رہ گئی۔ ایسے اعزاز اور اقتدار کی خدمت تھی کہ ریاست کا کوئی دوسرا عہدہ دار اسے غنیمت بلکہ عزیز تر سمجھ کر کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ ایک دوسرے موقع پر حضور نظام نے لکھا کہ میں آپ کے فرزند عقیل جنگ کو کوتوال شہر کی خدمت پر مامور کرنا چاہتا ہوں۔ اس زمانے میں کوتوال شہر کی قوت و اقتدار کا مقابلہ کوئی عہدہ دار تو کیا کوئی امیر یا وزیر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نواب صاحب نے صاف لکھ بھیجا کہ عقیل جنگ اس کام کے اہل نہیں، کسی دوسرے شخص کا انتخاب فرمایا جائے۔

ان کے سامنے اور ان کے بعد بہت سے بڑے بڑے اشخاص آئے اور چلے گئے لیکن نواب عماد الملک نہایت عزت و آبرو کے ساتھ آخر تک حیدرآباد میں رہے اور ہر دور میں ان کا اعزاز پہلے سے زیادہ ہوتا رہا۔

برٹش انڈیا اور گورنمنٹ آف انڈیا میں بھی ان کا ایسا ہی اعزاز تھا۔ چنانچہ لارڈ کرزن نے جو یونیورسٹی کمیشن ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے حالات کی تحقیق اور اصلاح کے لئے بصدارت مسٹر ٹامس ریلے مقرر کیا تھا اس کے ایک رکن نواب صاحب بھی منتخب کئے گئے تھے۔ اس سلسلے میں پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ ۱۹۰۲ء میں بہ عہد لارڈ کرزن امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں لارڈ مارلے نے پہلی بار وزیر ہند کی کونسل کے لئے دو ہندوستانی ممبروں کا انتخاب کیا۔ ایک نواب عماد الملک تھے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دو بار صدر منتخب ہوئے۔ ایک بار ۱۸۹۵ء میں میرٹھ کے اجلاس میں بزمانہ سرسید اور دوسری بار جب ۱۹۰۰ء کا کانفرنس کا اجلاس رامپور میں ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں مدراس یونیورسٹی کے کانوکیشن (جلسۂ تقسیم اسناد) میں خطبۂ صدارت پڑھا۔

مجھے یہ دیکھ کر بعض اوقات تعجب ہوتا اور رنج بھی آتا کہ ریاست کا ذکر نہیں کہ ان عنایتوں میں رہ کر انھوں نے انگریزی معاشرت کی گرویدگی کا اظہار کیا ہو۔ نشست و برخاست میں جیسے رہتے تھے بہت کم تبدیلی کی۔ وہ کھانا اپنا ہی کھاتے تھے۔ سرسید احمد خاں، نواب محسن الملک، نواب عماد الملک کے دسترخوان

میں نے یہی رنگ دیکھا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی ڈھنگ کے بنے ہوئے کھانوں میں وہ ذائقہ اور چٹخارہ کہاں جو ہمارے کھانوں میں ہے۔ اب تو لوگ وہ کھانے بھول گئے نام تک یاد نہیں۔ نہ دسترخوان کے کھانے والے رہے اور نہ پکانے والوں کے قدردان۔ اب جو کھانے کھاتے ہیں وہ نہ انگریزی ہیں نہ مغلئی۔ یوں کھانا سب ہی کھاتے ہیں۔ لیکن ایسے کم ہیں جو کھانے کا ذائقہ، لطافت اور رنگ و بو کا صحیح ذوق رکھتے ہیں۔ نواب عماد الملک بہت نفیس اور لذیذ کھانے کھاتے تھے۔ لیکن ان کے کھانے بہت مرغن ہوتے تھے۔ خدا جانے یہ لوگ یہ کھانے کس طرح ہضم کر لیتے تھے جبکہ کسی قسم کی ورزش کے بھی عادی نہ تھے۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ وقار آباد لے گئے جہاں ان کا ایک اچھا سا باغ اور بنگلہ تھا۔ کھانا ان کے ساتھ کھانا پڑتا۔ جب کھانے پر وہ بار بار ٹوکتے رہتے کہ دیکھیے جوان ہو تم سے تو میں بڈھا ہی اچھا ہوں تم سے زیادہ کھاتا ہوں۔ ان کے اصرار پر بھی میں نے کھانا بہت احتیاط سے کھایا۔ لیکن وہ مرغن کھانا جس میں مجھے بات بھی لگتی تھیں مجھے راس نہ آیا اور رات بھر بےچینی رہی۔ صبح ہوتے ہی میں نے وہاں سے نکل بھاگنے کی ٹھانی۔ مگر نواب صاحب نے جانے نہ دیا اور ٹھہرنے پر اس قدر اصرار کیا کہ میں مجبور ہو گیا۔ کھانا میرے سامنے آتا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ بیچارے میرے کم کھانے پر بگڑتے اور طعن کرتے تھے۔ انھیں کیا خبر کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ تیسرے دن تو میں نے ایک نہ سنی اور حیدرآباد جا کر ہی دم لیا۔

نواب صاحب کھانا تو خیر اچھا کھاتے ہی تھے لیکن کھانے کی تعریف اور اس کی باریکیوں کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ بعض چیزیں خود بھی پکاتے تھے۔ خاص ارہر کی دال جس میں کریری کی لاگ دیتے تھے بہت لذیذ ہوتی تھی۔ قدردان بھی ایسے ہی تھے۔ ایک روز جو میں ان کے ہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھے ہیں اور وہ ان سے بے تکلف باتیں کر رہے ہیں۔ جس وقت میں پہنچا تو نواب صاحب ان سے کھانے کی تعریف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میٹھے چاول تم نے خوب پکائے تھے لیکن شکر نئی تھی۔ نئی شکر گرم ہوتی ہے۔ اس نے کہا آپ نے بجا فرمایا اس وقت پرانی شکر نہ ملی، نئی کا استعمال کرنی پڑی۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرت باورچی تھے۔ نواب صاحب کے ملازموں میں وہ جا بجا ایسے تھے جن کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ کر اس طرح باتیں کرتے۔ کمال کی قدر ہو تو ایسی ہو۔

ان کے خاص دوست اور ملنے والے بہت کم تھے۔ مگر جس سے رابطہ تھا وہ خلوص کے ساتھ تھا۔ وہ اہل علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور ایسے اشخاص پر جن میں طالب علمانہ جستجو اور صحیح ذوق ہوتا بہت مہربان ہوتے اور ان کے لئے ہر کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے تھے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

ہمارے لوگوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ جس پر ایک بار اعتبار کر لیا بس اس کے ہو گئے۔ پھر کوئی اس کے خلاف کہے وہ نہیں سنتے تھے۔ یہی کیفیت سرسید احمد خاں کی تھی۔ اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ ان کے انگریز کلارک نے ایک لاکھ کا غبن کر دیا۔ نواب صاحب کے دفتر میں ان کے ایک مددگار عبداللہ بیگ صاحب تھے۔ میں نے ایک روز نواب صاحب سے کہا کہ اس شخص کی دیانت مشتبہ ہے اور جہاں تک معلوم ہوا ہے یہ آدمی اچھا نہیں ہے۔ یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے جو ایسا کہتے ہیں وہ خود ایسے ہیں۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جب دفتر کے حسابات کی تنقیح ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بہت سا سرکاری روپیہ اپنے تصرف میں لے آیا ہے اور غبن کے الزام میں خدمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس ذکر سے میرا مقصد نہیں کہ ان کے معتمد علیہ ایسے ہی تھے۔ بعض اشخاص جن پر ان کو اعتماد تھا درحقیقت اپنی سیرت، کردار اور قابلیت کے اعتبار سے بہت قابل قدر تھے۔

مذہباً شیعہ تھے۔ لیکن اہل تشیع کے بعض عقائد مثلاً تبرے اور تقیے کے سخت مخالف تھے اور کہتے تھے کہ جاہلوں کے عقیدے ہیں۔ نواب [illegible] مرحوم [illegible] جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں نواب عماد الملک بہادر کا بے حد ادب و احترام کرتے تھے۔ ایک ملاقات کے وقت جب ان کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ ایک بات میں مجھے ان سے اختلاف ہے اور کسی طرح وہ اس معاملے میں ہم سے اتفاق کرنے پر آمادہ نہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ اختلافی معاملہ تقیے کا تھا حالانکہ ہم نے بعض شیعہ علما اور نہایت قابل اور روشن خیال اشخاص کو یہ کہتے سنا ہے۔ [illegible]

بے تعصب شخص تھے۔ کسی مذہب یا مذہبی فرقے سے متعلق کسی قسم کا تعصب نہیں رکھتے تھے۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ لکھتے ہیں کہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کہتے تھے کہ جب میں نے الفاروق کو شائع کیا تو اس کا ایک نسخہ نواب عمادالملک بہادر کی خدمت میں بھیجا اور ان سے خواہش کی کہ اس کی نسبت آپ اپنے خیالات ظاہر فرمائیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ گذشتہ تیرہ سو برس میں صرف ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام عمر ابن الخطاب ہے۔ اتنا ان کی وقعت لکھنا اسلام کی خدمت تھی جو آپ نے ادا کی۔" سر رشتہ تعلیم بہت وسیع محکمہ ہے اور سینکڑوں آدمیوں کا تقرر ان کے ہاتھ میں تھا لیکن انھوں نے کبھی مذہبی پاسداری سے کام نہیں لیا۔ اس معاملہ میں بہت فراخ دل تھے۔ بعض عیسائی مشنریوں اور دوسرے غیر اسلامی اداروں کی جو اشاعتِ تعلیم کا کام کرتے تھے وقتاً فوقتاً مدد دیتے تھے۔

آخر زمانے میں انھیں مذہب سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ گفتگو میں اکثر محاسنِ اسلام کا ذکر کرتے تھے اور افسوس کیا کرتے تھے کہ لوگ اصول سے زیادہ فروع پر زور دیتے ہیں اور ترہات کو مذہب سمجھ رکھا ہے۔ کہتے تھے اصل اسلام اہلِ حدیث وہابیوں کا ہے۔ یہ اثر ان پر زمانۂ طفولیت سے تھا جبکہ وہ اپنے والد کے ساتھ بنگال کے مختلف اضلاع میں رہے۔ اس زمانے میں شاہ اسمٰعیل شہید علیہ الرحمۃ کے بے لوث سرفروش حامی اور داعی اشاعتِ اسلام کی خاطر بنگال کے اضلاع کا دورہ کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی ان کے ہاں آ کر مہمان رہتے اور ان کے والد ان کی بہت خاطر مدارات کرتے۔ نواب صاحب کہتے تھے کہ یہ لوگ کشتیوں میں سفر کرتے اور اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ ان بزرگوں نے گاؤں کے گاؤں مسلمان کر لئے تھے۔ یہ نومسلم بڑے مخلص اور پکے مسلمان تھے۔ جس وقت نماز کا وقت آتا فوراً سب کام چھوڑ چھاڑ کر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ مثلاً کھیت میں کوئی ہل چلا رہا ہے تو اذان سنتے ہی ہل جہاں تھا وہیں رہ جائے گا یا کسی اور کام میں مصروف ہے تو کام جس نوبت پر ہے وہیں چھوڑ دیا جاتا۔ یہ اپنے عقائد میں بہت راسخ تھے۔ مجال نہ تھی کہ کوئی شخص قبر پر پھول چڑھا سکے یا اسی قسم کی کوئی اور بدعت کر سکے۔ اس بات پر بہت افسوس کرتے تھے کہ ان مخلص مجاہدوں کے بعد جب پنجاب کے جاہل اور دنیادار پیروں نے آنا شروع کیا تو بیچارے بنگالی مختلف قسم کے ترہات اور بدعتوں میں پھنس گئے۔ شاہ اسمٰعیلؒ کے رفقاء کے تقوے اور سچے اسلامی جوش کے بہت قائل تھے۔ لڑکپن کا یہ اثر ان کے دل پر تمام عمر تک تازہ رہا۔

جیسا کہ میں نے ابھی لکھا ہے آخر زمانے میں اسلام کی حقانیت اور قرآن پاک کی تعلیم کی عظمت ان کا محبوب خیال ہو گئی تھی۔ ان چیزوں کو وہ طرح طرح سے بیان کیا کرتے تھے۔ ایک روز مولانا انوار اللہ خاں صاحب فضیلت جنگ بہادر صدر الصدور سے قرآن مجید کی فصاحت کے بعض نکات بیان کر رہے تھے دورانِ گفتگو میں فرمایا کہ لوگوں نے الفاظِ قرآن پاک کی معنویت اور ترتیب کی طرف بہت کم توجہ کی ہے اور اسی ضمن میں کہا کہ آیۃ الکرسی کے الفاظ میں ہی ترتیب ہے کہ دو چار قرآن اور لکھے جا سکتے ہیں۔ اسلام کی تبلیغ کو بہت بڑی اسلامی خدمت سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر وہ خواجہ کمال الدین کی بہت عزت کرتے تھے اور خواجہ صاحب اور ان کے رفقاء نے تبلیغ کا کام جو مختلف ممالک میں کیا اس کے بہت ثناخواں تھے۔ غالباً انھی کی تحریک پر سرکار سے خواجہ صاحب کو مالی امداد بھی ملی تھی۔

ایک روز مجھ سے کہنے لگے کہ ہندوستان کا آئندہ سربراہ (لیڈر) مذہب کے بھیس میں آئے گا۔ کچھ مدت بعد جب گاندھی جی میدانِ سیاست میں جلوہ فرما ہوئے تو مجھے نواب صاحب کی پیشین گوئی یاد آئی۔ اس سے قبل انڈین نیشنل کانگریس انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کے تصرف میں تھی۔ عوام سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ گاندھی جی اپنی قوم کے مزاج کو خوب پہچانتے تھے۔ انھوں نے یک لخت اپنی طرزِ زندگی اسی طرح بدل دی جیسے سانپ اپنی کینچلی بدل دیتا ہے۔ وہ ننگے سر ننگے پاؤں رہتے۔ گھٹنوں سے اوپر ایک معمولی سی دھوتی باندھتے اور کندھے اور سینہ چھپانے کے لئے کھدر کا بڑا سا رومال یا چھوٹی سی چادر ڈال لیتے۔ اس کے بعد سے ان کی زندگی درویشانہ اور زاہدانہ ہو گئی اور وہ دفعۃً مسٹر گاندھی سے "مہاتما گاندھی" ہو گئے۔ ہندو مخلوقات ان کی پوجا کرنے لگی اور ان کے ایک ایک لفظ کو الہام و وحی سمجھنے لگی۔ کانگریس کا دروازہ سب کے لئے کھل گیا۔ انگریزی کی جگہ ہندی، ہندوستانی اردو میں تقریریں ہونے لگیں۔ ہندو تو ہندو مسلمانوں کو خلافت کے لالچ نے ایسا لگایا کہ ان کے سرگروہ اور علماء گاندھی جی کا دم بھرنے لگے۔ گاندھی جی نے مذہب کو سیاست

میں ایسا ہوا کہ وہ مختصر سے ہی عرصے میں ہندوستان کے ملکی اور روحانی پیشوا ہو گئے۔

خطوں کا جواب بالالتزام دیتے تھے اور اپنے قلم سے لکھتے تھے۔ کبھی دوسرے سے نہیں لکھواتے تھے اور کبھی ٹائپ رائٹر کا استعمال نہ کیا۔ تمام تحریریں، اردو انگریزی سب خود لکھیں اور اپنے قلم سے لکھیں۔ ایسے زمانے میں بھی جب وہ ضعیف ہو گئے تھے اور کسی قدر ضعفِ بصارت کا بھی عارضہ تھا انھوں نے کبھی اپنے خط یا اپنی تحریریں کسی دوسرے سے لکھوانی گوارا نہ کیں۔

میانہ قد، کھلتا گندمی رنگ، خوبرو آدمی تھے۔ خضاب کرتے تھے، آخر زمانے میں ترک کر دیا تھا۔ سفید داڑھی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ حقہ پیتے تھے، پیچوان سامنے لگا رہتا تھا۔ سگرٹ سگار بہت زیادہ نہ پیتے تھے۔ کہتے تھے جہاز کے سفر میں ایک بار سگرٹ سگار پینے کی کوشش کی، اس کی بو سے بہت تکلیف ہوئی اور حقے ہی کی خواہش معلوم ہوئی۔ زبان میں ہلکی سی لکنت تھی۔ جامہ زیب تھے۔ ہمیشہ ہندوستانی یعنی حیدرآبادی لباس پہنتے تھے۔ جب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر ہوئے تو لباس میں تبدیلی کرنی پڑی لیکن یہ تبدیلی عارضی تھی۔ انڈیا کونسل کے ممبر مقرر ہوئے اور لندن میں رہنا ہوا تو انگریزی لباس اختیار کرنا پڑا۔ ان کے قویٰ بہت اچھے تھے۔ بہت قوی ہیکل تھے۔ لندن میں ایک حادثے سے ٹانگ میں چوٹ آگئی۔ زخم اچھا ہو گیا مگر ہڈی کا جوڑ ٹھیک نہ بیٹھا۔ اس سے انھیں اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف رہتی تھی۔ اگر یہ صدمہ نہ ہوتا تو کئی سال اور زندہ رہتے۔ پھر بھی ۸۴ برس کی عمر پائی۔ کبھی بے تکلف دوستوں کے ساتھ شطرنج بھی کھیل لیتے تھے۔ کسی زمانے میں ستار کا بھی شوق تھا۔

ان کی یادگار یہ چند تصانیف ہیں :-

۱- سوانح سرسالار جنگ۔ یہ نواب سرسالار جنگ کی مختصر سوانح عمری انگریزی زبان میں ہے۔ ۱۸۸۳ء میں جو نواب صاحب کی وفات کا سال ہے لکھی گئی۔
سرسالار جنگ ان کے محسن تھے اور ان کا ذکر بڑے خلوص اور محبت سے کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ریاست ہائے اسلامی میں مردم شناسی اور قدر دانی میں اورنگ زیب کے بعد کوئی شخص ہوا ہے تو وہ سرسالار جنگ تھے۔ اس کا ترجمہ اردو میں ہو گیا تھا۔

۲- DESCRIPTIVE SKETCHES OF THE NIZAM'S DOMINION اس میں ریاست حیدرآباد دکن کے جغرافی، تاریخی واقعات، انتظامی حالات، آبادی، صنعت و حرفت وغیرہ کا دلچسپ بیان ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں مسٹر ولمٹ بھی شریک تھے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے۔

۳- رسائل عماد الملک۔ اس میں نواب صاحب کے وہ تمام مضامین، خطبات و مقالات ہیں جو وقتاً فوقتاً اردو میں لکھے گئے۔

۴- انگریزی مضامین، مقالات و خطبات اور انگریزی نظموں کا مجموعہ۔

۵- قرآن پاک کا ترجمہ۔ یہ نواب صاحب کا سب سے اہم اور قابل قدر کام ہے۔ یہ ترجمہ انھوں نے نہایت تحقیق و کاوش اور محنت سے کیا تھا اور اس کے لئے خاص اہتمام کیا تھا اور ایک بڑا ذخیرہ تفاسیر و احادیث اور لغات اور عربی ادب کی کتابوں کا جمع کر لیا تھا۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ ترجمے میں حتی الامکان اصل کی سی سادگی، شان اور قوت باقی رہے۔ مترجم میں بڑی صفائی تھی، بہت غور و فکر کرنے کے بعد ایک ایک لفظ کا انتخاب کرتے اور لکھتے تھے۔ اس کے ساتھ عقلی بلند پائگی کا خیال رکھتے۔ ان کے مرض الموت سے قبل انگریزی ترجمہ ختم ہو گیا تھا۔ سورۂ پاروں کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا اور جلد پروف بھی چھپ گیا تھا۔ نواب صاحب کی وفات سے اس کام میں رکاوٹ ہو گئی۔ مولوی عبدالحق صاحب بھی حسرت کرتے تھے۔ افسوس کہ وہ بوجہ پیرانہ سالی، ضعفِ بصارت اور ناگہانی صدمے کے یہ کام جو ان کے فضل و کمال کا بہترین نمونہ تھا جاری نہ رکھ سکے۔

نواب عماد الملک بہادر کی شخصیت اس زمانے میں بعض اعتبار سے عجیب سی معلوم ہوگی۔ وہ مشرقی اور مغربی تہذیب کے جامع تھے۔ آدمی کو علم، دولت، آسائش، عہدہ، نام محنت سے مل جاتا ہے لیکن صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے۔ یہ صحیح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اس سے زندگی کے ہر شغل و شعبے میں ایک نرمی اور سہانی دلکشی آجاتی ہے۔ رواداری، اعتدال اور اطمینانِ قلب پیدا کر دیتی ہے اور باوجود نشیب و فراز اور کشمکش کے مختلف لوگوں کے مزاجات کے سمجھنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔ یہی ذوق نواب عماد الملک کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو میں پایا جاتا ہے۔ ان کی وضع داری اور ظاہری شان ایسی تھی کہ لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے جھجکتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں سے جو زیبِ علم اور ذوقِ تہذیب سے عاری ہوتے گو رسمی حیثیت سے

ان کا پایہ کتنا ہی بلند ہو جاتا ملنے سے ہوا کرتے اور ایسے اصحاب سے ان کا برتاؤ خشک اور پھیکا سا ہوتا تھا۔ لیکن اہلِ علم کی ملاقات سے بہت خوش ہوتے اور بے تکلف مل کے باتیں کرتے۔ ان ملاقاتوں میں طالب علمانہ سادگی، خلوص اور ہمدردی پائی جاتی تھی۔ وہ غریب سے غریب عالم یا طالب علم کے مقابلے میں بڑے سے بڑے جاہل امیر کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے علم و ادب کی اشاعت، اہلِ علم اور علمی اداروں کی امداد و سرپرستی میں ہمیشہ فراخ دلی سے کام لیا اور اس سے ان کو خوشی ہوتی تھی۔ وہ صادق القول، باوضع اور پابند اصول تھے۔ ان میں قدیم وضع اور جدید تہذیب کی بعض خوبیاں اس خوش اسلوبی سے باہم مل ہوئی تھیں کہ اس امتزاج نے ان کی روشن زندگی میں ایک قسم کا حسن پیدا کر دیا تھا۔

ان کی صحبت مغتنمات میں سے تھی۔ اس میں حکیمانہ اور طالب علمانہ دونوں شانیں نظر آتی تھیں۔ اپنے زمانے کے پرانے حالات، اپنے بزرگوں کی خوش دلی، وضع داری اور شجاعت کے کارنامے اور ان کے توہمات، اسراف اور عیش کے قصے بڑے مزے سے بیان کرتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، قدیم اساتذہ کے کلام پر بہت اچھی نظر تھی اور خاص صحبتوں میں ان کا منتخب کلام سناتے اور کبھی کبھی شعر کے محاسن و معائب پر تنقیدی نظر ڈالتے، جسے دیکھ کر ان کے ذوق کی داد دینی پڑتی تھی۔ اگر کوئی ان چیزوں کو قلمبند کر لیتا تو وہ ایک نادر بیاض ہوتی۔ مولانا حالی نے کسی جگہ ذکر کیا ہے کہ مظہر جان جاناں نے اساتذہ کے کلام سے منتخب اشعار کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا نام "خریطۂ جواہر" تھا۔ اس کا دلی کی شاعری پر بہت اچھا اثر پڑا۔ پرانے صاحبِ ذوق اور پڑھے لکھے حضرات اپنے پاس ایک بیاض رکھتے تھے، جہاں کہیں کوئی اچھا شعر یا کوئی خیال یا کام کی بات نظر پڑی یا کوئی مجرب نسخہ ہاتھ لگا وہ جھٹ اپنی بیاض میں لکھ لیتے تھے۔ نواب عماد الملک کی صحبت میں بعض اوقات ایسے علمی و ادبی نکات مل جاتے تھے جو گہرے مطالعہ اور فکر کا نتیجہ ہوتے تھے۔ ان کے علمی ذوق، علم و ادب کی سرپرستی اور صحبت سے جو فیض لوگوں کو پہنچا وہ ان کی تالیفات سے کہیں زیادہ مستند اور دور رس تھا۔

وہ جس خدمت پر مدت دراز تک فائز رہے، اگرچہ اس میں ایک گونہ ترقی ہوئی لیکن جیسی ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہو سکی۔ اس کا انھیں خود بھی اعتراف تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ ان کاموں کے لیے جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے سررشتہ کے منصوبوں اور تجویزوں کی منظوری کے لیے بہت سے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ کبھی اپنے اعلیٰ افسروں سے مل کر اور ان کو خوش کر کے کام نکالنا پڑتا ہے اور کبھی لڑ جھگڑ کر اور اپنے رسوخ سے کام لے کر منظوری حاصل کرنی پڑتی ہے۔ نواب عماد الملک اس قدر خوددار اور غیور، اور اپنے اعلیٰ افسروں سے اس قدر بلند مرتبہ تھے کہ اس قسم کی دوڑ دھوپ یا اپنے افسروں کی خوشامد کی کوشش ان کے امکان سے باہر تھی۔

ان کے علم و فضل، وسیع معلومات، علمی و ادبی ذوق اور عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے گہرے مطالعہ کو دیکھتے ہوئے ان کا علمی کام اس توقع سے کم ہے جو ان سے کی جاتی تھی۔ حیدرآباد کے اونچے حالات اور ماحول کی آسودگی کی تاثیرات نے بیزاری اور ان کی طرزِ معاشرت نے تن آسانی پیدا کر دی تھی اور کام اگر وہ کرنا چاہتے تھے اتنا ہی تھا جتنا ہو سکا۔ لیکن ان کی علمی سرپرستی، علمی فیض، عالمانہ استغنا، اعلیٰ سیرت اور بے لوث کرداری کی وجہ سے وہ دولتِ آصفیہ حیدرآباد دکن کی تاریخ میں ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد رہیں گے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد

محمد حسین خاں زبیری

یہ تذکرہ ہے لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد علیگ، کے ٹی۔ سی آئی ای۔ ایم اے (کنٹب)، پی ایچ ڈی (گوٹنجن)، ڈی ایس سی (الٰہ آباد)، سر آئزک نیوٹن اسکالر (کیمبرج)، پروفیسر، پرنسپل ایم اے او کالج، پرو وائس چانسلر، وائس چانسلر، ریکٹر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، ممبر لیجسلیٹو اسمبلی۔ ممبر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل، ممبر وائسرائے ڈیفنس کونسل کا

برصغیر پاکستان میں جب مسلمانوں کی فتوحات شروع ہوئیں تو عرب، عراق، ایران وغیرہ ممالک سے اکثر قبائل بھی بغرض ملازمت و تجارت یہاں آنے لگے ان میں سے اکثر اس ملک میں آباد ہو گئے انہی قبائل میں ایک عربی النسل قبیلہ بھی تھا جس کی نسبت حضرت زبیرؓ سے کی جاتی ہے یہ قبیلہ کازرون سے ملتان، پنجاب، دہلی اور یوپی کے مختلف علاقوں میں آ بسا اور کمبوہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کی جو بستیاں دہلی، میرٹھ، مراد آباد، امروہہ، سنبھل، بریلی اور مارہرہ وغیرہ میں قائم ہوئیں ان میں زمینداریاں بھی تھیں اور شاہی ملازمت و اعزاز کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ان میں بڑے بڑے علما، صوفیا، مصنفین، شعرا اور اطبا وغیرہ پیدا ہوئے ہیں کہ کارناموں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اپنی کتاب "خزانۂ عامرہ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "خدمات شرعیہ دار الخلافہ دہلی مثل قضا و افتا اکثر بہ قوم کمبوہ تعلق داشت و دارد۔"

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا۔ وہ ۱۸۷۷ء میں بمقام میرٹھ پیدا ہوئے اسی سال ایم اے او کالج علیگڑھ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اور اس مادر علمی کا وہ فرزند رشید جو اس کی خدمات کے لحاظ سے اپنے معاصرین اور رفقا میں فرد فرید ہے ساتھ ہی ساتھ اس عالم وجود میں منصۂ شہود پر آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے والد حافظ معین الدین احمد محکمہ مال میں ملازم تھے اور انہوں نے تحصیلداری تک ترقی کی۔ وہ جو مثل ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ڈاکٹر صاحب مشکل سے چار برس کے ہوں گے کہ ان میں یہ عادت تھی کہ گھر میں بچوں کے کھلونے جو ٹوٹ جاتے تھے ان کے ٹکڑے جمع کر کے ان کو پھر جوڑنے کی کوشش کرتے اور اکثر کامیاب ہو جاتے تھے۔ جب عمر تعلیم کے قابل ہوئی تو میرٹھ کے قومی مدرسہ میں ان کا داخلہ کرا دیا گیا یہ مدرسہ قدیم طرز کا تھا جسے اسی قبیلہ کے ایک بزرگ حافظ محمد روح اللہ خاں نے جاری کیا تھا۔

اس کے لئے جائداد وقف کر دی تھی۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اسی مدرسہ میں مولوی بشیر الدین احمد بانی اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ و ایڈیٹر اخبار "البشیر" بھی مدرس تھے اور وہ ڈاکٹر صاحب کے چچا تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ میں داخل ہوئے ڈاکٹر صاحب کو ابتدا ہی سے ریاضی میں بہت شغف اور دلچسپی تھی گرمیوں کی راتوں میں جب صحن میں لیٹتے تو انگلیوں اور ہتھیلی کے ذریعہ حساب کے سوال حل کرتے رہتے تھے۔ اور بسا اوقات رات کا بیشتر حصہ مطالعہ میں گزار دیتے تھے۔ چونکہ اوائل عمر ہی سے ضبط و نظم اور ترتیب اشیاء کا ملکہ قوی تھا اس لئے ان کے والد نے تیرہ سال کی عمر میں ہی تمام انتظام خانہ داری ان کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ نہایت اہتمام سے اشیائے خانہ داری منگاتے اور الماری میں رکھتے تھے۔ الماری کے کواڑ پر ہر ایک کا نام لکھ دیتے تھے جب الماری کھولتے جاتے ایک ایک نام یاد کر لیتے تھے۔

جب وہ مڈل کلاس میں آگئے جس کا امتحان بھی ان دنوں یونیورسٹی سے متعلق تھا تو ان کے ایک چند ہم جماعت نے فخریہ کہا کہ ضیاء الدین میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ خاموش رہے اور اپنے کام میں مصروف لیکن جب امتحان کا وقت آیا تو ریاضی کے پرچے میں اقلیدس کے چار سوال تھے جن میں سے کوئی دو سوال کرنے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے چاروں سوال نہایت عمدہ طور پر حل کئے اور لکھ دیا کوئی سے دو دیکھ لئے جائیں۔ اس طرح وہ اپنے حریف سے بازی لے گئے اوّل درجہ میں کامیاب ہوئے اور ریاضی و تاریخ میں امتیاز حاصل کیا۔

سنہ ۱۸۸۹ء میں وہ ایم اے او کالج سے ملحق اسکول میں داخل ہوئے اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ جو پہلے سے وہاں پڑھتے تھے ہاسٹل میں داخل ہو گئے۔ یہاں ان کے نمایاں ہم جماعت سیٹھ یعقوب حسن مرحوم اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب تھے جب انٹرینس کے امتحان کا وقت قریب آیا تو اساتذہ میں خیال آرائیاں شروع ہوئیں کہ دیکھئے امتحان میں اوّل کون آتا ہے ہیڈ ماسٹر کا خیال تھا کہ یعقوب حسن اوّل آئے گا اور سیکنڈ ماسٹر عبدالحق کے متعلق قیاس آرائی کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ انہوں نے بھی یہ چہ میگوئیاں سن لیں اور اپنی محنت و کوشش میں اضافہ کر دیا۔ اور امتحان میں سب ساتھیوں پر بازی لے گئے اوّل درجہ میں کامیاب ہوئے ان کو کالج سے لیئک میڈل اور سررشتہ تعلیم سے سرکاری وظیفہ ملا۔ چونکہ اس وقت تک کالج میں سائنس کی تعلیم کا انتظام نہ تھا اور ڈاکٹر صاحب سائنس کورس لینا چاہتے تھے اس لئے مجبوراً علی گڑھ چھوڑ کر میور سنٹرل کالج الٰہ آباد میں داخل ہو گئے یہاں بھی انٹرمیڈیٹ اوّل درجہ میں نہایت امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور سرکاری وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ پھر علیگڑھ واپس آگئے اور ۱۸۹۵ء میں اعلیٰ ریاضی کورس سے کر بی اے درجہ اوّل میں پاس کیا اور ان کو اس کے صلہ میں سٹریچی میڈل دیا گیا۔

قومی ہمدردی کا جوش ان کے سینہ میں فطرت نے ودیعت کیا تھا چنانچہ اس کا مظاہرہ مختلف صورتوں میں طالب علمی ہی کے زمانے سے ہوتا رہتا تھا۔ چنانچہ میر ولایت حسین صاحب جو ان کے استاد تھے ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ:۔

> "ڈاکٹر صاحب نے بی اے کی تعلیم کے زمانے میں ہی نمایاں ہونا شروع کر دیا تھا وہ کھیلوں میں بھی شریک ہوتے تھے اور علیگڑھ کی دوسری تحریکوں مثلاً ڈیبیٹنگ سوسائٹی یا قیام مدارس کی تحریک میں حصہ لیتے تھے چنانچہ ان کی کوشش سے مارہرہ میں مدرسہ اسلامیہ اسکول قائم ہوا۔"

یہ قصبہ ایک قدیم مردم خیز بستی ہے جو کبھی مشرقی علوم کا گہوارہ تھا لیکن لوگوں کو جدید تعلیم سے نفرت تھی۔ یہاں کنبوہ اور سادات بلگرام کی آبادی نمایاں تھی۔ چونکہ علی گڑھ کے قریب واقع ہے ڈاکٹر صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک قرارداد کے بموجب یہاں کا تعلیمی سروے کیا اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے اپنے اعزا کو آمادہ کر کے یہاں ایک جدید مدرسہ قائم کرا دیا۔

بی اے کا امتحان دینے کے بعد ہی ڈاکٹر صاحب کا تقرر کالجیٹ اسکول میں بشاہرہ سولہ روپیہ ماہوار اسسٹنٹ ماسٹری پر تقرر ہو گیا۔ نتیجہ نکلنے کے بعد ان کو اسسٹنٹ پروفیسر ریاضی کی جگہ مل گئی جہاں پہلے چالیس روپیہ اور بعد کو ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ ہو گئی۔ مرحوم نے

بجٹ رپورٹ میں ان کے متعلق تحریر کیا کہ :-

"اگر وہ میتھمیٹکس میں ترقی پا گیا اور اپنے تئیں ایک اچھا پروفیسر ثابت کر گیا اور ہمارے کالج میں رہے گا تو جہاں تک ممکن ہے ہم اس کی ترقی کا خیال رکھیں گے۔"

اس زمانے میں بی اے پاس کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ معراج ترقی خیال کیا جاتا تھا۔ کالج کی طرف سے پرنسپل نے ڈاکٹر صاحب کا نام اس عہدہ کے لئے گورنمنٹ میں بھیج دیا اور زوردار سفارش کی۔ پرنسپل اور ان کے اہل خاندان تو چاہتے تھے کہ وہ ڈپٹی کلکٹر بنیں لیکن وہ خود اسے ناپسند کرتے تھے اور کالج ہی میں رہ کر قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے غرض بڑی رد و کد کے بعد سب کو ڈاکٹر صاحب ہی کی رائے سے متفق ہونا پڑا اور انہوں نے ڈپٹی کلکٹری سے اپنا نام واپس لے لیا۔ جب وہ کالج میں مستقل پروفیسر ہو گئے تو سر سید نے ایک معاہدہ کا مسودہ تیار کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ کم از کم پانچ سال کالج کی ملازمت ترک نہیں کر سکیں گے جب یہ مسودہ ڈاکٹر صاحب کو دیا گیا کہ اس پر دستخط کر دیں تو انہوں نے سر سید کی خدمت میں عرض کیا کہ میرا مقصد تو اپنی پوری زندگی علیگڑھ میں صرف کرنے کا ہے۔ معاہدہ کی پابندی کو میں عار سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں کسی معاہدہ کی بنا پر قومی خدمت نہیں کرنی چاہئے بلکہ خود اپنے دل کے تقاضے سے یہ اہم کام انجام دینا چاہئے۔ سر سید پر اس جواب کا ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے فوراً اسی وقت معاہدہ کا مسودہ چاک کر دیا اور کہا کہ جاؤ کام کرو۔ ڈاکٹر صاحب کالج کی چاروں جماعتوں کو ریاضی پڑھاتے تھے۔ سنہ ۱۸۹۵ء کی بجٹ رپورٹ میں سر سید نے ان کے متعلق لکھا کہ :-

"جو ٹرسٹی کہ روزمرہ کالج کے حالات دیکھتے ہیں وہ بخوبی واقف ہوں گے کہ ضیاء الدین احمد کے کالج میں ہونے سے طالب علموں کو کس قدر علمی شوق بڑھتا جاتا ہے اور اس کا اس کالج میں رہنا طالب علموں کی ترقی تعلیم کے لئے کس قدر مفید ہے۔ بالفعل یہ امر پیش آیا ہے کہ پرنسپل صاحب نے حسب قاعدہ دو طالب علموں کا نام ڈپٹی کلکٹری کے گورنمنٹ میں بھیجا ہے جن میں ایک ضیاء الدین احمد ہے اگرچہ اس کے دوستوں نے بہت ترغیب دی مگر خود ضیاء الدین احمد نے علمی شوق سے ڈپٹی کلکٹری کے منصب سے علمی ترقی اور ہمارے کالج میں رہنے کو پسند کیا اور پرنسپل کو اطلاع کی کہ گورنمنٹ میں رپورٹ کر کے اس کا نام ڈپٹی کلکٹری سے خارج کرا دیا جائے پس ایسی حالت میں ضیاء الدین احمد ٹرسٹیوں کی توجہ کا بلحاظ قومی ترقی و تعلیم کس قدر مستحق ہے اور جب موقع ملے گا ٹرسٹی ضرور اس کی ترقی پر توجہ فرمائیں گے۔"

اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ میں منطق کا مضمون لازمی تھا مگر پروفیسر آرنلڈ جو اس مضمون کو پڑھایا کرتے تھے مستعفی ہو کر لاہور چلے گئے تھے ان کے اور مضامین تو مختلف پروفیسروں میں تقسیم کر دیئے گئے لیکن اس مضمون کو کوئی پڑھانے پر آمادہ نہ ہوا۔ بجٹ میں جدید تقرر کی گنجائش نہ تھی اس لئے ایک سخت قسم کا تردد تھا اس موقع پر ڈاکٹر صاحب آگے بڑھے اگرچہ انہوں نے خود یہ مضمون نہ پڑھا تھا لیکن اس بار گراں کو اپنے ذمہ لے لیا۔ مطالعہ کے بعد پہلے نوٹ تیار کرتے اور پھر لیکچر دیتے تھے اور بقول میر ولایت حسین "ایسی پڑھائی کہ امتحان یونیورسٹی میں اعلیٰ نمبروں سے طلبا پاس ہوئے" اور اس سال یونیورسٹی ممتحن کی رپورٹ یہ تھی کہ منطق کی تعلیم علیگڑھ میں بہترین ہوتی ہے۔

مسلمان طلبا عموماً ریاضی سے خائف رہتے تھے اور اسی لئے انجینئری وغیرہ کی تعلیم سے انہیں واسطہ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے علاوہ اپنے فرائض منصبی کے یہ انتظام کیا کہ طلباء کی باقاعدہ تربیت و تعلیم کی جانے لگی اور وہ رڑکی انجینئرنگ کالج و نیز محکمہ جنگلات کے مقابلہ کے امتحانوں میں شریک ہونے لگے۔ انہوں نے اس کام کے لئے مساحت پر ایک کتاب بھی لکھ ڈالی۔ علاوہ ازیں امتحان کے قریب گھر پر پڑھایا کرتے تھے اور ہفتہ میں دو مرتبہ عموماً ان کے گھر رات کو ایک جلسہ ہوا کرتا تھا اور باتوں باتوں میں وہ مشکل سے مشکل مسائل ریاضی اپنے طلباء کے ذہن نشین کر دیا کرتے تھے۔ اس قسم کے غیر معمولی کاموں کا انہوں نے کبھی کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔

سرسید کی وفات کے بعد سرسید میموریل فنڈ کی بنا ڈالی گئی اور محمڈن یونیورسٹی کی تحریک شروع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں جس ایثار اور انہماک سے کام کیا اسے جاننے کے لئے محسن الملک کی تقریر کا اقتباس کافی ہے۔ نواب صاحب نے کہا کہ:

> سرسید کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں ہو لیکن تیرہ سال تک کسی قسم کی کامیابی نہ ہوئی۔ آخر یہ قرار پایا کہ خاص آدمی کلکتہ بھیجا جائے۔ پروفیسر ضیاءالدین احمد مسلمانوں پر جان دینے والا ایک شخص ہے جس کو ڈپٹی کلکٹری ملتی تھی لیکن اس نے محض قومی بھلائی کے خیال سے اس نوکری کو منظور نہیں کیا اور کالج میں سو روپیہ کی نوکری کر لی اور اس قلیل تنخواہ پر پڑا ہوا ہے اگر وہ ڈپٹی کلکٹر ہوتا تو اس وقت پانچ سو کی تنخواہ ہو جاتی۔ غرضیکہ ضیاءالدین آمادہ ہوئے کہ میں کلکتہ جاتا ہوں چنانچہ وہ تین ہفتہ تک برابر کلکتہ پڑے رہے کل خرچ اپنا کیا اور ایک حبہ کسی سے خرچ کے واسطے کالج یا کانفرنس سے نہیں لیا۔ اس ہمدرد قوم نے وہاں جاکر میموریل فنڈ کے لئے کوشش شروع کر دی لیکن وہاں یہ دشواری پیش آئی کہ کلکتہ میں سربرآوردہ مسلمانوں کی مختلف پارٹیاں ہیں ایک گروہ کی کوشش جو قومی بھلائی کے لئے کی جاتی ہے دوسرا گروہ اس لئے اس کو توڑنے کی فکر کرتا ہے کہ ہمارے فریق مخالف کی نیکنامی نہ ہو جائے۔ بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست۔ مسلمانوں کی باہمی نااتفاقی وہاں بھی موجود ہے لیکن پروفیسر ضیاءالدین احمد کے تین ہفتہ قیام کا نتیجہ ہوا کہ سرسید میموریل فنڈ کے چندہ کے لئے کمیٹی کی بنا پڑی اور وہاں کے سربرآوردہ اصحاب نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو مدعو کرنے کی رائے دی غرض ۱۸۹۹ء میں کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ لفٹنٹ گورنر تک نے اس جلسے میں شرکت کی اور مادی و اخلاقی لحاظ سے یہ اجلاس نہایت کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہوا۔“

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی تحریک سے کالج میں انجمن القرض (ڈیوٹی سوسائٹی) قائم ہوئی تھی جس کا کام غریب طلبا کی امداد کے لئے روپیہ جمع کرنا تھا۔ طلبا اپنے تعطیل کے زمانے میں انفرادی طور پر جمع کرتے تھے اور انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو رغبت دلاتے تھے اس انفرادی دریوزہ گری سے مالی حالت میں تو کچھ ترقی ہو جاتی تھی مگر اصل مقصد میں کامیابی نہ ہوتی تھی یعنی مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کا ذہن نشین کرنا اور مسلمانوں کے خیالات کالج کی طرف سے درست کرنا۔ جس سال ڈاکٹر صاحب انجمن کے نائب امین مقرر ہوئے تو انہوں نے بجائے انفرادی کوشش کے طلبا کو مختلف مقامات پر وفد کی صورت میں روانہ کیا، تاکہ وہ بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں جلسے کریں اور کالج کے متعلق تقاریر کے ذریعے لوگوں پر ضرورت اور اہمیت کا اظہار کریں۔ اس سلسلے میں وہ اچھے لڑکوں کی تقریر کرنے کی صلاحیت کو تربیت کرکے ابھارتے تھے اور اچھے مقررین کے لئے انعام بھی مقرر کرتے تھے۔ ان وفود کا یہ نتیجہ نکلا کہ جہاں آٹھ سال میں ۱۸۹۶ء تک انجمن کو قریب پانچ ہزار روپیہ کے ملا تھا وہاں پانچ سال میں یعنی ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۲ء تک قریباً اکیس ہزار وصول ہوا۔ وہ انجمن سے بیس سال تک متعلق رہے۔ اس عہد میں انجمن کو تین لاکھ تریپن ہزار کی آمدنی ہوئی۔ انہوں نے اپنی آخری رپورٹ میں لکھا تھا کہ:

> ”ڈیوٹی کا فرض ہے کہ وہ اس قدر سرمایہ جمع کرے جس سے مستقل طور پر کم از کم ایک ہزار طالب علم بلا کسی قسم کا خرچ کئے ہوئے تعلیم پا سکیں ورنہ خوف ہے کہ مسلمان پورے طور پر اس مجوزہ محمڈن یونیورسٹی سے فائدہ اٹھانے سے معذور رہیں گے۔“

وہ نادار اور ہونہار طلبا کی امداد کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں سوچتے رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بار بار پرنسپل اور کارکنان کالج پر زور دیا کہ نادار طلبا کو تعلیم اور اقامت کے اخراجات میں رعایت ملنی چاہئے چنانچہ ان کی مساعی بار آور ہوئیں اور وہ واجبی شرح جاری ہو گئی بی اے کا کل خرچ دس روپیہ ماہوار اور ایف اے کا نو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا گیا۔ تنخواہ کی کمی کے باعث اساتذہ مشکل سے ملتے تھے۔

لہٰذا ڈاکٹر صاحب کی کوشش سے یہ طے پایا کہ جو اساتذہ ہاسٹل میں رہنا پسند کریں ان سے صرف پانچ روپیہ ماہانہ لیا جائے۔

(۲)

ڈاکٹر صاحب نے باوجود کثیر مشاغل و فرائض منصبی کے ۱۸۹۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے اور ۱۸۹۹ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور ۱۹۰۱ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ڈی ایس سی اوّل درجہ میں پاس کیا۔ مسٹر ماریسن پرنسپل نے اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھا کہ:

"امتحانات یونیورسٹی کا ایک نتیجہ علی گڑھ میں نہایت اطمینان کا باعث ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ پروفیسر ضیاء الدین احمد نے ڈی ایس سی کا امتحان اوّل ڈویژن میں پاس کیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے کالج اور مسلمانوں کی قوم کے متعلق اس قدر کثیر فرائض اپنے ذمے لے رکھے ہیں کہ اس بات کا سمجھنا مشکل ہے کہ انہوں نے اپنے پرائیویٹ مطالعہ کے لئے کب وقت نکالا ہوگا لیکن انہوں نے ایسے طریقے میں یہ وقت نکال لیا کہ وہ یونیورسٹی الٰہ آباد کی تعریف و توصیف کے مستحق ہوئے ہم یقیناً اس بات کی امید کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کیمبرج میں تحصیل علوم کے لئے عنقریب انگلستان کے واسطے روانہ ہو سکیں گے اور اگرچہ علی گڑھ کی سوسائٹی کو ان کے چلے جانے سے نقصان پہنچے گا تاہم ہم میں ہر شخص اس بات کے خیال سے خوش ہوگا کہ ان کو موقع ملے گا کہ انگلستان جا کر اپنی اعلیٰ قابلیتوں کو اوّل درجہ کے مہندسین کی نگرانی میں اصلی علمی تحقیقاتوں میں صرف کریں اور جب کہ کیمبرج میں تین برس تعلیم پا کر کالج کو واپس آویں گے تو ہمارے ٹیچنگ اسٹاف کو بڑا استحکام حاصل ہوگا۔"

حکومت نے اعلیٰ تعلیم کے لئے ڈاکٹر صاحب کو وظیفہ دیا ان ہی دنوں سر آغا خاں نے تین ہزار روپیہ سالانہ کالج کے لئے منظور کئے لیکن اس رقم میں سے نصف ڈاکٹر صاحب کے لئے مخصوص کر دی تاکہ وہ یورپ میں زیادہ عرصہ رہ کر مزید قابلیت حاصل کر سکیں۔ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں ڈاکٹر صاحب نے ٹرنٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لیا اور وہاں سے ریاضی آنرز میں ڈگری حاصل کی تمام پاس شدہ امیدواروں میں ان کا نمبر اوّل تھا۔ ۱۹۰۴ء میں انہیں سر آئزک نیوٹن اسکالرشپ ملا وہ پہلے ہندوستانی تھے جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔ کیمبرج میں انہوں نے سید علی بلگرامی کی سرپرستی میں ایک مسلم سوسائٹی قائم کی جہاں ہفتے میں دو بار کسی مشہور مسلمان کی زندگی اور کارناموں پر مضامین پڑھے جاتے تھے۔

ٹرنٹی کالج میں ایک لطیفہ یہ ہوا کہ جتنی بڑی داڑھی ڈاکٹر صاحب کی تھی اتنی ہی ان کے ٹیوٹر کی تھی۔ ایک دن ٹیوٹر نے کہا کہ بڑی دلچسپ اور مضحکہ خیز بات ہے کہ یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارا ٹیوٹر ہوں یا تم میرے ٹیوٹر ہو۔ ٹیوٹر کا منشا معلوم کر کے ڈاکٹر صاحب نے اپنے ٹیوٹر کی خاطر داڑھی منڈوا دی لیکن وہاں سے فارغ ہونے کے بعد پھر رکھ لی جو آخر وقت تک رہی۔ دوسری عجیب بات اس دور کی یہ ہے کہ وہ حسب عادت عموماً امتحان سے قبل رات گئے تک مطالعہ میں مصروف رہا کرتے تھے اور جب سونے کا ارادہ کرتے تب بھی ریاضی کے مسائل دماغ میں گھومتے رہتے اور نیند نہ آتی۔ جب دو ہفتے اسی طرح گزر گئے تو انہوں نے اپنے ٹیوٹر کے مشورہ سے ایک ماہر ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا اس نے خوب معائنہ کرنے کے بعد رائے دی کہ فوراً ہندوستان واپس چلے جاؤ ورنہ دماغ خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ سن کر واپس چلے آئے اور اپنی قوت ارادی سے علاج شروع کیا اور یہ مشق بہم پہنچائی کہ جیسے ہی کتاب بند کرتے تمام مسائل دماغ سے خارج ہو جاتے اور خالی الذہن ہو کر سو جاتے اور جب کتاب کھولتے تو تمام مسائل پھر دماغ میں آ جاتے۔ جب کئی ہفتے اس کی مشق کر لی تو پھر اسی ڈاکٹر سے جا کر ملاقات کی اس نے پھر معائنہ کیا اور کہا اب حالت درست ہے ہندوستان جانے کی ضرورت نہیں۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ کس طرح ڈاکٹر صاحب نے خود علاج کیا تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ قوت ارادی کا کرشمہ آخر وقت تک رہا۔ جب چاہتے اور جتنے وقت کے لئے چاہتے سو جایا کرتے تھے اور بروقت بیدار ہو جاتے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے گوٹنجن یونیورسٹی

جرمنی سے ہیئت میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی بعد ازاں پیرس اور اٹلی کی یونیورسٹیوں میں کچھ عرصہ مخصوص علوم کے ماہرین کے لکچروں کو سنا اور درس لیا۔ ان کی کامیابیوں کی اطلاع میں ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوتی رہتی تھیں اور اب ان کی واپسی کا زمانہ قریب آیا تھا حسن اتفاق سے ان کے کیمبرج کے ٹیوٹر ہندوستان میں محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر مقرر ہو گئے تھے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو ترغیب دی کہ وہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر کا عہدہ قبول کریں لیکن ڈاکٹر صاحب نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ڈائرکٹر تعلیمات یو۔ پی نے انسپکٹر مدارس کا عہدہ جس کا مشاہرہ ساڑھے سات سو سے شروع ہوتا تھا پیش کیا لیکن انہوں نے اسے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور نواب محسن الملک کو خط میں لکھا کہ :۔

> "موجودہ اور آئندہ ہر قسم کی ملازمت کے لئے میری طرف سے آپ جو جواب دیں گے وہی میرا جواب ہوگا۔ . . . . . آج مسٹر ڈی لا فوس ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کا باضابطہ خط میرے پاس پہنچا ہے جس میں انہوں نے بدلائل میرے انسپکٹری قبول کرنے پر زور دیا ہے۔ میں نے بھی بدلائل اس سے انکار کر دیا ہے۔"

سنہ ۱۹۰۶ء کے اواخر میں ڈاکٹر صاحب یورپ سے واپس ہوتے راستے میں مصر میں قیام کیا۔ یہاں جامعہ ازہر میں طلبائے ہیئت سے درس لیا اور وہاں کے اخباروں میں ہندوستان یورپ اور مصر کی تعلیم پر کئی بصیرت افروز مضامین شائع کئے۔ ایک مضمون میں لکھا کہ :۔

> مجھ کو جا بجا اسلامی ممالک کے اہل علم سے اور دیگر اکابرین سے ملاقات کے مواقع حاصل ہوئے ان سے جو گفتگو ہوئی اس سے میں اس یقینی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس وقت مسلمانان ہند دیگر ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور اگر دنیا کے مسلمان کسی وقت ترقی کریں گے تو مسلمانان ہند ہی اس ترقی کا باعث ہوں گے اور علیگڑھ اس ترقی کا مرکز ہوگا۔

(۳)

اواخر ۱۹۰۶ء میں ڈاکٹر صاحب نے وطن کی طرف مراجعت کی اور ۱۸ دسمبر کو براہ راست علی گڑھ پہنچے۔ نواب محسن الملک، پرنسپل اور اساتذہ و طلبا نے پرجوش استقبال کیا اور جس گاڑی میں وہ سوار ہوئے اس کے گھوڑے کھول دئے گئے اور طلبا نے گاڑی کو کھینچ کر نواب محسن الملک کی کوٹھی تک پہنچایا۔ اب انہوں نے پروفیسر ریاضی کی حیثیت سے بڑے جوش و خروش و سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد الٰہ آباد یونیورسٹی کی پروفیسری انہیں پیش کی گئی جس کا مشاہرہ علیگڑھ کی نسبت تقریباً دوگنا تھا مگر انہوں نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے مصر میں متعدد پبلک لکچر تعلیم پر دئے تھے۔ تقاریر کے دوران میں انہوں نے مصریوں کو مشورہ دیا تھا کہ ان کی پسماندگی کا سبب برطانوی پالیسی ہے اور اس پالیسی پر انہوں نے سخت نکتہ چینی کی تھی مصریوں کو یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی جائے اسی پر ملک کی ترقی کا دارومدار ہے۔ ان کے یہ خیالات برٹش ہائی کمشنر مقیم مصر کو ناگوار گزرے اور انہوں نے دوران ملاقات میں ان کی تقاریر پر اعتراض کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے صاف طور پر کہہ دیا کہ میں اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہوں۔ یہ سب معاملات وائسرائے ہند کو واضح کر دئے گئے اور برطانیہ سے ہدایات جاری ہوئیں کہ ضیاء الدین کی خاص طور پر نگرانی کی جائے۔ اس کے خیالات باغیانہ ہیں۔

چنانچہ جب وہ ہندوستان واپس آئے تو یہاں کے حالات کا معائنہ کرنے کے بعد انہیں اپنے خیالات میں ترمیم کرنی پڑی۔ تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو سیاسی ترقی کا موقع ملا تھا۔ شملہ ڈیپوٹیشن کے نتائج کا انتظار تھا۔ لہٰذا مسلمان حکومت سے کسی طرح بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے بھی نواب محسن الملک کے مشورہ سے مصلحت وقت کا تقاضا دیکھتے ہوئے اپنی زبان بند رکھی۔ لیکن باوجود اس کے تین سال تک خفیہ پولیس ان کی نگرانی کرتی رہی۔ ان کے مکان سے تمام وہ تعلیمی لٹریچر جو وہ یورپ اور مصر سے لائے تھے۔ چوری کرا لیا گیا۔ خفیہ پولیس کے اس افسر نے جو ان کا نگراں تھا ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب سے اس چوری کا اقرار کیا۔

ڈاکٹر صاحب ان پروفیسروں میں نہ تھے کہ جن کی سرگرمیاں صرف کلاس روم تک محدود رہتی ہیں۔ انہوں نے اپنے یورپ کے تجربہ اور علم کی بنا پر ایجوکیشنل کانفرنس میں ابتدائی تعلیم کی اصلاحات سے متعلق ایک اسکیم پیش کی۔ انہوں نے تجویز کیا کہ میڈیم قائم کیا جائے اور اس کے ذریعہ بچوں کو تعلیم دی جائے علاوہ ازیں ایسے بڑی عمر کے لوگ جن کی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے اور جو تعلیم کے شائق ہوں ان کے لئے شبینہ میں لیکچروں کا پروگرام مرتب کیا جائے۔ ابتدائی تعلیم مادری زبان ہی میں ہو اور عربی مدارس میں فارسی بھی اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جائے۔ تاریخ اسلام بھی ایک الگ مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے۔ انہوں نے خود علی گڑھ میں میڈیم اور کنڈر گارٹن اسکول قائم کیا۔ انہوں نے ایک اسکیم ایسی بھی تیار کی جس میں مذہبی تعلیم بچوں کو کنڈر گارٹن کے اصول پر دی جا سکتی تھی۔ کالج کے طلبا میں تعلیمی نقطہ نگاہ سے مل جل کر بحث و مباحثہ کا جذبہ پیدا کیا اور اس طرح ایسے اسکالرشپ ہر سال ہونے لگے۔ انہوں نے یہ بھی تحریک کی کہ علی گڑھ میں ایک اولڈ بوائز کالونی قائم کی جائے تاکہ وہ لوگ مادر علمی کی خدمت کر سکیں چنانچہ اکثر نے علی گڑھ میں مکانات بنا کر سکونت اختیار کر لی۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں جنگ طرابلس اور پھر جنگ بلقان چھڑ گئی ترکوں کی امداد کے لئے ایک کمیٹی کالج میں قائم ہوئی جس کے صدر ڈاکٹر صاحب تھے۔ لڑکوں نے عمدہ کھانا اور عمدہ پہننا ترک کر دیا اس سے جو بچت ہوئی وہ ترکی فنڈ میں دے دی گئی۔ ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن کو بھی بڑی امداد ملی اور کچھ طلبا نے اپنی خدمات پیش کیں۔ غرض ترکی امدادی فنڈ میں طلبا نے قریباً ۵۰ ہزار روپیہ بھیج دیا۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی۔ طلبائے علی گڑھ میں ترکوں سے ہمدردی اور سیاسی بیداری کا جذبہ زوروں پر تھا۔ حکومت ہند اس طرف سے خائف تھی لیکن نظم و ضبط قائم رہا۔ طلبا نے امپیریل ریلیف فنڈ کے لئے چندہ بھی جمع کیا اور ایمبولینس کور میں بھی خدمات انجام دیں۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں حکومت ہند نے کلکتہ یونیورسٹی کی تحقیقات کے لئے سیڈلر کمیشن مقرر کیا اس کا ایک ممبر ڈاکٹر صاحب کو بھی مقرر کیا گیا چنانچہ دو سال تک ڈاکٹر صاحب علی گڑھ سے الگ رہے اور کمیشن کے کام میں منہمک رہے۔ میٹرک میں مسلمان طلبا کی ناکامی کے پست ترین اعداد و شمار سے انہیں شبہ ہوا اور انہوں نے تحقیقات شروع کی۔ بنگال بھر کے مختلف مراکز امتحان کی کاپیاں منگا کر خود جانچا تو انہیں یقین ہو گیا کہ مسلمان طلبا ہندو متعصب ممتحنوں کا شکار ہوتے ہیں اور انہیں قصداً فیل کیا جاتا ہے کیونکہ اس زمانے میں طلبا امتحانوں کی کاپیوں پر نام لکھا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی سفارش پر نام کے بجائے رول نمبر لکھے جانے لگے۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں کالج کے اندرونی خلفشار کے باعث انگریز پرنسپل اور اس کے ساتھ انگریز اساتذہ نے ملازمت سے استعفا دے دیئے جو منظور کر لئے گئے۔ اور جنوری سنہ ۱۹۱۹ء سے ڈاکٹر صاحب کا تقرر پرنسپل کے عہدہ پر ہوا۔

(۴)

کچھ عرصہ سے کالج کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ بجٹ کی حالت متزلزل تھی۔ انگریز اساتذہ کے چلے جانے سے حکام ضلع اور محکمہ تعلیم ناراض تھا۔ ادھر کالج کے ٹرسٹیوں اور اولڈ بوائز میں معرکہ آرائیاں ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں ڈاکٹر صاحب نے پرنسپلی کا چارج لیا۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مئی سنہ ۱۹۱۹ء میں کالج تعطیلات کے لئے بند ہوا تو تعداد طلبا صرف ۱۸۰ رہ گئی تھی۔ حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ ۱۲ سو سے زاید طلبا تھے جن میں قریباً ایک ہزار بورڈر تھے۔

حالانکہ ڈاکٹر صاحب کا تقرر مشروط ہوا تھا کہ جب تک انگریز پرنسپل نہ ملے کام کریں۔ لیکن انہوں نے نہایت سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے حکومت کے حکام کی خوشنودی ضروری تھی تاکہ الحاق فسخ کرنے کی دھمکیاں اور گرانٹ بند کرنے کا خوف دور ہو سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے گورنر صوبہ کو دعوت دی اور انہوں نے کالج کا معائنہ کر کے نہایت عمدہ خیالات کا اظہار کیا اور ایک ہزار اپنی جیب خاص سے عنایت فرمایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کی سالانہ آمدنی بحال ہو گئی۔ مرکزی حکومت کی گرانٹ کا روپیہ رکا ہوا تھا وہ اضافہ کے ساتھ وصول ہوا۔ کالج میں بیداری کا نقشہ

قائم کیا گیا۔ چنانچہ اس سال کی رپورٹ میں کالج کے آنریری سیکرٹری نے لکھا کہ:۔

"جب میں سیکرٹری ہوا تو کالج میں خطرہ کا زمانہ تھا تمام یورپین اسٹاف فوجی معاملات میں جا چکا تھا .... گزشتہ چند برسوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کالج تنزل کر رہا ہے پبلک میں یہ احساس تھا کہ گورنمنٹ اب اس کو نظر التفات سے نہیں دیکھتی جیسے کہ زمانہ سابق میں دیکھتی تھی چنانچہ اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعداد طلبا میں کمی ہوتی گئی جب یکم مئی سنہ ۱۹۱۹ء کو کالج بند ہوا تو تعداد طلبا (۱۸۱) تھی کیونکہ اور طلبا امتحان دے کر جا چکے تھے کالج دوبارہ یکم اگست کو کھلا اور (۶۰۰) نئے داخلے ہوئے فروری سنہ ۱۹۲۰ء میں (۷۹۷) تک تعداد پہنچی جس میں (۶۲۰) بورڈر تھے۔ یہ اضافہ بڑی حد تک ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی ذاتی کوشش کا نتیجہ تھا۔ ساتھ ہی انجمن الفرض نے زیادہ مقدار میں قرضہ دیا۔ رعایتی شرح بھی جاری کی گئی اور (۱۵۰) طلبا اس شرح پر داخل ہوئے"

ٹرسٹیوں اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے ڈاکٹر صاحب کی خدمات کے اعتراف میں قراردادیں منظور کیں۔

کالج کی حالت کو پوری طرح سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ترک موالات کا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور کالج پر حملہ ہوا۔ یہ ایک سخت مصیبت کا وقت تھا ڈاکٹر صاحب جو کبھی لڑائی لڑ رہے تھے کالج اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ وہ رات دن کام کرتے تھے کبھی جلسے ہو رہے ہیں کبھی حکام سے مل رہے ہیں کبھی طلبا کے سرپرستوں کو خطوط لکھے جا رہے ہیں اپنے کارکنوں کو مختلف کاموں میں لگائے رہتے تھے۔ انہوں نے اول تو مولانا شوکت علی سے اگست ہی میں وعدہ لے لیا کہ علیگڑھ کو محفوظ رکھا جائے گا پھر جب اکتوبر میں علما آ پہنچے تو گاندھی جی کو یاد دلایا کہ آپ نے فروری ہی میں وعدہ کیا تھا کہ طلبا کو ہدایت کریں گے کہ ملکی سیاست میں حصہ نہ لیں انہوں نے جواب دیا ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ اور ترکی شرائط صلح نے میری رائے پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مولانا محمد علی سے انہوں نے کہا قومی یونیورسٹی کی اسکیم کو میں اس شرط پر جاری کرنے کو تیار ہوں کہ کل قوائے ہندوستان کے ماہرین تعلیم منظور کریں اور آپ علیگڑھ کالج کو چھوڑ دیں انہوں نے کہا ہم تو حکومت سے کسی قسم کا بھی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی رات دن کی مساعی اور دوڑ دھوپ کی بدولت ۹۹۰ بورڈروں میں سے ۳۰۴ باقاعدہ پرنسپل سے اجازت لے کر گھروں کو روانہ ہو گئے۔ قومی یونیورسٹی کے لئے صرف ۱۰۰ طلبا رہ گئے۔ غرض ڈاکٹر صاحب نے نہ تو اسٹرائک کی نوبت آنے دی اور نہ کوئی تصادم ہی پیش آیا۔ انہوں نے زیادہ تر بار اولڈ بوائز پر ڈال دیا۔ تحریک کے مخالف علما سے تقریریں کرائیں۔ اشتعال انگیز باتوں سے قطعی پرہیز کیا۔ غرض اسی طرح ۲۹ اکتوبر کو کالج بند کر دیا گیا۔ جب دسمبر میں کالج کھلا تو وہ ترقی کر کے مسلم یونیورسٹی ہو گیا تھا۔ غرض ڈاکٹر صاحب کی دلیری، ہمت اور حسن تدبیر نے میدان مار لیا۔ یونیورسٹی کا دستور اساسی ڈاکٹر صاحب ہی کا تیار کیا ہوا تھا۔

(۵)

یکم دسمبر سنہ ۱۹۲۰ء کو ایک ناقص ایکٹ کے ذریعہ مسلم یونیورسٹی کا وجود عمل میں آیا۔ وائس چانسلر مہاراجہ صاحب محمود آباد نامزد کئے گئے۔ اور حکومت نے کورٹ کی تشکیل تک مکمل اختیارات مہاراجہ صاحب کو سونپ دئے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے سخت مخالف تھے انہوں نے ان کی پرنسپلی کے تقرر پر بھی مخالفت کی تھی۔ اور اب یہ وائس چانسلر کے عہدے کے لئے وہ کسی انگریز کے متلاشی تھے اس وقت نہ کوئی انگریز اس بار کو اٹھانے کے لئے تیار تھا اور نہ کوئی مسلمان بھروسے کا مل سکا جو تمام حالات پر قابو پا سکے۔ مجبوراً ڈاکٹر صاحب ہی پرو وائس چانسلر بنا دیئے گئے۔ لیکن ہر معاملہ اور ہر کام میں مہاراجہ صاحب روڑے اٹکاتے تھے۔ اختیارات سب ان کے ہاتھ میں تھے اور وہ علیگڑھ سے اکثر غیر حاضر رہتے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذمہ داریاں بے شمار لیکن اختیار کچھ بھی نہیں مگر ڈاکٹر صاحب جو علیگڑھ کی خدمت میں دھن کے پکے تھے ڈٹے رہے اور بقول میر ولایت حسین صاحب وہ ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی کے کام میں اپنے تعلیمی تجربہ اور اپنے اسٹاف کی مدد سے راجہ صاحب کو

زک دیتے رہے۔

مہاراجہ صاحب محمود آباد چونکہ یوپی گورنمنٹ میں ہوم ممبر بھی تھے۔ انہیں مجبوراً وائس چانسلری سے استعفا دینا پڑا۔ کچھ دن نواب مزمل اللہ خان نے کام کیا لیکن دسمبر ۱۹۲۳ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر منتخب ہو گئے۔ اس انتخاب سے پہلے مہاراجہ صاحب نے صاحبزادہ صاحب کو ڈاکٹر صاحب کی طرف سے بدگمان کر دیا تھا چنانچہ انہوں نے بھی تعلیمی انتظام میں جس کی ذمہ داری ڈاکٹر صاحب پر تھی مداخلت شروع کر دی اور ایک ناگوار صورت پیدا ہو گئی۔ ان حالات سے مجبور ہو کر ڈاکٹر صاحب نے سولہ ماہ تک صبر و سکون سے حالات کا مقابلہ کرنے کے بعد استعفا دے دیا۔ ادھر یونیورسٹی کا جشن جوبلی ہونے والا تھا اور صاحبزادہ صاحب یہ مزید جانتے تھے کہ بغیر ڈاکٹر صاحب کے کام چلنا ناممکن ہے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے خط کے جواب میں ایک طویل خط لکھا اور آخر میں یہ تحریر کیا کہ:

> "ہمارے ادارے کی کامیابی ہر حالت میں اس امر کی متقضی ہے کہ اس کو ان ریگولیشنوں کے ماتحت چلایا جائے جو تیار ہو رہے ہیں ..... اور اس معاملہ میں آپ کا اور صرف آپ کا تجربہ اور اثر نہایت ضروری ہو گا .... جوبلی کی کامیابی کا اثر قوم کی سیاسی تنظیم پر بہت گہرا پڑے گا .... آپ کا علیحدہ ہو کر ایسے موقع پر چھوڑنا ہماری امیدوں کے مخالف اور قومی مفاد کے خلاف ہو گا .... میں آپ کا چھٹی تک پر جانا پسند نہیں کرتا لہٰذا آپ کا اشارہ جو استعفے کے متعلق ہے اس کو میں کبھی بھی خوش آمدید نہیں کہہ سکتا۔"

الغرض بڑی ردوقدح کے بعد ڈاکٹر صاحب نے استعفا واپس لے لیا اور جوبلی کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ ۲۵ دسمبر سے ۳۰ دسمبر ۱۹۲۵ء تک یہ تقریب جاری رہی۔ مسلم لیگ اور دیگر مختلف مسلم اداروں کے اجلاس بھی ہوئے۔ ہر مکتبۂ خیال کے مختلف زعما ایک جگہ جمع ہو گئے اور سات ہزار مسلمانوں کا ایک مرکز پر جمع ہو جانا حیرت انگیز امر تھا۔ ان ہی دنوں ہندو مسلم مناقشات کو ختم کرنے کا واحد حل ایک پمفلٹ کے ذریعہ تقسیم ملک کو بتایا گیا تھا۔ یہ پمفلٹ اگرچہ گاندھی جی کے نام کھلا خط کے نام سے پہلے شائع ہو چکا تھا لیکن اسے اس موقع پر دوبارہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا جس میں ملک کی مکمل تقسیم کی ایک اسکیم درج تھی۔ جوبلی کا یہ اہتمام و شان ڈاکٹر صاحب کی قوت تنظیم اور طلبا و اساتذہ کے اتحاد و ایثار اور جذبہ و جوش کا مظاہرہ تھا۔

مسلمانوں کا یہ اجتماع و جوش معاندین کو ایک آنکھ نہ بھایا اور اب یونیورسٹی کے خلاف معیار قابلیت اور نامناسب نتائج کے متعلق پروپیگنڈا شروع ہوا۔ اس میں سررشتۂ تعلیم کا انگریز ڈائرکٹر میکنزی اور یوپی کا مشہور ہندو اخباری لیڈر شریک تھے۔ اس سلسلے میں صاحبزادہ صاحب کی بعض تقاریر کو جو انہوں نے یونیورسٹی کی اندرونی بدنظمی کے متعلق مہاراجہ صاحب محمود آباد کو بدگمان کر دینے کی بنا پر کی تھیں بنیاد ٹھہرایا گیا۔ غرض صاحبزادہ صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے نظریات میں اختلافات بڑھتے ہی گئے۔ ان اختلافات کو ایک طرف تو ہوا دینے والے چند خود غرض علیگڑھ ہی میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ یہ اختلافات تو یوں ختم ہوئے کہ صاحبزادہ صاحب میدان سے ہٹ گئے اور دسمبر ۱۹۲۶ء میں ان کی میعاد ختم ہونے پر سر ولیم میرس گورنر یوپی کے ایما سے نواب سر مزمل اللہ خان کا انتخاب ہو گیا۔

لیکن جشن جوبلی میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہونا قائد اعظم اور دیگر زعما کا وہاں آنا صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا سوراج کی قرارداد کی تائید کرنا یہ سب امور ایسے تھے کہ صوبے کے متعصب گورنر کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے وہ نہیں چاہتا تھا کہ مسلم طلبا میں سیاسی بیداری پیدا ہو وہ چاہتا تھا کہ تعداد طلبا محدود ہو اور اساتذہ میں انگریزوں کی اکثریت ہو چنانچہ اس نے ۱۹۲۸ء میں اپنی تقریر کے دوران جب کہ سپاس نامہ کا جواب دے رہا تھا صاف طور پر کہا کہ یونیورسٹی کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ آپ سرسید کے نصب العین کی طرف لوٹ جائیں

اور وائسرائے نے بھی ایک تقریر میں کہا کہ:

"جو مسائل درپیش ہوں گے ان کے حل کرنے کے لئے آپ سر سید کے قائم کردہ اصولوں کو رہبر بنائیں گے۔"

یونیورسٹی کی تاسیس کے دور میں یو پی گورنمنٹ کے وزیر تعلیم مسٹر چنتامنی تھے جو ایک متعصب ہندو تھے ان کا رویہ ہمیشہ غیر ہمدردانہ رہا ان کا آوردہ سررشتہ تعلیم کا ڈائرکٹر میکنزی تھا اسے نہ صرف یونیورسٹی سے بلکہ خاص طور پر ڈاکٹر صاحب سے پرخاش تھی کیونکہ صوبہ کی کونسل میں ڈاکٹر صاحب ہی ایک ماہر تعلیم تھے جو میکنزی کی تعلیمی پالیسی پر شدید نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ اس نے مخالفت شروع کی اور چنتامنی کا اخبار لیڈر یونیورسٹی اور ڈاکٹر صاحب کے خلاف مضامین شائع کرتا تھا۔ ادھر صاحبزادہ صاحب نے یونیورسٹی سے الگ ہوتے ہی ایک پمفلٹ یونیورسٹی کے انتظامات کے خلاف شائع کر دیا۔

ان حالات میں وائسرائے نے بیگم صاحبہ بھوپال کو جو یونیورسٹی کی چانسلر تھیں اور ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کرنے کا پرزور مشورہ دیا۔ چنانچہ رحمت اللہ کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔ غرض رحمت اللہ کمیشن نے کام شروع کر دیا۔ باہمی اختلافات کیا بلکہ مخالفت کا یہ عالم ہوا کہ بعض حضرات نے شہادت کے دوران میں بدترین مذاق کا اظہار کیا۔ اور وہ وہ الزام ڈاکٹر صاحب کے خلاف تراشے گئے کہ جن کے خیال سے نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ لیکن کمیشن کا کام خفیہ ہدایات کے مطابق ڈاکٹر صاحب کو ہٹانا مقصود تھا۔ ساری رپورٹ میں کہیں تعلیمی مسائل پر ایسی بحث نہیں ہے جس سے اصلاح کا پہلو نکلتا ہو۔ جو رطب و یابس تھا رپورٹ میں درج کر دیا گیا۔ کمزوریاں کونسی یونیورسٹی میں نہیں ہیں۔ اور ذمہ داری کسی کی ہو وہ سب ڈاکٹر صاحب کے ہی سر تھوپ دی گئی اور بمصداق طویلہ کی بلا بندر کے سر۔ سب کی پاداش میں ایک شخص واحد کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا کیونکہ اس وقت کی حکومت کا منشا یہی تھا۔ لیکن کمیشن کو ڈاکٹر صاحب کی قابلیت و خدمات کا اعتراف کئے بغیر چارہ ہی نہ تھا چنانچہ کمیشن رپورٹ کے آخر میں لکھا کہ:

> "ہم ڈاکٹر ضیاء الدین کی پختہ علمی قابلیت ان کی کالج اور بعد ازاں یونیورسٹی کی طویل خدمات اور علیگڑھ سے ان کے عمیق و پرجوش محبت کے معترف ہیں لیکن ہم کو یہ بیان کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ حالیہ مشکلات میں ان کے قریبی تعلقات کے پیش نظر ان کی خدمات کا یونیورسٹی میں جاری رہنا اصلاحات روی اور ترقی کی اس نئی روح کے منافی ہوگا جو یونیورسٹی کی آئندہ کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ غالباً ڈاکٹر ضیاء الدین کے لئے بہترین راہ یہی ہوگی کہ وہ ریٹائر ہونے سے پہلے رخصت لے لیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے رپورٹ دیکھنے کے بعد ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۲۸ء کو وائس چانسلر کے سامنے اپنا استعفا پیش کر دیا۔ چونکہ اس خط سے جو ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا ان کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی پڑتی ہے لہٰذا اسے بے کم و کاست ہدیۂ ناظرین کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ خط یہ تھا۔

۲۶ مارچ سنہ ۱۹۲۸ء

بخدمت جناب وائس چانسلر صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مائی ڈیر نواب صاحب۔

سنہ ۱۸۹۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں ڈپٹی کلکٹری کے لئے نامزد ہوا مگر تھیوڈور بک نے اس کے مقابلہ میں مجھ کو اسسٹنٹ پروفیسری کی حیثیت سے اسٹاف میں شریک ہونے کا مشورہ دیا۔ میرے تقرر کے وقت سر سید علیہ الرحمۃ سے جو ملاقات ہوئی اس میں مجھ سے پانچ سال کی ملازمت کا اقرار نامہ لکھنے کا مطالبہ کیا گیا تھا مگر میں نے اس وقت عرض کیا کہ میرا ارادہ تو کالج میں تمام عمر خدمت کرنے کا ہے اس پر جو اقرار نامہ کا مسودہ انہوں نے میرے لئے خود لکھا تھا اسے پھاڑ ڈالا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں میں نے ڈی ایس سی کی ڈگری حاصل

ڈویژن میں حاصل کی جس کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا نے مجھ کو انگلستان جانے کے لئے اسکالرشپ عطا فرمایا۔ ۱۹۰۴ء میں میں نے ٹرنٹی کالج کیمبرج سے ریسرچ کی ڈگری اور ۱۹۰۵ء میں سر اسحاق نیوٹن اسٹوڈنٹ شپ اور ۱۹۰۶ء میں میں نے گوٹنجن یونیورسٹی جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ میں یورپ میں ہی تھا کہ مجھ کو انسپکٹر مدارس کا عہدہ دیا جا رہا تھا۔ مگر میں نے اس سے انکار کر دیا۔ وہاں سے واپسی پر میں علیگڑھ میں ۱۹۰۶ء میں ریاضی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں مسٹر ٹول کی ماتحتی میں سینیر ٹیوٹر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کا پہلا مسودہ تیار کرنے کے لئے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا سکرٹری مقرر ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں مسٹر ٹول کی عدم موجودگی میں ایم اے او کالج علیگڑھ کا قائم مقام پرنسپل مقرر رہا۔ جنگ طرابلس جنگ بلقان اور مسجد کانپور کے واقعہ کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک عام ہیجان پیدا ہو گیا تھا جس کا اثر کالج کے طلباء پر بھی پڑا ان میں نہایت بے چینی ظاہر تھی اور ہماری درسگاہ میں ڈسپلن کا نام بھی باقی نہ رہا تھا۔ اپنی قائم مقامی کے زمانے میں باوجود مخالف اثرات کے مجھے طلباء کے دلوں میں کالج کی عظمت قائم رکھنے میں کامیابی ہوئی۔

۱۹۱۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کا ممبر مقرر ہوا۔ میری عدم موجودگی میں آنریری سکریٹری بورڈ آف ٹرسٹیز اور یورپین اسٹاف میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں آخر کار یورپین اسٹاف نے استعفا دے دیا۔ ۱۹۱۹ء میں جب کمیشن سے فارغ ہو کر آیا تو کالج میں لڑکوں کی تعداد (۱۰۰) رہ گئی تھی کالج کی شہرت کم ہو رہی تھی اور اولڈ بوائز نے یہ خیال کر کے کہ کالج کی قدیم روایات کا خاتمہ ہو چکا ہے علیگڑھ میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ نومبر ۱۹۱۹ء میں سر ہارکورٹ بٹلر کی تشریف آوری کے موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے قریب پانچ سو اولڈ بوائز کو مدعو کیا اور ہز اکسلنسی کی خاص توجہ کو دیکھ کر ان میں بھی کالج کے معاملات سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ دوسرے سال تحریک ترک موالات کا حملہ ہوا اور ایمانداری سے میرا یہ یقین تھا کہ اگر ایم اے او کالج نہ رہا تو مسلمانوں کی قوم کو سخت نقصان ہوگا اس انتشار کی حالت میں کالج کو بند کر دیا گیا اور اس تعلیم گاہ کو چلانے کے لئے مسلم یونیورسٹی ایکٹ کا نفاذ کیا گیا تارکان موالات نے اپنی نیشنل یونیورسٹی ہماری یونیورسٹی کے متصل قائم کر دی تھی میری راہ میں سخت دشواریاں حائل تھیں لیکن میں نے متواتر محنت اور جانفشانی سے والدین اور اولڈ بوائز کی ایک بڑی تعداد کو مدعو کر کے ان کی مدد سے یونیورسٹی کے اقتدار کو قائم کر دیا میں نے اسٹرائک کی صورت کو بدل کر لڑکوں پر ان کی درسگاہ کی ذمہ داری کا پورا بار ڈال دیا۔ جوبلی کے موقع پر جب کہ قریب سات ہزار مہمان ہندوستان کے ہر حصہ سے ایم اے او کالج کی پچاسویں سالگرہ کے منانے کو جمع ہوئے تھے یہ اقتدار اور بھی مستحکم ہو گیا۔ اس وقت لوگوں نے بانی کالج کے کام کو جاری رکھنے کے لئے بہت دلچسپی کا اظہار کیا۔

یونیورسٹی کے قیام کے پہلے کئی سال تک نہ کوئی قوانین تھے اور نہ کوئی ضوابط تھے میں نے اپنی سالانہ رپورٹ میں جو فروری ۱۹۲۲ء میں پڑھی گئی تھی مندرجہ ذیل فقرہ لکھا تھا۔

> "جون ۱۹۲۲ء تک مسلم یونیورسٹی کے آرڈیننس وصول نہیں ہوئے تھے اور اس کے قیام کے اول اٹھارہ ماہ تک حکومت ہند نے وائس چانسلر کو پورا اختیار دے دیا تھا کہ کسی قسم کے آرڈیننس یا ریگولیشن بنائیں حتی کہ قوانین کی بعض دفعہ کو جا بجا نظر انداز کر دیں۔ یونیورسٹیوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ شخص واحد کو اور وہ بھی ایسے شخص کو جو موقع پر موجود نہ ہو اس قدر عرصہ کے لئے اس طرح سے مطلق العنانی کے ساتھ اختیارات دے دئے جائیں۔ بڑا معجزہ ہے۔ کہ یونیورسٹی کا اس دوران میں خاتمہ نہ ہو گیا۔"

بدقسمتی سے مجھ کو اپنے زمانہ میں تین مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا (۱) آنریری سکریٹری محمڈن کالج اور وائس چانسلر نے مجھ کو کافی امداد نہیں دی اور اکثر موقعوں پر انہوں نے کھلم کھلا اسٹاف میں میرے خلاف پارٹیاں قائم کیں (۲) میرے دفتر میں کبھی لائق آدمی نہیں ملے (۳) بعض ممبران اسٹاف نے میرے ساتھ مل کر کبھی کام نہیں کیا اور اکاڈمک کونسل میں میرے خلاف ایک مضبوط پارٹی بنائے

رکھی۔ آپ نے اپنے عہدہ کا چارج لینے کے بعد نہایت نیک نیتی کے ساتھ اسٹاف میں اتحاد عمل پیدا کرنے کی کوشش کی مگر آپ کو معلوم ہے کہ کس طرح آپ کی کوششیں رائگاں گئیں۔

موجودہ کانسٹی ٹیوشن کے مطابق پرو وائس چانسلر پر درس گاہ کے ہر شعبہ کے متعلق پوری ذمہ داری ہے لیکن اس کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ نالائق اور لاپرواہ میر اسسٹنٹ کی تنخواہ کے معمولی اضافہ کو بھی روکنے کا اختیار نہیں ہے۔ تمام باتوں کا دارومدار وائس چانسلر کی مرضی پر ہے خواہ وہ پرو وائس چانسلر کی تجاویز کو اگزیکٹو کونسل میں پیش کرے یا نہ کرے۔ سابق وائس چانسلر راجہ صاحب محمود آباد نے صاف احکام تحریری دیئے تھے کہ پرو وائس چانسلر کو کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی تجاویز اگزیکٹو کونسل میں بلا واسطہ بھیج سکے اور اس پر اس وقت سے عمل ہو رہا ہے۔ پرو وائس چانسلر کی حیثیت "ڈکٹیٹر" کے بالکل برعکس ہے خدا کرے کہ میرے جانشین مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یونیورسٹی کے چلانے میں سب سے بڑی جو مشکل ہے وہ یہ ہے کہ پرو وائس چانسلر پر تمام ذمہ داریاں ہیں مگر اسے کوئی اختیار نہیں ہے اور وائس چانسلر کو تمام اختیارات حاصل ہیں۔ مگر اس پر ذمہ داری کچھ بھی نہیں ہے۔

ایم اے او کالج کے پرنسپل صحیح طور پر یا غلطی سے اپنے سابق طلبا کو ملازمتیں دلانا اپنا فرض خیال کرتے تھے تاکہ وہ مطمئن رہیں۔ نواب وقار الملک مرحوم کے مستعفی ہونے کے بعد سے میں نے اس فرض کو انجام دیا اور ایمانداری سے میں اس کو کالج کی روایات میں خیال کرتا تھا جن کو سرسید علیہ الرحمۃ، نواب محسن الملک، مسٹر تھیوڈور بک اور سر تھیوڈور ماریسن نے قائم کیا تھا ان تمام صاحبان سے میرا گہرا تعلق رہا ہے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا مجھے فخر حاصل ہے

میری رائے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح ہمیشہ یہی رہی کہ گزشتہ سے خوشگوار تعلقات قائم رکھنا یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد ہے میں نے ہمیشہ نیک نیتی سے اس روایت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی اگرچہ اس میں مجھ کو اکثر کامیابی نہیں ہوئی میرا اندازہ ممکن ہے کہ اکثر موقعوں پر غلط رہا ہو اور ممکن ہے کہ اکثر میری رائے صحیح نہ ہوئی ہو لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ ایک ہی خیال رہا ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ میری سپردگی میں ہے اس کو بہترین مصرف میں لاؤں۔

۱۹۳۴ء سے میں پرو وائس چانسلری سے مستعفی ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۳۵ء کو تیس سال ملازمت کرنے کے بعد میں نے سابق وائس چانسلر صاحب سے استدعا کی تھی کہ وہ اکتوبر ۱۹۳۵ء سے مجھ کو پرو وائس چانسلری کے فرائض سے سبکدوش کر دیں۔ لیکن انہوں نے ایک خط مورخہ یکم مئی ۱۹۳۵ء میں مجھ کو یونیورسٹی کے مفاد کے خیال سے استعفا دینے سے منع فرمایا۔ ایک سال بعد ۱۹۳۶ء میں انہوں نے میرے دوبارہ تقرر کی مندرجہ ذیل الفاظ میں سفارش کی:۔

> "یونیورسٹی کو ایسے پرو وائس چانسلر کی ضرورت ہے جو قوم کی خاص ضرورتوں اور ملک کے مروجہ تعلیمی نظام سے واقف ہو اور پرو وائس چانسلر کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کے مختلف حصوں کے طلبا کے والدین سے ذاتی تعلقات ہوں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی خاص لیاقت اور قابلیت میں یہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں"

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے ریٹائر ہونے کے بعد میں نے آپ سے مئی ۱۹۳۸ء میں عرض کیا تھا کہ مجھ کو میرے موجودہ فرائض سے سبکدوش کر دیا جائے آپ نے مجھ سے زبانی فرمایا تھا کہ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے پیش ہونے تک میں توقف کروں۔

اس قدر عرض کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ دوران قیام علیگڑھ میں مجھ کو مختلف محکموں کی ملازمت ملتی رہی ہے لیکن میں نے اپنی تقرری کے وقت جو وعدہ کیا تھا اس کا لحاظ کرکے میں نے ان کے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اب مجھ کو پورے طور پر یقین ہو گیا ہے کہ میں یونیورسٹی کی بہتر خدمت اس سے اپنے باضابطہ تعلقات ختم کرنے سے زیادہ کر سکتا ہوں لہذا بغیر کسی پس و پیش کے اپنے استعفے کو پیش کرکے اپنا فرض

ادا کرتا ہوں اور آپ سے مستدعی ہوں کہ جلد سے جلد جس طرح بھی ہو آپ اور اگزیکٹو کونسل مناسب سمجھے اسے منظور کیا جائے ——

آپ کا صادق
ضیاء الدین احمد

استعفا بعد اعتراف خدمات منظور کر لیا گیا اور اگزیکٹو کونسل نے طے کیا کہ اس استحقاق رخصت کی بجائے جو کہ ان کو حاصل ہے چھ ماہ کی تنخواہ دی جائے جو ڈیڑھ ہزار روپیہ ہوتی ہے"۔ —— لیکن ڈاکٹر صاحب نے بذریعہ ایک خط وائس چانسلر کو مطلع کیا کہ مجھے اس رقم کے لینے سے انکار ہے۔ انہوں نے لکھا کہ:

"میں نے آپ کو اپنے استعفے کے دوران میں لکھا ہے کہ اس ادارہ کی خدمت میں میرا مقصد کام سے محبت اور فرض کی آواز کو پورا کرنا رہا ہے اور میں نے اپنی تیس سال کی ملازمت میں کبھی فرلو حاصل نہیں کی اور نہ کبھی کالج کے زمانہ تعطیلات کو کسی کام میں لایا اور ہمیشہ ان بڑی تعطیلوں میں یونیورسٹی کے مفاد کی خاطر اپنے خرچ سے دورہ کرتا رہا اور میرا ضمیر مطمئن رہا کہ میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ یہی میرا انعام ہے میں آپ کا اور اگزیکٹو کونسل کا اس مہربانی کے لئے مشکور ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں کوئی فرلو یا اس زمانے کے حق رخصت کی تنخواہ قبول نہیں کر سکتا اور نہ میں اس چیز کو منظور کر سکتا ہوں جس کو میں اپنے زمانۂ ملازمت میں جائز نہیں سمجھتا تھا۔"

بہرحال کمیشن کے ناکام کرنے سے جو مقصد تھا یعنی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں رکاوٹ ڈالی جائے اور ڈاکٹر ضیاء الدین کو الگ کر دیا جائے وہ حاصل ہو گیا۔ جس شان کے ساتھ ان کا استقبال یورپ سے واپسی پر کیا گیا تھا اس سے کہیں زیادہ دھوم دھام کے ساتھ انہیں رخصت کیا گیا۔ علیگڑھ سے رخصت ہونے کے بعد ایسے رہے کہ جیسے علیگڑھ سے کوئی واسطہ ہی نہیں دوست احباب سے خط و کتابت جاری رہتی تھی لیکن علیگڑھ کے نظم و نسق کے متعلق ایک حرف بھی نہیں ہوتا تھا۔ خدا نے انہیں غیر معمولی ضبط کا مادہ عطا کیا تھا یہ کام ہر ایک انسان کا نہیں ہے کہ اس طرح یکسو اور بے تعلق ہو جائے۔

ڈاکٹر صاحب مئی ۱۹۲۸ء میں یورپ چلے گئے اس سفر کا مقصد تعلیم پر اپنی کتاب کے لئے مواد جمع کرنا تھا دوران قیام انگلستان میں دو لطیفے ہوئے جو قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے لندن ٹائمز کے تعلیمی ایڈیٹر نے ملاقات کی۔ دوران ملاقات میں اس نے حیران ہو کر کہا کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ۱۹۲۶ء میں تو مسلسل یہ صدا اٹھتی رہی ہندوستان میں علیگڑھ سے بہتر کوئی یونیورسٹی نہیں لیکن چھ ماہ بعد کہا جانے لگا کہ اس سے بدتر کوئی ادارہ نہیں۔ عروج ترقی سے اترنے کے لئے کم سے کم پانچ سال کا عرصہ درکار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً جواب دیا کہ ۱۹۲۵ء کی جوبلی اس کا سبب ہے۔ جب تک یونیورسٹی ترک موالات کا مقابلہ کرتی رہی حکومت تعریف کرتی رہی اور جب جوبلی پر تمام مسلم زعما ایک جگہ جمع ہو گئے تو حکومت کو خوف ہوا کہ اب پھر علیگڑھ مرکزی حیثیت حاصل کرنے والا ہے اس نے قوت توڑنے کے لئے سب کچھ کیا گیا یونیورسٹی ویسی ہے جیسی تھی۔ دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ ایک روز مسٹر میریس سابق گورنر یوپی نے جو کہ اب انڈیا کونسل کے ممبر تھے ڈاکٹر صاحب کو لنچ پر مدعو کیا دوران گفتگو میں انہوں نے ایک سوال کیا کہ علیگڑھ میں اب کچھ Troubles تو نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے برجستہ جواب دیا آپ خود Troubles تھے آپ کے آنے کے بعد کچھ بھی نہیں۔

۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر صاحب مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں کامیاب ہوئے اور اسمبلی میں پہنچ کر انہوں نے ملک و قوم کی بیش بہا خدمات کیں۔

(۶)

ڈاکٹر صاحب کی سبکدوشی کے بعد سر راس مسعود کا انتخاب ہوا اور بعد کے لئے سر شاہ سلیمان کو کام سپرد کیا گیا علیگڑھ میں ایک

کا حصہ یونیورسٹی کے کاموں میں روڑے اٹکانے والی موجود تھی اسی جماعت نے سر شاہ سلیمان اور سر راس مسعود جیسے نیک نفس لوگوں کو بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ اکثر مشاہیرِ قوم کو خیال پیدا ہوا کہ یونیورسٹی کی ترقی کے لئے ڈاکٹر صاحب کا وجود ناگزیر ہے۔ اور صوبہ کے گورنر نے ڈاکٹر صاحب کو وائس چانسلری کے لئے آمادہ کرنا چاہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بعد ازاں وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے ڈاکٹر صاحب سے بوقتِ ملاقات اصرار کیا کہ وہ وائس چانسلری کے امیدوار بن جائیں۔ چنانچہ وہ مجبوراً راضی ہو گئے لیکن انہوں نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ نواب صاحب بھوپال چانسلری سے ضرور الگ ہو جائیں گے اور انہیں میرا انتخاب قبول نہ ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ انتخاب سے ایک روز قبل نواب صاحب بھوپال نے استعفا دے دیا۔ اور ڈاکٹر صاحب وائس چانسلر منتخب ہو گئے۔ اب یہ بڑا سخت سوال درپیش تھا کہ چانسلر کون ہو نواب صاحب بھوپال کو خیال تھا کہ کوئی مناسب آدمی ان کے درجہ کا مشکل ہی سے ملے گا لیکن ڈاکٹر صاحب اور لارڈ ولنگڈن کے ذاتی اثر سے نظام دکن نے چانسلر بننا منظور کر لیا اور اگست میں باقاعدہ ان کا انتخاب ہو گیا۔ نواب محمد اسماعیل خاں کو شکست ہوئی تین سال کے بعد ۱۹۳۸ء میں دوبارہ انتخاب ہونے لگا تو پھر اسماعیل خاں مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے لیکن اس مرتبہ چند اراکین کورٹ کو یہ معاملہ سپرد کر دیا گیا ان کے مشورہ سے دونوں دست بردار ہو گئے اور سر شاہ محمد سلیمان کا انتخاب ہو گیا۔ لیکن ۱۹۴۱ء میں شاہ صاحب کا انتقال ہو گیا اور پھر یہ مسئلہ پیش ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کو پیش کیا گیا اس مرتبہ سر سکندر حیات خاں اور سر اکبر حیدری نے بڑے انتظام و شدومد سے ڈاکٹر صاحب کی مخالفت کی اور سر شیخ عبدالقادر کو پیش کیا۔ غرض اس مرتبہ بھی ڈاکٹر صاحب ہی کامیاب ہوئے۔ اس بات کی بھی کوشش کی گئی کہ گورنر جنرل کی منظوری حاصل نہ ہو سکے لیکن مخالفین اس میں بھی ناکامیاب ہوئے۔ الیکشن کے زور شور میں جب ووٹ کے لئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سے درخواست کی گئی تو انہوں نے سر شیخ عبدالقادر مرحوم سے فرمایا کہ آپ نام واپس لے لیں تو اچھا ہی ہے کیونکہ الیکشن میں ضیاء الدین سے نہ شیطان جیت سکتا ہے اور نہ جبرئیل۔

اپریل ۱۹۴۰ء میں نظام کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اب ڈاکٹر صاحب جون میں تعزیت کے لئے حیدرآباد گئے وہاں کے اخباروں میں ڈاکٹر صاحب کے خلاف سر اکبر حیدری کے زیر اثر بہت زہر اگلا جا چکا تھا۔ لیکن نظام نے نہایت اخلاق و مہربانی سے خیر مقدم کیا اور کئی مرتبہ شرف ملاقات بخشا اور بذریعہ فرمان علیگڑھ یونیورسٹی میں ایک مسجد "مسجد زہرا" کے نام سے تعمیر کئے جانے کا اعلان کیا۔

تیسری بار اپریل ۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر صاحب کا انتخاب بلا مقابلہ عمل میں آیا۔

ڈاکٹر صاحب جانتے تھے کہ ان کی قوم تعلیم میں بہت پیچھے ہے اور اسی وجہ سے ملک میں مسلمانوں کا وقار ختم ہو چکا ہے ملک کے نظم و نسق میں بھی انہیں جیسا چاہئے حصہ نہیں ملتا لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لئے تعلیم کو عام کیا جائے اور تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ اور خصوصاً ٹیکنیکل تعلیم کا مسلمانوں میں بالکل فقدان ہے لہٰذا اس طرف توجہ کرنی چاہئے۔ ہندو تمام سرکاری شعبوں پر حاوی ہیں اور وہ بوجہ تعصب مسلمانوں کو وہاں گھسنے نہیں دیتے اگر مسلمان سوچتے رہے کہ جب کافی روپیہ ہو تو کام شروع کیا جائے تو یہ ناممکن ہے جس طرح بن سکے ہر قسم کی تعلیم جاری کر دینی چاہئے جب ایک کام جاری ہو جائے گا تو لامحالہ قوم اور حکومت دونوں اس طرف توجہ دیں گے اور امداد حاصل ہوگی اور ہمارے اداروں سے تربیت یافتہ افراد جیسے جیسے نکلیں گے کام سنبھال لیں گے انہی کاموں میں بتدریج ترقی ہوگی اسی تحریک کے تحت انہوں نے اپنی وائس چانسلری کے دور میں متعدد شعبے اضافہ کرنے شروع کر دیئے جا بجا انجینئرنگ کالج، زراعتی کالج، ٹیکنیکل کالج، میڈیکل کالج، ٹیچرز ٹریننگ کالج وغیرہ کی اسکیمیں تیار کرتے رہتے تھے اور حسب موقع ان اداروں کا اجرا بھی کیا گیا اگرچہ وہ چھوٹے پیمانے ہی پر ہوا۔ وہ مسلمانوں کو ہر شعبہ زندگی میں دوسروں کی محتاجی سے الگ دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جنگ کے حالات سے فائدہ اٹھا کر عسکری تربیت کے لئے بھی ادارہ کھول دیا۔ طبیہ کالج اور انجینئرنگ کالج کے فارغ التحصیل طلبا نے مسلمانوں کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور دے رہے ہیں۔ انجینئرنگ کالج کے ان ہی انجینئروں نے پاکستان

ہی آکر اس محکمہ کو سنبھالا۔

ڈاکٹر صاحب کو ہندوستان اور یورپ کے ممالک کے طرزِ تعلیم کے متعلق نہایت ہی وسیع معلومات تھیں۔ اس ضمن میں شاید ہی اس ملک میں ان کے مقابلہ کا کوئی شخص نکلے۔ ان کا نظریہ تھا کہ تعلیمی اداروں کو زیادہ سے زیادہ اپنے کاروبار میں آزادی ملنی چاہیے اور حکومت کو کم سے کم دخل انداز ہونا چاہیے۔ اور جس قدر سہولتیں عوام کو پہنچ سکتی ہیں وہ پہنچائی جائیں تعلیم کسی خاص طبقہ کا اجارہ ہو کر نہ رہ جائے۔

امتحانات کے مروجہ طریقہ کو بہت بُرا سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ یہ طریقہ غلط ہے اور ان کے نزدیک ایک خاص وقت میں پرچہ حل کرا کر اور نمبر دے کر طالب علم کی کئی سال کی محنت پر آخری فیصلہ کر دینا غیر منصفانہ ہے کیونکہ ایک ہی پرچہ کو اگر مختلف ممتحن دیکھیں تو نتیجہ مختلف نکلتا ہے۔ ان کے خیال میں یہ بہتر تھا کہ اساتذہ کو طلباء کی روز بروز ترقی اور اہلیت و صلاحیت کا علم ہونا چاہیے۔ موجودہ طریقِ امتحان ان کے نزدیک حافظہ کا امتحان تھا وہ طالب علم کی ذہنی اور دماغی ارتقا کا پیمانہ نہیں تھا۔ طالب علم کو پاس ہونے کے لئے نمبر حاصل کرنے تک وہ نرم رہتے تھے لیکن جوں جوں آگے بڑھتے سخت ہوتے جاتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اصول و قوانین انسان کے لئے بنائے گئے ہیں اور انسان نہیں بنائے گئے ہیں اگر اصول و قوانین کی پابندی سے انسان کو نقصان کا اندیشہ ہو تو قوانین کو نظر انداز کر دینا چاہیے انسان کو نگاہ رکھیے انسان کے وضع کردہ قوانین خدائی قوانین نہیں ہیں۔ انہوں نے طریقِ امتحان پر ایک کتاب بھی لکھی تھی اور اس کے بعد سے ممتحن بننا چھوڑ دیا تھا۔

وہ چاہتے تھے کہ ایسے طلباء مسلمانوں میں پیدا ہوں کہ وہ خواہ کیسی ہی مصیبت میں گھر جائیں کبھی بددل نہ ہوں اور ہمت نہ ہاریں اور اپنے لئے راستہ بنائیں اسی لئے وہ درس و تدریس سے زیادہ تربیت پر زور دیتے تھے ان کا خیال تھا کہ طلباء میں ضبط و نظم بغیر کسی تعزیری کارروائی کے قائم کیا جائے اور اسی پر ان کا عمل تھا۔ ہونہار طلباء کے ساتھ ہر قسم کی مراعات کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں کو نہایت شفقت سے کام کرنا سکھاتے تھے۔ ان کا دروازہ ہر وقت طلباء کے لئے کھلا رہتا تھا اور ملاقات میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ایم اے کے طلباء کو ہفتہ میں ایک بار ضرور گھر پر مدعو کرتے تھے اور اس وقت نہ صرف ان کے مضمون کے متعلق بات چیت ہوتی بلکہ قومی مسائل پر بھی گفتگو ہوا کرتی تھی انہیں اپنے شاگردوں کے متعلق جزئیات تک سے واقفیت رہتی تھی اور اگر برسوں بعد بھی کوئی مل جاتا تو اپنی غیر معمولی قوت یادداشت کی بنا پر اس کے پرانے واقعات دہرا دیتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ طلباء کو ان کے ساتھ فرزندانہ عقیدت ہو جاتی تھی۔ اس ضمن میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ چودھری خلیق الزمان صاحب سے منسوب ہے۔ چودھری صاحب موصوف نے فرمایا کہ جنگ بلقان کے زمانے میں طلباء مسجد میں جلسے کرتے اور حکومت برطانیہ کے خلاف تقاریر ہوتیں۔ ایک دن یہ معلوم ہوا کہ کوئی شخص ان تمام باتوں کو مسٹر ٹول پرنسپل تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کی چھان بین کے لئے چودھری صاحب ہی کے کمرہ پر مختلف ٹیموں کے کپتان اور یونین کے وائس پریذیڈنٹ جمع ہوئے اور قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر اپنی اپنی رائے دینے لگے کہ کون شخص مسٹر ٹول کو خبریں پہنچاتا ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ رائیڈنگ اسکول کے کپتان صاحب خبریں پہنچاتے ہیں۔ بعد ازاں یہ طے ہوا کہ چودھری صاحب رات ہی رات میں ایک اشتہار کا مسودہ تیار کر کے اور اسے اسکول کے بچوں سے الٹے ہاتھ سے لکھوا کر اس چغل خور کی قلعی کھولنے کے لئے مختلف مقامات پر چسپاں کرائیں چنانچہ چودھری صاحب نے ایسا ہی کیا حتیٰ کہ کپتان مذکور نے ان اشتہاروں کو نوچنا شروع کیا۔ شدہ شدہ یہ خبر ڈاکٹر صاحب کو بھی پہنچی اور چونکہ چودھری صاحب ایڈیٹر بھی تھے ان کے پاس آئے اور دریافت کیا کہ یہ اشتہار بازی کس کا کام ہے۔ چودھری صاحب نے لاعلمی کا اظہار کیا اس کے بعد ڈاکٹر صاحب چلے گئے۔ چودھری صاحب فرماتے ہیں کہ [illegible] میں ایک دن ڈاکٹر صاحب نے اصرار سے انہیں دعوت پر بلایا اور ادھر ادھر کی باتوں میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کو وہ اشتہار والا واقعہ یاد ہے؟ فرمانے لگے ہاں خوب یاد ہے وہ کارگزاری تمہاری ہی تھی۔ لیکن میرے پاس کچھ ثبوت نہ تھا اس لئے میں کچھ نہ کر سکا۔ اس قسم کی باتیں درحقیقت ان کی کامیابی کا راز تھیں۔

انہیں اپنے طلبا پر زبردست بھروسہ اور اعتماد تھا۔ جب لارڈ لوتھین ہندوستان آئے تو تمام ملک کے طلباء نے جہاں بھی وہ گئے ان کے خلاف مظاہرے کئے۔ سر آغا خاں کی خواہش تھی کہ وہ علیگڑھ آئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً لارڈ لوتھین کو مدعو کر دیا۔ سب لوگ پریشان تھے کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے طلبا کچھ ناشائستہ حرکت نہ کر بیٹھیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا ہمارے طلبا مسلمان ہیں اور انہیں اسلامی مہمان نوازی کا پاس ہے چنانچہ لارڈ موصوف آئے اور نہایت ضبط و نظم کے ساتھ ان کا خیر مقدم ہوا۔ کھانے کے بعد لارڈ نے طلبا کی تعریف کی ڈاکٹر صاحب نے جوابی تقریر میں فرمایا کہ:

> ”میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ طلبا کا زیادہ حصہ آپ کی آمد کا مخالف تھا لیکن جب کارکنان کالج نے دعوت دے دی تو طلبا نے اپنی مخالفت پر آپ کے خیر مقدم کو ترجیح دی۔“

طلبا سے بعض اوقات ایسی حرکات سرزد ہو جاتی تھیں جن کی بنا پر وہ قانون کی زد میں آ سکتے تھے ڈاکٹر صاحب اس موقع پر وہی کرتے تھے جو ایک باپ کر سکتا ہے وہ کہا کرتے تھے کوئی باپ اپنی اولاد کو پولیس کے حوالے نہیں کر سکتا میں کیسے کر دوں۔ ان کا عقیدہ تھا جرم کی اصلاح اس قسم کی تعزیری سزا سے نہیں ہوگی طلبا جوانی کی ترنگ میں اگر کوئی غلطی کر بیٹھتے ہیں تو بعد میں ضرور پچھتاتے ہیں اگر پولیس کے حوالے کر دیا جائے اور سزا کرا دی جائے تو بہت ممکن ہے وہ عادی مجرم بن جائیں۔ چنانچہ وہ طلبا کو اس طرح بچا لیتے تھے ایسی متعدد مثالیں ان کی زندگی میں پیش آئیں اور وہ طلبا جنہیں انہوں نے اس طرح بچایا بعد میں سوسائٹی کے نہایت مفید افراد ثابت ہوئے۔ رسٹی کیشن کے نام سے انہیں چڑ تھی وہ قوم کے نوجوانوں کی آئندہ زندگی برباد کرنے کے سخت مخالف تھے۔ کسی طالب علم کا داخلہ اس وجہ سے نہیں روکا جاتا تھا کہ اس کے پاس پیسہ نہیں ہے ایسے طلبا کی وہ ضرور مالی امداد کرتے تھے۔ وہ اپنے طلبا کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ فارغ التحصیل طلبا کو ملازمت دلانا ان کا روزمرہ تھا۔ کسی کی سفارش کرنے سے انکار کرنا وہ جانتے ہی نہ تھے کوئی دن ایسا جاتا ہو گا کہ کسی کی سفارش نہ کرتے ہوں انہوں نے بے شمار لوگوں کو برسرِ روزگار لگایا۔

وہ سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک مرکزی اسمبلی کے ممبر رہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی پارٹی سے متعلق رہے پہلے انڈی پنڈنٹ پارٹی میں اور پھر مسلم لیگ پارٹی میں۔ انہوں نے ریلوے، مالیات، ٹیکس اور مزدوروں کے مسائل پر ماہرانہ اور قابلانہ بحثیں کیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں سب سے پہلی تقریر ریلوے پر تھی اور ایسی پر مغز تھی کہ ریلوے کے فائنانشل کمشنر کو شبہ ہوا کہ شاید کسی ریلوے کے افسر نے لکھی ہے ڈاکٹر صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے دوران تقریر میں اس انگریز افسر کو مخاطب کر کے کہا کہ ”آپ کا خیال غلط ہے کہ یہ تقریر کسی نے مجھے لکھ کر دے دی ہے وہ میں نے تیار کی ہے میں نے آپ سے زیادہ مشکل امتحان پاس کئے ہیں مجھے ضرورت نہیں کہ کوئی میرے لئے تقریر لکھے میں دوسروں کو تقریر لکھ کر دینے کی قابلیت رکھتا ہوں۔“ معاشی مسائل پر بڑی وقیع تقاریر کرتے تھے۔ حکومت کے مسلمان ملازمین کے معاملات میں بڑی دلچسپی اور انہماک سے بحث کرتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ مسلمانوں کی تنظیم جداگانہ ہو اور ان کے مفاد محفوظ رہیں۔

ان کی علمیت اور ہمہ دانی کا یہ عالم تھا کہ ریاضی ان کا مضمون ہی تھا لیکن فلکیات، معاشیات، جغرافیہ، تعلیمات غرض جس موضوع پر ضرورت ہو اس کا سرسری مطالعہ کر کے اور اصول و نظریات کو سمجھ کر ایسی بحث کرتے تھے کہ ماہرین ان کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔ بظاہر وہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ لیکن دماغ کی مشین ہر وقت چلتی رہتی تھی۔ اکثر ایسا دیکھا گیا کہ بڑے بڑے تجربہ کار کسی گتھی کو سلجھانے میں سر کھپا کر بیٹھ گئے اور ڈاکٹر صاحب نے آنِ واحد میں سلجھا دیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ریاضی کو مسلمانوں نے ہوا سمجھ رکھا ہے مجھے اس طلسم کو توڑنا ہے۔ لیکچر کے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔ بعض متبحر عالموں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے مخاطب کی قابلیت سے اپنے علم کا توازن پیدا نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر صاحب میں باوجود تبحرِ علمی یہ قابلیت تھی کہ طلبا کی مشکلات کا اندازہ

خوب کر دیتے تھے اور اکثر اپنی جگہ یعنی کلاس سے نیچے اُتر آتے تھے۔ تاکہ مسئلہ طلبا کے ذہن نشین ہو جائے ان کے لکچروں میں جہاں علمی ہو لطائف و ظرائف ہوتے تھے تاکہ مضمون کی خشکی اسے غیر دلچسپ نہ بنا دے۔ باوجود عالی دماغی اور تبحر علمی کے ان میں طالب علمانہ جذبہ موجود تھا کوئی بات جو انہیں معلوم نہ ہو ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی سے دریافت کرنے میں انہیں تامل نہ ہوتا تھا اور نہ اس حقیقت کا ان میں غرور تھا۔ وہ ایک معمولی کلرک یا اسکول ٹیچر کے ہاں دعوت میں اسی خوشی سے شریک ہوتے تھے جیسے وائسرائے کے محل میں۔ انہیں اپنی عظمت و اہمیت کا قطعی احساس نہ تھا۔ بعض اوقات معلوم ہوتا تھا کہ انہیں پوزیشن کا پاس نہیں مخاطب چھوٹا ہو یا بڑا سلام میں پیش قدمی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ عرصہ تک یورپ میں رہے لیکن اپنے عادات و خصائل کے لحاظ سے وہ پورے مکمل ہندوستانی مسلمان تھے۔ چنانچہ کپڑوں کے معاملے میں کوئی اہتمام نہ تھا۔ کام کی مصروفیات کی وجہ سے سوٹ پہنتے تھے لیکن اس سوٹ کی بے اعتنائی سے پتہ چلتا تھا کہ انہیں اس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ عید بقرعید پر اور اعزا کی تقاریب میں وہ شیروانی پہنتے تھے اور پاجامہ۔ غرضیکہ ڈاکٹر صاحب انتہا درجہ کے منکسر المزاج تھے۔ اپنے ماتحتوں کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک رہتے تھے۔ اور طرح طرح امداد کرتے۔ مالی امداد گاہ بگاہ دیتے اور کبھی قرضہ کی صورت میں کر دیا کرتے تھے لیکن اس کی ادائیگی میں کبھی سختی نہ کی جاتی تھی۔

مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ گو وہ تقریبیں جو ہوا کرتی تھیں بڑی بڑی اور شاندار اور چھوٹی و معمولی لیکن ان کا اہتمام ایسا تھا کہ کم سے کم خرچ ہوتا تھا۔ ان کے پاس بیٹھ کر غم غلط ہو جاتا تھا۔ گاہ گاہ اپنے کنبہ کے افراد کو اور خصوصاً بچوں کو جمع کر لیتے تھے اس روز ان کی کوٹھی میں بڑی چہل پہل ہوتی تھی۔ بچوں کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے میں انہیں بڑا لطف آتا تھا۔ چائے ان کے ہاں بڑی بد مزہ اور خراب ہوتی تھی لیکن قہوہ اس قدر اعلیٰ درجہ کا پیتے تھے کہ اکثر احباب اس کی فرمائش کرتے تھے۔ اور قائد اعظم تو خاص طور پہ قہوہ پسند کئے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی میں اپنے اعزا کو مدعو کیا تھا اسی اندازے سے انتظام تھا۔ بعض طلبا نے سفارش کی اور قریب سو طلبا بن بلائے مہمان پہنچے ڈاکٹر صاحب قطعی نہ گھبرائے بلکہ خوش ہوئے اور انہیں الگ بٹھایا تاکہ دوسرے مدعو کا انتظار کریں اتنی دیر میں فوراً انتظام مکمل ہو گیا انہیں طالب علمی کے زمانے سے علیگڑھ کے ڈائننگ ہال کا نسخہ یاد تھا یعنی ایسے غیر متوقع حالات میں سالن میں شوربہ کا اضافہ کر دیا جاتا۔

ان میں ایک خصوصیت تھی کہ ابھی ایک مسئلہ درپیش ہے اس پر غور و فکر ہو رہا ہے کہ یکایک کوئی دوسری قسم کا مسئلہ آ گیا تو وہ فوراً اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتے تھے۔ نہ ان کا دماغ تھکتا تھا نہ ذہن میں الجھن پیدا ہوتی تھی جب کوئی بڑی سے بڑی اسکیم درپیش ہوتی تو ان کے سامنے اس کے تمام پہلو ہوتے اور معمولی سے معمولی جزئیات پر غور بھی ذہن ایسی تیزی سے کام کرتا تھا کہ جب کوئی ان کے ساتھ کام کرنے بیٹھتا تو مشکل ہی سے ان کا ساتھ دے سکتا تھا۔ یادداشت بڑے غضب کی تھی اور عجیب یہ کہ جس وقت جس چیز کو چاہتے یاد آ جاتی اور جب چاہتے اسے بھلا دیتے تھے۔

مخالفین کی ایک جماعت ہمیشہ ان کے درپے رہی لیکن وہ کبھی کسی سے انتقام لینا تو کجا اپنے مخالفین پر احسان کرتے تھے۔ جب ان کا انتخاب وائس چانسلری کے لئے ہوا تو نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال نے چانسلری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا لیکن ڈاکٹر صاحب نے عسکری تربیت کا مرکز یونیورسٹی میں جاری کرتے وقت ان سے امداد کی درخواست کی اور تعلقات خوشگوار ہو گئے نواب صاحب علی گڑھ آئے مشورہ بھی دیا اور امداد بھی۔ مرکزی اسمبلی میں ملک کے غذائی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے بھوپال کے غذائی نظم و نسق کی عمدگی کی مثال دی اور اس کی بہت تعریف کی۔ وہ کبھی کسی مخالف کی عزت کے درپے نہیں ہوتے تھے رحمت اللہ کمیشن کے صدر سر رحمت اللہ مرکزی اسمبلی میں اسپیکرشپ کے امیدوار تھے اور ڈاکٹر صاحب سے مدد کے طالب تھے ڈاکٹر صاحب نے کھلے دل سے ان کی امداد کی یہ وہی کمیشن تھا جس نے ڈاکٹر صاحب کو علی گڑھ سے الگ کر دئے جانے کی سفارش کی تھی۔ بعض اوقات جب

طلبا کسی معاملہ میں مخالفت یا ہڑتال کرنے پر تُل جاتے تو ان کے سامنے جانے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی مگر وہ اس وقت بھی بے دھڑک طلبا کے مجمع میں گھس جاتے اور ایسی تقریر کرتے کہ سرکش سے سرکش بھی گردن جھکا دیتا اور وہ جو چاہتے ان سے منظور کرا لیتے تھے۔ ان کے مخالفین ان پر پارٹی بازی کا الزام لگاتے تھے۔ پارٹیاں سب ہی نے بنائیں اور کوئی جمہوری ادارہ بغیر پارٹی نہیں چل سکتا۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ ان کی پارٹی جیتی اور دوسروں کی ہاری۔

ان کی کامیابی کا راز اس بات میں پوشیدہ تھا کہ دوسروں سے کام لینے کی اعلیٰ صلاحیت تھی اور سب سے زیادہ یہ کہ خود لگاتار و مسلسل کام کرنے کی دھن تھی۔ ذہانت کے علاوہ ان میں جسمانی توانائی اور ہمت اس غضب کی تھی کہ لگاتار گھنٹوں کام کر سکتے تھے جتنی زیادہ مشکلات ہوتیں اتنا ہی تیزی سے ان کا ذہن کام کرتا تھا اور کام کرنے کی قوت بہت بڑھ جاتی تھی۔ وہ دونوں سفر میں رہتے لیکن سفر سے واپس آتے ہی پہلے دفتر کا رخ کرتے اور کام میں مصروف ہو جاتے تھے ان کے ساتھ کام کرنے والے اکثر عاجز آ جاتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے ایک شاگرد رشید نے ان سے کہا کہ آپ کی تقلید کرنا معمولی انسان کا کام نہیں ہے آپ نے غالباً جن مسخر کر رکھے ہیں ہنس کر فرمانے لگے جو قوتیں خدا نے عطا کئے ہیں ان سے کام لینا چاہئے بس یہی جنات ہیں ان کو تابع کرنے کے لئے خلوص و محبت کی ضرورت ہے۔ ان کے سفر کا بھی حساب لگایا جائے تو غالباً عمر کا ایک چوتھائی سفر میں گزرا۔ یہ سب کچھ علیگڑھ کے لئے تھا اسی کے لئے وہ یہ تکالیف برداشت کرتے تھے۔ سر سید علیہ الرحمۃ کے بعد اگر کسی کی ہستی تھی تو ڈاکٹر صاحب کی تھی کہ ادھر آپ علیگڑھ کا نام لیں اور فوراً ڈاکٹر صاحب کا نام ذہن میں نہ آئے یا ڈاکٹر صاحب کا نام لیں تو علیگڑھ آپ کے ذہن پر مستولی نہ ہو۔ مسلم یونیورسٹی اور ڈاکٹر صاحب کچھ لازم و ملزوم سے تھے۔ ان کے دل و دماغ پر سب سے زیادہ حاوی جو چیز تھی وہ علیگڑھ اور اس کی خدمت۔ بعض مخالفین کا اعتراض تھا کہ اسمبلی کی ممبری سے علیگڑھ کے کام میں خلل پڑے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں بھی وہ علیگڑھ ہی کی خدمت کے لئے گئے تھے یونیورسٹی کے بے شمار کام نکلتے تھے۔ وہ جس قدر سفر یونیورسٹی کے لئے کرتے تھے ایک پیسہ بھی سفر خرچ کا یونیورسٹی سے نہ لیتے تھے۔ اور جو کچھ یونیورسٹی کو ان کے ذریعے حاصل ہوا وہ سب ان کے ذاتی اثر کا نتیجہ تھا۔ میڈیکل کالج فنڈ کے لئے دو سال میں پچاس لاکھ روپیہ جمع کر دینا ان ہی کے بس کا کام تھا۔ سر سید کے بعد اگر کسی کو چندہ جمع کرنے کا گُر آتا تھا تو وہ ڈاکٹر صاحب ہی تھے۔ ہر جگہ ہر موقع پر ان کے دل میں یونیورسٹی کی لگن قوم کی تڑپ اور اپنے طلبا کے لئے بے چینی رہتی تھی۔

قائد اعظم نے جب لیگ کے پرچم کے نیچے قوم کو مجتمع کر لیا اور مرکزی اسمبلی میں بھی مسلم لیگ پارٹی کی بنا ڈالی اس وقت ان کی دوربین نگاہ ڈاکٹر صاحب ہی پر پڑی انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے ذمہ پارٹی کی تنظیم کا کام کیا اور اس کا سکرٹری انہیں کو بنایا۔ اسی زمانے میں یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر کا انتخاب ہونے والا تھا اور کورٹ کے ممبران کی اکثریت ڈاکٹر صاحب کو چاہتی تھی لیکن انہوں نے قائد اعظم کی خواہش کا احترام کیا اور اس قومی خدمت کو اس پر ترجیح دی اور سر شاہ سلیمان کو بلا مقابلہ منتخب کرا دیا۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ خود دھن کے پکے تھے اور جس کام کو لے کر کھڑے ہوتے تو اسے بلا خوف مخالفت پورا کر کے چھوڑتے تھے اسی وجہ سے انہیں قائد اعظم کی یہ ادا پسند تھی کہ جب وہ کسی اصول یا پالیسی کو صحیح سمجھ کر اختیار کرتے تھے تو پھر کوئی چیز انہیں اپنی راہ سے نہیں ہٹا سکتی تھی اور جتنی مخالفت بڑھتی اتنا ہی ان کا عزم مضبوط ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ قائد اعظم کی سیاست دانی، بلند کردار دیانت اور حق گوئی کے بڑے مداح تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا عقیدہ تھا کہ اسلامی جمہوریت یہ ہے کہ پہلے سوچ سمجھ کر اپنا قائد چن لو اور پھر بے چون و چرا اس کا ساتھ دو۔ اختلاف ہو تو نجی طور پر بحث کرو لیکن عوام میں لیڈر کی ہمیشہ حمایت کرو۔ اسی جذبہ کے تحت وہ مسلم لیگ میں شریک ہوئے تھے۔ اور آخر وقت تک قائد اعظم کے حامی و مددگار رہے۔

ڈاکٹر صاحب کا تعلق علیگڑھ سے کم و بیش ساٹھ برس رہا ۔ وہ علیگڑھ میں بحیثیت طالب علم آئے ۔ ماسٹر ہوئے ٹیچر ہوئے ، ریڈر ہوئے ۔ اسسٹنٹ ٹیوٹر ہوئے ۔ ٹیوٹر ہوئے ، پرنسپل ہوئے ۔ پرو وائس چانسلر ہوئے ۔ چانسلر ہوئے اور آنریری ڈاکٹر ہوئے ۔ انہوں نے سر سید علیہ الرحمۃ سے تا زیست علیگڑھ کی خدمت کا وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا ۔ علیگڑھ سے والہانہ محبت طلباء کی خیر سگالی اور مادر علمی سے وفاداری ایسی خدمات ہیں جن کا دوست دشمن سب کو اعتراف ہے ۔

علیگڑھ کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے بعد ستر سال کی عمر میں وہ قوم کا جواں ہمت شیدائی ۱۹۴۸ء میں یورپ اور امریکہ تعلیمی ترقیوں کے مطالعہ اور مشاہدہ کی غرض سے وطن سے روانہ ہوا ۔ امریکہ اور دیگر ممالک یورپ کا دورہ کیا ۔ نومبر ۱۹۴۸ء میں واپسی کا ارادہ تھا کہ سر آغا خاں سے ملاقات کرنے کے لئے پیرس گئے وہاں سے لندن آتے ہوئے راستے میں فالج کا حملہ ہوا ۔ نرسنگ ہوم میں داخل ہو گئے ۔ وہاں ایک روز مسلمان نوجوانوں کو چائے پر مدعو کیا اور باوجود تکلیف کے ان سے کہا کہ آپ لوگ یہاں سے ہندوستان ہی واپس جائیں اور وہیں رہیں اگرچہ وہاں ملازمت نہیں ملے گی لیکن یہ خوشی کی بات ہے اسی وجہ سے آپ لوگ زراعت صنعت و حرفت اور صحافت کی طرف متوجہ ہوں گے ۔ وفات سے ایک روز قبل اپنے معالج ڈاکٹر غیاث الدین صاحب کو پاس بلا کر کہا ، کہ آپ اب ہندوستان جا کر کام کریں ، اب آپ جیسے حضرات کی وہاں ضرورت ہے اب مسلمانوں کی تعلیم وہاں ایک اہم مسئلہ ہو گا ۔

۲۳ دسمبر ۱۹۴۸ء کو گیارہ بج کر ۴۰ منٹ پر اس جہان فانی سے رحلت کی انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ دوسری و تیسری فروری ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب میں تابوت براہ بحری جہاز علیگڑھ پہنچا ۔ اور ۴ فروری کو سر سید علیہ الرحمۃ کے پہلو میں مغربی جانب دفن کیا گیا ۔

ملک بھر میں کہرام مچ گیا اخبار و رسائل نے تعزیتی مضامین لکھے ہم صرف دو رسائل کا مختصر اقتباس دیتے ہیں ۔ معارف نے لکھا کہ :

> مرحوم اس دور کی پیداوار تھے جب مسلمانوں پر مغربی تمدن مسلط تھا ۔ اور اس کا سب سے بڑا مرکز علیگڑھ تھا ۔ لیکن انہوں نے اس کا بہت کم اثر قبول کیا ۔ اب تو شیفتگی کی عمر تھی وہ ہر زمانے میں نہ صرف عقیدے بلکہ ظاہری وضع قطع میں بھی مسلمان رہے ۔ ان کی زندگی بڑی سادہ اور بے تکلف تھی ان کی سادگی میں ایک صاحب کمال کی شان بے نیازی پائی جاتی تھی ۔ شخصی طور پر بھی ان سے لوگوں کو بڑے فوائد حاصل ہوئے ان کی ذات سے سینکڑوں غریب طالب علموں نے تعلیم حاصل کی اور انہوں نے بہتوں کو جن کا کوئی سہارا نہ تھا ۔ ملازمتیں اور بڑے بڑے عہدے دلوائے ۔

صدق لکھنؤ کے مدیر نے لکھا کہ :

> موتیں اچھے اچھے مخلص مسلمانوں کی بھی کہنا چاہئے کہ روز ہی ہوتی رہتی ہیں اور بعض یقیناً بہت ہی دردناک دل گیر بھی ہوتی ہیں لیکن کچھ موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو فرد واحد کی نہیں پوری جماعت کی پورے ادارہ کی موت کہی جا سکتی ہے علیگڑھ کے مرحوم ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی وفات اسی قسم میں آتی ہے ۔ . . . . . . بڑے ذی مروت اور بڑے ہی فیض رساں تھے دروازہ ہر کس و ناکس کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا ہر اولڈ بوائے کے میزبان دوست اور دستگیر تھے ۔ آمدنی کا بڑا حصہ طلبا ہی کے لئے وقف تھا ۔ خدا معلوم کتنوں کو عہدے دلوائے کتنے بیروزگاروں کو روزگار سے لگایا کتنے بھوکوں کو کھلایا کتنوں کی سفارشیں کیں کتنوں کی فیس اپنے پاس سے بھر بھر دیں . . . . . .
>
> بعض اہل صحافت نے جو مستقل پروپیگنڈا مرحوم کی مخالفت میں مہینوں بلکہ برسوں جاری رکھا اور جس نے ان کے ہر ہنر کو عیب ہی بنا کر دکھایا وہ خود ہی ان کے حق میں کفارہ کا کام دے سکتا ہے ۔ عجب نہیں اسی سے وہ بالکل

ڈھل گئے ہوں۔

اصنافِ سخن میں مدحت طرازی۔ مرثیہ، سلام اور قصیدہ سب ہی کچھ ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کے جنازہ کے استقبال کے سلسلے میں شائع ہوئی جنازہ کی استقبالیہ نظم ایک جدت ہے ہم اسی نظم پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں ؎

استقبالیہ نظم از پروفیسر محمد صادق صاحب ایم اے شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی

علیگڑھ تو نے کی ہے اہلِ ملت کی پذیرائی — ہوئی ہے تجھ میں ارکانِ حکومت کی پذیرائی
ترے ایوان میں آمد ہوئی اکثر امیروں کی — بڑے ارماں سے کیں تو نے مداراتیں وزیروں کی
رئیسانِ وطن کا تو نے استقبال دیکھا ہے — شہانِ ذی حشم کا موکبِ اجلال دیکھا ہے
مگر یہ شان استقبال کی سب سے نرالی ہے — کہ آج اک تیرے شیدائی کی میت آنے والی ہے
سلامی کو صفیں استادہ ہیں اعیانِ ملت کی — کہ ہوگی پیشوائی دیدۂ ارکانِ ملت کی
بیاں کیا ہو حقیقت قوم کے اندوہ بے حد کی — کہ لاش آتی ہے یورپ سے ضیاء الدین احمد کی
وہ جس نے اپنی ہستی کو مٹایا قوم کی خاطر — پڑا جو بار وہ سر پر اٹھایا قوم کی خاطر
شکایت جس کے لب سے شکر بن کر برملا نکلی — وہ جس کے منہ سے اکثر گالیاں کھا کر دعا نکلی
بڑھاپے میں ملی تھی جس کو ہمت نوجوانوں کی — وہ جس کی خاکساری میں تھی رفعت آسمانوں کی
وہ جس کی عمر گزری میڈیکل کالج کی خواہش میں — دیا نقدِ حیات آخر اسی سودے کی کاہش میں
وہ جس نے خاک چھانی پائے مردی سے زمانے میں — فراہم کرنے لاکھوں ہی کالج کے خزانے میں
وہ اپنا ڈاکٹر جو ماہرِ امراضِ ملت تھا — جو سچ پوچھو چارہ سازِ قوم تھا ناصحِ ملت تھا
دیارِ غیر میں جس کے لئے پیکِ اجل آیا — زمانہ میں شہیدِ علم کا جس نے لقب پایا
جسے سب سے فزوں تھا قوم کا غم بعد سید کے — جو تھا طلاب کا محبوب وہ محبوب سید کے
سن اے خاکِ علیگڑھ سن یہ امانت سونپی جاتی ہے — تجھے سارے مسلمانوں کی دولت سونپی جاتی ہے
قیامت تک اسے آغوش میں رکھنا اسی راحت سے — کہ یہ خاکی جسد محروم آسائش تھا مدت سے
دعا ہے یہ کہ پلہ نیکیوں کا اسی بھاری ہو — دمِ حشر اس کے سر پر سایۂ افضالِ باری ہو

رہا دنیا میں ملت کی ہوا خواہی سے کام اس کو
ملے جنت میں قربِ حضرت خیر الانام اس کو

نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی مرحوم

غلام پنجتن

انیسویں صدی کا پہلا ربع گزر رہا تھا کہ ان کے دادا کشمیر سے بسلسلہ ملازمت پنجاب میں آئے۔ اور اس کے بعد میرٹھ میں مقیم ہو گئے۔ یہ ان معدودے چند مسلمانوں میں سے تھے جنہوں نے انگریزی تعلیم کو بدعت نہیں سمجھا اور اپنے فرزند خدا بخش کو انگریزی پڑھائی لکھائی۔ اپنے والد کی طرح یہ بھی جوان عمری میں کپتان ... بہادر کے ملازم ہو کر سرحدی ضلعوں ڈیرہ غازی خان، بنوں وغیرہ میں محکمہ بندوبست میں خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد مولوی خدا بخش صاحب ضلع سہارنپور کی کلکٹری میں ... پر آ گئے۔ چونکہ انہوں نے انگریزی وضع قطع اختیار کر لی تھی۔ لوگ انہیں کرانی کہنے لگے۔ مولوی خدا بخش صاحب ۳۵ برس کی عمر میں سہارنپور میں ۱۸۵۶ء میں انتقال کر گئے۔ ان کی والدہ اپنی بیوہ بہو اور چار کمسن پوتوں کو لے کر میرٹھ آ گئیں۔ ان چار یتیموں میں مولوی چراغ علی سب میں بڑے اور بارہ سال کے تھے جو آگے چل کر نواب اعظم یار جنگ بن کر آسمان ادب پر ہی نہیں چمکے بلکہ ریاست حیدرآباد کی تنظیم جدید میں جو سر سالار جنگ اول نے شروع کی تھی نمایاں مقام حاصل کیا اور آج تک ایک علامہ "چراغ علی گی" کے نام سے ان کا مسلک پہچاننے کی وجہ سے مشہور ہے۔

اس لاوارث گھرانے کو میرٹھ میں دوبارہ آئے ہوئے ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ وہ ہنگامہ شروع ہو گیا جس کو "غدر" کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔ سلطنت مغلیہ کی برائے نام حکومت کو بیرونی قوت کے ہاتھوں سے چھیننے کی مہم تھی جو مقررہ وقت سے پہلے شروع ہونے اور وسائل تمام نہ رکھ سکنے کی وجہ سے ناکام رہی۔ اس میں مسلمانوں میں زیادہ مذہبی جوش تھا اور وحشیانہ تخریب جو قتل و غارت گری تھی گویا ان لوگوں کو سبق دینا مقصود تھا جو سرکار انگریزی کا اقتدار بڑھانے میں اپنی فلاح سمجھے ہوئے تھے۔ چنانچہ شہر میرٹھ میں جہاں اس انقلاب کا آغاز ہوا کسی نے اس گھر کی طرف رخ بھی نہیں کیا۔ خون خرابا تو اس وقت عام ہوا جب لاہور سے سکھوں کی اور دکن سے نظام کی کمک شمالی ہند پہنچی اور انگریز بہادر کا سکہ بٹھانے کی غرض سے ہندوستانیوں کو بزدل بنانا اور مسلمانوں کا تختہ الٹنے اور انہیں ذلیل کرنا شروع ہوا۔ عوام تو کیا خواص میں بھی جو خوف بٹھایا گیا اس کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ سرسید جیسے جری شخص کی ہمت نہ ہوئی کہ اس شورش کے متعلق جو تحریر اور تصنیف کی اس کا نام رسالہ اسباب بغاوت ہند رکھتا۔

۱۸۵۸ء اور اس کے بعد کے کئی سال ایسے گزرے کہ میرٹھ اور اس کے قرب و جوار میں کسی کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا اور ایسے میں

جیسی کہ ایک یتیم کی تعلیم ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔ اس زمانے میں طریقۂ تعلیم بھی دوسرا تھا۔ نہ تعلیمی کمیشن بیٹھتے تھے نہ محکمۂ تعلیمات تھا۔ نہ وہ جبریہ ساری تعداد سال کے سال شائع ہوتا تھا۔ نہ پبلک اسکولس تھے نہ شاندار عمارتوں والے کالج۔ جب مہدی علی، مشتاق حسین، چراغ علی، الطاف حسین حالی، ذکاء اللہ، شبلی، نذیر احمد ایسے ادیبوں اور عالموں کو دیکھتے ہیں تو یہ خیال ضرور آتا ہے کہ آخر ایسے ادیب اور صاحب فکر، اہل بصیرت ہماری یونیورسٹیوں کی مکمل تعلیم کیوں نہ پیدا کر سکی۔ چنانچہ یہ دور اندیش کی ادھوری تعلیم حاصل کر کے افکار دنیا میں جیسی کہ بصیرت نظر، ہمارے بزرگ حاصل کر لیا کرتے تھے۔ اپنے دیگر ہم عصروں کی طرح چراغ علی کو اردو، فارسی اور انگریزی کی معمولی تعلیم حاصل کرتے ہی تلاش روزگار میں نکلنا پڑا۔ گورکھپور کی کمشنری میں ایک ضلع بستی نیا قائم ہوا تھا۔ چراغ علی وہاں جا کر بیس روپیہ ماہوار کے کلرک ہو گئے۔ دفتر کے بعد جو وقت ملتا اس میں کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے۔ ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء میں ایک انگریز افسر جس کے ساتھ ان کے والد مرحوم پنجاب میں کام کر چکے تھے اور گورکھپور ڈویژن کے کمشنر ہو کر آیا، چراغ علی اس سے ملنے گئے۔ اس نے ان کا تقرر سو روپیہ ماہوار کی جائداد نائب تحصیلداری پر جو اتفاق سے اس وقت خالی تھی فوراً کر دیا۔ اسی طرح بستی سے لکھنؤ پہنچے۔ اس زمانے تک انہوں نے اتنی علمی استعداد حاصل کر لی تھی کہ ان کے مضامین لکھنؤ کے رسالوں میں چھپنے لگے۔ لکھنؤ میں آ کر انہیں اہل علم و فضل کی صحبت کا موقع ملا۔ جس سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ پادری عماد الدین کی تاریخ محمدی کا جواب لکھ کر اسی زمانۂ قیام لکھنؤ میں انہوں نے شائع کیا جو نہ صرف علماء اسلام کو پسند آیا بلکہ سر سید احمد خاں نے جنہوں نے تہذیب الاخلاق میں ایک نئی روش اختیار کی تھی بڑی داد دی۔ عام مسلمانوں نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور چراغ علی اب مولوی چراغ علی کہلائے جانے لگے۔ سر سید نے ان کی ذہانت اور علمی شخصیت کی اتنی قدر کی کہ انہیں تہذیب الاخلاق میں مضمون لکھنے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح مولوی صاحب، اسلام پر جو اعتراضات ہو رہے تھے ان کے جواب دینے اور عیسائیوں کو اسلام اور اس کے پیغمبر کی خوبیوں سے واقف کرانے میں لگ گئے اور اسلامی فرقوں کی آپس کی کج بحثی سے ہمیشہ دور رہے۔ چنانچہ یہ مشہور واقعہ ہے کہ مردم شماری کے نقشوں میں اپنی بیگم صاحبہ کو تو انہوں نے شیعہ لکھا ہے لیکن اپنے اور اپنے بچوں کے نام سے آگے نقطے لگا دیا۔

لکھنؤ سے ان کا تبادلہ سیتاپور ہو گیا۔ وہاں انہیں سر سید احمد خاں کے لکھنؤ آنے کی خبر ملی اور وہ سر سید سے ملنے لکھنؤ آئے۔ دونوں کا غائبانہ تعارف تو خطوط اور تہذیب الاخلاق کے مضامین کے ذریعہ سے ہو چکا تھا۔ رو برو کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ انہیں جو جوہری ہوتے ہیں وہ مہدی علی اور مشتاق حسین کی طرح سر سید کی طرف کھنچے ہوئے چلے گئے۔ سر سید کو جس جوہر کی تلاش تھی وہ انہیں مل گیا۔ انہوں نے مولوی صاحب کو سینے سے لگایا، سر پر بٹھایا اور خوب چمکایا۔ دوسرے لفظوں میں مولوی صاحب رخصت لے کر علی گڑھ پہنچے اور سر سید نے انہیں انگریزی اور عربی کی مستند کتابوں کے مطالعہ اور ان کے تراجم میں لگا دیا جس کی اس وقت مذہبی نکتۂ نظر سے ضرورت تھی۔ اس دور میں عیسائی مشنریوں کے ساتھ تبلیغی کاموں کے لئے سرمایہ ہونے کے علاوہ حکومت کی پوری تائید حاصل تھی۔ عیسائی مذہب میں داخل ہونے سے روحانی برکت حاصل ہو یا نہ ہو اخلاقی حالت سدھرے یا نہ سدھرے مگر دنیاوی بہتری کا دروازہ ضرور کھل جاتا تھا۔ برہمو سماج اور اس کے بعد سوامی دیانند سرسوتی کا آریہ سماج بھی اسی روک تھام کے لئے انتھک کوشش میں لگا ہوا تھا۔ پڑھے لکھے مسلمان نئے فلسفے کے شیدا ہو کر اور اپنے پرانے دقیانوسی عقائد سے جو رفتہ رفتہ مذہب میں داخل ہو کر تو مذہب ہی چھوڑ چکے تھے بعض تشکیک میں پڑے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنے محققانہ مضامین میں وہ مسائل بحث میں اٹھائے اور وہ مسئلے نئے رنگ میں حل کئے کہ سر سید کو ان کی ذات سے بڑی بڑی توقعات پیدا ہو گئیں۔ سب جانتے ہیں کہ سر سید بعض معاملات میں بڑے ضدی تھے لیکن وہ ان استادوں میں نہ تھے جو شیخ سعدی کے

کس نیاموخت علم تیر از من   کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

کے خوف سے اپنے ساتھیوں سے محتاط رہتے ہیں۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ ان کے ساتھ والے اونچے اٹھتے چلے جائیں اور ان کو

اپنی قابلیت اور اہلیت کے اظہار کے برابر موقعے ملتے رہیں۔ چند ہی دنوں میں چراغ علی صاحب کی جامع قابلیت اور وسعت نظر کا سکہ بیٹھتا گیا اور آخر یہاں تک کہ انہوں نے مہدی علی (محسن الملک) کے ذریعہ سر سالار جنگ کو اطلاع دی کہ جیسے شخص کی آپ کو تلاش تھی مجھے مل گیا ہے۔ [illegible] کی تاریخ میں یہ بڑی نزاکت کا زمانہ تھا۔ سر سالار جنگ کی ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے کی خدمات بھلائی جا رہی تھیں اور وہ سلطنت برطانیہ کی بدلی ہوئی پالیسی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آقا کے دیرینہ وقار کو قائم رکھنے اور ریاست کے نظم و نسق کو جدید دور کے مطابق بہتر بنانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ جنرل سر رچرڈ میڈ فوجی خدمات کے علاوہ مختلف ممالک کا ڈپلومیٹک سفر بھی کامیابی سے ختم کر چکے تھے مخصوص حیثیت سے ان کا اثر گورنمنٹ آف انڈیا میں تھا۔ ان کو حیدرآباد کا ریذیڈنٹ بنا کر بھیجا گیا وہ سر سالار جنگ کو نیچا دکھانے کے جوڑ توڑ میں لگے ہوئے تھے اس کشمکش کے زمانے میں سر سالار جنگ نے مولوی صاحب کو فوراً حیدرآباد طلب کر لیا، اور سررشتہ مال میں محسن الملک کے مددگار کی حیثیت سے ان کا تقرر چار سو ماہوار پر کر دیا اور چند ماہ کے بعد ہی ان کو سات سو ماہوار اسی عہدے کی تنخواہ ملنے لگی۔

سرسید کے مشن اور ان کے کاموں کے ساتھ جو عقیدت میری گھٹی میں پڑی ہے اس کو وقار عالی کردار مصنف اور اعلیٰ عہدے دار کے معاملے میں ایک اضافہ اور ہوا تھا کہ مولوی صاحب مرحوم کے فرزند محبوب علی جو ناظم اسمبلی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے علیگڑھ کالجیٹ اسکول میں ۱۸۸۵ء میں میرے ہم جماعت تھے۔ ہم دونوں کی عمریں اتنی نہ تھیں کہ اس سے زیادہ کچھ یاد رکھ سکیں کہ مرحوم بھاری بھرکم جسم، بڑے سر، روشن آنکھوں والے تھے۔ اتنا خیال بھی ہے کہ بچوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ بچے ان سے ڈرتے نہ تھے اور وہ بچوں کی نا سمجھی کی باتوں میں دل بہلاتے تھے البتہ محسن الملک سے ان کے متعلق بہت سنتا رہا۔ محسن الملک کی یہ عادت تھی کہ کالج اور قوم کے کاموں سے جب وہ فارغ ہوتے تو اور نہانے کے کمرے میں بیٹھ کر دادی صاحبہ مرحومہ سے جو عربی فارسی میں کافی دستگاہ رکھتی تھیں، اپنے حیدرآباد کے پرانے ساتھیوں اور ہم عصروں کی اکثر باتیں کیا کرتے تھے اور اسی طرح ہمیں مولوی چراغ علی صاحب نواب اعظم یار جنگ بہادر کی بہت سی خصوصیات معلوم ہوئیں۔ محسن الملک اعظم یار جنگ سے تقریباً سات سال بڑے تھے، اور بارہ سال بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے آج کوئی پچاس برس کے بعد ہم ایسے خزاں رسیدہ کو سب سے زیادہ جو تکلیف ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں باہمی اختلافات کے باوجود محبت و خلوص تھا، جو آج مفقود ہے وہ بھلائیاں یاد رکھتے تھے اور ہم برائیاں۔ مثلاً علی گڑھ کے معاملات میں بعض امور میں نواب محسن الملک اور وقار الملک کا خصوصاً کالج میں انگریز اسٹاف کے معاملے میں اختلاف تھا لیکن جب میکڈانل سے جو اس وقت اس صوبے کے لفٹنٹ گورنر تھے ۱۹۰۰ء میں محسن الملک کے خلاف ہو گئے تو نواب وقار الملک ہی سب سے زیادہ محسن الملک کے ساتھ اُردو کی حمایت میں پیش پیش تھے۔ اسی طرح ان کی وفات کے بعد ۱۹۰۷ء سے ہمیں یہ محسوس ہوتا رہا کہ وقار الملک سے زیادہ ہمارے اس غم میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔

محسن الملک جب معتمد مالگزاری تھے اور مولوی چراغ علی صاحب مرحوم ان کے مددگار تھے جب وہ معتمد پولیٹیکل و فنانس ہوئے مولوی صاحب مرحوم کا تقرر ان کی جگہ معتمدی مال پر ۱۸۸۳ء میں ہوا۔ ان دونوں کی حیدرآباد میں یکجائی ہونے کے پہلے ہی سے محسن الملک مولوی صاحب مرحوم کی عربی و فارسی کی قابلیت اور طرز تحریر کے مداح ہی نہیں تھے بلکہ ان کو انگریزی زبان پر کافی عبور رکھنے والا اور اظہار خیال پر قادر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس زمانے کے مسلمانوں میں ان کا عبور نواب عماد الملک اور سر امیر علی سے کم نہ تھا۔ وہ مولوی صاحب کو ان دونوں ادیبوں سے زیادہ محقق اور گہرا خیال کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں مولوی صاحب تفریحی مشاغل اور ظاہری شان و شوکت کے لوازم سے بالکل بے نیاز تھے۔ انہیں نہ توصیف و تعریف کی پروا تھی نہ وہ مخالفت کی پروا کرتے تھے۔ نواب محسن الملک یہ بھی کہتے تھے کہ ان کے مددگاروں اور دوسرے عہدے داروں میں مولوی صاحب مرحوم ہی ایسے تھے جنہوں نے ان کے عروج کے زمانے میں بھی ان کی دل جوئی

بلکہ انہیں ملال اور رنج بھی جنہیں یہ توقع ہوتی کہ سرکاری یا غیر سرکاری معاملات میں وہ ذاتی تعلقات یا دوستی کی وجہ سے اپنی رائے بدل دیں گے۔

سرکاری معاملات میں جب تک وہ مقدمے کے پورے حالات و واقعات سے واقف نہ ہو جاتے کبھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ وہ معاملے کی تہ تک اس درجہ پہونچ کر رائے تحریر کرتے تھے کہ کبھی پوچھنے کی نوبت نہ آتی۔ ان کی اس حق پسندی اور بے لاگی کی اس درجہ شہرت ہوگئی تھی کہ ان تک بڑے سے بڑے افسر یا صاحب رسوخ آدمی کی سفارش پہونچانے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ امیر، امراء، جاگیردار، دولتمند انہوں نے کبھی ان لوگوں سے ذاتی تعلقات بڑھانے کی یا ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی ضرورت نہ سمجھی اور چونکہ ان سے مطلب برآری کی کسی کو توقع نہ تھی اس لئے مطلبی لوگ ان سے ناخوش رہتے تھے۔ وہ ہر قسم کی پالیٹکس سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ باوجود اس کے انہیں نواب سر آسمان جاہ کے زمانۂ وزارت میں معتمد مالگزاری چھوڑ کر مساوی حیثیت پر گلبرگہ صوبہ داری پر جانا پڑا اور نواب وقار الملک گلبرگہ سے ان کی جگہ آئے کیونکہ سر آسمان جاہ کے لئے نواب وقار الملک کو حیدرآباد میں اس خدمت پر رکھنا ضروری تھا وہ اس وزارت میں علاوہ اس وقت کے ناک کا بال سمجھے جاتے تھے۔ جب محسن الملک اپنے عہدے پولیٹیکل و فنانس کی معتمدی سے علیحدہ ہوئے تو اس جگہ پر نواب اعظم یار جنگ کو بلا لیا گیا۔

قبل اس کے کہ ان کی انتظامی قابلیت اور معاملات سرکاری میں انہماک کا ذکر کیا جائے یہ بیان کر دینا مناسب ہوگا کہ جو علمی شغف اور تصنیف و تالیف کی دھن انہیں حیدرآباد میں مستقلاً رہنے میں آنے سے پہلے تھی اس میں یہاں آکر اور اضافہ ہی ہوا۔ وہ اپنے کتب خانے پر جتنی ان کی ماہوار آمدنی بڑھتی گئی زیادہ خرچ کرتے گئے۔ ان کے مذہب کے ایک مولوی صاحب عبداللہ خاں ٹونکی مل گئے، جو ان کے لئے نایاب کتابیں مہیا کرتے اور علمی مباحث میں حصہ لیا کرتے۔ ان مولوی صاحب کو انہوں نے نادر اور قلمی کتابیں تلاش کر کے لانے کے لئے مصر تک بھیجا۔ وہ رات گئے تک آرام کرسی پر لیٹ کر کتاب پڑھا کرتے تھے اور اکثر اسی کرسی پر ان کی آنکھ لگ جاتی جب جاگتے تو پھر پڑھنے لگتے یا میز پر جا کر لکھنا شروع کر دیتے۔ وہ مشکل سے تین چار گھنٹے سوتے تھے۔ انگریزی ادب پر پوری قدرت حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے لیٹن اور گریک بھی سیکھی تھی وہ انگریزی زبان میں ایسی شستہ عبارت لکھنے لگے تھے کہ مسٹر جسٹس محمود جو کسی کو بہت کم مانتے تھے کہتے تھے کہ مولوی صاحب کا دماغ ایسے ایسے مقامات پر پہونچ جاتا تھا جہاں عام مصنفین نہیں پہونچتے۔

فرائض منصبی کی ادائیگی کے علاوہ مولوی صاحب ریاست حیدرآباد کی ایک بڑی خدمت جاگیرات پر ایک مفصل کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے ہزاروں مسلیں دیکھ ڈالیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کون سی جاگیریں کن کن شرائط کے ساتھ ملیں اور پھر اس میں نسلاً بعد نسل کیا تبدیلی ہوئی۔ جاگیر کا رقبہ کیا ہے۔ جاگیردار کیا خدمت ریاست کی انجام دیتا ہے۔ محاصل کیا ہے۔ کاشتکار اور دیگر باشندگان جاگیر کے حقوق اور ذمہ داریاں کیا ہیں۔ ادارہ کیا ہے۔ وصول کا طریقہ کیا ہے۔ بلکہ سرکاری دفاتر میں مواد نہ ملنے کی وجہ سے انہیں جاگیرداروں سے رجوع کرنا پڑا۔ بعضوں نے تو ان کے خطوط کا جواب تک نہیں دیا اور دل میں طرح طرح کے گمان کرنا شروع کر دئے۔ میرا خیال ہے کہ نواب صاحب مرحوم کو یہ کام ادھورا ہی چھوڑنا پڑا۔ اگر ان کے ہاتھوں جاگیرداری کی تاریخ مکمل ہو جاتی تو صیغۂ انعام و عطیات کو نئی نئی الجھنوں اور جاگیرداروں کو آئے دن کے مقدمات کی پیروی سے نجات مل جاتی۔ اور جاگیرداروں کے مشاہرہ کی جو صعوبتیں اٹھانا پڑیں ان سے چھٹکارا نصیب ہو جاتا۔

ان کو سرکاری خط و کتابت میں انشاء طرازی سے سخت نفرت تھی اور نہ کبھی وہ ایسے الفاظ سے متاثر ہو کر ایسی لفاظی کو ذرا التفات کر کے پڑھتے تھے۔ اس معاملے میں ان کی خفگی کا باعث یہی تھا کہ وہ اپنے مفوضہ کام کو کبھی ٹال کر نہ رکھتے تھے۔ وہ دفتر میں زیادہ بیٹھنے کے عادی نہ تھے۔

سر سالار جنگ کا انتقال بالکل ایک ہی دن کی بیماری میں ۸ ربیع الثانی سنہ ۱۳۰۰ ہجری کو ہو گیا۔ اور مستقل انتظام ہونے تک جناب راجہ نریندر بہادر کے سپرد وزارت کا کام کیا گیا اس وقت سے لارڈ رپن کے آنے اور مرحوم نظام کے تخت نشین ہونے تک مختلف امراء وزارت کا خواب دیکھتے

ہے کہ ایک گروہ واقی علی خاں کا حق جتاتا تھا اور سرآسمان جاہ اور وقارالامراء کو اس منصب پر فائز دیکھنا چاہتا تھا۔ ہر طرف سے بڑے بڑے پیچیدار پروپیگنڈے شروع ہوئے۔ سرخورشید جاہ کا تو ایک دو جگہ نام بھی آگیا۔ مسٹر پلو اور دوسرے ان کی جگہ حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنے لگے۔ محسن الملک اور عماد الملک نے واقی علی خاں کو ان کے باپ کا تمام مقام وزارت پر بھی حکومت ہند سے منوا لینے کی ترکیبیں کرنا شروع کر دیں۔ پوری ریاست بھر میں صرف مولوی چراغ علی اور نواب اکرام اللہ خاں دو شخصوں کا نام لیا جاتا ہے کہ ان کو ان جھگڑوں قضیوں سے کوئی دور کا تعلق بھی نہ رہا۔ نواب اکرام اللہ خاں تو سرسالار جنگ کے مرتے ہی استعفا دے کر چلے گئے۔ اور چراغ علی خاں نے سالار جنگ کی زندگی ہی میں جو کتاب حیدرآباد دکن انڈر سرسالار جنگ لکھنا شروع کی تھی اپنے گھر بیٹھے خاموشی سے بغیر اس خیال کے کون وزارت کا مستحق قرار پا کر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ اس کتاب کی تکمیل میں مشغول رہے۔ سرسالار جنگ کو معلوم تھا کہ یہ کتاب لکھی جا رہی ہے اور اس کے کچھ جز چھپ بھی چکے تھے لیکن اس کی اشاعت اور تکمیل ان کے مرنے کے بعد عمل میں آئی اور انہی کے نام سے منسوب کی گئی۔ اس کتاب کی چار جلدوں میں تمام انتظامات اور محکموں اور صیغوں میں جو اصلاحات ہوئیں ان کو مفصل بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک اور مستند کتاب گذشتہ دور کی اور سرسالار جنگ کے زمانے تک ختم کی جو تاریخی اور انتظامی معاملات پر ہے جو اس وقت بہت پسند کی گئی تھی اور انگریزی اخبارات نے تعریفانہ ریویو کئے تھے۔ مسٹر کارڈری ریذیڈنٹ نے مولوی صاحب موصوف کو ایک پرائیویٹ خط میں اس کی اشاعت پر مبارک باد دی تھی اور ان کی محنت اور لیاقت کی تعریف کی تھی سنہ ۱۸۸۳ء کی اڈمنسٹریشن Administration رپورٹ جس کی آج تک تعریف کی جاتی ہے بڑی تفصیل کے ساتھ سو سے زیادہ صفحات پر شروع سے آخر تک انہی کی لکھی ہوئی تھی۔ یہ رپورٹ ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور سرکار انگریزی میں ریذیڈنسی سے مسٹر کارڈری کے تعریفی نوٹ کے ساتھ بھیجی گئی تھی۔ ان کی ملازمت کے سلسلہ کا ایک اور بڑا کارنامہ حیدرآباد کا پہلا باقاعدہ تفصیلی بجٹ ہے جس کی جامعیت کے ساتھ ساتھ اس کی اختصار اور صفائی بھی قابل تعریف قرار دی گئی۔ اس بجٹ کی خصوصیتوں کا آگے چل کر خود مسٹر کراس کو اعتراف کرنا پڑا۔ مسٹر کراس نواب وقارالامراء کی وزارت کے زمانہ میں حیدرآباد پر کنٹرولر جنرل کی حیثیت سے مسلط کئے گئے تھے تاکہ وہ مالی معاملات کی جو ابتری اور جاگیروں کی فروخت اور عجیب مصارف پیدا ہو گئے۔ اور جن کی وجہ سے آگے چل کر دو کروڑ قرضہ لینے کا سوال پیدا ہوا، روک تھام ہو سکے۔ انہوں نے رپورٹ تیار کی اس میں شاہی اخراجات کو بہت بڑھا چڑھا کر دکھایا اور اس پر بڑی کڑی تنقید کی اور نظم و نسق کے ہر شعبے میں تخفیف مصارف کی بھی تحریک کی۔ مولوی صاحب اس وقت فنانشل سیکرٹری تھے۔ ان کے کانوں میں جب یہ بھنک پڑی کہ ایک انگریز کنٹرولر جنرل بنا کر یہاں لانے کی ترکیبیں ہو رہی ہیں اس کی روک تھام تو ان کی طاقت سے باہر تھی انہوں نے فنانس پر جو مستند کتابیں مل سکتی تھیں منگا کر دو ماہ میں ان سب کو پڑھ ڈالا۔ جب مسٹر کراس آئے اور ان سے سرکاری ملاقاتیں ہوئیں تو انہیں پتہ چلا کہ یہ موٹا سیاہ فام اور بڑی بڑی آنکھوں والا دیسی آدمی علم جدید کے مالیہ کے اصولوں اور ان کی دقتوں سے ان سے زیادہ واقف ہے۔

مسٹر پلاؤڈن اس وقت ریذیڈنٹ تھے۔ انہوں نے سرآسمان جاہ سے وزارت کی کرسی خالی کرائی تھی محسن الملک اور وقار الملک کو پہلے ہی ریاست سے باہر کرایا تھا۔ فتح نواز جنگ بھی علیحدہ کئے جا چکے تھے۔ نواب وقارالامراء بہادر کو وزارت پر لا کر ان کی جا بے جا تائید کر رہے تھے۔ ایک طرف تو انہیں بڑے بڑے شاہی مصارف کا رونا تھا۔ اور دوسری طرف حضور نظام کو مجبور کر کے ہیرا خریدوایا تاکہ اس طرح وقارالامراء کا قرضہ ادا ہو سکے اور یہ الزام اٹھایا جائے کہ وزیر اس قدر قرض دار ہے۔ اگر مولوی چراغ علی کا دم نہ ہوتا تو ریلوے کے شیئرز جو لندن میں بکھر رہے تھے بک ہی جاتے اور نظام اسٹیٹ ریلوے ہاتھ سے نکل جاتی۔ انہوں نے جمع و خرچ کا ایک صاف اور واضح Balance sheet تیار کیا کہ پلاؤڈن کو اس سے اتفاق کر کے تعریف کے ساتھ حکومت ہند کو بھیجنا ہی پڑا۔ انہیں ایک عرصے سے ذیابیطس کی شکایت تھی لیکن وہ آرام لینا جانتے ہی نہ تھے اس مرض کا آخری دور جب شروع ہوا تو اس زمانے میں بھی وہ اپنے مشاغل میں مصروف رہے۔ آرام لینا تو ان کو آتا

ہی دفعہ ان کی گردن سے اوپری حصے پر ایک گلٹی نکلی۔ حیدرآباد کے مشہور سرجن ڈاکٹر لارس نے کئی مرتبہ شگاف دیا اور مواد نکالا لیکن وہ جراحی عمل کے بعد اور کمزور ہوتے گئے۔ ان کے عزیز ان کو لے کر بمبئی گئے اور بہتر سے بہتر ڈاکٹروں کو دکھایا مگر جب انسان کا وقت آ جاتا ہے کسی کی دوا کارگر نہیں ہوتی اور جہاں کی مٹی نصیبوں میں ہوتی ہے قسمت وہیں لے جاتی ہے۔ ان کو بمبئی گئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہہ کر وہیں دفن ہو گئے۔

جن خوبیوں اور خصائل کے وہ تھے ایسے انسان کم پیدا ہوتے ہیں۔ وہ نہایت منکسر المزاج تھے نام و نمود کی ان کو خواہش نہ تھی۔ حتیٰ کہ نواب اعظم یار جنگ بہادر خطاب ملنے کے بعد انہوں نے کبھی نوابی کی شان جو اس وقت تو آج سے بھی زیادہ جتائی جاتی تھی کبھی نہیں دکھائی۔ انہوں نے ہمیشہ مولوی چراغ علی کے نام سے منسوب ہونا ہی پسند کیا۔ وہ اپنے ابتدائی زمانہ ملازمت میں جس طرح سے لوگوں سے ملتے تھے اسی طرح معتمدی کے زمانے میں بھی ملتے رہے۔ وہ اپنے دوستوں اور عزیز و اقربا کی نہایت خندہ پیشانی سے مدد کرتے رہتے اور اس طرح سے مالی مدد کی کہ مدد حاصل کرنے والوں کو اپنی کم مائیگی کا احساس نہ ہو۔ روپیہ کو وہ واقعی ہاتھ کا میل سمجھتے تھے۔ نوکروں پر آقائی نہیں جتاتے تھے نہ کبھی سخت لفظ ان کے منہ سے نکلا تھا اور وہ نوکر کے قصور پر چاہے کتنا ہی وہ نقصان کرے غصے کا اظہار کرتے تھے۔ ذیابیطس کی شکایت کی وجہ سے اور پہروں جاگنے کی عادت کی بنا پر رات کو کئی دفعہ پانی پینا پڑتا مگر وہ نوکر کو آواز نہیں دیتے خود ہی اٹھ کر پی لیتے۔ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف نہ تھے ان کی خاموش طبعی کی وجہ سے کچھ کا کچھ سمجھتے۔ وہ چونکہ اپنے وقت کی بہت قدر کرتے تھے اس لئے جو لوگ ان سے ملنے آتے ان کو صرف مطلب کی بات ہی کہنے دیتے۔ جب سرسید کو ان کی وفات کی اطلاع ہوئی تو ان کو جس قدر رنج ہوا وہ اس مضمون سے ظاہر ہے۔ جو تہذیب الاخلاق کی کسی جلد میں موجود ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

> "افسوس، ہزار افسوس۔ صد ہزار افسوس کہ پندرھویں جون ۱۸۹۵ء کو نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی نے بمقام بمبئی چار ہفتے کی بیماری میں انتقال کیا۔۔۔۔۔۔۔۔"
>
> "افسوس کہ پندرھویں تاریخ کو جبکہ ہم بمبئی کا لفافہ ان کے نام روانہ کر رہے تھے۔ اور خیر و عافیت چاہ رہے تھے اسی وقت انہوں نے بمبئی میں انتقال کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حیدرآباد میں سالار جنگ اعظم نے انہیں بلایا تھا اس زمانے سے اس وقت تک متعدد انقلابات حیدرآباد میں ہوئے۔ اور وہ یہاں بھی قائم رہے گمان کرو کہ بجز اپنے کام کے کسی سے کچھ کام نہ تھا۔ ان کو بجز اپنے کام اور علمی مشغلے کے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حیدرآباد میں یا دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔"
>
> "انگریزی زبان میں بھی انہوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مذہب اسلام کے ایک فلاسفر حامی تھے۔ ہمارے سچے دوست تھے۔ ایسی خوبیوں کے شخص کا انتقال کرنا ایسے زمانے میں کہ ان کی عمر کچھ بھی زیادہ نہ تھی نہایت افسوس اور رنج کے لائق ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ افسوس ہے کہ وہ مضمون اور اصل سوال کا جواب جو انہوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھنا چاہا تھا ناتمام رہ گیا اور اب امید نہیں کہ کوئی شخص اس اصل سوال کو حل کرے گا۔"

وہ سوال جس کا ذکر اقتباس بالا میں ہے دو ماہ پیشتر تہذیب الاخلاق میں شائع ہو چکا تھا اور یہ اعلان بھی ہو چکا تھا کہ اس کا جواب مولوی صاحب مرحوم لکھ رہے ہیں جو انگریزی میں کتاب کی شکل میں "العلوم الجدیدۃ والاسلام" کے نام سے شائع ہو گا۔ سوال یہ تھا کہ اکثر لوگوں کی رائے ہے کہ جدید علوم و فنون کی تعلیم عقائد اسلام سے برگشتگی پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو جدید علوم و فنون کے ان مسائل اور ان کے دلائل کو بیان کرنا چاہئے جو اس برگشتگی کا باعث ہیں اور ان کتب مذہبیہ اور ان مقامات کا نشان ضروری ہے جن کو تعلیم میں داخل کرنے سے اس برگشتگی کی روک ہو سکے اور اگر یہ رائے صحیح نہیں ہے تو اس کی عدم صحت کا بیان جہاں تک ممکن ہو مفصل اور مدلل بیان کیا جائے۔

مذہبی تصانیف میں ان کی پہلی کتاب "تعلیقات" کے نام سے ۱۸۷۲ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی اس میں انہوں نے پادری عماد الدین کی کتاب "تاریخ محمدی" کا جواب دیتے ہوئے یہ لکھا کہ اس کے ماخذ غلط ہیں حضرت عیسیٰ اور انجیل پر تفصیلی بحث کی تھی اس کے بعد انہوں نے انگریزی میں متعدد کتابیں "ریفارمز انڈر مسلم رول" "محمدی جہاد" وغیرہ لکھیں۔ "تحقیق الجہاد" میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ جہاد کی حقیقت جتلاتے ہوئے انہوں نے اسباب کو دکھایا ہے کہ پیغمبر اسلام کے زمانے میں جو لڑائیاں لڑی گئیں اس میں کفار کو قتل کرنا اور تلوار کے زور سے ان کو مسلمان کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ وہ سب حالت مجبوری میں اپنے بچاؤ کے لئے لڑی گئیں۔ ایک اور کتاب میں انہوں نے اسلام کی دنیوی برکتیں دکھلائی ہیں۔ "ایام الناس" جو اردو میں لکھا ہوا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے اس میں اس اعتراض کو مٹایا ہے کہ قرآن میں کوئی بھی کرامت ثبت نہیں۔ اس کتاب کے لکھنے میں انہیں بڑی محنت برداشت کرنا پڑی ہوگی اور کافی دقتیں ان کتابوں کے مہیا کرنے میں اٹھانا پڑی ہوں گی جن پر انہوں نے استدلال کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے قدیم یونانی اور عبرانی مورخوں کے حوالے سے ان قوموں کا وجود ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد رسالے لکھے ہیں اور کئی کتابیں نا تمام حالت میں چھوڑ گئے۔ ان رسالوں میں "غلامی"، "تعدد ازدواج" بہت مشہور ہیں۔ مسٹر ولیم میور نے جو قرآن پر اعتراضات کئے تھے اس کے جواب میں انہوں نے "رد شہادت قرآنی بر کتب ربانی" لکھی تھی۔

مولوی امیر حسن صاحب مرحوم جو محسن الملک کے چھوٹے بھائی تھے جنہوں نے اپنے نامور بھائی کی کتاب "آیات بینات" کا جواب "آیات محکمات" کی شکل میں عمر کا بہت حصہ صرف کیا، فرماتے ہیں کہ مذہب پر کتاب لکھنے والوں میں جو روش مولوی صاحب مرحوم کی تھی اس کی بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کے اعتراضات و جوابات سے یہ پتہ چلانا دشوار تھا کہ وہ سنی ہیں یا شیعہ، مقلد ہیں یا غیر مقلد۔ وہ جہاں تک ہو سکتا قرآن ہی سے استدلال کرتے تھے۔ عام رائے یہ ہے کہ مولوی چراغ علی اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ محقق اور وسیع النظر تھے۔ ان کی تقریباً سب کتابیں اسلام کی حمایت میں ہیں جن میں نہ لفاظی اور نہ عبارت آرائی ہے اور نہ خواہ مخواہ فصاحت و بلاغت دکھائی گئی ہے وہ واقعات کی تنقید و تنقیح صحیح نتائج کے استخراج اور معلومات علمی سے لبریز ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی تحریریں جوش اور گرمی سے عاری ہوں گی اور نہ دل چسپی کی ہوں گی جن سے نہ جذبات ابھر سکیں گے اور نہ دل بہل سکیں گے ان میں محض منطقی سرد مہری ہوگی۔ انہوں نے دنیا کو اپنی تصنیفات سے دکھلا دیا کہ مذہب اسلام ہی ایک مذہب ہے جس میں ترک دنیا و ترک لذات کے بغیر روحانی ترقی کے مدارج طے کرنے کے ذرائع موجود ہیں۔ وہ ان عالموں میں سے تھے جن کو صحیح معنوں عالم باعمل کہا جاتا ہے۔ جو وہ لکھتے تھے اس پر خود عمل بھی کرتے تھے۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا، وہ ایک شفیق باپ اور مخلص دوست تھے۔ ادائے حقوق میں وہ کامل تھے اور اپنی بات کے پکے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بیکار صرف نہیں کیا۔ وہ ایک ایسی مثال چھوڑ گئے جس کی پیروی کر کے دین اور دنیا دونوں سنبھل سکتے ہیں۔

۱۱ امرداد ۱۳۰۴ف فصلی کے جریدہ اعلامیہ میں ان کی وفات پر حسب ذیل اعلان شائع ہوا۔

> نواب مدار المہام سرکار عالی نے نہایت درجہ افسوس کے ساتھ سنا کہ مولوی چراغ علی صاحب اعظم یار جنگ بہادر معتمد مال و فنانس سرکار عالی نے بتاریخ ہشتم امرداد ۱۳۰۴ف فصلی بروز شنبہ بمقام بمبئی جہاں وہ علیل ہو کر بغرض علاج و تبدیل آب و ہوا گئے تھے انتقال ہو گیا۔ مرحوم ایک نہایت لائق کارگذار، واقف کار، ذی علم، مستقل مزاج اور سنجیدہ عہدہ دار تھے۔ نواب مدار المہام سرکار عالی کمال اظہار افسوس کرتے ہیں کہ طبقہ عہدہ داران میں سے مولوی چراغ علی صاحب مرحوم کے ایسے منتخب اور برگزیدہ شخص کے انتقال سے

درحقیقت بہت نقصان پہونچا"۔

ان کا سوگ مسلمانوں نے ہر جگہ منایا اور انگریزی اور اُردو اخبارات میں تعزیتی مضامین چھپے اور ان کی قومی، مذہبی اور علمی خدمات کو سراہا گیا۔ متعدد قطعے، تاریخیں اور نظمیں لکھی گئیں۔ "شمائے اعظم یار جنگ" سے اُن کے وفات کی تاریخ ۱۳۱۲ھ ہجری نکلتی ہے۔ مولانا حالی نے جو قطعہ لکھا تھا اس کے چند شعروں سے مولوی چراغ علی مرحوم کی اس عظمت کا جو سر سید کے حواریوں کے دل میں تھی پتہ چلتا ہے، وہ یہ ہیں:۔

مستفیداں پے نبردہ وا این معنی ہنوز　　مشتے از گنجینۂ لعل و گہر پاشید و رفت
از سحاب فیض بگلشن ناشدہ سیراب خلق　　صاعقے برق یمانی از افق تابید و رفت
کردنے آغاز خلق احسان سلطانی ادا　　نے دلی رنجید نے کس را برنجانید و رفت
یاوران قوم را تا زیست یاور بود و یار　　ہرچہ جز راست است در تائید شاں کوشید و رفت

سر سید محمود نے ان کی انتقال کی خبر سنتے ہی کہا:۔

حیف چراغ علی از دُنیا نہاں شد

اس سے ان کی وفات کی تاریخ سنہ عیسوی بھی نکلتی ہے۔ سید محمد حامد علی صاحب کاکوروی نے جو اُن کے ساتھ حیدرآباد میں کام کر چکے تھے تاریخ کہی:۔

"گوہر شب چراغ بروز ماند"

مختصر یہ کہ مولوی چراغ علی نواب اعظم یار جنگ بہادر اُن ہستیوں میں سے تھے جو پیوند خاک ہو جانے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ ان بزرگوں کی یاد آتے ہی مسلمانوں کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اُردو ان کی مذہبی زبان نہیں ہے اور نہ اکیلے انہی کی بنائی ہوئی ہے۔ مگر اس کے مٹنے ہی سے سر سید، محسن الملک، وقار الملک، اعظم یار جنگ، حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ ایسے بزرگوں کو حقیقی موت آ جائے گی، اور اگلی نسل میں کوئی اُن کا نام بھی نہ سن سکے گا۔

خدا وہ وقت نہ لائے!

نظام رامپوری

شاد عارفی

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ — دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

اگر آپ حیران نہ ہوں اور آپ میری چند سالہ تحقیق و تلاش پر بھروسہ کریں تو میں آپ کو یہ اطلاع فراہم کر سکتا ہوں کہ اوپر دیے ہوئے حضرت نظام کے مطلع میں پہلا مصرع حضرت نظام رامپوری کا نہیں بلکہ نواب کلب علی خاں صاحب المتخلص بہ نواب کے فکر کا نتیجہ ہے جسے مرحوم نے کلکتہ کے کسی شاعر سے متاثر ہو کر نظم کیا اور باہر کے شعرائے دربار سے اس پر گرہ کی فرمائش کی۔ اپنے اپنے رنگ میں سبھی نے زور لگایا مگر مصرع کا واقعاتی رنگ کسی کی گرہ برداشت نہ کر سکا۔ چونکہ یہ مصرع حضرت نظام صاحب کے ڈھب کا تھا چنانچہ انہوں نے کہا، دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ ——— مصرع دست و گریبان ہو گیا تھا۔ اس لئے نواب صاحب نے اظہار خوشنودی کے طور پر اپنا مصرع یہ کہہ کر نظام رامپوری کو عطا کر دیا کہ یہ مصرع تم ہی نے تو اور حضرت نظام نے بھی کوئی نہیں کی یہ کہ وہ کوئی جاگیر نہیں تھی جسے اوڑھا بچھایا جا سکتا ——— اور پھر اس مطلع پر پوری غزل کہی جو حضرت نظام صاحب کے دیوان کا ماحصل ہے اور یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ ہر دیوان میں ایک غزل اور ہر غزل میں ایک شعر بے پناہ ہوتا ہے۔ حالانکہ نظام رامپوری کی ایک اور غزل بھی ماحصل دیوان ہے جس کا یہ مطلب ہوا کہ حضرت نظام کے دیوان میں دو غزلیں وہی خصوصیت رکھتی ہیں۔ جو کسی اور شاعر کے دل پورے دیوان میں ہوتی۔ اس غزل کا ایک مصرع یہاں سنتا اور تفصیل بعد میں آئے گی۔ فرماتے ہیں ———

اے کیا بات تھی کیا بھول گیا

تو ہاں ——— آپ میری اس اطلاع پر حیران ہوئے ہوں گے لیکن مجھے اپنی اس تحقیق پر کتنی پشیمانی ہوئی تھی بیان نہیں کر سکتا لیکن اس طرح حضرت نظام کے عقیدت مندوں کو ٹھیس لگی تھی لہٰذا ان حضرت کو بھی کسی کے ذریعہ پتہ چلا تھا۔ جو ذرا ابن الوقت اور خود ہی قسم کے آدمی تھے ان سے اس لئے بدگمان ہو گئے کہ ماشاء اللہ نو خیز نہیں تو زادہ ہیں میں نے بے ساختہ کہا تھا ——— ارے بھئی …… اس مطلع کا پہلا مصرع صدر "ردیف و قافیہ" نظام کے تقد ہو گیا ہے۔ نہ کہ "نوک انظام" والی بات ہے۔ وہ کس طرح؟ انہوں نے پوچھا ——— تم بھی سمجھو ——— انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے ———

مضمون ادا ہو چکا ——— "مرا قشہ کے ہاتھ" ——— بجھا رنگ لگا کر وہ چلا گیا تھا - بالکل یوں جیسے کوئی کہے - میں نے ناک سے پھول سونگھا —— یا پھر - علی حزیں کا یہ مطلع دیکھو جس پر حضرت غالب نے بیجا اعتراض کیا تھا -

ز رشک نازکی آں نازنیں سوار ہنوز   کہ سبزہ می دمد از انگشت زنہار ہنوز

پہلے مصرع میں "ہنوز" متقدما کا رنگ اور ذائقہ ہے - یہی تو کہا ہے کہ مطلع میں شاعری کی پول کھلتی ہے - بہر حال - جب میں آتش کی طرح جوان تھا اور میری شاعری اختر شیرانی کی مسعودہ کی طرح جوان العمر - تو مجھے حضرت نظام کا یہ مطلع سنایا گیا - میں اس وقت زوائد وغیرہ سے واقف نہ تھا - اس لئے پورے مطلع پر پھڑک گیا کیونکہ میری شاعری کی بنیاد بھی اس وقت "واقعات" اور "معاملوں" پر قائم تھی - مثلاً

—— چھپائی ہیں جس نے میری آنکھیں میں انگلیاں اُس کی جانتا ہوں —— وغیرہ

اس لئے حضرت نظام رامپوری کا دیوان دیکھنے کی فکر پڑی - بڑی تلاش کے بعد ایک معمولی قسم کے (چپل چٹے) شخص کے پاس دیوان ہونے کی خبر ملی - پہونچا —— مگر وہ مست کے "سے تھے اس لئے پہلے تو صاف انکار کر گئے پھر میری التجاؤں پر کچھ پسیجے اور کہنے لگے کہ تم میرے سامنے دیکھ سکتے ہو مگر یہیں سے جا سکتے نہ اس کی نقل کر سکتے ہو - ایک شعر بھی نہیں - جی نہیں - اور انھوں نے دیوان بغل میں داب کر گھر چلنے کی ٹھانی - میں نے پھر عاجزی سے کام لیا تو ٹھہر گئے —— یہ قلمی دیوان تھا - لکھائی بہت بری - کاغذ بھی بادامی اور گلا سڑا —— کچھ دن متواتر ایک ایک گھنٹہ مطالعہ کر کے بہت سے شعر یاد کر لئے اور روز ایک نوٹ بک پر گھر آ کر نقل کرتا رہا - جب اس طرف سے مطمئن ہوا تو ان اشعار کا بغور مطالعہ کیا - تو صاف ظاہر ہوا کہ حضرت نظام اپنے ماحول سے تنگ آ کر جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ شخصی حکومت کے خوف سے نہ کہہ سکے - اس لئے جگہ جگہ بات چبا گئے ہیں - مثلاً

—— ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو ——

یا پھر

—— جیسے ہم بن جائے بیٹھے ہیں ——

اب حال نظام کچھ نہ پوچھو   غم ہوگا تمہیں اگر کہوں گا

کچھ آپ کو خبر بھی ہے بیتِ نظام کی   بیچارہ تنگ آ کے وطن سے نکل گیا - وغیرہم

حالانکہ یہ بیچارے نے کبھی ترک وطن نہیں کیا نہ کر سکتے تھے - مگر اس طرح وہ اپنی التجاؤں کو حسن طلب سے آگے لے گئے تھے اور جیسا کہ مجھے تحقیق ہوا اُن کی زندگی سخت مالی مشکلات کا شکار رہی - "انتقادیات" کا پہلا مضمون "میاں نظام شاہ رامپوری" ہے جس میں نیاز فتحپوری نے کسی تجسس سے کام نہیں لیا - ورنہ یہ کبھی نہ لکھتے کہ (جب میاں نظام شاہ کی شاعری کی خبر شہر میں عام ہوئی تو نواب نے انہیں بلایا اور منصب مقرر کر کے شعرائے دربار کا سلسلہ سے وابستہ کر دیا) - حیرت ہے کہ نیاز فتحپوری نے کس بنیاد پر منصب مقرر کرنے کا دعویٰ کیا ہے جبکہ کوئی تحریری سند یا اسٹیٹ گزٹ وغیرہ میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا - اس عبارت کے فوراً بعد انتقادیات میں ایک کھٹکتا ہوا جملہ اور بھی ہے کہتے ہیں (کہا جاتا ہے کہ میاں نظام شاہ نے اس کے بعد خود نواب سے فن شعر حاصل کیا) اس جملہ معترضہ کے صاف دو معنی ہیں - جس میں انتقاد پسندی کھلنے والے کو دوسری جانب بہکانے جاتی ہے - سمجھ میں نہیں آیا کہ جس کا منصب ہو جو نواب کا شاگرد ہو اس کی زندگی اس قدر تنگ رہی کہ یا وحشت یا شاید - مکان گر پڑا تو بنا نہ سکے - مفلسی کی بنا پر بیوی ایک بچہ [illegible] لے کر اپنے گھر جا بیٹھی اور پھر زندگی بھر واپس نہ آئی - یہاں نیاز فتحپوری کو ایک اور ٹھوکر

گئی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے انتخابات میں لکھتے ہیں کہ سید نظام شاہ نے ساری عمر تجرد میں بسر کی اور قلیل معاش پر نہایت صبر و توکل سے زندگی گزار دی۔ تعجب ہے کہ اپنے انتخابات میں نیاز فتح پوری منصب داری کا ذکر بھی کرتے ہیں اور تجرد کا بھی دعوے کرتے ہیں۔ لیکن قلیل معاش پر زندگی گزارنے کے متعلق اقرار کرتے ہیں۔ نواب کلب علیخاں صاحب نواب کا شاگرد اور قلیل معاش۔ منصب دار اور فاقے — ایسے متضاد بیانات ہی سے شک گزرتا ہے کہ واقعہ یہ نہیں ہے جو احتیاطاً یا مصلحتاً درج انتخابات کیا گیا ہے۔ حقیقت جو میری تحقیق میں آئی جس کے راوی حق گو اور معتبر تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ غلط۔ اُن کا منصب و نصب کچھ نہیں تھا۔ جوانی میں اپنے والد سید احمد شاہ صاحب کی جگہ سواروں میں نوکر ہوئے تھے۔ مگر اپنے لا اوبالی پن اور صوفیانہ روش اور شاعرانہ مزاج کے بنا پر یہ نوکری چھوڑ دی تھی۔ تنگ دستی کی وجہ سے بیوی عموماً پریشان رہتی تھی اور ایک لڑکے کی ماں بھی بن چکی تھی۔ اسی لئے فاقے کرتے کرتے تنگ آ کر گھر بیٹھ رہی اور سید نظام شاہ صوفی منش حضرات کی صحبت میں گزارتے رہے۔ بیوی کی جدائی اور اُس کی یاد نے وہ تمام باتیں یا مسائلے شعر میں ڈھالنے شروع کئے جو دل پر گزر رہے تھے گویا یہ اشعار ہیں جو ادا بندی اور معاملہ بندی کی مظہر ہیں۔ سب اُن کے گھر والوں سے متعلق ہیں۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ وہ انتہائی پاک باز قسم کے صوفی تھے۔ میں اس قسم کے دعوے کیوں کر رہا ہوں آپ گھبرائیں نہیں میں اُن کا معتبر راویوں کے ذریعہ ثبوت دوں گا۔ میں نے جس قدر وقت سید نظام شاہ کی زندگی پر لکھنے پر صرف کیا ہے۔ اور جہاں جہاں قدرت نے خلاف توقع وہ اسباب فراہم کر دیئے۔ جو سید نظام شاہ پر لکھتے وقت کسی کو نصیب نہ ہوں اُن کے لئے میں مشیت اور اُن کرم فرماؤں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری بڑی رہنمائی کی ورنہ میں تھک کر بیٹھ رہتا۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ سید نظام شاہ حضرت بیمار شاگرد و حضرت مومن کے شاگرد تھے۔ بعد میں صوفی علی احمد شاہ صاحب سے اصلاح لینے لگے —— مگر ایک سوال ہے جو بار بار مجھے ستا رہا ہے وہ یہ کہ مولوی صوفی علی احمد شاہ صاحب ان اشعار پر کیا اصلاح دیتے ہوں گے جن کا تعلق معاملہ بندی اور خلوت سرائے سے ہے اس سے ماننا پڑے گا کہ یہ سید نظام شاہ صاحب کی اپنی طبیعت ادا کا نتیجہ تھا۔ نیاز فتح پوری نے یہ کہہ کر سب سے الگ بات کہتے ہیں ایسی شان تخلیق معلوم ہوتی ہے سید نظام شاہ کو جرأت سے متاثر یا ان کے رنگ میں کہنے والا بنایا ہے حالانکہ اُن کا رنگ یا تو میر تقی سے ملتا جلتا ہے یا پھر نواب سیف الدولہ سے۔ اب میں ان تینوں شعراء کا کلام یکجا کر کے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں آپ خود اندازہ کریں گے کہ یہ ایک ہی شخص کا کلام ہے یا تین الگ الگ رجحانات طبع کا نتیجہ۔

جس کا تو آشنا ہوا ہوگا
اُس نے کیا کیا ستم سہا ہوگا
تیرا اخلاق اک قیامت ہے
غیر کا حال کیا ہوا ہوگا
دردِ دل اپنا میں اُس شوخ سے کہتا کیسی
جو چھپانے میں مزا ہے نہیں اظہار کے بیچ

گھر جانے کا کاکل نے نرالا ڈھب نکالا ہے
ہر ایک سے پوچھتا ہے اس کو کس نے مار ڈالا ہے
غیر سے کہتے ہیں وہ میرے ستانے کے لئے
ڈھونڈ لیں گے ہم بھی کوئی دل لگانے کے لئے
رات دن یہ سوچا رہتا ہے میرے دل کے تئیں
اے خدا وہ یاں سے جا کر کس کا مہمان ہوا

اُس پاس پھر گیا دل گمراہ کیا کروں
دم مارنے کی بات نہیں آہ کیا کروں
بے وہاں جائے بھلا ہم سے رہا جائے کہاں
دل ہے اور اس بزم میں جانے کا مزہ جائے کہاں
شب ہی چاہتا تھا جس کے پاس سے اک دم سرکنے کو
سو اس کے در پہ اب رخصت نہیں ہے سر پٹکنے کو

ان اشعار کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ میر سوز۔ نظام شاہ اور نواب آصف الدولہ جو میر سوز کے شاگرد بھی تھے قریب قریب ایک ہی رنگ میں کہتے تھے۔ اوپر دیے ہوئے تین تین شعروں میں ہر پہلا شعر میر سوز کا ہے دوسرا شعر نظام رامپوری کا اور آخری شعر نواب آصف الدولہ کا ہے۔

عبدالشکور صاحب پرنسپل گورنمنٹ رضا ڈگری کالج رامپور نے "نظام رامپوری" کے نام سے جو مجموعہ شائع کر دیا ہے اس میں موصوف نے بھی یہ بات مان لی ہے کہ نظام رامپوری کا ناظم رامپوری یعنی نواب یوسف علی خاں کا شاگرد ہونا محل نظر ہے۔ اور یہ کہ انہیں شاعر دربار ہونے سے کوئی مالی منفعت نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ انہوں نے نواب یوسف علی خاں صاحب ناظم اور نواب علی خاں صاحب نواب کی تعریفوں میں قصیدے تک لکھے (قصیدے میں ان کا رنگ بہت پھیکا ہے اور ان پرشکوہ الفاظ سے خالی ہے جو قصیدے کی جان ہوتے ہیں) ان قصائد کا نتیجہ بھی صفر رہا ہوگا ورنہ وہ تنگی معاش میں مبتلا نہ رہتے۔ چنانچہ انہوں نے یہاں تک کہا کہ مصرع

—— شب کو فرمائش سرکار نے سونے نہ دیا ——

سیّد نظام شاہ ۱۲۳۵ھ میں نواب احمد علی خاں صاحب بہادر کے عہد میں رامپور میں پیدا ہوئے۔ صحیح النسب سیّد تھے۔ ان کا سلسلہ بارھویں پشت میں حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ نیلا تہبند باندھے رہتے تھے اور کبھی کبھی سیاہ بھی۔ خلیق۔ ملنسار اور متقی قسم کے صوفی تھے۔ تین صاحبزادگان وقت کا سودا سلف خریدنے پر رقتی ملازم تھے۔ ان سے جو کچھ مل جاتا صبر و شکر کے ساتھ اس پر قناعت کر لیتے تھے —— یہ قناعت کا لفظ مجبوری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ورنہ وہ کوئی باقاعدہ متشرع اور مذہبی آدمی نہ تھے۔ صوفی مرد تھے لیکن صوفی اور قانع لازم و ملزوم نہیں رہے ہیں۔ اس لیے اگر وہ اتنے ہی نفس کُش تھے تو نواب یوسف علی خاں ناظم کے قصیدے کیوں لکھتے۔ نواب کلب علی خاں صاحب نواب کی مدح اور فرمائش سرکار کے سلسلے میں اپنی راتیں کیوں کالی کرتے۔ ظاہر ہے کہ ان کو کبھی وہ فراغت نصیب نہ ہوئی جس کے وہ دربار سے متمنی تھے۔

سیّد قیصر شاہ میاں جو نظام شاہ کے ساتویں لڑکے تھے۔ (ان سے پہلے چھ لڑکوں کا انتقال ان کے سامنے ہی ہو گیا تھا) اور اپنی والدہ کے ساتھ تھانہ پیلا تالاب پر رہتے تھے۔ جب میں ان سے ملا ہوں تو وہ بہت ضعیف اور عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ اپنے والد کی شاعری بابت قریب قریب کچھ نہیں جانتے تھے۔ خود پڑھے لکھے نہ تھے۔ اس لئے اپنے والد کی بے پروائی کے سخت شاکی تھے انہیں یہ قطعی معلوم نہیں تھا ان کے والد کو ناقدریٔ زمانہ نے اس بری طرح پیسا تھا کہ وہ لکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

—— ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا فسانہ ہو ——

ہاں ایک مثنوی کے بابت کہتے تھے جو ان کی والدہ کے پاس تھی جسے کوئی صاحب دیکھنے کو مانگ کر لے گئے اور پھر واپس نہ لائے —— ماسٹر امتیاز صاحب کشفاد — جو ڈرائنگ ماسٹر ہیں اور ایک اچھے آرٹسٹ بھی ایک روز میرے پاس میرا فوٹو کھینچنے آئے اور اس پر کچھ عمل کرنا چاہتے تھے۔ باتوں باتوں میں نظام صاحب کا ذکر آ گیا تو موصوف نے اپنے والد کے حوالے سے سیّد نظام شاہ صاحب کے بارے میں عجیب روایت بیان کی انہوں نے کہا کہ میرے والد جن کا اس عہد کی پسندیدہ ہستیوں میں شمار ہوتا تھا اپنا چشم دید حال بیان کرتے تھے کہ پہلے ہم لوگ بھی گھیر کتی میں رہا کرتے تھے وہیں سیّد نظام شاہ صاحب کا آبائی مکان بھی تھا جس کو انہوں نے بیوی سے ناچاقی کے بعد قریب قریب ترک کر دیا تھا صرف رات کو سونے کے لئے یہاں چلے آتے تھے اور دن بھر علی نور صاحب کی خدمت میں رہا کرتے تھے علی نور صاحب اس عہد کے ایک اچھے بزرگ تھے۔ ان کا ایک لطیفہ بھی سنتے چلئے۔ افغانستان سے ایک مولوی علی نور صاحب سے بیعت کے لئے آئے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ جب یہ موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ خربوزہ کھا رہے تھے۔ افغانی مولوی نے دیکھتے ہی کہا۔ لاحول ولا قوۃ میں کیا سمجھ کر

آیا تھا اور یہاں تو کچھ اور ہی دیکھ رہا ہوں۔ علی نور صاحب اس پر مسکرائے اور کہا۔ مرشدنا۔ اللہ میاں تو روزہ نہیں رکھتا۔ نظام بھی بلا کے تیز آدمی تھے۔ کہنے لگے۔ اللہ میاں روزہ تو نہیں رکھتا مگر وہ خربوزہ بھی نہیں کھاتا ہے ——— آپ اس جواب پر بڑے خوش ہوئے اور فوراً مرید کر لیا اور کہتے ہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں دولت فقر سے مالا مال کر دیا ——— جب سید نظام شاہ کا انتقال ہوا تو صحیح نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس وقت علی نور صاحب کی قدموں میں تھے یا کسی اور مکان میں مگر یہ سنا ہے کہ ان کا انتقال مسکونہ مکان میں نہیں ہوا اور انتقال کے بعد علی نور صاحب کے مقبرے ہی میں کہیں دفن ہوئے۔ نیاز فتح پوری نے یہ جو کہا ہے کہ انتقال کے بعد سید نظام شاہ اپنے پیر علی احمد شاہ صاحب کے قدموں میں دفن کئے گئے قطعاً موضوعی حیثیت رکھتا ہے۔ ہاں تو گھنشا رام کے والد کا بیان ہے کہ جب میاں نظام کا انتقال ہوا تو امیر احمد صاحب مینائی نے آکر نظام صاحب کے مسکونہ مکان میں حکومت کی طرف سے ایک اور قفل ڈال دیا سوئم کے بعد امیر مینائی نے ہی یہ مکان کھولا۔ غزلیات کے مسودے اور کچھ اشعار جو دیواروں پر کوئلہ سے لکھے ہوئے تھے نوٹ کئے اور ان کو ساتھ لے گئے۔ چونکہ پیر جی ان کی بیوی کو [illegible] نے یہاں ایک عجیب و غریب بات کہی۔ مجھے چونکہ کسی حقیقت کو چھپانا منظور نہیں ہے اس لئے وہ سب کچھ بے کم و کاست بیان کرتا ہوں حالانکہ امیر صاحب مینائی میرے دادا استاد ہیں کیونکہ میں فصاحت جنگ حضرت جلیل کا شاگرد رہا ہوں۔ رام گھنشا رام صاحب کے والد کا یہ خیال تھا کہ وہ اشعار جو امیر مینائی کے کلام میں نہیں ملتے یہ وہی اشعار ہیں جو وہ نظام شاہ کے مکان سے اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ میں نے جیسا سنا تھا آپ سے بیان کر دیا اب یہ آپ پر ہے کہ اسے قبول یا رد کریں ——— پھر بھی امیر مینائی سے اس قسم کی بدگمانی کی نسبت درست نہیں۔ ابھی میں نظام شاہ صاحب سے متعلق کچھ لکھنے پر سوچ ہی رہا تھا کہ مصداق مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔ کے طور پر ایک شخص میری غزل کا مطلع سن کر پوری غزل حاصل کرنے کو آ گئے۔ یہ امیر مینائی خاندان کے قدیم خدمتگذاروں میں ہیں۔ ان سے بھی سید نظام شاہ صاحب کا تذکرہ چھڑا تو وہ کھل پڑے۔ کہنے لگے کہ آپ حافظ بچھند عرف پنڈت سے ملئے جو کٹ کوئیا محلہ میں رہتے ہیں اور پھر انہوں نے پنڈت کے متعلق سب کچھ بعد خود ہی بتایا۔ پنڈت ان کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ یہ حافظ بچھند اور پنڈت کا کیا معاملہ ہے میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ منیر پورہ میں ایک بزرگ رہتے تھے۔ حافظ بچھند نے ان کی کرامت کا امتحان لینے کے لئے پنڈت کا روپ دھارا اور حاضر ہوئے۔ وہ بزرگ حقہ پی رہے تھے۔ حقہ آگے بڑھا کر کہا۔ پنڈت جی پیو ——— انہوں نے پنڈت ہونے کا عذر کیا تو فرمایا یہ تو ٹھیک ہے مگر ہمارے ہاں پنڈت اور شیخ سب برابر ہیں۔ بہت شرمندہ ہوئے اب پی لو ——— راز کھل گیا مگر یہ پنڈت کے نام سے ایسے مشہور ہوئے کہ لوگ ان کا نام بھول گئے۔ تو ان پنڈت کو سید نظام شاہ صاحب سے والہانہ محبت تھی ہر وقت ان کی خدمت میں رہتے اور ہر شعر اور ہر غزل کے متعلقات انہیں یوں حفظ تھے جیسے وہ اس کے مالک ہوں۔ ان پنڈت نے ہی لوگوں پر یہ راز فاش کیا تھا کہ انگوٹھی بھی وہ لینے نہ پائے آغا کے ہاتھ یہ مصرع تو آپ قلب علی خان کا مصرع تھا جس پر نظام رام پوری نے پہلے تو مصرع پہنچایا اور پھر پوری غزل کہی جو حاصل دیوان ہے۔ پنڈت نے یہ بھی بتایا کہ آخر عمر میں ایک مہترانی جو گھر میں کمانے آتی تھی سید نظام شاہ صاحب اس سے محبت کرنے لگے تھے (مگر بے لوث اور پاک) پنڈت کا کہنا ہے کہ وہ مہترانی بھی بڑی مزاج شناس تھی۔ جب نظام صاحب خاموش ہوتے یا کوئی شعر کہتے ہوتے تو وہ کوئی نہ کوئی چٹکی لے لیتی تھی اور نظام صاحب پھڑک جاتے تھے ——— ایک مرتبہ وہ بیمار پڑ گئی اور کئی دن تک نہ آئی تو آپ آبدیدہ بھی ہوئے اور اس کی مزاج پرسی کو اس کے گھر بھی تشریف لے گئے ——— پنڈت کہا کرتے تھے کہ ان کے کسی شعر میں محبوب کو ہاتھ لگانے کا ذکر نہیں ملتا۔ یہی نظام صاحب کا کردار تھا ——— اور یہ بات قرین قیاس یوں بھی ہے کہ نظام صاحب کے ہاں جو ابتذال کا کوئی شعر نہیں ملتا۔ وہی ننگی سی کیفیت۔ وہی حیا اور رکھ رکھاؤ جو ایک پاکباز شاعر کے ہاں ہوتا ہے نظام صاحب کا رنگ ہے۔ سید نظام شاہ صاحب کے تین دیوان کتب خانہ سرکاری میں موجود ہیں ایک مطبوعہ اور دو قلمی۔ قلمی اور مطبوعہ میں زمین آسمان کا فرق ہے کئی کلام اور اچھے اشعار مطبوعہ دیوان میں نہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً دو دیوانوں کی اشاعت

کے بعد دستیاب ہوئے ہوں گے۔ مطلب یہ کہ نظام شاہ صاحب کا دیوان تو دراصل ایک ہی ہے مگر قلمی نسخوں میں بقیہ اشعار بطور ضمیمہ شامل ہیں۔ شعرائے دربار رامپور جن میں میرے دادا استاد امیر مینائی بھی شامل ہیں نے حتی المقدور نظام کو ابھرنے سے روکا جس کے نتیجہ میں وہ درباری مشاعروں میں شریک تو ضرور ہوتے تھے مگر وہ منفعت حاصل نہ کر سکے جو ان کے حسب حال ہوتی۔ انتقال کے بعد یہ بھی نہ ہو سکا کہ ان کی کلیات شائع کر دی جاتی چنانچہ امیر مینائی نے ترتیب دے کر ایک دیوان سرکاری کتب خانے میں داخل کر دیا اور بس۔ وہ تو یہ کہیے کہ تمکنت رامپوری کو اس کا خیال آیا اور اس نے بڑی جانفشانی کے بعد ان کی کلیات اور وہ اشعار جو زبان زد تھے جمع کر کے شائع کرا دئے۔ چند اشعار اور پیش کرتا ہوں ہو سکتا ہے کہ ان کا کچھ زیادہ تعلق ان کی زندگی سے نہ ہو مگر اچھے اشعار سننے میں حرج ہی کیا ہے۔

تم سے کچھ کہنے کو تھا بھول گیا — ہائے کیا بات تھی کیا بھول گیا
خوش ہوں اس وعدہ فراموشی سے — اس نے ہنس کر جو کہا بھول گیا

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینہ میں وہ — اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو
کروٹ بدلنے میں جو دوپٹہ سرک گیا — گھبرا کے دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں — کیا منہ پہ اس نے رکھ لئے آنکھیں چرا کے ہاتھ
بے اختیار ہو کے جو میں پاؤں پر گرا — ٹھوڑی کے نیچے اس نے دھرا مسکرا کے ہاتھ
وہ زانوؤں میں سینہ چھپانا سمٹ کے ہائے — اور پھر سنبھالنا وہ دوپٹہ چھڑا کے ہاتھ
دینا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظام — منہ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

سوتے ہیں جان شال کے الٹائیں نہ دو — ہاں آنکھ آپ کی ہے منظر لگی ہوئی

کہتے ہیں سب یہ میری باتیں ہیں — تجھ کو شاعر بنا دیا میں نے

اس دست نگاریں کو ذرا میں نے چھوا تھا — کس ناز سے کہنے لگے اُف چھوڑئے گا ہاتھ

مرا کچھ حال دل کہتا اور اُس کا — وہ کہنا چپکے سے منہ پھیر کر کچھ
یہاں کہتا ہوں کچھ میں ہائے قسمت — وہاں کچھ دیتے ہیں ہنسا پھیر کچھ
نظام ایسے ابھی شاداں نہ تھے تم — خوشی کی وجہ کسی نے کیا خبر کچھ

کس نے کوسا تھا خدایا مجھ کو — کہ مجھے عشق بتاں ہو جائے

پھر نہ کہنا کہ مجھے تم نے کہیں دیکھا ہے   سیر دریا میں کئی بار وہیں دیکھا ہے
گر کوئی پوچھے مجھے، آپ اسے جانتے ہیں   ہو کے انجان وہ کہتے ہیں کہیں دیکھا ہے

بعد رنجش وہ مل کے پوچھتے ہیں   ہم نہ ملتے تو آپ کیا کرتے

مری جانب سے تم کو دشمنوں نے خط یہ لکھے ہیں   بھلا ایسا میں لکھ سکتا ہوں یہ تحریر میری ہے

قاصد تری باتوں کا تو ہے اور ہی مطلب   ان باتوں کا خط میں کہیں مذکور نہیں ہے

ہمدم نہ کہہ وہ بات جو دل کو بری لگے   اُس بیوفا سے گو مری رنجش بجا ہے

بھری ہیں اُن میں جو کچھ کدورتیں   جائے گی پر ابھی نہیں جاتی

چھپ چھپ کے دیکھنے کا مزہ دیکھتے تمام   یہ خیر گزری اُس کی ادھر کو نظر نہ تھی

شاد عظیم آبادی

سید حسن امام

خان بہادر سید علی محمد شاد (۱۲۶۲ — ۱۳۴۵ھ)

"خون نگار شہید" قسم کے بہاری کہے جانے والے مشاہیر میں شاد نہیں تھے جن کی ہستیاں خاک بہار میں پیوند کر دینے کے بعد یہ گل سرسبد کا تھا۔ میر و درد کی اپنی اپنی خصوصیتوں کا دل پکڑ لینے والا مجموعہ تیار کرنے کی فطری صلاحیت انہی کو ودیعت ہوئی تھی۔ بہاری خمیر کی مجبوریاں ہی سہی مگر ہزار بے قدری سے بھی گوہر "شب چراغ" آنکھوں سے اوجھل کب رہ سکتا تھا؟ شاد پر زمانے کی نظریں پڑتی ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کا احترام اپنی اپنی جگہوں پر رکھنے کے بعد بھی شاد خود اپنی بہاری بولی پر نازاں تھے۔ بدقسمتی سے ان کو "نادان دوست" تو ملے مگر دانا دشمن تک نہ ملا۔ نتیجہ یہ کہ اُن کے اکثر "بول" بزبان غیر ترجمہ ہو گئے۔

شاد کی شخصیت بہت ہی الجھی ہوئی سی ہے۔ کیا باعتبار ذاتی توقعات اور اس کے ماحصل کے کیا ماحول اور اس کی اقتضا کی نسبت سے۔ ان باتوں کے شواہد اور اثرات ان کے کردار اور کلام میں صاف نظر آتے ہیں۔ ان کے فرمودات پر جہاں تک خیال آرائی کی گئی ہے اس میں ان کی ذات کو معرض بحث میں لانے سے عموماً پرہیز کیا گیا ہے۔ اگر کسی طرح یہ ان کو زیر بحث لایا بھی گیا ہے تو اس میں معترضین نے جلیل قسم کی غیر واجب احتیاطیں برتی ہیں اور معترضین بری طرح اپنا بھانڈا پھوڑ بیٹھے ہیں۔ سچ۔ [illegible] "مردم" — کہنے کا مستحق شاد سے بہتر کیا ہوگا۔ ماہنامہ ندیم گیا کا شاد نمبر بصورت جناب حمید عظیم آبادی امیری اور ادارت میں شائع ہوا تھا۔ متکلم اسلام، شاد کو ثابت کرنے کے لئے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کا زور قلم ادا آ گیا تھا مگر شاد کی شخصیت کی تابانی یا تاریکی کو اُجاگر کرنے کے لئے کوئی روشن ضمیر جرأت نہ کر سکا تھا۔ ایک کھلی وجہ اس کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاد کی ذات خود اپنے فرمودات کے حجابات سے باہر آنے کی کبھی عادی ہی نہیں ہو سکی چونکہ شاد وہ بیں اکثر تنگ ہی رہتی تھی۔ لہٰذا بقول:
ہر کہ میدان عمل وا دور کن جیند مرد۔ قول کسی کا بھی ہو مگر نبایں حال "شاد کی دس کی بجا ہی ہے۔ آج جب شاد شعرائے بہار کی صفوں سے پار اُتر کر صرف اُردو کے منفرد و مرآمد اساتذہ کرام میں شمار ہونے لگے تو ان کی شخصیت سے دلچسپی لابدی ہی ہے۔

شاد کے تالیف کردہ تذکرۃ الاسلاف کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دادا ذیل میں بجنوط مستقیم کوئی ہستی غیر معمولی

کی ہندوستان میں کمی نہیں تھی۔ مصاہرت کے ذریعہ ننھیالوں میں متعدد سادات ملتے ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ مورثین اور وارث کے مذہبی رجحانات ایک سے نہیں ہیں۔ جن نسبتوں سے شاد اپنا امتیاز قائم کرتے ہیں وہ سیادت سے گو کہ اتراک سے ملتی ہیں، یعنی علی وردی خاں صوبہ دار بہار، اڑیسہ و بنگال کے ذریعہ۔ ظاہر ہے کہ شاد کا سا حساس طبع اس کو بالکل نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ پھر "کڑوے پر نیم" یہ ہوا کہ متاع خاندانی کا صرف تبرک ہی تبرک شاد تک پہنچا۔ ان کے قریبی رشتہ داروں میں، صرف نادر تاریخ الاقبال ہی نہیں بلکہ کثیر الاملاک امراء بھی تھے، جن سے ہم چشمی برقرار رکھنی شاد کے ایسے نازک طبع کے لئے "بن کھائے سنگرام" سے کسی طرح کم نہ تھی۔ سادات بارہہ کی قرابتداریوں سے بھی شاد بہت دنوں مستفیض نہیں رہ سکتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے پہلے ہی سے رائے عامہ بادشاہ گر بھائیوں کو مطعون کرنے لگی تھی۔ شاد کے ہوش سنبھالتے ہی غیر جانبدار تھا اور ان کے آگے کی نئی پود اس بارے میں بلند آوازہ ہو چکی ہوگی۔ پھر انگریزی تسلط میں جو کارہائے نمایاں ان کے بڑوں نے کر دکھائے تھے مگر اس کے اجر "دو دو دنیا" میں سے پھوٹی کوڑی بھی شاد کی قسمت نہ ہوئی۔ ان سب باتوں کو زیر نظر رکھتے تو ان کے بیہودہ نکتہ چیں یوں مشق ستم نہ فرماتے۔ ع

زانکہ مجنوں را طفلاں پئے خود دیوانہ بود

اس پس منظر پر صرف سرسری نظر ڈالنے والے کا تاثر جب بعید از فہم ہے نہ خلاف توقع۔ تو پھر کون سی حیرت کی بات ہے کہ آنکھیں کھولنے کے بعد سے ان کو موند لینے کی رخصت پانے تک اسی پس منظر میں گزر بسر کرنے والا بھی اثر لئے بغیر رہ سکا؟ آخر شاد بھی انسان ہی تو تھے۔ مگر اتنا بھی کسی نے غور کیا اور نتیجے میں "الپنچ" کی قسم متحرک کر میدان میں نہیں کر دیا۔ بلکہ لکھنؤ والے مرزا مچھو بیگ کی آخری منزل بھی اسی ذیل میں ہے۔ اگر شاد اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے صرف "شاگرد فریاد" ہوتے تو فغاں و نالہ کرتے یونہی رہ جاتے اور کسی کو ان کی یاد بھی نہیں رہتی۔ مگر وہ تھے تمیذ فطرت سب طرح کے جھٹکے سہار گئے۔ خزاں کے دور سے گزر گئے مگر جب بھی بہار سازگار ہوئی تو کف گلفروش و دامن باغباں میں تر و تازہ نظر آئے۔

آباؤ اجداد میں مذہبی دو رنگی کوئی خاص بات نہیں ہوتی بشرطیکہ شاد بھی معمولی قسم کے آدمی ہوتے۔ لیکن ان کی صلاحیتیں خاص تھیں کہ اس ماحول اور صورت حال سے بھی استفادہ کئے بغیر نہ رہیں گی۔ چنانچہ منظر عام پر اب تک آئے ہوئے ان کے کلام میں "نوحہ" قسم کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ ان کے مراثی بھی اپنے انداز میں منفرد اس لئے ہیں کہ وہ بین و بکا کے چنداں قائل نہیں ہیں۔ اس صنف سخن میں جو فلسفیانہ طرز انھوں نے اختیار کیا ہے وہ ایسا ہے کہ مرثیہ گو اساتذہ میں وہ سب سے ممیز ہیں۔ ان کے مراثی کا مقبول عام نہ ہونا ان کی خوبیوں کی دلیل ہے۔ جہاں مراثی بذیل رسمیات مذہبی مروج ہیں وہاں کے مطالبات شاد پورے نہیں کرتے۔ اور جہاں ان کی مقبولیت مصدق ہے وہاں مراثی کا رواج نہیں۔ کہا جائے تو یہ ہوگا کہ محنت برباد گئی۔ شاد اس سے بے خبر نہ تھے۔ مگر جو اصلاح ان کے پیش نظر تھی اس کو دور کی کوڑی لانا کہہ سکتے ہیں۔ آج زمانہ اعتنا نہ کرے مگر وہ دن دور نہیں جب ان کی اتباع بغیر چارہ نہ ہوگا۔ نثری خطبات شہادت تو اس ڈھرے پر آ چکے ہیں۔ منظومات میں شرما حضوری، "رقت کے بند" "سخت جانی" کا ثبوت دے رہے ہیں۔ لیکن فلسفیانہ استدلال آہستہ آہستہ قدم جما رہا ہے اور یہ شاد ہی کے مراثی کی آواز بازگشت ہے۔

شاد کی ایسی تحریریں نظر سے گزری ہیں جن کے سطحی مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے اعتنائی کے ساتھ خود ستائی کی جا رہی ہے لیکن بین السطور غور کرنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ اس بظاہر خودستائی کی تان جا کر ٹوٹتی ہے خود اپنے ہی مرثیہ پر۔ مکاتیب کے بارے میں ان کو کسی قسم کا خطرہ ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے "[illegible]" کوشش وعدے کے ڈر سے جو بات وہ منہ سے نکالتے بھی نہیں تھے۔ وہ ان کا قلم "بے زبان" ہو کے کہہ سکتا تھا۔ بعض بعض خطوط کے کچھ مفاہیم ایسے نکلتے ہیں جن کو شاد کا مقصود واقعی باور کر لینا خود اپنے ذوق سلیم کی توہین ہونی چاہئے۔ شاد کے ایسا متین و متواضع شخص کن مجبوریوں میں گر گیا ہوگا جب اس کا قلم ایسا بے قابو ہوگا۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت تھی مگر اس دور میں کون پرکھ کرتا؟

شاد کی اس کمزوری سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ محبت کے ایسے بھوکے تھے کہ ذرا ذرا سے ہی پھوپھا پکڑ بیٹھنے والے کی پذیرائی میں یہ کلمہ بھی فرما سکتے تھے ؎

دوست آں دانم کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

دھوکے پر دھوکا کھاتے رہنے کے بعد بھی "دوبارہ کی ہوس ہے" شاد پکارتے ہی چلے گئے ۔ اس کا سبب ان کی عقل کی کمی نہیں بلکہ حسن ظن کی فراوانی!

رئیسوں کی اولاد ہونے کا بہت بڑا ثبوت انہوں نے یہ دیا کہ حاشیہ برداروں کی باتوں میں آگئے اور اپنے ہی اچھے برے میں تمیز کرنا بھول گئے ۔ جہاں انہوں نے اشرفیاں لٹانے میں دریغ نہیں کیا، وہیں کوڑیوں پر جواب لگانے میں عار بھی نہیں کی۔

شاد کی اخلاقی خوبیوں پر حرف گیری کے سد باب کے لئے اس قضیہ نامرضیہ کو یکسو کر لینے پر کوئی آمادہ نہیں ہے کہ حضرت حقیر بلگرامی کو شاد نے استاد زمیں، استاد فن یا استاد من لکھا تھا ۔ بہر حال یہ قصہ اس وقت اٹھایا گیا جب شاد دنیا سے اٹھ چکے تھے ۔ بھیڑ یقینی شاد والے ہونے کی ۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جا سکتا تھا مگر اس سے احتیاط کے باوجود قصہ کو طول دیا گیا ۔ خلاصہ یہ کہ "از ماست کہ بر ماست"!

جہاں تک مجھے معلوم ہے شاد کی خانہ آبادی اور خانہ ویرانی پر "نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد حرمانے" ہی قسم کی تھی ۔ صرف ایک صاحبزادے سید حسین مرحوم کا مجھے علم ہے ۔ باپ بیٹے کو یکجا دیکھ کر شاد کی حرماں نصیبی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔ عجیب عجیب قسم کے درد و اندوہ شاد کو قسمت ہوئے تھے ۔ انہی کا فرق تھا کہ صرف جنس بدل کر بسر کر لینے پر قادر نہ تھے بلکہ اب گھر بیٹھے بیٹھے بھی حیات فریاد کی تسوید ختم کر کے مانے ۔ اس کتاب کی تاریخی حیثیت جو بھی سہی مگر اخلاق و معاشرے کے سمجھنے میں اس کا مددگار ہونا ناقابل انکار ہے۔

"دلّی، لکھنؤ کے بعد پٹنہ" ضرب المثل کا حکم رکھتا ہے ۔ مرشد آباد کو اس گنتی میں کبھی لیا ہی نہیں گیا تا بدیگراں چہ رسد ۔ آج پٹنہ چاہے جو کچھ بھی ہو جائے مگر شاد کی جوانی کے دنوں پٹنہ ایسا باغ بہار تھا کہ پورب دروازہ سے لے کر پچھم دروازہ تک گلستان سعدی کا باب پنجم صفحۂ قرطاس سے سطح ارضی پر منتقل ہو کر جاندار ہوا چاہتا تھا ۔ اگر "زر دستی" یا نعوذ باللہ "زور دستی" شاد کو کہیں سے چھو بھی گئی ہوتی تو یاران طریقت ایک کی دس لگائے بغیر کب مانتے ؟ ۔ ایسی ایسی گلفشانی کرتے کہ باغ شاد کے افسانے کی حقیقت نہیں رہتی ۔ مگر یوں بھی باز آنے والے تھوڑے ہی تھے ؟ کھینچ کھانچ کر ایک "گل رعنا بہار" کو شاخ پر چڑھا ہی دیا ۔ خاموشی ہی کو پیچھے پڑے۔ اس بارے میں شاد کے ماننے والوں کا سکوت رہا ۔ "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" کی غلط فہمی کو ہوا دینے لگا ۔ حالانکہ واقعہ میں واقعہ صرف اسی قدر تھا کہ خانت برادری سے نکالی ہوئی بیبیوں کے پنجۂ ستم سے خوف زدہ، پناہ ڈھونڈتی آ لگی تھی ۔ شاد نے محبت کا ذکر کلمہ پڑھا دیا ۔ کیا غلط کیا ؟ مگر یہ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے کے باوجود مرد الزام قرار پائیں تو کہنا ہی پڑے گا کہ ع

ملزم بر گلستاں اگر گلے در دامنم باشد!

خلاصہ یہ کہ ۱۲۶۵ ہجری مطابق ۱۸۴۶ء کا پیدا ۱۳۴۵ ہجری مطابق ۱۹۲۶ء کو دنیا سے اٹھ گیا اسی برس ناشاد رہا مگر سب نے اسی کو شاد پکارا ؎

برعکس تخلص ہے مگر شاد کریں کیا
مجبور ہیں مشہور اسی نام سے ہم ہیں

ان کی غزلوں کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ۔ ان کو جانے سے اصرار ہے کہ ہم شاد کو بھی مرنے ہی نہ دیں گے ۔ اس میں شک کی گنجائش یوں نہیں کہ اپنے مرنے کا یقین ہو تو ٹھہرا!!

نصیر حسین خیال

شاہ ولی الرحمن ولی کاکوی

آں کہ او وصفِ حسنِ تو تقریر می کند
خواب ندیدہ را ہمہ تعبیر می کند

نقوش لاہور کے مدیر محترم کی خواہش ہے کہ میں نواب سید نصیر حسین خیال عظیم آبادی کی شخصیت پر نقوش کے شخصیات نمبر کے لئے ایک مضمون لکھوں۔ ان کا رجسٹرڈ خط موصول ہوا تو میں نے محض اس وجہ سے تعمیل ارشاد سے پہلو تہی کرنا چاہی کہ میں نواب صاحب کی شخصیت سے واقفیت نہیں رکھتا۔ لیکن دوسرے ہی دن مدیر محترم کا تار ملا کہ مضمون جلد بھیجئے تو کسی نہ کسی طرح تعمیل ارشاد کے لئے تیار ہو گیا۔

نواب صاحب صوبہ بہار کے ایک ممتاز و مقتدر خاندان کے چشم و چراغ تھے اور برصغیر پاک و ہند میں کون ایسا ہے جو ان سے واقف نہیں۔ لیکن اگرچہ مجھ کو شاعری میں شاد مرحوم سے تلمذ حاصل ہے اور کم از کم تین سال تک ان کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا ہے جس کو تیس سال کا عرصہ گزر چکا۔ یہ امر واقعہ ہے اور یہ بدقسمتی بھی کہ میں نے کبھی نواب صاحب کو دیکھا اور نہ ان کی گفتگو سنی کیونکہ اس زمانے میں وہ کلکتہ میں قیام کرتے تھے اور میرے سامنے کبھی پیش نہیں آئے۔

شخصیت نگاری ایک مستقل اور مشکل فن ہے اور اس کی تعمیر میں متعدد عناصر کارفرما ہیں۔ کسی کی شخصیت پر کوئی قلم نہیں اٹھا سکتا جب تک کہ اس نے اس شخص کو قریب سے نہ دیکھا ہو اور نہ اس کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوا ہو اور اس کی شکل و صورت، خط و خال، رفتار و گفتار، عادات و اطوار، اخلاق و افعال اور سیرت و کردار سے کما حقہ واقف نہ ہو اور ان سب صفات کا تجزیہ و تفصیل نہ کر سکتا ہو۔ لہٰذا میرا یہ مقالہ گویا ایک ایسے خواب کی تعبیر ہے جس کو دیکھا ہی نہیں۔ تاہم کچھ نہ کچھ لکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ مدیر محترم کو میں مایوس نہیں کرنا چاہتا لیکن میری اس تحریر سے نواب صاحب کی شخصیت اجاگر نہیں ہو سکتی۔ یہ تصویر نہیں بلکہ خاکہ ہے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ خاکہ بھی نہیں بلکہ چند لکیریں ہیں۔

نواب خیال صاحب بہار ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مشاہیر میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت ہنوز جاذب توجہ ہے۔ متعدد ارباب قلم نے مختلف اوقات میں نواب صاحب سے متعلق خامہ فرسائیاں کی ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے سب سے پہلے پروفیسر محمد عبدالحق مرحوم نے [illegible]

کے انتقال میں ایک مقالہ سپرد قلم کیا تھا۔ جنوری ۱۹۳۳ء کے ندیم میں سید رضا قاسم صاحب مختار حسین آیا اور یاس کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا مئی ۱۹۵۵ء کے نگار میں بھی ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ دوسرا معارف میں بھی کسی صاحب کا ایک مفید مقالہ شائع ہوا تھا جس میں نواب صاحب کے سفر مغرب سے متعلق دلچسپ بحث کی گئی تھی۔ اول الذکر تینوں مضامین میرے پیش نظر ہیں۔ ان میں سے تیسرے مضمون میں نواب صاحب کی ادبی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور پہلے دونوں مضامین میں ان کے حالات زندگی اور خاندانی تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انھی دونوں مضامین کی مدد سے یہ مقالہ ترتیب دے رہا ہوں اور اس میں کچھ مفید مباحث بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔

نواب صاحب کا خاندان نہ صرف جاہ و ثروت بلکہ علم و فضل میں بھی ممتاز تھا۔ محفوظ الحق مرحوم کا بیان ہے کہ آپ کے مورث اعلیٰ عرب سے ایران کو منتقل ہوئے جہاں اس خاندان کو اتنا عروج حاصل ہوا کہ سید حسین فیروزی شاہ طہران ہو گئے اور ان کے پوتے کبیر آقا شاہ گورنر ہرات مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد اس خاندان نے ہندوستان کا رخ کیا اور اس کے اکثر ارکان صوبہ داری و وزارت کے درجہ تک پہنچے۔ عہد مغلیہ میں بھی اس خاندان نے اپنی قدیم عظمت و شان کو برقرار رکھا۔ چنانچہ قطب الملک نواب سید عبداللہ خاں اور امیر الامرا نواب سید حسین علی خاں ہندوستان کی تاریخ میں "سید برادران" اور "بادشاہ گر" کے القاب سے مشہور ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے کچھ ایسا اقتدار قائم کر لیا تھا کہ درحقیقت یہی حکمران تھے اور اس دور کے شاہان مغلیہ محض گنجفے کے بادشاہ تھے۔ صوبہ بہار سید حسین علی خاں کی جاگیر میں تھا اور وہ عرصے تک عظیم آباد میں مقیم بھی رہے۔ نواب علی وردی خاں صوبہ دار بنگال و بہار بھی اسی خاندان کے ایک رکن تھے۔ اس خاندان کی چند اور شخصیتوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان میں سے اکثر کا تذکرہ تذکرہ گلزار ابراہیم مؤلفہ علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی میں موجود ہے۔ مثلاً نصیر الدولہ سید ہدایت علی خاں ضمیر بخشی الملک اسد جنگ بہادر صوبہ دار عظیم آباد تھے۔ ان کے صاحبزادے نواب غلام حسین خاں سیر المتاخرین کے مصنف تھے جو فارسی زبان میں تاریخ کی ایک مشہور کتاب ہے۔

اس خاندان کی دوسری شاخ نے پانی پت میں برگ و بار پیدا کئے جس کے گل سر سبد خواجہ حالی مرحوم تھے اور وہ شاد مرحوم کے ماموں ہوتے تھے۔ خواجہ محمد قاسم کے صاحبزادے صمصام الدولہ خان دوران امیر الامرا خواجہ محمد عاصم کا ذکر بھی اہم ہے۔ امیر الامرا نے میر تقی میر کے لئے ایک روپیہ روزینہ مقرر کر دیا تھا جو انھیں تقریباً پانچ سال تک جاری رہا۔ ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ نادر شاہی حملے میں بمقام کرنال امیر الامرا کو زخم کاری لگا اور وہ دوسرے دن انتقال کر گئے۔ ان کے صاحبزادے نواب اشرف خاں کے دو صاحبزادے تھے۔ احتشام الدولہ رستم علی خاں نواب بہادر رستم اور نواب محمد حسن خاں مرزا۔ یہ دونوں بھائی انقلاب زمانہ سے مجبور ہو کر ترک وطن کر کے نواب سعادت علی خاں بہادر کے ہمراہ صوبہ بہار و بنگال کو روانہ ہو کر بنارس میں رہنے لگے۔ یہ دونوں سید فضائل علی خاں بے تخلص والد سید محمد علی خاں کے بھائی تھے۔ یہ حضرات اسی خاندان کے افراد تھے۔

نواب خیال کی والدہ فاطمہ بیگم کے والد نواب سید محمد عیسیٰ خاں عیشی اور آپ کی نانی عارفہ بیگم کے والد نواب سید مہدی علی خاں مہدی اور بھائی نواب سید جلال الدین حسین خاں تاثیر بھی شاعر تھے۔ آخر الذکر شاد مرحوم کے حقیقی ماموں تھے۔ نواب خیال کے دادا نواب سید محمد محسن خاں محسن اور نانا نواب سید محمد عاشق خاں محسن نواب سید تفضل علی خاں تفضل کے صاحبزادے تھے۔ محسن کے صاحبزادے نواب سید فیروز حسین خاں اور نواب سید جعفر علی خاں تھے۔ فیروز حسین خاں کے صاحبزادے نواب سید نصیر حسین خاں خیال اور جعفر علی خاں کے صاحبزادے نواب سید صادق حسین خاں شمال تھے۔ شاد مرحوم نواب خیال کے حقیقی ماموں تھے۔

غرضیکہ یہ امر مسلم ہے کہ نواب خیال ایک جلیل القدر خاندان کے فرد تھے جس نے علم و ادب کی عظیم الشان خدمتیں کیں اور جاہ و اقتدار بھی حاصل کئے۔ آپ کی ولادت بقول پروفیسر محفوظ الحق [illegible] میں اور بقول رضا قاسم صاحب ۲۱ مارچ [illegible] کو عظیم آباد پٹنہ کے محلہ حاجی گنج میں ہوئی۔ آپ کی عمر صرف تین[2] سال کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور آپ کی تربیت فاطمہ بیگم نے اپنے ذمہ لی۔ چند برسوں کے بعد انہوں نے

---

[1] والد ماجد حضرت شاد مرحوم

[2] مضمون سید رضا قاسم صاحب

انتقال کیا تو آپ کی پرورش و پرداخت آپ کے چچا جعفر حسین خاں اور ماموں شاد مرحوم کے زیر سایہ ہونے لگی۔ یہ خیال ہے کہ اس جوہر قابل کی آب و تاب شاد مرحوم کے فیض صحبت کی رہین منت ہے۔ آپ نے عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی کافی بصیرت پیدا کی اور سفر یورپ کے دوران میں فرانسیسی زبان سے بھی کچھ واقفیت حاصل کی۔ الغرض نواب صاحب اچھے خاصے ذی علم آدمی تھے۔

نوجوانی میں نواب خیال شعر و سخن کے بھی دلدادہ تھے اور حضرت شاد مرحوم سے اصلاح لیتے تھے لیکن کچھ دنوں کے بعد شاعری کو خیرباد کہہ کر نثر نگاری کی طرف مائل ہوئے اور اسی میں کمال حاصل کیا۔ آپ کی عمر تقریباً اٹھارہ ہی سال کی تھی کہ ۱۸۹۹ء میں آپ نے ایک علمی و ادبی رسالہ جاری کیا جس کا نام ادیب تھا۔ یہ رسالہ عظیم آباد پٹنہ سے نکلتا تھا لیکن ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء میں آپ کی شادی نواب واجد علی شاہ کے وزیر نواب استحکام الدولہ مرزا احمد بیگ کی صاحبزادی سے ہوئی تو آپ نے پٹنہ کے قیام کو خیرباد کہہ کر مستقلاً کلکتہ میں اقامت اختیار فرمائی اور رسالہ ادیب مرحوم ہو گیا۔ ملک کے متعدد رسالوں میں آپ کے اردو مضامین شائع ہوا کرتے تھے اور فارسی اخبار "حبل المتین" میں فارسی مضامین۔ علمی و ادبی مشاغل کے علاوہ آپ کو سیاسی و تعلیمی تحریکوں سے بھی دلچسپی تھی۔ آپ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے ٹرسٹی اور ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر بھی تھے۔

آپ کا سب سے بڑا کارنامہ وہ خطبہ صدارت ہے جس کا کچھ حصہ آپ نے دسمبر ۱۹۱۶ء کی آل انڈیا اردو کانفرنس لکھنؤ میں پڑھا تھا۔ یہ خطبہ صدارت سیکڑوں صفحات کو محیط ہے۔ افسوس ہے کہ پورا خطبہ کتابی شکل میں اب تک شائع نہ ہو سکا اور اب اس کی اشاعت کی امید بھی نہیں ہے۔ یہ عظیم الشان اجتماع یادگار رہے گا۔ کانفرنس ۲۹ دسمبر کی صبح کو ساڑھے گیارہ بجے قیصر باغ کی خوشنما بارہ دری میں منعقد ہوئی تھی۔ ایک بلند وسیع پلاٹ فارم جس پر گاؤ تکیے اور گدے دار کرسیاں رکھی گئی تھیں، متعدد ممتاز شرکاء جلسہ کے لئے بنایا گیا تھا اور اس کی پشت پر ایک اور پلاٹ فارم مستورات کے لئے تیار ہوا تھا۔ حاضرین کی تعداد ہزاروں تھی اور ہر صوبہ کے معزز اصحاب نے شرکت کی تھی جن میں سے چند افراد کے نام یہ ہیں:۔

راجہ صاحب محمود آباد، نواب ذوالقدر جنگ بہادر صدر مجلس استقبالیہ، مسٹر محمد علی جناح، مسٹر مظہر الحق، مسٹر [illegible]، [illegible] حسین، مسٹر فضل الحق، مولانا آزاد سبحانی، مولانا حسرت، مستی لکھنوی، مولانا سلیمان ندوی، مولوی عبد الحق، مرزا رسوا، مسز سروجنی نائیڈو، پروفیسر [illegible]، سید سجاد حیدر یلدرم، سید جالب ایڈیٹر ہمدم، ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر، پنڈت کشن پرشاد کول ایڈیٹر ہندوستانی۔ دوسرے روز کی نشست ۹ بجے شام سے تھی۔ نواب صاحب کے آنے میں کچھ دیر ہوئی تو مولوی نظام الدین حسن کی صدارت میں کارروائی شروع ہوئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد نواب صاحب تشریف لے آئے تو بقیہ کارروائی آپ ہی کی صدارت میں ہوتی رہی۔

نواب صاحب کے خطبہ صدارت کا کچھ حصہ جس کا نام "داستان اردو" ہے العصر کے تین نمبروں میں شائع ہوا تھا اور اس کا آخری باب "مغل اور اردو" کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا ہے۔ یہ مختصر خطبہ گراں قدر معلومات اور ادبی محاسن کا گنجینہ ہے۔ نواب صاحب کی ایک اور کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام "داستان عجم" ہے۔ یہ کتاب شاہنامہ پر گویا تبصرہ ہے اور اسی میں شاہنامہ کے مصطلحات مثلاً "درفش کاویانی"، "گرز گاو سر"، "ایوان ضحاک"، "برمایہ"، "چاہ بیژن"، "سیمرغ"، "سیاوش" وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔ گو یہ چیز نئی نہیں کیونکہ سخندان پارس میں آزاد نے بھی مصطلحات کی تشریح کی ہے پھر بھی یہ کتاب دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔

۱۹۱۷ء میں آل انڈیا تعلیمی کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی تو اس کی صدارت بھی آپ ہی نے فرمائی اور اپنے خطبہ میں اردو زبان کی اہمیت پر زور دیا۔ پھر ۱۹۱۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن میں آپ سے بھی شہادت لی گئی تو اس موقع پر بھی اردو زبان کی اہمیت کو زبردست پیرایہ میں بیان کیا۔

نواب صاحب سیر و سیاحت کے بھی دلدادہ تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں نظام حیدرآباد کی طرف سے آپ کو یورپ بھیجا گیا۔ آپ نے

---

[1] رسالہ العصر ۱۹۱۷ء

[2] مضمون سید رضا کاظم صاحب۔

وہاں کیمبرج یونیورسٹی کی مشہور انجمن یونین میں اردو زبان کے متعلق تقریر کی اور ایک مضمون بھی لکھا جو اردو رسالہ نو کے کیمبرج میں شائع ہوا۔ پروفیسر براؤن سے بھی آپ نے ملاقات کی اور دونوں میں فارسی میں گفتگو ہوئی۔ دوران گفتگو میں ایران کا ذکر آگیا تو آپ نے پروفیسر براؤن کو دوبارہ سفر ایران کی ترغیب دی۔ پروفیسر براؤن نے جواب دیا کہ "حالا پیر شدم طاقتے ندارم"۔ انگلستان کی سیر سے فارغ ہو کر آپ نے فرانس، بلجیم، جرمنی، اٹلی وغیرہ کی بھی سیر کی اور وہاں کے مشہور مقامات اور تعلیم گاہوں کو ملاحظہ فرمایا۔ اس کے بعد آپ مصر تشریف لے گئے جہاں شاہ فواد پاشا سے ملاقات ہوئی۔ پھر انگورہ (ترکی) پہنچے جہاں ترکی کے مصطفیٰ کمال پاشا سے نیاز حاصل ہوا۔

اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے آپ نے نہ صرف مضامین لکھے اور لیکچر ہی نہیں بلکہ عملی حصہ بھی لیا۔ اسی غرض سے ۱۹۳۶ء کے اپریل میں دہلی تشریف لے گئے۔ واپسی میں دو روز گیا میں جناب اکرم ایڈیٹر ندیم کے ہاں قیام کیا۔ دسمبر ۱۹۳۶ء میں آپ علی گڑھ تشریف لے گئے اور ۵ دسمبر کو نواب احمد سعید خاں سے ملنے کو چھتاری روانہ ہوئے۔ ۱۱ دسمبر کو وہیں آپ کے قلب میں درد اٹھا اور یہ درد ایسا مہلک ثابت ہوا کہ علاج کی بھی نوبت نہ آئی یہاں تک کہ چند ہی منٹ کے بعد روح پرواز کر گئی۔ آپ کی لاش کو نواب صاحب نے پٹنہ روانہ کر دیا جو ۱۲ دسمبر کو حضرت شاد کے پہلو میں سپرد خاک کی گئی۔

میں لکھ چکا ہوں کہ نواب صاحب ابتدا میں غزلیں کہتے تھے اور شاد عظیم آبادی سے انہیں تلمذ بھی حاصل تھا لیکن اگرچہ شاعری تو ترک ہو چکی تھی شاعرانہ ذوق مفقود نہ ہوا تھا چنانچہ ستمبر ۱۹۳۵ء میں بادشاہ نواب عشرتی کے دولت کدے پر ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا جس میں کچھ اچھی غزلیں کہی گئیں اور بیرون صوبہ کے حضرات نے بھی شرکت کی تھی تو نواب صاحب بھی اس مشاعرے میں شریک تھے لیکن غزل نہیں پڑھی تھی۔

نواب صاحب نے صرف ایک اولاد چھوڑی۔ آپ کے صاحبزادے سید امیر نواب صاحب ہیں جو آج کل غالباً حیدرآباد میں مقیم ہیں۔

نواب صاحب نہایت ہی وجیہہ و شکیل آدمی تھے گندمی رنگ اور قد اوسط تھا، مونچھیں بڑی بڑی تھیں اور اوپر کو اٹھی ہوئی لیکن داڑھی استرے کی مرہون منت تھی۔ طرز معاشرت مغربی اور اعلیٰ درجہ کا تھا۔ کبھی شیروانی استعمال کرتے تھے اور کبھی مغربی لباس لیکن ٹوپی ایک خاص قسم کی پہنتے تھے جس کے سامنے دو [illegible] لگے ہوتے تھے۔ لباس کا خاص خیال اور شوق تھا اور جو لباس بھی پہنتے تھے اعلیٰ درجہ کا ہوتا تھا۔ نہایت ہی خلیق اور ملنسار تھے اور لوگوں کو ایک ملاقات میں گرویدہ کر لیتے تھے۔ انداز گفتگو نہایت دلکش تھا اور گفتگو میں بھی صحت زبان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مذہبی خیالات میں کوئی شدت نہ تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کی زندگی پر مذہبی اثرات غالب نہ تھے لیکن معلومات بہت وسیع تھیں اور وہ ہر فن پر گفتگو کر سکتے تھے خواہ وہ ادبی ہو یا علمی، مذہبی ہو یا سیاسی۔

داستان اردو ادبی حیثیت سے ضرور قابل قدر ہے لیکن تاریخی نقطۂ خیال سے مصنف کے اکثر نظریے محل نظر ہیں۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:۔

۱۔ نواب صاحب کا ارشاد ہے کہ "آپ کی (بابر کی) اردو کا یہ پہلا شعر جس وقت ظل اللہ کے منہ سے نکلا ہوگا تو معلوم محفل کا کیا رنگ ہوا، بابریوں کا کیا حال ہوا ہوگا، کتنی واہ واہ ہوئی ہوگی" بابر کا شعر یہ ہے:۔

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی
فقرا ہلیغہ بس بولغوسیدر پانی و روتی

پھر یہ بھی فرماتے ہیں کہ "ہماری نظر جہاں تک ہے بابر سے قبل کسی نے اردو میں شعر کہنے کی ہمت و جرأت نہیں کی اس لئے جب تک اس کی تردید نہ ہو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کے سر پر اول اس صنعت کے بابا آدم مانے جائیں گے۔" بابر ۱۵۲۶ء مطابق ۹۳۲ھ میں ہندوستان آیا تھا۔ مذکورہ بالا شعر

ل روایت مولوی سید عترت حسین عظیم آبادی۔

یقیناً اس کے بعد کا ہوگا۔ لیکن مزید تحقیق کے بعد یہ حقیقت بے نقاب ہوئی ہے کہ شاہ میراں جی شمس العشاق (متوفی ۹۰۲ھ مطابق ۱۴۹۶ء) جو ولی سے پہلے ہو گزرے تھے اس کے بہت قبل اردو میں نظمیں لکھ چکے تھے ایک کا نام "خوش نامہ" اور دوسری نظم کا نام "خوش نغز" ہے۔ اور یہی تاریخی شہادت حقیقت ہے۔

۲۔ نواب صاحب کا خیال ہے کہ فضلی کی "دہ مجلس" (۱۱۴۵ھ) اردو نثر کی پہلی مثال ہے۔ یہ آزاد کے خیال کی بازگشت ہے لیکن جدید تحقیق یہ ہے کہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (م ۸۲۵ھ) نے اردو میں دو رسالے لکھے تھے "معراج العاشقین" اور "ہدایت نامہ"۔ معراج العاشقین شائع ہو چکی ہے۔ اس کا وجود ثابت کرتا ہے کہ دہ مجلس سے کم از کم تین سو سال پیشتر اردو میں تصنیف موجود تھی۔

۳۔ نواب صاحب عمدۃ الملک نواب محمد امیر خاں انجام کی دو غزلیں پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "عمدۃ الملک کی یہ دو غزلیں شاہد ہیں کہ وہ مسلّم زبان داں ہے اور کسی کا مقلد کیا سب اسی کے شاگرد و ریزہ خوار ہیں۔" اور انجام کے اس شعر کے متعلق ۔۔

نعش میری دیکھ کر مقتل میں یوں کہنے لگے
کچھ تو صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی

فرماتے ہیں کہ "ذرا زبان کو دیکھنا یہ دو سو برس کی اردو ہے۔ یہاں ولی کیا کسی ولی نے بھی یہ زبان کی کرامت نہیں دکھائی۔"

انجام کا انتقال ۱۱۶۰ھ میں ہوا ہے۔ ولی گجراتی یا دکنی نے انجام سے چالیس سال قبل ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی۔ اس وقت انجام اگر پیدا بھی ہوں گے تو بہت کمسن ہوں گے۔ اب ذرا ولی کی زبان کی کرامت ملاحظہ ہو ۔۔

صد حیف کہ وہ یار مرے پاس نہ آیا — میرا سخن راست اسے راس نہ آیا
پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا — شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا
زندگی جام عیش ہے لیکن — فائدہ کیا اگر مدام نہیں
جسے عشق کا تیر کاری لگے — اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
اے ولی رہنے کو دنیا میں مقام عاشق — کوچۂ زلف ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

انجام کی دونوں غزلیں میرے سامنے ہیں۔ ان میں زبان کی صفائی و روانی ہے مگر خیالات ہلکے پھلکے ہیں۔ ولی کے بعض اشعار میں اعلیٰ خیالات کی جھلک بھی پائی جاتی ہے مثلاً ۔۔

دشمن دیں کا دین دشمن ہے — راہزن کا چراغ رہزن ہے
صدق ہے آب رنگ گلشن دیں — پاکبازی ہے شمع راہ یقیں

۴۔ عمدۃ الملک انجام کو بیدل کا شاگرد لکھا ہے۔ اگر یہ شاگردی فارسی شاعری میں تھی تو ممکن ہے ورنہ انجام کا بیدل سے اردو شاعری میں اصلاح لینا محل نظر ہے۔ صرف دو اشعار بیدل کی طرف منسوب ہیں اس لئے وہ اردو کے شاعر ہرگز نہیں کہے جا سکتے۔ پھر دوسری جگہ نواب صاحب کا یہ ارشاد کہ انجام کسی کے مقلد نہیں شاگردی کی بنیاد کو منہدم کر دیتا ہے۔

۵۔ نواب صاحب انشا پردازی کے شوق میں کہیں کہیں صنعت ایہام سے بھی کام لیتے تھے۔ ایک جگہ ولی کی آمد کے لئے یہ جملہ فرماتے ہیں "ولی گوجری ندی کے کنارے ٹہلتے رہے" یہ روش آزاد کی تھی۔ نواب صاحب بھی انہی کے مقلد تھے لیکن ہر جگہ تاریخی بحثوں میں ایسے جملوں کا استعمال ثقاہت و متانت کے خلاف ہے۔

۶۔ ایک جگہ فرماتے ہیں "یہ وہی زمانہ تھا جس میں اس زمانہ کا ایک عالم وحید عصر مرد کبیر کاشی اور گیا جی کے جنگلوں کے درمیان اپنے ساتھیوں اور چیلوں کو پکارا اور کہا کہ دھرم کرو دھرم کرو دھرم کا سکھ بھوگو دھرم کی رکھ چاہو۔" اگر اس مفہوم کو کوئی جملہ معترضہ بنتی

زبانِ مبارک سے ادا کیا ہوگا تو وہ پالی زبان کا کوئی فقرہ ہوگا نہ کہ ایسی بھاشا میں جس کو اردو سے مشابہت ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ مذکورۂ بالا فقرہ پالی زبان کا کیونکر ہو سکتا ہے۔

۷۔ اردو کے ابتدائی دور میں دو نوری گزرے ہیں: پہلا نوری عہدِ اکبری میں گزرا ہے جو فیضی کا معاصر تھا، دوسرا نوری ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں گزرا ہے اور تانا شاہ کے وزیر کے لڑکے کا معلم تھا۔ اسی نوری کا نام شجاع الدین تھا لیکن نواب صاحب نے اس نوری کو عہدِ اکبری سے وابستہ کر دیا ہے۔

۸۔ نواب صاحب نے بعض اچھے اچھے اشعار کو ملکہ نورجہاں بیگم اور شہزادی زیب النساء سے منسوب کر دیا ہے۔ مثلاً اس شعر کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ نورجہاں بیگم کا نتیجۂ فکر ہے ؎

دیں جگر زخمِ جفا کو دلِ صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس دلِ بیباک میں ہم

اس پر نیاز فتح پوری نے صحیح تنقید کی تھی کہ اگر یہ شعر نورجہاں کا ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ آرزو سے اصلاح لیتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ تنقید و تحقیق کی موجودہ روش خیال صاحب کی تحریروں میں مفقود نظر آتی ہے اور شاید وہ اس کی اہمیت کے بھی قائل نہ تھے۔

۹۔ نواب صاحب شاد عظیم آبادی کے حقیقی بھانجے تھے لیکن مولوی سید قدرت حسین عظیم آبادی فرزند نذیر عنایت حسین اعظم جو شاگردِ شاد تھے، ان سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آخری ایام میں دونوں کے تعلقات خوشگوار نہ تھے اور کچھ کشیدگی پائی جاتی تھی۔ نواب صاحب نے شاد کی زبان کے متعلق صحیح رائے دی ہے کہ ان کی زبان نہ دہلی کی تھی نہ لکھنؤ کی بلکہ ایک خاص قسم کی زبان تھی۔ شاد کی شاعری کے متعلق حمید عظیم آبادی کا خیال ہے کہ اس پر حافظ کی شاعری کا پرتو تھا لیکن نواب صاحب نے ایک مکتوب میں حمید عظیم آبادی کو لکھا[1] کہ اس کا ثابت کرنا آپ ہی کا کام ہے۔ اس کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ حمید صاحب کے خیال کو انھوں نے اہمیت نہ دی۔ تلامذۂ شاد مصر ہیں کہ وہ ہر صنفِ سخن کے مالک تھے۔ بیشک انھوں نے مراثی، رباعیات اور قصائد بھی لکھے تھے لیکن نواب صاحب کا خیال تھا کہ وہ غزل کے سوا کسی اور صنفِ سخن کے مالک نہ تھے۔ اس خیال سے میں بھی متفق ہوں۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھیں کہ نواب صاحب نے شاد کی زبان اور شاعری کے متعلق جو رائے ظاہر کی تھی وہ کشیدہ تعلقات کی بنا پر تھی لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ آپ نے شاد کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے وہ صرف علم پر نہیں بلکہ تحقیق پر مبنی تھے اور یہ آزادیِ رائے، بے لاگ تنقید اور حریتِ خیال کی مثال ہے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس کو میں نے اپنے منجھلے بھائی شاہ منظر الرحمٰن اختر کاکوی شاگردِ رشیدِ شاد عظیم آبادی سے سنا ہے۔ شاد کی غزلوں کا انتخاب ہو رہا تھا۔ نواب خیال بھی اس مجلس میں شریک تھے اور بعض اشعار کے متعلق فرماتے تھے کہ میں نے یوں نہیں سنا ہے۔ ایک روز سید صاحب، شاد کے صاحبزادے، نواب صاحب سے بگڑ گئے کہ آپ ابا جان کی غزلوں کو ترمیم و اصلاح سے خراب کر رہے ہیں۔ نواب صاحب بھلا کب چوکنے والے تھے۔ آپ نے بے ساختہ جواب دیا کہ تم کیا ہو، میں تو ابا جان کے سامنے بھی یہی کیا کرتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اظہارِ خیال میں کسی کی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔

---

[1] مکتوب خیال مورخہ ۸ نومبر ۱۹۳۳ء بنام حمید عظیم آبادی مطبوعہ ندیم جولائی ۱۹۳۵ء

نواب صاحب کی شانِ ریاست، رکھ رکھاؤ اور مغربی طرزِ بود و باش سے متعلق بھی ایک واقعہ سن لیجئے۔ ۱۹۳۶ء میں نواب صاحب گیا میں جناب اخگر کے مہمان ہوئے تو آپ کے لیے کموڈ کا انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ نواب صاحب کو انقباض پیدا ہوا اور آپ نے اخگر صاحب سے دوستانہ اس کی شکایت کی۔

نواب صاحب کی شخصیت یقیناً ممتاز و بلند تھی۔ آپ نے ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں صرف کر دی۔ آپ کو اردو زبان سے عشق تھا۔ آپ کی انشا پردازی ایک خاص قسم کی تھی اگرچہ آپ آزاد کے مقلد تھے لیکن پھر بھی آپ کی انفرادیت نمایاں تھی۔ جب تک اردو زبان زندہ ہے نواب صاحب کا کارنامہ مشعلِ راہ اور آپ کا نام نامی روشن رہے گا۔

بعد از وفات تربتِ ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردمِ عارف مزارِ ماست

امداد امام اثرؔ

سید حسن امام

نواب شمس العلما سید امداد امام اثرؔ عظیم آبادی۔

سنہ ۱۹۰۰ء کو بیسویں صدی میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور انیسویں صدی میں بھی اس کو گنتا برائے نام ہی ہوگا۔ اسی عجیب و غریب سال میں مجھ کو اس زمانہ کے مولوی امداد امام سے سابقہ پڑا تھا وہ بھی بذریعہ علالت۔ اس وقت تک یہ پوچھئے تو میرا ان کا کوئی رشتہ ناطہ نہیں تھا۔ میری خالہ کی سگی بھتیجی ان کی شریک زندگی ضرور تھیں مگر یہ بھی کوئی رشتے میں رشتہ ہوا؟ پھر بھی دو باتیں ان کو عام شخصیتوں سے ممتاز کرنے والی اس وقت بھی صاف نظر میں ہوتی تھیں۔ اوّل یہ کہ پیشہ ور حکیم یا ڈاکٹر تو کسی درجہ سے نہیں تھے۔ دوسری بات یہ کہ باوجود جسمانی ناتوانی کے علاج جاری نہ رہ سکا چونکہ مولوی صاحب مشکل ہی سے ملتے تھے۔ اس آخری صورت حال سے اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ سیلانی سی طبیعت واقع ہوئی ہے۔ بزرگوں سے سننے میں آیا کہ ایک وقت ایسا بھی گزر چکا ہے کہ جناب اثرؔ نے بنا ملبوس بھگوا رنگوا کر فقیری لے لی تھی، ریش مبارک بڑھا لی گئی تھی۔ مونچھیں بھی حدود شرع شریف کے اندر رہتی تھیں۔ گو یہ صورت مجھے یاد رہی مگر نواب صاحب کا جذباتی ہونا ظاہر ہو گیا تھا میں نے تو ہمیشہ ان کو ادارۂ مجسم تبسم ہی دیکھا۔ قد آور ان کو نہیں کہا جا سکتا البتہ کم گوشت ہونے کی وجہ سے نکلا ہوا قد معلوم ہوتا تھا۔ شان متانت و بردباری پر حرف لائے بغیر بے حد خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے۔ آواز خاصی بھاری تھی مگر قہقہے بارِ سماعت نہ ہوتے تھے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ کسی بھی صحبت میں نواب صاحب کو دیکھا ہو اور انھوں نے کوئی ایسی بات نہ کی ہو جس پر خود بھی ہنسے ہوں اور سننے والوں کو بھی ہنسنے پر مجبور نہ کر دیا ہو۔ ہنستے وقت ان کی آنکھوں میں ایسی چمک اور چہرہ پر ایسی کیفیت کھیل جاتی تھی جو شریر بچوں کا حصہ ہوا کرتی ہے جبکہ ان کی شرارتیں کامیاب ہو جاتی ہیں! آپ کے اخلاق کی وسعت بسا اوقات خوشگواری کی حدوں سے باہر ہو جاتی تھی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ادب کے آگے عمر میں سبھی ان سے چھوٹے ہوا کرتے تھے۔ اگر کچھ افراد صحبت میں ان سے بڑے بھی کبھار ہوتے تو وہ بھی نواب صاحب کا ادب ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ اب فرض کیجئے کہ نواب صاحب میرے یہاں محفل جمائے بیٹھے پھول برسا رہے ہیں کہ دفتر سے کوئی اہلکار کسی ضرورت سے آ نکلا۔ نواب صاحب اس کی پذیرائی کے لئے گفتگو بند کر کے منتظر بیٹھے ہیں۔ اس سکوت کا سبب ابھی دریافت نہیں کیا جا سکا ہے کہ نواب صاحب سروقد استادہ۔ ساری مجلس گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اہلکار غریب منفعل اور گھبراہٹ میں بڑھتا چلا آیا۔ نواب صاحب نے بڑھ کر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا وہ تو حیران پریشان

ہو کر رہ گیا۔ اب سب لوگوں کی سمجھ میں بات آئی۔ ایسے موقعوں پر یہی کرنا پڑتا تھا کہ سب دم بخود رہ جاتے کہ نواب صاحب کو خفیف ہونا پڑے۔ جھنسنا پھنسانا ان کا ذوق تھا مگر ذرا سے میں متاثر ہو کر آنسوؤں سے منہ دھو لینا بھی ان کے لئے دشوار نہ تھا۔

نازک مزاجی ان کی مشہور تھی مگر میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ بد مزاجی کا انہوں نے مظاہرہ کیا ہو۔ "تیر بر ریش بجان درویش" کے قول سے عمل میں لاتے ہوئے ان کو دیکھا۔ شکار کا بے حد شوق کا مظاہرہ فرماتے تھے۔ مہاراج تکانی اور میر شفاعت حسین مرحوم اکثر اس مصیبت میں گرفتار ہوا کرتے تھے کہ نواب صاحب کو شکار کھلائیں۔ مصیبت کا لفظ میں نے قصداً لکھا ہے۔ نازک مزاجی کا بڑا مظاہرہ شکار کے موقعوں پر ہوا کرتا تھا۔ پارٹی کا ہر فرد سہما ہوا رہتا تھا کہ دیکھئے کس غریب پر نزلہ گرتا ہے۔ یہ ڈر اس بات کا نہ ہوتا تھا کہ نواب صاحب مار پیٹ کریں گے یا بے نقط سنائیں گے یا کسی کی عزت اتار لیں گے۔ جی نہیں۔ ایسی کسی حرکت کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر شیر وغیرہ درندوں میں سے کسی وحشی کے لئے مچان پر تیاریاں بیٹھی ہیں تو نواب صاحب خود گولی چلائیں گے نہیں اور کسی نے شکار گاہ سے جاتے دیکھ کر عجلت کر دی تو بس قیامت آ گئی۔ نواب صاحب اس سے کیا خفا ہوں گے خود اپنے آپ سے خفا ہو بیٹھتے ہیں۔ سارا لطف جاتا رہا۔ اسی طرح اگر پرندوں کا شکار ہے تو سمجھ لیجئے کہ شامت آ گئی اس شخص کی جس پر خاص توجہ صرف فرمائی نواب صاحب نے۔ اب اس غریب کو سوا اس کے چارہ نہیں کہ شکار کے نکات سیکھتا چلا جائے۔ نواب صاحب کے ساتھ ساتھ پرندے کے اتنا قریب کر دو کہ زمین یا شاخ شجر سے اڑ کر فضا میں پر افشانی کرنے لگے۔ بس پھر کیا تھا بندوق زمین پر دے ماری اور نواب صاحب جلے تن آخر خستہ و مظلوم صورت بنائے زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ ہمراہی پر سارا الزام دھرا لازم آیا کہ اسی کے انداز ہی سے شکار اڑ گیا۔ ہمراہی اگر سادہ آشنا ہوا تو وہ خود اپنی ناکردہ غلطیوں کا اعتراف کر لیتا تھا۔ نواب صاحب سے آئندہ پوری معلومات حاصل کرنے کا وعدہ اس نے ظاہر کیا نہیں کہ ممدوح الشان خود اس کی طرف سے معذرت خواہی فرمانے لگے۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔ اس کا چارہ ہی نہیں۔ کبھی کوئی ایسی شخصیت آ جاتی جو نواب صاحب کی افتاد طبع سے واقف نہ ہوتی اور مرکز توجہ خاص بھی قرار پا جاتی تو اس خیال سے کہ زد میں وہ نہ آ جائے کیا ہو جاتا کہ سب صاحبین میں سے کسی کو پہلے سے تیار کر لیا جاتا تھا کہ اشارہ پاتے ہی سب سے پہلے بندوق داغ دے یا کوئی سی حرکت ایسی کر دے کہ شکار نہ ہو سکنے کا الزام اس کے سر عائد ہو سکے اور مہمان مامون و محفوظ رہے۔

وطن کا پوچھا کرتے ہیں کہ حضرت آثر علی آبادی کا مرزا نام تھا۔ ممکن ہے کبھی آبا و اجداد یہاں رہتے ہوں گے مگر سوائے ایک کے ان کو میں نے بھی ہم نے تو نہیں دیکھا۔ ستمبر ۱۹۰۹ء کا ذکر ہے۔ شہر آگرہ کی کچہری روڈ پر زمینداران جیوہ داڑہ کی عملداری سے متصل کوٹھے پر جانب شمال ایک دو منزلہ مکان میں قیام فرما تھے۔ چند بزرگوں کے ساتھ ساتھ حاضری کا موقع ملا۔ اطلاع کرائی گئی۔ بیٹوں کی بابری کسیر مہر سے پتہ چلا کہ بغیر کسی قسم کی سوءِ مزاجی کے زوجہ محترمہ سے بے نیاز ہو کر کسی بیگم کو مستور کر رکھا ہے۔ پردہ ہو جانے کا تو جواب ہاں یا ناں ہو گی جاتی ایسا ہی ہوا۔ خیال ایسا آتا ہے کہ گلابی جاڑوں کی رات تھی کیونکہ کمرے کے اندر ہم سب بیٹھے تھے۔ کوئی ہوا ور نہ تھا۔ گفتگو چلتے چلتے اس سوال پر آ گئی تھی کہ تیر نظر کے گھسل ہونے کے بعد کیا ہے تحمل ممکن ہے کہ نہیں؟ وہ بالمقابل راستے ہی کی زد آ نکلی۔ نواب صاحب کے اشعار غزل کے اثبات کے اعتراضات سے مبالغہ نذر کئے گئے تو آپ نے انکشاف فرمایا کہ ہنگام جنون شباب جب آپ کے حضرت قبلہ گاہی کی تعیناتی مونگیر تھی تو وہاں کسی تقریب میں محفل گرم ہوئی تھی جس ہوئی پر ایک شمع سمل ابرق کی گھل رہی تھی اور جناب آثر آج تک اسی کھٹکے پہ مجبور ہی کر رہے۔

سوختم یک شمع از غم، ہیچ عالم سوخت

وہ شمع گل ہو گئی گی تو ایک جھلسی ہوئی کہانی ادھر ہو جائے۔ اسی شہر میں حضرت آثر اور حکیم ہیبت بیگ دہلوی مرحوم و مغفور کی ملاقات ہوئی۔ مرحوم شاعر تھے اور اس صدی کے پہلے ربع میں سے ایک ایک ہی جگہ ملاقات سے شاعرانہ تقریب مرغوب ہو گئی۔ نواب صاحب نے "سحر حسن و عشق" منظوم فرما کر چھپوا دی۔ یہ ایک نظم مسلسل تھی جس کے قوافی طرح دار و دلدار وغیرہ تھے اور ردیف کھیرا تھی۔ نظم کی ندرت تخلیق حسن کا قائل ہونا پڑتا ہے

حکیم صاحب کی مذمت کا کوئی پہلو سے تغیر ان کا مشغلہ رہی جس سے اس طرح نقش بر فرماس ہو گیا تھا کہ اس نظم لطیف کا مطالعہ کرنے والے کے شانِ کی محتاجی نہیں رہتی تھی کہ حکیم صاحب کا سامنا ہو اور کوئی اس کو یاد کر جائے کہ "مجنون طرفہ" سے مراد کیا تھی۔ پھر کمال یہ کہ مجھے بھی اس کو تکلف نہ رہتا تھا کہ حکیم صاحب سے نوک جھونک کرتے اور اس بات کے اعتراف میں ذرا سا بھی مضائقہ نہ سمجھے کہ "مجنون طرفہ" پڑھ کر اس نے پہچانا ہے ادھر حکیم صاحب کا یہ حال کہ "مجنون طرفہ" کا نام سمع مبارک تک پہنچا نہیں کہ خود بدولت طرفہ تماشا بن گئے۔ "تفریح القلوب" "مولا فتحہ کلام" میں نے آگے بھی پیدا وہ کی جائے تو تھا نہ یہ نہیں تک نوبت پہنچے بغیر نہ رہے۔ حکیم صاحب عموماً میرے غریب خانہ پر تشریف رکھا کرتے۔ جب تک اپنا مکان نواب صاحب نے تعمیر نہ فرمایا تھا ہمارے قریب ہی اکثر و بیشتر کرایہ دار بن کر کسی نہ کسی مکان میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ "مجنون طرفہ" قطعی نایاب ہے۔ سڑی گلی کوئی کہیں پڑی پرانی کاپی مل بھی جائے تو حکیم صاحب کہاں کہ "تحسین و تنقید"۔

۱۹۰۹ء میں ہم خود کرایہ کے مکان میں رہنے پر مجبور ہوئے۔ محلہ مرزا پور میں منشی ولی اللہ مختار مرحوم کے صاحبزادے مسٹر فرید اللہ وکیل مرحوم بیرسٹر ایٹ لا کا مکان میرے کرایہ میں تھا اور قریب ہی ڈاکٹر ملک فصیح احمد مرحوم کے مکان میں نواب صاحب مع بیگم مقیم تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کی اچھی چیز آدم زاد کی دنیا ہے۔ دنیا کا بہترین حصہ ایشیا ہے۔ ایشیا کا انتخاب ہفت اقلیم ہند ہے۔ ہندوستان کا اعلیٰ ترین صوبہ بہار، بہار کا اول نمبر علاقہ شہر گیا۔ گیا کا صحت مند و فرحت بخش حصہ وہ محلہ جہاں ڈاکٹر فصیح کا مکان واقع ہے۔ جب پھلگو ندی کے پار قصبہ انگلہ کے دو سیر کے اسی محلہ چیاد گنج میں کوٹھی خرید کر اس کی زندگی نے میرے سے کرایہ لینے کے بعد نواب صاحب یہاں اللہ کے آئے تو پھر آگیا تک تو وہی سلسلہ رہا مگر ڈاکٹر فصیح کے مکان کی ساری تعریفیں بھی اپنے ساتھ منتقل فرما لی تھیں۔ درمیان میں دوسرے مکانات کرایہ پر رہے تھے مگر ان کی ثنا و صفت اتنی نہیں ہوتی تھی۔ بہر کیف ذکر تھا ۱۹۰۹ء کا۔ میرے والد ماجد علیہ الرحمۃ علیل تھے اور علاج نواب صاحب سے رجوع تھا۔ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ کبھی صبح کبھی شام ایک وقت روزانہ کرم فرماتے تھے۔ ایک دفعہ اپنے مریض کو بہت خوش دیکھ کر نواب صاحب نے ایک سفیر اودھ کے جاپان سفر کی روئیداد سنانی شروع کی۔ اس میں ایسے ایسے مضحک پہلو نکالے اور ان کو بیان کرنے وقت وہ وہ مزے لئے کہ ہنستے ہنستے سب کا برا حال ہو گیا۔ مگر مریض پر اچھا اثر ہوا۔ اسی وجہ چلا کہ تمثیلی ادب پر قولاً فعلاً کتنی کامیابی کے ساتھ حاوی ہو سکتے تھے اگر اس کی طرف التفات فرماتے۔

نواب صاحب آٹھ ٹانگوں والے کتے سے ڈرتے تھے کہیں نظر آ جاتا تو فوراً بندوق طلب فرمایا کرتے تھے۔ بندوق آ گیا پیش کی جاتی کوئی شخص پڑھ کر مار دیا کرتا تھا۔ انھیں ان ہو جانے کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ کتے سے میں ڈرتا نہیں ہوں۔ اس کی کثافت ناقابل برداشت ہوا کرتی ہے۔ یہ کم بخت کتوں کو سیکھ دیتے ہو ہم سے بچنے کی ضرورت ہی کیا؟

۱۹۱۳ء میں نیپرہ جانا ہوا۔ نواب صاحب اتفاق سے وہیں مقیم تھے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ ملے بغیر چلا آتا۔ قیام گاہ پر جس وقت پہنچا تو دیکھا حسب عادت گول سائبان میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ دیکھ کر بڑے خوش ہوئے کہ خوب وقت پر آئے۔ دیکھو اخباروں کے علاوہ یہ رسالہ لکھ رہا ہوں۔ تم لوگوں کے یہاں کوئی کیا لکھتا ہے۔ تمہارے کام کی چیز ہے۔ ادھر ہاں جاتے ہو کہ بچے بیٹھے۔ مگر اب وہ کہاں آ گئے تو ٹھیک ہے۔ غالب ہی یاد آئے۔ ہی ہیں جنھیں بیٹھ گئے۔ آئی جا کر نال "ہم دکھتے مگر دل کیا کر سکتے تھے جو یہی رٹ لگائے تھا۔ اب اللہ کی کرنی کہ حسن امام صاحب کا صاحبزادہ بھی سے ملنا باتی تعطیلوں میں آیا ہوا کھیلتا کودتا آ پہنچا۔ نواب صاحب کی کرسی کا پشتیبان پکڑ کر کھڑا سننے لگا۔ اردو وہ غریب جانتے نہیں۔ اس کی سمجھ میں کیا خاک آتا۔ تہذیب شائستگی اس کی بندوں والی، وہ کیا جانے مشرقی ادب آداب۔ اس کی طبیعت جو الجھی تو جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے یہی الفاظ تھے جو بے تکان اس کے منہ سے نکلے:

WHAT NONSENSE YOU ARE TALKING, GRANDPA, LIKE AN OLD FOOL.

"کیا اول فول بک رہے ہو دادا میاں، بڈھے بے وقوف کی طرح"

نواب صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ بڑے ضبط سے کام لیا مسودہ کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ میرا جی تو بچھا جاتا تھا مگر اس کی خوشی کیا۔ آج بھی یہ حال ہے کہ نواب صاحب کی اس وقت کی بے بسی یاد آتی ہے تو رحم آ جاتا ہے۔

اس سے پہلے یا اس کے کچھ دنوں کے بعد کا واقعہ ہے کہ نواب صاحب اپنے چھوٹے بہنوئی آنریبل جسٹس سید شرف الدین کی کوٹھی چھجو باغ بانکی پور میں بیٹھے اپنی تازہ غزل سنا رہے ہیں۔ پڑھے لکھوں کے ساتھ شہر کے قریباً جاہل ملک اختیار حسرت خاں بھی موجود ہیں۔ قصہ آگے بڑھانے سے پہلے عرض کر دیا جائے کہ پٹنہ سٹی کے دو محلوں کی الگ الگ خصوصیت تھی۔ رانی پور کی طرف کی نام کے علاقے میں جو کم سواد بستے تھے وہ "ڑ" کا تلفظ نہیں کر پاتے تھے گھوڑے کو "گھورا" راستے رشتے وغیرہ کے ساتھ بولتے تھے۔ برخلاف چوک وغیرہ دیگر علاقہ والے "ر" کو "ڑ" بولتے "ر" ہی سے تلفظ کرنے کے عادی تھے "سر" کو "سڑ" بولنا ہی کو شاندار تصور کرتے تھے۔ اس تمہید کے بعد اصل قصہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

نواب صاحب نے شعر سنایا جس میں "زلف پیچ پیچ" سے متعلق خیال آفرینی ہوئی تھی۔ ادھر شعر تمام ہوا ادھر حسرت خاں پھڑک ہی تو اٹھے۔

"واہ واہ واہ۔ ایک تو زلف اس پڑ سے پیچ پیچ" اس وقت بھی یہی ہوا کہ نواب صاحب کو جیسے سکتہ لگ گیا۔

انھی دنوں کے عبرت ہی سننے میں آیا کہ شمس العلماء نے نکاح ثانی بجائے متعہ کر لیا ہے۔

۱۹۱۸ء میں نواب صاحب "مختار سپیشل پرشاد" آنجہانی کے مکان میں جو محل شاہ ٹولی کے مقام فرما تھے۔ موسم انتہائی گرم تھا۔ "لو" بھی چل رہی تھیں۔ فضا سوز و تپ رہی تھی۔ ہم لوگ زیریں دروزہ خانے میں پناہ گیر تھے کہ ٹھیک دوپہر کے وقت ذکر نے اطلاع کی کہ نواب صاحب پھاٹک پر تشریف لائے ہوئے ہیں اور مجھ کو طلب فرما رہے ہیں۔ گھبرا کر تہ خانہ سے برآمد ہوا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ پیادے اور شاگرد پیشہ مؤدب دست بستہ کھڑے ہوئے جھلس رہے ہیں اس لئے کہ حسب الحکم پھاٹک چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ پیادوں کے نشست کی چوکی پر نواب صاحب نزول اجلال فرما تھے۔ زندگی میں غالباً یہ پہلی اور آخری مرتبہ تھا کہ اس چوکی کو یہ عزت افزائی ہوئی۔ امتثال امر میں مجھے بھی چھوٹے عزت ملی ہی۔ یقین کیجیے کہ کوئی بھی میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ نواب صاحب نے بڑی گھبراہٹ اور معصومیت کے ساتھ اور کہا کہ وہ قطعی بے یار و بے مددگار، صرف راقم آثم کے سہارے اس شہر میں رہتے ہیں۔ اگر میں بھی صورت حالات کی مدد سے دست کش ہو گیا تو ان کی بے کسی کا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ میں کہاں سے وہ الفاظ لاؤں جو بے بسی اور داخلی کیفیت کا صحیح اعادہ کر سکیں۔ مجھ پر کیا گزری، اس وقت اس کو کوئی سوچ سکتا ہو تو سوچ لے۔ میں خود بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ جو ایک ذات بڑی کیسی بلند پایہ ہستی تھی۔ جس کی خوشنودی حاصل کرنے کے متمنی حاکم حکام، راجے مہاراجے، رؤسا و امراء ہی نہیں تھے بلکہ علماء و فضلاء بھی اور وہ ایک گمنام عزیز سے پناہ طلب کر رہی تھی۔ کیا عالم ہوگا نا قارئین کا آج بھی جب میں بیان کر رہا ہوں گا کہ اس کو کئی دن سے میرا آزردہ گیا۔ تحقیقات کیا تھی معلوم یہ ہوا کہ نواب صاحب کو کسی ایک دھیان کیا تھا کہ چند نفر ملازم جو برسر وقت ملازمت میں تھے اور ان میں کسی کسی کی مدت سال و ڈیڑھ سال کی پوری ہو رہی تھی۔ خطرہ پیدا ہوا کہ ترک خدمت کرنے کے بعد گاؤں جو ہو گیا ہوگا۔ ساتھ ہی ڈھارس بندھی اس خیال سے کہ اپنا ایک عزیز زمیندار ہے جس کے علاقوں میں ہوا زادے دیہی قسم کے اسامی ہوں گے صرف خبردار کر دینے کے لئے زحمت فرمائی گئی تھی کہ خطرہ پیدا ہو گیا حالت منقولہ سے صورت عمل میں منتقل ہو تو میں ضمانت کا سامان رکھوں۔

اسی زمانہ میں آنریبل مسٹر سید شرف الدین گورنمنٹ بہار کے ممبر کی حیثیت سے رانچی میں مقیم تھے کہ فالج میں مبتلا ہو کر گیا لائے گئے۔ بیمار ماموں کو دیکھنے سر علی امام گیا آئے۔ ابھی انھوں نے ماموں کی جگہ نہیں لی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں سب کچھ کر لیا تھا لہٰذا سر علی فکر مند تھے کہ نواب صاحب سے ملے بغیر جانے کا خیال بھی نہیں کر سکتے پھر دیر بھی تھا کہ وہاں سے بروقت رخصت دہلی تو کیا ہوگا۔ نواب صاحب کی شفقت جو مجھ پر تھی اس کے لحاظ سے میرا انتخاب ہوا کہ سر علی کے ساتھ جاؤں اور ان کی ٹرین چھوٹنے سے پہلے ان کے اسٹیشن پہنچ جانے کی راہ نکالوں۔ سپیشل پرشاد مختار والے مکان میں نواب صاحب مع متعلقین مقیم تھے۔ جس وقت ہم لوگ پہنچے سیدھے بجائے نواب صاحب وظیفہ میں مشغول تھے سلام ہو گئے پہر

سر علی تو زنانہ خانہ تشریف لے گئے ہیں نے نگھی وقت کی اطلاع کر دی۔ اس وقت تک نواب صاحب کے یہاں ایک صاحبزادی اور بڑا صاحبزادہ محمد حسین امام پیدا ہو چکے تھے۔ اسی بچے کو گود میں لے سر علی بس کمروں ہی میں باہر آئے تھے اور کہنا ہی شروع کیا تھا کہ بچہ بڑا پیارا ہے۔ اس کو دے دیا جائے کہ مخصوص طریقے سے پرورش و تعلیم کی خدمت وہ انجام دیں۔ سر علی کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ یہ بچہ صورت میں سر علی کی پہلی بیوی سے شباہت رکھتے ہوئے اور کھلتی ہوئی رنگت کا تھا۔ ابھی بات تمام بھی نہ ہو پائی تھی کہ نواب صاحب تسبیح رکھتے ہوئے مصلے سے اٹھے اور قریب قریب کھینچتے ہوئے صاحبزادے کو لے لیا اور سر علی کو ٹرین پکڑنے کی ضرورت یاد دلا کر چلتا کر دیا۔ مجھے روک لیا۔ بڑے کمرے میں لے جا کر دیوار میں بنی ہوئی الماری کھولی۔ اس کے کئی خانے کتابوں سے بھرے تھے۔ استفسار فرمایا کہ تجھے معلوم ہے کہ یہ کتابیں کس علم کی ہیں؟ انکار پر لاعلمی پر ارشاد ہوا کہ نجوم و فلکیات ان کا موضوع ہے۔ اس کے بعد کہنے لگے کہ سر علی امام بڑے قیافہ شناس ہیں۔ پہلی ہی نظر میں انھوں نے تاڑ لیا کہ بچہ کیسا نصیبہ ور ہے۔ اسی لیے اس کو حاصل کرنے کے لیے تو شادیں کر رہے تھے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بچہ ان کے حوالے کر دوں کہ اپنے جیسا کرسٹان بنا کر رکھ دیں۔ مجھے باری ہمیشہ کہا کرتے تھے بار بار یہ حق شادی کرنے کا تھا۔ مگر کیا کیا؟ کہ آپ سر کے امام باڑے اور تیرہ کی مسجدیں ویران ہو گئیں۔ علی امام، حسن امام مع بال بچوں کے کرسٹان ہو گئے۔ اسی لیے مجھے شادی کرنی پڑی۔ نسبت کا پہل خود لے بیٹھا کہ اس بچے کا زائچہ وہی ہے جو سکندر ذوالقرنین کا تھا۔ اس وقت بھی اس طفل شیرخوار کی روزانہ آمدنی علی امام، حسن امام کی مجموعی ماہانہ آمدنی سے زیادہ ہے۔" ——— افسوس کہ سن تمیز کو پہنچ کر یہ صاحبزادہ داغ دے گیا۔ انا للہ... الخ۔ گھر کے اندر اسی کی قبر پیش نظر رہ کر نواب صاحب کا جینا حرام کیے دیتی تھی۔

ادھر کئی سال سے آنریبل سر شرف الدین کا علاج یونانی ہو رہا تھا۔ آگرہ سے حکیم محمد حیات خان اسی لیے بلائے گئے تھے۔ بند کمرے میں انگیٹھیاں سلگی ہوئی رکھی رہتی تھیں۔ مریض کو غشی بار بار ہو رہی تھی۔ علاج زدہ کا یہ سب تبدیل کرنا مصیبت۔ حکیم صاحب کے بنائے کچھ بن نہیں رہی تھی — نواب صاحب کا دل ورم کا تھا۔ برادرانہ محبت میں اور بھی پگھلا جا رہا تھا۔ صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ بیزار ہو کر فریاد کرتا اٹھے اور یہ کہتے ہوئے سیدھے ہو لیے کہ تین گھنٹوں کے اندر علاج ختم نہ کر دیا تو دوا اور آرام حرام نہیں۔ نواب صاحب کیا کہہ کر اٹھے تھے اس کی توجیہ مخصوص صاحبوں کو خبر بھی نہ ہو سکی۔ ان کا تمتمایا ہوا چہرہ سبھوں نے دیکھ لیا تھا۔ ایک ایک بولی سب بولنے لگے۔ بیچارے حکیم صاحب کو یہ سمجھا کر سہارا دے رہے تھے کہ نواب صاحب غصے میں بھرے گئے ہیں کوئی دم میں بھری بندوق لیے آئیں گے اور کسی نہ کسی کو نشانہ بنائے بغیر نہیں رہیں گے — بیگم صاحب کو اپنی جان سب سے زیادہ خطرہ میں معلوم ہوئی۔ وہ تو بستر سنبھال کھڑکی کی راہ آنریبل بخشی پرشاد کے گھر جا رہا ہے — نواب صاحب سنا ہیں آتے ہی انگیٹھیاں بجھا دیں۔ ذرا دیر کو کمرے کے کل در کھلوا دیے۔ تیمارداروں کی جان میں جان آئی۔ کچھ وقفے کے بعد مریض کا پلنگ اٹھوا کر باہر سائبان میں لے آئے۔ مریض صاحب اپنے اپنی عقل کی جذباتی طبیعت سے واقف تھا ان باتوں سے خوش ہونے کے بجائے کبیدہ خاطر ہی تھے۔ جب ان سے سوال ہوا کہ کیا کھانے کو جی چاہتا ہے تو انھوں نے ناراضگی کی خاطر فرمایا "کھیرا"۔ یہ جانتے ہوئے کہ نزلے میں اس کی مضرت عیاں راچہ بیاں ہے۔ مگر نواب صاحب نے تنقیدی کیا نہ مانا بلکہ بازار سے منگوا کر کھیرے کی قاش پر سونٹ چھڑک کر کھلانے کو دیا۔ واقعی ایک گھنٹے کے اندر استفراغ کا نام بھی نہ رہا۔ اب باقاعدہ علاج شروع ہوا اور دیکھا فائدہ مترتب ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اپنے پاؤں چل کر مولوی شرف الدین پٹنہ سدھارے۔ یہ مرض کے علاج نواب صاحب کی حذاقت کا ایک کھلا ثبوت تھا۔

اسی سال سر علی کا تقرر بجائے مولوی شرف الدین ہو گیا تھا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر بحالی کے لیے درخواست دینے والوں میں میرے ایک عزیز بھی تھے۔ مگر افواہ یہ تھی کہ سر علی اپنے کسی خاص عزیز کا اس کے لیے انتخاب فرما چکے ہیں لہٰذا کسی کی دال نہیں گلے گی۔ میرے قابل احترام عزیز میرے پاس تشریف لائے کہ آنریبل سر خواجہ محمد نور اور آنریبل بخشی پرشاد سے اسناد حاصل کر دوں۔ نواب صاحب سے اس سلسلے میں کچھ عرض معروض کی۔ واسطے دینے والا کوئی نہ تھا۔ خود میرا اپنا دل نہیں چاہتا تھا مگر "الغرض مجنوں" کی وادی سے گزرے بغیر بعض وقت رہا بھی نہیں جاتا۔

جرأت رندانہ کام دے جائے تو تعجب کیا۔ نواب صاحب کی شفقت دیکھئے زیرِ بحث سا کری بیٹھے۔ وہی پتیل پرشاد وقار والا مکان۔ نواب صاحب معمولاً کچھ اسی انداز سے وظیفہ میں مشغول۔ نواب صاحب رام پور کا مکتوب کھلا پڑا تھا اور ممدوح الشان کو دستہ دار آموں کا ذکر ابھی بند تھا۔ اوراد و وظائف سے فراغ کے بعد باتیں شروع ہوئیں جن کا شعر و سخن سے سلسلہ ملا لینا دشوار نہ تھا۔ میں نے عرض کیا کہ بڑا تعجب ہے اتنا استاد ہونے کے باوجود غالب ایک شعر میں ذرا بہک گئے۔ تعجب کے ساتھ دریافت فرمایا کون سا شعر؟ عرض کیا ـــ

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

یہ ظلم و فسق حاکمِ مطلق تبارک و تعالیٰ پر الزام تراشی ہے۔ فرشتوں کے خلاف احتجاج نہیں ہے۔ سن کر شاباش دی اور کہا کہ اتنی احتیاط کون کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ خود حضور کا شعر اس سقم سے پاک ہے۔ بڑے تعجب اور شوق سے پوچھا کہ کون سا شعر؟ عرض کیا ـــ

کیا جانے لکھا کرتے تھے کیا کاتبِ اعمال
دنیا میں تو یارب کبھی محشر نہ ہوا تھا

سنتے ہی جذباتی آدمی تو تھے ہی، رو پڑے۔ بہت دعائیں دیں۔ عذر یہ کرنے لگے کہ تمام عمر جو کچھ لکھا پڑھا وہ سب جھک مارنے کے برابر ہے۔ جب خود نہ سمجھ پائے کہ جو کچھ لکھا ہے اس کا صحیح مطلب کیا ہے۔ یہ قسم فرمانے لگے کہ اس شعر کی یہ خوبی آج تک نہ سمجھ میں آئی تھی دادِ سخن دینے والی تھی۔ اب ضد فرما کر مجھ سے وعدہ لینے لگے کہ بسم اللہ سے تا تمت تک پورا دیوان مطالعہ کر کے حضرت والا کو ایک ایک شعر کا مطلب سمجھاؤں۔ وہ "اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی" کا مطلب عملی طور سے اسی دن سمجھ میں آیا۔ مجھ پر تو عذاب نازل ہوا مگر میرے عزیز محترم کا کام بن گیا۔ ایک زوردار سند لکھ دی۔ کمشنر اور چیف سیکرٹری کے نام زبردست سفارشی خطوط تحریر فرما دئے۔ اتنی پر بس نہیں کیا۔ پٹنہ کا قصد ظاہر فرما کر عزیز گرامی قدر کو سر علی سے ملا دینے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ نواب صاحب جب پٹنہ پہنچے تو اسٹیشن پر ہمارے عزیز محترم موجود تھے۔ عشق کی گاڑی سے کر سوار ہوئے اور عازمِ منزل مقصود ہوئے۔ بیچ راہ دریافت فرمایا کہ کلام تم سے کچھ یاد ہے؟ خوش اتفاق کہ یہ اشعار ان کو یاد تھے ـــ

ابھی ابھی بیٹھے ہو کیوں سر پر آفت لاتے ہو ۔۔۔ دل کی الجھن بڑھتی ہے جب زلفوں کو سلجھاتے ہو
چھپ چھپ کر تم رات کو صاحب غیروں کے گھر جاتے ہو ۔۔۔ کیسی ہے یہ بات کہو تو کیسے منہ دکھلاتے ہو
کیسا آنا کیسا جانا میرے گھر کیوں آؤ گے ۔۔۔ غیروں کے گھر جانے سے فرصت کب پاتے ہو

اس سے بھی خوش ہوئے۔ سر علی کے گھر پہنچ کر آپ باہری اقامت فرمانے لگے۔ چپراسی اردلی "سرکار سرکار" کہتے ہوئے دوڑ پڑے اندر لے گئے اور حرم میں تشریف لے چلنے پر اصرار کرنے لگے کہ آپ نے ایک دفعہ بھی صرف اطلاع کر دینے کو کہا۔ خبر ہوتے ہی خود سر علی دوڑے آئے تو آپ نے فرمایا کہ آج آپ کے ہاں تشریف نہیں لائے ہیں بلکہ حکومت کے آستانہ سے ایک شہری ملنے آیا ہے۔ یہ صاحبزادے میرے ساتھ ہیں اور انہی کی سفارش مجھے کرنی ہے۔ لائق و سعادت مند فرزند نے سفارش کو حکم کے درجہ پر رکھ کر وہی کیا جس پر یہ کہنا لازم آتا ہے کہ الولد سر لابیہ۔

نواب صاحب زندہ نہ سر علی امام مگر عمل خیر دونوں کے ہمیشہ یاد رہیں گے ـــ

نیکی کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

اب جو واقعات لکھے جاتے ہیں ان کے سنین و ترتیبِ قبل و بعد کا صحیح تعین نہیں کر سکتا۔ رستاخیز ۱۹۴۷ء میں اردو کی متاعِ حیات و مال و منال پر زوال آیا۔ میرا ایک ہی سرمایہ تھا یعنی حافظہ افسوس کہ وہی ضائع کر گیا۔ پرانی باتوں کے نقوش سطحِ دماغ پر گہرے بیٹھے تھے وہ بھی دھندلا گئے

یہ بعد کی یادداشتیں اب واضح نہیں رہی ہیں لہٰذا ان کی تصدیق کی ضرورت ہو سکتی ہے جس کا کوئی ذریعہ یہاں کراچی میں میسر نہیں۔

اب نواب صاحب شہر چھوڑ کر سندی پاوہ والی اپنی کوٹھی میں آباد — دوسرا صاحبزادہ کاظم امام پیدا ہو چکا مگر سال بھر کا بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دن اول وقت میرے گھر پر بیگم ہسپتال سے میرے بے تکلف دوست ڈاکٹر پرتول اسسٹنٹ سرجن تیز قدم چلنے کی وجہ سے کچھ ہانپتے ہوئے تشریف لائے اور جناب سول سرجن کی چٹھی دی وہ بھی فوری تشریف کہ میں جس حال میں ہوں ان کے ہمراہ چلا چلوں۔ انہوں نے صرف یہ بتایا کہ آنگلہ سے کوئی بچہ لایا گیا ہے جس کا اپریشن کرنا فوراً لازمی ہے۔ بچہ کو کسی سے منسوب بتایا جاتا ہے جس کے نام میں امام ہے۔ چونکہ تم اسپتال سے قریب رہتے ہو اور تمہارے نام میں بھی امام ہے لہٰذا سول سرجن صاحب تمہاری اجازت سے مطمئن ہو کر آپریشن کرنا چاہتے ہیں۔ واضح یاد کہ آنگلہ میں میرے عصبات پھٹتے ہیں۔ ہمارا فن بھی اسی قبیلے میں ہے لہٰذا میرا خیال نواب صاحب کی طرف نہ جا سکا۔ اسپتال پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ نواب صاحب کا نور دیدہ صاحبزادہ کاظم امام ہے جس کے گلے میں پھندا پڑ گیا ہے۔ ایک غریب درزی نواب صاحب کے یہاں ضخیم کپڑے سینے پر مامور تھا اس نے عقل سے کام لیا۔ بچہ کو لے کر افتاں و خیزاں اسپتال لے آیا۔ اور کسی کا معاملہ ہوتا تو میں ذمہ داری لینے نہ لینے کے متعلق سوچ بچار کرنے لگتا مگر نواب صاحب کی نازک مزاجی اور دوں کے آگے یہ نام کچھ میرے نزدیک ان کی ذات گرامی اعتماد کی سزاوار تھی لہٰذا میں نے بے تکلف آپریشن کی اجازت دے دی۔ آپریشن کامیاب ہوا۔ یورپین وارڈ کے ایک کمرے میں بچہ کو لٹا دیا گیا۔ نو دس مہینے کی جان، اپنے بھائی جان حسن امام صاحب کی ننھی سی تصویر اور ویسی ہی تیوری والی آنکھیں —— بڑی متانت سے خاموش پڑا سو رہا تھا۔ خواب آور دواؤں کا اثر گلے سے تیز سیٹی کی سی آواز جاری تھی۔ چونکہ نرخرے میں سوراخ کر کے اس قسم کا نلکی آر پار سوراخ والا بٹھا دیا گیا تھا جیسا وہ بڑے کے چوں چاں کرنے والی چڑیوں بطخوں میں آویزاں ہوا کرتا ہے۔ قریب سے شب نواب صاحب تشریف لائے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر خوب روئے۔ کئی دن بچہ اسپتال میں رہا۔ ربر کی نلکی نلکی کے سوراخ سے لگا دی جاتی تھی اور دودھ وغیرہ سیال قسم کی غذا پیٹ میں اتاری جاتی تھی۔ کلکتہ سے یورپین نرس مس اسٹرلنگ بچہ کی خدمت کے لئے مقرر ہو کر آ گئی تھی۔ نواب صاحب کے ساتھ کئی کئی گھنٹے اسپتال میں بسر ہوتے تھے۔ کبھی بچے کو روتے نہ سنا۔ مسکرا لینے کے سوا کھل کر ہنستے بھی نہ دیکھا۔ اس کی عمر ہی کیا تھی۔

آپ چاہے اس کو میری خوش فہمی پر محمول فرمائیے مگر مجھے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اپنی غیر معمولی و غیر متوقع فراست سے بچہ ہماری باتیں سمجھتا تھا ایسا بچہ پھر آج تک دیکھنے میں نہ آیا۔ افسوس کہ گھر جا کر چند مہینے ہی زندہ رہا۔ اس کی موت نے نواب صاحب کو زندہ درگور کر دیا۔ انا للہ...... الخ۔

اب وہ زمانہ ہے کہ سر علی امام کو مونس الملک اور حیدرآباد کو مملکت آصفیہ کا صدر اعظم لکھا جاتا ہے۔ نواب صاحب بھی حیدرآباد گئے ہوئے تھے۔ ابھی واپسی کی خبر بھی نہیں تھی کہ ایک دن یاد نہیں کس ضرورت سے گیا کہ ریلوے اسٹیشن سے باہر آتے ہی ایک کرایہ کی گاڑی میں نواب صاحب بیٹھے نظر آئے۔ گاڑی کی چھت پر اسباب لدا ہوا تھا۔ سمجھ گیا کہ حیدرآباد سے مراجعت فرما ہوئے ہیں۔ اسی لئے بڑے ذوق و شوق سے ان کی طرف لپکا۔ اب تصور فرمائیے کہ صدر عالی شان گاڑی کے اندر اور میں عام شاہراہ پر گاڑی سے لگا کھڑا ہوں۔ خیر صلاح کیسی؟ حکم ہوا کہ ہاتھ اٹھا دیجئے۔ خود بھی دست بدعا ہو کر گڑگڑا کر فرماتے جاتے ہیں کہ یا اللہ ہم سب بڑے گنہگار ہیں اور ہر سزا کے لائق مگر واسطہ اپنے نبی کریم صلعم اور ان کی آل اطہار علیہم السلام کا، میرے اعزہ و اقارب، دوست احباب پر اور چاہے جو بھی مصیبت نازل ہو مگر حیدرآباد کسی کو جانا نہ ہو سکے یا رب آمین ——!

ایک دن کا واقعہ سنئے۔ غریب خانہ حسینی منزل کے دروازہ پر ایک کرایہ کی گاڑی آ کر رکی۔ اس میں سے برآمد ہوئے نواب صاحب کی محل سرا کے باورچی میاں منگو مرحوم، بایں ہیئت کذائی کہ نہ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتے۔ "یا الٰہی خیر کیجیو" کہنے کے سوا اور کیا کرتا۔ خبر لائے کہ نواب صاحب سخت علیل ہیں اور فی الفور بلایا ہے۔ میں نے پوچھا کہ گاڑی پر سوار کرنے کی مہلت تھی مگر ٹوپی جوتی کی طرف دھیان دینے کی فرصت نہ ملی کیوں؟ غریب بلبلا اٹھا کہ نواب صاحب کی حالت پریشانی نے یہ ٹوپی چلی چڑنے پر مجبور کر دیا۔ پیادہ پا تمام راستے کی پیل پار کر کے گاڑی

پکڑی۔ خیر ساتھ ہو لیا۔ باورچی خانہ و دیگر چیزوں کا لانبا سا سائبان جس کے آگے سنگریزوں کی سڑک سی بنی تھی اسی پر پلنگ بچھا تھا اور کرسیاں پڑی تھیں۔ میں جب اس جگہ پہنچا تو دیکھا کہ دو آدمی دونوں بازوؤں کو سہارا دیتے ہوئے نواب صاحب کو ہوشیاری کے ساتھ سنبھالتے زنان خانہ سے اسی پلنگ پر لا رہے تھے۔ صورت سے نواب صاحب واقعی بے حد علیل نظر آئے۔ نقاہت بھی ایسی طاری تھی کہ جیسے کچھ مہینوں کے فاقہ زدہ مریض کی ہوتی ہے۔ نواب صاحب کی خو بو سے کافی واقفیت کے باوجود بھی میں صاف دھوکا کھا ہی گیا۔ پلنگ پر دراز ہوتے ہی مخاطب فرمایا کہ بابو! بڑے وقت پر تم آگئے بس چند گھنٹوں کا میں مہمان ہوں۔ جانبر ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ تم کو وصیت کرنے کے لئے بلایا ہے۔ اگر میری وصیت پوری کرنے کی حامی تم نے بھری تو میری جان آسانی سے نکلے گی اور روح آسودہ و مطمئن رہے گی۔ تم جانتے ہو کہ میں اس شادی بیاہ کا نہ تھا مگر عمر کے اس سن میں کیا کرتا؟ کہ ادھر کے امام باڑے اور نیرہ کی مسجدیں ویران ہو گئیں۔ علی امام، حسن امام کرسچن ہو گئے۔ کلام مجید پڑھنے والا میری نسل میں نہ رہا۔ مجبوری شادی کر کے دوبارہ نسل جاری کرنی چاہی اب آخری وقت ہے۔ ادھر میں مرا ادھر علی امام، حسن امام بال بچوں پر قبضہ جما لیں گے اور اپنے جیسا کرسچن بنائے بغیر باز نہ آئیں گے۔ لہٰذا بابو! میری وصیت ہے کہ میرے بعد میرے بال بچوں کے والی و کفیل آپ ہوں۔ علی امام، حسن امام سے ان کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ آپ سنی ہیں، آپ کی تربیت میں میرے بچے شیعہ نہ رہ سکیں گے۔ یہ مجھے گوارا ہے، موحد و مسلمان تو رہیں گے، کرسچن تو نہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا آپ زبان دیجئے کہ میری وصیت پر آپ عمل کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت مجھے جو حقیقت کی ہوا بھی نہیں لگی تھی مگر ذرا سی دیدہ دلیری کے ساتھ میں نے نواب صاحب کا بکس دواؤں والا طلب کیا۔ جو شیشی ہاتھ آئی اسی میں سے کاغذ پر چند گولیاں نکال کر نواب صاحب کو دیں کہ پہلے ان کو نوش فرمائیے اس کے بعد جو وصیت کیجئے گا اس کی تعمیل اپنی سعادت سمجھوں گا۔ جلد از جلد دوا کھا کر استفسار فرمایا کہ تم کو بھی اس طریقۂ علاج میں درک حاصل ہے؟ فیض صحبت کو میں نے حیلہ بنایا۔ دوا کھاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ خوب کھنکار کھنکار کر تھوکا۔ لیٹے سے بیٹھے ہو گئے۔ فرمانے لگے بابو! ہم سمجھ گئے۔ آپ نے اینٹیم ٹارٹ دیا ہے۔ لوگوں کی طرف مخاطب ہو کے کہا کہ یہ بھی بابو کی حذاقت ہے۔ میرے معدہ میں بلغم شدید جمع ہو کر زہر پھیلا رہا تھا۔ اگر ذرا سی دیر اور اس کا تدارک نہ ہوتا تو میرا کام تمام تھا۔ اب نواب صاحب پوری طرح توانا و تندرست، خوش و خرم، چاق و چوبند تھے۔ پلنگ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے ہاتھوں سے پکڑا اور چلے زنان خانہ کی طرف۔ ڈیوڑھی کے پردے کے پاس پہنچ کر شاید ان کو یاد آیا کہ ابھی وہ کس حال میں برآمد ہوئے تھے۔ لہٰذا تھوڑا سا اضمحلال اپنے پر طاری کر کے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہوئے اندر پہنچ گئے۔ محترمہ بیگم بھی میرے سامنے نہ آتی تھیں۔ ان کے پاس پہنچ کر گلوگیر مضمحل آواز میں فرما رہے تھے کہ بابو نے میری جان بچائی ہے بابو کے قدم لو۔ وہ غریب بیک وقت ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم۔ مگر ان کے واسطے سے مجھ غیر محرم کو دیکھ کر ہٹ بھی نہیں سکتی تھیں۔ پھر عادی بھی تو تھیں کہ اپنی عمر سے بہت زیادہ سن و سال والے عزیزوں سے سامنا ہوا کرے۔ مجھے بھی ٹکٹکی باندھ کے دیکھا کیں۔ بعد کو معلوم ہوا کہ بیچاری اونچا سنتی تھیں اور نواب صاحب آواز کی نقاہت کا بیکار مظاہرہ بھی فرما رہے تھے۔ ـــــ بیگم صاحبہ بحمد اللہ زندہ و سلامت ہیں۔

مذہب کے متعلق یہی نہیں کہ وہ اپنے شیعہ ہونے پر متشدد تھے بلکہ ہر صحیح الخیال کے متعلق اصرار فرماتے تھے کہ وہ بھی شیعہ ہے۔ سنیوں سے تقیہ کے اظہار میں بیباک تھے اور بڑی عجیب باتیں سنیوں سے منسوب کرتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ایسی ہی کوئی بات انھوں نے سنیوں سے منسوب کی تو میں بغیر کسی لحاظ کے احتجاج کر دیا کرتا تھا کہ آخر ہم لوگ بھی تو سنی ہیں۔ ان واہی تباہی باتوں سے ہم کو واسطہ کیوں نہیں ہے؟ بڑی سادگی کے ساتھ اس پر کہتے کہ بابو خدا نہ کرے آپ کہیں سنی ہونے لگے۔ پلٹ کر میں بھی کہہ دیا کرتا تھا کہ جب ہم سنی نہیں ہیں تو آپ کہاں کے شیعہ؟ کبھی ان باتوں سے نہ کبیدہ خاطر ہوا کرتے نہ بحث مباحثہ کو راہ دیتے نہ ابرو پر بل لاتے نہ چہرہ پر میل لاتے۔ یہاں تک کہ مسکراتے بھی نہیں۔ کہتے تو بس یہی کہ باتوں کا رخ پلٹ دیتے۔

"معجون طرفہ" کے سلسلے میں نادر الفاظ کا بیان ہو چکا ہے۔ اس زمانہ کے بنگالیوں کی اردو میں ایک غزل موزوں فرمائی تھی جو ان کے [illegible] احباب کو یاد ہو گئی تھی۔ اس میں کمال یہ ہے کہ موزونیت کے ساتھ مصارع پڑھے ہی نہیں جا سکتے جب تک بنگالیوں کا مخصوص تلفظ اپنایا نہ جائے۔ چند اشعار جو یاد رہ گئے ہیں ملاحظہ ہوں :-

مجھ میں جو کھل جاتا ہے اصفور کا موتی — اس واسطے پتلی وہ وچار بٹے ہیں
کاگری اس راہ میں پورتا ہے بابا — دن رات کلی لوگ یہاں پڑنکھا کئے ہیں
کرکا جو پیتا ہے کھڑا چوتا کے نیچے — اخبار یہاں پڑھتے ہیں اور بٹے ہیں

واضح ہو کہ تذکیر و تانیث کی طرف سے بے خیالی دانستہ ہے۔ بعض الفاظ کی ضروری تشریح یہ ہے :-

(۱) اصفور : اصغر (۲) کاگری : کیا گرمی (۳) پورتا : پڑتا (۴) پڑنکھا : پنکھا (۵) کرکا : چلم پینے کا ناریل (۶) چوتا : چھپروں کی اولتیاں (۷) بٹے : بی۔ اے

ختم کلام یہ عرض کروں کہ اتنی زیادہ تفصیل سے یہ بات کہ لکھنے کی ضرورت کا قائل ہو نہ ہوا اور اس سے اقتباس خاطر حاصل کرے۔ اس کے آگے بھی ضرورت پیش کرنے کو میں ابھی تیار نہیں ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ بھی ضروری ضروری تفصیلیں اور بحثیں تو میں نے ہنوز بر روئے کار لائی ہی نہیں ہیں۔ تحریر طول کا تتمہ دوسری قسط میں نذر ہوگا۔ اس کے ملاحظہ کے بعد جو ارشاد جو تجویز ہوگی اس کا قبول کرنا میرا فرض ہوگا۔ فی الحال تمنا بخیر و بالسلامت۔

نواب صدر یار جنگ بہادر

(مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی)

مالک رام

نواب صدر یار جنگ بہادر سے میری ملاقات محض حسنِ اتفاق کا نتیجہ تھی۔ وہ بالعموم علی گڑھ یا حبیب گنج میں رہا کرتے تھے، میں دہلی سے آگے کہیں گیا ہی نہیں تھا۔ ان کا حلقۂ احباب مجھ جیسے ہیچ میرز و ہیچ مداں سے بہت بلند تھا، اور عمر کا جو فرق تھا وہ ظاہر ہی ہے۔ پس عام حالات میں اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے مل سکتے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ملے۔

ہوا یہ کہ ۱۹۴۲ء میں مجھے غالب کی کتاب "سبد چین" دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ مختصر سا مجموعہ جس میں مشکل سے کچھ سات سو شعر ہوں گے غالب نے اپنی زندگی کے آخری ایام یعنی ۱۸۶۷ء میں شائع کیا تھا، لیکن چونکہ اس کے بعد نہ یہ الگ کہیں سے چھپا، نہ کلیات ہی کے کسی ایڈیشن میں اسے شامل کیا گیا، اس لیے مدت سے نایاب ہو چکا تھا۔ غالب کی بعض اپنی تحریروں اور یادگارِ غالب میں اس کا ذکر موجود ہے، اور وہیں سے مجھے اس کا پتہ چلا تھا۔ میں نے ادھر ادھر بعض احباب کی خدمت میں لکھا کہ اگر آپ کے پاس یہ کتاب ہو تو چند دن کے لیے مستعار عنایت فرمائیے۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ نہ یہ ہمارے یہاں ہے نہ ہم نے اسے دیکھا ہے۔ البتہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اتنا اضافہ کیا کہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی خدمت میں لکھ کے پوچھیے، ممکن ہے اُن کے کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ محفوظ ہو۔ چنانچہ میں نے ان کی خدمت میں لکھا۔ یہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ ان کا جواب یہ مژدہ لایا کہ "سبد چین" کا ایک نسخہ میرے یہاں موجود ہے۔ یہی تقریبِ تعارف۔

یہ گرمیوں کا ذکر ہے۔ میں ان ایام میں اپنے کام کے سلسلے میں شملے میں مقیم تھا۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو کتاب مجھے مستعار بھیج دی جائے، میں اس کی نقل لے کر اسے بحفاظت واپس کر دوں گا۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ آپ کہاں اتنی زحمت کریں گے، میں یہیں سے اسے نقل کروا کے چند دن میں بھجوا دوں گا۔ چنانچہ پندرہ بیس دن کے بعد انھوں نے یہ نقل مجھے بھیج دی۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں نے اس کی تلاش میں پانچ چھ مہینے صرف کیے تھے اور تقریباً مایوس ہو چلا تھا۔ اگرچہ یہ چیز میرے خیال سے بہت کم نکلی، تاہم مجھے یہی بہت تھا کہ غالب کا کلام اتنا نایاب کہ بڑے بڑے صاحب ذوق حضرات کے کتب خانے اس سے خالی تھے، اور وہ خود اس سے ناواقف تھے۔ اس لحاظ سے میں جتنا فخر بھی کرتا کم تھا۔

انھوں نے جو نقل مجھے بھیجی اس میں بہت غلطیاں تھیں۔ اب میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ آیا اصل کتاب ہی اتنی غلط چھپی ہے یا نواب صاحب

کے کاتب نے روانی اصلاحیں دی ہیں۔ اور جس سے کتنی غلطیاں تو یہ ہیں کہ میں نے خود ہی اٹکل سے انہیں درست کیا۔ پھر بھی کچھ ہیں رہ گئیں کہ ان کے پڑھنے سے عاجز رہا۔ ایک آدھ جگہ لفظ ہی لکھنے سے رہ گئے تھے۔ میں نے جب اس کا ذکر نواب صاحب سے کیا تو بولے۔ ہاں اگرچہ کاتب بہت محتاط آدمی ہے لیکن امکان ہے کہ اس سے غلطیاں ہوگئی ہوں۔ اس پر میں نے دل میں سے کہا کہ جب دیوان چھپا ہوا تو ایک دن کے لئے کسی جگہ سے چھپا ہوا دیوان لاؤں گا اور اصل نسخے سے اس کا مقابلہ کر کے درستی کروں گا۔ نواب صاحب مرحوم نے بھی مجھے اجازت دی کہ جب چاہئے ہمیں تو دیوان لے جائیے اور کتب خانے میں دیکھ جائیے۔ یہ تو میری خواہش تھی۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے آنے کا وعدہ کر لیا۔

اس کے تھوڑے دن بعد میں دہلی آگیا۔ یہاں ایک دن اب یاد نہیں۔ اس کی کون سی کتاب دیکھ رہا تھا کہ اس میں حکیم مومن خاں کے فارسی دیوان کا ذکر پڑھا۔ میں نے بھوپال کی دوست کو لکھا کہ آپ کے ہاں حبیب گنج میں مومن کا فارسی دیوان ہے۔ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ ہاں دیوان کا ایک نسخہ موجود ہے۔ لیکن اب جب تک آپ کسی کو نہیں بھیجا ہے، وعدہ وفا کیجئے۔ یہاں آئیے اور جو چاہیے سو دیکھئے۔ میں خود کئی دن سے وہاں جانے کے لئے پر تول رہا تھا لیکن مکروہات اجازت نہیں دیتے تھے۔ اسی کشمکش میں کئی مہینے نکل گئے۔ آخر ایک دن میں نے سر پھرا کے بستر باندھا اور بغیر اطلاع دئے علی گڑھ پہنچ گیا۔ گاڑی وہاں مغرب کے بعد پہنچی تھی۔ وہاں اچھا خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ جب میں علی گڑھ کے اسٹیشن پہنچا تو بوندا باندی بھی پڑ رہی تھی۔ اب میں نے خیال کیا کہ یوں بے اطلاع آنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اگر وہ یہاں نہ ہوئے تو پھر کیا ہوگا لیکن یہ خیال ایک لمحے سے زیادہ میرے دماغ میں رہا نہیں۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ دل نے کہا اگر نہ ہوئے تو کون سی قیامت آجائے گی، رات کی گاڑی سے واپس چلے جانا۔ بہر حال میں نے سواری لی اور چند منٹ میں میری سواری حبیب منزل میں جا پہنچی۔ وہ خود اس وقت موجود نہیں تھے۔ ملازم مجھے اندر جناب عبد الوحید خاں صاحب کے پاس لے گیا۔ میں نے آداب عرض کیا اور اپنا تعارف کرا کے خاموش ایک طرف بیٹھ گیا۔

نام آگیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں جناب عبد الوحید خاں صاحب کا تعارف کرا دوں۔

نواب صدر یار جنگ مرحوم نے اپنی عمر میں تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی ان کے چچا حاجی محمد عبد اللہ خاں صاحب کی صاحبزادی تھیں۔ نواب صاحب مرحوم کے سب سے بڑے صاحبزادے نواب بہادر مولوی محمد عبید الرحمٰن خاں صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ انہی بیگم کی اولاد ہیں۔ دوسری شادی بھی اپنے خاندان ہی میں ہوئی۔ یہ بیگم جناب محمد عابد خاں شیروانی رئیس بھیکم پور کی ہمشیرہ تھیں۔ نواب صاحب کا تیسرا عقد جناب مولانا عبد الغنی خاں صاحب مرحوم قائم گنج (ضلع فرخ آباد) کی دختر نیک اختر جناب زینب بیگم صاحبہ سے ہوا۔ مولانا عبد الغنی خاں مرحوم مشہور کتاب "[illegible]" کے مصنف ہیں۔ جس میں فارسی مصادر کے معنوں کی اسناد اساتذہ سے جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ سواد [illegible] اور ایک تذکرہ شعرائے فارسی بھی ان سے یادگار ہے۔ مولانا عبد الغنی خاں نواب صاحب کے استاد بھی تھے۔ انہوں نے فقہ اور حدیث و تفسیر کی متعدد کتابیں ان سے پڑھی تھیں۔ یہی مولانا عبد الغنی خاں صاحب جناب عبد الوحید خاں صاحب کے والد بزرگوار تھے اور جناب زینب بیگم صاحبہ ان کی ہمشیرہ تھیں۔ نفیس دلہن کے نام سے کبھی کبھی مضمون بھی لکھا کرتی تھیں۔ دو تین سال ہوئے کہ انتقال فرمایا۔

ایک اور بات یاد آگئی۔ غالب نے ایک غزل میں اپنے تمام مشہور معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ قطعہ ہے:

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود ۱ باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ ۲ حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں
غالب سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار ۳ ہست در بزم سخن ہم نفس و ہمدم شاں

یہاں دوسرے شعر میں علوی سے مراد مولوی عبد اللہ خاں علوی ہیں۔ یہ علوی ہمارے مولانا عبد الغنی خاں صاحب کے حقیقی ماموں تھے۔ مولوی محمد اسمٰعیل شہید دہلوی کے شاگرد تھے اور سید احمد بریلوی سے بیعت تھے۔ طبابت میں بھی دخل حاصل تھا۔ [illegible] میں اپنے وطن [illegible] میں تپ محرقہ سے وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ صہبائی کے شاگرد تھے۔ تاریخ وفات ہے "[illegible]"

باتوں سے بات یاد آتی ہے۔ غالب کے نانا غلام حسین خاں آگرہ کے رہنے والے تھے۔ غالب نے اپنی والدہ جو بیوی [illegible] بیگم صاحبہ کا نام عزت

ایک فارسی خط میں دیا ہے۔ جو انھوں نے آگرے ہی کے ایک صاحب خداداد خاں اسمان کے بڑے صاحبزادے ولی داد خاں کے نام لکھا ہے۔ اس خاندان کو غالب کی ننھیال سے بھی دیرینہ کے تعلقات تھے اور اسی رشتے سے غالب نے یہ خط بھی لکھا ہے۔ اصلی خط کتب خانۂ حبیب گنج میں موجود ہے۔ نیز ان خداداد خاں کے ایک اور صاحبزادے کریم داد خاں بھی تھے۔ ان کریم داد خاں کی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ ان صاحب کے نام لکھنا تو غیر ضروری ہے۔ البتہ ان میں سے ایک صاحبزادی کا نام بسم اللہ بیگم تھا۔ یہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں سے منسوب تھیں اور جناب عبیدالرحمٰن خاں صاحب انہی بسم اللہ بیگم کے صاحبزادے ہیں۔ گویا یہ غالب کے مکتوب الیہ جناب خداداد خاں کی پوتی کے بیٹے ہوئے۔ غالب کے جس خط کا اوپر ذکر ہوا وہ انہی سے نواب صاحب نے حاصل کیا تھا جو ان کے خاندانی اوراق میں محفوظ تھا۔

یہ جملہ معترضہ ذرا طویل ہو گیا۔ بہر حال جناب نواب صاحب نو بجے کے قریب مکان پر تشریف لائے۔ جونہی پہنچے انہیں میرے آنے کی اطلاع دی گئی۔ اس کمرے میں آئے جہاں ہم لوگ تھے۔ میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے دوزانو بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلنے پر نظر اٹھا کے جو دیکھتا ہوں تو وہ سامنے کھڑے تھے۔ اگرچہ میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا مگر میں نے قیافے سے فوراً پہچان لیا۔ چپکے سے بیٹھ گئے۔

بہت لانبا قد کوئی چھ فٹ کے قریب۔ گٹھا ہوا جسم۔ سرخ و سپید رنگت۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی ستواں ناک۔ خضاب لگی ہوئی بھرواں داڑھی۔ خضاب لگے کچھ دن ہو چکے تھے، کیونکہ جڑوں سے سپیدی جھلکنے لگی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی جس سے سامنے کے دانت نمایاں ہو گئے تھے اور ان کے پان کے شوق کے غماز تھے۔ جسم پر بند گلے کا شیروانی نما کوٹ اور نیچے ڈھیلا ڈھالا پاجامہ تھا۔ سر پر ٹوپی تھی اور اس کے اوپر مڑاسے کی شکل میں سپید شال اوڑھے ہوئے تھے۔ ایسے خوبصورت اور جامہ زیب آدمی میں نے بہت کم دیکھے تھے۔

بہت تپاک سے ملے اور اشارہ کر کے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے۔ برآمدے میں سے گزرتے ہوئے فرمایا: آپ نے خط کیوں نہ لکھا؟ اسٹیشن سے یہاں تک آنے میں تکلیف ہوئی ہوگی۔ میں نے کہا جی نہیں، مکان تو آسانی سے مل گیا تھا۔ آپ نے لکھا ہوتا تو میں کار اسٹیشن پر بھیج دیتا۔ غرض اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے انہوں نے تین چار سوال کر دیے۔ ان کے لہجے میں کسی طرح کی عجلت اور گھبراہٹ نہیں تھی، بلکہ آواز بہت دھیمی تھی اور ایک ایک لفظ انہوں نے الگ الگ کہا۔ کمرے میں پہنچے تو پھر بیٹھتے ہی فرمایا: میں تو آپ کو زیادہ عمر کا خیال کرتا تھا۔ آپ تو ماشاءاللہ بالکل جوان ہیں۔ میں نے عرض کیا: قبلہ جوانی کی بھی ایک ہی کہی۔ ساری عمر جس ماحول میں بسر ہوئی ہے وہاں یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ جوانی کس چیز کا نام ہے۔ "غمِ عشق" تو تھا نہیں، غمِ روزگار نے ہمیشہ پریشان رکھا۔ اس سے دل جوانی ہی میں بوڑھا ہو گیا۔ کہنے لگے: میں تو آپ کے فارسی کے ذوق پر بہت حیران ہوا۔ ابھی رشید صاحب کی فرمائش سے جو تعجب ہوا تھا وہ یہ تھا کہ آپ نے مومن کے فارسی دیوان سے متعلق مجھے کچھ بھیجا۔ پھر میری فارسی تعلیم کا حال پوچھا۔

فرمایا: میں مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کے پاس گیا تھا۔ ایک مدت سے یہ معمول ہے کہ جب یہاں علی گڑھ آتا ہوں تو اگر وہ یہاں موجود ہوں تو شام کا وقت ان کے ساتھ گزارتا ہوں اور واپسی بالعموم عشا کی نماز کے بعد ہوتی ہے۔ آج معمول سے ذرا دیر ہو گئی۔ پھر ان کی تعریف اور علم و فضل سے متعلق چند کلمات کہے۔ اس کے بعد موضوعِ سخن بدل گیا۔ فارسی ادب اور علم و ادب پر گفتگو ہونے لگی۔ اسی طرح رات گئے تک ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ خواہ مخواہ ان کے آرام میں خلل ہو رہا ہے۔ لیکن وہ اتنی محبت اور دلچسپی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ اگر وہ میری بے وقت کی دراندازی سے بے آرام بھی ہوئے تو انہوں نے کسی طرح اسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ آخر آدھی رات کے قریب میں نے باتوں باتوں میں اشارہ کیا تو نہایت لطف سے فرمایا: ارے آپ کی دلچسپ باتوں سے مجھے اس کا تو خیال ہی نہیں رہا کہ آپ سفر سے آئے ہیں۔ تھکے ماندے ہوں گے۔ اچھا اب آپ آرام کیجیے۔ کل صبح انشاءاللہ حبیب گنج چلیں گے۔ میں نے عرض کیا: وہ دو تین گھنٹے کا راستہ تھا، کوئی ایسا سفر تھا کہ میں تھک جاتا۔ آپ کو تکلیف کا خیال ہو رہا ہے۔ بہر حال ہم نے ایک دوسرے سے شب بخیر کہا اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اس دوران میں بارش زیادہ سنجیدگی سے ہونے لگی تھی اور ٹھنڈی تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ بدقسمتی سے میرے کمرے کے ایک روشن دان میں کچھ خرابی تھی۔

ے پوری طرح بند نہیں ہوا تھا اور ہوا سے اس کا پٹ کھٹکھٹاتا تھا۔ رات بھر اس بے ہنگم آواز کے باعث میں ٹھیک طرح سو نہیں سکا۔ خیر صبح کو اٹھا، حمام میں پانی گرم ہو رہا تھا۔ نہایا دھویا، ناشتے کے بعد ہم نواب صاحب کی موٹر پر حبیب گنج کے لئے روانہ ہوئے۔ اگرچہ بارش ختم ہو چکی تھی لیکن ہوا میں خاصی نمی تھی۔ اور سردی بھی خوب چمک گئی تھی۔ ڈرائیور کے علاوہ ہم تین آدمی تھے۔ نواب صاحب، ان کے مصاحب مولانا سعد اور میں۔ نواب صاحب اور میں پچھلی طرف بیٹھے اور مولانا سعد صاحب ڈرائیور کے برابر میں آگے بیٹھ گئے۔ سڑک بہت خراب تھی۔ اس کا اکثر حصہ پہلے ہی شکستہ سا تھا۔ رہی سہی کسر رات کی بارش نے پوری کر دی۔ گڑھوں میں پانی بھر گیا تھا اور جہاں پانی نہیں تھا وہاں کیچڑ موجود رہی تھی۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم افتاں و خیزاں حبیب گنج پہنچے۔ علی گڑھ سے ناشتہ کر کے چلے تھے اور دوپہر کے کھانے میں ابھی بہت دیر تھی۔ اس لئے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ پہنچتے ہی نواب صاحب نے کتب خانہ کھولنے کا حکم دیا۔ مہتمم صاحب آ گئے۔ الماریوں سے کرسیوں کو جھاڑا پونچھا اور ہم داخل ہوئے۔

اللہ اللہ! میں اپنے تاثرات کا حال کیا لکھوں۔ ہر طرف ہزاروں بیش قیمت کتابیں قرینے سے الماریوں میں چنی رکھی تھیں۔ غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر کسی پچھلے شاعر کے ہاں کوئی ایسا مضمون بندھ گیا ہے جو میرے یہاں بھی پایا جاتا ہے تو اس سے یہ خیال نہ کرو کہ میں نے اس سے توارد کیا ہے بلکہ یقین جانو کہ اس شخص نے روزِ ازل سے میرے مضمون کی چوری کر لی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال میرا اس وقت ہوتا ہے جب میں کسی جگہ کوئی نادر کتاب دیکھتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے غلطی سے میرے حصّے کی چیز یہاں آ گئی ہے۔ اور یہاں تو ایک دو نہیں ہزاروں کتابیں میرے ارد گرد پڑی تھیں ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

نواب صاحب کا عجیب عالم تھا۔ وہ ایک ایک کتاب منگواتے، مجھے دکھاتے اور پھر اس کی خصوصیات گنوانا شروع کرتے۔ یہ ملک الشعراء طالب آملی کا دیوان ہے۔ اس میں بہت سا کلام خود طالب کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ اس طرف میری توجہ علامہ شبلی مرحوم نے دلائی تھی۔ میں نے جب یہ دیوان خریدا ہے تو محض قدامت اور کتابت کی خوبی کے باعث۔ لیکن اتفاق سے علامہ نے دیکھ کر کہا کہ اس میں بہت سی غزلیں خود طالب کے ہاتھ کی ہیں۔ دیکھئے یہ [illegible] کی ہے۔ یہ مثنوی کا ایک قدیم نسخہ ہے۔ [illegible] اس سے قدیم تر نسخہ جرمنی کے مشہور کتب خانے میں محفوظ رہ گیا ہے۔ [illegible] درمیان میں کچھ برس پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ یہ دیوانِ حافظ حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے کتب خانہ میں رہا ہے۔ یہ دیکھئے ان کی مہر ہے۔ صاف پڑھا جاتا ہے۔ "محمد اورنگ زیب بادشاہ"۔

یہ شیخ سعدی کی بوستاں ہے۔ اس پر اودھ کے تین بادشاہوں کی مہریں ہیں۔ نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ۔

چند دن ہوئے ایک تازہ تحفہ آیا تھا۔ کلام مجید تھا۔ [illegible] مہتمم صاحب کے ہاتھ منگوایا۔ اس کے شروع میں پانچ چھ سطریں اس شان سے لکھی ہوئی تھیں کہ آدمی لکھاوٹ بہت قدیم اور خوشخط تھی [illegible] معلوم ہوتا تھا [illegible] خود نواب صاحب نے خریدا تھا۔ [illegible] اٹھایا اور اسے میرے ہاتھوں میں دے کر فرمانے لگے۔ دیکھئے تو یہ عبارت پڑھ سکتے ہیں؟ میں الٹ پلٹ کے پڑھنے لگا۔ آخر میں "نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی" کے الفاظ تھے۔ گویا یہ خود جہانگیر کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ اور اسی تحریر نے مجھے اس کے پڑھنے کے قابل کیا تھا۔ جہانگیر بادشاہ کے [illegible] قرآن کا دیباچہ [illegible] تھا اس کے ساتھ چند ایسے مصحفوں کے عکس دیے گئے ہیں جن پر مغل بادشاہوں کی تحریریں یا دستخط ہیں۔ میں اسے دیکھ چکا تھا۔ جہانگیر کی یہ عبارت پڑھنے کے بعد میں نے کہا کہ جہانگیر کے دستخط بالکل وہی ہیں جو قرآن کے دیباچے میں ہیں۔ یہ سن کر نواب صاحب بہت مسرور ہوئے۔ اور کہا کہ آپ نے قرآن کا دیباچہ دیکھا ہے۔ پھر اسے بھی منگوایا اور ہم دونوں اسے دیکھ دیکھ کے خوش ہوتے رہے۔

غرض ہم دیر تک اس جنتِ نگاہ کے نظارے سے بہرہ مند رہے۔ وہ کتاب نکلواتے جاتے، دکھاتے جاتے اور اس کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے جاتے۔ اگر میں ورق بھی [illegible] تو خوشی کا اظہار فرماتے۔ وہ مجھ کو کتابیں اس طرح دکھا رہے تھے جیسے میں کوئی [illegible]

مبصر یا صاحبِ علم و فن ہوں۔ وہ ہر طرف سے بے پروا ہو کر یہیں کتاب پہ کتاب نکالا ہے سمجھئے گیا آج جہاں مرتبا ضخیم کرکے کتابوں کا قدرداں چلا ہو اور میں دیکھتے ہیں کہ اگلی اور ساری نئی نئی فرادی پر عرق عرق ہوا جا رہا تھا۔ حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کا شعر ہے ؎

یاراں نہ مہربانی ماندند، نہ ہیچ ماند
ما خوب ہی شناسیم اے درد آنچہ مائیم

اصل بات یہ ہے کہ روابط غرض سب کچھ ہوتے ہوئے بھی احساسی اور بنیادی طور پر علمی آدمی تھے۔ ان کی ذہنی اور ذوقی آسائشیں اگر ہو سکتی تھیں تو کتابوں سے یا صاحبِ علم اصحاب کی صحبت ہیں۔ جہاں کہیں انہیں یہ دونوں چیزیں میسر آجاتیں ان کو پوری یہ ہوتا جو بہرحال عارضی چیز تھی۔ اٹھ جاتا اور وہ اپنے اصلی روپ میں نمایاں ہو جاتے۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ میں جب ان سے ملا تو وہ بے نقاب ہو گئے۔ مجھے یا قلعہ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ میں بھی پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتا ہوں اور کتابوں کا قدرداں۔ اس صورت میں عمر، مرتبہ، علم کا تفاوت کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اہم چیز یہ تھی کہ میں بھی ان کے خیال میں ہر کو شوق اور کتابوں کا رسیا تھا۔ یہی چیز ہم دونوں میں گویا قدرِ مشترک تھی۔ اس کے بعد بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایک ہم مشرب و ہم خیال شخص کے سامنے اپنا دل کھول کر نہ رکھ دیتے۔ اس میں کچھ بھی حد تک جذبۂ افتخار بھی شامل تھا۔ آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ آپ کا کوئی صاحبِ ذوق اپنا کوئی اچھا مال اپنے ہم جولیوں کو دکھائے بغیر چین نہیں آتا۔ اصل محرک میں بھی یہی بات ہے یعنی کسی ہم خیال کے ساتھ مل کر اس سے لطف اندوز ہونا اور اپنی ملکیت کا فخریہ اظہار یا اس کی نمائش کی خواہش۔

نواب مسعود جنگ نے عمر بھر کی محنت سے یہ کتب خانہ جمع کیا۔ بدقسمتی سے یہ ایسی جگہ تھا کہ وہاں تک پہنچنا آسان نہیں تھا اس لئے بہ ارادت، واقعی صاحبِ ذوق حضرات بھی وہاں جانے سے جھجکتے تھے۔ لیکن اگر کسی طرح نواب صاحب کو معلوم ہو جاتا تو وہ دعوتیں دے دے کر انہیں بلاتے، اپنا سوار بھیجتے اور جب واقعی کوئی قدرداں مل جاتا تو بچھے بچھے جاتے۔

عرب کے مشہور شاعر متنبی نے ایک شعر میں اپنی دو دل پسند چیزوں کا ذکر یوں کیا ہے ؎

وخیرُ مقامٍ فی الدُّنیٰ سرجُ سابحٍ
وخیرُ جلیسٍ فی الزّمانِ کتابُ

یعنی دنیا میں بہترین نشست برق رفتار گھوڑے کی زین ہے اور زندگی میں بہترین ساتھی کتاب ہے۔

یہی مصرع اصفیہ کتب خانے کا طغرا ہے۔ ربڑ کی ایک تکونی مہر میں یہ کندہ تھا اور جو کتاب یہاں داخل ہوتی اس پر یہ مہر لگائی جاتی تھی۔

آخر ہم اندر سے نکل کر باہر کے برآمدے میں آکے بیٹھ گئے۔ یہاں دیوار پر مختلف تصویریں، نقشے، مرقعے وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ ہندوستان کا ایک پرانا اور دلکش نقشہ تھا۔ جس میں ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کی مذہبی پیداوار اور حیوانات بھی تصاویر میں دکھائے گئے ہیں۔ مہاراجہ کرشن پرشاد مرحوم کا آخری زمانے میں مصوری کا بھی شوق ہوا تھا۔ یہاں ان کی دستکاری کے بھی چند نمونے دیکھے۔ تصویریں کچھ ایسی تو نہیں تھیں۔ البتہ تبرک ضرور تھیں۔ شروع میں غالب کے جس خط کا ذکر کیا ہے وہ بھی موجود تھا۔ اس خط کے آخر میں تاریخ تحریر [illegible] لکھی ہے، جو یقیناً غلط ہے۔ دیر تک اس پر بحث ہوتی کہ ٹھیک تاریخ کیا ہے۔ بہرحال کچھ فیصلہ نہ ہو سکا اور ہو بھی کیسے سکتا تھا محض قیاس آرائی ہی تو تھی۔ ثبوت کیسے مہیا کیا جا سکتا تھا۔ ذکر غالب کے ساتھ میں نے غالب کی جس تصویر کا عکس دیا ہے وہ میں نے یہیں سے لیا تھا۔

آنے میں جلد کا وقت ہو چلا تھا۔ فرمایا اگر کھانے کے بعد مطالعہ کیلئے کوئی کتاب چاہئیں تو نکلوا لیجئے۔ میں نے گزارش کی کہ سید جی کا مطبوعہ نسخہ دیوان غالب نکلوا دیجئے تاکہ جو نقل آپ نے بھجوائی ہے اس سے مقابلہ کر سکوں۔ نیز مولوی کا فارسی دیوان۔ کتابیں آگئیں اور ہم باہر چلے گئے۔ میں اپنے کمرے کی طرف گیا اور وہ مسجد کی طرف۔

* سید جی کی پہلی نسخہ و دیوان اشاعت میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی تھیں۔ اور اس کے آخر میں غلط نامہ لگایا گیا تھا۔ سوءِ اتفاق سے جیب کے والے نسخے سے یہ غلط نامہ غائب تھا اس لئے میں پوری تصحیح نہ کرسکا۔ آخر میں نے یہ کام اورنگ آباد جا کر پوری کے نسخے کو دیکھ کر کیا تھا اس کے باوجود میرے

شائع کردہ ایڈیشن میں بعض غلطیاں رہ گئی ہیں جن کا مجھے افسوس ہے۔

تھوڑی دیر بعد ملازم مجھے کھانے کے لئے بلانے آئے۔ دسترخوان لکڑی کا ایک نیچا سا تخت تھا۔ اس پر سفید چادر تھی۔ تخت کے چاروں طرف گدے تھے ہم لوگ ان پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب خود دسترخوان کے ایک سرے پر تھے۔ ان کے سیدھے ہاتھ ان کے خلف اکبر جناب عبیدالرحمن خاں صاحب تھے۔ اور اُن کے بعد کوئی اور۔ میں نواب صاحب کے بائیں طرف تھا۔ میرے برابر میں ایک اور صاحب بیٹھے تھے۔ جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ بس یہی پانچ کھانے پر تھے۔

کھانے میں قورمہ، پلاؤ تھا۔ قورمہ کا سالن تھا، شامی کباب تھے، ترکاری تھی۔ ملازم نے نواب صاحب کے سامنے ایک رکابی میں کوئی خاص چیز لاکے رکھی۔ یہ بینگن کا بھرتا تھا۔ انھوں نے اس میں سے ایک اور رکابی میں تھوڑا سا نکال کے مجھے عنایت فرمایا۔ کھانے کے دوران میں بات چیت ہوتی رہی۔ اس کے بعد کچھ مٹھائی آئی۔ جناب نواب صاحب نے یہ کہہ کے مجھے پیش کی کہ شوق فرمائیے۔ بازار سے نہیں آئی بلکہ خانہ ساز ہے۔

کھانے کے بعد نواب صاحب آرام کے لئے اندر تشریف لے گئے۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور حسرتؔ کا دیوان دیکھتا رہا۔

چار بجے کے لگ بھگ میں پھر سے گفتگو کرنے کی نوبت آئی۔ نواب صاحب تلاوت سے فارغ ہو کر عصر کی نماز کے لئے جا رہے تھے۔ مسجد پھاٹک کے باہر جہاں جماعت ہوتی تھی۔ نماز کی واپسی پر ہم رات کے کھانے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ درمیان میں ایک مرتبہ وہ مغرب کی نماز کے لئے اٹھے۔ لیکن نماز کے بعد پھر وہیں واپس آ گئے۔ حیدرآباد کے تذکرے، قدیم اور انگریز ریذیڈنٹ، سالار جنگ کے حالات سناتے رہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ مرحوم کی وضعداری کا ایک قصہ قابل ذکر ہے۔ فرمایا: مجھے پان کی عادت ہے لیکن تمباکو نہیں کھاتا۔ میں جب پہلی مرتبہ مہاراجہ بہادر کے ہاں گیا تو خاصدان میں پان رکھ کے لائے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور پان لے لیا۔ واپس جانے لگا تو دوسری مرتبہ وہ دروازے تک آ گئے۔ میں نے پھر شکریہ ادا کیا اور معذرت کی کہ میں تمباکو نہیں کھاتا۔ میں حیدرآباد میں بارہ برس رہا اور مہاراجہ بہادر سے اکثر ملاقات بھی ہوتی تھی۔ جب کبھی میں ان کے ہاں جاتا، وہ پہلے پان کی گلوری لاتے جو میں لے لیتا۔ پھر تمباکو لاتے تو میں شکریے کے ساتھ معذرت کر دیتا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ میں تمباکو نہیں کھاتا۔ لیکن کبھی ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے مجھے تمباکو پیش نہ کیا ہو۔

اس پہلی ملاقات کے موقع پر آپ نے میری نوٹ بک میں مندرجہ ذیل عبارت رقم فرمائی۔

بجا و دوستی باہر کسے منت ، قدم سایہ
بہ نگاہ بیدار ، ازدہ پائے ، زمین چشمے

کتبہ حبیب الرحمٰن

بفرمائش مالک رام صاحب بوقت ورود بایشاں در حبیب گنج ، ۷ شوال المکرم ۱۳۵۵ھ مطابق ۲۰ ، دسمبر ۱۹۳۶ء

اگلے دن میں واپس دہلی چلا آیا۔ چلتے وقت آپ نے اپنی تصنیفات کا مجموعہ میرے ساتھ گاڑی میں رکھوا دیا۔ یہاں آنے کے تھوڑے دن بعد میں نے پہلے سبد چین اور پھر ذکر غالب شائع کی۔ دونوں کے نسخے میں نے ان کی خدمت میں بھیجے۔ حوصلہ افزائی فرمانے کے لئے بہت تعریف کی۔

(۲)

اتفاقات سے میں ۱۹۳۸ء میں ملک سے باہر چلا گیا۔ جنگ کا سلسلہ دراز ہو گیا اور ۱۹۴۶ء کے اواخر میں واپس وطن آیا۔ اس تمام عرصے میں خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ میں جب رخصت پر آنے والا تھا تو انھوں نے لکھا کہ جب واپس آؤ تو حبیب گنج ضرور آنا۔ چنانچہ میں تعمیل حکم میں فروری ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ گیا۔ میں نے جانے سے ایک دن پہلے تار سے انھیں اپنے پہنچنے کی اطلاع دے دی۔ میں صبح کی گاڑی سے گیا تھا۔ کوٹھی پر پہنچا تو سب سے پہلے جناب عبیدالرحمن خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھے پہچانا نہیں۔ چونکہ دس برس کے وقفے کے بعد ایسا غیر متوقع بھی نہیں تھا۔ بہرحال ان سے معلوم ہوا کہ نواب صاحب بیٹھے

جیب گنج جاتی ہیں۔ میں فوراً ادھر جانے والی لاریوں کے اڈے پر پہنچا۔ اب رستے کا حال کیا بیان کروں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے پچھلے دس برس میں سڑک کی مرمت تک نہیں ہوئی۔ بلکہ اب اسے سڑک کہنا بھی غلط تھا۔ بس یوں سمجھئے کہ دونوں طرف کھیت تھے اور ان کے بیچ میں ایک خاصی چوڑی سی روش تھی جس پر بہت سا [illegible] مٹی کی بجائے [illegible] جمع ہو گئی تھی۔ موٹر کے پیچھے پیچھے گرد و غبار کا ایک طوفان چھایا ہوا تھا۔ اور اگر بدقسمتی سے کہیں سامنے سے بھی کوئی لاری یا موٹر آ نکلتی تو پھر تو بس یہی تصور کر لیجئے کہ مسافروں پر کیا گزرتی ہوگی۔ سفر کا آخری ڈیڑھ دو میل کا ٹکڑا [illegible] تھا۔ میں اڈے پر اترا اور ایک تانگے پر بستر رکھ کر آگے روانہ ہوا۔ لیکن یہ راستہ بھی اتنا خراب تھا کہ جھٹکوں کے مارے میری طبیعت خراب ہونے لگی۔ لاچار دو تین فرلانگ کے بعد میں تانگے سے اتر پڑا۔ باقی مسافت میں نے پیدل طے کی اور سامان تانگے پر آیا۔

میں ساڑھے تین بجے کے قریب جیب گنج پہنچا۔ نواب صاحب مرحوم باہر کے مغربی برآمدے میں فرش پر بیٹھے حسب معمول تلاوت قرآن میں مشغول تھے۔ میں [illegible] صاحب کو آداب عرض کر کے خاموش بیٹھ گیا۔ جب تلاوت سے فارغ ہو گئے تو میں نے جھک کے سلام عرض کیا۔ چونکہ نواب اونچا سنتے تھے اس لئے نہیں سنا۔ [illegible] صاحب نے کہا کہ ذرا اونچا کہئے۔ چنانچہ میں نے منہ ان کے کان کے قریب لے جا کے خاصی اونچی آواز سے دوبارہ کہا کہ آداب عرض کرتا ہوں۔ [illegible] غور سے دیکھا۔ میں نے بھی نام نہیں بتایا اور چپ چاپ ان کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک لخت پہچان کے [illegible] ہو گئے اور لپٹا لیا۔ اللہ اکبر! اس وقت کی گرم جوشی [illegible] الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ معلوم ہوا کہ میرا تار انہیں موصول نہیں ہوا۔ حالانکہ تار میں نے علی گڑھ کے پتے سے بھیجا تھا۔ وہاں سے جناب عبدالرحیم خاں صاحب نے آگے بستی روانہ کر دیا۔ چنانچہ میرے پہنچنے کے آدھ پون گھنٹہ بعد ایک شخص ڈاک لے کے آیا۔ اس میں میرا تار بھی تھا۔

نواب صاحب نے ملازم کو حکم دیا اور پانی کا لوٹا اور صابن، تولیہ وغیرہ لے آیا۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا۔ اتنی دیر وہ میرے پاس کھڑے رہے۔ پھر پوچھنے لگے [illegible] چند منٹ بیٹھنے کے بعد عصر کی نماز کے لئے مسجد میں چلے گئے۔ جاتے جاتے فرمایا۔ مغرب کے بعد آپ کو پچھلے سات برس کی رام کہانی سنانی ہوگی کہاں کہاں رہے اور کیا کیا دیکھا۔ میں نے عرض کیا بسر و چشم۔ شام کے کھانے کے بعد ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ نواب صاحب [illegible] میں نے اس پچھلے سات برس میں مشرق اوسط اور افریقہ کے تمام اسلامی ممالک کی سیر کی تھی۔ لیکن زیادہ قیام مصر میں رہا۔ [illegible] کہنے لگے۔ [illegible] صاحب اردو میں گفتگو نہیں ہوگی۔ آپ اتنے دن مصر میں رہے ہیں یقیناً عربی بہت اچھی بولتے ہوں گے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک بات کی وضاحت کر دوں۔

یوں کہنے کو تمام عربی ممالک کی زبان عربی ہے لیکن جب باہر سے کوئی ایسا شخص وہاں آتا ہے جس نے ساری عمر عربی پڑھی ہو اور اپنے آپ کو عربی کا عالم سمجھتا ہو تو اگر وہاں عام لوگوں سے بات چیت کرے تو [illegible] کہ وہ ان کی بولی نہیں سمجھتے اور انہیں اپنی بات سمجھانے میں بہت دقت محسوس کرے گا۔ بات یہ ہے کہ عام بول چال کی بولی کتابی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ اس عوامی زبان (دارجہ) کے اپنے اصول ہیں۔ اس کی گرامر الگ ہے۔ اس کی لغات الگ ہے۔ اس کا لب و لہجہ الگ ہے۔ بغیر عملی [illegible] کتابوں سے پڑھنے کے [illegible] ہو سکتا ہے۔ خود عربی ممالک کا یہ حال ہے کہ ایک مصری ایک عراقی کی بات سمجھنے میں مشکل محسوس کرتا ہے حالانکہ دونوں عربی بولتے ہیں۔ ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ میرے ایک مصری دوست ہیں۔ وہ کچھ زمانے میں [illegible] میں مصری قونصل تھے۔ مراکش کا علاقہ فرانسیسی عملداری کا حصہ ہے۔ ایک دن کچھ مراکشی کسی کام سے ان کے دفتر میں آئے۔ ان کا خیال ہے کہ مصر اور مراکش دونوں ملکوں کی زبان عربی ہے۔ فرمانے لگے قسم لے لو جو میں ان کی گفتگو کا ایک لفظ سمجھا ہوں۔ آخر ایک ترجمان بلوانا پڑا۔ جو عربی کی باتوں کا ترجمہ کرتا رہا اور اس طرح معاملہ طے ہوا۔ پھر ہر ایک جگہ کی بولی میں دخیل الفاظ ہیں یعنی دوسری زبانوں کے الفاظ [illegible] کہ لوگ انہیں بے تکلف برتتے ہیں اور [illegible] محسوس نہیں کرتے۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ یہ عربی کا نہیں کسی غیر زبان کا لفظ ہے۔ مراکش اور تیونس میں فرانسیسی اور [illegible] کے الفاظ بکثرت ہیں۔ مصر میں فرانسیسی اور اطالوی۔ اسی طرح عراق میں فارسی اور ترکی اور [illegible] کہ ہے۔ [illegible] کوشش سے [illegible] محض زبان اگر [illegible] رہ سکی [illegible] عوام [illegible] جب [illegible] بات چیت کریں گے تو [illegible]

[illegible] زبان میں ہیں، یوں سمجھئے کہ [illegible] کے لیے [illegible] زبان نہیں رہی بلکہ وہ [illegible] عام ہیں۔

اسی صحبت میں ایک مرتبہ [illegible] میں نے عرض کیا کہ مجھے عربی میں بات چیت کرنے میں کوئی عذر نہیں، لیکن بے ساختہ اور بے تکلف زبان پر جو کلمات آ جائیں گے [illegible] تو عربی کا ایک اچھا خاصا مذاق ہو جائے گا۔ فرمانے لگے، پرواہ نہ کیجئے۔ چنانچہ ہم پچھلے پندرہ [illegible] منٹ تک عربی میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے کوشش کی کہ حتی الوسع میری زبان عربی اور صحیح ہو، لیکن پھر بھی مشق نہ ہونے کے سبب کہیں کہیں [illegible] لفظ آ گئے۔ موضوعِ سخن اسلامی ممالک کے حالات تھا۔ وہاں کے لوگوں کے دینی اور معاشرتی مسائل سے متعلق پوچھتے رہے۔ جب میں نے بتایا کہ عوام بہت غریب ہیں اور دولت کی تقسیم بہت ناہموار طریقے پر ہوئی ہے۔ ملک کا تمام سرمایہ چند خاندانوں میں جمع ہو کے رہ گیا ہے۔ زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کا حکومت کی طرف سے کوئی انتظام نہیں، مغربی سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی بلکہ خلافِ اسلام تمدن و معاشرت ہر جگہ عام ہے تو بہت افسوس کرتے رہے۔

اس کے بعد [illegible] مولانا ابوالکلام آزاد نے جو خطوط قید خانے میں [illegible] کے نام لکھے تھے ان کا مجموعہ "غبارِ خاطر" کے نام سے چند ماہ پیشتر شائع ہوا تھا۔ میرے پہنچنے سے تھوڑے دن پہلے ایک اور مختصر کتاب ان کے ایک عزیز نے مرتب کر کے "کاروانِ خیال" کے عنوان سے چھاپی تھی۔ اس میں مولانا آزاد کے [illegible] خطوط چھپے ہیں۔ "غبارِ خاطر" کا ایک بہت خوب صورت ایڈیشن لاہور سے نکلا تھا۔ اس کے آخر میں ایک خط زیادہ ہے جس میں اسلامی موسیقی سے متعلق بحث ہے۔ "کاروانِ خیال" کے ساتھ اس ایڈیشن کا ایک نسخہ میرے پاس تھا۔ دونوں کتابوں کو اٹھایا اور ان پر دستخط کر کے مجھے مرحمت فرمائیں۔ [illegible] کی تعریف کرتے رہے۔ مجھے خیال ہوا کہ ان کی زندگی کے کچھ حالات پوچھوں، چنانچہ میں نے ان کے خاندان، تعلیم [illegible] سے متعلق کتنے سوال کئے۔ [illegible] جواب دیتے رہے۔ [illegible] میرے ایک عزیز نے پچھلے دنوں [illegible] کے رسالے [illegible] میں میرے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ [illegible] ایک خط ڈال کے آپ کو بھیج دوں گا۔ چنانچہ حسبِ وعدہ یہ پرچہ انہوں نے مجھے بھیجا تھا۔ اس میں بعض اصلاحیں [illegible] کے اپنے قلم سے ہیں، بعض [illegible]۔

[illegible] ناشتے کے بعد کتب خانے میں پہنچے۔ میرے پاس دیوانِ غالب کا ایک نسخہ ہے جس کا پہلا اور آخری ورق غائب ہیں۔ اس لئے مجھے یہ معلوم نہیں [illegible] کہاں سے اور کب شائع ہوا۔ [illegible] مجھے اس بات کا یقین تھا کہ یہ میرزا کی زندگی میں چھپا ہے۔ اس کے آخر میں [illegible] کی بھی [illegible] درج [illegible] "ذکرِ غالب" کے پچھلے ایڈیشن میں لکھ دیا۔ بعد میں اپنی غلطی پر متنبہ ہوا۔ اب یہ بات تو صاف ہو گئی کہ [illegible] کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا تھا، لیکن ایک نئی الجھن پیدا ہو گئی کہ [illegible] میرے پاس جو نسخہ ہے یہ کہاں اور کس سال میں چھپا۔ [illegible] اسی ایڈیشن کا [illegible] نسخہ ہو تو [illegible] یہ عقدہ حل ہو جائے۔ خوش قسمتی سے یہاں ایک مکمل نسخہ موجود تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ [illegible] کا نسخہ ہے۔ اس میں بہت غلطیاں رہ گئی تھیں، بعض شعر چھپنے سے رہ گئے، بعض دوبارہ چھپ گئے، کتابت کی غلطیوں کا تو [illegible]۔ اسی لئے میرزا نے [illegible] مطبع نظامی [illegible] ایڈیشن چھاپنے کی اجازت دے دی تھی۔

ہمیں کتب خانے [illegible] ایک شعر [illegible] ہے

[illegible]
[illegible]

[illegible] کا شکریہ ادا کیا۔

میں نے [illegible] کوئی تصویر ہو تو مرحمت فرمائیے۔ [illegible] تصویروں کے ذخیرے میں سے تلاش کرتے رہے [illegible] کوئی [illegible] تصویر [illegible] فرمانے لگے [illegible] تصویر [illegible] کہ مجھے

کو کسی کام سے اٹھا دیا ہوتا ہے۔ لیکن یہیں عجیب لگے سے روانہ ہوتے ہوتے دیر ہوگئی۔ جاڑوں کے دن پانچ بجے ہی خاصا اندھیرا ہو جاتا ہے۔ جب تک ہم لوگ پہنچے، روشنی اتنی کم ہو چکی تھی کہ تصویر اتروانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں پھر کسی وقت اتروا کر بھیج دوں گا۔ اگرچہ یہ افسوس ضرور رہے گا کہ آپ اس میں نہیں ہوں گے۔

راستے میں گرد و غبار کے طوفان کو دیکھ کے میں نے عرض کیا کہ اس دن یہاں آ کر دیکھ کے فردوسی کے شعر کی حقیقت واضح ہوگئی ہے ؎

ز سیں گرد میداں کہ بر شد بہ دشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

بہت مسرور ہوئے۔ پھر خود حافظے پر زور دے کر شاہنامے کے اسی مقام کے آٹھ دس شعر سنائے۔ میں ان کی یادداشت پر دنگ رہ گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ کے پیٹے میں تھی اور ظاہر ہے کہ شاہنامہ انھوں نے ایک زمانے سے نہیں دیکھا ہوگا۔ کوئی ایک آدھ شعر کسی جگہ سے حسب موقع پڑھ دینا کوئی کمال نہیں۔ یہ بات ہر کوئی کر سکتا ہے۔ لیکن یوں یاد ہونا کہ ایک شعر سن کر آگے پیچھے کے شعر سنا دینا معمولی بات نہیں۔

مرحوم کی ایک عادت تھی کہ اگر وہ کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتے تھے تو قطعاً خاموش رہتے یا کوئی اور ذکر چھیڑ دیتے۔ اس سفر میں بھی ایک اسی طرح کا ذکر چھڑا۔

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مولانا شبلی کی سوانح عمری "حیات شبلی" کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کو پڑھا اسی دوران مرحوم نے دیکھا تھا اور انھوں نے اس پر حواشی کا اضافہ کیا جو کتاب کے ساتھ چھپ گئے ہیں۔ اسی زمانے میں یہاں کو مشغلہ ہاتھ آیا اور انھوں نے مختلف رسالوں میں شبلی اور عطیہ بیگم کے موضوع پر مضمون لکھ کر ایک شاندار موضوع دے دیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک فتنہ بیدار کر دیا۔ ایک تحریر بھی اسی موضوع پر منتشر ہوئی تھی۔ جس وقت وہ شاہنامے کے شعر مجھے سنا رہے تھے میرا ذہن شعر العجم کی طرف منتقل ہوگیا۔ جس کے پہلے حصے میں مولانا شبلی نے کوئی سو صفحے میں شاہنامے پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ شعر العجم اور شبلی سے مجھے شبلی اور عطیہ بیگم کا قصہ یاد آگیا۔ اب مجھے جرأت اور تحقیق کا موقع مل گیا۔ جن صاحب نے "حیات شبلی" پڑھی ہے انھیں معلوم ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس سے متعلق ایک لفظ نہیں لکھا۔ مولانا کی ایسی بات نہیں جسے یوں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس میں کچھ اصلیت ہے تو اس کا برملا اعتراف کر لینا چاہیے تھا کیونکہ اس سے مولانا شبلی کی عظمت اور وقار میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی۔ اور اگر یہ غلط ہے تو پھر اس کی مدلل تردید کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اگر یہ معاملہ صاف نہ ہوا تو پھر قیامت تک نہیں ہو سکے گا۔ اس وقت مولانا شبلی کے تلامذہ اور احباب اور تربیت یافتہ اصحاب ہمارے درمیان موجود ہیں۔ جو اس موضوع پر بہ وثوق اور واقفیت کے ساتھ لکھ سکتے ہیں۔ بعد میں آنے والے تو بہرحال انھیں کے خوشہ چیں ہوں گے۔

انھی روایتوں کے خیال سے میں نے ان سے سوال کیا کہ آپ نے "حیات شبلی" میں کوئی فروگذاشت محسوس نہیں کی؟ پوچھا کیوں؟ آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟ میں نے کہا یہی عطیہ بیگم والے قصے پر بھی کچھ لکھنے کی ضرورت تھی۔ ہاں ہوں کر کے رہ گئے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے متعلق گفتگو کرنے پر تیار نہیں۔ ادھر میں محض خلاف عادت ان کی اتنی خواہش پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے میں نے پھر کہا۔ مکاتیب شبلی میں آپ نے مولانا کے خطوط مہدی افادی کے نام تو ضرور پڑھے ہوں گے۔ جواب اثبات میں دیا۔ پھر میں نے پوچھا کہ کیا آپ نے مہدی افادی کے خطوط کا مجموعہ بھی دیکھا ہے۔ فرمایا ہاں۔ ایک زمانہ ہوا دیکھا تھا۔ پھر کیا آپ نے کتاب "خطوط شبلی" بھی ضرور دیکھی ہوگی جس میں شبلی کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے عطیہ بیگم اور ان کی بہن کے نام لکھے تھے؟ فرمایا ہاں وہ بھی بہت مدت ہوئی دیکھے تھے۔ اب میں نے ان تمہیدوں کے بعد سوال کیا کہ مہدی نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صاف لکھا ہے کہ مولانا شبلی کا عطیہ سے یہ معاملہ نہیں تھا۔ آخر یہ کس بات کی پردہ داری تھی۔ کہنے لگے مجھے یہ کتاب دیکھے اتنا زمانہ ہوگیا ہے کہ اب ٹھیک طرح کچھ یاد نہیں۔ میں نے کہا اچھا یوں ہی سہی لیکن آپ اصحاب کی یہ کم سخنی بھی تو شک پیدا کرنے والی ہے۔ آخر آپ لوگ کھل کے کیوں کوئی بات نہیں کرتے۔ کہنے لگے "فائدہ"۔ فائدہ یہ کہ اس سے شک و شبہ کا دھندلکا دور ہو جائے گا اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ کسی کے متعلق روشنی مہیا ہو جائے گی اور اس کے بعد فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب میں نے گستاخانہ جسارت سے کام لیتے ہوئے ایک اور

حربہ استعمال کیا۔ میں نے کہا قرآن کہتا ہے لا تکتموا الشہادۃ ۔ جس جلسے میں اگر آپ کو کچھ بات معلوم ہو تو اس کے اظہار سے دریغ نہ کرو اور اسے مت چھپاؤ۔ اور آپ حضرات ہیں کہ سب کچھ جانتے بوجھتے خاموش ہیں۔ اور پوچھنے پر بھی نہیں بتاتے۔ لیکن مولانا صاحب پر وار بھی خالی گیا۔ وہ ہنس کے ٹال گئے۔ اتنے میں ہم علی گڑھ پہنچ گئے۔

میں شام کی گاڑی سے واپس دہلی چلا گیا۔ اسی سفر میں آپ نے میری نوٹ بک میں تحریر فرمایا تھا۔

اے آمدنت باعث آبادیٔ ما

ذکر تو بود زمزمۂ شادیٔ ما

بخواہش ملک رام صاحب بوقت ورود مسعود مقام حبیب گنج

فی البداہہ

اے طالب ملک رعائے یاراں

حل دام تو شد رفاقت صدر جہاں

حبیب الرحمٰن صدر یار جنگ
حبیب گنج، ۱۰ فروری ۱۹۴۶ء

میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد جلد ہی میں دوبارہ ملک سے باہر چلا گیا۔ پہلے خط و کتابت برابر جاری رہی۔ لیکن پھر صحت بے قاعدگی پیدا ہوگئی بلکہ آخری مہینوں میں تو بالکل بند ہوگئی تھی۔ لکھا کہ اب کچھ لکھتا ہوں تو انگلیوں میں درد کرنے لگتی ہیں۔ میں نے بھی بار بار خط لکھ کر انہیں تکلیف دینا پسند نہ کیا۔ جناب عبدالرحمٰن خاں صاحب سے ان کی خیر خبر ملتی رہتی تھی۔ آخر ایک دن ان کا خط ملا کہ وہ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء کو جمعے کے دن صبح کے سات بجے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۲)

موت بنی آدم کی میراث ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ وہ بھی عمر گزار کر وہاں گئے جہاں ہم سب کو جانا ہے۔ وفات کے وقت عمر چھیاسٹھ برس کی تھی۔ یعنی کتب مقدس کی مقررہ حد سے بھی کچھ زیادہ۔ تو اس لحاظ سے کوئی افسوس نہیں۔ پھر صحت ایسی تھی کہ نہیں کہہ سکتے ایک نہ ایک دن ضرور پیش آتا۔ وہ رئیس ابن رئیس تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی عمر عزیز کی تعمیرات میں صرف نہیں کی بلکہ علم کی اس دولت کو جمع کیا جو حاصل ہو سکتی ہے۔ ہر شعبے کے علم و فن کا شوق ہی نہیں کیا بلکہ شعر و ادب کی روح کی رازداری اور عملی اعانت سے شاد کام اور بہرہ ور ہوئے۔ یہ بھی کمال فرحت ہے۔ لیکن افسوس ہے تو اس بات کا کہ اب ان کے جیسے انسان نہیں پیدا ہوں گے۔ جس زندگی کی وہ پیداوار تھے وہ زندگی ہی ختم ہو گئی۔ اب ان کے سے انسان پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ ایک آدھ اور صورت جو اس زندگی کی یادگار باقی ہے وہ بھی ٹمٹماتی شمع ہے۔ جو ذرا ایک جھونکا ہوا اور گل ہوا اور بجھ گئی۔ [illegible]

زمانے نے نیا ورق الٹ دیا ہے۔ آج محبت، خلوص، دوستی، دردمندی، اخلاق اور قدردانی، علم اور فن، دین اور دنیا، غرض ہر چیز کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ مرحوم اس زمانے میں پیدا ہوئے، پلے، بڑھے اور پروان چڑھے۔ جسے ہم ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو وضعداری سے بہتر لفظ نہ ملے۔ وضعداری ایک قانون، ایک ضابطہ کلام تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ جس طرح کسی شخص سے آج ملتے ہیں اسی طرح آج سے پچاس برس بعد بھی ملیں گے۔ زندگی کا جو اصول آپ نے بنایا ہے اب کوئی طاقت آپ کو اس سے بال برابر نہیں ہٹا سکتی۔ آپ کی دوستی بھی کسی اصول پر مبنی ہوگی اور مخالفت بھی۔ یہ نہیں کہ جدھر کی ہوا چلی اسی طرف ہو گئے۔ اسے ہم زمانہ داری یا شریفانہ استواری سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ مرحوم اسی اصول کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اب یہ تصویر پھر نظر نہیں آئے گی۔ میر کا ایک شعر یاد آگیا، اسی پر ختم کرتا ہوں؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

علامہ عمادی

ابوالخیر مودودی

مستطیل سر، اور کشادہ ابھری پیشانی کے عمادی صاحب بڑے جامع کمالات تھے۔ اسلامی علوم نقلی و عقلی کے حافظ، وسیع النظر مورخ، عربی فارسی اردو کے انشا پرداز و ادیب، رنگین بیان و گرم لہجہ شاعر، کتاب میں دیدہ و دل باقی امور میں جنتی — ان کا حافظہ طرفہ تماشا تھا: بیسیوں برس کے چلے ہوئے رستے پر ان کو چھوڑ دیجئے، رستہ بھول جائیں گے اور بغیر رہنمائی کے اپنے گھر واپس نہیں پہنچ سکیں گے۔ حد یہ ہے کہ اسٹاف کے وہاں (افغانستان) میں رفیقۂ حیات نے ان کو زندگی کے رستے ہی میں چھوڑا اور وہ یہ رستہ بھی بھول گئے۔ لیکن کتاب، کوئی بھی ہو — فساد آزاد، کرچک باخرد، ذاتیکا بھیدیا ملک شاستر —— ایک دفعہ نظر سے گزر جانی شرط ہے، ناممکن ہے کہ اس کے مضامین ان کی یاد سے اوجھل ہو جائیں، بلکہ بعض خاص خاص جملے اور فقرے لفظاً بلفظاً یاد رہتے۔ جیسے بھی ایک ہی چیز کھلا دیجئے، وہ شوق سے کھاتے رہیں گے، لیکن ایک ہی قسم کی کتابیں مسلسل پڑھتے جائیں، یہ ناممکن تھا۔ تبدیلی ذائقے کے لئے —— اور ذہنی ہمیز کے لئے —— تیرتھ رام فیروزپوری کے ترجمے بھی پڑھتے تھے۔

عمادی صاحب کے نام سے، میں سب سے پہلے، امرتسر کے اخبار "وکیل"[1] کے ذریعے واقف ہوا —— اور ابو السلام صاحب کے نام سے بھی اولاً "وکیل" ہی کے ذریعے آنکھیں روشناس ہوئی تھیں —— یہ میرے عہد شعور کی بات ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں "وکیل" بڑا نامی گرامی اخبار تھا اور اس وقت کی صحافت میں اصابت رائے، متانت تحریر اور خوبی کے لحاظ سے بہت ممتاز تھا۔ عمادی صاحب اس کے اڈیٹر اور ابو السلام صاحب کے جانشین تھے۔ شعور بڑھتا گیا اور عمادی صاحب سے واقفیت بڑھتی گئی۔ "الندوہ"[2] کے پرانے پرچوں میں ابوالکلام اور ابن خلدون وغیرہ پر ان کے مضامین اور سب اڈیٹری میں ان کا نام نظر آیا۔ یہاں بھی وہ سب اڈیٹری میں ابو السلام صاحب کے جانشین تھے پھر "وکیل" کی ادارت کے ساتھ ان کی تراوش قلم سے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک ماہنامہ نکلنے لگا۔ جس میں نقلی علوم کے پہلو بہ پہلو مسلمان

---

[1] ۱۹۰۶ء — ۱۹۰۸ء

[2] یہ رسالہ بھی وکیل لمیٹڈ کے زیر اہتمام نکلتا تھا۔

کے عقلی و اکتشافی علوم پر بلند پایہ محققانہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے اتنا لکھا کہ اب معلوم ہوتا تھا بند ٹوٹ گیا ہے۔ شعور نے چند منزلیں اور طے کیں۔ قرآن کے ایک عربی ماہنامے "البیان" پر آگاہی[2] ہوئی۔ یہ ماہنامہ عمادی صاحب کی ادارت میں لکھنؤ سے سنہ ۱۹۰۲ء میں نکلا، جسے وہ سنہ ۱۹۱۰ء تک کامیابی سے چلاتے رہے۔ اسی زمانے میں ایک خاص بات یہ سنی کہ وہ ملکی علماء میں پہلے شخص تھے جنہوں نے بیرونِ ہند کی صحافت سے ناطہ جوڑا، اور مصر و بیروت کے رسالوں، اخباروں میں مضامین لکھے۔ "البیان" اسی تعارف کے سہارے نکلا تھا۔ پھر جب "الہلال" نکلا تو کچھ دنوں بعد "وکیل"[1] کی لوح سے ان کا نام رخصت ہو گیا، اور معلوم ہوا کہ ابو الکلام صاحب نے عمادی صاحب کو "الہلال" کی سلکِ ادارت میں چن لیا ہے۔ "الہلال" سے ظفر علی خاں صاحب نے ان کو "زمیندار" میں کھینچا، اور پھر دو تین برس کے وقفے کے بعد ان کا نام ظفر علی خاں صاحب کے نیم رسالے "ستارۂ صبح" میں شریک مدیر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ صحافت میں غالباً یہ ان کی آخری نمود تھی۔

یہ معرفت بہت بھاری بھرکم تھی، لیکن عمادی صاحب کی علمی فضیلت کا ایک بے نمود واقعہ دفعتہً اس وقت میرے سامنے آیا جب میں دار الترجمے سے متعلق ہو کے حیدرآباد جا رہا تھا، کسی مشورے کی غرض سے حکیم اجمل خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، حکیم صاحب نے فرمایا: "وہاں ایک بڑے فاضل شخص عمادی صاحب بھی ہیں۔ سفیر کابل سنہ ۱۹۱۸ء سے تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کی فکر میں تھے۔ ایک دن سفیر صاحب نے مجھ سے کہا، حکیم صاحب! آپ کے ہندوستان میں ایک آدمی ایسا نہیں ملتا جو ابن خلدون کی تاریخ کا ترجمہ کر دے۔ مجھے تین سال جستجو کرتے ہو گئے۔ مجھے یہ سن کر بڑی شرم آئی، سوچتا رہا، مولوی عمادی صاحب نے بڑے بھائی صاحب سے "قانون" پڑھا تھا، میں جانتا تھا کہ وہ عربی فارسی میں بڑی دستگاہ رکھتے ہیں، خط لکھ کے ان کو بلایا اور انہوں نے یہ کام انجام دے دیا۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ بہترین ترجمہ کیا اور دو سال میں پوری کتاب کا ترجمہ کر دیا۔"

یہ قسمت کی نیرنگی تھی کہ عمادی صاحب جس شعبے کے رکن تھے اسی شعبے سے ایک وہ بھی منسلک ہوا جو ان کی پا انداز میں بیٹھنے کے قابل تھا۔ لیکن اس گہرے تاثر کے باوجود میرے دل میں شوقِ ملاقات نہ تھا۔ خیال تھا کہ جب وہ ایسے ہی فضیلت پناہ ہیں تو اپنے متعدد ہم کاروں کی طرح اپنا سارا علم اپنی [illegible] پر لادے رہتے ہوں گے، آنکھوں میں نخوت تھرکتی ہوگی، زمین پر اس طرح چلتے ہوں گے گویا لوگوں کے سروں پر چل رہے ہیں، اور باتیں آنکھیں بند کر کے اس طرح کرتے ہوں گے جیسے بہت دور، کسی سیارے میں بیٹھے اپنے بندے پر وحی نازل فرما رہے ہیں۔

——— مگر جب ان کو دیکھا، تو پہلی نظر میں ذہن پر ان کی شخصیت کا پہلا عکس یہ پڑا کہ یہ شخص اپنے تئیں کوئی غیر معمولی ودیعتِ الٰہی نہیں سمجھتا؛ محض انسان، لاکھوں کروڑوں انسانوں کی طرح کا ایک انسان! اور اس سے زیادہ کچھ ہونے یا منوانے کی کوشش بھی نہیں کرے گا، اور میں بھول گیا کہ وہ کوئی بڑے جغادری فضیلت پناہ ہیں؛ اور میں سطوتِ دریا سے دبا سہما ساحل سے بہت دور کھڑا ایک نادان لڑکا ہوں۔ چہرہ پر شرافت کی ملاحت، خد و خال میں علم کا رچاؤ، آنکھوں میں گہرے پانی کا وقار۔

---

[1] وکیل بک ڈپو سے عمادی صاحب کی مستقل تصانیف و مقالات میں "محکمات"، "علم الحدیث"، "فلسفۃ القرآن"، "فلسفۂ ابن عربی"، "صناعۃ العرب"، "تاریخ عرب قدیم" اور تراجم میں مفتی محمد عبدہ کی مشہور کتاب "الاسلام والنصرانیہ" (جو "ریحان" کے مجموعے میں چھپی) شیخ عبدالعزیز شاویش کی "الاسلام دین الفطرۃ" اور امام راغب کی "تفصیل النشأتین و تحصیل السعادتین" شائع ہوئیں۔

[2] "البیان" تین حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصے میں عرب ممالک کے لئے ہندوستان کی تاریخ و رجال اور حالاتِ حاضرہ پر عربی میں مضامین ہوتے تھے۔ دوسرے حصے میں عرب اہلِ قلم کے مضامین بازترجمہ درج کئے جاتے تھے اور تیسرے حصے میں بلادِ اسلام کے حالات اور خبریں اردو میں ہوتی تھیں۔ ہندوستان سے زیادہ مصر و شام، بیروت اور شمالی افریقہ، تونس والجزائر و مراکش میں اس رسالے کی مانگ ہوئی۔

اسلاف عالی گوہر تھے۔ علم صدیوں سے متوارث تھا، جاہ و منصب بھی دیا لیا۔ نیک نہاد اولاد نے جو ہر دور بزرگوں کی حقیقی میراث ہے جتن سے محفوظ رکھی اور ایک نسل نے دوسری نسل کو پہنچا دی۔ نسباً یہ لوگ صدیقی تھے، صدیقیت ان کے علمی شرف کے ساتھ ان کے اوضاع و اطوار میں نمایاں رہی۔

شیخ عماد نام ایک صاحب فضل و کمال اس خاندان کے مورث تھے وہ آٹھویں صدی کے آخری برسوں میں ہندوستان آئے۔ اس زمانے میں علم کے قافلوں کی آخری منزل پورب دیس تھا۔ شیخ عماد بھی یہیں پہنچے اور جون پور میں خود وہ اور ان کے گھرانے کے لوگ افادۂ علوم میں مشغول ہو گئے۔ ابراہیم شرقی کے زمانے میں اس گھرانے کے درسی علوم کا شہرہ زبان زد عام تھا۔ اس نے بارہ گاؤں سیر حاصل جاگیر دیئے، ان لوگوں نے انہی دیہات کو اپنی درس گاہ بنا لیا۔

مسلمان بادشاہوں کی یہ جاگیر بخشیاں ایک مستقل تحریک کی حامل تھیں۔ جاگیروں کا مدعا تہذیبی اداروں کے لئے آزاد و با اختیار سرمایہ مہیا کرنا تھا۔ ہر درس گاہ قرب و جوار کے طلبہ کی اتالیق درس گاہ ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر طلبہ تن کے کپڑوں سے گھر سے چلتے اور جس درسگاہ میں پہنچتے، فراغت حاصل کرنے تک ان کے تمام مصارف کی وہی درس گاہ کفیل ہوتی۔ یہ دیہاتی درس گاہیں صحت مند تعلیم و تربیت کے علاوہ تبلیغ کا بالواسطہ وسیلہ تھیں۔

عمادی خاندان نے پورب کی بستیوں میں تقریباً ساڑھے چار سو برس تعلیم و تلقین کی شمعیں روشن رکھیں۔ آخر زمانے میں سوکھ پورا میں شیخ عبدالقادر عمادی کی درس گاہ مرجع عام تھی، جس میں بیک وقت دو دو سو طلبہ مقیم رہتے تھے۔ بادشاہی وقتوں کی جاگیر اودھ کی نوابی کے ابتدائی دور میں ضبط ہو چکی تھی، لیکن چشمۂ نور جاگیریں نہ تھیں خود ان کی ذات تھی۔ بزرگوں کا زرعیہ 'امرتو' ایک گاؤں تھا، اس کی آمدنی سے طلبہ کی مدارات کرتے اور دونوں وقت کا کھانا ان کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھاتے۔ یہ عمادی صاحب کے پردادا تھے۔

اس تعلیمی اور تہذیبی خدمت گزاری میں عورتیں بھی اپنے دائرۂ عمل میں مردوں کے ساتھ شریک تھیں، اور یہ ہمارے معاشروں کا سیکڑوں برس پرانا دستور تھا، اسی سے خاندانی اوصاف جلا پاتے تھے، تہذیب و شائستگی بلند ہوتی تھی اور معاشرے کا شیرازہ بندھا رہتا تھا۔

عمادی صاحب نے علمی شستگی کے اس ماحول میں آنکھ کھولی۔ خاندان میں اب تک بول چال کی زبان عربی تھی، صرف و نحو دادی سے پڑھی اور گیارہ برس کی عمر میں اتنی استعداد حاصل کر لی کہ خود "الف لیلہ" پڑھ لیتے اور اس کے مشکل مقامات لغت کی مدد سے حل کر لیتے۔ اس کتاب نے عربی ادب کا شوق پیدا کیا۔ علوم و آداب اپنے والد اور دادا سے پڑھے، دونوں بزرگ صاحب فضل تھے۔ ادب کی ڈھیروں اکثر کتابیں چھوڑ کے قرآن اور حدیث کے درس ہی میں بہترین ادب عالیہ بھی پڑھا دیا۔ اس طریق تعلیم سے طالب علم میں یہ استعداد پیدا ہو گئی کہ جاحظ و ابن قتیبہ کی ادبی صناعتوں اور کلام عرب کے مجموعوں سے خود استفادہ کرے۔ یہ زندگی سے ہنستے بولتے، کھرے اور سادہ، لطیف اور منطقی، کانٹے کی تول تھے۔ ادب کی تعلیم تھی، متنبی اور حریری اس کے آگے پانی تھے۔ نقلی اور عقلی علوم میں ملا نظام الدین کے اصول پر ہر فن کی ایک ایک دو دو جامع و مستند کتابیں پڑھائیں، فقہ میں عام نصاب کے خلاف امام محمد شیبانی کی جامع صغیر و جامع کبیر پر اکتفا کی، اور آخر میں امام رازی کی شرح اشارات پڑھائی۔ یہ درس نظامی پر اضافہ تھا۔ اس کے بعد خیر آبادی ادبیات سے فکر و نظر کی وسعتیں حاصل کرنے کے لئے مولوی ہدایت اللہ خاں[1] رام پوری کے درس میں داخل کر دیا۔

---

[1] مولوی ہدایت اللہ خاں رامپوری، مولوی فضل حق خیر آبادی کے یگانۂ روزگار شاگردوں میں تھے۔ چند سال رامپور میں درس دیا، پھر [illegible] میں جون پور آ گئے اور مدرسہ امام بخش کو رونق بخشی۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی ان کی کریم النفسی کا ایک واقعہ بڑے مزے لے لے کر بیان فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ استاذ العلماء مولانا لطف اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے امتحان کے سلسلے میں رامپور تشریف لے گئے۔ گرمی کا موسم تھا، امتحان [illegible] باقی ص [illegible] پر

ہزاروں رحمتیں ہوں ان بزرگوں پر جنہوں نے فقہ میں صلاحیت ردی کا قانون ذہن نشین کیا اور بنیادی تعلیم میں آزاد فکر کا سبق پڑھایا۔ اگر خدا نخواستہ عمادی صاحب قدوری شریف اور مولانا کنز الدقائق کی کل اسلاف کے چکر میں پڑ جاتے، تو اور جو کچھ بھی ہوتے لیکن بلند نگاہ اور وسیع القلب عمادی صاحب نہ ہوتے، بھونڈی بھونڈی باتوں میں الجھتے " صورت معنی " اور " معنی صورت " کے کانٹوں میں الجھتے، دوسروں کے لئے بھی مصیبت بنے رہتے اور خود اپنے لئے بھی۔ قرینے کی استنجی میں مستی ستائی، داڑھی کو یک مشت دو انگشت بنانا پڑتا۔ ٹخنے ڈھکا پاجامہ نہ پہن سکتے، اور یہیں تک کہ گہری ترشوانے کو مونچھوں کے وجود کا اطلاق بھی نہ ہو سکتا۔ شرح اشارات رازی کا سبق حقیقت میں آزاد فکر کا سبق تھا۔ امام رازی بڑے بت شکن تھے انہوں نے شانشیں کے طاقچوں سے بڑے بڑے بتوں کو گرایا ہے اور بڑے مزے سے ان کا مُثلہ کیا ہے۔ اور اس بت شکنی کے بعد بہت بڑا احسان یہ فرمایا کہ خود اپنا بت کسی طاقچے میں نہیں بٹھایا۔

درسیات سے فراغت کے بعد حکیم عبدالمجید خاں صاحب سے، دلّی گھرانے کے طب کی مشہور کتاب " القانون " پڑھی۔ پھر رام پور میں عرب محمد طیب[1] سے فنونِ ادب کا فیض حاصل کیا، اور طیب صاحب نے مکتب سے فراغی کی مسند پر بٹھایا۔

اس زمانے کی علمی دنیا میں مولوی عبدالعلی آسی ایک مشہور و مقبول شخصیت تھے۔ وہ مولوی عبدالحی فرنگی محلی کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ اور رام پور کے مدرسہ عالیہ میں مدرس رہ چکے تھے۔ مدرسی چھوڑ کر لکھنؤ میں " اصح المطابع " کے نام سے مطبع قائم کیا، جس میں حدیث و فقہ، خصوصاً عربی کی درسی کتابیں تصحیح و تہذیب کے ساتھ چھاپتے تھے۔ آسی صاحب کو اپنے اس کام کے لئے ایسے لوگوں کی جستجو رہتی تھی جو ادب اور مختلف علوم میں دست گاہ رکھتے ہوں اور غلط نسخوں کی تصحیح میں ان کی مدد کریں۔ وہ اپنے کسی کام سے رام پور آئے، طبیب صاحب نے ان کے مطلب کے موزوں ترین آدمی سے ان کو متعارف کیا، اور عمادی صاحب مکتب سے مطبع کی زینت بن گئے۔ یہاں علمی اور مطبوعہ نسخے تھے اور عمادی صاحب، اوّل سے آخر تک لفظاً لفظاً ایک ایک کتاب پڑھتے اور نقل و کتابت کی غلطیاں درست کرتے۔ آسی صاحب کو کاپیاں اور پروف دیکھنے میں بڑی مہارت تھی۔ جیسے بچوں کو ہجوں کے ساتھ قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ کاپیاں اور پروف پڑھتے تھے۔ یہ کام انہوں نے اپنے ذمے رکھا۔ کام کا دائرہ وسیع کر لیا اور حدیث و فقہ کے علاوہ معقولات کی بہت سی کتابیں اور درسیات کی تقریباً تمام کتابیں شائع

(بقیہ حاشیہ صفحہ) استاذ العلماء کی عادت تھی کہ دوپہر کے وقت باہر نکلتے تو سر پر چادر ڈال لیتے، چادر ڈال کے مدرسہ سے پیادہ پا استاذ العلماء مولوی ہدایت اللہ خاں رام پوری کے مکان پر پہنچے، مولوی صاحب قیلولہ کرنے زنان خانے میں جا چکے تھے، اطلاع پاتے ہی باہر تشریف لائے اور اس شان سے مہمان عزیز کی پذیرائی کی جو انہی بزرگوں کا حصہ تھا۔ اپنے بھتیجے کو بھیج کر کنویں سے تازہ پانی منگوایا اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنے مہمان کے پاؤں دھوئے۔ میاں گزارش یہ تھی کہ مولوی لطف اللہ صاحب نے دھوپ میں کرم فرمایا۔" اپنے ہم مرتبہ لوگوں کے ساتھ ان بزرگوں کے یہ آداب تھے۔

[1] عرب محمد طیب فارور علم سے ایک نادرہ تھے، علوم کا پتا دریا، دہلی کو تھا از جانے ہندوستان کس طرح آ نکلے، مولوی فضل حق خیر آبادی (متوفی سنہ ۱۸۶۱ء) سے معقولات میں کمال حاصل کیا، نقلی علوم میں صاحب دست گاہ تھے، کتاب سے بے نیاز، ان کا علم ان کے سینے میں تھا۔ ادب میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے، کلام جاہلیت پر اس قدر عبور تھا کہ گفتگو میں قصیدے پر قصیدے مسلسل پڑھتے جاتے، پڑھنے کے انداز سے شعری تصویروں کی عکاسی کر دیتے اور لہجے سے شعر کی خوبی نمایاں کر دیتے، نکات سخن بیان کرتے اور داد سخن دیتے۔ حالی یا متنبی کا شعر سنانے کی فرمائش کی جائے تو گفتگو میں برجستہ ہم معنی شعر پڑھتے جاتے۔ جس مجلس میں بیٹھ جاتے، کسی کا چراغ نہ جلنے دیتے۔ نواب کلب علی خاں کی مجلس کے جلیل ہزار داستان تھے، جنہوں نے طاق، نواب ان کی بہت ناز برداریاں کرتے۔ مذہب میں یاد تھے، جس رنگ کے گلاس میں چاہو ڈال دو، ڈگر بیتے تھے اسلام کے دائرے کے اندر۔ مدتوں مدرسہ عالیہ کے صدر مہتمم رہے اور علم کے دلیلنے بڑی فراخ حوصلگی سے جھیل گئے۔ خدا کی رحمتیں ہوں اس مرد آزاد و بے باک پر۔

گیں۔ "اصح المطابع" کا نام درسی حلقوں میں صحت طباعت کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ عمادی صاحب کہتے تھے کہ اس کام سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا، غلطیوں کی تصحیح نے تحقیق اور پرکھ کی استعداد پیدا کر دی، اور خود پڑھنے کی وجہ سے مباحث ذہن نشین ہو گئے، اور پوری کتابیں پڑھنے سے تفصیلاً ان کے مباحث سامنے آ گئے۔

تصحیح کا بار جب ہلکا ہوا تو احسن صاحب نے پہلے "الریاض" نام ایک عربی ماہنامہ جاری کیا۔ پھر عبد الوالی صاحب کے اہتمام سے "البیان" جاری ہوا۔ یہ دونوں رسالے عمادی صاحب کی ادارت میں نکلتے تھے۔ جب [illegible] تھے اس وقت سے عربی انشاء کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ تصحیح کے کام سے جب فرصت پاتے عربی جرائد کو مضامین بھیجتے رہتے تھے۔ احسن صاحب نے سمجھا کہ یہ ابر کرم جو باہر برستا ہے گھر ہی میں کیوں نہ برسے۔

عمادی صاحب کے فضل و کمال سے سب سے آخر میں دار الترجمہ اور حیدر آباد کے دوسرے علمی اداروں کو استفادے کا شرف حاصل ہوا۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے (خدا ان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے) اس قدر شناسی کے ساتھ تقرر فرمایا تھا کہ ایسے علم و فضل والے علماء خال خال نظر آتے ہیں ... مشرقی شعبے میں اس پایہ کے فاضل شخص کا موجود ہونا مشرقی شعبے کا بڑا شرف ہوگا۔ دار الترجمہ کو یہ بڑا شرف "تقریباً" بائیس سال حاصل رہا۔ اس مدت میں وہ کبھی کچھ رہے: مترجم[1]، "ناظر" بھی، "علمی ممبر" واضع اصطلاحات۔ عمادی صاحب کو عربی فارسی کی قدیم و جدید لغات و مصطلحات پر بڑا عبور تھا۔ اس لئے وہ ہر شعبے کی مجلس مصطلحات کے مستقل رکن تھے، اور ان کو ارکان مجلس میں بڑا امتیاز و احترام حاصل تھا۔ بایں ہمہ وہ رہنمائی سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اصطلاح وضع کرنے میں مدد دیتے اور اس بات سے غرض نہ رکھتے کہ ان کی امداد و رہنمائی قبول کی گئی ہے یا نہیں۔ وہ اپنی شخصیت کا بوجھ لادنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

دائرۃ المعارف اور کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد کے دو عظیم ترین بین الاقوامی شہرت کے ادارے ہیں۔ عمادی صاحب ان دونوں کے رکن رکین تھے۔ دائرۃ المعارف نے تاریخ اور فلسفے کے علاوہ ہیئت و ہندسہ وغیرہ علوم کی متعدد کتابیں یورپی مشرق شناسوں کے اشتراک سے شائع کی ہیں۔ اس قسم کی تمام کتابوں کی تصحیح و تہذیب کے نگران اعلیٰ عمادی صاحب مقرر کئے جاتے تھے[2]۔ کتب خانہ آصفیہ کی مجلس مخطوطات میں وہ کلی

---

[1] مترجم کی حیثیت سے عمادی صاحب کے قلم سے حسب ذیل کتابیں نکلیں:۔

(۱) مورخ مسعودی کی "تنبیہ و اشراف" اور "مروج الذہب" (۲) مورخ طبری کی تاریخ الرسل والملوک کی آخری دو جلدیں۔

(۳) طبقات ابن سعد کی بارہ جلدیں۔ (۴) ابن حزم کی الملل والنحل ——— یہ آخر الذکر کتاب تفسیر و حدیث علم کلام و فلسفہ اور مذاہب کی معلومات کا ایک عجیب مجموعہ ہے۔

[2] پانچویں صدی ہجری کے مشہور فلسفی طبیعی و ریاضیاتی مصنف ابن الہیثم کے حسب ذیل رسائل:۔

(۱) رسالۃ الضوء
(۲) رسالۃ المرایا المحرقۃ بالقطوع
(۳) رسالۃ المرایا المحرقۃ بالدائرۃ
(۴) رسالۃ المکان
(۵) رسالۃ شکل بنی موسیٰ
(۶) رسالۃ المساحت
(۷) رسالۃ ضوء القمر۔

محدث ابن جوزی کی مشہور تاریخی اور سیرتی خاکوں کا ذخیرہ المنتظم فی التاریخ وغیرہ۔

فنون کے مستند مبصر تھے۔ کتاب کسی موضوع و مضمون کی ہو، اس کی علمی قدر جانچنے میں ان کی نگاہ بہت تیز تھی۔ لیکن مادی قیمت کیا ہو؟ اس میں وہ کورے تھے اور اس سے سروکار بھی نہ رکھتے۔ جس نے زندگی بھر بازار جاکے کوئی چیز خریدی ہی نہ ہو، وہ قیمت جانچنے میں تیز کیسے ہو سکتا۔ یک رو گیری اور علم گیری ان کی شخصیت کی ایک بنیادی اینٹ تھی۔

حیدرآباد سے عمادی صاحب کے تعارف کا ذریعہ ظفر علی خاں صاحب[1] تھے —— یہاں حیدرآباد سے میری مراد حیدرآباد کی روح ہے؛ روح کا مظہر، جس سے حیدرآباد 'حیدرآباد' تھا —— اور اپنے رفیق دیرینہ کی کچھ اس شان سے تقریب کی کہ پیش گاہ سے تار کے ذریعے طلبی ہوئی، درباری لباس بر طرف کر دیا، پہنچتے ہی باریاب کیا اور مشرقی شعبے کو ان کی رکنیت کا شرف بخشا۔ پہلی ملاقات میں جوہر ذات کا نقش اتنا گہرا بیٹھا کہ عمادی صاحب خاص امتیازوں کے مورد بن گئے، ایسے امتیاز جن میں وہ یکسر منفرد تھے۔ بارگاہ میں جو نادر قلمی کتابیں صدر اعظم کی غرض سے پیش کی جاتیں، اور بڑے بڑے مصنف اپنی جو کتابیں نوازش و سرپرستی کی غرض سے پیش کرتے، ان کی قدر و قیمت جانچنے کے لئے ایک ہی معتمد چہرہ تھا: عمادی صاحب۔ ایسی مصاحبت تھی، براہ راست "ہمارے قاموس" اور "ہمارے جاحظ" مخاطب کئے جاتے۔ اپنے خاندانی کتاب خانے اور آصف جاہی ریکارڈ آفس کے دروازے ان پر کھول دیئے اور اس تاریخی مواد سے (جسے دیکھنے کا اتفاق عمادی صاحب کے سوا کسی کو نہیں ہوا) خود اپنے لئے ہندوستان کی سیاسی تاریخ لکھوائی اور سب سے زیادہ یہ کہ اپنے اطمینان اور اپنی تلاوت میں استفادہ کے لئے قرآن کے ان اردو ترجموں کی نسبت توثیق چاہی کہ دیکھ کر بتاؤ ان میں کونسا ترجمہ مستند ہے اور اگر اس میں غلطیاں ہوں تو حاشیے پر اصلاح کر دو۔ کس قدر جتایا جانے والا تھا انسانیت کو یہ امتیاز اور منفرد امتیاز! لیکن عمادی صاحب کا جوہر ذات اس قدر عالی اور گراں مایہ تھا کہ یہ سارے امتیازات سمندر میں بارش کی ایک بوند تھے!

عمادی صاحب نے بطور "تحدیث نعمت" بھی ان باتوں کے ذکر سے اپنی زبان کبھی آلودہ نہیں کی۔ وہ جو اردو کی ایک کہاوت ہے: نیکی کر کنویں میں ڈال، بالکل اسی طرح انہوں نے یہ سارے کام کئے اور ان کے ذکر و اذکار خاموشی کے کنوئیں میں ڈال دیئے۔ اس سے زیادہ نیکو کاری اور کیا ہوگی کہ وہ بھی ان کاموں سے بے خبر رہے جو ان سے قریب تر تھے۔

یوں کہئے کہ علم کا گہراپا تھا۔ "انا" احساس ذات ہے، یہ احساس جس قدر واضح اور مستقیم اور علم و فکر سے متوازن ہوتا ہے اسی قدر گہرا ہوتا ہے، اور جس قدر گہرا ہوتا ہے اسی قدر ہوشمند شخصیت تشکیل پاتی ہے —— لیکن اکثر جس نفسی کیفیت کا اظہار ہے وہ مستقیم اور متوازن احساس ذات نہیں، انا کی پرستی ہے —— عمادی صاحب کو احساس تھا کہ وہ علم و فکر سے بہرہ مند ہیں، ان میں ایک خاص کمال اور

---

[1] ظفر علی صاحب کو اعلیٰ حضرت آصف سابع اپنے زمانۂ شہزادگی سے جانتے تھے اور اسی جاننے کی وجہ سے ملک بدر کئے گئے تھے۔ بات یہ تھی کہ اعلیٰ حضرت آصف سادس (میر محبوب علی خاں) کے حکم سے تمام سیکرٹری شہزادہ ولی عہد کو مملکت کا کام سکھانے جاتے تھے۔ ظفر علی خاں صاحب اس زمانے میں ہوم سیکرٹری عزیز مرزا صاحب کے اسسٹنٹ اور پیش کار تھے، کاغذات پیش کرنے ہمیشہ یہی ان کے ساتھ جاتے۔ عزیز مرزا صاحب تمام سیکرٹریوں میں سب سے زیادہ لائق فائق، اسباب اور کام میں دھن رکھتے تھے، ولی عہد کی نگاہ میں بہت عزیز ہو گئے۔ دوسرے سیکرٹریوں کو ان کی فوقیت گراں گزری، ان لوگوں نے یہ سازش گھڑی کہ عزیز مرزا ولی عہد کو برسر اقتدار لانے کی سازش کر رہے ہیں۔ اس پاداش میں عزیز مرزا صاحب اور ان کے ردیف ظفر علی خاں صاحب ملک بدر کر دیئے گئے۔ اعلیٰ حضرت آصف سابع نے یہ بات یاد رکھی اور جب ظفر علی خاں صاحب کرم آباد کی قید معطلی سے نکلے اور اسی کے لگ بھگ زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کی نصابی کتابوں کے لئے سر رشتۂ تالیف و ترجمہ قائم ہوا، تو ظفر علی خاں صاحب کو حیدرآباد بلایا اور اپنے خاص فرمان سے مشرقی شعبے کا رکن مقرر فرمایا۔

خاص بصیرت ہے۔ اس احساس اور قلندر مشرب[1] بزرگوں کے فیض تربیت سے ان کی پُرکشش، منفرد اور جمیل شخصیت کو جنم دیا۔

ان کی شخصیت میں اس قدر اعلیٰ انسانی خوبیاں تھیں جو آج ڈھونڈنے سے بھی کہیں نظر نہیں آسکتیں، نہ خانقاہوں میں، نہ مدرسوں اور مکتبوں میں، نہ مسجدوں میں، نہ کسی بڑے سے بڑے روحانی مرکز میں۔ انانیت کا تو ذکر ہی کیا، نخوت اور تکبر کی پرچھائیں بھی ان میں نہ تھی۔ اپنے سے ملنے والے کی بھی بزرگ داشت کرتے۔ اپنے چھوٹوں کے ساتھ اس طرح پیش آتے گویا وہ خود ہر حیثیت میں ان سے چھوٹے ہیں۔ اپنی کسی بات اور کسی طریقے سے ایک جاہل ہم نشین کو اس بات کا خفیف سا بھی احساس نہ ہونے دیتے کہ وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں۔ نیکی اور دست گیری کا جو سلسلہ ایک دفعہ شروع کر دیا مرتے دم تک قائم رکھا۔ ان کی تنخواہ میں دست گیری کی ایک مستقل مد تھی۔ معمولی نہیں، چھ سو میں سے سو روپے کی مستقل مد! خود ان کا اپنا حصہ کھانے، کپڑے اور اوپری مصارف سمیت پانچ فی صد تھا اور دست گیری کا بیس فی صد! دست گیری اس شان سے کرتے کہ اونچا ہاتھ نیچا رہتا اور نیچا ہاتھ اونچا۔ جیسے مرید با اخلاص اپنے پیر و مرشد کو اور سعادت مند شاگرد اپنے استاد کو نذر پیش کرتا ہے۔ عیدین کے موقع پر دفتر کے چپراسیوں کا گروہ عید کے سلام کو آتا تو اگرچہ وہاں کا عام دستور یہ تھا کہ چپراسیوں کا سلام دیکھ لیا اور انعام دلوا دیا۔ لیکن عمادی صاحب ان سب سے معانقہ کرتے، بزرگ داشت سے ان کو بٹھاتے، خود ہر ایک کو عطر پان پیش کرتے اور عید کا انعام ٹھیک اسی طرح پیش کرتے جس طرح وہاں اعلیٰ حضرت کو نذر پیش کی جاتی تھی۔ عید اور عید گردی میرے لغت و کلام سے خارج رہی ہے، لیکن عمادی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا مقدم تھا۔ ان کی بلندیاں دیکھ کر میری پستیاں پانی پانی ہو جاتی تھیں۔ اور سچ پوچھیے تو اپنی پستی کا یہ احساس انہی کی بلند انسانیت کا ادنیٰ فیض تھا۔ شروع میں ایک دفعہ میں نے اس طریقے پر جسارت سے کچھ کہا، فرمانے لگے، "جب عمادی اعلیٰ حضرت کی جناب میں اس طرح عید کی نذر پیش کرتا ہے تو یہ لوگ بدرجۂ اولیٰ اس کے حقدار ہیں۔ عمادی کی نگاہ میں سب اس سے اعلیٰ اور اس کے مخدوم ہیں اور وہ سب کا ادنیٰ ترین خادم ہے۔" ان کے لہجے میں جو بے پناہ انسانیت کا خلوص اور گداز تھا۔ اس وقت بھی جب میں یہ لکھ رہا ہوں، وہ دھیمی اور گہری آواز میرے دل میں پیوست ہوئی جا رہی ہے۔

نوکروں کے ساتھ برادرانہ برتاؤ تھا۔ نوکر صرف دو تھے، لیکن ان کا سدا گھر والوں کے دسترخوان میں برابر کا حصہ رہتا تھا، بلکہ ان کے مہمان بھی جو خود کھاتے وہی ان کو کھلاتے۔ لذت کام و دہن سے زیادہ ان کو دسترخوان کی وسعت محبوب تھی۔ نوکر بیماروں میں ان کا بچوں کی طرح علاج معالجہ کرتے اور ان کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے۔

عزیزوں کے ساتھ بہت اُلفت تھی۔ وطن جب جاتے عزیزوں دوستوں کے لئے سوغاتیں لے جاتے، بچوں کو نقدی دیتے۔ خاندان کے متعدد بچوں کو ان کے رجحان کے مطابق پڑھوایا۔ ایک بھتیجے کو ادب کا اور ان کے صاحبزادے کو سائنس کا شوق تھا، دونوں کو با اہتمام ایک ساتھ علی گڑھ میں پڑھوایا۔

حیدرآباد کی جاہ و ثروت کا ان پر اتنا بھی اثر نہ تھا جتنا کانٹے پر اوس ہوتی ہے۔ وضع کی طالب علمانہ سادگی، جو ہمیشہ سے ان کا شعار تھی، حالات کے تغیر سے اس میں سرِمو فرق نہ آیا۔ ان کے ایک بہت پرانے ہم وطن دوست کہتے تھے کہ میں نے وطن میں زندگی کی جو روش دیکھی تھی

---

[1] قلندری طریق کا آغاز ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں شیخ خضر رومی ہندوستان لائے، پُر جذبہ حال تھے، صاحب فضل اور اپنے کام میں صاحب کمال تھے۔ [illegible] ان کا طریق کار تھا، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے استفادہ کیا اور متمتع ہوئے۔ وہ خود تو وجدان کی اس تازہ نظر سے ان ملکوں کو بہرہ مند کرنے واپس چلے گئے جہاں سے آئے تھے، لیکن یہاں بھی ان سے ایک مستقل طریق قلندری شائع ہوا۔ قطب بینوائی اس کے سر حلقہ تھے اور انہی کے جانشینوں میں بھی اسی طرز فکر کا پیوند لگا۔ [illegible] سلسلہ طریق متمتع ہوئے۔ عمادی صاحب کے بزرگ شیخ قطب بینوائی کے حلقے سے متعلق تھے۔ قلندر مشرب کا خلاصہ دو لفظوں میں حریت نفس ہے۔ [illegible] شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں خضر رومی کا مختصر ترجمہ لکھا ہے۔

وہی آج اس مرکزِ جاہ و نمائش میں دیکھ رہا ہوں۔ مزاج میں کوئی فرق ہے، نہ لباس اور بود و باش میں ——— اور اسی سلسلے میں عمادی صاحب کی تحصیلِ علم کے واقعات سنائے۔

انفرادیت لیے ہوئے باوضع داری، جو کچھ بھی تھی ان کی ٹوپی ہی تھی، پھندنے سے آزاد اونچی باڑھ کی نرم ترکی ٹوپی۔ ڈھیلی ڈھالی گھٹنوں سے بالشت بھر سے کچھ زیادہ نیچی شیروانی۔ ڈیڑھ نٹے پائنچے، ٹخنوں سے اونچے نہیں، اتنے نیچے کہ ایڑیوں سے ملے رہتے۔ یہ چیز خاص اسی قسم کے لوگوں کو بہت گراں گزرتی تھی۔ علما اور طلبہ سے کبھی گراں جسم نہ ہوئے۔ جو لباس عموماً پہنتے تھے۔ کوئی مجلس ہو اسی لباس میں جاتے۔ جلوہ فرمائی کا جدا لباس کبھی وا نہیں رہا۔

لباس کی طرح تعلقات میں بھی بڑے وضع دار تھے۔ جس سے جو تعلق تھا حاضر و غائب یکساں تھا۔ جو وضع پڑ گئی زندگی بھر کا دستور بن گئی۔ توہین چاہے کسی کی ہو کسی قسم کی ہو، اس سے انہیں سخت اذیت ہوتی تھی۔ بدگوئی، دل آزاری، طنز و استہزا، اپنی ذات کے متعلق ذکر اذکار ان کے مذہب میں گناہ تھے۔ آپ بیتی گفتگو میں اسی حد تک آتی جتنی کہ مفید اور سبق آموز ہوتی۔ حوصلہ افزائی ان کی خصوصیت تھی۔ جس میں ذرا بھی کوئی استعداد پاتے، اس کے لئے سراپا شفقت بن جاتے۔ کم استعدادوں کے کام کو اپنے مقام سے نہیں، ان کے مقام سے دیکھتے اور حوصلہ بڑھاتے۔ رد و کد، بحث و تکرار سے پرہیز کرتے تھے۔ لیکن بطور تفنن کوئی انوکھی علمی بات چھیڑ کے ذہنی ورزش کا لطف لیتے اور لطف اندوز کرتے۔ شواذ اور نوادر مسائل، اور لطائف و ظرائف، ان کے کشکول میں بہت تھے۔ انسان خواہ کسی درجے کا ہو، ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا۔ جس مسئلے پر گفتگو کرتے کمال خوبیاں نظر آتیں۔ عربی فارسی اردو تینوں زبانوں کے ہزاروں شعر، جید و جزل ہر قسم کے ان کے خزانۂ دماغ میں محفوظ تھے، سناتے اور ذکر بھی کرتے۔ مطالعے کے تنوع نے ان کی طبیعت کو لالہ زار بنا دیا تھا۔ ادبی تاریخی اور فقہی لطیفوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے، خوش وقت کرتے اور خوش وقت ہوتے۔ منہ بند کر کے اس طرح ہنستے کہ سارا جسم ہل جاتا۔ شاید مقامی محاوروں کی طرح ہنسنے کا محاورہ بھی مقامی چیز ہے۔ ہنسنے کی یہی وضع مرحوم مولوی ابوبکر شیث کی بھی تھی، دونوں "جون پوری" تھے۔ ممکن ہے ہنسنے کا یہ سانچا جون پور کی قدیم شائستگی نے ڈھالا ہو۔

تسمیے اور املا میں تردید کرنا اور غلطی کی اصلاح "غلط ہے" کہہ کے نہ کرنا ان کی مستقل عادت تھی۔ اور یہی مستقل عادت تھی کہ جو لوگ بننے کے شوقین ہوتے بڑی لگن آمیزی سے ان کی تسکین خاطر کرتے۔ ایک صاحب کو علامہ بننے کا سودا ہوا، خوب مدارات کی، وہ "حضرت العلامہ" ہو گئے اور اس سند پر کہ عمادی صاحب نے علامہ لکھ دیا ہے، علامہ بن کر اپنا قانونی حق سمجھ لیا اور عمادی صاحب نے طرح داری سے لکھ دیا کہ جامع العلوم کتاب کو مختلف کہتے ہیں اور جامع العلوم شخص کو علامہ، میرے دوست بلاشبہ علامہ ہیں اور ایسے علامہ کم ہوتے ہیں۔ قدر بیان کے لئے لطیف مزاجی ہے اور یہ بھی لطیف کا کرشمہ تھا۔ قدر شناس عالم رنگ بھانپ گئے۔ عمادی صاحب سے کہا: میرا اور آپ کا اس میں ہرج کیا ہوا، وہ غریب علامہ بننے کی کوشش میں کچھ بن ہی جائے گا، بگڑے گا تو نہیں۔ میرا تو یہ مسلک ہے۔

ہمیں تو شیخ و برہمن سبھی کی کشش لینی   پھر کیوں ہو کوئی اس دھن میں بگاڑنے والے

کسی بات کو وہ غلط جانتے ہوں، مگر اس کی مدارات میں بھی دریغ نہ تھا۔ کیا خوب اس طرح کہتے کہ یا اپنی جگہ مطلق وہ اپنی جگہ خوش۔

اور یہی مدارات تھی کہ قانون کے مترجم مسعود علی صاحب محوی نے عربی ادب پڑھنے کی خواہش کی اور استاد صاحب شاگرد کو اس کے گھر ہی جا کے پڑھانے لگے۔ محوی صاحب علی گڑھ کے پرانے فارغ التحصیل اور علامہ شبلی کے شاگرد تھے، عربی میں نمایاں استعداد کا علامہ شبلی نے ان کو وثیقہ دیا تھا، سن رسیدہ ہو چکے تھے، جوش صاحب نے خیال کیا کہ شاید وہ سابقہ سن رسیدگی کے غرّے کی وجہ سے خود پڑھنے نہیں آتے اور عمادی صاحب کو بلوا لیا۔ خوب برسے، خوب برسے، پڑھنے یہ بیٹھے، سنتے ہی وہ نہال ہوئے، جو بڑی بات تھی تو بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ان کے آنے سے مجھے کچھ ننگ نہیں لگ جائے گا۔ یہ بات تو قابلِ قدر ہے کہ انہیں اس عمر میں بھی پڑھنے کا شوق ہے۔ آپ پڑھتے عمادی آپ کی جگہ

میں بھی حاضر ہوگا۔" انہی عمادی صاحب کے ہاں ضیافت میں ظفر علی صاحب نے بیان کیا تھا (یہ ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء کی بات ہے) کہ مجھ سے ڈاکٹر اقبال نے ذکر کیا کہ میں ابن عربی کا فلسفہ سمجھنا چاہتا ہوں، کوئی ایسا آدمی بتاؤ جو مجھے ابن عربی کی فصوص اور فتوحات کے مباحث اور فلسفہ سمجھا دے۔ میں نے اپنے عمادی کو تجویز کیا اور یہ حضرت خود جا کے پڑھانے لگے۔" عمادی صاحب نے [illegible]، کہ رسم پابندی اوقات چل جاتی ہے۔

میں نے ایک مرتبہ تاریخ ابن خلدون کے فارسی ترجمے کا قصہ پوچھا، بہت سادگی سے اتنا کہا: "جو بزرگ یہ کام خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے تھے وہ بڑھاپے کو پہنچ چکے تھے، مولوی شبلی [illegible] صاحب کے زیر ہدایت وقت کے ضروری مباحث پر لکھنے اور تحقیق و مطالعے میں مشغول تھے۔" اور قصہ گویا تمام کر دیا۔

مولوی سید سلیمان صاحب کو بہت قلق تھا کہ "ان کے مضامین ابو الکلام کے نام سے شائع ہو گئے۔" ایک دن دار المصنفین کی کسی کتاب کے سلسلے میں عمادی صاحب کے پاس دفتر تشریف لائے، یہ قصہ لازم گفتگو سے تھا، فرمایا، "یاد ہے گا مولانا! آپ کو وہ میرا 'کانپور کی مسجد' والا مضمون اور ابو الکلام صاحب کا یہی کا خط! اسی مضمون سے شہرت لی اور اسی مضمون پر لکھنے والے کو غیظ و غضب سے نوازا ـــ اور مولانا! آپ نے دیکھا! آپ کے وہ مضامین بھی اپنی مکاتیب ادبی میں شامل کر لئے جو آپ وہاں چھوڑ آئے تھے ......" اور ان مضامین کی خوب ستائش فرمائی۔ عمادی صاحب نے کہا، "چھوڑیئے جناب مولانا (یہ عمادی صاحب کا خاص انداز تخاطب تھا) ان باتوں کو، اب وہ مضامین نہ مولانا ابو الکلام ہی کے لئے کوئی حیثیت رکھتے ہیں نہ آپ ہی کے لئے۔ یاد کے قابل تو وہ صحبتیں ہیں جو مولانا ابو الکلام کے ساتھ گزر گئیں۔ پھر وہ لطف صحبت حاصل نہ ہوا۔" سید سلیمان صاحب کو یہ بات خوش نہ آئی۔ بڑی دل گرفتگی سے عمادی صاحب کی صورت تکنے لگے۔ میرے لئے یہ بہت دلچسپ مطالعہ تھا۔

ان کا ذہن و وجدان کلیۃً عقلی تھا، اور وجدان انفعال کا نفسانی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے افکار و معتقدات میں بے حد راسخ تھے اور دوسرے کو اپنے معتقدات و مسلک کی پوری آزادی دیتے اور تصادم سے پرہیز کرتے تھے۔ ان کے ملنے والوں میں غالی شیعہ بھی تھے، اسماعیلی بھی، اور ایسے بے فکرے بھی جو "اگر رسول" کی زبان میں گفتگو کیا کرتے، اور یہ سب ان کی صحبت سے یکساں فرحت و انبساط حاصل کرتے۔ ایک [illegible] دوست نے پوچھا: مولانا! اسلام نے موسیقی کی سرپرستی کیوں نہیں کی؟ بولے: "آپ جس کو موسیقی سمجھتے ہیں اس کی سرپرستی اسلام نے اس وجہ سے نہیں کی کہ وہ طبلچی اور سارنگیے پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا، خیبر شکن حیدر کرار پیدا کرنا چاہتا ہے۔" کفر ان کے نزدیک لغت اور اصطلاح دونوں لحاظ سے، عقل سے بغاوت ہے اور استدلال ایمان کی مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مولوی معنوی نے استدلال کو پائے چوبیں کہا ہے، وہ پائے انہیں کھٹکتے ہیں۔ مولوی کے شعر کو انہوں نے یوں بدلا ہے:

پائے استدلالیاں چوبیں بود — پائے چوبیں باہمہ تمکیں بود
بلکہ استدلال کار دیں است — فخر رازی رازدار دیں است

اور یہ استدلال طریق دینی امور اور علمی امور میں، ان کا اصول کار تھا۔

وہ اپنی تسکین خاطر کے لئے جب کسی مسئلے کی تحقیق کے درپے ہو جاتے تو دن رات اسی دھن میں لگے رہتے اور تحقیق کے پھل سے، خواہ ان کی خواہش کے مطابق ہو یا خلاف، شاد و شاکر ہوتے۔ ان کا مدعا صرف تحقیق ہوتا تھا، وہ اپنی خواہش اور غلط نظر کو محمود نہیں بناتے تھے۔

تاریخی مطالعے میں ان کا طریقہ عام روش سے جدا تھا۔ وہ واقعاتی تاریخوں سے صرف زمین کا کام لیتے تھے اور عمارت گری کے لئے تذکرے و تراجم، رقعات و محاضرات (کشکولی کتابوں) اور دوسرے ماخذ سے واقعات کو روشن کرنے والے رشتوں کا کھوج لگاتے۔ اسی کے لئے وہ قصوں اور کہانیوں اور قصیدوں کا بھی مطالعہ کرتے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے سلسلے میں انہوں نے شاہی فرمانوں، جاگیری وثیقوں اور

انہوں نے وقف ناموں کا بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ مخطوطات اور دوسری علمی سرکاری مدوں سے دو ڈھائی ہزار سالانہ کی جو آمدنی ہوتی وہ علمی کتابوں اور ایسے ہی ذخیروں کے لئے وقف کر دی تھی۔

جرجی زیدان سے مسلمان کو بہت ہمدردی تھی۔ کہتے تھے کہ وہ بہت بڑا مصنف ہے۔ اس نے تاریخ اور افسانے کو ملا کر ایک نیا اسلوب پیدا کیا تھا۔ اس کے فن سے معاشرے کی اکثریت ہر زمانے میں بڑے ذوق شوق سے مستفید ہوئی۔ وہ مورخ کی بجائے ایک با مقصد نقاش ہے اور اس کی نقاشی اس ماحول کا دلفریب رنگ مہیا کرتی ہے۔ یہ ان کے تاریخی مطالعے کا انداز نظر ہے۔

ابن خلدون کے دو نظریئے: عربوں کی بدویت کے نظریئے اور علوم و آداب میں عربوں کی تہی دستی کے نظریئے سے سخت اختلاف تھا۔ کہتے تھے کہ مستشرقین نے زیادہ تر ان دو نظریوں کی وجہ سے ابن خلدون کی ستائش کی ہے۔ ان کی مختار رائے یہ ہے کہ ابن خلدون کے یہ دونوں نظریئے بے اصل ہیں۔ "تاریخ عرب قدیم" اور "مساعد العرب" ابن خلدون کے نظریۂ بدویت کی تردید کا تحریری ہیں لیکن ان کو اپنی معتاد روش کے مطابق تردید کے عنوان سے پیش نہیں کیا۔

مقالہ ہو یا ترجمہ، برداشتہ قلم لکھتے اور کسی پیراگراف یا صفحے میں شاذ و نادر کوئی لفظ قلم زد ہوتا۔ مدت سے خود لکھنا چھوڑ دیا تھا، ترجمہ لکھواتے تھے۔ ترجمہ لکھوانے کا ڈھنگ اکثر دیکھنے میں آتا: لیٹے رہتے، کتاب ایک نظر دیکھتے اور فقرے روانی سے بول دیتے۔ خوبی یہ ہوتی کہ ترجمہ مقفیٰ ہوتا۔ مسجع عبارتوں کے مقفیٰ ترجمے کی یہ مثال تھی:

والقمر الباهر والكوكب الزاهر والغمام
الماطر وما بالجو من طائر وما اهتدى بعلم
مسافر من منجد وغائر لقد سبق هاشم امية
الى المآثر اول منه وآخر وابو همهمة بذلك خابر
فقضى لهاشم بالغلبة۔

قسم ہے ماہ تاباں کی، نجم درخشاں کی، ابر باراں کی، مرغان فضا کی،
آسمان کی۔ قسم ہے اس پہاڑی ٹیلے کی جس سے رہبر کو راہ ملے
فراز پسند ہوں یا نشیب گیر سب کو جا ملے کہ خوبیوں میں ہاشم
امیہ سے بڑھ کے ہے آگے پیچھے ہر حال میں بڑھ چڑھ کے ہے
ابو ہمہمہ اس کا خیر سگال ہے اور یہی اس کا بیان ہے۔ اس بیان
کے ساتھ ہاشم کے غالب آنے کا فیصلہ کیا۔

لوگوں کی خدمت طرح طرح سے کرتے۔ ایک صاحب کے پاس قدیم قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ چاہتے تھے کہ آصفیہ کتب خانے میں اچھے داموں نکل جائے۔ ان سے کہا: فہرست بنائیے، ہر کتاب پر مختصر سا تعارف لکھئے کہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو۔ تعارف لکھنے کا کام ان کے بس کا نہ تھا۔ یہ کام اپنے ذمے لے لیا اور بڑا احسان یہ کہہ کے ان کو سبک دوش کر دیا کہ "مجھے پڑھنے کو اچھی کتابیں مل جائیں گی۔" وہ ہر ہفتے دس بارہ کتابیں لاتے اور تعارفی نوشتوں کے ساتھ اپنی کتابیں لے جاتے۔ مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ اتنی تکلیف کر کے کسی کے لئے لکھا ہے۔ چند نمونوں سے تعارف کی فنی خصوصیتوں کا اور ادبی شان کا اندازہ ہوگا۔

کیمیائے اسلام: اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تکوین تین طرح کی: نباتات و معدن و جمادیں، تینوں مشترک کیا ہے۔ نقص خلقت کی کتنی گنجائش ہے۔ کمالات کتنے ہیں اور نقصانات کس قدر ہیں، جوہر و عرض کی کیا نسبت ہے، ان اجسام کو بظاہر مختلف اور غیر محسوس کیا جاتا ہے کیا حقیقت میں ان کے اندر تحلیل نہیں ہے کہ اعمال تصعید و تنزیل و تحلیل و ترکیب سے وہی جنس سافل مرتبہ عالی میں پہنچ سکے اور صنعت گری کے طفیل مس کو سونے کی جیسے میں تبدیل کر لیا جائے؟

کیمیائے اسلام کا یہی موضوع ہے جو تمام تر حقائق اشیاء کے علم حق اور عمل صدق پر مبنی ہے۔

اسلام سے پیشتر کلدانی و مصری و یونانی قومیں بھی اسی میں مبتلا تھیں؛ مسلمان بھی ابتداءً اس طلب میں گرفتار ہوئے۔ خلافت سے محرومی کے بعد خالد بن یزید اس کے دلفگار، جابر بن حیان اس کی تحریروں میں پڑھے ہیں۔ جو طغرائی کی تحقیق میں فن سے تعلق نہیں رکھتے۔ ایک شخص زہریلی تصنیف

ہی سرگرم ہے، تکوین میں انہماک رکھتا ہے، یا یہی ہمہ کوشش بے نتیجہ رہتی ہے، اس لئے کہ نباتات و معادن و جمادات کے حقیقی علم سے مطلقاً آشنا نہیں۔

مسلمانوں نے یہ کمزوری محسوس کی، نجوم ہی کے زینے پر چڑھ کے کیمیا کے بام حکمت پر چڑھ گئے۔

یہ کتاب انہی حقائق پر حاوی ہے۔

معتزلی نے اپنے تمام پیش رووں سے الگ ہو کے ابوبکر رازی کو اپنا مدار علیہ ٹھہرایا ہے کہ اس علمی خلافت کے — فی زمانہ — وہی بانی و افضل تھے۔

رسالہ عرشیہ: فلسفۂ اسلام کے سب سے بڑے پیشوا شیخ بوعلی سینا کی یہ کتاب عربی زبان میں تھی جس کا یہ فارسی ترجمہ عہد سلاجقہ کی یادگار ہے۔ اسی عہد کی زبان ہے اور وہی انداز بیان ہے۔ "کائنات کس طرح وجود میں آئی، نیستی سے ہستی کیسے ہوئی، معدوم سے موجود کی کیا سبیل نکلی؟ کوئی شے اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جب اس کے لئے کوئی علت و سبب موجود ہو، یہ علت اس شے پر مقدم ہوتی ہے، وجود عدم سے نکلا تو کیوں کر نکلا؟ علت وجود کو وجود سے پہلے موجود ہونا چاہئے حالانکہ وجود سے پہلے آپ عدم کے قائل ہیں۔ یہ مباحث نمونۂ کتاب ہیں۔ ان ہی پر غور کرنے والے پر طبیعیین و دہریین کے مذہب کا فساد خود بخود واضح ہو جائے گا۔ اور ماننا پڑے گا کہ عدم اور وجود سے پہلے ایک واجب الوجود ہی ہے، تعالیٰ شانہٗ کہ وہی اس کائنات کا سبب بھی ہے اور مسبب بھی۔"

رسالۂ طیر: یہ بھی شیخ کی عربی تالیف کا فارسی ترجمہ ہے جو سلجوقیوں کے عہد میں ہوا تھا۔ اس میں انسان کی تخلیق سے بحث کی ہے کہ ایک نوع کے ہوتے ہوئے ان میں گوناگوں اختلاف کیوں ہے؟ اختلاف کی نہایت نازک علمی تحلیل کر کے دکھایا ہے کہ ہر انسان میں ترقی کی استعداد موجود ہے، یہ استعداد بالقوہ ہے، ریاضت سے اگر اس کو فعل میں لایا جائے تو کون سے مدارج ارتقا ہیں جن پر انسان فائز نہیں ہو سکتا!

تحفۃ الحبیب: اصفہان کے خوش بیان سخنور دلکش سخن میرزا فوقی کی یہ کتاب زبان آوری کی دنیا میں پرواز خیال کا ایک عجیب مرقع ہے۔ مثلاً سعدی نے اک طرحِ کلام میں شور انگیزی پیدا کی، کے حصے میں آئی، ایک غزل لکھی، خسرو بھی اسی زمین کو شاداب کرتے ہیں، اور معاصر ہندی ہیں جیسے ان روزن و خوشہ گوئی کہتے تھے، ایک نئی شان دکھاتے ہیں۔ حسن اس کو روانی و سلاست کے قالب میں ڈھالتے ہیں، سلمان ساوجی، خواجو کرمانی، عماد فقیہ کی شکر خائی اور حلاوت انگیز طبع آزمائی سے یہی زمین حسن شکرستان بن جاتی ہے۔ پھر حافظ آتے ہیں، اور صد ہا دو قبول خاطر سے اسی زمین کو آسمان کے ہمدوش بنا دیتے ہیں۔ پھر وحشی، اہلی، وکاتبی و نظیری و جامی اپنے اپنے طرز میں داد سخن دیتے ہیں۔

ایک ایک زمین میں مشاہیر شعرا کی طبع آزمائی کا یہ حیرت انگیز شاہکار معنی اہلِ فکر کے ذہنی مشغلہ کا ایک وافر سامان رکھتا ہے۔ جس سے ادب فارسی میں عہد بہ عہد حسن تخیل و لطف ذوق و عروج فکر کی ایک ایسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے کہ فارسی کی حد تک ایران و ہندوستان آج تک اس سے ناآشنا ہے۔

اسی سلسلے میں دو مضمونوں کے اقتباس، ادب میں تاریخ اور تاریخ میں ادب کی شان دکھاتے ہیں۔

(۱) ساتویں صدی ہجری کے آخری ایام ہیں، 'بغداد' کا تمدن سیلاب تاتار کی نذر ہو چکا ہے، 'ہلاکو' کا جانشین 'اباقا' سریر آرائے سلطنت ہے، 'تبریز' جو 'زبیدہ خاتون' کی یادگار تھا، آج اسی میں تاتاری لشکر کی چھاؤنی ہے، روم و عراق و ایران و توران و ماوراء النہر جتنے اسلامی ممالک تھے سب کے سب کفر کے نرغے میں آ چکے ہیں۔ مصر و شام کی ایک ہی بچی ہوئی اسلامی سلطنت رہ گئی ہے جہاں جا کر خلافت نے پناہ لی ہے، مگر اب اس پر بھی چڑھائی کے سامان ہو رہے ہیں، اسی ضرورت سے خود 'اباقا' 'تبریز' میں لشکر زن ہے، اور صاحب دیوان اعظم (خواجہ شمس الدین محمد) پر تاکید ہو رہی ہے کہ 'سیستان' سے لے کر ایران تک کی تمام فوجیں یک جا کر لی جائیں، پوری قوت کے ساتھ جمع

"مسلمانوں کے مناروں پر حملہ ہو سکے"۔

(۲) ہجرت نبوی کا چھیاسٹواں سال ہے، سیدنا حسین بن علی علیہما السلام دشت کربلا میں شہید ہو چکے ہیں، جوشِ انتقام نے عراق کو ایک شعلۂ جوالہ بنا رکھا ہے، یزید و آل یزید پر عام بیزاری مسلط ہے، قاتلین کا تو خاتمہ ہو چکا ہے مگر غم و غصہ تا اب بھی برپا ہے۔ اسی حالت میں قبیلۂ ثقیف کا ایک جواں مرد اٹھتا ہے اور سب کو جھا دیتا ہے۔ اس کی کنیت ابو اسحاق ہے، پہلے خارجی رہ چکا ہے، اس میں کامیابی موہوم نظر آئی تو اب زمرۂ محبت داران اہل بیت میں اپنے تئیں منسلک کرنا چاہتا ہے، بایں ہمہ شیعہ اس سے کھٹکتے رہتے ہیں کہ سیدنا حسین مجتبیٰ کے عہد میں اس کی کاٹ چھانس دیکھ چکے ہیں، اب نہ جانے یہ کاتا کیا گل کھلائے، یہ فتنہ کیا قیامت ڈھائے؟

اردو میں شعر کم کہتے تھے، عہد شباب کی ایک غزل ہے:

چشم پُرخوں کا ہے گردش میں نظام اے ساقی — گردشِ ساغر و مینا کو سلام اے ساقی
سطوتِ جام کی جاتی رہی عالم گیری — اب کہاں ولولۂ شربِ مدام اے ساقی
شیشہ ہے منتظرِ جلوۂ خورشیدِ ازل — مجھ کو درکار نہیں ماہِ تمام اے ساقی
کعبۂ دل میں جنوں کو ہے خدائی کا غرور — لب تک آتا ہے پھر اللہ کا نام اے ساقی
ہو تو صبح بنا گوش سے ہو گی کافور — گیسوئے بند جگر خوار کی شام اے ساقی
تیغ ابرو سے آشام کہیں پڑتے ہیں — دمِ شمشیر ہے رندوں کا مقام اے ساقی

لے گل رنگ شہادت کا چلے بزم میں دور
آ چکی ساعتِ افطارِ صیام اے ساقی

فارسی میں یوں داد سخن دیتے ہیں:

جبین ز ہجر ز تمنائی نشد رنگش — ہزار سجدہ کند تو بہ جبیں نرسد

خدایا تو ز جنت کہ ناوید قسمت — ہرگز در کریم بکافر نہ بستہ اند

الٰہی بیش ہمہ از آتشی دوزخ باک — ہر کہ در خلد درایہ نہ زند شش جہیم

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری — عجب این ست کہ بیمار تو بیمار ترست

فریبِ رنگ و دو زرنے گہر شناس مخور — حباب وار خود داری گہر بخشند
عجب مدار اگر مرغ خانہ پرور ما — نداد جنت پرواز بال و پر بخشند
جہاں کشا کہ چہ جانے اگر چہ بیا یہ — گلیم فقر بہ یا چند و تاج زر بخشند

علم اور علامہ ہونا کوئی بڑی بات نہیں، بڑی بات انسان ہونا ہے۔ عمادی صاحب جتنے بڑے عالم اور علامہ تھے اس سے زیادہ، اعلیٰ قسم کے انسان تھے۔ بلند نگاہ اور کریم النفس، انکسار صفت اور قلندر سیرت۔ ان کی زندگی شرافتِ علم اور شرافتِ نفس کے امتزاج کی نمود تھی۔

پنڈت برج نرائن چکبست

نجم الدین شکیب

چکبست کی وفات کو پورے تیس سال گزر چکے ہیں لیکن علمی اور ادبی حلقوں میں وہ ابھی تک اس طرح یاد کئے جاتے ہیں جیسے ان کی موت کا حادثہ کل ہی کی بات ہو۔ وہ صرف یہی نہیں کہ جوانی میں مرے بلکہ اس وقت اس دنیا سے گزر گئے جب ان کی قابلیت کی شہرت اپنے بھرپور شباب کو پہنچ چکی تھی۔ اگر موت کا بے رحم ہاتھ اس جوہر گراں مایہ کو قوم کے ہاتھ سے نہ چھین لے جاتا تو ابھی ملک اور قوم کے نوجوانوں کو ان سے کسب فیض کا موقع حاصل ہوتا اگر وہ زندہ ہوتے تو اس سال ہم ان کی چوہترویں سالگرہ مناتے۔ اس عمر کے پہنچتے ہوئے میں کوئی شبہ نہیں لیکن پھر بھی چند سال اور ان سے استفادے کی آس باقی ہوتی۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا اور ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو جب شہرت اور شباب کے پھول ان پر نچھاور ہو رہے تھے وہ اچانک بیمار ہو کر پانچ گھنٹے میں اس دنیا سے آگے چلے گئے ؎

لے چلی بزم سے کس وقت مجھے مرگ شباب
سب ابھی آئے بھی نہیں، بادہ بھی پیمانے میں ہے (چکبست)

چکبست کا آبائی وطن اور دور کی قدیم جائے سکونت فیض آباد ہے لیکن وہ تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بچپن ہی میں لکھنؤ چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے کیننگ کالج سے بی۔ اے پاس کیا اور ۱۹۰۸ء میں وکالت پاس کر کے قانون کے پیشے میں آ گئے تھوڑے ہی دنوں میں ان کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں ہونے لگا۔

وہ مشہور کشمیری برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ فارسی ادب سے لگاؤ ان کو ورثے میں ملا تھا۔ قدرت نے طبیعت موزوں عطا کی تھی مگر گھر کا ماحول بھی شعر و ادب کی فکر سے رنگین اور آبیاری کے لئے موزوں تھا اس لئے عمر ہی کم تھی سے مشق سخن کرنے لگے۔ ناسخ اور آتش غزل کی زمین کو ہموار بنا چکے تھے اس لئے شروع شروع میں چکبست نے بھی وقت کی اسی لے میں اپنے دل کی بات کہی لیکن زمانہ بدل رہا تھا۔ اب دنیا کے فرسودہ رسم گئے تھے کہ صرف حسن و عشق اور ہجر و وصل میں کوئی کشش نہیں محسوس ہوتی ان کے شعور سے جوان کی نسل میں کروٹ کر رہا تھا ان کی عمر کے [illegible] اور اردو کے شعروں میں وہ غم بھی ڈھلنے لگے جو ابھی تک اردو شعر و ادب کے لئے تقریباً نئے تھے۔ کوئی شبہ نہیں

اقبال کے نغمے ایک بیداری اور آزادی کی تحسین کر رہے تھے لیکن وہ گلستاں جس میں چکبست کی حب الوطنی نے زبان کھولی ابھی تک خاموش تھا اور چکبست نے خالص ہندوستانی قومیت کے ترجمان کی حیثیت سے تاریخ ادب میں اپنے لئے جو جگہ بنائی وہ ابھی تک کسی اردو شاعر کے نصیب میں نہ آئی تھی۔ نواب جعفر علی خاں اثر کا دعویٰ غلط نہیں کہ:

> "صرف چکبست ہی وہ قومی شاعر ہے جس نے کل ہندوستان کے جذبات و ضروریات کی بلا امتیاز
> تفریق مذہب ترجمانی کی ہے"

چکبست کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اردو اور فارسی کے علاوہ انہوں نے انگریزی ادب اور فلسفہ کا بھی بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مل، مارلے اور برک ان کے پسندیدہ فلسفی اور انشا پرداز تھے۔ رانا ڈے، گوکھلے اور تلک نے بھی ان کے خیالات اور جذبات پر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ بڑے زبردست قوم پرست تھے لیکن ان کی قوم پرستی کا دائرہ تنگ نہیں تھا۔ وہ ہندوستانی تہذیب کے قدردان تھے لیکن تمدن کے بڑھتے ہوئے دھارے کو روکنا نہیں چاہتے تھے بلکہ تہذیب کی قدیم اور جدید قدروں کے امتزاج سے ایک ترقی پسند سماج کا سنگ بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ بقول پنڈت کشن پرشاد کول مرحوم، چکبست کا عقیدہ تھا کہ:

> "پرانی تہذیب سے جو کچھ بچ سکتا ہے پوری طرح سمیٹ لینا چاہئے لیکن نئی روشنی اور نئے تمدن
> کے سامنے بھی آنکھیں بند نہیں کرنا چاہئیں۔ ہماری زندگی مشرق اور مغرب دونوں کی روشنی کا عکس ہونا چاہئے۔"

یہ صرف ان کا عقیدہ ہی نہیں تھا۔ انہوں نے زندگی بھر اس مقصد کے لئے جد و جہد بھی کی۔ انہوں نے اپنے قلم اور عملی زندگی سے بھی کام لیا اور تعلیمی اداروں میں شامل ہو کر بھی ابھرتی ہوئی نسل کو سنبھالنے اور صراط مستقیم پر چلنے کی کوشش کی۔ طلبہ سے ان کو بڑی امیدیں تھیں۔ وہ کیننگ کالج (جس نے اب لکھنؤ یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی ہے) کے قدیم طالب علم تھے۔ اس لئے وہاں کے حالات کا ان کے اوپر بہت اثر پڑتا تھا۔ وہ طلبہ کے سچے رہنما اور مربی تھے۔ جب موقع پاتے کالج جاتے، طلبہ سے ملتے، باتیں کرتے، ان کا نقطۂ نظر سمجھتے اور اپنا سمجھاتے۔

ملکی اور قومی معاملات میں ان کی تمنائیں خالص ہندوستانی تھیں۔ وہ مذہباً ہندو تھے لیکن ان کا کلچر خالص ہندوستانی تھا۔ مذہب کی صداقت پر پوری طرح ایمان رکھنے کے باوجود وہ انسان دوست تھے۔ ہر ہندوستانی ان کی نظر کا تارا تھا۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی غرض وہ سب ہی کے خیرخواہ تھے اور سب کے دکھ درد میں ایک سچے درد مند انسان کی طرح شریک ہوتے تھے۔ ان کا یہ شعر صرف شاعرانہ لاف نہیں ہے بلکہ ان کے مردانہ کردار کا سچا جوہر ہے جو موت کے میدان میں اترتے وقت ان کی زبان پر آیا تھا۔

درد دل، پاس وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا (چکبست)

ان کے سیاسی عقائد کا انداز انتہا پسندانہ نہیں تھا۔ ہم ان کو اعتدال پسند کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کی عظمت و برتری کا خواب دیکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ:

یہ آرزو ہے کہ [illegible] سے کام رہے
وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے (چکبست)

لیکن ہوم رول تحریک کے خلاف ان کا رویہ جارحانہ نہ تھا۔ انہوں نے پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں انگریزی حکومت سے پوری طرح تعاون کیا۔ ان کی انتہائی تمنا یہی تھی کہ:

"ہم ہوں گے، عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا"

وہ ہوم رول کے مطالبے سے کبھی آگے نہیں بڑھے۔ زمانے کے حالات سے آگے چل کر بیٹھے تھے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو یقیناً سیاسیات سے متاثر ہوتے لیکن موت نے اتنا وقت نہ دیا کہ ان کا خلوص ان کی بے چینیوں سے مل کر کسی واضح بغاوت کی شکل اختیار کر سکتا۔ لیکن پھر بھی ان کی تحریروں نے قومی جذبات کے ابھارنے میں جو حصہ لیا وہ بہت کم ادیبوں کے حصے میں آیا۔

چکبست بڑے خوش وضع، ملنسار اور وفادار دوست تھے۔ ان کا شباب اعلیٰ اخلاق و وجاہت کی تصویر تھا۔ لکھنؤ کی تراش خراش اور نوک پلک نے ان کی جامہ زیبی میں اور بھی چار چاند لگا دیے تھے۔ بہت سنجیدہ اور پُر فکر آدمی تھے۔ باتیں کم کرتے تھے لیکن خشک مزاج نہیں تھے۔ طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ قہقہہ لگا کر بہت کم ہنستے تھے لیکن خندۂ زیرِ لب سے کبھی ان کا چہرہ عاری نہیں ہوا۔ دوستوں اور بے تکلفوں کی صحبت میں ان کی سنجیدگی کبھی حائل نہیں ہوئی بلکہ ان کی بذلہ سنجیوں نے روتوں کو ہنسایا اور مردہ دلوں کو زندگی کی مسرت بخشی۔ پرانے زمانے کی تہذیب اور شائستگی سے ان کے خلوص و حسنِ اخلاق نے جلا پائی تھی۔ ان سب پر مستزاد ان کا دل تھا جس کا گوشہ گوشہ انسانیت سے معمور تھا۔ وہ سراپا اخلاق تھے۔ لکھنوی تہذیب اور معاشرت کے آب و رنگ نے اس میں اور بھی دل آویزی پیدا کر دی تھی۔ وہ اس وقت کے معاشرے کے تکلفات سے خالی نہ تھے لیکن ان تکلفات میں نقالی اور ذہنی غلامی کا شائبہ نہ تھا بلکہ ان پر جمالیاتی ذوق نے صرف دل و نگاہ کی تسکین کے لیے رنگین نقاب ڈال رکھا تھا۔ وہ قدیم شرافت کا پتلا تھے اور نئے خون نے ان کے دل میں جو ایک امنگ سی پیدا کر دی تھی وہ اس روایتی شرافت میں روح بن کر ان کو سراپا انسان بنائے ہوئے تھی۔

چکبست ترقی پسند ادیب اور رفارمر تھے لیکن بے راہ روی سے کوسوں دور تھے۔ انھوں نے ترقی اور اصلاح کے میدان میں بھی میانہ روی ہی کو اپنا اصول بنایا۔ وہ تعلیمِ نسواں کے زبردست حامی تھے لیکن ان کی حمایت غیر مشروط نہ تھی۔ وہ زندگی کے ہر عمل کو اخلاق کی کسوٹی پر کستے تھے۔ تعلیمِ نسواں بھی ان کے نزدیک ہندوستانی اخلاق کی روایات سے آزاد نہیں ہو سکتی تھی۔ ہندوستانی خاتون کا جذبۂ وفا، شرم و غیرت اور خانداں پروری یہ وہ جوہر تھے جن کو وہ زیورِ نسائیت کے لیے ضروری جانتے تھے۔ وہ عورت کو صرف "چراغِ خانہ" بنا کر نہیں رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ اس کے "شمعِ انجمن" بننے کے بھی حامی نہ تھے۔ ان کے نزدیک "امومت" اور اس کے فرائض کی بجا آوری عورت کا بڑا انسانی اور قومی فریضہ ہے جو تعلیمِ نسواں کو ہر جماعت کی خاتون کو سکھانا تھا۔ اپنی اولاد کی طرف سے مردوں کی بے اعتنائی دیکھ کر انھوں نے دخترانِ ہند کو متنبہ کیا تھا کہ:

اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں
یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز

مرحوم اودھ پنچ کا حلقہ چکبست کا خاص حلقہ تھا اور وہ تمام ادیب جو اس حلقے میں شامل تھے ان کے خاص دوست تھے لیکن اودھ پنچ کے لہجے میں جو جھنجھلاہٹ تھی اسے چکبست نے اپنی تحریروں میں اختیار نہیں کیا۔ ان کی فطرت جارحانہ نہیں تھی اس لیے وہ شدید اختلاف کے باوجود کسی کا دل ہنسی مذاق میں بھی دکھا نہیں سکتے تھے۔

چکبست نے گلزارِ نسیم کو ایڈٹ کر کے ایک دیباچہ لکھا۔ عبدالحلیم شرر نے اس دیباچہ پر بڑی چوٹیں کیں۔ چکبست نے اس کا جواب لکھا اور جواب الجواب بھی لیکن زورِ استدلال کے باوجود کہیں تلخی نہیں آنے دی۔ ان کے اوپر بعض حلقوں سے کچھ غیر اصولی اور نامناسب حملے ہوئے لیکن انھوں نے صبر اور ضبط کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کی تحریروں میں شروع سے آخر تک سچا تنقیدی وقار قائم رہا۔ جب گرما گرمی بہت بڑھی تو انھوں نے بڑی شرافت سے لکھا:

> "جناب شرر اطمینان رکھیں کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میرے قلم سے ایک فقرہ بھی ایسا نہ نکلے گا جس سے کسی بندۂ خدا کی توہین مقصود ہو۔"

یہ بندۂ خدا چکبست کا محبوب تھا۔ وہ اس کی خدمت کو خدا کی پرستش کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ ہندو تھے لیکن اس سے پہلے انسان تھے۔

اس لئے وہ سب کے لئے تھے کسی کے لئے غیر نہ تھے۔ کوئی ایسی بات جو کسی کی دل آزاری کا موجب ہو ان کے نزدیک روا نہ تھی۔ وہ مذہب کو بھی انسانیت اور انسان نوازی کی کسوٹی پر کستے تھے۔ انھوں نے اپنے مذہبی تصور اور رجحان کو اس شعر میں سمجھایا ہے ؎

ہمارے اور زاہدوں کے مذہب میں فرق اگر ہے تو اس قدر ہے
کہیں گے ہم جس کو پاسِ انساں وہ اس کو خوفِ خدا کہیں گے (چکبست)

چکبست نے بہت کمایا لیکن کبھی ایک پیسہ جمع نہیں کیا۔ وہ اپنے بڑے بھائی پنڈت مہاراج نارائن چکبست کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے صرف ایک لڑکی تھی۔ پنڈت مہاراج نارائن کے کئی لڑکے تھے۔ یہ سب چھوٹے بھائی بھی ساتھ ساتھ رہتے اور سگے بھائیوں اور بہنوں کی طرح پرورش پاتے تھے۔ چکبست کو اپنے بڑے بھائی پنڈت مہاراج نارائن سے بڑی محبت تھی۔ اچھی خاصی آمدنی رکھنے کے باوجود بھی ان کے دل میں خیال بھی نہ آیا کہ اپنی بیوی اور بچی کو لے کر الگ رہیں اور عیش سے زندگی بسر کریں۔ ایسے وفادار، محبت پرست اور کنبہ پرور بھائی کی موت پنڈت مہاراج نارائن کے لئے بڑا حادثہ تھی۔ چکبست کے انتقال کے وقت ان کی بچی چھوٹی تھی۔ اس کی شادی کے کل فرائض پنڈت مہاراج نارائن نے انجام دئے۔ چکبست کا ذکر ابھی تک ان کے خاندان میں تازہ ہے۔ ان کے بھتیجے ابھی تک اپنے مرحوم چچا کو ویسے ہی یاد کرتے ہیں جیسے اپنے باپ پنڈت مہاراج نارائن کو یاد کرتے ہوں گے۔ ان دونوں بھائیوں نے ہمدردی، فیاضی اور کنبہ پروری کی جو مثال قائم کی اس نے اس خاندان کو بڑھنے، پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کا ہنر سکھا دیا۔ آج چکبست برادران موجود نہیں لیکن ان کا فیضان ان کے خاندان میں جاری ہے اور کشمیری برہمنوں کی اس شاخ کی ترقی کا ضامن ہے۔

چکبست نے وکالت بھی کی اور روپیہ بھی خوب پیدا کیا۔ لیکن اس پیشے میں جتنے گہرے ہوتے گئے ان کی شعر و ادب کی تشنگی اور بڑھتی گئی۔ اتنے بڑے خاندان کی پرورش اور رشتے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے روپے کی ضرورت تھی اس لئے ترکِ دنیا میں کوئی مصلحت نہ تھی لیکن دنیا اپنی تمام رعنائیوں کے باوجود ان کی آخری منزل نہ بن سکی۔ ان کو پیشے کی مصروفیت میں بار بار اس کا خیال ہوتا کہ وہ اپنی اصل منزل سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے انتقال سے ایک یا دو روز پہلے بارہ بنکی کی عدالت ہی میں شیخ ممتاز حسین جونپوری سے جو اس وقت بارہ بنکی کی عدالت ہی میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے کہا تھا کہ آپ مجھے غالب کا ایک فارسی شعر لکھ دیجئے کہ میں ہر وقت اسے اپنی میز پر رکھوں اور پیشے کی مصروفیت کو اپنے ذوقِ علم و ادب پر غالب نہ آنے دوں۔ چکبست نے غالب کے اصل شعر میں تھوڑی سی ترمیم کر کے شیخ صاحب کے حوالے کیا۔ انھوں نے شعر اس طرح لکھا تھا ؎

دل اسبابِ سخن گم کردہ پابندِ غمِ ناں شد[1]
زراعت گاہِ دہقاں می شود چوں باغ ویراں شد

شیخ ممتاز حسین جونپوری اعلیٰ درجے کے خوشنویس ہیں۔ وہ اپنے عزیز دوست کی یہ فرمائش پوری نہ کر پائے تھے کہ چکبست کے انتقال کی خبر آئی۔ انھوں نے چکبست کے لکھے ہوئے شعر کو ایک حبیب کے طور پر محفوظ رکھا تھا لیکن وہ کہیں تلف ہو گیا۔ اگر ہوتا تو ادب اردو کے طالب علم کے لئے تبرک کے طور پر کام آتا۔

عدالت کی تازہ مصروفیت میں بھی چکبست کا ذوقِ سخن دلچسپی کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتا تھا۔ وہ جب کام کرتے کرتے تھک جاتے تو بعض سخن فہم اور سخن گو اہلکاروں کے پاس جا بیٹھتے۔ مصرعے پر مصرعے دیے جاتے۔ گرہیں لگائی جاتیں۔ کچھ کام کی باتیں ہوتیں۔ کچھ لطیفے ہوتے اور فضا میں ان کی بدولت ایک ہلکی سی شعریت پیدا ہو جاتی۔ اس زمانے میں عدالت خفیفہ میں ایک منصرم تھے۔ ان کا نام پیارے لال تھا۔ وہ چکبست کے شاعرانہ کمال کے قائل نہ تھے لیکن

---

[1] غالب کا اصل شعر غالباً یوں ہے ؎

دل اسبابِ طرب گم کردہ پابندِ غمِ ناں شد   زراعت گاہِ دہقاں می شود چوں باغ ویراں شد

چکبست کو ایک مصرعہ بھیجا اور فرمائش کی کہ اس پر گرہ لگائیں۔ مصرعہ یہ تھا ؎

"رنگ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں"

چکبست نے مسکرا کر گرہ کا مصرعہ لگا کر شعر لکھ دیا ؎

خلیفہ ہو راستے میں اُڑ کے پہنچے
رنگ گل سے جن کے پر باندھتے ہیں

پیارے لال جی صاحب پر جو کچھ بھی اثر ہوا ہو لیکن پیارا لال اس برجستہ گرہ سے بہت محظوظ ہوا۔ ان کی یہی خوش مزاجی تھی جس نے ان کو عدالتوں کی روکھی پھیکی فضا میں بھی ہر دلعزیز بنا دیا تھا اور جب ان کی ناگہانی وفات کی خبر آئی تو وہ بھی رو دیے جن کی آنکھیں برسوں سے مسلیں دیکھنے کے سوا رونا اور ہنسنا سب کچھ بھول چکی تھیں۔

شعر و ادب کا قافلہ اب بہت آگے بڑھ چکا ہے لیکن راہ میں اس نے جو مزار دیکھے ہیں وہ اسے ہمیشہ یاد آئیں گے۔ زندگی کی راہگزر پر مزار اور ویران کبھی نہ ہوں گے کیونکہ ہماری محبتوں کی یہ غیرفانی یادگاریں ہماری رہنمائی کریں گی۔ آج چکبست ہم میں نہیں ہیں لیکن جو تصنیفات انہوں نے آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑے ہیں وہ ہماری ادبی اور قومی زندگی کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔

مولانا احسن مارہروی مرحوم

جمیل زبیری

شہروں کی ہماہمی سے دور یوپی کے ایک چھوٹے سے ضلع ایٹہ میں ایک چھوٹا سا قصبہ مارہرہ ہے جسے بہت سے لوگ مارہرہ شریف کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ عجیب مردم خیز علاقہ ہے۔ مولانا احسن مرحوم جن کا اصل نام سید شاہ علی احسن تھا اسی چھوٹے سے قصبے کے رہنے والے تھے۔ میں نے انہیں پہلی بار اس وقت دیکھا جب میری عمر مشکل سے آٹھ دس سال ہوگی۔ مجھے خوب یاد ہے رمضان کا مہینہ تھا۔ میں اپنے نانا (صدیق حسن صدیقی جو خود بھی شاعر ہیں اور مولانا احسن کے شاگرد ہیں) کے ہمراہ مولانا کے گھر پہنچا۔ پرانی وضع کے ایک بڑے پھاٹک سے ہم لوگ مولانا کی بیرونی حویلی میں داخل ہوئے ہمارے سیدھے ہاتھ پر ایک دالان تھا جس میں چند کرسیاں پڑی تھیں۔ سامنے ایک چبوترہ تھا جس پر ایک لمبی سی چوکی بچھی تھی جس پر نہایت صاف ستھری ایک چادر بچھی تھی۔ چوکی کے اطراف چھوٹے مونڈھے اور کرسیاں رکھی تھیں جن پر چند اشخاص خاموش بیٹھے تھے چوکی کے سرے پر بڑے پھاٹک کی طرف منہ کئے ایک نہایت وجیہ انسان ایک مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ میرے نانا نے داخل ہوتے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ یہی مولانا احسن تھے۔ میں نے قریب پہنچ کر انہیں سلام کیا اور دیر تک ان کی طرف دیکھتا رہا۔ میں ان کی شخصیت سے کچھ ایسا مرعوب اور اس وقت کے ماحول سے کچھ ایسا متاثر ہوا کہ گو اس واقعہ کو آج تقریباً ۲۰، ۲۱ سال گزر چکے ہیں مگر ان کے جسم کا وہ نفیس کرتہ، وہ ہلکے سبز رنگ کا تہبند اور ان کے سیدھے ہاتھ پر سلگتا ہوا حقہ اور مولانا کا ہلکا پھلکا کر جلدی جلدی بولنا مجھے اس طرح یاد ہے جیسے آج کی بات ہو۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔ نانا کو قریب ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مجھے قریب بلا کر پیٹھ ٹھونکی اور حلیم اللہ (مولانا کا دیرینہ ملازم تھا) کو آواز دی "حلیم اللہ حلیم اللہ ہمارے بیٹھنے کے لئے ایک مونڈھا ہمارے قریب رکھو" اور مجھے بالکل اپنے پاس بٹھایا۔ اس اثنا میں کچھ اور لوگ بھی آگئے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑی پر تکلف دعوت ہے۔ افطار کا وقت قریب تھا چوکی پر طرح طرح کی چیزیں رکھی تھیں جن میں پکوان، مٹھائیاں، پھل، کھجوریں اور دہی بڑے غرض کہ ہر ایک چیز خاطر خواہ موجود تھیں اور لوگ موذن کی صدا کے منتظر تھے۔ ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتے اور مزاج پرسی کرنے کے بعد بیٹھنے کا اشارہ کرتے۔ میں خاموش بیٹھا کبھی ان کی طرف کبھی دہی بڑوں کی طرف اور کبھی دیگر افراد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک دفعہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور ذرا سا جھک کر پوچھا "کیوں بیٹے تمہارا روزہ ہے؟" میں خاموش رہا۔ گو موجودہ اشخاص میں سے کچھ کو معلوم تھا کہ میں گھر سے منہ ہاتھ صاف کرکے اور چہرہ پر روزے کے آثار پیدا کرکے چلا تھا مگر میری کم عمری چالاکی کو نہ چھپا سکی۔ وہ فوراً ہی محسوس کر کہنے لگے "ایک ڈاڑھ کا ہوگا" پھر اور دوسروں سے گفتگو ہونے لگے۔ روزہ کشائی کے بعد جماعت

کھڑی ہوئی۔ نماز خود انھوں نے ہی پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہو کر آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔ حقہ پلنگ کے لگا ہوا پان دیا۔ وہ کھا کر حقہ قریب کر لیا اور پھر گفتگو شروع ہوئی۔ مجھے ان کی گفتگو سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی کیونکہ اول تو وہ بہت جلدی جلدی بولتے تھے دوسرے ان کی گفتگو میری چھوٹی سی سمجھ سے بالاتر تھی۔ میں حیران و پریشان اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور جب نانا نے میری آنکھوں میں نیند کے آثار دیکھے تو مولانا سے رخصت لے کر چلے آئے۔ چلتے وقت مرحوم نے فرمایا "صدیق کل ضرور آنا۔"

اور یہ سلسلہ پورے مہینے جاری رہا۔ میں نانا کے ہمراہ دو تین مرتبہ اور گیا اور اس محفل کو ہمیشہ اسی طرح پایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا مرحوم علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور تقریباً ہر سال پورے ماہ رمضان کی چھٹی لے کر مارہرہ آ جاتے تھے۔ جہاں ان کی تفریح طبع اور عبادت کا بہت کچھ سامان موجود تھا۔ گھر کے نزدیک ہی ایک بڑی مسجد تھی جس میں وہ تراویح پڑھتے تھے اور چونکہ خود بھی حافظ تھے اس لئے کبھی کبھی خود بھی کلام مجید سناتے تھے۔ ستائیسویں روزے کو بڑی دھوم سے شبینہ کرتے تھے جس میں جلیبیاں بانٹی جاتی تھیں۔ شبینے کے سلسلے میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آگیا جسے میں نے اپنے والد کی زبانی سنا تھا۔ جس محلے میں ہمارا مکان تھا اس کی مسجد کے ایک امام تھے جن کا نام حافظ عبد الحمید تھا مگر لوگ انھیں گلاوٹھی والے حافظ جی کہا کرتے تھے۔ وہ بڑے پُر مذاق اور زندہ دل انسان تھے۔ ایک رات اپنی مسجد میں تراویح ختم کر کے میرے والد سے کہا: "چلو، بستی (بستی اس محلے کا نام ہے جہاں مولانا رہتے تھے) میں شبینہ ہے وہاں چلتے ہیں۔" بستی کی مسجد میں مولانا احسن جنھیں مارہرہ کے لوگ شاہ میاں کے نام سے یاد کرتے تھے تراویح میں موجود تھے اور اگلی صف میں سرے پر کھڑے تھے۔ حافظ جی جماعت کے دوران میں ہی ان کے قریب پہنچے اور کان کے برابر منہ لے جا کر کہنے لگے: "اس کے بعد میں سنا دوں گا۔" مولانا کو نماز میں غصہ آگیا اور نیت توڑ کر کہنے لگے: "لاحول ولا قوۃ، لاحول ولا قوۃ۔ نماز خراب کر دی۔" اور پھر نیت باندھ لی۔ حافظ جی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور اپنے گھر پہنچ کر دم لیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ احسن صاحب کا آدمی حافظ جی کو بلانے آیا ہے۔ انھوں نے کہلوایا تھا: "آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ آکر قرآن ختم کرا دیجئے۔" اور حافظ صاحب کو جانا پڑا۔ یہ اعلیٰ اخلاق تھا جو مرحوم کی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی اور یہ چیز انھیں اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملی تھی۔ مولانا مرحوم کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا۔ سید شاہ برکت اللہ جو مولانا کے جد امجد تھے، سترھویں صدی کے آخر یا اٹھارویں صدی کے شروع میں بلگرام سے مارہرہ شریف لائے تھے۔ بلگرام خود وہ جگہ ہے جہاں کا ہر فرد بقول غالب جوہر قابل کہے جانے کا مستحق ہے۔ مولانا کے بزرگوں میں حضرت صاحب عالم اور حضرت شاہ عالم بڑے عالم بزرگ گزرے ہیں۔ مارہرہ کی شہرت انھیں بزرگوں کی وجہ سے ہے اور مارہرہ، مارہرہ شریف کہلاتا ہے۔ یہیں تمام بزرگوں کے مزار ہیں۔

مولانا مرحوم سادات مارہرہ میں سے وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے انگریزی تعلیم کی ضرورت کو محسوس کیا اور جدید خیالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گو وہ خود انگریزی تعلیم حاصل نہ کر سکے مگر قدیم و جدید کی کشمکش میں انھوں نے ایک توازن قائم رکھنے کی کوشش کی اور اپنی ذاتی صلاحیت اور ذوق کی بدولت دونوں کے درمیان ایک معتدل راہ تلاش کرنے میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ان کے لئے یہ نہایت دشوار کام تھا کیونکہ بچپن سے ان کی تعلیم بالکل پرانی وضع پر ہوئی تھی۔ مولانا نے خود اپنی ایک نظم میں اپنے بچپن کا ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اس زمانے کے علمی رواج کا اندازہ ہوتا ہے۔

علی گڑھ کالج قائم ہونے کے بعد جگہ جگہ انگریزی اسکول کھلنا شروع ہوئے اور اسی کے زیر اثر مارہرہ میں بھی مولانا کے گھر کے نزدیک ہی ایک اسکول کھلا۔ حصول علم کا شوق تو تھا ہی۔ اس اسکول میں پڑھنا شروع کر دیا۔ ایک ترکی ٹوپی اور ایک انگریزی پرائمر بھی خرید لیا۔ شدہ شدہ جب ان کے والد بزرگوار کو اطلاع پہنچی کہ صاحبزادے نے انگریزی اسکول میں جانا شروع کر دیا ہے تو بہت ناراض ہوئے۔ اور نہ صرف انھیں مارا پیٹا بلکہ کتاب اور ٹوپی بھی چھین لی اور ہدایت کی کہ آئندہ ایسی حرکت نہ ہو۔ اس واقعہ کے چالیس سال بعد [illegible] میں مولانا نے اس واقعہ کو اس طرح نظم کیا۔

"سرسید کا فیض جاری"

سن [illegible] عیسوی گزرے تھے چالیس سال ✦ ✦ ✦ اس زمانے کے رواج علم کا کہتا ہوں حال

میرا مسکن تھا جو پہلے دو صدی سے خانقاہ
زیب مسند وہ تھے اس میں عارفان دیں پناہ
اس احاطے ہی میں اک اسکول انگریزی کھلا
وہ دیں لینے کے لئے جس کی طرف عالم ڈھلا
میں کہ جس کی زندگی کا ہو رہا تھا عنفوان
اس نئی تعلیم کی خواہش میں دوڑا بے لگاں
تھا نہ کوئی جز مالی امداد و سند کے لئے
رنج جاتا تھا کتابیں لے کے رشتہ جوڑ کے لئے
آتے جاتے دیکھنے والوں کی پڑتی تھی نظر
رفتہ رفتہ والد ماجد کو بھی پہنچی خبر
پھر ہے اس شوق تعلیم پہ بہت برہم ہوئے
اور بتصریح ارشادات یہ برہم ہوئے
"تجھکو انگریزی نہ پڑھنے دیںگے ہم او روسیاہ
مار ڈالیں گے جو اب آئی ادھر تیری نگاہ
ہے غضب جس گھر میں ورد شغل[1] و تسبیح رہے
اس میں انگریزی کی یہ گٹ پٹ رہے یہ ہرج ہے
سیکھتا ہے ان کا فن جو بولتے ہیں ڈیم[2] فول[3]
تجھکو معقول پڑھنا چاہیئے قال اقول"

مجھکو ان احکام کی تعمیل کرتے ہی بنی
زندہ رہ کر عالم فانی میں مرتے ہی بنی

اس نظم کے آخری مصرعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں انگریزی تعلیم حاصل نہ کر سکنے کا بڑا احساس رہا اور نئے اور پرانے رجحانات کے درمیان ایک میانہ روی قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا اندازہ ان کے اس قسم کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔

یہ شوق اضطراب تماشا سا دیکھنا
لکھتے جواب خط کا منگایا ہے تار پر

اس میانہ روی کا ذکر انھوں نے ایک مرتبہ اپنے رسالے "فصیح الملک" میں اس طرح کیا ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ ہر معاملے میں افراط و تفریط بری ہوتی ہے۔ آجکل کثرت سے نئی و پرانی دونوں شاعری اس طرح کی جاتی ہیں جن میں کوئی خاص اور تازہ لطف نہیں پایا جاتا۔ الا ماشاء اللہ ہم نئی شاعری کے مخالف نہیں ہیں .... فصیح الملک میں یہ کوشش کی جائے گی کہ ایشیائی پرانی طرز کے سوائے نئے خیالوں کی ایسی نظمیں شائع ہوں جو پرانے اور نئے دونوں اہل مذاق کی دلچسپی کے لئے موزوں ہو سکیں اور اس کے واسطے یہ معیار ہے کہ خیال نیا اور تخیل پر مگر طرز بیان، تشبیہیں اور تمثیلیں وہی ہوں جن کی ایشیائی طبیعتیں عادی ہیں۔"

انھوں نے میانہ روی قائم رکھنے کی برابر کوشش کی۔ انہیں اپنے خاندانی وقار اور پرانی روایات کا بڑا احساس تھا اور اس کے رکھ رکھاؤ میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ ہر ملنے والے سے بڑی محبت اور تواضع سے ملتے تھے اور بہت جلد ہی بے تکلف ہو جاتے تھے۔ مگر کسی قسم کی بیہودگی یا بد مذاقی روا نہیں رکھتے تھے۔ پرانے اخلاق کا مکمل نمونہ تھے۔ اگر کوئی دوسرا ان کے معیار سے گری ہوئی بات کر بیٹھتا تو ان کے چہرے سے ناگواری کا احساس ہونے لگتا تھا اور بسا اوقات صاف دلی سے اس کا اظہار کر دیتے تھے۔

---

[1] ورد، شغل و تسبیح کے قسم کی دعائیں ہیں۔

[2] مولانا کو اس نظم میں انگریزی کا یہ لفظ نہیں استعمال کرنا چاہیے تھا۔

[3] مولانا کے قلم سے اس لفظ کا نکل جانا سخت حیرت کی بات ہے۔

رشید احمد صدیقی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں مولانا کا ایک واقعہ اس طرح لکھا ہے۔

”مسوری جانے والوں کو معلوم ہے کہ وہاں ”فصل“ میں کس کس قسم کے وحوش و طیور کہاں کہاں سے کھچ کر آتے ہیں اور صید و صیاد، دانہ و دام، تماشا و تماشائی کیسی کیسی نیرنگیوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ایک مشاعرہ میں مولانا بھی شریک تھے۔ سامنے کی صف اول میں وہ سب کچھ تھا جس کی ترجمانی ایک مصرع میں ہوتی ہے جو میرے بچپن میں لکھنؤ میں بہت مقبول تھا۔ اس کا ایک مصرع مجھے اب تک یاد ہے۔

کہاں لیجاؤں دل دونوں جہاں میں اس کی مشکل ہے

مولانا کی باری آئی۔ پچھلے شعروں کی طرح سیدھے سادے لب و لہجہ میں یہ رباعی پڑھی

سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں
بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں
فرمائش معاف نوجوانان مستی !
بڑھاپے میں نیا ساز کہاں سے لاؤں

سننے والے اچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا اس کے بعد طرح میں غزل پڑھنی شروع کی جس کے ایک شعر پر جو صف اول کو مدنظر رکھ کر پڑھا گیا، مجمع سے وہ نعرۂ تحسین و تہنیت بلند ہوا کہ دیر تک کان پڑی آواز نہیں سنائی دی

بٹتی ہے امیروں میں ترے حسن کی دولت
یہ مصرف خیرات سمجھ میں نہیں آتا۔“[1]

مولانا کی کلاس میں اکثر طلباء شوخیاں کر بیٹھتے تھے اور مولانا برہم ہو جاتے تھے اور کلاس سے چلے جاتے تھے۔ ایک دفعہ رشید صاحب صدیقی سے جو شعبۂ اردو کے صدر تھے کہنے لگے[2]۔ ”رشید صاحب۔ طلباء پڑھنے نہیں آتے۔ وقت گزاری اور تفنن طبع کے لئے آتے ہیں۔ یہ دنیا میں جو چاہے کریں علم تو ان کو آنے کا نہیں۔“ مولانا کے پڑھانے کا طریقہ پرانا تھا وہ بالکل معلم بن کر پڑھاتے تھے اور طالب علموں سے اسی قسم کے آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم نے استادوں کے ساتھ اپنی طالب علمی کے زمانے میں برتے تھے۔

مولانا احسن مرحوم جس طرح خوش پوشاک تھے اسی طرح خوش خوراک بھی تھے اور اچھے کھانوں کا بہت شوق تھا۔ اسی طرح انھیں مٹھائی سے بھی عشق تھا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانہ تھا اور اسی شوق نے انھیں ذیابیطس کے مرض میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آموں سے بھی اسی طرح رغبت تھی۔ گو آم کھانے سے ان کے سارے جسم پر پھنسیاں نکل آتی تھیں مگر فصل بھر وہ ہر وقت کھانے کے بعد آموں کا ہونا لازمی تھا۔

ایک مرتبہ مین پوری میں مشاعرہ تھا۔ مارہرہ سے پوری ایک لاری بھر کر لوگ مشاعرے کی شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔ مولانا بھی ہم سفر تھے۔ راستے میں تکیہ پور پر لاری ٹھہری۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا مولانا نے کسی سے کہا ”جاؤ کچھ کھانا لے آؤ“۔ جو شخص کھانا لینے گیا وہ صرف اپنے اور مولانا کے واسطے کھانا لے کر واپس آگیا۔ مولانا نے پھر دوسرے آدمی کو بھیجا۔ وہ صرف اپنے واسطے کچھ لے کر واپس آگیا۔ مولانا کو غصہ آگیا۔ گھبرا کر لاحول پڑھی اور کہنے لگے ”تکیہ پور

---

[1] اس مشاعرے میں ساغر نظامی بھی موجود تھے۔

[2] یہ واقعہ بھی رشید احمد صدیقی صاحب نے اپنے اسی مضمون میں لکھا ہے جس کا اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

"اگر آپ شکار پوری ہو گئے، میں خود جاتا ہوں" اور روانہ ہو گئے تھوڑی دیر میں پورے اٹھارہ آدمیوں کے لئے کھانا لے کر آئے تھے اور یہ بھول گئے کہ تین شخصوں کا کھانا پہلے بھی آ چکا ہے۔ سب دل ہی دل میں مسکرا کر چپ ہو گئے کہ مولوی کی بات تھی جو ہوا کا جلد خود بھی ہنس پڑے ملک۔

مولانا کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ۱۸ سال کی عمر میں داغ کے شاگرد ہوئے اور اپنی غزلیں برابر اصلاح کے لئے بھیجتے۔ [illegible] میں اپنا پہلا مجموعہ "ریاض سخن" کے نام سے شائع کیا اور اس کو نواب صاحب ٹونک کی خدمت میں پیش کر کے داد تحسین حاصل کی۔ نواب صاحب نے بعد میں اس کا نام بدل کر "ریاض سخن" کی بجائے "ریاض جمیل" رکھ دیا۔

اس بات کو دنیا جانتی ہے کہ احسن مرحوم نے جو وقت اپنے استاد کے ساتھ حیدر آباد دکن میں گزارا وہ ان کی زندگی کا بہترین دور ہے۔ ان کی شاعری پر داغ کا کس قدر اثر ہے اس کا اندازہ حسب ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے ؎

کسی کو بھیج کر خط ہائے کیا یہ حجاب آیا
کہ ہر اک پوچھتا ہے نامہ بر آیا، جواب آیا
مجھ کو اے پیمان شکن پاس وفا کچھ بھی نہیں
بارہا تو نے کہا اب جو کیا کچھ بھی نہیں
کوئی دیکھے یہ تماشا کہ تکلف کب تک
ہو چکا پردہ بس اب آؤ ادھر دیکھیں سب
لے کے جو جنازہ تو مجھے دفن ہی کر دو
اٹھے ہی چلیں چار قدم ایک قدم اور
تھوڑی ہوئی جنبش ہی تو گھڑی بھر ہیں ساتھیں
کہتے ہیں بیمار سے باقی کوئی دم اور

اس فرق کو مولانا نے خود ہی ایک شعر میں باندھا ہے ؎

طرز ملتی ہی نہیں داغ کے شاگردوں کی
احسن اوروں سے الگ ان کی زباں ہوتی ہے

داغ کا رنگ نہ صرف ان کے شاگردوں تک محدود رہا بلکہ مولانا احسن کے شاگردوں تک نظر آتا ہے۔ اپنے استاد کی طرح مولانا کے بھی شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع تھا اور سب میں قریب قریب وہی رنگ پایا جاتا ہے۔

؎ گھر گھر مرا چرچا ہے در در مری رسوائی — اچھا ہے کوئی وحشی کوئی کہے سودائی (صدیقی)
؎ آتا نہیں یقین کہ کیا ہو گئے تم ہیں — اچھا ذرا دکھاؤ تو چاہت جتا کے (اختر)
؎ سوچ کیا ہے قتل میں [illegible] خنجر بھی — تم اگر ہو گے تو مجھے [illegible] (مشتاق)
؎ استاد مجھ سے ہجر میں الزام زندگی — اچھا ہی ہوا کہ میں اچھا نہ ہو سکا! (راز)

احسن کو داغ کی صحبت میں برسوں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ داغ کے انتقال کے بعد ان کی سوانح حیات کو ترتیب دینے کا کام انھوں نے اپنے ذمہ لیا اور اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ استاد کے نام اور کلام کو بچانے میں صرف کر دیا۔ داغ کی شاعری سے جس طرح وہ واقف تھے کسی دوسرے شخص کو ہونا ممکن ہے۔ داغ پر گو شاعر تھے۔ ان کا پورا کلام چار ضخیم دیوانوں میں مرتب ہو سکا۔ اس بات کی ضرورت تھی کہ اس کلام سے ایک انتخاب کیا جائے اور یہ کام بھی مولانا

احسن نے ہی کیا۔ داغ کی زندگی میں احسن ہر چیز میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے اکثر زیادہ تر اصلاحات حضرت احسن کے ہی ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ اکثر خطوط کا جواب بھی آپ ہی دیا کرتے تھے۔ داغ کو خود بھی اس چیز کا اعتراف تھا اور انھوں نے احسن مرحوم کو اپنے ایک شعر میں اس طرح یاد کیا ہے ؎

سید احسن جو میرے دوست بھی شاگرد بھی ہیں
جلوہ اللہ نے دی فکر رسا، طبع رسا

مولانا زود گو شاعر تھے اور شاعری سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ لیکن ان کی طبیعت میں آمد کم اور آورد زیادہ تھی اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر عالم میں شعر کہہ سکتے تھے جو وہ فکر کرتے تھے مگر ان کی فکر پریشان حال شاعروں کی طرح نہ تھی۔ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہتے، علمی و ادبی مسائل پر گفتگو کرتے رہتے مگر فکر شعر سے بھی خالی نہیں رہتے تھے۔ جس زمانے میں وہ "شاہکار عشق"[1] مثنوی تیار کر رہے تھے ان کا یہ عالم تھا کہ یونیورسٹی کی شعبۂ اردو میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہر طرح کے طلباء اور دوستوں سے گفتگو بھی جاری ہے۔ علمی بحثوں میں بھی حصہ لے رہے ہیں۔ اور مثنوی بھی لکھی جا رہی ہے۔ اس مثنوی کے لکھنے میں مشکل سے تین یا چار دن صرف ہوئے ہوں گے۔

وہ اپنے اوقات کے بہت پابند تھے۔ دراصل اس پابندی اوقات میں ان کے پرانے ملازم علیم اللہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علیم اللہ خود گھڑی کی سوئی ہے۔ علیم اللہ سے مولانا کو بڑا لگاؤ تھا۔ اور آخر میں انھوں نے اس کی بہن سے نکاح بھی کر لیا تھا جس سے ان کے ایک صاحبزادے[2] بھی تولد ہوئے جو بقید حیات ہیں مگر چونکہ انھوں نے اپنے خاندانی وقار کو قائم نہیں رکھا اس لئے احسن مرحوم ان سے ہمیشہ ناراض رہتے تھے۔

۱۹۳۳ء میں رسالہ "ریاست" نے مختلف مشہور شاعروں سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے روزانہ مشاغل کے بارے میں کچھ تحریر کریں۔ اس درخواست پر بہت سے شاعروں نے اپنے مشاغل کو نظم کر کے بھیجا تھا۔ مولانا احسن نے بھی اسی درخواست پر حسب ذیل غزل لکھی تھی ؎

کیوں پوچھ رہا ہے کوئی احسن کے مشاغل — کیا حسن عمل وقت ضعیفاں میں ملے گا
اوقات میں بے ضابطہ حالات میں بے ربط — ہر وقت وہ فکر غم دوراں میں ملے گا
اس پر بھی اگر کسی کو ہو ٹوہ تو سن لے — آوارہ وہ دل کے بیاباں میں ملے گا
تا صبح کو ہوگا وہ مصلے پہ نمایاں — یا خلوت کسی گوشۂ پنہاں میں ملے گا
جب تک نہ بجے دوپہر اس وقت تک اس کو — ڈھونڈو گے تو وہ اطفال دبستاں میں ملے گا
دیکھو گے اگر دو بجے سے چار بجے تک — سویا ہوا، بیٹھا ہوا، ایواں میں ملے گا
پھر چار بجے شام سے چھ سات بجے تک — مشغول ملاقات عزیزاں میں ملے گا
ہوگی پس مغرب جو تلاش اس کی تو اکثر — پڑھتا ہوا کچھ بزم شبستاں میں ملے گا

---

[1] دہلی کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوئے تھے جو نواب حیدرآباد دکن کے چھوٹے بیٹے کی غیر متوقع وفات پر بڑے جوش جلی سے لکھے تھے اور جن میں کچھ مستورات نواب حیدرآباد کے بھی شامل تھے۔ مولانا نے انہی مضامین کو مثنوی کے پیرائے میں منظوم کیا ہے۔

[2] ان کا نام رفیق ہے۔

ہوگا انھیں اوقات میں جو وقت میسر — سرگرم عمل شعر کے میداں میں ملے گا
جب آ کے بکھر زلف شب انگیز تو اس کی — پھوٹے سکوں، خواب پریشاں میں ملے گا

القصہ جو ہے آج یہاں محو تکلم!
لب بستہ وہ کل شہر خموشاں میں ملے گا

ناظرین کو یاد ہوگا کہ اسی ردیف قافیے میں حضرت جوش ملیح آبادی نے بھی غزل کہی تھی جو مقبول عام ہے۔

مولانا کو مشاعروں کا بڑا شوق تھا۔ بڑے تکلف سے ان کا اہتمام کرتے تھے اور شعراء مہمانوں کی خاطر مدارات اس طرح کرتے تھے جیسے خود مولانا ہی کے ہاں کوئی تقریب ہو رہی ہے۔ مشاعروں میں اپنی غزلیں نہایت وضاحت سے زور دے دے کر پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ مارہرہ کے چھوٹے سے اسکول میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ مولانا مرحوم اس کی صدارت فرما رہے تھے۔ حاضرین میں زیادہ مجمع اسکول کے طلباء کا تھا۔ میں بھی اسی اسکول میں پڑھتا تھا اور مشاعرے میں موجود تھا۔ شاعر کی حیثیت سے شریک ہونے کے شوق میں میں نے بھی اپنے ماما سے غزل لکھوا کر پڑھی تھی۔ جب لوگ اپنی اپنی غزلیں پڑھ چکے تو حضرت احسن نے اپنی غزل سنائی جو اسی اسکول کے لڑکوں کے لئے لکھی گئی تھی۔ لڑکے چیخ چیخ کر انھیں داد دے رہے تھے۔ مولانا جوش میں آ کر مسند سے آدھے کھڑے ہو ہو جاتے تھے۔ اس غزل کا ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے ؎

حکام بلائیں تو اندھیرے ہی سے اٹھ جائیں
اللہ بلائے تو سویرا نہیں ہوتا!

لڑکوں کی شوخی بہت بڑھ گئی اور وہ ناراض ہو کر مسند سے کھڑے ہو گئے اور مشاعرہ درہم برہم ہو گیا۔ وہ کہا کرتے تھے "اس طرح کے مشاعروں میں شرکت کرنے کے بعد میں عہد کر لیتا ہوں کہ اب آئندہ کبھی مشاعرے میں شرکت نہیں کروں گا مگر میرا یہ عہد بالکل اس حاملہ عورت کا سا ہوتا ہے جو دردِ زہ کی تکلیف میں مبتلا ہو کر ہمیشہ عہد کرتی ہے کہ آئندہ پھر بچہ نہیں جنے گی مگر تکلیف رفع ہونے کے بعد اپنے عہد کو بالکل بھول جاتی ہے۔"

احسن مرحوم کا ادبی مذاق ستھرا تھا اور وہ فن شعر گوئی سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ جس پر کثرت مطالعہ سے برابر جلا ہوتی رہتی تھی۔ کتابوں سے انھیں عشق تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنی کتابیں دوسروں کو عاریتاً دینے میں بھی تکلف کرتے تھے۔ کتابیں جمع کرنے اور مطالعہ کرنے میں انھیں خاص لذت حاصل ہوتی تھی۔ قدیم اور جدید مصنفین اور مؤلفین کی بیشتر تصانیف مولانا کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھیں۔ مولانا کو اگر پتہ چلتا کہ شعر و ادب اور تاریخ زبان پر کہیں کوئی کتاب نئی چھپی ہے تو انھیں اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک اس کا مطالعہ نہ کر لیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادگان نے وصیت کے مطابق ان کی تمام کتابیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانے کو دے دیں۔

مولانا نہ صرف شاعر ہی تھے بلکہ نثر میں بھی ان کی خدمات کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ اسکول اور کالج کے بیسیوں انتخاب مولانا کے قلم کے مرہون منت ہیں۔ نثر میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ کلیات ولی کا دیباچہ (جس کی ضخامت ۴۰۱ صفحات ہے) تاریخ نثر اردو موسوم بہ منثورات اور منتخب داغ کا مقدمہ ہے۔

جناب بشیر علی صاحب صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں کلیات کے بارے میں لکھا ہے کہ "تحقیق کا راستہ اتنا دشوار گذار ہے کہ یہاں چالاک سے چالاک رہرو ٹھوکر کھا جاتا ہے اور مولانا سے بھی کلیات مرتب کرنے میں کئی جگہ لغزشیں سرزد ہوئیں مگر ان کے کارنامے پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

---

[1] اس اسکول کا نام مدرسہ اسلامیہ اسکول تھا۔

علاوہ ازیں احسن مرحوم نے ایک اور دلچسپ سلسلہ " داغ و احسن " کے نام سے شروع کیا تھا مگر اس کام کی ابتدا بہت دیر سے ہوئی اور اسی وجہ سے یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ اسی طرح مولانا نے ایک لغت کی ترتیب بھی شروع کی تھی جس کا نام " فصیح اللغات " رکھا تھا افسوس کہ وہ بھی نامکمل رہ گئی مولانا نے اپنے علمی خیالات کو بھی دفتر کتابی صورت میں اپنی وفات سے تقریباً دو سال قبل شائع کیا تھا۔ اس کا نام " مکالمۂ علم " ہے اور اس سے مختلف علوم کے اور بھی تحریریں ہو سکتی ہیں۔ مولانا نے تھوڑے سے عرصے اردو میں اکثر مصری مرحوم۔ ایم اے کے ساتھ مخطوطات جاویدہ کے ادارے میں بھی کام کیا اور مخطوطات جاوید کی بھی جلد کی ترتیب و تدوین میں بھی شامل تھے۔

احسن مرحوم صاحب طرز نہ تھے مگر ان کی تحریر بھی ہوئی، رواں اور شگفتہ ہوتی تھی وہ عربی و فارسی کے دقیق الفاظ استعمال کر کے پڑھنے والوں پر خواہ مخواہ اپنی قابلیت کا رعب نہ ڈالنا چاہتے تھے۔ ملاحظہ ہو۔

"مغربی شاعری کے حامی جو ہماری پرانی شاعری کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر کند چھری سے ذبح کر رہے ہیں ان کا عجیب دماغ بہت بیمار ہیں۔ اور جہاں کہیں اس قسم کی بحث چھڑتی ہے تو وہ زلف و بلبل کی داستان یا رشتے کے ادوار دہرانے کے شاکی ہوتے ہیں یا مکروہ ہی کا فرقی تشبیہوں پر منہ آتے ہیں"

" مولانا عبد الحق کی طرح احسن مرحوم نے بھی اپنی نگارشات میں ہندی کے میٹھے میٹھے الفاظ بڑی خوبی سے استعمال کیے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ان کا املا بھی مثال ہے جس پر انھوں نے ہمیشہ خاص توجہ دی۔

مرحوم کی مالی حالت کچھ بہت زیادہ اچھی نہیں تھی اور بسا اوقات انھیں مجبوراً اپنی تصانیف کو فروخت کرنا پڑا۔

جولائی ۱۹۴۰ء میں کل ہند اردو کانفرنس میں بریلی تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی پر ان کی پیٹھ پر چھپا ہوا پھوڑا نکلا جس نے آگے چل کر کاربنکل کی صورت اختیار کر لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ علی گڑھ سے مارہرہ منتقل ہو چکے تھے۔ بغرض علاج اپنے بیٹے کے پاس علی گڑھ گئے۔ جب وہاں کچھ افاقہ نہ ہوا تو اپنے دوسرے بیٹے کے پاس جو میرٹھ میں ڈاکٹر تھے بغرض علاج پہنچے مگر ان کی ساری پیٹھ میں ایک پھوڑا پھیل گیا تھا جس کا اچھا ہونا ناممکن تھا۔ وفات سے ایک روز قبل سے بے ہوشی کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ آخر میں گردوں نے اپنا فعل بند کر دیا تھا۔ مرنے سے ذرا دیر پہلے آنکھیں کھولیں اور اسی بے ہوشی کے عالم میں پوچھا " کس پر مضمون لکھا جا رہا ہے؟ " اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کی نعش مارہرہ لائی گئی اور انھیں ان کے بزرگوں کی جاے خانقاہی " درگاہ " میں اتار دیا گیا۔

گو رہا ناخوش بہت آج اس کو موت نے
آہ جو احسن جہاں میں یادگار داغ تھا

دیا نرائن نگم

ثاقب کان پوری

جس طرح مسلمانوں کی تعلیم کا سرسید کے بغیر اور اردو کے تحفظ کا کوئی تصور عبدالحق کے علاوہ کے نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اردو کی ادبی صحافت کا تصور منشی دیا نرائن کے بغیر ممکن ہی نہیں، عہد حاضر میں حسرت موہانی مرحوم اور منشی دیا نرائن نگم نے کان پور کی تجارتی فضا کو بہت کچھ ادبی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ دیا نرائن نگم کی شخصیت نہ جانے کتنے ہی ادیبوں کے لئے کعبۂ مقصود تھی وہ یہاں طواف کرنے آئے یا پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے، درگا سہائے سرورؔ، پیارے لال شاکر، منشی پریم چند، نوبت رائے نظر، احسن جیبی ان سب سے کان پور کو دیا نرائن نگم کی وجہ سے قربت رہی۔

منشی دیا نرائن نگم سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۲۲ء میں ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب میرے عزیز و محترم دوست جگر مراد آبادی کی شاعری اور خوش ذوقی کا ادبی حلقوں میں نیا نیا چرچا ہوا تھا، ان کی رندی و سرمستی نے ادبی حلقوں کو جھنجھوڑ دیا تھا، خانقاہوں، مدرسوں، ندوۃ العلماء اور سید سلیمان ندوی کے دل و دماغ میں بھی اپنا گھر بنا لیا تھا۔ جگر صاحب منشی دیا نرائن نگم کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے انہوں نے جناب کرشن سہائے صاحب وحشی کان پوری، استاذی مولانا احسن جیبی مرحوم، مولانا محمد حسین محوی اور ان کے وسیلے سے مجھے بھی بلا لیا کہ اس نے شاعر بے بدل و جگر صاحب سے بھی ملنے کا بڑا اشتیاق تھا اور منشی صاحب کو بھی دیکھنے کی تمنا تھی لیکن کہ وہ زمانہ میری ادبی زندگی کا ابتدائی زمانہ تھا، یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ نیا ادیب بڑے نقاد اور مشہور ادیبوں سے تعلق پیدا کرنے کے لئے کتنا بے تاب رہتا ہے، میں وحشی صاحب کے گھر پہنچا انتہائی خندہ پیشانی سے ملے، جگر صاحب سے تعارف ہوا اور پھر جگر صاحب نے ایک غزل پڑھنی شروع کی، "دل میرا" اور "حاصل میرا"، ایک تو ان کے کلام کی گرمی اور دوسرے ان کے پڑھنے کا انداز، وحشی صاحب کرسی سے اتر کر فرش پر لوٹنے لگے، یہ بڑے صاحب دل رنگین ہیں اور محفل شعر میں بیٹھے ہیں، بزم قوالی میں حال دیتے ہیں، پھر یہ سب کچھ بڑی بے ساختگی سے ہوتا ہے، وہ مردانِ مرزا کشتگانِ عشق اور شیدائے نظیری میں سے ایک ہیں، جگر صاحب غزل پڑھ رہے ہیں، وحشی صاحب آنکھیں بند کئے ہوئے فرش پر لوٹ رہے ہیں اور نعرے بلند کر رہے ہیں عجیب منظر تھا، میں بھی، منشی صاحب پریشان ہو گئے، میری طرف دیکھا، میں نے کہا "آپ پریشان نہ ہوں وہ حال میں ہیں، ان کو کوئی مرض نہیں۔"

دونوں مسکرانے جیسے مطمئن ہو گئے ہوں۔ جب جگر صاحب کی غزل ختم ہوئی تو وحشی صاحب پھر اسی دنیا میں لوٹ آئے اور کرسی پر بیٹھ گئے کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔

یوں منشی دیا نرائن نگم سے میری پہلی ملاقات ہوئی، لیکن اس ملاقات میں ان سے زیادہ بات چیت نہ ہو سکی۔ جگر صاحب کا قوال اور وحشی صاحب کا حال ہمارے درمیان حائل ہو گیا۔ لیکن میں نے ان کے متعلق رائے قائم کی اور مجھے زندگی بھر اس رائے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اردو زبان تو برصغیر کی بہترین روایات کا سنگم ہے ہی، لیکن کچھ افراد بھی ایسے ملتے ہیں جو ہماری مشترک روایات کے امین ہوتے ہیں۔ دیا نرائن نگم بھی انہیں میں سے ایک تھے، وہ قیامت کے وضع دار تھے، جب پہلی بار میں نے انہیں دیکھا تو وہ کرتا اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تھے اور پھر میں نے ہمیشہ انہیں اسی لباس میں دیکھا، لباس کی یہ وضع داری ممکن ہے کہ بہت سے حضرات کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو، لیکن میرے خیال میں تو یہ کردار کی پختگی کی علامت ہے، داخلی شخصیت کا ایک اہم خارجی عکس۔ چشمے کے پیچھے دیا نرائن نگم کی آنکھیں ہمیشہ مسکراتی رہتی تھیں۔ یہ مسکراہٹ اور ہونٹوں کا تبسم ہی ان کی گفتگو تھا۔ پہلی ملاقات میں انہوں نے اپنے ہاتھ سے ڈبیہ سے پان نکال کر مجھے دیا اور بعد میں جب بھی ہم ملے اس رسم میں کبھی فرق نہ آیا۔ بے تکلفی میں یہ تکلف ان کی وضع تھی۔

اب تک پہلی ملاقات کا ذکر رہا تھا۔ اس ملاقات کے بعد میں کئی بار ان سے ملنے گیا۔ ۱۹۳۴ء میں میرے استاد حضرت احسن بھی زمانہ میں ملازم ہو گئے اور پھر تو تقریباً ہر روز زمانہ کے دفتر میں میرا آنا جانا ہو گیا۔ نگم آنجہانی سے بھی روزانہ کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ زمانے کا معیار وہ ہمیشہ بلند تر کرنے کی کوشش کرتے رہتے، انہیں اپنے بارے میں زیادہ کاوش کبھی نہ تھی۔ یہ بھی ان کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اسی لئے وہ اردو کے کسی استاد صاحب قلم کو ہمیشہ ادارہ زمانہ سے متعلق رکھتے۔ کم لوگوں کو شاید یہ بات معلوم ہو کہ درگا سہائے سرور، پیارے لال شاکر اور نوبت رائے نظر وغیرہ زمانہ کی ترتیب میں نگم آنجہانی کے معاون تھے۔ ان کے بعد احسن مجیبی اور یعقوب کلام ایسے زمانہ کو ان کے ساتھ ترتیب دیتے رہے۔

زمانہ کا دفتر نگم آنجہانی کے مکان واقع نیا چوک میں تھا، وہ اپنے رسالہ کا کام بڑی پابندی سے کرتے تھے اور اس زمانے میں بھی وہ میز کرسی پر بیٹھ کر دفتری انداز میں کام کیا کرتے تھے، احسن مرحوم مضامین وغیرہ دیکھتے تھے، اور نگم صاحب ادیبوں کو خود ہی خط لکھتے اور خطوط کے جواب دیتے، مضمون لکھنے سے وہ کافی ہچکچاتے تھے، لیکن خط بہت اچھے لکھتے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا خلوص کسی اور ادبی صنف کے سانچے میں ڈھل ہی نہ سکتا تھا، ان کی شخصیت خطوط کے آئینے ہی میں عکس گری کر سکتی تھی۔ ان کے خطوں میں ان کی سادگی اور ادائیں نظر آتی ہیں۔ وہ اردو کے تمام ادیبوں سے ان کے بہترین تعلقات تھے، ان کے خط پڑھ کر یوں ہی لگتا جیسے نگم صاحب یہ سب باتیں آمنے سامنے بیٹھ کر کر رہے ہیں۔ زمانہ کے لکھنے والے ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور کئی زمانہ سے زیادہ عرصہ تک غیر حاضر رہنے کے متعلق سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایک بار میرے یہاں آئے تو ان سے ملنے کے لئے چند دوستوں اور بزرگوں کو میں نے بلایا۔ نگم صاحب کو نہ بلا سکا۔ انہیں معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے خط لکھا۔

عزیزی ثاقب صاحب

آپ سید زادے ہیں اور میں آپ کا معتقد گو ہوں۔ آپ کا نہیں آپ کے بزرگوں کا۔ کانپور کے ساداتِ کبار ہی میرا ہے۔ میں اب لکھوں تو کیا لکھوں، ڈاکٹر ذاکر حسین آئے اور آپ نے مجھے بلایا ہی نہیں۔ اچھا شکایت پھر کروں گا۔ پہلے آپ کو نظیری کا ایک شعر سنا دوں۔

دیدہ ام دفتر پیمان وفا حرف بحرف
نام خوباں ہمہ ثبت است ہمیں نام تو نیست

کہئے اب بھی شکایت کی کوئی ضرورت ہے۔

آپ خانقاہوں میں رہتے ہیں اور خانقاہوں کے دروازے کبھی فقیروں پر بند نہیں ہوتے۔ شاید اب رسم و رہِ خانقاہی بدل گئی ہو۔ اگر ایسا ہے تو مجھے اطلاع دیجئے۔ ممنون ہوں گا۔

دعاگو

دیا نرائن

ان چند سطروں میں تعلقات، خلوص، طنز اور شکایت کی ایک دنیا آباد ہے۔ یہ بات عجیب ہے کہ نگم صاحب خطوں میں اردو اور فارسی کے اشعار تو برجستہ لکھتے تھے اور بڑے مناسب موقعوں پر مگر عام طور پر شعر ناموزوں پڑھتے تھے۔ تلفظ کا بھی کچھ ایسا ہی حساب تھا وہ کئی الفاظ بہت غلط بولتے تھے جیسے بشاش بشاش کو بشاش بشاش کہتے تھے۔ اسی طرح ایک مرتبہ کرشن سہائے وحشی کے مکان پر پریم چند، کبھانی، اصغر گونڈوی مرحوم، ماسٹر عبدالصمد بزمی اور احسن مرحوم وغیرہ سب موجود تھے۔ نگم صاحب درگا سہائے سرور کا ذکر کرنے لگے، دورانِ شعر خوانی میں انہوں نے جیذا جیذا کو جدا جدا (ح کو ج سے اور ذ کو د سے بدل دیا) کہا۔ سب ہی مسکرانے لگے۔ لیکن نگم صاحب سے کون کہتا۔

دیا نرائن نگم کو زمانہ سے بڑا گہرا لگاؤ تھا، یہ رسالہ ان کی زندگی کا مقصد بھی تھا اور حاصل بھی —— رسالے کا اپنا پریس تھا، عام طور پر انہیں زمانہ کا بانی سمجھا جاتا ہے مگر یہ صحیح نہیں، گورنمنٹ ہائی اسکول کے ایک ہیڈ ماسٹر صاحب نے پنشن کے بعد غالباً ۱۹۰۳ء میں زمانہ کا اجرا کیا تھا۔ جب وہ کانپور سے نکلنے جانے لگے تو یہ رسالہ نگم صاحب کے حوالے کر گئے اور انہوں نے زمانہ کو زمانہ بنا دیا۔ دیا نرائن نگم، کبھانی کے والد کچہری میں پیشکار تھے، وہ اپنے بیٹے کو وکیل بنانا چاہتے تھے لیکن نگم صاحب نے کبھی وکالت کے پیشے کو اچھا نہ سمجھا اور ادبی دنیا کے ہو کر رہ گئے۔

زمانہ کے علاوہ انہوں نے ہفت روزہ آزاد بھی نکالا، جو تقسیم ہند کے بعد تک جاری رہا۔ آزاد ۱۹۱۳ء میں جاری ہوا، اس کے اجرا کی تحریک مسجد مچھلی بازار کی شہادت سے ہوئی۔ دیا نرائن مسلمانوں کو ان کا حق دلانا چاہتے تھے، انہوں نے بڑی بے باکی سے برطانوی شہنشاہیت کی سنگینوں تلے اپنی رائے کا اظہار کیا، وہ سچے نیشنلسٹ تھے۔ گاندھی جی کے بڑے معتقد، کانگریس کی ہر تحریک کے حامی —— اسی لئے زمانہ میں نیشنلزم، ہندوستانی زبان، سوراج، مہاتما گاندھی اور ہندوستانی تمدن وغیرہ وغیرہ مسائل پر اکثر مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۳۲ء کی بات ہے میں نگم صاحب سے ملنے ان کے دفتر گیا، احسن صاحب ان دنوں میں زمانہ کو مرتب کر رہے تھے —— جس وقت میں پہنچا اس وقت احسن صاحب اور نگم صاحب میں بحث ہو رہی تھی، نگم صاحب زمانہ کا قومی نمبر نکالنا چاہتے تھے اور احسن صاحب اس تجویز کے خلاف تھے، ان کی یہ رائے تھی کہ زمانہ کو خالص ادبی پرچہ رہنا چاہئے۔ نگم صاحب کہنے لگے "مولانا زمانہ کے انداز کو سمجھئے حالی، چکبست اور اقبال کی شاعری کو آپ کیا کہیں گے، ان کے یہاں کیا نہیں ہے، نیشنلزم، مذہبی مسائل، مسلمانوں کا اتحاد، ہندوستان کی آزادی —— ادب زندگی سے الگ کس طرح ہو سکتا ہے، پریم چند کے افسانے تو آپ برابر پڑھتے ہیں، انہیں ادب کہیں گے یا نہیں، یہی تو زمانہ ہے، سیاست، آرٹ، موسیقی، رقص، مذہب، تاریخ اور سب ہی موضوعات پر مضمون چھاپنا چاہتا ہوں، آپ دیکھ لیجئے گا کہ آئندہ ادبی پرچے ایسے ہی ہوں گے اور پھر لوگ کہیں گے —— اس رنگ کی ابتدا زمانہ سے ہوئی تھی، قومی نمبر ضرور نکلے گا، چلئے ہم فیصلہ ثاقب صاحب پر چھوڑ دیں" نگم صاحب قہقہہ لگا کر الگ ہو گئے اور مزے کی بات یہ کہ فیصلہ خود ہی کر دیا کہ "قومی نمبر ضرور نکلے گا" اور فیصلہ ثاقب صاحب پر چھوڑ دیا۔ میرے لئے یہ بڑا دشوار مرحلہ تھا، نگم صاحب کے فیصلے پر میری بات کا کیا اثر ہوگا —— اور احسن صاحب میرے استاد ہیں —— کچھ دیر تک چپ رہا پھر میں نے کہا، احسن صاحب نے آپ کی مخالفت کب کی، ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ آزاد بھی نکالتے ہیں اور زمانہ بھی، سیاست کے لئے آزاد کے صفحات موزوں ہیں اور اگر زمانہ قومی نمبر نکالے تو ادبی شان کا، سیاسی مسائل پر علمی انداز کے مضامین لکھوائے

جائیں، قومی تمدن اور زبان کے مسائل پر غور کیا جائے، وطنی نظمیں شامل ہوں ——— آپ نے احسن صاحب کی پوری بات تو سنی ہوتی وہ یہی کہنے جا رہے تھے میں اُن کا شاگرد ہوں اس لئے بہت کچھ تمہید سے سمجھ جاتا ہوں۔ بولو میری جان چھوٹی" احسن صاحب خوش ہو گئے، کہنے لگے "جی ہاں یہی میرا مطلب تھا ورنہ زندگی سے تو پیچھا ہی کبھی نجات نہیں ملتی، اگر جان کہاں چھوٹی وہ تو محض میرا گمان تھا" اثر صاحب بولے "ٹھیک ہے تو چلئے ابھی کام شروع کر دیں، میں ہندوستانی زبان پر مضمون لکھنا شروع کرتا ہوں اور آپ دونوں نظمیں لکھیں، ابھی اسی وقت" دوسرے لمحے ہم دونوں سادے کاغذ لئے بیٹھے تھے، اثر صاحب پھر بول اٹھے، "ابھی آپ دونوں مولوی ہیں ورنہ جمعیت علمائے ہند کو جمعیت سے کوئی تعلق نہیں، بھئی احسن صاحب: احسن صاحب کہاں چپ رہنے والے تھے وہ بھی کہنے "واہ صاحب تعلق کیسے نہیں، مسلمان جغرافیائی حدود کا قائل نہیں ہوتا" آخر جب اثر صاحب مولانا احسن کو قائل کر چکے تو کہنے لگے "یار میرے دوستوں کی پاس داری بھی کوئی چیز ہے، میری ہی خاطر کچھ اشعار لکھ دو" پھر اثر صاحب میری طرف متوجہ ہوئے، "دیکھئے آپ اپنی نظم میں حالیہ سیاسی بیداری کا ذکر ضرور کیجئے گا اور ہاں مرکز کی خیال کیا ہوگا آپ کی نظم کا" میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا "اثر صاحب مجھے آپ یوں کوئی ہدایات نہ دیجئے مجھے وطنی نظم لکھنی ہے سو لکھ دوں گا۔ میں نے کاغذ پر یوں ہی لکیریں کھینچنی شروع کر دیں، اثر صاحب خاموش ہو گئے اور میں نے بھی دیر تک اُن کی طرف نہ دیکھا، کچھ دیر کے بعد میں نے اپنے کاندھے پر دباؤ سا محسوس کیا، نظر اٹھائی تو دیکھا کہ اثر صاحب کھڑے مسکرا رہے ہیں اور پان اُن کے ہاتھ میں ہے ———

"لو پان کھاؤ ——— میں شرمندہ ہوں، یہ بھی تو بھول گیا تھا کہ تم صرف میرے دوست اور عزیز ہی نہیں شاعر بھی ہو، شاعر بڑا حساس ہوتا ہے، ایک رسالے کے ایڈیٹر کو تو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے۔"

کتنی نرمی کے ساتھ وہ کیا کچھ کہہ گئے، مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں [illegible] دوست، شاعر، ایڈیٹر، حساس یہ سب باتیں مجھ پر ہنسنے لگیں، وہ مسکرا رہے تھے اور میں اُنہیں بس دیکھ رہا تھا اور چپ تھا۔

پان کیوں نہیں کھاتے ——— ارے پان نہ کھاؤ مسکرا ہی دو ——— اور میں مسکرانے کی جگہ ہنس پڑا۔

"تم نے کتنے شعر کہے؟"

میں نے پوری نظم لکھ لی ہے۔

سچ۔

"سچ" "اور آپ کا مضمون ہو گیا؟"

——— ہاں تمہید لکھ لی ہے ——— "اپنی نظم سناؤ"

"اس میں حالیہ سیاسی بیداری؟"

"پھر وہی باتیں"

میں کہہ رہا تھا کہ اس میں حالیہ سیاسی بیداری کا بھی ذکر ہے ——— یہ دیکھئے

محو کر دے اپنی پیشانی سے داغ عبدیت — پھر دکھا دے اپنی دنیا کو طریق حریت
پھر بلندی پر ہو تیرا پرچم حسن عمل — تیری آوازِ صداقت پھر ہو آمادہ [illegible]

"بہت اچھے" بہت اچھے ——— چلو تم نے نظم لکھ دی ——— اگر اب بھی نالاں ہو تو کوئی پروا نہیں۔

"آپ اصطلاح بھی حساب کتاب اور مول تول کی کرتے ہیں" ——— اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

میں نے یہ واقعہ خاصی تفصیل سے لکھا ہے اور اس کے لئے میں اپنے پڑھنے والوں سے شرمندہ نہیں ہوں —— کیونکہ اس واقعہ سے نگم صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آجاتے ہیں —— پہلی بات .. کہ وہ اپنے زمانے سے کس قدر آگے سوچ رہے تھے 'یا اتنا تو آپ کم سے کم مانیں ہی گے کہ ادب اور زندگی کے تعلق کا انہیں کتنا واضح احساس تھا اور یہ واقعہ ترقی پسند تحریک کی ابتداء سے بہت پہلے کا ہے —— دوسری بات یہ کہ اُن کا نقطۂ صحافت کس قدر صحت مند اور انقلاب آفریں تھا 'تیسری بات یہ کہ وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں کس قدر فعال اور سرگرم تھے 'وعدہ کی تاخیر کے روادار نہ ہوتے تھے۔ اور ان سب باتوں سے بڑی بات ان کی دوست داری و دوست نوازی —— بعض دوستوں کی کوئی بات انہیں بُری لگتی ہی نہ تھی، اگر دوستوں پر انہیں اتنا اعتماد تھا کہ وہ جو چاہتے کر لیتے —— اور ان کے اعتماد کے قابل بننا ہی ایک ایسا اعزاز تھا —— ہم سب کے لئے کہ کسی بات سے انکار نہ پڑتا تھا —— یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ نگم صاحب کا طنز کتنا شیریں، مگر چبھتا ہوا تھا —— نرم الفاظ کو وہ تلوار کی کاٹ بخش دیتے تھے۔ یہ خوبی اُن کی گفتگو اور خطوط ہی میں ملتی ہے، مضامین میں دور دور تک اس کا پتہ نہیں۔

اس واقعہ کے تین چار دن کے بعد جب میں گیا تو کہنے لگے کہ رجنی قومی نمبر کے لئے میں نے ایک چھوڑ دو مضمون لکھ لئے ہیں ایک دیہاتوں کے متعلق اور دوسرے قومی زبان کے بارے میں۔ میں نے کہا "دیہاتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں قومی زبان سے ہے" دیہاتوں والا مضمون دکھا دیجئے گا؟ "ارے دیہاتوں سے کیوں دلچسپی نہیں، ہندوستان کی نوّے فی صدی آبادی تو دیہاتوں ہی میں رہتی ہے" میں نے جواب دیا کہ "مجھے اعداد و شمار سے بھی دلچسپی نہیں اور دیہاتوں سے اس لئے نفرت ہے کہ وہاں سانپ رہتے ہیں" نگم صاحب مسکرائے "آپ کیسے شاعر ہیں۔ محبوب کی زلفوں کو سانپ سے تشبیہ دیتے ہیں اور سانپ کے روادار نہیں اور رات بھر اختر شماری کرتے ہیں اور اعداد و شمار سے نفرت ہے"! میں نے کہا "محبوب کی زلفوں کو سانپ سے تشبیہ دینے کا دور گزر گیا، اور رہی اختر شماری تو برائے شعر گفتن خوب است، ویسے تو میں رقم شماری کرنے والوں میں ہوں" وہ بہت ہی محظوظ ہوئے اور پھر انہوں نے ہندوستانی زبان کے مسئلے پر اپنا مضمون سنایا، وہ مضمون زمانہ کے قومی نمبر فروری [illegible] میں شائع ہوا ہے۔ اس میں اس مسئلے پر جس انداز سے غور کیا گیا ہے، اسی کی بناء پر آج بھی یہ مضمون ہمارے غور و فکر کا مستحق ہے۔ بولی، رسم الخط، اصطلاحات، سلیس اسلوب، نظامِ تعلیم میں قومی زبان کی اہمیت ان سب پہلوؤں پر انہوں نے بڑے اچھے مشورے دیئے ہیں۔ لیکن مجھے ان سے بنیادی اختلافات تھے۔ انہوں نے اردو کی جگہ ہندوستانی لکھا اور اردو و ہندی کو ایک ہی زبان قرار دیا، ہندی رسم الخط کی برتری کا دعویٰ کیا اور اردو رسم الخط کو غیر ملکی قرار دیا، ہمارے درمیان خاصی تیز قسم کی گفتگو ہو گئی، میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ پھر آپ کا رسالہ نکالنا اور اردو ادب کی خدمت کا دعویٰ کرنا بالکل ڈھونگ ہے۔ آپ اردو رسم الخط کو غیر ملکی قرار دیتے ہیں تو گویا اردو زبان اور ہندوستانی مسلمانوں کو بھی غیر ملکی سمجھتے ہیں اور پھر زبان و رسم الخط کا تعلق، لباس و جسم کا نہیں بلکہ جسم و روح جیسا ہے۔ اسی برہمی کے عالم میں میں اٹھ کر چلا آیا، اور ہفتے بیت گئے اور میں ان کے یہاں نہ گیا۔ پھر ایک دن وہ خود چلے آئے اور ہم دونوں یوں باتیں کرنے لگے گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی، آج جب میں اُن کے بارے میں اپنے تاثرات لکھنے بیٹھا ہوں تو دل کو یک گونہ مسرت ہے کہ ہمارا اختلاف اصولی تھا ذاتی نہیں، اور میں آج بھی اپنے کو صحیح سمجھتا ہوں۔

نگم صاحب ایک مرتبہ اور مجھ سے ناراض ہو گئے تھے، سوداؔ کے متعلق برادرِ محترم اثر لکھنوی کا ایک طویل مضمون کئی قسطوں میں زمانہ میں شائع ہوا تھا، جب میں نے جامعہ ملیہ کے لئے سوداؔ کا انتخاب کیا تو غالباً اثر صاحب کی اجازت سے اس مضمون کے بعض حصوں کو زمانہ کے حوالے کے بغیر دیباچے کے طور پر شامل کر لیا تھا، انہیں یہ گمان گزرا کہ زمانہ کا حوالہ کیوں نہ دیا اور انہوں نے اس کا اظہار اپنے تبصرے میں بھی کر دیا۔ اُن کی یہ شکایت کچھ ایسی بیجا بھی نہ تھی، جب کہ زمانہ سے انہیں اتنی محبت اور اتنا لگاؤ تھا لیکن ایسی باتوں سے ہمارے تعلقات

کو بھی متاثر کیا۔

یہ ہمیشہ سے میری عادت رہی ہے کہ اپنے دوستوں سے ان کی گھریلو زندگی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتا، وہ خود بتادیں تو یہ الگ بات ہے —— منشی صاحب آنجہانی سے بھی اس قسم کی گفتگو بہت کم ہوئی، اس لئے میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ شوہر کی حیثیت سے کیسے تھے؟ لیکن یہ یقین ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی بہت ہی خوش گوار ہوگی۔ وہ وسیع القلب تھے اور انسانوں سے بے پایاں محبت کرتے تھے ان کے پانچ بیٹے ہیں —— بڑے بیٹے [illegible] نگم وکیل ہیں اور والد کے انتقال کے بعد غالباً ۱۹۵۰ء تک زمانہ نکالتے رہے۔ نگم صاحب آنجہانی کو اپنے بیٹوں سے بڑا پیار تھا اور وہ اس باب میں خوش نصیب بھی تھے۔ آج ان کے سب بیٹے اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ ایک بیٹا آئی سی ایس ہے، دوسرا بیٹا پی سی ایس اور تیسرا انڈین پولیس سروس میں۔ یہ چند بکھری ہوئی یادیں ہیں۔ ان میں کوئی منطقی ربط نہیں، اور پھر محبت منطق کی زد سے آزاد ہے۔ آخر میں یقیناً آپ بھی اس قسم کی ہی باتیں لکھنے پر مجبور ہوں گے کہ منشی دیانرائن نگم بڑے آدمی تھے اور ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ نگم صاحب کے متعلق یہ سب کہنا مجھے بے معنی معلوم ہوتا ہے۔

سائل دہلوی

مالک رام

نواب سراج الدین احمد خاں سائل ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو شنبہ کے دن اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ چونکہ سال ولادت ۱۸۶۴ء تھا، اس طرح عمر پورے ۸۱ برس ہوئی۔ اللہ کریم انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ مرحوم مجھ پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ بہت دن سے خیال کر رہا تھا کہ اپنے تاثرات قلم بند کر دوں، لیکن ہائے مکروہات ـــ

مجھ کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا ۔ فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

میں تعلیم ختم کرنے کے بعد دو تین برس تک روزگار کے سلسلے میں ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا رہا، لیکن اسے میری نالائقی سمجھئے یا بدقسمتی، کہ کسی جگہ قدم نہ جم سکے۔ ان ایام میں یہاں دلی میں میرے ایک مہربان تھے، جنھیں اس بات کی بہت فکر تھی کہ کسی جگہ میرے لیے مستقل ٹھکانا ہو جائے۔ انھوں نے ۱۹۳۹ء کے آخر میں مجھے لکھا کہ اگر تم یہاں آ جاؤ، تو شاید ریڈیو کے محکمے میں تمھارا انتظام ہو جائے۔ چنانچہ اس بلاوے پر میں یہاں آ گیا۔ یہ دلی میری بڑی آرزو تھی، میں اس سے پہلے یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ اپنے رجحانات کے باعث، مجھے اس دور میں اس بلدہ سے جو دلچسپی ہو سکتی تھی، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہاں پہنچ کے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہوگی۔

اس زمانے میں یہاں میرے ایک ہم وطن عزیز دوست جگت موہن رہتے تھے۔ ساتھ کے کھیلے ہوئے، ساتھ کے پڑھے بڑھے، یوں سمجھئے، دانت کاٹی روٹی والا معاملہ تھا۔ وہ آج کی طرح جب بھی ایک اسکول میں مدرس تھے۔ میں انھی کے ہاں اترا۔ دو تین دن کے بعد وہ ایک صبح مجھ سے کہنے لگے۔ تمھیں اردو لکھنے پڑھنے کا شوق ہے، کسی دن فرصت سے لال کنویں میں ایک بڑے نواب صاحب رہتے ہیں، سراج الدین خاں نام ہے، ان سے جا کر ضرور ملو۔ میں نے پوچھا کہ کون نواب سراج الدین احمد خاں، وہی تو نہیں جو سائل تخلص کرتے ہیں۔ بولا، ہاں، وہی۔ میرا ارادہ ہونے کے باعث اگلے دن اتوار تھا، میں نے ناشتے کے بعد لال کنویں کی راہ لی ـــ

[illegible] ۔ [illegible]

جگت موہن صاحب کو سائل صاحب کے مکان کا ٹھیک ٹھیک علم نہیں تھا، وہ بس اتنا ہی جانتے تھے کہ کہیں لال کنویں کے محلے میں رہتے ہیں۔ البتہ مجھے معلوم تھا کہ ان کا داغ کے خاندان سے تعلق ہے، اس لیے میرے دل میں اطمینان تھا کہ ایسی معروف ہستی کا مکان تلاش کرنے میں

کوئی دقت پیش نہیں آ سکتی۔ چنانچہ میں پوچھتا پوچھتا گلی قاسم جان میں جا پہنچا جہاں اس خاندان کے مکانات ہیں۔ یہاں میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ میں نواب سراج الدین احمد خاں کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔ میں اس وقت جناب ضیاء الدین احمد خاں عرف ضمیر مرزا خلف نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی کے مکان کے سامنے تھا۔ اس شخص نے جواب دیا کہ یہاں سے دریافت فرمائیے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، تو میرے سامنے جناب ضمیر مرزا کا ملازم کھڑا تھا۔ میں نے اپنا سوال اس سے دہرایا۔ اس نے کہا، "جناب وہ اس گلی میں نہیں رہتے۔ ان کا مکان لال دروازے میں ہے۔" مجھے شبہ ہوا کہ شاید اسے نام سمجھنے میں کچھ غلطی ہوئی ہے۔ اس لئے میں نے دوبارہ تاکید سے کہا کہ میں نواب سراج الدین احمد خاں صاحب کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔ "جی ہاں۔ میں سمجھ گیا۔ وہی جو شاعر ہیں اور جن کے گھر میں بابری بیگم ہیں۔ وہ لال دروازے میں رہتے ہیں۔ آئیے میں آپ کو پہنچا آتا ہوں۔" چنانچہ ہم دونوں گلی قاسم جان سے نکل کے لال کنویں میں آ گئے۔ لال دروازہ کچھ دور تو تھا نہیں۔ یہی چند قدم کا فاصلہ ہے۔ اس کے اندر تھوڑی دور چل کے وہ سیدھے ہاتھ پر ایک اونچی کرسی کے مکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "لیجئے حضور، یہ ہے نواب صاحب کا مکان۔" اس کے بعد اس نے ملازم کو آواز دی اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ "آپ نواب صاحب سے ملنا چاہتے ہیں" اور مجھے اس کے سپرد کر کے خود واپس چلا گیا۔

میں ملازم کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کے ڈیوڑھی میں پہنچا۔ یہاں اندر گھستے ہی دائیں طرف ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی، غالباً ملازم کے لئے تھی۔ اس طرف کے کمرے میں اوپر جانے کا زینہ تھا۔ سامنے کے رخ پر ایک دروازہ تھا جس پر پردہ پڑا تھا۔ یہ گھر کے صحن میں کھلتا تھا۔ چوکھٹ پر ایک تختی لگی تھی، جس پر لکھا تھا "مکان بابری بیگم"۔ اسے دیکھ کر مجھے معاً "حویلی علی نقی خاں بہادر کی" والا لطیفہ یاد آ گیا۔

اسی ڈیوڑھی کی بغل میں بیٹھنے کا کمرہ تھا، جس میں داخل ہونے کے لئے دو سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ ملازم نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے یہاں بٹھا کے خود نواب صاحب کی خدمت میں اطلاع دینے چلا گیا۔

میں نے بیٹھ کے اردگرد نگاہ دوڑائی، تو دیکھا کہ یہاں اچھا خاصا مشرقی اور مغربی تمدن کا امتزاج ہو رہا ہے۔ یعنی کمرے میں دری کا فرش تھا۔ اس کے اوپر نصف کمرے کے لگ بھگ سپید براق چاندنی بچھی تھی۔ صدر میں ایک چھوٹا سا قالین ایرانی اور بڑے بڑے گاؤ تکیے لگے رکھے تھے۔ نشست کے قریب چاندی کا پاندان، ڈبیاں اور گلی، دو تین اگالدان اور سگرٹ کی راکھ جھاڑنے کی پیالیاں دھری تھیں۔ ...... اور جہاں چاندنی نہیں تھی وہاں چند کرسیاں اور ایک چھوٹی سی تپائی رکھی تھی۔ میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک نورانی صورت بزرگ کمرے میں داخل ہوئے۔

تقریباً ستر برس کا سن، کوئی چھ فٹ کا قد، کمر میں خفیف سا خم، میدہ و شہاب کی ملی جلی رنگت، الجھا ہوا چہرہ، کشادہ پیشانی، اونچی کاٹھی کی ستواں عقابی قسم کی نوک دار ناک، گلے کی ہڈیاں نمایاں حد سے ابھری ہوئی -- سڈول جسم، سنہری جھلک مارتی ہوئی سپید داڑھی، جو یک مشت تو یقیناً تھی وہ سنت کی خاطر جانئے۔ شربتی لیکن آنکھیں نسبتاً چھوٹی، لمبے لمبے بازو اور ہاتھ پاؤں، سر پر ٹلی سی چپکی کی ٹوپی، جس کے نیچے سے لمبے لمبے گھونگر والے بال نکلے پڑتے تھے۔ گلے میں کاج بٹن گریبان اور ململ آستینوں کا ململ کا کرتہ، کندھے پر رومال، ٹخنے ٹخنے کا تنگ پاجامہ، پاؤں میں سلیم شاہی جوتا، بائیں ہاتھ میں گلوری اور داہنے میں سگرٹ کا بکس اور دیا سلائی کی ڈبیا۔

یہ تھے نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی ابن نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب ابن نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر و رخشاں ابن فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر والئ فیروزپور جھرکہ و لوہارو، [illegible] اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ کہا ہے ؎

سائل کو تم نہ چشم حقارت سے دیکھنا
نواب پانچ پشت سے داماد داغ ہے

میں نے اٹھ کے آداب بجا لایا۔ بہت لطف سے مسکراتے ہوئے جواب دیا، بیٹھے بیٹھے، بیٹھ جائیے۔ پھر خود دوسری کرسی پر تشریف فرما ہوئے۔ پہلے نام پوچھا، تعلیم اور روزگار کا حال پوچھا۔ چونکہ خود شاعر تھے [illegible] کیا ہو گا کہ یہ ملنے کے لئے آیا ہے، تو ضرور شعر بھی کہتا ہو گا۔ پوچھنے لگے، [illegible]

ادھر اُدھر شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ تو پہلے کچھ تعجب کا اظہار کیا۔ پھر فرمایا۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ یہ بے کاری کا مشغلہ۔

ہم جس کمرے میں بیٹھے تھے وہ گلی کے رُخ پر تھا اور یہاں کی تینوں کھڑکیاں کھلی تھیں۔ نیچے گلی میں ایک [illegible] پر تھا جو [illegible] وقت شور مچاتا ہی رہتا تھا۔ اس شور سے تو بے ہنگم آواز سے میں بہت پریشان تھا، یہاں تک کہ بعض اوقات جب ایک دوسرے کی بات سننے میں بھی دقت ہوتا تھا۔ لیکن کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ [illegible] صاحب بھی اس کھٹ کھٹ سے بہت متنفر ہوئے۔ گھبرا کے آواز دی۔ ادھر کوئی ہے۔ دروازے پر سے ملازم نے جواب دیا۔ حضور حاضر ہوں۔ بولے، جاؤ اس کم بخت سے کہو کہ یہ شور بند کرے اور اگر وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تو اس سے کہو کہ وہ یہ محلہ چھوڑ کے کہیں اور چلا جائے۔ یہ کیا مصیبت نازل ہو گئی ہے۔ ملازم نے جا کے سمجھا دیا ہو گا۔ بہرحال آواز تو بند ہو گئی اور اس کے بعد ہم اطمینان سے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اجازت چاہی۔ فرمایا، جب طبیعت چاہے آؤ۔ میں دوپہر تک [illegible] مکان ہی پر رہتا ہوں۔ سہ پہر کو کبھی گھر سے نکلتا ہوں۔

یہ تھی جناب [illegible] صاحب سے میری پہلی ملاقات۔

اتفاق سے میری ڈیوٹی بھی [illegible] اس زمانے میں جو حضرات اس محکمے کے کرتا دھرتا تھے، میں انہیں خوش نہ رکھ سکا۔ چنانچہ مہینہ بھر یہاں رہ کے واپس لاہور چلا گیا۔

اگلے برس [illegible] ان کے ذریعے ایک اور [illegible] مل گئی۔ میں [illegible] مستقل طور پر ملازم ہو گیا۔ مشاہرہ قلیل تھا، لیکن کام بھی کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔ حکومت کے دفاتر کے ساتھ یہ لوگ بھی گرمیوں میں شملے اور سردیوں میں دلی جاتے آتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب سردی میں دفتر دلی آنے لگا تو میں بھی یہاں پہنچ گیا۔ یہاں آنے کے بعد میں پہلی فرصت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور سنہ ۱۹۳۱ء اور سنہ ۱۹۳۲ء کے دونوں جاڑوں میں متواتر ان کے ہاں آتا جاتا رہا۔ دراصل یہی وہ زمانہ ہے جب مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

اب تفصیل میں کیا جاؤں کہ کیسے کیسے ہمارے تعلقات میں گرمی پیدا ہوتی گئی۔ بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ حکم ہوا کہ جب تک دلی میں رہو [illegible] جب جی چاہے بلا ضرورت ہو آ سکتے ہو۔ لیکن اتوار کے دن کہ تمہیں دفتر سے چھٹی ہوتی ہے اور [illegible] کا ناشتہ میرے ساتھ کیا کرو۔ میں نے اقرار کیا۔ جو لوگ دلی کی سردیوں کو جانتے ہیں، انہیں خوب معلوم ہے کہ مجھے اس وعدے کے نباہنے میں کیا کیا مشکل پیش آئی ہو گی۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ میں نے [illegible] ناغہ نہیں [illegible]۔ یہ تفصیل کم ہیں۔ ان دونوں جاڑوں میں [illegible] برابر اتوار کو حاضر ہوتا اور اس دن عام طور پر دوپہر تک ان کے ساتھ رہتا۔

کھانے پینے میں مزاج بہت نفاست پسند تھا۔ حتی الامکان اس بات کی کوشش کرتے کہ [illegible] ہاتھ سے نہ لگائیں۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ [illegible] یا سالن کی تری انگلیوں پر رہ جائے۔ اس لئے بے دریغ چمچے اور کانٹے کا استعمال کرتے تھے۔ انہیں [illegible] پسند تھا۔ یعنی وہی، جیسے ہوٹل کے [illegible] میں [illegible] کے ساتھ دیا جاتا تھا۔ جب تمام پانی اس کے ٹپک جاتا، تو بقیہ [illegible] یا کسی اور سخت چیز کے درمیان رکھ کے دبا کر [illegible]۔ پھر جیسے چاہتے اس کے ٹکڑے [illegible] کاٹ لیتے۔ ناشتے میں [illegible] معلوم ہوتا تھا اور وہ اسے چھری کانٹے سے کھاتے تھے۔

کھانے میں مچھلی بہت پسند تھی، لیکن کانٹے سے ڈرتے تھے۔ آخری عمر میں [illegible] پر بھی فرق آ گیا تھا۔ [illegible] خیال نہیں رہتا تھا۔ اس لئے عام طور پر بیگم صاحبہ ان کے لئے علیحدہ پہلے سے کانٹا نکال کے دستر خوان پر رکھوا دیا کرتی تھیں۔ خوراک بہت کم تھی۔

ایک دن ناشتے پر فرمایا، [illegible] بیٹھے [illegible] کہ دوپہر کا کھانا [illegible] آج بھی میرے ساتھ کھانا ہے۔ اب میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جب وہ مجھ سے کچھ کھانے کو کہتے، تو میں کوئی حیل حجت نہیں کرتا تھا۔ وہ میری عادتوں سے خوب واقف تھے اور انہیں معلوم تھا کہ کسی

چیز مجھے پسند ہوگی اور کون سی ناپسند۔ اس لئے مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے کوئی ایسا کام کرنے کو نہیں کہیں گے، جو میرے خلاف طبع ہو۔ اس دفعہ بھی بیوی صاحبہ نے نہیں پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے۔ صرف اتنا کہہ دیا بہت اچھا۔ انھوں نے کسی دوست سے گاڑی مانگ لی تھی۔ ملازم کو حکم ہوا گاڑی لے آؤ۔ ہم بیٹھے اور سے اور نئی دہلی کے راستے حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر پہنچ گئے۔

نواب سائل مرحوم کے خاندان کو بزرگان دین سے بہت عقیدت ہے۔ یہ بہت کچھ اس لئے کہ خود ان کے اپنے اجداد میں بھی اولیاء اللہ گزرے ہیں۔ قریبی زمانے میں بھی ان کے پردادا نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں بحیثیت شاعر ہی معروف نہیں، تصوف اور اولیاء کے حلقوں میں بھی ان سے کم مشہور نہیں۔ وہ حضرت مولانا فخر الدین کے مرید اور خلیفہ تھے۔ خود نواب احمد بخش خاں اگرچہ شروع میں کچھ [illegible] سے [illegible] لیکن بعد میں اپنے چھوٹے بھائی کے ذریعہ انھوں نے بھی مولانا فخر الدین کی بیعت کر لی تھی۔ یہ اسی ارادت اور خوش عقیدگی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام حضرت خواجہ ضیاء الدین اجمیری کے نام کی رعایت سے نواب ضیاء الدین رکھا۔ جو مشہور عالم و ادیب نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کہلائے۔ سائل صاحب بھی حضرت مولانا شاہ [illegible] صاحب کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ یہ بزرگ شاعر بھی تھے۔ [illegible] تخلص تھا اور اسی زمانے میں ذوق کے شاگرد تھے۔ دیوان مطبوعہ موجود ہے۔

میرا سلطان جی میں یہ پہلا پھیرا تھا۔ سب سے پہلے ہم نے حضرت محبوب الٰہی کے مزار مقدس پر حاضری دی۔ یہاں فاتحہ پڑھ کے ہم باہر صحن میں بچھی ہوئی چوکیوں پر آ کے بیٹھ گئے۔ چند مجاور بھی ہمارے پاس آن بیٹھے۔ وہ نواب صاحب کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ بھی ایک ایک سے ان کے گھروں کا حال پوچھتے رہے۔ ایک مجاور مزار پر سے سبز کپڑے کے دو ٹکڑے لے آیا۔ ایک ایک ہماری ٹوپیوں کے گرد لپیٹ دیا گیا۔ سائل صاحب نے اس سے کچھ سوال کیا۔ پھر ہم سے کہنے لگے۔ بزرگوں کے مزاروں پر کپڑا آتا ہے وہ برکت کا ہوتا ہے۔ اس سے برکت حاصل ہوتی ہے اور دل میں ارادت اور اخلاص پیدا ہوتا ہے۔ افسوس یہ ان مقدس مقامات پر اکثر مجاور ایسے ہیں، جنھوں نے محض روزگار کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ لیکن ان میں بلاشبہ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے دل صاحب مزار کے انوار سے منور ہیں۔ اور اگر تم واقعی یہاں کی برکت حاصل کرنا چاہو، تو لازم ہے کہ انھیں کا واسطہ پکڑو۔

پہلے تو میرے جی میں آئی کہ ان سے کچھ پوچھوں گچھوں۔ لیکن موقع بے موقع تھا۔ ہمارے ارد گرد بہت لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اس لئے میں نے خاموشی سے [illegible] دیکھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ایسے لوگ ہیں، تو یقیناً مزار ہی پر بیٹھے ہوں گے۔

خیال اس سے کچھ غلط فہمی پیدا ہو جائے، اس لئے میں ایک اور واقعہ بھی لکھ دیتا ہوں جس سے ان کے مذہب اور مسلک صاحب مزار سے متعلق زیادہ بہتر روشنی پڑتی ہے۔

میں ان دنوں قرول باغ میں رہتا تھا۔ ان دنوں جامع مسجد کے [illegible] مسجد کے زیر سایہ خرابات۔ کا آغاز [illegible] یہاں کے ادیبوں کے حلقوں میں مجھے لے گئے تھے اور ان اصحاب کے ہاں اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ ایک شام میں مکتبہ جامعہ کے مہتمم [illegible] صاحب سے ملنے گیا تو دیکھتا ہوں کہ وہاں اچھا خاصا مجمع ہو رہا ہے۔ چند مقامی حضرات کے علاوہ باہر کے ایک بہت بڑے عالم اور مصنف بھی موجود تھے۔ میں نے انھیں ذاتی طور پر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ البتہ ان کی دو ایک جوانی کی تصویریں دیکھی تھیں۔ [illegible] رہا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ قریب [illegible] کے [illegible] میرے قریب [illegible] صاحب تشریف رکھتے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ [illegible] ایک [illegible] کے سلسلے میں یہاں تشریف لائے ہیں۔ خوب سنئے۔

مولوی صاحب ایک [illegible] کے [illegible] تھے۔ کچھ عرصہ پہلے دلی کے ایک [illegible] نوجوان نے [illegible] ایک کتاب [illegible] رسالے میں [illegible] شائع کی تھی۔ اس میں [illegible] بتا کے ان کی علمی حیثیت [illegible] لیکن [illegible]

معاملہ یہیں تک رہتا تو کوئی بات نہیں تھی غلطی کس سے نہیں ہو جاتی۔ پھر تحقیق و تصنیف کا میدان تو بہت وسیع ہے۔ خصوصاً جہاں تعلق استنباط اور استخراج سے ہو وہاں تو اختلاف کا بہت زیادہ امکان ہے۔ اگر جانے دو اس معاملے کو اسی نظر سے دیکھئے تو کوئی قباحت نہیں تھی لیکن خدا معلوم انہیں کیسے شبہ ہوا کہ اس رسالے کی تصنیف میں ان کے ایک مخالف عالم دین کا ہاتھ ہے جو یہیں دہلی ہی میں رہتے تھے۔ بقول امام شمس الدین ذہبی، دو صاحب علم ہمعصروں کے لئے ہم عصری بہت بڑا ابتلا ہے۔ وہ نہ صرف ایک دوسرے کی صحیح قدر و قیمت شناخت نہیں کر سکتے بلکہ بسا اوقات رشک و حسد کے باعث ان میں چشمک بھی ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے مخالف بن جاتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ پیش آیا۔ یہ دونوں صاحب ہمارے چوٹی کے عالموں اور مصنفوں میں سے تھے لیکن نقطۂ نظر کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کے اشد مخالف۔ چنانچہ جب یہ رسالہ موصوف کے پاس تبصرے کی غرض سے پہنچا تو انہوں نے اپنے مجلے میں اس پر رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھ دیا کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس پردۂ زنگاری میں کون معشوق ہے اور کس نے یہ کتاب لکھی ہے اور کیوں چھپائی ہے۔ یہ بھی تصریح ہوتا تھا کہ رسالے کے مصنف کا نام جعلی ہے۔

جونہی یہ پرچہ دہلی میں پہنچا جس میں یہ تنقید چھپی تھی اس نوجوان مصنف نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، عدالت میں ہتک عزت اور ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا کہ فلاں مجلے کے ایڈیٹر نے میری تصنیفی قابلیت پر حملہ کر کے میری ہتک کی ہے نیز یہ شبہ کر کے کہ میں نے یہ کتاب کسی اور سے لکھوا کے اپنے نام سے چھپوا دی ہے میری شہرت اور عزت پر حملہ کیا ہے۔ ٹھیک طور پر یاد نہیں رہا۔ ہرجانہ غالباً دس ہزار روپیہ طلب کیا گیا تھا۔

جو حضرات قانون سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں معاملہ کس قدر سنگین تھا۔ قرائن ایسے تھے کہ جرم ثابت ہو جائے گا اور موصوف کو سزا ہو جائے گی اور ہرجانہ ادا کرنا پڑے گا اس لئے قدرتی طور پر سب لوگ تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ اگلے دن اسی مقدمے کی پیشی تھی اور وہ اسی سلسلے میں یہاں آئے تھے۔

اتفاق کی بات کہ میں اس نوجوان مصنف سے چند دن پہلے نواب سائل صاحب کے مکان پر مل چکا تھا اور ان کا یہ رسالہ بھی دیکھ چکا تھا۔ نواب صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے ان کی تعریف کی اور ان کے والد مرحوم سے اپنے قدیم دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا تھا۔ یہ نوجوان بھی ان سے اسی طرح خوردانہ ملے تھے جیسے ایک خورد اپنے بزرگ سے ملتا ہے۔ میں نے جب اس مقدمے کی روداد سنی تو فوراً میرے ذہن میں یہ خیال گزرا کہ اگر نواب صاحب کوشش کریں تو شاید ان کی وساطت سے کچھ سمجھوتہ ہو جائے۔ چونکہ مقدمے کی پیشی اگلے دن تھی اور وقت تنگ تھا اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ ابھی جا کے ان سے ملنا چاہئے تاکہ اگلی صبح عدالت کے وقت سے پہلے اس نوجوان سے بات چیت کی جا سکے۔ میں نے جب اپنے اس خیال کا اظہار وہاں دو ایک دوستوں سے کیا تو انہوں نے بھی میری اس تجویز پر صاد کیا اور زور دیا کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو اس سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ غرض کہ میں باہر نکلا اور بائیسکل پر سوار ہو کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں جب سائل صاحب کے ہاں پہنچا ہوں تو ساڑھے دس سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود جونہی انہیں میرے آنے کی اطلاع ہوئی فوراً نیچے اتر آئے اور مجھے دیکھتے ہی پوچھا "کہو، خیر تو ہے"؟ میں نے کہا "نہیں تو کوئی ایسی بات نہیں"۔ کہنے لگے "اب میں یہ ماننے سے رہا۔ اس سردی کے وقت اتنی رات گئے تمہارا آنا بے سبب تو ہو نہیں سکتا۔" الغرض میں نے بے آرامی کی معافی چاہتے ہوئے سارا قصہ بیان کیا تو انہوں نے جو کچھ جواب میں کہا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا: "میاں! تم بہت بھولے ہو تم ان مولویوں کو نہیں جانتے۔ انہیں اپنے علم کا غرور ہے، انہیں اپنی نمازوں کا غرور ہے اپنے روزوں کا غرور ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے علم اور عبادت کی وجہ سے لوگ ان کے آگے سجدے کریں اور ان کے ہاتھ چومیں۔ ان کی ہر بات پر آمنّا و صدقنا کہیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تو لڑکا اپنے سگے باپ کی نامعقول بات ماننے کو تیار نہیں اور کہہ دیتا ہے "آبا جان! یہ بات تو کچھ جی میں نہیں آئی۔" بھلا یہ کل کے مولوی ملا کیسے توقع رکھتے ہیں کہ دنیا ان کی ہر بات بے چون و چرا تسلیم کرے گی۔ تم اس نوجوان سے مل چکے ہو۔ وہ گھر کا اچھا کھاتا پیتا ہے۔ اس کے باپ میرے اچھے دوست تھے۔ یہ ان کا اکلوتا لڑکا ہے اور وہ اس کے لئے اچھی خاصی پونجی چھوڑ مرے ہیں۔ اس کی عربی اور دینی علوم کی باقاعدہ تعلیم ہوئی ہے اور وہ برا نہیں۔ مجھے اس مقدمے کا علم نہیں تھا لیکن اگر انہوں نے اس کے خلاف کچھ لکھا ہے تو اسے بجا طور پر رنج ہونا ہی چاہئے تھا اگر انہوں نے اس دوسرے عالم کی مخالفت کے جوش میں کوئی ایسی بات لکھ دی ہے جس پر قانونی گرفت ہو سکتی ہے تو انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہی چاہئے۔

جو آنکھ لگائے گا، انگارے بنے گا۔ اگر کوئی اور مجھے اس معاملے میں دخل دینے کو کہتا، تو میں کبھی نہیں مانتا۔ لیکن تمہاری خاطر ہے میں اپنی سی کوشش کروں گا، آگے جو خدا چاہے۔ کل علی الصباح جو فجر جانے سے پہلے آ جانا میں تمہارے ساتھ خود اس کے پاس چلوں گا۔

میں نے یہ طویل داستان صرف اس لئے بیان کی ہے کہ اس سے سائل صاحب کے علاوہ دین سے متعلق خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ خود کوئی بہت بڑے عالم نہیں تھے۔ اپنے جد بزرگوار کے بعد انہوں نے شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سے کچھ عربی پڑھی تھی۔ حدیث کی چند کتابیں مشہور عالم مولوی سید نذیر حسین محدث دہلوی سے پڑھیں لیکن اس کے باوجود ہم کسی طرح یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہیں عربی علوم یا مذہب کچھ ایسی بڑی ہی دسترس تھی کہ انہیں ان کی رائے کا مقابل خیال کیا جائے۔ بلکہ اپنی خاندانی روایات کے مطابق وہ بہت خوش عقیدہ تھے اور سب علماء اور اصحاب فضل کا نام احترام سے لیتے تھے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جہاں وہ حقیقی بزرگی اور علم کے قدر شناس اور پرستار تھے، وہیں بناوٹ اور ملمع کے سخت دشمن بھی تھے۔ کسی بڑے سے بڑے نام کی شوکت اور شہرت انہیں مرعوب نہیں کر سکتی تھی اور وہ اپنے خیالات کے اظہار میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔

دیکھئے! بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں ذکر کر رہا تھا کہ ہم حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مقدس کی زیارت سے مشرف ہو کر باہر نکلے اور پھرتے پھراتے جناب خواجہ حسن نظامی مرحوم کے دولت کدے پر پہنچ گئے۔ سائل صاحب اور خواجہ صاحب میں پرانی بے تکلفی تھی۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں لیکن غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ میری تحریک آپ [illegible] جناب خواجہ صاحب کی دلجوئی ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم مکان پر تشریف نہیں رکھتے تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے حسین نظامی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہاں تھوڑی دیر ان سے بات چیت ہوتی رہی اور چائے پانی سے کچھ تواضع بھی ہوئی۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب موصوف فاسفورس کے تیل اور سرمے میں کا بہت اشتہار دے رہے تھے۔ جانے کیسے ان چیزوں کا ذکر چل پڑا۔ حسین نظامی صاحب نے اپنی دونوں چیزوں کا ایک ایک نمونہ ہمیں پیش کیا اور ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے رخصت ہوئے۔

باہر نکلے تو میں نے کہا کہ اب آئے ہیں تو چلئے، آپ کے دادا جان کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھ لیں۔ چنانچہ ہم گھومتے گھامتے چونسٹھ کھمبے کے پاس اس احاطہ میں پہنچ گئے جہاں غالب ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہاں فاتحہ کے بعد مختلف قبروں کی نشان دہی کرتے رہے۔ چنانچہ بتایا تھا کہ غالب کے پاس والی قبر معروف کی ہے۔ اس کے بعد معروف کی بیوی ہیں۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے علی بخش خاں کی قبر ہے۔ معروف کی پائنتی ان کے ایک مرید محمد حیات خاں والد محمد خاں (مرحوم پدری) ہیں اور ان کے برابر میں انہی کے صاحبزادے خان بہادر محمد نظام الدین خاں ہیں۔

دلّی کی ایک ایک اینٹ کے پیچھے ایک داستان اور ایک تاریخ دفن ہے۔ ہم یونہی اٹھتے بیٹھتے، باتیں کرتے اور مختلف بزرگوں اور بادشاہوں کے مزاروں سے درس عبرت لیتے ہوئے وہاں پہنچے جہاں گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اب جو چلے، تو ٹھیک ایک بجے کے لگ بھگ قطب میں جھرنے پر رک کے دم لیا۔ یہاں کے انتظام دیکھ کر میں کچھ متعجب سا ہوا۔ شامیانے لگے ہوئے ہیں، دریاں بچھی ہوئی ہیں۔ ایک طرف چولھا گرم ہو رہا تھا۔ ایک ملازم چائے کا سامان ایک چھوٹے سے تخت پر قرینے سے لگا رہا تھا۔ جب ہم داخل ہوئے، تو نواب صاحب نے ملازم سے پوچھا، کیوں میاں بھائی کے آنے میں کتنی دیر ہے۔ حضور وہ اب آتے ہی والے ہیں۔ آپ تشریف رکھئے۔ حکم ہو تو چائے تیار کروں۔ نہیں میاں، ہم بھائی کے آنے سے پہلے کیسے پی لیں یہ تو ٹھیک نہیں۔ حضرت! اتنے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ وہ آئیں گے تو دوسرا دور ہو جائے گا۔ بس چٹکی میں تیار کئے دیتا ہوں۔ پانی تو آگ پر رکھا ہی تھا۔ اس نے ایک جھپکے میں چائے کی دو پیالیاں بنا کے ہمارے سامنے رکھ دیں۔ نواب صاحب کا حال تو مجھے معلوم نہیں، لیکن میں اس وقت تین گھنٹے کی گشت کے بعد خاصی تھکن محسوس کرنے لگا تھا۔ ہم ابھی چائے ختم بھی نہیں کرنے پائے تھے کہ پیچھے زمین پر ایک گاڑی آ کے رکی اور اس میں سے ایک بزرگ برآمد ہوئے۔ دوہرا بدن، سانولا رنگ، لانبا قد، اگرچہ عمر [illegible] زیادہ تھی، لیکن جسم اب بھی کسا ہوا، بدن پر سفید کا شیروانی نما لمبا گرم کوٹ اور نیچے گرم پاجامہ۔ سر پر بادامی رنگ کی ٹوپی۔ وہ آئے اور آداب عرض کر کے، نواب صاحب کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ جب ایک دوسرے کا حال احوال پوچھ چکے، تو نواب صاحب نے کہا، بھائی، میں تم سے اس عزیز کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ پھر میرے متعلق چند جملے کہہ کر مجھ سے فرمایا، آپ خان بہادر

حکیم امجد علی خاں صاحب بھی، میرے بچپن کے لنگوٹیے، بھائی نہیں مگر بھائی سے عزیز تر۔

جن اصحاب نے ذوق کا تذکرہ پڑھا ہے ممکن نہیں کہ وہ حافظ غلام رسول ویران کا نام نہ جانتے ہوں۔ ویران ذوق کے شاگرد تھے۔ شاگرد ہی نہیں عاشق تھے۔ کیا مجال جو ان کی موجودگی میں کوئی استاد کے خلاف کچھ کہہ جائے۔ زبان ہی تک نہیں لاٹھی سے بھی اس کی خبر لینے سے نہیں چوکتے تھے۔ قدرت بھی منصف مزاج ہے۔ اگر کہیں ایک طرف کمی رہ جاتی ہے تو اس کی کسر کہیں اور سے پوری کر دیتی ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ ویران نابینا تھے مگر غضب کے ذہین اور حافظے کا یہ عالم کہ قرآن حفظ تھا، ہزاروں شعر نوک زبان تھے۔ کسی نے کوئی اعتراض کیا اور انھوں نے جھٹ سے سند میں کسی استاد کا شعر پڑھا، جیسے اعتراض کے انتظار ہی میں تو بیٹھے تھے۔

ذوق ۱۸۵۴ء میں فوت ہوئے۔ وفات سے پہلے وہ اپنا دیوان جمع نہیں کر سکے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے اکلوتے صاحبزادے خلیفہ محمد اسمٰعیل اور مولانا محمد حسین آزاد نے کام ہاتھ میں لیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ برپا ہو گیا۔ خلیفہ محمد اسمٰعیل بھی جنت سدھارے۔ بھرے گھر میں جھاڑو پھر گئی اور اس کے ساتھ ہی ذوق کا کلام بھی ضائع ہو گیا۔ جو بچا کھچا تھا اسے مولانا آزاد لے کر نکل بھاگے۔ ذوق کے شاگردوں کو قدرتی طور پر فکر ہوئی کہ اگر کلام جلد شائع ہو کر نہ نکلا تو کوئی استاد کا نام لینے والا بھی نہیں ملے گا۔ ظہیر اور انور دونوں بھائیوں نے باہم مشورہ کیا اور حافظ ویران کے پاس پہنچے کہ یہ استاد کے سب سے زیادہ حاضر باش شاگرد تھے اور ان کا کلام بھی سب سے زیادہ ان ہی کو یاد تھا۔ چنانچہ یہ بولتے گئے اور ظہیر اور انور لکھتے گئے اور اس طرح ان تینوں صاحبوں کی کوشش سے ۱۸۵۹ء میں دیوان ذوق کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کے ایک مدت بعد مولانا آزاد نے بہت کچھ کتر بیونت کر کے بلکہ اپنی طرف سے اضافے کر کے ایک اور دیوان شائع کیا جو اب متداول ہے۔

حافظ ویران استاد کی زندگی بھر قلعہ معلی ہی میں رہے۔ ان کی وفات کے بعد محلہ کشن گنج دہلی میں رہنے لگے۔ ۱۳۰۵ھ میں فوت ہوئے۔ "خاک سدۂ خواجہ" تاریخ وفات ہے جو انھوں نے خود ہی اپنی وفات سے دو برس پہلے نکالی تھی۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ بیرونی احاطے کے صدر دروازے سے ملی ہوئی ان کی قبر ہے۔ لوح مزار پر یہ شعر کندہ ہے ؎

فاتحہ تو ویراں پہ بھی پڑھتے جانا
ان سے کہہ دو جو یہیں اس رہ سے گزرنے والے

اولاد میں صرف ایک صاحبزادی چھوڑی۔ یہ حکیم امجد علی خاں صاحب انہی صاحبزادی کی یادگار تھے۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ حکیم صاحب موصوف ویران کے نواسے ہیں تو مجھے ایک پرانا مسئلہ یاد آ گیا۔

میرے دلی آنے سے کچھ دن پہلے لاہور کے ایک نوجوان ادیب نے "خاقانی ہند" کے نام سے ذوق کی سوانح عمری لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے اور اکثر باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھ دیا کہ ذوق مذہباً شیعہ تھے۔ میرے نزدیک یہ بات درست نہیں تھی۔ اس پر میں نے اس کی تنقید میں ایک مختصر تبصرہ شائع کی تھی۔ میں نے استدلال خود ذوق کے کلام سے کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کچھ ایسا قابل اطمینان ذریعۂ تحقیق نہیں۔ اب یہ سن کر کہ حکیم صاحب ایک ایسے شخص کے عزیز ہیں جو ذوق کا دن رات کا مصاحب تھا، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ سے کبھی اپنے نانا جان سے ذوق کے معتقدات سے متعلق بھی کوئی بات چیت ہوئی تھی۔ فرمایا پہلے تو میں ان کی وفات کے وقت بہت چھوٹا تھا۔ اس عمر میں مجھے ایسی باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی لیکن اگر ہوتی تو بھی میرا سر پھرا تھا کہ میں ان سے کوئی بحث ذوق سے متعلق کرتا۔ اگر انھیں کہیں یہ شائبہ بھی ہو جاتا کہ میرے سوال سے استاد کی تنقیص یا اعتراض کا پہلو نکلتا ہے تو وہ میرا کچومر نکال دیتے۔ ذرا دیر نہ لگاتے۔ لیکن اس کا میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ ذوق شیعہ نہیں تھے بلکہ اہل سنت والجماعت میں سے تھے۔

معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کا معمول ہے کہ اکتوبر سے لے کر مارچ تک جاڑوں کے چھ مہینے ہر اتوار دوپہر کو یہاں اجمل لائبریری پر آ جاتے ہیں۔ چاہے بارش ہو، آندھی ہو، طوفان آئے، ان کے اس معمول میں فرق نہیں آ سکتا۔ اگر آپ کسی اتوار کو حکیم صاحب کو یہاں موجود نہ پائیں تو سمجھ لیجئے کہ یا تو وہ دلی میں نہیں یا اتنے بیمار ہیں کہ بستر سے ہلنے کی تاب نہیں۔ دلی میں ہوتے ہوئے اور صحت کی حالت میں ناممکن ہے کہ وہ یہاں نہ آئیں۔

کوئی گھنٹے بھر میں دوست احباب جمع ہو گئے۔ بیشتر شاعر حضرات تھے۔ ان میں دو صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک تو حضرت بیزار مرحوم تھے، دوسرے

ظہیر دہلوی کے نواسے سید اشتیاق حسین شوق۔ حضرت میرزا میر زین العابدین خاں عارف کے بھتیجے اور جناب سائل صاحب کے عزیزوں میں سے تھے بلکہ رشتے میں بھائی ہوتے تھے۔ ایک نواب احمد بخش خاں کے پڑپوتے تھے اور دوسرے ان کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کے نواسے کے بیٹے گویا چار پیڑھی اوپر دونوں کا جد اعلیٰ ایک تھا۔ حضرت میرزا انگریزی حکومت کے زمانے میں مختلف معزز عہدوں پر فائز رہے۔ نوکری سے پنشن پانے کے بعد دہلی میں اپنے خاندانی مکان میں بیٹھے اور سارا وقت عبادت میں گزارتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ برس سے زیادہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود جسم نہایت چاق و چوبند، صحت عمدہ، حافظہ اور حاضر جوابی غیر معمولی طور پر تیز تھا۔ انھوں نے ہمیں ایسے ایسے لطیفے سنائے کہ ہنستے ہنستے ہمارے آنسو نکل گئے۔ آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ باوجود پیرانہ سالی اور ضعیفی کے انھیں غیر مہذب بلکہ عریاں لطیفے تک کہنے میں باک نہیں تھا ——— ان میں سے ایک لطیفہ نقل کرتا ہوں جو نسبتاً کم عریاں ہے:

ایک مولوی صاحب تھے نماز کا وقت آیا تو مسجد میں تشریف لائے۔ بیٹھے مسواک کی پھر لوٹا ہاتھ میں لے کے جائے ضرور میں گئے اور واپس آ کے وضو کرنے لگے۔ ابھی وضو ختم نہیں کر پائے تھے کہ ان کی ہوا خارج ہو گئی اور وہ بھی آواز سے۔ اس پر جو صاحب ان کے قریب حوض پر بیٹھے وضو کر رہے تھے بولے کہ یہ آواز جو آئی کیا ہے کہ آپ نے منہ میں تو مسواک کی لیکن پیچھے جو ہے اس کو پوچھا تک نہیں؟ (اب بھی میں نے بعض لفظ حذف کر دیے ہیں اور بعض بدل ڈالے ہیں)

معلوم ہوا کہ جوانی کے عالم میں شعر بھی کہتے اور حضرت تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے ؎

حضرت پہ بھی خدا کی قدرت ہے بت ہمیں راستہ بتاتے ہیں

اس کے ساتھ انھوں نے مومن کا یہ شعر پڑھا تھا ؎

کل جو مسجد میں جا پھنسا مومن رات کاٹی خدا خدا کر کے

سید اشتیاق حسین کا نام اس لیے یاد رہ گیا کہ اس دن انھوں نے مختلف شاعروں کے پڑھنے کی ایسی ہو بہو نقل اتاری تھی کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔ خوش قسمتی سے میں دور حاضر کے اکثر مشہور شاعروں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اور میں نے ان کا کلام ان کی زبان سے سنا ہے۔ اس لیے میں نے غور سے ان کی کے بعض شاعروں کی نقل اتارنے کو کہا اور وہ ہر امتحان میں پورے اترے۔ سائل صاحب اپنا کلام بہت ترنم سے پڑھتے تھے چنانچہ مشہور ہے کہ داغ کے آخری زمانے میں جب حیدر آباد میں تہنیتی مشاعرے ہوتے تھے مشاعروں میں اکثر حضور نظام اور استاد داغ کی غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ آج کل تو شاعروں کا حال یہ ہو گیا ہے کہ اگر گلے بازی سے عاری ہوں تو لوگ انھیں سننے سے انکار کر دیتے ہیں لیکن سائل صاحب کے پڑھنے کا انداز ہمارے موجودہ شاعروں کے پڑھنے سے بہت فرق رکھتا تھا۔ گلے میں سوز ہونے کا ذکر کیا۔ اس کے باوجود ان کے پڑھنے میں ایک خاص لذت اور دلکشی تھی جو سننے سے تعلق رکھتی تھی۔ افسوس یہ انداز انھی پر ختم ہو گیا۔ جب شوق صاحب بیشتر شاعروں کی نقل اتار چکے تو میں نے ان سے کہا کہ اچھا اب سائل صاحب کی نقل فرمائیے۔ کہنے لگے بڑا مشکل کام ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے صرف ایک مصرع تک ان کی نقل اتاری ہے اور اس پر بھی مجھے کچھ ایسا اطمینان نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے وہ مصرع پڑھا۔ اگرچہ اس میں کچھ فرق تھا تاہم بڑی حد تک سائل صاحب کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ سائل صاحب جیسی لے کے صرف آثار آ گئے۔ ترنم سے اثر ہو۔

اس کے بعد کئی مرتبہ مجھے ان بھلے وقتوں کی مجلسوں میں شریک ہونے کا موقع ملا اور ہر بار میں ان احباب کی مہربانی اور خلوص، محبت اور وضعداری سے بہت متاثر ہو کر واپس آیا۔ جو پرانی دلی کی تہذیب ہی وضعداری اور روایت رکھتی تھی۔ اس کی گرفت ملکی قانون اور مذہب و شریعت سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ کیا مجال جو آپ ان بزرگوں کو اس ڈگر سے ادھر ادھر ہٹا سکیں جو انھوں نے پہلے دن اپنے لیے پسند کر لی تھی۔ حکیم صاحب کی وضعداری کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

ان کے یہاں رمضان کے مہینے میں ہر جمعہ کو افطاری کا اہتمام ہوتا تھا۔ اس میں وہ اپنے خاص احباب کو مدعو کرتے ہی تھے لیکن اس کے علاوہ دعوت عام تھی۔ اس روز جس کا جی چاہتا وہ ان کے یہاں پہنچ جاتا اور روزہ افطار کرتا۔ ہر ایک کی مناسب خاطر تواضع ہوتی۔ کھانے کے بعد حسب ذوق چائے، شربت وغیرہ سے تواضع کی جاتی۔ میں نے صرف ایک جمعہ کو حاضری دی تھی۔ بلا مبالغہ سو سوا سو آدمی سے کم نہیں ہوں گے۔ افطاری کے بعد بے تکلف احباب ٹھہر جاتے۔ کچھ دیر تفریح رہتی۔ شعر و شاعری ہوتی۔

حکیم صاحب موصوف نے ۳۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کو فالج کے مرض سے وفات پائی اور اپنے نانا نیّر مرحوم کی طرح درگاہ خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوئے۔ سائل صاحب نے اپنے ایک عزیز دوست کی تاریخ وفات لکھی جو لوحِ قبر پر کندہ ہے:

بود مرد از نسلِ افغاں چارہ سازِ بیکساں　　حاجیِ بیت الحرام و زائرِ دارالٰہی
کرد رحلت از جہان و داد رنج بیکساں　　از فراقِ جاودانی درد و داغِ دائمی
سالِ تاریخِ وفاتش سائلِ دہلی نوشت
"نورِ عالم خاں صاحب حاجی امجد علی"
۱۳۵۷ھ

اس کے بعد وہ قطب صاحب کے جشن اور اجتماع بھی ختم ہو گئے۔

وہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

باقی ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

سائل صاحب کی پہلی بیوی نواب ممتاز حسین خاں والیٔ جھجر کی ہمشیرہ تھیں لیکن یہاں بیوی ہی بیوی کی زندگی اور جلد ہی گزر گئی۔ اس بیوی سے ان کے ایک بیٹا ہوا تھا جو صغر سنی ہی میں فوت ہو گیا۔ اس کا نام مظفر مرزا تھا یہی وہ بچہ تھا جس کی پیدائش کی کیفیت الاعظم کا باعث ہوا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا نکاح استاد داغ کی منہ بولی بیٹی لاڈلی بیگم سے ہوا جو ان کے چھوٹے بھائی میرزا امین الدین احمد خاں کی بیوہ تھیں۔ داغ کی اپنی صلبی اولاد صرف ایک بیٹا احمد تھا جو انہیں کم عمری ہی میں داغ دے گیا۔ انہوں نے ایک شعر میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

احمد کے غم میں دیدہ و دل کیوں نہ ہوں تباہ　　آنکھوں کا نور تھا مرے دل کا سرور تھا

اس کے بعد داغ نے لاڈلی بیگم کو گود لے لیا جو ان کی سالی اور بیگم کی نواسی تھیں۔ اس سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں تحریر زمانہ مرحوم کے علاوہ نے مجھ سے کہا تھا کہ یہی نواب سراج الدین احمد خاں ہیں کے گھر میں بارہ کی بیگم ہیں۔ میں نے جو شروع میں ذکر کیا ہے کہ لال قلعہ کے اندر ایک والان کے کھڑکے کے اوپر ایک تختی پر لکھا تھا "مکان لاڈلی بیگم" تو اس کا یہی مطلب تھا۔

جناب بیگم صاحبہ مرحومہ سائل صاحب سے کوئی بیس برس چھوٹی تھیں یعنی جب سائل صاحب کا نکاح ہوا ہے تو یہ کوئی ۱۸، ۱۹ برس کی تھیں اور وہ ۳۸، ۳۹ برس کے۔ ایک تو اس وجہ سے اور دوسرے یہ کہ وہ استاد زادی تھیں نواب صاحب بہت منکسر ان سے ڈرتے تھے اور یہ ان سے نرم گرم بات کر لیتی تھیں۔ جنوری ۱۹۴۲ء کے جاڑوں میں سائل صاحب حیدرآباد گئے تو وہاں انہیں ایک خوفناک حادثہ پیش آیا جس سے ان کے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد وہ بہت معذور ہو گئے اور بیساکھی کے بغیر چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے تھے جیسا کہ اس عمر میں ایسی سخت چوٹ مشکل ہی سے بالکل ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن اگر مناسب علاج ہوتا اور نواب صاحب حقیقتاً توجہ کرتے تو کم از کم وہ بہت چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے لیکن ان کے مزاج میں شروع سے بے پروائی اور کاہلی بھی تھی۔ انہوں نے نہ صرف خود اس طرف مناسب توجہ نہ کی بلکہ اس معاملے میں وہ کسی اور کی بھی نہیں سنتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ بعض اوقات بیگم صاحبہ بہت خفا ہوتیں —————— اور برہم ہو کے کہا کرتی تھیں یہ تو مرض کو پال رہے ہیں۔ بھلا جب تک اس کا مناسب علاج نہیں ہوگا یہ کیسے تندرست ہو جائیں گے۔

سائل صاحب اپنے استاد کا بہت ادب کرتے تھے دن میں کسی نہ کسی سلسلے میں بیسیوں مرتبہ ان کا ذکر آ جاتا۔ داغ صاحب کی بات اور داغ صاحب کی وہ بات۔ اپنے استاد بھائیوں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ جناب احسن مارہروی مرحوم، جناب نوح ناروی، جناب بیخود دہلوی وغیرہ سے میں سائل صاحب ہی کے ہاں ملا ہوں۔

استاد داغ کے متعلق کی کتنی باتیں مجھے سائل صاحب سے معلوم ہوئی تھیں جن میں سے بعض گفتنی ہیں بعض ناگفتنی۔

ایک دن اس سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی میں نے کہا۔ آپ کے خاندان نے انہیں نواب شمس الدین احمد خاں کا بیٹا تسلیم نہیں کیا —— آپ کی

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

اس میں کوئی شک نہیں کہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تھے۔

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تھا۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جب نواب شمس الدین احمد خاں کو پھانسی ہو گئی [illegible] تھی۔

ایک [illegible] [illegible] سے خالی نہ ہوگا۔

داغ کی شاعری کو دیکھ کے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ شخص شراب ضرور پیتا ہوگا۔ ایک مرتبہ مولانا نیاز فتح پوری نے داغ کے [illegible] اس شعر پر

[illegible] [illegible] شراب [illegible] کیا چیز حرام ہو گئی ہے

لکھا تھا کہ جس شخص نے کبھی پی نہ ہو وہ ایسا شعر کہہ ہی نہیں سکتا۔ میں نے ایک دن سائل صاحب سے اس کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے نہایت وثوق سے فرمایا۔ داغ صاحب نے کبھی شراب نہیں پی اور لوگوں کا یہ بالکل غلط خیال ہے [illegible] تھے۔

[illegible] ہوں گے۔

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

دعوت دی جاتی تھی۔ سائل صاحب بھی ان مشاعروں میں آتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے مشاعرے کے بعد جب وہ دہلی سے نکل رہے تھے، تو کسی نومشق نے پوچھا کہ دہلی میں آپ کا پتا کیا ہے، جس پر آپ کی خدمت میں خط لکھا جائے۔ یک دم کھڑے ہو گئے اور ہاتھ کی لکڑی کو زمین پر مارتے ہوئے چمک کے بولے میاں صاحبزادے، خط پر صرف "سائل دہلی" لکھ دینا، مجھے مل جائے گا۔ اسی طرح کا جواب ایک موقع پر غالب نے نواب علاؤالدین احمد خاں کو دیا تھا کہ بے شک صرف میرا نام اور دہلی لکھ دیا کرو، خط مجھ تک پہنچ جائے گا۔

لیکن اس کے باوجود طبیعت میں حد درجہ انکسار اور مروت کا مادہ تھا۔ کوئی ان کے پاس چلا جاتا، انہیں ملنے اور اس کی فرمائش پوری کرنے سے انکار نہیں ہوتا تھا۔ کوئی صاحب تشریف لے آتے اور کلام سنانے کی فرمائش کر دیتے۔ وہ اندر سے بیاض منگواتے، اور شعر سنانے لگتے۔ اب جب تک وہ شخص خود یہ نہ کہہ دے شکریہ، بس کیجیے، یا کوئی اور ذکر چھڑ جاتے، سائل صاحب بیاض ہاتھ سے نہ رکھتے۔ اگر کوئی صاحب ذوق آدمی ہوتا، تو خیر ایک بات بھی تھی، لیکن بعض اوقات ایسے ایسے گاؤدیوں سے واسطہ پڑ جاتا، جو نظم اور نثر کا فرق تک نہیں جانتے تھے۔ اب جانے والے زمانے کی بات، لیکن نواب صاحب بڑے حلیم، ان سے اسی طرح ان سے بھی پیش آتے۔ میں بہت جز بز ہوتا۔ ایک آدھ مرتبہ شکایت بھی کی کہ آپ کیوں ایسے کوڑھ مغزوں کو ٹال نہیں دیتے۔ ہمیشہ یہی جواب ملا۔ بیٹا! انکار کرنے کی جرأت نہیں پڑتی کہ اس سے اس کی دل شکنی ہوگی۔ تم نے سنا نہیں۔ دل بدست آور کہ حج اکبر است۔

ان کی زبان کی تعریف کرنا تحصیل حاصل ہے کہ ان کے خاندان کی زبان ہمیشہ مستند اور ٹکسالی سمجھی گئی ہے۔ اگر اردو کے محاورے کا لطف لینا ہو تو سائل کا کلام دیکھیے۔ باوجود داغ کا شاگرد ہونے کے انہوں نے استاد کی سیدھی سادی شاعری کا تتبع نہیں کیا۔ یہ چیز داغ سے مخصوص تھی اور انہی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ امیر مینائی نے اس میدان میں مقابلے کے لیے کچھ کوشش نہیں کی، لیکن نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ امیر کے شاگردوں میں سے ریاض خیرآبادی، حفیظ جونپوری اور جلیل مانکپوری نے اس رنگ کو نباہنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ خود داغ کے شاگردوں میں بعض بہت کامیاب ہوئے۔ احسن مارہروی، نوح ناروی، بیخود دہلوی استاد فن ہیں۔ مضطر خیرآبادی کی غزل میں استاد کا رنگ چوکھا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ داغ اپنے رنگ کا واحد مالک ہے۔ سائل نے شروع سے بھانپ لیا تھا کہ اس کوشش میں وقت ضائع کرنا بیکار ہے۔ انہوں نے اپنے لیے نئی راہ نکالی۔ زبان تو ان کی ہونا ہی چاہیے تھی، انہوں نے اس میں خاص عاشقانہ خیالات اور معاملات کے علاوہ مضمون آفرینی کی طرف توجہ کی اور بہت حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ انہوں نے بعض اوقات بہت مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے اور ان میں ایسے ایسے شگفتہ اور پر لطف شعر نکالے ہیں کہ کچھ انہی سے ممکن تھا۔

ان کی شاعری کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی اور بلا مبالغہ ایک لاکھ شعر سے کم ان کا سرمایہ نہیں ہوگا۔ لیکن ان کا بہت بڑا کارنامہ ان کی مثنوی نور محل ہے جس میں بنیادی طور پر اگرچہ نور الدین جہانگیر بادشاہ اور ملکہ نور جہاں بیگم کی حیات معاشقہ کا بیان ہے، لیکن اس میں اور بھی بیسیوں مسائل آ گئے ہیں۔ افسوس کہ یہ نامکمل رہ گئی، ورنہ خاصے کی چیز ہوتی۔ اب بھی اس میں سات آٹھ ہزار شعر سے کم نہیں ہوں گے۔

زمانے کا مذاق بدل گیا۔ ان کے سارے دیوان کون چھاپے گا اور کون پڑھے گا۔ لیکن اگر کوئی اللہ کا بندہ چار پانچ ہزار شعر کا انتخاب ایک مجلد میں شائع کر دے، تو یہ زبان کی واقعی خدمت ہوگی۔ اور مثنوی تو ضرور ہی چھپ جانا چاہیے، اگرچہ وہ نامکمل ہی ہے۔ بقول نظیری نیشاپوری

ہزار نقش دریں کارگاہ کار آراست
مگیر خردہ نظیری، بہ ہم نکو بستند

چودھری افضل حق (مرحوم)

شورش کاشمیری

ہم بعض لوگوں کو بہت جلد بھول گئے ہیں۔ ان میں مرحوم افضل حق بھی ہیں۔ فی زمانہ یارانِ قلم کی گروہ بندی نے بہت سی قابل قدر شخصیتوں کو طاق نسیاں کا گلدستہ بنا دیا ہے اور بہت سی ہستیوں کو شہرت کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

پنجاب میں مرحوم کی قومی زندگی میں پہلی جنگ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک جن لوگوں نے عزت کا مقام پیدا کیا ان میں بعض شخصیتیں ادب و سیاست کے امتزاج کی مظہر تھیں۔ چودھری صاحب بھی انہی میں سے ایک تھے لیکن سیاسیات کے اختلافی گروہ بندی نے انہیں اوجھل کر دیا اور آج وہ محض اس لئے ایک فراموش شدہ عظمت ہیں کہ ان کے گرد و پیش اعتراف و احساس کا کوئی متعلق نہیں۔ وہ زندگی میں بھی مفلس کا چراغ تھے اور زندگی کے بعد بھی گمنام قبر ہیں جس پر کوئی کتبہ آویزاں نہیں ہے۔

—— چودھری صاحب کی زندگی ہمیشہ مختلف دھاروں کا سنگم رہی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے خلاف بہت بڑا احتجاج تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز پولیس کے سب انسپکٹر کی حیثیت سے کیا تھا۔ جس زمانہ میں وہ پولیس کے سب انسپکٹر بھرتی ہوئے تب ہندوستانیوں میں سے بہت کم لوگ سب انسپکٹر ہوتے تھے۔ اس "اعزاز" کے مستحق چیدہ چیدہ خاندانوں کے چیدہ چیدہ لوگ ہی سمجھے جاتے تھے۔ مرحوم چودھری صاحب ہوشیار پور کے ممتاز راجپوتوں میں سے تھے۔ ان کے بڑے بھائی بھی پولیس ہی میں تھے اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ چودھری صاحب پولیس میں رہتے تو عجب نہ تھا کہ اپنی ذہانت و فراست کے بل پر پولیس کا اونچے سے اونچا عہدہ حاصل کرتے اور عین ممکن تھا کہ پنجاب میں جن ہندوستانی پولیس افسروں کی آج تک دھوم ہے ان میں سے ایک ہوتے لیکن تحریک خلافت کے آغاز میں مستعفی ہو گئے۔ —— سید عطاء اللہ شاہ بخاری فرماتے ہیں کہ وہ ہوشیار پور کے ایک جلسہ عام کو خطاب کر رہے تھے اور چودھری صاحب مرحوم اس جلسہ میں ان کی تقریر کے نوٹ لے رہے تھے۔ میں نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو مجھے ایک قبول صورت نوجوان کے چہرے پر جلال پیدا کرنے والی وردی نے بہت متاثر کیا۔ میں نے اثنائے تقریر میں کہہ دیا:

"اے کاش مجھے اس طرح کے نوجوان مل جائیں تو میں چند دنوں میں ہندوستان کی کایا پلٹ دوں لیکن

کیا کروں، میرے نوجوان زندگی بازی کی صف میں وردی پہنے کھڑے ہیں۔"

کچھ دنوں بعد لاہور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں جمعیتہ العلماء کا اجلاس منعقد ہوا تو چودھری صاحب نے اس اجلاس میں مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا ——— انگریزوں کے لئے کسی لیڈر کا مستعفی ہونا انتظامی نقطۂ نگاہ سے انتہائی خطرناک تھا۔ مسٹر بری کنٹن کول اس زمانے میں جالندھر ڈویژن کے کمشنر تھے۔ انہوں نے چودھری صاحب کو ڈرانے دھمکانے پھر جانے سمجھانے کی سرتوڑ کوشش کی، مگر چودھری صاحب قدم اٹھا چکے تھے اور پیچھے ہٹنے کو مطلق تیار نہ تھے ——— انگریزوں نے دو سال کے لئے قید کر دیا۔ یہ دور بڑا نازک تھا۔ چودھری صاحب کوئی بڑے لیڈر یا حکومت کا رکن نہ تھے، اعزہ و اقربا سرکار پرست تھے۔ جیل نے حکام بالا کے ایما پر سختیاں شروع رکھیں، قید تنہائی میں ڈالا، بیڑیاں لگائیں، چکی پسوائی، کھردری کملی اوڑھائی، ٹاٹ کے کپڑے پہنوائے، غرض کہ انگریزوں نے اذیتیں دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر چودھری صاحب نے ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا ——— پنڈت جگت رام شرما قید خانے میں آپ کے ساتھی تھے وہ رہا ہو کر آئے تو انہوں نے روزنامہ "بندے ماترم" میں ان مظالم کے خلاف احتجاج کیا، جس سے لوگوں کو پہلی دفعہ ان کی شخصیت اور ہمت کا علم ہوا۔

——— "دنیا میں دوزخ" "قید خانے کے کوائف" ان کی پہلی تصنیف ہے جو آپ نے رہائی کے بعد قلمبند کی۔ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی ہوشیارپور نے اس کو شائع کیا اور رہائی کے بعد آپ کو ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کا صدر منتخب کر لیا گیا۔

تحریک خلافت ختم ہو چکی تو مختلف جماعتوں کی صلاحیتوں کا بھرم کھلنے لگا مگر چودھری صاحب رفتہ رفتہ ابھرتے ہی گئے حتیٰ کہ دو چار برس ہی میں صوبے کے مسلمان لیڈروں کی صف اوّل میں شمار ہونے لگے۔ چنانچہ ہندوستان میں اندر خانہ جتنی اتحاد کانفرنسیں منعقد کی گئیں ان میں پنجاب کے مسلمانوں کی طرف سے آپ کو بھی مدعو کیا جاتا رہا اور ہمیشہ آپ کے مشوروں کی قدر کی گئی ——— اس رفتار نے انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا چنانچہ پہلی بار جب پنجاب کونسل کے انتخابات ہوئے تو ہوشیارپور کے مسلم حلقے سے لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہو گئے ——— پنجاب کونسل میں آپ کی قابلیت کے نقش ابھار واضح ہوئے، خود انگریز ممبروں نے ان کی جرأت و قابلیت کا اعتراف کیا اور اس کی شہادت کونسل کے اجلاسوں کی مطبوعہ کارروائیوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

میاں فضل حسین مرحوم آپ کے بے حد گرویدہ تھے، ہمیشہ آپ کی انتقادی تقریر کو توجہ سے سنتے ——— وہ تمام زندگی کوشاں رہے کہ چودھری صاحب اپنی موجودہ راہ سے ہٹ کر ان کے ہم قدم چلیں اور حکومت میں شریک ہوں لیکن چودھری صاحب ہمیشہ ان کے اس خیال کی مزاحمت کرتے اور اپنے طرز عمل کی سچائی پر اصرار کرتے تھے۔

چودھری صاحب مرحوم انتہائی عاجز طبیعت کے رنگ تھے۔ ہمیشہ لیڈروں کی سی نمود سے پرہیز کیا، انکسار ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کیا ہیں، بس جو کچھ تھے انتہائی عاجزی کے ساتھ تھے ——— صرف ایک دفعہ انہوں نے جیلخانوں میں اصلاحات کے مسئلہ پر بعض باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جیلخانوں کے سدھارنے میں میں نے جو کوششیں کی ہیں مجھے ان پر جائز فخر ہے۔

جن دنوں بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی جیلخانے میں اصلاحات کا مطالبہ کر رہے تھے اور بھوک ہڑتال پر تھے چودھری صاحب غیر سرکاری وزیٹر ہونے کے علاوہ اصلاحاتی کمیٹی کے ممبر تھے۔ آپ نے اس معرکہ میں جس مستعدی کا ثبوت بہم پہنچایا اس سے اپنے پرائے سب عش عش کر اٹھے گو آپ کو اس کمیٹی کی رکنیت سے محروم ہونا پڑا، لیکن آپ نے "دنیا میں دوزخ" کے شعلوں کو بجھا کر دم لیا۔ ایک قابل ستائش کارنامہ انجام دیا۔ واقفان حال کو معلوم ہے کہ اصلاحات کی سب سے پہلی قسط کے محرک آپ ہی تھے۔

سنہ ۳۰ء میں کانگریس نے ڈانڈی مارچ کیا تو گاندھی جی کے بعد دوسری مجلس عاملہ کے ارکان میں سے ایک آپ بھی تھے ——— سردار

[illegible] مچاتی تھیں۔ [illegible] رہتے تھے اور مارچ ایسے رہنما کن دہلی میں مجلس [illegible] کو گرفتار کرلیا گیا۔ آپ کو گورکھپور جیل میں رکھا گیا جہاں آپ نے اپنی مایۂ ناز تصنیف 'زندگی' سپردِ قلم کی ——— اس کتاب کے شائع ہوتے ہی آپ کے قلم کی دھاک بیٹھ گئی۔ چراغ حسن حسرت نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ جو باتیں علامہ اقبالؒ نے حسین اداؤں کے ساتھ کہی ہیں وہ چودھری صاحب نے سیدھے سادے الفاظ میں کہہ دی ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے 'زندگی' کی تعریف میں نظم لکھی۔ تمام ملک کے جرائد و رسائل نے خراج ادا کیا۔ پنجاب یونیورسٹی نے پہلا انعام پانچ سو روپے دیا۔ اٹھارہ سال یہ کتاب ادیب عالم کے نصاب میں رہی اور غالباً اب بھی شریکِ نصاب ہے۔

——— ۱۹۳۱ء کے بعد آپ نے پنجابی رفقاء کے ساتھ مل کر اپنی الگ راہ قائم کی۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں جس مجلسِ احرار کی بنا ڈالی گئی تھی کو مسلمانوں کی ایک علیحدہ تنظیم کے طور پر زندہ کیا گیا، تحریکِ کشمیر کی ہمہ گیری نے انہیں مورخِ احرار کا درجہ دیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری انہیں پیار سے احرار کے 'مہاتما جی' کہتے تھے۔ تحریکِ کشمیر سے لے کر دوسری جنگِ عظیم کے مختلف النوع ہنگاموں میں ان کی شخصیت کے دونوں پہلو ابھرتے گئے ———

ادبی زندگی میں انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ 'میرا افسانہ' ۴ جلد (خود نوشت سوانح) 'جواہرات' (افسانے)، 'شعور رقص (ڈرامہ)'، 'محبوبِ خدا (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح)'، 'دینِ خدا (اسلامیات)'، 'خطوطِ افضل حق (بیٹی کے نام خط)' 'تاریخِ احرار' اور انگریزی میں 'پاکستان و چھوت چھات' ———

افسوس ہے کہ ہمارے تنقید نگاروں نے ان کی ادبی زندگی سے انصاف نہیں کیا، حالانکہ وہ اسلوب سے لے کر مقصدیت تک صاحبِ طرز تھے۔ ہمارے ہاں بعض افسانہ نگاروں نے صرف ایک مجموعہ یا ایک افسانہ کی بنا پر ادبِ اردو میں جگہ حاصل کی ہے اور اس کی وجہ محض ادب میں دھڑے بندی ہے ورنہ ادب کی کوئی ترازو ایسی نہیں جس میں چودھری صاحب کے رشحاتِ قلم تل نہ سکتے ہوں اور ان کا پلڑا مقابلتاً جھکا ہوا ہو۔

——— اگر ادب کا مقصد تفسیرِ حیات، تنقیدِ حیات اور تعمیرِ حیات ہے تو 'زندگی' اس معیار پر پوری اترتی ہے، جتنا اثر نوجوانوں پر 'زندگی' نے ڈالا ہے اتنا شاید اس دور میں نثر کی کسی ایک کتاب نے نہیں ڈالا۔ لیکن یہ دوسری بات ہے کہ ادب کے سیاسی نقادوں کی نگاہیں اس طرف اٹھتی ہی نہیں اور اٹھتی ہیں تو پیچھے کو لوٹ جاتی ہیں۔

——— سیاسی زندگی میں چودھری صاحب "مسلمان سوشلسٹ" تھے۔ ایک زمانہ میں انہوں نے "اسلام میں امراء کا وجود نہیں" لکھ کر طلباء کی صفوں میں ہیجان پیدا کر دیا تھا، حتیٰ کہ ان کے کئی احرار ساتھی بھی ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ حالانکہ جو بات وہ کہنا چاہتے تھے اس کے مبادی کا شعور بھی ان حضرات کو نہ تھا۔

"تاریخِ احرار" بظاہر احرار کی تاریخ ہے لیکن حقیقتاً مسلمانوں میں طبقاتی احساس کے نشو و نما کی تاریخ ہے۔ مرحوم نے اس کتاب میں احرار کے جھگڑے سے اپنا ذہن نکال کر تمام پیش کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ان کے غصے اور احتجاج کا اندازہ ہوتا ہے جو ان کے دل میں سرمایہ دار طبقہ کی بدولت کھولتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ قرآن مجید میں سرمایہ داری کے خلاف جو احکامات ہیں ان کو یکجا کریں اور پھر ان تفسیروں، تعبیروں اور تاویلوں کے بخیے ادھیڑیں جنہیں مختلف اوقات میں حکمرانوں کی منشا کے مطابق ڈھالا گیا لیکن اس کی راہ میں کئی دشواریاں حائل تھیں مثلاً:

۱ - وہ اس مضمون کی صدیوں پرانی داستان کو سمیٹنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔

اولاً وہ وسیع المطالعہ نہ تھے، ثانیاً انہیں عربی کا بنیادی علم نہ تھا، ثالثاً عصری تحریکوں کے علمی رجحانات سے کماحقہ آگاہ نہ تھے، ان کا تجربہ صرف عملی سیاسیات کے بارے میں تھا۔

۲ - جس وقت انہوں نے اس انداز میں سوچنا شروع کیا وہ فکر و بحث کی اس یلغار کے لئے موزوں وقت نہ تھا۔

۲۔ جس ماحول میں وہ خود رہتے تھے وہاں دانشور، مفکر تھے اور مجذوب زیادہ تھے۔

—— تمام زندگی فقر و فاقہ میں بسر کی، لیکن وضعداری پر ایک تنکے کے لئے بھی آنچ نہ آنے دی —— جو کیا یا جماعت کی نذر کیا ان کے اخلاص و دیانت کی مثالیں اس دور کی پوری تاریخ میں نایاب ہیں —— ہندوستان میں ایثار پیشہ لیڈروں کی کمی نہیں، لیکن مسلمانوں میں اس کا قحط رہا، لیکن چودھری صاحب محدود ہونے کے باوجود بے پایاں تھے، انتہائی سیر چشم، اچھے گھرانے میں پرورش پا کر فقیری کی زندگی اختیار کی، وقار و اعزاز کی بالائی منزل میں قدم رکھا تو پھر اترے نہیں، اور اترے تو دوش پر —— آخری سفر کے لئے —— دونوں ہاتھ کھلے تھے لیکن دن بھر کے ہاتھ پہنچے والوں کو خبر نہ ہونے دی، مسکراتا چہرہ، متحرک آنکھیں، نرم گفتار، کہیں سے پیسے مل گئے، بعض کتابوں کی رائلٹی مل گئی، یا پنجاب کونسل میں حاضری کا چیک آ گیا تو اکثر و بیشتر احباب میں تقسیم ہو گیا۔

شادی کی ضرورت ہے، مولانا حبیب الرحمٰن سوالی ہیں، ماسٹر جی کے پاس کرایہ نہیں، جانباز مانگتا ہے، سردار شفیع کو بل چونگی کے پھر قرض درکار ہے، فلاں رضاکار کی شادی ہے، فلاں کارکن بیمار ہے اس کے پاس دوا کے لئے پیسے نہیں —— اور چودھری صاحب ہیں کہ اپنے آپ کو بیچ کر سب مطالبات کو پورا کر رہے ہیں۔

شہر میں جیسے گھر میں فاقہ، کوئی ساتھی روپیہ لے کر آ گیا تو عید ہو گئی ورنہ سب اچھا!

دو دفعہ کونسل کے ممبر منتخب ہوئے، ایک دفعہ ملکی ستیہ گرہ کی تحریک کے آغاز میں مستعفی ہو گئے، تیسری دفعہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا لیکن رہ گئے —— اور وہ اس طرح رہ گئے کہ صوبائی خود مختاری کے تحت پہلا انتخاب تھا، اب کے وزارتیں قائم ہو رہی تھیں، سردار سکندر حیات ہر قیمت پر شکست دلوانا چاہتے تھے، لاہور کے بہت سے ارباب نجف اور جبہ کے ہوشیار پور کے حلقۂ انتخاب میں وارد کئے گئے جنہوں نے بازو پھیلا پھیلا کر اعلان کیا کہ شہید گنج میں ان پر جو کچھ بیتی اس کا ذمہ دار چودھری ہے۔ مسلمان جذباتی قوم، ہوا کا رخ پلٹا، چودھری صاحب ہار گئے۔ پھر اس کے بعد بھی منتخب نہ ہو سکے، جب کھڑے ہوتے یونینسٹ پارٹی پوری طاقت سے مقابلہ کرتی، نتیجہ یہ نکلا کہ شکست کھا جاتے۔ ایک دفعہ راقم نے عرض کیا:

”چودھری صاحب! الیکشن لڑنے سے فائدہ؟ ہمیشہ زک اٹھانی پڑتی ہے“

ہنسنے لگے، ”شورش! میں اس لئے الیکشن نہیں لڑتا کہ مجھے جیتنا ہی ہے، میں اس لئے بھی الیکشن لڑتا ہوں کہ مسلمان امراء کو احساس ہو کہ غریب ان کا مقابلہ کر سکتا ہے اور غرباء میں یہ ذہن پیدا ہو کہ امراء کا مقابلہ کرنے سے عزت نفس بڑھتی ہے۔“

—— چودھری صاحب کی مجموعی قید کوئی آٹھ یا نو برس ہے۔ جیل سپرنٹنڈنٹوں اور جیلروں کے پاس انہیں مختلف جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا وہ ان کی سیرت کے شاہد تھے تو قریباً سب متفق الرائے تھے کہ وہ سیاسی قیدیوں میں غیرت مندی، خودداری اور بہادری کے اعتبار سے گوہر یگانہ تھے، اور ساتھ ہی انہوں نے جیل کیا، جو مصیبت آئی خندہ پیشانی سے جھیلی، کبھی کسی آفت پر اف نہ کی —— دمہ کا مرض جیل ہی میں لگا، آغاز معمولی تھا اس میں نام کو بھی خرابی نہ تھی لیکن جیل خانے میں ہمیشہ کے لئے گھر کر گیا۔ آخری بار ستمبر ۱۹۴۰ء میں قید ہوئے اور گجرات جیل راولپنڈی میں دمہ اٹھا، حکومت سے علاج کے لئے کہا لیکن مسترد ہو گیا، آخر رہا کر دیا، بہتیرا علاج کیا لیکن ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آخر افق حریت کا یہ ستارہ ۸ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

—— انسانی سیرت کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اس میں رچ بس گئے ہوں وہ بھی اس کے کردار کی گواہی دیں۔ چودھری صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ انہوں نے زندگی کے ہر موڑ پر ساتھیوں سے خراج وصول کیا۔ ان کے سب سے بڑے دشمن کا نام حقہ تمباکو کا

کے سخت خلاف تھے، انھوں نے اپنی کتابوں میں بھی اس کے خلاف جہاد کیا اور مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں کی ناکامی کے اسباب میں اس کو سرفہرست رکھا ہے۔ اس کا تلخ تجربہ انھیں تحریکِ کشمیر میں ہوا جبکہ احرار کے فراہم شدہ زرِ امانت میں سے نصف روپیہ قیدی رضاکاروں کو سگرٹ مہیا کرنے میں اٹھ گیا، کیونکہ بصورتِ دیگر ان کے معافی مانگ کر نکل آنے کا اندیشہ تھا اور اس صورت میں تحریک کی عزت بھی ختم ہو جاتی۔ اس کے علاوہ وہ حقہ نوشی کو کاہلی سمجھتے، اور تمباکو کی مضرتوں کو ام الامراض سے تعبیر کرتے تھے۔

ان کے سامنے کوئی ساتھی حقہ نہیں پی سکتا تھا۔ عام رضاکاروں کو ہمیشہ اجتناب کی تلقین کرتے بلکہ ان سے عہد لیتے، لطف کی بات یہ ہے کہ احرار کے ممتاز رہنماؤں میں ایک آدھ رہنما کے سوا چوہدری کے سبھی لیڈر حقہ نوشی کے خلاف تھے ———

افراد و جماعت کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ اتنا صاف تھا کہ بسا اوقات پڑھ کر حیرت ہوتی، بعض سیاسی تحریکوں کے متعلق انھوں نے عجیب و غریب تجزیے کئے ہیں۔ علامہ اقبال کو وہ اپنی صف میں سے سمجھتے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد کو علم کا شہنشاہ جن کے ہاں تخیل و افکار الفاظ سے شکن آجاتی ہے۔ جواہر لال نہرو کو سیاست کا لاڈلا بچہ جو چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوا ہے۔ گاندھی جی کو شاطر سیاستدان جو بنیا تھا اور مدبر کا ایک دلآویز آمیزہ تھے۔ کانگرس کو وہ ہندو سرمایہ داری کا قلعہ اور مسلم لیگ کو ظالم امراء کی آخری جائے پناہ سمجھتے تھے۔ غرض خلاصۂ کلام یہ تھا کہ:

> "احرار کبھی اس غریب کو ساتھ لے کر نہیں چلتے جو ان کی بات پر سوچتا ہو،
> ان سے اختلاف کرے، ان کے مقابلہ میں ذہین ہو اور ان سے علیحدہ بھی
> اپنی شخصیت کو ابھار سکے۔"

چوہدری صاحب میں یہ چاروں خصوصیتیں بدرجۂ اتم تھیں، نتیجہ معلوم کہ وہ بساطِ سیاست پر ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح ختم ہو گئے، حتیٰ کہ زمانے کے ساتھ انھیں دوست بھی بھول گئے۔

سیماب اکبرآبادی

نثار اٹاوی ایم۔ اے

سنہ ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔ میں بذریعہ مراسلت علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو چکا تھا مگر جذبۂ اشتیاق جو باقی تھا۔ ایک دن اس جذبۂ شوق کی شدت سے مجبور ہو کر آگرہ پہنچا۔ غالباً مئی یا جون کا مہینہ تھا۔ میری تربیت کچھ ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں استاد کا احترام فرض عین سمجھا جاتا ہے۔ استاد کی خدمت میں نذر پیش کرنا اور خصوصاً اس وقت جب استاد سے پہلی مرتبہ شرفِ نیاز حاصل ہو رہا ہو ضروری تھا۔ مگر اس زمانہ میں میری مالی حالت نہایت سقیم تھی۔ ایک مقامی اسکول میں معلمی کے عوض مجھے آٹھ روپیہ ماہانہ ملتے تھے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس سفر کے لئے کہاں سے مصارف کا انتظام کیا۔ استاد کی نذر کے علاوہ شیرینی لے جانا بھی ضروری معلوم ہو رہا تھا چنانچہ شہر سے ایک ٹوکری خرید کر دو روپیہ کی مٹھائی خریدی مگر وہ تو ٹوکری کی تہ ہی میں سما گئی۔ بڑے شش و پنج میں تھا کہ اتنی بڑی ٹوکری میں یہ ذرا سی مٹھائی لے کر کیا جاؤں۔ آخرکار ایک تدبیر سمجھ میں آ گئی۔ ایک روپیہ کے پھل خرید لئے۔ چند سنگترے، چند کیلے، اور غالباً ایک یا دو خربوزوں نے ٹوکری کو پُر کر دیا۔ تانگہ میں ٹوکری رکھ کر قصر الادب کی طرف روانہ ہو گیا۔ قصر الادب عمارت کی بالائی منزل پر تھا۔ میں ٹوکری لے کر اوپر پہنچا۔ صحن کے بعد ایک کمرہ تھا۔ اس سے ملحق ایک کوٹھری تھی جس پر پھولدار رنگین پردہ لٹک رہا تھا۔ بیرونی کمرہ میں ایک صاحب لکھنے پڑھنے میں مصروف تھے۔ میں ان سے ناواقف تھا۔ میں نے دریافت کیا مولانا کہاں ہیں؟ انھوں نے کوٹھری کی جانب اشارہ کر دیا۔ میں نے پردہ اٹھایا۔ دیکھا فرش پر سفید چادر اور قالین بچھا ہے۔ قالین پر حضرت علامہ گاؤ تکیے کے سہارے دراز کش ہیں۔ بیرون کی جانب ایک اور صاحب تشریف فرما ہیں۔ (بعد کو معلوم ہوا کہ وہ جناب محمد صادق صاحب ضیا چنیوٹی تھے) میں نے سلام کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ علامہ مرحوم کھڑے ہو گئے اور معانقہ کیا۔ ضیا صاحب سے بھی ہاتھ ملایا۔ مولانا فرمانے لگے "نثار صاحب! آپ تو میرے تصور میں کوئی مسن شخص تھے۔" میں نے عرض کیا۔ "جیسا ہوں حاضر ہوں"۔ مولانا نے میرے قیام کے متعلق دریافت فرمایا۔ میں نے عرض کیا "صرف آپ کے دیدار سے مشرف ہونے آیا ہوں۔ آپ سے نیاز حاصل کرنے کے بعد پہلی ٹرین سے واپس ہو جاؤں گا۔" مولانا نے بہت اصرار کیا کہ دو ایک روز قصر الادب میں مہمان رہوں مگر مجھے اس کو گوارا نہ ہوا کہ جب مجھ میں اتنی استطاعت

نہیں ہے کہ استاد کو کچھ نذر بھی پیش کر سکوں تو یہ کیسے مناسب ہو سکتا ہے کہ اپنی مہمان داری کا بار ان کے سر ڈالوں، چنانچہ میں نے بادلِ ناخواستہ معذرت چاہی اور واپسی کی اجازت طلب کی۔ انہی دنوں علامہ کا پہلا مجموعۂ نظم "کارِ امروز" شائع ہوا تھا چنانچہ اس کے مطالعہ کا شوق بھی کھینچ کئے ہوئے تھا۔ "کارِ امروز" کی قیمت اس وقت ساڑھے تین یا چار روپیہ تھی۔ میرے پاس کرایہ کے علاوہ اب صرف پانچ روپے باقی تھے میں نے مولانا سے کارِ امروز کا ایک نسخہ عطا کرنے کی گزارش کی۔ مولانا نے بلند آواز سے کہا، "اعجاز میاں! نثار صاحب کو ایک نسخہ کارِ امروز کا دے دیجئے۔" وہی صاحب جو کمرہ میں بیٹھے تھے کتاب لے کر اندر آئے اور معلوم ہوا کہ وہ علامہ مرحوم کے صاحبزادے حضرت اعجاز صدیقی ایڈیٹر شاعر ہیں۔ میں نے شیرینی کی ٹوکری میں صرف کا نوٹ رکھ کر مولانا کے سامنے پیش کیا اور گزارش کی کہ "کارِ امروز" میرے لئے جو چیز ہے اس کی کوئی قیمت نہیں چکا سکتا۔ آپ خواہ اسے نذر سمجھئے یا کتاب کی قیمت۔ مولانا خاموش ہو گئے۔ میں نے اجازت طلب کی اور اٹاوہ واپس آیا۔

یہ تھی میری علامہ مرحوم سے پہلی ملاقات ——

مولانا اس وقت باوجود عمر کی پچپن منزلیں طے کر چکنے کے کافی تنومند تھے۔ قد چھوٹا تھا مگر ان کی ترکی ٹوپی اسے درازی عطا کر دیتی تھی۔ سر کے بال سفید ہو چلے تھے اور انگریزی وضع پر ترشے رہتے تھے۔ مولانا کا چہرہ گول، آنکھیں بڑی اور چمکدار تھیں، ان کی آواز کافی رعب دار تھی۔ مونچھوں کے بال بہت ہلکے رنگتے تھے اور داڑھی صفاچٹ رہتی تھی۔ آخر عمر میں کمر میں تھوڑا خم آ گیا تھا، مگر چھڑی کے سہارے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ چل سکتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی پُر تکلف لباس میں نہیں دیکھا "کلیم عجم" میں ایامِ شباب کی تصویر دیکھ کر یہ ضرور معلوم ہوا کہ وہ کسی زمانے میں سوٹ بھی پہنتے ہوں گے لیکن جوانی کا یہ شوق بھی رخصت ہو گیا۔ میں نے انہیں ہمیشہ شیروانی اور چوڑے پائنچے کے پاجامے ہی میں ملبوس دیکھا۔ گھر پر قمیص اور تہبند یا پاجامہ کے عادی تھے۔ اگر گرمی کی شدت ہوتی تھی تو صرف بنیائن اور تہبند پر ہی اکتفا کرتے تھے مگر بغیر شیروانی اور ٹوپی کے مکان یا دفتر سے باہر جانا معیوب سمجھتے تھے۔ انہیں ترکی ٹوپی بہت مرغوب تھی، کبھی کبھی جاڑے میں سمور کی ٹوپی بھی استعمال کرتے تھے۔ ایسی سیہی کے کانٹوں جیسی لگتے سمور کے بالوں والی ٹوپی ان کے پُر رعب چہرہ کو اور بھی باوقار بنا دیتی تھی۔

اس ملاقات کے بعد مولانا سے میرے تعلقات روز بروز بڑھتے گئے۔ مولانا متعدد مرتبہ اٹاوہ تشریف لائے۔ میں بارہا آگرہ گیا اور چند روز دو ہفتہ مولانا کے یہاں قیام پذیر رہا۔ متعدد مقامی اور بیرونی مشاعروں میں ان کا ساتھ رہا۔ غرضیکہ ان کی ہجرت پاکستان کے وقت تک مجھے اس کے بے شمار مواقع ملے کہ میں ان کے نظریات، عادات و اطوار اور کردار کے ہر پہلو کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کر سکوں۔

علامہ سیماب مرحوم صبح تڑکے بیدار ہونے کے عادی تھے۔ انہیں اکثر مشاعروں کی شرکت کے باعث رات کے پچھلے پہر تک جاگنا پڑتا تھا مگر یہ جگار صبح خیزی کی راہ میں کبھی حائل نہ ہوتی تھی۔ وہ بہت جلد نمازِ فجر سے فراغت حاصل کر کے سحر گشت کے لئے نکل جاتے تھے۔ طلوعِ آفتاب سے پہلے کا سہانا وقت ان کی شگفتگیٔ طبع کے لئے بہت موزوں ہوتا تھا۔ وہ خود فرماتے تھے کہ "کارِ امروز" کی بیشتر نظمیں میں نے سحر گشت کے دوران میں کہی ہیں۔ واپسی پر مکان تشریف لاتے، غسل فرماتے، ناشتہ کرتے، اخبارات کا مطالعہ فرماتے اور ٹھیک دس بجے قصر الادب تشریف لاتے، دوپہر تک ڈاک دیکھتے، ضروری خطوط پڑھتے، ان کے جوابات لکھتے۔ پھر دوپہر کے کھانے سے فراغت پا کر اپنے بیرونی شاگردوں کے کلام پر اصلاح فرماتے۔ اسی دوران میں اگر موقع مل جاتا تو خود بھی شعر کہہ لیتے۔ شام کو مکان واپس آتے، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر کبھی مکان پر اور کبھی دفتر میں آرام فرماتے اور فکرِ سخن میں مصروف ہو جاتے۔ اگر کسی مشاعرہ کی شرکت ضروری نہ ہوتی تو وہ رات کو جلد سو جانے کے عادی تھے۔

مولانا بڑے ہی صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے۔ ان کی انگریزی کی تعلیم معمولی ہی تھی مگر ان کی انگریزی تحریر دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ صرف ایف۔ اے (سال اوّل) تک ہی پڑھے ہیں۔ عربی اور فارسی انہوں نے خوب پڑھی تھی۔ یہ تعلیم انہیں کچھ تو اپنے قابلِ قدر اساتذہ کے ذریعہ اور کچھ فطری ذوقِ مطالعہ سے حاصل ہوئی تھی۔ حضرت مولانا جمال الدین سرحدی مرحوم، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قمر الدین وغیرہ فاضل

بزرگوں سے انہوں نے عربی ادب، اصول اور منطق کی تکمیل کی تھی۔ ان کا فارسی کا مطالعہ بھی کافی وسیع تھا جس کا ثبوت ان کی وہ غزلیں ہیں جو انہوں نے فارسی میں کہی ہیں۔ یہ غزلیں اپنی شستگی، صفائی اور روانی کے اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔

اگرچہ علامہ کی تعلیم و تربیت قدامت پسند ماحول میں ہوئی مگر وہ بڑے روشن خیال اور دور اندیش انسان تھے۔ وہ زمانے کے تیور خوب پہچانتے تھے، اور اس کے ساتھ قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتے تھے، ان کی وقت شناس نگاہیں ہمیشہ مستقبل پر رہتی ہیں۔ ادب کے معاملہ میں بھی ان کا یہی وطیرہ تھا۔ جب ان کے معاصرین کی اکثریت روایتی غزل کی پُرپیچ وادیوں میں بھٹک رہی تھی انہوں نے اپنے تصورات اور جذبات کو نئی صورتوں کے سانچے میں ڈھالا اور جدید اُردو شاعری کی راہیں متعین کیں۔ "کلیم عجم" کے دیباچہ میں انہوں نے خود اپنی سرگزشت لکھی ہے اور اپنے نظریات شعری کی وضاحت فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"اوائل مشق سخن تک مجھے قدیم تغزل سے دلچسپی تھی۔ لیکن وقت اور زمانے کے ساتھ علم و معلومات کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا گیا رنگ قدیم سے لگاؤ کم ہو گیا۔ حالانکہ میرے رنگ قدیم میں بھی سوقیانہ، غیر متین اور بازاری عنصر کبھی نہ تھا۔ ۱۹۱۸ء سے میرا رنگ تغزل بدل گیا۔ میں اب شاعری میں بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں۔ میں شاعری میں فلسفۂ حقائق اور معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت یا اس کے متعلقات ہوں یا جو امرد پرستی کی نفسیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع حسن مطلق اور عشق حقیقی ہے اور تمام مجاز کا مرجع وہ ذات ہے جو حامل حسن اور مرکز محبت ہو۔ جس طرح علم شاعری کے لئے ضروری اور لازمی ہے اسی طرح محبت اور شاعری کو بھی لازم و ملزوم سمجھتا ہوں اور حقیقی واردات قلب کی ترجمانی میرا مسلک ہے۔ گو مجھے تمام اصنافِ سخن پر قدرت ہے مگر میں نظم، غزل اور رباعی کو اظہار خیال کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شعر کی الہامی حیثیت پر میرا ایمان ہے میں شعر میں بلند خیال کے ساتھ بلند الفاظ کا مؤید ہوں۔ ایسے الفاظ جن میں غرابت نہ ہو اور جنہیں تعلیم یافتہ اصحاب بہ آسانی سمجھ سکیں۔

میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شعرا غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں۔ اس لئے کہ غزل جس چیز کا نام ہے وہ اپنی قدامت و کہنگی کی وجہ سے اب زیادہ کارآمد نہیں رہی۔ شعرائے متغزلین اس صنف کو بہ تمام و کمال پامال اور ختم کر چکے ہیں۔ منتہی شعراء کے لئے بھی غزل میں اجتہاد و ایجاد کی گنجائش بہت کم باقی ہے۔ مگر نظم کا میدان ہنوز وسیع ہے اور یہ صنفِ سخن اردو شاعری کو کارآمد اور مفید بنا سکتی ہے۔ اس سے زیادہ تر توجہ اسی کی طرف ہونا چاہئے۔

شعر و شاعری کے متعلق میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ "زندگی شعر ہے اور شعر زندگی ہے" کائنات بغیر شاعر کے ایک ساز بے نغمہ ہے۔ شاعر دنیا کا ایک ایسا جزو ضروری ہے جس کے بغیر دنیا کا قیام ناممکن ہے۔ الہام و القا کا وہ سلسلہ جو انبیاء و اولیاء کی ذات مقدس تک مخصوص ہے۔ شاعر کے دماغ اور سروش کے ساتھ بھی باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔"

[کلیم عجم]

علامہ مرحوم کے نزدیک شاعر کا مرتبہ بہت بلند تھا انہیں بڑا دکھ ہوتا تھا جب وہ اکثر شعراء کو مشاعروں اور ادبی مجلسوں میں انسانیت سوز حرکات کا مرتکب ہوتے دیکھتے تھے، وہ شاعر کا وقار بہت بلند دیکھنے کے متمنی تھے۔ چنانچہ انہوں نے خود اپنی زندگی کو اسی رنگ میں ڈھال لیا تھا۔ وہ ایسے شعراء سے ملنا جلنا بلکہ بات کرنا تک پسند نہ کرتے تھے جو اخلاقی مراتب سے گرے ہوئے ہوں، اور یہی وجہ تھی کہ بعض لوگ انہیں غلطی سے متکبر اور خود پسند سمجھتے تھے، مولانا فطرتاً نہایت منکسر المزاج تھے۔ میں نے انہیں خود اپنی آنکھوں سے اپنے سے چھوٹے اور کمتر درجے کے شعراء کی بے حد تواضع کرتے دیکھا ہے۔ شکیل بدایونی جب کبھی تشریف لاتے مولانا نہایت محبت سے بٹھاتے، گھنٹوں باتیں کرتے، ان کا کلام سنتے، اپنا سناتے، چائے پلاتے اور بہ اصرار تمام میزبانی کے فرائض انجام دیتے۔

علامہ بڑے ہی خوددار انسان تھے ان کی خودداری ان کے پُر وقار چہرے سے جھلکتی تھی۔ جب کبھی ان کے خاندانی وقار کو ٹھیس لگ جاتی تھی تو ان کا پیمانۂ صبر چھلک اٹھتا تھا اور وہ بپھر جاتے تھے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو ان کی یہ ادا پسند نہ ہو۔ خودداری اور غرور کے درمیان بڑا ہی نازک فرق ہے اور ان دونوں کی حدود متعین کرنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ ایک مرتبہ مولانا حیدرآباد کے ایک مشاعرہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں ان کی بڑی قدر ہوئی۔ وطن واپس آنے پر چند حیدرآبادی احباب کے توسل سے تحریک ہوئی کہ مولانا مستقلاً حیدرآباد چلے آئیں۔ ولیعہد بہادر ان سے اصلاح کلام کے طالب ہیں۔ غالباً تنخواہ کے متعلق بھی معاملہ طے پا گیا مگر جب مولانا کو یہ معلوم ہوا کہ انہیں حیدرآباد کے رسوم کے مطابق دربار میں پگڑی اور پٹکا باندھ کر حاضر ہونا پڑے گا تو ان کی خوددار طبیعت نے بغاوت کر دی اور انہوں نے اس اعزاز کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ شکوہ آباد میں اسلامیہ اسکول کے قیام کے سلسلہ میں ایک جلسہ تھا۔ پروگرام میں مشاعرہ بھی شامل تھا۔ اسکول کا افتتاح کرنے کے لئے ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو مدعو کیا گیا تھا اور مشاعرہ کی صدارت علامہ سیماب کے ذمہ تھی۔ اتفاقاً دونوں حضرات ایک ہی ٹرین سے شام کے وقت تشریف لائے۔ منتظمین جلسہ میں چونکہ خاصی تعداد علیگڑھ کے تعلیم یافتہ طبقہ کی تھی لہٰذا وہ ڈاکٹر صاحب موصوف کو بڑے احترام سے کار پر بٹھا کر شہر لے گئے۔ مولانا کے لئے تانگہ کا انتظام کیا گیا۔ مولانا نے اسے اپنی توہین سمجھا اور اسٹیشن سے اس وقت تک قدم باہر نہ نکالا جب تک دوسری کار نہ منگوائی۔ بادی النظر میں یہ بات نہایت معمولی ہو سکتی ہے۔ کچھ لوگ اسے تنگ نظری اور عصبیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ معاملہ صرف سیماب کی ذات تک ہی نہ تھا بلکہ دیگر ارباب شعر و ادب کے لئے بھی تامّل کا مقام تھا۔ ہماری سوسائٹی میں ہمارے بزرگانِ ادب کا مرتبہ سیاسی لیڈروں سے بھی کمتر سمجھا جاتا ہے (خواہ اس کے وجوہات کچھ بھی ہوں) اور وہ ان کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتے اس لئے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ عوام کو اپنی اہمیت کا احساس دلائیں اور ان کو اپنا ادب اور احترام کرنا سکھائیں۔

مولانا سیماب کو اپنی خودداری کی بڑی بڑی قیمتیں ادا کرنی پڑیں۔ تاریخ ادب میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر یا ادیب ہوگا جس کے خلاف اس کی زندگی میں اس قدر کثرت سے لکھا گیا ہو جب مولانا سیماب پر پے در پے چاروں طرف سے حملے ہوتے تھے ان کے مخالفین اور معترضین ادبی تنازعات میں ذاتیات اور کردار تک اتر آتے تھے مگر وہ جواں ہمت شعر و ادب کی چہار دیواری میں بیٹھا کبھی ہنستا تھا کبھی جز بز ہوتا تھا اور کبھی زمانے کی ناقدر شناسی کا شکوہ کر کے تاسف کرتا تھا۔ انہوں نے شاید کبھی خود اپنی قلم سے ان حضرات کا جواب لکھنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے ایسے عزم اور ہمت کے انسان بہت کم دیکھے ہیں جو بیک وقت سیکڑوں طوفانوں سے گھرے رہے ہوں اور ان سے صحیح و سلامت نکل کر ملک میں اس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل کر سکے ہوں۔

ایک دن میں نے عرض کیا مولانا! ادبی دنیا میں آپ کے اس قدر مخالف موجود ہیں آپ زمانہ سازی سے کام کیوں نہیں لیتے؟ شعراء اور نقاد آپ کو متکبر سمجھتے ہیں اور آپ کی خوددارانہ اسپرٹ کا غلط مطلب نکالتے ہیں آپ بھی دوسروں کی طرح ان کو فریب دیجئے۔ رفتہ رفتہ سب رام ہو جائیں گے۔ مولانا میرے اس سوال پر غور و فکر میں پڑ گئے۔ ان کے چہرہ سے کچھ بے کلی کے آثار جھلکنے لگے۔ بولے۔ ستار صاحب! زمانہ سازی تو میرے بس کی بات نہیں! بچپن سے صاف گوئی کی عادت رہی ہے وہ کیسے بدل جائے۔ ویسے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں متکبر نہیں ہوں۔ مجھے اپنے وقار کے تحفظ کا ضرور خیال رہتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اور ملک کے دوسرے شعراء بھی اس پر عمل کریں۔ جو لوگ میرے بارے میں آج لکھتے ہیں کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ لیکن یاد رکھئے کہ جب یہ دور گزر جائے گا۔ میں مر جاؤں گا۔ یہ نسل مر جائے گی تو سیماب کے کارناموں کی قدر ہوگی۔ میں نے اتنا کام کر لیا ہے کہ دنیا مجھے فراموش بھی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی میں نے اپنے ہاتھوں سے حیات ابدی کا محل تعمیر کیا ہے اس عمارت کو میری مخالفت کے وقتی طوفان ڈھا نہیں سکتے ہیں۔

مشہیر شعرا و گیتی جہد حسن تا بہ شعراں

اس تخریب اور ریاکاری کے تحفظ کے علاوہ اگر آپ کے ذہن میں کوئی تدبیر ہو تو بتائیے میں اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے عرض کیا، مولانا آپ مشاعروں میں دوسرے شعراء سے الگ تھلگ رہتے ہیں وہ لوگ اس کا مطلب اگر یہ سمجھتے ہیں تو کیا بیجا ہے کہ آپ شاید انہیں اپنا ہم مرتبہ نہیں سمجھتے۔ مولانا فرمانے لگے۔ آپ کا خیال صحیح ہے مجھے بھی اس کا احساس ہے کہ دوسرے شعراء میرے متعلق اسی طرح سوچتے ہوں گے بعض وقت میں نے اشارتاً ان کو اس کا شاکی بھی پایا ہے مگر وہ میرا دکھ کیا جانیں۔ میں مدتوں سے بواسیر کا مریض ہوں یہ مرض اب ناسور کی شکل میں تبدیل ہو چکا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ زخموں کے باعث اکثر بیمار رہتا ہوں۔ بیٹھتا بھی ہوں تو تکیہ کا سہارا ضروری ہوتا ہے۔ سعادت سجاد حسین (مولانا کے صاحبزادے) میرے زخم صاف کرتے ہیں ان سے مواد اور خون رستا ہے۔ میں اگر دوسرے شعراء کے ساتھ مشاعروں میں قیام کروں تو میری وجہ سے انہیں کس قدر تکلیف پہنچے گی، جہاں عام شعراء قیام کرتے ہیں لوگوں کی آمد و رفت بکثرت رہتی ہے بربنائے تکلف مجھے بار بار اٹھنا بیٹھنا پڑے گا، یہ میرے بس سے باہر ہے، میرے زخموں کی صفائی وہاں ناممکن ہے میں نہیں چاہتا کہ صاف ستھری فضا میری ذات سے گندی ہو۔ اور لوگ مجھ سے اس بنا پر تنفر کا اظہار کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے دیگر معاصرین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاروں مگر یہ ناممکن ہے۔ یہ باتیں بھی میں صرف آپ سے کہہ سکتا ہوں ہر ایک سے کہنے کی نہیں۔ اب آپ ہی بتائیے اس میں میری کیا خطا ہے۔ مجھ پر جس قدر اعتراضات ہوتے ہیں اور میری جس قدر مخالفتیں کی جاتی ہیں وہ بربنائے حسد ہیں۔ وہ لوگ میری مقبولیت اور شہرت نہیں دیکھ سکتے۔ میں حاسدوں سے نہیں ڈرتا وہ ایک دن خود اپنی آگ میں جل کر خاک ہو جائیں گے۔

مجھے خدا نے حسد سے بچا لیا سیماب
ہزار شکر کہ محسود روزگار ہوں میں

علامہ مرحوم کی قادر الکلامی اور مشاقی کے سب ہی معترف تھے۔ شعر کہنا ان کے لئے بچوں کا کھیل تھا۔ کیسا ہی موضوع ہو ان کو اشعار موزوں کرنے میں دیر نہ لگتی تھی۔ وہ شعر گوئی کی مشین تھے۔ میں نے انہیں اکثر فکر سخن کرتے دیکھا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ مشاعرہ کا وقت ہو گیا ہے دس شاگرد بیٹھے ہیں مولانا شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح کرتے جاتے ہیں۔ ان سے باتیں ہو رہی ہیں اور اپنی غزل بھی کہہ رہے ہیں اگر تنہا ہوتے تو وقت فکر وہ عام طور پر پلنگ پر کروٹ سے لیٹ جاتے تھے۔ قلم اور کاغذ قریب رکھ لیتے تھے اور بے تکلف لکھتے چلے جاتے تھے۔ میں نے اکثر شعراء کو دیکھا ہے کہ وہ شعر کہتے وقت گنگناتے ہیں، ہاتھ پیر ہلاتے ہیں، مست ہو جاتے ہیں، سگرٹ پر سگرٹ پیتے ہیں اور تب کہیں چار سات یا دس شعر کی غزل کہہ پاتے ہیں۔ مولانا کے لئے یہ تمام حالات غیر ضروری تھے۔ وہ کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے بستر کے پیچھے کو ہو جاتے تھے، اور جس قدر اشعار چاہتے تھے موزوں کر لیتے تھے۔ مشاعروں میں کلام پڑھتے وقت بھی وہ مجلسی روایتی تکلفات سے اجتناب فرماتے تھے۔ عام شعراء کی طرح میں نے انہیں ہر شعر پر جھک جھک کے سلام کرتے اور انکسار نفسی کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کی آواز بڑی باٹ دار تھی۔ شعر عجب انداز سے ادا کرتے تھے۔ ان کے پڑھنے کے طریقہ کو تحت اللفظ کہا جا سکتا ہے اور نہ ترنم۔ وہ ان دونوں کے درمیان کی کوئی چیز تھی ان کے پڑھتے وقت شعر اور شاعر دونوں کے وقار کا احساس ہوتا تھا۔ عوام کو تو ان کے اشعار پر داد دینے کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ خواص کی داد پر وہ کبھی کبھی مسکرا دیتے تھے۔ جب ان کو کسی اچھے شعر پر مشاعرہ میں داد ملتی تھی تو ان کے چہرہ پر ایک خاص قسم کی بشاشت کی روشنی دوڑ جاتی تھی۔

ان کی قادر الکلامی کے بارے میں ابھی میں عرض کر چکا ہوں۔ اپنے بیرونی اور مقامی پچاسوں شاگردوں کی غزلوں اور نظموں پر اصلاح دینا ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ چند گھنٹے ان کے اس کام کے لئے وقف تھے۔ اگر کسی دن ڈاک کم ہوتی تھی تو اس فاضل وقت میں اپنے لئے کوئی غزل یا نظم کہہ لیا کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک تھے ان کے ادبی اور سیاسی رجحانات بھی جدا جدا ہوتے تھے۔ مولانا کو ان کے نظریات سے اختلاف ہو تو ہو مگر اصلاح کلام کے وقت وہ اپنے نظریات کو بالائے طاق رکھ کر شاگرد کے مسلک کے مطابق اصلاح دیتے تھے اور کسی کو اپنا نظریۂ حیات بدلنے پر مجبور نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ان کے ہزاروں شاگرد ملک کی مختلف تحریکات سے وابستہ ہیں۔ بعض روایتی غزل گو ہیں بعض ترقی پسند گروپ سے منسلک ہیں۔ کوئی کانگریسی ہے تو کوئی مسلم لیگ کا ہو گیا ہے اور کچھ لوگ کمیونسٹ

اور شکست جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان کی قادر الکلامی کے متعلق ایک لطیفہ سنئے۔ حضرت علامہ ایک مرتبہ ٹونک تشریف لے گئے۔ ٹونک کے شعراء کی ایک انجمن نے مشورہ کیا کہ مولانا کا امتحان لیا جائے چنانچہ انہوں نے صبح حاضر ہو کر مولانا سے عرض کیا کہ آج شب کو آپ کو ایک مشاعرہ کی صدارت فرمانا ہے جس کا مصرع یہ ہے۔ "آکہ مجھے تاب انتظار نہیں ہے"۔ اور یہ کہ آپ کو اپنے اصول کے دستور کے مطابق خطبۂ صدارت بھی پڑھنا ہوگا۔

اس زمین میں غالب کی ایک مختصر غزل ہے جس کی بحر نہ صرف اردو میں غیر مروجہ بلکہ نہایت مشکل ہے۔ مولانا کو بھی کسی نے آگاہ کر دیا کہ آپ کا امتحان مقصود ہے۔ علامہ مرحوم نے بخوشی یہ دعوتِ امتحان قبول کر لی اور رات کو مشاعرہ میں نہ صرف طویل طرحی غزل پڑھی بلکہ اسی زمین اور اسی ردیف قافیہ میں ساٹھ ستر اشعار کا خطبۂ صدارت بھی خلافِ معمول نثر کے بجائے نظم میں پیش کیا۔ مولانا کی اس قادر الکلامی پر بڑے بڑے اساتذہ دنگ رہ گئے۔ اور دوسرے دن کئی حضرات نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

مولانا جس زمانے میں "وحیِ منظوم" کی تکمیل فرما رہے تھے مجھے آگرہ میں ان کے ہمراہ چند دن قیام کا اتفاق ہوا۔ قرآن پاک کا ترجمہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ مولانا صبح غسل فرماتے اور نماز سے فارغ ہو کر کمرہ میں آ بیٹھتے تھے۔ لوبان اور اگر بتیاں جلائی جاتی تھیں۔ کلام پاک کے متعدد نسخے میزوں پر اور گرد کھول کر رکھ دیئے جاتے تھے اس کے بعد وہ ترجمہ شروع فرماتے تھے۔ ایک ایک آیت کی تلاوت کرتے تھے پھر مختلف تراجم کا مطالعہ کر کے اس آیت کا ترجمہ نظم کرتے تھے دوپہر کو تھوڑی دیر آرام فرمانے کے بعد سہ پہر سے پھر یہی شغل شروع ہو جاتا تھا۔ برسوں کا کام تھا مگر مولانا کو چونکہ زبان اور بیان پر بے انتہا قدرت حاصل تھی لہٰذا انہوں نے صرف ساڑھے پانچ ماہ میں یہ عظیم الشان کام سرانجام دے لیا۔ وہ اپنے اس کارنامہ پر بے انتہا مسرور تھے اور فرماتے تھے کہ میری یہ خدمت نہ صرف میری نجات کا باعث ہوگی بلکہ میرے نام کو دنیا میں زندہ رکھنے کی ضامن ہوگی۔ افسوس کہ سرمایہ کی کمی کے باعث یہ ترجمہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔ ان کے بڑے صاحبزادے مظہر صدیقی نے کراچی سے صرف تیسواں "پارۂ عم" کا ترجمہ چھپوا دیا ہے۔ حکومت پاکستان کو اس جانب توجہ کرنی چاہئے ایسا نہ ہو کہ دست بردِ زمانہ کے ہاتھوں یہ نایاب گوہر ضائع ہو جائے۔

مولانا مرحوم بڑے پکے مسلمان تھے۔ عقیدۃً وہ حنفی تھے۔ تصوف سے بھی انہیں گہری دلچسپی تھی۔ حاجی وارث علی شاہ صاحب سے انہیں بیعت حاصل تھی وہ اپنے پیر سے بے انتہا عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ حاجی صاحب قبلہ کی ایک تصویر ان کے سرہانے آویزاں رہتی تھی۔ اور اس پر پھولوں کا ہار یا کبھی کبھی ایک سہرا نثار رہتا تھا۔ وہ نماز بھی پڑھتے تھے اور روزے بھی رکھتے تھے اگرچہ اس ضمن میں زیادہ متشدد نہ تھے۔ بزرگانِ دین اور پیشوایانِ اسلام سے انہیں گہری محبت تھی۔ محرم کے ایام میں غم میں کپڑا رنگ کر لیتے تھے اور اس مہینے میں صرف سلام یا شہدائے کربلا سے متعلق نظمیں یا مرثیے نظم کرتے تھے۔ ان کے سلاموں اور اس قسم کی نظموں کے دو مجموعے "سرودِ غم" اور "نفیرِ غم" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ اس مذہبی شغف کے باوجود وہ دوسرے مذاہب کا بیحد احترام کرتے تھے۔ دوسرے مذاہب کے بزرگوں سے بھی ان کو دلی لگاؤ تھا۔ تعصب تو انہیں چھو تک نہ گیا تھا ان کے مجموعوں میں جہاں پیغمبر اسلام اور دیگر رہنمایانِ اسلام پر نظمیں ہیں وہیں ان کے دوش بدوش سری کرشن، گوتم بدھ وغیرہ کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ سری کرشن جی سے تو انہیں خصوصی دلچسپی تھی۔ انہوں نے ہندو مذہب کے اس پیغمبر محبت کے متعلق بہت سی نظمیں مختلف عنوانات سے کہی ہیں جو "کرشن گیتا" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں کرشن جی کو وہ کس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اظہار ان ہی کی زبان سے سنئے۔ "کرشن گیتا" کے دیباچہ میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے۔

> "مجھے ہندو مذہب کے قدیم اوتاروں میں صرف سری کرشن سے بڑی عقیدت و محبت ہے اس کا ایک سبب تو میرا شاعرانہ ذوق ہے کہ مجھے سری کرشن کی زندگی یکسر رومان اور مطلق محبت نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں پریم اور پریت یعنی عشق و محبت

کے بجتے نغمے چھپے ہوئے ہیں ان کا سرچشمہ میں سری کرشن کی مشہور تاریخی بانسری ہی کو سمجھتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ برج کے حدود میں سری کرشن کی بانسری نے جو گیت گائے ہیں ان کا اثر بندرابن اور جابن کی رنگین فضاؤں میں آج تک محسوس ہوتا ہے۔

میں جب کبھی وہاں جاتے ہوئے برج کی سرزمین سے ریل میں گزرتا ہوں تو مجھے خاموش صحرا کے ٹیلوں پر اور چرنے والے مویشیوں کے جھنڈ میں اب تک سری کرشن بانسری بجاتے ہوئے نظر آتے ہیں؟

مولانا کو قدرت کے مناظر سے بھی بڑی دلچسپی تھی انہوں نے مختلف مناظر پر نظمیں لکھی ہیں۔ گلشن، پہاڑ، شفق، ابر، صبح، شام، چاندنی یہ تمام مناظر ان کے لئے دلکشی کا سامان فراہم کرتے تھے اور مسرت و کیف و سرور دیتے تھے مگر انہیں بوجوہ دریا اور ساحل دریا سے نفرت تھی۔ ایک مرتبہ جب میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ مناظر دریا سے نفرت کا سبب ایک complex ہے۔ وہ ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں ڈھاکہ پہنچے ہوئے تھے۔ وہاں انہیں 'مان ندی' کشتی کے ذریعہ پار کرنی پڑی، دریا میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ جب کشتی درمیان میں پہنچی تو الٹ گئی مگر خدا کے فضل سے تمام مسافر بچا لئے گئے۔ مولانا مرحوم کو اسی دن سے دریا اور اس کی جملہ رعنائیوں سے نفرت ہو گئی۔ پہاڑ پر جانے کے لئے اکثر ان کا جی چاہتا تھا۔ وحی منظوم کے ترجمہ کے زمانہ میں میں نے ان سے گزارش کی کہ آپ آگرہ کی اس سخت گرمی میں اس قدر محنت کر رہے ہیں اگر مسوری یا نینی تال تشریف لے جائیں تو بہتر ہو۔ فرمانے لگے جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے مگر کیا کروں۔ پہاڑوں پر مکان بہ آسانی نہیں ملتے میں تنہا جا نہیں سکتا اگر بچوں کو یہاں چھوڑتا ہوں تو دل ان میں لگا رہے گا اور یکسوئی سے کام نہ کر سکوں گا اتنے بڑے خاندان کو لے کر کیسے جاؤں میری طبیعت یہ گوارا نہیں کرتی۔

انہیں اپنے اہل و عیال کا بڑا خیال تھا۔ خاندان میں سب ہی ان کو عزیز تھے۔ مولانا سب کی فکر رکھتے تھے۔ چھوٹے بچوں سے تو انہیں خصوصی محبت تھی اپنے تین چار سال کے پوتے انتصار سے اکثر کھیلا کرتے تھے اور اس کی پیاری پیاری باتیں سن کر بہت خوش ہوتے تھے۔ انہیں اپنی قیمت کا احساس اس لئے بھی تھا کہ وہ اس عظیم خاندان کے کفیل تھے وہ فسادات سے بہت ڈرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب میں آگرہ میں مولانا کے یہاں مقیم تھا شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ مولانا بہت پریشان اور سراسیمہ ہیں۔ ہر پانچ منٹ بعد تازہ حالات معلوم کرنے کی فکر ہے گھبرائے ہوئے کمرے میں ٹہل رہے ہیں میں نے جرأت کر کے عرض کیا مولانا مسلمان کے لئے موت برحق ہے آپ موت سے اتنا کیوں ڈرتے ہیں۔ کہنے لگے۔ مجھے اپنی جان کی اتنی فکر نہیں۔ بلکہ بچیوں اور بچوں کی فکر ہے۔

مولانا کو اپنے وطن آگرہ سے بے پناہ محبت تھی وہ اسے تمام دنیا میں سربلند و سرفراز دیکھنا چاہتے تھے ان کو اس کی ادبی منزلت کا بھی بخوبی احساس تھا۔ روضہ تاج کے عنوان سے انہوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ ان کی وطن دوستی کی شاہد ہیں ان نظموں میں آگرہ کی ایک ایک عمارت کا تذکرہ اس خوبی اور صداقت سے کیا گیا ہے کہ جواب نہیں، تاج کا حسن تو ان کی شاعری میں جذب ہی ہو چکا تھا۔ انہوں نے بھی تاج پر مختلف انداز سے اتنی خوبصورت اور کیف آور نظمیں لکھی ہیں جو شاید تاج کے فنا ہو جانے کے بعد بھی اس کا نام باقی رکھنے کے لئے باقی رہیں گی۔ وہ پاکستان میں تھے، مگر ان کی روح آگرہ کی گلیوں میں بھٹکتی پھرتی تھی اس جدائی سے انہیں کتنی روحانی تکلیف تھی اس کا احساس صرف وہی کر سکتا ہے جو ان کی طرح وطن دوست دل رکھتا ہو۔

علامہ مرحوم کی ذات مجسم عمل تھی میں نے انہیں کبھی بیکار نہیں دیکھا۔ احباب اور شاگردوں میں بیٹھ کر گپ شپ اڑانا ان کا شیوہ نہ تھا۔ وہ زندگی بھر علم و ادب کی خدمت کرتے رہے تقریباً ۳۰۰ کتابیں تصنیف کیں۔ اقتصادی حالات سے مجبور ہو کر اکثر کتابوں کا حق اشاعت دوسروں کے نام فروخت کر دیا۔ آخر میں چند کتابیں اپنے ادارہ قصر الادب کی جانب سے شائع کرائیں۔ ضعیفی میں بھی وہ رات دن کام کرتے تھے۔ پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد بھی تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ بدستور جاری رہا۔ پاکستان میں جب ان پر فالج کا حملہ ہوا تو تھوڑا سا افاقہ ہوتے ہی پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے، فالج کے اثر سے جب خود لکھنے کے قابل نہ رہے تو اپنے چھوٹے صاحبزادے مظہر صدیقی سے مزید خطوط کے جوابات اور غزلیں وغیرہ لکھواتے رہے۔ وہ دوسروں کو بیکار بیٹھے دیکھ کر تعجب کرتے تھے اور سوچتے تھے کہ لوگ بیکار رہ کر وقت کس طرح گزار لیتے ہیں۔ ایسے صاحب فکر و عمل شخص اب دنیا میں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ افسوس کہ علم و عمل کا یہ روشن ستارہ دنیا کو پچاس سال تک روشنی دے کر ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو کراچی میں گل ہو گیا۔

مرزا یگانہ چنگیزی

سید اعظم حسین اعظم

آج سے چند دنوں قبل مرزا یگانہ چنگیزی کے ذاتی حالات سے میں کچھ زیادہ واقف نہیں تھا کیونکہ مجھے ان کو قریب سے دیکھنے اور ان سے ملنے جلنے کا بہت کم موقع ملا تھا۔ میں نے سب سے پہلے شاید ۱۹۲۶ء میں مرزا یگانہ کے چند اچھے شعر انہی کے لہجے میں پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی سے سنے تھے۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اس طرح مجھ پر واضح فرمایا تھا کہ مرزا یگانہ نہ صرف اچھے شعر کہتے ہیں بلکہ پڑھتے بھی خوب ہیں۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اس وقت مرزا یگانہ کے جو اشعار سنائے تھے ان میں سے وہ ایک مجھے یاد ہے، اور دل سے پسند ہے۔ وہ شعر یہ ہے ـــ

ذرا بچا کے گلے کانٹوں کو روندتے چلیے [illegible] پھر آنکھ سے [illegible]

وہیں سے صاف نظر آیا سراغ منزل کا نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

اس کے بعد گاہ گاہ مرزا صاحب کا کلام ادبی رسالوں میں نظر سے گزرتا ــــــ کئی سال بعد حکیم سید محمد قاسم صاحب کے صحن خانہ میں مرزا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ حیدرآباد دکن میں سب رجسٹرار تھے۔ وہاں سے چھٹی پر آئے ہوئے تھے۔ میں نے روزنامہ "سرفراز" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کے کلام کی فرمائش کی اور انہوں نے کچھ شعر مجھے عنایت کیے۔

یہ مرزا یگانہ سے میری پہلی ملاقات تھی۔ سیاہ رنگ، داڑھی مونچھیں صاف، اکہرا، سن رسیدہ آدمی نظر آئے۔ شخصیت کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا مگر ان کی شہرت سن چکا تھا اور دیکھا نہیں تھا۔ اس لئے ان سے مل کر ذوقِ تجسس کو تسکین ہوئی کہ یہ ہیں مرزا یگانہ۔

اس کے بعد طویل مدت تک مرزا یگانہ سے ملنے کی نوبت نہیں آئی۔ رسائل میں یا خود ان کے مجموعۂ رباعیات میں مرزا غالب دہلوی کے متعلق ان کے معاندانہ اشعار پڑھ کر ان سے ایک طرح کی بیزاری دل میں پرورش پاتی رہی۔ ان اشعار میں صرف اپنی ہمہ دانی اور غالب کی ہجو ہوتی تھی کوئی ایسی قابل لحاظ تنقید نہیں ہوتی تھی جس سے ان کے سنجیدہ غور و فکر کا ثبوت ملتا۔

مرزا یگانہ حیدرآباد کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر لکھنؤ آ گئے تو کبھی کبھار انہیں دیکھنے سننے کا اتفاق ہوا، پھر بھی کوئی سیر حاصل ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا موقع نہیں ملا۔ تقریباً دو سال ہوئے کہ ان کے خلاف مسلمان پبلک میں ایک ہیجان عظیم برپا ہوا اور ایک دن ان کی بری گت بنائی گئی جو [illegible]

منسوب کی گئی تھیں وہ متوقع نہیں قابلِ اعتراض نہیں مگر مجھے مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی کا یہ رویہ بھی اچھا نہیں معلوم ہوا کہ انھوں نے ایک پرائیویٹ خط کو اپنے اخبار میں شائع کر کے اس طرح اچھال دیا کہ بات قابو سے باہر ہو گئی۔ چنانچہ میں نے اخبار "روشنی" میں جو کہ اس وقت میری ادارت میں نکل رہا تھا، اس مسئلے کو زیادہ اہمیت نہیں دی کیونکہ اس اشتعال انگیزی میں حصہ لینے والے اخبارات میرے نزدیک مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی کے آلۂ کار بن رہے تھے۔

اس دوران میں مجھے مرزا یگانہ کے حالات ان کے بعض اعزہ سے خاص طور سے معلوم ہوتے رہے۔ میں نے سنا کہ مسلم ہجوم کی تشدد و ایذا رسانی کا اثر مرزا یگانہ کے دل و دماغ پر بہت زیادہ ہوا۔ جس مکان میں وہ رہتے تھے اسے انھوں نے ایک مدت تک چھوڑ دیا اور اس ہجوم کے بعد سے پھر پلٹ کر اسے نہیں دیکھا۔ ان کا کہنا ہے کہ اسی میں ان کی نادر کتابیں اور مسودات سبھی کچھ تلف ہو گئے۔ پولیس نے عوام کے ہاتھوں سے جب انھیں رہائی دلائی تو وہ ایک دوسرے مکان میں پہنچے کسی عزیز کے ہاں جا کر پناہ گزیں ہو گئے اور ایک عرصے تک وہاں رہے۔ مگر انھیں اپنے گرد و پیش پر اعتبار نہیں رہ گیا تھا لہٰذا وہ اس محلے سے منتقل ہو کر ایک اور محلے میں کرایہ کے مکان میں رہنے لگے۔ اس مکان میں کچھ دن رہے تھے کہ کوئی اور سہارا نہیں تھا۔ تنہائی کی بڑی تکلیف تھی کہ جاڑے آتے ہی بہت سخت بیمار پڑ گئے۔ حالت نازک ہو گئی۔ ایک رشتہ دار کو خبر ہوئی تو وہ اپنے مکان واقع محلہ شاہ گنج میں انھیں اٹھا لائے۔

میں اسی محلہ شاہ گنج میں مرزا یگانہ سے پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی کے ساتھ ملا۔ ایک پختہ مکان کے صاف ستھرے کمرے میں ایک طرف ان کا پلنگ بچھا ہوا ہے۔ اس کی پٹی کے پاس ایک بڑے ظرف میں بہت سی راکھ رکھی ہے جس میں یہ بوڑھا، نحیف و نزار شاعر بار بار کھانس کر تھوکتا رہتا ہے۔ پلنگ کے سامنے ایک میز ہے جس پر کچھ کتابیں اور کاغذات اور کچھ چائے کے ظروف وغیرہ رکھے ہیں۔ وہیں زیتون کے تیل کا پھاہا، اسطوخودوس اور چند چیزیں وغیرہ ہیں۔ ایک معمولی سی کرسی رکھی ہے۔ کمرے کے بیچ میں کسی اور شخص کا بستر زمین پر بچھا ہوا ہے جس کے بعد کمرے کے دوسرے کنارے ایک اور پلنگ لگا ہوا ہے مگر مرزا صاحب اس وقت کمرے میں بالکل تنہا تھے۔ کمرے کا دروازہ بند رہا کرتا ہے جسے کسی کی آمد کی اطلاع ہونے پر مرزا صاحب خود اٹھ کر کھولتے ہیں اور پھر فوراً بند کر دیا جاتا ہے۔

مرزا صاحب بہت بیمار ہیں اور اپنی زندگی سے تقریباً مایوس ہیں۔ اس عالم میں انھیں اپنی تنہائی کا بہت زیادہ احساس ہے کیونکہ ان کی اولاد پاکستان چلی گئی ہے اور ان کی شریکِ زندگی بھی اس وقت ان کے پاس نہیں ہیں۔ وہ اپنے حال اور خاص کر مستقبل کے متعلق پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی سے بعض ضروری باتیں کرتے رہے۔ پھر نقوش کے لیے مضمون اور تصویر بھیجنے کا ذکر ہوا۔ کافی دیر گفتگو کے بعد ہم واپس ہوئے۔ تیسرے دن میں تنہا یگانہ صاحب کے یہاں دوپہر کو جا کر ان سے ملا۔ دو گھنٹے کی نشست میں بالعموم موصوف نے مجھ سے اپنے حالاتِ زندگی بیان کیے۔ کبھی لیٹ جاتے تھے اور کبھی کھانسی اور تنفس کی تکلیف سے بیٹھ جاتے تھے۔ ذرا سکون ہونے پر پھر لیٹ جاتے تھے اور سگریٹ جلا کر پینے لگتے تھے۔ کمرے میں میرے اور ان کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ میں نے کافی غور سے ان کی باتیں سنیں اور ان سے بعض ضروری سوالات کیے جن کے جوابات پا کر میں اس فن کار کی بعض خوبیوں اور بعض کمزوریوں سے براہِ راست مطلع ہوا۔

مرزا یگانہ کا پورا نام مرزا واجد حسین ہے۔ ان کے والد مرزا پیارے صاحب تھے۔ یہ ۱۳۰۱ھ میں شہر عظیم آباد کے محلہ مغل پورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ تاریخِ ولادت غالباً ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ تھی۔ ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید صاحب حسرت عظیم آبادی کے مدرسے میں ہوئی۔ پھر محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا۔ شعر و ادب میں مذاقِ سخن کی اصلاح سب سے پہلے مولوی سید علی خاں بیتاب عظیم آبادی نے دی اور ان کے بعد شاد عظیم آبادی نے کی۔ ۱۹۰۵ء میں علاج کے سلسلے سے لکھنؤ آئے۔ پھر یہیں ایک معزز گھرانے میں شادی ہو گئی۔ ۱۹۰۵ء سے لکھنؤ ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔

اردو زبان پر بڑی قدرت رکھتے ہیں اور زبان دانی، محاورہ بندی، جدتِ بیان اور جوشِ ادا کے لیے خاص طور پر مشہور ہیں۔ وہ دنیائے ادب میں تقریباً پچاس سال تک بہ خیال خود اپنے ادبی فرائض انجام دینے کے باعث مشہورِ عام رہے۔ عام طور پر یہ آواز آتی رہی کہ ادب لڑنے جھگڑنے میں گزار دی بمصداق

ہیں۔ یہ تمام اگر سچ ہوں تو کوئی الزام نہ ہوگا، مگر مرزا صاحب کے نزدیک ان کی یہ زندگی بجا طور پر ادبی زندگی تھی جسے جھگڑے سے موسوم کرنا حق کی طرف سے آنکھیں پھیرنا ہے۔ ابتدا میں انھوں نے معاصرین لکھنؤ کے خلاف اس لئے آواز بلند کی کہ ان کے نزدیک ان معاصرین کی روش صحیح نہ تھی اور وہ غالب کی غلط تقلید کر رہے تھے۔ مرزا یگانہ نے اس سلسلے میں شعرائے لکھنؤ پر پرجوش تنقیدیں کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام لکھنؤ اور سارا اودھ ایک طرف ہوگیا اور مرزا یگانہ ایک طرف۔ اچھا خاصا محاذ قائم ہوگیا جس کا زور و شور تقریباً بیس سال تک رہا۔ لکھنؤ کے شعراء نے مرزا یگانہ کا اس حد تک بائیکاٹ کیا کہ جس مشاعرے میں وہ جاتے تھے اس میں تمام دوسرے شعراء شرکت نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مرزا یگانہ کو مشاعروں میں مدعو کرنے سے احتراز کرنے لگے۔

مرزا یگانہ نے تقریباً ۱۹۳۲ء سے مرزا غالب کے کلام کی تنقید یا تنقیص کرنا شروع کی۔ اس سے ان کا مقصد "غالب پرستوں" کی روش کی اصلاح تھی مگر نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ سارے ہندوستان کے شاعر و ادیب بھڑک اٹھے کہ کل اہل ذوق مرزا یگانہ سے بیزار ہوگئے۔ مرزا یگانہ کی "غالب شکنی" بھی بڑھتی گئی تا آنکہ انھوں نے غالباً ۱۹۳۴ء میں "غالب شکن" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا۔

"غالب شکنی" کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک بار کانپور میں آل انڈیا شاعروں کی کانفرنس زیرِ صدارت سر راس مسعود مرحوم ہوئی جس میں مختلف ادیبوں نے مقالے پڑھے۔ ایک مقالہ نگار نے اس وقت کے شعراء پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مرزا یگانہ کے مجموعۂ رباعیات "ترانہ" کا حوالہ دیا جس میں مرزا یگانہ نے غالب کی ہجو میں سخت الفاظ استعمال کئے تھے۔ مقالہ نگار نے ترانہ کا حوالہ دیتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا کہ ایک ایسا بلند خیال شاعر ایسی پستی تک اتر سکتا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی بھی اس کانفرنس میں شریک تھے۔ آپ نے کانفرنس سے واپس آکر لکھنؤ سے مرزا یگانہ کو حیدر آباد خط لکھا، جس میں کانفرنس کے مقالہ نگار کے قول کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "آپ کے کمال کے قدر دان آپ کی شاعری کے بارے میں اس سے بہتر رائے سننے کے خواہشمند ہیں۔"

پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی کے اس مختصر خط کے جواب میں مرزا یگانہ نے ایک نہایت ہی طویل مکتوب انہیں روانہ کیا جس میں اپنے رویہ کو حق بجانب ٹھہراتے ہوئے غالب پر بری طرح لے دے کی تھی۔ اپنے اس مکتوب کو مرزا یگانہ نے بعد میں کتابی شکل میں "غالب شکن" کے نام سے شائع کیا۔ "غالب شکن" کے پہلے ایڈیشن میں جو رباعیاں درج ہیں ان میں محض غالب کی ہجو کی گئی ہے، کوئی تنقید نہیں ہے مگر جب "غالب شکن" کا دوسرا ایڈیشن "غالب شکن و آتشکدہ" کے نام سے شائع کیا تو اس میں بعض ایسی رباعیاں بھی اضافہ کیں جن میں غالب کے کردار کی بعض حقیقی کمزوریاں ایک حد تک دکھائی گئی ہیں۔

غالب پر مرزا یگانہ کے پے در پے حملوں سے ایک عرصے تک ہندوستان کے ادبی حلقوں میں مختلف قسم کی ہلچل رہی۔ آخر کو فضا میں سکون ہوگیا اور حسبِ معمول ان کے رفتہ رفتہ یہ سلسلہ بھی داخلِ دفتر ہوگیا۔ مرزا یگانہ کا عقیدہ ہے کہ یہ ایک فرض تھا جو فطرت کی طرف سے ان پر عائد کیا گیا تھا اور جسے انھوں نے بڑی کامیابی سے انجام دیا۔ مرزا یگانہ جس وقت اپنی اگلی معرکہ آرائیاں بیان کرنے لگتے ہیں تو اس پیرانہ سالی اور بیماری کے عالم میں بھی ان کے چہرے پر ایک تازگی و شگفتگی سی آجاتی ہے، ان کی آواز بلند ہو جاتی ہے، ان میں جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے اور وہ عجیب فاتحانہ شان سے مسکراتے ہیں۔ اس مسکراہٹ میں یہ اعتماد ہوتا ہے کہ وہ تو ضرور ہی فاتح رہے، اب یہ الگ بات ہے کہ دنیا اس کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔

اس میں تو بہرحال شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ مرزا یگانہ اپنی دھن کے پکے ہیں۔ وہ ملک کے مذاق، ماحول یا ملک کی موجودہ ادبی ضرورتوں کا مطالعہ ضرور کرتے ہیں مگر ان کو قابلِ اعتنا بھی نہیں سمجھتے۔ وہ ملک کو وہی چیز دے سکتے ہیں جو وہ خود دینا چاہتے ہیں۔ ساری زندگی ان کا یہی مسلک رہا، جس پر ان کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ صلح و آشتی کی توقع ایسے اکھڑ مزاج اور اپنے اوپر بہت زیادہ بھروسا رکھنے والے شخص سے بالکل بے محل تھی۔

مرزا یگانہ کی یہ خودداری و خود اعتمادی جو اکثر حضرات کے نزدیک خود بینی و خود پرستی کی حدود تک پہنچی ہوئی ہے، صرف شعر و ادب کی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ دیگر معاشرتی معاملات میں حتیٰ کہ اپنے نجی امور میں بھی کارفرما رہی ہے جس سے انھوں نے نقصانات بھی اٹھائے ہیں۔ چنانچہ حیدر آباد دکن کی وسیع و عریض ریاست میں بھی رہ کر جہاں بڑے بڑے مواقع ترقی کے تھے اور ان کے لئے دروازے بھی کھلے تھے، انھوں نے کوئی ترقی نہیں کی۔

اور خطاب رجسٹراری کے چھوٹے سے عہدہ پر رہ گئے۔ بجائے کسی ترقی کے وہ اپنے حکام بالا سے متصادم ہوتے رہے کیونکہ ان کے نزدیک ان حکام کی روش ان کے بارے میں معاندانہ و غیر منصفانہ تھی۔ وہ کسی بڑے سے بڑے افسر کی اشتعال انگیز کارروائیوں سے نہیں دبے بلکہ ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ہمیشہ اپنے ضمیر کا جھنڈا اونچا رکھا۔

اواخر ۱۹۴۲ء میں جبکہ مرزا یگانہ کی ملازمت ۵۵ سال کی بنا پر ختم ہونے والی تھی پرنس معظم جاہ بہادر نے مرزا صاحب سے خود فرمایا کہ آپ وظیفے سے پہلے چھ مہینے کی باقاعدہ رخصت لے کر میرے پاس کیوں نہیں آجاتے۔ پرنس کی یہ تجویز سن کر مرزا صاحب دل ہی دل میں بہت گھبرائے کہ یہ تو وہی بات کہ رہے ہیں جو بجا ایسے شخص سے کبھی ممکن نہیں یعنی دربارداری۔ مرزا صاحب نے پرنس کی تجویز کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہے۔ ادھر ان کا انسپکٹر جنرل رجسٹریشن بھی اس امر کا خواہاں ہوا کہ مرزا صاحب وظیفے سے پہلے چھ مہینے کی رخصت لے کر جگہ خالی کر دیں تو وہ اپنا مہرہ اس جگہ بٹھا دے۔ مرزا صاحب نے رخصت نہیں لی مگر انسپکٹر جنرل نے مرزا صاحب کا تبادلہ تعلقہ یادگیر سے ایسی جگہ کیا جہاں مرزا صاحب جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ آخر وہ نہیں گئے اور رخصت لے کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ انہوں نے پرنس کی دربارداری بھی قبول نہیں کی حالانکہ کم سے کم دو سو روپے ماہانہ ضرور ہی ملتے۔

مرزا یگانہ جو کچھ جانتے اور سمجھتے ہیں وہی زبان سے کہتے ہیں، "جھوٹ نہیں بولتے" ریا سے کام نہیں لیتے۔ وہ مصلحت بینی و مصلحت کوش ہی نہیں ہیں۔ وہ تہذیب سے گفتگو کو نفاق و ضمیر کشی سمجھتے ہیں۔ عمر بھر لڑتے رہے جس سے دنیا ان سے بیزار و نالاں ہو گئی مگر وہ اپنی اس جنگجویانہ روش پر نادم و پشیمان نہیں ہیں بلکہ آج بھی اس کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔

مرزا یگانہ نہ صرف اردو کے عظیم المرتبت شاعر غالب دہلوی کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں بلکہ فارسی کے بے نظیر غزل گو نظیری نیشاپوری سے بھی اپنے کو بہتر و افضل تصور کرتے ہیں۔ آپ علامہ اقبال کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے خلاف بھی مضامین لکھے ہیں۔

مرزا یگانہ کی تصانیف حسب ذیل ہیں،

(۱) "شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافات عزیزؔ" یہ رسالہ اسی نام سے چھپا۔ اس میں اردو کے نامور شاعر عزیزؔ لکھنوی پر شدید حملے اور ان کے کلام پر اعتراضات ہیں۔

(۲) "اندھی نگری": ایک مضمون ہے جس میں ہم عصر شعراء پر لے دے کی گئی ہے۔

(۳) "چراغ سخن": یہ عروض پر رسالہ ہے جس میں معاصر شعراء کی عروض دانی پر اعتراضات کی بارش کی گئی ہے۔

(۴) "ترانہ": مجموعۂ رباعیات۔

(۵) "غالب شکن" جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔

(۶) "ادب خبیث": یہ ایک مضمون ہے جو "ادب لطیف" کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اس میں اردو کے ان مضامین کی جو رسائل و جرائد میں "ادب لطیف" کے نام سے لکھے جانے لگے تھے بڑی زوردار مذمت کی گئی ہے۔

(۷) "آیات وجدانی" مرزا یگانہ کی غزلیات کا مجموعہ ہے اور شعری حیثیت سے یہ ان کا سب سے اہم ترکہ کہا جا سکتا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ مرزا یگانہ کی غزل میں بہت اچھے اچھے شعر ملتے ہیں۔ غالب کی غزلوں پر بھی انہوں نے غزلیں کہی ہیں اور ان میں بعض شعر بہت اچھے ہیں۔ مثلاً غالب کی زمین میں یگانہ کی غزل کا ایک شعر سنئے۔

پیدا نہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی
دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر

یگانہ کی بعض رباعیاں بھی بہت عمدہ ہیں۔ ایک رباعی سنئے —

کعبہ کی طرف دور سے سجدہ کر لوں　　یا دیر کا آخری نظارہ کر لوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا　　اک اور گنہ کروں کہ توبہ کر لوں

اہلِ مذہب کی نظروں میں یگانہ ملعون و مغضوب ہیں مگر خود یگانہ اپنے کو مسلمان سمجھتے اور مسلمان کہتے ہیں۔ البتہ وہ ایک آزاد خیال مسلمان ہیں اور بعض مذہبی نظریات کے متعلق کچھ اپنے مخصوص خیالات رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ انتہائی غور و خوض، تحقیق و تدقیق کے بعد اس نتیجہ تک پہنچے ہیں۔ ان میں کوئی تصنع و ریاکاری نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ غلط نتیجے تک پہنچے ہوں مگر ان کا دماغ یہیں تک انہیں لے گیا ہے لہٰذا وہ اس کے کہنے پر مجبور ہیں۔ — خیر اس نازک و ناخوشگوار بحث کو چھوڑئیے اور مرزا یگانہ کی ایک رباعی سنئے جس میں ان کی مذہبیت اور غالب دوستی دونوں ہی ایک ساتھ ظاہر ہوتی ہیں جو کہ بہت سے لوگوں کے لئے اچنبھے کی بات ہے اور خود مجھے بھی مرزا یگانہ کی زبان سے یہ رباعی سُن کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ کہتے ہیں —

دونوں ہی پلے ہیں علیؑ کے طالب　　جاں ایک ہے گو جدا جدا ہیں قالب
مذہب بھی شاعری بھی آیت ہیں　　غالب ہیں یگانہ اور یگانہ غالب

یہ رباعی سُن کر میں نے مرزا یگانہ سے کہا کہ اب ہیں تو آپ غالب کے قدردان نظر آتے ہیں۔ میرے جواب میں وہ بولے "مجھ سے بڑھ کر اور کون غالب کو سمجھ سکتا ہے؟"

یہ ہیں مرزا واجد حسین یاسؔ عظیم آبادی ثم یگانہ چنگیزی لکھنوی ثم علامۂ خاصانِ ادب ثم امام الغزل ثم غالب کے چچا۔

اب آپ انہیں جو کچھ سمجھئے۔ یہ آپ کے فیصلہ پر چھوڑا جاتا ہے۔ البتہ اتنی استدعا ضرور ہے کہ کسی رائے کے قائم کرنے وقت یگانہ پر کوئی الزام نہ عائد کیجئے گا۔ ان کی اصل تصویر پیشِ نظر رکھئے گا کہ یہی خود ان کی خواہش ہے اور ایک ستر سال کے بوڑھے خادمِ شعر و ادب کی آخری خواہش کا احترام بہرحال ضروری ہے۔

رضا علی وحشت

اختر قادری

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے گھر میں مولانا رضا علی وحشت کا ذکر سنتا اور ان کا کلام رسالوں میں پڑھتا آیا ہوں۔ غالباً ۱۹۳۶ء کا زمانہ تھا کہ مجھے پہلی بار مولانا وحشت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں میں اسکول کا طالب علم تھا۔ مولانا وحشت کے انداز گفتگو اور زبان کی شیرینی اور لطافت سے میں بے حد متاثر ہوا۔ جوں جوں گفتگو کرتے میرے اندر ایک روحانی مسرت پیدا ہوتی رہی۔ ان کے وقار اور شخصیت کا رعب مجھ پر طاری ہو گیا اور میں نے ایسا محسوس کیا کہ میں واقعی ایک بہت بڑی شخصیت کے سامنے کھڑا ہوں۔ انھوں نے مجھ سے دو چار سوال بھی فرمائے لیکن میں بہت گھبرا رہا اور مجھ سے ان کے کسی سوال کا جواب نہ بن پڑا۔ وہ مسکرا دیے۔ اس مسکراہٹ میں کوئی طنز نہیں تھا بلکہ محبت اور بزرگانہ شفقت تھی۔ اس کے بعد سے مجھے مولانا وحشت کی خدمت میں برابر حاضری دینے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا رہا ہے۔

میں مولانا وحشت کی شخصیت کے تین پہلو جانچے جا سکتے ہیں۔ پروفیسر، انسان اور شاعر۔ پروفیسروں میں عام طور پر ایک علمی رکھ رکھاؤ اور ضرورت سے زیادہ متانت، عالمانہ شان اور اپنے کو ہر وقت سنجیدہ دکھانے کا انداز پایا جاتا ہے۔ مولانا وحشت میں ایسی کوئی بات نہیں۔ مولانا وحشت علم کا ایک بحر ذخار ہیں۔ بڑے سے بڑا عالم بھی ان کے سامنے اپنے کو طفل مکتب محسوس کرتا ہے۔ باوجود اس کے وہ زندگی بھر اپنے کو طالب علم سمجھتے رہے اور عالمانہ شان کبھی بھی اپنے اندر پیدا نہیں ہونے دی۔ وہ لوگ جنھیں وحشت کو قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے وحشت کو صرف اردو و فارسی کا عالم سمجھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وحشت نے اردو و فارسی زبان و ادب کا بڑا گہرا اور باضابطہ مطالعہ کیا ہے لیکن یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان دو زبانوں کے علاوہ وحشت نے انگریزی زبان و ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلے میں ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع ہے۔ ان کی انگریزی تحریروں سے ان کی زبان دانی کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ جس زمانے میں مولانا وحشت اسلامیہ کالج کلکتہ میں اردو و فارسی کے پروفیسر تھے [illegible] تشریف لائے تھے۔ ان کو انگریزی میں ایک سپاسنامہ پیش کرنا تھا۔ انگریزی ادب کے ایک پروفیسر طاہر جمیل مرحوم کے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا۔ طاہر جمیل مرحوم ایک انگریز پروفیسر مرحوم کے پاس گئے اور ان سے سپاسنامہ لکھنے کی درخواست کی۔ پروفیسر مرحوم Holme نے اپنی مجبوری ظاہر کی اور انھیں مشورہ دیا کہ یہ سپاسنامہ مولانا وحشت سے لکھوایا جائے تو بہتر ہے۔ طاہر جمیل مرحوم کو پہلے تو یقین نہیں آیا اور سوچا کہ مولانا وحشت کو انگریزی سے کیا واسطہ لیکن آخر جب مولانا وحشت نے سپاسنامہ انگریزی زبان میں لکھ کر طاہر جمیل مرحوم کے سپرد کیا تو جمیل مرحوم کو سخت تعجب ہوا

اور انھوں نے دست بستہ کہا کہ "آج مجھ پر یہ راز کھلا کہ اردو فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی حضور کو دخل ہی نہیں بلکہ پوری مہارت حاصل ہے۔ میری نظر میں حضور کی عظمت اور زیادہ ہو گئی ہے۔" آخر عمر میں مولانا ہندی زبان سیکھنے کی طرف مائل ہوئے اور اس میں اتنی مشق بہم پہنچائی کہ ہندی لکھنا پڑھنا آ گیا۔ یہ ان کی ذہانت کی دلیل ہے۔ مولانا وحشت کی ان ہی خصوصیات اور قابلیت کی بنا پر ان کے ایک عزیز شاگرد کیپٹن [illegible] صدیقی مرحوم کہا کرتے تھے کہ وحشت گدڑی میں لعل ہیں۔

انسان کی حیثیت سے مولانا وحشت کا جواب اس زمانے میں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ اس باب میں وہ آپ اپنا جواب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شرافت اور عجز و انکسار سے ان کا خمیر اٹھا ہے۔ یہ ان کی شرافت کی دلیل ہے کہ آج تک کسی کو ان سے شکایت کا موقع نہیں ملا۔ شکایت تو درکنار جن کو ان سے ایک مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا وہ ان کے خلوص اور حسن سلوک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے آج تک انہیں کسی کو تم کہہ کر خطاب کرتے نہیں دیکھا۔ معمولی سے معمولی انسان کو بھی وہ لفظ آپ سے مخاطب کرتے ہیں۔ کبھی کسی کی شکایت کرنا، کسی کو برا بھلا کہنا ان کی طبیعت کے خلاف ہے۔ ہمارے یہاں کوئی دور ایسا نہیں جسے ہم شعرا کی معاصرانہ چشمک سے خالی کہہ سکیں۔ باوجود اس قدر نمایاں ترقی کے دورِ جدید بھی معاصرانہ چشمک سے خالی نہیں۔ ایک ادیب کا دوسرے ادیب کو اپنے سے کمتر سمجھنا ایک لازمی بات ہے۔ لیکن اس بارے میں وحشت کا کردار سب سے الگ اور منفرد ہے۔ ان کے اندر ہم ذرہ برابر بھی احساس برتری نہیں پاتے۔ وہ ہر کسی کو اپنے سے بلند و برتر سمجھتے ہیں۔ اور اپنے معاصرین کا ذکر نہایت احترام و محبت سے کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک صاحب وحشت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اپنے کلام پر اصلاح لینے کی خواہش ظاہر کی۔ مولانا نے اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں نہایت عدیم الفرصت انسان ہوں۔ میرے پاس رہ کر آپ کچھ نہ سیکھ سکیں گے۔ اور اسی لئے اب میں نے شاگرد بنانا ایک طرح سے ترک کر دیا ہے۔" ان صاحب نے فوراً پوچھا کہ سیماب صاحب (اس وقت سیماب صاحب حیات تھے) کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ مولانا نے کہا کہ "سیماب صاحب کے متعلق میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے بہت بہتر ہیں۔" مشاعروں میں ہر شاعر یہاں تک کہ مبتدیوں کا کلام بھی نہایت غور سے سنتے ہیں اور تعریف کرتے ہیں۔ شعر میں جو خوبی اور معنوی محاسن ہوتے ہیں ان کی طرف ہلکے ہلکے اشارے بھی کرتے جاتے ہیں اور اس طرح پڑھنے والوں کی ہر طرح حوصلہ افزائی فرماتے رہتے ہیں۔

مہمان نوازی مولانا وحشت کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔ جو لوگ ان کے یہاں جاتے ہیں وہ ان کی خاطر مدارات کئے بغیر انہیں آنے نہیں دیتے۔ خود ایک معمولی سی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے مہمان کو صوفے پر بٹھاتے ہیں۔ عمر کی وجہ سے اب مولانا وحشت بہت نحیف و نزار ہو گئے ہیں۔ کمزوری کی بنا پر اٹھنے بیٹھنے میں انہیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی ان کے یہاں چلا جاتا ہے تو فوراً دالان میں آ جاتے ہیں اور نہایت تپاک سے ملتے ہیں۔ اور جب تک وہ بیٹھا رہتا ہے خود بھی بیٹھے رہتے ہیں۔ ہر چند کہ ایسا کرنے میں انہیں سخت جسمانی کوفت محسوس ہوتی ہے لیکن اپنے ملنے والے کے اندر اپنی تکلیف اور کلفت کا ذرا بھی احساس پیدا نہیں ہونے دیتے۔ یہاں میں نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مولانا وحشت کی خدمت میں ہر روز حاضری دینے کو جی چاہتا ہے لیکن یہ سوچ کر کہ دالان تک آنے میں انہیں بڑی دقت ہوتی ہے ان کے یہاں جاتے ہوئے ہمت نہیں پڑتی۔

وضع داری مولانا وحشت کے کردار کی ایک بڑی اہم خصوصیت ہے۔ اس زمانے میں انہوں نے جس طرح اپنی وضع داری نباہی ہے اور نباہ رہے ہیں یہ انہی کے دل گردے کا کام ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا انہیں دیکھا اس زمانے سے آج تک ان کے لباس اور وضع قطع میں کوئی فرق نہیں پایا۔ لمبی شیروانی، چوڑے پائنچے کا پاجامہ، سر پر ٹوپی، عمدہ قسم کا موزہ اور جوتا، یہ ہے مولانا کا لباس۔ شیروانی کی جیب میں ایک گھڑی رہتی ہے جس کی طلائی زنجیر شیروانی کے بٹن میں لگی ہوتی ہے۔ یہ گھڑی مولانا کی جیب میں ہمیشہ رہتی ہے۔ اس لئے کہ انہیں وقت کی پابندی بہت زیادہ عزیز ہے۔ ان کی زندگی میں ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ وہ کہیں وقت مقررہ پر نہ پہنچ سکے ہوں۔ مشاعروں میں عام طور پر لوگ دیر سے

پہنچتے ہیں اور اب تو یہ چیز ہمارے یہاں روایت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ لیکن مولانا وحشت ہمیشہ مشاعروں میں وقت مقررہ سے قبل یا ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا جس کا یہاں بیان کر دینا لطف سے خالی نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ محسن کالج میں ایک مشاعرہ وحشت صاحب ہی کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ محسن کالج کلکتے سے کچھ تھوڑی دور ہے جہاں لوگ عام طور پر ٹرین سے جاتے ہیں۔ ٹرین شام کے سات بجے چھوٹنے والی تھی۔ جانے والے تمام شعراء اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔ اور مولانا وحشت کا انتظار کر رہے تھے۔ سات بجنے والے تھے اور مولانا وحشت اس وقت تک اسٹیشن نہیں پہنچے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں مختلف قسم کے شبہات پیدا ہو رہے تھے اور ان پر ایک بے چینی سی طاری تھی سبھی کہہ رہے تھے کہ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی ہے ورنہ وقت کی پابندی کا خیال مولانا سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے۔ سات بجنے میں ایک منٹ باقی تھا۔ تمام لوگ مایوس ہو چکے تھے کہ اتنے میں دور سے مولانا وحشت ٹرین کی طرف تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ جب وہ قریب پہنچے تو تمام لوگ ان کو لے کر ایک ڈبے میں داخل ہو گئے اور پھر فوراً ٹرین چل پڑی۔ کچھ دیر کے بعد ایک صاحب نے مولانا وحشت سے کہا کہ حضور آج خلاف معمول ٹرین ایک دو منٹ دیر سے روانہ ہوئی۔ یہ اچھا ہوا ورنہ شاید ہم لوگ اس سے نہ جا سکتے: مولانا وحشت نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ہمیشہ وقت کا خیال کیا ہے۔ کیا آج وقت میرا خیال نہ کرتا؟ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وحشت صاحب نے وقت کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔

مشاعروں میں وحشت صاحب شروع سے اخیر تک ایک ہی انداز میں بیٹھے رہتے ہیں۔ چاہے مشاعرہ دو گھنٹے کا ہو یا رات بھر کا۔ پہلو بدلنا یا بیچ میں اٹھنا مولانا کی وضع داری کے خلاف ہے۔ لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ کوئی شخص رات بھر مسلسل ایک ہی پہلو کیسے بیٹھ سکتا ہے۔ رات بھر مشاعرے میں ایک ہی انداز میں بغیر پہلو بدلے بیٹھا رہنا مولانا وحشت کے لئے جس قدر تکلیف دہ ثابت ہوتا ہوگا اس کا احساس مشکل نہیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہ بات ان کی وضع داری کے تحت آتی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ آداب مجلس کا انہیں کتنا پاس ہے۔ کم لوگ ہیں جن کی نظر مولانا کی اس وضعداری اور خصوصیت پر پڑتی ہے۔ یہاں مجھے وحشت صاحب کا ایک شعر یاد آگیا جو خود انہی پر صادق آتا ہے:۔

خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے

خطوط کا جواب لکھنا اور فوراً لکھنا مولانا کے لئے ایک فرض سے کسی طرح کم نہیں۔ آج بھی جبکہ کمزوری اور ضعیفی کی بنا پر ہاتھوں میں رعشہ پڑ گیا ہے لکھتے وقت انگلیاں کانپتی ہیں اور بینائی بھی کسی قدر کم ہو گئی ہے اگر کوئی انہیں خط لکھتا ہے تو وہ اس کا جواب فوراً لکھتے ہیں اس لئے کہ یہ بات انکی وضع داری کے خلاف ہے کہ ان کی ذات سے کسی کی دل شکنی ہو یا کسی کو تکلیف پہنچے۔ وہ خود نقصان اٹھا کر دوسروں کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں۔

میں نے اپنے ایک بزرگ سے سنا ہے کہ وحشت صاحب کے ایک ہم جماعت تھے جو زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے اور تعلیم ترک کر کے ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا تھا۔ وہ ہوٹل ہرگز ایسا نہیں تھا جہاں کوئی شریف اور معقول قسم کا آدمی جا کر بیٹھتا۔ لیکن کہتے ہیں کہ وحشت صاحب جب کبھی اس راہ سے گزرتے تو بلا ضرورت بھی اس ہوٹل میں جا کر چائے ضرور پی لیتے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ بتائی جاتی ہے کہ کہیں مولانا کے اس ہم جماعت کے دل میں یہ گمان نہ گزرے کہ وحشت صاحب بڑے اور مشہور آدمی ہو گئے ہیں اس لئے مجھ سے ملنے میں انہیں ہچکچاہٹ ہوتی ہے اور اسے کسر شان سمجھتے ہیں۔ مولانا جب کلکتہ میں تھے تو ان کے پاس ہمیشہ ٹرام کا پاس ہوتا تھا اور ٹرام والے پاس صرف فرسٹ کلاس کا دیتے ہیں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ مولانا پاس جیب میں لئے سیکنڈ کلاس میں بیٹھ جاتے۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحشت صاحب کے اندر جھوٹی شان و شوکت کی نمائش ذرہ برابر بھی نہیں ہے۔

وحشت صاحب کے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ برصغیر ہند و پاک کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں ان کے دو چار شاگرد موجود نہ ہوں۔ ہند و پاکستان سے باہر مثلاً رنگون وغیرہ میں بھی ان کے کچھ شاگرد ہیں۔ مولانا کے شاگردوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا اور ان کے تفصیلی حالات جاننا

بہت دشوار ہے اس لئے کہ مولانا دوسرے شعراء کے برخلاف اپنے شاگردوں کے متعلق بہت کم باتیں بتاتے ہیں۔ سر اکبر حیدری مرحوم (سابق گورنر آسام) بھی مولانا کے شاگرد رہ چکے ہیں اور ایک زمانے سے مولانا سے اصلاح لیتے تھے۔ لیکن مولانا نے اس کو اس طرح چھپا کے رکھا جیسے یہ کوئی اخفا کا راز تھا لیکن اپنے مقربین سے وہ زیادہ دنوں تک اس "راز" کو چھپا نہ سکے۔

مولانا اپنے شاگردوں کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ ان کے دکھ درد میں کام آنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اپنے شاگردوں سے کچھ قبول کرنا وہ معیوب سمجھتے ہیں۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے شاگردوں کی امداد کرتے ہیں۔ اور کسی کے کانوں کان اس کی خبر نہیں ہونے دیتے۔ لیکن جن شاگردوں کی وہ مدد کرتے ہیں وہ خود اس کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ اگر کبھی کسی شاگرد کی ملازمت چھوٹ گئی اور وہ مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا تو مولانا نے مسلسل ہر مہینے اسکو مالی مدد پہنچائی اور اپنے جیب خرچ سے دیتے رہے۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا وحشت اپنے شاگردوں کو شاگرد نہیں بلکہ اپنی اولاد سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ اولاد کا سا سلوک کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں اگر مولانا کے شاگرد ان کے پاؤں دھو دھو کر پیتے ہیں انکو خدا کی طرح پوجتے اور ان کے لئے ہر وقت اپنی جان تک قربان کر دینے کے لئے تیار رہتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مولانا وحشت کو روپیہ پیسہ کا کبھی کوئی لالچ نہیں ہوا۔ روپیہ کمانا انہوں نے ہمیشہ ضروریات زندگی کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا اور بس۔ انہوں نے آج تک اپنے کسی شاگرد سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ ایک مرتبہ محمد عبدالعلی شوق سندیلوی کو ایک نئی بات سوجھی اور انہوں نے غزلیں کہیں اور ہر غزل پر مختلف شعراء سے اصلاح لی۔ اور ہر ایک کو اس غلط فہمی میں رکھا کہ وہ انہی کے شاگرد ہیں۔ پھر ۱۹۳۲ء میں ان تمام شعراء کی اصلاحوں کو ترتیب دیکر کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ اور اس کا نام "اصلاح سخن" رکھا۔ اصلاح لینے کے زمانے میں مختلف شعراء سے ان کی خط و کتابت ہوتی تھی۔ اصلاح سخن کے اخیر میں ان تمام خطوط کو بھی "ضمیمۂ اصلاح سخن" کے نام سے شائع کر دیا۔ یہ خطوط بڑے پر لطف ہیں اور اس وقت کے اساتذہ کی افتاد طبع کی بخوبی ترجمانی کرتے ہیں۔ کسی صاحب نے ان سے مٹھائیاں طلب کیں کسی نے سندیلے کے لڈو کی فرمائش کی کسی نے اپنی کتابیں خریدنے اور فنڈ میں روپیہ جمع کرنے کو کہا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں "میرا یہ بھی معمول ہے کہ جو صاحب مجھ سے اصلاح لیتے ہیں ان سے بعض جن کا تعلق بزرگوں و اساتذہ سلف ان کی توفیق اور ہمت کے مطابق کچھ نقد مٹھائی تقسیم کر دی جاتی ہے۔ لہذا صاحب توفیق بھیجئے۔ باقی رہی استاد کی خدمت یہ آپ جانیں اور آپ کی ہمت۔" دوسرے صاحب لکھتے ہیں "ہمیشہ اصلاح کے لئے باضابطہ شاگردی لازمی ہے۔ شاگردی کی مٹھائی عنایت فرمائیے۔" ایک صاحب لکھتے ہیں "آپ نے ...... مجھے فنڈ میں اعانت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس وقت دو کتابیں چھپ رہی ہیں ...... ایک سو روپیہ کا خرچ ان دونوں کتابوں میں ہے۔ مجھے پچاس روپیہ بہت جلد بھیجا جائے۔ اگر آپ اعانت فرما سکتے ہوں تو جلد توجہ کیجئے ...... امید ہے کہ آپ قناعت کر کے جہاں تک جلد ہو سکے اور جو کچھ مناسب ہو رقم سے عنایت فرما کر شکریہ کا موقع دیجئے۔" ایک صاحب ٹکٹ کے دام تک وصول کرنا چاہتے ہیں اور فرماتے ہیں "جتنی غزلیں ایک دم آئیں اتنے ہی ٹکٹ بھی آنا چاہئیں۔" ایک صاحب لڈو کی فرمائش یوں کرتے ہیں "حسب طلب کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا!" "اب آپ سے ہم وطنی کی بنا پر ایک شکایت ہے۔ آپ نے جو اپنی لڈو کھلوانے بھیجا کیا سندیلے میں اب لڈو نہیں بنتے ہیں۔ یہ کھٹکا آیا ہے۔ شکایت یوں کہ کہیں پارسل نہ بھیج دیجئے گا۔ اس کو ضمیمۂ امانت رکھتے ہیں قطعیل کی ہیں اگر خود سے ہوں گا" ایک صاحب نے تو اس معاملے میں انتہا ہی کر دی ہے۔ ان کے خطوط بڑے دلچسپ ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں یہاں ان کے مختلف خطوط سے صرف چند سطریں نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں فرماتے ہیں "میرے دیوان ...... کی اشاعت کے متعلق میرے شاگردوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنے مصارف سے چھپوائیں گے۔ چنانچہ لوگوں نے ایک فنڈ کھولا ہے آپ بھی چندہ بھیجیں ...... یہ چلا بار ہے جو ڈالا جاتا ہے ...... اب تک تمہارے چندے کا انتظار ہے ...... کی اشاعت میں تم بھی کچھ مدد دو۔" آگے تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں "تمہاری امداد کا انتظار ہے۔" اپنے آخری خط میں یہ بزرگ کسی قدر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں "مجھے سخت حیرت ہے کہ اب تک آپ نے ...... کی اشاعت میں کسی قسم کی امداد نہ دی۔ محض معذرت کافی نہیں تو جو کچھ

جانیے۔ ان تمام لوگوں کی فرمائش اور روپیہ کے تقاضے کے پیش نظر مولانا وحشت کا ایک خط بنام شوق سندیلوی پڑھئے۔ وحشت صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"عزیز محترم۔ السلام علیکم۔ گرامی نامہ مع غزلوں کے موصول ہوا۔ نہایت شرمندہ ہوں کہ اس سے قبل رسید نہیں لکھ سکا۔ عدیم الفرصت رہتا ہوں۔ خدا خدا کر کے آج کچھ وقت ملا ہے۔ اکثر احباب کے خطوط عرصے سے اکٹھے پڑے تھے۔ اس وقت جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ کا کلام ماشاءاللہ بہت خوب اور پر اثر ہے۔ مجھ جیسے کم سواد کی اصلاح کا محتاج نہیں۔ لیکن از راہ امتثال امر میں نے کہیں کہیں ترمیم کر دی ہے۔ خطوں کو رجسٹری کر کے بھیجنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ ڈاک کا انتظام یہاں پوری طرح قابل اطمینان ہے۔ ٹکٹ ملفوف نہ بھیجیں۔ چونکہ میں اس کا روادار نہیں ہوں لہٰذا جو ٹکٹ آیا تھا اسے واپس کرتا ہوں۔ امید کہ آپ بجا نہ مانیں گے۔ خیر اندیش۔ وحشت۔"

آج ہمارے شعراء حضرات کے لئے مشاعروں میں جانا اور اس کے بدلے معاوضہ قبول کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اس سے میرا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں اس کو معیوب سمجھتا ہوں اور میری دانست میں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن اسکو کیا کیا جائے کہ مولانا وحشت کو یہ گوارا نہیں کہ وہ باہر کسی مشاعرے میں شرکت کریں اور اس کے بدلے انہیں معاوضہ دیا جائے۔ انہوں نے اس طرح کے کتنے ہی مشاعروں میں شرکت کی لیکن معاوضہ کی شکل میں ایک پیسہ بھی استعمال نہیں کیا۔ وہ تو اس پر بھی مشکل سے تیار ہوتے ہیں کہ آنے جانے کا خرچ مشاعرے کے منتظمین کے ذمہ ہو۔ مولانا وحشت کی یہی وہ شرافت، وضعداری اور روپیہ پیسہ کی طرف سے بے نیازی ہے جس نے لوگوں کو انکا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ یہ انکی وہ خصوصیات ہیں جن میں آج کم لوگ انکے شریک و حریف ہیں۔ مولانا کی سادگی اور شرافت نفسی کو دیکھ کر بے ساختہ مولانا حالی مرحوم یاد آ جاتے ہیں۔ لہٰذا مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ اس معاملے میں مولانا وحشت دور جدید کے حالی ہیں۔

مولانا وحشت کے بارے میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں زندگی کے نشیب و فراز سے گزرے ہیں۔ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس کو اس کے ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ جہاں انہوں نے زندگی کے بڑے خوشگوار دن گزارے ہیں وہاں انکو حالات نے بڑے کٹھن دور سے گزرنے پر بھی مجبور کیا ہے۔ لیکن آفریں ہے انکی ہمت اور مستقل مزاجی پر کہ دل پر ہزاروں قسم کے غم سہتے رہے لیکن جبیں پر شکن نہ آنے دی۔ احباب میں جب بیٹھے تو چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہی اور ان کے دل کی صحیح حالت سے کوئی بھی واقف نہ ہو سکا۔ البتہ اس کے لئے انہوں نے شاعری کا سہارا لیا اور شعر کے پردے میں سب کچھ کہہ گئے اور اس طرح کم سے کم دل کی بھڑاس تو نکال لی۔ ہر شخص جس نے وحشت صاحب کو قریب سے دیکھا ہے انکے حسب ذیل اشعار سے ان کی زندگی کے ایک پہلو کے متعلق بہت کچھ معلوم کر سکتا ہے۔

عدو بنے ہیں زمانے کے جاہ سے دل نے — اب کہاں اس میں تمنا کا گزر ہوتا ہے
عدو بنے ہیں زمانے کے مجھے کیا غم اگر — مٹ گیا دل سے مرے نام و نشان آرزو
شکل کچھ ایسی بدل دی یاس نے امید کی — آرزو پر بھی نہیں ہوتا گماں آرزو
کوئی کس طرح مصیبت سے بچے دنیا میں — مجھ سے اور بھی ہیں عشق کا سودا نہ سہی
جہاں میں چھوڑ جاتا میں اپنا ایک افسانہ — اگر مجھ سے مری روداد غم تحریر ہو جاتی
مجھے ضد ہے اپنی فلاح سے نہیں [illegible] — ہے ضرر ہی سے مجھے واسطہ [illegible]

یہ اور اس قسم کے اشعار وحشت صاحب کے ان مجموعے میں بھرے پڑے ہیں جن کو ترتیب دے کر ہم اگر چاہیں تو انکی زندگی کا خاکہ تیار کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے انکی پچھلی زندگی سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ اوپر میں لکھ چکا ہوں عمر کی وجہ سے مولانا اب نہایت نحیف و کمزور ہو گئے

ہیں۔ باہر آ جانا ان کے لئے ایک امر دشوار ہے۔ باوجود اس کے جب لوگ بہت مصر ہوتے ہیں تو کسی خاص صحبت میں وہ ضرور شریک ہو جاتے ہیں۔

غزل اپنی مجھے پڑھنے ہی پڑے گی وحشت
پاس احباب سہی، دل کا تقاضا نہ سہی

اب وحشت صاحب شعر و سخن سے ایک طرح سے دست بردار ہو چکے ہیں۔

نہ ہوا وحشت کو بزم شعر میں تکلیف شرکت کی
کبھی کچھ کہہ لیا کرتا تھا اب اس میں رہا کیا ہے

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کسی سے اپنا حال کہنا یا اپنی تکلیف و مصیبت بیان کرنا وحشت کی خوددار طبیعت کے خلاف ہے۔ وہ ہزاروں غم سہہ لیں گے لیکن باہر والے کو اس کی خبر تک نہیں ہونے دیں گے۔

کیوں سکوت اپنا بتائے سبب خاموشی
کیوں غلط حال کہے دل کی پریشانی کا

ان دنوں وحشت صاحب بہت رنجیدہ رہتے ہیں۔ اس کا ایک سبب تو ترک وطن ہے۔ وطن کا جب ذکر آتا ہے تو ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ یہ غم ان کو اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔

باعث اندوہ دل غربت کا ہر منظر مجھے
کاہش جاں کا سبب یاد وطن میرے لئے

وطن کے چھوٹنے کے علاوہ اس وقت جو غم کھا رہا ہے وہ پچھلے زمانہ کی یاد ہے۔ پچھلے واقعات جب انہیں یاد آتے ہیں تو باوجود سعی بھی ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ پچھلے ساتھیوں کو یاد کر کے وہ کڑھتے رہتے ہیں۔ اس وقت ان کے دل کی جو حالت ہوتی ہوگی وہ اہل نظر اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس وقت کا کلام صحیح معنوں میں ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ پوری پوری غزل ایک ہی رنگ میں ہوتی ہے وہ رنگ جس میں ان کی زندگی کا رنگ جھلکتا ہے۔

جو زندگی میں نہیں کچھ امید ہی نہ رہی — تو زندگی ہی ہماری رہی رہی نہ رہی
دل فسردہ نے یوں مجھ کو بے نیاز کیا — کہ دہر میں کوئی شے وجہ دلکشی نہ رہی
مقام شکر ہے کہ اک وقت ایسا آ پہنچا — کہ دل کے حال سے خود دل کو آگہی نہ رہی
غلط ہے دوں جو گلستان دہر کو الزام — جب اپنے غنچۂ خاطر میں تازگی نہ رہی

اور آخری شعر تو بالکل ان کے حسب حال ہے:۔

یہ کیا ضرور ہے روؤں میں عیش رفتہ کو
بہا ہی کیا ہے جو لب پر مرے ہنسی نہ رہے

وحشت صاحب شاعری میں صداقت کے قائل ہیں۔ ایسے خیالات جن میں صداقت کا فقدان ہوتا ہے ان کے نزدیک وقعت نہیں رکھتے۔ وہ خود اپنے شعروں میں بھی اس کا بہت خیال رکھتے ہیں اور اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت کرتے ہیں کہ صداقت کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ وہ حد سے زیادہ مبالغہ کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ مبالغہ جب اپنی حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو پھر شعر شعر نہیں رہتا بلکہ معما بن جاتا ہے۔ شعر میں صداقت اور بلند خیالی کے علاوہ وہ لطف زبان کا بھی بڑا خیال رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نہ صرف موضوع کوئی چیز ہے اور نہ صرف زبان

بلکہ موضوع اور زبان دونوں ہی کا پایا ایک مجموعی اثر پڑھنے والے پر چھوڑ جاتے ہیں۔

پسند آ نہیں سکتا ہے طبعِ وحشت کو
وہ شعر جس میں کہ پوشیدہ کچھ نکات نہیں

وحشت صاحب نے شعر کہنے کے علاوہ کچھ تنقیدی مقالے بھی لکھے ہیں جو کہ بہت پہلے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں وحشت صاحب نے مولانا حالی مرحوم کی غزل گوئی پر ایک وقیع مقالہ سپردِ قلم کیا تھا۔ جب یہ مقالہ حالی مرحوم کی نظر سے گزرا تو انھوں نے مولانا وحشت کو لکھا۔ مولانا آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے میری غزل گوئی کی طرف توجہ دی ہے۔ ورنہ اب تک لوگ مجھے قوم کا مرثیہ گو ہی سمجھتے رہے ہیں۔ ان باتوں سے وحشت صاحب کی فکر کی گہرائی و گیرائی اور شعور کی پختگی کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

سلطان حیدر جوشؔ

وحید احمد

یادش بخیر۔ مرحوم سلطان حیدر صاحب باپ کی طرف سے شیخ پورہ (بدایوں) کے فریدی خاندان سے تھے اور ماں کی جانب سے ان کا سلسلہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب دہلوی سے ملتا تھا۔ معلوم نہیں حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ شیخ فاروقی تھے یا سید تھے مگر سیادت فریدی کو تسلیم کرنے والے سلطان حیدر کے نام سے پہلے سید لکھا کرتے تھے۔ ان کے دادا نے پہلے عیش میں پھر راہ خدا میں اپنی کثیر جائداد گنوا دی تھی۔ سخاوت میں وہ مشہور تھے۔ چہرہ پر نور برستا تھا اور بڑھاپے میں بچوں کی سی باتیں اپنے وقار و ظرافت سے کیا کرتے تھے۔ سلطان حیدر کا بچپن اپنی والدہ صاحبہ کے زیر سایہ دہلی میں گزرا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اینگلو عربک اسکول دہلی سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد [illegible]ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ پہنچے۔ لیکن [illegible]ء میں بعہد نواب محسن الملک جب کالج میں اسٹرائک ہوا تو انہیں علی گڑھ کو خیرباد کہنا پڑا اور سلسلۂ تعلیم ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کچھ وقت بیکاری میں گزرا اور کچھ نجی ملازمت میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ [illegible]ء میں ملازمت تحصیلداری سے شروع کی اور نیک نامی کے ساتھ [illegible]ء میں ڈپٹی کلکٹری سے پنشن پائی۔ علی گڑھ میں سکونت اختیار کی اور وہیں [illegible] مئی [illegible]ء کو ہمیشہ کے لئے آرام کی نیند سو رہے۔

دہلی میں فٹ بال ٹیم کے اچھے کھلاڑیوں میں تھے۔ کھیلوں کے سلسلہ میں قلعہ کے انگریزی فوجیوں سے مراسم ہو گئے تھے۔ انگریزی تہذیب کے رسیا تھے علی گڑھ کالج کی فٹ بال ٹیم نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ صاحبیت کے مدارج طے کرنے کا یہاں خوب موقع ملا۔ اور ”جان بل“ کے خطاب سے نوازے گئے۔ لباس عمدہ اور دیدہ زیب پہنتے تھے۔ مجال نہ تھی کہ سوٹ میں کوئی سلوٹ در اندازی کر سکے۔ جسمانی ورزش کا آخر زندگی تک شوق رہا۔ ورزش اور ملازمت نے پابند اوقات بنا دیا تھا۔ اسی واسطے عادات اور اصولوں میں استقلال تھا۔ کم آمیز تھے لیکن جس سے ملتے خلوص سے ملتے۔ تصنع اور ظاہر داری کا ان کے یہاں گزر نہ تھا۔ ماشاء اللہ جسیم و وجیہ ہونے کے ساتھ زندہ دل تھے۔ ظرافت ان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ شرارت و شوخی فطرت میں داخل تھی۔ ان کی صحبت میں وقت کا اندازہ مشکل سے ہوتا تھا۔ آخر میں ثقل سماعت نے ستم پیدا کر دیا تھا مگر اپنی ظرافت سے اسے نباہ لے جاتے تھے۔

ہم یاد نہیں، مگر ایک مسلمان عالم و فاضل مذہب عیسوی قبول کر کے پادری کے عہدہ تک پہنچ گئے تھے اور دہلی میں منظر عام پر مناظرے کیا کرتے تھے۔ سلطان حیدر کو مناظرے سننے کا شوق تھا لہٰذا منطق سے ان کی دلچسپی بڑھی اور پھر منطق کی تحصیل بھی کی۔ اسی زمانہ میں ناولوں کا بھی چرچا شروع ہوا تھا لہٰذا طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک معمولی سا ناول شائع کر کے مصنف بن گئے تھے۔ "انتقام دانی" کے عہد میں شاید شاعری سے شوق رہا ہو لیکن ان کی شاعری کا کوئی نمونہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ بجز اس کے کہ جوش تخلص رکھتے تھے۔ بہر حال ان کا قلمی شوق در اصل رسالہ مخزن سے شروع ہوتا ہے۔ ابتدائی دو تین مضمون اگر قابل اعتنا نہ ہوں تو نہ سہی لیکن پھر ان کے مضامین میں اہمیت و خصوصیت جھلک مارنے لگی تھی۔ انگریزی رسالوں۔ مس کوریلی کے ناولوں۔ آسکر وائلڈ اور برنارڈ شا کے ڈراموں اور دیگر یورپین تصانیف کے پڑھنے کے بعد انہیں افسانہ نگاری کا شوق پیدا ہوا اور وہ اپنے مقبول و دلچسپ طرز کے مالک بن گئے۔ رسالہ تمدن میں ان کے چند مضامین و افسانے ان کی پختگی کے مظہر ہیں۔ تمدن ہی میں پروفیسر مشتاق دہلوی صاحب سے پردہ کے متعلق بحث چھڑ گئی تھی۔ اس علمی نبرد آزمائی سے رسالہ تمدن کی ہر دلعزیزی اور اشاعت میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ سلطان حیدر اور پردہ کی موافقت میں میں نے بھی مضمون لکھا تھا اور غالباً یہ میرا پہلا تحفہ جب مولانا شوکت علی صاحب نے علی گڑھ سے رسالہ 'اولڈ بوائے' جاری کیا تو جوش صاحب اپنے مضامین کے ذریعہ اس رسالہ کی روح و رواں تھے۔ پھر مولانا محمد علی صاحب نے دہلی سے کامریڈ کے ساتھ روزانہ ہمدرد بھی نکالا تو اس کے اسٹاف میں سید محفوظ علی صاحب۔ محمد فاروق صاحب اور قاضی عبد الغفار صاحب جیسے گراں قدر اہل قلم شامل تھے۔ ہمدرد میں اودھ پنچ کے مرحوم حاجی بغلول صاحب نے سیاسی آن بان کے ساتھ از سر نو جنم لیا تھا۔ اس موقع پر سلطان حیدر بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے سنجیدہ و مزاحیہ مضامین سے ہمدرد میں چار چاند لگا دیئے اور خوب خوب داد حاصل کی۔

لہٰذا شوق نے اب انہیں مستقل تصانیف کے لئے مجبور کیا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے دو کتابیں لکھیں۔ ابن مسلم ایک ناول ہے جو اپنی خصوصیات کی وجہ سے آج بھی بہترین نمونہ ہے۔ اس میں کردار نگاری کے وصف کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۸ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا اور دوسرا ایڈیشن میں نے اپنے نقیب پریس بدایوں سے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا اور اب تیسرا ایڈیشن لاہور سے چھپا ہے۔ اس کی اشاعت ۱۹۵۳ء میں سلطان حیدر کے انتقال سے چند ماہ پیشتر ہوئی تھی۔ ان کی دوسری کتاب باقی شیخوپورہ معتمد خان نواب کرید کی سوانح عمری ہے جو عہد جہانگیری۔ شاہجہانی اور عالمگیری سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں تاریخ کی خشکی کو ادب کی رنگینی کا ہم پلہ بنا دیا ہے۔ ان تصانیف کے بعد ان کی تحقیق اور ان کے مطالعہ میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ ریفیئل۔ آنجلو اور دیگر ماسٹرز کی تصاویر اور آرٹ کی گہرائیوں میں رسائی حاصل کی اور اس مطالعہ کے نتائج "انداز فکر"۔ کہکشاں لاہور۔ نقیب بدایوں۔ اور سرگزشت علی گڑھ وغیرہ میں بنہایت آب و تاب سے جلوہ گر ہوئے۔ ان کے مختصر افسانے مثلاً "میرا آئی" اور "نقش نقاش" ان کی بے مثال اور دلکش یادگار ہیں۔ رسالہ الناظر لکھنؤ میں ان کی کسی ظریفانہ بات پر حضرت مولانا عبد الماجد صاحب دریا آبادی نے قرآنی لغت میں "سلام" پیش کر کے اعتراض کیا تھا اور ان سے ذرا دیر تک شروع کی تھی جو ان کے جواب کے بعد ہی ختم ہو گئی۔ دوران ملازمت میں پہلی جنگ عظیم کے موقع پر ریکروٹنگ آفیسر بنا دیئے گئے تھے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے فوجی زندگی اور جنگ کے اصولوں کے متعلق کافی واقفیت و معلومات حاصل کی تھی۔ چنانچہ ان کی تصانیف میں اکثر میدان جنگ کے نقشوں کی بھی تفصیل مل جاتی ہے۔ سلطان حیدر صاحب مسلک آرٹ کو خود پسند کو مطالعہ تحریک کے اصول کے قائل تھے۔ اپنی تصانیف کو زیور طبع سے آراستہ کرنے کا شوق تھا۔ لیکن اشاعت کے متعلق بے نیاز رہے اور تجارتی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔ ابن مسلم کے تیسرے ایڈیشن کی اشاعت اور افسانوں کی طباعت کی اجازت وہ اپنے چند احباب کو بلا معاوضہ عطا کر گئے ہیں۔

ولایت سے میری واپسی ۱۹۱۹ء میں ہوئی تھی۔ یہ حضرت اس وقت ہردوئی میں تحصیلدار تھے۔ اتفاق سے وہاں پر بہترین صحبت د

سوسائٹی مہیا ہو گئی تھی۔ سید عباس علی صاحب۔ سید مسعود الحسن صاحب رضوی اور مولوی عبدالحسن صاحب اودودی وہاں ڈپٹی کلکٹری پر فائز تھے۔ سب کے سب زندہ دل اور باخلاق تھے۔ ان سب کی روح رواں عبدالحسن صاحب تھے اور سلطان حیدر اس سوسائٹی کے پُرجوش رکن اعلیٰ تھے۔ عبدالحسن صاحب قبلہ کی تعریف محض اس قدر کافی ہے کہ مشتق مسلمان ہیں اور علی گڑھ کالج کی ہمدردی سوسائٹی کے جناب تھے۔ ہردوئی کے دیگر مذاق سلیم رکھنے والے احباب کے علاوہ سلطان احمد صاحب بیرسٹر اور جان ظرافت چودھری محمد علی صاحب قبلہ اس سوسائٹی کے ممبر تھے اور چودھری صاحب کا شوق اُن کو کشاں کشاں ردولی سے یہاں لے آیا کرتا تھا۔ سوسائٹی کے صدر صاحب نے فرمان جاری کیا کہ ممبران آپس میں اپنے انداز و طرز میں گفتگو کیا کریں۔ اگر روزمرہ کی عادت کے مطابق گفتگو کسی نے کی تو ایسا مجرم ممبری سے خارج کر دیا جائے گا۔ شاعر ممبران کو حکم تھا کہ شاعری بھی عامیانہ روش کو ترک کر کے سوسائٹی کے رنگ میں کی جایا کرے اور اعلان عام تھا کہ شاعر ممبران میں سے کوئی ایک صاف ستھری غزل لکھے۔ پھر اس غزل کو بیک وقت تمام استادانِ فن کے پاس اصلاح کی غرض سے بھیج دے۔ اس سوسائٹی کی میٹنگ کے وقت اگر کوئی غیر ممبر آ پھنستا تو وہ بیچارہ اپنی قابلیت و ہمہ دانی کے جھکا بکا ہو کر رہ جاتا اور اس کے پلے کوئی بات نہ پڑتی۔ امیر حسن مرحوم انسپکٹر زراعت نے شاعری کے اس خاص طرز میں کمال حاصل کیا۔ شوکت الفاظ سے مشاعروں میں داد حاصل کرتے اور داد دینے والا جب مفہوم شعر سمجھنا چاہتا تو سر کھجا کے رہ جاتا۔ ان کی "ٹکڑے کر دیئے" والی مرصع غزل کا ایک شعر مجھے یاد ہے۔ اس شعر کا ایکٹنگ اور تصور کس قدر دل خوش کن نظارہ پیش کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اس نے پہلے مَس کیا۔ پھر دق کیا پھر چل کیا
اس طرح ظالم نے مستقبل کے ٹکڑے کر دیئے

نشتر سندیلوی کو جب جملہ شاعران باکمال کی اصلاحیں موصول ہو گئیں تو صنفِ شاعری و ادب میں اضافہ کرنے کی غرض سے کتابی صورت میں شائع کی گئیں۔ اور بڑے بڑے ماہرانِ فن کی شخصیتوں کو چمکا کر دکھا دیا گیا۔ غرض ہردوئی کی اس سوسائٹی میں سلطان حیدر کو پروان چڑھنے کا بہترین موقع ملا۔ رسالہ نقیب جاپانیوں کے اجراء کا تصور اسی سوسائٹی نے پیدا کیا تھا۔ بہرائچ پہنچ کر جب سید محفوظ علی صاحب سے میں نے مشورہ کیا تو وہ دل و جان سے سرپرستی پر آمادہ ہو گئے۔ نقیب نے ادب و ظرافت میں کس قدر اضافہ کیا مجھے نہیں معلوم لیکن یہ واقعہ ہے کہ سید محفوظ علی صاحب کو ایک مرتبہ محمد علی صاحب نے گوشہ سے نکال کر دنیائے ادب کو متعارف کیا تھا اور دوسری مرتبہ محفوظ علی صاحب کی تقلید کا فخر مجھے حاصل ہوا۔

سلطان حیدر صاحب کے معمولات میں تھا کہ وہ ہر صبح کو ورزش و غذا سے فارغ ہو کر اور ناشتہ سے پہلے اپنے ملازمین سے ظرافت فرمایا کرتے تھے۔ اور اس طرح بلا ناغہ طبیعت کے سمندر کو دن بھر کی ایسی رفتار پر چلنے کا مشق کیا کرتے تھے۔ یہ ایک مستقل ڈراما تھا جو مستقل طور پر صبح کے وقت کھیلا جاتا تھا یعنی جا و بیجا وجہ تراش کر ملازم پر جھوٹے الزاموں اور گالیوں کی بوچھاڑ کی جاتی تھی کہ کرسی صاف نہیں کی۔ میز پر چیز رکھ دی۔ چلم سے چنگاری کیوں اُڑتی ہے۔ ملازمین اس انعام کو دعائیں سمجھتے تھے اور بہر صورت ہو جانے پر جان جان کر اسی قسم کی حرکتیں کیا کرتے تھے کہ پارہ تیز ہو اور ہر اعتراض کا جواب ترکی بہ ترکی دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ناشتہ کا وقت آ جاتا۔ ناشتہ کھاتے وقت گھر والوں اور ساتھیوں کو سنا سنا کر انتخاب کو حق بجانب اور ملازم کو مجرم قرار دیا کرتے تھے اس کے بعد دن بھر ہنستے کھیلتے گزرتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ دوسروں کو ہنسایا کرتے تھے ہر مصیبت زدہ کو اس کی بہتری کیلئے صلاح مشورہ دیا کرتے تھے اور پوری ہمدردی کرنے میں انہیں باک نہ تھا لیکن برخلاف اس کے جب ذاتی پریشانی ہوتی تو اپنے انداز کو قائم رکھتے ہوئے زمین و آسمان کو زیر و زبر کر دینا بھی ان کی عادت میں داخل تھا اور بڑی مشکل سے ان کو تسکین حاصل ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ اپنی موجودہ زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے مجھ سے کہا کہ تمدن میں پردہ کے متعلق ہم نے غلط بحث کی تھی۔ پردہ تو جہالت کی بات ہے۔ میں نے کہا کہ آپ اپنی جہالت کا پردہ فاش کر رہے ہیں۔ میں تو پردہ ہی ڈالنا مناسب سمجھتا ہوں۔ صحیح یاد نہیں۔ غالباً [illegible] میں ہردوئی پہنچا اپنے کمرہ

ڈاکٹر محمود اللہ جنگ کی معیت میں مجھے مولوی عبدالسلام صاحب (جن کو ہندو مسلمان آزاد بھی کہتے ہیں) کی خدمت میں جانے کا اتفاق ہوا۔ کالی بلڈنگ کی مسجد کے سامنے مختصر سے بالاخانہ پر ان کا قیام تھا۔ فقہ و حدیث میں کامل ہونے کے ساتھ بڑے پایہ کے ولی بھی ہیں۔ اپنی کیفیت میں سرشار رہتے ہیں۔ علم کلام میں ان کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ خوب تقریر فرماتے ہیں۔ برابر بولتے رہتے ہیں۔ اور نئی تراش خراش کی علمی گالیاں ایجاد کرنے میں ان کی مثال نہیں۔ مجھ سے ہنس کر کوئی تشبیہ دینے والا ہوں برجستہ سلطان حیدر کے متعلق استفسار کیا اور فرمایا بڑے کٹر قسم کا دہریہ تھا۔ وجود مطلق سے انکار کرتا تھا۔ بڑی مشکل سے مثنوی کا ایک دفتر پڑھا کر میں نے اسے راہ پر لگایا تھا۔ جب میں نے جوش میں سلطان حیدر سے اس کا تذکرہ کیا تو اقبال کیا اور مولانا کی صفت و ثنا کرنے لگے۔

پنشن کے بعد مستقل قیام علی گڑھ میں تھا۔ گاہ شیخو پور بھی آ کر رہا کرتے تھے۔ بدایوں کے اسلامیہ انٹر کالج کے انتظامات میں خرابی واقع ہوئی اور اس کے متعلق اس کے صدر صاحب کلکٹر سے استدعا کر رہے تھے کہ انتظامیہ کمیٹی میں بحیثیت وزیٹر کے تشریف لا کر ٹرسٹیوں میں جھگڑوں کے متعلق تصفیہ کر دیں تو اسی وقت میں اور سلطان حیدر صاحب صاحب ضلع سے ملنے اتفاقیہ پہنچے۔ کلکٹر صاحب نے سلطان حیدر سے کہا آپ ٹرسٹی بھی ہیں پنشن بھی حاصل کر چکے ہیں لہٰذا میری رائے ہے کہ آپ کالج کے سیکرٹری بن جائیں تاکہ یہ بدنظمی دور ہو جائے۔ یہاں کی صورتِ حال پر غور کئے بغیر یہ حضرت راضی ہو گئے۔ صاحب نے صدر صاحب سے کہا اب میرے آنے کی ضرورت نہیں۔ صدر صاحب سیکرٹری شپ کے خواہاں کو انہیں منتخب کر کے ہمیشہ کے لئے دفن کر دیں۔ صدر صاحب نے بڑے تپاک سے وعدہ کیا۔ معاملہ طے ہو گیا اور سلطان حیدر صاحب انتظامات کے منصوبے باندھتے ہوئے گھر پہنچے۔ دوسرے دن صدر صاحب نے میٹنگ میں یہ کہہ کر سلطان حیدر صاحب کی استدعا پر کلکٹر صاحب نے یہ حکم دیا ہے لہٰذا آپ غور کر لیں اور سلطان حیدر صاحب کو سیکرٹری بنا لیں۔ پروپیگنڈا پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ٹرسٹیوں نے ان میں دو چار عیب نکالے اور ان کو سیکرٹری منتخب نہیں کیا۔ جب واپس آئے تو روداد مجھے سنائی۔ افسوس کی انتہا تھی۔ اس لئے نہیں کہ منتخب نہیں کئے گئے بلکہ اس لئے کہ [illegible] جینے کے بعد مضحکہ اڑایا گیا۔

اب اس عرصہ میں ان کے کچھ احباب عالم بالا کو منتقل ہو گئے اور کچھ احباب پاکستان چلے گئے۔ ان بیرونی و خانگی انقلابات نے ان کی جان پر بنا دی اور ان کی ظرافت شوخی نے بھی نیا وطیرہ اختیار کر لیا۔ بھائی عظمت اللہ خان کی وفات پر انہیں سخت صدمہ تھا۔ اس لئے کہ ان کے ذوق کی اصلاح کرنے میں ان کو بہت دخل تھا۔ ایک روز مجھ سے فرمایا کہ میں ہندوستان میں ایک مسلم ہوں اور نام پاکستان میں عطاء اللہ بیرسٹر کی وجہ سے میری ذمہ داری بندھی رہتی ہے۔ عطاء اللہ صاحب ان کے خالہ زاد بھائی اور بچپن کے ساتھی تھے۔ اس کے بعد جب بحیثیت پارلیمنٹری سیکرٹری کے مجھے علی گڑھ کے دورے پر جانا پڑا تو ان کو لکھ دیا تھا کہ میری مصروفیات مجھے ڈاک بنگلہ میں رہنے کے لئے مجبور کرتی ہیں ان سے فارغ ہو کر میرا وقت آپ کے یہاں گزرا کرے گا۔ دوسرے دن صبح کو جب ان سے ملنے گیا تو میری صورت دیکھتے ہی برس پڑے میرے عہدہ کو سیکڑوں صلواتیں سنا دیں۔ اور میرا اسباب ڈاک بنگلہ سے اپنے یہاں منگوا لیا پھر وہ تمام تکلیفیں اور اذیتیں برداشت کیں جن سے میں ان کو بچانا چاہتا تھا۔ دورانِ گفتگو میں مجھے یہ بتا دیا تھا کہ جواباً عطاء اللہ کو میں نے لکھ دیا۔ کہ فکر نہ کرو اس لئے کہ اقلیت ہر جگہ اور ہمیشہ مظلوم ہی ہوتی ہے۔ میں نے اس نکتہ کی تائید کی۔ جب میں حاکم ضلع سے ملنے گیا تو انہوں نے مجھ سے جائے قیام کی تبدیلی کی وجہ دریافت کی۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ سلطان حیدر میرے چچا زاد بھائی ہیں لہٰذا ان کے حکم کی مجھے تعمیل کرنا تھی۔ بڑی حیرت کے ساتھ صیغۂ راز میں کلکٹر صاحب نے بتایا کہ وہ تو پاکستانی جاسوس ہیں۔ میں نے ان کے خطوط پڑھے ہیں اور عنقریب ان پر مقدمہ چلانے والا ہوں۔ میں نے تعجب سے دریافت کیا کہ کس کو لکھے ہیں اور کیا لکھے ہیں۔ جواب ملا عطاء اللہ کو لکھے ہیں اور یہ لکھا ہے کہ اقلیت مظلوم ہوتی ہے۔ میں ہنس پڑا میں نے اصل واقعہ سمجھا کر انہیں یقین دلا دیا کہ سلطان حیدر کو سیاست سے کبھی واسطہ نہیں رہا۔ اور اب تو اپنے بعض مضامین میں کانگریس کو انہوں نے سراہا ہے

آپ کا مقدمہ ناکام ہوگا۔ تو تسلیم کرنے کے بعد اس شکایت کو باقی رکھا کہ باوجود پنشن یافتہ ہونے کے مجھ سے ملنے کبھی نہیں آتے۔ میں نے ان کی اس کوتاہی کی توجیہہ کر کے وعدہ کیا کہ اب وہ ملنے آئیں گے۔ مگر جا کر پورا لطیفہ سنا دیا اور عرض کیا کہ ہو آئیے۔ اب تو ایسے بگڑے کہ آتے ہی تو جاتے ہیں کہنے لگے میں کبھی ملنے نہیں جاؤں گا۔ اب وہ مجھ پر مقدمہ چلائیں۔ میں اور بھائی صاحب ہنسنے لگے۔ مگر صاحبزادے اور صاحبزادی صاحبہ نے ان کی بے طرح خبر لی کہ نہ دوست کو سمجھیں نہ دشمن کو سمجھیں یوں گھر میں بیٹھ کر ہر کس و ناکس سے بیچ بیچ کی اخباری مضامین پر بحث کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی C – I – D یا دشمن رپورٹ کر دے تو موجودہ فضا میں کوئی سننے والا نہیں اور برا دن دیکھنا پڑے گا۔ ٹھنڈے ہو کر قائل ہو گئے اور دوسرے دن کلکٹر صاحب کے یہاں جانے پر راضی ہو گئے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ کلکٹر صاحب کو انہوں نے رام کیا یا خود رام ہو گئے۔ گذشت خیر گذشت۔

اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ سلطان حیدر بہ حیثیت انسان کے مرنجان مرنج تھے۔ بہ حیثیت ادیب اور ظرافت نگار کے بلند پایہ رکھتے تھے لیکن بہ حیثیت ڈپٹی کلکٹر ان کی شوخی اور زندہ دلی نئے قسم کی تھی۔ جس کو عام مذاق کے لوگ نہیں سمجھ سکتے اور کیا عجب ہے کہ جتنے ڈپٹی کلکٹر صاحبان کا یہی مذاق ہو۔ اس کی ایک مثال دے کر سمجھاؤں گا کیونکہ ان خواص کو سمجھنے کی قابلیت (اچھے آپ ہی نہیں پا!)۔ کانگریس گورنمنٹ نے نیا نیا بنایا تھا۔ میں محض کونسل کا ممبر تھا اور سلطان حیدر کی بھی چھوٹی چھٹی ختم ہونے والی تھی۔ میرے سامنے کلکٹر اس لئے گئے کہ چھٹی کے بعد ان کی تعیناتی علی گڑھ ہو جائے۔ میں نے قدوائی صاحب سے اس قسم کا وعدہ کر انہیں بتا دیا مگر یقین نہیں آیا تو انہیں ساتھ لے جا کر ان کے سامنے چیف سیکرٹری موڈی صاحب کو نوٹ لکھوا دیا۔ شام کو جب کونسل کے اجلاس سے کمرے پر پہنچا تو فرمایا مجھے محقق ہوا کہ قدوائی صاحب کی موڈی صاحب نہیں مانیں گے۔ اس لئے پنتھ جی سے کہلوا دو۔ دوسرے دن میں نے پنتھ جی صاحب سے عرض کیا اور انہوں نے بھی وعدہ کر لیا۔ اور میں سمجھا کہ اب ان کو اطمینان ہو جائے گا۔ مگر بولے تو یہ بولے کہ چیف سیکرٹری بھلا ان منسٹروں کی کب ماننے والا ہے۔ مجبوراً میں نے عرض کیا تو اب آپ موڈی صاحب سے خود مل لیجئے۔ اس پر انہوں نے سپر ڈال دی اور موڈی صاحب سے ملنے کو گئے۔ موڈی کے سامنے قدوائی صاحب کا نوٹ موجود تھا اس نے ڈپٹی صاحب سے کہا کہ آپ علی گڑھ چاہتے ہیں؟ جواب دیا کہ ’علی گڑھ ہو یا کوئی سا اس کے قریب کا ضلع ہو۔ اور پھر خود ہی ایٹہ کا نام بھی تجویز کر دیا۔ اس نے پھر دریافت کیا کہ ترجیح کس کو دینا چاہتے ہیں۔ فرمایا ایٹہ کو۔ ملاقات ختم ہو گئی۔ واپسی پر کونسل کے اجلاس سے مجھے باہر بلا کر ملاقات کا حال مع متعلقات و مرصعات میں سنا دیا۔ لیکن مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے کہ جلدی میں اصل حقیقت کو میں نہیں سمجھ پایا۔ وقت رخصت مجھے تاکید کی کہ علی گڑھ کی تعیناتی کا خیال رکھنا۔ کچھ دن بعد خط آیا کہ ایٹہ بھیجا گیا ہوں۔ مجھے حیرت ہوئی اور قدوائی صاحب سے شکایت کرنے پہنچ گیا۔ دیکھتے ہی فرمایا کہ کیوں حضرت یہ کیا بات ہے۔ مجھ سے علی گڑھ کے متعلق کہا اور چیف سیکرٹری سے ایٹہ کے متعلق طے کیا۔ عرض کیا یک نہ شد دو شد۔ آپ نے تو الٹا میرا منہ بند کر دیا۔ میں تو خود اسی کی شکایت کرنے آیا تھا۔ فرمایا دفتر سے تحقیق کرو۔ نتیجہ تحقیق وہی نکلا جو قدوائی صاحب نے بتایا تھا۔ اب میں نے ان حضرت کو لکھا کہ این ہمہ آوردۂ تست۔ شکایت کس بات کی ہے۔ جواب ملا کہ یہ حرکت میں نے عمداً کی تھی کہ چیف سیکرٹری یہ دیکھے کہ میں منسٹروں سے اس پر اثر ڈلواتا ہوں۔ مگر تمہاری کوشش پر مجھے اعتماد تھا جس میں مجھے مایوسی ہوئی۔ تمہاری کوتاہی کی شکایت ہے اور کچھ نہیں۔ یہ توجیہہ سن کر مجھے اپنی غلطی تسلیم کر لینے کے علاوہ اور صورت ہی کیا تھی۔ اب خود بیوی کے انتقال کے بعد ان کی ظرافت نے اپنے اوپر خود ہنسانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ظرافت سے باز نہیں آتے تھے۔

خدا جانے کیا قصہ ہے میرا اپنا تجربہ یہی ہے کہ جب میرا کوئی عزیز و قریب اس جہان سے رخصت ہونے کو ہوتا ہے تو [illegible] وجہ ہو کر [illegible] اول کا نام یہ ہے کہ تحقیقوں کے ایک مجموعہ کی تمہید میں ان کے [illegible] ایک طویل [illegible] کر دیا تھا۔ ہر چند میں نے [illegible] لکھتے ہوئے [illegible] کا لفظ ہی [illegible]۔ لیکن انہوں نے میری نہیں مانی اور [illegible] ایک سخت خط لکھا جواب آیا کہ [illegible] معاف کر [illegible] معاف کر دیا لیکن [illegible] بند ہو گئی۔ اس دوران میں [illegible] صاحب کا [illegible]

اختر شیرانی

نیر واسطی

ادب کے سلسلے میں میری زندگی کا دلچسپ مشغلہ شعر، تنقید اور تاریخ ہے۔ لیکن میری عادت کے خلاف طفیل صاحب نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اختر کی شخصیت کے موضوع پر لکھوں۔ لہٰذا ان کے ارشاد کی تعمیل میں کوشش کر رہا ہوں کہ اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکوں گا۔

سنہ ۱۹۲۳ء سے اختر کا نام میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ میں ان دنوں چوک چونا منڈی لاہور میں مطب کرتا تھا۔ حافظ محمد عالم مدیر عالمگیر مجھ سے اپنے رسالے کے لئے نظمیں لکھوا کر لے جاتے تھے اور اکثر اختر کے حالات بیان کیا کرتے تھے۔ پھر اسی ضمن میں انتخاب اور بہارستان نے جنہیں اختر نے سنہ ۱۹۲۵ء و سنہ ۱۹۲۶ء میں جاری کیا تھا مجھے ان سے اور زیادہ روشناس کر دیا۔ لیکن اس کے بعد عاشق بٹالوی نے شاعری اور شعر میں ان کی محویت، بیخودی، وارفتگی اور والہانہ زندگی کے حالات کچھ ایسے لطیف اور پر کیف انداز میں بیان کئے کہ میں اختر کا نادیدہ عاشق ہو چکا تھا۔

مارچ سنہ ۱۹۳۰ء کا ذکر ہے کہ ایک دن شام کو مغرب کے بعد ایک حسین اور تنومند نوجوان ننگے سر، ہاتھ میں ترکی ٹوپی لئے کالی اچکن پہنے مطب میں آیا اور کہنے لگا کہ حکیم صاحب! ایک مریض کو دیکھنے کے لئے چلئے۔ میں نے اس کا نام پوچھا۔ فرمایا اختر شیرانی ——— سنتے ہی لپٹ گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ برسوں کے بچھڑے ہوئے کسی دوست کو پا لیا ہے۔ اختر سے میری یہ پہلی ملاقات تھی ——— اس کے بعد تمام عمر جب تک وہ زندہ رہے یہ رشتۂ محبت روز بروز مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا گیا۔

میں نے اختر کو زندگی کے ہر دور اور ہر حال میں دیکھا تھا کہ روزِ ملاقات سے یومِ وفات تک جس کو ان کی شاعری کی عمر کا پہلا دور سمجھنا چاہئے ان کی زندگی اور بالخصوص رومانی زندگی کے تمام مراحل میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں۔ میں نے ان کو خلوت میں دیکھا، جلوت میں دیکھا، دوستوں میں دیکھا، دشمنوں میں دیکھا، امیروں میں دیکھا، فقیروں میں دیکھا اور فلیمنگ روڈ کے تنگ و تاریک کمرے کے علاوہ گجرات کی راتوں کی جلوہ بازیوں، ایبٹ آباد کی مشام و دماغ کی تازہ سامانیوں، مری کی سبز برساتی فضا کی بہار زا شبنمیوں اور خصوصاً باغ لارنس کی دلکش چاندنی راتوں میں دیکھا۔ اختر ہر جگہ اور ہر حال میں ایک عجیب و غریب انسان نظر آیا۔

میانہ قد، سڈول جسم، روشن آنکھیں، کتابی چہرہ، سنہرا رنگ، کبھی کبھی اچکن، دو رنگے گلے کی قمیص اور سندھی طرز کا پاجامہ، چال میں لغزش اور نگاہوں میں مستی ——— گورا گورا سا ایک جوانِ خوش ——— یہ تھے اختر شیرانی جو ابتدا میں آگ تھے اور انتہا میں خاک ———

اختر ۴ مئی ۱۹۰۵ء کو اپنے وطن مالوف ٹونک میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے وقت آپ کے والد محترم حافظ محمود شیرانی نے آپ کا نام داؤد خاں رکھا۔ لیکن بعد میں انہوں نے اپنا تخلص اختر اختیار کر لیا۔ اور شیرانی الاصل ہونے کی وجہ سے شیرانی کہلائے۔

ان کے والد محترم حافظ محمود شیرانی فارسی علم ادب، تنقید اور تاریخ کے جید عالم تھے اور علم عروض میں تمام ہندوستان میں منفرد تھے۔ حافظ صاحب مرحوم جب ۱۹۱۳ء میں ولایت سے تعلیم سے فارغ ہو کر ٹونک تشریف لائے تو انہوں نے ٹونک میں اختر کی ابتدائی فارسی تعلیم کے لئے مولوی صابر علی صاحب شاکر کو مقرر کیا۔ جنہوں نے پہلے پہل اختر میں شعر کے ذوق کو بیدار کیا۔ ایک پہلوان قیوم خاں ملازم رکھا گیا جو اختر کو ورزش کراتا اور کشتی کا فن سکھلاتا تھا۔ اور ایک خوشنویس متعین کیا گیا جو اختر کو خوشنویسی کی مشق کراتا تھا۔ اختر کی حسین خط و خال اور جسمانی خوبصورتی و تنومندی در حقیقت اسی دور کی یادگار تھی۔

حافظ محمود شیرانی ۱۹۲۱ء میں جب ٹونک سے جلاوطنی کے سلسلے میں اہل و عیال کو ساتھ لے کر لاہور آئے اور یہاں آکر اورینٹل کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے تو اختر بھی ان کے ساتھ تھے۔ حافظ صاحب مرحوم نے اختر کو اورینٹل کالج میں داخل کرا دیا۔ اور غالباً ۱۹۲۲ء میں جبکہ اختر کی عمر ۱۶ سال کی تھی انہوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کر لیا۔

اس کے بعد خیال تھا کہ اس باقاعدہ تعلیم کے سلسلے کو اور آگے بڑھایا جائے کہ اختر شعر و سخن کی دلچسپیوں کی جانب زیادہ متوجہ ہو گئے۔

اختر نے انگریزی باقاعدہ نہیں پڑھی تھی لیکن مطالعہ کی بدولت خاصی استعداد بہم پہنچائی تھی اور کچھ عربی سے بھی واقفیت حاصل کر لی تھی۔

اختر نے بہت کمسنی ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن ۱۹۲۳ء سے ان کی نظمیں باقاعدہ رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ پہلی نظم جوگن تھی جس نے علمی اور ادبی حلقوں کو متوجہ کیا۔ اور پھر اس کے بعد سرزمین گجرات۔ انجام ہستی۔ تیتری کی "ایک بار دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس" اور اسی نوع کی بیشمار نظموں کا سلسلہ شروع ہو گیا جنہوں نے دنیائے شعر و ادب میں ہنگامہ برپا کر دیا۔

ابتدائی دنوں میں ٹمپل روڈ پر آپ کے والد کے مکان میں زینے کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ اختر کے لئے مخصوص تھا۔ جس میں چند کرسیاں اور ایک چارپائی دکھائی دیتی تھی۔ دریچہ کی جانب ایک میز تھی جس پر چند کتابیں رکھی رہتی تھیں اور کبھی کبھی نپولین کی مراجعت روس کی تصویر نظر آتی تھی۔

در حقیقت یہی تھا اختر کا وہ مدرسۂ شعر و مکتب فکر جہاں ادب اردو کے ایک نئے دور کی تخلیق ہوئی اور شعر و ادب کے نئے اسالیب و اقدار وضع ہوئے۔

اختر کے دوستوں، شاگردوں اور ملاقاتیوں کا ہجوم اسی کمرے میں رہتا تھا اور اختر نے جو ادبی رسائل و مجلات جاری کئے ان کا دفتر بھی در حقیقت یہی کمرہ تھا۔ یہاں اختر ہمہ تن اپنے دوستوں کی خاطر و تواضع میں مصروف رہتے اور ان کا ملازم فضل بار بار بالاخانے کے زینے سے نیچے کی منزل میں جہاں یہ کمرہ تھا آتا اور آنے والوں کی خدمت میں سگریٹ، پان، شربت اور لیمونیڈ وغیرہ پیش کرتا۔

۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک اختر کی شاعری کے شباب کا دور تھا۔ اس دور کے ابتدائی ایام میں ان کی شاعری نے سب سے زیادہ جن لوگوں کو متاثر کیا وہ کالجوں کے طلباء، طالبات اور اس دور کے ہونہار نوجوان ادیب تھے۔ لاہور کے تقریباً ہر کالج کا ہر نوجوان جسے ادب سے ذرا بھی وابستگی تھی ان کے پاس پہنچتا تھا۔ اسی زمانے میں ن۔ م۔ راشد نے گورنمنٹ کالج لاہور کی مجلس اردو میں اختر کی شاعری پر ایک شاندار مقالہ پیش کیا۔ جو اب ان کی کتاب اختر ستان میں شامل ہے اور اس کے بعد سید اختر احمد اختر اورینوی نے گورنمنٹ کالج پٹنہ میں ان کی شاعری پر ایک اور سیر حاصل مقالہ پڑھا۔

اس دور میں اختر کے گرد اس دور کے خوش ذوق نوجوان ادیبوں کا ایک شاندار حلقہ جمع ہو گیا تھا۔ ن۔ م۔ راشد۔ پیرزادہ احمد ندیم قاسمی

میرزا ادیب - وزیر حسن محمود - عمر فاروق - علی رضا - خضر تمیمی - مصطفےٰ احسن - سلیم رضا - عاشق بٹالوی - سرور کریم نواز - سید محمد جعفری - عظیم قریشی اور دیگر بے شمار نوجوان ادیب اختر کے پاس چاند کے گرد تاروں کی طرح جمع ہو گئے تھے۔ چراغ حسن حسرت بھی جنہیں اختر جوانِ حسن کہا کرتے تھے کبھی کبھی شام کو اس محفل کو جگمگاتے تھے۔ جگر و جوش جب لاہور آتے اس کلبۂ اختر کی زینت بنتے۔

پھر اختر کے ادبی رسالوں نے رومانی ادیبوں کے اس حلقے کو اور وسیع بنا دیا تھا۔ مولانا حسرت موہانی مولانا تاجور نجیب آبادی بابائے اردو مولانا عبدالحق - آغا حشر کاشمیری - چودھری خوشی محمد ناظر - عبدالرحمٰن چغتائی - چودھری فضل حق سب جج - شیخ عالم علی - ڈاکٹر تصدق حسین خالد - ڈاکٹر سید صبیح حسین نجمی - سید شبیر حسین بخاری - مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش - میر منظور محمود ولی - شیخ عبداللطیف تپش - سید ولایت حسین م ف ساحل ڈوٹی - اسرار الحق مجاز اور ان کے علاوہ اس دور کے تقریباً تمام مشاہیر علم و ادب اس حلقے میں شامل تھے۔

اختر کی اس محفل ادب میں ملک کی ممتاز اہل قلم خواتین بھی شریک تھیں۔ ان میں محترمہ کنیز فاطمہ حیا کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے علاوہ محترمہ ادا جیلانی - محترمہ عائشہ بیگم شمیم - محترمہ نسرین خانم - محترمہ آمنہ نسیم - محترمہ رضیہ خاتون رضا - محترمہ شکیلہ اختر - انسہ زہرہ بیگم اور دیگر بے شمار ادیب خواتین اختر کے رسائل میں مضامین نظم و نثر لکھتی تھیں۔

اختر کی دوستی کے لئے علم و فضل کی کوئی قید نہ تھی۔ ایک پنواڑی سے لے کر لاہور میں بڑے سے بڑا ادیب اور صحافی ان کا دوست تھا۔ میں نے یہاں اختر کے دوستوں کی جو فہرست پیش کی ہے وہ بہت مختصر ہے۔ صرف پنجاب اور بالخصوص لاہور میں اختر کے ادیب دوستوں کی تعداد جو مجھے معلوم ہے کہیں زیادہ تھی۔

درحقیقت کشمیر سے لے کر راس کماری تک ملک کا کوئی ادبی گوشہ اور کوئی ادیب، شاعر اور صحافی ایسا نہ تھا جو اختر سے واقف اور ان کا قدردان نہ ہو۔ دوستوں کے خطوط کا ایک انبار تھا جو روزانہ اختر کے پاس جمع ہو جاتا تھا۔

رومان میں اختر کے مخصوص طرز نگارش کے حامیوں کا جو حلقہ بن گیا تھا، اختر اسے دائرہ رومان کے نام سے یاد کرتے تھے۔ رومان میں ان کے خطوط پر تبصرے چھپا کرتے تھے۔ رومان کے سرنامہ پر تحریر تھا: "اردو کے نوجوان اہل قلم کا ماہنامہ"۔

انہیں مصوری سے گہرا لگاؤ تھا۔ موسیقی سے دلی وابستگی تھی۔ مشہور موسیقار مرحوم غلام حیدر ان کے خاص دوست تھے۔ اکثر موسیقی کی محافل میں شامل ہوتے۔ "ب [illegible] کے نغمے ان کو بہت پسند تھے جس کا ذکر انہوں نے اپنے ایک سانیٹ میں بھی کیا ہے۔

خطاطی اور فن خطابت سے اختر کو بڑی دلچسپی تھی۔ وہ خود بڑے اچھے خطاط تھے۔ حروف کے دائرے بڑے حسین بناتے تھے لیکن سطریں اکثر سیدھی نہیں رہتی تھیں۔ ہمیشہ ان کی یہ خواہش رہتی تھی کہ ان کا رسالہ بڑے اچھے خط میں چھپے اور اس مقصد کے لئے وہ عموماً لاہور کے مشہور کاتب لکھمی کو پسند کرتے تھے۔

کلاسیکی ادب میں اختر کی نظر بے حد وسیع تھی۔ فارسی کے شعراء میں طالب آملی سے لے کر آج تک کے جدید ایرانی شعراء کے کلام پر انہیں عبور حاصل تھا۔ شاعری میں حافظ کے پرستار تھے، اور اس کے دیوان کو شاعری کا قرآن کہا کرتے تھے۔ اردو شعراء میں میر اور غالب کے معتقد تھے۔ ذوق کا نام جب آتا تو انہیں محمد رمضان کے صاحبزادے کہہ کر عجیب انداز میں یاد کرتے۔

وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے لیکن مشترکہ ہند کے ہر مشاعرے میں طلب فرمائے جاتے تھے۔ جہاں جگر و جوش موجود ہوتے، اختر موجود ہوتے۔ مشاعروں میں وہ اپنا کلام بغیر ترنم کے پڑھتے تھے۔ سامعین چونکہ اختر اور اس کے کلام کے عاشق ہوتے اس لئے آپ کے کلام سے مشاعرہ گونج اٹھتا تھا۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا کہ عالم سکر میں بھی پڑھ دیتے۔ ان مشاعروں سے جو رقم وصول ہوتی وہ بالعموم بوتلوں کے جنبانی میں بہا دی جاتی تھی۔

شعر کہتے وقت میں نے اختر کو کبھی گنگناتے نہیں دیکھا لیکن شعر پھولوں کی طرح بے ساختہ ان کے منہ سے جھڑتے تھے۔ عالم سکر میں اکثر بے

بہت کم شعر کہے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ میں شراب کی کیفیت کو شعر کی مصروفیت میں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ وہ بالعموم خمار کی حالت کے بعد شعر کہتے تھے۔

پرائیویٹ صحبتوں میں اپنا کلام خود سنانے میں تامل کیا کرتے تھے اکثر دوستوں کو ارشاد فرماتے کہ وہ ان کا کلام پڑھیں۔ بعض دوست ترنم سے پڑھتے اور وہ اسی کو سن کر جھومنے لگتے تھے۔ اختر کا ہر شعر کسی نہ کسی داستان سے وابستہ ہے۔ آخری عمر میں اکثر ایسا دیکھا گیا کہ جب ان کے کسی دوست نے ان کا کوئی خاص شعر خوش الحانی سے پڑھا تو وہ بے چین ہو گئے ایک مرتبہ اصغر نے ان کی ایک مشہور غزل کا یہ شعر ترنم سے پڑھا کہ

؎ کس کی آنکھوں کا نشے دل پہ اتر جاتے ہیں
میکدے ہاتھ بڑھاتے ہیں جو سر جاتے ہیں

تو انہیں کلکتہ کا سفر اور اس کا ایک حسین منظر یاد آ گیا اور دیر تک زار و قطار روتے رہے۔

اختر اس عہد کے ادیبوں میں ابوالکلام اور آغا حشر سے متاثر تھے۔ اور آغا حشر بھی اختر سے اس قدر متاثر تھے کہ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ ؎

پھر زاہد سے کیوں ہے استغفار ہی پہ ناز
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تمہی اختر میں

مولانا ابوالکلام نے سنہ ۱۹۲۶ء میں جب دوبارہ الہلال جاری کیا تو اس میں اختر کی نظمیں شائع ہوئیں۔ انگریزی ادب میں اختر پر کیٹس کا اثر تھا اور گہرا اثر تھا۔ بعض دوستوں کا خیال ہے کہ ان کی زندگی بعد میں اسی کے رویے میں ڈھلتی گئی۔

رسائل و مجلات کی ادارت میں بھی ان کا خاص مقام تھا۔ ابتدا میں ہمایوں میں انہوں نے ادارت کے فرائض انجام دیے۔ مدتوں تک ماہنامہ سہیلی کی ادارت فرمائی اور آخر میں مولانا تاجور نے جب 'شاہکار' نکالا تو اس کے ادارتی فرائض میں بھی آپ شریک تھے۔ اور مولانا نجیب آبادی حسرت کے 'شیرازہ' کی ترتیب و تزئین میں بھی ان کا حصہ تھا۔

اختر نے سب سے پہلے سنہ ۱۹۲۵ء میں انتخاب کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام و معیار کچھ مدت کے بعد بدل کر بہارستان کر دیا۔ بہارستان جب بند ہوا تو سنہ ۱۹۲۸ء میں خیالستان جاری کیا لیکن خیالستان بھی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا —— اور اب کاروباری زندگی سے بے تعلقی کی وجہ سے وہ ارادہ کر چکے تھے کہ آئندہ کوئی رسالہ جاری نہیں کریں گے لیکن احباب کا اصرار غالب آیا اور انہوں نے غالباً سنہ ۱۹۳۲ء میں رومان کے نام سے رسالہ جاری کر دیا۔ اسی موقع پر کہا تھا کہ

؎ میں کہاں اختر متاعِ عالمِ فانی کہاں
طائرِ سدرہ نہیں تنکے اٹھانے کے لئے
لیکن اہلِ دل کی بزم آرائیوں کو کیا کروں
چاہیے جنگل میں جی کا دل بہلانے کے لئے

جیسا کہ اختر خود کہا کرتے تھے۔ یہ روایت قائم ہو گئی تھی کہ اختر کا کوئی رسالہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان میں اختر کا یہ عالم تھا کہ جب بھی وہ کوئی نیا رسالہ جاری کرتے فوراً خریداروں کا حلقہ مہیا ہو جاتا تھا۔

اختر کے ان رسالوں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ذریعہ بعد میں اختر کے مجموعہ ہائے کلام صبحِ بہار، اخترستان، لالۂ طور، طیورِ آوارہ، شہناز اور شعرستان کے لئے ان کی نظموں اور غزلوں کا بہت سا سرمایہ مل گیا۔ ان مجموعوں کے علاوہ نظم میں اختر کی دو کتابیں اور شائع ہوئیں ایک نغمۂ حرم دوسری پھولوں کے گیت۔ نثر میں دھڑکتے دل کے عنوان سے آپ کے مضامین نثر کا ایک مجموعہ چھپا۔ اور اس سے قبل ضحاک اور آئینہ خانے میں اختر کی دو مختصر کتابیں شائع ہوئیں۔ ان چھوٹے رسالوں کے علاوہ آپ نے مجمع البحرین، مطلع السعدین اور جامع اللغات کی ترتیب و تدوین میں بھی حصہ لیا اور عربی کی جوامع الحکایات کا دو جلدوں میں ترجمہ اور خلاصہ لکھا۔

اختر کے ذاتی عادات و خصائل بڑے عجیب و غریب تھے۔ نہ ان کی رات رات تھی نہ ان کا دن دن تھا۔ تمام عمر رندی و مستی، بیخودی، سرشاری اور پرستشِ حسن کے لئے وقف تھے۔ ہر چھوٹا بڑا ان کا دوست تھا۔ ہر ایک سے بے تکلفی سے ملتے اور بعض دوستوں

کے لئے نئے نئے پیار کے نام تجویز کرتے اور انہیں ان سے مخاطب کرتے۔ ان کی دوستی کے لئے اخلاص تک ضروری نہ تھا۔ ہر وہ شخص دوست بن سکتا تھا جو ملیح ہو۔ ملیح کے لفظ سے ان کے یہاں اصطلاحاً حسین صورت مراد لی جایا کرتی تھی۔

ابتدائی دور میں نشے کی حالت میں بہت زیادہ بولتے تھے۔ اور اس عالم میں اکثر چبھتی ہوئی باتیں کہہ جاتے تھے۔ لیکن گاہے بگاہے ریڈیو پر آتے تھے۔ سلسلۂ کلام جلد جلد ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی جانب منتقل ہوتا رہتا تھا۔ اور اس سے وہ دل و دماغ میں شگفتگی محسوس کرتے تھے۔ کھاتے بہت کم تھے لیکن پیتے بہت زیادہ تھے۔ گوشت اور بھنا ہوا گوشت اکثر پسند کرتے تھے لیکن بالعموم صورت یہ ہوتی کہ چند لقمے لے کر چھوڑ دیتے اور اس کے بعد حالت یہ ہوتی کہ کچھ دیر تک دسترخوان سامنے کھلا رکھا رہے اور وہ اسے دیکھتے رہیں۔

میں نے انہیں بہت کم پڑھتے دیکھا ہے لیکن حیرت ہے کہ جب وہ کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو محسوس ہوتا تھا کہ ایک بڑا پڑھا لکھا اور بہت مطالعہ کرنے والا انسان مصروفِ کلام ہے۔ فلیمنگ روڈ کے مشہور درمیانی منزل والے کمرے میں ان کی محفل ہوا کرتی تھی اس کے بعد عرب ہوٹل کا درجہ تھا جہاں وہ دوستوں میں بیٹھے محفل کو باغ و بہار بنائے رکھتے تھے۔

انہوں نے گھر اور گھر کے حالات سے کبھی تعلق نہیں رکھا۔ والد صاحب ناراض تھے اور اسی لئے والد کے ڈر سے والدہ ان سے چھپ چھپ کر ملتیں اور سمجھاتیں لیکن معاملہ سمجھنے سمجھانے سے حل نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے خود بیوی کی ضروریاتِ معیشت کی جانب کبھی توجہ نہیں کی۔ حافظ صاحب مرحوم ان کا اپنی بیٹی کی طرح خیال رکھتے تھے۔ اور اختر کے بچوں خورشید اور مسعود کو بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ لیکن آخری عمر میں مرنے سے پہلے جب لاہور میں میرے یہاں مقیم تھے اکثر بیوی بچوں کو یاد کرتے اور کبھی کبھی یاد کرتے کرتے رو پڑتے۔ ایک دن بیوی کی وفا اور اپنی بے وفائی کو اس قدر یاد کیا کہ روتے روتے ہچکی بند ہو گئی۔ مرنے سے پہلے اپنی بیگم کے متعلق ایک سانیٹ لکھا جس کا عنوان پہچان رکھا تھا۔ اس میں ایک جگہ لکھا کہ ؎

ہر ایک ذرہ میں ڈھونڈے گی یہ جبیں تجھ کو
یہ تب طلب نہ پائے گی جب کہیں تجھ کو

عام لوگوں کے ساتھ ان کا سلوک نہایت مشفقانہ بلکہ عزیزانہ ہوتا تھا۔ نائی، پنواڑی اور تانگے والے اکثر ان کے یار بنے رہتے تھے بعض وقت ایک تانگہ چار چار دن تک ان کی اردلی میں رہتا تھا۔ اور چار دن کے بعد کوچوان کو اگلے پچھلے پیسے دے کر جاتے تھے۔ ایک دن دہلی کے ریڈیو اسٹیشن پر صبح کے وقت ایک دوست کو ملنے گئے۔ شام تک تانگہ باہر کھڑا رہا۔ شام کو رخصت کرتے وقت دوست نے پوچھا کہ بھلا یہ دن بھر تانگہ کیوں کھڑا رکھا۔ فرمانے لگے کہ جوان غریب اور شریف آدمی ہے میں نے سوچا اس کا بھلا ہو جائے۔

محلّے کا پنواڑی ان کا دوست تھا جس کا بل مہینے مہینے بھر کے بعد ادا ہوا کرتا تھا۔ پان بے حد کھاتے تھے خصوصاً ان دنوں میں جب کچھ وقت کے لئے شراب ترک کر دی جاتی تھی۔ پان کے ساتھ بہت زردہ منگوایا جایا کرتا تھا۔ سگریٹ کا دور بھی بڑے زور سے جاری رہتا تھا۔ خصوصاً ان دنوں میں جبکہ شراب چھوڑ دی جاتی تھی۔ وہ سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے تھے اور اکثر اوقات دوست سگریٹ سلگا کر دیتے تھے کہ کثرتِ سیگار نوشی کی وجہ سے ان کی وہ انگلیاں زرد پڑ گئی تھیں جن سے سیگار اور سگریٹ پکڑتے تھے۔ ایک دن سگریٹ کی تعریف میں ایک جدید ایرانی شاعر کا یہ شعر سنایا ؎

سیگار بہ لب و ناز پری وش آل
ای ہمدم دل کش و دلدار کشیدنیست

دو تین مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ سگریٹ ہاتھوں ہی میں لئے سو گئے یا نشے میں غافل ہو گئے۔ فلیمنگ روڈ والے کمرے کے بستر سے دھواں اٹھنے لگا۔ فضل ملازم چلایا۔ والدہ محترمہ آئیں اور انہوں نے اختر کو بستر سے جدا کیا۔ ابتدائی دور میں اکثر [illegible] پسند کرتے تھے۔

میں نے ان کو پان، سگریٹ اور شراب کے سوائے کوئی چیز بازار سے خریدتے نہیں دیکھا۔ لباس اور ان کی ضرورت کی تمام چیزیں

کے لئے ان کی والدہ محترمہ مزید کر منگواتی تھیں۔

آخر عمر میں سر کے آگے کے بال کچھ سفید ہو گئے تھے۔ کوشش کرتے تھے کہ اس سفیدی کو چھپائیں اور اس مقصد کے لئے عموماً پیڈرو پین پاکس منگوا کر لگایا کرتے تھے۔

وہ بے حد ملنسار اور خلیق تھے لیکن کبھی کبھی ذرا خشک نظر آتے تھے مگر جب کھلتے اور خصوصاً بوقت مے پرستی کھلتے تو طبیعت بے حد شگفتہ ہو جاتی تھی۔ عالمِ کیف میں سب کچھ ہوتا تھا لیکن ہوش کی حالت میں میں نے انہیں بے حد متین دیکھا۔ چہرہ عموماً متبسم رہتا تھا اور ہوش کے عالم میں کبھی قہقہہ نہیں لگاتے تھے۔ جن لوگوں سے ملنا پسند نہ تھا ان سے ملاقات کے وقت بالعموم خاموش سے بیٹھے رہتے تھے۔

سینما سے انہیں کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ پہلے پہل جب متکلم فلمیں لاہور میں آئیں تو میں تین چار بار انہیں لے گیا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ تصویروں کی بجائے حسین صورتوں کی جانب زیادہ متوجہ رہے جو سینما ہال میں ادھر ادھر رونق افروز تھیں۔ البتہ ہندوستان کے مشہور رقاص سنگر کی فلم انہیں پسند آئی اور خصوصاً وہ منظر انہیں زیادہ پسند آیا جس میں پجارنیں مندر کے باہر دروازہ پر بیٹھیں ہاتھوں میں لئے کمال عقیدت سے رقاصانہ وارفتگی کا مظاہرہ کر رہی تھیں —— بایں ہمہ لطف یہ ہے کہ فلموں والے آتے اور ان سے اپنی فلموں کے لئے منظوم و منثور مکالمے لکھوا کر لے جاتے تھے۔ ریکارڈوں میں ان کا لیلیٰ و مجنوں والا مکالمہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اختر بہت کم بیمار ہوتے تھے اور ان کی بیماری بالعموم شراب کے بعد کی خماری کیفیت کا نتیجہ ہوتی تھی۔ جس نے آخر میں ان کے جگر اور عصبی نظام کو درہم برہم کر دیا تھا —— دو تین مرتبہ انہوں نے مجھے اپنے والد مرحوم کے علاج کے سلسلے میں یاد فرمایا جنہیں گاہے گاہے ضیق النفس کی شکایت رہتی تھی۔

ایک مرتبہ اختر نے ایک پردہ نشیں ضعیفہ مہمان کے علاج کے لئے مجھے گھر بلایا۔ گرمی کا موسم تھا۔ تنگ کمرہ اور مریضہ صاحب فراش لحاف اوڑھے پسینے میں شرابور پڑی تھیں۔ ان کا یہ حال دیکھ کر میرے لئے مشکل ہو رہا تھا کہ مریضہ کو حال بیان کرنے کی زحمت دوں۔ معلوم ہوا کہ عجلت میں اختر نے انہیں پردے کے لئے معمولی چادر کی جگہ لحاف دے دیا تھا۔

اختر مال و زر کے معاملے میں قطعاً بے نیاز انسان تھے ان کے نزدیک سونے چاندی کی ٹھیکریوں اور خزف ریزوں کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا۔

وہ طبعاً نہایت بلند سیرت اور نیک طینت شخص تھے۔ اور بادہ کشی کی عادت سے قطع نظر اگر دیکھا جائے تو وہ اتنے بلند مرتبہ انسان تھے کہ انسانی محاسن و اخلاق کی تمام خوبیاں اُن میں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ نہایت کریم النفس، نیک محضر، خلیق اور دوست نواز دوست تھے —— عطا پاش اور خطا پوش —— اور اس قدر غیور کہ انہوں نے اپنی زندگی میں حسن کی سرکار کے سوا کبھی کسی امیر و وزیر کی قصیدہ خوانی نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں کہ

کسی مغرور کے آگے ہمارا سر نہیں جھکتا
فقیری میں بھی اختر غیرتِ شاہانہ رکھتے ہیں

یہ سچ ہے کہ لوازماتِ شراب کے لئے وہ عالم بےخودی میں مزید مجبور ہو جاتے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہوش کے عالم میں تو انہوں نے خدا کے سوا کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا۔

وہ ایک مرد قلندر اور فقیر خاک نشیں تھے اور ان کے دل میں مہر و پیار کے سوا کسی کے لئے کینہ و حسد کی جگہ ہی نہ تھی۔

جاہ و حشم، مال و منال دنیا سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کسی پبلشر نے لاہور سے ٹرنک ان کی خدمت میں سات سو روپیہ بھیجے۔ وہ جب ان کو ڈاک خانہ سے لے کر گھر چلے تو راستے میں ضرورت مندوں اور دوستوں کو بانٹتے آئے تا آنکہ جب وہ گھر پہنچے تو صرف

باقی روپے کا ایک نوٹ ان کے ہاتھ میں تھا۔

اسی ضمن میں ایک لطیفہ یہ بھی سنیئے کہ ایک مرتبہ اختر ایک سرکاری ادارے سے اپنے ڈیڑھ سو روپے لینے تشریف لے گئے لیکن وہاں وقت یہ پیش آئی کہ ان کو کئی جگہ کلرکوں کے پاس جا کر کئی رجسٹروں میں دستخط کرنے پڑے۔ اب انہوں نے دو جگہ تو یہ تکلیف گوارا کر لی۔ لیکن جب ان کو تیسری جگہ ایک کلرک کے پاس جا کر دستخط کرانے کے لئے کہا گیا تو یہ کہہ کر خالی ہاتھ گھر واپس آگئے کہ بھائی ہم سے یہ بار بار دستخط نہیں ہوتے۔

اختر بے حد ہمدرد بنی نوع انسان تھے اور جہاں کسی کو تکلیف میں دیکھا تلملا اٹھتے اور اکثر رو پڑتے تھے۔ اور عورت ذات کی مصیبت تو وہ کبھی دیکھ ہی نہ سکتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ انار کلی میں تانگے میں سوار تھے کہ ایک عورت بھیک مانگنے آکھڑی ہوئی۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ جو کچھ ہو اسے فوراً دے دو۔ میں عورت کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔"

شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ چند ہم پیالہ و ہم نوالہ لوگوں کے سوائے جب کسی کو آتے دیکھتے شراب کی بوتل کو ادھر ادھر چھپانے کی کوشش کرتے اور رقیق القلب اس قدر تھے کہ ایک مرتبہ راستے میں سڑک پر چند مرجھائی ہوئی کلیاں پڑی نظر آئیں۔ وہیں بیٹھ کر دیر تک انہیں دیکھتے اور روتے رہے کہ بقول

مجھے تو کچھ اپنی بیمار کلیوں سے محبت ہے

بہ حقیقت یہ ہے کہ اختر اپنے ادب و آرٹ کی طرح اخلاق۔ انسانیت اور ذاتی و نفسی شرافت کے اعتبار سے بھی بہت بڑے انسان تھے —— ایک اتنے بڑے انسان جو کہیں صدیوں کے بعد اس خرابہ زار میں آتے ہیں۔ بقول

گردوں بسالہا دہد چو تو اختر سعد قراں

اختر نے اپنے مخالف معاصرین میں سے کبھی کسی سے انتقام لینے کی کوشش نہیں کی۔ جس نے آزار دیا اسے صبر سے سہہ گیا۔ میں نے انہیں دنیاوی امور میں کبھی کسی سے الجھتے نہیں دیکھا۔ وہ بہت کم ناراض ہوتے اور اگر کسی سے ناراض ہوتے تو صرف سلام و کلام ترک کر دیتے اور بس —— دشمنوں کے معاملے میں ان کا رویہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے ایک رسالے کے سلسلے میں انہیں شدید نقصان پہنچایا۔ خیال تھا کہ وہ اب اس سے کبھی نہیں ملیں گے۔ لیکن ایک دن جب وہ ان کے سامنے سے گزرا تو اسے لپٹ گئے اور الٹی اپنی طرف سے معافی مانگنے لگے۔

اختر اپنے دوستوں کے معاملے میں بے حد فیاض تھے۔ سخی اور سیر چشم واقع ہوئے تھے ایک مرتبہ جس سے تعلق ہو گیا اسے ساری عمر نبھایا۔ دوستوں کے ساتھ تمام عمر وہ بھائیوں کی طرح گھل مل کر رہے مثال کے طور پر اس ضمن میں میرے ساتھ ان کا سلوک یہ تھا کہ اختر مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے اور اختر صاحب کہنے پر ناراض ہو جاتے تھے۔ کہتے تھے مجھے اختر کہا کیجئے ساتھ ہی انہیں اس قدر پاس خاطر تھا کہ جب وہ شغل خاص میں مصروف ہوتے اور میری آمد کی آہٹ سن لیتے تو بڑی کوشش سے وہ دختر رز اور ساز کہا کرتے تھے ادھر ادھر چھپانے کی کوشش فرماتے تھے —— بایں ہمہ لطف یہ تھا کہ مجھ سے جو تکلف ایسا ہر رنگ میں روا ہوتا تھا اور مجھے اپنے عشق و عاشقی کے دلچسپ فسانے سناتے جاتے تھے۔

۱۹۳۴ء میں نکلسن روڈ چوک چوبرجی میں تھا اس کے بعد میں اپنا مطب مستی دروازہ کے باہر اپنے مکان خیر منزل میں لے آیا۔ یہاں بھی اختر حسب معمول باقاعدہ تشریف لاتے اور بالعموم شام کو سورج چھپے تشریف لاتے۔ ابتدائی ایام میں ان کا معمول یہ تھا کہ شام کو آتے ہی ساتھ لیا اور لارنس یا منٹو پارک کی طرف چل دیئے۔ یہاں آدھی رات تک بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ باتوں کے لئے کوئی موضوع مخصوص نہ تھا۔ بالعموم شعر و ادب موضوع گفتگو ہوتا۔ بسا اوقات دوسرے احباب کو بھی ساتھ لے لیا جاتا تھا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا اختر کا معمول یہ تھا کہ بالعموم شام کو تشریف لاتے اور کوشش کرتے کہ اسی رات گھر تشریف لے جائیں لیکن جب گھر سے ناراض ہوتے تو بالعموم یہاں ان کا مستقل قیام رہتا تھا۔ اور اس امر کا خیال رکھا جاتا تھا کہ بلا اطلاع کہیں شب گزاری نہ ہو۔ ایک دن مجھے اطلاع دیئے [illegible] سلیم کے یہاں [illegible] چلے گئے اور اس خیال سے کہ مجھے زحمت انتظار نہ ہو یہ منظوم خط لکھ کر مجھے ایک دوست کے

ساتھ ارسال فرمایا۔

برادرِ معظم و محترم دامت معالیکم

سلیم نے مجھے گھیر لیا ہے آج کی رات ۔۔۔ کسی بہانے سے بہلا لیا ہے آج کی رات
بہانہ جو بھی ہے بے حد حسین ہے لیکن ۔۔۔ نہ جانے مجھے بہکا لیا ہے آج کی رات
ہے واقعہ فقط اتنا کہ اتفاقاً آج ۔۔۔ نگاہِ حسن نے اپنا لیا ہے آج کی رات
کسی حسینہ کا ہے انتظار دونوں کو ۔۔۔ کسی حسینہ نے بہکا لیا ہے آج کی رات
معاف کیجیے مری غیر حاضری پھر آج ۔۔۔ کہ ایک حور نے پھسلا لیا ہے آج کی رات

کچھ ابھی دل کی لگی ہم نے اُٹھا رکھی ہے ــــــــــ اختر

ایک دن رات کو ایک بجے کے قریب کہیں سے تانگے میں تشریف لائے اور جب تانگے سے اترے تو کوچوان سے عالمِ مستی میں کچھ سخت کلامی ہو گئی۔ صبح خواب سے اُٹھے تو مجھ سے پوچھنے لگے کہ رات میں نے ایک تانگے والے کو کچھ سب و شتم کیا تھا میری آواز بھی تم تک تو نہیں پہنچ گئی تھی۔ یہ تھا اُن کی شرم مروت اور لحاظ کا عالم جو اُن کی ذاتی و نسبی شرافت کا نتیجہ تھا۔

دوستوں کی تقریبات مسرت میں وہ جس انداز میں شرکت فرماتے تھے اس سلسلے میں یہ مثال کافی ہے کہ میرے گھر کے بچوں کے ساتھ اُنہیں گہرا لگاؤ تھا۔ اکثر جب گھر آتے تو بچوں کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتے تھے۔ اور ان کی تقریبات میں گھر کے ممبروں کی طرح شریک ہوتے تھے۔ میرے بیٹے سکندر صولت کی سالگرہ ہوئی تو جھومتے ہوئے آئے اور یہ نظم لکھ کر سب کو سنائی۔ ؎

سُنا رہی ہے نوید بہار سالگرہ ۔۔۔ مسرتوں کی ہے پروردگار سالگرہ
زہے کہ سالگرہ ہے میاں سکندر کی ۔۔۔ بجا ہے کہیے سکندر وقار سالگرہ
سجا رہی ہے نگاہوں میں ہر کے عالم کیف ۔۔۔ بسا رہی ہے دلوں میں بہار سالگرہ
دیار دل میں کسی سے آئی ہے حور کی صورت ۔۔۔ مسرتیں ہیں بہر نثار سالگرہ
خوشی کے پھول برسنے لگے فضاؤں سے ۔۔۔ لٹا رہی ہے بہشت دیار سالگرہ
خوشی سے پھولے سمانے نہیں ہیں خورد و کلاں ۔۔۔ پکارتی ہے مبارک ہو یار سالگرہ
اسی فروغ سے تا حشر بار بار آئے ۔۔۔ دعائیں کرتی ہے یہ بار بار سالگرہ
دعا ہے عمرِ سکندر ہو رشکِ عمرِ خضر ۔۔۔ اسی بہار سے دیکھے ہزار سالگرہ

خوشی سے رقص کریں دل کے ساتھ روحِ اختر
بنا رہی ہے اسے خوشگوار سالگرہ

ایک مرتبہ میری اہلیہ گھر سے ناراض ہو کر کچھ مدت کے لئے بھوپال چلی گئیں۔ اختر ہمارے گھر کی ناراضگی کی اطلاعات سے بہت مغموم رہتے تھے ــــ لیکن کچھ دنوں کے بعد جب میں اپنی بچی رخشانہ اور اس کی والدہ کو بھوپال جا کر گھر واپس لے آیا تو بہت خوش ہوئے اور اسی وقت انہوں نے یہ اشعار کہے۔ ؎

دل کا سکون لے کے جو رخشانہ آ گئی ۔۔۔ تیرہ کدے میں رونق کاشانہ آ گئی
بھوپال کی خبر ہے کہ بھابی بھی آ گئیں ۔۔۔ بھائی کے گھر میں عشرت جانانہ آ گئی

اپنے پرائے آج محبت سے خوش ہوئے — ہر ایک کو گماں ہے کہ سلطانہ آ گئی
بھائی گئے تھے لینے فیروز جبیں کو وہ — ماہ جبیں بہ شوکت شاہانہ آ گئی
آنے کا اُن کے سب کو بڑا تھا خیال — وہ جان کعبہ روح صنم خانہ آ گئی
نیر کے دل کو آج نہ ہو کس طرح خوشی — وہ رشک صد پری و پریخانہ آ گئی
ماں منتظروں میں ہوئی جو کچھ ہوئی کمی — شمع خموش کی وہی پروانہ آ گئی

ہر چند تھی خفا گئی عیار شوق پہ
بجا روح ہماری اختر پیمانہ آ گئی

ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر کا اپنے دوستوں اور اُن کے گھروں کی غم و شادی کے ساتھ کس طرح کا اور کس قدر رابطہ رہا کرتا تھا۔

اُن کے والد حافظ محمود شیرانی مرحوم اختر کو ہمیشہ "اختر کی جگہ" داؤد کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اختر ان کے اکلوتے فرزند تھے اور ایسی صورت میں قدرتی طور پر حافظ صاحب مرحوم کو اختر کے ساتھ جو محبت ہو سکتی تھی ظاہر ہے۔ وہ اوائل اوائل اختر سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی علمی، ادبی اور شعری صلاحیتوں کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔ وہ اختر کے ادبی رسائل میں اپنے مضامین اشاعت کے لئے دیتے۔ تحقیق اور شعر کے بارے میں ان کو اختر کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ چنانچہ ان دنوں میں بھی جبکہ اختر سے ناراضگی تھی میں نے دیکھا کہ فضل ملازم بالاخانے سے کوئی چٹ لاتا جس میں کسی لغت یا تاریخی مسئلے میں اختر کی رائے معلوم کی جاتی تھی۔

ادھر اختر کی حالت یہ تھی کہ ان کے بال بچوں کے کفیل صرف حافظ صاحب مرحوم تھے اور اختر دنیا و مافیہا سے بے نیاز لاابالی زندگی بسر کرتے تھے۔ اختر سماج کے باغی تھے اور انہوں نے کبھی اپنی زندگی اور ماحول سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صرف شعر و نغمہ کی صدا تھے۔ انہوں نے کبھی کوئی کاروبار نہیں کیا۔ کبھی کوئی مکتبہ قائم نہیں کیا۔ انہوں نے کئی ادبی ماہنامے جاری کئے لیکن وہ کبھی زیادہ دیر تک نہیں چل سکے۔ کیونکہ آمد و خرچ پر کبھی کنٹرول نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ "پھولوں کے گیت" مجموعۂ نظم سے جو آپ نے بچوں کے لئے لکھا تھا غالباً دو سو روپے ملے۔ یہ روپے لے کر وہ لکھنؤ جا رہے تھے کہ راستے میں امرتسر کے چند جاننے والوں کو پتہ چلا کہ اختر کے پاس روپے ہیں۔ انہوں نے ان کو سٹیشن پر گاڑی سے اتار لیا۔ انہوں نے یہ روپے قرض لئے اور دو چار دن میں عیش و عشرت میں اڑا دئے۔ لیکن اب اختر کی سادگی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ بیٹھے شیراز ہوٹل میں روپے کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ مختصر یہ کہ روپے کی صورت میں کوئی چیز بھی ان کے پاس نہیں رہ سکتی تھی۔ آخر میں ان کے آخری مجموعہ ہائے کلام سے جو کچھ روپے وصول ہوئے بمشکل تمام ان کا مختصر حصہ ان کے بچوں تک پہنچایا جا سکا۔ دستار اُن کے پاس نہ تھی ایک کوٹ کبھی کبھی [illegible] سے ہوتا دیکھا جاتا تھا۔

ابتداء میں حافظ محمود شیرانی مرحوم نے کئی بار کوشش کی کہ اختر کو کسی کام میں لگائیں لیکن اختر ہمیشہ اس دام سے دامن بچاتے رہے۔ حافظ صاحب مرحوم جب اسلامیہ کالج لاہور کی پروفیسری چھوڑ کر اورینٹل کالج میں تشریف لے گئے تو اختر سے کہا گیا کہ اسلامیہ کالج میں اپنے والد کی جگہ قبول کر لیں لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ لڑکوں کا پڑھانا میرے بس کا روگ نہیں۔ پھر ۱۹۳۶ء میں اختر کو دارالترجمہ حیدرآباد دکن میں ایک عہدہ پیش کیا گیا لیکن آپ نے وہاں جانے سے بھی انکار کر دیا۔ درحقیقت وہ کسی قسم کی پابندی اپنے اوپر نہیں لینا چاہتے تھے۔

رفتہ رفتہ اختر کی دن رات کی خلوت گزینی یا گوشہ گیری، گھر اور گھر کی زندگی سے بیزاری، دنیا اور دنیا کی ہر قسم کی زندگی کی حدود و قیود سے بے نیازی، ہر وقت کی شعر خوانی اور ہمہ وقت عیش کوشی، رندی و مستی، القاب اور اعزاز سے لاتعلقی، ایک خاص قسم کی آوارہ

دھینگا مشتی اور سوا سر باز لڑکوں کی طرح کی زندگی اور ایک خاص طرز کے دوستوں سے میل ملاپ ـــــ یہ سب چیزیں کچھ ایسی تھیں جنھوں نے اختر کے والد محترم کے دل میں ان کے خلاف سخت غم و غصہ اور رنج و نفرت کے احساسات پیدا کر دیئے تھے۔

ساتھ ہی بعض مخصوص قسم کے احباب گاہے گاہے حافظ صاحب مرحوم کو مخصوص انداز میں ان حالات سے آگاہ فرماتے رہتے تھے۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا اختر اپنے یگانۂ روزگار باپ پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کے اکلوتے فرزند تھے اور قدرتی طور پر ان کے والد محترم کی یہ دلی خواہش تھی کہ ان کا فرزند بھی سوسائٹی اور ملک میں عزت اور علم و ادب میں امتیازی شہرت حاصل کرے ـــــ لیکن اختر کی اس زندگی کی وجہ سے جو انھوں نے اختیار کر رکھی تھی اختر اور ان کے والد محترم کے درمیان رفتہ رفتہ افتراق و شقاق کی ایک بڑی خلیج حائل ہو گئی تھی اور اسی لئے اختر کی گھر کی زندگی بے حد تلخ ہو گئی تھی۔ اور صورت یہ ہو گئی تھی کہ گھر ان سے تنگ تھا اور وہ گھر سے بیزار ـــــ بارہا ایسا ہوا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر دوستوں کے یہاں اقامت گزیں ہو گئے اور اس مقصد کے لئے اکثر میرے غریب کدہ کو شرفِ انتخاب بخشا۔ ـــــ لیکن پھر کسی نے گھر والوں سے صلح کرا دی اور وہ گھر واپس چلے گئے۔

اکثر ان کا معمول یہ تھا کہ رات گئے گھر لوٹتے تھے اور اس اثنا میں بارہا ایسا ہوا کہ ان کے والد محترم نے غصہ میں آ کر مکان کے اندر سے زینے کے دروازے کو قفل لگا دیا اختر آئے اور اس دروازے کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھے رہتے۔ ماں کی مامتا کے زیر اثر ان کی والدہ محترمہ جب یہ منظر دیکھتیں تو کمرے کے اندر کی طرف کواڑ کے پاس اپنے اکلوتے بیٹے کے قریب آ کر بیٹھ جاتیں۔ دونوں رات بھر بیٹھے باتیں کرتے رہتے اور اس طرح اکثر سردیوں کی ساری رات آنکھوں میں گزر جاتی تا آنکہ صبح ہوتی اور دروازہ کھلتا

اس سلسلے میں ایک قابل ذکر لطیفہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر پر رہتے یا کہیں اور ـــــ ان کی یہ عادت تھی کہ جہاں بھی رہتے خواہ دن بھر کہیں ہوں لیکن کسی نہ کسی وقت اپنے ٹھکانے پر ضرور پہنچتے تھے۔ یعنی مست و لایعقل رہنے کے باوجود اس قدر باخبر اور محتاط ضرور تھے کہ رات کو اپنا ٹھکانا نہیں بھولتے تھے۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ وہ میرے مکان پر قیام کے زمانے میں دن بھر غائب رہتے اور رات کو وہیں تشریف لاتے تھے۔

ان تمام امور کے باوجود اختر اپنے والد محترم کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ تمام تعزیرات سہتے اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔ میں نے دیکھا کہ جب بھی وہ اپنے والد محترم کا نام لیتے بڑے احترام سے لیتے اور اکثر ان کی خوبیوں اور خصوصیتوں کا ذکر کرتے۔ عام لوگوں کو اس سلسلے میں اختر کی محبت کا اندازہ اس وقت ہوا جب ٹونک میں ان کا انتقال ہوا اور لوگ جنازہ لے کر چلنے لگے تو اس رند خرابات نے راستے میں جنازہ کو روک کر پٹی پکڑ کر کچھ اس انداز میں صدائے نالہ و شیون بلند کی کہ شہر کا ہر چھوٹا بڑا اس منظر کو دیکھ کر زار و قطار رو رہا تھا۔

اختر کے ساتھ شراب کا تصور لازم و ملزوم کی صورت میں سامنے آتا ہے میں نے ذکر کیا ہے کہ اختر سے میری ملاقات ۱۹۲۶ء میں ہوئی ہے اس وقت اختر شراب کے خوگر ہو چکے تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ لاہور پہنچنے کے بعد انہیں ان کے مخصوص قسم کے دوستوں نے شراب کے ذائقہ سے آشنا کرایا تھا پھر جب علامہ تاجور مرحوم نے لاہور میں مرکز اردو حلقۂ ارباب علم و ادب کے نام سے قائم کیا اور یہاں ہند کے دیگر مشاہیر شعر و ادب کے ساتھ ساتھ حضرت جگر مراد آبادی بھی کچھ مدت کے لئے قیام پذیر ہوئے تو حضرت اختر نے اس سلسلے میں اس پیر مغاں کی بیعت کی۔ اختر کا بیان ہے کہ یوں شعر میں علامہ تاجور کا شاگرد ہوا اور شراب میں حضرت جگر کا۔ ابتدائی دنوں میں انہوں نے اپنا کلام علامہ تاجور کو دکھلایا۔ اور اس کے بعد وہ اپنے مخصوص رنگ میں ڈھل گئے۔

شراب میں یہ جگر کی تقلید کا مسئلہ اس حد تک خطرناک صورت اختیار کر چکا تھا کہ ایک مرتبہ جب اختر طبی مشورہ کے لئے حکیم فقیر محمد

چشتی مرحوم کے پاس گئے تو انہوں نے نبض دیکھ کر بسبیلِ تفنن فرمایا کہ "جگر کے کباب کھاؤ"۔

رفتہ رفتہ اختر اس حد تک شراب میں بہہ گئے تھے کہ ان کے جسم میں پانی کی جگہ شراب رہنے لگی۔ شراب۔ ہر وقت اور ہر طرح شراب ——— آخر میں شراب کی بدولت ان کا گوشت ہڈیوں سے جدا ہو گیا۔ جگر جل کے کباب ہو گیا اور شراب نے ان کی زندگی کے بخیے ادھیڑ دیئے۔

اختر کی بادہ کشی عام شرابیوں کی طرح کی نہ تھی ان کی عادت یہ تھی کہ جب وہ آغاز کرتے تو بے تحاشا پیتے۔ اکثر سودیشی پیتے اور آخر میں صورت یہ تھی کہ پانی ملانا کفر سمجھتے تھے۔ جب دور شروع ہوتا تو عموماً دو دو ہفتے جاری رہتا اور لطف یہ تھا کہ اس مدت میں غذا قطعاً ترک کر دی جاتی تھی۔ اس کے بعد خمار اور اس کے ساتھ قے اور ابکائیوں اور بے چینی اور گھبراہٹ کا زمانہ آتا۔ اب دو چار دن کے ناغے کرتے اور پھر دور لازم آ جاتا۔

جہاں تک پند و نصیحت کا تعلق ہے بہت سے دوستوں نے جو خود تو منکر تھے لیکن ان کے ساتھ "ہمرنگِ مستاں زیستن" کے عادی تھے انہیں شراب سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن بیکار ——— بارہا مجھ سے نہ پینے کا وعدہ کر کے جاتے لیکن اس کے باوجود میں دیکھتا کہ پیئے ہوتے اور جھومتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ میں پوچھتا کہ "حضرت یہ کیا ہوا" فرماتے کہ "اس دفعہ آخری بار حماقت ہو گئی"۔

کئی بار سخت کوشش کی کہ انہیں مجبور کر کے شراب سے باز رکھا جائے لیکن جب کبھی دو چار دن کا ناغہ ہوا اس اثنا میں کہیں نہ کہیں سے کوئی ہم مشرب ٹپک پڑا۔ جو ان کی توبہ کے ٹکڑوں کو چند روز بھی سلامت نہیں رہنے دیتا تھا۔

شراب کے بارے میں وہ اپنے خاص دوستوں کی جیبوں کو اپنی جیب سمجھتے تھے اور حسنِ طلب کچھ ایسا لطیف اور شاعرانہ ہوتا تھا کہ فرمائش پورا کئے بنا نہیں رہا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ مئی کا مہینہ تھا اور میں باہر دھوپ میں بیٹھا مطب کر رہا تھا۔ دو مشہور بلانوش شاعر دوستوں کو ہمراہ لے کر آ گئے۔

ایک صاحب نے فرمایا کہ "دھوپ میں اپنے مریضوں کو دعا دیتے ہیں"۔

دوسرے صاحب بولے کہ "اور شاعر کوئی آئے تو بھگا دیتے ہیں"۔

اور آپ نے فرمایا کہ "اہلِ دل اپنے مسیحا کو دعا دیتے ہیں"۔

اس کے بعد ان شاعروں کے سامنے فرمائش شروع کی اور بوتل کے پیسے لے کر چلتے ہوئے۔ شراب کے لئے رقم طلب کر کے اکثر یہ فرمایا جاتا تھا کہ بس آخری مرتبہ ہے اس کے بعد اس کو منہ نہیں لگاؤں گا۔ لیکن یہ کافر ہمیشہ منہ سے لگی رہی۔

شراب پی کر شرابی دوستوں کو ساتھ تانگے میں لے کر عموماً باہر نکلتے اور دوستوں کے یہاں پہنچتے۔ ملک میں سودیشی کا چرچا تھا۔ ٹھرا پینے کی عادت کی جانب اشارہ کر کے فرماتے کہ میں سودیشی کی تحریک کا زبردست حامی ہوں۔ شرابیوں اور شراب خانہ کے کاروبار سے جو آپ کو لگاؤ تھا اس سلسلے میں ایک لطیفہ یہ ہے کہ لوہاری کے چوک کے دائیں طرف باہر ٹھیکے کی دکان پر ایک مسلمان بادہ فروش ترکی ٹوپی اوڑھے شراب بیچا کرتا تھا۔ جب اس کا سر جھکتا اور ٹوپی کا پھندنا جھولتا آپ قہقہے لگاتے اور جھومتے۔

ارباب غرض مختلف کاموں کے سلسلے میں اختر کے پاس آتے تھے۔ کئی لوگ سفارشی خطوط لکھواتے۔ کئی انہیں اپنے کاموں میں سفارش کے لئے ساتھ لے جاتے۔ کئی ان سے اپنے اخبارات و رسائل کے لئے نظمیں لینے کے لئے آتے۔ اور کئی دوست ان کے پاس آ کر اپنی فلموں کے لئے ان سے مکالمات لکھواتے۔ اختر اس طرح کے کام بخندہ پیشانی مفت انجام دیتے تھے ——— اور لگتا ہے ان کاموں کی قیمت دیسی شراب کی صرف ایک بوتل ہوا کرتی تھی۔ جو اس زمانے میں دو ڈھائی روپے میں آتی تھی۔

اختر کی شاعری بڑی حد تک سلمیٰ کے تصور کے گرد گھومتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اختر کی شاعری سلمیٰ کے عشق کی رنگین داستان ہے

اس لئے ضروری ہوا کہ چند کلمات یہاں سلمیٰ کے متعلق بھی عرض کئے جائیں۔

جہاں تک لفظ سلمیٰ کا تعلق ہے یہ لفظ فارسی اور عربی ادب میں محبوبہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ حافظ کہتا ہے۔

ؔ ناصحِ حضرتِ سلمیٰ کہ سلامت بادا — چہ شود گر بسلامے دلِ ما شاد کند
ؔ منزلِ سلمیٰ کہ بادش ہر دم از ما صد سلام — پر صدائے ساربانان بینی و بانگِ جرس
ؔ ما بسلمی و حب بنی سلیم — این جیراننا وکیف الحال
ؔ امن تذکرتنی عن حب سلمی — غریق العشق فی بحر الوداد

اور جامی کہتا ہے کہ

ؔ ہمتِ شوق تا اہلِ دیار یقیست نیز بجمال سلمیٰ — کہ رساند از آن فراغ زیرِ لطفے بجانبِ ما

لیکن اختر کی شاعری میں سلمیٰ سے مراد ایک معین شخصیت تھی۔

سلمیٰ کا حقیقی وجود لوگوں کی نگاہوں سے اس لئے بھی مخفی رہا کہ اختر اس راز سے پردہ اٹھانا نہیں چاہتے تھے اور جو لوگ واقف تھے ان کو اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ وہ آخر عمر تک اس راز کو چھپاتے رہے اور جو لوگ پوچھتے انہیں بہ لطائف الحیل ٹال دیتے۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کا یہ طریق کار صحیح بھی تھا۔ آخر ایک شریف خاتون کو رسوا کرنے کا فائدہ۔

خود سلمیٰ کی بھی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح ان کا نام منظر عام پر نہ آئے اور جب انہیں ایک دو مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ شاعر بہک کر کچھ خاص قسم کے اشارات کرنے لگا ہے تو انہیں ایک خط میں اختر کو خاص طور سے تنبیہ کرنی پڑی جس کے جواب میں اختر نے ایک غزل میں کہا کہ

ؔ شعر میں ذکر کسی کا دلِ ناکام نہ کر — اس نے لکھا ہے کہ تو یوں ہمیں بدنام نہ کر
غیرتِ حسن کو منظور نہیں رسوائی — ضبط اے عشق اس افسانے کو یوں عام نہ کر

اور اس کے بعد اس حد تک اخفا کی کوشش کی گئی کہ اختر نے اپنے اور سلمیٰ کے خطوط کا اس وقت جو مجموعہ مرتب کیا اس میں اپنے لئے بھی "اختر کی جگہ "کوکب" کا لفظ اختیار فرمایا۔

یہ مجموعۂ مکاتیب ان دنوں بہت سے دوستوں کے یہاں چکر لگاتا رہا چند روز میرے پاس بھی رہا لیکن اس وقت مجھے اس کو نقل کرنے کا خیال نہ آیا۔ آہ اس وقت کسے خبر تھی کہ

ؔ ہے آج جو سرگزشت اپنی — کل اس کی کہانیاں بنیں گی

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کی ایک ایک نقل آغا خادم حسین بخاری اور سلیم کے پاس موجود ہے۔

بہر کیف احباب کی اطلاع کے لئے اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ سلمیٰ جن کا اصل نام اور ہے ایک معین شخصیت کا نام ہے اور وہ آج بھی بقید حیات ہیں۔

سلمیٰ سے اختر کے معاشقہ کی ابتدا ۱۹۲۶ء میں ہوئی جبکہ پہلے پہل سلمیٰ کا ایک مکتوب ان کے نام پہنچا اور اسے پڑھ کر انہوں نے وہ مشہور غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے کہ

ؔ لے آئے انقلابِ سپہرِ بریں کہاں — اللہ میں کہاں وہ ثریا جبیں کہاں

اس کے بعد جب درِ جاناں پہ طلبی ہوئی تو اختر یوں نغمہ سنج ہوا کہ

ؔ کتنی شاداب ہے دنیا کی فضا آج کی رات — کتنی سرشار ہے گلشن کی ہوا آج کی رات

کتنی فیاض ہے رحمت کی گھٹا آج کی رات　　کس قدر خوش ہے خدائی سے خدا آج کی رات
کہ نظر آئے گی وہ ماہ لقا آج کی رات

آج کیا بات ہے دنیا کے نظارے خوش ہیں　　باغ میں پھول سپہر پر ستارے خوش ہیں
ایک بے نام سی سرمستی کے مارے خوش ہیں　　ایک میں خوش نہیں جتنے بھی ہیں سارے خوش ہیں
ہے خوشی چار طرف نغمہ سرا آج کی رات

آج کی رات کے عنوان سے یہ تمام نظم اسی نوع کے جذبات و احساسات سے معمور ہے۔ یہ نظم یوم ملاقات سے پہلے کی ہے لیکن اس کے بعد جب ملاقات ہو چکی تو اختر بہ سبیل تقاضائے بازدید یوں ترانہ طراز ہوا کہ

؎ تمہیں ستاروں نے بھی بار بار دیکھا ہے　　شریر چاند نے بے اختیار دیکھا ہے
کبھی چمن میں گئی ہو تو مست پھولوں نے　　نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو　　بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے
قریب شام تمہیں عارفانِ گلشن نے　　ہزار بار سرِ لالہ زار دیکھا ہے
نسیم باغ نے زیب النسا بھی کبھی　　تمہیں بہ گلکدۂ شالامار دیکھا ہے
غرض مظاہر فطرت نے ہر طرح تم کو　　ہزار بار نہیں لاکھ بار دیکھا ہے
مگر مری نگہِ شوق کو شکایت ہے　　کہ اس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے
دکھا دو ایک جھلک اور میں نگاہوں کو
دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو

اور پھر اس کے بعد کی ایک ملاقات کا نقشہ ملاحظہ کیجئے۔

؎ کون آیا مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ　　زلف برہم زدہ و چشم حجاب آلودہ
کس نے پہلو میں بٹھایا ہے مجھے شرما کر　　کس کے ہاتھوں میں ہے لرزش سی حجاب آلودہ
کس کے ملبوس سے آتی ہے سہانی خوشبو　　کس کے ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ
کس کو شکوہ ہے مرے عشق سے رسوائی کا　　کس کا لہجہ ہے وہی لطف عتاب آلودہ
حسرت بوسہ پہ اختر یہ خیال آتا ہے
میرے ہونٹوں سے ہیں کیوں برگِ گلاب آلودہ

اختر سلمیٰ کی نسبت سے دیار سلمیٰ کا بھی جو جنت سے [illegible] نگارستانِ شوق رہا ہے عاشق تھا اور اس سلسلے میں اس نے بربط عشق پر بڑے دلگداز نغمے چھیڑے ہیں۔ ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

؎ اے سرزمینِ گجرات اے خلد زارِ الفت
پھولوں میں تیرے رقصاں روحِ بہارِ الفت
تیرا ہر ایک ذرہ ہے رازدارِ الفت ـــــ اور یادگارِ الفت ـــــ اے سرزمیں گجرات
عریاں ہے حسن تیرے سرسبز گلشنوں میں

آوارہ عشق تیرے شاداب دامنوں میں
فطرت برہنہ تیرے پُر نور انجمنوں میں ——— رنگین مسکنوں میں ——— اے سرزمین گجرات
پھر آرزو کو رسوا کرنے کی آرزو ہے
رونے کی اور آہیں بھرنے کی آرزو ہے
سلمیٰ کے پاؤں پر سر دھرنے کی آرزو ہے ——— مرنے کی آرزو ہے ——— اے سرزمین گجرات

ایک مرتبہ سلمیٰ جب بیمار ہوئیں تو اختر نے انہیں ایک منظوم خط میں لکھا کہ

تندرستی کا گلہ کیا ہے شکایت کیا ہے — میری بیمار بتا تو تری حالت کیا ہے
عشق بیماری ہے اور کتنی حسین بیماری — کیا خبر ہے غیروں کو یہ لذت کیا ہے
ساری دنیا کے مریضوں کو شفا دے یارب! — آج احساس ہوا ہے کہ علالت کیا ہے
رو دیے جب بھی سنی درد بھری کوئی خبر — درد ہی درد ہے یارب یہ طبیعت کیا ہے
ان کی صحت کی خبر آئے گی جلد آئے گی — دلِ ناداں تجھے آخر یہ وحشت کیا ہے
سامنے ہوں تو فدا کر دیں دل و جاں ان پر
ہم نہیں جانتے اختر کہ عیادت کیا ہے

تقریباً پانچ چھ سال تک یہ سلسلۂ معاشقہ جاری رہا لیکن آپ کو اس ضمن میں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ تمام دور جنسی آلودگی سے قطعاً مبرا رہا۔ مجھے اختر نے ذاتی طور پر ان حالات سے خود آگاہ کیا اور خود اختر کی تحریروں سے بھی یہ چیز واضح ہے۔ اختر نے اس مجموعۂ مکاتیب میں جو آج بھی دوستوں کے پاس ہے ایک مکتوب میں سلمیٰ کو اپنی ملاقات کا وقت یاد دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "کیا آپ میری محبت کی معصومیت اور فطرتی اور مقدس حیثیت کی داد نہ دیں گی؟" اور اس کے جواب میں سلمیٰ لکھتی ہیں کہ "آپ انسان نہیں دیوتا ہیں اور آپ کی اسی شان نے مجھے خرید لیا ہے" (یہ مکتوب روزنامہ آفاق لاہور کی اشاعت مورخہ ۲۲ دسمبر [illegible] میں شائع ہو چکا ہے)

اختر اپنی ایک نظم میں بھی اس جانب اس طرح اشارہ کرتے ہیں۔

قسم اس پاکبازی کی جو تھی باہم خیالوں میں — قسم اس بے نیازی کی جو تھی باہم سوالوں میں
قسم اس چاک دامانی کی جو بے سود وحشت تھی — قسم اس پاک دامانی کی جو معبودِ عفت تھی
محبت کی انہی معصوم راتوں کی قسم تم کو — حقیقت کی انہی موہوم راتوں کی قسم تم کو
خدا را اتنا بتا دو کیا وہ راتیں پھر نہ آئیں گی
وہ راتیں آہ وہ راتیں وہ راتیں پھر نہ آئیں گی

اختر و سلمیٰ کے مجموعۂ مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں ایسے لمحات بھی آئے کہ اگر سنجیدگی سے کوشش کی جاتی تو ان کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بعض وجوہ سے ایسا نہیں کیا گیا ——— بالآخر غالباً ۱۹۳۲ء میں سلمیٰ ایک جگہ رشتۂ تزویج میں باندھ دی گئیں اور یہ سلسلۂ نامہ و پیام ہمیشہ کے لئے وعدۂ حشر پر ختم ہو گیا ——— اختر نے اس موقع پر اپنی محبوبہ کو مطلع کر دیا کہ

دل و دماغ کو رو لوں گا آہ کر لوں گا — تمہارے عشق میں سب کچھ تباہ کر لوں گا
تمہاری یاد میں میں کاٹ دوں گا عمر کے دن — تمہارے ہجر میں راتیں سیاہ کر لوں گا

اگر مجھے نہ ملیں تم تمہارے سر کی قسم
میں اپنی ساری جوانی تباہ کر لوں گا
جو تم سے کر دیا محروم آسماں نے مجھے
میں اپنی زندگی صرفِ گناہ کر لوں گا

اور ہوا یہ ہے کہ اس کے بعد واقعی اختر نے اپنی جوانی تباہ کر لی۔

ہم نے ذکر کیا ہے کہ اختر جب آسمان شعر و ادب پر چمکے اور سلمیٰ کی یادیں ان کے نغموں سے فضائے ارض میں گونجیں تو اس سے سب سے زیادہ کالجوں کا ماحول متاثر ہوا جس میں طلباء کی طرح طالبات کا عنصر بھی شامل تھا۔ ان کے علاوہ ملک کی ان ادب نواز خواتین نے اختر کے کلام کو خوش آمدید کہا۔ جن میں سے اکثر بڑے ممتاز اور اعلیٰ گھرانوں کی چشم و چراغ تھیں۔

بعض خواتین اختر کو یوں ہی شوقیہ خطوط لکھتی تھیں۔ بعض اپنے کلام میں اصلاح کے لئے خطوط لکھتیں۔ اور ممکن ہے ان میں سے بعض کا اختر سے کچھ دل لگاؤ بھی رہا ہو لیکن اکثر کی حالت یہ تھی کہ اختر کی نظموں میں حسن اور نسائیت کے لئے اس کے احساسات اور بے پناہ طوفانی جذبات کو دیکھ کر اس کی شیدا اور اس کے ہنر کی دلدادہ تھیں۔ بعض کا معمول یہ تھا کہ اس کی نظموں میں سلمیٰ کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اس کو خطوط لکھتیں اور تفریحاً چھیڑتی تھیں۔ جو خواتین اس سے اپنے کلام میں اصلاح لیتیں اکثر اس کے کمالِ فن کی ستائش کرتیں۔ اور یہ اختر کی سادگی تھی کہ وہ ان سب چیزوں کو عشق و محبت کی کارفرمائیوں کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ درحقیقت یہ ہے کہ سلمیٰ کے بعد ان پرستارانِ اختر میں سے تقریباً سب کا تعلق اختر سے زیادہ اختر کے آرٹ سے رہا ہے۔

وہ خواتین جن سے اختر کی مراسلت رہی ہے زہرہ۔ پروین۔ ثریا۔ نسرین۔ ناہید۔ لالہ رخ۔ شمسہ اور لیلیٰ تھیں۔ لیکن اس ضمن میں لاہور کی عذرا۔ سندھ کی زلیخائے جہاں۔ امرت سر کی نوبہار ناز اور لکھنؤ کی ممتاز ادیبہ سے بہت زیادہ سلسلۂ نامہ و پیام قائم رہا ہے۔ عذرا سے متعلق اختر نے کئی نظمیں لکھیں جن میں سے

؎ کوئی مہ جبیں جلوہ دکھلا گئی　　مرے گھر پہ شامِ بہار آ گئی

شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

سندھ کی زلیخائے جہاں اکثر دہلی سے سندھ یا سندھ سے دہلی جاتے ہوئے لاہور سے گزرتیں ان کے خیر مقدم کے سلسلے میں جو نظمیں لکھی گئیں وہ ادب اردو کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

؎ راہِ دہلی سے صبا عطر فشاں آتی ہے　　خبر آئی ہے کہ وہ جانِ جہاں آتی ہے

اور پھر ؎ سامانِ رشکِ انجم و مہتاب کر کے جا　　لاہور کی فضاؤں کو شاداب کر کے جا
مانا کہ ارضِ سندھ ہے مضطر ترے لئے　　کچھ تو علاج پہلوئے بیتاب کر کے جا

جیسی نظمیں اسی وفد کی یادگار ہیں۔

ماہ لقا لکھنؤ کی شان میں لکھا۔

؎ کب تک رونقِ شامِ اودھ اے ماہ رواں　　شامِ لاہور کو بھی صبح بنا دے آ کر

اور امرت سر کی نوبہار ناز کی شان میں تحریر فرمایا۔

؎ ہر ذرہ اس کے حسن سے کاشی ہے آج کل　　امرت سر ایک وادیٔ ایمن ہے آج کل

عمر کے آخری حصے میں اختر کو ثریا سے کچھ رابطہ رہا ہے اور اس کا علم مجھے اس طرح ہوا کہ ایک دن مرنے سے کچھ مدت پہلے میرے

مکان کے سامنے سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ میں نے پوچھا کیا ماجرا ہے؟ — فرمانے لگے "آج شیریں کی موٹر ادھر سے گزرے گی"۔ شیریں کے متعلق آپ نے جو اشعار کہے وہ شہناز میں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مری سدا رخِ شیریں مری جانِ شیریں — تنگ ہے تیری دہانِ شیریں
ترا رخ ہے برقِ سحابِ بہاریں — ترے لعل لب ہیں گلستانِ شیریں

دیکھ لے دل نظر آیا وہ دیارِ شیریں — ذرہ ذرہ سے تجلی ہے بہارِ شیریں
خاکِ لاہور ہے گہوارۂ شانِ دلعت — اختر اس خاک میں مدفن ہے مقامِ شیریں

یہاں میں ضمناً یہ عرض کر دوں کہ اختر صورت ذات کے بارے میں سخت ذکی الحس واقع ہوئے تھے اور سلمیٰ کی مہجوری کے بعد وہ خاص طور سے بہت زیادہ جذباتی ہو گئے تھے جب بھی کوئی حسین صورت دیکھتے خود سراپا تصویر بن جاتے۔ کسی حسین صورت کا سامنا ہو جانا ان کے لئے مصیبت تھا، جس کا اظہار ان کے چہرے سے ہونے لگتا تھا۔ ایک دن میں مزنگ میں ان سے ملنے گیا۔ پتہ چلا کہ ایک حسین لڑکی کی تلاش میں سڑکوں پر ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔ میں نے ان کا پیچھا کیا اور جب مل گئے تو پوچھا کہ آخر اس آوارہ گردی سے مقصد؟ — فرمانے لگے زندگی کا اس سے بہتر مقصد اور کیا ہو سکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ یوں ہی کوئی صورت دیکھ کر اپنا تانگہ کسی تانگہ کے پیچھے دوڑانا شروع کر دیتے تھے۔ ایک بار لاہور سے گزرتے ہوئے سندھ کی شوخ کمسن نے گنڈیریاں کھا کے جب چھلکے پلیٹ فارم پر پھینکے تو وہ چھلکے سمیٹ کے سٹیشن سے گھر رومال میں باندھ لائے۔

خطوں کے معاملے میں یہ عالم تھا کہ جب بھی کوئی حسین خط آتا بار بار پڑھتے جھومتے اور کئی کئی دن تک خاص خاص دوستوں کو دکھاتے اور سناتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے ان مہکتے ہوئے خطوط کی نسبت ارشاد فرمایا۔

مٹ چلے میری امیدوں کی طرح حرف مگر — آج تک تیرے خطوں سے تری خوشبو نہ گئی

اختر کی زندگی کے تین دور ہیں۔ پہلا دور سلمیٰ سے معاشقہ سے پہلے کا ہے۔ اس زمانے میں اختر نے جوگن، بیتری اور فتنۂ سحر وغیرہ عنوان سے دلکش نظمیں لکھیں۔ دوسرا دور سلمیٰ سے معاشقہ کے زمانے کا ہے۔ اس دور کا تقریباً تمام تر سرمایۂ شعر و ادب سلمیٰ کے عشق کی حکایاتِ لذیذ و درد انگیز پر مشتمل ہے۔ اختر کی مشہور نظمیں آج کی رات، گجرات کی رات، اے سرزمینِ گجرات، اے عشق کہیں لے چل، انگوٹھی، آہ وہ راتیں، اعترافِ محبت، بستی کی لڑکیوں میں، بعض معانی لمحات کی یاد، ایک تصویر دیکھ کر، سلمیٰ نور جہاں کے مزار پر، "وہ" "مری سلمیٰ مجھے لے چل تو ان رنگیں بہاروں میں" اسی دورِ حیات سے متعلق ہیں۔

تیسرا دور سلمیٰ سے مہجوری کا زمانہ ہے۔ اس میں اختر نے ابتداً دنیا سے تنگ آ کر ہر مہکتے دروازے پر دستک دی ہے اور ہر ڈھلکتے آنچل کو چھیڑا ہے۔ عذرا، ریحانہ، سندھ کی شوخ کمسن، کشمیرن اور دوسرے حسین عنوان اسی دور سے متعلق ہیں اور اختر کی نظم "میری داستانِ حیات" جو لالۂ طور میں درج ہے اسی دور کی زندہ تصویر ہے۔ اس دور کا آخری حصہ تمام تر نالہ و شیون اور آہ و بکا پر مشتمل ہے جس میں اختر نے "بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ" اور "رخصتِ وادی" جیسی الیہ شاعری یادگار چھوڑی۔

اختر کا ہر شعر کسی نہ کسی سانحہ سے وابستہ ہے اور ان کی زندگی جن حالات و سوانح سے گزر رہی تھی ان ہی کے سانچے میں ان کی شاعری بھی ڈھلتی گئی۔ آخری دور ارمانوں کی پامالی پر مشتمل ہے۔ اسی عہد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شاداب ہو سکا نہ گلستانِ آرزو — گھٹتے ہی ابر باغ پہ چھا کر چلے گئے

بہت تڑپائے گی دل کو ہماری داستاں برسوں — کرے گا یاد دورِ زندگی ہم سا جواں برسوں

؎ بہار عشق جاتی ہے اب تو جہاں میں کیا رکھا ہے — جرس کا شور گونجا کارواں تیار ہے ساقی

؎ قرار چھین لیا بے قرار چھوڑ گئے — بہار لے گئے یاد بہار چھوڑ گئے
ہماری چشم حزیں کا خیال کچھ نہ کیا — وہ عمر بھر کے لئے اشکبار چھوڑ گئے
نگاہ درد کی عرض حزیں قبول نہ کی — ہمیں وہ غمزدہ و دلفگار چھوڑ گئے
امید و شوق سے آباد تھا ہمارا دل — امید و شوق کہاں اک مزار چھوڑ گئے

اختر کو اپنی زندگی میں پانچ عظیم حادثات سے سابقہ پڑا۔ سلمیٰ کی جدائی۔ اپنے چھوٹے بچے کی موت۔ بشیرن کی خودکشی۔ والد کی وفات۔ اور سب سے آخر میں ان کے عزیز دوست نظیر الدین کی ٹونک میں موت جو ان کی بڑی ٹریجڈی تھی جس پر انہوں نے حسب ذیل قطعہ کہا۔

؎ ہے غرق ظلمت یاس آسماں آج — مہ دوستی ہے نظروں سے نہاں آج
خدائی بحر غم میں کیوں نہ ڈوبے — ابھی ڈوبا نظیر الدین جہاں آج

ان تمام حادثات پر گھر والوں کا عتاب۔ دوستوں کی سرد مہری اور لاہور کی جدائی مستزاد تھی۔ یہ تھے اختر کے مصائب اور ان سب کا علاج آپ نے شراب تجویز کر رکھا تھا۔

تقسیم سے کچھ مدت پہلے اختر کے والد محترم حافظ محمود شیرانی اپنی مدت ملازمت ختم کرکے اہل و عیال کو ہمراہ لے کر ٹونک روانہ ہوئے تو اختر بھی ان کے ساتھ تھے۔ لیکن وہاں پہنچ کر وہ لاہور کی یاد میں ہمیشہ بیقرار رہے۔ ہر خط جو ٹونک سے آتا اس میں لاہور کی جدائی کا مرثیہ ہوتا۔ وہ لاہور آنے کے لئے بیچین رہتے تھے اور اس اثنا میں جو خطوط انہوں نے دوستوں کو لکھے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لاہور ہی کی خاک میں دفن ہونا چاہتے تھے۔ لاہور آنے سے پہلے کئی بار ان کے مرنے کی خبر مشہور ہوئی۔ اس زمانے میں انہوں نے نگار کے غزل گو شعرا نمبر میں لکھا کہ

> "ریاست ٹونک میں پیدا ہوا۔ لاہور میں ہوش سنبھالا اور شاید یہیں کے اخبارات کو سب سے پہلے میرے انتقال کی خبر شائع کرنے کا موقع ملے گا۔"

مرنے سے کچھ ماہ پیشتر ایک دن اچانک لاہور آگئے اور فرمانے لگے کہ بس اب میں لاہور ہی میں رہوں گا۔ میں نے زیر منزل کے نیچے کا کمرہ ان کے لئے کھلوا دیا۔ اور اس کے بعد وہ اسی میں باقاعدہ مقیم ہو گئے۔

اس بار بھی ان کے بسر اوقات کا عالم وہی تھا یعنی رات دن پینا۔ دن کو بالعموم غائب رہنا آدھی رات کو آنا۔ خود جاگنا اور دوسروں کو جگانا کہ بیٹھو خاقانی ماہ دگر شب آمد۔

اس اثنا میں کئی بار ایسا بھی ہوا کہ عالم نشہ و کیف میں باہر نکلے اور سلمیٰ کے محلہ کی گلیوں کی خاک چھان کر واپس آجاتے۔ اس مرتبہ اختر مصائب حیات سے کچھ بہت زیادہ تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور اس قدر رقیق القلب ہو چکے تھے کہ اکثر بات بات پر رو دیتے۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا اکثر بیوی بچوں کو یاد کرتے اور اپنی بے اعتنائیوں کا گلہ کرتے۔

پھر اس اثنا میں ایک خاص بات یہ دیکھنے میں آئی کہ اپنی تصویریں بہت زیادہ کھنچواتے اور سب میں تقسیم کرتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے میں اس بار اپنی تصویریں بہت کھنچوا رہا ہوں۔

ان چیزوں کے علاوہ اس دور میں ایک خاص چیز یہ دیکھی گئی کہ آپ پر عشق رسول کا غلبہ معلوم ہوتا تھا چنانچہ اسی زمانے میں آپ نے بہت سی نعتیں لکھیں جو آپ کے آخری مجموعہ کلام شہرود میں درج ہیں۔

لیل و نہار اسی طرح گزر رہے تھے کہ ایک دن آپ پر ردِ عمل کی کیفیت زیادہ طاری ہو گئی، جس کے نتیجہ میں خفقان و تشنج کی حالت پیدا ہو گئی۔ قبض شدید ہو گیا۔ جگر نے جواب دے دیا اور آنکھوں پر زردی چھا گئی۔ مجبوراً میں نے انہیں میو ہسپتال میں داخل کرایا۔ وہاں پہلے تو چند روز ٹھیک رہے۔ لیکن اچانک ایک دن طبیعت زیادہ بگڑ گئی ــــ اور بالآخر ۴۳ سال کی عمر میں ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کی دوپہر کو آپ نے وقت سے پہلے زندگی کی دشوار گزار راہوں کا سفر ختم کر لیا ــــ آہ

؎ میں میکدے کی راہ سے ہو کر گزر گیا
ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

مرنے سے پہلے اختر کے ہونٹوں پر یہ مصرع تھا۔ ؎ ہو گئی بزمِ میکدہ خاموش۔ شاعر نے یہ کہا اور بزمِ میکدہ سونی ہو گئی ۱۰ ستمبر کی صبح کو آپ کا تابوت ہسپتال سے بیرون منزل لایا گیا اور یہاں سے وہ تدفین کے لئے گورستان لے جا رہا تھا کہ اختر کی سمجھنے والی کو اختر یاد آیا۔ راستے میں ایک برقع پوش خاتون نے تابوت رکوا کر اس کا آخری دیدار کیا ــــ اور اس کے بعد شہرستانِ علم و ادب کی یہ عظیم دولت گورستان میانی میں ہمیشہ کے لئے سپردِ خاک کر دی گئی۔

ابو سعید بزمی

ادیبہ بزمی

طفیل صاحب آپ نے مجھ سے بزمی کی شخصیت کے متعلق لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ بزمی کا نام ہی میری زندگی کا سب سے اہم باب ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی نے اس کتاب کو ہی بند کر دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس لئے میں نے بھی پچھلی زندگی کے متعلق سب کچھ بھول جانے کی کوشش کی ہے۔ آج پانچ سال گزر جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں تو مجھے بھول ہی چکی ہیں۔ پھر بھی سوچتی ہوں کہ بہت سی باتیں ایسی موجود ہیں جن کی یاد ابھی تازہ ہے اور اگر اپنے جذبات سے قطع نظر انہیں کہہ دوں تو شاید مفید بھی ہوں۔ اس سلسلے میں میری کوشش یہی ہے کہ بزمی کو بحیثیت انسان کے آپ کے سامنے پیش کر دوں لیکن میرے ذہن میں ان کی گھریلو زندگی کا کوئی پہلو اس طرح سے نہیں آتا کہ گھر سے باہر کی زندگی یا اس خاص قسم کی "ذہنی دنیا" سے ان کو الگ کر دوں جو ان کے لئے سب کچھ تھی اور جس کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو بڑی دیانت اور کوشش سے تیار کیا تھا۔

ان کی موت پر مجھے عربی کی یہ ضرب المثل یاد آتی ہے: "ایک شخص تمام رات دعا مانگتا رہا کہ خدایا صبح کر دے اور جب صبح ہوئی تو اس کی بینائی زائل ہو گئی۔"

جب ارادے تکمیل کو نہ پہنچیں تو خواب پریشان ہی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بزمی کے بے شمار پریشان خوابوں کے دھندلے نقوش میرے ذہن میں باقی ہیں جنہیں اندھیروں سے کھینچ کر لانے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کی ترتیب سمجھ میں نہیں آتی اس لئے میں نے ان کی چند تصویروں کا سہارا لیا ہے کہ شاید یہ ذہن کی رہنمائی کر سکیں۔

پہلے یہ تصویر بزمی کی وہ واحد تصویر ہے جو نہ جانے کس اتفاق سے میرے پاس موجود ہے۔ بندۂ خدا نے اس مختصر سی زندگی پر ایک ستم یہ بھی کیا کہ کبھی تصویر ہی نہ اتروائی۔ ایک دن ان کی میز کے کاغذوں کے انبار میں سے پاسپورٹ سائز کی تصویر کے یہ عدد برآمد ہوئے۔ میں بہت حیران ہوئی۔ مگر وہ بولے: "مجھے کتنا پریشان کر رکھا تھا تصویروں کے لئے اب کبھی مت کہنا کہ تصویر

نہیں کھنچواتے۔"

اور میں مزید حیران ہو کر رہ گئی کہ کس قدر بے تکلفی سے بھوپالی دوستوں کی زبردستی کا احسان مجھ پر رکھ رہے ہیں۔ لیکن یہ تصویر تو بھوپال سٹیٹ پیپلز کانفرنس Bhopal State Peoples Conference کے ممبروں کے اصرار کا نتیجہ تھی ان لوگوں کی خواہش تھی کہ اس کانفرنس کے بانی اور وہاں کے عوام کے منظور نظر رہنما کی کم از کم تصویر ہی دفتر میں آویزاں ہو جائے۔ ورنہ ان کو برسوں تک یہ اعتراض رہا کہ اب کون تصویریں اتروانا پھرے۔

پھر آخری سفر پر روانہ ہونے سے پیشتر کہنے لگے۔ "جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک تصویر کھنچواؤں کہ خدا جانے کیا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مجھے عجیب سا وہم ہوا اور وہ تصویریں نہیں اتریں۔ اب جب میرا وہم حقیقت بن کر سامنے آ گیا تو میرے ہاتھ میں صرف یہی تصویر رہ گئی۔ اس میں بڑی بڑی گہری آنکھیں اور دونوں ابروؤں کے درمیان وہ چھوٹی چھوٹی لکیریں جو سوچتے وقت اور نمایاں ہو جایا کرتی تھیں دکھائی دے رہی ہیں۔ جبڑے کی ساخت اور دہانے سے قوت ارادی کی مضبوطی ظاہر ہے۔ چوڑی پیشانی اور چہرے پر وہی شگفتگی ہے جو مزے دار لطیفے بیان کرتے اور زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے وقت پیدا ہو جایا کرتی تھی اور یہ لیجئے حسب دستور داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔

—— شیو بنانے اور بال کٹوانے کا کام ان کے لئے بے حد مشکل تھا۔ ہمیشہ دفتر سے اٹھتے ہوئے دس بجے رات کو اگر کسی بد قسمت کی دکان اس وقت بھی کھلی رہ جاتی تو اس میں داخل ہو جاتے تھے اور وہ بھی دوستوں کی سرزنش سے تنگ آ کر۔ سنا ہے کہ اسی خصوصیت کی وجہ سے مولانا عبدالمجید سالک انہیں سردار جی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

نائی کی دکان سے چھٹکارا پا کر وہ یوں گھر آتے جیسے ساری دنیا کے جھگڑے چکا کر آئے ہوں۔ ایک دن بہت زوردار قہقہوں کے درمیان مجھے بتایا کہ "کل جو میں بال بنوانے گیا تو شخص مذکور کہنے لگا کہ بال پرانے فیشن کے بناؤں یا اس فیشن کے رہنے دوں" شاید یاد ہے کہ بڑے بال رکھنے کا فیشن ان دنوں نیا نیا شروع ہوا تھا جو نوعمر لڑکوں میں بہت مقبول تھا۔

شیو کی مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا ایک نسخہ انہوں نے ڈاڑھی نکلتے ہی معلوم کر لیا تھا وہ کہ شروع سے ہی ڈاڑھی چھوڑ دی جائے۔ مگر دوستوں کی دستبرد سے وہ بیچاری نہ بچ سکی۔ اس وقت سے بھدا شیو کرنے کی روایت شروع ہوئی۔

یہی حال لباس کے معاملے میں بھی تھا۔ عجیب بے نیازی کا عالم تمام عمر چھایا رہا۔ ان کی کھدر پوشی نے کھدر کی سرپرستی کے ساتھ، لباس کے مسئلہ کو بھی ایک ہی بار حل کر دیا تھا۔ ایک دم کئی تھان کھدر کے اٹھا لائے اور کرتے پاجامے، شیروانیاں اور ٹوپی سب تیار ہو گئی۔ بعد میں درزی کو یہ اختیار مل گیا کہ جیسی تو اپنی مرضی سے کپڑے بنا دیا کر۔ وہ ظالم ان کی ڈھیل سے دن بدن لاپروا ہوتا گیا اور سینے پرونے کے فن کے تمام تجربات کی وہ وہ جولانیاں دکھائیں کہ کیا کہئے۔ ایک دن جو گھٹنوں تک لمبی قمیص سی کر لایا تو میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور میں نے کھدر کے وہ سب کپڑے اٹھا کر پھینک دئے۔

"بس آج سے کھدر وغیرہ سب بند۔ آئندہ سے انسانوں کے سے کپڑے بنیں گے۔"

"ارے بھئی جیسا اسے آتا ہے اس بیچارے نے سی دئیے ہیں۔ آپ کا جی چاہے تو آپ ٹھیک کر دیجئے۔" لیجئے بھلا جاننے کا سوال آ گیا تو گویا یہ بھی نہ چاہے تو مت ٹھیک کرو یہاں ایسا ہی پہننے میں کسے انکار ہے۔

پھر میں نے بڑے شوق سے عام رواج کے کپڑے تیار کروائے تو انہیں بھی انہوں نے اسی بے نیازی سے پہن لیا جیسے پہلے درزی کے سلے ہوئے پہنے کرتوں کو۔ البتہ جدید وضع کے لباس میں اتنی ترمیم کر دی کہ کوٹ کے بجائے شیروانیاں سلوائیں۔

[illegible] کے دور میں شرفائی وضع داری اور شرافت کی علامت سمجھی جاتی ہے اور جو لوگ یوپی کے قدیم خاندانوں کی خصوصیات

سے واقف ہیں وہ شاید اس بات کی تائید کریں کہ ان لوگوں کے لباس ہی میں نہیں بلکہ چال ڈھال، اُٹھنے بیٹھنے، روزمرہ کی زندگی کے طور طریقوں میں ایک رکھ رکھاؤ، ایک دھیما پن، ایک صبر و سکون کی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ یہ صبر و سکون جسے اکثر بڑے ریاض سے حاصل کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک ان لوگوں کی خصوصیات تھیں جو قومی زندگی میں اہم خدمات انجام دے گئے اور بعد میں سوری کے عقب سے پار کئے گئے۔ برتی کا خاندان بھی ایسے ہی سوروں کا خاندان ہے جن کے ہاں اونچی آواز سے بولنا برا ہے، ریشمی کپڑے پہننا برا ہے۔ زمین پر زور سے قدم رکھنا برا ہے۔ غرض یوں سمجھا کرو۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

برتی کو اپنے اس ماحول سے بہت سی باتیں ورثے میں ملیں اور کچھ انھوں نے اپنائیں۔ ان کی طبیعت میں ایک دلآویز قسم کی یکسانیت تھی، ایک ٹھہراؤ تھا۔ سنتا ہے کہ اس ٹھہراؤ اور جنگلی عمل کو بھوپال کے علاقوں کی چیرہ دستیاں اور سیاسی جیل کی ہولناک کوٹھری بھی متزلزل نہ کر سکی۔

شدید سے شدید جذباتی موقع پر بھی وہ ایسے ہی پرسکون رہتے اور انتہائی غصہ میں بھی آہستہ سے ایک آدھ جملہ سنا دیتا۔ چہرہ کے آثار چڑھاؤ یا آنکھوں کی چمک کے سوا اور کسی طرح یہ پتہ چلانا مشکل ہوتا کہ یہ شستہ اور مہذب جملے کس جذبے کے تحت کہے گئے ہیں۔ بیشتر ان کے غصے کی حالت کچھ یوں ہوتی:۔

"کیا گڑبڑ ہے یہ؟ کیوں اتنا شور مچا رکھا ہے؟" —— وہ میز کاغذ پر سے نظریں اٹھائے بغیر لکھتے لکھتے بڑبڑاتے جاتے کیونکہ گھر میں ہر حال کسی نہ کسی وقت کوئی ہنگامہ ہوتا ہی ہے۔ اور مجھے اکثر کسی وجہ سے ان کے لکھنے میں مخل ہونا پڑتا۔

ان کا اعتراض کسی کو بھی نہ بھاتا۔ "جی ہاں ٹھیک ہے بے خبری میں ہر بات ہی ہنگامہ معلوم ہوتی ہے۔"

اس کا جواب عموماً یہ ہوتا کہ اپنا کاغذوں کا پشتارہ اٹھایا اور کسی دوسرے کمرے میں گھس کے کھٹ سے دروازہ بند ——

ابھی ان کی بے نیازی پر میری طبیعت کا غصہ باقی ہوتا کہ وہ بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ اپنا تازہ شاہکار سنانے آ موجود ہوتے۔ ایک مضمون نگار اپنے مضمون کی تکمیل پر جس طرح خوشی کا مجسمہ بن جاتا ہے اور مسرت کی روشنی اس میں نظر آتی ہے اس کا ساتھ نہ دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے مجھے اپنی ناراضگی جلدی ختم کر دینی پڑتی۔

تاہم ایسی لڑائی کے موقع بھی ہمارے اس حالت صالحہ زندگی میں بہت کم آئے کیونکہ برتی کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی جو عام طور سے گھروں میں فساد برپا ہوتا ہے۔ گھر میں کیا ہوتا ہے؟ کھانا کیا پکتا ہے؟ خرچ کس طرح ہوتا ہے؟ کون سا ملازم رکھا جاتا ہے؟ انہیں کچھ غرض نہ تھی۔

انہیں تو یہ مسرت ہی کافی تھی کہ گھر کی بدولت انہیں زندگی کا سکون و اطمینان تو میسر ہے —— کیا یہ خوشی ان کے لئے کافی نہیں تھی کہ وہ جس وقت چاہیں کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ اور انہیں مطالعہ کے لئے بھوپال کے قدیم کھنڈرات اور ویران سڑکوں پر تو پناہ نہیں لینی پڑتی کہ وہ والد کی سخت گیری کی زد میں نہ آسکیں۔ ان کو اپنے بچپن کے بے شمار دکھ یاد تھے اسی وقت کے جب زبان کو اظہار پر قدرت نہ تھی مگر دل دکھی احساسات کا خزانہ بن گیا تھا۔ بچپن ہی میں انہیں پرندوں سے بہت محبت تھی مگر وہاں گھر میں پرندے کہاں جہاں سوتیلی ماں کے نخروں کا راج ہو۔

ایک کتاب کہیں سے ان کے ہاتھ لگ گئی تھی جس میں پرندوں کی تصویریں تھیں تو ننھے اور سہمے ہوئے آرٹسٹ نے جو اس وقت رتی ذرا سا تھا گھر کے کونوں کھدروں میں الماریوں کے پیچھے اور جاڑوں میں بچھے کھٹ کے نیچے اندھیروں میں چھپ چھپ کر ویسے ہی تصویریں بنانے کی مشق شروع کر دی اور ایک ایک تصویر نقل کر کے چھپا دی۔ لیکن پھر والد صاحب کو پتہ چل گیا چونکہ گھر میں شرع کی رو سے کوئی تصویر رکھنا جرم تھا

اس لئے اصل اور اس کی نقل دونوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ جذبی کو یہ سانحہ بڑی جزوی تفصیلوں کے ساتھ یاد تھا۔ اس لئے یہ ان کے لئے بہت بڑا سکون کا باعث تھا کہ ان کے اپنے بنائے ہوئے گھر میں بچے اپنی مرضی سے کتابیں پڑھ سکیں گے۔ کھیل کھیل سکیں گے، آزادی سے ہنس سکیں گے اور یوں وہ اپنے سارے تشنہ ارمان پورے کر سکیں گے۔

اپنی عدیم الفرصت زندگی میں بھی وہ جب اپنے چار پانچ سالہ بیٹے کو سلیٹ پر کیل کانٹے بناتے دیکھتے تو اسے پاس بلا لیتے۔ "آؤ مُنّے چڑیا بنائیں! کیا بنائیں؟ کبوتر بنائیں! کبوتر!"

پھر بڑے انہماک سے کبوتر بنایا جاتا اور دونوں باپ بیٹے بے انتہا خوش ہوتے۔ شاید اپنی کامیاب تصویر سے زیادہ اپنے بچپن کی تمنا کو پورا کرنے پر خوشی ہوتی تھی۔

پھر یہیں تک بس نہ تھا۔ ایک دن دس پندرہ شیرازی کبوتر اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔

"ارے یہ کیا تماشہ ہے؟"

"یہی تماشہ کہہ دیا بڑی مشکل سے خرید کر لایا ہوں۔"

"بلی ہی کھا جائے گی۔"

"نہیں کھائے گی ہم خود دانہ پانی ڈالا کریں گے۔ ہم تو بچوں کے لئے لائے ہیں۔"

آخر بڑے اہتمام سے کابُک منگوائی گئی اور چنوں کا دانہ بچے سارا دن ڈالا بکھیرتے رہتے اور کبوتروں میں گھسے رہتے اور ادھر سے گزرتے ہوئے وہ اس خوبصورت منظر کو ایسی محبت سے دیکھتے جیسے کبوتروں کے سڈول اور پاکیزہ وجود میں ان کے آئیڈیل کا کوئی اہم راز چھپا ہوا ہو۔

جذبی کو مطالعہ کا بچپن سے شوق تھا۔ پانچ سال کی عمر میں والدہ کے انتقال کے بعد سے چودہ پندرہ سال تک کا عرصہ جو انہوں نے اپنے نانا کی حویلی میں گزارا تھا۔ مطالعہ کے یادگار دن تھے۔ ان کے نانا مولوی سراج الحق صاحب بھوپال میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے اور ایک وسیع کتب خانہ کے مالک تھے۔ انھوں نے بڑے شوق سے جذبی کو فارسی اور عربی پڑھائی کیونکہ ان کے کھینچے ہوئے زائچے کے مطابق یہ لڑکا بڑی علمی صلاحیتوں کا مالک بننے والا تھا۔ اس پُراسرار قدیم حویلی کے حجروں میں جہاں زندگی بہت احتیاط اور سنجیدگی کے ساتھ چلتی تھی وہ دونوں نانا نواسے ان خزانوں کو کریدا کرتے تھے جو اب دن بدن دیمک کے مول ہو رہے تھے۔

پھر جب نانا کے انتقال کے بعد اس حویلی کا سکون بھی ختم ہو گیا اور اس کی بنیادیں گھن لگ لگ کر بکھرنے لگیں تو جذبی نے عالمِ گردش کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی کو اپنا لیا کیونکہ نانا کے وارثوں کے لئے ان علمی خزانوں اور تاریک حجروں سے زیادہ اہم چیزیں موجود تھیں۔

انھوں نے ایک بار مجھے بتایا: "میں حجرے کے دروازے میں لیٹ کر کتابیں پڑھا کرتا تھا کیونکہ اس کے آگے ایک اور حجرہ تھا اور اس میں سے ہو کر ذرا سی روشنی میرے حجرے کے دروازے تک آیا کرتی تھی؟"

آخر وہ حویلی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور وہ کتابیں بک گئیں تو بھوپال کے کھنڈرات نے اپنی آغوش کھول دی جن سے رفاقت کی مدت تقریباً دس سال رہی۔ یہیں سے جذبی نے بھوپال کے مقامی اخبارات کے لئے مضمون لکھنے شروع کئے جن کی اشاعت والد کی سخت ناراضی کا باعث بنی اور یہیں سے منشی فاضل کے امتحان کی تیاری ہوئی جس کے لئے اس بنا پر جھڑکیاں دی گئیں کہ اتنی چھوٹی عمر میں چلا ہے امتحان دینے۔

بے چارے والد چند ہی سال بعد اس لڑکے کو جسے وہ منشی فاضل کے امتحان کے ناقابل سمجھتے تھے۔ دو بھائیوں اور ایک ماں کا سہارا

بنا کر چھوڑ گئے۔ سولہ برس کی عمر تھی کہ ملازمت کا چکر شروع ہوگیا۔ میٹرک کی سند سے لے کر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (گولڈ میڈلسٹ) تک کے سب مرحلے اسی طرح طے ہوئے۔

اخبار مدینہ سے تعلق کے دوران، چوبیس سال کی عمر سے تیس سال کی عمر تک، جب میرا ان کا ساتھ رہا وہ اگرچہ معاشی لحاظ سے آسودہ تھے مگر بینک بیلنس کچھ نہ تھا۔ کیونکہ آمدنی سے یا تو موٹی موٹی کتابیں خریدی گئیں یا اسٹیٹ پیپلز کانفرنس کے چندے دے دیے گئے تھے۔ ان کے سجائے ہوئے گھر میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں۔ غالب و اقبال کے کلام سے لے کر فسانۂ آزاد کی ضخیم جلدوں تک، انگریزی کے منتخب افسانوں سے لے کر معاشیات کی ٹھوس کتابوں تک، قرآن و بائبل کے مقدس نسخوں سے لے کر کارل مارکس کی کیپیٹل Capital تک کے مجموعے ان کے پاس موجود تھے۔

انہی کتابوں میں وہ آکسفورڈ ڈکشنری بھی تھی جسے وہ اپنی اوائل عمری کی نوکری میں دفتر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ تاکہ خالی اوقات میں پرانی فائلیں پڑھنے میں مدد دے سکے۔ اور یہ مدد میرے خیال میں بڑی مہنگی تھی۔ کیونکہ اس وقت ہر لفظ ان کے لئے ڈکشنری طلب ہوا کرتا تھا۔ اور ان کے انتقال کے بعد جب امریکہ سے ان کا سامان آیا تو دوسری اشیاء تو ہمیشہ کی طرح سے غائب ہو چکی تھیں۔ البتہ ان کی پسندیدہ کتابیں ضرور مل گئیں جن میں نہ تصویرِ بتاں تھیں اور نہ حسینوں کے خطوط تھے اسی لئے محفوظ رہ گئی تھیں شاید!

ان کا کتابیں رکھنے کا طریقہ بھی کچھ نیا ہی تھا۔ کچھ کھلی، کچھ ادھ کھلی، کچھ کے بیچ میں کاغذ پھنسے ہوئے اور بعض ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتی ہوئی۔ ایک میدانِ حشر تھا جس کے لئے عام سائز کی میز کو مختصر سمجھ کر ایک بہت بڑی میز لگی تھی اس طرح سے انہیں سب سے بڑا فائدہ یہ نظر آتا تھا کہ ہر چیز ہاتھ کے نیچے ہی مل جاتی تھی۔ اور ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہیں ہوتا تھا۔ ان کا قول تھا: "جو لوگ کتابیں سجا سجا کر رکھتے ہیں وہ انہیں پڑھتے نہیں۔" بعد میں جب تمام کتابیں الماریوں میں پہنچا دی گئیں تو انہیں شکوہ پیدا ہو گیا کہ ان کی تمام چیزیں ان سے کھو دی ہیں۔ اسی لئے ان کی ضرورت کی کتابیں مجھے ہی ہمیشہ ڈھونڈ کر نکالنی پڑتی تھیں۔

لیکن اخبار کے معاملے میں معاملہ برعکس تھا۔ اگر کوئی ان سے پہلے اخبار دیکھ کر اس کے صفحات آگے پیچھے کر دیتا تو ان کا یہ جملہ اکثر سنائی دیتا: "تمام اخبار باسی کر دیا ہے کے، ساری تہ خراب ہو گئی۔" پتہ چلتا کہ اس بات پر بہت ناراض ہیں۔

خوشبودار لطیف قسم کی چائے کے پیالے پی کر بڑے دھیمے انداز میں باتیں کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس وقت سیاست سے لے کر اپنی زندگی کے آئندہ پروگراموں پر غور ہوتا۔ ابوالکلام کی شخصیت ان کو بہت محبوب تھی اسی لئے وہ اکثر ان کے بارے میں گفتگو کرتے رہتے۔ اس کے علاوہ غدر کے دور میں انگریزی استبداد سے ٹکر لینے والے مجاہدوں کی داستانیں اور ان تمام بہادروں کے کارنامے جو غدر کے بعد سے آزادی کے دور تک انگریزوں کے مظالم سے ٹکرا کر اپنی جان پر کھیل گئے تھے ایسے اور بہت سے محب وطن لوگوں کی داستانیں انہیں ازبر تھیں۔

انہیں غدر کی سو سالہ برسی منانے کی بڑی تمنا تھی۔

"مجھے ۱۹۵۷ء کا بڑا انتظار ہے" ——— وہ بڑی دلسوزی سے کہتے۔

"ہم غدر کی سو سالہ برسی بڑے دھوم دھام سے منائیں گے۔"

اب جیسے جیسے ۱۹۵۷ء قریب آتا جاتا ہے مجھے ان کے جملے بار بار یاد آتے ہیں۔

کیونکہ انیس سو ستاون میں تو خود ان کی چپ چاپ گزرنے والی برسیوں کو چھ سال بیت چکے ہوں گے۔

"وہ کوئی انسان تھا، 'بلیّات' تھا پورا 'بلیّات'!"

"بلیّات" کا لفظ ان کی لغت میں بہت وسیع مفہوم رکھتا تھا۔ غصہ ہو تو "بلیّات"۔ پسندیدگی ہو تو "بلیّات"۔ کوئی زیب

دے جائے تو بلیّات۔ اگر احترام و عقیدت منظور ہو تو گویا بہت ہی "بلیّات"۔ ان بہت ہی بلیّات "قسم کے لوگوں نے ان کے ذہن کا بہت بڑا حصّہ گھیر رکھا تھا۔ جو لوگ کچھ بھی نہ ہوتے ان میں بھی عظمت کے پہلو ڈھونڈھ لیتے۔ اور اگر ان کو اطلاع دیتے کہ میں تو اسے یونہی سا آدمی سمجھتا تھا مگر وہ تو "بلیّات" نکلا یار۔

ایک دن ایک وارڈر کا قصہ سنا رہے تھے جو کہیں اتفاق سے کانگریس کی سیاسی تحریک کے سلسلے میں دس پندرہ دن جیل میں کاٹ آئے تھے اور اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتے تھے۔ پھر میں نے اُن کی بات کا رُخ بدل دیا۔

مجھے معلوم تھا کہ بھوپال جیل کی جن کوٹھریوں میں بزمی نے ڈھائی سال رہ کر اپنی صحت برباد کی وہ کلکتہ کے بلیک ہول سے بدتر تھیں وہاں سانپ، بچھو اور حشرات الارض قیدیوں کی ہم نشینی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ریاستی جیلوں میں کسی درجہ کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہی عام قیدیوں کی بارکیں جہاں نہ روشنی تھی نہ کھلی ہوا اور گرمیوں کی رات کو جب تپتی ہوئی پتھر کی کوٹھریوں میں ان قیدیوں کو بند کر دیا جاتا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو عوام کے لئے روٹی، کپڑا، اسکول اور اسپتال مانگتے تھے۔

میں نے کہا بزمی "یہ ٹھیک ہے کہ دنیا میں بہت سے عظیم انسان ہیں، بہت سے بڑے ذہین ہیں مگر آپ بھی ....

"ہم نے کیا ہی کیا ہے۔" بزمی نے تاسف کے انداز میں جواب دیا۔

رشید جہاں

صدیقہ بیگم سیوہاروی

رشید آپا!

یہ بات ہوگی اب سے کوئی تیرہ سال پہلے کی۔ میں علی گڑھ میں امیر نشاں میں رہتی تھی اور ابھی مجھے علی گڑھ آئے ہوئے مشکل سے پندرہ روز ہوئے ہوں گے کہ دیکھتی کیا ہوں کہ پھاٹک سے تیز تیز ایک خاتون چلی آ رہی ہیں۔ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام —— مردوں کی یہ بات مجھے پسند ہے کہ گھروں میں، مردانے میں بھی داخل ہوں گے تو دستک ضرور دیں گے۔ لیکن یہ خاتون چلی آئیں بس بے دھڑک —— برسات کی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ میں دوپٹہ پھینکے اطمینان سے پھر رہی تھی۔ میں کیا جانتی تھی کہ اس دوپہری دوپہر میں کوئی آ جائے گا اور پھر آنے والا بھی ایسا کہ قمیص کے اندر گلے میں سے ہاتھ ڈال کر کھجائے جا رہا ہو۔ ٹھہر ٹھہر —— مجھے اپنے بدن میں کھجلی سی محسوس ہونے لگی۔ آ گئی بیگما کہیں سے یہاں کھجانے کے لئے۔ میں ویسے ہی جلی بھنی تھی یہ سنگ ڈھنگ دیکھ، آئے حواس جاتے رہے۔ کچھ تو کیا کہتی اور بیگما ہی کہ میرے سلام کا جواب دیئے بغیر کرے ہی گھسی چلی آ رہی ہیں۔ میں بیزار، اپنے گھر میں مہمان بنی جا رہی تھی۔ بیٹھی بیٹھی سوچتی رہی کہ یہ اللہ ماری کون آ گئی۔ اس وقت اس کی اچھی بھلی صورت بھی تو مجھے زہر لگ رہی تھی۔ بیماری میں کوئی چیز اچھی لگتی ہے اور پھر ایسے چپچپاتے موسم میں۔

لیکن چند سیکنڈ کے اندر جیسے زمین میرے پاؤں کے نیچے سے کھسک گئی۔ مجھے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

”تم صدیقہ ہو؟ مجھے رشید جہاں کہتے ہیں۔“

”ڈاکٹر رشید جہاں!!!“ میرے منہ سے بلا سوچے سمجھے نکل گیا۔

”کیوں کیا رشید جہاں کوئی نہیں؟“ —— انھوں نے بڑے پیار سے کہا جیسے کسی بچے کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ کہہ رہی ہوں۔ پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو مجھے اپنے دوپٹے کا خیال آیا۔ نفسیات کی ماہر ہی تو تھیں سمجھ گئیں۔ ”اوہو! اپنے گھر میں سب ایسے ہی رہتے ہیں۔“ لیکن مجھے اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ میں تڑپ کر اٹھی اور دوپٹہ ڈال کر آ گئی۔ اب کہیں میرے ہوش و حواس ٹھکانے لگے۔

ذرا سی دیر میں بے تکلفی سے باتیں شروع ہو گئیں۔ ساری دنیا جہان کی باتیں۔ وہ سچ مچ کامیاب ڈاکٹر تھیں۔ کیسا ہی مریض ہو ان کے سامنے آ کر ساری باتیں اگل دے۔

اس روز دو تین گھنٹے میں مجھے محسوس ہوا جیسے میں انہیں بچپن سے جانتی ہوں اور سچ پوچھئے تو اس ملاقات کے بعد کوئی اور ملاقات نہ بھی ہوتی تو یہ دو تین گھنٹے ان کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے کافی تھے۔

ہمارا ملازم باہر گیا ہوا تھا اور وہ چائے بنانے کے لئے مجھے اٹھنے نہیں دے رہی تھیں۔ آخر معاملہ اس پر طے ہوا کہ میں کمرے میں سماوار لے آؤں اور وہیں چائے بنے اور وہ چائے بنانے میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ مگر چائے کے برتن! ہائے اللہ، وہ بھی تو دھلے ہوئے نہ تھے۔ میں اداس ہو گئی۔ آ گئیں چائے بنانے۔ میں نے بھی سوچا چلو پھر وہاں سہی۔ اس لئے وہ ماننے والی کہاں تھیں، ضدی جو ٹھہریں۔ جس بات پر اڑ جاتی ہیں ایسی اڑیل ٹٹو کی طرح اڑی ہی تو رہتیں (کم از کم میرا تجربہ تو یہی ہے۔ جب بھی ملی ہوں۔ میں نے انہیں کسی کے سامنے قائل ہوتے نہیں دیکھا)۔

اب اسی ملاقات میں لیجئے۔ ایک ناول نگار خاتون ہیں۔ بھلا سا نام ہے ان کا۔ اے۔ آر۔ خاتون۔ اے۔ آر۔ خاتون کے ناول "شمع" کا علی گڑھ میں بڑا زور تھا۔ لڑکیاں برقعوں میں لپیٹے پھرتی تھیں۔ جسے دیکھئے اسی پر بچھا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے سنا ہے کہ نیاز علی کے ناول "انور" اور "شمیم" بھی اسی طرح مقبول تھے اور یہ علی گڑھ کی لڑکیاں —— وہ بھلا کہیں ایک دو بار کسی چیز کو پڑھ کر اپنی تسلی کرتی ہیں۔ وہ تو بس پڑھتے ہی چلی جاتی ہیں۔ گویا حفظ کرنے کا ارادہ ہو۔ ہاں تو علی گڑھ میں ان دنوں "شمع" کا زور تھا اور میرے تو اس پندرہ بیس روز کے اندر ہی اندر سنتے سنتے کان پک گئے تھے، کیونکہ میں نے بھی اسے پڑھا تھا اور مجھے تو بڑی ناامیدی ہوئی تھی۔ جیسے کھودا پہاڑ اور اس میں سے نکلی "مری ہوئی چوہیا" اور اس روز کے بعد سے مجھے علی گڑھ کی لڑکیوں کے ناول پڑھنے کے ذوق اور ان کی پسند پر سے اعتماد اٹھ گیا۔

ہاں تو مجھے یہ ناول ذرا بھی پسند نہ آیا۔ لیکن دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔ اب کیا سنتی ہوں کہ ڈاکٹر رشید جہاں جو ترقی پسند تحریک کی بانیوں میں سے ہیں، اس ناول کی شان میں "قصیدے" پڑھ رہی ہیں۔ میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور آج تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ رشید جہاں جنہوں نے نہ جانے انگریزی، فرانسیسی، روسی اور دوسری زبانوں کے کتنے اچھے اچھے ناول پڑھے تھے وہ اس ناول سے اتنا متاثر کیوں تھیں۔ میں تو منہ میں انگلی داب کے رہ گئی۔ پہلے تو میں نے بحث کرنی چاہی مگر اللہ کا نام لو۔ "وہ بھلا کسی کی بات مانتی ہیں"۔ اس لئے کہ وہ تو شاید ملی جا کر مصنفہ کو اس عظیم کارنامے پر مبارکباد بھی دے آئی تھیں۔ اب انہوں نے اس عظیم ناول کی عظمت پر لیکچر دینا شروع کر دیا اور یہ ڈاکٹر رشید جہاں کی شخصیت کا اعجاز تھا کہ میں نے اس ناول کو دوبارہ پڑھا۔ مگر پھر بھی مجھے اس میں اچھے ناول کی کوئی بات نظر نہ آئی۔ لیکن وہ جب بھی ملیں تو ان کی محبت اور خلوص میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ اے آر خاتون کے ناول کی قصیدہ خواں رہیں۔

میں ابھی تک ان کا پورا نام لے رہی ہوں۔ یہ نام پڑھنے والوں کو ناگوار ہو لگے گا۔ اس لئے کہ وہ تو جگ کی "رشید آپا" تھیں۔ لیکن ابھی تک میری سمجھ میں نہ آیا تھا کہ انہیں کیا کہوں۔ شوکت تھانوی کی "رشیش محل" اس وقت تک نہیں آئی تھی اور اگر چھپ گئی تھی تو میں نے نہیں پڑھی تھی ورنہ یہ مسئلہ آپ ہی آپ حل ہو جاتا۔ کیونکہ بقول شوکت انہیں سب ہی رشید آپا کہتے تھے سوائے ان کے جو کسی مجبوری کی بنا پر نہ کہہ سکتے ہوں لیکن رشید آپا سے دوستی کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہر آدمی ان کو جانتا ہوگا۔ اتنے پیارے انسان کا نام لیکر کون پکارے گا۔ اگر [illegible] جانتے تو ضرور پوچھ لیتی۔

ہاں تو دو ایک روز بعد میں رشید آپا کی کوٹھی پر گئی۔ رشید آپا باہر ٹہل رہی تھیں مردانہ وار۔ (میں اس زمانے میں پردہ کرتی تھی) مجھے دیکھ کر خوش ہو گئیں جیسے میرا انتظار ہی تو کر رہی تھیں۔

"اچھا تو تم آ گئیں۔"

میں نے کہا: "آپ سے بدلہ جو لینا تھا۔"

رشید آپا مسکرا دیں۔ "اچھا تو آج جی بھر کر بدلہ لو۔ میں بھی تیار بیٹھی ہوں۔" اور پھر رشید آپا نے اپنی باتیں شروع کر دیں۔ اس دوران میں مجھے جو بات کھٹکتی رہی وہ یہی کہ انہیں کیا کہوں۔ یہ میری کمزوری ہے کہ شادی شدہ عورتوں کو بھابی ہی کہتی ہوں چاہے میں نے اُن کے "اُن" کی شکل بھی نہ دیکھی ہو لیکن شیخ عبداللہ کی کوٹھی کا چکر کاٹنے والا انہیں رشید آپا کہہ رہا تھا۔ بس مرتی نہ تو کیا کرتی۔ میں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ حالانکہ میں اگر انہیں 'بھابی' کہتی تو شاید پہلی اور آخری 'بھابی' کہنے والی ہوتی۔

ہاں تو اس روز پھر حسب دستور رشید آپا نے لمبی چوڑی باتیں شروع کر دیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں نے ذرا سی دیر کے لئے بھی یہ نہ سمجھا کہ رشید آپا اتنی پڑھی لکھی ہیں۔ علی گڑھ کے گرلز کالج کے ہال کی لڑکی ہیں اور نواب زادہ حمید الظفر کی بہو ہیں۔ بس مجھے تو وہ اپنی جیسی نظر آئیں۔

رشید آپا ابھی نہ جانے کتنی دیر باتیں کرتیں وہ تو پیچھے سے کسی نے دستک دے دی۔ رشید آپا نے انہیں اندر بلا لیا۔ میں ٹھٹک گئی۔ کہنے لگیں کہ "ارے یہ طالب علم نہیں ہے۔ اس سے پردہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں بھی تن کر بیٹھ گئی۔ جیسے واقعی طالب علم ہی سے پردہ کرنے کی ضرورت ہو (میں آج بھی جب اس واقعے کو یاد کرتی ہوں تو مجھے اپنے اوپر ہنسی آتی ہے) لیکن بات سنجیدہ تھی۔ کسی کامریڈ بیمار تھا اور رشید آپا کو اسے دیکھنے کے لئے جانا تھا۔ رشید آپا نے مجھ سے کہا "چلو پاس ہی ہے پیدل چلیں تمہیں سیر کرا لاتے ہیں۔ ابھی بات کی بات میں آئے جاتے ہیں۔" میں خوشی خوشی ساتھ ہو چلی۔

ہم لوگ چلتے چلتے جا رہے تھے اور راستہ تھا کہ کھنچتا چلا جا رہا تھا — عجیب و غریب آڑے ترچھے راستے اور گلی کوچے۔ میں نے اس سے پہلے ایسی گلیاں کاہے کو دیکھی تھیں اور رشید آپا جیسے ان راستوں پر سدا سے چلتی آئی ہیں۔ رشید آپا کو شاید میری تھکن کا احساس ہو گیا۔ اس لئے کہ انہوں نے باتیں شروع کر دیں۔ میں سمجھ گئی کہ مجھے کھلونے دے کر بہلا رہی ہیں۔ میں بھی اڑ گئی تھی کہ نہ بہلوں گی۔ پھر انہوں نے جاگیردارانہ نظام پر باتیں شروع کر دیں۔ مگر میں پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ بھانپ گئیں۔ ایکدم سے موضوع بدل کر بولیں "تمہارا رسالہ کیسا چل رہا ہے۔" (اس زمانے میں میں ایک زنانہ رسالہ دنیارنگ کی ادارت کر رہی تھی۔)

میں نے کہا: "بس یونہی۔"

اس وقت اگر میں چاہتی تو بڑے مزے میں رشید آپا سے ایک کہانی کا وعدہ لے لیتی لیکن میں جل رہی تھی۔

رشید آپا بولیں "پہنچے، ہم آ گئے۔" اب ہم ایک تنگ و تاریک راستے سے گزر رہے تھے۔ پھٹے گندے گندے مکان نظر آ رہے تھے پھر رشید آپا نے اطمینان سے کہا "بس ان ہی میں سے کوئی مکان ہو گا۔ بھلا یہاں کوئی تندرست رہ سکتا ہے جہاں تو بیماریوں کے جراثیم پلتے ہیں اور ہم ان بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ کیوں، صریحاً غلامی لعنت ہے یا نہیں؟"

اور میں اس وقت ان کے تیور دیکھ کر بے حد سنجیدہ ہو گئی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا: "جی ہاں" اور میں نے یہ کہہ تو دیا لیکن پھر مڑ کر دیکھا کہ کہیں کسی کامریڈ نے تو نہیں سنا اور پھر اطمینان کا سانس لیا۔ کاش اگر کوئی اس وقت سن لیتا تو ہنس پڑتا۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ اگر اس وقت فراق گورکھپوری یا مجاز مرحوم بھی ہوتے تو ان کی زبان سے بھی یہی نکلتا کہ "جی ہاں" ——

رشید آپا بڑبڑاتی چلی جا رہی تھیں۔ اب ہم مکان در مکان گھستے چلے گئے آخر ایک اندھیری سی کوٹھری میں پہنچے جہاں ایک بیمار کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ رشید آپا نے سرہانے جا کر اس کا ٹمپریچر لیا۔ "اوہ ۱۰۳ ڈگری بخار ہے۔ کیوں جی اس کو کب سے بخار آ رہا ہے؟"

"جی کئی روز سے۔" اس کامریڈ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

”اور تم کو آج نظر آتی۔ وہ چار روز اور ٹھہر جاتے۔ کس کا انتظار کر رہے تھے؟“

رشید آپا کو غصہ آ رہا تھا اور وہ خاموش تھا۔ پھر انہوں نے مریض کا باقاعدہ معائنہ کیا اور معائنہ کا یہ سلسلہ پندرہ منٹ جاری رہا۔ پھر رشید آپا نے ایک نسخہ لکھ کر اس کے حوالے کیا اور بولیں۔

”دیکھو! دودھ کے سوا اور کچھ مت دینا اور اسے سنگترے کا عرق ضرور پلاؤ۔“

کامریڈ نے نسخہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر رشید آپا کو ذرا ایک طرف لے جا کر ڈرتے ڈرتے بولا: ”آپ نے نسخہ تو لکھ دیا مگر دوا کہاں سے آئے گی، یہاں تو پھوٹی کوڑی پاس نہیں۔ پیسے ہوتے تو کسی ڈاکٹر کو ——“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

میں سہم گئی۔ رشید آپا کے تیور پہلے ہی سے کیا کم بگڑے ہوئے تھے اور رشید آپا کیا کوئی اور ڈاکٹر بھی ہوتا تو یہ سن کر اس کے غصے کا پارا نہ جانے کتنا اور چڑھ جاتا —— لیکن رشید آپا —— جیسے کسی نے آگ پر پانی چھڑک دیا ہو اور ان کے چہرے سے جیسے کسی نے سارا غصہ سوت لیا ہو۔ انہوں نے آہستہ سے کہا: ”اچھا میرے ساتھ چلو“ —— اب ہم تینوں چل پڑے۔ بہت دور تک خاموش چلتی رہیں پھر میری طرف متوجہ ہوئیں۔ ”کیوں صدیقہ! یہ حالات اپنے آپ بدل جائیں گے یا ان کو بدلنا پڑے گا؟“

آپ بتایئے اس کا کیا جواب ہوگا۔ اور میں جانتی ہوں کہ راجہ صاحب محمود آباد بھی ہوتے تو وہ بھی وہی جواب دیتے۔ جو رشید آپا کے دل میں تھا اور میری زبان پر۔“

ترقی پسندی کا یہ پہلا سبق تھا جو رشید آپا نے مجھے پڑھایا، میرس روڈ کی سڑک پر چلتے ہوئے۔

”موت اور اس مریض میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ شاید اتنا بھی نہیں جتنا کہ مجھ میں اور تم میں ہے۔“ رشید آپا نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی رہیں اور میں یہی سوچتی رہی کہ واقعی ان حالات کو بدلنا ہوگا، یہ اپنے آپ نہیں بدلیں گے۔

میں ابھی وہیں تھی اور رشید آپا آگے بڑھ گئی تھیں۔ ”بیچارہ اندھیرے میں پڑا کراہ رہا ہے۔ اندھیرے ہی میں ہے لیکن ان اندھیرے کے اندھیرا کب بھی تو دم ہے۔“

میں ان کی باتیں سنتی رہی۔ پھر ان کی کوٹھی آ گئی۔ رشید آپا اندر جا کر دس روپے کا ایک نوٹ لائیں اور اس آدمی کو دے کر بولیں: ”لو فوراً دوا لا کر پلاؤ۔ سنگترے بھی لیتے آنا۔ کل مجھے حال بتانا یا میں خود آ کر دیکھ لوں گی تمہارے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اب رشید آپا سے میری خوب دوستی ہو گئی لیکن اگر دوستی نہ بھی ہوتی تو اس میں فرق ہی کیا پڑتا۔ اس لئے کہ پہلے ہی روز وہ مجھ سے اس طرح ملیں کہ غیریت کے سارے پردے اٹھ گئے تھے۔ میں اپنے آپ پر کئی روز ناز کرتی رہی۔ رشید آپا مجھ سے بے تکلفی سے باتیں کرتی ہیں۔ مجھے اپنی بہن کی طرح سمجھتی ہیں۔ مجھے کتنی اچھی اچھی باتیں بتاتی ہیں —— لیکن یہ ایک فریب تھا جو بہت دن نہ چل سکا۔ اور میں اس خود فریبی میں زیادہ مبتلا نہ رہ سکی۔ اس لئے کہ وہ تو ہر ایک سے اسی بے تکلفی سے ملتی تھیں۔ میرے ساتھ کوئی خصوصیت تھوڑا ہی تھی۔ وہ ہر ایک سے یوں ہی تو اسی محبت اور خلوص سے ملتی تھیں۔

”واہ بھئی تم ابھی تک بی اے ہی میں ہو۔ میں تو جب تم سے بھی چھوٹی تھی یہی کوئی پندرہ سولہ سال پہلے تب کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھتی تھی —— تم ابھی تک بی اے ہی میں ہو؟“

اور لڑکی نے بیچارگی سے جواب دیا: ”جی ابھی تک کیوں، اسی سال تو آئی ہوں بی اے میں۔“

اور رشید آپا ہنس پڑیں۔ ”بڑی ذہین ہو، میں اتنی ذہین نہ تھی۔“ وہ لڑکی خوش ہو گئی اور پھر رشید آپا نے اسے پاس جا کر بٹھایا اور

جانے چلی۔

لیکن رشید آپا کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ وہ یوں تو اللہ میاں کو مانتی نہ تھیں لیکن دعائیں اور کوسنے بڑے مزے میں دیتی تھیں۔ بالکل بڑے بوڑھوں کے سے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے کوسنے میں ماؤں کی تڑپ بھی شامل ہوتی۔ منہ پر آ کر بات پرانی ہو جاتی ہے۔ اس لئے زبان سے ٹالتی ہوں ورنہ ان کے ایک آدھ کوسنے کا ذکر نوکِ قلم تک آ ہی گیا تھا۔ نہ جانے لوگ اس کی کیا کیا تاویلیں کریں —— بس یوں سمجھئے کہ وہ بڑھ بڑھ کر کڑکڑ کوسنے سے بھی نہ چوکتی تھیں مگر وہ لگی بھی کب تھیں۔

میری اور رشید آپا کی ملاقات کا سلسلہ کافی دنوں تک رہا۔ پھر وہ لکھنؤ چلی گئیں اپنے سسرال۔ اور میں چند مہینوں کے بعد دہلی چلی گئی۔ —— اس زمانے میں کبھی کبھی خط و کتابت کا سلسلہ بھی رہا، لیکن اکھڑا اکھڑا سا۔

اگر کہیں نثر میں استاد اور شاگرد کا سلسلہ چلتا ہو تو میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتی ہوں کہ میں اپنی تمام ترقی پسندی کے باوجود نذر چڑھا کے چڑھاوا، حق فرض ادا کر کے ان کی باقاعدہ شاگرد ہو چکی ہوتی لیکن شاگرد تو اس کے باوجود بھی تھی —— رسم رسوم ادا کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے مجھے جو کچھ بھی سکھایا وہ آج بھی میرے لئے مشعلِ راہ ہے۔

ستمبر ۴۰ء میں شادی کے بعد میں الہ آباد چلی گئی لیکن نہ جانے کیوں مجھے رشید آپا سے شرم آتی تھی کہ میں انہیں اپنی شادی کی اطلاع دیتی۔ دعوت تو خیر کیا دے سکتی کیونکہ شادی ہی ایسی کون سی شاندار ہوئی تھی بس دو بول پڑھے گئے تھے نہ ڈھول تاشے بجے نہ شہنائی۔ لیکن رشید آپا ٹوہ لگائے تھیں، جیسے بس موقع کی تاک میں ہوں۔

عوامی تھیٹر کی کانفرنس الہ آباد میں تھی۔ اس میں جہاں ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ آئے رشید آپا بھی لکھنؤ سے شرکت کے لئے چلی آئیں۔ رات کو ایک ڈرامہ "جادوگر" ہونا تھا۔ میں وہ دیکھنے کے لئے گئی۔ اچانک رشید آپا سے ملاقات ہو گئی۔ مسلسل بیماری کی وجہ سے ان کی تندرستی خراب ہو گئی تھی۔ چہرے پر بس گھونگھریالے بال نظر آتے تھے —— زرد زرد ہو رہی تھیں، جیسے کسی نے خون چوس لیا ہو۔ لیکن آنکھوں میں وہی چمک، وہی ذہانت اور وہی تیزی تھی۔ اور آنکھوں کا کیا، زبان کا حال بھی وہی تھا۔ پھڑ پھڑا کے کہ میں کچھ کہوں وہ تو مجھ پر برس پڑیں۔ "شادی کر کے چھپ گئیں اور مجھے پوچھا تک نہیں کیوں چپ بیٹھی رہیں"۔ انہوں نے سب کے سامنے کچھ اس طرح کہا کہ میں دلہنوں کی طرح شرما گئی۔ "چل ابھی دکھا۔" —— میں نے پوچھا نہیں اور وہ فوراً لے کر بیٹھ گئیں۔ رشید آپا کھلی پڑتی تھیں اور میں کٹی جاتی تھی۔ مجھے اندر لے گئیں، ڈرامہ شروع ہونے میں دیر تھی وہاں کچھ اور خواتین بھی آ گئیں۔

اُردو کے مشہور شاعر مسعود اختر جمال صاحب کے گھر کی کچھ خواتین۔ رشید آپا نے پھر وہی گفتگو شروع کر دی۔ اسی انداز میں جیسے اب سے چند سال پہلے علی گڑھ میں کیا کرتی تھیں، جیسے وہ اتنے گزرے ہوئے ماہ و سال کا مذاق اڑا رہی ہوں۔ ان کی طبیعت میں رتی بھر جو تبدیلی آئی ہو۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح ڈرامہ شروع نہ ہو اور میں باتیں کرتی رہوں۔ لیکن ڈرامہ شروع ہو گیا۔ یہ ایک مختصر سیاسی ڈرامہ تھا۔ جس میں بلراج ساہنی اور حبیب تنویر وغیرہ کام کر رہے تھے۔ دلچسپ اتنا کہ سارے دیکھنے والے محو۔ میں نے ایک مرتبہ جو مڑ کر دیکھا تو رشید آپا غائب۔ معلوم ہوا کہ پیچھے مردوں کے مجمع میں بیٹھی ہوئی دیکھ رہی ہیں۔ پھر ذرا سی دیر بعد جب اسٹیج پر روشنی پڑی تو دیکھتی کیا ہوں کہ رشید آپا بالکل آگے والی صف تک پہنچی ہیں۔ رشید آپا پردہ نہیں کرتی تھیں۔ لیکن یہ محض اتفاق نہ تھا۔ مجھے اسی روز معلوم ہوا کہ عام لوگوں کی طرح رشید آپا کسی ایک طبقے کی نہ تھیں۔ اگر آپ نے انہیں دیکھا ہے تو جانتے ہوں گے کہ مختلف طبقوں میں وہ موجود تھیں اور ہر طبقے کے آداب سے بخوبی واقف تھیں کیونکہ انہیں

ایسے ماحول میں پرورش ہی پائی تھی ۔ اور درمیانی طبقہ اُن کے لئے اجنبی نہ تھا ۔ وہ ڈاکٹر تھیں اور ان گھروں میں ان کا روز کا آنا جانا تھا ۔ اور ہر طبقہ سے انہیں اللہ واسطے کی محبت تھی ۔

غرض ہر جگہ وہ ایک جیسی تھیں ۔ کسی محفل میں اجنبی نہ تھیں ۔ جہاں پہنچ جاتیں ایسا معلوم ہوتا کہ گویا بس اسی ماحول میں پلی بڑھی ہیں ۔ بس وہ تو اسی میں گھل مل جاتیں ۔ کون ہے ایسا کہ ان کا جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ کر دے ——— ہاں تو بات چلی تھی اس ڈرامے کے بارے میں یہ ڈراما بہت پسند کیا گیا اور الٰہ آباد جیسے شہر میں بار بار اسٹیج ہوا ۔ ہر ایک واہ وا کر رہا تھا ۔ یہاں تک کہ مخالفین بھی عش عش کر کے اُٹھے تھے ۔ لیکن رشیدآپا نے منہ چڑاتے کہہ دیا ۔ "قطعی بکواس "۔

میں چونک پڑی : "رشید آپا ایسا کہہ رہی ہیں آپ ۔ اس ڈرامے کے بارے میں تو دوسرے بھی بُرا نہیں کہہ سکتیں " میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا ۔ اور دراصل بحث کرنے میں، میں ہوں بھی کمزور ہوں ۔

"ابی وہ ڈرامے کی کچھ مت کہو ۔ وہ ڈرامے تو اشتراکیت پر بنے ہیں ۔ انسانی مساوات اور برابری پر ۔ سرمایہ داری کے خاتمے پر ۔ مزدوروں کی چال پر ——— " رشیدآپا نے تڑخ سے جواب دیا اور مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرا منہ دھرا ہو گیا ہو ۔ اور پھر رشیدآپا نے نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا ۔ میں نے تو کچھ سنا نہیں ۔ رشیدآپا اپنی بات پر اڑی رہیں ۔ یہ ڈراما عام طور پر پسند کیا گیا ۔ پھر مجھے رشیدآپا کی رائے کا پس منظر معلوم ہوا ۔

ڈرامے کے مکالموں کے طنز مزدوروں کے سمجھ ہی میں نہیں آئے تھے جو پیچھے بیٹھے ہوئے تھے ۔ اتفاق سے ڈرامے کا موضوع ہی طنزیہ بھی تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ڈراما ہی سمجھنے سے قاصر رہے اور رشیدآپا مزدوروں کے خیالات کی ترجمانی کر رہی تھیں ۔ اور یہی نہیں بلکہ میں نے سُنا کہ بعد میں ان سے اور [illegible] صاحب سے اس پر خوب بحث بھی ہوئی ۔ انہوں نے عوامی تھیٹر کے تمام ساتھیوں سے شدت سے اختلاف کیا ۔ کچھ لوگوں کو ان کی تنقید بُری بھی لگی لیکن رشیدآپا بلاوجہ کبھی کسی کو خوش نہ کرتی تھیں ۔

اگلے دن میری بچی کی طبیعت خراب تھی ۔ لیکن شام کو میں رشیدآپا سے ملنے چلی آئی اور جب رشیدآپا کو معلوم ہوا تو مجھ پر برس پڑیں ۔ تم نے اپنی ماں اور ساس کی بھی اتنی باتیں کاہے کو سُنی تھیں ۔ کیا کیا رشیدآپا مردانہ وار زندگی گزارنے کے باوجود عورتوں کا سا مزاج رکھتی تھیں ۔ وہ عورتوں کی طرح بگڑ رہی تھیں ——— "تم بیمار بچی کو چھوڑ کر نکل پڑیں ۔ واہ لڑکی واہ ——— ننھی سی جان کا اتنا بھی خیال نہیں ۔ اجنبی ہو گئی میری محبت ——— " اور مجھے اُلٹے پاؤں واپس آنا پڑا ۔ مرتی نہ کیا کرتی ۔ ذرا سی دیر بعد دیکھتی کیا ہوں کہ رشیدآپا میرے گھر پر موجود ——— اس وقت وہ اپنا آدرش بھولے ہوئے تھیں اور خوب سنجیدہ تھیں ۔ سو فیصدی ڈاکٹر ———

بچی ایسی کوئی خاص بیمار بھی نہ تھی کہ جس کا علاج کرنا اتنا ضروری ہو ۔ یونہی بس نزلے زکام کی شدت سے بخار ہو گیا تھا لیکن رشیدآپا نے علاج شروع کر دیا اور جب تک بچی اچھی نہ ہو گئی وہ برابر آ کر دیکھتی رہیں اور انہوں نے میرا گھر سے نکلنا تقریباً ناممکن کر دیا ۔

رشیدآپا پر مجھے غصہ بھی بہت آیا ہے ۔ وہ سامنے ہوتیں تو ایسی جلی کٹی سناتیں کہ چھٹی کا دودھ یاد آتا ۔

یہ بھی اسی زمانے کی بات ہے میں الٰہ آباد میں تھی ۔ اس زمانے میں یوں تو پردہ چھوٹ چکا تھا ۔ لیکن گھر والوں کے سامنے بس یونہی ساڑی کی شکل دکھلانے کو ۔ حالانکہ انہیں بھی اس کا علم تھا لیکن محض بڑے بوڑھوں کے جذبات کا پاس ہو رکھا تھا ۔ اب میں کسی اور سے کیا کہتی ۔ اسی زمانے کی بات ہے ۔ مہینے میں چار پانچ آدمی ایسے ملنے چلے آتے تھے جنہیں رشیدآپا نے میرے پاس بھیجا ہوتا ۔ ان لوگوں کو محض افسانہ نگار خواتین سے ملنے کا شوق ہوتا ۔ اس کا اندازہ تو کچھ وہی لڑکیاں کر سکتی ہیں جنہیں ایسے "ادبی آفت" کا مقابلہ کرنا پڑا ہے یہ بات لکھنے کی نہیں ۔

بات یہ تھی جو لوگ رشیدآپا سے بحیثیت افسانہ نگار ملنے جاتے انہیں وہ میرے پاس "ریباؤنڈ" کر دیتیں ۔ اب میں نمٹوں ان سے ۔ اور

گھر میں چوری گڑیاں۔ اسے دو ریگا اخباروں میں تو لکھتی ہی تھیں اب مردوے بھی ملنے آنے لگے۔ لیکن رشید آپا سے کیا کہوں۔ کبھی کبھی جی میں آتا کہ ایک غصہ سے بھرا ہوا خط لکھ دوں۔ لیکن پھر رہ جاتی ——— البتہ اس کا فائدہ یہ ضرور ہوا کہ میں نے بہت جلد اس دوستی کو چھوڑ دیا۔ غالباً رشید آپا نے صلح سمجھ کر یہ کیا ہو۔ کیونکہ اب کوئی نہیں آتا۔ لیکن رشید آپا بھی تو زندہ نہیں ہیں۔"

رشید آپا کا گھرانہ بڑا عجیب و غریب ہے۔ ایک بہن گرلز کالج کی پرنسپل تھیں، ایک بہنوئی ڈاکٹر، بھائی بھاوج بھی علم والے ہی تھے۔ اور رشید آپا ——— انہیں کون نہیں جانتا۔ رشید آپا اپنے گھر میں سب سے الگ تھیں۔ وہ چاہتیں تو عیش کی زندگی گزار سکتی تھیں۔ لیکن انہوں نے ہر قسم کے عیش و آرام کو ٹھکرا کر ایک عام انسان کی زندگی کو ترجیح دی۔

اسی کوٹھی میں، میں نے ان کی ایک بہن کو دیکھا جو اپنی جوتی کی ایڑی کے بل پر چل رہی تھیں۔ پاس پڑوس کی فضا سے بے نیاز ——— ہم چار پانچ لڑکیاں رشید آپا کے پاس بیٹھی تھیں کہ ان کی بہن آئیں اور ہمارے سلام کا جواب دیے بغیر گزر گئیں ——— رشید آپا شرمندہ تھیں گویا یہ بد اخلاقی ان سے ہی ہوئی تھی۔ دوسروں کی کمزوری کو اس طرح اپنانا بھی تو بڑی بات ہے۔

میں نے شاید یہ کہیں نہیں لکھا کہ رشید آپا کمیونسٹ تھیں۔ اس کی ضرورت بھی نہیں اس لئے کہ ایسے لوگ اگر کمیونسٹ نہ بھی ہوں تو ان کی بڑائی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

آج رشید آپا ہمارے درمیان نہیں۔ وہ یہاں ہزاروں میل دور، روس کی سرزمین میں آرام کر رہی ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ رشید آپا کی روح بے چین ہوگی خاکِ وطن کے لئے۔ وہ اپنی بیماری کا علاج کرانے گئی تھیں۔ روس کی مٹی نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ آج روس میں ان کی ایک حسین سی قبر ہے۔ شاید ہم رشید آپا کے لئے اتنی حسین قبر نہ بنا سکتے۔ اس لئے کہ ہمیں ابھی ان کی عظمت کا صحیح معنوں میں احساس بھی نہیں۔ لیکن کون جانے ایک وقت ایسا بھی آئے جب ایک قبر ماسکو سے اکھڑوائی جائے۔ جس میں روس کی مٹی خاکِ ہند سے ملے۔ ہماری امانت ہمیں واپس مل جائے۔

رشید آپا ترقی پسند تحریک کی بانیوں میں سے ایک تھیں۔ وہ ایک بڑی افسانہ نگار تھیں۔ کم لکھتی تھیں لیکن بہت اچھا لکھتی تھیں۔ وہ بہت اچھی صحافی تھیں ——— وہ کمیونسٹ تھیں اور وقت آنے پر سرگرمیوں سے ادارہ کی تشکیل بھی کر لیتی تھیں لیکن ان کی بڑائی ان کے افسانوں میں نہیں ——— ان کے علاج معالجے میں نہیں، ان کے کمیونسٹ ہونے میں نہیں ——— ابھی کتنے افسانہ نگار اور پیدا ہوں گے جو شاید ان سے زیادہ اچھے افسانے لکھیں گے۔ ان سے اچھے اچھے ڈاکٹر بھی پیدا ہوں گے۔ ان سے اچھے اچھے کمیونسٹ بھی پیدا ہوں گے جو قوم کے لئے ان سے بڑی قربانیاں بھی دیں گے ——— لیکن ان میں کوئی رشید آپا نہ ہوگا۔ وہ سراپا خلوص کہاں سے ملے گا۔ وہ محبت کس میں ملے گی۔

وہ بے باک تھیں اور شاید اسی لئے کہ ان کے دل و دماغ میں کوئی گانٹھیں نہ تھیں۔ وہ کبھی کسی چیز کو فرض کر کے آگے نہ بڑھتی تھیں۔ جو دیکھتی تھیں بس وہی کہتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں ان کے ڈاکٹر ہونے کو دخل ہو، جو معروضات پر علاج نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے حقیقت پسند فنکار ہونے کو دخل ہو۔ لیکن یہ سچ ہے کہ وہ بے باک تھیں اور نڈر تھیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ پچھلے دنوں جب انہیں پولیس نے خطرناک سمجھ کر گرفتار کر لیا تھا تو ان کے مریضوں نے انہیں چھڑوا لیا۔ میں اس واقعہ کی سچائی کے بارے میں تصدیق سے کچھ نہیں کہہ سکتی تاہم یہ بات رشید آپا کے لئے غیر ممکن نہیں۔

میں نے رشید آپا کی شخصیت کا یہ دھندلا سا جائزہ لیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو یہ شکایت ہو کہ میں دودھ کا دودھ پانی کا پانی نہ کر سکی۔ ان کی شخصیت کی کمزوریاں سامنے نہ لا سکی۔ لیکن میں نے انہیں کیمرے کی آنکھ سے نہیں، اپنے دل و دماغ سے دیکھا تھا اس لئے ہو سکتا ہے کہ بہت سے داغ نظر سے اوجھل ہو گئے ہوں۔ لیکن اگر آپ انہیں جانتے ہیں تو خدارا مجھ سے قریب ہو کر کان میں بتائیے ان میں خامیاں تھیں بھی کب ———

مجاز[1]

ابواللیث صدیقی

۱۹۳۴ء میں علی گڑھ کا انٹرمیڈیٹ ٹوٹا تو اسکول کی جماعتیں اسکول کے ساتھ اور کالج کی جماعتیں یونیورسٹی کے ساتھ ملحق کر دی گئیں۔ چنانچہ میں بھی یونیورسٹی پہنچا۔ ایک تو یونیورسٹی کی شہرت اور فضا کا مجھ پر پہلے ہی سے رعب تھا، پھر علی گڑھ میں بعض ایسی روایات تھیں جن سے اکثر نو واردین گھبرا سکتے تھے۔ یہاں سینئر اور جونیئر میں کچھ ایسا حفظ مراتب تھا کہ بیچارے جونیئر ہوسٹل تک اپنے آپ کو محض "بدھو" اور سینئروں کے رحم و کرم پر سمجھتے تھے۔ ان کے تحت تمدنی سینئروں کو خاص مراعات حاصل تھیں۔ ڈائننگ ہال میں "بالائی" اور "مرغ کا ڈونگا" اور "پرہیزی"[2] تو خیر ان کا حق تھا، ہفتے میں ایک دن "بریانی" اور مچھلی کے شاہی ٹکڑے، ابھی پہلے ان کی خدمت میں پیش ہوتے، پھر ان سینئر بیروں کا حصہ ہوتا جو جونیئروں کو بتا دیتے کہ میاں یہ ختم ہو گئی۔ صرف سینئر طالب علموں کے لئے ہوتی ہے۔ پھر یہ سینئر طالب علم واقعی تھے بھی سینئر۔ مثلاً ان میں سے ایک صاحب ممتاز ہوسٹل کے ایک ہی کمرے میں بارہ سال سے مقیم تھے اور بی۔ اے پاس نہ کر سکے تھے۔ ہر سال وہ ایک آدھ مضمون میں پاس ہو جاتے اور دو ایک میں فیل، اور حساب لگاتے تو ہر مضمون میں الگ الگ کئی مرتبہ پاس ہو چکے تھے۔ اب یہ "مضامین" کی مستقل خوش فہمی تھی کہ انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ ان کا جواب پیدا ہو گا بھی نہیں۔ ایسے سینئر طالب علموں سے جونیئر لڑکے اور بڑے بڑے جغادری عہدہ دار بھی ڈرتے تھے اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

یونیورسٹی پہنچتے ہی مجھے بھی اس فضا کو محسوس کرنا پڑا۔ خیریت یہ تھی کہ اس وقت کے چند نمایاں "سینئر" میرے دوست اور ہم وطن تھے اور ان کے کرم سے میں ان آزمائشوں سے کسی قدر محفوظ رہا جن سے بالعموم جونیئر طالب علموں کو گزرنا پڑتا تھا، پھر بھی میں بڑی اجنبیت محسوس کرتا۔ میری حالت اس وحشی ہرن کی سی تھی جو جال میں یا نیا پھنسا ہو۔ ایک وقت یہ بھی تھی کہ میں نہ تو جونیئر تھا نہ سینئر۔ جونیئر کے حلقے سے تو میں یوں خارج سمجھا جاتا تھا کہ بعض اساتذہ اور سینئر طالب علم مجھ پر غیر معمولی شفقت فرماتے اور مجھے ایسی مراعات حاصل تھیں جو جونیئروں کو نصیب نہ ہوتی تھیں۔ سینئروں سے میں کچھ گھبراتا تھا اس لئے میری وحشت کا علاج کچھ میں نہ آتا تھا۔

---

[1] یہ مضمون مرحوم کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

[2] علی گڑھ کی خاص اصطلاح میں مرغ کا شوربا، مٹر پلاؤ وغیرہ۔ اصل میں یہ اصطلاح اس کی وجہ سے ہے کہ ڈاکٹری تجویز پر بیماروں کے لئے ڈائننگ ہال میں خاص کھانا پکوایا جاتا تھا۔ اکثر سینئر طلباء ڈاکٹر سے اپنے لئے مرغ کا شوربا اور پلاؤ بطور پرہیزی غذا تجویز کرا لیتے تھے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں علی گڑھ کی یونین (STUDENTS' UNION CLUB) کلب میں ایک مباحثہ ہوا، یہ مجھے معلوم تھا کہ یونین کے اس پلیٹ فارم سے عبدالرحمٰن صدیقی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین اور خواجہ غلام السیدین جیسے مقرر پیدا ہو چکے تھے اور یہاں تقریر کرنے کے لئے بڑی جرأت، ہمت اور استقلال کی ضرورت تھی۔ بہر حال میں نے تقریر کر ڈالی اور خلاف توقع بڑی داد پائی۔ تقریر کو کئی دن ہو چکے تھے۔ میں آفتاب ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۴۲ میں مقیم تھا، سہ پہر کے وقت ایک تیز طرار، خوش پوش اور خوش رو طالب علم تشریف لائے، تعارف ہوا فرمانے لگے "ڈاکٹر صاحب! میرا نام انصار حق ہاروانی ہے۔ کلاس میں ہم دونوں ساتھ ہیں لیکن اب تک تعارف نہ تھا۔ یونین میں آپ نے بڑی اچھی تقریر کی۔ یہ دیکھئے ہمارے یہاں سے طالب علموں کا ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار نکلتا ہے، اس میں آپ کی اس تقریر کی بڑی تعریف ہے۔"

یہ انصار سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد انصار کے بڑے بھائی اسرار اور پھر بہن صفیہ سے میری ملاقات ہوئی۔ اسرار اس وقت اسرار الحق تھے، مجاز کی شہرت صرف ایک محدود حلقے میں تھی۔ صفیہ سکول میں پڑھتی تھیں، بعد میں جب انھوں نے ۔۔۔ میں ایم۔ اے کیا تو میری شاگرد بھی رہیں۔ پھر وہ جاں نثار کی رفیقۂ حیات بنیں اور ۔۔۔ میں انتقال کیا۔ مجاز پر جوش اور دیوانگی کے بہت سے عالم گزرے، جب تک علی گڑھ میں رہا اکثر ملاقات رہی، پاکستان بنا اور میں ادھر رہ گیا۔ اس کے بعد مجاز سے صرف ایک مرتبہ لاہور میں ملاقات ہوئی۔ بھائی انصار اس وقت بھی قوم پرست تھے اب بڑے سیاسی لیڈر ہیں۔ جب وہ میرے ساتھ تھے اس وقت علی گڑھ میں عبدالرحمٰن، انور شیخ، احمد عباس اور حافظ عثمان انصاری جیسے مقرر موجود تھے ان کے سامنے انصار نوآموز تھے لیکن ان کے منفرد انداز و شیریں گفتار نے انہیں یونین کے نمایاں مقرروں میں شامل کرا دیا تھا۔ ان کے تیکھے خدوخال، پتلے ہونٹ اور دو نگینے، دو نگینوں میں ایک جوش اور حرکت اب تک میری آنکھوں میں پھرتی ہے۔ تینوں بہن بھائیوں کی صلاحیتوں، شہرت اور کارناموں پر غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ذہانت، شرافت اور لیاقت تینوں نے ورثہ میں پائی تھی۔

مجاز کی شعر و شاعری علی گڑھ کے خاص ماحول میں ہوئی۔ یونیورسٹی سے ہٹ کر علی گڑھ بڑی خشک، غیر دلچسپ اور غیر شاعرانہ جگہ تھی۔ شہر میں تالوں کی تجارت ہوتی اور ریلوے اسٹیشن پر "علی گڑھ کی مشہور نمائش" کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ساگونی جو شکر سے تیار ہوتی لیکن صورت اور مزہ دونوں میں مصالحوں سے مشابہ ہوتی۔ لیکن اس غیر شاعرانہ ماحول میں یونیورسٹی کی دنیا الگ تھی۔ اس کے دارالاقاموں میں زندگی اپنے پورے جلال و جمال، آب و تاب اور رنگ و روپ کے ساتھ جلوہ گر تھی، ان میں کھلنڈرے شاعر، ادیب، ملا اور مولوی، رند اور زاہد، پڑھنے والے اور بے فکرے سب ہی رہتے تھے۔ کسی کمرے میں طبلے کھنکتے اور ستار کے تار جھنجھناتے سنائی دیتے، کہیں شعر و شاعری کے چرچے ہوتے، کہیں ناچ کی محفل بھی ہوتی، کہیں کرکٹ، فٹ بال اور ہاکی کا ذکر ہوتا، لیکن دو چیزیں سب میں مشترک تھیں، "خوش باشی" اور "خوش مذاقی"۔ تیسرے درجے کے گھٹیا پن کا تو ذکر کیا کوئی دوسرے درجے کی بات بھی اس ماحول میں مشکل ہی سے جگہ پاتی تھی، شاید علی گڑھ کی اقامتی زندگی کی شہرت اور کامیابی کا راز اسی معیار میں مضمر تھا اور اسی وجہ سے جو لوگ علی گڑھ میں رہتے اور بستے تھے وہ بھی اپنے بچوں کو ہوسٹل میں کچھ وقت گزارنے بھیج دیتے، چنانچہ مجاز نے بھی ایک دو سال ہوسٹل میں گزارے، اس ماحول کا خاصا گہرا رنگ چڑھا تھا۔

علی گڑھ کے مجاز کے معاصرین میں حیات اللہ انصاری، سبط حسن، اختر حسین رائے پوری، علی سردار جعفری اور بعد میں جاں نثار حسین اختر، جذبی اور اختر الایمان قابل ذکر ہیں۔ ان میں اختر الایمان بہت کم عرصہ رہے اور علی گڑھ کی روایات ان میں سرایت نہ کر سکیں۔ باقی سب ایک ہی محفل اور بزم کے ایک ہی رنگ کے پروردہ ہیں جو آج ہندوستان و پاکستان کی ادبی دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ سب شاعر، ادیب اور دانشور ہیں۔ اور کچھ سب آتش نوا ہیں۔ اختر حسین رائے پوری کی دوسری

۱؎ میری ایم۔ اے کی کلاس سے بہت پہلے کا واقعہ ہے میں انٹرمیڈیٹ میں تھا کہ ہندوستانی کے پروفیسر محمد مجیب نے مجھے ڈاکٹر کہنا شروع کیا اور پھر یار دوست سب بھی مذاقاً کبھی طنزاً اسی لقب سے یاد کرنے لگے۔

سرد مہریوں نے ان کی راہ الگ کر دی۔ باقی ابھی تک ایک ہی راہ پر گامزن ہیں۔ سب نے آزادی کے گیت گائے ہیں اور آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا ہے۔ سب کے یہاں حب الوطنی ہے اور وطن کو سربلند کرنے کی آرزو سب کے یہاں موجود ہے، ان سب کی زندگی بے داغ ہے۔ انھوں نے کبھی کسی کی ٹوپی نہیں اچھالی اور نہ خود اپنی پگڑی اچھلوائی۔ ان میں سے کوئی ابن الوقت نہیں، یہ سب "وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں" کے قائل ہیں۔

علی گڑھ میں مجاز کے خاندان کا قیام میرس روڈ پر تھا جسے علی گڑھ کی سول لائن سمجھئے لیکن یہاں بھی سرکاری عہدہ داروں کی بجائے یونیورسٹی والوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کی کوٹھیاں، انگریز کلکٹر اور گرلز کالج کا ہوسٹل، یونیورسٹی کے طلبائے قدیم جو ریٹائر ہو کر علی گڑھ میں مقیم ہو جاتے، ان کے مکانات اور وہ والدین جو سرکاری عہدوں پر فائز ہو کر علی گڑھ آباد کرایا کرتے تھے یہاں رہتے تھے۔ اس پورے بیلٹ کو میرس روڈ کا "رومان پرور" علاقہ کہا، یہاں بہت سے صنم کدے تھے اور ان صنم کدوں کا طواف کرنے والے ملتے تھے۔ سڑک پر دو رویہ درختوں کی قطار، گھنی چھاؤں، تمام آم کے درخت، اندھیرا ہوتے ہی جگنوؤں کی چمک دمک، پپیہوں اور کوئلوں کی کوک نے اسے واقعی ایک رومانی علاقہ بنا دیا تھا۔ آبادی کے باوجود یہاں موروں کی بھی کثرت تھی اور میرس روڈ سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر یونیورسٹی کا زرعی فارم تھا جہاں ہم نے اکثر مور اور تیتر کا شکار کیا ہے۔ گرلز کالج کی وجہ سے اس علاقے کی رونق اور بڑھ گئی تھی۔ لیکن "عشقیہ گردی" کا کوئی امکان نہ تھا کہ یہ بات علی گڑھ کی روایات کے منافی تھی، یوں طواف کرنے والے اکثر یہاں گھومتے نظر آتے تھے اور مجاز تو رہتے ہی یہاں تھے۔ "نذرِ علی گڑھ" والی نظم میں مجاز نے اسی فضا کے لیے لکھا ہے کہ یہاں کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے، پھولوں سے جوانی ابلتی ہے، یہاں برقِ تبسم چمکتی ہے اور رنگ کی بارش ہوتی ہے، یہاں کی ہر شام، شامِ مصر اور ہر شب، شبِ شیراز ہے۔ ان سڑکوں پر اکثر لوگوں نے مجاز کو گھومتے دیکھا ہے لیکن ان کا کوئی رومان بدنام نہ ہوا اور شاید قریب کے جاننے والے بھی مجاز کی محبوبہ کا نام مشکل سے بتا سکتے ہیں۔

میرس روڈ اور ہوسٹل کے علاوہ علی گڑھ کی زندگی میں بعض اور چیزیں طلباء پر اثر انداز ہوتی تھیں اور ان میں سے ایک یونین تھی۔ یونین صرف مقرروں کی تربیت کے لیے ایک پلیٹ فارم ہی نہ تھی بلکہ علی گڑھ کی اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا آئینہ تھی۔ یہاں طالب علموں کو اکابر سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کا موقع ملتا تھا۔ یہاں وہ کھل کر اپنے افکار و خیالات کا اظہار کر سکتے تھے، سیاسی مسائل پر بے خوف و خطر بحث کر سکتے تھے، سیاسی لیڈروں سے صاف صاف باتیں کر سکتے تھے۔ پھر یہاں مشاعرے اور ادبی جلسے بھی ہوتے تھے۔ ایسے مشاعرے جو علی گڑھ کے علاوہ کہیں اور نظر نہیں آتے تھے، ان میں اساتذہ اور نوجوان شاعر اپنا کلام سناتے اور داد پاتے اور جو داد کا نعرہ یہاں سے بلند ہوتا اس کی گونج ملک کے دور دراز گوشوں میں پھیل جاتی۔ اسی علی گڑھ سے حسرت اور فانی اٹھے اور یہیں سے جگر اور اصغر کی شہرت کا آوازہ بلند ہوا۔ چنانچہ اسی یونین کے پلیٹ فارم سے مجاز کی جو نظمیں پہلی مرتبہ سنی گئیں ان میں 'نذرِ خالدہ' اور 'بے خانماں'، 'نذرِ علی گڑھ'، 'نمائش'، 'نورا'، 'رات اور ریل'، 'انقلاب' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۳۲ء کے قریب مجاز کی شاعری شروع ہوئی اور تین چار سال میں ان نظموں کی شہرت یونین کی چہار دیواری سے نکل کر سارے ملک میں پھیل گئی۔ اس وقت علی گڑھ کے نوجوان شاعروں میں مجاز سے زیادہ کوئی مقبول نہ تھا۔ مشاعروں میں بار بار ان سے پڑھنے کی فرمائش کی جاتی اور اس فرمائش میں طلبا سے زیادہ ان طالبات کی آوازیں بلند ہوتیں جو نیچے نہیں اوپر کی گیلریوں میں الگ بیٹھ کر یونین کی کارروائی دیکھتی تھیں۔

جنوری کے آخر اور فروری کے آغاز میں علی گڑھ میں نمائش ہوتی۔ یہ نمائش علی گڑھ کی معاشرتی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ سال بھر لوگ اس کا انتظار کرتے۔ خرید و فروخت کے پروگرام مہینوں پہلے بنائے جاتے۔ طالب علم مختلف بہانوں سے گھروں سے روپیہ منگا کر جمع کرتے۔ نمائش آتی تو جیسے زیادہ خوشی ہوتی۔ شام سے پہلے پہر تک تو علی گڑھ کے شہر والے اور مضافات کے دیہاتی نمائش دیکھنے آتے۔ نمائش کے دکاندار بھی اکتا جاتے، کچھ سو جاتے، کچھ اپنی دکانوں پر کھڑے، کچھ دکانوں پر پڑے ہوئے ڈائریاں لیے بیٹھے رہتے۔ شام ہوتے ہی ذرا چہل پہل

چھٹ جاتی اور کالج کے طلبہ اور طالبات، اساتذہ، ان کے اہل و عیال اور شرفا نمائش کا رُخ کرتے۔ اس وقت سے رات کے نو بجے تک نمائش اپنے شباب پر ہوتی۔ سیر ہوتی، نظارہ بازیاں ہوتیں، خرید و فروخت بہت کم ہوتی چہل پہل زیادہ۔ مجاز اس نمائش میں جس طرح دلچسپی لیتے اس کی جھلک ان کی نظم 'نمائش' میں ملتی ہے۔ غرض یہ تھا مجاز کا رنگا رنگ ماحول جس میں ان کی اور ان کی شاعری کی تربیت ہوئی۔

پڑھنے لکھنے سے مجاز کو کبھی دلچسپی نہ رہی۔ معلوم نہیں بی۔ اے بھی انہوں نے کس مصیبت سے پاس کیا ہو۔ لیکن جب انہوں نے ایم اے میں داخلہ لیا تو ان کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ اپنے اساتذہ کا بڑا احترام کرتے۔ رشید صاحب اور مولانا احسن کے ساتھ ان کی عقیدت کچھ مریدوں کی سی تھی لیکن قدیم ادب، لسانیات اور اس طرح کے موضوعات سے وہ بھاگتے تھے۔ مجھے وہ ادب القدما کہا کرتے تھے۔ ایک دن ان سے اس موضوع پر کھل کر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ شاعری میں رس اور رچاؤ پیدا کرنے کے لئے کلاسیکی ادب کے مطالعہ، تجربہ اور تنقید کی بڑی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو مجاز نے بھی تسلیم کیا۔ کچھ لکھنے پڑھنے کا پروگرام بھی بنا۔ میں نے تو کچھ پڑھ ڈالا، مجاز صرف پان کھانے، شعر کہنے اور شعر سنانے کی نذر ہو گئے۔ شراب انہوں نے شاید اس وقت تک شروع نہیں کی تھی یا کم از کم ہم لوگوں کو اس کا علم نہ تھا لیکن شاعرانہ لاابالی پن ان میں اس وقت بھی پوری طرح پیدا ہو چلا تھا۔ وہ ہر وقت اپنا یا کسی اور کا کوئی شعر گنگناتے رہتے، پھر پان کھانے لگتے، سگریٹ اور حقہ سے بھی کچھ شوق تھا۔ غرض نتیجہ یہ نکلا کہ مجاز بھاگ نکلے اور ایم اے کی تکمیل نہ کر سکے اور نہ باقاعدہ مطالعہ یا محنت کی طرف مائل ہوئے۔ اس لئے ان کی شاعری میں جو رس اور رنگ ہے وہ محض ان کی طباعی اور شاعرانہ فطرت کا مرہونِ منت ہے۔ اکتساب اور ریاض کا ان کے یہاں سوال پیدا نہیں ہوتا۔

علی گڑھ میں اس وقت طالب علموں کی ایک جماعت کانگریس کے خیالات کی ترجمان تھی اور ان میں سے بعض کو سوشلسٹ اور کمیونسٹ بھی سمجھا جاتا تھا۔ حیات اللہ انصاری، مسعود حسن، اختر حسین رائے پوری، علی سردار جعفری سب اسی حلقے سے وابستہ تھے۔ مجاز بھی ان کے ساتھ تھے چنانچہ ان کے یہاں بھی وہ دور آیا، طبیعت پر کبھی کبھی انقلاب کا سایہ پڑنے لگا۔ 'انقلاب' والی نظم اسی دور کی یادگار ہے۔ اس نظم کو مجاز نے جب بھی مشاعرہ میں پڑھا ان کی آواز میں ایسا جوش اور انداز میں چڑھاؤ تھا جیسے وہ لوگوں سے باہر نکلتے ہی جام پھینک کر شمشیر اٹھا لیں گے لیکن یہاں بھی ان کا فطری لاابالی پن سامنے آیا۔ یوں ان کے اشعار میں اس طرح کے خیالات بار بار ملتے ہیں لیکن عملی طور پر وہ اپنی شاعری کی رومانی فضا میں ہی بستے رہے اور آج تک آباد ہیں۔ انصار بڑے عملی قسم کے آدمی تھے اس لئے انہوں نے کانگریس کی عملی جدوجہد میں بڑا حصہ لیا اور اب تک وہ ایک سرگرم سیاسی کارکن ہیں۔

علی گڑھ کے مشاعروں میں اس وقت ترنم سے پڑھنے کا رواج عام ہو چلا تھا۔ حالانکہ علی گڑھ کی بزمِ سخن کے میرِ مجلس مولانا احسن مارہروی مرحوم ترنم کے سخت مخالف تھے اور انہوں نے ساغر نظامی کے ترنم پر ایک لطیف طنزیہ قطعہ مشاعرہ میں پڑھ کر سنا دیا تھا لیکن جگر کے والہانہ انداز نے علی گڑھ میں ترنم کا شوق پیدا کر دیا۔ سردار جعفری تو بے شک تحت اللفظ ہی نظم سناتے لیکن مجاز، جذبی اور جاں نثار اختر نے شروع سے ہی ترنم اختیار کیا۔ جاں نثار کی آواز ترنم کے لئے موزوں نہ تھی اس لئے مجمع میں کبھی کبھی ان کے ترنم کے ساتھ اس کی نقل بھی شروع ہو جاتی۔ لیکن جذبی اور مجاز دونوں کا ترنم بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ جذبی کے یہاں ترنم میں ایک سوز تھا اور مجاز کے یہاں نغمگی۔ پھر جذبی پڑھتے تو مجسم سوز بن جاتے اور مجاز مجسم نغمہ۔ ان کے چہرے پر بچوں کا سا تبسم کھیلتا رہتا، وہ جھوم جھوم کر اپنا کلام سناتے اور بار بار والہانہ انداز میں اپنے چاہنے والوں کی داد پر آنکھوں ہی آنکھوں سے شکریہ ادا کرتے جاتے۔ ان کی آواز باریک تھی لیکن بڑے سے بڑے مجمع میں مائیکروفونوں کے بغیر وہ بلا تکلف اسے آخری گوشے تک پہنچا سکتے تھے۔ ابھی تک ان کے ترنم کے انداز میں فرق نہیں آیا لیکن صحت خراب ہونے کے بعد سے اس میں کچھ اضمحلال کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔

مجاز کی صحت اس وقت بھی بہت اچھی نہ تھی ——— وہ دبلے پتلے اور نحیف سے آدمی تھے، اکثر بیمار رہتے اور اسپتالوں کی سیر کرتے لیکن

نرس نورا کی چارہ گری والی نظم شاید کسی اور اسپتال (دلی یا لکھنؤ) کی یادگار ہے کیونکہ یونیورسٹی کے اسپتال میں حسین نورا کی بجائے ایک کھچڑی ڈاڑھی والے مولانا نما ڈاکٹر کے فرائض انجام دیتے تھے اور وہیں بھی یونیورسٹی کے ڈاکٹر صرف زمانۂ امن (PEACE TIME DOCTOR) کے معالج کہے جاتے تھے اور بالعموم پرہیزی کھانے کی سفارش کے لئے ان کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی۔ سگریٹ بہت پیتے تھے، شاید اس کا اثر گلے اور سینہ پر پڑنے لگا تھا، بعد میں رندی کا دور آیا۔ اس کا پورا حال مجھے معلوم نہیں لیکن مجھے محسوس ایسا ہوتا ہے کہ جوش کے ساتھ رہ کر مجاز نے مے نوشی کا شغل اختیار کیا جس نے ان کی صحت کو اور تباہ کر دیا۔ لوگ اس تباہی کی ذمہ داری جوش پر عائد کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی مشہور ہے۔ مجاز ایک مرتبہ جوش کے یہاں پہنچے اور آواز دی۔ جوش صاحب موجود نہ تھے۔ زنان خانے سے پوچھا گیا کہ آپ کون ہیں؟ انہوں نے کہا 'مجاز' ہوں۔ وہاں سے جواب ملا "اچھا آپ ہی مجاز صاحب ہیں جنہوں نے جوش کو خراب کیا ہے؟" یہ کون جانتا ہے کہ کس نے کس کو خراب کیا۔ لیکن مجاز کے لاابالی پن میں اس رندی کی شدت سے اور اضافہ ہوا اور یقیناً ان کی شاعری کو اس سے نقصان پہنچا اور اس نے ایک کام کے آدمی کو وقتی 'نکما' کر دیا۔

مجاز کا ہمیشہ ہونٹوں پر کھلا ہوا تبسم ان کی شگفتہ مزاجی کا نشان ہے۔ دوستوں کی محفل میں وہ خوب قہقہے لگاتے اور ایسے فقرے چست کرتے کہ سامعین لوٹ لوٹ جاتے، اس سلسلے میں سب سے مشہور لطیفہ روش صاحب سے متعلق ہے۔ کسی محفل میں روش صاحب موجود تھے شاعرِ اعظم کی بات چھڑی۔ مجاز پہلے تو مسکرائے پھر کہنے لگے "حضرت شاعرِ اعظم' تو بعد کی بات ہے پہلے 'قدِ آدم' تو ہو جائیے۔" جن لوگوں نے روش صاحب کو دیکھا ہے وہی اس لطیفے سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ مجاز کی طبیعت کا یہی انداز ان کے کلام کی شگفتگی اور تازگی کی بنیاد ہے۔

مجاز دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار ہیں۔ اس معاملے میں ان کی 'دوست نوازی' میں بھی لاابالی پن ہے۔ ان کے کمرے میں، ہوسٹل میں ہو یا گھر پر، ہر وقت دوستوں کی محفل جمی رہتی یا پھر وہ خود اس کمرے سے بے نیاز دوستوں کے ساتھ رہتے اور اکثر ایسا ہوتا کہ کئی کئی دن وہ اس کمرے کا رخ نہ کرتے۔ کمرے میں چیزیں بے ترتیبی سے منتشر پڑی رہتیں، کتابیں البتہ کہیں نظر نہ آتیں اور نہ کلاس میں مجاز کبھی کتاب لانے کی زحمت کرتے۔ ان محفلوں میں شعر و شاعری ہوتی۔ تاش کھیلے جاتے، قہقہے لگائے جاتے اور ساری فضا ان سے گونج جاتی۔ شاید ہی کبھی کسی نے مجاز کو تنہا دیکھا ہو اور کسی مجلس میں شاید ہی کبھی وہ خاموش اور افسردہ نظر آئے ہوں۔ ان کے اس انداز میں جو رندانہ شان پائی جاتی ہے وہ ان کے اور ساتھیوں میں سے کم کے حصے میں آئی ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں خوش آہنگ ہیں اور جہاں غم ہے بھی وہاں ان کی مسکراہٹوں نے اس کی تلخی کم کر دی ہے، ایک جذباتی شاعر کے لئے یہ بہت بڑی نعمت ہے، خصوصاً جس دور میں مجاز ہیں اس میں زندگی کی تلخیاں اتنی بڑھ چکی ہیں کہ ایک تبسم یا ایک مسکراہٹ بھی کسی کو نصیب ہو سکے تو غنیمت ہے۔

مجاز کی طبیعت کا لاابالی پن ان کی وضع قطع اور لباس سے بھی ظاہر ہوتا تھا۔ وہ ایک خاصے خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور علی گڑھ میں یوں بھی عام طور پر طالب علم بہت خوش پوش رہتے تھے لیکن مجاز اس معاملے میں بھی بے نیاز تھے، ویسے ان کا لباس علی گڑھ کٹ پاجامہ اور شیروانی تھا لیکن دونوں سے لاابالی پن ظاہر ہوتا تھا۔ ٹوپی اس زمانہ میں سر کی بجائے زیادہ تر ہاتھ میں رہتی تھی۔ ترکی ٹوپی علی گڑھ سے رخصت ہو چکی تھی۔ ساتھی کھدر کی شیروانی اور کھدر کی گاندھی ٹوپی پہنتے تھے لیکن مجاز بالعموم سیاہ رنگ کی سمور کی ٹوپی استعمال کرتے تھے سرخ انہوں نے کبھی نہ پہنا اور نہ لاابالی پن کے باوجود کبھی بڑھے بالوں یا میلے کچیلے کپڑوں سے 'ہپی' کی صورت بنائی۔ لباس میں بے اعتنائی کے باوجود ایک نفاست اور ستھرا پن موجود تھا، اس زمانے میں علی گڑھ میں کابلی چپل کا رواج بھی عام تھا لیکن مجاز نے کبھی اسے پسند نہ کیا۔

غرض میں نے آج سے بیس بائیس سال پہلے مجاز کو جیسا دیکھا تھا آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ باہر والوں نے مجاز کو ان کی شاعری میں دیکھا ہے اور اسی سے ان کی صورت اور سیرت کا اندازہ لگایا ہے —— فیض نے 'آہنگ' کے دیباچہ میں مجاز کے کلام سے

کے اس پہلے شعر کو نقل کرتے ہوئے ۔

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

لکھا ہے کہ مجاز کی شاعری انہی تینوں اجزا سے مرکب ہے لیکن مجاز بنیادی طور پر "غنائی" شاعر ہے اور یہ کہ ایک "تیتر" ہے جو صبح کو [illegible] گیت گا رہا ہے جس میں شمشیر کم اور ساز و جام زیادہ ہے، یہاں میرا مقصد مجاز کی شاعری پر تنقید کرنا نہیں اس لئے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ ان کے اشعار میں بڑی تازگی، بانکپن، غزل کی ادا اور نغمگی ہے، بعض جدید رجحانات اور میلانات نے مجاز کو غزل سے دور لے جانا چاہا، چنانچہ انقلاب کا نعرہ مجاز کی شاعری میں ایک طوفان بن کر اٹھا، لیکن اس طوفان کو انجام تک پہنچانے کے لئے جس عزم و استقلال اور جس ریاض کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجاز کے بس کی بات نہ تھی، اس لئے انقلاب والی نظم اس مجموعے میں ایک ہی نمونہ ہے جو حال ٹکنیک میں نئے تجربات کا ہے، یہاں بھی ان کے یہاں فیض، راشد، سردار جعفری وغیرہ کی سی بات پیدا نہ ہوئی۔ اب مجاز کی شاعری میں اضمحلال پیدا ہو چلا ہے اس کے اسباب کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں۔ یہ کوئی عیب نہ ہوتا کہ وہ انقلاب کا مطرب بن جاتا اور جوش کی صحبت سے اسے کم سے کم اتنا فیض ضرور پہنچ سکتا تھا، اور ایسی صورت میں اس کے نغموں میں فیض کے بقول برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی اور بہار کی رات کی سی گرم جوشی اور اثر آفرینی ہوتی، لیکن نوجوان خاتون سے خطاب، اس انداز کی آخری نظم ہے جو ۱۹۳۷ء میں لکھی گئی۔

مولوی محمد داؤد عباسی

محمود احمد عباسی

روہیل کھنڈ (یو۔ پی) کے مشہور و مردم خیز قصبہ امروہہ[1] کے ایک علمی خاندان میں ۲ ر رمضان سنہ ۱۲۹۳ھ مطابق ۲۹ ر فروری ۱۸۷۶ء کو داؤد مرحوم نے آنکھیں کھولیں۔ اس علمی خاندان کے مورث اعلیٰ مولانا رکن الدین عباسی[2] اوائل عہد مغلیہ کے مشاہیر علما میں سے تھے۔ ان کے اخلاف میں نسلاً بعد نسلٍ علماء و فضلا ہوتے رہے۔ داؤد مرحوم کے والد مولوی علی محمد عباسی نے علوم دینیہ کی تحصیل و تکمیل کے بعد درس و تدریس کے بجائے وکالت کا امتحان پاس کیا اور اس پیشہ میں کامیاب و نیک نام رہے۔ انھوں نے اپنے سب بیٹوں[3] کو اس زمانہ میں انگریزی پڑھائی جب انگریزی کا پڑھنا حرام بتایا جاتا تھا چنانچہ ۱۲ ر ستمبر ۱۸۹۱ء کو داؤد مرحوم ۱۵ سال کی عمر میں مدرستہ العلوم علی گڑھ میں داخل ہوئے اور ۱۲ ہی سال تک اکتساب علم کرتے رہے ۱۹۰۳ء میں ایف۔ اے ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ خاص مضامین فلسفہ اور ادبیات فارسی تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد دو سال تک

---

[1] روہیل کھنڈ کی بہت قدیم بستی ہے۔ ابن بطوطہ دوران سیاحت میں یہاں بھی آیا تھا۔ اپنے سفرنامہ میں امروہہ کے شیخ زادوں اور قاضی شہر سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "یہ ایک چھوٹا سا حسین شہر ہے"۔ اسی حسین شہر کی خاک سے جو ہر چہار طرف آموں کے سرسبز و شاداب باغوں سے گھرا ہوا ہے، بڑے بڑے صاحب کمال اور خاص کر ریختہ اور اردو کے نامور شعرا اٹھے۔ شاہ میر سعادت علی سعادت امروہوی کو میر تقی میر نے ریختہ میں اپنا استاد بتایا ہے۔ استاذ الاساتذہ شیخ غلام علی ہمدانی مصحفی اور دکنی طرز کی تقلید پر اردو کا قدیم شاعر اسمٰعیل امروہوی۔

[2] یکے از اجلۂ علمائے عہد بابر و ہمایوں و اکبر شہنشاہان ہند و مورث خاندان عباسیہ متوطن امروہہ

"مرد آگاہ علم و فضل رکن الدین عباسی بہ آبائے سادات شد ز فیض او پیدا" (تذکرۃ الکرام)

[3] یہ سب آٹھ بھائی تھے۔ ان میں سے ایک صاحب جب اسکول میں داخل ہو کر انگریزی پڑھنے لگے اور Pen اور Cat وغیرہ الفاظ پڑھے تو ان سے ایسی کراہت محسوس کی کہ گھر آکر صاف کہہ دیا کہ میں ایسی کتاب نہیں پڑھوں گا۔ ان کو دینی مدارس میں بھیجا گیا۔ دیوبند اور امروہہ کے مدارس عربیہ میں تکمیل درس نظامی کے بعد فن طب حاصل کیا اور اسی فن میں اب وہ یکتائے روزگار ہیں۔ یہ ہیں مولانا حکیم فرید احمد صاحب عباسی بانی طبیہ کالج لاہور۔

علی گڑھ کالجیٹ اسکول میں ٹیچر رہے پھر ۱۸۹۶ء سے سرکاری ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ ابتداً نائب تحصیلدار رہے۔ بڑے فرض شناس اور متدین تھے۔ ضلع باندہ میں قحط کے امدادی کاموں کی نگرانی سپرد تھی اور ہزاروں روپیہ ان کی تحویل میں رہتا۔ اس کام کو ایسی خوبی اور دیانت سے انجام دیا کہ بہت نیک نام رہے۔ اپنے ایک دوست مولوی سید طفیل احمد علیگ، مرحوم کو، ۱۰ر اکتوبر ۱۸۹۷ء کے مرقومہ خط میں لکھتے ہیں:

"محض خدا کے فضل سے، اپنی کسی کارگزاری سے نہیں، میں اس قحط کے کام سے بہت نیک نامی کے ساتھ فارغ ہوا۔ یہ کام بڑی ذمہ داری اور جوابدہی کا تھا، ہزاروں روپیہ بلا کسی شرط کے میرے ہاتھ میں دے دیا تھا کہ مناسب طور سے خرچ کرو۔ اس میں لوگوں نے سینکڑوں روپیہ بلکہ ہزاروں غبن کیا اور کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ یہ واقعات تفصیل کے ساتھ انشاء اللہ بوقت ملاقات عرض کروں گا۔ ہاں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اس کام میں نیک نام رہا۔"

باندہ کے بعد چند اور اضلاع ایٹہ اور آگرہ وغیرہ میں تعینات رہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ایک مرتبہ نمونیہ کے شدید مرض میں مبتلا ہو گئے تھے تندرست ہونے کے بعد بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر باقی رہا۔ ۱۹۰۸ء میں پھیپھڑے متاثر ہوئے، بیماری کی رخصت بھی ملی۔ برابر کام بھی انجام دیتے رہے۔ اپنے اسی دوست کو ۳ر اگست ۱۹۰۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"میں بفضلہ اب بالکل تندرست ہوں، ضعف مطلق نہیں، صبح کو ناشتہ، دودھ، شہد کھانے کے ساتھ کاڈلیور آئل، تیسرے پہر کو میاں قریشی کی رائے سے شیرۂ بادام، خشخاش، الائچی، کالی مرچیں اور مصری، رات کو کھانے کے ساتھ پھر کاڈلیور آئل۔ اتنی چیزیں استعمال میں ہیں۔ ان مقویات کے سامنے تو پاس بیٹھنے والوں کا بھی ضعف جاتا رہے۔"

مگر مرض برابر بڑھتا رہا۔ حسن کارگزاری میں ترقی بھی ملی، تحصیلداری پر تقرر ہوا لیکن اس کے ایک سال کے اندر ہی یعنی ۴ر جون ۱۹۰۹ء میں بعمر تقریباً ۳۹ سال داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور فتح آباد ضلع آگرہ کے احاطۂ عیدگاہ میں دفن ہوئے۔

نہایت سلیم الطبع، نیک نہاد، ہر دل عزیز شخص تھے۔ متانت و سنجیدگی کے ساتھ طبیعت نہایت شگفتہ تھی۔ سخن سرائی کا ذوق موہبت الٰہی تھا۔ نہ کبھی کسی سے تلمذ حاصل تھا اور نہ کبھی مشق سخن کی۔ شعر فی البدیہہ کہتے۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب نے، جو کالج میں داؤد مرحوم سے کئی سال جونیئر تھے، ایک موقع پر لکھا تھا:

"محمد داؤد مرحوم کو جو راقم الحروف کے زمانۂ طالب علمی میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ایک تلمیذ رشید تھے، مبدء فیاض سے سخن سرائی کا ایک خاص ذوق مرحمت ہوا تھا۔ شعر فی البدیہہ کہتے تھے اور ظرافت تو مرحوم کا خاص حصہ تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کاندھلہ[1] سے جتنے لوگ علی گڑھ آئے سب کے سب امام شعرانی کی صورت تصویر ہوتے تھے اور قدرت نے ان کے جسم کو تو چھوٹا رکھا لیکن سروں کو ضرورت سے زیادہ خارج الاعتدال کر رکھا تھا۔ اس پر مرحوم کو یہ اُبھرتی بھپتی سوجھ گئی جو اسی وقت کالج کے ہر ایک لڑکے کی زبان پر تھی ؎

آتا ہے کاندھلے سے جو لاتا ہے سر پہ گنج
تاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا"

---

[1] کاندھلہ ضلع مظفر نگر یوپی میں پرانا قصبہ ہے۔

علی گڑھ کے تلامذہ میں خاص کر دورِ اولین کے طلباء میں داؤد مرحوم ہی کی شخصیت تھی جو باوجودیکہ طویل زمانہ تک علی گڑھ میں رہے لیکن اپنی وضع قطع میں مطلق کوئی تبدیلی نہ کی۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے ان کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

> "۱۸۹۸ء کی گرمیوں میں جبکہ میری عمر ساڑھے گیارہ برس کی تھی میں اپنے بھائی مولانا شوکت علی کے ساتھ ... بریلی کے اسکول سے علی گڑھ کے مدرستہ العلوم میں پڑھنے کے لئے گیا ...... اس "نیچر گڑھ" میں تقریباً سبھی طلباء کی ایک ہی سی وضع قطع تھی۔ شیروانی، اچکن، ترکی ٹوپی، سیدھا ڈھیلا ڈھالا پاجامہ، قمیص، جوراب انگریزی جوتا، یہی سب کا لباس تھا۔ کوئی شیروانی کی جگہ ترکی کوٹ پہنا کرتا تھا، ترکی ٹوپی کی جگہ کوئی سیاہ ایرانی ٹوپی پہنا کرتا تھا، کوئی کبھی کبھی کرتہ بھی پہن لیا کرتا تھا مگر داڑھیاں سوائے ایک آدھ کے سب کی منڈی ہوتی تھیں مگر مونچھوں کے بھی صفایا کرانے کا فیشن اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا۔ بال سب کے آگے سے چھوٹے پیچھے سے بتدریج زیادہ کترے ہوئے ہوتے تھے جو آج سارے ہندوستان میں رائج ہیں اور جنہیں ولایت تک کی عورتوں نے اسی طرح کتروانا قبول کرلیا ہے اور جو "ایٹن کراپ" کے نام سے موسوم ہیں لیکن جس پکی بارک میں ہم تینوں بھائی رہتے تھے اس کی پاس والی پکی بارک میں اور اس بیچ والے کمرے میں جہاں ایک عرصہ سے "ٹول ہاؤس" بن گیا ہے، ایک دراز قامت گورے چٹے صاحب رہتے تھے جو خالص ہندوستان کی پرانی وضع کی اچکن پہنا کرتے تھے جن کی ٹوپی ان کے وطن امروہہ کی ساخت کی گشتی نما ہوتی تھی (جس کو اب "گاندھی کیپ"[1] کہا جاتا ہے) جن کا جوتا دہلی کا سلیم شاہی وضع کا مگر سادہ ہوتا تھا اور جن کے بال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح لانبے رہتے تھے اور اگرچہ "بدوش" نہ سہی لیکن "بناگوش" ضرور آتے تھے تاکہ ان لمبے بالوں کے باعث اچکن پر تیل وغیرہ کا دھبہ نہ پڑ جائے۔ وہ گرمیوں میں ایک پتلے خاصے کا رومال اسی طرح ضرور باندھا کرتے تھے جس طرح سر سید رحمۃ اللہ علیہ اپنے گلے کی رسولی چھپانے کے لئے استعمال فرمایا کرتے تھے۔ یہ وضع قطع اس زمانہ کے بزرگوں کی اس وقت تک باقی تھی۔ لیکن علی گڑھ جیسے "نیچر گڑھ" کے کسی طالب علم کا اس وضع قطع کو برقرار رکھنا اس زمانہ میں اس سے بھی زیادہ نمایاں تھا جتنا کسی یوروپین لیڈی کا آج چھوٹے بال رکھنا، اچھا سایہ پہننا اور سینہ اور گردن، بازوؤں اور ہاتھوں سب کو کپڑے سے ڈھانپنا آج نمایاں ہوگا۔ اس لئے میری نظر بھی آتے ہی ان بزرگ پر پڑی اور اگر انہیں کسی اور طرح کا امتیاز بھی حاصل ہوتا تب بھی میں ضرور اپنے بھائیوں سے یہ پوچھتا کہ یہ اس عجیب وغریب وضع قطع کے بزرگ کون ہیں۔ لیکن محمد داؤد صاحب کو کون نہیں جانتا تھا۔ علی گڑھ کالج میں اس وقت سب سے زیادہ ممتاز اور ہر دلعزیز جو جماعت تھی اور جس میں محمد حبیب اللہ خان صاحب[2]،

---

[1] گاندھی کیپ اور امروہہ ساخت کی ٹوپی میں نمایاں فرق تھا۔ امروہہ ساخت کی ٹوپی ساٹن پر کلابتوں اور ریشم سے کڑھی ہوئی ہوتی تھی اور گاندھی ٹوپی کھدر کی۔

[2] یعنی خان بہادر الحاج مولوی محمد حبیب اللہ خان صاحب بی۔ اے (علیگ) سابق کلکٹر یو۔ پی جنہوں نے اپنے ادارہ علمی کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور اب بھی پیرانہ سالی میں انجام دے رہے ہیں۔

احمد حسین[1] مرحوم، قسیم[2] بیگ چغتائی جیسے طلباء شامل تھے اس کے سردار بھی پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ ان کے کمرے پر ہمیشہ ممتاز ترین طلباء کا مجمع رہا کرتا تھا۔"

داؤد مرحوم کی کالج کے طلباء میں بے حد ہردلعزیزی تھی اور باتوں سے ان کی شاعری، شگفتہ مزاجی اور پھبتی و فقرے چست کرنے کی وجہ سے تھی۔ وہ لطیفہ تو کہہ جاتے مگر اس سنجیدگی و متانت کے ساتھ کہ کبھی خود قہقہہ مار کر نہ ہنستے۔ مسکراہٹ لبوں پر آجاتی اور سامعین ان کے لطیفہ اور پھبتی سے پھڑک اٹھتے۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے کالج کے زمانہ کے دو ایک لطیفے لکھے ہیں۔ مولانا حالیؔ مرحوم کی مشہور غزل ہے:—

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

مقطع ہے:—

ان کو حالیؔ بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

اس مقطع کی جو تضمین داؤد مرحوم نے کی تھی مولانا محمد علی مرحوم اس کے متعلق لکھتے ہیں:—

"باوجود پوری سنجیدگی کے داؤد مرحوم کی طبیعت نہایت شگفتہ تھی اور مولانا حالیؔ کی مشہور غزل کے مقطع پر جو تضمین انہوں نے لکھی تھی اس نے تو مولانا حالیؔ تک کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ داؤد میری ساری غزل میں صرف میرا تخلص مطلع سے نکال ڈالیں تو میں خوش اور میرا خدا خوش۔ مگر تضمین بھی بلا کی تھی۔ ایک ہی مصرعے نے مولانا مرحوم کے شعر کا ستیاناس کر دیا۔ سنئے:—

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں — پہلے یہ دیکھے وہ اس کام کے ہیں بھی شایاں
[illegible] — ان کو حالیؔ بھی بلاتے ہیں گھر میں مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت"

اس کے بعد مولانا مرحوم ایک اور لطیفہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"بزرگوں کی شان میں داؤد صاحب نے صرف یہی ایک گستاخی نہیں کی تھی کالج میں ایک مونک پرنسپل ہیں

---

[1] احمد حسین بی۔ اے (علیگ) مرحوم ۱۸۸۵ء میں کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں بی۔ اے پاس کر کے ریاست رام پور کے اسٹیٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ ۔۔۔ء میں انتقال کر گئے۔

[2] مرزا قسیم بیگ چغتائی بی۔ اے (علیگ)، آگرہ کے رہنے والے ۱۸۹۵ء میں فرسٹ ایئر میں کالج میں داخل ہوئے ۱۸۹۹ء میں بی۔ اے پاس کر کے اول علی گڑھ کے ایک کلکٹر کے جن کی آنکھیں خراب تھیں پرسنل اسسٹنٹ ہوئے پھر کچہری میں مترجم ہو گئے اس کے بعد آگرہ کالج میں وارڈن رہے اور پھر اتفاق سے ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ خان بہادری کے خطاب یافتہ تھے۔ آخر میں جودھپور میں بھی رہے۔ بڑے لطیفہ گو تھے ان کے کئی بیٹے تھے جن میں مرزا عظیم بیگ چغتائی افسانہ نویسی میں مشہور ہوئے۔

[3] تضمین کے اس واقعہ کو مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے بھی یادگارِ حالی از صالحہ عابد حسین کے مقدمے میں بیان کیا ہے لیکن تضمین کے مصرعے بھی غلط لکھے ہیں اور داؤد مرحوم کا حال بھی صحیح نہیں لکھا اور بھی متعدد اصحاب نے جنہوں نے یہ لطیفہ بیان کیا ہے ایسی ہی غلطیاں کی ہیں۔

ایک طالب علم کو "بوم" کا لقب عطا ہوا تھا لیکن اس نسل کے بزرگ تو مولانا شبلی ؒ کی صحبت میں رہتے ہی تھے تھا جب کالج کا گروپ فوٹو کھنچنے لگا تو "بوم" صاحب فوراً مولانا شبلی ؒ کی کرسی کے پیچھے آ کر کھڑے ہوگئے جس پر ڈاکٹر صاحب نے اسی وقت کہہ دیا ؎

آج کالج میں لگی ہے جا بجا ہجوم ۔۔۔ طلبا کا ہے ہر طرف سے ہجوم
بول اٹھی روح سعدی مرحوم ۔۔۔ کہ کس نہ آید بزیر سایۂ بوم
"الا مولانا شبلی مخدوم"

مولانا شوکت علی مرحوم کو ڈاکٹر مرحوم کے بہت سے لطیفے کالج کے زمانے کے یاد تھے۔ مولانا شبلی ؒ نے ایک مسدس اردو میں لکھا تھا جس کا ایک بند یہ تھا ؎

بانیٔ مدرسۂ "سید" عالی گہر ۔۔۔ وہ مینجنگ کمیٹی کے معزز ممبر
شبلی فرزدہ وہ دست ہنر اعجاز اثر ۔۔۔ اور یہ ز بادۂ اقبال کے سب بے خبر
نہ تکلف کے کچھ انداز نہ کچھ جاہ کی شان
بزم میں آئے ہیں اس حال سے اشکال کی شان

اسی طرح جب مولانا موصوف قسطنطنیہ کے سفر سے واپس آئے تو ایک ڈنر کے موقع پر فارسی نظم پڑھی جس کے چند شعر یہ تھے ؎

کالج امروز بہ آں فرخ نشاں است کہ بود ۔۔۔ بزم را گرمیٔ ہنگامہ ہماں است کہ بود
ہر یکے رنگ و رنگینی و رنگا بو رنگ ۔۔۔ ہم چناں مدرسہ را رونق و ساماں است کہ بود
واں دگر دیدہ وراں کہ بہ اسکول بود ۔۔۔ ہم چناں سعی و طلب زو بجاں است کہ بود
شبلی فرزدہ آں جوہر کش طرف بساط
ہم بہ آں طرز نوی زمزمہ خواں است کہ بود

"ہماں است کہ بود" ردیف و قافیہ تھا اور حسب معمول اپنے نام کے ساتھ "فرزدہ" باندھ گئے تھے اس سے اس زمانہ میں وہ کالج کے طلبا میں

---

[1] مولانا شوکت علی مرحوم نے "علی گڑھ کالج کی ایک عجیب و غریب شخصیت" کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا اس میں بھی "بوم" کا یہ لطیفہ بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ مولانا شبلی ؒ نے جب یہ قطعہ سنا تو فوراً تاڑ گئے کہ یہ پھبتی ڈاکٹر مرحوم کے سوا اور کسی کو سوجھ سکتی ہے چنانچہ انھوں نے خود بھی اس کی بہت داد دی۔ "بوم اول" ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "بدایوں یا بریلی کے رہنے والے گورے رنگ بڑے بڑے دانت والے خوش وضع تھے مگر شے لطیف کی زندگی تھی جس کسی ہم جماعت سے رنجش ہو جاتی اپنے کمرے میں پنسل سے دیوار پر اس کی تصویر بناتے اور جوتے سے گھونسے کے جھونچ سے تصویر پر نشانہ بازی کرتے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ حاجت ضروری سے فارغ ہونے کے لیے پاخانہ میں بیٹھتے "اوند" کی زحمت سے بچنے کے لیے مولانا حالی کے "مسدس مد و جزر اسلام" کے اشعار بلند آواز سے پڑھتے۔ مولانا شبلی سے بڑی عقیدت تھی اور جان کی طرح ان سے چپکے رہتے تھے:

[2] مسٹر بک پرنسپل کالج [3] پہلے پروفیسر تھے مسٹر بک کے بعد پرنسپل ہوئے [4] مسٹر آرنلڈ عربی کے پروفیسر اور مشہور کتاب پریچنگ آف اسلام کے مصنف [5] مسٹر ہورسٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔

"شبلی غمزدہ" سے معروف تھے۔ داؤد مرحوم کو بھی سوجھ گئی اسی وزن و قافیہ میں انہوں نے بھی چند شعر کہہ دیئے۔ مولانا شوکت علی لکھتے ہیں کہ داؤد مرحوم نے "شبلی غمزدہ" کی بطرز مسخری کئی شعر کہہ دیئے جن کو ہم نے گا دیا جو سب ہی مشہور ہو گئے ان کا ایک شعر یہ تھا۔

شبلی غمزدہ در صورت خفاش گرشت
رنگ او تیرہ و تاریک چناں است کہ بود

مولانا محمد علی جوہر لکھتے ہیں:

"چودھری خوشی محمد خاں صاحب کالج کے "پوئیٹ لاریٹ" اور اپنے فن کے لحاظ سے "لانگ فیلو" تھے اور آرنلڈ صاحب اور مولانا شبلی خاص طور سے ان کے مداح تھے مگر چودھری صاحب کو زبان پر پوری قدرت نہ تھی اس لئے کبھی نظم میں داؤد صاحب اور کبھی نثر میں عبدالحق صاحب[2] (جو آج کل اورنگ آباد سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں اور اس زمانہ میں کالج میں "سینٹ پال" کے لقب سے معروف تھے) چودھری صاحب[3] کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ چودھری صاحب نے تامسن کی نظم "سیزنس" (فصول، موسم) پڑھ کر جو ان کے کورس میں داخل تھی ایک نظم لکھی تھی جس پر مولانا شبلی کے مشورہ سے آرنلڈ صاحب نے انہیں ایک انعام مرحمت فرمایا تھا اس میں ایک مصرعہ پر چودھری صاحب رک گئے تھے کہ ع: ناظر! اب سیر سبزہ کر ڈالو۔ ناظر آپ کا تخلص تھا اور حقیقت میں ناظر صاحب کے متعلق کہا جا سکتا تھا کہ "انظر الی الابل کیف خلقت" اس لئے ناممکن ہو گیا کہ اس مصرع کی داد نہ دی جائے جو اس پر داؤد صاحب نے لگایا تھا۔

ناظر صاحب فرماتے ہیں ——— ناظر! اب سیر سبزہ کر ڈالو
داؤد صاحب اس پر فرماتے ہیں ——— اپنے آگے کی گھاس چر ڈالو

نواب محسن الملک مرحوم جب حیدرآباد چھوڑ کر علی گڑھ چلے آئے اور وہ طلبہ جو بورڈنگ کے کھانے سے تنگ آ گئے تھے، اب نواب صاحب کے پاس جانے لگے اور علی گڑھ کے سدا بہار کھانے کی حسب دستور شکایت کرنے لگے تو نواب صاحب نے بھی "حسب دستور" اصلاح کے بہت سے وعدے کئے، ان وعدوں سے

---

[1] ڈاکٹر معین الدین حمید صاحب نے سجاد مرزا کے حالات میں (حاشیہ صفحہ ۱۲۳ شخصیات نمبر — نقوش — طبع ثانی ۱۹۵۶ء) یہ شعر بتغیر بعض الفاظ نقل کیا ہے یہ شعر مولانا شوکت علی مرحوم کے سامنے کا ہے اور وہ اس شعر کو اسی طرح پڑھا کرتے تھے اس کے علاوہ "غم سے سیر ہوں ہم .... رو رو ...... چہرہ خراشیدہ" کے متعدد شعر بھی سنایا کرتے تھے جو داؤد صاحب مرحوم کے کہے ہوئے تھے۔

[2] یعنی ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بابائے اردو ——— مولانا محمد علی مرحوم نے جس زمانہ میں (یعنی ۱۹۲۳ء میں) یہ تحریر لکھی تھی ڈاکٹر صاحب اورنگ آباد میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے اور وہیں انجمن ترقی اردو کا دفتر اور پریس بھی قائم کیا پھر چند سال بعد ملازمت سے ریٹائر ہو کر دہلی آ گئے۔ فسادات دہلی میں کتب خانہ انجمن برباد ہو گیا اس کے بعد کراچی آ کر از سر نو انجمن کا کتب خانہ، مطبع وغیرہ قائم کیا اور اردو کالج کی بنیاد ڈالی جو اب اعلیٰ پایہ درسگاہ ہے۔

[3] چودھری خوشی محمد خاں بی۔ اے علیگ نے ۱۸۹۲ء میں فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے کیا۔ انگریزی ملازمت میں آئے۔ اس کے بعد ریاست کشمیر میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ اردو نظمیں بہت لکھی ہیں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں خاص طور سے پڑھی جاتی تھیں۔

خوش ہو کر چودھری صاحب نے فارسی میں ایک نظم لکھی جس کا قافیہ "جان" اور "مان" تھا اور مولانا شبلی کے شاگرد رشید اور محبوب خاص نے اسے مولانا ہی کے انداز سے یونین میں پڑھا، ان کے بہت سے شاگرد آج بھی نقل اتارتے ہوں گے۔ اسی بحر اور قافیہ میں داؤد صاحب نے بھی فوراً ایک شعر لکھ دیا اور اسی انداز سے اپنے خاص حلقہ میں پڑھ کر سنا بھی دیا، وہ یہ تھا ؎

خوب تر صحرا نوردی می کند
اشتر پنجاب در ہندوستاں

اب قارئین کرام داؤد صاحب کے لگائے ہوئے مصرعہ کا لطف پوری طرح اٹھائیں گے ؎

ناقرا اب سیر سبزہ کر ڈالو
اپنے آگے کی گھانس چر ڈالو"

حامد علی[1] خان کے کمرے سے جو کالج میں "مشتی ستائیس" کہلاتے تھے ان کی شام میں گھڑی چوری ہو گئی تھی میز پر گھڑی کا خانہ خالی پڑا تھا۔ داؤد صاحب مرحوم ادھر آ نکلے چوری کا واقعہ سنا اور فی البدیہہ چند مصرعے موزوں کر کے گھڑی کے خانہ میں لکھ دیے۔ آخری مصرعہ یہ تھا ؎

چور گھڑی لے گیا کیوں نہ ہو خانہ خراب

علی گڑھ میں تعزیہ داری کے جلوس کے سلسلہ میں سخت بلوہ ہندو مسلمانوں میں ہو گیا تھا، اس فساد کی وجہ سے کالج بھی کچھ دن کے لئے بند کیا گیا تھا۔ ہندوؤں کا لیڈر لالہ بدری پرشاد وکیل تھا اور وہی مقدمہ کی پیروی میں پیش پیش تھا۔ مقدمہ کی پیشی کے دن ایک پر جوش مسلمان عمر خاں نامی نے کچہری کے احاطہ میں لالہ بدری پرشاد کی بانک سے ناک کاٹ لی۔ لالہ جی بڑے بزدل تھے غش کھا کر گر گئے اور پیشاب پاخانہ خطا ہو گیا۔

داؤد مرحوم نے اس واقعہ پر نظم لکھ ڈالی جس کے دو شعر یہ تھے ؎

واہ اے عمرو خاں قربان تیرے جائیے
ناک کاٹی ہے عدالت میں بھرے بدری کی
کیا بری حالت تھی لالہ بدری پرشاد کی
تن سے گرنے کی صدا تھی اور تعفن پاد کی

مولانا شوکت علی مرحوم اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

"بہادر علی جن کا بیٹا اختر علی تحریک خلافت کے زمانہ میں میرا سیکرٹری رہا تھا، وہ غریب اسکول میں تعلیم دینے لگے۔ نیک طینت شخص تھے لانبی داڑھی رکھتے تھے جس کی وجہ سے ہر شخص ان کا مذاق اڑاتا تھا۔ انہوں نے بی۔ اے میں ریاضی لی تھی، چونکہ عام خیال یہ تھا کہ مسلمان ریاضی میں کمزور ہوتا ہے اس لئے ہماری پارٹی کے سر کمال الدین نے جو عبدالرحمٰن صدیقی کے بہنوئی سورت کے رہنے والے اور فٹ بال کے کپتان تھے، ان کا نام "بابو کرشن" بروزن "بابو گھوش" رکھ دیا تھا۔ جب ریاضی کا مضمون انہوں نے چھوڑ دیا تو "بابو کھسکے" بروزن "بابو گھر گئے" کی پھبتی ہوئی۔ غرضکہ جب بہادر علی اسکول میں درس دینے لگے تو

---

[1] حامد علی خان ساکن فتح گڑھ ۱۸۹۰ء میں فرسٹ ایر میں داخل ہوئے ۱۸۹۳ء میں بی۔ اے کیا، اولاً نائب تحصیلدار ہوئے۔ امروہہ میں تعینات تھے، شکار کھیلتے میں بندوق کا نشانہ اتفاقاً لگا اور جاں بحق ہوئے۔ کسی مرتبہ پر وہ کالج میں انہیں جیس کے فرفرے کر بیٹھے تھے کہ یا تو زرق چارہ کا ہو گا یا ستائیس کا۔

داؤد صاحب مرحوم نے ایک خاص مناسبت کی بنا پر ایک قطعہ تصنیف کر دیا جس کو ہم نے گا دیا اور وہ سب میں مشہور ہو گیا اس کے صرف یہ دو شعر یاد رہ گئے ہیں ؎

کہاں بھیجی کسوت کدھر اسرا ہے — تمہارا ہی پیشہ گو کیسا بُرا ہے
بس اب اس سے رخصت دین ہی کیا دھرا ہے — ہمسا در علی یہ زمانہ بُرا ہے"

مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اپنے ذوقِ شعر کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

"وہ شعر نے جس شخص کے لئے اتنی کم عمر میں بقول غالب خود خواہش کی ہو کہ "گرد وفن او" وہ بھلا داؤد صاحب پر کس طرح عاشق نہ ہوتا جبکہ اسے اسی زمانہ میں معلوم ہو گیا ہو کہ داؤد صاحب کا بھی یہی فن تھا۔ میں نے سُنا تھا کہ چودھری فدا حسین[1] صاحب کو آج کل کے کلکٹر سید زین الدین[2] صاحب کے ساتھ خاص الفت تھی مگر زین الدین صاحب جس طرح ۱۹۲۱ء میں نان کو آپریٹروں[3] پر ظلم کرنے میں مشہور تھے اسی طرح اس زمانہ میں چودھری صاحب پر بھی ناک ظلم فرمایا کرتے تھے کہ بیچارے چودھری صاحب نے خودکشی کی ٹھان لی تھی۔ اس قصہ کو داؤد صاحب نے ایک مثنوی کی شکل میں منظوم کیا تھا اور ۱۸۹۰ء سے مجھے اس کا ایک شعر یاد تھا جس میں زین الدین صاحب کا اپنی کوٹھی سے یہ سنتے ہی گھبرا کر باہر نکل آنا بیان کیا گیا ؎

نہ بجا سرو تھی نہ سر پہ پچھاؤں
اس پہ طرہ یہ تھا کہ ننگے پاؤں

اس مثنوی کو میں بھلا کہاں دیکھتا لیکن کسی نہ کسی کی زبانی میں نے یہ شعر سن پایا تھا اور گو ذیابیطس کے باعث حافظہ اب بالکل برباد ہو گیا ہے لیکن الحمدللہ بچپن کے سنے سنائے شعر اب تک یاد ہیں۔ جب میرے عزیز دوست محمود احمد صاحب عباسی نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اپنے مرحوم بڑے بھائی کی اس مثنوی کو وہ پھر شائع کرائیں گے اور تقریظ لکھنے کی مجھ سے فرمائش کر کے مجھے وہ مثنوی دکھائی تو میں نے سب سے پہلے اسی شعر کی تلاش کی اور عجیب مسرت ہوئی جب اس کو اسی طرح مثنوی میں اسی موقع پر جس کا میں نے اپنے حافظہ سے اوپر ذکر کیا ہے پایا۔"

مثنوی کا نام "شکوۂ یار" رکھا، پانچ سو سے زیادہ شعر ہیں ۱۸۹۳ء میں طبع ہوئی۔ دیباچہ میں خود لکھتے ہیں:

---

[1] چودھری فدا حسین مرحوم ولد علی بخش ساکن پانی پت، ۱۸ جون ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۱ء میں انٹرنس پاس کر کے کالج چھوڑ دیا، اولاً نائب تحصیلدار ہوئے پھر تحصیلداری پر ترقی ہوئی کچھ عرصہ ریاست دوجانہ میں منیجر رہے ــــ عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔

[2] سید زین الدین مرحوم ایم اے، سید زین العابدین مرحوم کے فرزند تھے جو سرسیدؒ کے احباب خاص میں سے تھے اور علی گڑھ میں سب جج تھے۔ سید زین الدین مرحوم کا تقرر براہِ راست ڈپٹی کلکٹری پر ہوا، پھر کلکٹر ہوئے۔ ابتداً بڑے فیشن ایبل تھے، آخر میں مذہب کا رنگ غالب آیا۔ کچھ عرصہ ریاست رامپور میں بھی وہ افسر رہے۔ جب کبھی ملنا ہوتا اکثر داؤد مرحوم کا ذکر کرتے اور ان کے لطیفے سنایا کرتے تھے۔ مجھے اجازت دی تھی کہ مثنوی اور ان کے نام کے قطعہ کو بلا اظہار نام چھپوا دوں۔

[3] یعنی کانگریس کی تحریک عدم موالات پر عامل "Non. Co operators"

"چونکہ مجھے کسی سے تلمذ کی عزت بھی حاصل نہیں لہٰذا ضرور ہے کہ جابجا ٹھوکریں کھائی ہوں گی۔ بہرحال یہ ٹوٹی پھوٹی نظم جس پر نظم کا لفظ بھی مشکل سے عائد ہوتا ہے خاص اپنی رائے نیز ایک عزیز دوست کے اشارے سے اپنے سچے ہمدرد اور رفیق محمد فصیح کے نام سے معنون کرتا ہوں۔ پہلے بھی مجھے اکثر دوستوں نے یہ صلاح دی کہ میں اس کو طبع کرا دوں مگر مجھے یقین نہ تھا کہ طبع ہونے کے بعد مطبوع ہو گی لہٰذا جرأت نہ کر سکا اور بجائے چھپوانے کے چھپانے کی کوشش کی لیکن ان کے سخت اصرار اور متواتر تقاضوں نے اب مجھ کو اس بات پر مجبور کیا کہ اس کو طبع کرا کے پبلک کے سامنے اپنی یاوہ گوئی اور ژولیدہ بیانی کے ثبوت دوں۔"

تمہید کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

قلمِ دو جہاں دکھا جوہر — خامۂ دُر فشاں دکھا جوہر
وقت آیا ہے خوش بیانی کا — امتحاں آج ہے روانی کا
گل مضموں رنگ دکھلائیں — آج کاغذ پہ پھول کھل جائیں
لب پہ تحسین بار بار آئے — گلشنِ نظم میں بہار آئے
ہر ورق رشکِ سنبلستاں ہو — نظم کی غیرتِ گلستاں ہو
بحرِ مضموں میں جو تلاطم آج — جوش میں آئے قلزمِ مواج
کس طرح سے سنیں حسن کے زیر و ساز — کھولتا ہوں درِ خزینۂ راز
جوہرِ نظم گھیرتا ہوں میں — آج موتی بکھیرتا ہوں میں
گوہر و دُر کی کان ہے سینہ — جوہری کی دوکان ہے سینہ
تھے جو مضمون ازل سے سربستہ — ہیں مرے سامنے کمر بستہ
توسنِ فکر ہو جو گرم عناں — پردۂ غیب کے ہوں راز عیاں
پھر کے اک پل میں چار سو آئے — جب اڑے آسماں کو چھو آئے

اسی طرح کے چند اور شعر ہیں پھر "کیفیت ابتدائے الفت" کے عنوان سے یوں شروع کیا ہے ؎

اب سنیں صاحبانِ سوز و گداز — قصۂ دردِ غم کا ہے آغاز
اک مرے دوست اور کرم گستر — ذی خرد، ذی شعور، دانشور
نکتہ رس، نکتہ سنج، خوش اطوار — ساری باتوں میں الغرض ہشیار
مگر آگاہ ہے نہ الفت سے — نابلد محض ہے محبت سے
دور دل سے یہ لطف تھے سارے — جانتے ہی نہ تھے یہ بیچارے

---

[1] محمد فصیح گھوسی ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں ۔ ۱۸۹۸ء میں کالج میں داخل ہوئے ۱۹۰۲ء میں بی اے کلاس سے تعلیم چھوڑ کر چلے گئے پہلے سب انسپکٹر ہوئے پھر اکسائز انسپکٹر پھر تحصیلدار۔ دادو مرحوم کے کمرے میں وہ اور ان کے بڑے بھائی محمد وحید جو ڈپٹی کلکٹر ہوئے رہتے تھے محمد فصیح بڑے مزاح پسند تھے اور سید زین الدین سے ان کی دوستی تھی۔

ان مزوں سے زباں ہے بے بہرہ — ان صداؤں سے کان ہے بے بہرہ
جس کے دل میں نہ یہ حرارت ہو — اس سے بیزار جو طبیعت ہو
اس کے سودے سے ہو جو سر خالی — اس سے ہو گر کوئی بشر خالی
اس کو کچھ لطف زندگی ہی نہیں — بلکہ یوں کہیے آدمی ہی نہیں
اس کی تلخی میں بھی حلاوت ہے — اس کی تکلیف میں بھی راحت ہے
اس سے دل میں سرور آتا ہے — اس سے آنکھوں میں نور آتا ہے
اس کی بدنامی نام کا باعث — اس کی ناکامی کام کا باعث
یہ خزاں ہے بہار سے بہتر — بے قراری قرار سے بہتر
سوگ ہے باعثِ خوشی اس میں — موت ہے عینِ زندگی اس میں
اس کے جھٹکوں سے ہوش آتا ہے — خود بخود دل میں جوش آتا ہے
اس کے غم میں بھی اک بحالی ہے — اس کی جو بات ہے نرالی ہے
اس نے پائی ہے کچھ عجب تاثیر — خاک اس کی نظر سے ہو اکسیر
قدر میں پھول سے سوا مس ہو — جس کو یہ مس کرے وہ پارس ہو
جس پہ یہ مہرباں ہوتا ہے — وہ عزیزِ جہاں ہوتا ہے
شہرۂ عام قیس نے پایا — کس قدر نام قیس نے پایا
تخمِ الفت کا بو گیا فرہاد — سرخرو اس سے ہو گیا فرہاد
اس کے غم سے نہ تھا جو دل خالی — رتبہ عشاق میں ملا عالی
دقتیں ہیں مگر ہزار اس میں — ہر کسی کو نہیں ہے بار اس میں
اس جنوں کے لئے ہے سر درکار — اس تحمل کو ہے جگر درکار
اس میں زور آزمانے مشکل ہیں — اس کے صدمے اٹھانے مشکل ہیں
جو کوئی یہ مصیبتیں جھیلے — کھیلے وہ اپنی جان پر کھیلے
جان ہر ایک کھو نہیں سکتا — ایسے ویسوں سے ہو نہیں سکتا
اس میں لازم ہے مستقل رہنا — اس کے دکھ سب بجان و دل سہنا
چوٹ پر چوٹ کھائے اف نہ کرے — لاکھ صدمے اٹھائے اف نہ کرے

یہ مثنوی جب چھپ گئی اس کی بڑی شہرت ہوئی۔ کالج کے ہر ایک لڑکے کی زبان پر اس کے اشعار رہتے۔ رفتہ رفتہ سید زین العابدین مرحوم کے پدر بزرگوار سید زین العابدین صاحب کو خبر ہو گئی وہ ایسے برہم ہوئے کہ سرسید سے شکایت کی۔ انہوں نے مسٹر بک پرنسپل سے کہا [illegible] صاحب مرحوم طلبہ اور اسٹاف دونوں میں بڑے ہر دلعزیز تھے اور مسٹر ماریسن بھی خاص طور سے ان کے مداح تھے۔ سید محمود مرحوم کو بھی ان کے بعض لطیفے خاص کر مولوی شبلی کے متعلق پسند آئے تھے ان حالات میں کوئی اقدام ان کے خلاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بالآخر مسٹر بک نے

ان کی رائے معلوم کر کے سرکاری ملازمت کی سفارش کر دی اور اس طرح وہ سرکاری ملازمت میں منسلک ہو کر علی گڑھ سے باہر چلے گئے۔ سید زین العابدین مرحوم بھی اپنی ملازمت پر چلے گئے تھے ایک خط میں یہ شکوہ بھی کیا تھا کہ دوستوں نے ہمیں بھلا دیا ہے۔ دادا مرحوم نے جس قطعہ نظم میں اس کا جواب دیا تھا وہ یہاں درج کرتا ہوں: ـــ

آپ نے لکھا تھا مجھے خط میں بڑی حسرت سے ـــ اور حقیقت میں وہ تھی بات بھی حسرت والی
یعنی ہر روز شبِ گشت کی ہوتی تھی حالت ـــ اور جس قسم کی تھی اُس کی پریشاں حالی
کم زیادہ وہی حال تمہارا ہے کہ تم ـــ جس طرح لکھتے ہو بیٹھے ہو پریشاں حالی
ولولہ کوشش کرو اب کوئی نہیں چلنے کا ـــ عقل نے سودا کرو کیسی ہی دکھا جالی
چودھری کر گیا نکلا ہے جو کچھ کرنا تھا ـــ اس کی ہمت بھی قوی حوصلے اس کے عالی
اب شیخ مرحوم بھی کہیں نہ رہا جوش و خروش ـــ اور ادھر ہم پر بھی ہے چھائی ہوئی کنگالی
یعنی خود تم کو ہے افسوس کہ اب تم میں کچھ ـــ نہ رہی بات وہ لوگوں کو لبھانے والی
اب نہیں وہ کہ جسے چاہا اسے پھنکا دیا ـــ گویا اک آگ تھی جب جی میں ہوا بھڑکا لی
مل گیا جب کوئی بیچارہ تو دل اٹھا لیا ـــ صبر و ہمت کی جو کچھ پونجی تھی سب بکھرا لی
ہو گئے علم میں جب طاق ستم میں استاد ـــ خوب ہی بازی میں جب عشق ہم نے پیالی
تو کیا ایک عجب عشق سے نکلا آگے ـــ یک سادہ لوح مرحوم 'ہیری' پالی ہی کر ڈالی
اس نے روزِ زری ہی کر دی قیامت برپا ـــ ہو گئی دھوم زمانے میں وہ چھپسل ڈالی
اس کے تیور ہی کچھ ایسے تھے کہ دیکھے بیٹھے ـــ بانی تھی اس نے طبیعت بھی عجب متوالی
اس کی الفت نے بہکنے سے لگا دی جو کیا کیا ـــ مثنوی بھی کسی استاد نے اک لکھ ڈالی
قوم بھی مشہور ہوا ان کے باعث ـــ اور اس نے بھی کیا حقہ شہرت پالی
اس زمانہ کے گزر جانے کا اب یہی شغل ـــ ٹھہر کی نہیں جو ہے گزرنے والی
اب کوئی اور اسی قسم کی سوچو تدبیر ـــ شغل کچھ چاہیے اچھا نہیں بیٹھا خالی

ہم بتا دیں تمہیں اب اس پہ عمل کیجے گر
"شعر گوئی پہ شور ہی پیشہ کنند والی"

دادا مرحوم کے عزیزوں میں بی بی حسینی جو بامی ایک بزرگ وہ کے مرید تھے، کی کافی لکھائی سے ہر دو مرحوم واسطہ اپنی قبر کے لئے انہوں نے پہلے ہی سے جگہ مقرر کر لی تھی اور خاندانی قبرستان سے ذرا دور ہٹ کر ایک پختہ قبر بھی بنوا دیا تھا لیکن جب ۱۹۵۱ء میں مراد آباد ...

---

[1] اس زمانہ میں "روزِ زری" شائع ہوا تھا جو ... کا نام تھا، زین العابدین اور دادا مرحوم انگریزی تحریر کی قابلیت بڑھانے کے لئے انگریزی خطوط لکھا کرتے تھے۔ ایک روزی کی طرف سے اور دوسرا قرآن کی جانب سے۔

[2] یعنی چودھری نذر حسین مرحوم ساکن پانی پت ضلع کرنال۔

[3] اس زمانہ میں دادا مرحوم ڈسٹرکٹ اسکول میں ٹیچر تھے۔

ہی اور اس کی داغ بیل ڈالی گئی تو اس ریلوے لائن میں یہ چبوترہ آ کر مسمار ہو گیا۔ علی حسین مرحوم کو کچھ ایسا قلق ہوا کہ بیمار ہو کر اپنے بڑے فرزند ابن حسن عباسی کے پاس جو اس زمانہ میں تحصیلدار تھے اور بعد میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے، ان کے جائے تعیناتی پر چلے گئے اور چند روز میں دنیا سے بھی رخصت ہو گئے۔ لوگوں نے ان کی وفات کی تاریخیں کہیں۔ داؤد مرحوم نے بھی تاریخ کہی اور اپنے دوست مولانا طفیل احمد علیگ، مرحوم کو خط مورخہ ۲۱ رمضان المبارک میں لکھا کہ جو تاریخیں ہوئی ہیں وہ ان مرحوم کے حسب حال نہیں مجھ کو حسب حال لکھنی چاہئے چنانچہ مادۂ تاریخ ایسا ہی نکالا ہے۔ سنئے ؎

مر گئے ہیں بڑے میاں جب سے — دل میں اٹھتی ہے ان کے غم سے ہوک
تھے بڑے نیک بخت اور دیں دار — کرتے رہتے تھے سب سے نیک سلوک
جنتی ہونے میں نہیں ان کے — دوست دشمن کسی کے دل میں شکوک
سب نے لکھی ہیں ان کی تاریخیں — ہو گئی اک غلط بڑی سی چوک
اس لئے آج میں نے بھی اپنی — شاعری کی گھڑی کر دی ہے کوک
جب سے یہ حسن ہو گئی ہے بھول گیا — کس کو کہتے ہیں پیاس کیسی بھوک[1]

بولا ہاتف کہ ہو گئے بے گھر
آج عباسی، کمکار، بلغم، تھوک
۱۸۹۹ء

داؤد صاحب مرحوم کی بیاضوں میں جو راقم الحروف کے پاس اب تک موجود ہے میر انیس، مرزا دبیر، میر مونس کے متعدد مرثیے خاص کر وہ مرثیے جو حسن بیان، صنائع لفظی و بلاغت کے عمدہ نمونے ہیں نقل ہیں۔ وہ ہر سال بہ زمانہ طالب علمی ان مجالس کی شرکت کے لئے پنڈراول جایا کرتے تھے جہاں راجہ باقر علی خاں[2] کے یہاں محرم کی مجلسیں ہوا کرتی تھیں اور لکھنؤ کے نامی نامی مرثیہ گو آتے تھے۔ خان قلات نے اپنے ولی عہد سردار یوسف خان کو جو کم عمر تھے انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کے ایماء سے تعلیم و تربیت کے لئے علی گڑھ بھیج دیا تھا۔ ابھی چند ہی سال ہوئے تھے کہ اس نوجوان کو سند نشینی کی غرض سے وطن واپس جانا پڑا جہاں پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ مخالف پارٹی نے راستہ ہی میں بڑی بے دردی سے قتل کرا دیا۔ مس بیک کے دل پر جو اس نوجوان سردار کی گارجین تھیں ایسا اثر پڑا کہ انھوں نے انگریزی میں اس کا مرثیہ لکھا، وہ خود بھی شاعرہ تھیں اور داؤد مرحوم کی خوش طبعی کی قدردان۔ انھوں نے فرمائش کی کہ داؤد اردو میں مرثیہ لکھیں۔ داؤد مرحوم نے فرمائش کی تعمیل کی۔ یہ مرثیہ لکھا۔ صاحب تلامذہ جاوید کی رائے ہے "مرثیہ یوسف خان سے ان کی غیر معمولی لیاقت، معاملہ بندی اور مضمون آفرینی کے رنگ کا پتہ چلتا ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ مرثیہ اپنے رنگ میں فرد ہے۔" اب یہ مرثیہ سنئے ؎

خشک اور ویران صحرا میں بلوچستان کے — اک کھلا تھا پھول نازک سا نہایت خوش نما
باغباں ہونے دکھایا ہوگا کوئی پھول — اس سے بہتر حسن و صفا اور خوشبو میں کہاں
گلشن عالم میں لاکھوں گل کھلے ہوں گے مگر — کم ہوا ہوگا کوئی اس سے زیادہ دلربا
لیکن اس کے واسطے زیبا نہ تھی وہ سرزمیں — وہ گل تر ایسے ریگستاں کے قابل نہ تھا

---

[1] برعایت روزہ ماہ رمضان

[2] داؤد مرحوم کے رفیق اور ساتھی قطب الدین صاحب (مرحوم) کے بڑے بیٹے حیدرآباد کے مشہور افسر مال رہے۔ والد ماجد راجہ باقر علی خاں آف پنڈراول کے مصاحب تھے اس لئے داؤد صاحب مرحوم کو مجالس کی شرکت کے لئے وہاں قیام کرنے کی سہولتیں تھیں۔

ہاں مناسب تھی اُن کی خاک اس کے واسطے
تھا مصفّا پانی وہاں کا اور خالص تھی ہوا
کر کے اس پر غور آخر ایک دن تو میر نے
وہاں کے خانہ چمن میں اس گل کو لا کر بو دیا
سرزمین [illegible] میں اک باغ دیکھا پُربہار
مختلف اقسام کے پھولوں سے جو معمور تھا
[illegible] جنسیت اس کی کے [illegible]
اس گلِ نوخیز کو اس باغ میں لا کر رکھا
اس چمن میں گل سبھی تھے [illegible] رنگ کے
بو کی بھینی خوشبو سے تھا سارا جہاں مہکا ہوا
مہرباں تھا باغباں اور بار آور تھی زمیں
موسمِ گل جوش پر تھا اور اچھی آب و ہوا
[illegible] اس سارا [illegible] جس طرح بڑھ رہے تھے ہم
رات دن ہوتی تھی اس گل کی نشو و نما ہوا
حسن خوبی میں ترقی دم بہ دم ہونے لگی
تازگی بڑھتی گئی [illegible]
حیف گلچیں [illegible] نظر [illegible]
کر دیا گلشن سے اس کو وقت سے پہلے جدا
[illegible] کھلنے تھے جو [illegible] ابھی
بچنے پائی تھی نہ کامل طور سے نشو و نما
لے گئی قسمت اسے پھر کھینچ کر [illegible] وطن
[illegible] سے اس کے [illegible] نہ تھا
[illegible] بلا انگیز تھی چاروں طرف
پھر اسی طرح اک آفت تیز کا تھا سامنا
لیکن اس گل کو وہاں ان [illegible] کی کب تھی
ایک ہی جھونکے میں آخر کار وہ مرجھا گیا
جس چمن میں وہ گلِ رعنا رہا تھا چند روز
آج تک اس کی جدائی کا [illegible]
گل گریباں چاک ہیں [illegible] سب
[illegible] صبا
ہے یہ [illegible] کے تھے
اس کے [illegible] کہ وہ گل کون تھا
جس کی [illegible] خوش خمیر
[illegible] اس کا [illegible]
[illegible] ابھی
اس [illegible] سے وقت [illegible]
[illegible] میں رہ گئے
[illegible]
[illegible] اس کے حال پر
تو نے کس [illegible] کو خاک [illegible]
کس کو [illegible] اے خدا [illegible]
دل بھی تو آتا ہے کس سے [illegible]
کر دیا تاریک [illegible] چاند [illegible]
دفعتاً آنکھوں کے آگے [illegible] اندھیرا چھا گیا
اے گل [illegible] آ گئی تجھ پر خزاں
اے خزاں اس پھول کو [illegible]
تیرے [illegible] ابھی
کھا گئی [illegible] اور دنیا کی ہوا
باغِ عالم میں نہ دیکھی تھی ابھی تیری بہار
[illegible] کھلنے بھی نہ پایا تھا کہ تو مرجھا گیا
داستاں تیری [illegible]
مسکرا [illegible]
وہ تنِ نازک [illegible] سے [illegible]
بے کفن [illegible] خاک [illegible]
جان [illegible] ہو گی نہیں معلوم کس تکلیف سے
کیا اذیت ہو گی جب سینے میں [illegible]
تیرے [illegible]
جس سے تیرا [illegible]

پھر اگر کوئی بھلا تھا بھی تو سوئے وطن ہے مجھے جانا ترا اب تک نہاں اس روز کا
وہ دم رخصت تمہارا رو رو کے ملنا یاد ہے دل سے جاتا ہی نہیں اس دن کا وہ جانا ترا
کہہ رہی تھیں حسرت آگیں وہ نگاہیں تیری صاف ہو رہا ہے تو ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا
اپنے مدارس کو نہ آنا تھا تجھ کو یقیں سب تجھے سمجھا رہے تھے اور یاد بھی تھا
کچھ اداسی کا نہ یوں ہی تھا تجھے دل پر اثر بند ہوتا تھا نہ ہرگز آنسوؤں کا سلسلہ
اب یہ ثابت ہوگیا تیرا ہی کہنا تھا درست تھا غلط جو کہ میں کہتا تھا کہ پھر ملے گا
غیر ممکن ہے کہ تجھ کو بھول جائیں جلد ہم مدتوں ہوتا رہے گا ذکر کالج میں ترا
جس طرح کھیلوں میں تھا کامل یکتا تجھے ویسے ہی علمی ترقی کا بھی تجھ کو شوق تھا
سر برآوردہ رہا انجمن میں تو جس طرح کرکٹ فٹ بال میں ویسے ہی تو استاد تھا

اب نہ تو ہے اور نہ کالج میں ترا کوئی نشاں
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

داؤد مرحوم کا مجموعۂ کلام زیادہ تر اخلاقی نظموں، مثنوی، قطعات، تضمین اور چند غزلیات پر مشتمل ہے۔ اشعار کی تعداد ڈیڑھ دو ہزار ہے۔ ان کی ایک نظم "سچی دوستی کا امتحان" کو ان کے رفیق خان بہادر مولوی الحاج محمد حبیب اللہ خان صاحب سابق کلکٹر یو۔ پی نے ۱۹۱۳ء میں طبع کرا دیا تھا اور البشیر مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۱۳ء میں اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ مولانا حالی مرحوم کی نظموں سے اردو شاعری میں طرز جدید کی بنیاد پڑی، وہ تحریر کرتے ہیں:

"پچھلے پانچ چھ سال سے مدرسۃ العلوم کے طالب علموں نے اس طرز جدید میں طبع آزمائی کی اور چند عمدہ نظمیں پبلک کے سامنے پیش ہوئیں لیکن یہ نظم جس کا نام "سچی دوستی کا امتحان" ہے اور جو اب نذر ناظرین کی جاتی ہے ایسے اعلیٰ درجہ کی نفیس اور دلکش نظم ہے کہ مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کی نظمیں تو درکنار ان کل نظموں میں جو اس طرز جدید میں مولانا حالی کی نظموں کو مشق کر کے لکھی گئی ہیں بے مثل اور لاثانی ہے۔ اس نظم کے مصنف ہمارے دوست محمد داؤد صاحب بی۔ اے ہیں جنہوں نے محمڈن کالج میں تعلیم پائی ہے اور جو علاوہ کامل استعداد فارسی و عربی کے فن شاعری میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت کو قدرتی طور سے شعر سے خاص مناسبت ہے اور یہ رائے ہمارے دوست موصوف کے ذاتی تجربہ اور واقفیت کے بعد قائم ہوئی ہے۔ ہم پبلک پر اس کا فیصلہ چھوڑتے ہیں وہ اس نظم پر اپنی قطعی رائے قائم کرے لیکن ہم اپنی سمجھ کے مطابق اس امر کے کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ باعتبار خوبی مضمون، سلاست بیان، بے ساختگی طرز ادا اور بندش الفاظ وغیرہ کے یہ نظم نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے جس قصہ کو ہمارے دوست نے نظم کیا ہے وہ اخلاقی لحاظ سے نہایت پر اثر ہے اور اس لحاظ سے اور نیز سادگی اور سلاست زبان کے لحاظ سے یہ نظم اس قابل ہے کہ سرکاری دیسی مدارس کے کورس میں شامل کی جائے۔ ہمیں امید ہے کہ قوم اس دلکش نظم کی پوری قدر کرے گی اور ہمارے دوست مصنف جو اپنے فطرتی انکسار طبیعت کی وجہ سے پبلک اسٹیج پر آنے میں تامل کیا کرتے ہیں وقتاً فوقتاً ایسی عمدہ نظموں سے قوم کو فائدہ پہنچاتے رہیں گے اور اس ذریعہ سے اردو زبان کی روز افزوں ترقی میں مدد دے کر اس کو اپنا ممنون احسان کریں گے ——— ۲۰ فروری ۱۹۱۳ء"

اس نظم میں سو سے زیادہ شعر ہیں اور ہر شعر بندش، الفاظ و بے ساختگی طرز ادا میں دوسرے سے بڑھ کر ہے۔ بخوف طوالت یہاں شروع کے چند ہی شعر نقل کرتا ہوں ۔

کہہ رہا تھا فخر سے اک شخص یوں بیٹھا ہوا — مجھ سا خوش قسمت بھی دنیا میں نہ ہوگا دوسرا
کس کے ایسے ہیں سچے دوست اور ہمدرد ہیں — ویسے ہی احباب چاہے رزق ہر کسی کو دے خدا
ان میں ہر اک کا سلوک ایسا ہے کہ آئے وقت پر — مال و زر کیا جان تک گھر سے اور میں خدا
ایک قطرہ گر پسینے کا کہیں میرے گرے — سچ سمجھئے اس جگہ دیں گے وہ اپنا خوں گرا
بیوفائی کس کو کہتے ہیں نہیں ان کو خبر — نام سے آشنا کے کان ہیں نا آشنا
یار و ہمدرد و جانباز و رفیق و غمگسار — با مروت بے تکلف با وفا و باصفا
ناز ہو ان پر مجھے جتنا زیادہ ہے درست — جس قدر ہو فخر مجھ کو ان کے اوپر ہے بجا
وہ تعلق مجھ سے رکھتے ہیں شناسائی کے لوگ — کیا شکایت ہو کسی سے اور کیسا مجھ سے گلا
کہتے ہیں اپنے ہی جو کچھ دوستی کی رو سے بھی — غالباً یہ جھوٹ ہے ایسا تو کیا ہوگا بھلا
دوست اور آنکھیں چرائیں دوست سے ممکن نہیں — یہ تو اپنے دل سے لوگوں نے ہے شاید گھڑ لیا
مجھ کو اور سچے جو یاد رہتے ہیں سمجھ کر — بعض لوگوں کو انھی باتوں میں آتا ہے مزا
جیسے خود ہیں ویسا ہی اوروں کو کرتے ہیں قیاس — وہ سمجھتے ہیں کہ سب سا ہے زمانہ ایک سا
دوستوں کو دیکھ کر مشکل میں جو بچ جائیں دوست — تعلق میں ہو جائے گا ذرہ برابر بھی کیا

اسی نظم میں ایسے بھی شعر ہیں کہ صنعت ایہام کا اعلیٰ نمونہ کہے جا سکتے ہیں مثلاً ۔

خود غرض احباب سے رکھتے نہیں ہم خود غرض
جو ہیں اپنے کام کے ان سے ہمارا کام کیا

تذکرہ وحشت و گلشن کے مؤلف مولوی عبدالباری نے داؤد مرحوم کے تذکرہ میں ان کے کلام کا انتخاب شائع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ نہایت قابل، ذکی اور ذہین تھے ...... قدیم اور جدید دونوں رنگوں میں شعر کہتے تھے۔ طبیعت میں چونکہ شوخی کا مادہ زیادہ تھا اس لئے کہیں کہیں وہ ایک ہلکی ظرافت کا رنگ اختیار کر لیتا تھا (وحشت و گلشن)۔ اسی طرح لالہ سری رام ایم۔ اے صاحب خمخانۂ جاوید ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مولانا حالی کے اکثر اشعار کی تضمین کی ہے بلا کے ذکی اور ذہین تھے۔ ان کے کلام سے ان کی شوخی اور طبیعت داری اور ذکاوت ٹپکتی ہے۔ اگر زندگی وفا کرتی تو کیا عجب کہ اس فن میں بھی نام و شہرہ حاصل کرتے۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے فرمایا ہے کہ "خمخانۂ جاوید میں جو چند غزلیں اور متفرق اشعار اور یوسف خاں کا مرثیہ شائع ہوا ہے ان کو پڑھ کر داؤد صاحب مرحوم کی بے تکلف شاعری اور ان کے سہل ممتنع کا لطف اٹھایا۔ ان اشعار میں سے بچپن کے حافظہ نے ایک شعر کا اندوختہ مجھے جتا دیا تھا چنانچہ اس کو بھی اسی مسرت سے پڑھا ۔

یہ جھوٹ اور ہم سے! بس اب رہنے دیجئے
ہم بھی تو رات جھانک رہے تھے دراڑ سے

الغرض اب جبکہ میری عمر غالباً داؤد صاحب کی عمر سے بھی زیادہ ہو گئی ہے اس شعر کے معاملہ پر نظر پڑی تو تعجب ہوا کہ ان جیسا سنجیدہ اور متقی بزرگ بھی کم از کم شعر میں دراڑ سے جھانک سکتا تھا۔ اعتراف کرتا ہوں یہ شعر بھی مثنوی کی طرح صرف حکایات متفرقہ کے نام کو پڑیوں پر ایک [illegible]

کی شان میں کہا گیا ہو۔ اب اس غزل کے جس کا ایک شعر مولانا نے اوپر نقل کیا ہے چند اور شعر بھی دیکھئے ؎

اس عشق کے طفیل لڑائی رہی سدا
تقدیر سے، رقیب سے، ناصح سے، یار سے

انصاف کی ہے بات میں بیجا گلا کروں
جب ڈال دے وہ ہاتھ گلے میں پیار سے

رہزن ادھر ادا ہے ادھر زلف پرشکن
یارب بچائیو مجھے اس لوٹ مار سے

قربان عشق کے کہ ہم آزاد ہو گئے
قید حیات سے، غم ہستی سے، عار سے

میری طرف سے آپ کے دل میں ہے کیوں غبار
تقصیر ایسی کیا ہوئی اس خاکسار سے

محو کر دیا ہے مرا نام یوں کہا
وہ ہی نہ مانے تپ نے ضعیف و نزار سے

معلوم ہے مجھے کہ جو استاد ہیں جناب
یوں کھینچتے ہیں جیسے کسی پرہیزگار سے

خود مجھ کو تجربہ ہے بس اب کیا بیاں کروں
خالق بچائے ایسے شریروں کے وار سے

اب دو ایک تضمینیں بھی ملاحظہ ہوں۔ مولانا حالی کا شعر ہے ؎

آؤ لپٹیں جا کے ہم اس سے گلے
اس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

داؤد مرحوم نے اس کی یوں تضمین کیا ؎

اس سے ہم بھی اور وہ ہم سے خفا
گر حقیقت میں اسی کی ہے خطا
خیر اب جانے بھی دیں کیا فائدہ
آؤ لپٹیں جا کے ہم اس سے گلے
اس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

شعر حالی ؎

آ رہی ہے چاہ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

تضمین داؤد ؎

ہو رہا ہے رنگ عالم کا نیا
دکھ پہنچتا ہے عزیزوں سے سوا
کارواں و شہر میں یوں برملا
آ رہی ہے چاہ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

شعر حالی ؎

ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو
ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا

تضمین داؤد ؎

کیوں نشتر ملال سے سینہ فگار ہو
کیوں رنج کے خیال سے چشم اشکبار ہو
صدمہ کچھ نیا ہو تو دل بے قرار ہو
ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو
ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا

شعر حالی ؎

اک عمر سی ہو گئی ہے محفل کی رہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

تضمین داور —

طاقت تو ہیچ اٹھانے کو ہم میں رہی ہے کب　　تاب و قرار و ضبط گئے دل کے ساتھ سب
غم جھیلنے کا آپ ہی کچھ پڑ گیا ہے ڈھب　　اک شے سی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں جور و ستم سہار کا

اردو کے علاوہ فارسی میں بھی اسی بے تکلفی اور سلاست بیانی سے طویل نظمیں لکھ دیتے تھے۔ فتح نواز جنگ کو ریاست حیدرآباد دکن میں آخری عہدہ ہوم سیکرٹری کا تھا۔ انگلستان کے زمانۂ قیام میں انہوں نے گرٹروڈ نام کی ایک انگریز عورت سے شادی کر لی تھی۔ حیدرآباد کے قیام میں اس عورت کی بدچلنی کی شہرت ہوئی، سالار جنگ دوم سے اس کا ناجائز تعلق بتایا گیا، اخبارات میں مضامین شائع ہوئے۔ فتح نواز جنگ نے سکندرآباد میں ایک اخبار نویس [illegible] پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا، یہ مقدمہ بڑا ہنگامہ خیز ہوا۔ اسی زمانہ میں داور مرحوم کے ایک رفیق اور دوست مرزا مسعود علی بی۔ اے۔ علیگ، فتح نواز جنگ کے پیش دست تھے۔ ایک پمفلٹ لکھا گیا تھا، داور مرحوم نے اس کو فارسی میں نظم کر دیا تھا۔ بڑی طویل نظم تھی، ایک دو شعر اس کے لکھتا ہوں —

محرم راز این پمفلٹ بنوشت　　گفت این ہم حدیث شرعی ہست
چوں رسید این بگوش فتح نواز　　استغاثہ کناں ز جا برجست

متعدد کتابوں پر منظوم تقریظیں فرمائشاً لکھی ہیں۔ اردو و انگریزی میں بھی مضامین لکھتے۔ اردو مضامین بعض اخبارات میں شائع ہوتے مگر اپنے نام کا کبھی اظہار نہ کرتے۔ پھبتی کسنے میں بھی نہ چوکتے۔ "نیچری بھانڈ" اور "نیچری سانڈ" کی پھبتی جن پر کسی تھی وہ [illegible] چھپاتے رہے۔

مجذوب صاحب

محمد رضا انصاری

شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے فرق کی بدولت مجذوب صاحب کے شخصیت نگار پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ ان کا سن پیدائش عمر اور سال وفات وغیرہ کی تفصیل بھی بیان کرے ان میں سے ایک چیز بھی بدقسمتی سے میرے علم میں نہیں ہے۔ سن پیدائش اور عمر کے معاملے میں تو بعض بڑی بڑی شخصیتیں گمنامی کا شکار پائی جاتی ہیں لیکن کسی نمایاں شخصیت کا سال وفات نہ معلوم ہونا یقیناً جہالت ہے۔ اس جہالت کا مجذوب صاحب کے بارے میں مجھے اعتراف ہے۔

عجیب اتفاق ہے جولائی ۱۹۶۰ء میں حیدرآباد کی ایک ایسی صحبت میں جہاں کل ہند اردو کانگریس کے سلسلے میں حضرت جگر مراد آبادی کے ساتھ گیا ہوا تھا مجذوب صاحب کا ذکر آ گیا جن کے بیشتر اشعار مجھے یاد ہیں۔ جگر صاحب نے تقاضا کیا: "آپ کوئی دو شعر ان کے سنا دیجئے، دیکھئے آپ کے ذوق کا بھی امتحان ہے اس میں۔"

ذوق کا ذکر جگر صاحب نے محض چھیڑنے کے لئے کیا تھا اس لئے کہ رسالہ نیا ادب لکھنؤ سے میری وابستگی اور ماہنامہ منزل لکھنؤ کی ادارت نے جگر صاحب کو جو ترقی پسندوں کے ادبی ذوق سے بدگمان سے ہوچکے تھے میرے ذوق کا امتحان لینے کی دعوت دے دی۔ بہرحال دو شعر جو بروقت یاد آگئے میں نے سنا دئے ؎

گھٹا اٹھی ہے تو بھی کھول زلف عنبریں ساقی
ترے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

یہ مطلع جس غزل کا ہے اس کا مقطع بھی ؎

الٰہی خیر ہو مجذوب مے خانے میں آیا ہے
قدح کش، لاابالی، جام نازک نازنیں ساقی

دیر تک مجذوب صاحب کا ذکر ہوتا رہا۔ دونوں میں سے کسی کو ان کے بارے میں صحیح علم نہ تھا کہ وہ اب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

خط لکھا مجذوب صاحب نے گویا ایسا کبھی نہیں تھا انتقال معلوم ہوتا ہے؟

واپسی پر کچھ دنوں کے بعد ایک دفعہ حضرت مجذوب صاحب کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ اپنے وطن اورئی ضلع جالون میں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تاریخ انتقال بھی جولائی ۱۹۴۴ء کی کوئی تاریخ ہے۔ اس وقت ذہن پر زور دے کر حساب لگایا تھا اور غالباً وہی تاریخ یا ایک آدھ دن آگے پیچھے کی تاریخ تھی جب حیدرآباد میں مجذوب صاحب کی یاد ہم لوگوں کو آئی تھی۔ تاریخ انتقال مجھ کو یا دوسرے لوگوں کو نہ معلوم ہونے کی وجہ کھلی ہوئی ہے کہ آخر زمانے میں مجذوب صاحب ایسی جگہ قیام پذیر ہو گئے تھے جو خبروں کی رہگزر سے دور پڑتی تھی لیکن اس کی وجہ جاننا مشکل ضرور ہے کہ مجذوب صاحب کا ایسا شاعر جو شعراء کی درجہ اول کی صف میں حسرت، جگر اور اصغر وغیرہ کے طبقے کا غزل گو تھا، عام طور پر نقادوں اور تذکرہ نویسوں کی نگاہوں سے کیوں پوشیدہ رہا۔

صف شعراء میں جب کبھی مجذوب صاحب کو دیکھا اساتذہ کے پہلو بہ پہلو دیکھا اور جب محفل یکجائی ہوئی تو ہمیں انہیں پایا تو آتش بجاں پایا۔ معنی پایا۔ جب وہ "نالہ کناں" ہوتے تو اچھے سے اچھے شاعر خاموش سامع بن کر رہ جاتے۔ اس فضا میں جو مجذوب صاحب کی پُرترنم آواز اور بے چین جذبات سے ہیجان پیدا ہو جایا کرتی۔ بڑے بڑے سخن شناس وارفتہ ہو جاتے یا گم صم اور سب اس دعوے کے مؤید نظر آتے۔

یہ معانی، یہ حقائق، یہ روانی، یہ اثر
شاعری تیری ہے اے مجذوب یا الہام ہے؟

شاعر سب ہی "پیدائشی" ہوتے ہیں اس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ مجذوب صاحب "پیدائشی" شاعر تھے لیکن یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ مجذوب صاحب سراپا شاعر تھے۔

یہ امر مجذوب صاحب کے بہت سے جاننے والوں کو کچھ عجیب سا نظر آئے گا جس کا بظاہر واقعیت سے کوئی تعلق نہیں یعنی مجذوب صاحب ایک زمانے میں ڈپٹی کلکٹر رہ چکے ہیں پھر اس سے منتقل ہو کر محکمۂ تعلیمات (یوپی) میں اسسٹنٹ انسپکٹر ہوئے آخر میں انسپکٹر آف اسکولس کے عہدے پر پہنچ کر سبکدوش ہوئے۔

مجذوب صاحب سخت قسم کے متشرع بھی تھے اور صوفی بھی۔ صوفی صرف شاعرانہ حد تک نہیں بلکہ واقعتاً اپنے وقت کے ایک بڑے شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید خاص اور خلیفہ بھی۔ شیخ کے انتقال کے بعد خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں متوسلین کے حالات و کوائف کے نگراں اور مشیر بھی۔

تو وہ متشرع بھی تھے، صوفی بھی، سرکاری افسر بھی تھے اور سرکاری فہرستوں میں "خان صاحب" اور "خان بہادر" بھی۔ پھر بھی میں انہیں سراپا شاعر کہنے کی جرأت کر رہا ہوں ۔۔۔۔ شاعری اگر صرف قافیہ پیمائی کا نام نہیں بلکہ اس کیفیت، اس شعور اور اس احساس کا نام ہے جو ہر شاعر میں کم و بیش پایا جاتا ہے اور اس سے شعر کہلاتا ہے تو مجذوب صاحب پر یہ کیفیت اور یہ جذبہ ہر وقت طاری رہتا تھا۔ اکثر ان کے دوسرے فرائض اس کیفیت کے اظہار میں رکاوٹ بنتے تو ایک سخت قسم کی بے چینی ان کے ہر پہلو سے جھلکتی دکھائی دیتی تھی۔ اس بے چینی کو محسوس کرنے والا اچھی طرح جان لیتا تھا کہ اس میں نہ بناوٹ ہے اور نہ دکھاوا۔

ہم دونوں صاحبزادگان "مرزا گلی" (یہ لفظ عرف عام میں احتراماً) مجذوب صاحب کی تلاش میں ان کے مکان واقع بندی باغ مغرب کے بعد پہنچے۔ سنہ ۴۳ء کے آس پاس کی بات ہوگی اس وقت مجذوب صاحب انسپکٹر آف اسکولز ہو چکے تھے اور خان صاحب خواجہ عزیز الحسن غوری انسپکٹر آف اسکولز (یوپی) کہلاتے تھے۔ مکان بھی سرکاری بنگلہ ہی رہا ہوگا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے گئے ہیں۔ دیر تک ہم نے ٹہل ٹہل کر انتظار کیا آخر اس مسجد تک پہنچ گئے جہاں وہ نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ وہ مسجد کے صحن میں دو زانو بیٹھے ایک طرف گردن جھکائے اور اسے شانے پر لگائے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ تسبیح ان کے ہاتھ میں تھی اور پڑھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بالکل قریب جا کر سنا تو وہ گنگنا رہے تھے۔

پروانہ ہے، بلبل کا سا انداز نہیں ہے
جاں باز ہے مجذوب سخن ساز نہیں ہے

کیا مسکنت اور کیسی عاجزی تھی ان کی آواز میں۔ ایسی ہی جاں باز کہ جس بے نیاز گروہ کی سچائی کا یقین دلا رہے ہیں اس کے سامنے پہنچ کر ہم سب مجذوب صاحب کی صداقت کی دل آگاہی دیں مگر وہ تو عالم الغیب والشہادۃ سے معروف و راز و نیاز تھے، جس کے سامنے سوگند اور گواہ کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔

عربی زبان میں ایک لفظ "حنین" ہے جس کے معنی کسی کے شوق میں بے قراری کے ہیں۔ مجذوب صاحب مجسم اشتیاق اور سراپا شوق تھے۔ کام میں ہوں، سرکاری کام میں ہوں، خالی بیٹھے ہوں یا انجمن میں ہوں، لو ایک ہی لگی رہتی تھی۔ مجذوب نہ تھے "استن حنانہ" تھے۔ انھوں نے خود کہا تھا ع

محوِ فرقت میں ہوں میں استنِ حنانہ ہوں میں

"استن حنانہ" مسجد نبویؐ میں ایک درخت کا تنا تھا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وعظ فرماتے اور خطبہ دیتے وقت سہارا لیا کرتے تھے۔ پھر مسجد نبوی میں منبر بن گیا اور آپ اس پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے۔ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی جدائی درخت کے اس تنے کو بہت شاق گزری اور لوگوں نے اس لکڑی سے "حنین" — رونا سنا۔ اشتیاق بھی ایسا ہی تھا اسی لیے اس کو استن حنانہ یا نالہ کناں ستون کہا جاتا ہے۔

مجذوب صاحب تھے بھی ستون کی طرح دراز قد۔ "استن حنانہ" کی تشبیہ ان کے ظاہر و باطن دونوں کے عین مطابق تھی۔

مجذوب صاحب جب اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز ہو کر لکھنؤ میں متعین ہوئے تو ان کا قیام ڈاکٹر رضا شریف کے ہاں رہا، جو ہمارے اور ان کے گھروں کے درمیان صرف ایک سڑک حائل تھی، یہ ہمیں معلوم رہا اور نہ ہم نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کب سے ہمارے پڑوس میں تھے لیکن ہم نے میں پہلے پہل ان کا، ان کی شاعری اور ان کی والہانہ زندگی کا ذکر اپنے ایک بزرگ کی زبانی سنا جو ایک دوسرے بزرگ سے ذکر کر رہے تھے اور میں اپنے مطالعہ میں نحو میر یا فصول اکبری کا سبق پڑھنے بیٹھا ہوا تھا۔

انھوں نے کہا، سڑک پر ایک ہجوم دیکھ کر میں اس کی طرف بڑھا تو دیکھتا کیا ہوں کہ مجذوب صاحب کھڑے جھوم جھوم کر اور رقص کر کر کے گا رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر چونکے اور بولے "آئیے آئیے آپ حضرات اہل علم ہیں"۔ میں قریب چلا گیا۔ وہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک کبھی اس غزل کے اور کبھی اس غزل کے اشعار بلا لحاظ ترتیب سناتے رہے۔"

عجیب و غریب تعارف تھا یہ، سڑک پر ایک آدمی بھرے راستے، یہاں یہ تربیت ہوئی تھی کہ اکیلے سڑک پر نہ جاؤ، کسی سے سڑک پر بات نہ کرو، شیروانی کے بغیر گھر سے قدم نہ نکالو، سودا خود نہ خریدو وغیرہ وغیرہ۔ بڑا زبردست تضاد تھا ہماری معاشرت اور اس شاعر کے طور طریقوں میں۔ ایک دور سا اشتیاق ایسے آدمی سے ملنے کا، اس کی شاعری کے شوق میں نہیں، ہم اس عمر اور تحریر کی استعداد رکھتے کہ شاعری کی سمجھ بوجھ ہوتی ہے، اس عجیب و غریب شخصیت کو دیکھنے کی لگن ضرور ہوئی۔ جب یہ معلوم ہوا کہ آج رات کو وہ آئیں گے اور ایک نشست ہوگی تو ہم خوشی سے جھوم گئے۔ گرمی کا موسم تھا، مجذوب صاحب آٹھ ساڑھے آٹھ بجے رات کو آگئے۔ ہم کو سبق یاد کرنے اور مطالعہ دیکھنے کے بعد ہی اجازت ملی تو لپک کر مجذوب صاحب کو دیکھنے پہنچ گئے۔

دیکھا کیا، گورا چٹا، لمبی سفید داڑھی والا آدمی، سر پر دو ساجھوں والی چوگوشیہ ٹوپی، پہنے شیر گاؤں کا انگرکھا جس میں داہنے سینے سے متصل گھڑی اور قلم وغیرہ رکھنے والی جیب، یہ لکھنؤ کے خوش پوشاکوں کے ذوق پر ہمیشہ بار رہی۔ آستینوں اور دامنوں میں بیل لگی ہوتی۔ تخت پر بیٹھے دونوں ہاتھ اٹھائے اپنے پانوں جھوم جھوم کر ایسے انداز میں شعر پڑھ رہے تھے کہ شاعر کے ساتھ سامعین بھی جھوم رہے تھے یا کبھی جھنجھوڑ رہے تھے۔ ہم لوگ سب ملا کر دس بارہ سننے والے ہوں گے جن میں زیادہ تعداد طالب علموں کی ہوگی۔ مجھ سے دور سب سے پیچھے ایک پلنگ پر بیٹھا میں پنسل کاغذ لیے لکھ رہا تھا اشعار نوٹ کرتے ہی سوچا کہ جس شعر کی زیادہ تعریف ہو اس کو لکھوں —— مگر ایک شعر بھی ایسا نہیں تھا جس پر اہل علم سامعین نے جی کھول کر تعریف

شکل ہو کر رہ گئی۔ رسمی تعریف اور واقعی تعریف کا فرق میں اسی وقت سمجھ سکا تھا۔

مجذوب صاحب پڑھ رہے تھے:۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی ——— اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی
دل میں داغوں کی کثرت ہو گئی ——— رونما اک شانِ وحدت ہو گئی
یاس ہی اب دل کی خلوت ہو گئی ——— آرزو جو کی وہ حسرت ہو گئی
سوگ ہے یہ کس کی رحلت ہو گئی ——— بزمِ ماتم بزمِ عشرت ہو گئی
پڑ گئی تھی ان پہ بھولے سے نظر ——— بات اتنی سی قیامت ہو گئی
ایسی ضد کا کیا ٹھکانا سب بجا ——— بات جو کہہ دی وہ قسمت ہو گئی
جی رہا ہوں موت کی امید میں ——— مر ہی جاؤں گا جو صحت ہو گئی
رنج دینے سے وہ باز آئے خوب ——— جب کہ غم کھانے کی عادت ہو گئی
خاک میں کس نے ملایا یہ تو دیکھ ——— شکر کر یہ بھی سعادت ہو گئی

کر چکے رندی میں اے مجذوب تم
ایک مجلس میں یہ حالت ہو گئی

یہ تو ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا سب ہی اشعار ایک درجے کے نہیں یا سب بلند پایہ اشعار نہیں کہے جا سکتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب مجذوب صاحب خود سنا رہے ہوں تو پڑھنے سننے والے کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس کیفیت میں جذب ہو کر جو خود مجذوب صاحب پر طاری رہتی تھی ایک ایک شعر پر سر نہ دھننے لگے۔

ذرا اے ناصحِ فرزانہ اپنا کر سن تو وہ باتیں
نہ ہوگا پھر بھی تو مجذوب کا دیوانہ دیکھوں گا

مجذوب صاحب کے پڑھنے کا بالکل نرالا انداز تھا ٹھیک وہی جس کی طرف میر سوز کے تذکرے میں شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

> "انھوں نے (میر سوز نے) علاوہ شاعری کے شعر خوانی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ جس سے کلام کا لطف دوچند ہو جاتا تھا۔ شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے اور لوگ بھی نقل اتارتے تھے مگر وہ بات کہاں؟ آواز دردناک تھی۔ شعر نہایت نرمی اور سوز و گداز سے پڑھتے تھے اور اس میں اعضا سے بھی مدد لیتے تھے۔ مثلاً شمع کا مضمون باندھتے تو پڑھتے وقت ایک ہاتھ سے شمع اور دوسرے کی اوٹ وہیں فانوس تیار کرکے بتاتے۔ بد دماغی یا ناراضی کا مضمون ہوتا تو خود بھی تیوری چڑھا کر وہیں بگڑ جاتے۔"

آگے چل کر میر سوز کے بارے میں آزاد نے جو بات لکھی ہے وہ ہے جو مجذوب صاحب کے بارے میں میرے دل میں تھی مگر مجھے اس مفہوم کے اظہار کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے تھے آزاد لکھتے ہیں:

"ہم تو خیال کر کے دیکھیں تو ان کے اشعار اپنے پڑھنے کے لئے حرکات و انداز کے طالب ہیں۔"

مجذوب صاحب کے اشعار، حرکات و انداز نے کہاں تک مطالب میں داخل کیے ہیں یہ بحث طلب مسئلہ ہو لیکن ان کے حرکات و انداز سے شعر کا اثر یقیناً دوچند ہو جاتا تھا، یہ تجربے کی بات ہے۔

ایک دفعہ حضرت جگر مرادآبادی نے مجذوب صاحب کے ایک مجموعۂ کلام کے بارے میں بالکل یہی بات مجھ سے کہی۔ انھوں نے مجذوب صاحب کو مولانا مجذوب کہہ کر یاد کیا اور کہا: "دیکھیے ان کا یہ مجموعۂ کلام کیسا بے جان نظر آ رہا ہے، اصل بات یہ ہے کہ مولانا کے اشعار میں مولانا کے حرکات اور ان کی بے چینی کو جب تک شامل نہ کیا جائے صحیح معنوں میں ان سے لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا۔"

اشعار سنانے میں مجذوب صاحب کو میں نے بیہوش ہوتے یا غش کھاتے تو نہیں دیکھا جس طرح بقول مولانا آزاد میر سوز نے ایک خاص موقع پر عجیب انداز سے حسب ذیل قطعہ پڑھا۔

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے   سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفلِ پری رو   ارے رے رے رے رے رے رے رے رے رے

یہ مصرع پڑھتے پڑھتے وہیں زمین پر گر پڑے گویا پری زادوں کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہو گیا ہے اور ایسے نڈھال ہوئے کہ ارے رے رے کہتے کہتے غش کھا کر بیہوش ہو گئے۔

لیکن مجذوب صاحب کے حرکات و سکنات تھے کچھ اسی طرح کے۔ غزل سنا رہے تھے "کہیں ہوتی" "نہیں ہوتی" جب یہ شعر پڑھا۔

جتا دے ہم نشیں ہر چند رکھنی چشمِ گریاں پر
کبھی یہ آستیں ہوتی کبھی وہ آستیں ہوتی

تو پہلے داہنی آستین چشمِ گریاں پر رکھ لی، پھر گویا ہم نشیں نے ہاتھ جتا دیا تو بائیں آستین اس کی جگہ رکھ لی۔

ایک دفعہ یہ شعر پڑھا۔

بس بھی دو، ہنس بھی دو، ہاں ہاں چلو بس روٹھ چکے
اب ہنسے اب ہنسے دیکھو وہ ہنسی آئی ہے

"دیکھو وہ ہنسی آئی ہے" جب بھی کہا اس طرح کہا کہ جس کی طرف انھوں نے اشارہ کیا اس کو ہنسی آ کے رہی۔

انھوں نے جب سنایا۔

کسی کی یاد میں بیٹھے جو سب سے بے غرض ہو کر
تو اپنا بوریا بھی پھر ہمیں تختِ سلیماں تھا

تو اپنی نشست بھی اس طرح اکڑ کر بیٹھ گئے جیسے واقعی تختِ سلیماں پر بیٹھے ہیں۔

یا جب یہ شعر پڑھا۔

اٹھاؤں گا نہ زانو سے میں ہرگز اپنا سر ہمدم
ارے میں اپنی آنکھوں سے انھیں جاتا نہ دیکھوں گا

تو اس قدر جھک گئے کہ واقعی سر بہ زانو نظر آنے لگے۔

مجذوب صاحب کی یہ پہلی نشست تھی ہمارے یہاں۔ میں سامع سے زیادہ "منشی" بن کر اس میں شریک ہوا تھا۔ وہ تو ہر شعر دو تین بار پڑھتے تھے اور بیشتر اشعار ان سے بار بار پڑھوائے جاتے۔ مجھے نقل کرنے میں کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ ۹ بجے رات سے مجذوب صاحب نے سنانا شروع

کیا تھا، نہ وہ سنانے سے تھکے اور نہ سننے والے سننے سے۔ ظہر کی نماز کے وقت بادلِ ناخواستہ محفل برخاست ہوئی اور سننے والے ایک تشنگی لے کر اٹھے۔

محفل برخاست ہونے کا مطلب پڑھنے والے جو سمجھے وہ قطعاً صحیح نہیں ہے۔ مجذوب کی محفل نرالی شان سے برخاست ہوتی تھی مثلاً ظہر کی اذان ہوئی سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے کہ نماز کی تیاری کریں، مجذوب صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے مگر گنگناتے اور شعر سناتے ہوئے زینہ اتر رہے ہیں اور شعر سنا رہے ہیں، گھر سے نکل رہے ہیں اور گھوم گھوم کر شعر سنا رہے ہیں، کچھ لوگ چلے اور باقی لوگ ان کی مشایعت کو تھوڑی دور گئے۔ مجذوب صاحب شعر سناتے چلے جا رہے ہیں اور اگر سڑک پر ہیں تو راستے میں کھڑے ہو جائیں گے اور سناتے رہیں گے۔ مشایعت کرنے والوں کو ان کے اشعار کشاں کشاں ان کے گھر تک پہنچا دیں گے۔ جب ان کے گھر کا دروازہ کھلے مجذوب صاحب سناتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ گھڑی دیکھ کر ایک دفعہ زور سے "استغفراللہ" کہیں گے گویا نماز کا وقت تنگ ہوتا جا رہا ہے اور جلدی جلدی اپنے مکان کے زینے پر چڑھ جائیں گے۔ اس طرح محفل برخاست ہوتی تھی، ایک دو بار کی بات نہیں ہے ہمیشہ۔ یہ بھی ہوا ہے کہ مجذوب صاحب کو سکون نہیں ہوا ہے بےچینی اور اضطراب کا عالم طاری ہے دیکھا نماز ظہر کے بعد پھر گنگناتے چلے آ رہے ہیں اور پھر ان کی صدا پر یا اطلاع پر ہر طرف سے لوگ لپک لپک کر آ رہے ہیں۔ بقول مجذوب صاحب کے ؎

آ رہے ہیں ہر طرف سے طالبانِ دردِ دل!
میری آہ و فغاں ہے یا اذانِ دردِ دل؟

یہ تو آٹھ نو گھنٹے کی نشست تھی ایک دفعہ لگاتار دس گھنٹوں کی نشست ہوئی جس میں نماز اور کھانے چائے کے علاوہ کوئی وقفہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد بھی یہی محسوس ہوا کہ نہ سنانے والا تھکا اور نہ داستان مکمل ہوئی۔

دس گھنٹے کی نشست فرنگی محل کے ایک قدیم متوسل قاضی وحید الدین صاحب کے یہاں سترکھ ضلع بارہ بنکی میں ہوئی تھی اور سب لوگ لکھنؤ سے لد پھند کر وہاں پہنچے تھے۔

قاضی صاحب کے ایک قدیم ملازم نے گھر والوں اور مہمانوں کا برا حال دیکھا کہ نہ کھانے کا ہوش ہے نہ سونے کی فکر بس ایک بیٹھا گا رہا ہے اور سب میاں لوگ ہجوم کیے ہیں تو اسے عجیب معلوم ہوا اس نے بڑی حیرت سے کہا "ایک سٹری تو خیر سے رہا ہی، اس کے ساتھ سب میاں لوگ کاہے کو یوں سٹری ہو گئے"

مجذوب صاحب چاہے ایک گھنٹہ سنائیں یا دس گھنٹے سب کچھ زبانی سنایا کرتے تھے۔ ان کو سارا کلام حفظ تھا، نہ بیاض کا جھگڑا نہ نوٹ بک کی قید، یہ بات پہلے پہل میں نے مجذوب صاحب ہی میں دیکھی اس کے بعد جگر صاحب کو دیکھا کہ وہ جو کچھ سناتے ہیں زبانی سناتے ہیں خواہ کتنی ہی لمبی غزل ہو۔

مجذوب صاحب کبھی ایک دفعہ میں کوئی غزل پوری نہ سنا سکے، ایک غزل سناتے سناتے کوئی اور شعر کسی وجہ سے یاد آ گیا وہ سنایا اور اسی غزل پر چل نکلے، بیچ میں یاد آ گیا یا کسی نے یاد دلا دیا کہ فلاں غزل ہو رہی تھی تو نادم ہوئے اور سابقہ غزل کی طرف پلٹ گئے۔ یہ سب ان سے اضطراراً ہوتا تھا۔

غزل ہو رہی تھی ؎

یہ نالہ کس کا ہے یہ آوازِ حزیں ہے
دیکھیں کہیں مجذوب غزل خواں تو نہیں ہے

اس اثنا میں چائے آ گئی چھوٹے چھوٹے حسین فنجانوں میں، مجذوب صاحب بے قرار ہو گئے، غزل پھر چھیڑ کر گانے لگے، اب جو شعر انھوں نے

پڑھا وہ دوسری غزل کا مطلع تھا اور بے پناہ مطلع ؎

آ گئیں یاد وہ آنکھیں مجھے پیمانوں سے
غم ہرا اور ہوا عیش کے سامانوں سے

پھر اسی غزل پر چل دیے ؎

اجنبیت نہیں دل کو ترے بیگانوں سے — کچھ وہ گھل مل گئے ایسے مرے ارمانوں سے
یا تو ہم کو بھی اجازت ہو نہیں ہو یہ کرم — اس تصور کو بھی روکا ہے دربانوں سے
شوق سے مٹھیاں بھر بھر کے مجھے مٹی دی — آج تو لاد دیا آپ نے احسانوں سے

کس قدر پُرجوش ہوا ہوتا ہے پُر درد کلام
پڑھیے "گفتۂ مجذوب" کے دیوانوں سے

ابھی "گفتۂ مجذوب" کے دیوانے جوشِ رہائی کی کارفرمائی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ مجذوب صاحب پہلی غزل کی طرف لوٹ گئے اور ایک نیا مطلع سنایا ؎

اک عمر سے الجھن میں مری جانِ حزیں ہے
یہ بھی ہے کوئی بات کہ "ہاں" ہے نہ "نہیں" ہے

اسی غزل میں انھوں نے کہا تھا ؎

اف کشمکشِ حسن ہیں کیسی مری آنکھیں
کھب جاتا ہے نظروں ہی میں ذرا بھی جو حسیں ہے

درحقیقت مجذوب صاحب حسن کے دیوانے تھے۔ انسانوں سے لے کر جانوروں تک، جہاں بھی انھیں حسن کا جلوہ نظر آتا وہ آپے سے باہر ہو جاتے۔

ایسی ہی ایک محفل میں مجذوب صاحب کی سحری کے لیے آم لائے گئے۔ عشاء کے بعد سے گیارہ بجے رات تک وہ مولانا قطب میاں صاحب مرحوم کے یہاں سناتے رہے تھے۔ دوسرے دن مجذوب صاحب کو روزہ رکھنا تھا۔ گھر جا کر سحری کرتے۔ قطب میاں صاحب مرحوم نے اپنے یہاں انتظام کیا کہ تھوڑی دیر اور مجذوب صاحب کا سننا سنانا جاری رہے۔ بمشکل راضی کیا گیا، پھر مجذوب صاحب رضامند ہوئے۔ تھوڑے سے آم بھی تھے تروتازہ، خوش رنگ اور سڈول۔ بس مجذوب صاحب بے چین ہو گئے اور جب آم پر چاقو چلا تو انھوں نے منہ پھیر لیا۔

اسی وقت انھوں نے برملا حسن پرستی کے "جرم" کا اقرار کیا۔ کہنے لگے "میری چار پانچ مہینے کی ایک بچی ہے گوری گوری، خوبصورت، نرم نرم ہاتھ پاؤں، اس کو گود میں لے کر ایک عجیب طرح کا جوش ہوتا ہے یعنی اس کے چھوٹے چھوٹے بدن کو منہ میں لے کر دانتوں سے خوب چباؤں۔"

انسانی بدن کو دانتوں سے چبانے کا تصور بہت کریہہ ہے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ وفورِ رغبت کے اظہار میں "لب و دنداں" کی سرگرمیوں کا کتنا دخل ہوا کرتا ہے۔

مجذوب صاحب نے نفسیات، جنسیات، اشارات، کنایات کسی کا بھی سہارا لیے بغیر جذباتِ محسوس کی ترجمانی کر دی مگر اس طرح انھوں نے اپنی پوری شخصیت کو بے نقاب کر دیا۔ ایسی شخصیت کے لیے ایک ہی جامع لفظ ہے یعنی "حسن پرست"۔ وہ بلا کے حسن پرست تھے مگر غضب کے محتاط۔ کہتے ہیں ؎

حسن پسند پاک ہے دل [illegible] — وہ بہ جمال کے سوا کچھ مدعا نہیں

عشق والوں سے وہ دور رہنے کی پوری کوشش کرتے تھے مگر عشق کی بے حجابیاں انھیں تنگ کر کے پریشان رکھتی تھیں۔ معلوم کتنی بار انھوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے ؎

مجھے پڑھتے ہیں یہ عادت اگر بنا دیں مجھ کو　　نہ دیکھیں گے نہ دیکھیں گے کبھی کوئی حسیں مجھ کو
جہاں گردن اٹھی دیکھا نظر کوئی حسیں مجھ کو　　بس اب ہر دم نگہ رکھنا ہے سوئے زمیں مجھ کو
یہ جنت گوشہ گیری اب لے صحرا ہو دیں مجھ کو　　اٹھا لے آسماں مجھ کو کہ نگل جائے زمیں مجھ کو

یا ؎

پڑے اُف نرگس حسینوں سے پالا　　وہ معصوم نظریں وہ منہ بھولا بھالا
بلا ہی ہے دردِ محبت ! دہائی !　　ارے مار ڈالا ! ارے مار ڈالا

ایک دوسری غزل میں کہتے ہیں ؎

آتا ہے نظر حسن ہی جاتے ہیں جدھر ہم　　کیا پھوڑ لیں اب آنکھیں ہی اپنے حسن نظر ہم
اف پڑ ہی گئی اک بت کافر پہ نظر آج　　رکھتے تھے ابھی اس سے بچا کر ہی نظر ہم

ایک صاحب نے پوچھ لیا "یہ کون بت کافر" ہے۔ فوراً ہی مجذوب صاحب نے دوسرا شعر پڑھا ؎

اتنی تو خبر ہے کہ کوئی ہوش رُبا تھا　　دیکھا نہیں کچھ اس کے سوا اور خبر ہم

اسی غزل میں ایک شعر ہے ؎

در پردہ کوئی پردہ نشیں دیکھ رہا ہے　　اب حور بھی آ جائے تو ڈالیں نہ نظر ہم

محترم مولانا عبدالماجد دریابادی تشریف فرما تھے۔ سنتے رہے یا سنا کیے بڑی بات ہے۔ مولانا کی غیرت دینی [illegible] بھی گرفت کے بغیر جس میں دریا باقی تھی۔ وہ جس مرحلہ سے گزر کر آئے تھے غالباً اس کا فطری نتیجہ تھا کہ سخت قسم کا تقشف ان کا نگہبان بن جاتے۔ ہم فرنگی محلیوں کا مسلک ہو کر سماع، عرس اور زیارت قبور کے لئے شد رحال وغیرہ بھی ممنوع نہیں۔ غرض مولانا عنایت اللہ صاحب [illegible] اور مولانا دریابادی میں کچھ شعر و شاعری کے حضرات پر نوک جھونک ہو رہی تھی۔ مجذوب صاحب نے جب کہا: "اب حور بھی آ جائے تو ڈالیں نہ نظر ہم" مولانا عنایت اللہ صاحب نے تعریف کرتے ہوئے مولانا دریابادی سے پوچھا، مولانا عبدالماجد صاحب نے جواب میں فرمایا "بے شک اس میں اللہ کی ایک بڑی نعمت کا استخفاف تو پایا ہی جاتا ہے" استخفاف کے لفظ نے جو میرے کانوں کے لئے نیا تھا مولانا کا پورا جملہ ذہن نشین کر دیا۔

مجذوب صاحب خود راوی تھے کہ وہ اپنی موٹر پر جا رہے تھے حسبِ عادت متوسط رفتار سے خود ہی ڈرائیو کرتے ہوئے، پیچھے سے زور زور سے ہارن بجا اور ایک موٹر تیز رفتاری کے ساتھ ان کے داہنے سے نکل گئی۔ تیز رفتار موٹر کی چلانے والی ایک فیشن ایبل خاتون تھیں اور شاید انھوں نے دنیا اور صورت والے مجذوب کو [illegible] سمجھ کر [illegible] پہ چلتے چلتے آنکھیں بھی نکالیں۔ بس مجذوب صاحب اس ادا میں گم ہو گئے اور فرمایا ؎

اس ناز سے اس شان سے اس تیز روی سے
گزرو گے تو دنیا ہی سے جائیں گے گزر ہم

[illegible] جس پر مجذوب صاحب کا [illegible] میں تمام [illegible] ہے [illegible] حضرت مخدوم شاہ مینا [illegible] علاوہ لکھنؤ سے متعلق ہے۔ [illegible] ہر مہینے دھوم دھام کی زندگی اس وقت بھی ہوتی تھی اور آج بھی ہوتی ہے۔ [illegible] کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں [illegible]

اور مزار کی سہ بالا نشینان ملکانی فضاؤں میں شریک ہوا کرتی ہیں۔ ہر جمعرات کو عام طور پر اور خصوصی جمعرات کو تو اس کے بعد شام ہی سے شہر یار و دھوم کا گیا آب و تاب اور تمام جمال کے ساتھ اس سڑک سے مزار شریف کی سمت جاتی نظر آتی ہے۔ مجذوب صاحب نے اسی غزل میں ایک شعر ایسے ہی ایک موقع کے لئے کہا تھا ؎

ہم بھی ہیں اک سر راہ کھڑے آج حسینو!
ہر ٹولی کے نظارہ کو لگا دیں گے نظر ہم

ایسے شوخ اشعار مجذوب صاحب کی چلبلی طبیعت نے بہت سے کہے ہیں۔ اسی غزل کا ایک مطلع ہے ؎

جانے تو نہیں دیں گے اب آپ کو حرم ہم — شب آئے تجلی کی نگاہیں گے کرم ہم
پیری میں حسینوں سے نگاہیں تو لڑا کیں — دنیا یہ مگر ڈال ہی بیٹھے ہیں نظر ہم

یہ شوخی ان کی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی جس کی لگام مجذوب صاحب خود بھی کھینچے رہتے تھے اور جب منہ زوری زیادہ کرنے لگتی تھی تو خود اپنے مرشد مولانا تھانوی کو اس کیفیت کی اطلاع کرتے تھے وہاں سے مناسب ہدایتیں آ جاتی تھیں جن پر مجذوب صاحب عمل پیرا ہو جاتے تھے وہ زمانہ ان کے لئے سخت مصیبت اور کشمکش کا ہوتا تھا۔ مرشد کی ایک ہدایت کا علم دوسروں کو بھی ہو جاتا تھا، یعنی ان کو شعر خوانی کی ممانعت کر دی جاتی تھی۔ دوسروں کے لئے یہی ممانعت مصیبت سے کم نہ ہوتی، لوگ طرح طرح سے اصرار کرتے تھے اور مجذوب صاحب خاموش رہتے۔ لیکن یہ کہتے جاتے تھے کہ "آپ لوگوں کو کیا علم، یہاں دل پر چھریاں سی چل رہی ہیں"۔

ایک دفعہ یہی "توبہ" کا زمانہ چل رہا تھا۔ سب لوگ سنانے کا تقاضا کر رہے تھے کہ ایک صاحب نے جلیل کا شعر پڑھ دیا ؎

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

مجذوب صاحب بے قابو ہو گئے۔ توبہ ٹوٹتے ٹوٹتے بچی مگر انہوں نے ضبط کیا اور اٹھ کر چل دیئے۔ یہ صبح کی بات تھی شام کو جو آئے تو جھومتے اور رقص کرتے نئی غزل کے ساتھ ؎

زاہدوں پر سے اچھالی جائے گی — جان ان مردوں میں ڈالی جائے گی
شیخ پینے کا ارادہ تو کرے — خوش کوزے سے منگا لی جائے گی
اور آ نکلیں جو [illegible] — اس میں بوتل بھی چھپا لی جائے گی

۳۰، ۴۰ اشعار اس غزل کے شام تک ہو گئے تھے اور اس انداز سے انہوں نے سنائے جیسے کہیں سے رسی تڑا کر بھاگے ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجذوب صاحب عام شاعروں کی طرح شعر گوئی میں ریاض کرنے کی زحمت میں کبھی نہیں پڑے۔ ایک ابال کی طرح ان کے جذبات ابلتے اور موزوں قالب اختیار کرتے چلے جاتے تھے۔ کبھی کبھی جذبات کا دھارا اتنا تیز ہوتا کہ ایک زمین میں ڈیڑھ سو دو سو شعر تک کہہ ڈالتے تھے اور پھر انتخاب سناتے چلے جاتے تھے۔ مگر ان کی جو غزلیں تو مجھے یاد ہیں جو ڈیڑھ سو دو سو اشعار کی ہیں، ایک میں دس مطلع ہیں اور دوسری غزلوں میں بھی بیس سے اوپر مطلع کہے ہیں۔

دس مطلعوں والی غزل کا پہلا مطلع ؎

اب بھی مجذوب پہ حسرت دم پیری باقی ہے
کیا جنوں میں ابھی اکسیر ہستی باقی ہے؟

آن کہنے والا اور اس قدر بے تکلفی کے ساتھ سنانے والا مجذوب عام محفلوں سے اور خصوصاً ان تقریبوں سے جو اس کے اعزاز میں کی جائیں دور بھاگا کرتا تھا، اپنا اعزاز وہ کسی طرح پسند نہیں کرتے تھے کہتے تھے ـــ

ہم خاک نشینوں کو نہ مسند پہ بٹھاؤ
یہ عشق کی توہین ہے اعزاز نہیں ہے

سرکاری اعزاز کا جو "خان صاحب" کے خطاب کی شکل میں ملا تھا خود انہوں نے مذاق اڑایا ـــ

ہم تھے خواجہ صاحب اب ہم خان صاحب ۔۔۔ یوں ہی خاک ہوئی گھٹتی شان صاحب

ایک خان بہادر دوست کو خطاب ملنے پر لکھ بھیجا ـــ

کیا شان دکھاتے ہو تم اے خان بہادر ۔۔۔ تم خان بہادر ہو ہم ایمان بہادر
شاباش ہے شاباش ہے اے خان بہادر ۔۔۔ دنیا پہ کیا دین کو قربان بہادر

محفلوں سے گریز کی ایک وجہ تو ان کی بے قیدی و بے تکلفی طبیعت تھی دوسری وجہ ایک واقعہ کے بعد ظاہر ہوئی یعنی دوسروں کے ہاں کا کھانا کھانا وہ اس احتیاط کے پیش نظر جو اکل حلال کے پابندوں کے لئے ضروری ہوا کرتی ہے مجذوب صاحب پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجذوب صاحب اودھ کے ایک مسلمان تعلقدار کے یہاں زبردستی پہنچا دئے گئے جہاں انہوں نے مجبوراً کھانا بھی کھا لیا، رات بھر کی شعر خوانی کے بعد جب وہ واپس ہونے لگے تو ایک صاحب سے انہوں نے پوچھ لیا کہ تعلقدار صاحب کی آمدنی میں کوئی ناجائز ذریعہ تو شامل نہیں ہے، اطمینان دلا دیا گیا کہ وہ سود وغیرہ نہیں لیتے ہیں، جزئیات تک مجذوب صاحب نے پوچھ ڈالے اور جب یہ معلوم ہوا کہ لگان وغیرہ کی وصولی میں ان تعلقدار صاحب کے یہاں بھی عام زمینداروں اور تعلقداروں کی طرح کاشتکاروں پر ظلم کیا جاتا ہے تو مجذوب صاحب نے سب کی نظروں سے بچ کر گرم پانی کرا کے غسل خانے میں استفراغ کیا اور جب اطمینان ہو گیا کہ رات کی غذا کا کوئی ذرہ معدے میں باقی نہیں رہا ہے تو ہلکان ہو کر بستر پر پڑ گئے۔ اس ہلکان کا علم دوسروں کو بھی ہوا اور بڑی دیر میں ہلکان کا راز کھل پایا۔

یہ تو مجذوب صاحب کے لئے معمولی واقعہ تھا، کمال تو یہ کیا انہوں نے کہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد مل بھی گئی ان کو ڈپٹی کلکٹری کچھ دنوں اس عہدے کو جو آج سے پچاس سال قبل بادشاہی کے مترادف تھا انہوں نے گوارا کیا، اس کے بعد استعفیٰ داخل کر دیا، کیوں؟ اس لئے کہ اس ملازمت میں قانون شریعت کے خلاف دوسرے قوانین کے تحت انہیں فیصلے کرنے پڑتے تھے۔

ان کی خدمات حکومت یو۔ پی نے محکمہ تعلیمات کو منتقل کر دیں جہاں ان کے ابتدائی عہدے کی تنخواہ ڈپٹی کلکٹری کی تنخواہ سے آدھی تھی مگر وہ راضی اور مطمئن تھے۔

آخر میں جب وہ ایک ریجن کے انسپکٹر آف اسکولز ہو گئے اور ایک ہزار کے قریب ان کو تنخواہ ملنے لگی تو اکثر سنایا کرتے تھے ـــ

عیش ہے عزت ہے روزگار ہے ۔۔۔ اور اس دنیا میں کیا درکار ہے
اس جہاں کی نعمتیں بھی ہیں عطا ۔۔۔ اے خدا تیری بڑی سرکار ہے

(۲)

جادہ چوں نبضِ تپاں در تنِ صحرا بینند

(غالب)

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

اثر لکھنوی

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ایم اے، ڈی لٹ، ایل ایل بی چشم بد دور بلا کے ذہین ہیں اور یونیورسٹی کے امتحانوں میں ہمیشہ اول آیا کیے۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ انھیں اردو کا مسیحا اور اسی کے ساتھ اردو کا عاشق شیدا کہنا بے جا نہ ہوگا۔ انھوں نے انگریزی میں تاریخ ادب اردو لکھ کر اردو کو صرف ہندوستان بھر سے نہیں بلکہ غیر ممالک سے روشناس کرایا۔ اردو محض بول چال مخلوط سمجھی جاتی تھی اس کو زبان، بھرپور زبان، انواع و اقسام کے جواہر سے مالا مال زبان تسلیم کرایا۔ مطالعہ کا شوق اس حد پر ہے کہ ان کے گھر میں ہر طرف اردو زبان کی کتابوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں حتیٰ کہ غسل خانہ میں بھی کتابوں کی ایک الماری ہوتی ہے شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

شوق کا یہ حال ہے کہ ایک مرتبہ جب ہم دونوں کا تقرر کانپور میں تھا (سنہ [illegible] یا سنہ [illegible] کا ذکر ہے) مجھے لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں شریک ہونا تھا۔ انھوں نے بھی چلنے کا وعدہ کیا مگر عین وقت پر کسی ضروری منصبی کام نے روک لیا۔ ایک یا دو بجے رات کو دیکھتا کیا ہوں کہ رام بابو صاحب مسکراتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مال گاڑی میں سفر کیا۔ چلنے کا جاگا رات بھر کا جاگا (اس زمانے کے مشاعرے پو پھٹے ختم ہوتے تھے اور واپسی کے وقت یہ اندازہ دشوار ہو جاتا تھا کہ ہم چل رہے ہیں یا نیند میں چل رہے ہیں) یہ تمام زحمتیں گوارا کر کے مشاعرے میں بحیثیت سامع شریک ہونا —— کیا بجز اردو سے عشق کے کوئی اتنی زحمت برداشت کرنا گوارا کر سکتا ہے؟

ان کی اردو دوستی کا مزید ثبوت وہ پیغام ہے جو انھوں نے حال ہی میں راجستھان اردو کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر بھیجا تھا، اس کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

"اردو کی راہ میں جو دشواریاں اور خطرے ہیں ان سے اردو کے بہی خواہوں کو بد دل نہ ہونا چاہیے بلکہ ان سے مہمیز کا کام لینا چاہیے اور اپنے مساعی میں زیادہ مستعدی و انہماک دکھانا چاہیے۔

اردو کو ہندی سے دشمنی یا رقابت نہیں ہے۔ یہ مانتے ہوئے کہ ہندی ہندوستان کی زیادہ آبادی کی زبان ہے اگر اسے عالمگیر ہونا ہے

تو یہ صرف اس حالت میں ممکن ہے کہ اردو اس کی مدد کرے اور شریک کار ہو۔

اردو کو مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ مسلمانوں کی پیداوار نہیں بلکہ ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے۔ عام لوگوں نے اسے پالا پوسا ہے اور دونوں قوموں نے مل کر اسے پروان چڑھایا ہے۔ اردو اسی ملک کی پیداوار ہے باہر سے اس کی کھیپ نہیں آئی۔

لیکن بدلتے ہوئے حالات میں اسے اپنی بقا کے لئے نئے نئے خیالات کو اپنے میں جذب کرنا اور ان کا ساتھ دینا چاہئے۔ خود اپنی بے پناہ طاقت پر بھروسا کرنا چاہئے۔ اس کے پس منظر میں ہندوستانی روایات ہیں۔ اسے عام لوگوں سے علٰحدگی اختیار نہ کرنا چاہئے بلکہ ان سے قریب تر ہونا چاہئے۔ ایسی میٹھی، رسیلی، لچیلی اور کس بل رکھنے والی زبان کو متروک یا تہس نہس نہ ہونا چاہئے۔

اردو کا ادب سمندر ہے جس سے دل کا کنول کھل جاتا ہے۔ اس کا خزانہ بھرا پڑا ہے جس میں موتی، یاقوت، ہیرا، زمرد اور نہ معلوم کتنے رنگوں کے جواہر ہیں۔ ان کو یقیناً تلف ہونے سے بچایا جائے گا۔"

ہندوستان ایک برصغیر ہے اور کافی وسیع ہے جس میں نصف درجن یا اس سے بھی زیادہ زبانوں کے لئے گنجائش ہے۔ ایک زبان کی ترقی کا یہ مقصد نہیں کہ دوسری زبانوں کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ میل ملاپ میں رنگا رنگی ہونا چاہئے۔ اسی طرح حسن اور عشق میں یکجا جو مزہ پیدا ہوتا ہے"

انہوں نے ایک ضخیم کتاب میں یوروپین اور اینگلو انڈین شاعروں کا کلام مع حالات جمع کر دیا ہے جہاں جہاں رہے اعلٰے پیمانے پر مشاعرے کئے چنانچہ بلند شہر کے ایک مشاعرے میں میں بھی شریک ہوا تھا۔

ندرا کے قلمی نسخوں اور تصاویر کا ایک نایاب ذخیرہ جمع کیا ہے۔ وہ ہمیشہ اردو کے متعلق کچھ سوچا یا لکھا کرتے ہیں۔ شعر کے حسن و قبح پر ان کی نظر ایسی پڑتی ہے کہ باید و شاید۔ اردو نہایت صحیح و فصیح بولتے ہیں مگر تحریر میں بجائے اردو کے انگریزی استعمال کرتے ہیں وہ اس لئے کہ افادیت کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جائے۔

لگ بھگ پچاس سال سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور اکثر ملتے رہے ہیں۔ کبھی وہ میرے یہاں آئے کبھی میں ان کے پاس گیا۔ انسان کی حیثیت سے بھی ان کا مثل نہیں۔ شرافت کا پتلا، اخلاق مجسم۔ اس قابلیت اور ہر طرح کے دنیوی عروج کے باوصف رام بابو کو غرور چھو بھی نہیں گیا۔ ہر شخص کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنا اور ملنے جلنے والوں کی بھلائی کی فکر میں لگا رہنا۔ میں نے انہیں آج تک کسی کی برائی کرتے نہیں سنا۔ اگر کسی نے ان کے ساتھ برائی بھی کی تو خاموش ہو رہے کبھی انتقام لینے کا خیال بھی نہ گزرا کبھی حرف شکایت زبان پر نہ آیا۔ ان پر کئی کٹھن وقت پڑے مگر ہمیشہ مردانہ وار مقابلہ کیا اور کیا مجال جو تیور بھی میلے ہوئے ہوں۔ یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہو کہ ان کا کیرکٹر بنانے میں اردو کو کتنا دخل ہے۔

مجھے ناز ہے کہ رام بابو ایسا شخص مجھے دوست نہیں بلکہ اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ میں بھی ان سے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح محبت کرتا ہوں۔ ہم دونوں دل ہی دل میں اس محبت کے مزے لوٹا کرتے ہیں اور جب مل جاتے ہیں تو دونوں کی عید ہو جاتی ہے۔

ان کی کتابیں جو ابھی زیر تصنیف یا پریس میں ہیں ان کی اشاعت سے اردو کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ ہو گا۔ منتخب فہرست درج ذیل ہے۔

(الف) اردو ادب جدید (دو جلدیں) (ب) اشارت و روایت (ج) اردو شعرا کا مرقع مع پیش لفظ (د) منظومات [illegible]

(ہ) اردو اور فارسی کے شاعروں کا کلام بزبان ہندی (و) اردو ادب پر وہ مضامین جو پی ای این میں شائع ہوئے تھے [illegible]

یہ کچھ بھی نہ ہوتا تو ان کی تاریخ ادب اردو انگریزی میں جس کا ترجمہ اردو اور دوسری زبانوں میں ہو چکا ہے ان کو زندگی جاوید بخشنے کیلئے کافی ہے۔

میں بیمار ہوں اور زیادہ محنت نہیں کر سکتا۔ جیسا کچھ اور جتنا کچھ لکھنا چاہتا تھا نہ لکھ سکا جس کا افسوس ہے۔

جگ جگ جیو رام بابو۔ تمہارا بول بالا رہے۔

جوش ملسیانی

پنڈت ہری چند اختر

سنہ ۱۹۳۲ء کا ذکر ہے۔ کپور تھلے کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ لاہور اور دیگر مقامات سے کئی نامور شاعر آئے تھے۔ صدارت کے لئے سر شیخ عبدالقادر مرحوم سے درخواست کی گئی تھی۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا "جوش صاحب آ گئے؟" مشاعرے کے منتظم مولوی ظفر حسین صاحب اشک نے بتایا کہ جوش صاحب نے کسی اور مصروفیت کے باعث معذوری کا اظہار کیا ہے۔ شیخ صاحب نے فرمایا "حیرت ہے کہ یہاں جوش ملسیانی کے بغیر بھی کوئی مشاعرہ ہو سکتا ہے۔ اتنا بڑا استاد اس علاقے میں موجود ہے اور آپ اس کو نہیں بلا سکتے" اشک ایسا موقع شناس بھلا اس صورت حال سے کیوں نہ فائدہ اٹھاتا۔ فوراً تجویز پیش کر دی کہ اجازت ہو تو آپ کی طرف سے پیغام بھیج دیا جائے۔ چنانچہ ایک خاص ایلچی موٹر کار میں روانہ ہو گیا۔

اس وقت جو شاعر شریک محفل تھے ان میں سے کئی ایک کو اپنے علم و کمال اور مقبولیت و شہرت کی بنا پر استادی کا درجہ حاصل تھا اور دو چار حضرات ایسے بھی تھے جن کی "حفظ عزت" کی فکر تنگ مزاجی کی مناسب حدود سے تجاوز کر چکی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ سر عبدالقادر کی طرف سے جوش صاحب کی اتنی "شدید تعریف" اور خلوص بھرے اشتیاق پر کسی ایک پیشانی پر بھی بل نہیں آیا۔ اور پھر جب مشاعرہ کے اختتام کے قریب جناب جوش تشریف لائے تو ان سب کے چہروں سے حقیقی مسرت کا اظہار ہوتا تھا۔

جن لوگوں نے اس سے پہلے جوش کو نہیں دیکھا تھا انہیں کچھ دیر کے لئے مزید حیرت ہوئی ہو گی۔ درمیانے قد کا ایک سیدھا سادہ ادھیڑ آدمی۔ معمولی کپڑے کی گاڑھی قمیض اور دھوتی اور دیسی جوتا، لباس کی وضع قطع خالص دیہاتی، شاعرانہ بناؤ نہ استادانہ تکلف۔ کوئی تکبر نہ حاشیہ بردار، سراپا خلوص و انکسار، انداز میں دیہاتیوں کی سی اخلاص بھری سادگی اور بے تکلفی۔ ہونٹوں پر ہلکا سا مسکراہٹ آمیز تبسم۔ صورت شکل اور لباس کو دیکھو تو زیادہ سے زیادہ ایک سفید پوش دیہاتی کہہ سکیں۔ ہر شخص یوں ملتا ہے جیسے خود اسے بھی اپنے مرتبے کا علم یا احساس نہیں۔ بھلا اس وضع قطع اور انداز میں ناواقف لوگوں کو اس اشتیاق اور تعریف و توصیف کا جواز کہاں نظر آ سکتا تھا جس کا اظہار سر عبدالقادر

نے فرمایا تھا۔

لیکن انہیں کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ مشاعرہ قریب الاختتام تھا۔ دو چار شاعر باقی رہ گئے تھے وہ پڑھ چکے تو جوش صاحب سے درخواست کی گئی۔ یہ مشاعرہ مسلّم الثبوت اساتذہ اور مشہور و مقبول شعرا کی تعداد کے علاوہ کلام کی بلندی اور عمدگی کے اعتبار سے بھی ایک معیاری اجتماع تھا۔ ایک ہی محفل میں اس پایہ کا اتنا کلام آج کل تو کجا ان دنوں بھی بہت کم سننے میں آتا تھا۔ پس اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جب جوش صاحب شعر پڑھنے کے لئے اٹھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ سامعین نہ صرف داد و تحسین کے الفاظ کا ذخیرہ ختم کر چکے ہیں بلکہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے لگاتے لگاتے خود بھی شل ہو گئے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ آنے والے شاعر کی وضع قطع بھی کچھ قابل توجہ نہ تھی لیکن آپ نے ایک رباعی ہی پڑھی تھی کہ سب دوبارہ سنبھل کر بیٹھ گئے اور غزل شروع ہونے تک تو مشاعرے میں گویا ایک نئی روح ایک نیا جوش اور اس کے ساتھ ایک نئی قوت پیدا ہو گئی۔ اب وہ سیدھا سادہ مسکین صورت اور منکسر المزاج شاعر فلکِ سخن کا پُر جلال و صاحبِ سطوت بادشاہ نظر آ رہا تھا۔ دیہاتی سادگی کا مجسمہ نیستانِ شعر میں بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرج رہا تھا۔ ایک قصباتی اسکول کا مدرس پروازِ تخیل اور کمالِ فن کے وہ کرشمے دکھا رہا تھا کہ بڑے بڑے استاد بے خودی کے عالم میں جھوم رہے تھے۔ پنجاب کا ایک دیہاتی گویا دہلی کی ٹکسالی زبان میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا رہا تھا۔ جس پر دہلی اور لکھنؤ والے بھی رشک کریں۔

جن لوگوں کو پہلے حیرت ہوئی تھی وہ اور بھی زیادہ حیرت زدہ تھے۔ فرق یہ تھا کہ پہلے ان کی حیرت شک و شبہ پر مبنی تھی اور اب اس میں عقیدت اور احترام کا اظہار ہو رہا تھا لیکن خود شاعر اس صورتِ حال سے قطعاً متاثر معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ عام سامعین کے علاوہ باکمال شاعروں اور عالی مرتبت استادوں نے بھی بڑی فراخ دلی سے خراجِ تحسین ادا کیا تھا۔ صاحبِ فن اہلِ نظر کی تعریف و توصیف سے فن کار کو قدرتی طور پر خوشی ہوتی ہے۔ چنانچہ جوش صاحب بھی مسرور و مطمئن تھے لیکن اس سے زیادہ یہ کچھ نہیں۔ کسی حرکت کسی انداز میں کامیابی کے نشے، فخر مندی، غرور یا مقابلے کی خواہش کا شائبہ تک نہیں۔ تحسین و آفریں کے غلغلوں میں غزل ختم کر کے پہلے کی طرح مسکراتے ہوئے اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔ جیسے ایک فرض تھا وہ ادا ہو گیا اور بس۔ اقلیمِ سخن کا جلالت مآب پھر وہی مسکین صورت سادہ مزاج دیہاتی تھا گویا جیسے وہ شرم و عجز و انکسار کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے والا قادر الکلام پھر ایک عام کی طرح سیدھے سادے چھوٹے چھوٹے بے تکلف جملوں میں باتیں کر رہا تھا۔

یہ مغالطہ اور تعجب و تحیر جو فقط ظاہر بینوں تک محدود تھا۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ جس ماحول میں جوش صاحب کی تربیت و پرورش ہوئی اور جن حالات میں ان کی زندگی گزری ان کا پورا علم ہونے پر جوش صاحب کے شاعرانہ کمالات ان لوگوں کو بھی ایک معجزہ معلوم ہوں گے جو انہیں ایک مدت سے جانتے اور ان کے کلام اور مرتبے کو پہچانتے ہیں۔

پنڈت لبھو رام صاحب جوش یکم فروری ۱۸۸۴ء کو ضلع جالندھر (پنجاب) کے قصبہ ملسیاں میں پیدا ہوئے۔ دو سال کی عمر میں والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ انہوں نے بیٹے کی تعلیم اور کنبے کی گزر اوقات کے لئے کوئی اثاثہ نہ چھوڑا تھا۔ اس لئے نہایت غریبی اور تنگدستی سے بسر ہونے لگی۔ ۱۲ برس کے بے یار و مددگار یتیم کے کمزور کندھوں پر جو مشقت اور کثیر التعداد ذمہ داریوں کا بوجھ آ پڑا تھا ان کے تصور ہی سے جی بیٹھنے لگتا ہے۔

اس بے کسی اور اقتصادی مشکلات و مصائب کے علاوہ جوش صاحب کو ماحول بھی سخت غیر شاعرانہ نصیب ہوا۔ تیس سال عمر تک ملسیاں میں رہے۔ جسے صرف پنڈت جی کے لحاظ سے قصبہ کہہ دیا گیا ہے۔ پھر ۱۹۱۴ء سے نکودر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہ ملسیاں سے دس میل کے فاصلے پر تحصیل کا صدر مقام ہے۔ نکودر کو اگرچہ بعد میں ہائی اسکول نصیب ہو گیا۔ جس میں پنڈت جی فارسی کے اول مدرس تھے لیکن جوش صاحب

کے زمانۂ طالب علمی میں آپ کے وطن اور آس پاس کے مقامات میں نہ تو تعلیم و تعلم کا کچھ قابلِ ذکر چرچا تھا نہ کسی فرد واحد کو علم و فن میں کوئی امتیازی شان حاصل تھی۔ اور نہ ان کے ہم صحبت اور ہم جماعت طلبہ میں کسی کو شعر و سخن کا ذوق تھا۔ یہ علاقہ کافی زرخیز سمجھا جاتا ہے۔ اور مردم خیز بھی لیکن علم و ادب اور شعر و شاعری کے ساتھ جوش صاحب سے پہلے اسے کوئی مناسبت نہیں رہی۔ زرعی پیداوار کی صورت میں یہاں کی زمین سونا اور لعل اگلتی رہی ہوگی۔ زندگی کے شعبوں میں اس خاک سے بڑے بڑے آدمی اٹھے ہوں گے لیکن اس کے کسی گوشے، کسی خرابے سے کبھی کسی شاعر یا ادیب کا شہرہ ملک بھر تک نہیں ہوا۔ جن لوگوں سے جوش صاحب کو سابقہ پڑتا تھا۔ جن کی صحبت میں ان کا وقت گزرتا تھا جن کی بات چیت اور دل چسپیوں میں انھیں شامل ہونا پڑتا تھا ان کی سرگرمیوں میں شاعری اور زبان دانی اور ادب و انشا کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔ اس طرح کسبِ علم و فن اور وسعتِ مطالعہ کے اسباب اور سہولتیں بھی مفقود تھیں۔ پس ایسے حوصلہ شکن حالات، ادب کش ماحول اور ادیب کش ذمہ داریوں کے باوجود ایک بے سہارا پٹھان عالمِ نیم اگر ایک وسیع النظر معلم، ایک ممتاز و مستند ادیب اور ایک باکمال صاحبِ فن شاعر بن جائے تو اسے معجزہ کے سوا کیا کہا جائے گا۔

اب جوش صاحب کی شاعری کی جگہ ان کی ذات زیرِ بحث آگئی ہے تو چند اور باتیں بھی بیان کر دوں۔ ان کا طالب علمی کا زمانہ مالی اعتبار سے جتنا مصیبت ناک تھا تعلیمی ترقی کے لحاظ سے اتنا ہی خوش گوار رہا۔ حافظے کی قوت بچپن ہی سے زبردست تھی اور قدرت نے ذہن ایسا اچھا عطا کیا تھا کہ درسی کتابوں سے پڑھائی کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ مشکل سے مشکل سبق دو چار بار نظر ڈالنے سے ازبر ہو جاتا تھا۔ چناں چہ آپ محنتِ شاقہ سے کام نہ لیتے تھے اور اس طرح دوسری ذمہ داریوں پر توجہ کے لیے وقت نکل آتا تھا۔ مگر اس کے باوجود جماعت میں اوّل نمبر پر رہتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے امتحان کے دن تھے۔ شام کو کھانا کھانے کے بعد سائیکالوجی کے چالیس صفحے دیکھے اور وہیں لیٹے لیٹے سو گئے۔ صبح اٹھ کر ایک ہم سبق سے کہا کہ ذرا فلاں حصہ کتاب سے میرا امتحان لو۔ وہ سوال پوچھتا گیا اور یہ انھیں الفاظ میں درست اور معقول جواب دیتے گئے جو کتاب میں درج تھے۔ اس طرح آپ ادیب فاضل اور منشی فاضل بن گئے۔ اگرچہ اب ان جماعتوں کے پڑھانے والے جوش صاحب سے بہ سہولت استفادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت روز افزوں ذمہ داریوں میں گھرے ہوئے پریشان حال نوجوان کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ اس سے آپ کے "روزگار" کی سبیل بن گئی اور آپ اردو فارسی کے معلم اور پھر اوّل مدرس ہو گئے۔

مزاج کی سادگی اور بے تکلفی کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ یہ سادگی زندگی کے کسی ایک پہلو تک محدود نہیں بلکہ ساری زندگی پر چھائی ہوئی ہے۔ لباس کی یہ حالت ہے کہ معمولی کپڑے کی سفید پگڑی، سفید دھوتی اور سفید قمیص کو کافی سمجھتے ہیں اور عام طور پر اس سے آگے نہیں بڑھتے۔ سردیوں میں البتہ کمبل اوڑھ لیتے ہیں۔ گلوبند، کالر، نکٹائی اور بٹنوں کا تو ذکر ہی کیا کوٹ پاجامے کو بھی دفتر کی وردی کہا کرتے ہیں لیکن کبھی کبھار موسم کے اعتبار سے معمولی سیدھا سادہ کوٹ پاجامہ بھی پہن لیتے ہیں۔ جوتوں کے زیادہ سے زیادہ دو جوڑے جاڑے کے لیے کافی ہیں۔ وہ بھی سفر میں استعمال ہوتے ہیں۔ بوٹ آج تک نہیں پہنا۔ سر عبدالقادر نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ "اتنی سادگی اس رنگین کلام سے کچھ مناسبت نہیں رکھتی"۔ لیکن جوش صاحب کی رائے یہ ہے کہ

کیف آمد پہ منحصر ہے نشاط
ساز زرنگار کیا معنی

کھانے پینے میں بھی تکلف کو قطعاً دخل نہیں۔ جو کچھ ملا خدا کا شکر کر کے کھا پی لیا۔ بعض لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ شعر و سخن کی محفلوں میں کیف و مستی سے بھری ہوئی شراب کے خم کے خم لنڈھانے والے جوش نے عمر بھر کبھی شراب نہیں پی بلکہ گوشت سے بھی ہمیشہ پرہیز کیا۔ اس کے باوجود احباب کی محفلوں میں نہایت بے تکلفی سے شامل ہوتے اور انھیں کی طرح چہکتے ہیں۔ خود فرماتے ہیں ؎

آ گیا ہے جذبِ دل کو وہ اندازِ مے کشی
رندوں میں رند بھی رہیں دامن بھی تر نہ ہو

لیکن اس اندازِ مے کشی کو ہر شخص کے لیے موزوں نہیں سمجھتے۔ حالات و طبائع کے مطابق نسخے میں تغیر و تبدل بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً جناب شیخ کی جوانی

حالت اور منزلِ مقصود کے پیشِ نظر مشورہ دیتے ہیں کہ ؎

پی لو گے تو اے شیخ ذرا گرم رہو گے
ٹھنڈا ہی نہ کر دیں کہیں جنت کی ہوائیں

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جوش صاحب کسی خانقاہ کے درویش یا مندر کے مہنت ہی کے رہ گئے ہیں۔ اس پریشانیوں اور کلفتوں کی دنیا میں ہر شخص کو کسی نہ کسی وقت "چہ خورد بامداد فرزندم" کے جھگڑے سے فرار اور کسی ذہنی پناہ گاہ کی تلاش ہوتی ہے۔ چنانچہ جوش صاحب نے بھی ایسی مصروفیتوں کے علاوہ ایک شغل بے شغل منتخب کر رکھا ہے۔ شطرنج کھیلنے کا شوق خدا جانے انہیں کب اور کن حالات میں ہوا لیکن رفتہ رفتہ اس کا رنگ انہماک کی صورت اختیار کر کے علاج کی جگہ خود ایک مرض بن گیا۔ بارہا یہ دیکھا گیا کہ ایک صبح سے دوسری صبح تک کھیلتے رہے اور اٹھے بھی تو صرف اس مجبوری سے کہ دنیا اس انہماک کو دیکھ کر کیا کہے گی۔ آپ کا شمار پنجاب کے مشہور و معروف شاطروں میں ہوتا ہے۔ شطرنج کے متعلق ایک بیاض بھی مرتب کی ہے۔ جس میں بہت سے مشکل نقشے حل کئے ہیں۔ شاعری پر بھی اس شوق کا اثر ہونا لازم تھا۔ اکثر اشعار میں شطرنج کی اصطلاحیں اور تشبیہات بڑی خوبی سے استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً

سمجھتے خوب تھے ہم شاطروں کی چالوں کو
مگر نقشہ پڑا ایسا کہ بازی ہار بیٹھے ہیں
شکستِ انجامِ قیس و کوہکن کی ہم کو نہیں دیکھا
بساطِ عشق و الفت پر تو ہم شاطر نکلتے ہیں

ایک جگہ ناصح کی زبان سے فرماتے ہیں۔

مجھ سے جاں باز کو غربت میں ہے بساطِ شطرنج
جو نہ پلٹے کبھی واپس وہ پیادہ میں ہوں

شطرنج کا پیادہ آگے ہی بڑھتا ہے۔ اور مہروں کی طرح پیچھے نہیں ہٹتا۔ پہلے مصرع کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ جاں باز غربت اور بساطِ شطرنج خود ہی مذاقِ سلیم سے دادِ تحسین کا خراج حاصل کر لیں گے۔

عادات و خصائل کے اعتبار سے جوش صاحب قدیم وضع کے دیہاتی بزرگ ہیں۔ مزاج میں تکلف نام کو نہیں خود بے حد مخلص اور خلوص نواز ہیں۔ اور ایسے اشخاص سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ ظاہرداری اور ریاکاری کی مزدوری اور کاروباری صفات سے قطعاً محروم ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بے حد فراخ دل اور مرنجان مرنج ہونے کے باوجود ان صفات کے لوگوں کو سخت ناپسند فرماتے ہیں اور ان کے متعلق اپنے خیالات و جذبات کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ طبیعت میں بغض و شر کے فقدان کے باعث دوستی کا نباہ تو عمر بھر کر سکتے ہیں لیکن دشمنی کی راہ پر تھوڑی دور بھی نہیں چل سکتے۔ کسی میں کوئی خوبی ہو تو اس کی تعریف دل کھول کر کریں گے مگر فضول خوشامد اور چاپلوسی سے سخت نفرت ہے۔ میں نے اصول پرستی اور خودداری کے بڑے بڑے دعویداروں کو ذرا ذرا سی بات کے لئے ذلت کی انتہائی گہرائیوں میں گرتے اور اپنی خودداری بلکہ انسانیت کا خون ہوتے دیکھا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جتنے زور و شور سے اصول پرستی اور آزادیٔ ضمیر کے دعوے کئے جاتے ہیں۔ اتنی ہی ڈھٹائی اور بے حیائی سے ان دعووں کے اصولوں کی مٹی پلید کی جاتی ہے۔ مگر میں جوش جی کے متعلق پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے کسی حالت میں بھی یہ ذلت گوارا نہیں کی۔ اس سے بچنے کے لئے انہوں نے اپنی ضروریات میں انتہائی تخفیف کر لی اور قناعت کو اپنا مذہب بنا لیا۔ اس لئے فرماتے ہیں ؎

وہ گدا ہوں تاجِ شاہی کی نہیں ہے درکار
سر چھپانے کو جگہ ڈھونڈوں ہما کو دیکھ کر

حقہ آپ کا محبوب ساتھی ہے۔ سگرٹ سے نفرت ہے۔ بالعموم سفر میں بھی ایک سفری حقہ ساتھ رہتا ہے۔ مجلس مشاعرہ یا اس قسم کی دوسری تقریبوں کے موقعے پر جبراً قہراً سگرٹ پیتے ہیں۔ اور وہ بھی "ریڈ لیمپ"۔ اچھے اور قیمتی سگرٹ اس لئے پسند نہیں کہ ان میں حقے کا سا لطف بھی نہیں۔ نکودر کی تحصیل میں تقسیمِ ملک سے پہلے تمباکو کی بہت کاشت ہوتی تھی اور یہاں کا تمباکو دور دور تک مشہور تھا۔ آپ کا معمول تھا کہ فصل کے موقعے پر بیسیوں نمونے تمباکو کے منگواتے اور جو سب سے اچھا نکلتا اس کا اسٹاک سال بھر کے لئے خرید لیتے۔

سادہ زندگی میں کفایت ایک عادت سی بن جاتی ہے۔ آپ نہ خود بے جا خرچ کرتے ہیں نہ گھر میں کسی کو بے جا خرچ کرتے ہوئے برداشت کر سکتے ہیں۔ سادہ کپڑے، ماکولات و مشروبات میں انتہا درجے کی سادگی۔ تھرڈ کلاس سے اونچے درجے کا سفر میں نام نہ لینا اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں صرف بے جا سے بچنا آپ کی مخصوص خصوصیات ہیں۔ نکودر سے ملسیان آٹھ میل کا فاصلہ ہے۔ ریل اور موٹر کے ہوتے ہوئے بھی بالعموم پیدل آتے جاتے رہے ہیں۔ اسٹیشن سے گھر تک ایک میل کا فاصلہ ہوگا۔ لیکن سامان نہ ہو تو کبھی تانگے میں نہیں گئے۔

ہم نشینوں میں صاحب علم کوئی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کی صحبت کے فیضان سے ہم نشینوں میں قدرے سخن فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ آپ کے بہت پرانے ہم نشینوں میں سے آپ ہی کے ہم نام ایک حکیم صاحب ہیں جو نابینا ہیں۔ نکودر آپ گھر پر نہ ہوں تو عام طور پر ان کے پاس ملیں گے۔ علمی ادبی اور دنیوی ہر قسم کی گفتگو حقے کے دور کے ساتھ وہاں ہوتی ہے۔

انگریزی نہیں جانتے۔ جوانی کے زمانے میں انگریزی پڑھنے کی کوشش کئی بار کی مگر ہر بار ایک آدھ کتاب پڑھ کر چھوڑ دی۔ پہلی دفعہ تو جج (JUDGE) اور سولجر (SOLDIER) کے ہجوں سے جی بیزار ہو گیا۔ جج میں ڈی اور سولجر میں ڈی خدا جانے کس مصلحت سے ہے۔ دوسری مرتبہ پھر شوق چرایا مگر نائٹ (NIGHT) اور ہاف (HALF) اور نو (KNOW) وغیرہ وغیرہ کے تلفظ اور بے ربطیوں سے پریشان ہو کر رہ گئے۔ پھر تیسری بار احباب کی ترغیب و تحریص سے ایک ابتدائی کتاب شروع کی تو نکودر میں جہاں آپ کا مستقل قیام ہے طاعون پھیل گیا۔ چوتھی دفعہ کوشش کی تو شہر میں انفلوئنزے نے سر اٹھایا۔ یہ منحوس نتائج دیکھ کر کتاب پھینک دی اور پھر اس وہم میں مبتلا ہیں کہ اگر پڑھنا شروع کیا تو خدا جانے کیا قیامت نازل ہو۔

فصیح الملک مرزا داغ کے شاگرد ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ جوش صاحب سے فیض اصلاح پانے والوں کی تعداد بھی بہت ہے۔ حالانکہ آپ اکثر مبتدیوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ شاعری کا طوق آپ کے گلے میں تنگ ہے؟ پنجاب اور یوپی کے بڑے بڑے کہنہ مشق آپ سے مشورہ سخن کرتے رہے ہیں اور کرتے ہیں۔ آپ متروکات زبان کے پابند مگر حسن بیان کے دلدادہ ہیں۔ بیخود، سائل، احسن مارہروی، نوح، یگانہ، حسرت موہانی، اصغر، جوش، حفیظ سب سے آپ کے اچھے مراسم رہے ہیں۔ عمر کا ایک طویل حصہ آپ نے گوشۂ گمنامی میں اس طرح گزارا کہ ایک مشاعرے میں اکابر آپ کا کلام سن کر انگشت بدنداں رہ گئے تھے اور جب آپ نے انشاؔ کی مشہور زمین میں یہ شعر پڑھا

جناب شیخ کی میراث اس میں جا نہیں سکتی
ابھی تو گلشن جنت کے ہم حقدار بیٹھے ہیں

تو [illegible] شیخ بن کر آپ سے بغل گیر ہو گئے۔

یہ بات کہ بے شمار شاگردوں کو فیض پہنچانے کے باوجود آپ نے اپنے قابل فخر صاحبزادے حضرت عرش ملسیانی کو اصلاح کے فیض سے فیض یاب نہیں کیا۔ تعجب خیز ضرور ہے لیکن جوش صاحب کی وضع داری اور مزاج کی نفاست کو دیکھتے ہوئے یہ بات عین قابل قبول ہے۔ آپ جوش صاحب کی شخصیت میں ایک شفیق باپ، ایک باوقار استاد، ایک معزز شہری، ایک نہایت شریف انسان اور شہرت و ناموری کی تلاش نہ کرنے والا شاعر پائیں گے۔ انہیں شاعر کی عظمت کا احساس ہے۔ اس کے ساتھ خود اپنی عظمت کا احساس بھی ضرور ہے۔

انکار کیجئے نہ کمالات جوش سے
کم گو سہی مگر وہ سخن ور ضرور تھا

تلوک چند محروم

جگن ناتھ آزاد

مسلسل چھتیس برس تک سرکاری اور غیر سرکاری ملازمت کرنے کے بعد جب کنٹونمنٹ بورڈ اسکول راولپنڈی کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو انھوں نے اپنے اس طویل عرصۂ ملازمت کا جائزہ ان اشعار میں لیا۔

سی و پنج سال عمرم بملازمت بسر شد —— سحر شباب خود را بہ تیرہ شام کردم
شرفم بجز ہمیں چہ بود کہ در جوانی —— بسگاں ادب محروم بجواں سلام کردم

یہ ہیں ایک شاعر کی مسلسل چھتیس برس کی ملازمت کے تاثرات۔

چھتیس برس —— زندگی کا ایک حصہ —— بسگاں ادب محروم بجواں سلام کردم —— اور اس کے باوجود مسلسل تخلیق فن کا سلسلہ جاری رکھنا بڑی بات ہے۔ چھتیس برس کی اس مسلسل کوشش کا اندازہ ان تنقیدی یا تعریفی مقالات سے نہیں ہو سکتا جو مختلف رسائل اور کتابوں میں والد اور ان کی شاعری کے بارے میں لکھے گئے۔ والد کی زندگی کے وہ گوشے جو ان کے فن کے ساتھ گہرا معنوی ربط رکھتے ہیں اور اس فن میں خوابیدہ ہیں ابھی تک منظر عام پر نہیں آئے۔ میں اس مقالے میں بعض ایسے ہی گوشوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کروں گا۔

والد نے جب میں نے ذکر کیا کہ طفیل صاحب کا خط آیا ہے اور انھوں نے مجھ سے آپ کے بارے میں مقالہ لکھنے کے لئے کہا ہے کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر کہنے لگے کہ میری زندگی میں ایسے واقعات پیدا ہی نہیں ہوئے جنھیں زمانے کے لئے لکھا جائے اور جو واقعات ہیں وہ آج کل کے ہمارے سماج کی کوئی خاص تصویر پیش نہیں کرتے۔ پنجاب کی تحریکوں اور تعصبات کا زمانہ، اسے دہرانا کوئی مستحسن بات نہیں ہے۔ میانوالی اور راولپنڈی کے واقعات تو تمھیں یاد ہی ہوں گے۔ اگر مفتی محمد سعید اور میر شیر محمد جان میری امداد نہ کرتے تو متعصب لوگ میری زندگی ہی دشوار بنا دیتے۔ اب بھی انھوں نے کچھ کم پریشان نہیں کیا۔ اس سے پہلے بھی جب تم بہت چھوٹے تھے مجھے مخالفوں نے مسلسل کئی برس تک پریشان کیا۔ یہ باتیں لکھنے کی تھوڑا ہی ہیں۔

انھوں نے مقالہ نہ لکھنے کی جو وجہ بیان کی وہی میرے لئے یہ چند سطور لکھنے کی وجہ جواز بن گئی۔ پریشان کرنے والے لوگوں میں بعض مسلمان بھی

ہو سکتا ہے تعصب نے پریشان کیا اور اعانت کس نے کی؟ مسلمانوں ہی نے۔ اب ایک غیر مسلم شاعر کی زندگی کا یہ گوشہ پڑھنے والوں کے سامنے کیوں نہ آئے اس سے بڑی وجہ ایک شاعر کی داستان حیات لکھنے کی اور کیا ہو سکتی ہے اور پھر جتنی قدردانی ہوئی وہ کن لوگوں نے کی؟ کیا ان میں سے بیشتر مسلمان نہیں تھے؟ گویا یہ تو تاریخ ادب کا ایک ایسا باب ہے جو آج سے بہت پہلے معرض تحریر میں آجانا چاہئے تھا۔

خوشتر جی والد کا مسکن پیدائش ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے عیسیٰ خیل کی تحصیل میں گاجراں والا نام کا ایک گاؤں تھا جو ان کی جنم بھومی ہے یہ گاؤں اسی زمانے میں دریا برد ہو گیا تھا۔ ہمارا خاندان اپنی تھوڑی بہت کاشتکاری اور معمولی دکانداری کو چھوڑ کر عیسیٰ خیل آگیا اور وہیں آباد ہو گیا۔ والد کی عمر اس وقت پانچ سات برس کی تھی۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میرا بچپن دیہاتی مسلمان بچوں کے ساتھ کھیل کود میں گزرا۔ دریائے سندھ کی ایک شاخ گاؤں کے پاس سے گزرتی تھی۔ موسم گرما میں ہمارا سارا سارا دن اس دریا میں نہانے اور تیرنے میں گزر جاتا تھا۔ ساون بھادوں میں جب سارا گاؤں زیر آب ہو جاتا تھا تمام مکان ریت کر نکلے اور پھر گر جاتے تھے۔ اہل دیہہ کے لئے یہ بڑا حادثہ ہوتا تھا لیکن چونکہ اس کے عادی ہو چکے تھے کسی نہ کسی طرح گزارا کر ہی لیتے تھے۔ ہم بچوں کے لئے تو پانی کا اس طرح گرمیوں راستے ہوئے گھروں میں پہنچ جانا باعث مسرت ہوتا تھا۔ گرے ہوئے ملبے سے کواڑوں کے تختے سے کسان کی کشتیاں بنا لینا اور ادھر ادھر کھیلتے رہنا ان ایام میں ہمارا بہترین مشغلہ ہوتا تھا۔ اب جو غالب کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو وہ سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے ؎

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے　　خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

والد کا دریائے سندھ سے دلی ربط جو آج بھی ان کی گفتار اور اشعار میں موجود ہے، اسی زمانے کی یادگار ہے۔ ایک تازہ ترین نظم میں کہتے ہیں ؎

بھولا نہیں عالم تری امواج رواں کا　　وہ عالم رقصاں تری ہر گرد رواں کا
تو اور کنارا وہ مرے ذوق نہاں کا　　افسوس کہاں میں ہوں یہ نقشہ ہے کہاں کا

گو رشتہ کناروں سے ترے توڑ کے آیا
طفلی بھی جوانی بھی وہیں چھوڑ کے آیا

تقدیر ہی سے مجھے انکار نہیں ہے　　گو ربط نہیں اس سے سروکار نہیں ہے
کیا کیجئے وہ آج نہیں یار نہیں ہے　　آسودہ کسی طور دل زار نہیں ہے

وہ جوہر وہ جوش و خروش اب وہیں کہاں ہے
افسردہ کنارا ہے یہاں اک نہر رواں ہے

گرچہ دو جہاں کی تجھے عادت بھی رہی ہے　　خلوت تری بھاتی بھی وحشت بھی رہی ہے
منظر ترے صحراؤں میں کثرت بھی رہی ہے　　ساتھ اس کے طبیعت پہ حقیقت بھی رہی ہے

دیہات اجاڑے ہیں غضب ڈھائے بھی ہیں تو نے
نقشے جو بگڑتے تو بنائے بھی ہیں تو نے

ہاں میرے تصور میں ہے آباد جو قریہ　　آتا ہے ابھی مجھ کو بہت یاد جو قریہ
تھا جلوہ گہ حسن خداداد جو قریہ　　ہر قید تکلف سے تھا آزاد جو قریہ

بستا ہے کنارے پہ ترے اب بھی وہیں اور
مضمون تو ہو گا وہی ہو گرچہ زمیں اور

کوئی چھ سات برس کی عمر میں انہیں ورنیکلر مڈل اسکول عیسیٰ خیل میں باقاعدہ داخل کرا دیا گیا۔ پرائمری سے ہائی اسکول تک ہر جماعت میں اول رہے۔ پانچویں اور آٹھویں جماعت کے امتحان میں وظیفہ حاصل کیا۔ اس زمانے میں ضلع بھر میں کوئی ہائی اسکول نہ تھا اس لئے گھر سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر بنوں جا کر وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں میٹرکولیشن کا امتحان درجۂ اول میں پاس کیا۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحان بعد میں بدوران ملازمت پاس کئے۔

میٹرکولیشن کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں داخل ہونے کے لئے بنوں سے لاہور آئے۔ رستے میں پہلی بار ملکہ نور جہاں کا مقبرہ دیکھا۔ ان کی مشہور نظم "نور جہاں کا مزار" اسی زمانے کی یادگار ہے۔ والد بتلاتے ہیں کہ اب تو مقبرے کے چاروں طرف بیلیں اور درخت لگے ہوئے ہیں اور ویرانی کا عالم نہیں ہے لیکن اس زمانے میں جب میں نے اسے پہلے پہل دیکھا تھا۔ اس مقبرے کی کیفیت واقعی یہی تھی کہ ―

چمگادڑ جو گھر لیتے ہیں گنبد سے تو اکثر — آرام کیا کرتے ہیں اس روضے میں آ کر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں میں شپّر — اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام کے چکر
معمور ہے یوں گورِ غریبانہ کسی کی
آباد رہے محفلِ جانانہ کسی کی

اسی سال میرے دادا کا انتقال ہوا۔ وہ ایک نیک طبیعت انسان تھے۔ آتے جاتے مسافر کی خدمت خوشی سے کرتے اور جب کوئی سادھو مل جاتا اس کے ساتھ ہو لیتے اور کئی کئی دن تک گھر سے غائب رہتے تھے۔ میرے دادا اردو اور فارسی سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ اوائل عمر میں انہوں نے شعر کہنے کی بھی کوشش کی لیکن اسے جاری نہ رکھ سکے۔

والد کی پہلی شادی سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ پانچ برس بعد بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ایک سال کی بچی رہ گئی — ودیا — میری بہن جس کی خودکشی نے والد کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے مسرت چھین لی۔

اگلے برس دوسری شادی ہوئی۔ یہ میں اپنی والدہ کا ذکر کر رہا ہوں۔ میں دسمبر ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوا۔ تین چار برس کی عمر کے واقعات میری یادداشت کے دھندلکے میں ابھی تک موجود ہیں گویا آئندہ سطور صرف شنیدہ ہی کی نہیں بلکہ شنیدہ اور دیدہ دونوں چیزوں کی حامل ہوں گی۔

آج سے چونتیس برس پہلے کا زمانہ میری نظر کے سامنے ہے۔ عیسیٰ خیل میں ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ والد، والدہ، ودیا اور میں، ہم چار افراد اس میں رہتے ہیں۔ سردیوں کے دن ہیں، والد کوٹھے کی چھت پر دھوپ میں ایک چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ کوئی کتاب ان کے سامنے ہے۔ گنگنا رہے ہیں۔ والدہ مجھے اور ودیا کو اوپر بھیجتی ہیں کہ جا کر کہو بابا سے ترکاری لے آئیں۔ ہم دونوں اوپر جاتے ہیں۔ دو ایک بار انہیں پکارتے ہیں لیکن وہ ہماری طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ہم اس خوف سے کہ کہیں جھڑک ہی نہ دیں فوراً واپس آ جاتے ہیں۔ اخبار یا کتاب کی جانب ان کی محویت کا آج بھی یہی عالم ہے۔ سو بعض اوقات انہیں اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے دو چار بار پکارنا بالکل بے کار ثابت ہوتا ہے۔ ان کی محویت سے قطع نظر ان کا خوف اسی تصویر کا ایک اور پہلو ہے جو ایک زمانے تک قائم رہا اور جس کے نقوش آج بھی باقی ہیں۔

میرے اور ودیا کے دل میں ایک مدت تک والد کی محبت کے مقابلے میں شاید ان کا خوف زیادہ غالب رہا۔ یہ ان کے کردار کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ آج بھی وہ اپنی رائے کے خلاف دنیا بھر کی رائے سن سکتے ہیں لیکن میری یا ودیا کی رائے کے خلاف ہونا انہیں گوارا نہیں اور میں نے بھی حتی الامکان مخالفت سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی یہ افتادِ مزاج شفقتِ پدری کے رستے میں حائل رہی بلکہ جہاں تک میرا اور ودیا کا تعلق ہے ہمیں اس شفقت کا حصہ وافر ملا ہے۔ ہاں میری چھوٹی بہنیں ساوتری اور کرشنا اس محبت سے پوری طرح شاد کام نہیں ہو سکیں کیونکہ انہوں نے اس وقت ہوش سنبھالا جب ودیا کی خودکشی کے باعث والد کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ ودیا نے جو بائیس برس کی عمر میں تین بچوں کی ماں بن چکی تھی سسرال میں

ایک جھگڑے کی بنا پر اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک کر اپنے آپ کو آگ لگا دی تھی۔ وہ دن اور آج کا دن والد کے چہرے پر میں نے وہ مسرت نہیں دیکھی جو اس حادثے سے قبل نظر آیا کرتی تھی۔ والد کی زندگی کا یہ حادثہ کئی اداس شعروں میں ڈھل کر رہ گیا۔ لیکن انھوں نے اپنے اس ذاتی غم میں کسی اور کو شریک نہیں کیا اس لئے یہ اشعار آج تک کہیں منظر عام پر نہیں آ سکے ۔

شمشان کا نظارہ دکھاتی ہے یہ دنیا　　افسوس اسی شمشان میں کل ہم بھی پہنچیں گے
تو مرنے پہ مجبور ہوئی مر گئی جل کر　　ہم جینے پہ مجبور ہیں جل جل کے جئیں گے

بجھ نہیں سکتی کبھی دل میں جو آگ ہجر کی ہو لگی　　حالتِ زاری میں اب دامن کہاں ہیں پھٹے
تاک آ رہا ہے تیرے جل کرنے سے اے لختِ جگر　　ہو گئے روز و شب زمین و آسماں میرے لئے

پہلے ہی جو اندازہ تھی وہ میری قسمت میں　　افسوس کہ اب اور بھی برہم ہوئی دنیا
اے لختِ جگر آہ کہ جل کے تو مری ہے　　میرے لئے آتش کدۂ غم ہوئی دنیا

تاب اک لمحے کی لا سکتی نہیں جانِ بشر　　ایک چنگاری سے ہو جاتا ہے انساں بیقرار
اے گل مجبوریوں میں تو نے اے لختِ جگر　　کر لیا ملبوس میں تن کو اپنے تن پر شعلہ زار

دل بیتاب جو تا ہی رہے گا اس کی حسرت سے　　نہاں دل میں جو داغ پنہاں دے گئی دنیا
جگر پھٹتا ہے میرا آگ لگتی ہے کلیجے میں　　نظروں میں نظر آتی ہے جب جلتی ہوئی دنیا

کیں فلک اے وائے کہ داغ جگرم داد　　فریاد برآوردم و داغ دگرم داد
ایں داغ جگر پارہ تو بود جگرم سوخت　　ویں داغ دگر آہ کہ سرتا بسرم سوخت

"آں داغ جگر" اشارہ ہے میری چھوٹی بہن کی موت کی جانب۔ یہ بچی دو برس کی عمر میں دس بارہ دن بیمار رہ کر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی تھی۔ اس بچی کو موت کے بعد ہندوؤں کے طریقے کے مطابق جلایا نہیں گیا تھا بلکہ دفنایا گیا تھا۔ والد اور میں مسلسل تین روز اس کی قبر پر جاتے رہے۔ وہاں سے واپسی پر والد ہر روز ایک نظم کہتے تھے۔ تین دن کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا۔ یہ نظمیں بھی جہاں تک میرا خیال ہے کہیں شائع نہیں ہوئیں۔ چند اشعار مجھے زبانی یاد ہیں۔ یہاں درج کر رہا ہوں ۔

پہلی صبح

کیوں ہم سے روٹھ کر نکل آئی ہے تو یہاں　　اللہ میرے ساتھ چل مری پیاری شگفتہ
وحشت فزا مقام ہے جنگل ہے جہاں تک　　ہاں رات تو نے کیسے گزاری شگفتہ
خوابِ گراں میں تو ہے ابھی زیرِ خاکِ سرد　　بیدار کائنات ہے ساری شگفتہ

خوش ہو کے پھر اچھل پڑی گنگی تیرے ساتھ ہے
آنکھوں سے اس کی اشک ہیں جاری شگفتہ
آنکھوں میں آگیا دلِ صد چاک کا لہو
پتھر ہے تجھ پہ دیکھ کے بھاری شگفتہ
ویرانہ ہو گیا ہے بھرا گھر ترے بغیر
کٹتے ہیں سب کے دن بہ زاری شگفتہ

دوسری صبح

بالیں پہ ہو کے کل گئے پھر آج آگئے
اے کاش زیرِ خاک سے ہو آشکار تو
ہم دور دور سے کے آئے تھے گھر پہ ترے لئے
دیدوں کی بھیک پیاسی ہے تیرے جوار تو
گھر میں تمام رات کاٹی تھی تو نے تڑپ تڑپ
آسودہ ہو گئی تہِ خاکِ مزار تو
افسوس عمر بھر ہمیں تڑپائے گی وہ رات
جب ہو رہی تھی بہرِ سفر بے قرار تو
روتا ہے پھوٹ پھوٹ کے بابا بھی تیرا آج
وہ بھائی جس سے کرتی تھی بے حد ہی پیار تو
بھولا نہ غم جہاں تجھے جب گھر دیا
آئی تھی ہم کے ساتھ جہاں بار بار تو
جنت میں تیری روح سے ہم کو یہی نصیب
اتنا ہی کر گئی ہے ہمیں دل فگار تو

تیرے لئے دعا ہے دلِ غم نصیب کی
ہو بہرہ یاب رحمتِ پروردگار تو

تیسری صبح

ملتا نہیں ہے کچھ مری فریاد کا جواب
کس نے شگفتہ! تجھے یوں کر دیا خموش
مطلب یہ تھا کہ تو مرے نالوں سے جاگ اٹھے
غفلت میں یوں نہ رہ، دلِ درد آشنا خموش
مجبور شکیب کے لئے تیری خموشیاں
ایسا نہ خامشی میں تو ہو جاؤں گا خموش
طاری ہے آہ! شہرِ خموشاں پہ کیا سکوت
خاموش سرزمیں کی ہے ساری فضا خموش
سر منزلِ دیارِ عدم ہے یہی مقام
ذرے لگے ہیں کہنے مگر بے صدا خموش
وادی یہ وہ ہے جس میں مسافر آتے نہیں
بیٹھے ہیں جا کے دور کہیں نقشِ پا خموش
دم مارنے کی تاب کسی کو یہاں نہیں
پیر و جواں خموش ہیں شاہ و گدا خموش
لٹنے کو خوشی کے ہیں نہ ہمیں نالہ ہائے غم
تکبیر میں ہے کتنا یہ دیارِ فنا خموش

صدمہ نہ ہو کہیں تری معصوم روح کو
ہوتا ہے ساز تاب مری فریاد کا خموش

شگفتہ کے ذکر سے پہلے میں رقیہ کی خودکشی کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ ۱۹۴۳ء کی بات ہے جب ہم راولپنڈی میں تھے۔ جس روز دوپہر کو اس حادثے کی اطلاع تار کے ذریعے سے ملی اسی روز صبح کو ——— حادثے کی اطلاع سے پانچ سات گھنٹے قبل ——— والد بیدار ہوئے تو میں نے انہیں خلافِ معمول بہت افسردہ پایا۔ میں نے ان سے دو ایک بار پوچھا کہ طبیعت تو آپ کی اچھی ہے؟ رات کو نیند تو ٹھیک سے آئی؟ وہ آنکھوں سے رو دئے۔

ہاں بالکل اچھا ہوں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ہاں طبیعت پریشان سی ہے۔ حسب معمول سیر کو چلے گئے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد واپس آئے۔ افسردگی کا عالم بدستور طاری تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ اسکول یا کنٹونمنٹ بورڈ کا کوئی معاملہ پریشان کر رہا ہو گا دوبارہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ کنٹونمنٹ اسکول کی ہیڈ ماسٹری ان کے لئے دردِ سر تھا۔ میرا گمان یہی رہا کہ کوئی نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس دن اسکول جانے تک والد خلاف معمول خاموش ہی رہے۔ اپنی پریشانی کو چھپانا ان کے بس ہی میں نہ تھا۔ دوپہر کو تار ملا جس میں یہ الفاظ درج تھے ——— (VIDYADIED THE MORNING)

وہی صبح کا وقت جب والد افسردہ خاطری کے عالم میں بیدار ہوئے تھے ودیا اپنے آپ کو آگ کے سپرد کر رہی تھی۔ میرا یقین ہے کہ اس حادثے کی اطلاع کسی نہ کسی طرح ان تک پہنچ ہی رہی تھی۔

یہ میری جنموں کی زندگی اور موت کا ذکر تھا جو بلا ارادہ نوک قلم پر آ گیا ورنہ میں کہہ تو یہ رہا تھا کہ آج سے پچیس برس پہلے ہم لوگ کیسے رہتے سہتے تھے۔ بھیرہ تحصیل (ضلع سرگودھا) پنجاب میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ ہمارا وطن ہے اس لئے محبوب ہے ورنہ زندگی کی آسائیاں اور سہولتیں اس شہر میں قطعاً مفقود ہیں۔ زندگی کی اولین ضرورت پانی یہاں کمیاب بلکہ نایاب تھا۔ اب نہ جانے کیا کیفیت ہے۔ میں اپنے وقت کی بات بتا رہا ہوں۔ شہر سے دور ایک چھوٹا سا نالہ بہتا تھا شہر کی عورتیں ہر صبح و شام اپنے سروں پر دو دو گھڑے رکھ کر پانی بھرنے جایا کرتی تھیں اور گھر کی ضروریات کے مطابق دن میں کئی کئی بار جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ عورت گھر میں مقید تھی۔ پانی لانے کے سوا باہر کا سارا کام مردوں کے سپرد تھا اور گھر کے اندر کا سارا کام عورتوں کے سپرد۔ یہ پانی اس قابل نہیں ہوتا تھا کہ پیا جائے لیکن سارا شہر یہی پانی پیتا تھا۔ والد پندرہ برس کی عمر میں اس شہر سے نکلے اور جہلم، لاہور اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں پچیس برس گزارنے کے بعد جب دوبارہ بھیرہ میں آئے تو شہر کے پانی سے بیزار ہو گئے۔ انہیں ہر وقت یہ اندیشہ رہتا تھا کہ یہ پانی ہم لوگوں کو بیمار کر دے گا۔ چنانچہ وہ اکثر پانی کے گھڑوں اور صراحیوں میں پھٹکری کی ڈلی پھیرا کرتے تھے اور ہم لوگوں کو خاص ہدایت تھی کہ پانی گلاس میں اس طرح سے انڈیلیں کہ تہ کے قریب کے پانی میں حرکت پیدا نہ ہو۔ اس تمام احتیاط کے باوجود پانی نے اپنا اثر دکھایا اور والد بیمار پڑ گئے۔ پانی کی مٹی نے جمع ہو ہو کر گردے میں پتھری کی صورت اختیار کر لی تھی۔ شدتِ درد کے ناقابل بیان عالم میں انہیں چارپائی پر ڈال کر قریبی شہر جہلم میں لے جایا گیا جہاں وہ ایک مدت تک زیر علاج رہے۔ ڈاکٹر جمیل ایک مشہور انگریز ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے آپریشن کر کے پتھری خارج کی اور والد انتہائی نقاہت کے عالم میں واپس گھر آ گئے۔ اب ہر لمحہ بھیرہ کو چھوڑنے کی تجویز پیش نظر تھی لیکن اس کی کیا صورت کی جائے۔

مفتی محمد سعید میاں ان دنوں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ گجرات ان کا وطن تھا۔ نیک خصلت اور تعصب سے بالا انسان تھے۔ ذوق سخن رکھتے تھے۔ والد کے مداح تھے اور قدر دان۔ ان سے والد نے اپنی مشکل بیان کی کہ اس شہر سے مجھے نکالئے ورنہ پھر بیمار پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ انہوں نے ان کا تبادلہ کلور کوٹ کے مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے کر دیا۔

کلور کوٹ دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ گاؤں کے ارد گرد میلوں تک ریگستان پھیلا ہوا ہے۔ آندھیاں یہاں بکثرت آتی ہیں۔ بارش کی صورت کو لوگ ترستے رہ جاتے ہیں۔ بادل اٹھتے ہیں اور ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ نعمت غیر مترقبہ ——— صاف ستھرا پانی ——— جس کی تلاش میں والد نے اپنا شہر چھوڑا تھا یہاں بافراط موجود تھا۔ اب والد کو یقین ہو گیا کہ یہاں پانی کی خرابی کی بنا پر بیمار پڑنے کا اندیشہ نہیں۔

لیکن اس اسکول کی ہیڈ ماسٹری کانٹوں کا بستر نکلی۔ ٹیچروں میں شاید دس جماعتوں سے زیادہ پڑھا لکھا کوئی نہ تھا۔ ان کی وہ حیثیت رہی تھی جو اکثر دیہاتی مدرسوں کی ہوتی ہے۔ ایک مولوی صاحب نے ایک دن اپنے طلبہ سے کہا کل سب لڑکے اپنے گھر سے ایک ایک اینٹ لے کر آئیں۔ جمع شدہ اینٹوں سے کلاس روم کے لئے فرش بچھایا جائے گا۔ والد کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہیں ضابطے اور اخلاق کے نقطۂ نظر سے بہت ناگوار گزری۔ انہوں نے اس مولوی کو بلایا اور اس سے کہا کہ یہ حرکت تمہارے لئے اور ہمارے اسکول کے لئے بدنامی کا باعث ہے۔ جب سرکاری طور پر کلاس روم کے لئے فرش بنایا جا سکتا ہے

تو خلاف تھا وہ طلباء سے بھی پیچ کرنے سے کیا ہوتی؟ وہ صاحب اس وقت تو کچھ نہ بولے لیکن انھوں نے دوسرے ٹیچروں میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہیڈ ماسٹر متعصب ہے اور مسلمانوں کو تنگ کرتا ہے۔ کلکٹر گنج میں آبادی ہندوؤں کی تھی۔ مسلمان شہر سے دور مختلف دیہات میں آباد تھے۔ ان میں زمیندار اور جاگیردار قسم کے لوگ بھی تھے۔ خوشحال اور کھاتے پیتے بھی اور ایسے بھی جنھیں مفلس کہا جائے۔ ان دیہات میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ میرا خیال ہے معمولی پرائمری اسکول بھی کوئی نہ تھا' انگریزی مڈل کا تو کیا سوال؛ لہٰذا مسلمان طلباء کے لئے کلکٹر گنج میں آکر تعلیم حاصل کرنا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے جب ہم کلکٹر گنج میں آئے تو اسکول میں مسلمان طلبہ کی تعداد دو چار فی صد سے زیادہ نہ تھی۔ والد نے ان دیہاتی طلبہ کی سہولت کے لئے ایک بورڈنگ ہاؤس کا انتظام کر دیا جس میں بے شمار مسلمان طلبہ دیہات سے آکر داخل ہو گئے اور اسکول میں ان کی خاصی تعداد ہو گئی۔ اس بات سے دیہات کے تمام مسلمان خواہ وہ لوگ نمبردار تھے یا زمیندار، معمولی کاشتکار تھے یا کامدار بہت خوش ہوئے کیونکہ ان کے بچوں کی مستقل تعلیم کی ایک صورت پیدا ہو گئی تھی لیکن اسکول کے ٹیچروں کی ذہنیت جوں کی توں رہی۔ ایک ٹیچر نے بورڈنگ ہاؤس سے دو چار پائیاں اٹھوا لیں اور جب اس سے جواب طلب کیا گیا تو اس نے والد کو متعصب ہندو کہنا شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے یہ ٹیچر ایسے لوگ تھے جو کسی طرح سے معلمی کے مقدس کام کے موزوں نہیں تھے۔ یہ لوگ سرتا پا بے علم تھے اردو کا صحیح فقرہ بولنا ان کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہ ہوتا تھا لیکن یہ لوگ معلمی کے کام پر مامور تھے۔ ان میں سے ایک صاحب ہر روز دو ایک طلبہ کو اپنے گھر بھیج دیا کرتے تھے اور وہ طلبہ وہاں دن بھر طرح طرح کے ذاتی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ زیادہ تر وہ کام یہ ہوتے تھے کہ گائے بھینس کے لئے کھلی اور چارے کا انتظام' چارپائی وغیرہ کی بُنائی' گھر کی صفائی اور بچوں کو ادھر ادھر لئے پھرنا وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور صاحب نے طلبہ کی باریاں مقرر کر رکھی تھیں اور اپنی اپنی باری کے مطابق ہر طالب علم ان کے لئے گھر سے لسّی لایا کرتا تھا۔ ٹیچر صاحب لسّی میں مکھن کی موجودگی پر بھی اصرار کیا کرتے تھے۔ ایک ٹیچر صاحب جیب میں تاش ڈال کر اسکول آیا کرتے تھے اور جب موقع ملتا وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ والد ان بدعنوانیوں کو گوارا نہ کر سکے پہلے مشورہ، نصیحت اور ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے سے انھیں روکنا چاہا۔ انھوں نے والد کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز اور ڈپٹی کمشنر کو گمنام خطوط لکھے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز مفتی احمد سعید ایک شریف اور غیر متعصب مسلمان تھے۔ ان پر ان شکایات کا مطلقاً کوئی اثر نہ ہوا اور سازشیوں کو ہر بار منہ کی کھانا پڑی لیکن ان کا تبادلہ ہوتے ہی صورتِ حال بدل گئی۔ نئے ڈسٹرکٹ انسپکٹر مختلف مزاج کے افسر تھے۔ انھوں نے ان شکایات کا اثر لیا اور والد کے خلاف انکوائری قائم کی گئی۔ یہ ایک عجیب صورتِ حال تھی۔ مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے والد نے اتنا کچھ کیا اور انکوائری اس الزام کی تحقیق کے لئے ہو رہی تھی کہ یہ متعصب ہیں اور مسلمان طلبہ اور ٹیچروں کو پریشان کرتے ہیں۔

بہ جرمِ عشقِ توام می کشند و غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشائیست

انھوں نے مفتی احمد سعید کو ایک خط لکھا۔

"فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی"

لیکن وہ اب دوسرے ضلع میں افسر تھے اور یہاں کے معاملات میں بے بس تھے۔

ڈسٹرکٹ انسپکٹر خود انکوائری کے لئے تشریف لائے۔ ڈاک بنگلے میں "عدالت" قائم ہوئی۔ شہر کے ہندوؤں کو گواہی کے لئے بلایا گیا تھا۔ دیہات کے مسلمان اور اسکول کے ٹیچر اور طلبہ موجود تھے۔ ہر شخص کی عزت و آبرو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ٹیچروں نے دو چار معصوم طلبہ کو ورغلایا لیکن دیہات سے آئے ہوئے تمام مسلمانوں اور مسلمان طلبہ نے سازشی ٹیچروں کے خلاف گواہی دی اور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کو اس بات پر مجبور کیا کہ موجودہ ہیڈ ماسٹر کا کلکٹر گنج سے ہرگز تبادلہ نہ کیا جائے کیونکہ اندیشہ ہے کہ ان کے جانے کے بعد مسلمان بچوں کی تعلیم کا یہ انتظام شاید جاری

شروع کئے۔ والد کے لئے ایک عظیم فتح تھی لیکن اس کے باوجود وہ اس ماحول سے دل برداشتہ ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریس کی تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ والد نے قومی اور ملکی موضوعات پر بے شمار نظمیں کہیں اور یہ تمام نظمیں بغیر نام کے مختلف اخبارات میں چھپیں۔ اگر نام سے چھپتیں تو نوکری محفوظ نہیں تھی۔ وہ نظم کے ساتھ ایک خط ایڈیٹر کو لکھ دیا کرتے تھے کہ یہ نظم بغیر نام کے یا کسی فرضی نام سے چھاپ دی جائے۔ نہ جانے یہ بات کیوں ان کے ذہن میں نہ آئی کہ اخبارات کی ڈاک سنسر بھی ہو سکتی ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ ڈاک ہر روز سنسر ہو رہی تھی۔ والد کے خطوط کی نقل میانوالی کی خفیہ پولیس کو بھیج دی جایا کرتی تھی اور ان کے بارے میں میانوالی پولیس ایک فائل تیار کر رہی تھی۔ لالہ لاجپت رائے کے انتقال پر انہوں نے ایک طویل نظم کہی۔ یہ نظم لاہور کے ایک پبلشر نے کتابچے کی صورت میں شائع کی تھی۔ والد کا نام اس نظم پر موجود تھا۔ اس نظم نے پولیس کی فائل کو مکمل کر دیا اور یہ فائل ایک انکوائری کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اب کے معاملہ ڈپٹی کمشنر کے ہاتھ میں تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان کا نام رادھا کرشن تھا۔ حکومت کی جانب سے رائے بہادر کا خطاب بھی انہیں ملا ہوا تھا۔ اس انکوائری میں والد کے خلاف کسی قسم کے ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے اپنے خطوط کی نقول اور بعض حالات میں اصل خطوط اور اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظمیں موجود تھیں۔ حکومت وقت کے خلاف بغاوت کا جرم ثابت تھا۔ اس کی کم از کم سزا ملازمت سے برطرفی تھی۔ حکومت چاہتی تو گرفتاری کا حکم بھی دے سکتی تھی۔ رادھا کرشن ضلع کے دورے پر کلور کوٹ آئے۔ والد کو انہوں نے اسی ڈاک بنگلے میں طلب کیا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ والد اپنے خلاف اتنا سنگین معاملہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ ان کے اپنے ہاتھ کی تحریریں موجود تھیں۔ رادھا کرشن نے صاف الفاظ میں کہا کہ اگر میری جگہ کوئی مسلمان یا انگریز ڈپٹی کمشنر ہوتا تو آپ اس وقت جیل میں ہوتے۔ میں نے محض مذہبی تعلق سے سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ اب آپ ایک طرف ہو جائیے یا کانگریس کی تحریک میں شامل ہو جائیے یا سرکاری ملازمت میں رہئے۔ وہ تو یہ حکم دے کر چلے گئے۔ والد کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہ ہوئی لیکن اس سارے واقعے سے انہوں نے کوئی اچھا اثر نہیں لیا۔ رادھا کرشن نے اگرچہ ان پر احسان کیا تھا لیکن انہوں نے اس واقعہ کا جب بھی ذکر کیا بڑے افسوس کے ساتھ کہ وہ بھی کیا نیکی جو تعصب کی بنا پر کی جائے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے قدر دانی کرتے تو کوئی بات بھی تھی۔ تعصب کی بنا پر قدر دانی کی تو کس کام کی۔ اب بھی جب آپ کبھی اس زمانے کا ذکر کرتے ہیں تو اس واقعے کا ذکر افسوس اور درد سے کرتے ہیں۔ عیسیٰ خیل کے مرحوم نواب سیف اللہ خان کا تذکرہ اس موقع پر وہ ضرور کرتے ہیں۔ سیف اللہ خان مرحوم ان کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ جب کبھی ملاقات ہوتی تو بغلگیر ہو کر ملتے تھے اور بڑی عزت سے پیش آتے تھے۔ لاہور میں کسی ملاقات کے دوران میں نواب سیف اللہ خان سے نواب احمد یار خان دولتانہ نے یہ کہا تھا کہ عیسیٰ خیل وہی شہر ہے نا جہاں محروم صاحب رہتے ہیں؟ انہوں نے والد سے اس واقعہ کا ذکر کیا اور کہا کہ آپ تو ہمارے لئے واجب الاحترام ہیں۔ یہاں ضلع بھر میں زمینوں اور جائدادوں کے مالک ہم ہیں۔ آپ کی حیثیت ایک ہیڈ ماسٹر سے زیادہ نہیں لیکن ہمارے شہر کا نام آپ کی وجہ سے مشہور ہے۔ آپ کی ذات ہمارے لئے فخر کا باعث ہے۔

کلور کوٹ سے اب زمانہ انہیں راولپنڈی لے آیا۔ بات یہ تھی کہ میں نے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کر کے راولپنڈی کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ والد کلور کوٹ کے ماحول سے بیزار تو تھے ہی کوشش کر کے انہوں نے اپنا تبادلہ راولپنڈی کرا لیا۔ یہاں وہ گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ راولپنڈی میں ادبی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ عبدالحمید عدم کا قیام ان دنوں راولپنڈی ہی میں تھا۔ عطاء اللہ کلیم، عبدالعزیز فطرتؔ، شہباز، اکبر امرتسری یہ سب حضرات یہیں تھے۔ والد راولپنڈی آئے تو شہر کے ادبی حلقوں کی طرف سے ان کا خیر مقدم ایک پر تکلف دعوت کی صورت میں کیا گیا۔ ان کے آنے سے راولپنڈی کی ادبی سرگرمیوں میں نئی جان آ گئی۔ ان کی اپنی ادبی زندگی بھی زیادہ خوشگوار ہو گئی لیکن اسکول کے حالات یہاں بھی دردِ سر بن گئے۔ کلور کوٹ میں تو ایک افسر تھا ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز۔ یہاں گورنمنٹ بورڈ کا ہر ایک افسر تھا۔ ایک مسٹر محمد رفیق کو تو ان سے دلی بغض بھی پیدا ہو گیا۔ اس نے انہیں اسکول سے نکلوانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ایک اور مسٹر محمد جان ہیڈ ماسٹر [illegible]

ہائی کورٹ ہونے نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور اس کی پرورش کرنا کام بنا دیا۔ یہاں وہ ایک مجسٹریٹ محمد رفیع سے مل گئے جس سے والد کی پریشانیوں میں معتد بہ اضافہ ہو گیا۔ اسکول کے اوقات کے بعد ان کا سارا وقت اپنی صفائی میں لمبے لمبے بیانات لکھنے میں ضائع ہو جاتا تھا۔ چند برس بعد محمد رفیع کا انتقال ہو گیا اور صورت حال کسی قدر بہتر ہو گئی۔ یہاں سے آپ ۱۹۳۲ء میں ریٹائر ہوئے اور آپ نے "سی و پنج سالہ عمر ...." گزار کر اطمینان کا سانس لیا۔

فوراً بعد آپ گورڈن کالج راولپنڈی میں اردو فارسی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ مولانا تاجور کو اس تقرر کا علم ہوا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے والد کو جہاں شروع میں بھیجنا چاہئے تھا وہاں وہ آخر میں پہنچے ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں میں ان کا وقت قریباً ضائع ہی ہوا ہے انہیں شروع ہی سے کالج میں اردو فارسی کا لیکچرار مقرر ہونا چاہئے تھا۔

یہ تین برس بڑے اطمینان اور سکون میں بسر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا اور ہنگامۂ کشت و خون میں کپتان عبد الحمید اللہ امین چھپے اور ہر جگہ گھومتے رہے، آخر ایک فرشتہ خصلت انسان کی امداد سے بخیر و عافیت لاہور پہنچے۔ لاہور سے بہ ہزار دقت امرتسر اور پھر جالندھر گئے۔ میں ان دنوں دہلی میں تھا۔ انہوں نے مجھے خط لکھا کہ جالندھر تک آ گیا ہوں۔ دہلی پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ ہر طرف ایک افراتفری اور کسمپرسی کا عالم ہے۔ یہاں بھی کسی مسلمان ہی سے کام نکلے گا۔" لیکن کوئی مسلمان اس وقت جالندھر میں اس قابل نہ تھا کہ ان کی خدمت کر سکتا۔ بہ مشکل دہلی پہنچے۔ یہاں لالہ دیش بندھو گپتا آنجہانی نے "تیج" اخبار میں ان کی ملازمت کا انتظام پہلے ہی سے کر دیا تھا۔ کچھ مدت وہاں کام کیا۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج نئی دہلی میں لیکچرار مقرر ہوئے اور ابھی تک وہیں کام کر رہے ہیں۔

میں نے ابھی تک اس مقالے میں والد کی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اصل میں اس موضوع کو چھیڑنے کی ضرورت بھی نہیں لیکن اتنا لکھنا مضمون کے احاطے سے باہر بھی نہیں ہوگا کہ والد ابھی اسکول کے تیسرے درجے ہی میں تھے کہ ایک منظوم کتاب مجموعۂ قصص ان کے ہاتھ لگ گئی۔ اس میں چند قصے آسان نظم میں تھے۔ انہیں پڑھ کر خود بخود اسی بحر میں مصرعے موزوں ہونے لگے۔ بعد میں درسی کتابوں کی نظمیں پڑھ کر واقفیت بڑھنے لگی اور آٹھویں درجے تک پہنچتے پہنچتے ایسی نظمیں کہنے لگے جو ہم درس طلبا اور ماسٹر صاحبان کے لئے دلچسپی اور حیرت کا باعث ہوتی تھیں۔ ۱۹۰۱ء (ساتویں جماعت) میں آنجہانی ملکہ وکٹوریہ کا نوحہ لکھا جس میں ایک شعر یہ بھی تھا :-

فرطِ غم سے غنچے چپ ہیں گل گریباں چاک ہیں
نوجوانانِ چمن بھی سر پہ اڑاتے خاک ہیں

اس شعر پر ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز نے جو ایک وضع دار بزرگ تھے بہت داد دی۔ اس سے پہلے ایک مثنوی بارش پر کہی تھی جس کا ایک شعر میرے علم میں ہے :-

الٰہی اتنا ساسیلی ہوئی ۔۔۔ کہ ساری زمیں پانی پانی ہوئی

اگرچہ اس دور کی شاعری کچی تھی اور اردو مادری زبان نہ ہونے کے باعث زبان کے نقائص سے خالی نہ تھی لیکن وزن کی صحت ہر نظم میں برابر قائم رہتی تھی۔

ہائی اسکول میں پہنچ کر شعر گوئی میں زیادہ انہماک ہو گیا اور دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ایسی نظمیں بھی ہو گئیں جو "زمانہ" کانپور اور "مخزن" لاہور ایسے رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ چنانچہ "چڑیا کی زاری" اور "سمندر کا پیغام" مطبوعہ "مخزن" اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" کانپور سے اسی زمانے میں خط و کتابت شروع ہو گئی تھی اور انہوں نے تعریفی کلمات سے ہر نظم پر ان کا دل بڑھایا۔ شاعری میں آپ نے کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ ہی عروض کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔ فنِ عروض کے متعلق شروع ہی سے آپ کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ جب تک کوئی قابل استاد نہ ملے

حاصل کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا یہ کہہ کر اس سے ہمیشہ کے لئے دامن چھڑا لیا۔

محروم ہم کہ عشق نے شاعر بنا دیا — بے ساختہ زباں سے نکلتی ہے دل کی بات
کرتے رہیں گے گنتی یہ صاحب تمام عمر — مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات

اس قطعے کے بارے میں اب ان کی رائے یہ ہے کہ یہ محض انکساری تھی ورنہ عروض سے واقفیت کی اہمیت سے کسے انکار ہے۔

عروض کے بارے میں ان کی ایک بار علامہ اقبال سے بھی گفتگو ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں علامہ کی رائے کا انھوں نے مجھ سے اکثر ذکر کیا ہے۔ علامہ اقبال نے ان سے کہا تھا کہ میں نے تو عروض سبقاً سبقاً پڑھا ہے، ویسے شاعری کے لئے عروض جاننے کی ضرورت نہیں ہاں استادی شاگردی کے سلسلے کے لئے عروض کا جاننا ضروری ہے۔

والد استادی شاگردی کے سلسلے سے بالکل بے نیاز رہے ہیں۔ شعر میں ان کا کوئی استاد ہے نہ انھوں نے کسی کو اپنا شاگرد بنایا ہے کبھی مشورہ مانگا تو مشورہ دے دیا۔ انھیں ہندوپاکستان کے گوشے گوشے سے اس مضمون کے خطوط اکثر ملتے رہتے ہیں کہ میں آپ کا شاگرد رہنا چاہتا ہوں۔ آپ جواب میں یہی لکھتے ہیں کہ مطالعہ اور مشق جاری رکھئے جو ہو ہرگا تو چمک اٹھے گا۔ اصلاح لینے سے کچھ نہ ہوگا۔ اس قسم کے خطوط لکھنے والوں کو بعض کتابوں کے نام مطالعہ کے لئے تجویز کرتے رہتے ہیں جن میں "بانگ درا" "جام سرور" "کلیات داغ" اور "کلیات امیر مینائی" کے نام ضرور شامل ہوتے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ اول الذکر دو کتابیں خیالات میں تموج اور بلندی پیدا کرنے کے لئے اور آخر الذکر صفائی زبان کے لئے بہت مفید ہیں۔ اپنی شاعری کے بارے میں اکثر انھوں نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ میں نے شاعری کو نہ تو بطور فن حاصل کیا اور نہ اس پر فنی نظر سے توجہ کی۔ ایک رباعی میں لکھتے ہیں: —

شاعر ہوں شاعری میں استاد نہیں — گو فکر سخن ہے پاس اسناد نہیں
ہے شعر و سخن کا کب سے سودا مجھ کو — مدت اتنی ہوئی کہ کچھ یاد نہیں

میں نے والد کو شعر کہتے اکثر دیکھا ہے۔ جب طبیعت مجبور کرتی ہے یا کوئی خارجی تحریک رونما ہوتی ہے تو آپ کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک بار آپ جو کچھ لکھ لیتے ہیں وہ اس کی قطعی صورت ہوتی ہے۔ میں نے انھیں کلام پر نظرِ ثانی کرتے نہیں دیکھا۔ گھر میں بچوں کا شور ہو یا غل غپاڑہ ہو آپ کی شعر گوئی کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوا۔ ہاں کوئی فرمائشی نظم لکھنا ہو تو اس کے لئے کچھ نہ کچھ "اہتمام" ضروری ہو جاتا ہے۔ اکثر آپ کاغذ پنسل لے کر گھر سے دور شہر کے باہر چلے جاتے ہیں اور وہیں سے فرمائشی نظم ختم کر کے لاتے ہیں۔ اب تو فرمائشی نظمیں لکھنے کی انھیں ضرورت نہیں رہی لیکن جب کلورکوٹ اور راولپنڈی میں پڑھاتے تھے تو ڈسٹرکٹ انسپکٹروں اور ڈپٹی کمشنروں کی فرمائشوں پر اکثر اس قسم کی نظمیں کہنا پڑتی تھیں۔ بعض دفعہ تو آپ اس قسم کی نظمیں لکھ کر بے دلی سے "نذر" کر دیتے تھے۔ اس کی نقل اور مسودہ کو بھی اپنے پاس نہیں رکھتے تھے۔ میں ان نظموں کی نقلیں کبھی کبھار محفوظ کر لیا کرتا تھا اس وقت ان نظموں کی جانب رجوع کرنا مناسب نہیں کیونکہ یہ مقالہ یادداشت کے سہارے لکھا جا رہا ہے اور کتابوں بیاضوں یا کاغذات سے اشعار نقل کرنے سے اس کی نوعیت بدل جائے گی۔ کلورکوٹ کے زمانے کی بات ہے۔ ایک دفعہ دریائے سندھ کے سیلاب نے ضلع میانوالی کے کچا علاقے کے دیہات کو برباد کر دیا۔ ملک زمان مہدی خان ضلع کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ایس۔ ڈی۔ او۔ اور [illegible] صاحب تھے بہرحال ان لوگوں کی امداد کا کام ان افسروں کے ہاتھ میں تھا۔ ملک فیروز خان نون وزیر تعلیم تھے۔ وہ امداد کے افتتاح کا ساتھ کرنے اور تباہ شدہ لوگوں کی ڈھارس بندھانے آئے۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز نے والد کو نظم لکھنے کی فرمائش کی۔ آپ نے فی البدیہہ نظم کہی چند اشعار سنئے: —

خستہ جاناں را اماں آید ہمی — مرہم زخم نہاں آید ہمی
مژدہ بادا اے دل [illegible] — بعد ایام خزاں آید ہمی

در بہارش چمنستاں گشتیم باز   یادِ عہدِ آشیاں آید ہمی
از سرِ ما شورِ شش طوفاں گذشت   پس سکوں در دورِ زماں آید ہمی
ساحلِ امیدِ ما نزدیک شد   دلبرے از کوئے فتاں آید ہمی
از پئے امدادِ طوفاں دیدگاں   کشتیٔ امن و اماں آید ہمی
کارِ جیشے چوں زماں ہموار کند   از تخاذرش کے زیاں آید ہمی
ما نمی ترسیم از دشتِ بلا   رستمِ ما از کیاں آید ہمی

از ستم ہائے فلک مارا چہ غم
چوں ملک فیروز خاں آید ہمی

ملک فیروز خاں نون کے نام کا ایک سہرا بھی لکھا تھا ؎

مے فیروز بخشش در جام کردند
اناں فیروز خانش نام کردند

شاہزادہ صلاح الدین کا سہرا بھی بڑی کثرت اور حسن کے ساتھ استعمال ہوتا رہا۔

فی البدیہہ شاعری کا ذکر آگیا ہے تو دو ایک واقعات اور بھی سن لیجئے۔ اس فن میں آپ کو واقعی ایک کمال حاصل ہے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری سے آپ کے دوستانہ مراسم ایک زمانے سے ہیں۔ آپ جب کبھی لاہور آتے حفیظ صاحب سے ضرور ملتے تھے۔ حفیظ صاحب بھی جب کبھی راولپنڈی گئے اپنی مشاغل و مصروفیات کے باوجود والد سے ملنے ہمارے گھر ضرور آتے۔ ایک دفعہ والد لاہور آئے تو انہیں معلوم ہوا کہ حفیظ صاحب نے انارکلی میں بالائی منزل پر دفتر لے لیا ہے۔ آپ وہاں پہنچے تو حفیظ صاحب دفتر میں موجود نہیں تھے۔ آپ نے ایک کاغذ کے پرزے پر یہ شعر لکھے اور وہ پرزہ ان کی میز پر چھوڑ کر آگئے ؎

دفتر جو بالا خانے پہ دیکھا حفیظ کا   محروم دید آپ سے کر دل فگار ہوگیا
رونق بھری انارکلی کی چار چند   بالا در سرود ساز سے آباد ہوگیا
جن منزلوں پہ حسن کی جلوہ گری تھی   اب عشق ان میں مائل فریاد ہوگیا

۱۹۳۵ء کا ذکر ہے۔ راولپنڈی میں انجمن اسلامیہ کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ والد بھی شریکِ بزم تھے۔ حفیظ اپنی نظم پڑھ چکے تو والد نے کہا ؎

حفیظ جوش افزا ہے بزم سخن میں   قیامت تک رہے گی یاد تیری
نشہ آگیں ترے نغمات رنگیں   قمر آرا ہے جمال شعر تیری
کیا پایا جس نے نالے کو تو نے
یہ طرزِ حسن اس نے ہے ایجاد تیری

اسی جلسے میں حفیظ صاحب نے شائقین کی فرمائش پر چندے کی اپیل کی اور اپنی نظم "مستقبل بحال" پڑھی جس کے اس وقت کہیں کہیں سے مصرعے مجھے یاد ہیں ؎

مرے شیخ ہیں شیخ مرید قادر   ہماری ہی جانب سے غزل پر چادر
نہیں چاہتے ہم سخن کے قادر   ....

ہے مطلوب ہم کو نہ گریہ نہ خندہ
سنا نظم ایسی کہ ملے جس سے چندہ

مسدس بہت طویل تھا اور پھر زبانِ حفیظ۔ حاضرین پر بہت اثر ہوا۔ چندہ بھی خاصا جمع ہوا اور وعدے تو ہزاروں تک پہنچ گئے۔ جب چندہ وصول کی کارروائی ختم ہوئی تو والد نے صدرِ بزم قبلہ شیخ سر عبدالقادر سے جو ان کے قریب تشریف فرما تھے مخاطب ہو کر کہا ــ

حفیظ کہتے تھے احباب جس کو نغمہ نواز
بنا ہے گردشِ دوراں سے اب وہ چندہ نواز

شیخ صاحب بہت محظوظ ہوئے اور یہ شعر حفیظ صاحب کو سنایا۔ حفیظ اپنے مخصوص انداز سے مسکرائے اور قبلہ شیخ صاحب نے اسی چندے کے موضوع پر اکبر الٰہ آبادی کے مشہور اشعار سنائے۔

اجلاس تھوڑی دیر کے لئے برخاست ہوا۔ غالباً نماز کے لئے حفیظ صاحب نے اعلان کر دیا کہ حضرات! احباب مرحوم دوسری نشست میں بھی اپنا کلام سنائیں گے۔ والد کے پاس دوسری نشست کے لئے کوئی نظم نہ تھی۔ وقت بھی بہت کم تھا لیکن چونکہ اعلان ہو چکا تھا انہوں نے فوراً مسلسل نظم کہنا شروع کر دی اور جب چند نظموں کے بعد ان سے کلام سنانے کے لئے کہا گیا تو یہ اشعار ان کی زبان پر تھے ــ

اے ملتِ اسلام ترے ذوقِ نظر سے
فردوسِ نظر عالمِ معنی کا ہے گلزار
ہر سرو یہاں صورتِ پیوستہ ہے گویا
اشجار سے پیدا ہے ترے عالمِ اسرار
مستانہ کسی کنج میں عاشق ہے کوئی تو
عارف ہے کہیں محوِ سراپا دلِ ہشیار
[illegible]
دامانِ ترنم میں سمٹے گوہرِ افکار
جھلکی نظر آتی ہے یہاں حسنِ ازل کی
کتنا مچلتا ہوا آئینۂ گفتار
اعجاز سے کچھ کم نہیں یہ علم کا جادو
بے پردہ ہوئے جاتے ہیں [illegible] کے اسرار
[illegible]
روشن کی بارش کہ ہے جہاں مطلعِ انوار
[illegible]
جس حسن سے کھلتی ہے پردہ کشا جامی افکار

نغموں سے بھرا ہوا ترے چمن کی
کھلتی ہے دل آویز فضا ترے چمن کی

علامہ اقبال کا مرثیہ بھی انہوں نے اقبال کی رحلت کی خبر سنتے ہی فی البدیہہ کہا تھا۔ علامہ کے انتقال کی خبر ریڈیو پر آئی تو انہوں نے اسی وقت بزم کے اجلاس میں سکول بند کر دیا اور سیدھے گھر آئے۔ مجھے بتایا کہ اقبال اس دنیا میں نہیں رہے۔ پھر کہنے لگے ایک دو شعر ہوئے ہیں لکھو تاکہ شروع کروں۔ میں نے کاغذ پنسل اٹھا لی۔ آپ ٹہلنے کے ہر چکر پر ایک شعر لکھوا دیتے تھے۔ مرثیے کا پہلا شعر یہ ہے ــ

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا
احساس میں سما گیا دل میں اتر گیا

جب آپ یہ اشعار لکھوا چکے ــ

[illegible]
کاشانۂ بقا میں مسافر پہنچ گیا
قدسی تھا دارِ رنج و ملامت سے بچ گیا
ویرانۂ فنا سے سلامت گزر گیا!

باغِ جہاں میں صورتِ گل مسکرا دیا　　باغِ جہاں میں مثلِ نسیمِ سحر گیا
خاکِ چمن میں گوہرِ شبنم نہاں نہیں　　خورشیدِ جلوہ بار سے پوچھو کدھر گیا
"ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق"　　روشن تر اس حقیقتِ روشن کو کر گیا

میں نے کہا کہ اس نظم میں آپ "مر گیا" کا قافیہ تو استعمال نہیں کریں گے وہ کہنے لگے کیوں؟ میں خاموش ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ "مر گیا" کا قافیہ شعر کو بے جان کر دے گا۔ انھوں نے آخری شعر لکھوایا اور وہ شعر یہ ہے ؎

محروم! کیوں ترے دلِ حرماں نصیب کو
یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا

مجھے فوراً احساس ہوا کہ میں نے رائے دینے میں کس قدر غلطی کی تھی۔

دوسرے دن اقبال کے انتقال پر ماتمی جلسے کا پروگرام طے ہوا۔ گارڈن کالج کے ہال میں جلسہ کرنے کا فیصلہ ہوا لیکن عین وقت پر کالج کو کوئی ایسی ضرورت پیش آ گئی کہ وہ ہال ہم لوگوں کو نہ مل سکا۔ سارا انتظام مکمل تھا اسے ملتوی کرنا اب ہمارے بس میں نہ تھا چنانچہ طے پایا کہ کالج کے قریب میونسپل باغ میں جلسہ منعقد کیا جائے۔ تمام حاضرین کالج ہال سے ہو کر باغ میں پہنچ رہے تھے۔ والد بھی کالج سے ہو کر باغ میں آئے اور اپنی نظم سے پہلے مقامِ جلسہ کی تبدیلی پر یہ شعر پڑھا ؎

بلبلِ گلزارِ معنی بود آں رنگیں سخن
ماتمِ اقبال باید کرد در صحنِ چمن

وقار انبالوی کے ساتھ بھی ان کے مراسم بے تکلفی کی حد تک دوستانہ ہیں۔ وقار صاحب پہلے روزنامہ "پرتاب" میں کام کرتے تھے وہاں سے "احسان" میں آ گئے۔ والد کی ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے ؎

جس دن سے اُدھر سے تو اِدھر آیا ہے　　چشمِ جفا کو کم نظر آیا ہے
"احسان" پہ بھی احسان تھا تو ہی نہیں　　"پرتاب" کو بے وقار کر آیا ہے

یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ وقار صاحب نے یونہی باتوں باتوں میں ان سے کہا اس جنگ کا انجام کیا نظر آ رہا ہے۔ والد ایک آدھ منٹ تک خاموش رہے پھر بولے ؎

ہو لاکھ کہ ہٹلر خودی سے سرشار و مست　　ہو جائیں گے اس کے حوصلے آخر پست
جب گھر ہی میں خود اک جنگ ہو جائے گی　　کیا کر لے گا وہ اگر نہ کھائے گا شکست

ایک اخبار کا ایڈیٹر اور پھر شاعر ایڈیٹر ایسی چیزیں کہاں چھوڑتا ہے۔ وقار نے فوراً یہ رباعی لکھ لی اور اگلے دن اپنے ایک تمہیدی نوٹ کے ساتھ اخبار میں شائع کر دی۔

اسی سفرِ لاہور کا ذکر ہے۔ وقار اور والد اکٹھے جا رہے تھے۔ دیواروں پر جا بجا سینما کے پوسٹر نظر آئے۔ ان پر وہی عام تصویریں تھیں، نیم عریاں۔ وقار نے تصویروں کی جانب اشارہ کیا اور کہا ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ والد نے جواب میں کہا ؎

لبِ عشرت پہ تبسم نظر آتا ہے مگر　　آنکھ اخلاق کی روتی ہے جو بے شعور ہیں
عورتِ خانہ میں جس بات سے آتی ہے حیا　　منظرِ عام پہ ہوتی ہے وہ بے شعور ہیں

سینما دیکھنے سے آپ نے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ میرا خیال ہے زندگی بھر میں آپ نے دو چار تصویریں ہی دیکھی ہوں گی۔ اس کے علاوہ

جہاں تک اخلاقیات کے عام اصولوں کا تعلق ہے آپ صرف اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہی نہیں رہے بلکہ بقول مولانا عبدالمجید سالک ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک پوری نسل کے معلم اخلاق رہے ہیں۔ ان کی روزمرہ کی زندگی میں بھی مجھے ایک باقاعدگی اور ضابطہ نظر آیا ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے انہیں صبح کے ناشتے میں دودھ کے ایک گلاس کے سوا کچھ کھاتے پیتے نہیں دیکھا۔ ان کا یہ طریقہ آج تک جاری ہے۔ گھر پر تو اس معمول میں تبدیلی پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں۔ سفر میں بھی ان کی یہی کوشش رہتی ہے کہ اس میں بے قاعدگی نہ ہو۔ چائے یا لسّی سے انہیں کوئی رغبت نہیں۔ لسّی کو تو جو اہل پنجاب کی "قومی" غذا ہے بالکل استعمال نہیں کرتے۔ چائے کے لئے روزانہ [illegible] کا ہونا شرط ہے۔ دودھ کے بعد پھلوں کا نمبر آتا ہے اور پھل کے بارے میں اس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں کہ پھل بالکل بے ذائقہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کے نزدیک پھلوں کا چھلکا بہت مضر چیز ہے۔ اس سے پرہیز لازمی ہے چنانچہ اسی اصول کے تحت وہ انگور تک کا چھلکا اتار لیتے ہیں۔ گھر کے باقی لوگوں کو انگور کھانے کا یہ طریقہ بالکل پسند نہیں۔ اکثر اس امر کی کوشش بھی کی گئی کہ جہاں تک انگور کا تعلق ہے اسے چھیلنا ترک کر دیں۔ لیکن وہ اپنی وضع پر قائم ہیں۔

صحت کے پیش نظر وہ ٹماٹر بھی اکثر استعمال کرتے ہیں اور اس کا بھی چھلکا اتار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ چھلکا اتار لینے کے بعد ٹماٹر میں کیا باقی رہ جاتا ہوگا۔ شاید انہی باقاعدگیوں کا اثر ہے کہ صحت ان کی اس وقت تک اچھی ہے لیکن بعض عارضے ایک زمانے سے ان کے ساتھ ہیں۔ لڑکپن میں جب تیراکی کا شوق تھا تو دریائے سندھ میں ایک بار گہری چھلانگ لگائی۔ شوق تو پورا ہو گیا لیکن "ہرنیا" مستقل طور پر زندگی کا رفیق بن گیا۔ یہ اور اس کے ساتھ عرق النساء دونوں کبھی کبھی بڑی تکلیف اور پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ دوائیں آپ کی ہر لحظہ کی ساتھی ہیں۔ باہر کہیں سفر پر جاتے ہیں تو دس بارہ دوائیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نمک، مرچ اور چینی وغیرہ شیشیوں میں بند کر کے الگ ساتھ رکھتے ہیں۔ مشاعرے میں کہیں جاتے ہیں تو تمام شعراء کے لئے ان کی دواؤں کی پوٹلی حیرت کا باعث ہوتی ہے۔ دوائیں ساتھ لے کر ان کی سفر کی عادت شعراء میں بہت شہرت پا چکی ہے۔ ایک دفعہ لائل پور میں مشاعرہ تھا۔ قتیل شفائی والد سے ملنے آئے۔ جہاں شعراء کا قیام تھا وہاں دو چار کمروں میں رہ گئے۔ والد موجود نہیں تھے ایک کمرے میں میز پر مختلف دواؤں کی دس پندرہ شیشیاں رکھی تھیں۔ والد کے انتظار میں وہیں بیٹھ گئے۔ ان کا اندازہ صحیح نکلا۔ وہی کمرہ والد کا تھا۔

اتفاق کی بات ہے اسی مشاعرے میں ایک شاعر صاحب سامعین کا ہجوم دیکھ کر بیہوش ہو گئے۔ رات کے ڈیڑھ بجے کا وقت تھا ہم لوگ ان کو بڑی مشکل سے قیام گاہ تک لے آئے۔ والد کے پاس "امرت دھارا" موجود تھی۔ اس وقت وہ کام آئی اور شاعر صاحب اگلی صبح اچھے بھلے ہو کر رات کے مشاعرے پر تبصرہ فرما رہے تھے۔

چونکہ والد نے بہت کم عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور ایک نسل ان کا کلام پڑھتی چلی آ رہی ہے اس لئے ان کی عمر کے بارے میں اکثر غلط اندازے موجود ہیں۔ ایک بار جوش ملیح آبادی لاہور تشریف لائے۔ والد ان سے ملنے گئے۔ انہوں نے والد کو دیکھ کر بڑی حیرت کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ میں بچپن سے آپ کا کلام پڑھ رہا ہوں اور میرا خیال تھا کہ اب آپ بمشکل لاٹھی کے سہارے سے چلتے ہوں گے۔ آپ کی عمر کے بارے میں میرا اندازہ حیرت انگیز طور پر غلط تھا۔ اس واقعہ کو اٹھارہ برس ہو چکے ہیں اور آج بھی جب کہ والد کی عمر تقریباً ستر برس کی ہے آپ عصا یا چھڑی کا سہارا لئے بغیر باقاعدہ گھوم جاتے ہیں اور اب اس چھڑی کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے جو چند برس پہلے ان کے ہاتھ میں موجود رہتی تھی۔

عبدالرزّاق ملیح آبادی

شاہد خاں

خاندان پٹھان۔ وطن ملیح آباد۔ تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ خود کو مولانا آزاد سے زیادہ پرانا کہتے ہیں! عمر کبھی پچاس برس کی کبھی ساٹھ برس کی بتاتے ہیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ جوش ملیح آبادی سے، جو ان کی والدہ کے سگے چچیرے بھائی ہیں، کہیں چھوٹے ہیں۔

قد اچھا ہے۔ بدن گٹھا ہوا ہے۔ گینڈا کچھ اس وضع کا ہے کہ بڑا کوئی نہیں کہہ سکتا۔ رنگ صاف ہے۔ سر بڑا ہے۔ کلّا بھی چوڑا چکلا ہے۔ لوگ بدصورت نہیں کہتے۔

مزاج کس قسم کا ہے؟ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ کچھ متضاد سا ہے۔ شاید چولی دامن کا مرتبہ ہے۔ بالکل ٹھنڈے، جیسے برف کی سل۔ بالکل گرم، جیسے آتش فشاں کی چٹان۔ بہت ہی ہنس مکھ، نہایت ہی خشک۔ بہلنے پائیں، تو خود بھی کھلکھلائیں اور دوسروں کو بھی ہنسا دیں۔ منہ بنائیں، تو خود بھی تیوریاں چڑھائیں اور ہنستوں کو بھی رونا سا بنا دیں۔

لیکن اکثر مزاح میں۔ ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے کہ چوہے مارنے کے لیے سنکھیا لائے تھے اور وہ میز پر سامنے رکھی تھی۔ دوستوں سے بحث چل پڑی کہ قوتِ ارادی مضبوط ہو تو آدمی سب کچھ کر سکتا ہے۔ ایک دوست نے کہا "یہ تو بات ہے، ملیح آبادی صاحب فرمائیں کہ میری قوتِ ارادی بڑی ہے اور سنکھیا کا یہ ڈلا کھا لیں تو نتیجہ کیا ہوگا؟ اینٹھ کر رہ جائیں گے اور قوتِ ارادہ کھڑی تماشہ دیکھتی ہوگی!" اس پر انہوں نے وہ پورا ڈلا چبا کر اوپر سے پانی پی لیا۔ اور کہنے لگے "ابھی ثبوت ملا جاتا ہے۔ مجھے کچھ بھی نہ ہوگا!" یقیناً یہ پٹھانی جہالت تھی۔ مرنے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی؟ مگر جیسے اچھے ڈگروں کا ساتھ شاید سنکھیا قدرت بھی دے دیا کرتی ہے۔ حضرت کا مرض تو پندرہ دن گھر رہا، مگر پہلے سے کہیں زیادہ تندرست ہو گئے۔ سر کے بال کھچڑی سے تھے اور چہرے کا رنگ پیلا۔ سنکھیا کے طفیل بال کالے بھونرا ہو گئے اور رنگ گہرا سرخ! خود کہا کرتے ہیں سنکھیا کھانے کے بعد ایسی توانائی پائی ہے کہ پہلے تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بس جی چاہتا ہے اک ٹکڑا پھر ہو!

[illegible] کے سلسلے میں یہ واقعہ بھی لکھ دینا مناسب ہے کہ یا تو بیمار ہی نہیں ہوتے، اور ہوتے ہیں تو جان لیوا بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔

مصر میں ٹائیفائڈ کا شکار ہوئے۔ اور مصر میں ٹائیفائڈ ہندوستان میں پلیگ کی طرح ان کے زمانے میں مہلک ہوا کرتا تھا۔

مصر سے واپسی پر بمبئی کے ایک رئیس کی تیمارداری کر رہے تھے کہ اس نے قے کی اور ان کے منہ میں چلی گئی۔ اسی وقت خود بھی مبتلا ہو گئے پھر جب کلکتہ میں مولانا آزاد کے ساتھ تھے، تو دوبارہ ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوئے اور جب اچھے ہوئے، تو خود اپنے ہاتھوں کالا آزار کے جنگل میں گرفتار ہو گئے اور آٹھ مہینے بیماری سے کشتم کشتا کرتے رہے۔ ابھی ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے کینسر کے دنگل میں آ گئے۔ خوشی خوشی علاج کرانے گئے، اور ہنستے کھیلتے لوٹ آئے!

ایسی ایسی مہلک بیماریوں میں پھنسے، مگر کبھی پرہیز کیا، نہ ڈاکٹروں کی کسی ہدایت پر عمل۔ کبھی کبھی کہا کرتے ہیں "اپنی فکر کرنا حماقت ہے۔ خدا کو غرض ہوگی، تو ہمیں دنیا میں رکھے گا، اور غرض ہوگی تو اٹھا لے گا۔ ہم کب اپنی مرضی سے یہاں آئے تھے کہ زمین کو دانتوں سے دابے بیٹھے رہیں! پھر ہنس کر کہتے ہیں "اللہ میاں اُن کو جلدی مارتے ہیں، جو موت سے ڈرتا ہے۔ موت سے نہ ڈرو گے تو ملک الموت تم سے ڈرنے لگے گا!"

ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ موٹا پہنتے ہیں۔ موٹا ہی کھانا چاہتے ہیں، اگرچہ کھانے نہیں پاتے۔ بھدی چیزیں ہی استعمال کرنا پسند کرتے ہیں، مگر ساتھیوں کے لئے بھدی چیزیں گوارا نہیں کرتے۔ نفیس سے نفیس، نازک سے نازک چیزیں ان کے استعمال میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

نہایت چست، چالاک، چوبند ہیں۔ چلتے ہیں تو بہت تیز چلتے ہیں، لیکن بڑے ہی سست بھی ہیں۔ بیٹھے ہیں تو گھنٹوں بیٹھے ہیں، لیٹ گئے، تو اٹھنے کا نام ہی نہیں۔

صناع ہونے کا بھی زعم [illegible] ہے۔ بھوپال سے مولانا آزاد کی بیٹی ساجدہ کا چپل لائیں، تو حضرت نے بغیر فرمے کے ایک جوتا بنانا شروع کر دیا۔ مولانا دیکھتے اور ہنستے۔ فرماتے "مولوی صاحب آپ بھی وقت کو قتل کرنا خوب جانتے ہیں"۔ اور یہ حضرت مسکرا کر جواب دیتے "بن جائے گا، تو آپ ہی داد دیں گے"۔ اور جوتا بن جانے کے بعد واقعی مولانا نے داد دی تھی۔

نانبائی کا بھی دعویٰ ہے۔ ایک دفعہ اپنی دو شیرمالیاں خود ہی کاٹیں اور خود ہی کھائیں۔ اتفاق سے ایسی نفیس ہوئیں کہ ملیح آباد کا [illegible] جو تعلق داروں کی شیرمالیاں پکاتا تھا، دیکھ کر کہنے لگا "ہم سے ایسی شیرمالی نہیں بنے گی۔ یہ تو حیدرآباد کی بنی ہوئی ہے"۔ اور جب اُسے بتلایا گیا تو حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا "واقعی شیرمال تو آپ ہی نے بنی ہے، مگر کہ اللہ کی یہ بھلائی دنیا میں نہیں ہے؟!"

بال کاٹنے میں بھی خود کو استاد سمجھتے ہیں۔ مردوں ہی کے نہیں، لیڈیوں کے بھی۔ مردوں، عورتوں کے بال تراشنے کے سبھی فیشنوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ بھوپال ہی میں مولانا آزاد صاحب کو قینچی نائی کے سامنے بیٹھنا گوارا نہ تھا، یہ صاحب بول اٹھے "میں آپ کی حجامت بنا دوں گا"۔ پہلے تو مولانا حجامت کے ارادے پر ہنسے، پھر فرمایا "مولوی صاحب! آپ مجھے کیسی بھیڑ بنانا چاہتے ہیں؟ —— کیا آپ نائی ہیں؟"

—— بڑی منتوں، خوشامدوں کے بعد مولانا کی حجامت بنا دی گئی اور مولانا حیرت میں پڑ گئے!

کہا کرتے ہیں، بچپن میں بڑا تیز اور ذہین تھا، لیکن دس برس کا ہوا تو اول درجے کا گاؤدی سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ ایسا تھا نہیں، لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لئے خود بیوقوف بن گیا تھا!

سنہ ۱۹۱۳ء میں مصر کا سفر اختیار کیا۔ خاندان میں اب تک پہلے آدمی ہیں، جس نے حج کے علاوہ ہندوستان سے باہر سفر کیا۔ مصر کے وقت انگریزی سامراج کے کٹر دشمن بن چکے تھے، اور اسی نے سفر کیا تھا کہ لوٹ آئیں تو ملک میں انقلاب برپا کریں گے۔

مصر میں چار سال رہے۔ عربی پڑھی۔ مصر کیوں گئے؟ عربی کیوں پڑھی؟ خود بتایا کرتے ہیں، مسلمانوں کے اٹھنے سے پہلے ہندوستان میں انقلاب ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اور مسلمانوں کو وہی اٹھا سکتا تھا، جو اسلام سے کما حقہ واقف ہو، اور دنیادار ملاؤں کی، جو مسلمانوں سے جونکوں کی طرح چمٹے ہوتے ہیں، پوری طرح قلعی کھول سکے۔

مصر کی زندگی ہوناکیوں سے لبریز رہی۔ اسی زمانے میں قسطنطنیہ بھی گئے۔ ترکی حکومت "جہانِ اسلام" کے نام سے تین زبانوں میں ایک اخبار نکالا کرتی تھی۔ ترکی، عربی، اُردو۔ یہ حضرت پہنچتے ہی اُردو حصے کے ایڈیٹر ہو گئے۔ انور پاشا سے اور دوسرے عہدیداروں سے ملاقاتیں رہیں۔ قسطنطنیہ ہی میں تھے کہ پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ انھوں نے انور پاشا سے شمولیت کی خواہش کی، مگر موصوف نے ترکی فوج میں حصہ لینا منظور نہ کیا۔ فرمانے لگے "تم جوان ہو، تعلیم حاصل کرو۔ حکومت تمہارے مصارف کی ذمہ دار رہے گی۔ پھر یہ مشکل بھی ہے کہ بین الاقوامی قوانین کی رُو سے ہم کسی غیر ملکی کو اپنی فوج میں نہیں لے سکتے۔ جنگ کی حالت میں یہ پابندی باقی نہیں رہتی، لیکن ابھی تک ہم جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔"

اِدھر سے مایوس ہو کر مصر واپس آئے اور پہنچتے ہی انگریزی مارشل لا کے چنگل میں پھنس گئے۔ لمبی داستان ہے اور اس داستان کا یہ موقع نہیں۔ قسطنطنیہ میں امیر شکیب ارسلان، عبدالعزیز شاویش، عبدالحمید زہراوی، سیّد صالح تونسی، ابو سعید الہندی العربی، مرزا عبدالقیوم علی، عبدالجبار خیری اور عبدالستار خیری، لالہ ہردیال جیسے انقلابیوں سے ملاقاتیں رہیں۔

پہلی عالمگیر جنگ شباب پر تھی مگر یہ صاحب اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ ترکوں سے لڑنے والی ہندوستانی فوجوں کو انگریز پہلے مصر میں اُتارتے تھے۔ قاہرہ کے مضافات میں ایک مقام "زیتون" ہے۔ یہیں چھاؤنی ہوتی تھی اور یہ حضرت بھیس بدل بدل کے فوجیوں میں پہنچ جاتے اور انقلابی پروپیگنڈا پھیلاتے۔ اتفاق سے ایک روز ایسا ہوا کہ ایک فوج میں بیٹھے اپنا "انقلاب" چھانٹ رہے تھے کہ دفعتاً دو سپاہی فوج کی بھیڑ چیر کر نکل پڑے اور گلے مل کر زار زار رونے لگے۔ اب جو یہ حضرت دیکھتے ہیں، تو دونوں ملیح آباد کے اور اپنے خاندان کے۔ آنکھوں کے توتے (طوطے) اڑ گئے۔ مگر اب کرتے تو کیا کرتے!

اس خطرناک انقلابی مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ تین ہزار ہندوستانی فوجی، جن میں مسلمان، ہندو، سکھ سبھی تھے "باغی" ہو گئے اور مصر میں فوجی ہنگامہ برپا کرنے کی اسکیم بھی انہوں نے پیش کر دی، مگر اس مہم کے لئے بڑے ساز و سامان کی ضرورت تھی اور ساز و سامان یہاں مفقود تھا۔ کچھ نہ ہو سکا، لیکن یہ سچے انقلابی مجاہد اپنی قسم کے دھنی نکلے۔ انگریز انہیں ترکوں کے مقابلے پر مجبور کرنے لگے اور انہوں نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ انگریزوں نے سب کو مشین گنوں سے اڑا دیا۔ ملیح آبادی صاحب کہتے ہیں کہ آج تک اس حادثے پر خون کے آنسو رو رہا ہوں۔ یہ بیچارا خون میری گردن پر ہے!

متضاد طبیعت تو ہے ہی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی پڑھنے ہی کے لئے داخل ہوئے تھے۔ مگر وہاں فٹ بال کھیلنے کے سوا کچھ نہ کیا۔ یہاں تک کہ دن دن بھر اکیلے فٹ بال کھیلا کرتے، زبردستی امتحان پاس کرتے چلے گئے۔ لیکن درجہ چہارم میں سب کتابیں صرف عربی میں تھیں۔ اور یہ حضرت عربی کی پہلی گردان کے بھی حافظ نہ تھے۔ مجبوراً مصر بھاگ گئے، اور وہاں ذہن ایسا کھلا کہ ڈیڑھ مہینے کے اندر ہی درسگاہ میں سب سے بازی لے گئے۔ ان کے دو ہم سبق بہت مشہور ہوئے: مفتی امین الحسینی (فلسطینی) اور شیخ یوسف یاسین، جو اس وقت سعودی حکومت کے ایک بڑے رکن ہیں۔

یا تو چار برس ایک عربی لفظ نہ پڑھا تھا اور یا پھر چھ مہینے ہی میں عربی کے عالم، ادیب، انشاء پرداز اور مقرر بن گئے۔ علامہ رشید رضا مرحوم نے جو استاد تھے، اپنے اس شاگرد سے ایسا رشتہ جوڑا جو باپ بیٹے کے رشتے سے بھی سوا تھا۔ استاد کا آخری خط شاگرد کو استاد کی وفات کے دسویں دن ملا۔

مصر میں چار سال پڑھنے اور ہنگامہ آرائی کرنے کے بعد حجاز گئے۔ شریف مکہ، حسین بن علی نے ترکوں سے بغاوت کی تھی، اور مصر کے حاجی اب مکے جا سکتے تھے۔ یہ حضرت بھی حج کو تیار ہو گئے۔ مگر اصل غرض یہ تھی کہ شریف حسین کی بغاوت کے راز معلوم کریں اور حجاز سے چپکے سے ہندوستان بھاگ آئیں۔ مگر جدہ میں شریف کی پولیس نے گرفتار کر لیا۔ لمبی کہانی ہے، بڑی مشکل سے جان بچی اور ہندوستان

واپس آ گئے۔

سب حالات کیسے لکھے جائیں۔ بقول شخصے کم سنی سے انگریزی سامراج کو برباد کرنے کی قسم کھائے بیٹھے تھے اور پوری زندگی اسی خبط میں گزار دی۔ پہلے لکھنؤ میں مولانا عبدالباری مرحوم فرنگی محل کے ساتھ ایک خفیہ انجمن بنائی اور ہتھیار جمع کرنا شروع کر دیے، مولانا حسرت موہانی مرحوم بھی اسی انجمن کے ایک ممبر تھے، اور پڑھنے والے یہ سن کر حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ مولوی مظہر الدین شیر کوٹی ایڈیٹر "الامان"، دہلی بھی شروع شروع اس انجمن کے سرگرم رکن تھے۔ بعد میں انگریزوں سے مل گئے، مگر خدا مرحوم کو جزائے خیر دے کہ آخری وقت تک انجمن کا راز فاش نہیں کیا، ورنہ بہت سی لاشیں پھانسی کے تختوں پر لٹکی نظر آتیں۔

پھر مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کے ساتھ ہو گئے اور کوئی دس سال ان کے پاس رہے۔ ان کے اخباروں "پیغام"، "پیام"، "الجامعہ" (عربی)، اور "الہلال" کو ایڈیٹ کرتے رہے۔ کلکتہ ہی میں دو سال جیل کو بھی آباد کیا۔ "اصحاب کہف" میں مولانا آزاد کے علاوہ سی آر داس اور سبھاش چندر بوس بھی تھے۔

مولانا آزاد نے پچاس روپیہ ماہوار جیب خرچ دینا تجویز کیا تھا، مگر بیچ میں تین سال ایسے بھی گزرے کہ خود مولانا کا ہاتھ بالکل خالی تھا۔ اس دوران میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید، ابن قیم کی کئی کتابیں ترجمہ کر ڈالیں جو "الہلال بک ایجنسی" (لاہور) کے ہاتھ بیچ کر بال بچوں کا پیٹ پالتے رہے۔

جب مولانا کے ہاں کام نہ رہا تو ان کی اجازت سے الگ ہو گئے، مگر کلکتہ ہی میں رہے۔ اب ایک پیسہ کا بھی کہیں سے سہارا نہ تھا۔ دفعتاً طے کر لیا کہ مصری اخباروں کی نامہ نگاری کریں گے۔ اور مصر کے سب سے بڑے تین اخباروں: "المقطم"، "الاہرام" اور "البلاغ" کے نامہ نگار بن گئے۔ اتوار کے دن آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک کام کرتے، تینوں اخباروں کے مضمون تیار ہو جاتے، جس سے کئی سو روپیہ ماہوار کی آمدنی ہونے لگی۔

پھر خود اپنا اخبار ڈیلی کراؤن کے آٹھ صفحوں پر کلکتہ ہی سے نکالا۔ "ہند" نام رکھا۔ اس وقت کلکتہ میں دو روزنامے نکلتے تھے: "عصر جدید" اور "جمہور" جن میں چراغ حسن حسرت مرحوم کام کرتے تھے۔ یہ دونوں اخبار شام کو نکلا کرتے جو ایک ورق کے ہوتے، خبریں انگریزی اخباروں سے ترجمہ کر لی جاتیں۔ "ہند" بالکل اپ ٹو ڈیٹ نکلا۔ کیبل سے خریدی ہوئی تازہ ترین خبریں، ایڈیٹوریل، اور وہ سب کچھ جو کسی مہذب اخبار میں ہونا چاہیے۔ مگر لطف یہ کہ بغیر کسی سرمایہ کے نکالا۔ خوش قسمتی سے کاتب بھی دھن کے دھنی مل گئے، اور پریس والا بنگالی بابو بھی نہ جانے کیوں معتقد تھا۔ کسی کارکن کی کوئی تنخواہ نہیں تھی۔ رات کو چنے بھگو دیے جاتے اور دن بھر اخبار کا پورا عملہ، اپنے تھان پر کھڑا یہی دانہ کھایا کرتا۔ اور خود "سپہ سالاری" فرماتے تھے۔ مزے لے لے کر چنے چباتے ... ... اور چنے کے فضائل و محاسن پر آسمان زمین کے قلابے ملایا کرتے!

غرضیکہ اخبار چلا، خوب چلا۔ کاتب تک اپنے کچے گھروں کو پکا کر کے مطمئن ہو گئے۔ ان کی اور ان کے بھائیوں کی شادیاں بھی اخبار ہی کی آمدنی سے ہو گئیں۔ مگر خود جیسے بے سر و سامان تھے، ویسے ہی رہے اور اب خود ہی بتایا کہ "جو کچا جھونپڑا سر چھپانے کو تھا، وہ بھی پچھلے سال کی برسات میں سربسجود ہو گیا! اور اس پر بہت خوش ہیں کہ اب ساری دنیا ہمارا گھر بن چکی ہے!

خیر سے "دوستوں" کے وسیلے بھی ہیں۔ ایک دوست مل گئے "بیس بائیس" برس دوستی کے حقوق ادا فرماتے رہے۔ حضرت کو سولہ آنے بھروسہ ہو گیا۔ اخبار کو کمپنی بنا چکے تھے، اور "دوست" کو کمپنی کا ڈائرکٹر۔ پھر چند دن تشریف لے گئے، اور "دوست" کی عنایت سے اخبار ہی سے بے دخل ہو گئے!

اب پھر وہی ڈھاک کے تین پات ہاتھ میں تھے، لیکن شکست ماننے والے بھی نہ تھے، فوراً ہفتہ وار "اجالا" جاری کر دیا، اور پہلے ہی نمبر سے اشاعت چار ہزار کے اوپر تھی۔ کسی نہ کسی طرح پریس بھی قائم کر لیا اور "آزاد ہند" کے نام سے روزنامہ بھی جاری کر دیا۔ یہ دونوں اخبار بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں، اور ان کے ہونہار لڑکے، مسٹر احمد سعید، انہیں سنبھالے ہوئے ہیں۔

پھر ۱۹۵۰ء کے اواخر میں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کے ایما پر دہلی چلے آئے۔ اب ہندوستان کی ثقافتی کونسل کے سہ ماہی علمی رسالے "ثقافت الہند" کو بھی ایڈٹ کر رہے ہیں اور آل انڈیا ریڈیو کے عربی شعبہ کے نیوز ایڈیٹر بھی ہیں۔

علمی مشاغل پر میں نے کچھ نہیں لکھا۔ ملک بھر ان مشاغل سے واقف ہے۔ بہت سی تالیفیں اور ترجمے نکل چکے ہیں۔ بہت سے مسودے طباعت کا انتظار کر رہے ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولانا آزاد کے ساتھ اتنا لمبا علمی ادبی ساتھ رہا، مگر مولانا کا اسلوبِ نگارش قبول نہ کیا۔ خود کہا کرتے ہیں: "مولانا کا اسلوب، مولانا ہی کے ساتھ خاص ہے۔ اس کی نقل اتارنا اپنی فضیحت کرانا ہے۔"

خود اپنا ایک اسلوب پیدا کر لیا ہے۔ یہ اسلوب عجیب دلفریب ہے۔ نہایت آسان، عام فہم، اور دلنشین ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی محاسن سے بھرا پڑا ہے۔ مضمون تو مضمون ان کی کتابیں کی کتابیں پڑھ جائیے، نہ آپ الجھے ہوئے جملے ملیں گے، نہ بوجھل عربی فارسی لفظ، سیدھی سادی ہموار تحریر ملے گی۔ کہیں آپ کو رکنا نہ پڑے گا۔ مطالب بے تکلف ذہن میں بیٹھتے چلے جائیں گے۔ خود کہا کرتے ہیں: "میرے اخباروں کے کامیاب رہنے کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ اتنا آسان لکھتا ہوں کہ عورتیں اور بچے تک سمجھ جاتے ہیں۔" تحریر میں ہلکی سی ظرافت اور دلچسپی بھری چٹکیاں ہوتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ پڑھنے والا اکتاتا نہیں بلکہ چٹخارے لیتا ہوا پڑھتا چلا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین

ضیاء الحسن فاروقی

حکایت از قدِ آں یارِ دلنواز کنیم
بدیں فسانہ مگر عمر خود دراز کنیم

سنہ ۱۹۴۲ء میں جب میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا تو میرے زیرِ مطالعہ ایک کتاب تھی 'پردۂ غفلت'۔ بیداریٔ شعور کی اس منزل میں مجھے کتاب کے مصنف سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بس 'پردۂ غفلت' کے پلاٹ اور کرداروں سے الجھا ہوا تھا۔ مصنف کو میری جماعت کا کوئی طالب علم نہیں جانتا تھا اور شاید جو استاد ہم لوگوں کو اردو پڑھاتے تھے انہیں بھی اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک بڑا ادیب اور انشا پرداز ہے۔

میٹرک کے بعد جب میں علی گڑھ پہنچا تو وہاں ایک دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کی ہوئی اسٹینڈرڈ انگلش - اردو ڈکشنری کی تالیف و ترتیب میں مولوی عبدالحق کے علاوہ جس شخص کی ذہنی و علمی کاوشوں کی آمیزش ہے اس کا نام ڈاکٹر سید عابد حسین ہے اور وہ جامعہ ملیہ، دہلی میں پروفیسر ہے۔ اس کے بعد مجھے اس پروفیسر کے بارے میں اور جاننے کا اشتیاق ہوا۔ مجھے کا موقع تو بہت جلد نہیں ملا البتہ علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں میں نے عابد صاحب کے وہ ترجمے پڑھے جن کا اس وقت وہاں چرچا تھا۔ خاص طور سے میرے ایک دوست جو سائیکالوجی کے طالب علم تھے۔ نفسیات عنفوانِ شباب کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ یہ ترجمہ ہے جرمنی کے مشہور عالم ایڈورڈ اشپرانگر کی کتاب سائیکالوجی آف یوتھ (Psychology of youth) کا۔ ترجمے کے شروع میں جو دیباچہ ہے اس سے مترجم کی عالمانہ ژرف بینی کا کسی قدر اندازہ ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مترجم پروفیسر اشپرانگر کا شاگرد ہے اور برلن یونیورسٹی کا پی۔ ایچ۔ ڈی ——— جگ بیتی جو پنڈت نہرو کی مشہورِ عالم Glimpses into World History کا ترجمہ ہے اور ترکی میں مغرب و مشرق کی کشمکش جو خالدہ ادیب خانم کی تقریروں کے مجموعے — Struggle between the East and the West in Turkey — کا ترجمہ ہے ——— یہ دونوں ترجمے بھی میں نے علی گڑھ ہی میں پڑھے۔ یہ دونوں کتابیں میں نے مولانا ضیاء احمد بدایونی

(ریڈر شعبۂ فارسی - مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے کہنے پر انگریزی میں بھی پڑھیں۔ (مولانا یوں تو مجھے فارسی پڑھاتے تھے لیکن اردو کے متعلق میرا ذوق شوق دیکھ کر بڑے مفید مشورے دیتے تھے)۔ اس وقت تک میں نہ سمجھ سکا کہ مولانا نے اردو یا فارسی کی کسی کتاب کے بجائے انگریزی کی کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ کیوں دیا لیکن دو تین ہفتے کے بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ یہ دونوں کتابیں میں نے پڑھ ڈالی ہیں تو فرمایا کہ "آپ نے مجھ سے کسی موقع پر جگ بیتی اور ترکی میں مغرب و مشرق کی کشمکش کا ذکر کیا تھا۔ اب آپ یہ بتایئے کہ ڈاکٹر عابد حسین کے بارے میں بحیثیت مترجم کے آپ کی کیا رائے ہے؟" میں نے عرض کیا کہ "میں نے اس نقطۂ نظر سے تو ان کتابوں کا مطالعہ کیا نہیں اور پھر ایسے مسائل کے بارے میں ابھی میری رائے ہی کیا۔ البتہ مجموعی طور پر میرا تاثر یہ ہے کہ باوجود یہ جاننے کے کہ جگ بیتی ترجمہ ہے دوران مطالعہ میں کسی موقع پر یہ نہیں محسوس ہوا کہ یہ ترجمہ ہے"۔ کہنے لگے۔ "یہی مترجم کا کمال ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی مضمون یا کتاب کا منتقل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ ترجمہ کرنے والے کو دونوں زبانوں پر عبور ہونا چاہئے اور پھر سب سے اہم کام الفاظ کے صحیح انتخاب کا ہے' اس پر اسے پوری قدرت ہونی چاہئے ——— ڈاکٹر عابد حسین میں یہ دونوں کمال بدرجہ اتم موجود ہیں"۔

۱۹۴۵ء میں، میں نے علی گڑھ سے بی۔ اے کیا اور ایم۔ اے کرنے کے لئے میں نے الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ وہاں مجھے عابد صاحب کی ادارت میں نکلنے والے ہفت روزہ اخبار "نئی روشنی" کی خبر ملی۔ عابد صاحب سے جو ذہنی تعلق قائم ہوگیا تھا اس نے ایک دن "نئی روشنی" کو ڈھونڈ ہی لیا۔ پھر جب تک "نئی روشنی" نکلتا رہا اس کی آمد کا برابر مجھے انتظار رہتا۔ اسی میں میں نے چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنے شروع کئے اور اس طرح ایک طرح کا قلمی تعلق بھی قائم ہوگیا۔ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اور ملک کو، خاص طور سے مسلمانوں کو آگ اور خون کے جس سمندر سے گزرنا پڑا اس سے ایک طرح کی انفعالی کیفیت سبھی پر طاری تھی۔ چاروں طرف اندھیرا تھا، راہ اور نشانِ منزل سب گم ہوتا نظر آرہا تھا۔ مسلمانوں پر افسردگی اور شکست خوردگی کی ایک ایسی کیفیت طاری تھی جو صحیح طور پر سوچنے، حالات اور ان کے تقاضوں کو سمجھنے اور اپنے لئے کوئی لائحہ عمل متعین کرنے کی ساری صلاحیتیں مفلوج کئے دے رہی تھی۔ حالات کی ان تاریکیوں میں نئی روشنی نے بہت پریشان ذہنوں کو سیدھی راہ کا پتہ دیا اور جمود و تعطل کے سیاہ بادلوں میں امید کی کرن ہی کو منزل کی نشاندہی کی۔ میرا خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ عابد صاحب کا یہی ایک کام بہت بڑا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دماغوں میں وسعت اور دلوں میں گرمی ہے اور جو ملک و ملت کا درد رکھتے ہیں۔ "نئی روشنی" میں "بزم بے تکلف" کے نام سے ایک کالم ہوتا تھا۔ اس کالم کے ذریعے عابد صاحب نے طنز و مزاح کے پردہ میں بڑے بڑے سیاسی، سماجی اور اخلاقی مسائل چھیڑے اور ان کی طرف لطیف اشارے کرکے ذہنوں میں ایک بے چینی پیدا کی۔ ایسی بے چینی کہ اگر صحت مند بنیادوں پر اس کی پرورش کی جائے اور اسے زندہ رکھا جائے تو وہ کسی قوم کا بھی سرمایہ بن سکتی ہے۔ موجوں کا اضطراب دریا میں زندگی کی علامت ہے۔

۱۹۵۰ء میں ایم۔ اے کرنے کے بعد مدینہ (بجنور) کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہوگیا۔ غالباً ۱۹۵۰ء کے آخر یا ۱۹۵۱ء کے شروع میں مجھے جامعہ آنے کا اتفاق ہوا اور جامعہ پہنچ کر سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہ کہ عابد صاحب کے دروازہ پر صدا لگائی۔ عابد صاحب اتفاق سے تشریف رکھتے تھے۔ فوراً شرف باریابی حاصل ہوا۔ بڑی شفقت سے بٹھایا۔ پہلے میرے بارے میں پوچھا پھر مدینہ اور نئی روشنی کے بارے میں گفتگو ہوئی، پھر عام مسائل چھڑ گئے۔ ایک ایسے شخص سے جو عمر میں بہت چھوٹا ہو، علم میں بالکل ہیچ ہو، عابد صاحب نے دو ڈھائی گھنٹے گفتگو کی، بڑے اطمینان، سکون اور تفصیل کے ساتھ۔ جب میں رخصت ہوا تو آپ یقین مانئے میری آنکھیں پُرنم تھیں۔ معلوم نہیں کیوں؟ شاید فرطِ مسرت میں کہ اتنے بڑے آدمی سے ملاقات ہوئی! شاید اس لئے کہ اپنی ہیچمدانی کے باوجود پہلی بار اپنی شخصیت کا احساس ہوا تھا اس لئے کہ میں اتنی طویل اور مفصل ملاقات کی توقع لے کر نہیں آیا تھا "ایسی محبت اور شفقت کی امید نہ تھی۔ میں نے

بزرگوں سے سنا ہے کہ بڑا آدمی وہ ہے جو چھوٹوں کو یہ محسوس نہ ہونے دے کہ وہ چھوٹے ہیں۔

اس ملاقات کے بعد عابد صاحب کو کبھی کبھی خط لکھتا تھا۔ عابد صاحب فوراً جواب دیتے اور اگر کوئی بات مشورہ طلب ہوتی تو مشورہ دیتے اور مجھے اطمینان ہو جاتا۔ ۱۹۵۳ء میں جب میں جامعہ آیا تو عابد صاحب جرمنی میں تھے۔ ۱۹۵۴ء میں جب وہ جرمنی سے واپس تشریف لائے تو مجھ سے بڑی محبت سے معانقہ فرمایا اور کہا کہ جامعہ میں تو آپ کا دل لگ گیا ہوگا! اس دن سے لے کر آج تک کئی سال ہو گئے ہیں۔ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ کام کرتے ہوئے، مقالے پڑھتے ہوئے، ادبی و علمی جلسوں کی صدارت کرتے ہوئے، علمی مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے، چائے پیتے ہوئے، کھانا کھاتے ہوئے، کبھی کبھی حقے کے کش لگاتے ہوئے اور سگار پیتے ہوئے (ڈاکٹر صاحب نے تمباکو نوشی ترک کر دی ہے۔ لیکن جب مجیب صاحب سگار پیش کرتے ہیں تو پی لیتے ہیں) اور میں کہہ سکتا ہوں کہ عابد صاحب کی شخصیت میں بڑی جاذبیت اور ان کے یہاں بڑی سادگی اور اچھوتا پن ہے۔ ذہن صاف اور دل بڑا ہے۔

عابد صاحب ۱۷ صفر ۱۳۱۴ھ (۹ جولائی ۱۸۹۶ء) کو بھوپال میں پیدا ہوئے جہاں ان کے دادا مرحوم سید حامد حسین صاحب ملازم تھے۔ انہیں اردو، فارسی اور عربی اچھی آتی تھی، شاعر تھے اور تاریخ گوئی میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ خاندان کی روایت کے مطابق عابد صاحب کی تعلیم بھی پہلے گھر پر شروع ہوئی۔ قرآن پڑھا اور پھر عربی اور فارسی کا سلسلہ شروع ہوا۔ خاندان کے بعض بزرگ انہیں عربی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ ابتدائی کتابیں ختم کر لینے کے بعد انہیں لکھنؤ بھیجا جائے۔ اور وہاں سے وہ مجتہد بن کر آئیں اور اس کشمکش میں تیرہ چودہ سال گزر گئے۔ آخر کار 'قدیم' پر 'جدید' غالب آیا اور عابد صاحب ۱۹۱۰ء میں بھوپال کے جہانگیریہ ہائی سکول میں پانچویں جماعت میں داخل ہو گئے۔ اس عرصہ میں انہوں نے تھوڑی سی انگریزی اور حساب اُردو سیکھ لی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں انہوں نے اول درجہ میں میٹرک پاس کیا اور اسکالرشپ ملا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ میور سنٹرل کالج الٰہ آباد میں داخل ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ میں انہوں نے ریاضی اور سائنس لی۔ مگر ان مضامین سے کوئی طبعی مناسبت نہ تھی اس لئے ایف۔ اے میں سیکنڈ کلاس ملی۔ بی۔ اے میں جب آئے تو ریاضی اور سائنس کی دوستی کو چھوڑ کر فلسفے کی رفاقت لی۔ فلسفے کی خشکی کے ساتھ فارسی اور انگریزی ادبیات کی رنگینی سے ایک خوشگوار امتزاج قائم کیا اور بی اے میں فرسٹ کلاس لی۔ الٰہ آباد میں وہ مسلم بورڈنگ ہاؤس میں جو ایم۔ بی۔ ہاؤس کے نام سے مشہور ہے، رہتے تھے۔ ڈھائی سال تک وہ یہاں مسلم ہوسٹل میگزین کے ایڈیٹر رہے۔ اسی زمانہ میں ان کی ملاقات اکبر الٰہ آبادی مرحوم سے ہوئی تھی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد وہ علی گڑھ چلے آئے اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں ایم اے (انگریزی) میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ میں اس وقت ایک بے چینی تھی، ایک کشمکش تھی۔ عدم تعاون کی تحریک نے طلبہ اور اساتذہ کو ایک ہیجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ عابد صاحب اگرچہ اس تحریک سے الگ تھلگ رہے لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی لحاظ سے یہ سال ان کا بیکار گیا۔ ۱۹۲۰ء میں باہر جانے کے لئے انہیں ریاست بھوپال سے وظیفہ ملا، تھوڑی بہت امداد ان کے چچا نے بھی کی اور وہ انگلستان چلے گئے۔ جہاں انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں بی لٹ (آکسن) کے لئے فرسٹ پارٹ کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا۔ لیکن چونکہ وظیفہ کی رقم اتنی نہیں تھی کہ انگلستان میں رہ کر وہ یکسوئی سے تعلیم حاصل کر سکتے اس لئے وہ مارچ ۱۹۲۲ء میں وہیں سے جرمنی چلے گئے۔ جرمنی میں انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا۔ فلسفہ خصوصاً فلسفۂ تعلیم خاص مضمون تھا اور اس کے ساتھ عربی اور تاریخ یورپ دوسرے مضامین تھے۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ جرمنی میں پروفیسر ایڈورڈ شپرانگر کی رہنمائی میں علمی سرگرمیاں ہی ان کی توجہ کا مرکز رہیں۔ اس وقت اتفاق سے ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، خواجہ عبدالحمید اور ڈاکٹر سلیم الزماں وہیں موجود تھے۔ ہندوستانی ایسوسی ایشن ان سب کا علمی و تہذیبی پلیٹ فارم تھا۔ ذاکر صاحب سے وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ ذاکر صاحب کی کوششوں سے برلن کے کاویانی پریس نے دیوانِ غالب شائع کیا تھا اس

کی تصحیح میں عابد صاحب کا بھی ہاتھ تھا۔ عابد صاحب نے ایک مرتبہ مزاحاً مجھ سے فرمایا کہ دیوانِ غالب کا یہ نسخہ تصحیح نہیں بلکہ تنقید کے لحاظ سے بڑی دلچسپی رکھتا ہے۔

جرمنی ہی کے دوران قیام میں یورپ کے ایک مشہور شہر میں ان ہندوستانی نوجوانوں کی ملاقات حکیم اجمل خاں مرحوم سے ہوئی تھی۔ مضامینِ عابد میں ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے "سچا افسانہ"۔ اس مضمون میں اس ملاقات کی طرف اشارہ ہے۔ ان نوجوانوں کے بڑھے ہوئے ارادے اور بلند خیالات کا تصادم ہوتا ہے ایک پیرِ فرزانہ کی معتدل اور سبک رو دانشمند طبیعت سے۔ اس کا ایک پیراگراف ملاحظہ ہو کتنی حرارت ہے اس میں! کتنی پُرسوز حقیقت ہے یہ اپنے دامن میں لئے ہوئے!

> "یہ ہمتیں اور یہ ارادے ہیں ان نوجوانوں کے، مگر دنیا میں بڑے کام کرنے والے کے لئے محض ہمت اور ارادہ کافی نہیں، جب تک تجربہ اور معلومات اور لیاقت اور تدبیر، احتیاط اور استقلال شریکِ کار نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ صفات نوجوانوں کو نصیب نہیں۔ یہ اس پیرِ دانش کے حصے میں آتی ہیں جس کی رگوں میں خون کی گردش معتدل ہو چکی ہو اور جس کی سیرت میں وہ ترکیبی امتزاج پا چکی ہوں۔ ان نوجوان سپاہیوں کو تلاش ہے ایک پیرِ مرد جوان کا سالار بنے۔ یہ ایسا سالار چاہتے ہیں جس نے مشرق و مغرب کے درمیان کی دشوار گزار گھاٹیوں کو طے کیا ہے، اور دونوں میدانوں میں دادِ شجاعت دی ہے جس نے رن دیکھے ہیں اور معرکے جیتے ہیں۔ جس نے سختیاں جھیلی ہیں اور مشکلوں پر فتح پائی ہے۔ یہ لوگ چشمِ تصور سے ہندوستان کے تمام سربرآوردہ مسلمانوں کو دیکھتے ہیں۔ مگر کوئی ان کے کام کا نظر نہیں آتا۔"

جرمنی ہی میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے اپنا اصلاحی ڈرامہ "پردۂ غفلت" لکھا اور ڈچ مصنف ڈی بوئر (De Boer) کی کتاب ہسٹری آف فلاسفی اِن اسلام کو جرمن زبان سے اردو میں منتقل کیا۔ یہ کتاب اسلامی فلسفے پر نہیں ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت میں یہ کتاب مسلمان فلسفیوں کے بارے میں ہے اور جامع ہے۔

فروری ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب —— جامعہ کی تین اہم شخصیتیں —— جرمنی سے ہندوستان واپس آئے اور تینوں نے جامعہ کو اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس لحاظ سے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سال جامعہ کی تاریخ کا بڑا اہم سال ہے۔ تین شخصیتیں جو ایک دوسرے کے قلب کی حرارت، اور نگاہوں کی بلندی کو اچھی طرح سمجھتی تھیں، ایک ٹیم کی حیثیت سے اس قومی ادارہ کے لئے اپنی جان کھپانے کو تیار ہو جاتی ہیں جو شدائد و مشکلات کی سخت ترین منزلوں سے گزر رہا تھا جس کا نہ کوئی شاندار ماضی تھا نہ حال امید افزا اور نہ مستقبل کا پتہ —— اپنے مستقبل کو کسی ایسے ادارے سے وابستہ کر دینا بڑے دل و جگر کا کام ہے۔ لیکن بڑی شخصیتیں اسی طرح "نقد" کو نظر انداز کر کے "ادھار" سے معاملہ کرتی ہیں۔

ایک مرتبہ میں نے عابد صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ طالب علمی ہی کے زمانے سے نیشنلسٹ تھے۔ فرمایا کہ پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں میں انگریزوں کا طرفدار تھا، پانیر پڑھتا تھا اور میرے سیاسی خیالات وہی تھے جن کی تبلیغ پانیر کرتا تھا۔ لیکن جب جلیانوالہ باغ کا حادثہ ناگہاں پیش آیا تو میرے دل و دماغ کی دنیا بدل گئی۔ جلیانوالہ باغ کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ اسی زمانے میں مجھ پر گاندھی جی کی ایک تقریر کا جو معاشیات سے متعلق تھی اور جس میں پیداوار اور تقسیمِ پیداوار سے بحث کی گئی تھی، بہت اثر ہوا۔ سامراجی نظام کی چیرہ دستیاں مجھ پر واضح ہونے لگیں۔ جب میں آکسفورڈ گیا تو وہاں میرے خیالات بلکہ میرا طرزِ خیال ہی بدل گیا۔ نومبر ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے۔ آکسفورڈ میں جہاں

کہ بختے پہلے میں پیرس میں داخل ہوا تھا ایک دوست کے یہاں اکتوبر کے ماڈرن ریویو میں ٹیگور کا مضمون "حق کی ندا" (The call of truth) نظر سے گزرا جس میں عدم تعاون کی تحریک پر سختی سے تنقید کی گئی تھی۔ اسی کے ساتھ ۱۳ اکتوبر کے ینگ انڈیا میں گاندھی جی کا جواب "The great sentinel" کے عنوان سے پڑھا۔ ٹیگور اور گاندھی کی یہ بحث مشہور ہے۔ اپنے مضمون میں ٹیگور نے گاندھی جی کی تحریک پر جو اعتراضات کئے تھے ان میں بڑی جان تھی لیکن گاندھی جی نے جو جواب دیا تھا اس میں بڑی حقیقت پسندی تھی، آزادی اور عزت نفس کی تعلیم تھی۔ "شاعر" اور "مصلح" کی اس بحث میں مصلح غالب رہا اور میں گاندھی جی کو ٹیگور کو اپنے آپ کو اور زندگی کو اور ہی نظروں سے دیکھنے لگا —— غالباً خیالات کی یہی تبدیلی عابد صاحب کو جامعہ لے آئی۔ اب جامعہ میں انہیں پورے تیس سال ہو چکے ہیں۔ اس تیس سال کے عرصہ میں جامعہ نے نہ معلوم کتنے نشیب و فراز دیکھے —— اس پر جانکنی کا عالم طاری ہوا پھر زندگی کے آثار ظاہر ہوئے —— ڈاکٹر صاحب بھی اس نشیب و فراز سے گزرے ان کی شخصیت کی تعمیر میں جہاں بچپن اور جوانی کے بہت سے خانگی آلام و مصائب کا ہاتھ ہے وہاں عہد بلوغت کے اس نشیب و فراز کو بھی بہت دخل ہے۔

بہت کم لوگوں کو شاید یہ معلوم ہو کہ عابد صاحب نے شاعری بھی کی ہے اور ان کے اشعار اکبر الٰہ آبادی مرحوم سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ الٰہ آباد میں اکبر مرحوم سے ان کی ملاقات بحیثیت شاعر ہی کے ہوئی تھی۔ پھر جب وہ علی گڑھ آئے تو انہوں نے علی گڑھ میگزین میں اکبر الٰہ آبادی پر ایک مضمون لکھا اور غالباً اسی اشاعت میں ان کی ایک نظم "شرح درد اشتیاق" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اکبر مرحوم نے یہ مضمون اور نظم دیکھی تو رشید صاحب کو لکھا کہ یہ ڈاکٹر سید عابد حسین کون ہیں۔ (الٰہ آباد کی ملاقات کی یاد شاید ان کے ذہن سے نکل چکی تھی) نظم کا آخری بند یہ تھا:

……

باعث تسکیں اگر ہے یہ خیال — عارضی ہے زیست کا رنج و ملال
انتہائے نور و ظلمت کو سمجھ! — چند لمحے، چند ساعت، چند سال
پھر وہی آہنگ سیر و مکاں — پھر وہی سودائے حسن لازوال
قید صورت سے ملے گی جب نجات — شاہد معنی سے پھر ہوگا وصال

"مرغ جاں را آشیانے دیگر است
ایں مکاں را ہم مکانے دیگر است"

اکبر مرحوم نے عابد صاحب کو بھی لکھا "آپ کی نظم میں نے پڑھی۔ خوب ہے۔ خصوصاً آخر کا بند اسے پڑھ کر میری زبان پر بے اختیار یہ شعر آگیا ؎

آپ کی ہستی تو ذوق ماورائے عرفاں میں گم — کاش چھوڑے آپ کے دامن کو یزداں پرستی

عابد صاحب کی نثر بڑی چوکھی اور بڑی بسی ہوئی ہوتی ہے۔ عبارت کا ہر لفظ اپنی جگہ پر "نگینہ" ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں نے "مضامین عابد" کا مطالعہ کیا ہے وہ میرے اس دعوے سے متفق ہوں گے۔ یا پھر جن طلبہ نے جامعہ کالج میں ان سے اردو پڑھی ہے ان سے ذرا عابد صاحب کا حال بحیثیت استاد اردو کے پوچھئے۔ آج جبکہ وہ درس و تدریس کے کام سے الگ ہو کر تصنیف و تالیف کا کام کر رہے ہیں، طلبہ انہیں یاد کرتے ہیں اور ہم سب ان کی کمی بڑی طرح محسوس کرتے ہیں۔ طلبہ کے ساتھ ان کا تعلق بڑا گہرا ہوتا ہے۔ مستطیع اور غیر مستطیع ہر قسم کے طلبہ کو مختلف طریقوں سے ان سے فیض پہنچتا رہتا ہے۔ حاجتمند طلبہ کی وہ ہر طرح سے دامے، درمے، قدمے، سخنے مدد کرتے ہیں۔ عابد صاحب جب جامعہ میں رہتے ہیں تو کالج کے طالب علموں کو بڑا اطمینان رہتا ہے۔

مضامینِ عابد میں ایک مضمون "حدیثِ دیگراں" کے عنوان سے ہے۔ یہ مضمون ایک طرح سے تبصرہ ہے مولوی عبدالحق صاحب کے مجموعۂ مضامین "چند ہمعصر" اور خود مولانائے موصوف کی منفرد شخصیت پر۔ اس میں ایک جگہ عابد صاحب نے لکھا ہے: "ایک مصنف خواہ وہ خود پوشی میں کتنا ہی اہتمام کرتا ہو، یوں تو اپنی ہر تحریر کے اسلوب اور مضمون میں اپنی شخصیت کی ایک جھلک دکھانے پر مجبور ہے لیکن خاص کر اس وقت جب وہ دوسروں کی سیرت پر قلم اٹھاتا ہے اس کے ظرف کی، ذات کا حجاب اٹھ جاتا ہے، اوروں کے جوہر پرکھنے میں خود اس کے جوہر کھل جاتے ہیں ——— کیا میں اس موقع پر یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ یہاں صیاد خود اپنے دام میں آگیا ہے۔ اس مضمون میں کتنے ہی ایسے فقرے اور جملے ہیں جہاں عابد صاحب خود بھی آپ سے نہیں بچ سکے ہیں۔ مولانا کی سیرت کے سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے کہ "سچ پوچھئے تو مسندِ علم کی وہ منزلت ہے کہ جاہ و دولت کا تخت بھی اس سے اوپر جانا حقیقت میں نیچے اترنے کے برابر ہے۔" ایک مرتبہ، مجھے یاد ہے کہ انہوں نے بڑے پُرزور الفاظ میں "تلامذۂ مکتب" کے بلند مدارج کا مجھ سے ذکر کیا اور کہا کہ دنیا کے علم کے سامنے مسندِ جم کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

عابد صاحب کے یہاں کنبے کا تصور بہت وسیع ہے۔ خاندان اور عاقلہ کا ہر فرد ان کا عزیز ہے اور دل سے انہیں عزیز ہے اور جب کبھی کوئی موقع آتا ہے تو عابد صاحب کی موجودگی ان کے دل کو تقویت دیتی ہے۔ جب وہ طالب علم تھے اور وظیفہ پاتے تھے تو وظیفے کی رقم بڑی بیوہ کے علاج معالجے میں صرف کرتے تھے اور انہیں یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ ان کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں۔ صالحہ باجی (بیگم عابد حسین) کا کہنا ہے کہ عابد صاحب کی شرافتِ نفسی کا اندازہ گھر ہی میں ہوتا ہے۔ ملازموں سے انہیں بڑی محبت ہے اور جب کبھی میں کسی بات پر ملازموں سے باز پرس کرتی ہوں اور عابد صاحب کو اس کی اطلاع ہو جاتی ہے تو وہ ہمیشہ ملازموں کی طرفداری کرتے ہیں۔ عابد صاحب کے دوست بہت کم ہیں۔ لیکن جو ہیں ان پر وہ جان چھڑکتے ہیں، ذکی الحس اور متحمل اتنے ہیں کہ دوستوں سے معمولی سے درجے کی بات بھی نہیں چھپاتے۔ دوستوں کو بھی عابد صاحب کی رائے پر بہت بھروسہ ہوتا ہے، جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا ہے تو وہ ہی اسے حل کرتے ہیں اور سب مطمئن ہو جاتے ہیں۔

عابد صاحب کے مزاج میں بڑی سادگی ہے۔ لباس بہت سادہ اور کھانا بہت کم۔ بمشکل دو چپاتی کھاتے ہیں۔ میٹھا ان کی کمزوری ہے۔ طبیعت میں بھی بہت سادگی ہے۔ یہ ہنر ہے کہ وہ اس سادگی میں اپنی بذلہ سنجی کے ذریعہ بڑی چاشنی پیدا کر دیتے ہیں۔ مزاح ان کی طبیعت کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔

صبح و شام ایک دو میل تک ٹہلنا عابد صاحب کے معمولات میں سے ہے۔ روسو نے ایک جگہ اپنے بارے میں لکھا ہے کہ "میں بیٹھ کر سوچ ہی نہیں سکتا، میرے پاؤں کی 'حرکت' میرے دماغ کی 'حرکت' کا سبب بنتی ہے۔" میرا خیال ہے کہ عابد صاحب کے ساتھ بھی کم و بیش یہی معاملہ ہے۔ شام کے وقت کبھی کبھی میں ان کے ساتھ ہو جاتا ہوں، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے، میں کوئی بات چھیڑ دیتا ہوں، پھر "گل افشانیٔ گفتار" کا تماشہ دیکھتا ہوں۔ غالب کو اس کام کے لئے "پیمانۂ صہبا" کی ضرورت پڑی تھی، عابد صاحب کو کھلی ہوئی فضا چاہئے۔ عابد صاحب کی حاضر جوابی مسلّم ہے۔ سنا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی ان سے گھبراتے ہیں۔ بے شمار لطیفے ایسے ہیں جو جامعہ والوں کی زبان پر ہیں۔ کچھ فطری طور پر وہ حاضر جواب ہیں، علم و شعور، مطالعہ اور مشاہدہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ بچپن کا ایک واقعہ ہے۔ ان کے والد مرحوم کے ایک دوست تھے جو اکثر انہیں چھیڑا کرتے تھے۔ ایک دن وہ آئے اور ان کی طرف اشارہ کرکے ان کے والد سے کہا، آپ نے عابد حسین کو کیا قصائیوں میں دیا تھا؟ ابھی وہ کوئی جواب بھی نہیں دینے پائے تھے کہ عابد صاحب نے کہا "جی ہاں، انسانوں کا قصائی تھا۔" اس وقت ان کی عمر دس سال کی تھی۔

صالحہ باجی چوہوں سے بہت ڈرتی ہیں۔ ان کے یہاں کئی چوہیاں ہو گئی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان پر چوہوں کی طرف سے دہشت ہونی چاہئے۔ عابد صاحب اس معاملے میں بہت بے نیاز ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چھوٹی گھر کی چیزیں ہیں تو نہ جانے کیسے جانے دو۔ ایک مرتبہ عابد صاحب بہت غصہ سے

کے لئے کہیں باہر جا رہے تھے۔ صالحہ باجی کا اصرار تھا کہ ڈاکٹر صاحب ذرا جلدی آ جائیے گا' عابد صاحب کہہ رہے تھے 'ایسی کیا جلدی ہے' صالحہ باجی کی طرف سے جو دلیل دی جا رہی تھی اس میں چوروں کا خاص ذکر تھا۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ اگر کوئی چور آ گئے اور میرا گلا دبا دے تو میں کیا کروں گی، شور بھی نہیں مچا سکتی۔ عابد صاحب نے برجستہ کہا "اور اگر میں ہوا اور دو چور آ گئے، ایک نے آپ کا گلا دبایا اور دوسرے نے میرا تو نتیجہ کیا ہوگا؟"

پٹنہ میں ایک تعلیمی کانفرنس تھی۔ جامعہ کی طرف سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، پروفیسر محمد مجیب اور عابد صاحب اس میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ مجیب صاحب اور عابد صاحب کا قیام ایک ہی کمرہ میں تھا۔ رات کو جب یہ لوگ لیٹے تو مجیب صاحب کچھ بے چین ہو کے بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ عابد صاحب نے کہا 'مجیب صاحب! کیا بات ہے' مجیب صاحب نے بڑے تکلف سے کہا 'معلوم ہوتا ہے کہ چارپائی میں کھٹمل ہیں' عابد صاحب نے بے ساختہ فرمایا 'تو پھر مدح صحابہ پڑھئے' (مجیب صاحب شیعہ ہیں) عابد صاحب شیعہ تو ہیں لیکن عید بقر عید کی نماز جامعہ میں ہمیشہ سنیوں کے ساتھ پڑھتے ہیں اور 'وارکعوا مع الراکعین' کی زندہ مثال ہیں۔

عابد صاحب دُھن کے آدمی ہیں، کوئی کام اُن کے ہاتھ میں ہو جب تک وہ پورا نہیں کریں گے دوسرا کام نہیں شروع کریں گے۔ اسی لئے وہ ہمیشہ ایڈمنسٹریشن کی ذمہ داریوں سے بچتے رہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ان کی طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی ہے۔ وہ سست سوچتے ہیں' فرماتے ہیں کہ زبان کی طرح دماغ میں بھی لکنت ہے۔ لیکن اس سے ایک فائدہ یہ ہے کہ جو کچھ سوچتے ہیں تہ تک سوچتے ہیں، ہر پہلو کی تفصیل پر نظر رکھتے ہیں اس لئے ان کا ہر فیصلہ دو اور دو چار کی طرح واضح، صاف اور مطمئن کرنے والا ہوتا ہے۔

صالحہ باجی کہتی ہیں کہ گھر میں لوگ چھوٹے موٹے مرض کی اطلاع بھی عابد صاحب کو نہیں ہونے دیتے اس لئے کہ اگر انہیں خبر ہو جائے تو لکھنے پڑھنے کا سارا کام ترک کر کے اس طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹر سے رجوع کریں گے یہاں تک کہ بے چارہ مریض پچھتائے گا کہ ناحق انہیں اس کی اطلاع ہو گئی۔

عابد صاحب کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی ان کی انسان دوستی ہے۔ ان کی چال پُرسکون اور ہنسی دل نواز ہے۔ فرد کی ان کے نزدیک بڑی اہمیت ہے اور فرد کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں ان سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ سب کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اب وہ ملک کی ان چند شخصیتوں میں سے ہیں جن پر بجا طور پر ناز کیا جا سکتا ہے۔

عرشی رامپوری

عشرت رحمانی

پارٹیشن سے قبل ریاست رامپور (یو-پی) میں "بزم ادب" کے نام سے ایک ممتاز علمی ادبی جماعت قائم تھی۔ اس کے روح رواں مرحوم عزیز یوسف خاں مرحوم مدیر رسالہ "نیرنگ" و مالک مطبع سعیدی تھے۔ عزیز مرحوم نہایت اعلیٰ خوبیوں کے انسان تھے۔ "نیرنگ" اپنے زمانہ کا ایک ممتاز علمی ادبی ماہنامہ شمار کیا جاتا۔ اور عزیز مرحوم نے اپنی زندگی علم و ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی۔ اور اپنے کسب کمال سے عزیز جہاں بنے ہوئے اپنے گرد شیدائیان ادب کا ہجوم لئے خاموشی اور تندہی سے مصروف کار تھے۔ اس بزم کا مرکز "نیرنگ" کا دفتر عزیز مرحوم کا مکان واقع گھیر ملکیاں تھا جو دفتر کم اور یاروں کا تکیہ زیادہ تھا۔

بزم ادب کے زیر اہتمام یوں تو کبھی کبھار مختصر شاعرانہ محفلیں منعقد ہوتی رہتیں۔ اور سال میں ایک دو عالیشان قسم کے مشاعرے ہو جاتے۔ لیکن اس کی خاص سرگرمیوں میں روزانہ کی وہ محفل تھی جو چند مخصوص اہل علم و ادب پر مشتمل دوستوں کی نشست کہی جاتی۔ مگر اس میں علم و فن کا کوئی موضوع ایسا نہ تھا جو آگے دن زیر بحث نہ آتا ہو۔ اس بزم کے اراکین میں رامپور کے معدودے چند حضرات شریک تھے۔ جن میں بزرگ بھی تھے اور جواں سال بھی۔ عزیز مرحوم کے خلوص نے ان سب کو اپنی بزم ادب کی شمع کا ہم ذوق پروانہ بنا لیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۲ء کا زمانہ تھا میں اپنی ابتدائی تعلیم سے فراغت حاصل کر کے کلکتہ اور لاہور کے قیام کے بعد رامپور آیا تھا اور اپنے ذوق ادب کی تسکین کی خاطر [illegible] اس بزم میں شریک ہو گیا۔ میری حیثیت ان چند بزرگوں میں سب سے چھوٹے کی تھی۔ لیکن یہ یاران نکتہ داں کی محفل تھی جہاں چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ یہاں تو "زندگی برائے ادب" کا نعرہ سب کی زبان پر تھا اور ہر شام کے چند گھنٹے نہایت خلوص و یگانگت کے ساتھ ادبی گفتگو میں گزارے جاتے۔ علم و ادب کی گتھیاں سلجھانے کے لئے آپس میں بے حد دلچسپ و پرکیف بحث مباحثے برپا ہوتے۔ اور ان سب مباحثوں اور مذاکروں کے نتیجے میں بہت سا علمی مواد مجلہ "نیرنگ" کے صفحات کی زینت بن جاتا۔ ان مجالس میں شعر و نظم کی کوئی قید نہ تھی۔ کسی نشست میں ایک مصرع پڑھا جاتا اور تمام احباب فی البدیہہ گرہ لگانے میں مصروف ہو جاتے۔ اور تھوڑی دیر میں سب حضرات اپنی اپنی تازہ غزلیں سنا کر بزم

مشاعرہ منعقد کراتے ۔ ان احباب میں بھائی امتیاز علی خاں عرشی کی شخصیت بہ صفت ممتاز نظر آتی تھی ۔ عمر کے لحاظ سے تو کئی اور رنگ ان سے بڑے تھے ۔ مگر علمی فضیلت اور ادبی ذوق میں ان کا پایہ جواں سال حضرات میں خاصہ بلند تھا ۔ اور ادبی مباحث میں ان کی اصابت رائے امتیازی حیثیت رکھتی تھی ۔ شرکاء بزم میں چند بزرگ ایسے بھی تھے جو اپنی عمر اور علمیت سے حاضرین کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے کسی موضوع کی باریکیاں سمجھاتے ہوئے آواز کو بلند کرنے پر اتر آتے ۔ اور جب اپنی برتری تسلیم ہوتے نہ دیکھتے ۔ یا بالفاظ دیگر مرعوب نہ کر پاتے تو نوبت جھگڑے تک پہنچ جاتی ۔ مگر ان بزرگوں کے درمیان ایک جوان رعنا نہایت شگفتہ مزاجی و خندہ پیشانی سے مسئلہ کو سلجھاتا اور جھگڑے کو نمٹاتا نظر آتا ۔ یہ تھے بھائی عرشی جنہیں اس وقت یعنی آج سے تقریباً تیس سال پہلے بھی مولانا عرشی سے خطاب کیا جاتا ، جن کے ہونٹوں پر پُر کیف تبسم کھیلتا ۔ اور وہ بزرگوں کو 'بھائی' اور 'مولانا' سے مخاطب کر کے اپنی دھیمی اور شیریں آواز سے ان کے غیظ آلود تیوروں میں ملاحت گفتار کی نرمی پیدا کر دیتے ۔ اور فوراً ہی مشکل سے مشکل مسئلہ کو آسانی سے سلجھانے میں کامیاب ہو جاتے ۔ پھر مولانا عزیز کی مرنجاں مرنج طبیعت گفتگو کے اس پُر لطف انجام پر بشاش ہو جاتی ۔ اور ان کی لطیف آواز گونجتی سنائی دیتی کہ "چلیے بات ختم ہوئی" ۔ پھر وہ کسی ملازم کو چائے لانے کے لیے پکارنے لگتے اور تمام احباب قہقہوں کی گونج میں گفتگو کی تلخیوں کو چائے کی چسکیوں پر اڑا دیتے ۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ عرشی صاحب کئی سال قبل علوم مشرقی کی تحصیل سے فراغت کر کے علوم مغربی کی تعلیم میں مصروف تھے ۔ اور ان کے شب و روز علمی مشاغل میں گزرتے تھے ۔ کئی اداروں سے ان کو ملازمت کی پیش کش ہو چکی تھی مگر وہ اپنی علمی ادبی سرگرمیوں پر کوئی پابندی عائد کرنا پسند نہ کرتے ۔ ان کی عزلت گزینی شہرت کو گوارا نہ کرتی ۔ ان کے اکثر احباب جو پنجاب اور یوپی سے علمی و ادبی رسائل شائع کرتے تھے ان سے مضامین کی پُر زور فرمائش کرتے ۔ لیکن وہ ان کو کسی نہ کسی طرح بہ لطائف الحیل ٹال دیتے ۔ البتہ مولانا عزیز مرحوم کا خلوص ان پر غالب آتا اور نیرنگ کی کوئی اشاعت ان کے علمی یا ادبی مقالہ یا غزل سے خالی نہ ہوتی ۔ لیکن عرشی صاحب خوش فکر شاعر ہونے کے باوجود عام طور پر حجاب میں رہتے تھے ۔ اور ان کا کلام کسی مجلۂ ادب کی زینت نہیں بننے پاتا ۔ نہ کسی عام مشاعرہ کی محفل میں ان کا نام پکارا گیا ۔

بزم ادب کی بے تکلفانہ مجالس میں وہ کارکن و مہتمم کی حیثیت سے پیش پیش نظر آتے ۔ مگر مشاعرہ کے وقت وہ ایک خوش مذاق سامع کی حیثیت اختیار کر لیتے ۔ اور پیشتر ہی تمام احباب سے یہ وعدہ لے لیتے کہ ان کے سامنے شمع نہیں لائی جائے گی ۔ نہ اصرار و تقاضہ سے ان کو مجبور کیا جائے گا ۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ مخصوص بے تکلفانہ صحبت میں ہم لوگ ان کو مجبور کر دیتے اور وہ عجیب شاہانہ تکلف سے شعر خوانی پر آمادہ ہو جاتے ۔ بزم ادب کی بے تکلفانہ مجلسوں میں ایسے مواقع اکثر پیش آتے ۔ دراصل عرشی صاحب کی طبع رسا میں شاعری کا قدرتی مادہ ودیعت ہوتے ہوئے بھی وہ کئی وجوہ کی بنا پر اپنی شاعرانہ حیثیت کو منظر عام پر لانے سے محترز رہے ۔ ایک تو ان کی گہری ناقدانہ نظر ان پر کڑی پابندی لگائے رہی ۔ پھر سب سے زیادہ یہ کہ علمی ادبی تحقیق و تدقیق کو دوسرے تمام مشاغل پر ترجیح دیتے اور انہی کو اولیت حاصل تھی اور آخر کار ان کے تخلص نے ان کے نام اور علمی مقام کی حیثیت اختیار کر لی ۔ حالانکہ افغانی النسل ہونے کے باوجود ان کا پیشۂ آبا سپہ گری نہیں تھا مگر ان کے لیے شاعری ذریعۂ عزت نہیں ۔

عرشی صاحب کا خاندان افغانستان کے یوسف زئی سلسلہ میں اکوزئی شاخ حاجی خیل سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ کو ہندوستان آئے سوا سو سال ہوئے اور اسی عہد سے ان کے آباؤ اجداد رامپور کے محلہ بھماری میں سکونت پذیر ہوئے ۔ اور اسی آبائی مکان میں وہ آج تک رہتے ۔ ان کے دادا صاحب مرحوم مولوی اکبر علی خاں صاحب اپنے عہد کے جید عالم اور مشہور محدث تھے ۔ لیکن عرشی صاحب کے والد ممتاز علی خاں صاحب کو ورثہ میں ان علوم کا کوئی حصہ نہ ملا ۔

ان کو علوم مغربی سے ذوق ضرور تھا مگر فضیلت کے درجہ تک نہیں پہنچے اور وہ رامپور کے مویشی خانہ سرکاری کے ہسپتال کے افسر اعلیٰ

تھے۔ مگر انہوں نے ہونہار فرزند کی تعلیم میں اپنے حق کی کوتاہی کی کمی نہ فرمائی اور بھائی عرشی نے "آنچہ پدر نتواں کرد پسر تمام کند" کے مصداق والد صاحب کے نقشِ قدم پر چل کر مدارجِ فضیلت حاصل کئے۔ انہوں نے رام پور کی مشہور زمانہ درس گاہوں مدرسہ مطلع العلوم و مدرسہ عالیہ میں عربی و فارسی کے مروجہ درسیات کی تکمیل کی۔ اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں انگریزی ادب کے مطالعہ سے معقول استفادہ کیا۔ اس طرح اپنے ذوق اور ضرورتِ وقت کے لحاظ سے علوم جدید میں وافر استعداد بہم پہنچائی۔

جیسا کہ ابتداء میں بیان کیا جا چکا ہے بھائی عرشی نے تحصیلِ علم کے بعد کچھ عرصہ دراز تک اعلیٰ ملازمت سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ اور اپنی ضروریات کو محدود کر کے وقت کی آستاں بوسی گوارا نہ کی۔ موروثی جائداد اور والد صاحب کی ذاتی آمدنی خاندان اور ان کی ضروریاتِ حیات کے لئے کافی تھیں۔ والد مختار علی خاں صاحب بھی اپنے سعادت مند اور فاضل فرزند کے مشاغل علمی سے مسرور و مطمئن تھے انہوں نے کبھی کسی حالت میں عرشی صاحب کا وطن سے باہر نکل کر کسی اعلیٰ ملازمت سے وابستہ ہونا گوارا نہ کیا۔

ابتدا سے عرشی صاحب کا زیادہ وقت مشرقی علوم کے مطالعہ اور تحقیق ہی میں صرف ہوتا۔ ان کا حلقۂ احباب محدود و مخصوص تھا۔ ان کے خاص علمی احباب میں ابتداءً مولوی عزیز اللہ خاں عزیز مرحوم — مرزا ہادی علی بیگ واثق شادانی (حال استاد السنۂ شرقیہ گورنمنٹ سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور) اور ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی (صدر السنۂ شرقیہ ڈھاکہ یونیورسٹی) شامل ہیں۔ باقی رامپور کے اکثر علماء و فضلاء اور اہل ادب حضرات سے رشتۂ یگانگت قائم تھا اور ہے۔ عرشی صاحب نیک سیرت، نیک نفس اور سادہ مزاج انسان ہیں ان کا رہن سہن اور لباس تمام تر خالص مشرقی ہے۔ ہر موسم میں ان کا لباس کرتہ پاجامہ اور اچکن اور رامپوری ساخت کی مخملی ٹوپی رہا۔ اور آج تک وہی وضع قائم ہے۔ وہ اکہرے جسم کے نرم و صحیح خوش شکل خوش فکر مردانہ حسن کا مجسمہ ہیں اس لئے ان کو اپنی طرز کا لباس زیب دیتا ہے۔ انہوں نے ابتدا سے خاندانی وضع کے مطابق داڑھی رکھی۔ جو ان کے حسین چہرے پر نہایت خوش نما معلوم ہوتی ہے۔ پابندیٔ مذہب نے ان کی طبع سلیم میں خاص صلاحیت پیدا کی۔ اوائل عمر سے پابند صوم و صلوٰۃ ہیں۔ لیکن کٹر ملائیت کے سخت مخالف۔ انہوں نے مذہبی علوم کو برتا ہے۔ احکام قرآنی کو سمجھا اور ان کی روشنی میں شریعتِ دین کی تعلیم کو عملی جامہ پہنا کر اپنے عقائد و اعمال میں حقیقی اسلامی صلاحیتیں پیدا کی ہیں اور اور دوسروں کو اس سے متمتع کیا ہے۔ دوستوں، عزیزوں اور بیگانوں سے تعلقات میں مختلف درجات کے امتیاز اور حفظِ مراتب کو برقرار رکھتے ہوئے تعلقات و مراسم کو نباہنے میں ان کی طبع سلیم و وضع حلیم میں خاص ملکہ ہے۔

عرشی مجھ سے عمر میں چند سال بڑے ہیں۔ میرے ان کے تعلقاتِ یگانگت کی ابتدا تقریباً سنہ ۱۹۲۲ء سے ہوئی اور بزم ادب رامپور کے دور میں اس قربت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور علمی فضیلت میں تو وہ مجھ سے بزرگ تر ہیں۔ مگر ابتدا سے آج تک حاضر و غائب ہمیشہ سے میرے ان کے درمیان پرخلوص مساوی تعلقات برادرانہ قائم ہیں۔ میرے اور عرشی کے درمیان تو برادرانہ و مخلصانہ مراسم استوار ہیں لیکن میں نے اکثر ان کو دوسرے احباب سے بحث و تمحیص کے دوران میں بھی کبھی ایسی حالت میں نہ دیکھا جس سے یہ گمان ہو سکے کہ وہ خواہ مخواہ کسی پر اپنی فوقیت جتائیں یا فریقِ مخالف سے اپنی اصابتِ رائے منوانے کے لئے ملائیت کی روش اختیار کر کے کج بحثی پر آمادہ ہوئے ہوں۔ عرشی کی مرنجاں مرنج طبیعت کسی دشمن کے خلاف بھی تو بے سمجھے بوجھے کسی حیثیت سے آمادۂ انتقام نہیں ہوتی۔ اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ شاید عرشی وہ فرشتہ خصلت انسان ہے جس کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ اگر کوئی باوجود دشمنی پر آمادہ بھی ہو تو عرشی میں جانب خود دشمن آزاری کا مادہ نہیں۔ وہ دشمن کو اپنی حلیم الطبعی سے دوست تو بنا سکتے ہیں مگر اس کی تلخ کلامی یا ترش روئی کے جواب میں اپنے تیور اور زبان کو نہیں بگاڑ سکتے۔ اور یہ وہ خوبیاں ہیں جو اس دور کے بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ ان محدودے چند انسانوں میں ہیں جو ایک منفرد انسان ہیں جن کی نسبت کہا گیا ہے کہ ع

سخت دشوار ہے انسان کا انساں ہونا

عرشی کا ظاہر و باطن یکساں ہے ۔ سچی بات منہ پر کہہ دیتے ہیں ۔ ہر کسی کو "بھائی" نہیں کہتے مگر جس کو اس رشتہ سے مخاطب کرتے ہیں اس کو صدقِ دل سے سمجھتے بھی ہیں ۔ وہ عقائد کے لحاظ سے اہلِ سنت والجماعت ہیں ۔ اور علمی و مذہبی مسائل و معتقدات میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے پیرو اسی لحاظ سے ان کے نام کے ساتھ "حنفی" کی نسبت پائی جاتی ہے ۔

عرشی کی پیدائش ۸ دسمبر ۱۹۰۴ء مطابق ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ یوم پنجشنبہ کو اپنے آبائی مکان محلہ پھلواڑ (رام پور) میں ہوئی اور شاید اس ماہِ مبارک کی تمام برکات و فیوض ان کے حمیدہ عادات و خصائل میں بدرجۂ اتم ودیعت ہوئیں لیکن اپنی تمام علمی و مذہبی صلاحیتوں کے ساتھ وہ ایک عملی انسان اور روشن خیال شارحِ حیات ہیں ۔ ان کی پیدائش کے ماہ و ایام نے انہیں "رمضانی یا حجراتی" نہیں بنایا ۔ وہ اس نوع کی کٹر ملائیت سے متنفر اور اس قدر منکسر المزاج بزرگ ہیں کہ صحیح معنوں میں مولانا ہوتے ہوئے اس لقب سے شرماتے اور دوسروں پر اپنی فضیلت جتاتے گھبراتے ہیں ۔ حتیٰ کہ ان کی خاموش طبیعت نے شہرتِ عام سے ہمیشہ نفرت کی ۔ اور کتاب خانہ کے گوشہ میں معتکف ہو کر علم کے دریا بہانے کے باوجود اپنی ذات و صفات کو منظرِ عام پر لانا گوارا نہیں کیا ۔ حالانکہ عرشی کی علمی ، عملی زندگی تمام تر مشعلِ ہدایت ہے ۔ مگر وہ کبھی سرِ راہے نظر نہیں آتے ——— ان کے علمی ادبی کارناموں کے دفاتر ہیں ۔ تحقیق و تنقید کے ذخائر ہیں لیکن ان میں سے بہت کم اشاعت پذیر ہوئے ہیں ۔ اس کا بڑا سبب ان کا فطری حجاب اور قناعت اور پھر مقامی حالات کی وہ تنگ حدود ہیں جو انہوں نے اس محدود دائرہ میں اپنے اوپر عائد کر لیں ۔

عرشی کی شخصیت کا عملی پیکر جو ہمارے سامنے آتا ہے اس سے ان کے ظاہر و باطن دونوں کا پورا پورا اندازہ اس طرح ہوتا ہے:

> "تخلص کے عرشی ۔ مزاج میں فرشی ۔ فرشتہ صفت ، خجستہ خصلت ، نیک اخلاق ، اصلی انسان ۔ طبیعت میں وہ رچی اور نرمی کہ اشتعال انگیزی کا شائبہ تک نہیں ۔ سادگی کا مجسمہ ۔ اخلاص و مروت کا پیکر ، خلیق و متواضع ، خوش خلق ، خوش اطوار ، یاروں کے یار ۔ دشمن کے لئے بیکار ۔ علم و فضل میں ماتھی ملا ، مگر شگفتہ مزاجی ایسی کہ زندہ دلوں میں جوانِ رعنا ! کشادہ پیشانی ، وسیع القلب ، نیک مشرب ، نیک دل ۔ تہذیب و علومِ مشرق کے دلدادہ ، زمانہ کے انداز پر ہر معقول جدت قبول کرنے پر آمادہ ۔ صورت و سیرت میں حسین ، ظاہر و باطن سنجیدہ و متین ۔ کم سخن مگر خوش گفتار ، حکم آمیز ، نرم و بے ستیز مگر علم و عمل میں تیز ! اس ممتاز شخصیت کو اسم با مسمّیٰ کا لقب زیب دیتا ہے ۔ جس کی ذات میں وہ امتیازی جواہرِ علم و فن پوشیدہ ہیں جو ہر کسی کو عموماً نہیں پائے جاتے ۔ مگر وہ ایک ذخّار سمندر کی طرح خاموش ہے جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے ——— کے مصداق اپنے علمی فضائل و ادبی کمالات سے روح و سوح تشنگانِ علم و ادب کو تھوڑا تھوڑا سکوت کے ساتھ فیضیاب کئے جا رہا ہے ۔"

پیشتر کہا جا چکا ہے کہ عرشی صاحب نے ابتدا سے اپنے آبائی وطن رام پور کو اپنا ملجا و مسکن بنانے پر قناعت کر کے اس کو اپنی تمام علمی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا ۔

شروع میں چند دیگر علمی مصروفیتوں کے علاوہ کتاب خانۂ عالیہ رام پور (جو اب رضا لائبریری کے نام سے موسوم ہے) کے نایاب و نادر کتب خانے کی الماریوں سے استفادہ کر کے کئی سال تک خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خطبات و خطوط اور علامہ اقبال کی تحقیقات کی اور ان کو مرتب کیا ۔ اسی زمانہ میں مسٹر چیمپین (Mr. Champan) کتاب خانہ سرکاری کے ناظم اعلیٰ تھے ۔ اور انہوں نے عرشی صاحب کے ذوقِ علمی اور جستجو و تحقیق کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا کر بڑے اصرار سے ان کو اپنی نیابت کے لئے رضامند کر لیا ۔ عرشی نے اس عہدہ کو محض اس خیال سے قبول کیا کہ ان کا زیادہ وقت اس کتاب خانہ میں صرف ہوتا ہے ۔ اگر وہ باضابطہ اس سے منسلک ہو جائیں تو ان کے مطالعہ میں

وہ نادر مخطوطات بھی آ سکیں گے جن تک ان کی رسائی ابھی ایک عام شہری کی حیثیت سے نہ ہو سکی تھی۔ چنانچہ اس مردم شناس انگریز کے ساتھ کام کرنے کے بعد ان کی صلاحیتوں کا کمال اس کی زبانی نواب صاحب کو بھی بخوبی ہو گیا۔ یہ دیدہ ور فاضل انگریز مسٹر جیمپینی تو عرشی کے تبحر علمی و تحقیقی بیانات کا قائل و مداح تھا لیکن رفتہ رفتہ نواب صاحب بھی ان کے فضل و کمال اور اہمیت سے کما حقہٗ واقف ہو گئے۔ عرشی نے جیمپینی کی رہنمائی میں اس کو اپنا مونس و مشفق استاد تصور کر کے بڑی تندہی اور دل سوزی سے کام کیا۔ پھر ان کے ذوقِ علمی و فطری صلاحیتوں نے ان کے کام کی اہمیت کو اور بھی واضح کر دیا۔ یہ کتاب خانہ دنیا بھر کے ان چند گنے چنے عالیشان کتاب خانوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے جن کے گرانمایہ نوادر کی زیارت کے لئے شیدایانِ علم و ادب دور دراز کے سفر اختیار کر کے وہاں آتے اور اپنی تشنگیٔ ذوق کی تسکین کی خاطر مشقت و محنت گوارا کرتے ہیں۔

ریاست رام پور، روہیل کھنڈ (یو۔ پی) کے علاقہ میں اپنے علم و کمال کے لحاظ سے ایک خطۂ مردم خیز تسلیم کیا جاتا ہے، جو سالہا سال سے فضل و کمال کا منبع رہا ہے۔ یہاں اسلامی تعلیمات اور علوم شرقیہ کی درسیات کے لئے مدرسۂ عالیہ، مدرسۂ قادریہ اور مطلع العلوم وہ ادارے ہیں جو عرصہ دراز سے مرجع خلائق بنے ہوئے ہیں۔ اور جہاں دور دراز مقامات حتیٰ کہ بیرونی اسلامی ممالک سے طالبانِ علم آ کر دینی و دنیوی علوم کی تحصیل کرتے ہیں۔ اس سرزمین نے متعدد اکابرینِ دین و ملت اور کاملینِ علم و فن کو جنم دیا اور ملک کے اکثر علماء و فضلاء اور مشاہیر امراء و شعراء کا مسکن رہ چکا ہے۔ ہندوستان کے بیشتر شعرائے متقدمین و متاخرین ہر دور میں دربارِ رام پور کی زینت بنے ہوئے تھے۔ اسی لئے سرکاری کتاب خانہ میں مطبوعہ و غیر مطبوعہ نادر کتب اور گرانمایہ نسخہ جات قدیم تصاویر اور خطاطی کے بے بہا نقوش محفوظ ہیں جن میں سے بیشتر کمیاب و نایاب نوادر کا درجہ رکھتے ہیں۔

جب عرشی صاحب نے مسٹر جیمپینی کی نیابت میں اس کتاب خانہ کا جائزہ لیا اور اس کے ترتیب و نظام کا بہ غائر مطالعہ کیا تو ان کو اندازہ ہوا کہ ان نوادرات کے ذخائر بے ترتیب بدحالی میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کئی سال کی شبانہ روز جانفشانی کے بعد ان کو درست و منظم کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ناظم اعلیٰ مسٹر جیمپینی اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر انگلستان روانہ ہوئے تو کتاب خانہ کی نظامت عرشی صاحب کے سپرد ہوئی۔ اور نواب صاحب کا کلی اعتماد ہونے کے بعد انہوں نے کتاب خانہ کی مکمل و مفصل فہرست مرتب کی۔ اور اس کی ایسی اصلاح و تنظیم کی کہ ملک کے اکثر مشاہیر علم و ادب نے اس کو ہندوستان کا بے نظیر ادارہ تسلیم کیا اور عرشی صاحب کی گراں بہا خدمات و اعلیٰ لیاقت کی قرار واقعی داد دی۔ اس طرح یہ علم و فن کی محافظت عرشی صاحب کا ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس پر ہمیشہ فخر کیا جا سکتا ہے۔

اس تنظیم سے کتاب خانہ کے نادر جواہرات کو محفوظ کر دیا اور اس سلسلہ میں انہوں جو کاوش و محنت کی اور متعدد علمی ادبی کتابوں کا مسلسل مطالعہ کیا اس سے ان کے ذوق کی جلا بھی ہوئی۔ اس دوران میں ملک کے بیشتر شیدایانِ علم و ادب اور مشاہیر اس ادارہ سے استفادہ کرنے وہاں آئے عرشی صاحب کو ان سے ملنے، علمی مباحث میں حصہ لینے اور ان کے ساتھ ان کے ریسرچ کے کاموں میں شرکت و نگرانی کا بھی موقعہ ملا۔

بھائی عرشی کو خاص طور پر مذہب، تاریخ و تنقید ادب سے دلچسپی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی دقتِ نظر اور تحقیق و تفحص سے جو تخلیقات پیش کی ہیں ان کا مرتبہ دنیائے ادب میں نہایت بلند ہے۔ مولانا عرشی کا تبحر علمی، ذوقِ تنقید اور نکتہ رسی و ژرف نگاہی مسلم ہے وہ ایک جید عالم اور اردو فارسی اور عربی کے بلند پایہ نقاد ہیں۔ اور ان کی یہ مسلم الثبوت حیثیت کسی تبصرہ کی محتاج نہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم و ادب کے لئے وقف، اور کسی نہ کسی شعبہ کی تحقیق و جستجو میں گزرتا ہے۔

عرشی صاحب ذہنی اور جسمانی طور پر نہایت درجہ صحت مند اور عملی انسان ہیں۔ وہ اپنے فرائض و معاملات میں نہایت متین و مستعد

ہیں۔ اعزا و احباب کے ساتھ برتاؤ میں بھی وہ اپنے اس اصول کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ ہر معاملہ اور تعلق میں کامل خلوص و دیانت برتتے ہیں۔ اور اپنے علمی ادبی مشاغل کی انجام دہی میں بھی پوری طرح اپنے مقررہ اصول پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ اس لئے پابندیٔ وقت ان کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ کوئی ترغیب یا کوئی قوت ان کے عزائم و اصول میں تغیر یا اضمحلال نہیں پیدا کر سکتی۔

عرشی صاحب کی تحریر اور تقریر کا انداز تقریباً یکساں ہے۔ ان کا طرزِ ادا نہایت شستہ، سلیس اور نکتہ رسی کا مظہر ہے۔ زبان و بیان میں بلا کی صفائی اور قدرت ہے۔ اور ایسی شگفتگی کہ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع بہارستان نظر آتا ہے۔

وہ ایک خوش بیان مقرر بھی ہیں۔ اور طرزِ بدیع کے مالک بلند پایہ انشا پرداز اور خوش فکر شاعر بھی۔ مگر دقیقہ سنجی و نکتہ دانی تمام صفات میں نمایاں ہیں۔ پھر گفتار و کردار کی یکسانیت نے ان کو ایک ایسی امتیازی شان کا مالک بنا دیا ہے کہ عرشی سے ہم کلام ہو کر ہر شخص ان کی لطیف و جمیل شخصیت کے تمام اوصاف سے بآسانی روشناس ہو جاتا ہے۔ اور ان کے دلکش کلام کی لطافتوں سے بہرہ اندوز ہو کر طبیعت میں فرحت و انبساط محسوس کرنے لگتا ہے۔ اگر گفتگو علمی موضوع پر ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ بحرِ علم سے سیراب ہو رہا ہے۔ موضوع شعر و ادب ہو تو باغ و بہار کا احساس لے کر اُٹھے۔ اور پھر اس ہمہ صفت موصوف انسان میں ان تمام کمالات کے باوجود علمیت و فضیلت کا غرور نام کو بھی نہیں۔

ان کے حسین و متین چہرہ پر ہر وقت بشاشت نظر آتی ہے۔ اور ان کو رنج و فکر میں بھی مسکراتے ہی دیکھا گیا ہے۔ علما و فضلا کی محفل میں عرشی ایک فاضل اجل ہوتے ہیں۔ سیاسی مذاکرات میں ایک باخبر مدبر اور بزمِ احباب میں ان کی شگفتہ مزاجی و بذلہ سنجی کچھ اور ہی بہار دکھاتی ہے۔ بالخصوص بے تکلف دوستوں میں وہ گلزار بن جاتے ہیں۔ ان کی متانت و سنجیدگی میں بھی ایک کیف ہے۔ ناگوار خشکی کا شائبہ تک نہیں۔ ان کی خشک رندی پر ہزار پارسائی قربان ہیں۔ مزاج میں متین شوخی اور سنجیدہ مزاح کی چاشنی ہے۔ بعض اوقات وہ مطائبات کے ایسے لطیف پہلو نکالتے ہیں کہ اہلِ ذوق اعلیٰ ظرافت سے پھڑک رہ جاتے ہیں۔ برجستگی و بے ساختگی کا یہ عالم ہے کہ تحریر و تقریر میں کہیں بھی تکلف و تصنع یا آورد کا نام تک نہیں ہوتا۔ احباب کے رنج و خوشی میں اس طرح شریک نظر آتے ہیں جیسے اپنے گھر میں۔ قدیم دوستوں سے کہیں کسی حالت میں بھی ملاقات ہو بغلگیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور موقع پر خوش طبعی سے نہیں چوکتے۔

ایک بار سنہ ۴۸ء میں عرشی صاحب میرے قیام لکھنؤ کے دوران میں وہاں علمی مصروفیت کے سلسلہ میں تشریف لائے تھے اور میرے پاس قیام پذیر تھے۔ اسی عرصہ میں میرے ایک عزیز جنہوں نے پنجاب میں شادی کی تھی اور اپنی نئی دولہن کے ساتھ آئے تھے وہ بھی غریب خانہ پر مقیم تھے۔ میرے یہ عزیز عرشی صاحب کے بے تکلف دوست تھے۔ لیکن کسی وجہ سے عرشی صاحب کو ان کی شادی کی پہلے سے اطلاع نہ تھی۔ جب عرشی صاحب کی ان سے ملاقات ہوئی اور شادی کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے کہا "ہم رسمی مبارکباد کے قائل نہیں۔ اور شادی کی اس وبا کو ماننے کے لئے نہیں تیار۔ یہ شادی پھر ہوگی اور یہیں ہوگی۔ بھابی کو سلام ضرور کہیے، مزاج تو ظاہر ہے۔ آپ سے شادی کرنے کے بعد اس کا کیا پوچھنا!"

آخر ایک پُرتکلف دعوت کے ذریعہ میں نے شادی منانے کا انتظام کیا اور شادی پھر منائی گئی۔ اور اس واقعہ سے پانچ سال قبل جبکہ میں دہلی میں مقیم تھا۔ میری شادی کے موقع پر دوسرے مخصوص اعزہ و احباب کو جو دعوتی رقعے روانہ ہوئے ان میں جب عرشی صاحب کو یہ رقعہ پہنچا تو انہوں نے مجھ کو لکھا:

"بھائی! آپ کی شادی کی اطلاع ملی۔ آپ کی معقولیت کا خیال کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔ لیکن مجبوری! اپنے ابا آدم کی سنت کبھی پر عمل کر کے آپ کو انسانیت کا جامہ اختیار کرنا ہی ہوگا۔ بہرحال سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود ہونا مبارک! سوچتا ہوں آپ

جیسا سنجیدہ انسان جب شادی کرے تو احباب کیا کریں گے؟

شادیوں کے اس پُر لطف سلسلہ میں بھائی عرشی کی اپنی شادی بھی یاد آگئی۔ میری شادی سے کچھ عرصہ کے بعد اُن کی شادی ہوئی۔ میں دہلی میں ہی تھا۔ میرے نام رسمی دعوتی رقعہ کی بجائے ان کے قلم کی ایک تحریر موصول ہوئی۔ لکھا تھا۔ ع

مبارک باد مرگِ توبہ عرشی

بھائی —— یہ سوگ منانے آیئے۔ بھابی کو بیگم عرشی کا سلام کہہ کر ضرور لایئے۔ آخر ایک دن وہ آئیں گی اور یہ رسم آمنے سامنے ادا ہوگی۔ پھر یہ فریضہ پچھلی کیوں نہ ادا کروں۔ ہمیں بھی مرزا نوشہ کے "تمارد مرحوم و تقید شنے مار ڈالا اور تنبیہ بیزار رہ گئے"؟

عرشی کے ادبی لطائف اور علمی مطایبات بے شمار ہیں۔ لیکن اس مضمون میں ان کی ذات و صفات کا ذکر ہے۔ فضل و کمال پر تفصیلی تبصرہ نہیں۔ اس لئے میں دانستہ چند ذاتی لطائف کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔ بزمِ احباب کے لطیفوں کا بھی اگر تفصیل بیان کرنے لگوں تو اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں۔ ۱۹۴۱ء میں عرشی صاحب لاہور آئے ہوئے تھے۔ ان کے مخصوص احباب میں مولوی غلام ناصر خاں نگار مرحوم سابق ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ سنٹرل ماڈل ہائی اسکول کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ حسنِ اتفاق سے ولادت کے وقت عرشی صاحب غلام ناصر خاں صاحب کے مکان پر موجود تھے۔ لڑکی کی ولادت کی خبر سنتے ہی عرشی صاحب نے ان کو مبارک باد دی۔ اور فرمایا۔

"مٹھائی منگوایئے"؟

اسی دوران میں کسی حریف نے کہا کہ "کسی مولوی کو بلایا جائے لڑکی کے کان میں اذان دی جائے گی"؟

عرشی نے مسکرا کر کہا "بھئی۔ ہم سے بڑا مولوی کون ہوگا؟ ہم خود اذان دیں گے" اور بڑے اصرار سے جاتے ہوئے زنانہ میں پہنچے۔ اذان دی۔ اور باہر آکر مٹھائی کی پھر فرمائش کی۔ اور بولے۔

"اب تو میرے دو حقے ہوگئے۔ ایک بہ حیثیت مولوی اور ایک بچی کے چچا ہونے کا!"

پھر بچی کا نام رکھنے کے ذکر پر فرمانے لگے۔

"اس کی فیس علیحدہ لوں گا۔ آخر داڑھی کی لاج بھی تو رکھنا ہے"؟

عرشی صاحب کے عزیز ترین احباب میں مرزا نادر علی بیگ واثق (جن کا نام پہلے آچکا ہے) کا نام خاص ہے۔ موصوف [illegible] عرشی صاحب سے عمر میں بڑے ہیں۔ اور فضل و کمال میں خاص درجہ رکھتے ہیں۔ خاندانی برادری میں ہم سب احباب ان کو "نادر بھائی" کہتے اور ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ اور یہ محترم بھائی ہم میں سے ہر ایک کو کبھی "میاں" کبھی "بھیا" کہہ کر بڑی شفقت سے مخاطب کرتے ہیں۔

'نادر بھائی' بڑے پختہ مشاق کے ٹھیٹ عالم فاضل بزرگ ہیں۔ کسی موضوع پر بحث ہو ان کے سامنے کسی کی مشکل ہی سے پیش چلتی ہے۔ اُردو زبان دانی میں ان کو زندہ لغات کا درجہ حاصل ہے۔ عربی فارسی کے مستند فاضل ہیں۔ ساری عمر تحقیق علمی میں بسر کی۔ اور درویش علم کو گلے لگا کر تجرد کی زندگی گزار رہے ہیں۔ دوستوں کے جان نثار، حاسد اور دشمنوں کے جانی دشمن ان کے پُر خلوص کردار کی خاصیت ہے۔ عرشی صاحب مولانا کا بیحد احترام کرتے ہیں اور دونوں میں انتہائی خلوص و مودت کے تعلقات ہیں۔ وہ عرشی صاحب کو عرشی، امتیاز اور کبھی امتیاز علی خاں کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ان دونوں احباب کے درمیان جب کسی موضوع پر گفتگو چھڑ جائے تو گھنٹوں کے گھنٹے

مسلسل جاری رہ سکتی ہے اور یہ مرقع بیحد دلچسپ اور قابلِ دید و شنید ہوتا ہے۔

ہادی بھائی، کا بلند بانگ طرزِ خطابت اور عرشی صاحب کی دھیمی اور سہل شگفتہ بیانی۔ بحث میں کئی ایسے موڑ آتے ہیں جہاں ہادی بھائی عرشی صاحب سے روٹھنے اور بگڑنے لگتے ہیں۔ اور عرشی صاحب کو اصل موضوع کی اہمیت برقرار رکھتے ہوئے ان کو منانا بھی پڑتا ہے۔ لیکن بیجا شکست پر دونوں میں سے کوئی بھی آمادہ نہیں ہوتا۔ عرشی صاحب کے لئے محترم بھائی کے بگڑنے کا موقعہ ذرا نازک بھی ہوتا ہے۔ لیکن اکثر خلوص پہ انجام بخیر ہوا کرتا ہے۔ کبھی ہادی بھائی عرشی صاحب کی نکتہ سنجی اور علمی نکات سے متاثر ہو کر ان کو بے اختیار گلے لگا لیتے ہیں۔ اس وقت ہادی بھائی اپنے شکستِ پندار، پر ہٹ دھرمی سے کام نہیں لیتے بلکہ عرشی صاحب کے تبحرِ علمی کو تسلیم کر کے عالمِ سرخوشی میں جھومنے لگتے ہیں۔ عالمانہ فتح و شکست اور مخلصانہ مجادلہ کا یہ نظارہ نہایت پُر کیف اور دیدنی ہوتا ہے۔

غرضیکہ عرشی صاحب کا مخلص ترین دوست اور شدید ترین مخالف۔ بڑے سے بڑا عالم اور بلند پایہ ادیب ان کی علمی فضیلت اور دقیق و عمیق فکر کا قائل نظر آتا ہے۔ دوستوں کو ان کی ذات و صفات پر ناز ہے اور مخالف ان کا لوہا ماننے پر مجبور ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بے لوث اور بے غرض ایثار و خلوص کا مجسمہ احباب کا مونس و غمخوار اور دل آزاروں کے حق میں بے آزار ہستی کا حکم رکھتا ہے۔

ایک محترم عزیز دوست کی حیثیت سے مجھے ان کے اخلاص و مروت پر فخر و مسرت ہے اور یہ امر میرے لئے باعثِ ناز ہے کہ میں نے جب کبھی ان سے اپنے رسالہ نیرنگستان (دہلی) اور بعض احباب کے لئے مضمون کی فرمائش کی تو انہوں نے محروم نہ رکھا۔ اور ان کا ارشاد ہے کہ "تمہارا اصرار میری کاہلی پہ سدا غالب آتا ہے۔"

لیکن جس زمانہ میں (۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۸ء تک) میں آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام ڈائرکٹر تھا اور لکھنؤ اسٹیشن پر تعینات رہا۔ عرشی صاحب سے بارہا تقاضہ و اصرار کیا کہ ریڈیو اسٹیشن سے کسی علمی ادبی موضوع پر تقریر نشر کریں مگر انہوں نے ہمیشہ کتاب خانہ کی مصروفیت کا عذر پیش کر کے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ آخر میرا اصرار حد سے متجاوز دیکھ کر انہوں نے دورانِ ملاقات میں مجھے اس ٹال مٹول کی وجہ صاف طور پر بتا دی۔ انہوں نے فرمایا۔

"بھائی۔ بات یہ ہے کہ آپ اس محکمہ کے بااختیار رکن ہیں۔ اور میرے عزیز دوست۔ اس کا علم اکثر اصحاب کو ہوگا۔ میں آپ کے اصرار سے مجبور ہو کر چند بار تقریر نشر کروں گا۔ لوگوں میں یہ چرچا ہونے لگے گا کہ میں آپ کی دوستی سے فائدہ اٹھا کر ریڈیو کو اپنی شہرت کا آلۂ کار بنا رہا ہوں۔ میرے انکار اور آپ کے اصرار سے کون خبردار ہے۔ آپ پر خواہ مخواہ دوست نوازی کا الزام آئے گا اور میرا ضمیر مطمئن نہ ہوگا۔"

اس سے عرشی صاحب کے عقائد کی پختگی اور متانت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلہ میں جب میری کوئی بحث و تکرار کارگر نہ ہو سکی مجھے بیحد مایوسی ہوئی۔ اکثر اربابِ ذوق جو عرشی صاحب کے مداحوں و معتقدوں میں سے تھے ان کے سامنے بھی مجھ کو ندامت محسوس ہوتی۔ وہ مجھے رہ رہ کر ٹوکتے کہ مولانا عرشی سے آپ کے ایسے یگانگت کے مراسم ہیں اور آپ کا ریڈیو اسٹیشن ان کی تقریروں سے محروم ہے۔

مجھے اپنی ناکامی کے احساس نے ستانا شروع کیا۔ آخر میں نے ان کی بلا اطلاع "یومِ غالب" پر ان کی تقریر پروگرام میں شامل کر دی۔ اور مقررہ تاریخ سے چند روز قبل خود رام پور گیا۔ اور محض تقریر کی خاطر ان سے لکھنؤ اپنے ساتھ چلنے کے لئے اصرار کیا۔ وہ میری اس فرمائش کو نہ ٹال سکے اور لکھنؤ پہنچ کر میں نے مطبوعہ پروگرام ان کے سامنے پیش کر کے کنٹریکٹ پر دستخط کرنے اور تقریر لکھنے کی عرضداشت پیش کر دی۔

عرشی صاحب حیران تھے اور جب میں نے ان سے کہا کہ اگر اب آپ میری اس درخواست پر انکار کریں گے تو میری عزت اور ریڈیو اسٹیشن کی پابندیٔ نظام (جو میرے سپرد ہے) معرضِ خطر میں ہوگی۔ آخر عرشی صاحب نے مسکرا کر قلم اٹھایا۔ کنٹریکٹ فارم پر دستخط کئے اور تقریر لکھنے کی فکر کرنے لگے۔ چنانچہ انہوں نے مختصر مدت میں موعودہ تقریر لکھی اور نشر کی۔ جو بیحد مقبول ہوئی اور ہمیں بے شمار تعریفی خطوط موصول ہوئے۔ میں نے اس کامیابی پر بصد شکریہ ان کی خدمت میں عرض کیا سے

لائے عرشی کو انکار کے　　　کفر توڑا خدا خدا کر کے

ہنس کر فرمایا "خدا خدا کرو بھائی۔ میں اس لائق کہاں!" اس کے بعد چند بار اور بھی انہوں نے میرے تقاضوں پر مجبور ہو کر ریڈیو اسٹیشن پر لطف فرمایا۔ اور میں ہمیشہ ان کو اس حیلے سے منالایا کہ "بر سبیلِ تقریب چند روز کے لئے آپ لکھنؤ تشریف لے آتے ہیں اور ملاقات کا لطف نصیب ہو جاتا ہے۔"

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے عرشی صاحب خاموش طبع قانع اور کم آمیز بزرگ ہیں۔ لیکن ارباب علم و ادب سے ان کے مراسم بڑی حد تک قربت و یگانگت کے ہیں۔ اور گو وہ طبعاً شہرت پسندی سے محترز رہتے ہیں لیکن ہندوستان و پاکستان کے علاوہ تقریباً تمام بیرونی اسلامی ممالک میں ان کی علمی و ادبی تخلیقات اور مستند فاضل شخصیت کو بڑے احترام و وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

آخر میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مولانا عرشی کی ہمہ گیر شخصیت پر سیر حاصل مقالہ لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عرشی کی شخصیت میں ایسا تنوع اور خلوص و صداقت ہے کہ ان کے علمی ادبی کارناموں کے مطالعہ ہی سے ارباب علم و ادب ان کی شخصیت سے غائبانہ طور پر روشناس ہو جاتے ہیں۔ اور اس پیارے انسان کی پیاری علمیت و شخصیت سے والہانہ پیار کرنے لگتے ہیں۔ یہ مختصر مقالہ بھائی عرشی کے عالمانہ خلوص و محبت کی قدر کر کے میں وہی مسرت محسوس کر رہا ہوں جو ان سے گلے مل کر ہوتی ہے۔

سیّد امتیاز علی تاج

شوکت تھانوی

"چچا چھکن نے تصویر ٹانگی" یہ تھا وہ مضمون جسے پڑھ کر سید امتیاز علی تاج ذہن میں کچھ اس طرح اُبھرے جیسے جوانی میں کسی کو اپنا کوئی وہ کھلونا یاد آ جائے جس سے وہ بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔ اور کچھ ایسا محسوس ہوا کہ گویا بچپن کا کوئی بچھڑا ہوا ساتھی یکایک مل گیا ہو۔ حالانکہ میں کبھی سید امتیاز علی تاج سے نہ ملا تھا مگر ان کے اخبار "پھول" ہی سے دراصل میں نے اُردو سیکھی تھی۔ یہی پہلا اخبار تھا جو باقاعدہ میرے نام آتا تھا اور یہی اخبار تھا جس میں میرے بڑے بھائی ارشد تھانوی صاحب میرے نام سے کہانیاں لکھ لکھ کر چھپوایا کرتے تھے حالانکہ میں اس وقت شوکت تھانوی نہیں صرف محمد عمر ہوتا تھا۔

چچا چھکن کے سلسلۂ مضامین کو بڑی بے تکلفی کے ساتھ پڑھتا رہا۔ پھر سید امتیاز علی تاج کا ڈرامہ جاوید کا نامہ "انارکلی" کی صورت میں نظر سے گزرا اور دل میں ایک بے ساختہ ارمان پیدا کر گیا کہ کاش میں ان سے کبھی مل سکتا۔

[illegible] میں پہلی مرتبہ لاہور آنا ہوا۔ لاہور میں میرے لئے جو کشش تھی وہ علامہ اقبال، مرحوم عبدالقادر اور امتیاز علی تاج کی تھی یعنی جہانگیر کے مقبرے اور شالامار باغ سے بھی زیادہ کشش جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں سفر میں نہ جہانگیر کا مقبرہ دیکھنے گیا نہ شالامار کی سیر کی البتہ علامہ اقبال، مرحوم عبدالقادر اور امتیاز علی تاج سے نہایت بے تابی کے ساتھ ملنے کے لئے پہنچ گیا۔

ریلوے روڈ پر دارالاشاعت میں سید امتیاز علی تاج کو بڑے بانکے سجیلے جوان رعنا کی صورت میں میں نے دیکھا۔ خوبصورت پنڈلیوں میں چھنا ہوا چوڑی دار پاجامہ، پیروں میں سلیم شاہی جوتا۔ گلاؤ کے کام کا کرتا پہنے، سنہری کمانی کی عینک لگائے آپ اپنے ڈرائنگ روم میں مجھ سے ملے۔ مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم بھی اس وقت آپ کے پاس ہی موجود تھے۔ یہ ملاقات اس قدر رسمی اور سرسری سی ثابت ہوئی کہ آج تک اپنی اس بیچارگی پر شرم آتی ہے کہ ان سے مل کے گویا تعارف ان سے نہ کرا سکے اور تعارف کراتے بھی کیا۔ تھے ہی کس حیثیت کے ہم۔

تفصیلی ملاقات پھر [illegible] میں ہوئی جب سیٹھ دلسکھ پنچولی کے بلاوے پر لاہور آنا پڑا۔ تاج صاحب اس زمانے میں بہاولپور روڈ پر رہتے تھے۔ کوٹھی کے برآمدے ہی میں پہنچتے ہی ایک نہایت اشرف المخلوقات قسم کے طوطے کا عظیم الشان پنجرہ نظر آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انواع و اقسام

کی تیلیاں اسی برآمدے میں کھیلیں کرتی ہوئی نظر آئیں مگر اس سے قبل کہ اس کرشمے کو نذر سمجھ کر میں رفتہ خود تاج صاحب برآمد ہوئے اور مجھے اس ڈرائنگ روم میں لے گئے جس میں جھانسی کی رانی کا پلنگ مثل یہیں کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور جیل کے تکیوں اور صندوقوں کی وہ کثرت تھی کہ گویا اگر ایک سے بچے تو دوسرا صبر پر ٹھوکر مزید مارے گا۔ نارنجی رنگ کا یہ ڈرائنگ روم جس کی ہر چیز نارنجی تھی کچھ عجیب رومانی فضا پیش کر رہا تھا۔ لاہوری میرے لئے یہ پیالہ گھر تھا۔ جس میں مجھ کو صحیح قسم کے پان کھانے کو ملے اور یہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا کہ خود تاج صاحب بڑے سلیقے سے پان کھاتے ہیں۔ بڑی تفصیلی باتیں ہوئیں۔ ملاقاتوں کا بھی ایک سلسلہ قائم ہو گیا کبھی چودھری کے اسٹوڈیو میں ملاقات ہوتی تو کبھی ریڈیو اسٹیشن پر مگر ابھی تک ایک خاص فاصلہ درمیان تھا اور ۱۹۴۷ء تک یہ فاصلہ اسی طرح قائم رہا۔

قیام پاکستان کے بعد تاج صاحب کی تجویز پر ریڈیو پاکستان نے ایک تعمیری پروگرام "پاکستان ہمارا ہے" کے نام سے شروع کیا۔ میں تو ریڈیو میں تھا ہی اب تاج صاحب بھی آ گئے اور شروع کر دیا یہ پروگرام۔ یوں تو خیر اس وقت جوش عمل کا ہر شعبہ اور ہر گوشے سے حیرت انگیز مظاہرہ ہو رہا تھا مگر ہم لوگوں نے تو واقعی یہ سمجھ رکھا تھا کہ پاکستان گویا ہم ہی دونوں کو چلانا ہے صبح سے شام تک وہ جنون انگیز مصروفیت کہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا بس عالم یہ تھا کہ ؎

ہجر پہ چل رہی ہے پن چکی   دھن کی پوری ہے کام کی پکی

خیر ایک طرف میں ہوں دوسری طرف تاج صاحب وہ بھی لگے رہتے ہیں اور میں بھی۔ پروگرام ایک ہی ہے مگر دونوں ہی اس طرح لگے رہتے ہیں کہ نہ وہ تھکتے ہیں نہ میں تھکتا ہوں کہ یکایک تاج صاحب نے مجھ سے کہا "یار علامہ اب یہاں ہونا چاہئے ایک نظم لحافوں کے متعلق۔"

جی ہاں اسی قرب نے اب یہ تعلقات پیدا کر دیئے تھے کہ تاج صاحب نے مجھ کو علامہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ خیر علامہ تک بھی غنیمت تھا مگر ذرا اس "یار علامہ" کی ترکیب ملاحظہ فرمایئے ـــــ ہاں تو کہنے لگے "یار علامہ اب یہاں ہونا چاہئے ایک نظم لحافوں کے متعلق۔"

اب بتایئے لحاف کے متعلق نظم کہاں سے لائی جائے۔ نہ اقبال نے لحاف کو کبھی موضوع سخن بنایا، نہ مولانا ظفر علی خاں نے۔ مگر تاج صاحب ہیں کہ لحاف پر نظم مزید چاہتے ہیں۔ آخر عاجز آ کر عرض کیا:

"تاج صاحب لحاف پر تو مشکل ہی سے اساتذہ میں سے کسی نے نظم کہی ہو گی۔"

بڑے اطمینان سے بولے "تو کیا ہوا نہ علامہ آخر یہ شعر لحاف نہ سہی کمبل سہی۔"

پھر مصیبت یہ کہ نظم بھی وہ ایسی نہ چاہتے تھے کہ ؎

رب کا شکر ادا کر صاحب   جس نے بنایا تیرا لحاف

بلکہ مقصد یہ تھا کہ سردیوں میں اکھڑنے والے مہاجرین کا وہ دلدوز منظر اس نظم میں پیش کیا جائے کہ سننے والوں کے بستروں کا ٹاٹ بھی جاگ اٹھے اور وہ اپنے گرم گدے بستر چھوڑ کر کھلے آسمان کے نیچے سرد راتیں گزارنے والے مہاجرین کے لئے اوڑھنا بچھانا لے کر دوڑ پڑیں۔ چنانچہ شروع کی یہ نظم کچھ اس طرح کہ ؎

کانپتے تارے لرزتی چاندنی سکڑی فضا   بخت کی پیکار تھی رات بھر بیچ ہوا
آدمی تھا اور تھا بے کسی کا اعتراف   آگ خود ہی سو رہی تھی راکھ کا اوڑھے لحاف

اور ختم یہ نظم اس طرح ہوئی کہ جب میں کمبل تقسیم کرنے ایک مہاجر خاتون کے پاس پہنچا ہوں جو گود میں بچے لئے بت بنی بیٹھی تھی تو اس کا عالم یہ تھا ؎

گود میں بچہ تھا اس کے پھر بھی وہ بے آس تھی   اس کو تو سرسبز ہونا تھا کہ دولت پاس تھی
لیکن اس کو لے کر کمبل جو کھینچی آہ سرد   اس میں مادری تھی اس میں بے کسی تھی اس میں درد

دفعتاً بجلی گرائی اس نے جب مجھ سے کہا   آپ اب دادے ہیں کیل جب یہ بچہ سو گیا
جائیے بیجائیے کیل تو اب بیکار ہے   مجھ کو کیل کی جگہ اس کا کفن درکار ہے

اور اب جمعرات کو آٹھ بجے یہ پروگرام پیش ہوتا ہے تو پروگرام ختم کرنے کے بعد ابھی ہم لوگ ریڈیو اسٹیشن سے روانہ بھی نہ ہوئے تھے کہ فلاں فلاں اور کیمپوں سے بھرا ہوا ایک ٹرک ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا۔ جس کو ہم لوگوں نے کیمپ کی طرف روانہ کیا۔ معلوم نہیں یہ حالات کا تاثر تھا یا جوش عمل کا خلوص کہ اس پروگرام کے متعلق مہاتما گاندھی جی تک نے اپنی پرارتھنا سبھا میں کئی مرتبہ تاج صاحب کا اور میرا نام لے کر کہا کہ یہ دونوں پاکستان سے جو تعمیری پروگرام پیش کر رہے ہیں وہ صرف پاکستان کی خدمت نہیں کر رہا ہے بلکہ عام انسانیت کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

اس ذکر کو تفصیل میں لے جانے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ تاج صاحب کی اس سخت کوشی کے بعد اب ذرا اس کا وہ عالم بھی ملاحظہ فرما لیجئے جس کو بعض بخاری "بچلک" کہا کرتے ہیں۔ تاج صاحب کو ایک فیچر لکھنا ہے اور ان سے فیچر لکھوانا ذمہ داری میری ہے چنانچہ مقررہ تاریخ سے ایک ہفتہ قبل ہی سے میں روزانہ ان کو ٹیلیفون کر دیا کرتا ہوں اور جواب میں یہ سن لیتا ہوں "لاحول ولا قوۃ میں سمجھا تھا کسی ضروری کام سے فون کیا ہو گا" یہاں تک کہ اب کل وہ فیچر ہونے والا ہے اور مسودہ آج بھی غائب۔ مجبور ہو کر خود ان کی کوٹھی کی طرف اور وہ اودھم مچایا کہ تاج صاحب کو کچی نیند یا اچھا خواب چھوڑ کر اٹھنا پڑا۔ جمائیاں اور انگڑائیاں لیتے آفس روم میں آ گئے۔ بجائے اس کے کہ میں اس تکلیف دہی کی معافی چاہتا میں نے برجستہ فیچر کا مطالبہ پٹھانوں کے قرض والے تقاضے کی طرح شروع کر دیا کہ تاج صاحب کب اس کی کاپیاں بنیں گی۔ کب ریہرسل ہو گا کب وہ پیش ہو گا۔

میرا یہ اضطراب دیکھئے اور آپ کا یہ اطمینان کہ عینک آنکھوں سے اتار کر ماتھے پر لگائی آنکھوں کو ملا اور پھر نہایت سنجیدگی سے فرمایا۔ "یار علامہ میں نے کئی مرتبہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ کچھ نوٹس بھی تیار کئے۔ مگر کچھ موڈ پیدا نہ ہو سکا۔ کوئی ڈھب پیدا نہ ہوا۔ ادھر ہی ادھر خیالات آئے اور ادھر ہی ادھر غائب ہو گئے۔ یار چھوڑو بھی اس ذکر کو۔ پان کھاؤ۔"

اور جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں پان کے بجائے زہر کھانے کا ارادہ ہو رہا ہے اور آزردگی اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ رو دینے کو جی چاہ رہا ہے تو ایک دم یہ جمائیاں بھی ختم اور انگڑائیاں بھی غائب اور ایک دم کمر باندھ کر تیار بھی ہو گئے:۔

"تو یار علامہ مرا کیوں جاتا ہے لکھے دیتے ہیں نا۔ چار بجے مسودہ منگا لینا۔"

اور پھر تین بجے ٹیلیفون آ گیا کہ مسودہ منگا لو۔

تاج صاحب کی یہ کیفیت اور کیفیات کا یہ تضاد ان کی زندگی کا ایک عام خاصہ ہے کہنے لگے: "یار علامہ یہ علمی مشاغل واہیات اس تضییع اوقات کے بجائے اگر اپنا ہی کام دیکھیں تو بیڑہ پار ہو جائے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ بس یہ دھندا ختم۔"

میں یہ سن کر آ گیا اور ابھی اتنی ہی دیر میں نہ جانے کس کس سے کہہ بھی دیا کہ تاج صاحب علمی مشاغل سے کنارہ کش ہو گئے ہیں کہ اتنی ہی دیر میں ٹیلیفون چلا آ رہا ہے "یار علامہ یہ کیا واہیات ہے کہ ہر وقت دفتر میں بیٹھے رہتے ہو۔ ذرا آ نہیں جاتے؟"

پوچھا۔ "خیریت؟"

معلوم ہوا کہ کسی پروڈیوسر نے کچھ ایسے اخلاق و داد دے کر پھر کہانی دینے کو تیار ہو گئے اور یہ بھی نہیں معاملے کی معقولیت نے ادا بستے پر مجبور کیا ہو۔ بلکہ نہیں صرف چند جذباتی باتیں کچھ ملکی اور قومی قسم کی یعنی کہ پاکستان کی فلم انڈسٹری منجدھار میں ہے اور اس فلم سے بیڑا تو نہیں پار ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ بس تاج صاحب پھر پگھل گئے۔ حالانکہ اگر یہی بات ان سے کہہ دی جائے تو صاف مکر جائیں گے کہ "یار علامہ عجیب خبط ہے تم بھی میں اب ایسا بھی موم کی ناک نہیں ہوں۔" حالانکہ موم کی ناک بھی کیا سر تا بقدم موم کے ہیں۔

میں نے اپنی سنہ ۱۹۴۳ء میں اپنی کتاب "شیش محل" میں تاج صاحب کے متعلق کس قدر تعلیات لکھی ہیں بجا "خالص تجارتی آدمی ہیں مگر مروت

سے بالکل ماہر کار نظر نہیں آتے۔ تاج صاحب پر اس سے بڑا اتہام اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان کو تجارتی آدمی کہا جائے۔ پچھلے دنوں میں نے یہی بات لکھی تھی اور اب خود تاج صاحب اسی بات کا مجھ کو یقین دلانا چاہتے ہیں مگر میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ وہ تجارتی آدمی کسی صورت سے ہو بھی سکتے ہیں۔ روپے پیسے کے معاملے کی بات میں ان کی طرح شرمانے والا کیونکر تجارتی آدمی ہو سکتا ہے۔ یہ معاملات ان کی طرف سے اکثر مجھ کو طے کرنے پڑے لہٰذا ان سے زیادہ تجارتی آدمی تو میں ہوا۔

تاج صاحب میں ممکن ہے کچھ خامیاں بھی ہوں مگر ان کی ایک خوبی نے کم سے کم میری نظر میں ان کی ہر خامی کو چھپا دیا ہے کہ وہ آج بھی طالب علم ہیں۔ ڈراما ان کا فن ہے۔ مخالف ذہین بھی ان کی عظمت کا اعتراف نہ کرنا دھاندلی ہے مگر آج بھی وہ کسی مبتدی سے کسی آنے گئے سے مطلب یہ کہ کسی سے بھی اپنے اسی فن کے سلسلے میں کوئی مشورہ لیتے کبھی نہیں ہچکچاتے اور اگر کسی نے ایسا مشورہ دے دیا جس کو ان کے دل نے قبول کر لیا تو داد دینے میں بھی دیر نہیں کرتے۔ ہاں اب بات ہی کچھ یار آدمی ہو تو خیر۔

اسی کے ساتھ وہ خوفناک حد تک اس شخص کے لئے تنک مزاج بھی بن جاتے ہیں جو غیر ضروری طور پر ان کے سامنے بننے کی کوشش کرے۔ بڑے بڑے بت وہ گرا چکے ہیں اور گراتے ہوئے ایک آدھ فقرے سے بر خود غلط قسم کے لوگوں کی ایسی قلعی کھولی ہے کہ وہ ان کی چشم مروت ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔

گھر میں ان کی حیثیت ایک دوست باپ، ایک مہذب شوہر اور ایک فراخ دل آقا کی ہونے کے علاوہ ایک معصوم بچے کی بھی ہے جو اگر چاہے تو ہر چیز کی بھی کر سکتا ہے۔ اور پھر نہایت بھولپن سے اس کا اعتراف بھی کر لیتا ہے۔ مثلاً چوٹ لگی کمر پر اور ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ یہ بلڈ پریشر کا شاخسانہ ہے چنانچہ تمباکو قطعاً بند۔ نہ پان میں کھا سکتے ہیں نہ سگرٹ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں اور کمال کیا تاج صاحب نے کہ واقعی وہ پان بھی چھوڑ دیا جو ان کی زندگی کی واحد عیاشی تھا۔ میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمباکو کا چھوٹنا تو گھر والوں کے سلسلے میں تقدیر پھوٹ جانے پر بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ خیر یہ تو پان بھی جو پرہیز ہوا اور بڑی گھٹیا قسم کی جو پرہیز ہیں لگ گیا ہوں مثلاً گلے میں درد تھا ڈاکٹر نے بولنے کی قطعی ممانعت کر دی۔ اور کاغذ پنسل سرہانے رکھ دیا کہ لکھ کر بات کیا کرو۔ چنانچہ میں باتیں تو لکھ لکھ کر کرتا رہا مگر جب تنہائی ملتی تھی تو تھوڑا بہت گا لیا کرتا تھا۔

تاج صاحب نے شروع شروع میں تو بڑی پابندی سے پرہیز کیا، پان واقعی نہیں کھایا مگر جب ان کو حقہ پینے کی اجازت مل گئی تو چوری چھپے سگرٹ بھی پینے لگے اور بیگم صاحبہ امتیاز نے مورد الزام ان کو نہیں بلکہ ان کو قرار دیا جو ان کو سگرٹ پلا دیتے ہیں۔ میں نے اب تک بیگم کی سے پان یا پان کے خشک مسالے کی دعوت نہیں دی ہے ورنہ شاید میں ان کو اپنے اعتماد میں لے کر اور ہدایات دوں کا وہ لے کے تمباکو بھی کھلا دیتا اور وہ میری دوستی کے بے انتہا قائل بھی ہو جاتے۔

تاج صاحب مدت سے لکھ رہے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ ان کا قلم ابھی بوڑھا نہیں ہوا ہے مگر فلمی مرزا بیدل نے ڈرامے کے علاوہ سے کوئی ایسی بھی تخلیق اب تک لکھی نہ ہونے دی۔ وہ کہتے ہیں کہ زیادہ مقتدر یہ فلمی مشاغل و دیہات؟ مگر مصیبت یہ ہے کہ اب یہ کھیل نہیں چھوٹتا۔

حال ہی میں آپ ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے دار الاشاعت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور اسی توجہ کے کئی شاندار ثبوت بھی پیش کر چکے ہیں۔ سلیقہ، محنت اور انہماک کی اب بھی کمی نہیں مگر خدا کرے کوئی قلم پہ ضد پھر سر چڑھ جائے۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم

محمود نظامی

تبسم پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ کا نام اور تخلص ہی نہیں حلیہ بھی ہے فطرت بھی ہے اور عادت بھی۔ لیکن اگر پروفیسر تبسم صوفی بھی کہلاتے ہیں تو یہ تصوف پر ایک ذی روح طنز ہے کیونکہ جو لوگ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کو پوری طرح نہیں جانتے انہیں اس پوشیدہ ولی پر بعض اوقات مجھے کافر کا بھی گمان ہو سکتا ہے۔

میرے ان شفیق استادوں میں، جنہوں نے پچھلے تیس برس کے عرصے میں مجھے سکھانے پڑھانے کی ایک مسلسل کوشش کو جاری رکھا ہے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم ایک ایسے بزرگ ہیں جن کی شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جو کچھ نظر آتے ہیں وہ دراصل ہیں یا نہیں اور جو کچھ دراصل ہیں وہ نظر بھی آتے ہیں یا نہیں۔ میں نے جب انہیں پہلے پہل دیکھا تھا تو میں خود کسی قسم کے اوہام میں گرفتار ہو گیا تھا۔ یہ انیس سو اٹھائیس کی بات ہے میں اسلامیہ کالج لاہور میں فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا۔ ایک شام میں اور میرے چند ہم جماعت اپنے اُستاد ڈاکٹر تاثیر کے ہاں [illegible] روڈ والی حویلی میں بیٹھے کسی ادبی مسئلے پر ان کے خیالات سن رہے تھے کہ اچانک ایک چھوٹے قد کے دبلے پتلے بزرگ جو اپنے حلیے کے اعتبار سے وہسکی کے بلیٹروں کے خاندان سے معلوم ہوتے تھے کمرے میں وارد ہوئے ان کے آتے ہی تاثیر کا چہرہ یوں کھل گیا گویا انہیں کوئی نعمت ہاتھ آ گئی ہے۔ اور وہ "آ بھئی صوفی" کا فقرہ ادا کرتے ہی درس و تدریس کے مسئلے کو نظر انداز کر کے وہ اپنی فقرہ بازیوں، پھبتیوں اور طرح طرح کے مزاحیہ کلمات کے ساتھ پل پڑے۔ ان میں سے اکثر فقروں میں بڑے خوفناک قسم کے ذم کا پہلو نکلتا تھا جس سے صوفی صاحب کی ذات کے بارے میں کوئی شریفانہ یا معقول رائے قائم کرنا قدرے مشکل تھا۔ لیکن مجھے یاد ہے صوفی صاحب نہایت متانت اور سکون قلب سے تاثیر کے ان فقروں کے چپ چاپ لطف لیتے رہے۔ کبھی کبھی وہ انکھیوں سے تاثیر کے شاگردوں کو ایک نظر دیکھ لیتے غالباً اس خیال سے کہ ان بے خبر لڑکوں کی موجودگی میں اب کوئی جواب دینا چاہئے لیکن جب تاثیر کی کوشش کافی حد تک بے حالت اختیار کر گئی تو صوفی صاحب نے میز پر رکھی ہوئی پلیٹ میں سے پان اٹھایا اور اسے چباتے ہوئے ایک ہی مرتبہ جو تاثیر پر ایک فقرہ چست کیا۔ تو طلبہ کی ساری مجلس اپنے استاد کے ادب کے باوجود ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

اسی مجلس میں مجھ پر پہلی مرتبہ تبسم کی طبیعت کے کئی ایسے جوہر کھلے جو آج بھی ان کی شخصیت اور کردار کی نمایاں ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی طبیعت کا سکون اور ٹھہراؤ۔ ان کی بذلہ سنجی، ان کا خلوص اور ان کی شفقت، ہم عمروں کا لحاظ، ہم عصروں کا احترام یہ سب باتیں جو میں نے ان میں روزِ اول دیکھی تھیں، آج تیس برس گزر جانے پر بھی میں انہیں جوں کا توں دیکھتا ہوں۔ اس پہلی ملاقات میں جس خاص بات نے مجھے بے حد متاثر کیا وہ یہ تھی کہ اپنی تمام قابلیت کے باوجود تبسم نے کسی پر اپنے تبحرِ علمی کا رعب ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ آج بھی ان کی یہی حالت ہے۔ اب برسوں کی صحبت کے بعد جب بھی مجھ ایسے کسی نااہل شاگرد سے ملتے ہیں تو ان کی سعی یہ ہوتی ہے کہ نہ صرف اسے اس کی ذاتی نااہلیت کا احساس نہ ہونے دیا جائے بلکہ اس پر اپنی قابلیت اور علم کا رعب بھی کسی طور پر نہ گانٹھا جائے۔

لیکن اسی پہلی ملاقات میں مجھے صوفی صاحب کی ادبی شخصیت کا کوئی زیادہ علم نہ ہو سکا تھا، کیونکہ یہ مجلس زیادہ تر پُر مذاق فقروں اور چٹکلوں تک ہی محدود رہی۔ البتہ اتنا ضرور پتہ چلا کہ صوفی صاحب ٹریننگ کالج سے تبادلے پر گورنمنٹ کالج میں آ گئے ہیں، اور پھر آہستہ آہستہ صوفی صاحب کی ادبی عظمت کا حال ہم متعلمین پر کھلنے لگا۔ چند ہفتے بعد ایک دن تاثیر نے کہا آج صوفی کے ہاں قورمہ ہونے کا دن ہے۔ شب دیگ اور مچھلی کی ضیافت ہے۔ کون کون آئے گا میرے ساتھ۔ صلائے عام دیکھ کر ہم میں سے کئی لوگ پیٹ بھرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اور فوراً ایک مختصر سا قافلہ بارود خانہ روڈ سے تانگوں میں سوار ہو کر حضرت داتا گنج بخش کے عقب میں ذیلدار روڈ کی ایک گلی کے دہانے پر جا پہنچا۔

کھانے کے بعد ابھی چائے کا دور چل رہا تھا کہ حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری اپنی ایک غزل کا ایک مصرع گنگنانے لگے اور پھر احباب کی فرمائش یا اصرار کا انتظار کئے بغیر انہوں نے از خود غزل سنانا شروع کر دی۔ جملہ حاضرین ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اور ان کے کلام کا لطف لینے کے لئے آگے کو ان کی طرف سرک گئے لیکن اس دوران میں یہ بات ہم طلبہ کے لئے اچنبھے کا موجب بنی رہی کہ اپنا کلام سنانے کے دوران میں حفیظ کا روئے سخن بیشتر صوفی تبسم ہی کی طرف رہا اور وہ   کو مخاطب کر کے شعر پڑھتے رہے۔ اور پھر خود تبسم کی باری آ گئی۔ انہوں نے اپنا کلام سنایا جس پر تاثیر اور حفیظ نے خوب دل کھول کر داد دی۔ لیکن انہوں نے جو کچھ بھی سنایا وہ صرف فارسی میں تھا اور پھر برسوں تک ہم نے صوفی صاحب کا جو بھی کلام سنا یا پڑھا فارسی ہی میں تھا۔ یہ بات کئی برس بعد معلوم ہوئی کہ صوفی صاحب کی طبیعت فارسی سے اکتا کر اب ادھر ادھر ہر طرف میدان مار رہی ہے۔

چنانچہ اگر آج آپ صوفی صاحب کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہہ دیں کہ وہ ایک ہمہ گیر شاعر ہیں تو وہ صاف مکر جائیں گے کہ میں ہمہ گیر تو ضرور ہوں مگر [illegible] نہیں۔ آپ بحیثیت ایک پنجابی شاعر کے ان کے فن کو سراہنا شروع کریں تو وہ اپنا فارسی کلام سنا کر آپ کو سراپا سوالیہ نشان بنا دیں گے۔ آپ اب ان کی فارسی شاعری پر روشنی ڈالنے لگیں گے تو وہ اردو کی غزل سنا کر آپ کو ایک مرتبہ پھر چکرا دیں گے۔ آپ ٹھہر کر جب یہ فیصلہ کریں گے کہ وہ اردو، پنجابی اور فارسی تینوں زبانوں کے نہایت بالغ نظر شاعر ہیں تو وہ اپنے کلام کا خود ہی مجموعہ لے کر اپنا تخلص اپنے چہرے پر برساتے نظر آئیں گے اور بڑی معصومیت سے آپ کو سنانا شروع کر دیں گے یعنی

"ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ"

نتیجہ یہ کہ خود آپ کو اپنے اوپر ٹوٹ بٹوٹ ہونے کا شبہ ہونے لگے گا اور آپ اب مجبور ہو جائیں گے کہ تبسم کی شخصیت نگاری میں وہی طریقہ اختیار کریں۔ جو شعرائے کرام غزل کہتے ہوئے اختیار کرتے ہیں کہ پہلے دوسرا مصرع کہا جائے۔ یعنی بجائے یہ لکھنے کے کہ تبسم کیا ہیں آسانی اس میں رہے گی کہ یہ لکھا جائے کہ وہ کیا نہیں ہیں۔ تاکہ اس کے بعد آسانی سے یہ بات طے ہو جائے کہ وہ جو کچھ نہیں ہیں اس کے علاوہ جو کچھ ہیں وہ ہیں۔

مگر تجربے کے بعد یہ اندازہ بھی فوراً غلط ہو جائے گا کہ یہ صورت بھی اتنی ہی مشکل ہے جتنی آسان نظر آتی ہے اس لئے کہ تحقیقات کرنے کے

بھرتا چلے گا اور اصل صوفی صاحب وہ بھی ہیں جو نہیں ہیں لہٰذا اس ہونے نہ ہونے کا جھگڑا ختم کر کے اس ہمہ گیر شخصیت کے متعلق صرف یہ کہہ دینا کافی ہو گا کہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے کسی صوفیانہ خانوادے کے لئے بھی کسی سے بیعت نہیں لی لیکن ان کی منتشر سی ذات میں شخصیت اور روحانیت کے کچھ انمول جوہر یوں یکجا ہو گئے ہیں کہ ان کے جاننے والے ان سے وہی والہانہ عقیدت رکھنے پر مجبور ہیں جو صوفیائے کرام سے ان کے معتقدین اور حلقہ بگوشوں کو ہوتی ہے۔

تبسم زندگی بھر جہل کو عرفان بنانے کی کارگری فرماتے رہے ہیں۔ لڑکوں کو پڑھانا وہ فن ہے جس کا ہمیشہ یہ حشر ہوتا ہے کہ پیر تو درماندہ ہی رہتے ہیں مرید شفاعت کا کام شروع کر دیتے ہیں تبسم نے بھی خدا جانے کتنے شاگردوں کو دستار فضیلت سے نوازا ہے۔ اس مجلس میں ایسے بہت کم لوگ ہوں گے جنہوں نے کسی نہ کسی موقع پر ان سے کچھ نہ کچھ سیکھا نہ ہو۔ مگر طالب علموں کو یہ سکھانے پڑھانے والا طالب علموں سے خود کچھ حاصل نہ کر سکا۔ نئی روشنی کے اس دور میں بھی یہ وضعدار انسان وہی چراغِ مروت جلائے بیٹھا ہے جسے اس دور کے حساب سے گل ہی ہونا چاہئے تھا ہزاروں طالب علموں کا یہ استاد اپنے شاگردوں کے سامنے زانوئے تلمید کرتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ وہ زمانے سے کس قدر پیچھے ہے۔ تبسم آج بھی دوستوں سے دوستی کا دم بھرتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ شہر کوراں میں اس آئینہ فروشی پر دنیا ہنستی ہے۔ یہ آج بھی دوستوں کے لئے وقف ہیں۔ ان کی آج بھی دوستی پر دشمنی کا شبہ نہیں ہوتا۔ یہ آج بھی دوستوں کو گھیر گھیر کر لاتے ہیں۔ وعدہ وعید قرض ادا کرتے ہیں اور اس کی علامات میں خود اپنے کو بیچ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس دوستوں سے جو کچھ بچ رہا ہے وہ آج بھی دوستوں ہی کے لئے ہے۔ ان کے گھر کا سامان ان کے جسم کے کپڑے حد یہ ہے کہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز وہ کتابیں ہیں کہ الماری میں بند کر کے کنجیاں دانستہ کسی کنوئیں میں پھینک دی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص اپنی ذاتی شرافت کی وجہ سے ان سے کچھ طلب نہ کرے مگر یہ واقعہ ہے کہ اگر کوئی کچھ مانگ بیٹھے تو تبسم میں انکار کرنے کی تاب نہیں۔ البتہ مانگنے والا ذرا سلیقے کا آدمی ہو۔ سوال کرنے کا ڈھب جانتا ہو۔ موقعہ اور محل کا اس کو احساس ہو جس وقت صوفی صاحب انگلیوں میں سگریٹ اور ہونٹوں میں حقے کی نے دبائے۔ اچھا جمایا ہوا قوام چاٹ رہے ہوں۔ اگر کوئی شخص ان کے قوام کی مہک کی داد دے دے اور ذرا سا قوام ازراہ چاٹ کر اس کی تعریف کر دے تو صوفی صاحب کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو جائے گی۔ ان کی ناک کچھ اور سرخ ہو کر خوش رنگ بن جائے گی یہ وقت ہوتا ہے کہ جس کا جو جی چاہے مانگ لے۔ ویسے بھی ان کے گھر میں دوست نام کے ہر شخص کے لئے روٹی بھی ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اور کپڑے بھی ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ پیسہ درکار ہو تو بکس کی کنجیاں حاضر ہیں۔ کھیلئے چند بازیاں اور لے جائیے اپنی قسمت کا پیسہ۔ وہ جو کچھ کما چکے ہیں اس میں دوستوں کا حصہ ان کے ساتھ دیانت برت کر اور اہل و عیال کے ساتھ بد دیانتی کر کے ہمیشہ نکالتے رہے ہیں جو کچھ کمانا چاہتے ہیں اس میں بھی دوستوں کی پتی ہے۔ ورنہ خود ان کی ذات کے لئے سب ہی کچھ موجود ہے خود ان کے پاس۔ یہیں ان کے ان قدردانوں کے پاس جو صوفی کو سر آنکھوں پر جگہ دینا چاہتے ہیں مگر ہمت اس لئے نہیں کرتے کہ صوفی اپنے پتوں کی وجہ سے بھاری ہے۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی ساری زندگی کا ایک محبوب مشغلہ دوست بنانا تو رہا ہی ہے مگر باقی تمام دنیا کی دوستیوں کو اپنی کوششوں سے قائم رکھنا بھی ان کا ایک بے ساختہ شغل ہے اگر ان کو معلوم ہو گیا ہے کہ دو دوستوں میں کھٹ پٹ ہو گئی ہے تو وہ دونوں کے علیحدہ علیحدہ دوست بھی نہیں رہ سکتے۔ دونوں میں سے کسی ایک کے دوست اور دوسرے کے حریف بھی نہیں بن سکتے۔ اور نہ دونوں پر فاتحہ پڑھ کر خود الگ تھلگ رہ سکتے ہیں۔ اس اختلاف کی خبر سننے کے بعد ان کا ہر سرور بے کیف ہو جائے گا۔ اور ہر نشہ ہرن۔ وہ بیقرار سے نظر آنے لگیں گے اور ان کی تمام کوششیں سمٹ کر اس ایک مرکز پر آ جائیں گی کہ یہ بچھڑے ہوئے دوست کسی طرح آپس میں مل جائیں۔ اکثر ان کی حیثیت اس اختلاف میں اس دانے کی سی ہو جاتی ہے جو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آ جائے مگر ان کی یہ مقدس کوشش جاری رہتی ہے۔ اور انجیل مقدس کی یہ آیت اپنی تفسیر ان کی صورت پیش کرتی ہے کہ:۔

"مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔"

خدا کو وہ بے شک دیکھیں گے مگر ڈر تو یہی ہے کہ خدا نے اگر ان کو دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔ خدا کی طرف سے ان کو دیکھتے ہی ایک سوال یہ ضرور ہو جانا چاہئے کہ اے بندے ہم نے تجھ کو دنیا میں جس عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے بھیجا تھا۔ اس سے تو کس حد تک عہدہ برآ ہوا۔ ظاہر ہے کہ مقصد صرف یہ نہیں ہو سکتا کہ دوستیاں کیں اور نباہ کی حد تک کیں اور نہ صوفی صاحب بارگاہ خداوندی میں یہ کہہ سکیں گے کہ رب العزت میں نے تیرے بیشمار بندوں کو شب دیگ کھلائی ہے میرے دسترخوان پر تیرے خدا جانے کتنے بندے سیراب ہوتے رہے ہیں۔ اور یہ سمجھتے رہے ہیں کہ روزی اپنی کھا رہے ہیں صرف خوان میرا ہے۔ نہ صوفی صاحب یہ کہہ کر چھٹکارا حاصل کر سکیں گے کہ میں نے جو علم حاصل کیا تھا وہ بے شمار طالب علموں پر تقسیم کیا۔ سوال کی اصل نوعیت تو یہ ہوگی کہ اپنے بعد اپنی کیا یادگار چھوڑی۔ سرسید کو اگر یہ اطمینان تھا کہ اگر خدا نے مجھ سے پوچھا تو کیا لایا ہے تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں، ظاہر ہے کہ اسی قسم کے سوال پر خود حالی نے یہ کہا ہوگا کہ میں مسدس پہلے ہی سرسید کے ہاتھوں بھجوا چکا ہوں۔ مگر تبسم جن صلاحیتوں کے مالک ہیں اور دنیائے شعر و ادب کو ان سے جو توقعات ہیں اس معیار کی یہ کیا چیز پیش کریں گے۔ اپنے علم و فضل اور اپنی اہلیت و صلاحیت کو بروئے کار نہ لانے کا شکوہ ڈاکٹر تاثیر اور چراغ حسن حسرت کی طرح ان کی جان سے دور، ان سے بھی ہے۔ تاثیر اور حسرت سے جو شکایت ہے وہ بعد از وقت ہے مگر تبسم سے یہ شکایت بر محل ہے۔ تاثیر اور حسرت نے اپنے ساتھ خود انصاف نہیں کیا۔ تو شعر و ادب کے مؤرخ ان کے ساتھ کب تک انصاف کریں گے۔ کام نہ ہو تو نام کب تک زندہ رہ سکتا ہے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم خدا ان کو بڑی عمر عطا کرے اگر اب ان کے پاس وقت ہے کہ اپنے شایان شان کوئی بلند پایہ تخلیقی کام ایسا کر جائیں جو رہتی دنیا تک ان کو زندہ رکھے۔ اور وہ صلاحیتیں جن کے یہ امین ہیں ان میں خیانت کا الزام ان پر نہ لگے۔

مسعود حسن رضوی

علی عباس حسینی

میری شخصیت جن ذوات گرامی سے بہت متاثر ہوئی۔ وہ ہیں نواب زادہ محمد [illegible] رضوی [illegible] مرزا محمد حسین ایم اے [illegible] اور [illegible] مسعود حسن رضوی ادیب۔ [illegible] نے مجھے [illegible] مسعود صاحب کے اخلاص نے مجھے خادم اردو بنا دیا۔ حق یہ ہے کہ اگر مسعود صاحب اس طرف توجہ نہ دلاتے تو میں انگریزی [illegible] اردو میں [illegible] خیال کبھی دل میں نہ آتا۔ کالج میں تعلیم پانے کے زمانے میں [illegible] انگریزی [illegible] مسعود صاحب نے غیرت دلائی [illegible] اس [illegible] مسعود صاحب کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے۔

سوانح } یہ مسعود صاحب [illegible] زندگی [illegible] شخصیت کی کہانی، [illegible] زبانی اور کچھ میری زبانی مختصر۔ "آپ بیتی" میں وہ لکھتے ہیں: "[illegible] پیدا ہوا [illegible] عمر کے پانچویں سال [illegible] بسم اللہ ہوئی اور عربی فارسی کی تعلیم ہونے لگی۔ میرے والد [illegible] نقش قدم پر [illegible] طب یونانی کا ماہر اور علوم اسلامیہ کا عالم بنانا چاہتے تھے۔ [illegible] ان کی ناوقت وفات نے میری تعلیم کا رخ بدل دیا۔ [illegible] امتحان اول درجے میں پاس کرنے کے بعد [illegible] بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ایم اے کے درجے میں نام لکھوایا اور ایک سال انگریزی [illegible] تعلیم [illegible] ——— کوئی [illegible] ایل ٹی کی سند حاصل کی [illegible] ایم اے [illegible]

اوّل درجے میں اس امتیاز کے ساتھ پاس کیا کہ یونیورسٹی نے طلائی تمغہ عطا کیا۔ ۱۹۲۲ء میں اردو لیکچرار کی نئی جگہ نکلی اور اس جگہ پر میرا تقرر ہو گیا۔ تین سال بعد فارسی کے ریڈر شعبہ فارسی و اردو کے صدر کی جگہ خالی ہوئی۔ ۱۹۲۶ء میں اس جگہ پر میرا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۳۲ء میں سیاحت ایران کے لئے روانہ ہوا۔ اور عراق عرب کے مشہور شہروں اور وہاں کی عتبات عالیات کی زیارت کر کے بحری راستے سے ہندوستان واپس آگیا۔ اب تک جن کتابوں کی تصنیف و تالیف ترتیب ترجمہ یا تحشیہ میرے ہاتھوں انجام پا چکا ہے ان کے نام یہ ہیں: ۔ امتحان وفا۔ فرہنگ امثال۔ ہماری شاعری۔ فیض میر۔ مجالس رنگین۔ داستان اردو۔ روح انیس۔ انتخاب اردو۔ جواہر سخن جلد دوم۔ شاہکار انیس۔ دیوان فائز۔ متفرقات غالب۔ اردو زبان اور اس کا رسم خط۔ آب حیات کا تنقیدی مطالعہ۔۔۔ ان کتابوں کے علاوہ بہت سے تحقیقی اور تنقیدی مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور نامکمل کاموں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔۔۔۔۔۔ شعر کا ذوق میری فطرت میں مضمر ہے مگر اس کا اظہار شعر گوئی سے زیادہ شعر فہمی کی صورت میں ہوا۔ تاہم کبھی کبھی دل کے جذبات قلم کی زبان سے موزوں اور منظوم شکل میں بھی ادا ہو گئے۔ ان اوراق پریشان کا ایک چھوٹا سا گلدستہ بن گیا ہے ——— (ہماری شاعری۔ پانچواں ایڈیشن)

اس سوانح میں اتنے اضافے کی اجازت دیجئے کہ مسعود صاحب اپنے حسن خدمات کے صلے میں ۱۹۴۶ء میں ریڈر کی جگہ شعبہ اردو و فارسی کے پروفیسر مقرر کئے گئے اور سن گزشتہ میں اسی عہدۂ جلیلہ سے ریٹائر ہو گئے۔

حلیہ اور خصوصیات

(۱) متوسط قد، جسم چھریرا، گیہواں رنگ جو کبھی کھلتا ہوا ہو گا۔ چہرے پر خود اعتمادی کی جھلک۔ خوش وضع، شریف طبیعت، خوش مزاج، متین اور سنجیدہ۔ بات کیجئے تو ایسی مزے دار اور پیاری معلومات کی باتیں کہ اگر آپ کو فرصت ہو تو گھنٹوں سنا کیجئے اور آپ کا دل نہ بھرے۔ زبان ایسی صاف، شستہ اور سہل ہوتی کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ان کے منہ سے ہر لفظ جچا تلا نکلتا ہے۔ باوجودیکہ خاص لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئے، لکھنؤ ہی میں رہتے سہتے زبان اتنی منجھ گئی ہے کہ خود لکھنؤ والے غلطی کر جائیں تو کر جائیں لیکن ان کے منہ سے کوئی لفظ غلط یا محاورہ ٹکسال سے باہر نہ آپ سنیں گے۔ تقریر نہایت مدلل، منظم اور مفصل کرتے ہیں۔ ایسی کہ بحث طلب مسئلے کا کوئی گوشہ تحقیق اور ہی تشنہ نہیں رہ جاتا۔ یہ تقریر اردو میں ہو یا انگریزی میں یا ہندی میں یا فارسی میں، متانت، روانی، فصاحت اور شستہ زبان کی گل افشانیاں ہوتی ہیں۔ لکھنے کا انداز آپ نے آپ کی مشہور کتاب "ہماری شاعری" میں دیکھا ہو گا۔ ہر لفظ شگفتہ ہے، ہر جملہ مدلل اور شستہ ہے۔ واضح جملہ واضح تر کر دی ہے (فروغ اردو، جون ۱۹۵۵ء۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی)

(۲) سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے کا علمی و تحقیقی رتبہ اونچا ہے ——— موصوف کا ذکر اکثر ادبی حلقوں میں سنا ہو گا۔ سید مسعود حسن صاحب صرف لکھنے ہی میں ادیب نہیں بلکہ ان کی بات چیت اور انداز گفتگو میں بھی ایک خاص ادبیت پائی جاتی ہے۔ اور جب تقریر کرتے ہیں تو وہ بھی ادبیت کے رنگ میں ڈوبی ہوتی ہے ——— اپنے علمی و ادبی ذوق کے سلسلے میں سید مسعود حسن صاحب نے اردو اور فارسی کی نایاب قلمی اور مطبوعہ کتابیں جن کی تعداد کئی ہزار ہے بہت کچھ صرف کر کے جمع کی ہیں جن میں بہت سے انمول نوادر شامل ہیں ——— موصوف اردو زبان کے فاضل اور بہترین ادیب ہونے کے ساتھ ہی اردو کے عاشق بھی ہیں جس کی بقا و ترقی کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے ——— مسعود حسن صاحب طبیعتاً بہت نیک اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ آپ مذہبی آدمی ضرور ہیں مگر آپ کا شمار تعلیم یافتہ شخصیتوں کے اس گروہ میں کیا جاتا ہے جو آج کل کی اصطلاح میں "ترقی پسند" کہا جا سکتا ہے۔ ایک علمی و ادبی شخص میں سنجیدگی تو بہرحال ہوا ہی چاہئے مگر مسعود صاحب کی گفتگو میں خشکی نہیں ہوتی بلکہ ان کی باتوں میں ایک خاص مزے کی لطافت اور شگفتگی ہوتی ہے ——— (حقیقت حق ۱۹۵۳ء۔ ادبیات اصطلاحات۔ انیس احمد عباسی)

(۳) مرکزی اور شخصی باتوں پر ایسے سلجھے اور معقول انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر سے مخالفت کرنی مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان کے خیال میں اضافہ کر سکتے ہیں لیکن ان کے طرز استدلال سے انحراف آسان نہیں۔ (مختصر تاریخ اردو۔ ۱۹۴۳ء ڈاکٹر اعجاز حسین)

(۴) آپ قدیم کے عناصر شریف میں خوراک، پوشاک اور مکان کے بہترین برتنے والے ہیں۔ کھانا بہت اچھا کھاتے ہیں، کپڑا اچھے سے اچھا اور نہایت عمدہ سلا ہوا پہنتے ہیں ——— اور مکان آپ کا دیدہ زیب ہے، فرش سے زمین تک یہی ثبوت ہے آپ کی عمدہ طبیعت اور خوش مذاقی کا بہترین ثبوت ہے اپنے گھر

اور ترتیب کے لحاظ سے آپ نے ادب کے دو رخوں پر یعنی (۱) فن اور (۲) تہذیب و اخلاق اچھی طرح اختیار کئے ہیں۔ مزاج میں فصاحت، سلامت روی، حسن سلوک اور استقامت و یکسوئی ہر ہر بات سے نمایاں ہے ——— واضح رہنا چاہئے [illegible] اہل ایمان پیچھے سے آگے اور [illegible] ہوتے ہیں۔ لکھنؤ ۱۹۴۳ء ۔ مرزا محمد عسکری

میں مسعود صاحب کو ان سب سے پہلے سے جانتا ہوں۔ ۱۹۱۵ء میں جب میں ایف اے کی تعلیم کے لئے لکھنؤ آیا تو وہ بی اے کے پہلے سال میں تھے اور ہم دونوں شیعہ بورڈنگ ہاؤس میں مقیم ہوئے۔ اس زمانے کا حلیہ مرزا عسکری و ڈاکٹر ہاشمی کے بیان کردہ حلیہ سے قدرے مختلف تھا۔ رنگ سبزہ زیادہ صاف تھا، میری ہی طرح دبلے پتلے تھے اور خشخشی فرنچ کٹ داڑھی رکھتے تھے۔ مگر ان کی جبین روشن پیشانی ان کے درخشاں مستقبل کی طرف اس وقت بھی اشارہ کرتی تھی

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

ان کی آواز بڑی شیریں تھی۔ خود بھی شعر بڑے لحن سے پڑھتے تھے اور اس زمانے کے تمام خوش الحان شعراء کا کلام انہی کے انداز و لہجہ میں سنانے پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ عام طور سے مرثیے [illegible] مگر مخصوص احباب کی بزم میں غزلیں بھی، [illegible] بھی اور [illegible] بھی۔

بورڈنگ ہاؤس وہ عجیب زمانہ تھا۔ [illegible] کے منیجر تھے سید غلام حسین نقوی [illegible] ہو کر [illegible] لگے ہیں، اور بلاقی پچھنے کے ملازم تھے مسعود صاحب، میں اور مرزا [illegible] ایف۔ اے کے طلباء ہونے کی وجہ سے ان سے جونیر تھے۔ جس طرح مسعود صاحب [illegible] کے سرپرست تھے اسی طرح مرزا بھی [illegible] کے [illegible] تھے۔ [illegible] مرزا نے [illegible] کی۔ چونکہ قہقہہ اور ہنسی زندگی کو بڑھاتی ہے اس لئے حفظان صحت کے اصول کے ماتحت ایک قہقہہ کلب قائم کیا جائے جس کا مخصوص کام یہ ہو کہ ہم بلاقی پچھنے کے علاوہ ہر روز سہ پہر کو ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھیں اور قہقہہ لگانے کی ورزش کریں گے۔ مسعود صاحب کی ظاہری متانت نے وہ ایک دن [illegible] شریک ہونے پر مجبور کیا مگر بطور ظرافت غالب کا [illegible] وہ بھی اس کلب قہقہہ بازاں کے رکن رکین بن گئے۔ [illegible] کی انجمنوں کا جیسا [illegible] سے [illegible] کھانے پینے [illegible] پہلے کچھ شغل ناؤ نوش ہوتا۔ یعنی کبھی بسکٹ کباب کھائے جاتے کبھی آم یا امرود کے [illegible] کبھی دہی بڑے اور پیاس بجھائی جاتی کبھی لیموں کے شربت سے، کبھی صرف ٹھنڈے پانی سے۔ اب اس ناشتے کے لئے چندہ بھی ضروری تھا اور اس چندے کے لئے خزانچی بھی۔ یہ معزز عہدہ مسعود صاحب کو تفویض کیا گیا۔ اس لئے کہ ان کے بارے میں اس زمانے میں بھی یہ یقین تھا کہ [illegible] بھی خورد برد نہ کریں گے۔ اور اب ہم سب کی طرح وہ [illegible] رکھتے ہیں [illegible] رہ سکتے ہیں [illegible] امانت کی رقم [illegible] نہیں سکتے۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد جب میں اور مرزا ٹریننگ کالج الہ آباد میں داخل ہوئے تو مسعود صاحب اس شہر میں پہلے سے موجود تھے۔ وہ اس وقت صیغہ تعلیم کے [illegible] ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے اور [illegible] منڈی میں رہتے تھے۔ میں اور مرزا ہر اتوار اور چھٹی کے دن صبح سویرے مسعود صاحب کے ہاں پہنچ جاتے تو دن بھر [illegible] کھانے پکانے جاتے اور مختلف ادبی موضوعات پر بحث ہوتی رہتی۔ ہم سب غالب و انیس پرست تھے لیکن ایک دوسرے کو چلانے اور تپانے کے لئے کبھی کبھی ان اصنام ادب و سخن پر بھی خشت باری کر دیتے۔ اسی ضمن میں ایک دن مرزا نے کہا [illegible] ذوق غالب سے بڑے شاعر تھے میں نے کہا وہ سرے سے شاعر ہی نہ تھے، موزوں کرنا اور چیز ہے اور شعر کہنا اور شے۔ بحث گرما گرم ہوتی رہی۔ بالآخر حکم مسعود صاحب بنائے گئے۔ انہوں نے کہا کلام پیش کیجئے [illegible] مرزا صاحب دو روز میں ذوق کے دیوان سے اشعار چن کر پیش کریں [illegible] حامد نے پورا دن دیوان ذوق پر صرف کیا۔ [illegible] انہوں نے صرف ساٹھ ستر شعر منتخب کئے [illegible] بحث ہوتی اور بالآخر ساٹھ میں سے تین شعر ایسے مانے گئے کہ ان میں سے ہر ایک پورے دیوانوں پر بھاری تھا۔ میں نے مان لیا کہ ذوق [illegible] شاعر تھے اور [illegible] کی سعادت کی۔

اس طرح کی صحبتوں میں بھی مسعود صاحب کی شخصیت کی انفرادیت نمایاں تھی۔ وہ کبھی [illegible] ہماری طرح بیٹھ کر [illegible] کبھی غصہ ہوتے نہ جھنجھلاتے [illegible] ان کے ذہن سے محو ہوتا۔ [illegible] کے رہنے والے اکثر [illegible] اخلاص میں ایک [illegible] جاتے [illegible] کے درمیان [illegible] مسعود صاحب کا نام [illegible]

زبان پر بغیر صاحب کے نام کے نہ آتا اور نہ کوئی انھیں آپ کی جگہ تم کہہ کر مخاطب کرنے کی جرأت کرتا۔

بچپن سے لے کر یہی کیفیت ان کی عمر بھر رہی۔ انھوں نے کبھی بھی اپنے کو چھوٹا نہ رکھا، وہ فطرتاً شرمیلے بلکہ جھینپو تھے۔ مجھ سے خود بیان کرتے تھے کہ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے جب لکھنؤ آئے تو برسوں یہ حالت رہی کہ جہاں دو چار لڑکوں کو ایک جگہ کھڑا دیکھتے تھے راستہ کترا کر نکل جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جھینپا پن اور بے جوڑ پن کے باوجود بہت درجات کا کام کرتے۔ اس نظریے کے ماتحت مسعود صاحب یقیناً جری ہیں۔ اس لئے کہ انھوں نے لکھنؤ کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے میں تعلیم کی تکمیل کی، شیعہ بورڈنگ ہاؤس میں قیام کیا جہاں کے گیارہ طلبا قواعد و ضوابط کے خلاف بغاوت کرنے پر چھ چھ ماہ کو نکال دئے گئے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔ معلم ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ بڑے بڑے درجوں کو قابو میں رکھنے میں کامیاب ہوتے اور بڑے بڑے مجمعوں میں عالمانہ، ادیبانہ اور مدلل تقریریں بھی کیں۔

اسی عالم میں پچھلے ہوئے شوق نے انھیں ہر طرح کے احتساب کا اور اپنے جذبات کو چھپانے کا عادی بنا دیا۔ اور اس نے خودداری اور احساس کو ضرورت سے زیادہ بڑھا بھی دیا۔ ان کے رہن سہن سے کبھی یہ ظاہر نہ ہوا کہ انھیں کوئی مالی دشواری بھی پیش آ سکتی ہے۔ طالب علمی میں بھی جب سوائے وظیفوں کے کوئی سہارا نہ تھا ان کا لباس صاف ستھرا رہتا تھا۔ اور ان کے چہرے مہرے سے کبھی یہ ظاہر نہ ہوا کہ بعض وقت ان کے پاس فیس کے روپے بھی نہیں ہوتے۔

ایف اے کا امتحان سر پر تھا۔ امتحان اور کالج کی فیس ملا کر پچاس روپے دینے تھے۔ تین مہینے سے وظیفہ نہ ملا تھا۔ سخت پریشانی تھی کہ کیا کریں۔ ایک عزیز سے جو صاحب ثروت بھی تھے اور ان کے والد مرحوم کے مرہون منت بھی رہ چکے تھے، روپے قرض مانگے۔ انھوں نے سوچا میری طرح صاحب دوستوں سے دوسروں سے بھی مدد کریں اس لئے حیلہ شرعی کر کے ٹال دیا۔ مسعود صاحب کو ناگوار ضرور ہوا مگر خاموش ہو رہے۔ اتفاق یہ کہ احسان فراموش کے ایک بزرگ کو اس واقعہ کی خبر لگ گئی۔ انھوں نے بھیجا ہوا یاد دلایا، غیرت بھی دلائی اور خود ضمانت بھی کر لی۔ ان حضرت نے مجھے جواب ہوا کہ ایک عزیز کے ذریعے اب روپیہ بھیجے۔ مسعود صاحب نے کہا امتحان دے سکوں یا نہ دے سکوں اب ان کے روپے نہ لوں گا۔ انھوں نے مجھے بے اعتبار سمجھا، دوسرے کی ضمانت ضروری سمجھی۔ بڑی رد و کد ہوئی۔ بڑا اصرار کیا گیا مگر مسعود صاحب اپنی بات پر اڑے رہے۔ شاید یہی وہ استغنا تھا کہ اپنا کام کر بغیر کسی کوشش کے دوسری جگہ قرض حسنہ مل گیا۔ امتحان میں بھی شریک ہوئے اور ممتاز حیثیت سے اسے پاس بھی کیا۔

اسی خودداری نے انھیں شادی کے بازار میں بکنے سے بار بار روک لیا۔ بڑے لوگ پاس کرتے ہیں۔ ایک نواب صاحب کی طرف سے فرزندی میں لینے کی خواہش کی گئی۔ مکان، جائداد، موٹر، گاڑی، گھوڑا سب ہی کچھ مل رہا تھا۔ مگر انھوں نے کہا الفقر فخری۔ اسسٹنٹ ماسٹری کے زمانے میں ایک مشہور و مقتدر تعلقہ دار کے ہاں سے اسی طرح کی خواہش کی گئی اور بہت سے سبز باغ دکھائے گئے مگر انھوں نے کہا شادی کے معاملے میں میں اس کا قائل ہوں کہ لوگ یہ کہیں کہ فلاں صاحب مسعود صاحب کے سسرے ہیں نہ یہ کہ مسعود صاحب فلاں صاحب کے داماد ہیں۔ یعنی دامادی ذریعۂ عزت و ترقی و امتیاز نہ بنے بلکہ اپنی ذاتی صلاحیت و قابلیت۔

مسعود صاحب کا حافظہ غضب کا ہے۔ جس چیز کو دھیان دے کر دو تین بار پڑھ لیتے ہیں وہ حرف حرف یاد ہو جاتی ہے۔ شعرا تو بہت سے ایسے دکھائی دئے جنھیں اپنے کلام کے سیکڑوں شعر زبانی سنانے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ مگر سوائے مسعود صاحب کے کوئی صاحب علم و نظر میری نظر سے نہیں گزرا جو اپنے مضامین کے صفحے کے صفحے زبانی سنا سکتا ہو۔ مسعود صاحب کے اس حافظے نے جہاں ان کو اپنا علم تازہ رکھنے کا اچھا موقع دیا وہاں انھیں ایک فاضل اور ایک ادیب بے عدیل کی طرح استادی بخشی۔ یہی انھیں شاعروں کی شرکت سے معذور بنا دیا۔ جہاں کسی شعر کی زیادہ تعریفیں ہوئیں اور انھیں اساتذۂ قدیم میں سے کسی کا اس سے بہتر شعر یاد آ گیا۔ اب اگر صاحب شعر کی تعریف کرتے ہیں تو مروتاً کرتے اور دل سے نہیں کرتے ہیں اور اگر خاموش رہتے ہیں تو سکوت سخن شناس کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس لئے کنارہ کشی ہی میں سلامتی دکھائی دی۔

وہ بہت سی سرکاری، غیر سرکاری علمی و ادبی انجمنوں کے ممبر ہیں۔ مگر سوائے مسلم اکاڈمی اور ادبی انجمن اردو لکھنؤ کے کبھی کسی ادارے میں کوئی عہدہ قبول کیا۔ ان دونوں جماعتوں کی عہدہ داری سے انھیں تجربہ ہو گیا کہ خاموش ادبی کام کرنے والوں کے لئے انجمن بازی تضیع اوقات ہے۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو لکھنؤ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ادبی سکریٹری کی ممبری اب بھی ان کے لئے پریشان کن ہے۔

مسعود صاحب نے اپنے اور دوسروں کے لئے مختلف حدیں کھینچ رکھی ہیں۔ بے تکلفی کی حد، دوستی کی حد، عزیز داری کی حد۔ اس سلسلے میں ان کے ہاں انضباط ضروری ہے۔ وہ کبھی بے آپے نہیں ہوتے۔ وہ اپنی طالب علمی و عسرت کے زمانے میں بھی حد کے قائل تھے اور وہ اب اپنی ظرافت و علمیت کے زمانے میں خود بڑھ کر کسی کی حد کے مٹنے میں جلدی سے تیار ہوتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اگر کسی نے قرب سے تخفظ دیے والا اخلاص ان سے برتا اور دوستوں کے ان قریبی حلقوں میں تو شرم و لحاظ بھی جذبہ پیدا ہوا۔ اس پر بھی دل میں گمان ایسا ہے کہ طبیعت و مروت، شرافت و محبت، وفا و اخلاص کے ذکر پر دیدہ ہو جاتے ہیں۔ بس ضبط و تحمل مزاج کا جوہر بن گئے ہیں اس لئے چاہتے ہیں کہ آپ خود بھی حدود کے اندر رہیں اور انہیں بھی ان کی رگ احساس کو چھیڑ کر اس احاطے سے باہر نکلنے پر مجبور نہ کریں۔

صنف نازک کا ذکر مجھ جیسے بے تکلف دوستوں سے بھی نہ کیا۔ بظاہر وہ اس کے قائل ہیں کہ "عشق پنہاں است اگر مستور نیست"۔ لیکن تمہاری شاعری میں انہوں نے معاملات عشق کا بیان جس تفصیل سے کیا ہے اور اس سلسلے میں جو چٹپٹی باتیں لکھی ہیں ان سے غالب کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

وہ ہندی، انگریزی اور فارسی کے فاضل ہیں۔ اردو کے وہ چند زبان دانوں میں ہیں جو نہ صرف اس کے موجودہ ذخیرے کے وسیع ہیں سے ہیں۔ انہیں الفاظ کے استعمال پر بے پناہ قدرت ہے۔ ان کا ہر فقرہ بچا تلا ہوتا ہے۔ ایسے علوم میں بھی جن میں انہیں دستگاہ کامل حاصل نہیں وہ "یک من علم را دہ من عقل باید" کے مصداق ہیں۔ علاوہ ان تصنیفات و تالیفات کے جن کی فہرست ان کے سوانح کے ضمن میں دے دی گئی ہے ان کا غیر مطبوعہ کام بہت ہے۔ انہوں نے تاریخ اردو پر بہت سا مواد جمع کر رکھا ہے۔ اور داستان شاعری پر تحقیقی، تاریخی، انتقادی ذخیرہ [illegible] ان کی معلومات ہیں اور اس فن کی جتنی تصنیفات ان کے پاس موجود ہیں ہندوستان و پاکستان میں کسی کے پاس نہیں۔

مرثیوں کا ذخیرہ جیسا مسعود صاحب نے جمع کیا ہے وہ معلوم نہیں کہیں اور ہو [illegible] مرزا عسکری مرحوم لکھتے ہیں: "میر انیس کے پانچ مرثیوں سے لے کر آج تک کے قدیم و جدید مرثیے متعدد الماریوں میں رکھے ہوئے ہیں جن کو دیکھ کر آپ کے تجسس و تلاش، قوت انتخاب اور صرف زر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ نواب مقیم جیسے [illegible] مرحوم نے آپ کے مرثیہ خانے کی زیارت کی تھی اور اس کی کثرت و تنوع دیکھ کر مبہوت رہ گئے تھے۔ یہی حال راجہ امیر احمد خاں صاحب والی محمود آباد کا ہوا تھا جو مراثی کے جمع کرنے کے خاص طور پر شائق تھے۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی مرثیہ گو ایسا ہو گا جس کا مرثیہ مسعود صاحب کے پاس نہ ہو۔ یہی حال فارسی اور دوسری زبانوں کے مرثیوں کا ہے۔ ان کی تعداد ہزاروں میں ہے اور مسعود صاحب نے ہر ایک کو بغور پڑھ کر ہر ایک کی خصوصیات مرتب و [illegible] بیان لکھ رکھی ہیں۔"

بڑی کمی ان کی نفاست پسندی اور محتاط مزاجی ان کی فطرت و طبیعت ہے [illegible] ان کی تصنیفات کی کتابت و طباعت ہر ایک میں جزئیات پر نظر رہتی ہے۔ جب تک ایک ایک بات کی صحت و درستی نہ ہو معلوم ہو نہیں سکتی۔ تحقیق کے سلسلے میں ہر ایک چیز کی تحریر کا باعث ہوتی ہے۔ ہر کام پر تحقیق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ذرا ذرا سی باتیں جو عام طور سے نظر انداز کر دی جاتی ہیں ان کے لئے کلکتہ، پٹنہ، حیدر آباد اور علی گڑھ کے سفر کی ضرورت ہو جاتی ہے جب تک وہ مکمل تحقیق کر کے اپنے کو مطمئن نہ کر لیں کسی مضمون کا لکھنا ان کے نزدیک ممکن نہیں ہے۔ لیکن ان کی تحقیق کا معیار اب تک بھی اس قدر بلند ہے کہ [illegible] کسی مسئلہ کے مشکوک رہ جانے پر [illegible] آپ نے جو کچھ لکھا ہے اسے شائع کر دیجئے، مزید تحقیق آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ دیجئے [illegible] آتا ہے۔ خدا کرے وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں!

اب تک جتنا کام مسعود صاحب انجام دے چکے ہیں وہ اردو ادب میں زندہ رہنے کے لئے کافی ہے اگرچہ [illegible] بڑی بڑی [illegible] ماننا پڑے گا کہ مسعود صاحب ان لوگوں میں ہیں جن کو ادبی دیو کہا جاتا ہے!

علی عباس حسینی

کشور ضیاد زیدی

اگرچہ پرانا سا طریقہ ہوتا تو میں بڑے ڈرامائی انداز میں کہتی

یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں یہ لوگ

لیکن وہ دور گزر چکا۔ اب مضمون شروع کرنے کے لئے افتتاحیہ الفاظ سر چھپتے پھرتے ہیں۔ بہر حال نقوش میں شخصیات نمبر کی پیشکش دیکھ کر میرے دل نے کہا کہ علی عباس حسینی کی شخصیت سے مجھ سے زیادہ کون واقف ہوگا گو میرے الفاظ ان کو بھی طرح روشن اور واضح نہ کر سکیں بلکہ سا خاکہ تو بن ہی جائیگا۔ تکلف و تصنع سے دور۔ ایک شفیق باپ۔ مذاق نے شرارت پر شاباش دی اور نیچے فریاد کی۔ آنسو بہ نکلے گئے، تھوڑی ہی دیر نصیحت بھی ہوتی ساتھ ہی والدہ بھی ہیٹ میں آ گئیں۔... آپ ہی نے بگاڑ رکھا ہے بچوں کو ...... وہ بگڑیں ...... وہ پھر مسکرائے وہی شفیق پیاری سی مسکراہٹ جو انسان کے چہرے کو فرشتوں سے جتنا اور بہتر بنا دیتی ہے۔ کسی کو پیسے دئے کسی کو گڑیا لانے کا وعدہ ہوا۔ اور کوئی گیند کی خوشی میں اچھلنے لگا ———

اپنے ہی بچے نہیں اوروں کی فریاد بھی اسی دلسوزی سے سنتے ہیں۔ کسی کی فیس نہیں داخل ہوئی کسی کے پاس کتابیں نہیں ہیں کسی کے پاس گرم کوٹ نہیں ہے کسی کے بوڑھی کے جوڑوں میں درد پڑ رہی ہے ...... غرضیکہ دنیا کے ہر مرض کا واحد علاج "امرت دھارا" یعنی حسینی صاحب ...... گو کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا اظہار کرنا بچپنا اور کم ظرفی ہے۔ لیکن مجھے تو غصہ صرف اس بات پر آتا ہے کہ جو لوگ ہمیشہ ساتھ رہے، پچھلا بھلا یا سرپرستی کی۔ وہی آج کہتے ہیں کہ حسینی صاحب نے بے ترقی کی افضل شرح کی ہمدردی یا ممنون احسان ہونا تو دور کی بات ہے۔ میرے خیال میں حسینی صاحب کے خود ان ہی لوگوں کا ممنون کرم ہونا چاہئے۔

ہزاروں روپے کمائے لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔ گو کہ کمائی خالص حلال کی تھی لیکن روپے ایسے اڑنچھو ہو جاتے کہ بس کوئی دیکھتا رہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی دوست سا شہر میں آیا ہے تو جانے قیام ہوا ہے حسینی صاحب کے اور کہاں! اگر کسی کو تعلیم حاصل کرنی ہے تو جناب [illegible] کا گھر موجود ہے۔ اگر بیٹھنے میں کم از کم آٹھ دس شاندار ترقی نہ ہوں تو پھر بیٹھنے کا لطف ہی کیا ......

والد کے ساتھیوں نے اپنی عمارتیں بنوائیں۔ لاکھوں کا بینک بیلنس جمع کر لیا لیکن یہ جیسے کے تیسے رہے۔ خدا نے صبر اور مستقل مزاجی کی سادگی

حدیں ان پر ختم کر دی ہیں۔ سادات ہونے کے ناطے سے اور کیا چاہیے؟ کھانے کو مل جائے تن ڈھک جائے اور گلاس کے علاوہ کبھی کو کھلایا اور پہنایا جائے تو ایک سو ایک فی صدی جنتی ـــــــ گھر کا ہر فرد بیمار، دواؤں اور ڈاکٹروں کا سیلاب ہے کہ اُمڈا آتا ہے۔ روپے ختم ہو چکے ہیں پھر بھی اگر کوئی دوست آ گیا تو ایک دعوت اور ایک لیکچر...... چلئے پریشانی کا علاج ہو گیا۔ پھر کھانے کے خوش خوش گھر چلئے۔ باری باری سے سب کے ہاتھوں پر ہاتھ کا اگر بہت ہمت آ گئی تو دو ایک پلا دی اور چلے گئے اوپر۔ بس کتاب ہی اور وہ ہیں...... رات کے ایک دو بجے تک مطالعہ میں مشغول رہے۔ صبح سویرے اٹھتے ہی اخبار مانگا۔ اخبار ختم ہوا اور پھر کتاب ہاتھوں میں آ گئی۔ صبح سے شام ہو گئی نہ کہیں باہر گھومنے پھرنے جائیں گے نہ کسی دوست کے گھر ملنے جانے ان کی ساری دنیا تو انہی کتابوں میں سمٹ آئی ہے جن میں اپنی ساری فکریں، پریشانیاں، غم سب کچھ غرق کر دیتے ہیں۔ غصہ جیسے کم آتا تھا لیکن اب کافی آنے لگا ہے۔ اس لئے سب ان کے غصے سے بہت ڈرتے ہیں...... غصہ صرف کھانے پہ آتا ہے یا کسی دعوت کے سلسلے میں...... کیا کبھی اس قورمے میں مرچ کی کفایت کیوں برتی گئی ۔۔ یا صبح ناشتے میں صرف کباب ہی کیوں ہیں ۔۔ یا انڈا کہاں غائب ہے ۔ یا انڈا فرائی آ گیا تو خیر۔ دو دو چار لقمے جلدی جلدی کھائے اور پھر کتاب ایسے جلدی سے اٹھائی گویا معذرت کر رہے ہوں...... معاف کرنا عزیزم میں تجھ سے ذرا دیر جدا رہا ۔۔ !

کہیں سے افسانے کا تقاضا آیا ہے مگر یہاں خاموشی۔ آخر ہم لوگ بحث کرتے ہیں، ابا، لکھئے فلاں کا آج بھی خط آیا ہے ۔ اگر موڈ میں ہوئے تو حکم ہوا پنسل کاغذ لاؤ میں بولتا جاؤں تم لکھتے جاؤ...... ہم جا کر لے کر کبھی افسانہ پڑھتے ہیں ضرور لطف آتا ہے۔ ٹائپ رائٹر کی طرح لکھتے ہیں نہیں ...... اور بات جہاں ذرا دو منٹ بور ہوئی تو اپنا تو دم ہی نکل جاتا لیکن آہستہ آہستہ سمجھ میں آنے لگا کہ فنکار کی حیثیت سے دشتی کا موازنہ کرنا حماقت ہے۔ یوں بھی وہ جو کوئی لکھتے ہیں ضرور سناتے ہیں تاکہ ہمارے اندر لکھنے کا شعور پیدا ہو۔ وہ بھی اب جبکہ ہم خود بھی شعور کو پہنچ گئے ...... شروع شروع میں جب میں نے کہانیاں لکھیں تو والد کو دکھاتے بڑی شرم آئی چنانچہ کہانیاں شائع ہو گئیں تو انہوں نے پڑھیں۔ مجھے شاباش دی، کچھ تصحیح کر کے دکھایا...... مگر ہم تو یہی سوچتے رہے کہ والد نے وہ دو منٹ تک چھپا کر اپنے دل میں کیا سوچا ہوگا ۔۔ خیر اب ہم ایسے احمق نہیں رہے ...... ہاں البتہ ان کے بعض شوقین ہیں اس بارے میں بھی کبھی غصہ آ جاتا ہے لیکن شوکت تھانوی کی طرح پاندان سے شوق نہیں۔ پانوں کی ڈبیا رکھتے ہیں پاندان ان کے خیال میں صرف مستورات ہی کا حق ہے۔

ہر مہینے جتنی نئی کتابیں خرید سکتے ہیں خرید لیتے ہیں گو کہ یادداشت کا یہ اتفاق نہیں ہوتا تو بھی سیکڑوں کتابیں گھر میں موجود ہیں۔ کتابیں خرید کر پڑھیں، پھر ان سے بے نیاز ہو گئے خواہ وہ ردی میں چلی جائیں یا کسی صاحب ذوق کی الماری میں محفوظ ہو جائیں انہیں کوئی خبر نہیں ـــــــ اگر کبھی ضرورت پڑ گئی کسی کتاب کی تو لاکھ سر پٹکیں کہ شاید مل جائے مگر کتاب نہیں مل سکتی۔ اس لئے کہ صرف والد ہی کے دوست نہیں، ہمارے دوستوں میں سے بھی

ع ۔ جو بڑھ کے خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

حد یہ ہے کہ خود اپنی تصنیفات میں سے بھی ایک کی کوئی جلد گھر میں نہیں ہے۔ والد کی خاص خاص کتابیں بھی لوگ مانگ کے لے گئے اتفاق سے جو بچی کھچی نذر ہوئی تھی وہ بھی کسی کی محبت چڑھ گئی۔

یوں تو آپ انہیں کافی آزاد خیال سمجھیں گے لیکن حقیقتاً والد کافی قدامت پرست ہیں۔ نسل، ذات پات کے قائل۔ اور اپنے سید ہونے پر فخر......

لڑکیوں کو نوکری کرانے کے قائل نہیں۔ ملازمت میں بے شرمی پیدا ہوتی ہے اور جانے کیا کیا۔ لڑکیاں پڑھ لیں لیکن گھر پر بیٹھی رہیں تو بہتر ہے۔

کھانے پر بیٹھیں گے تو گھر کا ہر فرد ساتھ ہو خواہ جگہ تنگ ہی ہو مگر ہر ایک سمٹ سمٹا کر اسی میں بیٹھ جائے۔ اکیلے کھانا نہیں کھا سکتے، اکیلے کوئی تفریح نہیں کر سکتے۔ اکیلے بس وہ ایک ہی کام کرتے ہیں ـــ مطالعہ ـــ!

لباس کے معاملے میں حد سے زیادہ بے فکر۔ بس صاف ستھرا ہونا چاہئے قمیص کا کالر اگر ترچھا ہے تو کیا ہوا ۔۔ شیروانی زیادہ چوڑی سل گئی ہے تو کیا خرابی ۔۔ چنانچہ پچھلے جاڑوں میں نے والد ہی کی قمیصوں کو نئے فیشن کا بنایا اور وہ بہت خوش ہو کر میرے بنائے ہوئے کپڑوں کو پہنتے رہے

لیکن اس لاپرواہی کے باوجود آپ ان کے پاجامے کی موری کو موزے یا پاپوش سے چاک، گریبان نہیں پائیں گے اور نہ کبھی رومال کی گندگی سے کف [illegible]۔ قمیص کے گریبان میں اگر بٹن نہ بھی ہوں تو مضائقہ نہیں لیکن کالر ضرور بند رہے گا۔ گھر میں صرف تہمد اور بنیان پر قناعت کرتے ہیں، گرمیوں میں، لیکن آپ انہیں اس لباس میں کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ بغیر کرتے پاجامے کے وہ ڈرائنگ روم میں نہیں جاتے اور بغیر شیروانی، ٹوپی اور چھڑی کے قدم گھر سے باہر نہیں نکالتے۔ اپنی صحت کے معاملے میں بھی مستغنی ہیں، کھانا بہت کم چھوڑتے ہیں۔ بلکہ اس حرارت یا پیٹ کی گرانی کبھی وقت کے کھانے کا ناشتے میں اثر نہیں ہوتی۔ آج عالم یہ ہے کہ ماشاء اللہ اب بھی اپنے دانتوں سے زیادہ قوی ہیں...... کبھی کام سے عار نہیں ہے۔ بہ ضرورت شوق آپ انہیں کباب کی سیخیں بھی سینکتے دیکھ سکتے ہیں اور ملازموں کے بچھوڑے پر چٹنی لگانے کے لئے آدھی رات کو نیم کی پتیاں بھی چکھتے ———— شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ خالص دیہاتی ماحول کو پسند کرتے ہیں۔ زمیندار کے بیٹے لیکن تعلیم حاصل کرنے روز شہر سات میل پیدل آتے اور جاتے تھے۔ یہ بات دوسری ہے کہ آج ان کے بیٹے چند قدم پیدل بھی نہیں جا سکتے۔

لکھنے پڑھنے کا ایک عمر آئی لیکن وہ تو اب تک کوئی خاص لکھنے کا کمرہ ہے نہ میز و کرسی۔ حتیٰ کہ کسی وقت کاغذ کی بھی کمی پڑ جاتی ہے۔ ان کے پلنگ یا زیادہ سے زیادہ بستر پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے تہمد بنیان میں ملبوس، ایک چپل اور چند کاغذات اپنے سامنے بکھیرے آپ اپنے اس فنکار کو تخلیق میں مشغول دیکھ سکتے ہیں۔ اسی دوران میں بچے آ آ کر اپنی شکایتیں اور فرمائشیں بھی صادر کر دیتے ہیں۔ کبھی ذرا مسکرا کر تسلی دیتے ہیں کبھی ہلکی سی ڈانٹ۔ اور زیادہ تنگ آئے تو کاغذ سمیٹے اور ساوی اپنے گھر کی —— یعنی اوپر چلے گئے۔

ادھر انہوں نے ایک ناول پندرہ دن کے اندر لکھ کر ختم کیا ہے۔ جس کے ہیرو کے کردار کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ انہوں نے یہ ناول مسلسل سترہ اٹھارہ گھنٹے ایک نشست بیٹھ کر لکھا ہے اور ساتھ ہی اپنے چہیتے نواسے عسکری میاں کی ساری فریادیں بھی سنتے رہے ہیں اور ان کو تسلی بھی دیتے رہے، ان کی چوٹوں کی مرہم پٹی بھی کرتے رہے...... جب سے وہ ریٹائر ہوئے ہیں میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ جیسے وہ اب اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتے ہیں اور زیادہ جوش اور لگن کے ساتھ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ خداوند عالم ان کو ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے اور وہ ہمیشہ اسی طرح اردو ادب کو زندہ جاوید کرنے والے ادب پارے پیش کرتے رہیں......!

حامد علی خاں

محمد عبداللہ قریشی

حامد علی خاں منشی سراج الدین احمد خاں بانئ اخبار زمیندار لاہور کے فرزند ہیں۔ محرم [illegible] ہجری [illegible] کو کرم آباد (ضلع گوجرانوالہ) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی روشنی اور شعر و ادب کے چرچوں کی وجہ سے یہ سارا گھر آفتاب بنا ہوا تھا۔ منشی سراج الدین احمد خاں خود بڑے اچھے انشا پرداز اور شاعر تھے۔ ان کے فرزند اکبر مولانا ظفر علی خاں کا تو اس باب میں کوئی حریف ہی نہیں۔ غلام حیدر خاں صاحب جو مولانا ظفر علی خاں سے صرف تین سال چھوٹے ہیں۔ دنیائے صحافت میں کافی شہرت اور نام پیدا کر چکے ہیں۔ ان کے ایک بھائی محمد اکبر خاں جو علی گڑھ کالج کے ایک قابل گریجوایٹ تھے اور اخبار زمیندار میں مضامین اور نظمیں لکھا کرتے تھے۔ وہ بھی اگر زندہ رہتے تو اپنے عہد کے نامور شاعروں اور ادیبوں میں شمار ہوتے۔ ایک بھائی پروفیسر محمود احمد خاں جو کئی سال تک عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں پروفیسر کیمسٹری رہے اور اس کے بعد صدر شعبہ رہ چکے ہیں ہمیشہ یونیورسٹی کی مجلس اصطلاحات علمی کے رکن رہے ہیں۔ اب مجلس زبان دفتری حکومت پنجاب کے میر شعبہ ترجمہ ہیں۔ جن کی نگرانی میں اصطلاحات کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ حامد علی خاں نے یہ آنکھیں ایسے اعلیٰ گھرانے میں کھولیں پرورش پائی۔ پروفیسر حمید احمد خاں (اسلامیہ کالج لاہور) بھی انہی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے نہایت بلند پایہ ادیب اور نقاد ہیں۔ انھوں نے غالب کے متعلق بہت محققانہ کام کیا ہے۔

حامد علی خاں نے ابتدائی دینی تعلیم اسلامیہ پرائمری سکول لاہور اور چرچ آف سکاٹ لینڈ مشن ہائی سکول وزیرآباد میں حاصل کی۔ اسکاچ مشن کے انچارج ڈاکٹر ٹامس گراہم بیلی اس زمانے میں ان کے انگریزی کے معلم تھے ——— وہ بعد میں لندن یونیورسٹی میں اردو ادبیات کے شعبہ کے صدر ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر بیلی یورپین ہونے کے باوجود اردو اور پنجابی ایسی بے تکلفی سے برتتے تھے کہ سن کر حیرت ہوتی تھی۔ پنجابی میں بالخصوص ان کا لہجہ ایسا تھا کہ کوئی شخص ان کے ٹھیٹھ پنجابی ہونے میں شبہ نہ کر سکتا تھا۔ ان کے ذہن میں پنجابی ایسی رچی ہوئی تھی کہ وہ خاص خاص اشیاء کے نام بھی جان گئے تھے۔ وہ اپنے شاگرد حامد علی خاں کو ایسے کھاتے پیتے امیر گھرانے کا بچہ سمجھتے تھے جس کا تلفظ بدیہی انگریزی ہو۔ ایک مرتبہ پنجابی میں کہنے لگے منشی تاں ڈبل روٹی کھاندے ہوں گے۔ یہ پٹھان ہوسے لوگ گھیو ملا کے اک طراں دی روٹی پکاندے نے جہنوں پراٹھا آکھدے نے۔ اوہ بڑا ثقیل ہوندا اے۔ یعنی تم تو ڈبل روٹی کھاتے ہو گے۔ مگر یہاں لوگ گھی چپڑ کر ایک قسم کی روٹی پکاتے ہیں جسے پراٹھا کہتے ہیں۔ وہ بڑا ثقیل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بیلی اپنے شاگردوں کو بے تکلفی سے خالص پنجابی لہجے میں جھاڑا کرتے تھے۔ کسی کا نام شاہ محمد ہوا تو اسے جھٹ کہہ دیا "او شاہ محمدیا"

"ممنا" اور عبدالحمید کو "حمیدا" اسی طرح ایک دفعہ انھوں نے حامد علی خاں کو سبق شروع کرنے کے لیے یوں مخاطب کیا۔ "جمیل بھئی حامدا" حامد علی خاں کی عزت نفس نے یہ گوارا نہ کیا۔ چنانچہ ایک دوست کو ملا کر پلاٹ تیار کیا۔ کہ وہ انہیں ڈاکٹر وولنر کے سامنے اسی طرح حامدا کہہ کر پکارے۔ تاکہ یہ اس پر چڑ کر ڈاکٹر وولنر کو "حامدا" کہنے سے روک سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ ڈاکٹر وولنر نے دونوں کو جھگڑتے دیکھ کر اپنے پاس بلایا اور حامد علی خاں سے کہا "کیوں صاحب "حامدا" کہنے میں کیا برائی ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ دوستی اور بے تکلفی کی نشانی ہے۔ میں نے کونسل میں ممبروں کو دیکھا ہے کہ وہ میاں محمد شفیع کو شفیع شفیع کہتے ہیں اور وہ برا نہیں مانتے۔" مگر جب ڈاکٹر وولنر کو شفیع کے صحیح ہونے اور "شفیعا" میں خرابی واقع ہونے کا فرق معلوم ہو گیا۔ تو انھوں نے حامد علی خاں کو پورا نام لے کر پکارنا شروع کر دیا۔ جب موج میں آتے یا کبھی مذاق کی سوجھتی تو کہہ دیتے "بھئی طرح پچھاں دی ولادی لانے"۔

تحریک عدم تعاون کے زمانے میں حامد علی خاں نے نیشنل یونیورسٹی لاہور سے فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے پاس کیا اور اپنے مضامین اقتصادیات، تاریخ، سیاست، اردو وغیرہ میں یونیورسٹی میں اول آئے۔ اس یونیورسٹی کا انتظام تعلیم امریکن یونیورسٹیوں کی طرز کا تھا۔ گاندھی جی نے حامد علی خاں اور دوسرے کامیاب طلبہ کو اپنے ہاتھ سے سندیں عطا کیں اور جلسہ تقسیم اسناد کے بعد الگ سے جا کر باتیں بھی کیں۔

۱۹۲۲ء میں حامد علی خاں اسی یونیورسٹی میں اکنامکس (اقتصادیات) اور اردو کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ یہ یونیورسٹی بریڈلا ہال لاہور کے متصل واقع تھی۔ اور بریڈلا ہال کانگرس کا ہال تھا۔ جو اس وقت کانگرسیوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ملک کے تمام بڑے بڑے قومی رہنما وقتاً فوقتاً یہاں آتے تھے اور حامد علی خاں کو ان کے خیالات سننے کا اکثر موقع ملتا رہتا تھا۔ طبیعت میں انگریز دشمنی اور آزادی کی تڑپ شروع ہی سے موجود تھی۔ گویا ابتدائے عشق میں ہی لگ گئے تھے۔ مسٹر گاندھی، سی۔ آر۔ داس، لالہ لاجپت رائے، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت مدن موہن مالویہ، مسز سروجنی نائیڈو اور دیگر محب وطن اور آزادی پسند رہنماؤں کی تقریروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور آپ شعلہ جوالہ بلکہ آتش کا پرکالہ بن گئے۔ اگرچہ آپ عام شوریدہ سر نوجوانوں کی طرح اپنے جوش و خروش کا اظہار صاف صاف الفاظ میں نہ کرتے تھے۔ بلکہ اسے پوری قوت سے اپنے سینے میں چھپائے اور دبائے رکھتے تھے۔ پھر بھی کبھی کبھی یہ لاوا پھوٹ پڑتا اور طوفان برپا کر دیتا تھا۔ چنانچہ دو تین موقعوں پر ضبط کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

طالب علمی کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے۔ کہ مولانا ظفر علی خاں کسی سفر سے واپس کرم آباد پہنچے۔ "ستارۂ صبح" ان دنوں کرم آباد سے شائع ہوتا تھا۔ اور علامہ عبداللہ عمادی اس کی ادارت کے فرائض انجام دینے کے لیے وہیں رہتے تھے۔ مولانا نے علامہ عمادی سے اپنے سفر کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا "کہ بعض انگریز بڑے مہذب اور شریف النفس ہوتے ہیں۔ ان کا برتاؤ دیسی شرفا کے ساتھ ایسا اچھا ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ اس کی تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔" بات یہ تھی کہ ریل گاڑی میں مولانا کے ہم سفر انگریز ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ تھے۔ رات کے وقت گاڑی وزیر آباد اسٹیشن پر پہنچی۔ دونوں نے کچھ دیر آرام کرنے کے لیے ویٹنگ روم کا رخ کیا۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ وہاں صرف ایک ہی کوچ ہے۔ اس پر اس انگریز نے مولانا سے نہایت نرم لہجے میں کہا "افسوس یہاں صرف ایک ہی آدمی کی گنجائش ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہاں دوسرا کوچ بھی ہوتا"۔

مولانا کو اس کا یہ انداز جو حقیقت میں نہایت مہذب احتجاج تھا، اتنا پسند آیا کہ آپ نے اس کا ذکر اپنے اخبار "ستارۂ صبح" میں کرنا چاہا۔ حامد علی خاں اس وقت وہاں موجود تھے۔ ان سے رہا نہ گیا۔ فوراً بول اٹھے کہ یہ معمولی بات ہے۔ ہم کیوں اپنے وطن کے دشمنوں کی قصیدہ خوانی کریں۔ مولانا ظفر علی خاں مسکرائے اور کہنے لگے "یہ حامد صاحب تو بڑے انتہا پسند ہیں"۔ اس کے بعد انھوں نے اخبار میں اس واقعہ کا ذکر نہ کیا۔

نیشنل کالج میں حامد علی خاں نے اردو انجمن قائم کی اور وقتاً فوقتاً اس کے اہتمام میں مشاعرے بھی کرائے۔ ہندو نوجوانوں میں اردو کا شوق پیدا کرنے کے لیے کئی دفعہ ان کو خود غزلیں لکھ کر دیں اور پھر مشاعروں میں ان کی زبانی شعر کہلوا کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ایک مشاعرے کے صدر مولانا

عبدالمجید خاں سالک تھے۔ انہوں نے ہندو نوجوانوں کی غزلوں میں حامد علی خاں کا رنگ پہچان کر اور حامد علی خاں کو داد میں شریک دیکھ کر مشاعرے کے اختتام پر کہہ ہی دیا کہ "حامد صاحب! آج تو آپ نے اپنے کلام پر خوب داد دی"۔

یہ اسی قسم کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ نیشنل کالج کے پچانوے فی صدی طلبا اردو پڑھتے اور باقی پانچ فی صدی ہندی اور سنسکرت کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ تحریک خلافت کے عروج کا زمانہ تھا۔ حامد علی خاں بڑے جذبے کے ساتھ نیشنل کالج میں گئے تھے۔ مگر وہ ہندو نوجوانوں میں اپنے آپ کو بالکل اجنبی پاتے تھے۔ پھر بھی ان کا دل وطن کی آزادی کے جوش میں یہ اجنبیت گوارا کر لینے کو تیار تھا۔ مگر ادھر ترکی میں مصطفےٰ کمال پاشا کو کامیابی حاصل ہوئی ادھر ہندو نوجوانوں کی آنکھیں بدلیں اور انہوں نے خفیہ خفیہ سازشیں شروع کیں۔ ورزشی اکھاڑے قائم کئے اور اردو چھوڑ ہندی پڑھنی شروع کر دی۔

حامد علی خاں اپنے ہندو دوستوں کو باہم سرگوشیاں کرتے دیکھتے اور جب ان کے قریب جاتے تو وہ چپ سادھ لیتے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ آخر یہ تبدیلی کیوں ہے۔ کرشن گوپال دت ان کے نہایت مخلص دوست تھے۔ انہوں نے ایک دن ان سے اس کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے پہلے تو بتانے سے انکار کیا۔ پھر کہا "ان لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے۔ مسلمانوں کو یہاں رہنا ہے۔ تو ہندو ہو کر رہیں۔ ورنہ افغانستان چلے جائیں"۔ اس واقعے نے حامد علی خاں کی آنکھیں کھول دیں۔ یہ دراصل سیاسی جنگ کی ابتدا تھی۔ ہندوؤں کی اسی تنگ نظری اور تعصب نے آہستہ آہستہ مسلمانوں کو دو قوموں کا نظریہ اور پاکستان کا مطالبہ پیش کرنے پر مجبور کیا۔

رسالہ ہمایوں سے مولانا تاجور نجیب آبادی کے علیحدہ ہو جانے کے بعد دسمبر ۱۹۲۲ء میں حامد علی خاں اس کے جائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اور وہ ایک چھوٹے چھوٹے وقفوں کے سوا کم و بیش دس بارہ سال اس سے وابستہ رہے۔ آپ نے مضامین کے انتخاب اور زبان کی درستی میں اتنی کاوش اور محنت کی کہ ہمایوں جلد ہی ہندوستان کے دو چار بہترین پرچوں میں شمار ہونے لگا اور واقعہ یہ ہے کہ ہمایوں آپ کی توجہ اور محنت سے جس بلندی تک پہنچا ہمایوں کا کوئی دوسرا مدیر اسے وہاں تک نہ لے جا سکا۔

ہمایوں کی ادارت کا طویل زمانہ آپ نے نہایت محنت و تندہی اور امانت و دیانت سے گزارا۔ جو کتب وغیرہ تبصرہ کے لئے آتیں یا جو اخبار اور رسالے آپ اس سلسلے میں انتخابات و اقتباسات کی خاطر دفتر سے اپنے گھر لے جاتے۔ آج کل کی روش کے خلاف مطالعے کے بعد ان کو نہایت احتیاط سے واپس لے جا کر دفتر میں رکھ دیتے۔ اخبار و رسائل کے اس ڈھیر میں سے آپ نے کبھی کاغذ کا ایک پرزہ بھی اپنے پاس نہیں رکھا۔

حامد علی خاں نے اپنے زمانۂ ادارت میں نہایت سختی اور استقلال کے ساتھ اس امر کا لحاظ و خیال رکھا کہ ہمایوں ہر ماہ کی مقررہ تاریخ پر باقاعدہ شائع ہو جایا کرے۔ یہ پابندی رسالے کا ایک امتیازی وصف بن گئی اور اس کا اظہار بھی بارہا ہوتا رہا۔ مگر آپ کے بعد آنے والوں نے ہمایوں کا یہ امتیاز خاک میں ملا دیا۔

۱۹۲۸ء میں ہمایوں کی ادارت چھوڑ کر حامد علی خاں نے پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۲۹ء میں دوبارہ بی اے کی سند لی۔ اور پھر ۱۹۳۰ء میں لا کالج لاہور میں داخلہ لے کر قانون کی تیاری شروع کی۔ مگر وہ درمیان ہی میں چھوڑ دی۔

لا کالج کی طالب علمی کے دنوں میں بھگت سنگھ اور دت جیسے پرجوش نوجوانوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا اور ان کی لاشیں چوری چھپے فیروز پور کے قریب دریائے ستلج میں بہا دی گئیں۔ لاہور میں ان کے ماتمی جلوس نکلے۔ جب ایک ایسا ہی جلوس لا کالج کے سامنے سے گزرا۔ تو آپ نے دیکھا کہ نوجوانوں کی آنکھیں پرنم ہیں۔ وہ بے حال و محزوں غم کی مجسم تصویر بنے۔ سر جھکائے ایک ماتمی جلوس کی صورت میں جا رہے ہیں۔ اور پوری فضا پر سوگ طاری ہے۔ بھگت سنگھ نیشنل کالج میں ان کا شاگرد رہ چکا تھا جس پر کہا تھا۔ دبی ہوئی یادوں کو آگ لگ گئی۔ ایک شعلہ دل میں بھڑکا اور آپ نے آگے بڑھ کر بے اختیار "بھگت سنگھ زندہ باد" کے تین نعرے لگائے جن سے جلوس میں جوش اور حرارت کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ جلوس ان کی آواز پر زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس کے بعد آپ نے پلٹ کر دیکھا تو پیچھے دوسرے طلبا اور اساتذہ کے ساتھ لا کالج کے

پرنسپل مسٹر سی ایل اند کلارک آپ کی اس حرکت پر شکر گزار رہے تھے۔

۱۹۳۳ء میں حامد علی خاں نے مولانا تاجور نجیب آبادی کی خواہش اور مشورے کے مطابق لاہور میں اردو سبھا کی بنیاد ڈالی جس کے مستقل صدر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی اور نائب صدر ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر، پروفیسر تیاری، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور خواجہ دل محمد تھے۔ اس سبھا کے جلسے ڈاکٹر بھٹناگر کے زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی کی کیمسٹری لیبارٹری میں ہوا کرتے تھے۔ وہ اردو کے دلدادہ اور شیدا تھے۔ اس لئے سبھا کی کارروائیوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ علامہ کیفی نے اس سبھا میں بہت سے دلچسپ اور مفید مقالے پڑھے جن میں سے "نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ"، "تذکیر و تانیث" اور "اردو کی موجودہ ضروریات" وغیرہ بعد میں رسالہ اردو اور ہمایوں میں بھی چھپے اور کیفی صاحب کی کتاب منشورات کی زینت بھی بنے۔ شاید دو سال بعد اردو سبھا بشیر احمد کی "انجمن اردو" میں مدغم کر دی گئی۔

کچھ مدت بعد حامد علی خاں ایم۔ اے عربی کی تحصیل کے لئے اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ مگر دوسرے سال کے آخر میں آپ کے دوست ن۔ م راشد نے آپ کو بطور مشیر ادبی آل انڈیا ریڈیو دہلی میں کام کرنے کی دعوت دی۔ اور آپ قیام دہلی کے شوق میں کالج چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔

جن دنوں آپ اورینٹل کالج لاہور کے وولنر ہوسٹل میں مقیم تھے تو انڈین نیشنل کانگرس کی طرف سے یوم آزادی منایا جانے لگا۔ ہندو طالب علموں نے اس موقع پر کانگرس کا جھنڈا لہرانے کی تیاری کی۔ انہوں نے حامد علی خاں کو اس تقریب میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ مگر آپ نے کہا کہ چونکہ کانگرس مسلمانوں کی قومی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتی اس لئے میں اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہندو نوجوانوں نے کانگرس کا جھنڈا نصب کیا۔ اور مسلمان طلبہ نے مسلم لیگ کا جھنڈا لہرا دیا۔ چونکہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں حکومت کے خلاف تھیں۔ اس لئے کالج کے ارباب حل و عقد ڈرے اور انہوں نے اپنی عافیت اسی میں دیکھی کہ یونین جیک بھی لہرا دیا جائے۔ یونین جیک دیکھ کر ہندو طلبہ سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اسے کسی طرح اتروا دیا جائے۔ حامد علی خاں کو جب انگریزی جھنڈا نصب کئے جانے کا حال معلوم ہوا۔ تو ان کی قومی غیرت ایک دم جوش میں آگئی۔ اور آپ نے کانگرس پارٹی کے نوجوانوں سے کہا کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اس کے بعد آپ نے ان کی قیادت ہاتھ میں لے کر بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ کے سامنے نہایت تیکھے الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا اور نوجوانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ کہ بورڈنگ میں ہندو طالب علم رہتے ہیں۔ اس لئے کانگرس کا جھنڈا لہرانا سمجھ میں آ سکتا ہے۔ یہاں مسلمان طالب علم بھی مقیم ہیں۔ اس لئے مسلم لیگ کا جھنڈا بھی لہرایا جائے تو مقام تعجب نہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ اس بورڈنگ ہاؤس میں انگریز کون ہے جس کی نمائندگی یونین جیک کر رہا ہے؟ اس احتجاج کے کچھ دیر بعد بورڈنگ ہاؤس اور کالج کے منتظمین کو یونین جیک اتارنا پڑا ———

اسی روز پچھلے پہر میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں نے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے اعزاز میں دعوت چائے دی۔ جس میں اورینٹل کالج کے پرنسپل مولوی محمد شفیع اور حامد علی خاں دونوں شریک تھے۔ مولوی عبدالحق نے از راہ تفنن پرنسپل محمد شفیع سے پوچھا۔ آپ کے کالج میں تو قومی جھنڈا لہرانے پر کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی؟ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ بڑے پیر کا جھنڈا لہرا دیتے۔ حامد علی خاں فوراً بول اٹھے کہ یہاں تو بڑے پیر کا جھنڈا لہرا دیا گیا تھا۔ مولوی صاحب نے پوچھا وہ کیا؟ کہا۔ یونین جیک۔ اس پر بہت قہقہہ پڑا۔

جب حامد علی خاں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں تھے۔ تو ان سے وہاں کے افسروں نے ریڈیو پر نشر کرنے کے لئے اردو کے قدیم و جدید مستند شعراء کے کلام کا انتخاب کرایا۔ اور تمام دواوین اور مستند تحقیقی سرمایہ جو بڑی کاوش سے جمع کیا گیا تھا، ایک الماری میں بند کر کے ان کی تحویل میں دے دیا۔ حامد علی خاں نے منتخب کلام کی دو نقلیں کرائیں۔ ایک نقل تو عرصے تک ان کے پاس محفوظ رہی۔ اور دوسری بوقت ضرورت استعمال ہوتی رہی۔

جب برعظیم پاکستان و ہند میں ۱۹۴۷ء کی قیامت برپا ہوئی اور دہلی میں بھی قتل و غارت اور لوٹ مار کی آندھی تیزی سے چلنے لگی تو حامد علی خاں نے فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ہو آگ کی اس دہکتی ہوئی بھٹی سے نکل کر لاہور پہنچنا چاہئے۔ مگر شہر میں کسی محفوظ مقام تک جانا بھی دوبھر تھا۔ گلیوں اور کوچوں میں خون بہہ رہا

گلیوں میں جاری ہی تھی کہ کسی مسلمان کی مجال نہ تھی کہ ایسے خطرناک موقع پر گھر سے نکلتا اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا۔ ہر شخص اپنی جان بچانے اور سر چھپانے کی فکر میں تھا ایسی پُرآشوب ساعت میں آپ تن تنہا جان ہتھیلی پر رکھ کر ترکمان دروازہ سے نکلے اور ریڈیو اسٹیشن نئی دہلی پہنچ گئے۔ تاکہ دفتر کی امانتیں ذمہ داروں کے سپرد کر کے رسید حاصل کریں۔ آپ نے تمام کتابوں کی فہرست تیار کرائی اور کتابیں و تحریریں ان کے حوالہ کر کے رسید لی۔ پھر منتخب اشعار کا مجموعہ ڈائرکٹر کے سامنے پیش کر کے کہا کہ چونکہ اب میرا دہلی میں رہنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔

ڈائرکٹر نے ایک نظر مجموعہ اشعار پر ڈالی۔ پھر ان کی طرف دیکھا اور کہا: "حامد علی خان! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تمہاری جان اس امانت سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم یہاں کیسے پہنچے اور اب کس طرح گھر واپس جاؤ گے جب کہ بسوں کی آمدورفت بند ہو چکی ہے۔ کوئی دوسری سواری بھی نہیں جتی اور اکیلے سڑک پر پیدل چلنا خطرے سے خالی نہیں۔"

حامد علی خان ریڈیو اسٹیشن سے نکلے تو واقعی پریشان تھے۔ کہ اب کس طرح گھر پہنچیں گے۔ نہ کوئی تانگہ نظر آتا تھا۔ نہ بس۔ تھوڑی دور آگے بڑھے تو ایک ہندو جاٹ جو شکل صورت سے خطرناک معلوم ہوتا تھا آپ کے دل میں بجلی کی تیزی کے ساتھ ایک خیال آیا اور آپ جھٹ اس کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو آپ نے مسکرانا شروع کر دیا۔ حامد علی خان کے نہ ڈاڑھی تھی نہ ترکی پاجامہ۔ کوٹ اور ہیٹ میں ملبوس انسان کو کون مسلمان سمجھتا۔ اس ہندو نے جب ان کو بلاجھجک اپنے قریب آ کر مسکراتے دیکھا تو فطری طور پر ہندو اور اپنا ہم خیال ہی سمجھا اور کہا "کام تو خوب ہو رہا تھا مگر اس بڈھے (گاندھی) نے خراب کر دیا۔" حامد علی خان نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "یہ بڈھا ہر جگہ ہمارا کام خراب ہی کرتا ہے۔" اس پر اس ہندو نے دانت پیستے ہوئے کہا "یہ اپنے جھانسے سے نہیں ٹلتا۔ ہم سے کہتا ہے کہ ہاتھ روکو۔"

اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک تانگہ آنکلا جس میں تین چار ہندو پہلے سے سوار تھے۔ یہ بھی اس میں لد گئے اور بچتے بچاتے کسی طرح گھر آ گئے اور ۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کی صبح کو بذریعہ ہوائی جہاز ماڈل ٹاؤن لاہور میں پہنچ گئے۔

دہلی سے لاہور آنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں فردوس و روزنامہ امروز لاہور کے عملہ ادارت میں کام کیا۔ مگر فضا راس نہ آئی۔ سارا وقت اختلافی جھگڑے میں گزرا۔ البتہ عملی صحافت و سیاست کا خوب تجربہ حاصل ہوا۔

اس کے بعد مخزن کی ادارت سنبھالی جس کی طباعت و اشاعت کا انتظام ادارۂ فروغِ اردو کے ذمہ تھا۔ اس کے بند ہو جانے کے بعد اب [illegible] ماہنامہ الحمراء نکالتے ہیں جو سنجیدہ، متین، مہذب اور شستہ لٹریچر کا بہترین نمونہ ہے۔

حامد علی خاں ایک نرم گو، نرم گفتار اور نرم رو انسان ہیں۔ نثر اور نظم دونوں میں نام کر چکے ہیں۔ بہت متواضع، ملنسار اور خوش اخلاق ہیں۔ عزلت پسند اور گوشہ گیر ہیں۔ خلوت ہی کو انجمن سمجھتے ہیں۔ بالکل الگ تھلگ زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔ تنہا نشینی میں خاص لذت محسوس کرتے ہیں۔ ادبی مجالس میں بھی شاذ و نادر ہی شریک ہوتے ہیں۔ صوبائی تعصب سے بالا ہیں۔ ذات پات کی تمیز کو اچھا خیال نہیں کرتے۔ ٹھیٹھ پنجابی ہونے کے باوجود پنجابی کہلانے کی بجائے پاکستانی کہلانا چاہتے ہیں۔ مولانا، مولوی اور اس قسم کے شخصی امتیازات اور خطابات سے سخت نفرت ہے۔ نام و نمود بھی پسند نہیں کرتے۔ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی انہوں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ یہاں تک کہ دیباچہ نگاری کو بھی شہرت کا ایک ذریعہ سمجھ کر اس سے کتراتے ہیں۔ مگر ایک دفعہ ڈاکٹر محمد باقر نے ان کا یہ غرور خاک میں ملا دیا۔

بات یہ ہوئی کہ ڈاکٹر باقر اپنی ایک کتاب کا دیباچہ ان سے لکھوانا چاہتے تھے۔ مگر آپ کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ یہ ان کے اصول کے خلاف تھا۔ کتاب کا نام [illegible] اور دوسرے افسانے تھا۔ بالآخر جب اس وقت تک کتاب کا مسودہ زبردستی چھوڑ کر چلے گئے کہ پھر کسی وقت آ کر لے جاؤں گا۔ مگر اس کے کچھ عرصہ بعد ہی پی ایچ ڈی کرنے کے لئے ولایت روانہ ہو گئے۔ اور حامد علی خاں نے انہیں ان کا مسودہ واپس یا دیباچہ لکھنے کی [illegible]۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد آپ [illegible] کے پاس کتاب [illegible] اور دوسرے افسانے دیکھ کر حیرت ہوئی

کہ اس کے شروع میں حامد علی خاں کے نام سے مقدمہ موجود تھا۔ جس کی زبان بھی ناقص تھی اور انداز بھی اچھا نہ تھا۔ حامد علی خاں اس وقت تو اس ستم ظریفی پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر خاموش رہے۔ اس خیال سے کہ ع

نالہ کرتا ہوں تو اندیشۂ رسوائی ہے

لیکن جب ڈاکٹر باقر صاحب ولایت سے واپس آگئے۔ تو ان سے شکایت کی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آج کمپنی سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ ہم نے دو تین مرتبہ اپنا آدمی حامد صاحب کے پاس مقدمہ لکھوانے کے لئے بھیجا۔ مگر وہ نہ ملے۔ اس پر ہم نے دیباچہ کہیں اور سے لکھوا کر ان کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس جواب سے جو عذر گناہ بدتر از گناہ تھا۔ آپ کو تسلی تو نہ ہوئی۔ مگر آپ مروت کی وجہ سے خاموش ہی رہ گئے۔

آپ خودداری سے بھی زیادہ ایمانداری کے قائل ہیں۔ صداقت۔ راست بازی اور جرأت کا یہ عالم ہے کہ سچی بات منہ پر کہہ دینے سے کبھی نہیں جھجکتے اور اس کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ اس سے کوئی خوش ہوتا ہے یا ناخوش۔ امروز کی ادارت کے زمانے میں سعادت حسن منٹو کا ایک افسانہ اشاعت کے لئے آیا۔ آپ نے دیکھ کر واپس کر دیا کہ شائع نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ یہ مملکت پاکستان کے خلاف ہے۔ اس سے پاکستان کی توہین کا پہلو نکلتا ہے کیونکہ اس مضمون کے مختلف حصوں میں مختلف بیہودگیوں کی طرف اشارہ کر کے بار بار پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا گیا ہے۔ منٹو کی درخواست پر مولانا چراغ حسن حسرت کی رائے پر فیصلہ ٹھہرا۔ انھوں نے فرمایا کہ مضمون تو اچھا ہے۔ مگر فی الحال اسے شائع نہ کیا جائے۔

اس کے چند روز بعد جب حسرت۔ منٹو اور پطرس بخاری کسی مجلس میں جمع ہوئے تو حسرت نے منٹو کی دل دہی کے لئے رسمی صورت بنا کر کہا کہ آپ کا افسانہ تو بہت اچھا تھا۔ مگر حامد علی خاں نے اسے شائع نہیں ہونے دیا۔ بخاری نے کہا یہ عجیب بات ہے کہ چیف ایڈیٹر آپ ہوں۔ آپ کوئی مضمون شائع کرنا چاہیں اور وہ شائع نہ ہو سکے۔ حسرت نے کہا ان صاحب! مگر وہ بھی تو آخر ذمہ دار آدمی ہیں۔ انھوں نے میرے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ منٹو نے خود یہ واقعہ حامد علی خاں کو سنایا۔ حامد علی خاں نے حقیقت حال بیان کرنا چاہی تو منٹو نے کہا کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہی درست ہے۔ حسرت صاحب کی بات درست نہیں۔ البتہ ان کے حق میں ایک بات جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس وقت وہ نشے میں تھے۔

اس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جب حامد علی خاں نے امروز کے لئے خود منٹو سے مضمون مانگا۔ اس نے مضمون لکھنے سے تو انکار نہ کیا۔ مگر کہا: "حامد صاحب! آپ متانت پسند ہیں میرا مضمون برداشت نہیں کر سکیں گے۔" اس واقعہ سے حامد علی خاں کی سیرت کے کئی پہلو روشنی میں آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو کام آپ کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اسے پوری ذمہ داری۔ فرض شناسی اور محنت سے نباہتے ہیں۔ دوسرے پاکستان کی نظریۂ مملکت کے خلاف کوئی ایسی بات سننا گوارا نہیں کرتے جس سے اس کا مذاق اڑانا مقصود ہو یا جس سے اس کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ آپ کی سلامت روی اور اصابت رائے کا دوست دشمن سب کو اعتراف ہے۔

آپ اس قدر ترقی پسند بھی ہیں کہ روس۔ جرمنی۔ اٹلی۔ چین۔ امریکہ۔ فرانس اور دوسرے ملکوں کے بڑے بڑے آدمیوں اور قوموں کا ذکر اپنے بچوں میں ہمیشہ چھیڑتے رہتے ہیں۔ تاکہ معلومات عامہ ترقی کرے اور لوگوں کو اچھی باتیں اختیار کرنے کا موقع ملے۔ مگر اس خیال سے انھیں سخت وحشت ہوتی ہے کہ غلامانہ ذہنیت کے ساتھ اندھا دھند دوسرے ملکوں کے اصول اور طریقے اپنے ملک پر مسلط کر لئے جائیں۔

حامد علی خاں نثر بھی خوب لکھتے ہیں اور نظم بھی۔ غزل بھی نہایت عمدہ کہتے ہیں۔ اور نظم بھی۔ ان کا کلام پاکیزہ خیالات۔ رنگینی و بلند تخیل اور دلپذیر انداز بیان کا حامل ہوتا ہے۔ دل میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ آپ نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اردو کی بے لوث خدمت اور ادب و شعر کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ طمع اور ریا ان میں نام کو بھی نہیں۔ اپنی حالت پر قانع اور شاکر ہیں۔ سازش۔ جوڑ توڑ۔ دھڑے بندی۔ ہنگامہ آرائی اور پارٹی بازی کی لعنت میں کبھی گرفتار نہیں ہوئے۔ فرقہ وارانہ تعصب سے بھی ان کا دامن پاک ہے۔ مختلف فرقوں کے آپس کے جھگڑوں میں کبھی دخل نہیں دیتے۔ دشمنی کے متعلق جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ محبت یا نفرت کرنا نہیں جانتے۔ وہ محبت کا جواب محبت سے دیتے

اور نفرت کرنے والوں سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ مگر اس میں ذاتی غرض مندی کو دخل نہیں ہوتا۔

صادق علی خاں کی کوئی مستقل اور باقاعدہ تصنیف ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ رسالہ ہمایوں، نقوش اور الحمرا کی جلدیں کسی ایسی تصنیف و تالیف سے کم قیمتی نہیں۔ عرصہ ہوا منصور احمد مرحوم مدیر ادبی دنیا لاہور نے آپ کے سو شعروں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ مرتب کیا تھا جس کے شروع میں آپ کی شاعری پر بھی مختصر سا تبصرہ کیا گیا ہے۔

افسانۂ عشق آپ کی دوسری تالیف ہے۔ اس میں جمال محبت کے ساتھ نہایت دلکش اور پاکیزہ رومانی افسانوں کے تراجم جمع کیے گئے ہیں۔ ان کی زبان اتنی صاف اور شستہ ہے کہ بالکل طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔ الفاظ میں اتنا سوز اور ترنم ہے کہ بقول مدیر ساقی دہلی "ہم کیا انگریزی بھی اردو کا مزہ دینے لگ جاتی ہے"۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا چراغ حسن حسرت نے زمیندار میں لکھا تھا کہ "بعض مقامات پر بے اختیار اعتراف کرنے کو جی چاہتا ہے"۔

غزل کے مندرجہ ذیل چند شعروں میں ان کی رنگینیٔ شاعری کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے ۔

محبت زیست اک ایجاد ہے تیری محبت کی ۔ کہ خود بنیاد ہوں بنیاد ہے تیری محبت کی
یہ درد و سوز یہ کرب و الم حسرت و ماتم ۔ مری وارفتگی فریاد ہے تیری محبت کی
ہوئی قسمت کی گم گشتہ دنیا مرے دل کی ۔ مگر جنت ابھی آباد ہے تیری محبت کی
کوئی جھونکا ہی تیری زلف و خط و کاکل کی زنجیریں ۔ وہ رنگینی ابھی بنیاد ہے تیری محبت کی
وہی غم ہے وہی دل ہے وہی ہے وحشتِ دل کی ۔ وہی بیداد بیجا ہے تیری محبت کی

پھر یہ شعر دیکھیے ۔

عمر دو روزہ حسرت و حرماں میں کٹ گئی ۔ مجھ سے تری جفا کا گلہ بھی نہ ہو سکا
بیگانۂ دو جہان سے جو ہو کے رہ گئے ۔ وہ دل ہزار حیف تمہارا بھی نہ ہو سکا

بقول منصور احمد صادق کی شاعری کی ایک دلکش خصوصیت وہ ایمائی الفاظ ہیں جن کے استعمال سے وہ شعر میں پوری کہانی کہہ جاتے ہیں۔ جب وہ کوئی تصویر کھینچتے ہیں تو اپنے قلم کے ایک مختصر سے مس سے اس کے لئے ایک ایسا دھندلا سا پس منظر تخلیق کرتے ہیں کہ ہماری چشم تصور اسی تصویر سے گرد و پیش میں بھٹک جاتی ہے ۔ اور دیر تک اس نامعلوم اور حسین سرزمین کی سیر کرتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے ۔

گلزار کے سایوں میں وہی حشر بپا ہے
پھولوں سے ابھی تک تری خوشبو نہیں جاتی

"وہی" اور "ابھی تک" وہ الفاظ ہیں جو اس شعر میں کوئی افسانہ کہہ رہے ہیں۔ وہ کیا حشر تھا جو گلزار کے سایوں میں بپا ہوا۔ اور کیوں پھولوں سے ابھی تک اس کی خوشبو نہیں جاتی۔ صرف وجدان ہی ان سوالات کی پہنائی کو پا سکتا ہے۔

ایک اور شعر دیکھیے ۔

آنکھیں تری آنکھوں سے ملائی نہیں جاتیں
سر اب ترے قدموں سے اٹھایا نہیں جاتا

"اب" نے ایک پراسرار فضا پیدا کر دی ہے۔ کیوں اب آنکھوں سے آنکھیں نہیں ملائی جاتیں۔ کیوں اب سر قدموں سے نہیں اٹھتا۔ ذرا سوچئے تو دل میں تصورات کی ایک دنیا بس جاتی ہے۔

ان اوائل شعروں کے ساتھ ساتھ بعض جگہ الفاظ کی موسیقی بھی ایسی ہے کہ شعر پڑھتے ہی وہ سماں زندہ ہو جاتا ہے اور انسان تصور کی آنکھوں اور کانوں سے وہ سب کچھ دیکھ اور سن لیتا ہے جو شاعر نے دیکھا اور سنا۔ ذیل کے دو شعروں میں خزاں کی رخصت کا سماں اور باد خزاں سے پتوں کے گرنے کی آواز کس خوبی سے پیدا کی ہے ؎

خزاں رخصت ہوئی دیتی ہوئی عشق کا پیچ و فرق
چمن سر سے اطلاق تا پیچ گاتی ہے ہوا آئی
وہ ٹکٹی وہ کھڑاک کھڑکھڑا کر پتیاں جب گر گئیں
سپاہ گل قطار اندر قطار اندر صف آرا آئی

اور پھر ؎

اب جو بہار زندگی چپ چاپ سی ہے اڑ گئی
اٹھی صدائے درد جب کوئی گشت رہ گیا

پہلے مصرع میں ساحل دریا کی خاموشی کو تخیل تک پہنچا دیا ہے اور پھر دوسرے مصرع میں اس عظیم الشان سکوت کی ایک نہایت ہی مختصر لفظ سے توڑ کر اس تقابل کو ظاہر کیا ہے۔ جس کا اندازہ کبھی دریا ہی کے کنارے پر کھڑے ہو کر ہی ہو سکتا ہے۔

رئیس احمد جعفری

ارشد تھانوی

مولانا حالی بھی عنفوان شباب میں اپنی نئی نویلی دلہن کو اس کے خوشحال میکے میں چھوڑ کر پانی پت سے دلی بھاگ آئے تھے تاکہ اپنی تعلیم کی تکمیل کر سکیں اور میں ایک ایسے ۱۵ سالہ طالب علم کو جانتا ہوں جو اتنی سی عمر میں اسی علمی تشنگی کے تقاضے سے گھر چھوڑ کر چل دیا۔

یوپی کے ضلع سیتاپور میں ایک مردم خیز قصبہ خیرآباد ہے، وہاں کے مکتب میں ایک یتیم سید زادہ پڑھا کرتا تھا۔ معمولی نوشت و خواند اور ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس قصباتی مکتب میں بقدر ذوق اس کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ کسی بڑی درسگاہ کا طالب علم بننا چاہیے۔ ماں اور بڑے بھائی اس کمسنی میں اپنے سے علاحدہ کرنا اور کہیں دور بھیجنا نہ چاہتے تھے۔ لڑکے میں خواہش شدت سے پیدا ہوئی۔ ایک روز ماں نے کسی بات پر ذرا بیٹا ناخوش ہونے کا بہانہ ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ موقع پا کر گھر سے نکلا اور لکھنؤ پہنچ کر دم لیا۔ یہ بات راز ہے کہ یہ سفر جائز طریقہ پر طے کیا تھا یا ماں کی صندوقچی پر ہاتھ مارا تھا۔ اگر آخری شق کیا تو بھی یہ گناہ کسی طرح ثواب سے کم نہیں۔ بہرحال لکھنؤ پہنچ کر اپنی ذاتی کوشش سے دارالعلوم ندوہ میں داخلہ لیا۔ اور پڑھنے کا جو حق ہوتا ہے وہ پورا پورا ادا کیا۔ جتنی جتنی علمی مدارج میں ترقی کی اتنی ہی فکر و تدبر میں بھی صلاحیت پیدا کی۔ مگر درجۂ تکمیل تک پہنچتے پہنچتے کارکنان ندوہ کے خلاف سرکشی کی۔ انجمن اصلاح کے نام سے طالب علموں کی ایک انجمن بنائی تھی۔ اس کے سکریٹری کی حیثیت سے ہڑتال کرا دی اور جب معاملات رفع دفع ہو گئے تب بھی بغاوت کا جوش ٹھنڈا نہ پڑا۔ اور اس دارالعلوم میں رہنا گوارا نہ کیا۔ معتمد ندوہ اس زمانہ میں سید سلیمان تھے۔ وہ اس ہونہار طالب علم پر بہت شفقت کرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ اس کی تعلیم نامکمل رہے۔ اپنے خط کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین کے پاس دہلی بھیج دیا۔ بقیہ علمی مراحل جامعہ ملیہ میں طے ہو گئے۔ اس کے بعد ندوہ میں پہنچ کر بھی سند فضیلت حاصل کر لی۔ دینی و دنیوی تعلیم کا یہ پیکر اب مولوی رئیس احمد جعفری تھا۔ میری ان کی پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی جب یہ روزنامہ خلافت بمبئی کے چیف ایڈیٹر تھے۔ اور خلافت ہی کے نام سے ایک علمی و ادبی ماہنامہ بھی شائع کرتے تھے۔ ایک روز میں علمائے اسلام کا کوئی تذکرہ دیکھ رہا تھا۔ متعدد بزرگان کرام کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ صرف پڑھنا جانتے تھے، لکھنا انہیں نہ آتا تھا۔ ان کی تصانیف دوسروں کے قلم کی رہین منت ہیں۔ جو جعفری

کے شاگرد ہوتے تھے۔ اسی وقت ڈاک آئی۔ ایک لفافہ جو طرحدار تھا، یعنی تو شاندار پتہ پر نامۂ خلوص مرقوم تھا۔ انشا بہت خوب، عبارت بہت اچھی، مگر حروف بڑے بڑے اینٹھے اینٹھے ہوئے۔ میں عرصہ دراز تک کورٹ انسپکٹر رہا ہوں۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں بد خط لکھی ہوئی رپورٹیں اور روداد یں پڑھ چکا تھا۔ ندوی جعفری صاحب کا خط بلا تکلف پڑھ لیا اور سوچنے لگا کہ حضرت علوم مشرقی کے مستند عالم ہیں، البتہ ضرورت مغربی تعلیم بھی پائی ہے۔ ورنہ شاید بالکل طفلانہ لکھتے۔ اور قدیم علماء کی طرح علم کے ساتھ فن پر توجہ کو غیر ضروری سمجھتے۔ یہ اب سے ۴۰ برس پہلے کا ذکر ہے۔ اب تو یہ انداز نگارش اور بھی پختہ ہو گیا ہوگا۔ معلوم نہیں ان کی تصانیف کی کتابت کیونکر ہوتی ہے۔ کاتب لوگ ان کی لکھی پڑھ بھی لیتے ہیں یا نہیں، اگرچہ پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خط خشیانہ ہے۔ اور اگلے وقتوں کے انداز تحریر کا دلکش نمونہ دور حاضر کے ادیب و انشا پرداز اور صحافی اتنے بڑے بڑے دائرے نہیں کھینچتے۔

میں باالتزام خلافت دہلی کے لئے نظم و نثر لکھا کرتا تھا۔ اس لئے غائبانہ ہی غائبانہ رابطہ قائم ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد بھوپال کے ایک صاحب جامعہ ازہر میں اپنی تعلیم کی تکمیل کر کے واپس آئے۔ وہ جعفری صاحب کے دوست تھے، انہیں بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لائے۔ میں انہیں پہلی دفعہ دیکھ کر کچھ بھونچکا سا ہو گیا۔ دبیز جسم کے داڑھی لگائے نوجوان مولانا۔ اس پر طرہ یہ کہ بہت کم سخن اور سنجیدہ بیان۔ خلافت دہلی میں ایک بہت ہی دلچسپ افسانہ قسط وار ان کا شائع ہوا کرتا تھا۔ جس میں موجودہ معاشرت کے بعض نازک پہلو بڑی خوبی سے اجاگر کئے جاتے تھے میں سوچنے لگا کہ یہ ثقہ دین دار خشک قسم کا آدمی ایسی باریک بینی اور نکتہ سنجی کا اہل کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود نہیں لکھتے کسی سے لکھوا کر اپنے نام سے شائع کر دیتا ہے۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ دوران طالب علمی جبکہ ۱۵ سال کی عمر تھی ایک ماہنامہ 'اعجاز' ادارت کر چکے تھے، جو ان کے بڑے بھائی مولانا عتیق احمد نے بارہ بنکی سے نکالا تھا۔ اور جب جامعہ میں پڑھتے تھے تو مولانا محمد علی جوہر کی سوانح عمری لکھی تھی جو مکتبہ جامعہ نے چھاپی اور شائع کی۔ ان کے نانا مولوی سید نیاز احمد، یو پی پولیس سے پنشن لے کر بھوپال میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو گئے تھے۔ میں ان کی ماتحتی میں بھی رہ چکا تھا۔ اور چونکہ وہ میرے والد اور چچا کے دیرینہ دوست تھے۔ ان کا مستحق شفقت بھتیجا بھی رہا تھا۔ اس لئے بغیر دیکھے ان کے اس عزیز ترین نواسے کے حالات سن چکا تھا۔ بس دل کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ ع

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

اس کے دیکھے ہی کی رہی اتفاقی ملاقات کے کئی سال بعد

عاقل نے بلایا مجھے، میں بمبئی پہنچا

اپنی روانگی کی اطلاع جعفری صاحب کو بھی رسمی طور پر دے دی تھی۔ خیال تھا کہ جب ملیں گے تو اپنے بڑے نانا حضرت ریاض کے ممدوح کی ہو بہو تصویر ہوں گے۔ ع

اک صاحب ہیں عصا تھامے عمامہ باندھے

مگر مجھے۔۔۔ ہر دم ہو باسی دگر آں یار برآمد۔ ایک نوجوان ملنے آیا۔ دبلا پتلا۔ اکہرے جسم کا کلین شیو میں نے پہچانا نہیں۔ بڑے خلوص سے علیک سلیک کی۔ جب نام پتہ چلا تو یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ وہی جعفری ہیں جو ایک بھاری بھرکم مولانا کے پیکر میں بھوپال تشریف لے گئے تھے۔ گفتگو کی تو منہ سے پھول جھڑنے لگے۔ خوب گھل کے باتیں ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ اپنا ذاتی پریس قائم کر لیا ہے۔ اور ایک روزنامہ بھی کامیابی سے نکال رہے ہیں۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ قائد اعظم کی سوانح عمری لکھ رہے تھے یا لکھ چکے تھے۔ میں ان دنوں کٹر کانگرسی اور بھوپال اسٹیٹ پیپلز کانفرنس کی مجلس عاملہ کا سرگرم ممبر تھا۔ اس لئے سیاسی موضوع پر بحث چھڑ گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس سے پہلے متعدد لیگیوں کی کوشش کے باوجود میں کانگرس سے بد ظن نہ ہوا تھا۔ لیکن جعفری صاحب سے ایک گھنٹہ دو بدو کرنے کے بعد میں تہ دل سے مسلم لیگ کا حامی ہو گیا

کچھ عرصے کے بعد جب نواب بہادر یار جنگ صدر اسٹیٹس مسلم لیگ بھوپال آئے تو میں نہ صرف اسٹیٹ پیپلز کانفرنس سے مستعفی ہو چکا تھا۔ بلکہ اسٹیٹ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا رکن بنا دیا گیا تھا۔ میری وہ انقلابی نظمیں جو کانگریسی اخبارات چھاپا کرتے تھے ردی ہو چکی تھیں۔ اور نئی نظمیں کچھ اس قسم کی ہونے لگی تھیں ؎

ہندوانہ ذہنیت نے ودیا اسکیم کی　　سالکہ کھودی کانگرس کے شجرِ تعلیم کی
مدرسوں کو ودیا مندر بنایا جانے لگا　　مثلِ ضد میں بیرجان دین ابراہیم کی

وقت گزرتا رہا۔ لیگ طاقتور ہوتی گئی۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہو کر رہا۔ مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم ہو گئی۔ ۱۹۵۰ء کے آخر میں بھوپال کو میں نے بھی خیرباد کہا۔ لاہور آ کر کچھ دنوں بعد کراچی پہنچ گیا۔ مولانا رئیس احمد صاحب جعفری ندوی پہلے ہی پاکستان آچکے تھے کسی روزنامہ کی ادارت کر رہے تھے۔ مختلف موضوعات پر کتابیں لکھ رہے تھے۔ علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی، نفسیاتی، افسانوی، دینی موضوعات میں کوئی ایسا موضوع نہ تھا جس پر انہوں نے تصنیف و تالیف، ترجمہ، تلخیص کا حق ادا نہ کیا ہو۔ کراچی کی بے پایاں آبادی میں بھی انہیں ڈھونڈنے کی ضرورت نہ پڑی۔ ایک دن ارادہ کیا اور بہت آسانی سے انہیں پا لیا۔ اسی خلوص، اسی محبت، اسی شگفتگی سے ملے۔ اور ملتے رہے۔ میں بھی گیا۔ وہ بھی آئے۔ ہماری آمدورفت میں عجیب بات میں نے پائی۔ میرے ہاں وہ ناشتہ چھوڑ دیں گے۔ چائے پی لیں گے۔ اور اپنے یہاں ناشتہ ضرور کرائیں گے، چائے چاہے پیو یا نہ پیو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اتفاقی بات ہو۔ لیکن میرا متعدد بار کا تجربہ ہے۔ اور اس بات پر میری بیوی ان سے کچھ خفا بھی ہیں۔ بقول ان کے بھوپال کے تو سب کچھ کھا لیا۔ اب ازراہ اسی چیز سے پرہیز ہے۔ ایک مزے کی بات اور ہے۔ میں مدت سے ناول یا مختصر افسانے بالکل نہیں پڑھتا ؎

بھولی ریحانِ جوانی کی بہار آخر حیف　　صبح رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی

جعفری صاحب ازراہِ محبت مجھے اپنی ہر کتاب تحفتاً دیتے ہیں جو میرے ذوق کی ہوتی ہے۔ لیکن ایک ناول بھی عطا کر دیا۔ جو تازہ شاہکار نہیں بلکہ ۱۹۳۹ء کا چھپا ہوا تھا۔ میں نے دل میں سوچا ؎

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

میں نہ پڑھوں گا تو گھر والے اور بہت پڑھنے والے ہیں۔ ناول میز پر رکھ دیا۔ اگلے روز ریڈیو کے لئے ایک اسکرپٹ لکھنے بیٹھا۔ موڈ نہ بنا۔ ناول سامنے رکھا تھا ہی غیر ارادی طور پر اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ نامہ ورق شاکر ٹائٹل دیکھا۔ موٹے حروف میں نام لکھا تھا ـــ چاندنی۔ نیچے عبارت تھی ـــ جنت، جہنم، اور قیامت کی داستان ـــ دونوں عبارتوں کے درمیان 'قلمی دنیا' بھی لکھ دیا تھا۔ شبہ ہوا کہ شاید دوزخ، بہشت اور حشر نشر کو ملایا گیا ہے، اور یہ بیچارے فلم کمپنیاں جس طرح اپنی مذہبی روایات کو بیہودہ سین پیش کیا کرتی ہیں۔ ایسی ہی کوئی جسارت کہیں جعفری صاحب تو نہیں کر بیٹھے۔ مگر اس مرد مسلمان سے ایسی توقع نہیں۔ ورق الٹا۔ جعفری صاحب نے تحریر فرمایا تھا۔

> کاروبار پردہ کشی سے وابستہ رہ کر ڈیڑھ برس تک میں نے قلمی دنیا کا کھلا روپ دیکھا۔ جنت کا لطف، جہنم کا عذاب، قیامت کی نفسا نفسی سب کچھ اس جہانِ خراب آباد میں ہے۔ یہ ناول اسی دنیا کی ایک جھلک ہے۔

جی چاہا کہ اس نئی دنیا کی میں بھی سیر کروں، اور یہ بھی اندازہ کروں کہ دینی عالم جعفری نے اس دنیوی منظر کو کتنی گہری نظر سے دیکھا ہے۔ چنانچہ پڑھا اور خوب پڑھا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اجان گلمیں کے جس مفروضہ اسٹوڈیو مالک کی زبانی یہ فسانہ کہلوایا گیا ہے۔ یقیناً وہ خود جعفری صاحب کا ذہن۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ع

ماورا از دیں گیا و ضعیف ایں گماں نبود

ناممکن ہے کہ کسی سوسائٹی کو پورے طور پر اپنائے بغیر اس کی اس قدر صحیح عکاسی کی جاسکے کہ کوئی باریک سے باریک پردہ حائل نہ ہو۔ اور اس بحر بے پایاں میں گہرا غوطہ لگائے بغیر تہ کے موتی اور خزف ریزے نکالے جاسکیں۔ انجان صاحب ڈوب کر ابھرے بغیر اس قدر جانثار کیونکر ہوگئے

شناور بحر الفت میں کہیں ڈوبے کہیں نکلے

جعفری صاحب کا اس گندگی سے دامن بچا کر نکل آنا معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔ مگر یہ معجزوں کا زمانہ نہیں۔ اچھا ہوا کہ جعفری صاحب کراچی سے لاہور چلے گئے۔ ورنہ ممکن تھا کہیں یہ ستائش منہ در منہ کر بیٹھتا، اور وہ اس داد ایثار کو اپنی ذات پر ایک بیہودہ الزام سمجھ کر مجھ سے بلا وجہ دل میں آزردہ ہو جاتے۔ میں اس کو ان معنوں میں داد ایثار کہتا ہوں۔ انہوں نے اپنے کردار کی ایسی ہی قربانی دی ہے جیسی بعض مغربی ڈاکٹر بعض خطرناک امراض کی تحقیق و علاج کے لئے اپنے جسم اور بعض اوقات جان کی دیا کرتے ہیں۔ اور شدت مرض کی اذیت کا اندازہ لگانے کو اس مرض کے جراثیم اپنے خون میں داخل کر لیتے ہیں۔ اور ذاتی تجربہ کے بعد اس کی مدافعت کرکے مخلوق خدا کی تکالیف دور کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔ جعفری صاحب نے بھی ایک شدید ترین معاشرتی مرض کا تجربہ کرکے چاندنی کے نام سے نسخۂ شفا پیش کیا ہے۔ اور خود بھی اس مرض سے پاک صاف ہو کر ادبی و صحافتی فضا میں آگئے ہیں۔ جعفری صاحب میں ایک بڑی اچھی بات یہ ہے کہ وہ کبھی کسی سے خفا نہیں ہوتے اور دوستوں کو دشمن بنانا انہیں بالکل نہیں آتا۔ حالانکہ یہ بہت آسان بات ہے۔ اور عیب یہ ہے کہ حاسدوں کو جو دشمنوں ہی کی ایک بدترین قسم ہے دوست بنانے کی ناکام سعی سے باز نہیں آتے۔ اور "با دشمناں مدارا" کے اصول پر نقصان مایہ میں اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں۔

شبلی بی کام

قمر تسکین

میکسم گورکی نے اپنے "روزنامچے کے پریشان اوراق" میں ذکر کیا ہے کہ ایک روز وہ کسی پارک کے قریب سے گزر رہا تھا، اچانک اس کی نگاہیں ادھیڑ عمر کے ایک شخص پر پڑیں، جو ایک بنچ پر بیٹھا کبھی ہیٹ اوڑھ لیتا اور کبھی اُسے اُتار کر سورج کے سامنے کر دیتا تھا۔ گورکی نے قریب پہنچ کر دیکھا، تو وہ بیوقوف تھا۔ گورکی نے سوال کیا۔

"کیوں میاں بیوقوف! یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟"

بیوقوف نے منہ اٹھا کر بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یار یہ دھوپ قابو میں نہیں آتی۔ میں ہیٹ میں شعاعیں جمع کر کے جلدی سے اوڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن وہ نکل بھاگتی ہیں۔"

بیوقوف کو سمجھانا بے سود تھا۔ گورکی اُسے اپنے حال پر چھوڑ کر اپنی راہ لگ گیا۔

شبلی بی کام دھوپ پکڑنے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ لیکن میں اُسے ۱۹۳۲ء سے جانتا ہوں اور اگر میں اپنے علم میں اُن لوگوں کی معلومات بھی شامل کر دوں جو اُسے مجھ سے بھی پہلے سے جانتے ہیں تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ گزشتہ بیس برس سے طوفان میں مچھلیاں پکڑنے کی کوشش ضرور کر رہا ہے!

مجھے ایک قریبی دوست ہونے کی حیثیت سے اس کی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ جن دنوں وہ "عالمگیر" اور "خیام" کا ایڈیٹر تھا۔ اندرون شہر کے ایک تنگ و تاریک بازار میں رہتا تھا۔ وہ اس وقت مجرد تھا اور اس وقت بھی مجرد ہے۔ اس نے سات روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا چوبارہ کرایہ پر لے رکھا تھا جو صرف ایک کمرہ پر مشتمل تھا۔ اس کی سامنے کی دیوار میں کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ جس میں تین شیشے تھے جو بازار کی جانب کھلتے تھے۔ روشندانوں میں اور بازار سے گزرنے والی بجلی کے تاروں پر جنگلی کبوتروں کی ایک ڈار غٹرغوں غٹرغوں کیا کرتی۔ کمرے کے اندر تین الماریاں تھیں۔ ایک میں آئینہ، کنگھی، کریم اور سنگھار کا دوسرا سامان پڑا رہتا تھا۔ دوسری میں کتابیں اور رسالے بُری طرح ٹھنسے رہتے

تھے۔ جن پر برسوں کی مٹی کی تہیں جمع رہتی تھیں۔ مکڑیوں نے ان پر بھی جالے بنا رکھے تھے۔ اسی تیسری الماری کے اوپر ایک طاقچہ تھا جس میں بے شمار خطوط کا ڈھیر اوپر نیچے بے ترتیبی سے پڑے رہتے تھے۔ یہ خطوط راس کماری سے ہمالیہ تک کے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور ایڈیٹروں کے لکھے ہوتے تھے۔ ان میں ناموروں کے خطوط بھی ہوتے اور گمنام شخصیتوں کے بھی۔ بعض خطوط کے ہمراہ جواب کے لئے ٹکٹ بھی ہوتے اور جوابی لفافے بھی ——— لیکن شبلی بی کام کے لئے کسی خط کا جواب دینا ایسا ہی ہے جیسے بقول منٹو مرحوم کے ماں بہن کی گالی دے دینا۔ وہ اپنے نام آئے ہوئے تمام خطوط پڑھتا، ایک آدھ خط کا اپنے دوستوں سے بھی تذکرہ کرتے ہوئے اس مصمم ارادے کا اظہار کرتا کہ وہ اس خط کا جواب ضرور لکھے گا۔ اس نے اکثر ضروری خطوط تکیے، کوٹ اور پتلونوں کی جیبوں میں اڑسے ہوتے۔ جب یہ جیبیں جواب دے جاتیں تو وہ ان کو نکال کر خوشی سے اسی پرانی الماری کے نچلے خانے میں ڈال دیتا۔ جب وہاں بھی انبار لگ جاتا اور چوہے ان خطوط کو اپنا تختۂ مشق بنا چکتے تو وہ ان سب کو اٹھا کر اوپر طاقچے میں ڈال دیتا۔ میں تقسیم سے قبل چھ برس تک خطوط کے اس ڈھیر کو رفتہ رفتہ پھولتے دیکھتا رہا لیکن اسے ان کے جواب دینے کی فرصت نہ مل سکی۔ اسے جواب دینے کی فرصت ہی کہاں ہوتی ہے؟

وہ دن چڑھے چارپائی سے اٹھتا اور وہ بھی اس لئے کہ مہتر اور بہشتی کو آنا ہوتا۔ وہ ہمیشہ اس کا شاکی رہتا کہ سالے سونے نہیں دیتے۔ پھر یہ عذاب ناگزیر تھا، کیونکہ اگر وہ اٹھ کر کواڑ نہ کھولتا تو پانی کہاں سے آتا؟ صفائی کون کرتا؟

وہ بیدار ہو کر سب سے پہلے لوٹا ہاتھ میں پکڑ کر چھت پر چڑھ جاتا۔ شاید دن بھر میں یہی ایک موقع ایسا ہوتا جب وہ اردگرد کی منڈیروں اور چھتوں پر جھانک سکتا۔ لیکن اس کے پڑوسیوں ہی کا یہ عالم تھا کہ اکثر لوگ مالک مکان سے یہ کمرہ کرایہ پر مانگنے چلے آتے۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہاں کوئی بھی نہ رہتا تھا۔ پھر وہ شیو بناتا، غسل کرتا اور کپڑے پہن کر سیڑھیوں سے اتر کر ساتھ کے پان فروش سے سگریٹ کی ایک ڈبیا اور ایک پان خریدتا اور ہیرا منڈی کے ایک ہوٹل "بسم اللہ" کا رخ کرتا۔ رستے میں اس کے ایک ہندو پروفیسر کے بھائی کی دوکان تھی۔ وہ اس ہندو حلوائی سے اکنی کا بند اور ایک پیسے کی مکھن کی ٹکیہ خریدتا اور بسم اللہ ہوٹل میں پہنچ کر ایک چینک چائے کا آرڈر دیتا۔ یہ چائے دودھ، چائے کی پتی اور چینی کو ملا کر ایک ہی ساتھ ابالی گئی ہوتی۔

طوفان، آندھی آئی، موسلا دھار بارش ہوئی، لام لگ گئی، خاکساروں پہ گولی چلی، فسادات ہوئے۔ لیکن شبلی بی کام کے اس معمول میں کبھی فرق نہ آیا۔ وہ اپنے اس روزمرہ پر ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک عمل پیرا رہا۔

"بسم اللہ ہوٹل" سے نکل کر وہ تحصیل بازار کی راہ لیتا۔ یہاں "عالمگیر" اور "خیام" کا دفتر تھا۔ بشرطیکہ اسے دفتر کہا جا سکے کیونکہ میرے خیال میں اسے دفتر کی بجائے کباڑ خانہ کہنا زیادہ موزوں تھا۔ جگہ انتہائی تنگ اور بے ڈھبی سی اور سب سے زیادہ مصیبت عالمگیر پریس کی گڑگڑاہٹ۔ "سید مٹھا بازار" سے "تحصیل بازار" کی طرف چلیں تو اس بازار کے بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اسی مسجد کے ساتھ ایک بڑا سا پھاٹک ہے۔ اس پھاٹک سے داخل ہوں تو دو بڑی سی مشینیں نظر آتی تھیں۔ یہ مشینیں پہلی جنگ عظیم کا ماڈل تھیں۔ اس لئے پوری قوت سے چیختی چلاتی رہتی تھیں۔ ان کے پہلو میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جہاں حافظ محمد عالم مرحوم ایک لمبے بازوؤں والی آرام کرسی پر بیٹھے رہتے تھے۔ ایک میز کرسی شبلی بی کام کے لئے مخصوص تھی۔ دوسری میز ایجنسی کلرک کے سپرد تھی۔ تیسری میز اشتہارات کے زیر استعمال تھی۔ چوتھی میز پر ایک کلرک بیٹھتا تھا اور پانچویں میز ایک ٹائپسٹ کو دے دی گئی تھی۔ میں آج بھی اس چھوٹے سے کمرے کا تصور کرتا ہوں تو "بلیک ہول" کے واقعہ پر یقین کر لینے کو جی چاہتا ہے۔ حیرت ہے کہ اس قدر تنگ و تاریک کمرے میں اتنے لوگ، اتنی میزیں اور اتنی کرسیاں کس طرح سما جاتی تھیں۔ پھر ملاقاتی بھی تو ہوتے تھے اور حافظ صاحب سے کاروبار کرنے والے لوگ اس پر مستزاد!

اس کمرے کی ایک چھوٹی سی واحد کھڑکی سڑک کی جانب کھلتی تھی۔ جہاں پانچ سات منٹ کے بعد ایک آدھ پھیری والا ضرور ہانک لگا رہا ہوتا تھا۔ دال مرونڈے ——— قلفیاں لیک ——— نان کباب ——— آلو چھولے ——— کتابوں رسالوں کی ردی ——— پرانی بوتلیں ——— ٹھنڈی میٹھی گنڈیریاں

—— ہر وقت کی الجھنیں سستانے نہ دیتیں —— پریس کی کھٹ پٹ —— حافظ مرحوم کے وہ "وقتاً فوقتاً" بلند ہوتے نعرے —— "محمد کہاں ہو؟ —— بھئی ادھر آؤ —— چار سیر آم لاؤ۔ نہایت اعلیٰ، نہایت نفیس، نہایت میٹھے، نہایت عمدہ، نہایت اچھے ہیں۔" لیکن ان سب باتوں کا شاید شکیل بی کام پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ صبح سے شام تک اسی پریس میں کام کرتا۔ اسی شور و غل کے بھرے بازار میں مسلسل دس برس تک شکیل بی کام نے تخلیقی کام کیے اور کسی ایک بار بھی اس کے قلم نے تھکنے کا نام نہ لیا۔ ایک دفعہ اس نے "شاعر" آگرہ میں "ہم ایڈیٹروں" کے عنوان سے لکھا تھا کہ جب تک مشینوں کے پہیے گڑگڑاتے ہیں، گراریاں گھومتی ہیں، سلنڈر چلتے ہیں اور پٹہ چلتا ہے۔ اس کا قلم بھی کاغذ کی سطح پر جولانیاں دکھاتا ہے۔ لیکن جونہی مشینیں ٹھہر جاتی ہیں اس کا قلم بھی تھم جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زمین نے اپنے محور کے گرد گھومنا چھوڑ دیا ہے، جیسے گنبدِ افلاک کی گردش رک گئی ہے جیسے اس کے ذہن پر تاریکی سی چھا گئی ہے اور اب وہ اپنے ذہن سے کام نہیں لے سکتا، اپنے خیالات کی دنیا نہیں سنوار سکتا۔

شکیل بی کام مسلسل دس برس تک ہنگاموں کی اسی دنیا اور گڑگڑاہٹ کے اسی عالم میں بیٹھ کر ہفت روزہ "خیام" اور ماہنامہ "عالمگیر" کو ایڈٹ کرتا رہا۔ ان دونوں جریدوں کا شمار اس وقت کے معیاری اور کثیر الاشاعت جرائد میں ہوتا تھا۔ اور ان کا ہر دوسرے تیسرے مہینے کوئی نہ کوئی ضخیم خاص نمبر شائع ہوتا رہتا تھا۔ وہ ان پرچوں کا حقیقتاً چیف ایڈیٹر، منیجنگ ایڈیٹر اور سب ایڈیٹر تھا۔ وہ کام کی زیادتی کے باوجود اپنے فرائض کو جس خوش اسلوبی سے نبھاتا وہ دنیائے ادب و صحافت میں ضرب المثل ہو چکی ہے۔ لوگ اسے "ادبی اور صحافتی جن" کہا کرتے تھے۔ غالباً اسی تن دہی سے متاثر ہو کر نیاز فتح پوری نے ایک دفعہ اسے لکھا تھا۔

"اگر تمہاری طرح کا محنتی آدمی مجھے مل جائے تو میں "نگار" اس کے سپرد کر کے خود گوشہ نشین ہو جاؤں۔" اسی زمانہ میں جوش ملیح آبادی نے اس کے کسی مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے "کلیم" میں یہ رائے ظاہر کی کہ

"محنت، جانفشانی اور عرق ریزی اس کا کام ہے۔"

اسی دور میں اس نے عالمگیر کے صفحات پر بیس بائیس صفحات کا ایک مقالہ "داغ، شعر اور اس کی زندگی اور ادب پر اثر" لکھا تو ڈاکٹر سروری [illegible] نے لکھا۔

"آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ میں نے اتنی کتابیں نہیں پڑھیں۔"

اس مقالہ پر مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا عبدالستار صدیقی، عندلیب شادانی، برج موہن دتاتریہ کیفی، محی الدین [illegible] اور بے شمار دوسرے حضرات نے جو خراجِ تحسین ادا کیا وہ خطوط میں نے بھی دیکھے ہیں اور "عالمگیر" میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

وہ اسی پریس میں بیٹھ کر "حرف و حکایت" کے عنوان سے جو ہیرے موتی بکھیرتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے کئی کئی سو صفحات کے ناول بھی اسی پریس کی مشینوں اور صندلی فضاؤں میں بیٹھ کر لکھے گئے ہیں۔

سورج ڈھلے شکیل پریس سے نکلتا اور اخبار و رسائل کا پلندہ بغل میں داب کر سیدھا لوہاری دروازے کی طرف ہو لیتا۔ وہاں [illegible] میں بیٹھ جاتا۔ سامنے کے ہوٹل سے چائے کا ٹی سیٹ آتا اور وہ چائے کی پہلی پیالی کے ساتھ ہی تازہ دم ہو جاتا۔ اس کے دوست احباب بھی وہیں آ جاتے اور یا تو رات گئے تک وہیں گپ شپ گرم رہتی یا وہ دو تین دوستوں کے ہمراہ انارکلی سے مال روڈ کا چکر کاٹتا اور بھاٹی دروازے کے رستے واپس عالمگیر پریس میں آ پہنچتا۔

اسی زمانہ میں احمد ندیم قاسمی نے اس کی سیرت کا حال جس طرح اُسے لکھا تھا کہ "سنا ہے آپ پہرے کے پہرے بادامی انارکلی بازار میں نکلتے ہیں" عالمگیر پریس میں "میس" کا انتظام تھا۔ ایک کاتب کھانا تیار کر دیتا اور وہ پریس کی چھت پر بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ چائے پیتا۔ کمرے کی چارپائی پر لیٹ کر ایک آدھ سگریٹ کے کش لگاتا اور پھر رات کے نو بجے اسی [illegible] میں آ جاتا۔ سیڑھیوں میں داخل ہوتا تو سب سے پہلے سیڑھیوں کا دروازہ بند کرتا۔

پھر اوپر پہنچ کر کمرے کے تمام کواڑوں کو چٹخنی لگا دیتا۔ دراصل یہ وقت اُس کے مطالعہ کا ہوتا۔ اس وقت کسی کو آنے کی اجازت نہ ہوتی۔ نو بجے رات کے بعد اس کے کسی عزیز ترین دوست کو بھی اس کی ضرورت محسوس ہوتی اور وہ اس کے کمرے پر جا کر لاکھ آوازیں دے، اُسے پکارے، دروازہ کھٹکھٹائے لیکن وہ سب کے جواب میں چپ سادھے رہتا۔ حتیٰ کہ اس کا دوست مایوس ہو کر لوٹ جاتا۔ اس وقت وہ "حرف و حکایت" "فکر و نظر" اور "ذکر و فکر" کا مواد تیار کرتا یا بیرونی رسائل کے لئے مضمون لکھتا۔ اس نے ناول اور افسانوں کی بیشتر کتابیں بھی اسی وقت میں لکھی ہیں۔

میرے علاوہ احسان بی اے اور میرزا ادیب کا بھی اُن کے ہاں آنا جانا تھا۔ اس لئے انہیں ایسے وقت میں بھی اس سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔

میرزا ادیب نے اپنے ایک افسانے "عبدالرحمٰن" کا مواد شفیقؔ کے اسی کمرے سے لیا تھا اور عبدالرحمٰن دراصل عبدالرحیم شفیقؔ کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ اس افسانے کے آخری حصے میں میرزا ادیب ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ لیکن ماحول نگاری میں ان کا یہ افسانہ بڑا کامیاب ہے۔ میرزا صاحب نے لکھا ہے۔

> "گرمیوں کے دنوں میں مچھروں کے حملے سے بچنے کے لئے وہ پاؤں کو کسی چادر میں چھپا لیتا اور اگر موسم سرما ہوتا تو اوور کوٹ میں لپٹا لپٹایا دیوار سے سہارا لگائے کسی کتاب کا مطالعہ کرتا، لکھتا اور ساتھ ہی ساتھ سگریٹ کے کش بھی لگاتا رہتا۔"

اس وقت دیوار سے سہارا لگا کر سرہانے ایک چارپائی پر رکھی رہتی۔ سیاہی کی بوتل اکثر چارپائی پر اُلٹ جاتی۔ چادر سیاہی سے تر بتر ہو جاتی۔ لیکن وہ افسوس نہ کرتا بلکہ ہنس پڑتا کیونکہ اس کے بجٹ میں ہر ماہ ایسی آفتوں کی رقم مخصوص رکھی جاتی تھی۔

ایک بجے رات تک وہ فکر و مطالعہ میں کھویا رہتا۔ پورے ایک بجے جب بازار میں ہنگامہ ختم ہو جاتا۔ پان فروش چیل سے حقہ اور تختہ مانجھنے لگ جاتا۔ دودھ دہی والا کڑاہے صاف کر کے ایک طرف رکھ دیتا اور کوائی رگڑ رگڑ کر صاف کرتا اور بازار کے تمام ریڈیو اپنی ریکارڈنگ ختم کر دیتے تو شفیقؔ بھی کام چپ چاپ نیند کے آغوش میں جا سوتا۔

برابر دس برس تک اس کا یہی پروگرام رہا۔ اُسے دُنیا کا کوئی ہوش نہ تھا۔ اس کی جوانی کی زندگی اسی ڈگر پر بسر ہوتی رہی۔ اس کے بیوی بچے تھے ہی نہیں کہ گھریلو الجھنوں کے حل کی فکر ہوتی۔ شادی کے متعلق اس کے خیالات عجیب ہی۔ میرزا ادیب نے لکھا ہے کہ

> "اس کی ذہنی تخلیقات کے سارے ملک کے گوشے گوشے میں پھیل چکے تھے۔ لوگ اسے بہت بڑا آدمی سمجھتے تھے۔ مگر جو دو تین دوست اس کے بہت قریب تھے اور اس کے معمولاتِ حیات سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ اکثر حیران ہو کر یہ سوچتے تھے کہ اپنی بے پناہ قابلیت کے باوجود یہ شخص اپنی زندگی کے معیار کو بلند کیوں نہیں کرتا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کی نگاہوں میں دولت کی کوئی وقعت نہیں تھی اور عورت کے تصور نے اس کی زندگی کی سرد فضا کو ابھی چھوا تک بھی نہیں تھا۔ شادی کے بارے میں اس کا نظریہ عجیب و غریب تھا۔ جب کبھی گفتگو میں شادی کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ مسکرا کر کہتا: "میں شادی صرف اس لئے کروں گا کہ میرے گھر میں ایک عورت ہر صبح میرے لئے چائے کی گرم گرم پیالیاں بنا دیا کرے اور جب میں کام سے فارغ ہو کر گھر آؤں تو میرے لئے کھانا بالکل تیار موجود ہو۔"

اس کے مزاج کی ایک بات یاد آ گئی۔ قیام پاکستان سے قبل میں لاہور سے ایک رسالہ شائع کرنا چاہتا تھا۔ شفیقؔ سے ذکر ہوا تو اس نے ایک ریستوران میں جو خاکہ بنا کر مجھے دیا تھا۔ وہ یہ تھا۔

ماہنامہ ندیم لاہور ——— ایڈیٹر قمر تسکین

ایڈیٹوریل ——— پڑھنے والے بھائیو! میں نہ تو ادیب ہوں نہ شاعر۔ ایک معمولی ایڈیٹر ہوں جس کا کام نامور لوگوں سے تحریریں چھینا اور اُن کو ٹھیک ٹھاک کر کے شائع کر دینا ہے۔

ماہنامہ ندیم کا پہلا شمارہ ایک طویل ہیر پھیر کے بعد پیش کر رہا ہوں۔ اگر آپ اس کی سرپرستی قبول فرمائیں تو آپ بڑے اچھے آدمی ثابت ہوں گے

اور میری روٹی پانی کا بندوبست ہو جائے گا ——— آداب عرض۔ قمر شکیل

پہلا افسانہ

وہ ایک لڑکی پر عاشق ہوا۔ لیکن لڑکی
کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔

ڈراما

"تم ؟"
"ہاں جی !"
معاف کیجئے۔ میری نظر کو دھوکا ہوا

نظم

یہ صبح کا وقت اور یہ راوی کا کنارا
اب کیا ہے جانے کے سوا اور کا چارا

مزاحیہ گیت

منہ سے ڈنڈیاں ہیں
چوہے ناچت ہے

نفسیات

ادیب اس لئے لکھتا ہے کہ اس کی ماں نے
اس کا دودھ چھڑا کر اسے ذہنی صدمہ پہنچایا۔

ریویو

"وحشیات" اس دور کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں مغز نام کو بھی نہیں۔ بس چھلکا ہی چھلکا ہے۔

جب وہ موڈ میں ہو تو سیکڑوں لطیفوں، چٹکلوں اور حکایتوں سے پوری محفل کو کشتِ زعفران بنا کر رکھ دیتا ہے۔ خوب ہنستا اور خوب ہنساتا ہے۔ اس کے احباب اس کے قریب بیٹھ کر اپنی ہر پریشانی کو بھول جاتے ہیں ——— لیکن اگر وہ کام میں مصروف ہو تو اس سے بڑھ کر خشک مزاج انسان کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۵۲ء کا ذکر ہے۔ پروفیسر اختر اورینوی پٹنے سے آئے تو لاہور میں ایک آدھ دن کے لئے ٹھہر گئے۔ میں اور میرزا ادیب انہیں شیلی بی کام سے ملانے عالمگیر پریس لے گئے۔ شیلی دیوار کی طرف منہ کئے کاغذوں پر جھکا ماہنامہ "عالمگیر" کے کام میں مصروف تھا۔ ہم تینوں اس کے عقب میں جا کھڑے ہو گئے اور میں نے شیلی کو متوجہ کرتے ہوئے تعارف کرایا۔ "آپ ہیں اختر اورینوی صاحب ———" شیلی نے منہ پھیرے بغیر اپنا ہاتھ عقب کی طرف بڑھایا۔ اختر اورینوی اور اس کا ہاتھ مل گئے۔ ایک منٹ، دو، تین اور چار منٹ گزر گئے۔ شیلی بدستور پڑھنے میں مصروف رہا اور منہ پھیر کر بھی نہ دیکھا۔ چنانچہ ہم تینوں "السلام علیکم" کہہ کر پریس کی گڑگڑاہٹ سے نجات پا گئے۔ تمام راہ میں اور میرزا ادیب انتہائی شرمندگی کے عالم میں قدم اٹھاتے رہے۔ بیچارے اختر اورینوی خاموش رہے اور اپنی منزل پر ہم سے جدا ہو گئے۔ واپسی پر ہمارے درمیان شیلی کے بارے میں کوئی گفتگو نہ ہوئی۔

شیلی بی کام کی زندگی کے اس عجیب و غریب اسلوب نے اسے ایک افسانوی کردار بنا کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ اختر اورینوی نے "چشمہ گرم انارکلی اور بھول بھلیاں" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا۔ یہ افسانہ شیلی کے گرد گھومتا ہے۔ اس افسانے کی اٹھان بہترین ہے لیکن کلائمکس خلافِ واقعہ ہے۔ میرزا ادیب نے بھی اپنے افسانے "عبدالرحمٰن" میں کھوج لگانے کی کوشش کی کہ شیلی بی کام کی تفریح کا انحصار کس چیز پر ہے؟ اختر اورینوی کا خیال ہے کہ شام کے وقت اس نے انارکلی سے کھلونا خریدا اور اسی میں فرحت محسوس کر کے مطمئن ہو گیا ——— میرزا ادیب اپنے افسانے میں اچانک ایک روز اس کے کمرے میں تبدیلی دیکھتا ہے۔ نئے پردے، کرسی، میز وغیرہ دیکھ کر کچھ اندازے لگاتا ہے۔

لیکن میری رائے میں یہ دونوں حضرات تہہ تک نہیں پہنچ سکے۔ شیلی کی تفریح کے اسرار کی گتھی ان سے نہیں سلجھ سکی اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں بھی اس معمہ کو نہیں سمجھ سکا۔ ان دنوں شیلی کے گھر پر کسمپرسی کا عالم تھا۔ اس لئے وہ کسی کو اپنے گھر کا پتہ نہ بتاتا تھا۔ اس کے کمرے کا نقشہ میرزا ادیب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"کمرے کی ہر چیز فرسودہ، بے جان اور بے روح تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا زندگی کی حرارت نے اس تنگ و تاریک اور محدود دنیا میں کبھی سانس لیا ہی نہیں ہے۔ جس وقت وہ کمرے میں موجود ہوتا تو کبھی کبھی پرسکوت فضا میں چلنے پھرنے یا برتن اٹھانے اور رکھنے سے ایک لرزش سی پیدا ہو جاتی۔ مگر چند لمحوں کے بعد ہی یہ لرزش اس طرح غائب ہو جاتی جیسے کسی جھیل کی کائی بھی سطح پر پتھر گرنے سے اضطراب کے بعد

اکثر بیدار ہو کر اُٹھتا تو ایک ابھرتے ہوئے دائرے میں ڈوب جاتیں۔ اس کی زندگی کے ہزاروں دن اور ہزاروں راتیں اس ویران کمرے میں گزر چکی تھیں۔ مگر اس کی حالت آج بھی وہی تھی جو آج سے سات برس پیشتر تھی۔ سات سال کی لمبی مدت اس نے اس کمرے میں اس طرح گزار دی تھی جیسے کوئی مطرب ایک سرائے میں قیام کر رہا ہو۔ چائے پینے، کام کرنے اور سونے کے علاوہ اسے دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی!

تقسیم سے کچھ عرصہ قبل حافظ محمد عالم کی بیماری کے دوران اس کی طبیعت میں کچھ بیزاری سی پیدا ہوئی۔ شاید وہ مسلسل دس سال تک ایک ہی جگہ کام کرتا کرتا تھک گیا تھا۔ اس نے کتابی بولی اور ہفتہ وار، ماہوار رسالوں کو چھوڑ کر روزناموں کی دنیا میں چلا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد بھی شکیل کے کام کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سید مٹھا بازار والا چوبارہ تو فسادات کی نذر ہو گیا اور تقسیم کے بعد وہ جالندھر سے اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے نئی انارکلی میں دو تین کمرے الاٹ کرا لئے ہیں لیکن یہاں بھی اس کے حصہ میں صرف ایک ہی کمرہ آسکا ہے۔ اس کے گھر میں اگرچہ اب بھی بیوی کا نہیں ہے تاہم ماں باپ موجود ہیں۔ اس کے باوجود وہ صبح سویرے اٹھتا ہے، شیو بناتا، نہاتا دھوتا اور ناشتہ سے فارغ ہو کر تانگے پر سیدھا دفتر پہنچتا ہے۔ پہلے وہ اپنے دفتر کا کام ختم کر کے دو بجے کے بعد رسالہ "عالمگیر" کے دفتر میں محفل احباب جماتا تھا اب رسالہ "ڈائرکٹر" کے دفتر میں بیٹھتا ہے۔ اُسے فلموں سے دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایک فیصد بھی فلمی آدمی نہیں۔ اُسے دراصل ان فلمی دفتروں کے ان گدّوں سے دلچسپی ہے جو اس کے تھکے ہارے جسم کو چند گھنٹوں کے لئے آسودگی دیتے ہیں۔ "فلم ویک" کے دفتر کا صوفہ اس کی بے پروائی کے باعث جل گیا تو وہ رسالہ "ڈائرکٹر" کے دفتر میں اٹھ آیا۔ یہاں سے اٹھائے گا تو کسی اور ایسی جگہ جہاں اس کے بقول پیشاب کرنے کی جگہ ہو، پنکھا ہو، ایک صوفہ سیٹ ہو اور چائے منگوائی جا سکے، چلا جائے گا اور اسی دفتر میں ہر روز اپنی جیب سے دس کا ایک نوٹ نکال کر چائے منگوائے گا۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے سب لوگوں، سب ملاقاتیوں اور سب دوستوں کو چائے پلائے گا۔ کوئی کھانا کھانا چاہے تو کھانا کھلانے سے بھی دریغ نہ کرے گا۔

وہ کہا کرتا ہے — "میں چاہتا ہوں کہ نیوزی لینڈ چلا جاؤں، سمندر کے کنارے کسی سرسبز و شاداب تختہ پر بیٹھا رہوں، لیٹا رہوں۔ حتیٰ کہ کئی صبحیں طلوع ہوں اور شامیں غروب ہو جائیں" — دراصل اس کا جسم تھک چکا ہے لیکن تعجب ہے کہ اس کا ذہن ابھی تک نہیں تھکا۔ اس میں ایک لاوا سا سلگ رہا ہے۔ جس کی چنگاریاں اس کی تحریروں میں اڑتی رہتی ہیں۔ تقسیم کے بعد سے وہ روزنامہ اخباروں میں چیف ایڈیٹر کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ وہ اداریے لکھتا ہے۔ کئی فکر انگیز تحریکیں چلا چکا ہے۔ کئی وزارتوں کو الٹ چکا ہے۔ عوام کے ان گنت مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد میں کئی زعموں کے بخیے ادھیڑ چکا ہے۔ لیکن وہ ایک عجیب کردار ہے۔ سچی بات ہے میں اب تک نہیں سمجھ سکا۔

اس کی بہترین تفریح ہوٹل میں ایک دو گھنٹہ بیٹھنا ہے۔ جہاں اُسے اک ذرا چھیڑ دیا جائے تو پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ اور مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ گزشتہ پچیس برس سے بے شمار سیاسی، ادبی اور مذہبی تحریکوں کا عروج و زوال دیکھ چکا ہے اس لئے معاشرے کا ایک مزاج بن کر رہ گیا ہے۔ اُسے ادب اور صحافت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

وہ باتیں بڑے مزے کی کرتا ہے اور اس حد تک بے باک ہے کہ کسی کی پروا نہیں کرتا۔ وہ ناشروں کے بھی خلاف ہے اور مصنفوں کے بھی، سیاستدانوں کے بھی اور —— سب کے۔ بلکہ کبھی کبھی تو خدا اور انبیاء اور اولیاء بھی اس کی زد میں آئے بغیر نہیں رہتے۔ پھر بھی اس کی گفتگو بے معنی اور بے تکی نہیں ہوتی۔ انداز خواہ کچھ ہو۔ اس میں علمیت کا رنگ ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً وہ حسرت، سالک اور سلیمان ندوی کو کوسنے بیٹھے گا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دے گا کہ حسرت صاحب نے فلاں تاریخ کا مادہ غلط نکالا ہے اور فلاں کتاب کا نام غلط لیا ہے۔ سالک صاحب نے قصہ چہار درویش کا کردار غلط شخص کے سر منڈھ دیا ہے۔ سلیمان ندوی نے مستشرقین کی کتابیں ترجمہ کرا کے اپنے نام سے چھاپ دی ہیں۔ لیکن وہ عمر خیام کی تاریخ پیدائش متعین نہیں کر سکے۔ حالانکہ گوسوامی نے نجوم کی رو سے منٹ اور سیکنڈ بھی بتا دیئے ہیں۔ اس کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے اور وہ پتے کی باتیں کہتا ہے اب انکار کون

کرے؟ برا مانے بھی تو تدارک کس طرح ہو؟

وہ Idealist (آئیڈیلسٹ) ہے اور اپنے آئیڈیل کی تلاش میں ہے۔ شاید اسی لئے صبح سے رات کے دس بجے تک اخباروں اور رسالوں کے دفتروں میں ہنگامہ خیز زندگی بسر کر رہا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ سکون مانگ رہا ہے۔ کیا وہ اپنے آئیڈیل کو پا سکے گا؟ کیا اُسے سکون میسر آسکے گا؟

میرا قیاس بھی یہی خیال ہے کہ وہ طوفان میں مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ آرٹ کی بلندیوں پر پرواز کرتا ہے۔ لیکن زندگی کے آرٹ سے آگاہ نہیں۔ وہ ایک "حقیقت پسند" دنیا میں "حقیقت" کی تلاش میں سرگرداں ہے ——— اس کی حالت قابلِ رحم ہے ——— !

اس کے والد اور والدہ دونوں نثر نگار تھے۔ اسی لئے جب شبلی نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو اس کے اردگرد اخباروں اور کتابوں کے انبار کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سب سے پہلا مضمون دس برس کی عمر میں بچوں کے اخبار "پھول" میں شائع ہوا۔ اس زمانہ میں وہ پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ نویں جماعت سے شبلی بی کام نے انگریزی میں مضمون نگاری کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کا سب سے پہلا مضمون پندرہ روزہ "سن رائیز" میں شائع ہوا۔ سکول کے زمانہ میں اس نے زیادہ تر وہی کچھ لکھا جو پڑھنے یا سیکھنے میں آیا تھا۔ لیکن عبدالرحیم میں جو شبلی چھپا بیٹھا تھا وہ سب سے پہلے ٹیکسلا کے کھنڈروں میں گھومتے وقت بیدار ہوا۔ اُسے دیہات سے خاص طور پر دلچسپی ہے۔ دیہاتوں میں وہ صرف اُجڑے ہوئے دیار شامل نہیں کرتا بلکہ سنسان پہاڑ بھی شامل کرتا ہے۔ اُسے آبادیوں میں رہنے سے اتنی مسرت نہیں ہوتی جتنی دور دور تک پھیلے ہوئے پہاڑ کے دامنوں میں گنگناتی ہوئی ندیوں اور آبشاروں کی ساحرانہ موسیقیوں میں بیٹھ کر ہوتی ہے۔ اس کے احساسات اس وقت بیدار ہوئے جب وہ جہلم کے نواحی پانی کے کنارے بیٹھ کر شفق کے رنگین نظاروں کی تصاویر میں کھو گیا۔

بی کام اس کے نام کا جزو بن چکا ہے۔ جسے کوشش کے باوجود وہ آج تک علیحدہ نہیں کر سکا۔ حتیٰ کہ اب تعارف کے وقت بھی لوگ پوچھتے ہیں۔ کون شبلی؟ شبلی بی کام! ——— تو مجبوراً اسے اثبات میں سر ہلانا پڑتا ہے۔ اس نے کئی دفعہ اپنے مضامین پر شبلی بی کام کے بجائے عبدالرحیم شبلی لکھ دیا ہے اور یہ مضامین جب اس کے دوستوں کی نظر سے گزرے تو انہوں نے پوچھا کیا ——— "اچھا آپ تھے۔ ہم نے سمجھا۔ وہ کوئی اور شبلی ہو گا۔" اس نے اپنے نام کے ساتھ بی کام لکھنا کبھی گوارا نہیں کیا۔ لیکن بدقسمتی سے بعض ایڈیٹروں نے اس کے پتے میں سے یہ الفاظ نکال کر نام کے ساتھ منسلک کر دیئے۔ شروع شروع میں ایڈیٹروں نے غالباً مولانا شبلی مرحوم سے عبدالرحیم شبلی کی علیحدہ شخصیت ظاہر کرنے کے لئے ڈگری کو نام سے منسلک کیا تھا اور اب یہ ایک ایسا جزو بن گیا ہے جسے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے خاندان میں یہ رواج ہے کہ ہر شخص کا ایک تخلص رکھ دیا جاتا ہے۔ عام اس کے کہ وہ شاعر ہو یا نہ ہو۔ اس کا تخلص بھی اس کی والدہ محترمہ نے اس کے پیدا ہوتے ہی تجویز کیا تھا۔ غالباً اس وقت مولانا شبلی نعمانی نئے نئے فوت ہوئے تھے اور ان کے ادیبانہ کارناموں کی گونج ابھی تک فضا میں باقی تھی۔ اس لئے ظاہر ہے اس کی والدہ نے یہ خیال کیا ہو کہ شاید یہ لڑکا بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلے اور عجب نہیں کہ ان کی طرح شاعر ہی نکلے۔ اس لئے یہ تخلص "شبلی" اس پر ٹھونس دیا گیا۔ تاہم اس میں شعر و شاعری کا فطری ذوق موجود ہے جو کبھی کبھی معاشیات کی خشک تعلیم کے باوجود ابھر آتا ہے اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا ہے جب یہ کلام موزوں کی صورت میں ڈھل گیا۔ گو اس کے نام سے متعدد نظمیں اور غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ وہ ان کو اپنے ادب میں شامل کرنے کو تیار نہیں ہے۔

سانولی رنگت، لمبے بال، متوسط قد اور موٹی موٹی آنکھوں والا اٹھائیس سالہ سید عبدالرحیم ہاشمی (شبلی بی کام) دوستوں کی محفل میں بے باکی کے ساتھ قہقہے لگاتا، ہنستا اور سگریٹ پیتا ہوا جب معلمانہ انداز اختیار کر لیتا ہے تو بڑا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا یہ معلمانہ انداز چھوٹے بڑے تمام ادیبوں کے ساتھ ہے۔ وہ اپنے کسی دوست اور کسی ملاقاتی کو نہیں بخشتا۔ کسی کو معاف نہیں کرتا۔ وہ ادیبوں کے دکھ درد سے

بخوبی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا مستقبل بھی ادیبوں سے وابستہ ہے۔ صرف اسی کا نہیں بلکہ اُردو کی عظیم زبان کے تمام ادیبوں کا۔ اسی لئے وہ ایک ادیب کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا احساس کرتا ہے۔ اس کے دل میں خلوص ہے اور جب وہ انتہائی خلوص سے کسی ادیب کو چھوٹے اور معمولی مسائل سے لے کر بڑے اور دقیق مسائل کے بارے میں سمجھا رہا ہو تو اس کا یہ انداز بالکل مخلصانہ معلوم ہوتا ہے۔

میں نے اپنے اس مضمون میں شکیل بی کام کی کمزوریاں نہیں گنوائیں۔ اس لئے کہ میں اس کا دیرینہ دوست ہوں اور مجھے اس میں خوبیاں ہی نظر آتی ہیں۔ اس کی شخصیت بڑی پیاری پیاری، بڑی حسین اور بڑی عجیب و غریب ہے۔ میرا خیال ہے کہ "عجیب و غریب" کا لفظ قدرے وضاحت طلب ہے ——!

شکیل بی کام جب بولنے پر آتا ہے تو اپنے مخصوص انداز میں اپنی عینک کے دائروں سے اپنی شعلہ بار آنکھیں نچا نچا کر بولے چلا جاتا ہے اس وقت اُسے آپ کسی ناراضی، ندامت، آزردگی، مصروفیت غرضیکہ کسی شے کی پرواہ نہ ہوگی اور اس کے دلائل کا سلسلہ اس وقت رکے گا جب آپ اپنی مکمل شکست کا اعلان کر دیں گے۔

آپ اپنے کسی ذاتی مسئلہ پر اس سے انتہائی ضروری مشورہ کر رہے ہوں گے تو وہ اچانک اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے فضا میں کچھ لکھنے لگے گا اور آپ کے مسئلہ پر قطعی توجہ نہ دے گا۔ اس وقت بھی اُسے آپ کسی ناراضی، آپ کے جذبات و احساسات غرضیکہ آپ کا بالکل خیال نہ ہوگا!

اگر وہ موڈ میں ہوگا تو آپ کے ہلکے سے اشارے پر وہ چار سو روپے تک ادھار دینے سے دریغ نہ کرے گا اور اس کے ذہن میں ان روپوں کو واپس لینے کا خیال تک نہ ہوگا۔ لیکن اگر آپ کی جان پر بن آئے اور آپ اس کے سامنے ایک آدھ روپے کے لئے دستِ سوال دراز کریں۔ وہ موڈ میں نہ ہو تو آپ کی کسی بات سے متاثر نہ ہوگا اور ایک پھوٹی کوڑی بھی جیب سے نہ نکالے گا۔

وہ مال، لارنس، میکلوڈ اور انار کلی میں اس قدر سادہ شان سے چلتا پھرتا نظر آتا ہے کہ کسی روزنامہ اخبار کے چیف ایڈیٹر کے بجائے کسی دفتر کا معمولی سا کلرک نظر آتا ہے۔

آج کی مادی دنیا میں وہ ہر بڑے آدمی، ہر عالم، ہر وزیر، امیر سے نفرت کرتا ہے حتیٰ کہ ان کے سلام کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن ہر بے حیثیت آدمی، ہر مظلوم، ہر مجبور، غریب اور ہر غریب کے گلے میں باہیں ڈال کر گھومتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔

جس کام میں مالی فائدہ ہو۔ اُسے ٹالتا رہتا ہے حتیٰ کہ یہ موقعہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ دوسروں کے ان گنت کام بھی کرتا ہے اور اس سلسلہ میں اپنی جیب سے دشمنی کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔

ہر روز ایک نئی اسکیم بناتا ہے۔ اس کے ذہن میں ہزاروں، لاکھوں اسکیمیں تہ در تہ سجی ہوئی ہیں۔ لیکن وہ آج تک کسی اسکیم کو بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ وہ خود ہی کہا کرتا تھا کہ علم النجوم کی رو سے میں "لیگا" ہوں جو آگے بڑھتا بڑھتا عین منزل کے قریب پہنچ کر پھر اس طرح پلٹ کر غائب ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

یہ ہے شکیل بی کام، وہ عجیب و غریب کردار۔ جسے میں اب تک نہیں سمجھ سکا اور جو میرے خیال میں آج بھی طوفانوں میں مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

بدر الاسلام فضلی

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی میرے بہت پرانے دوست ہیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات آج سے تینتیس سال پیشتر مسلم ہائی اسکول پانی پت کے کتب خانے میں ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کتب خانے کی بڑی میز کے پاس ایک نہایت سنجیدہ جوان گہرے مطالعہ میں مصروف ہے۔ اور بار بار ایک کاغذ پر کچھ یادداشت لے رہا ہے۔ چھریرا جسم، ستا ہوا چہرہ، سیاہ داڑھی، سر کے بال باریک کٹے ہوئے۔ بدن پر ایک صاف مگر سادہ کرتا اور شرعی پاجامہ۔ یہ تھے شیخ محمد اسماعیل۔ ان کی شخصیت میں جو چیز میرے نزدیک سب سے زیادہ جاذب توجہ تھی وہ ان کا خلوص تھا، ان کی حق گوئی، راستبازی اور نیک نیتی تھی۔

شیخ صاحب کی شخصیت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں تنوع اور رنگا رنگی نہیں ہے۔ ان کو نہ تو انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں کا شوق ہے نہ ان کو بہت عمدہ قسم کے لباس سے شغف ہے۔ اور نہ کھیل تماشوں، میلوں اور دوسری تفریحات کی طرف میلان۔ انہوں نے تمام عمر سینما نہیں دیکھا۔ اور کسی قسم کا کھیل بھی نہیں کھیلا۔ عملی سیاست سے بھی وہ ہمیشہ علیحدہ رہے۔ ان سب چیزوں کو چھوڑ کر ان کو ایک اور صرف ایک چیز سے عشق ہے۔ وہ ہے کتاب، مطالعہ، علمی تحقیق اور تصنیف و تالیف۔ ہم نے مطالعے کے شوقین بہت دیکھے ہیں مگر اس لحاظ سے شیخ صاحب کی مثال نہیں ہے۔ اپنے لڑکپن کا ذکر شیخ صاحب نے بارہا کیا ہے۔ خود ان کے قول کے مطابق وہ اس زمانے میں رات کو ڈھائی ڈھائی بجے تک کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ والدین کی تاکید تھی کہ رات کو جلد سو جائیں۔ ان کے ڈر سے منہ لحاف میں ڈھک لیتے اور لحاف کے اندر مٹی کے تیل کا چراغ جلا کر شیخ صاحب کتاب پڑھتے رہتے۔ مگر والدین سمجھتے کہ سو رہے ہیں۔

شیخ صاحب نے ہمیشہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ کتابیں خریدنے پر صرف کیا اور ہمیشہ اچھی کتاب کی تلاش میں رہتے تھے۔ اس طرح انہوں نے ایک بے نظیر ذاتی کتب خانہ جمع کر لیا تھا۔ جو بیش بہا قلمی نسخوں اور نایاب مطبوعہ کتابوں پر مشتمل تھا۔ جس خوش اسلوبی سے شیخ صاحب اس کو استعمال کرتے تھے بہت کم لوگ ذاتی کتب خانوں سے ایسا استفادہ کر سکتے ہیں۔ اکثر شائقین علم اس کتب خانے کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آتے تھے۔

کتب خانہ شیخ صاحب کی زندگی بھر کا عزیز ترین اور نہایت قیمتی سرمایہ تھا۔ افسوس ہے کہ یہ ۱۹۴۷ء کے انقلابات کی نذر ہو گیا۔ شیخ صاحب کی صحت پر اس کے ضائع ہو جانے کا بہت بُرا اثر پڑا ہے۔

بالعموم دیکھا گیا ہے کہ ذاتی کتب خانوں کے مالک اپنی کتابوں کی ہوا بھی کسی کو نہیں لگنے دیتے۔ مگر شیخ صاحب اس معاملہ میں بہت فیاض رہے ہیں۔ اُن کے کتب خانے سے ہر شخص فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔

شیخ صاحب کی یادداشت نہایت عمدہ ہے۔ بعض اوقات اُن کی اس خوبی سے عجیب لطیفے رونما ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں سید محمد امین صاحب پرنسپل عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد نے اپنے کالج میں حالی جوبلی بڑی دھوم دھام سے ایک شاندار جشن منائی تھی۔ شیخ صاحب اور میں حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت کے نمائندوں کی حیثیت سے وہاں مدعو تھے۔ مسٹر اکبر حیدری اس اہم جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مولانا حالی پر تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کے دوران میں دفعتہً مولوی صاحب نے شیخ صاحب سے سوال کیا کہ مجالس النساء مولانا حالی نے کس سنہ میں لکھی تھی؟ شیخ صاحب اس وقت کچھ لکھ رہے تھے۔ مگر بلا تامل انہوں نے سوال کا جواب دیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ تمام حاضرین جلسہ کی نظریں شیخ صاحب پر پڑیں اور لوگ حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ کون بزرگ ہیں جو حالی کے متعلق ایسا یقینی علم رکھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق صاحب بھی استفسار فرماتے ہیں۔ اور بھروسہ کرتے ہیں اور جن کو حالی کی زندگی کے جزئیات گویا ازبر ہیں۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ حالی کی تحقیق پر شیخ صاحب نے ساری عمر جس قدر کاوش و کوشش کی ہے کسی دوسرے کو میسر نہیں۔ انہوں نے اس قدر مواد اس موضوع پر جمع کیا ہے کہ اگر وہ لکھیں تو بہت آسانی سے ہزار صفحہ کی سوانح عمری لکھی جا سکتی ہے۔ بہرحال لکھنے کی آرزو تو اب تک پوری نہ ہو سکی مگر شیخ صاحب نے مولانا حالی کے غیر مطبوعہ کلام اور کلیات نظم جمع و مرتب اور شائع کئے ہیں۔ ان کے علاوہ دو جلدیں مقالات حالی مرتب کئے جن کو انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا۔ ایک مختصر سوانح حیات تذکرہ حالی کے نام سے لکھی۔ اور بکثرت مضامین مختلف رسائل کے لئے لکھے۔

شیخ صاحب نے ملک کے موقر رسائل و جرائد میں مضامین لکھنے کا سلسلہ پندرہ سال کی عمر سے شروع کیا اور اب تک جاری ہے۔ ان کی تعداد بتانا مشکل ہے۔ لیکن بعض تحقیقی مقالے واقعی قابل صد تحسین و آفرین ہیں۔ اس لحاظ سے شیخ صاحب کی ایک قابل ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ ان مضامین پر تحقیق کا کام آپ نے دس پندرہ سال تک کیا۔ یہ استقلال حیرت انگیز ہے۔ ایسا ہی ایک مقالہ [illegible] قابل ذکر ہے۔ جو شیخ صاحب نے سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد مرتب کیا۔ مولانا وحیدالدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی فرمایا کرتے تھے کہ اس مضمون کو دیکھ کر میں فخر کرتا ہوں کہ میرے اہل وطن میں ایک ایسا فاضل محقق موجود ہے۔ میں نے بھی اس مقالہ کا اسی وقت انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

شیخ صاحب کو میں نے کبھی کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب ہوتے نہیں دیکھا۔ ذاتی تعلق کے علاوہ وہ کبھی کسی کی خوشامد نہیں کرتے۔ بڑے بڑے لوگوں سے اُن کا ملنا ہاں وہ برابر کے درجے میں رہا۔ اپنی رائے کے اظہار میں اُن کو ہمیشہ بے باک پایا۔ مگر اس کے ساتھ وہ دوسروں کی رائے کی قدر کرنا بھی جانتے ہیں۔ وہ بے حد خلیق، متواضع اور ملنسار انسان ہیں۔ ریاکاری، تصنع سے اُن کو دور کا واسطہ نہیں۔ دوستوں کے مخلص اور ہمدرد دوست ہیں۔ عزیز و اقارب کے ساتھ اُن کا سلوک ایسا ہے کہ ان کی شکایت کسی سے سننے میں نہیں آئی۔ یہ بڑی بات ہے۔

اُن کی صحبت کا رنگ خالص علمی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اُن کی گفتگو بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ مجھے بچپن ہی سے سالہا سال تک اُن کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ ایک عرصے تک یہ معمول رہا کہ ہم دونوں علی الصباح سیر کے لئے جاتے اور دو گھنٹے تک علمی باتوں پر گفتگو کرتے رہتے۔ یہ لطف میں عمر بھر نہیں بھول سکتا اور اب بھی یہ تمنا دل میں موجود ہے کہ کاش وہ زمانہ پھر لوٹ آئے۔

شیخ صاحب غالباً ۱۸۹۳ء میں دہلی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ زندگی کا بیشتر حصہ اپنے اسی آبائی مکان [illegible] میں گزرا۔ مکان مولانا انصاری کے مکان کی پشت پر تھا۔ جس میں مولانا حالی پیدا ہوئے تھے۔ پیچھے کے مکان میں وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے تھے۔ اوپر کی منزل

شیخ صاحب کا کتب خانہ تھا۔ دن بھر اسی جگہ بیٹھے تصنیف و تالیف و تحقیق کے دل پسند مشغلے میں محو رہتے تھے

بچپن دہلی میں گزرا جہاں ان کے والد بسلسلۂ کاروبار رہا کرتے تھے۔ عنفوانِ شباب میں پانی پت لوٹ آئے۔ کچھ عرصہ تک حالی مسلم ہائی اسکول کے کتب خانہ میں لائبریرین رہے۔ اسی زمانے میں یہ بھوپال اور پھر حیدر آباد پہنچے۔ ...... سنہ ۱۹۴۳ء میں ان کا انتخاب ہفت روزہ "عروج" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہوا۔ جو ضلع جھنگ کا سرکاری اخبار تھا۔ مگر وطن کی محبت نے کچھ ایسا مجبور کیا کہ ڈیڑھ سال بعد ہی استعفیٰ دے کر پانی پت واپس آ گئے۔ دو سال تک "پیغامِ حیات" کے نام سے ہفت روزہ اخبار نکالتے رہے لیکن بعض وجوہ سے اس کو بھی بند کرنا پڑا۔ سنہ ۱۹۴۷ء سے وہ مسلسل لاہور میں مقیم ہیں۔ اور اُن کا محبوب مشغلہ تالیف و تصنیف برابر جاری ہے۔ اُن کی تصانیف کی تعداد اس قدر ہے کہ اُن سب کا ذکر طوالت سے خالی نہیں۔

شیخ صاحب اگرچہ بہت سنجیدہ آدمی ہیں۔ لیکن اُن کی طبیعت میں جذبۂ مزاح کی بھی بہت عمدہ صلاحیت ہے۔

ایک بار اُن کے ایک بے تکلف دوست اپنے جوان بیٹے کی شکایت کرنے لگے۔ اُن کے دوست کا نام محمد ذبیح تھا۔ شیخ صاحب نے ہمدردی کرتے ہوئے فرمایا "کیا کیا جائے آخر پسرِ ذبیح ہے"

بعض لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ کسی دوسرے سے ملنے جاتے ہیں تو میز کے قریب بیٹھ کر میز کی چیزوں مثلاً پن کشن، پیپر ویٹ وغیرہ سے کھیلتے رہتے ہیں یا میز پر رکھے ہوئے خطوط ہی پڑھنے لگتے ہیں جو ایک قسم کی بدتہذیبی ہے۔ ایک دفعہ شیخ صاحب بھی ایک ایسے ہی شخص کے ہاتھوں تنگ آ گئے۔ اخلاق مانع تھا کہ اُن کو سختی سے روک دیں۔ اس موقعہ پر شیخ صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بہت خوب تھا۔ وہ حضرت حسبِ عادت پھر آئے اور اپنا کام شروع ہی کیا تھا کہ شیخ صاحب نے میز کی دراز میں سے ایک خوبصورت گڑیا نکال کر اُن کے آگے رکھ دی۔ "لیجئے اس سے شوق فرمائیے"۔ دوسرے لوگ بے حد محظوظ ہوئے اور وہ خود ایسے بھاگے کہ پھر نہ لوٹے۔

میں نے شروع میں لکھا ہے کہ شیخ صاحب کی طبیعت میں رنگا رنگی نہیں ہے اس کے باوجود وہ اچھے افسانے لکھنے میں کامیاب ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اُن کے افسانوں کے کردار بالعموم تاریخی ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

محمد عثمان

انسان فرشتہ ہے نہ شیطان۔ اس قول کی تصدیق کسی اور بزرگ سے ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو، ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی شخصیت سے بخوبی ہو سکتی ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر برق اگرچہ کم و بیش بیس برس سے دینیات پر لکھ رہے ہیں اور 'دو قرآن'، 'دو اسلام' اور 'ایک اسلام' جیسی مذہبی کتابوں کے مشہور مصنف ہیں مگر ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو انہوں نے اس شہرت اور اس تصنیف و تالیف کا اثر نہ اپنے ظاہر پر چھانے دیا ہے اور نہ باطن پر۔ ظاہر پر اس طور نہیں کہ ان کی سج دھج، میل جول اور وضع قطع کی جو سادگی، بے تکلفی اور ایک گونہ خوش مذاقی ایک مڈل اسکول کے گمنام ٹیچر میں تھی، کالج کے نامور پروفیسر میں بھی بجنسہٖ قائم ہے اور باطن پر یوں نہیں کہ ایک عام انسان میں اخلاق و کردار کی جو کمزوریاں پائی جاتی ہیں ڈاکٹر برق میں اپنی ڈاکٹری، پروفیسری اور مصنفی کے باوصف ان کا ایک معقول حصہ بتمام و کمال موجود ہے۔

ڈاکٹر برق کی ابتدائی زندگی اور تعلیم دونوں بے قاعدہ اور ناہموار تھیں۔ ابھی تیسری جماعت میں تھے کہ والد کے پیر و مرشد نے سرکاری اسکول کی بجائے مسجد میں بھیجنے کا حکم سنا دیا۔ اس کے بعد متعلم جیلانی برسوں ایک مسجد سے دوسری مسجد اور ایک ملا سے دوسرے ملا تک پڑھنے اور سیکھنے کی غرض سے جاتا رہا اور ساتھ ساتھ اس کا قیام و طعام بھی بدلتا رہا۔ آج والد کے پاس ہے تو کل بھائی کے پاس اور پرسوں ان دونوں سے تنگ آ کر یا دونوں کو تنگ کر کے کسی دور اور ویران مسجد کو جا بسایا ہے اور قریب کے گاؤں سے دونوں وقت کی روٹیاں مانگ کھانے پر مطمئن ہے۔ اس کشمکش میں نہ جانے زندگی کی اور کتنی راتیں گزر جاتیں مگر مسجد نیلا گنبد لاہور میں ایک شام ایک خیال نے اس کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔ عربی اور فارسی کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں۔ نماز مغرب کی اذان پر اپنے حجرے سے نکلتے اور وضو کے لئے آستینیں چڑھاتے ہوئے جیلانی نے دل میں سوچا "اب کوئی باقاعدہ امتحان کیوں پاس نہ کیا جائے؟" وضو کرتے اور نماز پڑھتے اس کا ذہن زندگی میں پہلی مرتبہ ایک باقاعدہ کام کر گزرنے کا منصوبہ بناتا رہا۔ امام نے قرأت شروع کی تو جیلانی امتحان کے کمرے میں بیٹھا منشی فاضل کا کوئی پرچہ تیزی سے حل کر رہا تھا۔ جب امام سجدے میں جھکا تو دوسرے نمازیوں کے ساتھ اس نے بھی اپنا سر تو فرش مسجد پر رکھ دیا تھا مگر وہ ابھی تک پرچے کے جوابات لکھ رہا تھا۔ امام رکوع و سجود کی منزلیں طے کرتا گیا اور جیلانی منشی فاضل کے مختلف پرچے 'پہلا، دوسرا، تیسرا' حل ہو چکا تھا...... لیکن ابھی تک اسے اس پرچے کا خیال نہ آیا تھا جو پانچ پرچوں سے پیچیدہ ہوتا ہے

اور اب صرف اس کے ذہن میں منصوبے کا سب سے کٹھن سوال پیدا ہوا۔ "مگر داخلے کی فیس کہاں سے لاؤں گا؟" اور جب امام نے سلام پھیرا تو جیلانی کے منصوبے کا فقط "اقتصادی پہلو" طے ہونا باقی تھا۔

اس رات اس کے خیال اور شوق نے جیلانی کو پوری نیند نہ سونے دیا۔ وہ داخلے کے لئے روپے کی فراہمی پر غور کرتا رہا۔ سب سے پہلے اسے والد کا خیال آیا۔ اس نے سوچا والد پٹواری ہیں۔ ضلع کیمبل پور کے مشہور گاؤں بسال کے پٹواری، مگر دوسرے پٹواریوں کی طرح وہ رشوت نہیں لیتے اور تہجد گزاری میں آپ اپنی مثال ہیں۔ مگر چونکہ وہ روپے ماہوار تنخواہ کے باوجود اپنی طبعی کفایت شعاری کی بدولت ان کے پاس تھوڑی سی رقم ضرور بچی ہے اور اگر وہ انہیں لکھ دے تو ...... اس کے دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ جیسے اس کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس کی خوشی سنبھل گئی۔ حتیٰ کہ اسے اپنی بلاوجہ خوش فہمی پر تعجب سا ہونے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے اطمینان اور تعجب کی یہ کیفیت پھر پریشانی میں بدل گئی۔ اس نے سوچا نہ جانے داخلے کی فیس کیا ہو اور والد دو چار روپے سے زیادہ کی رقم بھیجنے کے عادی نہیں۔ اور پھر اس کا ذہن گذشتہ سات سالہ زندگی کی راہوں پر بھٹک گیا۔ عسرت و تنگ دستی کے بیتے ہوئے واقعات آنکھوں کے سامنے آنے لگے اور پھر نہ جانے کیونکر اس نے والد کی دی ہوئی یا بھیجی ہوئی مختلف رقموں کا میزان لگانا شروع کر دیا جو اس سے پہلے وہ بارہا لگا چکا تھا اور جو ہر وقت اس کے حافظے میں محفوظ تھا۔ وہ چاہتا تو فقط میزان کو ذہن میں تازہ کر لیتا مگر آج وہ پھر اس کی تفصیلات میں جانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک ایک مد کو یاد کیا اور آخر میں جب سب رقموں کو جمع کیا تو پہلے کی طرح "کل" پھر پچیس نکلا۔ اس نے سوچا سات برس کے طویل عرصے میں پچیس روپے اور اس کی طبیعت پر افسردگی چھا گئی۔ پھر اسے اپنے لباس کا خیال آنے لگا۔ اس کے پاس کھدر کے دو جوڑے تھے جسے وہ باری باری ہر جمعہ کو مسجد کی طرف سے ملنے والے صابن سے دھو لیتا تھا۔ ایک جمعہ کو اس کے بعض ہم جماعتوں نے جن کے پاس دو سے زیادہ جوڑے تھے، انتہائی بے فکری کا ثبوت دیتے ہوئے راوی کی سیر کا پروگرام بنا ڈالا اور اسے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ اس دعوت کو رد نہ کر سکا مگر جب وہ دوپہر کے وقت لوٹ کر آئے تو نماز جمعہ سے پہلے کپڑے دھونے کا وقت باقی نہ رہا تھا۔ اس روز اسے اس بات کا شدید احساس ہوا تھا کہ اس کے پاس کم از کم تین جوڑے کپڑوں کے ضرور ہونے چاہئیں۔ اس روز بھی اسے والد کا خیال آیا تھا اور طبیعت پر تھوڑی دیر کے لئے افسردگی چھا گئی تھی اور بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فیس کے لئے والد کو تکلیف نہ دے گا اور اگلے روز جب اس نے اپنی مشکل اپنے ایک مہربان استاد مولانا غلام مرشد[1] سے بیان کی تو انہوں نے اندرون بھاٹی کے ایک تاجر اور نیک دل مسلمان خان بہادر محمد تقی سے ضرورت کے بارہ روپوں کا انتظام کر دیا۔

اس کے چند سال بعد جیلانی نے ایک اور منصوبہ تیار کیا۔ یہ منصوبہ پہلے منصوبے سے جس قدر مختلف تھا اسی قدر وہ حالات بھی مختلف تھے جن میں یہ منصوبہ تیار ہو رہا تھا۔ مسجد نیلا گنبد کے مدرسہ حمیدیہ کا متعلم جیلانی اب ماسٹر غلام جیلانی برق، منشی فاضل، مولوی فاضل، ادیب فاضل تھا اور بھلوال ہائی اسکول میں پچاس روپے ماہوار پر فارسی کی تدریس پر مامور تھا۔ وہ حجرہ مسجد کی بجائے دو روپے ماہوار کرایہ کے ایک کچے مکان میں رہتا تھا جس کے تین کمرے اور ایک کھلا سا صحن تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ماسٹر جی نے اپنے گھر کے لئے فرنیچر کے طور پر ڈیڑھ روپے میں کپڑے کی ایک آرام کرسی اور چار آنے میں ایک بڑا سا اسٹول خریدا تھا اور جب وہ مکان کے سب سے صاف کمرے میں اپنی چارپائی کے پاس آرام کرسی بچھا کر اور سامنے تازہ خریدا ہوا اسٹول رکھ کر کرسی پر دراز ہوا تو اس نے دل میں اطمینان اور خوشی کی ایک عجیب کیفیت محسوس کی۔ ایک ایسی کیفیت جس سے وہ پہلے کبھی آشنا نہ ہوا تھا اور پھر اس کے ذہن میں ایک نیا پلاؤ پکنے لگا۔ اس نے سوچا عربی، فارسی اور اردو کے کئی مرحلے طے ہو چکے ہیں۔ اب انگریزی کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ وہ اس سے پہلے اسلامیہ ہائی اسکول نوشہرہ اور دو ایک اور مقامات پر بھی

---

[1] شاہی مسجد لاہور کے موجودہ خطیب۔

کا کام کوئی اڑھائی تین سال کے قریب کر چکا تھا اور یونیورسٹی کے مذکورہ بالا امتحانات پاس کرنے سے اس کا حوصلہ زیادہ، اس کا عزم پختہ اور علم میں آگے بڑھنے کا شوق تیز تر ہو چکا تھا۔ کئی سال پہلے جب وہ مدرسہ حمیدیہ لاہور میں زیر تعلیم تھا اس نے علامہ اقبال مرحوم کو انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں اپنی نظموں سے حاضرین پر جادو کا سا اثر کرتے دیکھا تھا۔ پھر وہ نظمیں اسی زمانے میں بعض اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئیں اور شاعر کے نام کے ساتھ اس نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ لکھا پایا تو ان لفظوں کی حقیقت اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ ایم اے کے بعد گویا علمی دنیا کا یہ سب سے بڑا اعزاز ہے تو متعلم جیلانی نے جس کو ابھی تک خبر نہ تھی کہ منشی فاضل یا کسی دوسرے امتحان میں شریک ہونے کے لئے یونیورسٹی کو کچھ فیس بھی دینی پڑتی ہے، دل میں ٹھان لی کہ وہ بھی اس علمی مرتبے کو پانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ اب حالات کو سازگار پاکر اس نے ایک جامع منصوبہ مرتب کیا جس کی تکمیل کا تعلق پی۔ ایچ۔ ڈی سے اور آغاز کا اسی سال میٹرک کے امتحان میں شریک ہونے سے تھا۔

۱۹۲۹ء میں ۲۰ برس کی عمر میں ماسٹر غلام جیلانی برق نے جب بی۔ اے پاس کیا تو وہ فکر و خیال کی کئی وادیوں میں گھوم چکا تھا۔ ۱۹۲۴ء کے قریب اسے محمود دہر جیال کی ضخیم کتاب 'تہذیب اسلام' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں اسلامی نظریات اور انداز فکر کی برائی کی گئی تھی اور کچھ ایسے 'ٹھوس دلائل' دئے گئے تھے جن کا جواب اوسط درجے کے پڑھے لکھے مسلمان کی قابلیت اور قدرت سے باہر تھا۔ کچھ دنوں بعد سوامی دیانند کی 'ستیارتھ پرکاش' ہاتھ لگ گئی۔ اس کے بعد پنڈت لیکھ رام اور مخالف اسلام مستشرق مصنفین کی باری آئی اور 'ماسٹر جی' بہک گئے ——— پہلے تلاوت قرآن موقوف ہوئی۔ پھر نماز چھٹی، پھر روزے ترک ہوئے اور آخر میں ہستی باری تعالے سے انکار کا مرحلہ آیا۔ یہ دور کوئی پانچ سال چلا اور اس میں سوائے چہرے پر ایک داڑھی کے، جو نہ جانے اس کی برق نگاہی سے کیسے بچ رہی، ظاہر و باطن سے مسلمانی کا ہر نشان رخصت ہو گیا اور آہ! وہ تنہا و اداس داڑھی جو اپنی بزم ایمان کے اجڑ جانے پر درحقیقت مرزا غالب کی شمع خاموش تھی ؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

۱۹۳۳ء میں ایم۔ اے کرنے کے تھوڑے عرصہ بعد ماسٹر برق پروفیسر برق بن کر گورنمنٹ کالج ہوشیار پور میں تعینات ہوئے تو ان کی زندگی میں نئی دلچسپیوں نے قدم رکھا۔ تاش اور شطرنج مدتوں سے ان کے مرغوب کھیل تھے مگر اب تک وہ محض ترپ کا عامیانہ کھیل کھیلتے تھے اور پتوں کے ساتھ مہروں کے خرام ناز کی دلفریبیوں سے ناواقف تھے۔ یہاں آکر برج سیکھی تو دو ہی چار دن میں طبیعت داد دینے لگی اور حوصلہ اتنا بڑھا اور شوق اتنا پھیلا کر سروسز کلب کے علاوہ بیڈمنٹن کلب کے بھی رکن بن گئے تاکہ کھیل کا تار گھنٹوں ٹوٹنے نہ پائے۔ ٹینس بھی انہوں نے اسی زمانے میں سیکھا۔ انگریزی لباس تو وہ مدت سے پہن رہے تھے مگر اس کی نازک مزاجیوں سے آگاہ نہ تھے۔ یہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ داڑھی کی موجودگی اس کے حق میں مضر ہے۔ چنانچہ شیو بنانے کے آداب سے آراستہ ہوئے اور یہیں آکر ان کا یہ گمان یقین میں بدلا کہ ان کی پہلی بیوی ان کی رفاقت کا حق ادا کرنے کی بالکل اہل نہیں۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے منصوبے کی طرف سے غافل ہو کر بس انہی دلچسپیوں میں کھو گئے تھے۔ ہوشیار پور کے زمانہ قیام میں ان کے وقت کا خاص حصہ ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تیاری میں صرف ہوا۔ وہ دس بجے کے قریب کلب سے اٹھ کر گھر جاتے اور کھانا کھانے کے بعد مطالعہ و تحقیق میں لگ جاتے۔ یہ مشغلہ کھیل سے کچھ کم دلچسپ نہ تھا۔ اس لئے رات گئے تک، اکثر دو بجے تک جاری رہتا۔ چارپائی اور اس کے سامنے پڑی ہوئی میز کے اوپر نیچے، دائیں، بائیں انگریزی، عربی اور فارسی کی کتابیں اور رسالے بکھرے پڑے ہوتے۔ پروفیسر برق بڑی دماغ سوزی اور عرق ریزی کے ساتھ ان سے ضرورت کا مواد اور معلومات اخذ کرتے، تنقیح و تہذیب کے بعد ان کو ایک خاص انداز سے مرتب کرتے اور ان سے اپنی کتاب کے لئے مستند نتائج نکالتے تھے۔ یہ علمی مشقت کوئی چھ سال تک جاری رہی۔

۱۹۴۰ء میں پروفیسر برقی (مدرسہ حمیدیہ کا وہ متعلم جیلانی جس کو ستر برس کی عمر تک یہ خبر نہ تھی کہ امتحان کے لئے کچھ فیس بھی دینی پڑتی ہے) پنجاب یونیورسٹی کو دو صد روپیہ فیس ادا کر کے اور امام ابن تیمیہ کی زندگی اور کارنامے پر اپنی تحقیق کا لوہا منوا کر ڈاکٹر برقی بن گئے۔ لیکن اس منصوبے کی تکمیل سے کچھ عرصہ پہلے ان کا دماغ ایک نیا منصوبہ سوچ چکا تھا اور اب انہیں اپنے تیسرے منصوبے کی دھن سمائی تھی۔ آپ پوچھیں گے تیسرا منصوبہ کیا تھا؟

۱۹۳۰ء کے قریب علامہ مشرقی کی تصنیف 'تذکرہ' سے وہ روشناس ہوئے اور ملّا ازم کے چنگل سے نکلے تو دل میں اسلام کی حقانیت اور قرآن کی عظمت کا یقین پہلے سے ہزار گنا بڑھ چکا تھا۔ آٹھ دس سال کے زیرِ مطالعہ 'تحقیق اور غور و فکر سے وہ جس نتیجے پر پہنچے اس کے تین پہلو تھے:

۱۔ اسلام کسی سائنسی حقائق سے متصادم نہیں۔ قرآن حکیم نہ صرف مطالعۂ فطرت اور تسخیرِ کائنات کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے بلکہ اس کی سینکڑوں آیات اور سائنس کے جدید انکشافات اور نظریات میں حیرت انگیز مطابقت اور ہم آہنگی پایا جاتا ہے جو دینِ اسلام کی حقانیت اور قرآن کے من جانب اللہ ہونے کا زبردست ثبوت ہے۔

۲۔ اسلام وہ نہیں جو اکثر علماء کی زبان و قلم سے پیش کیا جاتا ہے بلکہ وہ ہے جس کی تعلیم و تصدیق قرآن اور فقط قرآن سے ہوتی ہے اور ان دونوں 'اسلاموں' میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ 'ملّا' کا پیش کردہ اسلام مذہبی تعصب، کج بینی اور فکر و عمل کی مسکینی کا نام ہے مگر حقیقی اسلام علم و اخلاق کی بلندی، نظر کی وسعت اور قلب کی فراخی ہے۔

۳۔ مذاہبِ عالم کی اصل ایک ہے اور ان کا باہمی تضاد اور موجودہ منافرت کم نظر اور حقیقت ناآشنا پادریوں، پروہتوں اور ملّاؤں کی پیدا کردہ ہے۔

جب متذکرہ بالا خیالات ڈاکٹر برقی کے دل و دماغ میں راسخ ہو گئے اور طبیعت ان کے اظہار کے لئے بے چین ہونے لگی تو انہوں نے ان کو مسلسل وار شائع کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ یہی ان کا تیسرا منصوبہ تھا جو 'دو قرآن' (۱۹۴۴ء)، 'دو اسلام' (۱۹۵۰ء) اور 'ایک اسلام' (۱۹۵۱ء) کی صورت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

ان حالات کا بیان اور ان 'منصوبوں' کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ ان کے بغیر ڈاکٹر برقی کی شخصیت کا وہ پس منظر اجاگر نہ ہو سکتا جس میں اس نے اپنی تعمیر کی اور ان واقعات کا اندازہ نہ ہو پاتا جن سے وہ دوچار ہوئے، جن سے انہوں نے اثر لیا اور جن کی مدد سے ان کی شخصیت کو اپنا مخصوص آب و رنگ حاصل ہوا۔ پیش منظر کو سمجھنے کے لئے پس منظر کا دیکھنا بہرحال ایک ناگزیر چیز ہے۔

جو لوگ اپنی محنت اور ذہانت سے ابھرتے ہیں بعض اوقات ان میں خود رائی اور انانیت ذات کا ضرورت سے بڑھا ہوا احساس بھی ابھر آتا ہے۔ ڈاکٹر برقی کو یہ جذبہ چھو تک نہیں گیا۔ شہرت و پندار سے بڑھ کر کوئی چیز ان کی ذات سے دور نہیں۔ آپ ان سے ملئے، ان سے الجھئے، اگر جی چاہے تو ان کے منہ پر ان کے سارے کارنامے کی نفی کر ڈالئے، وہ اس کے جواب میں کوئی ایسا کلمہ منہ سے نہ نکالیں گے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے یا مخاطب کرتے کوئی ایسا انداز اختیار نہ کریں گے جس سے یہ پایا جائے کہ وہ اپنے کو آپ کی ذات یا بات سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اس لحاظ سے نہ صرف ان کو اپنے علم اور مصنفانہ صلاحیت پر کوئی ناز نہیں بلکہ ان میں ایک طرح کی 'نفی ذات' بھی بڑی نمایاں ہے۔ یہ 'نفی ذات' نہ تو صوفیانہ عجز و انکسار سے کوئی تعلق رکھتی ہے اور نہ 'اخلاقِ جلالی' کے تحمل و بردباری سے۔ ایسا نہیں کہ وہ بھڑک نہیں اٹھتے یا برس نہیں پڑتے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے لیکن روزمرہ کی زندگی میں، گھر میں ہوتے ہوئے، کالج کے اوقات میں، احباب کی صحبتوں میں، کلب میں، سینما میں، سیر و شکار کے موقعوں پر غرض ہر جگہ جہاں وہ قلم و کتاب کے بغیر چلتے پھرتے اور ملتے ملاتے موجود ہوتے ہیں ان کو اپنی مصنفانہ شہرت یا عالمانہ حیثیت بالکل اور قطعاً یاد نہیں ہوتی اور کوئی اجنبی ان کی گفتگو، غیر علمی مشاغل میں ان کے انہماک اور

دوستوں سے ان کی بے تکلفی کی نوعیت سے ہرگز نہیں پا سکتا کہ یہ "روح قرآن" یا "ایک اسلام" والے ڈاکٹر برق ہیں۔

خوش دلی ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کا جوہر ہے۔ ان کی عمر اس وقت باسٹھ ترسٹھ برس کی ہے اور اقتصادی شعور کے اس عہد میں وہ نو بچوں کے باپ اور جہاں تک ان کے عقد کا تعلق ہے ایک سے زیادہ بیویوں کے شوہر ہیں، اس کے باوجود چٹکلے چھوڑنے میں وہ اپنا حریف نہیں رکھتے۔ وہ تبسم زیر لب کے نہیں فلک شگاف قہقہوں کے قائل ہیں۔ یہ قہقہے ان کے دیوان خانہ میں، کلب میں، کھانے اور چائے کی میز پر اور کالج سٹاف کے رسمی وغیر رسمی اجتماعوں میں بھی بلند ہوتے اور گونجتے ہیں مگر ان کی بہار دیکھنی ہو تو کوئی اس وقت دیکھے جب کالج کے اوقات ختم ہونے پر وہ بے تکلف ساتھیوں کی محفل میں باغ و بہار بنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ عالمانہ اور شاعرانہ نکات کے علاوہ ان کے حافظہ میں سعدی و رومی کی حکایات، جالندھر سے لے کر لکھنؤ کے مراثیوں، جولاہوں اور ملاؤں کے سچے اور جھوٹے، گفتنی اور ناگفتنی لطائف کا اتنا بڑا ذخیرہ محفوظ ہے اور ان کا طرز بیان اس قدر دلکش، انداز آفریں اور ترقی پسندانہ ہے کہ محفل ایک بار جم جائے تو گفتگو کبھی ٹوٹنے کا نام نہ لے گی۔ آغاز مجلس عام طور پر علمی قسم کا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب یا کوئی اور رفیق کسی مضمون یا کتاب کی تیاری میں مصروف ہیں اور انہوں نے اپنے "زیر غور" نظریہ کا انکشاف کر دیا ہے یا مخصوص صحبت سے کوئی مسئلہ درپیش ہے، مسائل کا دائرہ حدیث کی حجیت سے لے کر فرائڈ اور اوڈی پس الجھاؤ تک وسیع ہے، تو دو چار احباب کے درمیان ہولے سے بحث چھڑ جائے گی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ڈاکٹر صاحب خواہ اس وقت سٹاف روم میں موجود ہیں یا نہیں، آج "اجلاس" ضرور ہوگا۔ چنانچہ رفقاء جوں جوں جماعتوں سے فارغ ہوتے آئیں گے، اراکین کی تعداد بڑھتی جائے گی۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر صاحب اور حزب اختلاف کے لیڈر یا ڈپٹی لیڈر تشریف لے آتے ہیں۔ اب باقاعدہ کارروائی شروع ہوتی ہے۔ آیات قرآنی پڑھی جا رہی ہیں، اتفاق سے دو رفقاء حافظ قرآن ہیں، احادیث بیان ہو رہی ہیں۔ توریت اور انجیل سے حوالے سنائے جا رہے ہیں، تفسیر کے نکتے حل ہو رہے ہیں، منطق و استدلال کے جوہر دکھائے جا رہے ہیں اور وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو نظریات کے "مناظر" کرتے ہیں یا علمی اداروں کے ماہر عموماً کیا کرتے ہیں مگر اب بحث نے طول کھینچا ہے اور طبیعتوں میں کچھ تیزی آنے لگی ہے۔ اس مرحلہ پر "سرکاری" یا "مخالف" بنچوں میں سے کسی باذوق نے منہ کا مزا یا محفل کا رنگ بدلنے کے لیے کسی حاضر دوست پر کوئی فقرہ چست کر دیا ہے یا چٹکی لے دی ہے تو سمجھیے کہ اب محفل کا پہلا دور ختم ہوا اور کارروائی جب دوسرے دور میں داخل ہوتی ہے تو فضا قہقہوں سے گونج رہی ہوتی ہے۔ وہ چہرے جو تھوڑی دیر پہلے زرا مشکلیں اور علم کی سنجیدگی سے بوجھل بوجھل نظر آتے تھے اب پھول کی طرح شگفتہ ہیں اور بقول پطرس کھلی ہوئی باچھیں پھر کھینچ تان کر اپنی اصلی جگہ پر واپس نہیں آتیں۔ ڈاکٹر صاحب پہلے بھی صدر نشین تھے، اب بھی میر مجلس ہیں۔ لطائف و ظرائف کا دفتر کھل گیا ہے مگر اصل کشش ان کی قدرت بیان میں ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بعد یہ کمال میں نے ڈاکٹر برق ہی میں دیکھا ہے کہ عربی، فارسی، اردو، پنجابی، ملتانی، سندھی، پشتو، کشمیری اور ڈاکٹر صاحب کی حد تک انگریزی بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ غرض لطیفہ جس زبان اور طبقے کا ہوگا اس کو اسی زبان اور اسی طبقے کے لب و لہجہ میں ادا کر سکیں گے۔ ڈاکٹر صاحب جب "صاحب لوگوں" کے واقعات جن کا ذاتی تجربہ بھی ان کو کچھ کم نہیں رہا کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے مخصوص تلفظ سے کام لیتے ہیں تو سماں بندھ جاتا ہے۔ اسی طرح جب وہ ان بے شمار ہیڈ ماسٹروں، انسپکٹروں، پرنسپلوں اور ڈائرکٹروں کا ذکر خیر کرتے ہیں جن سے انہوں نے نفع یا نقصان اٹھایا تو ایک ایک کی انفرادیت اس کی مخصوص آواز، طرز گفتگو اور انداز کار کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے اور سامعین کو بے حد محظوظ کرتی ہے۔ لیکن اس تمام لطیفہ گوئی اور واقعہ نگاری پر غالب اور سب سے بڑھ کر دلچسپ ان کی "آپ بیتی" ہے جسے موقع و محل کی رعایت سے وہ انتہائی بے باکی اور صدق گوئی کے ساتھ "منظر عام" پر لاتے ہیں۔ ماضی میں ان سے جو کچھ سرزد ہوا، اور جیسا جیسا انہوں نے جو کچھ کیا، بیان واقعہ سے خواہ ان کی اہانت و سبکی کا پہلو نکلتا ہو خواہ ان کی کسی نفسی یا اخلاقی کمزوری کا پتہ چلتا ہو وہ کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر اس کا ذکر کریں گے۔ مرزا غالب نے اپنے کسی خط میں لکھا ہے کہ "آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔" ڈاکٹر صاحب کا سلوک بھی اپنی ذات کے ساتھ

اور وہ بے باکانہ اور غیر جانبدارانہ ہے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کی مجلس آرائی کی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک ایک اور بات کا ذکر یہاں نہ آئے۔ ان کے پاس ریختی روز مرہ کے قریب الفاظ و محاورات ایسے بھی ہیں جو بقول شخصے کسی اسکول یا مدرسے میں پڑھائے نہیں جاتے اور نہ شریف گھرانوں میں بولے سنے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ و محاورات انہوں نے اس وقت سیکھے تھے جب ابھی وہ اسکول نہیں جاتے تھے یا اسکول سے بھاگ جاتے تھے مگر ان کے بے تکلف اور بے ساختہ استعمال میں دستگاہ انہوں نے برسوں کی ریاضت اور مشق و مہارت سے بہم پہنچائی ہے اور اس میں اتنی بڑی جدتیں اور نزاکتیں پیدا کی ہیں اور اب یہ الفاظ مع 'حواشی' اور جدید فرہنگ کے ان کی شخصیت اور بزم آرائی کا جزو لاینفک ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اگرچہ پنجاب یونیورسٹی کے سند یافتہ 'محقق' ہیں مگر تحقیق کئے بغیر نتیجے پر پہنچنا یا فیصلہ کرنے کے بعد تحقیق کی کوشش کرنا ان کی شخصیت کا ایک طرفہ پہلو ہے۔ اس میں بری نیت کو کچھ دخل نہیں۔ ان کا ارادہ ہمیشہ معصوم ہوتا ہے مگر ان کی طبیعت میں جلدی سے نتیجہ نکالنے اور ان نکلے یا نکالے ہوئے نتیجے پر اصرار کرنے کی صلاحیت بڑی غیر معمولی ہے۔ اس سے بار بار دوسروں کے جذبات اور خود ڈاکٹر صاحب کی شہرت کو صدمہ پہنچا ہے اور اگرچہ احساس دلانے یا حقیقت واضح ہونے پر وہ تلافی مافات کی کوشش کرتے ہیں مگر بعض اوقات ان کی یہ 'زود پشیمانی' غالب کے روایاتی محبوب سے کم بعد از وقت نہیں ہوتی۔ چند سال اُدھر کی بات ہے۔ کالج میں طالبات کو ایک خاص نظم اور ضابطے کے ساتھ تعلیم پاتے ابھی دو تین برس ہی ہوئے تھے اور اس دوران میں ایک آدھ معمولی درجے کا ناخوشگوار واقعہ پیش آ چکا تھا کہ ایک شگفتہ اور رنگین طبیعت کے نوجوان نئے نئے لیکچرار مقرر ہو کر یہاں آئے۔ ان کے آنے کے دو اڑھائی ہفتے بعد ارباب کالج کو کسی کاپی میں پڑا ہوا ایک محبت آمیز خط ملا جس کے آخر پر ان کا نام درج تھا۔ ان دنوں کوئی مستقل پرنسپل نہ ہونے کے باعث اگرچہ برائے نام انچارج ایک اور صاحب تھے مگر عملاً ڈاکٹر صاحب ہی کرتا دھرتا تھے۔ انہوں نے خط دیکھتے ہی 'سارے معاملے' کو بھانپ لیا اور نوجوان لیکچرار کو بلا کر صاف صاف اور خاصے نا ملائم لفظوں میں گفتگو کر ڈالی۔ خوددار اور بے یار و مددگار اجنبی پر تو قیامت ہی گزر گئی۔ وہ تو خدا بھلا کرے اس طالب علم کا جس کے کان تک جب یہ بات پہنچی تو بھاگا بھاگا آیا اور اصل ماہنامے کو بھی اٹھا لایا جس سے وہ مکتوب نگار کے نام کے اس نے محض پسندیدہ اسلوب کی بنا پر وہ خط نقل کیا تھا اور کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔ ورنہ بے خطا لیکچرار اپنی 'صفائی' میں ناکام اور اپنی نیک نامی سے مایوس ہو ہی چکے تھے۔

میں نے یہ واقعہ بہت سوچ بچار کے بعد یہاں درج کیا ہے اور محض اس لئے درج کیا ہے کہ اس کے بغیر ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کا یہ سنگین رخ تشنۂ اظہار رہ جاتا۔ فیصلے میں یہی جلدی اور طبیعت کی یہی تیزی ان دو خطوط کا باعث ہوئی جو انہوں نے 'صدق' کے ایک تبصرہ پر مولانا عبدالماجد دریابادی کو پار سال یا دو سال پہلے لکھے تھے۔ علاوہ اور باتوں کے اس میں ڈاکٹر صاحب کا مولانا کو یہ مشفقانہ مشورہ بھی شامل تھا۔ "قبلہ! آپ علمی و اسلامی مسائل پر لکھنا چھوڑ دیں، اس لئے کہ یہ کام آپ کے بس کا نہیں۔۔۔۔۔" اپنے اسی خط میں ایک جگہ مولانا کو یقین دلاتے ہیں: "آپ کی اسلام سوز جہالتوں پر ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے لیکن کوئی صاحب فکر و نظر آپ جیسے متعصب لاشئی پر وقت کیوں ضائع کرے۔"

مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو متذکرہ بالا دونوں واقعات کا بعد میں بے حد افسوس ہوا۔ انہوں نے اپنے رفیق سے بھی معذرت چاہی اور مولانا کے لئے بھی ان کے دل میں معذرت خواہی کے سینکڑوں ارمان پوشیدہ ہیں مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جب تک دم میں دم ہے ہر ایسی صورت پیدا ہونے پر وہ فیصلے پر تحقیق سے پہلے ہی پہنچیں گے۔

ان کی طبیعت کا یہ رخ لطیف پہلو بھی رکھتا ہے اور کثرت الوقوع کے اعتبار سے لطیف پہلو سنگین پہلو پر بلاشبہ غالب ہے۔ اب تو تحریر

جلدی اٹھ آتے ہیں۔ چند سال پہلے تک وہ گرمی ہو یا سردی کلب سے آدھی رات کو لوٹتے تھے اور ظاہر ہے کہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر یا جاگتے رہ کر دروازہ کھولنے کا فرض اور ایثار صرف اہلیہ ہی کا حصہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب جب دروازہ کھٹکھٹاتے تو اہلیہ احتیاطاً اور نیم عادتاً پوچھ لیتیں: "کون ہے؟" ڈاکٹر صاحب شاید دیر سے آنے کے احساس کو دور کرنے یا بیگم کے اس ایثار کی نقد داد دینے کی خاطر ان کے مستقل کون ہے کے جواب میں اکثر کوئی نہ کوئی خوش دلی کا جملہ کہتے۔ کبھی کہتے: "آپ کا سرتاج" کبھی بولتے "آپ کا نیازمند شوہر" کبھی کہتے "جو تمہارے درجن بھر بچوں کا باپ" وغیرہ وغیرہ۔ ایک دفعہ گھر میں ساس آئی ہوئی تھیں۔ اہلیہ نے ماں کی شفقت اور مامتا سے فائدہ اٹھایا اور دروازہ کھولنے کا کام ان کے سپرد کر کے خود سو رہیں (بقول ڈاکٹر صاحب کے ماں بیٹی کی آواز میں مماثلت بہت ہے)، حسب معمول بارہ بجے کے قریب جب ڈاکٹر صاحب نے دروازہ کھٹکھٹایا تو تھوڑی دیر کے بعد ایک نسوانی آواز نے پوچھا "کون ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے کھٹ سے تپاک کے ساتھ جمائی میں خاوند کا ایک بھرپور مترادف لڑھکا دیا ...... اور پھر کئی روز تک وہ جس احساس سے مغلوب رہے اس کی تفصیل نہ پوچھئے۔

کلب کا ذکر آگیا ہے تو اس کو یہیں نمٹاتے چلیں۔ ہوشیارپور سے ڈاکٹر صاحب کو زندگی کے دو نہایت مخلص اور وفادار ساتھی میسر آئے۔ دوسری بیگم اور برج۔ گرمی ہو یا سردی، بادل برس رہا ہو یا آندھی اٹھ رہی ہو، لکھنے پڑھنے کا کوئی ضروری کام ہو یا طبیعت ناساز ہو، ہر حال میں عین اس وقت جب مؤذن نمازِ مغرب کے لئے پکار رہا ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب اپنی سائیکل پر کلب پہنچتے ہیں اور پھر تین ساڑھے تین گھنٹے تک برج میں لگے رہتے ہیں۔ اتوار کے روز البتہ خاص کھیل بھی ہوتا ہے اور دوپہر کے کھانے کے بعد سے نو بجے رات تک مسلسل اور لگاتار جاری رہتا ہے۔ اس طرح آج کل اوسط کوئی چار ساڑھے چار گھنٹے یومیہ سے زیادہ کی نہیں مگر ایک زمانے میں وہ چھ چھ سات سات گھنٹے یہ کھیل کھیلتے تھے اور برسوں ان کے "سگریٹ پان" کا خرچ اس سے پورا ہوتا رہا ("سگریٹ پان" تو خیر یوں ہی محاورۃً) کہ دوسری جنگ سے پہلے کے اٹھارہ بیس روپے ماہوار بڑی چیز ہوتے تھے اور کیا عجب علامہ طنطاوی مصری کی تفسیر (جس سے متاثر ہو کر انہوں نے "روح قرآن" لکھی) اور علامہ یوسف علی کا انگریزی ترجمۂ قرآن جس کے وہ بے حد معترف ہیں، اسی مد سے خریدے گئے ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ وہ اس کھیل میں ہارے بہت کم ہیں۔ ان کی جیت کا ریکارڈ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کا ہے مگر ہار اٹھارہ روپے سے آگے نہ کبھی اور ہار بھی انہیں کسی معمولی آدمی کے ہاتھوں نہیں ہوئی۔ غالباً ۴۸ء کے شروع کا ذکر ہے، راجہ غضنفر علی خاں مرکز میں وزیر تھے اور ان دنوں پنجاب کے دورے پر تھے کہ ایک روز کھیل پر آنکلے۔ دن بھر آس پاس کے مہاجر کیمپوں میں کمبل اور لحاف بانٹتے رہے اور رات کے ابتدائی حصے میں مقامی کلب کے مقامی اور مہاجر کھلاڑیوں سے پیسے جیتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے حصے کے طور پر مبلغ اٹھارہ روپے شاہی نذر کئے۔

برج کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کو شطرنج، شکار اور شمع معمے سے بھی شغف رہا ہے۔ شطرنج پر اب بھی توجہ فرماتے ہیں۔ سال میں دو ایک بار شکار پر بھی نکلتے ہیں البتہ "شمع" والوں کی بے اصولی سے تنگ آ کر انہوں نے معمے حل کرنے ترک کر دئے ہیں۔ بیچ میں کچھ دنوں "بیسویں صدی" اور "آستانہ" سے بھی شغل فرمایا مگر وہ بھی بالآخر بے اصول ثابت ہوئے۔

انگریزی میں یہ خیال ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے کہ ماتحت اپنے افسر کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ اس کو پسند کرے گا یا ناپسند، اس سے محبت کرے گا یا نفرت۔ ڈاکٹر صاحب اس خیال کی زندہ اور نہایت زوردار تائید ہیں۔ وہ پرنسپل کی شخصیت کو بالکل اور ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگر پرنسپل ان کے ڈھب کا ہے یا اس سے ان کے مخلصانہ تعلقات استوار ہو چکے ہیں تو وہ ہر جگہ اور ہر موقع پر اس کی نیک دلی اور انسان دوستی کی تعریف کریں گے۔ اگر ایسا نہیں تو ان کی قوتِ بیان کا ایک خاص حصہ اس کی مردم آزاری کی تشہیر کے لئے وقف رہے گا۔ البتہ اس میں وہ ایک خاص وضع کے پابند ہیں۔ "مردم آزار" پرنسپل جب تک کرسی پر ہیں ڈاکٹر صاحب اس کی قدح میں محتاط رہیں گے۔

صرف ایسی محفل اور موقع پر "حقیقت" کا "انکشاف" کریں گے جس میں ان کے اندازے کے مطابق "سرکاری" آدمی کوئی نہ ہو۔ ورنہ "محفوظ" قسم کی محفلوں میں وہ بڑی حد تک "غیر جانبدار" ہو جاتے ہیں۔ اس میں اخلاقی جرأت کی کمی کو اتنا دخل نہیں جتنا ان کی "امن پسندی" اور کالج کی فضا کو مکدر ہونے سے محفوظ رکھنے کے جذبے کو ہے۔ وہ طبعاً صلح کل اور تعاون پسند ہیں اس لئے اپنی طرف سے کبھی پہل نہیں کرتے لیکن اگر دوسری طرف سے پہل ہو جائے (جو بدقسمتی سے خارج از امکان نہیں) تو وہ برہم ہونے کے علاوہ پریشان بھی ہو جاتے ہیں۔ برہم اس لئے کہ پرنسپل نے ان کے جذبۂ تعاون کی قدر نہ کی اور پریشان اس لئے کہ وہ کسی قیمت پر بھی پرنسپل سے بگاڑنا پسند نہیں کرتے۔ (اور پرنسپل سے ان بن کی صورت میں ماتحت کا تبادلہ ہو جانے لگنے کی دیرینہ روایت ہے) اگرچہ پرنسپل ان کا "وطنی" ہی نہیں، اور بھی بہت کچھ ہے۔ دو سال پیشتر وہ کسی غرض سے کراچی گئے تو ڈیڑھ دو ہفتے میں بے لطف "لوٹ آئے"۔ کسی ذاتی یا سرکاری کام سے لاہور جائیں تو جلدی سے جلدی واپس آنے کی فکر کرتے ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد سے ان کے پاس یہاں ایک فراخ اور عمدہ مکان ہے جس کی دوسری منزل کے بعض حصے مغلیہ فن تعمیر کی یاد دلاتے ہیں اور اپنے تارک وطن ہندو مالک کی خوش مذاقی پر دلیل ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے کلب اور یہاں کی دوستیاں اور تعلقات۔ یہ سب عناصر ان کی "امن پسندی" کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب لاپروا مگر مخلص خاوند اور صد درجہ شفیق اور مہربان باپ ہیں۔ ان کے ماشاءاللہ نو بچے بچیاں ہیں (بچیوں کی تعداد بچوں سے دوگنی ہے) ایک جو سب سے بڑا ہے پہلی بیگم سے ہے جو گزشتہ اٹھارہ بیس برس سے ڈاکٹر صاحب کے گھر کی بجائے گاؤں میں اپنے والد اور ڈاکٹر صاحب کے حقیقی ماموں کے گھر میں رہتی ہیں اور اس دوران میں فقط دو چار مرتبہ اپنے بچے کی علالت کے موقعوں پر یہاں آئی ہیں، باقی آٹھ بچے دوسری بیگم سے ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا پشاور یونیورسٹی میں ایم۔ ایس۔ سی کر رہا ہے اور سب سے چھوٹی بچی نے ابھی پار سال اسکول جانا شروع کیا ہے۔ باقی سات درجہ بدرجہ کالج اور اسکول کے مختلف درجوں میں ہیں۔ ان سب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا سلوک نہایت محبت آمیز اور بے تکلفانہ ہے۔ میں نے تاثیر مرحوم کو اپنے بچوں کا دوست، ہمجولی اور شریر ساتھی پایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بھی اپنے رنگ میں بچوں کے ساتھ خاصے خوش دل اور خوش مزاج واقع ہوئے ہیں۔ میں نے ابھی انہیں لاپروا اور مخلص خاوند کہا ہے۔ مخلص اس لئے کہ میاں بیوی کے درمیان خلوص اور اخلاص کا جو تصور عام اور بجا طور پر پایا جاتا ہے ڈاکٹر صاحب (میرا مطلب دوسری بیگم کی نسبت سے ہے) اس پر پورا اترتے ہیں اور لاپروا اس بنا پر کہ . . . . . ذرا ٹھہرئیے میں اس کی وضاحت ایک مثال سے کرتا ہوں۔ چند سال اُدھر کا واقعہ ہے ایک دوست نے جو کلب میں دیر تک بیٹھنے کے عادی تھے شادی کی لیکن اس کے باوجود کلب سے اپنے "تعلق خاطر" کو کم نہ کیا۔ بیگم صاحبہ ذرا جدید وضع کی واقع ہوئی تھیں، ہفتہ عشرہ تو صبر کر گئیں پھر ایک روز بولیں: "میرا خیال ہے آپ کی شادی مجھ سے ہوئی ہے کلب سے نہیں" شادی میاں بھی عورتوں کی "مساوات" کے جدید تقاضوں سے ناواقف نہ تھے۔ جذبات کی نزاکت کو "فوراً" سمجھ گئے۔ لیکن میرا اندازہ ہے ڈاکٹر صاحب کے سامنے "جذبات کی نزاکت" کو سمجھنے کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوا اور یوں بھی وہ "نزاکتوں" کے قائل نہیں اور جو شخص زندگی اور جذبات کی نزاکتوں سے چنداں سروکار نہ رکھتا ہو اور یوں "معقول آدمی" ہو میرا یقین ہے وہ بطور خاوند کے ضرور لاپروا ہوگا۔

البتہ ایک لحاظ سے وہ بڑے "بیوی پرست" واقع ہوئے ہیں۔ انہیں عورتوں کے سیاسی، معاشرتی یا معاشی حقوق سے تو چنداں دلچسپی نہیں اور نہ وہ تحریک نسواں کے مساواتی نظریہ سے کوئی ہمدردی رکھتے ہیں مگر وہ "بیوی" کو "ماں" کے یا زیادہ واضح لفظوں میں یوں کہ اس کی "ساس" کے "جارحانہ عزائم" سے محفوظ رکھنے کے بہت بڑے حامی اور مؤید ہیں۔ رفقاء میں سے کوئی شادی کرے تو مبارکباد کہنے کے بعد اکثر پہلا سوال یہی کرتے ہیں: "والدہ ماجدہ زندہ ہیں؟" اگر جواب نفی میں ہو اور مخاطب سے بے تکلفی بھی ہو تو اس کو ایک بار اور مبارکباد کہنے میں کچھ مضائقہ نہ سمجھیں گے اور شادی کی کامیابی کی فی البدیہہ پیشگوئی کر دیں گے اور جواب مثبت میں ہو تو ذرا سوچ میں پڑ جائیں گے اور بڑے پرخلوص لہجے میں مشورہ دیں گے کہ جہاں تک ممکن ہو بیگم صاحبہ کو والدہ ماجدہ کے سایۂ عاطفت سے

دوری رکھنے لگا۔ بس شادی کی کامیابی کا یہی گر ہے؟ اور اگر بوڑھے ہوں تو پھر اس بات کا قدرے تفصیل سے ذکر کریں گے کہ ان کی اپنی والدہ محترمہ اپنی تین عدد پیاری بہوؤں کی طلاق کا سامان کر چکی ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی ڈاکٹر صاحب عورت کے متعلق کوئی اونچی رائے نہیں رکھتے۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ اس سے خود ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اونچی رائے قائم کرنے میں کتنی مدد مل سکتی ہے۔

طوالت کے خوف سے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے بعض اور پہلوؤں پر مختصر طور سے لکھتا ہوں۔ اگرچہ میرا ارادہ ان پر قدرے تفصیل سے لکھنے کا تھا۔ وہ شعر و سخن کا بہت عمدہ اور پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں، بڑے زوردار قسم کے عوامی مقرر ہیں۔ سپاس نامہ لکھنے میں وہ ید طولیٰ حاصل ہے کہ چاہیں تو ملا شور بازار جیسے افغان کی چیخیں نکل جائیں[1]۔ پرنسپل کے پاس جب کوئی ایسی تجویز یا سفارش لائیں جس کی منظوری خود ان کی نظر میں مشتبہ ہو تو 'جناب' کا لفظ معمول سے زیادہ فراخ دلی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر ایسے طریق کار کو بھی آزما دیکھتے ہیں جس کو اخلاق پر مضمون لکھتے یا تقریر کرتے وقت وہ جائز نہیں ٹھہراتے۔ بڑے متواضع، ملنسار اور دوست نواز ہیں مگر کبھی کبھی اس وصف حمیدہ کے ڈانڈے 'دھڑا بندی' اور 'ناحق' سے بھی جا ملتے ہیں۔ ایک زمانے میں پڑھنے اور لکھنے دونوں میں محنت اور شوق کی کارفرمائی تھی۔ اب بہ کفایت پڑھتے اور بہ عجلت لکھتے ہیں۔ دیر سے سونے اور دیر سے اٹھنے کے عادی ہیں۔ برسوں سے انہوں نے سورج طلوع ہوتے نہیں دیکھا، سوائے ایسے موقعوں کے جب وہ دوستوں کے اصرار یا اپنے شوق سے سیر و شکار کی کسی مہم میں شریک ہوں اور اس کے لئے صبح سویرے کی کسی گاڑی، بس یا موٹر سے روانہ ہونا ہو۔ دیر سے اٹھ کر پہلے اخبار دیکھتے اور پھر شیو بناتے ہیں۔ اس کے بعد وضو کر کے دو رکعت نماز فجر خاص پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ سردیوں میں بس یہی دو رکعت ان کا 'چھٹکارا' ہے۔ البتہ گرمیوں میں رات کو جب کلب سے لوٹتے ہیں تو کھانا کھانے سے پہلے اور غسل کرنے کے بعد اکثر دو رکعت بطور نماز عشا کے ادا کرتے ہیں۔ نماز جمعہ کے وہ قطعی 'تارک' ہیں۔ گذشتہ چودہ برس سے انھوں نے مسجد میں قدم نہیں رکھا۔ روزے کی بجائے وہ ایک روپیہ یومیہ فدیہ ادا کرتے ہیں۔

آخر میں میرا جی چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے مذہبی افکار و خیالات پر بھی کچھ کہوں مگر اس مضمون کے اصولی اور تکنیکی تقاضے اس امر کے مانع ہیں۔ البتہ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ میرے نزدیک وہ بعض سچے دعووں کے قدرے کمزور وکیل ہیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ اول یہ کہ کوئی یا خیال جس قدر اونچا اور بلند ہوگا اسی قدر اپنے حق میں اونچے اور بے داغ استدلال کا تقاضا کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے سے بڑے اور عمیق سے عمیق خیال کی حمایت میں ایک آدھ محکم دلیل دینے کے بعد تھک سے جاتے ہیں اور پھر اس شاعر کی طرح جو غزل میں دو ایک اچھے شعر کہہ چکنے کے بعد بھرتی کے اشعار پر اتر آتا ہے، وہ ایسے دلائل دینے لگتے ہیں جو اپنے اندر کچھ زیادہ وزن اور واقعیت نہیں رکھتے۔ غور سے دیکھا جائے تو غزل اور سنجیدہ مضمون نگاری میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ غزل میں ایک آدھ کام کا شعر بھی نکل آئے تو بقول مولانا حالی ساری غزل جگمگا اٹھتی ہے اور بالفرض وہ نہ بھی جگمگا اٹھے تو بھی اس کے برے شعروں کا اس کے اچھے شعروں پر چنداں برا اثر نہیں پڑتا۔ لیکن سنجیدہ مضمون میں خواہ اس کا تعلق مذہب و فلسفہ سے ہو یا کسی اور علم سے صرف ایک بودی دلیل کے ہونے سے سارے مضمون کے وقار اور قدر و قیمت کو دھکا لگتا ہے۔ دوسرے اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا انداز بیان اپنے اندر ایک خاص طرح کی شگفتگی اور ادبیت رکھتا ہے مگر بحیثیت مجموعی اس میں گھن گرج زیادہ ہے اور نرمی اور دل سوزی کم ہے۔ گھن گرج بھی زندگی اور ادب میں ایک مقام رکھتی ہے مگر اس کے علاوہ بھی

---

[1] چند سال پہلے اپنے دورۂ پاکستان کے وقت جب ملا صاحب یہاں تشریف لائے تو حکام ضلع کی سفارش و درخواست پر ڈاکٹر صاحب نے ان کی خدمت میں بزبان فارسی ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ اس میں مشرقی پنجاب کے مظالم کا ذکر کچھ اس انداز سے تھا کہ ملا صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

بہت سے مقامات ہیں اور ایک مبلغ کا، ایک ایسے شخص کا جو دلوں کی کھیتیاں سیراب کرنے اور عقائد و اخلاق میں تبدیلی پیدا کرنے کا خواہاں ہو ان مقامات سے بطورِ خاص آگاہ ہونا ضروری ہے۔ قرآن حکیم نے دین کی نشر و اشاعت کو حکمت اور محبت دونوں کا پابند بنایا ہے اور اس کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ 'دشمن تمہارا جگری دوست بن جائے'، علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے ۔۔۔

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ڈاکٹر صاحب 'کوہ و بیاباں' میں تو 'سیلِ تند رو' بن جاتے ہیں مگر راہ میں 'گلستاں' آ جائے تو 'جوئے نغمہ خواں' نہیں ہو پاتے ——— اس کے باوجود مذہبی تعصب اور تنگ نظری کے خلاف انہوں نے اپنے رنگ میں جو جہاد کیا ہے اور انسان دوستی کے جس جذبے کے وہ علمبردار ہیں اس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

اے آر خاتون

زبیدہ خاتون

ایک بیٹی کا اپنی ماں کے صحیح نقش و نگار اور جیتی جاگتی تصویر کو لفظوں میں پیش کرنا ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کو ظاہر کرنا کچھ عجیب سی بات ہے بلکہ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اور پھر اے آر خاتون کی شخصیت تو بالکل بحر اوقیانوس کی طرح گہری ہے، بلکہ ایک معمہ ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی کن کن عادات کو خوبیوں کے دفتر میں داخل کیا جائے اور کس بات کو کمزوری سمجھا جائے۔ یہ دونوں باتیں ان میں اس قدر گتھی ہوئی ہوتی ہیں کہ ان کو سلجھا کر الگ الگ کرنا ذرا وقت اور دیر طلب کام ہے، کیوں کہ کوئی بھی انسان خوبیوں اور برائیوں سے پاک نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ فیصلہ تو پڑھنے والے ہی خوب کر سکیں گے۔ مگر سچی سچی بات کہہ دینے میں کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک باعمل انسان ہیں اور انہیں ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا ایک مرض سا ہے۔ وہ ہر ایک سے یہی کہتی ہیں کہ "کوئی نہ کوئی کام کرتے رہو اور کچھ نہ ملے تو کھیل ہی کھیلو"۔ اگر کھیلنے والے کوئی توجہ نہیں دیتے تو وہ خود کوئی کھیل شروع کر دیتی ہیں، اگر کوئی ان کا ساتھ نہ دے۔ تو بچوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیتی ہیں، بچے تو اس کے منتظر ہی رہتے ہیں کہ گھر کا کوئی خاص فرد ان کے کھیل میں دلچسپی لے۔

وہ چپکے ہی چپکے اپنے کام میں ایسے مصروف رہتی ہیں کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ اور دیکھنے والوں کو ان کا کیا ہوا کام ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جن آ کر کر گیا ہو۔ بعض وقت تو ان کے مسلسل کام ہی کام سے دیکھنے والوں کی طبیعت اکتا جاتی ہے، مگر ان کی کوشش اور مستقل مزاجی میں ذرہ برابر فرق نہیں آنے پاتا۔ چاہے کتنا بھی کوئی انہیں اس کام سے بیزار کرانے کی کوشش کرے، طرح طرح سے اس کام کے عیوب ان کے سامنے ظاہر کرے، مگر توبہ کیجیے وہ بغیر کسی کی بات کا جواب دیئے اپنے کام میں مصروف رہتی ہیں اور اس کو مکمل کر کے ہی چھوڑتی ہیں۔

مشغول و مصروف رہنا ان کی عادت ہے ان کا کہنا ہے کہ بیکاری سے انہیں الجھن ہوتی ہے صحت پر خراب اثر پڑتا ہے اچھی بھلی پریشانیاں

اور آنکھوں سے بچنے کے لئے انھوں نے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی عادت ڈال لی ہے۔

انھوں نے ہمیشہ زندگی کو خوشگوار اور آسان بنانے کی سعی کی ہے اور اب تک اسی جدوجہد میں کوشاں رہتی ہیں اس راہ میں انھیں بڑی بڑی رکاوٹیں بھی پیش آتی ہیں، مگر وہ بڑے صبر و استقلال سے اپنی دھن میں لگی رہتی ہیں۔ نہ جانے اُن میں چیونٹی کی سی ہمت کہاں سے آگئی ہے۔

وہ بہت جلد آنکھوں ہی آنکھوں میں مشکل سے مشکل کام سیکھ لیتی ہیں اگر کسی کو بڑے جدید اور نرالی قسم کا سلا ہوا کپڑا پہنے دیکھیں گی اور وہ انھیں پسند آجائے گا (کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جدید طرز کا فیشن انھیں پسند آجائے) تو یقین مانئے کہ بالکل ویسا ہی بلکہ اس سے بہتر جب تک وہ اپنے ہاتھ سے تیار نہیں کریں گی انھیں چین نہیں آئے گا۔ ان میں سیکھنے کا شوق اور تجسس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ہر کسی کی وہ بات یا کام جو انھیں پسند آجائے ضرور سیکھ کر دم لیں گی "جستجو" بھی اُن کی ایک فطرت ہے۔ وہ دُنیا کی ہر قسم کی معلومات و حالات اپنے میں جذب کرلیتی ہیں خبروں یا کسی میچ کی کمنٹری کے وقت اگر انھیں تلاش کیا جائے تو وہ ریڈیو کے پاس بیٹھی ہوئی بڑی دلچسپی سے خبریں یا کمنٹری سنتی ہوئی ملیں گی۔

گھر کے دوسرے لوگوں کی زیادہ تر یہی خواہش ہوتی ہے کہ گھر میں رسالے یا کتابیں کم آیا کریں کیونکہ وہ کتاب کا کیڑا بھی ہیں کوئی کتاب ہاتھ لگ جانی شرط ہے۔ وہ اس کو ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اگر کبھی کوئی بے حد موٹی ناول کتاب مل جائے گی (چاہے وہ عنوان ہی چشم کا کیوں نہ ہو) ایسا معلوم ہوگا جیسے امی گھر میں موجود نہیں ہیں۔ کبھی کبھی کوئی کہہ اٹھتا ہے "ارے یہ موٹی موٹی کتابیں کہاں سے آجاتی ہیں۔ خدا کے لئے انھیں منع کیا کرو۔" مگر امی تو چشمہ لگائے کتاب میں اس قدر غرق ہوتی ہیں کہ انھیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کوئی کیا کہہ رہا ہے یا ان کے اردگرد کیا ہورہا ہے۔ کتاب ختم ہونے کے بعد وہ ان کے ذہن میں اس قدر سما جاتی ہے کہ اکثر کئی کئی دن وہ اسی کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔ کتابوں کی وجہ سے وہ اپنا آرام تک بھول جاتی ہیں (جس کی انھیں اشد ضرورت ہے) انھیں یہ تک خبر نہیں ہوتی کہ وہ کہاں ہیں، کیا کرنا ہے، ضروری سے ضروری کام کتاب ہاتھ میں آکر کچھ دیر کے لئے اُن کے ذہن سے نکل جاتا ہے۔ وہ اپنا اچھا خاصا وقت باورچی خانہ میں بھی صرف کرتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے کاموں میں بھی گھری رہتی ہیں جیسے لکھنا پڑھنا، خطوط کے جواب دینا، یا کسی آئے گئے سے بات چیت کرنا" اور کوئی نہ کوئی کھانا بھی پکتا رہتا ہے یا کسی کھانے میں جدت ہوتی رہتی ہے ورنہ کسی غیر ضروری اور بچے ہوئے کھانے کی شکل اور ذائقہ تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ مثلاً رات کا بچا ہوا قورمہ صبح کے کھانے پر بہترین پلاؤ کی صورت میں ملے گا۔ یا دن کی بچی ہوئی دال رات کو کریلوں میں تبدیل ہوجائے گی۔ سالن کے بچے ہوئے آلو یا اروی شام کی چائے پر پکوڑوں اور چاٹ کا کام دیں گے۔ اور روٹیاں کبابوں کی شکل اختیار کریں گی صبح کے دودھ پر سے اتری ہوئی بالائی اگر کسی نے نہیں کھائی ہے تو وہ دوپہر کے کھانے پر پراٹھوں میں نظر آجائے گی اگر کوئی کسی قدر بھی کوشش کرے مگر ان کھانوں کی اصلیت ہرگز نہیں پہچان سکے گا۔ ان کے یہ سب کام ایک ہی وقت میں چلتے رہتے ہیں۔

ایک مرتبہ محرم کے مہینے میں شاید دس تاریخ کو دوپہر کے کھانے سے گھنٹہ دو گھنٹہ قبل نیاز کے سلسلہ میں کہیں سے کوئی چیز آئی اس کو دیکھ کر ہم میں سے کسی کی زبان سے نکلا "کاش یہ کھچڑا ہو" اور اس کو صرف کھیر پاکر ہم لوگ اچھے خاصے مایوس ہوگئے۔ مگر جس وقت سب کھانا کھانے بیٹھے تو دیکھا کہ دو ڈونگے بھرے بہترین قسم کے خوشبودار کھچڑے کے میز پر موجود ہیں۔ ہم سب نے حیرت سے امی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے مسکرا کر صرف اس قدر کہا "تم سب کا کھچڑا کھانے کو جی چاہ رہا تھا مجھ سے جس طرح بھی ہوسکا کھچڑا تمہارے واسطے تیار کردیا۔ کیونکہ میں جانتی ہوں تم لوگوں سے خود تو کوئی کام نہیں ہوسکتا بس زبانی ہی چاہ کر رہ جاتا ہے۔"

چنانچہ خوب ہی جی بھر کر وہ مزیدار کھچڑا کھایا گیا اور ایک حضرت کے تو پیٹ میں درد تک کی نوبت آگئی مگر انھوں نے کھچڑے سے ہاتھ نہیں روکا مگر ہم میں سے کسی کو آج تک یہ پتہ نہیں چلا کہ اس دن والا لذیذ کھچڑا جس کے تیار [illegible] ہے ایک مدت درکار ہوتی ہے کون سے

بچے ہوئے اور بے مصرف گھرانے کی روح تھا۔

ان سب کاموں اور باتوں کے باوجود ان کا دماغ کسی اور ہی فکر میں رہتا ہے اس کی کسی کو خبر نہیں ہوتی ممکن ہے کسی ناول یا افسانے کا پلاٹ اس میں گھومتا ہو۔ یہ وہ کسی کو نہیں بتاتیں۔ ان میں قوتِ برداشت کافی سے زیادہ ہے وہ اکثر لوگوں کی کڑوی کسیلی بات بھی سن کر خاموش ہو جاتی ہیں، بلکہ شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتی ہیں۔ ان کا مقصد ہے کہ زندگی میں کسی سے مخالفت اور دشمنی نہیں پیدا کرنی چاہیے بلکہ ایسی بات ہی نہیں کرنی چاہیے جس سے شر و فساد کی بو آئے اور اگر اس کوشش کے باوجود مجبوراً کسی سے بدمزگی ہو جائے تو تمام عمر کے لئے اس سے تعلقات ختم کر لینے چاہئیں۔ ان کی اس بات سے ایک قسم کی غیرت و خودداری پائی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ خود اس کو اپنی ایک بڑی کمزوری سمجھتی ہیں۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ خاندان کے تمام افراد ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ کبھی کسی کے منہ سے ان کے بارے میں شکایت کے الفاظ نہیں سنے گئے بلکہ اکثر لوگ ان کی حد سے بڑھی ہوئی تعریف کرنا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ عام طور سے وہ خاصی کم گو ہیں وہ کبھی کسی سے بڑھ کر بات کرنے میں پہل نہیں کرتیں۔ کسی محفل یا جلسہ وغیرہ میں انجان لوگوں کے سامنے وہ گھنٹوں خاموش بیٹھی رہتی ہیں۔

بعض وقت ان کی خاموشی کچھ ناجائز سی معلوم ہوتی ہے بلکہ وہ کچھ الجھی ہوئی اور بیزار سی نظر آتی ہیں جس کو سب ہی محسوس کرتے ہیں اور وہ اپنی اس عادت سے کبھی کبھی اچھا خاصا نقصان اٹھا لیتی ہیں کیونکہ وہ مغرور تو بالکل نہیں ہوتیں مگر وہ مجبور ہیں اپنی فطرت کو کس طرح بدل سکتی ہیں۔ انہیں خود اس بات کا احساس ہے اس کو بھی اپنی بڑی کمزوری سمجھتی ہیں۔

دیکھنے والے پہلی نظر میں انہیں کچھ مغرور اور متکبر ضرور سمجھتے ہوں گے مگر جتنا زیادہ وقت وہ ان کے ساتھ گزارتے ہوں گے ان کی رائے یقینی طور پر بدل جاتی ہوگی کیونکہ طبعاً وہ منکسر المزاج ہیں۔

اکثر لوگ ان سے ملنے یا آٹو گراف وغیرہ کی قسم کی چیزوں کے لئے ان کے پاس آتے رہتے ہیں جس میں زیادہ تر کالج کے لڑکے لڑکیوں کا حصہ ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر گھر والوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کچھ تکلف کر کے آنے والوں سے ملیں مگر ان کا جواب ہوتا ہے "نہیں میں جس حالت میں ہوں اسی طرح سب سے ملوں گی میرا یہی دستور ہے میں لوگوں پر بناوٹی رعب جمانا نہیں چاہتی۔" اور وہ اسی حالت میں سب سے ملتی ہیں چاہے اس وقت وہ باورچی خانہ میں بیٹھی پسینہ میں شرابور ہی کیوں نہ ہو رہی ہوں یا ہاتھ میں کھرپی لئے کسی کیاری وغیرہ میں پانی لگا رہی ہوں۔ گھر والے ان کی اس عادت سے جز بز ہو کر رہ جاتے ہیں مگر ان کو ایسی باتوں کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی۔ وہ اپنے لئے کسی قسم کا اہتمام نہیں کرتیں بہت ہی سادہ قسم کا لباس پہنتی ہیں مگر دوسروں کے لئے بناؤ سنگار اور تکلفات کو ایک قسم کا ہنر اور سلیقہ خیال کرتی ہیں۔

وہ وقت اور موقعہ پر ہر قسم کی عادت ڈال لیتی ہیں اور زمانہ کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں مگر حد سے تجاوز نہیں کرتیں۔ بلکہ وقت کی بہتر اور آسان روش اختیار کرتی ہیں اسی وجہ سے انہوں نے اپنے کوئی سخت اصول نہیں بنائے جو بدلے نہ جا سکتے ہوں وہ کہتی ہیں کہ یہ سخت اصول بعض وقت انسان کو بڑی ذہنی الجھن میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

ان کے پاس آنے والے لڑکے لڑکیاں انہیں جدید قسم کی الٹرا فیشن سمجھ کر خاص تیاری کر کے ملنے آتے ہیں اور ان کی سادگی اور گھریلو پن دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے ہیں۔ مگر جیسے جیسے وہ ان سے بات کرتے ہیں، ان کی شخصیت سب پر چھانے لگتی ہے اور ان سے مل کر کوئی مایوس نہیں ہوتا بلکہ لوگ گرویدہ ہو جاتے ہیں، وہ عمر اور شخصیت کو ملحوظ رکھ کر سب سے بات کرتی ہیں لڑکے لڑکیاں ان کی صحبت میں بے تکلف ہو سکتے ہیں اور بڑی عمر والے انہیں خود سے زیادہ تجربہ کار اور ہوش مند سمجھتے ہیں۔ ان کی گفتگو سطح سے ابھری ہوئی، کھلی اور صاف ہوتی ہے۔

وہ اپنے آپ کو کسی سے بہت بے تکلف نہیں ہونے دیتیں، ان کا خیال ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی اکثر بدمزگی کا پیش خیمہ ہوتی ہے وہ کسی کی بات میں قطعی مداخلت نہیں کرتیں اگر ان کے سامنے دو شخص آپس میں لڑتے ہوں تو انہیں بالکل اعتراض نہیں ہوگا۔ ان کا

مشاہدہ بے حد صحیح ہے وہ چہرہ دیکھ کر بڑی آسانی سے انسان کے عادات و اطوار کا پتہ لگا لیتی ہیں بقول شخصے وہ اڑتی چڑیا کو پہچان لیتی ہیں۔ ان کی نگاہوں سے بچ کر اور چھپ کر کوئی کام کرنا بڑا مشکل ہے، وہ ایک ہی نظر میں سب کچھ تاڑ جاتی ہیں۔ اور حافظہ تو ایسا پایا ہے کہ رشک آتا ہے معلوم نہیں کس کس زمانہ کی لوگوں کی سنی سنائی باتیں تک انہیں ازبر رہتی ہیں اور واقعات تو انہیں ایسے یاد رہتے ہیں جیسے وہ ابھی ہو چکے ہوں۔

صحت خراب ہو جانے کی وجہ سے وہ اب بعض وقت زیادہ پریشان ہو جاتی ہیں اور اسی وجہ سے وہ مجمع عام میں جانے سے پرہیز کرتی رہتی ہیں اور اچھی اچھی ادبی محفلوں سے گریز کر جاتی ہیں۔ بارہا ریڈیو کے پروگرام جو انہیں اکثر پیش ہوتے رہتے ہیں مسترد کر دیتی ہیں۔ ان میں قوتِ تقریر بہت کم ہے وہ اپنے آپ کو برسرِ عام پیش نہیں کر سکتیں۔ وہ بحالتِ مجبوری کسی بڑے جلسہ یا پارٹی وغیرہ میں شرکت کرتی ہیں۔ ان کی طبیعت میں روک ٹوک اور جھجک کافی سے زیادہ ہے وہ کبھی بے دھڑک اور آزادی سے کوئی کام یا بات چیت نہیں کر سکتیں۔ وہ سوچ بچار کی عادی ہیں۔

یہ تو تھیں اُن کی عادتیں اور خصلتیں مگر اب آخر میں اُن کے مختصر خاندانی حالات بھی لکھنے ضروری ہیں تاکہ اس تاریکی میں بھی روشنی پڑ جائے۔ ان کا نام امت الرحمٰن ہے وہ سنہ ۱۹۰۰ء میں دہلی کے محلہ کوچہ چیلان میں خواجہ میر درد کی بارہ دری کے قریب اپنے دادا صاحب کے مکان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے دادا مولوی محمد یوسف صاحب، شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی کے نواسے شاہ اسحاق صاحب کی اولاد میں تھے۔ اور ان کی دادی صاحبہ خواجہ میر درد صاحب کی اولاد میں تھیں۔ امّی صاحبہ کی عمر مشکل سے سات سال کی ہوگی کہ ان کے والد مولوی محمد سلیمان صاحب کا انتقال ہو گیا اور جب وہ چودہ سال کی ہوئیں تو والدہ کی شفقت سے بھی محروم ہو گئیں۔ ان کی شروع کی تعلیم اور پرورش ریاست بھوپال میں ہوئی کیونکہ ان کے دادا صاحب بھوپال میں مجلس علماء کے رکن اور جاگیردار تھے۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ اپنی دادی صاحبہ کے ساتھ مکہ معظمہ چلی گئیں اور تین سال تک وہاں رہیں۔

اُنیس کی عمر میں اُن کی شادی اپنے ماموں خان بہادر ڈپٹی سید بہاء الدین کے لڑکے سید ظہیر الدین سے ہو گئی۔

یہ ہیں اُن کے مختصر سے خاندانی حالات، شادی کے بعد ہماری امّی زیادہ تر دہلی سے باہر رہیں۔ کیونکہ ہمارے پاپا یو پی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ امّی کو بچپن ہی سے تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ مگر خاندانی روایت کے مطابق اس زمانہ میں لڑکیوں کو اسکولوں کی تعلیم دلانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے انہوں نے جس قدر بھی سیکھا اور لکھا پڑھا سب اپنے شوق اور محنت کا نتیجہ ہے۔ ان کے مضامین وقتاً فوقتاً رسالہ عصمت میں شائع ہوتے رہے۔ "ہماری بی" "... کا پرچہ" اور "شمیم کی شورش" خاص طور پر مقبول ہوئے۔ ان کا پہلا ناول "شمع" سنہ ۱۹۳۹ء ہی میں مکمل ہو گیا تھا مگر دوسری جنگ عظیم کا آغاز تھا اور اسی جنگ کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگی میں بھی کشمکش اور انقلاب پیدا ہونے لگا۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں ہمارے پاپا جو آرمی میں کیپٹن بھی تھے لڑائی کے سلسلے میں ملایا بھیج دیئے گئے۔ امّی اور ہم پانچوں بھائی بہن دہلی میں اپنے دادا خان بہادر سید بہاء الدین صاحب کے پاس رہے اور ایک سال تک کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا اور پھر امّی نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے علی گڑھ میں کوٹھی بنا کر وہاں کی سکونت اختیار کر لی۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں سنگاپور انگریزوں کے قبضہ سے نکل کر جاپانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا یعنی انگریزی فوجوں نے شکست کھائی۔ تقریباً تین سال تک ہم لوگ اپنے پاپا کی طرف سے ایک امید و بیم کی حالت میں وقت گزارتے رہے۔ اس عرصہ میں "شمع" اور اس کے بعد "تصویر" شائع ہو چکی تھیں۔ تین سال بعد انگریز حکومت نے پاپا کے لڑائی میں کام آنے کا اعلان کر دیا۔ اور امید کی ننھی سی آخری کرن بھی ہمیشہ کے لئے ڈوب گئی۔

اب امّی کی زندگی میں ہر طرف انقلاب اور مشکلات کا طوفان تھا۔ جو ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لئے بھی ایک انقلاب کا پیش خیمہ بن گیا یعنی اسی زمانہ میں پاکستان وجود میں آگیا۔ وہ بھی اپنے دوسرے مسلمان بھائی بہنوں کی طرح وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں اور لاہور میں

سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں مگر انہیں جن جن مشکلات اور پریشانیوں اور جد و جہد کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ مشکل ہی سے کسی خاتون کو کرنا پڑا ہوگا اور انہیں اب تک کسی قسم کا ذہنی سکون میسر نہیں ہوا ہے ابھی۔ مشکلات اور اُلجھنوں کی وجہ سے اب اُن کی صحت بالکل خراب ہو گئی ہے اُن کے اعصاب پر بہت خراب اثر پڑا ہے۔ مگر وہ اپنی تکالیف کو ٹالنے کی بہت کوشش کرتی ہیں۔ اور اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ باوجود ہر قسم کے تفکرات اور پریشانیوں کے جو انہیں گھیرے رہتی ہیں، انہوں نے کبھی اس کا عکس دوسروں پر نہیں پڑنے دیا، بلکہ اپنی اولاد تک کو اس کے اثر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں، وہ خود ہر مشکل بہت ہنس کھیل کر جھیل لیتی ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اُن جیسی بلند حوصلہ باہمت اور وسیع النظر خاتون مشکل سے ملے گی۔

اس چھوٹے سے خاکہ میں اگرچہ ابھی بہت کچھ تشنگی باقی ہے پھر بھی اے۔ آر۔ خاتون کی دھندلی سی جھلک ضرور ملے گی۔ مگر اس کو پڑھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ "گھٹنے پیٹ کی طرف جھکتے ہیں۔"

(۳)

ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے

اقبال

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

(سید احتشام حسین)

اکبر کو اپنے عہد کے الٰہ آباد میں اپنے اور امرودوں کے سوا بہبود کے دوسرے سامان بالکل نظر نہ آئے۔ مجھے معلوم نہیں اکبر سے پہلے الٰہ آباد میں کسے ایسی شہرت اور اہمیت حاصل تھی جسے وہاں کے امرودوں کے ساتھ یاد کیا جاتا رہا ہو اور یہ بات بھی تحقیق طلب ہے کہ الٰہ آباد کے امرودوں کو کس زمانے میں وہ انفرادیت نصیب ہوئی جب ان کا ذکر دوسری جگہ کے امرودوں سے الگ کیا جانے لگا لیکن اپنے عہد کے الٰہ آباد کے متعلق یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں کے جن لوگوں کو جانے بغیر الٰہ آباد کی معرفت ادھوری رہ جائے گی ان میں ایک ذات پروفیسر ڈاکٹر سید اعجاز حسین ایم اے ڈی لٹ، صدر شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی کی بھی ہے۔ امرود اب بھی اپنی جگہ پر ہیں لیکن انسان ایک دوسرے کے لئے جگہ خالی کرتے رہتے ہیں۔ اعجاز صاحب (اس سارے مضمون میں انہیں اسی نام سے یاد کیا جائے گا) شاید وہ امرود کے ساتھ اپنی اہمیت کے قائل نہ ہوں لیکن وہاں کے امرودوں کی برائی نہیں سن سکتے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ پہلے اکبر کی برائی سن لیتے تھے، اب الٰہ آبادیت کے غلبہ کی وجہ سے یہ بھی گوارا نہیں۔ بہرحال ذکر ہے اعجاز صاحب کا اور ان کی انفرادیت کے پیش نظر میں انہیں اکبر یا امرود کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرنا چاہتا اگرچہ ان کا تعلق دونوں سے ہے۔ اکبر پر انہوں نے ہندی میں ایک کتاب لکھی ہے اور امرودوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں، اکبر کو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، امرود کھاتے اور کھلاتے ہیں۔

اعجاز صاحب کو میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۳۳ء میں دیکھا اور پہلی ہی ملاقات میں مجھے ان کی ان خصوصیات کا اندازہ ہو گیا جنہیں میں اب بھی ان کی ذات اور شخصیت کا جزو سمجھتا ہوں، یہ خصوصیات شعر و ادب سے متعلق نہیں، انسان کی روزمرہ کی اخلاقی، سماجی اور عملی زندگی سے وابستہ ہیں۔ یہاں اپنے متعلق کچھ لکھنا ناگزیر ہوگا اور اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

اعظم گڑھ سے ۱۹۳۱ء میں ہائی اسکول کرنے کے بعد میں نے مزید تعلیم کے لئے الٰہ آباد کا رخ کیا، وہاں کچھ آسانیاں تھیں اور میری قدرت محدود زندگی کے لئے ایسا ہی علمی اور سیاسی مرکز میں ایک کشش رکھتا تھا چنانچہ وہاں دو برس گورنمنٹ انٹر کالج میں پڑھتا رہا۔ اسی دو سال میں اعجاز صاحب کا نام تو میں نے کبھی کبھی سنا لیکن ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ چوک میں کتابوں کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی۔ آتے جاتے میں اس پر بھی ٹھہر جاتا تھا۔ کتابیں خرید تو مشکل سے سکتا تھا لیکن نگاہوں کی دعوت ہو جاتی تھی۔ ایک دن ایک نئی کتاب نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ دیکھا تو ایک تازہ تصنیف

تھی "آئینۂ معرفت"۔ مصنف کا نام سید اعجاز حسین۔ دوکان پر جو بزرگ میاں بیٹھے تھے، انہوں نے مجھے بہت زیادہ پُر شوق دیکھ کر چند جملے کتاب کی تعریف میں کہے اور مصنف کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیا۔ میں نے اُن کی آنکھیں بچا کر اپنی جیب ٹٹولی تو کتاب کے لئے دام بھی نہ تھے، چرا لیا اور اس کتاب کے پڑھنے کے لئے بہتر وقت کا انتظار کرنے لگا۔

انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ کا سوال تھا۔ وہ سہارا ختم ہو چکا تھا جس کے بھروسہ پر الٰہ آباد میں تھا۔ کوئی نوکری تلاش کروں یا پڑھوں۔ اسی کشمکش میں تھا کہ میرے دو بھائی اور دوست سید محمد شفیع مرحوم اور سبط حسن آ گئے اور انہوں نے اصرار کیا کہ بی اے میں نام لکھواؤ، کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ یہ وہی سبط حسن ہیں جو پاکستان کی جیلوں میں کئی سال کی قید و بند جھیل کے اب لاہور میں ایک صحافی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ شفیع بھائی مرحوم نے اسی سال بی اے پاس کیا تھا، سبط حسن بی اے میں پڑھ رہے تھے۔ جب یہ لوگ الٰہ آباد جانے لگے میں بھی ساتھ ہو لیا۔ یونیورسٹی پہنچ کر نام لکھا لیا۔ بورڈنگ ہاؤس کے اخراجات میرے امکان میں نہ تھے۔ چاہتا تھا کہ دوسرے طلباء کے ساتھ کہیں قیام کروں اور تعلیم کا سلسلہ جاری رکھوں۔ شام کے وقت شفیع بھائی مرحوم مجھے ساتھ لے کر نکلے اور اپنے بعض جاننے والوں سے یہ کہہ کر میرے قیام کی کوئی صورت نکل سکے۔ جب کئی دوستوں سے مل ملا کر واپس آنے لگے تو شفیع بھائی مرحوم نے کہا چلو تمہیں اعجاز صاحب سے بھی ملا دیں، بہت اچھے آدمی ہیں۔ اعجاز صاحب ان دنوں محلہ [illegible] میں گنگا کے کنارے اپنے ننہال مکان میں رہتے تھے۔ اندر مکان بہت بڑا تھا لیکن باہر ایک کمرہ تھا جس میں کچھ زیادہ سامان نہ تھا۔ ایک میز اور چند کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی ہوتی تھیں۔ لکھنے پڑھنے کا سامان تھا نہ کتابیں۔ سامنے کھلی جگہ تھی جہاں سے دریائے گنگا اور اس کے گرد و پیش کا برساتی منظر دکھائی دے جاتا تھا۔ اطلاع کراتے ہی اعجاز صاحب باہر تشریف لائے۔ اخلاق اور گرمجوشی سے ملے، ایسا اخلاق جو تصنع سے بے نیاز ہوتا ہے، صاف شفاف شیشے کی طرح جس کے پار دیکھا جا سکتا ہے۔ کمرے کے بجائے ہم لوگ صحن میں بیٹھے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ اس دن کیا کیا باتیں ہوئیں لیکن یہ یاد ہے کہ جب میرے قیام کے لئے کسی جگہ کی تلاش کا سوال آیا تو کہا کہ جب تک کہیں انتظام نہیں ہو جاتا، یہیں رہیں، یہ کمرہ خالی ہی تو رہتا ہے۔ کچھ تکلفات اور عذر و معذرت کے بعد یہی طے ہوا۔ اعجاز صاحب کا اصرار دوسرے خیالات اور تاملات پر غالب آیا۔ میں چند دنوں میں وہیں اٹھ آیا اور چند دن قیام کا ارادہ کم و بیش چھ سال کے قیام میں تبدیل ہو گیا۔

انہی دنوں ایک اور لطیفہ پیش آیا۔ گرمیوں کی تعطیل کے زمانے میں جب وطن میں قیام تھا اور کچھ عزیزوں اور دوستوں نے اُکسایا تھا کسی جلسہ میں یہ طے پا گیا کہ چند مہینے تک بال نہ ترشوائے جائیں۔ بالوں پر تقریباً دو مہینے گذر چکے تھے جب میں اعجاز صاحب کے یہاں آیا۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ جو کسی کو [illegible]۔ چند دن تو اعجاز صاحب نے میرے بالوں کی بے ترتیبی بڑھاؤ کو غور سے دیکھا اور سوچا کہ شاید کوئی زبردست انقلابی اور شکستہ سری شاعری ہے لیکن جب اور باتوں کی کوئی خاص علامت مجھ میں نظر نہ آئی تو انہوں نے بڑی نرمی اور آہستگی سے کہا، احتشام صاحب آپ بال کیوں نہیں کٹواتے؟ میں جانتا تھا کہ کبھی نہ کبھی یہ سوال ضرور اٹھے گا، میں نے کہا فرصت نہیں ملی، اگلے اتوار تک بنوا لوں گا، اور اگلا اتوار بھی گذر گیا۔ اب کچھ ایسا تھا کہ اعجاز صاحب سے دیر دیر تک باتیں ہوتی تھیں، گھر، خاندان، تعلیم، ادبی دلچسپی اور تفریحی مشاغل کا ذکر آتا تھا۔ آخر انہوں نے ایک دن کسی قدر سختی سے کہا، آخر بات کیا ہے کہ آپ بال نہیں ترشواتے، کیا پیسے نہیں ہیں؟ میں نے سوچا اب اتنی کڑی چھوڑ کر کسی شرط کی پابندی اس طرح کی جائے کہ دیکھنے والوں کو ناگوار گذرے، حماقت ہے۔ میں نے کہا، کل ضرور بنوا لوں گا۔ اتفاقاً دوسرے دن دوستوں کے دستخط سے خط آ گیا کہ بال کٹوا ڈالو کیونکہ ایک صاحب کو ناگوار ہو گیا اور لڑکوں نے رسم "مو تراشی" ادا کر دی، اب کسی پابندی کی ضرورت نہیں۔ میں نے اعجاز صاحب کو وہ خط دکھایا اور بال ترشوانے چلا گیا۔ انہوں نے اس عجیب و غریب عہد و پیمان سے جو لطف لیا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔

یہ مضمون لکھنا پڑا کہ چند ہی دن میں مجھے اعجاز صاحب کے مزاج، انداز فہمائش اور انداز گفتگو کا اچھا خاصا اندازہ ہو گیا۔ وہ ذرا کسی کے ذاتی معاملات میں ضرورت سے زیادہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ وہ اس طرح اپنی بات کہتے ہیں کہ ناگوار ہونا تو یہ ظاہر ہونے دیتے ہیں کہ ان کو بھی مجھ سے کیا مطلب۔ مزاج کی یہی وہ خصوصیت ہے جو ان کے دوستوں اور شاگردوں کو ان کا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ اعجاز صاحب اپنی محبت، شفقت اور ذاتی توجہ سے ہر شخص کی نجی زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں اور بہت جلد تکلف، تصنع اور دوری کی وہ حدیں ٹوٹ جاتی ہیں جو ابتدائی ملاقات میں دیواریں بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ان کے تمام دوستوں اور شاگردوں نے اس سحر کاری کا تماشا دیکھا ہے۔

بی اے میں میں نے جو مضامین لیے تھے ان میں اردو ادب بھی تھا۔ مجھے اردو سے دلچسپی تھی، کچھ الٹا سیدھا لکھتا بھی تھا، شعر بھی کہہ لیتا تھا، جو کتاب ہاتھ لگتی پڑھ بھی لیتا تھا، لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میری زندگی میں اردو کی کیا جگہ ہے۔ لیکن یونیورسٹی کے باہر میں نے اعجاز صاحب کو اردو زبان و ادب ہی کے عشق میں سرشار پایا اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھنا اور بات ہے اور اس کے عشق میں مبتلا ہو جانا اور بات ہے۔ اعجاز صاحب نے کبھی واضح الفاظ میں مجھے اس کی تلقین نہیں کی، مجھے خاص طور سے اردو لکھنے پڑھنے کی طرف متوجہ نہیں کیا لیکن وہ جس طرح اپنی زبان سے دلچسپی لیتے تھے، اٹھتے بیٹھتے اس کا ذکر کرتے تھے، شعر سے لذت لیتے تھے، ان میں ایک چھوت کی سی کیفیت تھی۔ ان سے ہو کر اردو دوستی کی برقی لہریں دوسروں تک پہنچتی تھیں اور انھیں اپنے رنگ میں رنگ دیتی تھیں۔ چنانچہ مجھے زبان و ادب کے متعلق کچھ نئے تجربے ہونے لگے۔

ان دنوں اعجاز صاحب "مختصر تاریخ ادب اردو" لکھ رہے تھے۔ یہ کتاب اس طرح لکھی جا رہی تھی کہ چند صفحے لکھ کر کاتب کو دے دیے جاتے تھے، کتابت کی تصحیح ہو کر کاپیاں پریس کو بھیج دی جاتی تھیں، پروف پڑھے جاتے تھے اور کتاب چھپتی جاتی تھی۔ میں اکثر دیکھتا تھا کہ اعجاز صاحب کے بعض ایم اے کے طلبا ان کے پاس آ جاتے ہیں، کتاب کے بعض مباحث پر بحث ہوتی ہے، کچھ حصے پڑھے جاتے ہیں، تھوڑی دیر ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی ہیں لیکن کام نہیں رکتا۔ ان شاگردوں میں ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی، رضا عظیم، طالب الہ آبادی، جمیل قدوائی ہوتے اور میں دخل در معقولات کا مرتکب ہوتے ہوئے بھی ان صحبتوں میں شریک ہوتا۔ دو چار بیٹھکوں ہی میں ذرا کھل سے گئے کہ کاپیاں اور پروف میرے ذمے ہو گئے، چھوٹے موٹے مشوروں میں بھی شریک کیا جاتا اور کبھی لائبریری سے بعض کتابوں کے حوالے تلاش کرنے کا کام بھی میرے سپرد کر دیا گیا۔ مجھ سے کم تر ادبی ذوق رکھنے والا اور مطالعہ کرنے والا بھی ہوتا تو ان باتوں سے فائدہ اٹھاتا۔ میں نے جو کچھ بھی سیکھا، اعجاز صاحب کا یہ عمل آج تک جاری ہے۔ وہ کتاب چھپا کر نہیں لکھتے، اس کا ذکر صرف اوروں ہی سے نہیں چھپاتے، بہت زیادہ اہتمام نہیں کرتے تاکہ بتانے سے پہلے کہ آخری منزل تک دوستوں اور شاگردوں سے اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں، مشورے سے گریز نہیں کرتے، وہ آسانی سے اپنی رائے نہیں بدلتے، لیکن اپنی بات پر اڑتے بھی نہیں۔ جب وہ مشورہ کرتے ہیں تو ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ واقعی وہ کوئی کتاب یا مضمون لکھنے والے ہیں بلکہ یہی خیال ہوتا ہے کہ شاید کوئی خیال آ گیا ہے اور اسی پر گفتگو کر رہے ہیں، لیکن سارا مواد ان کے ذہن میں یکجا ہوتا رہتا ہے۔ اب کتابیں اور مضمون لکھنے کا ذکر آ گیا تو اس بات کو مکمل ہی کر دوں۔

اعجاز صاحب جو کچھ لکھتے ہیں اس کا خاکہ زیادہ تر پہلے ہی ذہن میں مرتب ہو جاتا ہے اور کئی دن تک ذہن ہی میں اس کی ترتیب ہوتی رہتی ہے۔ اس کا زیادہ حصہ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہونے سے پہلے ہی پختہ ہو جاتا ہے۔ دن کی مشغولیت میں وہ عموماً سنجیدہ اور غور و فکر سے لکھے جانے والے مضامین کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، رات کے وقت بھی شاذ و نادر ہی لکھنے کا کام کرتے ہیں۔ چونکہ اپنے موضوع کے متعلق برابر سوچتے رہتے ہیں اس لیے جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو تیز لکھتے ہیں اور عام طور سے زیادہ کاٹ چھانٹ نہیں کرتے۔ مضامین کو دہراتے بھی کم ہیں اور میرا خیال ہے کہ اسی کی وجہ سے انھیں نقصان بھی پہنچتا ہے۔ اس بات کا تعلق کسی حد تک اعجاز صاحب کے مزاج سے بھی ہے جس میں ایک

غزل کی شستہ روی کے ساتھ ساتھ کلام کو خاطر نشین بنانے کی دُھن کا امتزاج ایک خاص انداز سے ہوا ہے۔ اس کا اثر ان کی گفتگو، تحریر و تقریر اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

جہاں تک تصانیف کا تعلق ہے، اعجاز صاحب نے اس خاموشی سے اس کام کو انجام دیا ہے کہ شاید ان کے بہت سے شاگردوں کو بھی خبر نہ ہوگی کہ اس وقت تک ان کی ہندی، اردو ملا کر اٹھارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور دو ایک کتابیں زیر تصنیف ہیں جن میں سے ایک تو جلد ہی طباعت کی منزلوں سے گزرنے والی ہے۔ "آئینۂ معرفت" مختصر تاریخ ادب اردو جس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ہر ایڈیشن میں کافی ترمیم ہوتی رہی ہے، "نئے ادبی رجحانات" (کئی ایڈیشن)، "مذہب اور شاعری"، "ملک ادب کے شہزادے"، "انتخاب جوش"، "جواہر میر" (ہندی)، "اکبر الٰہ آبادی" (ہندی) ایسی کتابیں ہیں جو گہرے تنقیدی مطالعہ کی دعوت دیتی ہیں لیکن مضمون کی نوعیت ان کے سرسری جائزے اور تعارف سے بھی روکتی ہے تاہم یہ تو کہنا ضروری ہے کہ اردو ادب کے طالب علموں کو اعجاز صاحب سے اس سے زیادہ واقف ہونا چاہیے جتنا وہ اس وقت واقف ہیں۔ یہ تو تھا تصنیف کا ذکر جس میں ادبی مضامین شامل نہیں ہیں، جن کی تعداد کافی ہے لیکن یہ بات تو بہت ہی تھوڑے سے لوگ جانتے ہیں کہ اعجاز صاحب ایک مدت سے شاعری کی دیوی کے قدموں میں بھی اپنے قیمتی اشعار چڑھاتے رہتے ہیں۔ یہ کام بھی علی الصباح تاروں کی چھاؤں میں ٹہلتے ٹہلتے ہوتا ہے، کشمیر کی آب و ہوا اور مسوری کی فضا بھی شعر کہنے پر اکساتی ہے اور کئی نظمیں اس فضا کی یادگار ہیں۔ زیادہ تر غزلیں کہتے ہیں لیکن انہیں چھپا کر رکھتے ہیں، ایسے تھوڑے سے لوگ ہیں جنہیں ان کے اشعار سننے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی خاص مشاعرے کے لیے کسی دوست یا بزرگ کے اصرار پر کوئی غزل کہی ہے ورنہ زیادہ تر شوق ہی کے تقاضے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اعجاز صاحب کو شاعری کا یہ ذوق اپنے نانا سید حسین صاحب ذوقی مرحوم سے ملا جن کا سلسلۂ تلمذ آتش سے ملتا تھا۔ اپنی شاعری کے متعلق ایک دفعہ اعجاز صاحب نے میرے ایک استفسار کے جواب میں مجھے لکھا کہ "آٹھویں درجے سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن نانا مرحوم کلام پر اصلاح دینے کے لیے راضی نہیں ہوتے تھے، کہتے تھے کہ ابھی کہتے رہو۔ ایف اے تک یہی حال رہا۔ جب میں ایف اے میں پہنچا تو میری ان کی بڑی لڑکی یعنی میری خالہ کے اصرار پر کبھی کبھی میری غزلیں دیکھ لیتے تھے۔ اسی زمانے میں سید مہدی حسن ناصری مرحوم کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ کالج کے علاوہ ان سے گھر پر بھی ملتا تھا۔ ان کی صحبت ایک درس گاہ تھی۔ تقریباً گفتگو میں علمی مسائل، ادبی واقعات، بزرگانِ ادب کے تذکرے ہوا کرتے رہتے۔ میں کلاس میں ان سے عربی پڑھتا تھا۔ گھر پر اردو کی باتیں ہوتی تھیں۔ نانا کی آنکھیں جاتی رہیں تو انہوں نے میرے کلام کی اصلاح کا کام بھی باقاعدہ ناصری صاحب کے سپرد کر دیا چنانچہ میں نے دو سال تک اصلاح لی لیکن یوں بھی ناصری مرحوم ہی سے فیض اٹھایا۔"

یہ تو اعجاز صاحب کا بیان ہے میں نے خود انہیں ہمیشہ اپنے نانا مرحوم اور ناصری صاحب مرحوم کا ذکر بڑے ادب اور جذبے کے ساتھ کرتے ہوئے سنا ہے۔ ناصری صاحب کے انتقال پر انہوں نے ایک پُر درد مرثیہ حالی کے مرثیۂ غالب کے تتبع میں لکھا تھا۔ یہ سب کچھ ہے لیکن شاعری سے اعجاز صاحب کی دلچسپی اتنا بہت گہری نہیں ہے۔ بہت کم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو کچھ کہا ہے اس کا بہت تھوڑا سا حصہ ان کے پاس محفوظ ہے۔

اعجاز صاحب کی شخصیت اور کردار کا مطالعہ کئی پہلوؤں سے کیا جا سکتا ہے۔ ان کی تصویر کئی آئینوں میں دکھائی جا سکتی ہے جیسے ادب اور زبان کی خدمت اور ایک معلم کی زندگی کے مختلف پہلو، یہ وہ کسوٹیاں ہیں جن پر انہیں پرکھا جا سکتا ہے۔ جو شخص انہیں ایک انسان کی حیثیت سے نظر انداز کرے گا، ان کے طرز زندگی اور ارتقائے ذہن کا نفسیاتی مطالعہ نہیں کرے گا وہ انہیں سمجھ نہیں سکے گا۔ اس کے لیے مختصراً ان کے حالاتِ زندگی سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

اعجاز صاحب اگست ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ ننہال محلہ ماجد پور شہر الٰہ آباد میں تھا اسی کو اپنا گھر جانا۔ والد بزرگوار سے غریب اور نیچے

بھلے آدمی تھے، اس لئے تنہا ہی سے پرورش اور تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کی۔ ابتدائی زندگی ناز و نعم میں بسر ہوئی لیکن جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی گئی گھر کی حالت خراب ہوتی گئی۔ چار پانچ سال کے اندر والدہ اور ان کی تین بہنوں کا انتقال ہو گیا اور نہ جانے کس طرح خاندان کی مالی حالت بھی تباہ ہو گئی۔ ابتدا میں فارسی عربی پڑھی، پھر انگریزی اسکول میں نام لکھایا۔ ریاضی جان لیوا ثابت ہوئی اور انٹرنس میں دو سال کی ناکامیابی کے بعد کلکتہ جا کر وہاں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ کلکتہ میں زندگی تکلیف سے بسر ہوتی تھی۔ کبھی کبھی فاقے کی نوبت بھی آ جاتی تھی لیکن یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے شوق نے ساری مشکلیں آسان کر دیں۔ ابھی بی اے میں داخلہ لیا ہی تھا کہ شادی ہو گئی۔ بہت زیادہ تو نہیں لیکن شادی میں کسی حد تک اعجاز صاحب کی پسندیدگی کو بھی دخل تھا۔ اس لئے مالی دشواریوں کے باوجود یہ زندگی خوشگوار رہی۔ لوگوں کے مشورے اور ضرورت اس بات پر مجبور کرتی تھی کہ نوکری کر لی جائے لیکن جب ۱۹۲۷ء میں بی اے سے فراغت حاصل ہو گئی تو آگے پڑھنے کی دھن سوار ہوئی۔ اسی زمانے میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں اُردو ایم اے کی ابتداء ہوئی۔ اس نے شوق کو ایسا ابھیر دیا کہ تمام دشواریوں کو نظرانداز کر کے نام لکھا لیا اور ۱۹۲۹ء میں کامیابی حاصل کی۔ یونیورسٹی نے اُردو ہی میں ریسرچ اسکالر بنا دیا اور سال بھر بعد لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ مالی حالت کچھ بہتر ہوئی اور خیال ہوا کہ اب ضعیف العمر والد کی خدمت کی جائے لیکن اسی سال اُن کا انتقال ہو گیا۔ والد نے معمولی سی زمینداری اور کچھ مکانات چھوڑے تھے جن کے تنہا وارث اعجاز صاحب تھے۔ وہ جس مکان میں رہتے تھے وہ اچھا خاصا بڑا مگر قدیم وضع کا تھا۔ شروع ہی میں سے گنگا کے کنارے کھیتوں سے کچھ ہٹ کر جس مکان کا ذکر کیا ہے وہ اسی کا ایک حصہ تھا۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے بعد یہ پرانا مکان کچھ نامناسب معلوم ہوا کہ ایسے مکان میں رہنے سے الجھن تھی۔ اس لئے ایک مکان بنوانے کا خیال ہوا۔ اپنے پرانے مکان سے کوئی ڈھائی تین سو گز کے فاصلہ پر سڑک کے اس پار ایک زمین لے لی اور ۱۹۳۲ء میں مکان کی بنیاد پڑ گئی۔ یہ بس میرے یہاں پہنچنے کے ذرا بعد کی بات ہے۔ چنانچہ مکان بننے لگا اور ۱۹۳۳ء میں "نشیمن" کی صورت میں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا۔

اس مکان کا ذکر کئی حیثیتوں سے اعجاز صاحب کی زندگی اور کردار کے سمجھنے میں اہمیت رکھتا ہے۔ اُن کے مزاج کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے کہ وہ ناامیدی میں امید اور بے سروسامانی میں ساز و برگ دیکھتے ہیں۔ یہ خیال کہ کل کیا ہوگا انہیں کسی کام سے نہیں روکتا۔ وہ ہر کام اسی پختہ یقین کے ساتھ شروع کرتے ہیں کہ اس کا ہونا قطعی ہے۔ میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ وہ بہت سی کتابیں، کاغذ، قلم دوات اکٹھا کرتے ہوں اور پھر کوئی کتاب کے لکھنے کا سلسلہ شروع کرتے ہوں۔ کتاب شروع ہو جاتی ہے اور سامان اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ یہی "نشیمن" کے بننے میں بھی ہوا۔ تین سال کی ملازمت اور تقریباً دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ میں دو منزلہ بنگلے کا کوئی سوال نہ تھا۔ دوسرے ذرائع بھی محدود تھے۔ مکان بنوانے کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔ لیکن ایک اچھے بڑے بنگلے کی بنیاد پڑ گئی اور دیکھنے والوں میں ایک خوبصورت عمارت کھڑی ہو گئی۔ اگرچہ وہ بہت سی الجھنیں اپنے ساتھ لائی۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ اعجاز صاحب کے مزاج میں جو امید پرستی ہے وہ کبھی کبھی ان خطروں کی طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتی جو پیچیدگی پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی انہیں ان باتوں کی طرف متوجہ کرے تو وہ ان کی تاویل اور توجیہ ایسی خوبصورتی سے کریں گے کہ آپ اُن کے خیالات کو غلط بتانے کے بجائے اُن کے ہم خیال بن جائیں گے۔ کچھ سال کے ساتھ میں مجھے ایسی دشواریاں بار بار پیش آئی ہیں۔ اس وقت تو تعمیر بنگلہ، خوردی، دوستی، شاگردی اور بعض تجربے ہو سکے کچھ زیادہ ہو گیا تھا، آسان ہی میں دیکھا لیکن اس کا اندازہ اب بھی ہوتا ہے۔ کوٹھی کو تیار ہوئے ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اعجاز صاحب کے ایک بہت ہی عزیز دوست سید ماجد علی صاحب وکیل ایک دن بڑے سویرے آ گئے اور اعجاز صاحب کو اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا کر لے گئے۔ انہوں نے تقریباً بیس ہزار روپے قرض لئے تھے۔ انہیں ضامن کی ضرورت تھی۔ کوٹھی نے اعجاز صاحب کی حیثیت بڑھا دی تھی اور اعجاز صاحب گئے اور ضمانت کے کاغذ پر دستخط کر کے چلے آئے۔ بعد میں لوگوں نے سمجھایا کہ یہ بڑی غلطی ہے لیکن اعجاز صاحب اس طرح سوچنے کے عادی نہیں ہیں اور نہ انہیں کبھی اس کا خیال ہوا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ۱۹۳۶ء میں اچانک سید ماجد علی صاحب مرحوم کا انتقال ہو گیا اور اعجاز

صاحب ایک بہت بڑی مصیبت کا شکار ہو گئے۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں جب اعجاز صاحب نے بغیر شکوہ و شکایت کے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا کر، اپنا پسندیدہ مکان کرایہ پر اٹھا کر برسوں میں اس قرض کا ایک بڑا حصہ ادا کیا۔ ساری جسمانی، ذہنی اور مالی کوفت انہوں نے بڑی خوش دلی سے جھیل لی۔ اپنی گھریلو ذمہ داریوں اور ضرورتوں کی وجہ سے جو بوجھ جتنا ہلکا ہوتا تھا اتنا ہی بڑھتا جاتا تھا۔ ان باتوں نے ان کی صحت اور کام کرنے کی صلاحیت پر بڑا برا اثر ڈالا جسے وہ اب تک بھگت رہے ہیں لیکن وہ نہ زمانے کے شاکی ہیں اور نہ ماضی کے مرثیہ خواں، نہ لوگوں کی ضرورت سے زیادہ ہمدردی سے خوش ہوتے ہیں نہ قسمت کے گلہ مند۔ انہیں مستقبل پر بھروسہ ہے۔ اور ہمیشہ آگے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔

یہی مستقبل پرستی اُن کے سیاسی تصورات میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ عملاً اور عقیدتاً اشتراکی نظام کے حامی ہیں۔ سیاسی کاموں میں حصہ نہیں لیتے لیکن ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے ہر اُس سیاسی اقدام کو قبول کرتے اور ٹھیک سمجھتے ہیں جو ترقی پسندانہ ہو اگرچہ اس میں جذباتیت کا بھی اچھا خاصا دخل ہوتا ہے۔

اعجاز صاحب کی زندگی بہت سے قانون اور قاعدوں کی پابندی برداشت نہیں کر سکتی، سرکاری اور غیر سرکاری ہر کام ایک غیر رسمی شکل اختیار کر لیتا ہے یعنی وہ جس کام کو بھی ہاتھ میں لیتے ہیں یا اُن کے ہاتھ میں پہنچ جاتا ہے اُسے اس کے سارے غیر ضروری لوازم کے ساتھ انجام دینے کے بجائے اپنے ڈھنگ سے پورا کر دیتے ہیں اور اسی بات کی توقع دوسروں سے بھی رکھتے ہیں۔ اُن کے شاگرد بڑی خوشی سے اُن کے ہر کام کے لئے تیار رہتے ہیں کیونکہ وہ بھی انہیں حتی الوسع مایوس نہیں کرتے۔ یونیورسٹی میں طلبا کی دشواریاں کیا ہیں؟ داخلہ کے شرائط میں کوئی نقص، فیس کی معافی، وظیفے کے لئے سفارش، حاضری کی کمی اور امتحان میں شرکت کی اجازت، کسی سفارش، نوکری کی تلاش میں مشورہ اور کوشش وغیرہ اعجاز صاحب ان میں سے ہر کام کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اُن کی طبیعت خراب ہو، کسی اور کام کا وقت ہو، دھوپ اور گرمی ہو، شدید بارش ہو رہی ہو، کڑاکے کے جاڑے ہوں وہ دوسروں کے کام کے لئے نکل کھڑے ہوں گے، اپنی سی کوشش ضرور کریں گے، چاہے سو فیصدی کامیابی نہ ہو۔ اپنے کام کے لئے وہ یہی امید دوسروں سے رکھتے ہیں، حالانکہ اس کا مقصد اپنی محنت کا معاوضہ نہیں ہوتا۔

ان تمام خصوصیات میں جس خصوصیت کی سب سے زیادہ جھلک نظر آتی ہے وہ اُن کے مزاج کی سادگی ہے۔ اس کی جھلک اُن کی گفتار میں، طرز تحریر میں، لوگوں سے ملنے جلنے میں، طرز معاشرت میں ہر جگہ اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ یہ سادگی ہر ایک پر یکساں اپنا پرتو ڈالتی ہے۔ میں نے انہیں "بڑے لوگوں" شاگردوں اور ادیبوں سے بھی ملتے دیکھا ہے۔ اور صاحب پور کے ناخواندہ یا معمولی لوگوں سے بھی۔ اُن کا بنیادی انداز مشکل ہی سے بدلتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں سے خود اُن کی ضرورتیں وابستہ ہوں یا انہیں کوئی کام اعجاز صاحب سے ہو، چھوٹے چھوٹے لوگ اپنی ضرورت سے ان کا گھریلو کام یا محض کا رشتہ ظاہر کر کے اُن کے پاس آئیں، وہ یکساں انہماک سے گفتگو کرتے ہوئے ملیں گے۔ اعجاز صاحب کی گفتگو کا انداز بھی مخصوص ہے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ گفتگو کرتے ہیں اور گفتگو میں خوش طبعی اور بے تکلفی کا انداز پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ طبیعت پر مزاح غالب ہے لیکن اگر بات چیت کو خوشگوار اور غیر سنجیدہ بنانے کی ضرورت پیش آجائے تو وہ اس کام کو بڑی خوبی سے پورا کرتے ہیں۔ یہ موقع نہیں ہے کہ ان کے لطیفے اور چٹکلے پیش کئے جائیں لیکن ایک واقعہ بے اختیار یاد آ گیا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ ہندی میں ایک استاد ہیں۔ ڈاکٹر رام کمار ورما، ہندی کے بڑے اچھے ادیب، شاعر اور ڈرامہ نگار۔ اعجاز صاحب کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے مشتاق ہیں۔ میں اس کا شاہد تو نہیں لیکن کبھی کبھی ان کی صحبتوں میں بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔ ایک دن میں اعجاز صاحب کے ساتھ تھا راستہ میں ڈاکٹر رام کمار ورما کی کوٹھی پڑتی تھی۔ ان کے یہاں پہنچ گئے۔ ایک صاحب پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی سرکاری افسر یا رئیس معلوم ہوتے تھے۔ ورما صاحب نے بے تکلف انداز میں اعجاز صاحب کا خیر مقدم کیا اور کہا بھئی کئی دن سے ملاقات نہیں ہوئی کیا کرتے رہتے ہو۔ اعجاز صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا، اب تمہیں کیا بتاؤں، وہ جو تمہارے گورنر صاحب بہادر ہیں نا، وہ آئے اور پیچھے پڑ گئے کہ شاعری میں ہیرو کتنا جھوٹ بولا جائے

گے، وہ کمبخت زمانہ، اور پھر اگر معاملہ شکار ہی تک ہوتا تو کوئی بات نہ تھی، کہنے کو مچھلی تو خیر کسی میں تیرتی ہیں براہ راست کلکتہ سے منگوا دیا ہوں، بڑی مشکل میں جان ہے، کیا کروں، اس کی دلچسپی تو وبالِ جان بن گئی ہے، عجیب دھکڑ دروازے پر پکڑا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تو اعجاز صاحب کی باتوں کے انداز سے واقف ہی تھے، انہوں نے بھی کہا، مارو گولی مچھلی پر، کہاں جاؤ گے ہم لوگوں کو چھوڑ کر، بات اسی انداز میں ہو رہی تھی اور وہ صاحب بیٹھے تھے، وہ حیران کہ آخر یہ کون شخص ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ ان کو حیرت ہی میں چھوڑ کر ہم لوگ چلے آئے۔ دوسرے دن وہ صاحب اعجاز صاحب کے یہاں آموجود ہوئے اور پیچھے پڑ گئے کہ ہمارے بھائی کی نوکری کے لئے میری سفارش گورنر صاحب سے کر دیجئے۔ انہیں لاکھ یقین دلایا گیا کہ یہ محض مذاق تھا، مگر وہ کسی طرح نہ مانے، آخر اعجاز صاحب نے ان سے جھوٹا وعدہ کر لیا، پھر مجھے یاد نہیں کیا کیا۔ ——— ایسے دلچسپ قصے ان کے ساتھ پیش آتے رہتے ہیں اور وہ کبھی کسی بزم کو بے کیف اور خشک نہیں ہونے دیتے۔ ان کا مزاج مرنجاں مرنج ہے اور جان بوجھ کر کسی کو تکلیف پہنچانا ان کی فطرت کے خلاف ہے۔ انہوں نے ایک زمانہ میں تصوف کا مطالعہ کیا، مذہب کے ظاہری لوازم سے گذر کر ان کی بنیاد اور اصل پر غور کیا اس سے ان کے مزاج میں ایک خاص قسم کی فراخ دلی پائی جاتی ہے۔ مذہب، رنگ و روپ، دولت اور افلاس کی بنیاد پر وہ انسانوں میں تفریق نہیں کرتے بلکہ ان کی اخلاقی زندگی اور انسانی صلاحیتوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صبح خوشگوار ہو اور ٹہل کر واپس آجانے کے بعد بھی سورج نہ نکلے اور مناظر فطرت کی دلفریبی دل نشین ہو تو وہ صبح کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ تصوف نے ان کے کردار اور خیالات پر گہرا اثر چھوڑا ہے جس کے اچھے اخلاقی پہلو ان کی زندگی میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ کہا گیا اعجاز صاحب بہت سی پابندیوں سے گھبراتے ہیں اور مہدی افادی کی زبان میں "محاذ رسمیہ" کے قائل نہیں ہیں اسی وجہ سے بڑی بڑی کانفرنسوں میں، شادی بیاہ میں، مجالس و محافل میں، جہاں بے رنگ بے قرار ہو کر بیٹھنا پڑے اور دوسروں کے ہاتھ میں وقت کی لگام ہو، شرکت سے گھبراتے ہیں، اگر شرکت ہونا ہی پڑے تو کسی وقت پیچھے سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور وقت کی لگام خود اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے مسلسل کسی کام میں لگے رہنا ان کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے اسی وجہ سے ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں ان باتوں سے دلچسپی نہیں ہے، مگر جنہیں ان سے ملتے رہنے کا اتفاق ہوتا ہے وہ ان کی اکتاہٹ کا سبب آسانی سے معلوم کر لیتے ہیں۔

اعجاز صاحب ایک استاد کی حیثیت سے غیر معمولی جذب و کشش کے مالک ہیں۔ انہیں اپنے شاگردوں پر بھروسہ رہتا ہے اور شاگردوں کو ان پر۔ ان کا بے تکلف، بے ریا اور تصنع سے خالی انداز ان کے طالب علموں کو ان کے قریب لاتا ہے اور یہ قرب محض رسمی ملاقات سے گزر کر ہموار دوستی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے شاگردوں کے ذہن میں ان کی ادبی اور انسانی حیثیت اس طرح گڈمڈ ہو جاتی ہے کہ وہ انہیں جدا نہیں کر سکتا۔ ان کی ایک کمزوری کا عمل دوسری خوبی سے ہوتا ہے اور آخر میں ان کی شفیق اور ہمدرد شخصیت ذہن پر چھا جاتی ہے۔ انسانی ہمدردی کا ایک بڑا حصہ ان کو ورثہ میں ملا ہے، وہی غلطیوں کا ارتکاب بھی کراتا ہے، کمزوریوں کے روپ میں بھی ظاہر ہوتا ہے لیکن ان سے قریب رہنے والوں کو معلوم ہے کہ اس کے پیچھے کوئی اخلاقی نقص نہیں ہے۔ میں پھر عرض کروں گا کہ کوئی شخص الہ آباد جائے اور اعجاز صاحب سے نہ ملے تو اس کی بدذوقی اور لاعلمی پر مجھے افسوس ہوگا۔

احتشام صاحب

ڈاکٹر محمد حسن

کہا جاتا ہے حسن کی روح پتھر میں مجسمے کی شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی بیدار ہو جاتی ہے۔ وہ جہاں ایک طرف سنگ تراش کے سینے میں دھڑکن بن جاتی ہے اور تصور کی دنیا آباد رکھتی ہے وہاں جمادات کے خاموش وجود میں بھی کسی محبوب کی طرح ناز سے انگڑائیاں لیتی ہے یہ بکھری ہوئی انگڑائیاں نہ جانے حسن کے کتنے گل گشت روپ رنگ کی شکل میں ابھرتی رہتی ہیں۔ یہ روداں کا مجسمہ "بوسہ" ہے، یہ حسن کارانہ تصور، تاج محل ہے، یہ میکائیل انجلو کی مریم ہے اور یہ غالب کی غزل کا شعر ہے جس کی لذت کسی سرمدی نغمے کی طرح پاکیزہ اور مسحور کن ہے۔ احتشام صاحب کی شخصیت بھی شاید اسی قسم کے حسین مجسمہ کا انتخاب ہے۔

احتشام صاحب کی شخصیت کے بارے میں کوئی کیا کہے —— اس شخصیت کے نہ جانے کتنے پرت اور پہلو ہیں۔ اگر پہلی ملاقات کو اہمیت دیجئے تو آپ کو لگے گا ان میں ایک شعوری ہوئی متانت ہے، ایک متانت اور آہنگ ہے جیسے کوئی چاہے تو ان کو "برقرار" سے قائم رکھتی ہوئی مسکراہٹ میں دیکھے، چاہے تو ان کی باتوں کی شیرینی اور شخصیت میں رچے بسے خلوص سے پہچان لے لیکن پچھلے بارہ سال کے عرصے میں جب سے میں ان سے واقف ہوں، مجھے بارہا ان کی صحبت میں اس بات کا احساس ہوا کہ افلاطونی حقیقت کی طرح احتشام صاحب کی شخصیت دراصل کسی حقیقی شخصیت کا عکس ایک روپ ہے وہ الفاظ جو میرے کانوں میں آتے ہیں، وہ متانت، طرز عمل، وہ مسکراہٹ اور یہ باقاعدہ زندگی —— دراصل کسی عظیم تر حقیقت کا عکس ہی ہے۔

وہ عظیم تر حقیقت، وہ اصل احتشام حسین کہاں ہے؟ اتنا جانتا ہوں کہ ان معنوں میں شاید اس حقیقت کا وجود ہی نہیں جن معنوں میں احتشام صاحب کا وجود ہے وہ تو ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے، ہر احساس اور جذبے کی فضا میں بکھرتا رہتا ہے جو مختلف شخصیتوں کے درمیان ایک وسیع انقلاب انسانی کے سینے میں جاری ہے۔ کبھی ایک ابھرتے ہوئے کسی سیل کی طرح اچھلتا ہے اور ساحل تک کو رنگین کرتی چلی جاتی ہے، کبھی دوسرا تصور واقعہ ہے اور اس لہر کو کسی خلا بند میں کھوتا ہوا گذر جاتا ہے پھر کوئی اور احتشام حسین آتا ہے جو ان گذرے ہوئے بکھرے ہوئے خوابوں کی باقیات چنتا ہے اور نئے رنگ محلوں کی تعمیر کے خواب دیکھتا ہے۔

شاید احتشام صاحب کا یہ بڑا ہی ابہام انگیز "مابعدالطبیعاتی" تصور ہوا لیکن اصل یہ ہے کہ جس نے احتشام صاحب کی شخصیت میں چھپے ہوئے اس فنکار کا کرب اور تخلیقی اضطراب نہیں دیکھا وہ انہیں صحیح طور پر نہیں جانتا۔ وہ انسان جس کے بارے میں صرف اس کی تحریریں ہی سب کچھ کہتی ہیں، دراصل

درد و داغ، جستجو و آرزو کا انسان ہے۔ نہ جانے احساس کے کتنے گداز لمحوں اور پگھلا دینے والے تجربات سے اس شخصیت کا خمیر بنا ہے۔

آپ سے یہ چند شعر سنے ہیں:

کل تو غیروں کی یاد آئی تھی　　آج کیوں ہے فضا اداس اداس

جب حریم دل میں روشن ہی نہ تھے غم کے چراغ
چاندنی راتیں تھیں ایسی جیسے اندھی راتیں نہ تھیں

بھول جانے کی آرزو کیوں ہے　　کیا محبت بھی ہے زمانہ شناس

یہاں فن کار کی گفتار میں جو احساس کی سطح پر اتنا گداز ہے، اپنا جام لبریز رکھتا ہے جو ڈوب جانے کے امکانوں میں دل کے درد کا جوہری بنتا ہے۔ حادثات ہی سے نہیں چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کی شکست سے بھی جس کی آنکھیں نم ناک ہو جاتی ہیں اور پھر بھی جس کی شخصیت اپنا آہنگ، توازن اور احتیاط نہیں کھوتی۔

بارہ سال پہلے کی بات ہے جب میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ اردو میرا مضمون تھا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی صدر شعبہ تھے۔ آزاد نظم کی بحث اپنے شباب پر تھی۔ راشد اور میراجی رسالوں میں مقبول تھے۔ ہوسٹل کے اندر اور کلاس کے باہر "دریچے کے قریب" اور "رقص" کی نظمیں بات بات میں پڑھی جاتی تھیں۔ احتشام صاحب کے مضامین اپنے وطن مراد آباد ہی میں "نگار" کے پرانے پرچوں میں پڑھ چکا تھا۔ یہ مضامین زیادہ تر مذہبی تھے۔ اسی میں وہ مضامین بھی تھے جو ابو سعید بزمی سے "امامت اور خلافت" کی بحث کے سلسلے میں لکھے گئے تھے یا پھر افسانے تھے جن میں نیاز کا رنگ جھلکتا تھا یا پھر کہیں کہیں علی عباس حسینی اور اعظم کریوی کا طرز ساخت ابھرتا نظر آتا تھا۔

بہرحال کلاس میں احتشام صاحب کو دور سے دیکھا۔ ترکی ٹوپی، سیدھی سادی شیروانی پہنے ایک متوسط قد اور اوسط درجے کا جسم نظر آیا۔ البتہ انہیں دیکھ کر پہلا احساس ان کے شائستہ اور کافی خوش رو ہونے کا ہوا تھا۔ پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہم سب اس محفل میں سامعین کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ احتشام صاحب ہم میں سے ہر ایک سے فرداً فرداً باتیں کر رہے ہیں۔ ان کے پڑھانے کے انداز میں بڑی گرم جوشی تھی جیسے ادب کی تعلیم اس شخص کے لیے صرف روزی کمانے کا ذریعہ نہ ہو بلکہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہو۔

ان کے پڑھانے کی تعریف کرنا دشوار ہے۔ ان کے کلاس کی منظر کشی کرنا ممکن ہے البتہ ان کے لکچروں ہی میں نہیں ٹیکسٹ بک پڑھانے میں بھی بار بار اس کا احساس ہوتا تھا کہ طلباء اور استاد دراصل ایک طویل سفر پر ایک ساتھ روانہ ہوئے ہیں کوئی ایک قدم آگے ہے کوئی کچھ پیچھے اور احتشام صاحب ایک ایسے گائیڈ کی طرح جو خود بھی ہم سفروں کی ٹولی میں گھل مل گیا ہے اور نئے نئے پہلوؤں سے خود بھی لذت لے رہا ہے، راہ کی سمت بھی بتا دیا کرے اور جلوہ بار گلستانوں کو متعارف کرتے ہوئے بڑھے جا رہے ہیں۔

ان کا پڑھایا ہوا شعر ایک جیتا جاگتا تجربہ ہوتا ہے۔ صرف مشکل الفاظ کی تشریح ہی نہیں، نازک جذباتی مسائل آ جاتے تھے۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ ایک بار پورا گھنٹہ اس بحث کی نذر ہو گیا تھا کہ پہلی نظر میں محبت ہو سکتی ہے یا نہیں، اور اگر ہو سکتی ہے تو اس کے نفسیاتی، حیاتیاتی یا جمالیاتی اسباب کیا ہیں۔ پھر غالب کے اس شعر کے ساتھ —

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی　　وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

حسرت کے اس شعر کا تعارف ہوا —

ایک ہی بار ہوئی وجہ گرفتاریٔ دل　　التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

پھر فانی چلے آئے ۔۔۔

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا   مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

آہستہ آہستہ ہم لوگوں کو غالب کے کلام کے زندہ اور تابناک ہونے کا احساس ہونے لگا۔ جو لوگ پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتے تھے ان کے کانوں میں لووس کی "CONVENTION & REVOLT IN POETRY." فیرؔ کی "AN ESSAY ON LITIRARY CRITICISM" اور ڈیل کی "LOVE IN THE MACHINE AGE" کے نام پڑنے لگے اور یوں سے ہی ہم لوگ کم از کم نفسیات، جنسیات اور مارکسیت کے نام سے روشناس ہونے لگے۔

پھر ان کی ذاتی واقفیت کا یہ حال تھا کہ سال میں چار چھ مرتبہ سو دو سو صرف یادداشت سے حاضری لے لیا کرتے تھے۔ قبل تقسیم کے لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو طلباء کی تعداد کافی ہوتی تھی لیکن ہر طالب علم کے بارے میں احتشام صاحب کو نہ صرف پوری معلومات ہوتی تھیں بلکہ ہم میں سے زیادہ تر ان کو گھر پر جانتے بھی تھے۔

"زمانہ" میں میرا ایک چھوٹا سا افسانہ چھپا تھا۔ احتشام صاحب پہلے شخص تھے جنھوں نے وہ افسانہ پڑھا اور کلاس میں مجھ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ احتشام صاحب ان دنوں یا ہم سے ملتے ہی رہتے تھے، ادب اور علم کے راہیوں میں تھے اور جب مسعود صاحب یا مولانا محمد حسین مرحوم سے ان کے مباحثے ہوتے تھے تو ہم لوگوں میں بڑی مختلف پارٹیاں بنتی تھیں اور گرماگرم بحثیں ہوتی تھیں۔

انہی دنوں میں نے "حلقۂ احباب" کے نام سے ایک چھوٹی سی انجمن کی بنیاد ڈالی تھی جس میں چند ہم جماعت طلباء جمع ہوتے تھے، اپنے لکھے ہوئے افسانے پڑھا کرتے تھے اور ان پر بحثیں ہوتی تھیں۔ جوش کا یہ عالم کہ کچھ روپے چندے کے جمع کر کے "حلقۂ احباب" کے نام سے رسالہ نکالا جو چند شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ ان دنوں ہمارے حلقے کا سب سے کامیاب افسانہ نگار احمد حسن تھا اور مجھے آج بھی اس بات کا یقین ہے کہ وہ افسانے لکھتا رہتا اور ان دنوں "پاکستان اسٹینڈرڈ" کی سب ایڈیٹری میں اسیر نہ ہوتا تو یقیناً آج صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا۔

اس بے بضاعت حلقے کی صدارت کے لئے ہم لوگوں نے بہت ہی ڈرتے ڈرتے احتشام صاحب سے درخواست کی اور اس کے بعد سے چار چھ سال تک برابر احتشام صاحب ان جلسوں کی صدارت کرتے رہے۔

"حلقۂ احباب" کی سیکرٹری شپ نے مجھے احتشام صاحب سے بہت قریب کر دیا۔ مگر کل چند دنوں کی احتشام صاحب اور میں نے مل کر حلقہ کا جو مسلسل پروگرام تیار کیا تھا اس میں نہ صرف اردو ادب کی تمام تر اصناف کا جائزہ لینے کا ارادہ تھا بلکہ مختلف علوم و فنون کے ماہرین سے ان کے فن پر مقالات لکھانا بھی شامل تھا۔ مختلف ہندوستانی زبانوں کے ادب کا اجمالی خاکہ پیش کرنا اور غیر ملکی ادب کی اصناف میں سے ہر ایک کا تفصیلی جائزہ بھی ہماری فہرست مقالات میں شامل تھا۔ اس سہ سالہ پروگرام کا افتتاح کرنا ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے منظور کر لیا تھا۔

اب یہاں احتشام صاحب کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ نہ جانے کتنی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ احتشام صاحب جس طرح اپنے ہم نشینوں اور ملنے والوں کے دل میں جگہ کرتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی خود ان میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ خود اپنی بات کہتا ہوں اپنے رفیقوں کے دل میں عمل کا ذوق پیدا کرنا اور جوش پیدا کرنا بہت آسان کام تھا۔ یہی نہیں اکثر مولوی عبدالحق اور خواجہ غلام السیدین جیسے بزرگوں کو دہلی اور علی گڑھ سے کھینچ بلانا اور "حلقہ" کے لئے جوش پیدا کر دینا بھی دشوار نہ تھا۔ لیکن خود احتشام صاحب کو اس کے لئے آمادہ کرنا جوئے شیر لانا تھا۔

ہم سب لوگ دن رات پروگرام بناتے، منصوبے گھڑتے، جلسوں کی نوعیت کے بارے میں سوچتے لیکن جب ہم یہ ساری تجاویز اور سارے منصوبے خواب سے کر احتشام صاحب کے پاس پہنچتے تو وہ ان کے راستے کی کچھ ایسی رکاوٹیں نکال دیتے کہ ہمارے سارے ولولے پر پانی پھر جاتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ۱۹۴۷ء کی ایشیائی کانفرنس میں آئے ہوئے ایرانی مندوبین کو میں نے لکھنؤ آنے کی دعوت دے دی۔ خیال یہ تھا کہ یہ لوگ

وقت کی کمی کی وجہ سے دعوت تو کیا قبول کریں گے البتہ ایک شکریے کا خط لکھیں گے اور ہمارا فرض پورا ہو جائے گا۔ 'حلقۂ احباب' کے پاس کوئی سرمایہ ہی موجود نہ تھا۔ وقت آنے پر البتہ پچاس ساٹھ روپیہ چندہ کر لیا جاتا تھا۔

ایسی حالت میں ہماری حیرت کا اندازہ لگائیے جب ایرانی وفد کا تار آیا کہ وہ لکھنؤ آ رہے ہیں اور انھوں نے ہماری دعوت قبول کر لی ہے۔ گھبرائے ہوئے احتشام صاحب کے پاس پہنچے۔ احتشام صاحب بہت برہم ہوئے بولے "بڑی غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ آپ لوگ بیٹھے بٹھائے شوشے چھوڑا کرتے ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ تین چار ہزار روپیہ سے کم خرچ نہ آئے گا۔ اب یہ رقم کہاں سے لائیے گا؟"

پھر ہم لوگ سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر دوڑتے رہے۔ یو پی گورنمنٹ کے وزراء سے ملے، وائس چانسلر سے ملے اور آخرکار رفیع احمد قدوائی مرحوم کی مدد سے ان کے قیام و طعام، سیر و تفریح وغیرہ سب کا انتظام ہو گیا۔ 'حلقۂ احباب' کی طرف سے ایک عصرانہ دینے کا پروگرام بنایا گیا اور یونیورسٹی میں ایک جلسہ کرنے کا اہتمام کر لیا۔

ہم سب لوگ بے حد مطمئن تھے کہ دیکھیں اب احتشام صاحب کیا دشواری بتاتے ہیں۔ احتشام صاحب کے پاس پہنچے، ساری روداد ایک ہی سانس میں سنا ڈالی۔ جلسے کے بارے میں پروگرام بتایا۔ ۹ اپریل کے لیے جلسہ طے کیا تھا۔ احتشام صاحب نے مخصوص انداز میں اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے متوازن لہجے میں کہا:

"یہ تو سب ٹھیک ہے مگر جلسے کے لیے حاضرین کہاں سے آئیں گے؟"

بات غلط نہ تھی کیونکہ طلباء کے امتحانات ہو رہے تھے لیکن مندوبین دہلی سے یہاں تک آ جائیں، یو پی گورنمنٹ کو ہم اس ہفت خواں سے گزرنے کے بعد آمادہ کر لائیں اور اس کے بعد ایرانی وفد کے استقبال کے لیے حاضرین کی کمی پڑے ——— یہ صرف احتشام صاحب کی افسردگی پسند طبیعت سوچ سکتی تھی۔

افسردگی پرستی کی بجائے بھی کہا جا سکتا ہے۔ یاس پرست لکھوں لیکن یاس ایک مستقل اور اتفاقی کیفیت ہے پھر مجھے یہ بھی احساس ہے کہ یہ الفاظ میں ایک ایسے نقاد کے بارے میں لکھ رہا ہوں جس نے ہماری تنقید میں عمرانی اور مارکسی انداز نظر کو رواج دیا ہے اور جسے افق بخشنے میں عمرانی اور مارکسی نقطۂ نظر زندگی کے رجائی پہلو کے نمائندہ ہیں۔ اگر میں نے احتشام صاحب کی تحریرات نہ پڑھی ہوتیں تو ان کی ذات کو یا تو میر کے دوبارہ جنم لینے سے تعبیر کرتا یا پھر انھیں صوفی 'وجودیاتی' یا قنوطی تسلیم کر لیتا۔

غالب کا شعر ہے ؎

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

بے دلی کا استعارہ بنا ہوا احساس میں نے کم لوگوں میں دیکھا ہے جو بھی ہے اسے کاہلی کہیے۔ مجھے تو بارہا ایسا لگتا ہے کہ احتشام صاحب کے اندر ایک بہت ہی اچھا آدمی چھپا ہوا ہے جو وضع دار ہے جس نے قصبہ ماہل کے ایک قدیم گھرانے میں پرورش پائی ہے اور اس کی قدیمی روایات کو اپنے میں جذب کیا ہے۔ یہ وضع دار اور بہت ہی اچھا آدمی اتنا طاقتور ہے کہ وہ باغی نوجوان جو ان کی دوسری شخصیت کا جزو ہے ہر بار اچھے آدمی سے شکست کھا جاتا ہے۔ اس نوجوان باغی کو وہ کھل کے سامنے کبھی نہیں ہونے دیتے۔ اس کی دبی ہوئی کچلی ہوئی شخصیت ایک افسردگی کی شکل میں پھیل گئی ہے۔ یہ وہ ماسک ہے جس کا ذکر کرشن چندر کے ناول 'شکست' کے آخری صفحات میں ملتا ہے۔

اب ذرا اس بہت ہی اچھے آدمی کی چند پرچھائیاں دیکھیے:

میں نے ایسے آدمیوں کو ان کے کمرے میں بیٹھے ہوئے دیکھا ہے جن سے انھیں شدید اختلاف ہے اور جن سے وہ سوائے مجبور ہونے کے

اور کوئی حظ حاصل نہیں کر سکتے۔ گھنٹوں کو تو کیا اگر وہ دو دن تک بھی اسی طرح بیٹھے باتیں کرتے رہیں گے تو احتشام صاحب کھانے کے لئے اندر بلائے جانے والے سارے تقاضوں کو ٹال دیں گے۔ اگر اس وقت ان کی ریڈیو ٹاک کا وقت ہوگا تو اسے کل پہ ٹال دیں گے لیکن آپ سے بار خاطر ہونے سے یہ نہیں کہیں گے کہ آپ کسی اور وقت تشریف لے آئیے گا۔ یہ ہی نہیں ان کی باتوں میں اکتاہٹ کا ایک ہلکا سا پرتو بھی نہیں آنے پائے گا۔

ان سے ملنے آنے والوں کی عجیب عجیب قسمیں ہیں ان میں شاید سب سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو اپنی کتابوں پر دیباچہ لکھوانے آتے ہیں۔ میں نے خود ایک سے زیادہ مرتبہ ان سے اس "مقدمہ بازی" کی شکایت کی ہے انہوں نے ایسے ادیبوں کے مجموعوں پر بھی دیباچے لکھے ہیں جو اس کے مستحق نہیں تھے۔ کسی نے ایک دن مجھ سے کہا کہ انجینئرنگ کی ایک ابتدائی کتاب پہ احتشام صاحب سے دیباچہ لکھا۔ میں نے آکر ان سے فریاد کی۔ کہنے لگے "لوگ یہ تو دیکھتے ہیں کہ احتشام نے دیباچہ لکھا ہے لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ احتشام نے کیا لکھا ہے۔ لوگ آتے ہیں بار بار تقاضے کرتے ہیں، سفارشیں کراتے ہیں آخر ہم ان کو کیا کہا جائے جو کچھ بھی ہو صاف ہی میں آپ سے کہہ دیتا ہوں؟"

اور اس کی گواہی خود میں دے سکتا ہوں کہ میں نے ایک ایسی ہی گھٹیا کتاب کے دیباچہ کے لئے بیک وقت جوش ملیح آبادی سے کہ ان کے ایک دوست کے خط وصول ہوتے دیکھے ہیں۔

امریکہ جانے سے پہلے ہر شام وہ امین آباد میں اردو کتابوں کی دوکان "دانش محل" میں آ بیٹھتے۔ یہاں ان کے دوست اور ہم عصر ہر طرح طرح کے آدمی ہوتے ہیں اور موضوعات کے دائرے میں کتابوں سے لے کر لکڑی کے نرخ تک سب کچھ شامل ہے۔ وہ گھنٹوں مقامی سیاست اور الیکشن کے نتائج پر بحث کرتے ہیں۔ یہ بزم بے تکلف تو نہیں کہی جا سکتی کیونکہ احتشام صاحب کی شخصیت کھل کھیلنے کی عادی نہیں۔ ہاں یہ وہ جگہ ضرور ہے جہاں وہ گھڑی بھر کے لئے دو چار خوشگوار لمحے گزار جاتے ہیں۔ اور آپ یقین کیجئے کہ وہاں بیٹھنے والوں کے گروہ میں سے ہر ایک کے لئے احتشام صاحب کے دل میں گرم جوشی اور خلوص کے وہی سوتے ہیں جو شاید کسی پسندیدہ ادیب کے لئے ہوں گے۔

ایک اور طرح دیکھئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں ریڈر شپ کا مسئلہ درپیش تھا امیدواروں میں یوں تو بہت تھے لیکن خاص مقابلہ احتشام صاحب اور آل احمد سرور صاحب کے درمیان تھا۔ سرور صاحب کا تقرر ہو گیا اور اس دن سے آج تک اگر لکھنؤ یونیورسٹی میں سرور صاحب کسی کو اپنا بہترین دوست کہہ سکتے ہیں تو وہ احتشام صاحب ہیں۔ یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ نہ جانے کتنی بار میں نے سرور صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سنے ہیں اور اس خلوص کا اندازہ کیا ہے جو احتشام صاحب کی رگ رگ میں پیوست ہے۔

یوں تو یہ معمولی سی بات ہے لیکن ایسے موقعوں پر جب انسان خود اپنی مسرتوں کی شکست کا منظر دیکھتا ہے اور اس کے سامنے اپنے مستقبل پر چھائے ہوئے کہرے ہوتے ہیں تو اچھے اچھے تقدس پرستوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، عداوت اور جلن کی چنگاری جاگ جاتی ہے۔ اردو ادب میں بھی زمانہ نہیں بدلا لیکن اس وسعت قلب کی مثالیں کم ہی ملیں گی جب چند لمحوں کے حریف زندگی بھر کے رفیق ہو گئے ہوں۔

یہ چشم مروت احتشام صاحب کے کردار کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ وہ فن شعر کا شعور بھی رکھتے ہیں استدلال سے کام لیتے ہیں اور تنقید نگاروں کی صف اول میں ہونے کے باوجود ان کا قلم داد دینے اور بیگانہ شاعروں کے بچے کو توڑنے میں جری نہیں بنا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے دائرے غیر واضح اور مبہم ہوں، وہ ذہن کے ساتھ پکاسو کے آرٹ پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں لیکن اگر خدانخواستہ پکاسو ان کو دیباچہ لکھنے بھیجتا تب وہ بھلے مانس اس کی کوئی نکتہ چینی کر پاتے — یہ امر بحث طلب ہے۔

چاہے ان کے قلم کے خار اختلاف نہ ہونے پر نکتہ چینی کر لیجئے لیکن ان کے ہمدردانہ رویے پر کوئی شبہ نہیں کر سکتا۔ مروت میں وہ کہیں کہیں اس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ شاید بہت سے لوگ اسے جرم سمجھیں۔ اگر یہ بات ہے تو اس لئے انہوں نے ہم عصروں پر بہت کم لکھا ہے۔ ان کا کام اردو کی تنقید کو ایک نظریاتی بنیاد دینا تھا اور ہر چند کہ جو کچھ انہوں نے اس رنگ میں کہا ہے وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے جو وہ کر سکتے ہیں اور غالباً صرف وہی کر سکتے ہیں۔

پھر بھی ادبی تنقید کا یہ موڑ تاریخی موڑ ہے۔

شخصیت سے ہٹ کر بات تنقیدی فکر کی طرف جا پہنچی۔ دراصل احتشام صاحب کی ادبی خدمات سے ان کی سماجی خدمات کا مرتبہ کچھ کم نہیں ہے۔ ان کا کارنامہ صرف وہ مضامین نہیں ہیں جو رسالوں میں چھپتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ احتشام صاحب خود اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں۔ ان کے طالب علم یونیورسٹی کا ہر وہ لڑکا جو انہیں جانتا ہے، ہر ادب سے دلچسپی رکھنے والا نوجوان جو انہیں جانتا ہے، احتشام صاحب کو اپنی شخصیت کا ایک جزو سمجھنے لگتا ہے۔ وہ گھنٹوں اس کی باتیں سنیں گے، اس کی جذباتی الجھنوں میں غمخواری کریں گے، اس کو مشورے دیں گے، اس کے لئے فکر و دماغ فراہم کریں گے اور چاہے وہ اس نئی نسل کے دکھوں کا مداوا نہ کر سکیں مگر ان کی آواز ان کی شیریں گفتگو بے قرار دلوں کے زخموں پر مرہم ضرور رکھ دیتی ہے۔ امید کا نہیں غمخواری کا مرہم ——

اس طرح وہ ایک نسل کا مرکز بن گئے ہیں جہاں لوگ مداوا پانے نہیں جاتے شاید غم بانٹنے اور تھکے ہوئے چلے جاتے ہیں یہ غم وہ بانٹتے ہیں یہ بات البتہ یقینی ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی کام کی جگہ نکلے اور وہ آپ کا ذکر نہ کریں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ صحبتوں میں وہ ادنیٰ سے ادنیٰ شناسا کو پہچان لیں گے اس سے بات کریں گے اور اپنے سارے مسائل بھول کر اس صحبت میں اس ادنیٰ سے شناسا کا ذکر شروع کر دیں گے۔

گھریلو زندگی میں بھی احتشام صاحب بڑے خاموش، سنجیدہ اور جھگڑوں سے بچنے والے انسان ہیں۔ خریداری کے لئے وہ کبھی بازار نہیں جاتے، بیشتر ان کے چھوٹے بھائی اقتدار ان کی شیروانی کا کپڑا، ان کے قلم کی روشنائی اور جوتے خریدتے دیکھے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی اور شام کو کافی ہاؤس کے علاوہ بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ جلسے جب تک ان کے سر نہ آ پڑیں یا وہ صدر نہ بنا دیئے جائیں اس وقت تک وہ ان سے دامن کش ہی رہیں گے۔ البتہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں جو سرور صاحب کے ہاں ہوتا ہے تقریباً پابندی سے آتے ہیں۔ وہاں نوجوان ادیبوں سے ان کی گفتگو بہت دلچسپ ہوتی ہے۔

احتشام صاحب یوں بہت گھریلو آدمی ہیں ان کا گھر بچوں سے آباد رہتا ہے۔ کوئی ان کا قلم جیب سے نکالے لئے جا رہا ہے، کوئی ان کی گود میں بیٹھنے کے لئے جنگ و دو کر رہا ہے، کوئی کتاب چھینے لئے جاتا ہے اور اس کی تصویریں دیکھ رہا ہے اور احتشام صاحب نہایت جمعیت خاطر سے کبھی بچے کو پچکار رہے ہیں اور کبھی آپ سے کروچے کے فلسفۂ جمالیات پر بحث کر رہے ہیں۔ مگر ان کی بچی ثریا کی طبیعت ذرا ناساز ہے تو ان کے سارے پروگرام منسوخ ہو جائیں گے۔ حالانکہ خود اپنی بیماری کو ہمیشہ ٹالتے ہی رہتے ہیں۔

یہ بیماری جسمانی ہے یا صرف (بقول رشید احمد صاحب صدیقی) "اسٹائل" ہے یہ کہنا مشکل ہے۔ البتہ دو دنوں میں تھوڑی بہت صحیح ہو گیا۔ بلڈ پریشر ان کا مرض ہے لیکن اس کے علاوہ طبیعت کی گرانی، الجھن اور پریشانی بھی گھر کر جاتی ہیں۔ ایک شام معلوم ہوا کہ احتشام صاحب آج دلی جانے والے ہیں، وہاں جامعہ کی طرف سے "یوم نظیر" منایا جا رہا ہے۔ حضرت گنج ہی میں مجھے اطلاع ملی۔ ساڑھے نو بج چکے تھے اور گاڑی غالباً ۹-۲۰ پر جاتی تھی۔ ابھی ان سے کچھ کام تھا۔ بھاگم بھاگ بارود خانہ پہنچا۔

گھر کے سامنے رکشا کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر میں اقتدار میاں بستر لئے رکشا میں رکھ رہے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ٹھیک سے ملاقات بھی نہ ہو سکے گی۔ بہرحال اطلاع کرائی تو جیسے رہا کرتے ہیں ویسے ہی باہر چلے آئے۔ میں نے حیرانی سے پوچھا:

"آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟"

بولے: "طبیعت میں عجب طرح کا خلجان سا ہے۔ کچھ گرانی محسوس ہو رہی ہے۔ سوچتا ہوں کہ جاؤں یا نہ جاؤں؟"

اتنے میں اقتدار میاں اور رکشا والے دونوں نے جلدی مچانا شروع کی، کہنے لگے،

"میاں اقتدار! ۹-۲۰ کے بعد کوئی اور گاڑی نہیں جاتی؟"

اقتدار میاں نے کہا: "شاید ۱۲ بجے جاتی ہے؟" پھر بھی کوئی ۱۵-۲۰ منٹ معاملہ اسی طرح رکا رہا، فیصلہ ہوا کہ اس گاڑی سے جانا ملتوی کیا جائے

تو ۱۲ بجے دیکھا جائے گا۔ بستر ادھر بچھا دیا گیا۔ رکشا رخصت ہوا اور ہم دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ۱۲ بجے میں اٹھ گیا۔ تیسرے دن معلوم ہوا کہ احتشام صاحب دہلی نہیں گئے۔

اب بھی اگر دوستی میں شبہ ہو تو میں جان لیجئے کہ احتشام صاحب جو امریکہ، لندن اور پیرس کے نادر عجائب گھروں اور آرٹ گیلریوں کی سیر کر آئے ہیں آج تک آصف الدولہ اور شاہ نجف کے امام باڑے اور شاہان اودھ کی آرٹ گیلری دیکھنے بھی نہیں گئے۔ لکھنؤ میں محرم کی رونق لکھنؤ سے باہر کے رہنے والے بھی دیکھنے کے لئے آتے ہیں لیکن اس [illegible] شخص نے تعزیر کے انداز میں ہمیشہ اپنے ہی باغ و بہار سے مطلب رکھا ہے۔ باقی باغ کے نظاروں سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔

لکھنؤ کا کافی ہاؤس اور حضرت گنج پیرس کی اور شہر کے سارے جدید ذوق رکھنے والوں کا مرکز ہو گیا ہے۔ شام کو ایک کرنے میں آل احمد سرور، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکرجی، پنڈت جواہر لال نہرو کے اخبار نیشنل ہیرالڈ کے ایڈیٹر چیلاپتی راؤ، کبھی کبھی ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اور ان کا سیاسی گروپ اکٹھا ہو جاتا تھا مگر احتشام صاحب برسہا برس میں صرف ایک آدھ بار اس محفل میں دکھائی دے جاتے تھے۔

شہر کے سب سے خوبصورت سینما ہال میں بہترین انگریزی فلمیں جگمگاتی رہتی ہیں لیکن وہ ادیب جس نے نہ جانے کتنے طلبا کے سینے میں آرٹ کا ایک مربوط اور بھرپور تصور پیدا کیا ہے، خود یہاں کسی اور سینما ہال میں کبھی فلم دیکھنے نہیں جاتے۔ یہ وہی احتشام صاحب تو ہیں جنہوں نے امریکہ اور برطانیہ میں صرف انگریزی ہی نہیں [illegible]، پرکشش اور اعلیٰ فلمیں بڑی تعداد میں دیکھی ہیں۔ یہ وہی احتشام صاحب ہیں جن سے اگر رقص اور مجسمہ سازی پر بات کیجئے یا ہندستانی موسیقی کا ذکر چھیڑئیے تو گھنٹوں اس طرح بات کرتے رہیں گے کہ آدمی حیران رہ جائے۔

امریکہ جانے کا واقعہ سنئے۔ انہی دنوں میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک عارضی جگہ پر شعبۂ اردو میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ تقرر ایک سال تک تھا۔ اتفاق سے جب اس جگہ کے مستقل ہونے کا سوال آیا تو صدر شعبہ اور رجسٹرار آف یونیورسٹی کی حمایت کے باوجود ایک دوسرے صاحب اس جگہ پر مقرر ہو گئے۔ جس روز اس نتیجے کا اعلان ہوا ہے، احتشام صاحب اپنے وطن ماہل (ضلع اعظم گڑھ) گئے ہوئے تھے۔

تیسرے یا چوتھے روز وہ واپس آئے۔ میری ملازمت کے آخری دن تھے کچھ کی تہائی میں بسر کر رہا تھا۔ دیکھا کہ احتشام صاحب مجھ سے ملنے کو رکشا سے چلے آ رہے ہیں، اداس، خاموش اور رنجیدہ۔ مجھے دلاسہ دینے لگے۔ میں نے اس ملنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ ان کے دل میں میری ناکامیابی کا کتنا گہرا عکس [illegible] پھر کہنے لگے:

"شاید مجھے امریکہ جانے کے لئے سال بھر کی چھٹی لینا پڑے، اس صورت میں ایک عارضی جگہ اور نکلے گی"۔

مجھے اس شاید کی داستان معلوم تھی لیکن اس وقت میں اس دردمندی سے اس قدر مبہوت ہو گیا تھا کہ اس کے بارے میں کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ البتہ یہ جانتا تھا کہ امریکہ والے ان کے بلانے کے بارے میں طے کر چکے ہیں، ہاں ان کو جانے کے بارے میں طے کرنا ہے۔ یہ داستان طویل ہے کہ کس کس طرح احتشام صاحب نے امریکہ کو ٹالنے کی کوشش کی اور کچھ بار بار [illegible] کی کوشش کی کہ وہ بلاوا ٹالتے رہیں گے۔ درخواست دینے میں کیا ہوتا ہے۔

اور جب ایک منزل آ ہی گئی ان کو اپنی خاموش ذہنی اذیت سے گزرنا پڑا ہو گا۔ انہوں نے امریکہ جانے کا فیصلہ فقط راستہ صاف کرنے کے لئے ایک مدت کے طور پر کیا۔ جب کوئی ایسا نہ ملا جو اس اقدام کی مخالفت کرتا اور وہ گوشہ [illegible] کے بجائے آرام بہت ہے "دو ہزار"۔ جب یونیورسٹی نے چھٹی اور ٹکٹ دونوں دے دئے، جب ڈاک [illegible] والوں نے ان کا [illegible] اور ویزا بھی منظور کر دیا تب کوئی بہانہ باقی نہ رہ گیا جو ان کے جانے کو روکتا، [illegible] کی ایک گھڑی سے بھی ان کا چہرہ [illegible] نہیں ہوا۔ وہ [illegible] اور [illegible] پر سب ان کو پہنانے کے لئے [illegible] اکٹھا ہو گیا ان کی گردن [illegible] سے بھر گئی تو وہ بار بار [illegible] لئے [illegible] ڈالتے جاتے تھے اور [illegible] مسکراہٹ کے ساتھ [illegible] گال [illegible] تھے لیکن ان [illegible]

کی وسعت، ذہنی [illegible] اور سماجی [illegible] ضرورت میں [illegible] ہی تھی صرف فرق کا ایک جاندار احساس تھا۔

امریکہ میں غیر ملکی پروفیسر [illegible]، ایک یہودی پروفیسر [illegible] سے جنہوں نے [illegible] پڑھایا اور [illegible] اردو زبان سے بندھا ہوا تھا۔ علی جواد حسینی [illegible] جن کی آنکھیں [illegible] ڈاکٹر [illegible] احتشام صاحب سے کچھ پڑھا ہو گا۔ تھے وہ [illegible] جیسے تھے۔ طلباء کو کچھ [illegible] نئی اردو اور انگریزی [illegible] سکتے یونیورسٹی کے [illegible] ساتھ [illegible] ایسی [illegible] احتشام صاحب کو بہت کم [illegible] نصیب ہوئی ہو گی۔

امریکہ کیا ہو گا، لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہنگامہ ہو ایک بازار ہے جو کہ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلا گیا ہے۔ وہاں [illegible] جنگل اور قصبے [illegible] کے [illegible] ہر قدم پر [illegible] خاموشی، سکون اور متانت شاید وہاں کے قومی کردار کا بنیادی جوہر نہیں کہی جا سکتی۔ سڑکوں کے کنارے [illegible] اونچی اونچی عمارتوں کے نیچے نوجوان لڑکے لڑکیاں [illegible] کی گرمی [illegible] ہاتھ ڈالے ہوئے دکانوں میں مصروف ہیں۔ ہوٹلوں میں [illegible] جاز کی موسیقی [illegible] ہے۔ [illegible] شراب پانی کی طرح بہہ رہی ہے [illegible] ہو رہی ہے اور جسم کی گردش [illegible] کے آداب سے بے پروا [illegible] کی طرح [illegible] رہے ہیں۔

ہنگامہ [illegible] اور کلبوں میں [illegible] جسم [illegible] مست ہو کر مرد اور عورت بھی جھوم رہے ہیں، گا رہے ہیں [illegible] جا رہے ہیں۔ ایسے موقعوں پر تو لگتا ہے جیسے پاک بازی [illegible] کے ہونٹوں [illegible] کی ضرب [illegible] جاتی ہے۔ مگر ان خطوں میں جو امریکہ کے مختلف شہروں سے [illegible] پاس احتشام صاحب کے پاس [illegible] چند اور لوگوں کے پاس آئے اور [illegible] کی شیروانی اور ترکی ٹوپی [illegible] جس [illegible] نوجوان کا [illegible] جنہیں پہلی بار [illegible] نے [illegible] میں دیکھا تھا۔

امریکہ سے آئے ہوئے [illegible] کے علاوہ کوئی [illegible] تفصیل سے باتیں ہوتی ہیں۔ یہ معلوم ہوا کہ وہ امریکہ کی ہر ایک اہم یونیورسٹی کا دورہ کر کے گئے تھے وہاں کی [illegible] اور خاص طور پر [illegible] اردو کے [illegible] کی زیارت [illegible] وہاں [illegible] جیسے [illegible] فن کاروں سے ملے ہیں۔ لندن میں [illegible] مرحوم ڈاکٹر [illegible] شیکسپیئر کے وطن کی زیارت [illegible] ملاقات کی ہے [illegible] کی زیارت کی ہے [illegible] لکھنے والوں سے ملے ہیں [illegible] ادیبوں اور فن کاروں کی محفلوں میں شریک رہے ہیں۔

ان سب ملاقاتوں اور زیارت گاہوں نے احتشام صاحب کو متاثر کیا ہے۔ ان کے ذہنی افق میں بڑی وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوئی ہے۔ ان ملاقاتوں کا حال [illegible] صحبت میں ان کی زبانی سنیے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ خود ان دانشوروں سے باتیں کر رہے ہیں [illegible] کی قیام گاہوں کی سیر کر رہے ہیں [illegible] ان کا سفر نامہ [illegible] ہے [illegible] میں نے ابھی [illegible] کتاب ساحل اور سمندر کو ختم کیا ہے۔

اس میں باتوں کی دلچسپی کہیں کھو گئی ہے [illegible] سیدھی سپاٹ [illegible] ہیں۔ [illegible] احتشام صاحب جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو [illegible] سے رخصت [illegible] وقت [illegible] ہے۔ یہی نہیں مجھے ان کی تقریروں [illegible] ریڈیو کے لئے لکھے ہوئے [illegible] اکثر [illegible] زندگی اور شادابی [illegible] جھلک [illegible] جاتا ہے۔ [illegible] شاید اس لئے کہا ہے [illegible] اگر وہ کوئی شگفتہ اور رنگین جملہ [illegible] لکھ جاتے ہیں تو نظر ثانی میں اسے کاٹ دیتے ہیں۔

قلم [illegible] کے اظہار میں [illegible] جب احتشام صاحب کا [illegible] اور احتشام صاحب کی شخصیت [illegible] ہو جاتی ہے [illegible] امریکہ سے زیادہ [illegible] کتابوں کی مدد سے اور کچھ [illegible] تجربوں کی مدد سے کیا ہے۔ یہاں [illegible] تحریروں کی [illegible] امریکہ کے ساحل کے [illegible] کا کیف [illegible] ہو جاتے ہیں۔

[illegible] لوگوں کے ہجوم [illegible] یاد آ گئیں

یہاں ساحل ہی ساحل ہے سمندر اور اس کے طوفان نہیں کیونکہ ان طوفانوں پر احتشام صاحب اس تخلیق سے بہت پہلے ہی کہیں پار اُترے ہوئے ہیں۔

احتشام صاحب ہمارے ان تنقید نگاروں کے میر کارواں ہیں جنہوں نے نقطۂ نظر پر اصرار کیا جن کے نزدیک تنقید نہ محض تشریح تھی نہ محض جمالیاتی ذوق کی نمائش بلکہ اس کا عمرانی عمل بھی ہے اور اسی بنا پر نقاد کا زاویۂ نظر ہونا بھی ضروری ٹھہرا اور ادب کا حکیمانہ مطالعہ بھی۔ شاید اسی لئے حکیمانہ مطالعے کی یہ امنگ خود انہیں اپنے تجزیے کی طرف لے گئی۔ "ساحل اور سمندر" ان سطروں کے ساتھ ختم ہوتی ہے:

> "میرا یہ طویل اور تنہا سفر یہیں سے آگے کچھ اور نہیں دیکھا تو اتنا ہی سہی کہ میں نے احتشام حسین کو سمجھنے کی کوشش کی.....
> عجیب انسان ہے، متضاد کیفیتوں کا حامل، حقیقتوں سے جدوجہد کرنے کا شائق اور خوابوں کے پیچھے مارا مارا پھرنے والا، اسے سمندر سے بھی محبت ہے، ساحل بھی عزیز ہے۔ وہ طوفانوں کی خواہش بھی کرتا ہے اور سکون کا مشتاق بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے زندگی کے ساتھ بے وفائی برتی۔ اس کی داستانوں میں سے صرف مطالعہ کو چن لیا، مطالعہ کتابی ہی نہیں ہو مشاہدے اور زندگی کی جدوجہد میں شریک ہو کر تجربے حاصل کرنے کا بدل نہیں ہو سکتا۔ سماجی جانور بننے کے لئے کچھ نہ کچھ جنون یا عشق بھی پیدا کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اس نے اس راز کو نہیں سمجھا وہ خود تنہا رہا کہ کوئی جنس نہ بکے، کوئی کچھ کہہ بیٹھے یہ ایک سمٹی ہوئی محدود شخصیت کی نشانی ہے۔ تفریحوں اور وقت گزاریوں کے بہت سے در کھلے ہوئے دیکھ کر اس نے کچھ کیا بھی تو اس طرح جیسے اپنے گرد و پیش سے خوفزدہ ہو جاتا ہو۔ جب لوگ دلچسپیوں میں مصروف ہوتے اور وہ پڑھتا، سمندر کی موجیں گنتا رہتا تو میرا جی چاہتا کہ یہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لوں اور کھیل کود میں کھینچ کر یہ رقص سے ہنگامے، یہ قہقہے، یہ محض ہنسی کے لئے ہنسی، یہ صرف بات کے لئے بات محض حماقت تو نہیں، کچھ نہ کچھ لذت تو حاصل ہوتی ہی ہوگی ورنہ لوگ کوشش کیوں کرتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ یہ سنجیدگی بے محل ہے۔ اس طرح اپنے خول کے اندر رہنا بے معنی ہے۔ رقص، کھیل کود، بات چیت کے بہانے دل ملتے ہیں، جسم ملتے ہیں، تجربہ حاصل ہوتا ہے نئی باتیں آشنا کراتے، کبھی کبھی وہ اسی طرف آیا لیکن اس کی آشنائی اس کے فلسفیانہ علم اور اس کے احساس تنہائی کو دور نہ کر سکا میں سمجھ نہ سکا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ غالباً اسے خود بھی اس کا علم نہیں ہے۔ شاید اس میں اتنی گہرائی اور خاموشی ہے جس کو وہ بانٹ نہیں سکتا۔ ایک دن جب میں نے اسے بہت مجبور کیا تو اس نے مسکرا کر شیکسپیئر کے ڈرامے "ایز یو لائک اٹ (As you like it)" کا چوتھا ایکٹ میرے سامنے کر دیا۔"

"ساحل اور سمندر" صفحہ ۲۹۶

آپ اس کے جواب میں جیکس اور روزالنڈ کا یہ مکالمہ پڑھئے۔ مجھے احتشام صاحب کے بارے میں دو چار باتیں کرنے کی اور اجازت دیجئے۔

آخری بات ان کی سیاست کے بارے میں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ احتشام صاحب ذہن کے دریچے بند کر کے زندگی کو نہیں دیکھتے ہیں نہ کمیونسٹ، ایسے موقع پر بھی جب کمیونسٹ پارٹی غلط قسم کی پالیسی پر کاربند تھی احتشام صاحب نے اپنے توازن اور اعتدال کو نہیں چھوڑا۔ شاید اس لئے کہ وہ ان کی فطرت کا دوسرا نام ہے۔ اس غلط پالیسی کے زمانے میں وہ علم و دانش کے اداروں میں رہے۔ سارے مصنفین کی کانفرنس میں شمولیت کرتے رہے۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ مجھے ان کی سیاست سے الجھن ہوتی ہے۔ ادب میں ایک مجبوری ہے جو کسی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ احتشام صاحب کی شخصیت جو سیاست اور روس کے مناقشوں، ہنگاموں اور اس کے دھندوں میں گم ہو جاتی ہے اپنے جمالیاتی شعور کے ساتھ نکھر کر سامنے آئے۔ اب "ساحل اور سمندر" کو لیجئے۔ یہاں بھی یہ سفر ایک شخص بہت زیادہ واضح اشتراکی رجحان رکھنے والے سیاست داں کا سفر معلوم ہوتا ہے جو God that failed جیسی غیر ادبی کتاب کا رد لکھنے کی فکر میں ہے۔ کبھی ایسا لگتا ہے جیسے وہ ادب کے

سارے حسن کو نچوڑ کر انسانیت کے عظیم ورثے کو خانوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔

اگر میں احتشام صاحب سے اتنا قریب نہ رہا ہوتا تو شاید ان کی ادبی شخصیت پر شک کرنے لگتا یا ان کے ادبی شعور پر حرف لاتا لیکن میں جانتا ہوں کہ ان کا مذاقِ شعر، جمالیاتی حس اور گہری وسعتوں سے پار ہو جانے والی نظر" اپنی نظیر آپ ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں تازہ و خوبصورت، ترشے ہوئے اور یاد رہنے والے شعروں ہی کو پیش کیا ہے۔ ہاں ان کی تنقید جمالیات کے دائرے ہی سے آگے نہیں بڑھتی۔ بلکہ ادبیات کے احاطے سے بھی آگے قدم رکھ کر عمرانیات اور سیاسیات کو چھو لیتی ہے۔

احتشام صاحب ان دنوں خاموش ہیں۔ میں جانتا ہوں ان کے پاس کہنے کے لئے بہت سی باتیں ہیں لیکن شاید اس بین الاقوامی سفر نے انھیں نگاہ کے نئے افق دئے ہیں۔ اب ان کا ادبی مذاق صرف چند مضامین سے تسکین نہیں پاتا۔ ان کی نگاہ اب کائنات کی سیاح ہے اور اس منزل تک پہنچنے کے لئے صرف شوق کی بلندی کافی نہیں۔ ہمتوں کی بلندی بھی ضروری ہے۔

مگر کیا ان سب باتوں کے بعد بھی کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ احتشام صاحب کو جانتا ہے؟ ان احتشام صاحب کو جنھوں نے کبھی اپنی اصل شخصیت کو خود اپنے سامنے بھی بے نقاب نہیں کیا، جو کبھی اپنی الجھنوں کا ذکر چند آوازوں میں نہیں کرتے، جن کے سینے میں اسرار "ایلورا کی گپھاؤں" کی طرح قید ہیں۔ ان کا شعری مذاق نکھرا ہے لیکن ان میں جو بھلا مانس مہذب انسان ہے وہ کسی برے شعر پر برہم ہونے یا کسی گھٹیا شاعر سے سختی سے پیش آنے کا بھی عادی نہیں ہوتا۔ ان کی شخصیت میں بڑی تابناکی، بڑی سرمستی، بڑی گرمی ہے لیکن اس شخصیت پر سنجیدگی، متانت اور وقار کے وہ پہرے ہیں کہ وہ اپنے ضمیر سے سرگوشی میں بھی اپنے دل کے ارمان دہرا نہیں سکتے۔

کب یہ پہرے اٹھیں گے کب اس اصل شخصیت کا طلوع ہوگا ـــــ کون کہہ سکتا ہے؟!

اختر حسین رائے پوری

دیویندر ستیارتھی

"حسن و عشق کے گیت تو بہت ہو لئے۔ بغاوت کے گیت ہوں تو نکالئے اپنے جھولے سے!"

"تو آپ نے مجھے کوئی مداری سمجھ لیا کہ جب چاہوں اپنے جھولے سے بے موسم کا پھل نکال کر پیش کر دوں۔"

"بہت خوب۔ لیکن بغاوت کے گیتوں سے میرا کیا مفہوم ہے، یہ شاید آپ نہیں سمجھے۔"

"ارشاد"

"میرا اشارہ کسانوں کے ان گیتوں کی طرف ہے جن میں انھوں نے قسمت کا رونا رونے کی بجائے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کا ارادہ ظاہر کیا ہو، جن میں ہمیں اُن کے وہ تیور نظر آ سکیں جو اپنے اقتصادی حالات پر غور کرنے والے کسی شخص کے چہرے پر اکثر دیکھے گئے ہیں۔"

"لوک گیتوں میں ایسے گیتوں کی بھی کمی نہیں۔"

"تو ذرا ایسے گیتوں کو منظرِ عام پر لائیے۔ ان کی ہمیں زیادہ ضرورت ہے۔ خالص شاعری کے نقطۂ نظر سے تو دوسرے گیتوں کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں، لیکن جہاں تک ادب کی افادیت کا تعلق ہے، ہمیں کسانوں کے ایسے گیتوں کو ترجیح دینا ہوگی جن میں وہ اپنے کھیتوں کے بارے میں کچھ کہتے ہیں، اپنے ہل چلانے کی بات سوچتے ہیں، زمینداری غلامی سے آزاد ہونے کے لئے آواز بلند کرتے ہیں۔"

گفتگو کے یہ نقوش آج تک دھندلے نہیں ہوئے۔ اگرچہ یہ گفتگو بیس برس پیشتر ہوئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اختر حسین رائے پوری کلکتے کے ہندی ماہنامہ "وشو متر" کے مدیرِ اعلیٰ تھے اور میں اس خیال سے ان کے یہاں پہنچا تھا کہ کسی طرح ایک مضمون کی پیشگی مزدوری مل جائے اور اس سے دارجلنگ جانے کا نہیں تو آدھے راستے تک کا ٹکٹ لیا جا سکے۔

میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ادیب نے مجھے ادب کے اقتصادی پہلو سے اتنی شدت سے روشناس کرایا۔ اختر حسین نے وعدہ کیا کہ وہ وشو متر کے مالک مول چند سے کہہ کر میرے لئے دارجلنگ کے کرائے کا انتظام کر دیں گے۔ میرا مضمون انھوں نے وشو متر میں چھاپنا منظور کر لیا، لیکن پڑھنے کے ساتھ ہی انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ لوک گیتوں کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے ادب کے گہرے مطالعے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے مجھے گورکی کے افسانوں کا بھی اسی طرح جائزہ لینا چاہئے۔

"آپ پہلے پہل کلکتے میں کب تشریف لائے تھے؟" میں نے پوچھا۔ "ظاہر ہے کہ آپ رائے پور میں پیدا ہوئے ورنہ اپنے نام کے ساتھ رائے پوری کیوں لکھتے؟"

"۱۹۱۲ء میں رائے پور میں میری پیدائش ہوئی جہاں میرے والد صاحب ملازم تھے۔" اختر حسین نے مسکرا کر کہا۔ "ویسے ہمارا خاندان بہار سے تعلق رکھتا ہے۔ خیر چھوڑیئے۔ یہ پرانی باتیں ہیں۔"

"یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ کلکتے میں کب آئے۔"

"۱۹۲۰ء میں مجھے کلکتے آنے کا موقع ملا۔ کلکتے کی مجھ پر گہری چھاپ ہے۔ ماہنامہ وشومتر شروع ہوئے تو خیر بہت دن نہیں ہوئے۔ روزنامہ وشومتر کلکتے کا پرانا ہندی اخبار ہے۔ روزنامہ وشومتر میں ترقی ہوتے دیر نہ لگی۔ جب بار بار سوچا ہے کہ کیا کبھی کلکتے کو چھوڑ کر بھی کہیں جا سکوں گا یا نہیں۔"

دارجلنگ سے لوٹ کر میں اختر حسین رائے پوری سے ملنے گیا تو انہوں نے تفصیل سے کلکتے میں اپنی زندگی کے حالات سنائے۔ پچاس پچپن روپے ماہوار سے ان کی زندگی شروع ہوئی۔ جن میں سے سترہ روپے ماہوار تو مکان کے کرائے میں ہی نکل جاتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اکثر انہیں رات کی ڈیوٹی کرنی پڑتی تھی۔ کلکتے میں انہیں چار بار مکان بدلنا پڑا تھا۔ پہلے مکان کے صحن میں کسی دھوبی کی بھٹی چڑھتی تھی اور پتھر کے کوئلے کے دھوئیں کے مارے ان کا ناک میں دم آجاتا تھا۔ اس کشمیری دھوبی کے گیت کے [illegible] ہوتے ہوئے جسم اور روح پھیل [illegible] ہوئے نقش کرتے ہوئے اختر حسین نے مسکرا کر کہا "آپ ٹھہرے گیتوں کے رسیا۔ تو لیجئے آپ کو اس کشمیری گیت کی یاد دلا دوں جو اس کشمیری دھوبی کے ساتھ کو گایا کرتے تھے۔ اصل گیت کے بول تو یاد نہیں پہلے بول کا مفہوم یوں تھا ——— اے شال، اے لپٹے ہوئے پانی سے اب تو نکلے گی۔ پھر کہیں اس قابل ہوگی کہ مجبوری کی [illegible] ہی نکلے!" پھر اپنے دوسرے مکان کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ اس کا راستہ ایک ایسی سڑک سے ہو کر گزرتا تھا جس کے دونوں طرف چمڑے کے گودام تھے اور گیروں کے کچے چمڑے کے ڈھیروں ہی سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ نہ جانے کتنی بیماریوں کے جراثیم اس گلی میں پھیلا کرتے تھے۔ انہوں نے مسکرا کر کہا "آج بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے کی اس گلی کی بدبو میری ناک میں بسی ہوئی ہے۔ بھینس کے چمڑے کی بو کبھی قدرے چھپائی ہوئی ہوتی تھی۔ گائے کے چمڑے سے ایسی بو آتی تھی۔ جیسے بھنتے ہوئے گوشت سے آتی ہے۔"

"لگے ہاتھ تیسرے اور چوتھے مکان کا حال بھی بتا دیجئے۔"

"تیسرے مکان کے چھت پر بڑے کمرے میں دو مہرا ہی منظر دیکھنے کو نصیب ہوتا تھا۔ مالک مکان نے یہ قاعدہ بنا رکھا تھا کہ وہ جمعرات کی صبح کو اپنے ہاں آئے ہوئے بھکاریوں کو ایک ایک ادھیلا دے گا۔ میں اپنے برآمدے میں کھڑا ہو کر دیکھا لنگڑے لولے اور اندھے بھکاریوں کے جھگڑے کا جواب دیا کرتا تھا۔ کچھ دیر تک یہ منظر دیکھنے کے بعد کئی روز تک میری طبیعت پریشان رہتی تھی۔ مجھے ان سرمایہ داروں سے نفرت ہو گئی۔ جو دان پن کے بڑے ڈھونگ رچانے میں ہی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اب سنئے چوتھے مکان کا حال۔ اس کے سامنے ایک پنجابی ہوٹل تھا جہاں صبح سے لے کر آدھی رات تک تندور پر روٹیاں پکا کرتی تھیں۔ ہوٹل کا مالک تندور کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھا اپنے ہاتھوں سے تندور میں روٹیاں لگایا کرتا تھا۔ اس کا اپنا حساب تھا۔ کٹوری سے گندھے ہوئے آٹے کی ایک خاص مقدار لے کر پیڑے پر رکھتا اور ہتھیلی کی مدد سے گول شکل دیتے ہوئے اسے اچھالتا اور دونوں ہاتھوں میں سے کچھ دیر کے لئے [illegible] کا سماں باندھنے کے بعد تیزی سے تندور کے اندر تھاپ دیتا۔ دھماکے کے ساتھ تندور میں روٹی تھاپنے کے بعد ہر بار وہ اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتا اور پاس رکھی گوڑ گوڑی اٹھا کر ایک کش لگا لیتا۔ اس بھٹیارے تندور والے کی ڈیوٹی دن بھر چلتی رہتی تھی۔ [illegible] تندور میں گوڑ گوڑی کی گڑگڑ۔ یہاں میرا یہ حال ہے کہ اس کی ہر تھاپ کے ساتھ گویا میرے دماغ پر چوٹ پڑتی ہے۔ اس کلکتے کے کوئے کی تھاپ میرے اندر جیسے چوٹ کے نشان کی مانند گونجتی جاتی ہے۔ جیسے [illegible] بات سمجھ کر ابھی بس میں گھنٹے گزر جاتا ہے کہ روٹی پر ٹکنے کی آواز اسی طرح گونج اٹھتی ہے جیسے کہ اس ہوٹل کی تیزی دماغ کے [illegible]

آنسوؤں میں گھلتی رہتی ہے۔“

اس پر واقعی زور کا قہقہہ پڑا اور اختر حسین نے بات کا رخ کسی قدر بدل کر میرے اس مضمون کی تعریف شروع کر دی جو میں نے ان کی حسب ہدایت وشرمتر کیلئے لکھ کر دیا تھا۔ وہ دیر تک مجھے سمجھاتے رہے کہ لوک گیتوں کے آئینے میں ہمیں گاؤں کی زندگی کے نقشے کو دیکھنا چاہیے اور اپنے عوامی ادب میں عوام کی وہ آواز سننی چاہیے جو ان کی اقتصادی کشمکش کی یاد دلاتی ہے۔ میرے مضمون کا وہ گیت انہیں خاص طور پر پسند تھا جس میں بنگال کا کسان شیخ اللہ سے شکایت کرتا ہے کہ ندی میں سیلاب آگیا اور ڈانڈ ٹوٹ جانے سے اس کی فصل کا اناج بہہ گیا اور اب وہ اپنی بیوی کیلئے زیور بنوا کر دینے کا وعدہ پورا نہ کر سکے گا۔ اگرچہ اختر حسین ایک ہی سانس میں کہہ گئے تھے کہ محض اللہ سے شکایت کرنا کافی نہیں ہے کسان کو چاہیے کہ اپنے ہاتھوں اپنی قسمت بنانے کا پوری طرح تہیہ کرے۔

باتوں باتوں میں اختر حسین نے اس واقعہ کا ذکر کیا جب وہ ایک بار اپنی پتلون کی کریز بچاتے ہوئے اپنے گھر کے سامنے والے ہوٹل میں داخل ہو رہے تھے کہ راستے میں ایک بھکاری نے ان کا بازو پکڑ لیا۔

”لیکن مجھے میری پیٹی بورژوا ذہنیت فوراً بیدار ہو گئی تھی“، انھوں نے کسی قدر سنجیدہ ہو کر کہنا شروع کیا۔ ”میں نے اسے فوراً دھکا دے کر پرے کر دینا چاہا تھا کہ ہاتھ دیکھ کے رہ گئے۔ اس کے ہاتھوں کو لقوہ مار گیا تھا اور وہ کسی کی طرح تھرتھرا رہے تھے۔ اس کے بازو میں روٹی کے ٹکڑے دبے ہوئے تھے۔ اس میں اتنی بھی طاقت نہ تھی کہ خود روٹی کھا سکے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ صرف یہی چاہتا ہے کہ میں اس کی روٹی اسے کھلا دوں۔ کلکتہ جیسے شہر میں جہاں بھکاریوں کی کوئی کمی نہ تھی، میرے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے ہاتھ سے اسی بھکاری کو اسی کی روٹی کھلا سکوں۔ میں اس کے منہ میں لقمہ دیتا جا رہا تھا اور وہ بھکاری اسے چبا چبا کے نگل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میرے لئے واقعی یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اور کیا عجب ہے کہ اس واقعہ کا مجھ پر گہرا اثر ہوا اور میں یہیں سے اس نظام سے نفرت کرنے لگا جس کی بدولت سیکڑوں ہزاروں لوگ بھکاری بننے پر مجبور رہتے ہیں۔“

اس روز مجھے اختر حسین کا ایک مضمون پڑھنے کا موقع ملا جو کچھ دن پہلے وشرمتر میں شائع ہوا تھا۔ اس ڈائری نما مضمون میں ایک جگہ انھوں نے لکھا تھا۔

”چھ اگست۔ پھر ریل کا سفر، میری زندگی ڈرائنگ ماسٹر کی پرکار یا پٹواری کی جریب کی مانند ہو گئی ہے۔ میں سچ مچ سندباد جہازی ہو گیا ہوں۔ لیکن نہ کہیں سونے چاندی کی بارش ہوتی ہے اور میں ان کی تلاش میں اپنی بری حالت کو بد سے بدتر بناتا جاتا ہوں۔“

اس مضمون میں آگے چل کر اختر حسین نے ملک کی سماجی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا۔

”میرا جسم ہی بیمار نہیں، میری روح بھی بیمار ہے۔ یہ جگہ گوبر کا ڈھیر ہے۔ میری تعلیم کی روشنی سے کیڑوں کی طرح اتنے انسان کلبلا رہے ہیں۔ ان کے بیچ میں میری روح جگنو کی طرح کبھی جلتی ہے، کبھی بجھ جاتی ہے۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن دنیا میرے لئے یا تو بہت تنگ ہے یا اتنی بڑی کہ اس کی کشمکش میں مکھی کی طرح میں پسا جا رہا ہوں۔ کچھ دنوں سے پھر دل کی دھڑکن شروع ہو گئی ہے۔ کل پڑھتے پڑھتے یک دم میرے ہاتھ تھرانے لگے۔ دل پنکھے کی طرح گھومنے لگا۔ کان بھائیں بھائیں کرنے لگے۔ چہرہ خون کے دباؤ کی تیزی سے سرخ ہو گیا۔ میں نے سانس روک لیا کہ کہیں اس دھڑکن میں رک ہی نہ جائے۔ ایسا دورہ کبھی نہ پڑا تھا۔ پھر بڑی مشکل سے ہاتھ پاؤں نڈھال ہو گئے۔ اندھیرا اور سناٹا۔“

اختر حسین ایک ضروری کام سے باہر چلے گئے تھے۔ میرے ہاتھ میں ان کا مضمون تھا۔ انھوں نے لکھا تھا۔

”کیا انسان روٹی کمانے اور کھانے والے حیوان کے سوا کچھ نہیں؟ کیا یہی زندگی کا مفہوم اور مقصد ہے؟ کیا جینا اس لفظ کا آخری مفہوم ہے؟ اگر کام کرنے اور جینے میں کوئی فرق نہیں تو میں ہرگز کام نہ کروں گا۔ کبھی منزلوں کے پیچھے دوڑا، اپنی چیخ و پکار کو سنتے ہوئے بتانا ہے مجھے

پکار رہوں اور اسی طرح مر جاؤں۔ دنیا کو میری زندگی کی ضرورت نہیں تو مجھے بھی اس دنیا کی ایسی کیا ضرورت ہے:

میں سمجھ گیا کہ اختر حسین کے یہ جذبات ان کی دل کی بیماری کی ہی پیداوار ہیں۔ ان کا مضمون پڑھتے پڑھتے ایک جگہ میری نظر جم گئی،

ان کسی وقتی چیزیں ہیں جو مجھے خدا کے اچھے ٹیسٹ کا قائل بنانے لگی ہیں: . . . . حسن، عورت اور ٹھرا ایک وسیع ہے۔ قدرتی او بو چیلی قیمت میں پنجابی خوانچے والے کے بارہ نزاکتوں کا مزہ ہے . . . . . روپے پر حکمرانوں کی مہریں کیوں دی جاتی ہے؟ کیوں نہیں جو ہو پروردگار کی تصویر اس پر نقش کر دی جاتی: . . . . . . چھتیس راگ راگنیوں کی شیرینی روپے کی جھنکار میں سمٹ آئی ہے۔

اختر حسین لوٹ کر آئے تو میں نے کہا: "لیجئے یہاں بیٹھے بیٹھے آپ کا یہ مضمون تو میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پڑھ گیا۔ کہیں کہیں آپ نے خوب چوٹ کی ہے":

ایک زور کا قہقہہ پڑا۔ ذرا سنبھل کر اختر حسین بولے: "اب ذرا چائے والے کا انتظام کیا جائے":

چائے آئی تو ہماری گپ ان گرما گرمی پوری طرح جم گئی۔ انہی دنوں 'وشال بھارت' کے ایڈیٹر پنڈت بنارسی داس چترویدی نے 'گھاسلیٹ وِرودھ' کے عنوان سے ایک مضمون شائع کرایا تھا جس میں ادب سے متعلق کچھ بنیادی مسائل اٹھائے گئے تھے۔ اختر صاحب نے اس مضمون کا اپنے مضمون "ادب اور انقلاب" سے موازنہ کرتے ہوئے بتایا کہ جہاں پنڈت جی نے اپنے مضمون میں محض "حقیقت پسندی" کے حق میں آواز اٹھائی ہے وہاں "ادب اور انقلاب" میں انقلابی حقیقت پسندی پر زور دیا گیا ہے۔

"ٹالسٹائی نے کہا ہے کہ آرٹ محض آئیڈیا ہی نہیں بلکہ وہ ایک ہتھیار بھی ہے!" اختر حسین نے یوں اپنا نظریہ پیش کیا۔ "محض کسان کا دکھڑا رونے اور زمیندار کے ظلم و ستم پر دہائی دینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مجھ سے کوئی پوچھے کہ مستقبل کس کا ہے تو میں تو ڈنکے کی چوٹ سے یہی کہوں گا کہ مستقبل کسانوں اور مزدوروں کا ہے۔ مستقبل ان ادیبوں کا ہے جو کسانوں اور مزدوروں کو جگانے کے لئے قدم بڑھاتے ہیں۔ اب ادب کو محض دل لگی سمجھنے کی غلطی نہیں کی جا سکتی۔ یہی ایک ہتھیار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ادب پڑھے لکھے لوگوں کو بتایا جائے کہ لوٹ کھسوٹ کیوں ہوتی ہے اور اسے کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ لوٹ کھسوٹ کیسے ہوتی ہے، حالانکہ ضرورت اس کی بھی ہے:

"میں نے کہا: "آپ کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم کسانوں اور مزدوروں کے لئے لکھنا چاہتے ہیں تو انہی سے ان کی دکھ بھری کہانی کہنا کتنا بے معنی ہے:

"آپ نے میرا نکتہ پا لیا۔ کسانوں اور مزدوروں کو تو ہمیں یہ بتلانا ہے کہ ان کا ناس کس طرح بچایا جا سکتا ہے":

اس کے بعد بات کا رخ بدل کر اختر حسین نے بتانا شروع کیا کہ کلکتے میں رہتے رہتے ان کا من بالکل اوب گیا ہے اور وہ اپنی زندگی کسی نئے ڈھب پر ڈھالنا چاہتے ہیں۔ میں نے ہنس کر کہا: "پھر مجھے بھی بتائیے نا":

"آپ ٹھیک کام کر رہے ہیں،" انہوں نے ہنس کر کہا، "آپ کو میں بھلا کیا راستہ دکھاؤں گا۔ ہاں ایک بار پھر یہ عرض کروں گا کہ لوک گیتوں میں حسن و عشق کی آواز سننے تک ہی اپنی پوری طاقت نہ لگا دیجئے۔ میرا مطلب ہے کہ کلاس سٹرگل والی بات قدم قدم پر یاد رکھئے۔ اور میرا تو خیال ہے کہ آپ کا کام اسی صورت میں مفید ثابت ہو سکتا ہے":

"لیکن آپ یہ تو نہیں سمجھتے کہ میں خواہ مخواہ مارا مارا پھرتا ہوں ان گیتوں کی تلاش میں":

"ان لوک گیتوں کے سامنے تو میرا سر جھک جاتا ہے۔ اور جو شخص مختلف زبانوں کے لوک گیتوں کو ایک ساتھ ہمارے سامنے لا کھڑا کرے وہیں اپنے ملک کے تمدن کی رنگارنگی کے باوجود اپنے تمدن کی ہم آہنگی سے روشناس کراتا ہے اس کو میں بھی ممنون ہونا ہوگا":

"اس ذرہ نوازی کے لئے شکریہ" کہہ کر میں چلا آیا۔

اس کے بعد کلکتے میں اختر حسین سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مجھے یہ پتہ چلتے دیر نہ لگی کہ اختر صاحب نے وشال بھارت کی نوکری چھوڑ دی اور وہ اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں علی گڑھ یونیورسٹی میں چلے گئے۔

میں بھی کلکتے سے کشمیر جا پہنچا۔ اور کشمیر میں تین مہینے گزارنے کے بعد میں نے پشتو لوک گیتوں کے سلسلے میں پشاور جا کر دم لیا۔ اس بیچ میں اختر حسین کی کوئی خبر نہ ملی۔ جب بھی کبھی کوئی "کلاس سٹرگل" کے موضوع والا گیت ملتا اختر صاحب کی یاد ہو آتی۔ آخر میں نے "وشال بھارت" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر برج موہن ورما کو لکھا کہ اختر صاحب کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تو ورما جی نے مجھے اس خط کی کچھ سطریں لکھ بھیجیں جو اختر صاحب نے ان کے نام ۱۵ فروری ۱۹۳۶ء کو لکھا تھا: "پچھلے چار مہینے کیسے بیتے، اس کا حال سنئے۔ اکتوبر میں علی گڑھ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر نے کہا کہ آپ خوشی سے بوریا بستر اٹھا لیجئے گا، نوٹس دے جائیے گا! اچھا یہی سمجھا گیا کہ ابھی اخباروں کی چیخ پکار سے بچا جائے۔ کانگریس کا میلہ لگنے والا تھا۔ ہم بھی خود اپنے گشتی نامہ نگار بنے وہاں جا پہنچے۔ اگر حضرت دل .... ہائے ورما جی! اس دل نے کہیں کا نہ رکھا! کمبخت کہیں پاتا نہیں، یوں ہی دھوکا کرتا ہے! بس صاحب ہم وہاں قریب قریب لیٹے ہو چکے تھے کہ ڈاکٹر انصاری تک پہنچ ہو گئی۔ نسخہ ملا کہ اس خبر کے ساتھ دو مہینے چپ چاپ پڑے رہو۔ قرنطینہ میں ایسے ویسے رہا۔ انجکشن لئے گئے۔ اس روگ سے شاید بہت دنوں کے لئے چھٹی ہو۔"

ورما جی کے خط سے مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ علی گڑھ یونیورسٹی سے نکالے جانے کے بعد اختر حسین کو کچھ دن دلی میں فاقہ مستی میں گزارنے پڑے اور پھر اسی پریشانی میں وہ لاہور جا پہنچے۔ لاہور سے انھوں نے ورما جی کو خط لکھا:

پیارے ورما جی!

آپ کو یاد ہو گا کہ ہندی سنسار میں اختر نامی ایک آوارہ بھی رہتا تھا۔ اب وہ بچارا دکھی جریب کی مانند زمین ناپتا لاہور چلا آیا ہے۔ علی گڑھ، بمبئی، دلی .... کہیں بھی آسن آسرا نہ ملا۔ اس بیچ میں برابر بیمار اور بیکار رہا۔ تنگ آ کر ہندی سے ناطہ توڑ رہا ہے۔ ان دنوں "اردو" اورنگ آباد کا کچھ کام کرنے لگا ہے۔ شاید روٹیوں کا کچھ سامان ہو جائے۔ کہیں مل چند جی ملیں یا مار دیں، وہاں کی کوئی پوچھے تو میری ہندی کی کہہ کر یہ شعر سنا دیجئے حالانکہ دونوں بیچاروں کو حسن یا عشق سے کوئی واسطہ نہیں۔

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

اگر آپ اب بھی میرا دل اتنا سمجھتے ہیں کہ وشال بھارت مفت بھیج دیا کریں تو امیر منزل علی گڑھ کا پتہ بدل کر لاہور کا پتہ کر دیجئے۔ بہت دنوں تک یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔

امید ہے آپ سب لوگ خیریت سے ہوں گے۔ جو یاد کرتے ہوں انھیں یاد، جو بھول گئے ہوں ان کا بھی شکریہ۔

آپ کا

اختر حسین رائے پوری

اس کے بعد ایک عرصے تک کسی دوست کے خط سے بھی اختر حسین کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ مستقل طور پر انجمن ترقی اردو کے ادارے سے وابستہ ہو کر حیدرآباد چلے گئے ہیں۔ ادھر میری اپنی مسافرت قائم رہی۔ مئی ۱۹۳۶ء میں جب میں کلکتے میں تھا اور جنوبی ہندوستان کی جاترا میرے پیش نظر تھی میں چاہتا تھا کہ حیدرآباد جا کر اختر حسین سے بھی ملاقات کروں گا۔ لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ اختر حسین تو نظام سرکار کا وظیفہ لے کر پیرس چلے گئے ہیں، اور اب وہاں سے ڈی لٹ لے کر ہی واپس آئیں گے تو جہاں مجھے یک گونہ خوشی ہوئی وہاں اس بات کا افسوس بھی ہوا کہ اب نہ جانے کب اپنے اس دوست سے ملاقات ہوگی جس نے مجھے واقعی پہلی بار "کلاس سٹرگل" کے نظریے سے لوک گیتوں کے پرکھنے پر مجبور کیا

کی تحقیق کی تھی اور یوں مجھے عوامی ادب کے ترقی پسند عناصر کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانے کی طرف راغب کیا تھا۔

۱۹۴۰ء کے آخری دنوں میں جب میں لنکا سے لوٹ کر لاہور پہنچا تو مجھے ایک دن ایک دکان میں ایک کتاب دیکھنے کا موقع ملا .... گورکی کی آپ بیتی حصہ اول "میرا بچپن" مترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ڈی لٹ (پیرس)۔ مجھے یہ جان کر بیحد خوشی ہوئی کہ میرا ایک دوست ترقی کرتے کرتے ڈی لٹ ہو گیا اور اب مجھے بھی اسے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے نام سے یاد کرنا ہوگا۔

کسی نے یہ بھی بتایا کہ اختر حسین کے افسانوں کا مجموعہ "محبت و نفرت" دلی سے شائع ہو چکا ہے۔ لیکن یہ کتاب مجھے کہیں نظر نہ آئی۔

جنوری ۱۹۴۱ء میں مجھے لاہور سے دلی جانے کا اتفاق ہوا تو اختر حسین سے ملاقات ہو گئی۔ پیرس سے لوٹ کر وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے تھے۔ وہ بہت خوش نظر آتے تھے۔ اگرچہ کلکتے کی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ اب بھی اپنے چہرے پر ایک خاص طرح کی کیفیت طاری کر لیتے تھے جو ان کی موجودہ آسودگی سے بہت کم میل کھاتی تھی۔

انھوں نے مجھے کھانے پر بلایا۔ اپنی بیوی سے میرا تعارف کرایا۔ یہ پتہ چلنے پر کہ بیگم اختر حسین ایک بہت بڑے پولیس افسر کی "دختر بلند اختر" ہیں میں زیر لب مسکرایا۔ لیکن خود اختر حسین صرف مسکرانے پر اکتفا نہ کر سکے۔ انھوں نے بہت بڑا قہقہہ لگایا اور کہا: "وہ مضمون تو آپ نے بھی پڑھا ہوگا جو پنڈت بنارسی داس چترویدی نے بندہ کے بارے میں لکھ کر وشال بھارت میں شائع کرایا ہے:

اتفاق سے وہ مضمون میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ وہ اندر سے اس مضمون کا کٹنگ نکال لائے اور لال پنسل کے نشان والی کچھ سطروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے: "یہاں سے پڑھنا شروع کیجیے۔"

میں نے بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔

"ہمارے پاٹھکوں نے کالپی کا نام سنا ہوگا۔ اس کالپی کا جو تین مہاپرشوں کی جنم بھومی ہونے کا مان رکھتی ہے۔ ایک [illegible] دوسرے امیر علی ٹھگ اور تیسرے لالہ گوکل چند جی اگروال روشو متر والے! ان تو اسی کالپی کے ایک پولیس سپرنٹنڈنٹ کے ہاں ڈاکٹر جی کی سگائی ساتھ سیوک کو اس کی خبر بھی نہیں دی گئی۔ کوئی بات ہی نہیں بنا بھی کیسے سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹھیک ہی ساتھی سنگیوں نے یہ خبر پھیلا دی — ہم تو پہلے ہی سے کہتے تھے کہ اختر سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی ہے۔ نہیں تو پولیس افسر کے ہاں کیوں اس کی شادی ہوتی!"

خیر وہ پہلی دعوت کا خوب مزا رہا۔ ہم لوگ دیر تک قہقہے لگاتے رہے۔ کلکتے کی ملاقاتوں کو ذکر میں بار بار چھیڑ دیتا۔ بار بار اختر صاحب سے کلاس سٹرگل کی تھیوری پر مزید روشنی ڈالنے کی درخواست کرتا۔ بیگم اختر حسین تو حیران تھیں کہ ہم لوگ کیسی بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ویسے تو بیگم تو تھیں کہ کھانے سے ہی فرصت دیتی۔ ایک سرو رعنا سا ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ایک بالوں والا وجیہ جوان اپنے میزبان سے اتنی بے تکلفی برتتے ہوئے یہ بات شاید بیگم اختر حسین کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اختر صاحب نے بیگم اختر کو مرعوب کرنے کے لیے بتایا کہ یہ شخص ترقی کے اس میدان کے سفر پر موجود ہے اس نے اپنے پیروں سے ہندوستان کی دھرتی ناپ رکھی ہے اور بھی بہت سے تعریفی جملے وہ ایک سانس میں کہ گئے۔ سچ پوچھو تو یہ اپنی تعریف سن کر مجھے ذرا خوشی نہ ہوئی۔ اگرچہ میں بہت پہلے حال تو نہ تھا۔ لیکن اپنے سر وحال دوست کے بیچ سجے ڈرائنگ روم میں مجھے اپنا لباس واقعی بہت بدزیب اور میلا نظر آنے لگا۔ کبھی میں اپنے دوست کی طرف دیکھتا اور کبھی اپنی طرف۔ کلاس سٹرگل کی تھیوری اپنی تمام تر شدت سے میرے سامنے اجاگر ہو گئی تھی۔ بار بار میرے ذہن میں یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ کیا اختر صاحب اور میں ایک ہی کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے دوست سے یہ سوال پوچھنے کی جرات نہ ہوئی۔ گو کہ وہ تو بہت دیر سے گورکی کی آپ بیتی کی تعریف کیے جا رہا تھا۔ جس کا ترجمہ اس نے بڑی خوبی سے اردو ادب کو عطا کیا تھا۔ میرے دوست کی بات میں ایک طرح کا فریب اندیشہ تک موجود تھا۔ لیکن جب بھی میری نظر اپنے لباس کی طرف جاتی جب بھی مجھے اپنی بے آسودگی کا خیال آتا مجھے یہ محسوس ہونے لگتا کہ اختر صاحب تو وضعداری میں آج بہت کمال کر رہے ہیں۔ اس وضعداری میں اگر کسی چیز کی کمی تھی تو وہ تھی اپنا پن کی

کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان سوالوں کے اندر ہی ان کا گھر ہے۔ وہاں اگر بیٹھے ہی کسی طرح اپنی دنیا آباد کر سکے تو کہیں جانا بھی نہیں دیکھ سکتا۔

"یہ حضرت نوکری سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔" شام کو چائے پر اختر صاحب نے بیگم اختر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بارہا مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ اختر صاحب مجھ سے زندگی میں کوئی نوکری نہیں ہو سکے گی۔ ان کا یہی تصور ہے اور تخیل بھی۔ حیات کا واضح مقصد ہے ان کے سامنے۔ یہ واضح مقصد سامنے نہ ہوتا تو کوئی ایسا شخص تھا کہ برسوں سے لوک گیتوں کی کوشش میں دیس بدیس کی خاک چھانتا پھرتا۔ گورکی کی طرح ہی ان کی زندگی بھی سڑکوں پر گزری ہے۔ ان کے مشاہدے اور تجربے کی گہرائی کو داد دے سکتے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ انھیں وہ مسالہ کر جو ملتے تھے مجھے ان کے مضامین میں نظر آتے ہیں ان سے ہمارے ادیب کوسوں دور ہیں۔ کتنے کوسوں دور ـــ ہاں تو۔"

"اب وہ جتنے بھی دیکھئے اختر صاحب!" میں نے ہنس کر کہا۔ "ایک دوست کی زبان سے یہ سچی سہی لیکن اتنی تعریف بھلا کیسے برداشت کی جا سکتی ہے؟"

اس شام میں نے اپنا ایک غیر مطبوعہ افسانہ "اور بنسری بجتی رہی" انہیں پڑھ کر سنایا۔ میں نے انہیں بتایا کہ گڈریوں کی ایک لوک کہانی میں سانپ کے ذکر سے تذکرہ سن کر مجھے یہ افسانہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ میرا ایک اور افسانہ "کنگ پوش" جو میری اپنی زندگی سے متعلق تھا، مجھے "اور بنسری بجتی رہی" سے کہیں زیادہ پسند تھا۔ اختر حسین کی صحیح رائے معلوم کرنے کے لئے میں نے دونوں افسانے ایک ساتھ پڑھ کر سنا ڈالے تھے۔ میری حیرت کی حد نہ رہی جب انہوں نے مجھے بتایا۔ "اور بنسری بجتی رہی" دوسرے افسانے سے کہیں بڑھیا افسانہ ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب انہوں نے مجھے افسانوں کی دنیا میں بھٹکنے کی بجائے یہیں لوٹنے کی رائے دی کہ میں سیدھا اپنی لوک گیتوں والی ڈگر پر ہی چلتا رہوں۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "شاید آپ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ میرا قلم افسانے کے لئے راس نہیں آ سکتا۔"

"یہ فیصلہ ابھی سے کیسے کیا جا سکتا ہے؟" وہ گمبھیر ہو کر بولے۔ "لیکن میں تو محض اتنا ہی عرض کرنا چاہتا تھا کہ کہیں آپ لوک گیتوں کے کام کو بالکل ہی نہ چھوڑ دیں۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "ویسے آپ ٹھیک فرما رہے ہیں۔ مجھے اپنے ذمے لئے ہوئے کام کو تو پورا کرنا ہی چاہئے۔ جو بات آپ نے کہنے سے کی وہی بات دراصل ایک اور دوست نے بڑے دھوم دھڑلے سے یوں کہی کہ جب میں اس دنیا سے کوچ کر جاؤں گا اور خدا کے دربار میں مجھے آواز پڑے گی، تو ستیارتھی افسانوں والا! آگے آئے" ستیارتھی لوک گیتوں والا ہی کہہ کر مجھے آواز دی جائے گی۔"

خیر اس وقت تو افسانوں کی بات آئی گئی ہو گئی اور میں لاہور لوٹ آیا۔ یہ عجیب بات ہوئی کہ افسانے کی طرف میرا رجحان پہلے سے زیادہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ مجھے یہ پروا بھی نہ ہوتی تھی کہ پہلا افسانہ کہیں شائع ہو جائے اور پھر دوسرا افسانہ لکھا جائے۔ "اور بنسری بجتی رہی" کو دوسرے غیر مطبوعہ افسانوں کے نیچے دبا رہا۔

ایک دن دلی سے اختر صاحب کا خط آیا کہ وہ "ہمایوں" کے نام سے ایک ماہنامہ شائع کر رہے ہیں۔ انہیں فوراً "اور بنسری بجتی رہی" بھیج دیں۔ چنانچہ وہ افسانہ میں نے انہیں بھیج دیا لیکن بدقسمتی سے وہ یہ ماہنامہ شروع نہ کر سکے اور وہ افسانہ ہی واپس کر سکے ہیں۔ میں نے کئی بار لکھا بھی۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے سمجھا کہ ہمارے ڈاکٹر اختر حسین صاحب بھی اور بہت سے دوستوں کی طرح بڑے آدمی بن گئے ہیں۔ وہ کاس مرکل والی تھیوری بھول گئے ہیں۔ خیریت ہوئی کہ میرے پاس میرے اس افسانہ کی ایک نقل موجود تھی۔ ایک مدت کے بعد وہ افسانہ کہیں جا کر "ادب لطیف" میں شائع ہوا۔ میرا دوسرا کوئی افسانہ بھی گم ہو جانے کے ڈر سے اتنی دیر بعد شائع نہیں ہوا تھا۔ جب یہ افسانہ شائع ہوا تو میں نے "ادب لطیف" کے اس شمارہ کی ایک کاپی خط کے ساتھ اختر حسین صاحب کو بھی بھجوائی۔ انہوں نے اب کے بھی کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے سوچا میں نے ایک دوست کھو دیا لیکن میں نے بھی ناراض نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

چار پانچ سال کے بعد ۱۹۴۲ء میں جب میں لاہور سے دلی چلا آیا تو میں نے دیکھا کہ اختر صاحب ہند سرکار کی ایجوکیشن منسٹری میں ایڈوائزری

کے عہدے پر کام کرتے تھے۔ ان کی رہائش بلاک ریڈیو روڈ پر قرول باغ میں تھی۔ میں اس مکان میں پہلی بار ان سے ملنے گیا تو دیکھا کہ ان کا ڈرائنگ روم پہلے سے بھی زیادہ سجا ہوا ہے۔

میں نے ان سے شکایت کی کہ ادھر انہوں نے لکھنا کیوں کم کر دیا ہے۔ وہ دیر تک سرکاری فائلوں سے ہی فرصت نہ ملنے کا بکھان کرتے رہے۔

میں نے بات کا رخ بدل کر کہا: "گورکی کی آپ بیتی کے تینوں حصے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پڑھ گیا۔ آپ نے ترجمے میں اصل کا حق ادا کیا ہے۔ قدم قدم پر قاری یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہی نہیں کہ زبان آسان رکھی گئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی ہے بول چال کی زبان کا انداز۔ کاش آپ نے اپنے طبع زاد افسانوں میں بھی اسی زبان کو اپنایا ہوتا:"

اس پر اختر حسین نے ہنس کر کہا: "اچھا تو آج آپ نے میری ٹانگ کھینچنے کی یہ ترکیب نکالی ہے!"

لیکن جب بیگم اختر حسین نے مجھ سے اتفاق رائے کا اظہار کیا تو میں نے سنبھل کر کہا: "اب فرمائیے اختر صاحب! خیر آپ لکھتے سہی، چاہے کٹھن زبان ہی میں کیوں نہ لکھیں۔ حالانکہ آپ کی زبان کا بھی ایک خاص رکھ رکھاؤ ہے۔ اس میں ایک خاص نکھار بھی ہے۔"

"آپ تو نقاد بنتے جا رہے ہیں!"

پھر بات کا رخ اس ڈی سیٹ کی خوبصورتی کی طرف گھوم گیا۔ اختر حسین دیر تک اس ڈی سیٹ کی تعریف کرتے رہے۔ لیکن بہت جلد اختر حسین نے گورکی کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "گورکی کی آپ بیتی حصہ اول کے مقدمے میں میں نے یہ بات زور دے کر لکھی ہے کہ گورکی کے ادبی شاہکاروں کا بیشتر حصہ دیس سے باہر لکھا گیا۔ جب میں یورپ میں تھا تو مجھے اٹلی کے جنت نظیر جزیرہ کاپری میں جانے کا فخر حاصل ہوا تھا۔ نیپلس کی بندرگاہ سے اسٹیمر پر سوار ہو کر میں گھنٹے بھر میں نیلے سمندر کے بیچوں بیچ پہاڑیوں کے دامن میں آباد ہرے بھرے اس جزیرے میں جا پہنچا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے وہ مکان دیکھا جہاں بیٹھ کر گورکی نے اپنی امر کہانیاں لکھی تھیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ روس سے دور بیٹھ کر گورکی کہیں زیادہ وقار سے کام لے سکا، کہیں زیادہ وسیع النظری سے اپنے خیالات اور احساسات کو پیش کر سکا:

"ایسی ہی کوئی چیز آپ بھی تو لکھیں:"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، دفتری فائلوں سے کون چھٹکارا دلائے گا! یہی کیا کم غنیمت ہے کہ کبھی کبھار جب کسی میگزین کے ایڈیٹر کا تقاضا حد سے بڑھ جاتا ہے تو طبیعت پر زور ڈال کر کچھ نہ کچھ قلمبند کر پاتا ہوں۔ ویسے میں جو کچھ لکھتا ہوں اس میں اپنے طور پر کامیاب قسم کی چیز پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"موضوع کی نوعیت اور مصنف کی شخصیت دو الگ الگ چیزیں ہیں، تو شاید آپ بھی نہیں مانتے؟"

"جی تو رونا یہی ہے صاحب! اب آپ میری بات سمجھے۔ آپ بھی تو نوکری کے چکر میں آ پھنسے۔ اگرچہ آپ کی نوکری قدرے آسان ہے۔ آپ کی میز پر شاید اتنی فائلوں کا ڈھیر نہیں لگتا ہوگا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جب مصنف کی شخصیت دفتری فائلوں کے ڈھیر کے نیچے دبی پڑی ہو تو شاید اپنے موضوع کے ساتھ کیسے انصاف کر سکتا ہے؟"

جس دفتر میں مجھے ان دنوں ملازمت کرنی پڑی تھی وہ ایک طرح کا غیر سرکاری دفتر تھا اور میرے لکھنے پر کسی طرح کی پابندی نہ تھی۔ پھر بھی میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ جس روز میرے لکھنے میں یہ نوکری حائل ہوگی اسی روز میں اس سے استعفیٰ دے دوں گا۔ یہ بات اختر صاحب سے بھی پوشیدہ نہ تھی۔ زندگی کی کشمکش کا مذاق کرتے کرتے انہوں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ ہر طرح اس دفتر میں نوکری کی ہے۔

جب ملک کی تقسیم کا معاملہ سامنے آیا تو میرا خیال تھا کہ اختر حسین تو ہر صورت میں ہندوستان میں رہنے کو ترجیح دیں گے، لیکن میری حیرت کی حد نہ رہی جب مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے پاکستان میں جا کر رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جتنا میں ان کو سمجھ سکا تھا اس کے بعد یہ ان کا اپنا انتخاب تھا، ان کا اپنا فیصلہ تھا۔

ملک کی تقسیم عمل میں آئی تو اختر حسین دلی چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ میں نے سمجھ لیا کہ اب شاید اس زندگی میں کبھی ان کا دیدار حاصل نہیں ہوگا۔

اختر حسین کے پاکستان چلے جانے پر مجھے حیرت نہ ہوتی اگر وہ وہاں جا کر لکھنے کی رفتار تیز کر سکتے۔ لیکن اس کا نتیجہ تو در اصل اس توقع کے برعکس نکلا۔

پاکستان میں شائع ہونے والے رسائل میں اختر حسین کا چہرہ کہیں تو نظر آئے اس کے لئے میں بری طرح ترس گیا۔ بار بار نقوش کے بھاری بھرکم شماروں میں اپنے دوست کا چہرہ اور اس کی تازہ ترین تحریر کا کوئی نمونہ ڈھونڈنے کا جتن کیا۔ لیکن جب کہیں اختر حسین کا ذکر تک ملنا دشوار ہو گیا تو میں سمجھ گیا کہ اب اختر حسین نے لکھنے کی طرف سے یکدم سنیاس لے لیا ہے اور اب یہ سوچنا بیکار ہے کہ وہ پھر سے قلم اٹھا کر لکھنے لگیں گے۔ کئی بار دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ انہوں نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔ لیکن لاکھ سوچنے پر بھی اس کا جواب نہ مل سکا۔

کئی سال کا عرصہ بیت گیا۔ آخر اتنا ضرور پتہ چلتا رہا کہ اختر صاحب پاکستان کی ری کنسٹرکشن منسٹری میں کام کر رہے ہیں۔ لیکن نہ کبھی میں انہیں خط لکھ سکا، نہ کبھی ان کا خط آیا۔ میں انہیں یہ بھی تو نہ لکھ سکا کہ میں بھی ادھر کئی برسوں سے ہندوستان کی پبلیکیشنز ڈویژن میں، ہندی آج کل کی ادارت کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں اور اردو میں تو بدستور قلم سے کام لئے جا رہا ہوں۔

۲۳ ستمبر ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ میں اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ جو اٹھی تو دیکھا کہ زینے سے ایک شخص میرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ شخص میری طرف بڑھا آ رہا تھا۔ جانی پہچانی صورت۔ میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس شخص کی طرف بڑھا، ہم بغلگیر ہو گئے۔ یہ اختر حسین ہی تو تھے۔

"کب تشریف لائے اختر صاحب!" میں نے جھٹ سے پوچھ لیا۔

"دو گھنٹے ہوئے۔ میں اب زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ شام کو انڈیا کافی ہاؤس میں آئیے گا۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے؟" میں نے کہا۔

"بس ذرا اختر صاحب سے ملنے آیا تھا۔" انہوں نے کھڑے کھڑے جواب دیا۔ "سوچا آپ کو اپنے آنے کی اطلاع کر جاؤں۔ شام کو کافی ہاؤس میں ذرا بیٹھیں گے۔ آپ بھی آئیے گا۔"

وہ جس طرح آئے تھے اسی طرح جلدی جلدی چلے گئے۔ مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہی اختر حسین تھے۔

شام کو نئی دہلی کے انڈیا کافی ہاؤس کی بالکونی میں پہنچا تو اختر حسین اور شمشیر سنگھ نرولا پہلے سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اختر صاحب کے چہرے پر وہی رنگ جھلک اٹھتا تھا جو ہم ان کے چہرے پر آج سے برسوں پہلے دیکھا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنے اندر شباب کا رنگ ابھی تک بچا رکھا ہے۔ آواز میں وہی شگفتگی، آنکھوں میں وہی تبسم، چہرے پر وہی ذہن کی بیداری کا احساس۔ لیکن ان کی باتوں میں بڑی گہرائی آگئی تھی۔

اتفاق سے بالکونی کے ایک کونے میں مجھے اپنا ایک دوست نظر آ گیا۔ میں نے اسے پاس بلا کر اختر صاحب سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا: "یہ بھی آپ کے مداحوں میں سے ہیں۔"

"بہت خوب!" اختر صاحب نے قہقہہ لگایا۔

میرے دوست نے اپنی بغل سے ایک کتاب نکال کر اختر صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "اس پر اپنا آٹوگراف ہی دے دیجئے۔"

یہ پیام شباب کی جلد تھی جسے اتفاق سے میرا دوست اسی روز بازار سے خرید کر لایا تھا۔ اختر حسین نے پیام شباب پر چند الفاظ لکھ دیئے۔ کافی آئی تو اختر صاحب دیر تک گرم کافی کی تعریف کرتے رہے۔ جیسے ان میں بھی قاضی نذر الاسلام کی کسی بنگالی نظم کا انداز گھلا ہوا ہو۔ "پیام شباب میں نذر الاسلام کی شاعری آپ کو کیسی لگی؟" انہوں نے میرے دوست سے جھٹ پوچھ لیا۔ اس کے جواب میں میرا دوست صرف مسکرا کر رہ گیا۔

کافی ہاؤس سے نکل کر میں اور نرولا اختر صاحب کو کنسٹی ٹیوشن کلب تک چھوڑنے گئے۔ راستے بھر مجھے بار بار اختر حسین سے یہ پوچھنے کا خیال آتا رہا کہ انہوں نے لکھنا کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر کہ اختر حسین یہاں ہمارے یہاں ایک مہمان کی حیثیت رکھتے ہیں اور میں ان کے دل کو ٹھیس نہ لگنے دوں، خاموش رہا۔

آخر مجھ سے رہا نہ گیا، میں کہہ اٹھا: "آپ کا یہ پانڈوؤں کا سا بن باس کا زمانہ کب ختم ہو گا؟"

"بہت خوب!" اختر حسین نے اندھیرے میں قہقہہ لگایا۔ "یہ تشبیہ بھی خوب رہی۔ لیکن صاحب آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

نرولا نے بھی قہقہہ لگایا اور پھر ذرا سنبھل کر کہا: "ستیارتھی تو یہی کچھ بول اٹھتا ہے۔"

"یوں وضعداری کو ہاتھ سے نہ جانے دو نرولا!" اختر صاحب نے نرولا کو کاٹتے ہوئے ٹوک دیا: "ستیارتھی ہم دونوں سے بہتر ہے۔"

لیکن نرولا کب چپ رہنے والا تھا، بولا: "زندگی بہ عمل است نہ بہ سال!"

اندھیرے میں اختر صاحب کا چہرہ نظر نہ آ سکتا تھا۔ وہ کچھ نہ بولے۔ لیکن مجھے محسوس ہوتے دیر نہ لگی کہ ایک ادیب کو دوسرے ادیب پر یوں جھپٹتے دیکھ کر انہیں ذرا بھی خوشی نہ ہوئی۔ جب میں نے ان سے وداع لی تو بے الفاظ میں اتنا ضرور کہا: "دیکھئے اختر صاحب کتب پبلشرز کے زیر اہتمام نئے ادب کے نئے معیار کے سلسلہ میں آپ پر لکھنا چاہا تھا، لیکن اتنے میں وہ سلسلہ ہی بند کر دیا گیا۔"

"تم جس کی پبلشری کی بات کر رہے ہو اگر ستیارتھی اسے قرار دیتی تو دکان بڑھانی ہی پڑے گی۔" نرولا نے فقرہ کسا: "اور پھر یہ پہلی مرتبہ تو نہیں ہوا!"

اختر صاحب واپس چلے گئے۔ بہت دن تک پھر ان کی کوئی خبر نہ ملی۔ کہیں بھی میگزین میں بھی ان کے بارے میں یا ان کے قلم کا کوئی شاہکار بھی دیکھنے کو نہ ملا۔

اچانک ایک روز نقوش کا افسانہ نمبر (جنوری ۱۹۵۵) موصول ہوا تو میں نے بڑے اشتیاق سے اس میں اختر حسین رائے پوری کا کوئی نیا افسانہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ ان کا افسانہ اس افسانہ نمبر میں کہیں نظر نہ آیا۔ اس افسانہ نمبر کے آخر میں ایک بحث چھپی ہوئی دیکھی ——— اردو افسانے کی روایات اور تجربے۔ جس میں سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، ابو سعید قریشی، انتظار حسین، حمیدہ اختر اور شوکت تھانوی نے حصہ لیا تھا۔ اس ادبی بحث کو میں بڑے غور سے پڑھنے لگا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ کہیں تو کسی نے اختر حسین رائے پوری کے بارے میں ان نئے ادیبوں کی کیا رائے ہے۔ ایک جگہ میری نظر جم گئی:

حمیدہ اختر: اختر حسین رائے پوری کس دور میں آتے ہیں؟

وقار عظیم: وہ عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

عبادت بریلوی: افسانہ نگاری کی حیثیت سے ان کا کوئی خاص مرتبہ نہیں۔ ان کے بیشتر افسانے یا ترجمے ہیں یا مغربی افسانوں سے ماخوذ ہیں ——— زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں ایک رومانی سی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے قبل بھی ایسا ہو چکا ہے۔ انہوں نے اس میں کوئی جدت نہیں کی۔

پچھلے دنوں سہیل عظیم آبادی سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ اختر حسین رائے پوری دلی آ کر چلے بھی گئے۔ یہ خبر صحیح تھی۔ اختر صاحب دلی آئے ضرور، لیکن وہ مجھ سے ملے بغیر ہی پاکستان واپس چلے گئے۔ حالانکہ وہ دوسرے کئی دوستوں سے ملتے گئے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ان سے ملوں، لیکن ان کے پاس وقت کم تھا اور انہیں واپس جانے کی جلدی تھی۔

اگر ان سے ملاقات ہو جاتی تو میں ان سے یہی عرض کرتا کہ اختر بھائی! نقوش میں آپ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے بارے میں [illegible]

اختر اورینوی

شکیلہ اختر

وہ اخیر دسمبر کی ایک سرد اور سنہری شام تھی جب [illegible] میں ایک مرتبہ گزر گئی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنے ہاتھوں میں اپنی بہترین تصویر کا ایک شاہکار لئے ہوئے [illegible] آ گئے تھے۔ میں اپنی حیران نگاہیں ان کے سامنے اٹھا بھی نہ سکتی تھی۔ سردی کے باوجود میری پیشانی پر پسینے آ گئے تھے اور [illegible] دوستوں کے ساتھ میں بیٹھی ہوئی ایک عورت چپ چاپ کھڑی تھی۔ اماں۔ [illegible] جانا تھا۔ میرا سارا جسم کانپ رہا تھا کہ یہ اتنا بڑا واقعہ مجھے اچانک ہو گیا تھا اور میں اس بات کا فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ آج کا دن میری زندگی میں سب سے زیادہ خوشی کا تھا [illegible]! [illegible] دو سال پہلے کی [illegible] یاد آ گئی جب [illegible] کی شادی کے ہنگاموں [illegible] سے گھر بھرا ہوا تھا [illegible] اماں کے چہرے [illegible] ان اشاروں والی باتوں کا [illegible] سمجھتی تھی اس لئے [illegible] مجھے [illegible] بیٹی کی شادی پر دونوں سے خوش [illegible] ہوتا ہے۔ احساس کرنے والی [illegible] مجھے [illegible] اپنے پاس بٹھاتے ہوئے یہ بتایا کہ تمہارے اختر [illegible] ڈاکٹروں [illegible] خوبصورت آنکھوں میں [illegible] [illegible] —— میں [illegible] [illegible]

دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ ان کا سارا بچپن تو بیماریوں ہی میں گذرا ہے پرہیز کرتے کرتے تھک کر چچا بے خود بسکٹ چاکلیٹ کھلانے لگے۔ میں نے ایک دن اماں کو یہ بات بتادی۔ بس پھر تو میری شامت ہی آگئی۔ — خود تو ان میں سکت تھی نہیں مجھ ہی پہ رد کیا کہ اسی دن شام کو جتنی بھی میری گڑیاں الماری کے اوپر رکھی تھیں سب کو اتروا کے ایک ایک کی ٹانگ توڑ توڑ کر باہر پھینک دی۔ اور بیٹی تم بات سنتیں اور چھوٹے کا بھی تو بے حد ناپسند ہے۔ وہ اونچی آوازیں بولنے بھی نہیں دیتے اور ہنسی حد یہ ہے کہ تصویر کھنچوانے تک کی اجازت نہیں ملتی ہے۔ تم سے پوچھا جاتا کہ ہمیں ہی عمران کو بھی پسند کر لیں۔ اور اماں باتوں کو سن کر مجھ کو ہنسی آگئی تھی۔ وہ جو خاندان بھر کی آنکھوں کا تارا تھا جس کے قہقہے اس گھر کی زندگی تھے جس کی شوخیوں کی گونج میں ساری دنیا سمٹ کر آگئی تھی، وہ وقت سے بہت پہلے بیدار ہو چکا تھا اور جس کے سامنے خاندان کی بڑی بوڑھیوں کی آنکھیں بچھا کرتے رہتے کے باوجود اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ کرتی تھی اور جس سے خاموشی کے ساتھ محبت کرنے کے عجیب احساس کے سوا زبان پر نام لانے تک کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ امی کے ان کے لئے طور پر کہا کرتی رہی تھیں کہ "مزاج پرسی کر آؤ" اور اسی وقت پھر مجھ کو اپنی ایک حماقت بھی یاد آگئی۔ جب وہ اماں کو خط لکھتیں۔ تو میں بھی اس کے کونے پر بڑی سعادت مندی سے کچھ نہ کچھ لکھ دیا کرتی تھی۔ ایک دن اماں کے نام کا ایک لفافہ آیا تو اس میں میرے نام کا بھی ایک پرچہ تھا مگر وہ پرچہ ایسا ہی تھا جیسے ایک بم کی طرح مجھ پہ آکر گرا ہو۔ لکھا تھا "تم جو یہ لکھتی ہو کہ میں یہ دیکھوں کہ تمہارا لفظ جاہلانہ تو اچھا ہی تھا تمہارا خط نہیں" بلکہ گھر کے بچے بچے کی زبان پر بھی یہی جملہ تھا اور میرے لئے ڈوب مرنے کی کوئی جگہ بھی نہ رہی تھی۔ ڈیرہ دون جانے والی ٹرین کا ٹکٹ بھی بڑی مشکل سے ملا تھا تو میں پورب کی طرف کھلنے والے جھروکے کی چھت پر خاموش بیٹھی تھی اور وہ پچھم کی طرف والی چھت پر سارے لوگوں کے ساتھ تنہا بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور اچانک میرے دل میں ایک تڑپتی ہوئی تمنا پیدا ہوئی کہ کاش وہ چھتوں کے بیچ کا سارا فاصلہ ایک خلا بن جاتا اور میں گھوم کر جانے کی بجائے سامنے روشنی ہوئی وہاں پر پہنچ جاتی ——— مگر اس جگہ پہنچ کر میں کیا کرتی؟ کیا مزاج پرسی کرنے کی مجھ میں ہمت ہو سکتی تھی! اور آج پورے دو سال کے بعد وہ اپنے ہاتھ میں خوبصورت سیٹ لیے ہوئے میرے پاس کھڑے تھے۔ ان کی کھلی ہوئی سفید رنگ کی پیشانی پر بیک برش کئے ہوئے گھنے اور سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے اور موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے شربتی آنکھیں میری بے بسی پر مسکرا رہی تھیں۔ اسی وقت جب سارے لوگ بڑے کمرے کے فرش پر اکٹھے بیٹھے تھے اور دنیا جہان کی باتیں ہو رہی تھیں میں اسی شام والے انداز میں ایک طرف بڑی تنہا سی چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں ان کو اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی اور ان کے قہقہوں کی گونج میں ان کی دلچسپ باتیں سن کر سوچ رہی تھی کہ ممانی جان نے آخر سب کے خلاف ان کو کیوں اتنا ڈرا رکھا ہے؟ — مگر پھر بھی میں وہ مسئلہ حل نہ کر سکی۔ اور نہ ہی کوئی فیصلہ کر سکی۔

ان دنوں میری عمر صرف ۱۷ سال کی تھی لیکن اپنے گھر کی سب سے بڑی لڑکی ہونے کی صورت میں ہر کسی کی نگاہ ہوتیں۔ میرے بڑے پن کا احساس مجھ پر رہ گیا تھا اور اسی احساس بڑائی نے آخر مجھ کو ۱۷ سال ہی کی عمر میں سنجیدہ کر کے وقت سے بہت پہلے ہی جھکا رکھا تھا۔ کمرے کے اندر سے جیسے ہی اماں باہر دوسری طرف گئیں ان کی شریر نگاہیں اچانک میری طرف اٹھیں۔ "اچھا ذرا ایک آدھ شعر ہی آپ لوگوں کو سنا دوں گا۔" شکیل بھیا نے (جو میرے چچا اور خاندان بھائی ہیں) ادب لگا کر کہا۔ اور وہ کچھ ہی دیر اپنے شعروں سے ان کی طرف دیکھا اختر بھیا کی شاعری اور رنگ خیال میں ان کے پیچھے ہونے اشتیاق کے مارے خاموش ہو رہے تھے اور جیسے سے معصوم صورت والی میری سہیلی بھی مسکرا کر ان کی طرف حیرت سے تکتی ہوئی رہ گئی۔ میز پر جلتے ہوئے لیمپ کی روشنی سیدھی ان کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور عینک سے ڈھکی ہوئی ان کی بڑی بڑی ذہین آنکھوں میں شرارت اُبل رہی تھی۔ "اچھا تو پھر میں اپنا ایک شعر سناتا ہوں۔ تم سب مل کر مجھ کو اس کے معنی بتاؤ۔" داہنی طرف کو ذرا سے جھکے ہوئے ان کے گداز لبوں پر ایک تھرتھراہٹ سی آئی۔

"شیشۂ دل کے لئے ہے یہی معراجِ کمال
تیری محفل میں بھی جا کر تجھے دیکھا نہ کرے"

اور اچانک ایک بجلی سی بہت حقیقت بجلی کی طرح میرے دل و دماغ پر کوندی اور اچانک میری نگاہیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔ شکیل بھیا دنیا بھر کی تشریح کرتے رہے اور میں رات بھر یہی سوچتی رہ گئی تھی کہ میری بیتی ہوئی سال کی خاموش نگاہوں میں اتنی تاثیر اس سے ہو گئی تھی۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ ڈیرہ دون میں ان کی

طبیعت بہت رنگ پر تھی اور مسوری کی ٹھنڈی ہواؤں پر [illegible] لگنے کی وجہ سے وہ جلد ہی پٹنہ واپس آ گئے تھے۔ میڈیکل کالج میں ان کا تیسرا سال شروع ہو چکا تھا اور اچھے اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے وہ ڈاکٹری کی تعلیم کو کسی طرح سے بھی مکمل کر لینا چاہ رہے تھے۔ مگر اس طرف اچانک پھر ان کے منہ سے تھوڑا سا خون آ گیا تھا اور پٹنہ کے سب سے بڑے پروفیسر اور ڈاکٹر ٹی۔ این۔ بنرجی نے مکمل طور پر آرام کرنے کے لئے سون کے کنارے رہنے کی تاکید کر دی تھی۔ اسی لئے اب وہ ایک بیمار کی حیثیت سے تبدیلی آب و ہوا کی خاطر چاہے سے یہاں دریائے سون کے کنارے کچھ مہینے گزارنے کو آ گئے تھے ان کے برتن علیحدہ طور پر آ گئے تھے پانی پینے کا گلاس تک الگ تھا اور ان کے گھر والوں نے بڑی تاکید سے اس بات پر زور دیا تھا کہ ان کو آؤٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں الگ تھلگ رکھا جائے اور ان کے کھانے پینے کی چیزیں دوسروں سے بالکل علیحدہ رکھی جائیں۔ ٹی۔ بی کا کیڑا ابھی تک نکلا تو نہیں تھا مگر پھر بھی احتیاط رکھنا ضروری ہے اس خوف سے وہ رونے لگیں۔ ان کے اپنے بچے کا اتنا عزیز [illegible] جو دونوں کے انتظار پر [illegible] پیدا ہوا تھا اور آج جو ان کی خوش قسمتی سے ان کے گھر کا مہمان بنا تھا "پام روڈ" کی اتنی بڑی شاندار کوٹھی کو چھوڑ کر ان کو آؤٹ ہاؤس میں جگہ دی گئی۔ وہ اماں جان کا چہرہ بھی پژمردہ تھا انھوں نے بچپن میں کتنے پیار سے ان کو اپنی گود میں کھلایا تھا۔ اور آج جب موت کا سایہ ان کے سر پر منڈلا رہا محسوس ہو رہا تھا تو وہ کس طرح سے ان بچاروں کا دل توڑنا چاہتے تھے۔ "نہیں بھئی یہ تو نہیں ہوگا۔ اب جو بھی ہو ہم تو ایک ہی ساتھ رہ کر گزاریں گے۔" اور اماں جان کے اس فیصلے پر بے حد خوش تھیں۔ یہ ۱۹۳۱ء کی شروع جنوری کی بات تھی۔ آموں کے باغ، شیشم، جھاؤ اور تاڑوں کے جھنڈ اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں ان کے لئے زندگی کا پیغام لاتے رہے۔ سرکنڈے کے رنگین پھولوں سے ڈھکے ہوئے ریتوں کے اونچے اونچے سنہرے ٹیلوں میں اب ان کے نغموں کی گنگناہٹ گونجنے لگی تھی اور سون کے ساحل پر گھنٹوں اکیلے بیٹھے ہوئے یا تو اپنی تصویروں میں رنگ بھرتے رہتے یا بڑی اچھی اچھی نظمیں لکھتے رہا کرتے تھے۔ اور چاندنی راتوں میں "پام روڈ" کے سامنے نہر کے کنارے چپ چاپ سے بیٹھے ہوئے وہ شیشم کے پتوں سے چھن چھن کر چھلکتی ہوئی بے قرار چاندنی کو دیکھتے ہوئے اپنی تازہ کہی ہوئی نظموں کو گنگنایا کرتے تھے انھی دنوں کی لکھی ہوئی نظم کا ایک ٹکڑا یہ بھی تھا۔

دل کی کلی کھلی ہی تھی جو بادِ خزاں نے آ لیا
نغمے مچل رہے تھے کہ ساز مرا بکھر گیا
خندہ ابھی تھا زیرِ لب آنسو کا ابر چھا گیا
اپنی خوشی کا آفتاب وقتِ سحر غروب تھا

اردو کی شاداب فضائیں، ہرے بھرے باغوں اور لہلہاتے ہوئے دھان کے کھیتوں میں جہاں وہ حیات فرما رہے تھے، قریب ہی جگہ میں وہ ایک بڑے ادیب شاعر اور نقاد بھی رہتے تھے۔ ان دنوں نیاز فتحپوری کا بڑا گہرا اثر ان پر بھی پڑا ہوا تھا بڑے بڑے افسانہ نگار [illegible] استادوں کے ساتھ انھوں نے پہلی بار اردو ہی میں افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے جن میں سے کچھ تو داستان [illegible] میں چھپتے رہے تھے، اور انھی دنوں ان کا ایک افسانہ "نیا شوالہ" نگار میں چھپا اور بہت مقبول بھی ہوا تھا۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال کی تھی۔ اور وہ اپنی بیماری کو اس درجہ بھول چکے تھے کہ گھنٹوں شعروں میں تیرتے رہتے اور ریت کے ٹیلوں پر لمبے لمبے قدموں کے ساتھ گھومتے رہتے اور نہر میں دیر دیر تک کشتی رانی کرتے رہتے تھے۔ اور جب تھک کر اس کے بعد بھی وقت بچ جاتا تو "پام روڈ" کے ہرے بھرے لان پر [illegible] تصویریں بناتے رہتے اور اس کے بعد پھر [illegible] بانگ درا بھی پڑھا کرتے تھے۔ صحیح معنوں میں ان کو اتنا بڑا ادیب اور شاعر اردو ہی نے بنایا ہے۔ وہ لکھنے اور دماغ میں ادب کا بیج لے کر ضرور آئے تھے مگر سون کے ساحل پر ہی ان بیجوں سے کونپلیں پھوٹی تھیں اور ہرے بھرے پتے نکلنے لگے تھے۔ پانچ فٹ گیارہ انچ کا قد، دبلا جسم، لمبی گردن اور سیاہ و بڑی برش کٹے ہوئے سیدھے سے بال، وہ سارے [illegible] میں نمایاں طور پر نظر آ جاتے اور لمبے لمبے قدموں والی چال سے وہ دور ہی سے پہچان لئے جاتے تھے۔ نوجوانی کی چمک، روشنی [illegible] کے بعد بھی جب تک ان کے چہرے پر مسکراہٹ رہتی دل کھول کر باتیں کرنے کو جی چاہتا اور جوان

سمجھ گئی جہاں تک بس پھر تو "کی" اور "کی" ان سے زیادہ دور رہتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ میں نے ہمیشہ سے ان کے اندر دو شخصیتوں کو پایا تھا۔ ایک تو لطیف خیالات و جذبات کا بے پایاں محبت کرنے والا، نرم دل، محبوب شاعر و ادیب۔ اور دوسرا خاندان کا لاڈلا مگر دائمی بیماری سے مضمحل چڑچڑا، ضدی، زود رنج کڑھنے والا اور بڑے پرانے خیالات کا انسان۔ اور تو اور ان کے دونوں پہلو اپنے اپنے وقت پر اونچے اور نیچے ہوتے رہتے تھے لیکن سون کے ساحل پر چلتی ہوئی بڑی لطیف اور صحت بخش ہواؤں نے زیادہ تر ادب اور شاعری والا محبوب پہلو ہی ابھارا تھا ——— دوسرے سال میرے ناناجان کا انتقال ہو گیا تھا اور ہم سارے لوگ ایک ہی ساتھ اورین آ گئے تھے وہی گھر میرا ننھیال تھا اور وہی اختر صاحب کا آبائی گھر بھی۔ اختر صاحب کے والد اور میرے ناناجان کی جیتے جی زمینداری اور کاشتکاری بھی سب کی سب ایک ساتھ تھی اور ناناجان کی موت سے سارا انتظام وہ ہم پر ہی آ رہا تھا۔ ابھی دونوں اختر صاحب مکمل طور پر ایک زمیندار اور کاشتکار بن کر رہ گئے تھے ان کا کھانا بھی کھیت ہی پر جایا کرتا تھا اور پانچ سو بیگھے والے کھلیان میں غلوں کے ہزاروں ہزار من اونچے اونچے ڈھیر پر وہ سارا سارا دن لمبے آرام سے بیٹھے ہوئے ریل پیل، لگت اور کھلیان کے کاموں میں جٹے ہوئے گزار دیتے کہ ذرا بھی اس کا پتہ نہیں چلتا تھا کھیتی کے سوا کبھی انہوں نے دوسرا کام بھی کیا تھا۔ اور جاڑے کی شام میں جب سامنے کارندے اپنے کاندھوں پر ہل رکھے اپنے اپنے گھروں کو جانے لگتے اور پیچھے بیل بھی گرد اڑاتے ہوئے بڑے بڑے سینگوں کی گھنٹیاں بجنے لگتیں تب ٹھیک اسی وقت بڑے بھاری بھاری جوتوں کی ٹاپ برآمدے کے پختہ فرش پر بھی گونج اٹھتیں اور گرد سے اٹے ہوئے جوتوں کے تلے میں سے دو دن کی مٹی پھیلیں نکل نکل کر ادھر ادھر بکھر جاتیں اور میں حیران نگاہوں سے دیکھتی ہوئی سوچتی رہ جاتی کہ وہ بات بات میں شعر و ادب کی تفسیر بیان کرنے والا انسان کہاں چلا گیا؟

اب ان کی صحت ہر طرح سے اطمینان بخش تھی۔ چند مہینوں کی کاشتکاری کے بعد جولائی سے کالج کھلنے والا تھا۔ میڈیکل کا کورس پورا کرنے کے لئے انہوں نے بڑی کوشش کی مگر ڈی۔ ایس۔ ہزری صاحب نے بڑی سختی سے روک دیا۔ اور مشکلوں کے بعد انہوں نے صرف آرٹ کالج میں داخل ہونے کی اجازت دی تھی۔ اختر صاحب پٹنہ جا چکے تھے۔ مگر جیسے ہی چھٹیاں آتیں سیدھے بھاگ کر اورین چلے آتے اور سون کے ساحل پر پھر ایک زندگی سی آ جاتی تھی لیکن ان ہی دنوں میں انہوں نے میڈیکل کالج کی تیز اور تیکھی دواؤں کی بو کو بھلا کر آرٹ اور ادب کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ کبھی کبھی وہ بڑی حسرت سے کہا کرتے کہ میں نے صرف غریبوں کی خدمت کے لئے ڈاکٹری پڑھنا چاہا تھا۔ مگر اب مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں ادب اور آرٹ ہی کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ گلشن، ورڈسورتھ، کیٹس، بائرن اور براؤننگ کی نظمیں مجھے سمجھاتے رہتے کبھی دیر دیر تک غالب، میر اور اقبال سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے مجھ کو ان کی خصوصیات بتاتے۔ اس وقت ان کے الفاظ اور خیالات کی روانی کو دیکھتے ہوئے مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا کہ علم کا یہ سمندر کسی بہت بڑے ساحل سے ٹکرانے کو بے چین ہے۔ اور میں! ——— میں تو اس سمندر کے کنارے خودرو گھاس کی ایک ایسی گھاس تھی جس کے گرد مد و جزر میں بھی کبھی سمندر کی موجیں ایک دائرہ سا بنا کر تھوڑی دیر کے لئے اس میں ایک حسن پیدا کر دیتی ہیں۔ ان کو بچپن ہی سے کیٹس سے محبت تھی اسی کی شاعری میں اختر اپنے درد اور غم کی جھلک نظر آتی تھی۔ اور اختر صاحب کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ کیٹس ہی کی طرح ٹھیک ۲۸ سال کی عمر میں وہ بھی اس دنیا سے چلے جائیں گے۔ کیٹس کا نام اور اس کی درد بھری شاعری ہی ان کے دل میں اپنے مرض کا غم ابھار دیا کرتی تھی۔ ویسے اپنی بیماری کا احساس ان کو کبھی بھول کر بھی ہوا کرتا تھا۔ انہی دنوں میں نے بھی اپنے بچپن سے لکھنے لکھانے کے شوق کو پورا کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی اور اختر صاحب جس تیزی سے اورین میں صحت یاب ہو رہے تھے اسی رفتار سے میں بھی چھوٹے چھوٹے انشائیے لکھنے کی مشق کر رہی تھی۔ گھر کی چھت سے ادب نواز تھا اور اس پر سے ایک ادیب شوہر۔ پھر دیکھ کر شوق تو روز افزوں ہونا ہی ہوتا ہے۔ میری اماں اور ابا جان کو اختر صاحب سے بے حد محبت تھی گھر کے اندر چھوٹے چھوٹے بچے بچے بڑے تھے مگر ایک دن بھی اس گھر میں یہ محسوس نہیں کیا گیا تھا کہ کوئی چھوت کا مریض یہاں رہتا ہے۔ ڈاکٹروں کا بھی خیال بہت کچھ بدل گیا تھا اسی لئے سن ۳۲ء میں ۲۲ برس کی لڑکی ہوتی ہوئی اور میری زندگی میں آ گئے تھے۔ پٹنہ کالج کی گرمی کی چھٹیوں میں جب شہر اور تیتروں کے ادھر اونچے ٹیلوں کی وجہ سے "پام ہوا" کی بلڈنگ عمارت ایک محل جیسا حسین بن کر رہ گئی تھی۔ سارا دن گرمی سے تڑپتے ہوئے گزرتا شام کو سون کے کنارے

رات کا آنچل بڑا ہی ٹھنڈا، خمار آگیں اور پرسکون ہوتا تھا۔

اختر صاحب نے انگلش میں آنرز لیا تھا، ان کے پڑھنے کی شان بڑی نرالی تھی، انہوں نے جب بھی کتابیں دیکھیں، ایسے ہی جیسے افسانے پڑھے جاتے ہیں، ادب گھنٹوں ہم لوگ بھی پڑھتے تھے۔ ان کو نئے کورس میں انگلش کا لٹریچر، خصوصاً شیلی بہت پسند تھا۔ اکثر وہ اس کے گیتوں کا ترجمہ کر کے سنایا کرتے۔ اس کی نغمگی اور سادگی کے وہ بے حد مداح تھے۔

اختر بھائی کی چھٹیوں سے پہلے ہی میرے منجھلے چچا کا سارا خاندان "بام والا" میں آگیا تھا۔ منجھلے ابا ریٹائر ہو کر "بام والا" کے قریب ہی اپنی کوٹھی بنوانے لگے تھے۔ اچانک طور پر آجانے والے دن بے حد حسین، بڑے رنگین اور بہت ہی دلچسپ تھے۔ ایک تو ہم بہنوں کی بھی خاصی تعداد تھی اس پر سے ایک ہی ساتھ منجھلے ابا کی پانچ لڑکیاں آگئی تھیں، دو ان سے بڑی تھیں، ایک ہماری عمر کی اور دو میری بہن جمیلہ کی ہم عمر اس سے کچھ چھوٹی۔ بس پھر تو "بام والا" میں جیسے پر لگ گئے تھے۔ ہنسی خوشی کی شرارتیں، کی باتیں اور اختر صاحب کی لکھی ہوئی نظموں میں اصل کی جو ہی شادابیوں، مناظر اور حسن کو سراہا گیا تھا ان کے ہر پہلو پر عقیدت کے پھول چڑھائے جاتے تھے اور کرشن جی کی بنسی پر جھوم اٹھنے والی گوپیوں کی طرح ہم اختر صاحب کے ان مصرعوں پر لہک لہک اٹھتے تھے۔

سبزۂ شاداب پر شبنمی جالوں کا ہجوم ۔ صحن گل وادی میں رقصاں ہے غزالوں کا ہجوم
شاعر سرشار کے رنگین خیالوں کا ہجوم

اور اختر صاحب اکثر ہماری بیٹھکوں میں شامل ہو جاتے تو ایک [illegible] ہی کر دیتے۔ وہ دن بڑے یادگار طور پر گزرے ہیں۔ ہم سب کی سب اختر صاحب کے گرد ایک گھیرا ڈالے بیٹھی رہتیں۔ کسی کے ہاتھ میں بانگ درا ہوتا اور کسی کے ہاتھ میں دیوان غالب، ہر طرف بس دیوان ہی دیوان نظر آتے تھے۔ میر کی شاعری چھڑتی، غالب کا انداز بیان سمجھا جاتا اور اقبال کے تصورات پر ان کے تبصرے ہوتے رہتے۔ اختر صاحب نے ایک خاص شاعرانہ ماحول پیدا کر کے ہمارے دل و دماغوں کو بھر دیا تھا۔ شاعری اور احساس شعریت سے ہم اتنے ہم آہنگ ہو گئے تھے کہ اچانک طور پر ہم ساری بہنوں نے ایک ہی ساتھ شعر کہنا شروع کر دیا۔ اختر صاحب حیران رہ گئے۔ ہم سب کے بیٹھے بٹھائے یہ انہی کی کرامات تھے کہ ایک ساتھ اتنی لڑکیاں جو ابھی شعر کہنے لگ گئی تھیں، جو تعلیم سے بے حد دور رہیں۔ "بام والا" پورے طور پر شعر و ادب کا گہوارہ بن کر رہ گیا تھا۔ آدھی آدھی رات تک بیت بازی ہوتی رہتی۔ مصرع طرح دیا جاتا، شعر لکھے جاتے اور پھر مجلس مشاعرہ منعقد ہوتی۔ صدارت کی کرسی اختر صاحب کے لئے مخصوص تھی اور ہماری ساری ادبی جماعت شمیم، شکیلہ اختر، عزیزہ، نگار، رضیہ، [illegible] نسیم صبا بن کر کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کرتی۔ اندر سبھا کی محفل بھی رہتی اور اختر صاحب اپنی جگہ پر استقامت سے رہتے۔ مگر ان ساری رنگینیوں کے ساتھ ہی ساتھ خاندان کی پابندی بھی تھی، اسلامی خصوصیات پر وہ بڑے ہی باقاعدہ رنگ میں روزے ادا کرتے اور جمعہ کی نماز پڑھاتے ہوئے بہت ہی شاندار خطبے دیا کرتے تھے۔ اسکول سے لے کر میڈیکل کالج تک میں ان کی پڑھائی کا ایک اعلیٰ ریکارڈ تھا اور کوئی نہ کوئی وظیفہ ان کو ملتا ہی رہا تھا۔ میڈیکل کالج میں اسکالرشپ کے ملنے میں وہ پیش پیش تھے۔ وہ تبلیغی سلسلے میں چندہ دے دیا کرتے تھے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں میڈیکل کالج سب سے ہی اچھے اور فیشن کا کالج سمجھا جاتا اور [illegible] کالج کے ہوسٹل میں اختر صاحب کے بستر پر ہمیشہ ایسی ہی چادر بچھی رہتی تھی کیونکہ انہوں نے اپنے وظیفے کے پیسوں کے ساتھ چادر کی قیمت بھی غریب لڑکوں کی فیس میں دے ڈالی تھی۔ اماں کی محبت نے جس کے انتخاب میں بڑا اچھا چھینٹ کا ڈیزائن پسند کیا تھا مگر گھر والوں کو اس کی خبر تک نہ پہنچنے دی تھی۔ اسی طرح سے جب وہ اورین پہنچے تھے تو ہم لوگ ان کے بستر میں کسی بچے کا توشک دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا گھر میں ایک بزرگ ضعیفہ کے پاس توشک نہیں تھا، اختر صاحب نے خود چپکے سے لے کر اپنے توشک کے دو ٹکڑے کر دیئے اور وہ توشک اب ایسی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ایک دن "بام والا" میں وہ سارا دن اپنے کوٹ کا کالر بند کئے ہوئے پھرتے رہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ایک [illegible] کے پاس کرتا نہیں تھا، اختر صاحب نے اپنی قمیض اتار کر اس کو دے دی تھی اور اب اپنا کوٹ اس سختی سے بند کئے پھر رہے تھے کہ اس وقت کوئی دھلی ہوئی قمیض ان کے پاس نہیں تھی۔

اپنی طبیعت، مزاج اور ذوق و شوق کے لحاظ سے وہ بڑے عجیب و غریب انسان ہیں۔ ساری دنیا کا غم سمیٹ لینے کی تڑپ نے ان کو اچھا خاصا

ایک انسانیت کا پیکر بنا دیا ہے۔ وہ جب بی۔ اے کرنے کے لئے پٹنہ کالج کے مسلم ہوسٹل میں رہنے لگے تو سارے لڑکوں کی سرداری انہی کو بخشی گئی تھی۔ اتفاق سے بڑا ہی اچھا اور زندہ دل گروپ اکٹھا ہو گیا تھا۔ شیطانی کی ساری اسکیمیں انہی کے کمرے میں سوچی جاتی تھیں۔ ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ کی بے جا مداخلت ان مصیبتوں کو بہت ہی کھلتی تھی اسی لئے اسٹڈی پیریڈ کی گھڑیوں میں کورٹ کے بوٹ میں سارا گروپ مزے میں کالج کے پیچھے بہتی ہوئی گنگا کی سیر کرتا رہتا اور جہاں اچانک سپرنٹنڈنٹ کی یاد آ جاتی تو پھر گنگا کے دوسرے کنارے پر سے ٹوٹی پھوٹی کالی ہانڈی میں بیٹھے چلتے جوتے بڑی حفاظت کے ساتھ ہوسٹل میں لائے جاتے اور پھر ان کے نام پر فاتحہ پڑھ کے ان کے کوارٹر کی طرف بڑے زور کے دھماکوں سے ہانڈی پھوڑ دی جاتی تھی۔ ۱۱، ۱۱ بجے رات کو ہوسٹل کے بند پھاٹک پر سے وہ بڑے اطمینان سے کود جاتے تھے جیسے ان کو کبھی احتیاط کی تاکید ہی نہ کی گئی تھی۔ ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء میں بہار کا بھیانک زلزلہ آیا تھا اور اسی کی تباہ کاریوں کی وجہ سے یونیورسٹی کا امتحان بجائے مارچ کے مئی میں ہو رہا تھا۔ اختر صاحب کے سارے پرچے بڑے اچھے ہو رہے تھے آخر کا صرف ایک پرچہ باقی رہ گیا تھا کہ اچانک ان کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا۔ وہی خون جس نے ان کو محبوب میڈیکل کالج سے چھڑا دیا تھا اور اب وہ آرزو کا پورا امتحان بھی ختم نہ کر سکے تھے۔ ہوسٹل کے دریچے سے باہر خون تھوکتے ہوئے ان کا چہرہ فق تھا اور ہوش اڑا ہوا تھا۔ اگر خون آنے کی بات ذرا سی بھی پھیلتی تو پھر امتحان دینا تو درکنار ہوسٹل کو بھی چھوڑنا پڑتا۔ مگر جیسے ڈوبتا ہوا انسان ایک تنکے کا سہارا لے انہوں نے شکیل بھیا کو ساتھ لے کر جو اسی ہوسٹل میں رہتے تھے بظاہر بڑے سکون سے ٹہلتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے یہاں چلے گئے اور مسلم ہوسٹل سے اٹھ کر میڈیکل کالج کے اسی پرانے غم گسار ہوسٹل میں چلے آئے جو پہلے بھی ان کے دکھوں کا شریک رہ چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی ہمت افزائی کی کیلشیم کا کوئی انجکشن دیا اور خاموشی کے ساتھ امتحان دینے کی تاکید کر دی۔ دوسرے روز اتوار تھا اختر صاحب نے کئی انجکشن لئے کیلشیم کی گولیاں کھاتے رہے مگر ریسٹ کرتے رہنے کے باوجود بھی خون کے تھکے منہ سے آتے ہی رہے۔ دوسرے روز اسی حالت میں وہ امتحان دینے چلے گئے ان کے مرجھائے ہوئے زرد چہرے پر مسکراہٹ اب بھی موجود تھی۔ اگزامنیشن روم میں بنچ پر بیٹھے ہوئے وہ امتحان کا پرچہ لکھتے رہے تھکیں خون کا ابال آتا رہا اور وہ بڑی خاموشی کے ساتھ ان کو اپنے رومال میں جذب کر کے اپنی جیب میں ڈالتے چلے گئے وہاں سے باہر آ کے وہ شکیل بھیا سے برف اور نارنگی لئے بیٹھے تھے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد برف کے ٹکڑے اور چھلی ہوئی نارنگی اختر صاحب ایک ہی جاتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ امتحان کے کمرے میں وہ ان کی بڑھتی ہوئی تشنگی کسی نے نہیں دیکھی تھی اور جیسے تیسے آرزو کا آخری پرچہ ختم ہی ہو گیا۔ خون آنے کا وحشت ناک اثر ان پر امتحان کے بعد ایسا ہوا کہ وہ اسی حالت میں ۴۲ میل لاری پر چل کر آرہ پہنچ گئے۔ اور یہ پیام وہاں پر جیسے ایک ماتم لگ گیا۔ گھر والے اور باہر کے سارے لوگوں کی ہمدرد نگاہیں ان سے زیادہ ہو چکی تھیں۔ آرہ کے سارے علاقے بھر میں ایک افسردگی سی چھا کر رہ گئی تھی اور لوگ بار بار عیادت اور ہمدردی کے الفاظ میرے لئے سوہان روح ہی کرتے رہے تھے۔ مکمل ریسٹ کی صورتوں میں بھی جب کسی طرح سے خون آنا بند نہ ہوا تو پھر بہار کے ڈاکٹر سے اسٹیشن کی بوجھل آنکھ بھی لوگ یہ بھی ساتھ تھی، پٹنہ کے ڈاکٹروں نے ڈھیروں ڈھیر دواؤں کی فہرست بھی افسردہ چہروں کے ساتھ تسکین دیتے رہے۔ مگر اختر صاحب پر ایک وحشت سوار تھی وہ پٹنہ سے گھبرا کر پھر آرہ پہنچ گئے تھے۔ اب تک شکیل بھیا نے بڑی رفاقت کی تھی پر گھر ان کے والدین کا تھا اور وہاں ایک ڈاکٹر کے مکان کی وجہ سے علاج کی سہولت فراوانی تھی۔ سارا دن انجکشن دیتے ہی گزرتا۔ مگر دوائیں جیسے بے اثر ہو چکی تھیں۔ اختر صاحب کو بات تک کرنے کی سخت ممانعت تھی چپ لیٹے ہوئے وہ بڑی حسرت سے صرف مجھی کو تکتے رہتے تھے میرا دل ڈوبا جا رہا تھا لیکن کسی طرح سے ان کو بہلانے اور تسکین دینے کی کوشش کرتی۔ اور گزری ہوئی باتوں کو چھیڑ چھیڑ کر کس طرح سے وقت کاٹنا چاہتی تھی میری شادی کو پورا ایک سال ہو رہا تھا اور میں اپنی کاری گری کے ساتھ میں نہیں جانتی تھی کہ اب میں کیا کروں؟ میرے جہیز کا بستر بچھا ہوا تھا اور ان کے مرجھائے ہوئے زرد اور نحیف چہرے کے نیچے میرا تکیہ اول بنا ہوا وہ تکیہ کا غلاف ایک دن تھا جس کو میں نے بڑے چاؤ سے بنایا تھا۔ کبھی کبھی ان کا ہاتھ بڑھا کر دھیرا سا ہاتھ آہستہ سے اٹھتا اور میرے شانے کو بڑے پیار سے تھپتھپانے لگتے۔ وہ کیا کہنا چاہتے تھے میں نہیں جانتی کیونکہ خاموش زبان کو انہوں نے اشارہ دل میں نشتر لگا آنکھیں اپنے آپ بے اختیار ہو جاتیں لیکن میں بڑی مشکل سے ان اٹھتے ہوئے آنسوؤں کو پی جاتی اور کبھی بیماری کی طرح ان کو آئندہ کے خواب سنانے لگتی: بھاگل پور ایک اچھا سا گھر ہے گا جہاں ہم پھول کھلائیں گے۔ جہاں ایک چھوٹا سا اچھا سا بچہ ہوگا اور ہماری میزوں پر اخبار

اور نظموں کا ایک ڈھیر لگا رہے گا۔" میری اس بات کو سن کر ان کے لبوں پر ایک تھرتھراہٹ سی کانپ جاتی اور نڈھال آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے بے ساختہ طور پر ڈھلک پڑتے اور میں ایک بے بسی کے عالم میں حیران رہ جاتی کہ آخر میں کیسے ان کو بہلاؤں؟ ۔ خالہ اماں بے حد پریشان تھیں اور خالو ابا جو میرے اپنے چچا بھی تھے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے زیادہ، باپ ہی تھے انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "تم مت گھبراؤ! بس ابھی خون رک جائے گا ابھی سب سے آخری انجکشن کوبرا سانپ کے زہر کا دیا گیا ہے۔"

مگر جب رات کے گیارہ بجے اور موسلا دھار بارش ہونے لگی تو میں اور شکیل بھیا قریب ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے یہ دیکھ کر گھبرا اٹھے کہ ان کے منہ اور ناک سے خون کی قے ہو رہی تھی۔ تکیہ اور لحاف اور بیلچی خون سے بھر گئی تھی پھول بنتے ہوئے غلاف قمیص اور سارا بستر خون سے تر بتر ہو رہا تھا اور اس پر سے بھی خون گر کر جا رہا تھا۔ خالو ابا اختر صاحب کی نبض پکڑ کر بیٹھے رہے۔ میں حیران نگاہوں سے سب تکتی رہی اور اختر صاحب ایک پتھر کے بت بنے خاموش سامنے کی دیوار کو دیکھتے رہے۔ یہ کیا تھا؟ کیا ہو جائے گا؟ ہم سب کو اس کا شدید طور پر احساس تھا۔ ایک دو انجکشن اور دیے گئے۔ دوا اور برف کے ٹکڑے منہ میں ڈالے جاتے رہے۔ اس وقت انھوں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے مگر بڑی مضبوطی کے ساتھ میرا ہاتھ تھام رکھا تھا جیسے موت کے بھنور میں ڈوبتے ہوئے بھی ایک بے بس ہاتھ کے سہارے سے شاید اپنی زندگی کے ساحل کو پالیں گے۔ میری زبان پر سکتہ تھا لیکن میری روح خدائے تعالیٰ کے آگے ایک بے بس سوالی بن کر بھیک مانگ رہی تھی۔ دعاؤں کے لئے بار بار امام جماعت احمدیہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد ایدہ اللہ کی خدمت میں قادیان تار پر تار دیے جاتے رہے اور دعاؤں کی قبولیت کا معجزہ اور خدائے تعالیٰ کا خاص فضل ہی تھا کہ وہ اندھیری رات صبح کی پہلی کرن میں آخر آ ہی گئی۔ اور ان کو کسی طرح سے پٹنہ لاکر پی اینڈ ڈبلیو وارڈ میں داخل کیا گیا۔ اختر صاحب کو بخار اور کھانسی تو تھی ہی نہیں مگر کمزوری بے حد بڑھ چکی تھی۔ اختر بیٹھنے چلنے اور بات کرنے سے معذور کیے جا چکے تھے۔ ڈاکٹروں نے میڈیکل کالج میں ان کو ایک اچھے اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے کافی توجہ دے کر پڑھایا تھا وہ سب کے سب بڑی محبت سے دیکھنے اور علاج کرنے آتے رہے۔ میڈیکل کالج ہوسٹل کے ایک ہر دلعزیز ڈاکٹر محمد شمائل نے ان کے بڑھے ہوئے بالوں کو اپنے سامنے حجام سے کٹوا بھی کروایا ان کی شیو کرائی اور کپڑے تبدیل کرا کے واپس جاتے جاتے مڑ کے پھر بیٹھے اور قریب آ کر ہنستے ہوئے بولے: "بالوں کی زیادہ خدمت کرو گے تو پھر بڑھ آئیں گے۔ بس جلدی سے اچھے ہو جاؤ پھر ہم تم کو پروفیسر بنا دیں گے۔" ایک مردہ سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر آئی جیسے ان کا دل کہہ رہا تھا "پروفیسر! پروفیسر کون بن سکے گا!" پٹنہ کے سارے بڑے ڈاکٹروں کی یہی کوشش تھی کہ جہاں تک جلد ہو سکے ٹی بی کے پاس والے اٹکی سینی ٹوریم میں ان کو داخل کر دیا جائے۔ مگر وہاں سے ہر بار کا جواب یہی آ رہا تھا کہ کوئی سیٹ خالی نہیں ہے۔ ادھر زیادہ خون آ جانے کی وجہ سے اختر صاحب کمزوری میں بہت ہی گھٹ گئے تھے وہاں تک جانا ذرا مشکل ہی لگتا تھا ایک مہینے کے بعد خاص صورت میں ان کو آ جانے کی اجازت مل گئی تھی کہ آپ ایک پلنگ اور مریض کے استعمال کی ساری چیزیں خرید کر بھیجیں۔ اور ان ساری چیزیں خرید کر بھیجنے پر بھی برآمدے میں صرف رہنے کو ایک پلنگ بچھانے کی جگہ مل سکی تھی۔ میں یہاں بھی ساتھ ہی آئی تھی۔ میرے ہی سامنے ایمبولینس پر سے جب ان کو اسٹریچر پر اتار کر وارڈ میں لایا جا رہا تھا ٹی بی سینی ٹوریم کے انگریز سپرنٹنڈنٹ نے انتہائی کمزور مریض کو دیکھتے ہی صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کے پچکے ہوئے گالوں والے چہرے پر شفقت کی ایک لہر دوڑ گئی "یہ جوان لڑکا ہے اور آپ یہاں رہنے کی ہمیں اجازت دے چکے ہیں"۔ بیڈ کے ڈسپنسر صاحب بھی رہ گئے تھے۔ ہوتی جو آواز نکل سکتی تھی۔ چپ چاپ لیٹے رہے کہ ان کے لئے یہ ایک مرحلہ تھا۔ یہاں آنے کے بعد ان کے چہرے سے پژمردگی دور ہو گئی تھی۔ اس دنیا کے سامنے ہی لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد اور غم گسار تھے۔ پٹنہ میں ان کا علاج یہ ہو چکا تھا اور یہی خبر ان کے لئے بڑی اذیت رساں تھی۔ اب تک وہ یہی سمجھتے رہے تھے کہ کسی رگ کے پھٹ جانے سے خون آ جاتا ہے۔ اٹکی آ کر ایک ہی ہفتہ میں زندگی اور دوا کے اثر سے وہ آنے لگے تھے۔ ضعیف آنکھوں سے خوف و ہراس ختم ہو رہے تھے اور سب وارڈ کے اندر مریضوں اور نرسوں کے ہنسی مذاق میں رہتے رہتے وہ بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔ ایک دن جب میں صبح میل ٹرین سے آئی ہوئی ریل پر سے اتر کر اسٹیشن سے پیدل چلتی ہوئی ان کے پاس پہنچی تو شاید وہ پہلے کسی بات پر ہنس رہے تھے اور اسی طرح سے ہنستے ہوئے انھوں نے ایک ساتھی مریض کو سمجھا کر کہتے ہوئے مجھ سے ملایا اور کہا بھی۔ یہ ابتری ہے جو یہ شخص سی بچتی ہوئی ڈولی اور یہ جاری

کھو دیا ہیں تو اور ہیں بڑے خلوص کے ساتھ ان صاحب کو تسلیم کرلیا اور رفاقت کا انکشاف سمجھ کر ان سے مل مل کر خوش ہوتی رہتی۔ ایک ہی مہینے کے بعد اچھی ہو کر ان کا بخار ٹھیک ہو گیا تھا صحت کے ساتھ ان کی فن کارانہ صلاحیت بھی ابھرتی جا رہی تھی۔ جب بھی سینی ٹوریم میں کوئی فنکشن ہوتا سب سے آگے ہی رہتے۔ مدراسی سپرنٹنڈنٹ مرتضیٰ صاحب کچھ اس طرح سے متاثر ہو چکے تھے کہ ہر بات ان کے مشورے سے ہوتی۔ ڈراموں کے لئے اسٹیج بنانے سے لیکر ڈرامہ لکھنے اور اس کے ایک ایک کردار سے کامیاب طور پر ایکٹنگ کرانے کی کوشش انہی کی رہین منت ہوتی۔ سینی ٹوریم کے انتظامی امور میں بھی وہ کافی حصہ لینے لگے تھے۔ یہاں تک کہ ان کو سوال ہر ٹھیک تھا مگر جہاں مریضوں کی عام سہولت کے سلسلہ میں ان کے بنائے ہوئے نقشے ہیں گڑبڑ ہوتی پھر وہ ساری باتیں تفصیل کے ساتھ وہاں سے نکلنے والے ایک انگریزی اخبار "مشعل" میں کم و بیش چھپ کر مشتہر ہو جاتیں۔ چھوٹا انگریزی میں اس اخبار کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی تھی جہاں بھی اس قسم کی باتیں چھپیں مرتضیٰ صاحب کی بدحواسیوں کا عجیب عالم ہوتا۔ وہ اخبار لے سیدھے ان کے پاس پہنچ آتے، صاف طور پر جواب مانگتے کہ یہ کام شخصیت کس کی ہے مگر جس انسان کے رعب سے سارا سینی ٹوریم کانپتا تھا، اختر صاحب کے وقار کے آگے اس کی بولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ بار بار ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر وہ یہی کہتے جاتے "تم پتہ چلاؤ گے کہ ہماری یہ ساری گھر کی باتوں کو باہر چھاپ کون رہا ہے؟" اختر صاحب کے چہرے کی سرخی کچھ اور سے بڑھ جاتی اور پھر اخبار میں ایک دو مراسلات کے بعد ان کے سامنے مطالبات پورے ہو جاتے۔ اختر صاحب بھی وارڈ میں تھے ان دنوں اس وارڈ کو "ورٹی" کر رہا تھا اس میں دو دو مریضوں کے بلاک تھے۔ ٹی۔ بی کے مریض بخار اور کھانسی میں بے دم پڑے رہتے تھے زندگی جن کے سامنے سسک رہی تھی اور موت کے سائے جن کی طرف تیزی سے بڑھے چلے آ رہے تھے اور جو بے بسانہ طور پر ایک ایک ڈش بچے ہوئے ٹکڑوں کو بڑی تیزی سے نگل جاتے تھے تاکہ جلد سے جلد ان کے جسم میں سارا وٹامن پہنچ کر مدافعت کرتی ہوئی موت کا مقابلہ کر سکے۔ اسی وارڈ میں اب قہقہے گونجنے لگے تھے اور موت کی تاریک وادیاں ان کی ہنسی کی پھلجھڑیوں سے سہانی ہی ہونے لگی تھیں۔ چند ہی مہینوں کے بعد اختر صاحب کے بی۔ اے کا نتیجہ نکل گیا تھا۔ وہ پہلے کا پہلے سے انگلش ادب میں فرسٹ آئے تھے اور یونیورسٹی میں ان کا نمبر تیسرا تھا۔ گولڈ میڈل جو ملا اختر صاحب بڑی خاموشی سے سینی ٹوریم کے پل پر اپنے دوست کا ہیرا لگا رہے تھے۔ ہر یونیورسٹی کی طرف سے ان کو سونے کا میڈل اور ڈھائی سو کی انگلش کتابیں انعام میں ملی تھیں۔ مگر اب وہ ساری کیفیت سے بے نیاز ہو کر سینی ٹوریم پر اسی طرح سے چھا گئے تھے جیسے کہ شکار ہی کرتے ہوئے دو منٹ کے پورے چاند پر ہم کر رہ گئے تھے۔ انھوں نے یہاں بھی کئی افسانے لکھے "سینی ٹوریم" کا فقیر اسی دور کا لکھا ہوا بہت پسند کیا گیا تھا۔ پورے اور چند ہی مہینوں میں وہ صحت یاب ہو گئے تھے ان کا پھیپھڑا بھی لے۔ پی ٹھیک ہو گیا تھا اور چہرے کے سفید جلد کے اندر سے خون کی سرخی جھلکنے لگی تھی۔ وہ ایک میل سے زیادہ ٹہلنے لگے تھے۔ گاؤں، کھنڈر اور جنگلوں کی قبروں میں بیٹھے ہوئے وہ انگلش اسلام کی خوبیوں کو بڑے پیار سے سمجھاتے رہتے۔ ہیں راتیں سے دو میل دور ایک گاؤں میں رہتی تھی وہاں سے پیدل چل کر ان سے ملنے کو آتی تو کبھی وہ کسی کی قبر پر بیٹھے ہوتے یا نمبر کو وارڈ کی کسی تقریب کی تیاریوں میں لگے رہتے۔ اماں سے ہماں کو پیار بھی مل گیا تھا اور جو قریب ہر جگہ راہبری رہتا ہے۔ اگلی سینی ٹوریم میں جب وہ بیٹھے تھے اور مرتضیٰ صاحب نے کبھی گوارا کر ان کو واپس جانے کو کہہ دیا تھا اس وقت اچانک ان کے منہ سے پھر خون آ گیا تھا۔ تار پاتے ہی میں ادول سے سیدھی ان کے پاس پہنچی اب زرد لیٹے ہوئے وہ ویسے ہی پلنگ پر خاموش پڑے تھے دونوں ہاتھوں پر تکیہ سے دباب کہنیاں دبا دبا کر دو دی گئی تھیں۔ ان کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی دل کو سنبھالا تم آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ اسی پرانے طریقے پر پھر انھوں نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا ان کے چہرے پر بے حد گھبراہٹ تھی۔ ڈری ہوئی خاص طور پر ان کی تکلیف اپنے دل سے کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے وہ مجھ سے بڑے پیار سے بولی۔ اب تو بھیا اچھا ہے بھابھی۔ سچ سچ اس نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ اے بھابھی جیجی تو تیرے لئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اماں تو جو بیٹھی ہے گھر بار اور دو جا اچھا لگنے تک نہ آئی یہاں —— بڑا پھول دیتے ہی تھی بیچاری —— جو بھرا آگ کے پھول آ گیا کہیں گی —— اختر صاحب نے اس سے پہلے جس ہمت سے اپنی بیماریوں کا مقابلہ کیا تھا اب ان کی طرف دیکھتے ہوئے یہ لگتا تھا جیسے وہ زندگی بازی ہار چکے ہیں۔ سرہانے خاموش رہنے کو بورڈ لگا تھا اور وہ بے حس و حرکت ایک طرح سے بیٹھے ہوئے سامنے سینی ٹوریم کے اس آفس کو دیکھتے رہتے جہاں ابھی چند دنوں میں وہ کئی تقریریں کر چکے تھے جہاں دو مہینے ہوئے فائلوں میں ان کے کئی اصلاحی نقشے موجود تھے اور جس جگہ مرتضیٰ کے

جیسے سخت گیر ڈاکٹر کے چہیتے بن کر بھی انتہائی لاغری میں بھاگ لگے وہ اپنی بات منواتے رہے تھے۔ ایک دن ان کے منہ سے کچھ زیادہ خون آ گیا تھا، یکایک وہ اپنی ترشی ہوئی بہت ہی نازک اور خوبصورت انگلیوں کو دیکھتے رہے اور یاد سے پیا شعر پڑھنے لگے، وہ آہستہ آہستہ سسک رہے تھے اور ایک مصور، ایک شاعر اور ایک ادیب کی وہ فن کارانہ انگلیاں ان کے خشک اور کانپتے ہوئے لبوں پر دھری تھیں۔ ان کے مرجھائے ہاتھوں میں اتنی حسین انگلیوں کو دیکھ کر ہمیشہ سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ غلطی سے اس ہاتھ پر لگ گئی ہیں اور اب روح شمع کی کانپتی ہوئی لو شاید بجھنے لگی تھی۔ ڈولی بڑے خلوص سے ان کی خدمت کر رہی تھی جب کچھ اچھے ہونے لگے تب وہ ایک دن مجھ کو سمجھاتی ہوئی کہنے لگی بھابی بھیا کو سمجھا دیں کہ وہ اتنے زور زور سے گرج گرج کر کسی کو ڈانٹا نہ کریں۔ سچ کہتی ہوں بھابی ابھی تو میں نے اپنی زندگی میں اتنی گرجتی ہوئی ڈانٹ کبھی بڑے صاحب کی بھی نہ سنی تھی۔ — ہاں کبھی ابھی میں چھوٹے سے منع کر دی۔ بہرحال اختر صاحب جب اچھے ہو گئے تب یہ راز کھلا کہ ڈولی نے کسی وارڈ سرونٹ کو کچھ زیادتی سے ڈانٹ دیا تھا جس سے اختر صاحب کو غصہ آ گیا اور وہ انسانیت کی اس تضحیک کو برداشت نہ کر سکے۔ پہلے تو انھوں نے ڈولی کو سمجھایا کہ وہ اس نوکر سے معافی مانگ لے مگر ڈولی نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ ایسے ایسے نوکر اس کی جوتی کی نوک پر دھرے رہتے ہیں، اتنی بات سن کر اختر صاحب اپنی بلند آواز میں ڈولی پر جو گرجے تھے تو پھر سارا وارڈ اکٹھا ہو گیا۔ اور اسی رات کو سوتے سوتے میں ان کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا تھا۔ ڈولی اپنے کوارٹر جا کر خوب روتی رہی تھی مگر جیسے ہی اس کو ان کی بیماری کی خبر ملی تو رات ہی کو بنگلے پر دوڑتی ہوئی وہ اس چلی آئی۔

سوا سال اگلی میں رہ کر اختر صاحب واپس پٹنے آ گئے تھے۔ مہتہ صاحب نے ایک بڑی اچھی سرٹیفکیٹ دے کر ان کو خاندان اور سوسائٹی کے لئے بے ضرر لکھ دیا تھا۔ ان کا وزن کافی بڑھ گیا تھا، لیکن پھر بہترین کھانے اور آرام کرنے کی سخت تاکید کر دی گئی تھی۔ وہ اکتوبر میں پٹنے آ گئے تھے، زندہ دلی اور شوخ مزاجی کے ساتھ شرارتوں میں کوئی کمی نہ آئی تھی ان کو دیکھ کر بھولے سے بھی یہ خیال نہ ہوتا تھا کہ کبھی ان کو دکھوں سے بھی واسطہ پڑا تھا۔ ان کی آنکھوں میں وہی محبت خلوص اور پیار یا سب ہی کچھ تھا مگر اس کے ساتھ ہی ایک چڑچڑاہٹ اور بیزاری کی جھلک بھی صاف نظر آنے لگی تھی۔ معمولی معمولی باتوں میں وہ خفا ہی ہو جاتے اور ایسا لگتا جیسے اپنے راستے میں ایک چھوٹی سی کنکری کو بھی وہ روک دیکھنا ان کو گوارا نہ تھا، اتنی لمبی بیماری نے جیسے ایک داغ ان پر چھوڑ دیا تھا۔ دوسرے ہی سال اختر صاحب نے پرائیویٹ طور پر اردو میں ایم۔ اے کا امتحان دے دیا اور پھر فرسٹ کلاس فرسٹ آ کر ایک اور سونے کا میڈل اور دوسری اردو کتابوں کا انعام پایا تھا۔ اب تک وہ صرف اپنی زندگی کو قائم رکھنے کی جدوجہد کرتے رہے تھے مگر اب ان کو زندگی گزارنے کا راستہ تلاش کرنا تھا ان کی نگاہوں میں زندگی گزارنے کا معیار بڑا ہی سیدھا سادا تھا ان کو انسانیت سے بے حد محبت تھی اور انھوں نے اپنے اور دوسرے کے فرق کو کبھی بھی محسوس نہ کیا تھا، خود بیمار رہتے رہتے ان کے دل میں انسانی زندگی کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی۔ اور اختر صاحب شروع ہی سے ہر ممکن طور پر دوسروں کی مدد کو اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ شادی کے فوراً ہی بعد میں نے اپنا ایک جوڑا کڑا ان کو پٹنے جاتے وقت دے دیا تھا کہ میری طرف سے گاؤں میں کسی لڑکی کو دے دیجئے گا وہ اس کو پہن کر اچھے زیور کی خواہش پوری کر لے گی۔ جب یہ واپس پٹنے پہنچے تو میں نے بڑے اشتیاق سے ان کی اٹیچی کھولی، کڑے کے جیسے میں نے نگاہوں میں پھر رہے تھے مگر جب اٹیچی کھلی تو اس میں کڑے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ یہ تماشہ دیکھتے ہوئے بڑے سکون سے بولے "تمہارے کڑے؟ وہ تو بڑے قیمتی کڑے تھے" جنرل وارڈ میں بارہ بجے رات کو ایک لڑکی زچہ ہو کر مر گئی تھی اس کا بھائی روتا ہوا ہوسٹل میں میرے پاس آیا، اسپتال والے مردے کی لاش مردہ خانہ بھجوا رہے تھے مگر وہ بے چارہ شریف لڑکا اس خیال سے کانپ رہا تھا کہ جو لڑکی عزت میں عورت اور حیا کے ساتھ مر گئی تھی اس کے بے جان جسم کو اب مردہ خانہ تک پہنچانے کے لئے ڈوموں کے ہاتھ لگیں گے، ان لوگوں کے پاس ایک پیسہ تک نہ تھا، میں نے ڈاکٹروں سے کہہ کر لاش کو صبح تک اسپتال ہی میں رکوا دیا اور سویرے ہی تمہارے کڑے بیچ کر اس بیچاری کو سپرد خاک کر دیا۔"

اختر صاحب ایم۔ اے کے بعد تلاش روزگار میں پریشان ہی تھے کہ ان پر پھر دوبارہ اس مرض کا بڑا ہی سخت حملہ ہو گیا، جوڑ جوڑ میں درد کے ساتھ سارا جسم متورم ہو گیا تھا اور درد کی ٹیس کے ساتھ تیز بخار نے ان کو نڈھال کر دیا۔ کسی طرح سے پھر وہ پٹنے ہاسپٹل کے وارڈ میں داخل کئے گئے۔ بنرجی صاحب نے دیکھا دل پر بھی کافی اثر ہو چکا تھا، چھ مہینے تک ایک طرح سے بستر سے لگے ہوئے تھے جب چلنے پھرنے کی سخت تاکید کر دی گئی تھی، اس وقت جب ہم اٹھ سے

ملنے کے لئے جاتے تھے تو ان کی آنکھوں میں نفرت اور غصہ بھرا رہتا تھا اور کئی کئی دن تک ہم لوگوں میں سے کسی سے بھی بات نہیں کیا کرتے تھے۔ مگر ایسا نہ کرو بھی چند ہی دنوں تک رہتا تھا اور اصل ان کو اسلام سے بے حد محبت تھی اور خدا سے ناتا کرنے کے بعد وہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے اشاروں میں بھی وہ ہمیشہ نماز پڑھتے۔ رہتے تھے۔ مگر ان دنوں وہ اپنے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکتے تھے کہ ان کا حشر کیا ہو گا اور ان کا مستقبل آخر کیسا ہو گا۔ یہ گاؤں ایک ایسا دھندلکا تھا جس کے پار ان کی نگاہیں پہنچ ہی نہ سکتی تھیں۔ ڈاکٹر محمد شال نے اسپرین کی گولیاں کھلا کھلا کر ان کے درد کو دبا رکھا تھا اور اس وقت بھی جب کہ ان کے سارے جسم کے جوڑوں پر گول تھیلی کی تیزی کے ساتھ سفید پٹیاں بندھی تھیں ڈاکٹر محمد شال بڑے پیار بھرے خلوص سے کہتے "اختر تم جلدی سے اچھے ہو جاؤ ہم تم کو پروفیسر بنا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔" ڈاکٹر محمد شال کی باتیں تھوڑے تھوڑے نے آخر پوری ہی کر دیں۔ سنہ ۳۸ء کے دسمبر میں بڑے ڈرامائی انداز میں اختر صاحب کو پٹنہ کالج میں اردو کی لیکچراری مل گئی تھی۔ پبلک سروس کمیشن نے ان کا نام دوسرا بھیجا تھا ان کے دوستوں کی ساری کوششیں دیکھ کر بے چین ہو گئی کہ پہلے سے ایک کالج میں کام کرتے ہوئے لیکچرار کو کمیشن نے یونیورسٹی کے چند ہی اچھے نمبروں کے معیار سے سیدھے سادے طور پر منتخب کر دیا تھا اور دستی چیز ہی اعلیٰ صلاحیت، پر مطلق اور بے روزگار ہی پر اس کی نگاہیں نہ گئی تھیں۔ تعلیم کے منسٹر ان دنوں ڈاکٹر سید محمود صاحب تھے اختر صاحب کے دوست علی اطہر صاحب کی پہنچ وہاں تک بھی تھی اور آخر ڈاکٹر سید محمود صاحب کو انہوں نے اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ پٹنہ کالج میں لکچرار اردو کے کلاس میں تینوں منتخب شدہ امیدواروں سے لکچر دلوایا جائے اور تب وزیر تعلیم خود سے یہ فیصلہ کریں کہ اس جگہ کا اصل حق دار کون ہو سکتا ہے۔ یونیورسٹی اور کالج میں یہ ایک نیا تماشہ تھا وزیر تعلیم کے ساتھ دو پارلیمنٹری سکریٹری، پرنسپل اور بہت سے پروفیسر بھی لیکچروں لڑکوں کے ساتھ اردو کے کلاس میں بیٹھ چکے تھے۔ اختر صاحب کے ہم چشموں نے یہ خبر مشہور کر رکھی تھی کہ پروفیسر نجم الدین صاحب نے اختر کو پہلے سے سوالات بتا دئیے ہیں اور پروفیسر صاحب ہی مضمون ڈاکٹر صاحب کو اختر سے پہلے کو کہیں گے۔ یہاں تک کہ ان کے مقابلے کے دو امیدواروں نے بھی مقابلے کے کمرہ میں ڈاکٹر صاحب سے جا کر شکایت کر دی۔ ڈاکٹر صاحب کو بات بہت بری لگی اور انہوں نے صاف طور پر کہہ دیا کہ امتحان لینے میں آیا ہوں وہ کہ پروفیسر نجم الدین صاحب۔ اس کے بعد وزیر تعلیم نے پہلے امیدوار کے سامنے اسی وقت ایک مضمون پیش کیا اور اس پر کلاس کے سامنے تقریر کرنے کو کہا۔ جب وہ تقریر کر چکے تو ڈاکٹر صاحب نے بال جبریل سے چند اشعار دئیے کہ اس کی تشریح کریں جب وہ تشریح بھی کر چکے تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اب آپ بال جبریل میں سے جو اشعار چاہیں اختر صاحب کو تشریح کے لئے دے دیں۔ پہلے صاحب نے کتاب لے کر بڑے غور سے ورق گردانی شروع کر دی کہ کوئی سا شعر ایسا منتخب کریں جو اختر صاحب کے بس کا نہ ہو۔ جب کئی منٹ صرف ہو گئے تو یہ چیز ڈاکٹر صاحب کو بری لگی اور انہوں نے جلدی کرنے کی تاکید کی تو انہوں نے اشعار منتخب کر کے دے دئیے۔ اب اختر صاحب کی باری تھی اختر صاحب نے ان شعروں کی تشریح کر دی۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے غالب اور ذوق کے متعلق خود ہی اختر صاحب سے سوالات کئے اور اسی موضوع پر لکچر دینے کو کہا۔ جب وہ لکچر دے چکے تو انہوں نے تیسرے صاحب کے لئے بال جبریل سے اشعار منتخب کئے اتفاق سے وہ اشعار مسجد قرطبہ کے تھے جن کو تیسرے صاحب غلط طور پر پڑھ رہے تھے۔ کلاس کے لڑکوں نے اب ہوٹنگ کرنا شروع کر دیا تھا اور ہمارے طفیل احمد خاں، مطلع بیدری اور مظفر نقوی نے چن چن کر سوالات کرنے بھی شروع کر دئیے تھے۔

تینوں امیدواروں کی تقریریں اپنے اپنے نمبر حاصل کر چکی تھیں۔ وہ کانگریس کی وزارت کا دور تھا اختر صاحب کے ساتھ دونوں امیدوار کانگریسی تھے محمود صاحب ابھی کالج کے احاطے ہی میں تھے کہ لڑکوں نے اپنی کامیابی میں ایک جگہ پر پرجوش نعرہ لگایا اور مسلم لیگ زندہ باد کی گرج سن کر محمود صاحب نے متحیر ہو کر پوچھا یہ نعرہ کیسا تھا؟ علی اطہر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ لڑکے اختر زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے ڈاکٹر محمود کو مسکراتے ہوئے اشارہ کر دیا۔ اختر صاحب کے دوستوں میں علی اطہر صاحب، اشرف الدین احمد، شرف عظیم آبادی، مشتاق علی نقوی اور رضا نقوی نے اختر صاحب کو ایک دولھا کی طرح سجا کر پہلے پہل لیکچرار کی صورت میں پٹنہ کالج بھیجنا چاہا۔ بکس کو کھولا گیا اس کے اندر کوئی سوٹ یا شروانی نہیں تھی بس جو ایک پرانا سا کوٹ تھا وہ کوٹ تھا جس کو جھاڑ پونچھ کر دوستوں نے ایک ساتھ مل کر پہنایا۔ اب جوتے کا سوال رہ گیا تھا مگر جوتے ایسے تھے کہ مر ہی گئے

کی طرح اچھے نظر آتے ہیں۔ جب تنگ مہری کا پاجامہ اور کم سا بڑا سا کوٹ کا دامن اور کوٹ تو خیر کسی طرح سے لٹکے اور چلتے تو یہ بڑا صاحب دار دکھائی دیتا مگر پاؤں میں صاف طور پر نظر آتے جوتے کے تو بس سے ہے جوتوں کا کیا بنتا۔ وہ سب نے اپنے اپنے جوتوں پر نظر ڈالی۔ مگر تو یہ کھلے وہاں تو ایک کو لیے جوتوں کی ضرورت تھی۔ جیسے تیسے انھوں جوتا پر پالش رنگوا لیا اور پورے سات بیل ڈول سے ایک قسم پہ بیٹھ کر ساری رات کو کرنے کے نئے دولہا کے ساتھ کراچی پہنچ گئے۔ وہ دن اختر صاحب کی کراچی کی زندگی کا پہلا دن تھا۔ پنڈی کو کراچی کے اس ماحول سے ہی ہم آہنگ کیا ہو گا کہ جہاں کو پہنچا وہاں تھی اسی جگہ مسلم ہوٹل کی ایک کوٹھڑیوں سے سپرنٹنڈنٹ اور بعض یہودیوں کے ہم ساتھی کی ہانڈیاں ہمیشہ ہی چلتی رہتی تھیں۔ کانوں میں سہرے اور دلہن ہوتے بجتے پتے قدموں سے چل کر انھوں نے اپنی دہشتناک بیماری کی حالت میں ایم۔ اے کا امتحان دیا تھا۔ ان کو اس ماحول کے کونے کونے سے بے پناہ محبت تھی۔ اختر صاحب کے دوستوں کی مختلف پارٹیاں ہیں جو بھی ان سے ذرا خلوص سے ملا وہ ان کی زندگی سے کبھی دور ہو سکا کوئی کا نشان لگا ان کے دوستوں میں شریک ہیں۔ تو کالج کے لڑکے ان کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں اور اختر صاحب کو اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ آج دو تین سال سے صرف اپنے کلاس ہی کے نہیں بلکہ دوسرے کالجوں کے لڑکوں کے لئے بھی مرکز ہدایت اور مستقبل کی تعمیر کی جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ ان کا تعلق اپنے شاگردوں سے جہاں اپنے عزیزوں کی طرح ہے وہاں ایک بار قادر اور پر خلوص دوست کی طرح بھی۔ ہمارے کالج کے شاعر اور ادیبوں کے لئے اختر صاحب کی نگاہوں میں بلکہ عزت بڑا احترام ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ نئی پود میں ادب اور شاعری کی ذرا سی بھی صلاحیت دیکھ کر اپنی خوشیوں کا اظہار کرتے ہوئے ان کو آگے بڑھانے میں کوشاں رہیں گے۔ مگر اتنے وسیع اخلاق کے باوجود بھی اختر صاحب کے مخلص دوستوں کا ایک بے تکلف گروپ بھی تھا جو اب پاکستان چلے جانے سے تتر بتر ہو گیا ہے۔ دوستوں نے ان کے ساتھ جہاں محبت اور وفاداری کا بہت سا ثبوت دیا ہے وہاں اختر صاحب کو بھی اپنے دوستوں سے بے حد محبت رہی ہے۔ انہوں نے اپنے دوستوں کی ضرورت کو ہمیشہ اپنی ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان کے ایک دوست کو اپنے والد کے مقدمے کی پیشی پیچ کرنے کو روپے کی ضرورت تھی اختر صاحب نے جب اپنی جیب خالی دیکھی تو پھر انہوں نے بڑے اطمینان سے اپنے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانوں میں لی ہوئی سونے کے میڈلوں کے ساتھ اپنے اور بھی بیچتے ہوئے سونے اور چاندی کے میڈلوں اور کپوں کو اونے پونے بیچ کر روپے اپنے دوست کے حوالے کر دیے اور جب اس دوست کو اس امر کا علم ہوا تو اختر صاحب کے سامنے آکر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ یادگار چیزیں گھر میں رہنے کی بجائے دوکانوں پر بک چکی تھیں۔ اسی ذریعے سے انگریزی اور اردو کی ان ساری کتابوں کو جو انہیں انعام میں ملی تھیں اور قبل ازیں اپنے کمرے کی الماری میں بند کر کے مضبوط تالا لگا دیا تھا۔

ایک تو نقاہتوں کے بعد پیدا ہونے والی اولاد اور وہ بھی اکلوتی، لاڈ پیار ہو کر رہ جاتی ہے اس پر سے بچپن میں نا تندرستی اور کمزوری جیسی بیماریوں نے ان کی طبیعت میں وہ نفاست پیدا کر کے ان ہی آرام طلب بنا دیا تھا۔ وہ تو کچھ خاندانی ذہانت ہی تھی جو ہمیشہ کام آتی رہی۔ ان کا سارا بچپن بیماریوں میں کٹ گیا تھا اور وہ بچی کو پڑھنے والی شفیق ماں کے اٹھ جانے کے بعد اختر صاحب کے میٹرک پاس ہونے سے کچھ دن پہلے ہی خاموشی کے ساتھ قبر میں چھپ گئے تھے۔ نوجوانی کے عالم میں نقاہتوں کی رنگینیوں میں بھی منہ سے خون کے تھکے آنے لگے تھے اور جب سینی ٹوریم سے اچھے ہو کر واپس آئے تو ریح بیرونی کے سخت حملے کے ساتھ دل پر بھی بلڈ پریشر کا اثر پڑ گیا تھا۔ بار بار لمبا سفر کر کے قدم ڈالتے ہوئے وہ اپنی ملازمت کو نبھاتے آرہے ہیں۔ محض خدا کا فضل اور مکان اور آرام ان کی زندگی کا ایک ضروری جزو ہو کر رہ گئے ہیں۔ کالج کے فرائض کے ساتھ دنیا بھر کے کاموں کا ایک جھنجھٹ ان کے ساتھ لگا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ جلسوں میں کتنی تقریریں کرتے رہنے کا تو اب جیسے پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ اور اختر صاحب کے ساتھ سارے لوگ یہ جانتے ہیں کہ حضرت امام جماعت احمدیہ مرزا بشیر الدین محمود احمد ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی دعاؤں کی قبولیت سے اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر ان کو صحت عطا فرما کر زندہ رکھا ہوا ہے اور قوم کی خدمت کا موقع عطا کیا ہے۔ سن ۲۳ کے جلسوں سے لے کر جنگ اور تقسیم ملک کی ہولناکیوں میں ہر دلعزیزی کا ایک بھرپور دور گزر گیا تھا اختر صاحب آج تک ان سے عالم سے رہتے ہیں۔ آنے والے مہمانوں اور عزیزوں کی کثرت سے مجبور ہو کر بھی کسی وقت ان سے پیچھا چھڑا کر دو چار دن کی چھٹی کے لئے درخواست لکھنے جاتی تو وہ صاف طور پر چٹپٹی چیزوں اور بچے ہوئے کھانا کھانے سے ہی انکار کرتے ہوئے اعلانیہ طور پر کہہ دیتے کہ وہ ایک ساتھ دو کام نہیں کر سکتے ہیں۔ یا تو وہ کھانا کھائیں اور چٹنی کا انتظار ہی کریں گے یا پھر [illegible]۔ اور یہی قلم اور [illegible] ان کے کمرے سے نکل آتی۔ اختر صاحب کا گھر ان کی ذاتی شہرت سے [illegible]

کے ساتھ ہی کبھی خالی نہ رہا تھا۔ ان کے اور میرے بھائیوں سے بھتیجوں کے مکان میں ایک رونق رہتی تھی مگر وہ سب کے سب لڑکے اپنے لئے ایسے کرے جو بچتے تھے جو اختر صاحب سے دور رہیں۔ جب لکھنے کی حالت میں قلم اور سادہ کاغذ لئے میں ان لڑکوں کے پاس پہنچتی تو وہ بھی ڈرتے ڈرتے اور شان سے رکھ دیا کرتے کہ ہم بھی ایک ساتھ دو کام نہیں کر سکتے ہیں یا تو پوسٹ ہی لکھتے رہیں گے یا پھر کورس کی پڑھائی ہوگی۔ اور اختر جیسے تیسے لکھ لکھا کر میری اپنا کالا برقرار تھی اور لڑکوں کو ساتھ لے کر لے اور چین کے ساتھ ضرورت کی اور بھی بہت سی چیزیں حاصل کر کے گزر جاتی۔ خدا کا شکر ہے کہ اختر صاحب کے گھر سے ان سترہ برسوں میں کئی عزیز پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو کر نکلے ہیں۔ اپنوں کے ساتھ کئی عزیزوں نے بھی میٹرک، بی۔ اے، بی۔ ایس سی اور ایم۔ اے اس گھر سے پاس کیا ہے۔ زمانے میں کیا کچھ ہوتا رہا، اختر صاحب ابھی تک بے خبر ہیں کہ کون سی چیز نایاب ہو گئی تھی اور اب کن چیزوں کی فراوانی ہے۔ مارکٹنگ شد و مد جھگڑوں سے وہ بچوں کی طرح گھبراتے ہیں۔ ابھی اور ہر سی چیزوں کی پہچان وہ خریداری میں دام کے اندازے کرتے ہیں جو چیز سستی مل گئی بس زندگی گزارنے کے لئے وہی بہتر ہے۔ ایک دفعہ علی گڑھ سے واپس آ کر اپنی نوکری کے سلسلے میں علی گڑھ سے واپس آتے آگرہ میں ٹھہرے اور وہاں میرے لئے خاص طور پر انہوں نے تحفہ خریدا۔ ان دنوں میں الہ آباد میں تھی۔ آتے ہی بڑی محبت سے کہا "میں تمہارے لئے دو تحفے خرید کر لایا ہوں۔" اور جب ان تحفوں پر میری نظر پڑی تو میں حیران کہیں خیال ہی نہ ہو گئی۔ موٹی ٹاٹ کا کالا سا کلہ ہوا جس سے بھی بدشکل، ہر جوڑ ڈھیلا تھا اور لکڑی کی بدصورت سی ایک ساری تھی تب سے میں نے کبھی ان کو بھی میں قربانی میں "آپ کے تحفے سے" مگر وہ بیچارے آج دن بڑے صبر کے کا جھگڑا کرتے رہے تھے۔ اختر صاحب بہت بڑے ادیب، نقاد، اردو کے محسن اور یونیورسٹی میں اردو کے چیئرمین اور بڑے اچھے انسان ہوں تو ہوں —— مگر وہ اپنی زندگی گزارنے سے جیسے کوسوں دور رہتے ہیں!

گھر کے اندر جہاں میرے ساتھ ان کو بھی صفائی کا شوق ہے وہاں وہ مجھ سے وہ بہت کہتے اس بات پر جھگڑتے رہیں گے کہ پلنگ کی چادر، تکیہ کا غلاف، میز پوش اور دروازوں کے پردے فضول اور بیکار چیزیں ہیں اور ان کپڑے غریبوں کے جسم پر ہونا چاہئے۔ لیکن جب میں اپنے روپے سے چادر وغیرہ منگاؤں گی تب بڑے اطمینان سے فرمائیں گے کہ تمہاری چادر کا ڈیزائن بڑا اچھا ہے اور اس کمرے کے فرش پر قالین سا لگا ہوا صحن بڑا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے کھانے پینے کا عالم بڑا عجیب ہے وہ بڑے سے بڑے منظروں اور عالم بھیروں کے مشاعروں کے انتظام کو بجتے ہوئے بھی اپنے آپ پر ان کا احساس نہیں ہونے دیتے ہیں کرتے انکو دعوت کرتے رہنے کا بے حد شوق ہے۔ جب کبھی ان کو کسی کتاب یا امتحان کے پیپر دیکھنے کا معاوضہ ملا وہ میرے پاس آئیں گے۔ "مجھے فلاں لوگوں کی دعوت کرنی ہے۔ چیزیں سب گھر کی پکی اور عمدہ ہونی چاہئیں تاکہ اعتراض نہ آئے۔" اور جب میں مہمانوں کی تعداد اور کھانے کی فہرستیں بنا کر کئی سو روپیہ یا بیالیس روپے لیں گے تب وہ گھبرا جاتے ہیں اور کہیں بھائیوں کو عمدہ قسم کا کھانا اور وہ بھی صرف پندرہ روپے میں کھلانے کی کوشش کریں گے۔ اس سے زیادہ مجھ کو غصہ آتا ہے جہاں پانچ روپے سیر گھی ہو اور ایک ایک مرغی دو دو روپے میں آتی ہو وہاں بیس قسم کی عمدہ چیزیں پندرہ روپے میں آپ کیسی اور سے بنوا لیجئے، اور الزام میرے سر سے ٹل جاتی ہے۔ اور کبھی ان کو بھی اپنے حساب سے زائد خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ جب معترض کھانے پر جانے کا سوچ رہے تھے کھانے کی فہرست تیار کی گئی کھلانے کے لئے گھر سے کا تقاضہ ہو چکا تھا اچانک ان کو برتنوں کی یاد آئی وہ بڑے اطمینان سے بولے گھر میں جو بھی برتن ہیں اسی سے کام چلایا جائے گا میں نے صاف طور پر بے جوڑ برتنوں میں کھانا کھلانے سے انکار کر دیا۔ لیکن انہوں نے اس بات پر بہت زور دیا کہ ہمارے دوست تو پتوں پر بھی کھانا کھا لیا کرتے ہیں لیکن میں نہ مانی۔ اور وہ بہت دیر تک کٹ کٹ کر آپ کھاتے رہے ان کو وہ گھرانا ایسے گھروں میں وہ اپنی خوشی سے کچھ کر بھی نہیں سکتے ہیں اور اس کی اپنے کے لفظ پر میری ان سے کافی لڑائی ہوتی رہی ہے۔ اور ایسے ہی بہت سی پیاری لڑائیاں ہم اکثر لڑتے رہتے ہیں۔ اختر صاحب میں جو سب سے بڑا عیب ہے وہ یہی کہ معمولی سی معمولی بات کو بھی لکھتے ہیں اتنے زور سے بولا کریں گے کہ دور سے دیکھنے والا یہی سمجھے کہ کوئی بڑی بھاری جنگ ہو رہی ہے اور وہ جہاں زور سے بولے تو میرے دماغ گویا اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ تو پھر بھی کوئی بات جرکی تو آہستہ سے بول ہی نہیں سکتے۔ پھر وہ جیسے خود انتہائی سادگی سے رہتے ہیں اسی طرح سے اپنے عزیزوں اور ملنے والوں کو بھی رکھنا چاہتے ہیں اور ان کی یہ چیز مجھے کھلا دیتی ہے شام کی چائے ختم ہوتے ہی وہ میرے پاس آئے کہ ایک لڑکے کو ٹرین لے کر گئے ہیں اسٹیشن پر چھوڑ دو۔ ابھی کرنے جا رہا ہوں۔ لڑکوں نے کوشش کی تھی

کہاں لوگ بھی مجھے ہرگز یوں شمار نہیں کریں گے لیکن انکار میں کچھ نہیں ہو سکتا ہے اب میں جب اختر صاحب کو اپنے ہی پاس بلا لوں گی یہ سنتے ہی میرے ہوش اڑ گئے۔ جلدی سے بتا دیتے، گھر کی صفائی ہو جاتی، آخر دنیا کہیں سے آ کر دیکھے ہر چیز ڈھنگ میں رہنی چاہئے" اور وہ چڑھ کر کہتے "بڑے لوگوں کی نگاہیں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں جاتیں، کہیں گے کیا! میں کوئی نواب کا نواسہ تھوڑا ہی ہوں جو اپنی شان جتاتا پھروں، ہم جیسے ہیں ویسے ہی رہیں گے۔" اور جب اختر صاحب کے مختلف گھروں میں مجاز، ساحر، حفیظ، سلام، عبادت بریلوی، سرور، احتشام، فراق، اپندر ناتھ اشک، عرش ملسیانی، عبدالقادر سروری، جعفر علی خان اثر، اور جگر مراد آبادی جیسے معزز مہمان آتے رہے تو گھر ان دنوں بھی پٹنے میں رہتی تو بس یہی کہا جاتا ہے کہ مہمانوں کے رہنے تک میں اس گھر سے کہیں دور چلی جاتی تاکہ اختر صاحب کے پھوہڑ پن کا الزام مجھ پر عائد نہ ہو۔ بڑے سے بڑے محترم مہمانوں کو وہ بڑی فراخ دلی سے اپنے گھر میں ٹھہرا کر خوشی محسوس کرتے رہتے ہیں اور میں اتنے عرصے تک ان کی شایانِ شان خدمت نہ کر سکنے کے احساس اور غم سے تڑپتی رہتی ہوں۔ مہمان مجھے کب سے عزیز ہیں اور ان کی مہمان نوازی ہو کر بھی میں مشہور ہے کہ اختر صاحب کا اصول نرالا ہے کہ وہ زمین پر چٹائی بچھا کر مٹی کے برتنوں میں ہی اپنے مہمانوں کو کھلا کر خوشی محسوس کریں گے اور میں تو اپنے مہمانوں کو سر آنکھوں پر بٹھانے کی قائل ہوں۔

گھر کے اندر جب ہم دو عام میاں بیوی کی حیثیت سے گفتگو کرنے لگتے ہیں تو گھر میں آتے ہوئے عزیزوں کو ہمارا کھیل بڑا اچھا لگتا ہے ادب شاعری اور فلسفہ پر باتیں کرتے کرتے ہم مذہب اور قرآن شریف کی تفسیر تک پہنچ جاتے ہیں۔ جب تک ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں، تب تک تو گفتگو میں اپنا پن قائم رہتی ہے مگر ایسا اکثر ہی ہو جاتا ہے پھر ہم الگ راستوں پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ کبھی یہ بھی نکلتا ہے کہ ہم آٹھ آٹھ دنوں تک ایک دوسرے سے بول چال بند کر دیتے ہیں۔ اختر صاحب کا گھر کبھی مہمانوں سے خالی نہ رہا ان کے رشتہ داروں سے زیادہ میرے عزیزوں کو ٹھہرنے کی ضرورت رہتی ہے لیکن میرے عزیز بھی تو ان کی پیار اور محبت کے بھوکے ہیں۔ جب کبھی ان کو کہیں سے روپیہ ملتا ہے وہ تاش کے پتوں کی طرح پھینٹتے ہوئے روپے کو بانٹ دیتے ہیں اور روپے ملنے کی بھی عجیب عجیب صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ عذرا اگر دن بھر ہنستی رہیں گی تو ان کو دس روپے ملیں گے، شمیم نے اگر آج ایک شعر کا بھی معنی بتا دیا تو وہ پندرہ روپے جیت لیں گی۔ اور شہلا کی دوا جو اگر ایک ہفتہ کے اندر بہتر آ گئی اور اس نے بچا کر دے دیا تو پچاس روپے شہلا کے ہوں گے۔ کسی کو افسانے کا فن سمجھنے پر انعام دیا جاتا ہے تو کسی کو زیادہ شعر یاد رکھنے پر۔ لیکن ابھی تک مجھ کو یاد ہے کہ شادی سے پہلے پانچ روپے کا لالچ دے کر انہوں نے مجھ سے پورا شکوہ یاد کروایا تھا اور آج تک میرے وہ پانچ روپے باقی رہ گئے ہیں۔ اختر صاحب گھر میں آنے والی چیز نہیں ہیں۔ جتنے بنیان اور قمیصیں کی سخت ضرورت ہے گھر اور ستر بکس آتے ہیں کبھی کبھی کوٹ بنواتے وقت کپڑوں کی تنگی کا رونا رویا جاتا ہے مگر پیسے جب بھی آئے نا معلوم کہاں گئے۔ اختر صاحب کے گھر میں ان کا اپنا کوئی بچہ نہیں ہے مگر ہمارا ایک نسل پڑھ پڑھ کر نکل چکی ہے اب ان کی نسل پڑھنے آ گئی ہے اور اس طرح سے خدا نے ایک ہی ساتھ مجھ پر چار آٹھ آٹھ بچے دے دیئے ہیں۔ منی اور گلی اختر صاحب کے بھائی فضل احمد آئی۔ پی۔ ایس اور میری اپنی پھوپھی زاد بہن صوفیہ شہزاد کے بچے ہیں اور چار سال کی عمر سے میرے پاس رہ کر کانونٹ میں تعلیم پا رہے ہیں۔ میری منجھلی بہن رضا اور نما کا بچہ بھی سینٹ فرانسس میں ہے جو چھوٹی بہن عذرا کی بچی ہیں اور میرے بھائی مجوزہ احمد کی بچی نسرین کانونٹ کے بچے کلاس میں ہیں۔ اور اختر کی بہن شمیم اور میری سب سے چھوٹی بہن ہندی کی ہائی اسکول میں ہیں۔ اور اختر صاحب کے چچا زاد بھائی کا بچہ تاج مسلم اسکول میں ہیں۔ گھر اب گھر نہیں ہے وہ ایک بورڈنگ ہاؤس ہی بن کر رہ گیا ہے جہاں قدم قدم پر بستر جگہ جگہ پر چپل، سلیٹ اور اسکولوں کی کتابیں بکھری پڑی رہتی ہیں۔ صبح کو آٹھ بجے جب سارے بچے کانونٹ اور اسکول چلے جاتے ہیں تو دماغ جاکر ٹھکانے لگتا ہے اور جب چار بجے رکشا موٹریں اور گاڑیاں ان سب کو لا لا کر پہنچانے لگتی ہیں تو پھر گھر سے کہیں بھاگ جانے کو جی چاہتا رہتا ہے۔ اور آئے ہوئے مہمان بچوں کی اس فوج سے بری طرح گھبرا گھبرا کر بھی تعریف کرنے سے باز نہیں رہتے۔ اختر صاحب کا دستر خوان ہمیشہ سے بڑا لمبا چوڑا بچھتا رہا ہے گھر کے سارے لوگ ایک ہی ساتھ کھانا کھایا کرتے ہیں اور کھانے کے دوران ایسی ایسی مزیدار باتوں کا سلسلہ رہتا ہے کہ گیارہ بارہ بجے رات تک پڑھائی کے متعلق بھی رہتی ہے جو بچے اونگھ اونگھ کر جھولنے لگتے ہیں پھر بھی کسی کو پلنگ پر جانے کو جی نہیں چاہتا۔

اختر صاحب کی بعض عادتیں عجیب ہیں۔ وہ اپنی چابی کبھی کہیں نہیں رکھیں گے جیب میں۔ اگرچہ کوئی خاص چیز نہیں ہے پھر بھی کسی کو چھونے نہیں دیا جاتا بلکہ سارا گھر چھوڑ کر بس وہ اپنے لئے ایک کمرہ مخصوص کر لیتے ہیں اسی ایک کمرے میں ان کی ساری چیزیں اپنی اپنی مقررہ جگہوں پر دھری رہتی ہیں کسی نے ان کے کمرے کی کسی ایک چیز کو بھی چھیڑ دیا بس تو پھر چراغ کے پیچھے کر ہاتھ لگ گیا۔ ان کے لکھنے کی میز پر قلمی گرد ہو تو ہو مگر اس کو کوئی چھوتے نہیں۔ ہیں جب وہ جاگ مرے مارے پڑ کل جاتی ہیں تب غریب میز کی قسمت جاگتی ہے۔ اختر صاحب کے افسانے لکھنے کی بھی عجیب شان ہے کہ وہ صاف جو میز پر ساری چیزیں ان کے خیال سے اپنی اپنی جگہ پر ہوں موسم ان کی پسند کا ہو کیونکہ ان دنوں زیادہ کام نہ ہی اور گھر کے اندر مہمانوں کا بھی تانتا ہوا سیلاب نہ ہو۔ تب وہ افسانہ یا کوئی مضمون لکھنا شروع کریں گے پتلی پتلی سفید اور گلابی رنگ کی انگلیاں دو تین ہی سطروں تک چلتے چلتے تھک جائیں گی باہر دروازے پر کبھی ہلکے اور کبھی زور سے دستک ہونے لگے گی کبھی ملاقاتی کارڈ آنے لگیں گے اور اختر صاحب سے روز ملنے والوں کا پھر ایک تانتا بندھ جائے گا۔ صبح سے دوپہر، دوپہر سے شام اور شام سے رات۔ رات گئے تک نہ جانے کتنے قسم کے لوگ آتے رہیں گے اور اختر صاحب قلم سے، زبان سے اور پھر اپنی تفصیلی باتوں سے ان سب کی خدمت کا پورا حق ادا کر کے تھکے ہوئے سے اپنی مسہری پر لیٹ کر آرام کرنا شروع کر دیں گے اور اس طرح سے کبھی کبھی تو پندرہ دن تک بھی ان کا افسانہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا ہے۔ گھر کے اندر میری یا بچیوں میں شاید ہی آواز ہیں۔ ریڈیو بجتا رہتا ہے بچے آنکھ مچولی کھیلنا شروع کر دیتے ہیں اور جاری ہو جاتی ہیں ٹیلیفون مارکیٹ سے تازہ تازہ خبریں، بھری چیزوں پر تفصیلی گفتگو کرنے لگتی ہیں اور جب میں اسی وقت میں گھر کے نوکروں یا باورچی پر مجھے غصہ آجاتا ہے تب تو گورنمنٹ کیسے کوارٹر ایک چڑیا خانہ ہی نظر آتا ہے اس وقت اختر صاحب بیچارے اپنی چندیا پر شکنوں سے بچائے ہوئے کچھ غنیمت سے بال پر آملہ کا تیل مسلوا کر نکلتے باہر اپنے احاطے میں ٹہلنے کو نکل جاتے ہیں۔

اختر صاحب کی ایک خاص چیز ان کا بجٹ ہے۔ ہر تھوڑے دنوں کے بعد وہ اپنا بجٹ بناتے ہیں۔ ہر مہینے ایک خاص رقم جہاں کی آمدنی پر لگتی ہے تبلیغ اسلام کے لئے چندہ بھیج دینے کے بعد اپنے روز کا حساب بناتے ہیں۔ بجٹ ہی کے حساب سے بالکل نپے تلے ہوئے سارا مہینہ گزار دیتے ہیں ان اگر بیرونی دوستی یا کسی پبلشر سے فاضل روپے مل گئے تب تو پھر خرچ بھی جانا شروع کرتے رہے۔ انکو کسی چیز کی عادت نہیں ہے نہ وہ سگریٹ پیتے ہیں نہ پان اور دوا ہے بس ایک عادت عمدہ غذا، دوا ہیں اور کام کرتے رہنے کی ایسی ہے جو سب عادتوں سے بڑھ چڑھ کر ہے ۔۔۔!

اختر صاحب کی اب تک دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں افسانے، ڈرامے، ناولٹ اور تنقیدی مضامین سبھی ہیں۔ انہوں نے ایک ناول "تعمیر" بھی لکھا ہے جو کئی سالوں سے لکھا ہوا بکس میں دھرا ہے۔ ہندوستان میں غریب اردو پر کوئی پبلشر اپنا سرمایہ لگاتے ہوئے ڈرتا ہے اور پاکستان ہمارے لئے دور راہی ولیس شہر ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ اور ایک نظموں کا مجموعہ بھی مسودوں کی صورت میں پڑا کسی آنے والے اچھے دن کا انتظار کر رہا ہے اختر صاحب کو بہار کے آم اور بھیجا بانچپورے کے مناظر بہت پسند ہیں۔ جب وہ کالج کا کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ اورین کی پہاڑی پر حضرت بدھ کی طرح بیٹھ کر سکون اور نروان حاصل کریں گے۔

اختر صاحب حاجیپور ضلع زیدی سیدوں کے گھرانے سے ہیں۔ اورین میں ان کے بزرگ سید احمد جان فیروز تغلق کے زمانے میں آکر بسے تھے اور فوجی کمانداروں میں انہوں نے جاگیر پائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اپنی ضد اور چڑچڑاہٹ کے باوجود اپنی پٹھان طبیعت اور سادگی جیسی صلاحیت اور نرمی کے ساتھ وہ بڑے کام کے آئیڈیل آدمی ہوتے اگر بچپن کی چھوٹی باتوں میں مجھ سے وہ الجھتے نہ رہتے۔

---

[1] نوٹ: اورین کی بستی میں ایک پہاڑی ہے جس پر پالی زبان میں کتبے لکھے ہوئے ہیں اور بدھ کی مورتیاں بنی ہوئی ہیں کہا جاتا ہے کہ مہاتما بدھ نے اس پہاڑی پر آکر دھیان کیا تھا۔

حیات اللہ انصاری

مسیح الحسن رضوی

جب کسی شخص کی زندگی ہنگاموں سے خالی ہو اس میں گھن گرج کی کیفیت نہ ہو بلکہ اس کے برعکس نرم رو دریا کی سی کیفیت ہو تو اس کے بارے میں کیا اور کیونکر کہا جائے؟ حیات اللہ انصاری افسانہ نگار ہیں، صحافی ہیں اور اب لیڈر بھی بنتے جا رہے ہیں۔ ان میں سے اگر کسی بھی حیات اللہ کو ہاتھ لگایا جائے گا تو دوسرے حیات اللہ کا ذکر ناگزیر ہو جائے گا۔ اس سے بچنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ آپ کے سامنے اس حیات اللہ کو پیش کیا جائے جو ان تینوں چیزوں کا مرکب ہے ——— حیات اللہ جو انسان ہے اور سب کچھ بعد میں۔

اس حیات اللہ نے زمانہ کے بڑے سرد و گرم چکھے ہیں۔ عزیزوں کی خفگی اور دوستوں کی بے زاری اور تمسخر۔ عزیزوں کی خفگی کے سبب ایک زمانہ میں فرنگی محل سے "بن باس" ملا اور دوستوں کی بیزاری کے سبب انجمن ترقی پسند مصنفین سے علاحدگی اختیار کرنی پڑی۔ اب جب کہ حیات اللہ انصاری اپنی راہ و رنگ میں کامیاب ہو گئے ہیں تو دوست تو دوست عزیز بھی انہیں اپنا رہے ہیں۔ فرنگی محلیوں سے ملئے تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ حیات اللہ کا تعلق فرنگی محل سے ہے۔ دوست کہیں گے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں حیات اللہ انصاری کا ہم سے کم ہاتھ نہیں ہے۔ بلکہ سر کانفرنس میں تو ڈاکٹر علیم نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ایک زمانہ میں حیات اللہ ہم سے زیادہ گرم کمیونسٹ تھے اور ہمیں انہیں لگام دینے کے لئے کہنا پڑتا تھا کہ "ذرا سنبھل کے، آگے خندق ہے۔" بہرکیف حیات اللہ انصاری خندق میں گرنے سے بچ گئے۔ اس میں ڈاکٹر علیم کا مشورہ شامل تھا یا خود حیات اللہ کی کوششوں اور سمجھ کا ہاتھ، یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن ان کی اس تبدیلی کا ان کے دوستوں پر بڑا گہرا ردعمل ہوا جو بقول ان کے بزرگوں کے حیات اللہ انصاری کی صحبت میں پڑ کر خراب ہو چکے تھے۔ کمیونسٹ حیات اللہ گاندھیائی بن گئے تھے اور ہندوستان (ہفتہ وار لکھنؤ) کی ایڈیٹری کر کے بڑے زور شور سے گاندھیائی فلسفہ حیات کی تبلیغ کر رہے تھے۔ دوست ان کی اس تبدیلی کا مذاق اڑاتے پھر رہے تھے۔ اس مذاق اڑانے کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے چند سال ادھر اردو کو علاقائی زبان بنوانے کے لئے دستخطی مہم چلائی تب بھی ان کا مذاق اڑایا گیا۔ جب انہوں نے صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں بیس لاکھ دستخط پیش کر دئیے تب بھی ان کا مذاق اڑایا

گیا جب انہوں نے کل ہند امن کونسل کے متنازعہ اور ہندی کے افسانہ نگار یشپال کی اردو دشمنی کے خلاف اپنے اخبار میں احتجاج کیا اور انہیں کھلم دشمن ٹھہرایا اس وقت بھی اُن کا مذاق اڑایا گیا اور ایک بھرے جلسہ میں ملک راج آنند نے حیات اللہ کو اپنے الفاظ واپس لینے کا حکم دیا۔ اور شاید یہ سن کر آپ کو تعجب ہو کہ جب لکھنؤ کے ایک انگریزی روزنامہ میں کسی نیپالی نے پیغمبر اسلام کے نام پر اپنے کتے کا نام رکھ کر اس کی گمشدگی کا اشتہار دیا اور حیات اللہ انصاری نے اپنے اخبار قومی آواز کے ذریعہ اس کے خلاف احتجاج کیا تب بھی بعض حلقوں کی طرف سے ان کا مذاق اڑایا گیا اور ان کو فرقہ پرست اور رجعت پسند کہا گیا۔ جب اردو کی دستخطی مہم کے سلسلہ میں ایک بڑے جلسہ عام ان پر قاتلانہ حملہ ہوا تو ان کی "گاندھیائی ستیہ گرہ" کا مذاق اڑایا گیا۔ تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حیات اللہ انصاری کی زندگی اس مذاق اڑانے کے شیطانی چکر کے درمیان پروان چڑھی ہے۔ لیکن خود ان کے کردار پر اس کا اثر الٹا اور ردعمل ہوا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کے بھی دوست ہیں اور دوستوں کے یار غار۔ وہ ہر شخص کی زندگی میں اچھے پہلو ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ پھر ان ہی اچھے پہلوؤں کے سہارے وہ اس شخص سے اپنے تعلقات کی عمارت استوار کرتے ہیں۔ اور ان کی یہ ٹکنک اتنی کامیاب رہی ہے کہ اب ان کے مخالفین بھی ان کا احترام کرنے کے لئے اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔

اس مضمون کو آگے بڑھانے سے قبل میں آپ کے سامنے سنہ ۱۹۲۵ء کے حیات اللہ کا کچھ ذکر کروں گا۔

غالباً اس وقت حیات اللہ کی عمر تیرہ چودہ سال کی رہی ہوگی۔ فرنگی محل کے ایک حصہ میں وہ اپنے والد مولانا وحید اللہ مرحوم کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک بے چین بچہ جس کا اپنا کمرہ "حیات منزل" ایک کیوریو شاپ و نوادر کی دکان، تھا جس میں ہر طرح کی چیزیں تھیں۔ کوک سے خود بخود چلنے والا پنکھا، توپ، تھیٹر کے پردے، بائیسکوپ کی مشین، عجیب و غریب میزیں اور کرسیاں، "طلسم ہوشربا" فسانۂ آزاد اور نہ جانے کیا الم غلم۔ یہ سب چیزیں خود حیات اللہ کی بنائی ہوئی تھیں۔ ان کے بچپن کے ایک ساتھی کا کہنا ہے کہ اگر حیات کو انجینئری کی تعلیم دی جاتی تو وہ آج ملک کا ایک ماہر انجینئر ہوتا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ وہ زمانہ تھا جب تحریک خلافت دم توڑ چکی تھی۔ مسلمان اور خصوصاً اس کے علما کا طبقہ میدان میں آنے کے بعد پیچھے ہٹ چکا تھا۔ حیات اللہ کا تعلق چونکہ علما کے خاندان سے تھا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیاسی افراتفری اور علما کی باہمی پھوٹ کی وجہ سے فرنگی محل کی قیادت کا آفتاب بھی غروب ہو چکا تھا۔ ان حالات اور ماحول میں حیات اللہ فرنگی محل میں تعلیم و تربیت حاصل کر رہے تھے۔ ان کی جدت پسندی، ذہانت اور روشن خیالی کا احساس اس وقت عام طور پر فرنگی محل میں کیا جانے لگا تھا۔ چنانچہ ان کے ہم عمر ساتھیوں کو ان کی صحبت میں بیٹھنے اور اپنا وقت برباد کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن فرنگی محل کے بچے اس وقت اپنے بزرگوں کی نصیحت کے مقابلہ میں کم سعادت مند واقع ہوئے تھے اس لئے وہ چھپا چوری حیات منزل میں جمع ہوتے اور اس لڑکے کے کارنامے اور اختراعیں دیکھ کر اپنے جذبۂ تحیر کو تسکین دیتے۔ اس زمانہ کے دو واقعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک مولانا کو فرنگی محل کے ایک مکان کے کمرہ میں "جلوۂ طور" نظر آنا اور حیات اللہ انصاری کا مسجد اسحٰق کے عقب میں واقع ایک دوسری چھوٹی مسجد کے مینارے سے چھلانگ لگانا۔

پہلا واقعہ اس طرح ہے کہ حیات اللہ کہیں سے ایک تیز روشنی والا دھماکا لے آئے۔ اور جب مولانا تہجد ادا کرنے کے بعد سو گئے تو انہوں نے اس دھماکے کو داغ دیا۔ چاروں طرف روشنی ہو گئی اور مولانا چلائے کہ —— "نور الٰہی نور الٰہی" —— کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد مولانا ہمیشہ کے لئے مجذوب ہو گئے۔

دوسرا واقعہ راوی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک دن حیات منزل میں لڑکے جمع تھے۔ حیات اللہ نے ان سب سے اپنے مینارے سے چھلانگ لگانے اور بانسوں کے درختوں کے ایک جھنڈ کے بانس کی مدد سے، جو مینار کی اونچائی تک پہنچا تھا اپنے نیچے تک بخیر و خوبی پہنچنے کی حیرت انگیز داستان بیان کی۔ لڑکوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس واقعہ کے بعد حیات اللہ اس ٹولی کے مسلم لیڈر بن گئے۔ اب ان کی قیادت میں لڑکوں کی ٹولی گومتی اپنی گود اور شہر کے دوسرے حصوں کی سیر کرتی۔ اگر کسی دن دیر ہو جاتی اور لڑکے اپنے والدین کے ڈر سے گھبراتے تو حیات اللہ ان کا اطمینان کرا

دیتے ۔ پھر فرنگی محل کی گلیوں میں جب یہ ڈلی حاصل ہوتی تو حیات اللہ حلوائی کی دکان سے جلیبیاں لے کر ان میں تقسیم کر دیتے اور کہتے کہ گھر پہنچ کر کہہ دینا کہ میلاد شریف سے آ رہے ہیں ۔ میلاد کے لئے جلیبیاں خریدنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیات اللہ اپنی کم عمری میں اپنے ماحول اور اپنے بزرگوں کی کمزوری سے اچھی طرح واقف تھے ۔ لیکن یہ لڑکا جس کا نام حیات اللہ تھا محض جدت پسند اور شریر ہی نہیں تھا وہ اس کم عمری میں پکا حافظ قرآن بھی تھا ۔ حیات منزل میں ایک بار اس نے حباب سے پھٹنے والا پیسہ بنایا ۔ جس دن تراویح میں حباب بند تھی وہ اتفاقاً پھٹ گیا ۔ حیات اللہ کا آدھا منہ حباب سے جھلس گیا لیکن انہوں نے اس وقت شور نہیں مچایا ۔ منہ پر پانی بھی نہیں ڈالا ۔ وہ خاموشی سے اس جگہ سے ہٹے اور فرسٹ ایڈ بکس سے انہوں نے کوئی چیز منہ پر مل لی ۔ یہ فرسٹ ایڈ بکس ان کی عمر عیاری کی زنبیل میں دوسری چیزوں کے ساتھ موجود رہتا تھا ۔

لوگ کہتے ہیں کہ اگر حیات اللہ اس وقت حاضر دماغی سے کام نہ لیتے تو ان کا منہ ہمیشہ کیلئے آدھا سیاہ اور آدھا سفید ہو گیا ہوتا ۔ ان کی یہ زندگی جسے شرارتی کہنا چاہیے اس طرح ختم ہو گئی کہ ان کے والد وحید اللہ کا انتقال ہو گیا ۔ اس سے پہلے ہی ماں مر چکی تھیں ۔ اب ان کے سر پر کوئی وارث نہیں تھا ۔ اس موقع پر انہوں نے فرنگی محل کے عربی مدرسے سے سند حاصل کر لی تھی لیکن اس تعلیم سے وہ بالکل مطمئن نہیں تھے ۔ انہیں کوئی آگے کی راہ سمجھانے والا بھی نہیں تھا ۔ ایک محبت کرنے والا ماموں زاد بھائی ضرور تھا لیکن وہ خود کم تعلیم یافتہ تھا جو انہیں محض مفید مشورے دے سکتا تھا ۔ ان مشوروں کے طفیل انہوں نے دو تین سال میں انٹرنس پاس کر لیا لیکن ان کے حوصلوں نے یہیں بس نہیں کی وہ کوشش کر کے علی گڑھ پہنچ گئے جہاں وہ اس زمانہ کے سب سے غریب پرور ہوسٹل آفتاب ہال میں رہنے لگے ۔ یہاں کے قیام کے دوران میں ان کی زندگی کا اہم واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو میں تقریر کرنے کی مہم چلائی اور ساری یونیورسٹی میں ہنگامہ کھڑا کر دیا ۔ اس سے قبل وہ لکھنؤ میں کیمپ فرسٹ ہی بچکے تھے ۔ جہاں انہوں نے وجود باری کے مسئلہ پر مولانا عبدالباری مرحوم کی خفگی مول لی تھی ۔ یہاں شاید یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی کی دہریت سے متعلق تحریروں نے حیات اللہ کی زندگی پر بچپن ہی میں زہر گھول دیا تھا ۔ چنانچہ اسی زمانہ میں انہوں نے اپنے استاد اور بزرگ مولانا عبدالباری مرحوم سے وجود باری کے مسئلہ پر تلخ باتیں کیں تو مرحوم نے انہیں اپنی صحبت سے اٹھ جانے کا حکم دیا ۔ حیات اللہ خاموشی سے اس صحبت سے ، جس میں سید جالب دہلوی مرحوم وغیرہ شریک تھے اٹھ کر چلے آئے ۔ لیکن ابھی وہ اپنے "حیات منزل" کے راستہ ہی میں تھے کہ مولانا عبدالباری نے انہیں واپس بلایا ۔ شفقت سے اپنے پاس بٹھایا اور ان کو مخاطب کر کے کہا کہ "میں عالمانہ سطح پر عقیدے کے اس خلوص کا احترام کرتا ہوں" ۔ اس واقعہ کے بعد مولانا مرحوم حیات اللہ کا آخر وقت تک احترام کرتے رہے ۔ عام مذہبی لوگوں کی کم ظرفیت کے خلاف مولانا کا یہ رویہ حیات اللہ کے لئے ایک نیا تجربہ تھا ۔ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ زندگی میں انہوں نے اس سے کس طرح فائدہ اٹھایا ۔

علی گڑھ سے بی اے کی ڈگری لینے کے بعد اب جو حیات اللہ لکھنؤ واپس آتے ہیں تو کایا پلٹ گئی تھی ۔ کیمپ فرسٹ حیات اللہ بتوسل مولانا علی مرحوم لکھنؤ اسکول پر رہنے لگے تھے ۔ یہاں سے دوستوں سے چھیڑ چھاڑ اور طعن و تشنیع کا دور شروع ہوا ۔

ان کی زندگی کے اس دور (سنہ ۱۹۳۹ء) میں میں ان سے متعارف ہوا ۔ اس وقت ان کے افسانوں کا مجموعہ "انوکھی مصیبت" شائع ہو چکا تھا ۔ "آخری کوشش" جیسا غیر فانی شاہکار انہوں نے ابھی تخلیق نہیں کیا تھا ۔ کمیونزم کو وہ خیر باد کہہ چکے تھے ۔ لیکن گاندھیائی ہوتے ہوئے بھی وہ غیر طبقہ واری سماج کے علمبردار تھے ۔ میری طرح ان کی نظریاتی زندگی کا یہ معمہ بہتوں کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آخر گاندھی ازم کو مارکسزم کے غیر طبقہ واری سماج سے کیا نسبت ہے ۔ لیکن اب بہت دنوں ساتھ رہنے کے بعد کم از کم میں نے اس معمہ کو حل کر لیا ہے ۔ حیات اللہ ناک کو سر کے پیچھے ہاتھ گھما کر پکڑتے ہیں دوسرے اسے سامنے سے پکڑ لیتے ہیں ۔ یہ طریق کار کا فرق ہے ۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ حیات اللہ سرمایہ داری کے اس لئے مخالف ہیں کہ اس میں فرد کو معاشی مساوات اور ترقی کے مواقع حاصل نہیں ہیں ۔ اس کے ساتھ وہ کمیونزم کے اس لئے مخالف ہیں کہ اس میں ریاست کی جبریت کو بڑا دخل ہے ۔ پھر ان کے سامنے سماج کی نابرابری کو ختم کرنے کے لئے کون سا فلسفہ حیات ہے ؟ یہ فلسفہ حیات

ان کی نظر میں گاندھی ازم کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جس کی بنیاد معاشی مساوات کے اصولوں پر ہے اور جہاں سیاست کی جبریت کا کوئی سوال نہیں ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے خیال میں گاندھی جی کی تعلیمات میں بھرپور Human touch ہے۔

یہ ایک لمبی بحث ہے۔ جس میں یہاں پڑنے کی گنجائش نہیں۔ تاہم اب نئے حالات کے پیش نظر حیات اللہ کو اپنے طور پر اتنی کامیابی ضرور ہوئی ہے کہ ان کے دوست اور مخالف بھی انہیں رجعت پسند نہیں کہتے ہیں۔ بلکہ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔ کسی فرد کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے؟

آج حیات اللہ جس مقام پر کھڑے ہوئے ہیں وہاں تک پہنچنے کے لئے انہوں نے ہر طرح کی مشکلات کا سامنا سرفروشانہ جذبہ کے ساتھ کیا ہے۔ دنیا میں شاید سب سے بڑی ذلت فاقہ کھینچنے کی ہے۔ اس فاقہ کا احترام صرف اس صورت میں کیا جا سکتا ہے جب آدمی اپنے اصولوں اور نظریات کے لئے بھوکوں مرنا گوارا کرے لیکن ناحق کے سامنے سر نہ جھکائے۔ حیات اللہ ان دشوار گزار راہوں سے بھی بڑی خاموشی اور پامردی کے ساتھ گزرے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں جب سامراجی جنگ ہٹلر کے روس پر حملے کے بعد قومی جنگ بن گئی تھی اور حیات اللہ کے بیشتر ساتھی ریڈیو، مشاعروں اور پبلسٹی کے دوسرے ذرائع سے روپیہ بٹور رہے تھے تو اس وقت حیات اللہ لکھنؤ کی دسمبر کی سردیوں میں خشخشی شیروانی پہنے اسی شان استغنا سے رہتے تھے اور چنے کے لڈوؤں سے ناشتہ حاصل کرتے تھے۔ دوسرے ادیب عشرت کدوں میں جا کر جوش منانے تھے اور حیات اللہ اپنے گھر پر سانپ پالتے تھے۔ ان سانپوں کے پالنے کا قصہ یہ ہے کہ پنڈت نہرو کے ایک عزیز مسٹر کول جو مشہور [illegible] ہیں اس زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے۔ ان کی کسی طرح سے حیات اللہ سے دوستی ہو گئی۔ پھر کیا تھا دونوں نے مل کر سانپ پالنا شروع کئے۔ میں کول صاحب کے بارے میں تو نہیں جانتا ہوں لیکن حیات اللہ کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے اس فن شریف کو سیکھنے میں اپنا کافی وقت برباد کیا۔ اس زمانہ میں سانپوں سے متعلق قصے کہانیاں بھی لکھیں اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس موضوع پر جب ریڈیو پر ان کی تقریر ہوئی تو ان کے اس اصرار پر ریڈیو کے ذمے داروں میں کافی کھلبلی مچ گئی کہ تقریر سے پہلے مائک پر بین بجائی جائے۔ بہرکیف ان سانپوں کا قصہ یوں ختم ہوا کہ کول صاحب انگلینڈ چلے گئے اور حیات اللہ کی زائد انرجی کے نکاس کے لئے دوسری راہیں نکل آئیں۔ انہوں نے پرانے لکھنؤ میں زور و شور کے ساتھ تعلیم بالغاں کا کام شروع کر دیا۔ جو ایک عرصہ تک جاری رہا۔ اس کے ٹھیک پندرہ برس بعد انہوں نے بالغوں کی تعلیم کے لئے انہیں دس روز میں اردو لکھنا پڑھنا سکھانے کے لئے "حیات اللہ قاعدہ" تیار کیا۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان (ہفتہ وار لکھنؤ) بند ہو گیا۔ حیات اللہ کی تیس چالیس روپے ماہوار کی نوکری چھوٹ گئی اور وہ اس وسیع دنیا میں جہاں ان سے ہمدردی کرنے والوں کا شدید قحط تھا وہ بالکل تنہا رہ گئے۔ تنہا اس معنی میں کہ حیات اللہ نے ہندوستان کے ذریعہ ادب اور صحافت کی بڑی خدمت کی تھی۔ آج کے بہت ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں سے کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے ان کے اخبار میں نہ لکھا ہو۔ اس وقت اس ہفتہ وار اخبار کو جاننے والوں کی تعداد بہت کم ہو گی لیکن ترقی پسند تحریک کے سلسلہ میں نقادوں نے کہیں بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حیات اللہ نے اس پرچہ کے ذریعہ اپنے ان متوازن خیالات کا [illegible] کیا تھا جن کو بعد میں انہوں نے قومی آواز کے ذریعہ پیش کیا ——

قومی آواز کا ذکر کئے بغیر حیات اللہ کی زندگی بڑی ادھوری رہ جائے گی۔ لیکن ان کی زندگی کے اس پہلو پر لکھنے سے قبل ان کی رضاکارانہ بے کاری کے زمانہ کا ایک قصہ اور تجربہ ان کے کردار پر روشنی ڈالنے کے لئے یہاں لکھنا ضروری ہے۔ جب ہندوستان کے تمام ممتاز ادیبوں نے ایک ایک کر کے فلمی لائن کو اختیار کیا تو حیات اللہ نے بھی قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے چیتن آنند کے ہاتھ اپنی ایک فلمی کہانی "نیچا نگر" فروخت کی۔ اس سلسلہ میں وہ کئی ماہ بمبئی رہے۔ جب اس کہانی کا فلم تیار ہوا تو اس نے فرانس میں اکاڈمی انعام جیتا۔ لیکن اس عرصہ میں بمبئی کی فلمی دنیا نے حیات اللہ کو یہ احساس کرا دیا۔ چنانچہ وہ اپنی فلمی کہانی کے پیسے جیب میں ڈال کر بمبئی سے بھاگ نکلے اور لکھنؤ آ کر دم

گیا۔ یہاں رفیع احمد قدوائی مرحوم سے انہوں نے ملاقات کی اور انہیں ایک اردو روزنامہ نکالنے کا مشورہ دیا۔ قدوائی صاحب اس وقت یو۔ پی۔ کی کانگرس کا الیکشن لڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ وہ اخبار نکالنے پر پوری آمادہ ہو گئے۔ حیات اللہ نے کام سنبھال لیا۔ اس وقت حسن عسکری دہلی میں تھے۔ جب پہلا پرچہ نکلا تو انہوں نے حیات اللہ کو جھلا کر ایک مختصر کڑوا کسیلا خط لکھا۔ حیات اللہ حسن عسکری کا خط پی گئے۔ پھر اس کے بعد شاید دونوں میں کبھی خط و کتابت نہیں ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک الیکشن کے پرچے کو اپنی کوششوں سے ایک باوقار روزنامہ بنا دیا اور آج یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی اور ثقافتی خدمت جس صحت مند طریقے سے قومی آواز انجام دے رہا ہے، اس کی مثال آزاد ہندوستان میں مشکل سے ملے گی۔ قومی آواز کی بقا کے لئے انہوں نے اپنے محدود ساتھیوں سے بھی اسی طرح جنگ کی جس طرح وہ باہر اپنے ترقی پسند ساتھیوں اور قدامت پرست جماعتوں سے کرتے رہے تھے۔ انہوں نے خود پیٹ پر پتھر باندھ کر اور اپنے ساتھیوں کے پیٹ پر پتھر بندھوا کر قومی آواز کو زندہ رکھا ہے۔ اسی کی وجہ سے ادارہ کے اراکین میں تلخیاں پیدا ہوئیں۔ اختلاف پیدا ہوئے، نیت کا سوال درمیان میں لایا گیا۔ دوستی اور تعلقات میں فرق آیا لیکن وہ اپنی بات پر جمے رہے۔ بات پر جمے رہنا حیات اللہ کا بہت بڑا وصف اور کمزوری ہے۔ وہ جب سوچ سمجھ کر ایک بات کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر بڑی مشکل سے اسے بدلنے پر تیار ہوتے ہیں۔ پچھتاتے بھی نہیں ہیں۔ اس میں بعض اوقات کٹھ حجتی کو دخل ہوتا ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ انہوں نے کسی مسئلے کے بارے میں خوش نیتی سے اپنی رائے نہ قائم کی ہو۔

لیکن خود ان کی بھی ایک کمزوری ہے۔ یہ کمزوری ان کے تخیل کی اڑان ہے۔ میں کہوں گا اگر آپ حیات اللہ کے ساتھ رعایت برتیں تو ان کی امید پرستی کا نام دے سکتے ہیں۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ لیکن ان کے اس مایوس نہ ہونے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر آپ خدانخواستہ ان کی باتوں میں آ گئے تو یہ عین ممکن ہے کہ آپ امید کا دامن ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ ایک زمانہ میں انہوں نے اپنے ایک کیپٹن دوست کوئل چند رستوگی کے ساتھ مل کر کوہ پیمائی کا بڑا عظیم الشان پروگرام بنایا تھا۔ اس کے لئے لکھنؤ کے تاجروں سے سامان جمع کرنے کی ایک طول طویل فہرست بھی بنائی گئی تھی۔ دن بھر یہ دونوں دوست کوہ پیمائی کے اصولوں پر دلچسپ گفتگو کیا کرتے۔ غریب رستوگی اس گپ میں اتنا منہمک ہو جاتا کہ اس کی نوجوان آنکھوں میں ایورسٹ کی برفیلی چوٹیاں چمکنے لگتیں۔ لیکن کچھ دن کے بعد یہ ہوا کہ حیات اللہ کو اپنے تخیل کی اڑان کے لئے دوسرا مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ رستوگی غریب آج کل وار فنڈ کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ شاید اسے اس بات کا علم نہیں ہے کہ تن سنگھ کے ایورسٹ سر کرنے سے قبل حیات اللہ انصاری اپنے تخیل ہی میں اسے کبھی کا سر کر چکے ہیں۔ تو یہ تخیل پرستی یا امید پرستی حیات اللہ کی فطرت کا خاصہ ہے جس کے سہارے انہوں نے اپنی زندگی کے کتنے ہی معرکے سر کر ڈالے ہیں۔ لیکن حیات اللہ کے اس اسکیچ کو پڑھنے والوں کو میرا یہ مشورہ ہے کہ وہ رستوگی کی مثال کو سامنے رکھیں اور زیادہ امید باندھنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ بسا اوقات حیات اللہ کی اس اڑان کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ ایک بار یو۔ پی۔ اسمبلی میں کبھی وزیر مالیات حافظ محمد ابراہیم نے اپنی بد قسمتی سے بجٹ تقریر میں اردو کا ذکر خیر فرما دیا۔ دوسرے دن جب یہ تقریر اخبارات میں چھپی تو حیات اللہ نے اپنی امید پرستی کے ہاتھوں اس کی بڑی پبلسٹی کی —— اردو کی جیت اور ان کے تخیل نے سیکڑوں ہوائی قلعے بنا ڈالے۔ پھر یہ ہوائی قلعے از خود ہی گرے اور بیچارے حیات اللہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اب یہ نوبت پہنچ گئی ہے کہ وہ اردو کے مقدمے سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اس پر بھی انہوں نے صبر اور تخیل کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے اور اب وہ "مرد جنگ" کی تیاری کر رہے ہیں۔ وہ جمہوریت کی فتح پر بھرپور اعتماد رکھتے ہیں۔

ان کے تخیل کی اڑان کی ایک دوسری مثال بھی سنتے چلئے۔

سنہ [illegible] میں غیر منقسم ہندوستان کی جو سیاسی صورت حال تھی اس سے کم و بیش سب ہی واقف ہیں۔ یہاں ان اشتراکی واقعات کا اعادہ

کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ان حالات میں بھی حیات اللہ مایوس نہیں تھے۔ ان کے تخیل کی اڑان کا وہی حال تھا۔ چنانچہ ۱۰ر جولائی ۱۹۴۲ء کو مجھے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"...... جو تحریک چلنے والی ہے اس پر مجھے پورا عقیدہ ہے۔ اب ہندستان کو آزاد اور غلامی کو ختم سمجھئے آٹھ دس مہینوں کی بات ہے۔ یہاں قربانیوں کی ضرورت ہے۔"

مجھے اس کا اقرار ہے کہ تنزنگ کی طرح اس بار بھی ان کے ساتھ ایورسٹ کی چوٹی پر جا پہنچا۔ لیکن بعد کو جو واقعات پیش آئے اس نے مجھے سخت مایوس کیا۔ اگر میں تنزنگ ہوتا تو شاید میں بھی ٹورنگ کے چکر میں پڑ گیا ہوتا۔ لیکن یہ نہ سمجھئے گا کہ حیات اللہ انصاری کی اس تخیل پرستی میں حقائق سے بالکل ناطہ توڑ لیا جاتا ہے۔ میں نے اڑان کے لئے انہیں پر تولتے وقت زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے دیکھا ہے۔ اب اسی معاملہ میں یہ ہوا کہ وہ مجھے یہ بتلا رہے تھے کہ اپنے دوست اور انگریزی ناول "کنتھا پورا" کے مصنف راجا راؤ کے ہمراہ اس کوشش میں نکل کھڑے ہوئے کہ برطانی سامراج کے مظالم کی داستان کو غیر ملکی اخباروں میں شائع کرایا جائے۔ یہ راجا راؤ بھی عجیب خوابی انسان تھے۔ اپنے تخیل کی اڑان میں حیات اللہ سے ہزاروں ہزار ہاتھ آگے۔ حیات اللہ کشمیر اسٹریٹ کے ایک کمرہ میں بیٹھ کر ایورسٹ کو سر کرنے کی ہمت رکھتے تھے۔ پھر راجا راؤ تو ہوائی جہاز پر سفر کرتے تھے۔ اس لئے یہ دوہرے پنکھے ان کے تخیل کی اڑان۔ اس سونے پر سہاگہ احمد علی (ہماری گلی والے) کی ذات تھی جو اپنی حیثیت حقیقت پسندی سے دونوں کو بریک دیتے تھے۔

اس وقت (۱۹۷۶ء) حیات اللہ انصاری قومی آواز، دستخطی مہم اور فرقہ پرستوں کے خلاف جہاد کرنے کا دوسرا نام ہے۔ دستخطی مہم کے سلسلہ میں اوپر بھی ذکر آ چکا ہے۔ جب انہوں نے اس مہم کو شروع کیا تھا تو بہت کم لوگوں کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ بیس لاکھ دستخط جمع کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس زمانہ میں ہندستان کا جو سیاسی مزاج تھا اس میں یہ بات ناممکن بھی نظر آتی تھی۔ لیکن انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک عظیم الشان تنظیم کھڑی کر دی۔ جس نے پوری لگن کے ساتھ بیس لاکھ دستخط جمع کر کے صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ آج اگر حیات اللہ کی کوششیں بار آور نہیں ہو رہی ہیں تو اس میں ان کا قصور نہیں ہے۔ ہندستان کے جمہوری مزاج کا قصور ہے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے حیات اللہ کو ہندستان کی جمہوریت پر اٹل بھروسہ ہے۔ اس لئے وہ اس سلسلہ میں اپنے بس بھر کام کئے جا رہے ہیں۔ اس مہم کے سلسلہ میں حیات اللہ نے ان دیکھے میدانوں کو سر کیا۔ بڑے بڑوں سے ٹکر لی۔ یہاں تک کہ انجمن ترقی اردو کے معتمد قاضی عبدالغفار مرحوم تک کی مخالفت مول لی۔ اس سلسلہ میں انسانی فطرت کی کمزوری کے پیش نظر یہ ممکن ہے کہ دونوں میں قیادت کے لئے بھی رسہ کشی ہوئی ہو۔ لیکن قاضی عبدالغفار کے انتقال کے بعد انہوں نے قومی آواز میں جو اداریہ لکھا اس میں اردو کی جد و جہد کا سہرا قاضی صاحب مرحوم کے سر باندھ دیا۔ جو لوگ حیات اللہ کے مزاج سے ناواقف تھے انہوں نے منہ میں انگلیاں دے لیں۔ جب حیات اللہ کو اس حیرت کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی مخصوص دلکش مسکراہٹ پر اکتفا کی۔

اسی طرح کا ایک ہنگامہ مجاز مرحوم کے انتقال کے موقع پر اس وقت پیش آیا جب انہوں نے "مجاز رخصت ہو گیا" کے عنوان سے ایک اداریہ سپرد قلم کیا۔ اس اداریہ میں حیات اللہ نے دل کھول کر مجاز کے فن کی تعریف کی۔ صحیح معنوں میں اس اداریہ میں انہوں نے خون کے آنسو بہائے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق کمیونسٹ پارٹی کی بھی خبر لے ڈالی اور اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ "مجاز اس لئے جادو نہ جگا سکے کہ وہ ایک ایسی جماعت سے وابستہ تھے جو ادب کو اپنے مقاصد کے مسائل اور ایک خاص سیاسی نظریے سے منسلک رکھنا چاہتی ہے ....."

علی سردار جعفری جو ان دنوں ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے انہوں نے اداریہ کو پڑھا۔ اپنے مخصوص انداز میں بادل

کو دونوں ہاتھوں سے سر کے پیچھے پھینکا اور کہا کہ "حیات نے سب ٹھیک لکھا ہے مگر یہ ...... " پھر انہوں نے کمیونسٹ پارٹی والے پیرا گراف کو "قومی آواز کے ہر ہر دل کو دکھایا" یہ غلط ہے اس موقع پر یہ نہ ہونا چاہیے تھا۔"

واقعی اگر حیات اللہ اس موقع پر اپنے دشمنوں کو نہ کریدتے تو اچھا تھا۔ یہ ان کا حسن معاملہ بھی لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایسی ہمت کتنے لوگوں میں ہے جو بغیر مجاز سے متاثر ہوئے بغیر بے باکی سے اپنے خیالات کو ڈنکے کی چوٹ پر کہہ سکیں۔ اس کے دوسرے دن مجاز کے سوگ میں ایک جلسہ ہوا۔ سب نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس جلسہ میں حیات اللہ بھی بولے۔ لیکن انہوں نے یہاں بھی اپنی راہ دوسروں سے الگ نکالی اور مجاز کی رند مشربی پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالی۔

حیات اللہ بڑے پیارے دوست ہیں۔ ان کی سنجیدگی کے پیچھے ایک بڑی زندہ دل، ہنسوڑ اور چٹکلے باز شخصیت چھپی ہوئی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کی کمزوریوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ انہیں تنگ کرتے ہیں۔ خود بھی اور دوستی پر زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انہیں عمدہ پراٹھے، قورمہ کباب اور پلاؤ کھلاتے ہیں۔ دوستوں کی بیویوں کو شوہروں کے خلاف بغاوت کرنے پر اکساتے ہیں۔ چنانچہ جذبی کے ساتھ علی گڑھ میں ایک دلچسپ لطیفہ پیش آچکا ہے۔ حیات اللہ کسی کام سے علی گڑھ گئے ہوئے تھے۔ جذبی ان کے پرانے رفیق اور دوست ہیں۔ ان کی بیوی نے بتلایا کہ جذبی میرے ساتھ باہر نکلتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ کبھی سینما تک ساتھ نہیں جاتے۔ حیات اللہ نے انہیں تسلی دی اور یقین دلایا کہ اس مرتبہ ایسا انتظام کر کے جاؤں گا کہ جذبی ہمیشہ آپ کے ساتھ سینما جائے گا۔ وہ ٹھیرا بڑا شاعر اور یونیورسٹی کا لیکچرار! شاید اسے ڈر لگتا ہوگا کہ اس کے چیلوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ جذبی بیوی کے ساتھ نکلتا ہے۔ جب اس دن جذبی گھر واپس آئے تو حیات اللہ نے انہیں دوسرے شو میں بیوی کے ساتھ سینما جانے کا الٹی میٹم دے دیا۔ جذبی گھبرا گئے۔ مگر مجبور تھے وہ خود اتنے شریف واقع ہوئے ہیں کہ اس شرارت کی مدافعت کرنا ان کے بس سے باہر ہے۔ اس واقعہ کے بعد حیات اللہ لکھنؤ واپس آگئے۔ معلوم نہیں جذبی کے طالب علموں کو اس بات کا علم ہوا یا نہیں کہ جذبی اپنی بیوی کے ساتھ سینما دیکھتے ہیں۔ طالب علموں کو چاہے معلوم ہو یا نہ ہو لیکن ہماری دعا ہے کہ اس کی خبر مولانا عبدالماجد دریابادی کو نہ ہونا چاہیے کہ حیات اللہ دوسروں کی عورتوں کو سینما دکھاتا پھرتا ہے۔ کیونکہ اگر انہیں اس بات کا علم ہو گیا تو حیات اللہ کی خیریت نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں یاد آیا کہ "قومی آواز" جب شروع شروع میں نکلا ہے تو حیات اللہ نے مولانا عبدالماجد دریابادی سے بھی معرکے لئے تھے۔ لیکن حیات اللہ ٹھیرے ٹھنڈے مزاج کے انسان انہوں نے جسونت سنگھ کے بقول اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ذکر حیات اللہ کے اچھے اور دلچسپ دوست ہونے کا تھا۔ ہر شخص کی طرح حیات اللہ کا بھی ایک مخصوص حلقہ احباب ہے۔ ان کی روح کی گہرائیوں میں جھانکنے کے لئے اس حلقہ احباب میں شامل ہونا ضروری ہے۔ یہاں حیات اللہ ایک بالکل مختلف انسان ہیں۔ جو آپ کو سستے پھلوں کے خریدنے کے گُر سے لے کر کباڑی اور نخاس کے سستے مال کے ذریعہ گھر کو سجانے کی ترکیبیں بتاتے نظر آئیں گے۔ حیات اللہ بچپن سے پیٹ کے مریض ہیں۔ شاید بچپن میں ماں کے قبل از وقت انتقال کی وجہ سے باپ نے بہت زیادہ دودھ پلایا ہوگا جس کی وجہ سے ان کا معدہ کمزور ہو گیا۔ بہرکیف وجہ کچھ بھی رہی ہو اس پیٹ کی بیماری کا سلسلہ آج تک قائم ہے۔ اور اب وہ اس کا علاج غذاؤں اور دواؤں کے ذریعہ خود کر لیتے ہیں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن آگے چل کر معاملہ نازک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب ان کا کوئی دوست درد سر، بے خوابی یا اسی قسم کی کسی دوسری شکایت کا ذکر کرتا ہے۔ حیات اللہ ذرا سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ "اچھا تو آپ کو یہ شکایت ہے؟" پھر اس شکایت کا تجزیہ پیٹ سے ملا کر کہیں گے "سب پیٹ کی خرابی ہے۔ ابھی آپ کو قبض تو نہیں ہوئی؟" اب وہ بیچارہ دوست ذرا جھنجھلا کر کہتا ہے "جی نہیں قبض کبھی نہیں ہوئی۔ مجھے کیا میری سات پشتوں کو یہ موذی مرض کبھی نہیں ہوا۔" لیکن حیات اللہ اس کی بات کا اعتبار نہیں کریں گے۔ وہ کھانے اور دکھانے کی ایک لمبی چوڑی فہرست گنا

دیں گے اور آخر میں مشورہ دیں گے کہ آج رات کو فاقہ کرنا اور سوتے وقت انیما لے ڈالنا۔ دوسرے دن جب یہ دوست ملے گا تو اس سے مزاج پوچھیں گے۔ پھر دریافت ہوگا انیما لیا تھا؛ دوست کسی ناگہانی آفت کا بہانہ کر کے بتلائے گا کہ انیما لینے کی نوبت نہیں آئی۔ چنانچہ تاکید کی جائے گی کہ آج ہی لے دیکھیے پھر بات۔ آخر روز روز کے سوال جواب سے تنگ آ کر دوست ایک دن حیات اللہ کو مژدہ سنائے گا کہ آپ کے انیما نے معجزہ کر دکھایا۔ درد سر، بے خوابی، اعصابی تشنج سب غائب اور یہ سن کر حیات اللہ کا چہرہ فرطِ مسرت سے سرخ ہو جائے گا۔

اس سلسلہ میں مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۵۳ء میں انہیں اپنے قومی آواز کے اسٹاف کی صحت کی طرف سے سخت تشویش پیدا ہو گئی۔ پہلے تو انہوں نے فرداً فرداً سب کو ان کی صحت کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن جب کسی نے نہیں سنا اور بالآخر ان کو سب کی صحت چوپٹ نظر آئی تو انہوں نے وٹامن والے سستے کھانوں کی ایک فہرست دفتر میں لٹکوا دی اور اس کے ساتھ اپنا ایک طول طویل نوٹ بھی لگا دیا جس میں انہوں نے سب کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ سستی غذا کے ذریعہ بھی وٹامن حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی غربت کے زمانہ کے تجربات کو بھی گنوایا۔ ان کا یہ مشورہ اس سلسلہ میں واقعی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ فصلی پھل، آم، خربوزہ وغیرہ اس وقت کھانا چاہئے جب بڑے لوگوں کا ان کے استعمال سے پیٹ خراب ہو جائے اور وہ بازاروں میں سستے داموں فروخت ہونے لگیں۔ اس میں یہ نکتہ ہے کہ فصلی پھل مزے ہی کیلئے نہیں وٹامن حاصل کرنے کے لئے کھانا چاہئیں۔

پھر اسی صحبت میں حیات اللہ، خدا، حسن، سچائی اور آئین اشٹائن کے نظریہ اضافت پر مجھ سے دیر تک باتیں کرتے نظر آئیں گے۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے ایک زمانہ میں حیات اللہ خدا کے قائل نہیں تھے۔ لیکن اب ان کی منطق نے خدا کو پا لیا ہے۔ وہ اسے حسن اور سچائی کے روپ میں جلوہ گر دیکھتے ہیں اور ایک صوفی کی طرح چپہ چپہ پر اس کے نقش کو کندہ دیکھتے ہیں۔ ایک ایسی ہی صحبت میں قرآن کے بارے میں ان سے پوچھا گیا کہ آپ اسے الہامی کتاب مانتے ہیں یا نہیں —— ؟ حیات اللہ ایک ذرا مراقبہ میں چلے گئے۔ پھر سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی بولے میں مانتا ہوں۔ کس طرح؟ کچھ دیر وہ پھر خاموش رہے اور پھر بولے "بھئی اصطلاح میں یا بالفاظ دیگر دل کی زبان میں اس مسئلہ پر بات ہو سکتی ہے" سمجھتے نا؟ ان سے اصرار کیا گیا۔ کہنے لگے میں ایک چھوٹا موٹا ادیب ہوں مجھ سے میری انا اور وجدان لکھاتا ہے۔ فرض کیجئے کہ یہ انا کسی شخص میں مر جائے یا دن کچھ کسی کی خودی مٹ جائے پھر وہ جو لکھے گا یا کہے گا وہ محض اس کی انا کی گونج نہیں ہوگی۔ ایک آفاقی پکار ہوگی۔ اب آپ اسے جو کچھ نام دے لیجئے۔"

ان کے اس استدلال کو ہم جیسے افسانوی تخیل کی اڑان کا نام دیں گے۔ لیکن دل کی زبان کو سمجھنے والوں کے لئے اس میں ہزاروں نکات پوشیدہ ہیں۔ حیات اللہ کا بچپن اور زندگی کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا ہے۔ ان کا لکھنؤ کے علاوہ کے فرنگی محل کے قدیم خاندان سے تعلق ہے۔ خدا تک رسائی حاصل کرنے میں ان کی خاندانی روایات کا ہاتھ ہے یا ان کے گاندھیائی ہونے کا اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن اگر اس سوال کا جواب دینے کے لئے حیات اللہ سے کہا جائے تو یقین ہے کہ وہ گاندھی جی کی تعلیمات کو اپنے خدا تک پہنچنے کا وسیلہ قرار دیں گے۔

نفاست کے اعتبار سے حیات اللہ پورے لکھنوی ہیں۔ وہی لب و لہجہ (لیکن تصنع سے پاک) وہی لباس کا اہتمام اور وہی تہذیب کا رکھ رکھاؤ۔ لکھنؤ میں ان کا قیام شہر کی نئی آبادی والے حصہ میں ہے۔ عید بقرعید کے موقع پر وہ صرف اپنے بزرگوں سے ملنے فرنگی محل جاتے ہیں اور اس بات پر شدت سے اصرار کرتے ہیں کہ ان کے چھوٹے ان سے ملنے کے لئے تشریف نہ لائیں۔ چنانچہ فرنگی محل جانے کا انہوں نے کچھ ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ لامحالہ ان کے چھوٹوں کو ان سے عید ملنے کے لئے ان کے گھر جانا پڑتا ہے۔

لکھنؤ میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں ایک تہذیبی برائی یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے دو فرقے شیعہ اور سنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھے ہیں۔ لیکن حیات اللہ نے بہت شعوری طور پر اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شیعہ سنی علماء اور عمائدین شہر کا یکساں احترام کرتے ہیں۔ وہ دونوں فرقوں میں یکساں مقبول ہیں۔ شیعہ علماء اور مقتدر گھرانے کی کوئی ایسی تقریب نہیں ہوتی ہے جس میں حیات اللہ کو مدعو

نہ کیا جاتا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ جب لکھنؤ میں مدح صحابہ اور تبرّہ کے سلسلے میں باہمی تعلقات بہت خراب ہو گئے تھے تو ان ہی دنوں میں حیات اللہ نے شیعوں کی مشہور درس گاہ سلطان المدارس کے طلباء کے حقوق کے لئے ایک تحریک کی رہنمائی کی تھی۔ جس میں طلباء نے ایک لمبی ہڑتال بھی کی تھی۔ لیکن کسی موقع پر بھی حیات اللہ کو اس لئے مورد الزام نہیں ٹھہرایا گیا کہ وہ شیعوں کی درس گاہ کی تخریب کر رہے ہیں۔ وہ لکھنؤ اسکول کی شاعری کے کچھ ایسے معتقد نہیں ہیں لیکن انیس کا لوہا مانتے ہیں۔

اس مضمون کے شروع میں آنحضرت کی وفات کے متعلق ایک دل آزار اشتہار کا ذکر آ چکا ہے۔ اس سلسلے میں حیات اللہ نے شہر میں جو مجلس عمل بنائی تھی اس میں دونوں فرقوں کے نمائندوں کو شریک کیا تھا۔ پھر جب مجلس عمل کے ایک عالم نے جو ان کے عزیز ہوتے ہیں مجلس عمل کے فیصلے سے انحراف کیا تو حیات اللہ نے بغیر کسی قسم کی رو رعایت کے اخبار کے ذریعے ان کا پول کھولا۔ اس واقعہ کے سلسلے میں ان کی وہ غیر فرقہ پرست شخصیت بھی کافی مجروح ہوئی۔ لیکن اس کی انہوں نے ذرا پروا نہیں کی۔ جب ان سے کہا گیا کہ آپ اس تحریک کے ساتھ بہت دور تک چلے گئے ہیں تو انہوں نے نہایت ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حیات اللہ اگر اپنے اخبار میں اس تحریک کے خلاف کچھ لکھ دیں گے تو معاملہ ختم ہو جائے گا وہ معاملہ کی نزاکت اور مسلمانوں کے جذبات سے واقف ہی نہیں ہیں۔ لوگوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن اس دھن کے پکے شخص نے اس معاملہ سے نپٹنے کے بعد دوسرا مورچہ سنبھالا اور بالآخر مخالفین کو یہ سمجھانے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی کہ انہوں نے اس معاملہ میں جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔

حالات نے اس وقت حیات اللہ کو سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا ہے جس کے لئے وہ بالکل نادم اور شرمندہ نہیں ہیں۔ لیکن یہ ایک بہت افسوسناک بات ہے۔ دراصل وہ بنیادی طور پر ایک فن کار اور صحافی ہیں اور یہیں ان کی جگہ ہے۔ چند سال ادھر وہ ایک صحافتی وفد کے ساتھ مصر گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر وہ اپنے ساتھ فراعنہ مصر کی داستانیں، بادشاہوں اور شہزادیوں کے مجسمے اور وادی نیل کے دہقان کی کہانیاں لے کر آئے۔ مصری سماجی زندگی کے اور بہت سے پہلوؤں کا بھی جمالیاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ کر کے لوٹے۔ لیکن انہیں وہاں شاہ فاروق کے خلاف ہونے والی سازش اور اس انقلاب کی کوئی بو باس نہیں ملی جو ان کی واپسی کے چند ماہ یا شاید چند ہفتوں کے بعد رونما ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخصوص حالات کی وجہ سے وہ ایک سیاسی آدمی بن گئے ہیں ورنہ اس سے انہیں فطری لگاؤ نہیں ہے۔

بعض لوگوں کا اب سے چند سال قبل یہ خیال تھا کہ کانگرس میں حیات اللہ بس چند دنوں کی بات ہے کہ وزیر نہیں تو نائب وزیر اور وہ بھی نہیں تو پارلیمنٹری سکریٹری ضرور ہو جائیں گے۔ لیکن حیات اللہ کی ذات سے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ انہوں نے اردو کی تحریک اور اقلیت کے حقوق کے لئے جس جان جوکھم کی منزل میں قدم رکھا ہے وہاں سے سرکاری کرسیاں بہت دور ہیں۔ واضح رہے کہ بعض دوسرے لوگوں کی طرح حیات اللہ منزل سے پلٹ پڑنے کے لئے کوئی چور دروازہ کھلا ہوا نہیں رکھتے ہیں۔ جب وہ اپنی منزل پر روانہ ہونے لگتے ہیں تو چور دروازہ تو چور دروازہ وہ معمولی دروازوں اور جھروکوں کو بھی بند کر دیتے ہیں۔ آج اپنی اس سچائی اور خلوص کی وجہ سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ اگر ہندوستان میں اقلیت کی تاریخ ختم نہیں ہو گئی ہے تو آگے چل کر حیات اللہ کا نام یقیناً ان چند زندہ لوگوں میں ہو گا۔ جنہوں نے ہندوستان کے جمہوری نظام میں اسے صحیح جگہ دلوانے کے لئے کام کیا اور دوسروں کو ان کا کھویا ہوا اعتماد واپس دلوایا۔

حیات اللہ کو کسی نے غصہ آتے نہیں دیکھا، یہ ایک ایسی بات ہے جو ان کے سب جاننے والوں کو معلوم ہے۔ لیکن ان سے ان کے بارے میں استفسار کیا گیا تو وہ مسکرا کر بولے "سلطانہ نے یہ غصہ دیکھا ہے" — اس مکالمہ کی سچائی نے استفسار کرنے والے کو خوفزدہ حیرت کر دیا۔ بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ حیات اللہ کو بھی غصہ آتا ہے وہ چار پانچ دن کھانا چھوڑ دیتے ہیں، روٹھ بھی جاتے ہیں اور وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک عام شوہر کرتا ہے — لیکن اس داستان کی تفصیل چھیڑنا بیکار ہے۔ پھر کچھ باتیں سلطانہ حیات سے بھی تو پوچھنا چاہئیں جو حیات اللہ کے ساتھ دس بارہ برس سے بڑی خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔

اوپندر ناتھ اشک

کوشلیا اشک

اشک جی نے اپنی ایک ہندی نظم میں لکھا ہے :

اور میں دریا
چر کا چلا
تھکا اور ہارا
منتھر گتی سے ساگر میں بہنے والا
مون اور گمبھیر، شانت اور شرانت
یوون کی سب یاد بھلا کر
ٹوٹ، تھک کر
بہتا ہوں اوشرانت[1]

---

[1] اور میں دریا
بہت دیر کا چلا ہوا
تھکا اور ہارا
آہستہ آہستہ سمندر میں بہنے والا
خاموش، گمبھیر و شانت
جوانی کی سب یاد بھلا کر
ٹوٹ اور تھک کر
بہتا ہوں کھویا کھویا سا

لیکن رکاوٹوں کو پار کر کے میدانوں کے ساتھ آہستہ آہستہ چپ چاپ گھونٹ گھونٹ سے بہتا دریا کی رفتار کا عکس ایک پہلو بھی ہے اور اس کی انتہا بھی ۔ موسم سرما کا سرکتا ہوا ، نحیف و نزار ، بے جان اور بے حس سا بہنے والا دریا برسات کے موسم میں کناروں کو توڑ ! ٹھاٹھیں مارتا ہوا دیوانہ وار بہنے لگتا ہے اسے دیکھ کر کون سوچ سکتا ہے کہ یہ کبھی قریب المرگ زخمی سانپ سا آہستہ آہستہ بھی سرکتا ہوگا ۔

دریا کی روانی کی یہی دو حدود اشک جی کے مزاج کی حدود ہیں ۔ ان کے مزاج کی ایک انتہا کو دیکھ کر اس کے بارے میں کسی طرح کا یقین اپنے دل میں پیدا کرنے والا شخص جب اس کی دوسری انتہا کو دیکھے گا تو نہ صرف اسے حیرت ہوگی بلکہ اس کے اس یقین کو بھی صدمہ پہنچے گا ۔

اشک جی سے اپنے تعارف اور اپنی شادی کے ابتدائی دنوں میں میری حالت اسی شخص کی سی تھی جس نے دریا کی روانی کا محض سیلابی روپ ہی دیکھا ہو ——— چھوٹی عمر ہی میں اشک جی کی شادی ہو گئی تھی ۔ ایک بھولی بھالی ناخواندہ دیہاتی لڑکی کے ساتھ ۔ وہ کسی قابل ہوتی کہ دق نے طویل اذیت کے بعد اسے موت کی گود میں سلا دیا ۔ اس کی وفات سے اشک جی کو بڑا صدمہ پہنچا ۔ ان کے سماج میں بیوی کے مرتے ہی رشتے آنے لگتے ہیں ۔ اشک جی کو پہلی بیوی سے محبت تو نہ تھی لیکن چار برس کی رفاقت کے بعد اسے چاہنے لگے تھے ۔ انھوں نے جلدی دوسری شادی نہ کی ۔ سب جج بننے کے لئے قانون پاس کیا تھا لیکن مقابلے کے امتحان سے محض دو مہینے پہلے بیوی کے رحلت کر جانے کی وجہ سے افسردہ دل ہو کر انھوں نے سب جج بننے کا خیال چھوڑ دیا اور اپنے فطری رجحان کے مطابق ادب کی خدمت میں محو ہو گئے ۔

لاہور کی زندگی ان دنوں کافی دلچسپ لیکن رسوا تھی ۔ کوئی نہ کوئی سکینڈل آئے دن پھیلا کرتا ۔ وہاں سے سکون کی تلاش میں نکلے تو وسط پنجاب کے ایک گاؤں پریت نگر میں جا پہنچے ۔ وہاں بھی رسوائی نے پیچھا نہ چھوڑا ۔ ایک لڑکی کے سلسلے میں خاصا سکینڈل پھیل گیا ۔ اشک جی اتنے تنگ آ گئے کہ انھوں نے اپنے بھائی کو لکھ دیا ——— "میری شادی کہیں طے کر دو" بھائی صاحب نے دیکھے بھالے بغیر ایک جگہ سگائی پکی کر دی ۔ کچھ دن گزرے اور کچھ سکون ہوا تو محسوس کیا کہ خاصی جلد بازی ہو گئی ہے ۔ پہلے بھی شادی کچھ ایسے ہی ہوئی تھی ۔ تجربات کافی تلخ تھے ۔ انھوں نے بھائی صاحب سے کہا ۔ "سگائی چھوڑ دیجئے ۔" بھائی صاحب نے کہیں دور کے رشتے ہی میں سگائی طے کر دی تھی ، وہ نہیں مانے ۔ تذبذب اور کشمکش کی ایسی ہی حالت میں تھے اور انتہائی اداس اور گرفتہ خاطر رہتے تھے ۔ جب ان سے میرا تعارف ہوا اور میں نے ان کے مزاج کا وہی روپ دیکھا جس کا ذکر انھوں نے اپنی مندرجہ بالا نظم میں کیا ہے ۔

میں ان دنوں منٹگمری میں ہیڈ مسٹریس تھی ۔ لاہور آتی تو ریٹیگن روڈ پر اپنے ماما جی کے ہاں ٹھہرتی ۔ اشک جی وہیں مجھ سے ملنے آیا کرتے ۔ آتے تو ڈرائنگ روم میں ایسے چپ چاپ بیٹھ جاتے گویا منہ میں زبان ہی نہ ہو ۔ کوئی بات پوچھتی تو اتنی دھیمی آواز میں جواب دیتے کہ قریب بیٹھا شخص بھی نہ سن سکے ۔ ان دنوں میں سوچا کرتی تھی کہ ان کی اس مغموم اداس زندگی کو مسکرا سکوں گی ——— آپ میری حیرت کا اندازہ کر سکتے ہیں جب اپنی شادی کے ایک ماہ بعد ہی میں نے انھیں فلک شگاف قہقہے لگاتے دیکھا اور مجھے ستانے لگا کہ میں بے حد سنجیدہ مزاج ہوں اور دعا کی ان جیسے ہنس مکھ مزاج آدمی کے ساتھ نبھ سکوں ۔

کبھی اس حد پر اور کبھی اس کے عین برعکس دوسری حد پر چلنے والے اشک جی کے مزاج کا محض ایک پہلو دیکھنے والا جب اچانک اس کا دوسرا پہلو دیکھتا ہے تو وہ کچھ لمحے کے لئے حیران و ششدر رہ جاتا ہے ——— اپنی ازدواجی زندگی کے گزشتہ سات برسوں میں ، ہماری شادی ہوئے صرف سات برس گزرے ہیں ، حیرت کے ساتھ دھچکا سا لگنے والے ایسے لمحے کم نہیں آئے ۔

شادی کے دنوں ہی کا ذکر ہے ۔ ایک بار ہم نے کچھ احباب کو مدعو کیا ۔ ان دوستوں میں کچھ اشک جی سے عقیدت بھی رکھتے تھے ، بزرگ تھے

پھلکا، بھرتہ، ترکاری اور سالن مسالہ کے ڈونگے وغیرہ رکھ کر میں نے سب سے دسترخوان پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو میں نے اپنے دائیں طرف کونے پر بیٹھے ہوئے مہمان سے کہا کہ شروع کیجئے: انھوں نے کچھ اخلاق اور تکلف اور کچھ عقیدت کے سبب اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اشک جی سے کہا: "جی آپ ہی شروع کیجئے" اور بھرتے کا ڈونگا ان کی طرف بڑھا دیا۔

اشک جی اپنی عادت کے مطابق لگاتار باتیں کر رہے تھے۔ انھوں نے ڈونگا بڑھایا تو کسی طرح کے تامل یا جھجک کے بغیر ان سے ڈونگا لے کے اشک جی نے اپنی پلیٹ میں سالن ڈالا اور اسے آگے بڑھانے کی بجائے وہیں رکھ دیا اور دوسرے ڈونگے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ڈونگے پر ڈونگا اٹھا کر یہ سالن مسالہ وغیرہ اپنی پلیٹ میں ڈالتے گئے اور اپنے سامنے ڈونگے اکٹھے کرتے گئے اور پھر یہ دیکھے بغیر کہ کسی دوسرے نے بھی کچھ لیا ہے یا نہیں آپ نے کھانا شروع کر دیا۔

میں نے دبی زبان سے کہا: "آپ نے کھانا شروع کر دیا۔ ڈونگے آگے بڑھائیے۔"

اشک جی نے توڑا ہوا لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا: "ارے بھائی لیجئے! تکلف نہ کیجئے اور لیتے جائیے۔"

اور بدستور کھاتے رہے۔

تب کچھ شرمسار سی ہو کر میں نے ڈونگے آگے بڑھائے۔

اسی طرح ایک بار کا ذکر ہے۔ خلاف امید دو تین مہمان زیادہ آ گئے۔ میں نے انھیں بیٹھک سے بلایا اور کہا: "باقی تو سب ٹھیک ہے لیکن بینگن کا بھرتہ شاید کچھ کم پڑے۔ ڈرتی ہوں کوئی رہ نہ جائے۔ بازار تو جا رہی ہے۔ آپ کہیں تو جلدی سے دو بینگن منگا کر بھون لوں، دیر نہ لگے گی۔"

بولے: "تم فکر نہ کرو جی، سب ٹھیک ہے اور کچھ پکانے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں، میں سب سنبھال لوں گا۔"

میں نے کہا: "تھوڑا تھوڑا خود ہی سب کی پلیٹوں میں ڈال دیجئے گا۔"

بولے: "تم ذرا بھی فکر نہ کرو، میں سب دیکھ لوں گا۔"

اور باہر جا کر چند دوستوں سے باتوں ہی میں محو ہو گئے۔ میں بھی مطمئن ہو گئی۔

جب وقت پر سب کھانے کے لئے بیٹھے تو میں نے بھرتے کی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے بھرتہ اٹھایا اور کافی مقدار میں اپنی پلیٹ میں ڈال کر بولے: "دیکھو بھئی یہ ترکاری بس اتنی ہی ہے۔ لیتے وقت ذرا دوسروں کا خیال رکھئے گا۔"

شرم کے مارے میرا برا حال ہو گیا۔ میں نے کہا: "آپ تو دوسروں کا خیال رکھئے۔"

"ارے یار۔۔۔۔" کہتے ہوئے انھوں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "اب تو جو ہونا تھا ہو گیا ہمیں وہ بس ڈال دیا۔" اور پھر مجھ سے معافی مانگتے ہوئے بولے "خفیف کیوں ہو رہی ہو، یہ سب اپنے آدمی ہیں۔ یہاں کھانا کھانے تھوڑی آئے ہیں۔ اس بہانے کچھ دلچسپ گھڑیاں بیت جاتی ہیں۔" اور دوستوں سے بولے "مزید تھوڑا تھوڑا۔ یہ تو اور پکانے کو کہتی تھیں، میں نے روک دیا کہ تم سب اپنے آدمی ہو، تکلف کی کیا ضرورت ہے۔"

اشک جی کے لئے سبھی اپنے آدمی ہیں۔ جامعہ ملیہ دہلی کے پروفیسر سرور نے ان کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

> "اشک کی طبیعت میں ایسی ہی بے نام کشش ہے، پہلی ہی ملاقات میں آپ انھیں پائیں گے
> سب سے بے تکلف اور سب کے دوست۔"

اور مجھے ان کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کی یاد آ جاتی ہے۔

مجھے ریناڑ سے لاہور پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی لیکن وہ مجھ سے پہلے پریت نگر سے لاہور پہنچ گئے تھے۔ میں ابھی غسل وغیرہ سے بھی فارغ نہ ہوئی تھی کہ آپ کا چھوٹا بھائی پہنچا۔ معلوم ہوا کہ اشک جی کو آئے چار پانچ گھنٹے ہو چکے ہیں، ان کی طبیعت خراب ہے، ہلکی سی حرارت ہے، ہاکی کھیلتے ہوئے گھٹنے پر گہری چوٹ آ گئی ہے اور اگر مجھے خاص تکلیف نہ ہو تو میں ابھی ادھر چلی چلوں۔

اشک جی کے بڑے بھائی لاہور میں دانتوں کے ڈاکٹر تھے۔ بائبل سوسائٹی کے سامنے ان کی سرجری تھی۔ ان کے بھائی نے مجھے وہاں کا پتہ بتایا۔ میں نے کہا: "آپ ان سے کہئے کہ میں آدھ گھنٹے میں خود ہی وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

میں نے اشک جی کو پہلے بھی دو ایک بار دیکھا تھا۔ سلک کا بنگالی کرتا اور باریک کپڑے کی دھوتی پہنے، ہندی سماج لاہور کے جلسوں میں ان کی نظمیں بھی سنی تھیں لیکن وہ مجھ سے واقف نہ تھے۔ چند خطوں ہی کا تعارف تھا۔ دروازے کی چق اٹھا کر میں اندر داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ جیکٹ اور کھلے گلے کی قمیص پہنے بیٹھے ہیں۔ ایک ٹانگ پر پٹی بندھی ہے جو نصف سرکاری جیکٹ میں لپٹے ہوئے ہے۔ قمیص کے کف میں تین تین بٹن لگے ہیں اور اس جیکٹ کی پیٹی میں تین تین بکلس۔ بڑی حیرت کے ساتھ میں نے نمسکار کیا۔ میرے نمسکار کا جواب دیئے بغیر بولے: "آؤ! میں بیٹھے ہی والا تھا کہ چابک اٹھا کر بولے: "یہاں مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ گھر میں پتا جی آئے ہوئے ہیں اور بچے ہوتے ہیں۔ چلو بیدی کے ہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ جواب دیتی آپ نے باہر نکل کر تانگے والے کو آواز دی اور اگلی سیٹ پر جا بیٹھے۔

بیدی کا نام سن کر جانے کیوں میں نے سمجھا کہ ہم کسی ڈاکٹر کے ہاں جا رہے ہیں ——— ڈاکٹر بیدی ——— اور میرے تخیل میں جدید طرز کا سجا سجایا ایک ڈرائنگ روم گھوم گیا۔ لیکن جب گنگا رام ہسپتال کے پاس سے ہو کر رشی نگر کے باہر کی سڑک پر چلتے ہوئے تانگا ایک کیچڑ بھری گلی کے سامنے جا رکا اور مکانوں کے آگے بہتے ہوئے چھپڑوں کی عفونت کے مارے دماغ پھٹنے لگا (اس وقت تک رشی نگر میں نالیاں نہ بنی تھیں اور مکانوں کا گندا پانی ان کے آگے بنے ہوئے چھپڑوں میں اکٹھا ہو جاتا تھا) تو میرا ماتھا ٹھنکا لیکن تانگے سے اتر کر میں چپ چاپ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

جس کمرے میں ہم داخل ہوئے وہ نہ جدید تھا نہ میرے تصور کے مطابق سجا ہوا تھا اور نہ بیدی ہی ڈاکٹر تھے۔ کمرہ چھوٹا سا تھا۔ اس میں ایک پلنگ بھی بچھا تھا، ایک میز اور دو تین کرسیاں بھی تھیں اور "کوشلیا، بیدی" کہہ کر اشک جی نے جس شخص سے ہاتھ ملایا وہ گھنی داڑھی کا ایک سیدھا سادا سکھ نوجوان تھا، ننگے سر اور کچھا پہنے ہوئے۔

کمرے میں ایک فلالین سوٹ میں ملبوس ایک اور سکھ نوجوان بھی بیٹھا تھا۔ اشک جی اسے جانتے تھے یا نہیں، یہ تو میں نہیں کہہ سکتی لیکن اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر اپنے دوست کو دیکھتے ہوئے سامنے صحن میں لے گئے اور اس سے بولے: "بھائی! اپنے اس دوست کو جلدی چلتا کرو، خواہ تمہیں کتنا ہی جبر کرنا ہو۔" میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے: "ان کو ذرا ادھر جا کر بٹھاؤ اور مجھے کوئی پاجامہ دو۔ اس نکر کی قید سے نجات حاصل کروں۔" اور اپنے دوست کو جواب دینے کا موقع دیئے بغیر رسی پر دھو کر سوکھنے کی غرض سے ٹنگا ہوا اور سوکھا ہوا ایک پاجامہ لے کر مجھ سے "میں ابھی آیا ہوں" کہہ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

میں حیرت زدہ سی بیدی صاحب کے ساتھ (کیونکہ یہ بیدی اردو کے مشہور افسانہ نگار، راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ کوئی دوسرے نہ تھے) پچھلے اندر اسی کمرے میں گئی اور جس کرسی کی طرف انہوں نے اشارہ کیا اس پر چپ چاپ بیٹھ گئی۔

کچھ عقیدت کے مارے اور کچھ اس لئے کہ میں آج پہلی بار دور سے اشک جی سے ملاقات کرنے آئی تھی میں ان سب باتوں کے باوجود جو میرے نزدیک خلاف تہذیب و شائستگی تھیں، چپ چاپ بیٹھی رہی۔ یہ جان کر کہ افسانے لکھنے والوں کی کیا حالت رہی ہے، میں نے اس وقت تک اشک جی کی کتابیں ہی پڑھی تھیں اور ابھی تک ان کے افسانوں سے ہی روشناس تھی، وہ بھی اس انداز سے کھیل سکتے ہیں، یہ آنکھیں کھلا رہیں۔ مجھے حیرت ہوئی تھی اور اشک جی کی اس قریب قریب الھڑ بے تکلفی کو دیکھ کر میں حیرت زدہ ہو گئی تھی لیکن اس عجیب لڑکپن کے باعث انہیں کچھ اور جاننے کا تجسس بھی

میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔

مجھے بیدی صاحب کی وہ بے تکلفی نہ بھولے گی۔ میں نے بعد میں انہیں نہایت قیمتی سوٹ میں ملبوس بھی دیکھا ہے اور جب اشک سے بیچ ہوتے ماڈل ٹاؤن کے بنگلے میں بھی، لیکن اپنے ملنے والوں کے معاملے میں میں نے انہیں اتنا ہی مہذب اور با اخلاق پایا ہے۔ اشک جی کبھی کبھی بہت روکھے ہو جاتے ہیں لیکن بیدی صاحب کو میں نے کبھی خواہ دوست ہو یا خواہ مہمان سے روکھا سلوک کرتے نہیں دیکھا۔

مجھے بٹھا کر بیدی صاحب (اپنے ملاقاتی کو چلتا کرنے کی بجائے) مٹھائی کی طشتری اور سوڈے کا گلاس اندر سے لے آئے اور اسے ان ڈاکٹر صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے بولے "لیجئے ڈاکٹر صاحب! اتنی دیر سے آپ بیٹھے ہیں کچھ کھائیے نا؟"

ڈاکٹر صاحب (جو بعد میں معلوم ہوا کسی ڈاکٹر بنانے والی کمپنی سے بوگس ڈگری لئے ہوئے تھے، غالباً اپنے دماغ کا راستہ ناپتے تھے۔ اگرچہ بیدی صاحب نے "اتنی دیر" کہتے ہوئے ان الفاظ پر زور دیا تھا لیکن اس لطیف اشارے کو وہ کیا سمجھتے۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے تپائی کو اپنی طرف کھینچ کر اس کے نیچے گھٹنے ٹکا دیئے اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مٹھائی کا ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالنے لگے۔

بیدی صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آنے اور ایک جانے لگا۔ اپنی کرسی پر بیٹھے وہ پہلو بدلنے لگے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اپنے دوست کو کبھی نہ ٹال سکتے لیکن اشک جی نے پینترا بدل کر انگریزی میں کہا "اب اپنی کانفرنس ختم کر دو یار! کچھ وقت ہمارے لئے بھی رہنے دو؟"

کوئی احمق ہی ہو گا جو اتنا سیدھا اشارہ نہ سمجھے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب اچانک ہڑبڑا کر اٹھے اور بیدی صاحب سے معافی مانگ کر پھر آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ اشک جی نے مختصراً بیدی صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ بیدی صاحب پھر وہی مٹھائی اور سوڈے کی بوتلیں اٹھا لائے اور اشک جی جا کر پلنگ پر تکئے کے سہارے لیٹ گئے۔

وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے انگلی کی چوٹ سے جو بات شروع کی تو اپنے جوش اور حرارت کے باوجود اپنی زندگی کی سبھی کھٹی اور ان کہی باتیں کہہ گئے۔

لیکن سب سے بے تکلف اور سب کے "دوست" کی دوسری انتہا بھی ہے۔ یوں تو اشک جی دوستوں ہی سے نہیں، بارہا پہلی بار ملنے والوں سے بھی اپنی سبھی کھٹی ان کہی باتیں کر دیتے ہیں لیکن جنہیں وہ اپنا دشمن سمجھ لیں یا کوئی ان کی توہین کر دے یا انہیں دھوکا دے دے تو اس سے روزانہ ملنے پر بھی کبھی اس پر اپنا جذبہ ظاہر نہیں ہونے دیتے اور دس برس بعد بھی اپنی ہتک کا بدلہ لینے سے نہیں چوکتے۔ یہ بات نہیں کہ اپنے کردار کی اس خامی سے بے بہرہ ہیں۔ بات چل پڑے تو اشک جی اس کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ اسے زمانہ جہالت کا نشان بتاتے ہیں اور ہمیشہ اپنی اس عادت سے نجات پانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انہوں نے ایسے خاندان میں جنم لیا ہے جہاں دادا کی توہین کا بدلہ پوتے چکاتے رہتے ہیں اور جب بھی کبھی کوئی ان کی ہتک کر دیتا ہے تو ان پیدائشی جذبے سے مجبور ہو کر یا عمر کا سارا فلسفہ بالائے طاق رکھ کر اپنی اس توہین کا انتقام لینے کے لئے تل جاتے ہیں۔ نہ اس توہین کو بھولتے ہیں اور نہ اس وقت تک سکون پاتے ہیں جب تک اس کا بدلہ نہ لے لیں یا دوسرا معافی نہ مانگ لے۔

ان کی معافی کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی سے دھوکا کھانے یا ہتک کی وجہ سے ناراض ہوتے ہیں، دل میں کڑھتے اور سوچا کرتے ہیں اور اس ہتک کا بدلہ لینے کی اسکیمیں سوچتے رہتے ہیں کہ وہ اپنی اس حرکت پر اظہار افسوس کر دیتا ہے۔ بس یہ سب کچھ بھول کر اس کے گن گانے لگتے ہیں۔

ابھی تین چار برس پہلے ان کے ایک دوست نے دھوکے کے ساتھ ہم سے نہ صرف دلی والا مکان (جہاں اشک جی کے بھی حصے پر میرا بھائی رہتا تھا) خالی کروا دیا بلکہ وہاں میرے بھائی کا جو سامان تھا وہ بھی ٹھکانے لگا دیا۔ اشک جی نے سارے ناطے توڑ لئے لیکن جس کو اس نے

مکان دیا وہ بھی ادیب دوست تھے انھوں نے ٹھیک بات جانتے ہی کھل کر افسوس ظاہر کیا۔ تب نہ صرف اشک جی نے مکان واپس لینے کی کوشش نہیں کی بلکہ مالک مکان کو لکھ کر حتی الامکان انہیں وہاں جمانے کی سعی کی۔ لیکن جس دوست نے دھوکہ دیا تھا اس سے انتقام لینے کا عہد کئے رہے۔

پچھلے دنوں جب ڈاکٹروں سے صلاح مشورہ کرنے بمبئی گئے تو کہیں وہ بھی بمبئی پہنچا ہوا تھا۔ اسے ان کے وہاں ہونے کا پتہ چلا تو ملنے چلا آیا۔ نہ جانے کیا کیا باتیں ہوئیں لیکن وہ معافی مانگ گیا۔ واپس آئے تو بولے ”وہ شاید ...... پنچ گنی آئے؟“

میں حیرت زدہ سی ان کا منہ تکنے لگی۔

تب بتانے لگے کہ کیسے وہ ملا۔ کیسے مسز زیدی کے ساتھ ملاقات سے ملنے آیا کیسے بحث ہوئی اور کیسے انھوں نے اسے لاجواب کر دیا۔ کیسے پاکستان میں اس کا بڑا نقصان ہوا ہے اور کیسے اس نے اپنے کردار پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔

جب اس صفائی پر بھی میرے چہرے سے حیرت اور غصے کے آثار نہ مٹے تو بولے ”جب اس نے معافی مانگ لی تو کیا میں اسے پھانسی پر لٹکا دیتا۔ بمبئی میں گرا پڑا ہے۔ حال اس کا آج کل پتلا ہے۔ لاکھ برا سہی مگر آدمی دلچسپ ہے۔ میں نے اسے پنچ گنی آنے کے لئے کہہ دیا۔ اب بتاؤ اس غصے کو؟“

اور یہ کہہ کر بے پروائی سے سر کو جھٹکا دے کر اپنے کام میں محو ہو گئے۔

اشک جی اپنے کپڑوں کے سلسلے میں بڑے سیدھے سادے ہیں۔ لوگوں نے انہیں ہر طرح کا لباس پہنے دیکھا ہوگا لیکن سوٹ بوٹ، اچکن، ڈھیلی قمیص شلوار، دھوتی کرتا وغیرہ ہر فیشن کے کپڑے پہننے کے باوجود انہیں تہبند پہنے ننگے بدن رہنا بڑا پسند ہے۔ پہلے پہل یہ سوٹ وغیرہ بھی پہنتے تھے جب انہیں سرکاری دفتر میں کسی سے ملنے جانا ہوتا ورنہ سارا دن گھر میں ننگے بدن تہبند اور کبھی کبھی محض کچھا پہنے بیٹھے رہتے (قمیص یا کرتا قریب ہی رکھتے) کوئی آتا تو جھٹ پہن لیتے۔ پھر جب خود سرکاری دفتر میں نوکر ہوئے تو اگرچہ ہمیشہ پینٹ وغیرہ کسے رہنا پڑا لیکن تہبند سے ان کا موہ نہیں گیا۔ جب بھی گھر میں ہوتے تہبند پہنتے۔

دلی میں یہ آل انڈیا ریڈیو میں نئے نئے ملازم ہوئے تھے۔ گرمی کا موسم تھا لیکن شامیں نسبتاً ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ ایک شام کھانا کھانے کے بعد بولے: ”چلو ذرا سیر کی جائے۔“

اپنی عادت کے مطابق صرف تہبند پہنے ہوئے تھے۔ مجھے تو بڑی بدتمیزی معلوم ہوئی تھی۔ لیکن نئی نئی آئی تھی جھجک تھی وہ زور دیتی تھی۔ آہستہ سے میں نے کہا: ”کپڑے تو بدل لیجئے!“

کہنے لگے: ”پھر سیر کا مزا کیا خاک آئے گا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں ننگے بدن گھومنے کا جو لطف ہے وہ کپڑے ٹھونس کر جانے میں کہاں؟“

”میں تو نہیں جا سکتی۔“

بولے: ”اس وقت سڑک پر کون ہوگا؟“

”تو بھی“ میں نے کہا ”میں تو نہ جاؤں گی۔“

”تو میں ہو آتا ہوں، مہندر کو لے لوں گا۔“

مہندر اردو کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے چھوٹے بھائی ہیں اور خود بھی خوب لکھتے ہیں۔ ہمارے ان کے گھر ساتھ ساتھ تھے۔ مہندر بھائی کو ساتھ لے کر یہ ننگے بدن صرف تہبند پہنے اس کی دائیں کور کو ہاتھ میں پکڑے خاص انداز میں اٹھلاتے چلے جا رہے تھے کہ نظامی صاحب جو آل انڈیا ریڈیو میں شعبہ موسیقی کے انچارج تھے اور خود بھی بہت اچھے موسیقار تھے آتے دکھائی دئیے۔ بل ورڈ روڈ پر بجلی کی روشنی تو ہے لیکن

دونوں طرف نیم کے گھنے پیڑوں کے باعث وہاں اندھیرا سا رہتا ہے۔ پر تمام وہاں سے تانگا چلا جاتا ہے۔ اس وقت تو ساڑھے دس کا وقت تھا، سڑک سونی تھی اور نظامی صاحب آسمان کی طرف منہ کئے کوئی دھن بناتے اور گنگناتے چلے آ رہے تھے۔

بڑھ کر اشک جی نے ان کے کندھے پر ہاتھ مارا: "کیوں بھئی کدھر؟"

نظامی صاحب کا خیال اپنی دھن میں تھا۔ سڑک پر خاصی تاریکی تھی۔ چند دن پہلے اس مقام کے نزدیک ہی ایک ریڈیو انجینئر پر قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا۔ اشک جی کو اس عالم میں دیکھ کر وہ فوراً پہچان نہ سکے۔ ان کا رنگ فق ہو گیا اور لمحہ بھر کے لئے وہ ان کو گھورتے رہے۔ پھر جب اشک جی نے اپنا فلک شگاف قہقہہ لگایا اور منو بھائی نے جھک کر انہیں آداب عرض کیا تو ان کی جان میں جان آئی۔ حیرت سے انہوں نے پوچھا: "کیا بات ہے ایسے کیوں گھوم رہے ہو؟"

اشک جی کو اس میں حیرت کی کوئی بات نہ دکھائی دیتی تھی۔ جو شخص بی۔ اے تک لنگوٹ لگائے جسم پر تیل کی مالش کئے جالندھر کے بیرون بازار میں بھاگتا پھرتا رہا ہو، جیسے کسی نے لگام نہ دی ہو، اور جو اس بات کا ذکر بڑے فخریہ انداز میں کرتا ہو، اسے دلّی کی نسبتاً سونی سڑک پر لنگوٹ نہیں تہ بند لگائے گھومنے میں کیا برائی نظر آ سکتی ہے۔ "تم بھی نرے گھر گھسو ہو" کہتے ہوئے اشک جی نے ان سے ہاتھ ملایا اور آگے بڑھ گئے۔

ادھر کچھ برسوں سے اشک جی نے تہ بند پہننا چھوڑ دیا اور متواتر نوکری کرنے کی وجہ سے اپنے قول کے مطابق زیادہ وقت کپڑوں کے قید خانے میں بند رہتے ہیں لیکن نہ ابھی تہ بند کا موہ چھوٹا ہے نہ ننگے بدن بیٹھنے کا۔ بمبئی میں جب جب گھر پر کام کرتے رہتے ہیں اپنی پرانی عادت کے مطابق ہمیشہ ننگے یا بنیان اور تہ بند [illegible] میں کام کرتے رہتے ہیں۔ یوں بھی کپڑوں کے معاملے میں کچھ عجیب طرح کی بے نیازی ان کے مزاج میں ہے۔ اکیلے تھے تو جو بھی کپڑا باہر پڑا یا ٹرنک کے اوپر پڑا ہوا وہی پہن لیتے تھے۔ میں آئی تو جو بھی نکال دیتی وہی پہن لیتے۔ لیکن اس کے باوجود جب کبھی جی سے پہنتے ہیں تو پھر نفاست پسندی کی حد کر دیتے ہیں۔ پہلے پہل مجھے یہ بے نیازی اور ناز بڑا عجیب سا لگتا تھا لیکن اب میں ان کے مزاج کی اس انتہا پسندی کی عادی ہو گئی ہوں۔

دلّی کی بات ہے۔ یہ دیکھ کر کہ پاس میں پیسے ہوتے ہوئے بھی یہ بڑے بھدے کپڑے پہنتے ہیں۔ سبب کچھ بھی ہو، جب میں آئی تو آل انڈیا ریڈیو کی ڈیوٹی کے باوجود گرمیوں کے لئے ان کے پاس صرف تین پتلون اور تین قمیصیں تھیں ——— ذرا دھو کر ڈالا اور پہن کر چلے جاتے تھے اور سردیوں کے لئے فقط ایک ذلیل سا سوٹ تھا۔ میں نے آتے ہی ان کے نہ نہ کرنے پر بھی دو اچھے گرم سوٹ سلوائے۔ ایک دن جب میں نے نیا سوٹ پہننے کو نکالا تو ٹائی حسب پسند نہ ہونے کے باعث چھوڑ دیا۔ میں اسی شام کچھ بہت اچھی ٹائیاں لے آئی۔ کسرت کرتے، حجامت بناتے اور غسل کرتے ہوئے انہیں کچھ دیر ہو گئی تو جھلانے لگے۔ جلدی میں کوئی بھی قمیص پہننے لگے تھے وہ۔ آخر جب سوٹ پر پھبتی ہوئی قمیص پہنی تو ٹائی پر کافی دیر لگا گئے۔ بوٹ پر پالش کیا گیا۔ آخر جب پوری طرح اطمینان ہو گیا تو ناشتے کا وقت نہ رہا۔ کسی نہ کسی طرح دو منٹ میں ناشتہ کر کے بھاگے۔ ان کے جانے پر میں حیرت زدہ سی کھڑی سوچنے لگی کہ کہاں تو اتنی بے پرواہی کہ کیا پہنتے ہیں کیا نہیں پہنتے اس کا ہوش نہیں اور کہاں اتنی نفاست پسندی کہ کالج کے لڑکے بھی مات کھا جائیں۔ کام کرتے ہوئے میں متواتر یہی سوچتی رہی۔

ان کے گئے پانچ چھ منٹ گزر گئے تھے اور میں منا رہی تھی کہ میٹنگ کے وقت پر پہنچ جائیں تاکہ اس دیر کا غصہ مجھ پر نہ اترے، تبھی برآمدے میں پھر ان کے جوتوں کی آواز سنائی دی۔ میں تیزی سے باہر بھاگی کہ کوئی فائل رہ گئی ہو تو دیکھ کر جلدی سے دے دوں۔ دوسرے لمحہ آپ داخل ہوئے اور سیدھے اندر کے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے پوچھا: "کیا ہوا؟ کیا رہ گیا؟"

بولے: "کچھ نہیں۔"

جا کر دیکھتی ہوں تو آئینہ کے سامنے کھڑے وسلنگ کر کے ٹہل رہے ہیں۔

ان کی ماں جی سے ایک بار بات چلی تو کہنے لگیں: "لڑکپن ہی سے اس کی ایسی عادت ہے۔ نہیں پہنتا تو نہیں پہنتا، پہنتا ہے تو اول نادر کی بات کرتا ہے۔ ایک بار مہیندر بڑے بھائی کی شادی پر بڑھیا سلک کا ایک کوٹ سلوایا۔ درزی نے اوپر کی جیب کہیں زیادہ نیچے کر دی۔ مجھے تو اس میں کوئی نقص نہ لگتا تھا مگر اس نے وہ ایک بار پہن کر دیکھا اور پھر نہیں پہنا۔"

ان دنوں اشک جی آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔

ان کے اس رومانی مزاج کا ایک اور ثبوت مجھے انہی دنوں پھر ملا۔ مری ہی کی بات ہے۔ میں نے اندر پرستھ گرلز ہائی سکول میں نوکری کی تھی۔ لڑکیوں کے امتحان ہو چکے تھے اور پرچوں کا ڈھیر آیا پڑا تھا۔ انہی دنوں نوکر بھاگ گیا۔ کسی طرح رات کا کھانا پکا کر، برتن اور کپڑے ویسے ہی اسی طرح چھوڑ کر میں پرچے دیکھنے لگی اور رات کے دو بجے تک دیکھتی رہی۔ یوں بھی میں صبح دیر سے اٹھنے کی عادی ہوں۔ اس دن کچھ اور دیر ہو گئی۔ اٹھتے ہی میری نظر جس چیز پر پڑی وہ رسی پر سوکھنے کے لئے ڈالے ہوئے اُجلے دھلائے کپڑے تھے۔ حیرت ہوئی کہ کس نے دھوئے۔ سوچا شاید کہیں سے کوئی نوکر مل گیا ہے۔ خوشی خوشی سے بھاگی اندر گئی تو دیکھا باورچی خانے میں باپ بیٹا (اشک جی کی پہلی بیوی سے ایک لڑکا ہے) بیٹھے برتن مل رہے ہیں اور اشک جی اپنے لڑکے کو برتن ملنے کے فن میں مشاق بنا رہے ہیں۔

میں بھونچکی سی چوکھٹ میں کھڑی رہ گئی۔ پھر بڑھ کر میں نے کہا: "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیا میں مر گئی ہوں جو برتن ملنے آ بیٹھے ہیں؟"

کہنے لگے "مرنے کا نام نہ لو۔ پھر تیسری بیوی اب مجھے کہاں سے ملے گی؟"

میں نے کہا: "ہٹائیے، یہ مذاق مجھے پسند نہیں۔"

لیکن انہوں نے مجھے برتنوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ کہنے لگے "میرے ہاتھ تو سخت ہو چکے ہیں، تم کیوں فضول ہی انہیں خراب کرتی ہو۔ تم سے بُرے نہیں ملوں گا، اس بات کا یقین رکھو، سکول کے دنوں میں برسوں برتن ملے ہیں۔ جاؤ جلد تیار ہو جاؤ، سکول پہنچنے میں تمہیں دیر ہو جائے گی۔"

مجبور ہو کر مجھے جانا پڑا۔ خوش قسمتی سے اسی دن نوکر مل گیا، نہیں تو جانے یہ کتنی دیر تک کھانا بنتے رہتے۔

لیکن اس واقعہ کے چند دن بعد کا ذکر ہے، اتوار تھا۔ میں باہر صحن میں بیٹھی پرچے دیکھتی تھی اور اشک جی اندر کچھ لکھ رہے تھے کہ مجھے آواز پڑی۔ مجھے اٹھنے میں کچھ دیر ہو گئی تو پھر آواز پڑی۔ پرچے چھوڑ کر میں بھاگی۔ بولے: "ذرا وہ ڈکشنری دینا۔"

ڈکشنری دو قدم کے فاصلے پر ریک میں پڑی تھی۔ میرے سامنے وہ دن پہلے کپڑے دھونے اور برتن ملنے کا واقعہ گھوم گیا۔ ڈکشنری دیتے ہوئے سوچنے لگی کہ جو آدمی ایسی شاہانہ آرام طلبی کا مالک ہو سکتا ہے کہ وہ دو قدم اٹھ کر چیز اٹھانے کی بجائے دوسرے کو بلائے، وہ کپڑے دھونے اور برتن ملنے جیسا مشکل کام کیسے کر سکتا ہے۔

لیکن یہی نازبرداری اور انتہا پسندی اشک جی کے مزاج کا اہم جزو ہے۔ ان کا سبھاؤ ایسے سکون پسند آدمی کا سا نہیں جو پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر وہیں ڈیرا ڈال دے، بلکہ ایسا بے کل راہی ہے جس کو کبھی پہاڑوں کی چوٹیاں پسند ہیں، کبھی گہری گھاٹیاں، جو کبھی گنجان شہروں کو پسند کرتا ہے کبھی سنسان ویرانوں کو۔ کبھی یہ انتہا مرغوب ہے کبھی وہ۔ کوئی ایک معیار یا درمیانی راہ انہیں پسند نہیں۔ بچپن ہی سے اشک جی کی زندگی حوادث سے پُر رہی ہے۔ انہوں نے زندگی کے کڑوے جام بھی پئے ہیں اور بے حد میٹھے بھی، فراوانی بھی دیکھی ہے اور فقدان بھی۔ بے انتہا محبت بھی پائی ہے اور بے پناہ نفرت بھی اور نہ جانے کتنے پیدائشی سنسکاروں، ماں باپ کی کمزوریوں اور کئی دوسری جسمانی، ذہنی، معاشرتی اور اقتصادی پیچیدگیوں کے باعث ان کا سبھاؤ

ایک دوسرے کے برعکس حدوں میں گھڑی کے پنڈولم کی طرح گھومتا رہتا ہے۔ قہقہے مارتے ہیں تو چھت پھٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور کبھی جب کسی عزیز کی طرف سے ٹھیس پہنچنے پر رو پڑتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کیونکر انہیں تسکین دی جائے۔ ایک طور میں اتنے کمزور کہ بے ساختہ رحم آ جائے۔ دوسرے طور اتنے مضبوط کہ پہاڑ سے بھی ٹکر لینے کو تیار ہو جائیں۔ پھکڑ ایسے کہ کیا پہنتے ہیں اس کا دھیان نہیں، کیا کھاتے ہیں اس کی پروا نہیں، لیکن دوسری طرف پر اتنے نفاست پسند کہ لباس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کا خیال رکھنے والے اور اتنے مہذب کہ منہ سے ہر لفظ جانچ تول کر نکالنے والے، کبھی اتنے فراخ دل کہ بڑی سے بڑی بات کو خاطر میں نہ لائیں اور کبھی اتنے تنگ دل کہ چھوٹی سی بات پر راتوں کی نیند حرام کر لیں اور جب تک اس کا انتقام نہ لے لیں چین نہ پائیں۔ کبھی ایسے کنجوس کہ تکلیف اٹھا کر پیسہ پیسہ جوڑیں اور کبھی ایسے فضول خرچ کہ اتنی مصیبت سے جمع کی ہوئی رقم لمحہ بھر میں خرچ کر دیں کبھی مستقل بے یقینی کے ایسے شکار کہ اپنی اور دوسروں کی زندگی تباہ کر دیں اور کبھی ارادے کے ایسے پکے کہ دو ٹوک فیصلہ کر کے اس سے ایک انچ بھی نہ ہٹیں کبھی بے حد سنگدل کبھی موم کی طرح پگھل جانے والے، کبھی اتنے شاطر کہ بڑے سے بڑے چالاک سے دھوکا نہ کھائیں اور کبھی ایسے سادہ لوح کہ عام آدمی بھی ٹھگ کر چلا جائے۔ انہی انتہاؤں کو لے کر اشک جی کے اس تفاوت بھرے مزاج کے سلسلے میں ایسے دلچسپ واقعات ہیں کہ ایک مضمون میں ان پر پوری روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔

لیکن جس طرح کوئی عام اصول مستثنے سے خالی نہیں ہوتا اسی طرح اشک جی کا یہ مختلف انتہاؤں پر چلنے والا سبھاؤ بھی مستثنیات سے خالی نہیں میں نے پچھلے بیس برس میں ان کی طبیعت کے ایسے پہلو بھی دیکھے ہیں جن کی صرف ایک ہی انتہا ہے۔ اس سے مختلف دوسری حد نہیں۔

ان کے لکھنے ہی کو لیجئے۔ لکھنے کی ان کو دھن سی ہے اور یہ دھن انتہا ہی کا دوسرا نام ہے۔ بارہا ادیبوں کے اپنے زرخیز اور بنجر اوقات ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا وقت آتا ہے جب ان کی تخیل برسات میں چڑھی ہوئی ندی کی طرح ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار کو منظر پر لاتی جاتی ہے۔ پھر ایسا وقت بھی آتا ہے جب تخیل کی باڑھ اتر جاتی ہے اور ان کا دماغ اترے ہوئے سمندر کے کنارے کے بے کیف سنسان ساحل سا ہو جاتا ہے۔ وہ ہفتوں، مہینوں اور بارہا برسوں کچھ نہیں لکھ پاتے۔ اشک جی کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ ہمیشہ لکھتے ہیں۔ سردی، گرمی، برسات یا سوکھے میں متواتر بہنے والی دوامی ندی کی طرح ان کی تخیل ہمیشہ بھری رہتی ہے۔ یہ دکھی ہوں یا سکھی، گھر ہوں یا باہر، اکیلے ہوں یا دوکیلے ہمیشہ لکھنے کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ ان کے دوست ان کی اس عادت کو سنک کا نام دیتے ہیں۔ یہ ہے بھی سنک ہی، لیکن ان کی یہ سنک ایک ہی انتہا پر قائم رہتی ہے۔ اس کی دوسری انتہا یعنی سستی بے کاری میں نے ان کے ہاں کبھی نہیں دیکھی۔ لکھے بغیر وہ رہ ہی نہیں پاتے۔ ابھی ایک برس پہلے، جب ڈاکٹروں نے دق کا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے ہدایت کی کہ انہیں پورا آرام لینا چاہئے تو میں سمجھتی تھی کہ اب یہ کچھ دن چین لیں گے۔ میں نے انہیں الگ کمرے میں لٹا دیا اور دروازہ لگا دیا کہ کوئی ان سے بات نہ کرے گا۔ انہوں نے نہ کھانا چھوڑا نہ باتیں کیں، لیکن لیٹے لیٹے یادداشت کے بل پر "دیپ جلے گا" کے نام سے ایک طویل نظم لکھ ڈالی۔ ایک مہینے بعد میں انہیں پنچ گنی لے آئی اور چار مہینے تک انہیں کام کرنے کی اجازت نہ ملی۔ ان دنوں یہ لیٹے لیٹے ایک دوسری طویل نظم لکھتے رہے۔

عام طور پر اشک جی اپنے ناطے رشتے داروں سے اسی حد تک محبت کرتے ہیں جس حد تک پیار ان سے پاتے ہیں۔ لیکن بڑے بھائی، ماں اور سب سے چھوٹے بھائی اس سے مستثنےٰ ہیں۔ ماں اور بڑے بھائی خواہ ان سے کیسا ہی روکھا سلوک کیوں نہ کریں، خواہ کتنی ہی ٹھیس کیوں نہ پہنچا دیں، یہ ان کی رکھائی اور بے اعتنائی کا جواب ہمیشہ ادب اور محبت ہی میں دیتے ہیں۔ ان کے برے سلوک سے رنجیدہ خاطر ہوتے ہیں۔ یہ بات ہے کبھی کبھی کوئی چھوٹا سا واقعہ ان کی راتوں کی نیند حرام کر دیتا ہے۔ یہ ان کی بدسلوکی پر کڑھتے جلتے رہتے ہیں، لیکن جب ان سے ملتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں اور ان کے دکھ سے دکھی اور ان کے تفکرات سے متفکر ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح دوستوں کے سلسلے میں بھی ان کی محبت ایک ہی انتہا پر رہتی ہے۔ اشک جی کا قول ہے کہ جسے ہم پسند کرتے ہیں، پیار کرتے ہیں،

جس کی دوستی کے خواہشمند ہیں اس کی خامیوں کو دیکھنا بے معنی ہے۔ اس کی دوستی میں جو مسرت ہمیں حاصل ہوتی ہے اسی پر ہماری نظر ہونی چاہیے دوستی بھلا کوئی بیوپار کی چیز ہے۔ جسے ہم چاہتے ہیں اسے دوست بنائے رکھنے کے لئے اس کی اچھی ہی اچھی باتوں پر توجہ دے کر ہمیشہ محبت دینی چاہیے انتقام کی تو بات ہی وہاں نہیں اٹھتی اور میں نے دیکھا ہے کہ اپنے عزیز ترین دوستوں کے سلسلے میں (اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے) اشک جی ہمیشہ اپنے اس قول پر عمل کرتے ہیں۔

اشک جی کی ایک اور سنک تھی جس کی دوسری مخالف انتہا مجھے نظر نہیں آئی۔ وہ تھی باقاعدہ صبح اٹھ کر ورزش کرنا۔ شادی کے بعد جب میں نئی نئی دلی آئی تو میں نے دیکھا کہ صبح اٹھ کر لنگوٹ لگائے تیل کی مالش کر کے ڈنٹر بیٹھک نکالتے اور فری ہینڈ کسرت کرتے۔ بیدی صاحب ان دنوں دلی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی اشک جی کو فری ہینڈ کسرت کرتے دیکھا تھا۔ اس اچھل کود کو دیکھ کر انہوں نے اشک جی کو "ہنومان" کے خطاب سے سرفراز کر دیا اور جتنے دن وہ رہے صبح صبح اشک جی کی کسرت ایک فلک شگاف قہقہے سے شروع ہوتی رہی۔ لیکن وہ دھن کے یہ ایسے پکے ہیں کہ کسی مذاق یا پھبتی کی وجہ سے اپنی دھن نہیں چھوڑتے۔ اس لئے "ہنومان" کہلائے جانے کے باوجود بلاناغہ ورزش کرتے رہے۔ مجھے بچپن کی پرانی شکایت ہے۔ دورہ پڑتا ہے تو نڈھال ہو جاتی ہوں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے۔ "تم ورزش نہیں کرتیں اسی لئے تمہاری آنتیں کمزور ہو گئی ہیں۔ پرانے خیالات کی ہندوستانی عورتیں گھر کے کام کاج کی صورت میں اور مغربی عورتیں ناچ گانے کی صورت میں کافی کسرت کر لیتی ہیں اور تندرست رہتی ہیں۔" اس سب کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ورزش کی اہمیت پر چھوٹی موٹی تقریر کر ڈالی۔ سانس روک کر، سینہ پھلا کر مجھے بتانے لگے ——— کس طرح کسرت کرنے سے کمر پتلی ہو جاتی ہے، سینہ چوڑا ہو جاتا ہے اور جسم کی ایک اچھی تکون سی بن جاتی ہے۔ مجھے انہوں نے صلاح دی کہ اگر میں فری ہینڈ ورزش نہیں کر سکتی تو کم سے کم سانس روک کر سینہ پھلا کر رسی ہی پھاندا کروں۔

ورزش کی اہمیت پر انہوں نے مجھے اتنے لیکچر دیے اور بیدی صاحب کے قول کے مطابق ہنومان کی طرح کود پھاند کر اتنی طرح کی ورزشیں بتائیں کہ میں بھی ورزش کے ذریعے اپنی بیماری دور کرنے اور کمر پتلی بنانے کی کوشش کر دیکھنے کو تیار ہو گئی (دھیان رہے یہ بتا دوں کہ خود اشک جی موٹے ہیں اور میں دبلی) لیکن ان کی طرح سانس روکے اور سینہ پھلانے پر آنکھوں کے ڈھیلے نکلنے کی سی ہو جاتی تھی اور میری غائبانہ ہنسی نکل جاتی۔ کچھ دن تک میں نے بھی کود پھاند کی لیکن ایک تو مجھے صبح جلدی اٹھنے کی عادت نہیں اور پھر کسرت کرنا مجھے نہایت خشک اور اکتا دینے والا کام معلوم ہوتا ہے۔ پھر میری آنتوں کو بھی کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ کچھ ہی دن بعد میں نے ہتھیار ڈال دیے اور نہایت عاجزی سے کہا کہ کمر کی تکون آپ ہی کو مبارک ہو۔ مجھے کسی خوبصورتی کے مقابلے میں تو بیٹھنا نہیں۔ مجھے تو آپ معاف ہی رکھیں۔

اشک جی نے پھر مجھے مجبور نہیں کیا۔ لیکن خود متواتر اچھل کود کرتے رہے۔ وقت ہوتا تو مالش بھی کرتے ورنہ ڈنٹر بیٹھکیں خواہ چھوڑ دیں، فری ہینڈ کسرت ضرور کر لیتے۔ کئی بار میں ناشتہ رکھ دیتی۔ وہ قریب قریب ناشتے پر بیٹھ جاتے لیکن پھر کسرت کرنے کا خیال آ جاتا اور "بس چند منٹ کے لئے معاف کرو" کہہ کر بھاگ جاتے اور پیٹ دبا، سینہ پھلا، جسم کی تکون بنا کر اچھل کود کرنے لگتے۔ اگر اپنے ضبط اور باقاعدگی کی داد چاہتے کبھی کبھی آئینہ دیکھتے تو افسوس ہوتا کہ اتنی باقاعدگی سے ورزش کرنے کے باوجود گال پچکے جا رہے ہیں۔ تب بازو کو ابھار کر، ابھرے ہوئے پٹھے کی سختی دیکھ کر مطمئن ہو جاتے کہ گال بھلا نہیں بھرے لیکن ورزش کرنے سے پٹھوں میں لوہے کی سی مضبوطی آ گئی ہے۔

میں جب سے آئی ہوں میں نے انہیں باقاعدگی سے بلاناغہ ورزش کرتے دیکھا ہے لیکن اتنی ورزش کے باوجود انہیں آنتوں میں تکلیف رہنے لگی۔ اپنی سنک میں انہوں نے ورزش کی مقدار کچھ اور بڑھا دی اور کسی شریف آدمی کے کہنے پر ابلی ہوئی ترکاریاں کھانا شروع کر دیں۔ اپنی عادت کے مطابق اس بات کو بھی انتہا تک لے گئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پچھلے سوا سال سے بیمار پڑے ہیں۔ وقت پر پتہ چل گیا کہ بیماری [illegible] پھیپھڑے میں ہے ورنہ نہ جانے کیا ہوتا ——— جب علی الصباح اٹھ کر اور سانس روک کر جسم کی تکون بنایا کرتے تھے اس وقت ضرورت

اس بات کی تھی کہ بستر پر کچھ دیر اور لیٹ کر آرام کرتے اور اعلیٰ ہری ترکاریوں کی بجائے طاقت ور غذا کھاتے۔ یہ سب معلوم ہونے پر ڈاکٹر ہی ایک خلاف شگاف تو ضرور لگانا چاہتے ہیں لیکن اب اس کی بھی اجازت نہیں کیونکہ اس سے پھیپھڑے کو نقصان پہنچتا ہے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یہ بیمار نہ پڑتے تو ان کی یہ مسلک ہمیشہ رہتی۔ اس کی دوسری مخالف انتہا پر چلنا — یعنی مکمل آرام ان کے لئے کبھی ممکن نہ ہوتا۔

آپ دق سے بیمار ہو کر ڈیڑھ برس پنچ گنی کے سینی ٹوریم میں گزار کر الہ آباد آ گئے ہیں۔ دل و دماغ آکسفورڈ پر مصروف رہتے ہیں۔ لیکن جسم سے آرام لینے کو مجبور ہیں۔ دق کی اس مجبوری نے انہیں تھوڑا بہت فلسفی بنا دیا ہے اور ان کی طبیعت اپنی انتہا پسندی چھوڑ کر میانہ روی سیکھ رہی ہے لیکن وہ میانہ روی سیکھ پائے گی اور مکمل طور پر صحت مند ہونے پر وہ سیکھ قائم رہے گی۔ اس میں کم سے کم مجھے شک ہے۔

حفیظ ہوشیارپوری

ناصر کاظمی

سنہ ۴۳ء کی بات ہے۔ خاصی سردیاں تھیں۔ رات کا وقت تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں ایک انٹر کالجیئیٹ مشاعرہ تھا۔ رنگ رنگ کے طالب علم وہاں موجود تھے۔ بعض جانے پہچانے مقامی و غیر مقامی شاعر بھی تھے۔ سامعین اور ارباب ذوق سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تاجور نجیب آبادی حسب معمول کرسی صدارت پر بیٹھے تھے۔ اُن کے ساتھ ہی سٹیج پر یوں تو دو تین اور بھی اصحاب تھے لیکن ایک بہت دلچسپ اور عجیب سی چیز بھی تھی۔ گورا سانولا رنگ، لٹکے ہوئے گال، خشک ہونٹ، سر پر بہت سے بال، اکہرا جسم، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، آنکھیں گویا کسی پیڑ سے لٹکتی ہوئی بیریوں کی ایک مالا۔ شاعر مسند پر آ کر اپنا کلام سناتا۔ صاحب صدر دل بڑھاتے اور داد دیتے لیکن یہ صاحب اپنی حرکتوں میں گم تھے۔ خود ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔ شاعر ان کی طرف دیکھتا تو ایک دم سنجیدہ ہو جاتے اور سر کو نفی میں ہلا کر داد دینے لگتے۔ مشاعرہ ختم ہوا۔ شاعروں کو داد ملی۔ طلبا کو انعام ملے۔ پہلا انعام جسے ملا اُس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ دوسرا انعام اعجاز بٹالوی کو ملا۔ میں عبدالمجید بھٹی کے ساتھ ہوسٹل میں آ کے بیٹھ گیا۔ پھر وہاں کچھ اور لوگ جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے حفیظ ہوشیارپوری سے تعارف کرایا۔ میں دنگ رہ گیا۔ خیر یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں۔

حفیظ نے کوئی ڈیڑھ درجن غزلیں سنائی ہوں گی۔ تاثیر صاحب نے آدھا دیوان غالب سنا دیا۔ اِن دنوں اُردو میں کچھ اُن کے اپنے شعر بھی تھے۔ ایک غزل داغ کے رنگ میں تھی باقی رنگ غالب۔ حفیظ نے میری طرف دیکھا اور پھر دیکھا۔ میں نے بھی انہیں معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ڈرتے ڈرتے دو ایک غزلیں سنائیں۔

اگلے دن میں سگریٹ لے کر کالج ہوسٹل کی طرف جا رہا تھا کہ وہی عجیب سی چیز ایک میلا خستہ سا گرے سوٹ پہنے شانوں میں خمیدہ سی کمر اور دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے دکانوں کے بورڈوں کی طرف دیکھتے ہوئے اور گرد و پیش کی چیزوں سے بے خبر کسی کو ڈھونڈتی ہوئی نہ جانے کدھر سے کدھر کو جلدی جلدی چلتی دکھائی دی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔۔

ہم سے دیوانے رہیں شہر میں سبحان اللہ
دشت میں قیس رہے کوہ میں فرہاد رہے

سنا ہے حفیظ خاصہ پڑھا لکھا شاعر ہے۔ ہوگا! میں نے تو اس کے ہاتھ میں آج تک کبھی کوئی کتاب، نہ دیکھی اور نہ ہی اُسے کبھی کتب خانے کی طرف جاتے دیکھا۔ جب اس نے ایک دن مجھے یہ بتایا کہ اس نے گورنمنٹ کالج لاہور سے نفسیات کا ایم۔ اے کر رکھا ہے تو میں حیران سا ہوگیا۔ مگر اکثر اس وضع قطع کا طالب علم میں نے اس کالج میں تو نہیں دیکھا۔ اور یہ نفسیات نہ جانے اُسے کیسے ہضم ہوگئی۔ اُسے مل کر تو ذرا بھی تو احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک فرض شناس خاوند، ایک شفیق باپ اور ریڈیو میں ایک ذمہ دار افسر بھی ہے۔ جب وہ پہلی دفعہ ڈپٹی ڈائرکٹر ہوکر لاہور آیا تو میں دو تین دن تک واقف ہونے پر بھی اُسے ملنے نہیں گیا۔ ایک تو اس کی نئی مصروفیات کا خیال، دوسرے میں بھی ان دنوں پریشان سا تھا۔ ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا اور میں پراگندہ روزی پراگندہ دل لاہور کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ سوچا اس بُرے حال میں حفیظ کو کیا ملوں، اس حفیظ کو جس نے مجھے کبھی بُرے آسودہ حال میں دیکھا تھا۔ اُسے آئے ابھی دو دن ہی گزرے تھے۔ رات کے کوئی ۱۱ بجے ہوں گے۔ میں اپنے تاریک کمرے میں موم کی شمع جلائے کلیاتِ میر پڑھ رہا تھا کہ ایک نحیف سی آواز آئی "ناصر" میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ حفیظ کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا "ناصر!" میں نے کہا "جی!" اور حفیظ بولا "میں اپنا درد کہاں تک چھپاؤں گا" یہ میری ایک مصرع ہے

؎ ناصر میں اپنا درد کہاں تک چھپاؤں گا

حفیظ میرے ساتھ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے میرے شعر پڑھنے کا کوئی نہ کوئی موقع ڈھونڈ لیتا ہے۔ پہلے میں اسے دل لگی سمجھتا تھا لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ واقعی ایک دردمند انسان ہے۔ وہ ہر آدمی سے اخلاص و دردمندی نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے اس انداز کو کوئی سمجھتا ہے۔ جب میں صاحب حیثیت تھا تو وہ خوش ہوتا تھا جب غریب الوطن ہوکر یہاں آیا تو اس نے مجھ سے عملی ہمدردی بھی نہیں کی اور نہ ہی کبھی کوئی امداد کی حالانکہ وہ کر سکتا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ اس نے میری غربت کا کتنا احترام کیا! بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی دوست ہو کر بھی کام نہ آئے یہ بات نہیں۔ حفیظ اصل میں کسی کو دوست نہیں بناتا اگر بناتا ہے تو اُسے بوجھ کا درجہ دیتا ہے۔ وہ ذرا اذیت پسند ہے۔ دوستوں کو مصیبت میں دیکھتا ہے تو وہ بظاہر بے نیاز رہتا ہے مگر اس کا دل روتا ہے۔ دراصل وہ اپنے ساتھ بھی یہی کرتا ہے۔ مجھے اس نے کبھی سہارا تو نہیں دیا لیکن گرنے بھی نہیں دیا۔ اور ایک وہ ایسی ہمدردی کی کرن ہے کہ آج تک اس کی بدولت چین سے دن گزار رہا ہوں۔

تقسیم ملک سے پہلے جب میں اسلامیہ کالج میں پڑھتا تھا انہی دنوں میں بھی ہوسٹل کے کمرہ نمبر میں رہتا تھا۔ میرا کمرہ دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ ماں باپ زندہ تھے، خاندانی جاہ اور نام تھا۔ خوشی برداشت کرنے کی بڑی ہمت تھی اور ہر وقت سنتے تھے کمروں کی جھنجھٹ رہتی۔ ان دنوں میں اکیلا رہتا تھا۔ ویسے میں تھا بھی اکیلا ادیب اور شاعر لوگ تو کیا ہم جماعتوں سے بھی بالکل الگ۔ وہ جیسے سب مجھے جانتے تھے یہ مجھے اب معلوم ہوا میں کمرے میں بیٹھا شاید کسی شخص کا انتظار کر رہا تھا۔ ان دنوں ایک ہی شخص کا انتظار تھا۔ وہی غالب والا شخص ——— اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کئی بار کہا کون؟ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میں پھر اپنے دھیان میں لگ گیا۔ دستک پھر ہوئی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہی چیز میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے کچھ ہنسی سی آگئی لیکن میں ضبط کر گیا۔ ان کے ساتھ پروفیسر عبدالمجید بھی تھے جن کے ذکر کے بغیر میرے احباب کا حلقہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

"معاف کیجئے۔ آپ کو زحمت ہوئی" حفیظ نے بڑے پیار سے کہا۔ میری آنکھیں پھر بھی آئیں۔ خوشی بھی ہوئی کہ ایک معروف سا آدمی میرے پاس خود چل کر آیا اور پریشانی بھی کہ انتظار کسی اور کا تھا۔ حفیظ نے حسب معمول وقت کم ہونے کی معذرت کی اور فوراً جیب سے ریڈیو کا کنٹریکٹ نکال مجھے دستخط کرنے کو کہا۔۔۔۔ میری عمر اس وقت سولہ برس ہوگی اور میرے پاس صرف چار پانچ غزلیں ہی اس قابل تھیں کہ کسی ادبی مجلس میں سنائی جا سکیں۔ میں کچھ چپ سا ہوگیا۔ پھر خیال آیا کہ حفیظ سے میری کوئی دوستی بھی نہیں کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی دنیائے ادب میں مجھے کوئی جانتا ہے۔ یہی سوچ کر میں نے دعوت منظور کر لی۔ وہ دن اور آج کا دن ایسی سیکڑوں ہی دعوتیں مل چکی ہیں بلکہ بعض وقت تو ایسی دعوتوں کا انتظار سا بھی رہتا ہے۔ کیونکہ روزی کا سوال ہوتا ہو کبھی یہی سوچا نہیں کہ وہ دلکش گھڑی بڑی گھڑی تھی جب میں ریڈیو کے مشاعرے میں شریک ہوا۔ میری غزل پڑھتا تھا وہ لوگ مجھے جانتے تھے اور نہ ہی میری زندگی اس سکھ کے دن دیکھنے کا وہم ہوتی۔ پھر یہ سلسلہ کبھی کچھ لوگ مجھے کہیں پہ صورت سے جانتا تھا۔ لیکن اب اس کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ کوئی کمک بن گیا کوئی

افسر ہو گی کوئی پاگل ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

آل انڈیا ریڈیو میں حنیف جب پروگرام اسسٹنٹ تھا تو بھی وہ سیدھی سادی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے افسر خود چل کر اس کے کمرے میں آتے تھے۔ اب ڈائرکٹر ہے۔ اب بھی یہی حال ہے۔ میں اس کے دفتر گیا، چپراسی کو چٹ دی، وہ اٹھ کر ملا۔ سگریٹ پیش کی اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے یوں لگا کہ شاید ڈائرکٹر صاحب سے کوئی دیہاتی رشتہ دار ملنے آ گئے ہیں پھر کام خیال آیا کہ یہ تو وہی حنیف ہے۔ اتنا سیدھا سادا افسر میں نے اس سے پہلے اس کے دفتر کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کی۔ دلچسپی افسری کی تعریف اور وہی بدگوئی۔ وہ دوسروں کے متعلق بہت ہی کم باتیں کرتا ہے۔ بلا کا محنتی ہے۔ صبح نو بجے سے چراغ جلنے تک کام کرنا تو جیسے اس کا معمول ہے۔ دیانتداری اور محنت سے کام کرنا یوں تو اس کی فطرت میں شامل ہے لیکن اس میں میاں بشیر احمد صاحب کو بھی دخل ہے۔ وہ میاں صاحب کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں انجمن اردو پنجاب میں بحیثیت اسسٹنٹ سیکرٹری کام کرتا رہا۔ اور میاں صاحب ان گنے چنے لوگوں میں سے ہیں جنہیں وہ اپنا دوست سمجھنے کے علاوہ ایک بہت بڑا انسان بھی کہتا ہے۔

حنیف کو پرانی اور نایاب کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ یہ شوق اسے اپنے بڑے بھائی واقف مرحوم سے ورثے میں ملا۔ اس کی کتابیں دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا کہ یہ شخص ایسی نایاب کتابیں کس وقت پڑھتا ہوگا۔ اس کے پاس فارسی، اردو کے تذکرے، پرانے شعراء کے دیوان، کچھ قلمی نسخے اور بعض نایاب کتابیں ہیں۔ موسیقی، تصوف، صرف و نحو، لسانیات اور بعض تاریخی کتابوں سے اس کی الماریاں اٹی پڑی ہیں۔ وہ اچھی کتابیں کسی کو نہیں دیتا۔ بالکل اسی طرح وہ کسی کو قرض نہیں دیتا۔ مجھے اس کی یہ بات بڑی بری لگتی ہے۔ یہ ایک اچھا اصول سہی لیکن اس میں خود غرضی کا ایک پہلو بھی نکلتا ہے۔ کتابوں کا اسے بری طرح خبط ہے۔ میرے خیال میں وہ ان کی صرف دیکھ بھال ہی کرتا ہے۔ چھٹی کے دن جب بھی میں نے پوچھا کہ بھائی کہاں چلے ہو تو اکثر یہی جواب ملا چلتے ہو تو کچھ رشتہ داروں سے ملنے جانا ہے یا پھر کشمیری بازار جا رہا ہوں، شاید کوئی کتاب ہاتھ لگے۔ ایک دفعہ میں اس کے ہاں بیٹھا تھا کہ واقف مرحوم کے ذکر سے حیات کا دیوان نکلا۔ یہ بڑا کم یاب اور پرانا نسخہ تھا۔ اس کی بڑی بچی صبیحہ نے بجلی کا پنکھا بند کر دیا۔ کہنے لگی "اس کتاب کے اوراق بہت بوسیدہ ہیں آپ پڑھ لیں پھر پنکھا چلا دوں گی" میں نے حنیف کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ صبیحہ بڑی ذہین ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بغیر حنیف کی شخصیت ادھوری رہ جاتی ہے۔ وہ اور اس کے دوسرے بہن بھائی حنیف کو بھائی حنیف کرنی ہوشیار پوری کہتے تھے۔ ماں باپ نے تو نام عبدالحفیظ رکھا تھا۔ اصل حنیف نے خود اتار دیا۔ ہم اور اس کی اولاد میں سے صبیحہ سے پوچھا کرنی کے کیا معنی ہیں وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی کہنے لگی "ایک" میں نے کہا "ایک چیز" وہ شرما کر بھاگ گئی۔ صبیحہ کی ذہانت کا ایک لطیفہ ہو گیا۔ ایک دفعہ حنیف نے مجھے نو عالم اور شیخ صلاح الدین کو چائے پر بلایا۔ حنیف نو عالم کو قطب عالم کہتا ہے۔ صبیحہ فوراً بول اٹھی یہ عالم ہیں یا عالم اور یہ قطب ہے یا کتب۔ ہم سب حیران رہ گئے۔ حنیف بھی لفظوں کا رسیا ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ اپنی بچی کا شاگرد ہے۔

حنیف بڑی رنگین زندگی بسر کرتا ہے۔ بے کیف اور بعض اوقات بے معنی باتیں بھی کر لیتا ہے۔ اس کے لطیفے اتنے خشک ہوتے ہیں کہ اس کے بڑے بڑے عقیدت مند تنگ آ کر ادھر ادھر بھاگنے لگتے ہیں۔ بعض تو روٹھ بھی جاتے ہیں۔ لیکن مجھے اکثر یوں لگتا ہے کہ یہ شخص بہروپیا ہے۔ اس کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ۔ لیکن یہ تو منافق کی تعریف ہے۔ وہ منافق نہیں۔

جلتے ہیں کس کو دیکھ کے دلسوزیٔ احباب
یعنی مری بزم فروزاں نہ ہوئے ہم

اُسے تاریخ گوئی پر بڑا عبور حاصل ہے۔ اور یہ فن بھی اس نے واقف مرحوم سے سیکھا۔ چلتے چلتے اشتہاروں کو دیکھ کر تاریخ نکال دیگا۔ آپ کی باتوں میں سے کوئی بھی فقرے سے نکال دیگا۔ میں نے تو ایک دفعہ اس کی تاریخ گوئی سے [illegible] میں شادی کر لی۔ اس نے فوراً ایک تاریخ کہی۔

شاعر شیریں بیاں شادی شدہ — ہر قدم سے آ رہی تھی ہر جگہ ناصر کاظمی
شادی ہوئی تاریخ ہے پابند ناصر کاظمی

صبیح کو جب معلوم ہوا تو اس نے فوراً کہا۔

ناصر کاظمی
۱۹۵۲

کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ یہ سارا خاندان ہی آدم گر ہے۔ حنیفؔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتا ہے۔

حنیفؔ میں بہت سی انسانی کمزوریاں ہیں لیکن گوارا کرنی پڑتی ہیں۔ وہ فن کی بو سونگھ لیتا ہے۔ اچھی سے اچھی غزل سنا دیجیے بھانپ جائے گا۔ ایک شعر یہ شاعروں ایسے علم کا قائل ہے جو الفاظ میں منتقل ہو۔ صرف و نحو، عروض اور زبان پر اسے پورا عبور حاصل ہے۔ لفظوں کا بے محل و بے محل استعمال اس طرح کرے گا کہ شعر کانوں کو برا لگنے لگتا ہے۔ اس کی بے کیفی اور بے رونقی کے باوجود وہ بڑا اچھا انسان بھی ہے۔ وہ دوستی ترک کر سکتا ہے لیکن دشمنی نہیں کر سکتا۔ اس نے اپنی خشک باتوں سے لوگوں کو خاصا مایوس کر رکھا ہے۔ شاعری کا رسیا ہے۔ جب بھی فرصت ملے فکر سخن کرتا ہے لیکن داد و تحسین سے بالکل بے نیاز ہے۔ اہم باتیں سرسری طور پر کرے گا اور معمولی باتوں کو بڑی اہمیت دے گا۔ ہر طرح سے ملنے والوں کا امتحان لیگا اور جو اتنے تمام کیسے گا اُسے دل میں رکھے گا۔ وہ شیر کی کھال پہن کر بچوں کو ڈرانے کے بہت خلاف ہے۔ اسی لئے اس کی شخصیت بڑی نرم و نازک اور دھیمی سی ہے۔ کبھی کچا نہیں بیٹھتا۔ جہاں ہو بوڑھا ہو یا بچہ ہو اُسے کسی نہ کسی طرح چھیڑے گا۔ بیٹھنے کو جھنسائے گا۔ جیسے ملا اسے احساس ہو گا وہ کچھ کہے گا لیکن وہ بڑا ہو جاتا ہے بیٹھے گا۔ حاضر جواب ہے۔ آپ حیران ہونگے کسی چیز کا جواب نہیں دیا اور کا جواب شعر میں دیا۔ پھر آپ کو پتہ چلے گا کہ وہ کبھی پڑھتے آدمی کی ذہنی سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک بات کو ہر موقع بے محل و بے محل استعمال کرے گا کہ آپ بیٹھنے کی اہمیت کے قائل ہو جائیں گے۔ مجلس آپ کو کسی نہ کسی بات پر جھنجھلا دے گا اور خود سنجیدہ ہو جائے گا۔ ویسے میں نے اسے روتے بھی دیکھا ہے۔ یہ بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر۔ آتے جاتے دیکھو تو ہنس ہنس کے مر جاؤ گے۔ تم اسے دیکھو تو رو پڑو گے۔

حنیفؔ کی غزل روایت سے آشنا ہے لیکن کسی کا غالب نہیں ہوتا ہے۔ دراصل وہ اپنے آپ کو روایت سے کسی طرح بھی الگ نہیں کرنا چاہتا۔ وہ بہترین اُستاد ہے۔ غالبؔ کو جب لوگوں نے بے اُستاد کہا تو اس نے ایک فرضی اُستاد ایجاد کیا۔ مجھے قسمت سے اس اُستاد مل گیا۔ اس جیسے فی البدیہہ شعر کہنے والے کم ہی دیکھے ہیں۔ اکثر میرؔ تو اس نے بھی پڑھا ہے مگر وہ خواہ مخواہ میرؔ کے قریب کرنے کا قائل نہیں۔ بیدلؔ اور غالبؔ کا قائل ہے۔ ویسے میرؔ کا نام اس نے اپنے ایک مقطع میں استعمال بھی کیا ہے۔

نقش ہے قولِ میرؔ دل پہ حنیفؔ
"کیا عبارت غموں نے لکھائی ہے"

مگر شیخ صلاح الدین نے اسے قائل کر لیا کہ اس پر میرؔ کا بھی اثر ہے۔ شیخ صلاح الدین کا ذکر میں نے یہاں اس لئے کیا کہ یہ ایک ایسا شخص ہے جس کی بات سننا کبھی نہیں بھولتا خواہ وہ کیسی ہو یا اس میں کوئی کھوٹ ہو۔

جس زمانے میں حنیفؔ سے اپنی دوستی ہوئی وہ زمانہ غزل گو شعراء کیلئے بہت بھاری زمانہ تھا۔ جیسے میں دو چار کا لکھیں کچھ یاد تھا۔ لیکن حنیفؔ اپنی روش پر ڈٹا رہا۔ وہ کھمبے کی طرح گھڑی گاڑ کر بیٹھا رہا۔ اور اس نے اسی کنج تنہائی میں رہ کر بڑے حوصلے سے مروا لگی۔ شاعروں جل سے ہیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا غزل کے فن میں کوئی ہے تو ہے۔ اس کا معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ دور حاضر نے اُسے عام قبولیت کے طغرے سے ذرا محروم سا رکھا ہے لیکن اس سے اس کے مقام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے سینکڑوں ہی غزلیں کہی ہیں۔ لیکن یہ اسی کا حوصلہ ہے کہ اس نے ابھی تک صاحب دیوان بننا نہیں چاہا۔ میں کہہ رہا تھا کہ ان دنوں ادیبوں پر روایت سے بغاوت کرنے کا بھوت سوار تھا۔ وہ الٹی سیدھی باتیں لکھ کر صرف شہرت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پرانی نسل کا دور تو گزر گیا لیکن ابھی ان کے نام باقی ہیں۔ بعض لوگ تو اساتذہ کی تقلید ہی کو شاعری سمجھتے ہیں۔ بعضوں کا یہ حال ہے کہ بے سر پیر کے مصرعے موزوں کرکے ہی قانع ہیں۔ اس پورے دور کے جواب میں حنیفؔ کا یہ شعر کافی ہے۔

بہت بلند ہے اس سے میرا مقامِ غزل اگرچہ میں نے محبت کے گیت بھی گائے

مجھے تو یوں لگتا ہے کہ حنیفؔ اپنے آپ کا کوئی ساتھی ہے۔ جو بچوں کی طرح ہنستا ہے روتا ہے اور ضد کرتا ہے جب بھی اس سے ملتا ہوں جیب میں ہاتھ ڈالو۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے ابھی سرنگ سے چھپکلیاں نکل رہا ہو۔

ن - م - راشد

عطاء اللہ سجاد

راشد اور میں زندگی میں ایک دوسرے کے اس قدر قریب رہے ہیں اور ہماری رفاقت اس قدر طویل رہی ہے کہ میرے لئے ایک خارجی معروضی حیثیت سے اس کی ذات اور شخصیت کا تجزیہ کرنا بے حد مشکل ہے۔

راشد سے میری ملاقات آج سے قریباً اٹھائیس سال قبل دسمبر ۱۹۳۵ء کی ایک شام کو ہوئی تھی۔ خیال تھا وہ شام بھی دوسری عام شاموں کی طرح بے حد خشک اور مغز فرسا رہنے والی ہوگی لیکن میرے لئے اس کے تصور میں آسودگی اور راحت کے احساس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

ضلع گوجرانوالہ کے ایک معمولی سے قصبہ سکھیکی منڈی میں ہمارے مرحوم دوست اشرف کا مکان تھا۔ اشرف نے ہمارا تعارف کرایا۔ عطاء اللہ۔ نذر محمد۔ میں نے دیکھا نذر محمد گندمی رنگ کا ایک خوب رو نوجوان ہے جس کی لمبی پلکیں اس کی عینک کے شیشوں میں سے بھی نمایاں تھیں۔ جن لوگوں نے گذشتہ پندرہ سال میں راشد سے ملاقات کی ہے وہ شاید میرے اس بیان کو میری دوستانہ نظر کی خوش فہمی پر محمول کریں کیونکہ راشد کے چہرے پر آج کل جوانی کی اس لطافت اور دلکشی کی بجائے ایک درشتی جھلکتی ہے جسے اس کی ملازمت نے اور بھی گہرا کر دیا ہے۔

اصل میں راشد نے بے حد حساس طبیعت پائی ہے۔ اپنی ملازمت کے دوران میں وہ کئی بار استعفیٰ دے چکا ہے۔ لیکن وہ کوئی بڑبولا آدمی نہیں وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا ہے اور قدرتی طور پر اس کا چہرہ اس کے اندرونی خلفشار سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اس کے اپنے قول کے مطابق [illegible] ہمارے ایک دوست نے اس کے متعلق (BORN UNHAPPY) یعنی پیدائشی افسردہ دل کی پھبتی کسی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طبیعت کا آدمی محفل آرائی کے لئے مشہور نہیں۔ اس کی کم آمیزی اور کم گوئی بعض لوگوں کے دلوں میں اس کی طرف سے بے جا طور پر بُعد اور خشکی کا ایک احساس پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے باوجود جب وہ اپنے مخصوص حلقۂ احباب میں موجود ہوتا ہے تو کم آمیزی کی دھند چھٹ جاتی ہے اور مروت و اخلاص کی روشنی اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

جس وقت ہماری ملاقات ہوئی وہ اپنے نام کے ساتھ راشد حیدری لکھتا تھا۔ جب میرا اس سے تعارف ہوا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہی نذر محمد راشد حیدری ہے چنانچہ میں نے ادب میں محبت کے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے جب اس سے راشد حیدری کی ایک نظم "اے محبت ....." کا ذکر کیا جو اس سے چند ماہ پہلے کے ادبی دنیا میں شائع ہوئی تھی تو اس نے بڑے منکسرانہ انداز میں کہا کہ وہ نظم میری ہے۔ میں یہ سن کر اچھل پڑا اور اس سے دوبارہ

ہاتھ ملاکر کہا کہ مجھے آپ سے مل کر واقعی بے حد خوشی ہوئی۔ راشد نے مسکرا کر اشرف سے کہا ابھی انہیں یہ معلوم کر کے کہ میں راشد وحیدی ہوں واقعی بے حد خوشی ہوئی ہے۔ شاید اس فقرے میں یہ طنز پوشیدہ تھی کہ مجھ سے پہلے مل کر اس شخص کو جس خوشی کا اظہار کیا تھا وہ محض رسمی تھا۔ راشد اپنے نام کے ساتھ وحیدی اپنے ایک ماموں وحید گیلانی سے اظہار عقیدت کے طور پر لکھتا تھا۔ وحید گیلانی مرحوم بھاٹی گیٹ اسلامیہ ہائی سکول میں سیکنڈ ماسٹر تھے لیکن انہوں نے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء تک "قوس قزح" کے نام سے ایک ایسا ادبی مجلہ شائع کیا جس کی مثال آج بھی کہیں نہیں ملتی۔ "قوس قزح" اردو صحافت میں ایک سے زیادہ صورتوں کا علمبردار اور شعر و ادب کے ایک نئے دور کا نقیب تھا۔ اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس وقت کی نوجوان پود اس مجلہ کے ادبی کارناموں سے بے حد متاثر ہوئی۔

سکھیکی میں راشد اور میں نے جو آٹھ دس دن مل کر کاٹے وہ ایک پائدار اور دائمی دوستی کی بنیاد بن گئے۔ ہر روز سہ پہر ہم اشرف مرحوم کے مکان کے سامنے سڑک کے کنارے کرسیاں بچھا کر بیٹھ جاتے اور پھر گلشن شعر و ادب کا چرچا رہتا۔ لطیفہ گوئی ہوتی اور اپنا اپنا کلام سنایا جاتا۔ ہمارے پاس سے کپڑے دھونے والی عورتوں کی ٹولیاں جنسی مذاق کرتی اور ہنستی کھیلتی گزر جاتیں۔ اور ہم قہقہوں سے اشرف مرحوم جس رنگینی کی اس فراوانی سے خوب محظوظ ہوتا۔ انہی دنوں کی یاد میں راشد نے لاہور پہنچ کر ایک نظم بھی لکھی تھی جس کے چند مصرعے مجھے اب تک یاد ہیں۔

آہ وہ سکھیکی کی جنڈی وہ پھوسی ناڑوں کے ڈھیر

……

ہر سحر وہ میلے کپڑے لے کے آنا نہر پر
اور تعفن بھیجنا صابن کا نہر کی ہر لہر پر
وہ کوشلیا کی ہنسی، وہ جس کا نام آتا نہیں
جس کے نغمے یاد ہیں جس کی ادائیں یاد ہیں

راشد کی پیدائش سنہ ۱۹۱۰ء میں اس کے آبائی وطن اکال گڑھ میں ہوئی۔ اکال گڑھ پنجاب کے ضلع گوجرانوالہ کا ایک تاریخی شہر ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ پنجاب کا حسن اگرچہ راشد کو شاعر تو بنا سکتا ہے لیکن اسے رانجھا یا مہینوال نہیں بنا سکا ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی ہیر یا سوہنی داخل نہیں ہوئی۔ اگرچہ اس نے اردو ادب کو چند لاجواب حسین نظمیں بخشی ہیں لیکن اس کی کتاب حیات میں معاشقہ کا کوئی باب نہیں۔ البتہ اس نے متوسط گھرانے کے ایک شریف مسلمان نوجوان کی طرح اپنی ماموں زاد کے لئے جو اس کی منگیتر تھی اور اب اس کی رفیقہ حیات ہے ضرور ایک نظم لکھی تھی۔ ایک بند مجھے یاد رہ گیا ہے۔

حریم عفت و عصمت میں ہے قیام اس کا
طواف خانۂ جنت میں ہے خرام اس کا
تمام دہر سے بڑھ کر ہے احترام اس کا

اسی سے پیار مجھے ہے اسی سے پیار مجھے

راشد افلاطونی عشق کا قائل نہیں۔ اختر شیرانی سے کسب فیض کرنے کے باوجود وہ اس کے اس نظریہ سے کبھی متفق نہیں ہوا جو اکثر یاد وصل میں ہوائی گھوڑا لیتا تھا۔ اس کی نظم "حسن انساں" افلاطونی نظریۂ عشق پر ایک طنز ہے۔ اس کے نزدیک جسم اور روح دونوں کے آہنگ کا نام محبت ہے۔ غالباً دور حاضر کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے اس جسارت کے ساتھ محبت میں جسم کے آہنگ پر زور دیا ہے اور محبت کے افلاطونی نظریہ کی تضحیک کی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ راشد کی زندگی کسی "ایپیکیورین" کی زندگی رہی ہے بلکہ اس کے برخلاف وہ ان تمام "قیود" INHIBITIONS پر بھی عمل پیرا رہا ہے جن کی تعلیم اس جیسے لوگوں کو اپنے گھروں میں ملتی رہی ہے۔ البتہ اس نے زندگی میں جنس کی اہم حقیقت پر ہمیشہ زور دیا ہے اور جنس کے متعلق اس کا نظریہ ہمارے نوجوانوں کی دلچسپ اور طویل بحثوں کا موضوع بنا رہا ہے جن میں ہم چند گنے چنے احباب شریک تھے۔ راشد نے اپنی مشہور نظم "انتقام" لکھی جس میں ایک مصرع تھا

میرے ہونٹوں نے تجھے پیدا کیا

میں نے کہا اس کی بجائے

میرے خوابوں نے تجھے پیدا کیا

ہونا چاہئے۔ راشد نے کہا اگر میں ہونٹوں کی بجائے خوابوں لکھ دوں تو میرا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

وہ جب ہم تقریباً تین سال قلعہ گوجر سنگھ میں مقیم رہے۔ میں اور چودھری اب مسٹر جسٹس محمد یعقوب علی خاں اورینٹل کالج میں پڑھتے تھے اور راشد ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد مولانا تاجور کے نئے رسالہ شاہکار کی ادارت کرتا تھا۔ وہ زمانہ ہمارے لئے تنگدستی اور عسرت کا زمانہ تھا۔ ان سیکڑوں بے مایہ نوجوانوں کی طرح جو لاہور جیسے غدار شہر میں جو جھا کے سے وارد ہوتے ہیں ہم لوگ بھی اپنے لئے راستہ بنا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ زندہ رہنے کے لئے تگ و دو کر رہے تھے لیکن ان دنوں کی بے فکری۔ خود اعتمادی، صلاحیت کا اور بھی [illegible] کہیں نظر نہیں آتی۔ ہم نے اپنے مکان کا نام لاشئے یعنی آشیانہ رکھا ہوا تھا۔ میں اورینٹل کالج میں پڑھنے کے علاوہ احسان کے عملۂ ادارت میں بھی منسلک تھا اور شام کو جب میں دس بارہ گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد لاشئے میں واپس آتا تو وہ خانہ مستوں کی پھبتیاں میرا استقبال کرتیں۔ بے فکرے قہقہے بلند ہوتے اور اس کے بعد زندگی کی ہر چیز مسکراتی ہوئی نظر آتی۔

لاشئے میں ہمارے نقل مکان کرنے کا پہلا دن تھا۔ شام کے وقت پروفیسر احمد شاہ بخاری تشریف لائے۔ ہماری کتابیں ابھی چارپائیوں پر پڑی تھیں اور بخاری صاحب کو بٹھانے کے لئے اس وقت ہمارے پاس کوئی کرسی نہیں تھی۔ بخاری صاحب نے کتابوں کو چارپائی پر دیکھا تو

چار پائے برو کتابے چند

کی پھبتی کہی۔ راشد نے کرسی نہ ہونے پر معذرت کی اور چارپائی خالی کر دی۔ اب بخاری صاحب جو بیٹھے ہیں تو علم و ادب کے دفتر کھل گئے۔ اتفاقات کے ایک ایک مصرعہ پر داد دی، راشد کی تشبیہات کے سلسلہ میں [illegible] کی تشبیہات کا ذکر آیا۔ اس وقت کی انگریزی شاعری کے رجحانات پر سیر حاصل تبصرہ ہوا۔ راشد نے امریکہ کا ایک رسالہ دکھایا جس میں "اتفاقات" کا انگریزی ترجمہ چھپا تھا۔ انگریزی میں پڑھ کر فرمایا "راشد تم سے انصاف نہیں ہوا"

غالباً یہ علمی صحبت دو ڈھائی گھنٹے جاری رہی۔ اور اس کے بعد صرف ایک بار ہم بخاری صاحب کی زیارت سے لاشئے میں بہرہ ور ہوئے۔

لاشئے میں اختر شیرانی مرحوم، مولانا تاجور، راجہ مہدی علی خاں اور راشد کے دو ہم جماعت آغا عبد الحمید اور محمد فاروق بھی آیا کرتے تھے کبھی کبھی مولانا چراغ حسن حسرت بھی تشریف لاتے کیونکہ وہ "احسان" میں میرے رفیق کار تھے اور میں انہیں گھسیٹ لایا کرتا تھا۔ مولانا تاجور کا ہر معاملے کے متعلق بات کرنے کا اپنا ڈھنگ تھا اور ان دنوں "[illegible]" کے مصداق ان کی باتیں ہمارے لئے کئی کئی ایک ہفتے کے مذاق کا موضوع بن جاتیں۔

راشد کو مولانا ان دنوں غالباً پچیس روپے ماہوار تنخواہ دیا کرتے تھے۔ مولانا کا تمام کاروبار ان کے برادر نسبتی سلیمان خاں صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ اور مولانا ایک مشکل صورت حال سے بچنے کے لئے ہمیشہ سلیمان خاں صاحب کو سپر کے طور پر استعمال کرتے۔ مثلاً اگر وہ راشد کے کسی اداریے یا نظم کی تعریف کرتے تو ہم کہتے کہ مولانا بجا ہے راشد کی تنخواہ میں بھی اضافہ فرمائیے تو کہتے "بھئی یہ تم نے بڑی مشکل بات کہی۔ اگر راشد کو ترقی دوں تو پھر سلیمان خاں بھی مانگے گا۔ اب تم ہی بتاؤ میں اسے کیسے انکار کر سکوں گا۔ وہ میری بیوی کا بھائی ہے۔ بھئی ترقی کی بات اس وقت دیکھی جاوے گی پہلے سے راشد کی تنخواہ بڑھا دوں گا۔

اگر کسی اخبار یا رسالہ میں مولانا یا شاہکار کے متعلق کوئی تنقید شائع ہوتی اور ہم لوگ مولانا سے اس کا تذکرہ کرتے تو مولانا بڑی سنجیدگی سے فرماتے بھئی یہ تو غنڈوں کی ایک پارٹی ہے [illegible]۔ انہوں نے تو مجھے ختم کرنے کے لئے ہزاروں روپے چندہ جمع کر رکھا ہے۔"

قلعہ گوجر سنگھ کے قیام کا زمانہ راشد کی شاعری کا بہترین زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں اس نے "آنکھوں کے جال" "زوال" اور [illegible] نظمیں لکھیں۔ کبھی کبھی اس کی کسی نظم پر بحث کے دوران میں میں اس کی نظم کی پیروڈی شروع کر دیتا۔ یہ اس کی دکھتی رگ تھی اور ایک دن تو اس نے بڑی

سنجیدگی کے ساتھ مجھ سے سوال کیا کہ کیا میری نظمیں واقعی اس قدر ناقابلِ تفہیم ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال میرے طرزِ عمل پر ناراضی کا بلاواسطہ اظہار تھا۔ وہ خود اُسے بھی اور اس کے لاتعداد مداحوں کو اس وقت بھی یقین تھا کہ راشد نے اردو ادب پر شعر و سخن کی کئی نادیدہ اور شاداب دنیاؤں کے دروازے کھول دیئے ہیں۔

راشد ایک بے حد شاداب تخیل کا مالک ہے۔ اس تخیل، اپنی مخصوص Diction اور اچھوتی تشبیہات کے زور سے وہ ایک معمولی تجربہ کو ایک عظیم نظم کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ عرب ہوٹل کے ایک نیم روشن اور تنگ کمرے میں ایک شام کھانا کھاتے اس نے دیکھا کہ اس کے گلاس کا عکس سفید پتھر کی میز کی سطح پر پڑ رہا تھا۔ چند دن کے بعد اس نے اپنی نظم "آنکھوں کے جال" مکمل کر لی جس میں اب یہ مصرعے پڑھتا ہوں تو عرب ہوٹل کی وہ شام یاد آ جاتی ہے۔

آہ! تیری مدبھری آنکھوں کے جال
میز کی سطح درخشندہ کو دیکھ
کیسے پیمانوں کا عکس سیمگوں
اس کی بے اندازہ گہرائی میں ہے ڈوبا ہوا

"زوال" کا پس منظر ہمارے مکان کے دریچے کا صحن ہے جس میں گوندنی کے ایک درخت کے پیچھے سے راشد نے چاند کو اُبھرتے دیکھا اور یہیں ایک ایسی نظم تخلیق کی جو اپنے تاثر میں لازوال ہے۔

لاہور میں ادب کو ذریعۂ معاش بنانے کی کوشش ناکام ہونے کے بعد راشد نے کمشنر ملتان کے دفتر میں کلرکی پر قناعت کر لی۔ یہ اس کی زندگی کا غالباً تلخ ترین زمانہ تھا۔ تنگ دستی، قلیل تنخواہ، متاہل زندگی کی ذمہ داریاں، مزاج اور نیم خواندہ افسروں کی رعونت اور ملازمت کے لئے اس کی طبیعت کی ناموزونیت ان سب چیزوں نے اس کی حساس طبیعت پر بے حد اثر کیا۔ اس کی اس زمانے کی نظموں سے بھی یہ تلخی نمایاں ہے۔ "شاعر درماندہ" اسی دور کی یادگار ہے اور [illegible] ان دنوں غالباً یہ پہلی حقیقی نظم ہے جو سیاسی پس منظر کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

اس زمانے میں راشد خاکسار تحریک میں شامل ہو گیا اور سی۔ آئی۔ ڈی نے کمشنر کو اس کے خلاف رپورٹیں بھیجنی شروع کیں۔ دفتر کا سپرنٹنڈنٹ پہلے ہی اس لئے مخالف تھا کہ راشد اس کے سامنے ٹوپی پہن کر نہیں آتا تھا۔ اس نے بھی رنگ آمیزی کی لیکن خوش قسمتی سے کمشنر مشہور علم دوست مسٹر کنگ تھے۔ انھوں نے اس سی۔ آئی۔ ڈی والوں کو ڈانٹ پلا دی اور راشد سے ان کا رویہ ہمدردانہ ہو گیا۔ اس کے بعد راشد کو ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ ان دنوں آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر فیلڈن تھے۔ راشد نے جاتے ہی ان سے کہا

"جناب میں خاکسار تحریک میں شامل ہوں، کیا اس بات کا میری ملازمت پر کوئی اثر پڑے گا"

فیلڈن صاحب نے مسکرا کر کہا "تمہارا ارادہ ہمارے کسی سٹوڈیو پر بم پھینکنے کا ہے؟"

راشد نے جواب دیا "نہیں"

"تو پھر جاؤ اپنا کام کرو"

دہلی کے دوران قیام میں بھی راشد کے مزاج کا حد سے بڑھا ہوا احساسِ عزتِ نفس اور ذکاوتِ حس باعثِ زحمت بنتے رہے۔ اسٹیشن ڈائرکٹر مسٹر ایڈوانی سے مسلسل دانتا کل کل رہی۔ ایک دفعہ ریڈیو کے اعلیٰ افسران نے حکم دیا کہ پروگرام اسسٹنٹ پروگراموں کے نشر کے دوران میں کھانا نہ کھایا کریں۔ راشد نے یہ حکم سنا تو کہنے لگا "ہم کوئی ورکشاپ ہیں کہ ہم پر ایسے حکم نافذ کئے جاتے ہیں۔" ایڈوانی صاحب کہنے لگے کہ میں تمہاری یہ بات افسرانِ متعلقہ تک پہنچا دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور راشد کچھ عرصے کے لئے اس وجہ سے افسروں کے زیرِ عتاب

رہا۔ اسی طرح ایک دفعہ ریڈیو کے انگریز چیف انجینیئر سے لڑائی ہو گئی۔ راشد انتظار کے کمرے میں ایک کرسی پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا کہ چیف انجینیئر صاحب وارد ہوئے اور انھوں نے حکم دیا کہ وہ ٹانگیں پھیلا کر نہ بیٹھے۔ راشد نے ان کی طرف دیکھ کر کہا کہ آپ تشریف لے جائیے اور اپنا کام کیجئے۔ آپ کو اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ میں کس طرح بیٹھتا ہوں۔ چیف انجینیئر صاحب نے رپورٹ کر دی اور معاملہ افسران بالا تک گیا لیکن راشد اپنی پوزیشن پر اڑا رہا۔

دہلی کے دوران قیام میں راشد نے اپنی نظم "زنجیر" کے قریب لکھی جس میں سیاسی غلامی کا اظہار زیادہ شدت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

راشد کی زنجیری نظم ہے جو اس نے یاد داشت کی۔

جنگ عظیم کے دوران میں راشد فوج کے محکمہ نشر و اشاعت میں کپتان بھرتی ہو کر چلا گیا اور اس ملازمت میں وہ قاہرہ، تہران اور عراق میں تعینات رہا۔ تہران کے دوران قیام میں اس نے وہ نظمیں لکھیں جو اب "ایران میں اجنبی" کے نام سے اس کے دوسرے مجموعہ کلام میں چھپ رہی ہیں۔

فوج کی ملازمت بھی راشد کو راس نہ آئی اور وہاں بھی اس نے افسروں کے جبر و تعدی کے خلاف احتجاج کے طور پر استعفیٰ دے دیا اور ریڈیو کے محکمہ میں واپس آ گیا۔ آج کل وہ نیویارک میں یونائیٹڈ نیشنز (U N O) کے ریڈیو یونٹ میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدہ پر تعینات ہے۔ یہ کام اسے بے حد پسند ہے اور وہ اپنی موجودہ ملازمت پر خوش معلوم ہوتا ہے۔

راشد ایک صاف گو انسان اور بے حد مخلص دوست ہے۔ اسے اپنی نفرت یا ناپسندیدگی چھپانے کے لئے ملائم الفاظ کا انتخاب کرنا نہیں آتا۔ وہ دوستوں کے وار بڑی خندہ پیشانی سے سینے پر سہہ لیتا ہے لیکن اگر اسے یہ شبہ ہو کہ فلاں گوشہ سے فلاں بات اسے ذلیل کرنے کے لئے اور محض حسد اور بغض کی وجہ سے کی گئی ہے تو پھر وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتا ہے۔ دلی میں جب ہمارے ایک مرحوم و مغفور دوست سے (جن کے لئے میرے دل میں ہمیشہ بے حد محبت اور عزت رہی ہے) راشد کے تعلقات خراب ہو گئے اور جانبین نے ایک دوسرے کی طرف توپوں کے منہ پھیر دیے تو راشد نے اپنی معرکہ کی ہجو "اشتراکی" لکھی۔ یہ نظم ایک ہجو کی حیثیت سے اتنی کامیاب تھی کہ اس نے اپنے حریف سے بھی داد وصول کی۔ کچھ عرصہ کے بعد دونوں دوستوں میں مصالحت ہو گئی اور محبت کے شفاف پانی نے تمام گرد و غبار دھو دیے۔

مرحوم کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے راشد رخصت پر لاہور آیا ہوا تھا اور مرحوم نے کئی بار مجھ سے ذکر کیا کہ راشد اور بیگم راشد ان کی تیمارداری کے لئے ایک سے زیادہ بار آئے تھے۔

راشد ایک مخلص دوست، ایک شائستہ لیکن ناخوش گو انسان ہے۔ وہ اپنی رائے کے اظہار کے لئے مبہم اور نرم الفاظ تلاش نہیں کرتا بلکہ جس انداز میں وہ کوئی بات محسوس کرتا ہے اسی انداز میں کہہ دیتا ہے۔ شاید یہ اس کے کردار کی خامی ہو لیکن آج کل زندگی کی قدر بدل گئی ہے اور لوگ سانپ کے زہر کی بجائے اس کے حسن پر زور دینے لگے ہیں۔

احمد علی

سید علی اکبر قاصد

میرے مضمون کا عنوان "احمد علی" بہت ادھورا اور نامکمل سا ہے —— کبھی ہیر کٹنگ سیلون والے آپ کے سر کے بال زیادہ تراش دیں تو آپ کا چہرہ دو چار دن عجب اجنبی اجنبی سا لگے گا۔ اسی طرح احمد علی کا نام پروفیسر کے دُم چھلّے کے بغیر عجیب عجیب سا لگتا ہے —— ہاں یہ ذکرِ خیر ہے پروفیسر احمد علی کا —— "انگارے" والے احمد علی —— "ٹوئی لائٹ اِن ڈیلی" والے احمد علی —— لکھنؤ یونیورسٹی والے احمد علی اور حکومت پاکستان کے محکمۂ امور خارجہ والے احمد علی۔

آج سے کوئی پندرہ سال پہلے میرے استاد پروفیسر کلیم الدین احمد نے ایک بھری محفل میں کہا تھا کہ "احمد علی کے افسانوں میں زندگی کا مزاج ملتا ہے اور احمد علی نے تھوڑا ہی لکھ کر ادب میں اپنا ایک انفرادی مقام حاصل کر لیا ہے —— اس وقت میرے دل میں احمد علی سے ملاقات کی تمنا ابھری تھی —— اور طالب علمی و کم عمری کا وہ جذبہ بھی دل میں پیدا ہوا تھا کہ کاش میں بھی احمد علی کی طرح لکھ سکتا —— میں "احمد علی کی طرح" لکھ تو نہ سکا مگر آج اس کی بجائے "احمد علی پر" لکھ رہا ہوں۔

پانچ برس پہلے —— میرے دوست سلیم اللہ فہمی ایک شام مجھے احمد علی کے مکان پر لے گئے۔ وہاں پروفیسر احمد علی اور چراغ حسن حسرت مرحوم سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی —— یہ ملاقات میرے لئے ایک ڈرامائی تاثر رکھتی تھی —— ایک عام پڑھنے والے کی حیثیت سے میرے ذہن نے بھی ان دونوں کی خیالی تصویریں بنا رکھی تھیں —— چراغ حسن حسرت دبلے پتلے سے منحنی آدمی ہوں گے۔ دھیمے دھیمے باتیں کرتے ہوں گے —— باتوں کا لہجہ ان کے اشعار کا سا ہوگا ؎

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں
زلف کی رخسار کی باتیں

اور احمد علی پروفیسروں کی طرح ہوں گے —— خاصے بھاری بھرکم —— چندیا پر بال کم، چہرے پر فارغ البالی کے اثرات —— مگر یہ پہلی ملاقات ان ذہنی تصویروں کو لے ڈوبی۔ مجھے تھوڑی سی تکلیف ضرور ہوئی لیکن تھوڑی دیر بعد ذہن نے حقیقت سے مطابقت حاصل

کری۔ شام کے سائے گہرے ہوتے گئے۔ اور احمد علی کی شخصیت کے نقوش اُبھرتے گئے۔

احمد علی کو پہلی بار دیکھتے ہی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص انسانوں کے ہجوم میں شامل بھی ہے اور ان سے الگ بھی ہے ——— احمد علی اصل میں تو خوبصورت نہیں یوں گریگری پک اور دلیپ کمار خوبصورت کہے جاتے ہیں لیکن ان کے چہرے کے گرد ایک انفرادی فضا موجود ہے۔ نقشہ تیکھا ہے۔ اور آنکھوں کی چمک ان کی شخصیت کا بنیادی عنصر مگر یہ چمک ویسی نہیں جیسی کسی ماہر مسمریزم کی آنکھوں میں ہوتی ہے بلکہ اس میں کچھ آگ سی اور خاکستری کیفیت بھی ملتی ہے ——— شعلے پر راکھ کا غلاف ——— احمد علی کی مخروطی لمبی انگلیاں بھی فوراً مرکزِ توجہ بن جاتی ہیں ——— زندگی کے اس سفر میں کتنے ہی لوگوں سے ملا ہوں اور

قامت و چہرہ ، وہ وہ دیکھا ، کبھی نہ بھولے ، یاد رہے

لیکن کسی کی انگلیاں احمد علی کی انگلیوں کی طرح مرکزِ توجہ نہ بن سکیں ——— ابھی پہلی ملاقات کی شام کی بات کر رہا ہوں ——— جب چائے آئی اور سب پینے لگے تو احمد علی بڑی نفاست سے پیالی اُٹھاتے، اپنے ہونٹوں تک لے جاتے اور پھر طشتری میں رکھ دیتے ——— ان کے اس عمل میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ مجھے محسوس ہوا جیسے احمد علی پیدائشی بلکہ موروثی طور پر بت تراش ہیں ——— احمد علی کے سر کے بال بڑے بڑے تھے اور بے ترتیبی میں بھی ایک ترتیب تھی جیسے غزل کے اشعار میں یا مستانوں میں ہوتی ہے ——— اُردو میں باتیں کرتے کرتے انگریزی بولنے لگتے اور لہجہ کا خیال رکھتے ——— پہلی ملاقات نے احمد علی کی شخصیت کے یہ تاثرات پیدا کئے اور یہ آج بھی قائم ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ان کو قریب سے دیکھنے کے بعد اضافے ضرور ہوئے ہیں۔

لباس کے معاملے میں احمد علی ان لوگوں سے بہت الگ ہیں جو "انٹلیکچول" کہلاتے ہیں۔ اگر کسی شام کسی ایسے آدمی سے آپ کی ملاقات کرائی جائے جو گہری ہری قمیص کے ساتھ ساتھ گہری سرخ ٹائی لگائے ہوئے (BRUTE AMERICAN CONTRAST) اور کہا جائے کہ "ان سے ملئے، یہ ہیں پروفیسر احمد علی" تو یہ کسی پریشانی کی بات نہیں، اور اسی لئے یہ بات میں نے آپ سے احتیاطاً عرض کر دی ہے ——— اس ذوقِ لباس کی نفسیاتی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ احمد علی کراچی کی بے رنگ زندگی سے انتقام لے رہے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ نہ موسیقی کی محفلیں جمتی ہیں۔ نہ رقص کی لہریں اٹھتی ہیں، نہ ہم مشرب کہیں دو چار بیٹھتے ہیں ——— اس کی ایک اور نفسیاتی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ غالباً احمد علی غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو جوان رکھنے اور جوان پیش کرنے کے لئے یہ اہتمام کرتے ہیں ——— ان کی عمر اب بھی کوئی پچاس پچپن سال ہے، پہلی نظر میں یہ عمر جچتی بھی نہیں لیکن جب مخاطب ان سے قریب ہوتا جاتا ہے تو وہ کم عمر معلوم ہونے لگتے ہیں، شوخ کپڑے، باتوں میں شوخی، حرکات و سکنات اور جنبشوں میں جوانوں بلکہ نوجوانوں کی سی بے چینی اور قوت کا اظہار، کچھ وارفتگی اور والہانہ پن، اور اسی قسم کی گفتگو کرتے ہوئے جاپانیوں کے پنکھے سے کھیلتے رہنا ——— یوں گردشِ ایام پیچھے کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

احمد علی دیکھنے میں خاصے لمبے آدمی ہیں مگر اس لمبائی سے بہت زیادہ ان کے اندر گہرائی ہے، علم کی اور مطالعے کی ——— بلاشبہ وہ ایک بڑے فنکار ہیں، ممتاز نقاد اور شگفتہ ادیب، ادب اور زندگی پر ناقدانہ نظر رکھنے والے ——— خوش گفتار اور دلکش مسکراہٹوں والے احمد علی ہمارے ادب اور کلچر کی تاریخ میں زندہ رہیں گے ———

احمد علی گفتگو کے فن کے بڑے ماہر ہیں ——— جس طرح اچھے بلند پایہ گویّے کا RANGE بہت وسیع ہوتا ہے اسی طرح احمد علی کی باتوں کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے ——— جولیس سیزر اپنے بارے میں کہتا تھا کہ ——— "میں آیا ——— میں نے دیکھا ——— اور میں نے فتح کر لیا" ——— احمد علی بھی بڑے فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ "میں آیا ——— میں نے باتیں کیں ——— اور میں نے فتح کر لیا"

ایک بڑی ہی اونچی قسم کی محفل میں، میں بھی شریک تھا اور احمد علی بھی ——— احمد علی کے سامنے پیالہ و مینا تو نہیں تھے مگر چاروں طرف

خواتین موجود تھیں جو پھر دیکھئے انداز گل افشانیٔ گفتار۔ احمد علی بیک وقت ایک معمر انڈونیشی خاتون، ایک ادھیڑ جاپانی خاتون، ایک نوجوان چینی خاتون اور ایک مسکراتی ہوئی ہسپانوی خاتون سے باتیں کر رہے تھے اور کیسی باتیں؟ —— انڈونیشیا میں شاعری کے نئے رجحانات، جاپان میں اٹھارھویں صدی عیسوی کے معاشی حالات، چین کا مستقبل —— پھر احمد علی کو ہسپانوی خاتون کی ابروؤں میں اسپینی فن تعمیر کی جھلک نظر آگئی۔ محراب، اور وہ آدھے گھنٹے تک اسپینی فن تعمیر پر گفتگو کرتے رہے —— کبھی کبھی احمد علی کی گفتگو عجیب انداز کی ہوتی ہے —— بظاہر اُن کے عام تصورات وعقائد سے مختلف، ایسے موقعوں پر قدامت کا وہ اظہار کریں گے کہ حیرت ہو جائے گی —— کوئی عورت سُنے تو بیاختہ کہے۔ اللہ! یہ انگارے کا مصنف بول رہا ہے؟ —— میں سوچتا ہوں کہ اصلی احمد علی کون ہے؟ —— یہ جملے کہنے والا یا انگارے کا افسانہ نگار! بھائی جان (احسن مجتبیٰ ندوی) اور ابوالخیر کشفی نے ستم یہ کیا کہ مہر نیمروز کے پچھلے شمارے میں کسی کا یہ جملہ چھاپ دیا کہ —— "بندے کو خدا پر یہ فوقیت ہے کہ خدا لذتِ مرگ سے آشنا نہیں؟" —— میں نے چھپنے کے بعد پڑھا، مجھے فوقیت کے لفظ پر شدید اعتراض تھا۔ بھائی جان اور کشفی کہتے کہ ہمیں کب اتفاق ہے؟ یہ تو کسی کا قول ہے، ہم نے چھاپ دیا، آپ جواب دیجئے" —— ایک دن شام کو احمد علی آنکلے اور کشفی اور بھائی جان سے اُلجھ پڑے —— "صاحب! آپ نے یہ کیا چھاپ دیا؟ اس قول کے لکھنے والے نے خدائے بلند و برتر کے بارے میں ایک منٹ بھی نہیں سوچا —— خدا تو علیم و بصیر ہے۔ دانائے رموز کل ہے، سب سے بڑا فنکار ہے وغیرہ وغیرہ" —— کشفی بڑی معصومیت سے بولے کہ —— "یہ احمد علی صاحب بول رہے ہیں یا مفتی شفیع" —— احمد علی ہنس پڑے اور بحث ختم ہو گئی... لیکن وہ لمحہ بہت قیمتی تھا، خدا اور مذہب کے بارے میں احمد علی کے صحیح جذبات سامنے آگئے۔ احمد علی نے دہلی کی روایات کی آغوش میں پرورش پائی ہے —— وہ روایت شکن ضرور ہیں لیکن اُن کی زندگی اور ان کی تحریروں میں یہ روایات بغیر کچھ کہے سُنے در آتی ہیں —— اسی لئے وہ دلی والوں کی طرح کبوتر بھی اُڑا سکتے ہیں۔

احمد علی صرف کبوتر ہی نہیں اڑاتے بلکہ انہیں کئی اور جانوروں سے بھی دلچسپی ہے۔ جمشید روڈ پر ایک مکان میں رہتے ہیں لیکن یہ مکان بھی اُن کے مذاق کا کس ڈھنگ آئینہ دار ہے —— چھوٹا سا باغیچہ —— چھوٹے چھوٹے پتھروں سے نمونے کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی —— چھوٹا سا گڑھا گڑھے میں پانی —— پانی میں رنگین مچھلیاں —— جالیاں لگی ہوئی —— جالیوں میں اُلّو —— رنگ برنگی چڑیاں، گھاس پر خرگوش اور ایک عدد بلی —— دروازے پر دو عدد کتے —— سودا کے قصیدے کی طرح احمد علی شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پر پانی تو نہ پلا سکے، لیکن یہ صلاحیت ان میں موجود ہے، بلی اور کتے کو رشتۂ رفاقت میں منسلک کر رکھا ہے، ایک زمانے میں تو وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچ رہے تھے کہ بلی اور کتے کو زنجیرِ حنا کی گرفت میں باندھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ —— اس سلسلے میں اُن سے اگر کوئی شکایت ہے تو بس اتنی کہ ہمیشہ کاٹ کھانے والا کتا رکھتے ہیں۔

عجائبات سے احمد علی کو بہت شغف ہے، اُن کا ڈرائنگ روم —— کمرہ کیا ہے کہ ہے ایک بڑا ہال ہے اور داخلے کا دروازہ بیضاوی ہے، آپ ملاقات کرنے میں بیٹھیں گے تو قدیم مجسمے، تصویریں، ایک بہت بڑے چوبی صندوق اور ایسے ہی الّم غلّم سامان کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے احمد علی کو بھول جائیں گے —— جب آپ اپنے عالم میں آئیں گے تو احمد علی کی آنکھوں کو مسکراتا پائیں گے —— "یہ صندوق دور شون شانگ کا ہے۔ "یہ منقش تھال عہد چین جاں چانگ سے تعلق رکھتا ہے۔" وغیرہ وغیرہ —— احمد علی نے یہ سب سامان اپنے قیام چین کے زمانے میں جمع کیا تھا۔ جب وہ پاکستان کے سفارتی نمائندے کی حیثیت سے چین گئے تھے —— ویسے وہ پہلے بھی انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے قیام پاکستان سے پہلے بھی چین ہو آئے ہیں —— اور وہ یہ سب سامان اسّی بڑے چوبی صندوقوں میں بھر کر لائے تھے۔ جو اب ان کے کمرے میں رکھا جاتا ہے، بھابی جلیس (بیگم احمد علی) کا کہنا ہے کہ جب گھر میں زیادہ مہمان آجاتے ہیں، تو احمد علی اسی صندوق پر سوتے ہیں مگر اسی احترام و عقیدت سے کہ رات بھر سو نہیں پاتے —— یہ کمرہ عجائب خانہ بھی ہے اور نگار خانۂ چین بھی، اسی لئے جہاں ظفر یا مومن کے

ایمان کے لئے باعث ضرر ہے، کیونکہ طبیعت چوری کی طرف ہر وقت مائل رہتی ہے۔

آج کل احمد علی کو ایک ہی دھن ہے اور وہ ہے مکان بنوانے کی ——— یہ دھن اُن کی تخلیقی قوت سے جونک کی طرح چمٹ گئی ہے۔ ——— انھوں نے ہاؤسنگ یونین ایریا میں ایک پلاٹ لیا ہے، بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میرا تعلق یونین سے ہے اور احمد علی کا دوست ہونے کے علاوہ مجھے وہ ماہر تعمیرات بھی سمجھتے ہیں، چنانچہ اب جب بھی ملتے ہیں اور اکثر ملتے ہیں تو مکان کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں، کتابیں پڑھنے کی جگہ وہ جرمنی، انگلستان، فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے مکانوں کے نقشوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں ——— کسی مکان کی چھت پسند آتی ہے تو کسی کا برآمدہ ——— بال کی کھال نکالنے میں احمد علی اپنا جواب آپ ہیں، اُن کا تذکرۂ مکان اب تو دفتر طلسم ہوشربا بن گیا ہے، اور میں بور ہونے کے باوجود احمد علی سے کہہ نہیں پاتا۔ بگڑتے ہوئے آئیں گے ——— "بھئی اکبرا ——— آخر یہ کیا ہے؟ تم میرے مکان کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے، کل کوئی پتھر اٹھا لے گیا۔ اور آج مٹی لے گیا۔ یہ سب کیا ہے؟"

آج کل جلیس بھابی اور احمد علی کے درمیان بچوں کے علاوہ اگر کوئی موضوعِ گفتگو ہے، تو یہی مکان کا سلسلہ ——— فرصت کے اوقات میں دونوں میاں بیوی مکان کا نقشہ بناتے رہتے ہیں یا بگڑتے رہتے ہیں ——— "باتھ روم یہاں ٹھیک رہے گا" ——— "بھئی میں اپنی اسٹڈی بائیں بازو کے مشرقی گوشے میں بنواؤں گا" ——— "سامنے کی جالیاں ویسی ہی ہوں گی جیسی ......" یا پھر یہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی کسی مکان کا نقشہ لے بیٹھتے ہیں، چھت احمد علی کو پسند نہیں آئی اور دروازے جلیس بھابی کو ناپسند ہیں ——— یہ سلسلہ اب معمولات کا حصہ ہو گیا ہے۔

احمد علی کی ازدواجی اور گھریلو زندگی بہت خوشگوار ہے، بھابی جلیس اُن کے دبلے پن کی تلافی اور تکمیل ہیں، احمد علی کی طرح وہ بھی گفتگو کے فن کی ماہر ہیں۔ اس تسلسل سے بولتی ہیں جیسے کتاب پڑھ رہی ہوں ——— شادی شدہ خواتین احمد علی اور بیگم احمد علی سے مل کر اپنے شوہروں سے اور شاکی ہو جاتی ہیں "میاں ہو تو ایسا ——— بیوی کا کتنا خیال رکھتا ہے، ہر بات مان لیتا ہے، ایک تم ہو کہ میری سنتے ہی نہیں" ——— اور بیچارے شوہر جل کر کہہ اٹھتے ہیں ——— "بیوی میاں پر حاوی ہے" ——— حالانکہ ایسا کہنا حقیقت سے خاصہ دور ہے ——— احمد علی کے دونوں بچے عروج اور ارحم بہت پیارے اور ذہین ہیں ——— ان ناموں میں بھی احمد علی کی دو معصوم تمنائیں چھپی ہوئی ہیں ——— ایک بات اور ——— احمد علی کو جب جلیس بھابی کے سامنے گھر سے باہر رہنے کا بہانہ تراشنا ہوتا ہے تو بہترین ذہانت کا ثبوت دیتے ہیں۔

زمانے کی طرح کراچی کا موسم بھی بدل گیا ہے اور اب کراچی میں آسمان پر بادل چھائے رہتے ہیں اور بارش ہوتی ہے تو ہوتی ہی چلی جاتی ہے، فضا کے ابر آلود ہوتے ہی لوگ سیر و تفریح اور پکنک کے لئے گھروں سے نکل پڑتے ہیں لیکن ایسے میں احمد علی کی مصروفیت دلچسپ اور مکمل طور پر انفرادیت لئے ہوئے ہوتی ہے، اپنی خاکستری "اوپل" میں اپنے دونوں بچوں کو بٹھا کر ——— بغیر نعرہ لگائے ——— ویرانے کی طرف نکل پڑتے ہیں، وہاں ان کے بچے مینڈکیاں پکڑتے ہیں اور احمد علی فورس ان ریزرو (FORCE IN RESERVE) بن کر اپنے بچوں کو مینڈکیوں کی گرفتاری میں کمک پہنچاتے ہیں۔ جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو واپسی ہوتی ہے اور ان کے ٹرنک میں تمام کا حاصل یعنی قسم قسم کی چھوٹی بڑی مینڈکیاں بڑی احتیاط سے رومال میں بندھی ہوئی ان کے گھر آ جاتی ہیں، مینڈکیاں پکڑتے وقت ان کی لمبی مخروطی انگلیوں میں نفاست کے ساتھ تشدد بھی ہوتا ہے اور پینٹنگ بھی ——— احمد علی پینٹنگ کے بھی بڑے ماہر ہیں۔ اس دلچسپ مشغلہ اور کام میں بھابی جلیس ان کی مدد نہیں کرتیں مگر اظہار ناپسندیدگی بھی نہیں کرتیں ——— وجہ ظاہر ہے، ایسے سہانے موسم میں انہیں احمد علی کی دوسری مصروفیتیں پسند نہیں۔

عرصے سے احمد علی نے کوئی تخلیقی چیز نہیں لکھی ——— اُن کی زندگی اور مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے جب میں اس بارے میں سوچتا ہوں تو کئی باتیں سمجھ میں آتی ہیں ——— ایک تو یہ کہ احمد علی اپنی گزشتہ تخلیقات سے مطمئن ہیں، دوسری بات یہ کہ انہیں کچھ یہ احساس بھی ہے

کہ نقادوں نے ان کے صحیح ادبی مرتبہ کا تعین نہیں کیا۔ اور اس احساس میں وہ حق بجانب ہیں ——— تیسری بات یہ کہ وہ موجودہ ادبی ماحول سے مطمئن نہیں، جس میں کوئی دو چار کہانیاں لکھ کر مشہور ہو جاتا ہے اور نقاد اس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں ——— ویسے ابھی احمد علی کو بہت کچھ کہنا ہے، ان کے دامنِ خیال میں ابھی بہت کچھ ہے ——— کتنے ہی افسانے نامکمل پڑے ہیں ——— دوست انہیں لکھنے پر اکساتے رہتے ہیں۔ اور جب وہ سنجیدگی سے لکھنے کی طرف مائل ہوتے ہیں تو وہی دوست یا معتقد میدان سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں ——— حسن مثنیٰ صاحب اور کشفی صاحب نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ MERMAIDS IN LUCKNOW (ناول) کا اردو میں ترجمہ کیا جائیگا۔ اور "انگارے"، "شعلے"، "ہماری گلی" اور "قید خانہ" کے افسانوں کا انتخاب ایک جلد میں شائع کیا جائے گا۔ ہر شام دو گھنٹے کام کیا جائیگا۔ کشفی تو یہ وعدہ کر کے ہندوستان چلے گئے اور بھائی جان دو مہینے گھر سے ہی نہ نکلے۔ اب اس کا کیا علاج؟ ——— ایک ہی علاج ہے، وہ یہ کہ احمد علی خود ہی دن کے دو چار گھنٹے ادب کے لئے وقف کر دیں۔

احمد علی بہت اچھے، مخلص، اور سچے دوست ہیں کیونکہ وہ اچھے آدمی ہیں۔ دوستوں کے لئے وہ بڑی سے بڑی قربانی کر سکتے ہیں ——— قرض سے کر بحث و تمحیص تک ——— بحث و تمحیص قربانی یوں ہے کہ اس کے لئے وقت کو قربان کرنا پڑتا ہے۔

یہ ایک ادھوری جھلک ہے، اس احمد علی کی جو باغی ہونے کے ساتھ ساتھ روایت پرست ہے ——— جسے پرانی شاعری بہت پسند ہے ——— اور کبیر کے ایک دوہے یا میر کے ایک شعر کے سہارے زندگی کے کتنے ہی لمحے کاٹ سکتا ہے ——— جو ادبی طور پر خاموش ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ خاموشی ایک بڑے ادبی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

اختر انصاری

عزیز عرفی

اختر صاحب کی کیفیت ایک جھیل کی سی ہے۔ خاموش اور پر سکون۔ جس کی سطح پر ہلکی ہلکی لہریں ہوں جو حلقے بناتی ہوئی حلقوں ہی میں گم ہو جاتی ہیں۔ ساحل پر کھڑا ہوا کوئی شخص پتھر پھینک دے تو تمام سکون درہم برہم ہو جائے۔ ساری جھیل میں لہریں ہی لہریں رقص کرنے لگیں۔ ہر گوشہ متحرک ہو جائے ــــ اور پھر اس کے بعد ساکن سطح پر مسکراتا ہوا سکوت۔ وہاں تو ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، مدوجزر ہے جو اپنی تند و تیز لہروں سے اچھلتا ہوا ساحل پر کھڑے ہونے والے تندرو اور ذہین تماشائیوں کو دور تک دھکیل دیتا ہے۔ یہاں اس ندی کا جوش ہوتا ہے اور عزم بھی نہیں جو سنگلاخ چٹانوں کو کاٹتی گنگناتی اور اشتیاق اپنی منزل کی طرف دوڑتی رہتی ہے ــــ وہ تو محض ایک جھیل ہے ایک پر سکون اور ساکت جس کی سطح کے نیچے کئی ننھی منی سرخ اور سبز سنہری مچھلیاں تیرتی رہتی ہیں ــــ حسرتوں کی طرح پلتی رہتی ہیں ــــ اور پھر ایک زمانہ آتا ہے کہ وہ مچھلیاں مر جاتی ہیں۔ جھیل کی رگ رگ مرتعش ہو جاتی ہے۔ لہریں ساحل سے ٹکرانے لگتی ہیں، جیسے وہ ساحل کو توڑ کر باہر نکل جائیں گی، اور ایک پہاڑی ندی کی طرح سنگلاخ چٹانوں کا سینہ چیرتی ہوئی اپنی منزل کو پا لیں گی ــــ بے بس بے اماں حسرتیں دم توڑتے توڑتے بھی تڑپیں گی ــــ لیکن پھر جھیل کی سطح اسی طرح ساکت ہو جاتی ہے۔ اور جھیل کا پانی دھیمے دھیمے سرگوشیاں کرنے لگتا ہے۔ "کون اس برسوں پرانے سکون کو چھوڑ کر پتھروں سے سر ٹکرائے۔"

اس طرح یہ کہنا قطعاً وقت طلب نہیں کہ اختر صاحب میں دنیا سے لڑنے اور جھگڑنے کی ہمت نہیں۔ انھوں نے زندگی بھر حسرتوں اور امیدوں کے ماتم منائے ہیں۔ مرحوم آرزوؤں کا ماتم کیا ہے۔ لیکن دیوانہ وار گریبان کو چاک کیا اور نہ دامن کو تار تار ــــ بلکہ ناکامی، مایوسی اور محرومی پر مسکرانے کے لئے ایک چھوٹی سی دو تین کمروں کی جنت تعمیر کی۔ جہاں اب وہ چاروں طرف سے دروازے بند کئے اپنے کمرے میں بیٹھے آہستہ آہستہ پائپ پیتے رہتے ہیں۔ آتش دان پر شیلف ہیں۔ مگر ہر شیلف پر اپنی تصانیف کو "چمکتے ہوئے نظر آئیں گے" دیوار پر آویزاں شاہکار مصوروں کی اپنے گرد پھیلی ہوئی قیمتی اشیاء کو دیکھتے رہتے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں۔ انھوں نے دروازے کے شیشوں پر بھی رنگ کے غلاف چڑھا دیئے ہیں کہ باہر والوں کی ناکام حسرتیں جھانک کر رنگ میں بھنگ ڈالیں ــــ لیکن یہ سب باتیں تعبیر طلب ہیں۔

اختر صاحب نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ جامع مسجد دہلی کے اطراف کی گلیوں میں گزارا۔ ان کے والد دہلی کے سرکاری سرجن تھے۔ ایک شفیق باپ کی حیثیت سے ان کی خواہش تھی کہ اختر صاحب بھی سرجن بن جائیں۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح اختر صاحب کی آرزوؤں کے بار آور ہونے کا وقت آیا ــــ ان کے والد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اختر صاحب کا مستقبل رہ گیا۔ تصورات میں جھلملاتا ہوا محل ڈگمگانے لگا۔ لیکن اختر صاحب نے حالات کے سامنے سپر نہ ڈالی اور اپنے اس تصوراتی ایوان کے حصول کے لئے لڑنے لگے۔ مگر قسمت کے دربان نے محل کے دروازے ہی سے ناکام

نامراد ہوتا گیا ـــــ اور جب وہ لندن سے واپس ہوئے تو ان کی دنیا میں تاریکی چھائی ہوئی تھی ـــــ اور اس تاریکی میں ان کی سوتیلی ماں، بہن، بھائی، بیوی بچے ان کی طرف کھلی باچھوں سے دیکھ رہے تھے ـــــ اختر صاحب کے والد سخت مذہبی قسم کے آدمی تھے۔ وہ دہلی کے محل سرا میں تھے۔ لیکن انہوں نے "دنیا کمانے" کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ لہٰذا ریٹائر ہو کر ان کی بے وقت موت کے بعد کچھ جائداد اور ایک محدود رقم کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ جو بچا تھا وہ اختر صاحب کے لندن آنے جانے میں اور دوستوں کو قرض دینے میں ختم ہو گیا ـــــ یہ واقعہ ہے کہ اختر صاحب نے پانچ چھ ہزار روپیہ سال دو سال میں اپنے چند دوستوں کو دے ڈالا۔ خود اس زمانہ میں وہ سگریٹ پیتے تھے نہ جوا۔ نہ کوئی خاص دلچسپی رکھتے تھے ـــــ دوسرے تعیشات کا تو ذکر ہی کیا ہے ـــــ وہ روپیہ خرچ کرنے میں بقول خود نہایت بے پروا واقع ہوئے ہیں۔ اکثر کہا کرتے ہیں۔

" میں اپنی اس کمزوری سے ہزار کوشش کے باوجود آج تک چھٹکارا نہیں پا سکا ہوں۔ جذبات کی رو میں بہہ کر روپیہ خرچ کر ڈالتا ہوں اور پھر کف افسوس ملتا رہتا ہوں۔ کف افسوس ملنے کے ساتھ ساتھ دل ہی دل میں عزم کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی حماقت نہیں کروں گا۔ لیکن وقت آنے پر بالکل وہی حماقت دوبارہ مجھ سے سرزد ہوتی ہے۔ اس کے بعد پھر کف افسوس ملنے کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے تاآنکہ پھر روپیہ ہاتھ میں آئے اور ایک دفعہ پھر وہی حماقت سرزد ہو۔ زندگی بھر یہی چکر قائم رہا ہے ـــــ" اس سلسلے میں اختر صاحب ایک مزے کی بات یہ بھی کہتے ہیں کہ ذہنی سکون ہی کی خاطر یہ ضروری ہے کہ میری جیبیں خالی ہوں۔ کیونکہ جب تک میرے پاس پیسہ رہتا ہے میں خرچ کرنے کی تدبیروں پر غور کرنے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتا۔ ان کا یہ انگریزی کا جملہ مجھے اکثر یاد آتا ہے ـــــ

" FOR SHEER PEACE OF MIND I MUST — BE PENNILESS."

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ ایک بھرے پرے خاندان کا بار اٹھانے کے باوجود اختر صاحب نے آج تک بقول خود پانچ روپے بھی پس انداز نہیں کئے۔ اس سلسلے میں وہ مذکورہ بالا قسم کی بات کہا کرتے ہیں ـــــ " میں اکثر یہ سوچتا ہوں اور یہ سوچ کر اپنے آپ کو عبرت دلاتا ہوں کہ میرے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہوتے ہوئے مہینے کے تیس دنوں میں انتیس دن میرا ہاتھ خالی رہتا ہے اور جیب میں ایک پھوٹی کوڑی کا بھی وجود نہیں ہوتا۔ عجیب بات ہے چنانچہ اکثر دل ہی دل میں عہد کرتا ہوں کہ آئندہ ضرور پس انداز کروں گا اور وقت بے وقت کے لئے ضرور کچھ روپیہ محفوظ رکھوں گا۔ لیکن یہ عہد آج تک شرمندۂ تکمیل ہوا نہیں ہے ـــــ"

پھر یہ سب باتیں تو ضمنی طور پر کہی گئیں۔ قصہ اصل میں اختر صاحب کی ابتدائی زندگی کا تھا۔ لندن سے واپسی پر اختر صاحب نے ملازمت کے لئے ہاتھ پیر مارے۔ لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ لہٰذا علی گڑھ جا کر بی۔ ٹی میں داخلہ لیا ـــــ اور جب وہ بی۔ ٹی (B.T.) کر کے نکلے تو انہیں ایک اچھی خاصی رقم ادا کرنی تھی۔ (جس کی قسطیں ۱۹۵۰ تک خود تھوڑی تھوڑی ادا کرتے رہے) ایک اچھے خاصے فیملی (FAMILY) کو پالنا تھا۔ لہٰذا انہوں نے مسلم یونیورسٹی کے سٹی اسکول میں کام شروع کر دیا۔ اس وقت تک ان کے عزائم جوان تھے اور ان کا یقین محکم تھا کہ وہ اسکول سے جلد ہی نجات پا کر اپنی آرزوؤں کی تکمیل کر سکیں گے جو ماحول کی ناسازگاری کی وجہ سے پروان نہ چڑھ سکیں۔ لیکن وہ پورے تیرہ سال تک اسکول سے نہ نکل سکے۔

ماحول اور حالات کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنا کچھ آسان بات نہیں۔ اختر صاحب کی آمدنی قلیل تھی اور اخراجات زیادہ ـــــ بہن بھائیوں کی تعلیم اور پرورش ایک طرف ـــــ اپنی آرزوؤں کی تکمیل دوسری طرف ـــــ دونوں باتیں بیک وقت ممکن نہ تھیں ـــــ انہوں نے اپنی آرزوؤں اور حسرتوں کا خون کیا۔ لیکن بہن بھائیوں کی تعلیم اور پرورش سے ہاتھ نہ اٹھایا ـــــ اختر صاحب کو اسکول سے نکلنے کے مواقع بھی ملے۔ لیکن ان میں RISH لینے کی ہمت نہ تھی ـــــ کیونکہ اختر صاحب کو ابتدا ہی میں ناکامیوں اور محرومیوں نے جکڑ دیا تھا۔ دوسرے ایک بڑی فیملی (FAMILY) کی پرورش ان کا فرض ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہ ہمیشہ مزید جدوجہد کا مقابلہ کرنے سے کتراتے رہے ہیں اور انہوں نے اپنی اسی حالت کو اپنا نصیب سمجھ لیا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اختر صاحب نے اپنی زندگی کے لئے جو معیار متعین کیا تھا صرف وہ اس پر قائم

رہے "کہ اب ان سے بلند تر جانے کیلئے کوشاں بھی رہے — یہی چیز اختر صاحب کی ذہنی الجھنوں سے تیز تفکرات کی داخلی اور خارجی زندگی میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

اختر صاحب کو پہلی بار میں نے اس وقت دیکھا جب میں ہائی اسکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا — نویں دسویں جماعتوں کو انگریزی پڑھاتا تھا۔ گھنٹہ بجا اسکول کے لان پر پائپ منہ میں دبائے شگفتہ دہن اپنا ہی کام، ان کا روز کا معمول تھا۔ ان کے مزاج میں بھی تیز پن سا نے اور بارعب قسم کے اساتذہ سے ہی تھے۔

طلبا کا ایک خاص مشغلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کے متعلق مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے تبصرے کیا کرتے ہیں اور زیادہ تر ان اساتذہ کا ذکر خیر ہوتا ہے جن سے بلاواسطہ تعلق ہوتا ہے — لہٰذا آٹھویں جماعت تک کے تمام طلبا ان کے متعلق بہت کم جانتے تھے لیکن اس کے برعکس ان جماعتوں کے طلبا میں اختر صاحب کو قریب سے دیکھنے کا شوق ہمیشہ رہا، اور وہ ہر جماعت میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے گئے۔

میں پانچویں یا چھٹی جماعت میں تھا کہ ایک دن کسی ہم جماعت نے پوری کلاس کو اطلاع دی — "اختر صاحب بہت بڑے شاعر ہیں . . . " یقین جانیے ہم یہی سمجھے کہ اختر صاحب انگریزی میں شاعری کرتے ہیں اور مدتوں تک ہم ایک دوسرے سے کہتے رہے — "اختر صاحب انگریزی میں شاعری کرتے ہیں اور ان کی نظمیں لندن کے رسالوں میں چھپتی ہیں۔"

اس کی وجہ یہی تھی کہ اختر صاحب ہمیشہ سوٹڈ بوٹڈ رہتے۔ جوتے کی چمکتی پالش سے لے کر فرانسیسی طرز کے تراشیدہ بالوں تک ہر چیز نک سک سے درست۔ کیا مجال کہ جوتے پر گرد جم جائے یا بالوں کی ایک آدھ لٹ پریشان ہو جائے — اور پھر عام طور پر مشہور تھا کہ اختر صاحب روزانہ سوٹ تبدیل کر کے آتے ہیں۔ اگر پورا سوٹ نہیں تو کوٹ پتلون میں سے ایک چیز تو ضرور، اور اگر اتفاق سے دونوں میں سے کوئی چیز بھی تبدیل نہیں ہوئی تو "ٹائی" تو یقینی طور پر وہ نہیں ہوگی جو وہ کل باندھ کر سکول آئے تھے — پھر اس کی مناسبت سے سگریٹ کی بجائے پائپ منہ میں دبائے رہتے — پھر ہم لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ اختر صاحب ولایت ہو آئے ہیں — اس وجہ کی بنا پر ہم لوگ اختر صاحب کو مکمل "انگریز" تصور کرتے تھے — (یہ دوسری بات ہے کہ اختر صاحب کو رنگ کی مناسبت سے انگریزوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں) اور ہم لوگوں کو مکمل یقین تھا کہ اختر صاحب گھر کے اندر بھی چھری کانٹے سے کھاتے پیتے — حتیٰ کہ بیٹھتے اور سوتے بھی مغربی انداز میں ہوں گے — بلکہ بیوی اور بچوں سے بھی انگریزوں کی طرح ملتے ہوں گے۔ انہی باتوں کے پیش نظر اختر صاحب کے چھوٹے بھائی ارشد سے جب میری اور دوسرے ساتھیوں کی ملاقات آٹھویں جماعت میں ہوئی تو ہم لوگ اس سے اکثر اختر صاحب کی گھریلو زندگی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے — اور وہ اکثر چڑھ کر کہتا۔

"آخر تم لوگ اختر صاحب کو سمجھتے کیا ہو —؟"

جب میں نویں جماعت میں پہنچا تو اختر صاحب کو قدرے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، جب کہ اختر صاحب انگریزی کے استاد کی حیثیت سے کلاس میں تشریف لائے۔

اختر صاحب کا معمول تھا کہ وہ ایک دھیمی سی مسکراہٹ سے کلاس میں داخل ہوتے — ایک ایسی مسکراہٹ جس میں سنجیدگی کا عنصر کچھ زیادہ ہی ہوتا۔ ہم لوگ تعظیماً کھڑے ہو جاتے — اختر صاحب گردن کے ایک خم سے بیٹھنے کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ جاتے — اختر صاحب کوٹ کی اوپر کی جیب سے رومال نکالتے — چشمہ اتار کر چہرے کو اچھی طرح صاف کرتے اور پھر چشمہ صاف کر کے لگا لیتے — رومال کی خوشنما تہہ لگا کر پھر کوٹ کے اوپر کی جیب میں لگا لیتے — کبھی کبھی ٹائی کی گرہ بھی

[illegible] کی ضرورت پڑ جاتی ——— اس کے بعد کتاب لے کر کھڑے ہو جاتے اور پڑھانا شروع کر دیتے۔

اختر صاحب پائپ بہت پیتے ہیں۔ اگر آپ ان کے کمرے میں جائیں تو اور چیزوں کے علاوہ ایک چھوٹی سی میز پر پائپوں کا ایک اچھا خاصا انبار نظر آئے گا ——— اور پھر پائپ سے متعلق دیگر اشیا بھی۔ ممکن ہے یہ چیز آپ کو کسی غلط فہمی میں مبتلا کر دے ——— لیکن یہ حقیقت ہے کہ اختر صاحب کو پائپ، سیگریٹ [illegible] کرنے اور اس کو قبا کر پلانے میں مہارت حاصل ہے ——— پائپ اختر صاحب کی زندگی کا ایک لازمی جزو ہی نہیں بلکہ "شریکِ زندگی" ہے ——— وہ گھنٹوں تنہا بیٹھے رہتے ہیں اور پائپ پیتے رہتے ہیں۔ جہاں اور جب بھی آپ اختر صاحب کو دیکھیں گے وہ پائپ ضرور پیتے ہوئے ہوں گے ——— لیکن کلاس کے اندر اختر صاحب نے پائپ کبھی نہیں پیا۔ جب پڑھانا ختم کر دیتے یا توجہ کرنے کے لئے دیتے تو کمرے سے باہر برآمدے میں جا کر ٹہلتے رہتے اور پائپ پیتے رہتے ——— ایک مرتبہ عجیب واقعہ پیش آیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ اختر صاحب کو بہت شدید قسم کی کھانسی ہو گئی تھی ——— پائپ ہی کی زیادتی کی وجہ سے ——— اور کلاس میں پڑھاتے پڑھاتے اس قدر سخت قسم کا دورہ پڑتا کہ کتاب میز پر رکھ کے برآمدے میں چلے جاتے اور کافی دیر تک کھانستے رہتے ——— اتفاق کی بات انہی دنوں اسکول کا معائنہ ہوا ——— اور جب اختر صاحب ہماری کلاس میں پڑھا رہے تھے تو انسپکٹر صاحبان گھومتے ہوئے آ گئے ——— اور اختر صاحب کو پڑھاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ اختر صاحب اطمینان سے پڑھاتے رہے ——— لیکن چند ہی منٹ بعد ان کا چہرہ سرخ سے سرخ تر ہونے لگا اور انہوں نے اپنی پوری قوت کے ساتھ پڑھانا شروع کر دیا ——— ہم لوگ متحیر کہ یہ ماجرا کیا ہے اور اختر صاحب ہیں کہ انتہائی بلند آواز میں پڑھائے جا رہے ہیں اور اسی تیزی سے [illegible] ہوتا جا رہا ہے ——— تھوڑی دیر بعد جب انسپکٹر صاحبان چلے گئے ——— تو اختر صاحب کتاب میز پر پھینک کر بری طرح کھانستے ہوئے باہر چلے گئے اور کافی دیر تک کھانستے رہے ——— جب کھانسی تھمی تو ہنستے ہوئے کلاس میں داخل ہوئے۔ سب نے خیریت دریافت کی تو کہنے لگے ——— "جس چیز سے ڈرتا ہوں وہی سامنے آ جاتی ہے ——— میں سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کے سامنے کھانسی پریشان نہ کرے ——— اور ان لوگوں نے جوں ہی اندر قدم رکھا مجھے کھانسی آنے لگی ——— اب میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ میں سانس روک کے زور زور سے پڑھاتا رہوں۔"

اسکول نے اختر صاحب کی زندگی پر کافی گہرے نقوش چھوڑے ہیں ——— اس کے کئی پہلو ہیں۔ اول تو ایک اسکول میں رہتے ہوئے اختر صاحب کو "فاضل وقت" کافی ملا ——— چونکہ ایک اسکول ٹیچر کی مصروفیات بہ نسبت دوسرے شعبہ جات کے ملازمین کے کم ہوتی ہیں۔ سال میں چھٹیاں بھی کافی ملتی ہیں اور روزانہ کے اوقات میں بھی کافی فرق ہوتا ہے ——— دوم یہ کہ ہمارے معاشرے میں اسکول ٹیچر کی جو وقعت ہوتی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ——— در اصل نہ یہ سارا نظامِ تعلیم، اساتذہ کو اچھی تنخواہیں دیتا ہے اور نہ ہماری سوسائٹی ایک اسکول ٹیچر کو اس کی جائز عزت دیتی ہے۔ گو ان حالات میں اول تو اس شعبہ کو اچھے دماغ ملتے نہیں ——— اور جو بیچارے یہاں سے مجبور ہو کر آ جاتے ہیں تو ان کی ساری صلاحیتیں کچل کر رہ جاتی ہیں ——— لہٰذا اختر صاحب کی حساس طبیعت پر ایک اسکول ماسٹر کی کم حیثیتی کا شدید احساس ہوا۔ ایک مرتبہ اختر صاحب اپنے کسی عزیز کے یہاں دہلی گئے۔ ایک شام ان کے میزبان نے کسی کلب میں وہاں کے معزز شہریوں سے تعارف کرایا ان لوگوں نے اختر صاحب کا بحیثیت شاعر اور ادیب بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا لیکن جوں ہی ان لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ یہ ایک اسکول ماسٹر ہیں تو ان کے سارے اشتیاق پر جیسے اوس پڑ گئی ———

ایک خط میں اسکول کی زندگی کے متعلق لکھتے ہیں:—

"یہ ۱۸ سال علیگڑھ میں جس ذلت، مصیبت اور پستی کی حالت میں گزارے ہیں ان کی یاد عمر بھر دل میں ناسور کی طرح رہے گی۔"

اس قسم کی باتوں سے اختر صاحب گوشہ نشین ہو گئے۔ اسکول ماسٹری سے وہ کبھی مطمئن نہ رہے۔ لیکن اس دلدل سے نکلنے کے لئے انہوں نے کوئی جدوجہد بھی نہیں کی۔ حالانکہ اسکول چھوڑنے کی خواہش ہمیشہ رہی۔

اس بنیادی وجہ کے علاوہ اختر صاحب کے گوشہ نشین ہونے میں چند چیزیں اور بھی کارفرما ہیں — پہلی چیز تو یہ کہ اختر صاحب ادبی ذوق رکھتے تھے۔ لہٰذا جب انہیں اسکول میں ملازمت مل گئی اس سے قطع نظر کہ وہ اس سے مطمئن تھے یا نہیں — انہیں اپنے اس ذوق کی پرورش کرنا تھی۔ لہٰذا انھوں نے مطالعہ اور تصنیف کے لئے اسکول کے فاضل وقت سے جی بھر کے فائدہ اٹھایا — ان کی تقریباً تمام ہی تصنیفات اسی دور کی ہیں۔ اختر صاحب کی زندگی میں ناکامی سے بھی ادب کو فائدہ پہنچا — اگر بالفرض اختر صاحب سول سروس میں کامیاب ہو جاتے تو یقینی بات ہے کہ اختر صاحب کی حیثیت جو اس وقت اردو ادب میں ہے وہ نہ ہوتی — یا پھر کچھ انھوں نے اردو ادب کو دیا ہے وہ نہ دے سکتے۔

دوسری بات یہ کہ اختر صاحب کی مالی حالت اس قدر اچھی نہ تھی کہ وہ دنیا کے ہنگاموں پر خرچ کر سکتے لہٰذا انھوں نے اپنی قلیل آمدنی کو اپنی گھریلو زندگی پر ہی خرچ کرنا بہتر سمجھا — چونکہ اختر صاحب نے اپنی زندگی کے لئے جو خاکہ مرتب کیا تھا اس کے حصول میں انہیں خارجی طور پر ناکامی ہوئی تھی لہٰذا اس کی تکمیل اپنی خانگی زندگی میں کرنا تھی — اور انھوں نے رفتہ رفتہ اپنی ادبی تخلیقات کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ معیار ذہن میں رکھ کر اپنے گھروں کو (FURNISH) کیا۔ ایک خط میں اپنے گھروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”اصل میں میری شاعری اور دوسرے ادبی کام کو مشہور ہونا چاہئے تھا۔ لیکن شہرت نصیب ہو رہی ہے میرے گھروں کو۔ یہ شہرت دور دراز کے مشہور شہروں تک پہنچ گئی ہے ماشاء اللہ!“

ادبی تخلیقات کے علاوہ یہی گھر تو اختر صاحب کی زندگی کا ماحصل ہیں۔ ان کی تعمیر کردہ اپنی جنت ہیں اور وہ اپنی اس ”جنت“ کے حقیقی خالق کی حیثیت سے ان گھروں میں چھپے رہتے ہیں اور چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں۔

اختر صاحب کی گوشہ نشینی سے جہاں انہیں ادبی کام کرنے کے لئے اور اپنی حسرتوں اور آرزوؤں کی داخلی طور پر تکمیل کے لئے مواقع ملے وہاں ایک سب سے بڑا یہ بھی نقصان ہوا کہ وہ اس گوشہ نشینی سے مکمل طور پر آرام طلب اور سست ہو گئے — ان کی تخلیقی صلاحیتیں گہری نیند سو گئیں۔ اختر صاحب کے لئے یہ کہنا کہ وہ فطری طور پر شروع ہی سے آرام طلب اور سست تھے میرے خیال میں غلط ہے — جو شخص اپنی تعلیم کے زمانہ میں ہمیشہ نمایاں طالب علم رہا ہو — باپ کی موت کے بعد ناموافق ماحول کی پروا کئے بغیر اپنے مقصد کے حصول کے لئے لندن کا سفر کرے اسے بنیادی طور پر آرام طلب اور سست نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ وہ بعد کے واقعات اور حالات تھے جن کی وجہ سے اختر صاحب گوشہ نشین ہوئے۔ اور گوشہ نشینی نے انہیں آرام طلب اور سست بنا دیا۔ ان کی جدوجہد کرنے کی قوت کو زنگ چاٹ گئی۔ ان کی حساس طبیعت مسلسل ناکامیوں اور محرومیوں کی وجہ سے سہم گئی اور مزید مصائب کا مقابلہ کرنے سے ہمیشہ کتراتی رہی — ان ہی وجوہ کی بنا پر وہ اپنی زندگی میں کوئی انقلاب برپا نہ کر سکے لیکن انقلاب کے ہمیشہ منتظر رہے —

اختر صاحب جب تک اسکول میں رہے انہیں تعلیم کے علاوہ علمی دنیا اور آل انڈیا ریڈیو میں جانے کے مواقع بھی ملے۔ لیکن وہ اسکول نہ چھوڑ سکے — ایک مرتبہ شاید ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا ریڈیو سے کچھ جگہیں مشتہر ہوئیں۔ اختر صاحب نے بھی سوچنا شروع کیا۔ احباب سے مشورہ کرتے رہے اور سوچتے رہے — حتیٰ کہ آخری تاریخ آگئی۔ لہٰذا رات کو فیصلہ کیا گیا کہ دہلی جا کر ہی درخواست دی جائے — چونکہ اگلے دن درخواست کا پہنچنا لازمی تھا۔ لہٰذا دوسرے دن علی الصبح پہلی گاڑی سے روانہ ہو گئے — اردو بازار میں چند احباب سے پھر مشورہ کیا — ان لوگوں نے کہا — ”اماں کس مصیبت میں پڑ رہے ہو — یہ نوکری تمہارے بس کی نہیں۔۔۔“ کچھ ریڈیو کی ملازمت کے واقعات بھی سنائے — اور اختر صاحب شام کو درخواست دیئے بغیر علی گڑھ واپس آگئے۔

اسکول میں رہتے ہوئے وہ کم از کم ایم۔ اے تو کر سکتے تھے۔ لیکن ایم۔ اے بھی ان کے لئے پرانا خواب رہا — شاید چار پانچ بار تو انھوں نے ایم۔ اے کرنے کا ارادہ کیا — ایک دو بار شاید فارم اور فیس داخل کرنے کے علاوہ ایک دو پرچے بھی دے آئے — لیکن ایم۔ اے نہ کر سکے

خدا بھلا کرے حبیب الرحمان صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج کا۔ وہ ایک دن اختر صاحب کو پکڑ کر ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس لے گئے اور انہیں دو ماہ کی چھٹی منظور کرا دی اور مسلسل ایم۔ اے کے لیے تقاضا کرتے رہے ۔۔۔ ایک خط میں خود اس کا تذکرہ کیا ہے ۔۔۔

"۱۹۴۰ء میں ایم اے میں نے پاس کیا ۔۔۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ بھی صرف حبیب صاحب کے اخلاقی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ ورنہ میں تو تیرہ سال سے ارادہ ہی کر رہا تھا اور اسکول میں پڑا سڑ رہا تھا ۔۔۔" (خط بنام اظہر جمیل صاحب)

ایم۔ اے پریویس تو کر لیا، مگر جب فائنل کا وقت آیا تو بیوی بیمار ہو گئی ۔۔۔ اور وہ ہمت چھوڑ بیٹھے۔ احباب نے بہت افزائی کی۔ روزانہ ان کو یقین دلایا گیا کہ بھئی آپ کو تو امتحان کی تیاری کی ضرورت ہی نہیں آپ یونہی نمایاں طور پر کامیاب ہو جائیں گے ۔۔۔ ہر شام اختر صاحب احباب سے وعدہ کر بیٹھتے لیکن ہر رات "غور" کرتے اور ارادہ چھوڑ دیتے ۔۔۔ لیکن کچھ احباب بھی پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے تھے، انہوں نے اختر صاحب کو امتحان میں بٹھا ہی دیا ۔۔۔ اور وہ کامیاب ہوئے اور نمایاں طور پر کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے ان کو لے لیا۔

جب اختر صاحب اسکول چھوڑ کر یونیورسٹی پہنچے تو معلوم ہوتا تھا ان کے تمام عزائم از سرِ نو بیدار ہو گئے ہیں ۔۔۔ انہوں نے [illegible] ایک پروگرام مرتب کیا اور پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے کا عزم صمیم ۔۔۔ ایک سال تک وہ پی ایچ ڈی کرنے کے لیے سوچتے رہے ۔۔۔ دوسرے سال داخلے کے لیے فارم منگوائے گئے۔ لیکن وہ فارم بھی پڑے رہ گئے اور پی ایچ ڈی کا خیال آہستہ آہستہ اڑ گیا۔

اب وہ شعبۂ اردو سے ٹریننگ کالج چلے گئے ہیں۔

شعبۂ اردو سے ٹریننگ کالج تک کی داستان بھی بڑی عجیب قسم کی ہے ۔۔۔ اختر صاحب جب شعبۂ اردو میں پہنچے تو انہیں تدریس سے الحاق ہوا، کالجیٹ اسکول کی ملازمت مل گئی، لیکن بدقسمتی جو ہمیشہ ان کی تاک میں رہتی ہے، ابھی انہیں وہاں بیٹھے ہوئے عجیب دھچکا لگا، جس اسامی پر ان کا تقرر ہوا تھا وہ تقسیم ہند کے بعد اردو کو دیس نکالا ملنے کی وجہ سے تخفیف میں آ گئی۔ لہٰذا اختر صاحب کو حکم ملا کہ اسکول واپس جاؤ ۔۔۔ اور اختر صاحب تلملا گئے ۔۔۔

"میرے معاملے میں ابھی تک کچھ نہیں ہوا ۔۔۔ جو صورت حال تمہارے سامنے تھی وہی اب تک ہے۔ یونیورسٹی کھلنے پر شاید کچھ ہو ۔۔۔ بہر حال یہ طے کر چکا ہوں کہ اسکول واپس نہیں جاؤں گا ۔۔۔ اگر شعبۂ اردو میں مستقل تقرر نہ ہوا تو استعفیٰ بھی دے دوں گا ۔۔۔ اپنے آپ کو کافی تباہ کر چکا اب اس سے زیادہ کا حوصلہ نہیں۔ سترہ سال سے ہی گڑھے میں پڑا گھس گھس کر رہا ہوں اور آج تک ۱۲۰ روپیہ کا لیکچرر نہ ہو سکا۔"

اس خط میں جو علی گڑھ سے فرار کا ثبوت ملتا ہے ۔۔۔ وہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی ڈھاکہ یونیورسٹی کے لیے دعوت ہے ۔۔۔ جس کے متعلق وہ اکثر سوچتے رہے اور ٹالتے رہے لیکن جب انہیں علی گڑھ سے قطعی مایوسی ہو گئی تو انہوں نے خود ڈاکٹر شادانی کی طرف رجوع کیا۔ ان واقعات کی تفصیل بھی ان کی زبانی سنئے:۔

"گرمیوں کی تعطیل میں میں نے ارادہ کر لیا کہ ڈھاکہ چلا جاؤں گا اور شادانی صاحب سے خط و کتابت بھی کی۔ لیکن ایک ماہ سے زیادہ اس ارادہ پر قائم نہ رہ سکا۔ میرے دماغ پر اس کا بہت برا اثر ہوا۔ دن کی نیند اڑ گئی اور طبیعت ہر وقت بے انتہا پریشان اور وحشت زدہ رہنے لگی ۔۔۔ اتفاق سے شادانی صاحب رام پور آئے۔ میں نے سوچا کہ جب ڈھاکہ جا رہا ہوں تو ان سے ملنا اخلاقی فرض ہے ۔۔۔ چنانچہ رام پور گیا ۔۔۔ ان سے گفتگو کر کے میں نے محسوس کیا کہ میرا وہاں جانا حماقت ہو گی ۔۔۔ تفصیل لکھنی نہیں صرف اتنا لکھتا ہوں کہ جب ڈھاکہ سے پتہ چلا کہ وہاں زندگی خاصی مہنگی ہے اور مکان نایاب ہیں ۔۔۔ مجھے بڑی کوشش کے بعد وہ ایک کمرہ [illegible] دلا سکیں گے۔ تو میں نے دل میں کہا کہ کیا میرے دماغ میں پھوڑا نکلا ہے کہ میں دہلی کی جائداد چھوڑ دوں، علی گڑھ کا آٹھ دس ہزار کا سامان ٹھکانے لگاؤں ۔۔۔ جمی جمائی زندگی پر لات ماروں اور وہاں جا کر ٹھوکریں کھانا شروع کر دوں۔ اس وقت میں نے طے کر لیا کہ بہر حال میں یہیں رہوں گا ۔۔۔ چاہے اسکول ہی جانا پڑے ۔۔۔ چنانچہ پھر [illegible]

جو میرے لئے ذہنی حیثیت سے بھاری ہی تھی فوراً منظور ہو گئی اور میں نہایت خوش و خرم علی گڑھ میں آیا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پرنسپل ٹریننگ کالج حبیب صاحب میرے معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں اور مجھے اپنے یہاں لے جانا چاہتے ہیں۔ لیکن میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی کیونکہ خورشید الاسلام کراچی گئے ہوئے تھے اور خیال تھا کہ وہیں رہ جائیں گے اور شعبہ اردو میں ایک جگہ اور خالی ہو گی پھر کب تک میرا تقرر عارضی کیا جاتا رہے گا۔ گذشتہ تین سالوں میں بار بار ایسا ہوا کہ شعبہ اردو میں جگہ خالی ہوئی اور تکلیف میں لے آئی گئی ...... چونکہ خورشید صاحب کے زمانے میں میرا تقرر عارضی تھا اس لئے وہ واپس آ گئے — جب وہ واپس آ گئے تو میں یقیناً حبیب صاحب کی طرف جاتا ...... بہر حال یکم نومبر ۵۸ء سے میرا تقرر مستقل لیکچرار کی حیثیت سے بغیر PROBATION کے کیا گیا — اور علی گڑھ میں ۱۰ سال پڑھانے کے بعد میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ میں بھی ملازم ہو گیا — چنانچہ اب ٹریننگ کالج میں ہوں۔ گھر سے ملا ہوا کالج ہے جس سے آرام کی زندگی ہے — — — میں نے ایم ایڈ میں داخلہ لے لیا ہے۔ چند ماہ میں ختم کر لوں گا۔ اس کے بعد پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لوں گا۔ اور اب اردو کے بجائے ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی کروں گا ....

(خط بنام اختر حسین صاحب)

لیکن شاید آج تک نہ وہ ایم ایڈ کر پائے ہیں اور نہ پی ایچ ڈی۔

اختر صاحب کا روزانہ کا معمول ہے کہ وہ کالج سے آتے ہی غسل خانہ میں گھس جاتے ہیں — اس سے پیشتر کہ پسینہ خشک ہو وہ اپنے جسم پر پانی ڈالنا شروع کر دیتے ہیں — غسل کرنے کے بعد کھانا کھاتے ہیں اور پھر لیٹ کر سر پہ چادر تان کر سو جاتے ہیں — دن کی نیند اختر صاحب کو رات کی نیند سے زیادہ عزیز ہے۔ رات کو وہ ڈھائی بجے سونا تو معمول کی بات ہے لیکن اگر اختر صاحب کو رات جاگنا پڑے تو وہ خوشی خوشی رات گزار دیں گے۔ لیکن دن کی نیند ختم کرنے کے لئے دوپہر کا کھانا لازمی طور پر ملتوی کرنا ہوتا ہے — سردیوں میں جب اسکول کا وقت صبح دس بجے سے شام چار بجے تک ہو جاتا تھا اختر صاحب شام چار بجے اسکول سے واپس آ کر سوتے — دوپہر کو دو تین گھنٹے ضرور سوتے ہیں۔ سونے کے بعد کمروں کی صفائی۔ ہر چیز کو صاف کرنے کے بعد اس کی مخصوص جگہ پر رکھنا روز کا فریضہ ہے — کمروں کی صفائی اور چیزوں کی ترتیب کے معاملے میں اختر صاحب کو نہ ملازم پر بھروسہ ہے اور نہ بیوی پر — لہٰذا اس کام کو وہ بڑے اہتمام، جوش اور شوق کے ساتھ خود کرتے ہیں۔ صفائی سے فارغ ہونے کے بعد پھر غسل کرتے ہیں اور بالوں وغیرہ کو سنوارنے کے بعد اپنے کمرے پر آ کر پائپ سے شغل شروع ہو جاتا ہے — اسی دوران میں چائے آ جاتی ہے اور پھر اس کے بعد ملاقاتیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

اختر صاحب سے ملاقات کرنے کا یہ مخصوص وقت ہے۔ لہٰذا ہر شخص چھ بجے کے بعد آتا ہے اگر کوئی شخص پیشتر آ جائے تو اس سے اختر صاحب کو بھی تکلیف ہوتی ہے اور اس شخص کو بھی — چونکہ ان کے معمول میں خلل پڑ جاتا ہے وہ کسی سے ملنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور غصہ آتا ہے — ملاقاتی کو یا تو مایوس ہونا پڑتا ہے کہ اختر صاحب سو رہے ہیں یا پھر برآمدے میں بیٹھ کر کافی عرصہ تک انتظار کرنا ہوتا ہے۔

احباب سے ملاقات کا سلسلہ رات کے دس گیارہ بجے تک رہتا ہے — اسی دوران میں ادبی محفلیں بھی ہوتی ہیں، مشاعرے بھی ہوتے ہیں، خوش گپیاں بھی ہوتی ہیں۔ اختر صاحب اپنی مرحوم حسرتوں اور شکستہ امیدوں کا ماتم بھی کرتے ہیں، قسمت کو گالیاں بھی دے بیٹھتے ہیں اور کمرے کی چمکتی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر ایک فاتح کی طرح مسکراتے بھی ہیں۔

اختر صاحب کے ملاقاتیوں میں اسکول کے طالب علم بھی ہوتے ہیں بی۔ اے اور ایم۔ اے کے بھی — یونیورسٹی کے نوجوان لیکچرر بھی ہوتے ہیں اور پیران کہنہ سال بھی — شاعر و ادیب بھی ہوتے ہیں اور غفور صاحب (لیکچرر ٹریننگ کالج) جیسے فلسفی بھی جو اکثر بیٹھے بیٹھے فلسفے کی گتھیاں سلجھانے میں محو ہو جاتے ہیں اور اختر صاحب مزے میں پائپ دبائے دوسری طرف بیٹھے ہوئے دیگر احباب سے باتیں کرتے ہیں۔

اختر صاحب اپنے احباب کے حلقے میں بہت زیادہ مقبول ہیں۔ وہ شروع کی چند ملاقاتوں میں بہت کم کھلتے ہیں اور نئے [illegible]

کا بھی ہونے لگی ہے ـــ لیکن جب بے تکلف ہوتے ہیں تو اس کے ساتھ اپنی تحریروں کا اس بے تکلفی سے ذکر کرتے ہیں کہ اب یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اختر صاحب سے اس کے مراسم بہت گہرے ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اب اختر صاحب کے ساتھ ہمدردی کے علاوہ عقیدت بھی ہو جاتی ہے۔ رات کو جب متعدد احباب اختر صاحب کے یہاں جمع ہو جاتے ہیں تو ہر شخص اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب دوسرے حضرات تشریف لے جائیں تو میں اختر صاحب سے باتیں کروں چنانچہ یہ سلسلہ کافی طویل ہو جاتا ہے۔

دوستوں کے رخصت ہونے کے بعد اختر صاحب کھانا کھاتے ہیں۔ کچھ دیر برآمدے میں چہل قدمی کرنے کے بعد اپنے کوچ پر آ کر لیٹ جاتے ہیں۔ تازہ رسائل پڑھتے ہیں یا پائپ پیتے ہیں، اپنی سسکتی ہوئی حسرتوں کو پچکارتے ہیں اور ان کے حصول کے لئے راہیں سوچتے ہیں ـــ یہی وقت مطالعہ اور تصنیف کا ہوتا ہے۔ لیکن لکھنا تو انہوں نے ۱۹۴۹ء سے مستقل طور پر چھوڑ رکھا ہے ـــ ہاں مطالعہ روز کرتے ہیں اور پھر رات ایک دو بجے اندر مکان میں جا کر سو جاتے ہیں۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوست احباب نہیں آتے یا جلدی رخصت ہو جاتے ہیں تو اختر صاحب ریڈیو سنتے رہتے ہیں یا پائپ پیتے رہتے ہیں۔ ریڈیو دھیمی دھیمی آواز میں سنتے ہیں کہ کمرے میں بیٹھا ہوا دوسرا شخص مشکل سے ہی سن پاتا ہے ـــ لیکن وہ اپنے کوچ پر لیٹے رہتے ہیں، ریڈیو ان کے سرہانے دھیمی آواز میں بجتا رہتا ہے، پائپ پیتے رہتے ہیں اور سنتے رہتے ہیں ـــ ایک شب ریڈیو سن رہے تھے، شاید کوئی ڈرامہ ہو رہا تھا کسی کردار نے ایک شعر پڑھا، سن کر چونک گئے، اور دیر تک اس شعر کو پڑھتے رہے اور سر دھنتے رہے ـــ دفعتاً خیال آیا کہ یہ تو خود ان کا ہی شعر ہے۔ لہٰذا فوراً اپنا مجموعۂ کلام نکال کر تصدیق کی۔

اختر صاحب فطرتاً بہت زیادہ نفاست پسند ہیں۔ ان کی خارجی زندگی میں یہ نفاست پسندی دوسرے لوگوں کو تصنع کی حد تک معلوم ہوتی ہے۔ اختر صاحب بیماری کے بعد گھر سے بہت کم نکلتے ہیں ـــ اس کی وجہ آرام پسندی اور گوشہ نشینی کے علاوہ ایک یہ بھی ہے کہ زیادہ تر احباب خود ان کے گھر ہی آ جاتے ہیں۔ لہٰذا انہیں دوسروں کے گھر جانے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ لیکن جب کسی دوست سے ملے ہوئے بہت دن گزر جاتے ہیں تو بے چین ہو کر خود اس کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ بازار وغیرہ بھی ماہ دو ماہ میں ایک دو بار ہی جاتے ہیں ـــ لیکن جب اختر صاحب گھر سے نکلتے ہیں خواہ کالج جانے کے لئے، کسی تقریب میں شرکت کے لئے یا کسی دوست سے ملنے کے لئے ـــ نکلتے ہیں جینٹلمین کیل کانٹے سے لیس ہو کر ہی ـــ منزل پر پہنچ کر رومال سے چہرے اور چشمے کے شیشوں کو صاف کرنا ان کا سب سے پہلا کام ہوتا ہے ـــ اس کے بعد کنگھا نکال کر بالوں میں پھیرتے ہیں خواہ بال بگڑے ہوئے ہوں یا نہیں۔ جوتے کو بھی رگڑ کر چمکاتے ہیں۔ چہرہ اور جوتے کو صاف کرنا ان کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ اگر جوتے پر گرد ہی جمی ہو تو اس گرد کا عکس ساری شخصیت پر پڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے ـــ اگر جیب میں دو رومال نہیں ہیں تو وہ ایک ہی رومال سے دونوں کا کام کر لیتے ہیں ـــ اور پھر ان سے فارغ ہونے کے بعد پائپ میں تمباکو ڈالتے ہیں، تب کہیں جا کر بات چیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

مٹی اور دھوئیں سے اختر صاحب بری طرح چڑتے ہیں ـــ اگر سڑک پر گرد اڑ رہی ہو یا بیٹھے ہوئے کہیں دھواں اڑ کر ان کے اوپر آ جائے تو اختر صاحب اپنا چہرہ پیٹ لیتے ہیں۔ اپنے شانے اور کوٹ کو اس طرح جھاڑنا شروع کر دیتے ہیں جیسے ماتم کر رہے ہوں ـــ دھول گرد میں مٹی اور دھوئیں کی بو [illegible] ہی گھر کے چاروں طرف سے بند کرنے کے [illegible] میں تمام دروازے دیکھتے ہیں، ایک ایک دروازے کو اچھی طرح بند کر دیتے ہیں۔ مبادا ان میں سے دھول کے ذرات آ جائیں۔

اختر صاحب کی زندگی میں دو چیزیں نہایت واضح ہیں ـــ مایوسی اور سردی ـــ مایوسی کی ابتدا ان کی عملی زندگی کے ساتھ ہوئی۔ میرے خیال میں ان کی زندگی میں کوئی ایسا غیر معمولی قسم کا حادثہ تو [illegible] ہی نہ تھا ـــ البتہ اختر صاحب کی ناز و نعم میں پلی ہوئی حساس طبیعت نے چھوٹے سے واقعہ کو بھی ایک پہاڑ سمجھا اور اس میں [illegible] ہر چھوٹی بات کو [illegible] کوشش کر [illegible]

خدائی کو پہاڑ سمجھ کر اپنا سر پیٹ لیا، قسمت کو گالیاں دیں اور دنیا سے مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ انہیں یہ بھی گلہ رہا کہ وہ ایک قیمتی انسان ہیں، لیکن لوگ ان کی طرف توجہ نہیں دیتے ـــــ لیکن انہیں یہ احساس کبھی نہیں ہوا کہ ہمارا معاشرہ اس شخص کو عزیز نہیں رکھتا جو ان کی دہلیز پہ جبینیں نہ رگڑے شہنشاہوں کے درباروں کا طواف نہ کرے۔ خواہ وہ کتنا ہی قابل، عالم فاضل کیوں نہ ہو ـــــ یہی حال ادبی دنیا کا ہے ـــــ انہیں شکایت ہے کہ ادب والوں نے انہیں وہ جگہ نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے اور انہیں اکثر و بیشتر نظر انداز کیا گیا۔ تو یہاں بھی وہی چیز کارفرما ہے ـــــ اختر صاحب ہنگاموں سے بھاگتے رہے ـــــ وہ شاعر ہیں لیکن مشاعروں میں کبھی نہیں جاتے نہ وہ مشاعروں کے گروہ کے قریب ہی ہوتے ہیں وہ گروہ بندی کے بھی قائل نہیں۔ اگر وہ بھی ایک گروہ یا حلقہ بنا لیتے تو آج انہیں غالباً یہ شکایت نہ ہوتی۔

اختر صاحب کی زندگی میں مایوسی اس قدر رچ گئی ہے کہ اب وہ ہر کام کی ابتدا ہی سے مایوس ہو کر کہنے لگتے ہیں۔ "چونکہ یہ کام میں کر رہا ہوں اس لئے یہ کبھی نہیں ہو سکتا" ـــ مایوسی اور قسمت سے گلہ اختر صاحب کی زندگی میں قدم قدم پہ ملتا ہے

" دوسرے روز صبح ہی سے لو بڑی شدت کے ساتھ چلنے لگی اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا، میں نے جو گھر سے نکلنے کا ارادہ کیا تھا ـــ "

(خط بنام اظہر حسین صاحب قادری)

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"...... غالب نے اپنے خطوط میں کہیں کہیں اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے کہ میں نے جس سے عشق کیا، اس کو مار رکھا اور جس فرمانروا کی شان میں قصیدہ لکھا اس کی سلطنت کا بیڑا غرق ہوا۔ تو یعنی غالب کی کوئی اچھی خصوصیت تو مجھ میں جلوہ گر ہے کہ ہوتی، مگر یہ ایک بد صفت جو ان میں تھی میرے اندر بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے ـــ مختصر یہ کہ اول درجہ کا منحوس ہوں ـــ جہاں جاتا ہوں اس نحوست کا اثر ساتھ لے جاتا ہوں ـــ آپ کو یاد ہوگا کہ آج سے سترہ سال پہلے ۱۹۳۳ء میں جب میں سٹی اسکول میں ٹیچر ہو کر آیا تھا تو یہ اسکول کیا اچھا بھلا ادارہ تھا، روپے کی وہ فراوانی تھی کہ جب کسی طرح خرچ نہیں ہوتا تھا تو استادوں کو دس دس INCREMENT دے دیئے جاتے تھے۔ میرے آتے ہی اس کی مالی حالت خراب ہو گئی اور برسوں استادوں کی سالانہ ترقیاں بند رہیں ـــ اور اس کے بعد جب تک میں رہا وہ اسکول پنپ نہیں سکا اور اس کی مالی حالت گرتی ہی چلی گئی۔ پھر جب میں نے خدا خدا کر کے ایم اے کیا اور شعبہ اردو میں لیکچرار ہو گیا تو میرے تقرر کے بعد ہی ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک میں آ گیا چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ اردو کو اس ملک سے دیس نکالا مل گیا، اور شعبہ اردو دم توڑنے لگا ـــ گویا میں اردو میں ایم اے کر کے ہندوستان میں اردو کا مقدر گرتا گیا۔ اور صاحب، تکلف برطرف میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دوسری بڑی لڑائی بھی صرف اس لئے لڑی گئی کہ ۱۹۳۹ء تک میری تنخواہ کسی قدر معقول ہو گئی تھی اور قسمت کو ضرورت اس بات کی تھی کہ مہنگائی زیادہ سے زیادہ ہو جائے تاکہ میں بدستور بھوکا ننگا بنا رہوں ـــ چنانچہ آپ بھی جانتے ہیں کہ مجھ ایک مفلس کے لئے کس قدر وحشت ہوتی ہے ـــ آسمان پہ اگر کبھی کوئی بدلی نظر آتی ہے تو میرا چہرہ پیلا پڑ جاتا ہے اور غالباً آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ علی گڑھ تیزی کے ساتھ صحرا بنتا جا رہا ہے ـــ آپ کے سر کی قسم اگر میں ہمالیہ کی چوٹی پہ سکونت اختیار کر لوں تو وہاں بھی خاک اڑنے لگے ـــ "

اس سلسلے میں اختر صاحب نے مجھے اس طرح لکھا تھا۔

...... میں جب سے یونیورسٹی میں آیا تھا۔ بہت خوش تھا اور بہت مطمئن تھا اور "ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے" کے مصداق یہ سوچ سوچ کر ڈر رہا تھا کہ دیکھئے کیا مصیبت نازل ہونے والی ہے ——— خوف بھری نظروں سے باری باری اپنے سب بچوں کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا کہ خدا جانے ان میں سے کس کو اللہ پیارا ہونے والا ہے ——— بارے اس معبود حقیقی نے میرے بچوں کی جاں بخشی کی اور صرف میری ملازمت کی جان پہ بنی۔

اس مسلسل مایوسی نے اختر صاحب کو زندگی میں محرومی کا شدید احساس پیدا کر دیا ہے۔ لہٰذا وہ اس مایوسی سے قطع نظر اپنی آسودگی اور مسرتوں کے حصول کے لئے سوچتے رہتے ہیں اور اگر اتفاق سے ان کے حصول کا موقع مل جاتا ہے تو ایک حقیقی فاتح کی طرح قہقہے لگاتے ہیں ———

اسکول سے جب اختر صاحب شعبۂ اردو میں آئے تو ان کی مالی حالت پہلے کی نسبت کافی بہتر ہو گئی۔ اول تو یہ کہ آمدنی میں اضافہ ہوا اور دوسرے یہ کہ چھوٹے بھائیوں کے ملازم ہونے سے ان کے شانوں سے بار بھی کم ہو گیا۔ لہٰذا اختر صاحب کے پاس گھر کے اخراجات نکالنے کے بعد ایک اچھی خاصی رقم بچنے لگی کچھ بچا کر رکھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ لہٰذا انہوں نے بے تحاشا قیمتی چیزیں خریدنی شروع کیں۔

اختر صاحب کے پاس پائپ ہمیشہ ضرورت سے زائد رہے لیکن کوئی اس قدر قیمتی پائپ دوستاحبوں کے شوق کی صحیح طور پر تکمیل کرتا لہٰذا ۱۰ روپیہ کا DUNHILL خریدا۔ اسی طرح ۲۰ روپیہ کا RONSON لائیٹر خرید لیا۔ اختر صاحب سگریٹ نہیں پیتے ایک مرتبہ دہلی گئے۔ پندرہ روپیہ کا سگریٹ کیس پسند آ گیا خرید لائے۔ دریافت کیا "بھئی یہ کیس لئے؟" جواب ملا "یوں ہی"۔ ایک مرتبہ دہلی سے بڑی چھان بین کے بعد چالیس روپے کا لوٹا اور ایک ٹیبلٹ سیٹ خرید کر لائے ہر دوست سے فخریہ کہا۔ "کم از کم دہلی بھر میں اس سے اچھا لوٹا نہیں تھا ——— پورے دن بھاگ دوڑ کرنے کے بعد دستیاب ہوا ———" لیکن ٹیبلٹ سیٹ چند دن بعد ہی طبیعت سے اتر گیا اور آخر کار ایک دوست کو عنایت فرما دیا۔

انہی دنوں اختر صاحب گرلز کالج میں PART TIME LECTURER ہو گئے۔ آمدنی کے ساتھ ساتھ مصروفیت بھی بڑھ گئی۔ لہٰذا سائیکل کی ضرورت ہوئی۔ ایک پرانی سائیکل گھر میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کا بناؤ سنگار کرایا لیکن بوڑھی گھوڑی پہ لال لگام نہ جچی۔ اسے فروخت کر کے تین سو روپے کی ریلے سائیکل خرید ڈالی ——— حالانکہ سائیکل چلانے سے اچھی طرح واقف بھی نہ تھے اور ایک دن پسلی کی ہڈی کو تکلیف ——— ہفتہ بھر تک پٹیاں باندھے رہے۔

ایک مرتبہ [illegible] صاحب امراؤ سنگھ کی دوکان پر کھڑے تھے۔ شوکیس میں رکھا پلاسٹک کا بنا ہوا گھڑی کا اسٹینڈ پسند آ گیا۔ اختر صاحب نے قیمت دریافت کی، جواب ملا۔ "صاحب یہ تو ہم دوکان کی شو کے لئے لائے ہیں فروخت کرنے کے لئے نہیں ——— آج تک کسی نے ہم سے طلب نہیں کیا۔" لیکن اختر صاحب بضد اور ہر قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ——— لہٰذا خرید لیا ——— اسی طرح اختر صاحب نے اپنے کمرے کی آرائش میں اضافے کئے ہیں۔

اختر صاحب جب بھی کوئی چیز خریدتے ہیں تو سب سے اعلیٰ کوالٹی کی پسند کرتے ہیں۔ عمدہ اور حسین چیز خریدنا ایک طرح سے ان کی HOBBY ہے۔ ان کے سامنے ایک ہی قسم کی الگ چیزیں رکھ دی جائیں اور ایک کی قیمت کم اور ایک کی قیمت زیادہ بتائی جائے تو زیادہ قیمت کی چیز ہی پسند کریں گے ——— وہ جب کبھی کسی دوکان پر جاتے ہیں تو خاموشی کے ساتھ دوکان کی اشیاء کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ وہ عام طور پر دوکان دار سے چیزیں کم طلب کرتے ہیں بلکہ مطلوبہ اشیاء کی طرف اشارہ کرتے جاتے ہیں اور دوکان دار پیک کرتا جاتا ہے ——— قیمت ٹھہرانا ان کے بس کی بات نہیں۔

اختر صاحب تنگ دست رہتے ہیں لیکن دل بہت بڑا رکھتے ہیں۔ قرض مانگنے والوں کو شاذ و نادر ہی مایوس کرتے ہیں۔ پھر اس قرض کی

واپسی کا انتظار بھی کرتے رہتے ہیں ——— ایک مرتبہ سکول کا چپراسی ایک خط بلکہ عتاب نامہ لے کر آیا کہ آپ یا تو اسکول میں واپس آ جائیے یا اپنی جگہ سے مستعفی ہو جائیے — ان دنوں اختر صاحب شیعہ مسجد میں آ چکے تھے اور ان کی معاشی حالت ڈانواں ڈول تھی۔ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ جیب میں شاید دو ہی روپے تھے وہ چپراسی کو دے دیئے ——— کیونکہ انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ چپراسی ایک عرصے کے بعد گھر آئے اور خالی ہاتھ واپس جائے۔

اختر صاحب اشتراکیت کے حامی ہیں ——— انہیں دکھ ہے کہ انہوں نے اشتراکیت کو پڑھا ہے، سمجھا ہے اور اسے اپنی نفسیات میں پرورش کیا ہے۔ لیکن اختر صاحب کی اشتراکیت ان کی ذات تک ہی محدود ہے وہ کبھی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بنے اور نہ ان کے کسی جلسے میں شریک ہوئے ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹوں کی گرفتاریاں ہوئیں یونیورسٹی سے بھی چند طلباء اور اساتذہ گرفتار ہوئے۔ اختر صاحب کو پریشانی لاحق ہو گئی۔ چونکہ صرف کمیونسٹ ہی نہیں بلکہ وہ ادیب اور شاعر بھی گرفتار کئے جا رہے تھے جنہیں اشتراکیت سے ہمدردی تھی۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں کہنے لگے ——— "یوں تو نظر بندی سے کوئی ڈر نہیں۔ لیکن پیچھے خدانخواستہ سارا سکون درہم برہم ہو جائے گا —"

مذہب سے اختر صاحب کو کسی قسم کی دلچسپی نہیں۔ وہ عید اور بقر عید کی نماز بھی نہیں پڑھتے۔ لیکن قربانی ضرور کرتے ہیں ——— خواہ مہمانوں کی خاطر کرتے ہوں یا احباب کے لئے لیکن مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں ——— وہ دلی کے شیعہ نہیں پر NON VEGETRIAN ہیں ہوٹل میں جا کر کھانا بھی کھا لیتے ہیں ———

گاندھی جی کے مرنے کی خبر سن کر انہیں ایک دھچکا سا لگا۔ کہ صاف کہتے کہتے افسردہ ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے ——— لیکن اس لئے نہیں کہ گاندھی جی ہندوستان کے بڑے لیڈر تھے یا ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے بلکہ اس لئے کہ وہ ایک "عظیم انسان" تھے۔

ایک مرتبہ اکبر حسین صاحب قادری نے دعوت افطار کی ——— اختر صاحب کو بھی بلایا — اختر صاحب افطار کا وقت ختم ہونے کے بعد پہنچے سب نے دریافت کیا "اتنی دیر کیوں ہو گئی —" جواب دیا — "یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں بے روزہ دار ہو کر آپ لوگوں کے ساتھ شرکت کروں — لہذا اب آپ لوگ افطار کر چکے ہیں۔ باقی کے پروگرام میں آپ کا شریک ہوں —"

آپ اختر صاحب سے گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہیے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ آئے گی لیکن دبی دبی سی۔ یا طنز میں ڈوبی ہوئی ——— وہ خود کبھی محفل میں، کسی نشست میں ایسا واقعہ بیان نہیں کر سکتے جس سے سامعین کے پیٹوں میں بل پڑ جائیں ——— لیکن برخلاف اس کے ان کے سامنے اگر کوئی پُر مزاح واقعہ یا لطیفہ بیان کیا جائے تو وہ انتہائی لطف لیتے ہیں۔ خوب ہنستے ہیں، بار بار بیان کرتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں —

ایک مرتبہ اختر صاحب "ریڈیو ٹاک" کے سلسلے میں دہلی گئے — میں بھی ہمراہ گیا۔ غازی آباد سے عطا محمد رشید جو کہ اب تحصیلداری کے دھندوں میں دب کر رہ گئے ہیں ابھی ہم رکاب ہو گئے — اس دن اختر صاحب بہت خوش تھے — واپسی پر جامع مسجد سے ریلوے اسٹیشن تک متعدد لطیفے بھی سنائے۔ جب ہم لوگ اسٹیشن پر پہنچے تو دہلی میل پلیٹ فارم پر آ چکی تھی حالانکہ روانہ ہونے میں قریب دو گھنٹے باقی تھے — عطا محمد تو قمیص اور پینٹ کا تکیہ بنا کر اپنی برتھ پر دراز ہو گئے ——— اختر صاحب نے اسٹیشن کے باہر شربت اور چاٹ کی دکانوں پر چاٹ کھانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے کہا "اس وقت رات کے گیارہ بجے ہیں اور سنا ہے کہ یہاں رات میں مسلمانوں کے لئے اکیلا نکلنا ٹھیک نہیں — بہتر یہی ہے کہ اسٹیشن پر بیٹھیے —" یہ ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے جب کہ فسادات کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن اختر صاحب نہیں مانے کہنے لگے — "ہم لوگ سوٹ پہنے ہوئے ہیں۔ انگریزی میں بات کریں گے کوئی نہیں پہچانے گا —" بہرحال ہم لوگ اسٹیشن کے باہر پہنچ گئے — اختر صاحب نے تو بہت مزے لے لے کر چاٹ کھائی۔ ہم لوگوں نے اس دوران میں بہت کم بات کی لیکن جو بات کی وہ انگریزی میں کی۔ مجھے تو کسی حد تک ڈر بھی محسوس ہو رہا تھا لیکن اختر صاحب بالکل اطمینان سے چاٹ کھاتے رہے ——— اختر صاحب نے جب دوکاندار کو پیسے دیئے تو وہ کہنے لگا۔

"بابو جی آپ لوگوں نے بڑی جرأت کی ——— ویسے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن سارے بدمعاشوں کو کون روک سکتا ہے ——— آپ لوگ اب

اسٹیشن پر پہنچا رہے ہیں!

اختر صاحب کی عمر اس وقت تقریباً ۴۶ سال ہے۔ اس عمر کو اگر جوانی نہیں کہہ سکتے تو شاید بڑھاپا بھی نہیں کہہ سکتے — لیکن اختر صاحب کو اپنے بوڑھے ہونے کا احساس آج سے پانچ سال قبل ہی سے ہو گیا ہے۔

"ہاں ایک بات لکھنی بھول گیا۔ بڑی تیزی کے ساتھ زندگی کے زینے طے کر رہا ہوں۔ میرا مکان [illegible] کی آخری حد ہے۔ میرے مکان سے کوئی سو قدم آگے ٹریننگ کالج ہے، جہاں تک میں پہنچ چکا ہوں۔ ٹریننگ کالج سے سو قدم آگے قبرستان ہے، وہ میری آخری منزل ہوگی جیسا کہ ہر انسان کی ہوا کرتی ہے۔ زندگی کے مدارج طے کرنے کا مطلب یہ بھی تھا کہ اب میری عمر ۴۱ سال کی ہوگی — بال سفید ہو گئے — آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی اور چہرے سے بڑھاپا ٹپکتا ہے — زندگی بڑی ناکام ثابت ہوئی ......"

(خط بنام اظہر حسین صاحب قادری)

اختر صاحب کی زندگی بڑی ناکام ثابت ہوئی — ٹھیک ہے — اس نے مایوسی دی — محرومی اور ناکامی دی — آرزوؤں اور حسرتوں کو پیس ڈالا — لیکن اختر صاحب میں اتنی جرأت بھی تو نہیں کہ باقی ماندہ زندگی کو زیادہ عیش و آرام سے گزاریں — وہ ناکامیوں اور نامرادیوں سے اس درجہ خائف ہو گئے ہیں کہ آگے قدم بڑھانا چاہتے ہیں، قدم اٹھاتے ہیں اور پھر وہیں قدم جما لیتے ہیں۔

جب اختر صاحب ٹریننگ کالج میں ۲۰۰ روپیہ کے مستقل لیکچرار ہو گئے تو شادانی صاحب نے ڈھاکہ سے پھر ایک بار دعوت دی — "اور ابھی گزشتہ ہفتہ شادانی صاحب کا ایک خط پھر آیا — لکھتے ہیں کہ کچھ دن ہوئے تم نے اپنے ایک دوست کی سفارش کی تھی (مطلب مجھ سے ہے) اب وقت آیا ہے کہ میں ان کے لئے کچھ کر سکوں — ۵۰۰ روپیہ تنخواہ دلوا سکتا ہوں اور ۵۰ روپیہ مہنگائی الاؤنس —" اس خط کو پڑھ کر ساری کشمکش اور ذہنی الجھن جس کا میں شکار رہا پھر زندہ ہو گئی — مگر میں بھی عجیب شخص ہوں — مختلف طریقوں سے اپنے آپ کو سمجھایا — "تو نے [illegible]" — اور شادانی صاحب کو انکار لکھ دیا ......" اور جھیل کا پانی دھیمے دھیمے سرگوشیاں کرنے لگتا ہے — "کہاں اس برسوں پرانے مسکن کو چھوڑ کر پتھروں سے سر ٹکرانے —"

اتنا کچھ لکھنے کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ اختر صاحب کی زندگی اور شخصیت کے بہت سے پہلوؤں کی طرف اشارہ بھی نہیں کر سکا — اول تو ان کے ادبی کارناموں کا ذکر بالکل نہیں آیا — خیر یہ چیز تو میرے موضوع سے خارج بھی ہے کیونکہ یہ ادبی نقادوں کا منصب ہے میرا نہیں — ویسے یہ اپنی جگہ پر حقیقت ہے کہ اردو کی دنیائے ادب میں اختر صاحب کی حیثیت معروف ترین ہے — "معروف ترین" کا لفظ میں نے سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے، اس لئے کہ اختر صاحب اردو ادب میں شاعر، افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے مستقل مقام رکھتے ہیں — ہمارے لکھنے والوں میں متعدد حضرات ایسے ہیں جو دو حیثیتوں سے اعلیٰ درجے کی شہرت رکھتے ہیں —

علاوہ ازیں اس مضمون میں میں اختر صاحب کی ان ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کا ذکر بالکل نہیں کر سکا جنہوں نے کم و بیش سات آٹھ سال سے انہیں معطل کر رکھا ہے اور جن کو بطور عذر کے اختر صاحب نے ایڈیٹروں کے خطوط کا جوابوں سے مستقل جواب بنا رکھا ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ انسان کی زندگی کا نازک ترین پہلو ہوتا ہے اور نہایت گہرے اور نفسیاتی مطالعہ کے بغیر اس کے ذکر سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔ میں اختر صاحب سے کلی واقف ہونے کے باوجود اس گہرے اور نفسیاتی مطالعہ کا دعویٰ نہیں کر سکتا اسی لئے میں نے اس چیز کا ذکر چھیڑنے سے قصداً اجتناب کیا — ان وجوہ کے علاوہ — میرا خیال ہے کہ میں اختر صاحب کی غیر معمولی ذہانت اور ان کے حساس پہلو اور شخصیت کو پوری طرح پیش بھی نہیں کر سکا، جس کا سبب تنگیٔ داماں کے علاوہ یہ بھی تھا کہ آخر میں اتنا اور لکھوں گا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ پانچ سال پیشتر تک کی معلومات کی بنیاد پر لکھا ہے اور پچھلے چند سالوں میں اگر اختر صاحب کی شخصیت کی نئی تہیں نظروں کے سامنے آئی ہوں اور یقیناً آئی ہوں گی تو ان سے میں بے خبر ہوں! ...

رہارو آگئے اور یہاں تھانیداری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ لڈن ماموں سنہ ۱۹۱۲ء میں وہیں رہارو میں پیدا ہوئے۔ ابھی یہ ڈیڑھ سال کے تھے کہ ان کے نانا اور والد کو ریاست سے پنشنیں مل گئیں اور وہ اپنے وطن رام پور آگئے۔ چنانچہ لڈن ماموں بھی رام پور آگئے۔ عربی فارسی کی تعلیم اپنے نانا اور والد سے گھر پر حاصل کی، اُردو حکیم حتی میاں سے پڑھی۔ علم حاصل کرنے کی لگن سے تنگ آکر خاندانی روایت سے بغاوت کرتے ہوئے اپنے ماموں کرامت علی خاں کے ذریعہ جو اس وقت رام پور میں تھانیدار تھے، ۱۲ برس کی عمر میں اسکول میں داخلہ لے لیا۔ جس پر لڈن ماموں کے والد عرصہ تک ناراض رہے اور کہتے رہے کہ کرامت علی خاں نے میرے لڑکے کو کرسٹان بننے میں مدد دی ہے جسے میں کسی طرح معاف نہیں کر سکتا۔ مگر ایک دن بہار کر ریلی سے لڈن ماموں کے بڑے ماموں کا تار آگیا اور یہ دیکھ کر کہ لڈن ماموں نے وہ تار حرف بحرف پڑھ کر سنایا بہت خوش ہوئے اور اپنی ناراضگی کے ردِعمل میں بڑے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا میں غلطی پر تھا۔ زمانہ کا تقاضا یہی تھا جو تم نے کیا۔ اب تم شوق سے انگریزی پڑھ سکتے ہو مگر اپنے بزرگوں کا امتیاز ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ "مجھ پر بھروسہ کیجئے" لڈن ماموں نے جواب دیا اور اس بھروسہ کو آخر تک نبھایا۔ چونکہ قدرت نے انہیں علم حاصل کرنے کی تڑپ دی تھی اس لئے ان کے مطالعہ کا یہ عالم رہا کہ رات کے دو دو بجے تک کتاب ہے اور لڈن ماموں ہیں اور آپ تعجب کریں گے کہ یہ شوقِ مطالعہ آج بھی کم نہیں۔ خصوصاً شعر و ادب کی دلچسپی جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ سبعہ معلقہ کا ایک ایک شعر مع اپنی تمام خوبیوں کے ان کا موضوعِ سخن تھا یعنی یہ مطالعہ ورق گردانی کے طور پر نہ تھا بلکہ بعینہٖ مفہوم و معانی میں ڈوب کر استفادہ مدِنظر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی سبعہ معلقہ کے شاعروں میں صرف لبید کو ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں اس میں ایک خودداری اپنی تمام سنجیدگیوں کے ساتھ موجود ہے۔ یہ لڈن ماموں کے وسیع ذوقِ مطالعہ کا نتیجہ ہی تو ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے دیوانوں کا انتخاب ایک ایک شعر میں مرتب کیا ہے۔ مگر یہ وہ شاعر ہیں جو انہیں پسند نہیں پھر بھی ان کا گہرا مطالعہ کر کے یہ انتخاب تیار کیا ہے۔ حضرت میر کا یہ شعر جس کا مصرعہ ہے "یہ کس گل نے تبسم کیا"۔ خاقانیِ ہند ذوق کے دیوان کا خلاصہ ملاحظہ کیجئے ؎

منعم موذی کے گھر کو اہلِ حاجت لوٹ لیں
مانگتا ہے کب کوئی جب تک کہ عسل زنبور ہے

ناسخ اور اس قسم کے دوسرے خشک شعراء کے متعلق کہا کرتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنی عمر ضائع کی اور کاغذ بھی ——— زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کے کلام سے رسالۂ مذکر و تانیث تیار کیا جا سکتا ہے یا وہ اردو لغت جس میں اشعار کے ذریعہ مثالیں پیش کی گئی ہوں۔ حضرت آتش کا یہ مطلع "سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا" الخ ——— رند کا یہ شعر جس کا آخری مصرعہ ہے "وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد"۔ حد یہ ہے کہ اپنے استاد فصاحت جنگ حضرت جلیل کو اس ایک مطلع کا شاعر کہتے ہیں ؎

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

اگر آپ حضرت غالب کے دیوان کا خلاصہ چاہیں گے تو صاف صاف کہہ دیں گے کہ وہ تو خود انتخاب ہے، انتخاب کا انتخاب حماقت ہے ہاں اگر آپ یہ پوچھیں گے کہ ان کے نزدیک غالب کا سب سے اچھا شعر کونسا ہے تو کہیں گے ؎

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

دو چار دن کے بعد آپ اگر پھر یہی سوال کریں گے تو جواب ملے گا ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اگر آپ معنی بہت چھیڑ دیں گے تو ارشاد ہوگا۔ اس شعر میں غالب کی خوبی اپنے اخلاق کو واضح ہے۔ محبوب سے کہتے ہیں ہم گالیاں برداشت ہی نہیں کر سکتے وہ تمہاری ہوں یا کسی اور کی۔ مگر رقیب کے گالیاں سہہ جانے سے ہم اندازہ کرتے ہیں کہ تیرے لبوں کی شیرینی ایسی کوئی حد ہی نہیں رکھتی —— اس کے بعد اگر آپ یاد دلائیں گے کہ چار دن پہلے تو آپ نے غالب کا وہ شعر پسند کیا تھا اور آج اس شعر کو سب سے اچھا شعر بتاتے ہیں تو فوراً مسکرا دیں گے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ کلام تو سب ہی اچھے شعر کہہ گیا ہے۔ حضرت حالی کا یہ مقطع بہت پسند ہے ؎

بڑا جی خوش ہوا حالی سے مل کر — ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ایک دن کہنے لگے جوش کو میں بہت اچھا شاعر سمجھتا تھا مگر اس کا یہ مقطع دیکھ کر "ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں" جوش سے میرا دل برا ہو گیا۔ حضرت حالی کے اس مقطع کا ایسا مذاق اڑایا ہے جس کا جواب نہیں۔ غرضیکہ لڈن ماموں نے اردو کے تمام شعراء کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے کچھ دن ہوئے میں لڈن ماموں سے امیر مینائی کے ایک شعر کا مطلب پوچھ رہی تھی مطلب بتاتے بتاتے کہنے لگے کہ یہ شعر امیر مینائی کا نہیں بلکہ نظام رامپوری کا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے ایسی دلیلیں پیش کیں جن سے ان کی بات کو تقویت پہنچتی تھی ایک دن کہنے لگے نظام کے کلام کا سرقہ ہوا ہے میں پرانے لوگوں سے پوچھ تاچھ کر رہا ہوں پھر ثابت کروں گا کہ نظام کا بہت سا کلام امیر مینائی کے کلام میں شامل ہو گیا ہے۔

بہرحال لڈن ماموں کی شاعری اپنی جگہ خلوص اور تجربہ ہے اور ان کے فطری شاعر ہونے میں کسی کلام کی گنجائش نہیں۔

شاعر کو الہام ہوتا ہے اس بات کی جانچ میں نے لڈن ماموں کی شاعری سے کی ہے۔ اس گھر میں لڈن ماموں رہتے تھے اب وہ اپنے بھتیجے ماسٹر خدا احمد خاں صاحب کے پاس رہتے ہیں اور اپنا ذاتی مکان فروخت کر دیا ہے۔ اس کا نقشہ کھینچنا بہت مشکل ہے مرزا کے شہر آشوب سے بڑھ کر ہے۔ کچی کھپریل سے ڈھکی ہوئی کوٹھری جس میں نہ گرمی کا آرام نہ سردی کا نہ بارش سے حفاظت ہو سکتی ہے بغیر پلاستر کی ٹوٹی ہوئی دیواریں۔ ایک چھوٹا سا پلنگ ایک ٹوٹا ہوا تین ٹانگ کے گھڑے دروازہ بغیر زنجیر کا جس کو جب جاتے تار لگا کر بند کر جاتے۔ یہ تھا اردو کے شاعر نثار عارفی کا مکان جس میں وہ شعر کہتا تھا۔

لڈن ماموں روز تو نہیں لکھا کرتے تھے لفظوں کے روپ میں علاج اور سماج کے زخموں پر نمک چھڑکا کرتے تھے اور اب بھی یہ شغل جاری ہے۔ جیسا میں نے پہلے لکھا لڈن ماموں انتہائی خوددار کم پڑھے اور شریف قسم کے آدمی ہیں "جو کی روٹی کھا مگر آزاد رہ" ان کی زندگی کا اصول ہے خوشامد کرنا نہیں جانتے۔ صاف دل اور صاف گو ہیں لگی لپٹی کے قائل نہیں۔ خدا اور رسول پر پکا ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ لوگ جو ان کو دور سے دیکھتے ہیں ان کے متعلق مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ کمیونسٹ ہیں کسی کی رائے ہے احراری ہیں مگر میری رائے میں وہ ایک سچے مسلمان ہیں اور شاعر کے علاوہ کچھ نہیں۔ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔ رامپور کے اکثر رئیسوں نے ان کی امداد کرنا چاہی مگر لڈن ماموں نے انکار کر دیا۔ وہ کہتے ہیں اگر رئیسوں سے روپیہ لوں گا تو ان کے خلاف پھر نظمیں کیسے لکھوں گا۔ میری شاعری کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

لڈن ماموں کی باتوں میں بلا کی کشش ہوتی ہے مختلف موضوعات پر بات چیت کرتے جائیں گے مگر درمیان میں لطیفے اور قصے بھی جاری رکھیں گے۔ لڈن ماموں کبھی اکیلے نہیں رہتے یار دوستوں اور شاگردوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ اگر شعر و شاعری سے فرصت ہے تو شطرنج کھیلی جا رہی ہے۔ اس کام سے فرصت ملی تو پتنگ بازی اور کبوتر بازی۔ ان کے پرانے گھر میں بہت سے کبوتر پلے ہوئے تھے۔ کبوتروں، مرغیوں اور کتوں کے بارے میں بہت کافی معلومات رکھتے ہیں۔ ایک دن میں نے پوچھا لڈن ماموں آپ نے اس قدر کبوتر کیوں پال رکھے ہیں کہنے لگے ان کے

دم سے گھر کی تنہائی محسوس نہیں ہوتی —— زندگی چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہے۔

لڈن ماموں زندگی کی معمولی سی معمولی بات اور ہنگامے میں دلچسپی لیتے ہیں اور اسی سے اپنی شاعری کا مواد تیار کرتے ہیں۔ مزدور اور سماج ہو یا عزیز اور دوست کسی کو شاعر کی حیثیت سے نہیں بخشتے۔ جس میں کوئی چار سو بیس قسم کی بات دیکھتے ہیں اس کی شان میں قصیدہ لکھ مارتے ہیں اور بہت تیز کر جاتے ہیں۔ دسہرہ، گنگا اشنان، مہنگائی، نمائش وغیرہ نظمیں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

لڈن ماموں نے کچھ دن ہوئے ایک غزل لکھی تھی جس کا مطلع تھا ؎

میں تو چکی سے کھا رہا ہوں شاد
دال ملتی ہے جیل خانہ میں

یہ شعر ان کی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے مگر خدا کو رازق ماننے کی وجہ سے دونوں وقت مزے سے کھاتے ہیں۔ کون دیتا ہے کہاں سے آتا ہے؟ وہ جانے جو دونوں جہان کا رازق ہے اور پتھر کے کیڑے کو بھی رزق پہنچاتا ہے۔

سیّد عبدالحمید عدمؔ

شاد امرتسری

۱۹۴۳ء کی سردیوں کی ایک شام کا ذکر ہے میں ٹمپل روڈ پر ایک چھوٹے سے ٹی سٹال میں چائے پی رہا تھا کہ چائے خانہ میں ثاقب علی ثاقب داخل ہوئے کہ ان سے ہر شام وہاں ملاقات ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ ایک موٹا تازہ شخص سگرٹ کو انگوٹھے اور دو انگلیوں میں تھامے جھومتا جھامتا اندر گھس آیا۔ گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، چوڑا چکلا جسم، "توند کچھ بڑھی ہوئی"، ڈھیلے ڈھالے کپڑے جیسے از خود اس کے جسم پر اٹک گئے ہوں۔ بوسیدہ کوٹ کے کالر غائب، پاجامہ تھا یا پتلون ڈھیلی ہوتی جس کو وہ بار بار ہاتھ سے پکڑ کر اونچا کرتا تھا۔ گردن پر ابھری ہوئی رگ کی نمود سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص کبھی دوسروں سے نہیں دبا۔ چہرہ مسکراتا ہوا اور آنکھوں میں ایک معصوم سی چمک۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ سوچتا کہ کون ثاقب صاحب اپنے ساتھ کیا لئے آئے ہیں انہوں نے مجھ سے کہا۔ شاد صاحب! آپ ہیں عدم صاحب یعنی سید عبدالحمید عدمؔ، اُردو کے مشہور شاعر۔ میں یہ سن کر بھونچکا سا رہ گیا کہ اس ڈیل ڈول کا شعر سے کیا تعلق ہو سکتا ہے مگر اتنے میں عدمؔ صاحب نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ "حضور آپ سے مل کر واقعی خوشی ہوئی۔" اتنا کہا اور بیٹھ کر سگرٹ پینے لگے۔ میں نے چائے منگانا چاہی مگر عدمؔ صاحب نے پھر مسکراتے ہوئے کہا: "حضور یہ چائے کا وقت نہیں اب تو شام ہو رہی ہے۔" یہ کہا اور پھر نہایت بے تکلفی سے داد طلب انداز میں میری جانب دیکھا۔ ثاقب صاحب بھی مسکرا رہے تھے۔ کچھ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ چائے ختم ہوئی تو ہم تینوں ٹی سٹال سے نکلے۔ باتیں کرتے کرتے اور چلتے چلتے میکلوڈ روڈ تک پہنچے تو عدمؔ صاحب جھٹ [illegible] سنگھ کے باہر والی دیسی شراب کی دکان کی طرف چلنے لگے میں اور ثاقب صاحب بھی پیچھے پیچھے ہو لئے۔ دکان کے اندر داخل ہوئے۔ عدم صاحب بوتل کو ہاتھوں میں تھامے کھڑے تھے اور ان کے چہرے سے کچھ اس قسم کی معصوم مسرت ٹپک رہی تھی جو ایک بچے کو اس کی پسند کا کھلونا مل جانے پر ہوتی ہے۔ بوتل کو کاغذ میں لپیٹ بغل میں دبا عدم صاحب بولے "حضور یہیں بیٹھ جائیں؟" میں ان دنوں دیال سنگھ کالج کا طالب علم تھا اور بعض وجوہ کی بنا پر [illegible] روڈ پر ایک دوست کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ میرے دوست مسٹر حسن کسی دفتر میں ملازم تھے۔ [illegible] اور میرے عزیز دوست۔ میں نے سوچا شراب خانے میں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا: "عدم صاحب گھر چلتے ہیں۔" عدم صاحب کو جیسے کسی نے بہشت کی خوشخبری دے دی۔

سبحان اللہ کہا اور ہم گھر کی جانب چل پڑے۔

بوتل کھل گئی۔ اس سے پہلے میں نے دیسی شراب کبھی نہیں پی تھی مگر عدم صاحب نے اس خلوص اور بے تکلفی سے دعوت دی کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ ٹھرا نہیں، چند ہی منٹ کے بعد شراب کا اثر ہوا اور عدم صاحب نے از خود اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔ ایک دو تین چار اور معلوم نہیں کتنی غزلیں سنا ڈالیں۔ دور چلتا رہا اور شعر ہوتے رہے۔ یہ محفل کافی دیر تک رہی اور آخر عدم صاحب کی یہ حالت ہو گئی کہ مجھے اور ناشب صاحب کو انہیں پکڑ کر تانگے میں لادنا پڑا۔

عدم صاحب سے بظاہر یہ میری پہلی ملاقات تھی مگر مجھے کچھ یوں محسوس ہوا کہ وہ میرے بہت پرانے دوست ہیں اور عرصے سے ملتے ہیں۔

دوسرے روز شام کے قریب میں گھر پہنچا تو عدم صاحب کو موجود پایا۔ میری غیر حاضری میں وہ میرے دوست اور میرے کمرے کے ساتھی مسٹر حسن سے نہ صرف اپنا تعارف کرا چکے تھے بلکہ نہایت بے تکلفی سے محو گفتگو تھے اور انہیں اپنی کئی غزلیں بھی سنا چکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی عدم صاحب نے اس طرح اٹھ کر میرا استقبال کیا جیسے وہ صاحب خانہ ہوں اور میں ایک مہمان کی حیثیت سے ان کے گھر آیا ہوں —

تھری ایکس رم کی بوتل میز پر کھلی پڑی تھی اور اس کی بو سے سارا کمرہ مہک رہا تھا۔ میرے دوست مسٹر حسن (جو اب بھی میرے ہمسائے ہیں) شراب بالکل نہیں پیتے مگر پینے والوں کو نہ صرف برداشت کرتے ہیں بلکہ ان کے لئے ساز و سامان فراہم کرنا سعادت تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک پلیٹ میں کچھ کباب بھی پڑے ہوئے تھے۔ ان دنوں ہمارے اس کمرے میں جس کا نام ہم نے پاکستان کالج رکھا ہوا تھا، شام کو روزانہ محفل آراستہ ہوتی تھی۔ مختلف قسم کے احباب جمع ہو جاتے تھے۔ ظہیر کاشمیری، سیف الدین سیف، مراتب علی ناشب، لطیف انور اور ہمارے ایک کرم فرما مسٹر خلیل شام ہوتے ہی چلے آتے۔ خوش گپیاں ہوتیں۔ خلیل صاحب لطیفہ بازی اور بذلہ سنجی سے ہمیں نوازتے۔ سیف صاحب کلام سناتے، ان سے بحثیں ہوتیں۔ ظہیر کاشمیری سے کمیونزم پر گرما گرم گفتگو ہوتی۔ علم و ادب کی باتیں ہوتیں اور گاہے گاہے شراب کا دور بھی چلتا۔ میرے دوست مسٹر حسن تاش کے بہت شوقین ہیں۔ ان کے بھی کچھ دوست احباب آ جاتے۔ وہ الگ تاش میں مصروف رہتے اور ہم اپنے کام میں مگن۔ گویا یہ کمرہ صحیح معنوں میں سعدی کے اس شعر کی تفسیر تھا —

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

عدم صاحب کے آنے سے اس روز کی محفل میں ایک نمایاں فرق یہ پڑا کہ شراب روز آنے لگی اور اکثر اوقات عدم صاحب اپنے ساتھ ہی بوتل لے آتے۔ وہ باقاعدہ شام ہوتے ہی دفتر سے سیدھے میرے ہاں چلے آتے۔ دوسرے احباب بھی جمع ہو جاتے۔ عدم صاحب شراب کے ساتھ ساتھ بیسیوں غزلیں بھی سناتے جاتے۔ ہمیں غزلوں سے اور خود کو شراب سے بے ہوش کرتے۔ عدم صاحب کا حافظہ بہت تیز ہے اور انہیں اپنی سینکڑوں غزلیں یاد رہتی ہیں اور خاص طور پر شراب پینے کے بعد تو انہیں تمام بھولے بسرے شعر بھی یاد آ جاتے ہیں۔

عدم صاحب کے سلسلے میں یہ کہنا بالکل بے جا نہ ہوگا کہ شراب کے بغیر ان کی شخصیت بالکل بے معنی ہے۔ اس کے بغیر وہ اکھڑے اور بہت بور دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی گفتگو بے جان، بے معنی اور معاندانہ ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ کسی بھی حسین شے سے ایسی حالت میں متاثر نہیں ہوتے۔ ان کا ایک شعر اس سلسلے میں سنئے —

شراب پی کے مجھے آنکھ کھول لینے دے
ابھی جھجکتے ہوئے رخ کو بے نقاب نہ کر

یوں بھی عدم صاحب کا علم و ادب کا مطالعہ بہت محدود ہے۔ وہ کسی ادبی یا فنی نظریے یا کسی مکتب خیال کے اصولوں سے پوری طرح

شناسا نہیں ہیں اور یہ اس لئے نہیں کہ انہوں نے کسی نظریے یا کسی مکتبِ فکر کے اصولوں کے مطالعہ نہیں کیا اور نہ اس لئے کہ وہ خود کو بہت عالم سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ ان کا مزاج ہی کچھ اس قسم کا لاابالی واقع ہوا ہے کہ وہ کسی سنجیدہ قسم کے ادب یا نظریے کا مطالعہ کر ہی نہیں سکتے اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ شروع سے ہی انہوں نے سائنس کی تعلیم پائی۔ حساب کے مضمون سے بہت دلچسپی رہی۔ بی۔ اے کے بعد ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک ہو گئے اور ایس۔ اے۔ ایس کے امتحان میں (سب آرڈینیٹ اکاؤنٹس سروس جو بک کیپنگ اور اکاؤنٹسی کا امتحان ہوتا ہے) دو بار فیل ہونے کے بعد تیسری بار پاس ہوئے اور پھر اس طرح سے دفتری کام میں محو ہوئے کہ انہیں ادبیات کا مطالعہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

ندیم صاحب کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی سادگی اور معصومیت ہے۔ معصومیت کا لفظ میں روایتی طور پر استعمال نہیں کر رہا بلکہ اگر اجازت ہو تو میں یہ کہوں گا کہ ندیم صاحب کی شخصیت میں محض معصومیت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ زندگی کا ہر پہلو چاہے وہ ادبی ہو، دفتری ہو یا ان کے فن سے متعلق ہو ان کی شخصیت کی اس خصوصیت سے بہرحال اثر پذیر ہوتا ہے۔ ان کی طبعی سادگی اس حد تک ان کی زندگی میں رچ گئی ہے کہ بعض اوقات یہی معصومیت اور سادگی ان کے دوستوں کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔ بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ اس کی وضاحت کر دوں تاکہ ان کی سادگی اور معصومیت کا تکلیف دہ ہونا آپ پر بھی ثابت ہو سکے۔

۱۹۵۳ء کے شروع میں جب لاہور میں فسادات شروع ہو چکے تھے لاہور میں روزانہ شام کے وقت کرفیو نافذ ہو جایا کرتا تھا ان دنوں ہماری شام کی محفلوں میں احباب کی کمی کا شدید احساس ہوتا تھا مگر ندیم صاحب قریب قریب بلاناغہ آ جاتے تھے اور چونکہ کرفیو کا وقت ساڑھے آٹھ بجے نافذ ہو جاتا تھا اس لئے بعض اوقات گھر واپس جانے کی بجائے میرے گھر ہی سو جایا کرتے تھے۔ انہی دنوں ندیم صاحب دو تین روز کیلئے اچانک غائب ہو گئے۔ مجھے تشویش ہوئی۔ آخر چوتھے روز آئے اور کہنے لگے: "حضور ایک چھوٹا سا مقدمہ بن گیا ہے"۔ میں حیران ہوا کہ معاملہ کیا ہے۔ کہنے لگے میں اسی لئے تین چار دنوں سے نہیں آیا۔ "حضور بات یہ ہے کہ میرے پاس اس دن ایک بوتل رم کی اور کچھ بوتلیں بیئر کی تھیں۔ میاں میر سے کوئی تانگے والا لاہور آنے کے لئے تیار ہی نہ ہوتا تھا۔ سب کہتے تھے کہ کرفیو کا وقت ہونے والا ہے۔ آخر ایک تانگے والے کو میں نے آمادہ کر ہی لیا۔ رم کی بوتل اور بیئر ساتھ تھی۔ راستے ہی میں کرفیو کا وقت ہو گیا۔ پولیس نے تانگے والے کا چالان کر دیا۔ بوتلوں پر قبضہ کر لیا اور مجھے کوتوالی میں لے گئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے استفسار پر میں نے بتایا کہ شراب میں اپنے اور اپنے ایک دوست مختار امرتسری کے لئے لے جا رہا تھا۔ حضور آج تاریخ ہے اور آج آپ کو میرے ساتھ کوتوالی جانا پڑے گا تاکہ معاملہ ختم ہو اور شراب واپس مل جائے ورنہ حضور شراب مفت میں حرام ہو جائے گی۔" چنانچہ میں کئی دن ان کے ساتھ اس مصیبت میں مبتلا رہا اور خدا خدا کر کے قصہ پاک ہوا۔

اسی قسم کے بیسیوں واقعات ہوں گے جہاں ان کی سادگی اور معصومیت نے کسی نہ کسی مصیبت سے دوچار کیا۔

ندیم صاحب کا مزاج بالکل بچوں کا سا ہے۔ وہ بچوں کی طرح ضد بھی کرتے ہیں مگر جھٹ مان بھی جاتے ہیں۔ انہیں جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں۔ یہ میں بالکل مبالغہ نہیں کر رہا۔ وہ اگر کبھی کبھار جھوٹ بولنے کی کوشش بھی کریں تو ان کے چہرے سے اس طرح عیاں ہو جاتا ہے جس طرح ایک ڈرپوک بچے کو جھوٹ بولتے وقت چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ پر قابو نہیں رہتا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ شاید انہی اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے ان کے شعروں میں صداقتِ احساس اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے ورنہ ان کی زندگی کا تجرباتی میدان بہت محدود ہے۔ وہ زندگی میں فقط تین کام کرتے ہیں۔ دفتر جاتے ہیں، شعر کہتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ یہی ان کی زندگی کی کل کائنات ہے۔ زندگی کے بے شمار شعبوں اور پہلوؤں کا مطالعہ کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ وہ بیوپاری، سیاست بازی اور گروہ بندی سے اس طرح ناآشنا ہیں جس طرح آج کا کوئی انسان نہیں ہوتا۔ وہ فریب کھا سکتے ہیں دے نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی خاص مکتبِ خیال کے معتقد نہیں۔ ان کی آزادیٔ طبع اور آزادیٔ فکر کسی ضابطے کی متحمل نہیں اور شاید کبھی ہو بھی نہیں سکتی۔ اس آزادی بلکہ آزاد روی کی وجہ ان کا طبعی لاابالی پن ہے۔ میں نے اکثر [illegible]

کوشش کی کہ انھوں نے شراب نوشی کو اس طرح اپنے آپ پر سوار کیوں کر رکھا ہے مگر کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ یہ بھی زندگی کے ساتھ ان کے غیر سنجیدہ سلوک کی آئینہ دار ہے۔ وہ کسی مسئلے پر بھی سنجیدگی سے غور نہیں کرتے۔ ایک عجیب قسم کی بے راہ روی اور لاابالی پن ہر وقت ان کو اپنے دام میں پھنسائے رکھتا ہے۔ یہ بے راہ روی اور لاابالی پن اس طرح مستقل صورت اختیار کر چکا ہے کہ عدم صاحب اس کے اثر سے محفوظ ہی نہیں رہ سکتے۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ عدم صاحب سے کہوں یہ ایک مصنوعی لبادہ تو نہیں اوڑھ رکھا ہے کہ یہ بے راہ روی ان کی زندگی اور ان کے فن کا ناگزیر پہلو تو نہیں مگر ہر بار مجھے یہ خیال ہوا کہ ایسی بات نہیں۔ یہ لاابالی پن اور ایک فنکارانہ وارفتگی ان کی شخصیت کا ایک فطری جزو ہے۔ یہ محض سوانگ ہے اس پر سوانگ نہیں۔ یہ کوئی تصنع نہیں بلکہ اصل ہے۔ پھر یہ حقیقت کچھ اور بھی واضح ہوئی جب میں نے ان کے تصورِ عشق پر غور کیا۔ غور کرنے پر مجھے حیرت ہوئی کہ انھوں نے زندگی میں کبھی عشق نہیں کیا۔ عشق سے میری مراد بالکل وہی مجنوں اور فرہاد کا عشق نہیں بلکہ زندگی کا وہ ایک اور فقط ایک یادگار جذباتی واقعہ ہے جو اکثر اوقات فن اور جذبات و احساسات میں ایک دائمی گداز پیدا کرتا ہے۔ کسی سے شدید قسم کا عشق نہ کرنے کا سبب ان کی وہی فطری بے راہ روی اور طبعی لاابالی پن ہے۔ عدم صاحب نے کسی سے بھی عشق نہیں کیا مگر پھر بھی وہ ہر حسین چہرے کے عاشق و شیدائی ہیں اور یہ احساس اکثر اوقات ہنگامی ہوتا ہے۔ یہ حسن پرستی اگرچہ ایک عمومی قسم کے حساس انسان کی حسن پرستی نہیں تاہم اس حسن پرستی میں وہ تڑپ اور وہ دائمی گداز بھی نہیں جو زندگی میں صحیح عشق کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور جس سے ایک گہرا غم، ایک دردمندی اور ایک ابدی دل سوزی پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے کبھی آنکھیں گہر بار اور دل آباد ہوتا ہے۔ مگر اس دردمندی اور کیفیتِ غم کی غیر موجودگی نے عدم صاحب کو زیادہ نقصان نہیں پہنچایا۔ انھوں نے اپنے آپ کو آتشِ سیال کی بھٹی میں ڈال کر کندن بنانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

عدم صاحب کی وارفتگی بھی منفرد نوعیت کی حامل ہے۔ منفرد میں نے اس لئے کہا ہے کہ بعض اوقات ان کی وارفتگی نے عجیب عجیب گل کھلائے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کا ذکر ہے۔ ان دنوں لاہور میں فسادات بہت ہی خطرناک صورت اختیار کر چکے تھے۔ ایک رات ظہیر کاشمیری اور عدم صاحب میرے گھر ہی سوئے۔ قریب قریب صبح ہونے والی ہو گی کہ کمرے میں شور ہوا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ کمرے میں بتی جل رہی تھی اور کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ ظہیر کاشمیری مجھے چیخ چیخ کر پکار رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ عدم صاحب کا تکیہ بالکل جل چکا ہے۔ بستر کی چادر جل رہی ہے، یہاں تک کہ عدم صاحب کے سر کے بال بھی جل رہے ہیں مگر انہیں قطعاً ہوش نہیں۔ آخر بڑی مشکل سے میں نے اور ظہیر کاشمیری نے عدم صاحب کو جگایا۔ تکیے کو صحن کے دستی پمپ کے پانی سے بجھایا۔ عدم صاحب کو یہ معلوم کر کے بہت زیادہ حیرت نہ ہوئی کہ ان کی گردن جل رہی تھی۔ کہنے لگے "حضور! ایسا اکثر بار ہوا ہے" یہ کہا اور ایک سگریٹ جلا لیا۔ تھوڑی دیر بعد سب کے سب پھر سو گئے۔ ابھی مشکل سے آدھ گھنٹہ ہی رہا ہو گا کہ ظہیر کاشمیری کی آواز پھر گونجی۔ پھر اٹھے تو دیکھا کہ عدم صاحب کی قمیص جل رہی ہے مگر وہ بالکل بے خبر پڑے ہیں۔ پانی کا گلاس ان کی قمیص پر ڈالا گیا مگر انہیں ہوش نہ آیا۔ صبح ہو چکی تھی۔ ظہیر کاشمیری نے کہا کہ اگر میں رات کو نہ جاگتا تو صبح اخبار میں خبر چھپ جاتی کہ سکھوں نے کئی شاعروں کو جلا ڈالا۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ ہے۔ انہی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک شام عدم صاحب تشریف لائے۔ ان کے ساتھ الطاف مشہدی بھی تھے۔ دور چلا۔ شراب ختم ہوئی تو الطاف مشہدی کے کہنے پر عدم صاحب ان کے ساتھ تلاشِ شراب میں نکل کھڑے ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد کچھ دیر تک تو میں نے انتظار کیا، پھر میں بھی سو رہا۔ صبح سویرے اٹھ کر دیکھتا ہوں کہ عدم صاحب تنہا ہی صحن چلے آ رہے ہیں۔ منہ سوجا ہوا، گھٹنوں پر نیلے نیلے داغ، پتلون پھٹی ہوئی۔ میں نے پوچھا "حضرت کیا معاملہ ہے؟ الطاف کہاں چلا گیا؟" لیکن چونکہ نشہ بہت تھا کوئی معقول جواب نہ دیا اور لیٹ گئے۔ میں نے ان دنوں سیکرٹریٹ میں عارضی طور پر ملازمت کر لی تھی۔ میں دفتر جانے کی تیاری کر چکا تو نائب صاحب آ گئے۔ اتنے میں عدم صاحب جاگے اور زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ "حضور میں مر گیا۔ حضور میں وفات پا جاؤں گا۔" نائب صاحب اور میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت کو بہت سی چوٹیں آئی ہیں۔ خیر بڑی مشکل سے گھر پہنچایا گیا۔ چند روز بستر میں رہے۔ کوئی دوا وغیرہ استعمال کرنے کی بجائے پانچ روز مسلسل صبح و شام ٹھرا پیا اور ٹھیک ہونے پر بتایا کہ حضور اس رات الطاف مشہدی کے ساتھ انارکلی میں ایک سکھوں کے چوک میں

شراب کی جستجو میں جا پہنچے۔ تھوڑی سی مل گئی۔ سکھوں سے کسی بات پر تو تو میں میں ہوئی تو آپ نے ہوٹل کی بالکنی سے جان بچانے کی غرض سے چھلانگ لگا دی۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ میں نے کیوں اور کب چھلانگ لگائی۔

وارفتگی کے سلسلے میں یاد آیا کہ عدم صاحب اکثر بچوں کی طرح پیسے گم کر دیتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کچھ خریدنے کے لئے جیب میں سے روپے نکالے اور کہیں گر گئے۔ اسی وارفتگی کے سبب وہ کئی کئی روز تک نہیں نہاتے اور پھر لطف یہ کہ انہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ سردیوں میں خاص طور پر وہ ایک ایک قمیص کئی کئی دن پہنے رکھتے ہیں۔ ان کے کوٹ اور پتلون کی حالت اکثر خراب ہوتی ہے۔ کپڑے اکثر ان کے جسم پر لٹکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ کئی کئی دن تک منہ بھی نہیں دھوتے۔ صبح اٹھے، کلی کی اور دفتر چلے گئے۔ جب تک جیب میں پیسے ہوں گھر کا رخ نہیں کرتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہفتہ ہفتہ بھر گھر سے باہر رہے۔ بڑا لڑکا خالد بار بار گیا اور ہر بار انہوں نے کہا بیٹا میں آج ضرور آؤں گا۔ ایک دفعہ انہوں نے خود ایک واقعہ سنایا، مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ کوئی پانچ سو روپیہ تنخواہ لے کر شام کو اختر شیرانی سے ملے اور ایک ہی شام میں پانچ سو روپے شراب اور عورت کی نذر ہو گئے۔ صبح گھر گئے تو بیوی نے تنخواہ مانگی، کہنے لگے کہ کسی جیب کترے نے کمال صفائی سے جیب کاٹ لی ہے۔ ایک پیسہ بھی نہیں چھوڑا۔ بیوی جان گئی کہ جھوٹ ہے۔ لڑائی ہوئی اور بصد مشکل اسے منایا۔ اسی طرح ان کی بے راہ روی اور وارفتگی کے سینکڑوں واقعات ہیں۔ اسی وارفتگی نے ان کے کردار میں کئی خوبیاں بھی پیدا کی ہیں۔ اسی مستی اور رندی نے ان کو معصوم بنا دیا ہے۔ شراب کی ایک بڑی عادت (میں ذاتی طور پر اسے برا بھی نہیں سمجھتا) نے ان کی تمام انانیتوں کو ختم کر دیا ہے اور انہیں خلوص کا پیکر بنا دیا ہے۔ وہ دوستوں سے خلوص سے ملتے ہیں۔ دوستوں کی خاطر جو کچھ بھی کر سکتے ہیں کرتے ہیں۔ دل آزاری کا ڈھنگ ہی انہیں نہیں آتا۔ کسی کو دکھ دینا ان کی سرشت ہی میں نہیں۔ وہ صحیح معنوں میں صاف گو اور صاف دل ہیں۔ ان کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ کسی سے کوئی بغض یا عناد رکھنا ان کی فطرت میں داخل ہی نہیں۔ ہر بات منہ پر کہتے ہیں اور خلوص سے کہتے ہیں۔ دل میں کبھی میل نہیں رکھتے اور دل میں میل رکھنے والوں سے ملتے بھی نہیں۔ شراب نے ان کو واقعی انسان بنا دیا ہے۔ ان کے کردار کی انہی خوبیوں نے ان کے فن میں بھی خلوص، صداقت اور سچائی کے عناصر پیدا کئے ہیں۔ ان کا مشاہدہ اور تجربہ خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے متعلق ہو نہایت سادہ، صحت مند اور صحیح ہوتا ہے۔ تجربے اور مشاہدے کی یہ سادگی اور صحت شعور و لاشعور کے مختلف مرحلوں سے گزرنے کے بعد بھی برقرار رہتی ہے اور جب وہ ان تجربات و مشاہدات کو شعری صورت دیتے ہیں تو یہ تمام سادگی، صحت اور خلوص شعر کے لازمی جزو بن جاتے ہیں اور اس طرح شعر کو صداقت پر مبنی اور ہمہ گیر بنا دیتے ہیں۔ ان کا فن نکھرا نکھرا ہے۔ ہلکے پھلکے مضامین ہیں جن میں کوئی الجھن نہیں جن میں ہلکے ہلکے اشارے اور کنائے مفہوم کو لطیف بنا دیتے ہیں۔ ان کی شاعری کا حسن و دلکشی اور شعریت کا وجود ان کی سادگیٔ بیان، بے تکلفی اور بے ساختگی کے باعث ہے۔ کسی خاص نظریاتی فکر کا فقدان ان کے ذہن کو محدود دائروں میں گھومنے سے باز رکھتا ہے۔ وہ زندگی کو جیسے دیکھتے ہیں اسی طرح اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے اشعار ہلکے پھلکے تصنع اور بناوٹ سے پاک ہوتے ہیں۔ رندی اور اس کے اثرات اور اس کے رد عمل کے متعلق انہوں نے متنوع قسم کے شعر کہے ہیں جن میں روایتی رنگ کی بجائے ایک انفرادی رنگ کی جھلک موجود ہے۔ رندی کے متعلق چند شعر دیکھئے :۔

پیتا ہوں حادثات کے عرفان کے لئے　　ہے ایک تجزیہ بھی غمِ روزگار کا
زمانے کی رفتار سے تنگ آ کر　　عدم کر لیا مے کدے میں بسیرا
مے کی حسین چیز ہے اور واقعی حرام　　میں کثرتِ شکوک سے گھبرا کے پی گیا
سو بار لغزشوں کی قسم کھا کے چھوڑ دی　　سو بار چھوڑنے کی قسم کھا کے پی گیا
بادہ کشی حرام ہے یا زندگی حرام　　تصدیق کر رہا ہوں غمِ روزگار سے

عدم کی شاعری شراب، حسن اور عشق کی شاعری ہے۔ اس میں اگرچہ کوئی سنجیدہ اور واضح فلسفہ یا انداز فکر نہیں مگر اس کے باوجود ان کی تمام غزلوں میں

ایک نیم فلسفیانہ دھیمی دھیمی لہر رواں دواں ہے جس میں کبھی کبھار لہریں بھی اٹھتی ہیں۔ ان کے ہاں تصوف کی ہلکی سی چاشنی بھی ملتی ہے۔ تصوف کا باقاعدہ بیان تو نہیں مگر ہلکے ہلکے اشارے موجود ہیں۔ چند شعر سنئے ؎

جھلکتے ہیں حجابات دیر و حرم میں ——— مگر بے تکلف نظر آ رہے ہو
بہار و خزاں کم نگاہوں کے وہم ——— برے یا بھلے سب زمانے ترے
ضمیر صدف میں کرن کا مقام ——— انوکھے انوکھے ٹھکانے ترے
جب بھی ہوتے ہیں ہم ندیم تنہا ——— یاد سے ہم کنار ہوتے ہیں
ہم نہیں یہ روایت ہے یا حقیقت ہے ——— سنا تو ہے وہ رگ جاں سے کم ہی بچتے ہیں
ایک ہی بار تری شکل کا عرفاں تھا محال ——— دوسری بار کوئی آئینہ حیراں نہ ہوا

آج کے شاعروں نے جہاں کئی شعری لوازم کو نظر انداز کر دیا ہے وہاں تغزل کو بھی کہ شعر کی بنیادی خصوصیت ہے قابل توجہ نہیں سمجھا۔ ندیم کے ہاں تغزل اور روانی مستقل طور پر موجود ہے۔ ان کی شاعری میں ایک مترنم فضا پیدا ہوتی ہے جسمیں گونجتے ہوئے الفاظ اور دلکش ترکیبیں ہی ان کا نغمہ کا تار و پود ہیں۔ اشعار میں کہیں کہیں شوخی اور شرارت کے عناصر بھی ملتے ہیں مثلاً ؎

بے خودی میں مرا ادراک ہے بے بس سا لگے ——— نرم سی موت کیسے میں شامل آغوش نہیں
تخلیق کائنات کے دلچسپ جرم پر ——— ہنستا تو ہوگا حضرت یزداں کبھی کبھی

ندیم صاحب میں ایک بہت بڑی خامی یہ ہے کہ وہ شعر بہت کثرت سے کہتے ہیں اور انہیں اس بات کا دھیان نہیں رہتا کہ کون سا شعر اس قابل ہے کہ رکھا جائے اور کون سا حذف کر دیا جائے۔ یوں تو ہر شاعر کو اپنا ہر شعر عزیز ہوتا ہے مگر اس کے باوجود شعراء میں اکثر اس قدر تنقیدی شعور ضرور ہوتا ہے کہ وہ کون سے اشعار رکھیں اور کن کو حذف کر دیں۔ اردو کے سب سے بڑے شاعر غالب کے اسی تنقیدی شعور نے غالب کو عظیم اور لافانی بنایا ہے۔

ندیم صاحب شعر بہت کثرت سے کہتے ہیں اور بعض اوقات رطب و یابس کو بھی چھپوانے سے گریز نہیں کرتے۔ ندیم صاحب کی زود گوئی اور کثرت گوئی سے مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ ۱۹۴۶ء ہی کی بات ہے۔ ایک رات وہ زیادہ مصروف نہیں تھے اس لئے میرے گھر ہی سو رہے۔ قریب قریب آدھی رات کا وقت ہوگا کہ دفعۃً میری آنکھ کھلی دیکھا کہ بتی جل رہی ہے۔ ندیم صاحب چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ ایک ہاتھ میں سگرٹ دوسرے میں پنسل لئے کچھ سوچ رہے ہیں۔ فرش پر سامنے تکیے پر پڑی ہے۔ میں پھر سو گیا۔ صبح میں نے پوچھا مولانا رات کیا بات تھی۔ کہنے لگے حضور یونہی نیند کھل گئی خیال آیا کہ کچھ شعر ہی کہہ ڈالوں مگر فقط سات غزلیں کہہ کر ہی نیند آگئی۔ اب جو شاعر گھنٹے دو گھنٹے میں سات غزلیں کہہ ڈالے اندازہ کیجئے کہ وہ کس کثرت سے شعر کہتا ہوگا۔ کثرت سے شعر کہنا برا نہیں مگر ان سب اشعار کو من و عن رکھ لینا یقیناً برا ہے۔ وہ جو کچھ کہہ دیں اس میں کانٹ چھانٹ کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ شعر اچھا ہوا برا ہوا بس ہو گیا۔ اب اس میں مزید غور و فکر کرنا ان کا اصول ہی نہیں۔ اسی وجہ سے بعض اوقات غزلوں میں بہت ہلکے شعر بھی ملتے ہیں جنہیں پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ کاش یہ شعر غزل میں نہ ہوتے۔ مجھے یاد ہے میں نے کئی بار کہا کہ فلاں غزل میں سے فلاں شعر نکال دیجئے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ہاں ضرور حذف کر دوں گا مگر جب غزل چھپی تو وہ اشعار موجود تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ انہوں نے آج تک جتنے شعر کہے ہیں وہ انہیں قریب قریب سب کے سب زبانی یاد ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ حافظہ ان کا بلا کا ہے۔ اشعار کہنے کے بعد ان کو یاد ہو جاتے ہیں اس لئے اول تو وہ چاہیں بھی تو ان اشعار کو حذف نہیں کر سکتے۔ حافظے سے متعلق ایک واقعہ یاد آیا۔ اتوار کا دن تھا۔ مجھے دفتر سے چھٹی تھی۔ ندیم صاحب صبح ہی تشریف لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد سیٹھ صاحب بھی آگئے۔ ندیم صاحب کہنے لگے حضور آج چھیڑیئے کوئی

بندوبست ہوتا نظر نہیں آتا۔ میرا خیال ہے آج ایک مجموعہ ہی ترتیب دے ڈالوں اور چودھری نذیر کو دے کر پیسے حاصل کروں؟" میں نے کہا، "وہ کیسے؟" کہنے لگے: "حضور، مجھے اپنے کوئی دو سو قطعات یاد ہیں ان کو نقل کرنے کی ضرورت ہے۔" چنانچہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے اور دوپہر کے کھانے کے وقت تک پورے دو سو قطعات حافظے سے نکال کر کاغذوں پر لکھ دیے۔ مجموعے کا نام "ہوائے برشگال" رکھا۔ شام ہوئی تو کہنے لگے: "چلیے حضور، چودھری نذیر کے پاس چلتے ہیں تاکہ آج کی شام کا بندوبست ہو۔"

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ عدم صاحب میرے دوست ہیں۔ میں نے ان کی شخصیت اور ان کے فن کو پرکھنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔۔ روایتی انداز اختیار نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے پیشہ ور نقاد حضرات کو میری کئی باتوں سے اختلاف ہو۔ میں سمجھتا ہوں انہیں مجھ سے اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں نے عدم کو جس طرح دیکھا ہے، جس طرح ان کی زندگی اور ان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے اس کی ایک سیدھی سادی تصویر آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ اگر اس تصویر میں عدم صاحب کے کچھ خدوخال آپ کو نظر آ گئے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے یہ چند سطریں بے مصرف نہیں لکھیں۔

جذبی

انور عظیم

— کیا جھک مار رہے ہو؟

— جذبی کے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کر رہا ہوں۔

— اف: جذبی کے متعلق! اتنے UNINSPIRING آدمی کے متعلق! حد ہو گئی!

واقعی حد ہو گئی۔ ذرا اس شاعر پر ایک نظر ڈالیے۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات نہیں جو اپنی پہلی جھلک میں لوگوں پر چھا جائے وہ چلاتے ہیں کہ ہائے ہو جائے۔ اس کی شکل و صورت، اس کا قد، اس کی آنکھیں، اس کی باتوں کا انداز کہیں کوئی لچک، وار، کوئی تیز دلکش جلوہ نظر نہیں آتا۔ اگر اس کی پوری شخصیت میں کوئی چیز چمک مار رہی جو اس نظر آتی ہے تو وہ اس کا سر کا صفاچٹ میدان ہے۔ اس چٹیل چکنے سر کے کنارے دونوں طرف ہلکے ہلکے بال اُگے ہوئے ہیں جو وسط میدان میں دونوں طرف سے آ کر مل گئے ہیں۔ اور انہوں نے اس چکنے ارغوانی قلعے کا احاطہ سا کر لیا ہے۔ یہ سر چقندر جیسا چمکدار ہے۔ آنکھیں اتنی ہی چھوٹی گہری اور چمک سے محروم ہیں۔ جذبی کو پہلی نظر میں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک ایسے آدمی کے سامنے کھڑے ہیں جس میں کھل کر ہنسنے اور جینے کی صلاحیت بالکل مفقود ہے۔ کبھی جو دوں نے اس شاعر کی شخصیت میں ایک تکلیف دہ پیچیدگی سی پیدا کر دی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر آپ ان سے باتیں کریں، گھل مل جائیں۔ پھر دیکھئے اس کے چہرے کی گھٹن اور افسردگی سے مسکراہٹ کا ایک کوندا کس طرح لپکتا ہے اور سب کچھ اجالا کر دیتا ہے لیکن وہاں بھی مایوسی ہو گی۔ وقتے رُکے رُکے اور شرمیلی دبی مسکراہٹ کی معصومیت اور جذبات کی پاکیزگی پر آپ بار بار غور کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ جذبی کبھی بھی چھچھورا شاعر نہیں ہونے ہوں گے لیکن ان سے پہلی بار مل کر یہاں کو پہلی بار دیکھنے کے بعد مجھے اس شخص پر بڑا رحم آیا تھا۔ میں نے ہمدردی کے جذبات کے ساتھ سوچا تھا۔ یہ بیچارہ اس گھٹن سے کس طرح بچا ہوگا۔ اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو پھر میرا یہ قیاس صحیح ہوگا کہ بچپن میں جذبی کی نازکی اور ظالم جراح کا تختۂ مشق بن گئے ہوں گے۔ اور جراح نے اپنا سارا حوصلہ اسی ایک تختۂ مشق پر نکال لیا ہوگا۔

واقعی جذبی میں اتنی گھٹن، اتنی گتھی، اتنی طبیعت! جو اس سے کل رہی ہے خود پر محیط ہونے میں ناکام رہی ہے؟ کیوں ہے؟ کیا ایک انسان جبلی طور پر ایسا ہوتا ہے؟ یا سماجی حالات اور زندگی کے تجربے اس کے مزاج اور اس کی پوری شخصیت کی تربیت اور ترتیب کرتے ہیں؟ کیا جذبی محض گھٹن اور تجربوں کے زہر سے بھرا ہوا، طبیعت کے اندھیرے میں بھٹکتا ہوا، ایک افسردہ دل اور انجمن کو افسردہ کرنے والا انسان ہے؟ کیا اس خاکستر کے ڈھیر کے اندر چنگاریاں دبی ہوئی نہیں ہیں؟ کیا اس کی شخصیت میں اس کی رنجی رہائی، جذبات کی، اس کے شعور اور تجربے کی آنچ، اس کی شاعری میں ان چنگاریوں کے گھنگھرو

دوڑتے ہوئے نظر نہیں آتے وہ اس کی شاعری کو اس کی شخصیت سے الگ کر کے کیوں دیکھا جاتا ہے۔ اس کی شاعری کی پوری ترتیب و تشکیل میں اس کی اپنی شخصیت کا کتنا دخل ہے اور اس کی کتنی حوصلہ پوری، مایوسیوں کی کتنی پکار، ان مایوسیوں پر غلبہ پانے والی کتنی نت نئی قوتیں اسیر ہیں۔ شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں یا جاننا چاہتے ہیں۔

شاعری زندگی شعر سے نہیں شروع ہوتی۔ شاعری زندگی کے تلخ و ترش، حقیقت و خوشگوار تجربوں کا جذباتی رچاؤ جب فنی سانچے میں ڈھلتا ہے۔ یہ الفاظ کی موسیقی میں تجسیم پاتا ہے تو اس میں شاعری کی خوبیوں زندگی کے ساتھ کے دور کے اجتماعی تجربوں کی بنیادی سچائیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ان سچائیوں کے حل ہونے ہماری محسوس کے سامنے ہیں لیکن ان کی جڑیں ماضی کے دل میں پیوست ہیں۔ جہاں یہ بات پورے انسانی سماج کے لئے صحیح ہے وہاں اس کو ایک فرد کی زندگی اور اس کے فنی مظاہر کو جانچتے ہوئے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جذبی آج ہمارے سامنے جیسے ہیں ویسے ہیں۔ لیکن آئیے ذرا ہم پیچھے ہٹ کر دیکھیں۔ آج سے بہت پہلے جب جذبی ابھی عدم میں تھے۔ اور حضرت معین احسن اس دنیا میں موجود تھا۔ میں نے شروع میں کہا تھا کہ جذبی کسی اناڑی جراح کا تختۂ مشق بن گئے ہوں گے۔ اگر آپ حالات کی سختیوں اور نا انصافیوں کو ایک انسان کی زندگی میں ایک تمام جراح کا دور ہی سمجھنے پر راضی ہو جائیں تو یہ قیاس حقیقت میں بدل جائے گا۔

جذبی کا خاندان جو بہت پہلے میرٹھ سے دادا پور جہاں منتقل ہو گیا تھا، پھر دوبارہ لکھنؤ واپس آ گیا۔ ان کے دادا ڈاکٹر عبد الغفور شکیب کی بدولت گھر میں کے چند ملازموں میں ادبی فضا پیدا ہو چکی تھی۔ جذبی کے بچپن ہی میں ادبی ماحول نے اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ نو دس برس کے ہوں گے وہ ایک لغت مرتب کر رہے تھے۔ جس کا چودہ سال کا کام دھرا رہ گیا۔ پھر ان کی پھوپھی خاقان بیگم جن کی شادی داغ دہلوی سے ہوئی ان کی ادبی دلچسپیوں اور مصروفیتوں سے بھی گھر کے ماحول میں کافی ادبی رنگ پیدا کر دیا تھا۔ یہی زمانہ معین احسن کی عمر ۔ یہ وہ سال کی عمر کے ساتھ شاعری کا شوق ادا کرنا واجب ہو گیا تھا۔ ان کو روزانہ غزلیں یاد کرنے کے لئے کہا جاتا۔ جہاں معین احسن جن کے بچپن کا اندازہ اگر آج کے بچپن سے لگایا جائے تو وہ دیکھنے میں ایک بے حد مسکین، خاموش اور سست لڑکا دکھائی دیں گے۔ یہی لڑکا پرانی تہذیب کا بار سر پر اٹھائے، سر پر ٹوپی چپکائے، آنکھیں نیچی کئے، نہایت ادب سے غالب، اسمٰعیل میرٹھی، حالی اور اقبال کی چیزیں زبانی یاد کرتا، اور روز اپنے بزرگوں کو سنایا کرتا۔ انہیں کے اسی وقت کے یاد کئے ہوئے اشعار ابھی تک یاد رہیں۔ ذرا غور کیجئے وہ معصوم سا لڑکا انہیں کے یہ اشعار سنا رہا ہے۔

وہ بیستِ و چہرہ سرحت و جاہ کی مسند
سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب بند بند
سم ہستی سر حب اجتناب سے روشن ہزار چند
نازک مزاج، شوخ، سیہ چشم، سر بلند

ماں اور چچا بھی وغیرہ کی ادبی دلچسپیوں اور غزلیں اور نظمیں یاد کرنے کا اس خاموش لڑکے کے ذہن پر یہ اثر ہوا کہ نو سال کی عمر ہی میں جناب نے تک بندی شروع کر دی۔ ان دنوں جھانسی میں قیام تھا۔ وہ ساتویں آٹھویں جماعت کی طالب علمی کا دور تھا۔ صادق دہلوی کا شمار ان دنوں استادوں میں ہوتا تھا۔ ان کے شاگرد تھے حامد شاہجہانپوری۔ وہ معین احسن کے گھر والوں کے پڑوسی تھے۔ ان کے یہاں اس ننھے شاعر کا آنا جانا تھا۔ ان سے تعلقات کا اثر پڑا۔ حقیقت اتنی بڑھی کہ معین احسن نے ان کی پوری بیاض حفظ کر لی۔ ان ہی دنوں باضابطہ شاعری کا آغاز ہوا۔ معین احسن نے اپنی ایک غزل دوسرے کے نام سے ان کو دکھائی۔ انہوں نے ایک آدھ شعر پسند کیا۔ اسی طرح معین احسن نے جو اس وقت نویں جماعت میں پڑھتا تھا، اور جس کی عمر اس وقت چودہ سال تھی اپنا تخلص جذبی رکھا۔ اور اپنی شاعرانہ زندگی کی پہلی منزل ہی میں بے دھڑک داخل ہو گیا۔ ان دنوں دنیائے شاعری میں جگر اور فانی کے نام روشن تھے۔ دونوں غزلوں کا بڑا شہرہ تھا۔ ان دنوں نظموں کا رواج نہیں تھا۔ ایک ایسے زمانے میں ایک ہونہار شاعر نے اپنی نئی زندگی کے ابتدائی دور میں باقاعدہ اصلاح حاصل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ غزلوں کا دور تھا۔ معین احسن غزل کے سامنے اپنی طبع آزمائی کے لئے وہی میدان تھا۔ حامد شاہجہانپوری نے ان کی غزل کا اندازہ لگایا اور انہیں اپنے استاد

صادق دہلوی سے رجوع کرنے کے لئے بھیج دیا۔ وہ ہر شعر پر بحث کیا کرتے تھے۔ ایک آدھ لفظ کے الٹ پھیر سے اگر شعر ہو جاتا تو ٹھیک ورنہ وہ پورا شعر کاٹ دیا کرتے تھے۔ وہ بندش، چستی، ابہام وغیرہ پر بات چیت کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعر کو اپنے ابتدائی دور میں ہی کافی محنت کرنی پڑی۔ استاد پوچھا کرتے۔ بتاؤ تجربے کا شاعری سے کیا تعلق ہے؟ اور اس کے بعد زندگی کے واقعات کی تشریح کیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے بعد ملال کے استاد نے کہا تمہاری غزلیں دوسرے درجے کے استادوں سے اچھی ہوتی ہیں۔ اگر دماغ خراب نہ ہو تو ——

آگرے میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو وہاں اردو کے ایک اور شاعر سے ملاقات ہوئی۔ وہ شاعر تھا مجازؔ۔ مجازؔ ان کے ہم جماعت تھے۔ دونوں سائنس کے طالب علم تھے۔ ان دنوں آگرے میں میکش اکبرآبادی وغیرہ کا دور تھا۔ کالج کا پہلا سال تھا۔ شاعری کی محفلیں ایک استاد و رفت بننے کے شوق رہی تھیں۔ ان ہی دنوں ملال کو فانی سے ملنے کا موقع ملا۔

ایک دن حضرت جسارت کر کے فانی کے یہاں پہنچے تو وہ آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف پختہ کار شاعر تھے۔ ان کا رعب اور شہرت تھی اور دوسری طرف ایک نوخیز نوجوان۔ کالج کا طالب علم۔ شاعری میں کی ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ لیکن یہ شاعری کا جنون اس دور کے ایک عظیم المرتبت شاعر کے یہاں کھینچ لایا تھا۔ وہ بڑی محبت اور تپاک سے پیش آئے۔

- کہئے کیا شغل ہے؟ فانی نے پوچھا۔

- سائنس پڑھتا ہوں۔ یہ وہ الفاظ تھے جو جلدی سے فر فر اور تیزی کے ساتھ سہمے سہمے ملال کی زبان سے ادا ہوئے۔

- شعر و شاعری کا شوق بھی ہے؟

- صاحب بس یوں ہی تک بندی کر لیتا ہوں۔ سراپا انکسار آواز مشکل سے نکلی۔

- کچھ سنائیے:

ملال نے اپنی آنکھیں اٹھائیں۔ ان کے سامنے بڑی متانت کے ساتھ ایک کشیدہ قامت، گورا رنگ، اچھے لباس میں بیٹھے تھے۔ ان کے کھچڑی بالوں نے ان کے انداز میں مزید شان پیدا کر دی تھی۔

ملال نے اپنی غزل کا پہلا شعر پڑھا

دل کو ہونا تھا جو تقدیر میں خسراب　　پاس تھی یوں تو منزل مقصود

فانی نے شعر پڑھتے ہوئے دوسرا مصرعہ یوں پڑھا

پاس تھی ورنہ منزل مقصود

نوجوان شاعر نے خاموشی سے اصلاح قبول کر لی اور نہایت سعادت مندی کے ساتھ دوبارہ اصلاح شدہ شعر پڑھا (فروزاں میں یہ غزل اصلاح شدہ شعر کے ساتھ شائع ہوئی ہے)۔

پھر جذبی نے فانی کو ایک اور غزل سنائی —— فروزاں کی پہلی غزل جس کا مقطع ہے

ضبط غم بے سبب نہیں جذبی

جو اس وقت تھا ؎

ضبط غم بے سبب نہیں ہے ملال　　خلش دل بڑھا رہا ہوں میں

فانی ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ بہت داد دینے لگے

بہت سے طالب علم قسم کے شاعر آتے، آپ سے امید کروں گا —— اس خلش کو زندہ و تابندہ رکھئے گا۔

اس واسطے نے کیا گل کھلائے اور کیسے وہ دست شاعری کو پروان چڑھایا، لوگوں کو معلوم ہے۔

فانی حیدرآباد چلے گئے۔ لیکن خط سے تعلقات کا سلسلہ رہا۔ اس کے بعد بھی ان سے چار پانچ بار ملنے کا موقع ملا۔ یہ وہ دور تھا جب شاعری کا جنون پورے شباب پر پہنچ گیا۔ اس زمانے میں شاعروں کی بیٹھک جیلانی کے ہاں ہوا کرتی تھی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ ملال (جذبی) اور شہید (مجاز) دونوں یار غار تھے اور دونوں ایک دوسرے کی لاج رکھتے ہوئے ایک ساتھ بڑی آن بان سے سائنس کے امتحان میں فیل ہوئے۔ شہید بھی شاعر تھے، اور دونوں میں دوستانہ چشمک بھی چلتی تھی۔ جذبی نے اپنے دوست کے تخلص کا فائدہ اٹھا کر ایک پیروڈی لکھ ڈالی تھی ؎

آہ شہیدا واہ شہیدا　　دیکھیے او صرفہ شہیدا

ان دونوں شاعروں کی موجیں زندگی کے ساحل کی بندشوں کو توڑ کر ہر طرف دوڑ جاتی تھیں۔

ان دنوں کا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ہوسٹل میں ایک صاحب موتی تھے۔ وہ نٹ کھٹ اور ٹک چڑھے تھے۔ یاروں کی ان سے ٹھنی رہتی تھی۔ ملال اور شہید کے ایک دوست عابد تھے۔ عابد سے موتی کی چھیڑ جو قسم پیرہ ہوا کرتی تھی۔ موتی کے نام کا فائدہ اٹھا کر ملال نے ایک قطعہ تیار کر دیا۔

عابد نے یہ کہا کہ بڑا بدصفات ہے　　کیوں بھونکتا ہے رات گئے ایسی بات ہے
میں نے کہا کہ آپ برا مانتے ہیں کیوں　　جب جانتے ہیں آپ کہ کتے کی ذات ہے

یہیں دونوں کی محمد مکرم بھی اسی کالج میں فرسٹ ایئر میں پڑھتے تھے، اور ان دونوں شاعروں دلگشا سے لڑکوں کے مقابلے میں ایک ممتاز طالب علم کی حیثیت رکھتے تھے، اور وہ بزم ادب کے سیکرٹری تھے۔

اس زمانے میں جذبی اور مجاز کی دوستی بہت بڑھ گئی۔ بلکہ بقول جذبی دوستی ان دنوں صرف مجاز سے تھی۔ لڑکے کہا کرتے "بھئی دونوں نکاح کر لو"۔ خود ان کے والدین ان کے "جڑواں پن" سے کچھ اتنے قائل ہو گئے تھے کہ جذبی ان سے ملنے جانے کی اجازت لینے آتے تو وہ فرماتے "YES ASRAR ULHAQ CAN ALSO GO."

فیل ہونے کے بعد دونوں کو جدا جدا ہونا پڑا۔ جذبی لکھنؤ چلے گئے اور مجاز علی گڑھ سدھارے۔ اسی زمانے میں خبط ہوا کہ تخلص بدلنا چاہیے۔ اور ۱۹۳۲ء میں یہ نیک کام بھی ہو گیا۔ ملال جذبی میں منتقل ہو گیا۔

یہاں بھی شاعری کا سلسلہ اسی مجنونانہ ہمواری کے ساتھ جاری رہا۔ کتابیں خوب پڑھی جاتیں۔ لیکن نصاب کی کتابوں کا خیال آتے ہی طبیعت الجھنے لگتی۔ "آؤٹ آف کورس کی غیر شاعرانہ فضول کتابیں کون پڑھے"۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ یہاں بھی لڑھک گئے۔

جذبی پر اس کے بعد بڑا کڑا وقت آیا۔ موصوف کے ابا جان کو دھچکا لگا۔ اور وہ اپنے صاحبزادے کے تعلیمی مستقبل کو رو بیٹھے۔ کہنے لگے

"میاں، شعر و شاعری میں تمہاری ناؤ ڈوب گئی۔ اب چھوڑو، چپ چاپ پوسٹ آفس وغیرہ میں کام کرو۔"

جذبی جب ساڑھے تین سال کے تھے ان کی والدہ فوت ہو چکی تھیں۔ سوتیلی ماں کی سخت کوشیاں سانپ کی طرح ان کے نوجوان دل کو ڈستی رہی تھیں۔ ابا بھی ان کے مشورے سے متاثر تھے۔ اپنے فیل ہونے نے معاملہ اور بگاڑ دیا تھا۔ جاننے اور کھٹنے میں غم عشق کے کچوکے بھی لگنا شروع ہو گئے تھے۔ جذبی کا کہنا ہے "غم عشق کیا ہے دونوں طرف سے ایک معصوم اور مبہم تعلق کہہ لو۔ مختصر قسم کی جذباتی تعلق جو زہر کی طرح پک رہی تھی ۱۹۳۳ء میں زخم ہو کر پھٹ پڑا۔

ایک شام جب ابا کی نظروں کے پھر جانے کا غم سینے پر ایک بوجھ بنا ہوا تھا، آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تیر رہے تھے ـــ اگست یا ستمبر کا مہینہ تھا۔ انتہائی ذہنی کوفت کے عالم میں ایک مصرعہ ہو گیا

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے

پندرہ منٹ میں غزل ہو گئی:

اسی غزل نے بعد میں جذبی کو مشہور کیا اور اس کو ایک قنوطیت پسند شاعر کا خطاب دے دیا۔ حالانکہ بقول جذبی "یہ غزل اس خاص لمحے کے موڈ کی بے ساختہ ترجمانی کرتی ہے":

(اس غزل کی اس وقت کوئی خاص وقعت نہیں ملی۔ دو سال تک پڑی رہی۔ ۱۹۳۵ء میں "ہمایوں" کو بھیج دی گئی۔ مجنوں نے وہی غزل "ایوان" میں شائع کی۔

اس غزل کا موڈ شاعر پر گہرا ہو کر چھا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دن سوتیلی ماں سے سخت جھگڑا ہوا۔ اس جھگڑے نے اس غزل کے دل شکستہ شاعر کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اپنے ایک دوست کے بھائی کے ساتھ احمد آباد کی سیر کو چلے گئے۔ ٹرین میں ایک صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ترقی پسند تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ ایک نئی فلم کمپنی کھلی ہے ——— "مون فلم کمپنی"! یہ خبر اس زمانے میں حوصلہ افزا معلوم ہوئی کہ اس میں زیادہ حصہ مسلمانوں کا ہے۔ جذبی نے ان سے ایک خط لیا اور اس فلم کمپنی میں آ دھمکے۔ وہاں مہینہ بھر خاک چھانتے رہے۔ شوٹنگ وغیرہ دھری رہ گئی۔ بیٹھک، ڈائرکٹر آدمی بااخلاق تھے۔ جتنے روپے تھے کھا پی گئے۔ کمپنی ٹھپ ہو گئی۔ اسی زمانے میں جذبی کے پرائیویٹ امتحان کا نتیجہ نکل چکا تھا اور اتفاق سے شکستہ کشتی "امتحان" ساحل کنار ہو گیا تھا۔

ساحل کی تمنا اور بڑھی اور جذبی نے اپنے والد کو ایک خط لکھا کہ "اگر آپ میری مدد کریں تو میں علی گڑھ یا دہلی جا کر اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھوں"۔ پھر تنہائی مصیبت کا دور شروع ہوا۔ تعلیم دہلی میں شروع ہوئی۔ حالات ناقابل برداشت تھے۔ ساحر وغیرہ جو ان دنوں بھوپال میں تھے کچھ مدد کر دیتے تھے۔ اسی دوران میں زبردست علالت کا حملہ ہوا۔ اور اس زمانے میں جذبی کو زندگی سے انتہائی نفرت ہونے لگی۔ فلسفے میں شاعر بیچارہ پھر اٹک گیا۔ جناب کا خیال تھا "جیسے فیل نہیں ہوتا۔ یا تو محسن کو فلسفہ نہیں آتا تھا یا میں واقعی فلسفے میں نا اہل تھا"

پھر وہی مسئلہ۔ بہار رنگ لائی۔ لیکن ۱۹۳۹ء میں آخر کامیابی نصیب ہوئی۔ اور ابا سے صلح ہو گئی۔ علی گڑھ میں انگریزی میں داخلہ لے لیا۔ لیکن ابا نے سخت مخالفت کی اور پھر دہلی واپس آ گئے۔ وہاں خالد فقیہ اور مجاز ریڈیو میں ملازم تھے ——— "آواز" کے نائب مدیر۔ ان کے ساتھ جذبی کا قیام رہا۔ لیکن مصیبت وہاں بھی منتظر تھی۔ مجاز برطرف کر دیئے گئے۔ دونوں کا قیام اسی طرح دہلی ہی میں رہا۔ اس زمانے میں جوش بھی دہلی آ گئے تھے۔ وہ قرول باغ میں مقیم تھے اور "کلیم" نکال رہے تھے۔ اس زمانے میں شعر و شاعری کے جنون کے ساتھ سب سے بڑا کام نوکریوں میں درخواستیں بھیجنا اور ٹیوشن کی تلاش کرنا تھا۔ اور اس سے جو وقت بچتا وہ جوش کی صحبتوں میں گزرتا۔

ان ہی دنوں رات کے اندھیرے میں قسمت کا ستارہ چمکا۔ بمبئی میں ایک جگہ مترجم کی نکل آئی۔ یہ جگہ سیکرٹریٹ میں تھی۔ تین چار مہینے وہاں کام کیا۔ پھر وہاں سے بھی چھٹکارا اور افتاں و خیزاں بھوپال پہنچے۔ ۱۹۴۰ء میں سکول میں جگہ ملی۔ اس سکول کا نام ماڈل ہائی سکول تھا۔ جذبی نے ڈٹ کر یہاں دس مہینے تک کام کیا۔ لیکن تنخواہ کا مسئلہ طے نہ ہو سکا۔ یعنی یہی طے نہ ہو سکا کہ تنخواہ ملے گی یا نہیں۔

آخر یہ بھی چھوٹ گیا اور یہ شاعر آوارہ لکھنؤ پہنچ گیا۔ وہاں سردار جعفری، سبط حسن وغیرہ "نیا ادب" نکال رہے تھے۔ اس کام میں سب ہی لگے تھے۔ سب کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سردار اور سبط حسن ساتھ رہتے تھے جہاں کچھ دنوں تک جذبی بھی وہیں پڑے رہے۔ افلاس و تنگی کا آفتاب سوا نیزے پر آ گیا تھا۔ یکایک سکول میں دس مہینے تک جھک مارنے کا صلہ مل گیا۔ دس مہینے کی تنخواہ شاعر کی قسمت میں تھی ——— چھ سو روپے! شاعر کو اتنی خوشی ہوئی کہ بیمار پڑ گیا۔ دو سو تو کھڑے گھاٹ ڈاکٹروں کی نذر ہو گئے۔ باقی چار سو روپے لے کر یہ صورت علی گڑھ وارد ہوئے۔ اس وقت ایم اے کرنے کی دھن سوار ہو گئی۔ اس زمانے میں ترقی پسندی کی تحریک ابھر رہی تھی۔ اور جذبی کو بھی اس تحریک کا ایک رکن سمجھا جاتا تھا۔ ترقی پسندی کا معیار جب جوش کی نظمیں تھیں۔ اور اس وقت تک ترقی پسندی کی بنیاد ڈالنے والوں نے وضاحت بھی نہیں کی تھی:

جذبی نے بھوپال کے دوران قیام میں "فطرت ایک مفلس کی نظر میں" لکھی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں ایک اور نظم "تلاش" لکھی:

نظم دو بیٹھکوں میں مکمل ہوئی۔

علی گڑھ آنے کے بعد جذبی کی صحت بالکل ہی خراب ہو چکی تھی۔ اور ذہن کسی کل بیٹھنے کو تیار نہ تھا۔ وہاں ایک ایسا حلقہ تھا جو سیاست اور ادب میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اور جو کچھ کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ اس زمانے کی راتیں باتوں میں بیت جاتی تھیں۔ سورج ڈوبتا تھا اور پھر جلوہ گر ہوتا تھا لیکن بحثیں ختم ہونے کو نہ آتی تھیں۔ ادب پر بات ہوتی، سیاست پر بات ہوتی، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بات ہوتی۔ ان کی تشنگی پھر بھی نہ بجھتی۔ اس حلقے میں نیاز، محسن، انور انصاری وغیرہ تھے۔ اس زمانے میں ادبی مسائل کے صحیح خد و خال ابھر کر سامنے آنے لگے تھے۔ اور ان کو سمجھنے کی بصیرت پیدا ہونے لگی تھی۔ لیکن پے بہ پے الجھنیں، ذاتی شکستیں، ماحول کی سرد مہریوں نے خود شاعری کی تخلیقی قوت پر اوس ڈال دی تھی۔ احساس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اور پائے ثبات ڈگمگا گئے تھے۔ اس زمانے میں ایک خیال کا بھوت بہت ستایا کرتا۔ ایک صلاحیت تھی وہ بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ ایک بار جبر کر کے کوشش کی، تین چار شعر ہوئے۔ ہمت جواب دینے لگی۔ پھر کوشش کی —— یونہی بے خیالی میں مصرعے آنے لگے ——

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں

معلوم ہوا ایک بند ہو گیا جو ایک ہی خیال کی ترجمانی کرتا ہے۔ امتحان کو چند دن تھے۔ ہیجان بے حد شدید تھا۔ پڑھا لکھا سب غائب ہونے لگا۔ اس لئے کہ ان ہی دنوں ایک طرف تو بیچارگی امتحان کا بھوت سوار ہو رہا تھا۔ دوسری طرف رومانی تجربات نے دل کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ جذبات کی دنیا میں وہی آگ لگی کہ "سراپا زندگی دھوئیں کا ایک بچا ہوا مینار بن گئی۔ دل کے تار شدت جذبات سے ٹوٹنے اور دماغ کی کڑیاں ہل گئیں" یہ ۱۹۴۱ء کا زمانہ تھا۔ اسی جذباتی ہیجان اور انتشار کے دور میں جذبی نے سب سے زیادہ شاعری کی۔ کئی نظمیں خون جگر کا اعجاز بن کر ابھر آئیں —— کون جانے یہ اشعار تھے یا شاعر کی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے شعلہ فشاں خون دل کے قطرے —— اتنا تو سب کو معلوم ہے کہ وہی لہو کے قطرے آج تک جدید شاعری کی رگوں میں آگ کی طرح دوڑ رہے ہیں۔

"پھر جگا لوں" کی داستان مجروح شدہ دل کی داستان ہے جس میں محبت کی مقدس خودی کا بھی احساس موجزن ہے۔ یہ نظم اسی دور کی نظم ہے اور شاعر کے جذباتی تجربے کی خوبصورت یادگار ہے۔ اس تجربے کا ہیجان انسان کے معصوم جذبے کو بالیدگی بخشنے والا ہیجان ہے۔

علی گڑھ سے طبیعت اچاٹ ہو چکی تھی۔ "آج کل" کی ملازمت مل گئی اور جذبی دلی آ گئے —— وہاں جذبی کو زیادہ تر بیمار رہنا پڑا۔ دوسری عالمگیر جنگ پورے شباب پر تھی۔ یہ وہ دور تھا جب دلی ادیبوں کے لئے ایک مرکز سی حیثیت بن گئی۔ فیض، تاثیر، راشد، کرشن چندر، منٹو، اپندر ناتھ اشک، بیدی، اختر الایمان —— یہ پورا قافلہ یہیں بسا ہوا تھا۔ ان سب ادیبوں سے جذبی کا ملنا جلنا کافی تھا۔ ان ملاقاتوں میں ادبی زندگی کی چاشنی تھی اور بعض لمحات دلچسپ گزرے۔

لیکن اس نئی ملازمت کے کولہو میں پسنے کے بعد جلد ہی جذبی کو محسوس ہوا کہ گاڑی چلنے کی نہیں۔ چلے گی تو اٹک اٹک کر چلے گی: "آج کل" کا ایڈیٹر جوش ملیح آبادی نہیں، ایک ایرانی الاصل مدیر تھا۔ وہ واقعی حکومت کا خاص چہیتا۔ وہ انگریز حکام سے زیادہ انگریزی حکومت کا وفادار تھا۔ جب اس کو جذبی کے رجحانات اور میلانات کا احساس ہوا تو قدم قدم پر روڑے اٹکانے لگا۔ ایک بار "آج کل" کے ٹائٹل کا رنگ سرخ چھپا۔ وہ چند ہندوستانی انگریز کہنے لگا: "جناب یہ تو سوویت رنگ ہے"۔

ایک انگریز پروڈکشن کا انچارج تھا۔ اس نے بھی یہی بات کہی۔ جذبی کے دل میں آگ سلگنے لگی۔ اس کے بعد ایک رنگین، و تفہیم جو ایک مضمون ترجمے کو ملا جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کا ہر آدمی آزادی کے محل میں آرام کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ جذبی نے اس کے ترجمے سے انکار کر دیا۔ کئی دن ان سے جھڑپ ہوئی۔ معاملہ بگڑتا گیا۔ جذبی نے تنگ آ کر اور انکار کر کے بیٹھنے کی چھٹی لے لی اور بمبئی چل دیئے۔ وہاں سبط حسن اور جعفری کے ساتھ رہے۔ جذبی کو یہ خیال تھا کہ وہاں فلم کمپنی وغیرہ میں رہیں گے۔ مجاز نے ایکٹنگ وغیرہ سے بڑی محبت پیدا کی۔ تقدیر نے کیا امتحان لیے

کری دلا دیں گے۔ چلو امید کی ایک اور کرن پھوٹی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین سے انٹرویو ہوا۔ انھوں نے پوچھا "کہئے آپ نباہ کر سکیں گے یا نہیں؟"

"جناب کیوں نہیں کر سکیں گے" جواب حاضر تھا۔

"جی، پریم چند بھی آئے یہاں لیکن نہیں چل سکے۔"

اس کے بعد جذبی کو وحشت سی رہنے لگی۔ "سمجھوتے کی ایک حد ہوتی ہے۔" جذبی کو بمبئی کا سا ہنگامہ اور شور و غوغا الگ کھائے جا رہا تھا۔ یہاں تنہائی میسر نہیں آئی تھی۔ اسی وحشت کے زمانے میں مسز نیڈو سے ملاقات ہو گئی۔ ان سے جذبی نے ریسرچ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے وظیفہ دلا دیا۔ وہاں سے جذبی سیدھے دہلی آئے۔ استعفا دیا، علی گڑھ میں کام کرنے لگے۔ اتفاق سے موقع نکل آیا۔ اور یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی۔ اس وقت سے آج تک جذبی اسی علی گڑھ میں زندگی گزار رہے ہیں جس کے بارے میں ایک بار انھوں نے مجھ سے کہا تھا

"یہ ایک کنواں ہے جہاں ہم مینڈکوں کی طرح ایک محدود دائرے میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ جب کوئی مینڈک باہر سے آکر اس میں ٹپک جاتا ہے تو [illegible] میں کافی چہل پہل ہو جاتی ہے۔"

یہ بات انھوں نے میرے اچانک ٹپک پڑنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہی تھی۔

زندگی کا پیچ در پیچ سلسلہ جذبی کو یہاں تک لے آیا ہے۔ جذبی اور ان کو جاننے والے یہ جانتے ہیں کہ ایک شاعر کی زندگی کا سلسلہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ صحیح ہے کہ آج وہ مسلم یونیورسٹی میں ایک لیکچرار کی حیثیت سے ایک خاموش زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا اپنا ایک چھوٹا سا کوارٹر ہے۔ گلی اینٹوں سے بنا ہوا ایک صوفہ۔ کور۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ایک اچھے اور دیندار شوہر اور شفیق باپ کی زندگی خاموشی سے گزار رہے ہیں۔

صبح آٹھ بجے سے یونیورسٹی کی پڑھائی شروع ہوتی ہے۔ اور اسی وقت سے ان کے فرائض کا چکر شروع ہوتا ہے۔ یونیورسٹی سے واپس آکر پھر وہی بیوی وہی بچے، وہی گھر اور وہی گھر کا قافلہ۔ اسی چھوٹے سے کوارٹر میں ایک چھوٹا سا صحن باہر ہے یہی اس شاعر کا گھر نما ہے۔ یہاں [illegible] انتظار کر آپ جب اندر پہنچیں گے تو ایک ترتیب اور بے ترتیبی سی نظر آئے گی۔ ایک میز، اس کے آگے ایک کرسی، ایک اور آرام کرسی، اس کے آگے ایک چھوٹی سی میز۔ اور اس چھوٹی سی میز پر کبھی کتابیں، کبھی چائے کا طشت اور کبھی سگار کا بکس نظر آئے گا۔

میں جب کبھی اچانک جذبی کے بعد صحن سے مختلف منزل طے کرتا ہوا جو میں نے اکثر ان کو تنہا پایا ہے۔ وہ میزوں اور کرسیوں سے پرے ایک گوشے میں پڑی چارپائی پر موندھا بچھائے ہوئے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں کمرے میں گھس پڑا ہوں اور اس کے بعد شاعر کو میرے آنے کا علم ہوا ہے۔ جی نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ابھی میں باہر ہی ہوں اور ابھی اس کا یقین بھی نہیں ہوتا ہے کہ حضرت گھر پر موجود ہیں یا تیر کمان سے نکل چکا ہے کہ تشریف لائیں کی لے میں چق کے پیچھے سے خیر مقدم کے نعرے گونجنے لگے۔

میری عمر اور جذبی کی عمر میں ایک پوری ادبی نسل کا فرق ہے۔ لیکن جذبی نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی عمر کی بزرگی کا سہارا نہیں لیا۔ اور بعض مباحث ایسے بھی آئے جب میں نے تلخ باتیں کہیں اور سختی سے کہیں۔ لیکن جذبی کے انداز گفتگو اور دوستانہ لب و لہجے اور برتاؤ میں فرق پیدا نہیں ہوا۔ میں جانتا ہوں اور جذبی بھی جانتے ہیں کہ ان کے بعض کٹر تصورات کو میں ان کے محدود ذہنی ماحول کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔

جذبی میں بڑی زندگی ہے۔ مجھے ان سے مل کر کبھی تھکن، اکتاہٹ اور بوریت کا احساس نہیں ہوا۔ میں جب بھی ان سے ملا ہوں، مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک مخلص اور محبوب دوست سے بات کر رہا ہوں۔ جب اختلاف کی بات ہوتی ہے واضح ہوتی ہے۔ اور ہم دونوں نے کبھی بھی ایک دوسرے کو حلقہ بگوش اسلام کرنے والی ہٹ دھرمی سے کام نہیں لیا ہے۔ میں نے ان میں وہ لچک بھی محسوس کی ہے جو ایک صحت مند اور منطقی گفتگو کو کسی نتیجے تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے۔

جذبی کے متعلق یونیورسٹی میں، یونیورسٹی سے باہر علی گڑھ میں اور علی گڑھ سے باہر آپ کو مختلف رائیں سننے کا اتفاق ہوگا۔

"جذبی ——— اوہ جذبی بہت بور ہے، بالکل برف کی سل۔"

"جذبی بہت مغرور ہے وہ اپنے سوا کسی کو شاعر ہی نہیں مانتا۔"

"جذبی ساس اور بیوی سے بہت ڈرتا ہے۔"

"جذبی اپنے رفیقوں کی ترقی سے جلتا ہے۔"

"جذبی میں خود پرستی نے حقیقت کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت ختم کر دی ہے۔"

"جذبی کی [illegible] میں ملاؤں [illegible] سیدھا کرو۔"

اور بہت سی باتیں ——— باتیں اور باتیں۔ سچی باتیں، کچی باتیں، اچھی باتیں، بری باتیں۔ ان میں سے اکثر باتیں غلط ہیں۔ اکثر باتیں تعصب، خود غرضی اور تنگ نظری سے پیدا ہوئی ہیں۔ لیکن ایک بات صحیح ہے اور کہی ہوئی باتوں میں سے آدھی بات سو فیصدی سچ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لوگوں کی خوشامد اور چاپلوسی کی باتوں کو پسند کرتے ہیں بلکہ اس معاملے میں انہیں واقعی سیدھا سمجھتا ہوں۔ ایسے یاروں کی مثال بھی موجود ہے جنہوں نے جذبی سے ہر قسم کی مدد لی، ان کی شخصیت کے سامنے [illegible] بنے بیٹھے ان کی [illegible] ادب کی زمین پر پاؤں [illegible] کھڑے ہوتے ——— اور جب پر نکلنے کی سکت پیدا ہوئی تو جذبی کو گالی دیتے ہوئے فضا میں اپنی بولیاں بولتے ہوئے بلند و معلق ہو گئے۔

جذبی کی پچھلی زندگی اور موجودہ ہستی کی زندگی میں بہت سے ایسے اتفاقات ہوئے ہیں [illegible] جس کی طرف شاعر کا ہاتھ بڑھا، کانٹوں کی بیل میں جل گئی ہے۔ وہ بچہ جو سات [illegible] سال کی عمر میں ماں کو کھو بیٹھا، جس کی تعلیمی زندگی میں بار بار رکاوٹ پیدا ہوتی رہی، جس کے اپنے کم عمری ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، جس نے مختلف ملازمتیں کیں اور ہر جگہ حالات سے ٹکر ہوئی [illegible] ضمیر اور آزادی کے خیال سے کچھ کرنے نہ دیا، جس نے اپنی ساری زندگی افلاس [illegible] "ناامیدی اور شکستوں کے اندھیرے میں بتائی"، جس نے [illegible] شاعر [illegible] کی غزلیں [illegible] محبت کی ناکامی بھی جس کے [illegible] زندگی کا زہر پی گیا اور جس کے [illegible] سے بھری ہوئی [illegible] شکل سی پیچیدگی بھی خود ہی کی آزمائش ہو گئی ——— اس آدمی کے لئے مختلف حالات میں افسردہ ہو جانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ ان کی شاعری اس وقت میرا موضوع نہیں ہے لیکن میں جب ان کی شاعری کا مطالعہ کرتا ہوں تو ان کی زندگی کی پوری کہانی مسلسل وار آئینہ در آئینہ سامنے آ جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی مایوسیاں، رقت خیز غم انگیزیاں، پھر ان غم انگیزیوں پر امید کی چھاؤں ——— (کہ وہ لوگوں کی زندگی یا شاعری کا یہ پہلو دکھائی نہیں دیتا) ——— اس لئے جب بہت سے دوسرے شاعروں کے مقابلے میں جذبی پر نظر ڈالتا ہوں تو میں ان کی ذات، ان کی روح کو اور ان کی شاعری کو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ذاتی زندگی اور شاعری کا اتنا اچھا اور خوبصورت آہنگ بہت کم فنکاروں میں دکھائی دیتا ہے۔

اس وقت جبکہ جذبی کے حال پر ایک سرسری نظر ڈال رہا ہوں تو یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں جو میں کہہ نہ سکوں گا۔

وہ شام ابھی مجھے یاد ہے۔ [illegible] ——— سردیوں کا زمانہ تھا۔ میں اچانک علی گڑھ پہنچ گیا تھا۔ باہر [illegible] سنہری چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ رات کے گیارہ بارہ بجے تھے اور ہم مسلسل زندگی کے مختلف مسائل پر بات کر رہے تھے۔ جذبی بہت جذباتی ہو گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ [illegible] اور کسی منزل سے آگے بڑھ کر رفاقت کا [illegible] حاصل نہیں کرتا۔ وہ [illegible] حاصل کرنے کے لئے مشکل پسندی اور بے لوث خلوص کی ضرورت ہے۔ اس وقت جذبی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں [illegible] زندگی کے مختلف تجربوں [illegible] جذبی نے زندگی کے [illegible] [illegible]

"وہ مجھ سے محبت کرتی ہے، وہ بھی جانتی ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں [illegible] زندگی کی گھٹن میں [illegible] کام کرتا ہے۔"

وہ [illegible] کہتے گئے [illegible] یہ دنیا [illegible] سے بھری ہوئی ہے۔"

اسی وقت ان کی بیوی [illegible] جذبی نے [illegible] ان کی آنکھوں [illegible]

[illegible] دیکھو میری محبوبہ ہے جو مجھے کبھی دغا نہیں دے گی۔"

اس دن مجھے معلوم ہو گیا کہ جذبی کے جذبات زندگی کے کس موڑ پر پہنچے ہیں [illegible]

جذبی کی شاعری کا بہترین حصہ ان کی اپنی زندگی کا ذاتی تجربہ ہے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ جذبی کی شاعری اور زندگی دونوں ہم آہنگ ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں قنوطیت اور یاسیت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ لیکن یہ اداسی یا یاسیت، یہ شکست خوردگی ان کی پوری شاعری اور ان کی پوری زندگی پر محیط نہیں ہے۔

جذبی کو اپنی موجودہ زندگی میں، موجودہ سماجی نظام کی خرابیوں سے [illegible] کا احساس [illegible] ایک [illegible] کی نظم [illegible] لیکن [illegible] جب اس فضا میں زہر [illegible] ہے تو وہ چلا اٹھتے ہیں:

"اب انقلاب آ ہی جائے تو اچھا ہے۔ اپنی زندگی ہی بدل جائے ——— انتظار کب تک؟"

جذبی سردار جعفری کی شاعری [illegible] کہتے ہیں "وہ شاعر [illegible] بہت اچھا شاعر ہوں لیکن وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی [illegible] اور اگر وہ [illegible] تو پھر وہ سردار جعفری نہیں۔"

لیکن [illegible] جب دوستوں کا ذکر کریں گے تو اسی شدت اور خلوص کے ساتھ کہیں گے ——— [illegible] کے اختلافات جتنے بھی ہوں [illegible] سردار کی خوبیوں اور انسانیت [illegible] مجھ سے زیادہ [illegible]"

جب کبھی غم روزگار، [illegible] انسانیت، خلوص، عمل [illegible] کا ذکر آیا ہے جذبی نے [illegible] انسانی دوستی کا اعلان کیا ہے اور [illegible] کے لمحات یاد کر کے ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

جذبی کے بارے میں ایک [illegible] کہی جاتی ہے کہ وہ ایک بے عمل آدمی ہیں لیکن [illegible] پچھلے سال کا ذکر ہے [illegible] انجمن ترقی پسند مصنفین کی [illegible] کانفرنس کے سلسلے میں [illegible] جذبی میرے ساتھ [illegible] دوستوں اور [illegible] کانفرنس کے [illegible] تھے۔

کبھی کبھی جذبی پر ایک غیر منطقی [illegible] کا دورہ پڑتا ہے [illegible] لیکن [illegible] جذباتی کیفیت ہوتی ہے۔

ہاں جذبی رات کے [illegible] مسائل کے متعلق ہوتی ہیں یا زندگی [illegible] دوسرے تجربوں کے متعلق۔

ایک رات ——— [illegible] جذبی [illegible] جگر مراد آبادی کے ساتھ [illegible] رات کافی [illegible] جگر مراد آبادی اور جذبی کے نام پر [illegible] شاعر جگر مراد آبادی اور جذبی [illegible]

گھر پہنچ کر [illegible] گپ ہوتی رہی [illegible] بہت خوش [illegible] کانفرنس کے لئے جگر مراد آبادی سے [illegible] کامیاب ہو گئے تھے۔

جذبی [illegible] لمحات کم ہوتے ہیں [illegible] وہ ایک خاموش انسان کی طرح اپنے [illegible] ——— [illegible] سگریٹ [illegible] ——— اس وقت [illegible] زندگی [illegible] ماضی کی طرف ہے اور نظریں مستقبل کی طرف۔

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

جذبی کو راکھ کا ڈھیر سمجھنے والوں سے صرف اتنا عرض کروں گا کہ راکھ کے ڈھیر کو ٹھوکر لگا کے آگے بڑھ جانے سے پہلے ایک ذرا ٹھہرئیے اور اس ڈھیر کو کرید کر دیکھئے ——— ابھی اس کے اندر چنگاریاں باقی ہیں جو اگر ہوا دی جائے تو جنگل کی آگ بن سکتی ہیں۔

شکیلہ اختر

صوفیہ فضل

یہ گھنگھریالے سیاہ بال اور سنہرے رنگوں والی آپا کو ہم نے ہوش سنبھالتے ہی دیکھا۔ جب بھی ان کی طرف نظر اٹھی تو بس ڈرتے ہی ڈرتے۔ شاید یہ کہ آپا کے آنے سے پہلے دو بھائی پیدا ہوتے ہی بچپنے اس دنیا سے جا چکے تھے۔ اب آپا جو آئیں تو ایک لاڈلی اس پر سے بیمار ۔۔ اسی لئے اتنے لاڈ چونچلے رہتے آپا بس آپا ہی بن بیٹھیں۔

پانچ برس میں کچے کچے آم اور امرود کھاتے کھاتے بیمار پڑ کر جب میں اچھی ہوئی تو آپا نے مجھ کو سزا دینے کے لئے یسرنا القرآن پڑھانا شروع کیا۔ جہاں تک لفظوں کی بات تھی ایک دو دن تک کی گنتی میں رٹا دیا کرتی مگر کڑے، ٹیڑھے اور ملے جلے ہوئے الفاظ کسی طرح بھی میرے پلے نہ پڑتے تھے اور آپا کو ساتھ ہی ساتھ یہ دھن بھی لگی رہتی تھی کہ ایک ہی دفعہ ساری کی ساری کتاب وہ مجھے ختم ہی کرا دیں۔ جانے یسرنا القرآن کی بھی مجھ سے کیسی اللہ واسطے کی بیر تھی جو اس کا کوئی لفظ اور حرف میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ابھی ابھی دل و دماغ کو سنبھال کر پڑھ رہی ہوں کہ پچھلے صفحے کی دوسری سطر کی گڑبڑ ہے۔ جیسے تیسے اس بلا سے ابھی نجات ملی ہی تھی کہ ایک اور تیسری زبان کتاب "آمدنامہ" کی مری سوار۔ ابھی عربی، اردو اور فارسی کی کھچڑی میں دماغ خراب ہی ہو رہا تھا کہ ادھر سر اور پیٹھ پر آپا کے دھموکے پڑنے شروع ہو گئے۔ ہاتھ سے مارتے مارتے جب ان کا دل نہ بھرا تو ایک دن کنگھی سے مارتے مارتے آپا نے اونچی کرسی والے برآمدے سے مجھے نیچے دھکا دے دیا ——— پھر تو بس اسی دن سے ہمارے نصیبے بھی کھل گئے۔ اماں جان نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ایسی پڑھائی سے باز رہیں جس سے میری بچی کی جان ہی چلی جائے" ——— شام تک جب آپا کا غصہ اتر گیا تب انھوں نے بھی یہ مان لیا کہ یہ کتاب ہے ہی فضول۔ آخر آپا نے کھیلتے ہی کھیلتے نو سال کی عمر میں اپنی ساری پڑھائی کیسے ختم کر دی تھی؟ پھر اس دن سے کبھی آپا نے کسی کو پڑھانے کی ہمت نہیں کی۔ اب بھی کسی بچے کی پڑھائی پر بس بھولی سی نظر ڈال لیتی ہیں۔

شاید آپا کے مزاج میں سب سے بڑی چیز ہمت اور ان کے گھنگھریالے بالوں نے ہی پیدا کی ہوگی جو ان کو بے حد پسند ہیں اور اس کے بعد دادی اماں کی بیماری نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ہم سارے بھائی بہنوں میں آپا سب سے زیادہ خلیق، ملنسار، ہنس مکھ اور ڈٹ کر محنت کرنے والی ہیں مگر کبھی اچانک ایسے ہی ہنستے ہنستے آپا کو غصہ آ جاتا ہے جیسے پہاڑی علاقوں میں یک دم بدلیاں، گھٹائیں اور بجلیاں چمکتی ہیں اور پھر

زوروں کی بارش ہو کر رُک جانے، دھلا ہوا آسمان صاف نکھر اُٹھتا ہے بالکل اسی طرح سے ابھی ابھی غصے، چڑچڑاہٹ اور بیزاری کے بعد آپا کا سنہرا چہرہ پیاری پیاری مسکراہٹ سے چمکنے لگتا ہے اور ہم حیران نگاہوں سے یہ تکتے رہ جاتے ہیں کہ آپا کا غصہ نقلی تھا یا ان کی یہ مسکراہٹ نقلی ہے۔ کیسی ہی وہ لاکھ غمگین اور افسردہ ہوں اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈوبی ہوئی ہوں لیکن اسی وقت اگر کوئی ان سے ملنے کے لئے آ جائے تو پھر ان کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح وہی خلوص بھری مسکراہٹ تیرتی نظر آنے لگے گی اور ان کی آواز میں رنج و غم کا ایک سایہ تک نظر نہ آئے گا۔ وہ ایک ہی وقت میں جی بھر کے رو بھی جاتی ہیں اور دل کھول کر ہنستی بھی ہیں۔

خاندان بھر یا باہر جیسی بھی محفل ہوگی آپا اس پر چھا کر رہ جائیں گی۔ خوبصورت سے خوبصورت دیہاتی ماحول سے لے کر شہر کی اعلیٰ ترین سوسائٹی تک میں آپا کی قدر، محبت اور عزت یکساں طور پر ہوتی ہے۔ ابھی ابھی آپا اگر ایک دیہاتی کنبے سے چھوٹے سے صحن میں بڑے خلوص کے ساتھ دلچسپ باتوں میں مگن ہیں تو شام کو بہترین ڈرائنگ روم میں نفیس صوفے پر اسی دلچسپی کے ساتھ مزے دار باتوں میں لگی نظر آئیں گی۔ ان کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بعض دفعہ گھر میں تماشے نظر آتے ہیں۔ گیسٹ روم میں کچھ اور ہی رنگ ہے اور ڈرائنگ روم میں سے شستہ اور بے تکلف اور چہکتی ہوئی آوازیں آ رہی ہیں، پھر اچانک دوسرے کمرے سے آپا کی آواز آنے لگتی ہے۔ فرق بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ آواز کی رفتار اور لہجے میں وہ پہلی سی روانی نہیں رہتی۔ دوسرے کمرے میں کئی مہمان خواتین چوکی کے فرش پر ریزرو طریقے سے بیٹھی ہوئی ہیں، چہرے پر سنجیدگی چھائی ہے۔ بس بیاہ کے لگے بندھے اور خاص علیم آبادی لہجے میں سنبھل سنبھل کر باتیں کر رہی ہیں۔ ٹھیک اسی وقت کچھ لوگ دروازے سے آ کر ایک ٹھنڈی سی آہیں کرنے کو سعی ہو جاتے ہیں اور پردے کے پیچھے آپا کی اصلاح ہیں تو وہی دبی سی آواز ان کی ہر طرح کی امداد کا یقین دلاتی ہے۔ ڈرائنگ روم اور دوسرے کمرے کی مہمان دوستوں کی تنہائی کا خیال کیے جب آپا دروازے سے چلتی ہیں تو برآمدے کے پاس سے گزرتی ہوئی چند ضرورت مند عورتیں انہیں اپنی دکھیا کہانی سنانے لگتی ہیں اور آپا کبھی چپاتی اور کبھی کسی کے نام کا خط لکھ کر ان کو دینے لگتی ہیں اور پھر کتنے کڑے کے ساتھ گھر میں اپنی ہر وہ رشتہ داروں سے چپکے چپکے کرا کے دو چار روپے سے ان کی امداد کر دیتی ہیں اور اس دوران میں اگر وقت ہوا تو ڈرائنگ روم کی مہمان بیبیاں ریڈیو کھول کر اپنا دل بہلانے لگتی ہیں اور دوسرے کمرے کے اندر پٹی ساری کا سیدھا آنچل اوڑھے بیٹھنے کے زیور اور رنگ برنگ شوخ قسم کی مستورات حیران نگاہوں سے آپا کو ڈھونڈتی ہوتی ہیں۔

آپا کی مقبولیت کی کوئی انتہا نہیں۔ ان کو گھر صاف رکھنے کا جنون ہے اور اپنے مہمانوں کے ساتھ اخلاق برتنے کے ساتھ ان کو قسم قسم کی چیزیں کھلانے کی ان پر دھن سوار رہتی ہے۔ اکثر آپا کا گھر مہمانوں کی کثرت سے ایک چڑیا خانہ نظر آتا ہے۔ کئی کئی کھانے کھلائے جاتے ہیں اور سب بلکہ کر اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ آپا اپنے گھر کو ربڑ کی طرح کھینچ کر نہ جانے کیسے بڑا کر لیتی ہیں اور سارے مہمان جن کی تعداد کبھی کبھی سو سے اوپر ہو جاتی ہیں رات کو اپنے اپنے بستروں پر سوتے نظر آتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آئے گئے لوگوں سے ان کا گھر خالی رہا ہو۔ اس گھر کی حالت بالکل ویٹنگ روم جیسی ہے۔ ایک بستر ابھی بندھ رہا ہے کہ گیٹ پر موٹر یا ٹیکسی لگی اور کئی بستر اور بکس اندر آ گئے۔ پلنگ، چارپائی کا مرکز ہے، کبھی کرسیوں کی ضرورت لگی رہتی ہے۔ پھر بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو بڑے اطمینان سے کہہ دیتے ہیں کہ ان کا خرچ ہی کیا ہے؟ دو زبانیں، دو میاں بیوی اور دو چار نوکر چاکر۔ " بیچارے صاحب مستقل طور پر ان کے ساتھ رہنے والے عزیزوں کی تعداد اڑتالیس ہے۔ اس پر سے دلی اور پٹنہ اور گیا، مظفرپور اور چھپرہ کے رشتہ داروں کا تو ذکر ہی کیا۔ پھر بھی گھر ایک کا ایک ہی ہے۔ ان مہمانوں کے ہاتھوں آپا بیچاری نے پورے گھر میں ہی آگ سے رکھا ہے اور ان کو کس ایک خوب کی کتاب کی طرح ہمیشہ سے خالی کا خالی ہی رہا۔ یہاں تک کہ کپڑے، جوتے، کپڑے اور صاف تک کے پیچھے اسی چکر میں چلے جاتے ہیں۔ آپا کو ریڈیو کے مضمون اور دو کتابیں اور افسانوں کے جتنے بھی روپے ملتے ہیں وہ سب کے سب بڑے اطمینان سے بجٹ کے بنے ہوئے انگلش ریڈ کے بجٹ پر چڑھ جاتے ہیں اور اس پر بھی آپا مہینے کے بعد گھبرائی گھبرائی سی رہتی ہیں۔

تیمارداری آپا کی فطرت کا ایک حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ جب بھی بیمار ہوا آپا بغیر اپنی زندگی کے اس کی خدمت کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ بعض وہ

ہسپتال میں، دو کرسیوں کو جوڑ کر سوتی رہی ہیں۔ بیسیوں پیچیدہ بوڑھے مریضوں کو گھر ان کا جانا پہچانا ہوا ہے ہسپتال کا سارا اسٹاف ان کو دور ہی سے آتا دیکھ کر سلام کرتا ہے اور اس سلام کے پیچھے ان بیچاری کا برسوں کا بھلا ہوتا جاتا ہے ۔

آپا کے دل میں بغیر کسی تعصب کے ساری انسانیت کے لئے بڑی گہری محبت اور ہمدردی ہے وہ ان کے دکھوں پر تلملا جاتی ہیں۔ اسی سلسلے میں شادی کے چند مہینوں کے بعد آپا نے اپنے ہزاروں روپے کے زیور اور شادی کے قیمتی کپڑے تک بیچ کر خیرات کر دئے۔ غریبوں کے بچوں کی تعلیم میں آپا بڑے خلوص سے حصہ لیتی ہیں، انہی کی تحریک اور کوشش سے اردو کا ایک مدرسہ کھولا گیا ہے جہاں غریبوں کے چالیس بچے پڑھ رہے ہیں۔ صحیح معنوں میں آپا انسانیت کی خدمت کے لئے ایک ایمبولنس کار ہیں۔ کوئی دکھی ہوا، کوئی تکلیف میں ہوا، کسی کی طبیعت خراب ہوئی اور ایمبولنس کار کی محبت بھری گود کھلی ہے۔ مگر آپا ایک ایسی ایمبولنس کار ہیں جس کی مشینری خود ہی بگڑ رہی ہے، جس کے کل پرزے کمزور ہو چکے ہیں جس میں جگہ جگہ کی بیسیوں پیچیدگیاں لگی ہیں، جس کا چل چل کر جھول گیا ہے اور وہ گاڑی ابھی تک صرف اپنی ہمت اور اپنی غیر معمولی محبت اور دلچسپی پر چل رہی ہے اور اس وقت تک چلتی رہے گی جب تک کہ تمام حصے پرزوں کی ایک ایک پرزہ ٹوٹ کر بکھر نہ جائے گا۔ ہم لوگوں میں سے کوئی کتنا ہی بیمار ہو آپا کی بے پایاں محبت بھری خدمت ہمارے دلوں میں سکون بھر دیتی ہے اور ہسپتال کا ماحول پھر ہمارے لئے اتنا ہولناک نہیں رہتا۔ جہاں وہ دوسروں کی تسکین کی موجب ہیں وہاں دو سال ہوئے جب آپا کے پیٹ کا بہت ہی بڑا آپریشن ہوا تھا تو چند ہی دنوں کے بعد اسی کمرے کے دوسرے کمرے میں سے کا اچھا خاصا ایک مریض اپنے سارے خاندان کے ساتھ آیا اور دس بجے رات کو اس کی سانس اکھڑ گئی اور دو بجے کے قریب میں ڈھارس دینے والی آپا بیٹھی ہیں۔ بستر کی پٹیوں کو ذرا سی جھکی دیوار کا سہارا لے کر چلتی ہوئی رونے کی آواز سن کر اپنے کمرے سے بھاگ گئیں اور ساری رات انہوں نے نرس کی ڈیوٹی دوسروں میں جاگ کر گزار دی۔

آپا کی طبیعت میں بے حد سادگی ہے بڑی سے بڑی مجلس میں جہاں علیم آبادی بیٹھے اور اونچے طبقے کی شوخی اور فیشن عروج پر ہوتا ہے وہ اپنے سادہ دھلے ہوئے کپڑوں میں شریک ہوتی ہیں۔ کسی کی امارت کبھی بھی انہیں مرعوب نہیں کر سکتی ہے اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے سوا وہ کسی چیز کو بہت کم اہمیت دیتی ہیں۔

جس طرح انجمن ترقی اردو کی میٹنگوں میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی ہے ویسے ہی مارکیٹنگ میں بھی۔ جہاں وہ عورتوں کی ایک بہت ہی فعال ممبر ہیں، چندہ جمع کرنا اور جمعیت کے مختلف کاموں کی ذمہ داری انہی پر ہوتی ہے وہاں خاندان کے لئے رشتے کی تلاش اور شادی کا انتظام بھی ان کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے۔ آپا کے ہاتھوں کے پکے ہوئے باقرخانی اور مرغ مسلم سے لے کر چٹنی، اچار اور مربے تک بھر بھر بھیجے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہزاروں سلائیاں گھر میں ہوں، کٹنگ ماسٹر ابھی تک صرف آپا ہی ہیں۔ سوئٹر کے نمونے اور دوسری چیزوں کے نمونے انہی کے ذریعے ہم لوگوں تک پہنچتے ہیں۔ ایسے کاموں میں ہم تھک سے جاتے ہیں آپا بڑے سکون سے ان کاموں میں لگی رہتی ہیں یہاں تک کہ بچوں کے بھرے میں بیٹھی بھی گھروندے کبھی فرغل کے ہاتھی اور گھوڑا بنا کر انہیں دے دیتی ہیں۔

آپا کے دل میں محبت اور خدمت کا ایک اتھاہ سمندر چھپا ہوا ہے مگر ان کی طبیعت میں بلا کی عجلت، چڑچڑاہٹ اور ضد کے ساتھ تنک مزاجی بھی۔ خاندان بھر میں ان کی جیسی بے لوث محبت اور اخلاص برتنے والی شخصیت نہیں ہے۔ لیکن وہ بے حد جذباتی ہیں اور بات بات پر ان کے اکثر جھگڑے ہیں۔ ساری مجلسوں میں جہاں لوگ ان کو وحشی سمجھتے ہیں اور ان کی بیٹھنے جھڑنے والی پر لطف اور خلوص بھری باتوں میں ان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں وہاں قہقہے پر قہقہے لگانے والی آپا گھر کے اندر چپ چاپ ہوتی ہیں۔ غصے سے مرد بھی ڈرتے ہیں۔ گھر کے سارے ملازمین اور بچوں کے لئے بس آپا ہی کا رعب کافی ہوتا ہے کہ وہ آ رہی ہیں۔ مگر اتنے رعب اور ادب کے بعد بھی سارے لوگ ان پر جان دیتے ہیں۔

ادب اور شاعری سے آپا کو بہت ہی بچپنے سے لگاؤ رہا ہے۔ اماں جان اور ابا جان دونوں کو ادب سے گہری دلچسپی رہی تھی اسی لئے آپا نے ہوش سنبھالتے ہی میر، غالب، حالی، انیس، اقبال، جہانگیر، عصمت اور تہذیب ہی کو دیکھا۔ جب وہ صرف دس سال کی تھیں تو اسی وقت انہوں نے پہلی بار شعر

لکھا تھا۔ بچپن ہی سے آپا کی نگاہ بہت ہی بڑی گہری تھی، وہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بہت زیادہ محسوس کیا کرتی تھیں۔ آپا کی تعلیم تو بہت ہی معمولی طور پر ہوئی تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے شوق اور کوشش سے اپنے مطالعہ کو بہت وسیع کر لیا ہے اور اب وہ دنیا کے بہت سے موضوعات کو اپنا چکی ہیں۔ ایسے تو وقت بے وقت وہ دنیا بھر کی تاریخ اور جغرافیہ اور ایسے ہی بے کار و بیکار کتابیں پڑھتی ہی رہتی ہیں لیکن ان کو اسلامی ہسٹری پڑھنے، پڑھنے کا ایک جنون سا ہی ہے اور جب پڑھتے پڑھتے ان کو کوئی اچھی چیز مل جاتی ہے تو پھر وہ سیدھی ہم لوگوں کے پاس چلی آتی ہیں اور پھر گھنٹوں انہی باتوں پر تبصرے ہوتے رہتے ہیں۔ آپا کو پڑھنے کی لت اس حد تک لگی ہوئی ہے کہ ناشتہ کھانے کے وقت بھی کوئی کتاب ضرور ان کے ہاتھ میں رہے گی۔

آپا کا سب سے پہلا افسانہ "مرحمت" [illegible] کے ادب لطیف میں چھپا تھا اور اس کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ اسی کے بعد سے آپ نے اپنی شاعری ختم کر کے افسانہ نگاری شروع کر دی تھی۔

اب تک ان کے جتنے بھی افسانے چھپتے رہے ہیں وہ ہمارے کرداروں کی آنکھوں کے سامنے سے گزر چکے ہیں۔ ایک آدھ افسانہ جو انھوں نے پلاٹ سوچ کر لکھا بھی ہے تو اس طرح کہ دو تین قلم ہی چلتا ہے اور نہ کہانی ختم ہی ہوتی ہے۔ "ریچھ"، "آنکھ مچولی" اور "تلاش" ان کے ذہن کی جو حساب تک نکل چکے ہیں اور ان افسانوں کے کیریکٹر بھی چلتے جاگتے اور چلتے پھرتے انسان ہیں۔ آپا کے دو افسانے "مظلوم" اور "موسیٰ" میں اتنی زندہ تصویر کھینچی گئی ہے کہ ان افسانوں کے چھپنے کے بعد "مظلوم" والی بڑھیا جتنے کے جن جن گھروں میں جاتی تھی لوگ دور ہی سے اس کو دیکھ کر پہچان گئے کہ یہی مظلوم والی بڑھیا ہے اور اسی طرح سے ہسپتال میں کمپونڈر کی بیوی (موسیٰ) کا ایک ایک نشان افسانے میں اس قدر نمایاں ہے کہ اس کو پڑھنے والے بے اختیار موسیٰ کو یاد کرنے لگے اور آج مرنے کے بعد بھی موسیٰ ہمیں زندہ نظر آتی ہے۔

آپا کی افسانہ نگاری کی عجیب عجیب خصوصیتیں ہیں۔ ٹھیک ہیں عصمت چغتائی کی طرح کبھی مسہری یا پلنگ پر پیٹ کے بل لیٹی ہوئی وہ تکیے کے سہارے سے لکھتی چلی جاتی ہیں۔ ایک افسانہ ختم ہوا دوسرا شروع ہوا تیسرے کی باری آئی۔ شور ہو رہا ہے، شادی کے ہنگامے ہیں، لڑکیاں جھگڑ رہی ہیں ۔۔۔ بے دھڑک لکھی جا رہی ہیں۔ بلا کی گرمی پڑ رہی ہے، پسینے کے قطرے ٹپک رہے ہیں مگر آپا ہر چیز سے بے خبر اسی انداز میں لیٹی ہوئی لکھتی چلی جا رہی ہیں۔ گھر سنسان سا لگ رہا ہے، ہم لوگوں کی مسلسل دوڑ دھوپ بند ہوئی ہے۔ ایک ہفتہ دس دن اسی جنونی کیفیت میں جب گزر جاتے ہیں تب پتہ چلتا ہے کہ آپا نے ایک ساتھ چار افسانے لکھ ڈالے ہیں اور جیسے ہی انھوں نے اپنا قلم رکھا ہمارا یہ کام شروع ہو جاتا ہے کہ ان کے لکھے ہوئے افسانے سنتے چلے جائیں۔ افسانوں کو سنا کر اور ان کی پسندیدگی کے بعد آپا اطمینان کی ایک گہری سانس لے کر ان افسانوں کو اپنے فائل میں بند کر دیتی ہیں اور پھر بھول وہ بھول جاتی ہیں کہ انھوں نے کبھی افسانہ بھی لکھا تھا ۔۔۔ جب مہمان داری، شادی، بیاہ، مارکیٹنگ، خدمت خلق اور شعر و نغموں سے فرصت ملتی ہے تو کبھی کبھار ایک آدھ افسانہ صاف کر کے کہیں بھیج دیا۔ آپا نے ایک بہت ہی بڑا ناول پھر لکھنا شروع کیا تھا "سمندر اور ساحل" اس کا پلاٹ ہمارے ہی ہوئی مشترکہ کی کہانی تھی۔ بہت سے صفحے لکھے جا چکے ہیں۔ اس کا ایک حصہ "نیا دور" کے فسادات نمبر میں "ایک دن" کے نام سے نکل بھی چکا ہے۔ مگر افسوس کہ وہ بار بار دیری اب کہیں شائع نہیں ہو سکتی ہیں۔ ان دنوں وہ ایک ناولٹ لکھ رہی ہیں کہ اس ماہ وہ بھی چھپ چکے ہیں [illegible] کام ہے۔

آپا کو فطرت سے بڑی نرم دل اور دردمند نگاہیں ملی ہیں۔ جس موڑ سے ہم لوگ آسانی سے گزر جاتے ہیں آپا ٹھٹک کر رہ جاتی ہیں اور ان کی نگاہوں میں وہ سب کچھ آ جاتا ہے جس کو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ اگر روز مرہ کے سارے فضول کام آپ کے سپرد نہ ہوتے تو آج وہ افسانوی دنیا میں چھا کر رہ گئی ہوتیں۔

"آنکھ مچولی"، "گھر یا دیواریں" آپا کے بہترین افسانے ہیں اور شاید یہی انھوں نے ہم سب سے بہتر کہانی لکھی ہے۔ آپا کئی برسوں سے انیمیا کی مریض ہیں مگر اب ان کی بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ ڈاکٹروں نے ان کو مکمل طور پر آرام کرنے کی تاکید کی ہے مگر گھر کی دیکھ بھال، تیمار داریوں کے کام اور ان کی تیاریوں اور بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ یہی سوچ کر آپا ڈاکٹروں کی ساری ہدایتوں کو ان سنی کر کے اپنی اسی پرانی ڈگر پر چلی جا رہی ہیں۔

(۴)

نوا ہا زندہ شد در شاخساراں

مولٰنا محمد علی

ضیاء الدین احمد برنی

محمد علی دو سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سے ان کی تعلیم و تربیت کا بار ماں کے ضعیف کندھوں پر آن پڑا۔ انھی کی تربیت کا اثر تھا کہ علی برادران ان صفات سے متصف ہوئے جن کی وجہ سے وہ سارے ہندوستان پر چھا گئے۔ محمد علی نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔

محمد علی پہلے بریلی کے اسکول میں بھیجے گئے۔ اس کے بعد علی گڑھ میں تعلیم پاتے رہے۔ وہاں سے انگلستان گئے اور آکسفورڈ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ آئی سی ایس کے امتحان میں وہ گھوڑے کی سواری میں فیل ہو گئے اور ملک و ملت کے لیے یہ اچھا ہی ہوا ورنہ وہ زیادہ سے زیادہ کلکٹر بنتے اور سیکڑوں ہزاروں کلکٹروں کی طرح گمنامی کی حالت میں مر جاتے۔

ولایت سے آنے کے بعد وہ کچھ دن تک رام پور کے محکمۂ تعلیم میں ملازم رہے۔ وہاں سے بڑودہ چلے گئے اور پھر نو سال میں کمشنر تک پہنچ گئے۔ بڑودہ میں تقریباً چھ سات سال تک ملازمت کی۔ مضامین نگاری کا شوق پہلے سے تھا۔ ٹائمز آف انڈیا بمبئی کے ایڈیٹر سر لوویٹ فریزر ان کے دوست تھے۔ ان کی درخواست پر انھوں نے ملک کی سیاسی حالت پر چند مضامین لکھے جو بعد کو کتابی صورت میں بھی شائع ہو گئے۔

بعض باتوں کی وجہ سے وہ بڑودہ کی ملازمت سے دل برداشتہ ہو گئے تھے اور اس لیے انھوں نے دو سال کی چھٹی لے لی اور کلکتہ چلے گئے۔ پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر ان کے دوست تھے جب انھیں معلوم ہوا کہ محمد علی خالی ہیں تو انھوں نے بہاولپور کی وزارت عظمیٰ پیش کی۔ اسی طرح ایک دوسری ریاست نے بھی انھیں اپنانے کی کوشش کی مگر محمد علی نے ان پیشکشوں کو ٹھکرا دیا اور کلکتہ سے ہفتہ وار اخبار کامریڈ نکالنے کے انتظامات میں لگ گئے۔ کامریڈ کا پہلا پرچہ ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو نکلا۔ محمد علی کی پبلک لائف صحیح معنوں میں اسی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ ۲۰ سال تک مسلمانوں کی جنگ میں یہ شخصیت دنیا کے سامنے رہی اور بالآخر ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں جہاں وہ برطانیہ کے سامنے ہندوستان کا مطالبۂ آزادی پیش کرنے کے لیے گئے تھے، انتقال کر گئے۔ ان کی تمنا تھی کہ وہ غلام ملک میں نہ مریں۔ یہ دعا قبول ہوئی اور انھوں نے ایک آزاد ملک میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔

محمد علی طالب علمی کے زمانہ ہی سے اپنی غیر معمولی ذہانت کے لئے مشہور تھے۔ بریلی میں بھی، علی گڑھ میں بھی اور آکسفورڈ میں بھی۔ ان کے حافظہ کی یہ کیفیت تھی کہ وہ متعدد شعراء کی غزلیں کی غزلیں زبانی سنا دیتے تھے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کے بیسیوں حصے انھیں ازبر تھے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا کہ یار لوگ بیٹھ جاتے تھے اور ان سے مختلف شعراء کا کلام سنتے تھے۔ "فسانۂ آزاد" کی بیسیوں طویل طویل عبارتیں بھی انھیں یاد تھیں۔

ابتدا ہی سے وہ بہت محنتی تھے۔ حالانکہ ذہین طلبا بالعموم محنت سے جی چرایا کرتے ہیں۔ یہی حالت آخر وقت تک رہی۔ میرے خیال میں انھوں نے کم و بیش کئی ہزار کتابیں پڑھی ہوں گی۔ وہ حکومت اور کانگرس کی شائع کردہ رپورٹوں کا بھی گھنٹوں بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتے تھے۔ راتوں کو دیر تک جاگنے کے عادی تھے۔ ۱۹۱۴ء میں انھوں نے لندن ٹائمز کے اشتعال انگیز مضمون "ترکوں کی پسند" کا جو دندان شکن جواب دیا تھا وہ ایک ہی نشست میں جو ۳۶ گھنٹوں پر مشتمل تھی، لکھا گیا تھا۔ اس اثنا میں انھوں نے اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لیا تھا۔ صرف چائے، بسکٹ اور کافی پی پی کر وقت گزاری کرتے رہے۔ مجھے وہ سماں اب بھی اچھی طرح سے یاد ہے۔ وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے لکھ رہے ہیں، بیسیوں کتابیں ادھر ادھر پڑی ہیں، کبھی اس سے اقتباس لیتے ہیں اور کبھی اس سے۔ یہ مضمون نہ صرف انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے بلکہ معلومات اور دلائل کے اعتبار سے بھی وہ اس قدر پر زور ہے کہ خواہ مخواہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ لندن کی گول میز کانفرنس کے دوران میں باوجود علالت کے وہ مطالعہ کرتے رہتے۔ بیمار ہیں مگر ملک و ملت کے مسائل پر غور کر رہے ہیں، اسکیمیں تیار کر رہے ہیں، انٹرویو دے رہے ہیں، تقریریں کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان کا حافظہ اس قدر قوی نہ ہوتا تو یقیناً ان کی تقریریں اور مضمون اتنے جامع نہ ہوتے۔ یہ سب ذہانت اور محنت کے کرشمے ہیں۔

علی برادران کی باہمی محبت :

محمد علی کو اپنے بڑے بھائی (شوکت علی) سے غیر معمولی محبت تھی۔ آج کل کے لوگ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ شوکت علی ان سے بہت کام لیا کرتے تھے۔ محمد علی چڑچڑے ہوتے تھے مگر انھیں احساس تھا کہ وہ چھوٹے بھائی ہیں اور اس لئے انھیں بڑے بھائی کا کہنا بلا چون و چرا مان لینا چاہئے۔ ایک مرتبہ انھیں "سگ باش برادر خورد مباش۔ خواہ باش برادر بزرگ مباش" کی مثل سنائی گئی تو اس کے جواب میں انھوں نے کہا "میں سگ بننا پسند کروں گا، لیکن یہ کبھی پسند نہ کروں گا کہ میرے بھائی خفا ہوں۔" علی گڑھ میں دونوں بھائیوں کے برادرانہ تعلقات کے چرچے رہا کرتے تھے۔ شوکت علی انھیں چھیڑنے یا غصہ دلانے کی غرض سے یا کبھی کبھار دوسروں کے سامنے اپنی شان کی دھونس جمانے کے لئے ان سے سب کے روبرو جھڑک جھڑک کر کام لیا کرتے تھے مگر وہ اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبے کے ساتھ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتے تھے۔

۱۹۲۲-۲۳ء میں جب دونوں بھائی بیجاپور جیل میں محبوس تھے، اس زمانہ کا ذکر ہے کہ شوکت علی کی بعض "حرکتوں" کی وجہ سے حکومت نے ان سے یہ رعایت چھین لی تھی کہ وہ بی اماں سے مل سکیں۔ اس وقت محمد علی نے نہایت ایثار سے کام لے کر اپنے ایک خط میں جو جیل سے نکل گیا تھا اور میرے پاس سنسر شپ کے لئے آیا تھا، بی اماں کو یوں لکھا:

> "...... میری جنت یا تلواروں کی چھاؤں میں ہے یا آپ کے قدموں کے نیچے ہے، تاہم مجھے یہ قبول ہے کہ آپ کو دیکھے بغیر آپ سے ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں مگر یہ ہرگز قبول نہیں کر سکتا کہ میں تو آپ کے دیدار سے سعادت اندوز ہوا کروں اور شوکت کی آنکھیں اس نظارہ کو ترسا کریں۔ وہ ہر حالت میں مجھ سے کہیں زیادہ آپ کی محبت اور اس انعام کے مستحق ہیں۔"

مذکورہ بالا عبارت دنیا کے ہر ادب کے لئے باعث فخر ہو سکتی ہے، اس لئے کہ اس میں نہ صرف ماں کے احترام کو نہایت خوبی سے دکھایا گیا ہے بلکہ بڑے بھائی کی عزت کو بھی جس خوبصورتی سے نبھایا گیا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

انگریزوں سے دشمنی :۔ اسے آکسفورڈ کا اثر کہئے یا کسی اور سبب پر محمول کیجئے مگر یہ حقیقت ہے کہ محمد علی شروع شروع میں [illegible]

کی ابتدائی زندگی میں انگریزوں کے بالکل مخالف نہ تھے۔ ان کے بہت سے دوست جو آکسفورڈ میں ان کے ساتھ پڑھتے تھے ہندوستان میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ان سب سے ان کے تعلقات دوستانہ اور بے تکلفانہ رہے مگر نظربندی کے زمانہ میں ان کی طبیعت نے پلٹا کھایا اور انہیں انگریزوں سے ہمیشہ کے لئے نفرت ہو گئی اور انہوں نے طے کر لیا کہ اب انگریزوں کو نکال کر ہی دم لیں گے۔ گول میز کانفرنس کی تقریر میں بھی یہی جذبہ کار فرما تھا۔ میرے خیال میں وہ سب سے پہلے لیڈر ہیں جنہوں نے کانفرنس میں بیٹھ کر انگریزوں سے للکار کر کہا کہ یہ مقدر ہو چکا ہے کہ ہندوستان سے برطانوی تسلط نابود ہو کر رہے۔ ساتھ ہی انہوں نے انگریزوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بھی بڑھایا مگر پیشکش اس سے مختلف تھی جو "کامن ویلتھ" کے اجراء کے وقت کی گئی تھی۔

انگریز اس لئے مخالف ہو گئے تھے کہ انہوں نے علی و ملی جنگیں لڑنا شروع کر دی تھیں۔ سر جیمز میسٹن جو یو۔ پی کے لفٹیننٹ گورنر تھے، محمد علی کے خصوصی دوستوں میں تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے مشورہ کے برخلاف وہ کانپور کی مسجد کے قضیہ میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں تو وہ ان کے خلاف ہو گئے۔ یہ مخالفت اور زیادہ زوروں پر ہو گئی جب محمد علی نے وائسرائے سے یگانگت اور دوسرے انگریز دوستوں کی امداد سے لارڈ ہارڈنگ پر زور ڈال کر کانپور کی مسجد کا فیصلہ بڑی حد تک مسلمانوں کے حق میں کرا لیا۔ محمد علی کی نظربندی (۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک) ایک بڑی حد تک میسٹن کی مخالفت کی رہین منت ہے۔

مقدمہ کراچی میں وہ عدالت میں انگریز جج پی۔ سی۔ کینیڈی کی آمد پر کھڑے تک نہیں ہوتے تھے۔ سرکاری وکیل راس آلسٹن نے جن سے محمد علی کی پرانی شناسائی تھی، آخر ایک دن پوچھ ہی لیا کہ "مسٹر محمد علی! میں دیکھتا ہوں کہ آپ جج کی آمد پر کھڑے بھی نہیں ہوتے، حالانکہ آپ دیکھتے ہیں کہ میں خود بھی کھڑا ہو جاتا ہوں۔" محمد علی نے جواب دیا کہ "آپ کو تو اسی بات کی فیس ملتی ہے۔"

اس معاملہ میں شوکت علی بھی محمد علی کے ہمنوا تھے۔ بمبئی کے مسلمانوں کے مجمع میں ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: "انگلستان والوں کو یورپ سے بوریا بستر سمیت نکال دینے کا ارادہ تھا لیکن ہم انہیں نکلتے وقت بوریا بستر بھی نہیں رکھنے دیں گے۔ یہ مال ہمارا ہے۔" ایک اور موقع پر انہوں نے انگریزوں کے خلاف تشدد برتنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "میں جب بھی انہیں قتل کرنے کا خیال کرتا ہوں تو یکایک ان کے ننھے معصوموں کی نیلی آنکھیں راہ میں حائل ہو جاتی ہیں اور میری تلوار کند ہو جاتی ہے۔" (یہ صرف مفہوم ہے، اصل الفاظ اس وقت میرے سامنے نہیں ہیں)

گول میز کانفرنس:

انگریز دشمنی کے باوجود محمد علی گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ان کی شرکت ان کی حب الوطنی کا سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔ وہ اس وقت سخت بیمار تھے اور جہاز میں اسٹریچر پر ڈال کر لیجائے گئے تھے۔ روانگی سے پیشتر جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ لندن کیوں جا رہے ہیں تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا "مرنے کے لئے جا رہا ہوں۔" لیکن ایک پیام میں انہوں نے فرمایا تھا کہ حکومت نے صلح و آشتی کا جو دروازہ کھولا ہے میں اسے بند کرنا نہیں چاہتا۔ اس موقع پر کئی ایک اخبارات نے لکھا تھا کہ جب اس کانفرنس میں کانگرس شرکت نہیں کر رہی ہے تو محمد علی کو بھی شریک نہیں ہونا چاہئے۔ اردو اخبارات میں مخالفت میں نظمیں بھی لکھی گئی تھیں، سنجیدہ اور غیر سنجیدہ دونوں۔ غلام احمد خاں آرزو (مدیر ہندوستان امرتسر) نے بھی ایک سنجیدہ نظم لکھی تھی جس کے چند اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں:

اللہ کا سپاہی اور گول میز پنچایت

تیرا تھا قول فیصل "آزادئ مکمل" ہندوستاں بھر میں جس سے مچی تھی ہلچل
گمراہ ہو گیا خود ہم کو دکھا کے مشعل وہ ولولہ وہ جذبہ سب ہو گیا معطل

اب دستِ ستم اس کی جانب بڑھا ہوا ہے — جو ماتھا سجدوں کے نور میں رنگا ہوا ہے
اغیار کو وہ در پہ کیسا تنا ہوا ہے — لیکن نہ جانے تیری غیرت کو کیا ہوا ہے

آزادیٔ وطن کیا یوں بے خطر ملے گی؟ — قربانیاں دئے بن فتح و ظفر ملے گی؟
لندن کے ہوٹلوں میں کھا کر نہ ملے گی — جیلوں ہی میں ملے گی وہ چیز اگر ملے گی

مسلم ہندو گھروں پر اور تقریباً سارے راستہ کی جھنڈیوں پر یہ اشعار لکھے ہوئے تھے۔ محمد علی اس چیز سے بے تاثر رہے، بے حس اور گول میز والی تقریر میں انہوں نے اس واقعہ کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

مگر محمد علی ان چیزوں سے مطلق متأثر نہیں ہوئے۔ وہ جس چیز کا ارادہ کر چکے تھے وہ اٹل تھی

جب محمد علی کانگریس سے علیحدہ ہوئے اس وقت وہ سارے ہندو پریس کے غصہ کا نشانہ بن گئے تھے۔ لیکن مرنے سے چند ہفتے قبل سینٹ جیمز پیلس میں جب انہوں نے معرکۃ الآرا تقریر کی تو اس مخالفت کے سارے تار و پود بکھر گئے۔ بمبئی کے سب سے ممتاز قوم پرست اخبار "بمبئی کرانیکل" نے ان کی وفات پر جو خراجِ تحسین پیش کیا اس کا آخری حصہ ملاحظہ کیجئے:

> "مولانا محمد علی کی آخری تقریر سے اس آزادیٔ عشق و حریت کی اسپرٹ کا اظہار ہوتا ہے جو زندگی بھر ان کا نمایاں جوہر رہا ...... اگرچہ وہ کانگریس سے الگ ہو گئے تھے لیکن انہوں نے گول میز کانفرنس میں اپنی گرجدار آواز میں کہا: "ہندوستان اب برطانوی تسلط کو برداشت نہیں کرے گا" .... اس جملے سے کسی ایماندار کانگریسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ان کی وفات سے دنیا ایک دلچسپ اور ہنگامہ پرور شخصیت سے محروم ہو گئی ہے۔"

محمد علی کی بے باکی:۔

محمد علی ہمیشہ سے بے باک تھے۔ انہوں نے کبھی نتائج و عواقب کی پروا نہیں کی۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے برملا کہتے تھے۔ گول میز کانفرنس میں انہوں نے جو کھری کھری باتیں کہیں وہ ہندوستان کے کسی اور لیڈر نے نہیں کہیں۔ اسی طرح پہلی اسلامی موتمر میں جو مکہ میں منعقد ہوئی تھی انہوں نے اپنی گرجدار آواز میں سلطان ابن سعود مرحوم کو مخاطب کر کے صاف صاف کہہ دیا تھا:

> "آپ اپنے آپ کو اس مقدس سرزمین کا بادشاہ اور ملک الحجاز کہتے ہیں اور کہلاتے ہیں جہاں رسول مقبول ﷺ نے اپنی زندگی بسر کی تھی حالانکہ آپ کے پیشرو ترکوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو خادم الحرمین کہا اور کہلوایا۔ آپ بھی ان کی تقلید میں اپنے آپ کو خادم الحرمین کہو اور ملوکیت پر جو حضرت معاویہؓ کی سنت ہے ہرگز ہرگز نہ چلو۔"

یہ باتیں ایک مردِ حر ہی کہہ سکتا ہے اور محمد علی اپنے زمانے کا سب سے بڑا مردِ حر تھا۔ اعلائے کلمۃ الحق کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو گی؟

شانِ مذہبیت:۔

محمد علی کی مذہبیت جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ بالفاظِ دیگر ان کا ہر کام دشمنی و دوستی اللہ کے لئے تھا۔ نظر بندی کے زمانہ میں جب سپرنٹنڈنٹ پولیس عبدالمجید سی۔ آئی۔ ڈی کے افسر مسٹر چارلس کلیولینڈ کے ایما پر چھندواڑہ پہنچے تاکہ رہا کرنے سے پیشتر علی برادران سے ایک عہد نامہ پر دستخط کرائیں جس کا یہ مضمون تھا کہ وہ غیر آئینی طریقوں اور تشدد سے ہمیشہ محترز رہیں گے تو محمد علی نے اس عبارت میں یہ اضافہ کیا کہ سب سے پہلے مجھ پر اللہ کی اطاعت فرض ہے اور بادشاہِ وقت سے میری وفاداری اس شرط سے مشروط ہے کہ اگر دنیاوی قوانین خدائی احکام سے ٹکرائیں گے تو اس صورت میں میں صرف اللہ کے احکام کی اطاعت کروں گا۔ حکومتِ وقت نے اسے قبول نہیں کیا اور اس سے دونوں بھائیوں کو مزید دو سال تک قید و بند میں رہنا پڑا۔

مقدمۂ کراچی میں بھی جو طویل بیان انھوں نے دیا تھا اس کے دوران میں راڈویل کا ترجمۂ قرآن ہاتھ میں لے کر فرمایا تھا:

> "قرآن مجید کے اس ترجمہ کی طرف دیکھیے اس میں بہت سی باتوں کی بار بار تکرار موجود ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے ...... ہمارے مذہب کے تمام احکام اور جملہ قوانین کا واحد، اہم اور جامع ترین منبع یہی کتاب ہے ..... آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے مذہب کا حقیقی سرچشمہ کہاں واقع ہے۔ ہمارے مذہب کا ایک اور منبع بھی ہے جسے احادیث کہتے ہیں لیکن حقیقی اور اصل سرچشمہ یہی کتاب ہے اور کوئی مسلمان ایسا نہیں جسے کسی آیت کے بارے میں کوئی اختلاف ہو۔ میرے مذہب کی یہی سب سے یقینی اور سب سے محفوظ بنیاد ہے اور اس کے بارے میں دو رایوں کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ جہاں کہیں اور جب کبھی دنیوی اور مذہبی احکام کا ٹکراؤ ہوگا میں ہمیشہ مذہبی احکام کو مانوں گا اور دنیوی احکام کو مذہبی احکام کے تابع سمجھوں گا۔

محمد علی کے لطیفے:-

ان باتوں کے باوجود ان میں خشکی نام کو نہ تھی۔ ان کی بے شمار خوش گپیاں اور بذلہ سنجیاں ثبوت ہیں اس بات کا کہ وہ قدرت کی طرف سے کیسا دل لائے تھے۔ وہ درحقیقت اپنے دور کے دوسرے غالب تھے۔ چند لطیفے ملاحظہ ہوں:

ایک مرتبہ حکیم محمد اجمل خاں کے مکان پر محمد علی کسی مشاورتی جلسہ میں شریک تھے۔ حکیم صاحب کسی ضرورت سے زنان خانہ میں گئے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص کمرے کی کنجی لایا جس میں ایک خط بھی رکھا ہوا تھا۔ بعض لوگوں نے رائے دی کہ خط کو پڑھ دیا جائے۔ محمد علی نے کہا کہ پڑھنے کی ضرورت نہیں یہ پرچۂ ترکیب استعمال ہے۔ حکیم صاحب کا مکان اور پرچۂ ترکیب استعمال کس قدر برمحل ہے۔

ظفر الملک ایڈیٹر "الناظر" مرحوم ایک مرتبہ دھانی کا سبز لبادہ پہنے ہوئے مسلم لیگ کے جلسہ میں شریک ہوئے۔ ان کا کنٹوپ بھی اسی رنگ کا تھا۔ محمد علی نے دیکھتے ہی پھبتی کسی: "یہ ہرا ٹڈا کہاں سے آ گیا؟" اس پر زور کا قہقہہ پڑا۔

حکومتِ ہند میں ایک زمانہ میں سر کریڈک ہوم ممبر تھے۔ اپنے اخبار "کامریڈ" میں محمد علی نے لکھا:

"کون کہتا ہے کہ کونسلوں میں گدھے نہیں ہوتے۔ وہاں بھی ایک گدھا ہے۔ کیا تم نے اسے (Crawling) یعنی رینگتے ہوئے نہیں دیکھا؟" یہ مذاق "لندن ٹائمز" میں بھی نقل ہوا تھا۔

جن دنوں اینگلو انڈین اخبارات و دربار دہلی میں مہاراجہ بڑودہ کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی کر رہے تھے اس زمانہ میں بڑودہ کا ریذیڈنٹ ایک گوری ایسا تھا جس کا نام کاب تھا۔ اس نے مہاراجہ کے خلاف زہر چکانی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مہاراجہ کو بادشاہ کی شان میں بے ادبی کرنے کی حرکت سے سخت سزا ملے۔ اینگلو انڈین اخبارات اور ریذیڈنٹ کی مہم کے جواب میں محمد علی نے اپنے سابق آقا کی حمایت میں "کامریڈ" میں COB AND HIS COBWEBS کے عنوان سے کئی ایک مضامین لکھے جن میں کاب کی سازشوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ COBWEB مکڑی کے جالے کو کہتے ہیں۔ اس میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ کاب کے دلائل تارِ عنکبوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ محمد علی کبھی مہاراجہ کے ملازم بھی رہ چکے تھے لیکن سلسلۂ مضامین شروع کرنے سے پیشتر انھوں نے استعفیٰ دے دیا تھا تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ وہ مہاراجہ کے ملازم ہیں۔

محمد علی سیاسیات میں "ترکِ تعاون" کے حامی تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانی نمائندے اسمبلیوں میں جائیں اور تضییعِ اوقات کریں۔ برخلاف اس کے ایک طبقہ ایسا تھا جو اسمبلیوں میں رہ کر تحریک کی مہم جاری رکھنا چاہتا تھا۔ انہی دنوں کا قصہ ہے کہ محمد علی اسمبلی کا تماشا دیکھنے کے لیے پریس گیلری میں جا کر بیٹھ گئے۔ پنڈت شام لال نہرو نے انھیں دیکھتے ہی کہا: "مسٹر محمد علی! جب آپ یہاں تک تشریف لے آئے ہیں تو پھر نیچے آ جائیے۔" محمد علی نے

برجستہ جواب دیا: "میں اپنی اس بلندی سے آپ کی پستی دیکھنے کے لئے آیا ہوں" ۔۔۔ ممبران اسمبلی کھسیانے ہو کر رہ گئے۔ محمد علی کے اصل الفاظ یہ تھے:۔

I HAVE CAME HERE TO LOOK DOWN.

کامریڈ کے آخری دور میں محمد علی کو ایک آرٹسٹ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ عبدالسمیع خاں جو ہوشنگ آباد کے رہنے والے ہیں اور آج کل کراچی میں قیام پذیر ہیں، اس سلسلے میں ان سے ملنے کے لئے گئے۔ محمد علی نے پوچھا کہ کہاں کے رہنے والے ہو؟ سمیع صاحب نے کہا کہ سی پی (صوبجات متوسط) کا رہنے والا ہوں۔ محمد علی نے حیرت سے پوچھا کہ کیا سی پی میں بھی آرٹسٹ ہوتے ہیں؟ سمیع صاحب نے برجستہ کہا: "آرٹسٹوں کو چھوڑیئے سیپی میں تو موتی پیدا ہوتے ہیں۔" محمد علی پھڑک گئے اور اس قدر خوش ہوئے کہ انہیں فوراً رکھ لیا۔ محمد علی عمر بھر اس لطیفہ کو نہیں بھولے۔ جب کبھی کسی سے ان کا تعارف کراتے تو کہتے کہ یہ سی پی کے موتی ہیں۔

محمد علی اسمبلی جاتے وقت کبھی کبھی سمیع صاحب کو بھی ساتھ لے جاتے تھے تاکہ وہ مختلف ممبروں کی نشست و برخاست کے انداز کو دیکھ کر اسکیچ بنائیں۔ یہ اسکیچ اخبار میں چھپتے تھے۔ ان اسکیچوں کی سرخیاں محمد علی اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے جو بہت برمحل اور معنی خیز ہوا کرتی تھیں۔ کبیر الدین احمد ان دنوں بنگالی مسلمانوں کے نمائندہ تھے۔ ان کے اسکیچ کے نیچے محمد علی نے لکھا "THE WIT AND WISDOM OF BENGAL" یعنی بنگال کی نکتہ سنجی اور دانشمندی۔ ان صاحب کی تقریریں بہت دلچسپ ہوتی تھیں اور دوران تقریر میں وہ اپنے مزاح سے ممبروں کو ہنساتے رہتے تھے ۔۔۔۔ سر ٹریک وائٹ کے اسکیچ کے نیچے انہوں نے نام کی رعایت سے لکھا "WHITE MEN'S BURDEN." اس لئے کہ انگریز جیسے سابق حکمران کہا کرتے تھے کہ خدائے برتر نے ہندوستان کی حکومت کا بار ہمارے کندھوں پر رکھا ہے اور وہ مرتے دم تک اس دلیل کو اپنی حکومت کے قیام کے جواز میں پیش کرتے تھے۔ انگریز (WHITEMEN) اس حکومت کو خدائی امانت سے بھی تعبیر کرنے کے عادی تھے۔ محمد علی جناح کے اسکیچ کے نیچے انہوں نے لکھا "THE BOMBAY DUCK RESTING." اس میں جناح کے لباس کی طرف اشارہ ہے جو ہمیشہ اس بارے میں غیر معمولی طور پر محتاط رہا کرتے تھے۔ ڈک بطخ کو کہتے ہیں جو سفید براق پروں کا پرندہ ہے۔ جناح کے صاف ستھرے لباس پر شکن تک نہ ہوتی تھی۔ اس ریمارک کی برجستگی کس قدر برمحل ہے۔

محمد علی کی مخالفتیں:۔

دارالسلطنت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ محمد علی بھی کلکتے سے دہلی آ گئے۔ کلکتے سے کامریڈ کا آخری پرچہ ۱۴ ستمبر ۱۹۱۲ء کو نکلا تھا اور دہلی سے اس اخبار کا پہلا پرچہ تقریباً ایک مہینے کے بعد ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا۔ محمد علی کے آتے ہی دہلی کے کرسی نشین لیڈروں نے محسوس کر لیا کہ ایک بڑے نجم والا ستارہ افق دہلی پر طلوع ہوا ہے اور یہ کہ اب ان سب کی لیڈری ماند پڑ جائے گی۔ ان کی آمد سے پہلے خان بہادروں اور راجے بہادروں نے لیڈری پر قبضہ کر رکھا تھا مگر ان کے آتے ہی یہ بت گر کر پاش پاش ہو گئے۔ انہوں نے چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے خوب ہی کان بھرے کہ اس دام بیرنگ کو یہاں سے خارج البلد کر دیا جائے مگر ان کی کوششیں ناکام رہیں۔ محمد علی نے آتے ہی دو معرکے سر کئے۔ ایک تو انہوں نے قصابوں کی زبردست ہڑتال کو خوش اسلوبی سے نمٹایا، دوسرے انہوں نے جامع مسجد والوں سے جھگڑا اور زبردست اور مسلسل جہاد کر کے انہیں مجبور کر دیا کہ نمازیوں کی آسائش کی خاطر مسجد میں دریاں بچھائیں اور شامیانے لگائیں۔ محمد علی کا یہ مطالبہ عوام کا مطالبہ تھا اور اس لئے جامع مسجد کمیٹی کے ممبروں کا دل پسیجا اور انہوں نے مطالبے کے سامنے بڑی حد تک خوشدلی کے جذبے کے ساتھ سر تسلیم خم کر دیا۔ محمد علی نے ایک جدت یہ کی کہ آتے ہی جامع مسجد کو اپنی تقریروں کا پلیٹ فارم بنا لیا۔ ان کی آمد سے پہلے یہاں صرف مذہبی تقریریں کی جاتی تھیں۔ خود مسجد کی واگذاری کے وقت منجملہ دیگر شرائط کے یہ شرط عائد کر دی گئی تھی کہ اس میں سیاسی تقریریں ہرگز نہ کی جائیں گی مگر محمد علی نے اس شرط کی مطلق پروا نہ کی اور برابر تقریریں کرتے رہے۔ اس کی وجہ سے ان کے مخالفین کو ایک اور موقع مل گیا کہ وہ حکام کو آمادہ کریں کہ وہ محمد علی کو جامع مسجد میں سیاسی تبلیغ کرنے سے روکیں۔ مگر اس دفعہ بھی حکام کچھ نہ کر سکے۔ محمد علی کی دہلی میں

مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جس دن وہ جمعہ کی نماز کے بعد نظر بندی کے حکم کے ماتحت دہلی سے مہرولی چلے ہیں، لاکھوں آدمیوں کا جم غفیر جامع مسجد اور اس کے باہر انہیں الوداع کہنے کے لئے جمع ہو گیا تھا اور دونوں بھائی لوگوں سے مصافحہ کرتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ سب کی آنکھیں اشکبار اور دل ان کی رہائی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ یہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

بعد کو بہت سے ایسے مسائل آ گئے جن کی وجہ سے ہندوستان کے لیڈر گروہوں میں بٹ گئے، مثلاً جنگ طرابلس، جنگ بلقان، ہندو مسلم اتحاد، مسئلہ خلافت، نہرو رپورٹ، مسئلہ قتل مرتد، سائمن کمیشن، شدھی، گول میز کانفرنس وغیرہ۔ نہرو رپورٹ کے معاملہ میں پنجاب کے لیڈروں نے محمد علی کا ساتھ نہیں دیا اور اپنی لیگ علیحدہ بنائی۔ اسی سلسلہ میں محمد علی پر نثر و نظم میں سب و شتم کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ تقریباً ان کی وفات تک برابر جاری رہا مگر ان کی آخری تقریر پڑھنے کے بعد ان کے بہت سے مخالف ان کے گرویدہ ہو گئے اور کانگریسی اخبارات کی مخالفت بھی ایک گونہ جاتی رہی۔ مرنے کے بعد تو وہ تقریباً سب فرقوں کے ہیرو بن گئے تھے۔

محمد علی کا ایک معرکہ خواجہ حسن نظامی سے ہوا۔ چونکہ اس بحث پر علیحدہ مضمون میں تفصیلی بحث کی جا رہی ہے اس لئے یہاں میں صرف اشارۃً اس کا ذکر کروں گا۔ اس جنگ میں مختلف اخبارات میں محمد علی پر اس قدر گندگی اچھالی گئی کہ پناہ بخدا مگر محمد علی نے مقابلۃً اپنے مضامین میں متانت اور سنجیدگی کو ملحوظ رکھا اور یہ اردو صحافت کا درخشاں پہلو ہے۔ دوسرا معرکہ ظفر علی خاں سے ہوا جو محمد علی کے خلاف نظم و نثر دونوں میں اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھایا کرتے تھے۔ مخالفت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اگر محمد علی "ہمدرد" میں قتل مرتد کے خلاف مضامین لکھتے تھے تو "زمیندار" میں قتل مرتد کی تائید میں مضامین نکلنے شروع ہو جاتے تھے وقس علیٰ ہذا۔ محمد علی کی انصاف پسندی دیکھئے کہ وہ اس مخالفت میں بھی انھوں نے کھلے دل سے دو ٹوک کہا کہ ظفر علی نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ بمبئی میں حافظ علی بہادر خاں ایڈیٹر "اقبال" نے بھی کچھ عرصہ تک علی برادران کے خلاف محاذ قائم کیا تھا۔

مضامین محمد علی میں ڈاکٹر اقبال کے خلاف چند مضامین ملتے ہیں۔ یہ اس لئے لکھے گئے تھے کہ ڈاکٹر اقبال نے اپنے صوبہ کی کونسل میں وہاں اپنی تقریروں میں کہیں یہ کہہ دیا تھا کہ انہیں ہندوستانیوں پر اعتماد نہیں ہے اور اس لئے پنجاب میں انگریز افسروں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں مقرر کیا جائے۔ محمد علی بگڑ گئے اور انہوں نے ان کی نظموں کے طویل اقتباسات پیش کر کے پوچھا کہ اقبال! تمہارے علم و عمل میں یہ تفاوت کیوں ہے؟ محمد علی کا انداز تحریر نہایت شستہ ہے اور پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفت کے باوجود وہ ڈاکٹر اقبال کے احترام کو بھی ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے۔ اقبال بھی محمد علی کا غیر معمولی احترام کرتے تھے۔ "اسیری" اور "وفات" پر اقبال نے جو لافانی نظمیں لکھی ہیں وہ بھی بتاتی ہیں کہ اقبال کو محمد علی کا کس قدر احترام منظور تھا۔

سرسید کے بعد غالباً محمد علی ایسے لیڈر تھے جنہیں سب سے زیادہ گالیاں دی گئیں مگر وہ ؎
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوئے

پُر آشوب دور:۔

یہ حقیقت ہے کہ محمد علی نے بڑا پُر آشوب دور پایا تھا۔ جنگ طرابلس، جنگ بلقان اور پہلی جنگ عظیم ان کے زمانہ میں ہوئیں۔ ساتھ ہی روسیوں اور انگریزوں کے ہاتھوں ایران کا گلا گھونٹنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ مصر انگریزوں کی غلامی میں تھا۔ طرابلس پر اطالیہ کا غاصبانہ قبضہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ افریقہ کی دیگر شمالی ریاستیں فرانس کے پنجۂ استبداد میں تھیں۔ الغرض ساری دنیائے اسلام ایسی ہیجانی کیفیت میں تھی کہ اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ مقدونیہ میں بلقانی ریاستیں ترکوں پر بے پناہ مظالم ڈھا رہی تھیں۔ محمد علی کو ایک ایک کا فکر تھا اور انہوں نے چندہ کر کے طبی مشن روانہ کر کے ترکوں کی حمایت میں وفد خلافت بھیج کر عالم اسلام کے مصائب کو ہلکا کرنے کی امکانی کوشش کی۔ ہندوستان کی

آزادی کی جدوجہد اس پر مستزاد تھی۔ ایک جان تھی جو دنیائے اسلام کے غم میں اپنے آپ کو ہلکان کئے ہوئے تھی۔ اگر یہ ساری چیزیں نہ ہوتیں تو قدرت نہ جانے محمد علی سے کیا کیا کام لیتی۔

ذاتی خصوصیات:۔

پہلی جنگ بلقان میں جو دول عظمیٰ کی سازش کا نتیجہ تھی، ترکوں کی پے در پے ہزیمتوں نے محمد علی کے دل پر بہت چرکے لگائے تھے۔۔۔ دوسری جنگ بلقان میں جو لوٹ مار کی تقسیم پر بلقانی اتحادیوں میں برپا ہوئی تھی جب غازی انور پاشا نے دول عظمیٰ کے احتجاج کے باوجود ایڈریانوپل پر بے مثال یلغار کر کے قبضہ کر لیا تو جتنی خوشی محمد علی کو ہوئی اتنی کسی اور کو نہ ہوئی ہوگی۔ ایڈریانوپل کے قبضہ کا تار رات کو آیا تھا اور وہ سارے مسلمانوں کو اس مسرت میں شریک کرنے کے لئے سیدھے جامع مسجد پہنچے اور دھواں دھار تقریر کی جس میں ترکوں کو اس کامیابی پر مبارکباد دی گئی تھی اور دول عظمیٰ کی سازشوں کو بے نقاب کیا گیا تھا۔ یہ خبر دوسرے دن اخبارات میں نکلنی تھی لیکن محمد علی نے انتظار نہیں کیا اور راتوں رات سارے شہر دہلی میں یہ دل خوش کن خبر پہنچا دی۔ وہ رات بھی کیا ہیجانی رات تھی۔

جب [illegible] بے چارہ افغان [illegible] پولیس نے تحقیقات میں بہت کچھ لیت و لعل سے کام لیا۔ بھیا احسان الحق جو محمد علی اور خواجہ حسن نظامی دونوں کے دوست ہیں، سیدھے محمد علی کے پاس پہنچے اور انہیں صورت حالات سے واقف کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ خواجہ صاحب اور محمد علی میں قلمی جنگ ہو رہی تھی لیکن ذاتی تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے دہلی کے ڈپٹی کمشنر بیڈن سے ٹیلیفون پر ایک گھنٹہ تک گفتگو کی اور انہیں معاملہ کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا اور زور دیا کہ اس قتل کی پولیس پوری تحقیقات کی جائے اور مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ محمد علی کے کیریکٹر کی اس بلندی کا ذکر آج بھی بھیا احسان بڑے فخر سے کیا کرتے ہیں۔

محمد علی ذیابیطس کے مرض میں مبتلا رہتے تھے۔ مرض کا صحیح علاج اس لئے نہیں ہو سکا کہ وہ پرلے درجے کے بد پرہیز واقع ہوئے تھے۔ وہ آموں کے عاشق تھے لیکن کسی طرح آموں کو چھوڑنے پر رضامند نہ تھے۔ ایک دن خود بھی آم کھا رہے تھے اور دوسروں کو بھی کھلا رہے تھے کہ دوران گفتگو میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا: "خواہ جان چلی جائے مگر میں آم کسی حالت میں نہیں چھوڑوں گا۔" بعد کو ڈاکٹروں کے زور دینے سے انہوں نے ایک آم روز پر قناعت کر لی تھی لیکن وہ ایک آم سائز میں کئی آموں کے برابر ہوا کرتا تھا۔

لباس کے معاملہ میں کم سے کم ابتدائی دور میں وہ دوسرے محمد علی جناح تھے۔ آخر میں جب انہوں نے اپنی وضع قطع بدل لی اور ڈھیلا ڈھالا جبہ پہننا شروع کر دیا اس وقت بھی وہ اعلیٰ قسم کا کھدر استعمال کرتے تھے۔ مدت تک محمد علی کوٹ پتلون میں ملبوس رہے۔ اس کے ابتدائی دور میں وہ اسی سوٹ بوٹ میں رہے۔ وہ انگرکھا اور چوڑی دار پاجامہ بھی زیب تن کرتے تھے۔ ٹوپی سفید رنگ کی بالوں والی استعمال کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کی ٹوپی میلی ہو گئی۔ جبل پور کے ایک خلافتی کارکن تھے جن کا نام اس وقت میرے ذہن سے اتر گیا ہے۔ وہ اس وقت بے بالوں کی نئی ٹوپی پہنے پاس ہی بیٹھے تھے۔ محمد علی نے اپنی ٹوپی اتار کر ان کے سر پر رکھ دی اور ان کی ٹوپی خود پہن لی۔ خلافتی کارکن اس عزت افزائی پر بے حد خوش تھے مگر اور گروہ کے لوگ جس مقصد سے بات آئی گئی ہو گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ جو لباس بھی وہ زیب تن کرتے تھے وہ ان پر خوب سجتا تھا۔ ترکی مشن میں وہ فوجی لباس میں نظر آتے ہیں۔ اپنے ڈیل ڈول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں کے کمانڈر انچیف ہیں۔ یہ فوجی لباس بھی انہیں خوب زیب دیتا تھا۔

غالباً ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے کہ تار کا ہرکارہ ایک ضروری تار بہت تاخیر سے لایا اور جب اس سے پوچھا گیا تو خاطر خواہ جواب دینے کی بجائے اس نے غرانا شروع کر دیا۔ اس پر محمد علی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسے خوب پیٹا اور پھر خود ہی تار گھر والوں کو ٹیلیفون پر اطلاع دی۔ پوسٹ ماسٹر نے کہا کہ تار بہت دیر پہلے بھیجا گیا تھا۔ اس نے یا تو راستہ میں وقت ضائع کیا ہوگا۔ پھر اس نے تار کے دیر سے پہنچنے کی معذرت چاہی اور کہا کہ آپ نے اچھا کیا کہ اسے سزا دے دی۔

ایک دن محمد علی میرے سامنے "روزنامہ خلافت" کے ایڈیٹر حافظ علی بہادر کو ڈانٹ رہے تھے کہ انہوں نے سوقیانہ اشتہار اپنے یہاں کیوں چھاپا۔ وہ آمدنی کی کمی کا عذر کرنے لگے اس وقت انہوں نے فرمایا "میں فاقے کرنا بہتر سمجھتا ہوں لیکن سوقیانہ اشتہاروں کو کبھی قبول نہ کروں گا۔" اس دن کے بعد سے کبھی کوئی مخرب اخلاق اشتہار روزنامہ "خلافت" کی زینت نہ بن سکا۔ "مراد آباد میں مردہ زندہ ہو گیا" یا "اس کے پڑھنے سے بیٹوں کا بھلا ہو گا" جیسے اشتہارات بھی محمد علی کی نظروں میں شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

اپنی زندگی میں انہوں نے بہت سوں کو مختلف ریاستوں میں اچھے اچھے عہدوں پر ملازم کروا دیا۔ وہ بہت دوست نواز تھے۔ کئی رئیسوں سے ان کے تعلقات گہرے اور دوستانہ تھے۔

جب کبھی انہیں روپے کی ضرورت پیش آتی تو وہ اپنے دوستوں ہی کو تکلیف دیتے۔ اس سلسلہ میں مہاراجہ محمود آباد سے بھی انہوں نے بہت سی رقمیں لیں۔ نواب حمید اللہ خان بھی ان کی مدد کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ریاست بھوپال نے شبلی کی سیرۃ نبوی کے ترجمے کے سلسلہ میں انہیں پانچ ہزار روپے دیے۔ ترجمہ کا کام ابتدائی منزل سے کبھی آگے نہیں بڑھا۔ اگر وہ مکمل ہو جاتا تو ایک اور عظیم الشان خدمت ان سے بن پڑ جاتی۔

محمد علی ہر اعتبار سے بڑے آدمی تھے۔ ان کے رفقاء اور ان کے معاصر ان کے سامنے بونے تھے۔ سچ یہ ہے کہ وہ بے حد جذباتی آدمی تھے اور بعض اوقات انہیں اپنے اوپر قابو نہ رہتا تھا۔ جب وہ دہلی سے [illegible] جا رہے تھے تو شاید الہ آباد کے اسٹیشن پر انہیں چند انگریز نظر آگئے انہوں نے چلا کر کہا "نکال دو ان حرامزادوں کو۔"

وہ دوستوں کے جاں نثار دوست تھے اور یہ حقیقت ہے کہ انہیں جتنے مخلص دوست اور کارکن ملے وہ مشکل سے کسی اور کو ملے ہوں گے۔ میر محمود علی، حکیم اجمل خاں، عبدالماجد دریابادی، چودھری خلیق الزمان، پروفیسر نواب علی، ڈاکٹر انصاری، مولانا سلیمان ندوی، سید حسین، راجہ غلام حسین، ولایت علی بمبوق، عبدالرحمن صدیقی، شعیب قریشی وغیرہ ان میں سے ہیں جو محمد علی کے ہمیشہ رفیق رہے۔ چند [illegible] میں مسز نائیڈو ان کی عاشق زار تھیں، ہاں انہیں اور [illegible] ان کی قابلیت نے جو سکہ جمایا تھا وہ آخر وقت تک قائم رہا۔ جو دوست ان سے الگ ہوئے وہ سیاسیات کی بنا پر علیحدہ ہوئے نہ کسی اور بنا پر۔ سید عبداللہ بریلوی ایڈیٹر "بمبئی کرانیکل" بھی اختلافات کے باوجود ان کے زبردست دوست اور مداح رہے۔

محمد علی کے ایک دوست نے جب ان سے غداری کی اور گول میز کانفرنس میں انہوں نے جس بڑی جاسوسی کی طرف اشارہ بھی کیا ہے، تو دوستوں کے بیچ میں پڑ جانے سے محمد علی نے ان کا قصور دل سے معاف کر دیا مگر وہ اسے کبھی بھولے نہیں۔ کہا کرتے تھے کہ میں معاف کر سکتا ہوں مگر بھول نہیں سکتا۔ یہ بھی بشریت ہے۔

ایک دفعہ محمد علی نے مولانا شبلی کی دعوت کی۔ تنسیخ کا ذکر ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔ اس دعوت میں راقم الحروف کے علاوہ اور بہت سے دوست شریک تھے جن میں پشاور کالج کے پروفیسر محمد شفیع بھی تھے۔ دعوت کے اختتام پر مولانا شبلی نے واقعہ کانپور پر اپنی رباعیات اور نظمیں سنائیں اور پھر ایک تقریر میں محمد علی کی خدمات کو سراہا اور انہیں خراج تحسین ادا کیا۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ آپ جس کسی شخص کے نام میں محمد اور علی کا اجتماع دیکھیں تو سمجھ جائیے کہ وہ لازمی طور پر زمانہ کا بہت بڑا آدمی ہے اور اس سلسلہ میں تاریخ اسلام سے اپنے دعوے کے ثبوت میں بہت سے نام پیش کیے۔ محمد علی سر جھکائے اپنی تعریف سنا کیے اور پھر یکایک بول اٹھے "رسوائے عالم محمد علی والی ایران کا بھی تو ذکر کیجیے۔" مولانا شبلی نے فرمایا کہ "یہ کلیہ کی استثنا ہے۔" اس پر زور کا قہقہہ پڑا۔

بہرحال محمد علی کی شخصیت عجیب و غریب تھی۔ وہ بیک وقت لیڈر، افسانہ نگار، شاعر، صحافی، مقرر، مؤرخ اور زبردست انشاء پرداز تھے

۱؎ چند ہم عصر از مولوی عبدالحق (بہ تغیر الفاظ)

"کامریڈ" کے فائل موجود ہیں۔ انہیں پڑھتے اور ان کی تحریرات پر سر دھنتے۔ انگریزی انشاپردازی کے میدان میں انہوں نے انگریزوں تک کو شکست دے دی ہے۔ ان کے اردو کے مضامین بھی جوش سے لبریز ہوتے تھے۔

بیجاپور سے رہائی کے بعد محمد علی کی جو کتابیں میرے پاس آخری بار سفر یورپ کے لئے آئیں ان میں دیوان غالب کا ایک نسخہ بھی تھا۔ محمد علی کی عادت تھی کہ وہ پڑھتے وقت اچھے اچھے شعروں پر ایک، دو یا تین نشانات (ص) لگا دیا کرتے تھے۔ جو نسخہ جیل میں ان کے زیر مطالعہ رہا وہ نظامی پریس کا مطبوعہ تھا۔ بعض بعض جگہ وہ حاشیہ پر کچھ بھی لکھ دیتے تھے جو بہت پر لطف اور اچھوتی ہوا کرتے تھے۔ ایک دو مثالیں درج ذیل کی جاتی ہیں۔

غالب کا ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو:

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے — مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر — جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

نظامی پریس والے ایڈیشن میں اس قطعہ پر جو شرح درج ہے اس پر محمد علی نے ذیل کے دلچسپ انداز میں نکتہ چینی کی تھی۔ فرماتے ہیں:۔

"اس لطیفہ کے آخری حصہ کا ستیاناس کر دیا۔ غضب ہوا کہ اسے چھپنا تیری خیر
اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے دور ہو جا ورنہ کچا چبا جائیں گے۔ سب سے زیادہ
پر لطف نرالا ہوا ہوتا ہے۔ نرم سا ہوا، ٹھنڈا ہوا، ریکا ہوا بلکہ کچا پورٹ۔"

اسی طرح غالب کے اس غیر مطبوعہ شعر پر جو نظامی والے ایڈیشن میں درج ہے:

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

محمد علی نے ذیل کی عبارت تحریر فرمائی تھی:

"تیور تو کچھ اور ہی کہہ رہے ہیں۔ مرزا ایسے رہبانی نہ تھے کہ چند تصاویر اور حسینوں
کی یادگاریں ان کا ترکہ ہوتیں۔ مگر ممکن ہے کہ شعر مرزا ہی کا ہے۔ بہرحال کچھ اچھا شعر
نہیں ہے۔"

افسوس ہے کہ غالب کا یہ ایڈیشن جامعہ ملیہ لائبریری میں محفوظ نہیں رہا۔

بہرحال امید نہیں کہ آئندہ محمد علی جیسا کوئی اور سرپھرا لیڈر ہندوپاکستان کی سرزمین سے اٹھے۔ خدا ان کی تربت پر اپنے انوار کی بارش نازل کرے۔

مولانا حسین احمد مدنی

رشید الوحیدی

مولانا حسین احمد مدنی سنہ ۱۲۹۶ھ ہجری میں یوپی کے ایک چھوٹے سے قصبے بانگرمئو ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد مرحوم مولانا حبیب اللہ صاحب ایک اسکول میں مدرس تھے ابھی مولانا کی عمر بہت کم تھی کہ ان کے والد بزرگوار اپنے آبائی وطن ٹانڈہ ضلع فیض آباد واپس آگئے مولانا مدنی نے چشم بخشش اسی قصبے میں کھولی یہاں ان کے والد بزرگوار مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اس طرح آپ کی تعلیم کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم حسب دستور گھر ہی پر شروع ہوئی اس سلسلے میں کسی چھان بین کی ضرورت نہیں مولانا خود اپنی سوانح عمری "نقش حیات" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"میرے والد مرحوم کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال تھا ہر بچے کو چار برس کی عمر میں پڑھنے بٹھا دیتے تھے اور ذرا سی کوتاہی پر بلا لحاظ کافی مرمت کر دیتے تھے۔" اس طرح مولانا کو آزادی کے ساتھ کھیلنے کا صرف ۴ برس تک ہی کا عرصہ نصیب ہوا آگے تحریر فرماتے ہیں۔ "جب میں ۴ برس کا ہوا تو گھر ہی والدہ مرحومہ کے پاس قاعدہ بغدادی اور سیپارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ صبح سات سے ۹ بجے تک تو گھر میں مقید رہتا اس کے بعد کھانا کھا کر والد مرحوم کے ساتھ اسکول چلا جاتا۔ آپ کے والد مرحوم بچوں کی تربیت کے خیال سے بچوں کو زیادہ تر باہر کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کو منع کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا اگر کبھی موقع مل جاتا تو اپنے ایک ماموں نادر بھائی کے یہاں جو ان کے گھر کے قریب رہتے تھے چلے جاتے اور گھر میں چھپ کر گولی کھیلتے۔ اگر کہیں شامت اعمال سے اس کی اطلاع والد کو ہو جاتی تو خاصی مرمت ہو جاتی۔ اسی طرح ماں باپ کے زیر تربیت اور سایۂ عاطفت میں آٹھ برس کی عمر تک وطن ہی میں قرآن شریف (ناظرہ) اور فارسی کی چند کتابیں مثلاً آمدنامہ، دستور الصبیان، گلستاں وغیرہ پڑھیں اور اسکول میں ساتویں درجے تک پڑھ لیا تھا اس زمانے کی تعلیم کا معیار نیز فنون کی کثرت کی وجہ سے اسی درجے میں اکثر اقسام ریاضی حساب اقلیدس تاریخ عمومی تاریخ خصوصی مساحت عملی تحریر۔ املا۔ خوشنویسی، دو کورس وغیرہ شامل تھے۔ نیز ان تمام فنون میں مولانا نے اپنی ذہین طبیعت اور والد مرحوم کی تربیت سے بہت اچھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ مولانا ابھی تیرہ سال کے ہوئے تھے کہ ان کے .... والد مرحوم نے چونکہ مذہبی اور دیندار آدمی تھے مذہبی تعلیم کے لئے انہیں دارالعلوم دیوبند بھیج دیا جہاں انہوں نے وہاں کی منتخب شاخ سے اساتذہ

کی توجہ اور شفقت کا رُخ اپنی طرف پھیر لیا۔ دیوبند میں عسرت اور تنگی اتالیق کی سخت نگرانی سے ہمیشہ پریشان رہے تاہم اس کو ایک رحمت خداوندی سمجھا۔ حسبِ قاعدہ دیوبند کے اہلِ شہر طلباء دارالعلوم کی امداد کے خیال سے اپنے گھروں سے کھانا کھلایا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نے جو کہ مردم شناسی کا جوہر رکھتے تھے۔ انہیں اپنے دامن میں پناہ دی اور ان کا کھانا اپنے گھر سے کر دیا تھا۔ مدرسے سے صبح و شام مولانا کھانا لینے شہر تشریف لے جاتے اس بے نیاز اور سچے طالب علم کی ضروریات بہت محدود تھیں صرف چند کتابیں دو چار جوڑے کپڑے اور مٹی کا پیالہ جس میں مولانا اپنا اور اپنے بڑے بھائی کا کھانا لاتے تھے ان کا کل ساز و سامان تھا۔ ایک مرتبہ کسی طرح آپ کا پیالہ کھانا لاتے وقت ٹوٹ گیا آپ وہیں کھڑے ہو کر رونے لگے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے والد محترم ادھر سے گزرے رونے کا سبب دریافت فرمایا تو آپ نے کہا کہ ایک ہی پیالہ تھا وہ ٹوٹ گیا اب کھانا کس چیز میں لاؤں اور اگر مدرسے واپس جاتا ہوں تو بھائی ماریں گے۔ انہوں نے تسلی دی اور دوسرا پیالہ خرید کر دیا تو یہ نازک مرحلہ طے پایا۔ آپ کی محنت کا یہ عالم تھا کہ ہفتے میں ۶ دن شب و روز کتابوں میں لگے رہتے اور ساتویں دن پورا دن رات سو کر گزارتے حتیٰ کہ کھانے تک کا ہوش نہ رہتا صرف پانچوں وقت نماز پڑھنے کے لئے الارم اٹھا دیتا تھا۔ کھانا بہت کم ہوتا تھا زیادہ تر نیند سے بچنے کے لئے نمکین سادی چائے استعمال فرماتے تھے آپ کے نزدیک کتاب، درس گاہ، استاد کا ادب و احترام اور ان کی محبت سچے علم کے حصول کے لئے ضروری تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ عبرت اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ایک مرتبہ شہر میں بھنگیوں نے ہڑتال کر دی اہلِ شہر کی پریشانی کا عالم قابلِ دید تھا سخت گرمی کا زمانہ اس پر پاخانے کی سڑاند اور بدبو کسی سزا سے کم نہ تھی شیخ الہندؒ نے مولانا سے فرمایا جاؤ بھنگی کو بلا لاؤ کئی دن سے صفائی نہیں ہوئی ہے ابھی شاید ان کو بھنگیوں کی اس تحریک کا علم نہ تھا۔ مولانا صورتِ حال سے واقف تھے مگر تعمیلِ حکم ضروری تھا گئے اور یونہی واپس آ کر گھر کے پیچھے تمام گندگی صاف کر ڈالی حتیٰ کہ ہاتھ بھر بھر کر نالی تک بالکل صاف کر دی۔ بہت دنوں تک شیخ الہندؒ کو اس واقعہ کی اطلاع نہ ہو سکی سنہ [illegible] میں مولانا کے والد محترم ہجرت کر کے مدینے تشریف لے گئے وہاں پہنچ کر . . . . . . بڑی مصائب کا سامنا کرنا پڑا وہ مولانا کی کتاب نقشِ حیات میں با تفصیل درج ہے بہرحال ذرائع آمدنی کا فقدان اور خرچ کی ضرورت سے مجبور ہو کر معمولی سی پرچون کی دکان کھول لی مگر اس کی آمدنی زیادہ تر مکان اور دکان کے کرائے پر صرف ہوتی۔ آخر مجبور ہو کر اُجرت پر کتابت شروع کر دی ادھر استاد کے حکم کے مطابق درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھنا بھی از حد ضروری تھا۔ چنانچہ حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں درسِ حدیث کا سلسلہ شروع کر دیا رات کو گھر کی ضرورت کے لئے مشک بھر کر پانی لاتے۔ دن بھر دوسری جگہ مصروفیات کے علاوہ درس دیتے تھے بعض وقت عسرت کا یہ عالم رہا ہے کہ آدھ پاؤ موٹھ کی دال ایک ہانڈی بھر کر پانی میں نمک ڈال کر ابال لیا اور تھوڑا تھوڑا سب نے پی لیا اللہ کا شکر ادا کر کے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ کبھی تربوز کے چھلکے لا کر نمک ڈال کر کھائے اور کبھی سبزی منڈی سے گری پڑی سبزی کو دھو کر ابال کر اس سے تارِ نفس کے قیام کا سہارا ڈھونڈا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ پیٹ پر پتھر باندھ کر حرم شریف میں درس دینے کے لئے تشریف لے گئے اس طرح مولانا کی ان تنگیوں اور صعوبتوں سے گزرے اور امتحان میں پورے اترے مگر جب اہلِ مدینہ سے متجاوز ہو کر حلقۂ درس ترک و بخارا، سمرقند، قازان، قزق، ترکستان، مصر اور کابل کے طلبہ تک پہنچا تو مولانا نے خدا کے بھروسے پر کسبِ معاش کے اور ذریعوں کو ترک فرما دیا اور یکسو ہو کر درسِ حدیث میں ہی مصروف ہو گئے۔ پھر سنہ ۱۹ میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ گرفتار . . ہوئے اور مالٹا بھیج دیئے گئے۔ شیخ الہندؒ کی تحریکِ آزادی جو عام طور سے ریشمی خطوط کی تحریک سے مشہور ہے۔ ہماری قومی زندگی کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے شیخ الہندؒ کا کیا منصوبہ تھا اور ہندوستان کو انگریزوں کے چنگل سے چھڑانے کے لئے انہوں نے کیا اسکیم بنائی تھی۔ بلاوی مولانا کے C—I—D سے دامن بچا کر وہ کس طرح حجاز پہنچے تھے اور وہاں شریفِ مکہ کی غداریوں کا کس طرح نشانہ بنے تھے یہ بڑی حیرت انگیز پُر عجیب داستان ہے اور تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو گئی ہے۔ حجاز میں مولانا مدنیؒ کو جب اپنے استادِ محترم کے منصوبے کا علم ہوا تو دل سے ان کے ساتھ ہو گئے۔ یہاں سے

مولانا کی جد و جہد آزادی کا آغاز ہوتا ہے۔ شیخ الہندؒ کے بعد مولانا نے ان کے نصب العین کو پوری طرح اپنایا اور آزادی کی راہ میں بڑی بڑی صعوبتیں اٹھائیں۔ چنانچہ مالٹا میں حضرت شیخ الہندؒ کے رفیق کار رہے اور وہاں اپنے میر کارواں کی بھرپور خدمت کی۔ وہاں انگریز حکام کی سختیوں کی وجہ سے شیخ الہندؒ کو گرم پانی نہ ملتا تھا اور گٹھیا کا مرض تھا جس کی وجہ سے سردی میں بہت دقت ہوتی تھی مولانا کو استاد کی اس تکلیف کا احساس ہوا۔ آپ ایک لوٹا پانی لے کر پیٹ سے لگا لیتے اور تمام رات لحاف اوڑھ کر بیٹھ جاتے۔ صبح سویرے بدن کی حرارت سے نیم گرم پانی پیش کر دیتے۔ بہت دنوں تک یہ انتظام رہا مگر استاد کو اس کی کوئی خبر نہ ہوئی۔

شیخ الہندؒ کا دور جس قدر پُر آشوب اور انگریزوں کی ساحرانہ مکاریوں کا دور تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس میں شیخ الہند ایک وقت [illegible] صوفی یا خانقاہی پیر کی حیثیت سے بھی مسلمانوں کی موجودہ پریشانیوں کا علاج نہ کر سکتے تھے چنانچہ وقت اور حالات کی نبض کو پہچان کر مولانا میدان سیاست میں اترے اور ثابت کر دیا کہ وہ میدان سیاست میں ایک بہترین کمانڈر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی بنیاد بعد میں علماء کی سیاسی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جس کے اہم ہیرو مولانا مدنی۔ عبید اللہ سندھی۔ مفتی کفایت اللہ اور انور شاہ رحمہم اللہ وغیرہم قرار پائے۔ مولانا مدنی کے عہد میں بھی بہر حال وہی جابرانہ حکومت کے مظالم اور وہی انگریزوں کی تیز پروازیاں قائم تھیں جن کے انسداد کے لئے پیروں کو خانقاہوں سے نکل کر عوام کے دوش بدوش اس تحریک کو زندہ رکھنے کی ضرورت تھی جو آپ سے پہلے اس جماعت کے نامور [illegible] اسلاف کرام نے شروع کی تھی۔ چنانچہ مولانا نے شیخ الہند کے بعد جس ذمہ داری سے اس کو زندہ رکھا اس کے خوشگوار نتائج انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کی صورت میں ظاہر ہوئے اس کے بعد مولانا نے سیاست کو جس قدر سمجھا اور اس کو اپنی جماعت میں ترقی دی اس کے ضمن میں مولانا کی ہندوستان میں قربانیاں روز روشن کی طرح ظاہر ہیں۔ اگر مولانا کی بے پرواہ غیور طبیعت اور قانع و شاکر فطرت نے اس آزادی کے صلے میں کسی اونچی پوزیشن کو قبول نہ کیا اور دنیا کے سامنے وہ شہزادہ وزیر اعظم کی صورت میں نہ ظاہر ہوئے تو اس سے اعلیٰ ظرفیت اور خلوص پر پردہ پوشی ناممکن ہے۔ بشرطیکہ مورخ کا قلم انصاف اور دیانت کا ساتھ نہ چھوڑے اور خدا نخواستہ یہ قربانیاں کسی تعصب کی نذر نہ ہو گئیں۔

مولانا کی زندگی کا تقریباً ہر گوشہ جہاد سے تعبیر ہے آپ کا روز مرہ کا معمول اسلامی طرز زندگی میں ڈھل چکا ہے۔ شب بیداری کا یہ عالم ہے کہ رات کو ۲ بجے تک دار العلوم میں طلبہ کو حدیث شریف کا درس دیتے ہیں اس کے بعد ڈیڑھ بجے تک تصنیف و تالیف کے سلسلے میں کچھ کام کرتے ہیں۔ پھر ۴ بجے سے اٹھ جاتے ہیں اس کے علاوہ آپ کے یہاں روزانہ تقریباً ۳۰ — ۴۰ مہمانوں کا ہجوم رہتا ہے جن کو ملاقات خود مولانا وقت دیتے ہیں اور ان کے طعام و قیام کا پورا انتظام مولانا اپنے ذمے رکھتے ہیں۔ جن کے لئے وقت کی کوئی قید نہیں۔ ایک ایک ماہ بھی لوگ قیام کرتے ہیں جس میں پاکستان ہندوستان کے علاوہ مدراس کلکتہ بمبئی افریقہ سورت بھی جگہ کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔

مولانا کی محفل میں زاہد عابد شاعر ادیب لیڈر عوام شہری دیہاتی امیر غریب ہر طرح کے لوگ شامل ہیں اور مولانا کی ذات میں اپنے جذبات و افکار کی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ کوئی مشکلات کا ذکر کرتا ہے جس میں ملازمت یا حکام کی بد مزاجیاں خانگی مسائل قرض ہر طرح کی مشکلیں شامل ہیں اور مولانا ہر نوع کے مسائل کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھتے ہیں کہیں میرزا غالب کی شاعری زیر بحث ہے تو مولانا ایک ایک شعر پر پوری طرح تبصرہ فرمائیں گے کسی وقت ڈاکٹر اقبال مرحوم کا ذکر آ گیا تو ان کے جذبہ دینی اور خودی کے مسئلے پر سیر حاصل تشریح فرمائیں گے کہیں اسلام کی نشر موضوع سخن ہے کسی وقت قسطنطنیہ، تیونس، مراکش کی موجودہ کشمکش اور تاریخ صدود اربعہ الگ انقلابی امور الگ عنوان بحث بن گئے ہیں اور اگر وقت آپ کسی دیہاتی سے مصروف تکلم پائیں گے تو ربیع و خریف کی ہونے والی تمام فصلوں میں ہر قسم کے غلے اور ان پر منفی اثرات بحال فرمائیں گے اور اسی قدر معلوماتی تبصرہ کریں گے کہ بڑا کاشتکار کسان اور زمیندار بھی مولانا کے ادب تہ کر کے ٹھیٹ مدح ان کا درس حاصل کرے۔ موسمی پھلوں میں بالخصوص آم اور خربوزہ پسند فرماتے ہیں لیکن ان کے انتخاب میں کسی کے محتاج نہیں۔ عمدہ اور غیر عمدہ قسموں پر بڑی تشریح فرمائیں گے کیونکہ اور

مذاق کے سلسلے میں اول تو آپ کو محفل میں ہر وقت ایک نہ ایک ظریف الطبع ایسا مل جائے گا جو مولانا کی طبیعت کا اندازہ پا کر اپنے رنگ میں آ جائے اور پھر مولانا کو ایک اچھوتے رنگ میں دیکھ لیجئے کسی کو گلاب جامن سے کسی کو برفی سے کد ہے تو اس کو اسی عنوان سے چھیڑیں گے اور حسب حال کبھی کبھی بازار سے منگوا کر اسے کھلوائیں گے اگر کسی نے سلوک اور تصوف کے مسائل چھیڑ دیئے ہیں تو اس قدر روحانی کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ شاید بڑے متقی کو بھی ایک مرتبہ اپنی عبادت اور طاعت پر شک ہونے لگے اور راہ طریقت کے الجھے سے الجھے مسائل کچھ نگاہوں سے کچھ زبان سے اس طرح حل ہونے چلے جائیں گے کہ طالب راہ تصوف اطمینان قلب کے ساتھ وہاں سے اٹھے گا۔ غرض کہ ہر قسم کے انسان کو اپنی ذہنی طبعی روحانی غذا بخوبی اس محفل میں حاصل ہو جاتی ہے۔ مہمانوں کے سلسلے بعض اوقات انتہائی تکلیف دہ صورت اختیار کر لیتے ہیں کوئی اصرار کر رہا ہے کہ میرے بچے کی بسم اللہ ہے تشریف لے چلیں کہیں عقیقہ کہیں شادی وغیرہ یہ رسوم مولانا کے زحمت سفر کا اکثر باعث بنتے رہتے ہیں مولانا کچھ دیر تو سختی سے پھر گھبراتے ہوئے پھر خوشامدانہ انکار فرمائیں گے آخر دوسرے کے اخلاق کریمانہ ہیں تاب انکار نہیں رہتی اور ڈائری میں تاریخ لکھی جاتی ہے ایک مرتبہ ایک صاحب تشریف لائے اور آتے ہی پوچھا کہ حضرت میرے والد کا کیا نام تھا مولانا نے ان کی غرض سوال کو بھانپ لیا فرمایا مجھے نہیں معلوم بس پھر کیا تھا مہذب اور غیر مہذب گالیاں جس قدر آتے یاد تھیں سنا ڈالیں مگر کھانے کے وقت مولانا کے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھایا اور کچھ دیر وہیں قیام کیا ایسے بھی مہمان آتے ہیں جو بقول مولانا میرے اصلاح نفس کے لئے آتے ہیں۔ مولانا کو ایک باپ کی حیثیت سے جہاں تک دیکھا گیا ہے شاید کوئی شفیق سے شفیق باپ باوجود کمال محبت و قدرت کے وہ درجہ حاصل نہ کر سکے۔

ابھی ابھی مولانا بمبئی کے طویل سفر سے واپس آئے ہیں اگر درس کا وقت ہے تو فوراً مدرسے تشریف لے جائیں گے۔ وہاں سے اگر اطمینان سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ چاروں طرف سے ابا جی ابا جی کا شور بلند ہوا دوسرے لمحے کوئی بچہ پیروں سے چمٹا جا رہا ہے کوئی کمر سے چمٹا جا رہا ہے کوئی پشت پر چڑھا جا رہا ہے کوئی جھولا جھول رہا ہے مولانا نہایت شفقت و محبت سے فرماتے ہیں ذرا ہٹ تو جا دیکھ تیرے لئے کیا لایا ہوں چھوڑ تو کمر ٹوٹتی یا جھڑکی کا شائبہ تک نہیں حیرت ہے اس برداشت پر اور تعجب ہے افسوس دنیا اس طبیعت پر اور اخلاق مصطفوی پر۔ بچوں کو پھل کھلونوں سے بہلا رہے ہیں مگر بچوں کو تو مدت سے بچھڑے ہوئے ابا جی کی ضرورت ہے اور والد محترم تھوڑی دیر بعد قوم و ملت سے بھرپور قلب سے تھوڑا سا حصہ بچوں کی دلجوئی کے لئے نکالتے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے نے کوئی جلسہ منعقد کیا تو اس کی صدارت بھی ابا جی سے کرانا چاہتے ہیں۔ ابا جی پریشان ہو جاتے ہیں میرے پاس کہاں وقت ہے مگر اس وقت ایک شفیق باپ اور چھوٹے لخت جگر کا مسئلہ ہے جہاں ضد اور ہٹ تمام مسلمات منوا لیتی ہے وقت کا بہانا یا فرصت کم ہونا تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کا عذر ہو سکتا ہے!

مولانا کے مکان پر مہمانوں کا ہجوم تو رہتا ہے اس کے علاوہ دارالعلوم میں طلبہ کی امداد کے سلسلے میں مولانا کی طرف سے کھانا جاری ہوتا ہے یہی نہیں کنبہ پروری آپ کا ایک اہم ترین فریضہ ہے اور پھر کنبے میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو والد مرحوم کے زمانے کی یادگاریں ہیں والد کے ساتھ رہنے والوں میں جس قدر حاجت مند تھے سبھی مولانا کی امداد کے حقدار ہیں اور ان کا خرچ مولانا کے ذمے ہے۔ عید الفطر عید الاضحیٰ کے مبارک موقع پر مولانا خود محلے کے ہر گھر میں تشریف لے جاتے ہیں اور بڑوں سے بچوں تک کو حسب مراتب عیدی تقسیم فرماتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حضرت شیخ الہند کے انتقال کو تقریباً ۳۰ سال کا عرصہ گزر گیا مگر ان کی صاحبزادیوں کے ساتھ وہ معاملہ ہے جو شاید ایک باپ اپنی بیٹی کے ساتھ نہ رکھ سکے عید کے مبارک موقع پر اس گھر میں کافی رقم خرچ فرماتے ہیں اور خود نفس نفیس تشریف لے جاتے ہیں تمام احوال دریافت فرماتے ہیں صاحبزادیوں کے سامنے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اپنے کسی بہت بڑے مربی یا باپ کے سامنے ہیں گفتگو میں تابعداری انکساری کا طرز نمایاں رہتا ہے۔

مولانا کو مہمانوں کے علاوہ درخت اور پرندوں سے بھی بہت انس ہے دارالعلوم جیسے عظیم الشان ادارے میں کافی خوبصورت وسیع و عریض باغ صرف مولانا کے شوق اور طلب کا رہین کرم ہے جس میں بہت سے درخت بنگال۔ آسام۔ بمبئی۔ سورت۔ لکھنؤ سے مولانا کے اپنے جیب خاص سے

منگا کر لگائے جاتے ہیں اور اس کی نگہبانی و باغبانی ملازم سے زیادہ خود مولانا فرماتے ہیں۔ چمن کے سلسلے میں معمولی سے نقصان پر طبیعت سخت باز پرس فرماتے ہیں لیکن قصداً اگر کسی نے صدمہ پہنچایا ہے اس وقت تو آپ سے برداشت نہ ہوگا اور اگر کسی ضرورت سے یا اتفاقاً کسی سے کوئی نقصان ہو گیا تو کچھ خیال نہیں فرماتے۔ ایک بار آسام سے قیمتی پودوں کے گملے آئے مولانا انہیں شوق سے ملاحظہ فرما رہے تھے اتفاق سے صاحب سے چھوٹی بچی بھاگ کر آئی اور کسی جھٹکے سے گملے پر گر پڑی ننھے پودے ذرا سی دیر میں ختم ہو گئے۔ برداشت اور درگزر کی جو کیفیت اس وقت دیکھنے میں آئی وہ حیرت انگیز تھی۔ اطمینان سے بچی کو اٹھایا اور مسکراتے ہوئے کمرے میں تشریف لے گئے اور پھر اس کے بعد کبھی اس پر اظہار خیال نہ فرمایا۔ مجموعی طور پر مولانا کی زندگی بہت حسین منظم اور مہذب زندگی ہے جس میں تماشا گاہ عالم کی سیر کا سامان بھی ہے۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

نعیم صدیقی

کہتے ہیں کہ پاکستان میں خوراک کی کمی ہے، تعلیم کی کمی ہے، اسلحہ کی کمی ہے ——— اور دوسری طرف آدمیوں کی بہتات ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہاں سب سے خوفناک قلت آدمیوں ہی کی تو ہے۔ کوئی قوم اگر آدمیوں کے قحط سے دوچار ہو تو اس کو ہر چیز کی کمی دوچار کرتی جاتی ہے۔ بلاشبہ مردوزن کا ایک بے پناہ ہجوم یا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے جو پاک زمین کے گھیرے میں آیا ہے ——— آٹھ کروڑ نفوس! ——— ان میں وزیر بھی ہیں، لیڈر بھی ہیں، ایم اے بھی ہیں، صحافی بھی ہیں، ادیب اور آرٹسٹ بھی ہیں، تاجر اور صناع بھی ہیں، سپاہی اور سپہ گر بھی ہیں، لیکن انسان بہت ہی کم ہیں۔ "بڑے آدمی" ہماری قسمت میں بہت لکھے گئے ہیں، لیکن "آدمی" ہمارے پاس نہیں ہیں! آج بھی ہمارے شہر زندگی کے گرد وہی رومی کا شیخ چراغ ہاتھ میں لئے سرگرداں ہے اور الاپ رہا ہے کہ "انسانم آرزوست"! ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں معاشی مردم شماری کا ریکارڈ کئی درجن ٹنوں کا بوجھ ہو۔ لیکن اگر ہم اپنے ان کے ہزاروں معاشی حیوانوں کو عقل، وفا، مروت، انسان کا سا دل چھوڑ دیں تو پھر شاید مردم شماری کا سارا اندراج چاول کے ایک دانے پر ہو سکے گا ——— یہ آپ نے سنا ہوگا کہ ماہرین خطاطی چاول کے ایک دانے پر پورا سورۂ یٰسین لکھ دکھاتے ہیں! یہی آدمی بننے کیلئے علمی ارتقا کی تحریک بھی اور کوشش روا رکھی گئی ہے

"آدمی گوشت اور ہڈی کے اس ہونے اور چلتے پھرتے ڈھانچے کو نہیں کہتے جس پر چند اندرونی خواہشات سواری کرتی ہیں۔ آدمی نام ہے شعور اور احساس کا، آدمی نام ہے اصول اور ایمان کا، آدمی نام ہے سیرت اور اخلاق کا ——— اور یہ مخلوق ہمارے ہاں ایک ناقابلِ ذکر اقلیت کا مقام رکھتی ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی اسی اقلیت کا ایک فرد ہے ——— "ایک آدمی"!

وہ اگرچہ ایک انقلابی مفکر بھی ہے، ایک سحر طراز ادیب اور خطیب بھی، لیکن اس کی بڑائی کا اصل راز یہ ہے کہ وہ ایک آدمی ہے۔ ایک ایسا آدمی جو پاکستان بھر میں نمایاں ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ کسی چوٹی پر کھڑے ہو کر ارضِ پاک کے آدمیوں پر نگاہ ڈالیں تو شاید پہلی نگاہ اسی شخصیت کے منطقے میں پڑے گی۔ آخر کیوں؟ ——— اس لئے کہ یہ ایک ایسی شخصیت ہے کہ جس کی اہمیت کسی آبائی جاگیر، کسی سرکاری عہدے، کسی خاندانی منصب اور کسی مصنوعی شہرت اور نمائشی پروپیگنڈے کے سبب نہیں، بلکہ محض ایک نظریہ و مقصد، ایک سیرت و کردار اور ایک سرگرم عمل کے بل پر ہے۔ وہ بڑا آدمی ہے تو فقط اس بنیاد پر کہ وہ ایک آدمی ہے، وہ ایک انسان ہے!

ہاں مگر ـــــ اب مودودی ایک فرد کا نام نہیں رہا۔ اب اس لفظ کو بولتے ہی زندگی کا ایک کلی فلسفہ، ایک اجتماعی کریکٹر، ایک سیاسی تصور، ایک تحریک اور ایک نصب العین نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ مودودی کا نام لیتے ہی اسلامی دستور کے مسائل ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں اور اسلامی نظام کا ہیولیٰ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اس معیار کی شخصیتوں کو ہمیشہ دیکھا اور دکھایا جاتا رہا ہے۔ دیکھنا اور دکھانا ایک تو "ہیرو پرستی" کے گھٹیا جذبے سے ہوتا ہے۔ لیکن اس دیکھنے اور دکھانے کا ایک اعلیٰ محرک بھی ہے، اور وہ یہ کہ ان اوصاف اور عادات کو معلوم کیا جائے جنہوں نے ہم جیسے کسی پیکرِ آب و گل کو انسانوں کے نفع کیلئے بہت بڑے پیمانے پر خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا ہوتا ہے۔ اس تحریر کا منشا بندگانِ خدا کیلئے ایک نیا ذہنی دیوتا گھڑ کے پیش کرنا نہیں ہے بلکہ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ شخص جس کے نام سے پاکستان کا ایک ان پڑھ دیہاتی تک واقف ہے اور جس کا حلقۂ تعارف عراق اور شام اور حجاز تک پھیلا ہوا ہے، آخر اس کا اصل جوہرِ شخصیت کیا ہے۔

جو لوگ بڑے آدمی کہلاتے ہیں ان کی سب سے بڑی چھوٹائی یہ ہوتی ہے کہ ان کا بڑاپن بالعموم ان کی شخصیت پر باہر سے ایک خول کی طرح چڑھا ہوتا ہے۔ اس چمکتے دمکتے خول کو دور ہی دور سے دیکھتے رہیے تو بڑی مرعوبیت طاری رہتی ہے، اس کے اندر کے آدمی سے اگر سابقہ پڑ جائے تو ظاہر کے تصنعات کے محل چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ لیکن مودودی کی شخصیت اپنے بیرونی ظاہر سے لے کر اپنے باطنی جوہر تک بالکل یکساں اور یک آہنگ ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مودودی کی سوانح عمری اس کی پیشانی اور چہرے پر نقش ہوئی ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم جلاوطنی کا دور ختم کر کے وطن تشریف لائے تو کسی موقع پر ریل میں سفر کرتے ہوئے لاہور سے گزرے۔ مولانا مودودی ان سے ملاقات کرنے پلیٹ فارم پر پہنچے گو کچھ معلوم نہ تھا کہ مولانا سندھی کس ڈبے میں ہیں، تلاش ہی میں تھے۔ مولانا سندھی مرحوم نے دیکھتے ہی خاص طور پر متوجہ کر کے (غالباً نظر کی ہے) مصافحہ کیا اور پہلے سے ملاقات نہ ہونے کے باوجود بڑے جزم و یقین کے ساتھ استفہامیہ انداز میں فرمایا: "آپ مولانا مودودی ہیں نا؟" پہلی بار ایک چہرے کو اور وہ بھی ایک نظر دیکھ کر غائبانہ تعارف کے بل پر ایک شخصیت کو پہچان لینے کی جو حیرت انگیز نظیر سندھی صاحب نے قائم کی وہ خود شاہد ہے کہ مودودی کا ظاہر اس کے باطن کا کتنا مکمل آئینہ دار ہے۔ ظاہر و باطن کے درمیان خود پیدا کردہ فاصلے نہیں ہیں، تصنع اور تکلف کے پردے نہیں ہیں، تضاد اور تناقض نہیں ہے۔ دور سے جو کچھ دکھائی دیتا ہے قریب آنے پر وہی اور زیادہ نکھر کر نگاہوں میں آجاتا ہے۔

آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے ـــــ اور اگر میں ان برسوں کو گنتی کر کے گن نہ لیتا تو میرا گمان یہی ہوتا کہ گویا کل کا واقعہ ہے ـــــ میں ابھی اپنے گاؤں ہی میں مقیم تھا اور آئندہ زندگی کے متعلق بنتے بگڑتے نقشوں میں گم، کچھ لکھنے، کچھ سوچنے اور زیادہ تر پڑھنے اور سمجھنے میں مصروف تھا۔ اس چھوٹی سی دور افتادہ دیہی آبادی کے برانچ پوسٹ آفس میں ہر روز ڈاک کا میلا سا جو تھیلا آیا کرتا تھا اس میں میرے نام کا کوئی نہ کوئی اخبار یا رسالہ ضرور ہوتا۔ ایک رسالے میں مولانا کے نام سے جب پہلا مضمون میری نظر سے گزرا تو مضمون نگار کا نام ابوالاعلیٰ مودودی بڑا ہی عجیب لگا۔ یہ مضمون بھی کسی زورِ بیان کا متحمل نہیں تھا۔ کیونکہ اس میں محض ایک اسلامی نو آبادی ـــــ دارالاسلام ـــــ کے عملی قیام کی دعوت دی گئی تھی[1]۔ اس تحریر میں سادگیِ بیان کا حسن تو تھا ہی، مگر اس کا خاص تاثر (جو اب تک میری کتابِ ذہن کے اوراق پر ثبت ہے) یہ تھا کہ لکھنے والا ان تمام لکھنے والوں سے مختلف چیز ہے جنہیں میں جانتا تھا اور اس کے اندر بڑا غیر معمولی پن ہے۔ ہمارے ادب کی روایت کا تقاضا یہ تھا کہ اس ترغیبی مضمون میں ایک تو جوش انگیزی موجود ہوتی اور دوسرے روشن ہی روشن پہلو پیش کئے جاتے۔ لیکن نہیں، جذباتیت کے بجائے اس کا مزاج فکری تھا اور اس میں روشن پہلوؤں کے ساتھ مشکلات و موانع کو بھی قاری کے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود بغیر مبالغہ اور خطیبانہ لفاظی سے مدد لئے، لکھنے والے نے اس

---

[1] [illegible] علامہ اقبال کے [illegible] مولانا مودودی بھی دارالاسلام کو [illegible] اقبال [illegible] کر رہا تھا۔

میں پوری پوری تو نئی روح پیدا کر دی تھی۔ اس مضمون کے پس منظر کے دھندلکے میں ایک نئی قسم کی شخصیت میرے سامنے تھی جسے پہچاننے سے تو میں قاصر تھا، لیکن جس کی جاذبیت نے مجھے اس لمحہ اشتیاق میں اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ یہ کون آدمی ہے؟ یہ انوکھا سا نام کس کا ہے؟ یہ کیا اسکیم ہے؟ بس یہ سوالات سامنے تھے اور مضمون کو بار بار پڑھا جا رہا تھا۔ والد مرحوم سے ذکر کیا۔ ان کو پڑھ کر سنایا۔ اس رسالے کے مدیر نے اپنے نوٹ میں خود بھی مجوزہ سکیم سے دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ لہٰذا ان کو خط لکھا اور خط کے جواب میں سرسری سی ابتدائی معلومات مزید حاصل ہوئیں مگر ان معلومات نے مزید تشنگی پیدا کر دی۔ میرے دل میں اس سے قبل صرف ایک ہی تو شخصیت سے غیر معمولی دلچسپی کارفرما تھی ——— میرا اشارہ اقبالؒ کی طرف ہے ——— لیکن اب ایک اور متوازی قسم کی شخصیت سے میری دلچسپی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ——— بعد میں غائبانہ تعارف کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

سنہ ۱۹۳۸ء کے بالکل آغاز میں ہفتہ بھر کا پروگرام بنا کر لاہور آیا اور مقصد سفر یہی تھا کہ اقبالؒ اور مودودی دونوں سے ملاقات کروں گا۔ بلکہ اپنے اس دور کے ذہن کے مطابق کہنا چاہیے "زیارت"! لیکن زیارت صرف علامہ اقبالؒ ہی کی حاصل ہو سکی جو بیک وقت پہلی بھی ثابت ہوئی اور آخری بھی! چند ہفتے بعد اقبالؒ اپنا نغمہ حیات افروز پورا کر کے ازلی و ابدی فضاؤں کی طرف پرواز کر گیا۔ ۱۹۳۸ء ہی کے وسطی حصے میں دوبارہ مودودی کو قریب سے دیکھنے کا اشتیاق لئے ہوئے پٹھانکوٹ کا عزم بالجزم کر کے دوسرا سفر کیا۔ غائبانہ تعارف تو اب کافی آگے تک جا چکا تھا، کیونکہ ماہنامہ ترجمان القرآن کے متعدد شمارے نگاہ سے گزر چکے تھے۔ غالباً "سیاسی کشمکش حصہ اول" کے فکر انگیز مباحث دل و دماغ میں اپنی جگہ پیدا کر چکے تھے۔ اور مولانا کے ساتھ کام کرنے والے ایک کرم فرما سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہاں اس امر کا ضمناً تذکرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اگرچہ ایک غیر سیاسی علاقے کا دیہاتی نوجوان تھا اور عملاً پارٹی پالیٹکس سے ابعد تھا، لیکن ملک میں مسلمانوں کو انگریزی استبداد اور متعصب ہندو اکثریت کی دو چکیوں سے جو محنت اور کشمکش درپیش تھی اس سے فطری حد تک گہرا ربط رکھتا تھا۔ اپنی پوری قوم کی طرح میں بھی اندھیرے میں تھا کہ اب کیا ہونا چاہیے اور راہ نجات کیا ہے؟ مولانا مودودی کی تحریریں دیکھ کر امید کی ایک کرن ہاتھ آئی کہ شاید یہ شخص صحیح طرز پر سوچ رہا ہے اور ممکن ہے کہ اس کے ذریعے الجھنوں کے اس جنگل سے باہر نکلنے کا راستہ مل سکے جو اتفاق تاریخ کی صورت میں دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ میری ابتدائی دلچسپی مذہبی سے زیادہ سیاسی تھی، لیکن خود اس سیاست کے اندر "مسلم قومیت" کی روح تہ نشین تھی۔ بارش میں گھر سے چلا اور کچھ وقت دارالاسلام کی اسی نو آبادی میں رہ کر مولانا مودودی اور ان کے خیالات اور ان کی عمل سکیم کو سمجھنے کا ارادہ لے کر چلا۔ بس والوں نے ایک بڑی دو آب کی نہر کے کنارے اتارا۔ کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا کہ کوئی دیہاتی آئے اور مزدوری لے کر سامان پہنچا دے۔ آخر اس بستی کا خاکروب "فقیرا" ادھر سے گزرا اور جب اس کو معلوم ہوا کہ مجھے دارالاسلام جانا ہے تو اس نے سوٹ کیس اور بستر سر پر رکھ لیا اور ہم چلے۔ میرا یہ راہنما مجھے بسوں کی سڑک کے بجائے ریل کے پل کے رستے لے گیا جو نیچے سے بند نہیں تھا۔ اور ایک ایک قدم اس کے (غالباً مختصر) سلیپروں پر رکھ کر اسے پار کرنا پڑتا تھا جیسے تو اتنے لمبے پل اور اس کے نیچے شور کرتے اور بپھرے ہوئے مٹیالے مٹیالے پانی کو دیکھ کر دل دہل گیا۔ ارادہ کیا کہ واپس ہو کر جرنیلی سڑک کے راستے نہر کو پار کروں، لیکن پھر خیال آیا کہ ایک خاکروب کے سامنے مجھے ایسی کمزوری نہیں دکھانی چاہیے۔ چلا، مگر دس پندرہ سلیپروں پر لمبے لمبے ڈگ بھرنے کے بعد سر چکرایا، بیٹھ گیا۔ لیکن ایک بار پھر اسی ہمت افزا خیال نے سہارا دیا اور پھر فقیرا کے نقش قدم پر آگے بڑھنے لگا جو بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے بے ساختگی سے چلا جا رہا تھا۔ پل پار کرنے کے بعد جھاڑیوں اور کھیتوں اور سبز گھاس کے بیچ ہرے بھرے ماحول میں چند کوارٹر دکھائی دینے لگے اور ان کوارٹروں کے درمیان مسجد اپنے میناروں کی دونوں باہیں اوپر کو پھیلائے کھڑی تھی۔ پہلے سے اطلاع تھی اور ایک دوست منتظر تھے۔

نہایا دھویا اور پھر ملاقات کا بے چینی سے منتظر رہا۔ غالباً مغرب کی نماز کا وقت قریب ہوا تو بستی کی مختصر سی آبادی ——— تین چار افراد ——— مسجد کی طرف سمٹنے لگے۔ اذان ہوئی اور اس کی آواز پر قریب کے ایک بڑے کوارٹر سے ایک شخص برآمد ہوا۔ مائل کرتہ، نیچے کا غرارہ نما پاجامہ، سر پر

والی ہی کی ایک ٹوپی (جو نماز کیلئے گویا خاص تھی) پاؤں میں غالباً باٹا کے سیاہ رنگ کے سلیپر —— پورا لباس خالص اُجلا جو سبز پس منظر میں عجیب شان سے نمایاں تھا —— اس سادہ لباس کے ساتھ ایک روشن چہرہ (جلد کی سپیدی کے ساتھ جوہر سیرت کی تجلی سی جھلک لئے ہوئے) جس پر سکّہ بند مذہبی معیار سے بھری بھری شرعی سیاہ رنگ داڑھی!! —— کسی تعارف کے بغیر میں پہچان گیا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے خیالات سے میں نے تھوڑا سا استفادہ کیا ہے۔ آنے والے نے مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک ایسے انداز سے "السلام علیکم" کہی جو آج تک میں نے کسی اور میں نہیں پایا۔ متوازن جھجک کے ساتھ مصافحہ کیا، کھڑے کھڑے دوستوں نے مختصر تعارف کرایا اور پھر نماز کھڑی ہوگئی۔ نماز کا امام بھی وہی شخص تھا دلچسپ یہ کہ نماز اور قرأت کا اسلوب بھی بے حد ندرت لئے ہوئے تھا اور اس میں بھی اس شخص کی سیرت کی جھلک موجود تھی۔

اپنے پروگرام کے مطابق دو مہینے کا عرصہ میں نے جنگل کے دامن میں آباد شدہ اسی مختصر سی بستی میں گزارا۔ مولانا مودودی کا بیشتر وقت ترجمان القرآن کی ادارتی ذمہ داریاں، تصنیف کا کام اور خط و کتابت میں صرف ہوتا۔ مولانا سے ملاقات یا تو نمازوں کے اوقات پر مسجد کے کشادہ صحن میں ہوتی اور کبھی نماز سے قبل اور کبھی نماز کے بعد بات چیت رہتی، یا عصر کے بعد مولانا جب سیر کو نکلتے تو ترجمان القرآن کے مینیجر اور کاتب، مولانا صدر الدین اصلاحی اور میں —— اور کوئی مہمان آجاتا تو وہ بھی —— سب ساتھ جاتے۔ دین و سیاست کے اہم مسائل پر بحثیں بھی ہوتیں، لطائف بھی ہوتے، بستی اور اس کی مقصدی سکیم سے متعلق معاملات بھی چھڑتے، ترجمان القرآن اور اس کے مکتبے کے امور کا تذکرہ بھی ہوتا اور اہم اور دلچسپ خطوط اور باہر سے آئے ہوئے سوالات اور اعتراضات پر بھی بات چیت ہو جاتی۔ اس بزم متحرک کی دلچسپیاں اور ان کی یادیں تو اب دل و دماغ کا مستقل سرمایہ بن گئی ہیں۔ کبھی مغرب کے بعد کا کھانا اکٹھا ہو جاتا اور سلسلۂ گفتگو عشاء تک جاری رہتا۔ اس بزم متحرک کا نشہ دو ہی چار روز میں اتنا تیز ہو گیا تھا کہ صبح ہی سے عصر کا انتظار رہتا اور اشتیاق کہتا کہ "سورج خدا کے واسطے ڈھل جاتے تھے"!

ابتدائی رابطے کے اس دور کی واقعاتی تفصیلات اب کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہیں اور نہ گفتگوؤں ہی کا پورا مواد سامنے رہ گیا ہے۔ البتہ وہ تاثرات میں بیان کر سکتا ہوں جن کو اپنے ساتھ لے کر میں بعد کی اسلامی تحریک کے اس چھوٹے سے کیمپ سے رخصت ہوا۔

خیالات ہی کے مطالعے سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ شخص مولوی نہیں ہے (یہ بات مولویت کے بارے میں ہر طرح کے تحقیر آمیز تاثر سے الگ ہو کر محض حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے کہہ رہا ہوں) پہلی بار چہرہ سامنے آنے پر میری نگاہ نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ بعد کی ملاقاتوں اور گفتگوؤں نے اس رائے کو قطعی بنا دیا۔ مگر حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ یہ شخص مسٹر بھی نہیں تھا۔ وہ مومن اور مسلم اور دین کا رمز شناس ضرور تھا، مگر اس کے گرد روایتی تقویٰ کی پرتکلف اور بوجھل فضا نام کو بھی موجود نہ تھی۔ وہ آزاد خیال اور وسیع النظر تھا، مگر اس میں وہ لاابالیانہ پن بالکل نہیں تھا جو اسلام تک کی حدود کو پامال کرتا ہوا کہیں کا کہیں جا پہنچتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک گفتگو مجھے نہیں بھولتی جب کہ جاری بزم متحرک میں داڑھی کی بات چھڑ گئی۔ مولانا مودودی کہہ رہے تھے کہ (الفاظ یاد نہیں صرف مفہوم ذہن میں ہے) داڑھی کو آج جو غیر معمولی اہمیت دے دی گئی ہے اصولاً وہ مقام دین میں نہیں تھی۔ مجھ ایسا روزانہ دست بخود شیو بنانے والا اور داڑھی کے تارک "بارگراں" سے ڈرنے والا جہاں یہ الفاظ سن کر مطمئن بھی ہوا اور حیرت زدہ بھی! اسی حیرت زدگی میں بے اختیار میں نے سوال کیا کہ کیا داڑھی نہیں رکھنی چاہیئے؟ جواب ملا کہ میرا مطلب یہ نہیں، رکھنی تو چاہیئے لیکن اس کو دینی حلقوں نے جو حد سے بڑھی ہوئی اہمیت دے دی ہے وہ خود دین میں نہیں پائی جاتی —— آج تو ایک مسلمان سے مذہبی حضرات کے ہاں جو اہم ترین اوّلین مطالبات کئے جاتے ہیں ان میں داڑھی سب سے پیش پیش ہے۔ اس گفتگو سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ یہ شخص متوازن مزاج اور انصاف پسند ہے۔ انصاف پسندی اور توازن کی

لے اس سلسلے میں یہ بیان کر دینا مناسب ہوگا کہ [illegible] کا ایسا شعور نہ تھا۔

ایک اور اہم شہادت جو میرے سامنے آئی اس نے بھی مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔ ان دنوں میرے دل میں مسلم لیگ کے لئے دبی دبی سی ہمدردی موجود تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ چند دوستوں کی صحبت بخشش نے خاکسار تحریک کے بارے میں کچھ جاننے اور سمجھنے کی تڑپ پیدا کر دی تھی۔ مودودی صاحب سے کسی موقع پر میں نے مشرقی صاحب کے نظریے اور ان کی برپا کردہ تنظیم کے متعلق رائے دریافت کی۔ اس پر ایک طویل سلسلۂ گفتگو ہماری بزم محفل میں چھڑ گیا۔ مولانا نے خاکسار تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ درحقیقت علامہ صاحب نے یورپی فکر اور تحریک کی عمارت اسی فلسفے پر رکھی ہے اور قرآن سے اسلامی اصطلاحات کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مولانا نے مشورہ دیا کہ سنی سنائی باتوں کی بجائے مجھے علامہ صاحب کے اصل لٹریچر کو دیکھنا چاہیے اور خوش اخلاقی سے کوئی رائے قائم کرنی چاہیے۔ کتابیں مولانا کے پاس موجود تھیں۔ میں نے تذکرہ اور اشارات کو میں نے پڑھا۔ ان کتابوں پر مولانا مودودی کے حواشی موجود تھے اور ان کو میں ساتھ ساتھ دلچسپی اور ذوق و تجسس سے پڑھتا گیا۔ ان حواشی میں کہیں کہیں اعتراف اور کہیں تحسین موجود تھی کہیں پر اور اختلاف کا اظہار اور کہیں کہیں غلطی پر سخت گرفت پائی جاتی تھی۔ ان حواشی کو پڑھنے سے مجھے خاکسار تحریک کی ماہیت سمجھنے کے ساتھ ساتھ مودودی صاحب کی سیرت کے ایک اہم گوشے کو بھی زیادہ اچھی طرح جاننے کا موقع ملا۔ میرے سامنے اب تک زیادہ تر ایسے ہی لوگ تھے جو نظریاتی اور سیاسی میدان میں انگریزوں کے خلاف ہوں تو آزادی کے مخالف ہوتے ہیں اور حامی ہوں تو نااہل حامی! لیکن اس میدان میں مجھے پہلی بار ایک نئے کردار سے تعارف حاصل ہوا۔

یہ بات بھی میں نے محسوس کی کہ یہ شخص ایک انداز ساز "قسم" کا آدمی نہیں ہے، نہ جامد اور خشک اور مقفل قسم کی فطرت پر اس کی شخصیت بنی ہے، بلکہ یہ ایک اصول و مقصد رکھنے والے نایاب سرمایہ کار کی طرح بازار سے تیز اپنے کو بچائے رکھتا ہے۔ گفتگوؤں میں معلومات کی روشنی میں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اس نے اب تک صرف مقصد پر قربانیاں دیتے ہوئے کاٹا ہے اور آئندہ اس کے سامنے معاشی مشکلات اور سیاسی مخالفتوں کے سنگین تر مراحل ہیں، لیکن یہ اپنی منزل سے منہ موڑنے والا نہیں ہے۔

مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اس کے سامنے جو کچھ بھی اسکیم ہے (اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی کامل صورت میرے ذہن میں متحقق نہیں ہو سکی تھی) وہ ایک لمبا پروگرام اور نفاذ اخلاق کار اور کسان کا سا صبر چاہتی ہے۔ یہ ہتھیلی پر سرسوں جما کر کام کے نتائج کی فصل جلد از جلد کاٹ لینے والوں میں سے نہیں ہے اور نہ جوشیلے پن کا مریض ہے جو ہماری قوم کا مستقل روگ بن چکا ہے۔

یہ رائے بھی میرے ذہن میں قائم ہو گئی کہ یہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے، اپنے ارادوں میں مخلص ہے اور اس کی متاع فکر و عمل منڈی کا مال نہیں ہے۔

سب سے زیادہ مجھے جس چیز نے متاثر کیا وہ میرے جیسے ایک دیہاتی نوجوان کو جس کا علمی و عملی، دینی یا سیاسی کسی بھی لحاظ سے کوئی مقام نہ تھا، مودودی کی نگاہوں میں ایک اہمیت حاصل تھی۔ میں نے کسی لمحے بھی محسوس نہیں کیا کہ ایک بڑا آدمی کسی اونچے مقام سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ اور بڑے آدمیوں کے بارے میں میرا چلا آرہا اعتقاد، مودودی صاحب کے ہاں قطعی طور پر بدل گیا۔ وہاں بُعد مراتب کے بجائے میں نے قرب و اخوت محسوس کیا۔ یوں یہ حقیقت بھی مجھ پر واضح تھی کہ مولانا "پیرانِ کلیسا" سے مختلف ہیں۔ اور ہر جوانِ اقبال کی "حرفِ مدعا" کی دعا کے ساتھ قوم کی نئی نسل کی طرف روئے سخن رکھتے ہیں۔

الغرض میرے لئے یہ ایک نیا کردار تھا جس کا سمجھنا بڑا ہی مشکل تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا تھا کہ یہ ہمارے مستقبل کا کردار ہے۔ اگلے وقتوں کے لوگوں کے بالمقابل "نئے آنے والے وقتوں" کا کردار تھا۔ یہ کردار مرعوب کن نہیں بلکہ جاذبیت دار تھا۔ اس سے ڈر نہیں آتا تھا بلکہ اس کے لئے محبت و احترام کے جذبات پیدا ہو گئے تھے! ان سارے تاثرات کے ساتھ مودودی کی ذات اور اس کی فکر سے ایک گہرا رابطہ استوار کئے ہوئے میں نے "دارالاسلام" کو الوداع کہی۔

یہی ہے وہ ایک آدمی جس کی شخصیت کا مطالعہ کرنا پیش نظر ہے۔ مطالعۂ شخصیت کا اصل مقصد اس جوہر سیرت کا سراغ لگانا ہے جس کا پودا آدمی کی زندگی کے عمیق ترین گوشوں تک جاتا ہے اور جس کے سرچشمے سے زندگی کی کیاری کا ایک ایک ذرۂ خاک سیراب ہوتا ہے۔ کسی کے جوہر سیرت تک پہنچنے کیلئے جب ہم ذہنی سفر کرتے ہیں تو سب سے پہلے سابقہ "مظاہر شخصیت" سے پیش آتا ہے، اور آگے بڑھیں تو اخلاق و اطوار سے دوچار ہوتے ہیں، اور سب سے آخر میں جا کر نظریات و افکار اور اصول و مقاصد دیکھے جاتے ہیں۔ مولانا مودودی کی شخصیت کے فکری پہلو کو میں نے ایک الگ مضمون میں پیش کر دیا ہے۔ اخلاق و اطوار پر یہاں براہ راست بحث کرنے کا ارادہ نہیں، یہاں صرف مظاہر شخصیت کو پیش کرنا مطلوب ہے۔ "مظاہر شخصیت" سے میری مراد آدمی کے وہ نقوش

لے ملاحظہ ہو "مولانا مودودی ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں"

اسالیبِ اظہار میں جو بول چال، تحریر و تقریر، کھان پان، نشست و برخاست اور "ذوقیات" کے اندر پائے جاتے ہیں اور جن کے ذریعے اس کے ذہن اور اس کی سیرت کی کتاب کو پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی گھر کے جس ماحول میں رہتا ہے، جس جگہ میں بیٹھتا اور جس دفتر میں وہ قلم چلاتا ہے، جس لباس کو پہنتا اور جن اشیاء کو اپنے استعمال میں رکھتا ہے، ان سب پر اس کی شخصیت کی چھاپ پڑی ہوتی ہے۔ کوئی شخص فرنیچر اور دوسرے سامان کو جو ترتیب دیتا ہے، جس ڈھنگ سے وہ خط و کتابت لکھتا ہے، جس طرز پر وہ دستخط ثبت کرتا ہے، اس کے اندر اس کی شخصیت کی روح شامل ہوتی ہے۔ یہ سب مظاہرِ شخصیت[1] ہیں اور ان کا مطالعہ کر کے کسی شخص کے اصل جوہرِ سیرت کی قدر و قیمت مشخص کی جا سکتی ہے اور اس کا اخلاقی مقام متعین کیا جا سکتا ہے، چاہے اس سے ملاقات تک کا موقع نہ ملا ہو۔ آدمی کی داستانِ عمر بھر اس کے ماحول اور اس کے اطوار اور اس کے متعلقات پر کسی پراسرار قلم سے مرقوم ہوتی رہتی ہے۔ مظاہرِ شخصیت کے مطالعہ کے معنی خفیہ رسم الخط میں لکھی ہوئی اسی داستان کو پڑھنے کے ہیں ورنہ بجائے خود معلومات کہ فلاں کیا پہنتا اور کیا کھاتا ہے اور کیسے بیٹھتا ہے اور کیونکر بولتا اور لکھتا ہے، کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتیں اور ان کے حاصل کرنے اور قلم بند کرنے اور دوسروں تک منتقل کرنے میں وقت اور قوت صرف کرنا کسی معقول آدمی کا مشغلہ نہیں ہو سکتا۔

آدمی کا سراپا اس کی شخصیت کا نقش ہوتا ہے اور سراپا کی ایک نظر دیکھتے ہی انسانی کردار کا ایک راز داں اس کے اندر سے جھلکنے والی شخصیت کا مقصود اولیہ پا لیتا ہے۔ مولانا مودودی کا سراپا، بلکہ وجاہت دار چہرہ کسی بھی ماحول میں ہو ——— گھر میں، مجلس میں، دفتر میں، ریلوے اسٹیشن پر، گاڑی کے کسی ڈبے میں، جلسہ میں ——— بالکل ممتاز اور نمایاں رہتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ جس شخصیت کا آئینہ دار ہے اس کے نمونے تقدیر نے بہت زیادہ تعداد میں نہیں بنائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے آغاز میں مولانا مودودی کی ایک قلمی تصویر پیش کر دی جائے۔ یہ تصویر میں اپنے قلم سے کھینچنا چاہتا تھا، مگر اس میں وقت زیادہ درکار ہے۔ وقت بچانے کیلئے میں اپنے صحافی دوست علی سفیان آفاقی کی مرتبہ تصویر مستعار لے لیتا ہوں:-

> "چھوٹے بالوں کے بیچ جن میں درمیان سے مانگ نکلی ہوئی، کھلتا ہوا گندمی رنگ، چوڑا ماتھا، آنکھوں پر ہلکے سے نیلے رنگ کے شیشوں کی عینک،
> (نوٹ ——— مولانا سفید شیشے استعمال کرتے ہیں۔ ن۔ ص)، مضبوط جسم اور مسکراتی ہوئی آنکھیں، چہرہ وجیہ بلکہ، اور سفیدی ڈاڑھی پر
> جہاں تہاں سیاہی کی ترشح!"
> (ابوالاعلیٰ مودودی)[2]

مولانا مودودی ان پر قیمت بیہودہ "گنتی" میں سے ہیں جن کے قامت پر توجہ نہیں جاتی۔ یوں قد بہت چھوٹا نہیں ہے، دوسرے بدن کی وجہ سے قد کو مغالطہ ہوتا ہے لیکن مجموعی ہیئت اس درجہ جاذب ہے کہ مودودی صاحب کے سراپا میں کوئی بات کھٹکتی نہیں۔ وہ بھرے بدن کے باوجود مولانا کی چال ڈھیلی ڈھالی اور بے کار قسم کی نہیں ہوتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی خاص مشن پر جا رہا ہے۔ چال کے بارے میں ابھی دو دن تفہیم القرآن کے حاشیے میں خود مودودی صاحب نے ٹھیک علم کی بات لکھی ہے، ملاحظہ ہو۔

> "مگر غور طلب چیز یہ ہے کہ آدمی کی چال میں آخر وہ کیا اہمیت ہے جس کی وجہ سے اللہ کے نیک بندوں کی خصوصیات گناتے ہوئے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا؟ اس سوال کو ذرا تامل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی چال محض اس کے انداز رفتار ہی کا نام نہیں ہے بلکہ وہ درحقیقت اس کے ذہن اور اس کی سیرت و کردار کی اولین ترجمان بھی ہوتی ہے۔ ایک عیار آدمی کی چال، ایک غنڈے بدمعاش کی چال، ایک

---

[1] کچھ چیزیں ایسی پائی گئی ہیں جو بڑے آدمیوں کے مظاہرِ شخصیت کا جزو بن جاتی ہیں۔ [illegible] اور اس کے نتیجے میں ہر آدمی کے اپنے مظاہرِ شخصیت ایک امتیازی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کسی کی شخصیت کا [illegible] قد و قامت اس کے مطابق نہیں بن سکتے [illegible] اپنے ہی قد و قامت کے مطابق لباس [illegible]

[2] آفاقی صاحب نے سراپا [illegible] جب داڑھی بالکل سیاہ تھی اور [illegible] کشادہ پیشانی والا روشن چہرہ [illegible] عجیب بات ہے کہ مولانا مودودی کی ڈاڑھی کے بال اب تیزی سے سفید ہو رہے ہیں۔ اور اب تو کوئی ہی بال سیاہ رہ گیا ہو گا۔

ظالم و جابر کی چال، ایک متکبر خود پسند کی چال، ایک باوقار و مہذب کی چال، ایک غریب مسکین کی چال، اور اسی طرح مختلف اقسام کے دوسرے آدمیوں کی چالیں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ ہر ایک کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس چال کے پیچھے کس طرح کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ پس آیت کا مدعا یہ ہے کہ رحمان کے بندوں کو تم عام آدمیوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر ہی بغیر کسی سابقہ تعارف کے الگ پہچان لو گے کہ یہ کس طرز کے لوگ ہیں۔ اس بندگی نے ان کی ذہنیت اور ان کی سیرت کو جیسا کچھ بنا دیا ہے اس کا اثر ان کی چال تک میں نمایاں ہے۔ ایک آدمی انہیں دیکھ کر پہلی نظر میں جان سکتا ہے کہ یہ شریف اور حلیم اور ہمدرد لوگ ہیں، ان سے کسی شر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

(ترجمان القرآن۔ ج ۴۲۔ عدد ۵)

میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ مولانا مودودی کی چال یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ شخص احساسِ ذمہ داری کے عالم میں کوئی فرض ادا کرنے جا رہا ہے۔ مگر گھبراہٹ کے انداز سے نہیں، پروقار طریق سے۔ ممکن ہے دوسروں کا تاثر کچھ اور ہو، لیکن اتنا بہر حال ہر کوئی محسوس کرے گا کہ "یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا" کے معیار پر یہ چال پوری اترتی ہے۔

مودودی صاحب کے سراپا کا ایک جزو لباس بھی ہے اور میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ وہ گھر اور دفتر میں رہتے ہوئے کیسا لباس پہنتے ہیں۔ سردیوں میں کھلے پاجامے کے ساتھ دھاری دار قمیص اور اونی سویٹر استعمال کرتے ہیں۔ سر پر گرم اونی ٹوپی پہنتے ہیں۔ پاؤں میں جرابوں کے علاوہ چرمی کے موزے بھی ہوتے ہیں اور [illegible] کا بوٹ جوتا۔ گذشتہ سال سخت سردی پر جانے پر سفید رنگ کی اونی قبا بھی اوڑھ لیتے ہیں جسے زیارت سے آتے ہوئے ساتھ لائے تھے۔ باہر جانا ہو تو تنگ مہری کا چوڑی دار پاجامہ، موسم کے مطابق گرم یا سرد شیروانی اور قراقلی کی بنی ہوئی ایک [illegible] کی سیاہ رنگ ٹوپی استعمال کرتے ہیں۔ گرمیوں میں باہر جانے کا لباس بھی یہی شیروانی سمیت بالکل سفید ہوتا ہے اور غالباً اس لباس میں مودودی صاحب کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔ وضع کیلئے کلائی کی گھڑی اور [illegible] موجود رہتی ہیں۔ لباس کے تنوع کا دائرہ محدود، لیکن شخصیت کی ترجمانی اور زیبائش کیلئے ہمیشہ موزوں رہتا ہے۔ مودودی کے لباس کے اصل اجزا ہیں ـــــ صفائی، سادگی اور حسنِ ذوق!!

آدمی [illegible] نطق سے بڑھ کر اس کا ذریعہ اظہار اور تعارف نہیں ہو سکتا۔ نطق شخصیت کے ہتھیار کی سی صورت ہے۔ سارے جذبات کی اساس کی حقیقت نکل کر جلوہ کی کائنات باہر آتی ہے [illegible] رنگ پایا۔ "تمام ہوا سخن گفتہ" والی بات بجا نہیں ہوتی۔ موضوعات کی پسندیدگی، زبان کا معیار، الفاظ کا انتخاب، لہجہ کا اتار چڑھاؤ، بولنے کی رفتار، آواز کی پستی و بلندی، بات چیت میں جذبات کی آمیزش اور اس کا تناسب، وہ چیزیں ہیں جو پانچ منٹ میں ایک آدمی کی ساری باطنی حقیقتوں کا خود اسی کی زبان کے لاؤڈ سپیکر سے اعلانِ عام کر دیتی ہیں۔ کسی کا ذہنی و علمی معیار کیا ہے، کسی کا ظرف کتنا ہے، کسی کا ذوق کس نوعیت کا ہے، کس میں سنجیدگی کس درجہ پائی جاتی ہے، کوئی کہاں تک بااصول ہے، یہ اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے سوالات ہیں جن کا جواب ایک شخص دو چار فقرے بول کر دے چکتا ہے۔ مگر بسا اوقات خود نہیں جانتا کہ اس نے اپنی کن کن حقیقتوں کو دوسروں کے سامنے رکھ دیا ہے۔

مولانا مودودی کی گفتگوؤں سے میں گزشتہ پندرہ سولہ برس کے زمانے سے بہرہ اندوز ہو رہا ہوں۔ مولانا کے اندازِ گفتگو پر چند باتیں جو مستقل تاثرات کی حیثیت سے میرے ذہن میں موجود ہیں، اس موقع پر بیان کرتا ہوں۔

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ تحریر یا تقریر کے اندر آدمی کا مرتبہ جتنا بلند ہوتا ہے، وہی آدمی نجی زندگی میں گفتگو کرتے ہوئے انتہائی پست ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس کی تحریر و تقریر میں اصول پسندی اور مقصدیت ہوتی ہے، لیکن اپنی گفتگوؤں میں اس کی بے اصولی اور اس کی لامقصدیت صاف صاف نمایاں ہوتی ہے۔ اسی طرح جو تحریر و تقریر میں جو سنجیدگی اور معقولیت کسی کی شخصیت میں محسوس ہو رہی ہوتی ہے، حلقۂ گفتگو کے ماحول میں پہنچ کر وہ ساری کی ساری یک لخت غائب ہو کر رہ گئی۔ تحریر و تقریر میں علمیت و تفکر کے کچھ آثار جھلملا رہے تھے لیکن گفتگو کے دائرے میں سامنا ہوتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ سب کچھ تصنع کی کرشمہ سازیاں تھیں۔ اسی طرح تحریر و تقریر میں زبان کے محاسن موجود تھے لیکن بات چیت میں سب غائب!! الغرض تحریر و تقریر کا آدمی جو سامنے ہوتا ہے وہ بالعموم اس آدمی سے بالکل الگ ہوتا ہے جس سے ہم معاملہ کرتے ہیں، جس کے ساتھ بیٹھتے اور جس سے بات چیت کرتے ہیں۔ لیکن مولانا مودودی اس معاملے میں اپنی مثال آپ ہیں کہ وہ نہ صرف تحریر و تقریر کے دو الگ الگ میدانوں میں ایک ہی سی حالت پر رہتے ہیں بلکہ وہ اظہار کے ان دونوں میدانوں سے اُتر کر جب کبھی عام بات چیت کے نسبتاً محدود دائرے کی طرف چلتے ہیں تو بھی اپنی یکسانی کو برقرار

رکھتے ہیں۔ وہی بلندیٔ افکار، وہی سنجیدگی و وقار، وہی حسنِ گفتار، وہی طرزِ استدلال، وہی الفاظ کا وہی حسنِ انتخاب، ظرافت کی وہی چاشنی، معلومات کی وہی وسعت، وہی بے لاگ منطق، اصولیت کا وہی زور، اور کلام کا وہی مزاج آپ کو معمولاً نشست کی ہلکی پھلکی بات چیت میں بھی ملے گا جو موصوف کی تحریر و تقریر میں پایا جاتا ہے۔

بہت سے لوگوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کے اندر دوسروں کے لئے بڑی زور دار جاذبیت پائی جاتی ہے اور جاذبیت کا یہ اثر ان کی گفتار میں پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔ جاذبیت کیلئے بہت ساری چیزیں تباہ کن ثابت ہو سکتی ہیں۔ مگر ان میں سے ایک سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ ہے آدمی کی خودی کا متورم ہو جانا۔ خودی جب متورم ہو جاتی ہے تو اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کی زبان اور اس کی گفتگو اس کے زہر سے متاثر ہوتی ہے۔ اس عالم میں آدمی کی "میں" کا بوجھ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور وہ ہر موقع پر اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے۔ اپنے آپ کو پیش کرتا ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں پر ٹھونستا ہے۔ اپنے آپ کو بڑا جتاتا ہے۔ اپنے آپ کو بڑا تسلیم کرانا چاہتا ہے۔ لیکن متورم خودی کے بوجھ کو اٹھانے پر کوئی دوسرا تیار نہیں ہوتا۔ لوگوں کو ایسے شخص کی گفتگو سے انقباض ہوتا ہے اور وہ اس کے اردگرد سے چھوٹ چھوٹ جایا کرتے ہیں۔ مولانا مودودی کو اللہ تعالیٰ نے صحت مند خودی دی ہے۔ اس شخص نے اپنے آپ کو دوسروں پر ٹھونسنے اور اپنے آپ کو بڑا منوانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ میں نے بارہ پندرہ برس میں سینکڑوں مجالس میں مولانا مودودی کی گفتگوؤں کو سنا ہے مگر کبھی کسی گفتگو کے دوران میں ایسا نہیں ہوا کہ میرے یا دوسرے ساتھیوں کے ذہن نے مولانا کے انا کا بارِ گراں اپنے اوپر پڑتا محسوس کیا ہو۔ ایک رُخ یہ، اور دوسرا رُخ یہ کہ مودودی کی زبان پر کبھی کوئی فریبکارانہ کلمۂ انکسار بھی نہیں آیا۔ یہ بھی انسانی خودی کا ایک دوسرا رنگ ہے، اور شاید پہلے سے کچھ زیادہ ہی خطرناک۔ مودودی صاحب سے ملنے والوں کو کہیں یہ ابتلا پیش نہیں آتا کہ ایک شخص کی مسلسل سنتے رہیے اور خود ان کو اپنی افتادِ طبع کے اظہار کا موقع نہ ملے۔ یہاں ہر شخص کو بات کرنے کا کھلا موقع ملتا ہے۔ مجلس میں مودودی صاحب کی شخصیت رکاوٹ نہیں بنتی ہے۔ نہ جدید یا قدیم قسم کے مراسم و آداب!

ہمارے معاشرے کی ایک عام روایت بن چکی ہے کہ لوگ اختلافی گفتگوؤں میں خود ہی تُو تُو مَیں مَیں کرتے جھگڑنے پر اتر آتے ہیں۔ ہماری یہ قومی صفت صرف معمولی درجے کے لوگوں ہی میں نہیں، اونچے درجے کے مصنفین، لیڈروں، مدیروں، معلموں، اخبار نویسوں اور مذہبی رہنماؤں تک میں پائی جاتی ہے اور جو جتنا بڑا ہے اس میں یہ خوبی اتنی ہی وافر پائی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں گفتگو کا بنیادی فارمولا یہ ہے کہ اپنی بات دوسرے سے منوا کے چھوڑنا ہے۔ اس کے لئے دو ہی صیغے اختیار کئے جاتے ہیں۔ ایک جو عموماً کم استعمال میں آتا ہے وہ لجاجت کا صیغہ ہے۔ یعنی منت خوشامد کر کے اور اپنے جذبات کے حق میں رحم کی اپیلیں کر کے مخاطب سے کوئی بات منوانا۔ دوسرا صیغہ جو ہمیشہ رضاکاروں اور تو خانوں سے لے کر پارلیمانی ایوانوں تک کثیر الاستعمال ہے، قوتِ غضبیہ کو کام میں لانے کا صیغہ ہے۔ یعنی آپ نے بات کہی، نہیں مانی گئی تو پھر دوبارہ دہرا کر اسے دہرایا، پھر نہیں مانی گئی تو آواز اونچی ہو گئی۔ پھر نتھنے پھولنے لگے۔ ہونٹوں پر جھاگ آنا شروع ہوا۔ گردن کی رگوں کا ابھار بڑھ گیا ———— آخری حد خدا جانے کیا ہو!

مولانا مودودی اختلافی امور پر گفتگو کرتے ہوئے ان دونوں طریقوں سے ہٹ کر ایک تیسرا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کا صیغہ افہام و تفہیم کا صیغہ ہے۔ یعنی مقصدِ کلام دوسرے کی بات کو سمجھ لینا اور اپنی بات سمجھا دینا ہوتا ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ مخاطب مولانا کا سارا استدلال سن کر اپنے موقف سے نہیں ہٹا۔ اسی پر قائم رہا۔ یا مولانا کے مقابلے میں کسی دوسرے عالم یا لیڈر کی رائے کو ترجیح دیتا رہا تو ایسے موقعوں پر مودودی صاحب ہمیشہ ٹھنڈے انداز سے یہ کہا کرتے ہیں کہ "آپ چاہیں تو وہ رائے رکھ سکتے ہیں" ———— اس فقرے نے بارہا مناظرہ پسند لوگوں کی اکڑفوں کو درہم برہم کر دیا ہے۔ حقیقتاً مودودی کو مناظرانہ انداز کی گفتگو سے شدید درجے کی نفرت ہے۔ وہ ایسی گفتگو کو اول تو اپنے خاص حکیمانہ اسلوب سے افہام و تفہیم کے صیغہ پر لانے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر کامیاب ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کسی طرح کامیابی نہ ہو تو پھر "قَالُوْا سَلٰمًا" کی قرآنی ہدایت کے مطابق بہترین "حسنِ فرار" کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

معقول استدلال کو جب کوئی شخص محض کج بحثی اور معاندانہ یا اندھی تقلید کی وجہ سے رد کر رہا ہو، اور اندازہ ہو جائے کہ بار بار ایک ہی دلائل دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تو ایسی صورت میں مودودی صاحب بالعموم صاف صاف اعترافِ شکست کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ "میرے پاس جو دلائل تھے وہ میں نے پیش کر دیئے۔ اگر آپ ان سے مطمئن نہیں ہوتے تو اپنی رائے پر قائم رہیے۔ اور کوئی دلیل میرے پاس نہیں ہے" ———— کم لوگ اس طرح اعترافِ شکست کر

سکتے ہیں۔

ہر لیڈر اور عالم اور بڑے آدمی کو خبطیوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ خبطیوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے خیالات اور جذبات میں توازن نہیں ہوتا اور جن کو اپنے ذہن سے خود آگاہی نہیں ہوتی۔ نہ ان کو اپنے علم و افکار پر کوئی قابو حاصل ہوتا ہے۔

اس طرح کے کج فہم ذہن کے لوگ طرح طرح کے مسائل، قسم قسم کی کہانیاں، رنگ رنگ کی پہیلیاں لے کے مولانا مودودی کو بھی شرف ملاقات سے سرفراز فرماتے رہتے ہیں۔ نوع انسانی کی اس صنف سے اگر آپ بحث کرنے لگیں یا ان کے خیالات کو منظم کرنے کی کوشش کے درپے ہو جائیں یا ان کو آپ ان کے عدم توازن سے آگاہ کرنے کی کاوش میں لگ جائیں تو پھر ان کی طبع اور زیادہ رواں ہوتی ہے۔ پھر ان سے گھنٹوں اور ہفتوں گفتگو کرتے رہیے، بلکہ برسوں مغز لڑاتے رہیے، یہ اسی حالت پر رہیں گے جس پر تھے۔ مودودی صاحب ایسے آدمی کو دو چار باتوں میں پہچان جاتے ہیں اور بڑے بھاری ایثار سے کام لیتے ہیں۔ یعنی اسے کھلا موقع دیتے ہیں کہ وہ بولتا چلا جائے اور خود چپ چاپ بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ کوئی اختلاف نہیں کرتے، کسی چیز کی تردید نہیں کرتے۔ کسی بات پر لقمہ نہیں دیتے، بلکہ سراپا تسلیم و اتفاق" بن کر رہ جاتے ہیں۔ بیچارا خبطی کتنا ہی خبطی کیوں نہ ہو، مقابل سے کسی رد و قدح کے بغیر گھنٹہ دو گھنٹہ مسلسل بولنے کے بعد آخر ہمت ہار دیتا ہے۔ چنانچہ ان اوقات سے مولانا مودودی کو ہم نے خود گزرتے دیکھا ہے اور ہمیں یہ اندازہ ہوا تھا کہ جو شخص اس شہادت گاہ الفت سے یوں گزر سکتا ہے اسے جیل اور پھانسی لغزش نہیں دلا سکتے۔

ہم جتنی مدت سے مولانا مودودی کے ساتھ ہیں دو باتوں کی شہادت ہم پورے وثوق سے دے سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مودودی صاحب کو ہم نے ایک لمحے کے لئے بھی مغلوب الغضب نہیں دیکھا اور نہ آپ کو کبھی غضب آلود الفاظ میں بات کرتے سنا ہے۔ حد یہ کہ جن لوگوں کا نقوش اور الزامات اور گالیوں اور دوسری زیادتیوں کا مولانا کو بحیثیت انسان کے سامنا کرنا پڑا ہے ان کے رد عمل کے طور پر بھی ایسا نہیں ہوا کہ مولانا کی زبان کا معیار پاکیزگی و سنجیدگی اپنی مقررہ حد سے نیچے گرا ہو۔ بہت سارے گھٹیا الفاظ ہیں جو ادب و صحافت کی گفتگوؤں ہی میں نہیں، اخباری کالموں میں بھی ہر روز استعمال کرتے ہیں۔ لیکن مولانا مودودی کے چمنستان تکلم میں ان کا دخل کسی جگہ نہیں ہوتی۔ ان گنت اسالیب ہیں جو ادنیٰ قسم کی جذباتیت نے اپنے اظہار کیلئے وضع کر لئے ہیں اور جا بجا معزز ترین اور شرفا دن رات ان کو استعمال میں لاتے ہیں لیکن مولانا مودودی کے جہان ذوق میں ان کی سمائی قطعاً نہیں! مولانا کے حسن ذوق کا شعور رکھنے والے کسی آدمی کے سامنے آپ کوئی فقرہ ان کے دریافت کریں تو وہ آپ کو بتا سکے گا کہ مولانا یہ لفظ بول سکتے ہیں یا نہیں!

ایک شخص جس کی مادری زبان دہلی کے شریف گھرانوں کی خاص بولی ہو، پھر اس بولی کو سید زادگی کی علمی فضا نے سیراب کیا ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے اسلام کے آداب اخلاق نے ایک خاص مزاج دیا ہو اس سے آپ کس انداز گفتگو کی توقع کر سکتے ہیں؟ ——— حلقۂ یاراں ہو یا مجلس بیگانگاں، سوشل زندگی کے ہیجان ترو تازہ ہوں، یا گھر کی چار دیواری کے اندر کا حلقہ، بیوی بچوں سے ربط ہو یا نوکروں اور ملازموں سے، مولانا مودودی کی گفتگو نفاست، سنجیدگی اور پاکیزگی کے متعین معیار سے کبھی بھولے سے بھی نیچے نہیں گرتی!

مولانا کے انداز گفتگو کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ بڑے جماؤ کے ساتھ ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہیں۔ بقول ملک غلام علی صاحب (مولانا کے خاص معاون کار) اگر کوئی شخص چاہے تو پوری گفتگو صحیح رسم الخط میں قلمبند کر سکتا ہے۔ یہ انداز گفتگو وہی شخص رکھ سکتا ہے جو خفیف، تندی، جلد بازی اور ذہنی اضطرابات سے مغلوب نہ ہو۔ مولانا مودودی جیسی شخصیت کا ایک مستقل ابتلاء یہ ہوتا ہے کہ طرح طرح کے لوگ آ آ کر ذہنی امتحان لیتے ہیں۔ خبطی، ذہنی الجھاؤ کے مریض، خود پسند، تیز زبان، مناظرہ باز، بگڑے ہوئے معتقد، غرضیکہ ہر قسم کی مخلوق ایسے لوگوں کو تختۂ مشق بناتی ہے۔ ایسے لوگ بات کرتے کرتے مخاطب کا ذہنی سکون درہم برہم کر دیتے ہیں اور ان کے مقابلے میں انضباط کو قائم رکھنا معمولی آدمیوں کے بس ہی میں نہیں ہوتا۔ لیکن مولانا مودودی ایسے لوگوں کی گفتگوؤں کے ریلوں کے درمیان سنجیدگی و وقار کی چٹان بنے اپنے مزاج کو قائم رکھتے ہیں۔ غالباً اسی سلسلے کے جذبات انگیز "امتحانات" میں سے ایک وہ تھا جب ایک قادیانی پارٹی مولانا پر تبلیغ کرنے دار الاسلام پہنچی تھی۔ اس امتحان صبر و وقار کے موقع پر میں بھی شریک مجلس تھا۔ گو جو کچھ روداد پہلے سے ملک غلام علی صاحب بیان کر چکے ہیں اس لئے انہی سے الفاظ مستعار لیتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ایک مجلس میں مولانا اور ہمارے سامنے ان لوگوں نے اپنے فن مناظرہ اور علم کلام کے خوب خوب کرتب دکھائے۔ کئی گھنٹے تک گفتگو رہی جس میں سوالات و جوابات کا سلسلہ جاری رہا۔ بیچ بیچ میں کرخت بھی ہو رہی تھی اور غصہ بھی آ رہا تھا۔ کبھی ہمارا جی یہ چاہتا تھا کہ ان سے رخصت اور معافی طلب کی جائے اور کبھی ہم اس پر آمادہ ہوتے تھے کہ انہیں ترکی بہ ترکی جواب دیے جائیں۔ مگر مولانا تحمل سے ان کی باتیں سنتے رہے، انہیں سے جواب بھی دیتے رہے اور حق کو ان پر واضح کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ آخر کار جب مولانا نے دیکھا کہ ہمارا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے تو قادیانی حضرات سے دھیمے لب و لہجہ میں کہنے لگے کہ "میں نے اپنے ساتھیوں کو بڑی محنت سے کافی مدت تک ضبط اور برداشت کی مشق کرائی ہے خطرہ ہے کہ آپ لوگ میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر کر نہ جائیں"۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ بات کام کر گئی یا مبلغین اتمام حجت کرتے کرتے تھک گئے۔ بہرحال اس کے بعد وہ تشریف لے گئے"۔ (مودودی ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں)

جو لوگ مولانا کو دور ہی سے دیکھتے ہیں اور بے تکلفی کے دروازے کے باہر ہی باہر سے چلے جاتے ہیں ان کو ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ مولانا گفتگو اور ملاقات میں بے پناہ قسم کی گرمجوشی نہیں دکھاتے۔ کوئی نیا آدمی ملنے آئے گا تو وہ خوش اسلوبی سے سلام کا جواب دیں گے۔ ہاتھ کی تھوڑی سی ہیئت یا جنبش اور بالائی حصہ جسم کے بالکل خفیف سے جھکاؤ کے ساتھ ہلکا سا مصافحہ کریں گے۔ اور وہ عام مجلس میں اگر بیٹھے تو تھوڑی دیر کیلئے سکوت اختیار کریں گے تاکہ آنے والا کوئی بات کہنا چاہتا ہو تو اسے موقع ملے۔ ورنہ جو سلسلہ چل رہا تھا وہی از سر نو شروع ہو جائیگا۔ ملاقاتی جھجکتا ہی خاص طور سے تو دریافت مدعا کیلئے سادہ انداز میں کہیں گے: "فرمائیے!" یا پھر یہ سوال کریں گے کہ "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" مولانا نے بطور خود کبھی معانقہ نہیں کیا البتہ چاہنے والے پٹھان رفقا اس معاملہ میں کبھی کبھی پیش دستی کر لیتے ہیں۔ ہاں یاد آیا ——— جیل کے زمانے میں تنہائی اور رفقا سے علیحدگی کے ردعمل کی وجہ سے مولانا معانقہ کرنے لگے تھے۔ بعض لوگ مولانا کے طرزعمل کے اس ظاہری پہلو کو سرد مہری سمجھ کر اداس ہوتے ہیں۔ خصوصیت سے پاکستان کے اندر پٹھان اور پاکستان کے باہر اہل عرب اس کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ مولانا کے مزاج کا ایک مجبورانہ پہلو ہے جو علمی کاموں میں انہماک کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس مزاج کی سطح کے نیچے ایک حد درجہ ملنسار آدمی پایا جاتا ہے چنانچہ دارالاسلام سے لیکر اب تک مولانا کا یہ حال ہے کہ وہ رفقا اور ملاقاتیوں سے ملے بغیر اور معمولاً مجلس میں کچھ وقت بیٹھے بغیر رہ ہی نہیں سکتے ——— چاہے کیسے ہی سخت ضروری کام اور اہم معاملات درپیش ہوں۔ وہ "مردم گریز" اور "خانہ نشین" اور "اپنے آپ سے کام رکھنے والے" آدمی ہرگز نہیں ہیں۔ ملنے والوں سے وہ ملتے ہیں اور بات کرنے والوں سے وہ خوب باتیں کرتے ہیں مگر خواہ مخواہ کی زبان چلانے اور گپ اڑانے کی صلاحیت ان میں نہیں ہے۔ پروفیسر ثروت آفاقی کے فلسفے کی رو سے ایسا آدمی مرد ہی نہیں ہو سکتا ———

ہر آدمی اپنے جوہر سیرت کے لحاظ سے اپنا ایک مستقل رنگ رکھتا ہے۔ کسی میں حزن و یاس، کسی میں اضطراب، کسی میں غضب و تنفر، کسی میں شوخی و شرارت اور کسی میں سنجیدگی کا بنیادی رنگ نمایاں دیکھتے ہیں۔ مولانا مودودی کا رنگ جمعیت و وقار کیساتھ شگفتگی کے امتزاج سے بنتا ہے۔ بعض شخصیتیں جو علمی تحقیق اور فکری کاوشوں میں جھونک دی جاتی ہیں بالعموم شگفتگی کا جوہر کھو بیٹھتی ہیں اور ان کی سنجیدگی آخر کار خشونت بن کر رہ جاتی ہے۔ دوسری طرف شگفتگی کا جوہر جن اشخاص میں اپنی حدود پھاند جاتا ہے وہ وقار کا رنگ کھو بیٹھتے ہیں۔ مودودی کی شخصیت دونوں جوہر صحیح تناسب کے ساتھ اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اس سے حسنِ اعتدال ضائع نہیں ہوتا۔

مولانا مودودی پر متانت و وقار گویا لوگوں سے ملنے ملانے سے ساختہ پن رہا۔ لیکن تفریح اور بے تکلفی کے خاص الخاص لمحات میں بھی دامنِ وقار ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ اسی طرح جب میں پچھلی تاریخ کو دیکھتا ہوں تو بے شمار واقعات ایسے سامنے آتے ہیں جو ایک پیکر خاکی کے لئے پوری طرح غارت سکون ہونے جا سکتے تھے اور ان کا اثر لازماً مودودی کے دل و دماغ پر پڑا ہوگا ——— بلکہ کبھی کبھی تو ہم قریبی ساتھیوں کو ان پر دکھ بھی ہوتا ——— لیکن نازک ترین اجتماعی مواقع میں، مجالس گفتگو میں اور سیر کے اوقات میں جب بھی سامنا ہوا تو ہمیشہ ایک ایسا چہرہ سامنے آیا جس پر گویا ایک غیر مرئی تبسم کی افشاں چھڑکی ہوئی ہو۔ مضمون نگاری اور مصنفانہ کاوش کے لمحات ہوں، جماعتی دفتر کی مسائل کی پیچیدگیوں کا دور ہو، مخالفین کی شرارتوں اور اپنوں کی نادانیوں سے

ساتھ ہو۔ کسی بھی حال میں اس پر سے ان کی شگفتگی کا رنگ نہیں مرجھایا۔ یہ شگفتگی گفتگو میں ہلکے پھلکے مزاح کا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ بے جا نہ ہوگا اگر یہاں چند مثالیں بیان کر دوں، جن سے مولانا کے مخصوص اسلوبِ مزاح کا اندازہ ہو سکے گا۔

ایک مذہبی حلقے کے بزرگ اپنے اخبار میں کئی برس سے مولانا مودودی پر خدا واسطے کی عنایات فرماتے رہتے ہیں۔ ایک صاحب نے کسی مجلس میں مودودی صاحب سے کہا کہ ایک مرتبہ آپ ان کے بارے میں بھی کچھ لکھتے تو مناسب ہوتا۔ میں ان سے بالکل واقف ہی نہیں۔ مودودی صاحب دھیمے انداز میں کہنے لگے "میں نے ان کی شخصیت کا خوب اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ ان میں جوہر کہیں نہیں ہے، بس زیر و زبر ہی زیر و زبر ہے۔"

مرکز کی گاڑی کی چھت پر سامان رکھنے کیلئے ایک مربع شکل کا جنگلہ لگا لیا گیا ہے۔ یاد نہیں کب کی بات ہے، ہم مولانا کے ساتھ گاڑی کے انتظار میں لاہور کی کسی سڑک پر کھڑے تھے، دور سے اسی رنگ اور ماڈل کی کوئی گاڑی آتی دکھائی دی۔ کسی نے کہا کہ لیجئے گاڑی آگئی۔ مولانا نے ایک نگاہ ڈالی اور کہا نہیں ———— اس کے سر پر وہ طرۂ کشتی نما تاج نہیں ہے۔

قیوم خانی دور میں پشاور جانے کے لئے مولانا مودودی گاڑی کے انتظار میں ہم کو ساتھ لئے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ اور جماعتی اور سیاسی امور پر بڑی اہم گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب میری توجہ کی زد میں آگئے جو ہمارے پیچھے پیچھے چلتے اور پھر جب ہم ایک سرے پر پہنچ کر مڑتے تو وہ پھر پیچھے ہو لیتے۔ گفتگو میں احتیاط کی ضرورت واضح تھی، مگر مولانا ساتھ لگے ہوئے ساتھی سے بے خبر تھے۔ میں نے توجہ دلانے کی مختلف تدبیریں سوچیں، مگر بالآخر "[illegible]" ہی اختیار کرنا پڑا۔ انگریزی میں کہا: "There is a fifth person behind us." (دراصل ہمارا گروپ چار افراد پر مشتمل تھا)۔ مولانا نے برجستہ کہا: "نہیں۔ کہنا چاہئے: a fifth-columnist"۔

ماہر القادری صاحب نے اپنے ایک مضمون میں ایسا ہی ایک مزاح آمیز نکتۂ لطیف درج کیا ہے۔ جس زمانے میں علماء کرام دستوری رپورٹ پر مشورت کر رہے تھے، ایک صاحب نے پوچھا: "مولانا علماء کی مجلسِ مشاورت کا کیا رنگ ہے؟" فرمایا: "صبغۃ اللہ!"[1]

(ماخوذ از "مودودی —— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

۱۹۴۸ء میں پہلی گرفتاری سے کچھ ہی قبل مولانا نے لائل پور اور جھنگ کا سفر کیا تھا۔ بہت سے لوگ ساتھ تھے، میں بھی تھا۔ ایک مقام پر کار کسی ضرورت سے رک گئی۔ چودھری محمد اکبر صاحب ضرورت کے بعد [illegible] کر کے لوٹے تو مولانا نے پوچھا: "کیا پانی کہیں سے مل گیا ہے؟" چودھری صاحب نے کہا: "نہیں دوسری طرح کام چلانا پڑا۔" مولانا نے فرمایا: "اچھا تو یوں کہئے کہ ڈرائی کلیننگ کی ہے۔" (ماخوذ از "مودودی —— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

مرکز کی گلی فیروز پور روڈ سے جہاں ملتی ہے پہلے وہاں نشیب تھا۔ بعد میں مٹی ڈال کر راستہ اونچا کیا گیا جس کی چوڑائی بہت کم تھی۔ ایک دفعہ کہیں سے گاڑی پر آ رہے تھے تو ڈرائیور نے جب گاڑی کو گھمایا، مولانا نے کہا: "دیکھنا بھئی! احتیاط سے! کہیں فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ نہ ہو جائے"[2] (ماخوذ ایضاً)

ایک لطیفہ ———— جو ہے تو بڑا چٹ پٹی قسم کا، لیکن شاہکار درجے کا ہے، اسے دبا نہیں رکھا جا سکتا۔ ایک موقع پر مولانا کی طرف سے چائے دی گئی، بسکٹ اور پیسٹری ساتھ تھی۔ مولانا نے باقر خاں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: "افسوس ہے کہ ہم باقر خانی کا انتظام نہ کر سکے۔" ———— خوب قہقہہ ہوا۔ (ماخوذ ایضاً)۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس لطیفہ کی موجد اوّل بیگم ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحومہ تھیں۔ ایک بار انہوں نے باقر خاں صاحب سے پوچھا تھا کہ "آپ کی باقر خانی کا کیا حال ہے؟"

زمانۂ جیل کے لطائف میں سے ایک اور شاہکار عرض ہے جو حسنِ تشبیہ کا بھی ایک نادر نمونہ ہے۔ مولانا ظفر علی خاں اپنی رہائی کے لئے [illegible]

---

[1] مسلم ہستی کے رنگ کے بارے میں آیتِ قرآنی ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (ترجمہ: "یہ اللہ کا رنگ ہے ——— اور اللہ کے رنگ سے اور کس کا رنگ بہتر ہو سکتا ہے؟")

[2] آیت ہے: وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ۔

بے چینی سے منتظر تھے اور کبھی کبھی مولانا سے ملتے تو پاؤں دبایا کرتے اور ان کی گفتگو سے کچھ سرمایۂ تسکین حاصل کرتے۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ اب مولانا مودودی کی اسارت کا تسلسل مولانا اختر علی خاں اور بعض دوسرے احباب کی رہائی میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اسی حقیقت کو مودودی صاحب نے ایک لطیفہ میں یوں کہا: "بات یہ ہے کہ گلی میں ایک ٹرک پھنس گیا ہے اور اس کے پیچھے کاریں، بیل گاڑیاں، تانگے سبھی رکتے جا رہے ہیں اور پورا ٹریفک جام ہو گیا ہے۔ ٹرک نکلے تو ٹریفک رواں ہو"

لطائف تمثیل و تشبیہ کے سلسلے میں دو تین چیزیں اور قابل ذکر ہیں۔

اضطرابات پنجاب ۱۹۵۳ء کی تحقیقاتی عدالت میں ایک تحریری بیان میں مولانا نے اپنی پوزیشن کو حکومت کی زیادتی کے بالمقابل واضح کرنے کیلئے ہر واقعہ کو یوں بیان کیا کہ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص سڑک سے ہٹ کر کھیتوں میں جا کھڑا ہو اور دوسرا شخص وہاں مورچے جما کر اس کو گھیر لے۔ ایک فقرے میں پوری تصویر آ جاتی ہے۔

مولانا کو پتھری کی تکلیف ہے۔ کسی نے آپریشن کرانے کا مشورہ دیا تو کہنے لگے: "ایک بار آپریشن کرا چکا ہوں، کیا کروں کہ میرے جسم میں پتھر بنانے کی مستقل فیکٹری کام کر رہی ہے"۔

اضطرابات پنجاب ہی کے سلسلے میں مولانا نے ۶ مارچ کو جو اخباری بیان دیا تھا اس میں ایک جملہ تھا کہ اس حکومت میں اب ایک آدمی بھی ایسا نہیں رہا جو ایک قلعہ دار کی سطح سے بلند سطح پر سوچ سکے ——— یہ الفاظ میں شہری آزادیوں کی پامالی، جمہوری اصولوں سے بے نیازی، دھاندلی اور قوت کے بے جا استعمال اور سیاسی سمجھ بوجھ اور صبر و تحمل سے بالاتر ہو کر انتہائی اقدامات کرتے چلے جانے کی پوری تاریخ بیان ہو گئی جو پاکستان بننے کے بعد سے تسلسل و تواتر سے جاری تھی۔ ایک لفظ قلعہ دار کے لطیف تمثیلی استعمال کو دیکھئے!

"جماعت کی تاریخ اور لائحہ عمل" میں ایک مقام پر یہ واضح کرتے ہوئے کہ ہماری اصل کشمکش اشتراکیت، مغربی الحاد، اور فرنگی ولایتیت کے خلاف ہے، جماعت کے خلاف مہم چلانے والے دینی حضرات کے بارے میں لکھا ہے کہ "علماء کی اسلامی فوج کے دستے یا تو بیچ میں لڑتے ہوتے ہیں یا کہیں بیکار کھڑے کئے گئے ہیں"۔

ایک خاص عرصہ کے اندر مولانا مودودی دستوری مہم کے سلسلے میں کام کرنے کا نقشہ مجلس شوریٰ کے مشورے سے تیار کر رہے تھے۔ رفقاء نے خطرات کی طرف اشارہ کیا۔ مسکرا کر فرمایا: "سانپوں سے کھیلنا ہمارا کام ہے ——— داؤ ٹھیک پڑ گیا تو کامیابی، ورنہ پڑا تو ڈسے جانے کا خطرہ واضح ہے"۔

ماہر القادری صاحب کا بیان کردہ ایک لطیفہ اور ہے، جی چاہتا ہے کہ اسے بھی بیان کیا جائے: "مولانا نے اپنے صاحبزادے (غالباً فاروق نام تھا)[1] کو کراچی میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن ہم تینوں موٹر میں جا رہے تھے۔ مولانا کے صاحبزادے ان سے مشینوں اور کل پرزوں کا بار بار ذکر کرتے تھے۔ میں نے کہا ان کو اس فن سے بہت دلچسپی ہے۔ مسکرا کر بولے: باپ مولوی، بیٹا لوہار!"

("مودودی ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں")

سود حصہ دوم میں اشتراکیت پر تنقید و بحث کرتے ہوئے اس کی آہنی ڈکٹیٹرشپ کے بارے میں دو تین صفحے کا ایک نوٹ لکھا ہے۔ اس نوٹ میں مذکور ہے کہ جب کوئی کارکن اپنے گھر میں بیٹھتا ہے تو اس کی بیوی بچوں تک میں یہ ڈر ہوتا ہے کہ پکڑا گیا .... ایک روز یکایک ایسا ہوتا ہے کہ اس کا بھیجا ہوا پارسل واپس آگیا ہے۔ یہی یہ اس امر کی اطلاع ہے کہ اس کا خاوند یقین کو پیارا ہوا .... اس کا فرض ہے کہ اچھی کامریڈ کی طرح اس معاملے کا جواب تک منہ سے نہ نکالے[2]۔ ——— "یقین کو پیارا ہوا" اور "کامریڈ" کی لطافت اس نوٹ پر ہر صاحب ذوق کو محسوس ہوگی۔

ہاں، وہ بھی تو ایک دلچسپ چیز تھی۔ دارالاسلام کے دور میں ایک مرتبہ ترجمان القرآن کا ذخیرہ لاہور سے بذریعہ ریل گیا تھا۔ مرنا اسٹیشن سے اسے دو فرلانگ دور لے جانا تھا۔ بالعموم حمالی کا کوئی قابل حصول انتظام تھا نہیں۔ اس لئے ہم سب مدیر ترجمان القرآن سمیت اس مہم کو نکلے۔ کرسیاں، میزیں

---

[1] مولانا کے صاحبزادوں کے ناموں میں فاروق تو گویا مسلسل روایت آتا ہے (یعنی احمد فاروق، عمر فاروق، خالد فاروق وغیرہ)

[2] پہلے یہ باتیں مبالغہ آمیز معلوم ہوتی تھیں اور ان کو پروپیگنڈہ قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا تھا، لیکن اب خود خروشچیف اور بلگانن کے بیانات ان کی صداقت ثابت کر رہے ہیں۔

اور دوسری چھوٹی چیزیں تو ایک ایک دو دو آدمیوں کے ذریعے جا سکتی تھیں، البتہ ایک بڑی الماری کا بوجھ "اجتماعی طور" پر اٹھایا جاتا تھا۔ سامنے کئی آدمی باری باری کندھا دیتے ہوئے لے چلتے جن میں خود مولانا مودودی بھی شامل تھے۔ وہ کبھی ادھر سے سنبھالتے، کبھی ادھر سے سہارا دیتے۔ اس موقع پر خوب کہا کہ "عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"۔

بے شمار یاد رہ جانے والے اور بھول جانے والے لطائف و نکات میں سے چند چیزیں ہی اس وقت عرض کی جا سکیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مودودی کی شخصیت کے عناصر ترکیبی میں شگفتگی کا کیا مقام ہے۔ اور اس کی اصل تصویر ان ڈراؤنی تصویروں کے مقابلے میں کیسی ہے جن کو دوسری وضع کے بعض معتقدوں نے مرتب کیا ہے۔ ان ڈراؤنی تصویروں کے ذریعے جن لوگوں نے مودودی کو دیکھا ہے ان کی نظر میں ایک ایسا کٹھ ملا اور ایک ایسا مجسمۂ خشونت بسا ہوا ہے کہ بسا اوقات وہ اس کی وجہ سے ڈرپوک بچوں کی طرح راتوں کو چونک چونک اٹھتے ہیں۔

ایک صاحبِ دعوت کی رائے ہے کہ اس دور میں یہ بہت بڑی کمزوری ہوگی کہ وہ قلم سے جادو نہ کر سکتا ہو اور کاغذ کے میدان میں تگ و تاز نہ دکھا سکے۔ وہ لیڈری جو محض زبان کے چٹخارے پر چل جاتی تھی اس کا دور بھی گزر چکا۔ ایسے بہت سے خطیبِ زباں آج داستانوں میں زبان والے دور دراز گوشوں میں پڑے ہیں۔ یہ لوگ کاغذ کے میدان میں ہار گئے۔ کیونکہ یہ دور جس قسم کی فکری غذا کا طالب ہے اور جس ڈھنگ کی زبان کا محتاج تھا وہ فراہم نہ تھی۔ تقریر کی لیڈری آسان ہے، تحریر کی لیڈری مشکل ہے۔ مولانا مودودی جس دعوت کو لے کے اٹھے ہیں وہ زبان و قلم دونوں کے استعمال کے بغیر اپنا راستہ نہیں نکال سکتی۔ خدا کی عطا ہے کہ مودودی کو اس نے قلم کی طاقت سے بہرہ وافر دیا۔

قلم سے آدمی جو کچھ لکھتا ہے، اس کے معانی و مطالب سے قطع نظر، محض لکھنے کا ظاہری اسٹائل اور اس کا رسم الخط بول کر کہہ دیتا ہے کہ لکھنے والا کیا ہے کیا نہیں ہے۔ آدمی کی ہر تحریر میں خواہ وہ ایک سطر ہی کی کیوں نہ ہو اس کا اپنا ہاتھ اور اس کا اپنا قلم اس کی شخصیت کے احوال پنہاں کاغذ پر نقش کرتا چلا جاتا ہے۔ ہماری تحریریں گویا ہماری خود نوشت سوانح عمریاں ہیں ——— معنویت کے اعتبار سے بھی اور ظاہری انداز کے اعتبار سے بھی۔ چنانچہ نفسیاتی مطالعہ و تجزیہ کا فن اب یہاں تک ترقی کر چکا ہے کہ ماہرین ایک آدمی کے اپنے لکھے ہوئے نام، پتے یا دو چار سطروں کے مشاہدہ سے اس کے احوال و اخلاق کے تمام مخفی پہلو سامنے لا رکھتے ہیں اور ان کے اندازے بالعموم اتنے ہی قیاسی فیصلے صحیح نکلتے ہیں۔

اسی نقطۂ نظر سے مولانا مودودی کی تحریر کا ایک ہلکا سا جائزہ لینا مقصود ہے۔ یعنی ہم ان کی تحریر کی ادبیت اور اس کی فصاحت و بلاغت پر نہیں بلکہ اس کے ظاہر پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

مولانا مودودی کے لکھنے کا ہمیشہ ایک خاص ماحول ہوتا ہے۔ ان کا لکھنے کا کمرہ ——— جو دفتر بھی کہلاتا ہے ——— دوہری دیواروں پر مشتمل ہوتا ہے، اینٹ گارے کی دیواروں کی اندرونی جانب ایک چار دیواری الماریوں کی ہوتی ہے۔ جن میں دینی اور عقلی علوم کی کتابیں مولانا مودودی کی جائے نشست کے چاروں طرف صف بستہ حاضر رہتی ہیں۔ ایک طرف اگر مستقل جلدوں کی قطار ہے تو دوسری طرف انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی بٹالین کھڑی ہے۔ اس ہاتھ بخاری اور اس کی شروح ہیں تو اُس ہاتھ دستوریات اور معاشیات پر اچھی اچھی انگریزی کی کتابیں ہیں۔ ادھر اگر اسلامی تاریخ پر بیش بہا قدیم عربی لٹریچر ہے تو ادھر یورپ کی مذہبی اور سیاسی تاریخ سے متعلق انگریزی زبان میں جدید لٹریچر آراستہ ہے۔ اسی الماری میں قرآن کی بھاری بھرکم تفاسیر ہیں تو اسی الماری میں بائبل سے متعلق بیسیوں وزنی تحقیقات موجود ہیں۔ کہیں فقہ اسلامی کی مستند کتابیں بھی ہیں تو کسی دوسری جگہ انگریزی دور کے قوانین اور جدید جدید تصانیف موجود ہیں ——— وہاں ابن خلدون جلوہ فرما ہیں تو یہاں افلاطون۔ وہ ابن تیمیہ ہیں تو یہ کارل مارکس۔

لکڑی کے قرینے سے مرتب کی ہوئی کتابوں کی اینٹوں سے جو چار دیواری چنی ہے اس کے درمیان ایک بھاری میز بچھی ہوئی ہے۔ اس بھاری میز پر بائیں جانب کاغذات رکھنے کا چھوٹا سا خانہ دار ریک پڑا ہے۔ ریک کے ساتھ چند کتابیں قطار میں کھڑی ہیں۔ دائیں جانب تازہ آئی ہوئی کتابیں، مسودے، پروف، خطوط وغیرہ رکھے ہیں۔ سامنے ایک لمبا چوڑا گتہ بچھا ہے اور اس پر لکڑی کا زیرِ مشق نشست کے بالکل سامنے دھرا رہتا ہے۔ اس تختۂ نوشت کے

ساتھ لگے ہوئے کلپ نے کاغذ کے تراشے اپنے بھینچے ہوئے ہونٹوں میں پکڑ رکھے ہیں۔ اس سے آگے ٹیبل پالش کیا ہوا قلمدان، دو پیپر ویٹ، ایک گوند دانی، لفافے کا پیڈ، ایک پن گیر، ایک خاکستر دان، ایک ٹفتی —— مکمل سیٹ —— ترتیب سے رکھا ہوا ہے۔ دو تین شیشے کے پیپر ویٹ بھی کاغذات پر رکھے ہیں۔ ان چیزوں کو آپ ہمیشہ ترتیب میں رکھا پائیں گے اور ان میں سے ہر چیز کی ایک جگہ ہمیشہ متعین رہے گی۔ ملاقاتی اور رفقائے کار اس ترتیب کو بدل دیتے ہیں تو ان کے جانے کے بعد مولانا کا ہاتھ سب سے پہلے ان کو ان کی اپنی صحیح جگہ پر پہنچا دیتا ہے۔ کسی چیز کا بے ڈھنگے پن سے رکھا ہونا مودودی کے ذہن پر فوری اثر ڈالتا ہے۔ کمرے یا برآمدے میں کوئی کرسی ٹیڑھی رکھی ہو، نماز کیلئے بچھنے والی چٹائیاں غیر متوازی ہوں، میز کے کاغذات ترچھے رکھے ہوں، وہ نگاہ پڑتے ہی اپنے ہاتھ سے پہلے اسے ٹھیک کریں گے۔ دو ایک موقعوں پر کسی لپیٹی چٹائیوں کے ترچھے ہونے پر مزاحاً فرمایا: "اس سے بچھانے والے کے ذہن کا ٹیڑھا ہونا واضح ہوتا ہے"۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر مطالعۂ شخصیت کی صلاحیت رکھنے والا کوئی شخص مودودی صاحب کی عدم موجودگی میں ان کے کمرے میں داخل ہو اور اُسے کمرے کا ماحول صرف پانچ منٹ دیکھنے کا موقع ملے تو وہ مودودی صاحب کی آدھی سیرت تو ضرور صحیح صحیح لکھ دیگا۔ اس پرسکون گر خیال انگیز ماحول میں مودودی صاحب سوچتے اور لکھتے ہیں۔ وہ صبح ناشتے کے بعد اپنے وقت مقررہ پر آ کر کرسی پر بیٹھ جائیں گے۔ پان کی ڈبیہ اور بٹوا ساتھ ہوگا۔ پان کھائیں گے اور دماغ میں فکر و کاوش کا پورا کارخانہ متحرک ہو جائے گا۔ بالعموم ان کا چہرہ بتا دیتا ہے کہ اس وقت وہ کسی مضمون یا کسی مسئلے پر کاوش میں ہیں۔ جب پورا نقشہ ذہن میں مرتب ہو چکے گا تو وہ قلم اٹھائیں گے۔ ویسے بھی الل ٹپ انہوں نے کبھی کچھ نہیں لکھا —— بلکہ پہلے سے سوچے بغیر کوئی بھی کام وہ نہیں کرتے۔ کیا عجب کہ وہ سونے اور کھانے کیلئے بھی پہلے سے سوچتے ہوں۔ پورا مواد اکٹھا کر لینے، حوالے جمع کر لینے اور سلسلۂ بحث کی کڑیاں دل ہی دل میں جوڑ لینے کے بعد وہ قلم کو حرکت میں لاتے ہیں۔ یوں سمجھئے خط ہو یا مضمون یا کچھ اور —— پہلے وہ اسے اپنے دماغ کے اوراق پر لکھتے ہیں اور پھر اُس عبارت کو دیکھ دیکھ کر کاغذ پر منتقل کرتے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لکھنے میں بڑی روانی رہتی ہے اور زیادہ قطع و برید نہیں ہوتی۔

مولانا کا قلم بڑا کاغذ خور واقع ہوا ہے۔ ذوقِ نفاست کی وجہ سے وہ ہمیشہ اچھے چکنے اور دبیز کاغذ کو پسند کرتے رہے ہیں اور کئی کئی رِم یک وقت خرید لیتے رہے ہیں۔ مگر اب کاغذ کا قحط —— اور خصوصاً اچھے کاغذ کا قحط —— نایابی کے سبب وہ بات نہیں رہی۔ تاہم اب بھی عمدہ سے عمدہ کاغذ موجود رہتا ہے۔ وہ فل سکیپ سائز کے پورے تختے پر لکھنے کے عادی ہیں۔ کاغذ کی پرچیوں اور چٹھیوں پر کبھی نہیں لکھتے۔

لکھنے سے پہلے وہ شکن ڈال کر داہنی طرف کھلا حاشیہ چھوڑتے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت مولانا کے دو قلمی مسودے ہیں۔ ایک ۱۹۴۱ء کا "تقریر اجتماع شمالی ہند منعقدہ دارالاسلام"، دوسرا ماضی قریب کا "ترجمان القرآن کی ایک سابق اشاعت کے اشارات"۔ دونوں مسودوں کا حاشیہ ڈیڑھ انچ چھوڑا ہے۔ ہمیشہ تقریباً اتنا ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ ۱۹۴۱ء والے مسودے کے ہر صفحے پر پوری اکتالیس اکتالیس سطریں ہیں اور بعد کے مسودے میں سینتالیس سینتالیس —— یہ منظم سطربندی سفید کاغذ پر بغیر زیر مسطر کے، ذہن کی قطعی سی مہارت اور اعصاب پر اس کے انضباط کی دلیل ہے۔ دونوں میں سے کسی مسودے کے اوراق کو ذرا فاصلے پر پھیلا دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک ہی تحریر کی مشینی نقلیں ہیں۔ قطع و برید بہت ہی کم ہے اور جو کچھ ہے بھی اس کا اندازاً نصف حصہ ایسا ہے جو نظرثانی کرتے ہوئے ضروری محسوس ہوا۔ پورے اوراق میں تمام کی تمام سطریں بالکل سیدھی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ بائیں جانب سے عبارت سطر کے آخر تک جا کر انچ کے دسویں حصے کی حد تک نیچے کو جھکاؤ رکھتی ہے۔ ہر پیراگراف واضح طور پر الگ سے شروع ہوتا ہے۔ حروف کی اشکال بالکل یکساں ہیں۔ لکھتے ہوئے شروع سے علاماتِ اوقاف اور واوین اپنی اپنی جگہ پر لازماً موجود ہیں۔ بلکہ الفاظ ضروری حرکات بھی اپنے ساتھ لئے ہوئے ہیں۔ حلقہ دار حروف (مثلاً ص، ق، و وغیرہ) کے حلقے اندر سے لازماً خالی ہیں جیسے کہ ہونے چاہئیں۔ جہاں کسی لفظ کو کاٹا گیا ہے یا کوئی چیز بعد میں بڑھایا گیا ہے وہاں ضرور ہی علامتِ اضافہ (^) دی گئی ہے۔ کٹی ہوئی سطروں کے باوجود بھی اشکال نمایاں ہیں۔

اس طرزِ تحریر کو دیکھتے ہی جو رائے قائم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لکھنے والا بہت ہی متوازن مزاج آدمی ہے اور بڑا پورا احساسِ ذمہ داری رکھنے والا ہے۔

وہ دوسروں کے حقوق اور آرام کا لحاظ رکھتا ہے ۔ اس کی زندگی میں ضبط و نظم اور باقاعدگی ہے ۔ وہ جذباتی آدمی نہیں ہے بلکہ مزاج میں معقولیت اور ٹھیراؤ رکھتا ہے ۔ وہ مستقل مزاج ، صاحبِ عزیمت اور تلون سے خالی ہے ۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے اہم نتائج انسانی شخصیت و کردار کے بارے میں اخذ کر سکتا ہے ۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ ان نتائج کے حق میں پورا پورا استدلال کیا جائے کہ رسم الخط شخصیت پر کس طرح گواہ ہے ۔ مجھے صحافت کے شعبے میں کام کرنے کی وجہ سے قسم قسم کے رسم الخط دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور نئے لوگوں کی طرف سے جو خطوط اور نگارشات موصول ہوتی ہیں ان کے لکھنے والی شخصیت کا اندازہ کر لیتا ہوں اور بسا اوقات لفافے پر لکھا ہوا پتہ دیکھ کر ہی ابتدائی تاثر قائم ہو جاتا ہے ۔ ادبی اور صحافتی شخصیتوں کے رسم الخط کے چند اہم نمونے میری نگاہ میں ہیں ۔ میری شہادت یہ ہے کہ مودودی صاحب کے طرزِ تحریر کے ہم پایہ کوئی دوسرا نمونہ میرے تجربے میں نہیں آیا ۔

تحریر ہی کے سلسلے میں آدمی کے خطوط کا طرزِ انشاء بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ مودودی صاحب کے لکھے ہوئے خطوط دیکھنے کا خاص موقع مجھے حاصل رہا ہے ۔ ایک زمانے میں ترجمان القرآن اور مرکزِ جماعت کی ڈاک کا کام مولانا کی نگرانی میں میرے ذمے رہا ہے ۔ ان کی مستقل عادت یہ ہے کہ وہ ڈاک خود دیکھتے ہیں اور پوری توجہ سے دیکھتے ہیں اور مختلف شعبوں کے ناظمین کی رہنمائی کیلئے نشانات لگا کر مختصراً ہدایات لکھ دیتے ہیں ۔ جن خطوط میں خود ان کو مخاطب کیا گیا ہو یا اسلام یا جماعت کے متعلق اصولی مسائل دریافت کئے گئے ہوں ان کے جواب وہ اپنے قلم سے لکھتے ہیں یا املا کراتے ہیں ۔ یا کم سے کم جوابی مضمون کا خلاصہ اور اس کی ترتیب زبانی بتا دیتے ہیں ۔

اپنے قلم سے لکھے ہوئے خطوط میں مولانا مودودی کی چند مستقل روایات نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں ۔ دونوں حاشیے چھوڑنے اور پیرے بنانے اور علامات لگانے کی پابندی اور سطروں کی سیدھائی اور تحریر کی صفائی خطوط میں اور بھی زیادہ اچھا منظر پیش کرتی ہے ۔ ہر خط کی پیشانی پر تاریخ ضرور درج ہوتی ہے ۔ بلا استثناء تمام خطوط کا سرنامہ "محترمی و مکرمی ! (خواتین کے لئے محترمہ و مکرمہ) السلام علیکم و رحمۃ اللہ" کے الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے ۔ اس کے بعد تقریباً ہر جوابی خط کا آغاز عنایت نامہ ملا سے ہوتا ہے ۔ خاتمہ ہمیشہ "خاکسار ابوالاعلیٰ" کے الفاظ پر ہوتا ہے جو خط کے نیچے بائیں کونے میں اوپر تلے لکھے ہوتے ہیں ۔ خط کا پتہ ہمیشہ بخدمت شریف جناب کے مقررہ الفاظ سے شروع ہوتا ہے اور زیادہ تر تین سطروں میں مکمل ہوتا ہے ۔ شہر یا مقام زیر خط کشیدہ ہوتا ہے ۔ خط کے اس ڈھانچے میں شاید برسوں سے کبھی کوئی تغیر نہیں آیا ۔ بے شمار خطوط کے سابق مطالعہ کی بنا پر میں یہ کہتا ہوں کہ کسی خط میں عشق و محبت اور غیر ضروری طور پر مزاح کا استعمال نہیں ہوتا اور نہ غیر ضروری نفسِ مضمون پر غیر ضروری فقروں کا اضافہ کہیں محسوس ہوتا ہے ۔ خطوط میں مضمون نگاری کے بجائے زیادہ تر گفتگو کا رنگ پایا جاتا ہے ۔ عام گفتگو کا نہیں ، مدلل گفتگو کا ۔

وہ زمانہ جس میں ڈاک میرے سپرد تھی ، بالعموم بعد ظہر میں مولانا کے ہاں جاتا اور کبھی کبھی دفتر میں اور کبھی باہر آم کے بڑے پیڑ کے نیچے نشست رہتی ۔ اہم علمی خطوط کے جوابات مولانا خود املا کراتے ——— کبھی آرام کرسی پر بیٹھے اور کبھی ٹہلتے ہوئے ۔ کبھی کبھی تو مودودی صاحب مجھ سے خطوط پڑھوا کر پہلے سنتے بھی نہیں بلکہ محض یادداشت کی بنا پر بالکل اسی ترتیب سے جوابات لکھوا دیتے جس ترتیب سے خطوں میں سوالات درج ہوتے تھے ——— اور کمال یہ کہ سوالات آیات اور احادیث اور فقہ کے مباحث سے بھی متعلق ہوتے ۔ پھر وہ املا ایسی روانی سے کراتے کہ کسی موقع پر بھی کلام کا تسلسل اور بحث کا ربط نہ ٹوٹتا ۔ یہی نہیں اگر املا کے بیچ میں کوئی صاحب آجاتے تو بعد میں بس اتنا پوچھ لیتے کہ آخری فقرہ کیا تھا ۔ بعض اوقات کچھ خطوط میں اپنی میز پر بھی رکھتا اور ملاقاتی کسی خاص خط کے بارے میں دریافت کرتے اور مجھے یاد نہ ہوتا کہ وہ کہاں پڑا ہے ۔ جبکہ وہ ہفتہ کی پوری ڈاک کے ایک ایک خط کا ان کو مستحضر ہوتا ، یہ خیال رہتا اور اس کا نفسِ مضمون مستحضر رہتا ۔ لیکن سارے خطوط املا ہی نہیں کرائے جاتے بلکہ بعض کے متعلق مولانا صرف اشارات دے دیتے اور ان کو لکھنے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دیتے ۔ اس احساسِ ذمہ داری کی وجہ سے میں بھی پوری کاوش اور محنت کرتا ۔ یہ مولانا کا ایک مستقل طریقِ تربیت تھا ۔

اکثر لوگ شرعی مسائل میں استفتاء بھیجا کرتے ۔ ایسے ہر استفتاء کے جواب میں تمہیداً یا خاتمہ پر یہ ضرور لکھواتے کہ میں مفتی نہیں ہوں ۔ فتویٰ نہیں دیا کرتا ، صرف اپنی معلومات کے مطابق رائے عرض کرتا ہوں ۔ فتویٰ مطلوب ہو تو کسی دارالافتاء کی طرف رجوع کیجئے ۔ اور رائے سننے کی شکل صورت

کے بجائے ان کی اسپرٹ اور مقصدیت کو نمایاں کرتی۔ خاص بات میں نے یہ نوٹ کی کہ مولانا مودودی نے کبھی کسی سوال، اعتراض یا اختلاف کرنے والے کو نفرت اور تحقیر اور غیظ و غضب سے مخاطب نہیں کیا۔ بلکہ ایسی چیزوں کے آنے کو ہمیشہ کام کے حق میں مفید سمجھتے تھے۔ چاہے ان کے الفاظ اور انداز سخت بھی کیوں نہ ہوں۔ البتہ جاہلانہ اور شرپسندانہ ذہن کا انہوں نے کبھی خیر مقدم نہیں کیا۔ ایسے لوگوں کو ہمیشہ نصیحت کرتے کہ مناظرہ بازیاں اور ٹیڑھے سوالات تو حق میں بھی مدد نہیں دے سکتے۔ اختلافی معاملات میں بالعموم یہ لکھ دیتے کہ میرا مطالعہ یہ ہے۔ اب آپ کو یہ فریق حق معلوم ہو تو قبول کیجئے ورنہ جس کی رائے آپ کو صحیح معلوم ہو اسی کو اختیار کیجئے۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں کے متعلق خطوط کو بھی وہ خوش آئند نہیں سمجھتے تھے۔ اور صاف انداز سے لکھ دیتے کہ ان جھگڑوں کے بجائے دین کی اصل حقیقت کو پانے کی ضرورت ہے۔ فقہی اور فروعی اختلافات کے لئے باہم دگر توسع کے ساتھ معاملہ کرنا چاہئے۔ مجھے ایک موقع بھی ایسا یاد نہیں کہ پوری خط و کتابت میں مولانا نے کسی کی تکفیر کی ہو یا تفسیق! ——— بلکہ جواب ترش و تلخ کا مورد یا انداز بھی کبھی اختیار نہیں کیا۔

چنانچہ مجھے ایک حد تک اس خط و کتابت کے زمانے میں مولانا کی سیرت کا دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ واضح مطالعہ کرنے کا موقع مفت میں ملا۔ ساتھ ساتھ میری فکری تربیت ہوتی گئی اور نظام اسلامی سے متعلق عملی کاوشوں کے دروازے مجھ پر کھلتے گئے۔ شاید میرے اسلوب نگارش پر بھی اس دور کا اثر بہت زیادہ پڑا ہو! ——— ہر بڑے آدمی کی طرح مولانا مودودی کو خطوط میں بڑے بڑے قصیدے بھی موصول ہوتے اور کبھی کبھار ان میں گالیاں بھی لکھی ہوئی آتیں۔ مگر نہ کوئی قصیدہ مودودی صاحب کے مزاج پر اثر انداز ہو سکا اور نہ گالیوں کا رد عمل بجز ایک بے نیازانہ تبسم کے کچھ اور میرے سامنے آیا۔ اس ڈاک کے سوا جو علمی مسائل یا جماعتی معاملات سے متعلق ہوتی، بقیہ خطوط کو محفوظ رکھنے کا اہتمام مودودی صاحب نے کبھی نہیں کیا، ورنہ انبار لگ جاتے۔ اہم محفوظ شدہ خط و کتابت اب رسائل و مسائل نامی مجموعے کی صورت میں مطبوعہ ہے۔

ان اشارات سے میں خود نتائج اخذ کرنے کے بجائے یہ کام اس مقالے کے قارئین پر ہی چھوڑتا ہوں۔

ہر صاحب دعوت کو زبان کی طاقت کی ضرورت ہے۔ محض قلم کے بل پر بھی کام کئے جا سکتے ہیں مگر عوام کے قریب ہو کر ان کو کھینچنے اور منظم کرنے اور کسی تحریک کو آگے سے چلنے کیلئے وہ آدمی موزوں نہیں ہو سکتا جو اسٹیج پر گونگا ہو جائے۔ مولانا مودودی گونگے نہیں ہیں، خطیب ہیں۔

میں نے ان کا اولین خطاب دارالاسلام کی مسجد میں جمعہ کے موقع پر سنا۔ ان چند دیہاتیوں کی کثیر تعداد کے اندر تھوڑے سے تعلیم یافتہ لوگ پٹھانکوٹ اور آس پاس کے قصبوں اور شہر جالندھر کی طرف سے آ کر شامل تھے۔ مولانا نے ان دنوں اردو زبان میں خطبات جمعہ کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ (اور اب وہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے)۔ اذان ثانیہ پر وقار سے اٹھے۔ منبر کے (غالباً) پچھلے زینے پر کھڑے ہوئے، آہستگی اور سادگی سے خطاب شروع کیا۔ ——— ایسے جیسے لوگوں سے باتیں کر رہے ہوں۔ یہ سنجیدگی کا ایک بڑا مظہر تھا۔ سیدھے سادے کلمات کا اثر اس خاموش فضا میں پوری طرح نمایاں تھا۔ بعد میں مودودی صاحب نے متعدد مواقع پر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجے کے علمی خطبے دیئے۔ ارکان جماعت کے مختصر اجتماعات میں بارہا تقریریں کیں۔ سوالات کے جوابات دیئے اور ہدایات دیں۔ آہستہ آہستہ ان کی خطابت آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے بہت سے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کی ہیں۔ اور آئے دن یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اب وہ اپنی ذہنیت کے بہت ممتاز مقرر ہیں۔

انہوں نے اپنی دعوت کی ذہنیت کے مطابق خطابت کے ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی ہے اور پرانے خطیبانہ مکتب خطابت سے الگ ہو کر ایک نیا مکتب خطابت استوار کیا ہے۔ مولانا خطابت کو ایک اہم ذمہ داری سمجھتے ہیں اور ضروری قرار دیتے ہیں کہ ایک ایک لفظ پہلے سے غور کرنے کے بعد زبان پر لایا جائے۔ کیونکہ بڑا ہو یا چھوٹا، ان میں ہر ایک کا اچھا یا برا اثر پڑتا ہے۔ اور اس سلسلے میں آدمی کو آخرت کی عدالت میں جواب دہی کرنی ہے۔ بے سلسلہ اور بے ربط اور موضوع سے آزاد ہو کر چھاجوں پانی کی طرح جھاگ اڑا اڑا کر بہنے والی تقریر کو وہ تعلیم و تربیت عوام کے لحاظ سے مضر سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ طرز تقریر ہماری قوم میں کئی پشتوں سے عام طور پر رواج پا گیا ہے۔ اور اس سے سنجیدہ اور فکری دعوت کو جذب کرنے کی صلاحیت کم ہو گئی ہے۔ نیز

خطابتی ساحروں نے اس کا مذاق ضرور بگاڑ دیا ہے۔ لہٰذا اب اسے جوشیلی اور بے ربط تقریروں کی زہر غذا دینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مودودی کے مکتبِ خطابت میں ایسی تقریر کی کھپت نہیں ہے جس میں چٹکلے، لطیفے، کہانیاں، قوالی، سوز، شورش انگیزی، شعر، بیہودہ مدیحہ، ذو معنی اور فلمی دادہ گری کے عناصر پائے جائیں۔ اس مکتبِ خطابت کی تقاریر سادہ، مدلل، سنجیدہ، مدلل اور منطقی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ان کی مدت مختصر ہوتی ہے۔ مودودی صاحب نے عمر میں کبھی کوئی ایسی بے سروپا تقریر نہیں کی جو ایک محدود اور معینہ وقت کی حدود سے آگے بڑھی ہو اور ساری ساری رات جاری رہی ہو، طوفانی لہریں اٹھاتے صبح کر دی ہو جس میں نعروں کی بہار، واہ واہ اور سبحان اللہ کا ہنگامہ، زندہ باد ——— مردہ باد کا شور۔ کہنے کی بات کہی اور اسٹیج سے رخصت ہو گئے۔

تقریر کے اس مخصوص اسلوب کے تقاضے سے مودودی صاحب پہلے سے کئی کئی گھنٹے صرف کر کے تیاری کرتے ہیں۔ سوچتے ہیں، جمع کرتے ہیں، مواد اکٹھا کرتے ہیں، پھر ایک کاغذ پر تقریر کے مطالب کی کڑیاں مختصر اشارات کی شکل میں درج کر لیتے ہیں۔ جب یہ ہو چکتا ہے تو تقریر کے پورے "موڈ" میں آ جاتے ہیں۔ تقریر کرنے سے پہلے کے تھوڑے سے وقفے میں ان کے چہرے پر ایک خاص رنگ پایا جاتا ہے جس کو قریب سے جاننے والے ساتھی ہی پہچان سکتے ہیں۔ اپنے انہی اشارات کے ذریعے وہ اپنی پوری تقریر بعد میں کسی کو بٹھا کر لفظ بلفظ ترتیب سے املا کرا دیتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی تقریر مختلف مقامات پر کرنی پڑی تو بالعموم ہر جگہ الفاظ دہرائے گئے اور اس کی ترتیب میں سرِ مو فرق نہیں آیا۔

اسٹیج پر تقریر کرتے ہوئے ان کا جو کچھ مخصوص انداز ہوتا ہے اس کے امتیازی خدوخال کو میں نے ایک خاص موقع پر تفصیل سے سمجھا۔ ہمارے ایک دوست کرداروں کا ڈرامائی چربہ اتارنے میں ماہر ہیں۔ خصوصیت سے مقررین کا تو وہ ریکارڈ ہی کر کے حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے مجمع کی موجودگی میں ایک مرتبہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ مودودی صاحب کی تقریر کا ریکارڈ سنایا۔ اس ریکارڈ کو سننے کے بعد اب میں با آسانی بتا سکتا ہوں کہ مودودی صاحب کے امتیازات کیا ہیں۔ وہ اسٹیج پر یا روسٹرم کے سہارے کھڑے ہوتے ہیں اور کاغذات سامنے رکھ لیتے ہیں۔ جسم کا بالائی حصہ کسی قدر آگے کی طرف جھکا ہوا ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ ——— عموماً بایاں ——— کمر کے پیچھے رہتا ہے۔ دوسرے ہاتھ سے وہ شیروانی کے تیسرے یا چوتھے بٹن کو ذرا دبا کر پکڑے رہتے ہیں۔ یہی ہاتھ کبھی کبھی بڑی آہستگی سے مختصر سی اشاراتی حرکت کرتا رہتا ہے، جیسے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ یہ حرکت تیز یا سست ہوتی ہے۔ تقریر کی ابتدا دھیمی آواز اور انتہائی ٹھہراؤ سے ہوتی ہے اور الفاظ میں شخصیت کا وزن محسوس ہو رہا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ آواز اور لہجہ چڑھاؤ کی طرف جاتے ہیں، مگر بس ایک متعین حد تک۔ اس حد سے آگے کوئی ایسا جوش نہیں جا سکتا ہے جس کے پیچھے شدتِ جذبات کام کر رہی ہو۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے اور بہت کم دیکھنے میں یہ رنگ آتا ہے۔ تقریر پھر اپنی فطری مقدار اعتدال پر آ جاتی ہے۔ موضوع کے ساتھ ساتھ مودودی صاحب بالکل مستقیم چلتے ہیں اور ادھر ادھر کی آوارہ گردی نہیں کرتے۔ تقریر میں دردمندی کی لہر ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ انہوں نے دستور، آئین، جمہوریت اور انتخابات اور دوسرے اہم اور پیچیدہ مسائل پر جب کبھی خطاب کیا ہے، اپنی بات کو عام فہم بنا کے پیش کیا ہے اور ہر پیچیدگی کا حسن و خوبی سے تجزیہ کر کے غیر تعلیم یافتہ سامعین تک کو متاثر کیا ہے۔ ان کا اندازِ تفہیم اپنی مثال آپ ہے۔

اس طرح کی تحریر نگاری "ادبِ تقریر" — تقریر جس میں مجمع کو اس کی دل پسند دنیا کی جھلکیں دکھلائی جاتی ہوں، وہ دور گزر گئے جب عوام پر اثر ڈالنا اتنا آسان نہیں۔ اس کے لیے مودودی صاحب نے جلسوں اور اجتماعات کی ایک نئی فضا برسوں کی محنت سے پیدا کی ہے۔ پہلے اپنے رفقاء کو اور پھر ان کے ذریعے عوام تک کو ضبط و نظم اور سنجیدگی اور خاموشی کی تربیت دی ہے۔ "تحسین و تالیاں" کا عنصر اجتماعات سے بالکل خارج کر دیا ہے۔ خصوصاً پابندیٔ وقت کے معاملے میں ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ قابلِ ذکر ہے۔ گزشتہ کل پاکستان اجتماع کے موقع پر جلسۂ عام بھی رکھا گیا تھا۔ لوگ آٹھ بجے سے جہانگیر پارک میں جمع ہو چکے تھے اور کچھ ابھی آ رہے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے مودودی صاحب کی تقریر ہونی تھی۔ اگلی صفوں میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے قریب کے دوسرے ساتھی سے پوچھا "وقت کیا ہوا ہے؟" انہوں نے جواب دیا: "ابھی آٹھ بج کر سولہ منٹ نہیں ہوئے۔" ادھر مودودی صاحب کی تقریر شروع ہو گئی۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ کسی مخالف طاقت نے شر پسند عنصر کو تیار کر کے مودودی صاحب کی تقریر میں مزاحمت کرنے اور جلسہ خراب کرنے بھیجا لیکن

جماعت اسلامی کے جلسوں کی سنجیدہ و منضبط فضا اور مودودی صاحب کی شخصیت اور ان کے انداز تقریر نے ہمیشہ ایسی فضول کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ ایسے جلسے میں یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ مولانا مودودی (بلکہ ان کے دوسرے رفقا بھی) اس طرح کے حالات میں کبھی بھی گھبراتے نہیں۔ بلکہ جرأت مندی اور اعتماد کے ساتھ ہر قسم کے حوادث کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور خدا ان کو اس میں بھی کامیابی دیتا ہے۔

جلسوں میں جا کر وہ سوالات کو ہمیشہ خوش آمدید کہتے ہیں۔ چنانچہ چٹوں پر چٹیں آتی ہیں اور ان کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ بڑی حوصلہ مندی سے ساری [illegible] ان چٹوں کو ایک ایک کر کے پڑھتے ہیں۔ اور ایک تقریب میں حاضر دماغی سے ان کے ایسے چٹکلے ہوتے جواب دیتے چلے جاتے ہیں کہ سامعین اش اش کر اٹھتے ہیں۔ مثلاً لائل پور کی تقریر [illegible] میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ جب دوسری پارٹیوں نے مل کر ایک متحدہ صورت اختیار کر لی ہے تو آپ نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کیوں بنائی؟" مولانا نے فوراً جواب دیا کہ "افسوس ہے کہ مجھے ڈیڑھ ہی اینٹ مل سکی، ورنہ میں اس سے بڑی مسجد بناتا۔"

تقریر کے دوران میں اگر گلے کی تکلیف کی وجہ سے، وہ دو تین بار پانی پیتے ہیں۔ نعرے لگائے جانے کو دل سے پسند نہیں کرتے، بس گوارا کرتے ہیں۔ تقریر کرنے کے بعد چند لمحے سستانے کے لئے کرسی پر بیٹھتے ہیں پھر جلد روانہ ہو جانا چاہتے ہیں۔ لیکن لوگ آ آ کر مصافحہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ رفقا راستہ بناتے ہیں اور ان کو جلد از جلد بھیڑ سے نکال لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے مولانا کی ریڈیائی تقریریں بھی سنی ہیں (جو اب مطبوعہ صورت میں ملتی ہیں) عام طور سے یہ ہے کہ مولانا مودودی کی آواز ریڈیو کی ضروریات کے مطابق بہت ہی موزوں ہے۔ آواز بہت صاف سنائی دیتی ہے، اچھی طرح پہچانی جاتی ہے اور تلفظ کی پوری صراحت محسوس ہوتی ہے۔ ریڈیائی تقریروں میں بولنے کی رفتار اکثر اوقات تیز ہی ہے کیونکہ ۱۰، ۱۵ منٹ میں وہ موضوع سے متعلق اپنی پوری بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اب تو مولانا مودودی پر ریڈیو کے دروازے بند ہیں، کیونکہ سیاسی آدمی ہونے کا تصور پاکستان میں ایسا تصور ہے جس کے بعد آدمی سے خالص علمی اور فکری اور دینی استفادہ کا بھی سوال نہیں رہتا۔

سالانہ اجتماع کی تقریر کا بنیادی نقشہ حسب مطالبہ مجلس شوریٰ کے مشورے سے بنتا ہے اور امیر جماعت ——————— خواہ وہ کوئی ہو ——————— اس نقشے کی پابندی کرتا ہے۔ مولانا مودودی اتنی اونچی شخصیت رکھنے کے باوجود اس پابندی سے کوئی استثنا نہیں رکھتے۔ یوں بھی کسی اہم کے سلسلے میں جو اختلافات ہوں، ان کے لئے بھی مجلس شوریٰ ہی کے اندر باقاعدہ مناقشہ چلتا ہے اور تقریر کے اساسی خطوط متعین ہو جاتے ہیں۔ البتہ فوری اور ہنگامی اور متفرق مواقع پر جبکہ جماعت کی پہلے سے بنی ہوئی پالیسی کے اندر کام کرنا ہوتا ہے۔ مولانا مودودی (اور جو کوئی بھی امیر ہو) تازہ مشورے کے بغیر خطاب کرتے ہیں۔ جماعت کا قائد اور داعی اوّل بھی اپنی امتیازی شخصیت کے باوجود جماعت کے نظم کی پابندی سے بالاتر نہیں ہے۔

نماز کے بھی کئی کئی اسٹائل ہیں اور ہر اسٹائل شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ ریاکار آدمی کی نماز اور خدا ترس کی نماز، بے سمجھے بوجھے کی نماز اور شعوری نماز، زندگی سے ہم آہنگی رکھنے والی نماز اور اس سے تضاد رکھنے والی نماز، عجلت باز آدمی کی نماز اور مستقل مزاج شخص کی نماز، عادت کی نماز اور ارادے کی نماز، ناپختہ شخصیت کی نماز اور کسی ممتاز شخصیت کی نماز ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ پہچانی جاتی ہیں۔

مودودی صاحب ہمیشہ پابندی سے مسجد میں نماز باجماعت ادا کرتے رہے ہیں، لیکن اب جب سے پتھری کی تکلیف اور نزلہ کے پے در پے حملوں نے عمر کے تیسرے مرحلے میں آ کر ان کے اعصاب کو صدمہ پہنچا دیا ہے، وہ بیشتر نمازیں مرکز کے لان میں رفقائے مرکز اور ملاقاتیوں سے مل کر ادا کر لیتے ہیں۔ پھر بھی جمعہ کو ضرور محلے کی مسجد (مسجد رسول پورہ، اچھرہ) میں جاتے ہیں۔ ہر قسم کے خطیبوں کے خطبے سنتے ہیں اور ہر سطح کے اماموں کی اقتداء کرتے ہیں۔ اس شخص کو جس کے دوستوں، دشمنوں کے حلقوں میں چرچے ہیں اور جس کے ساتھ حامیانہ یا مخالفانہ دلچسپیاں رکھنے والے ہزارہا انسان بیرون پاکستان کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں، اس کو آپ مسجد رسول پورہ کے کسی کونے میں ایک درویش بے نیاز کے انداز سے بیٹھا پائیں گے۔ اس کا سر جھکا ہوگا اور وہ خطبہ نماز کے

ساتھ سن رہا ہوگا۔ فرض نماز کے بعد دعا ہوتے ہی وہ اٹھتے اور ایک موج نسیم کی طرح غیر محسوس طور پر چلے جاتے۔

دارالاسلام کی مسجد کی امامت زیادہ تر مودودی صاحب کرتے تھے اور اب بھی مرکز میں یا جماعت کے اجتماعات کے موقعوں پر وہی مصلے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ گھر سے وضو کر کے چلتے ہیں۔ سنتیں بھی گھر سے پڑھ کر آتے ہیں اور کبھی مسجد میں پڑھ لیتے ہیں۔ امامت کیلئے کھڑے ہوں تو سیدھے کھڑے ہوتے ہیں مگر مؤدبانہ جذبات قیام کے اسلوب میں صاف جھلکتے ہیں۔ نماز کیلئے استقبال قبلہ کرتے ہیں ان کے اندر ایک خاص طرح کا احساس ذمہ داری پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی نماز ہمیشہ معتدل ہوتی ہے ——— نہ غیر معمولی طور پر طویل، نہ جلد بازانہ ——— سکون اور وقار اور اطمینان ارکان میں شروع سے آخر تک جھلکتا ہے۔ قرأت کا انداز بالکل ہی خاص قسم کا ہے۔ ایک ایک آیت الگ الگ کر کے اور اس کے اجزائے مطالب کو واضح کرتے ہوئے قرآن پڑھتے ہیں۔ لہجے میں ٹھیک معانی مطالب کے مطابق اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ وہ تو مصنوعی لہجے سے گریز کرتے ہیں اور نہ بے ڈھنگے طریق سے عبارت کی طرح آیات پڑھتے ہیں۔ کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے اور وہ ساتھ نماز پڑھنے والوں پر اثر انداز ہوتی ہے کہ جیسے کائنات کے فرمانروا کی خدمت میں کھڑے ہیں اور اپنے جذبات پیش کر رہے ہیں اور اُدھر سے لطف و عنایات طلب کر رہے ہیں۔ مودودی کی نماز میں وہی کیفیت پائی جاتی ہے جو ان کے کل کام میں ہے۔ اس میں دلوں کو چونکا دینے والا وہ جمود نہیں ہوتا جو ہماری نمازوں پر روح دوران سے پرتو افگن ہے اور جس کی وجہ سے اصل تو نماز کی طلب ہی ختم ہو گئی ہے۔ اور اگر اپنے آپ کو گھسیٹ کر لے جایئے بھی تو اکتاہٹ اور اوس پڑ جاتی ہے۔ فرض پڑھنے کے بعد مختصر سی دعا ہوتی ہے اور امامت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سنتیں پڑھ کر مولانا مودودی بھی جائے نماز سے الگ ہو جائیں گے اور دوسرے لوگ بھی منتشر ہونے لگیں گے۔ مودودی صاحب نوافل مسجد میں نہیں پڑھتے کیونکہ قرآن و حدیث کے مطابق ان کا نظریہ یہ ہے کہ فرائض اجتماعی طور پر اور نوافل اخفاء کے ساتھ ادا کرنے چاہئیں۔ مودودی صاحب کی نماز اور امامت نہ بے جا طور پر طویل ہوتی ہے نہ بے ڈھنگی اور بے کیف۔ بلامبالغہ عرض کروں گا کہ پہلی نماز جو میں نے مودودی صاحب کے ساتھ ادا کی اس کا ذائقہ پہلے کی تمام نمازوں سے مختلف تھا۔ اس امامت میں نئی شخصیت جلوہ گر تھی۔ نماز اور قرأت کا یہ خاص اسلوب میں نے پہلے بھی اور بعد میں بھی کسی دوسرے میں نہیں پایا اگرچہ دوسرے حضرات کی نماز و امامت میں بھی طرح طرح کی خوبیاں اور اثر انگیزیاں محسوس ہوئی ہیں۔ نماز کی اصل میں تقویٰ نماز بنتا ہے اور تقویٰ نماز تصور حیات پر مبنی ہوتا ہے۔ مودودی صاحب کی نماز میں ان کا انقلاب آموز تصور حیات طاری و ساری رہتا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ چیز صرف نفسیاتی و روحانی تجربہ سے تعلق رکھتی ہے اور مقالہ کی تنگی اس کی متحمل نہیں ہے۔

دارالاسلام میں میں نے دوسرے رفقاء کے ساتھ مولانا مودودی کے حلقۂ درس میں قرآن اور حدیث کا جو مطالعہ کیا ہے درحقیقت اس نے میرے ذہنی سانچے کو بڑی حد تک توڑ پھوڑ کر موجودہ شکل دی ہے۔ مسلسل پانچ برس یہ حلقۂ درس ایک استاذی مرتبی کے سے انداز پر جاری ذہنی و اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ درس بہت جگہ ہوتے ہیں، بہت سے بزرگ درس دیتے ہیں، لیکن مجبوراً پھر وہی کہنا پڑتا ہے کہ مودودی صاحب کے درس کا انداز بھی بالکل مختلف پایا۔

طریقہ یہ تھا کہ نماز فجر یا نماز عصر کے بعد تمام لوگ حلقہ زن بیٹھ جاتے اور اپنے اپنے مصحف سامنے رکھ لیتے۔ اکثر اوقات ہم لوگ پہلے سے درس میں آنے والے حصہ کا مطالعہ کر لاتے اور اس کے بارے میں سوالات اور الجھنیں نوٹ کر لاتے۔ مولانا ہلکی آواز سے تعوذ اور تسمیہ کہہ کر آغاز کرتے پھر گزشتہ سلسلہ کلام کو خلاصۃً چند جملوں میں مستحضر کر دیتے، پھر اگلی آیات کا معنوی ربط سامنے لاتے۔ اس کے بعد ایک ایک آیت پڑھتے، اس کا سادہ مگر جامع اور اثر انگیز اور جدید اردو میں ترجمہ کرتے، پھر خاص خاص اصطلاحی کلمات کی وضاحت کرتے۔ جو مغالطے متعلقہ مضمون کے بارے میں عام طور پر پائے جاتے ہیں ان کو صاف کرتے اور آخر میں احکام اور تقاضے واضح کرتے۔ پھر اگلی آیت، پھر اس سے آگے ——— اور اسی طرح تقریباً ایک ڈیڑھ رکوع ہر نشست میں ہو جاتا۔ اس درس میں کبھی بھی صرف و نحو اور منطق اور بلاغت کی ٹیکنیکل بحثوں کا پرتو ہم پر نہ پڑنے دیا۔ ان کا

اسلوب عام آدمی ——— خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوان ——— کو سمجھانے کا تھا اور اسی کی ذہنی سطح، دلچسپی اور الجھن کو پیش نظر رکھتے ہوئے بحث سے جدید علوم اور جدید مسائل کا اگر کچھ بھی تعلق ہوتا تو ساتھ کے ساتھ ان پر مختصر گفتگو کرتے۔ نیز مختلف فقہی نقطہ ہائے نظر کو مختصراً سامنے رکھ دیتے۔ صاحب درس کے سامنے اصل نصب العین یہ تھا کہ شرکاء اپنے اندر قرآن کا انسانِ مطلوب پیدا کریں اور درسِ حدیث کے ذریعے اس کے تفصیلی خدوخال نمایاں کریں۔

درس کی ایک ایک آیت اور حدیث پر ہر مرحلے میں سوالات کی بوچھاڑ شروع ہوتی۔ سوالات ہر قسم کے ہوتے تھے۔ اونچے علمی قسم کے، عقلی مذہبی گروہوں کے پیدا کردہ، جدید طبقوں کے اٹھائے ہوئے، شگفتہ انداز کے، جذباتی طرز کے ——— اور اکثر مولانا مودودی ان سارے سوالوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ چاروں جانب سے سمیٹ لیتے۔ حکیمانہ و تفہیمانہ اسلوب سے ہر بات کی وضاحت ہوتی چلی جاتی۔ کسی معرکے کے مسئلے کے چھڑ جانے پر لمبی بحث کا سلسلہ چل نکلتا اور اسی کی وجہ سے درس ایک ہی آیت یا حدیث پر رکا رہتا۔ بحث میں فریقین تیزی بھی دکھاتے اور باہر سے آنے والے مہمان بھی اسی طرح سے حصہ لیتے۔ مگر صاحب درس شگفتہ انداز پر بار بار اصل حقیقت کو نمایاں کرنے کی سعی مسلسل کرتا چلا جاتا اور آخری جیت اسی کی ہوتی۔ خصوصیت سے جہاں کہیں معاشی اور سیاسی بحثیں پیدا ہوتیں وہاں بڑی بڑی گرما گرمی پیدا ہو جاتی۔ کمیونسٹ پروپیگنڈے کے پھیلائے ہوئے تصورِ مساوات کی بنیاد پر ہم لوگ خوب خوب الجھتے بلکہ ندامت کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک معقول پر ہماری طرف سے زیادتی ہی ہوتی۔ مگر وہ مجسمۂ استقلال، نہ کبھی گھبرایا، نہ کبھی تحمل و حلم سے عاری ہوا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید لعنت ملامت پر اتر آتا، حلقۂ درس سے نکال باہر کرتا یا کم از کم سلسلۂ درس ہی کو برطرف کر کے بیٹھ رہتا۔ آج کیا کل وہی مسکراتا چہرہ، وہی شگفتہ مزاج اور وہی تفہیمی انداز ہمارے سامنے ہوتا۔ باہر سے مودودی صاحب کے نئے نئے عقیدت مند پیری مریدی کی روایات ذہن میں لئے ہوئے آتے اور ہماری بے تکلفانہ اور آزادانہ گفتگو کو غیر شرعی اور غیر مودبانہ سمجھ کر خفا ہوتے۔ کبھی تو حلقۂ درس ہی میں ٹوک دیتے۔ ہم چپ ہو جاتے اور خود مولانا مودودی ہماری مدافعت کرتے اور ہماری آزادی اور ہمارے حقوق کی وکالت کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بحث فلسفۂ ارتقاء کے سلسلے میں بہت طول پکڑ گئی تھی۔ اسی طرح ایک مرتبہ اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰہِ (حدیث) پر خوب خوب دماغ سوزی ہوئی۔ غالباً ایک یحییٰ صاحب تھے اور دوسرا میں تھا جن کا کسی بھی بنیاد کے بغیر اصرار تھا کہ یہ حدیث موضوع ہے اور قابلِ استرداد۔ مولانا مودودی نے بجائے اس کے اس کا ایک ایسا مفہوم ہمارے سامنے رکھا جس پر کسی پہلو سے اعتراض وارد نہیں ہوتا تھا۔ ان کا مطالعہ یہ تھا کہ اَلسُّلْطَانُ کے معنی یہاں بادشاہ نہیں بلکہ حکومت و سلطنت بلکہ حاکمیت ہیں اور حدیث کا منشا، انہوں نے یہ واضح کیا کہ بادشاہت یا حاکمیت یا اقتدار اللہ تعالیٰ ہی کے اقتدار کا ایک پرتو ہے اور جو شخص اس خدائی امانت وظیفہ کو پاکر اس کی اہانت کرتا ہے خدا بھی اسے ذلیل کرتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے علم خدا کا ایک عطیہ ہے اور جو عالم علم کو انسانیت کیلئے استعمال نہ کرے وہ مجرم ہے۔ اس مفہوم نے ذہن کے دروازے کھول دیئے۔ مگر حدیث کا جو استعمال ہماری تاریخ میں ہو چکا تھا اور اسی کی وجہ سے جو اضطراب عام طور پر ہم لوگوں میں پھیلا ہوا تھا اسی کی وجہ سے ہم اصرار کرتے تھے کہ ایسی حدیث کو آخر بنائے استدلال بنانا ہی کیا ضرور ہے۔ یحییٰ صاحب تو بڑی صفائی سے یہ کہتے تھے کہ مولانا جب معلوم ہے کہ ہمارے بادشاہوں کے حفظِ اقتدار کیلئے دنیا پرست عالموں نے صریحاً گھڑی یا اس کا استعمال کیا ہی تو پھر جانتے بوجھتے ایسی حدیثوں کو کیوں لیا جائے۔ صاحب درس نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ یہ اصول ہمارے ذہن نشین کرایا کہ اگر کوئی حدیث روایت و سند کی صحت رکھتے ہوئے کوئی ایسی تاویل و تشریح قبول کرتی ہو جو دین کے اصولوں اور اس کے مجموعی تاثرات کے مطابق بیٹھ سکے تو محض بلا وجہ اسے رد کرنے کا کسی کو حق نہیں ہو سکتا ——— بہر حال اس آزادانہ فضا میں ہم نے دین کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سمجھا۔

درس ختم ہوتا تو ہم سب اپنے اپنے مصحف لے کر منتشر ہو جاتے۔ کسی دن جاتے ہوئے اپنی کسی علمی غلطی اور کسی عملی کوتاہی کا شعور و احساس لے کے جاتے اور اس کی اصلاح کا جذبہ موجزن محسوس ہوتا۔ کسی دن دین کی کوئی نئی حقیقت دل و دماغ میں لئے ایک عجیب سی مسرت کے ساتھ ——— جسے مسرتِ علم کہنا چاہیئے ——— مسجد سے نکلتے۔ کسی دن ذہن کی کوئی الجھن اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتی اور وہ آگے مزید سوالات کے بارے میں از سر نو بحث چھیڑنے کا محرک بنتی۔ کسی دن مختلف الخیال رفقاء آپس ہی میں بحث کرتے ہوئے نکلتے اور بس گھنٹے بھر صحن کے

مواقع پر وہی بحث بار بار جاری رہتی یہاں تک کہ اگلے دن کا درس سامنے آجاتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ درس کے بعد ہم لوگ مودودی صاحب کے ہاں ان کے دفتر میں جب ٹھہرتے اور دماغ کی رہی سہی بھڑاس نکالتے۔ یہ سب کچھ ہوتا مگر بدتمیزی کے رنگ سے خدا نے فضا کو پاک رکھا۔ کیونکہ بنیادی کردار اور مرکزی نقطہ سب کو انضباط میں لئے ہوئے تھا اور سب طالب علم تھے نہ کہ مناظرہ باز۔ خطرات ٹوٹتے اور بنتے، بیمار خیالات پگھلتے اور نئی شکل اختیار کرتے۔ شخصیت و کردار میں ایک تزلزل سا آ رہا تھا۔ ذہنوں میں ہر روز نئے انکھوے پھوٹتے رہتے۔ اور ہم محسوس کرتے کہ ہمارے اندر تخریب و تعمیر کا متوازی عمل جاری ہے۔ ہمارے اندر کا پرانا انسان دم توڑ رہا ہے اور ایک نیا انسان ابھر رہا ہے۔ مذہب کے رنگ آلود موروثی تصورات اکھڑ رہے ہیں اور تحریک اسلامی کا نیا نقشہ دل و دماغ کے سطح پر جھلک رہا ہے۔ الغرض ہم نے مودودی صاحب سے جو چیز بھی قبول کی ہے اپنی آزادیٔ رائے کو برقرار رکھتے ہوئے اور دلیل و شخصیت کی بالادستی دیکھ کر قبول کی ہے۔ عقیدت مندی کے ساتھ آستانہ بوسی تو شاید کسی ایک امر میں بھی نہیں کیا۔ مودودی صاحب نے بھی اس طریق تعلیم و دعوت کو صحیح سمجھ کر اپنایا تھا۔ وہ دراصل اندھے مرید (followers) نہیں چاہتے تھے کہ جن کو گاؤ بنا کر وہ اپنی عقیدت کے باڑے میں رکھیں اور اس کو اپنی کرامات کی چراگاہوں میں چرا کر اس کے گوشت اور دودھ اور اون سے فائدہ اٹھائیں اور پھر دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے یہ گلّہ اپنی اولاد کے لئے بطور ترکہ اور جاگیر کے چھوڑ جائیں ——— وہ ایک سوچنے سمجھنے اور اپنے اندرونی جذبے سے حرکت کرنے والی طاقت پیدا کرنے کے اہتمام میں تھے جو اسلامی اصولوں پر ایک نئی دنیا بنانے کا پارٹ ادا کر سکے۔ ہمیں کبھی مغالطہ نہیں ہوا کہ ہم فی الواقع اس گراں بہا کام کے پورے طور پر اہل ہو گئے ہیں۔ احساس صرف یہ ہے کہ دارالاسلام کی تربیت نے ہمیں ایسے سوچنے سمجھنے والے پیروانِ اسلام میں ڈھال دیا ہے جن کا سرچشمۂ فکر قرآن و حدیث ہے۔ اور جو اعتماد کے ساتھ مخالفانہ حالات کے مقابلے میں ہر طرف سے ہو کر دنیا میں آگے بڑھنے کا راستہ خود بنا سکتے ہیں۔

اس درس کا سلسلہ کبھی کبھی مرکز میں اب بھی جاری رہتا ہے۔ اور اب بھی سوالات اور بحثیں چھڑتی ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ ہم دارالاسلام کے دور کے درس کو ترس گئے ہیں۔ کتنا اچھا تھا ہمارا وہ زمانۂ ناآشنائی! کتنے ناقابلِ فراموش ہیں وہ تحقیق کے مزے"!

اب آپ صاحبِ درس کی شخصیت کا نقشہ آپ خود اپنے ذہن میں کھینچ سکتے ہیں۔

لیجئے اب ذوقیات کے دائرہ کی طرف!

مولانا مودودی کے ذوقیات کا شجرۂ طیبہ چائے اور پان سے سیراب ہوتا ہے۔ اور اس کی ٹہنیاں پان کے پتوں سے آراستہ ہیں۔ پان مولانا کے ہاں مسرت و تفریح کا ترجمان ہے اور یہی نازک سا برگِ سبز پریشانیوں کے بارہائے گراں اپنے کفِ حنائی پر سہارتا ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کاوش و فکر کا قدیم رفیق ہے۔ دماغ میں جونہی سوچنے کی تحریک ہوتی ہے ساتھ مولانا مودودی کا ہاتھ ڈبیہ بٹوے کی طرف بڑھتا ہے۔ ادھر زردہ چھالیہ ڈالا جاتا ہے اور ادھر خیالات ترتیب پانے لگتے ہیں۔ پان چبانے کے لئے جبڑوں کی ہلکی ہلکی جنبش تو ذہن میں افکار کی رزم خیز لہروں سے بالکل ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ مودودی کی تحریروں میں کوئی شک نہیں کہ پان کے پتے کی سبزی اس کے کتھے کی سرخی چھالیہ اور چونے کی تیزی اور زردے کی حرارت انگیز اور تفریح زا لطیف تحریک کے سارے پہلو شریک رہتے ہیں۔

کل ہی مولانا مودودی سے احباب کی مجلس میں (جو سفرِ حج سے واپسی پر فوراً ہی مرکزی دفتر میں منعقد ہوئی) دریافت کیا گیا کہ پان اس لمبے سفر میں ملتا رہا۔ فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص انتظام یہ کیا کہ مفتی محمد شفیع صاحب کو ہم سفر بنا دیا۔ ان کے ساتھ پان کا ذخیرہ تھا اور وہ اسے دیر تک محفوظ رکھنے کا کوئی خاص طریقہ جانتے تھے۔ چنانچہ پان ملتا رہا۔ کراچی سے ان کا ذخیرہ ختم ہو گیا مگر ہم مکہ پہنچ گئے اور مکے کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ کی دعا ہی ضمانت ہے کہ یہاں رزق ضرور ملے گا۔ ایک صاحب نے پوچھا" کیا مولانا! پان بھی رزق کی تعریف میں آتا ہے؟" ——— "اجی واہ، تو کیا روٹی اور سالن ہی کا نام رزق ہے؟" ——— مودودی صاحب خندہ آمیز انداز سے فرمانے لگے: "اصل رزق تو پان ہے۔"

ایک گفتگو ماہر القادری صاحب نے یوں روایت کی ہے:

"ایک بار پان کا ذکر چل نکلا۔ میں نے مولانا سے کہا کہ آپ تو بڑے شوق سے مزہ لے لے کر تمباکو کھاتے ہیں۔ مگر میرا یہ عالم ہے کہ چھالیہ میں تمباکو چھو بھی جائے تو اس چھالیہ کو نہیں کھا سکتا۔ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ میں بھی پہلے تمباکو نہیں کھاتا تھا۔ ایک بار کسی صاحب نے تمباکو کا پان کھلا دیا (میرا خیال یہ ہے کہ غالباً انہوں نے غلطی سے تمباکو کا پان دے دیا تھا۔ م ق) اور اس پان کو کھا کر مجھے گھماؤ سی آئی۔ بس اس گھماؤ کے بعد مجھے تمباکو کھانے کی عادت پڑ گئی ——— مگر اس عادت پر اتنا قابو بھی ہے کہ جیل میں جاتا ہوں تو وہاں پان کی یاد نہیں آتی۔"

(مولانا مودودی ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں)

جیل جانے کا واقعہ بھی سن لیجئے جسے میں پہلے لکھ بھی چکا ہوں۔ پہلی مرتبہ کی گرفتاری (۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء) کے موقع پر ضروری کاغذات اور تیاری ہو چکنے پر مولانا روانگی کیلئے نکلے۔ برآمدے میں رفقاء سے ملے، پولیس کے کنارے کھڑے ہوئے اور بطور معمول پان طلب کیا: "ذرا میرا بٹوا کہاں ہے؟ آخری پان کھا لیا جائے۔" پوچھا گیا کہ آخری کیوں؟ تو ہنستے ہوئے فرمانے لگے: "بس اب طلاق دے دوں گا۔" پان جیسے رفیق کے بارے میں یہ فیصلہ سن کر کسی نے پوچھا کہ کیا جیل کے بعد بھی یہ طلاق جاری رہے گی؟ تو فرمایا: "نہیں یہ طلاق رجعی ہے، مغلظہ نہیں۔" اس پر سید نقی علی صاحب اور دوسرے لوگ قہقہہ لگا کر ہنسے۔ یوں یہ شخص ہنستے ہنساتے مصافحہ کر کے نامعلوم مدت کی قید کیلئے مسلح پہرے میں جیپ گاڑی کے اندر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

(مولانا مودودی ——— اپنی اور دوسروں کی نظر میں)

مولانا کی رائے میں پان کی ترکیب و ترتیب الہامی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ذرا اس کے اجزاء کے تنوع اور ان کی باہمی مناسبت کو دیکھئے۔ کہاں کہاں سے اجزا لا کر جوڑے جاتے ہیں۔ انسانی دماغ محض عقل کی رہنمائی سے کہاں یہ ترکیب پیدا کر سکتا ہے۔

ایک بار جب کہ انگریزی دور حکومت تھا، کہنے لگے کہ ان انگریزوں نے اپنی عادت بد کا کتنا اہتمام کیا ہے کہ گاڑی کے اونچے درجے کے ڈبوں میں شراب کے پیگ رکھنے کے سٹینڈ لگا کر رکھے ہیں کہ راستے میں بھی ——— ضرورت ہو تو بیٹھے بیٹھے ——— شراب کی چسکیاں لی جاتی رہیں۔ لیکن ان کم بختوں کو ہمارے پان کا لحاظ نہیں کہ اگالدان لگا دیئے ہوتے۔ اسلامی نظام حکومت کبھی آیا تو گاڑیوں کے ڈبوں میں اگالدان ضرور لگیں گے۔

دار الاسلام کے دور میں مولانا مودودی کے پاس ایک بڑا سا پان دان تھا جس پر قلعی یا پالش کیا ہوا تھا۔ یہ بالعموم دفتر کی میز پر دکھائی دیتا اور جب مولانا مجلس شبانہ میں آ بیٹھتے تو پان دان بھی ساتھ آتا۔ اس حسن ذوق کا یہ نمونہ تاریخی حیثیت اختیار کر گیا، کیونکہ کم و بیش لوگ باہر سے آتے تو ——— سامنے تو نہیں ——— ادھر ادھر دبی زبان سے کہتے کہ پاندان خلاف شریعت ہے۔ ہم لوگ سن کر ہنس دیتے۔ بعض میں یہ راز کھلا کہ ایسے حضرات اسے چاندی کا پاندان سمجھتے تھے اور سونے چاندی کے برتنوں کو محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کیلئے حرام ٹھہرایا ہے۔ خود پان بھی بعض لوگوں کی نظروں کا کانٹا بنا رہتا۔ کچھ لوگ اسے ناجائز نہیں سمجھتے تھے مگر تہذیبی کراہت سے مولانا سے درخواست کرتے تھے کہ عام تعصبات کا لحاظ کرتے ہوئے آپ اسے ترک کر دیں۔ مگر مولانا مودودی دوسروں کو خوش کرنے اور دوسروں کو خوش کرنے کیلئے نہ کوئی چیز اختیار کرتے ہیں، نہ چھوڑ ترک کرتے ہیں۔ ایک پان ہی پر کیا موقوف، کوئی اگر کرسی کی نشست پر اعتراض کرتا، کوئی سفید اجلے لباس ہی پر اپنے الٹے نظریات کے ڈھیر ڈال دیتا، بلکہ ایک مرتبہ تو ایک عجیب قسم کے مہمان نے دوران گفتگو میں مولانا کی صفائی کو بھی خلاف اسلام قرار دیا۔ مودودی صاحب ان امور میں بحث کرنے کے بجائے ... خوش اسلوبی سے طرح دے جاتے۔

ضمناً ایک ضروری بات یاد آئی۔ مولانا مودودی ذوقیات کے معاملے میں گھٹے ہوئے مذہبی ذہنوں کے برعکس بڑے فراخ دل اور عالی ظرف واقع ہوئے ہیں۔ ہمارا تقشف زدہ مذہب ہر ہر چیز پر اعتراض کی انگلی رکھتا ہے۔ بالخصوص پان اور چائے اور سگریٹ تو بہت ہی بڑے مظلوم ہیں۔ جماعت میں آنے والوں میں جو لوگ حقہ اور سگریٹ کے عادی تھے ان کی اکثر شامت آتی رہی ہے۔ خصوصاً مرکز میں جا رہنے والوں کو تو کسی نہ کسی زاویہ کی

خشونت سے بہت سابقہ رہتا۔ میں خود اس تلخ تجربے سے گزر رہا۔ مگر میری اور اس طرح کے دوسرے رفقا کی عموماً پناہ گاہ مولانا مودودی ہوتے۔ وہ رسمی مسئلوں کو شریعت کا جزو نہیں مانتے اور نہ ممنوعات کے دائرے کو خواہ مخواہ وسیع کرتے چلے جانے کے قائل ہیں۔ بلکہ ان کا مسلک یہ ہے کہ اباحت اور رخصت سے فائدہ اٹھانے کا حق کوئی کسی سے سلب نہیں کر سکتا۔ ابتدا میں احتراماً میں مولانا مودودی کے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ نہیں پیتا تھا اور خطوط املا لینے کے دور میں جب مولانا کے دفتر میں زیادہ دیر بیٹھنے سے اعصاب میں ہلچل ہونے لگتی تو چپکے سے ان کے پاندان سے زردہ کے چند ریزے لے کر منہ میں رکھ لیتا۔ مولانا میری کمزوری سے جب آگاہ ہو گئے تو کسی مجلس میں بر سبیل تذکرہ یا "اشارۃً" واضح کیا کہ سگریٹ جسے پینا ہو وہ پیئے، اس میں کیا حرج ہے۔ جب سے اب تک مولانا ہمارے سامنے پان کھاتے ہیں اور ہم ان کے سامنے سگریٹ پیتے ہیں۔ کسی طرف سے ملامت ہو تو ہم اس پناہ گاہ میں سمٹ جاتے ہیں۔ میں اب کئی سال کی تربیت سے اسی قسم کے جملہ معاملات میں جماعت کی عمومی فضا انتہائی فراخدلانہ وسعت کی ہو گئی ہے اور کوئی بھی اب خردہ گیریاں نہیں کرتا۔

میں نے جیل کی ڈائری میں (جس کے چند اوراق شائع ہوئے ہیں) لکھا ہے کہ اپنی دوسری دفعہ کی رہائی کے دوران میں مولانا کے خلاف مقدمے کی کارروائی سننے ہم فوجی عدالت میں گئے۔ کارروائی ختم ہونے پر ملاقات ہوئی تو جستہ جستہ تذکرے میں میں نے بیان کیا کہ سگریٹ چھوڑ دیا ہے۔ مولانا ہنس کر فرمانے لگے: "ایسے نہیں، جیل میں آئیے تو چھوڑ دیجیے، باہر جائیے تو پھر پیجیے، پھر جیل آئیے تو پھر چھوڑ دیجیے۔"

مولانا مودودی چائے سے بھی خاص رغبت رکھتے ہیں۔ لیکن مولانا آزاد کے ذوق سے آپ کا ذوق بالکل برعکس ہے۔ مودودی صاحب اس معاملے میں پنجابی نحو کے قائل ہیں، یعنی چائے کی پتی بھی بہت ہو، دودھ بھی بہت ہو، شکر بھی بہت ہو۔ چنانچہ شکر کے تین چمچے آپ کے بڑے پیالے کو میٹھا کرتے ہیں۔ چائے کی گرمی کے ساتھ آپ کو برفاب کی ٹھنڈک سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ ٹھنڈا پانی مولانا مودودی کے لازمی حوائج میں سے ایک ہے۔ مگر ٹھنڈے پانی کا مفہوم ان کے ہاں یہ ہے کہ آدھی برف ہو اور آدھا پانی۔ حتیٰ کہ جاڑے میں بھی وہ ٹھنڈے پانی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یاد ہے کہ جب دارالاسلام کے زمانۂ خطر میں راتوں کو پہرے کا انتظام ہوتا تھا اور ڈیوٹی دینے والے گروپوں میں مولانا مودودی کی باری بھی جس رات آتی تھی تو آپ برف کا خاص انتظام کر لیتے تھے ـــــ گھنٹے گھنٹے بعد برف کی سل کو تیشے سے توڑا جاتا اور مولانا خود بھی برفاب پیتے اور دوسرے ساتھی بھی۔

کھانوں میں مولانا مودودی کے گھر کا ایک خاص مرغوب کھانا شب دیگ ہے۔ یہ شب دیگ مولانا کی والدہ محترمہ کی ہدایت و نگرانی میں بالالتزام عید الاضحیٰ کے موقع پر پکتی ہے اور سارے رفقا مولانا کے ساتھ مل کر کھاتے ہیں۔ واقعی یہ چیز خوب رہتی۔ تقسیم کے بعد شاید ایک بار اس قصۂ ماضی کی یاد دلائی جا سکی ہے۔

مودودی صاحب کے ذوقیات کے سلسلے میں کھانے کا ایک دلچسپ فلسفہ سنئے۔ ابھی گزشتہ رمضان میں ہمارے ایک پیر و فقیر دوست نے سمن آباد میں مودودی صاحب کو دعوتِ افطار دی۔ یہ دعوتِ افطار مغلئی کھانے سے کسی قدر زیادہ متعلق تھی۔ دستر خوان فرش پر بچھا، لیکن چھری کانٹا موجود تھا۔ دو چار دوستوں نے چھری کانٹا اٹھایا۔ مگر مولانا مودودی نے مشرقی طریق ملحوظ رکھا۔ میزبان نے پلاؤ کے قریب چمچ رکھ کر اپنا شائستہ چمچہ پیش کیا۔ ساتھ ہی کسی صاحب نے پوچھا "چھری کانٹے سے کھانا اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ہے یا نہیں؟" فرمایا "جائز کیوں نہیں، مگر دست و دہن کے درمیان اگر کوئی تیسری چیز حائل ہو جائے تو کھانے کا مزہ غارت ہو جاتا ہے۔" اب ایک لطیف سلسلۂ گفتگو چھری کانٹے کے حامیوں اور مخالفوں کے ساتھ چل نکلا۔ مودودی صاحب نے باتوں باتوں میں کھانے سے متعلق ایک مکمل فلسفہ پیش کر دیا۔ فرمایا: کھانے کا مزہ محض اچھے ذائقے کا نام نہیں جو زبان کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، بلکہ اس میں پانچ حسیات حصہ لیتے ہیں۔ کھانے کا ایک رنگ اور اس کی ایک شکل ہوتی ہے جس سے آنکھیں بہرہ اندوز ہوتی ہیں۔ ایک خوشبو ہوتی ہے جس سے مشام متاثر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ مل کر ذائقہ کی حس لطف اندوز ہوتی ہے۔ کھانے میں لمس کا بھی ایک حصہ ہے اور وہ حصہ یہ ہے کہ انگلیاں براہِ راست مس کریں۔ چھری کانٹے اور چمچے سے لمس کا یہ حصہ غارت ہو جاتا ہے۔

ذوقیات کے دائرے میں اور بہت سی چیزیں قابل ذکر ہیں لیکن اس مضمون کیلئے اتنا ہی حصہ کافی ہے۔

رکھتے ہیں اور ٹھیک سمجھتے ہیں کہ آدمی کے ساتھ بس کر ہی اسے جانچا پرکھا جا سکتا ہے۔ خصوصیت سے لیڈروں، وزیروں، علماء، مصنفوں اور صحافیوں کو دور سے کبھی جانا پہچانا نہیں جا سکتا ہے۔ کتابوں اور مقالوں، تقریروں اور بیانوں میں بالکل دوسرا آدمی جلوہ گر ہوتا ہے جو تمام محاسن و کمالات کا جامع معلوم ہوتا ہے۔ اصل آدمی ستر پردوں کے پیچھے بہت دور تاریکی میں چھپا دیکھ رہا ہوتا ہے کہ دنیا کس طرح بیوقوف بن رہی ہے۔ شہرت شخصیت کا حجاب اکبر ہے۔ مولانا مودودی کے ساتھ ہم نے رہ بس کر دیکھا ہے۔ ان سطروں میں یہی دکھانا مطلوب ہے کہ وہ رفقا کے درمیان کس طرح رہتا سہتا اور گھلتا ملتا ہے۔ مطالعۂ شخصیت کا یہی بہترین طریقہ ہے۔

اولین بات یہ ہے کہ مولانا مودودی اپنے ملنے والوں اور کسی طرح کا تعلق رکھنے والوں میں سے ایک ایک فرد کو پوری اہمیت دیتے ہیں۔ خصوصیت سے ساتھ کام کرنے والے رفقا، چاہے وہ عمر، علم، منصب، کارکردگی اور دوسرے اوصاف کے لحاظ سے کسی بھی درجے کے ہوں، سب کے سب ان کی نگاہ میں ایک ہی طرح کی دوستانہ اہمیت رکھتے ہیں اور ایک ہی طرح توجہ حاصل کرتے ہیں۔ اپنے ہر ملاقاتی اور اجتماعات میں شریک ہونے والے تمام کارکنانِ جماعت پر وہ فرداً فرداً توجہ صرف کرتے رہتے ہیں۔ اب چونکہ تعداد زیادہ ہو چکی ہے اور شرکائے اجتماع بہت زیادہ ہوتے ہیں اس لئے وہ دورِ اول والی بات نہیں رہی، پھر بھی ہر ایک سے انفرادی ربط رکھنے کی کوشش مولانا ضرور کرتے ہیں۔ وہ تقریباً تمام ارکانِ جماعت کو فرداً فرداً نام اور شکل سے جانتے ہیں، بیشتر صورتوں میں ان کے ذہنی ارتقاء کے مراحل اور ان کے جماعتی اعمال کو سمجھتے ہیں، خوبیوں اور کمزوریوں سے باخبر رہتے ہیں۔ مقامی جماعتوں کے حالات کی یاد تازہ رکھتے ہیں۔ کئی کئی سال پہلے جن لوگوں کو کبھی ایک بار دیکھا تھا ان کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں اور اسی طرح گزشتہ سلسلۂ واقعات کا مستحضر کر لیتے ہیں۔ گردے کے آپریشن کے بعد ان کا حافظہ اگرچہ متاثر ہوا ہے اور اب کسی کسی موقع پر وہ کوئی چیز یاد لانے کے لئے ان کو ذرا سی کاوش کرنی پڑتی ہے، لیکن متعلقہ افراد کو اہمیت اور توجہ دینے کی خوبی جوں کی توں قائم ہے۔ ہر ایک کو اہمیت اور توجہ دینا خود پسندی، علیحدگی پسندی اور اپنی ذات میں سمٹے رہنے کی عادت کے بالکل اُلٹ ہے اور مولانا مودودی کی شخصیت کی مستقل جاذبیت کا ایک سبب یہی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ وہ ہر ایک کو اعتماد میں لیتے ہیں، شریکِ مشورت کرتے ہیں اور ذمہ داریاں سونپتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے ساتھیوں سے بات چھپانے کی کوشش کی ہو یا ان کے خلاف بے اعتمادی کا اظہار کیا ہو۔ ہماری ہزار کوتاہیوں کے باوجود مودودی صاحب کی اس افتادِ مزاج میں کبھی کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ انہوں نے رفقا کے درمیان کبھی اقرب اور ابعد کا امتیاز نہیں کیا۔ ایک کے خلاف دوسرے کے سامنے کسی طرح کا اظہارِ شکوہ اور اظہارِ نفرت نہیں کیا۔ دارالاسلام کے دور سے لے کر اب تک ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب کبھی کسی سفر سے آمد ہوئی، کسی ملاقات اور گفتگو اور مشاورت سے فراغت ہوئی، کوئی اجلاسِ شوریٰ ختم ہوا تو مولانا مودودی کے گرد رفقا جمع ہو جاتے ہیں اور بے تکلفی سے باتیں پوچھتے ہیں اور باتیں سنتے ہیں۔

مولانا مودودی بحیثیت امیر اگرچہ کارکنانِ مرکز اور اپنے ماتحت امرا کے لئے نیز خاص طور پر دفتر ترجمان القرآن کے کارکنوں کے لئے "افسر" کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن برسوں کا تجربہ گواہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی افسرانہ اور حاکمانہ انداز سے نہ کوئی کام کسی کو سونپا ہے، نہ بازپرس کی ہے اور نہ بالادستی کے اظہار کے لئے اس طرز سے گفتگو کی ہے۔ سارا معاملہ دوستانہ انداز سے چلتا ہے۔ اسی دوستانہ انداز کی چاٹ ہے کہ مولانا کے ساتھ رہ کر کام کرنے کا ہر کسی کو شوق رہتا ہے اور کوئی ان کا ساتھ چھوڑ کر جانے پر اس وقت تک آمادہ نہیں ہوتا جب تک جماعتی مصالح کا شدید تقاضا نہ ہو۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا مودودی کے ہاں ہر شخص کو خصوصیت سے رفقا کو اختلاف اور تنقید کا پورا پورا حق حاصل رہتا ہے۔ علم اور عقل کے لحاظ سے چھوٹے سے چھوٹا آدمی اٹھے گا اور جھجک میں پڑے بغیر زور دے کر وہ بات کرے گا جو اس کے ضمیر کی آواز ہو۔ یہ تنہائی تک ہی محدود نہیں، عام مجالسِ گفتگو میں کوئی رفیق کسی بات پر کہہ دے گا کہ مجھے اس سے اختلاف ہے یا آپ کا یہ نقطۂ نظر فلاں جماعتی اصول سے یا آپ ہی کے فلاں قول سے متصادم ہے۔ اور پھر اجتماع میں ——— رفقا اٹھ اٹھ کر بے دھڑک سوالات کریں گے، اعتراضات سامنے لائیں گے اور اپنے اختلافات بیان کر دیں گے۔ جماعتی فیصلہ تو فوری اختلاف کے باوجود ہر ایک عملاً قبول کرتا ہے، لیکن مولانا کے علمی نظریات اور ذاتی تصورات سے اختلافات کیے جاتے اور مسلسل برقرار رہتے

ہیں۔ ہمارے جماعتی نظم میں اسلامی جمہوریت کا یہ پہلو بڑی ہی اہمیت رکھتا ہے اور اسی کی وجہ سے کسی بھی منصب پر آنے والا شخص ایک کڑے امتحان سے گزرتا ہے۔ چونکہ سب سے بڑا منصب مرکزی امارت کا ہے۔ لہٰذا مرکزی امیر پر معاملات و مسائل اور تنازعات کے بھاری بوجھ کے ساتھ تنقید کی تیز بوچھاڑ بھی ہے کہ یہ کا سامنا ہر دور کا رہا ہے۔ تنقید کے حق کو اسلامی تقاضوں کے مطابق استعمال کرنے کی تربیت پاتے رہنے کے باوجود جماعت میں ہمیشہ ایسے نئے لوگ موجود رہتے ہیں اور بعض دیرینہ ساتھی بھی اپنے مزاج کی وجہ سے اس معاملہ میں ہمیشہ نئے رہتے ہیں) جو بے دھڑک پن سے تنقید کرتے ہیں مگر مولانا مودودی اس بوچھاڑ کا مقابلہ تحمل اور شگفتگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور ڈانٹ ڈپٹ یا ترش روئی کا کبھی مظاہرہ نہیں کرتے۔ انھوں نے اسلامی اصول کے مطابق اپنی پوری زندگی کو ایک کھلی کتاب کی طرح جماعت کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس کے کسی بھی صفحے کی کسی بھی عبارت پر ہر رفیق کو اظہار رائے اور تنقید، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بازپرس کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ جماعتی امور سے آگے نکل کر مولانا کے گھر اور ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت اور دوسرے شخصی معاملات تک پر متعدد بار لوگوں نے کھل کر گفتگو کی ہے۔ زندگی کو اس طرح سب کے سامنے رکھ دینا اور تنقید و اعتراض کا عام حق دے دینا کوئی آسان کام نہیں۔ جسے آسان معلوم ہو وہ اسے ذرا کر کے دیکھے۔ اس مقام تک شاید کوئی لیڈر اور عالم دین مشکل ہی سے رسائی رکھتا ہوگا۔ اور رفقاء نے جس شخص کو بارہا اعتراضات کی چھلنیوں میں چھان کر، تنقید کے پیمانوں میں پھٹک کر دیکھا ہے وہی اس کی صحیح قدر پہچانتے ہیں۔ مولانا مودودی کی کمزوری، بیماری سے صحت گرتی ہے۔ لباس، وضع قطع، اور دوسرے پہلوؤں میں مختلف لوگوں نے ان کو طرح طرح کے مشورے دیے ہیں، بلکہ بعض نے اصرار کیا ہے۔ لیکن مولانا نے کسی کو خوش کرنے کے لئے کبھی کوئی ایسی تبدیلی اپنے اندر نہیں کی جس کے لئے دین تقاضا نہ کرے اور ضمیر کے اندر جس کیلئے تحریک نہ ہو۔ بعض لوگ چاہتے تھے کہ آپ ٹوپی پہنا کریں، بعض کا اصرار تھا کہ داڑھی زیادہ لمبی رکھیں، بعض کا مشورہ تھا کہ سر کے بال کی ہیئت بدل دیں، بعض کا تقاضا تھا کہ اسلوب نگارش اور طرز گفتگو میں تبدیلیاں کریں اور کچھ یہ چاہتے تھے کہ لباس میں پیوند لگایا کریں۔ لیکن مولانا مودودی دوسروں پر اثر انداز ہونے کے لئے کسی اوپری سی ترمیم پر بھی کبھی راضی نہیں ہوئے۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنی کسی عادت اور اپنے کسی معمول کو کبھی کسی سے اخفا میں رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ڈرامائی کردار بننے پر کبھی ایک لمحہ بھی تیار نہیں ہوئے۔

رفقاء کی عزت نفس کا مولانا کو ہمیشہ خاص خیال رہتا ہے۔ وہ ان کا پورا پورا احترام کرتے ہیں اور اسلامی آداب کے ساتھ ان سے مساویانہ معاملہ کرتے ہیں۔ انھوں نے کبھی کسی رفیق کو ملامت نہیں کی، برا بھلا نہیں کہا، غضبناک ہو کر سخت گیری کا معاملہ نہیں کیا۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کی تربیت سے تغافل برتا ہے۔ تربیت ہمیشہ ملحوظ رہی۔ بس اس کا منصب جداگانہ تربیت کا تھا۔ مولانا مودودی کے طریق تربیت کا ایک جز تو یہی اعتماد میں لینا، احترام ملحوظ رکھنا، ذمہ داریاں سونپنا اور مستند سطح پر معاملہ کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کریم النفسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھوٹی چھوٹی چیزوں پر گرفت نہیں کرتے اور اہم تر کوتاہیوں پر وہ ایک خفیف سے اشارے یا اصلاح طلب ایک جملے کے ذریعے بیٹھے بیٹھے مسکراتے احساس دلا دیتے ہیں۔ اس سے آگے کا معاملہ ہو تو بغیر کسی کی گرفت کے پاس بٹھا کر تفصیل سے بات سمجھا دیتے ہیں۔ اظہار ندامت پر فوراً اسے معاف کر دیتے ہیں۔ اگر کسی رفیق یا ملازم کی اصلاح سے پہلے تجربے کے بعد وہ بالکل مایوس ہو جائیں ——— اور ایسی صورتیں پورے گزشتہ دور میں شاذ ہی چار پیش آئی ہیں ——— تو خوبصورتی سے معاملہ ختم کر دیتے ہیں۔ مولانا مودودی کا یہ طویل المیعاد طرز تربیت نتائج کے لحاظ سے بہت ہی کامیاب رہا ہے۔ خصوصاً انھوں نے اپنی بیگم صاحبہ کی زندگی میں جو انقلاب پیدا کیا ہے وہ حیرت ناک ہے۔ ہماری یہ بہن ایک ایسے خاندان سے آئیں جس میں مغربیت تیزی سے چھا رہی تھی۔ مولانا موصوف کی والدہ مرحومہ کے اصرار سے یہ رابطہ قائم ہوا۔ شادی کے بعد جب مولانا مودودی کے نظریات و عزائم زیادہ واضح طور پر راسخ ہونے لگے اور پھر جب وہ ایک ایسے راستے کی طرف مڑ گئے جو دنیوی کامرانیوں کے باغ و بہار سے نہیں، بلکہ فقر و فاقہ کے خارزار سے ہو کر گزرتا تھا اور وہ خارزار دارالاسلام کی بے رونق اور سادہ دیہاتی زندگی کی صورت میں بالکل سامنے آ گیا تو ہماری ان محترمہ بہن کے سارے خواب درہم برہم ہونے لگے۔ وہ گویا عیش و مسرت کی ایک دنیا سے ایثار و مشقت کی بالکل ایک دوسری دنیا میں منتقل ہو گئیں۔ دل و دماغ میں جو کچھ ایسے انقلاب سے ہونا چاہیے تھا وہ ہوا۔ لیکن مولانا مودودی ٹھنڈے دل سے ایک تدریجی سکیم کے تحت ان کی دلجوئی کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ وہ پہلے دور میں کچھ سخت نظر آئیں، پھر کچھ پڑھتی رہیں، اور ایک خاص ماحول میں رہتے رہتے آخر کار اپنی جگہ سے چل

گئیں۔ پھر جو وہ ایک بار آگے بڑھیں تو ایسی بڑھ آ پہنچیں کہ جہاں ان کے اندر ایک نئی شخصیت پیدا ہو گئی۔ بالکل اسی طرح مولانا مودودی اپنے بچوں کو ڈانٹے اور برا بھلا کہے اور بات بات پر ٹوکے بغیر مشفقانہ انداز میں تربیت دینا پسند کرتے ہیں۔ کبھی جو بچے کوئی غلط حرکت کریں تو ایک آواز آئیگی "ہائیں ——— ہائیں" یا "اونہہ ہونہہ"! ——— بس یہی مولانا مودودی کا عصائے تربیت ہے جسے وہ بچوں پر استعمال کرتے ہیں۔

رفقائے جماعت مولانا مودودی کی شخصیت سے دو ہی عزیمت و استقلال لیا ہے۔ ہر موقع پر مولانا ہی کی ذات نے ان کی ہمت بندھائی ہے۔ ڈرپوک اور کمزور شخصیتیں اپنی کمزوری اپنے ساتھیوں میں بھی منتقل کر دیتی ہیں۔ اور اسی طرح عزیمت و استقلال کے پیکر قریبی لوگوں پر بھی اپنے اس جوہر کا پرتو ڈال دیتے ہیں۔ دارالاسلام کے دور خطر میں مولانا مودودی آس پاس کی بستیوں کی حفاظت رکھنے کے لئے چار چار سے گروپ مرتب کر کے بھجواتے تھے اور تاکید کرتے تھے کہ کوئی شخص ایک چھڑی اور ایک چاقو تک ساتھ لے کر نہ جائے کیونکہ مسلح ہو کر امن و سلامتی کی دعوت دینا بے معنی ہے۔ اور ہم بے دھڑک علاقے بھر میں گھوم آتے۔ حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ نفرت و کدورت اور فتنہ و فساد کی بارود ہر آبادی کے نیچے بچھ رہی ہے۔ جب دور فساد شروع ہو گیا تو اس عالم میں مولانا مودودی نے بنفس نفیس بستی کی حفاظت کے لئے فوجی نظام تجویز کیا اور بہتر منصوبہ بنایا۔ خود وہ اس نظام کے کمانڈر تھے اور تمام انتظامات میں حصہ دار رہے۔

جب والی کشمیر کے نام پر ہمارے خلاف "جہاد اکبر" (اخبار آفاق) ہوا کے ایک دو رسالے نے (جسے جماعت اسلامی سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے) ایک بہت بڑا نوٹ لکھا اور جھوٹ کی کڑیاں ملا کر تردید کر دی کہ یہ لوگ غدار ہیں۔ میں "تسنیم" کے ادارے میں شریک تھا۔ مولانا سے مشورہ لینے گیا کہ اس پر تردیدی نوٹ لکھنا چاہیئے۔ مولانا مودودی مزاحاً کہنے لگے۔ تردید کیوں ——— صاف صاف کہئے کہ ہم اقراری مجرم ہیں ——— بس اتنے سے فقرے نے مجھے اور دوسرے رفقائے مجلس کو ستم عوام و حجت سے ملال کو یاد اسی وقت میرے ذہن میں ایک مصرع نمودار ہوا ——— "ہم لوگ اقراری مجرم ہیں"! ——— اگلی صبح تک نظم مکمل ہو گئی۔ پھر جب یہ ہنگامہ سرد پڑ گیا اور حوالی کام کرنے کیلئے اخبارات کی طاقت بھی ہم سے چھین لی گئی تو طے پایا کہ شہر کے ہر حلقے میں جلسے کر کے اپنی بات واضح کی جائے۔ سوال یہ تھا کہ ابتدا کس حلقے سے کی جائے۔ مودودی صاحب کہنے لگے کہ سب سے پہلے خطرناک ترین موقع کو لیجئے" اور وہ موچی دروازہ تھا۔ ان کے اس مشورے نے جو خاص روح کارکنوں کے اندر پھونک دی اس کا آج تک ہمیں اندازہ ہے۔

اور پھانسی کی کوٹھڑی میں! ——— اعزہ و رفقا ملنے جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ "آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟" "جی ہاں! عینک کے تاگے اور خلال کے چند تنکوں کی!" یہ تھا اس شخص کا جواب جس کے لئے پھانسی کا پھندا تیار ہو رہا تھا۔ مولانا مودودی نے رحم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں دریافت کرنے پر جو تین وجوہ آپ نے بیان فرمائے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اگر میرے جیسے آدمی نے بھی جان بچانے کے لئے رحم کی اپیلیں کرنا شروع کر دیا تو پھر اس ملک میں غیرت و حمیت کا بالکل خاتمہ ہو جائیگا۔

اور جب فوجی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا ——— مولانا کے وکیل نے ایک راہ یہ سجھائی کہ آپ "تسنیم" کے شائع کردہ بیان کو اپنانے سے انکار کر دیں۔ لیکن مولانا مودودی کی غیرت نے اس مشورہ کو مسترد کر دیا اور جب عدالت میں پوچھا گیا تو آپ نے کسی قدر زور دے کر کہا کہ "ہاں! یہ پورا بیان میرا ہے"!

مولانا اپنے رفقا کے درمیان اپنی سادہ زندگی کی وجہ سے بھی محبوب ہیں جن کا تعلق دوسروں سے مساویانہ اخوت کی بنیادوں پر جڑ چکا ہے۔ ان کا لباس ہمیشہ سادہ رہا اور بسا اوقات تو ان کے کرتے اور پاجامے پر خاصی بڑی اور بھاری رفو لگے ہوئے بارہا ہم نے دیکھے ہیں۔ لیکن یہ نمائشی فقر سے ہمیشہ خالی پائے گئے۔ ان کے ہاں کے کھانے اور کھانے کا موقع ملا اور دعوتوں میں شرکت کی لیکن کھانا ہمیشہ سادہ پایا۔ دفتر میں چٹائی کرسی ہمیشہ رہے لیکن میزوں اور قالینوں کو کبھی بار نہ مل سکا۔ کبھی کوئی ملازم یا کوئی بچہ گھر میں ملازم رہتا ہے۔ لیکن تمام کاموں کے لئے نوکروں کا لشکرہ کبھی بھرتی نہیں ہوا۔ اس سبب سے مولانا مودودی کو دن میں کئی کئی بار خود ہی اٹھ کر گھر جانا پڑتا اور باہر کے دروازے پر دستک دے کر بار بار دیتے رہتے ہیں۔ مولانا مودودی اپنے ہاتھ سے بہت سارے کام کر لیتے ہیں اور ایسے کاموں کی فہرست بہت دلچسپ ہے مگر تفصیل کا موقع نہیں۔ یہ سادہ زندگی ان کے لئے رفقا سے مساویانہ رابطہ رکھنے کو آسان بنا دیتی ہے ——— دارالاسلام میں ہر روز شام کو کبھی کرسیوں پر کبھی چٹائیوں پر اور کبھی کنار چبوتروں اور گھاس پر تکلف برطرف کر کے برادرانہ محفل جمتی اور مولانا مودودی بھی

میں ایک ازدحام میں کر بیٹھتے۔ رات کو اجتماعی کھانا ہوتا اور کارکن کھانے پر یکجا ہو جاتے اور باہم دگر دست درازیاں ہوتیں۔ اجتماعی کھانے کی روح رواں ہمیشہ مودودی صاحب ہوتے۔ وہ موجود ہوتے تو کھانا اچھا ہو جاتا۔ اب لاہور میں صرف عید کے موقع پر اس اجتماعی کھانے کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔

اجتماعات کی صورت میں کئی برس تک مولانا ایک عام رکن کی طرح قیام و طعام کے عام انتظام میں حصہ دار ہوتے۔ فرش پر سوتے اور سب کے ساتھ مل کر رہتے۔ اب ان کی صحت کی کمزوری کا لحاظ کر کے ان کے رفقا نے پرہیزی کھانے کا انتظام شروع کیا ہے اور ان کو اجتماع گاہ میں قیام گاہ کا ایک گوشہ الگ کر کے دے دیا جاتا ہے تاکہ وہاں وہ ضروری امور کیلئے سوچ سکیں، تقریر کی تیاری کر سکیں اور آرام لے سکیں۔ مگر آرام کہاں!! اسی طرح وہ سفروں میں جب بھی رفقا کے ساتھ جاتے ہیں تو اسی درجے میں سفر کرتے ہیں جس میں سب کے لئے سفر کرنا ممکن ہو ——— اور یہ تیسرا درجہ بھی ہو سکتا ہے۔ [illegible] اجتماعات ([illegible]) میں کراچی تشریف لے گئے تو اسی آخری درجے میں سفر کیا۔ کسی ایک موقع پر کہیں ان سے کسی ملاقاتی کی جانب سے سوال کیا گیا کہ "آپ اور تھرڈ کلاس میں؟" فرمایا "اگر کوئی چوتھا درجہ ہوتا تو اسی میں سفر کرتا۔"

اندازہ کر لیجئے کہ کیسی شخصیت ہے اور اس کے ساتھ اس کے رفقا کی وابستگی کس نوعیت کی ہو گی۔

ان ——— اس سادہ زندگی کے پس منظر میں وہ ایثار کام کر رہا ہے جو اس زمانے میں اپنی مثال آپ ہے۔ جب اپنا نصب العین معین کر کے آپ ترجمان کے راستے پر چل پڑے تو بار بار ایسے مواقع آئے کہ ترجمان القرآن سے کبھی ایک حلقے کے خریدار ٹوٹ جاتے کبھی دوسرے حلقے کے، لیکن مودودی کے ایمان نے اس ٹوٹ پھوٹ کی کبھی پروا نہیں کی۔ آخر میں مسلم لیگی حلقوں کے ناراض ہونے کا تو رسالے کی خریداری پر نمایاں اثر پڑا۔ مگر حق کا ڈھنڈورا پیٹنے والا اپنے موقف سے نہیں ہٹا۔ حالات کی اس گردش میں بار بار مولانا مودودی فقر و فاقہ کی بالکل سرحد پر جا پہنچتے رہے ہیں۔ اور دوسری طرف تن تنہا بہت ساری ذمہ داریاں اٹھانے کی وجہ سے رات کو دو دو بجے تک بیٹھ کر کام کرنے کے عادی رہے ہیں۔ ترجمان کے مقالات کے مجموعے کتابی شکل میں آئے اور دوسری کتابیں شائع ہوئیں تو یہ لٹریچر حد درجہ مقبول ہوا اور کئی کئی ایڈیشن اب تک نکلے ہیں۔ آمدنی کا یہ ایک جائز اور وسیع ذریعہ تھا اور اس سے مولانا مودودی اپنے مالی حالات کو ہمیشہ کیلئے مستحکم بنا سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے یہ کتابیں تحریک کیلئے وقف کر دیں۔ اس وقت وہ چار کتابوں کے علاوہ باقی کل کتابیں جن کی تعداد پچاس پچپن کے قریب ہو گی اب جماعت اسلامی کی ملک ہیں۔ اس ایثار کے ساتھ دوسرا ایثار یہ تھا کہ جماعت اور تحریک کے عائد کردہ مختلف فرائض کا بار شروع سے بلا معاوضہ اٹھایا ——— حالانکہ یہ شرعاً اور اخلاقاً ناجائز نہیں تھا کہ مولانا اپنا پورا وقت دیتے ہوئے بقدر کفالت جماعت سے معاوضہ لیتے۔ اس کے لئے اصرار بھی کیا گیا، لیکن وہ قرض اٹھا اٹھا کر کام چلاتے رہے، یہ صورت بالکل قبول نہیں کی۔

سوچئے کہ ہمارے پاس کتنی ایک مثالیں ایسی موجود ہیں!

اس موضوع کے سلسلے میں ضروری ہے کہ مولانا مودودی کو ذرا مجلس شوریٰ میں دیکھا جائے جو بیرونی دنیا کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے۔

مودودی صاحب ہمیشہ مقررہ وقت پر پہلے سے ایوان (جو عموماً ان کا دفتر ہی ہوتا ہے) میں موجود ہوتے ہیں۔ لوگ آتے اور بیٹھتے جاتے ہیں۔ ماحول بڑا سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ [illegible] پڑھی جاتی ہے۔ ایجنڈا پڑھا جاتا ہے اور اکثر اوقات تمام ارکان شوریٰ باری باری اپنے اپنے علاقوں کے تحریکی حالات کے بارے میں معلومات پیش کرتے ہیں۔ پھر مسائل پر بحث شروع ہوتی ہے۔ مولانا مودودی بحث کے دوران میں نقطہ ہائے نظر کو سمجھنے کے طور میں پرسکون طریق سے بیٹھے رہتے ہیں۔ ابتدائی عام بحث کے بعد آہستہ آہستہ دو یا زیادہ اختلافی آراء متعین شکل میں سامنے آجاتی ہیں اور ضرورت ہو تو ان کو مولانا مودودی اپنے [illegible] تجزیہ کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ اب ان آراء کے حق میں مختلف افراد (جو کبھی مستقل گروہ بندیوں کی شکل اختیار نہیں کرتے) انفرادی طور پر استدلال کرتے ہیں۔ بحث اگر قطب راہ سے ذرا دور جا پڑی ہو تو مولانا شستہ انداز سے اسے مرتب تجزیہ کر کے اسے پھر راہ راست پر ڈال دیتے ہیں۔ اگر لوگ زیادہ بولنے لگیں تو کسی کسی موقع پر یکایک مولانا اٹھنے لگیں گے اور مسکرا کر کہیں گے "اچھا حضرات! آپ بحث جاری رکھئے میں ذرا پیشاب کر آؤں۔" اس پر اکثر چہرے مسکرا اٹھتے ہیں اور لطیف ترین انداز کی اس تنبیہ کو سمجھ کر بولنے والے [illegible] کر لیتے ہیں۔ مولانا مودودی ذرا اس دوران میں اپنی رائے کو سامنے لاتے ہیں اور کبھی برعکس ہوتا ہے کہ پہلے

سے وہ کوئی چیز لے کر بیٹھے ہیں بے منوا جاتے ہیں۔ واقعی صورت ہو تو بھی یہ ہے کہ وہ دوسروں کی بحث سے بہت پہلے اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ ہیں اپنی رائے کو آخری شکل دیتے ہیں۔ اپنے منصب کے زور سے انہوں نے کبھی کسی بات کو پیش کیا ہے نہ منوایا ہے۔ وہ اگر کوئی نقطۂ نظر رکھتے ہیں تو وہ بحث کے بعد کسی موقع پر دلنشین انداز میں دلائل و وجوہ کے ساتھ اسے پیش کر دیتے ہیں۔ پھر بھی وہ اپنے رفقائے شوریٰ سے اختلاف کرتے ہیں اور پھر ان کا نقطۂ نظر قبول کیا جاتا ہے۔ اس طرح باہمی سے متفقہ فیصلے طے پاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اختلافی معاملات کے درمیان جب بحث بہت طول کھینچ جاتی ہے تو مولانا مودودی ان کے مابین نقطۂ اتصال پیدا کر کے اس خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں کہ بحث کا طوفان چھٹ چھٹا جاتا ہے۔ شوریٰ کی تاریخ میں کم ہی ایسے مواقع ایسے آئے ہیں جن پر کثرت شماری سے فیصلہ ہوا ہو، وہ شوریٰ میں محض بلکہ روایت یہ ہے کہ باہمی افہام و تفہیم کے بعد اتفاق رائے اور اطمینان قلب و ذہن کے ساتھ یہ معاملات طے پاتے ہیں۔ مجلس شوریٰ میں مولانا مودودی کا ایک اہم پارٹ یہ رہتا ہے کہ جب بھی بحث کی فضا بوجھل ہونے لگتی ہے تو وہ ایک تبسم انگیز فقرے سے اس کو ہلکا پھلکا بنا دیتے ہیں۔ یہ حقیقت باہر کے لوگوں کو معلوم نہیں ہوگی کہ جماعت میں اگرچہ تمام مسائل پر ارکان شوریٰ باہم بھی اور امیر جماعت سے بھی گفتگو کر لیتے ہیں۔ لیکن ایوان سے باہر امیر کی طرف سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ وہ پہلے سے اپنے ہم خیال تیار کر کے لائے اور نہ ارکان شوریٰ علیحدگی میں امیر کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ سارا کام ایوان کے اندر ہی انجام ہوتا ہے۔ اس سبب سے نہ گروہ بندی پیدا ہوتی ہے نہ سازشیں! —— اور ہر فرد یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ تمام کارروائی میں برابر کا حصہ دار ہے اور اس کی رائے ویسی ہی قیمتی اور اس کا استدلال ویسا ہی اہم ہے جیسے کسی اور کا اور خود امیر کا!

ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص میرے اس مطالعۂ شخصیت میں اچھے ہی اچھے پہلو دیکھ کر مجھ پر قصیدہ گوئی کا الزام رکھے۔ میں کسی کو روک نہیں سکتا، مگر اتنا حق تو اپنے آپ سے ضرور رکھتا ہوں کہ قصیدہ گوئی کے لئے میرا مزاج بنایا ہی نہیں گیا۔ مگر دوسری طرف میرا مزاج یہ بھی نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کا تکلف کر کے کوئی عیب کسی کے اندر نکالوں۔ مودودی صاحب کی شخصیت کا مجموعی نقشہ بہت ہی صاف ستھرا اور نفیس ہے اور اس میں کوئی بنیادی اور اہم قسم کی کجی یا فساد موجود نہیں ہے۔ یوں وہ انسان ہیں۔ رائے قائم کرنے، فیصلے دینے، معاملات کو سمجھنے اور تدابیر اختیار کرنے میں غلطیاں کرتے ہیں، ہم سب ایسی غلطیوں پر ان سے بحث بھی کرتے ہیں اور اگر ہمارے دلائل مضبوط ہوں تو مولانا مودودی قائل ہو کر تبدیلی بھی قبول کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ان کے اخلاق اور کردار کی ساخت کا تعلق ہے اس میں کوئی رخنہ تلاش کرنے میں ناکامی ہوتی ہے۔ کمزوریاں ان میں ہوں گی مگر آخر تحریک کی چکی میں پڑ کر اپنے رفقاء کے ساتھ ساتھ خود مودودی صاحب بھی تو پستے ہیں۔ اور وہ تو ہم سب سے پہلے (۱۹۴۱ء میں) اپنی اس سلگائی ہوئی چکی میں از خود پڑے تھے اور اس میں پستے ہوئے ان کو آج ۲۵، ۲۶ سال ہو چکے ہیں۔۔۔ —— میں اپنے ضمیر کے سامنے بہرحال مطمئن ہوں کہ یہ میں نے عقیدت مندی کے رنگ سے نہیں بلکہ تصویر واقعیت اور حقیقت کے رنگ سے مرتب کی ہے —— اور اتنی اچھی تصویر سامنے ہونے کے باوجود میں کہتا ہوں کہ مودودی ہرگز کوئی فرشتہ نہیں، وہ معصوم نہیں، وہ انسان ہے اور غلطیاں اور کوتاہیاں اور کمزوریاں رکھنے والا انسان ہے۔ مودودی کی شخصیت کا یہ مطالعہ اب ختم کرتے ہوئے میں [illegible] کے چار فقروں کو دہراتا ہوں کہ "مولانا مودودی کی زندگی اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ وہ ایک انسان کی زندگی ہے۔" (ابوالاعلیٰ مودودی) اور ان الفاظ ہی کی روشنی میں تعصب کی ان دیواروں پر ماتم کرنا چاہتا ہوں جن کو لوگوں نے خود اپنے اور مودودی کے درمیان کھڑا کر رکھا ہے اور غلط افواہ پر بدگمانیاں کرنے والوں کو اذن دے رکھا ہے کہ ان دیواروں پر نیا پلستر لیپتے رہیں۔ مودودی صاحب سے جسے اختلاف ہو وہ اختلاف کرے، جو ان کے مذہبی تصور کو غلط سمجھتا ہو وہ اپنا اختلاف اور تنقیدی نقطۂ نظر پورے زور سے سامنے لائے اور جسے ان کے سیاسی پروگرام سے بعد ہو وہ سیاسی میدان میں ان کا پورا پورا مقابلہ کرے —— مگر وہ اپنی ذاتیت کے انسان اور ایک تاریخی شخصیت ہونے کے لحاظ سے ساری ملت کی ایک قیمتی متاع ہیں بلکہ انسانی دنیا کے بنیادی سرمایۂ شخصیت و کردار کا ایک جزو ہیں!

—— اور ان کی ذات میں علم اور عمل کے پہلو کچھ ایسے پیوستہ موجود ہیں جن میں سے ہر ایک کی ہمیں ضرورت ہے۔ انہی پہلوؤں تک رسائی حاصل کرنے کا راستہ کھولنے کیلئے ان کا یہ مطالعۂ شخصیت مفید ہے ورنہ محض ایک شخص جس کا نام ابوالاعلیٰ مودودی ہے کسی دوسرے سے قابل ترجیح نہیں ہے۔

علّامہ مشرقی

غلام جیلانی برق

یہ ۱۹۰۶ء کی بات ہے۔

کہ میرے گاؤں (جبال ضلع اٹک) میں میرے والد صاحب کے مرشد فروکش ہوئے۔ حضرت والد والہانہ عقیدت کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں اور میرے ایک بھائی غلام ربانی عزیز بھی ہمراہ تھے۔ ہم نے بھی نذرانہ پیش کیا۔ مرشد نے پوچھا۔ کیا بچے کیا کرتے ہیں۔ حضرت والد نے بتایا کہ سرکاری سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ بڑا چھٹی میں اور چھوٹا تیسری میں۔ یہ سنتے ہی مرشد کے تیور بدل گئے۔ جلال میں فرمایا: "ان کو آج ہی سکولوں سے اٹھا لو۔ کفر کی تعلیم ہے۔" اور ہم دونوں بھائی مسجد میں بھیج دیئے گئے۔ جہاں ہم نے چند سال درس کا نصاب ختم کیا۔ یعنی دس برس عربی۔ نحو۔ فقہ۔ منطق فلسفہ۔ حدیث۔ تفسیر اور تاریخ پر صرف کیے۔

مسجد کے یہ تیرہ برس میری زندگی میں بہت اہم تھے۔ اوّل اس لئے کہ یہاں مجھے عربی زبان پر قدرت حاصل کرنے کے مواقع میسر آئے۔ اور دوم اس لئے کہ مجھے ملّا و پیر کی اندرونی زندگی دیکھنے کا موقع ملا۔ چونکہ یونانی فلسفہ پڑھنے کے بعد تقلید کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ اور عقل آزاد ہو گئی تھی اس لئے میں نے اس مذہب کے ہر پہلو پر غور کرنا شروع کر دیا جو ملّا پیش کر رہا تھا۔ بے شمار شبہات پیدا ہوئے۔ جن کا جواب ملّا کے پاس موجود نہ تھا۔ رفتہ رفتہ شبہات بے چینی میں بدل گئے۔ اور بے چینی نے بغاوت و الحاد کی صورت اختیار کر لی۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۳ء تک میں خدا، رسول اور اسلام و قرآن سے باغی رہا۔ میرا کام رسول خدا کی تضحیک اور کتاب اللہ کا مذاق اڑانا تھا۔ اور عالم یہی تھا کہ بڑے بڑے زندیق میرے سامنے کان پکڑتے تھے۔ اور انہیں مجھ سے پناہ مانگنی تھی۔

میرا الحاد عین شباب پر تھا۔ کہ ایک دن (۱۹۲۴ء) ایک دوست علامہ مشرقی کی مشہور کتاب تذکرہ میرے پاس لائے۔ اور کہا۔ کہ اسے پڑھو۔ شاید تمہارے بعض شبہات کا حل اس میں موجود ہو۔ میں نے نفرت و حقارت سے کتاب کو اٹھایا لیکن چند ابتدائی جملوں ہی نے میری دنیائے دل میں ایک زلزلہ سا بپا کر دیا۔

"دنیا کی سب سے مسلّم اور مروّج اشیاء میں سب سے بڑا تنازعہ مذہب ہے۔ یہ جھگڑا کیوں ہے۔ یہ جھگڑا کیا ہے۔ یہ رسمی عقائد، یہ شرعی مراسم، یہ مذہب کے تفرقے، یہ بت پرستی کی مورتیاں، یہ مشعلوں کی قربانیاں اور جنت کے

چڑھاوے کیوں ہیں۔ یہ گیری، شعبدہ نوازی اور عیاری کا ایک شغل کیا ہے۔ اور یہ تسبیحوں کے ہار، رنگ کے عمامے، مولوی صاحب نماز پڑھ رہا ہے۔ دان، خیرات، صدقات، نذر، نیاز، لمبی لمبی داڑھیاں، منشرح چہرے، تعویذ، اصطلاح، جہاں ساشنان وغیرہ .... وہ اسرار جو ہیں .... جن کو ہر شخص نہایت عقیدت و التزام سے کرتا ہے۔ ان کے سچے یا جھوٹے ہونے کے متعلق ایک حرف زبان پر نہیں لاتا۔ جاہل اور عالم، کم فہم اور عاقل سب اس شغل نامعلوم میں جکڑے رہتے ہیں اور ان کو بنائے زندگی کا استحکام سمجھتے ہیں ....

تعجب ہے کہ مذہب کی طرف اس عام میلان کے باوجود ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ کون سا مذہب سچا ہے۔ کون سا شارع کائنات کی منشا کے مطابق ہے اور مذہب کی سچائی کا معیار کیا ہے! .... آج علم الطبیعیات کے حقائق پر سارا جہان متحد ہے .... زمین کی محوری حرکت یا سورج کے اضافی سکون پر ساری دنیا متفق ہو چکی ہے .... لیکن ہندو اور بدھ، گبر و برہمن، عیسائی اور مسلمان کے درمیان اختلاف بدستور قائم ہے اور رہے گا۔ صداقت کی جامع الاذہان کیفیت کیوں ان سب کو کسی مشترک حقیقت پر جمع نہیں کرتی؟ ....

میرا یقین ہے کہ دنیا کے مختلف پیغمبر جہاں سے آئے تھے ایک ہی پیغام لائے تھے۔ انہوں نے اس کار فرما جہاں کو ایک ہی چشم بصیرت سے دیکھا تھا۔ وہ انسان کو ایک ہی منظم جذبے سے دیکھ کر تڑپ اٹھے تھے۔ حیرت کی گتھیاں اور علم کی مشتبہ سرنگیاں ان کے دلوں میں ایک ہی راہ سے داخل ہوئی تھیں .... جو کہ وہ سب ایک تھا، خدا کے ساتھ ایک تھی، چشمہ ایک تھا۔ علم ایک تھا۔ دستور ایک تھا۔ پیغام ایک تھا۔ جب تک یہ محرم اسرار لوگ اس دنیا میں رہے۔ اس راز کو برملا کہتے رہے۔ سولی پر چڑھ کر اور صلیب پر لٹک کر خلق خدا کو آمادۂ عمل کرتے رہے۔ سب کو ایک رب العالمین اور ایک قانون پر متحد کرتے رہے۔ لیکن ان کے بعد جب ناحقیقت شناس لوگوں نے اس کام کو سنبھالا تو لوگوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پیغام خدا اغلاط کر اپنے پیچھے صفیں کھڑی کر لیں۔ آج سطح زمین پر خدا کے نام کا متضاد مذاہب کا کثرت سے فساد اور بغاوت سے ہے .... یہ مذہب کی ضد فی الحقیقت جہالت اور ناشناسی کی ضد ہے .... علم اور تحریک کی ضد قطعاً نہیں۔ علم جہاں ہوتا ہے اتحاد و اشتراک پیدا کرتا ہے۔ امن و سلام اور سعی و عمل پیدا کرتا ہے .... اس کے ہوتے ہوئے جدال ناممکن ہے .... دو مخالف فریق آج تک اس بات پر نہیں لڑے کہ پانی سیال نہیں، آگ ٹھنڈی ہے، یا بوجھل چیز آسمان کی طرف جاتی ہے .... اسی طرح اگر دنیا کے تمام مذاہب علم کی کسوٹی پر پرکھے جائیں .... تو آج ہی نسل انسانی متحد .... ہو سکتی ہے۔

(تذکرہ علامہ مشرقی۔ آغاز)

میں اس کتاب کو پڑھتا گیا۔ ان انکشافات و تشریحات کے متعلق میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ یہ بات میرے کانوں میں پہلی مرتبہ پڑی تھی۔

"دنیا کے مختلف پیغمبر جہاں سے آئے تھے ایک ہی پیغام لائے تھے"

مجھے تو ملا نے یہ سمجھایا تھا کہ پہلے انبیاء کے پیغام نامکمل اور ناقص تھے اور ان میں زبردست تضاد و تباین تھا۔ میں حیران تھا کہ ایک خدا نے ایک نسل انسانی کی طرف سیکڑوں متضاد مذاہب کیسے بھیجے تھے۔ اور اقوام و ملل کو باہم الجھا کر سطح زمین پر فتنہ و فساد کی آگ کیسے بھڑکائی تھی۔ علامہ مشرقی نے مجھے پہلی مرتبہ بتایا کہ

"انبیاء نے افسوس کہ اس زمین پر بیٹھنے کا ڈھنگ سکھایا .... اجتماعی بقا کی راہ دکھائی۔ اقوام کے عروج کا اصل

بیان کئے۔ حکومت علما کو فکر سے تعلدار ی ثابت کر کے دنیاوی سزائیں تجویز کیں۔ اخروی سزا کے حوالے تعیین کی۔ انھوں کو ملامت بے جا کر کے صدیوں تک دوام و شکی دے گئے۔ آخر ماؤں کو ان آنکھوں سے مزاحتی دکھا گئے۔ یہی ان کا لایا ہوا دین تھا......

انبیا کو اس فطرت کے گلو گیرنے کا عزم ان کی بے مثال بصیرت کے باعث ہوا...... کمال غور و انہماک سے ہوا۔ وسیع نظری و بلند بینی سے ہوا۔ تفکر کے بام بلند اور تدبر کے اونچے اٹلے پر چڑھ کر ہوا۔ زمین سے کئی منزلیں بلند ہو کر بلکہ ستاروں کی رصدگاہوں پر پہنچ کر ہوا۔ نہیں نہیں۔ آسمان سے اور آسمان پر بیٹھنے والے خدا سے ہوا۔ وحی اور نبوت سے۔ عجز اور عشق سے۔ تعقل اور تکلم سے ہوا...... ہر زمانے میں ان انبیا کی بدولت اصول دین کی تجدید و تکمیل ہوتی رہی۔ کوئی مخالف راہ و عمل کوئی نیا دین یا جادۂ مذہب۔ دنیا کے کسی نبی نے ختماً قائم نہیں کیا" (تذکرہ صفحہ)

نیز بیان کے علاوہ بات کہنے کا طریقہ اس قدر دلنشیں مرقع اور مرقوم تھا۔ کہ بات دل میں اترتی تھی۔ دور الحاد میں انبیا کے متعلق میری یہ رائے تھی کہ یہ سب لیڈری کے جذبے اور ذی وجاہت کے شوقین تھے۔ یہ اپنے جلوس نکال کر نعرے لگوانا اور پیری مریدی کی دکان چمکا کر دنیا کمانا چاہتے تھے۔ علامہ نے میرے ان وساوس پر یوں آگ برسائی۔

"یہ سوال کہ کیا سب رہنمایانِ خلق اور اجتبٰہُ وَاَنَّ مَن جو اپنی مدت العمر سعی و عمل کے بعد خلق خدا کو ایک راہ پر لگا گئے تھے جو اپنی دھن کے اس قدر پکے تھے کہ گردنیں کٹا گئے مگر اپنی بات کو نہ چھوڑا۔ کیا یہ سب معاذ اللہ مجنون تھے اور دغاباز تھے۔ کیا ان کا تانا بانا سب مکر و فریب کا جال تھا...... کیا ان سب کو نفس نے اس قدر دھوکے دے رکھا تھا۔ کہ دھوکے ہی میں جیتے رہے۔ دھوکے ہی میں کھٹتے رہے۔ دھوکے ہی میں قوموں کا سر دامان کے فلک الافلاک تک پہنچا گئے۔ اور دھوکے ہی میں مر گئے...... کیا موسیٰ فی الحقیقت ایک بے علم۔ بدحواس۔ وحشتناک اور مختل الحواس مجنون تھا جو فرعون کی ما فوق طاقت کے خلاف بے سود علانیہ بر سر پیکار رہا۔ جو اپنی بے سر و سامانی کے باوجود اس کو علی الاعلان ہلاکت کا اٹل پیغام سناتا رہا۔ جس نے ڈنکے کی چوٹ اس کو اور اس کی قوم کو عذاب کی دھمکیاں دیں...... کیا عیسیٰ علیہ السلام محض ایک مرنجاں مرنج۔ سادہ لوح۔ خالی الذہن۔ دنیا و مافیہا سے نابلد اور بھیڑوں کو چرانے والا گڈریا تھا جس پر قیصر روم نے افترا باندھ کر اسے واجب القتل قرار دیا تھا...... جس کی سنجیدہ آنکھوں میں تسکے ہیبت و خوف نظر آتا تھا...... کیا بدھ علیہ الرحمۃ والسلام جیسا باکمال شخص جس کے پیروؤں کی تعداد آج دنیا کے سب نئے اور پرانے مذاہب کے ماننے والوں سے بڑھ کر ہے...... فی الحقیقت ایک جان کش اور نفس کش۔ ایک خشک مغز اور بد مست اگیانی نادہی تھا جس نے تخت سلطنت کو لات مار دی۔ اور باشندگان زمین کو راہ راست پر لانے کیلئے وہ اندوہناک مشقتیں جھیلیں کہ سطح زمین پر کیا اکھی اور قرنوں تک اس مرد کش کا اثر چار دانگ عالم میں باقی رہا......

...... کیا وہ سالار انبیا اور ختم الرسل محمد علیہ السلام والصلوٰۃ جس کے آسمان شکاف علم و عمل کو دیکھ کر رحمت ایزدی کا موسلا دھار مینہ روئے زمین پر ابدالآباد تک برستا رہے گا۔ جس کے تاجین بقار فنا تک جس پہ بحر و بر اور شمس و قمر سلام بھیجتے رہیں گے۔ جس کی قوت تغیر و انقلاب کا اندازہ کرنے میں خود کو زمین بیٹھنے کی پرانی آرزو رہے گی کیا وہ سرور عالم فی الحقیقت ایک گوشہ نشیں۔ کملی پوش۔ بے نوا آدمی۔ نا ما ورمان نا بدسا ایک غار نشین اور متوکل اور ناکش متقی ہی تھا۔ جس نے اتنی قلیل مدت میں عرب کی بے نام اور مجبور زدہ قوم سے علم و عمل کے وہ گوہر تابیں قرار سے اکناف عالم میں رواں کئے کہ دنیا ہمیشہ ان کے کارناموں کو شک کی نظر سے دیکھا کرے گی۔ کیا یہ سب کر لینے کو توفیق اور

پیشوایان مثلاً الیاس [illegible] تھے ...... کیا ان کی معتم بالشان کامیابی [illegible] انسانی کی ان سے حقیقی ترقی؟ ان کے مٹائے ہوئے پردوں کا اس قدر پھیلاؤ، ان کی پیدا کی ہوئی تحریک کا اس قدر دوام بجائے خود اس امر کی دلیل نہیں کہ یہ لوگ فطرت کے اٹل قوانین کے مستقل کارندے تھے۔ وہ ملکوتِ زمین کے متعلق اللہ کے کارکن تھے۔ کیا آج ایک یا دس یا دس ہزار [illegible] فلسفی [illegible] برس کی متفقہ سعی و عمل سے [illegible] زمین پر وہ [illegible] وہ وزن، یقین، وہ قوتِ اعتقاد، وہ حرکت، وہ تموج اور وہ [illegible] پیدا کر سکتے ہیں جو ان پیغمبروں میں سے کسی ایک فرد نے پیدا کی تھی؟

(تذکرہ، صفحہ ۱۰۱)

میں تذکرہ کو پڑھتا گیا۔ یہ شگفتہ بیان، یہ جلالی ترکیب، یہ [illegible] اسلوب اور یہ [illegible] تشریح۔ بات دل میں یوں اترتی گئی۔ جیسے گھٹا ٹوپ ظلمت میں آفتاب [illegible] داخل ہو کر ایک [illegible] سی پیدا کر دی۔ میرا دینی تعصب جڑ سے ہل گیا۔ اور میں مشرقی کے [illegible] میں ڈھل گیا۔ اس کتاب نے [illegible] تصورات کو [illegible] میں بکھیر دیا۔ اور قرآن کا سیدھا سادا اسلام کچھ ایسے انداز میں پیش کیا کہ میری سرکشی اطاعت میں اور میری [illegible] تسلیم و انقیاد میں تبدیل ہو گئی۔ وہی قرآن جو ایک [illegible] پہلے مجھے تعریف اور [illegible] کا [illegible] معلوم ہوتا تھا اب نسلِ انسانی کا مکمل نظامِ حیات نظر آنے لگا۔ وہی رسول جن کی [illegible] مجھے ایک [illegible] معلوم ہوتی تھی۔ اب ایک عظیم الشان [illegible] اپنی قوم کا سچا رہبر اور قائد [illegible] نظر آنے لگا۔

علامہ مشرقی نے اس کتاب میں [illegible] پیش کی ہیں۔

اوّل: یہ کہ ایک اللہ کا پیغام ایک نسلِ انسانی کی طرف ہمیشہ ایک تھا۔ یہ پیغام کبھی عربی میں نازل ہوا، کبھی عبرانی میں، کبھی [illegible] میں [illegible] ہیں۔ [illegible] الگ الگ تھے۔ لیکن [illegible] شراب ایک تھی۔ مذہب ایک زبردست صداقت کا نام ہے۔ اس میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ وہ [illegible] ہر زمانے میں [illegible] ہے۔ [illegible] پانی سے ہمیشہ [illegible] نشیب کی طرف بہتا رہا۔ اگر آج ہمیں [illegible] مذہب میں اختلاف نظر آتا ہے۔ اگر آج [illegible] کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ اگر آج بنی اسرائیل [illegible] فلسطین میں برداشت نہیں کر سکتے، تو اس کی ذمہ داری [illegible] قرآن [illegible] ہوتی۔ [illegible] مجوس اور یہود [illegible] سے جو نسلِ انسانی کے اتحاد کو برداشت نہیں کر سکتے۔ [illegible] نسلِ انسانی کو [illegible] اور [illegible] آگ [illegible] رکھا ہوا ہے۔

دوم: [illegible] فطرت کی قوتوں [illegible] کو مسخر کر سکتے ہیں۔ [illegible] خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے اور اسی سے [illegible] حکمت و دانش کے [illegible] ہیں۔ [illegible]

علامہ مشرقی [illegible] کے نظریات [illegible] ہے۔

سوم: [illegible] قرآن حکیم میں [illegible] مسلمانوں سے [illegible]

کیا تھا۔ قرآن، نصاریٰ، ہنود، وید، ژند اوستا وغیرہ مذاہب کے بیشتر صحیفے پر گہری نظر ہے۔ تذکرہ کا اصل موضوع یہی مسئلہ ہے۔ اور بڑی تفاصیل سے بحث کی۔ اس سلسلے میں فرماتے ہیں۔ کہ اعمال صالحہ کے بغیر زبانی زبانی اقرار اور عملاً کچھ نہ کرنا اسلام کی روح کے منافی ہے۔ یہ دنیا دار العمل ہے۔ یہاں عمل سے بیڑے پار ہوتے ہیں۔ اللہ کے خزانے عام ہیں وہی اقوام انعام پاتی ہیں۔ جو کام کرتی ہیں۔ یعنی تنظیم۔ محنت۔ جذبۂ سرفروشی۔ اتحاد، مساوات اور کاوشات اور جنگ۔ ورنہ یہ سارا عالم گواہی دے رہا ہے۔

> "ہمیں اُمت میں وہی قرآنی اقبال کا اسلام عملاً و معناً موجود ہوگا۔ جو قوم اس قانون خدا کا اتباع اپنے تن بدن کو گلا کر ڈال کر کرے گی ...... وہ اس جدوجہد اور صبر آزما منازل سے پہلے گزر جائے گی۔ وہی اس کی صحیح معنوں میں محبوب و منظور نظر اس کی مسخر اور تابع ہو جائے گی ...... الغرض خدا اور مطالب زمین بتا رہی ہیں اسلام اور اقوام قرآن یہ ہے۔ قرب سب کچھ عمل اور صرف عمل سے ہو سکتا ہے۔ پیہم اور شبانہ روز کی تکلیف سے ہو سکتا ہے۔ اقوام عالم کے نئے ڈھنگ، تشکیل کار اور قانون خدا میں آسانیاں وضع کر کے اس مقام جلیل کے بلند درجے حاصل کی امید رکھنا ہر شخص اور قوم کا کام نہیں۔ الفاظ پر عقیدہ عمل اور قرآن میں یہ اتحاد کہ کے شرعی پا جائے اور باعزت کچھ سال پیش اندازی طرح اپنے آپ کو مسلمان بنائے رکھنا کچھ اور تاریک امت کا شیوہ ہے۔ اس رواج نے خواص و عوام کو دھوکا دیا ہے۔ جو ایمان کا کرتے ہیں۔ وہ غلط کرتا ہے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹا آدمی اس زبانی مجموعہ صحیح اور منطقی عبادات کچھ پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ کافر چھوٹے کی زبانی کا جگت کو دیکھ کر اسے غلام حصت سے بے عزت کر دیتا ہے۔ پھر آخر شخص وقت سے اس کام پر اجرت یا نعمت کی امید رکھنا پوری جہالت ہے ...... ہمیں میری دانست میں اگر ایک شخص اپنے لفظی اور زبانی عقیدے پر عامل نہیں۔ تو اس کا عقیدہ خدا کی نظروں میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا...... کہنا اور کر کے نہ دکھانا منافقت ہے۔ اصل بد معاشی اور ایمان کی ضد ہے...... قرآن کا کھلا فیصلہ ہے...... حقیقتہً یہ کام چوری کا ہے...... برخلاف اس کے جو شخص عمل کر رہا ہے...... وہی اس کے دل لعلے ہونے پر سچا ایمان رکھتا ہے۔ وہی اس کو صحیح معنوں میں مان رہا ہے۔ وہی اس کو دل سے آقا تسلیم کرتا ہے وہی مسلم اور مومن ہے...... مسلمانوں کی مجبوری اور کم ہمتی۔ قوم نے آج عمل کی تکلیف دہ صورت کو خیرباد کہہ کر عقائد کی آرام دہ مکاری پر تکیہ کر لیا ہے۔ اور اس مشغلے کے اندر ایک نیا مکر یہ پیدا کر لیا ہے۔ کہ جماعت عقیدہ پرستی سے اس بات کے درپے رہتے ہیں۔ کہ خدا کو خوش کرنے کے لئے عقائد کو درست کیا جائے۔ اعمال کے درست ہونے پر بحث قطعاً بند ہو چکی ہے۔ گویا ہم سے ملک اس لئے چھینے جا رہے ہیں کہ عالم زمین و آسمان کو اس لاولد اکثریت کے عقائد پسند نہیں رہے......
> اسلام عمل اور صرف عمل ہے۔ جو عامل ہے۔ اس کا عقیدہ بھی درست ہے۔ نہیں بلکہ اسے زبانی عقیدے کی ضرورت ہی نہیں خالی قول و عقیدہ بجز فریب کچھ نہیں۔ آج کچھ نہیں کل کچھ نہیں اور ایمان لاولد کچھ نہیں۔"

(تذکرہ ص ۳۶-۴۳)

یہ ۹۰۰ صفحات کی ضخیم دینی تحقیق، پر معنی دینی کتاب اول تا آخر اسی طوفانی انداز کے ساتھ چلتی ہے۔ قدم قدم پر جدت۔ ترجمہ و تشریح کی ندرتیں، دوسرے مذاہب کی تحریف شدہ تفاصیل اور ضابطۂ عروج و زوال کی ایمان افروز تفاسیر۔ کتاب کو پڑھ کر

ع۔ قبول کیا دنیا میں ایک کافر مسلمان ہو گیا

اس زمانے میں میں اور میرے بڑے بھائی غلام ربانی عزیز (آج کل پروفیسر گورنمنٹ کالج ملتان) گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور میں مدرس تھے۔ وہ بھی تذکرہ پڑھنے سے پہلے گمراہ تھے۔ وہ بھی میری طرح اس کتاب سے متاثر ہوئے۔

اور علامہ مشرقی کو جو اس وقت گورنمنٹ ہائی سکول پشاور میں پرنسپل تھے۔ خط لکھا کہ میں اور میرے بہت سے احباب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم ڈیڑھ سو آدمی آپ کے ہاں آ گئے۔ تو آپ کو بڑی تکلیف ہو گی۔ اس لئے آپ ہی یہاں آنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ علامہ نے جواب میں سخت قسم کا انکار کیا۔ لیکن ہم مسلسل لکھتے رہے۔ اور مختلف ترغیبات سے کام لیتے رہے۔ آخر علامہ نے ہتھیار ڈال دیے۔ اور ہمیں اطلاع دی۔ کہ میں ۱۵ رمضان المبارک (غالباً ستمبر ۱۹۳۲ء) کو آپ کے ہاں بچوں سمیت موٹر میں آ رہا ہوں۔ دو تین گھنٹے ٹھہروں گا۔ ہم نے اُن کی بیگم صاحبہ کا ایک ایڈووکیٹ قاضی محمد شفیع مرحوم کے ہاں ٹھہرنے کا بندوبست کیا۔ سڑک پر تین میل تک سکاؤٹ کھڑے کر دئے تھے۔ ان کے پاس بگل تھے۔ مقصد یہ کہ جب اُن کی کار نمودار ہو، تو بگل بجائیں۔ تاکہ ہمیں اطلاع ہو جائے۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب اُن کی کار قاضی صاحب کے مکان کے سامنے رکی۔ اور اس سے ایک طویل قامت۔ خوش پوش۔ گندمی رنگ۔ داڑھی صاف۔ اور گھنی مونچھوں والا انسان نمودار ہوا۔ سفید ریشمی پتلون۔ اوپر سفید ریشمی اچکن۔ سر پہ ترکی ٹوپی۔ "مجھے مشرقی کہتے ہیں۔ اور یہ ہے الامام ابن المشرقی" الامام کی عمر مشکل آٹھ نو برس کی ہو گی۔ علامہ صاحب بیٹھک میں تشریف فرما ہوئے تو خیر و عافیت کی رسمی گفتگو کے بعد علمی مسائل زیر بحث آ گئے۔ آپ نے جنت و دوزخ پر بھی روشنی ڈالی۔ اور فرمایا۔ کہ جنت و جہنم دنیا میں بھی موجود ہیں۔ سکونِ قلب ایک جنت ہے جو صرف قرآنی کردار سے حاصل ہو سکتا ہے۔ سلطنت بھی جنت ہے۔ علم بھی جنت ہے۔ قابل اور سعادت مند اولاد بھی جنت ہے حسین اور شریف رفیقۂ حیات بھی جنت ہے۔ اسی طرح تکالیف۔ امراض۔ پریشانیاں۔ افلاس۔ جہالت۔ غلاظت۔ بدکرداری سب جہنم ہیں۔ انسان جنتوں اور جہنموں میں محصور ہے۔ قرآن ایک ایسی زندگی کی تعلیم دیتا ہے۔ جس سے آپ کی زندگی میں بے شمار جنتیں جمع ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں دنیوی آرائشوں کا ذکر کیا ہے۔ وہاں جنات (جنت کی جمع) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور چونکہ اخروی جنت صرف ایک ہے۔ اس لئے اسے ہر جگہ "جنت" کہا۔ "جنات" نہیں کہا۔ آپ نے اخروی جنت کے متعلق فرمایا۔ کہ وہاں داخل ہو کر ہر جنتی کو ایک زبردست مسرت حاصل ہو گی اللہ تعالیٰ اس مسرت کو ایک رنگ دوام عطا کر دیں گے۔ دنیا کی تمام مسرتیں عارضی ہیں۔ ایک شخص کو لاٹری کا ایک لاکھ روپیہ انعام ملتا ہے۔ اس کی مسرت چار پانچ دن کے بعد مدھم پڑ جاتی ہے۔ لیکن جنت کی خوشیاں اور مستیاں لازوال ہوں گی۔ اگر دنیا میں جنسی لذت کے بعض لمحات کو لازوال کر دیا جائے تو یہی جنت بن سکتی ہے۔

گفتگو[1] جاری تھی۔ کہ ظہر کی اذان ہو گئی۔ بیٹھک ہی میں صفیں آراستہ ہو گئیں۔ ہم سب مسرور تھے۔ کہ آج ایک عظیم مفکر و مفسر کی قیادت میں نماز ادا کریں گے۔ لیکن علامہ نے یہاں بھی جدت کو نہ چھوڑا۔ اور اپنے نابالغ بچے الامام کو فرائض امامت سرانجام دینے کے لئے آگے کر دیا۔ بچے کی خود اعتمادی دیکھئے۔ کہ بے دھڑک آگے بڑھا۔ اور پوری صحت سے نماز پڑھائی۔ بعد نماز علامہ مشرقی نے اجازت چاہی اور واپس چلے گئے۔

۱۹۳۸ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں مجھے عربی ایم اے کے لئے جانا پڑا۔ اس سال دسمبر کے آخری ہفتے میں مجھے علامہ مشرقی کا ایک خط اچھرہ سے ملا۔ کہ میں مذاہب کی عالمی کانفرنس میں شامل ہونے کے لئے انگلینڈ جا رہا ہوں۔ فلاں تاریخ (غالباً ۲۰ دسمبر ۱۹۳۸ء) کو شام کے چار بجے مجھے میکلوڈ روڈ پر خواجہ فیروز الدین بار ایٹ لا[2] کے مکان پر ملو۔ میں چند ہم جماعتوں کے ساتھ وہاں گیا۔ یہ صحبت رات کے دس بجے تک جاری رہی۔ ہم نے کھانا بھی وہیں کھایا اس دوران میں مختلف مسائل زیر بحث آئے۔ میرے حافظے میں صرف چار محفوظ ہیں۔

(۱) اس مرتبہ علامہ نے داڑھی بڑھا رکھی تھی۔ میں نے اس "تکلف" کی وجہ پوچھی۔ تو کہنے لگے۔ اس کی وجہ ایک فوری جذبہ ہوا ہے۔ بات یوں ہوئی کہ جسٹس سر سلیمان مجھے ملنے کے لئے آئے۔ تو آتے ہی بر رنگ معذرت کہنے لگے۔۔

---

[1] درمیان میں کھانے کا کوئی وقفہ نہ تھا۔ اس لئے کہ سب معہ الامام بھی روزہ دار تھے۔ (برق)

[2] یہ سطور لکھ رہا تھا۔ کہ کسی نے "زمیندار" میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ جس میں خواجہ صاحب کی وفات حسرت آیات کی خبر درج تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (برق)

معاف فرمائیے گا۔ میں آج شیو (SHAVE) نہیں بنا سکا۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "کیا ڈاڑھی اتنی بُری چیز ہے۔ کہ ایک دن بھی منہ پر رہ جائے۔ تو دوسروں سے معافی مانگنا پڑتی ہے؟ اگر گاندھی بکنگھم پیلس میں ننگے پیروں اور ننگے جسم کے ساتھ جا سکتا ہے۔ تو ایک مسلمان یقیناً ڈاڑھی کے ساتھ دوسروں سے مل سکتا ہے۔ میں اب سے ڈاڑھی رکھوں گا"

بات سن کر لطف آ گیا۔

۲۔ فرمایا:-

"اس سال جب گرمیوں میں حسب معمول حکومت پنجاب و ہند کے دفاتر شملے میں منتقل ہوئے۔ تو صوبائی و مرکزی دفاتر کے مسلمان آئی سی ایس افسروں نے ایک ادبی جماعت بنائی۔ اور مجھ سے التماس کی۔ کہ آپ "تذکرہ" کی باقی نو جلدیں جلد از جلد شائع فرمائیں۔ اور ساتھ ہی پانچ ہزار جلدیں خریدنے کا نہ صرف وعدہ کیا۔ بلکہ بیس ہزار روپے پیشگی ادا کرنے کی پیش کش بھی کی"

"تو پھر آپ نے کیا جواب دیا؟" میں نے پوچھا

فرمایا: "میں نے انہیں لکھا ہے۔ کہ کیا آپ لوگ "تذکرہ" کی پہلی جلد پر عمل کر چکے ہیں"

علامہ کے اس ٹیڑھے جواب پر غصہ بھی آیا۔ اور ہنسی بھی ہوئی کہ اگر علامہ صاحب قوم کے عمل کا انتظار کرتے رہے۔ تو پھر ان کا وہ وعدہ جو "تذکرہ" کے صفحۂ عنوان پر بایں الفاظ درج ہے۔

"قرآن حکیم کے صحیح مقاصد اور اس کے منشا پر انشاء اللہ تعالیٰ پورے دس جلدوں میں ایک مکمل اور مبسوط علمی تبصرہ"

کبھی شرمندۂ ایفا نہیں ہوگا۔ "تذکرہ" کی پہلی جلد ۱۹۲۴ء میں نکلی تھی۔ آج پورے تیس برس گزر چکے ہیں۔ علامہ نے چھ جلدوں کے مسودے تیار بھی کئے۔ ان میں سے جلد دوم کا ایک مضمون "گاندھی اور چرخہ" رسالے میں بعنوان تھا میں نے بھی پڑھا۔ لیکن کوئی جلد قوم کے مشتاق ہاتھوں تک تا حال نہیں پہنچ سکی۔

۳۔ فرمانے لگے

"ابوالکلام آزاد کی تفسیر جلد میدان میں آ رہی ہے۔ سنا ہے کہ آزاد نے نظریۂ عمل "تذکرہ" سے چرا لیا ہے۔ اور علمی دیانت کی حد ہے کہ اعتراف تک نہیں کیا!"

جب چند روز بعد تفسیر آزاد کی پہلی جلد مجھے ملی۔ اور "مالک یوم الدین" کے تحت علامہ کے مشہور نظریۂ عمل کی تفاصیل پڑھیں۔ تو مسرت بھی ہوئی کہ امام الہند کے اسلام سے نئے نکتے ہیں۔ اور افسوس بھی۔ کہ "تذکرہ" کا احسان مان لیتے تو قرآن کا کیا بگڑ جاتا۔ بہرحال میری مسرت بہت زیادہ تھی اور افسوس محض رسمی سا۔

۴۔ اللہ کے قول (الہامی صحائف) و عمل (کائنات) کا ذکر چل پڑا۔ تو ایک دلچسپ کہانی سنائی۔ جس کا تعلق انگلستان سے تھا۔

"۱۹۰۹ء کا ذکر ہے۔ کہ اتوار کا دن تھا اور زور کی بارش ہو رہی تھی۔ میں کسی کام کے لئے باہر نکلا۔ تو جامعہ کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینس (SIR JAMES JEANS) پر نظر پڑی۔ جو بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے قریب ہو کر سلام کیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوبارہ سلام کیا۔ تو وہ متوجہ ہوئے۔ اور کہنے لگے "تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔ معاف کیجئے۔ اتوار کا دن ہے۔ زور سے بارش ہو رہی ہے۔ اور آپ نے چھاتا بغل میں داب رکھا ہے۔ اگر کوئی مصلحت مانع نہ ہو۔ تو تان لیجئے۔ سر جیمز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتا تان لیا۔

دوم یہ کہ آپ جیسا شہرۂ آفاق نماز پڑھنے جا رہا ہے، یہ کیا؟ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں سائنس کے انکشافات اور نو بہ نو حقائق نے مذہب کو تعلیمی حلقوں سے باہر نکال دیا تھا اور تعلیم یافتہ طبقہ مذہب کے نام تک سے بیزار ہو چکا تھا۔ میرے اس سوال پر پروفیسر جینز لمحہ بھر کے لئے رک گئے۔ اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے۔ "آج شام کو چائے میرے ساتھ پیو۔" میں شام کے وقت ان کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ ٹھیک چار بجے لیڈی جینز باہر آکر کہنے لگیں۔ "سر جینز تمہارے منتظر ہیں۔" اندر گیا۔ تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی ہوئی تھی۔ لیڈی جینز نے چائے بنا کر ایک پیالی مجھے اور ایک پروفیسر صاحب کو دی۔ پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے۔ کہنے لگے۔ "تمہارا سوال کیا تھا؟" اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اجرام آسمانی کی تخلیق۔ ان کے حیرت انگیز نظام۔ لرزہ فگن پہنائیوں اور فاصلوں۔ ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشش اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفاصیل پیش کیں۔ کہ میرا دل اللہ کی اس داستان کبریا و جبروت سے دہلنے لگا۔ اور ان کی اپنی کیفیت یہ تھی۔ کہ سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے حیرت و خشیت کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں۔ اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے "عنایت اللہ خان! جب میں اللہ کے تخلیقی کارناموں پر ایک ہلکی سی نظر ڈالتا ہوں۔ تو میری تمام ہستی اللہ کے تصور و جلال سے لرزنے لگتی ہے۔ اور جب کلیسا میں اللہ کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں۔

"تو بہت عظیم ہے" "تو بہت بڑا ہے"

تو میری ہستی کا ہر ذرہ میرا ہمنوا بن جاتا ہے۔ مجھے بے حد سکون و سرور نصیب ہوتا ہے اور ان سجدوں کے بعد میں کچھ ہلکا سا محسوس کرنے لگتا ہوں۔ عام لوگوں کی صرف زبان نماز پڑھتی ہے۔ اور میری ہستی کا ہر ہر ذرہ محو تسبیح و تحمید ہو جاتا ہے۔ مجھے دوسروں کی نسبت ہزار گنا زیادہ کیف نماز میں ملتا ہے۔ کہو عنایت اللہ خان! تمہاری سمجھ میں آیا۔ کہ میں گرجے میں کیوں جاتا ہوں؟"

پروفیسر جینز کی ان تفصیلات نے عجیب کہرام سا میرے دماغ میں پیدا کر دیا۔ میری نگاہ و تصور قرآن کریم کے طول و عرض کا جائزہ لینے لگی اور ایک دلچسپ آیت سامنے آگئی۔ میں نے کہا

"جناب والا! میں آپ کی روح افروز تفاصیل سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یاد آگئی ہے۔ اگر اجازت ہو تو پیش کروں۔" فرمایا "ضرور پیش کرو۔" وہ آیت یہ تھی۔ ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانھا وغرابیب سود۔ ومن الناس والدواب والانعام مختلف الوانہ کذلک انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔

(قرآن)

(اور پہاڑوں میں سفید، سرخ اور سیاہ رنگ کی تہیں موجود ہیں۔ اسی طرح انسانوں، حیوانوں اور دیگر جانداروں کے مختلف رنگ ہماری حکمت کا تقاضا ہیں۔ اور مت بھولو کہ اللہ سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں)

"کیا کہا۔ اللہ سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں۔ حیرت انگیز۔ بہت عجیب۔ یہ بات جو مجھے پچاس برس کے مسلسل مطالعہ و مشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی۔ محمد کو کس نے بتائی تھی؟ کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے؟ اگر ہے۔ تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ محمد ان پڑھ تھا۔ اسے یہ علم حقیقت خود بخود کبھی معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے یقیناً اللہ نے بتایا تھا۔ بہت خوب۔ بہت عجیب......" اور سر جینز کئی منٹ تک اسی آیت پر [illegible] رہے۔ اور محمد عربی علیہ السلام کی خدمت اقدس میں خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔ اسی صحبت میں مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ کلام قرآن کو سائنس کی نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اور اسی خیال نے مجھ سے "تذکرہ" لکھوایا:

ذرا سلسلۂ اسباب پر غور فرمائیے۔ مشرقی کا راستے میں ہی ابھرنا۔ سر جینز سے اتفاقاً ملاقات۔ وہ شام کی چائے۔ وہاں وہ معجزات تخلیق و تکوین پر حیرت انگیز بحث۔ وہ مشرقی کے قلب و دماغ کا تلاطم۔ اور وہ "تذکرہ" کی تخلیق۔ یہاں شاید یہ ذکر کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ میں نے "ایک اسلام تذکرہ"

کے زیرِ اثر لکھی ہے۔ اور "دو قرآن" کا تخیل بھی اسی کتاب کی بعض تفاصیل سے لیا تھا۔

اسی صحبت میں علامہ نے ملازمت ترک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے وجہ پوچھی۔ تو کہا۔ "والدۂ اکرام بار بار طعنے دیتی ہے۔ کہ "تذکرہ" کا مصنف، اور انگریز کی وزیری غلامی کا حریص بنے ہیں! یہ بات مجھے سہی نہیں۔" چنانچہ آپ نے کچھ عرصہ بعد ملازمت ترک کر دی۔ اور جس کی ترغیب پر ملازمت چھوڑی تھی۔ وہ علامہ صاحب کو چھوڑ گئیں۔

تیسری ملاقات

۱۹۳۲ء میں خاکسار تحریک پورے جوبن پر تھی۔ ہندوستان کے طول و عرض میں اندازاً چار لاکھ مسلح رضاکار "رپرزنٹ، چپ راست" کرتے نظر آتے تھے۔ میں ان دنوں گورنمنٹ کالج ہوشیار پور میں معلم تھا۔ کسی کام کو لاہور آیا۔ تو علامہ سے ملنے کی اُمنگ اُٹھی۔ تانگے پر بیٹھ کر "اچھرہ" جا پہنچا۔ مجھے ایک خاکسار دوسری بالائی منزل میں لے گیا۔ یہ تھا علامہ کا خاص کمرہ۔ جس میں نہ کوئی کرسی تھی نہ میز۔ نہ قلم نہ کاغذ۔ فرش پر ایک پھٹی پرانی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک مقام پر دو مربع فٹ میں چٹائی اُدھڑی ہوئی تھی۔ اور فرش میں یوں گڑھا پڑ گیا تھا۔ جیسے پانی کا قطرہ برسوں ایک ہی جگہ پڑتا رہے۔ اور اس کے نیچے گڑھا بن جائے۔ دس بارہ منٹ کے انتظار کے بعد زینے پر سے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ اور چند لمحات کے بعد علامہ مشرقی اپنی ہیبت سمیت نمودار ہوئے۔ کہ سر کے بال بے طرح بکھرے ہوئے اور گریبان کے بٹن کھلے تھے۔ شلوار ٹخنوں تک کا کرتہ بند ہوئے۔ اور دیہاتی ڈھیلا سا پاجامہ کرتہ۔ پاؤں میں ٹوٹی ہوئی چپل۔ میں تعظیماً اُٹھا۔ آپ نے خشونت سے ایک نگاہ میرے قیمتی سوٹ۔ ہیٹ اور نکٹائی پر ڈالی۔ بے دلی سے ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ مصافحہ کے بعد اس گڑھے والے مقام پر جا بیٹھے۔ اور ڈاک پڑھنے لگے۔ کافی دیر کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھنے لگے۔ "آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟" میں نے دیرینہ تعلقات جتلاتے ہوئے کیمبرج میں آپ کی یاد کا ذکر کیا۔ تو جھٹ کہنے لگے۔ "وہ ریشمی سوٹ پہن کر میں ہزاروں موٹروں میں مزے اڑانے والا مشرقی فوت ہو چکا ہے۔ آپ کے تعلقات اسی مشرقی سے ہوں گے۔ یہ مشرقی آپ کو بالکل نہیں پہچانتا۔" اور پھر ڈاک پڑھنے میں کھو گئے۔ علامہ کی یہ طرز میرے لئے ایک الٹی میٹم تھی کہ یا تو ملازمت چھوڑ کر خاکسار تحریک میں شامل ہو جاؤ۔ اور یا مجھ سے تعلقات منقطع کر لو۔ میں اتنی بڑی قربانی کے لئے تیار نہ تھا۔ چند لمحات کے بعد میں نے اجازت طلب کی۔ اور یہ تھی علامہ سے میری آخری ملاقات۔ اس کے بعد نہ ملاقات کا موقع ملا اور نہ سلسلۂ مکاتبت جاری رہ سکا۔

حالاتِ زندگی

عنایت اللہ خان ۲۵ اگست ۱۸۸۸ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عطا محمد خان ایک با اثر رئیس اور صاحبِ علم بزرگ تھے۔ ایف۔ اے تک امرتسر میں تعلیم حاصل کی۔ اور پھر فارمن کرسچین کالج لاہور سے ۱۹۰۶ء میں بی۔ اے (حساب) کی ڈگری لی۔ ۱۹۰۷ء میں ایم۔ اے (ریاضی) درجۂ اوّل میں پاس کیا۔ اور یونیورسٹی کا پچھلا ریکارڈ توڑ دیا۔ پھر کیمبرج یونیورسٹی کے کرائسٹ کالج میں چلے گئے۔ جون ۱۹۰۹ء میں آپ ریاضی کے امتحان میں اوّل رہے اور "فاؤنڈیشن سکالر" کا خطاب حاصل کیا۔ ۱۹۱۰ء میں ریاضی کا ٹرائی پاس امتیاز سے پاس کیا اور "سینئر رینگلر" کا خطاب پایا۔ ۱۹۱۱ء میں "مشرقی ٹرائی پاس" کے دو امتحانات (عربی و فارسی) میں شامل ہو کر درجۂ اوّل حاصل کیا۔ ہر ٹرائی پاس کی میعاد تین برس ہوتی ہے۔ لیکن آپ نے صرف چار برس میں تین "ٹرائی پاس" میں امتیازی کامیابی حاصل کی جس پر لندن کے اخبارات نے آپ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ۱۹۱۲ء میں آپ کیمبرج کے سب سے بڑے امتحان "مکینیکل سائنس ٹرائی پاس" میں شامل ہوئے۔ اور نہایت شان سے کامیاب ہوئے۔ اس پر آپ کو دنیا کے مختلف حصوں سے پیغاماتِ تہنیت موصول ہوئے۔ اور اخبارات نے جلی سرخیوں سے آپ پر شذرات لکھے۔

انگلستان سے واپس آئے۔ تو مندرجہ ذیل اسامیوں پر فائز رہے۔

۱۹۱۳ سے ۱۹۱۶ تک اسلامیہ کالج پشاور کے وائس پرنسپل
۱۹۱۶ سے ۱۹۱۷ تک ″ ″ ″ پرنسپل

۱۹۱۷ سے ۱۹۱۹ تک انڈر سیکریٹری تعلیمات حکومت ہند۔

۱۹۲۰ ؍ ۱۹۳۱ ؍ سرحد میں پرنسپل ٹریننگ کالج۔ انسپکٹر مدارس۔ ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل گورنمنٹ ہائی سکول پشاور

آپ کو سنہ ۱۹۱۳ء میں آئی ای ایس بنا دیا گیا تھا۔ جب آپ ۱۹۳۲ء میں مستعفی ہوئے تو اس وقت آپ کی تنخواہ دو ہزار کے قریب تھی۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں آپ نے خاکسار تحریک کا آغاز کیا۔ جسے سنہ ۱۹۴۰ء میں حکومت برطانیہ نے کچل دیا۔ گو یہ تحریک سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد بھی زندہ رہی لیکن حکومت مسلسل اس کے تعاقب میں رہی۔ یہاں تک کہ ختم ہو گئی۔

تصانیف

علامہ کی تصانیف یہ ہیں:۔

۱۔ تذکرہ۔ جس کے متعلق ایک پروفیسر نے علامہ کو لکھا تھا۔

"ہماری کتابوں میں سب سے بڑی کتاب قرآن ہے اور ارضی کتابوں میں "تذکرہ"۔ جہاں تک قوم کے فلسفۂ عروج و زوال کا تعلق ہے حقیقتاً تذکرہ زمین کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ غیر اقوام میں آج تک دو اہم کتابیں تصنیف ہوئی ہیں۔ مقدمہ، اور ہیگل کی دائی گیست۔ مؤخر الذکر تذکرہ کے بعد دوسرے درجے پر آتی ہے۔

۲۔ خریطہ۔ جس کا موضوع یہ ہے کہ شاعر دور زوال کی پیداوار ہے۔ جب کوئی قوم ترقی کے انتہائی نقطہ پر پہنچ جاتی ہے تو شاعر مفقود ہو جاتا ہے۔ اور جب زوال شروع ہوتا ہے۔ تو شاعر آ جاتا ہے۔ اس نظریہ پر ہر قوم کی تاریخ سے یقین انگیز شہادت پیش کی ہے۔ کتاب بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔

۳۔ اشارات۔ جس میں خاکسار تحریک کا پروگرام اور کچھ ہدایات درج ہیں۔

۴۔ **قول فیصل**۔ "تذکرہ" کے رنگ میں لکھی ہوئی ایک چھوٹی کتاب۔ جس کا موضوع "حرکت و عمل" ہے اور اقتباس ملاحظہ ہوں۔

> "ہمارا مذہب، ہمارا دین، ہمارا اسلام، ہمارا ایمان سپاہی بننا ہے۔ دنیا کو زیر نگیں کرنا ہے۔ بُنیان مرصوص کی طرح مضبوط رہنا ہے۔ خالدؓ۔ طارقؒ۔ عمرؓ۔ صلاح الدینؒ نہیں۔ نہیں۔ بلکہ سرور کائنات اور ختم رسل کے عمل کی پیروی کرنا ہے۔ اگر یہ دلیری، تو ہم مسلمان نہیں رہ سکتے ...... تم اگر آج بھی کل بادشاہ بنتے ہو، اور ہم ماں کے پیٹ سے بادشاہ بن کر نکلے تھے، بادشاہت ہمارا مذہب ہے، اور تم نے مذہب میں ملاوٹ کرنے کا غور کیا ہے۔ اس لئے ہم اپنے مذہب پر چل رہے ہیں ...... تم اگر اس مذہب کو پسند نہیں کرتے۔ تو پہلے قرآن، حدیث، اور مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تاریخ کو دنیا سے مٹا دو۔ ہم خود بخود اپنا مذہب چھوڑ دیں گے۔ مسجد کے ملاؤں۔ قُل اعوذیوں، مکار پیروں اور خود غرض رہنماؤں کا پیش کیا ہوا اسلام ہم نہیں مانتے ...... کہ یہ حسرت بھری اور بزدلی کا اسلام ہے۔ فریب و مکر کا اسلام ہے۔ ہمارا مذہب وہ ہے جو ایک ایک دن میں نو سو شہر فتح کیا کرتا تھا۔ جس پر خدا کا آخری رسول تئیس برس تک خود چل کر دکھا گیا ...... ہاں وہ مذہب ہے۔ جس کے ایک ہی چھوٹے سے نکتے پر چل کر تم اگر چاہو دنیا کے بادشاہ بنے بیٹھے ہو۔ حجروں میں بیٹھے ہوئے غریب مولوی اور باسی ٹکڑے کھانے والے بیچارے ملاؤں کو کیا خبر کہ اسلام کیا ہے۔"[1]

---

[1] پوشیدہ رہیں بیچارے فقیروں کی نظر سے
شہباز و فلک سیر کے احوال و مقامات (اقبالؒ)

یہ عجیب مکاری ہے، کہ تم کہتے ہو، رسول خدا صلعم نے مسواک کی۔ اس لئے اے مسلمانو! مسواک کیا کرو۔ مرد کائنات تھو پھینکا کرتے تھے۔ اس لئے تھو پھینکو۔ تم رسول ڈھیلے سے استنجا کیا کرتے تھے۔ اس لئے پانی ہوتے ہوئے بھی ڈھیلے سے استنجا کرو ...... یہ عجیب مسخرا پن ہے کہ تم رسول خدا کے ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کو دین و ایمان کا جزو سمجھتے ہو۔ لیکن ...... ان کی چوبیس گھنٹے کی سپاہیانہ زندگی۔ ان کے ہر وقت تلوار اور تیر و کمان سے مسلح رہنے ...... ان کے پے در پے غزوات ان کے خونریز معرکوں ...... اور ہر وقت کے عمل اور مستعدی کو شیر مادر کی طرح بے ڈکار ہضم کر جاتے ہو ...... اور تمہاری شیطانی لغات میں رسول کے ان اعمال کا نشان تک موجود نہیں ...... رسول خدا سے تمہاری جھوٹی محبت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے، کہ جب کوئی شخص آج پھر اسی سپاہیانہ زندگی، اسی محبت و مواخات، اسی حرکت و عمل اور اسی حاکمانہ اور فاتحانہ انداز زندگی کی طرف بلاتا ہے ...... تو تمہارے آرام پرست جسم اور غفلت زدہ نفس پکار اٹھتے ہیں، کہ یہ ایسا شخص نبی بننا چاہتا ہے۔ تمہارے ارادے صاف ہیں، کہ تم عمل سے بھاگنا چاہتے ہو، اس قدر، کہ بے عمل رہ کے اپنا آرام مانگتے ہو۔ اپنی جنت، حوروں کی دکانوں کی حفاظت چاہتے ہو، اور رسول خدا کے مشکل کاموں سے منہ موڑتے ہو ...... کیا ملا سے تمہاری محبت اس لئے نہیں، کہ وہ بیچارا تمہارے گھر کا نمک کھا کر ...... ایک مسواک، ایک تھو، ایک ڈھیلے اور ڈاڑھی کے بدلے تم کو جنت کا اشتہار دے دیتا ہے۔ تم سے ڈر کر قرآن کی آیات چھپاتا ہے ...... تمہاری روٹیاں کھا کر نوکروں اور ذلیلوں کی طرح تمہارے حکم کا بندہ بنا ہوا ہے۔ وقت بے وقت، جیسی نماز چاہو پڑھا دیتا ہے۔ مالک مسجد کو کام پڑ جائے تو فوراً کفر کا فتویٰ دیتا ہے۔ طلاق چاہو تو طلاق کا فتویٰ دے دیتا ہے۔ رجوع چاہو، تو رجوع کرا دیتا ہے۔ نکاح پر نکاح چاہو، تو باندھ دیتا ہے۔ اور جہاد و قتال کو ممنوع قرار دیتا ہے ...... وہ تمہارے مطلب کا آدمی ہے۔ تمہیں اسلام کا کوئی تکلیف دہ حکم نہیں سناتا۔ تمہاری غفلتوں کی تاویلیں کرتا اور گناہوں کے حیلے ڈھونڈتا ہے ...... یہ ہے تمہارا مولانا، مولوی، لیڈر، مرشد، دین کا امام اور سند لیکن جو شخص مرد کائنات کے چوبیس گھنٹے کے عمل کی طرف تم کو بلاتا ہے ...... وہ دجال، کافر اور مدعی نبوت۔

یا للعجب

(ص ۱)

۵۔ مولوی کا غلط مذہب۔ زیادہ تر مسائل پر مشتمل ہے۔ اس میں مولوی کے سارے اسلام پر بری طرح آتش باری کی ہے۔

لغزشیں

میرے مضمون کا تعلق علامہ کی ادبی و تحقیقی زندگی سے ہے۔ سیاسی زندگی سے نہیں۔ لیکن یہ مقالہ ان کی سیاسی زندگی کو چھیڑے بغیر نامکمل رہتا۔ اس لئے اس پہلو پر بھی کچھ کہنا پڑا۔

عام دستور یہی ہے، کہ جب کوئی مہم کامیاب ہو جائے، تو صاحب مہم کو جادوگر، مدبر اور ہوشمند ہیرو کہا جاتا ہے۔ اور ناکام ہو جائے تو مورخ اسباب ناکامی پر بحث کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ کمال اتاترک کامیاب ہو گیا، تو مشرق و مغرب کے مورخین نے اس کی جرات، شجاعت، تدبر اور جانبازی پر طویل مقالے لکھے۔ دوسری طرف نپولین کو واٹرلو میں شکست ہوئی تو اس کی لغزشوں پر سینکڑوں کتابیں نکل آئیں۔ یہی حال علامہ مشرقی کا ہے کہ آپ نے عین اس وقت، جب خاکسار تحریک کی ہیبت سے برطانیہ کا ایوان تدبر کانپ رہا تھا، دو خطرناک قدم اٹھائے۔ پہلا لکھنؤ میں، جب علامہ شیعہ و سنی کے تصادم کو روکنے کے لئے کئی ہزار خاکساروں کے ہمراہ لکھنؤ میں داخل ہو گئے۔ اور وہاں مسلح پولیس سے مقابلہ شروع کر دیا۔ اس تصادم میں دو درجن خاکسار مجروح و شہید ہوئے۔ اور مشین گنوں نے خاکساروں کی ہمت و استقلال پر کاری ضرب لگائی۔ دوسرا تصادم حکومت پنجاب سے ۱۹۴۰ء میں ہوا۔ اس زمانے میں دوسری جنگ عالمگیر چھڑی ہوئی تھی۔ اور حکومت برطانیہ ہر طرح خاکساروں کی فوج کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھتی تھی۔ جنگ میں بعض اوقات حکومتوں کے خزانے خالی ہو جاتے ہیں۔ اور ہر بڑی [illegible] پہ جا پہنچتا ہے [illegible]

بے چارگی کے اس عالم میں اگر کوئی شخص ہمت کرے، تو حکومت کا قہر نازل ہوتا ہے۔ کچھ ایسے ہی حالات کی بنا پر حکومت نے خاکساروں پر پابندیاں لگا دیں کہ وہ پنجاب کے چار شہروں یعنی جالندھر، امرتسر، لاہور اور شاید راولپنڈی میں مارچ نہ کیا کریں۔ تدبر کا تقاضا یہ تھا کہ علامہ مشرقی یہ پابندی قبول کر لیتے۔ لیکن وہ قانون شکنی پر ڈٹ گئے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۰ء کے شدید تصادم میں خاکساروں کا بڑا جانی نقصان ہوا۔ علامہ گرفتار ہو گئے۔ اور خاکساروں کے گروہ لاہور کی مختلف مساجد میں جا گھسے۔ جہاں سے تیس یا چالیس یوم تک مقابلہ جاری رکھا۔ آخر تھک گئے۔ حکومت نے سب کو گرفتار کر لیا۔ تحریک کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ ملک میں وسیع پیمانے پر خاکساروں کی گرفتاریاں ہوئیں۔ اور اس طرح دس برس کی تعمیری کوششیں چشم زدن میں برباد ہو گئیں۔ اور ہماری امیدوں کا مرکز عمل و عزائم سے زمین پکڑ گیا۔

ان تمام حوادث میں مسلمانان ہند کی ہمدردیاں علامہ کے ساتھ تھیں۔ لیکن جب تحریک پاکستان نے قائداعظم رحمتہ اللہ علیہ کی عظیم قیادت میں زور پکڑا۔ تو علامہ مشرقی نے پریس اور پلیٹ فارم سے حضرت قائداعظم پر شدید بمباری شروع کر دی۔ ابتدا سے علامہ کا نصب العین آزادی اور اسلامی سلطنت کا قیام تھا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ جو مجاہد قائداعظم اسی جہاد میں دس کروڑ مسلمانان ہند کی کمان کر رہا ہے۔ علامہ صاحب اس ہستی پر کیوں برس رہے ہیں؟ علامہ کی یہ وہ خطرناک لغزش تھی۔ جس نے انہیں مسلمانان ہند کی ہمدردی و محبت سے یکسر محروم کر دیا۔ اور وہ ملکی سیاست میں پس صف بے کارواں ہو کر رہ گئے۔ اس وقت (۱۹۵۶ء) وہ پاکستان میں ایک بے حرکت سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں وہ دب چکے ہیں۔ حالانکہ قدرت نے انہیں ایک شاداب دماغ، تحریر میں نمک، عرفانی قلم، فکر میں تخیل اور ایک تند و تیز جذبۂ ایمان عطا کیا ہے۔ وہ تعمیر ملت میں ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ اس وقت ہمارا ملّی و انفرادی اخلاق تیزی سے زوال پر ہے۔ ہمارے گراں فروش تاجروں نے عوام کا دم ناک میں کر رکھا ہے۔ ہمارے کارخانہ دار ہمارا خون چوس رہے ہیں۔ ہمارے راشی اہلکار ہماری بنیادوں میں پانی دے رہے ہیں۔ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جرائم بڑھ رہے ہیں۔ صداقت و دیانت کا جنازہ اٹھ رہا ہے۔ روح کی نگری اجڑ رہی ہے۔ اور ابلیس کی دنیا بس رہی ہے۔ کیا ان نازک اوقات میں قوم کے اخلاق کو سدھارنے کی ضرورت نہیں؟ کیا بدکار اقوام کی سلطنت کبھی باقی رہی ہے؟ اگر نہیں رہی۔ اور ہماری بدکاریاں پاکستان کے لئے ایک مستقل خطرہ بن چکی ہیں۔ تو پھر علامہ صاحب خاموش کیوں ہیں؟ آج خاکسار تحریک کی پھر ضرورت ہے۔ کس لئے؟ بازاروں سے گراں فروشی، چور بازاری، جھوٹ اور کھوٹ کی لعنت کو مٹانے کے لئے۔ ہر گھر اور ہر دفتر تک یہ آواز پہنچانے کے لئے۔ کہ وہ اہلکار جو حرام کو سمجھتے ہیں۔ وہ افسر جو راشی، کنبہ پرور، مستحق کش اور انصاف فروش ہیں۔ وہ عوام جو جھوٹ بول رہے ہیں۔ جو اتحاد و تنظیم کی قوت سے محروم ہیں اور جن کی دنیا سے دل برباد ہو چکی ہے۔ وہ سب اپنی آزادی کے دشمن اور دولت خداداد پاکستان کے بدخواہ ہیں۔ اگر یہ لوگ باز نہ آئے۔ تو دیر یا زود ان سے دولت آزادی چھین لی جائے گی۔

فرض کی آواز

میری یہ محکم رائے ہے کہ علامہ مشرقی میں اصلاح و تعمیر کی بے پناہ طاقت موجود ہے۔ ان کا اخبار ہم لاکھوں دلوں میں زلزلہ پیدا کر سکتا ہے۔ ان کی مہیب آواز کروڑوں غفلت زدہ نفوس کو خواب غفلت سے جگا سکتی ہے۔ اور ان کی آتشیں تقریریں ہمارے ویران دلوں میں ایمان و یقین کی دہکتی ہوئی چنگاریاں ابھار سکتی ہیں۔

کیا علامہ صاحب اپنے فرض کو پہچانیں گے؟

نشاں راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مرد راہ داں کے لئے (اقبال)

---

[1] میں نے اس تحریک سے پوری ذہنی وابستگی رکھتے ہوئے اپنے خلوص کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ باتیں ناگوار خاطر ہوں تو معذرت خواہ بھی ہوں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

شورش کاشمیری

مولانا ابوالکلام آزاد کے پیرایۂ بیان کو ملحوظ رکھیں تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۸۹۲ء مطابق ربیع الاول ۱۳۱۰ھ میں پٹنہ میں عدم سے اس عالمِ ہستی نما میں وارد ہوئے اور نعمتِ حیات سے متمتع۔ ددھیال کی طرف سے عطاء اللہ اور ننھیال کی جانب سے شرف الدین احمد نام رکھا گیا۔ عوام نے ترنگ سے بالا پیر کہنا شروع کیا، عقیدت مند صرف شاہ جی کہتے ہیں۔ حضرت علامہ انور شاہ نوراللہ مرقدہٗ نے انجمن خدام الدین لاہور کے سالانہ اجلاس میں امیرِ شریعت کا لقب تجویز کیا، خود بیعت فرمائی۔ ان کے علاوہ پانچ سو علماء نے بھی بیعت کی جن میں مولانا ظفر علی خان مدیر زمیندار بھی شامل تھے۔

اسلاف خاندان بخارا سے کشمیر وارد ہوئے۔ سلطان زین العابدین والیٔ کشمیر کے زمانہ میں انہیں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ ان کی رحلت پر خاندان کی شاخیں ہندوستان کے دوسرے مقامات میں بس گئیں۔ ایک شاخ نے گجرات میں اور دوسری نے پٹنہ میں قیام کیا ——— آپ کے والد بزرگوار کی شادی اسی شاخ کے ایک بزرگ حکیم سید محمد شاہ اندرابی کی دختر فرخندہ اختر سیدہ فاطمہ اندرابی سے ہوئی۔ آپ ابھی بچے ہی تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی رحلت پر والد پٹنہ سے گجرات چلے گئے اور دوسری شادی کر لی۔ شاہ جی ننھیال ہی میں رہے جہاں نانی مرحومہ نے بیٹی کی نشانی سمجھ کر بڑی شفقت سے پالا۔ آپ کے نانا کا مکان شعر و ادب کی محفلوں کا مرکز تھا۔ شاد عظیم آبادی اکثر نانی صاحبہ سے محاورہ اور روزمرہ کی صحت کے لئے تشریف لاتے تھے۔ ان کی صحبتوں سے آپ نے بھی استفادہ کیا۔ رفتہ رفتہ شعر و شاعری اور زبان و کلام کا ذوق بڑھ گیا ———

غالباً نانی صاحبہ کی وفات پر آپ نے پٹنہ سے گجرات کا قصد کیا۔ اثنائے سفر میں جو واقعات پیش آتے رہے۔ ایک آدھ جگہ ملازمت بھی کی۔ کچھ دنوں بنارس میں چاندی کے ورق کوٹتے رہے حتیٰ کہ امرتسر پہنچ گئے۔ وہاں مختلف اساتذہ سے قرآن، حدیث اور فقہ پڑھی۔ تھے خوش الحان اور خوش الحانی کا یہ جوہر آپ کو نانا مرحوم سے ورثہ میں ملا تھا۔ وعظ شروع کیا تو سارا امرتسر گرویدہ ہو گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر پنجاب اور امرتسر گولیوں کا تختۂ مشق بنا تو ملک میں ایک ہیجان کھڑا ہو گیا۔ مولانا محمد علی و شوکت علی کی تحریک پر آپ نے تحریک خلافت میں خطیبانہ حیثیت اختیار کی ——— دیکھتے ہی دیکھتے تمام ملک میں آپ کی خطابت کا شہرہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ ہندوستان میں یہ بات متفق علیہ ہو گئی کہ اردو زبان میں آپ سے بڑا کوئی عوامی خطیب نہیں۔

شاہ جی اور خطابت ہم نشیں رہیں۔ آپ نے تقریباً تیس یا پینتیس برس قید کا زمانہ چھوڑ کر، اس دشت پیمائی میں بسر کئے ہیں۔ ہر مہینہ کی تقریباً دو تہائی

آپ کے لوہے کی دھاک بیٹھ چکی ہے۔ لاکھوں آدمیوں کو آپ کی سیاست سے اختلاف رہا۔ اب بھی اختلاف کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن کوئی سا شخص بھی اس سے اختلاف نہیں کرے گا کہ خطابت ان کی وراثت ہے۔ وہ بولتے نہیں موتی رولتے ہیں ——— ان کی برجستہ گوئی، ان کی حاضر جوابی، ان کی بذلہ سنجی، ان کی نکتہ آفرینی، ان کی زبان دانی، ان کی شعر و سخن سے دلچسپی، غرض ——— ع

ہزاروں خوبیاں ایسی کہ ہر خوبی پہ دم نکلے

درحقیقت وہ ایک چلتا پھرتا شرعی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ اردو، فارسی، پنجابی کسی زبان میں بھی ان کی طبیعت بند نہیں۔ وہ ایک بحر ذخار ہیں، ان کا کوئی لفظ موتی سے خالی نہیں ——— بلاشبہ ان کا نام دیماستھینیز، سسرو، ایڈمنڈ برک، سحبان ابن وائل اور سعد زغلول کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے خطابت اختیار نہیں کی بلکہ خطابت نے انہیں منتخب کیا ہے، برصغیر کی بہت سی تحریکیں انہوں نے سلگائی ہیں۔ وہ زبان و بیان کا ایک ایسا مرقع ہیں جس میں رنگا رنگ تصویریں ہیں، ان کی خطابت کو نگار خانے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے ——— ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ایک خوبصورت وجود میں عنفوان شباب کی جو رعنائیاں ہوتی ہیں وہ تمام تر ان کی خطابت میں ہیں۔ انہوں نے اپنے خیالات کی سزا بھی بھگتی ہے۔ انگریزوں سے بھی اور مسلمانوں سے بھی، لیکن انگریزوں کی سزائیں ان کی متاع عزیز ہیں، مسلمانوں سے انہیں کوئی گلہ نہیں، وہ اس کے ڈانڈے تیرہ سو برس کی تاریخ کے مختلف حصوں سے ملاتے ہیں ——— اس وقت ان کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہے۔ اس حساب سے انہوں نے جوانی کے اٹھارہ برس قید و بند میں بسر کیا ہے ——— ع

خوردہ افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

——— ان کی بھی محفلیں باغ و بہار ہوتی ہیں ——— ع

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

تمام رات بیت جائے مجال ہے وہ بولنے سے نہیں تھکتے اور آپ سننے سے نہیں تھکیں گے۔ جب آتش جوان تھا وہ شروع رات سے پو پھٹنے تک تقریر کرتے اور لوگ تھے کہ نقش کالحجر ہو کر بیٹھے رہتے۔ ان کا مضمون زلف یار کی طرح پیچ در پیچ بل کھاتا ہوا کہیں ختم نہیں ہوتا۔

تنہائی سے انہیں سخت نفرت ہے۔ غالباً اس کا تصور بھی ان کے ہاں نہیں، وہ زندگی کو بازار سمجھتے اور بازاری پر مرتے ہیں لیکن سب سے بڑا عوامی خطیب ہونے کے باوجود عوام کو کالانعام سمجھتے ہیں۔ غالباً ان کا خیال ہے کہ سارے عوام [illegible] کا ٹکڑا ہے۔ ان کے نزدیک [illegible] نظم معریٰ، بھگا راگ، برطانوی سیاست اور غلام احمدی نبوت عجیب و غریب پہیلیاں ہیں۔

دوستوں پر عنایت اور بے جا اعتماد کرتے ہیں۔ دشمنوں کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتے ——— سیاسیات میں حصہ لینے کے بعد اب سیاسیات سے سخت متنفر ہیں، انہیں انتخاب کے نام سے چڑ ہے، بیعت کرتے نہ لیتے ہیں، دل کی دوستی کو دماغ کی دوستی پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ اختلاف فکر و عمل کے علی الرغم مولانا عبدالمجید سالک، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، سید احمد شاہ بخاری اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی یاری کا دم بھرتے تھے مگر جس زمانے میں مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر شیخ محمد عالم، ڈاکٹر سیف الدین کچلو وغیرہ سے اتحاد فکر و عمل تھا ان سے دل کی رسم و راہ کا کوئی معاملہ نہ تھا۔

جماعت احرار، سیاسیات میں ان کی مساعی شکست انجام کا ثمرہ ہے۔ اب تو خیر حکومت ہی نے اسے خلاف قانون قرار دے رکھا ہے لیکن ایک زمانے میں احرار کا طوطی بولتا تھا۔ چوہدری افضل حق مرحوم، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایسے لوگ آپ کے دست و بازو تھے۔ اب وہ سبو ٹوٹ چکا، صہبا چھلک گئی، میکدہ اجڑ گیا، آبگینے کے ریزوں میں تلچھٹ باقی ہے اور بقول اقبال ؎

بیا یک لحظہ با عاماں درآمیز کہ خاصاں بادہ ہا خوردند و رفتند

حسن جہاں کہیں ہو ان کی کمزوری ہے، جنگلوں کی سنسانی سے لے کر پھولوں کی لالائی تک میں وہ حسن تلاش کرتے اور اس پر مرتے ہیں۔ وہ جذبات کے بھوکے اور جذبات پر مرتے ہیں۔ انہیں عاشقی حسن سے قطعاً لگاؤ نہیں۔ تاج محل کو گاندھی جی کے الفاظ میں مزدوروں کے بیگار کی یادگار کہتے ہیں۔ تمام زندگی سیر و سیاحت میں گزار دی لیکن سیر و سیاحت کے عادی نہیں، موٹا جھوٹا پہنتے، سادہ غذا کھاتے اور ہنسی خوشی جیتے ہیں۔ اب کچھ دنوں سے طبیعت بیمار ہے، دوستوں کے بگڑنے اور بچھڑنے کا سخت رنج ہے، فرماتے ہیں:

"میاں اب تو دشمن بھی شریف نہیں رہا۔ شریف دشمن سے لڑنے میں تو لطف آتا تھا۔"

چہرہ خوش اور آواز خوش ان کی طبعی خوراک ہیں، گو صوفی مشرب ہیں لیکن مزامیر کے قائل نہیں، صرف گلے کے رس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ شعر و شاعری سے انہیں ایک گونہ وابستگی ہے، تمام اساتذہ کے چیدہ چیدہ شعر ازبر ہیں، ان کے برمحل استعمال میں جو خصوصیت انہیں حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں، مولانا آزاد کی طرح ان کے حافظے کی گرہیں بھی طبیعت شگفتہ ہو تو کھلتی اور بکھرتی بھی جاتی ہیں، بقول شاعر ؂

وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں

کبھی سرو قامت تھے، اب ان کا قد بھی ان کے دل کی طرح اللہ کے حضور میں جھک گیا ہے۔ چہرہ پر جھریوں کی سیج بچھا دی ہے، ماتھا کشادہ لیکن فکر کی کائنات پیالیوں سے مجروح، آنکھیں ——— ایک زمانہ میں ساری مستی شراب کی سی تھی ——— اب چپ چاپ گویا کچھ سوچ رہی ہیں۔ ابھی تک جب شہسواروں کا بانکپن، قرآن پڑھیں تو قرن اول کا بیتا بھی یاد آ جاتا ہے۔ شعر سنائیں تو کبھی رباعیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں:

"دنیا کسی کے لئے کبھی نہیں بدل سکتی۔ تمام زندگی نصف افسانۂ امید اور نصف ماتم یاس ہے۔"

اور اب اس مصرعہ میں ؂

مختصر حال چشم و دل یہ ہے
اس کو آرام اس کو خواب نہیں

رحمان

اثر صہبائی

مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جسٹس اور پاکستان کا مایۂ ناز فرزند وزیر آباد کے ایک متوسط طبقے کے گھرانے میں ۱۲ جون ۱۹۰۳ء کو پیدا ہوا۔ ابھی زندگی کی صرف تین بہاریں گزری تھیں کہ قدرت نے ایک نہایت ہی کڑا امتحان لیا، یعنی ۱۹۰۶ء میں آپ کے والد ماجد جناب شیخ غلام [illegible] کا سایۂ شفقت سر سے اٹھ گیا۔ اب صرف آپ کی والدہ ماجدہ تھیں اور آپ کا توام بھائی رحیم۔ زندگی کے آغاز ہی میں یتیمی کا یہ عظیم حادثہ اس ننھی سی عمر کے بچوں کے سر پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں بھائیوں کی کفالت اور تعلیم و تربیت کا بار آپ کی والدہ کے بھائیوں نے اٹھایا۔ اس گھر پر پیار کی تربیت ان خوش نصیب انسانوں کی قسمت میں لکھی تھی۔ ان میں سے شیخ مولا بخش صاحب تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں لیکن شیخ عنایت اللہ اور شیخ رحمت اللہ صاحب اپنی محنت اور محبت کا پھل دیکھنے کے لئے زندہ ہیں۔ رحمان صاحب کے دل میں ان دونوں بزرگوں کے لئے بے پناہ احترام ہے۔ ان کے احسانات کا آپ کو بڑا احساس ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ بھی اپنے لخت جگر اور نور نظر کی شاندار کامیابیاں دیکھنے کے لئے [illegible] تک زندہ رہیں۔

آپ کی تعلیم وزیر آباد کے ایک مشن اسکول میں ہوئی۔ بچپن سے نہایت ذہین و ذکی، گمبھیر اور متین طبع تھے۔ والد کے سایہ اٹھ جانے نے آپ کو بہت قبل از وقت سنجیدہ بنا دیا تھا۔ رحمان صاحب نے ۱۹۱۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور صوبہ بھر میں دوئم رہے۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ آپ کے توام بھائی رحیم [illegible] کالج میں [illegible]۔ ابھی آپ کے ساتھ تھے۔ دونوں بھائی نہایت اچھے [illegible]۔ دونوں ذہین اور شوقین تھے۔ [illegible] لیکن دونوں کے لبوں پر ایک لطیف سا تبسم ہر وقت کھیلتا رہتا تھا۔ دونوں میں بڑی دلکشی اور دلربائیت تھی۔ رحمان صاحب اپنی ابتدائی ذہانت اور قابلیت کے باعث بہت ممتاز تھے۔ [illegible] کالج میں [illegible] غالب [illegible] سے زیادہ متانت [illegible] تاہم [illegible] دل پر رحمان صاحب کی قابلیت، ذہانت، سنجیدگی اور کردار کی معصومیت کا [illegible] نقش تھا۔

ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں [illegible] HONOURS SCHOOL OF MATHEMATICS میں

لے لیا اور صوبہ بھر میں اول آئے۔ دو سال کے بعد ریاضی میں ایم۔ اے بھی کیا۔

گورنمنٹ کالج ہی میں آپ نے انگریزی میں انشا پردازی شروع کی۔ آپ کے انگریزی مضامین کالج کے میگزین "راوی" میں شائع ہوتے تھے۔ انگریزی کے مشہور پروفیسر مسٹر فرقو رحمان صاحب کی انشا پردازی سے بہت متاثر ہوئے اور آپ کی حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ رحمان صاحب کی توجہ اردو ادب کی طرف مبذول کرانے میں یہی پروفیسر صاحب پیش پیش تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء کے لگ بھگ جبکہ آپ ایم۔ اے میں تھے آپ نے اردو میں سب سے پہلی نظم "بانگ جرس" لکھی۔ ظاہر ہے کہ اس نظم کی ادبی حیثیت کیا ہو سکتی ہے لیکن یہ اپنی تاریخی اہمیت کے اعتبار سے زندہ رہے گی۔

افسوس کہ ہمارے ملک کے بہترین دل و دماغ حکومت کی مشین کے کل پرزے بننے پر مجبور ہیں۔ تعلیمی اداروں میں اتنی دلکشی نہیں۔ علم و ادب کی قدر پرکاہ کے برابر بھی نہیں۔ کوئی ادیب آزادانہ طور پر محض اپنے ادب کے بل بوتے پر عزت کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں ہر ذہین قابل شخص اضطراری طور پر مقابلے کے امتحانات کی طرف لپکتا ہے۔ چنانچہ رحمان صاحب بھی آئی۔ سی۔ ایس کے امتحانی مقابلے میں شریک ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں بڑے امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ مسلمانوں میں اول اور ہندوستان بھر میں تیسرے نمبر پر رہے۔ مزید تربیت کے لئے انگلستان چلے گئے۔ وہاں عربی اور فارسی بھی ان کے مضامین تھے۔ ۱۹۲۸ء میں اپنے کمال امتیازات کے ساتھ اپنے وطن عزیز میں واپس تشریف لائے اور مختلف مراحل طے کرتے ہوئے ۱۹۴۶ء میں لاہور ہائی کورٹ کے اور اکتوبر ۱۹۵۴ء میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے

کچھ ہمتِ مرداں ہوتی ہے کچھ رحمتِ یزداں ہوتی ہے
قطرے ہی سمندر بنتے ہیں، ذرّے ہی بیاباں ہوتے ہیں

ایف۔ اے کے بعد رحمان صاحب سے پھر ایک مدت تک ملاقات نہ ہو سکی۔ کئی سال بعد غالباً ۱۹۳۶ء میں کشمیر میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں ان دنوں وہاں وکالت کیا کرتا تھا۔ ایک دعوت میں ہم دونوں اکٹھے تھے۔ سرسری ملاقات رہی۔ اس وقت تک بھی مجھے رحمان صاحب کی شعر گوئی کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان پر مجھے بھی کشمیر سے ہجرت کرنا پڑی۔ اس دور پر آشوب کا تذکرہ اب لا حاصل ہے۔ میں بھی انتہائی پریشانی کے عالم میں سیالکوٹ پہنچا۔ ناداری اور بیکاری تو دونوں ہی تھیں۔ آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی۔ تمام کاروبار بند پڑے تھے اور اخراجات پہلے کی نسبت زیادہ تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنے آبائی شہر میں بھی ایک اجنبی تھا۔ وکالت کا کام غالباً نومبر ۱۹۴۷ء میں شروع کیا۔ طبیعت بہت بے چین تھی۔ آزردگی اور شکستہ دلی کے باعث کام کاج میں جی نہ لگتا تھا۔ انہی ایام میں رحمان صاحب کی ایک نظم "ناصبور دل" ہمایوں میں دیکھی۔ نظر سے گزری تو حیرت بھی ہوئی کہ اتنی پختہ اور دلآویز نظم رحمان صاحب نے کیونکر لکھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ برسوں سے مشق سخن فرما رہے ہیں۔ ان دنوں آپ ہائی کورٹ کی ججی کے علاوہ کسٹوڈین کا کام بھی کیا کرتے تھے۔ میں نے ایک مختصر سا خط لکھا جس میں ضمناً اس وقت کی ذاتی پریشانی کا بھی کچھ تذکرہ تھا۔ چند دنوں کے بعد آپ نے مجھے سیالکوٹ میں ہی اسسٹنٹ کسٹوڈین مقرر فرما دیا۔ رحمان صاحب کی اس عملی ہمدردی کا مجھ پر نہایت گہرا اثر ہوا۔ چنانچہ شکریہ ادا کرنے کے لئے میں لاہور پہنچا۔ آپ نہایت تپاک اور محبت سے ملے اور دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ آپ نے اپنی افسری کا مجھے مطلقاً احساس نہ ہونے دیا۔ شعر و ادب، سیاست اور زندگی کے دوسرے مسائل پر ایک بے تکلف دوست کی طرح باتیں کرتے رہے۔ آپ کی ہمدردی اور انسان دوستی کا پیرایہ بہت دلفریب تھا ۔۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

اس کے چند ماہ بعد مجھے سیالکوٹ کا پبلک پراسیکیوٹر مقرر کیا گیا۔ اس تقرر کے سلسلے میں مجھے آنریبل مسٹر جسٹس ایم۔ آر۔ کیانی کا بالخصوص

شکر ادا کرتا ہوں جہاں وہ ان دنوں حکومت پنجاب کے گورنر تا ... تھے۔ آپ کی بے انداز محبت، نوازش اور ادب پروری کا میرے دل پر گہرا نقش ہے۔ میں ملازمت کی وجہ سے اس مرتبہ شفیق رہے۔ مجھے کبھی کبھی واہ سے لاہور آنا پڑتا تو لاہور آنے کی سب سے بڑی کشش رحمان صاحب کی ذات گرامی تھی ان کی ملاقات کے تصور سے ہی خوش ہو جاتا تھا ان سے مل کر عجیب تازگی اور روحانی لذت محسوس ہوتی تھی اور جب میں ان سے رخصت ہوتا تو ان محبوب شخصیت کی ملاقات کئی دن تک میرے لئے باعث فرحت و انبساط رہتی۔ یہ ملاقاتیں ایک نشاطِ خاص حاصل ہوا کرتی تھیں اس لئے مجھے ان کو زیادہ قریب سے دیکھنے کے موقعے ملتے رہتے تھے۔

آپ بڑی دلکش اور محبوب شخصیت کے مالک ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ انفرادی گفتگو اور طرز ملاقات کو عادت میں یوں سمو آتے ہیں اور ملنے والوں سے اتنی گرمجوشی، بے تکلفی اور خلوص و محبت سے ملتے ہیں کہ ہر ملنے والا یہ احساس لے کر اٹھتا ہے کہ رحمان صاحب اس کے بہترین دوست ہیں۔ جس کا جی چاہے ملاقات کے لئے آجائے، جب تک جی چاہے باتیں کرے اور جب جی چاہے اٹھ کر چلا جائے۔ میں نے آج تک رحمان صاحب کو کبھی اس قسم کا اشارہ تک بھی کرتے نہیں دیکھا کہ ملاقاتی ان کے لئے بار خاطر بن رہا ہے۔ حالانکہ بعض ملاقاتی ضرورت سے بہت زیادہ طویل اور بیکار گفتگو بھی کرتے ہیں ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو
دار و گیر و حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

رحمان صاحب ہر شخص کی بات نہایت غور اور ہمدردی سے سنتے ہیں اور جہاں تک بس چلے اس کی پوری پوری مدد کرتے ہیں ؏

ہوا ممکن تو یاری کی نہیں تو اشکباری کی

میں سیالکوٹ سے آتا تو علمی اور ادبی موضوعات پر بڑی دلچسپ گفتگو رہتی۔ میری خواہش تھی کہ میں لاہور چلا آؤں۔ چنانچہ جب محض ضمنی طور پر میں نے اپنی اس دیرینہ خواہش کا اظہار کیا تو آپ نے نہایت گرمجوشی سے اس کی تائید فرمائی اور محض لفظی تائید پر اکتفا نہ کیا بلکہ عملی طور پر اس معاملے میں ہر طرح مجھے کامیابی ہوئی۔ چنانچہ آپ کی اس توجہ خاص کے باعث میرا تبادلہ لاہور میں ہو گیا۔

دوسروں کے ساتھ نیکی اور احسان کرتے ہوئے رحمان صاحب کی ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ دوسرا شخص ان کے احسان کے بوجھ کو محسوس نہ کرے۔ اس قسم کی طبیعت خوش قسمتی سے بہت تھوڑے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

لاہور آنے کے بعد مجھے رحمان صاحب کو اور زیادہ قریب سے دیکھنے کے موقعے ملتے رہے۔ رحمان صاحب کی سب سے نمایاں خصوصیت توازن و اعتدال ہے۔ ان کے مزاج میں خوش مذاقی کے ساتھ ساتھ تیزی اور ان کے دل میں حرارت کے ساتھ ساتھ سلامتی طبع کا نہایت عمدہ امتزاج ہے۔ میں نے آج تک آپ کو خفگی یا برہمی کی حالت میں نہیں دیکھا۔ ان کی محبت اور گرمجوشی میں بھی رکھ رکھاؤ اور توازن پایا جاتا ہے۔ ان کے ہاں نہ خودی کا نشہ ہے نہ بے خودی کی لغزش، علم و حکمت ہے مگر پندار نہیں، خلوص و محبت ہے لیکن ہوس و شیدائی نہیں، محنت و مشقت ہے لیکن یبوست اور تلخی نہیں، ہمدردی اور دلبستگی ہے لیکن خود نمائی نہیں، رواداری اور مذہبیت ہے لیکن تعصب اور تنگ نظری سے کوسوں دور۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ میں جب بھی رحمان صاحب کے پاس جاتا عام طور پر ایک معمر اور مختلف الخیال شخص وہاں ضرور آجاتا اور اپنے آلام و مصائب کی داستان شروع کر دیتا۔ اکثر اوقات وہ باتیں کرتے کرتے رونا بھی شروع کر دیتا۔ بے چارے کو کچھ ثقل سماعت کی بھی شکایت تھی اس لئے خود بھی زور زور سے باتیں کرتا اور رحمان صاحب کو بھی اپنی طبیعت کے خلاف کچھ اونچی آواز میں جواب دینا پڑتا۔ میں تو ابھی اس کی حالت دیکھ کر متاثر ہوتا لیکن اس کی طول طویل ایک ہی بات کو بار بار دہرانا اور رونا چلانا مجھ پر کچھ گراں سا گزرتا تھا۔ البتہ رحمان صاحب اس کی رام کہانی بڑے صبر و سکون، تحمل اور

[illegible] سے منشی اور فلسفی کی [illegible] سے اس کا دل بہلاتے ۔ اس شخص کے متعلق آپ نے [illegible] مجھے [illegible] سے بات چیت کی ۔ غرض اس کی امداد میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ۔ بعد میں رکھان صاحب نے اس شخص کی کہانی یوں بیان فرمائی "یہ ایک ذی عزت اور شریف مہاجر ہے ۔ تقسیم سے قبل ایک متمول اور خوشحال انسان تھا ۔ اب بڑھاپا ہے ۔ نادار و بے کس [illegible] رہی ہے ۔ اس کا ایک ہی [illegible] تھا [illegible] نے ایک جگہ ملازمت دلا دی تھی ۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ وہ لڑکا ایک حادثے کا شکار ہو گیا اور اب یہ شخص زندگی کے [illegible] کا بوجھ اٹھانے کو تنہا رہ گیا ہے ۔"

یہ کہانی سن کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ رکھان صاحب کی دوست نوازی اور انسان دوستی کا میرے دل پر نہایت گہرا اثر ہوا ۔

۲۴ اپریل [illegible] کا ذکر ہے ۔ پہلا روزہ تھا میں رکھان صاحب سے ملنے گیا ۔ گرمی کی شدت تھی [illegible] کوئی دس ساڑھے دس کا وقت ہو گا ہم باتوں میں مصروف تھے کہ یکایک آپ کی نظر باہر پہرہ دینے والے سپاہی پر پڑی ۔ دھوپ کی تیزی بڑھ رہی تھی اور سایہ کم ہو رہا تھا ۔ آپ نے سپاہی کو آواز دی ۔ کھڑکی بند تھی [illegible] سپاہی کو آواز دی پھر رکھان صاحب سے دریافت کیا [illegible] "یہ سپاہی غالباً روزے سے ہو گا ۔ [illegible] اس شخص کو [illegible] ہے ۔ یہ مقررہ وقت سے پہلے جا سکتا ہے ؟"
[illegible] سپاہی سے [illegible] ۔ سپاہی بے حد خوش اور شکر گزار تھا اور میں دیر تک اس عظیم المرتبت شخص کی انسان دوستی سے متاثر [illegible]

آنچہ [illegible] بسیار است و نیست
نیست جز انسان دریں عالم [illegible] بسیار است و نیست

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست   ما زندہ ازانیم کہ آرام نہ داریم

آپ اب بھی [illegible] حقیقت کا [illegible] ہے لیکن رکھان صاحب [illegible] مجالس کی صدارت [illegible] بزم اقبال اور ادارۂ ترقی ادب کی رکنیت اور مجلس زبان دفتری کی صدارت وغیرہ وغیرہ ۔

عام طور پر مختلف مجلسیں بڑے بڑے آدمیوں کو صدر وغیرہ محض اس لیے منتخب کر لیتی ہیں کہ ان کے بڑے نام کو استعمال کیا جائے ۔ ان بڑے آدمیوں کو مجلس کے کام سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے نہ مجلس کو اس بڑے آدمی سے کوئی سروکار ہوتا ہے ۔ ایسے بڑے لوگ سمجھتے ہیں کہ [illegible] باعث [illegible] سمجھتے ہیں ۔ رکھان صاحب کی رکنیت یا صدارت محض نمائشی [illegible] نہیں ہوتی ۔ ان مجالس کی کارروائیوں میں آپ ایک محقق کی [illegible] طرح دلچسپی لیتے ہیں اور ان کے [illegible] کو کامیاب بنانے میں وقت اور دماغ صرف کرتے ہیں ۔ جو فرض بھی اپنے ذمے لیتے ہیں اس کو پوری دیانت داری سے نباہتے ہیں ۔ مجلس زبان دفتری کے بعض اراکین نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ رکھان صاحب اصطلاحات کے ترجمے میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں ۔ ترجمے کے الفاظ پر اچھی طرح غور فرماتے ہیں اور اکثر اوقات اپنی طرف سے ایسی تجاویز پیش فرماتے ہیں جو عام طور پر قابل قبول ہوتی ہیں ۔ دفتری زبان کے ترجمے کا کام نہایت خشک اور صبر آزما ہے لیکن فرض کی ادائیگی کا احساس ہے کہ اس کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں ۔

"[illegible]" پاکستان [illegible] رکھان صاحب اس کے مستقل [illegible] کے سلسلے میں نہایت عمدہ کام کر رہا ہے ۔ [illegible] منعقد ہو چکی ہیں ۔

بزمِ اقبال کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ "اقبال" انگریزی اور اردو میں بالالتزام شائع ہو رہا ہے۔ علامہ مرحوم کے متعلق ایک جامع اور مستند کتاب زیرِ تصنیف ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں ہوگی۔ ایک کتاب اب شائع ہو چکی ہے، "فکرِ اقبال"۔ اور "ذکرِ اقبال" پہلا حصہ مولوی عبدالمجید سالک اور دوسرا حصہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے سپرد کیا گیا ہے۔ "ادارۂ ترقی ادب" کی طرف سے بھی غیر ملکی زبانوں کی چند بلند پایہ علمی کتابوں کے ترجمے شائع کئے جا چکے ہیں۔

ان تمام اداروں کی روحِ رواں رحمان صاحب کی شخصیت ہے۔ اکثر بڑے لوگ خط کا جواب دینا گوارا نہیں فرماتے اور اس میں اپنی ہتک محسوس کرتے ہیں لیکن رحمان صاحب اپنی تمام مصروفیتوں اور مجبوریوں کے باوجود اپنے احباب کے خطوط کا جواب دینے میں بڑے مستعد ہیں۔ ہر خط کا جواب مناسب وقت پر مل جاتا ہے۔ خط اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور عام طور پر اردو میں بڑے خوشخط ہیں۔

اگرچہ ہر مسلمان جج کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی فقہ سے براہِ راست متعارف ہو لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ اکثر جج اور وکلاء صاحبان اسلامی قانون کا مطالعہ بھی انگریزی زبان میں ہی کرتے ہیں۔ بہت کم جج اور وکیل ایسے ہیں جن کو عربی زبان پر اتنا عبور ہو کہ وہ اسلامی فقہ کے اصل ماخذ تک رسائی حاصل کر سکیں۔ رحمان صاحب عربی اور فارسی دونوں زبانوں سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن آپ نے یہیں تک بس نہیں کی۔ آپ نے باقاعدہ طور پر ایک پروفیسر رکھا ہوا ہے جس سے پڑھتے ہیں۔ روزانہ صبح کے وقت عربی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ اس عمر میں باقاعدہ طور پر عربی پڑھنے کا کیا مقصد ہے؟ کیا آپ اسلامی قانون پر کوئی کتاب لکھنا چاہتے ہیں؟ فرمانے لگے "اسلامی قانون پر ایک مستند کتاب لکھنے کو جی تو چاہتا ہے اور وقت کی یہ نہایت اہم ضرورت بھی ہے لیکن افسوس کہ میرے پاس تحقیق و جستجو کے لئے اتنا وقت نہیں۔ بہر حال میری اتنی خواہش ضرور ہے کہ میں فقہ کی کتابوں کو انگریزی کی بجائے عربی میں پڑھ سکوں۔"

آپ بڑے باہمت انسان ہیں اور آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ "قانون"، "انگریزی ادب و فلسفہ" اور اردو ادب کی پرانی اور نئی کتابیں آپ کے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ میں نے اردو کی بہت سی کتابیں سب سے پہلے آپ ہی کی میز پر دیکھیں۔ پھر وہ کتابیں محض الماریوں اور میز کی آرائش کے لئے نہیں ہیں بلکہ آپ ہر کتاب کو بڑے غور سے دیکھتے ہیں اور ایک بے لاگ رائے قائم کرتے ہیں۔ بڑے لوگوں کی بات تو خیر چھوڑ دیجئے بعض بڑے بڑے ادیب بھی پوری کتاب پڑھنے کے بغیر ہی اپنا گراں قدر تبصرہ سپردِ قلم فرما دیتے ہیں اور اس حرکت پر فخر بھی کرتے ہیں۔ رحمان صاحب اس گروہ سے الگ ہیں۔ آپ رائے دینے سے قبل پوری کتاب کو غائر نظر سے دیکھتے ہیں اور ایک منصف مزاج جج کی طرح بے لوث فیصلہ دیتے ہیں۔ آپ کی تنقید بے لاگ ہونے کے باوجود ہمدردانہ اور فیاضانہ ہوتی ہے۔

میں نے اپنی کتاب "بامِ رفعت" کا ایک نسخہ پیش کیا اور تبصرے کی خواہش کی۔ ایک دو ماہ بعد آپ سے ملاقات ہوئی تو خود ہی فرمانے لگے "بھئی میں نے "بامِ رفعت" ایک مرتبہ تو پڑھ لی ہے لیکن تبصرہ لکھنے سے پیشتر میں اس کو دوبارہ پڑھنا چاہتا ہوں۔" چنانچہ اس سے قریباً ایک مہینہ بعد رحمان صاحب نے ایک سیر حاصل تبصرہ رقم فرمایا۔

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم   با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

آپ کو صرف اپنے کام سے کام ہے۔ آپ کی زندگی ایک پُروقار خاموش اور تیز دریا کی طرح ہے۔ نہایت خاموشی اور پوری دیانتداری سے اپنے فرائض ادا کرتے ہیں اور منہمک رہتے ہیں۔ میں نے آج تک آپ کی زبان سے کسی کی تنقیص یا مذمت نہیں سنی۔ رحمان صاحب جیسے جج کی شخصیت عجیب پر بہت زیادہ دلچسپ ہے اور پھر آپ ہر محفل میں کوئی نہ کوئی تفریح کا پہلو ضرور نکال لیتے ہیں۔ غرور و نمائش، لاف و گزاف، خود ستائی، خود نمائی اور عصبیت کے دھبوں سے آپ کی تصویرِ حیات یکسر پاک ہے۔

۱۹۲۲ء میں شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ آپ کی سب سے پہلی غزل ۱۹۲۳ء میں رسالہ "نیرنگ خیال" لاہور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد کبھی شعر کہا تو کبھی بغرض اشاعت کے لئے بھیج دی ورنہ از خود کہیں نہ بھیجی۔ پھر ایک مدت تک آپ کا کلام "زمزمان" کے فرضی نام سے "نوائے وقت" (اس زمانہ میں یہ پندرہ روزہ اخبار تھا) میں شائع ہوتا رہا اور اس کا علم آپ کے بہت تھوڑے سے احباب کو تھا۔ علامہ اقبال کی فارسی مثنوی "اسرار خودی" کا منظوم ترجمہ آپ نے ۱۹۲۳ء کے لگ بھگ شروع کیا اور نہایت مستعدی اور خاموشی کے ساتھ اس کو پانچ چھ سال میں ختم کیا۔ یہ ترجمہ بجا طور پر ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ علامہ مرحوم کے کلام کے ترجموں کا جب بھی تذکرہ لکھا جائے گا "مترجم اسرار" کا ذکر ناگزیر ہوگا لیکن آپ نے اس عظیم کام کو جس وقار اور متانت کے ساتھ انجام دیا، تصنع، فخر و غرور، تفاخر و تکبر اور خود اشتہاری آپ کے خمیر ہی میں نہیں ہے۔

آپ ۱۹۳۸ء میں پنجاب یونیورسٹی کے لائبریرین مقرر ہوئے نیز ۱۹۵۶ء میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی مجلس INTERNATIONAL CONGRESS OF THE ORIENTALISTS کے اجلاس میں شرکت کے لئے [illegible] روانہ کیے گئے۔ [illegible] یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری آپ کی خدمت میں پیش کی۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا لیکن مجھے اس کا علم صرف اس وقت ہوا جب اس مضمون کے سلسلہ میں میں نے آپ سے تفصیلی ملاقات کی۔ میرا خیال ہے کہ اکثر احباب کو اس کا علم ان سطور کے ذریعے ہوا ہوگا۔ آج تک آپ نے اپنے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" نہیں لکھوایا۔ البتہ پنجاب یونیورسٹی والے لکھ دیتے ہیں تو آپ نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ انکسار اور بے نیازی کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی!

ای مسلماناں کہ میری کردہ اند	در شہنشاہی فقیری کردہ اند

رحمان صاحب کی روزمرہ زندگی میں مذہبیت اور صوفیت کا نہایت خوشگوار امتزاج ہے۔ عام طور پر مغربی لباس پہنتے ہیں لیکن گرمیوں میں گھر پر ململ کا کرتہ اور لٹھے کی شلوار استعمال کرتے ہیں۔ بڑے نڈر ہیں۔ کبھی خواہ مخواہ انگریزی میں گفتگو نہیں کرتے بلکہ عام طور پر نہایت شستہ اردو میں باتیں کرتے ہیں گو کبھی کبھی پنجابی میں بھی گفتگو ہوتی ہے۔ کھانا بالکل سادہ اور دیسی ہوتا ہے۔ امور مذہب میں شریعت کی عائد کردہ حدود کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ تلاوت قرآن روزانہ تو نہیں البتہ کبھی کبھی ضرور ہوتی ہے اور ماہ رمضان میں ایک مرتبہ قرآن کریم ضرور ختم کرتے ہیں۔ ٹینس کا شوق ہے اور بڑے التزام سے کھیلتے ہیں۔ مگر ٹینس کا کھیل کبھی دیر تک کھیلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی صحت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ جسم مضبوط اور متناسب ہے۔ زندگی کی بنا قناعت و سادگی ہے۔ سادگی ہے لیکن ایسا زاہد خشک یا متعصب نہیں۔ قوت و اقتدار ہے لیکن بد مزاجی اور رعونت نہیں۔ حقیقت میں رحمان ایک سچے صفت مسلمان ہے۔

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم	از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

شرافت نفس اور خلوص و وفا آپ کے کردار کی نہایت ہی تابناک خصوصیت ہے۔ ۱۹۲۵ء میں آپ کی شادی آپ کے ماموں جناب شیخ مولا بخش صاحب کی لڑکی سے ہوئی۔ یہ شادی ہر لحاظ سے نہایت ہی کامیاب ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں آپ کی رفیقۂ حیات ہمیشہ کے لئے آپ سے جدا ہو گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس وقت آپ صرف اڑتالیس برس کے لگ بھگ تھے۔ جوانی کا عالم تھا، ولایت کی تعلیم و تربیت تھی اور ایک اچھے عہدہ پر فائز تھے لیکن اس جواں مرد نے اس آزمائش کے دور کو بڑے صبر اور حوصلے سے گزارا۔

اس صدمہ میں آپ نے صرف دو نظمیں لکھیں: "ایک شام" اور "شب دیجور"۔ یہ نظمیں اگرچہ اتنی پختہ اور معیاری نہیں ہیں تاہم آپ کی روح کے کرب اور بے سکونی کی ترجمان ہیں۔ صرف ایک شعر اور وہ بھی فارسی کا سن لیجئے کتنا بے ساختہ اور لطیف شعر ہے۔

اے آرزوئے زندگی و چشم پر نم	از ما امید رفتہ بکجا آرمیدہ

پہلی شادی سے آپ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ آخر ۱۹۳۶ء میں دوسری شادی کی۔ خدا کی قدرت اس بیوی سے بھی پورے نو برس تک کوئی اولاد نہ ہوئی۔ کئی مخلص احباب و اقربا ایک اور شادی کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ اگر آپ اولاد کی خاطر تیسری شادی کر بھی لیتے تو اس میں اخلاقاً یا شرعاً کوئی قباحت نہ تھی۔ لیکن آپ ان تمام ترغیبوں اور تحریکوں کو ٹالتے رہے اگر کسی نے بہت زیادہ اصرار کیا تو بس اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے "بھئی اگر مجھے اولاد دینی ہے تو اس بیوی سے بھی دے سکتا ہے۔" خدا پرستی اور وفا پرستی کی کتنی روشن مثال ہے! آخر پورے نو برس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی بیوی سے فرزند عطا فرمایا اور اب بفضلہ آپ کے تین فرزند اور ایک دختر ہے۔

دورِ حاضر میں ایسے وفا پرست شوہر کی مثال کم ہی ملے گی

رحمان صاحب کی شرافت، انسان دوستی، رحم دلی اور نرم مزاجی کو ان کی کمزوری پر محمول کرنا شدید غلطی ہوگی۔ جہاں کسی اہم اصول کا تعلق ہو وہاں آپ کے کردار کی پختگی کا پوری شدت کے ساتھ اظہار ہوتا ہے۔ یہی فرشتہ سیرت رحمان ایک مردِ آہنی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

جب آپ وائس چانسلر تھے تو کالجوں کے طلباء نے ایک منظم اور مضبوط تحریک شروع کی کہ ان کے امتحانات ملتوی کر دیے جائیں۔ اخبارات میں مضامین نکلے، جلسوں میں تقریریں کی گئیں، جلوس نکالے گئے اور بڑے بڑے زوردار نعرے لگائے گئے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ رحمان صاحب کی کوٹھی کے سامنے شدید قسم کے مظاہرے بھی کیے گئے لیکن یہ مردِ خدا ایک چٹان کی طرح اس طوفانِ بدتمیزی کا مقابلہ کرتا رہا۔ یہ نہیں کہ طلباء کے ساتھ آپ کو کوئی ہمدردی نہ تھی وہ تو ہمدردی کا ایک پیکر ہے۔ سوال صرف بنیادی اصول کا تھا۔ امتحانات کے التواء کا یہ مطلب تھا کہ آئندہ بھی طلباء کے جائز ناجائز مطالبات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح یونیورسٹی کا وقار خاک میں مل جاتا اور اس کا تمام نظم و نسق تباہ و برباد ہو جاتا۔ پھر اس میں یونیورسٹی کو بہت سا مالی نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اگر رحمان صاحب اس وقت ذرا سی بھی کمزوری دکھاتے اور ان مظاہروں کے سامنے جھک جاتے تو یونیورسٹی کے امتحانات حقیقی معنوں میں بازیچۂ اطفال ہی بن کر رہ جاتے۔ اگرچہ ممکن تھا کہ وقتی طور پر آپ سستی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لیتے اور "رحمان زندہ باد" کے بھی چند نعرے بلند ہو جاتے۔

دیانت داری اور فرض شناسی رحمان صاحب کو اپنے والد مرحوم سے وراثت میں ملی ہے۔ آپ کے والد محکمہ ریل میں ملازم تھے۔ تنخواہ کچھ زیادہ نہ تھی، اور کوئی ذریعۂ آمدنی نہ تھا۔ بالائی آمدنی سے پرہیز کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان محدود وسائل سے بیوی بچوں کے لئے آسائش کے سامان مہیا نہ کئے جا سکتے تھے۔ آپ کی بیوی کبھی تنگدستی کا گلہ کرتیں تو آپ فرمایا کرتے "کیا میں ان بچوں کے لئے حرام کا لقمہ مہیا کروں؟"

رحمان صاحب نے فرمایا "ہماری والدہ ماجدہ ہمیں اکثر والد مرحوم کی اس قسم کی باتیں سنایا کرتی تھیں اور میں ان باتوں سے بچپن ہی میں بہت متاثر ہوا کرتا تھا۔ ایک شریف، ایماندار اور خدا ترس باپ حقیقت میں رحمتِ الٰہی ہے! انسانی سیرت اور کردار کی تشکیل و تکمیل ایسے ہی ماحول میں ہوتی ہے۔"

یہ فقرے رحمان صاحب نے بڑے رقت انگیز لہجے میں ادا فرمائے۔

میں نے پوچھا "آپ کا محبوب شاعر کون ہے؟" فرمایا "میرا محبوب ترین شاعر اقبال ہے" علامہ مرحوم سے آپ کو بے پناہ عقیدت اور محبت ہے۔ مرحوم کے کلام پر آپ کی گہری نظر ہے۔ بچپن سے پڑھتے رہے ہیں۔ خدا معلوم ایک ایک شعر کتنی کتنی مرتبہ پڑھ چکے ہیں۔ آپ کی اس والہانہ عقیدت کا زندۂ جاوید ثبوت "ترجمانِ اسرار" ہے۔ "اسرارِ خودی" کا منظوم ترجمہ، یہ چھ برس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اقبال کے بعض شارحین بجائے تو مرحوم کے لئے بدنامی کا باعث ہی ثابت ہوئے ہیں لیکن رحمان کی زندگی میں اقبال کی تعلیم متشکل نظر آتی ہے۔ رحمان کے کردار کی تعمیر میں اقبال کے افکار کو بہت دخل ہے

"شاعری کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟" میں نے مزید سوال کیا۔

فرمایا: "شاعری کے متعلق میرا نظریہ وہی ہے جو علامہ مرحوم نے پیش کیا ہے۔ ادب میں اگر اخلاقی اور روحانی افادیت نہیں تو وہ محض ذہنی تعیش ہے۔ میں اپنا نظریہ "بام رفعت" کے تبصرے میں وضاحت کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔"

"بام رفعت" کے تبصرے میں آپ یوں رقمطراز ہیں: "روایتی شاعری جدید قسم کی بھی ہو سکتی ہے اور قدیم نوع کی بھی۔ پرانی روایتی شاعری معروف ہے لیکن نئی روایتی شاعری کی صورت کسی قدر ترقی پسندی کے نقاب نے دھندلی کر دی ہے۔ میرے نزدیک ہر وہ شاعری خواہ تصنیف جو خلوص اور احساس پر مبنی نہ ہو بلکہ محض ایک مقبول طرز کی پیروی میں رونما ہو روایتی ہے، خواہ اسے گل و بلبل کے افسانے کی شکل دی گئی ہو اور خواہ "مزدور" یا "دیہاتی لڑکی" کے عنوان سے جدید رومانی انداز میں اسے پیش کیا گیا ہو۔ ایسی شاعری درحقیقت شاعری نہیں ہوتی بلکہ قدما کی اصطلاح میں محض "قافیہ پیمائی" اور جدید طرز کی نظم کے پیش نظر "آہنگ آرائی" کہلا سکتی ہے۔ حقیقی شاعری وجود میں نہیں آتی جب تک کہ خارجی واردات جذبات کی بھٹی میں سلگ کر قلبی کیفیات میں تبدیل نہ ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اس قسم کی شاعری میں ذاتی تجربہ کا عنصر یا براہ راست انعکاس ہونا چاہئے۔"

حال ہی میں "حلقہ ارباب ذوق" کے سالانہ جلسے کے موقع پر رحمان صاحب نے ایک نہایت ہی مختصر عالمانہ، پرمعنی اور بصیرت افروز خطبہ صدارت ارشاد فرمایا ہے۔ چند اقتباسات بلا تبصرہ پیش کرتا ہوں:

> "ادب برائے ادب کا فرسودہ نظریہ اس حقیقت کی روشنی میں صریحاً باطل ٹھہر سکتا ہے۔"
>
> "میری نظر میں تقلیدی اور بے روح ادب جسے مصنف کے ایمان و اخلاص نے جلا نہیں دی محض روایتی ہے، خواہ روایت پرانی ہو یا نئی۔"
>
> "اس طبقے کے ادیبوں کا ایک گروہ تحت الشعور اور لاشعور کے گڑے مردے اکھاڑنے کو ہی اپنی محنت سمجھتا ہے۔ اسی ذریعہ سے عریانی، فحاشی، جنسی کج روی اور سوقیانہ زبان نے جدید ادب میں راہ پائی ہے۔ افراط و تفریط نے نوبت یہاں تک پہنچائی کہ بعض من چلوں نے بغاوت محض کو اپنا شعار بنا لیا۔ سماج سے بغاوت، قانون سے بغاوت، مذہب و اخلاق سے بغاوت، خدا سے بغاوت، ہر بلند آدرش سے بغاوت۔"
>
> "عظیم ادب وہی ہے جس کے پس منظر میں ایک صحت مند نظریہ حیات، ایک جیتا جاگتا نصب العین کارفرما ہوتا ہے۔"

روایتی ادب کے علمبرداروں کے متعلق فرماتے ہیں:

> "یہ لوگ محض قدیم یا جدید روایت کی لکیر پیٹ رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی ذاتی سرمایۂ خیال نہیں۔ ان کا تصورِ ادب سراسر میکانکی ہے۔ ان کی جدت یا ندرت محض الفاظ کے الٹ پھیر کا نام ہے۔ ان کے ہاں صورت ہے معنی نہیں، جسم ہے جان نہیں۔ انہیں ایک طرح سے کاروانِ حیات کا پسماندہ غبار کہئے۔"

میں نے پوچھا: "آپ کے نزدیک زندگی کا بہترین نصب العین کیا ہے؟"

فرمانے لگے: "انسان کے لئے بہترین نصب العین وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ اقبال نے اسلام کی نہایت دلکش مگر حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ اسلام کی موجودگی میں ہمیں کسی دوسرے نظام حیات کی حاجت نہیں۔ اگر ہم لوگ تخلقوا باخلاق اللہ کو پیش نظر رکھیں اور سرور کائنات [illegible] ان کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم میں پھر صدیقؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ پیدا نہ ہوں۔ خود اعتمادی اور خدا اعتمادی ہی زندگی

بہترین فلسفہ ہے کلامِ حکیم' اور کلام ربی انسان کا رہبر ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ یہی اسلام کی روح ہے۔ اسی کی پیروی ہم پر فرض ہے۔"

رحمان صاحب کے ان الفاظ سے میں بے حد متاثر ہوا۔ یہ محض رنگین بیانی یا وعظ گوئی نہ تھی بلکہ ایک صاحب عمل کی روح کی گہرائیوں میں سے اٹھی ہوئی آواز تھی۔ رحمان کی زندگی خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کا ایک سبق آموز اور ولولہ انگیز مجموعہ ہے۔

"کون سی کتاب نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟" میں نے مزید دریافت کیا۔

فرمایا "قرآن پاک نے۔ میں نے اس مقدس صحیفے کو بار بار پڑھا ہے اور اب بھی اکثر پڑھتا ہوں اور انشاء اللہ عمر بھر پڑھتا رہوں گا۔ کلام ربانی سے بہتر اور کون سا کلام ہو سکتا ہے۔ زندگی کے سفر میں یہ ایک شفیق رہنما اور بہترین رفیق ہے۔"

اس "مغرب زدگی" "الحاد و زندقہ" اخلاقی انتشار اور روحانی انحطاط کے تاریک و یاس انگیز دور میں، رحمان کا وجود حب اسلام، حب پاکستان اور حب خیر و حق کی ایک روشن شمع ہے۔ خدا اس شمع کو دیر تک روشن رکھے اور اس کی روشنی کو تیز سے تیز تر کرے۔ آمین!

اسی ہائی کورٹ میں پہلے بھی دو ادیب اور ادیب پرور جج ہو گزرے ہیں۔ جسٹس ہمایوں مرحوم اور جسٹس سر شیخ عبدالقادر مرحوم۔ ایک شاعر تھے اور دوسرے شاعر گر اور نثر نگار۔ ہمایوں مرحوم کا عہد تو میں نے نہیں دیکھا لیکن سر عبدالقادر مرحوم سے میری کچھ شناسائی بھی تھی اور جن ایام میں میں لاہور میں زیر تعلیم تھا مرحوم اکثر مشاعروں کی صدارت فرمایا کرتے تھے۔ بڑے خوش وضع، خوش پوش، خوش خلق اور خوش ذوق بزرگ تھے۔ تحریر و تقریر میں بڑی شگفتگی اور سلاست تھی۔ بڑے ادب دوست اور ادیب پرور تھے۔ آج جب میں رحمان صاحب کی تصویر کشی میں مصروف ہوں تو بار بار بے اختیار سر عبدالقادر مرحوم کی تصویر کے مختلف پہلو میری نظروں کے سامنے ابھر رہے ہیں۔ معمولی اختلافات سے قطع نظر رحمان صاحب مجموعی طور پر حقیقی معنوں میں شیخ مرحوم کے جانشین ہیں۔

رحمان صاحب ایک اچھے ادیب، بہت اچھے جج اور نہایت ہی اچھے انسان ہیں۔ جب کبھی رحمان صاحب کے جاننے والوں میں ان کا ذکر چل نکلتا ہے تو میں اکثر احباب کو ان کی تعریف میں رطب اللسان پاتا ہوں۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی ایسا ذاتی واقعہ سناتا ہے جس سے میرے تاثرات کی تائید ہوتی ہے اور میں اپنے حسن انتخاب پر خوش ہو کر زیر لب یہ شعر گنگناتا ہوں ؎

ہر کس کہ دید روئے تو بوسید چشم من
کارے کہ کرد دیدۂ من بے نظر نہ کرد

حمید نظامی

شورش کاشمیری

پہلی دفعہ حمید نظامی سے ملئے تو آپ کے لئے یہ باور کرنا محال ہوگا کہ یہی وہ شخص ہے جس کا وجود قصرِ حکومت کے شہزادوں سے لے کر کافی ہاؤس کے کھلنڈروں تک میں زیر بحث رہتا ہے، جو اپنے اخبار میں دو انگشت ہونے کے باوصف اپنے وجود میں پہاڑ سا سر ہے، جس سے وزراء خوف کھاتے اور صحافی حسد کرتے ہیں، جس کی ذات پر پچھلے دس بارہ برس میں اتنی بے جا تنقید کی گئی ہے کہ اس تمام مواد کو یکجا کریں تو روایتی چغل خوروں کی بیہودہ و مقطوع آوازوں کا ایک دفتر تیار ہو سکتا ہے لیکن اس نے اپنے بے حوصلہ نقادوں، کرم فرماؤں، دلچسپ مزاجوں یا دوستوں مثلاً معاصرین کی دشنام طرازیوں کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا اور حتی الامکان اس بے پرواہی سے انہیں نظر انداز کیا ہے جیسے وہ کوئی وجود ہی نہیں رکھتے ہیں۔ ان حکمرانوں سے اس کی ٹھن گئی ان کا ہر جست سے تعاقب کیا۔ بالآخر وہ پشیمان، چاروں شانے چت ہو گئے۔ کتنوں نے گھٹنے ٹیک دئے اور اکثر ہار کے تو لوٹ آنے لگے۔ اس نے ہر محاذ پر جم کر مقابلہ کیا، ہمیشہ تنہا لڑا، بارہا زخم بھی کھائے لیکن پیٹھ پر نہیں سینہ پر، کئی دفعہ موت و حیات میں ایک ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا۔ قلم نے شاید اسے نگل جاتے لیکن وہ اس ققنس کی طرح جو اپنی خاکستر سے زندہ ہو گیا۔ اس کی دوستی محدود ہے لیکن جس سے ہے چند اصولوں کے تحت ہے اور پکی ہے، دوست اس پر اعتبار رکھتے اور اس کی رفاقت میں راحت محسوس کرتے ہیں۔

—— دشمن رو سخت ہے بلکہ سنگدل، اس کا تیر ہمیشہ نشانہ پر بیٹھتا ہے۔ کوئی وار خطا ہو جائے تو وہ اس سے پژمردہ نہیں ہوتا بلکہ ازدم ہو کر دوسرا وار کرتا ہے۔ ایک وار، دو وار، تین وار —— وار ہی وار —— آخر وہ پالا مار ہی لیتا ہے۔ اس کی دوستی میں مروت ہے لیکن اس کی دشمنی میں لذت۔ اس نے حریفوں کے لئے اپنے لغت سے عفو کا لفظ ہی نکال دیا ہے۔ کسی مرحلے پر بھی وہ دشمنوں سے رحم یا تلطف کا عادی نہیں۔ وہ قبروں تک پہنچا کرتا ہے اس کے ہاں حریفوں کے کفن بھی نوچ لینے کی چیز ہیں۔

—— ہندوستان میں پاکستان کی جدوجہد کے دو بڑے صحافی رہے تھے۔ انگریزی صحافت میں الطاف حسین، اردو اخبار نویسی میں حمید نظامی —— حمید نظامی نے روایتی اصولِ جنگ کے تحت ہر حربہ استعمال کیا، تیغ و قلم کا میدان اس کے ہاتھ رہا —— جس سے تاریخِ پاکستان کی صحافت میں اس کا نام علامت [illegible] بن گیا۔ مثلاً اس نے اپنے گرد پاکستانی افواج کی ایک بڑی کھیپ جمع کر لی، میدانِ جنگ۔

ہیں تو "قوت نرسے" کا کام ہوتی رہی لیکن انقلاب کے بعد بعض لوگ نشۂ اقتدار سے بہک گئے۔ بعض نے ساتھ چلنا چاہا لیکن دشواریٔ منزل کے احساس سے پنڈ چھڑا لیا اور بعض تماشائی ہونے کی خواہش میں خود تماشا ہو گئے۔

اس دور میں مرحوم لیاقت علی، خواجہ شہاب الدین اور میاں ممتاز دولتانہ ——— یہ تین حضرات تھے جن سے ان کی لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ اسباب کیا تھے؟ یہ ایک اختلافی مضمون ہے لیکن مرحوم کے الفاظ میں ——

چھوٹی چھوٹی رنجشیں اک حادثہ سا بن گئیں!
چھوٹی چھوٹی رنجشوں سے دوستی جاتی رہی

معلوم نہیں کہاں سے آیا؟ اس سے قطع نظر، لڑائی ایک دفعہ شروع ہو کر خود بخود سرگرم ہو گئی۔ نظامی نے جو کچھ لکھا وہ ننگی تلوار کی طرح اس کے وار تیز ہوتے گئے۔ کئی جھڑپوں میں وہ خود چور چور ہو گیا لیکن آڑے وقت ڈٹ کر ابھرتا ہی رہا۔ خان لیاقت علی خان اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور اب انہیں بیچ میں لانا مناسب نہیں لیکن خواجہ شہاب الدین کو اس حقیقت کے اقرار میں تامل نہیں ہوگا کہ وزیر و مدیر دونوں میں کس کا قلم ظفر مند رہا ———

خواجہ صاحب کا ایک خط حمید نظامی کے نام حال ہی میں جدہ سے آیا تھا جس میں خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

"جہاں میں آج بیٹھا ہوں وہاں دل و دماغ دنیوی علائق سے عمداً رستگاری چاہتے ہیں۔ کسی معذرت کے لیے نہیں، واقعے کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ "نوائے وقت" ہی اردو صحائف میں پڑھنے کی چیز ہے۔"

میاں ممتاز دولتانہ سے لگاؤ زیادہ رہا۔ انہوں نے "بدلہ" لینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور معاملہ اس سے مختلف نہ تھا کہ ——

سانس دیکھو تنِ بسمل میں جو آتے جاتے
اور پھر کار یا حسرت و نے جاتے جاتے

لیکن یہاں بھی حمید نظامی ہی سرخرو نکلے۔ گو دولتانہ کا دورِ وزارت ان کے لیے سخت ابتلا کا دور تھا۔ ایک اخبار بند، دوسرا بند، تیسرا بند، ڈیکلریشن منسوخ، پریس چھاپنے سے انکاری، "قلم غائب"، احباب غائب، رجعت پسند حملہ آور، ترقی پسند تماشائی لیکن حمید نظامی کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وقت پر اٹھنا، وقت پر لکھنا، وقت پر کھانا، وقت پر پینا، وقت پر سونا ——— ہفتے میں دو بار سینما دیکھنا، دن ڈھلے بیڈن روڈ پہنچ جانا، ساتھیوں میں گپ اڑانا، ہنسنا کھیلنا اور گھر چلے جانا ——— دوستوں سے صرف دوستی کی بات کرنا، اور بس ——— اس سارے دورِ مصیبت میں انہوں نے کبھی دوستوں کو اپنی افتاد صبح و شام سے آگاہ نہیں کیا۔ ہر چہ باداباد، دوسرے قارئین کے ساتھ ان کے خاص احباب کو بھی اخبار ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ گزشتہ روز "نوائے وقت" پر کیا گزری؟ "آثار" کیوں بند ہوا؟ اور "نوائے پاکستان" نکلے از مطبوعات نوائے وقت ہے۔

پھر ان کا یہ رویہ اپنے احباب ہی سے نہیں بلکہ اپنے گھر والوں سے بھی ہے۔ گورنر راج کے زمانے میں ان پر مقدمہ دائر کیا گیا کہ بغیر لائسنس کے پستول رکھا ہے اور وارنٹ نکلے، گرفتاری ہوئی، ضمانت لی گئی ——— اگلے دن اخبار میں چھپا تو اہلیہ نے حیرت سے استفسار کیا۔ انہوں نے جو جواب دیا ملاحظہ ہو:

"اس کا گھریلو معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا اور اب آپ نے اخبار میں پڑھ ہی لیا ہے۔"

ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے مصائب میں جب اپنی بیوی کو بھی حصہ دار نہیں بناتے جو حقیقتاً ان کی شریکِ حیات ہے تو پھر بھلا وہ ان دوستوں پر اپنے مصائب کا کوئی بوجھ کیونکر لاد سکتے ہیں جو محض ان کے شریکِ گفتگو ہیں ——— وہ احتیاط کرتے ہیں۔ ان کے ہونٹوں سے کسی راز کا کھلنا

انتہائی مشکل ہے۔ ان کی آنکھوں پر موٹے موٹے شیشے کے چشمے کے بیاد خول چڑھے رہتے ہیں جن سے کوئی بات بھی نہیں ابھرتی ہے ——— چہرہ ان کا گوشت کی تہوں سے اس قدر مجلد ہے کہ ورق الٹے بغیر کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کتاب میں کیا ہے۔ انہیں غصہ ضرور آتا ہے لیکن روزانہ نہیں، کبھی کبھار افراد پر بھی اور خیالات پر بھی۔ اس وقت وہ لفظ لفظ کاٹنے لگتے ہیں۔ ان کے صاف ستھرے ماتھے پر سلوٹیں جم جاتی ہیں۔ آخر کار غصہ اس پر ختم ہوتا ہے کہ وہ

یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

اور عموماً "معتوبوں" ہی کے گریبان ان کے ہاتھوں چاک ہوتے ہیں ——— آج جس گروہ کے ہاتھ میں ملکی سیاست کی باگ ڈور ہے اس کا خمیر رجعت کی خاک میں گندھا ہے۔ ان لوگوں نے انگریزی عہد حکومت میں نہ صرف اپنے ہی خاندانوں کو پروان چڑھایا بلکہ اپنے آپ کو قبیلے کا ماؤنٹ ایورسٹ سمجھا۔ ان کی سیاسی تاریخ، جمہور المسلمین پر ٹوٹ پڑنے کی تاریخ ہے۔ بالخصوص مرحوم پنجاب کے شرب و قبائل انگریزوں کے خود کاشتہ پودے ہیں۔ حمید نظامی ان کے رخسار پر ایک زوردار تھپڑ ہے۔ اس نے زندگی کی مراعات ورثہ میں حاصل نہیں کیں بلکہ جوڑ جوڑ کر بنائی ہیں، اس نے معاشرہ کے خلاف جدوجہد کر کے اپنی راہ پیدا کی اور موجودہ مقام حاصل کیا ہے۔

سلطان عبدالحمید نے جو زوال خلافت کے فرماں روا تھے ایک بیان میں کہا تھا "اگر خلافت کا تخت مجھے دوبارہ مل جائے تو میں سب سے پہلے ترکی کے اخبار نویسوں کو دار پر لٹکا دوں گا" ——— یہاں جن خاندانوں کے ہاتھ میں عنان اختیار ہے ان میں سے کچھ افراد کی ایک کیفیت اس کی دولت بھی ہے اور وہ ہر عوامی تحریک سے بے پروا ہو کر دوستانہ روابط نبھا رہا ہے لیکن ان کے اندرونی خیالات میں اس کا نام باقاعدہ طبقاتی حریف درج ہے۔

جہاں تک اس کے سیاسی خیالات کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے افق ہی سے طلوع ہوا ہے۔ اس میں اور اس کے حکمرانوں میں خیالات کا کوئی بنیادی ٹکراؤ نہیں، جو ٹکراؤ ہے وہ طبائع اور طبقات میں ہے اسی لئے ارباب اختیار کی انا اس سے بدکتی اور وہ بھی بدکا کرتے ہیں۔ لیکن نظامی ان کی طبقاتی فتح مندیوں کے خلاف ایک تنقیدی محاذ ہے۔ وہ غربا کے بچوں کا انتقام ہے، جو بڑی مدت کے بعد پنجاب کے بااقتدار خاندانوں سے ہو بہو لیا گیا ہے۔

حفیظ اہل زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

اس نے اپنے فکر و نظر کو ایک خاص سانچے میں ڈھال لیا ہے اس کی بعض کاوشیں اور پنجاب کے حالات کی ملازمت ہے۔ اس خصوصیت نے اس کے "گرد و پیش" بعض ایسے عناصر پیدا کر دیئے ہیں جو محض تحزب کی خاطر اس پر گالیوں کا جھاڑ باندھتے ہیں۔ اس وقت اس کی عمر ۳۹ اور ۴۰ سال کے درمیان ہے۔ اس نے زندگی کی عمارت اٹھانے میں ایک ایک اینٹ خود چنی ہے، وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو اپنے خاندانوں کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں بلکہ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی وجہ سے ان کا خاندان پہچانا جاتا ہے۔

اس نے اپنے بل پر تعلیم حاصل کی، اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے اور ایف سی کالج لاہور سے ایم۔ اے (انگریزی) کیا۔ پڑھتا رہا، کماتا رہا اور پڑھتا رہا ———

اس کو لکھنے کا شوق شروع سے تھا، اس کی طبیعت کے دروازے ادب و سیاست دونوں کے لئے کھلے تھے، ابتداً بعض اردو رسائل میں لکھتا رہا۔ "شیرازہ" "ہمایوں" اور "ادبی دنیا" میں طنز و مزاح اور افسانے، ہلکے پھلکے مضامین اور شذرے لکھے۔ کئی تراجم بھی چھپے آخر کار اس کی طبیعت کا ایک رخ بن گیا، ادھر سیاسیات کا ایسا چسکا پڑا کہ بہ حیثیت طالب علم ۱۹۳۷ء میں مسلمان طلبہ کی سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سنگ بنیاد رکھا اور صدر منتخب ہو گیا۔ ۱۹۳۹ء میں صدارت سے علیحدگی اختیار کر لی پھر ۱۹۴۰ء میں قائداعظم کے ایما اور دوستوں کے اصرار پر صدر بن گیا۔ اسی اثنا میں کالج کے مباحثوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ زبان پر قابو تھا، خیالات تقریباً منجھے ہوئے تھے، بیسیوں مباحثوں میں شرکت کی اور کوئی پندرہ کے قریب انعام لئے بھی۔

حاصل کئے۔ لاہور سے علی گڑھ تک ماری ماری، جہاں گئے کامیاب رہے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں ایم۔ اے کیا تو معیشت کا سوال سامنے تھا۔ کئی راہیں کھلی تھیں، لیکن طبیعت کا میلان صحافت کی طرف تھا۔ انہی دنوں اپنے ایک دوست کے لئے جو آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان دے رہے تھے، ادبیات اردو کا چار سو صفحات کا ایک خلاصہ تیار کیا جو ایک معروف پبلشر کو پسند آ گیا اس نے فوراً خرید لیا۔ اپنے نام سے چھاپا چنانچہ اب تک اس کے کئی ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں۔

۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو پندرہ روزہ نوائے وقت نکالا جو پہلے ایک [illegible] ہفت روزہ تھا۔ ۲۲ جولائی سنہ ۱۹۴۴ء کو قائد اعظم کی تحریک "اور آشیرباد" سے روزنامہ ہو گیا۔ پاکستان کے لئے نوائے وقت نے جو کچھ کیا مخفی نہیں۔ ہر کہ و مہ کو معلوم ہے تیس چار برس ہی میں ان کی شہرت کا مطلع روشن ہو گیا —— اس سے پہلے صحافت کا مزاج زیادہ تر ادبی تھا مسلمانوں میں صحافی شاذ اور انشا پرداز عام تھے۔ ایک ایڈیٹر کے لئے شاعر و ادیب ہونا ضروری ہوتا تھا، نوائے وقت نے اس سنت سے انحراف کیا —— جو لوگ اردو اخبار نویسی کو شعر و انشا کی چیز سمجھتے تھے یا جنہیں انگریزی میں دستگاہ کے باعث اردو اخبار نویسی کا وجود ہی اضافی نظر آتا تھا، نوائے وقت نے ان کے خیالات کی نفی کی اور اخبار کو صرف اخبار کی حیثیت سے پیش کیا۔ انگریزی کی برتری نے انگریزی خوانوں کو اردو اخبارات سے بے تعلق کر رکھا تھا اور مشرقی مزاج کے معدودے چند انگریزی خواں بھی اردو اخبار محض اداریوں کی خاطر پڑھتے تھے، نوائے وقت نے اس ذہنیت کو یکسر بدل ڈالا اور اب غالباً نوائے وقت پہلا روزنامہ ہے جو پاکستانی انگریزوں میں بھی عزت یا شوق سے پڑھا جاتا ہے —— ہمارے ملک کی سیاست میں اس کا وجود ناگزیر ہو گیا ہے، اس کے حامی و مخالف گالی دینے یا تعریف کرنے کے لئے اس کو ضرور پڑھتے ہیں —— اس کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ ملکی سیاسیات میں مسائل تخلیق کر سکتا اور مسلسل ایسے موضوع پیدا کر لیتا ہے جس پر نقد و نظر اور تنقید و تنقیص کی ایک عام بحث شروع ہو جاتی ہے —— جس سے ایک خاص ذہنی حرکت ہوتی ہے اور مرحوم پنجاب کے اضلاع میں اسی ذہن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

نوائے وقت یا حمید نظامی لازم و ملزوم ہیں، دونوں کی شخصیت ایک دوسرے میں پیوست ہے، ایک کی نفی سے دوسرا ابھر نہیں سکتا۔ اس کی اپنی پسند و ناپسند بھی شدید ہے بلکہ سنگین، اسی طرح اس کے مخالف و موافق بھی، افراط و تفریط پر ہیں —— اس کے مخالفوں کی سب سے بڑی تعداد اسی کے طبقے میں ہے۔ اس کا واحد جرم یہ ہے کہ وہ ان کے طبقے کا ہو کر ان سے آگے نکل گیا ہے —— اس کے اداریوں میں عبارت نام کو نہیں ہوتی۔ چھوٹے چھوٹے فقرے اور تلی بندھی بات "سر راہے" (زنگاری کا کالم) کی ادبی حیثیت محل نظر ہو سکتی ہے لیکن اس میں ایک ہلکی سی چوٹ ضرور ہوتی ہے جس سے ضارب و مضروب دونوں لطف لیتے ہیں۔

اکثر لوگوں میں اس کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ وہ مغرور ہے لیکن وہ مغرور نہیں، صرف رکھ رکھاؤ کا عادی ہے، عام لوگوں میں خلط ملط کو برا سمجھتا۔ اس کا خیال ہے کہ ہر انسان اس قابل نہیں ہوتا کہ اس سے "رسم و راہ" پیدا ہو —— جو لوگ کسی نہ کسی وجہ سے عام ہو جاتے ہیں وہ تبرک کی طرح تقسیم ہو کر اپنی عزت کھو بیٹھتے ہیں۔

وہ ان تقریبوں میں بیٹھنے کے بجائے ان کی گالی کھانے میں عزت کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہے۔

اور حمید نظامی کی ساری تصویر الفاظ کے انہی نیم نستعلیق جوڑوں میں ہے۔

آغا شورش کاشمیری

(محمد وارث کامل بی اے)

لاہور کی وہ تفریحی رہگذر جو اپنے اردگرد حاشیے بناتی ہوئی کہیں نہر کی سیدھ اور کہیں بل کھاتی ہوئی چلی جاتی ہے آج سے پچیس سال پہلے کسی جوان رعنا کے خرام ناز کی تختۂ مشق بنی ہوئی تھی۔ اس نوجوان سے میری آنکھیں نہ صرف ایک دو بار بلکہ بار بار چار ہوئیں لیکن کچھ تو اپنی کم آمیزی کے باعث اور کچھ اس وجہ سے کہ اس جوان رعنا کی عقابی نگاہیں اور خطابت زدہ گفتار کسی راہرو کو رسمی علیک سلیک کی اجازت بھی نہیں دیتی تھیں، میرے اور اس جوان رعنا کے درمیان اجنبیت کی دیواریں حائل رہیں۔ یہ عقدہ بھی نہ کھل سکا کہ آخر یہ نوجوان ہے کون؟ البتہ مجھ پر اس نوجوان کے چہرے بشرے کے جو نقش ابھر آتے تھے میں تصور میں کبھی کبھی انہی سے ہم کلام رہا اور اس ہم کلامی کو بزعم خود تعارف سے تعبیر کرتا رہا حالانکہ اس ہم کلامی اور اس تعارف کی حیثیت ایک طلسم خیال کی سی تھی۔ اس نوجوان کی ہیئت کذائی میں خصوصیات کا حسین امتزاج تھا قلم کی زبان آج بھی اس کا مرقع کھینچ سکتی ہے۔ کتابی چہرہ، عقابی آنکھیں، ستواں ناک، ڈھلکے ہوئے رخسار، شاداب ہونٹ، پھیلے کان، کھلی پیشانی، اگلے ہوئے دانت، [illegible] گردن عقاب کی مانند، سادہ رنگ کھلا ہوا قد، زبان خاموش لیکن آنکھیں ہر لحظہ گردش میں، چہرے پر متانت و ظرافت سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی۔ رفتار ایسی کہ ہر قدم پر ہوئے تنے جھکے اور گفتار ایسی (اس کا اندازہ بعد میں ہوا) کہ پرکاشے ہیں ہوں آگے عزم و حوصلہ کی یہ شان دیکھ کر [illegible] سے یہ پیکر دیکھنے میں گویا شعر مجسم ہو جاتا ہے —

ہر چند کوہ سے بھی گراں تر ہے بار عشق
ہمت یہ کہہ رہی ہے کہ تنہا اٹھائیے

شاہی مسجد میں ایک جلسہ کا پروگرام تھا۔ لوگ شہر کے اطراف و اکناف سے اس کثیر تعداد میں جمع ہوئے تھے کہ مسجد کا صحن عرفات کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس اجتماع میں میں بھی شریک تھا لیکن میری حیثیت ایک ایسے تماشائی کی سی تھی جس کی بیدلی نہ اسے درس عبرت دیتی ہے نہ اس کے لئے تسکین ذوق کا سامان فراہم کرتی ہے۔ غالب نے بھی ایسے ہی تماشائی کی ذہنیت کو اس شعر میں ادا کیا ہے —

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

خوش قسمتی سے میں اسٹیج کے قریب ہی بیٹھا تھا اور یہ میں ہی جانتا ہوں کہ اس قرب کی خاطر میں نے اپنے وقت کا کتنا قیمتی حصہ صرف کیا تھا۔ مجمع بیٹھے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں نے اسٹیج پر بیٹھی ہوئی ایک ایسی بڑی شخصیت جسے سیاست کی شکل دکھاتے ہیں اور تمام "زندہ دلانِ پنجاب" اپنی کشتی کا ناخدا سمجھتے تھے یعنی حضرات، والدین مولانا ظفر علی خاں جو آج کل کسمپرسی کے عالم میں بستر علالت پر ایام پیری کی زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں۔ اسٹیج کے بام و در اللہ اکبر اور مولانا ظفر علی خاں زندہ باد کے نعروں سے زور زور سے گونج اٹھے۔ مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں تقریر کی۔ تقریر کیا تھی شعر و ادب کے سانچے میں ڈھلا ہوا ایک بصیرت افروز مقالہ تھا جس کی ہر ادا آتش نشاں کا شعلہ جو آگ برسا رہا تھا۔ ہم "حق" قوم اور جمہور" کی تصویر بنے بیٹھے تھے اور اگر اس پورے مجمع میں کسی کو مولانا کے خیالات سے اختلاف بھی تھا تو اس پر یہ کیفیت گزر رہی تھی ؎

دل میں گھٹ گھٹ کے رہ گئی حسرت
لب پہ آ آ کے رہ گیا مطلب

دیکھتا کیا ہوں کہ وہی بھرے بدن کا کشیدہ قامت نوجوان اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے اور کسی رسمی تمہید کے بغیر تقریر شروع کر دیتا ہے۔ میں نے ابتدا ہی میں سمجھ لیا تھا کہ مولانا ایسے بلیغ البیان اور فصیح اللسان مقرر کے بعد اس غریب کی صدا نقار خانے میں کون سنے گا لیکن اس نوجوان نے کچھ ایسے وقار سے تقریر کی کہ مجمع اس کی تقریر کے اختتام تک جما رہا بلکہ کچھ نعروں سے اپنی دلچسپی کا ثبوت بھی دیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نوجوان نے مولانا کی بارگاہ فضل و کمال میں خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد یہ بھی کہا تھا۔

> "مولانا آپ کی شخصیت واجب الاحترام ہے۔ میں آپ کے فضل و کمال کا اعتراف کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ آپ کی ہر بات تسلیم کر لی جائے آپ نے جو روش اختیار کی ہے میرے خیال میں اس سے قوم کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے لیکن فائدہ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

میں اس نوجوان کی تقریر کے دوران کچھ ایسا محو سا ہو گیا تھا کہ قوت تمیز بھی جواب دے گئی جو ذرا بحال ہوئی اور دیکھی بھالی شکل کی شناخت ہو سکی کہ اب جب اس نوجوان کی تقریر کے خاتمہ پر لوگوں میں کھسر پھسر ہوئی تو میں نے بھی کان لگائے۔ کوئی صاحب اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ یار یہ شورش بالکل سامنے کا لونڈا ہے کل تک اسے بستہ بغل میں دبائے سکول جاتے دیکھتے تھے اور آج یہ اتنے بڑے مقرر کے کان کتر رہا ہے۔ جس کی دھاک دور دور بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ لونڈا تو آفت کا پرکالا نکلا۔ یہ بات چیت ابھی ختم ہوئی تھی کہ پیچھے سے ایک صاحب نے میرا شانہ ہلایا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میرے خالہ زاد بھائی تھے۔ (یہ صاحب کیپٹن شفیق احمد خاں ایم اے پی سی ایس ہیں جو آج کل جھنگ میں مجسٹریٹ درجہ اول لگے ہیں) کہنے لگے وارث صاحب! اس شورش کی تقریر! یہ ہے کیا چیز۔ ایک مدت سے ہم ان کتابوں کے ورق چاٹ رہے ہیں لیکن پھر بھی ہمارے اندر یہ اہلیت پیدا نہیں ہوئی کہ ہم اس دھڑلے سے تقریر کر سکیں۔ وارث صاحب! اور یہ تقریر ہی ایک ایسا فن ہے جس سے کسی کی شخصیت نمایاں ہو سکتی ہے۔ ہمارا یہ کہنا کہ ہم نے اتنے امتحان پاس کئے ہیں اور ہمارے پاس اتنی سندیں ہیں دنیا کی نظروں میں ہمارا وقار نہیں بڑھا سکتیں۔ جس سے کیا بھائی صاحب اس نوجوان شورش کو میں اچھی طرح جانتا ہوں کئی ماہ برابر میری اور اس نوجوان شورش کی گزر گاہ ایک ہی رہی ہے۔ اندازہ تو مجھے پہلے بھی تھا کہ یہ نوجوان چھپا رستم ہے اور جونہی شہرت اس کی گود میں ڈال پہنچے ہو سکتے ہیں لیکن یہ میرا کہنا کہ میں نے اس سے کچھ اور زیادہ قریب ہونے کی کوشش نہیں کی۔

یہ نوجوان شورش، یہ وہی رضا شورش جس کی کتاب زندگی کا ایک ورق میں نے اوپر کی سطور میں پیش کیا ہے آج صرف شورش نہیں بلکہ آغا شورش کاشمیری ہے۔ آغا شورش کاشمیری ابھی عمر رسیدہ نہیں، ابھی ایک سال کے بعد انہیں عزت، وجاہت اور شہرت کی وہ معراج نصیب ہوگی جس پر ان کے اقران و امثال رشک کریں گے یہ کوئی منجمانہ پیشین گوئی نہیں بلکہ ایک تجزیہ کیا گیا ہے جو میں نے ان کی فکر کی مناسبت سے کی ہے۔ آغا شورش کاشمیری

نے ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو اس رنگ و بو کی دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ اس حساب سے وہ اس گلستان آب و گل کی ۵۰ بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ کسے خبر تھی کہ آغا شورش کی تاریخ ولادت، ۳۰ سال بعد ایک نئی اسلامی مملکت "پاکستان" کی تاریخ ولادت ثابت ہو گی۔ یہ عجیب مناسبت بھی قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے یا معجزات ان خدمات کا صلہ کہنا چاہئے جو اس نوجوان سپاہی کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا رہی ہیں۔

آغا شورش کاشمیری نے عملی سیاست کے میدان میں نوجوان بھارت سبھا کے ممبر کی حیثیت سے قدم رکھا۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۸ سال کے لگ بھگ تھی۔ شروع ہی سے زمیندار کا مطالعہ بڑی باقاعدگی سے کرتے تھے۔ وہ وہ ادبی شہ پارے جو مولانا ظفر علی خاں کے قلم جواہر رقم سے نکلتے تھے آغا شورش بڑے شغف اور بڑے انہماک سے ان کے معانی و مطالب پر غور کرتے اور ان کے محاسن پر سر دھنتے تھے۔ شعر گوئی اور نثر نگاری کی صلاحیتیں بھی اسی دور میں پیدا ہوئیں۔ الہلال و البلاغ کے مطالعہ نے ان کے آئینہ ذہن پر کچھ اور صیقل کر دیا تھا۔ ایک طرف مولانا ظفر علی خاں کی جذباتیت اور دوسری طرف مولانا آزاد کی ابوالکلامیت دونوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور آغا شورش کی شخصیت پر ادب و انشا، شعر و سخن، تقریر و خطابت اور علم و فکر کے ایسے رنگین نقوش چھوڑے کہ برصغیر کے طول و عرض میں ان کی دھوم مچ گئی۔ برطانوی دور میں جب تحریک آزادی کا پہیہ زوروں پر تھا تو اس نوجوان خطیب نے ملک کے گوشے گوشے میں اپنی شعلہ مقالی اور آتش بیانی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اس حقیقت سے آغا شورش کاشمیری کے بدخواہ بھی انکار نہیں کر سکتے کہ جہاں تک فن خطابت کا تعلق ہے ان کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے۔ اس سال جب یوم اقبال کی تقریب پر آغا نے تقریر کی تو پورے ہال کی روح کھچ کر آغا کی آنکھوں میں آ گئی تھی۔ آغا کی تقریر کا راز جس چیز میں مضمر ہے وہ یہ ہے کہ آغا اپنے خیالات کا اظہار زبان سے نہیں بلکہ زبان دل سے کرتے ہیں۔ زبان و دل کی اس ہم آہنگی کے ساتھ اپنی آواز کی پوری گونج اور کڑک سے جب آغا شورش کاشمیری تقریر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن پر معانی و مطالب کی بارش ہو رہی ہے۔ ان کے مطالب الفاظ کے تابع نہیں ہوتے بلکہ الفاظ کو بضرورت پیش آتی ہے کہ مطالب کے آگے سر تسلیم خم کریں۔ آغا شورش ایسی زبان لکھتے اور ایسی زبان بولتے ہیں جو عوام کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں گھر کر جاتی ہے۔

آغا شورش کاشمیری کو تحریک آزادی میں شرکت کی پاداش میں برطانوی استعمار نے اپنی دس سال دس ماہ کی طویل مدت تک قید رکھا۔ آغا نے ایک سال دو ماہ قید تنہائی کی صعوبتیں اٹھائیں۔ دو دن بھوک ہڑتال کی۔ یہ قید ۱۲۴ الف اور ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت عمل میں آئی تھی۔ اسی طویل المیعاد اسیری کے عالم میں آغا شورش کو اپنی زندگی میں پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ انسانیت کا معیار کتنا گر چکا ہے! انسان اپنے ہی ابنائے جنس انسانوں کے ساتھ کتنا بہیمانہ برتاؤ کرتے ہیں محض عہدے اور منصب کی ہوس میں دوسروں کا خون کتنا سفید ہو گیا ہے کہ وہ یہ سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ جس شخص کے ساتھ ہم وحشت و درندگی کا سلوک کر رہے ہیں وہ خود بھی تو اسی قوم کا ایک فرد ہے۔ ہتھکڑی، ڈنڈا بیڑی، کوڑے اور سنٹرل جیل کے محل میں بھڑکتے ہوئے گندے کیڑے یہی وہ عزیز ترین تحفے تھے جو کسی کے اشارے پر جیل کے حکام نے آغا کے خلاف بڑی بے دردی کے ساتھ استعمال کئے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۶ء تک آغا کی زندگی کے دس سال قید کی سرگرمیوں سے الگ تھلگ رہ کر بسر ہوئے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ آغا کی اسیری کی تمہید ہی دس سال مدت کا حاصل ہے۔ اگر آغا کی زندگی کے دامن پر قید و بند کی صعوبتوں کے داغ نہ ہوتے تو آغا یہاں تک نہ پہنچتے۔ ان کی شخصیت کا نقش بھی نہ ابھرتا اور وہ محض ایک گمنامی کی زندگی بسر کرتے۔

آغا شورش کاشمیری کئی سال سے ہفتہ روزہ چٹان لاہور کے مالک و مدیر ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں مجلس احرار نے جب روزنامہ "آزاد" نکالا تھا تو کچھ عرصہ کے لئے اس کی ادارت کے فرائض بھی آغا نے سرانجام دیئے تھے۔ اس وقت تک آپ کے قلم سے جو تصانیف نکل چکی ہیں ان کی فہرست یہ ہے۔

(۱) قیدی کا روزنامچہ (جو جیل کے حکام نے پنجاب سی آئی ڈی کے مشورہ سے ضبط کر لیا)
(۲) آزاد ہند کے فوجی مقدمہ (۳) اس بازار میں (۴) گفتنی و ناگفتنی (ابوالکلام) (۵) پس
دیوار زنداں (زیر طبع) (۶) مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری (زیر ترتیب)

آغا شورش کاشمیری ایک نامی علاوہ شاعری کے مالک ہیں۔ "چٹان" ان کے کارنامے جو قریب پاکستان اور بھارت کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں آغا کے

ترجمان ہو جاتے ہیں اس ہر دل عزیزی اور اس قبول عام کا راز شاید اسی حقیقت میں مضمر ہے کہ آغا شورش کا شاعر بھی وہ ہے اور اس کے ساتھ ہی ادراک کا قاری بھی۔ شورش ہمیشہ تحریر و تقریر ہو یا شعر، ان کی ہر بات میں جوہر عمل کار فرما نظر آتا ہے۔ گفتنی ناگفتنی کے دیباچہ میں آغا نے لکھا ہے کہ

"میں نے جو کچھ کہا، اس پر عمل بھی کیا۔ ان سیاسی شعروں میں میرے کردار کی پوری پوری جھلک موجود ہے۔ میری خامیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی۔ یہاں مجھ میں قدرے انا جاگ اٹھتی ہے جو شاعر مستعار انقلابی نعروں سے ہیرو بنتے ہیں مجھے نہ صرف ان سے ہمدردی پیدا ہوتی بلکہ ان کے چہرہ شناسی پر بھی رحم آتا ہے ان کا سارا گھمنڈ خود فریبی کے گھر کے دعووں پر ہے جن لوگوں کو اپنے ملک کی سیاسی جدوجہد کے ابجد سے واقفیت نہیں اور جن عوام کو وہ عوام کہتے ہیں کبھی ان کے لئے کٹنے کی بھی خواہش نہیں کی وہ انہیں تلوار کے زخم کھانے پر کیونکر آمادہ کر سکتے ہیں مجھے فخر ہے کہ میں نے عوام کو قریب سے پڑھا اور انہوں نے قریب سے سنا ہے میرے ہر شعر کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ میں انہی کے بیچ میں ہوتا اور انہی کے ذہن کی بات کہتا ہوں۔ مجھے اس مقصد کے لئے اپنے ماحول سے باہر کسی مزدور کا گھنا چہرہ دیکھنے کی ضرورت نہیں اور نہ پرائے دیس سے محرکات شعر ڈھونڈنے کی احتیاج ہے میرا ملک اور میری قوم ایک نظم مسلسل ہیں جن میں سے موضوع، مضمون اور عنوان ڈھونڈتا ہوں میرے گردوپیش اتنا مواد پڑا ہے کہ اس کے سامنے شاعر و ادیب ایک طرف رہے، آفتاب و ماہتاب بھی دامن پھیلا سکتے ہیں ؎

دامان باغباں سے کف گل فروش تک
بکھرے پڑے ہیں سینکڑوں عنوان مرے لئے"

آغا شورش کاشمیری کو واقعی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ یہ کہیں ؎

بہت قریب سے دیکھا ہے رہنماؤں کو — بہت قریب سے کچھ راز پائے ہیں میں نے
کہوں تو گردش لیل و نہار رک جائے — وہ راز جن سے بہت زخم کھائے ہیں میں نے

آغا شورش کاشمیری کی سیاسی اور ادبی زندگی کے چند پہلوؤں پر تو میں نے اپنی بساط کے مطابق سطور بالا میں روشنی ڈالی ہے لیکن ابھی میں نے ان کی عادات و اطوار کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس موضوع کو حرف آخر کی حیثیت دینا چاہتا تھا۔ اور اس لئے کہ کسی مضمون کی آخری سطریں ذہن پر کچھ دیرپا نقش چھوڑ جاتی ہیں دوسرے ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ میں اپنے قارئین پر یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ نوجوان جس کی زندگی انقلابات کے پر ہول ماحول میں بسر ہوئی ہے اور جس کے قلم کی جولانیوں نے اچھے اچھے ادیبوں، خطیبوں، شاعروں، صحافیوں اور سیاسی رہنماؤں کو ناک چنے چبوا دیئے ہیں ایک گداز اور شائستہ اطوار کا مالک ہے۔ حقیقت میں یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا جوش مزاج میں منصب کی خشونت، تپتی ہوئی عمیق اور دلیری ایسی کہانی ہے جس کے پیچھے کسی بلندی پر ڈالی ہوئی کمندیں ہیں جو کی نوازش نہیں غیظ و غضب کے جذبات کھلے ہیں یہ وقت تیزیوں کی آواز ہوگا۔ اگر میں یہ کہوں تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔

تیور بدل گئے تو زمیں کانپنے لگی
ابرو کے اک اشارہ سے محشر بپا ہوا

اگر یہ عیب ہے تو آغا شورش کاشمیری کا دامن اس سے منزہ و مبرا ہے۔ آغا کی افتاد طبع ہی کچھ ایسی ہے کہ ان سے ان کے بہت سے معتقدین

لگتا ہے کبھی آغا بڑے تپاک سے ملتے ہیں اور کبھی ایسی بلا کی مردم بیزاری کا ثبوت دیتے ہیں کہ واقف اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ مجھے ان کے قریبی دوستوں سے معلوم ہوا ہے کہ آغا شورش کاشمیری نے کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ آغا خالص پنجابی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن تقریر و تحریر میں ان کی زبان اور کلاسیکیت کے سلیقے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ان کے احساس پر جوش غالب آجاتا ہے لیکن یہ غلبہ صرف چند لمحات کے لئے ہوتا ہے پھر زرا اپنے جذبات پر قابو پالیتے ہیں۔ آغا صاحب جب ٹیلیفون پر کسی سے گفتگو کرتے ہیں تو طنز و ظرافت کا ایک دفتر کھل جاتا ہے۔ چٹان کے مالک و مدیر کی حیثیت سے ان کا کردار بہت بلند ہے۔ کاتب، ادارۂ تحریر، منیجر اور چپراسی سبھی ان سے خوش اور مطمئن ہیں۔ ان کا برتاؤ ان سب سے ہمدردانہ ہے، مشفقانہ ہیں اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آغا نے زمانے کے نشیب و فراز دیکھے ہیں اور ہر رنگ کی زندگی بسر کی ہے۔

(۴)

چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

(غالب)

حیدر آباد کی چند شخصیتیں

تمکین کاظمی

بیس بائیس سال پہلے میں نے چند شخصی خاکے لکھے تھے جنہیں اہلِ علم نے بہت پسند کیا اور بعض لوگ برابر تقاضا کرتے رہے کہ اس سلسلہ کو جاری رکھو مگر میں اس طرف توجہ نہ کر سکا۔ البتہ پیوستہ سال مجھے خیال ہوا کہ ان سب بزرگوں، دوستوں، عزیزوں کے شخصی خاکے لکھوں جن سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں، چنانچہ بعض کے متعلق الگ الگ میں نے لکھنا شروع کیا۔ ابھی یہ خاکے زیرِ تکمیل ہی تھے کہ نقوش کا شخصیات نمبر شائع ہوا اور مجھے اس کے مطالعہ کی فکر ہوئی۔ تقسیم کے بعد سے پاکستانی مطبوعات کا حصول مشکل ہو گیا ہے۔ وہی بات کہ طریقہ نہیں یہاں کے ادارے بھی بڑی مشکل سے منگوا سکتے ہیں۔ بالآخر عزیزم سعادت نظیر نے کہیں سے مانگ کر شخصیات نمبر لا دیا اور میں نے اس ضخیم نمبر کی ورق گردانی ماہ میں کر لی اور ایک طویل خط طفیل صاحب کو لکھا مگر میرا یہ خط یا تو انہیں ملا نہیں یا وہ انجان ہو گئے۔

گزشتہ مہینے میں محبی نصیر الدین ہاشمی نے مجھ سے خواہش کی کہ شخصیات نمبر کے ضمیمہ کے لئے کیفی حیدر آبادی پر کچھ لکھ دوں، چنانچہ میں نے ان کی فرمائش کی تعمیل کر دی اور انہوں نے کیفی کا شخصی خاکہ طفیل صاحب کو بھجوا دیا اور پھر طفیل صاحب نے فرمائش کی کہ حیدر آباد والوں کے خاکے لکھ دوں۔

میری ولادت ۱۹۰۲ء کی ہے اور میرا گھرانا علمی ادبی رہا ہے۔ جس کی وجہ سے بچپن ہی سے مجھے علماء، فضلاء اور شعراء سے واقفیت رہی ہے اور بیشتر مشاہیر سے میں بچپن ہی سے مانوس تھا۔ اس طرح میں سینکڑوں بزرگوں پر لکھ سکتا ہوں مگر میں نے چند بزرگوں کی ایک فہرست بنا لی ہے اور انہی کے خاکے پیش کر رہا ہوں۔

شخصیات نمبر میں بعض لوگ مثلاً امجد، فرحت اللہ بیگ، وحید وغیرہ پیش کئے گئے ہیں، اس لئے انہیں میں نے چھوڑ دیا ہے اور بعض حضرات پر مستقل طور پر کتابیں لکھی گئی ہیں اور وہ علیحدہ شائع ہو رہے ہیں اس لئے اس مضمون میں انہیں بھی نہیں لیا گیا ہے۔

مسلم اور غیر مسلم میں فرقہ واریت مجھے پسند نہیں۔ اس مضمون میں میں نے دونوں شخصیتیں پیش کی ہیں [illegible] کے ساتھ ملکی غیر ملکی کا سوال بھی حیدر آباد کی [illegible] میں شامل نہیں ہوں، جو لوگ حیدر آباد آ کر بس گئے وہ ملکی ہی ہیں چاہے دو سال رہے ہوں یا دو سو سال [illegible] انہیں حیدر آبادی ہی

شمار کرتا ہوں۔

مشکل یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے خاکے کے ساتھ مستقل تنقید اور نظم و نثر کے اقتباس بھی چاہتے ہیں اور ان نمونوں کی [illegible] ایک جگہ نہیں ہو سکتی، حالانکہ بالکل مستقل چیز ہے اس میں تنقید، تبصرہ اور اقتباس کی گنجائش نہیں۔ اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اگر کسی کے متعلق کوئی ایسی بات لکھے کے لئے قطعاً تیار نہیں جو اخلاقی یا مذہبی لحاظ سے ناگفتہ بہ ہو اور وہ زندہ ہو، چنانچہ حال ہی میں حقی اور رنگ آبادی پر میں نے ایک مضمون لکھا اور اس زمانے کی [illegible] پر بھی روشنی ڈالی تو میرے بزرگوں نے تعجب سے دیکھا، میں حیران ہوں کہ کیا کروں بقول ترقی حیدرآبادی۔

حیراں ہوں دیا اٹھاؤں تو کس کو اٹھاؤں
پیمانہ ہاتھ میں ہے پیماں سامنے ہے!

بہر حال میں یہ کوشش کروں گا کہ جو بھی لکھوں سچ لکھوں اور لگی لپٹی نہ رکھوں، واقعات ایمانداری اور دیانت کے ساتھ پیش کر دوں۔ آپ اس مجموعے میں ایسے بزرگوں کے خاکے ملاحظہ فرمائیں گے جو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور ایسے لوگوں کے خاکے بھی دیکھیں گے جو اللہ کے فضل سے اب بھی بقید حیات ہیں۔ میں نے جو معیار قائم کیا ہے اس پر سب کو جانچا ہے، چاہے وہ مرحوم ہوں یا موجود۔ فقط!

علامہ عبداللہ یوسف علی

۱۹۲۰ء میں ضلع گلبرگہ میں [illegible] کی حیثیت سے بھی کام کرنا پڑا ہے۔ ایسے تو بعض شہر [illegible] کی گنجائش تھی مگر معزز مہمانوں کا استقبال اور ان کا انتظام بھی بعض وقت میرے تفویض رہا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں بعض مشاہیر سے بھی مجھے نیاز حاصل ہوگا، جن میں عبداللہ یوسف علی بھی تھے۔

عبداللہ یوسف علی صدر المہام (وزیر) مال و صنعت و حرفت و تجارت کی حیثیت سے دورہ پر آنے والے تھے اور میں گورنمنٹ [illegible] ان کا انتظار کر رہا تھا [illegible] ٹرین [illegible] پلیٹ فارم پر [illegible] سے ایک [illegible] معمولی قد و قامت کا شخص [illegible] سوٹ پہنے ہوئے اترا اور اپنے سوٹ کی گرد جھاڑنے لگا، میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا [illegible] بھی چاہتا تھا کہ میں نے خود ہی دریافت کیا "صدر المہام صاحب کہاں ہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور [illegible] کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دوسری طرف [illegible] یہی سوال کیا تو انہوں نے [illegible] کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں نے ان سے [illegible] کہ آپ [illegible] صدر المہام تو نہیں ہیں [illegible] اترا کر [illegible] صدر المہام سے [illegible] میرا تعارف کرایا۔ اس طرح مجھے علامہ عبداللہ یوسف علی سے نیاز حاصل ہوا۔

عبداللہ یوسف علی [illegible] گورنمنٹ [illegible] آتے [illegible] ان کے [illegible] غسل [illegible] کے بعد [illegible] چائے پینے کے لئے [illegible] بحیثیت [illegible] کے ساتھ [illegible] اور [illegible] سے بڑی محبت تھی۔ اس لئے وہ جب بھی [illegible] تھے۔

[illegible] گورنمنٹ [illegible] ایک [illegible] وہ کھل گئے اور بڑی دلچسپ باتیں کرنے لگے [illegible] پہلی ملاقات [illegible]

کے آثار قدیمہ اور عمارتیں حسین تالاب وغیرہ کا معائنہ بڑے شوق سے کیا اور جہاں جاتے مجھے ساتھ لے جاتے تھے۔ باسط جنگ بہادر بڑے خوش اخلاق و ظریف آدمی تھے۔ وہ علامہ کی اس روش پر حیران تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ علامہ باوجود اتنے قابل، ایسے مشہور اور بڑے عہدہ دار ہونے کے ایک نوجوان کے ساتھ قہقہے لگانے اور بات بات پر چٹخارے لینے پر کیسے مائل ہو گئے۔

باسط جنگ بہادر جب بھی گلبرگہ آتے والد مرحوم ان کی دعوت کیا کرتے تھے اس لئے اب بھی ان کی دعوت کی اور ان سے کہا کہ اپنے ساتھ صدر المہام صاحب کو بھی لائیں تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے میں صدر المہام کو اپنی طرف سے آپ کے پاس چلنے کو نہیں کہہ سکتا۔ آپ فلاں سے کہلوا دیجئے۔ والد نے علامہ سے فرمایا کہ کل رات کو کھانا باسط میاں ہمارے پاس کھائیں گے۔ اگر تم بلا سکو تو عبداللہ صاحب کو بھی بلا لو۔ میں نے علامہ سے عرض کیا کہ کل رات غریب خانہ پر ماحضر تناول فرمائیے تو انہوں نے بڑی خوشی سے دعوت قبول کر لی اور فرمایا بھنی ہوئی بکری ہو تو بہتر ہے۔ چنانچہ اس دعوت میں دو بکریاں ان ہی کے لئے تھیں جنہیں علامہ نے بہت پسند کیا۔

گلبرگہ میں پانی بھوسنگی کے تالاب سے آتا تھا اور یہ تالاب بہت ہی مختصر تھا۔ میں نے اس کو وسیع کرنے کی تحریک کی تو علامہ نے اسے منظور فرمایا اور اپنے نوٹس میں اس کو بھی شریک کر دیا۔ بھوسنگی کا تالاب دیکھ کر واپس ہوتے ہوئے حضرت رکن الدین تولہ کے مزار پر پہنچے۔ میں نے حضرت موصوف کی سوانح سنائی کہ مجذوب تھے۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ جس وقت یہاں آئے یہ یہیں اسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ بندہ نوازؒ نے یہاں پہنچ کر دودھ سے بھرا ہوا پیالہ بطور نذر پیش کیا تو آپ نے اس کو بطور نذر قبول کیا۔ چونکہ حضرت سے چار زانو بیٹھے ہوئے تھے اس لئے جب انہیں کھڑے ہونے میں تکلیف ہوئی اور آپ نے فرمایا "تولا"۔ چونکہ یہ ایک مقامی کی زبان سے لوگوں نے سنا تھا اس لئے ان کو تولا کہنے لگے جو بعد وفات مشہور ہو گیا۔ حضرت کے پاس ہی آپ کے ایک معتقد عبداللہ کا مزار ہے جو ابتدا برہمن تھے اور آپ کے معتقد تھے۔ آپ ہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور یہیں رہنے لگے۔ لوگ زیارت کے لئے آتے اور گوشت ساتھ لا کر کھایا کرتے تھے جو انہیں ناگوار گزرتا۔ انہوں نے حضرت تولا سے اس کی شکایت کی تو حضرت نے اس کی ممانعت کر دی چنانچہ اب تک یہ دستور ہے کہ جو بھی حضرت کی زیارت کے لئے جاتا ہے ایک روز پہلے سے گوشت کھانا چھوڑ دیتا اور نہا دھو کر جاتا اور اپنے ساتھ گوشت نہیں لے جاتا ہے۔ میں نے یہ قصہ سنایا تو علامہ بہت متاثر ہوئے فرمانے لگے "آپ نے دیکھا ہمارے بزرگوں نے تبلیغ کی کتنی باتیں کیں اور اپنے اخلاق اور کردار سے کس قدر اثر قائم کیا اور کس طریقے سے تبلیغ کی۔" پھر فرمانے لگے "یہ تبلیغ کی باتیں انہی لوگوں پر کیوں ختم ہو گئیں اب کہیں باقی نہیں ہیں؟ اس لئے کہ ان بزرگوں میں خلوص تھا، محبت تھی، ہر کام نیک دلی سے کرتے تھے اس لئے اثر بھی ہوتا تھا۔ اب خلوص کا فقدان ہے، محبت نہیں رہی۔ نمود و نمائش رہ گئی ہے اور ہر کام دکھاوا رہ گیا ہے اس لئے کوئی اثر نہیں رہا۔ کردار و گفتار کے بیچ بھید پڑ گئے ہیں۔ آپ واقف ہیں۔" فرمانے لگے [illegible] پھر بزرگ صوفیائے کرام کا ذکر فرماتے رہے اور ان کے طریقہ تبلیغ کی وضاحت فرمائی۔

[illegible] کا معائنہ کیا تو کارخانہ جہاں قالین، شطرنجیاں، دریاں بنائے جاتے تھے بڑی تفصیل سے ملاحظہ کیا اور بہت پسند فرمایا اور [illegible] معائنہ میں جرائم اور ان کے ارتکاب، اسباب اور اس کے اثرات پر ایسی جامع تقریر فرمائی کہ ہر شخص متاثر ہو گیا۔ ایک ایک [illegible] اور ہر کام کو بہت پسند کرتے تھے۔

[illegible] کا ملاحظہ کیا تو پوچھا۔ ہر سال [illegible] سے قبر کی زیارت کو خاص و عام آتے ہیں [illegible] روحانیات پر ایک مدلل تقریر فرمائی اور ثابت کیا کہ روحانی اثرات ختم نہیں ہو سکتا اور قیامت تک ان کی یہی کیفیت رہے گی۔

[illegible]

گلبرگہ دکن میں کا بھی پرانا مسلمان شہر ہے۔ کیونکہ یہاں شہروں میں اپنا مدارس کا دنگل ہے جس کی بنا کافی دھوم سے ہوتی ہے۔ علامہ نے دنگل کا مشاہدہ کیا اور دنگل کے عکس اور دنگل کشتی کے متعلق ہندو مسلم جھگڑے کا حال سنا تو فرمانے لگے "بھائی یہ بڑے نام مسلمانوں کی حکومت ہے اقتدار اعلیٰ انگریزوں ہی کا ہے مگر یہاں یہ حال ہے کہ مسلمان ہندو دنگل پر عکس چڑھانے نہیں دیتے جب کبھی ہندوستان آزاد ہو جائے گا اور جمہوری حکومت ہوگی تو پھر ہندوؤں کا غیر ہونا مسجدوں کا یہ دونوں حریف ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر رہیں گے۔"

علامہ کا یہ سوال حرف بحرف پورا ہوا۔ شاید اسی کو دیکھ کر انہوں نے ترک وطن کرکے لندن جا رہے۔

میرے بعض دوستوں ڈاکٹر عالم ایم اے ایل ایل بی جو ان دنوں علیگڑھ سے ایل ایل بی کر رہے تھے، اور عبدالمنعم سعیدی بی اے علیگ، جو عثمانیہ سے ایل ایل بی کر رہے تھے بڑی خواہش کی کہ علامہ سے انہیں ملاؤں۔ اس سلسلے میں میں نے علامہ سے استدعا کی کہ میرے پاس چائے پر تشریف لائیں اور ان لوگوں سے ملیں تو بڑی خوشی سے آمادہ ہو گئے اور شام کی چائے پر میرے احباب سے ملاقات کی۔ اکبر عالم سے سیاسیات پر اور منعم سعیدی سے مذہب پر دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ بعض اور طالب علم بھی تھے ان سے بھی دیر تک باتیں کیں۔ ایک طالب علم مسعود کا تعلق کے ایک غریب خاندان سے تھے میرے پاس رہتے تھے ان سے خصوصیت کے ساتھ بات چیت کی اور دوسرے روز انہیں ملنے کے لئے کہا اور سب لوگوں کے سامنے اپنی طالب علمی کے حالات سنائے کہ کس طرح انہوں نے افلاس اور تنگ دستی میں طالب علمی کی اور کس طرح ایک امیر شخص نے ان کی مدد کی، اپنے حالات بڑی بے تکلفی سے سنائے اور اپنی فلاکت اور تنگ دستی کے اظہار میں کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ وہ اس قدر بڑا آدمی تھے۔ کتنے حقیقت پسند اور کیسے سچے اور حق گو۔ میں نے کسی بڑے آدمی کو اتنی صفائی سے اپنی سابقہ زندگی اور مفلسی کا ذکر کرتے نہیں سنا۔ بعض لوگوں پر یہ زمانہ گزر چکا ہے وہ بھی ہمیشہ اس کے بیان سے گریز کرتے رہے مگر علامہ نے فخر کے ساتھ سب کچھ سنا دیا۔ ان کی سابقہ اور ابتدائی زندگی کے حالات سننے کے بعد ہم لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت اور زیادہ ہو گئی اور ہم انہیں ایک نمونہ سمجھنے لگے۔

یوں تو علامہ کے مضامین اور کتابیں میری نظر سے گزر چکی تھیں مگر جب وہ حیدرآباد آئے تو میں انہیں ایک دفتری عہدہ دار ہی سمجھتا تھا۔ اس ملاقات میں معلوم ہوا کہ وہ بڑی معلومات کے بزرگ ہیں۔ تاریخ پر ان کی بڑی اچھی نظر تھی۔ شاہان بہمنیہ کی قبریں دیکھیں تو بڑے مزے سے تاریخ بیان کرنے لگے چونکہ ان دنوں میں نے گلبرگہ کی ایک مختصر تاریخ اور حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی سوانح عمری مرتب کی تھی اس لئے میری معلومات تازہ تھیں۔ مجھ سے اس خصوص میں علامہ نے گفتگو فرمائی تو بہت خوش ہوئے اور میری معلومات کی بڑی داد دی اور بڑے اچھے مشورے مرحمت فرمائے۔ اسی طرح مذہب پر بھی بڑی خاص نظر تھی اور تصوف سے متعلق بڑی خاص معلومات تھیں اور ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ عربی، فارسی، انگریزی، مرہٹی، گجراتی کے علاوہ کنڑی بھی اچھی طرح جانتے اور روانگی سے بولتے تھے۔ عربی، لاطینی اور سنسکرت کے قائل تھے کہ یہ زبانیں ام السنہ ہیں یعنی بقیہ زبانوں کی ماں زبانیں ہیں۔ اردو بڑی صاف اور شستہ بولتے اور اردو کا بڑا ذوق رکھتے تھے۔

عبدالمنعم سعیدی ان دنوں آسکر وائلڈ کے ایک ڈرامے کا ترجمہ کر رہے تھے۔ میں نے ذکر کیا تو فرمایا۔ یہ ڈرامہ جس کا ترجمہ کر رہے ہو کوئی خاص چیز نہیں ہے وائلڈ کا ترجمہ کرنا ہو تو اس کے ڈی پروفنڈس کا ترجمہ کرو تاکہ اس سے قوم کی اصلاح ہو سکے اگر تم لوگوں کی مشق جاری رہے تو دس سال کے بعد اس ڈرامے کا ترجمہ کر سکتے ہو۔

علامہ نرے علمی آدمی تھے ادب پر بھی خاصا عبور رکھتے۔ البتہ شاعری سے زیادہ دلچسپی نہ تھی مگر اس سے بے بہرہ بھی نہ تھے۔ اساتذۂ اردو کے کلام سے واقف تھے۔ غالب اور اقبال کے اکثر شعر بھی یاد تھے اور میر کے شعر بھی سنایا کرتے تھے۔

بہرحال گلبرگہ میں ایک ہفتہ علامہ کا قیام رہا اور ان دنوں میں صبح سے شام تک میں ساتھ رہا۔ بعض حضرات کے ہاں رات دیر تک بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے۔ میرے حالات پوچھتے تک حکایات رہیں اور ان کے جانے کے بعد بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں جب بھی حیدرآباد

ان کا مقصود علامہ سے ملنا۔ ایک روز اسی طرح تشریف لے گئے تو ایک قدیم ایرانی تصویر مجھے دی کہ اس کی فوٹو کاپی کرا دو۔ میں نے وہ تصویر لے لی اور ایک فوٹوگرافر سے اس کی کاپی کرائی اور یہی تصویر ایک نقاش کو جو پرانی تصویروں کی نقلیں کرنے میں بڑا ماہر تھا دے کر اس کی ایک نقل بھی کرائی۔ دو تین روز کے بعد میں نے نقاش کی بنائی ہوئی نقل اور فوٹو کی کاپی لے جا کر پیش کی۔ آپ نے دیکھ کر رکھ لیا۔ پھر میں نے وہی اصل تصویر جو علامہ نے دی تھی پیش کی تو بہت پریشان ہوئے دونوں کو لا کر دیر تک دیکھتے رہے اور پھر اصل اور نقل کو الگ الگ رکھ کر بڑی تعریف کی کہ بڑا اچھا مصور ہے اور خوب نقل کی ہے۔ پھر فرمایا کہ میں چند تصویریں بمبئی سے منگا دوں گا اسی طرح ان کی نقل بھی کرا دو۔ مگر بمبئی سے اس کے چند ہی روز بعد وہ حیدرآباد سے تشریف لے گئے۔

کاچی گوڑہ میں اسٹیشن کی بہ حیثیت ناظم ریلوائی "میرا منصب" متعلق تھا اکثر اسٹیشن جانا اور پلیٹ فارم پر جانا پڑتا تھا اس سلسلہ میں اکثر آتے جاتے ہوئے دوستوں سے ملاقات ہو جاتی تھی اسی طرح ایک روز پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا بمبئی ٹرین کا نظارہ کر رہا تھا کہ علامہ نظر آئے۔ لپک کر ٹرین میں سوار ہو گیا اور ملاقات کی تو فرمایا میں حیدرآباد سے واپس جا رہا ہوں۔ پھر ان تمام احتیاطات کا ذکر فرمایا جو حیدرآباد میں ہوئے اور وہاں تک حیدرآباد کے متعلق گفتگو فرماتے رہے۔ شولاپور تک میں نے ساتھ دیا اور وہاں اتر پڑا "اتفاق" سے قیام کاچی گوڑہ کے زمانے میں مجھے بمبئی جانے کا اتفاق بھی اکثر ہوتا رہا لیکن میری آخری ملاقات علامہ سے بمبئی ہی میں ہوئی اس کے بعد سے زندگی میں بمبئی جانا ہو سکا اور نہ کسی دوسری جگہ علامہ سے نیاز حاصل ہو سکا۔

میرے نثری مضامین کا مجموعہ "صحیفۂ نثر" شائع ہوا تو میں نے بھیج دیا۔ مجھے علامہ نے بہت پسند فرمایا۔ خصوصاً دو ایک مضامین بہت پسند کئے اور مجھے لکھا کہ فرصت ملی تو "میں ملتی" اور "فکر و بات" دونوں مضامین کا ترجمہ انگریزی میں کروں گا۔ میں نے ریختی گو شعرا کا تذکرہ بھی بھیجا تھا اسے دیکھ کر تحریر فرمایا "کتاب مجھے پسند نہیں آئی گو محنت ہے اس خاص شاعری کے پسند کرنے والوں کے لئے کارآمد ہو مگر ایسے کام کرنا وقت ضائع کرنا ہے" عجیب اتفاق ہے کہ نواب فخر یار جنگ بہادر مرحوم نے بھی میرے تذکرۂ ریختی کو ملاحظہ فرما کر مجھے تحریر فرمایا تھا "انھوں آپ کے ادبی اور اخلاقی نقطۂ نظر میں اختلاف ہی سمجھئے۔"

علامہ کی سب سے زیادہ جو بات مجھے پسند تھی وہ ان کی رواداری اور وسعت قلبی تھی بڑی فیاضی سے تشنگانِ علم کو سیراب کرتے۔ مضمون نگاروں کی دل افزائی فرماتے اور ہمت بندھاتے تھے۔ "میں دو سال علامہ سے مجھے نیاز حاصل ہوا ہے میری مضمون نگاری کی رفتار تیز اور جو مضامین میرے چھپ چکے تھے انہیں دیکھ کر علامہ نے میری بڑی ہمت افزائی کی تھی اور بہت سے مفید اور کارآمد مشورے دیئے تھے جو میرے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے اور انہی کو پیش نظر رکھ کر میں نے مضمون نگاری کی۔

مطالعہ اور اپنے مفید مطلب مضامین کے نوٹس لینے کے متعلق علامہ نے بڑی عمدہ ہدایات دی تھیں۔ علامہ نے بڑی تفصیل سے مجھے سمجھایا تھا کہ انتشارِ ذہن ہو تو مطالعہ نہ چھوڑو ہر ایک کتاب پڑھو اسے جو اس کے مضامین اپنے دماغ میں محفوظ رکھا کرو۔ ایک ہی موضوع پر مختلف مصنفین کی کتابیں یکے بعد دیگرے غور سے پڑھا کرو اور ایک دوسرے میں کیا فرق ہے غور کیا کرو۔ کسی موضوع کو حقیر اور پامال نہ سمجھو، ہر موضوع کا مطالعہ کرو۔" اسی طرح اور بھی بہت سی باتیں علامہ نے بتائی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ میرے ابتدائی مضامین جو ایک اٹھارہ سالہ نوجوان کی زندہ مشقی کا نتیجہ تھے دیکھ کر اگر علامہ ان پر پسندیدگی ظاہر نہ فرماتے اور میری نوجوانی اور بچوں کی زبان دیکھ کر خاموش ہو جاتے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ختم ہو گیا مگر علامہ نے میری بڑی ہمت افزائی کی اور مجھ میں خاص شوق اور ہمت پیدا کی جس کا نتیجہ تھا کہ میں نثر پر لکھتا رہا اور آج تک لکھ رہا ہوں۔ معلوم نہیں میری طرح علامہ نے اور کتنوں کو انشا پرداز بنا دیا۔ خداوند عالم علامہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین!

عبداللہ العمادی

ہوش سنبھالنے کے بعد سے علامہ عبداللہ العمادی کی تصانیف اور مضامین میرے مطالعہ میں رہتے تھے مگر کبھی ان سے مجھے نیاز حاصل نہیں ہوا تھا۔ دارالترجمہ کے قیام کے بعد جب عمادی حیدرآباد آگئے تو مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے مجھے اپنا گرویدہ کر لیا کہ میں ان کا حلقہ بگوش ہو کر رہ گیا۔ معلوم نہیں ہے کس نے میرا تعارف کرایا تھا یا کسی اور نے بہرحال میرا نام سنتے ہی بے انتہا مسرور ہوگئے میرے بعض مضامین کا حوالہ دیا اور فرمایا کہ میں تمہارے مضامین پڑھ کر خوش ہوتا اور تمہارے لئے دعا کیا کرتا تھا۔ تم میرے لئے اجنبی نہیں ہو میں مدت سے تم سے مانوس ہوں۔ ان کی اس شفقت و عنایت کا مجھ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ میں نے بھی انھیں اپنا شفیق بزرگ اور مربی سمجھ لیا اور یہ شفقتیں و عنایتیں آخر وقت تک میرے حال پر مبذول رہیں۔

عمادی کم رو، کم گو، کم آمیز قسم کے بزرگ تھے۔ نیا شخص ان سے مل کر تو انھیں عالم نہ سمجھ سکتا اور نہ ہی معقول آدمی بلکہ اجنبی اگر ان کے علم کی گہرائی اور علمی کارناموں سے واقف نہ ہوتا تو انھیں خاطر ہی میں نہ لاتا۔ بظاہر کم گو تھے مگر مسائل علمیہ کے وقت ان کی زبان اور قلم چل دیتا ہوتی۔ جب کھل جاتے تو ان کی طلاقتِ لسانی ظاہر ہونے لگتی اور ایسے جواہر بکھیرتے کہ سننے والا مالامال ہو جاتا۔ اس مطالعہ کے کسی بات کا شوق ہی نہ تھا کیونکہ بالکل معمولی بات لیتے تھے۔ ابھی اسی طرح ہوتا۔ مرشد ابتدا ہی ہوتی تھی کہ وہ جواب پہنچا تھا۔ طبیعت میں اس قدر عجز و انکسار تھا کہ میں نے اس قسم کے کسی بزرگ میں نہیں دیکھا۔ کوئی اپنی کتاب لا کر ضد کرتا کہ مولانا تقریظ لکھ دیجئے۔ کتاب الٹ پلٹ کر دیکھی، سرسری طور پر پڑھ لیا اور برداشتہ تقریظ لکھ دی۔ لطف یہ کہ صاحب تصنیف کی تعریف اتنی کہ وہ پھولا نہ سماتا اور آخر میں ایک آدھ فقرہ ایسا لکھ دیتے کہ جاننے والے جان جاتے کہ یہ سب ایک جنتری کی دل آزاری کے لئے لکھا ہے۔ معلومات کا یہ حال تھا کہ کسی موضوع پر گفتگو کیجئے یہ معلوم ہوتا کہ وہ اس فن کے ماہر ہیں۔ میں انھیں صرف عالم سمجھتا تھا فن تاریخ میں ان کی قابلیت مجھے معلوم ہی نہ تھی ایک دفعہ پوچھا کیا کر رہے ہو تو میں نے عرض کیا "ارسطو جاہ" پر کام کر رہا ہوں۔ آپ نے ارسطو جاہ کا نام اور پورے حالات بیان کرنے شروع کیے۔ وہی ارسطو جاہ جو میں نے عرض کیا تھا۔ وہی ارسطو جاہ کی کارگزاریاں جو گنانے لگے تو معلوم یہ ہو رہا تھا کہ میں نے آٹھ دس سال کی محنت میں جو چیزیں جمع کی تھیں وہ عمادی کی زبان کی نوک پر ہیں۔ میں نے حیرت ظاہر کی تو فرمایا کہ تم تحقیق کر رہے ہو اور مسلسل اس موضوع پر کام کر رہے ہو اس لئے تمہیں حیرت ہو رہی ہے۔ نظام کے پورے حالات میری نظر میں ہیں چنانچہ میں نے اپنی یہ کتاب پیش کی تو ملاحظہ فرما کر بڑی داد دی اور جہاں جہاں میں نے تحقیق کی تھی اور جو باتیں میں نے گلزار آصفیہ اور رعایا کی اسناد کی بنا پر لکھی تھیں ان کی داد دی کہ یہ کام تم نے بڑا اچھا کیا ہے یہ مواد دوسرا شخص فراہم نہ کر سکتا تھا۔

طبیعت میں استغنا اور درگزر کا مادہ بہت تھا۔ ہمیشہ اپنی حالت پر قانع رہے اور بڑے سے بڑے مخالف کو بھی مخالف نہیں سمجھا۔ ہر ایک کو دوست ہی سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے مخالفین بھی بہت ہی کم تھے اور جو تھے بھی تو مخالفت کرتے ہوئے شرماتے تھے یہ ان کے کردار تھے جن کی وجہ سے دشمن بھی دوستی پر مجبور رہتے۔

ارسطو جاہ پر کام کر کے ہی میں نے کتاب یوسف علی خان رسالدار جنگ کو ترتیب دیا تھا چونکہ ارسطو جاہ میر عالم کے آقا اور میر عالم کی زندگی چلانے والے تھے اس لئے ان کی سوانح حیات میں میر عالم کا چہرہ بے نقاب ہو رہا تھا۔ نواب صاحب نے ابتدا یہ چاہا کہ میر عالم کے خلاف جتنی باتیں ہیں انھیں قلم زد کر کے شائع کروں۔ مگر میں اس کے لئے آمادہ نہ ہوا تو انھوں نے کوشش کی کہ یہ کتاب چھپنے نہ پائے چنانچہ اپنے ذاتی اثر سے کام لے کر حکومت سے جو امداد اس کتاب کی اشاعت کے لئے مل رہی تھی اسے رکوا دیا۔ اس پر جھگڑ کر میں نے "میر افسانہ" کا تصور ان کے

طور پر لکھا جس میں جیرالنساء کا تعلق میر عالم کے خاندان سے ثابت کر کے میں نے اپنے دل کا غبار نکال دیا تھا۔ میں نے اس کا ذکر کیا تو عمادی نے بڑا اشتیاق ظاہر کیا کہ مجھے دکھاؤ۔ میں نے مسودہ پیش کیا تو یہ کہہ کر رکھ لیا کہ دیکھ کر واپس کروں گا۔ دو تین روز کے بعد جب میں نے مسودہ مانگا تو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فرمایا اگر تم سے میں کوئی خواہش کروں تو پوری کرو گے؟ میں نے عرض کیا ضرور۔ تو فرمایا اس مسودے کو ضائع کر دو یعنی کتاب ہرگز شائع نہ کرنا۔ میں نے بحث شروع کی تو فرمایا تم نے وعدہ کیا ہے میری خاطر یہ کام کر دو۔ چنانچہ میں نے ان سے مسودہ لے کر وہیں چاک کر دیا اور پرزے انہی کی میز کے نیچے رکھی ہوئی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیے۔ میرے اس طرز عمل سے خوش ہو کر بہت دعائیں دیں اور فرمایا میاں! ایک بڑے گھرانے کی عورت کا ناجائز تعلق ریذیڈنٹ ہی سے سہی مگر شرمناک بات ہے۔ تم فقط عاقل الدولہ کے خاندان کو ذلیل کرنا چاہتے تھے جس میں میر عالم ضمنی طور پر آجاتے ہیں مگر یہ تو پورے دکن بلکہ سارے ہندوستان کے لئے ذلت کی بات ہے۔ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ذلیل کر لینا کیا بات! اچھا ہوا جو تم نے مسودہ چاک کر دیا۔ خدا تمہیں اس کی جزائے خیر دے گا۔ بعد میں جب میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ عمادی نے یہ مسودہ چاک کروا کر مجھ پر بڑا احسان کیا۔ اگر یہ طبع ہو جاتا تو یقیناً بری بات تھی۔ اس طرح وہ اپنے چھوٹوں کی زندگی بنایا کرتے تھے۔

مومن خاں مومن دہلوی پر میں نے کام شروع کیا تو مجھے بہت سا مواد فراہم کرا دیا اور بڑی دلسوزی سے مشورے دیتے رہے۔ جب کلکتہ سے مومن کے قلمی کلیات کی نقل میں نے منگوائی تو بہت خوش ہوئے اور کتاب آتے ہی لے کر خود ملاحظہ کیا اور پنسل سے بیشتر اشعار پر نشانات بھی بنائے۔ باوجود لکھنؤ اسکول کے مرید ہونے کے مومن کے معترف اور مداح تھے اور مومن کے قصے بڑی دلچسپی سے سنایا کرتے تھے۔

علمیت کا یہ عالم تھا کہ دریا تھے۔ تمام شعبہائے علوم پر حاوی تھے اور ہر شعبہ پر عمیق نظر تھی۔ عام طور پر پرانے علماء یک فنے ہوتے تھے۔ حدیث پر عبور ہوا تو صرف و نحو میں نیاز مند، صرف و نحو پر عبور ہوا تو حدیث و فقہ میں کورے۔ مگر عمادی کی نظر سب پر یکساں تھی۔ ادب جاہلیہ اور اسلامیہ، قرآن، حدیث، فقہ سے لے کر تاریخ، جغرافیہ، طب اور علوم جدیدہ تک پر حاوی تھے اور جس فن پر بھی گفتگو کرتے معلوم ہوتا تھا کہ اس فن کے ماہر خصوصی ہیں اور عمر اسی فن میں گزاری ہے۔ ایسے ہمہ گیر عالم کم از کم میری نظر سے ایک دو ہی گزرے ہیں ورنہ میں نے بیشتر علماء کو ایک آدھ فن ہی میں ڈوبا پایا ہے۔

حیدرآباد میں ایک بزرگ حکیم ابراہیم جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر تھے جو بڑے وسیع معلومات اور ذہین تھے۔ ہزاروں شعر ازبر تھے۔ شعرائے جاہلیہ، شعرائے اسلام، شعرائے ایران اور شعرائے ہند کے ہم معنی شعر ہزاروں یاد تھے جنہیں وہ گھنٹوں سنایا کرتے تھے مگر ان میں صرف حافظہ کا کمال تھا علمیت نہ تھی۔ برخلاف ان کے علامہ عمادی باوجود علمیت کے ان سے اچھے حافظے کے مالک تھے۔ قاضی تلمذ حسین نے ریاض خیرآبادی کی خمریات کا ایرانی سے مقابلہ شروع کیا تھا۔ ایک روز معلوم نہیں قاضی صاحب نے عمادی کو طلب کیا تھا یا وہ خود پہنچ گئے تھے کہ خمریات کا دور ہو رہا تھا۔ خوش نصیبی سے میں بھی پہنچ گیا تو عمادی نے کاغذ قلم میرے آگے کھسکا دیا۔ اب یہ ہونے لگا کہ قاضی صاحب ریاض کا شعر پڑھتے جسے سنتے ہی عمادی ایرانی کا شعر اسی مضمون کا سناتے اور پھر عرب کے دو چار شعراء کے شعر یکے بعد دیگرے سناتے، اساتذہ عجم کے شعر بھی سناتے، جنہیں میں لکھ لکھ کر کر دیتا جاتا کیونکہ قاضی صاحب کا بھرم ہی اتنا رہ گیا تھا کہ جیسے یہ بھی سنا ڈالیں نہ جاتا تھا۔ ادھر اس کے شعر قاضی صاحب کو بھی یاد تھے مگر دوسرے شعرائے عرب اور ایران کے شعر سن کر یا پڑھ کر قاضی صاحب بھونچکے رہ جاتے تھے۔

صرف شعر ہی عمادی کو یاد نہ تھے بلکہ وہ عروض پر بھی حاوی تھے اور عروض کی غلطیاں بیشتر اساتذہ کے اشعار سے نکالتے رہتے۔ قاضی تلمذ حسین نے ریاض کا کلیات چھپوانا شروع کیا تو سب سے پہلے عمادی نے اس کی مخالفت کی کہ اتنا رطب و یابس چھپا کر روپیہ برباد کرنے کی بجائے ریاض کے کلام کا انتخاب شائع کر دو مگر قاضی صاحب بھی ضدی تھے اور انہیں کچھ ایسی عقیدت یا محبت ریاض سے تھی کہ انھوں نے اتنا ضخیم کلیات ریاض رضوان چھپوا ہی ڈالا۔ اس سلسلے میں عمادی کے خیالات بڑے ترقی پسند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر شخص کے شاہکار ہی منظر عام پر لائے جاسکیں

اور اسی چیز کو پیش کیا جائے جو دنیا میں کبھی نہ کسی حیثیت سے کارآمد ہو یا اپنا مقام پیدا کر سکتی ہو۔ رطب و یابس شائع کر کے عوام کو پسند کرنے کا رجحان دینا صاحب تصنیف کی عظمت کو کم کرنا ہے مگر دنیا میں ایسے لوگ کم ہیں جو کانٹوں کو چھانٹ کر پھول چن سکیں۔ بیشتر کانٹوں ہی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور پھولوں تک پہنچنے نہیں پاتے۔

عمادی میں ذوق بہت تھا، شعر کی پرکھ تھی۔ جوش کے تغزل کے وہ حقیقی مداح تھے۔ جن دنوں نیاز فتحپوری ہندوستان بھر میں سب سے بڑے نقاد تھے عمادی برابر ان سے خوش ہو کر بیٹھتے اور اس ہنگامہ آرائی پر مسکراتے تھے اور ہمیشہ نیاز کی انفرادیت اور اپچ کی مدح کیا کرتے تھے۔ خصوصاً نیاز کے ذوق شعری کے معترف تھے۔

جوش ملیح آبادی چونکہ عمادی کے دور حیدرآباد کے ساتھی تھے اس لئے جوش کا ساتھ بھی زیادہ رہا اور اس قربت کی وجہ سے جوش کی چھوٹی بڑی اور بے اعتدالیوں سے بھی زیادہ واقف ہوتے گئے۔ انہوں نے کبھی بھی جوش سے نفرت نہیں کی اور نہ ہی جوش کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔ اتفاق سے میں بھی ان دنوں میں جوش کے ساتھ زیادہ رہتا تھا۔ جوش کی اکثر رباعیاں میں نے لکھیں کیونکہ جوش ان دنوں فی البدیہہ کہا کرتے تھے اور میں بھی لکھ لیا کرتا تھا۔ یہ رباعیاں میں سنا کر عمادی کو چھیڑتے جاتے تھے۔

حیدرآباد کے مولوی اور شیوخ چھٹنے سے جوش کی شکایتیں شروع ہوئیں تو جوش نے رباعی کہی ۔

پیمانِ شکم پر ایمان سینے والو　　خونِ قوم حق دست کا پینے والو
تم اپنی غرض سے کہیں رکھو گے ہاتھ　　اعدا پہ احمقوں کی جینے والو

اسی زمانے میں ایک بہت ہی بھولے ولی کو ایک عالم دین بزرگ نے عمادی سے اس کی شکایت کی۔ میں حاضر خدمت ہوا تو عمادی نے فرمائش کی جوش کا تازہ کلام سناؤ۔ ایک روز پہلے ایک فقیر کو اٹھ کر بھیک مانگ رہا تھا اس پر جوش نے فی البدیہہ کہا تھا ۔

اک گدا کی زباں پہ بے ساختہ آئی　　واہ کیا شانِ کبریائی ہے
کل جو دیہیم تختِ شاہی تھا　　آج وہ کاسۂ گدائی ہے

میں نے یہ قطعہ سنایا تو عمادی آبدیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے اس ملحد کے دل میں کتنی روشنی ہے جہاں اہل شکم والے قرآن کے الفاظ پر مٹے رہتے ہیں اور یہ ملحد اس کی روح تک پہنچ جاتا ہے۔

عمادی میں وسعت نظر خاصی تھی وہ تنگ نظر نہ تھے۔ بڑے ہی عالی ظرف اور وسیع النظر تھے۔ جوش انہیں اکثر چھیڑتے۔ کبھی جوش کے ساتھ ڈاکٹر علی اشرف الطاف بھی عمادی کے پاس پہنچ جاتے دونوں مل کر خوب پھبتیاں کستے۔ اس کے ساتھ عمادی بھی چھیڑتے۔ شاعر اسلام کی بزرگی کی داد دیتے اور خوش خوش ان لوگوں کو چلتا کر دیتے۔ عمادی ان لوگوں کے جانے کے بعد بھی خفگی کا اظہار نہ کرتے تھے۔ کوئی اور ہی اس بیہودگی کو کیا کوئی ملامت کرتا۔ کہتے یہ بھی ایک رنگ ہے۔ یہ اسی حال میں خوش ہیں۔ اللہ انہیں نیک توفیق دے۔

جوش کے شہر بدر ہونے کا افسوس عمادی کو بھی اتنا ہی ہوا جتنا جوش کے چاہنے والوں کو ہوا۔ میں جب بھی ملتا جوش کی خیریت دریافت پوچھا کرتے اور ان کے لئے دعا کیا کرتے تھے۔ عمادی کو رنگ نسل یا مذہبی اور متعصب قسم کا ملا سمجھتے تھے وہ کسی طرح نہ تھے اور ان میں وہ کٹر پن تھا جو مولویوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ عمادی ایک روشن خیال عالم اور اپنے شاگرد سید سلیمان ندوی سے زیادہ وسیع المشرب آدمی تھے۔ علم کے سچے قدردان اہل سخن، سخن شناس اور طالب علموں اور ادیبوں کے سرپرست تھے۔ نیا لکھنے والا جس کی تحریر میں ذرا بھی کیفیت یا ادبی نکتہ ہوتا تو اس کی دل افزائی کرتے۔ انہوں نے بہت سے اہل ادب کو عالم بنایا اور ان کی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں کارآمد بنایا۔ یہ علمی خدمت علم و ادب کی عمادی نے کی ہے۔ اب ایسے لوگ کہاں!

ترکی اور مصحفی

غلام احمد ترک علی شاہ قلندر ترکی نور محلی پانی پتی عجیب و غریب بزرگ تھے ابتداً خلاقی تخلص کرتے تھے پھر غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کے سلسلے میں مرید ہو گئے اور ترک علی شاہ نام رکھ کر ترکی تخلص کرنے لگے۔ [illegible] کی باقیات الصالحات سے تھے۔ [illegible] امام بخش صہبائی کی شاگردی کا فخر تھا ان بزرگوں سے [illegible] اور ریختہ میں میر علی اوسط رشک سے تلمذ تھا۔

ترکی خود کچھ نہ تھے مگر شاعر گر ضرور تھے۔ ہزاروں کو شاعر بنا دیا تھا۔ چنانچہ شیخ غلام قادر گرامی جالندھری کو ترکی ہی نے شاعر بنایا۔ گرامی ان کے سالے تھے اس لئے ترکی نے گرامی کی پرورش پرداخت کی لکھایا پڑھایا اور شاعر بنا کر چھوڑا۔ چونکہ ترکی نہایت کمزور طبیعت کے آدمی تھے اور [illegible] اس لئے گرامی [illegible] تنگ آ کر ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور ترکی کو [illegible] گرامی نے [illegible] دیکھا انہیں چھوڑا اور خود حیدرآباد پہنچ گئے اور یہاں بھی گرامی کو تنگ کرتے رہے۔

خوش نصیبی سے [illegible] ترکی [illegible] اور ترکی [illegible] ترکی کی [illegible] اعتراض [illegible] مرزا [illegible] کے انتقال کے بعد [illegible] مرزا [illegible] ایک روز [illegible] ترکی [illegible] ایک شعر تھا۔

اے مقدر خیر کر [illegible]
جام [illegible]

ترکی نے شعر سن کر [illegible] سمجھ کر [illegible] آپ نے اس شعر کے معنی کیا ہے

بعد [illegible] اختیار [illegible] ساقی
بگفت [illegible] جام [illegible] است

یہ سن کر مرزا [illegible] اور [illegible] ترکی صاحب [illegible] استاد [illegible] آپ کو [illegible] اس قسم کی باتیں کر کے [illegible] کیا بات ہے [illegible] استاد کی کرامت تھی [illegible] ختم ہوا۔

یہ حالت [illegible] ترکی کی عمر بھر رہی۔ شاعر [illegible] کسی کے کلام پر اعتراض کر دیتے اور جھگڑا مچایا کرتے تھے۔ [illegible] ایک کتاب ترکی نے لکھی ہے [illegible] اعتراض [illegible] کلام پر اعتراض کیا ہے بعض اعتراضوں کا جواب بھی خود ہی دیا ہے اور بعض کی توثیق کی ہے۔

جس سے خوش ہوتے اس کی داد دیتے اور جس سے خفا ہوتے اس پر کچھ اعتراض جڑ دیتے تھے چنانچہ [illegible] کے بعد

ظہیر دہلوی بھی آگئے اور انھیں داغ جیسے نے مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے پاس رکھوا دیا تو ترکی، ضیائی (خلف اکبر ضیائی)، اور جلیل (فصاحت جنگ) جو پہلے سے مہاراجہ کے پاس تھے ظہیر کی مخالفت کرنے لگے۔ اور ان دونوں نے ترکی کو تیار کر کے آگے کر دیا چنانچہ ہر مشاعرہ میں ترکی نے ظہیر پر فقرے کسے اور داغ پر پھبتیاں اڑائیں۔ داغ چونکہ اس مشاعرے میں شریک نہ تھے اور ظہیر نے غزل پڑھ کر مشاعرے سے نکل کر داغ کو سارا قصہ سنا دیا تھا اس لئے داغ نے مہاراجہ بہادر کو لکھا اور مہاراجہ نے ترکی کی خوب خبر لی اس طرح ترکی کی تمام ہمت گئی اور ہاتھوں سے جاتی رہی اور آخر کو مجبور ہو کر ظہیر سے دوستی کر لی اور پھر ایسے دوست بن گئے کہ ظہیر کے مرنے تک رفاقت کی بلکہ ظہیر کے موت کے وقت رو رو کر بدحال ہو گئے۔ اس طرح ترکی کی دشمنی دوستی ہو گئی مگر دوستی کے معنی ترکی کے پاس اعتراض ذکر کرنے کے نہ تھے وہ ہر ایک پر اعتراض کرتے اور ہر ایک کی ہنسی اڑاتے تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد ان کے مربی تھے سو روپیہ ماہوار دیا کرتے اور عید بقر عید دیوالی دسہرے پر الگ سلوک کرتے پھر بیچ بیچ میں ترکی اپنی ضرورت کا اظہار کر کے الگ سے لیا کرتے تھے مگر باوجود اس کے موقع پر نہ چوکتے بلکہ مہاراجہ کی ہنسی بھی اڑاتے تھے علاوہ ازیں یہ تو مستقل مربی تھے مگر آغا شوستری، صف شکن جنگ (نواب ناظم)، ضیا یار جنگ (شمسی) وکیل، وزیر الدولہ، عبد الجبار خاں آصفی، نجمی، محمد علی خاں (ناظم) صورت جنگ، عابد وغیرہ ہمیشہ ترکی کی مالی امداد کرتے تھے مگر یہ ان لوگوں کو بھی نہ بخشتے بلکہ موقع پر چوٹ بھی دیتے تھے۔

عبد الجبار خاں آصفی جو ایک اچھے شاعر اور بہت عالم تھے ترکی پر بہت مہربان رہتے تھے اور مددگار بھی تھے۔ چنانچہ آصفی اکثر کہا کرتے تھے کہ برعکس نہند نام زنگی کافور کے مصداق "کاٹھیاواڑی" کا نام ترکی رکھا گیا ہے، چونکہ کاٹھیاواڑی گھوڑا بدخلقت اور تند خو ہوتا ہے اس سے آصفی ترکی کو انھی صفات سے متصف پاتے تھے۔

ملک الشعراء علی شوستری بڑے عالم تھے۔ ایرانی نژاد تھے مگر اردو زبان پر جو عبور تھا اور باوجود عجمی ہونے کے عربی پر اتنی قدرت تھی کہ ہر زبان کی مادری زبان معلوم ہوتی تھی۔ یہ بھی ترکی کے مربی اور محسن تھے مگر ترکی انھیں خاطر میں نہ لاتے تھے اور ہمیشہ ان پر اعتراض کیا کرتے تھے ایک روز آغا شوستری بیٹھے ہوئے ایرانیوں کی تعریف اور اہل ایران کی فضیلت بیان کر رہے تھے اور ڈینگ مار رہے تھے کہ ایرانی نہایت ہی ذہین اور ذکی ہوتے ہیں ان کا دماغ نہایت رسا ہوتا ہے ہر چیز بڑی آسانی سے سیکھ جاتے ہیں چنانچہ ع

عقل و دانش بہر جا مردم ایراں دارند!

بالکل صحیح کہا گیا ہے۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ حضور نظام (مرحوم) کا چوبدار آیا اور کہنے لگا کہ حضور نے یاد فرمایا ہے۔ آغا شوستری نے کہا "تم چلو، ہم آتا ہے۔" بس یہ جملہ منہ سے نکلا ہی تھا کہ ترکی جھپٹ کر آغا پر گر پڑے۔ کہنے لگے استاد! آپ پندرہ بیس سال سے ہندوستان میں ہیں ہم اردو بولتے اور لکھتے رہتے ہیں اب تک آپ کو اردو نہ آئی۔ ابھی آپ نے فرمایا "تم چلو ہم آتا ہے۔" بخلاف آپ کے ہم ہندوستانیوں نے ایران کی صورت تک نہیں دیکھی نہ تو ایرانیوں سے صحبت رہتی ہے اور نہ ہمارا روزمرہ فارسی ہے۔ پھر بھی ہم صحیح فارسی بولتے لکھتے پڑھتے ہیں اور شعر بھی ایسے لکھتے ہیں جن میں کسی کو آپ بھی شک کرتے ہیں۔ ایسی غلط زبان تو ہم نہیں کہتے جیسی ابھی آپ نے کہی۔ اب فرمائیے ایرانی افضل ہیں یا ہندوستانی اس طرح ترکی کسی کو نہ بخشتے تھے۔

امجد حیدرآبادی جو حیدرآباد کے مشہور اور ہندوستان کے واحد رباعی گو شاعر ہیں ترکی کے شاگرد تھے۔ شاید انھیں اپنی قابلیت کا زعم ہو مگر ترکی اسے برداشت نہ کر سکے بلکہ اپنی شاگردی سے نکال دیا اور اتنے خفا ہوئے کہ اپنے تذکرہ گلشن زبان ختم ہونے میں لکھ مارا:

"امجد تخلص، احمد حسین نام، حیدرآبادی۔ کئی سال ہوئے دائرہ تلمذ سے خارج ہو گئے"

بمرد یا [illegible] ملائکۃ الفقیر منسلک شد و بر شعر خود در چند روز نابینا بود بار گشتہ بود

آنکہ گفت: قضا اوساز آمدین تاریخ کردم:

غور فرمائیے آج جیسا فاضل متورع، عربی فارسی ہر دو زبان دان "کا تخلص ٹھیرے تو دوسرے کس شمار و قطار میں! انگلی کو حال تو یہ تھا کہ اساتذہ عجم بھی ان کو مانتے تھے۔ ایک مشاعرے میں اردو نظم پڑھا جس کے چند شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں:—

یہی فطرت میں ذرہ سے کہ ہے کلاہ قمر شاہد مہر سے حسن کہ ہے خورشید خاوری
اچھا ہوا کہ پہلے ہی مجھ سے گزر گئے سعدی و انوری و وحشی و رودکی
ورنہ دکھاتے رنگ حوادث کی نہیں کچھ قدر بھی تو ان کی بھی ہیں کیا یاری

ظاہر ہے کہ جو ترکی سعدی، انوری، وحشی اور رودکی کی ترقی بھی نادر سمجھنے کا احسان کر سکتا ہے وہ بھلا معاصرین اور شاگردوں کی کیا حل اعتراض کرتا ہوگا۔ وہ ترکی تخلص انہی لوگوں کی ادنیٰ سی تعریف کیا کرتے تھے جو ان کے مدح، معتقد، مرید یا محسن تھے ورنہ دوسروں پر زبان اعتراض کھلی رہتی مگر اپنے بھی رہ بچتے بلکہ ان پر بھی منہ مارتے تھے غرض۔ استاد ترکی اپنے تخلص کے اعتبار سے اپنے آپ کو ترکش کا ترکیت کہتے تھے مگر اصل حقیقی ان میں خاصا کا خلیا و اذیت موجود تھا اور یہ عیب ترکی سے منسوب تھے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت نیک دل اور رقیق القلب تھے۔ استاد ظہیر دہلوی سے جب ان کی دوستی ہو گئی اور ان کی حالت سے واقف ہو گئے تو ان کی بڑی امداد و اعانت کرتے رہے۔ میں ذاتی طور پر واقف ہوں کہ لوگوں سے کہہ کر ظہیر کی رقمیں، دکانیں اور جو بھی وائے [illegible] ذریعے سے کام آتے رہے۔ بیشتر جا تحفوں کو مہاراجہ کے پاس پیش کر کے امداد دلواتے۔ نواب صاحب ٹانک سے رقم دلواتے اور جہاں تک ہو سکتا اسی وسعت سفارش میں دریغ نہ کرتے تھے۔ اعتراض تو وہ اپنے بڑوں پر بھی کرتے تھے اس سے ان کی دانست میں دل آزاری یا کسی کی تخفیف ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی اپنی قابلیت اور ذہانت کے اظہار اور تفریح سے غرض تھی اس لئے وہ اس کو اہمیت ہی نہ دیتے تھے۔ مشاعرے میں [illegible] اعتراض کر کے ناک میں دم کر دیتے اور دوسرے روز اسی شخص کے گھر جا کر جس پر اعتراض ہوتے تھے مل لیتے۔ ان کی موجودگی میں کوئی دوسرا کسی پر اعتراض کرتا تو خود آستین چڑھا کر معترض کے اعتراضوں کا ایسا دندان شکن جواب دیتے کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ ہزاروں شعر یاد تھے اور عروض پر عبور تھا۔ سند میں شعر پیش کرنے میں تو کمال تھا۔ پے در پے سینکڑوں شعر سند کے سناتے اسی لئے ہر شخص ان سے ڈرتا تھا۔ اس اعتراض میں لطف یہ ہوتا تھا کہ آپ نے کسی پر اعتراض کیا اور اپنی تائید میں دس پندرہ شعر سنا دیے اور کسی نے یہ اعتراض ختم کرا لیا ایسے ہی یہی اعتراض ہو جاتا اور وہ موجود رہے تو فوراً معترض سے پلٹ پڑتے اور اس کے خلاف بحث کرنے لگتے اور اپنی تائید میں اساتذہ کے شعر بھی سناتے جاتے۔ اس طرح بحث بھی ان کی رہتی اور پٹ بھی ان کی۔ غرض عجیب بوقلمونی ہوتی رہی اور میں سب پر پہلا ہوا رہوں۔ والد مرحوم ان کی اس حرکت پر ہمیشہ ٹوکا کرتے مگر وہ ایک نہ سنتے تھے۔

دوسرا ان پر اعتراض کس آدمی [illegible] ہوتے بلکہ خوش ہو کر بحث کرتے اور معترض کو قائل کر کے دم لیتے تھے۔ ایک روز جلسہ دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے تازہ غزل سنا رہے تھے۔ مطلع کا دوسرا مصرعہ تھا ؎

رگ لیلیٰ زند آں جا ز مجنوں خوں چکید ایں جا

مجھے چونکہ ان پر اعتراض کر کے ترکی نے شہ دیا تھا اس لئے میں [illegible] کا طالب ہی تھا بےساختہ کہہ دیا میں نے کہ استاد یہ اردو کے شعر سے

کھلی فصد لیلیٰ نے قربان مجنوں کے خوں نکلا

کا ترجمہ ہے یہ کہہ کر استاد بگڑ گئے۔ والد مرحوم نے بھی ڈانٹ بتائی مگر تھوڑی دیر کے بعد استاد نے مجھے شاباشی دی کہ خوب [illegible] ایسا ہی خیال

ضرور تھے جو غزل وغیرہ بھی کہتے تھے۔ نہایت چلبلی طبیعت پائی تھی فارسی اور اردو مذاق کہنے کا بہت شوق تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس میں کمال رکھتے تھے۔ یہ چوبیس گھنٹے ترکی کے ساتھ رہتے تھے چونکہ دونوں ظریف اور ہمراز تھے اس لئے خوب گھٹتی تھی مگر تفضل ترکی سے بھی زیادہ شوخ تھے ہمیشہ ترکی کو چھیڑتے اور چٹکیاں لیتے رہتے تھے۔

ایک رات مہاراجہ کی ڈیوڑھی سے ترکی گھر واپس ہو رہے تھے تفضل ساتھ تھے۔ ہرنی باولی کے پاس پہنچ کر ترکی نے کہا میاں تفضل یہ سید صاحب کا مزار ہے ذرا فاتحہ پڑھ لیں تفضل نے کہا چلئے۔ مزار سڑک پر تھا مگر ٹھیک اسی جگہ تفضل نے ترکی کو ایک مکان میں داخل کر دیا جہاں چند عورتیں صحن میں سو رہی تھیں۔ ترکی نے زور زور سے فاتحہ پڑھنی شروع کی تو عورتیں نیند سے جاگ کر غل مچانے لگیں۔ سارے محلے والے جمع ہو گئے اتفاق سے مکان میں مہاراجہ بہادر کے ایک متوسل کا رہنے کا تھا وہ اوپر بنگلے پر تھے انہوں نے نیچے آ کر دیکھا تو ترکی نظر آئے۔ پوچھا استاد کیا حال ہے تو کہا میں سید صاحب کی درگاہ پر فاتحہ پڑھنا چاہتا تھا مجھے رات کو سجھائی نہیں دیتا ہے اس مردود تفضل نے یہاں پہنچا دیا۔ غرض صاحب خانہ نے قندیل ساتھ دے کر اپنے ملازم کو بھیجا اور ترکی گھر پہنچے۔ ایسی دل لگیاں تفضل بہت کرتے تھے۔ ترکی ہی نے مہاراجہ سے سفارش کر کے علاوہ نقد جمعیت میں تفضل کو نوکر رکھا دیا تھا۔ نوکری معاف تھی۔ گھر بیٹھے تنخواہ آ جاتی تھی ایک مشاعرے میں فارسی طرح تھی "یارم کردہ اند" تفضل نے نصف اردو نصف فارسی غزل پڑھی ہے

وصل کے وعدے پہ ہیں بے قرارم کردہ اند ایک بوسہ کے لئے امیدوارم کردہ اند
وہ نہ آتے تھے جو آئے تو رقیبان ساتھ لائے راہ میں سارے ہی سے گل شمع مزارم کردہ اند

اپنی نوکری کے متعلق بھی ایک شعر کہا تھا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں آ رہا ہے دوسرا مصرع تھا

نقد میں نوکر جناب پیشکارم کردہ اند

ایک اور مشاعرے میں طرح ہوئی تھی "جواں کی" "زباں کی" وغیرہ تفضل نے بڑی دھوم دھام کی غزل پڑھی تھی مقطع تھا

تفضل جب کہ تم ہو جاتے بڈھا
ذرا لیتے وقت ہی جورو جواں کی

بہرحال ترکی اور تفضل کی خوب گھٹتی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ترکی فارسی کے بہت اچھے شاعر اور علوم شعر کے ماہر تھے مگر اردو میں انہیں کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ اصولاً انہیں اردو میں شعر نہ کہنا چاہئے تھا مگر اپنی استادی کے زعم میں اردو کی ٹانگ بھی توڑتے رہے اور ایک دیوان بھی اردو کا چھپوا ڈالا تھا۔

بحیثیت مجموعی نہایت دلچسپ اور قابل شاعر تھے۔ ان ساری کمزوریوں کے باوجود بہت غنیمت آدمی تھے اور اپنی وضع کے ایک ہی تھے ترکی کا انتقال ہوئے ۱۴ سال ہو گئے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل ہی کی بات ہے۔ آج کل میں سلطان شاہی میں مقیم ہوں۔ ان کے مکان کے سامنے سے اکثر گزرتا ہوں اور وہ مجھے بے حد یاد آ جاتے ہیں اور شاید زندگی بھر یاد آتے رہیں گے۔

وجودی شاہ

میں نے نوکری سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کئی بار کی تین چار دفعہ تو نوکریاں چھوڑ دیں مگر پھر آ کر نوکری کی گرفت میں [illegible]۔ اسی طرح ۱۹۴۳ء میں بھی میں نے ملازمت چھوڑ دی اور اپنے حساب میں نوکری کو خیرباد کہہ کر ایک [illegible] [illegible]

اسے چلانا شروع کیا۔ اس کو دیکھنا کی ابتدا یہ تھی کہ ایک روز میرے قدیم اور محترم دوست حضرت سید شاہ عبدالقادر صاحب اپنی فوک کار پر [illegible] سے تشریف لائے اور مجھے اپنے ساتھ اسی گاڑی میں بٹھا کے لے چلے اور نامپلی کے [illegible] جدہ کے دروازے ہوتے ہوئے مکانات پر پہنچ کر گاڑی روکی۔ ایک اے کلاس کے مکان پر پہنچے تو وہاں خانہ میں ایک ریش دراز، [illegible] سرخ و سپید [illegible] نظر آئے شاہ صاحب نے بڑی عقیدت سے دست بوسی کی اور میرا تعارف کرایا کہ میرے دوست اور علوم مشرقی کا طالب علم اور ادب و انشاء کا رسیا ہے۔ پیر و مرشد نے بڑی خندہ پیشانی سے ملاقات فرمائی تعلیم کے متعلق سوالات فرمائے۔ بعض عرب مصنفین کے متعلق گفتگو کی پھر فارسی شعراء کا ذکر کیا اور اردو شعراء پر بڑی دیر تک گفتگو اور بحث فرماتے رہے۔ شاہ صاحب نے شاید پہلے ہی سے میری شکایت کر رکھی تھی اس لئے پیر و مرشد نے مختصر سے وقفے سے میرا امتحان لینا شروع کیا اور جن جن چیزوں پر خود حضرت کے معلومات تھے ان کے متعلق بڑی تفصیل سے بات چیت کی گویا کہ [illegible] کر شامل رہے کہ مجھے کتنے پانی میں ہے۔ دو تین گھنٹے تک گفتگو فرمانے کے بعد جب حضرت قبلہ نے اپنے اس [illegible] خادم کو کہیں بھی نہ پایا تو ابن وحشیہ پر گفتگو فرمانے لگے۔ ابن وحشیہ سے [illegible] میں بالکل ہی ناواقف تھا۔ اس نام کے ایک مصنف کے دو مختصر رسالے تو مخطوطات میں کتب خانہ آصفیہ کی فہرست میں ضرور نظر آئے تھے مگر چونکہ مجھے اس فن سے دلچسپی نہ تھی اس لئے میں نے ان کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ حضرت نے جب مجھے ابن وحشیہ سے ناواقف پایا تو اس کے فضائل و مناقب گنانا شروع کیا اور بڑی تعریف و توصیف فرمائی۔ بہرحال اس صحبت میں پیر و مرشد نے مجھے خوب رگڑا اور دوسرے روز ملنے کا وعدہ لے کر رخصت کیا ساتھ ہی ساتھ میری کتابیں بھی دیکھنے کی خواہش کی۔ دوسرے روز صبح شاہ صاحب نے پھر گرفتار کیا اور میں اپنی کتاب "[illegible]" بغل میں داب کر شاہ صاحب کی فوک کار میں سوار ہو گیا حضرت قبلہ میرے منتظر ہی تھے گرم گرم میٹھا کھلایا اور بڑی نفیس چائے پلائی۔ میں نے اپنی کتاب پیش کی ورق الٹ پلٹ کر دیکھا اور میرے والد مرحوم کی تصویر دیکھ کر پوچھا "یہ پاشا بھائی تو تمہارے کون تھے؟" میرے والد کا عرف پاشا میاں تھا اور ان کے بے تکلف دوست اور ساتھی پاشا بھائی پکارا کرتے تھے اس لئے میں بھی حیران ہو گیا کہ حضرت میرے والد کو پاشا بھائی کیسے کہہ رہے ہیں۔ میں نے جب بتایا کہ میں انہی پاشا میاں کا بیٹا ہوں تو حضرت نے کھڑے ہو کر مجھے گلے سے لگا لیا اور آبدیدہ ہو گئے۔ دیر تک پرانے تذکرے کرتے رہے جب ذرا دل کی رقت کم ہوئی تو میں نے پوچھا آپ کب ملا کرتے تھے؟ فرمانے لگے تمہیں تو [illegible] یاد ہیں؟ میں نے عرض کیا جی [illegible] تھے، دو چار تو ضرور یاد ہیں۔ [illegible] کہنے لگے ہاں ان کا کوئی بھائی بھی تھا؟ میں نے عرض کیا ہاں ایک ان کے چھوٹے بھائی پاشا محی الدین تھے جو قرآن خوانی کا شوق فرماتے تھے۔ کہنے لگے میں وہی پاشا محی الدین ہوں۔ پھر میرا بچپن کا حلیہ اور میرے گھر کے افراد کا پتہ نام بتایا اور فرمانے لگے مجھے تم سے پہلی ملاقات پر ہی [illegible] ہو گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ [illegible] ہے۔ اب مجھے چچا پکارنا۔ پھر کیا تھا میں چچا پکارنے لگا۔ یہ تھے میرے مشفق بزرگ سید شاہ محی الدین پاشا قادری [illegible]۔

وہ قادری تخلص فرماتے تھے اور چونکہ حضرت شمس الدین [illegible] کے مرید اور خلیفہ تھے اس لئے اپنے آپ کو شمسی فرمایا کرتے تھے۔ ۱۹۵۵ء تک بھی یہ حضرت ہمارے پاس آتے جاتے تھے اس کے بعد سے پھر ملاقات نہیں ہو سکی۔ ان دنوں جب یہ غریب خانہ پر تشریف لایا کرتے تھے [illegible] شروع ہوتی اور [illegible] پیدا کرتے تھے۔ گویا اس زمانے کے [illegible] شمار ہوتا تھا [illegible] کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔

اب یہ چند روز جیل کے بعد نظر آئے تو اسی شان سے [illegible] ایک نشست روزانہ ہو گئی جس میں [illegible] بہت سے موضوعات پر [illegible] بہرحال

اور بزرگ نے مجھے بھتیجا بنا لیا اور ایسا بنایا کہ میں بڑی حاضری دینے لگی۔ بعض لوگوں نے مجھے مرید سمجھا بعضوں نے خوش مند اور بعضوں نے کیمیا کا خواہش مند اور کسی نے فقط دیوانہ کیونکہ حضرت کے پاس اسی قبیل کے لوگ زیادہ آیا کرتے تھے۔

صبح ناشتے بھی نہ پاتے کہ مریدین، معتقدین اور ضرورت مندوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ مرید تو خیر اپنی سعادت مندی سے اپنی حاضری دیتے۔ معتقدین خاص ضرورت کے تحت آتے مگر ایک جماعت ضرورت مندوں کی ایسے گروہوں کی بھی تھی جو طرح طرح کا روگ لیے آتا کوئی اور خود کچھ بیان چاہتی۔ بعض لوگ عمل عملیات تعویذ گنڈوں کے لئے بھی آ جاتے اور بعض محض روحانی ترقی کی خاطر حاضر ہوتے تھے۔

یہی سب کچھ تھا حضرت سب کو چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہو جاتے جیسے سے کچھ جانتے نہ تھے یا باہر سے نکل آتے اور شعر و شاعری، لطیفہ گوئی، بدیہہ گوئی، فقرہ، پھبتی، ضلع جگت سے لے کر ٹیک تک شروع ہو جاتا اور بعض وقت تو بے تکلف مغلظات بھی رواں ہو جاتیں۔

مریدین اور معتقدین حیران ہوتے کہ حضرت اس نوجوان سے اتنے مانوس کیوں ہیں مگر وہ فطرت انسانی سے ناواقف تھے۔ حضرت بھی آخر انسان تھے دن بھر حدیث، فقہ، مسائل اور وحدت الوجود بیان کرتے کرتے تھک جاتے تھے۔ مریدین اور معتقدین سے دل لگی مذاق تو کر سکتے تھے اور نہ اس طبقے میں کوئی اس کا اہل ہی تھا اس لئے اس تفریح کے واسطے انھوں نے مجھے منتخب فرمایا تھا۔ چنانچہ میرے پہنچتے ہی ایک ایک کر کے سب کو چلتا کر دیتے۔ بعض بے تکلف جو رہ جاتے وہ بیٹھے رہتے اور پھر سید شاہ وجودی صاحب فقط وجودی رہ جاتے اور ایک شاعر کی طرح سب بے تکلف ہو جاتے۔

حضرت شمس الدین صاحب قبلہ نے حیدرآباد میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی تھی چشتیہ گھرانے کے بزرگ تھے تقویٰ اور تصفیہ کے علاوہ ان سے لوگوں کو عقیدت ملنے لگی۔ جس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے وہ بندۂ بے دام ہو جاتا۔ بیشتر طوائفوں کو تائب کرا کر نکاح کرا دیا چنانچہ زہرہ بائی اور موتی جان وغیرہ جیسی مشہور رنڈیاں حضرت کے ہاتھ پر تائب ہوئیں اور لوگوں سے نکاح کر کے گرہستن بن گئیں۔ بیشتر ہندو خاندان بھی معتقد تھے چنانچہ شیراجی اور شاہی پرشاد وغیرہ کا خاندان پورا معتقد تھا جیسے ناتھ پرشاد صاحب جو بعد کو جمال الدین احمد بنے انھی شمس الدین کے دست گرفتہ تھے جنھیں بعد میں مولوی محمد حسین صاحب ناظم [illegible] نے بیاہ کیا۔

اپنے پیر کی طرح وجودی شاہ صاحب سے بھی بڑی مخلوق کی عقیدت تھی مرید کرنے کے خواہش مند تھے لوگ مرید ہونے آتے تو آپ پیر بھائی بنتے یہاں وہاں اپنے خلیفہ نادر میاں وغیرہ کے پاس بھیجا دیتے۔

نہایت ہی نڈر، بڑے بے باک اور فقر و غنا کے مالک تھے۔ حیدری صاحب صدر اعظم حیدرآباد جیسے پیر پرست، فقیر دوست اور بزرگ نواز تھے۔ حیدرآباد کے پیران باصفا حیدری صاحب سے طرح طرح کے فائدے اٹھاتے تھے میں نے جب یہ دیکھا کہ وجودی صاحب کی کوئی معاش نہیں ہے اور ان کی گزر بسر بڑی تکلیف سے ہوتی ہے تو میں نے کہا حیدری صاحب کو آپ کے پاس پہنچا دیتا ہوں ان سے اپنے لئے تنخواہ کرا لیجئے اور خانقاہ کے لئے کچھ نقد رقم منظور کرا لیجئے۔ یہ سنتے ہی مجھ پر ایسے برسے خوب صلواتیں سنائیں مگر میں نے بھی ان کا ناک میں دم کر دیا۔

مولوی محمد سجاد صاحب بہاری خاندان کے ایک بزرگ تھے۔ مدرسہ دارالعلوم میں والد مرحوم اور بھائی مولوی سید غلام حسین صاحب مرحوم کے ساتھ پڑھ چکے تھے اور اتفاق سے میرے بھی رشتہ دار ہو گئے تھے۔ یہ حیدری صاحب کے سرکاری سیکرٹری تھے کیونکہ بڑے بڑے مولوی مشائخ وغیرہ حیدری صاحب سے ملتے رہتے ان ہی کے توسط سے ملتے تھے اور جہاں جہاں بھیجنا چاہتے حیدری صاحب کرتے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں میں نے ایک روز مولوی سجاد صاحب کو ساتھ لے جا کر وجودی شاہ صاحب سے ملا دیا اور شاہ صاحب نے سجاد صاحب پر وہ رعب گانٹھا کہ سجاد صاحب بس گڑگڑا کر رہ گئے کہنے لگے یہ ای اکیلے صاحب ایسے بزرگ تو بڑے صاحب کمال ہیں انھیں سے کہا

"پھر کہا ہے کسی روز مرزا کو یہاں بٹھئے مگر شاہ صاحب کو پہلے سے اطلاع نہ دیجئے، اچانک لے آئیے۔" چنانچہ سجاد صاحب نے وعدہ کر لیا۔ ایک روز دفتر میں مجھ سے کہنے لگے: "اجی تمکین صاحب! کل تعطیل ہے ذرا سویرے آپ بھی شاہ صاحب کے پاس آ جائیے، ہم بھی آئیں گے۔" چنانچہ دوسرے ہی روز آٹھ بجے میں شاہ صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ [illegible] چند حاضرین کو چلتا کر دیا اور چائے کا انتظام کر دیا۔ ٹھیک دس بجے حیدری صاحب مع سجاد صاحب تشریف لائے۔ میں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ "حضرت! مرزا گھر آئے ہیں، آپ اپنے مکان کی بیرونی خاطر انسانیت سے ملاقات فرمائیے، انہیں ناواقف نہ سمجھئے ورنہ بڑی توہین ہو جائے گی۔" یہ سن کر شاہ صاحب پیچ و تاب کھاتے رہے اور حیدری صاحب و سجاد صاحب حاضرین میں داخل ہو گئے۔ میں نے تو فرار پر قرار کیا کیونکہ خوف یہ تھا کہ کہیں یہ حضرت کوئی بات بے تکی کہہ دیں گے تو غضب ٹوٹ پڑے۔ وجودی شاہ صاحب نے حیدری صاحب سے بڑی عمدگی سے ملاقات کی اور کوئی گفتگو بے ربط نہیں کہتے رہے اور خوب رعب گانٹھا۔ چنانچہ حیدری صاحب نہایت ہی معتقد ہو کر واپس ہوئے۔ حیدری صاحب کے چلے جانے کے بعد میں پہنچا تو وجودی شاہ نے حیدری صاحب کی بڑی تعریف کی اور تفصیل سے ساری گفتگو سنائی کہ یہ باتیں ہوئیں وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی صاف کہہ دیا کہ تم نے سفارش کر کے حیدری کو بلایا تھا اور میں نے اس خیال سے کوئی بے ادبی ایسی نہیں کی کہ تم پر حرف نہ آئے۔ مگر اب میں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ پھر نہ تو حیدری کی ضرورت ہے اور نہ خانقاہ کی، نہ ہی حیدری صاحب کے آنے کی۔ میں آزاد فقیر ہوں۔ حیدری صاحب آتے رہیں گے تو لوگ مجھے سفارش کرنے کے لئے مجبور کریں گے اور میں سفارش کرتا رہوں اور وہ نہیں مانیں گے تو مجھے تکلیف ہوگی یا جھگڑا کر دوں گا۔ اس لئے اب ایسی ترکیب کیجئے کہ وہ آنے نہ پائیں۔" چنانچہ میں نے بحث مباحثہ کر کے اس خیال کو بدل دیا اور وہ خاموش ہو رہے۔ اس کے بعد دو تین دفعہ بات کر دی گئی تو حیدری صاحب تنہا آئے اور وجودی شاہ صاحب سے مل کر گئے مگر معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ تیسری دفعہ آنے کے بعد پھر کبھی آنے کی انھوں نے تکلیف نہیں کی۔ اس کا سبب نہ تو وجودی صاحب نے بتایا، نہ حیدری صاحب نے سجاد صاحب سے کچھ کہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت نے کوئی گالی حسب عادت دے دی ہوگی اس لئے حیدری صاحب رک گئے۔

بہرحال وجودی شاہ میں یہ خصوصیت تھی کہ وہ سب سے بڑے اخلاص سے ملتے تھے اور دن رات میں ان کی طبیعت تھی کہ ہر حالت پر قانع اور شاکر تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ انہیں سونا بنانا آتا تھا۔ وقت اور ضرورت پر سونا بنا لیتے، اسے فروخت کر کے قرضہ ادا کر دیتے، قرض لوٹا دیتے، ملازمین کی تنخواہیں، مکان کا کرایہ ادا کر دیتے۔ کچھ سونا بچ جاتا تو عیش کرتے، خوب مزے اڑاتے اور پھر جب روپیہ ختم ہو جاتا اطمینان سے بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد پھر قرض کا سلسلہ شروع ہوتا اور یہ کیفیت ہوتی جب قرضے بہت زیادہ ہو جاتے اور مزید قرض نہیں ملتا اور دوست [illegible] ہو جاتے تو ایک روز کسی سے نہ ملتے، دن بھر بیٹھے رہتے، بات کرنا بند کر دیتے اور دوسرے روز خاص خاص لوگوں کے حوالے کر کے کہتے کہ اسے فروخت کر کے قرضہ ادا کرو۔ ایک [illegible] ان کے معتقد تھے انہی [illegible] کے ہاتھ سے سونا فروخت کراتے۔ دو تین وقت شاہ عبدالقادر صاحب کے اور میرے حوالے بھی آٹھ آٹھ تولہ سونا کیا کہ فروخت کر دو۔ یہ سونا اس قسم کا ہوتا تھا [illegible] سونا ہمارے ہاتھ سے فروخت کرایا گیا۔ اس زمانے میں اچھا سونا تیس روپیہ تولہ تھا اور ان کا بنایا ہوا سونا انیس روپیہ تولہ فروخت ہوا۔ اس طرح زندگی بڑی عمدگی سے گزار دیتے تھے۔

یہ سونا بنانا انھوں نے کس طرح سیکھا کبھی بھی ظاہر نہیں کیا۔ چنانچہ لوگ اسی فکر میں رہتے کہ کہاں سے کیمیا کا نسخہ معلوم کریں۔ مگر انھوں نے کسی کو بھی نہیں بتایا۔ [illegible] سے باہر [illegible] وغیرہ اور پھر بغداد اور عراق میں بھی بہت رہ چکے تھے، وہیں کسی نے سکھا دیا تھا۔ [illegible] ساتھ رہتی تھیں۔ کوئی اولاد نہ تھی۔ اکثر مریدوں کے بچوں کو اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔

کبھی جی چاہتا تو [illegible] پیتے تھے۔ [illegible] گجرات کے رہنے والے تھے اور [illegible] بھی تھا۔ [illegible]

بیٹھے رہتے۔ بڑے ہی حاضر جواب اور نقلیات دان تھے۔ حیدرآباد میں مشہور ہو گیا تھا کہ ایک وظیفہ جو ستر سال کا تھا قضا ہو گیا اور یہ حضرت یوسف شریفؒ کے تصرف سے ہوا۔ اسی شہرت کے زمانے میں ایک مولوی صاحب جو دارالعلوم کے فارغ التحصیل اور مدرسہ عالیہ کے مدرس تھے حضرت سے ملنے کے لیے آئے اور یہی ذکر کیا اور کچھ ایسی گفتگو کی کہ شاہ صاحب کو جلال آ گیا۔ جھٹ سے آپ نے داڑھی کو آدھی مونچھ داڑھی میں دبا لیا اور کہنے لگے "ارے مولوی! یہ لوگ تو بڑے بزرگ ہیں میں ایک ادنیٰ غلام ان کا ہوں، دیکھ ابھی تجھے عورت بنائے دیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے جو آنکھیں نکالیں اور چہرہ خوفناک بنایا تو مولوی صاحب ساری شیخی بھول گئے اور جوتیاں چھوڑ کر وہاں سے بھاگ گئے۔ ادھر ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد حضرت بھی ہنسنے لگے۔ اس طرح بعض حرکتیں بڑی مزے دار کر لیتے تھے۔

نواب اسمٰعیل خاں [illegible] اور نبیرہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اکثر حیدرآباد آیا کرتے تھے کیونکہ بخشی خلیل الزماں سے ان کی قرابت تھی۔ ایک دفعہ وہ ملنے آئے تو میں بھی بیٹھا ہوا تھا ان سے میرا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ میرے بھتیجے ہیں۔ بعد میں کہیں ان سے پھر ملاقات ہوئی تو انھوں نے پوچھا "جناب! آپ کے چچا صاحب کہیں لگ گئے ہیں اسی لئے آنکھیں بند کر لیتے اور باتیں کرتے کرتے بہک جاتے ہیں" میں نے کہا "پہنچے ہی کب سے تھے جو کہیں پہنچ کر رک گئے"۔ اس پر وہ بہت مسرور ہوئے اور دیر تک شاہ صاحب کا ذکر کرتے رہے۔ وہ بھی کبھی کبھی شاہ صاحب سے ملنے آتے تھے۔

حضرت امجد سے وجودی شاہ کی بہت دوستی تھی۔ سید ابراہیم ادیب جو عربی کے پروفیسر اور ادب العالیہ کے بڑے جید عالم تھے، امجد کے بڑے مخلص دوست تھے۔ وجودی شاہ کا اور امجد کا ایک مدرسہ کا ساتھ تھا اس لئے دونوں میں بڑی بے تکلفی تھی۔ ساری دنیا امجد صاحب کو صوفی سمجھتی تھی مگر وجودی شاہ ہمیشہ ان سے یہی کہتے کہ امجد تم نے کیا تصوف پڑھا ہے اور وہ ہنس کر خاموش ہو جاتے اور سید ابراہیم صاحب تو وجودی شاہ سے باقاعدہ مسائل تصوف پوچھا اور سمجھا کرتے تھے۔

مریدین کی تعداد ایسی تھی کہ کوئی دو تین سو مرید ہوں گے۔ چند خلیفہ بھی تھے۔ نواب جان نثار جنگ کو خلافت دی تھی اور خالد میاں ان کے چہیتے خلیفہ تھے۔ اپنا کتب خانہ بھی انھی کو دے دیا تھا اور وصیت کی تھی کہ خالد میاں کے باغ میں دفنایا جائے چنانچہ خالد میاں نے انھیں اپنے باغ ہی میں دفنایا اور مقبرہ بھی بنا دیا اور ہر سال بڑی دھوم سے عرس بھی کرتے ہیں۔

حیدرآباد میں زندگی یہیں بیٹھ کر [illegible] کہتے ہیں ایک دفعہ ایک بزرگ عوض علی شاہ تشریف لائے جو شاہ صاحب کے پاس بھی آنے جانے لگے۔ چنانچہ انھوں نے مجھے وہاں اکثر دیکھا اور حضرت سے بے تکلف پایا تو ایک دفعہ میرے سامنے ہی پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں تو کہا "ایک سلسلہ میں یہ میرے پیر ہیں۔" انھوں نے پوچھا کہ "کونسا سلسلہ؟" کہا "امجدیہ"۔ وہ حیران ہوئے کہ امجدیہ سلسلہ کیسا تو کہا آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ملک الکمالات نے بھی اپنے خلفا بنائے ہیں چنانچہ یہ انھی کے خلیفہ ہیں اور سلسلہ امجدیہ میں صاحب خرقہ و سجادہ ہیں میں نے اس سلسلہ میں انھی سے بیعت کی ہے۔ عوض علی شاہ یہ سن کر اتنے پریشان ہوئے کہ پھر انھوں نے ادھر آنے کی ہمت نہیں کی۔

اپنے قدیم ملنے والوں اور پرانے دوستوں سے وجودی شاہ کو بڑی ہمدردی تھی چنانچہ ڈاکٹر راحت اللہ خاں کیوریٹر آصفیہ لائبریری کو جو ان کے قدیم ہمجولی اور دوست کے فرزند تھے بہت چاہتے تھے۔ اسی طرح بعض اپنے قدیم دوستوں سے بڑی وضعداری سے ملتے تھے۔

وجودی شاہ کا خاندان بہت بڑا تھا مدراس، اورنگ آباد اور ویلور میں ان کے قرابت دار بہت تھے۔ حیدرآباد کے مشہور [illegible] صاحب قادری کے گھرانے سے بھی [illegible] کا خاندان [illegible] قرابت تو یہ تھی کہ مشہور ہفتہ وار اخبار تیرھویں صدی مدراس کے اڈیٹر و مالک سید [illegible] یہ سارا خاندان بہت بڑا اور پھیلا ہوا تھا مگر وجودی شاہ سب سے دور دور اور الگ تھلگ رہتے تھے۔ مجھے جہاں کی [illegible] بہت پسند [illegible] اور روپیہ پیسہ [illegible] کے عادی نہ تھے بہت ہی خود دار وضع دار تھے

حتی الامکان کسی کی برائی نہ کرتے اور اگر کوئی کسی کی برائی کرتا بھی تو اسے بھی روک دیتے اور مجلس بدل کر موضوع بدل دیتے تھے۔

شعر بھی خوب کہتے تھے۔ دیوان مکمل کر لیا تھا۔ اس میں سے کچھ حصہ ان کے ایک مرید جعفر علی صاحب نے دو سال ہوئے چھپوا دیا ہے مگر کتابت کی غلطیاں بہت زیادہ ہو گئی ہیں۔

بہرحال وجودی شاہ صاحب بہت غنیمت بزرگ تھے اور یہی ایک بزرگ ہیں جو میرے پیر طریقت ہیں سے مجھے عقیدت تھی ورنہ دوسرے بزرگوں سے نہ تو میں نے زیادہ ملاقات کی اور نہ ہی وہ مجھے متاثر کر سکے۔

مکتبہ ابراہیمیہ کے مالک عبدالحق بھی وجودی شاہ کے مرید ہو گئے تھے اور خلیفہ بھی۔ انہوں نے داڑھی پیر سے زیادہ ہی بڑھا لی ہے ع

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی!

مولوی سید محمد یوسف الدین

بعض لوگ اس نام کو پڑھ کر حیران ہوں گے کہ یوسف الدین صاحب کو شخصی خاکہ میں کس طرح لکھ سکتا ہوں کیونکہ ان کو انتقال کیے ۵۰ سال ہو گئے اور ان کی وفات کے وقت میری عمر ۱۰ سال کی تھی مگر واقعہ یہ ہے کہ مرحوم سے میری واقفیت کی وجہ یہ ہے کہ مولوی صاحب میری والدہ کے حقیقی ماموں تھے۔ میرے نانا (سید عبدالرحیم صاحب جو حکومت حیدرآباد کے اول تعلقدار (کلکٹر) اور نواب وقار الملک کے اسٹیٹ کے مہتمم تھے) نے جس وقت انتقال کیا ہے میری والدہ کم سن تھیں۔ انہیں مولوی صاحب نے اپنے پاس بلا لیا اور خود ہی نگرانی میں تعلیم دلاتے رہے۔ اسی طرح شادی ہونے تک والدہ انہی کے پاس رہیں۔ شادی کے بعد اپنے گھر رہنے لگیں مگر مولوی صاحب ہر ہفتہ گھر سے آیا کرتے تھے اور میں دو دو دن تک ان کے ساتھ ہی ساتھ رہتا تھا۔

یوسف الدین صاحب کی ولادت اور تعلیم حیدرآباد ہی میں ہوئی تھی مگر عجیب و غریب دماغ انہوں نے پایا تھا۔ باوجود صلاحیت اور خاندانی وجاہت کے سرکاری ملازمت قبول کی اور ترقی کرتے کرتے چند ہی سال میں اول تعلقدار (کلکٹر) ہو گئے۔ حضور غفران مکان میر محبوب علی خاں کا دور تھا اور کہا جاتا ہے کہ آپ پر ان کا بڑا اعتماد تھا چنانچہ پرنس (یا پرائیوٹ) اسٹیٹ کی معتمدی بھی ملی تھی مگر آپ نے وہاں کے حالات دیکھ کر کچھ اصلاحیں کرنے اور پہلا مکمل بجٹ مرتب کرنے کے بعد معذرت کر لی اور پھر تعلقداری پر چلے گئے۔

مولوی صاحب کی ایک بڑی عظیم پارٹی تھی جس کے ارکان میں ڈاکٹر اگھورناتھ، نواب عماد جنگ (اول)، نواب رفعت یار جنگ (اول)، محمد کاظم علی صاحب معتمد تعمیرات، محبوب علی صاحب کمشنر کروڑ گیری (کسٹم)، مولوی مدنی صاحب، مولوی عبداللہ صاحب عرف کچے والے شاہ صاحب، ملا عبدالقیوم وغیرہ تھے۔

حیدرآباد میں یوسف الدین صاحب پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے شہر سے دور جنگل میں پہاڑ کے قریب ٹولی چوکی و قلعہ گولکنڈہ کو جاتے ہوئے ایک اونچی پہاڑی پر بنگلہ بنوایا۔ اس کا نام انہوں نے مجلس اسلام "مرکا" رکھا۔ یہ پرانی وضع کی خوشنما کوٹھی اب تک موجود ہے۔

ابتداً یوسف الدین صاحب نے [illegible] انگلو انڈین گھرانے میں جو مسلمان ہو گیا تھا شادی کی اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] حیدرآباد [illegible] شادی کی اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

امرآباد ایک بہت اونچا مقام ریاست حیدرآباد میں تھا جس کی چوٹی تک پہنچنے کی کسی نے ہمت نہیں کی تھی مولوی صاحب نے امرآباد کا پیچ پیچ راستہ طے کیا۔ یہ اتنی چوٹی تک گھوڑے پر گئے۔ ایک تفصیلی رپورٹ مرتب کی اور اس مقام کو سینی ٹوریم بنانے کی تحریک کی۔ یہ رپورٹ انھوں نے شائع ہوئی تھی جو قابل دید ہے۔ اس میں امرآباد کے متعلق کوئی بات چھوٹی نہیں۔ وہاں کی پیداوار، زرعی کیفیت، آب و ہوا، جغرافیائی حالت، بلندی سے لے کر وہاں کی جڑی بوٹیوں کے نام اور ان کے خواص تک لکھے ہیں۔ اب پچاس سال کے بعد ان کی رپورٹ پر عمل کیا گیا ہے اور امرآباد کو سینی ٹوریم بنایا گیا ہے۔

اسی طرح تنگبھدرا پراجیکٹ کا خیال بھی سب سے پہلے [illegible] صاحب ہی کو آیا اور انھوں نے بڑی جامع رپورٹ لکھی تھی جو گم ہو گئی تھی۔ اب تک زیر بحث رہی اور اب کہیں یہ منصوبہ پورا ہوا۔

قدیم ریاستیں ہمیشہ سازش کا گہوارہ رہی ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد بھی اس سے بچ نہ سکا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آج سے ساٹھ سال پہلے ۱۹۰۸ء میں ایک منظم سازش یہاں شروع کی گئی تھی۔ ایک محضر بنایا گیا تھا جس میں سلطنت کا روپیہ سے حضور نظام کی بے ترتیبی کا اظہار کر کے خواہش کی گئی تھی کہ یہاں ریجنسی قائم کی جائے۔ اور اس محضر پر حیدرآباد کے بڑے بڑے لوگوں سے دستخط کرائے گئے تھے اور یہ محضر وائسرائے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ مولوی صاحب کو اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے سب سے پہلے حضور نظام کو یہ اطلاع پہنچائی اور پھر اس کے انسداد کی فکر کرنے لگے اس زمانے کا وائسرائے بھی سازشیوں سے ہمدردی رکھتا تھا اس لیے بھی شاید اس سلسلہ میں کوشش ہو رہی تھی اور حیدرآباد کے ریذیڈنٹ سے بھی اسی قسم کی کوئی رپورٹ حاصل کی تھی بہرحال وائسرائے نے اس محضر کو دوسری شہادتوں کے ساتھ شامل کر کے اپنی ذاتی رپورٹ کے ساتھ لندن بھجوانے کے لیے تمام کاغذات تیار کر لیا تھا اور یہ لفافہ وائسرائے کے دفتر کے تہ خانے میں محفوظ تھا کہ مولوی صاحب نے وہاں پہنچ کر کسی ترکیب سے یہ لفافہ حاصل کر لیا اور حیدرآباد روانہ ہو گئے مگر مولوی صاحب راستے ہی میں تھے کہ گڑبڑ شروع ہو گئی اور وائسرائے کو معلوم ہو گیا کہ انھوں نے لفافہ حاصل کر لیا ہے چنانچہ ٹیلی گرام روانہ کیے گئے اور مولوی صاحب جب حیدرآباد اسٹیشن پر ٹرین سے اترے تو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ مولوی صاحب نے راستے ہی سے بعض لوگوں کو تار دے دیے تھے اور سکندرآباد اور بیگم پیٹ اسٹیشن پر بعض لوگ موجود تھے جنھیں مولوی صاحب نے اپنا ٹفن کیریئر دے دیا تھا جس میں وہ لفافہ تھا۔ اس طرح لفافہ حیدرآباد پہنچ کر محفوظ ہو گیا اور مولوی صاحب نے گرفتار کنندگان سے جھگڑا شروع کیا کہ ریاست میں تحویل ملزمین کا قانون چونکہ نافذ نہیں ہے اس لیے ان کی گرفتاری غیر قانونی ہے۔ بہرحال حکومت ہند نے اسی سلسلے میں تحویل ملزمین کا قانون نافذ کرایا اور مولوی صاحب کو گرفتار کر کے ضمانت پر چھوڑ دیا گیا مگر مشکل یہ تھی کہ مولوی صاحب نے جو جرم کیا تھا اس کا اظہار کیا نہ جا سکتا تھا اس لیے چند فرضی الزامات مثلاً وائسرائے کی لائبریری کے ملازمین کو رشوت دینا وغیرہ لگا کر مقدمہ چلایا گیا مگر پریوی کونسل نے مولوی صاحب کو عزت کے ساتھ بری کر دیا اور حکومت حیدرآباد نے دوران مقدمہ میں جو انھیں معطل رکھا تھا پریوی کونسل کے فیصلے کے بعد بحال کر دیا اور ایام معطلی کی پوری تنخواہ بھی دلوا دی اور پھر انھیں اول تعلقداری (کلکٹری) سے صوبہ داری (کمشنری) پر ترقی دی گئی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس محضر کو حضور نظام نے ملاحظہ نہیں فرمایا یا ملاحظہ فرما کر بھی چھپا دیا تو مولوی صاحب نے عرض معروض کر کے روک دیا اور [illegible] اسی وقت [illegible] ملا کر ختم کر دیا گیا۔ البتہ چند سربرآوردہ جو اس سازش کے بانی تھے حیدرآباد سے نکال دیے گئے تھے۔

رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت

یہ تو تھے مولوی صاحب کے سیاسی اور انتظامی کارنامے مگر ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ "[illegible]" ہے۔ قصہ یہ ہے کہ مولوی صاحب کو اردو کا [illegible] ریاست [illegible] تھی چنانچہ انھوں نے [illegible] کر کے ایک

رسم الخط خط انقلابی کے نام سے تیار کیا تھا اور اس سلسلہ میں سرجان کلم، ہیری نیڈو وغیرہ سے بھی انھوں نے مشورہ کیا تھا۔ خط انقلابی میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہر جزو حروف تہجی پر کم و کاست حاوی تھا۔ کوئی نیا حرف یا نئی شکل نہ تھی۔ ابتداً مولوی صاحب نے ایک کتاب خط الاسلامی کے نام سے لکھی جس میں سرگزشت خط بیان کی گئی تھی اور پھر موجودہ رسم الخط کی برائیاں اور کمزوریاں ظاہر کی گئی تھیں اس کے ساتھ ساتھ خط انقلابی کے اصول اور اس کی تخلیق کے وجوہ بیان کیے گئے تھے۔ یہ کتاب ہندوستان کے اہل الرائے کے پاس بھجوائی گئی اور محسن الملک، شبلی نعمانی، نذیر احمد، شرر وغیرہ نے اسے بہت پسند کیا اور مولوی صاحب نے خط انقلابی کا ٹائپ بھی ڈھلوا لیا۔

اس سلسلہ میں میرے والد کو مولوی صاحب نے گھر پر بلا لیا کیونکہ ہر گھڑی مولوی صاحب کے ساتھ رہنا ضروری تھا اس لئے والد کا تقرر بھی محکمۂ مال کی سفارش پر یوسف الدین صاحب نے فرسٹ ہمراہوں میں کر دیا اور والد مرحوم گورنمنٹ ہاؤز ہی میں رہنے لگے۔ مولوی صاحب جس بنگلہ میں رہتے تھے اس کے برابر ہی ٹینس کورٹ تھا اور ٹینس کورٹ سے ملے ہوئے چند کمرے تھے جو دو حصوں پر تقسیم کیے گئے تھے ایک حصہ میں والد مرحوم رہتے تھے اور دوسرے حصے میں مولوی صاحب کی صاحبزادی کی اپنی اتالیق رہتی تھیں۔

خط الاسلامی کی ترتیب حروف تہجی کے تختہ اور کے گراف کے تھے۔ بہرحال تھا جو ہی مولوی صاحب نے والد کو ساتھ لے کر پہلے کلکتہ اور بمبئی سے مراسلت کی مگر ان دونوں شہروں میں بھی کسی کارخانے نے خط انقلابی کی کاسٹنگ پر آمادگی ظاہر نہیں کی بالآخر مدراس کی ایک ٹائپ فاؤنڈری اس کے لئے تیار ہو گئی اور والد نے مدراس جا کر خط انقلابی کی کاسٹنگ کرائی اور میں نے بھی والد کے ساتھ مدراس کا پہلا سفر اسی سلسلہ میں کیا۔ مدراس سے ٹائپ ڈھلوا کر لانے کے بعد والد جن کمروں میں رہتے تھے انھی کمروں کے پیچھے ایک کمرے میں ٹائپ پریس قائم کیا اور خط انقلابی کی چھپائی شروع ہوئی چنانچہ چند پمفلٹ اور رقیمے شائع کیے گئے اور مختلف زبانوں کی عبارت خط انقلابی میں چھاپی گئی۔ اس نئے خط کو حضور نظام نے بہت پسند فرمایا اگرچہ چند مہینوں کی مہلت ملتی تو درسی کتابیں اور سرکاری مطبوعات خط انقلابی ہی میں چھپ جاتیں اور یہ ٹائپ عام ہو جاتا مگر بدنصیبی سے اسی دوران میں حضور غفران مکان نے رحلت فرمائی اور ان کی رحلت کا صدمہ مولوی یوسف الدین صاحب کو اتنا شدید ہوا کہ وہ چند ہی مہینوں کے بعد بیمار ہو گئے اور ان کے گلے پر پھوڑا نکل آیا۔ حیدرآباد اور سکندرآباد کے ولیمسن اور ولایتی ڈاکٹر اور حکما علاج نہ کر سکے۔ بالآخر مولوی صاحب کو مدراس لے جانا پڑا مگر وہاں بھی علاج نہ ہو سکا۔ مایوس ہو کر واپس ہو رہے تھے کہ قیام گاہ سے اسٹیشن جانے کے لئے کرسی پر بٹھا کر جوں ہی اٹھایا گیا اللہ کو پیارے ہو گئے اور مدراس ہی میں مدرسہ محمدیہ کے احاطہ میں آسودہ ہو گئے۔

خط انقلابی مولوی صاحب کا کارنامہ ایسا کارنامہ ہے کہ اس پر ہندوستان و پاکستان ناز کر سکتا ہے۔ آج جو ٹائپ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور لائنو ٹائپ، لیتھو ٹائپ اور اچھے ٹائپ رائٹر کے نہ ہونے سے اردو زبان کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اور اس کی ضرورت کو محسوس کر کے یار لوگ اردو زبان کے لئے ہندی اور رومن ٹائپ قبول کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں اور اردو رسم الخط کی بے مائگی پر زور دے رہے ہیں اس ضرورت کو آج سے پچاس سال پہلے مولوی صاحب نے محسوس کیا تھا اور "علاج حادثہ قبل از وقوع" کے تحت اس کا حل بھی انھوں نے نکال لیا تھا۔

مولوی صاحب کے انتقال کے بعد والد مرحوم کو خط انقلابی سے بڑی دلچسپی تھی مگر یہ حضرت نرے مولوی اور شاعر قسم کے بزرگ تھے، پھر والد کی کم عمری کی وجہ سے اصلاح فروعی بھی تقدیر ہی تھی اس سے کچھ نہ کر سکے۔ مولوی صاحب کے تین فرزند تھے اور یہ تینوں بھی ان کے انتقال کے وقت کم سن تھے۔ اہلیہ مرحوم کی صاحبزادی بیگم ولی الدولہ نہایت قابل، مہذب اور بڑی منتظم خاتون تھیں۔ بفضلہٖ اب تک موجود ہیں لیکن انھیں اپنے اسٹیٹ کے انتظامی امور سے فرصت نہ ملی کہ وہ اس ٹائپ کی طرف توجہ کر سکتیں۔ بڑے فرزند مولوی سید فضل الدین نے نظامت آبکاری کی مددگاری پر پہنچ کر [illegible] میں انتقال کیا۔ منجھلے فرزند مولوی سید نظام الدین گورنمنٹ سرشتہ میں حیدرآباد کے نائب ناظم ہوئے اور انھیں بھی ٹائپ سے

دلچسپی رہی اور خود انھوں نے دو تین قسم کے اردو ٹائپ ایجاد کئے اور نسخ کا مانو ٹائپ بھی بنا لیا جو ہندوستان اور پاکستان میں پہلا اردو کا مانو ٹائپ ہے مگر اس میں وہی حروف کی دوری اور نشست اور کرسی کی آفت ہے۔

میں بچپن ہی سے خط انتظامی سے مانوس ہوں۔ میرے سامنے اس کی کاسٹنگ ہوتی اور دس بارہ سال کی عمر میں میں نے اس کی کمپوزنگ سیکھی ہے مگر اردو دنیا چونکہ نستعلیق ٹائپ کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی اس لئے میں انتظار کر رہا تھا کہ نستعلیق ٹائپ کا دھوکا بے نقاب ہو چکے اور اردو دنیا نستعلیق کی ناکامی کو اچھی طرح سمجھ لے تو میں اس خط کو پیش کروں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب وقت آ گیا ہے اور اردو زبان کے لئے ایک ایسے ٹائپ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے جو مفرد حروف رکھتا ہو، خوبصورت ہو، پڑھنے میں آسان ہو، جس کا مانو ٹائپ اور لائنو ٹائپ بھی بن سکے اور ٹائپ رائٹر بھی بن سکے۔

ان سب خصوصیات کا حامل "خط انتظامی" ہے، چونکہ یہاں موضوع نہیں ہے اس لئے میں اس خط کو پیش نہیں کر سکتا، انشاء اللہ نقوش کے کسی آئندہ شمارہ میں خط انتظامی پیش کروں گا۔

معاف فرمائیے اس تفصیل میں زیادہ وقت ضائع ہو رہا ہے اور مولوی یوسف الدین کی شخصیت ابھی پردے ہی میں ہے۔ مولوی صاحب شریف و سید بزرگ تھے انتقال کے وقت ساٹھ ایک سال کی عمر تھی، پورا قد، بھاری بھرکم جسم، گول چہرہ، شاہی رعب دار، بھرواں داڑھی جیسے خضاب لگایا جاتا تھا، سر پر انگریزی وضع کے بال، ہمیشہ سیدھی مانگ نکالا کرتے تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی، منصب داری پگڑی، دستار ہوتی اور ٹوپی کبھی کبھار پہنتے تھے، طیلسانی رومی دستار ۱۹۴۵ء سے پہلے میں نے انھیں سوٹ پہنتے ہوئے بھی دیکھا ہے مگر ٹائی نہ لگاتے تھے مفلر لپیٹ لیا کرتے تھے۔ جس کپڑے کی شیروانی ہوتی اسی کپڑے کی پتلون بھی ہوتی تھی۔ صرف نماز کے لئے عیدین یا جمعہ کو مسجد جاتے تو ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہنتے یا گھر پر پاجامہ رہتا ورنہ ہمیشہ پتلون اور شیروانی پہنا کرتے۔ گھر میں ململ کا کرتہ اور پاجامہ پہنتے مگر یہ پہنے ہوئے یا تو اندر اپنے کمرے میں رہتے یا پھر اندرونی حصہ ہی میں اس لباس میں نظر آتے۔ ڈرائنگ روم میں بغیر شیروانی کے نہیں آتے تھے۔ متانت اور سنجیدگی کا یہ حال تھا کہ انہیں کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا البتہ مسکرا دیتے ضرور تھے۔ گفتگو نہایت مختصر کرتے بلکہ اشاروں سے مطلب ادا کیا کرتے تھے۔ تحریر اور تقریر معمولی مختصر، تقریر تو ان کی کسی نے نہیں سنی کیونکہ دو چار جملوں ہی میں اپنا مطلب ادا کر دیتے تھے۔

میری والدہ کو بہت چاہتے تھے اور وہ ان کی خدمت میں گستاخ بھی بہت تھیں چونکہ باتیں بہت کرتی تھیں اس لئے مولوی صاحب انہیں طوطی پکارا کرتے تھے۔ میری ولادت ہوئی تو مولوی صاحب نے میرا نام رکھا "ابو رضا سید صباح الدین" یہ تاریخی نام تھا اور سنہ ولادت ۱۳۴۲ھ نکلتے تھے مجھے ابو رضا پکارا کرتے تھے کبھی کبھی موڈ میں ہوتے تو طوطی بھی کہتے۔

میری تسمیہ خوانی (بسم اللہ) ہوئی تو مولوی صاحب نے مجھے سوٹ سلوا دیا اور اس کے بعد سے اپنے انتقال تک ہر مہینے مجھے ایک سوٹ سلوا دیا کرتے، اپنے بچوں کے لئے جب کپڑے بنواتے میرے لئے بھی بنوا دیتے اور اپنی لڑکیوں کے لئے جب کپڑے تیار کراتے میری والدہ اور خالہ کے لئے بھی بنواتے تھے۔

میرے نانا سید رحیم الدین صاحب کی تنخواہ سے جو روپیہ بچا تھا اسے مولوی عبدالباقر خاں وکیل حیدرآباد کے پاس محفوظ کر دیا تھا۔ جب ضرورت پڑتی میری نانی مجھے بھیج کر وکیل صاحب کے پاس سے روپیہ منگوا لیتیں۔ مولوی عبدالباقر خاں سے مولوی صاحب کی بڑی گہری دوستی تھی کیونکہ ہر کام ان کے مشورے سے کرتے تھے اسی طرح مولوی عبدالغفور صاحب وکیل سے بھی ان کے مخلصانہ مراسم تھے انہی مراسم کی وجہ سے مولوی صاحب کی بڑی صاحبزادی مولوی عبدالغفور صاحب کے صاحبزادے سے بیاہی گئیں اور مولوی عبدالباقر خاں صاحب کے فرزند مولوی عبدالباسط خاں رجسٹرار کو باسط جنگ، جن کو مولوی صاحب نے دوم تعلقدار بنایا اور پھر صوبیدار ہو کر گلبرگہ کی صوبیداری پر مقرر کیا تھا۔

مولوی صاحب کی ظرافت اور سنجیدگی کا یہ حال تھا کہ کسی سے بے تکلف ملتے بھی نہ تھے، صرف کاروباری باتیں ہوا کرتی تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ میری ولادت سے ڈیڑھ دو سال پہلے والدہ کو ایک لڑکا ہوا۔ والدہ مولوی صاحب ہی کے بنگلہ پر تھیں، آیا نے شاید ڈبل چوکی تک جا کر سیندھی یا تاڑی کا شوق کیا اور واپس آکر بچے کو دودھ پلا کر سلا دیا۔ بچہ ایسا سویا کہ بس سو ہی گیا، صبح جب سب لوگ جاگے تو دیکھتے کیا ہیں کہ لڑکا نیلا پڑ گیا ہے اور زندگی کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ اسی روز مولوی صاحب نے خاندان بھر میں اعلان کر دیا کہ آئندہ سے کسی بچے کے لئے انا ملازم نہ رکھی جائے، اگر ماں کا دودھ کافی نہ ہو سکے تو بکری کا دودھ پلایا جائے۔ چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ میرے پیدا ہونے کے بعد چونکہ والدہ کو دودھ کم آتا تھا اس لئے مجھ بکریوں کے دودھ پر میری پرورش ہوئی۔

ایک دفعہ مولوی صاحب بیدر کے دورہ پر گئے ہوئے تھے، واپسی میں گلبرگہ سے کوئی اٹھارہ بیس کوس رہ گئے ہوں گے، ادھر تانگہ خراب ہوگیا، اور مولوی صاحب تانگے سے اتر کر پیدل چلتے ہوئے گلبرگہ پہنچے، انہیں پیدل چلنے کا اتفاق عمر بھر میں پہلی دفعہ ہی ہوا ہوگا۔ شام میں چائے پی کر حسب معمول ٹینس کورٹ پر چہل قدمی بھی نہ کر سکے بلکہ اپنے سونے کے کمرے میں چلے گئے، یہ کمرہ چونکہ زنانہ حصہ پر واقع ہوا تھا اس لئے میں ان کے سونے کے کمرے میں بھی پہنچ جاتا تھا اور وہ بھی ان کے خاموش رہا کرتے تھے۔ شام میں جب میں نے کمرے میں پہنچ کر دیکھا تو مولوی صاحب پلنگ پر بیٹھے اپنے پاؤں آپ دابتے ہوئے نظر آئے، اپنے پاؤں آپ دابنا میرے لئے نیا تماشا تھا میں نے لپک کر والد کو سنایا کہ "ماموں پاشا پلنگ پر بیٹھے اپنے پاؤں آپ داب رہے ہیں" یہ سن کر والد نے کہا کہ "تمہارے ماموں پاشا پندرہ بیس میل پیدل چل کر آئے ہیں اس لئے پاؤں دکھ رہے ہوں گے" دس پندرہ نوکر چاکر اور دس بارہ ہی خانگی نوکر رہتے تھے مگر انہوں نے کسی سے پاؤں دبانا پسند نہیں کیا اور اپنے پاؤں آپ دابتے رہے۔

میری نانی جو مولوی صاحب کی چھوٹی بہن اور اپنے بھائی پر نثار ہونے والی تھیں مولوی صاحب کے گھر کا پانی تک نہیں پیتی تھیں جب میں نے یہ دیکھا تو ان سے پوچھا "اماں! آپ ماموں پاشا کے گھر میں کھانا کھاتی ہیں نہ پانی بھی پیتی ہیں یہ کیوں؟" تو کہنے لگیں "بیٹا! پاشا کو دشمنوں نے ورغلا کر مسان بنا لیا ہے اس لئے ان کے گھر کا کھانا پانی میرے لئے حرام ہے۔" مدت تک میں لوگوں سے پوچھتا رہا کہ مسان کیا چیز ہے مگر کسی نے نہیں بتایا۔ ایک روز جبکہ مولوی صاحب مجھے اپنے ساتھ سکندرآباد لئے جا رہے تھے میں نے خود انہی سے مسان کے معنی پوچھے اور وہ خود بھی حیران ہوئے کہ مسان کیا بلا ہے۔ پھر میں نے سارا قصہ سنایا اور بتایا کہ اماں نے ایسا کہا ہے تو مولوی صاحب نے خاصا قہقہہ لگایا اور کہا۔ فری میسن ایک سوسائٹی ہے جسے عربی میں اخوان کہہ سکتے ہیں یہ ایک اخلاقی سوسائٹی ہے جس کے رکن وہی ہو سکتے ہیں جو کسی مذہب کے پیرو اور خدا کی وحدانیت کے قائل ہوں۔ میں بھی اسی وجہ کا ممبر ہوں، یہاں کے جہلا نے اس سوسائٹی کو نہ جاننے کی وجہ سے کچھ مختلف باتیں مشہور کر دی ہیں۔ یہی بات تمہاری نانی نے بھی سنی ہوگی۔" چنانچہ سکندرآباد سے واپس آکر مولوی صاحب نے اپنی بہن کو سمجھایا اور وہ اپنے بھائی کے گھر میں کھانے پینے لگیں۔

مولوی صاحب کی وضعداری اور خودداری بھی حیدرآباد بھر میں مشہور تھی، کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ مسٹر ڈنلپ صدر ناظم اور معتمد مال تھے اور علاوہ ازیں ان کے افسر تھے۔ جب کبھی ڈنلپ دورہ پر آتے تو مولوی صاحب صوبہ داری کی گاڑی اسٹیشن بھجوا دیتے اور اسی میں اللہ بخش کو استقبال کے لئے جاتے اور اسٹیشن سے ساتھ لاتے۔ مولوی صاحب اپنے ڈرائنگ روم میں آرام کرسی پر بیٹھے رہتے، جب ڈنلپ گاڑی سے اتر کر دالان میں پہنچ جاتے تو یہ کرسی سے اٹھ کر دروازے تک جا کر ان کا استقبال کرتے اور ساتھ لا کر ڈرائنگ روم میں لا کر اپنے آرام کرسی پر بٹھا لیتے اور جب ڈنلپ واپس ہونے لگتے تو بھی انہیں پہنچانے اسٹیشن نہ جاتے بلکہ گورنمنٹ ہاؤس کے دروازے میں کھڑے کھڑے خدا حافظ کہہ دیتے تھے۔

کرم خاں نامی کوئی پیش دستی مرحوم تعلقدار (ڈپٹی کلکٹر) اورنگ آباد کے دفتر کے تھے کسی سلسلہ میں ان سے خفا ہو کر ڈنلپ نے لکھا کہ "کرم خاں بہت ڈاکو ہے" مرزا صاحب نے اس کے جواب میں ڈنلپ کو لکھا کہ کرم خاں معمولی شخص ہے اس نے اگر رشوت لی بھی ہو تو اپنی حیثیت کے لحاظ سے چالیس پچاس روپے لئے ہوں گے یہ رقم ڈاکہ نہیں کہی جا سکتی۔ علاوہ ازیں یہ غریب ہندوستانی غیر مہذب ہے اس لئے ڈاکو کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔ مہذب ڈاکو وہ ہے جس نے لاکھوں روپیہ قحط کا ہضم کر لیا اور ڈکار تک نہ لی۔" آخری فقرہ ڈنلپ پر چسپت کیا گیا تھا کیونکہ انھوں نے قحط کے انتظامات میں خوب وارے نیارے کئے تھے۔

تحریر اور تقریر میں مرزا صاحب ضرب المثل تھے خانگی خط بھی سرکاری سیاہی سے نہیں لکھتے تھے، دفتری ملازمین سے خانگی کام مطلق نہ لیتے تھے انھوں نے کبھی سرکاری کاغذ خانگی تحریروں کے لئے استعمال نہیں کیا ایک دفعہ محبوب نگر کے دورہ پر تھے۔ والد نے انھیں خط لکھا آٹھ دس روز کے بعد جواب دیا اور شروع ہی میں لکھا کہ میں دورہ پر تھا، تمہارا خط وہیں ملا مگر میرے ساتھ لفافے کاغذ نہ تھے اور نہ وہاں مل سکتے تھے۔ تمہیں معلوم ہے کہ سرکاری لفافے کاغذ خانگی کاموں کے لئے استعمال نہیں کرتا اس لئے محبوب نگر واپس آ کر جواب لکھ رہا ہوں۔

سلطان نواز جنگ حیدرآباد کے ایک بہت بڑے جاگیردار نواب تھے انھوں نے سرکاری مال سے بہت سا روپیہ لے لیا تھا اس کا تصفیہ کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کے رکن مرزا صاحب بھی بنائے گئے، سلطان نواز جنگ کی بیوی میرے والد کی حقیقی خالہ تھیں۔ اس لئے والد نے خصوصیت سے مرزا صاحب سے سفارش کی مگر مرزا صاحب نے فوراً ہی ٹکا سا جواب دیا اور والد نے سلطان نواز جنگ کو لکھ دیا۔ سلطان نواز جنگ نے اس خوف سے کہ یوسف الدین صاحب میرے خلاف تصفیہ نہ کر دیں حضور نظام سے عرض کیا انھوں نے مرزا صاحب سے فرمایا کہ سلطان نواز جنگ سے رعایت کریں تو مرزا صاحب نے عرض کیا مقدمہ صاف ہے سلطان نواز جنگ سے کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی بہتر ہے کہ کمیٹی میں میری شرکت ہی نہ ہو اور میری غیر حاضری میں دوسرے اراکین تصفیہ کر دیں ورنہ میں تو ان سے کسی قسم کی رعایت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مرزا صاحب کی غیر موجودگی میں مقدمہ کا تصفیہ ہوا اور قرضے کی اقساط مقرر ہوئیں۔

رعب داب کا یہ عالم تھا کہ اول تعلقدار (کلکٹر) ان سے آنکھ نہ ملا سکتے تھے۔ کبھی کسی کو آپ کے سوا نہیں کہتے تھے، عزیزوں کو البتہ تم اور تو کہہ کر مخاطب کر لیتے مگر غیروں کو کبھی تم نہ کہتے تھے۔ ان کا بچہ بیٹا بھی آپ ہی سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ حیدرآباد کے امراء سے برابر سے ملتے تھے اور کسی سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ نظام الدین حسن ولی اسسٹنٹ ان چیف جسٹس ہوئے تو نہ جانے کیا بات ہوئی کہ مرزا صاحب سے سخت مراسلت ہونے لگی۔ مرزا صاحب نے اس شدت سے حملہ کیا کہ نظام الدین پریشان ہو گئے اور معافی مانگ کر جان چھڑائی۔

چونکہ مرزا صاحب کے والد حکیم زین العابدین بڑے اچھے طبیب تھے اس لئے انھیں بھی طب سے خاصا لگاؤ تھا اور اس فن کے معلومات بھی خاصی تھے۔ خود ذیابیطس کے مریض تھے اور پرہیز بہت سخت کرتے تھے۔ صحت کے متعلق مشورے بڑے عمدہ دیتے تھے۔ والد مرحوم جگر کی خرابی سے علیل ہو گئے تو انھیں مسلسل ہدایات لکھتے رہے یہ خطوط میرے پاس محفوظ ہیں اور بڑے کار آمد ہیں۔ اردو بہت اچھی لکھتے تھے۔ ان کی تحریر میں دکنیت کا شائبہ تک نہ تھا مگر بول چال بالکل دکنی تھی البتہ لہجہ دکنی نہ ہوتا تھا ہمیشہ دلی کے لہجہ میں بات چیت کرتے تھے۔

مظفر جنگ

اعلیٰ حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں شاہ دکن کی ہمشیرہ نواب مظفر جنگ سے بیاہی گئی تھیں اور نواب موصوف کے بھائی نواب

جہانگیر جنگ کی صاحبزادی حضور میر عثمان علی خاں بہادر سے بیاہی گئی تھیں اس لئے اس خاندان کو شاہی قرابت کا اعزاز بھی حاصل ہو گیا۔ یہ خاندان تعلیم اور عالم خاندان رہا ہے۔ بخارا کے پایہ تخت "اورنگ" سے اس خاندان کا تعلق تھا اور نواب نظام الملک آصف جاہ کا خاندان بھی اورنگ ہی کا تھا۔ آصف جاہ کے خاندان میں "سیادت" اور اس خاندان میں "افغانی" (شیخ زادگی) کا اعزاز تھا۔ آصف جاہ نے دکن میں آکر استقلال پایا تو بخارا سے اس خاندان کے لوگوں کو بلایا اور نواب مظفر جنگ کے جد بھی آ گئے۔ یہ خاندان علمی و ادبی خاندان تھا چنانچہ مظفر جنگ اپنے خاندان کے گل سرسبد تھے۔

حیدرآباد کا محلہ [illegible] اسی خاندان نے آباد کیا۔ [illegible] کے آداب سے کے مرحوم ممتاز الامراء نواب کیلانی نے اپنی ڈیوڑھی کی بنیاد ڈالی ان کے بعد نواب ظفر جنگ نے اپنی ڈیوڑھی بنائی اور ان کے پیچھے نواب رفیع الدولہ نے اپنی ڈیوڑھی کی بنیاد رکھی۔ ان کے پہلو میں نواب تیمور جنگ نے اپنی ڈیوڑھی بنانی شروع کی اور اس سے متصل نواب سعید جنگ نے اپنا مکان بنایا اس طرح ایک دائرہ بن گیا جو اب تک کچھ شکستہ اور کچھ ویرانوں کی شکل میں موجود ہے۔ البتہ رفیع الدولہ کی ڈیوڑھی مظفر جنگ کی ڈیوڑھی کے نام سے اب تک موجود اور آباد ہے اور اس میں مرحوم کے ایک صاحبزادے نواب قادر جنگ موجود ہیں۔

مظفر جنگ بہادر عالم فاضل بذلہ سنج ادیب اور خاندانی بزرگ تھے۔ چونکہ میرے ہم جد تھے اس لئے میری آمد و رفت ان کے پاس بہت تھی والد مرحوم سے بڑے بے تکلف دوست تھے اور بڑی بے تکلفی تھی مظفر جنگ کے اور میرے مکان کے بیچ میں صرف نواب حفیظ اللہ خاں کا مکان و تیمور جنگ کی ڈیوڑھی تھا اس قربت کی وجہ سے بھی آمد و رفت زیادہ تھی۔ شام میں محلے کے شرفاء علماء اور ذی حیثیت بزرگ اور بعض احباب ڈیوڑھی پر آجاتے مغرب سے عشاء تک بڑی پر لطف صحبت رہتی تھی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، علم، ادب، شعر کبھی موضوع زیر بحث رہتے، بالکل دربار کا ٹھاٹھ ہوتا تھا۔ نواب صاحب متوسط قد کے بزرگ تھے۔ سرخ و سفید رنگ بھاری بھرکم ڈیل ڈول چہرہ بہت ہی روشن بڑی بڑی آنکھیں نہایت روشن اور تیز گھنی گول ڈاڑھی بھویں، ڈاڑھی سفید بھی کچھ کچھ سیاہ، "قد متوسط" وقار و متانت، بات بات سے ظاہر، گفتگو بڑی نرمی آہستگی اور شفقت سے کرتے اور بہت مختصر جملے ادا کرتے تھے، مسکراتے زیادہ تھے مگر قہقہہ کبھی نہ لگاتے تھے صوفی، مشائخ اور علماء جو حیدرآباد آتے ضرور یہاں حاضری دیتے تھے۔

ڈیوڑھی کے بیچ کے ہال میں دریچوں سے مسند بچھی ہوتی اس پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے نواب صاحب بیٹھتے اطراف حاضرین اپنی اپنی حیثیت کے موافق بیٹھ جاتے۔ ہر طرح کی گفتگو حسب مراتب بعض کو مخاطب کر کے ہوتی۔ خاصدان میں پان رکھے رہتے سب لوگ بے تکلف پان کھاتے حقہ پیتے اور باتیں کرتے مگر اس بے تکلفی میں بے ادبی کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ ادب، قاعدہ، سب کے پیش نظر رہتا۔

خاندان کے کتابی ذخیرے کے علاوہ خود نواب صاحب نے بہت زیادہ کتابیں جمع کی تھیں دو کمرے کتب خانے کے تھے جن میں ہزاروں جلدوں کی نادر کتابیں تھیں اور بیشتر قلمی مطالعہ طلب۔ معتقد تھیں خود نواب صاحب کو تصنیف و تالیف کا شوق تھا لیکن بہت سی کتابیں خود انہوں نے لکھی تھیں جو چھپنے والے منقول کر سنایا کرتے تھے۔ ان کی ڈیوڑھی میں کبھی کوئی بات بیکار نہیں ہوتی، ہمیشہ علمی ادبی مذہبی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ علاوہ خاندانی جاگیر اور منصب کے عہدہ صدر الصدور سے بھی سرفراز تھے اور غالباً صدر المہامی (وزارت) امور مذہبی اسی عہدے کا تسمیہ تھی۔ اس وجہ سے سارے علماء ان میں جمع ہوا کرتے تھے۔ طالب علموں سے نواب صاحب کو خاص دلچسپی تھی اور ان کی بہت مدد کرتے تھے۔ مدرسہ منصب داران میں ایک لڑکا جماعت ہشتم میں میرے ساتھ پڑھتا تھا لیکن اس نے مدرسہ چھوڑ دیا چونکہ تیز اور ذہین لڑکا تھا اور مجھ سے خاص دوستی ہو گئی تھی اس لئے میں نے اس کا پتہ چلایا اور اس کے مکان پر جا کر ملاقات کی اور مدرسہ نہ آنے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا کہ اس کے والد نے یکایک انتقال کیا ہے اور چونکہ وہ ملازم نہ تھے اور منصب کی تنخواہ پر خاندان کی گزر بسر تھی اس لئے اب کوئی ذریعہ معاش خاندان کا نہ رہا اور اس کی والدہ چاہتی ہیں کہ وہ اپنے باپ ہی کے دفتر میں نوکری کرے اس لئے اس نے تعلیم چھوڑ دی ہے۔

یہ حال سن کر مجھے بڑی تکلیف ہوئی اور میں نے اسے مجبور کر کے اپنے ساتھ لے لیا اور نواب صاحب کے پاس لے جا کر پیش کیا میں نے حالات سنائے تو نواب صاحب بہت متاثر ہوئے پھر مجھ سے فرمایا کہ اس لڑکے کی ماں کی طرف سے ایک درخواست اور دو بہنوں کی طرف سے دو درخواستیں الگ الگ لکھوا لاؤ اور تھوڑی دیر ٹھہر کر ایک چٹھی ناظم تعلیمات کے نام لکھ دی کہ اس لڑکے کے نام وظیفہ یا اسکالرشپ جاری کر دیا جائے اور جب وہ رخصت ہونے لگا تو پچیس روپے نقد مرحمت فرمائے اور تسلی دلاسا دیا اور فرمایا کہ کل سے مدرسہ جایا کرو تمہاری ماں بہنوں کے نام اور تمہارے نام جو وظیفہ ہو گا ان سب کی مجموعی رقم تمہارے والد کی تنخواہ کے برابر ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس لڑکے نے اطمینان کے ساتھ منشی فاضل کامیاب کر کے تعلیمات میں ملازمت کر لی اور جلد ہی صدر مدرس و ہیڈ ماسٹر بھی ہو گیا۔

مولوی عبدالجبار خاں آصفی رام پوری کے گھر کے سامنے ایک بڑھا دھوبی رہتا تھا اس کی بڑھیا دھوبن آنکھوں سے معذور تھی دھوبی مر گیا تو مولوی صاحب نے میرے سامنے ہی نواب صاحب سے عرض کیا نواب صاحب نے درخواست پیش کرنے کے لئے فرمایا دوسرے روز مولوی صاحب نے میرے ہاتھ سے درخواست لکھوائی اور خود اس پر تصدیق کی اور پانچ روپیہ ماہوار تنخواہ کی سفارش بھی لکھی اور مجھی کو دیا کہ پیش کر دو میں نے پیش کیا تو درخواست پڑھ کر نواب صاحب نے دس روپیہ ماہوار کی اجرائی کی تجویز کی اور دوسرے مہینے ہی سے تنخواہ جاری ہو گئی۔

نواب صاحب کے انتقال کے وقت کئی صاحبزادے تھے، نواب محب اللہ خاں بہادر آغا رضا علی کے نام سے مشہور ہوئے تھے علم دوست اور ادب نواز اور اچھے شاعر تھے مگر طبیعت میں لاابالی پن تھا سرور نگر میں رہتے تھے ارباب اردو کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی اور اسی انجمن سے ایک ماہوار "تحفہ" بھی نکالتے رہے جو ایک آدھ سال سے زیادہ نہیں چل سکا۔ آخر میں آغا رضا علی نے ترک وطن کر دیا تھا اور تقریباً گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

نواب صاحب کے دو اور صاحبزادے نواب سردار جنگ اور نواب تاور جنگ ان کے انتقال کے وقت کم سن تھے۔ بعد کو تکمیل تعلیم کی غرض سے یورپ گئے اور بیرسٹری کی، سردار جنگ بہادر اب بھی بیرسٹر ہیں اور تاور جنگ بہادر نے ملازمت کر لی تھی ملازمت کے ختم پر پنشن لے کر وظیفہ پنشن لے لیا ہے۔

مرحوم کی کتابیں نواب رضا علی نے چھپائیں اور نواب سردار جنگ اور تاور جنگ نے، معلوم نہیں مسودے باقی بھی ہیں یا تلف ہو گئے۔

حیدرآباد میں محرم میں جو کام تھے اور مذہب و اخلاق حرکات ہوتی تھیں ان کے سدباب کی طرف سب سے پہلے نواب صاحب ہی نے قدم اٹھایا اور مکہ مسجد میں مشیخت کے خاتمہ اور خاص خاص ایام میں نمازوں اور وعظوں کا بندوبست بھی شروع کیا، اضلاع میں واعظین مقرر کئے اور حیدرآباد کے مسلمانوں کو حقیقی مسلمان بنانے کی طرف توجہ کی مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا شرک و بدعت کی جڑیں گہری گڑی ہوئی تھیں اس لئے نواب صاحب کی عمر کم ہو گئی اور انھوں نے ایسے وقت انتقال کیا جب کہ حیدرآباد کو ان کی شدید ضرورت تھی۔ اس خاندان کا علم و فضل انہی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ کیا ہے ع

فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

انوار اللہ خاں

مولانا انوار اللہ خاں المخاطب بہ فضیلت جنگ بہادر مرحوم حیدرآباد کے قدیم علماء میں سے تھے۔ آپ کا خاندان قدیم دکنی تھا اور مشہور بزرگ حضرت شاہ رفیع الدین قندھاری قدس سرہ سے آپ کے خاندان کو تعلق تھا۔ بلحاظ فضیلت و قابلیت حیدرآباد میں کوئی عالم آپ کے پایہ کا

دیا تھا مگر آپ کو اپنی علمیت و فضیلت کے اظہار کا شوق تھا نہ آپ کا انکسار اور عجز اس کی اجازت دیتا تھا۔ آپ کو شاہ دکن کی استادی کا شرف حاصل تھا پھر آپ صدر الصدور اور صدر المہام امور مذہبی بھی ہو گئے تھے مگر عہدہ و دولت، شان اور امارت آپ میں پیدا ہی نہ ہو سکی، وہی عالمانہ وقار بلکہ طالب علمانہ انکسار آپ میں تھا جو آخر تک رہا۔

آپ کے دو کارنامے بڑے اہم ہیں ایک "مدرسۂ نظامیہ" کا قیام اور دوسرے "مجلس اشاعت العلوم" کی بنیاد۔ آپ نے درس نظامیہ کی ترویج کی خاطر مدرسۂ نظامیہ کی بنیاد ڈالی اور اپنی ساری توانائیاں اس کے لئے صرف کر دیں۔ خود حضور شاہ دکن نے بھی اس سے دلچسپی لی اور نظامیہ کا آغاز نہایت عمدگی سے ہوا۔

انوار اللہ خاں عالم تھے نیک دل تھے اور حریص عمل الخیر تھے نیک کام میں جلدی کرتے تھے۔ چنانچہ مدرسہ کے قیام میں بھی انہوں نے بڑی جلدی کی چونکہ نرے عالم تھے اس لئے سیاسیات سے قطعاً ناواقف تھے اور ضروریات زمانہ سے بھی بے خبر ہی تھے۔ انہیں اپنی نیک دلی سے یہ سوچ رکھا تھا کہ دکن کو دینی تعلیم کی سخت ضرورت ہے اور ملک کی خدمت علماء ہی کر سکتے ہیں مگر غور نہیں کیا کہ صرف دینی تعلیم سے کام نہیں چل سکتا اس کے ساتھ ہی ساتھ روشن خیالی اور دنیوی تعلیم بھی ضروری ہے چنانچہ مدرسۂ نظامیہ بغداد کا درس و نصاب جو سینکڑوں سال پہلے تجویز ہوا تھا اور اب خود بغداد و مصر میں نہ تھا یہاں مقرر ہوا اور طالب علمی یا مزدوری گری شروع کی گئی۔ اساتذہ بھی پرانے خیال کے فراہم کئے گئے اور طریقۂ تعلیم و طرز رہائش بھی قدیم ہی رکھا گیا۔ مدرسہ چلنے لگا، فارغ التحصیل نکلنے لگے مگر نظامیہ نہ تو دارالعلوم حیدرآباد بن سکا نہ دارالعلوم دیوبند یا ندوۃ العلماء بنا۔ ندوہ، دیوبند اور دارالعلوم سے زیادہ روپیہ نظامیہ پر صرف ہوا مگر نظامیہ کسی ایک فارغ التحصیل کو بھی دنیا کے سامنے فخر سے پیش نہ کر سکا۔ اب بھی نظامیہ چل رہا ہے مگر اس کا عدم و وجود دونوں برابر ہیں۔

دوسرا کارنامہ مولانا کا "مجلس اشاعت العلوم" کا قیام تھا۔ اس مجلس سے زیادہ تر مولانا ہی کی کتابیں شائع ہوئیں اور بیرونی علماء کی کتابوں کی اشاعت بھی عمل میں آئی اور یہ کام نسبتاً نظامیہ کے زیادہ نافع، مفید اور دیرپا رہا۔ مولانا نے بیشتر کتابیں بڑی قیمتی تحریر فرمائیں خصوصاً "مقاصد الاسلام" کا سلسلہ بڑی اہمیت کا تھا اس کے علاوہ فتنۂ قادیانیت کے خلاف بھی مولانا نے کئی کتابیں لکھیں جو جمع ہو گئی ہیں اور دوسرے علوم و فنون پر بھی متعدد رسائل تحریر فرمائے ہیں۔ بہرحال عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں بہترین کتابیں اس مجلس سے شائع ہوئیں اور یہ ایک احسان عظیم علم و ادب پر مولانا کا رہا۔

ان علمی کاموں کے علاوہ مولانا نے امور مذہبی کے دفتر میں "صدارت العالیہ" بھی قائم کرا دیا تھا اور اہل خدمات شرعیہ قاضی، خطیب، ملا وغیرہ ائمہ مساجد، موذنین وغیرہ کے لئے نصاب و تعلیم مقرر کر کے امتحان بھی مقرر کرا دیا تھا جس سے دیہات کے مذہبی لوگوں کو فائدہ پہنچنا چاہئے تھا مگر پورا فیض اس سے نہ پہنچ سکا۔ کیونکہ مولانا کے بعد کے لوگوں کے ہاتھ میں جب یہ رہا ان کو ان کاموں سے دلچسپی ہی نہ تھی۔

میرے والد مرحوم سے مولانا کے مراسم بڑے قدیم اور پرخلوص تھے جس کی وجہ سے مجھ پر بھی بڑی شفقت و عنایت فرمایا کرتے تھے اور میں جب بھی حاضر خدمت ہوتا مجھ سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ باتیں فرماتے چونکہ میں بچپن ہی سے شعر و سخن کا ذوق رکھتا تھا اور اساتذہ کا کلام مجھے بہت یاد تھا اس لئے مجھ سے فرمائش کر کے شعر سنتے اور اگر کوئی اچھا ہوتا تو اپنے شعر بھی مجھے سناتے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ عالم شاعر نہیں ہو سکتا، معاف کیجئے میں نے غلط کہہ دیا ہے "عالم شاعر نہیں ہوتا"۔ اگر وہ شعر کہنے لگے تو شاعر ضرور ہو جاتا ہے مگر شاعری کی روح مر جاتی ہے اور صرف موزونیت باقی رہ جاتی ہے خصوصاً عربی ادب کا ماہر اور عربی شعر کا واقف کوئی عالم اگر اردو زبان میں شاعری کرنے لگے تو پھر موزونیت کی بھی خیر نہیں ہوتی موزونی اور شعر بھی عربی شعر کی پیروی اس طرح ہوتا ہے کہ اردو دوں معلوم ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ یہی کیفیت میں نے مولانا میں محسوس کی۔ مولانا کا پایۂ علم میں بہت بڑا تھا۔ عربی ادب پر بھی تمام عبور تھا اسی وجہ سے طبیعت میں ایک قسم کی پیوستگی تھی جو شاعری کے

مزاج تھی اس میں شک نہیں کہ مولانا صاف اور بے عیب شعر کہتے تھے مگر کلام موزوں ضرور ہوتا تھا اور کچھ نہیں چھپا تھا مولانا اور مجموعہ چھپ چکا ہے۔
باوجود اس علم و فضل کے مولانا تقریر میں کوئی خاص بات پیدا نہ کر سکتے اور مناظرہ تو کر ہی نہ سکتے تھے۔ کوئی ان کی بات کاٹ دیتا تو خاموش ہو جاتے پھر گفتگو ہی ختم فرما دیتے۔ ایک دفعہ میرے سامنے ہی ایک شخص نے کچھ پوچھا اور مولانا اس کا جواب دینے لگے مگر اس نے بیچ ہی میں کہا نہیں ایسا نہیں ہے ایسا ہے تو مولانا نے خاموشی اختیار کی پھر اس نے بہت کچھ کہا کر فرمایا مگر کوئی بات ہی نہیں کی اور ٹال گئے۔ اس طرح مخالف کو چپ کرا دینا بحث مباحثہ مناظرہ کرنا ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔ نہایت متین خاموش اور باوقار تھے۔ لکھتے خوب تھے اور مسائل علمیہ کو اس عمدگی سے تحریر فرماتے کہ پڑھ کر جی خوش ہو جاتا تھا۔ تحریر میں زیادہ شگفتگی نہ تھی مگر صاف اور مدلل تحریر ہوتی تھی۔

بدنصیبی سے ایک جماعت حیدرآباد میں ان کی مخالفت پر آمادہ ہو گئی تھی اس لئے ان کے خلاف خاصا پروپیگنڈا ہوا اور بعض جھوٹے الزام ان پر لگائے گئے اور مشہور کیا گیا کہ مولانا نے ائمۂ فقہ کے خلاف فتوے دئے ہیں۔ مگر یہ سب غلط تھا۔ مولانا نہایت محتاط اور بڑے پابند بزرگ تھے۔

میں نے مولانا کی شاگردی باقاعدہ نہیں کی ہے مگر بیشتر فائدہ اٹھایا ہے چنانچہ جب کبھی حاضر خدمت ہوتا کوئی نہ کوئی بحث چھیڑ دیتا یا مسئلہ پوچھ بیٹھتا اور مولانا اس کو بڑی عمدگی سے بیان فرما دیتے اس طرح بیٹھے بیٹھے بہت کچھ پڑھ جاتا۔

بدنصیبی سے نظامیہ سے کوئی خاص مستند شخص نہ نکل سکی جو اس دارالعلوم کا نام روشن کرتا ورنہ بیشتر فارغ التحصیل طبقے اچھے نکلے۔ چنانچہ محمد بادشاہ، مولانا ابوالوفا، سید محمد بادشاہ قادری، سید رشید پاشاہ قادری، مفتی اشرف علی وغیرہ خصوصاً مولوی رکن الدین اور حکیم مصطفیٰ کے علاوہ نکلے مگر جس طرح دیوبند مولوی شبیر احمد اور مولوی طیب اور ندوہ مولانا سید سلیمان، مولوی معین الدین، مولوی عبدالسلام وغیرہ پر ناز کر سکتا ہے نظامیہ کسی کو پیش کر کے اظہار افتخار نہیں کر سکتا۔ میری رائے ہے کہ یہ ملک کی بدنصیبی ہے ورنہ مولانا کی نیک نیتی میں کوئی کلام نہیں انھوں نے تن من دھن سب نظامیہ کے لئے نثار کر دیا اور چونکہ وہ خود پرانے زمانے کے بزرگ تھے اس لئے اسی طرح کا مدرسہ قائم کر دیا ان کے بعد نظامیہ کے کارپردازوں کو زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے روش بدلنی چاہیے تھی مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔

عبدالجبار خاں آصفی

مولانا عبدالجبار خاں آصفی کا خاندان رامپوری تھا اور مولانا رامپور ہی سے حیدرآباد آئے تھے، پرانی وضع کے عالم اور متقی بزرگ تھے مولانا حالی اور مولانا شبلی ان کے معتقد تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جید عالم اور مستند طالب علم تھے، کسی کو خاطر میں لاتے نہ کسی سے دبتے تھے علم و ادب میں بھی پہلوانی فرماتے تھے مگر وہ بھی میرے مکان کے قریب رہتے تھے۔ والد مرحوم سے بھی دوستی تھی اور میرے خاندان کے بیشتر افراد سے محبت و مروت تھی اس لئے مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔ ایک روز میں کتاب بغل میں دابے ان کے مکان کے سامنے سے جا رہا تھا، یہ گھر سے نکلے تو میں نے سلام کیا پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ میں نے عرض کیا فلاں صاحب کے پاس۔ کہنے لگے کیا لے جا رہے ہو؟ میں نے عرض کیا طبری ہے۔ فرمانے لگے بے وقوف وہ صاحب تجھے طبری پڑھا سکیں گے؟ وہ تو خود پڑھنے بیٹھیں گے تجھ سے کس بے وقوف نے کہا کہ اس جاہل سے پڑھے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا فرمانے لگے کل سے میرے پاس آیا کرو۔ چنانچہ دوسرے روز سے میں نے باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ تاریخ کا ایسا فقید عالم میری نظر سے نہیں گزرا۔ ایک دریا تھا جو رواں تھا۔ اس خوبی سے پڑھاتے کہ بغیر یاد کئے سبق ذہن نشین ہو جاتا اور لغات اس عمدگی سے حل کرتے کہ پھر زندگی بھر نہ بھولنے پائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ آصفی [illegible] آصفی

کے نام سے مسند ظہوری کا ترجمہ فرما رہے تھے۔ ڈیڑھ جزو میں نے پڑھی ہے اس کے بعد کچھ ایسا مصروف رہا کہ وقت نکال نہ سکا۔

بہر حال میں نے وقت واحد میں پہلوانی علم ادب شعر تاریخ اور علوم متفرقہ کو آصفی میں جمع پایا ہے۔ کوئی پہلوان آ جاتے تو آپ کشتی لڑنے کے داؤ پیچ اور ان کی گتوں پر مسلسل تقریر فرمانے لگیں گے۔ کوئی نجومی آ جاتے تو پھر نجوم ہی درمیان میں رہے گا اور پھر کشتی کی تاریخ اور اس کی اہمیت پر تقریر ہی فرمائیں گے اور اگر بدنصیبی سے کوئی شاعر پہنچ گیا تو پھر اس کی خیر نہیں۔ اپنا فارسی کلام جو سنانا شروع کریں گے تو دم لینے نہ دیں گے۔ اساتذہ کی غزلوں پر غزل کہنے کا بہت شوق تھا پہلے وہ سناتے مثلاً حافظ کی پوری غزل سنا دیتے پھر اپنی غزل سنانے لگتے۔ کمال یہ کہ پہلے حافظ کا شعر سنایا جاتا کہ حافظ نے اس قافیہ کو یوں باندھا ہے اور میں نے یوں ادا کیا ہے اس طرح ان کی ایک غزل سننے کے لئے تین گھنٹے لگتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو غزل کسی کی غزل پر کہی گئی ہو اور قافیہ کو تمام طرح باندھا گیا ہو وہ کتنی طویل ہو گی۔ یہی حال ان کی غزلوں کا تھا ایک ضخیم کلیات تقریباً ایک ہزار صفحات کا مرتب فرمایا ہے جو مشاقی اور موزوں طبعی کا اچھا نمونہ ہے مگر اس میں شعریت ہے نہ تغزل۔ فارسی ہی زیادہ کہتے تھے۔ کبھی کبھار اردو میں بھی کہہ لیا کرتے تھے جو فارسی ہی کی طرح مشاقی کا نمونہ ہوتی تھی۔

دس بارہ بڑی نفیس کتابیں لکھیں جن میں سے تین چار طبع ہو چکی ہیں۔ کئی صاحبزادیاں اور دو صاحبزادے تھے۔ ایک جوانی ہی میں چل بسے اور دوسرے جو تقریباً میرے ہم عمر ہیں کچھ تماشا کرتے رہتے ہیں۔

مولانا شبلی نے تاریخ دکن پر کام کیا تو انہی سے بھی کام لیا اور سلسلہ آصفیہ میں جو تاریخ دکن لکھی گئی ہے اس میں بھی آصفی کا بڑا حصہ ہے۔

طبیعت کے سخت اور مزاج کے تیکھے تھے۔ زبان بہت صاف تھی اور گالیاں بھی بے تکلف دے دیا کرتے تھے۔ مجھ سے جو شوق فرماتے "تو سید ہے اس لئے تجھے گالی نہیں دے سکتا، ورنہ جی تو چاہتا ہے کہ خوب گالیاں دوں۔" میں عرض کرتا "حضرت! حاضر ہوں جو حسرت نکال لیجئے" تو فرماتے "یہ حماقت! میری طبیعت خراب کرانا چاہتا ہے۔" موڈ میں آتے تو نرا مذاق کرتے مگر اس میں بھی پہلوانی اور پھکڑ پن ہوتا۔

مہاراجہ کشن پرشاد بہادر بہت چاہتے تھے۔ ایک دفعہ مہاراجہ نے ایک لطیف مذاق کیا ایک فارسی غزل لکھ کر ترکی کو دکھائی۔ ترکی کی اصلاح کے بعد طباطبائی (نظم) کو دکھائی اور ان کی اصلاح کے بعد کسی اور کو۔ اس طرح آخر میں یہ غزل آصفی کے پاس بھجوائی۔ آصفی نے وہ اصلاح دی کہ غزل کے پرخچے اڑا دئے۔ جب یہ اصلاح شدہ غزل انہیں واپس ملی تو مہاراجہ نے اپنی ایک تحریر کے ساتھ اپنی اصل غزل اور سب اصلاحیں آصفی کے پاس بھجوا دیں جسے دیکھ کر آصفی آپے میں نہ رہے۔ دیکھتے یہ ہے کہ ایک لمبا چوڑا خط مہاراجہ کو لکھا جس میں ترکی سے لے کر طباطبائی سب کو رد کر ڈالا اور مہاراجہ کو بھی جو جی چاہا لکھ دیا۔ مہاراجہ یہ خط پڑھ کر خاموش ہو گئے پھر بلوایا مگر آصفی نہ گئے بالآخر مہاراجہ نے معذرت کی اور بڑی مشکل سے انہیں منایا۔

ترکی نے انہیں بہت بھڑکایا تھا ان کی کمزوریوں سے واقف تھے ان کی غزل پر غزل کہتے اور مقطع میں ان کی تعریف کر دیتے بس آصفی پھولے نہ سماتے حالانکہ ترکی کی غزل آصفی کی غزل کے سامنے کچھ بھی نہ ہوتی یہ شعر پڑھ کر خوب جھوم جھوم کر لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔

سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ نہایت صاف دل سیدھے سادے بزرگ تھے دل میں بغض نہ رکھتے تھے۔ جب خفا ہوتے تو جو منہ میں آتا کہہ جاتے اور جب غصہ رفع ہو جاتا تو معافی بھی مانگ لیتے تھے۔ گو بہت سادہ تھی زندگی [illegible] طلباء کی امداد کرتے کتابیں دیتے اہل حاجت کی خدمت کرتے اور ان کی سفارش کرتے مگر ساتھ ہی ساتھ [illegible] بھی کرتے جاتے تھے۔

عبدالجبار خاں صوفی

مولانا عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری [illegible] حیدرآبادی [illegible] تھے۔ [illegible] حیدرآباد کے شعراء و ادباء [illegible]

خاندانِ شاہی سے قرابت قریبہ رکھنے والوں کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ چونکہ والد مرحوم نے بھی مدرسۂ اعزہ میں تعلیم پائی تھی اور صوفی صاحب کے شاگرد بھی رہ چکے تھے اس لئے جب بھی وہ سلطان پورہ کی طرف جاتے صوفی صاحب سے ضرور ملتے تھے اور ان کے ساتھ میں بھی جایا کرتا تھا۔ چونکہ باپ کے استاد تھے اس لئے مجھے بہت زیادہ ادب کرنا پڑتا تھا۔ سلطان پورہ میں میرے احباب اکثر رہتے تھے جن کے لئے میں جایا کرتا تھا اور جب بھی مجھے ملاحظہ فرماتے صوفی صاحب پکار لیا کرتے اور گھنٹہ دو گھنٹے اپنی علمی مصروفیات کا حال سناتے تھے۔

تذکرۂ شعرائے دکن دو جلدوں میں، تذکرۂ اولیائے دکن دو جلدوں میں اور تاریخ دکن کئی جلدوں میں مرتب کی تھی۔ تذکرے تو مکمل چھپ گئے مگر تاریخ دکن کی ایک ہی جلد طبع ہو سکی۔ مرحوم کو کام کرنے کا ڈھب آ گیا تھا اور بڑا سستا کام کر کے کرارے دام وصول کرتے تھے۔ سستا اس لئے کہ دو چار تذکروں کو سامنے رکھ کر اور چار چھ آدمیوں کے حالات حاصل کر کے تذکرے مرتب کر دیتے تھے اور انہیں سرکار میں پیش کر کے ہزاروں روپیہ ان کی چھپائی کے لئے بھی حاصل کر لیا تھا اس طرح خوب فائدہ اٹھایا۔

بڑے نقل پسند اور بر خود غلط قسم کے بزرگ تھے۔ ایک دفعہ فرمانے لگے میاں! تصنیف و تالیف بڑی مشکل چیز ہے۔ خونِ جگر کھانا پڑتا ہے تب کہیں کتاب لکھی جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا قبلہ! ایسی کتاب جیسی کہ آپ نے شعرائے دکن لکھی ہے علم ہو تو ایک بیٹھک میں لکھی جا سکتی۔ یہ سن کر بہت خفا ہوئے۔ میں تو بھاگ کھڑا ہوا مگر آپ نے فوراً مولوی غازی الدین احمد جو بعد کو غازی یار جنگ ہوئے، سے شکایت کی۔ کیونکہ یہ بزرگ بھی ان کے شاگرد رشید اور مدرسۂ اعزہ کے اسکول فیلو تھے۔ انہوں نے میری خوب خبر لی اور مجھے صوفی صاحب کے پاس جا کر باقاعدہ معافی مانگنی پڑی۔

نایاب کتابوں کے متعلق ہمیشہ فرماتے کہ میرے پاس موجود تھی طغیانی میں تلف ہو گئی۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد کی موسی ندی میں ایک زبردست سیلاب آیا تھا جس میں اکثر مکانات برباد ہو گئے اور صوفی صاحب کا مکان بھی شاید گر گیا تھا۔

الغرض ان باتوں سے قطع نظر آدمی قابل تھے عربی فارسی کے فارغ التحصیل تھے اردو کا مطالعہ بھی اچھا تھا۔ شعر گوئی کا شوق بھی تھا مطالعہ بھی اچھا تھا۔ معلومات نہایت وسیع تھیں۔ بڑھاپے کے باوجود حافظہ نہایت ہی اچھا تھا اور ہر بات بڑی تفصیل سے سنایا کرتے تھے۔ حیدرآباد کے بڑے بڑے لوگ مثلاً نواب سلاوت جنگ صدر المہام مال، نواب رستم جنگ ناظم کروڑ گیری، نواب غازی یار جنگ، [illegible] وغیرہ ان کے شاگرد تھے جن کی شاگردی پر مولوی صاحب ناز فرمایا کرتے تھے۔

مولوی صاحب کا اصل کارنامہ تاریخ دکن ہے۔ دکن کا تاریخی مواد نہایت مبہم اور منتشر ہے مگر مولوی صاحب نے بڑی محنت سے اسے فراہم کیا اور بڑے ہی سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ چونکہ میں بھی تاریخ کا طالب علم ہوں اور تاریخ دکن میرا موضوع ہے اس لئے ان کی محنت کا اندازہ میں نے اچھی طرح کیا ہے۔

مختصر یہ کہ مولوی صاحب بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے اور اپنے زمانے کے قابل لوگوں میں سے تھے۔ بیس پچیس کتابوں کے مسودے مولوی صاحب نے چھوڑے ہیں مگر ان کے ورثا نے اس طرف توجہ نہیں کی۔

حکیم وحید الدین عالیؔ

حیدرآباد سے سینکڑوں صاحبانِ فضل نکلے جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر حکیم وحید الدین عالیؔ ہیں۔ اتفاقاً حکیم صاحب اور والد مرحوم [illegible] بھی تھے۔ اس لئے ہمارے گھر آتے [illegible] تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ [illegible]

ناصل بھی حکیم صاحب کے ساتھی تھے اس سے بھی زیادہ مراسم ہے۔

بظاہر حکیم صاحب نہایت کم گو اور کم سخن ہوتے سے نظر آتے تھے مگر حد درجہ ذہین اور بڑے ہی ذہین تھے یوں امتحان کی حد تک انھوں نے مولوی فاضل کا امتحان کامیاب کیا تھا مگر عربی پر انہیں عالمانہ عبور اور ماہرانہ قدرت تھی بڑے بڑے علماء ان سے بات کرنے سے جھجکتے تھے ایک دریا تھے جو چھلکتے رہتے۔ طبیعت کا یہ حال کہ ع

وہیں پانی بھرا جس شعر کی بحر زمیں نکلی

کبھی سبع معلقہ کا جواب لکھتے تو کبھی متنبی کی دھجیاں بکھیرتے۔ کبھی صاحب قصیدۂ بردہ کی خبر لیتے تو کبھی انوری و ذوقی کو جھنجھوڑتے۔ غرض بلا کے طباع اور ذہین تھے۔

سناء الملک، طوبیٰ شوستری ایک بہت عالم اور قابل بزرگ تھے۔ عراق اور ایران میں عمر گذاری تھی اور علمائے عالم میں یکتا شمار ہوتے تھے۔ حضور غفران مکان میر محبوب علی خان شاہ دکن کے استاد تھے اور واقعہ یہ ہے کہ عربی و فارسی میں اپنی نظیر آپ تھے مگر وحید الدین حالی کے سامنے ان کا چراغ بھی نہ جلتا تھا۔ طوبیٰ شوستری نے عراق میں عربی کی تکمیل اہل زبان اساتذہ سے کی تھی اور ایران میں فارسی کی تکمیل کی تھی اور لطف خاص یہ کہ مادری زبان فارسی تھی بخلاف ان کے حالی نے نہ تو اہل زبان علمائے عرب سے تحصیل کی تھی اور نہ عراق و عرب کی صورت دیکھی تھی مگر طبعی مناسبت، ذاتی کوشش اور فطری لگاؤ کی وجہ سے عربی ادب اور خصوصاً عربی شعر پر اتنے حاوی تھے کہ طوبیٰ شوستری تک ان کے معترف تھے۔

حالی کے فرزند حکیم نظام الدین صاحب نے بعض قصائد اور طوبیٰ شوستری کے چند خطوط شائع کئے ہیں۔ کاش حالی کے عربی اور فارسی کلام کی اشاعت ہو جاتی۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ حالی کے جیسا عربی کا شاعر ہندوستان بھر میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ بالکل تعریف نہیں حقیقت تھی ع

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

یہی حال عربی کا تھا۔ فارسی میں بھی خوب شعر کہتے تھے خصوصاً نعت بہت کہی ہے مگر افسوس ہے کہ فارسی کلام بھی شائع نہ ہو سکا۔

طب میں بھی غیر معمولی مہارت تھی۔ تشخیص بڑی اچھی کرتے تھے اور نسخہ نویسی میں بھی کمال تھا اور بہت سوچ سمجھ کر علاج کرتے تھے طبیب کی حیثیت سے ملازم تھے اور باقاعدہ مطب بھی کرتے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو ان کی پروفیسری کے لئے انتخاب ہوا ابھی جائزہ بھی حاصل نہیں کیا تھا کہ انتقال ہو گیا۔ عمر مشکل پچاس برس ہوگی کہ دنیا سے منہ موڑ لیا۔

عجیب و غریب بزرگ تھے۔ فنا فی العلم تھے کھانے پینے اور پہننے کا شوق مطلق نہ تھا صرف مطالعہ ان کا مشغلہ تھا جو کتاب پڑھتے اس پر نوٹ ضرور کیا کرتے۔ چنانچہ والد کے کتب خانے میں بیشتر کتابیں ایسی تھیں جن پر حالی کے نوٹس تھے۔

ایک دفعہ والد کو درد گردہ ہو گیا اور بڑی تکلیف ہونے لگی حکیم محمود بھائی کا علاج ہو رہا تھا۔ مجھ سے راستے میں ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ والد شمس آباد سے بیمار ہو کر آگئے ہیں۔ درد گردہ ہے اور محمود بھائی کا علاج ہے۔ سن کر خاموش ہو گئے دوسرے روز صبح تشریف لائے نسخہ ملاحظہ کیا نبض دیکھی قارورہ دیکھنے کے لئے کہا اور جو نسخہ جو بلا ہوا رکھا تھا پھینکوا دیا خود گھر جا کر دوا بھجوائی۔ دوسرے ہی روز سے تکلیف کم ہونے لگی اور ایک ہفتے میں صحت ہو گئی۔

مشہور ہے کہ حالی مفت دوا دیتے تھے مگر میں نے ہمیشہ ان سے دوا مفت ہی لی ہے کبھی مجھ سے دوا کی قیمت نہیں مانگی اور نہ دوا دینے سے انکار کیا البتہ کتاب انھوں نے مجھے ہمدردی کی غرض سے بعض کتابیں مانگیں مگر وہ ٹالتے رہے تو صاف انکار کیا۔

[illegible]

والد جب کبھی اضلاع سے آتے تو حالی سے ملنے ضرور جاتے اور دن بھر حالی کے پاس گزارتے۔ اس کے دوسرے روز حالی مطب سے ہمارے گھر آجاتے اور شام تک یہیں ٹھہرتے۔ والد کو عربی سے شغف زیادہ تھا اس لئے فارسی شاعری کم ہی موضوع بحث میں آتی اور دونوں ایک دوسرے کو اپنا اپنا فارسی کلام سناتے تھے۔ والد خود بھی کہہ لیتے تھے مگر حالی کی شاعری سے ان کی شاعری کو کوئی نسبت نہ تھی۔ ان کا سرمایہ فارسی میں پچیس غزلوں سے زیادہ نہ تھا اور حالی کا یہ حال تھا کہ ایک ایک نشست میں بیس بیس چالیس چالیس غزلیں سنا دیتے تھے مگر تھے دونوں دوست اور ایک دوسرے کے اشعار کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔

حالی کے انتقال سے دو ایک مہینے پہلے کا واقعہ ہے کہ حالی صبح صبح تشریف لائے اور شام تک خوب [illegible] رہے پھر والد سے فرمائش کی۔ والد نے ایک نئی غزل سنائی۔ اس شعر پر حالی پھڑک گئے اور بہت دیر تک داد دیتے رہے ؎

جور و جفائے آسماں [illegible]
[illegible] آستاں [illegible] زمیں زمیں

ہندوستان میں عربی کا ایسا شاعر کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ پیدا ہوگا۔ کاش بھائی حکیم نظام الدین اپنے والد کا عربی کلام چھپوا دیں اور دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ہندوستان نے بھی عربی شاعر پیدا کئے ہیں۔

قطب الدین فاضل

مدرسہ دار العلوم حیدرآباد کو حضرت مولوی [illegible] کو پیش کر دیا تھا اس کی کارگزاری مسلم اور اس کا احسان حیدرآباد پر تھا۔ یہ دونوں حکیم حبیب الدین فانی اور حکیم قطب الدین محمد علی فاضل تھے۔

قطب الدین صاحب کا خاندان حیدرآباد کا قدیم خاندان تھا۔ ان کے دادا بھی قطب الدین ہی تھے جو [illegible] کے خاص لوگوں میں سے تھے اور ان کے والد غیاث الدین بھی [illegible] کے بزرگ تھے جو ہمارے خاندان سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ غیاث الدین [illegible] کے متعلق [illegible] تھے مگر جب حضرت [illegible] شاہ سے بیعت ہوئے تو [illegible] اپنے بیٹے قطب الدین کے حق میں دست بردار ہو گئے اور [illegible] شروع کر دی۔ نواب غیاث الدین خاں سے غیاث الدین شاہ ہو گئے اور مرتے دم تک اسی وضع پر قائم رہے۔ غیاث الدین شاہ صاحب سے میری [illegible] بیاہی گئی تھیں اس لئے قطب الدین میرے پھوپھیرے بھائی ہوتے تھے اور میرے والد ان کے ماموں تھے مگر [illegible] تیس سال بڑی عمر کے تھے اور [illegible] اس لئے قطب الدین میرے والد کو ماموں کہنے کے بجائے [illegible] پکارتے تھے۔

قطب الدین حیدرآباد ہی میں پیدا ہوئے اور تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کیا پھر طب اور انگریزی کے امتحان بھی دئے۔ ان دنوں حیدرآباد میں [illegible] کی پڑھنے کا شوق [illegible] تک پہنچ گیا تھا [illegible] عربی اور فارسی [illegible] طب کا امتحان [illegible] ایک [illegible] ایسا [illegible] عربی کو فاضل اور [illegible] زبان [illegible] ہندوستانی [illegible] عربی [illegible] قطب الدین [illegible]

نثر ہی میں نہیں بلکہ نظم میں بھی تھا اور عربی فارسی دونوں زبانوں میں دریا بہاتے تھے۔

تصنیف و تالیف کا شوق ہوا تو کتابیں لکھنی شروع کیں۔ فنون کی کتابوں کی شرحیں لکھیں، رسالے لکھے اور پھر مختلف موضوعات پر بیسیوں کتابیں لکھ ڈالیں۔ ابتداً پائگاہ میں تعلقدار ہو گئے پھر مستعفی ہو گئے تھے۔ امیر پائگاہ نواب لطف الدولہ بہادر ان سے بڑا سلوک فرماتے تھے۔

قصیدہ لامیہ کی طرح ایک دفعہ جو نو ہی کی ترنگ میں لگ گئے، چار چار سو شعر کے چار چھ قصائد لکھ ڈالے۔ ان کا مقابلہ حیدرآباد میں اگر کوئی کر سکتا تھا تو علامہ وحید الدین عالی ہی تھے۔ ان دونوں میں بہت محبت تھی اور ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے۔ اعلیٰ حضرت غفران مکان میر محبوب علی خان شاہ دکن نے ایک دفعہ سالار الملک آغا شوستری سے پوچھا کہ آپ حیدرآباد میں کس کو پسند کرتے ہیں تو انہوں نے کہا یوں تو یہاں بہت سے عالم ہیں مگر قطب الدین سب سے تیار اور بڑے ہی ذہین ہیں۔ یہ سن کر حضور نے یاد فرمایا اور یہ باریاب ہوئے۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ حضور نے فرمایا قطب الدین تم کو میں صدارت یا تعلیمات میں مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ تو عرض کیا سرکار! چار پشت سے پائگاہ کا نمک خوار ہوں۔ لطف الدین خان اس وقت تک لطف الدولہ نہیں ہوئے تھے، نے پائگاہ کو میرے سپرد کر دیا ہے میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ حضور نے فرمایا میں لطف الدین خان سے کہہ دوں گا تو عرض کیا سرکار، وہ حکم کی تعمیل میں خانہ زاد کو اجازت تو دے دیں گے مگر خانہ زاد انہیں کیسے چھوڑ سکے گا۔ اس جواب سے حضور بے حد متاثر ہوئے اور مسکرا کر فرمایا اچھا تم پائگاہ ہی میں رہو۔ چنانچہ قطب الدین نے پائگاہ ہی میں عمر گزار دی اور تقریباً ۷۰-۷۵ سال کی عمر ہوئی کہ انتقال کیا۔

ان کے انتقال کی اطلاع جب ان کے والد بزرگوار کو دی گئی تو انہوں نے نہایت ہی صبر و استقلال سے کیفیت سنی اور جنازہ حافظ ڈنگر کی مسجد میں لانے کے لئے کہا کیونکہ یہ چنچل گوڑہ میں رہتے تھے اور قطب الدین صاحب نے فتح دروازے کے مکان میں انتقال کیا تھا۔ جب جنازہ حافظ ڈنگر کی مسجد میں لایا گیا اور غیاث الدین شاہ صاحب کو اطلاع دی گئی تو وہ اٹھ نہ سکے۔ بد نصیبی سے یہ اطلاع میں نے ہی دی تھی مگر جب وہ اٹھ نہ سکے اور میں بھی انہیں سہارا دے کر اٹھا نہ سکا تو ان کے مرید چودھری شہاب الدین اور عبدالکریم کو میں نے بلایا اور تینوں مل کر انہیں کھڑا کر سکے۔

بیٹے کی اطلاع پا کر گر بیٹھ جانا ہونے سا فطری تھا، دیکھنا یہ تھا کہ عمر میں پہلی اور آخری بار کمر جھکتی ہوئی نظر آئی۔ غیاث الدین شاہ صاحب کی واقعی کمر ٹوٹ گئی گو بعد وہ زندہ رہے مگر چلنے پھرنے کے قابل نہ تھے۔

قطب الدین صاحب مجلسی حیثیت سے زیادہ دلچسپ نہ تھے باتیں اکھڑی اکھڑی کرتے، باتیں کرتے کرتے اپنی دھن میں کھو جاتے اور جھول جھول کر باتیں کرتے جس طرح کہ بچے مکتبوں میں رٹتے جھول جھول کر پڑھا کرتے ہیں غالباً یہ جھولنے کی عادت انہیں مکتب ہی سے ہو گئی تھی۔

حافظہ غیر معمولی قوی تھا۔ بچپن کی پڑھی ہوئی کتابیں تک ازبر تھیں اور بے تکلف سنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ سے پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ میں نے جواب دیا سکندر نامہ۔ پوچھا بحری یا بری؟ مجھے معلوم نہ تھا کہ سکندر نامے بحری اور بری الگ الگ ہیں۔ میں نے کہا دونوں جو نظم میں ہیں تو کہا میاں یہ دونوں ہی نظم میں ہیں۔ تم جس کو پڑھ رہے ہو اس کا کوئی شعر سناؤ۔ میں نے شعر سنایا ؎

شنیدم ز پیران دینار سنج
کہ زر زنگ شد در جہاں گنج گنج

شعر سن کر کہا یہ سکندر نامہ بری ہے۔ پھر آپ نے سکندر نامے کے شعر سنانے شروع کئے اور تقریباً ڈھائی تین سو شعر ایک سانس میں سنا دئے۔ چند شعر جو میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے میں نے پوچھے تو انہیں سمجھا دیا۔

عربی قصائد، فارسی قصائد اور غزلیات اور اردو کلام کا خاصا ذخیرہ موجود ہے، بیشتر قصائد اور نظمیں چھپی ہیں مگر اشاعت محدود ہوئی ہے۔

میرزا قادر علی خان ابوالعلائیؒ، ڈاکٹر سیادت علی خان، ڈاکٹر ولی الدین انہی کے فرزند ہیں۔

قطب الدین صاحب کی کتابوں میں سے شرح شرح محمدی بہت مشہور اور مقبول ہوئی۔ قانونی کتابوں کے علاوہ ان کی دوسری کتابیں طبع نہیں ہوئیں۔ مسودات غالباً قادر علی صاحب کے پاس ہیں جو شاید تلف ہو جائیں گے کیونکہ اب کوئی امید ان کی طباعت اور اشاعت کی نہیں ہے۔

محب حسین

مولوی محب حسین یو پی کے باشندے تھے، ابتداً حیدرآباد آ کر افسر جنگ کے توسط سے فوج کے دفتر میں ملازم ہو گئے اور افسر جنگ کی لڑکیوں کو پڑھاتے بھی رہے۔ آدمی معقول، پڑھے لکھے اور وضع دار تھے۔ حیدرآباد میں بہت جلد مقبول ہو گئے۔ پردے کے خلاف تھے اور شدت کے ساتھ پردے کی مخالفت کرتے تھے۔ پھر ان کی دو تین صاحبزادیاں میری والدہ مرحومہ کے ساتھ پڑھتی تھیں اس لئے ہم لوگوں سے خاصے مراسم تھے۔ ہفتے میں ایک دو بار یہ لوگ ہمارے گھر آتے اور ہم بھی ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ اس آمد و رفت کی وجہ سے میں بھی محب حسین صاحب سے مانوس تھا اور ان سے خوب باتیں کیا کرتا تھا۔ والد مرحوم ان کے مخالف تھے کیونکہ وہ انہیں دہریہ، ملحد اور نیچری کہتے تھے مگر انہوں نے مجھے کبھی ان سے ملنے کی ممانعت نہیں کی۔

حیدرآباد کی مشہور خاتون صغرا ہمایوں مرزا کو محب حسین نے بہت مشہور کیا۔ اپنے رسالوں "معلم نسواں" اور "مشفق نسواں" میں ان کا خاصا پروپیگنڈا کرتے رہے۔ غالباً محب حسین کی بے پردگی کی اسکیم پر کاربند ہونے والی حیدرآباد میں سب سے پہلی خاتون یہی تھیں۔

محب حسین مترجم بڑے اچھے تھے۔ میڈوز ٹیلر جو غالباً حیدرآباد [illegible] بھی رہے تھے، کی دو بہترین کتابیں "امیر علی ٹھگ" اور "میرا پہلا جرم" اردو میں منتقل کیں۔ خصوصاً امیر علی ٹھگ بڑا نفیس ترجمہ ہے۔ مدتوں تک وہ ماہنامے نکالتے رہے اور ان میں اکثر ترجمے شائع کرتے رہے۔ حیدرآباد میں علمی ادبی فضا محب حسین ہی نے پیدا کی اور یہاں کے نوجوانوں میں علمی کاموں اور ادبی ہنگاموں کا شوق پیدا کیا۔ چنانچہ حیدرآباد کے شرفا کی ایک بڑی جماعت ان کی وجہ سے علم و ادب کی طرف مائل ہو گئی اور انہوں نے خوب کام کیا۔ نوجوانوں میں مباحثوں اور تقریروں کا شوق بھی محب حسین نے پیدا کیا۔ ان میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بالکل غیر سیاسی آدمی تھے اور ان کی طبیعت سازش کی طرف مائل نہ تھی اس لئے اطمینان کے ساتھ حیدرآباد میں کام کرتے رہے۔

عربی فارسی خاصی جانتے تھے، اردو بھی اچھی تھی۔ انگریزی پر اتنا عبور تھا کہ اردو میں ترجمہ بڑی عمدگی سے کر لیتے تھے۔ باتیں بہت اچھی اچھی کیا کرتے تھے۔ عبدالحلیم شرر سے بڑا انس تھا اور دونوں میں خوب چھنتی تھی۔

اس زمانے کے [illegible] کے مطابق [illegible] اور مولوی صاحب مشہور تھے گو بالکل غیر مذہبی آدمی تھے۔ کئی ایک کتابیں چھپوائی تھیں۔ اب تو ان کے نام بھی مجھے یاد نہیں ہیں۔ آخر میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے اور مرتے دم تک اسی حال میں رہے۔ ۱۹۲۶ء میں جب گھر گئے تو مجھ سے ملاقات کی اور "رقعات محب" کی بہت سی جلدیں خود عنایت کرنے کے لئے مجھے دیں مگر جب ۳۵ء کے اواخر یا ۳۶ء کے اوائل میں گھر گئے تو انتقال ہو چکا تھا اور دماغ بھی متاثر ہو گیا تھا۔ گلبرگہ میں ایک وکیل تھے علیم الدین جن سے محب حسین کی ایک صاحبزادی بیاہی گئی تھیں۔ علیم الدین کے انتقال کے بعد کچھ جائداد، مکان اور زمینیں وغیرہ ان کی صاحبزادی کے حصے میں آئی تھی۔

جس کے انتظام کے لیے یہ گلبرگہ آیا کرتے تھے۔ اتفاق سے گلبرگہ کے آخری سفر میں دو تین روز میرے مہمان رہے۔ ان دنوں خدائی کرنے لگے تھے ایک روز فرمانے لگے: "واجد تم مجھے خدا مانتے ہو یا نہیں؟" میں نے کہا حضرت! یہاں تاپور میں ایک پیغمبر ہیں جن کا نام ہے عبداللہ اور عبداللہ تاپوری مشہور ہیں۔ چونکہ گلبرگہ انہی پیغمبر کے حدود مملکت میں ہے اس لئے اصولاً پہلے آپ کو اپنی خدائی کی تصدیق عبداللہ تاپوری سے کرانی چاہئے تب انہیں ہم گلبرگہ والے آپ کو خدا مانیں گے۔ فرمانے لگے میاں تم مذاق کر رہے ہو۔ میں نے کہا جی نہیں بالکل واقعہ عرض کر رہا ہوں ان تاپوری پیغمبر کے ایک داماد یہاں وکیل ہیں آپ اجازت دیں تو انہیں یہاں بلا کر اپنی طرف سے شہادت میں پیش کر دوں گا۔ کہنے لگے بے وقوف ہوگا کوئی جاہل ہوگا جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے۔ میں نے کہا قبلہ! خدائی اور پیغمبری کا دعویٰ قابل اور فاضل لوگ ہی کرتے ہیں جاہل نہیں کرتے خود آپ بھی تو بڑے قابل ہیں۔ یہ سن کر بگڑنے لگے میں نے بڑی منت سماجت کے بعد منایا ورنہ بستر باندھ کر جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔

اس طرح وہ ایک سال گزار کر محب حسین نے انتقال کیا۔ کئی شادیاں کیں اور ہر ایک بیوی سے اولاد ہوئی اور سب خوش حال ہیں۔ ایک بیٹے جوانی ہی میں مر گئے ان کا ایک لڑکا بھی گزیٹڈ پوسٹ پر ہے۔ ڈاکٹر صادق حسین ایک بیٹے ہیں جو صدر اعظم کے دفتر میں متعلق تھے وظیفہ پر سبکدوش ہو گئے ہیں اور تھیاسوفیکل سوسائٹی میں روحانیات پر تقریریں کرتے رہتے ہیں ایک صاحبزادے اعجاز حسین بی اے ایل ایل بی ہیں جو وکالت میں ناکام رہ کر ملازمت اختیار کر چکے ہیں۔ سال دو سال میں یہ بھی وظیفہ پر سبکدوش ہو جائیں گے۔ لڑکیاں بھی خوش حال ہیں۔ محب حسین صاحب کی علمی خدمات بھلائی نہیں جا سکتیں۔ حیدرآباد کی علمی ادبی فضا ان کی شرمندۂ احسان ہے۔

عزیز جنگ ولاؔ

مولوی احمد عبدالعزیز المخاطب بہ عزیز جنگ متخلص بہ ولاؔ بڑے قابل بزرگ تھے۔ مولوی یوسف الدین صاحب سے بڑے اچھے مراسم تھے، موصوف کے بڑے فرزند مولوی غازی الدین احمد المخاطب بہ غازی یار جنگ چونکہ والد مرحوم کے ہم مکتب تھے اس لئے بھی ہم لوگوں سے خاندانی مراسم ہو گئے تھے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں اتفاق سے غازی یار جنگ گلبرگہ پر ایڈیشنل سیشن جج ہو کر آئے اور مولوی علی الدین احمد [illegible] ناظم عدالت و مجسٹریٹ ہو کر آئے اور مولوی رکن الدین احمد وہاں پہلے ہی سے مہتمم خزانہ و ٹریژری آفیسر تھے اس طرح تینوں بھائی ایک جگہ جمع ہو گئے اور ان حضرات کے قیام تک تقریباً روزانہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس لئے بھی ہمارے مراسم اس خاندان سے زیادہ ہو گئے۔

عزیز جنگ بہادر کی خدمت میں والد کے ساتھ اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا، پھر تنہا بھی جاتا رہا۔ وظیفہ لینے کے بعد ولاؔ نے اپنی زندگی تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایسا منکسر، ایسا سلجھا ہوا، ایسا روادار شخص، ایسا [illegible] حیدرآباد بھر میں کسی کو نہیں پایا۔ ولاؔ مدراسی تھے اور مدراس کے شریف ترین گھرانے نائطہ سے تھے، یہ خاندان اپنے رہن سہن، بود و باش، صحت صفائی، اصول اور وضعداری میں اپنی نظیر آپ ہے۔ ولاؔ اس نائطہ گھرانے کے صحیح جانشین اور نمائندے تھے۔ ابتداً کچہری کی خدمت پر مامور ہو کر ترقی کرتے کرتے اول تعلقداری، [illegible] انسپکٹر ہو کر وظیفہ لیا۔ مختلف محکموں میں مامور رہے اور جس کام کو بھی انجام دیا نہایت دیانت اور خوش سلیقگی سے انجام دیا۔

تعلیم واجبی ہوئی تھی، عربی فارسی کی بڑی اچھی استعداد تھی، مطالعہ بھی بڑا اچھا تھا جوانی ہی سے تصنیف و تالیف کا ذوق تھا اور ہر چیز پر لکھتے تھے چنانچہ کھجوروں کی کاشت سے لے کر انگور کی کاشت تک ایک ایک کتاب لکھی ہے اور ہر کتاب اپنے موضوع پر مکمل اور مفید ہے۔

فن تاریخ گوئی پر ایک نفیس کتاب لکھ دی۔ اس کے علاوہ اردو میں تاریخ گوئی سے متعلق کوئی کتاب نہیں۔ جو ہیں وہ تاریخی جملے اور قطعے جمع کر کے "گلشن تاریخ" "آئینہ تاریخ" وغیرہ ناموں سے لوگوں نے کتابیں شائع کیں مگر فن تاریخ گوئی پر اس کی ترتیب پر یہ اولین اور آخری کتاب ہے۔

اسی کے ساتھ ولا نے "قانون مال" "قانون عملیات" "مصطلحات عملیات" وغیرہ پر بیسیوں کتابیں شائع کیں۔ ان کی خوش قسمتی سے حکومت نے ہر کتاب پر صلۂ تصنیف دیا اور سرکاری طور پر جلد جلد خریدی جاتی رہیں چنانچہ تصنیف و تالیف سے خاصا مالی فائدہ انہوں نے اٹھایا۔

"آصف اللغات" کے نام سے ایک لغات کی ترتیب شروع کی اور اس کو ساتھ ہی ساتھ چھپواتے بھی رہے اور غالباً دس بارہ جلدیں چھپوا بھی دیں۔ یہ بڑی اچھی اور خاص لغات تھی جو اب نایاب ہو گئی ہے۔ یہ تمام کتابیں ولا نے اپنے ذاتی پریس میں چھپوائی تھیں کیونکہ انہوں نے اپنے مکان ہی پر ایک پریس قائم کر لیا تھا۔ کاتب اور سنگ ساز بھی ملازم رکھے تھے اور اپنی ہی نگرانی میں چھپواتے رہتے تھے۔

طبیعت میں انتظامی صلاحیت اور نفاست بہت تھی۔ سلطان پورہ میں ایک مکان اور باغ بنا لیا تھا۔ مکان نہایت ہی وسیع اور بڑا ہی نفیس بنوایا۔ پھر اپنے لڑکوں کے لئے الگ الگ حصے بھی بنوا دیے تھے چنانچہ چاروں بیٹوں کے لئے چار قطعات الگ الگ تھے مگر یہ چاروں ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ "عزیز باغ" ایک نمونے کا مکان تھا اس گھر کے کپڑے تک باہر نہ جاتے تھے۔ اندر ہی دھوبی ملازم تھا جو اندر ہی کپڑے دھوتا تھا اور چاروں بھائی ایک ساتھ ہنسی خوشی رہتے تھے۔

ولا بڑے ہی خوش قسمت بزرگ تھے۔ ان کے صاحبزادے سب کے سب قابل اور کارآمد نکلے۔ غازی یار جنگ نے عدالت کے افیشیٹنگ آفیسر کی حیثیت سے وظیفہ لیا۔ محی الدین احمد صاحب ناظم کروڑگیری ہوئے۔ دین یار جنگ بہادر صدر ناظم کوتوالی و انسپکٹر جنرل پولیس ہوئے اور اب حضور نظام کے پرائیویٹ اسٹیٹ کی کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ رکن الدین احمد صاحب ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدہ پر سبکدوش ہوئے اور اب بھی حضور نظام کے پرائیویٹ اسٹیٹ میں کارگزار ہیں۔

ولا کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ عربی، فارسی اور اردو زبان میں خوب شعر کہتے تھے۔ اردو کا ایک ضخیم کلیات اور فارسی کا ایک دیوان شائع کیا ہے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپائے مبارک بڑا نفیس نظم کیا ہے جو طبع ہو چکا ہے۔

ولا نے حیدرآباد کی مطبوعات جمع کر کے رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ واقع لندن کو تحفتاً دیں جنہیں یورپ کے اہل علم نے شکریے کے ساتھ قبول کیا اور برٹش گورنمنٹ سے "شمس العلماء" کا خطاب بھی پایا تھا۔

ولا نہایت ہی وضع دار اور پابند وضع تھے اور جن لوگوں سے جس طرح ایک دفعہ مل لیتے اسے آخر تک نباہتے تھے۔ میں جب کبھی جاتا اگر کوئی میووں کا موسم ہوتا تو پھل ورنہ مٹھائی ضرور رکھواتے۔ اپنے باغ کے آم بھی کھلایا کرتے تھے ورنہ مٹھائی تو ضرور ہی ہوتی۔ نام بنام ہر ایک کی خیر و عافیت پوچھتے اور پھر عام گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ اپنی تصانیف بھی سرفراز کیا کرتے اور اس کے متعلق گفتگو کی جاتی تو خوش ہوتے تھے۔

ایک زمانہ میں مجھ کو کتب خانہ آصفیہ جانے کی عادت ہو گئی تھی۔ کوئی خاص کتاب مطالعہ میں نہ ہوتی تو اساتذۂ فارسی کے دواوین کا مطالعہ کرتا اور ایسے شعر جن میں محاورات یا خاص خاص تلمیحات وغیرہ ہوتیں نوٹ کرتا جاتا اور ان کو جمع کر کے جب بھی حاضر ہوتا پیش کر دیتا۔ میری اس حقیر کوشش سے بہت خوش ہوتے اور مجھے دعائیں دیا کرتے تھے۔ شاید ہی ان میں سے کچھ چیزیں ان کے کام آئی ہوں گی مگر جو محنت کر کے جمع کرتا اور ان کا خیال رکھ کر پیش کیا کرتا تھا اس سے خوش ہوتے تھے۔

ولا کی ازدواجی زندگی اور خانگی زندگی ضرب المثل تھی اور لوگ اس پر رشک کرتے تھے۔ یہی طرز ان کے صاحبزادوں میں بھی ہے جن میں دین یار جنگ نے سب سے زیادہ اس رنگ میں حصہ پایا ہے۔

کشن پرشاد شاد

ہز ایکسی لنسی سر مہاراجہ یمین السلطنت کشن پرشاد بہادر شاد ان بزرگوں میں سے تھے جو نہ صرف شاعر اور ادیب تھے بلکہ شاعر نواز و شاعر گر بھی تھے۔ مہاراجہ بہادر نے وزارت کی گود میں پرورش پائی اور تعلیم و تربیت بھی شاہانہ طریقے پر ہوئی۔ بچپن سے حضور غفران مکان میر محبوب علی خاں بہادر شاہِ دکن کی مصاحبت حاصل رہی اور حضور مرحوم کے وصال تک شرفِ خدمت حاصل رہا۔

مہاراجہ کو شاعری اور ادب کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔ مہاراجہ چندو لال بھی شاعر، ادیب اور ادیب پرور تھے چنانچہ ان کی علم پروری اور ادب نوازی نے دکن کو گہوارہ بنا دیا تھا۔ شاہ نصیر، شیخ حفیظ وغیرہ کو انہوں نے ہی دہلی سے بلایا تھا اور یہ دونوں ایسے آئے کہ سرزمین دکن ہی میں آسودہ ہو گئے۔

مہاراجہ بہادر نے بھی چندو لال کی طرح سینکڑوں کو جلایا اور ہزاروں کی پرورش کی۔ حیدر آباد کی علمی چہل پہل زیادہ تر انہی کی زیر بار منت ہے۔ یوں تو وہ ہر ایک کی پرورش کرتے اور ہر ایک کو نوازتے تھے مگر شعراء اور ادباء کو خصوصاً بہت سرفراز کرتے تھے۔

رتن ناتھ سرشار، امجد حیدری، ثاقب بدایونی، برق غازی پوری، ظہیر دہلوی، ترکی پانی پتی، جلیل، [illegible]، فصاحت جنگ، اختر مینائی، [illegible]، فانی بدایونی وغیرہ سینکڑوں شعراء کی پرورش مہاراجہ نے کی اور سینکڑوں شعراء اور نثر نگار، جوش بلگرامی، [illegible] یار جنگ، جوش ملیح آبادی، [illegible] صدیقی وغیرہ کی سرپرستی اور اعانت کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاید ہی کوئی بدنصیب ہو گا جسے مہاراجہ سے فیض نہ پہنچا ہو۔

لالہ سری رام دہلوی (مولف خمخانۂ جاوید) سے لے کر خواجہ حسن نظامی تک ہزاروں مؤلفین اور مصنفین مہاراجہ کے مہمان ہوتے۔ کسی کو خانہ باغ میں ٹھہراتے تو کسی کو کسی محل میں اور کسی کو اپنے کسی متوسل کے گھر پر اور پھر اس کو اس کی حیثیت سے زیادہ "رخصتانہ" دے کر رخصت فرماتے تھے۔

مہاراجہ کی تعلیم خاصی اچھی ہوئی تھی۔ فارسی اچھی طرح جانتے تھے عربی سے بھی ناآشنا نہ تھے انگریزی سے بھی بقدر ضرورت واقف تھے اردو پر خاصا عبور تھا۔ مہاراجہ نے سینکڑوں کتابیں لکھیں اور تقریباً اسی قدر چھپ بھی گئیں۔ کسی موضوع پر بند نہ تھے فوٹو گرافی سے لے کر ناول، افسانہ، ڈرامہ، عروض، سفرنامہ، شعر و ادب سب پر تصنیف فرما دیتے۔ شعر بھی خوب کہتے تھے۔ ابتداً مظفرالدین معلیٰ سے مشورہ سخن کرتے تھے پھر استاد داغ سے مشورہ کرنے لگے۔ داغ کے بعد جلیل کو مہاراجہ بہادر نے استاد شاہ بنایا اور خود بھی مشورہ کرنے لگے۔

مہاراجہ بحیثیت انسان بڑے مکمل تھے۔ کردار نہایت بلند اور شخصیت بڑی ہی مکمل تھی۔ عفو و درگزر کا مادہ شاید ہی کسی میں اتنا ہو جتنا مہاراجہ میں تھا۔ میں نے ہزاروں آدمی دیکھے مگر ایسا وسیع القلب کوئی نظر نہ آیا۔ بڑی سے بڑی خطا بلا معذرت خود بخود معاف کر دیتے تھے۔

میرے گھر کے سامنے [illegible] سیف الملک [illegible] کے احاطہ محلے میں ایک کریم الدین نامی نوجوان رہتے تھے۔ بہت ہی معمولی حیثیت کے آدمی تھے۔ واجبی واجبی تعلیم یافتہ تھے۔ ترکی کو اپنا اردو کلام بتایا کرتے تھے۔ ایک روز مہاراجہ کے ایک ملازم نے میرے پاس آکر ان کا پتہ پوچھا۔ میں نے پتہ بتا دیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد انہیں ساتھ لیتے ہوئے آیا اور میرے سامنے دو سو روپے انہیں دے کر رسید لکھوائی اور مجھ سے گواہی بھی لکھوائی کہ میرے سامنے یہ رقم کریم الدین کو دی گئی ہے۔ کریم الدین نے رقم لینے کے بعد کہا کہ انہوں نے چند روز پہلے مہاراجہ کی خدمت میں ایک منظوم درخواست بھجوائی تھی کہ میں اجمیر شریف جانا چاہتا ہوں، زادِ راہ سرفراز فرمایا جائے۔ چنانچہ اب مہاراجہ نے سرفرازی فرمائی ہے۔

چونکہ مہاراجہ اس قسم کی داد و دہش کے عادی تھے اس لئے مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ دو چار روز کے بعد میں حاضر ہوا تو مہاراجہ بہادر نے بلا لیا اور انھوں نے پوچھا کریم الدین جو تمہارے گھر کے پاس رہتا ہے کون شخص ہے۔ میں نے اس کے متعلق جو کچھ جانتا تھا عرض کر دیا اور یہ بھی عرض کر دیا کہ استاد ترکی کو اردو غزل بنا کے دیتے ہیں۔ یہ سن کر مہاراجہ بہت محظوظ ہوئے فرمانے لگے کیا ترکی صاحب اردو زبان کے بھی استاد ہو گئے؟ میں نے عرض کیا وہ ہر زبان کے استاد ہیں۔ فارسی اور اردو دونوں پر انہیں یکساں عبور ہے اور اب تو مشاعروں میں اردو غزل بھی پڑھنے لگے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد مہاراجہ بہادر نے کمرے میں جا کر ایک گول لپٹا ہوا کاغذ لا کر مجھے عنایت فرمایا کہ اسے دیکھ کر تلف کر دو۔ یہ ایک عرضی کا کاغذ تھا جو بڑی سائز کا تھا اور اس پر موٹے قلم سے ایک نہایت بیہودہ شعر مہاراجہ کے متعلق لکھا ہوا تھا جس میں بڑی غلیظ گالی تھی۔ اس شعر کو پڑھ کر میں نے کاغذ کے پرزے پرزے کر دئے اور میرا چہرہ غصے سے متغیر ہو گیا۔ میرا یہ حال دیکھ کر مہاراجہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: "پانچ چھ مہینے پہلے اس شخص نے ایک تحریر بھیجی تھی کہ اجمیر شریف جانا چاہتا ہوں آمد و رفت کے لئے اخراجات پانچ سو روپے دئے جائیں۔ میں نے اس وقت کوئی توجہ نہیں کی، ڈیڑھ دو مہینے کے بعد پھر اس شخص نے ایک تحریر بھجوائی مگر میں نے اس پر بھی کوئی توجہ نہیں کی۔ اب دو تین مہینے کے انتظار کے بعد اس نے اس طریقے سے یاد دہانی کی ہے۔ پہلا مصرع ہے ؎

شاد ہو کر کیوں نہ خاطر شاد کی؟

یہی گالی تھا' دوسرے مصرعے میں اس نے گالی دے کر ہجو کی ہے۔ یہ عام طریقہ ہے شعراء پہلے قصیدہ پیش کرتے ہیں پھر تقاضا کرتے ہیں اور آخر میں ہجو کرتے ہیں۔ اس غریب نے بھی یہی کیا۔" میں نے عرض کیا بالکل صحیح ارشاد ہوا مگر کسی شاعر نے کسی امیر کی ہجو ایسی نہیں کی ہے۔ اتنا ہی کہ جو ہجو فردوسی سے منسوب کی جاتی ہے وہ بھی ایسی بیہودہ نہیں ہے۔ فرمانے لگے تم سچ کہتے ہو مگر وہ فردوسی تھا اور یہ کریم الدین ہے ؎

ہمت ہر کسے بقدر ہمت اوست

بعد کو جب میں نے ترکی سے یہ قصہ کہہ دیا تو انھوں نے کریم الدین کو اپنے پاس آنے سے منع کر دیا تھا اور بیشتر شاگردوں کو یہ قصہ ترکی نے سنا بھی دیا تھا۔

غور فرمائیے ایک بے حیثیت بیہودہ شخص سے ایسی گالی سن کر دو سو روپے دینا مہاراجہ کے کردار کو کہاں پہنچا دیتا ہے؟

میرے خاندان کے کسی بزرگ کی شاگردی مہاراجہ کے کسی بزرگ نے کی تھی اس کا لحاظ وہ مرتے دم تک فرماتے رہے اور میں ہمیشہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ وزارت سے علیحدہ ہونے کے بعد مہاراجہ سے جن جن لوگوں نے بے اعتنائیاں کی تھیں اور جو لوگ انہیں سلام کرنے بلکہ ان کا سلام لینے تک کے روادار نہ تھے ان سے جو جو سلوک مہاراجہ نے کئے ہیں میں بخوبی جانتا ہوں' دوبارہ وزیر اعظم ہوتے ہی ان سب لوگوں نے پرستش کر دی، صدقے اتارے، پھول چڑھائے، قصائد، قطعات، تاریخیں پیش کیں اور طرح طرح سے آمد و رفت شروع کر دی اور مہاراجہ اسی طرح ملتے رہے جیسے ملازمت کے زمانے میں ملتے تھے بیچ کے سلوک کو انھوں نے بھلا ہی دیا۔ ایسا وسیع القلب اور درگزر کرنے والا شاید ہی پیدا ہو۔

مہاراجہ میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کبھی کسی کا دل نہ توڑتے اور جو شخص جو بھی خواہش کرتا اس کی تکمیل کا وعدہ کر لیتے اور اپنی حد تک کوشش بھی کرتے تھے، اپنے آپ کو انھوں نے کبھی بھی بڑا آدمی نہیں سمجھا۔ ہمیشہ اپنے تئیں عاجز و فقیر و غریب ہی سمجھتے رہے۔ خود شریف الطبع تھے اس لئے ہر ایک پر اعتماد کرتے تھے۔ ابتداءً ان کی پیشی میں مولوی محمد علی وغیرہ (کماشت مل محرر وغیرہ) رہے ان پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ سارا کام انہی پر چھوڑ دیا تھا ان کے دستخط دیکھ کر خود دستخط کر دیا کرتے تھے اور محمد علی کا یہ حال تھا کہ انھوں نے بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور جھوٹی اعتماد دیتے رہے۔ اسی وجہ سے لوگ ان کے مخالف ہو گئے چنانچہ لال خاں کوتوال نے غرض جعل سازی اور جعل کا مقدمہ بنا کر محمد علی کو مشہور کرا دیا اور وہ حیدرآباد سے پونا چلے گئے اور بعد میں احمد نگر جا رہے جہاں ان کا انتقال ہو گیا اور وہیں دفن ہوئے۔ یہ مہاراجہ کی داد و دہش کے نمونے تھے

مہاراجہ کی صدارت عظمیٰ کے زمانے میں مہدی نواز جنگ بہادر ان کے معتمد ہو گئے جو نہایت ہی قابل اعتماد اور شریف آدمی ہیں۔ مہاراجہ نے ان پر بھی اتنا ہی اعتماد کر لیا جتنا کہ [illegible] محمد علی پر کرتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ ان کے بھی مخالف ہو گئے چنانچہ حیدری صاحب نے سر اعظم ہوتے ہی مہدی نواز جنگ کو خاصا پریشان کیا مگر مہدی نواز جنگ بہادر بھی بڑے مرد میدان نکلے اور بڑی ہی مستعدی اور حاضر دماغی سے مقابلہ کیا اور آخر کامیاب رہے۔

مہاراجہ کے انتقال کے بعد ایک کتاب مہدی نواز جنگ بہادر نے مہاراجہ کے متعلق شائع کرائی ہے جو بہت غنیمت ہے مگر ایک کتاب سے کیا ہو سکتا ہے مہاراجہ کی ایک ایک خصوصیت پر ایک ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

مہاراجہ نے علم و ادب کی نہ صرف خدمت کی بلکہ اس گلشن کی آبیاری بھی کی اور دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح علم و ادب کے لئے وقف رہے۔

مہاراجہ کی داد و دہش ایک مستقل موضوع ہے ان کے مورث اعلیٰ راجہ چندو لال بھی بہت دینے والے مشہور تھے مگر ان کی سخاوت پر تبصرہ کرتے ہوئے راے مکھن لال نے اپنی تاریخ "یادگار مکھن لال" میں یہ لکھنے کی جرأت کی ہے کہ "ایک ہاتھ سے رشوت لیتے اور دوسرے ہاتھ سے خیرات کرتے تھے" مگر مہاراجہ کے عہد کا مورخ ایسی جرأت نہیں کر سکتا کیونکہ مہاراجہ نے کبھی بھی رشوت نہیں لی نہ کبھی نذرانہ قبول کیا اپنی جاگیر کی آمدنی اور اپنی پیشکاری کی تنخواہ اور اپنی صدارت عظمیٰ کی تنخواہ ہی سے داد و دہش کرتے تھے۔ آخر میں جب داد و دہش بڑھ گئی اور آمدنی کم ہو گئی تو قرضہ لیتے رہے مگر ہاتھ نہ روکا۔

مہاراجہ ضرورتاً اور بلا ضرورت دیتے ہی رہتے تھے کوئی مانگے یا نہ مانگے مگر وہ دیتے ضرور تھے اور عجیب و غریب طریقے دینے کے تھے۔ حاضر باشوں کو زیادہ دیا کرتے تھے۔ صبح جب موٹر پر سوار ہو کر نکلتے تو ایک تھیلی میں روپے، اٹھنیاں، چونیاں، دونیاں بھری ہوتیں۔ ڈیوڑھی سے نکلتے ہی مٹھی بھر بھر کر پھینکتے جاتے واپس آنے تک یہ تھیلی ختم ہو جاتی۔ دن میں چار دفعہ بھی نکلتے تو اسی طرح نکلتے اور یونہی مٹھیاں بٹتیں۔ پھر جو حاجت مند اور غرض مند آتے انہیں الگ سرفرازی ہوتی۔ رات کے کھانے پر اکثر حاضر باشوں کو روک لیتے اور جب وہ کھانا کھا کر جانے لگتے تو جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالتے اور چپکے سے دے دیتے۔ ایک زمانے میں ہوش بلگرامی اور میں ایک ساتھ جایا کرتے تھے اور ہم رات کے کھانے پر روک لئے جاتے چنانچہ ایک روز لفافہ ہوش کو ملتا اور ایک روز مجھے۔ اس لفافے میں کم سے کم پچیس اور زیادہ سے زیادہ پچاس روپے ہوا کرتے تھے۔

۱۹۳۰ء میں مجھے ٹائیفائڈ ہو گیا۔ میری علالت کی اطلاع ملی تو مکان پر تشریف لائے۔ جاتے جاتے سرہانے کے تکیے کے نیچے دو نوٹ ایک ایک سو روپے کے رکھ کر تشریف لے گئے اس طرح تین دفعہ تشریف لائے اور تینوں دفعہ ہی تکیے کے نیچے نوٹ چھوڑ گئے روزانہ آدمی کو بھیج کر خیریت دریافت کراتے اور میر حبیب احمد صدیقی کو جواب دیتے۔ اے ڈی سی کے ہاتھ الگ روپے بھجواتے اور کہلواتے کہ علاج معقول کریں ضرورت ہو تو اور منگوا لیں۔

میں نے ادارۂ علمیہ کے نام سے ایک بک ڈپو قائم کیا تھا جو عابد روڈ پر تھا۔ ہمیشہ آتے جاتے تشریف لاتے اور کتابیں لے جاتے، بل بھجوانے سے پہلے رقم آ جاتی۔ میرا چھوٹا بھائی رشید اختر چلا جاتا اور وہ جب بھی جاتا فرماتے "بھئی وہ کتابیں جو آئی تھیں ان کی قیمت لیتے جاؤ" چنانچہ ماشاءاللہ سو روپے اسی وقت دے دیتے۔ اس طرح کتابوں کی قیمت چار چار دفعہ ادا ہوتی۔ یہ دینے کے بہانے تھے۔ عید، بقرعید، ہولی، دیوالی کوئی تقریب ہو سرفرازی لازمی تھی۔ دیتے وقت اس کی حیثیت نہیں دیکھتے تھے جسے دے رہے ہیں بلکہ اپنی حیثیت پیش نظر ہوتی۔ دل کھول کر دیتے اور پھر شرماتے کہ میں نے کم دیا ہے۔ یہ بات میں نے مہاراجہ کے علاوہ صرف مولانا خورشید علی ناظم دفتر دیوانی میں پائی ہے اور کوئی تیسرا

اس صفت سے متصف نظر نہیں آیا۔

مذہب کے معاملے میں مہاراجہ "گول" تھے۔ صبح اٹھ کر پوجا بھی کر لیتے نماز بھی پڑھ لیتے، دھیان گیان بھی کرتے اور ذکر و شغل بھی کر لیتے اولیاء کی جاترا بھی دھوم دھام سے کرتے گیارہویں کی نیاز بھی تزک و احتشام سے ہوتی اور محرم بھی بڑی عقیدت سے منایا جاتا۔ مشائخین کے ہاتھ چومتے، گرو بابا کے پاؤں چھوتے دونوں طریقوں پر چلتے رہے۔

ایک مسلمان خاتون سے عقد کیا تھا اور صاف لفظوں میں اپنے آپ کو مسلمان لکھوا دیا۔ مرتے وقت وصیت کی کہ ہندو طریقے پر جنازہ اٹھایا جائے کیونکہ انہیں باور کرایا گیا تھا کہ اگر آپ مرتے وقت کوئی وصیت نہ کریں اور مسلمان طریقے پر دفن ہوں تو آپ کی موروثی پیشکاری آپ کے فرزند خواجہ پرشاد کو نہ ملے گی۔ محض خواجہ پرشاد کی خاطر مہاراجہ نے جو ایسی چلنا پسند کیا مگر بدنصیب خواجہ پرشاد کو پھولنا پھلنا نصیب نہ ہوا، بمبئی میں ایک ہوٹل کی بالائی منزل پر سے گر کر بیچارے کی جان گئی۔

جی تو نہیں چاہتا کہ مہاراجہ کا ذکر ختم کروں مگر لکھنا بہت ہے اور وقت کم ہے اس لئے مجبوراً ختم کر رہا ہوں۔

حیدر آباد کے دورِ اول کے بزرگوں میں سے میں نے ان ناموں کا انتخاب کیا۔ یہ وہ ہیں جن سے میں ذاتی طور پر واقف رہا ہوں اور جو باتیں میں نے لکھی ہیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں اور اپنے محسوسات کو ایمانداری سے پیش کیا ہے۔

لیجئے دوسرے دور کی چند شخصیتوں سے روشناس ہو جائیے یہ دور بڑا طویل ہے اس میں سینکڑوں بزرگ دیکھے ہیں مگر میں نے صرف چند کا انتخاب کیا ہے۔

ضیا یار جنگ

مفتی نور الضیاء الدین المخاطب بہ ضیا یار جنگ یوپی کے قدیم شرفاء سے اور حیدر آباد کے عالم فاضل بزرگ تھے۔ اورنگ آباد کے مشائخ گھرانے سے تعلق تھا۔ حیدر آباد ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی تھی۔ فارغ التحصیل اور نہایت خوش بیں بزرگ تھے۔ علم و ادب کے علاوہ دیگر مشاغل پتنگ بازی، شطرنج، شکار، شاعری، بٹیر بازی، گھوڑوں کا شوق تھا۔ "تاش بینی" میں بھی مشہور تھے، مختلف خوبیاں جمع تھیں۔

یہاں بھی میرے لئے وہی مصیبت ہے جس سے ڈرتا ہوں۔ ضیا یار جنگ بہادر کی حیثیت حیدر آباد میں وہی تھی جو یوپی میں نواب صاحب جہانگیر آباد یا چودھری محمد علی ردولوی کی تھی۔ اس فن "تاش بینی" کو انہوں نے فنی طرح استعمال کیا تھا اور اس میں ماہر کامل تھے مگر تفصیلات نہ تفصیل پسند کریں گے اور نہ حیدر آبادی بزرگ پڑھنے کے بعد مجھے زندہ رہنے دیں گے اس لئے ؎

کردم اشارتے و مکرر نمی کنم!

شطرنج دن دن بھر کھیلتے، پتنگ مسلسل لڑاتے، معین پتنگوں کے پیچھے ہوتے جتنے لوگ شریک ہوتے انہیں کھلاتے پلاتے۔ اپنی عادت کے مطابق ہر بات کا خیال رکھتے تھے۔ یہ تھے مرزوقات، علی حنیف ایک چھوٹی چھڑی ہاتھ میں لئے انگلیا پہنے تھے مسائل علمیہ سے بھرے ہوئے ؎

اک ذرا چھیڑئیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

جب سے بڑا شوق چلتے چلتے لکھوا دیتے، اہم سے اہم مسئلہ شطرنج کھیلتے کھیلتے حل کر دیتے اہم سے اہم مقدمہ کا فیصلہ گڑگڑی گڑگڑاتے ہوئے

فیصلہ کر دیتے ہائی کورٹ میں مفتی اور جج کی حیثیت سے بھی کام کیا اور ایسا اچھا کام کیا کہ بڑے بڑے قانون داں قدرداں تھے امراء ان کی وجہ سے ملنے دینے کی ضرورت تھی اس لئے تحائف اور نقد بھی ساتھ ہے کر قبول کر لیتے تھے مگر مجھے ذاتی طور پر اس کا علم نہیں ہے

۱۹۱۱ء میں جب حیدرآباد میں پلیگ ہوگئی تو ہم لوگ قرولی چوکی میں نواب سید یوسف الدین صاحب کے بنگلہ میں منتقل ہو گئے ضیاء یار جنگ کا باغ بھی قریب ہی تھا ایک روز صبح ناشتہ کر کے والد ضیاء یار جنگ کے پاس جانے لگے تو میں بھی ساتھ ہو گیا، والد مرحوم کے ہم عمر اور شاید استاد بھائی بھی تھے اس لئے دونوں میں بڑی بے تکلفی تھی۔ والد کو دیکھتے ہی لپٹ گئے مجھے چھاتی سے لگایا اور بیٹھ کر شاعری شروع ہو گئی کا کھانا وہیں کھایا، شام میں والد کو "جبل السلام" تک پہنچا گئے۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی جو ان سے ہوئی اس کے بعد والد کے ساتھ اور تنہا بھی حاضر ہوتا۔ جس زمانہ میں پتنگوں کا جشن ہوتا تو مجھے بھی یاد فرماتے، دو دو دن روک رکھتے اور بڑے خلوص سے مدارات اور فرماتے تھے۔

مقرر بڑے اچھے تھے، ایسی اچھی تقریر فرماتے کہ دل کو بھی خوش ہو جاتا تھا، کسی موضوع پر تقریر کر رہے ہوں باغ و بہار کا لطف پیدا کر دیتے تھے مگر بحث و جرح اور برجستہ فقرہ نہ تھے۔ معاصرین کا لحاظ کرتے تھے چھوٹوں کی دل افزائی کرتے کسی میں کوئی بات قابلِ التفات پاتے تو دل کھول کر داد دیتے اور صحیح رہبری کرتے تھے۔

فارسی کے بڑے اچھے شاعر تھے، فارسی غزل بڑی اچھی کہتے تھے، مہاراجہ کشن پرشاد کے مشاعروں میں خصوصیت سے شریک ہوتے اور بڑی سیر حاصل غزلیں پڑھتے تھے۔ شاگردوں کو بنانے اور تیار کرنے کا شوق تھا عبداللہ خاں کامل شاگرد رہے تو ان پر بڑی محنت کی نہ صرف انہیں تیار کیا بلکہ "بارگاہِ خسروانی" میں بھی پیش کر دیا اور ان کے لئے بڑی جدوجہد کی مگر کامل صاحب میں نقص یہ تھا کہ محسن کش تھے انہوں نے ضیاء یار جنگ ہی کے خلاف ریشہ دوانی شروع کی۔ ضیاء یار جنگ اس میدان کے بھی مرد تھے، ایسا چیلنج دیا کہ کامل ناقص ہو کر رہ گئے، بہرحال کسی جگہ رکتے نہ تھے۔ ہر کام کو تیار، ہر بات کے لئے آمادہ تھے۔

اگر ضیاء یار جنگ میں یہ دوسری باتیں نہ ہوتیں اور وہ صرف علمی ادبی کام میں لگ جاتے تو ملک کو بے انتہا فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ یوں بھی انہوں نے ملک کی علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی خدمت خاصی کی ہے۔ ایک مجموعہ کلیات یادگار چھوڑا ہے جو شاید تلف ہو جائے گا کیونکہ ان کے پس ماندوں کو شعر و ادب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

غلام حسین داؤد

آج سے پچاس سال پہلے ایک بڑی اچھی جماعت ترجمانوں اور دکنیوں کی ابھری جو بہت کام کرتی رہی۔ ان میں سب سے زیادہ علمی آدمی غلام حسین داؤد تھے یہ حضرت علمی اور شریف الخاندان تھے، گھر کے بھی خوش حال تھے، طبیعت میں جدت اور دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ علمی ادبی جدوجہد بھی کرتے تھے۔

چھوٹی چھوٹی نظمیں بڑی اچھی کہتے تھے، ان دنوں مرہٹی بانی اور سبیتی بھی خوب عام تھی، جس طرح مندروں میں دیوداسیاں ہوتی ہیں اسی طرح حیدرآباد میں ایک طبقہ مرہٹیوں کا تھا جو نیچ ذات کی ہوتی تھیں مگر ہوتی غضب کی تھیں۔ ان میں سے کچھ "گائن" کی حیثیت سے دربار میں ملازم ہوتی تھیں کچھ "کلاونت" کی حیثیت سے گھروں میں نوکر رہتیں اور کچھ صرف پیشہ کرتی تھیں مگر سب ہوتی تھیں مرہٹی۔ حیدرآباد کا نوجوان طبقہ ان سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ لوگوں نے ایک ایک مرہٹی بطور "داشتہ آید بکار" رکھ لی تھی۔ شہر کا ادنیٰ درجہ تو کم مگر متوسط اور اعلیٰ طبقہ بہت زیادہ اس سے متاثر تھا۔ ان دنوں یہ معیوب بھی نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مرہٹی بھی عجیب چیز تھی، ایک واقعہ اس کے بارے میں

پھٹنے کے بعد مشکل ہوتی تھی۔ اگر لڑکی سے اپنی بیاہتا بیوی کو چھوڑ کر ملیں کو گھر ڈال دیا تھا اور انہی کے ہو رہے تھے۔ ماں کے اس ناسور کا علاج کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ سب سے پہلے غلام حسین وآر نے ایک بڑی نظم کہی اور کمال الدین پلپ ساز نے چھ صفحہ رسالہ کی صورت میں ہزاروں کی تعداد میں شائع کی اس کا نام رکھا "ہرلی کی بہار" پھر جینے کی خوشی پر ایک نظم کہی اور "شرم سے تو نگا ناگ" کے نام سے چھپوائی۔ اس کے بعد "ہرلی نامہ" "ملنے کی دوستی" وغیرہ قسم کی نظمیں بڑی عمدہ عمدہ کہیں اور شائع کیں۔

یہ نظمیں صرف وآر ہی کی نہیں ہوتی تھیں۔ وآر کے علاوہ عبد الحی باغ، میرے والد رتجی، کیفی، زخم، وزیر آثر وغیرہ کے والد بھی شریک ہوتے تھے۔ کبھی یہ شخص چاروں مل کر ایک نظم پوری کرتے، کبھی آدھی ایک کہتا اور آدھی دوسرا۔ نظم چھپواتے اسے بغیر نام کے یا فرضی نام سے اور اس کے طابع و ناشر وآر ہی ہوتے تھے۔ والد کی شادی میں جو مبارکبادیں، سہرے، قطعات وغیرہ کہے گئے تھے، انہیں بھی ایک جگہ کر کے وآر نے کتابی صورت میں چھپوا دیا تھا اسی طرح کیفی کی شادی پر سہروں کا مجموعہ وآر نے چھپوا دیا۔ اس طرح وآر نہ صرف دوستوں کی خدمت کرتے بلکہ ملک کی اخلاقی اور سماجی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ حیدر آباد میں ہاکر چلتے ہی نہیں۔ وآر نے اپنی چھوٹی چھوٹی کتابوں کی دو دو پیسے قیمت رکھ کر لڑکوں کو دینا شروع کیا اور وہ گھوم پھر کر بیچنے لگے اس طرح وآر ہی نے حیدر آباد میں ہاکر پیدا کئے اور پھیری والے کتب فروش بھی انہی کتابوں کی وجہ سے بنے۔ ان کتابوں کے ساتھ لڑکوں نے "آدمی" بغدادی قاعدہ وغیرہ بھی رکھ کر پھرتے بیچنا شروع کر دیا۔ وآر کی نظمیں اتنی مقبول ہوئیں کہ بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئیں۔ یہ سلسلہ وآر اور ان کے ساتھیوں نے سات آٹھ سال تک جاری رکھا۔ میں نے ان تمام کتابوں کو اکٹھا کر کے جلدیں بنا لی تھیں مگر میری زندگی "دشت گردی اور صحرانوردی" میں بسر ہوئی اور پچھلے تیس سال سے حیدر آباد میں بھی تو "محلہ نوردی"۔ کبھی کوٹھی میں تو کبھی سلطان پورہ میں، کبھی چھتہ بازار میں تو کبھی سلطان شاہی میں اس طرح کرایہ کے مکانوں میں رہنے سے میری کتابیں دیمک کی نذر الگ ہوئیں اور ادھر سے ادھر آنے جانے میں الگ ضائع ہوئیں اب ان میں سے ایک کتاب بھی میرے پاس نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے انہیں جھنجھوڑ کر ان کی حفاظت بھی نہیں کی، نہ معلوم کتنے کام کی چیزیں میں نے برباد کیں۔

بچپن ہی میں یہ نظمیں چھپتے چھپتے کی جاتی تھیں میں یاد کر لیا تھا کیونکہ ہمارے دیوان خانہ ہی میں یہ کہی جاتی تھیں۔ ایک نظم کے چند شعر یاد آ گئے، پیش ہیں۔ شانِ نزول یہ ہے کہ ایک صاحب بیوی بچوں کو گھر بار کو چھوڑ کر رنڈی کے گھر پڑے ہیں اور ان کے بیوی بچے یوں دن گزار رہے ہیں ۔۔

ماں بے قرار ہے کہ پکانے کو کچھ نہیں — بچے بلک رہے ہیں کہ کھانے کو کچھ نہیں
بیٹی کے پاس جسم چھپانے کو کچھ نہیں — گھر کا یہ حال ہے کہ بچھانے کو کچھ نہیں
رو رو کے بلکتے بچے کو سلا رہی ہے

. . . .

بہرحال وآر نے ملک کی بڑی خدمت کی۔ ایک پریس انہوں نے قائم کر لیا تھا، کتابت بھی خود کرتے، کبھی کسی سے لکھوا لیتے۔ نہایت رنگین مزاج اور درد مند دل کے مالک تھے، مجھ پر بڑی عنایت فرماتے۔ جب کوئی کتاب چھپواتے سب سے پہلے مجھے عنایت فرماتے تھے۔ رہتے کہاں تھے مجھے معلوم نہیں کیونکہ ہم کبھی ان کے گھر جاتے ہی نہ تھے۔ یہی آتے اور بہت آتے بلکہ دو دو دن ہمارے پاس ہی رہتے تھے۔ سید علی مصلی ایک صوبیدار جو میرے والد کے دوست تھے وہ بھی بہت آتے تھے۔ وآر سے ان کی بڑی بے تکلفی تھی۔ دونوں جب مل بیٹھتے ہوتے تو آپس میں خوب چھیڑ چھاڑ ہوتی تھی۔ اب تو بہت کم لوگ وآر کو جانتے ہیں مگر ان کو حیدر آباد کبھی بھلا نہیں سکتا۔

عزیز یار جنگ

نواب مشرف جنگ کے فرزند تھے، حیدرآباد کے قدیم شرفا کے فرد تھے، باپ بھی بڑے شاعر اور مشہور شاعر فیض کے شاگرد رہے تھے۔ قبیلہ کا مشاعرہ وہی منعقد کرتے تھے۔ حیدرآباد ہی میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ اول تعلقدار اور ناظم عطیات رہ کر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ داغ کے شاگرد تھے اور شعر خوب کہتے تھے۔ دو دیوان ایک واسوخت طبع ہو چکے ہیں۔ والد کے خواجہ تاش ہونے کی وجہ سے مجھ پر بھی مہربان تھے۔

بیس سال ہوئے کہ حیدرآباد کے ایک ماہنامے نے مجھ سے خواہش کی کہ عزیز یار جنگ کی شاعری پر مضمون لکھوں میں نے اس سلسلے میں ایک خط لکھا تو فوراً جواب دیا۔ اتفاق سے ان کے واسوخت پر میرے ایک ملاقاتی نے مضمون لکھا اور مجھ سے کہا کہ میں اس مضمون میں عزیز یار جنگ بہادر کی تحریر کا فوٹو بھی شائع کرنا چاہتا ہوں۔ آپ وہ خط جو آپ کے نام ہے مجھے دے دیجئے چنانچہ میں نے وہ انہیں دے دیا۔ اب جو ان صاحب نے مضمون چھپوایا تو یہ خط اس طرح شائع کیا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انہی کے نام آیا ہے۔ اتفاق سے یہ مضمون عزیز یار جنگ کی نظر سے گزرا تو بہت خفا ہوئے۔ مجھے یاد فرما کر خفگی کا اظہار فرمایا کہ "تمہارے والد کے تعلقات کی وجہ سے میں نے تمہیں یہ خط لکھا تھا اور بے تکلفانہ مراسلت تھی۔ اس اجنبی شخص کو میں ایسا خط کس طرح لکھ سکتا تھا اس نے تو اسے شائع کر کے اپنے ہم چشموں میں اپنی عزت تو بڑھالی مگر لوگ مجھے کیا کہیں گے کہ ایسے معمولی شخص کو اس طرح مخاطب کیا ہے۔ اب تم اعلان کر دو کہ یہ خط میرے نام تھا۔ فلاں شخص نے مجھ سے حاصل کر کے شائع کیا ہے۔"

میں نے ان کی خفگی دور کرنے کی خاطر اعلان کرنے پر فوراً آمادگی ظاہر کر دی مگر ایسا اعلان کرنا اس لئے مناسب نہیں جانا کہ اس طرح دھوکہ دے کر خط اپنی طرف منسوب کرنے والا شخص پست گر جاتا۔ بہرحال عزیز کا غصہ بڑی مشکل سے کم ہوا۔ یہ ان کی وضعداری اور احتیاط تھی معمولی اور اجنبی لوگوں کے ساتھ مراسلت اور بے تکلفانہ مراسلت تک پسند نہ کرتے تھے۔ داغ جب ترپ بازار میں آ گئے تو عزیز بہت قریب ہو گئے تھے اس لئے داغ کے پاس زیادہ اٹھتے بیٹھتے تھے اور شاگردان داغ سے بہت مانوس تھے۔

داغ کے بھتیجے امراؤ مرزا نادان داغ کے بعد بہت پریشان ہو گئے تھے۔ آخر میں عزیز ہی کے گھر پر رہتے تھے اور عزیز ہی ان کے کھانے اور پینے تک کے ذمہ دار تھے چنانچہ پینے کے لئے روزانہ نادان کا ایک روپیہ مقرر کر دیا تھا اور نادان کے مرنے تک ان کی امداد و اعانت کرتے رہے۔ عزیز سے روپیہ وصول کر کے نادان نے ترپ بازار کے کوٹھے کے پھاٹک سے پی اور حالت نشہ میں باہر نکلے ہی تھے کہ ایک موٹر سے ٹکرا گئے گرے اور بری طرح گرے۔ لوگوں نے پہنچ کر اٹھایا تو آخری شعر یہ سنایا ؎

ضعف سے گرچہ جب اماں میں گرا
میں نے ٹھوکر ابھی کہاں کھائی ہے؟

نادان کا کلام پرچوں کی شکل میں تھا اور یہ پرچے ایک تکیے میں بھرے ہوئے تھے جو عزیز یار جنگ کے پاس رہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عزیز یار جنگ کے دیوان "ارمغان عزیز" میں کچھ حصہ نادان کا بھی ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ حقیقت حال کیا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہ ہوگا کیونکہ عزیز خود شاعر تھے اور اچھے شاعر تھے۔

گنگ محل کے قریب مسز ریکاشا کے گھر کے سامنے گھر بنایا تھا اور ڈاکٹر مس ریکاشا سے بڑی دوستی تھی جس کی وجہ سے خود بھی بہت باقاعدہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آخر میں یورپ کا سفر بھی کیا تھا۔ شعر و سخن کا ذوق بہت تھا دن بھر اسی کا چرچا رہتا تھا۔ مرتے تک یہی کیفیت رہی۔ بڑے وضعدار اور شریف آدمی تھے۔

اکبر علی

مولوی اکبر علی مدیر صحیفہ: کیفی صاحب نے ابتداً صحیفہ کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا تھا مگر وہ ایک لاابالی آدمی تھے۔ پابندی سے رسالہ نکالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا اس لئے رسالہ جلدی بند ہو گیا اور اسے اکبر علی صاحب نے لے لیا، چند پرچے ماہوار نکالے اور پھر ۱۹۱۱ء میں حضور میر عثمان علی خان بہادر کی تخت نشینی کی تقریب میں صحیفہ کو روزنامہ بنا دیا اور اس اخبار کو بڑی محنت سے چلاتے رہے۔ اکبر علی حیدرآباد ہی کے رہنے والے تھے۔ غالباً فوجی گھرانے سے تھے۔ دارالعلوم سے مولوی فاضل کامیاب کر کے صدر محاسبی میں ملازمت کر لی تھی۔ پھر صحیفہ جاری کیا تو نوکری چھوڑ دی اور بڑی محنت سے صحیفہ کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ بڑے پابند صوم و صلوٰۃ، حنفی، ہٹ دھرم سے تھے جس بات پر اڑ جاتے اڑے ہی رہتے۔ والد کے دوست تھے اس لئے مجھ پر بڑی عنایت فرماتے تھے۔

۱۹۲۹ء میں جب کہ میں والد کے ساتھ عثمان آباد میں تھا اکبر علی صاحب نے مجھے نامہ نگار بنا دیا اور اضلاع کی ہفتہ وار خبریں بھیجنے کے لئے کہا چنانچہ میں ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء تک عثمان آباد اور گلبرگہ سے صحیفہ کی نامہ نگاری کرتا رہا۔ ہر دو چار مہینے کے بعد دو چار روپے کے ٹکٹ اور چھپے ہوئے فارم اکبر علی صاحب میرے پاس بھجوا دیا کرتے تھے۔ یہی معاوضہ دیتے تھے وہ نامہ نگاروں کو۔ فارم حالات لکھنے میں کام آتے اور ٹکٹ لفافے پوسٹ کرنے میں لگ جاتے۔

۱۹۳۲ء میں جب میں مستقل طور پر حیدرآباد آ گیا تو مجھ سے ترجمہ کی خواہش کی اور میں نے صحیفہ کے لئے ترجمہ کرنا بھی شروع کیا مگر مولوی اکبر علی صاحب نے اس کا معاوضہ نہیں دیا۔ عبدالرؤف صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی جو بعد میں حیدرآباد میں وزیر بھی ہو گئے تھے، مرحوم روزانہ تین چار گھنٹے صبح میں بیٹھ کر ترجمہ کرتے رہے مگر مولوی جی نے انہیں بھی سرکاری ہی ٹرخایا اور کوئی معاوضہ نہیں دیا۔ کاتب، پریس، اسٹاف کسی کی تنخواہیں کم دے کر روتے رہتے مگر مولوی جی کے کان پر جوں نہ رینگتی۔

صحیفہ کو ادبی شمارہ کر کے خاصا فائدہ اٹھایا پھر دہلی اور کلکتہ کے سفر میں حضور نظام کے ساتھ جا کر سفر شاہانہ کا روزنامچہ مرتب کیا اور اس کی طباعت اور اشاعت کے لئے خاصی رقم لی۔ اس طرح آمدنی کے ذرائع بہت معقول پیدا کر لئے تھے مگر تنخواہ مشاہرہ کرتے تو مجبور کر کے مول تول کرتے تھے۔ اس سے زیادہ ہمت نہ کرتے تھے۔ اس طرح بخالت ان کی طبیعت ثانیہ ہو گئی تھی۔ اسی بخالت کے باعث ان سے سب تنگ تھے۔

اس سے قطع نظر وہ بڑے ہی پابند اور دھن کے پکے تھے۔ جو بات ذہن میں آتی لکھتے اور بے دھڑک لکھتے تھے کسی بڑی سے بڑی ہستی کا خوف بھی نہ تھا۔ البتہ سر اکبر حیدری کو بہت مانتے تھے۔ ریلوے کے سلسلے میں سر اکبر کی موافقت کے پوسٹر چھپوائے اور خود رات کو ٹانگہ پر ایک بیرے کی مدد سے [illegible] اور پوسٹر لے کر رات بھر حیدرآباد میں گھوم کر دیواروں پر اپنے ہاتھ سے پوسٹر لگاتے اور سر حیدری سے دو پیسے بھی نہ پاتے۔

پرانی وضع کے آدمی تھے نئی باتیں نہایت ناپسند تھیں۔ اپنے اخبار میں ایک کالم [illegible] کے نام سے رکھا تھا جس میں عورتوں کی آزادی پر پھبتیاں کستے اور مزے مزے سے عورتوں کی بدکرداریاں چھاپتے تھے۔ آج کل جس طرح سدی جیوری گلشن عورتوں کی برائیوں کو مزے لے لے کر لکھتا ہے اسی طرح اکبر علی بھی لکھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک خبر چھپی کہ کوئی لڑکی اپنے موٹر ڈرائیور کے ساتھ فرار ہو گئی مولوی جی نے سرخی یہ باندھی "موٹر سے شوہر" اسی طرح مزے مزے کی چیزیں چھاپتے رہتے تھے۔

بعض خرافات پر دل سے خفا ہوتے اور بڑی عمدگی سے اس کے خلاف لکھتے اور یہ قلمی جہاد مسلسل کرتے رہتے تھے غرض حیدرآباد کے قصر صحافت کے ایک ستون تھے۔ تقریباً چالیس سال تک صحیفہ چلاتے رہے اور بڑی عمدگی سے چلایا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے برابر چلا سکے۔ پرچہ اب تک چل رہا ہے جو انہی کی یادگار ہے۔

ادبی ذوق بھی رکھتا تھا۔ علامہ شبلی کے زمانے میں ایک عربی ناول "انسان الغاب" کا ترجمہ "جنگلی انسان" کے نام سے کیا تھا جو چھپ چکا تھا۔ شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔ آخر عمر میں نعتیہ مشاعرہ ماہوار کرتے تھے اور خود بھی اپنی نعت مشاعرے میں سناتے تھے۔ بہرحال غنیمت آدمی تھے۔

راجیشور راؤ اصغر

حیدرآباد کے مشہور سمستان جگتیال کے والی تھے۔ یوپی میں یہ سمستان ہوتا تو راجہ اصغر پر بڑا فخر کرتا۔ مگر یہاں رہتے، راجہ تھے، زیادہ وقت حیدرآباد ہی میں گزارتے تھے اور علمی و ادبی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا خصوصاً کتابیں بہت چھپواتے رہتے۔ شاید ہی کوئی مہینہ ہو جس میں راجہ صاحب نے کوئی کتاب نہ چھپوائی ہو۔ آخر آخر میں بڑا اچھا کام کرنے لگے تھے۔ ایک بڑی ضخیم ہندی لغات چھپوائی تھی جو اب بڑی کارآمد ہو گئی ہے۔ ایک انتخاب شعراء کا "نغمۂ عندلیب" کے نام سے چھپوایا تھا جو نہایت ضخیم اور نفیس ہے۔

ابتدا مجھ سے مراسلت رہی پھر میں راجہ صاحب کے پاس آنے جانے لگا۔ آہستہ آہستہ بے تکلف ہوتے گئے اور آخر میں خاصے بے تکلف ہو گئے تھے۔ بولتے کم تھے اور اردو صاف نہ تھی مگر لکھتے خوب تھے۔ مولانا مختار احمد سے مشورہ کرتے تھے اور اپنے مسودات انھی کو دکھاتے اور انھی کی معرفت چھپواتے بھی تھے۔ پندرہ ایک سال ہوئے کہ سبکدوش ہوئے۔ تخمیناً ساٹھ سال کی عمر تھی۔ ایک دفعہ اپنی تصانیف مجھے بتائیں تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ تقریباً سوا سو کتابیں تھیں۔ زیادہ تر میری پیدائش سے پہلے کی چھپی ہوئی تھیں۔ عام طور پر لوگ انھیں بیس پچیس کتابوں کا مالک سمجھتے ہیں مگر یہ سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔

چونکہ خود نمائی نہ تھی اور اپنا پروپیگنڈا کرنا نہ آتا تھا اس لئے زیادہ مشہور نہ ہو سکے۔ احباب بھی ایسے نہیں تھے جو اچھالتے اس لئے بیچارے تقریباً گمنام رہے۔

مختار احمد

"محقق اسلامی مولانا مختار احمد" ٹونک کے باشندے تھے۔ مدتوں پہلے حیدرآباد آ گئے اور ایسے آئے کہ یہیں پیوند زمیں ہوئے۔ علمی خدمات کے صلے میں کچھ تنخواہ بھی مقرر تھی اور ٹونک سے جو آتا تھا وہ سال میں دو تین بار خاصی رقم اکٹھی مل جاتی تھی جو یار دوستوں میں صرف ہوتی یا دعوتوں میں۔ تنخواہ کی تو بڑی شاندار دعوت کرتے، خود کھاتے دوستوں کو کھلاتے۔ تنخواہ ختم ہو جاتی تو فاقہ کشی کے لئے بھی تیار ہو جاتے مگر اپنی ظرافت اور تنگ دستی زبان پر نہ لاتے۔ مجھ سے دوستی اس طرح ہوئی کہ ایک رسالے میں ان کا مضمون چھپا تھا۔ میں مکتبہ ابراہیمیہ میں بیٹھا تھا کہ تشریف لائے۔ بغیر کسی تعارف کے مجھ سے پوچھا آپ نے پڑھا ہے؟ میں نے رسالے کا نام پوچھا۔ اچھا مضمون کس کا ہے پوچھا۔ میں نے جواب دیا نہیں! پوچھا آپ جانتے ہیں یہ کون ہے؟ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو پوچھا مضمون کیسا ہے؟ میں نے تعریف کی تو کہا میرا مضمون ہے۔ اس کے بعد گھنٹے گذر گئے گپ شپ اڑاتے رہے۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ جہاں ملتے روک لیتے۔ بڑی گفتگو ہوتی اور خوب باتیں ہوتیں۔ جغرافیہ دانی ان کا خاص موضوع تھا۔ اسلامی شہروں کے متعلق بڑی معلومات رکھتے تھے اور اس موضوع کے سوا میں خوب لکھتے تھے مگر صرف جغرافیہ ہی کی حد تک معلومات محدود نہ تھیں، تاریخ اور ادب پر بھی خاصا عبور تھا۔ عالم و فاضل بزرگ تھے۔

اپنے چھوٹے بھائی مولوی وقار احمد ایم اے ایل ایل بی مدیر روزنامہ نظام گزٹ کی تعلیم و تربیت انھی کی محنت کا نتیجہ ہے۔ پہلے

ایک بیٹے مختار احمد کو بھی بڑی محنت سے تیار کیا تھا مگر وہ بے وقت داغِ مفارقت دے گیا۔ علی جو اب نظام گزٹ میں کام کرتے ہیں انہی کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ مولوی غلام مصطفیٰ ترکی حیدرآبادی سے بڑی دوستی تھی۔ اپنے ایک لڑکے کی شادی ان کی لڑکی سے کی تھی۔

لغات پر بھی مختار احمد صاحب کی نظر بڑی اچھی تھی۔ آخر میں دکنیات کی طرف بھی متوجہ ہو گئے تھے۔ دکنی زبان کی ایک لغات بھی مرتب کر رہے تھے، اپنے موضوع سے ہٹ کر دوسرے مضمون پر کتابیں لکھتے اور فروخت کر دیتے تھے بعض بڑی اچھی کتابیں فروخت کر دیں جو دوسروں کے نام سے چھپیں۔ راجہ راجیشور راؤ اصغر بھی ان سے اچھا سلوک کرتے تھے مگر یہ اپنے شاہ خرچ تھے کہ زندگی تکلیف ہی میں بسر کی۔ آدمی وضعدار اور بڑے مخلص تھے۔ بڑی فراخ دلی اور ادبی جذبہ حوصلگی خاصی تھی۔ طبیعت میں تصنع اور بناوٹ مطلق نہ تھی۔

مانک راؤ وٹھل راؤ

پائگاہ کے جاگیرداروں میں ملازم بھی تھے۔ پرانی وضع کے عربی فارسی پڑھے ہوئے بزرگ تھے۔ تاریخ کا ذوق فطری تھا تاریخِ دکن پر بڑی اچھی نظر تھی۔ بستانِ آصفیہ کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کی کئی جلدیں چھپ چکی ہیں چونکہ جدید طریقۂ تحقیق اور طریقۂ ترتیب سے ناواقف تھے اس لئے اپنی کتابیں بڑے غیر علمی طریقے پر مرتب کیں اور چھاپیں۔ مگر مواد نہایت ہی عمدہ جمع کیا ہے۔ آنے والی نسلیں اس مواد کو اپنے حسبِ منشا استعمال کر سکتی ہیں جو بڑا کارآمد ہو گا۔

ان میں خصوصیت یہ تھی کہ نہایت معتدل قسم کے بزرگ تھے تعصب و تنگ نظری مطلق نہ تھی۔ تاریخ کو تاریخ ہی کی طرح مرتب کرتے تھے افسانوی واقعات سے تاریخ مرتب کرنے کے قائل نہ تھے۔ سو سال پہلے ایک مورخ غمگین لال گزرے ہیں جو دیوان چندو لال کے میر منشی تھے۔ انہوں نے ایک بڑی نفیس تاریخ "یادگارِ غمگین لال" مرتب کی تھی اور بڑی ہی دیانت داری سے واقعات مرتب کئے تھے ان کے بعد مانک راؤ ہی کا نمبر ہے۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ میری ملاقات راؤ صاحب سے کب ہوئی مگر ۲۰ سال سے ملاقات تھی ہی جب کبھی حسینی علم کی طرف جاتا ان سے ضرور ملتا اور وہ جب کبھی چادرگھاٹ کی طرف آتے مجھ سے ضرور ملتے تھے تاریخ کی ترتیب کے سلسلے میں مشورہ کرتے مگر مشورے پر عمل نہ کرتے بلکہ اپنے ڈھب ہی پر ترتیب دیتے تھے۔

کام کرنے کا ڈھنگ بڑا اچھا تھا۔ اخبارات کے کٹنگ بڑے سلیقے سے جوڑ رکھتے تھے اور الگ الگ عنوانات پر الگ الگ کٹنگ جمع کرتے تھے اسی طرح انہوں نے تاریخ مسلسل مرتب کی تھی اور بڑی عمدہ چیز محفوظ کر دی تھی مثلاً حیدرآباد کی طغیانیاں ایک جگہ کر دی تھیں بعض چھوٹی چھوٹی مستقل رسالوں کی نقلیں جو بڑی اہم تھیں۔ گزشتہ تیس چالیس سال میں ایسا اچھا اور کارآمد مواد کسی نے بھی فراہم نہیں کیا۔

ذات کے برہمن تھے اور پابندِ مذہب بھی تھے۔ کھانے پینے میں احتیاط کرتے تھے مگر عملی رواداری اور مذہبی بے تعصبی خاصی تھی۔ طبیعت میں انکسار تھا اور بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ مرنے سے پہلے ایک جلد تیار کر رکھی تھی اور چھپانے کی فکر میں تھے کہ انتقال ہو گیا۔ بہر حال دو تا چھ جلدیں جو انہوں نے چھپوا دی ہیں یہی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

سردار نواز جنگ

آج سے تیس پینتیس سال پہلے آپ نے انگریزی اخباروں میں "سید سردار علی کی کھلی چٹھی" پڑھی ہو گی۔ یہ کھلی چٹھیاں انہی نواب سید سردار علی خاں

المخاطب بہ سردار یار جنگ کی ہوتی تھیں۔

یہ حیدر آباد ہی کی پیداوار تھے ان کے والد سردار دلیر الملک بہادر یہاں معتمد وغیرہ رہے اور آخر میں اپنے عہدے کی وجہ سے بہت مشہور ہو گئے تھے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں جبکہ ہم لوگ ضلع رائچور میں تھے سردار صاحب کو میں نے دیکھا جہاں وہ دوم تعلقدار (ڈپٹی کلکٹر) ہو کر آئے تھے۔ ہمارے مکان کے قریب ہی ان کا رہائشی مکان تھا شام میں اکثر والد انہی کے پاس جا کر بیٹھتے اور رات میں اکثر سردار صاحب ٹہلتے ہوئے ہمارے پاس آجاتے تھے، سردار صاحب مجھ سے بہت مانوس تھے۔ کاغذ، لفافے، پنسل اور رنگین تصویروں کے رسالے مجھے دیا کرتے تھے۔ رائچور سے والد کا تبادلہ عثمان آباد ہو گیا اور پھر سردار صاحب بھی وہاں سے دوم تعلقدار ہو کر آگئے اور پھر ضلع ہی میں اول تعلقدار ہو کر مستقر عثمان آباد پہنچے، اس طرح مسلسل ملنے کا اتفاق ہوتا رہا، پھر سردار صاحب رائچور اور اس کے بعد گلبرگہ کے اول تعلقدار ہو کر چلے گئے، والد عثمان آباد ہی میں تھے اور میں حیدر آباد میں تھا کہ سنہ ۱۹۲۳ء میں سردار صاحب نے والد کا تبادلہ گلبرگہ کر دیا اور مجھے بھی بلا لیا اور مجھ سے اپنے پاس صوبہ داری ہی میں کام لینے لگے اور مسلسل ڈیڑھ دو سال تک میں ان کے پاس کام کرتا رہا، صوبہ داری تخفیف ہو گئی تو میں معطل رہ گیا اور پھر دکن ٹائمز میں چلا گیا اور سردار صاحب ناظم (پوسٹ ماسٹر جنرل) ہو گئے مگر مجھ سے مراسم آخر تک رہے۔

مسئلہ برار پر ایک مستقل کتاب اور کئی داستانوں کی سوانح عمریاں سردار صاحب نے لکھی ہیں ایک مختصر سی اردو کتاب برار سے متعلق "خیابانِ برار" کے نام سے بھی شائع کی ہے۔ لوگ ان سے انگریزی کے مصنف کی حیثیت سے واقف ہیں مگر کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ یہ اردو کے بھی بڑے اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ آخر میں شاعری تو چھوڑ دی تھی مگر ادب کا ذوق باقی تھا۔

میں نے سردار صاحب کی طرح کا انسان کہیں نہیں دیکھا، معاف فرمائیے نہایت ہی ایمانداری سے عرض کر رہا ہوں کہ سردار صاحب میں بیک وقت واحد صفات مخلوق بھی پائے جاتے تھے اور خصوصیات اصل بھی، گفتگو کرنے لگتے اور تصوف بگھارتے تو معلوم ہوتا کہ بایزید وقت ہیں ان سے بڑا صوفی اور پیر کامل شاید ہی ہو مگر جب گفتگو ختم ہو جاتی اور عمل کا دور آتا تو محسوس ہوتا کہ چنگیز و ہلاکو کی روح ان میں حلول کر گئی ہے۔ ایسی متضاد شخصیت کہیں دیکھنے میں آئی نہ سننے میں۔ میں ان کا ذکر بھی برائیاں گنانے اور بدنام کرنے کے لئے نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس لئے کر رہا ہوں کہ علمائے نفسیات کے لئے ایک مسئلہ پیش کر دوں اور وہ اس پر غور کر سکیں۔ ایسی متضاد شخصیت اور متغیر کردار کا کوئی مقام میں تجویز نہیں کر سکتا۔ آپ ہی ان کے لئے کوئی مقام تجویز کریں تو بہتر ہوگا۔

مجھے ان کے پاس کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے اور چونکہ میں بچپن سے ان کی خدمت میں گستاخ تھا اور وہ مجھ پر بزرگانہ شفقت فرمایا کرتے تھے اس لئے میں ان سے یہ کہہ بھی دیتا تھا کہ آپ کی یہ حرکت منافقت پر محمول کی جا سکتی ہے یہ فعل ظالمانہ ہے تو ہنستے اور فرمایا کرتے "میاں! انسان فطرت میں بدی ہے تو جب تک کسی سے مسلسل نیکیوں کا صدور نہ ہو اسے بدی سمجھو، جب اس کی مسلسل نیکیاں دیکھتے جاؤ تو اس کی نیکی کا گمان کر سکتے ہو یقین پھر بھی نہ کرو۔"

یہ تھا ان کا فلسفہ اور اسی پر وہ عمر بھر کاربند رہے مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی ان کا دوست نہ بن سکا اور وہ چار یار نصیب ہوئے جو اپنی وضعداری کی وجہ سے دوستی نباہتے رہے وہ بھی دل ہی دل میں ان سے متنفر تھے۔

عربی فارسی میں تعلیم بڑی اچھی ہوئی تھی انگریزی کے زمانے کے ادیب تھے آکسفورڈ میں انگریزی کی تکمیل کی تھی، اردو پر بھی خاصا عبور تھا، بڑی صاف سلیس اور بامحاورہ اردو بولتے اور لکھتے تھے۔ مطالعہ اتنا اچھا کہ تصوف، فلسفہ، الٰہیات، منطق، سیر، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، معقولات، منقولات سب پر یکساں نظر تھی، جس موضوع پر گفتگو کرتے یہ معلوم ہوتا کہ خاص اسی کا فن ہے اور اس کے ماہر ہیں، عام معلومات کے علاوہ قانونی اور تجربی معلومات کا بھی یہی حال تھا۔ انگلستان سے واپس ہوئے ہوتے ہوں گے ایک روز فرمانے لگے کہ یہاں کے کالج اور فرینڈز آف

انڈیا سوسائٹی دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے جا کر ان لوگوں کو اطلاع دی اور انھوں نے آنے کی اجازت دے دی تو سردار صاحب نے [illegible] کے [illegible] اور سوسائٹی کے ممبروں کو ایسا الجھایا کہ سب ان کا کلمہ پڑھنے لگے۔ بعض تو ایسے گرویدہ ہوئے کہ اسٹیشن تک خدا حافظ کہنے گئے۔ بہت سے بعض انگریزوں نے بڑی حیرت سے پوچھا کہ تمھارے حیدرآباد میں ایسے قابل لوگ کس طرح پیدا ہوتے ہیں جو اتنی غیر معمولی قابلیت اور بڑے اعلیٰ دماغ کے مالک ہیں۔ میں نے جواب دیا: "آپ لوگوں نے فقط ایک ریونیو منسٹر کو دیکھا ہے۔ منتظمین اور صدر المہام لوگ ان سے زیادہ قابل ہیں۔" حیرت میں مصلحتاً کہی گئی مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کو سردار صاحب نے تجربہ کر دیا۔ یہ حال ان کی قابلیت کا تھا۔

انگریزوں کے زمانے میں حیدرآباد کے متعلق بڑی گڑبڑ ہو رہی تھی۔ گو حالات نازک صورت اختیار کر چکے تھے اس سے حضور نظام کو دہلی بلایا گیا تھا۔ سردار نواز جنگ نے حسن نظامی کو فراہم کر کے دہلی میں حضور نظام کے استقبال کی تیاریاں کرائیں اور اس شان کا استقبال کرایا کہ انگریز بھی دنگ رہ گئے۔ یہ سارا کھیل سردار صاحب نے حیدرآباد میں بیٹھ کر کھیلا۔ پھر جب حضور دہلی سے واپس ہونے لگے تو حیدرآباد میں جشن اور چراغاں کرنے کی تحریک کی اور سب سے زیادہ خود سردار صاحب نے حصہ لیا۔ ایسے کھیل وہ بیٹھے بیٹھے کھیل جاتے تھے۔ اس کا خمیازہ انھیں یہ بھگتنا پڑا کہ انگریز سخت ناراض ہو گئے اور ریذیڈنسی ان کی علیحدگی کا مطالبہ کرتی رہی اور انھیں وظیفہ پر سبکدوش ہونا پڑا۔ یہ سب میری آنکھوں دیکھی بات ہے۔ اس زمانے میں بھی سردار صاحب کے پاس تھی اور جو خط و کتابت میرے سامنے ہوتی رہی اور بعض خطوط مجھ سے لکھوائے گئے۔ اس لیے میں اس واقعہ سے واقف ہوں۔

سردار صاحب کو عبدالقدیر صاحب بدایونی سے محبت تھی۔ ان کا بہت احترام کرتے اور باقاعدہ یاد کرتے تھے مگر بعض لوگوں کے متعلق انھوں نے سفارش کی اور وعدہ کر لیا کہ ان کی سفارش نہیں کریں گے مگر ان کے جاتے ہی ان لوگوں کو ڈانٹ بتائی کہ تمھارے لیے مولوی کو تم نے [illegible] کر کے بنا لیا۔ میں نے ان کے کہنے سے وعدہ کر لیا ہے مگر یاد رکھو تمھیں اسی طرح سزا دوں گا۔

بعض لوگوں کو منصب تحصیلداری دے کر بھجواتے پھر بعض لوگوں سے کہہ کر ان کے خلاف درخواستیں دلاتے اور ان درخواستوں پر کارروائی کر کے انھیں تحصیلداری سے ہٹا دیتے۔ وہ لوگ دوڑے پہنچتے تو ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور رلا رلا کر پھر کسی تحصیلداری پر بھجواتے۔ اس طرح کے کام بہت کرتے اور اس سے خوش ہوتے تھے۔

فصیح جنگ ان کے بڑے مزیدار اور ہمدرد تھے جنھیں وہ "حضرت حسنی" لکھتے اور کہتے تھے۔ ایک مرتبہ مشہور ہوا کہ سردار صاحب کو زوال آ رہا ہے۔ فصیح جنگ نے نواب حسین دوست خاں سے میرے سامنے ہی کہا کہ "اب نواب سردار صاحب کو زوال ہو رہا ہے میں بھی اپنا بستر باندھ رہا ہوں۔ تم بھی اپنی جاگیر کا انتظام کرو اب حیدرآباد کی خیر نہیں ہے۔" سردار صاحب بیٹھے ہوئے سنتے رہے۔

کمال یہ تھا کہ اپنے ماتحتین کو معطل، معزول، برطرف کر کے یا تبادلہ کر کے سردار صاحب یہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے ایک کام کیا ہے اور خلق اللہ کو اس طرح فائدہ پہنچایا ہے۔

سردار صاحب کی دو خصوصیتوں کا میں قائل ہوں۔ ایک تو یہ کہ شاہ پرست تھے۔ مرتے دم تک شاہ پرست رہے اور دوسری یہ کہ جب کسی شخص کے کتنے ہی دشمن ہوں وہ مر جاتا تو اس کے بیوی بچوں سے سلوک کرتے۔ بعض لوگوں کو سردار صاحب نے برباد کیا پھر انھیں معطل کیا اور پریشان کرتے رہے۔ اسی پریشانی میں وہ مر گئے تو آپ نے ان کے بچوں کو جیب سے روپے دیے۔ بیوی کے وظیفے کی کارروائی ذاتی طور پر سفارش کر کے وظیفہ منظور کرایا۔ بعضوں کے لڑکوں کے تقررات کرائے مگر زندگی بھر وہ لوگ معتوب رہے۔

شیر دل ایسے تھے کہ کسی سے ڈرتے نہ تھے اور ہیبت سے ڈرنے کے [illegible] اپنی طرف سے ذکر آ گئے تھے۔ زمانہ ہی سمجھ [illegible] سے ہر شخص سے پیش آتے اور وہ ذرا بھی بے اعتنائی کرتا تو پھر مقابلہ شروع ہو جاتا اور ایسا پیچھا کرتے کہ توبہ بھلی۔

مجلس گڑھ بریاست سامی میں ڈاکٹر عبد الصاحب بھی رہتے تھے جو سردار صاحب کے بھی معالج تھے۔ ناظم طبابت نے ان کا تبادلہ لاتور پر کر دیا اور ان کی جگہ اچھا سا دوسرا بدل بھیجے گئے میں نے سردار صاحب سے ذکر کیا کہ ڈاکٹر صاحب سے کوئی کہ تبادلہ نہیں ہو گا سارا ان کا باندھ میں اور خود سردار صاحب نے ایک پرائیویٹ خط ناظم طبابت کو لکھا کہ ڈاکٹر عبد الصاحب بڑے ہی مخلص اور ہمدرد ڈاکٹر ہیں مجلس گڑھ کے باشندوں اور ہم دونوں کو ان کی بڑی ضرورت اور اس سے صحت فائدہ پہنچ رہا ہے اس لئے ان کا تبادلہ منسوخ کر دیا جائے مگر ناظم طبابت بھی ایک ہی کائیاں تھے انھوں نے جواب دیا کہ لاتور پر ایک ہمدرد اور مخلص ڈاکٹر کی ضرورت ہے وہاں بہت سے کوئی اچھا ڈاکٹر نہیں ہے اس لئے ڈاکٹر عبد الصاحب کا وہاں بھیجا جانا لاتور والوں کے لئے ضروری ہے۔ مجلس گڑھ ڈاکٹر صاحب سے بہت فائدہ اٹھا چکا اب لاتور والوں کو بھی فائدہ اٹھانے دیجئے۔ یہ جواب بڑا دندان شکن تھا مگر سردار صاحب بھی کانٹے کے آدمی تھے جواب وصول ہوتے ہی ایک ٹیلیگرام ناظم طبابت کو کیا کہ ڈاکٹر عبد الصاحب کے بارے میں بارگاہ خسروی میں عرض پیش کر رہا ہوں براہ کرم فرمان کا انتظار فرمایئے ۔۔۔ یہ ایسی ضرب تھی کہ ناظم طبابت اسے روک نہ سکے۔ ڈاکٹر صاحب کا تبادلہ منسوخ کر دیا اطلاع ان کو دی کہ ان کا تبادلہ منسوخ کیا جاتا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کو وہاں سے جانے نہ دیا۔ اب انھوں نے عرض پیش کیا یا نہیں اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر ناظم طبابت تو مرعوب اور مجبور ہو گئے۔

بہر حال سردار صاحب کی شخصیت عجیب مرکب تھی اور عجیب و غریب بزرگ تھے۔

توفیق

دکن میں شاعری کا جو چرچا رہا ہے وہ ہزاروں شاعر ہو گئے اور ہیں مگر یہاں کی شاعری کچھ تخیل کچھ شوق اور کچھ بیکاری کے تحت رہی، جیسے پہلے لوگ سر پر تخلص مقرر کرنا لازمی سمجھا جاتا تھا جس طرح خواہ مخواہ اپنی کنیت رکھ لیتے ہیں اسی طرح بیکاران قوم بھی ایک نہ ایک تخلص ڈھونڈا کرتے تھے اور تخلص کی لاج رکھنے کے لئے غزل بھی کہہ لیتے اور یاران خواہ مخواہ ایسی محفلوں میں پڑھا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض ہستیاں ایسے بھی تھے اور ہیں جنھوں نے عمر بھر دو دو غزلیں کہیں مگر عمر بھر اپنے آپ کو شاعر سمجھتے رہے اور اب تک سمجھ رہے ہیں مگر ایسے لوگ صرف دکن ہی میں نہیں تھے اور ہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان میں بھی ہر جگہ ہیں مگر انھیں میں چند ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے جو واقعی شاعر تھے اور جن کا شمار شعرا میں شمار کیا جا سکتا تھا ایسے ہی لوگوں میں سید جلال الدین توفیق بھی تھے یہ بزرگ سید زادے اور سادات صدر سے تھے۔ پرانی وضع کے تعلیم یافتہ اور خاصے پڑھے لکھے تھے عربیات فارسی سے باخبر اور خوش وضع بھی نظر تھی۔ صدر محاسبی میں ملازمت تھی منتظم ہو کر بیٹھے بچپن سے شعر گوئی کا شوق تھا اور عربی ادب کی مشق تھی۔

طبیعت میں شگفتگی تھی۔ سوچ سمجھ کر شعر کہتے اور احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ابتدا شعرائے لکھنؤ کی اتباع کی اور آتش و ناسخ کی پیروی کرتے تھے مگر جلد ہی اس سے ہٹ کر غالب و ذوق کی طرف متوجہ ہو گئے اور ان دونوں استادوں کا مطالعہ شروع کیا کہ خود ان دونوں کی روش پر گامزن ہو گئے اس سے یہ فائدہ تو ہوا کہ ان دونوں استادوں کے رنگ میں بے تکلف شعر کہنے لگے مگر نقصان یہ ہوا کہ اپنا کوئی رنگ پیدا نہ ہو سکا۔

توفیق نے شروع ہی سے کوشش تو کی کہ رنگ اختیار کرنے کی کی ہے اور ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے مگر تصوف اور اخلاق کی طرف جو وہ مائل ہوتے گئے تو طبیعت آزاد ہو گئی اور زیادہ تر غالب ہی کی پیروی کرتے رہے۔ توفیق خوش گو شاعر پیدا ہوئے تھے۔ ان کی طبیعت شاعری کے لئے موزوں تھی مگر غالب کا رنگ ان پر چھایا رہا تھا اس لئے توفیق کے پاس تغزل اور صرف تغزل ہی تھا اور اس کے لئے "رندی" کی ضرورت تھی اور توفیق ایک دم "تائب" تاہم عاجزی سے کہتے تھے اس لئے توفیق کے رنگ میں جو کچھ کہتے گیا توفیق کو بیتے اشعار میں وہ جان لیتے تھے

اس میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ تغزل تخیل سے پیدا نہیں ہوتا، یہ عمل کا محتاج ہے۔ ذکیؔ اگر بندۂ عاشق مزاج ہوتے اور باقاعدہ عاشق ہو کے معشوق پر ”نذر“ ہو جاتے تو ان سے بھی تغزل نبھ نہ سکتا۔ جس طرح امیر مینائی نے معروضات عشق کو سامنے رکھ کر غزل کہی ہے اور داغؔ کا تعاقب کرنا چاہا ہے اسی طرح ذکیؔ نے بھی مسلک پر بیٹھ کر داغؔ کا تغزل نبھانا چاہا ہے۔ یہی وجہ ان کی ناکامی کی ہوئی۔

رہا غالبؔ سو اس کا انداز بیان ہی اور تھا۔ طرز بیدل میں ریختہ کہنا ذکیؔ سے کیا ہو سکتا۔ اس لئے اس رنگ میں بھی وہ مسائل تصوف ہی بیان کر کے رہ گئے۔ آدمی دماغ دار اور ذہین تھے اگر اپنے دماغ سے داغؔ و غالبؔ کے تتبع کا خیال دور کر دیتے اور اپنے طور پر فکر شعر کرتے تو یقیناً اچھے شاعر بن جاتے مگر وہ اس طرف غور کر ہی نہ سکے۔

ذکیؔ نے ابتدا مشاعروں میں بھی شرکت کی اور وفاتی نظمیں، سہرے اور قصائد بھی کہے مگر درمیان میں وہ بہت محتاط ہو گئے تھے۔ جی چاہتا تو غزل کہتے ورنہ نہ کہتے۔ بعض وقت تو مہینوں شعر نہ کہتے اور پھر شعر کہنے لگتے تو مسلسل کہتے رہتے۔

والد مرحوم سے ذکیؔ کی دوستی بھی۔ صدر صاحب کا میں ذکیؔ کے علاوہ ایک اور شاعر صاحبزادہ حافظ مرزا امیرالدین ضیاؔ گورگانی دہلوی بھی تھے جو شہزادہ مرزا ضیا دہلوی کے فرزند اور داغؔ کے شاگرد رشید تھے۔ یہ بھی بڑے قابل اور عروض کے ماہر تھے۔ والد مرحوم نے ان سے عروض پڑھی تھی اور داغؔ کے انتقال کے بعد انہی سے مشورہ کرتے تھے۔ صدر صاحب کا دفتر آب شہر میں سالار جنگ کی ڈیوڑھی ہی میں تھا۔ آتے جاتے میں اکثر صدر صاحب ہی چلا جاتا اور پہلے ضیاؔ اور ان کے بعد ذکیؔ سے مشورہ ملتا تھا۔ مجھے ذکیؔ سے مل کر خوشی ہوتی تھی کیونکہ نہایت منکسر، بہت ہی متواضع اور بڑے ہی مخلص و رنگ تھے۔ ضیاؔ بھی جو داغؔ اور عروض داں تھے یا تھے ہی تند خو اور طنز سار تھے۔ کبھی ضیاؔ نے مجھے شعر نہیں سنایا۔ شعر تو بڑی چیز ہے سیدھے بات کرنے کے بھی روادار نہ ہوتے تھے۔ سلام کا جواب دینا بھی ان کے لئے بار تھا۔ بخلاف ان کے ذکیؔ کا یہ عالم تھا کہ سلام کیجئے تو کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔ بڑی محبت سے جواب دیتے، مصافحہ کرتے اور خندہ رو ہو جاتے۔ بڑی ہی محبت سے بات چیت کرتے۔ غزل کی فرمائش کی جاتی تو کبھی سنا دیتے کبھی بڑی لجاجت کے ساتھ معافی مانگ لیتے۔

میرے ایک عزیز ہاشم علی مرحوم سے ذکیؔ کے برادرانہ مراسم تھے اور وہ ہاشم علی کے پاس بہت آتے جاتے تھے۔ وہاں گانے بجانے کا چرچا بھی رہتا تھا۔ کبھی کبھار اپنی غزل گا کر بھی سناتے۔ موسیقی سے بھی انہیں دلچسپی تھی اور واقف بھی تھے۔ اپنی غزلوں کی دھنیں خود ہی بناتے تھے اور کبھی کبھار ہارمونیم پر گاتے بھی تھے مگر مخصوص صحبت میں زیادہ لوگ ہوتے تو بے زبان ہو جاتے۔

اسی زمانے میں ایک دو طوائفوں کو بھی اپنا کلام دینا شروع کیا تھا جس کی وجہ سے چند غزلیں خاصی مشہور ہوئیں۔ رنڈیوں سے غزلیں گوانے کا کام حیدرآباد میں سب سے پہلے داغؔ نے لیا۔ جب غزل کی چلتی کے دو ہی طریقے تھے مشاعرے یا رنڈیاں۔ لوگ مشاعرے میں غزل سن کر اکثر شعر یاد کر لیتے جو مشہور ہو جاتے یا پھر رنڈیاں غزلیں گاتیں تو ان سے سن کر عوام بھی گانے لگتے۔ داغؔ نے تو ایک دو رنڈیاں ہمیشہ نوکر رکھیں اور ایک قوال گویا بھی ہمیشہ نوکر رہا۔ شام ہی رنڈیاں آتیں۔ داغؔ اپنی تازہ غزل دے دیتے۔ وہ یاد کر لیتیں۔ بعض یا تو خود سکھاتے یا وہ خود دھن نکال کر سناتیں۔ نہ تو شعر ور دیتے۔ اسی طرح غزلیں گا کر سکھتے۔ یہ غزلیں داغؔ کے پاس سے واپس جاتیں ہی رنڈیاں اپنی سہیلیوں کو سناتیں، سکھاتیں اور دوسرے دن وہ گاتیں۔ ان کے چاہنے والے اس غزل کو گلی گلی پہنچا دیتے اور غزل جس دن کہی جاتی اس کے دوسرے روز شہر بھر میں مشہور ہو جاتی۔ اسی طرح داغؔ کا قوال رحمت اللہ بھی ان کی غزلوں کی چلتی کرتا۔

ذکیؔ کو داغؔ کا یہ طریقہ معلوم تھا اس لئے انہوں نے بھی ایسی ہی کوشش کی مگر زمانہ بدل چکا تھا۔ داغؔ نے انیسویں صدی عیسوی میں رنڈیوں سے پبلسٹی کا کام لیا تھا مگر بیسویں صدی عیسوی میں رنڈیوں کا زور ختم ہو چکا تھا۔ رنڈیوں کی جگہ گراموفون لے چکا تھا۔ اب وہی غزلیں مشہور ہوتی تھیں جو ریکارڈ پر گائی جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں وہی رنڈیاں بھی تھیں اختری بائی جیسی، صاحب وقت، صاحب جان جیسی الغرض داغؔ کی غزلیں گا کر ہی شہرت لیتی

اور چھوٹے سے چھوٹا دل پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ بڑی خصوصیت یہ تھی کہ واقعی عوامی شاعر تھے کلام اتنا صاف بے ساختہ اور ایسی روزمرہ میں ہوتا تھا کہ ایک بار سننا کافی تھا۔ کانوں کے راستے دماغ میں پہنچ کر حافظے میں محفوظ ہو جاتا تھا۔ بخلاف اس کے توفیق ترقی کی کوشش کے پیچھے اور غالب کا قالب برتتے رہتے تھے جس سے عوام بالکل نا آشنا تھے۔ پھر بھی ایک روزی کے منہ سے مشہور ہو کر توفیق کی یہ غزل چند سال تک زبان زد عوام رہی ۔

اس نے کہا ہستی تری میں نے کہا جلوہ ترا   اس نے کہا پھر ہستی میں نے کہا پردہ ترا
اس نے کہا جاتا ہوں میں نے کہا میری اجل   اس نے کہا پھر زندگی میں نے کہا آنا ترا
اس نے کہا شام بلا میں نے کہا گیسو ترے   اس نے کہا صبح صفا میں نے کہا چہرا ترا
اس نے کہا کیا کام ہے میں نے کہا خدمت تری   اس نے کہا کیا نام ہے میں نے کہا بندا ترا
اس نے کہا دل لے گیا میں نے کہا دل لے گیا   اس نے کہا وہ کون تھا میں نے کہا غمزہ ترا
اس نے کہا کس سے لگی میں نے کہا تقدیر سے   اس نے کہا تقدیر کیا میں نے کہا منشا ترا

علامہ اقبال کی یہ غزل مشہور ہوئی ۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

توفیق نے بھی اسی زمین میں ایک غزل کہی جو حیدرآباد میں خاصی مشہور ہوئی ۔

کبھی پردہ دور ہوں میں ادا کبھی ہوں میں پردۂ راز میں   کہ حقیقت اک میری مشترک ہے حقیقت اور مجاز میں
یہ کہاں کے جلوے سما گئے یہ کہاں کی حیرتیں چھا گئیں   کہ ہزاروں آئینے لگ گئے ہیں نگاہ آئینہ ساز میں
نہ کروں سلام جو جھک کر نہ کروں جو سجدہ تو کیا کروں   یہ خیال بت مرے سامنے میں کھڑا ہوا ہوں نماز میں

توفیق جلیس اور پر گوشے کے خواہشمند تھے مگر اس کے اصول اور طریقے نہ جانتے تھے اور نہ انہیں اس کی خبر تھی کہ ان کا کلام عوام سنے اور عوام کے سمجھنے کے قابل نہیں ہے اسی لئے وہ زیادہ مشہور نہ ہو سکے خصوصاً عوام ان سے ناواقف ہی رہے ۔

شمع آسا ترقی سوز غم میں جل کے حاصل کی
یہ گھلنا واہ دولت ہستی ہے میرے دل کی

ایسے شعر بھلا عوام کو کیا پسند آتے اس لئے توفیق خاص خاص لوگوں ہی میں مقبول رہے ۔

توفیق کے ہمعصروں میں کیفی اور امجد تھے۔ امجد سے غزل نہیں سنبھلتی تھی اس لئے انہوں نے ابتدا چند نظمیں کہیں اور پھر رباعی پر اتر آئے اور اپنے آپ کو رباعی کے لئے وقف کر دیا۔ یہ اچھا بھی ہوا کیونکہ غزل میں وہ توفیق اور کیفی کا ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ کیفی البتہ زمانہ شناس تھے اور وہ عوام کے نزدیک رہنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے عام فہم اور رنگین روزمرہ کے شعر کہنے شروع کئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ توفیق سے زیادہ شہرت کیفی کو حاصل رہی اور اب بھی جس قدر کیفی مقبول ہیں توفیق نہیں ہیں۔

شاگردوں کی کثرت سے بھی جو شہرت ہوا کرتی ہے توفیق اس سے بھی اجتناب کرتے تھے ان کے چند ہی شاگرد تھے جو محدود حلقۂ احباب رکھتے تھے۔ اس لئے وہ بھی توفیق کو زیادہ اجاگر نہ کر سکے۔

بہرحال توفیق کو جتنا مشہور ہونا چاہئے تھا اتنی شہرت نہ ہو سکی حالانکہ ان کا ایک دیوان بہت پہلے چھپا پھر اس کا دوسرا ایڈیشن اضافے کے ساتھ شائع ہوا مگر پھر بھی کوئی بات پیدا نہ ہوئی۔ دوسرے دیوان پر جو [illegible] میں شائع ہوا ہے جناب عبدالرزاق راشد نے بڑا اچھا مقدمہ لکھا تھا مگر

زکی کے لائق فرزند تحسین سے ایک انگریزی پیش لفظ مرحوم ثاقب محمد حنیف انس سے بھی لکھوا لیا اور اسے دیوان کے ساتھ چھپوا کر خوش ہو گئے کہ ثاقب محمد حنیف انس زکی کا قدردان ہے۔ (تحسین صاحب بیچارے بھی صدر محاسبی کے کلرک ہی تھے ان کی دانست میں یہ اعزاز بہت بڑا تھا کہ ثاقب جیسا شخص قدردانی کرے) انہیں یہ معلوم نہیں کہ شاعر کو کلام اپنا کس قدر عزیز ہوتا ہے جس پر کلام کے دستخط ہوتے ہیں [illegible] کے محسود ہو سکتے نہیں۔

بہرحال باوجود ایسی کوشش کے اور اپنے بیٹے کی جدوجہد کے زکی حیدرآباد میں زیادہ شہرت نہ پا سکے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے اچھے شاعر، بہت خاص شخصیت کے مالک اور بڑے ہی نیک دل بزرگ تھے۔

تجلی

سید قطب الدین نام تجلی تخلص تھا۔ سید یار جنگ کے پوتے اور [illegible] جنگ کے نواسے تھے۔ والد کا نام سید سیادت علی خاں تھا جو ناظم [illegible] حیدرآباد تھے۔ اپنے والد کے انتقال کے تیسرے روز پیدا ہوئے۔ اماں نے منحوس سمجھ کر [illegible] تو نانا [illegible] جنگ نے اپنے گھر لے جا کر پرورش کی۔ آہستہ آہستہ اماں کو بھی صبر آیا تو بیٹے کو اپنے گھر بلا لیا اور بڑے چاؤ چونچلے سے بسم اللہ خوانی کی تھی کہ خود اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ [illegible] غیاث الدین علی شاہ اور خالہ نے پال پوس کر پروان چڑھایا۔ [illegible] غیاث الدین علی شاہ نے اپنی نگرانی میں اپنے بیٹے سید قطب الدین محمود علی فاضل کے ساتھ تعلیم و تربیت کی۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ [illegible] میں ہوئی۔ پھر دارالعلوم حیدرآباد میں شریک ہو گئے اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔ طبیعت پر تصوف کا رنگ غالب تھا۔ [illegible] آغا داؤد کے ہاتھ پر بیعت کی اور تصوف ہی کے ہو رہے۔ شعر و سخن کا ذوق بھی تھا اور موسیقی کا ذوق تھا۔ گھر کا باپ اور دادا دونوں شاعر تھے اس لئے خود بھی شعر کہنے لگے۔ پہلے [illegible] کی اور پھر [illegible] حیدرآباد آ گئے تو [illegible] کو کلام دکھانے لگے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے تھے۔ فارسی میں پہلے ستار الملک آغا شوستری کو دکھاتے تھے، ان کے انتقال کے بعد سے [illegible] کو دکھانے لگے۔ [illegible] منصب سے سرفراز تھے۔ سید عبدالرحیم [illegible] کی صاحبزادی سے [illegible] سید محمد یوسف الدین صاحب [illegible] کی بھانجی تھیں، شادی ہوئی۔ یوسف الدین صاحب کے کہنے پر نوکری کر لی۔ ابتداً صدر [illegible] ہوئے پھر ضلع [illegible] کے [illegible] اور ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ [illegible] سے عثمان آباد تبادلہ ہوا [illegible] اور گلبرگہ ہی میں اللہ کو پیارے ہوئے اور خواجہ بندہ نواز کے پائیں میں آسودہ ہیں۔ یوں تو آٹھ دس لڑکے لڑکیاں ہوئے مگر تین لڑکے باقی رہے: ۱۔ راقم الحروف ۲۔ سید رفیع الدین کاظمی ۳۔ سید رشید الدین کاظمی۔ رفیع الدین [illegible] ہیں کہ انہوں نے شادی نہیں کی۔ راقم الحروف اور رشید الدین [illegible] اہل و عیال میں مبتلا ہیں۔

تجلی کی شعر و شاعری [illegible] ۱۹۳۰ء تک وہ حیدرآباد ہی میں تھے اور اس زمانے کی سوسائٹی میں خاصا رسوخ رکھتے تھے۔ [illegible] داغ، توفیق، کیفی، محشر، رسا، ناظم، جلیل، اختر، [illegible] ثاقب وغیرہ سے برادرانہ اور دوستانہ مراسم تھے۔ [illegible] دن رات شعر و سخن کا [illegible] رہتا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں [illegible] تعیناتی [illegible] حیدرآباد [illegible] ۱۹۴۰ء میں عثمان آباد تبادلہ ہو گیا تو [illegible] ختم ہو گئی اور [illegible] حیدرآباد کی محفلیں چھوٹ گئیں۔

اضلاع رائچور، عثمان آباد، گلبرگہ اور ان ضلعوں کے تعلقات میں [illegible] تحصیلدار رہے، [illegible] رہے اور اپنے ذاتی [illegible] سے لوگوں میں شعر و ادب کا ذوق پیدا کیا۔ مطالعہ کا بڑا شوق تھا [illegible] محنت سے کتابیں جمع کی تھیں

جو تلف ہو گئیں۔ حیدر آباد سے جب ہم لوگ باہر گئے تو یہاں کا ذخیرہ تباہ ہوا اور مرحوم کے انتقال کے بعد جب ہم اضلاع کا جمع شدہ ذخیرہ گھر میں رکھ کر حیدر آباد آ گئے اور یہاں مستقل طور پر انتظام کر کے اس ذخیرے کو منتقل کرنا چاہا تو وہ بھی برباد ہو چکا تھا اس طرح مرحوم کا بہترین ذخیرہ ضائع ہوا۔

نثر نویسی کا شوق نہ تھا۔ چونکہ حیدر آباد میں فارسی عام تھی اور والد کے بچپن میں فارسی ہی میں مراسلت ہوا کرتی تھی اس لئے فارسی ہی میں لکھتے تھے میرے بچپن میں وہ مجھ کو اور عثمان آباد سے جو خطوط مجھے لکھا کرتے وہ فارسی ہی میں ہوتے تھے اور میں جواب بھی فارسی ہی میں لکھا کرتا تھا۔ جب میں نے اردو نثر لکھنی شروع کی تو انہیں بھی اردو میں خطوط لکھنے لگا اور وہ بھی اردو ہی میں مراسلت کرنے لگے۔ فارسی بولتے بھی بڑی روانی سے تھے مگر لب و لہجہ بالکل ہندوستانی ہوتا تھا ایرانی لہجہ میں یا تو بول نہیں سکتے تھے یا جھینپتے تھے بہرحال ان کی فارسی بڑے بڑے ایرانیوں کا معمول تھا۔ یہی حال اردو کا بھی تھا اردو بھی نہ صرف دکنی لہجے میں بولتے تھے اور ہمیشہ دکنی محاورے استعمال کرتے تھے البتہ شعر میں دکنی محاورات کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے۔

خط کافی بڑے اچھے تھے۔ نواب ظفر الدین خاں مشہور خوشنویس کے شاگرد رہے تھے اور قطعات بڑے اچھے لکھتے تھے یوں عام تحریر بھی خوشخط لکھا کرتے تھے خط شکستہ نہیں لکھتے تھے اور مجھے بھی شکستہ لکھنے سے منع کرتے تھے۔ کہتے تھے یہ خط شکستہ کا لکھنا منصبداروں کا کام ہے۔ شریف لوگ ایسا خط نہیں لکھتے۔

ہمارے خاندان میں سب بزرگ حافظ ہوتے تھے مگر نہ کسی کے نام کے ساتھ حافظ لکھا یا کہا جاتا تھا اور نہ کبھی اپنے حفظ کا اظہار کرتے تھے۔ والد مرحوم نے دس بارہ پارے حفظ کئے تھے اس کے بعد چھوڑ دیا تھا مگر دیکھ کر پڑھنے کے عادی تھے چار پانچ صفحے کے بعد کہیں ضرورت پڑتی تو دیکھ لیتے ورنہ پڑھتے جاتے تھے۔ انتقال سے ایک سال پہلے انہیں اپنے حافظ نہ ہونے کا احساس پیدا ہو گیا۔ گلبرگہ میں جس مکان میں رہتے تھے اس کے پیچھے ایک مسجد افتادہ حالت میں پڑی ہوئی تھی آپ نے اسے درست کرایا اور خود وہاں نماز پڑھنے لگے مغرب عام طور پر اسی مسجد میں پڑھتے تھے۔ رمضان آیا تو آپ نے اس مسجد میں تراویح کا انتظام کرنا چاہا۔ ایک حافظ جی کو مقرر کیا مگر انہوں نے ایک دن پہلے اطلاع دی کہ میں نے آپ سے اس مسجد میں تراویح پڑھانے کا طے کیا تھا مگر اب بعض وجوہ سے پڑھا نہیں سکتا آپ کوئی اور انتظام کر لیجئے۔ اس اطلاع پر بہت برہم ہوئے دوسرا حافظ ملا نہیں۔ مجھ سے کہا تو میں نے کہا آپ خود پڑھا دیجئے۔ آپ کو تقریباً کلام مجید حفظ ہے روزانہ دوپہر میں احتیاطاً پارہ پڑھ لیجئے اور رات میں پڑھا دیجئے۔ ترکیب سمجھ میں آ گئی مجھے اور میرے ایک دوست کو بھی پابند کر دیا کہ تم دونوں بھی دوپہر میں ایک پارہ خوب غور سے پڑھا کرو اور مسجد میں جب میں پڑھاؤں تو سنتے جاؤ غلطی ہو جائے تو لقمہ دیا۔ اس طرح تراویح پڑھانے لگے اتفاق سے مرحوم ہی کے ایک شاگرد لقمہ دینے کا فرض انجام دینے لگے اور میں رہ گیا مگر مرحوم نے اس طرح تیس دن میں تیس پارے ختم کر دئے اور انہیں اپنے حافظ نہ ہونے کا جو قلق تھا جاتا رہا۔

جوانی میں طب کا امتحان بھی دیا تھا۔ عملی طور پر مطب نہ تھا اور خود دائم المرض تھے جب بھی کوئی حکیم نسخہ لکھتا اس میں کتر بیونت کر کے خود ہی طبیعت خراب کر لیتے یہ مرض جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی بڑھتا ہی گیا۔

زود رنج، مجموعہ امراض اور بچوں کی طرح ہر ایک کی بات کا یقین کر لیتے، فوراً گھبرا جاتے اور جلدی ہی بہل جاتے تھے۔ قلبی کیفیت اچھی تھی ذکر و اشغال میں منہمک رہتے تھے اور اوراد و وظائف کے پابند تھے۔ چونکہ مذہبی آدمی تھے اس لئے مجاذیب اور مزارات کے بڑے معتقد تھے جو مجذوب مل جاتا اسے پکڑ کر گھر لاتے، کھلاتے پلاتے، کپڑے بناتے اور نذر دے کر رخصت کرتے تھے۔ فاتحہ، نذر و نیاز ہمیشہ ہوا کرتی تھی بزرگوں کی اور حضرت وہاب کی نذر بڑے اہتمام سے کرتے تھے۔ میں چونکہ ان کے اس طریقے کا مخالف تھا اس لئے مجھ پر خفا ہوتے رہتے یا رو پڑتے تھے اور طبیعت بگڑنے لگی تو میں نے حیدر آباد لانا چاہا کہنے لگے تم مجھے حیدر آباد لے جانا چاہتے ہو لے چلو مگر میں مرنے والا ہوں، وعدہ کرو کہ نعش گلبرگہ لا کر خواجہ صاحب کے پائیں میں دفنا دو گے۔ اگر ایسا کر سکتے ہو تو لے چلو ورنہ انتظار کرو۔ ڈاکٹر حسینی اور ڈاکٹر عبد الرب بھی

اس کی تائید کی کہ جب وہاں دفن ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں لوگوں سے جاتے ہو۔ چنانچہ وہیں انتقال کیا اور خواجہ صاحب کے پائیں میں آسودہ ہوئے۔

چار دیوان مکمل کئے تھے ان چاروں کا اکٹھا کر کے ایک دیوان بنایا جو بہت ضخیم ہو گیا اس کی طباعت کے لئے ایک عزیز ابوالعلائی میں آگرہ سے معاملات طے کئے مسودہ بھجوایا مگر طبع ہی بر طباعت ہو گئی اس زمانے میں دیوان کی تاریخیں بھی لوگوں سے منگوائی تھیں "سلور جبلی" نام رکھا تھا، اس دیوان کا انتخاب میں نے کیا ہے جس کی طباعت کی فکر کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ چھپ جائے گا۔

مرحوم کی شاعری کا یہ حال تھا کہ طبیعت موزوں پائی تھی، مرزا داغ سے عشق و عاشقی سے بعض نا جانکاہ مضامین بوجہ فراق باندھتے تھے ظاہر ہے کہ یہ بات پیدا ہو سکے گی عشق بھی جاری رہتی تھی یہ چاہا تو روزانہ دو دو غزلیں کہہ ڈالتے اور بعض دن تھکتے شعر گوئی کا طریقہ وہی قافیہ پیمائی تھا پہلے قافیے چن لیتے اور مصرع ہر ایک میں موزوں کرتے پھر ان مصرعوں پر مصرعے جم جاتے اس طرح غزل کہی جاتی۔ اس میں آورد ہی آورد ہوتی تھی آمد نادر، ایک آدھ شعر صاف نکلتا اور بس سارا دیوان ایسا ہی ہے۔

آخر میں نعت بہت کہنے لگے تھے، شروع میں شاید طبیعت زیادہ رواں تھی۔ ابتدائی غزلیں کچھ اچھی ہیں۔ اکثر اپنے حسب حال شعر کہتے تھے

دشمنوں سے بھی جھک کے ملتا ہوں یہ تحمل شعار ہے میرا
لگاؤ آگ دل کو، دل کو کر دینا تحمل تم مگر نامل لگی بیجا کسی نا اہل انساں سے
با مردم اہل تند خوئی مشکل با مردم بد ذات نکوئی مشکل
با مردم بد مگو کہ حرف معقول گوئی مشکل و گر نہ گوئی مشکل

اپنی امارت اور خاندانی وجاہت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ دوستی اور عزیزوں سے کبھی کوئی کام نہیں لیا، مرحوم اول دست تحصیلدار تھے اور نصیح جنگ سے بے تکلف یارانہ تھا مگر کبھی نصیح جنگ سے اپنی مستقل تحصیلداری کے لئے نہیں کہا۔ میں نصیح جنگ کے پاس بہت جایا کرتا تھا مگر مجھے ہمیشہ منع کرتے تھے کہ خبردار میرے لئے یا اپنے لئے نصیح الدین سے کچھ نہ کہنا۔

داغ سے والہانہ محبت تھی جب داغ کا ذکر کرتے آب دیدہ ہو جاتے اور اس احترام سے "استاد داغ" کا نام لیتے جیسے کسی پیر کا نام لے رہے ہوں، اسی طرح مولوی سید یوسف الدین صاحب سے بھی انہیں عقیدت تھی۔

حساب میں بہت کمزور تھے اس لئے تاریخ بھی کم کہتے تھے۔ ایک روز بیٹھے ہوئے تاریخ کہہ رہے تھے، میں نے پوچھا کیا ہے۔ کہنے لگے جلال لکھنوی کے انتقال کی تاریخ نکال رہا تھا۔ ایک مصرع بڑا اچھا نکالا ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہے تو کہا "جاں کندنی سید ضامن علی جلال" میں نے کہا یہ تو وفات کی تاریخ نہیں ہے کہنے لگے پھر کیا ہے۔ میں نے کہا یہ نزع کی تاریخ ہے۔ جاں کندنی ہی تو ہے، وفات یا انتقال ابھی کہاں؟ کہنے لگے ٹھیک تو ہے مجھے خیال نہ رہا۔ ان کے استاد عباس مرزا تھے جنہیں آپ نے کچھ تاریخ نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں کئی الفاظ بچے وغیرہ تھے اس کی مدد سے بڑی محنت مشقت کے بعد تاریخ نکالتے تھے وہ بھی وفات جا کر جاں کندنی ہو جاتی تھی۔

میری مضمون نگاری سے بہت خفا رہتے تھے۔ لاہور کے بعض رسائل میرے نام کے ساتھ "مولانا" لکھتے تھے کوئی مضمون مولانا تمکین کاظمی کے نام سے شائع ہوتا تو دیکھ کر بڑے خفا ہوتے کہتے میاں! ہم نے بڑی محنت کی ہے مگر اب بھی لوگ مرزا ہی لکھتے ہیں تم کو شرم آتی ہے کہ ہم اس لقب کے مستحق نہیں ہیں۔ لوگ غلط اندازہ کر رہے ہیں اور تم ہو کہ بائیس سال کی عمر میں مولانا بن گئے وہ لوگ جو تمہیں مولانا لکھتے ہیں صورت دیکھیں تو کیا کہیں گے؟

عظمت اللہ خاں دہلوی کی شاعری پر میں نے ایک تفصیلی مضمون لکھا تھا جو جامعہ میں چھپا تھا۔ یہ مضمون پڑھا تو بڑے خفا ہوئے کہنے لگے یہ بچکی کی گتھیاں ہیں ان میں شاعری کہاں ہے آج تم ہو کہ اسے شاعری ثابت کرنے چلے ہو شعر کی قسم کو ہوا بھی نہیں لگی۔ استادوں کا کلام

پڑھا کرو، شعور پیدا ہوگا۔

مگر باوجود اس دوستی کے بعض باتیں بڑی اچھی تھیں۔ مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ ان سے بحث نہ کروں گا۔ میں نے کبھی کوئی بات مرحوم سے بحث میں کبھی کوئی بات صحیح نہ کر سکتا تو چپ رہ جاتا اور وہ بھی چپ ہو جاتے تھے۔ رات گھر کی پابندی ہوتی اور میں غائب ہو جاتا، دن میں بیٹھتا اور سو جاتا۔ صبح پوچھتے کہاں رات کہاں رہے تھے، تو میں بجائے جواب کے خاموش ہو جاتا۔ تھوڑی دیر جواب کا انتظار کرتے پھر کہتے بیٹھو گھر جا کر کہو کہ رات میں جا رہا ہوں دیر سے آؤں گا تاکہ مجھے انتظار کی زحمت نہ ہو۔ تم کہتے ہو میں پریشان ہوتا ہوں، ابھی تمہیں میری پریشانی کا احساس نہیں ہے، جب تم باپ بنو گے تو قدرِ عافیت معلوم ہوگی۔ ؎ قدرِ بابا آں زماں دانی کہ خود بابا شوی

مرحوم نے بڑی محبت سے میری تربیت کی تھی۔ چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا ہر بات سمجھایا کرتے۔ خصوصاً علمِ مجلسی میں تو انہوں نے مجھے مکمل کر دیا تھا۔ یہ جو ۳۵-۳۶ سال سے لکھ رہا ہوں یہ انہی کی فیضِ تربیت کا نتیجہ ہے۔

عظمت اللہ خاں

عظمت اللہ خاں سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جبکہ وہ ابھی حیدرآباد میں تھے۔ ان کی ایک مختصر کتاب "سریلے بول" چھپی تھی جسے میں نے امتیاز علی صاحب تاج سے لے کر پڑھا تھا اور انہوں نے ہی مجھے ساتھ لے جا کر عظمت اللہ خاں سے ملایا تھا۔ اس کے بعد سے میں ان سے اکثر ملا کرتا تھا اور بڑی پرلطف صحبت رہتی تھی۔ ان دنوں امجد اور تاج بھی وہاں اکثر آیا کرتے تھے۔

عظمت مرحوم ان دنوں ٹیگور کے ڈراموں کا ترجمہ کر رہے تھے۔ اکثر حصہ سنایا کرتے اور پھر مختلف باتیں ہوتیں۔ ایک روز صبح صبح میں پہنچا تو دیکھا کہ یہاں کئی اصحاب تشریف لائے بیٹھے ہوئے ہیں اور بڑی گرم بحث ہو رہی ہے۔ میرے پہنچتے ہی عظمت نے پوچھا "تمکین صاحب! آپ حسن میں رنگ کو بھی شمار کرتے ہیں یا نہیں؟" سوال میری سمجھ میں نہیں آیا، میں نے وضاحت چاہی تو ایک اور صاحب نے تفصیل سنائی کہ یہاں بحث یہ ہو رہی ہے کہ حسن کا تعلق رنگ روپ سے ہے یا نہیں؟ میں نے کہا ہے اور ضرور ہے۔ یہ سنتے ہی حاضرین نے نعرہ لگایا اور عظمت خاموش ہو گئے۔ میں نے پھر اپنے جواب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور سب لوگ چپ ہو گئے۔ بحث صرف یہ تھی کہ کالا رنگ حسن میں داخل نہیں ہے، کالے رنگ کی عورت حسین نہیں کہلا سکتی۔ عظمت کہتے تھے کہ رنگ چاہے گورا ہو یا کالا حسن اس میں بھی ہو سکتا ہے، اور میں بھی عظمت کا ہم خیال تھا۔ صرف ہم دو ایک طرف تھے اور ایک بڑا گروہ دوسری طرف تھا۔ بحث بڑی لمبی ہو گئی تھی، بالآخر بغیر کسی تصفیہ کے ختم ہو گئی۔ یہ ابتدا تھی عظمت سے بے تکلفی کی۔ وہ مجھ سے خاصے بڑے تھے مگر اس روز جیسے بے تکلف ہوتے گئے تو کھل گئے کہ اپنی ساری زندگی کی روداد بلا کم و کاست بیان کر دی اور مجھ سے بھی سب کا اعتراف کرا لیا۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے تھے۔

عظمت نہایت شریف، باوقار، مخلص اور قابل آدمی تھے۔ محنتی اور کارگزار بھی بہت تھے، کام کرنے سے تھکتے نہ تھے۔ خاکے اور اسکیم بنانے میں تو انہیں کمال تھا۔ دفتری کام بڑے انہماک سے کرتے تھے، گھر پر کام کرنے کا وقت انہیں نہ ملتا تھا اس لئے کہ لوگ بہت آ جاتے تھے۔ میں جب گھر سے آتا ان سے ضرور ملتا تھا۔ ایک روز میں نے کہا اپنی نظمیں چھپا دیجئے تو کہنے لگے ایک شرط پر چھپاتا ہوں، تم جمع کر دو اور ایک مضمون میری نظموں کے متعلق ایمانداری سے لکھو، ورنہ مجھ سے نہ نظمیں جمع کرنا ہو سکے گا اور نہ اس پر کچھ لکھنا۔ بات آئی گئی ہو گئی مگر ان کے انتقال کے بعد مجھے خیال ہوا کہ یہ نظمیں اکٹھی کر دوں۔ چنانچہ میں نے "اردو" اور "علیگڑھ میگزین" وغیرہ سے نظمیں نقل کیں اور ایک مضمون "عظمت اللہ خاں اور ان کی شاعری" لکھا اور "سریلے بول" کے ساتھ چھپوا دیا۔ اس وقت تک عظمت کو عام لوگ نہ جانتے تھے۔ "اردو" پڑھنے والے اور علیگڑھ کے طلبا ہی جانتے تھے۔

ہاں یاد آیا، اس مضمون کے شائع ہوتے ہی یار لوگوں نے یہ چرچا شروع کیا کہ عظمت اللہ خاں کی بہترین معدودے چند نظمیں بھی [illegible] اکثر رسالوں کو بھی [illegible] کی نظمیں بھجوائیں۔ میرا مضمون جب عظمت نے پڑھا تو مجھے ایک لمبا چوڑا خط لکھا کہ آپ نے واقعی مجھے شاعر ثابت کر دیا ورنہ میں تو اسے شاعری نہیں سمجھتا تھا۔ اب وہ جو نظمیں تم نے جمع کر لی ہیں سمجھو کہ وہ میں چھپوا دیتا ہوں۔ اس کے بعد ہی وہ بیمار ہوئے اور ماروگیا ورم چلے گئے۔ میں حیدرآباد آ گیا۔ [illegible] ہی تھے، بہت سی مہلت ہونے کی آخری خط میرے پاس آیا کہ اب ڈاکٹر نے لکھنے پڑھنے کی اجازت دے دی ہے۔ ایک دو ہفتے میں واپس بھی ہو جاؤں گا۔ اسی مضمون کا ایک خط عبدالرزاق [illegible] کو بھی لکھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انتقال کی اطلاع بھی ملی۔

عظمت کی موت ناوقت ہوئی۔ ملک کو ان کی شدید ضرورت تھی ان کے جیسے معتدل لوگ بہت کم تھے کاش وہ اور جیتے اور کام کرتے۔

عظمت کے مضامین اور ان کی نظموں کا مجموعہ دونوں جمع ہو گئے ہیں مگر ان کے ترجمے نہیں چھپ سکے۔ عظمت نے بہتیروں کو شاعر اور مضمون نگار ایڈیٹر بنا کر چھوڑا۔ رفیق بیگ نے عظمت ہی کے مشورے سے شاب کا کام کیا اور "نقاش" جاری کیا۔ فرحت اللہ بیگ اپنے مضامین میں عظمت ہی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اپنے تمام مضامین عظمت نے فرحت اللہ بیگ کو ہی دے دیے تھے۔ امجد صاحب عظمت کو رباعیاں چھپنے کے بعد رسالوں کو دیتے یا مجموعے میں چھپواتے۔ اسی طرح قرآن پاک کے لیے نظمیں لکھ کر عظمت کو دکھایا کرتے۔ مسعود جنگ، ہم ہر کام عظمت ہی سے پوچھتے تھے۔ غرض عجیب و غریب آدمی تھے عظمت اللہ خاں!

بعض ایسے لوگ بھی ان سے لکھوا لیتے جو بظاہر بہت قابل مشہور تھے ؎

ہم کہیں ان کو کوئی اللہ کے بندے ہوں گے

بہر حال عظمت ایک مشین تھے جو نظم، نثر، انگریزی، اردو سبھی کچھ ڈھالتے رہتے، رہ گیا ان پر خرچ، ان کے حصے میں اور لگے روپیہ دو روپیہ کے حصے ہی آتے تھے۔

نہایت زندہ دل، ہر دل عزیز آدمی تھے۔ ململ کا کرتا پہنے کہنیوں تک آستین چڑھائے بیدی آرام کرسی پر بیٹھے حقہ یا سگریٹ پیتے جاتے باتیں بھی کرتے شعر بھی کہتے مضمون بھی لکھتے، اصلاح بھی دیتے، مشورے بھی دیتے، "کبھی کچھ ہو جائے" کہتے ہنستے ہنساتے وقت گزار دیتے، خود خوش ہوتے اور دوسروں کو خوش کرتے تھے۔

ہمالیہ سے لے کر بزم افلاک، روس سے لے کر قسطنطنیہ تک، خدا سے لے کر تانا شاہی تک، ہر موضوع پر جی بھر کر گفتگو کرتے اور ہر بات کے تجربے سناتے جاتے تھے۔ مسعود جیسے نہایت سچے بڑے ہی وفادار دوست تھے۔

حکیم شمس اللہ قادری

حیدرآباد کے سب سے پرانے مضمون نگار تھے۔ غالباً حیدرآبادی مضمون نگاروں میں حکیم صاحب پہلے ہیں جو ہندوستان کے اچھے پرچوں میں تحقیقی مضامین لکھتے رہے۔ ورنہ یہاں کے لوگ پہلے تو لکھنے پڑھنے ہی سے شرماتے تھے اور لکھتے پڑھتے بھی تو حیدرآباد سے باہر کے رسالوں میں چھپواتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔

حکیم صاحب کی تحقیق کے قائل بڑے بڑے لوگ تھے چنانچہ شبلی نعمانی وغیرہ ان کو بہت مانتے تھے۔ حکیم صاحب سے پہلے بھی بڑے بڑے محقق اور مورخ ہوا، ہزاروں کتابیں حافظے میں محفوظ تھیں، حیدرآباد میں [illegible] کے لوگ، وہ تھے۔ ایک تھے عبداللہ خاں جو کتب خانہ آصفیہ میں رہتے تھے۔ غالباً اتنی سمجھ تھے جو شخص ملتا اس سے کتاب پر سوال کرتے، سفر پوچھتے اور سب مضمون حافظے میں محفوظ ہو جاتا۔ کسی نے اگر پوچھا تو کتاب کا

نام بتا دیے کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر اس کی تفصیل ہے دیکھ لو۔ تحقیق۔ ساری مولوی عبداللہ خاں سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ تذکرہ گلشنِ ہند مرزا علی لطف کا کسی کباڑی کی دکان سے نواب محمد یار جنگ نے خرید لیا تھا جسے عبداللہ خاں نے کہ عبدالحق (بابائے اردو) سے مقدمہ لکھوا کر شائع کیا تھا۔ عبداللہ خاں کے بعد حکیم صاحب ہی کا نمبر تھا مگر عبداللہ خاں آتشی شخص تھے اور حکیم صاحب پڑھے لکھے تھے مگر طبیعت حافظے سے کم تھی۔ حافظہ غضب کا تھا۔

نوجوان مضمون نگاروں سے بہت خوش ہوتے اور ان کی رہنمائی کرتے تھے چنانچہ حکیم صاحب نے ہمیشہ میری حمایت کی ہے۔ بیچ میں ایک شخص کی وجہ سے مجھ سے حکیم صاحب سے ناچاقی ہو گئی تھی مگر مولانا سید خورشید علی صاحب نے مصالحت کرا دی اور پھر وہ ویسے ہی مہربان ہو گئے۔ آثارِ قدیمہ، مسکوکات، وفیات، کتابیات وغیرہ پر کئی ایک کتابیں چھپ چکی ہیں۔ چند تاریخیں ایڈٹ کر کے چھاپی ہیں۔ سب سے اچھا کام "اردوئے قدیم" چھپوائی جو بڑی اہم اور کارآمد ہے۔ مدتوں رسالہ تاریخ مرتب کرتے رہے۔ اس طرح ملک کی بڑی خدمت کی۔

عبدالحق (بابائے اردو) حکیم جی کے قدیم دوست تھے۔ آخر آخر میں حکیم صاحب نے عبدالحق کے قدم بقدم چلنا شروع کر دیا اور وہی فوائد حاصل کیے جو عبدالحق نے کیے تھے۔ بہتر مکان اور بہتر خوراک ہو گئی تھی۔ ایک بہتر کتب خانہ اور چھاپہ خانہ بھی چھوڑ کر انتقال کیا۔ حکیم صاحب کے تین فرزند ہیں جو روزنامہ اخبار نکالتے ہیں اور کاروبار اچھی طرح چلا رہے ہیں۔

حکیم صاحب میں برائیاں بھلائیاں دونوں تھیں مگر برائیاں ان کی شخصی تھیں جن کا اثر دوسروں پر نہ پڑتا تھا ان کی ذات سے لوگوں کو نقصان کم فائدہ زیادہ پہنچا ہے اور یہی ان کے بقائے دوام کے لئے کافی ہے۔

یہ دورِ دوم تھا جس سے آپ روشناس ہوئے۔ اس دور کے صرف اتنے ہی بزرگ میں نے منتخب کئے ہیں ورنہ بڑی لمبی فہرست ہے۔

اب تیسرے دور کو ملاحظہ فرمائیے۔ اس دور سے بھی چند شخصیتیں میں نے منتخب کی ہیں۔

نظامت جنگ

حیدرآباد میں ایک خاندان بڑا مشہور، قابل اور باعزت گزرا ہے جس کے اراکین عالی اوصاف، علاؤ جنگ اول و دوم، رحمت یار جنگ وغیرہ تھے۔ نواب سر نظامت جنگ بہادر (ایم اے، ایل ایل بی، بیرسٹر ایٹ لا) بھی اسی خاندان کے ایک رکن تھے۔ ابتداً سررشتہ عدالت میں ملازم ہو گئے پھر صدر المہام سیاسیات (پولیٹیکل ممبر) ہو گئے تھے۔ دولت والوں کا یہ عالم کہ دوسروں کا پانی بھی نہ پیتے تھے۔ احتیاط کا یہ عالم کہ مرزا غالب تو دوسروں سے محض ملاقاتیوں کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ خیراتی کام ہوتے رہے۔

شادی نہیں کی تمام زندگی بسر ہوئی۔ چند دوست مکانات بنانے کا شوق رہا۔ بلند شہر میں بنوایا اور پھر اسے فروخت کر دیا۔ اسی طرح کئی مکانات اور باغات بنوائے۔ نہایت ہی خاموش، کم گو، نہ کوئی جاہ و تکبر تھے۔ ابتداً ذرا زیادہ ہی بیٹھے رہے۔ انگریزی ادب پر خاصا عبور تھا۔ نظم و نثر دونوں پر حاوی تھے۔ حضور نظام کی اکثر نظموں کو انگریزی میں منتقل کیا تھا۔ خود بھی انگریزی میں نظم بھی کہتے تھے۔

حیدرآباد نے جہاں عربی، فارسی اور اردو کے شاعر پیدا کئے وہاں انگریزی کے شاعر بھی پیدا کئے ہیں جن میں پہلا نمبر ہے سروجنی نائیڈو کا اور

اور دوسرا امر نظامت جنگ کا، انگریزی کے ادیب تھے اور بڑے بڑے انگریز ان کا لوہا مانتے تھے، مولانا محمد علی کامریڈ کے لئے ان سے مضامین لکھوایا کرتے تھے۔

نواب صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی عظیم الدین احمد ابتداً ضلع عثمان آباد پر مددگار تعلقدار ہو کر گئے۔ اتفاق سے ہم لوگ بھی وہیں تھے، اس لئے ہم سے بھی مراسم ہو گئے چونکہ مجھ پر بہت کرم فرماتے تھے اس لئے میں بھی ان سے زیادہ ملتا تھا۔ یہ بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح کم گو، کم آمیز اور بے غرض بزرگ تھے۔ عثمان آباد سے تبادلہ ہوا تو گلبرگہ کے مددگار ناظم ہو گئے، ان دنوں نواب صاحب نظامت جنگ گلبرگہ ہی کی روڈ پر رہتے تھے اور عظیم الدین صاحب بھی ساتھ رہتے تھے۔ میں اکثر صبح کے وقت ان سے ملنے جایا کرتا تھا، ورانڈے کے سامنے چبوترے پر آرام کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھتے نظر آتے۔ سامنے گوالا بھینس کا دودھ دوہ رہا ہوتا اور نواب صاحب اس طرح بیٹھے اس کی نگرانی کرتے رہتے۔ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ گوالا دودھ دوہتا ہوا ایک ٹھلیا رکھتا اور پھر کچھ دودھ روزانہ اپنے گھر لے جاتا تھا۔ کسی نوکر نے دیکھ لیا اور نواب صاحب کے سامنے ٹھلیا پیش کی کہ اس طرح گوالا روزانہ چوری کرتا ہے۔ نواب صاحب نے تحمل کر کے بڑے غصے سے فرمایا "میں تو بارہ سال سے دیکھ رہا ہوں، تم نے کونسی نئی بات معلوم کی"۔ ٹھلیا گوالے کو دے دی گئی اور معاملہ حسب دستور چلتا رہا۔

اخبار نظام گزٹ ہفتہ وار جاری ہوا تو میں اس میں گپ کا کالم لکھا کرتا تھا۔ نواب صاحب نے شاید کبھی پڑھ لیا اور یہ کالم پسند آ گیا۔ مسلسل پڑھتے رہے اور پھر مجھے یاد فرمایا۔ میں نے دفتر میں ملاقات کی تو بڑی خوشی سے ملاقات فرمائی اور گپ کے سلسلہ پر داد دی اور مجھے فرصت سے ملنے کے لئے فرمایا۔ ایک روز شامت جو آئی تو میں نے بنگلے پر حاضری دی۔ صبح کا وقت تھا، ورانڈے کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اطلاع کروائی تو بلا لیا اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے گفتگو فرمانے لگے۔ میں کھڑا کا کھڑا رہا۔ اسے تکبر ہو یا یہ ادا مجھے پسند نہ آئی۔ یقیناً وہاں کرسی نہ تھی، ایک اسٹول پر اخبارات رکھے تھے۔ میں نے اخبارات اٹھا کر نیچے ڈال دیئے اور اسٹول پر بیٹھ کر گفتگو شروع کی۔ نواب صاحب کو اس طرح بلا اجازت میرا بیٹھ جانا ناگوار گزرا، باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کی اور دو چار منٹ کے انتظار کے بعد چلا آیا۔ اس کے بعد مجھے کبھی ان سے ملنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

میرے ہم زلف مولوی محمد حسین صاحب منصبدار نواب صاحب کے قریبی عزیز ہیں۔ ان کی لڑکی کی شادی میں اچانک سامنا ہو گیا تو صورت دیکھتے ہی نام لے کر مخاطب کیا اور بڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے اور شکایت کی کہ آپ پھر نہیں آئے۔ میں نے اس دن کا واقعہ دہرایا تو مسکرا کر فرمایا معلوم نہیں کیا بات تھی، مجھے یاد نہیں، مگر پھر بھی میں نے ان کے گھر جانے کی ہمت نہیں کی۔

وظیفہ (پنشن) لینے کے بعد بالکل مذہبی آدمی ہو گئے تھے۔ قرآن کی تفسیر بھی لکھ رہے تھے، بعض چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی لکھی تھیں۔ ایک انجمن علم و عمل کے نام سے قائم کی تھی جس کے لئے ایک مکان اور نقد رقم وقف کی ہے۔

مرحوم میں جو صلاحیتیں تھیں وہ ان کی کم گوئی اور بے جا وضعداری کی وجہ سے بروئے کار نہ آ سکیں۔ بہر صورت جب تک ملکی خدمت میں رہے مذہب سے دور دور ہی رہے۔ وظیفے کے بعد جو مذہبی خدمت شروع کی تھی وہ ان کے شایانِ شان نہ تھی، معمولی صلاحیتوں کے لوگ بھی یہ کام کر سکتے تھے، ان سے جو توقعات تھیں پوری نہ ہو سکیں۔

بہت نیک، مخیر اور وضعدار آدمی تھے۔ بعض قرابت داروں کی مالی امداد بھی کرتے تھے مگر اپنے خاندان کی خوشحالی اور ترقی کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اتنا بڑا شخص چاہتا تو بہت کچھ کر سکتا تھا مگر وہ اپنے خاندان والوں کو بھی نہ بنا سکے۔ اس بات کو وہ وضعداری سمجھتے تھے۔ سماجی حیثیت سے بھی قوم انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتی، ایک انگریزی شاعر کی حیثیت سے حیدر آباد ان پر فخر کر سکتا ہے۔ انگریزی نظموں کے چار پانچ مجموعے طبع ہو چکے ہیں جو عام طور پر پڑھے گئے ہیں۔

بہادر یار جنگ

حیدرآباد کے ایک مشہور اہلِ سیف (فوجی) خاندان سے تھے۔ بڑی غیر معمولی شخصیت تھی۔ بچپن ہی سے تقریر کا شوق تھا۔ مشہور ہے کہ کم سنی میں اپنے والد کے ساتھ نظام کلب گئے تو والد نے اپنے دوستوں سے کہا کہ بہادر خاں تقریر بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ لوگوں نے مجبور کیا کہ تقریر کرو۔ تو تقریر شروع کی اور تمہید اس طرح شروع کی کہ آپ لوگ بزرگ اور قابل ہیں، مجھ جیسے کم معلومات کا آپ کے آگے تقریر کرنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ اس پر ہنسی ہوئی تو معلوم ہوا کہ ضرب المثل الٹی استعمال ہو گئی تھی۔ اس طرح جو کچھ پڑھتے یاد رکھتے اور تقریر میں اس کا استعمال بڑی خوش اسلوبی سے کرتے تھے۔

حیدرآبادی تقریر کے معاملے میں ہمیشہ پیچھے رہے ہیں۔ تقریر کا مادہ ان میں ہمیشہ کم رہا ہے۔ غالباً نواب بہادر یار جنگ حیدرآبادیوں میں پہلے شخص ہیں جنھیں قدرت نے طلاقتِ لسانی سے سرفراز کیا تھا۔ آپ کا بیان بھی پُر جوش، پُر اثر و دلفریب تھا۔ تقریر کے لئے کھڑے ہو جاتے تو اپنی ظاہری شخصیت ہی سے حاضرین کو مرعوب کر لیتے اور پھر جب گل افشانیٔ گفتار ہوتی تو غضب ہی کر دیتے تھے۔

ابتدائی تعلیم کچھ زیادہ نہیں ہوئی تھی مگر بہادر یار جنگ نے بعد میں درسی کتابیں بڑی محنت سے پڑھیں اور خاصی قابلیت بہم پہنچائی تھی۔ معمولی عربی اور خاصی فارسی پڑھی تھی۔ اردو کا مطالعہ بڑا اچھا تھا۔ مشاہیرِ ہند جو حیدرآباد آتے، ان سے بہت ملتے اور حصولِ معلومات کی کوشش کرتے تھے۔ سیاسیات سے بڑی دلچسپی تھی۔ شخصی اعتبار سے خلیق اور مجلسی آدمی تھے۔ جلد بازی بھی طبیعت میں تھی۔ ابتداً عراق اور ایران کا سفر کر کے آئے تو حیدرآباد میں اپنے مشاہدات بصورتِ تقریر بیان کرنا شروع کیا۔ اس طرح ان کی تقریریں شروع ہوئیں۔

حیدرآباد کے چند نوجوانوں نے اتحاد المسلمین کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی جس کے روحِ رواں خواجہ بہاؤالدین تھے۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ بہادر یار جنگ غیر معمولی طور پر ابھر رہے ہیں تو اتحاد المسلمین میں کھینچ لیا اور نواب اس طرح اتحاد المسلمین سے ایسے وابستہ ہوئے کہ انجمن ان میں جذب ہو گئی اور وہ انجمن میں جذب ہو گئے۔

سیاسی حیثیت سے ملک کا مفاد اور وطن کی محبت اولین تھی، چونکہ ناتجربہ کار اور کم سن تھے اس لئے غور و خوض کا مادہ کم تھا۔ اگر چند برس اور زندہ رہتے تو غیر معمولی لیڈر ہوتے۔ تقریر بے حد اچھی کرتے تھے۔ نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان بھر میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ قائدِ اعظم بھی بہت پسند کرتے تھے۔

علم و ادب سے بھی شغف تھا۔ ادبی کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ بھی کرتے رہتے اور کبھی کبھار شعر بھی کہتے تھے۔ عین جوانی میں دل کے دورے کی وجہ سے اچانک موت واقع ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ناوقت موت ہوئی ؎

این ماتم سخت است کہ گویند جوان مرد

احمد محی الدین

حیدرآباد کے قدیم اور شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مولوی اکبر کے خاندان سے بھی قرابت تھی جن کا ... خانہ اب تک موجود ہے۔ حیدرآباد ہی میں ولادت، تعلیم و تربیت ہوئی۔ حیدرآباد سول سروس کے لئے کوشش کی مگر انتخاب نہ ہو سکا۔ بددل ہو کر ملازمت کی کوشش کی مگر شدید ناکامی ہوئی۔ آخر کار ملازمت پسند نہ آئی۔ چند روز ملازمت بددل اور بے قرار رہے۔ ان دنوں معین الدین صاحب بی اے سی

یا ڈی سی کالونی کی بورڈنگ کے مہتمم تھے جو ان کے عزیز تھے۔ ہر جمعرات کی رات وہاں "یاران خاص" جمع ہوتے، بڑی دلچسپ صحبت رہتی۔ نواب اقتدار جنگ حقانی بی۔ اے، بی۔ ٹی، مولوی سیف اللہ صدیقی، احمد محی الدین، راقم الحروف وغیرہ جمع ہوتے تھے۔ ان دنوں نواب مسعود جنگ نے حقانی صاحب کو روزنامہ صحیفہ دیا تھا اور وہ بہت چراغ پا تھے، سیف اللہ اور میں انھیں چھیڑنے کے لئے ہر جمعرات کی رات کو ایک ایک گھنٹے کی تعلیمی ہفتہ وار اخبار کی اسکیم مرتب ہوتی، "معلم" نام تجویز ہوتا، ذیلی عنوانات بنائے جاتے اور ایک مکمل خاکہ ایسا تیار رہتا گویا کل سے اخبار جاری ہی ہوگا۔ کسی جمعرات کی رات روزنامہ کا خاکہ بنتا، نام تجویز ہوتا تاثر کے لحاظ سے "الوقت"، ذیلی عنوانات تجویز ہوتے، تمام کام زبانی انجام پاتا، کبھی بک شاپ اور جنرل اسٹور کی تجویز ہوتی۔ اس طرح رات دلچسپی سے گزرتی، صبح معین الدین صاحب نہاری کا نفیس ناشتہ کراتے اور سب لوگ واپس ہو جاتے، چند روز بڑی دلچسپی رہی، اس کے بعد جب معین الدین صاحب نے بورڈنگ چھوڑی تو جمعرات پارٹی بھی ختم ہوگئی۔ میں گلبرگہ چلا گیا اور اسکیمات چونکہ فرضی تھیں اس لئے سب بھول گئے، چونکہ مجھے گلبرگہ سے ہر ہفتہ حیدرآباد آنے کی عادت تھی اس لئے ایک دفعہ حیدرآباد آیا تو "خداوند" (عبدالرحمن نے سیف اللہ کا نام رکھا تھا اور ہم لوگ انھیں خداوند ہی کہتے تھے) ہنسنے لگے، فرمایا کہ احمد محی الدین نے اخبار نکالنا طے کر لیا ہے اور "الوقت" کی اجرائی کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ مجھ سے ملاقات ہوئی تو احمد میاں نے کہا اخبار نکالنا تو طے کر چکا ہوں مگر نام سوچ رہا ہوں۔ "الوقت" مجھے پسند نہیں۔ تجویز کی "مشیر دکن" جیسا نام چاہتا ہوں۔ میں ترکیب نام کا مخالف تھا اس لئے میں نے اس ترکیب کے نام رکھنے کی مخالفت کی مگر احمد میاں اسی طرف مائل تھے۔ آٹھ دس روز کے بعد پھر حیدرآباد آیا تو معلوم ہوا کہ "رہبر دکن" نام تجویز ہوا ہے اور درخواست بھی دے دی گئی ہے چنانچہ منظوری ملی اور "رہبر دکن" بڑی آب و تاب سے نکلا، احمد میاں نے ایسی نیک نیتی سے اخبار جاری کیا تھا کہ وہ ترقی کرتا ہی رہا اور جنوبی ہند کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار ہوگیا۔ ملک و قوم کی خدمت کی اور حق یہ ہے کہ حق خدمت ادا کیا۔ حیدرآباد میں اس وقت دو روزنامے اور نکلتے تھے ایک "صحیفہ" دوسرا "مشیر دکن" یہ دونوں ہی اگلے وقتوں کے پرچے تھے۔ ایک کے ایڈیٹر مولوی تھے دوسرے کے پنڈت جی۔ صحیفہ ایسا اخبار تھا کہ اشتہار چھاپنا خلاف شرع سمجھتا تھا، کسی جاندار کی تصویر صحیفہ میں شائع ہو ہی نہ سکتی تھی۔ مشیر کے پنڈت جی بھی اسی قسم کے کرشمے کرتے تھے، مولوی حبیب محمود حقانی مشیر کے نگران تھے مگر مضامین کی حد تک ان کا تعلق تھا، کاتب اور چھپائی سے وہ بے تعلق تھے۔ ایسے زمانے میں ایک روشن خیال اخبار کی شدید ضرورت تھی۔ اجرائی کے چند سال بعد ہی سے خاص نمبر یعنی سالگرہ نمبر، عید نمبر وغیرہ نکلنے لگے، جو مصور ہوتے تھے۔ شہزادگان و ملاقاتوں کی تصویریں بھی "رہبر دکن" ہی میں طبع ہوئیں۔ غرض جتنی جدت ہو سکتی تھی ہوتی رہی۔ کارکن بھی بڑے مخلص ملے۔ احمد میاں کے بھائی یوسف الدین مہتمم تھے، سعید اللہ خاں ہاشمی ترجمہ کرتے تھے اور زیادہ تر وہی اداریے لکھتے تھے۔ مترجمین اور دوسرے کارکن بھی چیدہ چیدہ، مستعد اور مخلص ملے اور خوب کام ہوتا رہا۔ کسی شخص یا ادارے سے مقابلے کے لئے اتنی صورتیں ہوتی نہیں تھیں جتنی احمد میاں نے کیں۔ اپنے محلے کا کوئی آدمی مر جاتا تو وہ تجہیز و تکفین کے مصارف برداشت کرتے، اس کے متعلقین کا ماہوار وظیفہ مقرر کر دیتے، تنگ دستوں کا خاص طور پر دل سے مقرر کرتے اور وقت پر ادا کرتے۔ رمضان میں خاصے دیا کرتے اور دوسری صورتیں بھی ہیں، اس سلسلہ کا کہاں تک شمار دیتا تھا۔

رہبر دکن جاری کرنے کے بعد گزرے تو نواب اقبال علی خاں مہتمم تعمیرات کے کہنے ہوئے تو میں نے ان کا بائیکاٹ کیا، اس سے بہت متاثر ہو کر حکومت کے پاس منتقل ہوگئے وہ دونوں بڑے اور دو روز اقبال علی خاں کے ہاں رہے، اس طرح وہ کس کا خیال رکھتے تھے، میں سفر پر گیا تو تجار، صوبہ دار اور محلے والوں کو خریدار بنایا اور اتفاق سے سر خریداروں نے نقد چندہ دے دیا، دو قسطیں ادا کی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسدود ہونے کو تھیں مگر اصلاح کا وعدہ کیا اور خاصے خریدار ہر ضلع سے فراہم کئے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ ان کے ایک بیٹے سید معین ہوئے اور ابتدائی تقرر گزیٹڈ خدمت پر ہوا اور وہ احمد محی الدین جس کو حیدرآباد میں حیدری صاحب نے گزیٹڈ خدمت نہیں ملی تھی اپنے احباب اور اعزا کو اپنی کوشش سے گزیٹڈ خدمتیں دلا دیا۔

خوش قسمتی سے میاں کی میراث میں رہی اولاد اچھی ہوئی، تعلیم و تربیت اچھی رہی کہ اولاد کو صرف تین ایک ہی ملیں، ماشاءاللہ خاصی پھولی پھلی ہے ان کی اولاد خاطت سے رکھی بھی رہی ہے۔ یہ برکت ان کی کنبہ پروری اور نیک دلی کی ہے۔ اپنے عزیزوں اقارب کی امنوں سے لا فانی مدد کی اپنی آمدنی کا خاصا حصہ ان پر صرف کرتے تھے۔

مدتوں بلدیہ و میونسپل کارپوریشن کے رکن رہے، وہ بھی شہری خدمت اہلِ عرب کی بیشتر کمیشنوں کے رکن رہتے تھے اور اپنی ذاتی رائے بڑے بے لاگ طریقے سے بیان کر دیتے تھے۔

خاص نمبر نکلنے سے پہلے ترتیب اور مضامین کے متعلق مجھ سے اور تصاویر اور اشتہارات کے متعلق عبدالرزاق صاحب آرٹسٹ سے مشورہ کر لیتے اور ایک لائحہ عمل بنا کر اس پرچے سے کاربند ہو جاتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے لائق فرزندوں نے بڑی عمدگی سے یہ پرچہ کئی جاری رکھا۔ پولیس ایکشن کے بعد جب سب پرچے بند کر دیے گئے تو یہ بھی بند کر دیا گیا۔ انہی کے ایک عزیز نے رہنمائے دکن کے نام سے جاری کر کے دوبارہ پرچہ جاری کر دیا جو اسی طریقے پر چلایا جا رہا ہے مگر ؎

وہ بات کہاں گئی کہ کسی کے ساتھ تھی

فانی

فانی بدایونی کا کلام مدت سے پڑھ رہا تھا، ان کی تصویریں بھی دیکھی تھیں مگر ان سے ملنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔ اتفاق سے ایک روز مغرب کی نماز پڑھ کر جامع مسجد سے نکل ہی رہا تھا کہ ایک دبلے پتلے، متوسط قد و قامت کے شریف آدمی نے مجھ سے جوش ملیح آبادی کے گھر کا پتہ پوچھا۔ اتفاق سے میں جوش ہی کے پاس جا رہا تھا۔ جوش ان دنوں حیدرآباد میں رہتے تھے۔ میں نے کہا چلیے میں بتا دیتا ہوں، وہ ساتھ ہو گئے۔ مجھے سائیکل لے کر اپنے ساتھ پیدل چلنا ہوا کہ رستے میں انھوں نے ایک دو مصرعے بھی کہے اور پھر خانۂ جوش کے گھر تک پہنچ گئے۔ جوش دیوان خانے کے برآمدے ہی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جوش سے ان صاحب کی شاید کبھی ملاقات ہو چکی تھی مگر جوش نے بھی انھیں پہچانا نہیں۔ بالآخر انھیں اپنا تعارف کرانا پڑا کہ میں فانی بدایونی ہوں۔ اس طرح معلوم ہوا کہ یہ دبلا پتلا کھچڑیا سا شخص فانی ہے۔ جوش نے بہت اصرار کیا کہ ان کے مہمان ہو جائیں مگر فانی نے انکار کیا اور نظامیہ ہوٹل کے قیام ہی سے خوش رہے۔ یہ تھی پہلی ملاقات فانی سے۔ اس کے بعد مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں، مہاراجہ بہادر کے پاس، جوش کے پاس، جوش کے پاس، نظامیہ میں۔ چند روز رہ کر فانی چلے گئے۔ دوبارہ آئے تو نام پلی اسٹیشن کے پاس "صلح سرائے" میں قیام کیا اور پھر بعد میں اس مکان میں منتقل ہو گئے جو آتش جدہ کا مکان تھا اور مہاراجہ بہادر نے ان کے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ یہ قیام مستقل تھا۔ پھر تو ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

اردو شعرا میں سب سے زیادہ رنگا شاعر میر تھا جس نے سوا شاعری کے کچھ نہیں کیا اور اگر شاعری کے علاوہ کچھ کیا تو ماتم۔ اشعار ان کا مصرع تاثر کی شاعری مجموعہ ہوتی ہے نفسیات کی اور غیر نفسیات والی شاعر شاعر نہیں کہلا سکتا۔ میر کے بعد کوئی نفسیات والا شاعر اگر پیدا ہوا تو وہ فانی ہی تھا۔ فانی کو نفسیات سے چڑ تھی، وہ نفسیات کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑتے تھے۔ انھیں دنیا اور دنیوی مخلوق سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ تو دل ہی میں رہتے تھے اور اپنے تخیل کی دنیا اور اس کی مخلوق میں مگن رہتے تھے۔ مجسم غم، مجسم حزن و ملال۔ رونا ان کا دستور تھا۔ مسرت بھی ان میں حسرت ہو کر پائی گئی۔

مجھے وراثت الٰہی سے تعلق بھی تھا اس لئے کہ وہ بھی روز بیٹھنے کے عادی تھے، تو آتی ہے ان سے نیز وہ کتنی دیر سے [illegible] تو وہ بھی اس فن کی [illegible] تعریف تھے، بہت بے تکلفی اور بڑی وضع داری رہتی تھی مگر وہ تو کوئی بھی بات کرتے تھے وہ چلتے پھرتے کہ دنیا آپ کے ساتھ [illegible]

محبت میں سارا جہاں رو رہا ہے — وہیں دور ہی آسماں رو رہا ہے

بالکل یہی حال فانی کا تھا۔

میں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ وکالت کریں مگر زیادہ نہ چلے، ہیڈ ماسٹر بنائے گئے فرض کی حد تک رہے، وہ چاہتے تھے کہ مدرسہ میں بچے تعلیم کے ساتھ ہوتا رہے، لڑکے سینہ کوبی کریں، مدرسہ میں بیچ بچی لگائیں اور سب مل کر رٹتے جائیں اور —

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اٹھے
کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اٹھے

کا سماں رہے۔

اور کوئی شخص ہوتا تو دنیا پا لیتا، حیدرآباد پر چھا جاتا مگر فانی نالے کرتے رہے، مہاراجہ بہادر سرپرست، اعظم جاہ بہادر مربی، حیدرآباد مانوس، سارے عہدہ دار ہمدرد، علمی طبقہ سر پر بٹھاتا تھا اور حیدرآباد کے عوام خاص سے مانوس ہو گئے تھے۔

داغ حیدرآباد آگئے تھے تو ان کو مدار المہام کی سرپرستی نصیب تھی، دکنی شہزادے کی قربت رہی، ایک شاہی صاحبہ سے ملاقات تھی مگر داغ نے ایک ایک کے بھول کو بھلا دیا، عوام کو مسحور کیا، عہدہ داروں کو مسخر کیا اور پستی سے فلک نا پر پہنچ کر رہے، داغ زوال دیکھے ہوئے تھے، زوال ان کی نہ ہی فانی کی طرح انہیں سرپرستیاں نصیب تھیں مگر داغ استاذ السلطان بنے اور فانی فنا ہو گئے۔

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا ہمیں!
ہندوستاں میں بستے ہیں ہندوستاں سے دور

کیونکہ حیدرآبادیوں کو مخالف بنا لیا، حیدرآباد والے اپنے وطن کو دکن کہتے ہیں اور صرف شمالی ہند کو "ہندوستان" چنانچہ داغ کے زمانے میں بھی ایسا ہی کہتے تھے، داغ نے بھی ایسا ہی کہنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ جب وہ اہل وطن کو خط لکھتے تو "اے ہندوستان کے رہنے والو" جیسے دور دیس سے لکھتے تھے، داغ اس گُر سے واقف تھے کہ روم میں رہنا ہو تو رومیوں کی طرح رہو، چنانچہ انہوں نے حیدرآباد میں حیدرآبادیوں کی طرح زندگی گزاری اور اسی لئے کامیاب بھی ہوئے مگر فانی نفسیات سے بے خبر، زمانے کے حالات سے ناواقف اور صورت حال کے اندازے سے قاصر تھے، یہ شعر ان کی عزت میں اضافہ نہ کر سکا اور نہ حیدرآبادیوں کے حالات بدل سکا، البتہ فانی سے لوگ بددل ہو گئے اور اسے طنز سمجھ کر حیدرآبادی فانی سے نفرت کرنے لگا، بہرحال فانی نے بڑی تلخ زندگی گزاری، آخری زمانے میں ان کے حالات بد سے بدتر ہو گئے تھے، میرا بھتیجا بھائی رشید کاظمی فانی کے قریب ہی تھا، بیچارہ ان سے بہت ملتا اور ان کی حالت پر روتا تھا مگر ہم لوگ رو کر کیا کر سکتے تھے اور روتے بھی کب تک،

شام کے مرحلے کو کب تک روئیے!

مجھے فانی سے محبت تھی، ان کے لئے اکثر روتا ہوں اور شاید مرتے دم تک روتا رہوں گا، میں دعا کرتا ہوں کہ خدا کسی کو شاعر نہ بنائے اور اگر بنائے تو غالب، داغ، اکبر و اقبال بنائے، میر و فانی نہ بنائے، آمین!

فصاحت جنگ

حافظ جلیل حسن جلیل مانکپوری المخاطب بہ نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل القدر امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ امیر رامپور ہی میں تھے کہ جلیل ان کے پاس پہنچ گئے اور امیر اللغات کا کام کرنے لگے، امیر چاہتے تھے کہ ان کی لغات کے لئے حیدرآباد سے کوئی امداد ملے اور وہ لغات ختم کر سکیں، اسی کے لئے انہوں نے داغ سے مراسلت کی تھی اور داغ نے حضور نظام سے عرض کر کے بہار کے مقام پر حضور لگا [illegible]

ٹھیرے تھے امیر کو باریاب کرایا تھا اور حضور نے انہیں حیدرآباد آنے کا حکم دیا تھا' اس حکم کی تعمیل اور داغ کے تقاضے پر امیر معہ اپنے دو عزیزوں اور شاگردوں کے حیدرآباد پہنچے مگر ایسے آئے گویا مرنے کے لئے آئے تھے۔ آتے ہی بیمار ہوئے اور اللہ کو پیارے ہو گئے' دوسرے لوگ تو واپس ہو گئے مگر جلیل اور احمد مینائی واختر یار جنگ، فرزند امیر مینائی حیدرآباد ہی میں رہ گئے' ابتداً داغ نے ان دونوں کی مدد کی پھر مہاراجہ کشن پرشاد نے دونوں کو ملازم رکھ لیا۔ داغ کا انتقال ہوا تو مہاراجہ نے جلیل کو پیش کیا اور حضور غفران مکان کی استادی کا شرف حاصل ہوا' حضور غفران مکان کے بعد حضور بندگان عالی نے بھی اپنی استادی سے سرفراز فرمایا اور پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور پانچسو روپیہ سالیانہ بھی منظور ہوا' آخر میں حضور نے مکان بھی دلا دیا تھا جو اب جلیل منزل کے نام سے موسوم ہے۔

جلیل صاحب نہایت متقی پرہیزگار، پابند وضع نیک دل بزرگ تھے۔ والد مرحوم چونکہ داغ کے شاگرد تھے اور جلیل داغ کے پاس زیادہ آمد و رفت رکھتے تھے اس لئے والد سے بھی راہ رسم ہو گئے تھے پھر مہاراجہ کی ڈیوڑھی سے متعلق ہوئے تو [illegible] کے ساتھ رہنے لگے اور [illegible] کے رشتے گہرے دوست اور داغ کے استاد بھی تھے اس لئے مکان پر بھی آمد و رفت رہتی تھی اور میں بچپن سے جلیل سے واقف تھا حضور نے جلیل القدر لقب سے سرفراز فرمایا تھا جس کی مسرت میں جلیل نے ایک مرصع قصیدہ پیش کیا تھا جس کا ایک شعر تھا ؎

جلیل القدر کر دیکھو جلیلِ زار کو دیکھو
لقب جو شاہ سے ملتا ہے ہر جا جاری ہو جاتا ہے

جب بھی جلیل تشریف لاتے میں یہ شعر گنگنانے لگتا جسے سن کر جلیل خوش ہوتے تھے۔

سنہ ۱۹ء میں والد لاہور چلے گئے اور ایسے گئے کہ آخر تک اسلامیہ ہی میں رہے۔ والدہ مرحومہ کی زندگی تک میں کبھی حیدرآباد اور کبھی لاہور یا [illegible] میں رہتا تھا مگر والد کے انتقال کے بعد سے میں بھی حیدرآباد میں مسافرانہ آیا کرتا تھا اور "سفر در وطن" کا لطف اٹھاتا تھا ۱۹۴۲ء تک یہی حال رہا۔ اس اثنا میں مجھے جلیل سے ملنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ ۱۹۴۲ء میں مستقل طور پر حیدرآباد آ گیا تو یہی سرچارہا کہ کسی دن ملوں گا مگر مل نہ سکا' ایک دفعہ میں نے کسی مضمون میں یہ لکھا تھا کہ پوری غزل کسی استاد کی بھی مرصع اور منتخب نہیں ہوتی۔ میر کے اتنے بڑے دیوان میں سے یار لوگوں نے ۷۲ نشتر چنے ہیں' آج جلیل استاد ہیں مگر باوجود اس استادی اور کہنہ مشقی کے ان کی غزل میں ایک دو شعر ہی اچھے نکلتے ہیں ورنہ بقیہ شعر یوں ہی ہوتے ہیں۔ جلیل کے ایک شاگرد تھے لطف علی عارف بیچارے وہ بھی پڑھے لکھے تھے اس مضمون کو پڑھا تو انہیں بے انتہا غصہ آیا کہ استاد جلیل کی یہ توہین و تذلیل کی گئی ہے چنانچہ جلیل کو سنایا کہ یہاں ایک بدلگام ہے جو بڑے بڑے استادوں کے متعلق جو جی چاہتا ہے لکھ دیتا ہے چنانچہ اس نے حضرت کے متعلق یہ لکھا ہے۔ جلیل بیچارے بڑے بردبار تھے سب تحمل کر گئے اور وہ مضمون [illegible] بھی پڑھوایا۔ چنانچہ عارف نے پڑھ کر سنایا تو جلیل نے سنا اور کہا بیچارے نے بڑی صحیح بات کہی ہے اس نے تو میری استادی کا اعتراف کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ میری غزل میں ایک دو شعر اچھے ہوتے ہیں اور یہ بالکل صحیح تنقید ہے میں تو اس کا ممنون ہوں کہ بیچارے نے اچھا مضمون لکھا ہے۔ پھر میرے متعلق پوچھا کہ کون ہے کہاں کا رہنے والا ہے میرے ایک ملاقاتی نواز آزاد بھی وہاں موجود تھے انہوں نے اپنی معلومات کی حد تک بتایا کہ وہ انہیں کسی دن لے آئیں گے کیونکہ وہ بھی مشتاق ہیں' چنانچہ آزاد نے مجھے مجبور کیا اور میں جلیل صاحب کے پاس پہنچا شام کا وقت تھا میں ملا تو غور سے دیکھنے لگے میں نے عرض کیا آپ نے پہچانا؟ تو فرمایا بعض چہرے تو بار بار دیکھا ہوا ہے مگر یاد نہیں آتا ہے کہ کب اور کہاں دیکھا ہے۔ میں نے عرض کیا آپ [illegible] سے واقف ہیں؟ وہ بیٹھے ہی کھڑے ہو گئے مجھے چھاتی سے لگا لیا اور کہنے لگے یہاں [illegible] کے بعد تم مل رہے ہو مگر [illegible] آنا کا ملال ہے کہ میں [illegible] ہی رہا تھا کہ تم نے نام سے دیا [illegible] کہتے رہے اس کے چند ہی سال کے بعد میں انہی کے محلے میں جا بسا اور ان کی جلیل منزل کے سامنے ہی رہتا تھا اکثر جلیل [illegible] بیٹھتے۔ آخر تک یہی حال رہا۔

بڑے وضع دار، مخلص بزرگ تھے۔ اوقات اتنے معمور کہ ولی نظر آتے تھے۔ جاڑا ہو یا گرمی تہجد برابر پڑھتے۔ تہجد کے بعد ذکر و شغل میں مصروف ہو جاتے تھے اور پھر فجر پڑھ کر ذرا لیٹ جاتے۔ نمازیں باجماعت ہوتیں۔ گھر ہی پر جماعت ہوتی تھی۔ مہمان نواز تھے۔ آئے دن دعوتیں، مہمان رہتے تھے۔ خوش نصیب ایسے کہ بیٹے، نواسے، پوتے، پڑپوتے سبھی تھے اور سب خوشحال تھے اور اب بھی ہیں۔

کسی کی برائی سنتے اور نہ خود برائی کرتے۔ چاہے کوئی بھی غزل سناتا تو خوش ہوتے۔ اصلاح چاہتا تو اصلاح دیتے، مشورہ دیتے۔ اختر مینائی کا بڑا احترام کرتے تھے اور اختر مینائی سے بے انتہا انس تھا۔ ہر مہینے تنخواہ آتی تو تنخواہ کی پوری تھیلی اختر میاں کے پاس بھیج دیتے۔ وہ اس تھیلی کو رکھ لیتے اور پھر مٹھائی منگوا کر تنخواہ کی تھیلی مٹھائی کی چنگیر کے ساتھ واپس بھجواتے تو مٹھائی سب میں تقسیم ہوتی اور تنخواہ کی تھیلی کھلتی۔ آخر تک یہ معمول رہا۔

پوتوں نے ریڈیو خریدا اور گھر میں لگا دیا تو بہت خفا ہوئے۔ حکم ہوا پھینک دو۔ یہی نہیں اختر میاں سے کہا۔ انہوں نے کہا اچھا حافظ صاحب ریڈیو کہاں ہے ہم بھی سنیں گے تو کچھ اشارہ کیا۔ عاشقی کیا۔ اختر میاں سے کہا کیا مزا لگتا ہے۔ ابھی بھی ہے تو خاموش ہو رہے اور خبریں سنیں۔ پھر اکثر سن لیتے تھے۔ ایسا خلوص اور اتنی محبت بہت کم دیکھنے میں آئی۔ دونوں جلیل و اختر ایک دوسرے کے عاشق تھے۔ ان بزرگوں کی محبت جوانوں کے سے رنگ لیے تھی۔

حیدرآباد میں ہزاروں شاگرد ہیں اور حیدرآباد سے باہر بھی ہزاروں ہیں۔ اردو میں دیوان اور کئی ایک تصانیف چھپ چکی ہیں۔ آخری دیوان "روحِ سخن" اب تک نہیں چھپا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دیوان "روحِ سخن" ہی ہے۔

جلیل کے بیٹوں اور شاگردوں نے ایک بزمِ جلیل قائم کی ہے۔ مشاعرے کرتے رہتے ہیں۔ کاش مشاعروں پر روپیہ ضائع کرنے کی بجائے دیوان چھپوا دیں۔

واقعہ یہ ہے کہ جلیل بہترین غزل گو تھے۔ لکھنؤ اسکول میں اتنا اچھا غزل گو کوئی پیدا نہیں ہوا۔

صفی اورنگ آبادی

بہبود علی صفی اورنگ آبادی، اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن ہی میں باپ کے ساتھ حیدرآباد آ گئے اور یہیں مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم پائی۔ باپ صاحب حیثیت تھے۔ صفی خوش نویس بھی تھے۔ باپ کی زندگی تک نوکری نہیں کی پھر نواب [illegible] بہادر کے پاس خوش نویسوں میں ملازم ہو گئے۔ مگر جب نواب [illegible] کو معلوم ہوا کہ ان کا دیوان صاف کرنے والا خوش نویس بھی شاعر ہے اور صفی تخلص کرتا ہے تو نوکری چھوڑ دی۔ حیدرآباد کے مشہور امیر نواب حسین الدولہ بہادر نے مدتوں اپنی مصاحبت میں رکھا۔ پھر نواب تراب یار جنگ سعید نے بھی سرپرستی کی۔ آخر میں خود انہوں نے اپنے شاگردوں سے ماہوار رقم مقرر کر لی تھی اور اسی پر گزر بسر کرتے تھے۔

ابتدا میں میر علی کو استاد بنایا پھر ضیا دہلوی کی شاگردی کی۔ اس کے بعد فروغ حیدرآبادی سے مشورہ کرتے رہے۔ آخر میں [illegible] حیدرآبادی کے شاگرد ہو گئے تھے۔ ہمیں ابیات اچھی کہتے، عروض اور قافیہ کی تعلیم باقاعدہ حاصل کی تھی۔ یوں تو اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتے رہے مگر غزل پر زیادہ مائل تھے اور خوب کہتے تھے۔ ہجو بھی کہی مگر زیادہ کہتے تھے۔

حیدرآباد میں عوامی شاعر ایک ہی پیدا ہوا وہ صفی تھا۔ ان کی غزل کا یہ حال تھا کہ ادھر غزل ہوئی اور ادھر مشہور ہو گئی۔ پھر بچے بچے سے سن لیجئے۔ پھولے پھولے بیٹھے ملا کر گاتے پھرتے ہیں۔

جب کبھی تیری دید ہوتی ہے ‖ اپنی اُس روز عید ہوتی ہے
جگ کے معجزوں کی کرامت ہے ‖ اس سے زیست مزید ہوتی ہے
اچھے گل دیکھ اپنی شکل نہ دیکھ ‖ سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے

ان کی مقبولیت عوام میں بہت ہوتی تھی اور وہ زیادہ تر عوام ہی سے ربط رکھتے تھے اور انہی کے خیالات کی ترجمانی بھی کرتے رہتے تھے اسی وجہ سے عوام ان کے کلام سے خوش بھی تھے۔

اپنے استاد نظیرؔ کی طرح برجستہ گو، سیدھے سادے، سادہ دل آدمی تھے۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے شعر کہہ دیا کرتے تھے۔ کسی بات کے پابند نہ تھے جو مل گیا پہن لیا، جو مل گیا کھا لیا، اسی طرح جو مل جائے پی بھی لیتے تھے، ہولی دیوالی کسی کی تخصیص نہ تھی لیکن آخر عمر میں تائب ہو گئے تھے۔ مرنے سے پہلے بڑے پابند نمازی ہو گئے تھے۔

نظیرؔ کی طرح تمام عمر فقیر آدمی رہے۔ ایک ضخیم دیوان موجود ہے مگر شاگرد اور متعلقین بجائے دیوان چھپوانے کے مشاعرے کئے جا رہے ہیں۔

علی منظور

سادات امروہہ میں سے تھے۔ نہایت منکسر مزاج، بڑے ہی خوش وضع، بہت ہی شریف اور سیدھے سادے ایک آدمی تھے۔ ہر ایک سے محبت سے ملتے، بڑے ہی خلوص سے بات چیت کرتے، کوئی مخالفت بھی کرتا تو "اللہ تعالیٰ خوش رکھے" کہہ کر خاموش ہو جاتے۔ مجھ سے بیس ایک سال سے مراسم تھے مگر نہ تو وہ میرے گھر آتے نہ میں ان کے گھر جاتا۔ محفل شعر میں اور سیر پر ملاقاتیں ہو جاتیں۔ جب بھی ملتے بڑی محبت سے ملتے اور بعض ایسے احباب کی خیر و عافیت پوچھتے جن سے میری خط و کتابت رہتی تھی مثلاً حامد علی خاں، مہر یا مجروح وغیرہ۔ ماحول، محلہ، اعزہ سب غیر شاعرانہ تھے مگر شاعر تھے اور خوب کہتے تھے۔ نظم، غزل، نعت سبھی کہتے تھے جو بھی کہتے سوچ سمجھ کر کہتے اور کہہ کر غور بھی کرتے تھے۔ کلام اچھے رسالوں میں چھپتا تھا۔ لوگوں نے مشہور کیا ہے کہ نعت کا ایک مختصر سا دیوان بھی چھپا تھا جسے ان کے ایک ملاقاتی نے اپنی بیوی کے نام سے چھپوا لیا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ واقعہ کیا ہے۔

وہ مجھ سے چھوٹے ہی تھے، حال ہی میں انتقال ہوا۔ مجموعوں کے بعد کا کلام بھی خاصا ہے۔ نہایت قانع اور منکسر المزاج تھے۔ ان کے بیٹے فرزند کلام اکٹھا کر رہے ہیں، کوئی بہتر صورت نکلے تو ایک ضخیم مجموعہ جمع ہو جائے گا۔

ہوشؔ بلگرامی

کیفی حیدرآبادی کے ایک شاگرد تھے۔ راجہ بھوانی پرشاد بہادر گڑھی میں حضرت صفی الاسلام کے بازو "ارغوانی منزل" میں رہتے تھے۔ شاعر ہونے کی وجہ سے بھوانی راجہ سے میری بھی دوستی ہو گئی تھی اور بھوانی راجہ دوست تھے ہوشؔ بلگرامی کے، اس طرح ہوشؔ سے میری دوستی ہوئی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہوشؔ ریلوے وغیرہ میں نوکر تھے اور چادر گھاٹ کے دروازے کے قریب رہتے تھے۔

۱۹۳۶ء میں ہوشؔ شہر بدر ہو گئے اور سب ملازمتیں بھی ختم ہو گئیں۔ ۱۹۴۸ء میں پھر حیدرآباد آ گئے تو ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس بار وہ "سالار جنگ" میں ہوشؔ کی اتنی ٹھوکریں لگی تھیں اور ایسے تجربے ہوئے کہ واقعی ہوشؔ ہی ہوش میں آ گئے تھے۔ صاحب بیت اور دربارداری میں کامل اور بزم مجلسی کے ماہر

ہو گئے تھے۔ علمی خدمت ادبی مذاق رسالہ نکالنے کی رسم ختم ہو چکی تھی صرف مصاحبت باقی رہ گئی تھی جو بہت کام آئی۔ یہ دور مہاراجہ کشن پرشاد کی مصاحبت سے شروع ہوا۔ مہاراجہ نے کئی مہینے تک اپنی ذاتی سرپرستی میں رکھا پھر ملازمت [illegible] ماسٹر جنرل آفس میں [illegible] جنگ [illegible] بنا دیا اور جوش دفتر میں کام کرنے لگے۔

انہی دنوں حضور نظام دہلی تشریف لے گئے واپسی پر حیدرآباد میں بڑا جشن چراغاں ہوا اسی جشن کے دوران جوش بارگاہ سلطانی میں بھی باریاب ہونے لگے اور تقرب روز بروز بڑھتا گیا۔ مہاراجہ بہادر نے [illegible] سیکرٹری کی مددگاری بھی دلا دی اور اب جوش [illegible] اور مصاحبت حضور نظام سے معزز و متقرب ہو گئے۔ علمی ادبی مشاغل بھی شروع ہو گئے۔ [illegible] اور [illegible] بھی شروع ہو گئیں۔ [illegible] زبان [illegible] کا شوق تھا ہی [illegible] وسیلہ [illegible] بھی بنایا اور لوگوں کو کھلانے بھی لگے جن پر پر تکلف دعوتیں ہونے لگیں اس طرح ماحول کو سازگار بنا لیا۔ سامنے عہدہ داروں سے بے تکلف مراسم ہو گئے اور جوش وِن (WIN) جانے لگے۔

مددگاری سے ترقی کر کے نائب معتمد ہوئے [illegible] کی تنظیم کی اور اس میں [illegible] ہو گئے اور دعوتیں اور بڑھ گئیں۔ جوش [illegible] خطاب بھی [illegible] مہاراجہ بہادر سے [illegible] ملاقاتیں ہوتیں۔ دوسرے عہدہ داروں سے بھی برابر رہتی۔ یہ [illegible] کا زمانہ تھا اور یہی زمانہ احتیاط، سلامت روی اور دور اندیشی کا ہوتا ہے مگر غفلت کے پردے بھی تو پڑ جاتے ہیں۔ جوش بھی [illegible] بے ہوش ہونے لگے [illegible] تعمیرات کے معتمد [illegible] سیکرٹری بھی ہو گئے۔ بس اب کیا تھا [illegible] ہو گئے اور [illegible] نظر آنے لگی [illegible] دوست [illegible] ہو گیا [illegible] حضور [illegible] لگے۔ مہاراجہ بہادر [illegible] دیکھتے رہ گئے اور کچھ کر نہ [illegible] دوست احباب اور متعلقین ایک ایک کر کے کنارہ کش ہو گئے۔ [illegible] مددگار [illegible] شروع ہوئی "[illegible]" [illegible] مکمل ہو گئی [illegible] مہاراجہ بہادر کی [illegible] نظر آنے لگے [illegible] اور جوش معتمدی سے ہٹ گئے۔ حضور نظام نے [illegible] جاری فرما دی۔

[illegible] اب آنکھیں کھلنی چاہئے تھیں مگر نہ کھلیں۔ جوش اس نشہ کو نہ اتار سکے۔ پولیس ایکشن ہوتے ہی [illegible] تو یہ دعوتیں رہیں اور انہیں خوش کرنے کے لئے ایک کتاب لکھنے لگے جس میں حضور نظام سے لے کر اپنے [illegible] کی مخالفت کی۔ دعوت کر کے مسودہ سناتے [illegible] داد دیتے اور یہ خوش ہوتے مگر [illegible] لوگوں نے باوجود حالات بدلنے کے ان کی کتاب کو چھپنے نہیں دیا۔ جوش [illegible] تو انہیں بھی مسودہ کا کچھ حصہ سنایا اور جوش نے بھی منع کیا کہ اس کو نہ چھپوائیے۔ بعض ابواب مجھے بھی سنائے تھے اور میں نے بھی سخت مخالفت کی تھی مگر کسی کی پیش نہ گئی اور جوش نے کتاب چھپوا ڈالی "مشاہدات" نام رکھا پھر چند [illegible] لوگوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی منع کیا اور بعض [illegible] بھی ظاہر کئے جس کی وجہ سے بعض صفحات نکال دیئے گئے، بعض سطریں حذف کی گئیں اور بے ربط کتاب بے ربط ترین ہو گئی۔

چند ہی نسخے فروخت ہونے [illegible] شروع ہو گئیں [illegible] تنقیدیں اور خلاف مضامین چھپنے لگے۔ بعض لوگوں نے عدالتی کارروائی کی دھمکی بھی دی [illegible] اس کشمکش میں [illegible] ہوا۔

[illegible] ڈاکٹر [illegible] صاحب [illegible] ہو گیا [illegible] جوش کے [illegible] نظر آنے لگے [illegible] جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ جوش [illegible] میں [illegible] ۱۸ نومبر [illegible] کو جوش سے ملاقات کی [illegible] نواب [illegible] بہادر [illegible]

معتمد فوج بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہوش سے یہ طے ہوا کہ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے میں نے مشاہدات جن کے متعلق گفتگو ہی نہیں کی مگر خود انہوں نے ذکر چھیڑا اور میں نے حالات حال کی وضاحت کی اور صورت حال بھی واضح کر دی۔ یہ گفتگو [illegible] کہ [illegible] اسلام [illegible] نے ایسی شدید مخالفت کتاب کی اشاعت کی کی کہ [illegible] کے بعد ہوش اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ بقیہ جلدیں تلف کر دیں چنانچہ [illegible] اسلام کو انھوں نے اجازت دی کہ فریق ثانی سے بات چیت کر کے کتاب کی سب جلدیں ان لوگوں کے حوالے کر دیں۔ اس قضیہ کے بعد مجھے ہوش نے بڑی گرمجوشی اور خوشی سے مجھے رخصت کیا اور میں ۱۹ / نومبر کو ملنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔

۱۹ / نومبر ۵۵ء کو صبح ہی ایک جھٹکا لگا اور ہوش ہمیشہ کے لئے بیہوش ہو گئے۔

ہوش نے ڈاکٹر سید علی بلگرامی کے پاس ہوش سنبھالا تھا نواب عماد الملک کے پاس رہ چکے تھے نہایت ذہین، طباع، انگریزی اردو میں تھے، فارسی عربی بقدر ضرورت جانتے تھے، مطالعہ نہایت اچھا تھا، صحبت یافتہ تھے، علم مجلسی کے ماہر تھے، طبیعت میں [illegible] تھی لکھنے پڑھنے کا ذوق تھے۔ مضامین بہت لکھے تھے ایک مجموعہ جوہر ادب کے نام سے طبع ہو چکا تھا بقیہ مضامین چھپنے کی فکر میں تھے۔ ابتدائی دور میں ایک چھوٹی سی کتاب "بیدگری" پر شائع کی تھی، مذہب کے بارے میں اتنے وسیع المشرب تھے کہ لوگ ان سے ناخوش رہتے تھے، جلد باز فطرت پائی تھی، ہر کام میں جلدی کرتے تھے اور خیالات بھی جلد جلد بدلتے رہتے تھے۔ ایک طویل مثنوی بھی چھپوائی تھی۔

پولیس ایکشن کے بعد یہ حیدرآباد چھوڑ کر جانا چاہتے تھے مگر چھوڑ نہ سکے۔ مرنے سے پہلے بھی حیدرآباد چھوڑنے کی فکر میں تھے مگر حیدرآباد نے کس طرح ان کی رخصت ہونے دی اور یہیں کی مٹی قسمت میں تھی۔

ہوش کے مخالفین بہت اور موافقین کم تھے جن لوگوں نے انہیں نزدیک سے دیکھا تھا وہ ان کے قائل تھے کیونکہ ان میں برائیوں کے ساتھ ساتھ بھلائیاں بھی زیادہ تھیں اور میری دانست میں بھلائیاں برائیوں سے زیادہ ہی تھیں۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے چاہے آپ اسے دوستی پر محمول کریں، حقیقت بھی یہی ہے کہ ان کی جو باتیں دشمنوں کو برائیاں نظر آتی تھیں وہ دوستی کی وجہ سے مجھے بھلائیاں معلوم ہوتی ہیں۔ بہر حال ہوش میرے دوست اور مخلص دوست تھے اور مجھے ان کے مرنے کا بہت صدمہ ہے۔

جو دور معلوم تھا۔ اس میں سے صرف چند شخصیتیں میں نے انتخاب کی ہیں ورنہ یہ فہرست بڑی طویل تھی۔

یقیناً آپ اس دور حیدرآباد کی چند شخصیتوں سے روشناس ہو جائیے اس دور کے علاوہ وہ بھی جو بقید حیات موجود ہیں اور بیشتر اہم خصوصیات کے مالک ہیں یہ فہرست بھی طویل ہے، چونکہ مضمون بہت لمبا ہو گیا ہے اس لئے میں نے اس فہرست کو قصداً مختصر کر دیا ہے۔

مُردوں پر کچھ لکھنا آسان ہے مگر زندوں کے متعلق بیانات سے لکھنا بہت مشکل ہے اور پھر ان لوگوں کے متعلق لکھنا جو [illegible] ہیں بہت ہی مشکل ہے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ اخلاقی جرأت اور بے لاگ انداز سے لکھوں مگر مجھے اپنی کوشش میں کس قدر کامیابی ہوئی ہے اس کا اندازہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔

زین یار جنگ

مولوی زین الدین انجینئر الملقب بہ خطاب نواب زین یار جنگ جنھیں حال ہی میں بھارت سرکار نے "پدما بھوشن" کے اعزاز سے نوازا ہے حیدرآباد کے ان بزرگوں میں سے ہیں جو واقعتاً ہیں اور مقبول ہیں۔ ہر دور میں آپ نے بڑی سلامت روی دکھائی۔ آپ ڈاکٹر سید علی بلگرامی مترجم تمدن عرب و تمدن ہند کے داماد ہیں۔ یورپ سے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی اور حیدرآباد آکر مختلف خدمات پر فائز رہے۔ شروع سے آپ کا تعلق کانگریس سے نہایت ہی قریبی رہا۔ حیدرآباد میں اتحاد المسلمین کے عروج کے دور سے پہلے آپ صدر المہام (وزیر) تعمیرات تھے۔ اس کے بعد جو عبوری کابینہ بنی تو آپ نے حکومت ہند اور حضور نظام کے درمیان میں رہ کر بڑی کوشش کی کہ حالات سازگار ہو جائیں۔ پولیس ایکشن کے بعد جدید وزارت بنی تو اس میں بھی آپ کو وزارت پر لیا گیا اور سررشتہ تعمیرات آپ ہی کے ذمہ رہا اور جب تک عام انتخابات ہو کر جدید کابینہ نہ بنی آپ وزارت پر فائز رہے۔ انتخاب میں آپ کے فرزند ارجمند سعادت علی صاحب نے کامیابی حاصل کی اور منتخب ہو کر [illegible] کام کرتے رہے پھر سیکرٹری بنا لیے گئے۔

حضور نظام نے جو ٹرسٹ بنائے ہیں ان میں آپ ٹرسٹی اور چیئرمین کی حیثیت سے شریک ہیں۔ آپ کی غیر جانبدارانہ پالیسی اور اعتدال پسندی ہی کا سبب رہا ہے اور اسی وجہ سے آپ ہر وقت ہر طبقے میں مقبول رہے۔ آپ کی فنی معلومات کا یہ حال ہے کہ دنیا کے بہترین آرکیٹکٹ مانے جاتے ہیں۔ آپ نے دو مرتبہ دنیا کا دورہ کیا ہے۔ پہلا دورہ عثمانیہ یونیورسٹی کی تعمیر کے سلسلے میں ہوا اور دوسرا اس کے بعد اور تیسرا دورہ گزشتہ سال حکومت ہند کی طرف سے قومی تھیٹر کے نقشے کے سلسلے میں ہوا ہے۔ حیدرآباد کی بہترین عمارتیں، عثمانیہ یونیورسٹی، کتب خانہ آصفیہ وغیرہ آپ ہی کے نقشے ہیں۔ [illegible] کے گنبد اور تجربے کا نقشہ بھی آپ ہی نے بنایا ہے جو بے انتہا نفیس نقشہ ہے۔

بحیثیت انسان آپ بڑے صاحب کردار اور بڑی خاص شخصیت کے مالک ہیں۔ علم و ادب سے بھی بہت لگاؤ ہے۔ مذہبی کاموں سے بھی شغف رہا ہے۔ تمام بڑی بڑی کمیٹیوں اور تقریباً تمام اداروں کے رکن ہیں۔ مدرسہ دارالعلوم کو آپ ہی نے کالج بنایا اور اسی کی بدولت تمام [illegible] طلبا اور قاری اور ادب پروری کا ذوق آپ کو شروع سے ہے اور ہر قسم کی خدمت کیے جاتے ہیں۔

ستر سال کی عمر میں آپ میں نوجوانوں کی سی پھرتی اور جوانوں کی سی ہمت ہے۔ کام سے تھکتے نہیں، دن بھر مصروف رہتے ہیں۔ سرکاری، سماجی، اخلاقی کاموں میں صبح سے شام تک مشغول اور مصروف رہتے ہیں۔ عملی زندگی آپ کی قابل رشک ہے۔ بچپن سے میں نے آپ کی خدمت کا مطالعہ کیا اور ہمیشہ ایک طریقے اور ایک ہی رنگ میں دیکھا ہے۔ آپ کی وضع قطع شروع سے [illegible] وہی اب تک ہے۔ خلق، ملنساری، ہمدردی، شفقت میں [illegible] ہوتا جاتا ہے۔

سید خورشید علی

۱۹۰۸ء میں جب رود موسیٰ میں طغیانی ہوئی اور سیلاب کم ہوا تو والد مرحوم اپنی ایک بہن کے گھر کا حال دیکھنے کے لیے جانے لگے اور میں بھی ضد کر کے ساتھ ہو گیا۔ [illegible] سے بہت سی گاڑیاں [illegible] دیکھیں [illegible] ان میں ایک [illegible] سید خورشید علی صاحب بھی تھے جو کالا [illegible] کوٹ، سفید پتلون پہنے، ترکی ٹوپی لگائے، ہاتھ میں بید کی چھڑی لیے [illegible] "بنے" پھر رہے تھے۔ والد نے بتایا کہ یہ خورشید علی ہیں اور مجھے یہ پرجوش نوجوان ہیں۔ اس کے بعد میں نے ہر جگہ انھیں دیکھا اور احترام کی نظر سے دیکھا مگر ملاقات کبھی نہ ہوئی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں جب میں نے گریجوایٹ ہو کر حیدرآباد کی ملازمت اختیار کی تو ملازمت کی حیثیت سے حیدرآباد میں [illegible] صدر صاحب نے ایک سال [illegible] انکار کر دیا اور [illegible] اور

اعداد و بیاض رکھا پر ترقی میں بجائے سرور الدولہ جنگ اور باسط جنگ نے مجھے منتقل کرنا چاہا تو مجھ ہی نے پسند نہیں کیا۔ نصر اللہ خاں کی شکایت جب میں نے فریار جنگ معتمد فنانس سے کی تو انہوں نے بکمال عنایت و نوازش مجھے ایک تعارفی چٹھی دے کر مولوی سید خورشید علی صاحب کے پاس بھیجا۔ جب میں نے اس چٹھی کے ذریعے ملاقات کی تو موصوف نے بڑی یگانگت اور شفقت سے مجھے اپنے دفتر میں منتقل کرنا قبول فرمایا مگر مشکل یہ تھی کہ دفتر دیوانی و مال و ملکی میں جائیداد پر اسامیاں خالی نہ تھیں اور گلبرگہ والے میری مزید رخصت منظور نہیں کر رہے تھے اس لئے میں نے گلبرگہ کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر دفتر دیوانی میں کام کرنا شروع کر دیا اور مولوی صاحب نے چند ہی روز کے بعد میرا تقرر کر دیا۔

دفتر دیوانی بالکل اسلامی اور تاریخی دفتر تھا، مولانا نے اسے بڑی خوبی سے منظم کیا تھا۔ منتخب لوگوں کو جگہ دی تھی اور سب کو بڑی محبت سے پیار کیا تھا۔ اس دفتری تنظیم کے علاوہ ایک اخلاقی ترتیب بھی ایسی قائم کی تھی کہ دفتر کے لوگ اس طرح رہتے تھے گویا ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دفتر دیوانی میں ایک ہی خاندان ہے جس کے سرپرست مولانا خورشید علی ہیں۔

مولانا کی شخصیت بڑی ارفع و اعلیٰ ہے۔ آپ حیدرآباد کے قدیم اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد ہی میں ہوئی پھر نظام کالج میں بھی آپ نے تعلیم پائی اور نوجوانی ہی میں علم و ادب، فلسفہ اور منطق کی خدمت میں منہمک ہو گئے۔ ابتداً فنانس میں مترجم کی حیثیت سے مامور ہوئے اور پھر جلد ہی ترقی کر کے مددگار معتمد اور پھر ناظم دفتر دیوانی و مال ہو گئے۔ اتفاقاً آپ کو سر گلانسی اور سر اکبر حیدری جیسے عہدہ داروں کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا اور ان عہدہ داروں نے آپ کی تحقیق و قدر افزائی کی، نوجوانی ہی سے آپ تحقیق و دفتر میں خاصے مشہور ہو گئے تھے اور سب اوقاف ذخیرہ نقاد وغیرہ رسائل اور متعدد جرائد میں آپ کے مضامین بہت چھپا کرتے تھے۔ انگریزی سے ترجمہ کرنے میں آپ کو کمال تھا، گوئٹے پر سب سے پہلے اردو میں آپ نے ہی ایک مختصر سی کتاب شائع کی تھی اور اردو داں طبقے کو گوئٹے کی شاعری سے آپ ہی نے روشناس کرایا تھا۔

بیت المعمورین، نظام کلب، والنٹیئرز، حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے معتمد و سیکرٹری رہے ہیں۔ آپ نے عہد عثمانی کی تعلیمی، علمی اور ادبی ترقی پر ڈاکٹر زور، عبد القادر سروری، راجہ جانکی پرشاد سے مختلف کتابیں لکھوا کر چھپوائیں اور ایک شاہ پرست کی طرح ہمیشہ وفادار رہے۔

پندرہ سال سے زیادہ ہوا کہ آپ نے ریٹائر ہو کر اپنی زندگی علم و ادب کے لئے وقف کر دی ہے۔ دکن کی کئی انجمنیں آپ نے اپنی نگرانی میں چلائیں، تاریخ "راحت افزا" چھپ بھی رہی ہے اور مآثر نظامی وغیرہ مرتب شدہ رکھی ہیں۔ اب بھی آپ علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں اور کچھ نہ کچھ ہی لکھتے رہتے ہیں۔ تاریخ خصوصاً تاریخ دکن پر آپ کی نظر بڑی گہری ہے اور ادب پر بھی انشا پردازانہ عبور ہے۔ اردو بڑی لطیف اور پیاری لکھتے ہیں۔

مجھ پر دفتر دیوانی میں چلنے کے جو بزرگانہ عنایت و شفقت فرماتے ہیں اور میں اپنے بزرگ کی طرح احترام کرتا ہوں۔ آج تیس برس سے میرے خاندان میں میرا کوئی بزرگ باقی نہیں رہا ہے مگر مولانا کی ذات کو میں اپنا بزرگ سمجھ کر مطمئن اور مسرور رہتا ہوں۔ شروع سے مجھ پر جو عنایت و نوازش ہے وہ اب تک مسلسل جاری ہے۔ نہ صرف میری خانگی زندگی بلکہ تصنیف و تالیف میں بھی مولانا امداد و اعانت فرماتے رہتے ہیں اور اپنے زریں مشوروں سے مجھے نوازتے رہتے ہیں۔

نہایت خاموش کارکن اور مخیر بزرگ ہیں۔ سینکڑوں زندگیاں آپ نے بنا دیں۔ "گمگشت خاندان" پر ہمیشہ مائل رہے ہیں یعنی جن لوگوں کی امداد کی اس طرح کی کہ دوسروں کو خبر تک نہ ہونے پائی۔ چنانچہ ایسی ہستیاں آج نام و نمود حاصل کر چکی ہیں جو مولانا کی امداد پر تعلیم و تربیت پاتی رہیں اور مولانا ہی نے ان کی زندگی سنواری۔ صرف یہی ایک صفت ایسی ہے جو انہیں ممتاز بناتی ہے۔

میں نے اپنی عمر میں دو ایسے سخی دیکھے ہیں جو دے کر شرماتے تھے گویا کم دیا۔ ایک مہاراجہ بہادر دوسرے مولانا خورشید علی۔ ان دونوں کا یہی طریقہ تھا کہ اپنی حیثیت سے زیادہ دیتے اور پھر شرماتے کہ کم دیا ہے۔

زود رنج، تند مزاج اور وضعدار قدیم طبیعت کے بزرگ ہیں۔ غصہ آ جاتا ہے مگر جلد فرو ہو جاتا ہے خفا جلد ہوتے اور معاف بھی جلد کر دیتے

اور پھر صاف بھی ہو جاتے ہیں، البتہ جن باتوں پر اڑ جاتے ہیں اسے دنیا کی کوئی قوت بھی ہٹا نہیں سکتی۔ وظیفہ لینے کے بعد سے خانہ نشین ہیں پانچ مرتبہ اس وغیرہ کہیں بھی دوبارہ ملازمت نہیں کی۔ بعض جگہ سے پیش کش ہوئی بھی تو ٹال دیا، نہایت قانع، مسرور اور مطمئن بزرگ ہیں اپنے قدیم ملنے والوں سے یگانگت خلوص اور ہمدردی رکھتے ہیں اور بڑی عمدہ زندگی گزار رہے ہیں۔

عبدالرحمن خاں

پہلے پروفیسر تھے پھر پرنسپل ہوئے اور پھر شیخ الجامعہ عثمانیہ ہوئے۔ بڑے قابل اور خاموش بزرگ ہیں، قدیم علمی خاندان سے ہیں۔ لندن سے ڈگری لاکر نظام کالج میں صدر شعبہ سائنس ہوئے، پھر عثمانیہ یونیورسٹی کے پرنسپل بنے، نواب سعادت جنگ مرحوم صوبہ دار و صدر المہام مرحوم کی صاحبزادی سے شادی کی، خاں صاحب کے سسرال سے میرے قدیم مراسم تھے اور ان کے چھوٹے سالے رشید اللہ خاں سے دوستی بھی تھی۔ خاں صاحب سے بھی شادی کے بعد سے مراسم ہو گئے، بڑے ہی شریف، نیک اور علمی بزرگ ہیں، جامعہ عثمانیہ کے اولین سند یافتہ طلبا کو یورپ اسکالرشپ دلا کر لندن وغیرہ بھجوایا۔ ڈاکٹر نظام الدین، ڈاکٹر سیادت علی خاں، ڈاکٹر رضی الدین، ڈاکٹر قدیر وغیرہ آپ ہی کے زمانے کے فارغ التحصیل آپ ہی کے یورپ بھجوائے ہوئے ہیں۔ سینکڑوں طلبا کی سرپرستی کر کے تعلیم دلائی اور پھر ملازمت بھی دلائی، بیشتر غریب طالب علم آپ کی وجہ سے آج خوش حال، فارغ البال اور مشہور و معروف ہیں۔

فلکیات سے آپ کو ذاتی شغف ہے اور اسی فن میں آپ اب تک کام کئے جا رہے ہیں باوجود وظیفہ لینے کے اب بھی آپ کی نظریں آسمان پر لگی ہوئی ہیں اور ستاروں کے پھیر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نئی نئی دریافتیں کرتے ہیں، مضامین چھپواتے ہیں، لکچر دیتے ہیں، ہندوستان میں آپ واحد ماہر فلکیات ہیں جو اس فن کے کامل سمجھے جاتے ہیں اور ساری دنیا کے فلکی آپ کو مانتے ہیں۔

چونکہ آپ معاشیات یا سیاسیات کے ماہر نہ تھے اور نہ "خوشامد پیشہ" واقع ہوئے تھے اس لئے آپ کو قبل از وقت وظیفہ پر سبکدوش کیا گیا مگر آپ نے اس کا کوئی اثر نہ لیا۔ اپنے کام میں لگے رہے، باوجود کبر سنی کے قویٰ نہایت ہی اچھے ہیں اور اب بھی آپ بیگم پیٹ سے حیدرآباد تک کبھی کبھی سائیکل پر بھی آ جاتے ہیں، بہر حال خاں صاحب بین الاقوامی شہرت کے مالک اور حیدرآباد کی خاص شخصیت ہیں۔

علی یاور جنگ

آپ ایرانی النسل ہیں، آپ کے والد بزرگوار ڈاکٹر نصیر جنگ بہادر تھے اور آپ کی والدہ ماجدہ طیبہ بیگم صاحبہ نواب عماد الملک بہادر مرحوم کی صاحبزادی تھیں، آپ کی والدہ مرحومہ نے حیدرآباد کی نسوانی دنیا میں تعلیم کی روح پھونک دی تھی۔ آج حیدرآباد کی نسوانی ترقی اور تعلیم کی جو ہل چل نظر آتی ہے، یہ بیگم صاحبہ کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ نواب علی یاور جنگ کی ولادت حیدرآباد ہی میں ہوئی ابتدائی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی پھر آپ نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے سیاسیات میں ڈگری لی اور حیدرآباد آ کر نظام کالج میں پروفیسر ہو گئے مگر آپ کو قدرت نے سیاسی گتھیاں سلجھانے کے لئے پیدا کیا تھا اس لئے آپ جلد ہی ناظم اطلاعات و ڈائرکٹر آف انفارمیشن ہو کر بننے گئے پھر سکریٹری آف پولیٹیکل منسٹری ہوئے اور ہوم سکریٹری بن کر وزیر تعلیمات ہو گئے۔

حیدرآباد میں اصلاحات کا نفاذ آپ ہی کے ہاتھوں ہوا اور حیدرآباد کی شمولیت یونین کا مسودہ بھی آپ ہی نے مرتب کیا مگر آپ ہی کی مخالف

پارٹی نے ہنگامہ مچا دیا جس کی وجہ سے آپ مستعفی ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔ جب پولس ایکشن ہوا تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور آپ کی مخالفت کا نتیجہ لوگوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ملٹری گورنر کے دور میں آپ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے اور پھر آپ کی خدمات مرکزی حکومت نے حاصل کر لیں اور آج کل آپ مصر کے سفیر ہند ہیں۔

علم و ادب کا ذوق آپ کو ورثے کے طور پر ملا ہے۔ اس پر ذاتی دلچسپی مستزاد ہے۔ آپ نہایت مستعد، بڑے ہی کارگزار اور باریک بیں ہیں۔ نکتہ رس دماغ کے مالک ہیں۔ انگریزی ادب پر انشا پردازانہ عبور ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بڑا اچھا ہے خصوصاً پولیٹیکل تاریخ میں آپ استادی حیثیت رکھتے ہیں۔

میرے نہایت ہی قدیم عنایت فرما اور کرم گستر ہیں۔ ہمیشہ میری اعانت اور دل افزائی فرماتے رہے اب تک موصوف کی عنایتیں میرے شامل حال ہیں۔ میری دلی تمنا اور دعا ہے کہ یہ تابناک ستارہ افق ہند پر تاباں و درخشاں رہے۔

سجاد مرزا

مولوی عزیز مرزا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے سر سید کے آنکھوں کے سامنے تعلیم پائی اور جنہیں حیدرآباد نے خصوصیت سے بلا کر خدمت دی۔ اگر سازش کا شکار نہ ہوتے تو عزیز مرزا صاحب ہوم سیکرٹری کے بعد شاید وزارت پر بھی ترقی پاتے مگر قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔

مولوی عزیز مرزا مرحوم کے صاحبزادے حیدرآباد ہی میں رہے، پہلے بھی تھے اور اب بھی حیدرآبادی ہی ہیں۔ مولوی احمد مرزا انجینیر، مولوی ابو سعید مرزا (سعید جنگ) جج نے بڑی ترقی کی مگر افسوس ہے کہ ان دونوں بزرگوں سے میرے زیادہ مراسم نہ تھے۔ مولوی احمد مرزا صاحب سے نہایت مختصر مراسم رہے مگر مولوی سجاد مرزا صاحب سے میرے مراسم بہت زیادہ رہے۔ موصوف جب صدر مہتمم تعلیمات بن کر گلبرگہ تشریف لائے تو میں گلبرگہ ہی میں تھا اس لئے مدت تک نیاز حاصل رہا، پھر موصوف حیدرآباد آ گئے تو بھی نیاز حاصل ہوتا رہا۔ صدر مہتمم تعلیمات، پرنسپل ٹیچرز ٹریننگ کالج، ناظم تعلیمات اور پھر معتمد تعلیمات (ایجوکیشنل سیکرٹری) رہ کر موصوف نے وظیفہ پر سبکدوشی حاصل کی۔ چونکہ آپ ماہر تعلیم اور بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے اس لئے یونیسکو نے آپ کو مشیر تعلیم بنایا اور آپ نے بڑی عمدگی سے اس اہم خدمت کو انجام دیا اور اب پھر حیدرآباد واپس ہو گئے ہیں۔

علمی خدمت کا جذبہ آپ میں اتنا ہے کہ حیدرآباد کی انجمن ترقی اردو کے ہال کے لئے آپ نے اپنے کاٹھے پیٹ کی کمائی میں سے ایک کثیر رقم عنایت کی اور ہال بنوا دیا۔ مدتوں تک "المعلم" نام سے ایک تعلیمی ماہنامہ نکالتے رہے۔ آپ کی کفایت شعاری بڑی قدیم ہے۔ شروع میں جب تک ملازمت کی عمر چلنے لگی تو آپ نے کفایت شعاری شروع کی اور ہمیشہ اللہ کا دیا ہوا بڑا بچاتے رہے۔ انتہا یہ کہ آپ اپنا رسالہ دستی ہاتھ کے بنے ہوئے کاغذ پر چھپواتے اور خط لکھنے کے لئے کاغذ تک دستی استعمال کرتے تھے۔

بڑی سوجھ بوجھ کے مالک، نہایت ہی دماغ دار اور شگفتہ مزاج، دوست نواز، وضع دار اور خلیق الطبع بزرگ ہیں۔ ملنے جلنے کی بھی ایک خاص وضع رکھتے ہیں اور جس سے جیسے مراسم ہوتے ہیں اسی طرح آپ ملاقات بھی رکھتے ہیں۔ لوگوں نے سینکڑوں کتابیں لکھوا دیں مگر آپ نے کوئی کتاب اپنے نام سے نہیں چھپوائی۔ نام و نمود سے قطعاً تعلق نہیں ہے۔

کیقباد جنگ

کیقباد آپ کا نام ہے، مفتی آپ کا خاندانی نام ہے۔ بمبئی کے پاس گریجویٹ ہیں۔ حیدرآباد میں پارسی خاندان بڑی مدت سے آباد ہیں اور تجارت و ملازمت بڑی کامیابی سے کر رہے ہیں۔ آپ کا خاندان بھی حیدرآباد کا قدیم خاندان ہے۔ آپ نے مختلف محکموں میں ملازمت کرنے کے بعد نائب معتمد سیاسیات و پولیٹیکل جوائنٹ سیکرٹری ہو کر وظیفہ حسن خدمت حاصل کیا۔ بڑے ہی صاحب ذوق اور علم دوست بزرگ ہیں۔ آپ کا کتب خانہ بے نظیر ہے۔ مطبوعات جدیدہ کا آپ کو شوق نہیں بلکہ عشق ہے۔ ناممکن ہے کہ کوئی نئی کتاب طبع ہو اور آپ نہ منگائیں۔ حافظہ نہایت قوی اور معلومات بڑے ہی بحر ہیں۔ فارسی پر آپ کا عبور ہے۔ قدیم پہلوی سے بھی واقف ہیں اور جدید فارسی کے ماہر ہیں۔

مذاہب عالم کا مطالعہ آپ نے بڑی تحقیقی نظر سے کیا ہے۔ مذہب اسلام سے آپ کو لگاؤ ہے اور قرآن کا وسیع مطالعہ ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے لاہور سے ایک کلام مجید شائع ہوا تھا۔ آپ نے فوراً منگوا لیا اور مطالعہ شروع کیا تو اعراب کی بیشتر غلطیاں نظر آئیں۔ چنانچہ آپ نے یہ غلطیاں نوٹ کر کے مجھے دیں اور میں نے ملا کر دیکھا تو واقعی یہ سب غلطیاں اس نسخے میں موجود تھیں۔ لطف یہ ہے کہ یہ غلطیاں آپ نے کسی صحیح اعراب والے نسخے سے مقابلہ کر کے نہیں نکالی تھیں بلکہ سرسری طور پر مطالعے میں نظر آ گئی تھیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کا قرآنی مطالعہ کتنا گہرا اور مستقل ہے۔

مجھ سے تیس ایک سال سے مراسم ہیں اور آپ کے کتب خانے سے میں فائدہ اٹھاتا رہتا ہوں۔ اپنے نوجوان لڑکے کے ہوائی حادثے میں ہلاک ہونے سے بد دل ہو کر کتابیں فراہم کرنا چھوڑ دیا تھا مگر پھر یہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ کئی مہینے سے بغرض علاج بنگلور گئے ہوئے ہیں۔ گزشتہ مہینے میں ان کا آپریشن بھی ہوا ہے جو سنا ہے کہ کامیاب رہا مگر ابھی مراسلت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ آپ کے فرزند سے جو ساتھ ہیں خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے۔ خداوند عالم صحیح و سلامت واپس لائے۔

مہدی نواز جنگ

حیدرآباد ہی کے شرفا سے ہیں۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد ہی میں ہوئی اور محکمۂ مال میں ملازم ہو گئے۔ غالباً دوم تعلقداری تک پہنچے تھے کہ مہاراجہ بہادر نے صدر اعظم ہوتے ہی آپ کو معتمد باب حکومت و رجسٹرار بنا لیا اور مہاراجہ کے معتمد خاص کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ آپ نے جس دیانت، محنت، سلیقے اور تجربے سے معتمدی کی ہے، سارا ملک واقف ہے۔ اس اہم خدمت پر رہ کر سبھوں کو خوش رکھنا ناممکن تھا۔ چنانچہ سر اکبر حیدری آپ سے خفا ہو گئے اور جب صدارت عظمیٰ پر فائز ہوئے تو آپ کو بڑی آزمائش میں مبتلا کر دیا مگر مہدی نواز جنگ نے بڑی بہادری سے ان آزمائشوں سے عہدہ برآ ہو کر دکھا دیا کہ وہ بڑے سے بڑے معرکے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

جب تک ملازمت میں رہے ملک کی خدمت کی۔ پھر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو کر بھی خدمت کرتے رہے۔ گزشتہ انتخابات میں دوست احباب نے مجبور کیا تو کانگریس کی طرف سے آپ بھی کھڑے ہو گئے اور منتخب ہو کر [illegible] وزارت سے سرفراز ہوئے۔

سابق دور کے تین ہی بزرگ ایسے ہیں جنہوں نے انقلاب کے باوجود اپنے آپ کو کامیاب و کامران بنا لیا۔ پہلے نواب زین یار جنگ، دوسرے نواب علی یاور جنگ، تیسرے نواب مہدی نواز جنگ۔ اب وزارت طبابت سے [illegible] ہیں۔ خدمت ملک بہرحال کئے ہی جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نواب سالار جنگ بہادر کے اسٹیٹ کی کمیٹی کے صدر نشین بھی آپ ہیں اور بڑی عمدگی سے اسٹیٹ اور نمائش کو ترقی دے رکھا ہے۔

بڑی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک اور عجیب و غریب بزرگ ہیں۔ علم و ادب سے بڑی دلچسپی ہے مطالعہ نہایت اچھا اور معلومات بڑی ہی نفیس ہیں۔ نواب بہادر کی ایک مختصر سی تالیف بھی آپ ہی نے مرتب کرا کے شائع کی ہے جس میں بڑا ہی اچھا مواد ہے۔

خدا کرے آپ کی کوشش بار آور ہو اور سالار جنگ کا کتب خانہ عوام کے مطالعہ کے لئے کھول دیا جائے اگر ایسا ہو جائے تو ملک کی بڑی خدمت ہوگی اور لوگ علمی ادبی تحقیق بڑی آسانی سے کر سکیں گے۔

ڈاکٹر عبد اللطیف

کرنول کے مشائخ گھرانے سے ہیں۔ انگریزی ادب میں لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا ہے اور انگریزی کے بڑے اچھے ادیب ہیں جامعہ عثمانیہ میں شعبہ انگریزی کے صدر رہے اور پھر وظیفہ حسن خدمت حاصل کر لیا۔ غالب پر ایک کتاب بھی انگریزی میں لکھی اور پھر اس کا ترجمہ بھی کرا کر چھپوایا۔ سیاسیات اور مذہب پر بھی بڑی اچھی نظر ہے، چونکہ انگریزی بڑی اچھی لکھتے ہیں اس لئے قائد اعظم بھی انہیں بہت پسند کرتے تھے اور تقسیم ہند سے پہلے آپ سے کام بھی لیا کرتے تھے۔

اب حیدر آباد ہی میں قیام ہے اور عبادت پر کام کر رہے ہیں۔ بڑے بالغ نظر اور کثیر معلومات کے بزرگ ہیں۔ عملی آدمی نہیں ہیں، کتابی اور تحریری آدمی ہیں۔ خود لکھیں خود چھپوائیں یہ ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ کاش کوئی ادارہ اس کام کو اپنے ذمے لے اور ان سے کام لکھوایا جائے، بڑے ہی کار آمد بزرگ ہیں۔

ڈاکٹر سیادت علی خان

آپ مولوی قطب الدین فاضل کے فرزند ہیں۔ حیدر آباد ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ مولوی فاضل، ایم اے، ایل ایل بی کرنے کے بعد لندن جا کر آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی سی ایل اور ڈی فل اور بار ایٹ لا انگلستان سے کیا۔ حیدر آباد آ کر جامعہ عثمانیہ کے قانون کے پروفیسر ہو گئے۔ پھر سر رشتہ عدالت میں منتقل ہو گئے اب ہائی کورٹ کے جج ہیں۔

جسٹس ڈاکٹر میر سیادت علی خان ملک کے ان جوہر داروں میں سے ہیں جن پر ملک ناز کر سکتا ہے۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی پر یکساں عبور ہے۔ مذہب، ادب اور قانون پر یکساں نظر ہے مگر اپنے مخاطب کو اپنی علمیت سے مرعوب کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ مرنجان مرنج، بااخلاق اور وضع دار آدمی ہیں، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں کا وقار ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ ان کے والد میرے والد کے بھتیجے تھے مگر عمر میں چند سال بڑے تھے اور یہ میرے بھتیجے ہیں مگر ہم عمر ہیں ہم دونوں میں چند ہی مہینوں کا فرق ہے۔

آج کل قانون ہی کی طرف زیادہ مائل ہیں، شرعی قانون شہادت پر بڑی نفیس کتاب لکھی ہے جو بہت مقبول ہے اور بہت سی شرحیں لکھی ہیں، مضامین خوب لکھتے ہیں مگر آج کل عدالتی مصروفیات کی وجہ سے کم لکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر ولی الدین

آپ جسٹس ڈاکٹر میر سیادت علی خان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ حیدر آباد ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ منشی فاضل، ایم اے، ایل ایل بی کرنے

کے بعد لندن گئے اور آکسفورڈ سے پی ایچ ڈی کیا اور بار ایٹ لا کرکے واپس آگئے۔ جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبہ فلسفہ ہیں۔

تصوف کا مطالعہ بڑا گہرا ہے اور آج کل مذہب اور تصوف پر کام کر رہے ہیں۔ ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ علامہ اقبال پر بھی ایک بڑی نفیس کتاب لکھی ہے جو بہت مقبول ہوئی۔

خاموش کارکن ہیں، ہنگاموں میں نہیں پھنستے۔ اطمینان سے بیٹھ کر کام کئے جاتے ہیں۔ مشرقی اور مغربی علوم پر حاوی ہیں۔ پڑھانے سے جو وقت بچتا ہے وہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں صرف کرتے ہیں۔ باوجود فلسفی ہونے کے تحریر میں شگفتگی ہے اور مضامین بڑے اچھے لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر نظام الدین

حیدر آباد ہی کے قدیم خاندان کے فرد ہیں۔ مولوی فاضل کامیاب کرنے کے بعد بی۔ اے کرتے کرتے لندن چلے گئے اور عوفی پر تحقیق کرکے فارسی میں پی ایچ ڈی کیا۔ حیدر آباد واپس آکر جامعہ عثمانیہ کے فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ حال ہی میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے ہیں۔

عماد الملک، قطب الدین فاضل، محمد یار جنگ نے ایک دار الاشاعت "دائرۃ المعارف" کے نام سے قائم کیا تھا جو پچاس سال سے عربی کی نایاب اور کمیاب کتابیں شائع کر رہا ہے، جب اس کا تعلق جامعہ عثمانیہ سے ہوا تو ابتدا پروفیسر الیاس برنی اس ادارے کے نگران رہے اور پھر ڈاکٹر نظام الدین کے سپرد ہوا، ڈاکٹر صاحب عربی کے نہ صرف فارغ التحصیل ہیں بلکہ انہیں عربی زبان اور ادب سے بڑی ہی محبت بھی ہے اس لئے انہوں نے بڑی دلچسپی سے دائرۃ المعارف کو چلایا اور اب وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد بھی نہایت ہی مستعدی سے چلا رہے ہیں۔

ڈاکٹر نظام الدین بھی نہایت خاموش کام کرنے والے ہیں، ٹھوس اور اہم کاموں میں لگے رہتے ہیں، ایران والوں نے فردوسی کی ہزار سالہ یادگار منائی تو حیدر آباد سے بطور نمائندہ آپ ایران بھیجے گئے اور جشن ہزار سالہ فردوسی میں شرکت کی۔ بہرحال آپ ملک کے مایۂ ناز لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔

پچھلے پچیس تیس سال سے عالم ہیں، دوسرے ہمدردان ملک کی طرح آپ بھی اپنا پراپیگنڈہ نہیں کر سکتے اور نہ تملق اور خود ستائی سے لوگوں کو مرعوب کر سکتے ہیں، خاموشی سے علمی و ادبی خدمت کئے جا رہے ہیں مگر چونکہ عربی کی نایاب اور کمیاب کتابیں آپ ایڈٹ کرکے چھپواتے ہیں اس لئے عوام ان خدمات سے ناواقف ہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

مولوی فدا حسین خاں وکیل حیدر آباد کے مشہور اور قابل وکلاء میں سے تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں انہی فدا حسین خاں صاحب کے فرزند ارجمند اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے بھائی ہیں۔ ولادت اور ابتدائی تعلیم و تربیت حیدر آباد ہی میں ہوئی اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی میں شریک ہوئے۔ ترک موالات کے زمانے میں جامعہ ملیہ قائم ہوئی تو آپ بھی اس میں شریک ہو گئے اور وہاں سے لندن جاکر پی ایچ ڈی کیا۔ پھر حیدر آباد آکر شعبہ تاریخ کے ریڈر ہو گئے آج کل جامعہ عثمانیہ کے تاریخ کے پروفیسر ہیں۔

نہایت زندہ دل، مرنجان مرنج، متحمل اور محنتی شخص ہیں۔ وضعداری کے کیریکٹر کی حیثیت سے بھی ممتاز ہیں۔ مگر کیا تاریخ اور ادب پر بڑا عبور ہے۔

ایک درجن کے قریب کتابیں چھپ چکی ہیں، سیاسیات، ادب اور تاریخ پر تمام کتابیں ہیں۔ علامہ اقبال پر بھی ایک بڑی عمدہ کتاب لکھی ہے جو بہت پسند کی جاتی رہی۔

میں نے جب مومن خاں مومن پر کام کرنا شروع کیا تو مجھے ڈی تاسی کے تذکرے سے مومن کے حالات لینے کی ضرورت پڑی۔ اپنے شفیق اور محترم ڈاکٹر ستار صدیقی سے میں نے خواہش کی تو انھوں نے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کو لکھا اور یوسف حسین خاں صاحب نے مجھے ڈی تاسی کا ترجمہ کر دیا۔ یہ پہلی ملاقات بیس سال پہلے ہوئی تھی اور آج تک ڈاکٹر صاحب اسی خلوص اور محبت سے ملتے ہیں جس طرح پہلی ملاقات کی تھی بڑے ہی وضع دار واقع ہوئے ہیں۔

اردو زبان سے ڈاکٹر صاحب کو والہانہ محبت ہے اور اردو میں مستقل طور پر کام کئے جاتے ہیں۔ حال ہی میں کسی نے اردو کی بجائے جنوبی رسم الخط کو رواج دینے کی تحریک کی تو آپ نے سخت اختلاف کیا اور بڑی عمدگی سے اردو رسم الخط کی حمایت کی۔ بہر حال اردو کے سچے خدمت گزار ہیں۔

یہ خاکے ہیں حیدرآباد کے چار ادیبوں کے۔ میں نے مرحومین کو زیادہ اور زندوں کو
کم دیا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر زور پر بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ حالات کی وجہ سے جتنا لکھا
کو میں نے چھوڑ دیا ہے۔ انشاء اللہ پھر کسی وقت اس کی تلافی ہو جائے گی ——— فقط

تمکین کاظمی

علی گڈھ کی چند شخصیتیں

خلیل الرحمن اعظمی

شعر و ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے الفاظ و حروف کے پردوں پر بنے ہوئے غیر فانی نقوش کے ساتھ نقش گروں کی شخصیت سے دلچسپی لینا ایک فطری امر ہے۔ کوئی کتاب، کوئی شعر، کوئی ڈرامہ، کوئی ناول اور کوئی کہانی جب ہم پر اپنی تخلیق کا جادو جگانے لگتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ہمارے ذہنوں میں اس فن پارے کے خالق کا چہرہ ابھرنے لگتا ہے۔ اچھی کتاب اور اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیق اپنے پڑھنے والے کے اندر بھی ایک طرح سے تخلیق کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے اور وہ اس طرح کہ ہمارا ذہن اس فنکار کی شخصیت اور اس کے خد و خال کی ایک مکمل تصویر بنا لیتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ادبی شاہکار سے متاثر ہونے کے بعد ہم اپنے ذہن میں اس کے خالق کی جو تصویر بناتے ہیں وہ اتنی خوبصورت اور دلآویز ہوتی ہے کہ اس کی اصل تصویر دیکھ کر ہمیں کچھ مایوسی سی ہوتی ہے اور دل کو عجیب دھکا سا لگتا ہے۔ شاید اسی لئے رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ دنیا کی تمام تصانیف کم و بیش صرف منافقت یا کمال محبت کا نمونہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان تصانیف میں مصنف نے اپنا اصل چہرہ چھپانے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے جس طرح قدیم زمانے کے پیغمبروں اور صوفیوں، اوتاروں اور رشیوں منیوں کی شخصیت کے گرد انسانی تخیل نے ایک ماورائی اور خوبصورت ہالہ بنا رکھا ہے اور مختلف صدیوں اور مختلف ادوار کے انسانوں نے ان کو اپنے زاویے سے دیکھ کر ان کی تصویریں بنائی ہیں اسی طرح ان شاعروں، ادیبوں یا مصنفوں کے ذاتی حالات اور ان کے کردار اور شخصیت کے بارے میں ہماری معلومات کا دائرہ محدود ہے ان کی تصویریں بھی صنم گری کی حدود میں آتی ہیں۔ گوتم بدھ، رام چندر، کرشن، مسیح، زرتشت اور دوسرے روحانی پیشواؤں کے مجسمے اور تصویریں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور ان سب تصویروں میں اصل شخصیت سے زیادہ روایات اور تصورات اور کسی قوم یا کسی فرد کے اپنے ذہن کی پرواز کا عنصر نمایاں ہے۔ قدیم فلسفیوں اور شاعروں کے بارے میں بھی ہم زیادہ تر اسی صنم گری کے شکار ہیں۔ ہومر، کالیداس، فردوسی، دانتے، اور شیکسپیئر وغیرہ کی تخلیقات پڑھ کر ہمارے ذہن میں ان فنکاروں کے جو خد و خال ابھرتے ہیں وہ اصل سے کہاں تک مطابق ہوں گے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو اکثر ذہنوں کو پریشان کرتا رہتا ہے۔ غالباً یہی جذبہ محرک بنا کہ دنیا میں جو لوگ ترجمہ، خط اور آنے والی نسلوں

کے لئے اپنے کارنامے چھوڑ جائیں ان کی زندگی کے حالات بھی لکھے جائیں، ان کی ذاتی اور نجی شخصیت اور کردار کا ریکارڈ رکھا جائے، ان کے پرائیویٹ خطوط اور دوسرے کاغذات محفوظ کئے جائیں اور کچھ لوگ کیمرے کے مانند اپنے اوپر یہ فرض عائد کر لیں کہ ان غیر فانی ہستیوں کی غیر فانی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب رکھیں۔ غالب نے بڑی خوبصورتی سے اس خواہش کا اظہار کیا ہے اور آدمی کی لکھی ہوئی تحریر کو خدا کی طرف سے تعینات کئے ہوئے کاتبوں کے مرتب کردہ اعمال نامے سے زیادہ معتبر و مستند ٹھہرایا ہے ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

رشید احمد صدیقی کا یہ ایک قول اور یاد آیا ہے اسے اس موقع پر نقل کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ لکھتے ہیں:۔

"داعی اسلام کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ مرعوب اور متاثر کر رکھا ہے وہ میری ایک کمزوری ہے۔ یعنی میں کبھی اس کی جرأت نہیں کر سکتا کہ میری پرائیویٹ زندگی کی تمام جزئیات منظر عام پر آئیں یا لائی جائیں۔ رسالت مآب کا ضبط و ظرف دیکھئے کہ مقرب ترین اصحاب حتیٰ کہ ازواج مطہرات کو اس امر کی ہدایت تھی کہ روحی فداک کی زندگی کے ہر چھوٹے عمل تک کی خبر دوسروں تک پہنچائیں اور وہ بھی اس لئے کہ وہ اسوۂ حسنہ تھے۔ اس "ملک آتشیں" پر آزمائے جانے کے لئے کون آمادہ ہے؟"

واقعہ یہ ہے کہ اس "ملک آتشیں" پر آزمائے جانے کے لئے ایک پیغمبر ہی آمادہ ہو سکتا ہے اس لئے کہ اسے اپنے اوپر یہ اعتماد ہو سکتا ہے کہ اس کے ظاہر و باطن اور قول و عمل میں مکمل مطابقت ہے لیکن فنکار کی شخصیت عموماً پیچیدہ ہوتی ہے۔ اس کے اندر بیک وقت دو شخصیتیں ہوتی ہیں ایک وہ جو باہر سے نظر آتی ہے جہاں وہ ایک آدمی، ایک مرد، ایک عورت، شوہر، بیوی، بیٹا، باپ، بھائی، جوان، بوڑھا، خوبصورت، بدصورت، اندھا، لنگڑا، بہرا، بھینگا، جوشیلا، متحمل، اڑیل، غضبناک، باہمت، بزدل، توانا و ضعیف، افسردہ و نازاں، فاتح و کامراں، شکست خوردہ و آزردہ، چاہنے والا، چاہے جانے والا اور چاہت سے محروم۔ غرض عام آدمیوں کے اندر جو سیکڑوں اور ہزاروں رنگ روپ ہیں کم و بیش ہمارا فنکار بھی انہی کی گرفت میں ہوتا ہے۔ فنکار کی دوسری شخصیت اس کا اندرون ہے جو عام نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے لیکن اس کی تصانیف اسی کا کرشمہ ہوتی ہیں۔ بعض فنکاروں کے یہاں اندر کا یہ انسان ہمہ وقت بیدار رہتا ہے، بعض کے یہاں کبھی کبھی چونک اٹھتا ہے اور کچھ نشانات چھوڑ کر پھر گہری نیند سو جاتا ہے۔ ان دونوں شخصیتوں کا رشتہ ملانے اور ان کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے کا، ان کا تجزیہ کرنے کا کام ایک ماہر نفسیات ہی کر سکتا ہے لیکن ماہر نفسیات اس جگہ بے بس ہو جاتا ہے جب معمول (Subject) کے بارے میں اس کے پاس خاطر خواہ مواد (Data) نہ ہو۔ باسویل کی طرح کم ہی لوگ ہوں گے جو جانسن کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہیں اور اس کا سیاہ و سپید عوام الناس کے حوالے کر دیں اور روسو کے مانند کسی میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ اپنے پیرہن کا ایک ایک تار نوچ کر پھینک دے اور اپنے آپ کو سربازار عریاں کر کے کہے کہ آؤ اے لوگو اس شخص کا تماشا دیکھو جس نے معاہدۂ عمرانی کی تخلیق کی ہے۔

اردو زبان میں سیرت و سوانح کی تاریخ ابھی سو برس سے بھی زیادہ کی نہیں ہے۔ "آب حیات" پہلی کتاب ہے جس میں محمد حسین آزاد نے اردو کے مشہور شعراء کی تصویریں کچھ اس چابکدستی سے بنائی ہیں کہ ہم انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا دیکھ سکتے ہیں لیکن صاحب آب حیات کے پاس ماضی کے شعراء کے بارے میں جو مواد تھا اس کی حیثیت "شنیدہ" کی سی تھی، اس میں آزاد کی طباعی اور ذہانت نے اتنی رنگ آمیزی کی ہے کہ یہ نقوش دلآویز ہونے کے باوجود افسانہ طرازی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ غالباً اسی لئے موجودہ دور کے ایک ذہین افسانہ نگار نے ایک بار لکھا تھا کہ اردو کے پہلے افسانہ نگار محمد حسین آزاد ہیں اور افسانہ لکھنے کا ڈھنگ میں نے "آب حیات" سے سیکھا ہے۔ خالص سیرت نگاروں میں اولین حیثیت حالی کی ہے لیکن حالی نے "یادگار غالب" اور "حیات جاوید" دونوں کتابیں اس اعتقاد کے ساتھ لکھی ہیں کہ ابھی ہمارے ملک کی اخلاقی حالت اس قابل نہیں ہے کہ بڑے آدمیوں کی تصویر کا ہر رخ پیش کیا جائے یہی وجہ ہے کہ بعد میں چل کر جب

غالب کے سوانح نگاروں نے ان کی شراب نوشی، قمار بازی، ڈومنی سے محبت اور ان کی چھوٹی چھوٹی اخلاقی کمزوریوں کا ریکارڈ مرتب کرنا شروع کیا تو "بادہ خوار" غالب کو صرف "ولی" سمجھنے والا طبقہ چیخ اٹھا۔ شبلی نے حالی کو یہ طعنہ دیا تھا کہ حیات جاوید "کتاب المناقب" اور "مدلل مداحی" ہے، لیکن خود شبلی کے سوانح نگار سید سلیمان نے اپنے ممدوح کو جنید و شبلی، بایزید بسطامی، غزالی اور شاہ ولی اللہ کے پہلو میں بٹھانے کی کوشش کی اور جب دوسرے لوگوں نے عطیہ فیضی کے نام شبلی کے پرائیویٹ خطوط کو مرتب کر کے شائع کر دیا اور ان کی حیات معاشقہ کے لئے نفسیات دانوں کو مواد مل گیا تو پرستاران شبلی بھی برہم ہو گئے۔ شیخ عطاء اللہ نے مکاتیب اقبال مرتب کئے تو اس کی پہلی جلد کی اشاعت محض اس لئے روک دی گئی کہ اس سے اقبال کے عقیدت مندوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی اور کتاب سے ان صفحات کو خارج کر دیا گیا جن سے اقبال کی شخصیت یا علم پر کوئی دھبہ آ سکتا ہو۔

اب ادھر کچھ دنوں سے ہمارے یہاں اخلاقیات کا یہ نقشہ تبدیل ہو رہا ہے۔ غالباً سر رضا علی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنا کچا چٹھا پیش کرنے کی جرأت کی ہے اور اس حیثیت سے "اعمال نامہ" اس صنف ادب کا [illegible] ہے۔ اب نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل نے یہ خطرناک فریضہ اپنے اوپر عائد کیا ہے کہ ہماری زبان کی وہ علمی و ادبی شخصیتیں جو ہمارے درمیان موجود ہیں ان کے پیچھے کچھ محتسب لگا دینے چاہئیں جو "درون خانہ" قسم کے اندراجات مرتب کریں اور وہ حضرات جو ہماری محفلوں سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن ان کا کوئی نہ کوئی ہم صحبت اب بھی ان کی یاد اپنے سینے میں دفن کئے ہوئے ہماری بزم میں رونق افروز ہے وہ اس دبے ہوئے خزانے کو باہر نکالے تاکہ وہ متاع بے بہا جو دراصل قوم کی ملکیت ہے قوم کے کام آئے۔ یہ کام بڑے جان جوکھوں کا ہے۔ کس میں اتنا بوتا ہے جو اس بال سے باریک راستے پر چل سکے اور قدم ڈگمگانے نہ پائیں۔ مشاہیر کی تاریخ پیدائش، تاریخ وفات اور ان کے کارناموں کا بہی کھاتہ بنانا، اپنی ملاقاتوں کا حال مزے لے لے کر بیان کرنا اور اس طرح چالیس پچاس صفحے سیاہ کر دینا ممکن ہے۔ مضمون نگار کی رسوائی کا سامان فراہم کرے اور نفسیات دانوں کو خود شخص موجود کے بارے میں رائے قائم کرنے کا موقع دے لیکن اس سے اصل مقصد کہاں تک پورا ہو گا، یہ سوچنے کی بات ہے۔ کم از کم مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ میں یہ کام ایمانداری سے کرنا چاہوں تو خون تھوک دینا پڑے گا۔ اول تو ان لوگوں کے بارے میں میرے ذہن پر بہت نقوش و تاثرات دھندلے ہیں، ان کی حیثیت اس تصویر کی سی ہے جو اس کیمرے سے کھینچی گئی ہو جو قریب قریب زاویۂ تصویر سے باہر (out of focus) ہو۔ دوسرے یہ کہ بعض ایسی ایسی باتیں جنہیں بیان کرنے میں "خوف فساد خلق" کا اندیشہ ہے۔ میں ایک معمولی دنیادار آدمی ہوں حق کا اظہار کر کے منصور کی طرح دار پر چڑھنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔

طفیل صاحب کا اصرار ہے کہ میں علی گڑھ والوں پر قلم اٹھاؤں لیکن مجھے بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ علی گڑھ کی علمی و ادبی شخصیتوں اور یہاں کے مشاہیر سے میرا واسطہ اس طرح پڑا ہے کہ کسی کو صرف دور سے سڑک پر چلتے پھرتے دیکھا ہے، کوئی صاحب زن سے اپنی موٹر کار میں میرے پاس سے گزر گئے ہیں، کوئی صاحب اسٹیج پر تقریر کرنے یا تحقیقی و علمی مقالہ پڑھنے آئے ہیں اور علم و ادب کا دریا بہا کر چلے گئے ہیں۔ کسی صاحب کے کلاس میں ایک طالب علم کی حیثیت سے بارہا کہیں پچھلی صف میں بیٹھا اونگھتا رہا ہوں۔ کسی کو کسی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے گل افشانیٔ گفتار کرتے اور اپنے احباب میں ہنستے بولتے دیکھا ہے۔ کسی سے بطور عقیدت ملنے گیا ہوں اور ان کے عالی شان ڈرائنگ روم میں ڈرا سہما بیٹھا رہا ہوں اور ہر وقت یہ اندیشہ لاحق ہو رہا ہے کہ کہیں کسی شیشے کی نازک شے سے نہ ٹکرا جاؤں اور مجھے خفت اٹھانی پڑے۔ کسی کے پاس اپنی ڈگری کے لئے سفارش نامہ یا کسی دوسرے بڑے آدمی سے ملنے کے لئے تعارفی خط لکھوانے گیا ہوں اور چند منٹ باادب بااحترام بیٹھ کر واپس آ گیا ہوں۔ گیارہ سال کی زندگی میں علی گڑھ کے ان صاحبان جاہ و جلال کے گھروں کے اندر جا نکلنے کا مجھے موقع نہیں ملا اور نہ میں نے کبھی استری کئے ہوئے صاف ستھرے کپڑوں سے ہٹ کر شب خوابی کے لباس یا لنگوٹ باندھ کر ورزش کرتے یا اپنے بیوی

بچوں سے چہل کرتے یا نوکروں کو پیٹتے اور تنخواہوں سے روتے دیکھا ہے۔ اگر بعض لوگوں کو دیکھا بھی ہے تو کبھی کبھی اور ان کو بھی بیان کرنے کی اس لئے جرأت نہیں کہ مجھے ابھی یہاں رہنا ہے۔ ابھی اسی دریا کا پانی پینا ہے کسی مگرمچھ سے بیر کیا نادانی نہیں تو کیا ہے۔ پڑھنے والوں کا کیا ہے ہر طرح بھولے بھلکے لکھنے والے کا تو حشر ادھر ہو جائے گا۔ اس لئے قارئین کرام کو پہلے ہی آگاہ کئے دیتا ہوں کہ میری اس تحریر کو ایک اخبار نامہ نگار کی سرسری رپورٹ اور ایک ایڈیٹری فرمائش کی تعمیل سے زیادہ وقعت نہ دی جائے۔ اگر کوئی بات زبان قلم سے ناموزوں و نامناسب نکل جائے تو اسے محض میرے طرز نگارش کی خامی و ناپختگی پر محمول کیا جائے۔

جہاں تک شہر کا تعلق ہے علی گڑھ ہندوستان کا ایک بہت ہی معمولی اور حقیر فقیر سا شہر ہے بلکہ بعض اعتبار سے اسے شہر کہنا بھی جسارت ہے۔ یہاں نہ تو بادشاہوں کے محلات اور تاریخی آثار ہیں اور نہ ہی کوئی قابل ذکر اور قابل دید مقام۔ ایک پرانا قلعہ موجود ہے لیکن وہ بھی ایسا قلعہ جو غالباً مرہٹوں نے فوجی سامان رکھنے اور اپنی سپاہ کی حفاظت کے لئے بنایا تھا اس لئے وہ دور سے ایک پہاڑی کی شکل میں نظر آتا ہے اور قریب جانے سے ایک بڑے پھاٹک کے اندر پکی فصیلیں، تہ خانے اور دمدمے گاہیں ہیں اور وہ بھی آہستہ آہستہ نیست و نابود ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ پہلے یہ ایک قصبہ تھا اور اسے کول کہا کرتے تھے۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک سے قبل علم و ادب کے سلسلے میں علی گڑھ سے صرف چند ہی نام وابستہ ہیں۔ غالب کے بعض احباب اور تلامذہ میں منشی ہرگوپال تفتہ، منشی نبی بخش حقیر، منشی بالمکند بے صبر اور جواہر لال شعلہ کا نام لیا جاتا ہے۔ کول ہی میں مقیم تھے۔ اور وہ بھی کچہریوں میں ملازمت کے سلسلے میں۔ البتہ پچھلی صدی میں استاذ العلماء مولوی لطف اللہ صاحب علی گڑھی مرحوم اپنے دور کے زبردست عالم گزرے ہیں۔ جن کا ایک عربی کا مدرسہ تھا اور دور دور سے لوگ تحصیل علم کے لئے آیا کرتے تھے۔ کول کا نام کب سے علی گڑھ پڑا اور یہ علی کون صاحب تھے جن سے نسبت دی گئی اس کے بارے میں یقینی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ البتہ سرسید کا تبادلہ جب بنارس سے یہاں ہوا اور انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کا دفتر یہیں منتقل کر لیا تو اس کا نام علی گڑھ پڑ چکا تھا۔ علی گڑھ کا شہر ریلوے لائن کے ایک طرف ہے دوسری طرف وہ بستی ہے جو سرسید کی بسائی ہوئی ہے۔ پہلے جہاں خاک اڑتی تھی۔ اس لق و دق میدان اور اس نیم ریگستانی علاقے کی چمن بندی اور اسے ایک ایسی علمی بستی کی شکل میں تبدیل کر دینا جو آگے چل کر اسی طرح دنیا کی بڑی درسگاہوں میں شامل ہو گئی۔ جو تحصیل علم کے علاوہ تربیت اور قومی تعمیر و تشکیل کا منبع بھی رہی ہیں۔ یہ بڑے سرسید ہی کا کام تھا۔ اور اب علی گڑھ اس فہرست کا ایک نام ہے جس میں ندوہ، کلکتہ، جامعہ ازہر، آکسفورڈ، کیمبرج، دیوبند اور شانتی نکیتن وغیرہ شامل ہیں۔ جہاں علم و فضل اور تہذیب کی شمعیں روشن ہوئیں۔ سرسید نے اس خرابے کو کچھ اس طرح آباد کیا کہ لوگ دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد، بھوپال اور حیدرآباد کے درباروں کا ٹھاٹ و شکوہ بھول گئے اور دور دور سے تشنگان ادب نے تشنگی کو اسی چشمے سے سیراب ہونے کے لئے اپنے ڈیرے ڈال دئے۔ ابھی ایک صدی بھی نہیں گزری ہے جب اس کی نیو پڑی تھی لیکن اس عرصے میں یہاں سے کیا کیا نابغے اٹھے جنہوں نے اردو زبان و ادب کا دھارا موڑ دیا اور ہوا کا رخ اپنے قابو میں کر لیا۔ تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ترتیب و تدوین سرسید کے مبارک ہاتھوں یہیں کہیں ہوئی تھی۔ حالی نے مسدس مد و جزر اسلام یہیں سرسید کے بنگلے میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ شبلی نے اسلام کے بکھرے ہوئے شیرازے کو یہیں سرسید کے بنگلے کے قریب ایک جھونپڑے سے مکان میں بیٹھ کر مرتب کیا تھا۔ نذیر احمد، ذکاء اللہ، محسن الملک، وقار الملک، وحید الدین سلیم اور عنایت اللہ دہلوی جیسی ہستیاں انہی گلی کوچوں اور ویران سڑکوں پر پھر چکے ہیں اور کیا عجب کہ ان راستوں کو ان کے پاؤں کی آہٹ ابھی تک یاد ہو۔ جس کلاس روم میں آج ذخیرہ اندوز طالب علم سیاہ شیروانیاں پہنے نظر آتے ہیں وہیں کبھی عبدالحق، حمید الدین فراہی، محمد علی، شوکت علی، مشتاق علی جالبی، عبدالرحمن بجنوری، حسرت موہانی، ذکاء جالبی، عظمت اللہ خاں، ظفر علی خاں، اقبال سہیل، سجاد حیدر، مسعود انصاری طالب علم بن کر بیٹھ چکے ہیں۔ جن شہ نشینوں کے کمروں میں آج اساتذہ درس دیتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں آرنلڈ، سر والٹر ریلے، ارنسٹ، ژرژی، اسٹرلنگ، اشرف، مولانا ابو بکر محمد شیث اور مولانا احسن مارہروی جیسی ہستیاں ہو کر علم و ادب کے موتی رول چکے ہیں گے۔ ابھی یہیں ہیں۔ اور ابھی ہم بستیوں میں بیٹھ

اردو ادب کے معماروں کی آوازیں گونجی ہوں گی جب انہیں اس حیثیت سے کوئی نہ پہچانتا ہوگا۔ اختر حسین رائے پوری، سبط حسن، سردار جعفری، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، مجاز، جاں نثار اختر، باری، منٹو اور شاہد لطیف کے مانوس چہرے اب بھی اسی بستی کے راہی ہیں۔ اب بھی ان کی آوازیں یہاں گونج رہی ہیں۔

اس تحریر کا لکھنے والا آج سے گیارہ سال قبل ۱۹۴۵ء میں ایک کم سواد طالب علم کی حیثیت سے علی گڑھ میں داخل ہوا اور یہاں کی ہوا کچھ اس طرح لگی کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی اسی بستی کا ہو رہا۔ اس کی نس نس میں علی گڑھ کی مٹی کچھ اس طرح رچ گئی ہے کہ اب شاید اس کی خاک یہیں ٹھکانے لگے۔ وما توفیقی الا باللہ۔ "خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں"۔ ان کو دیکھنے والے ان کے بارے میں لکھیں گے۔ ناچیز نے جن چہروں کو دور یا نزدیک سے دیکھا ہے ان کے بارے میں مختصراً لکھتا ہے۔

نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم

علی گڑھ اسٹیشن سے اترتے ہی سید کی جس بستی کا میں نے ذکر کیا ہے اس طرف دو سڑکیں جاتی ہیں۔ ایک یونیورسٹی روڈ دوسری میرس روڈ۔ اب اس سڑک کا نام تقسیم ہند کے بعد ٹیکارام سندر روڈ ہو گیا ہے لیکن یہ نام صرف بورڈ پر لگا ہوا ہے اسے اب بھی میرس روڈ ہی کہتے ہیں۔ اس سڑک پر چلیے تو ایک فرلانگ آگے جا کر نواب چھتاری کی کوٹھی سے متصل اور نواب دھرم پور کی امریکن کوٹھی کے مقابل ایک شاندار اور خوبصورت عمارت ملے گی جس پر "حبیب منزل" لکھا ہوا ہے۔ یہ نواب صدر یار جنگ کی کوٹھی ہے۔ علی گڑھ میں اتنی وسیع اور پرشکوہ عمارت شاید ہی اور ملے۔

نواب صدر یار جنگ بھیکم پور (ضلع علی گڑھ) کے رہنے والے تھے اور شروانیوں کے مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہاں انہوں نے اپنے نام سے بھی ایک بستی بسائی جس کا نام "حبیب گنج" رکھا۔ ان کا کتب خانہ جو ہندوستان کے نادر ترین کتب خانوں میں سے ہے وہیں ہے۔ علی گڑھ کی اس کوٹھی کی تعمیر سے متعلق یہاں یہ روایت مشہور ہے کہ جس زمانے میں نواب صاحب مرحوم حیدرآباد میں صدر الصدور اور امور مذہبی کے مشیر اعلیٰ تھے اسی دوران میں ایک بار فرماں روائے دکن کا کسی وجہ سے آپ پر عتاب نازل ہوا۔ وہاں سے علیحدہ ہو کر "حبیب گنج" چلے آئے اور اپنے علمی مشاغل میں مصروف ہو گئے لیکن نظام دکن کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ انہیں اپنے اس رویے پر نظر ثانی کرنی پڑی اور کئی سال کے بعد دوبارہ نواب صدر یار جنگ کو اسی عہدے پر مامور کیا اور اس عرصے کی تنخواہ یکمشت عنایت فرمائی۔ اسی رقم سے نواب صاحب مرحوم نے "حبیب منزل" تعمیر کرائی اور وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کا مستقل قیام علی گڑھ ہی میں رہنے لگا۔ اب یہ مکان ہندوستان کے تمام مشاہیر علم و ادب کی جولان گاہ تھا۔ نواب صاحب نہ صرف اس دور کے زبردست عالم اور صاحب تصنیف بزرگ تھے بلکہ ان کی حیثیت ایک ادارہ کی تھی۔ وہ مشرقی تمدن کا آخری اور بے مثال نمونہ اور علم و فضل کا مجسمہ تھے۔ ہندوستان کی کوئی قومی و مذہبی تحریک ایسی نہ تھی جس کے وہ روح رواں نہ رہے ہوں۔ ندوۃ العلماء، ایجوکیشنل کانفرنس اور علی گڑھ یونیورسٹی تینوں آپ کی قیادت سے مشرف ہو چکے ہیں۔ آخر عمر میں مسلم یونیورسٹی کی دینیات کی فیکلٹی کے ڈین بھی تھے۔ حسن اتفاق سے علی گڑھ آتے ہی مجھے مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مل گیا۔ میں بچپن ہی میں نواب صاحب کے علم و فضل اور ان کی عظمت سے واقف ہو چکا تھا۔ میرے والد مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم نے علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی کے ایما پر بیسویں صدی کے اوائل میں ایک عربی درسگاہ مدرسۃ الاصلاح کے نام سے سرائے میر (اعظم گڑھ) میں قائم کی تھی اور مسلمانوں کی معاشرتی و تمدنی اصلاح کے لئے ایک انجمن اصلاح المسلمین کی بنیاد بھی رکھی تھی اس درسگاہ سے نواب صاحب مرحوم کو بھی دلچسپی تھی یہی وجہ ہے کہ جب میں اعظم گڑھ سے علی گڑھ کے لئے روانہ ہونے لگا تو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مجھے نواب صاحب کے نام ایک تعارفی خط دیا اور یہ فرمایا کہ علی گڑھ جا کر سب سے پہلے نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا۔ اس زمانے میں نواب صاحب

ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی روحِ رواں تھے اس لئے مجھے کانفرنس سے عربی کے ایک وظیفے کے ملنے کی بھی توقع تھی۔ چنانچہ میں علی گڑھ کے ایک سینئر طالب علم مولوی محمد عابد ندوی اندوری کی معیت میں نواب صاحب کے یہاں حاضر ہوا۔ انہیں دیکھ کر مجھ پر تھوڑی دیر کے لئے ایک رعب سا چھا گیا۔ سرخ و سپید رنگ، لمبا قد، خوش پوش اور خوبصورت آدمی تھے۔ سفید نورانی داڑھی تھی لیکن چہرہ عام علماء جیسا نہیں تھا۔ شائستگی اور نفاست کا ایک پیکر میرے سامنے تھا۔ بڑی نرم آواز میں انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا لیکن میں سن نہ سکا۔ کچھ بولا تو کسی نے کہا کہ زور سے بولئے نواب صاحب اونچا سنتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں میں اپنے حواس پر قابو پا گیا کیونکہ نواب صاحب کے لب و لہجے میں تمکنت کے بجائے شفقت و مروت تھی۔ اس ملاقات کے بعد بھی مجھے اپنے زمانۂ طالب علمی میں نواب صاحب کے یہاں جانے کا موقع ملا لیکن کسی نہ کسی ضرورت سے۔ اس زمانے میں میری علمی استعداد اتنی نہ تھی کہ مرحوم سے کچھ استفادہ کر سکتا۔ کئی امور ایسے تھے جن کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہ پڑی۔ نواب صاحب کی شرافت، وضعداری اور رکھ رکھاؤ اور ان کی علم دوستی کے چرچے علیگڑھ میں عام تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نواب صاحب کے یہاں شام کو دیوان خانے میں نشست ہوتی تھی جس میں علی گڑھ کے اکثر اہل علم حضرات جایا کرتے تھے۔ وہاں کیا کیا علم و ادب کے خزانے لٹتے ہوں گے کاش اس میں میرا بھی حصہ ہوتا۔ نواب صاحب کی بگھی روزانہ شام کو میں دیکھتا تھا جو مفتی عبداللطیف صاحب کے مکان "نور ولا" کے سامنے رکتی تھی اور انہیں لے کر مولوی عبدالقدیر صاحب علوی (استاد شعبۂ عربی) کے یہاں جاتی اور پھر یہ دونوں حضرات نواب صاحب کے یہاں تشریف لے جاتے۔ نو ساڑھے نو بجے رات میں یہی بگھی ان دونوں بزرگوں کو اپنے مکانوں میں واپس لاتی تھی۔ اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔

نواب صاحب کا جب بھی ذکر آتا تو علی گڑھ والے اس بات پر بہت افسوس کرتے کہ ان کے خاندان میں اب اس جگہ کو کوئی سنبھالتا نظر نہیں آتا۔ مرحوم کے بڑے صاحبزادے مجذوب ہو گئے ہیں اور مستقل طور پر کچھوچھہ شریف (فیض آباد) میں مخدوم اشرف جہانگیر کی درگاہ میں رہتے ہیں۔ دوسرے فرزند عبید الرحمٰن خاں صاحب شروانی آج کل مسلم یونیورسٹی کے ٹریژرار ہیں لیکن ان کے حصے میں باپ کا علم و فضل نہیں آیا۔ عبید الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے یعنی نواب صاحب کے پوتے ریاض الرحمٰن خاں شروانی نے عربی میں ایم اے کیا ہے اور یونیورسٹی میں عربی کے استاد ہیں۔ ان کو پڑھنے لکھنے سے مزید دلچسپی ہے اور کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ خدا کرے نواب صاحب کی روایات کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہوں۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں علی گڑھ ہی میں نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے مرنے سے مشرقی علم و فضل اور وضعداری کا آخری چراغ گل ہو گیا۔

مرحوم جہاں مذہبی علوم، تاریخ و فلسفہ اور فقہ اسلامی کے زبردست عالم تھے وہاں شعر و ادب کا اعلیٰ اور ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ میر حسن کا تذکرہ اور دیوان خواجہ میر درد کی ترتیب و تدوین اور ان کے مقدمے ان کی یادگار ہیں۔ شاعر بھی تھے اور حسرت تخلص کرتے تھے۔ "کلامِ حسرت" کے نام سے ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ مرحوم کی خط و کتابت حالی و شبلی سے لے کر پچھلے دور کے تمام مشاہیر ادب اور علماء سے تھی اور ان کے کتب خانے میں یہ نوادر محفوظ ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد کی نفاست پسند طبیعت نے اپنے افکار و خیالات کے اظہار کے لئے مولانا شروانی کو اپنا مخاطب بنایا اور احمد نگر کے ایام نظربندی میں جو خطوط لکھے وہ "غبارِ خاطر" کے نام سے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان خطوط کی اشاعت نے نواب صدر یار جنگ کی شخصیت کو اور بھی دلکش بنا دیا اور ابو الکلام کا یہ حبیب سارے ملک کا محبوب بن گیا۔ کاش ہندوستان کے اہل علم مولانا شروانی کے نادر کتب خانے سے صحیح طور پر استفادہ کر سکیں کیونکہ اس مرحوم نے جس عرق ریزی سے یہ موتی چن چن کر اکٹھا کئے ہیں ان کی قدر و قیمت کا پہچاننا موجودہ نسل کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

خان بہادر شیخ عبداللہ

میرس روڈ پر "حبیب منزل" سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر ایک مکان ہے جس کا نام "عبداللہ لاج" ہے۔ یہ مکان مسلم گرلس کالج کے احاطے میں ہے۔ اس میں نوّے سال کے ایک بڈھے مجسم نورانی صورت کے بزرگ ملیں گے جو باہر نکلیں گے تو ترکی ٹوپی سر پر ہوگی۔ انہیں علی گڑھ والے "پاپا" کہتے ہیں۔ یہ شیخ عبداللہ ہیں جو مسلمان قوم میں تعلیم نسواں کے اوّلین معمار ہیں۔ سرسید نے جب علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا اور نئی تعلیم سے اپنی قوم کو بہرہ ور کرنا چاہا تو قدامت پرستوں نے ان کی کتنی مخالفت کی اور انہیں کس کس طرح مطعون کیا وہ دنیا کو معلوم ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نئی تعلیم کو ہمارے ملک میں مردوں کے لئے اس قدر مہلک قرار دیا گیا تو عورتوں کے سلسلے میں اس کا نام لینے کی کسی کو کیا ہمت ہو سکتی تھی۔ سرسید کے ذہن میں یہ پروگرام بھی تھا لیکن اس وقت قوم کی ڈوبتی ناؤ کو پار لگانے کے لئے صرف مردوں کی تعلیم کے لئے بنیاد ڈالنا ہی ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ بعد میں اس مشن کی تکمیل شیخ عبداللہ کے ہاتھوں ہوئی۔ شیخ عبداللہ کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ ایک کشمیری برہمن تھے اور کمسنی ہی میں مشرف بہ اسلام ہو کر علی گڑھ کی درسگاہ میں داخل ہوئے تھے اور سرسید کے دامنِ تربیت نے انہیں کچھ اس طرح ڈھال دیا کہ یہیں کے ہو رہے۔ مسلم گرلس کالج کی بنیاد ڈالی اور تعلیم نسواں کی حمایت میں علی گڑھ سے رسالہ "خاتون" نکالا۔ ان کے اس کام میں ان کی وفا شعار بیگم اعلیٰ بی نے بڑا ہاتھ بٹایا۔ سب سے پہلے خود شیخ صاحب نے اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلائی اور پردے کی سختیوں کو کم کر کے انہیں قومی اور ملکی کاموں میں مردوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ ان کی صاحبزادی رشید جہاں نے اردو میں پہلی بار جدید طرز کی افسانہ نگاری شروع کی۔ خود ان کے شوہر محمود الظفر نے اسی طرز میں ان کا ساتھ دیا۔ "انگارے" جو اردو افسانہ نگاری اور ترقی پسند ادب کی تحریک میں ایک اہم تاریخی حیثیت رکھتی ہے اس میں سجاد ظہیر اور احمد علی کے علاوہ ان دونوں میاں بیوی کی کہانیاں بھی ہیں جو قدامت پرستی کے خلاف بغاوت کا ہمارے ادبی سرمائے میں نشانِ اوّلین ہیں۔ دوسری صاحبزادی ممتاز جہاں بیگم تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد گرلس کالج کی پرنسپل ہو گئیں۔ انہیں سارا علی گڑھ ممتاز "آپا" کہتا ہے۔ خورشید جہاں بھی شیخ صاحب کی لڑکی ہیں جنہوں نے ایک زمانے میں "رینوکا دیوی" کے نام سے فلمی دنیا میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ ان کے صاحبزادے محسن عبداللہ بھی ایک عرصے تک فلم سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ محسن عبداللہ کی بیوی یعنی شیخ صاحب کی بہو شاہدہ خاتون بھی فلمی دنیا میں چلی گئیں اور "نینا" کے نام سے اداکاری کے کمال دکھائے۔

مسلم گرلس کالج نے آہستہ آہستہ اپنے قدم جمائے اور ہزاروں مسلم خواتین اس کالج سے تعلیم پا چکی ہیں۔ عصمت چغتائی بھی اسی کالج کی پروردہ ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے اور ان کا مشہور ناول "ٹیڑھی لکیر" یہیں کے مشاہدات پر مبنی ہے۔

شیخ صاحب باوجود پیرانہ سالی کے ایک دلکش شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی نرمی اور معصومیت ہے۔ چہرے پر داڑھی نہیں ہے لیکن مونچھیں موجود ہیں۔ اب جھک کر اور آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ لوگوں کی باتیں بڑے انہماک سے سنتے ہیں اور ضرورت مندوں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے ہیں۔ وہ گرلس کالج کی تمام بچیوں سے باپ کا سا برتاؤ رکھتے ہیں اور اپنی بیٹی ممتاز جہاں کے کام میں اب تک ہاتھ بٹاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں ہر سال سرسید کے یومِ وفات کے موقع پر ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں شیخ صاحب کا شریک ہونا ضروری ہے۔ اس موقع پر ہر سال وہ ایک تقریر کرتے ہیں اور سرسید کی باتیں کر کے آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کی جوبلی منائی گئی۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں بھی ایک جلسہ ہوا۔ شیخ صاحب نے جو تقریر کی اس کا ایک فقرہ بہت ہی دلچسپ تھا۔ طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "جس جگہ آج تم بیٹھے ہوئے ہو انہی کرسیوں پر کبھی پہلے میں بھی بیٹھا کرتا تھا اور میری طالب علمی کے زمانے میں جب کوئی بڑا آدمی آتا تھا تو سوچا کرتا تھا کہ کیا کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میں بھی اسٹیج پر آکر تقریر

کر سکوں گا اور وہ لوگ میرے سمجھنے کے لئے بہت خوش ہوں گے۔ میں اس درسگاہ کا ممنون ہوں کہ اس کی تربیت نے مجھے اس قابل بھی بنایا۔"

خان بہادر حبیب اللہ خاں

علی گڑھ سے باہر کم حضرات ان سے واقف ہوں گے لیکن علی گڑھ میں ان کی حیثیت ایک ادارہ سے کم نہیں۔ یہ علی گڑھ کی زندہ تاریخ ہیں۔ ان کی عمر بھی پچاسی نوّے سال سے کم نہ ہوگی۔ یہ سرسید اور علی گڑھ کے عاشقوں میں ہیں۔ ان کا قول ہے کہ اگر حضرت محمد صلعم آخری نبی نہ ہوتے تو نبوت کا خاتمہ سرسید پر ہوتا۔ سرسید پر اعتراض اور نکتہ چینی یا کسی نوع کی تنقید وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ حبیب اللہ خاں اصلاً شاہجہاں پور کے پٹھان ہیں۔ علی گڑھ میں سرسید کے زمانے میں ہی داخل ہوئے اور یہاں سے فارغ ہو کر ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ملازمت کے دوران میں بھی وہ علی گڑھ کے معاملات میں دلچسپی لیتے رہے اور یہاں کی آئے دن کی سیاست کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں رہی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین کی معرکہ آرائیاں علی گڑھ میں مشہور تھیں۔ آپ صاحبزادہ صاحب کے جاں نثار دوستوں میں تھے اور ان کی حمایت میں انہوں نے ڈاکٹر ضیاء الدین کو ناک چنے چبوا دیئے۔ جب تک ڈاکٹر ضیاء الدین زندہ رہے ان کی زندگی کے ایک ایک لمحے کا احتساب حبیب اللہ صاحب کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ ان کے مکان میں ایک کمرہ محض ڈاکٹر ضیاء الدین کے خلاف ریکارڈ جمع کرنے کے لئے وقف تھا لیکن جس دن ڈاکٹر صاحب کے انتقال کی خبر آئی سارے کاغذات میں اپنے ہاتھ سے آگ لگا دی اور کہا کہ مرحوم کو خدا معاف کرے۔ اب ان کے عیوب کی تشہیر درست نہیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ڈپٹی حبیب اللہ صاحب نے علی گڑھ کو مستقلاً اپنا وطن بنا لیا اور یہیں اپنی شاندار کوٹھی بنوائی جس کا نام اپنے عزیز ترین دوست میر ولایت حسین صاحب کے نام پر "ولایت منزل" رکھا۔ ڈپٹی صاحب نے شادی تمام عمر نہیں کی۔ اپنا مکان یونیورسٹی کے نام لکھ دیا ہے۔

"ولایت منزل" علی گڑھ میں مرجع خلائق ہے۔ علی گڑھ کے تمام اکابر اور ارباب اقتدار یہاں آ کر زانوئے ادب تہ کرتے ہیں۔ مولوی محمد طفیل صاحب منگلوری بھی ڈپٹی صاحب کے عزیز ترین دوست تھے اور انہی کے مشورے سے علی گڑھ میں بیٹھ کر انہوں نے "مسلمانوں کا روشن مستقبل" لکھی۔ خود ڈپٹی صاحب نے صاحبزادہ آفتاب احمد کی سوانح عمری "حیات آفتاب" کے نام سے شائع کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس صنف ادب میں یہ ایک وقیع اضافہ ہے۔ "میرا علی گڑھ" کے نام سے علی گڑھ کی ایک تاریخ لکھ رہے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب مکمل ہونے پر علی گڑھ کی سب سے معتبر تاریخ ہوگی کیونکہ علی گڑھ سے متعلق ڈپٹی صاحب کے پاس ہر طرح کا مواد محفوظ ہے۔ شاید ہی اس تحریک پر اتنا وافر ذخیرہ کسی کی ملکیت ہو۔

ڈپٹی صاحب اب کافی ضعیف و ناتواں ہو گئے ہیں۔ ہاتھوں میں رعشہ ہے اور بینائی بھی کمزور ہے۔ اپنی کتاب اس طرح تصنیف کر رہے ہیں کہ لیٹے لیٹے مولوی محمود الحسن صاحب کو بولتے جاتے ہیں۔ مولوی محمود الحسن صاحب جنہیں لوگ مسکین صاحب بھی کہتے ہیں، یہاں بچوں کے اسکول میں مدرس ہیں اور ڈپٹی صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری بھی۔ ہر جمعہ کو انہی کے ساتھ تانگے پر بیٹھ کر یونیورسٹی کی جامع مسجد میں جاتے ہیں۔ اس وقت شروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس ہوتے ہیں۔ نماز جمعہ کے بعد سرسید کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہیں اور یہی معمول چلا آ رہا ہے۔ علی گڑھ میں کوئی بات اس وقت تک مستند نہیں سمجھی جاتی جب تک ڈپٹی صاحب اس کی تصدیق نہ کر دیں۔ یونیورسٹی نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی دی ہے۔

مولوی محمد مقتدیٰ خاں شروانی

یہ بھی اسّی سال کے لگ بھگ ہوں گے۔ نورانی داڑھی اور مقدس چہرہ۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی اور ہاتھوں میں بڑھاپے کا سہارا ایک عصا۔

جس میں طرح طرح کے کاغذات بھرے ہوئے ہیں۔ یہ بجا طور پر علی گڑھ کے "نوادر کدہ" ہیں۔ سر سید نے جب علی گڑھ میں انسٹی ٹیوٹ پریس قائم کیا تو اس کا انتظام و انصرام ان کے سپرد ہوا۔ وحید الدین سلیم کے بعد انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ادارت بھی آپ ہی کے سپرد ہوئی۔ ان کے اہتمام میں نہ جانے اُردو کے کتنے بیش بہا جواہر زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئے۔ یونیورسٹی پریس کی کتابیں کتابت و طباعت کے لحاظ سے بہت پہلے اپنا معیار قائم کر چکی تھیں۔ نواب اسحٰق خاں مرحوم نے ایک زمانے میں امیر خسرو کے کلیات مختلف حصوں میں اس دور کے علامہ ترین محققوں سے مرتب کرا کے آرٹ پیپر پر آپ ہی کے اہتمام میں شائع کرائے تھے اور اس کام کے لئے ایک گراں قدر رقم صرف کی تھی۔ مولوی عبد الحق صاحب رسالہ اُردو اورنگ آباد سے نکالتے تھے تو اس کی طباعت علی گڑھ میں محمد مقتدیٰ خاں شروانی کے اہتمام میں ہوتی تھی۔ رشید احمد صدیقی کا رسالہ سہیل بھی ان کے اہتمام میں آرٹ پیپر پر چھپا کرتا تھا۔

فارسی و اردو کتابوں کی اتنے اعلیٰ پیمانے پر طباعت و اشاعت کے اہتمام کے علاوہ مقتدیٰ صاحب خود بھی زبردست علم و فضل کے مالک ہیں اور متعدد علمی و تاریخی کتابوں کے مصنف ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں جو مخطوطات و نوادر ہیں وہ سب آپ کی نظر میں رہتے ہیں اور اس پیرانہ سالی میں بھی وہ ان کی اشاعت اور ترتیب و تدوین کے متعلق اسکیمیں بناتے رہتے ہیں۔ [illegible] میں جب ایم۔ اے کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی گزٹ کی ادارت کا کام میں نے سنبھالا تو اس کا پہلا پرچہ نکلتے ہی موصوف میرے دفتر میں تشریف لائے اور بڑی مسرت کا اظہار کیا اور اس کی ترتیب و اشاعت سے متعلق اپنے تجربات مجھے بتاتے رہے۔ اس وقت یہ تعلق ایسا بڑھا جو اب تک قائم ہے۔ اب بھی جب کہیں راستے میں نظر آ جائیں گے تو رک کر گھنٹوں باتیں کریں گے۔ اپنے بٹوے سے کچھ کاغذات نکال کر مجھ کو دکھائیں گے اور اپنے اشاعتی پروگرام کی مجھ کو اطلاع دیں گے۔ ان کے اس ذوق شوق اور محنت کو دیکھ کر ہم نوجوانوں کو شرم آتی ہے۔

ایک زمانے میں علی گڑھ میں انجمن اُردوئے معلّیٰ کے اہتمام میں ایک اُردو کانفرنس ہوئی تھی۔ جس میں خطبہ دیتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی نے محمد مقتدیٰ خاں شروانی کی خدمات کو بہت سراہا تھا اور کہا تھا کہ یہ شخص واقعی اس قابل ہے کہ اُردو زبان کی ایک اکیڈیمی یا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے اور اس کی باگ ڈور اس کے سپرد کر دی جائے۔

محمد مقتدیٰ خاں شروانی یہاں کے اخبار "علی گڑھ" اور "جمہور" میں چھوٹے چھوٹے مزاحیہ اور ظریفانہ مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں جن میں ان کا اپنا اسلوب نگارش ہے۔ ان مضامین پر "محتشم" لکھا ہوتا تھا۔

وہ جب کسی سے باتیں کرتے ہیں تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کہے جائیں اور دوسرا ہمہ تن گوش ہو کر سنتا رہے۔ سننے والا اگر بے صبر ہے اور بیچ میں اپنی کوئی بات چھیڑ دیتا ہے یا انہیں کچھ بتانے لگتا ہے تو وہ فوراً ٹوک کر "معلوم معلوم" کہیں گے اور اگر اس پر بھی وہ بولتا رہے تو معلوم معلوم معلوم بہت تیزی سے کہنا شروع کر دیں گے۔ یہاں تک کہ وہ بے چارہ گھبرا کر خاموش ہو جائے گا اور پھر انہی کی سننے لگے گا۔

شروانی خاندان کے شجرہ اور اس کی تاریخ سے بھی آپ کو خاص دلچسپی ہے اور اس سلسلے میں کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ نواب مزمل اللہ خاں شروانی کی سوانح حیات بھی مرتب کر رہے ہیں اور آج کل جب ملتے ہیں تو سو سو طرح سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔

منشی نجم الدین

چھوٹے قد کے ایک خستہ حال معمر بزرگ ہیں جن کی حیثیت سے علی گڑھ کے پرانے لوگ واقف ہیں۔ یہ سر سید کے ملازم تھے۔ ان کی وفا شعاری اور خدمت گزاری کی وجہ سے سر سید انہیں بہت عزیز رکھتے تھے اور پیار سے "میرا ٹٹو" کہا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ نام ایسا چلا کہ اب تک انہیں "سر سید کا ٹٹو" کہا جاتا ہے۔ ان کے پاس سر سید، حالی، شبلی، محسن الملک، ذکاء اللہ، راس مسعود وغیرہ کی تصاویر موجود ہیں جو خود

مصنفین نے اپنے دستخط کے ساتھ انہیں تحفے کے طور پر دی تھیں۔ نیز ان کے نام ان کے بہت سے خطوط اور ان بزرگوں کی دستخطی تصویریں ہیں۔ اس نادر ذخیرے سے مختار الدین احمد آرزو صاحب نے فائدہ اٹھایا ہے اور منشی صاحب سے متعلق ایک مستقل مضمون "منشی تحریریں" [illegible] میں شائع کرایا ہے جس میں بہت سے خطوط اور ان کے عکس بھی شامل ہیں۔ بشیشر کی نوجوانی کی ایک تصویر بھی ان کے پاس محفوظ تھی جو رسالہ آج کل دہلی میں شائع ہوئی۔ اب کافی ضعیف ہو گئے ہیں۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر سے متعلق ہیں اور کتابوں اور مسودات کی نقل کا کام کر کے گزارہ کرتے ہیں۔ علی گڑھ کے ایک ایک مکان کا جغرافیہ اور وہاں کے رہنے والوں کے متعلق ایک ایک تفصیل ان کو یاد ہے اور سر سید اور ان کے معاصرین کی ایک زندہ یادگار ہیں۔

مولوی اکرام اللہ خاں ندوی مرحوم

بہت موٹے اور بھدّے خدوخال کے ایک پستہ قد اور گول مٹول سے بزرگ تھے۔ شخصیت میں کوئی وجاہت یا جاذبیت نہ تھی۔ خاموش طبع تھے۔ ان کو میں نے اکثر یونیورسٹی مارکیٹ یا انجمن ترقی اردو کے دفتر کے آس پاس اسی طرح چلتے ہوئے دیکھا تھا جیسے بیگانہ رہے ہوں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ "وقار حیات" کے مصنف مولوی اکرام اللہ خاں ندوی یہی ہیں۔ مولوی صاحب ندوہ کے لائق فرزند اور شبلی کے عزیز شاگردوں میں تھے۔ شبلی کی زندگی ہی میں "الندوہ" کی ادارت کی۔ بعد میں نواب صدر یار جنگ ان کو ایجوکیشنل کانفرنس میں لائے اور مستقل طور پر اسی سے وابستہ رہے۔ "کانفرنس گزٹ" کی ادارت اور تصنیف و تالیف کا کام آپ کے سپرد تھا اور نہایت خاموشی سے اپنے تحقیقی و علمی مشاغل میں لگے رہتے تھے۔ وطن شاہجہان پور تھا لیکن علی گڑھ ہی میں بس گئے تھے اور کانفرنس کمپاؤنڈ کے ایک مکان میں بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ [illegible] میں انتقال ہوا اور یہیں سپرد خاک ہوئے۔

سلطان حیدر جوش

اردو انشاء پردازی کے دور اوّلیں کی باقیات میں سے تھے۔ علی گڑھ کے گریجویٹ تھے اور عرصہ تک ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ شیخوپور بدایوں وطن تھا لیکن ریٹائر ہونے کے بعد علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جس زمانے میں میں نے انہیں دیکھا ہے ان کی عمر کافی ہو چکی تھی لیکن چہرے پر بڑی رونق اور فارغ البالی تھی۔ گورے چٹے تھے اور دیکھنے میں انگریز معلوم ہوتے تھے۔ عام طور پر مکمل سوٹ میں ملبوس رہتے تھے۔ سر کے بال تقریباً غائب ہو چکے تھے اور داڑھی آخر عمر تک منڈاتے تھے۔ سنتا ہے پہلے احاطہ مینڈھو ہاؤس کے قریب کہیں رہتے تھے لیکن آخر عمر میں میرس روڈ کی ایک کوٹھی "حامد منزل" میں فروکش تھے۔ ایک بار ابوالفضل صدیقی کے ساتھ ان سے ملنے گیا۔ ملنے کے بعد اندازہ ہوا کہ تقریباً بہرے ہو چکے ہیں۔ صدیقی صاحب کانوں کے پاس چلّا چلّا کر ان سے کچھ باتیں کرتے رہے اور میں خاموش بیٹھا رہا۔ کئی سال ہوئے علی گڑھ ہی میں انتقال ہو گیا۔ ان کے صاحبزادے احسان حیدر صاحب مسلم یونیورسٹی سٹی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، بعد میں انگلستان چلے گئے اور اب سنتا ہے کراچی میں ہیں۔ جوش صاحب کی صاحبزادی محمودہ انور یہیں گرلز کالج میں لکچرر ہیں۔

ظفر عمر

"نیلی چھتری" اور "بہرام کی گرفتاری" کے مصنف ظفر عمر علی گڑھ کے پرانے گریجویٹ تھے۔ وطن جیوٹ ضلع بلند شہر تھا۔ ان کے نام کے بارے میں ایک روایت یہاں سننے میں آئی کہ اصل نام ظفر علی تھا۔ ان کے باپ کو کسی شیعہ بزرگ نے طعنہ دیا کہ حضرت آپ سنّی ہیں لیکن "علی" کا

پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اسی پر ان کے باپ نے "ظفر عمر" نام رکھ دیا۔ علی گڑھ سے فارغ ہونے کے بعد پولیس کے محکمے میں ملازم ہو گئے اور اس میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان کے جاسوسی ناول اسی زمانے کے تجربات پر مبنی ہیں۔ ان ناولوں نے اچھی مقبولیت حاصل کی اور ان سے اتنی آمدنی ہوئی کہ کئی ناولوں کے نام پر علیگڑھ میں انہوں نے ایک ایک مکان بنوایا "نیلی چھتری"، "چوروں کا کلب" اور "لال کوٹھی" تینوں کوٹھیاں شمشاد بلڈنگ سے قلعہ کی طرف جانے والی سڑک پر ہیں۔ "نیلی چھتری" میں خود رہتے تھے۔ ایک بار دور سے انہیں دیکھنے کا موقع ملا جب وہ ریٹائر ہو کر مستقل طور پر یہیں مقیم تھے۔ وجیہہ آدمی تھے لیکن ایک بار گولی کا نشانہ بنے اور ایک ٹانگ کاٹ دینی پڑی۔ آخر عمر میں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے بہت دلچسپی لیتے تھے اور اس کے زبردست کارکن تھے۔ ان کی صاحبزادی سے اختر حسین رائے پوری کی علی گڑھ ہی میں شادی ہوئی۔ تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہیں انتقال ہو گیا۔

پروفیسر عبدالعزیز میمن

اس وقت پوری دنیا میں عربی زبان کے مسلم الثبوت ادیب اور محقق ہیں۔ عربی علوم کے سلسلے میں آپ کا نام طٰہٰ حسین اور پروفیسر کرنکو کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ آپ کی بے شمار کتابیں بیروت اور مصر سے اعلیٰ درجے کے ٹائپ میں شائع ہو چکی ہیں اور وہاں کے اہل زبان سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔ ہندوستان میں عربی کو اس طرح مادری زبان کے مانند لکھنے اور بولنے والے بہت کم ادیب پیدا ہوئے ہوں گے۔ میمن صاحب راجکوٹ (کاٹھیاواڑ) کے رہنے والے ہیں۔ تعلیم باقاعدہ کسی درسگاہ میں نہیں حاصل کی اور نہ ہی ڈگری کے نام کی کوئی شے ان کے پاس ہے۔ مختلف علماء کی خدمت میں رہ کر علم حاصل کیا اور خود ذہانت و محنت سے استعداد میں اضافہ کیا۔ نذیر احمد کے شاگرد بھی رہ چکے ہیں۔ نذیر احمد کے علم و فضل کے ساتھ ان کی خست اور کنجوسی بھی میمن صاحب کے حصے میں آئی ہے۔ انھوں نے روپیہ جمع کر رکھے ہیں اور خود نہایت معمولی طور پر رہتے ہیں کہ باہر سے آنے والا شخص پہچان بھی نہیں سکتا کہ یہی علامہ عبدالعزیز میمن ہیں۔ شکل و صورت سے تاجر معلوم ہوتے ہیں۔ چوڑا چکلا چہرہ، لمبا قد، بہت چوڑا ماتھا، خشخشی داڑھی اور چوڑی مہری کا پاجامہ۔ سر پر مارواڑیوں کے انداز کی ایک ٹوپی۔ اکثر ایک ٹوٹی پھوٹی سائیکل سے بازار کی طرف جاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ سائیکل پر ایک بڑا سا تھیلا بھی لٹک رہا ہو گا۔ بازار سے سبزی ترکاری، اناج، مسالے تمام ضروریات کی چیزیں خود خرید کر لائیں گے اور دکانداروں سے ایک ایک پیسے پر گھنٹوں تکرار کریں گے۔ ایک بڑا سا مکان بھی بنوا رکھا ہے۔ اور اس کے مختلف حصے کرائے پر اٹھا رکھے ہیں۔ کرایہ اس سختی سے وصول کرتے ہیں کہ کوئی سود خوار پٹھان اپنا قرض بھی اس طرح نہ وصول کرتا ہوگا۔ نہ صرف روپے پیسے کے معاملے میں بلکہ علم کے معاملے میں بھی ان کا بخل اسی درجے کا ہے۔ ان سے کسی سلسلے میں استفادہ کرنا اور کچھ معلوم کر لینا یا اپنی ریسرچ کے سلسلے میں مدد لینا آسان کام نہیں۔ میرے علم کے مطابق اب تک اس مقصد میں محض ان کے شاگرد مختار الدین آرزو صاحب کامیاب ہوئے ہیں۔ مئی جون کی چلچلاتی دوپہروں میں میمن صاحب ان کو ریسرچ میں مدد دینے کے لئے بلاتے تھے لیکن آرزو صاحب کو بھی کام کرنے کی وہ دھن تھی کہ دو سال تک باقاعدہ حاضری دیتے رہے اور کام ختم کر کے چھوڑا۔

میمن صاحب ویسے کافی ظریف اور بذلہ سنج آدمی ہیں اور ادھر ادھر کی باتیں خوب مزے لے لے کر کرتے ہیں جہاں کسی نے محفل میں کوئی علمی مسئلہ چھیڑ دیا تو فوراً کہیں گے "ابی حضرت آپ کن دھندوں میں پڑ گئے چھوڑیئے اس کو بتایئے کشمیر کے سلسلے میں پاکستان نے اب کیا بیان دیا ہے"۔ میمن صاحب کے مکان میں نہ کوئی آراستہ ڈرائنگ روم ہے۔ اور نہ ہی بیٹھنے کا کوئی کمرہ۔ کھری چارپائی پر بیٹھے ہوئے حقہ گڑگڑاتے رہتے ہیں۔ تمباکو بڑا اچھا پیتے ہیں اور طرح طرح کے تمباکوؤں کو ملا کر تجربہ کرتے رہتے ہیں۔ اپنے شاگردوں سے تمباکو اور امین آباد لکھنؤ میں حاجی کے یہاں کی بنی ہوئی خوبصورت چلموں کی فرمائش کرتے ہیں۔ شام کو ان کی نشست احمدی نابینا اسکول

کے ایک نابینا مدرس کے یہاں رہتی ہے۔ یہ نابینا مدرس خود باغ و بہار آدمی ہیں اور سارے علی گڑھ کی خبروں کی کنجی۔ میمن صاحب موصوف ان کے پاس سے ہر طرح کی مقامی اطلاعات کا ذخیرہ جمع کر کے اپنے گھر واپس جاتے ہیں۔ گھر پر ایک ریڈیو بھی ہے لیکن گھڑی دیکھ کر ٹھیک اسی وقت ریڈیو کھولتے ہیں جب خبریں آ رہی ہوں۔ کوئی اور پروگرام نہیں سنتے۔

علامہ اقبال کا ذکر بہت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ علی گڑھ میں انہی کے توسط سے مجھے جگہ ملی تھی۔ اقبال کے ذاتی حالات سے متعلق ان کے پاس معلومات کا ایک ذخیرہ ہے۔ مختار الدین آرزو صاحب کے ساتھ مجھے اکثر جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں خاص طور سے اسی موضوع کو چھیڑ دیتا تھا اور ان کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی ہنسی مذاق میں عربی کے اشعار پڑھتے ہیں اور ان کا مطلب اردو میں بڑے عمدہ طور پر سمجھاتے ہیں۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں شعبہ عربی کی چیئرمین شپ سے سبکدوش ہو چکے تھے لیکن اس کے بعد بھی علی گڑھ ہی میں قیام رہا۔ پچھلے سال انہیں پاکستان میں علوم اسلامی کے تحقیقی ادارہ کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا ہے اور سنا ہے وہاں اٹھارہ سو روپے تنخواہ ہے۔ اب بھی کبھی کبھی یہاں آتے رہتے ہیں۔

پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری

سنسکرت کے عالم ہیں اور یونیورسٹی میں سنسکرت کے استاد۔ ویدانت اور اسلامی تصوف دونوں پر آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور مختلف فلسفوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ایک زمانے میں ان کے مضامین جامعہ اور ہندوستانی وغیرہ میں چھپا کرتے تھے جن میں ان کا مضمون "راس لیلا" خاص طور پر اہم ہے جس میں کرشن کے رقص اور راس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت اور اشاریت کی فلسفیانہ توجیہ کی ہے۔ اردو میں ایک کتاب "راس یا فلسفۂ نشاط" کے نام سے لکھی تھی جو مسلم یونیورسٹی پریس سے مولوی مقتدیٰ خاں شروانی کے اہتمام میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب پنڈت جی نے "ترجمان حقیقت ڈاکٹر سر محمد اقبال" کے نام معنون کی تھی۔ سادہ وضع رکھتے ہیں۔ دیکھنے میں عالمانہ وقار کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن جب بولتے ہیں تو مجلس پر چھا جاتے ہیں۔ شعبہ فلسفہ و نفسیات کے اہتمام میں اکثر آپ کے توسیعی لکچر ہوئے ہیں، جن میں میں بھی شریک رہا ہوں اور اس میں شک نہیں کہ تحقیق کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ عملی تصوف سے بھی لگاؤ ہے۔ ڈاکٹر عشرت حسین انور کے یہاں اکثر نشست ہوتی ہے اور تصوف و روحانیت کے موضوع پر گھنٹوں باتیں ہوتی ہیں۔ حقّے سے بھی شوق ہے۔ جس زمانے میں میرا قیام ۵۔ حالی روڈ پر تھا، میں نے انہیں مولوی مشتاق حسین صاحب (اورینٹل اسسٹنٹ لٹن لائبریری) کے پاس خوشبودار تمباکو پیتے اور کھل کر باتیں کرتے سنا ہے۔ شمشاد بلڈنگ کے ایک معمولی کوارٹر میں رہتے ہیں اور سارا وقت مطالعے میں صرف کرتے ہیں۔ اپنے صاحبزادے کی آوارگی سے بہت ملول ہیں۔

مولانا ضیاء احمد بدایونی

دیوان مومن کے شارح و مرتب مولانا ضیاء احمد بدایونی فارسی و عربی کے زبردست عالم و محقق اور اسلامی فقہ و تصوف، فلسفہ و منطق اور عروض و بیان کے مسلم الثبوت ماہرین میں سے ہیں۔ آپ کا شمار ہندوستان کے ان چند علماء میں ہوتا ہے جن سے ہر وقت ہزارہا محقق و تشنہ کام اور علمی و ادبی کام کرنے والے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ علی گڑھ میں جب کوئی علمی مسئلہ حل نہیں ہوتا تو مولانا کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور وہ اسے باتوں باتوں میں پانی کر دیتے ہیں۔ یہاں کے ایک نوجوان اور ذہین ادیب مولانا کے تبحر علمی کے اس لئے قائل نہیں تھے کہ انہوں نے موٹی موٹی کتابوں کی تصنیف نہیں کی ہے اور نہ پیشہ ور مصنفوں کی طرح نام کمایا ہے۔ ایک بار یہی حضرت جو غالب پر ریسرچ کر رہے تھے اور فارسی کے

محض شعراء کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں اپنی ذہانت کے علاوہ ملک کے متعدد مشہور ادیبوں اور نقادوں سے رجوع کر چکے تھے باآخر جب مولانا کے پاس تشریف لے گئے تو مولانا نے چند منٹوں میں ساری دقتیں حل کر دیں اس کے بعد وہ صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ سب سے کہتے تھے "واقعی یہ شخص خلیج فارس کا مگرمچھ ہے"۔ اس تشبیہ میں جہاں ان صاحب کی ذہانت اور مولانا کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے وہیں ان کے حلیے اور چال ڈھال کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ پچاس سال سے زیادہ عمر ہوگی، توند نکل آئی ہے۔ مختصر سی شباہت اور چوڑی مہری کا اونچا پاجامہ ہاتھوں میں چھڑی لے کر چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ رینگ رہے ہیں اور پھنکارتے جا رہے ہیں۔

مولانا بدایوں کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ شرافت، وضعداری، دردمندی اور علم دوستی کا جوہر آپ پر ختم ہے۔ علم کا غرور جو ہمارے بیشتر علماء کا کلیہ رہی ہے مولانا میں چھو کر بھی نہیں گیا ہے۔ مولانا شبلی کے طرز کی نعتیہ نظمیں بھی لکھتے ہیں اور پرانے انداز کی غزلیں بھی۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "تجلیات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ انجمن اردوئے معلی کے جلسوں میں رشید صاحب کے اصرار سے اپنی غزلیں ترنم سے پڑھتے ہیں۔ انہیں جب بھی میں نے معصومیت سے پڑھتے سنا ہے تو بے ساختہ مرحوم حسرت موہانی کی یاد آ جاتی ہے۔

علی گڑھ میں اپنا ذاتی مکان بدر باغ میں "بیت الحبیب" کے نام سے بنوایا ہے۔ شعبہ فارسی میں ریڈر ہیں اور ہر وقت مطالعے میں مشغول رہتے ہیں۔ افسوس ہے ان کی اولاد میں بھی کوئی ان کا جانشین نظر نہیں آتا۔

خواجہ منظور حسین

علی گڑھ کے ان چند فرزندوں میں ہیں جن پر علی گڑھ نے ہمیشہ ناز کیا ہے۔ ان کے علمی وقار اور تنقیدی نظر کا نہ صرف ہندوستان کے چوٹی کے ادیب اعتراف کرتے ہیں بلکہ انگلستان اور فرانس وغیرہ میں ان کا قول سند مانا جاتا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ اور ای ایم فارسٹر جیسے مشاہیر آپ کے بڑے مداحوں میں [illegible] پروفیسر احمد علی نے اپنی انگریزی کتاب T.S. Eliot's Peny World of Dream. خواجہ صاحب کے نام معنون کی ہے۔ ثنائی نے چین کی بہترین کہانیوں کو پہلی بار اردو میں خواجہ صاحب کے ہی ایما سے منتقل کیا اور انہی کے نام اپنی کتاب "زندہ چین" کا انتساب کیا۔ آل احمد سرور جیسے فاضل نقاد خواجہ صاحب کے تربیت یافتہ ہیں۔ ان کی کتاب "تنقید کیا ہے" خواجہ صاحب کے نام معنون ہے۔ پروفیسر وقار عظیم نے "نیا افسانہ" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں بہت کچھ خواجہ صاحب کی رہنمائی کو دخل ہے جس کا انہوں نے اپنے دیباچے میں اعتراف کیا ہے۔

علی گڑھ میں خواجہ صاحب شعبۂ انگریزی کے صدر تھے۔ آکسفورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے علی گڑھ کو اپنا مستقر بنایا تھا اور یہیں اپنا ذاتی مکان بدر باغ میں بنوایا تھا۔ ان کی شادی یہیں کے پروفیسر ایم ایم شریف (سابق صدر شعبہ فلسفہ) کی صاحبزادی سے ہوئی تھی اور اس طرح یہ میاں افتخار الدین اور احمد شاہ بخاری پطرس کے ہم زلف ہوتے ہیں۔ دہلی کے شرفاء میں سے ہیں۔ ان کے اسلاف میں سے ایک باکمال شخص خرم صاحب گزرے ہیں جن کا ذکر اشرف صبوحی نے اپنی کتاب "دلی کی چند عجیب ہستیاں" میں کیا ہے۔

خواجہ صاحب خوبصورت آدمی ہیں۔ گورا چٹا رنگ، میانہ قد، اکہرا جسم۔ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ عام طور پر پہنتے تھے۔ عام گفتگو میں انگریزی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کی زبان دہلی کی خاص ٹکسالی زبان ہوتی تھی۔ ان کو میں نے صرف ایک بار انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے سنا ہے۔ جب ای ایم فارسٹر علی گڑھ آئے تھے اور یونین ہال میں خواجہ صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ شعبۂ انگریزی کی "ریلے لٹریری سوسائٹی" میں خواجہ صاحب ہر سال کسی نہ کسی موضوع پر ایک وقیع مقالہ انگریزی میں پڑھتے تھے۔ اس مقالے کو سننے کے لئے لوگوں کو کتنا اشتیاق ہوتا تھا اور کتنے مشاہیر اس مجلس میں موجود ہوتے تھے اس سے علی گڑھ والے خوب واقف ہیں۔

خواجہ صاحب انتہائی خلیق اور منکسار ہیں۔ ایک معمولی طالب علم بھی ان کے یہاں پہنچ جاتا تھا تو گھر سے فوراً نکل آتے اور گھنٹوں اس کے ساتھ اپنے لان میں ٹہل ٹہل کر باتیں کرتے۔

اپنے دوست تصور حسین زیدی کے ساتھ جو اس زمانے میں ایم اے کے طالب علم تھے مجھے بارہا ان کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ خواجہ صاحب کا ادبی نقطۂ نظر بہت سلجھا ہوا تھا، ترقی پسند شعراء میں فیض اور جذبی اور افسانہ نگاروں میں بیدی کے قائل تھے۔ کرشن چندر اور سردار جعفری کے ادب میں جو صحافتی عنصر ہے اس پر کڑی تنقید ہم لوگوں نے خواجہ صاحب سے اس زمانے میں بھی سنی ہے، جب ان کی شہرت و مقبولیت حد درجہ بڑھی ہوئی تھی۔ جذبی صاحب پر بطور خاص شفقت فرماتے تھے۔ انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام "فروزاں" کی ترتیب و انتخاب میں خواجہ صاحب کو ہی رہنما بنایا۔

اُردو میں خواجہ صاحب نے کوئی مستقل کتاب شائع نہیں کی لیکن اُردو ادب میں خواجہ صاحب کی خدمات سے اہل نظر واقف ہیں۔ وہ ان چند ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے سب سے پہلے فرانسیسی اور روسی ادب کے شاہکاروں کو اُردو ادب میں منتقل کیا۔ آج بھی علی گڑھ منتھلی، جامعہ اور اُردو کے پرانے فائلوں میں خواجہ صاحب کے ترجمے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک طویل مقالہ "ادب اور اخلاق" بھی لکھا تھا جو علیگڑھ کے ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا لیکن نہ جانے کیوں کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا۔ دراصل خواجہ صاحب کا علم اور شعور اب اس درجہ تک پہنچ چکا ہے کہ وہ اپنی لکھی ہوئی چیزوں سے مطمئن نہیں ہوتے۔ کہتے ہیں کہ کوئی تحریر جب تک خود میرے اپنے معیار پر پوری نہ اترے اسے کس طرح اشاعت کے لئے دے دوں۔ یہی سبب ہے کہ ٹیگور پر ان کی کتاب اب تک مسودے کی شکل میں ان کے پاس پڑی ہوئی ہے۔ یہ کتاب اگر خواجہ صاحب کسی طرح چھپانے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو میرا خیال ہے اُردو تنقید میں یہ سب سے معیاری اور قیمتی اضافہ ہوگا۔ خواجہ صاحب کی گپ شپ اور ان کی باتیں سن کر علی گڑھ کے بہت سے طالب علم اور لکچرر ادیب اور نقاد ہو گئے اور ادبی دنیا میں شہرت حاصل کی۔ خواجہ صاحب کا ضبط دیکھئے کہ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے۔ شہرت کی خواہش کبھی بھولے سے بھی ان کے دل میں نہیں پیدا ہوتی۔

اپنی طالب علمی کے زمانے میں خواجہ صاحب "علی گڑھ میگزین" کے ایڈیٹر تھے۔ اس زمانے کے میگزین دیکھنے کے قابل ہیں۔ ان میں خواجہ صاحب کے اس دور کے مضامین اب بھی اپنے طرز انشاء اور سوجھ بوجھ کے لحاظ سے خاصے کی چیزیں ہیں۔ سجاد انصاری خواجہ صاحب کے عزیز ترین دوست تھے۔ اُردو میں اپنی نوعیت کے انوکھے فلسفیانہ اور فکر انگیز مضامین خواجہ صاحب کی تحریک سے جلد جلد لکھے گئے جنھیں خواجہ صاحب نے ان کی وفات کے بعد "محشر خیال" کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ کتاب اس زمانے میں مرتب ہو کر شائع نہ ہو گئی ہوتی تو آج اس جواں مرگ ادیب کو کوئی نہ جانتا۔

۱۹۴۷ء میں خواجہ صاحب پاکستان چلے گئے اور آج کل گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ہیں۔ سنا ہے اقبال پر ایک کتاب لکھی ہے اور اسے شائع کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ کاش وہاں کے لوگ اس قیمتی متاع کو خواجہ صاحب سے برآمد کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

قاضی عبدالغفار

"لیلیٰ کے خطوط" کے جواں طراز اور جواں نگار مصنف جب تقسیم ہند کے بعد انجمن ترقی اُردو (ہند) کے سیکرٹری ہو کر علی گڑھ تشریف لائے تو اس وقت ان پر خزاں کا عالم تھا، صحت جواب دے چکی تھی اور طبیعت بجھ سی گئی تھی پھر بھی شائستگی و نفاست اور تہذیب و شرافت کا ایک پیکر تھے، ان کو دیکھ کر کسی ایسے طیور کا گمان ہوتا تھا جو ابھی ابھی دھل دھلا کر آیا ہو اور گرد و غبار کا ہلکا سا نشان بھی نہ ہو۔ اپنے لباس

اور طرزِ رہائش کے اعتبار سے قاضی صاحب بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح ایک ارسٹوکریٹ ادیب تھے لیکن مولانا کے برخلاف قاضی صاحب نہ تو خلوت پسند تھے اور نہ ہی انانیت کے اسیر۔ انتہائی ملنسار، نرم طبیعت، بردبار اور عفو و درگزر سے کام لینے والے آدمی تھے یہی وجہ ہے کہ فریب کھانا اور پھر اس کی تجدید کرنا ان کی شخصیت کا ایک جزو بن چکا تھا۔ ان کی نرمی اور ملنساری سے فائدہ اٹھا کر بہت سے نالائق نہ صرف ان کو بلکہ انجمن کو نقصان پہنچاتے اور قاضی صاحب کی افسردگی اور آزردگی میں اضافہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ سخت علالت کے دوران میں بھی بستر پر بیٹھے لیٹے انجمن کا کام کیا کرتے اور سارے خطوط کا جواب خود دیتے۔ آخر عمر میں اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ نوجوان ادیبوں کی ہمت افزائی اور ان کے لئے ہر طرح کمربستہ رہنا قاضی صاحب کا ایسا جوہر تھا جو پرانی نسل کے لوگوں میں مجھے کسی اور میں نظر نہیں آیا۔ آج سے کئی سال پہلے "ادبِ لطیف" میں میرا مضمون "بہادر شاہ ظفر" چھپا تو انہیں بہت پسند آیا۔ دفتر بھیج کر مجھے بلایا اور بہت ہی تعریف کی اور کہا کہ جس نقطۂ نظر سے تم نے بہادر شاہ ظفر پر تنقید کی ہے وہ بالکل نئی چیز ہے اور بہت ہی قابلِ قدر، میری خواہش ہے کہ تم اسی نقطۂ نظر سے ظفر کے کلام کا ایک انتخاب مرتب کردو۔ میں اسے انجمن سے شائع کروں گا۔ اور اگر انجمن کی تحریری کمیٹی نے نامنظور کیا تو اپنے خرچ سے طبع کراؤں گا۔ میں نے یہ انتخاب مرتب کرکے دے دیا۔ اتفاق کہ اسی زمانے سے قاضی صاحب پر سخت علالت کا دورہ پڑنے لگا اور ان کا زیادہ وقت حیدرآباد اور بمبئی میں علاج کے سلسلے میں صرف ہونے لگا اور میرا مسودہ انجمن کی فائل میں پڑا رہ گیا اور اب اس کی اشاعت کی نہ جانے کب نوبت آئے۔

علی گڑھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے کوئی جلسہ ہوتا اور قاضی صاحب کو مدعو کیا جاتا تو اپنی ناطاقتی کے باوجود آتے ایک بار کرشن چندر کی آمد کے موقع پر سالانہ جلسہ ہوا تو قاضی صاحب نے صدارت بھی کی اور خطبۂ صدارت بھی لکھ کر لائے۔ جس زمانے میں مسلم یونیورسٹی گزٹ کی ادارت کا بار میرے کاندھوں پر تھا میں نے حسرت موہانی کی وفات پر ان سے ایک مضمون گزٹ کے لئے لکھنے کو کہا۔ دوسرے ہی دن قاضی صاحب نے یہ فرمائش پوری کی اور اس کا اصل مسودہ عنایت فرمایا اور کہا کہ یہ اب تمہارے اخبار کے علاوہ کہیں اور نہ بھیجا جائے گا۔ یونیورسٹی کے چند اساتذہ نے آج سے دو سال قبل ایک علمی ادبی رسالہ "فکر و نظر" کے نام سے شائع کرنے کی اسکیم بنائی اور اشاعت کے لئے آپس میں چندہ کیا۔ اس رسالہ کے لئے قاضی صاحب نے سب سے پہلے چندہ دیا اور انجمن کی طرف سے "فکر و نظر" کے لئے اشتہار بھی دلوایا۔ اس کی مجلس ادارت کا پہلا مشاورتی جلسہ قاضی صاحب نے خود اپنے یہاں کیا۔ اس موقع پر انہوں نے ایک پر تکلف دعوت بھی کی۔ میں ان کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اور جھجک کر رہا تھا۔ قاضی صاحب نے فوراً بہت سی چیزیں میری طرف بڑھا دیں اور کہنے لگے میں تو اپنی ضعیفی اور علالت کی وجہ سے مرغن غذائیں ہضم نہیں کر سکتا لیکن میں نے آپ نوجوانوں کی دعوت اس لئے کی ہے کہ خود آپ کو کھاتے دیکھ کر مجھے ایک تسکین سی ہوتی ہے۔

علی گڑھ میں ہر سال ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوتا ہے۔ جس میں مشاہیر شعراء تشریف لاتے ہیں اس موقع پر قاضی صاحب کے یہاں ایک دعوت اور شعر و شاعری کی نشست منعقد ہوتی تھی۔ اس میں علی گڑھ کے شعراء کو بھی بلاتے۔ اتنی ستھری شعر و سخن کی بزم میں میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔

قاضی صاحب کا وطن مراد آباد میں تھا۔ علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ تھے اس کے بعد صحافتی دنیا میں داخل ہوئے اور مولانا محمد علی کے ساتھ ہمدرد، کامریڈ میں اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کلکتہ میں کام کیا۔ خود بھی کئی اعلیٰ درجے کے اخبار نکالے جس میں "جمہور" اور "صباح" کلکتہ سے اور "پیام" حیدرآباد سے نکالا اور صحافت نگاری کی تاریخ میں ایک نمایاں مثال قائم کی۔ قاضی صاحب کے قلم سے ایک سطر بھی ایسی نہ نکلتی تھی جو ایک مخصوص طرزِ نگارش کی حامل نہ ہو۔ اس درجہ کے صحافی اردو زبان میں کم ہی گزرے ہیں۔

علی گڑھ میں ان کا قیام صاحبزادہ آفتاب احمد کی کوٹھی "آفتاب منزل" کے ایک حصے میں تھا۔ ان کے ڈرائنگ روم اور خوابگاہ دونوں میں جانے کا بارہا اتفاق ہوا۔ وہاں نادر ترین کتابوں کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد کی جوانی کی تصویر، مرزا یعقوب جو قاضی صاحب کے خسر تھے،

ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی کی تقریریں بھی اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ قاضی صاحب کے داماد چودھری محمد سلطان صاحب مسلم یونیورسٹی میں شعبہ سیاسیات میں ریڈر ہیں اور قاضی صاحب سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر نواب ساجد علی صاحب کی کوٹھی میں فروکش ہیں۔ اپنے نواسے طارق سلطان سے بہت پیار کرتے تھے اور اسے بیٹے کی طرح اپنے ہی ساتھ رکھتے تھے۔

۱۰ جنوری سنہ ۱۹۵۲ء کو تین بجے دن میں قاضی صاحب کا علی گڑھ ہی میں انتقال ہو گیا۔ علالت کا سلسلہ عرصے سے چل رہا تھا لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ اس قدر جلد ہم سے رخصت ہو جائیں گے۔ یونیورسٹی کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ دوسرے دن یونیورسٹی یونین میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس جلسے میں یہاں کے طالب علموں اور استادوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ذاکر صاحب نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو کر کہا کہ "میں آپ لوگوں کو گواہ بنا کر یہ وصیت کرتا ہوں کہ اگر میں مر جاؤں تو میرے مرنے پر نہ کوئی جلسہ ہو اور نہ یونیورسٹی بند کی جائے۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین

ذاکر صاحب سے میری ذاتی واقفیت علی گڑھ سے پہلے کی ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے جامعہ ملیہ دہلی میں عارضی طور پر کلرکی کی تھی۔ ذاکر صاحب کا قاعدہ ہے کہ وہ جہاں رہیں گے چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے بھی ملیں گے۔ اس سے کرید کرید کر باتیں پوچھیں گے اور طرح طرح سے اس سے تعلقات بڑھائیں گے۔ میں ذاکر صاحب کی شہرت و عظمت اور ان کی تعلیمی خدمات کا پہلے ہی معترف تھا بلکہ جامعہ ملیہ کی پچیس سالہ جوبلی کے موقع پر سنہ ۱۹۴۶ء میں اس لئے دہلی گیا تھا کہ ذاکر صاحب کی تقریر سنوں اور واقعہ یہ ہے کہ یہ ایسی تقریر تھی جسے سن کر میری آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں اور دل پگھل گیا تھا۔ اب جامعہ کی کلرکی کے زمانے میں ذاکر صاحب کی شخصیت نے اور بھی مسحور کیا اور پھر تو یہ حال ہو گیا کہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لئے جسے احباب کے سامنے کہنے میں بھی جھجک ہوتی۔ میں بلا تکلف ذاکر صاحب سے کہہ دیتا تھا اور وہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرتے یا مجھے اس طرح مطمئن کر دیتے کہ میں سرے سے اس ضرورت ہی کو مہمل سمجھنے لگتا۔ یہ ذاکر صاحب کا خاص آرٹ ہے اور اس جادو سے بچنا کم از کم میرے لئے مشکل ہے۔ میں جب بھی ان کی خدمت میں کسی کام سے حاضر ہوا ہوں تو واپس اگر چاہے مقصد پورا نہ ہوا ہو لیکن لگا یہی ہے کہ سو فی صدی کامیابی ہوئی ہے۔ بعض اوقات ذاکر صاحب لطف لینے کے لئے دانستہ بھی غلط باتیں کہتے ہیں اور کچھ اس طور سے کہ آدمی کو چکر میں ڈال دیتا ہے۔ پھر مسکراتے ہیں اور بڑے وثوق کے طور پر کہتے ہیں میں غلط کہہ رہا تھا آپ اتنی جلدی قائل کیوں ہو گئے۔ ذاکر صاحب بڑے بڑے خیالات اور اعلیٰ مقاصد کا اظہار کرنے والوں سے بالکل متاثر نہیں ہوتے۔ ان کا اندازہ ہے کہ ایسے لوگ عام زندگی میں ناکام رہتے ہیں کیونکہ یہ لوگ جذباتی اور تخیل پرست ہوتے ہیں اور عمل کی صلاحیت سے محروم۔ ان کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ "کھٹ کھٹ کئے جاؤ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا"۔ یہی وجہ ہے کہ صبر و شکر کے ساتھ مستقل مزاجی سے اپنے کام میں لگے رہنے والوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ اپنے ملنے والوں سے اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ زندگی میں جو چھوٹے چھوٹے کام، چھوٹی چھوٹی ذمہ داریاں اور بظاہر معمولی معاملات ہیں انہیں حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں جو شخص ان چھوٹے چھوٹے کاموں کے کرنے کا سلیقہ اور طرز نہیں رکھتا وہ بڑے بڑے کام بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی بڑی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

ذاکر صاحب کی ایک اور چیز سے میں بطور خاص متاثر ہوں اور وہ ان کا لکھنے کا طریقہ ہے۔ ذاکر صاحب اگرچہ پیشہ ور ادیب نہیں ہیں۔ ضرورتاً کبھی کبھی مضمون یا خطبہ لکھتے لیکن ان کی ایک ایک سطر میں ان کا طرز نگارش عجیب جادو جگاتا ہے۔ میرا خیال ہے ذاکر صاحب ایک صاحب طرز ادیب ہیں اور ان کی اس خصوصیت کو ہمارے بڑے بڑے پیشہ ور ادیب اور نقاد نہیں پہنچے جنہوں نے ادب ہی کے لئے عمریں گنوائی ہیں۔ ان کا لکھنے کا انداز خالص تخلیقی ادب کا سا ہے۔ عموماً اس وقت لکھتے ہیں جب پانی سر سے گزرنے والا ہو لیکن اپنی تحریر میں اپنی

شخصیت کا سارا جادو ختم کر دیتے ہیں۔ سادہ، ترشی ہوئی، دلآویز اور تخلیقی جوہر سے مالا مال کسی اردو ادیب، یا سیاست داں اور ماہر تعلیم کے یہاں مجھے نہیں ملی۔ خط لکھنے کا پیڈ سفید ہوتا ہے۔ اگر اس پر نام چھپا ہوا ہو تو اردو ٹائپ میں ہوگا۔ عام مضامین بھی بیٹھے بیٹھے ہی لکھ سکتے ہیں۔ سادہ خط اس قدر خوبصورت ہے کہ رشک آتا ہے۔ کہیں سے کوئی جملہ یا فقرہ کٹا ہوا نہیں ملے گا۔ پوری کی پوری تحریر آئینے کی طرح صاف و شفاف ہوتی ہے۔ گورنمنٹ کی ملازمت کے دوران میں کانووکیشن کے موقع پر ان کی انگریزی تقریر چھاپنے کے لئے مجھے جانا پڑتا تھا اور جب مسودہ میرے ہاتھ میں آتا تھا تو گھنٹوں دیکھا کرتا۔ کئی بار میں نے خود اسی طرح کا ہینڈ رائٹنگ بنانے کی مشق کی لیکن بہت کم کامیابی ہوئی۔ ویسے ان کے دستخط کی نقل میں اچھی خاصی کر لیتا ہوں۔

ذاکر صاحب میں ذہانت اور سلیقہ دونوں بلا کا ہے۔ وہ اپنے مخصوص موضوعات تعلیم، معاشیات اور فلسفہ کے علاوہ دنیا بھر کے موضوعات پر اچھی خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ جغرافیہ، سائنس، انجینئرنگ، طب، امور خارجہ، تاریخ، ادب و شعر، تصوف و مذہب، رقص و موسیقی کوئی شعبہ ایسا نہیں جس پر ذاکر صاحب کی دسترس نہ ہو۔ اس موضوع پر یہاں سے اگر کسی تقریر یا جلسے کا افتتاح کرنے کے لئے بھی کہا جائے گا تو ایسی خیال انگیز باتیں کریں گے کہ اس کے بڑے بڑے ماہرین دنگ رہ جائیں گے۔ عام اس قسم کی معلومات وہ ثانوی ذرائع سے حاصل کرتے ہیں یعنی اس موضوع سے متعلق کسی کی باتیں سن کر یا کسی شخص سے گفتگو کر کے کچھ پوچھنے کے بعد لیکن وہ اس علم کو اس طرح ہضم کر لیتے ہیں اور اسی طرح اپنے ذہن میں رچا بسا لیتے ہیں کہ کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ذاکر صاحب اس کے متخصص نہیں ہیں۔

علی گڑھ کے استادوں سے ان کو عام طور پر یہ شکایت رہتی ہے کہ یہ لوگ اپنے علم سے کام لینا نہیں جانتے۔ ہمارے یہاں پروفیسر محمد حبیب، ڈاکٹر ہادی حسن، ڈاکٹر بابر مرزا جیسے تاریخ داں اور ماہرین سائنس موجود ہیں لیکن دنیا ان کو اس لئے نہیں جانتی کہ ان کی تصانیف نہیں ہیں اور اگر ہیں تو برائے نام۔ ذاکر صاحب نے یوم سرسید کے موقع پر ایک بار تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ سرسید کو دیکھئے کہ کام کرنے کی ایسی دھن تھی کہ کوئی صناعت ہو، یا ہومیو پیتھک، رسالہ ہیضہ اور رسالہ طاعون تک لکھ ڈالا حالانکہ وہ ان فنون کے ماہر نہ تھے۔ لیکن پہلے یہاں کے استاد ان کے ماہر ہو کر بھی آنے والی نسلوں کے لئے کچھ نہیں چھوڑ جانا چاہتے۔

رشید احمد صدیقی

رشید صاحب کے مضامین کا جادو تو مجھ پر اسی زمانے میں چل گیا تھا جب میں اعظم گڑھ میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے مضامین علی گڑھ کے بارے میں پڑھ پڑھ کر میں علی گڑھ کا گرویدہ ہو گیا تھا اور یہی مضامین مجھے یہاں کھینچ کر لائے۔ رشید صاحب کی تصویر "مضامین رشید" میں دیکھ چکا تھا اور ان کی شخصیت کے بارے میں ذہن میں طرح طرح کے نقوش بناتا رہتا۔ اعظم گڑھ سے چلتے وقت شبلی کالج کے پرنسپل بشیر احمد صدیقی صاحب نے جو رشید صاحب کے عزیز اور حقیقی بھائی تھے مجھے تعارفی خط دیا لیکن علی گڑھ میں اس تعارفی خط کا رشید صاحب پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا کہ میرے پاس صرف اسی وقت آئیے گا۔ جب آپ کو ڈیوٹی سوسائٹی سے قرض کی ضرورت ہو۔ اس قرض کی مجھے کئی بار ضرورت پڑی اور رشید صاحب کے یہاں جانا پڑا۔ گھر پر بار بار جاتا اور واپس آ جاتا کیونکہ اول تو مکان اس قدر لق و دق ہے کہ دروازے سے گھر کے اندر باوجود چلانے اور دروازہ کھٹکھٹانے کے آواز نہ پہنچتی دوسرے یہ کہ اگر کوئی نوکر یا مالی برآمد بھی ہوا تو اس نے فوراً جواب دیا کہ رشید صاحب گھر میں نہیں ہیں۔ ناچار پھر شعبۂ اردو کا چکر لگاتا اور وہاں بھی موجود نہ ہوتے تو شعبۂ اردو کے چپراسی میاں خاں کی ہدایت کے بموجب بشیر الدین صاحب لائبریرین کے کمرے میں جاتا۔ یہیں اکثر ملاقات ہوتی تو رشید صاحب بغیر کہے مقصد سمجھ جاتے اور درخواست پر رقم مطلوبہ کی منظوری لکھ کر مجھے کہتے کہ اسے خاں صاحب (عبد المجید خاں) آنریری سپرنٹنڈنٹ ڈیوٹی سوسائٹی کے پاس لے جائیے۔ چنانچہ اس کے بعد ڈیوٹی کے فارم کی خانہ پری اور رقم کی ادائیگی کا مرحلہ حاصل کرنے میں خاں صاحب کے سو سو ناز اٹھانے پڑتے۔

اگرچہ بعد میں اندازہ ہوا کہ خاں صاحب بڑے وضع دار آدمی ہیں اور ان کی باتیں نہ صرف دلچسپ ہوتی ہیں بلکہ ان کے پاس معلومات کا بے اندازہ ذخیرہ اور لطائف و ظرائف کا ایک خزانہ ہے۔ علی گڑھ کے ایک ایک شخص کی سات پشت کی تاریخ کوئی ان سے پوچھ لے۔ ایسے ایسے انکشاف کریں گے کہ آدمی دنگ رہ جائے اور سچ تو یہ ہے کہ میں ابتدا ہی میں یہاں کے ہر شخص کی اہمیت سے واقف ہو گیا تو اس میں خاں صاحب کی ان ملاقاتوں کا بہت کچھ فیضان ہے۔

رشید صاحب کی شخصیت کا شروع شروع میں مجھ پر کچھ اثر نہیں پڑا۔ شکل و شباہت کے اعتبار سے بھی وہ کچھ یونہی سے ہیں۔ لباس اور چال ڈھال سے کسی طرح نہ پروفیسر معلوم ہوتے ہیں نہ ادیب اور نہ ہی کوئی قابل ذکر شخص۔ جو آدمی ان کو نہ جانتا ہو وہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہی رشید احمد صدیقی ہیں۔ دور سے دیکھ کر ان کو کوئی مزاح نگار تو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ایک آدھ جلسوں میں انہیں تقریر کرتے سنا تو اندازہ ہوا کہ تقریر سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور صرف شکریہ یا معذرت کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔ ایک آدھ فقرے ضرور مزہ دے جاتے تھے لیکن خود ان فقروں کو ادا کرتے ہوئے رشید صاحب کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہ ہوتا۔

رشید صاحب سے صحیح معنوں میں ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب میں بی اے کا طالب علم تھا اور 'نگار' پر میرے مقالات باقاعدہ نگار میں شائع ہو رہے تھے۔ غالباً نیاز صاحب نے ان کو لکھا کہ علی گڑھ کے یہ کون صاحب ہیں جن کے مضامین 'نگار' میں چھپ رہے ہیں تو رشید صاحب کو میری تلاش ہوئی اور یہ جان کر انہیں بڑا تعجب ہوا کہ میں وہی شخص ہوں جو ڈیوٹی سوسائٹی سے قرض لینے کے لئے انہیں اکثر گھیرتا ہے۔ پھر تو رشید صاحب بہت مہربان ہو گئے۔ کہا کہ جب مجھ سے ملنے گھر آیا کرو تو اپنا نام ضرور بتا دیا کرو کیونکہ میں نیکر اور بنیائن پہنے ہوئے اپنے باغیچے میں کام کرتا رہتا ہوں۔ غیر ضروری آدمیوں سے ملنے کے لئے کپڑے بدل کر باہر آنا اور پھر ان کے لئے کرسیاں اور مونڈھے نکلوانے میں زحمت ہوتی ہے اور علی گڑھ ایسی جگہ ہے کہ اگر جھوٹ نہ بولا جائے تو سارا دن اسی کی نذر ہو جائے۔

رشید صاحب سے قریب آنے کے بعد پہلا تاثر زائل ہو گیا اور آہستہ آہستہ ان کی شخصیت میں دلکشی نظر آنے لگی۔ اب ان کی باتوں ان کے فقروں میں مزہ آنے لگا۔ اور یہ اندازہ بھی ہوا کہ وہ فطری طور پر ایک مزاح نگار ہیں۔ بی اے تک میرے پاس اردو اختیاری مضمون کی حیثیت سے نہیں تھا۔ میرا ارادہ فلسفہ یا معاشیات میں ایم اے کرنے کا تھا لیکن رشید صاحب کے مشورے سے میں نے اردو میں ایم اے کرنے کا ارادہ کر لیا اور ان کا طالب علم ہو گیا۔ رشید صاحب کلاس میں لیکچر نہیں دیتے بلکہ باتیں کرتے ہیں اور بسا اوقات موضوع سے بہک بھی جاتے ہیں لیکن ہم لوگوں کو اندازہ ہوتا کہ وہ انتہائی ذہین اور طباع آدمی ہیں اور ان کا ایک ایک جملہ اپنے اندر علم و ادب کا بیش بہا خزانہ رکھتا ہے۔ یہ معلومات چاہے امتحان کے لئے کام نہ آتیں لیکن زندگی میں یا ادب و شعر کی پرکھ میں تیر بہدف نسخہ ثابت ہوتیں۔ رشید صاحب ڈیپارٹمنٹ کے اسٹاف روم میں بجائے چیئرمین کی کرسی کے ایک بنچ پر آرام کرسی پر بیٹھتے اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے دوسرے اساتذہ سے باتیں کرتے۔ کمرہ میں بیٹھ کر چھوٹی چھوٹی باتیں ہم سب پر واضح کرتے اور مزے لیتے۔ انجمن اردوئے معلیٰ کے جلسوں میں بھی رشید صاحب کی گل افشانی گفتار دیکھنے کے قابل ہوتی۔

رشید صاحب کی ایک خصوصیت کا میں نے اندازہ کیا کہ وہ جس کو چاہنے لگیں اس کا ہر طرح ساتھ دیتے ہیں چاہے وہ کتنی ہی غلطیاں کرے اور غیر ذمہ داری کا مرتکب ہو۔ اس میں ڈیپارٹمنٹ کے چپراسی میاں خاں سے لے کر حمید خاں صاحب اور بہت سے اساتذہ اور طالب علم بھی شامل ہو سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے دوست کے مقابلے میں اگر حضرت جبرئیل بھی آسمان سے اتر آئیں تو میں دوست ہی کی حمایت کروں گا۔

رشید صاحب صحیح معنوں میں ایک تخلیقی فنکار ہیں۔ کتابوں سے زیادہ ان کی توجہ زندگی کے مشاہدات پر ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کتابیں تو اکثر انسانی ذہن کو بیزار بنا کر چھوڑ دیتی ہیں اور احساس سے عاری اور قوت نو سے محروم کر دیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ان مضمونوں کے کچھ بہت زیادہ

قائل نہیں جو ولی کے کسی دوست یا معشوق کے سالِ پیدائش کی تحقیق میں برسوں لگاتے ہیں یا سیکڑوں صفحے سیاہ کرتے ہیں۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ہر طرح کی بہت سی معلومات جمع کرنا اور اپنے ذہن کو ایک کباڑخانہ بنا لینا انسان کی اُپج کو ختم کر دیتا ہے اور اس کو شخصیت کی نرمی اور انسانی رشتوں کی لذت سے محروم کر دیتا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ان کے گھر میں کوئی کتب خانہ نہیں۔ ان کے پاس آئے دن تحفے میں کتابیں آتی رہتی ہیں، لیکن وہ اسے لائبریری میں یا دوستوں کو دے دیتے ہیں۔ رسالے گھر کے بچے پڑھتے ہیں اور پھر بعد میں یونیورسٹی کے میڈیکل آفیسر ڈاکٹر [illegible] صاحب اٹھا لے جاتے ہیں۔

شام کو رشید صاحب باقاعدہ اسٹاف کلب جاتے ہیں اور احباب میں بیٹھ کر برج کھیلتے ہیں۔ کھیل میں وہ ہار جیت کی کچھ ایسی فکر نہیں کرتے۔ کھیل کے آداب اور اسپورٹس مین شپ کا ہر لمحہ لحاظ رکھتے ہیں۔ جوانی میں ٹینس کے بڑے اچھے کھلاڑی تھے لیکن مسلسل صحت کی خرابی نے یہ مشغلہ چھڑوا دیا۔

رشید صاحب کی گھریلو زندگی میں بڑی رونق اور چہل پہل ہے اور وہ پورے طور پر اس کی گرفت میں رہتے ہیں۔ وہ [illegible] بجٹ یا پوسٹ کی پیٹ کتابیں لکھ کر تصنیفات کی تعداد میں اضافہ کرنے کی ان کو آج تک فکر نہ ہوئی۔ کہتے ہیں یہ بازاری اور اشتہاری لوگوں کا کام ہے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم

ڈاکٹر عبدالعلیم کو علی گڑھ کے بعض لوگ "گم صم بدھو" سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کی باوقار اور بھاری بھرکم شخصیت، فلسفیانہ انداز میں کچھ سوچتے رہنا اور عموماً ہر بات کا "ہاں" یا "نہیں" یا کسی مختصر ترین فقرے میں جواب دینا ہے۔ سگار ان کے جسم کا ایک ضروری جزو معلوم ہوتا ہے۔ فرنچ کٹ خوبصورت داڑھی، سرخ و سپید رنگ، سر پر چھلے دار بال۔ عموماً چوڑی مہری کا پاجامہ اور شیروانی پہنتے ہیں۔ یہاں کے جلسوں کی صدارت ان کی قسمت میں لکھ دی گئی ہے۔ ہر جگہ پکڑے جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ فن انہیں خوب آتا ہے۔ ویسے بھی وہ کسی مجلس میں بیٹھے ہوں تو صدر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی زبان دراصل بھری بزم میں کھلتی ہے۔ تنہائی میں ملئے تو وہ دو دو چار قسم کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کئی آدمی بیٹھے ہوں تو بڑی دلچسپ باتیں کریں گے۔ کسی پر فقرے کسیں گے، کبھی بات میں مزاح کا پہلو نکال دیں گے۔ ڈاکٹر علیم کا اصل جوہر ان کی تقریر میں کھلتا ہے۔ کوئی موضوع ہو، کسی مسئلے پر مباحثہ یا سمپوزیم ہو، کسی مقالے پر تنقید و بحث آ پڑی ہو پھر وہ اس کے بارے میں ایسی واضح، دو ٹوک اور مدلل باتیں کریں گے کہ سارے اُلجھے ہوئے دھاگے کھل جائیں گے۔

ڈاکٹر علیم یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے صدر اور ادارۂ علوم اسلامی کے نگراں ہیں لیکن اس سے یہ اندازہ لگانا درست نہیں کہ وہ عربی کے ادیب یا محقق ہیں جس طرح علامہ عبدالعزیز میمن وغیرہ۔ علیم صاحب نے جرمنی سے عربی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی لیکن ڈاکٹر ذاکر صاحب کی طرح دراصل وہ ایک ماہر تعلیم ہیں اور انہوں نے کسی ایک موضوع میں اختصاصی حیثیت حاصل کرنے کے بجائے اپنے علم کا دائرہ وسیع رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں فلسفہ و نفسیات، تاریخ و معاشیات، سیاسیات و علم مدن، شعر و ادب اور لسانیات پر یکساں عبور ہے اور ان میں سے ہر ایک پر بڑی جچی تلی رائے رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو میں بہت کم تنقیدی مضامین لکھے ہیں لیکن یہ مضامین اپنی گہرائی اور جامعیت کے اعتبار سے بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہیں۔ آج اردو کا کوئی ایسا ادیب نہیں جو اتنے کم صفحات لکھنے کے باوجود ادبی دنیا میں اتنی وقعت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔

تنظیمی صلاحیت اور کسی ادارے کی نگرانی و رہنمائی کے لئے علیم صاحب بہت موزوں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے انہوں نے علی گڑھ میں شعبۂ عربی کی باگ ڈور سنبھالی اس کے نصیب جاگ گئے اور اس وقت سارے شعبوں میں یہی شعبہ سب سے زیادہ ترقی کر رہا ہے اور

اپنی وسعت کا دائرہ بڑھاتا جا رہا ہے۔

بحیثیت انسان ڈاکٹر علیم کی شرافت، اور طلباء و اساتذہ سے ان کی ہمدردی علی گڑھ میں ضرب المثل ہے۔ وہ یہاں ایک "مشکل کشا" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس مشکل کشائی میں شعر و ادب اور ریسرچ سے لے کر حصول ملازمت، وظیفہ اور فیس کی معافی سب کچھ شامل ہے۔

یونیورسٹی روڈ پر مکان ۳۰ میں رہتے ہیں۔ یہ پہلے پیوکس کا بہت پرانا شاندار بنگلہ تھا۔ اب اس کی چھت پختہ کر دی گئی ہے۔ علیم صاحب کی گھریلو زندگی بڑی خوشگوار ہے۔ اور ایک بہت بڑے کنبے کی پرورش کا انتظام بڑی خوبی سے کر رہے ہیں۔ بحیثیت شوہر اور باپ کے بھی ان کی شخصیت بے مثال ہے۔

آلِ احمد سرور

اب تو خیر سرور صاحب مستقل طور پر علی گڑھ میں آ گئے ہیں لیکن اس بیچ کے عرصے میں جب وہ رامپور یا لکھنؤ میں تھے اس وقت بھی انہیں علی گڑھ کا ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ ان کی شخصیت پر علی گڑھ کی زبردست چھاپ ہے۔ ان کے ذہن کی تعمیر میں اقبال، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عابد، خواجہ غلام السیدین، سر راس مسعود اور خواجہ منظور حسین کا فیضان شامل ہے۔ وہ مشرق و مغرب اور قدیم و جدید کا ایک خوبصورت امتزاج ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ محبوب و مقبول ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر میں کافی لچک اور وسعت اور ان کے مذاق میں رچاؤ اور نکھار ہے۔ موجودہ تنقید نگاروں میں سرور ہی صاحب ایسے ادیب ہیں جو ایک مخصوص اسلوب نگارش کے مالک ہیں۔ یہی انداز ان کی عام گفتگو اور تقریر میں بھی جھلکتا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں بڑے اچھے مقرر رہ چکے ہیں اور یہاں کی یونین کے وائس پریزیڈنٹ بھی۔ سرور صاحب خشک اور خلوت پسند یا خاص اسکالر قسم کے آدمی نہیں، وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں۔ ان کی دلچسپیوں اور تعلقات کا دائرہ بہت وسیع اور رنگارنگ ہے اور افراد سے لے کر اسٹیج کے ہنگاموں تک ان کی دسترس اور رسائی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جہاں جاتے ہیں فضا پر چھا جاتے ہیں۔

سرور صاحب میں ذہانت اور طباعی کا جوہر تنقید کی طرف سے بہت واضح ہے۔ پامال اور فرسودہ مسائل کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں کہ بالکل نئی چیز معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ایک ایک فقرے میں چشمے کی سی روانی اور شیرینی ہوتی ہے۔

شکل و شباہت کے اعتبار سے سرور صاحب خوش اندام لوگوں میں ہیں اور بڑی نفاست سے رہتے ہیں۔ سرخ و سپید رنگ، میانہ قد، کلین شیوڈ چہرہ، عام طور پر سوٹ پہنتے ہیں ویسے ان کی پرانی علی گڑھ کی تمام تصویریں شروانی ہی میں ہیں۔ عینک ان کے چہرے پر بڑی کھبتی ہے۔ ہونٹوں پر پان کی ہلکی سی سرخی ہوتی ہے اور عام طور پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ گھریلو زندگی بہت خوشگوار ہے۔ شعبے میں ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی پروفیسر شپ کے علاوہ قاضی عبد الغفار مرحوم کے بعد انجمن ترقی اردو کی باگ ڈور بھی آپ ہی کے سپرد کی گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جب سے سرور صاحب نے یہ کام اپنے ذمہ لیا ہے انجمن کی رگوں میں نیا خون آ گیا ہے اور اس کا کام دوگنی رفتار سے ہو رہا ہے۔

علمی و تنقیدی مضامین کے علاوہ ادھر سرور صاحب نے پھر شاعری کی طرف توجہ کی ہے اور پچھلے سال اپنا مجموعہ کلام "ذوق جنوں" شائع کر چکے ہیں۔ اب مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگے ہیں اور اپنا کلام تحت اللفظ میں سناتے ہیں۔

معین احسن جذبی

جذبی صاحب ۱۹۴۱ء میں اردو میں ایم اے کرنے کی غرض سے علی گڑھ تشریف لائے۔ ایم اے کرنے کے بعد کچھ دنوں کے لئے

رسالہ آج کل دہلی میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے لیکن سنہ ۱۹۴۲ء میں مستعفی دے کر پھر علی گڑھ واپس آگئے اور پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں شعبہ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ میں اسی سال نیا نیا علی گڑھ میں وارد ہوا تھا لیکن جذبی صاحب کی شاعری کا بہت دنوں سے پرستار تھا اور انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔ کچھ روز تک اس کی کوئی سبیل نہ نکل سکی۔ کئی مہینے کے بعد سید یوسف حسن کے توسط سے میں جذبی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جذبی صاحب سے ملنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے میرے ذہن کو کچھ دھچکا سا لگا کیونکہ میں نے ان کی جو خیالی تصویر بنا رکھی تھی وہ اور ہی تھی۔ ان کی شخصیت اور ان کے طرز گفتگو نے پہلی بار مجھے کچھ مایوس کیا لیکن دو ہی چار ملاقاتوں میں یہ احساس ہونے لگا کہ جذبی صاحب ایک سیدھے سادے بے تکلف اور ملنسار آدمی ہیں وہ اپنے ملنے والے پر اپنی شاعری یا اپنی قابلیت و ذہانت کا رعب نہیں جماتے اور نہ ہی اس پر اپنی شخصیت کو مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں جو آدمی اچھا اور معقول نظر آتا ہے فوراً اس سے دوستانہ اور برابر کی سطح پر تعلقات پیدا کر لیتے ہیں۔ چاہے وہ طالب علم ہی کیوں نہ ہو اس کے لئے چائے منگاتے ہیں اور سگریٹ پینے پر اصرار کرتے ہیں اور بے دھڑک پوچھ بیٹھتے ہیں "کبھی محبت کوئی عشق بھی وغیرہ بھی کیا ہے؟" ان کے اس طرز ادا نے بہت جلد علی گڑھ کے نوجوانوں کو جو ادب کی دیوی کے پجاری تھے آہستہ آہستہ ان کے گرد کھینچ لیا۔ اشرف ملیح آبادی مرحوم، قاضی سلیم، اصغر عباس زیدی، سید منہاج الدین، رحیم بخش قادری، ریاض الدین قیصر، باقر مہدی، منظور حسین۔ ہم سب کی ایک ٹولی سی بن گئی اور کچھ دنوں میں جذبی صاحب کے ایما سے اور ان کی رہنمائی میں ہم لوگوں نے یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ اختر حسن صاحب اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے۔ وہ زمانہ واقعی عجیب زمانہ تھا۔ نئی نئی کتابوں اور نئے رسالوں کی تلاش رہتی اور جوں ہی جذبی صاحب کی ڈاک میں کوئی چیز آتی ہم سب اسے چاٹ جاتے۔ لکھنے کا جنون تھا اور اناپ شناپ لکھنے کے صفحے سیاہ کئے جاتے۔ انجمن کے جلسے الحمرا میں ہوتے جو اس زمانے کا ایک خوبصورت ریستوران تھا۔ ہر جلسے میں حاضرین کی چائے، برفی اور نمک پاروں سے تواضع کی جاتی۔ جذبی صاحب کی وجہ سے انجمن کے ہر جلسے میں خواجہ منظور حسین صاحب تشریف لاتے، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر مسعود حسین اور انور انصاری وغیرہ بھی آنے لگے۔ باہر سے مولوی عبدالحق صاحب، قاضی عبدالغفار، حیات اللہ انصاری، اختر حسین رائے پوری یا کوئی بھی ادیب آجاتا تو جذبی صاحب اسے انجمن کے جلسے میں کھینچ لاتے۔ اس موقع پر ہم سب یوسف صاحب کو فوری جلسے کے لئے آمادہ کرتے اور تمام ممبروں کو اطلاع دینے کے لئے بڑے شوق سے سارا علی گڑھ چھان مارتے۔ اس زمانے میں یہاں کی انجمن ترقی پسند مصنفین ہی سب سے بڑا ادبی مرکز اور شعر و سخن کی نشست بن گئی اس میں جو مضامین پڑھے جاتے، جو تنقیدیں ہوتیں اور جو بحثیں آپس میں کی جاتیں ان کا کئی کئی دن تک چرچا رہتا۔

جذبی صاحب ہم لوگوں کے یہاں بعض اوقات ہوسٹل میں پہنچ جاتے اور اس وقت جو بھی مل جاتا سب کو لے کر اسٹاف کلب کے کمرے میں جہاں ان کا قیام تھا آتے اور اپنے نوکر نذر علی کو چائے بنانے کے لئے آواز دیتے اور پھر گپ شپ، شعر و شاعری اور شخصیات پر گفتگو چھڑتی۔ جذبی صاحب شعر و ادب سے متعلق اپنے نظریات اور تخلیقی عمل سے متعلق اپنے ذاتی تجربات بیان کیا کرتے اور ہم لوگوں کو اپنی نظم و نثر کو زیادہ سے زیادہ موثر اور خوبصورت بنانے کے لئے مشورہ دیتے۔ ان کی گفتگو میں اکثر خواجہ منظور کے اقوال کا حوالہ رہتا۔ کبھی کبھی مجاز، سردار جعفری، سبط حسن، مخدوم، اختر حسین رائے پوری، فیض، تاثیر، راشد، میراجی وغیرہ کا ذکر چھیڑ دیتے اور پچھلی صحبتوں کا ذکر بڑے لطف سے کرتے۔ ان شاعروں اور ادیبوں کی پرائیویٹ زندگی، ان کی آپس کی چشمکیں، ان کا خلوص و محبت اور ان کے ساتھ گزرے ہوئے لطیفے جذبی صاحب کا خاص موضوع ہوتے۔ اب یہ اندازہ ہوا کہ جذبی صاحب بہت ہی دلچسپ اور باغ و بہار آدمی ہیں۔ ان کے پاس اتنے تجربات اور اتنی باتیں ہیں کہ تازندگی ختم ہونے نہ آئیں۔ ان صحبتوں کے علاوہ سب سے بڑی چیز ہم لوگوں کے

سنے یہ بھی کہ جذبی صاحب ہر طرح سے ہم لوگوں کو چاہتے۔ وہ صرف ادبی معاملات میں ہی نہیں بلکہ ہر معاملے میں رہبری کرتے۔ فیس اور واجبات کا مسئلہ، ڈائننگ ہال سے کھانا بند ہو جانے کا مسئلہ، یونیورسٹی کا اکاؤنٹ جمع نہ ہونے اور نام کٹ جانے کا، امتحان آنے پر ہال ٹکٹ حاصل کرنے کا انتظام۔ غرض جذبی صاحب ہمارے ہر دکھ سکھ کے ساتھی ہو گئے۔ میں جب بی اے میں پہنچا تو میری سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر مجھے ہوسٹل سے نکال دیا گیا۔ جذبی صاحب خود مجھے اپنے گھر لے آئے اور کہا آج سے تم میرے ساتھ رہو گے۔ میں قریب قریب دو سال تک جذبی صاحب کے ساتھ اس طرح رہا کہ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی یہ محسوس ہوا کہ میں کسی دوسرے کے گھر پر پڑا ہوں اور اس کا ممنونِ احسان ہوں۔ اس گھر میں میں خاندان کے ایک ممبر کی حیثیت سے تھا۔ اسی زمانے میں جذبی صاحب کی بھوپال میں شادی ہوئی۔ ان کی بیوی کے آنے کے بعد بھی جذبی صاحب کے معمولات یا دوست احباب سے تعلقات اور ملاقاتوں میں فرق نہیں آیا۔ اسی طرح محفلیں گرم ہوتیں۔ چائے کا دور چلتا اور ہر طرح کے ادبی پروگرام بنائے جاتے۔

جذبی صاحب کے ساتھ رہ کر مجھے خصوصیت سے ان کے شعری عمل کو سمجھنے میں بھی آسانی ہوئی۔ اول تو وہ کم کہنے کے عادی ہیں۔ آئے دن کے واقعات پر یا سیاسی پالیسی کے ماتحت نظمیں لکھنے کو وہ شاعری نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں یہ صحافت اور پمفلٹ بازی ہے۔ اسی لئے اس معاملے میں وہ اپنے دوست سردار جعفری سے کبھی متفق نہ ہو سکے۔ جذبی صاحب اپنی نظمیں بڑی محنت سے لکھتے ہیں۔ مہینوں ایک موضوع کو ہضم کرتے اور چباتے جباتے رہتے ہیں۔ اس کے لئے نقشہ تیار کرتے ہیں اور پھر لکھ لینے کے بعد بھی نظم کو ذرا چھپنے کے لئے نہیں بھیجتے۔ اسے کچھ مہینے اور سال سال ڈالے رکھتے ہیں اور اس پر اتنی تراش خراش کرتے ہیں کہ بسا اوقات ایک ایک نظم کے لئے ایک ایک ضخیم جلد نوٹ بک ختم ہو گئی ہے۔ "میری شاعری اور نقاد" کے عنوان سے ان کی نظم میرے سامنے لکھی گئی اور اس کی تکمیل میں کئی سال لگ گئے۔

اسٹاف کلب (پرانا اسٹاف کلب جہاں آج کل پراکٹر آفس ہے) چھوڑنے کے بعد جذبی صاحب نے اپر کوٹ میں مکان کرایہ پر لیا۔ میرا قیام ان کے ساتھ اسی مکان میں تھا۔ جذبی صاحب تقریباً آٹھ سال تک رہے۔ یونیورسٹی کے قریب مکان حاصل کرنے کی ہمیشہ کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر تنگ آکر ایک نظم بعنوان "مکان نامہ" لکھ کر ڈاکٹر صاحب کو بھیجی۔ خیر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ذکاء اللہ روڈ پر انہیں ایک اچھا سا مکان مل گیا ہے۔ جذبی صاحب کی خانگی زندگی بڑی خوش گوار ہے اگرچہ ایک بڑے کنبے کی پرورش کا بوجھ ان کے کاندھوں پر ہے۔ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہو چکی ہیں۔ صاحبزادے سہیل میاں کافی ہونہار اور تیز ہیں۔ جذبی صاحب اپنے بچوں سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔ ادھر کئی سال سے مسلسل وہ اپنے پی ایچ ڈی کے تھیسس کے سلسلے میں بیحد مصروف اور فکرمند رہے جس کی وجہ سے شعر کہنے کی رفتار اور بھی کم ہو گئی تھی۔ ان کے عزیز دوست مجاز مرحوم نے کہا تھا کہ "اب تک صرف دو غم سننے میں آئے تھے غمِ جاناں اور غمِ دوراں۔ جذبی نے ایک تیسرا غم ایجاد کیا ہے اور وہ ہے "غمِ تھیسس"۔ شکر ہے کہ اس غم سے اب جذبی صاحب نے نجات حاصل کر لی ہے کیونکہ ان کا تھیسس مکمل ہو گیا ہے۔

اختر انصاری

جن لوگوں نے اختر انصاری کے رومانی تغزلات اور "دوپہری خواب" کی نظمیں پڑھی ہیں۔ وہ اختر انصاری کو دیکھتے ہیں تو یقین نہیں آتا کہ یہی ہیں۔ بھاری بھرکم آدمی ہیں اور اعلیٰ درجے کا سوٹ پہنتے ہیں اس لئے بادی النظر میں گمان ہوتا ہے کہ کوئی آئی سی ایس قسم کے آدمی ہیں۔ جس زمانے میں پہلی بار ان کے مکان احاطہ شیخ ہادی میں ان سے ملنے کے لئے سید یوسف حسن کے ہمراہ گیا تو اختر صاحب مسلم یونیورسٹی سٹی ہائی اسکول میں ٹیچر تھے لیکن ان کا آراستہ ڈرائنگ روم، ایسی بچھے ہوئے صوفوں کے شاہکار، رنگا رنگ شیشے کی بنی ہوئی چیزیں، مختلف وضع اور فیشن کے فرنیچر، ایک قیمتی کتب خانہ جس میں ضخیم کتابیں اور تمام مشہور رسالوں کے مکمل فائل

دیکھ کر یہ دنگ رہ گیا۔ پوری یونیورسٹی میں کسی بڑے سے بڑے پروفیسر کو بھی میں نے اس ٹھاٹھ سے رہتے نہیں دیکھا تھا۔ اختر صاحب ایک صوفے پر سلیپنگ گاؤن پہنے ہوئے پائپ پی رہے تھے اور دیکھنے میں انگلستان یا فرانس کے بعض ناول نگاروں سے مشابہ تھے۔

بعد میں اختر صاحب یونیورسٹی میں اُردو کے لیکچرر ہو گئے اور اتفاق سے ایم اے میں مجھے ان کا طالب علم ہونا پڑا۔ اس زمانے میں ان سے قریب ہونے کا موقع ملا۔ اب یہ اندازہ ہوا کہ بظاہر اس شاندار جسم کے اندر ایک چوٹ کھایا ہوا دل ہے اور اختر صاحب طرح طرح کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہیں۔ دوران تعلیم میں وہ واقعی آئی سی ایس ہونے کے خواب دیکھا کرتے تھے اور اسی غرض سے انگلستان گئے بھی تھے لیکن اچانک والد کے انتقال سے خاندان کا شیرازہ بکھر گیا اور انہیں ناکام واپس آنا پڑا۔ ایم اے بھی نہیں کیا تھا اس لئے اسکول کی ٹیچری کے علاوہ کوئی نوکری نہیں مل سکتی تھی۔ والد نے گھر میں فرنیچر اور سامان آرائش کافی چھوڑا تھا۔ اختر صاحب نے اسے اپنے ڈرائنگ روم میں سجایا اور پھر اسی طرح اس جذبے کی تسکین کے لئے سامان فراہم کرتے رہے۔ اسکول کی محدود زندگی نے آہستہ آہستہ ان کو اپنی گرفت میں لینا شروع کیا اور ان کی تخلیق ایک تقریباً ختم ہونی شروع ہو گئی اور اُردو کا کامیاب ترین شاعر، افسانہ نگار اور تنقیدی بصیرت کا حامل ادیب و انشاء پرداز ادبی افق سے غائب ہونے لگا۔ اختر صاحب کو اس کا بہت احساس تھا لیکن ان کے مطالعے اور تحصیل علم میں کمی نہیں آئی۔ "ایک ادبی ڈائری" کے پڑھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس طرح ایک اسکول کے گمنام ٹیچر نے دنیا کے علمی و ادبی شاہکاروں کا بااستیعاب مطالعہ کیا ہے اور ان کے متعلق ایک رچی ہوئی رائے رکھتا ہے جو بڑی بڑی یونیورسٹی کے اعلیٰ درجے کے پروفیسروں کے بس کی بات نہیں۔

یونیورسٹی میں آجانے کے بعد اختر صاحب کی زندگی میں ایک گونہ تبدیلی ہوئی لیکن ابھی اس نئی عمارت کی پوری بنیاد بھی کھڑی نہ ہوئی تھی کہ اختر صاحب کی شعبہ اُردو میں ملازمت ختم ہو گئی۔ کچھ دنوں وہ بہت پریشان رہے۔ آخر کار ٹریننگ کالج میں انہیں ایک لیکچرر شپ مل گئی۔ اس جگہ پر انہوں نے بڑی مستعدی اور جانفشانی سے کام کیا اور کالج میں معتبریت حاصل کی اور ایک مدت تک اس بات کی کوشش بھی کی کہ اپنے حواس کو مجتمع کر کے اپنی کھوئی ہوئی ادبی زندگی کو دوبارہ واپس لائیں۔ اس مقصد میں انہیں تھوڑی بہت کامیابی ہوئی ہے اور ادھر کچھ ایسی چیزیں لکھی ہیں جس میں نئے تیور اور نئی اٹھان ہے۔ "یادوں کے چراغ" کے نام سے اپنی آپ بیتی بھی لکھ رہے ہیں جس کے بعض اجزاء سننے کا مجھے بھی موقع ملا ہے اس میں شک نہیں کہ مکمل ہونے پر ایک قابل قدر ادبی تحفہ ہوگا۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

مسعود صاحب ذاکر صاحب کے بھتیجے اور قائم گنج کے پٹھان ہیں لیکن ان کے مزاج میں ایسی نرمی اور ٹھنڈک ہے جو ٹیگور کی شاعری میں ملتی ہے۔ وہ ہندوستان میں لسانیات کے چند مسلم الثبوت ماہرین میں سے ہیں اور اسی موضوع پر پیرس سے ڈی۔ لٹ کر کے آئے ہیں لیکن ان تمام مرحلوں سے گزرنے کے بعد بھی وہ اس نرمی پر کوئی پردہ نہ ڈال سکے۔ ان کا مزاج خالص ہندوستانی ہے۔ ادھر انہوں نے اپنی شعری تخلیقات کا مجموعہ "دونیم" کے نام سے شائع کر دیا ہے اسے پڑھنے کے بعد میرا کچھ ایسا اندازہ ہے کہ ان کے کلام میں گیتوں کا حصہ سب سے زیادہ جاندار ہے اور "روپ بنگال" ان کی ایک کامیاب تخلیق ہے۔ مسعود صاحب نے ابتدا ہی میں اپنی شاعری میں ہندوستانی کلچر کے بعض عناصر کو سمونا اور ایک رسیلی زبان کا تجربہ شروع کیا تھا اس سے ادھر وہ کچھ ہٹ سے گئے ہیں لیکن اس طرز کو اگر پورے طور پر پروان چڑھنے کا موقع ملے تو مسعود صاحب کے ہاتھوں اُردو شاعری میں زبردست اضافہ ہو سکتا ہے۔ مسعود صاحب نے ہندی اور سنسکرت ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور بنگالی زبان سے بھی واقف ہیں اور یہ سارے اثرات ان کی شخصیت میں رچ گئے ہیں اس لئے اس قسم کی شاعری کے لئے ان سے زیادہ کوئی موزوں نہیں۔

مسعود صاحب بحیثیت انسان اپنی مثال آپ ہیں۔ ان جیسا مخلص آدمی مشکل سے ملے گا۔ رشید صاحب اکثر "بھلمنساہٹ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس لفظ کا استعمال سب سے زیادہ موزوں مسعود صاحب کے سلسلے میں ہو سکتا ہے۔ میں نے ان کو کبھی غصے میں یا غضبناک نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی کسی کو سخت اور نا ملائم بات کہتے ہوئے۔ ان کی لغت میں شاید دشمن کا لفظ نہیں ہے۔ بعض لوگ حسد کی بنا پر مسعود صاحب کی شخصیت میں کیڑے نکالتے ہیں لیکن خود مسعود صاحب نے آج تک کسی کی ذاتی کمزوریوں کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔

مسعود صاحب خوبصورت اور وجیہہ آدمی ہیں اور قد و قامت اور رنگ روپ پر مزید قائم گنج کی چھاپ ہے۔ بہت سادہ وضع رکھتے ہیں۔ جاڑوں میں ایک کھردرا سا سوٹ اور گرمیوں میں پتلون اور بش شرٹ زیب تن ہوتی ہے۔ گاہے ماہے شروانی بھی پہنتے ہیں۔ دیکھنے میں قد آور تندرست ہیں لیکن معمولی سا سفر بھی انہیں ہفتوں کے لئے صاحب فراش کر دیتا ہے۔ زکام سال بھر پیچھا نہیں چھوڑتا۔ گرمی کے دنوں میں بھی اسٹاف روم کے اندر پنکھے سے دور ہٹ کر بیٹھتے ہیں۔ آج کل اپنا ذاتی مکان بنوا رہے ہیں اور بقول شخصے "تعمیر پسند" ہو گئے ہیں۔ چائے، سگریٹ، پان کسی سے شوق نہیں۔ وہ مکمل طور پر ترک منشیات کے اصول پر عامل ہیں۔ امتناع مسکرات کا قانون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

آج کل شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو

علی گڑھ میں آرزو صاحب کی شہرت پہلے پہل علی گڑھ میگزین کے "غالب نمبر" کی وجہ سے ہوئی لیکن ان کے تحقیقی مضامین بہت پہلے سے رسالوں میں شائع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ "نگار" میں ان کا مضمون "سلیمات سید سلیمان ندوی" ایک ہنگامہ بپا کر چکا تھا اور "ادبی دنیا" میں رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادب اردو" پر انہوں نے ایک ٹھوس مقالہ لکھا تھا۔ تحقیق کا ذوق آرزو صاحب کو قاضی عبد الودود صاحب کی صحبت میں ملا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوتا ہے جب وہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے طالب علم تھے۔ اس زمانے میں آرزو صاحب پٹنہ کے مشاعروں میں ایک ہونہار نوجوان شاعر کی حیثیت سے شریک ہوتے اور اپنی مترنم آواز کی بنا پر خوب داد لیتے۔ غزلوں پر جمیل مظہری اور پرویز شاہدی کا اثر نمایاں تھا۔ لیکن جلد ہی قاضی عبد الودود صاحب سے سابقہ پڑا تو شاعری ترک کر کے تحقیق کی طرف آ گئے۔ قاضی صاحب کا آرزو صاحب پر گہرا اثر ہے۔ علی گڑھ کی تعلیم نے آرزو صاحب کو ڈگری ضرور دی لیکن ان کی شخصیت کی مکمل تشکیل علی گڑھ آنے سے قبل ہو چکی تھی یہی وجہ ہے کہ یہاں آنے کے بعد آرزو صاحب کے طرز فکر اور طریق کار میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ علی گڑھ میں انہیں اپنے کام کے لئے ایک وسیع میدان ملا اور اپنی تحقیق کے نتائج کو مناسب طور پر اشاعت دینے کا موقع بھی۔ ان کا قول ہے کہ ایک جگہ کھودو لیکن گہرا کھودو۔

آرزو صاحب بقول عرشی ملسیانی زبردست "گورکن" ہیں۔ پرانی کتابوں اور قلمی نسخوں کی تلاش کا ایسا چسکا ہے جو کہیں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔ ایک بار اورینٹل کانفرنس لکھنؤ میں مجھے ان کے ساتھ شریک ہونے کا موقع ملا۔ اسی موقع پر مخطوطات و نوادر کی ایک نمائش بھی ہوئی تھی۔ اس وقت ان کا ذوق و شوق اور انہماک دیکھنے کے قابل تھا۔ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری کا ایک ایک پرزہ انہوں نے پڑھ ڈالا ہے اور جہاں کہیں کوئی قیمتی خزانہ دبا پڑا ہے، اس کی ان کو اطلاع ہے۔ ابھی دو سال قبل راک فیلر فاؤنڈیشن کے اسکالرشپ پر عربی میں ریسرچ کے لئے آکسفورڈ یونیورسٹی گئے تو جرمنی، فرانس اور دوسرے ملکوں میں اردو ادب سے متعلق سارا مواد چھان مارا اور

آخر کار بہت کچھ ساتھ لے کر آئے۔ پچھلے دنوں "آج کل" میں راجہ رام موہن رائے کا ایک اُردو خط گارساں دتاسی کے نام شائع کیا ہے جو انہیں پیرس میں ملا۔ جدید تحقیق کی رو سے یہ اُردو کا قدیم ترین خط قرار دیا گیا ہے۔ یہ تو محض ایک دریافت ہے۔ دیکھئے اپنی جھولی سے ابھی اور کیا کیا نکالتے ہیں۔

باوجود محقق ہونے کے آرزو صاحب خشک اور کھردرے آدمی نہیں۔ ان کی شخصیت میں بڑی رنگا رنگی اور زندگی کے مزے سے لطف لینے کی بھرپور صلاحیت ہے۔ محفلوں اور دعوتوں میں شریک ہونا، رقص، مصوری اور موسیقی کا مذاق صحیح رکھنا، پکنک اور سیاحی، چاندنی راتوں میں ٹہلنا اور ریستوران میں بیٹھ کر احباب کے ساتھ نفیس چائے اور سگریٹ پینے کا سلیقہ بھی آرزو صاحب کو آتا ہے۔ آرزو صاحب کے اندر مزاح کی حس بہت بڑھی ہوئی ہے، وقت پر ان کو فقرے خوب سوجھتے ہیں۔ ان کی گل افشانیٔ گفتار سے صحیح طور پر چند ہی واقف ہیں۔ جس زمانے میں مسلم یونیورسٹی گزٹ کا ایڈیٹر تھا اور میرا قیام ۵۔ حالی روڈ پر تھا اسی زمانے میں آرزو صاحب سے تعلقات بڑھے اور اتنی قربت ہوئی کہ آرزو صاحب مستقلاً میرے ساتھ قیام پذیر ہو گئے اور دو سال تک اس طرح گزرے ہیں کہ ہم دونوں کا ایک ایک لمحے کا "اعمال نامہ" ایک دوسرے کے سینے میں محفوظ ہے۔ ۵۔ حالی روڈ پر ہم مولوی مشتاق حسین صاحب (اسسٹنٹ لٹن لائبریری) کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے اور Paying Guest کی حیثیت سے رہتے تھے۔ مشتاق صاحب علی گڑھ کی عجیب و غریب ہستیوں میں سے ہیں۔ ان کی شخصیت بجائے خود علی گڑھ میں ایک ادارہ سے کم نہیں۔ اگرچہ انہوں نے کوئی علمی ادبی کام نہیں کیا لیکن ان کے علم، ان کی ذہانت، اور ان کی سوجھ بوجھ کے سب قائل ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ جو چیز لوگوں کو ان کی طرف کھینچتی ہے، وہ ان کا خلوص، مہمان نوازی اور دوست نوازی ہے۔ ۵۔ حالی روڈ پر شام کو محفل جمتی تھی۔ جس میں مشتاق صاحب صدر بن کر بیٹھتے اور ادھر اُدھر میرے اور آرزو صاحب کے علاوہ تیموری تابؔ، حشمت اللہ انصاری، حنیف خاں ناشاد اور ستیہ رشمی آتیں، ایک گول کمرے میں ہوتے۔ چائے کا دور چلتا اور دُنیا بھر کے مسائل پر بحث مباحثہ ہوتا۔ ایسے موقعوں پر آرزو صاحب کے لطیفے اور فقرے اور برجستہ مکالمے اس قدر دلکش ہوتے تھے کہ دیر تک اس کا نشہ باقی رہتا۔

آکسفورڈ سے واپسی پر آرزو صاحب نے ایک علیحدہ مکان کرایہ پر لے لیا ہے اور اب مع اہل و عیال کے مقیم ہیں۔ ان کے دو بچے طارق اقبال اور خالد اقبال بڑے پیارے ہیں۔

آرزو صاحب مستقل مزاج کے آدمی ہیں اور زندگی بسر کرنے کا فن انہیں آتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں کا ایک شمہ بھی انہوں نے بیکار نہیں چھوڑا ہے اور ہر طرح سے کامیابیوں کو اسیر کیا ہے۔

مسعود علی ذوقی

اختر انصاری صاحب کے آئی سی ایس نما شخص ہیں جو ایک زمانے میں اپنی فطرت نگاری اور رومانی نظموں اور گیتوں کے لئے مشہور تھے اور ان کی تخلیقات "ہمایوں" اور "نیرنگ خیال" میں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھیں۔ انہوں نے شاعری کی بساط بہت جلد الٹ دی۔ کوئی مجموعہ مرتب کر کے نہیں چھپوا سکے اس لئے آج ادب کے طالب علم ان کا نام تقریباً بھول چکے ہیں۔ ذوقی صاحب ایک شاندار اور اسمارٹ آدمی ہیں اور آج کل مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ ڈرامے کے ڈائرکشن سے بھی شغف رکھتے ہیں چنانچہ ایک زمانے میں نیاز فتحپوری کے ساتھ مل کر ایک فلمی کمپنی کھولنے کی اسکیم بنائی تھی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ فلم کے حلقے میں کئی سال تک بمبئی میں بھی قیام رہا ہے اور متعدد فلموں کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر رہ چکے ہیں جن میں محبوب کی فلم "آن" خاص طور پر اہم ہے۔ [illegible]

کے کالجوں میں پرنسپل بھی رہ چکے ہیں۔ میں نے ذوقی صاحب کو پہلی بار ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے موقع پر دیکھا تھا جب وہ "فانی کی المیہ شاعری" پر مقالہ پڑھنے کے لئے آئے تھے۔

ڈاکٹر محمد عزیز

"تاریخ دولت عثمانیہ" کے مصنف ڈاکٹر محمد عزیز یہاں شعبہ اردو میں استاد ہیں۔ ڈاکٹریٹ کے لئے جو مقالہ لکھا تھا اس کا عنوان ہے۔ "اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ" یہ اب کتابی صورت میں انجمن ترقی اردو سے شائع ہو چکا ہے۔

عزیز صاحب ایک فرشتہ صورت اور فرشتہ سیرت بزرگ ہیں، نرمی، بردباری، تحمل اور انکساری کا مجسمہ ہیں۔ بہت محنتی استاد ہیں اور ٹکسٹ پڑھانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہے لیکن دیکھنے میں تقریباً ساٹھ کے معلوم ہوتے ہیں۔ خرابی صحت نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے لیکن ان کے علمی مشاغل اور مطالعے میں کوئی کمی نہیں آئی۔

سادہ وضع رکھتے ہیں۔ شروانی، پاجامہ اور شروانی ہی کے کپڑے کی بنی ہوئی ٹوپی پہنتے ہیں۔ گردن جھکا کر چلتے ہیں انہیں دیکھ کر اکثر گمان گزرتا ہے کہ حالی ایسے ہی رہے ہوں گے۔ وطن ضلع اعظم گڑھ ہے۔ کچھ دن دار المصنفین سے بھی وابستہ رہ چکے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری

شعبۂ انگریزی میں استاد ہیں اور خواجہ منظور حسین کے عزیز شاگرد اور تربیت یافتہ۔ خواجہ صاحب ہی کی طرح اسلوب صاحب نے مطالعے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ خواجہ صاحب کے بعد اب علی گڑھ میں وسعت معلومات اور ادبی پرکھ کے اعتبار سے اسلوب صاحب ہی ان کی جگہ لیتے نظر آتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسلوب صاحب نے ابھی اپنی زندگی کو اس طرح کتابوں کے حوالے کر رکھا ہے۔ کہ لوگوں سے تعلقات بڑھانے یا متاثر کرنے کا ڈھب انہیں بالکل نہیں آتا۔ طالب علمی کے زمانے میں ان لڑکوں میں تھے جنہوں نے شروع سے آخر تک ہمیشہ فرسٹ کلاس فرسٹ حاصل کیا اور اس کے لئے اپنی صحت اور اپنی سماجی زندگی کی قربانی دی۔ انگلینڈ جانے کے بعد اپنی شخصیت اور زندگی کے بعض گوشوں کے تشنۂ تکمیل ہونے کا اسلوب صاحب کو احساس ہونے لگا لیکن یہ ایک دن کا کام نہیں، پھر بھی ادھر چند سالوں میں انہوں نے اپنے آپ کو بہت بدلا ہے۔ کم آمیزی کی عادت کم کی ہے اور اب محفلوں میں بھی نظر آتے ہیں اور احباب اور واقف کاروں کا حلقہ بھی بڑھ گیا ہے۔ کھل کر ہنسنے اور قہقہہ لگانے لگے ہیں۔ لطائف و ظرائف، چھیڑ چھاڑ اور شکوہ شکایت سے بھی تھوڑی بہت دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اپنی رائے کو منوانے کے لئے ذرا جھگڑنا، جنگ سے بچنا اور اپنی بات پر اڑ جانا بھی سیکھ لیا ہے۔ غرض اسلوب صاحب آہستہ آہستہ کتابوں کے اس بھاری بوجھ کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں جس نے ان کی قابلیت و لیاقت میں تو بے انتہا اضافہ کر دیا تھا لیکن شخصیت کا سارا رس چوس لیا تھا۔ عنقریب انگریزی ادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آکسفورڈ جا رہے ہیں۔ امید ہے وہاں یہ تراش خراش مکمل ہو جائے گی۔

اسلوب صاحب ادب کے معاملے میں کسی رو رعایت کے قائل نہیں۔ خواجہ منظور کی طرح وہ ہر تخلیق کا معیار اور اس کی سطح دیکھتے ہیں، اور اس کے تخلیقی عناصر اور رنگ و ڈھنگ سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان کو خود بھی شہرت کی کوئی خواہش نہیں اور نہ ہی ان لوگوں سے بالکل مرعوب ہوتے ہیں جن کا ادبی دنیا میں ڈنکا بجا رہتا ہے۔ اسلوب صاحب کے نزدیک ایسے لوگ ادنیٰ درجے کے اشتہار باز ہیں۔ ایک نوجوان ادیب کا ذکر ہو رہا تھا جو بڑی تیزی سے اپنی تصانیف کی تعداد میں اضافہ کر رہے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو کسی ایک مرکز پر متعین کرنے کے

بجائے اپنے ذہن کو بنیوں کی دکان کی طرح ہر طرح کے مال سے بھر دیا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین اور تجزیوں کا ذکر چلا تو اسلوب صاحب کہنے لگے اگر یہ صاحب بڑے ادیب یا افسانہ نگار کے مداح ہو جائیں گے جو ریڈیو سے منسلک ہو یا کسی مشہور رسالے کی ایڈیٹری اس کے ہاتھ میں ہو تاکہ اس کے ذریعہ اپنی پبلسٹی کرا سکیں۔ یہ لوگ ادیب یا آرٹسٹ نہیں، ادبی کباڑیے اور دلال ہیں۔ اسلوب صاحب کہنے لگے مجھے اس قسم کی شہرت و سستی قیمت یا اس طرح کتابوں کا مصنف بننے کی کبھی ہوس نہیں ہوئی۔ میری خواہش ہے کہ چاہے میں زندگی میں چند ہی مضامین یا ایک ہی کتاب کیوں نہ چھوڑ جاؤں لیکن اپنے ضمیر کا خون نہ کروں۔

اسلوب صاحب نے بلاشبہ اپنے سارے مضامین میں محنت کا حق ادا کیا ہے اور ایمانداری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ایک بار کہنے لگے کہ ایک مشاعر نے مجھ سے محض اس لئے بہت تعلقات بڑھائے کہ اس پر میں مضمون لکھ دوں اور اپنے مضمون میں انہیں وہی عظمت عطا کروں جو خود ان کے اپنے خیال کے مطابق انہیں ملنی چاہئے۔ اس پر میں نے کہا کہ بھئی مجھے اسی طرح کا کام کرنا ہوتا تو دنیا میں ایسے ذی رتبہ لوگ پڑے ہوئے ہیں جن کی تعریف اور قصیدہ خوانی کو اپنا شعار بناؤں تو مادی منفعت حاصل کر سکتا ہوں۔ اس وقت میں آپ کا ہی انتخاب کیوں کروں گا۔

اسلوب صاحب ۱۹۴۲ء سے لکھ رہے ہیں۔ ان کا پہلا قابل ذکر مضمون رسالہ جامعہ میں "اقبال کا ذہنی ارتقا" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس عرصے میں کوئی اور پیشہ ور یا تجارتی ادیب و مشتہر باز ہوتا تو نہ جانے کتنی کتابیں اس کی بازار میں بکتیں لیکن اسلوب صاحب کا یہ حال ہے کہ برسوں میں کہیں ایک مضمون لکھیں گے اور اسے بھی بہت غور و فکر اور نظر ثانی کے بعد چھپنے کے لئے دیں گے یہی وجہ ہے کہ رسالوں میں ایک لمبے وقفے کے بعد ان کا کوئی مضمون شائع ہوتا ہے۔ تو چلتا ہوا نام نہ دیکھ کر عام قاری نظر انداز کر دیتا ہے لیکن اہل نظر سے یہ چیز نہیں چھپتی۔ ان کا کوئی مضمون ایسا نہیں جو سرسری یا صحافتی اور عجلت کا ہو اور اسے اول درجے کے اہل علم نے نہ سراہا ہو۔ میرا خیال ہے اسلوب صاحب کی یہ روش انہیں ادب میں دیرپا مرتبہ دلائے گی اور ان کی کتابیں چار دن کی چاندنی نہ ثابت ہوں گی۔

اسلوب صاحب کا وطن سہارنپور ہے اور ڈاکٹر انصاری کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک خوب صورت اور وفا شعار بیوی کے شوہر اور دو معصوم بچوں کے باپ ہیں۔ گھریلو زندگی پرسکون ہے۔

منیب الرحمٰن

آٹھ سال انگلستان میں رہنے اور وہاں سے فارسی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لینے کے بعد دو سال پہلے اپنی پرانی درسگاہ علیگڑھ میں وارد ہوئے جہاں سے انہوں نے فارسی کے علاوہ تاریخ میں بھی ایم۔ اے کیا تھا۔ منیب صاحب جب علی گڑھ سے انگلستان گئے تھے تو اپنی شاعری کی وجہ سے مشہور تھے۔ انہوں نے اردو شاعری میں جدید میلانات اور ہیئت کے نئے تجربوں کو آگے بڑھانے میں بڑا سرگرم حصہ لیا تھا لیکن واپس آئے تو اسکالر بن کر۔ شاعری سے زیادہ ریسرچ پر زور دینے لگے اور جب اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ان کا تقرر ہو گیا تو وہ اور بھی آہستہ آہستہ شاعری سے دور ہوتے گئے انہوں نے اپنے کلام کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا ہے۔ اپنی پچھلی نظموں کو ناقابل اشاعت سمجھتے ہیں اور نئی نظم لکھنے کی انہیں فرصت نہیں۔

منیب صاحب ایک دلکش شخصیت کے مالک ہیں۔ قد و قامت، جسم، رنگ اور چہرے کے نقوش ہر اعتبار سے علی گڑھ کی اصطلاح میں انہیں "سویٹ" کہا جا سکتا ہے۔ اپنے والد اکرام حسین صاحب ریٹائرڈ ڈی۔ آئی۔ جی اور اپنے بڑے بھائی حفیظ الرحمٰن صاحب ہیڈ کلرک مسلم یونیورسٹی کے ساتھ اپنی خوب صورت اور شاندار کوٹھی "گل رعنا" میں رہتے ہیں اور اس کا ایک حصہ اپنے لئے مخصوص

کرکے اس کا نام "خوشتر" رکھ دیا ہے۔ ان کی سوئس بیوی بڑی وفا شعار اور ہر طرح سے ان کے مزاج کے مطابق ہیں۔ وہ یونیورسٹی میں فرنچ اور جرمن زبان کی لکچرر ہیں جن کے کلاسز عموماً شام کو ہوتے ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں نجیب صاحب شام کو اپنے ننھے بچے مصطفیٰ کی نگہداشت کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر عشرت حسین انور

فارسی اور فلسفہ میں ایم اے ہیں اور "اقبال کی مابعد الطبیعیات" پر تحقیقی مقالہ لکھ کر فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ چینی فلسفے پر تحقیق کرنے چین گئے تھے جہاں ان کی ایک ٹانگ پر فالج گرا اور لارڈ بائرن ہو گئے۔ ادھر چند سالوں سے سنسکرت سیکھ رہے تھے اور سنا ہے اب اس کا سب سے بڑا امتحان دینے والے ہیں۔ عشرت صاحب کو کام کرنے کی بڑی دھن اور جم کر میز پر بیٹھنے کی عادت ہے۔ ملنے والوں سے بچنے کے لئے اپنے گھر کے باہر تالا لگا لیتے ہیں اور دن رات اپنی تصانیف کی تکمیل میں مصروف رہتے ہیں۔ اقبال کا تقابلی مطالعہ مشرق و مغرب کے سارے فلسفیوں سے کر ڈالا ہے اور بہت جلد اپنی تحقیق کے نتائج اشاعت کے لئے دینے والے ہیں۔ فارسی میں شاعری کرتے ہیں اور اقبال کی مثنوی اسرار خودی کا جواب "سرود بیخودی" کے نام سے دیا ہے۔

عشرت صاحب ایک صوفی منش بزرگ ہیں۔ شادی تمام عمر نہیں کی۔ اجمیر کی خانقاہ سے وابستہ ہیں اور وہاں کے عرسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ خود ان کے یہاں علی گڑھ میں برابر قوالی کی محفلیں جمتی ہیں۔ ایک آدھ قوال تو مستقل طور پر ملازم رکھ لیتے ہیں۔ بڑے ہنس مکھ اور زندہ دل آدمی ہیں اور باتیں کرتے ہیں تو چھا جاتے ہیں۔ گورا چٹا رنگ اور تیکھے خد و خال ہیں، عینک اور لباس میں زیادہ تر ڈاکٹر ذاکر کا تتبع کرتے ہیں اسی لئے ایک زمانے میں علی گڑھ والے انہیں ہادی حسن کا Miniatuere کہتے تھے۔ حالی روڈ کے بنگلہ میں فروکش ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن

علی گڑھ میں نو وارد ہیں اور ابھی ان کا حال اس پودے کا سا ہے جو دور دراز کی سرزمین سے اکھیڑ کر نئی جگہ پر لگایا گیا ہو اور پورے طور پر جڑ نہ جما سکا ہو۔ اجنبی ہونے کی وجہ سے کھویا کھویا سا رہتا ہو۔ علیگڑھ شہر اور یونیورسٹی دونوں کے ماحول سے شاکی رہتے ہیں اور یہاں رہ کر ہر وقت لکھنؤ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ اصل وطن مراد آباد ہے اور زمینداری خاندان سے تعلق ہے۔ تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی میں حاصل کی اور وہیں ادبی تربیت حاصل کی اور اپنے مضامین کے ذریعہ روشناس ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد عرصہ تک صحافت کے پیشے میں رہے۔ پائنیر میں کام کیا اور بعد میں ایک علمی رسالہ "علم و عمل" کے بھی ایڈیٹر رہے۔ اب مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد ہیں۔

محمد حسن صاحب ایک ذہین طباع آدمی ہیں اور انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے ادب پر اپ ٹو ڈیٹ معلومات رکھتے ہیں۔ رقص، موسیقی، مصوری اور دوسرے فنون پر بھی مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ ریڈیائی ڈرامے اور نئی کتابوں پر تبصرے اور مختلف موضوعات پر تقریریں ان کی لکھنؤ اور دوسرے ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوتی رہتی ہیں۔ "ہندی ادب کی تاریخ" بھی لکھی ہے اور "ہندوستانی جمالیات" پر کام کرنے کا ارادہ ہے۔ علی گڑھ میں انہوں نے ایک اردو تھیٹر کی بھی بنیاد ڈالی جس نے پچھلے سال علیگڑھ میں اور یہاں سے باہر حیدرآباد اور نینی تال وغیرہ میں مختلف ڈرامے اسٹیج کئے۔ ڈرامے خود ہی لکھتے ہیں، ڈائرکٹ کرتے ہیں اور اسٹیج پر اداکار کی حیثیت سے بھی آتے ہیں ——— محمد حسن صاحب ایک مرنجاں مرنج اور با اخلاق آدمی ہیں۔ لکھنؤ میں ان کی صحبتیں مجاز، نصیر حمید اور شوکت صدیقی وغیرہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس زمانے کے لطائف و ظرائف بڑے مزے سے سناتے ہیں۔ شادی ابھی نہیں کی ہے۔ دودھ پور کے علاقے میں [illegible] میں رہتے ہیں جو اس علاقے کا آخری مکان ہے۔ اس کے بعد بس دور تک میدان اور کھیت۔ علیگڑھ میں آنے کے بعد اگرچہ وہ شاکی بنے رہتے ہیں لیکن ان کی صحت اب لکھنؤ کی نسبت یہاں زیادہ اچھی ہے۔

بہار کی چند ادبی شخصیتیں

شاہ ولی الرحمٰن کاکوی

جناب نقوش کے مدیر محترم نے فرمائش کی ہے کہ بہار کے ادیبوں سے متعلق ایک مضمون لکھوں۔ انہوں نے موضوع کی وضاحت نہیں کی کہ شعرا بھی ادیبوں میں شامل ہیں یا نہیں۔ تاہم میں نے مشاہیر شعرا کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا ہے کیونکہ ادبیات میں شاعری بھی شامل ہے۔

مخدوم شیخ شرف الدین احمد بہاریؒ

آپ امام تاج فقیہہ (مدفون بیت المقدس اور فاتح منیر) کے پوتے، مخدوم شیخ شہاب الدین پیر جگ جوت کے نواسے اور مخدوم یحییٰ منیری کے صاحبزادے تھے۔ شیخ پیر جگ جوت مذکور کاشغر کے حکمران اور شیخ شہاب الدین سہروردی (متوفی ۶۳۲ھ) کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ کا مزار کچی درگاہ جیٹھلی میں گنگا کے کنارے پٹنہ سٹی سے چھ میل پورب موجود ہے۔ مخدوم بہاری ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۸۲ھ میں وفات پائی۔ آپ عرصہ تک بہتیہ و شاہ آباد اور راجگیر (پٹنہ) کے جنگلوں اور پہاڑوں میں فقر و قناعت کے ساتھ ریاضت و مجاہدہ میں مصروف رہے۔ آپ کی پیدائش منیر میں واقع ہوئی تھی جو پٹنہ سے ۲۰ میل پچھم ایک قصبہ ہے اور بہار شریف میں وفات پائی جہاں آپ کی درگاہ و بوسہ گاہ خلائق ہے اور ہر سال عظیم الشان عرس ہوتا ہے۔ آپ سے کچھ اردو اقوال بھی منسوب ہیں، مثلاً "بسیں بھلا پردوہ" وغیرہ۔ لیکن آپ کے علم و فضل کا اصل تماشا گاہ آپ کے فارسی مکتوبات ہیں جن میں اسرار تصوف پر مدلل بحثیں ہیں۔ آپ علوم ظاہری و باطنی میں کمال رکھتے تھے۔ آپ کے عم زاد بھائی مخدوم شاہ شعیب (متوفی ۸۲۴ھ) نے مناقب الاصفیا کے نام سے ایک کتاب فارسی میں لکھی۔ آپ کا مزار شیخپورہ (ضلع مونگیر) میں ہے۔

قاضی سید عنایت اللہ مونگیری (سال پیدائش ۱۰۰۰ھ) فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں شریک تھے۔ ملا غلام یحییٰ (متوفی ۱۱۸۰ھ) جو پٹنہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، اُن کی قابلیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے میر زاہد پر حاشیہ لکھا۔ یہ مرزا مظہر جان جاناں (متوفی ۱۱۹۵ھ) کے مرید تھے۔ اس قبیل کے سیکڑوں علماء و فضلاء بہار میں تھے جن کا ذکر نظر انداز کرتا ہوں۔

مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی (۱۰۵۴ھ - ۱۱۳۳ھ)

مرزا بیدل ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اُن کی جائے پیدائش میں اختلاف ہے۔ کوئی بخاری کہتا ہے، کوئی لاہوری، کوئی دہلوی، کوئی اکبرآبادی۔

اور کوئی عظیم آبادی۔ بندرابن خوشگو نے سفینۂ خوشگو میں بیدل کو اکبرآبادی الوطن لکھا ہے۔ اس کا بیان قابل استناد معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس نے بیدل سے برسوں ملاقاتیں کی تھیں۔ لیکن علامہ آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ) نے جو بیدل کی وفات (۱۱۳۳ھ) کے وقت ۱۸ سال کے تھے ان کو عظیم آبادی لکھا ہے۔ ایک جگہ نہیں بلکہ اپنے تینوں تذکروں، ید بیضا، خزانۂ عامرہ اور سرو آزاد میں۔ علامہ سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ بیدل کا مولد و منشا صوبہ بہار تھا۔ مصحفی نے بھی اپنے تذکرہ "عقد ثریا" میں ان کو عظیم آبادی لکھا ہے۔ بہرحال بیدل کی طفولیت و آغاز شباب کا زمانہ بہار میں گزرا ہے اس لئے اگر ارباب عظیم آباد انہیں اپنا ہم وطن سمجھیں تو کوئی قباحت نہیں۔ شاہ آباد میں آرہ سے ۲۰ میل پچھم ایک قصبہ ہے جس کا نام رانی ساگر ہے اسی کے قریب ایک بستی سرائے جادو تھی وہاں ایک بزرگ شاہ کمال قادری رہتے تھے۔ بیدل کے والد اور چچا مرزا قلندر کو انہی سے بیعت تھی۔ بیدل بھی انہی کے دامن فیض سے وابستہ ہوئے۔

بیدل کا پایۂ شاعری اتنا بلند ہے کہ ان کے ریختوں کا طائر خیال بھی وہاں تک پرواز نہیں کر سکتا۔ انہوں نے فلسفہ، تصوف و اخلاق کے ایسے ایسے نکتے شاعرانہ لطافت کے ساتھ اور گوناگوں اسالیب سے بیان کئے ہیں کہ بیدل کے کمالات شاعرانہ پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ بیدل نے نثر میں بھی تین کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، چہار عنصر، نکات بیدل، رقعات بیدل۔ کلیات بیدل میں ہزاروں غزلیں، متعدد مثنویاں اور سیکڑوں رباعیات ہیں۔ غالب نے بیدل کی پیروی کرنا چاہی لیکن ناکام رہے۔ بیدل کے خیالات نہایت عمیق، رنگین اور دلکش ہیں۔ اس رنگ کا کوئی شاعر ایران میں بھی پیدا نہیں ہوا۔ بیدل کے کلام میں ڈاروِن کا نظریۂ ارتقا اور اقبال کا "انسان کامل" بشکل موجود ہے ؎

ہیچ شکلے بے ہیولا قابل صورت نشد   آدمی ہم پیش ازاں کادم شود بوزینہ بود
مختلف انسان کامل مرکب آید بچشم   بے تامل شد یقیں جنگ بوزنہ بود ہست

بیدل حیرت کے بیان پر ہر طرح قادر ہے۔ وہ وحدت کی وادیوں سے گزرتا ہے لیکن منزل مقصود نہیں پاتا کیونکہ ذات تک انسان کی رسائی نہیں۔ اس فلسفہ کو اس نے بار بار بیان کیا ہے۔ اور قوت اختراع سے ایسے نئے نئے اسالیب سے کام لیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ بیدل کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تہمت ہستی بحیرت کشتہ بے پردگی ورنہ   از غنچہ کم دریدہ ہر دل کشا یک چمن ورنہ
پیچ ناز ہائے رسیدہ و بے سیدہ گشتہ ہیچ   پیچ و تاب حلقۂ زلف او کہ بے شود بہ جستجو را
تمام عمر ہم یک غافل کہ دل براہ کوئی رساندہ   جگر بداغ گرمی آتشیدہ نفس بہ آہ گرمی نرساندہ
مگر کہ بشمع فنا نگاہے رسد بفریاد و حال بیدل   وگرنہ آں برق بے نیازی بہ پیچ گیاہ کرمی نرساند
زنہار از عدم ہستی وا زگل رنگ می جوشد   نواے محفل قدرت بیک آہنگ می جوشد
تجدید ناز شگفتہ رنگ لباس آرائیست   بے پردگی ریا بطرز نقاب افگندنست
ہر جا در دوش بہ شیدہ نمود مانع خود پوشیدہ   دور تشہد مشعل ناکسی چیدہ جست
گلہ بے ہر کعبہ کی رہ رو کہ بہ سوے دیر   ہر بار از جستجو عالم فرسنگ می شد
بیدل آں شعلہ کہ از دم چہ بیرون گرم است   یک حقیقت زہر جا آئینہ نمایاں شدہ است
ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما   چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بکنار ما

بیدل اردو میں بھی شعر کہتے تھے لیکن صرف دو شعر مشہور ہیں جن کو میر نے نکات الشعرا میں درج کیا ہے ؎

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں   اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

علامہ عظیم تحسین (متوفی ۱۲۰۲ھ) بیدل کے قریب العہد تھے اور فارسی میں اشعار کہتے تھے۔ میر غلام حسین شورش (متوفی ۱۱۹۵ھ) نے فارسی میں اردو شعراء کا ایک تذکرہ لکھا۔ شاہ کمال علی کمال متوفی ۱۲۴۵ھ دیوانہ (صاحبِ دیوان) ... ... کے رہنے والے میر کے ہم عصر تھے۔ دیوانِ اردو کے علاوہ نتائج الافکار ان کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ حضرت عشق عظیم آبادی (متوفی ۱۲۱۲ھ) نے اردو دیوان کے علاوہ تصوف میں چند رسالے بھی تصنیف کئے۔ یہ بزرگ مرزا محمد علی فدوی کے استاد تھے اور فدوی سے راسخ عظیم آبادی نے اصلاح لی تھی۔ نواب علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی (متوفی ۱۲۰۸ھ) ایک قابلِ قدر ادیب و مورخ اور فارسی کے گو [illegible] تھے۔ ان کا تذکرہ گلزار ابراہیم (۱۱۹۸ھ) اردو شعرا کا ایک بلند پایہ اور مستند تذکرہ ہے۔ گلشن ہند اسی کا ترجمہ ہے۔ خلاصۃ الکلام اور صحفِ ابراہیم بھی ان کی تصانیف میں شمار کئے جاتے ہیں۔

میرے دیوانہ پن کو دیکھ کر زنجیر ہنستی ہے
یہاں تدبیر کرتے ہیں وہاں تقدیر ہنستی ہے

سید غلام حسین خاں (۱۱۴۰ھ–۱۲۱۹ھ) پٹنے کے مورخ اور ادیب تھے۔ انہوں نے نثر کی کئی کتابیں لکھیں جن میں سیر المتاخرین فارسی زبان میں ہندوستان کی تاریخ تین جلدوں میں ہے اور اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو گیا ہے۔ ان کا وطن حسین آباد (ضلع پٹنہ) تھا۔ یہ شاعر بھی تھے اور شیخ علی حزیں سے اصلاح لیتے تھے۔ خواجہ امین عظیم آبادی اردو و فارسی کے شاعر تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۱۱ھ میں ہوا۔ ان کے اشعار ملاحظہ ہوں:

نیست مے نوری بجز غم کار چشیدہ را
دل بسفر تو بود رنج سفر کشیدہ را

دل کا قرار ہی اوقات زاری میں گئی
عمر گئے گزری کی پر کیا ہی خواری میں گئی

بلبل کو باندھئے تو رگِ گل سے باندھئے
دل باندھئے تو زلف کی کاکل سے باندھئے

شیخ وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی نے تیرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں اردو شعرا کا ایک تذکرہ فارسی میں لکھا۔ انہی کے شاگرد آغا حسین قلی خاں عاشق عظیم آبادی نے دو جلدوں میں فارسی شعرا کا تذکرہ لکھا جس کا نام نشترِ عشق ہے۔

شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی

راسخ اردو زبان کے اچھے غزل گو اور مثنوی نگار تھے۔ شاد عظیم آبادی نے لکھا ہے کہ راسخ ۱۱۶۳ھ میں پیدا ہوئے لیکن یہ صحیح نہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب کی تحقیق ہے کہ وہ ۱۱۶۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ حال میں راسخ کا دیوان شائع ہوا تھا جو اب نایاب ہے۔ انہوں نے فدوی سے اصلاح لی تھی۔ پھر لکھنؤ جا کر میر سے مستفید ہوئے۔ ۱۲۳۸ھ میں وفات پائی۔ انتقال سے چند سال قبل ایک رسالہ لکھا جس کا نام ملاحت اور [illegible] ہے۔ یہ رسالہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ راسخ کے چند اشعار یہ ہیں:

بیگانہ ہے جو یاں کی راہ نہیں کچھ جانتا ہے
دیکھئے کیا ہو شام تلک دل تو بہت گھبراتا ہے

عقل والوں کی دانست تو دانائی کچھ کام نہ آئی
اب شہر ڈھونڈیں گے کسی سودائی کو

تا خوابِ مرگ ذکر تھا ان کا زبان پر
نیند آگئی ہمیں تو اسی داستان پر

نہیں برق ان پہ کچھ حسد مجھے شکایت تو انہوں سے ہے
جنہیں تیرے جلوے کے سامنے مری جان بے خبری رہی

اشعارِ مثنوی

کیا کہوں آہ محبت کیا ہے
کیا کہوں اس میں مصیبت کیا ہے

عشق اک لذتِ روحانی ہے　　عشق کیفیتِ وجدانی ہے
اس کے وارفتوں کو حیرت ہے　　عشق اک زورِ بے کیفیت ہے
ابتدا اس کی ہے گریاں رہنا　　انتہا رفتہ و حیراں رہنا
عاشقی شوق ہے کچھ مت پوچھو　　ہمگی ذوق ہے کچھ مت پوچھو
کچھ عجب شعلۂ سرکش ہے یہ　　ایک پرکالۂ آتش ہے یہ
ایک جنجال ہے مائل ہونا　　دو نگاہوں کا مقابل ہونا!
عشق میں طینتِ شداد ہے ایک　　رتبۂ خسرو و فرہاد ہے ایک

ناسخ کی غزلوں پر میر کی غزلوں کا پرتو ضرور ہے۔ لیکن غزل میں میر ارفع و اعلیٰ ہیں اور ناسخ کا ان سے کوئی مقابلہ نہیں۔ تاہم ناسخ نے اپنی مثنویوں میں عشق کی جیسی تعریف کی ہے میر کی مثنویوں میں ایسی دلکش تصویریں نظر نہیں آتیں۔ پھر بھی میر میر ہیں اور ناسخ ناسخ۔

جوشش عظیم آبادی، رضا عظیم آبادی (متوفی ۱۲۱۲ھ)، دل عظیم آبادی، وحشت، گل، حسرت عظیم آبادی، ثابت عظیم آبادی، ملال عظیم آبادی، بہار، بسمل، رام نرائن موزوں بھی اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔

عظیم آباد میں کچھ ایسی دلکشی تھی کہ دلی کی تباہی کے بعد وہاں کے کچھ شعرا نے یہاں پناہ لی اور ان میں سے اکثر یہیں پیوندِ خاک ہو گئے۔ مثلاً فغاں دہلوی (متوفی ۱۱۸۶ھ)، ضیا دہلوی، میر باقر حزیں دہلوی وغیرہ۔

قصبہ پھلواری شریف جو پٹنہ سے چھ میل مغرب واقع ہے، علم و فضل کا مرکز رہا ہے۔ اس قصبہ کے شعرا میں شاہ ابوالحسن فرد (۱۱۹۱ھ - ۱۲۶۵ھ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا نہایت ضخیم فارسی دیوان دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ ان کا ایک فارسی اور ایک اردو شعر درج کرتا ہوں ؎

کشتگانِ ناوکِ او را دہد جانے دگر　　کی رہا تیرے کہ دارم ذوقِ پیکانے دگر
میرے جنوں کا شور ہے اب آسماں تلک　　رسوائی اپنی ہو گئی کہاں سے کہاں تلک

اس سلسلے میں چند اور شعرا بھی قابلِ ذکر ہیں، مثلاً سید شاہ باقر علی باقر گیاوی (شاگردِ غالب)، شاہ فرزند علی صوفی منیری (شاگردِ غالب) جن کی کتاب سیرت شرف شائع ہو چکی ہے، شاہ امین احمد شوق بہاری مصنف مثنوی شہد و شیر وغیرہ۔

سید فرزند علی صفیر بلگرامی (۱۲۴۹ھ - ۱۳۰۶ھ)

صفیر کی پیدائش مارہرہ میں ہوئی۔ بچپن ہی میں بلگرام آئے اور کچھ ہی دنوں کے بعد آرہ اپنے والد کے ساتھ پہنچ کر یہیں کے ہو رہے۔ ان کو جگت شاگرد کہنا چاہیے کیونکہ انہوں نے رشک، سحر (علاوہ ناسخ)، غالب اور مرزا دبیر سے اصلاحیں لی ہیں۔ اردو کلیات شائع نہ ہو سکا۔ بہت پر گو شاعر تھے اور نثر نگاری میں خاص درجہ رکھتے تھے۔ رشحاتِ صفیر، ترجمۂ بوستانِ خیال، چشمۂ کوثر، تحقیق الانسان، مردم دیدہ اور جلوۂ خضر (تذکرۂ شعرائے اردو) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کہنہ مشق استاد تھے اور شاگرد بنانے کا خاص شوق تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

خاک سے میری بگولہ بھی عیاں ہونے کو ہے　　یہ غبارِ ناتواں بھی آسماں ہونے کو ہے
بادۂ عشرت جو شرابِ طہارت میں نے جام لیا　　ہاے یہ جرأت ساقی نے کی دوڑ کے بڑھ کر تھام لیا
کسی حالت میں اے دل غم نہیں نقصان دل کا　　جو شیشہ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر پیمانہ ہوتا ہے

مولانا حکیم عبدالحمید پریشاں (۱۲۴۵ھ-۱۳۲۳ھ)

آپ نہایت ذی علم بزرگ تھے۔ طبابت میں خاص مہارت حاصل تھی۔ نواس پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ غدر کے سلسلہ میں آپ کے والد بھی بعض حکام کی امرا کے زیر عتاب رہے۔ فارسی، اردو، عربی میں شعر کہتے تھے۔ شاد عظیم آبادی سے برابر قلمی جنگ رہی۔ آپ کے دو چار اشعار فارسی و اردو کے سن لیجیے۔ ـــ

قامت افراز نیازم بہ خمیدن بے تاب
بسمل خنجر نازم بہ طپیدن بے تاب
دست بر بستہ تیغم ز رسیدن کوتاہ
پائے بشکستہ شوقم بہ دویدن بے تاب
ہماری الجھنوں کو کاکل محبوب جانے ہے
پریشاں کی پریشانی پریشاں خوب جانے ہے
مرگ مرگ نامرادی، زندگی سوز و الم
کون سی صورت میں بہبود چراغ کشتہ ہے

خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی

آپ ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں وفات پائی۔ اردو، فارسی اور عربی کی تحصیل کے بعد آپ نے ابتدائے شباب ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ صوبہ بہار میں شاد جیسا کوئی غزل گو نہیں پیدا ہوا۔ تقدم زمانی کے لحاظ سے راسخ یقیناً قابل احترام ہیں، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ خیالات کی گہرائی، طرز بیان کی شگفتگی، حسن و عشق کی دلکش واردات، بحر کی روانی، جذبات و احساسات کی شدت و صداقت، اخلاق و تصوف کی نکتہ طرازی، درد و حسرت کی مرقع نگاری کے لحاظ سے شاد کا خاص مقام ہے اور آپ کی شاعری رہنما میل کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ آپ نے لکھنؤ کے غیر صحت مند رنگ سخن کو ترک کر کے پاکیزہ اور رنگ تغزل اختیار کیا۔ آپ کا کلام ابتذال سے پاک ہے اور غزلوں میں انفرادی شان نمایاں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ـــ

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا
اسیر جسم ہوں میعاد قید لا معلوم
یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم
سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
چشم سیہ میں سرمہ دے زلف میں شانہ کر
قتل جہاں کے واسطے تازہ کوئی بہانہ کر
اہل ہوس بھی ہو گئے آگے حریف میکشاں
پیر مغاں الٹ دے خم بند شراب خانہ کر
وہ عالمگیر جلوہ اور وہ حسن مشترک تیرا
خدا جانے ان آنکھوں کو ہوا کس کس پہ شک تیرا
جہاں سے مکتب حیرت میں ہے چپ چپ رہنا
پڑھانا ہو یہاں سے الف سے بے کہنا
یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
ذرا جینے کا قصہ ورنہ حال شاد کہتے ہیں
حقیقت میں جمال یار کا افسانہ کہتے ہیں
ترے کمال کی حد کب کوئی بشر سمجھا
اسی قدر اسے حیرت ہے جس قدر سمجھا
یوں حبابوں کا نہ دل توڑ خدارا اے موج
انہی قطروں کی بدولت تو ہے دریا تیرا
دیکھے نہیں سب مجھے عہد کا حوصلہ دیا
جس کی طلب تھی ساقیا اس سے کہیں سوا دیا

طلب کرتے نہیں ساقی سے گو افراط ہے مے کی
زباں رکھتے ہیں چپکے ہیں رنگِ محفل دیکھنے والے

اگر ہے عشق میں دل بھی ہے جان بھی
مردانہ باش ختم ہے یہ امتحان بھی

یہی داغوں کو [illegible] ہی کل اپنی عمریں گے
تری مرضی نہیں لے دو دل اجاڑ سوئیں گے

تڑپ سے [illegible] اور بھی تسکین ہوتی ہے
تو پہلے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

میں شاد تنہا ایک طرف دنیا کی دنیا ایک طرف
سارا سمندر ایک طرف آنسو کا قطرا ایک طرف

شاد نے سب اصنافِ سخن پر توجہ کی۔ غزلوں کے علاوہ مرثیے، رباعیات اور نظمیں بھی لکھیں۔ کلامِ شاد اور میخانۂ الہام، مجموعۂ غزلیات، مجموعۂ مراثی دو جلد، اور مجموعۂ رباعیات مع ترجمہ انگریزی، ظہورِ رحمت، اور مثنوی [illegible] یہ سب چیزیں چھپ کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ شاد نے نثر کی طرف بھی توجہ کی۔ مثلاً تاریخ صوبۂ بہار، نوائے وطن، نقش پائدار (دو جلد)، افسانۂ صورت الخیال (دو جلد)، فکرِ بلیغ، اور حیاتِ فریاد، یہ سب چیزیں شائع ہو چکی ہیں۔ شاد کے تلامذہ میں مرزا عظیم آبادی، آباد عظیم آبادی، بیتاب عظیم آبادی، مستقیم عظیم آبادی، اعجاز عظیم آبادی، جلال عظیم آبادی، حمید عظیم آبادی، پاشی عظیم آبادی (یگانہ لکھنوی)، جمیل عظیم آبادی، اختر کاکوی، مطالا کاظمی مرحوم، رشید مرحوم قابلِ ذکر ہیں۔

شاد کے معاصرین میں حسب ذیل حضرات بھی مشاہیرِ بہار میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اکبر داناپوری (شاگرد حبیب الہ آبادی) آپ کے دو دیوان تجلیاتِ عشق اور جذباتِ اکبر اور نثر میں مرقع [illegible]، رسالہ ادراک اور کئی اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ شوق نیموی (شاگرد تسلیم لکھنوی) نہایت ذی علم بزرگ تھے۔ آپ کی کتاب آثار السنن (حدیث) نصاب میں داخل ہے۔ غزلوں کا دیوان اور مثنوی سوز و گداز، یادگارِ وطن کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کو لسانی تحقیقات کا خاص ذوق تھا چنانچہ آپ نے جلال لکھنوی سے کئی اہم اور امتیازی بحثیں اس سلسلہ میں قائم کیں۔ نواب امداد امام اثر عظیم آبادی بھی بڑے پاکیزہ ذوق بزرگ تھے۔ عرصہ ہوا آپ کا دیوان رام پور سے شائع ہوا تھا اب نایاب ہے۔ تغزل میں آپ نے غالب و میر کی تقلید کی۔ آپ کی تصانیف کی بھی کافی تعداد ہے۔ جن میں کاشف الحقائق خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ قابلِ قدر کتاب دو جلدوں میں ہے۔ جو اگرچہ مختلف مباحث پر مشتمل ہے لیکن اس میں تنقیدی نکات کا بھی کافی حصہ ہے۔ ضرورت ہے کہ کم از کم اس تنقیدی حصہ کو پھر شائع کیا جائے کیونکہ کتاب اب نایاب ہے۔ (شاگرد [illegible] لکھنوی) آزاد عظیم آبادی بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن کی طباعی اور پرگوئی ایک مثال تھی۔ غزلوں اور نظموں کا ضخیم کلیات ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ آپ نے آخر عمر میں علامہ اقبال سے متاثر ہو کر بہت سی نظمیں جدید رنگ میں لکھیں اور بہت خوب لکھیں۔ اردو ادب کی بہترین خدمت ہو اگر ان نظموں کا مجموعہ شائع ہو جائے۔ اس دور کے نظم نگاروں میں آزاد کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں اختر بہاری اور شائق عماد پوری بھی قابلِ ذکر ہیں۔

---

[۱] بہار لکھنوی تغزل میں یگانۂ روزگار تھے۔ ان کا کلام [illegible] پر چھپ چکا۔

[۲] اختر کاکوی شاعری میں استاد [illegible] رکھتے ہیں۔ غزلوں کے دیوان کے علاوہ انہوں نے جدید رنگ کی نظمیں بھی بہت لکھی ہیں۔ تنقیدی مضامین لکھنے میں بھی بہت مشاق ہیں۔ مطالا کاظمی [illegible] اعلیٰ درجہ صلاحیت کے مالک تھے۔ انہوں نے بیتاب پر ایک مختصر کتاب لکھی ہے جس کا نام [illegible] ہے۔ [illegible] نوجوان مختار [illegible] کے بجھائے ہیں۔

[۳] آپ کے صاحبزادے عزیز عظیم آبادی آپ کی یادگار اور ذوقِ سخن کے ترجمان ہیں۔

نواب نصیر حسین خیال (۱۸۸۰ء-۱۹۳۴ء)

نواب خیال شاد عظیم آبادی کے حقیقی بھانجے تھے۔ آپ نے ابتدائے شباب ہی سے اردو نثر نگاری کی طرف خاص توجہ کی۔ آپ نے ایک رسالہ ادیب ۱۸۹۸ء میں پٹنہ سے جاری کیا تھا۔ جب آپ کی شادی کلکتہ میں ہوگئی اور وہیں قیام رہنے لگا تو تین سال کے اندر ہی یہ رسالہ بند ہوگیا۔ آپ کو سیاسی و تعلیمی امور سے بھی دلچسپی تھی اور اردو زبان کی خدمت کا خاص ذوق تھا۔ ۱۹۲۶ء میں آپ نے آل انڈیا اردو کانفرنس لکھنؤ کی صدارت کی تھی جس میں ایک پر مغز خطبہ دیا تھا۔ آپ نے [illegible] کی بھی سرپرستی کی تھی اور ہر جگہ اردو زبان کی خدمت کو مد نظر رکھا۔ آپ کی تصانیف میں "مغل اور اردو" اور "داستانِ عجم" شائع ہوچکی ہیں۔ اول الذکر در اصل "داستانِ اردو" کا ایک باب ہے۔ آپ کی تحریر پر محمد حسین آزاد کا پرتو تھا اور آپ کی انشا پردازی ایک خاص درجہ رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ آپ کے متعدد مضامین فارسی و اردو [illegible] بھی قابل ذکر ہیں۔ ضرورت ہے کہ آپ کا تمام ادبی سرمایہ شائع ہوکر منظر عام پر آجائے۔ آپ عربی، انگریزی اور فرانسیسی سے بھی واقف تھے۔

سید عبد الغفور شہباز عظیم آبادی (متوفی ۱۹۰۸ء)

شیخ پورہ میں ایک چھوٹی سی بستی مرتضیٰ ہے۔ یہیں شہباز کی پیدائش ہوئی۔ عربی، فارسی کے علاوہ بی۔ اے تک انگریزی بھی پڑھی تھی۔ کلکتہ سے دور سلطنت ایک اردو اخبار جاری ہوا تھا۔ شہباز اس کے ایڈیٹر تھے۔ کچھ دنوں کے بعد دوسرا اخبار جریدۂ روزگار جاری کیا۔ ۱۸۸۸ء میں نواب عبد اللطیف خاں وزیر بھوپال کے پرنسپل اسسٹنٹ مقرر ہوگئے۔ کچھ عرصے کے بعد حیدرآباد پہنچے اور مولوی عزیز مرزا کی ماتحتی میں مترجمی کے فرائض انجام دیتے، اور پھر اورنگ آباد کالج میں پروفیسر ہوگئے۔ علامہ جمال الدین افغانی سے بھی انہوں نے استفادہ کیا تھا۔ اور ان کی تقاریر و مضامین کا ایک مجموعہ مقالات جمالیہ کے نام سے مرتب کیا تھا۔ شہباز کی ادبی صلاحیت اچھی خاصی تھی، اودھ پنچ لکھنؤ اور الپنچ پٹنہ میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ وہ انگریزی نظموں کے ترجمہ پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ انہوں نے کلیات نظیر اکبر آبادی کی [illegible] کے ساتھ شائع کیا اور نظیر کی سوانح عمری بھی لکھی جو زندگانی بے نظیر کے نام سے شائع ہوچکی ہے۔ نواب سید محمد آزاد انسپکٹر جنرل رجسٹریشن بنگال و بہار بھی ایک ادیب تھے۔ ان کے ظریفانہ مضامین اودھ پنچ میں چھپتے تھے۔ جن کا مجموعہ شہباز نے خیالات آزاد کے نام سے شائع کیا اور ان کی سوانح عمری بھی لکھی۔ شہباز کی کچھ اور کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں مثلاً رباعیات شہباز، خیالات شہباز وغیرہ۔ [illegible] کے دربار میں رسائی پیدا کی۔ شہباز کو [illegible] سے بھی ربط پیدا ہوگیا تھا۔ بچوں کی نظمیں بڑی [illegible] ہیں۔ شہباز نے بچوں پر ایک نظم لکھی ہے۔

کہیں ذرہ ہے کہ زہرہ جبینوں کا ! کہیں رحمت ہے کہ شاہ نازنینوں کا
غرض مجمع ہے کس کے پردہ نشینوں کا [illegible] جیسے سلاطینوں کا
پھر [illegible]

شہباز کی ایک رباعی بھی سن لیجیے ؎

خوب صورت خالق نے نقش [illegible] باندھا [illegible] کمر باندھا
اک کوزۂ [illegible] ہے سر پہ اس کے خوب کس کر باندھا

---

(۱) مضمون سید شبیر الحق صاحب [illegible] مرحوم۔

خان بہادر سید ضمیر الدین احمد (۱۸۶۲ء - جنوری ۱۹۲۲ء)

آپ عظیم آباد کے ایک عالی خاندان رئیس اور قابلِ قدر ادیب تھے۔ ۱۸۸۴ء میں پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے فلسفہ، انگریزی اور فارسی میں اعزاز کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا۔ آپ نے انگریزی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھیں مثلاً شیر شاہ کی لائف (انگریزی)، راسخ کی لائف (انگریزی)، داؤد خاں قریشی کی لائف (انگریزی)، ترجمہ طبقات اکبری (انگریزی)، فلسفۂ تصوف، تذکرۂ ملوک، سیرۃ الشرف۔ تذکرۂ ملوک میں ملک قطب الدین ایبک سے لے کر تغلق سلاطین تک کے تاریخی حالات درج کیے گئے ہیں۔ سیرۃ الشرف مخدوم شرف الدین بہاری کی لائف ہے۔ یہ آخر الذکر کتاب بہت قابلِ قدر اور ادبی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے۔ عرصہ ہوا یہ کتاب چھپی تھی، اب نایاب ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے پھر شائع کیا جائے۔ آپ نے انگریزی میں متعدد مضامین بھی لکھے تھے۔[1]

علامہ سید سلیمان ندوی (۱۳۰۲ھ - ۱۳۵۳ھ)

علامہ ندوی کا وطن قصبہ دیسنہ ضلع پٹنہ تھا۔ پھلواری اور دربھنگہ میں کچھ دن تعلیم پانے کے بعد ندوۃ العلما لکھنؤ کے دار العلوم میں داخل ہوئے اور وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر ندوۃ العلما میں مدرس اور پھر دکن کالج میں پروفیسر رہے۔ الندوہ کی سب ایڈیٹری کی، پھر الہلال کے حلقۂ ادارت میں شامل ہوئے۔ علامہ شبلی کے خاص تربیت یافتہ اور جانشین تھے۔ دار المصنفین کا خاکہ شبلی نے تیار کیا تھا لیکن اس کی بنیاد و تعمیر علامہ ندوی کی مساعیٔ جمیلہ سے ہوئی۔ شبلی سیرۃ النبی کی صرف دو جلدیں لکھنے پائے تھے کہ ۱۹۱۴ء میں انتقال ہو گیا۔ انھوں نے انتقال کے وقت سیرۃ النبی کی تکمیل کی خدمت علامہ ندوی کے سپرد کی۔ آپ نے ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے ساتھ انگلستان، ۱۹۲۶ء میں وفد حجاز کے صدر کی حیثیت سے حجاز اور ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ کابل کا سفر کیا۔ غرضکہ علامہ ندوی کی علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، اور مذہبی خدمات عظیم ہیں۔ اور ایسی گوناگوں خدمات صوبۂ بہار کیا علمائے ہند میں سے بھی کسی نے نہیں کیں۔ اب ایسا جامع حیثیات عالم و ادیب شاید ہی پیدا ہو۔ آپ کا علمی تبحر آپ کے بے شمار مضامین اور تصانیف سے نمایاں ہے۔ الندوہ، معارف، الہلال اور ملک کے دوسرے اخبارات و رسائل میں آپ کے بے شمار مضامین شائع ہوئے۔ آپ کی تحریروں میں روانی و شگفتگی مابہ الامتیاز چیز تھی۔ شذرات و وفیات لکھنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ آپ نے حسب ذیل تصانیف یادگار چھوڑیں: سیرۃ النبی (جلد ۳ - ۶)، ارض القرآن (دو جلد)، حیات امام مالک، سیرت عائشہ، خیام، حیات شبلی، نقوش سلیمانی اور متعدد خطبات و مقالات۔ عربی زبان پر بھی آپ کو قدرت حاصل تھی چنانچہ اس زبان میں بھی آپ برجستہ تقریر کرتے اور مضامین لکھتے تھے۔

علامہ ندوی کے سلسلے میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی (مرحوم) (م جون ۱۹۵۶ء) کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ آپ بھی ایک عالم و ادیب تھے۔ گیلانی ضلع پٹنہ وطن تھا۔ عرصہ تک جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبۂ دینیات کے صدر رہے۔ آپ نے مذہبی، علمی، ادبی موضوعوں پر بہترین تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔

مولانا مسعود عالم ندوی (مرحوم) (م ۱۹۵۴ء) بھی بہار کے فرزند تھے اور علم و ادب کے خدمت گزار۔ عربی کی استعداد بہت اچھی تھی چنانچہ ندوہ

---

[1] آپ کے صاحبزادے سید مبارز الدین احمد صاحب رفعت ایک ممتاز شاعر و ادیب ہیں۔ ان کی شاعری رفعتِ تخیل اور پاکیزگیٔ ذوق کی حامل ہیں۔ آپ نئے اسلوب کے مرثیے بھی لکھتے ہیں جو ممتاز ادبی رسالوں سے باہتمام چھپ رہے ہیں۔ یہ مضمون نگاری پر بھی قادر ہیں۔

سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب ندوۃ العلماء میں وہ مدرس ہو گئے تو عربی میں ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام الضیاء تھا۔ اس کے بعد وہ اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں شعبۂ عربی کے فہرست نگار مقرر ہوئے اور انگریزی میں عربی کے مختلف مخطوطات کی فہرست کی ایک جلد مرتب کی جو شائع ہو چکی ہے۔ ان کی ایک کتاب "اشتراکیت اور اسلام" شائع ہو چکی ہے۔ مولوی سید ریاست علی ندوی بھی گیا کے باشندے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کی تاریخ صقلیہ (سسلی کی تاریخ) دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد تاریخی مضامین لکھے جو معارف، ندیم اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوئے۔ ایک زمانہ میں رسالہ ندیم (گیا) کے ایڈیٹر تھے اور کئی سال تک اس خدمت کو انجام دیا۔ پھر معارف کے سب ایڈیٹر بھی رہے۔ آج کل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل ہیں۔

افسانہ نگاری میں بھی صوبۂ بہار ممتاز رہا ہے۔ شاد کی صورت الخیال کے علاوہ نواب افضل الدین احمد رئیس بارھ (ضلع پٹنہ) نے ایک طویل افسانہ شائع کیا جس کا نام فسانۂ خورشیدی ہے۔ منیر بلگرامی نے بھی ایک ناول "معراج العروس" لکھا تھا جس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ اس سلسلہ میں سید علی سجاد عظیم آبادی کا ذکر بہت اہم ہے۔ یہ محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سٹی کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ شاعر بھی تھے اور شاد سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کا ناول "محل زادہ" زبان و بیان کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ ان کی شادی لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ ان کی بیوی خالص لکھنؤ کی رہنے والی تھیں۔ انہی کی صحبت کا اثر تھا کہ ٹھیٹھ لکھنوی زبان و محاورات میں یہ ناول لکھا۔ ان کا ایک اور ناول "تی تزی" ہے۔ اس کی زبان بھی خالص لکھنؤ کی زبان ہے۔

موجودہ دور میں حسن عظیم آبادی، پروفیسر اختر اورینوی، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی اور پروفیسر ڈاکٹر اختر حسین وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سہیل عظیم آبادی مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے کئی مختصر افسانے کتابی شکل میں اور کچھ رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ساتھ ہی وہ شعر بھی کہتے ہیں۔ تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں اور افسانہ نگاری بھی کرتے ہیں۔ افسانہ نگاری میں وہ خاص طور پر ممتاز اور انفرادی حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کا طرز نگارش بھی شگفتہ اور دلکش ہے۔ ان کے متعدد افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ فن تنقید میں ان کی کتابیں "تحقیق و تنقید" اور "تنقید جدید" قابل تحسین ہیں۔ طنز نگاری کے فن میں بہار میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ گیا کے رہنے والے ہیں اور کاروباری آدمی ہیں۔ وہ نظمیں اور غزلیں ابتدائے شباب ہی سے کہتے تھے۔ لیکن ۱۹۳۲ء میں جب انہوں نے رسالہ ندیم گیا سے جاری کیا تو ان کے قلم کی رفتار بہت تیز ہو گئی اور ندیم کے شذرات کے علاوہ افسانے بھی ان کے قلم سے نکلے اور ندیم ہی میں اکثر شائع ہونے لگے۔ ان کے افسانے مزاحیہ اور طنزیہ ہیں۔ ان افسانوں کا مجموعہ کئی جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ ایک کا نام "طنزیات ماہوری" ہے۔

ڈاکٹر عظیم الدین احمد پی ایچ ڈی مرحوم

ڈاکٹر عظیم نے بی اے تک تعلیم پائی لیکن وہ عربی و فارسی میں بھی کافی بصیرت رکھتے تھے۔ اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں شعبۂ عربی کے فہرست نگار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد حکومت سے وظیفہ حاصل کر کے جرمنی گئے اور وہاں "سامیات" میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے۔ پہلے پنجاب یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ تقریباً دو سال کے بعد وطن (پٹنہ) واپس آئے اور پٹنہ کالج کے شعبۂ عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ آپ حکیم عبد الحمید پریشان کے نواسے تھے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب شاعر بھی تھے۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے جس کا نام "گل نغمہ" ہے۔ اس میں آپ کے چھوٹے بھائی کلیم الدین احمد صاحب کا ایک بصیرت افروز مقدمہ بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو قرآن پاک سے خاص ذوق تھا اور اس کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ قرآنی آیات اس قدر یاد تھیں کہ کلاس کے لکچروں میں اور اپنی تقریروں میں برجستہ پیش کر دیتے تھے۔ قرآن پاک کی تفسیر بھی لکھ رہے تھے جو تمام نہ ہو سکی۔ آپ کی ادارت میں پٹنہ کالج سے ایک قابل قدر رسالہ نکلا جس کا نام معاصر ہے۔ یہ رسالہ ابھی تک جاری ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کے کئی قابل قدر مضامین شائع ہوئے تھے۔ "میر تقی میر کی شاعری پر ایک نظر"، "راسخ عظیم آبادی" اور "فلسفۂ حسن و عشق"۔

سید وصی احمد بلگرامی

وصی احمد بلگرامی قصبہ گولا، شاہ آباد کے رہنے والے اور صغیر بلگرامی کے پوتے ہیں۔ تیس سال تک ڈپٹی کلکٹری کی۔ ۱۹۵۱ء میں پنشن لینے کے بعد ترک وطن کر کے کراچی چلے گئے۔ مضمون نگاری کا شوق ابتدائے شباب سے ہے اور متعدد ادبی مضامین کے مالک ہیں۔ ان کی ادبیت مسلم ہے اور طرز نگارش میں انفرادیت نمایاں ہے۔ ان کے بعض مشہور و مقبول مضامین یہ ہیں "جیلر نگ کے تین بیٹے" "کشمکش" (مطبوعہ ندیم)، "ملک شعرا کے شہزادے" (مطبوعہ نگار)، "زلف و رخ" اور "سپاہی کی بیٹی" (مطبوعہ تجلی گیا)۔ "کشمکش" میں سلطان عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی اور صغیر بلگرامی وارد ہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے صغیر کی استادی اور سلطان و شاد کی شاگردی کی داستان بیان کی ہے اور شاد کو صغیر کا شاگرد کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا ہے۔ "سپاہی کی بیٹی" سے اردو زبان مراد ہے۔ "ملک شعرا کے شہزادے" کتابی شکل میں بھی شائع ہو گیا ہے۔ جناب نیاز فتحپوری ان کے ادبی مضامین کے بڑے مداح ہیں۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر محفوظ الحق مرحوم، اور عبدالمالک آروی مرحوم بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی علامہ سلیمان ندوی کے ہم وطن اور اردو کے قابل قدر مضمون نگار ہیں۔ ان کی "رقعات عالمگیر" شائع ہو چکی ہے جس میں اورنگ زیب کے خطوط اور رقعات جمع کئے گئے ہیں۔ یہ آج کل رسالہ "نوائے ادب" بمبئی کے اڈیٹر ہیں۔ یہ رسالہ علم و ادب کی گراں قدر خدمات کر رہا ہے۔ پروفیسر محفوظ الحق مرحوم پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ آرہ میں شادی ہوئی تھی۔ پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں شعبۂ فارسی کے پروفیسر تھے۔ ادبیات فارسی کا مطالعہ بڑا گہرا اور وسیع تھا۔ اسی لئے ان کو ہندوستان کے فاضل مستشرقین میں شمار کیا جاتا ہے۔ فارسی ادبیات کے وہ بڑے مبصر و محقق تھے۔ انہوں نے متعدد پر مغز و محققانہ مضامین لکھے اور ساری عمر ادبی خدمات میں گزار دی۔ عبدالمالک آروی مرحوم عربی، فارسی اور انگریزی سے واقف تھے۔ وہ آرہ کلکٹری کے ایک معمولی محرر اور گمنام شخص تھے لیکن علم و ادب کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے متعدد ادبی مضامین لکھے اور کئی کتابیں تصنیف و تالیف کیں جن میں "اقبال کی شاعری" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ لیکن ان کی تصنیفات و مضامین میں غیر متعلق اور دور از کار باتیں بہت ہوتی تھیں۔ سید مظفرالدین ندوی صاحب بھی بہار ہی کے فرزند ہیں، چاٹگام میں کسی کالج کے پرنسپل تھے، اب پنشن پا گئے ہیں۔ انہوں نے ایم اے گب کی انگریزی کتاب "مشتے" کا اردو ترجمہ کیا جس کا ایک اقتباس علامہ سلیمان ندوی کی کتاب سیرۃ النبی جلد ششم میں موجود ہے۔

قاضی عبدالودود بار ایٹ لا عظیم آبادی

قاضی صاحب عظیم آباد کے ایک رئیس خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کچھ دن علی گڑھ میں تعلیم پائی، پھر نیشنل یونیورسٹی کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ اس کالج کے ٹوٹ جانے کے بعد پٹنہ میٹرک اور آئی اے اول درجہ میں پاس کیا اور ۱۹۲۲ء میں امتیاز کے ساتھ بی اے کی ڈگری لی۔ ۱۹۲۳ء میں انگلینڈ جا کر بی اے کیمبرج اور بیرسٹر ہو کے ۱۹۲۸ء میں ولایت سے واپس آ کر علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ قاضی صاحب کو بچپن ہی سے کتب بینی کا شوق ہے۔ ذہانت اور ذوق تنقید اعلیٰ درجہ کا ہے۔ فارسی و اردو کا مطالعہ بڑا وسیع ہے اور وسیع معنی میں ایک گراں پایہ مستشرق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معلومات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ انہیں فارسی و اردو ادبیات کا ایک دبستان اور دائرۃ المعارف کہنا چاہیے۔ انہیں تحقیقات کا ذوق فطرت سے عطا ہوا ہے اور بلاشبہ وہ موجودہ دور کے محقق اعظم ہیں۔ علمی و تحقیقی مضامین کا انبار لگا دیا ہے۔ یہ مضامین ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو گئے ہیں۔ اگر تمام مضامین کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں۔ قاضی صاحب کی تحقیقات کے کچھ نمونے درج ذیل ہیں۔ "خان آرزو کا سال ولادت" "محقق کے تذکرہ" "معشوق قریباً" میں

۱۱۰۱ھ درج ہے۔ میں نے قاضی صاحب سے دریافت کیا تو انہوں نے خود مجمع النفائس کا حوالہ دے کر کہا کہ وہ ۱۰۹۹ھ میں پیدا ہوئے تھے اور "نول غریب" مادۂ تاریخ ہے۔ شاہ مبارک آبرو کا سال وفات پردۂ خفا میں تھا، قاضی صاحب نے سفینۂ خوشگو سے صحیح سال وفات ۱۱۴۶ھ پتا لگا لیا۔ انشا اور جرأت کی تاریخ وفات ۱۲۳۳ھ اور ۱۲۲۵ھ کہی جاتی تھی لیکن قاضی صاحب کی تحقیق ہے کہ صحیح سال وفات ۱۲۳۲ھ اور ۱۲۲۲ھ ہے۔ ارباب ادب کو یقین تھا کہ ملا عبد الصمد واقعی غالب کا استاد تھا۔ قاضی صاحب نے دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے کہ وہ خود غالب کا زائیدۂ فکر تھا۔

قاضی صاحب کے ذکر کے سلسلہ میں ڈاکٹر مختار الدین آرزو کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ آرزو صاحب، بہار سب ڈویژن کے رہنے والے ہیں۔ ان کی تحصیل علم کی مختصر روداد یہ ہے کہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے دستار فضیلت حاصل کر کے کچھ عرصہ کے بعد گریجوایٹ ہوئے اور علی گڑھ سے ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں لیں۔ پھر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے وظیفہ پا کر ولایت گئے اور مغرب کے چشمۂ علوم سے سیراب ہو کر چند مہینے ہوئے کہ واپس آ گئے ہیں۔ آرزو صاحب کی تحریریں مختلف رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی طرز سادہ، رواں اور شستہ ہے، اور میرے خیال میں ڈاکٹر عبد الحق کی تحریر سے کچھ مشابہت رکھتی ہے۔ علی گڑھ میگزین ۱۹۴۹ء کا غالب نمبر انہی کی ادارت میں نکلا تھا اور اب کتابی شکل میں "احوال غالب" کے نام سے چھپ گیا ہے۔

کلیم الدین احمد

کلیم الدین احمد صاحب، ڈاکٹر عظیم کے نامور فرزند ہیں۔ انگریزی میں بی اے آنرز اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں اور دونوں امتحانوں میں اول آئے۔ ۱۹۳۸ء میں ولایت گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے ٹرائی پاس کر کے وطن واپس آئے اور پٹنہ کالج کے لیکچرار ہو گئے۔ آج کل پٹنہ کالج کے پرنسپل ہیں۔ کلیم الدین کے تربیت یافتہ دماغ نے اردو ادب کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین بڑے چاؤ سے پڑھے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے ان کی معرکۃ الآرا کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" منظر عام پر آئی۔ اس کے بعد "اردو تنقید پر ایک نظر" اور "اردو داستان گوئی" یہ سب کتابیں اردو میں ہیں۔ انگریزی میں بھی تھوڑا عرصہ ہوا ایک کتاب شائع ہو چکی ہے جس کا نام "سائکو اینالیسس اینڈ لٹریری کریٹیسزم" ہے۔ کلیم الدین صاحب اردو شاعری کے مرتبہ کو تسلیم نہیں کرتے اور وہ اردو شاعری کے سرمایہ کو مغربی عینک سے دیکھتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ وہ غزل گوئی کو "نیم وحشی صنف سخن" سمجھتے ہیں۔ غزل گوئی وہ صنف ہے جس نے فارسی میں حافظ اور اردو میں غالب کو بقائے دوام کا خلعت دیا ہے۔ اس لیے کلیم صاحب کا فیصلہ اور ارشاد قابل سند نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اردو تنقید کو بھی وہ اقلیدس کا خیالی نقطہ اور معشوق کی موہوم کمر قرار دیتے ہیں، لیکن یہ ارشاد بھی قابل تسلیم نہیں۔ کلیم صاحب میں ایک عیب یہ بھی ہے کہ اپنے والد ماجد کے کلام پر تنقید کرنے میں انہوں نے غیر جانبداری سے کام نہیں لیا۔ "اردو شاعری پر ایک نظر" میں ان کی تیغ قلم سے تقریباً ہر شاعر کا کلام مجروح ہو گیا لیکن ڈاکٹر عظیم کا کلام اس کی زد سے محفوظ رہا۔ ایسی روش ایک نقاد کے دامن کمال کا بدترین داغ ہے۔

پروفیسر جمیل مظہری

جمیل مظہری ضلع سارن (صوبہ بہار) کے باشندے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں ایم اے کرنے کے بعد ان کی ادبی و صحافتی زندگی کلکتہ کی فضا

۱؎ مقدمہ نقش جمیل

نئی سانس لینے لگی۔ حضرت وحشت سے ان کو تلمذ ہے۔ ۱۹۳۳ء میں وہ پٹنہ میں پبلسٹی افسر ہوئے، لیکن ۱۹۴۲ء کی تحریک سے متاثر ہو کر مستعفی ہو گئے اور جیل بھی گئے۔ جیل سے رہائی پا کر حضرت جوش ملیح آبادی کی وساطت سے فلمی دنیا میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں محکمۂ نشر و اشاعت کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہوئے اور ۱۹۵۰ء سے پٹنہ کالج میں شعبۂ اردو کے پروفیسر ہیں۔

جمیل مظہری نہایت بلند پایہ شاعر ہیں، وہ غزلیں بھی کہتے ہیں، قصیدے بھی، مرثیے بھی اور رباعیاں بھی، غرض وہ ہر صنفِ سخن پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی ذہنیت فلسفیانہ اور رجحانِ طبیعت مفکرانہ ہے۔ ان کے طرزِ بیان و اسلوبِ نگارش میں قوت و شوکت ہے، الفاظ میں شیرینی و دلآویزی، شادابی، شگفتگی اور گھلاوٹ ہے۔ وہ ایک خوش فکر و خوش گو شاعر ہیں۔ ان کے خیالات میں پختگی و متانت ہے، جذبات میں صداقت ہے، احساس میں شدت ہے، تجربات میں وسعت و ہمہ گیری ہے، اور لب و لہجہ شاعرانہ و عاشقانہ ہے۔ ان کے ہاں داخلیت و خارجیت میں ہم آہنگی، طنزیات میں دلکشی و سنجیدگی، افکار و خیالات میں رنگینی اور گہرائی اور طرزِ بیان میں ترنم اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ وہ ترقی پسند شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری حدودِ فن کے دائرے میں سانس لیتی ہے۔ ان کی غزلوں کے دو چار اشعار ملاحظہ ہوں۔

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا
ہے رزم آرائیوں میں جیسے اجالا ہو جیسے چراغِ منزل
کہیں سرِ راہ یہ مسافر ٹھٹک نہ رہ جائے زندگی کا
یہی تو انجامِ جستجو ہے کہ ٹھوکریں کھا کے جنگلوں کی
جبیں رسوا ہو کے رکھ دے اپنی حرم کی چوکھٹ پہ ہو گیا ہو
جیتے ہیں کیا اتفاق سے اس عالم میں ہے کوئی مسلسل
یہ رنگ کے لوگ کیا کریں گے مر بھی نہ سکے جینا ہی پڑا

جمیل کی نظموں کا مجموعہ "نقشِ جمیل" منظرِ عام پر آ کر خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔ وہ صرف اعلیٰ درجہ کے شاعر ہی نہیں بلکہ بلند مرتبت ادیب بھی ہیں۔ ان کا افسانہ "فرض کی قربان گاہ پر" جواب کتابی شکل میں "تلخ و شکست" کے نام سے شائع ہو چکا ہے نہایت فنکارانہ اور قدرِ اول کا افسانہ ہے۔ جمیل جیسا تخیل ان کے قلم سے ورنہ روم کی کوئی چیز نہیں نکلی۔ حکیم جو رنگ ریاض کے افکار کو بھی انہوں نے افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے اور قوتِ تخیل سے آب و رنگ بھر کر ایک عجیب دلکش تصویر پیش کی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جمیل کی شاعرانہ و ادیبانہ صلاحیت اس شعر کا مصداق ہے۔

ہر علم جلوۂ و پرتو دلِ شیدا داری
دیگراں را ہمہ بخشیدہ و تو تنہا داری (رومی)

جمیل کے ساتھ پروفیسر اجتبیٰ حسین رضوی کا ذکر بھی اہم ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام "شعلۂ نوا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ رضوی کے خیالات و افکار میں بڑی گہرائی ہے اور طرزِ بیان فلسفیانہ و شاعرانہ ہے۔ وہ تھیوسوفیکل سوسائٹی کے رکن ہیں اور ان کی طبیعت روحانی اور صوفیانہ خیالات کی طرف مائل ہے جس کے نقوش "شعلۂ نوا" میں نظر آتے ہیں۔ وہ بیدل کی طرح دریائے حیرت میں بھی غرق ہیں جس کا ثبوت ان رباعیوں سے ملتا ہے جن کا عنوان "حکمت و حیرت" ہے۔ رضوی کے بھی دو تین اشعار سن لیجئے۔

اسی انقلاب قدم قدم پہ حیات زندہ و دار ہے
جو ہزار طرح کی گردشیں ہیں تو ایک طرح کا قرار ہے
یہ شامِ ہجر تمام رنگ سے ہے صبح جو اداس کے
یہی نے اہل صفا کے ہیں کہیں خوب روپ نکھار ہے
ہم تو آشفتہ سری سے نہ سنورنے پائے
آپ سے کیوں نہ سنوارا گیا گیسو اپنا

اسی سلسلہ میں پرویز شاہدی اور تمنا عظیم آبادی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں حضرات خاص عظیم آباد کے باشندے ہیں۔ پرویز شاہدی کا شمار ترقی پسند شعرا میں ہے۔ ان کے افکار میں رعنائی اور فنکاری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے متعلق صرف اتنا لکھ دینا کافی ہو گا کہ جمیل مظہری بھی اپنی شاعری پر ان کی شاعری کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی غزلیں اور نظمیں رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس وقت میرے سامنے ان کا کلام موجود نہیں ہے۔ اس لئے نمونہ پیش کرنے سے مجبور ہوں۔

ناز عظیم آبادی حضرت زکی لکھنوی کی یادگار اور قدیم رنگ کی شاعری میں اس صوبہ میں جواب نہیں رکھتے۔ جو کچھ کہتے ہیں بہت پختہ استادانہ کہتے ہیں۔

سہو قلم سے میں نے ابھی تک تمنا عمادی پھلواروی کا ذکر نہیں کیا۔ یہ ایک ذی علم بزرگ ہیں اور ان کی شاعری زیادہ تر مذہبی، اور دقیقہ رسی میں کوئی کلام نہیں۔ وہ نثر نگاری پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ شوق سندیلوی کی مشہور کتاب "اصلاح سخن" کے جواب میں انہوں نے "ایضاح سخن" ایک کتاب لکھی جس پر ڈاکٹر عندلیب شادانی نے "معاصر" میں تبصرہ کیا تھا۔

شوق نیموی کے شاگردوں میں ضیا عظیم آبادی مرحوم بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے بڑی اچھی طبیعت پائی تھی اور ان کے کلام میں سوز و گداز بہت ہے کیونکہ ان کا دل چوٹ کھایا ہوا تھا۔ ان کا دیوان جو صرف ایک بار شائع ہوا تھا اب ناپید ہے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے ایک شعر پر میر کے شعر کا دھوکا ہوتا ہے۔ چنانچہ اثر عظیم آبادی اس شعر کو میر ہی کا سمجھتے تھے۔

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

صحافتی دنیا میں بھی صوبہ بہار گمنام نہیں ہے۔ ۱۸۷۳ء میں مظفر پور سے سائنٹفک سوسائٹی بہار کی طرف سے "اخبار الاخیار" نام ایک اخبار جاری ہوا تھا جو مہینے میں دوبار شائع ہوتا تھا۔ اس کے اڈیٹر منشی قربان علی خاں تھے۔ پٹنہ سے ایک ظریفانہ اخبار نکلا جس کا نام "پنچ" تھا۔ اس کا طرز تحریر اودھ پنچ لکھنؤ جیسا تھا۔ اس نے سالہا سال تک ظرافت کے پھول کھلائے۔ اس کے اڈیٹر منشی عبدالرحیم تھے۔ نواب سید نصیر حسین خیال کی ادارت میں پٹنہ سے "ادیب" نکلتا تھا جس میں بھی ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ چند اور اخبارات و رسائل کے نام یہ ہیں۔ "اتحاد"، "المبشر" (زیر ادارت سید منظور علی ندوی مرحوم)، حسن و عشق، (دوہری)، بزم (حسن اور تاریخ و گیا)، ندیم (زیر ادارت عبدالباری صاحب آسی)، تصویر خیال، ظرافت (راجگیر، بہار شریف)، مریخ، نسیم (پٹنہ)، ندیم، اشتہار (گیا)، تہذیب (پٹنہ)، معیار (پٹنہ)، معاصر (پٹنہ)، بہار تلک[1] (پٹنہ) وغیرہ۔ ندیم انجم کی ادارت میں جاری ہوا۔ پھر ریاست ٹونک اور اس کے بعد حسن امام وارثی اور محی الدین تمنائی اڈیٹر ہوئے۔ اس جریدہ نے ۱۵-۲۰ سال تک اردو کی خدمت کی۔ معیار بلند پایہ کا رسالہ تھا مگر اس کی زندگی نے وفا نہ کی۔ قاضی عبدالودود صاحب اس کے اڈیٹر تھے۔ ان کا نام ہی اس کے معیار کا ضامن ہے۔ معاصر اب تک جاری ہے۔ اس میں زیادہ تر قاضی عبدالودود صاحب، کلیم الدین صاحب، اختر اورینوی صاحب اور حسن عسکری صاحب کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ حسن عسکری صاحب پٹنہ کالج میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ اور قابل قدر مورخ۔ ان کا دماغ تاریخی معلومات کا مخزن ہے۔ وہ نہ صرف انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں بلکہ فارسی کتابوں کا بھی۔ اخباروں میں آج کل "صدائے عام" (زیر ادارت نظیر حیدر صاحب وکیل) اور "ساتھی" (زیر ادارت غلام سرور جو ایک نوجوان ادیب ہیں) جاری ہے۔

یہ مقالہ کچھ طویل ہو گیا ہے لیکن موضوع ہی اتنا وسیع تھا کہ اس سے زیادہ اختصار بھی ممکن نہ تھا۔

سرگذشت عہد گل را از نظیری می شنو
عندلیب آشفتہ تر می گوید ایں افسانہ را

---

[1] بہار تلک پرویز شاہدی نے جاری کیا تھا جو ایک مشہور ترقی پسند شاعر ہیں۔ اس کی ادارت ضیا عظیم آبادی کرتے تھے۔

سرحد کی ادبی شخصیتیں

سید فارغ بخاری

صوبہ سرحد کی ادبی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو ایسی بے شمار ادبی شخصیتیں نظر آتی ہیں جن کی عظمت مسلم ہے۔ جنہوں نے اپنے اپنے دور میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اپنے ماحول کی کایا پلٹنے میں اہم پارٹ ادا کیا۔ ان میں بڑی تعداد شخصیتیں بھی ہیں جو کسی طرح سے بھی چھپائے نہیں چھپتیں۔ انہوں نے ایک دور افتادہ اور پسماندہ ماحول میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اجاگر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لی۔

عنوان کے اعتبار سے میرا موضوع نہایت وسیع ہے۔ اتنا وسیع کہ اگر نقوش کے شخصیات نمبر کا دوسرا حصہ سارے کا سارا بھی اس کے لئے وقف کر دیا جائے جب بھی شاید اس عنوان کی وسعت کا حق ادا نہ ہو سکے کیونکہ اس طرح موضوع صرف اردو شعراء تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس میں پشتو، فارسی اور ہندکو زبان کی ادبی شخصیتوں کا ذکر بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف تین چار صدیوں میں پھیلی ہوئی اردو ادب کی بہترین شخصیتوں کے تفصیلی جائزے کا بھی یہ مختصر مضمون متحمل نہیں ہو سکتا۔

اس صورت میں میں نے موضوع کو سمیٹنے کی غرض سے اپنے لئے ایک درمیانی راہ ڈھونڈ نکالی ہے۔ وہ یہ کہ ان صفحات کو میں ان حضرات کے ذکر تک محدود رکھوں جن سے میں نہ صرف بالمشافہ مل چکا ہوں بلکہ ان سے نیازمندانہ مراسم کا شرف بھی حاصل رہا اور نہایت قریب سے ان کی شخصیت کے مطالعہ کا موقع بھی ملا۔

مضمون کو زیادہ جامع اور مکمل طور پر پیش کرنے کی غرض سے میں نے ایک تدبیر یہ سوچی ہے کہ پشتو، فارسی، ہندکو زبانوں اور خود اردو کے قدیم اساتذہ کی اور بالعموم شخصیتوں کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے گزر جاؤں اور صرف اردو کے ادیبوں اور شاعروں ہی کا تذکرہ کروں۔

پشتو ادب کی تاریخ تقریباً دو ہزار سال پرانی ہے۔ اس لمبے چوڑے عرصہ میں اس نے ہزاروں شاعر اور ادیب پیدا کئے انہیں نہایت دقت نظر سے دیکھا جائے جب بھی سینکڑوں ایسی عظیم ادبی شخصیتیں نظر آتی ہیں جنہیں کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بیرونی دنیا تو صرف خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کے ناموں ہی سے واقف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پشتو ادب کی تاریخ میں ان دو فنکاروں

کی مثال نہیں ملتی۔ خوشحال خان خٹک کی شخصیت تو کچھ ایسی گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی کہ شاید دوسری قوموں میں اس کا جواب مشکل ہی سے مل سکے گا وہ صرف گفتار ہی کا نہیں کردار کا بھی غازی تھا وہ نہ صرف پشتو زبان کے عظیم شاعر اور ادیب کی حیثیت سے بلکہ ایک بہادر اور اولوالعزم جرنیل کے طور پر بھی پشتو قوم میں ایک منفرد شخصیت کا مالک ہے۔ اس نے پشتون قوم کو غیر ملکیوں کی غلامی سے چھڑانے کے لئے اپنی تمام عمر میدان کارزار میں گزار دی اس صاحب سیف و قلم نے ایک طرف تو اپنی شمشیر [illegible] اور دوسری طرف پشتو ادب کو اپنے گرانمایہ منظوم ذخیرے سے مالا مال کر دیا۔

رحمان بابا کا کردار خوشحال خان سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ایک صوفی منش شاعر تھا۔ اس نے پشتو غزل کے باغ میں وہ گل کھلائے جن کی بہار جاوداں سے یہ گلزار سدا مہکتا رہے گا۔ رحمان بابا کو اگر پشتو کا حافظ کہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ وہ پشتون قوم کا ہر دلعزیز اور نہایت مقبول عوامی شاعر ہے اس کی شاعری میں عوام کے دکھ درد کی ترجمانی بھی ہے اور وہ جوہر وہ کشش اور وہ جادو بھی جس کا اثر جلدی ہوتا ہے اور دیر تک قائم رہتا ہے اس کے کلام میں وہ خوبی ہے جس نے اردو میں میر اور غالب اور فارسی میں سعدی اور حافظ کو ہر عہد میں محبوب بنائے رکھا۔

خوشحال خان اور رحمان بابا کا درجہ پشتو ادب میں بہت بلند سہی لیکن ان کے علاوہ بھی یہاں کئی ایک نامور شخصیتیں نظر آتی ہیں۔

پشتو زبان کا پہلا شاعر امیر کروڑ ۱۳۹ھ کی روایت ہے وہ امیر پولاد کا بیٹا تھا۔ بڑا بہادر، دلیر اور شجاع انسان تھا ایک وقت میں سو مردان جنگی مسلح پوش کا مقابلہ کرتا اس نے اپنے عہد میں غور، بالشتان، خیسار، تمران اور بورکوشک کے مشہور و نامی قلعوں کو فتح کیا۔

امیر کروڑ تلوار کے ساتھ ساتھ قلم کا بھی دھنی تھا اگرچہ اس کی صرف ایک ہی رزمیہ نظم دستیاب ہو سکی ہے لیکن اس نظم سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ کس قدر زور قلم کا مالک تھا اور اس نے اپنی طویل عمر میں کیا کچھ نہیں کہا ہو گا۔

اس کے علاوہ بیٹ نیکہ، اسعد سوری، ملک یار غرشین، شیخ متی کو بھی پشتو ادب کے متقدمین کا درجہ حاصل ہے۔

بابا ہوتک، ساتویں صدی ہجری کا ایک ممتاز حماسی پشتو شاعر ہے یہ ایک خدا رسیدہ بزرگ تھا اپنی قوم کا قائد ہونے کے باعث قلم کے ساتھ ساتھ اسے تلوار بھی سنبھالنا پڑی۔ رزمیہ شاعری میں بابا ہوتک کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کی نظمیں اپنے ماحول کی آئینہ دار ہیں اور اپنے عہد کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔

اکبر زمینداوری نویں صدی میں ہوا ہے پشتو کی اولین مثنوی اکبر سے منسوب ہے جس کی وجہ سے اس کی عظمت بڑھ جاتی ہے اس کے علاوہ نظم اور غزل میں بھی اپنی منفرد خصوصیات نے اکبر کو اپنے معاصرین میں بہت بلند کر دیا ہے۔

مرزا خان انصاری نے گیارھویں صدی کا زمانہ پایا ہے وہ اس اعتبار سے پشتو کا منفرد شاعر ہے کہ اس نے سب سے پہلے پشتو شاعری کو تصوف سے آشنا کیا۔ سب سے پہلے اپنا دیوان بھی اسی نے مرتب کیا اور ایک روایت کے مطابق پشتو نثر نگاری کا بانی مبانی مرزا خان ہی ہے۔

مرزا خان پیر روشان کے سلسلے کا فرد ہے۔ پیر روشان ایک بہت بڑی انقلابی شخصیت تھی وہ ایک عالم باعمل تھے انہوں نے حکومت وقت کی استبدادیت کے خلاف اس وقت علم جہاد بلند کیا جبکہ ان کے ہمعصر علماء حکومت کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی کی طرح اس کے اشاروں پر کھیل رہے تھے انہوں نے پیر صاحب پر طرح طرح کے اتہام تراشے اور صاحب اقتدار لوگوں کے ایماء پر انہیں پیر تاریک کا نام دیا لیکن پیر صاحب ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر اپنی دھن میں لگے رہے انہوں نے سارے پختون خواہ میں بیداری کی لہر دوڑا دی اور اپنی سحر بیانی سے قدیم نظریات اور فرسودہ روایات کے تار و پود بکھیر دیئے۔

پیر صاحب بڑی اولوالعزم شخصیت کے مالک تھے انہوں نے علمائے وقت اور حکومت وقت کی منظم مخالفت اور قدم قدم پر بے پناہ رکاوٹوں کے باوجود عوام کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور اپنے عقیدت مندوں کا اتنا عظیم اور طاقتور گروہ پیدا کر لیا کہ حکومت کو بھی ان کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوف محسوس ہونے لگا۔

پیر صاحب کا ادبی پایہ بھی بہت بلند ہے وہ عربی فارسی پشتو اور ہندی زبانوں کے عالم بے بدل تھے انہوں نے پشتو نثر کو رواج دے کر پشتو ادب پر ناقابلِ فراموش احسان کیا۔

خوشحال خاں اور رحمان بابا نے گیارہویں صدی ہجری میں پشتو ادب کو ایک نئی شاہراہ پر ڈال دیا۔ انہوں نے آتے ہی اپنے اپنے الگ سکول جاری کئے۔ اور ان کے بعد سے لے کر دورِ جدید تک جتنے شعراء بھی گزرے ان میں سے ہر ایک انہی دو سکولوں میں سے کسی نہ کسی سے ضرور وابستہ نظر آتا ہے۔

خوشحال خاں کا خاندان بڑا زرخیز ثابت ہوا۔ اس نے ہر دور میں کئی ایک بلند پایہ شاعر پیدا کئے۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے ان دنوں غاز خٹک اور اجمل خٹک اسی مشہور خاندان کی یادگار ہیں جنہیں پشتو ادب کے دورِ جدید میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

خوشحال سکول سے زیادہ رحمان سکول مقبول ہوا حتیٰ کہ خوشحال خاں کی اولاد میں سے بھی اکثر شعراء نے رحمان سکول ہی کی پیروی کی۔ اس کی وجہ رحمان بابا کے کلام کی سادگی، سلاست، بے ساختگی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے غزل کے مزاج کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ رحمان بابا کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود خوشحال سکول یکسر ختم نہ ہوا بلکہ ہر دور میں اس کے معتقد بھی ملتے رہے اور دورِ جدید میں تو ایک وقت پھر یہ سکول اس قدر مقبول ہوا کہ اس وقت تمام کے تمام نوجوان چیدہ چیدہ شعراء خوشحال ہی کے رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان کا یہ انداز صنفِ نظم تک ہی محدود ہے اور جہاں تک غزل کا تعلق ہے وہ اب بھی رحمان بابا کی تقلید سے دامن نہیں چھڑا سکے۔ آخری دور میں حمزہ خاں شنواری، سمندر خاں سمندر، محمد اکبر خادم، صنوبر خاں مہمند، خلیق، قاضی اثر، حافظ جلالی، زخمی، جگر پشتو ادب کی گرانقدر شخصیتیں ہیں۔

دورِ جدید میں اجمل خٹک، سید رسول رسا، فضل حق شیدا، امیر محمد طوفان، قلندر، راہی، مہدی شاہ، سلیم، دوست محمد کامل، فیض یوسف، مراد شنواری، ایاز، نصر اللہ خاں نصر، اسیر، وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

فارسی ادب کا سراغ یہاں گیارہویں صدی ہجری سے ملتا ہے۔ معز الدین جہاں کا پہلا دریافت شدہ فارسی شاعر ہے۔ لیکن فارسی کے ساتھ ساتھ پشتو اور اردو میں بھی اس کا درجہ بہت بلند ہے۔

ابتدا ہی سے سرحد کے تقریباً تمام اردو پشتو شاعر فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے ہیں اس لئے ان کا علیحدہ ذکر بے محل معلوم ہوتا ہے۔ البتہ تیسرے دور میں چند ایک خالص فارسی گو شعراء بھی ملتے ہیں جن میں سے استاد زین العابدین عابد، قاضی غلام محمد طلا، منشی امیر الدین اسیر، مولوی علی رضا عندلیب، سردار خاں بابا خاں زاہد، غلام محمد خٹک، مرزا غلام عباس، منشی غلام جیلانی اور سید جی میاں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آخری دور میں ادیب پشاوری، رضا کاظمی اور ملک ناصر خالص فارسی گو شعراء میں نمایاں نظر آتے ہیں اور دورِ جدید میں جب کہ فارسی کا ذوق دم توڑ رہا ہے۔ نبیل بخاری سرحد کا اکلوتا شاعر ہے جس نے محض فارسی ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔

فارسی کی طرح ہندکو کے شعراء میں بھی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ مقامی زبان کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی اپنے زورِ قلم کے جوہر دکھاتے رہے ہیں۔

سرحد کے خالص ہندکو شعراء میں بارہویں صدی ہجری کی تنہا یادگار استاد گاموں ہیں ان کے بعد مظفر، جیلانی اور دولی چند، مسعود، ہیرا، مسکین، عبد اللہ، شاد، کریم اور نئے لکھنے والوں میں وحشی، مخلص، جوش، سید، یونس، مظفر تاتاری، اثر، پہلوان، نظر، حمید، شاد اور حقی ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان میں سے جوش اور مظفر نے بڑا نام پیدا کیا۔ پرانی ڈگر چھوڑ کر نئی راہیں تلاش کیں اور ہندکو شعر کو اردو کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔

اردو ادب کا آغاز سرحد میں چودھویں صدی عیسوی میں ہو چکا تھا۔ لیکن اردو کا اولین مستند صاحب دیوان شاعر قاسم علی خاں آفریدی ہے آفریدی نے پشتو فارسی کے شعر بھی کہے ہیں لیکن اردو میں اسے ولی دکنی کا مقام حاصل ہے۔

اس کے عہد میں حیدر پشاوری بھی ایک عظیم شاعر گزرا ہے۔

دوسرے دور میں ریاض سرحدی، عزیز پشاوری، شیخ سالم، مرزا عباس اور تیسرے دور میں سید شاہ خادم، عاصی سرحدی، غلام حسین بیگ برق گنجوی، سلطان فرخ وغیرہ قابل قدر ادبی شخصیتیں گزری ہیں۔

شائق سرحدی

خصوصاً شائق سرحدی کو تو ایک انقلابی شاعر اور بلند پایہ نقاد کی حیثیت سے بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ حالی کی طرح اس نے سب سے پہلے یہاں پرانی قدروں سے بغاوت کا نعرہ بلند کیا بلکہ خود بھی اس پر عمل کر کے دکھایا۔ انہوں نے غزل کو نیا موڑ دینے کے عملی تجربے کئے اس کی آواز گو اس وقت بالکل اجنبی تھی لیکن یہ پورے معاشرے کی آواز تھی یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستانی عوام کو اس بری طرح کچلا گیا کہ وہ برسوں سر نہ اٹھا سکے۔ یہ اثر بیسویں صدی کے آغاز میں کہیں جا کر زائل ہوا تو لوگوں کو اپنی زبوں حالی اور غلامانہ زندگی کا احساس ہوا ان کے دلوں میں انقلاب انگیز ولولے کروٹیں لینے لگے لیکن اس وقت تک ملک میں کوئی انقلابی تحریک موجود نہ تھی۔ اس لئے دلوں کی امنگیں دلوں ہی میں مچل رہی تھیں۔ شائق نے ان عوامی امنگوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا انہوں نے اردو شاعری کی روایتی قدروں سے انحراف کر کے نئے رجحانات کو جنم دیا اور سارے ماحول کی کایا پلٹ کر دی۔

شائق ایک مکتبۂ فکر، ایک تحریک، ایک ادارہ تھا اس نے اس تیرہ و تار ماحول میں ایسی انقلابی مشعل روشن کی جسے رجعتی حلقوں، حکمرانوں اور مخالفتوں کے جھکڑ بھی نہ بجھا سکے۔

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی اسی مکتبۂ فکر کا ایک بیباک نمائندہ تھے۔ علم و فضل ترکے میں پایا۔ علماء عصر سے حدیث، فقہ اور تفسیر کی تکمیل کرنے کے بعد دار العلوم دیوبند میں داخل ہوئے جہاں شیخ الہند علامہ محمود الحسن صاحب سے کسب علم کیا۔ ۱۹۱۲ء میں فارغ التحصیل ہو کر پشاور پہنچے تو اپنے استاد گرامی کے مشورے سے سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا۔

ان کی شخصیت بڑی دلآویز، بڑی جاذب نظر اور بڑی ہمہ گیر تھی۔ وہ بیک وقت ایک عالم باعمل، شعلہ نوا مقرر، نڈر صحافی، بے خوف رہنما، بلند پایہ ادیب اور ایک انقلابی شاعر تھے۔ آپ کی تمام عمر قید و بند میں گزری۔ دوران اسیری ہی میں پلورسی کا عارضہ ہو گیا۔ ۱۹۴۲ء میں رہا ہو کر آئے تو بستر علالت پر ایسے پڑے کہ پھر اٹھ نہ سکے اور آخر مئی ۱۹۴۳ء کو اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔

آپ سرحدی عوام کے محبوب رہنما تھے۔ اپنی عمر کا غالب حصہ انگریز سامراج کے خلاف جنگ آزادی میں گزارا۔ سرحد میں نوجوان بھارت سبھا اور کانگرس کے بانی مبانی تھے۔ صوبہ سرحد کا نوجوان طبقہ آپ کے خیالات سے بے حد متاثر تھا۔ میں نے طالب علمی کے زمانے میں انہیں کبھی منبر پر خطبہ دیتے دیکھا، کبھی خاکروبوں کے جلوس کی قیادت کرتے پایا اور کبھی کسی عظیم الشان عوامی اجتماع کے سامنے دھواں دھار تقریر کرتے نظر آئے۔

سیاسی الجھنوں اور قید و بند کے مصائب نے آپ کو شعر و سخن کی طرف متوجہ ہونے کا کم موقع دیا تاہم انہوں نے جو کچھ کہا وہ فیض کی طرح

کم ہونے کے باوجود اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے خصوصاً ہجویات پر تو انہوں نے جو کچھ لکھا وہ سوائے فیض کے اور کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔

سائیں احمد علی

میں غالباً پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارے محلّے میں ارباب مندی کی دوکان پر ایک ضعیف العمر شخص سڑک کے کنارے چارپائی پر بیٹھا رہتا۔ انہیں میں نے بارہا کھانستے ہوئے دیکھا یا آنکھیں بند کئے بیٹھا ہوا پایا۔ ہر وقت عقیدت مندوں کا ہجوم گھیرے رہتا۔ میں انہیں کوئی خدا رسیدہ بزرگ سمجھتا رہا۔ ایک دن کسی نے بتایا۔ "یہ سائیں ہے ——— ہندکو، اردو اور فارسی کا بہت بڑا شاعر" ——— یہ سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ اس وقت تک میرے ذہن میں جبہ و قبا والے قصیدہ گو درباری شاعروں کا ہی تصور تھا ——— "کیا شاعر ایسے بھی ہوتے ہیں؟" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ——— اور اس دن سے آتے جاتے وہاں کھڑے ہوتے پہروں سائیں مرحوم کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا ——— یہاں تک کہ ایک دن ارباب مندی نے مجھے ٹوک دیا ——— "جاؤ بیٹا۔ اپنا کام کرو۔ یہاں کوئی تماشا تو نہیں ہو رہا ———"

سائیں مرحوم اُمّی شخص تھے لیکن ان کی شخصیت اتنی جامع اور بھرپور تھی کہ بڑے بڑے اہل علم ان کا لوہا مانتے تھے ——— ابتدا میں مقامی زبان ہندکو کو اپنایا اور اسے اتنے عروج تک پہنچایا کہ آپ کو ہندکو کا غالب کہا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اردو فارسی میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان زبانوں میں بھی اپنے لئے ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا۔

سائیں زبان و محاورہ کے بادشاہ تھے ہر وقت اردو میں بات چیت کرتے۔ صحت زبان و تلفظ کے معاملے میں اتنے محتاط واقع ہوئے تھے کہ ذرا بھی کوئی غلط لفظ استعمال کرتا تو بر سر مشاعرہ ٹوک دیتے۔

ادبیات سرحد کا تیسرا دور سرحد میں اُردو کی تبلیغی اور عملی کارگزاریوں کا دور تھا اور ان تحریکات کی موجد اور بانی وہ سائیں کی واحد شخصیت تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے پشاور میں پبلک مشاعروں کا آغاز کیا جو اُردو کی نشر و اشاعت اور ادبی تبلیغ کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ تھا۔ انہوں نے یہاں کے اولین ادبی ادارے بزم سخن کی بنیاد رکھی جس میں ادیبوں کی تمام منتشر قوتوں کو یکجا کر دیا۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مشاعروں کے انعقاد اور بزم سخن کے قیام سے یہاں ایک ایسی شمع روشن ہوئی کہ سرحد کے گوشے گوشے سے ادبی پروانوں کا ہجوم اس کے گرد جمع ہونے لگا۔

سائیں کے شعور کی پختگی اور ان کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے انفرادی سرگرمیوں کو اجتماعی رنگ میں ڈھال کر زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ آپ عروض سے بھی واقف تھے اور فن شاعری پر بھی پوری دسترس رکھتے تھے اپنے دور کے تمام بڑے چھوٹے شعراء آپ کی عظمت کے قائل تھے اور ان میں سے اکثر آپ سے مشورۂ سخن بھی لیتے تھے۔

آخر عمر میں طبیعت میں تلخی اور چڑچڑاپن آ گیا تھا بہت کم بولتے تھے۔ دُور دُور سے لوگ شوق ملاقات سے آتے لیکن بسا اوقات بیٹھ بیٹھ کر چلے جاتے کسی کو جرأت نہ ہوتی کہ انہیں بلائے یا سلسلۂ گفتگو چھیڑے ——— کبھی موڈ میں ہوتے اور شعر سنانے لگتے تو بھی کسی کو داد دینے یا کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا ——— کوئی بھولے سے داد دے بیٹھتا تو فوراً سوال کرتے۔ "بتاؤ کیا سمجھا ہے؟" ——— شعر سنانا بند کر دیتے اور اس کی وہ خبر لیتے کہ آئندہ کے لئے بیجا داد دینے سے وہ ہمیشہ کے لئے توبہ کر لیتا۔

انہیں نمود و نمائش سے نفرت تھی وہ ہمیشہ خاموشی سے سنانا اور سننا پسند کرتے ——— خود بھی بہت کم داد دیتے۔ چپ چاپ سر جھکائے سنتے جاتے ——— کہیں غلطی ہوتی تو سر اُٹھا کر معنی خیز نظروں سے دیکھتے اور فوراً اصلاح کر دیتے ——— کبھی کوئی شعر پسند آتا تو سر ہلا دیتے بس یہی ان کی سب سے بڑی داد تھی۔

سائیں کا فیض سخن رات دن جاری رہتا وہ آخر عمر میں جو بیمار پڑنے لگے تھے عمر کی زیادتی کے باعث قویٰ مضمحل ہو گئے اور عناصر میں اعتدال

رہا۔ گر کشمیری کے پاس اپنے ایک مخلص دوست ارباب سرور کی دوکان کے سامنے چارپائی پر پڑے رہتے اور اہل علم حضرات کا ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا۔

اُردو میں غالب اور انیس سے اور فارسی میں حافظ اور نظیری سے بہت متاثر تھے۔ اردو فارسی کے بیسیوں اشعار ازبر تھے جنہیں روزمرہ گفتگو میں نہایت سلیقے سے پیش کرتے۔ سخن فہمی میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ بیدل اور نظیری کے دقت طلب اشعار آپ کے پاس لائے جاتے اور آپ سنتے ہی صرف چند اشاروں سے مشکل سے مشکل شعر کو صاف کر دیتے۔

لباس نہایت سادہ پہنتے۔ ہفتوں کپڑے بدلنے کا ہوش نہ رہتا۔ بالکل مجذوبوں کی طرح پڑے رہتے لیکن ایک دنیا قدردان تھی۔

بظاہر معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا لیکن آخر وقت تک بڑی شان سے وقت گزارتے رہے۔ ۱۲ اپریل سنہ ۱۹۳۱ء کو پچانوے برس کی عمر پا کر یہ آفتاب علم غروب ہوا اور شیخ حبیب صاحب کی زیارت کے پاس "گنج" دروازے کے سامنے سپرد خاک کئے گئے۔

بیدل پشاوری

مرزا داور خاں بیدل پشاوری سرحد میں اپنے دور کے اولوالعزم شاعر تھے۔ وہ صوبہ سرحد کے قدیم شعراء میں تنہا خوش نصیب شاعر ہیں جن کا دیوان ان کی زندگی میں مرتب ہو کر شائع ہو گیا اور اس اعتبار سے بھی وہ پہلے سرحدی شاعر ہیں جنہیں ہندوستان کے مشاہیر شعراء حضرت بیخود دہلوی، حضرت فصاحت جنگ جلیل، حضرت ریاض خیرآبادی اور حضرت نوح ناروی نے ان کے دیوان کی اشاعت پر خراج تحسین پیش کیا۔

اردو فارسی دونوں زبانوں کے بلند پایہ شاعر تھے۔ فن شاعری میں بھی درک حاصل تھا۔ کلام ہموار ہے۔ ان کی شاعری خالص داخلی شاعری ہے۔ کلام میں تعلّی اور خودستائی نہیں اگرچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ چیز ان کی طبیعت میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ اپنے معاصروں کا تو ذکر ہی کیا وہ تو میر، غالب اور اقبال کو خاطر میں نہ لاتے۔ ہر ایک کے سامنے برملا ان پر نکتہ چینی کرتے اور اپنے آپ کو ان سے بہتر اور بلند شاعر ظاہر کرتے ——— ممکن ہے انقضائے عمر کے باعث آخر وقت میں یہ بات ان کی طبیعت میں پیدا ہو گئی ہو۔

بیدل نے طویل عمر پائی۔ آخر میں ان کا دماغ تقریباً ماؤف ہو چکا تھا۔ بعض اوقات بڑبڑاتے اور ہذیان گوئی کرتے ہوئے بازاروں میں گھومتے نظر آتے ——— راستے میں جو بھی ملتا اسے باآواز بلند اپنے اشعار سنانے لگتے۔ ہر شعر پر داد طلب کرتے اور دوسرے شعراء کا مضحکہ اڑاتے۔ آخر یہ چیز اتنی بڑھ گئی کہ دوستوں نے ان سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ عمر بھر کے ملنے والے انہیں دیکھتے تو کترا کر نکل جاتے ——— مشاعروں میں کھڑے ہو کر سنانے لگتے تو بس سناتے ہی چلے جاتے، لوگ اکتا جاتے، منتظمین تنگ آ جاتے لیکن آپ کو ذرا احساس نہ ہوتا۔ کوئی ٹوک دیتا تو ناراض ہو کر چلے جاتے۔ یہاں تک کہ انہیں مشاعروں میں مدعو کرنے سے گریز کیا جانے لگا۔ سادگی ان کے کلام کی بڑی خوبی اور سطحیت بڑا عیب تھا۔

آپ نے ۱۰ اپریل سنہ ۱۹۳۹ء کو پشاور میں انتقال کیا اور وزیر باغ کے قریب دفن ہوئے۔ قاضی آغائے روحی نے قطعۂ تاریخ وفات کہا۔

؎ سال رحلت روحی آشفتہ حال
گفت بیدل شاعر شیریں مقال
۱۳۵۸ھ

رعنا کاظمی

اگر انسانی طبائع میں ذہنی وراثت کو واقعی کوئی دخل حاصل ہے تو مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ شعر و ادب سے میری طبیعت کا لگاؤ درحقیقت میرے ننھیال کا عطیہ ہے۔ یوں تو ددھیال میں علم و فضل کی کمی نہ تھی لیکن وہاں شعر و سخن کا رسیا کوئی نظر نہیں آیا۔ برخلاف اس کے ننھیال میں جہاں

تک سراغ ملتا ہے۔

اور پھر آگے چلئے تو دونوں ماموں سکندر شاہ رضا کاظمی اور علی شاہ جگر کاظمی نہ صرف شاعر بلکہ علم و فضل میں ایک نمایاں مقام کے مالک ——

رضا کاظمی مرحوم فارسی زبان کے بے بدل شاعر تھے یہی ذوق انہیں کشاں کشاں ایران لے گیا جہاں برسوں مقیم رہے اور وہاں کی سب سے بڑی درس گاہوں میں معلم کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اہل ایران سے اپنے علم و فن کا لوہا منوایا۔ چنانچہ ان دنوں وہاں جو شعراء کا تذکرہ لکھا گیا اس میں ادیب پشاوری اور رضا کاظمی کے نام سر فہرست نظر آتے ہیں۔

میری طفلی کا زمانہ تھا کہ رضا مرحوم ایران سے لوٹ کر پشاور پہنچے۔ ان کی شخصیت یوں بھی بڑی بارعب تھی جب یہ پتہ چلا کہ وہ شاعر بھی ہیں تو میں اور زیادہ مرعوب ہوا۔ چار پانچ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ انہیں پہلی دفعہ دیکھا تو یہی جی چاہا کہ لپٹ جاؤں اور التجا کروں کہ مجھے بھی شاعری سکھا دیجئے لیکن ان کے حضور تو بڑے بڑے لوگوں کا ناطقہ بند ہو جاتا۔ میری بساط ہی کیا تھی جو تاب سخن کی جرأت کرتا۔

رضا کا علم و فضل میں بھی جواب نہ تھا۔ عربی فارسی کے علامۂ روزگار، فلسفہ منطق اور حکمت میں بے مثال —— بڑے بڑے لسان ان کے سامنے گنگ نظر آتے —— فارسی کا لب و لہجہ اتنا شستہ کہ اہل زبان بھی سن کر ششدر رہ جاتے۔ علامہ اقبال مرحوم سے ملنے گئے تو انہیں اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے کہا "میں نے آج تک کسی ہندوستانی کو اس قدر فصیح فارسی بولتے نہیں سنا"۔

علم و فن کے اسی گھمنڈ نے انہیں تیز دماغ بنا دیا تھا کسی سے سیدھے منہ بات تک نہ کرتے۔ ان کی اس بددماغی سے اپنے بیگانے سبھی شاکی تھے۔ اس ہمہ دانی کے باوجود اسی بددماغی کے باعث تمام عمر فقر و فاقہ میں کٹی۔ عین جوانی میں ادبی حلقوں کو سوگوار چھوڑ کر وفات پا گئے

جگر کاظمی

یہ میرے دوسرے ماموں ہیں جو آج ۷۰ برس کی عمر میں بفضل تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ یہاں کے بیشتر مشہور شعراء آپ کے حلقۂ تلامذہ میں رہ چکے ہیں جن میں سے حضرت ضیا جعفری اور رضا کاظمی کے نام قابل ذکر ہیں۔ خود مجھے ان سے اصلاح لینے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ شعر و سخن کی طرف میرا رجحان انہی کی توجہ کا رہین منت ہے۔ ان کی وجہ سے مجھے گھر میں یہ شاعرانہ ماحول نصیب نہ ہوتا تو شاید شاعری کی بجائے میں نے کوئی اور دھندا اختیار کیا ہوتا۔ پھر میں ان کی دوربیں نظر کا بھی معترف ہوں۔ بچپن ہی میں جب کبھی گھر آتے مجھے دیکھتے ہی فرماتے "یہ منا ضرور شاعر نکلے گا"۔ پھر مجھ سے پوچھتے "کیوں بیٹا شاعر بنو گے"۔ میں تائید میں سر ہلا دیتا اور وہ مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے ——

جگر صاحب یہاں کے اولین ادبی ادارے بزم حق کے موسسین میں سے ہیں اور یہاں کے ادبی ہنگاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔

اردو کے علاوہ فارسی کے بھی بلند پایہ شاعر ہیں خصوصاً اس گئے گزرے زمانے میں بھی قصیدہ کی صنف آپ ہی کے دم قدم سے یہاں زندہ ہے۔

جگر صاحب ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے نو برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ماموں کے ہمراہ کلکتہ چلے گئے جہاں مدرسۂ عالیہ میں پانچ سال تک پڑھتے رہے۔ ۱۸۹۵ء میں تعلیم چھوڑ کر دہلی کی طرف کا رخ کیا —— زاد راہ نہ ہونے کی وجہ سے سال بھر دہلی ہی میں پڑے رہے۔ پشاور پہنچ کر چند دن قیام کیا اور پھر ایک عزیز کے ہمراہ کشمیر جا پہنچے جہاں فارسی عربی کی تعلیم مکمل کی۔

کلکتہ میں قیام کے دوران میں حضرت شمس کلکتوی سے اصلاح لیتے اور مشاعروں میں شامل ہوتے تھے ان دنوں وہاں آغا حشر مرحوم کی وجہ سے ادبی ہنگامے زوروں پر تھے جگر نے ان صحبتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا —— دہلی پہنچے تو ایک دن پھرتے پھراتے ایک مشاعرے میں جا پہنچے یہ مشاعرہ حضرت داغ دہلوی کی صدارت میں ہو رہا تھا آپ نے اجازت لے کر غزل پڑھی ایک شعر پر داغ مرحوم نے چونک کر جگر کو دیکھا اور پوچھا "کہاں کے رہنے والے ہو؟" آپ نے بتایا "سرحدی ہوں" —— یہ سن کر انہیں بڑا تعجب ہوا ان کی بڑی تعریف کی اپنے برابر بٹھایا اور فرمایا ——

ہم تو سمجھتے تھے سرحد پٹھانوں کا ملک ہے وہاں اُردو کوئی جانتا بھی نہ ہوگا۔ لیکن تمہاری زبان تو دلی والوں سے زیادہ فصیح معلوم ہوتی ہے" نظم و نثر بے تکلف لکھتے ہیں اور کھرے کھرے گٹھے ہوئے لکھتے ہیں —— باغ و بہار قسم کے آدمی ہیں۔ طبیعت میں ذرا مزاح ہے لیکن تلخی نہیں —— معمر و سالخوردہ بزرگ ہیں لیکن طبیعت جوان پائی ہے۔ صحت بحال اور قویٰ میں اعتدال ہے —— شاعری سے زیادہ اپنی غیر معمولی صحت پر فخر کرتے ہیں اور اس کے اظہار میں گھونسے سے پتھر توڑنے کا کرشمہ بارہا احباب کو دکھا چکے ہیں۔

جگر صاحب عہد رفتہ کی یادگار ہیں۔ آپ کے معاصروں میں سے صرف قاضی قضا صاحب حیات ہیں۔ آپ نے سرحد میں اُردو کی ترویج کے سلسلہ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور ایسے وقت میں ادب کی شمع روشن کی جب کہ یہاں کا ماحول تیرہ و تار تھا —— آپ نے عظیم الشان مشاعروں اور ادبی ہنگاموں کے ذریعے لوگوں میں ادبی ذوق پیدا کیا اور آج سرحد میں اردو ادب جس بلند مقام پر نظر آتا ہے اس میں آپ کی مساعی جمیلہ کا غالب حصہ ہے۔

قاضی محمد عمر قضا

قاضیوں کے مشہور گھرانے میں جنم لیا۔ علم و فضل ترکہ میں پایا۔ شعر و سخن کا ذوق گھٹی میں پڑا تھا کچھ عرصہ داغ دہلوی سے غائبانہ اصلاح لیتے رہے۔ تمام عمر شعر کہتے اور حقہ پیتے گزر گئی۔ والد کی وفات کے بعد ایک معقول جائیداد ترکہ میں پائی۔ ساری عمر کوئی دھندا نہ کیا۔ بیٹھ کر کھاتے رہے اسی مشغلے میں تمام جائیداد پھونک ڈالی حتیٰ کہ رہائشی مکان تک نہ رہا۔ کتابیں جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک رہا —— ان کی لائبریری میں فرانسیسی، انگریزی، عربی، فارسی، گجراتی، پشتو اور اُردو کتب کا ایک نہایت قیمتی ذخیرہ موجود ہے جن میں بڑے بڑے نادر نسخے بھی ملتے ہیں۔

ابتداء میں گھڑ سواری اور شطرنج کا بہت شوق تھا لیکن شاعری کے شوق نے باقی تمام شوق بھلا دیئے۔

قضا عالم و فاضل شخص ہیں اور اہل علم کی قدر کرتے ہیں لیکن نقادانہ طبیعت سے کوئی شخص بھی محفوظ نہیں رہتا۔ ان کی عمر اس وقت ۸۰ برس ہے۔ سماعت جاتی رہی، بصارت کمزور ہو گئی، اعضا مضمحل ہو گئے لیکن دل و دماغ محفوظ ہیں۔ ہوش و حواس قائم ہیں —— اب بھی باتوں میں وہی چاشنی وہی مٹھاس، وہی لطافت —— مادری زبان پشتو ہے لیکن ہمیشہ اردو بولتے ہیں یہاں تک کہ گھر پر بھی اُردو ہی میں باتیں کرتے ہیں —— صاف اور شستہ اُردو —— کوثر میں دھلی ہوئی زبان ——

قضا نہایت نقاد اور ممتاز شاعر ہیں۔ انہیں ادبیات سرحد کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے —— وہ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ اصناف سخن میں صرف غزل کو اپنایا اور اسے عروج پر پہنچایا۔

قضا کو ہم سرحد کا غالب کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ غالب کی طرح انہیں اپنے فارسی کلام پر ہمیشہ ناز رہا اور اردو مجموعے کو بے رنگ سمجھتے رہے لیکن ان کی شہرت و عظمت کا باعث یہی اُردو مجموعہ ثابت ہوا —— غالب کی طرح بیدل اور نظیری سے بے حد متاثر ہیں اس لئے ان کی طبیعت نہایت دقت پسند تھی اور طرز بیدل میں ریختہ لکھنے کو اپنے ذوق سخن کی معراج سمجھتے تھے چنانچہ ابتدائی غزلوں میں ان کا یہی مرغوب انداز رہا ہے۔

یک جہاں جلوہ محو اضطراب ضبط دل
کاہش افکار سے قضا ہر آئینہ سیماب تھا

لیکن رفتہ رفتہ سادہ اور سلیس، زبان میں غزل لکھنے لگے زبان اور محاورہ پر عبور حاصل تھا یہ اسلوب اتنا مقبول ہوا کہ انہوں نے اپنے لئے منفرد مقام حاصل کر لیا ؎

آؤ نہ ہم بھی بھیس بدل کر ادھر چلیں   ہے ربط ان کے ناز کو ناآشنا کے ساتھ

آئی سمجھ گھڑی قیامت کی　　زلف سے ماپ چکے ہیں قد اپنا
لیجئے آپ کو مبارک ہو　　کھا گیا غیر کو حسد اپنا

قضا کو داغ سے شرفِ تلمذ رہا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آپ داغ کے مکتبِ فکر سے بہت کم متاثر ہوئے بلکہ اس کے برخلاف ان کے کلام میں غالب کے رنگ کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

قضا سے پہلے سرحد میں غزل روایتی ڈگر پر چل رہی تھی انہوں نے اسے رفعتِ احساس اور تازگیٔ معانی، مضمون آفرینی کی بنا ڈالی اور غزل کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ قضا سے پہلے بلکہ ان کے دور میں بھی یہاں غزل میں کوئی ندرت نہ تھی، وہی گھسے پٹے مضمون باندھے جاتے اور اگلے ہوئے نقمے چبائے جاتے —— قضا نے آکر ایک ایسے مکتبِ فکر کی بنیاد ڈالی جس نے یہاں کی ادبی گھٹی ہوئی شاعرانہ فضا کو چونکا دیا —— قضا کی شاعری اس مسلسل بھیانک تاریکی میں روشنی کا مینار ثابت ہوئی —— تلاش و جستجو کے دلدادہ اس کی طرف لپکے اور اس سے مستفید ہونے لگے۔

قضا میں انانیت ضرور ہے لیکن ان کے علم و فضل کے پیشِ نظر یہ انانیت انہیں زیب دیتی ہے —— تمام عمر لکھتے رہے اور اتنا کچھ لکھا کہ کئی دیوان مرتب ہو سکتے ہیں۔ ان کی آخری آرزو یہی ہے کہ کسی طرح دیوان چھپ جائے اور اس کے لئے وہ سالہا سال سے کوشاں ہیں۔ اس وقت سے جب پریس ان کا اپنا تھا اور دیوان چھاپنے میں کوئی خاص دقت نہ تھی۔ لیکن ان کی حد سے بڑھی ہوئی احتیاط اور بدگمانی نے اس دیرینہ آرزو کو شرمندۂ تکمیل نہ ہونے دیا۔ چنانچہ کلام چھپنے کے لئے اس خدشہ سے نہیں دیتے کہ کوئی چرا لے۔

مشاعروں میں ابتدا ہی سے کم شریک ہوتے ہیں اور اب تو ایسے معذور ہو چکے ہیں کہ مہینوں گھر سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ ویسے بھی گھر سے باہر شاذ ہی نکلتے تھے۔ تمام دن بیٹھک میں بیٹھے پڑھ رہے ہیں یا پھر حقہ پی رہے ہیں —— یہ بھی شاید قضا صاحب کی منفرد خصوصیت ہے کہ وہ سلیٹ پر شعر لکھتے ہیں، اسفنج سے مٹاتے اور صاف کر کے لکھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ غزل کی نوک پلک درست ہو جائے تو اسے کاپی پر منتقل کر لیتے ہیں۔

نہ چلی سامنے قضا کے　　غوث کی، قطب کی، ولی کی

غلام محمد غوثی سرحدی

سنہ ۱۹۳۲ء میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر گھر سے نکلا اور تلاشِ معاش میں دہلی ہوتا ہوا کلکتہ جا پہنچا۔ وہاں پشاور کے جواں سال شاعر اختر آصفی کے ذریعے غلام محمد غوثی سے تعارف ہوا۔ آپ صحافی بھی ہیں، شاعر بھی اور عروضی بھی ——

بیس برس کی عمر میں اپنے وطن مالوف پشاور کو چھوڑ کر کاروباری سلسلے میں کلکتہ جانا پڑا اور وہیں کے ہو رہے۔ غزل کے شاعر ہیں، غزل قدیم رجحانات کی آئینہ دار ہے۔ آغا حشر مرحوم اور وحشت کلکتوی کے جلیسوں میں سے ہیں نہایت ثقہ قسم کے بزرگ ہیں۔ نیشنلسٹ خیالات رکھتے ہیں شروع ہی سے کانگرس کے ساتھ تھے اور آج بھی ان کی وضعداری اور اصول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بارہا قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ تمام عمر ہنگامہ بازی میں گزری —— صوفی منش بھی ہیں اور رند مشرب بھی —— ان کی زندگی عجیب ہنجار سے گزری۔ کبھی سونے چاندی میں کھیل رہے ہیں تو کبھی فقر و فاقے سے دوچار ——

خوش پوش اور خوش ذوق انسان ہیں ہر وقت فکرِ سخن میں کھوئے کھوئے نظر آتے ہیں۔ میری ادبی تربیت میں غوثی صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ اگرچہ

صرف چند ابتدائی غزلوں پر ہی ان سے اصلاح لی تاہم میرے ادبی ذوق کو جلا دینے اور سب سے پہلے ادبی حلقوں سے متعارف کرانے کا سہرا انہی کے سر ہے۔

۱۹۳۵ء میں پشاور واپس آیا۔ انہی دنوں مجھے یہاں کی ادبی محفلوں میں شمولیت کا موقع ملا اور میری ادبی زندگی کا آغاز بھی ہوا۔ حلقۂ ادبیہ پشاور سے وابستگی اختیار کی اور مشاعروں میں باقاعدہ حصہ لینے لگا۔

اس وقت یہاں کی قدیم ادبی جماعت بزم سخن آخری سنبھالا لے رہی تھی۔ وہ اپنی بجھتی ہوئی بوڑھی ہڈیوں کے ساتھ جواں سال ادبی ادارے حلقۂ ادبیہ سے ٹکر لینے کے لئے میدان میں کود پڑی تھی۔ اس کے صدر محمد شاہ برق تھے۔

محمد شاہ برق

برق صاحب نہایت پر گو اور حاضر دماغ واقع ہوئے ہیں ہمیشہ مشاعرے سے دو تین گھنٹے پہلے بیٹھ کر پندرہ بیس اشعار کی غزل کہہ لیتے تھے —— ایک دفعہ دفتر سے دو مہینے کی چھٹی لے کر کوہاٹ گئے اور واپسی پر ایک سو غزلیں لکھ لائے —— تمام عمر شعر و سخن کے مشغلے ہی گزاری۔ دفتر سے چھٹی ہوتی تو بزم سخن کے بالاخانے یا میر عباس مرحوم کے قہوہ خانے میں جا بیٹھتے جہاں احباب جمع ہونے لگتے ادبی بحثیں ہوتیں۔ اساتذہ کے کلام کی شرح کی جاتی اور نو عمر شعراء کے کلام پر اصلاح دی جاتی۔ یہاں تک کہ ایک بجے شب یہ محفل برخاست ہوتی اور آپ گھر کا رخ کرتے۔ یہ سلسلہ کم و بیش پچیس تیس برس تک ایک ہی ہنجار پر قائم رہا۔ اب گوشہ عزلت اختیار کر لیا ہے اور ادبی دنیا سے بالکل کنارہ کش ہو گئے ہیں۔

ہنس مکھ اور ملنسار ہیں بھی بے تحاشا چائے پینے اور بے تحاشا شعر کہنے کی وجہ سے بدنام تھے لیکن اب صرف کثرت چائے نوشی کا الزام سہہ رہے ہیں۔

خالص مکی

حلقۂ ادبیہ میں ایک سفید ریش بزرگ کبھی کبھار تشریف لاتے تھے ضعیف العمر، دائم المریض لیکن زندہ دل، فہمیدہ اور بامذاق —— بعد میں معلوم ہوا وہ یہاں کے مشہور اساتذہ میں سے ہیں اور انہیں خالص مکی کہتے ہیں۔

دماغ زرخیز پایا تھا مشرقی علوم پر عبور حاصل تھا خصوصاً سخن فہمی میں تو اپنی نظیر آپ تھے۔ طبیعت دقت پسند تھی۔ بیدل نظیری اور غالب سے بیحد متاثر تھے اور انہی کی تقلید میں خود بھی فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں نہایت اُلجھے ہوئے شعر کہتے تھے لیکن بظاہر مزاج کے بڑے ملنسار تھے یہاں تک کہ اسی رو میں غالب کی طرح سے بھی دریغ نہ کرتے۔

خالص کے اصلی حریف ان کے ہمعصر جگر کاکی تھے۔ ابتدا ہی سے ان میں ٹھن گئی اور یہ چشمک آخر تک قائم رہی ان کا سب سے بڑا مشغلہ ایک دوسرے کی مخالفت کرنا تھا۔ خالص جہاں بیٹھتے جگر پر کڑی تنقید کرتے اور جگر ہر ملنے والے سے خالص کی شکایت کرتے —— لیکن خالص فوت ہوئے تو سب سے زیادہ قلق جگر کو ہوا وہ رو رو کر کہتے تھے خالص کے اٹھ جانے سے ہماری شاعری ختم ہو گئی اور یہ حقیقت ہے کہ خالص کی وفات کے بعد جگر بالکل گوشہ نشین ہو کر رہ گئے۔

خالص آزاد مشرب اور وسیع النظر انسان تھے ان کے والد اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ ہوش سنبھالا تو اہل حدیث بن گئے شیعی لٹریچر پڑھتے پڑھتے اثنا عشری ہوئے۔ بمبئی میں کہیں سے خوارج کا لٹریچر ملا اس سے متاثر ہوئے۔ کچھ دن عیسائیت کی طرف رجحان رہا۔ پھر مرزا غلام احمد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور آخر میں سب بندھنوں سے آزاد ہو گئے۔ نہایت خوش مذاق اور صاف گو واقع ہوئے تھے اپنی اس مذہب بازی

یہ ایک لطیفہ اکثر سنایا کرتے کہ ان کا ایک پٹھان دوست انہیں محرم کے جلوسوں میں دیکھا کرتا تھا۔ پھر اس نے سنا خاص قادیانی ہو گئے۔ کچھ مدت بعد ایک جلسے میں پایا تو وہ بے حد متعجب ہوا اور بے ساختہ بولا "یہ کمبخت بھی ہر مذہب میں حاضر ہے"۔

خاص نستعلیق قسم کے بزرگ تھے چہرے سے تدبر اور رعب ٹپکتا۔ گفتگو ثقہ اور متین ہوتی۔ علمی باتوں میں بڑی دلچسپی لیتے اور خوب مزے لے کر طنز کے تیر پھینکتے جاتے۔ دوسروں کو زچ کرنے میں انہیں بڑا لطف آتا۔ وہ نہایت دلکش خیال اور روشن دماغ انسان تھے کسی بات کا برا نہ مانتے یہاں تک کہ اپنی کمزوریوں کو بھی برملا بیان کرتے لیکن افسوس کہ ان کی تحریر میں یہ بات پیدا نہ ہو سکی۔

خاص مزدور پیشہ تھے آمدنی محدود تھی لیکن طبیعت شاہانہ پائی تھی۔ مہینوں فقر و فاقہ گزارنے کے بعد جہاں کہیں کام بنتا اور سو پچاس روپے ہاتھ آتے وہیں دوستوں کو کھلا پلا کر پھر وہی فقر و فاقہ ——— اپنے کام میں بڑے ماہر تھے ٹھیکیداروں میں نوکریں لگاتے لیکن کچھ بھی پس انداز نہ کر سکے۔ ہزاروں عالیشان بلڈنگیں بنائیں گو خود ایک جھونپڑا تک نہ بنا سکے۔ ایک ٹوٹے پھوٹے کرائے کے مکان میں رہتے جو ایک دن بارش ہوتی تو مہینہ بھر ٹپکتا ———

آخر عمر میں صحت جواب دے گئی۔ ذیابیطس کے مریض تھے، ہاضمہ بیکار ہو گیا، سماعت جاتی رہی، چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے ——— کام کاج کرنے کے قابل نہ رہے۔ احباب نے کوشش کر کے ایک سکول میں معلم کرا دیا۔ لیکن وہاں بھی زیادہ دن نہ گزر سکے مسلسل بیماری کے باعث تنگدستی ایسی مستقل ہوئی کہ مرتے دم تک چھٹکارا نہ مل سکا۔ خودداری کا یہ عالم کہ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا۔ کئی کئی وقت کا فاقہ ہوتا لیکن چہرے پہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی، ماتھے پہ بل تک نہ آتا ——— لیکن اپنی زندگی کے اس المیے کو بھی وہ اپنی شاعری کا موضوع نہ بنا سکے۔

خاص کی شعر فہمی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ ایک دفعہ یاروں کو مذاق سوجھا سب نے مل کر ایک مہمل غزل لکھی جو محض الفاظ کی ترکیب کا گورکھ دھندا تھی غزل انہیں سنائی گئی انہوں نے بڑی تعریف کی لیکن جب راز کھلا تو وہ ڈٹ گئے کہ اس میں معانی موجود ہیں۔ چنانچہ اب جو انہوں نے معنی پہنانے شروع کئے تو سب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے وہی مہمل غزل خاص کی تشریح سے اچھی خاصی غزل معلوم ہونے لگی تھی۔

فروری [illegible] میں پشاور میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

رضا حسین رضا ہمدانی

اسی دوران میں رضا ہمدانی سے میرا تعارف ہوا جس سے آگے چل کر ایسے قلبی تعلقات قائم ہوئے کہ ہماری رفاقت دوستوں کے حلقوں میں ضرب المثل بن گئی اور ہم ایک دوسرے کے نام سے پہچانے جانے لگے۔

رضا ہمدانی سے میری پہلی ملاقات بزم سخن کے ایک مشاعرے میں ہوئی اور پھر جہاں ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا تو بڑھتا ہی گیا ——— میں نے اس ایرانی الاصل، غزال چشم صنم زادے کو ایرانی اور کلاسیکی قالینوں میں اور رضا کو بھی شاعری میں گم پایا اور رنگ برنگے شال دوشالوں میں بیٹھے ہوئے بھی فکر سخن میں غلطاں دیکھا ——— رضا کی دوکان پر ہر وقت شعر و ادب کا جمگھٹا لگا رہتا اور وہ اپنے شاعرانہ پیشے روزگار کے تانے بانے میں مصروف۔

رضا بزم سخن کا جنرل سیکرٹری تھا۔ بزم کا حقیقی دفتر رضا کی دوکان ہی تھی معاشی دھندے کے بعد اس کا سارا وقت ادبی خدمت کی نذر ہو جاتا۔

ایک مدت تک رضا کی انگلیاں فن سوزن سے کھیلتی رہیں ——— وہ قالینوں اور شال دوشالوں کے سوراخ بند کرتا رہا اور معاشی آسودگی اس کے دامن میں ناقابل رفو سوراخ بناتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ روزگار سے گلو خلاصی کر کے چوک کے ترازو میں سبز و سیاہ چائے تولتے دیکھا گیا۔ یہاں بھی ہم مشرب احباب کا جمگھٹا رہنے لگا۔ ایسی دوکانداری میں یہ سلسلہ کب تک چلتا۔ آخر اس نے اس علاقے سے بھی جان چھڑائی اور جہانگیر پورہ میں ایک چھوٹی سی تمباکو کی دوکان کر لی۔ یعنی ایک آزاد ریاست ——— جس میں شاعری زیادہ ہوتی اور دوکانداری کم ———

دائرہ ادبیہ اور بزمِ سخن کی باہمی چپقلش، مشاعروں اور سیاست کے جوڑ توڑ اور تخریبی مگر زندہ دلی سے بھرپور ہنگاموں کا مرکز یہی دوکان تھی۔ اس گروہ بندی کے باوجود رضاؔ کی امن جو اور صلح کل طبیعت کا یہ عالم تھا کہ حزبِ مخالف کے اراکین بھی اس کی قدر کرتے —— راقم الحروف دائرہ ادبیہ کے ساتھ وابستہ تھا، اور رضا سے بھی گہرا انس تھا —— ہم دونوں بزم و دائرہ کے موضوع پر بروقت بحثتے اور اکثر یہ مباحثہ تکرار کی سرحدوں کو چھونے لگتا —— اسی قضیئے کو نپٹانے کے لئے ہم نے ایک الگ جماعت بنانے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۴۳ء میں ہم نے بزمِ سخن اور دائرہ ادبیہ سے قطع تعلق کر کے ادبستان کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اب رضاؔ کی ادبی سرگرمیاں مشاعروں کے حدود پھاند کر نشر و اشاعت کا روپ اختیار کر گئیں۔ ماہنامہ ندا اور ہفتہ وار شباب انہی ایام کی یادگار ہیں۔

جب معاشی بحران نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تو رضاؔ نے بڑی مصیبت میں پشاور سے ہجرت کر کے راولپنڈی کو جا بسایا۔ وہاں بھی ادبی ہنگاموں نے ساتھ نہ چھوڑا۔ پھر لاہور جا کر ہفتہ وار مصور شباب کا اجراء کیا اور جب شباب بند ہو گیا تو کراچی جا کر صحافت کو ذریعہ معاش بنانے کی کوشش کی۔ ادبی لگن وہاں بھی ہمراہ رہی۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو کراچی کی سلور جوبلی منعقدہ ۱۹۵۳ء کے استحکام و انصرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور انجمن کی پچیس سالہ ادبی رپورٹ رضاؔ ہی کے تراوشِ قلم کا نتیجہ تھی جو سندھ میں اردو کی ایک جمیل تاریخ ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کا ریلا جہاں ملک کے افراد کو سات سمندر پار لے گیا وہاں اس نے ہمیں وطن آنے پر اکسایا اور جب ہم پشاور پہنچے تو پھر وہی معاش کا سوال اپنی بھیانک صورت لئے ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اسی زمانہ میں ہم دونوں نے طبی ڈاکٹری اختیار کی اور کچھ عرصہ بعد —— رضاؔ قالینوں کی بجائے جسمِ انسانی کے زخموں کو رفو کرنے لگا۔

آج غیر شاعر دنیا رضاؔ کو ڈاکٹر کی حیثیت سے جانتی ہے۔ اب وہ ملازمت سے تو بے نیاز ہے لیکن شعر و ادب سے بے نیاز نہیں —— سنگِ میل کا جبری اتنا ابھی اس کے تخلیقی جذبے میں سنگِ گراں نہیں بنا۔ چنانچہ اس وقت وہ بے شمار کتابوں کا مصنف ہے۔

رضاؔ کی شاعری میں مقصد بھی ہے اور فن بھی —— دل کی باتیں بھی ہیں اور دماغ کی بھی —— ادب کی چاشنی بھی ہے اور عمل کی حرارت بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں وہ خلوص ہے جو شعر کو تصنع اور آورد سے پاک اور منزہ رکھنے میں مدد دیتا ہے۔

رضاؔ ادبیات سرحد کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔ وہ سچا رفیق، مخلص فنکار اور ان تھک ادبی کارکن ہے —— وہ سادہ وضع، سادہ دل اور سادہ فکر انسان ہے۔ اس کی ادبی خدمات کا پلڑا بہت بھاری ہے۔ اس نے یہاں ادبی جدوجہد میں نہایت اہم پارٹ ادا کیا —— وہ سب سے پہلا سرحدی ادیب ہے جس نے پشتو لٹریچر کو اردو دان طبقے سے متعارف کرایا۔ یہی کارنامہ اس کا نام زندہ رکھنے کو کافی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اس نے بہت کام کیا۔ اس کی نظم و نثر تخلیقات بے پایاں ہیں۔ وہ گزشتہ پچیس برس سے خدمتِ ادب میں منہمک ہے۔ وہ گلشنِ ادب کا ایک سدا بہار پھول ہے، ایک مکتبۂ فکر ہے، ایک تحریک ہے ——

جعفر علی جعفری

جعفریؔ کو میں نے دیکھا تو وہ نابینا تھے لیکن کہتے ہیں کچھ عرصہ پہلے ان کی آنکھیں اچھی بھلی تھیں۔ دکانداری کرتے تھے اور ان کی دکان پشاور کے شعراء کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ بینائی کے ساتھ وہ دکان بھی جاتی رہی لیکن اس حادثے نے ان کے شعری ذوق کو مضروب کرنے کی بجائے اور جلا دی اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر شعر و سخن میں دلچسپی لینے لگے۔

جعفریؔ بزمِ سخن کے فدائی تھے اور اس بزم کی تمام تر سرگرمیاں انہی کی مرہونِ منت تھیں۔ مشاعروں کے لئے پنڈال سجانا، شعراء کو طرح کی اطلاعیں تقسیم کرنا —— غرض سب کچھ جعفریؔ ہی کو کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ وہ تمام نو آموز شعراء کے کلام کی اصلاح بھی کرتے اور مشاعروں کو کامیاب بنانے

کے لئے کئی کئی طرحی غزلیں لکھ کر فرضی شاعروں میں بانٹ دیتے۔ پھر انہیں پڑھنے کی ریہرسل بھی کراتے اور مشاعروں میں خود ہی انہیں داد بھی دیتے —— یہ ان کا محبوب مشغلہ تھا جس میں وہ دن رات جٹے رہتے۔

جعفری بڑے زندہ دل انسان تھے۔ ہنگامہ آرائی ان کی زندگی تھی اور طنز و مزاح ان کی گھٹی میں پڑے تھے —— ہر مشاعرے کے طرحی مصرع پر کسی نہ کسی کی ہجو میں دو چار شعر ضرور کہتے —— ادھر یہ شعر ان کے منہ سے نکلے اُدھر زبان زد خاص و عام ہو جاتے اس طرح مشاعرے سے پیشتر عموماً پہلے ہی ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔

جعفری کا طنز ان کے اقتضائے طبیعت کے باعث تھا اس سے کسی کی دل آزاری مقصود نہ تھی چنانچہ وہ اپنے عزیز دوستوں اور چہیتوں کو بھی معاف نہ کرتے بلکہ بعض اوقات تو اپنے آپ کو بھی لپیٹ میں لے آتے۔

ہم کہاں کے مولویاں تھے مگر اے جعفری
جب کبھی پی لی تو اس کو پیچ میں پیچیدہ ہو گیا

ان کے طنزیہ اشعار بے شمار ہیں لیکن ان میں زیادہ تر ثقاہت سے گرے ہوئے اور مبتذل قسم کے ہیں اگرچہ ان میں فنی محاسن موجود ہیں لیکن ابتذال کی وجہ سے احاطۂ تحریر میں نہیں لائے جا سکتے۔

ہزلیات اور ہجو میں جعفری کا کوئی ثانی نہ تھا ان کی شوخ و شنگ طبیعت اس طرف خوب چلتی تھی اس پر امی بھی تھے اس لئے انہیں جرأت سے بڑی مناسبت تھی لیکن ان کے حسرت ناک انجام پر نظر کی جائے تو وہ انشاء سے بہت قریب ہے۔ آخری ایام میں جب راقم الحروف رضا ہمدانی کی معیت میں جعفری کے مکان پر انہیں دیکھنے گیا تو ان کی حالت زار دیکھ کر بے اختیار آنسو نکل آئے —— کمرے کے ایک کونے میں بوسیدہ فرش پر ہی دبکے گم سم بیٹھے تھے۔ بیمار و نزار، جسم میں کپکپاہٹ —— ہماری آواز سن کر سر اٹھایا آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے بہت دیر تک وفور گریہ سے بات نہ کر سکے آخر بولے "فارغ بھائی مرنے کے انتظار میں گھڑیاں گن رہا ہوں لیکن یہ انتظار کمبخت تو طول شب ہجراں ہو گیا ہے ہم چلتے پھرتے اندھا ہو کر بھی کسی پہ بوجھ بن کر نہیں رہا لیکن اب اتنا معذور ہوں کہ زندہ لاش بن کر رہ گیا ہوں۔ بھائی جاوید خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے لیکن یہ مانگے تانگے کی زندگی مجھے منظور نہیں۔"

ان کی یہ سقیم حالت دیکھ کر دل بھر آیا۔ یا اللہ کیا یہ وہی جعفری ہیں جن کی باتوں سے پھول جھڑتے تھے جو اپنے لطیفوں سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے —— جن کے سامنے بڑے بڑے چرب زبان گنگ ہو کر رہ جاتے۔ انہیں دیکھ کر مجھے آب حیات کا وہ واقعہ یاد آگیا جو مولانا آزاد نے انشاء کے متعلق لکھا ہے۔

دراصل جعفری کی زندہ دلی کا جنازہ اسی دن نکلا جس دن ان کی جوان سال اکلوتی لڑکی اچانک فوت ہو گئی اس زخم نے جعفری کی زندگی کو بے لذت کر دیا اور ان کا دل یک لخت دنیا اور دنیا کے ہنگاموں سے اچاٹ ہو گیا ادبی محفلوں میں جانا چھوڑ دیا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

جعفری نے تقریباً دو برس کی طویل علالت کے بعد جون ۱۹۵۸ء کو وفات پائی۔

ضیا جعفری و عبدالودود قمر

دائرہ ادبیہ میں یوں تو بہت سے نوجوان ادیب موجود تھے لیکن ضیا اور قمر اس ادارے کی روح رواں تھے انہوں نے بزم سخن سے بغاوت کر کے دائرہ کی بنیاد رکھی اور اپنی انتھک کوششوں سے اسے انتہائی عروج تک پہنچایا۔ میں دائرہ ادبیہ میں آیا تو ضیا اور قمر کا طوطی بول رہا تھا۔ اس وقت سرحد کے طول و عرض میں نئے اور پرانے اچھے لکھنے والے موجود تھے لیکن ان دو شخصیتوں کے سامنے سب کے سب گھٹنے اور

باشندے معلوم ہوتے تھے ۔

ضیا اور قمر کی رفاقت ادبیات سرحد کا ایک سنہری باب ہے ۔ انفرادی طور پر شاید ان کی سرگرمیاں اتنی مفید ثابت نہ ہوتیں لیکن مجموعی طور پر انہوں نے بے نظیر کام کیا ——— یہی ٹیم دورِ جدید کی بانی مبانی ہے ۔ انہوں نے ماضی کی فرسودہ قدروں سے بغاوت کر کے جدید رجحانات کے لئے زمین ہموار کی اور نئے لکھنے والوں کی صحت مند تربیت سے ان کے دلوں میں خود اعتمادی اور بلند نگاہی کے جذبے کو جنم دیا ۔

ضیا اور قمر کی ملاقات حادثاتی تھی قمر کی رومانی جمال کا شہرہ تو تھا ہی لیکن ضیا بھی مہر نیم روز سے کم نہ تھے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی ایسے گھائل ہوئے کہ آج تک ان کے بندھن نہ ٹوٹ سکے ۔ ان کی اٹوٹ رفاقت کی وجہ مزاج کی ہم آہنگی بھی تھی دونوں مذہبی رجحانات کے حامل تھے دونوں " درجوانی توبہ کردن " والے پیغمبرانہ گروہ میں سے تھے دونوں علم و فضل کے شیدائی اور شعر و ادب کے رسیا تھے ضیا نے قمر کو تصوف کی چاشنی لگا کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ۔ دونوں نے ایک ہی پیر کامل سے بیعت کی اور ایک دوسرے کے ابدی ساتھی بن گئے ۔

ضیا اور قمر کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ۔ وہ مثبت و منفی تاروں کی طرح مل کر سرحد کے ادبی ماحول میں روشنی کا مینار ثابت ہوئے ۔ ضیا صرف ادیب اور شاعر ہی ہے لیکن قمر اس کے ساتھ ساتھ ایک اچھا منتظم اور ان تھک ادبی کارکن بھی ہے ۔ نئی پود کی تربیت میں ان دونوں کا برابر حصہ ہے ۔ دائرہ ادبیہ کے زمانہ میں راقم الحروف مشورۂ سخن ضیا صاحب سے لیتا تھا لیکن ذہنی تربیت اور لکھنے لکھانے کی ترغیب قمر صاحب ہی نے دلائی ۔

ضیا کو دورِ جدید کے کارواں کے سالار کی حیثیت حاصل ہے ۔ سرحد میں سب سے پہلے جدید اقدار کو انہوں نے ہی اپنایا ۔ ان کی شاعری کلاسیکیت اور جدت کا ایک خوشگوار سنگم ہے وہ پرانی تہذیب کی بنیادوں پر نئی عمارت کھڑی کرنے کے حامی ہیں ۔ اسی توازن نے انہیں بھٹکنے سے بچایا اور ہر عہد میں مقبول بنایا ———

ضیا کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی رجائیت ہے ۔ وہ صوفی منش بھی ہیں اور رند مشرب بھی ——— ان میں قرار بھی ہے اور تڑپ بھی ——— ان کے ہاں جنسی ہیجان بھی ہے اور زندگی کے مخصوص مسائل بھی ——— وہ فن کے دلدادہ بھی ہیں اور مقصد کے شیدائی بھی ———

ضیا کی زندگی اور فن میں جتنی مطابقت پائی جاتی ہے وہ شاید ہی کسی اور فنکار کو نصیب ہوتی ہو ——— صوفی منش ہونے کے باعث وہ اپنی روز مرہ زندگی میں ایک صلح کل انسان ہیں ——— ہر مذہب ، ہر فرقے اور ہر مشرب کے لوگوں سے گھل مل کر رہنا اور اخلاص و محبت سے پیش آنا ان کا خاصہ ہے ——— اسی طرح ادب میں بھی وہ ایک صلح کل شخصیت رکھتے ہیں وہ اپنے آپ کو کسی مخصوص دائرے میں مقید نہیں کرتے ۔ کسی ایک مکتبۂ خیال سے وابستہ نہیں ہوتے ، کسی خاص عقیدے کے پرچار پر عقیدہ نہیں رکھتے ۔

ضیا کی ایک بڑی صفت ان کی وسیع النظری ہے وہ تنگ نظری اور تعصب سے کوسوں دور ہیں وہ جمود و وضع داری کے قائل نہیں اور نہ مغرور ہیں نہ برخود غلط ——— اسی چیز نے ان کے فن کو بڑا فائدہ پہنچایا اور انہیں جاوداں بنا دیا ۔ انہوں نے جو کچھ کہا سوچ سمجھ کر کہا ۔ خلوص اور دیانت داری سے کہا ———

ضیا کی رعنائی زندہ دلی اور بذلہ سنجی ضرب المثل بن چکی ہے وہ زیادہ دیر سنجیدہ نہیں رہ سکتے ، یہ ان کی کمزوری بھی ہے اور خوبی بھی ——— وہ ہر گفتگو میں بہت دلچسپی لیتے ہیں ۔ گھنٹوں بولتے ہیں لیکن سنجیدہ سے سنجیدہ بحث کے دوران میں ایک آدھ فقرہ ایسا کہہ جاتے ہیں جس سے بحث کی ساری سنجیدگی درہم برہم ہو کر رہ جاتی ہے ۔ دراصل زیادہ سنجیدہ فضا میں ان کی روح گھٹنے لگتی ہے ان کی طبیعت میں مزاح بہت ہے اور جب ان پر مزاح کا دورہ پڑے یا کوئی ترشا ترشایا فقرہ ان کے ذہن میں ٹمٹمانے لگے تو اسے روکنا ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا ۔

ضیا محفل کی جان ، مشاعروں کی رونق اور ادبیات سرحد کے بوستان کا لالۂ احمر ہیں ۔

نذیر مرزا برلاس

برلاس ضیا اور قمر کے ایک اور ساتھی ہیں۔ جو شروع ہی سے ان کے دوش بدوش سرحد میں شعر و ادب کے پودے کو اپنے خونِ دل سے سینچ رہے ہیں۔ میں اگر یہ کہوں کہ برلاس کی کوشش ہی مجھے دائرہ ادب میں کھینچ کر لے گئی تو بے جا نہ ہوگا۔ سب سے پہلے میں نے انہیں دائرہ کے ایک مشاعرے میں سنا۔ وہ اپنی مشہور نظم رنگین وادی پڑھ رہے تھے مجھے اُن کی آواز بڑی عجیب سی لگی۔ غزل کے ماحول میں ان کی رومان میں ڈوبی ہوئی اس حسین و جمیل نظم نے سارے مجمع کو رنگین خوابوں کی ایک پُراسرار دنیا میں پہنچا دیا۔ اور میں تو ان کی شخصیت سے اتنا مرعوب ہوا کہ ان کے سامنے مجھے ایک عرصہ تک شعر پڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

برلاس سرحد میں اردو شاعری کے رومانی دور کا آغاز کرنے والے بھی ہیں اور خاتم بھی —— برلاس نے ہوش سنبھالا تو پنجاب میں اختر شیرانی کا طوطی بول رہا تھا۔ اختر متحدہ ہندوستان میں مسلّم طور پر اردو شاعری کے رومانوی دور کے بانی مانے جاتے تھے۔ برلاس ان دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم پا رہے تھے۔ انہوں نے اختر کو پڑھا، سنا اور نہایت قریب سے دیکھا —— دوسرے نوجوان شعراء کی طرح برلاس بھی اختر سے بے حد متاثر ہوئے۔ ادھر مغربی شعراء میں سے ورڈز ورتھ، شیلے اور کیٹس کے مطالعے نے بھی انہیں رومانیت کی طرف مائل کیا اور ان کی طبیعت بھی ابتدا ہی سے رومان پسند واقع ہوئی تھی ان سب اتفاقات نے مل ملا کر برلاس کو سرحد میں اپنے دور کا سب سے بڑا رومانی شاعر بنا دیا۔

برلاس کی تمام عمر پڑھنے پڑھانے میں گزری۔ انہوں نے ایک معمولی ٹیچر کے طور پر اپنی زندگی شروع کی اور اس وقت اسلامیہ کالج پشاور میں پروفیسر ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو لکھتے کم اور پڑھتے زیادہ ہیں۔ کتاب ان کی بہترین رفیق ہے اور ہر سال کوئی نہ کوئی امتحان دینا ان کی عادت بن چکی ہے۔ ناساعد حالات کی وجہ سے انہیں تعلیم ادھوری چھوڑ کر ملازمت کو ذریعۂ معاش بنانا پڑا لیکن تحصیل علم کے ذوق نے نچلا نہ بیٹھنے دیا اور انہوں نے منشی فاضل، ادیب فاضل، بی اے، بی ٹی، ایم اے اردو، اور ایم اے فارسی کے امتحانات ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پاس کر لئے۔ ان دنوں طہران میں پی ایچ ڈی کی تیاری میں منہمک ہیں۔

سردار عبدالرب نشتر

نشتر صاحب کو شاعر کے طور پر کم اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے زیادہ لوگ جانتے ہیں۔ آپ جسمانی طور پر بھی اور ذہنی اعتبار سے بھی ایک قد آور شخصیت کے مالک ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں بزمِ سخن سے رابطہ پیدا ہوا اور شعر و سخن میں دل چسپی لینے لگے لیکن علی گڑھ سے واپسی پر سیاسی رجحانات کے غلبے نے انہیں ادب سے چھین لیا۔ پھر بھی جب تک پشاور میں رہے کبھی کبھار شعر بھی کہہ لیتے اور ادبی محفلوں میں بھی شریک ہوتے رہتے۔ ابتدا میں اکبر الٰہ آبادی مرحوم سے بذریعہ خط و کتابت مشورۂ سخن لیتے رہے۔

شروع میں نیشنلسٹ خیالات رکھتے تھے اور کانگریس کے سرگرم کارکن تھے۔ بعد میں نظریات میں انقلاب رونما ہوا اور بعض دوسرے نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرح کانگریس کو متعصب ہندوؤں کی جماعت سمجھ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے اور مسلم لیگ میں شامل ہو کر مسلمانوں کی علیحدہ ریاست کے قیام کے لئے کوشش کرنے لگے۔

انہوں نے ایک وکیل کے طور پر اپنی زندگی کا آغاز کیا اور ترقی کرتے کرتے حکومت کے اعلیٰ عہدوں تک جا پہنچے۔ پاکستان کے چوٹی کے رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں —— فارسی، انگریزی، اردو اور پشتو کے نہایت اعلیٰ مقرر ہیں۔

ادھیڑ عمر ہو چلے ہیں لیکن بانکپن نہیں جاتا۔ آنکھوں کی چمک اور چہرے کی شگفتگی برقرار ہے۔ انہیں دیکھ کر یہ بات بے حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ شاعر

سکے لئے یہ صورت بہت ضروری ہے۔

میر ولی اللہ

میر صاحب ضلع ہزارہ کی ممتاز ادبی شخصیت ہیں۔ وہ ذہین محقق اور مستعد انسان ہیں۔ انہوں نے تن تنہا یہاں وہ کام کیا جو بڑے بڑے ادارے انجام نہ دے سکے۔ تمام عمر خدمت ادب ہی میں گزری۔۔۔۔ شگفتہ اور رنگین طبیعت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر وقت ہشاش بشاش رہتے ہیں اور آج پچھتر برس کی عمر میں بھی چہرے پر جوانی برستی ہے۔ قویٰ بحال اور صحت برقرار ہے۔

عالم فاضل انسان ہیں مشرقی زبانوں کے علاوہ انگریزی پر بھی پورا عبور حاصل ہے اور اپنے علم و فضل سے انہوں نے پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ آپ انگریزی، فارسی، عربی کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ پہلے سرحدی ادیب ہیں جنہوں نے ادبی حلقوں سے اپنے فن کا لوہا منوایا اور متحدہ ہندوستان کے مشاہیر ادبا کے دوش بدوش ملک کے بلند پایہ ادبی پرچوں میں چھپتے رہے۔

میر صاحب کی شخصیت جامع، ہمہ گیر اور بے مثال ہے آپ بیک وقت نہ صرف ایک نغز گو شاعر، کامیاب مترجم اور بلند پایہ نثار ہیں بلکہ طنز و مزاح میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

میر صاحب نے زرخیز دل و دماغ اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

میر صاحب کاک ٹیل قسم کے رائٹر ہیں جو تمام اصناف ادب پر حاوی نظر آتے ہیں اور سارے ادبی ماحول پر چھائے ہوئے ہیں۔

آپ ایک عرصہ سے پشاور یونیورسٹی میں لا کالج کے پرنسپل کے طور پر متعین ہیں ان دنوں بھی فرصت کے اوقات میں تصنیف و تالیف ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

وحید المؤرخین حاجی سرحدی

راولپنڈی کے قیام کے دوران میں ایک بزرگ سے ملنے کا اتفاق ہوا جو بڑی مستعلیق قسم کی شخصیت کے مالک تھے۔ ملتے ہی ہماری آمد پر برجستہ چند تاریخیں ارشاد فرمائیں اور ہمیں بغیر کسی تعارف کے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی کہ آپ ہی وحید المؤرخین حضرت حاجی سرحدی ہیں۔

ابتدا میں گورنمنٹ ہائی سکول پشاور میں معلم رہے پھر پنشنیوں کے اتالیق کے طور پر راولپنڈی جانا ہوا اور اس سرزمین کو ایسا اپنایا کہ آخر وفات بھی وہیں پائی۔

نہایت پرگو واقع ہوئے تھے عمر بھر طویل [illegible] نظموں کا بے پناہ ذخیرہ ترکے میں چھوڑا لیکن بدقسمتی سے کوئی مجموعہ چھپ نہ سکا۔

حاجی سرحدی مرحوم اپنے دور کے ممتاز شاعر تھے لیکن ان کی شہرت ایک تاریخ گو کے طور پر ہوئی تاریخ گوئی میں انہیں بہت کمال حاصل تھا یہاں تک پاک و ہند کی مشاہیر شخصیتوں نے انہیں بیسویں صدی کا سب سے بڑا تاریخ گو تسلیم کرتے ہوئے وحید المؤرخین کا خطاب دیا۔

جن حضرات کو حاجی مرحوم سے شرف نیاز حاصل ہوا ہے وہ اس امر کی تائید کریں گے کہ فی البدیہہ تاریخ کہنے میں آپ کس حد تک ماہر واقع ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں بے تکلف تاریخ کہتے جیسے پہلے ہی سے مادے نکال رکھے ہوں جو کوئی ملنے جاتا اس کی آمد پر برجستہ تین چار تاریخیں کہہ ڈالتے۔ آپ نے دنیا کی مشاہیر شخصیتوں کے متعلق ایسی پرزور تاریخیں کہیں جو اردو ادب کے گراں بہا ذخیرے کے طور پر محفوظ رکھنے کے قابل ہیں۔ آپ نے نثری طور پر بھی بے بدل نظمیں یادگار چھوڑیں۔ آخر عمر میں فن تاریخ گوئی پر ایک بلند پایہ کتاب بھی لکھ رہے تھے جسے مکمل کرنے کی موت نے رخصت نہ دی۔

ذوالفقار بخاری

پشاور میں اسد اللہ شاہ بخاری ایک بڑے ثقہ قسم کے بزرگ ہوتے تھے جو زندگی بھر ادبی جلسوں کی صدارت کرتے رہے لیکن ان سے بہتر صدر ملنا محال تھا۔ خود شاعر نہ تھے لیکن صدارت کے لئے ایسے موزوں کہ کسی مشاعرے یا ادبی جلسے میں ان کا صدر ہونا کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا۔ شخصیت اتنی باوقار کہ نہ صرف کرسی صدارت سج جاتی بلکہ اپنی چٹخارے دار تقریر اور نہایت دلآویز طریقے سے قدیم اساتذہ کی منتخب غزلیں سنا کر مشاعرے کا رنگ باندھ دیتے اور حاضرین کو ایسا مسحور کر دیتے کہ کیا مجال جو کوئی ہلنے کا نام لے۔

ان شاہ صاحب کے تین فرزند تھے رفعت بخاری، پطرس بخاری اور ذوالفقار بخاری ——— حسن اتفاق دیکھئے کہ یہ تینوں علم و فن میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ثابت ہوئے۔

رفعت بڑے بھائی تھے جو اپنے دور کے ذہین اور فطین شاعر گزرے ہیں مجسم ہنگامہ تھے کبھی ایک سے الجھتے کبھی دوسرے سے ——— کسی کی پگڑی اچھالتے تو کسی کی قبا پر ہاتھ ڈالتے۔ بزم سخن سے بگڑے تو بزم انکار کھڑی کر دی اور ایسے معرکے کے مشاعرے کئے جن کی نظیر نہیں ملتی۔

رفعت بڑی خوبیوں کے مالک تھے لیکن بدقسمتی سے دماغی عارضے میں مبتلا ہو کر لاہور کے مینٹل ہسپتال میں داخل ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ پطرس کو کون نہیں جانتا ان کا ذکر شخصیات نمبر حصہ اول میں تفصیل سے آچکا ہے اسلئے مزید کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہوگا۔

ذوالفقار بخاری ان دنوں ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔ یہ حضرت بھی کئی خصوصیات کے مالک ہیں۔ شاعری سے لے کر گانے بجانے تک کے فن میں طاق ہیں۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو ملنے والے کو مبہوت کرنے کے لئے کافی ہے۔

شعر کہنے سے زیادہ سنانے کے شوقین ہیں۔ پڑھنے کا انداز دلکش ہے اور داد وصول کرنے کا ڈھنگ بھی خوب آتا ہے ——— لہک لہک کر پڑھتے ہیں اور جھوم جھوم کر داد وصول کرتے ہیں۔

دیکھنے میں بگڑے معلوم ہوتے ہیں اور بنیادی طور پر بھی ہیں کچھ ——— افراط ذوق سے ہے کہ روزمرہ زندگی کی چھوٹی موٹی سرگرمیوں تک ہر بات میں وہ اداکاری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

پُرگو بھی ہیں اور بدیہہ گو بھی ——— ایک ہی نشست میں غزل کہتے ہیں۔ بے تکلف کہتے ہیں۔ جب چاہیں کہتے ہیں اور خوب ٹھوک بجا کر کہتے ہیں۔ الفاظ کی موزونیت، بندش اور اسلوب کا خیال رکھتے ہیں۔ اشعار کی چولیں بٹھانے میں انہیں خاص کمال حاصل ہے۔

فہمیدہ اختر

بڑے گھرانے کی چھوٹے قد کی یہ نوجوان خاتون ادبی حیثیت سے بہت اونچی شخصیت رکھتی ہیں۔ طبقۂ نسواں کی بہت بڑی افسانہ نگار ہیں۔ ادبی ذوق گھٹی میں پڑا تھا۔ طالب علمی کے زمانہ ہی سے علم و ادب میں دلچسپی لینے لگیں۔ لیڈی گرفن گرلز ہائی سکول میں سب سے پہلی ادبی انجمن بزم ادب کی بنیاد رکھی اور اسی کی جنرل سیکرٹری مقرر ہوئیں۔

سرحد میں خواتین مسلم لیگ کی بنیاد پڑی تو ادب کو خیرباد کہہ کر سیاست میں حصہ لینے لگیں اور قیام پاکستان کے سلسلہ میں ان تھک کام کیا۔ [illegible] میں ادارۂ تعمیر نو میں شامل ہونے سے ادبی جنون پھر تازہ ہوا اور چند ایک اچھے افسانے پیش کرنے کے بعد پھر سیاست کی بھول بھلیوں میں کھو گئیں۔ لیکن ایک عرصہ تک سیاست کے خارزار میں بھٹکنے کے بعد احساس ہوا کہ ان کی قربانیوں کا ثمر ایک خاص طبقے کی اجارہ داری میں منتقل ہو

چکا ہے۔ اور ملک و قوم کی سربلندی کے جو خواب برسوں میں انہوں نے تیار کئے تھے وہ مسمار ہو رہے ہیں اس نازک مرحلہ پر مایوس ہونے کے بجائے وہ پھر ادب کی طرف لوٹ آئیں چنانچہ انہوں نے نہایت محنت اور کاوش سے چند انقلابی کہانیاں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔

فہمیدہ نے اصلاحی قسم کے مضامین بھی لکھے ہیں لیکن ان کا اصل میدان مختصر افسانہ ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں تہذیب کا ماحول اور تہذیب و تمدن کی بھرپور عکاسی کی ہے اور یہی ان کی وہ خصوصیت ہے جس نے انہیں دوسرے ان گنت لکھنے والوں میں ممتاز درجہ دیا ہے۔

نثار عزیز

نثار عزیز نے اپنی شخصیت کی تعمیر بڑی محنت سے کی ہے حال ہی میں انہوں نے شادی کر لی ہے۔ اگر شادی کے بندھن حائل نہ ہوئے تو یہ تعمیر مثالی ثابت ہوگی۔

نثار عزیز نے افسانے بھی لکھے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی —— لیکن ان کی شہرت کا باعث ان کا مشہور ناول نگری نگری پھرا مسافر ہے جس میں انہوں نے اپنی ہی زندگی کے واقعات کو ناول کا روپ دے دیا ہے۔ اور اس لئے اس میں فن سے زیادہ خلوص ہے۔

نثار عزیز بے حد حوصلہ مند خاتون ہیں وہ تمام عمر قسمت کے خلاف برسرپیکار رہیں۔ میٹرک کرتے ہی ٹی بی کے موذی مرض نے حملہ کر دیا اور انہیں تعلیم ادھوری چھوڑ کر پانچ چھ برس واؤد سینیٹوریم میں گزارنے پڑے لیکن ہمت نہ ہاری اور ابھی پوری طرح صحت یاب بھی نہ ہو پائی تھیں کہ پھر سے از خود پڑھنا شروع کر دیا اور آخر ایم اے کر کے ہی دم لیا۔

قتیل شفائی

قتیل کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب اسے اورنگ زیب کے نام سے زیادہ اور قتیل کے نام سے کم —— بہت ہی کم لوگ جانتے تھے۔ وہ اس وقت شعر نہیں کہتا تھا لیکن مذاق بلند تھا۔ اساتذہ کی جستہ جستہ غزلیں یاد تھیں جنہیں اپنے مخصوص ترنم سے پڑھ کر محفل کو مسحور کر دیتا۔ یہ پشاور کی بات ہے۔ وہ دور تھا کہ تلاش معاش میں وہ پشاور آیا تھا لیکن یہاں کامیابی نہ ہوئی اور پھر پنڈی میں جا کر چونگی کی ملازمت اختیار کر لی۔

تھوڑے عرصہ بعد ہی قتیل کا نام اخبارات اور رسائل میں نظر آنے لگا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ چوٹی کے شعراء میں شمار ہونے لگا۔ لیکن وہ اس ابتدائی ملاقات کو بھولا نہیں یہی وجہ ہے کہ آج تک ہمارے مخلصانہ تعلقات پہلے ہی کی طرح قائم ہیں۔

قتیل کی منفرد شخصیت میں اس کی خود اعتمادی کو بڑا دخل ہے۔ وہ بے عیب انسان نہیں اپنی کمزوریوں کا بھی اسے احساس ہے لیکن اپنی خوبیاں بھی اس سے ڈھکی چھپی نہیں۔ وہ محنتی ہے، ذہین ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ حوصلہ مند بھی ہے۔ اسے موجودہ مقام تک پہنچنے میں جس جگر کاوی سے کام لینا پڑا۔ قدم قدم ناکامیوں سے سابقہ پڑا لیکن وہ مایوس نہ ہوا اور ایک دفعہ جو قدم آگے بڑھایا اسے کسی قیمت پر بھی پیچھے نہ ہٹایا۔

قتیل دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن ہے وہ منافقت نہیں جانتا۔ صاف دلی اور صاف گوئی اس کی وہ خصوصیات ہیں جو بسا اوقات اس کے لئے بڑی نقصان دہ بھی ثابت ہوئیں لیکن مقتضائے طبیعت کے باعث وہ ان چیزوں کو ترک نہ کر سکا۔

قتیل کی شاعری کی ابتدا بھی گیتوں سے ہوئی اور شاید اس کی انتہا بھی گیتوں ہی پر ہو وہ نظمیں غزلیں بھی کہتا ہے۔ اور خوب کہتا ہے۔ اس کا مزاج گیتوں کے لئے بنا ہے وہ حسن اور رومان کا شاعر ہے گیتوں کا شاعر ہے اس کی غزلوں اور نظموں میں بھی گیت ہی ہنستے بولتے نظر آتے ہیں۔

قتیل کے گیتوں کی نمایاں خصوصیت ان کی وسعت اور ہمہ گیری ہے اس کے گیتوں میں دیہات کے الھڑ اور سادہ باشندوں کے بے لوث اور خالص جذبات و احساسات کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں اور ان میں وہ عوامی مزاج ملتا ہے جو اردو شاعری کی دوسری اصناف کو فارسی کی تقلید کی وجہ سے نصیب

نہ ہو سکا۔

قتیل نے اپنی مختصر سی شاعرانہ عمر میں بہت کچھ لکھا اس نے مثنویاں لکھیں، منظوم ڈرامے لکھے، ریڈیو فیچر لکھے، بے شمار گیت، قطعات، نظمیں، غزلیں لکھیں۔ اس میں لکھنے کی بڑی قوت ہے۔

قتیل پانچ بچوں کا باپ اور پانچ کتابوں کا مصنف ہے۔ دونوں طرف اس کی تخلیقات کا یہ توازن غیر شعوری تھی لیکن اس میں کچھ نہ کچھ ربط ضرور محسوس ہوتا ہے۔

قتیل کی شخصیت پیچیدہ یا پر اسرار نہیں وہ سیدھا سادہ ایک عام انسان ہے لیکن کوئی شخص بھی اس سے ملنے کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا یہ جادو نہ اس کی آنکھوں میں ہے نہ باتوں میں نہ چہرے میں ——— پھر یہ جادو اس کی شخصیت میں کہاں سے آیا اور کیونکر آیا یہ سراغ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کیونکہ اس طلسمی چراغ کو اس نے ایسے نہاں خانوں میں چھپا رکھا ہے جہاں آج تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکی ——— خود اس کی بھی نہیں۔

انگر سرحدی اور عزیز اختر وارثی

ان دونوں حضرات نے کوہاٹ میں اردو زبان و ادب کی اشاعت کے سلسلے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ عزیز اختر کی حیثیت انگر کے لئے دست راست کی حیثیت رکھتی تھی ان کا ملاپ بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ انہوں نے اس دور افتادہ سرزمین پر بے نظیر ادبی اجتماعات کئے۔

انگر بڑی ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں ان کی سرگرمیاں محض ادب تک محدود نہیں۔ ان میں کام کرنے کی بے پناہ قوت تھی وہ بیک وقت ادبی سیاسی اور مذہبی محاذوں پر کام کرتے رہے۔ وہ کوہاٹ میں انجمن ترقی اردو کے صدر، کانگرس کمیٹی کے جنرل سکرٹری اور مجلس تعلیم القرآن کے ناظم تھے ہنگامہ آرائی ان کی فطرت بن چکی تھی۔ ایک طرف کانگرس کے جلسے ہو رہے ہیں تو دوسری طرف اردو کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا جا رہا ہے اور ساتھ ہی عید میلاد کا جلوس نکالا جا رہا ہے۔ ان کے اخلاص اور نیک نیتی کے باعث دوست دشمن سب ان سے محبت کرتے، ان کی عزت کرتے اور انہیں احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

عزیز اختر کوہاٹ کے مخلص اور بے حد عزیز ادیب رہنما ہیں۔ ان کا شمار ترقی پسند شعراء میں ہوتا ہے۔ شروع میں حضرت سیماب اکبر آبادی سے اصلاح لیتے رہے بعد میں سیماب سکول سے بہت آگے نکل گئے لیکن جو عقیدت ان سے شروع میں تھی آخر تک اسے نبھاتے رہے۔

اختر سادہ وضع، سادہ دل اور مخلص انسان ہیں ایک اچھے شاعر کے ساتھ ساتھ وہ ایک بے پناہ ادبی کارکن بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے دوست انگر سرحدی کی رفاقت میں صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے بہت سارے کام انجام دیا ہے لیکن اب کچھ عرصہ سے خاموش زندگی گزار رہے ہیں۔

موسیٰ خان کلیم

سب سے پہلے ۱۹۵۳ء میں ماہنامہ "طور" کے سلسلہ میں ان کا نام سننے میں آیا۔ انہی دنوں نہ صرف ان کا نام سنا بلکہ انہیں دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا وہ خود ڈیرہ اسمٰعیل خان سے چل کر محض ملاقات حاصل کرنے کے لئے پشاور آئے۔ ڈیرہ جیسے دور افتادہ مقام سے ایک بلند پایہ ادبی پرچے کا اجراء کلیم ہی کا کام تھا اس پرچے کو کامیاب بنانے کے لئے انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا لیکن اس ناساز گار ماحول میں وہ پنپ نہ سکا اور وہ بمشکل تمام سال بھر تک زندہ رہ سکا۔

نام موسیٰ خان تھا تخلص کلیم اختیار کیا، پرچہ نکالا تو وہ بھی طور ——— ان تمام رعایتوں سے ان کے کلاسیکل ذوق کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

اسلامیہ کالج پشاور سے ایم اے کیا اور وہیں پروفیسری کا منصب پایا۔

علم و ادب سے والہانہ عشق ہے۔ مطالعہ وسیع ہے اور دماغ زرخیز —— اقبال اور غالب سے بہت متاثر ہیں خصوصاً اقبال کے تو فدائیوں میں سے ہیں۔

شاعر کم اور نقاد زیادہ ہیں۔ عموماً علمی اور تحقیقی مضامین لکھتے ہیں اور موضوع کا حق ادا کرتے ہیں طلباء میں علمی ادبی ذوق پیدا کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

مضطر تاتاری

پشاور کے جدید شعراء میں سب سے پہلے میرا تعارف مضطر ہی سے ہوا لیکن یہ حقیقت مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ بالکل امّی شاعر ہے۔ اس انکشاف نے صرف مجھے ہی نہیں بڑے بڑے لوگوں کو چونکا دیا۔ کیونکہ اس کی گفتگو، اس کے کلام اور اس کے مبلغ علم غرض کسی چیز سے بھی یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ وہ سرے سے پڑھنا لکھنا جانتا ہی نہیں۔ چنانچہ جب ندیم قاسمی صاحب پر یہ راز کھلا تو انہوں نے کہا —— یہ شخص اگر پڑھا لکھا ہوتا تو بڑے بڑے اونچے فنکاروں کی کرسیاں خالی کرا دیتا۔

مضطر —— سائیں احمد علی مرحوم کا شاگرد بھی ہے اور صحبت یافتہ بھی —— اس کی شاعری کی ابتدا چند سی حرفیوں سے ہوئی —— انیس، جوش اور اقبال کے کلام نے اردو شاعری کا شوق دلایا اور انہی تین شاعروں سے وہ متاثر بھی نظر آتا ہے —— سب سے پہلے مضطر نے اپنی ایک نظم دائرہ ادبیہ کے مشاعرہ میں پڑھی اس نظم کی ایسی دھوم مچی کہ ادبی حلقوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

مضطر نظم کا شاعر ہے یہ کلیہ کہ ہر شاعر کی ابتدا غزل سے ہوتی ہے مضطر کے ہاں آکر باطل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس نے تمام عمر غزل نہیں کہی۔

مضطر ایک مخلص دوست اور سچا فنکار ہے اس نے تمام عمر خدمت ادب میں گزاری وہ ایک خاموش کارکن ہے۔ نام و نمود کی خواہش سے کوسوں دور —— وہ ادبیات سرحد کے گلستان کا خود رو پھول ہے، انمول موتی ہے، ایک گیت ہے۔

فارغ بخاری[1]

فارغ سے میرا بائیس برس کا ساتھ ہے۔ ہم دونوں اخبارات و رسائل میں مل کر کام کرتے رہے، ادبی اداروں میں ایک ساتھ حصہ لیا، تصنیف و تالیف میں شریک کار رہے، اور سرد و گرم زندگی میں اتنا قریب رہا کہ اب تو ایک دوسرے کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال نظر آتا ہے۔

اس عرصہ میں جہاں تک میں نے فارغ کا مطالعہ کیا وہ مجھے ایک بہت بڑا "شعبدہ باز" نظر آیا۔ وہ جو کچھ بظاہر دکھائی دیتا ہے، درحقیقت ویسا نہیں، بلکہ ذرا غور سے دیکھئے تو اسے بالکل اس کے برعکس پایئے گا۔ دراصل اسے لوگوں کو دھوکا دینے ہی میں لطف آتا ہے، اسی لئے اس نے اپنی شخصیت کو کتنے ہی مصنوعی غلافوں میں چھپا رکھا ہے، مثال کے طور پر اس کا قد جتنا چھوٹا ہے شخصیت اتنی ہی بڑی ہے۔ وہ جتنا بڑا فنکار ہے اس سے کہیں زیادہ بڑا انسان ہے۔

فارغ کو پہلی نظر میں دیکھ کر انسان کو خاصی مایوسی ہوتی ہے، ٹھگنا سا قد، بے ڈھنگا سا ناک نقشہ، نہ گفتگو میں کوئی کشش، نہ شکل و صورت میں جاذبیت، نہ میل جول میں رغبت —— کیا یہی وہ فارغ ہے جس کی نظمیں لوگ جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں جس کی تحریروں سے عظمت و بغاوت کی بو آتی ہے، جو پوری ایک درجن کتابوں کا مصنف ہے، وہ کتابیں جنہیں پڑھ کر اس کی عظمت کا عظیم و ضخیم مجسمہ ذہنوں

---

[1] فارغ بخاری پر رضا ہمدانی نے لکھ کر اس سلسلے کو مکمل کر دیا۔ (مرتب)

میں اُبھرنے لگتا ہے ——— نام بڑا اور شکل چھوٹے ——— بڑا ترقی پسند بنا پھرتا ہے ——— ترقی پسند ہم نے بھی دیکھے ہیں —— بڑھے ہوئے بال —— بے تکا سا لباس —— ماورائی ساحلیہ —— اور اسے دیکھئے —— اچھے بھلے انسانوں کی طرح سوٹ بوٹ پہنے، ٹائی لگائے۔ ہر وقت کام میں یوں جتا ہوا جیسے گوشت پوست کا نہیں ربڑ کا بنا ہوا مشینی انسان ہو —— کون کہے گا اسے ترقی پسند —— مجھے نہ کبھی قہوہ خانوں میں گپیں ہانکتے دیکھا نہ ہی بازاروں میں چکر کرتے پایا، وہ تو ہر وقت انڈا دینے والی مرغی کی طرح کچھ گھونسلوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ دنیا اور اس کے ہنگاموں سے دُور، جہاں کوئی ہم نفس ہو نہ ہم زبان —— ایسے ہی کسی گوشہ عزلت میں اگر کتابوں، فائلوں اور کاغذوں کے انبار میں ڈوبا ہوا کوئی شخص نظر آئے تو اسے بلا جھجک فارغ بخاری کہہ دیجئے۔

فارغ، اس کا تخلص بھی اس کی مصروف زندگی پر ایک بھرپور طنز ہے —— برعکس نہند نام زنگی کافور —— وہ جب سے پیدا ہوا شاید ہی اسے کبھی سستانے کا موقع ملا ہو، اس لمحے کی وہ ہمیشہ آرزو کرتا ہے، لیکن جہاں کہیں یہ لمحہ میسر آئے، کوئی نہ کوئی کام اپنے لئے ڈھونڈ نکالتا ہے، اور کچھ نہ ہو تو اپنے نصف درجن بچوں کو پڑھانے میں ہی وقت ضائع کرنے لگے گا —— دراصل اسی مصروفیت میں اس کی زندگی ہے۔ اور مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جس دن اس کے کرنے کو کوئی کام نہ رہا اسی دن اس کی موت واقع ہو جائیگی۔

صبح اسے اپنے مطب میں دیکھئے تو دوپہر کسی اخبار کے دفتر میں، شام دوستوں کے جھرمٹ میں اور پھر رات گئے تک کسی نظم، مضمون یا کتاب کی تکمیل میں منہمک —— ہر شش ماہی پر جب اس کی کوئی نئی کتاب مارکیٹ میں آتی ہے تو احباب حیران و ششدر رہ جاتے ہیں، "آخر یہ ظالم اتنی ضخیم کتابیں لکھتا کس وقت ہے؟" اس انتہائی مصروفیت کے باوجود وہ بڑے بڑے مشاعروں میں بھی شریک ہوتا ہے، ہر سال ناک کا آپریشن بھی کراتا ہے۔ اور وقت نکال کر سیفٹی ایکٹ کے بہانے جیل یاترا بھی کر آتا ہے۔

فارغ دیکھنے میں بڑا سست اور کاہل الوجود نظر آتا ہے، یہاں بھی دیکھنے والوں کو وہی چکمہ —— وہی شعبدہ بازی ملاحظہ اس میں کام کرنے کی اتنی قوت و صلاحیت ہے کہ بہت کم لوگوں میں یہ چیز پائی جاتی ہے۔ جس وقت 'بزم بازی' کا جنون سوار تھا تو اس نے تن تنہا پشاور میں یکے بعد دیگرے کئی ادارے کھڑے کر دیئے 'ادب ستان' 'انجمن ترقی اردو' 'انجمن ترقی پسند مصنفین' وغیرہ کی داغ بیل ڈالنے والا فارغ اور صرف فارغ ہی تھا —— پھر اخبارات و رسائل کا دورہ شروع ہوا تو 'شباب' 'اکسیر کاری' 'نغمۂ حیات' 'العلاج' اور 'سنگِ میل' جیسے گرانقدر پرچوں کا اجرا سرحد ایسی سنگلاخ سرزمین سے کیا۔ اور انہیں کامیاب کر کے دکھایا —— اس کے بعد تصنیفات و تالیفات کا خیال ہوا تو نہایت قلیل عرصہ میں متعدد کتابیں لکھ ڈالیں۔

اگر آپ جلد باز واقع نہیں ہوئے، اور پہلے ہی لمحے اور اس کے متعلق کوئی غلط رائے نہیں قائم کر لیجئے تو دوسرے ہی لمحے اسے بے تکلف پائیے گا، اور پھر لمحہ بہ لمحہ اس مصنوعی سنجیدگی کے چھلکے اترتے جائیں گے اور ان میں سے ایک ایسی پہاڑی اور دلآویز شخصیت اُبھر آئے گی جسے آپ عمر بھر چاہیں بھی تو بھلا نہ سکیں، اس جادو کو توڑنے کے لئے جس اسم اعظم کی ضرورت ہے، آپ کہیں گے لگے ہاتھوں وہ بھی آپ کو بتا دوں، عام طور پر لوگ اپنی تعریف سے خوش ہوتے ہیں، لیکن فارغ پر یہ حربہ کبھی نہ آزمایئے گا، ورنہ اس کا موڈ اور زیادہ بگڑ جائے گا۔ کیونکہ اسے خوشامد سے بے حد چڑ ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ وہ جلد از جلد کھل جائے اور گھل مل کر اصلی فارغ سامنے آ جائے تو چپکے سے کوئی ادبی بحث چھیڑ دیجئے یا پھر شام کے بعد اسے ملئے۔ کیونکہ رات کے چوبیس گھنٹوں میں یہی ایک ایسا وقت ہے جب وہ اس موڈ میں ہوتا ہے جس کے متعلق غالب نے کہا ہے۔ ع پھر دیکھئے انداز گل افشانیٔ گفتار۔ ایک دفعہ اسے چھیڑ دیجئے اور پھر سنئے وہ یوں چہکنے لگے گا جیسے محفل میں کسی نے مہتابی چھوڑ دی ہو۔

فارغ کو اپنی شخصیت بنانے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔ وہ بچپن ہی سے بڑا حساس واقع ہوا تھا اسی شدتِ احساس کے

باعث اس نے اپنے والد مرحوم کی وفات کے بعد بھائیوں پر بوجھ بننا گوارا نہ کیا، اور تعلیم ادھوری چھوڑ کر تلاشِ معاش میں ایک عرصے تک دلی، لکھنؤ، کلکتہ اور برما کے ہنگاموں میں کھویا رہا —— اس نے صرف چھ روپے ماہانہ کی ملازمت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا —— اور پھر کبھی پان بیڑی کی تو کبھی بسیں چلاتے گھسٹتا رہا، کبھی منشی بنا تو کبھی کلرک، کبھی فروٹ کا کاروبار کیا تو کبھی کارخانوں کی منیجری، کبھی کتابوں کا دھندا چلایا، تو کبھی صحافت کو ذریعہ معاش بنایا، لیکن اس کی بیتاب صفت طبیعت کو کہیں بھی سکون نہ ملا۔ آخر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پھر سے حصولِ علم کے لئے جدوجہد شروع کر دی اور راتوں کی محنت شاقہ سے اپنی علمی تشنگی کو بجھاتا رہا۔

آج اس کی زندگی بہت حد تک منظم ہو چکی ہے لیکن اب بھی یہ عالم ہے کہ صبح وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی ڈسپنسری میں مریضوں کی دیکھ بھال کرتا دکھائی دیتا ہے۔ تو دوپہر کو کسی اخبار کے دفتر میں ایک صحافی کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اور رات ڈھلتے ہی ایک ادیب شاعر اور مصنف کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے۔

فارغ، زندگی کی بھٹی سے کندن ہو کر نکلا ہے۔ اسے گردشِ روزگار نے ایسی ایسی پٹخنیاں دی ہیں کہ اگر اس کی فطری رجائیت آڑے نہ آتی تو اب تک کبھی کی یا تو خودکشی کر لی ہوتی یا پاگل خانے پہنچ کر دم لیتا ——

یہ اس کی فطری رجائیت ہی کی کارفرمائی تھی کہ جیل کی کال کوٹھڑی میں بھی وہ ایک لمحے کے لئے مغموم نہ ہوا۔ جیل سے اس نے مجھے بیسیوں خط لکھے، مگر ان میں قید کی صعوبتوں کا کبھی بھول کر بھی ذکر نہ کیا، بلکہ میری تالیفِ قلب کے لئے یوں کوشاں رہتا، جیسے اسیری کے ایام وہ نہیں، میں گزار رہا ہوں۔

فارغ جیل میں بھی بیکار نہ بیٹھا، اس نے مصوری سیکھی، با ترجمہ قرآن کریم پڑھا، مکتوب نگاری کی۔ فلسفے اور نفسیات کا مطالعہ کیا، اور دو نہایت قیمتی کتابیں لکھیں: "قفسِ رنگ" جو اس کی نظموں غزلوں کا مجموعہ اور "قید و بند" جو اس کی جیل کی آپ بیتی ہے۔

فارغ اپنی نظموں میں صبح کے اجالے اور سحر کی روشنی پر جان چھڑکتا ہے لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ در اصل وہ رات کی تاریکی کا دلدادہ ہے —— دن کو تو وہ اپنی زندگی کا حصہ ہی نہیں سمجھتا، کیونکہ ان اوقات کو اس نے محض نان و نفقہ کے حصول کی غرض سے محنت و مزدوری کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ البتہ رات کو وہ صرف اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اس میں کسی کی مداخلت بھی برداشت نہیں کرتا۔ رات کو اپنانے کے لئے اس نے بڑے جتن کئے۔ بڑی بڑی منفعت ملازمتوں کو ٹھکرایا، نہایت معقول معاشی وسائل پر لات ماری، اس لئے کہ وہ اس کی دولت پر ڈاکہ ڈالنا چاہتے تھے۔ رات ہوتے ہی وہ ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح اپنا سکہ چلانا شروع کر دیتا ہے۔ بڑے اہتمام سے وہ رات کی دیوی کا استقبال کرتا ہے اس کے چرنوں میں عقیدت کے پھول چڑھاتا ہے۔ اور پھر رات کی دیوی کی عبادت میں مصروف ہو جاتا ہے تو بسا اوقات صبح کے تڑکے تک یہ ریاضت جاری رہتی ہے۔

فارغ کو دوستوں سے بڑا پیار ہے۔ لیکن تنہائی اسے دوستوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اسے سگرٹ، کاغذ، قلم اور کتابیں مہیا کر دی جائیں تو شاید تمام عمر بھی وہ تنہائی سے نہ اکتائے گا۔

حسن، شراب اور شعر —— فارغ کی تین سب سے بڑی کمزوریاں ہیں۔ اس کی ان کمزوریوں سے بعض سیاسی دوستوں نے بڑے بڑے فائدے اٹھائے ہیں۔ وہ بت شکن کہلاتا ہے، اور واقعی اس نے بڑے بڑے بتوں کو توڑا بھی ہے۔ سب سے پہلے تو اس نے اپنے خاندان کے اس روایتی بت کو توڑا کہ مسندوں پر بیٹھ کر آباؤ کے نام کی سوداگری کرو اور سادہ لوح مریدوں سے روپیہ بٹور کر عیش کرو لیکن جہاں محنت کا نام آئے وہاں صاف انکار، اس کا خیال ہے کہ سیدوں نے اپنے آپ کو 'برہمن' کی طرح کی کوئی ہستی سمجھ رکھا ہے جو مزدوری کو کسرِ شان سمجھتے ہیں، فارغ کو چونکہ شروع ہی سے روایتی باتوں سے چڑ تھی اس لئے اس نے محنت مزدوری کو کبھی عیب نہ سمجھا۔

ایک عرصے تک وہ اپنے پندار کے بت پر مسلسل ضربیں لگاتا رہا اور آخر اسے چکنا چور کر کے چھوڑا۔ خیال کیجئے جس شخص نے ایسے عقیدت مندانہ ماحول میں آنکھ کھولی ہو جہاں عام رنگ اس کے برابر بیٹھنے کی جرأت نہ کریں، جہاں اس کی دست بوسی اور قدم بوسی کو ارادت مندوں کا گروہ اپنے نصیب کی معراج سمجھے، اور جہاں اس کو پیرزادہ ہونے کی حیثیت سے ماورائی انسان سمجھا جائے، اس کا اس حد تک عجز و انکسار پر اتر آنا کہ غیر مزدوروں، غریبوں اور مفلوک الحال گروہ کے کسی اور سے سروکار ہی نہ ہو، زندگی کا کتنا بڑا انقلاب ہے، اور اس سے بڑھ کر بت شکنی اور کیا ہو سکتی ہے بقول یگانہ مرحوم ؎

غلام ہمت آنم کہ خود شکن باشد

لیکن اپنی ان کمزوریوں کے باعث غیر شعوری طور پر اس نے کئی ایک ایسے نئے بت بھی تراش ڈالے جن کی تخلیق پر اب وہ خود بھی پشیمان ہو گا۔ اپنی اسی انتشار طبیعت کے باعث اس نے اپنے بعض چہیتوں کے جنون شہرت کی تسکین کے لئے ان کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

فارغ کے مذہبی نظریات بظاہر ملحدانہ قسم کے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ مذہب کے مابعد الطبیعاتی تصور کا قائل نہیں۔ وہ اس کی جلد حیثیت پر اعتقاد نہیں رکھتا، لیکن اس کے باوصف وہ بزم سماع میں شریک ہوتا ہے، مجلس عزا میں سوگوار نظر آتا ہے۔ مولود شریف میں سر پر ٹوپی لگائے مؤدب بیٹھتا ہے، اپنے بچوں کی سنت کے موقع جھومتا ہے۔ روزے نہ رکھتے ہوئے عید کی تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے اور ذرا قریب آ کر ایک بات کان میں سن لیجئے ـــــ یہ ملحد کبھی کبھار چھپ چھپا کر نماز بھی پڑھ لیتا ہے۔ اس کی لائبریری میں مختلف مکتب ہائے فکر کے تراجم قرآن کے علاوہ گیتا اور انجیل مقدس کے نسخے بھی مل جاتے ہیں۔

اس حقیقت کو کون نہیں جانتا کہ فارغ نے نہ صرف سب سے پہلے پشتو ادب، کلچر اور معاشرت کو بیرونی دنیا سے متعارف کرایا بلکہ اس مہم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مشن بنا رکھا ہے۔ اور اپنا فن، قلم اور تمام تر تخلیقی قوتیں اس کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ لیکن میں اگر یہ بات آپ کو بتا دوں کہ وہ پشتو کا ایک فقرہ تک صحیح ادا نہیں کر سکتا تو آپ یقیناً متعجب ہوں گے۔ اور یہی نہیں بلکہ وہ اکثر اپنے پشتون ادیب دوستوں سے 'بد' بھی ہو جاتا ہے۔

فارغ کو اپنی طبیعت کے تلون کا خود بھی اعتراف ہے۔ وہ کبھی کوئی ایک کام بھی زیادہ دنوں تک مستقل مزاجی کے ساتھ نہیں کر سکا۔ ذریعۂ معاش ہی کو لیجئے، سوائے ڈاکٹری کے اور کسی کام سے بھی وہ زیادہ دیر تک نباہ نہیں کر سکا۔ اور ڈاکٹری کے سلسلے میں بھی آج تک اس کی ڈسپنسری متحرک ڈسپنسری کی طرح مختلف مقامات کا سیر کر چکی ہے ـــــ اسی طرح ادب میں بھی اس نے ایک صنف پر قناعت نہیں کی۔ منظومات میں غزل، نظم، رباعی، قطعہ، مرثیہ، سلام، منظوم فیچر، گیت اور نثر میں افسانہ، مضمون، تنقید، ڈرامہ، ناول غرض ہر شعبے پر ہاتھ مارنے کی کوشش کی۔

زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اس کے تلون کا یہی عالم ہے۔ لیکن جب ہم ادبی نظریات کے متعلق اس کی مستقل مزاجی اور وفاداری عزائم کو دیکھتے ہیں تو اس کی شخصیت کے اس واضح تضاد پر سخت حیرت ہوتی ہے۔

دراصل فارغ دوہری شخصیت کا مالک ہے۔ ایک اس کی انفرادی شخصیت ہے دوسری اجتماعی ـــــ لیکن ان دونوں متضاد شخصیتوں میں اس نے کچھ اس خوبصورتی سے سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ ان کے درمیان کسی قسم کے تصادم کا امکان نہیں رہا۔ اسی طرح جس طرح اس کے نام "سید میر احمد شاہ" اور اس کے تخلص "فارغ بخاری" میں۔ ـــــ

انتظاریہ

سر سید احمد خاں

(شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

رنگ سرخ و سفید، چہرہ نہایت پُر رعب، پیشانی بلند، سر بڑا، بھویں بھاری بھاری، آنکھیں متناسب اور نہایت روشن، ناک چھوٹی، کان لمبے، لٹکے ہوئے، بڑی بڑی سفید لمبی داڑھی میں داخل گھنی مونچھیں، جسم فربہ، قد لمبا، ہڈی چوڑی چکلی، ہاتھ پاؤں قوی اور زبردست، بدن گٹھیلا اور مضبوط، صورت وجیہ، وزن پورا ساڑھے تین من، لباس ترکی مع شرٹ انگریزی۔ یہ تھے جواد الدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سر سید احمد خاں مرحوم بانی علی گڑھ کالج، مجدد زبان اردو، باعث تخلیق مسدس حالی۔

یہ تو ہوا سر سید کا حلیہ۔ آئیے اب آپ کو ان کی گھریلو زندگی کی بھی ایک جھلک دکھاؤں۔ آج سے سولہ برس پہلے ۱۹۳۹ء میں میں نے مولوی عنایت اللہ مرحوم ایم اے والد [illegible] سے درخواست کی کہ اپنی زندگی کے کچھ حالات مجھے لکھ دیں۔ مولوی صاحب مرحوم میری کسی درخواست کو کبھی رد نہیں کرتے تھے، اس مرتبہ بھی انہوں نے منظور کیا اور اپنے واقعات حیات لکھ کر مجھے پانی پت بھیج دیے۔ مولوی عنایت اللہ، سر سید کے نہایت عزیز دوست شمس العلماء خان بہادر مولانا ذکاء اللہ پروفیسر میور سنٹرل کالج الہ آباد کے لڑکے تھے اور نہایت لائق، مہذب اور سعادت مند تھے، اس لئے سر سید کو شروع ہی سے نہایت عزیز تھے، اور وہ بھی ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔

مولوی عنایت اللہ نے اپنے جو حالات مجھے بھیجے ان میں اس وقت کی کیفیت بھی لکھی جب انہوں نے پہلے پہل سر سید کو دیکھا۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ دہلی میں مولوی عنایت اللہ کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا، لہٰذا بچپن ہی میں مولانا ذکاء اللہ ان کو اپنے ساتھ الہ آباد لے گئے۔ راستے میں اپنے دوست سر سید کے پاس بھی دو دن علی گڑھ ٹھہرے۔ اس قیام کا جو نہایت ہی دلچسپ اور پُرلطف حال مجھے مولوی عنایت اللہ نے لکھا، آج میں اسے بہ تمام و کمال نقل کرتا ہوں۔ اس عبارت سے جہاں سر سید کی گھریلو معاشرت اور خانگی زندگی کا حال نہایت خوبی کے ساتھ معلوم ہوتا ہے، وہاں مولوی عنایت اللہ کی نہایت حسین و دلکش طرز تحریر کا بھی قارئین کرام کو تھوڑا سا اندازہ ہو جائیگا۔

> غالباً جولائی ۱۸۷۳ء کا زمانہ تھا کہ میرے والد مرحوم مولانا ذکاء اللہ، جو اس وقت میور کالج الہ آباد میں پروفیسر تھے، گرمیوں کی تعطیل دہلی میں ختم کر کے الہ آباد واپس جا رہے تھے۔ اس مرتبہ انہوں نے مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو، جو مجھ سے تین برس چھوٹے تھے، اپنے ہمراہ لے جانا چاہا تاکہ الہ آباد میں ہماری تعلیم کا کوئی بہتر بندوبست کریں۔ راستے میں چند روز، سر سید مرحوم کے پاس علی گڑھ میں قیام کرنے کا قصد کیا۔ میری عمر

اس وقت تک شاید میں کچھ جھینپ رہی تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اپنی والدہ سے جدا ہونے کا اتفاق ہوا۔ چلنے کا وقت آیا تو امّاں نے ہم دونوں بچوں کو گلے سے لگا لیا، پیار کیا اور کوئی دعا پڑھ کر دم کی۔ مجھے بے اختیار رونا آ گیا مگر ضبط کیا۔

اس سے پہلے میں کبھی ریل پر سوار نہ ہوا تھا۔ اسٹیشن پہنچ کر گاڑی میں بیٹھا۔ بیٹھا کیا! کبھی دروازے کی کھڑکی سے منہ نکال کر جھانکتا تھا، کبھی اس کھڑکی سے۔ اور سب سے زیادہ بے قراری اس بات کی تھی کہ دیکھئے ریل کب چلتی ہے اور کیونکر چلتی ہے۔ آخر کار یہ وقت بھی آ گیا۔ ریل ہلکی۔ اسٹیشن کی عمارت سرکتی ہوئی ایک طرف کو کھسکی۔ پھر تیزی شروع ہوئی۔ ریل کبھی سیدھی کبھی سانپ کی طرح لہراتی جو گاڑی اُڑتے ہوئے درخت میرے آگے پیچھے دوڑنے لگے اور تار کے کھمبے تیزی کے ساتھ ہوا کے جھونکے دار میں ایک عجیب سماں پیدا کرنے لگے۔ اب یہ معلوم ہوا کہ میدان، کھیت، مکان، آدمی، درخت، ہر چیز کوئی ایسا [illegible] کی طرف دوڑا جا رہا ہے۔ جب میں اپنے وطن سے نکلا اور میرے دل کو [illegible] کی اشیاء بے تحاشا دوڑتی نظر آئیں۔ جب دیکھا آسمان کے کنارے زمین سے ملے ہوئے معلوم ہوتے [illegible] اور پیچھے چھوٹے بادل۔ نیچے دھوپ تھی اور بادلوں کے ٹکڑے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ انجن کی طرف کبھی کبھی سیاہ دھواں نظر آتا تھا۔ مگر تھوڑی دیر میں زمین دھوپ میں سے نکل کر بادلوں کے سایہ میں آ جاتی اور ہر طرف اندھیرا چھا جاتا۔ بادل الگ ہوتے [illegible] نکلتا تھا۔ اب [illegible] دیکھ [illegible]۔ یہ کیفیت بھی تھوڑی دیر میں بدل جاتی اور پھر اندھیرے کے بعد روشنی [illegible] میں آ جاتی۔

جب کوئی اسٹیشن قریب آنے کو ہوتا تو گاڑی کو پلیٹ فارم پر لانے کے لئے پٹڑی بدلتی اور پھر کون سا [illegible] ایسا ہوگا جس کا منہ کھڑکی سے باہر نہ ہو اور گاڑی کو اس حال میں دیکھ کر تالیاں بجانے لگے۔ بڑے اسٹیشنوں پر ریل کے کئی قسم کے مسافروں کی بھاگ دوڑ، گھوڑا گاڑی [illegible] انجن [illegible] مستقیم ہوا اور پھر ہری جھنڈی دکھا کر [illegible] کے بعد اپنی گاڑی کی طرف آتا۔ جتنی ریل میں [illegible] پلیٹ فارم [illegible] ہوا۔ بڑے اسٹیشنوں کے قریب بہت سے انجنوں کا نظارہ۔ کوئی کھڑا ہے، کوئی چل رہا ہے، کوئی دھواں نکال رہا ہے، کوئی دھوئیں اور بھاپ میں چھپا ہوا ہے۔ [illegible] سب ہی۔ پھر ٹرین کا [illegible] چال سے [illegible] اور [illegible] سے اسٹیشن کی اونچی اور لمبی چھت کے نیچے داخل ہونا۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم، قلیوں اور مسافروں کا شور، سودے والوں کی پے کی صدائیں، [illegible] اور چائے والوں کا [illegible] ہوا سامان۔ اگرچہ یہ سب معمولی چیزیں تھیں مگر میرے لئے تو گویا دنیا کے مشاہدوں کا ایک دفتر کھل گیا تھا۔ جو نئی چیز [illegible] دیکھیں۔ کئی دفعہ [illegible] کی [illegible] پیش [illegible] مگر جب دیکھنے سے [illegible] اسی حال میں چند گھنٹوں کے سفر کے بعد دلی نزدیک آ گئی۔ [illegible] اتنا یاد ہے کہ کسی نے آ کر کہا کہ "سید صاحب نے گاڑی بھیجی ہے"۔ اسٹیشن سے نکل کر ہم سب اس گاڑی میں بیٹھے اور تھوڑی دیر کے بعد ایک احاطہ میں جو مجھے باغ معلوم ہوا داخل ہوئے۔ ایک بڑے بنگلے کے سامنے برساتی میں آ کر گاڑی ٹھہر گئی۔

ہم نے [illegible] انگریزی وضع کے مکان دور سے دیکھے تھے لیکن ان کے اندر نہیں گیا تھا۔ گاڑی سے اتر کر ہم کئی کمروں میں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آئے جو مجھے بہت وسیع معلوم ہوا۔ اس کمرے کے سب سے بڑے دروازے میں خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی اور پانی پڑ رہا تھا۔ [illegible] پنکھے والا [illegible] تھا۔ کمرے میں بہت سی خوبصورت کرسیاں نئی وضع کی رکھی ہوئی تھیں اور خس کی خوشبو کے ساتھ کوئی اور خوشبو بھی وہاں موجود تھی جو بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ خس کی ٹٹی کے قریب ایک میز جس کی پوشش سبز تھی بہت سے کاغذ، کتابیں اور کچھ لکھی ہوئی چیزیں نہایت سلیقہ اور خوبصورتی سے رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے قریب ہی [illegible] ایک بھاری بھرکم آدمی۔ سفید [illegible] سفید داڑھی، سفید لباس، موٹے موٹے پاؤں [illegible] معلوم ہوتے تھے۔ [illegible]

گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے تھے۔ یہی سید احمد خاں تھے جنہیں دلی کے بعض لوگ صرف "علی گڑھ والا" کرانٹا کافر کہتے تھے اور وہ ایک خوف اور پھر بڑی چیز سمجھے جاتے تھے۔ سید صاحب والد صاحب اور مجھ کو السلام علیکم کہتے ہوئے کرسی سے کچھ جھکے جھکے اٹھے اور بولے کہ "آپ آ گئے" والد سے مصافحہ کیا۔ اور ہم دونوں بھائیوں کو دیکھ کر کہا "ارے یہ کون ہیں؟" ہم دونوں قریب گئے اور جھک کر آداب کیا۔ سید صاحب نے ہماری صورتیں غور سے دیکھیں۔ پھر قریب بیٹھے اور والد سے باتیں کرنے لگے۔ اب میں کبھی سید صاحب کی صورت دیکھتا تھا اور کبھی کمرے کے ساز و سامان کو۔ فرشی پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ ہر طرف صفائی اور سلیقہ۔ نیچے فرش پر بڑا حاشیہ دار کرمچ اور بیل دار دریوں کی دری اور سفید براق سی چھت گیری۔ دیواروں پر ہلکا فیروزی رنگ۔ کہیں کہیں سنہری چوکھٹوں میں تصویریں لگی ہوئیں۔ جن میں پہاڑ، سبزہ زار اور سپاہی نظر آتے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ میں بھی ان میں کہیں ہوتا۔ آتش دان کا کارنس میرے سامنے تھا اس قدر پر تکلف تھا کہ اب تک بڑے سے بڑے نقش نگار کو بھی وہ لطف نہیں دے سکتے۔ اس کارنس پر بہت سی خوبصورت رنگ برنگ کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں اور ان سب کے اوپر دیوار میں ایک عجیب صورت کا گھنٹا لگا ہوا تھا۔ سید صاحب اور میرے والد جب باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے تھے تو پنکھے کی ہلکی آواز کے ساتھ اس گھنٹے کی کھٹ کھٹ میرے تصور میں اس کمرے کی بزرگی اور متانت کو دوبالا کر دیتی تھی۔ کارنس پر جو چیزیں آراستہ تھیں ان میں سب سے زیادہ دلکش سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا روضہ تھا جو شیشے کی صندوقچی میں رکھا ہوا تھا۔ یہ مجھے منصور کا مقبرہ معلوم ہوا جیسے میں دہلی میں بارہا دیکھ چکا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تاج بی بی کا روضہ ہے۔ میں اس کو ایک کھلونا اور اس طرح کی چیز اس کا مالک ہونا قابل رشک سمجھنے لگا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اتنے اونچے پر کیوں رکھا ہوا ہے کہ کسی لڑکے کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔

سید صاحب اس قدر عظیم تھے کہ مجھ کو اپنے والد ان کے سامنے بہت ننھے اور مختصر معلوم ہونے لگے۔ در اصل اس سے پہلے میں ان کے برابر کسی کو بڑا آدمی نہ سمجھتا تھا۔

سید صاحب والد سے بھی باتیں کرتے جاتے تھے اور کبھی کبھی ہم دونوں بھائیوں سے بھی کوئی بات پوچھ بیٹھتے تھے۔ میرے بڑے بھائی تو کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ مجھ میں کچھ اوارا۔ کیونکہ سخت عدیم الفرصت تھا۔ میں سید صاحب کے پاس کھڑا ان کے لکھنے کی دوات کو بڑی حیرت کے ساتھ دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس دوات کو دیکھ کر مجھے بالکل شیر ببر کا دھوکا معلوم ہوتا تھا۔ بالکل اسی صورت کا جس کی تصویر میری ریڈروں میں ہوتی تھی۔ اس کی آنکھیں لال لال نگینوں کی طرح خوب چمک رہی تھیں۔ میں اس خواب حیرت سے اس وقت چونکا جب سید صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم کیا پڑھتے ہو؟ میں نے ایک ہی سانس میں جواب دیا۔ "اردو کی چوتھی ختم کر چکا ہوں۔ فارسی کی دوسری پڑھتا ہوں اور فرسٹ ریڈر شروع کر رکھی ہے۔" اس سیدھے سادے جواب پر سید صاحب اور میرے والد بہت زور سے ہنسے۔ وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ شاید میرا یہ "علم و فضل" باعث مسرت ہوا ہو۔

یہ دونوں بزرگ باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد قہقہے بھی لگاتے تھے۔ سید صاحب نے کچھ کاغذات والد کو دئیے۔ جب وہ ان کو پڑھنے لگے تو سید صاحب لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب نے لکھتے لکھتے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور ایک چھوٹے سے بکس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بڑی عجیب آواز میں کہا "پنکھا روکو" بس پھر فرشی پنکھا فوراً رک گیا۔ سید صاحب نے بکس میں سے ایک چرٹ نکال کر دیا سلائی جلائی اور جب دیا سلائی چرٹ کے قریب لائے تو مجھ کو ان کا چہرہ اور بھی عظیم الشان اور خوفناک معلوم ہونے لگا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ کمرے کی خوشبو کے علاوہ جو خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی وہ چرٹ کی تھی۔

اس آواز اور چہرے کا نقش دل پر ہوتے ہی میں سید صاحب سے ڈرنے لگا اور یہ اسی خوف کی ابتدا تھی جو ہمیشہ قائم رہا۔ حتیٰ کہ غائب بھی دل سے نہ گیا۔

جس کمرے میں سید صاحب کی نشست تھی اُس کے قریب ہی ایک کمرہ والد کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہیں ہمارا اسباب رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر سید صاحب کے پاس ٹھہر کر جب والد صاحب اس کمرہ میں آئے تو ہم دونوں بھائی بھی اُن کے ساتھ آئے اس کمرے میں جو غسل خانہ تھا اس کا چینی کا سامان اتنا صاف ستھرا اور میرے لئے عجیب تھا کہ بغیر اجازت کسی چیز کو چھو سکنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کپڑے بدلنے کے کمرہ میں جو آئینہ دار خوبصورت میز رکھی تھی اس پر کچھ چیزیں شیشے کی بھی رکھی تھیں۔ ملازم سب کو مجھ سے سخت دشمنی تھی کیونکہ جہاں میں نے خوش ہو کر کسی چیز کو ہاتھ لگایا، اور وہ آپ سے آپ ٹوٹ کر گر پڑتی تھی۔

شام ہوئی تو سید صاحب بنگلے سے باہر آئے۔ کوٹھی کے احاطے میں ایک طرف کو باغ تھا۔ اس کے سرے پہ ایک چبوترہ تھا۔ اس پر بہت سی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کرسیوں پہ بیٹھ کر سید صاحب اور میرے والد پھر باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب نے مجھے اپنے قریب بلایا اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا "منہ کھولو" میں نے منہ کھولا تو کہنے لگے "ارے اس لڑکے کے منہ میں سے تو خون نکل رہا ہے توبہ توبہ"۔ میں دلی سے چلا تھا تو پان کھایا تھا۔ اس لئے دانت لال ہو گئے تھے۔ میں نے شرمندہ ہو کر جلدی سے منہ بند کر لیا اور سمجھ گیا کہ پان کھانا بری بات ہے۔

جب کچھ رات ہو گئی تو آدمی نے آ کر کہا "کھانا میز پر ہے" اس پر سب لوگ اُٹھے اور کھانے کے کمرے میں آ گئے۔ یہاں پھر میری آنکھوں کے لئے عجیب و غریب منظر تھے۔ میز پر نہایت سفید چادر، چینی کے برتن، شیشے کے گلاس، چاندی کے چمچے، ہاتھی دانت کے دستے کی چھریاں میز پر رکھی تھیں۔ میز پر دو بڑے شاندار لیمپ روشن تھے۔ پنکھا چل رہا تھا۔

اس سامان کو دیکھ کر مجھے اپنے گھر کا دسترخوان، برتن اور فتیل سوز یاد آیا۔ میری والدہ دسترخوان ہمیشہ اُجلا بچھوایا کرتی تھیں۔ مگر وہ گاڑھے کا ہوتا تھا۔ اس میز پوش کی صفائی اور چمک سے اُسے کیا نسبت تھی۔ برتن تانبے کے قلعی دار ہوتے تھے۔ چینی کے برتن خاص خاص کھانوں کے لئے یا جب کوئی مہمان آئے تو برتے جاتے تھے۔ شیشے کے گلاس صرف گرمیوں میں یا رمضان شریف میں افطار کے وقت نکالے جاتے تھے۔ مامائیں ان کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ چھریاں اور کانٹے چاندی کے تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ گھر کا فتیل سوز اگرچہ روز مرہ مانجھا جاتا تھا مگر اس کی بدصورت شکل اور ٹمٹماتی ہوئی روشنی ان لیمپوں کی صاف اور تیز روشنی کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی۔

باتیں کرتے اور قہقہوں پر قہقہے لگاتے سب لوگ میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تین چار سفید پوش ملازم اور ایک بہت بڑی لمبی داڑھی کا دبلا پتلا شخص مگر بے حد چست چالاک اور تیز خانساماں طرح طرح کے کھانے سامنے لاتا تھا۔ اور سب لوگ چمچوں سے حسب ضرورت کھانا اپنی رکابیوں میں نکال کر کھاتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کی رکابیوں میں بڈھے خانساماں نے خود ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا۔ کھانے کے ذائقے کی نسبت میں نے غور نہ کیا مگر یہ یقینی ہے کہ وہ گھر جیسا نہ تھا اور یہی بات ہے کہ میں نئی نئی چیزوں کے دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا کھا رہا ہوں۔

جب ہم دونوں کھانا کھا چکے۔ تو سید صاحب نے ایک نوکر سے کہا کہ "ان بچوں کو اُن کے پلنگوں پر لے جا کر سلا دو۔"

صبح ہوتے ہی چڑیوں کی آواز پر آنکھ کھلی۔ میں بے انتہا خوش تھا۔ جتنی چیزیں اب تک دیکھی تھیں ان کی نسبت بیسیوں سوال والد سے کرتا تھا۔ اور بار بار پوچھتا تھا کہ اللہ آباد میں یہ سب چیزیں ہوں گی یا نہیں؟ والد بھی کچھ جواب دے دیتے تھے۔ کبھی ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔

والد نے علی گڑھ میں دو دن قیام کیا۔ پھر اللہ آباد روانہ ہو گئے اور دوسرے دن صبح ابھی دن نہیں نکلا تھا کہ وہاں پہنچ گئے۔

ساڑھے آٹھ برس کی عمر میں سید صاحب کی طرز معاشرت پر میرا بچہ سا دماغ غور کرنے کے قابل تو کیا ہوتا، مگر ان کے بنگلہ کی بہت سی چیزیں جو میں دیکھا کرتا تھا میرے پاس بھی ہوتیں۔ اب یہ شوق پیدا ہوا کہ جہاں بھی رہوں وہاں کی ہوا ایسی ہی اچھی ہو۔ ایسے ہی کھلے میدان ہوں، باغ ہو، باغوں میں پھولوں کے پودے ہوں۔ گرد و پیش کی سب چیزیں صاف ستھری، چمکتی ہوئی، ہلکے ہلکے رنگوں کی ہوں، اور کوئی چیز میلی اور خراب نہ ہو۔ یہ ایسا خیال تھا جس کا بہت گہرا اثر طبیعت پر تمام عمر غالب رہا۔

یہ ہے سرسید کی طرز معاشرت کا وہ دلاویز نقشہ جو مولوی عنایت اللہ کے سحرطراز قلم نے نہایت نہایت خوبی کے ساتھ کھینچا ہے۔ آئیے اب آپ کو اس عظیم الشان انسان کی شخصیت سے متعارف کرائیں۔

انیسویں صدی اس لحاظ سے تاریخ میں نہایت نمایاں رہے گی کہ اس میں ایک دو نہیں بہت سے ایسے نامور مصلح، ریفارمر، ادیب، شاعر، مورخ اور انشاء پرداز پیدا ہوئے کہ زمانہ ان کی نظیر شاید ہی پھر کبھی دکھا سکے۔ دنیا ہزاروں لاکھوں چکر کھاتی ہے جب ایسے باکمال پیدا ہوتے ہیں جیسے قدرت نے اس صدی میں پیدا کئے۔ ان مشاہیر میں سرسید مرحوم اپنی خوبیوں، اپنی لیاقتوں اور اپنے عظیم الشان کارناموں کی بدولت بلاشبہ ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ملک کے خیرخواہ، قوم کے ہمدرد اور مسلمانوں کے حقیقی غمخوار تھے۔ اپنی ساری عمر انہوں نے قوم کی بھلائی، بہبودی اور ترقی کے غم میں گزار دی مگر قوم کی طرف سے ہمیشہ ان کو نیچری، مرتد، کافر، بے ایمان کے "معزز خطابات" سے نوازا گیا۔ اور مکہ معظمہ تک سے ان کے لئے کفر کے فتوے بڑی کوشش اور سعی سے حاصل کرکے تمام ملک میں نہایت کثرت کے ساتھ ان کی تشہیر کی گئی۔ قوم کے حقیقی بہی خواہوں کو قوم کی طرف سے ہمیشہ یہی صلہ ملا کرتا ہے۔

جو اوصاف و فضائل و محاسن ایک ریفارمر، ایک لیڈر اور ایک مصلح قوم میں ہونے چاہئیں وہ قدرت نے نہایت فیاضی کے ساتھ سرسید کو عطا کئے تھے۔ اولوالعزمی و بلند حوصلگی، ہمت و جرأت، بہادری و شجاعت، مستقل مزاجی و خود اعتمادی، دلیری و بے خوفی، سچائی و راست بازی، ہمدردی و محبت، غیرت و حمیت، عقل و فہم، دانائی و دور اندیشی، تدبیر و تدبر، انتظام و قابلیت، خوش اخلاقی و منکساری، وقار و متانت، رعب و داب، اثر و رسوخ، قدردانی و حوصلہ افزائی، محنت و جفاکشی، فراخ حوصلگی و عالی ہمتی، رواداری و بے تعصبی وغیرہ اخلاق حسنہ جن کا ایک لیڈر میں پایا جانا ضروری ہے وہ سب کے سب سرسید کے وجود میں پورے طور پر پائے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ سرسید پیدائشی لیڈر تھے یا خلاق مطلق نے ان کو لیڈری ہی کے لئے پیدا کیا تھا تو شاید کچھ بیجا نہ ہوگا۔

قدرت جس فرد پر مخصوص طور پر مہربان ہوتی ہے ان کو بڑی کثرت اور بہتات کے ساتھ اپنے انعامات اور عطیات سے نوازتی ہے۔ خوش قسمتی سے سرسید انہی باکمال اشخاص میں سے ایک تھے جن کی ذات میں بیک وقت بہت سے محاسن اور فضائل جمع ہو گئے تھے۔ وہ جہاں ایک آتش بیان مقرر تھے وہاں ایک جید ادیب بھی تھے۔ جہاں انہوں نے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف توجہ دلائی وہاں اپنے زمانہ کے اردو ادب کو بھی ایک نئی زندگی بخشی۔ جہاں انہوں نے مدرسۃ العلوم مسلمانان قائم کیا۔ وہاں سائنٹفک سوسائٹی اور آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بھی بنیاد ڈالی۔ ایک طرف انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی رہنمائی کی تو دوسری طرف انڈین نیشنل کانگریس سے مسلمانوں کو روکا۔ یہ ایسی روش تھی کہ مسلمانوں کا بڑے سے بڑا لیڈر بھی اس دلدل سے اپنے دامن کو بچا سکا۔ مگر سرسید کی دوربین نگاہ نے پہلی ہی نظر میں نہایت عاقبت اندیشی سے تاڑ لیا تھا کہ کانگریس کبھی بھی مسلمانوں کی حقیقی ہمدرد نہیں ہو سکتی۔ اس سے سرسید نے مسلمانوں کو اس سے الگ رہنے کی بڑے زور سے تلقین کی۔ یہی حقیقت تھی جو ہمارے مسلم لیڈروں پر بڑے تلخ تجربوں کے بعد آخر میں ظاہر ہوئی اور وہ ایک ایک کرکے کانگریس سے نکل گئے۔ ایسے ہی موقع پر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کتنے بلند نگاہ، عاقبت اندیش، اور صائب الرائے انسان تھے۔

ہمارے اس وقت کے سیاسی لیڈر مذہب سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ اور ہمارے بیشتر مذہبی رہنما سیاست میں صفر محض کا درجہ رکھتے ہیں۔

الا ماشاء اللہ۔ مگر سر سید میں یہ بات نہ تھی۔ وہ جہاں مسلمانوں کی تعلیم اور ان کے اصلاحی کاموں پر ایک ناظر نظر رکھتے تھے وہاں اصلاحی اور دینی تصنیفات پر بھی بہت کافی عبور رکھتے تھے۔ ایک دفعہ مولوی سید وحید الدین سلیم نے جو سر سید کے لٹریری اسسٹنٹ تھے مجھے ایک واقعہ سنایا جس سے سر سید کی کتب احادیث سے گہری واقفیت کا عجیب حال معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا:۔

"ایک دن بیٹھے بیٹھے سر سید نے مجھ سے کہا کہ صحاح ستہ میں جس قدر احادیث معراج کے متعلق آئی ہیں سب کو تلاش کر کے ایک جگہ کر دو۔ مگر کاغذ کے ایک طرف لکھنا۔ میں نے یہ کام بڑی محنت سے چار چھ مہینے میں ختم کیا۔ اور جب کر لیا تو سید صاحب سے جا کر کہا کہ "جناب وہ کام ختم ہو گیا ہے" سر سید نے پوچھا "کونسا کام؟" میں نے کہا "وہی معراج کی حدیثوں کی نقل کا" سر سید بولے "اچھا تو پھر لے آئیے اور ساتھ ہی ایک گوند دانی اور قینچی بھی لیتے آئیں۔" جب میں تینوں چیزیں لے آیا تو سید صاحب نے اپنی میز کی دراز میں سے اپنا ایک مسودہ نکالا جو کہ پورا ایک مضمون تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس مضمون میں جگہ جگہ کہیں کم کہیں زیادہ صفحہ خالی چھوڑ رکھا ہے۔ میرے ہاتھ میں سے سید صاحب نے احادیث معراج کی نقل لے کر جلدی جلدی ایک ایک حدیث کو قینچی سے کاٹ کر اپنے مسودہ کے خالی مقامات پر چپکانا شروع کیا اور تھوڑی دیر میں تمام حدیثیں جہاں جہاں ان کے مقامات تھے وہاں چسپاں کر دیں۔ کوئی حدیث باقی بچی نہ مسودہ میں کوئی جگہ خالی رہی۔ احادیث پر اتنا عبور اور کتب احادیث سے اتنی گہری واقفیت دیکھ کر میری عقل چکرانے لگی اور میں حیران ہو کر سید صاحب کی شکل دیکھنے لگا کہ کتنے عجیب و غریب دماغ کا یہ شخص ہے اور اس کا حافظہ کتنا زبردست ہے کہ اس کو پہلے ہی سے سب پتہ تھا کہ صحاح ستہ میں کہاں کہاں معراج کے متعلق احادیث آئی ہیں اور وہ کتنی لمبی چوڑی ہیں۔ ان کی تعداد کتنی ہے۔ اور ان کا مطلب کیا ہے۔ ابھی تو انھوں نے وہ تمام حدیثیں اپنے اپنے موقع پر بڑی پھرتی سے چسپاں کر دیں۔ میری حیرانی کو دیکھ کر سید صاحب کہنے لگے "میاں! ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ مسودہ لے جاؤ اور چھپنے کے لئے دے دو۔ پھر وقت ملا تو اطمینان سے دیکھنا۔"

ایسا جامع حیثیات انسان جیسے سر سید احمد خاں تھے بہت ہی کم کسی قوم میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جب پیدا ہوتے ہیں تو ایک زبردست انقلاب بپا کر جاتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ سے پہلے مسلمانوں کے عروج کا ستارہ غروب ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں ان کی عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہو گیا تھا اور ان کے اشراف اپنی شرافت کھو چکے تھے۔ تعلیم اور تہذیب ان میں مفقود ہو گئی تھی۔ ان کی شاعری مزخرفات میں ابتذال سے بدتر ہو گئی تھی۔ ان کا ادب جنوں اور پریوں کی فرضی کہانیوں اور عشق و محبت کے بے سروپا افسانوں میں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ ایسے سخت مصیبت اور سیاہ و تاریک زمانہ میں قدرت نے سر سید احمد خاں کو پیدا کیا۔

جب غدر کا زمانہ گزر گیا اور مسلمانوں پر جو گزرنا تھا وہ بھی گزر گیا تو سر سید احمد خاں کی رگ رگ میں ملت اور قوم کی ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اپنی بدقسمت قوم کو جھنجھوڑنے اور جگانے کے کام میں مصروف ہو گئے۔

انھوں نے سب سے اول مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف توجہ دلائی۔ جس کے بغیر اس ملک میں ان کی حیثیت دو کوڑی کی ہو گئی تھی۔ سر سید نے اپنے ہم وطنوں کی حالت دیکھ کر اپنی قوم کو غیرت دلائی اور اس کے نونہالوں کے لئے علی گڑھ میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ جو مدت ہوئی مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو چکا ہے یہی وہ مدرسہ ہے جس سے سارے ہندوستان میں تعلیم و تہذیب کی روشنی پھیلی اور مسلمان بھی اپنے دیگر اہل وطن کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے قابل ہو سکے۔

اس مدرسہ کی ابتدائی ترقی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ [illegible] میں اس کے گریجویٹس کی تعداد صرف [illegible] تھی۔ مگر صرف دس گیارہ سال کے عرصہ میں چار سو تک پہنچ گئی۔

"مدرسۃ العلوم مسلمانان" کے قیام کے بعد سر سید نظم اردو کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ چونکہ وہ خود شاعر تھے اور ان کو اچھی تخلیق کے ساتھ اردو

فارسی کے کچھ اشعار ان کی یادگار ہیں۔ اس لئے اپنے مخلص مرید مولانا الطاف حسین حالی کو نظم اُردو کی تجدید کے لئے انتخاب کیا۔ سرسید کا یہ انتخاب نہایت موزوں ثابت ہوا اور آج ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ نظم اُردو کے اس مجدد اعظم نے اردو شاعری کو کس درجہ تنگ سے نکال کر کتنے ارفع اور اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا۔ مگر بلاشبہ شک یہ سب کچھ جو ہوا سرسید ہی کا طفیل تھا۔ سرسید ہی نے حالی سے وہ زندۂ جاوید نظم لکھوائی جس کی نظیر اردو کے تمام قدیم و جدید لٹریچر میں ایک بھی نہیں۔ اپنے اس کارنامہ کو سرسید ہمیشہ بڑے فخر سے بیان کرتے اور کہا کرتے تھے کہ "جب میدان حشر میں خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ تو میں عرض کروں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اس کے سوا اور کچھ نہیں۔"

اردو نثر کی جو تجدید سرسید نے کی۔ آج تمام اردو مصنفین۔ ادیب۔ مورخ اور انشاء پرداز سب ہی اس کی تقلید کر رہے ہیں۔ اور ہر شخص انہیں کو جدید ادب کا امام مان رہا ہے۔ جسے آپ آج کل کی نئی اصطلاح کے مطابق "بابائے ادب جدید" کہہ لیجیے۔

خوش قسمتی سے سرسید کو رفیق اور ساتھی بھی ایسے اعلیٰ درجہ کے مل گئے تھے کہ شاید ہی کسی لیڈر کو ملے ہوں۔ تعلیمی کام میں سب سے بڑے مددگار نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک تھے۔ جنہوں نے پورا پورا حق رفاقت ادا کیا اور اپنے قائد کے انتقال کے بعد بھی ان کے کام کو نہایت خوبی اور لیاقت کے ساتھ جاری رکھا۔ نہ صرف جاری رکھا بلکہ نہایت ترقی دی۔ یہاں تک کہ ایک معمولی مدرسہ عظیم الشان یونیورسٹی بن گیا۔

نظم اردو کی اصلاح میں سرسید کے معاون خصوصی مولانا حالی تھے۔ انہوں نے جس بے نظیر طریقہ پر اور جس خلوص و محنت سے اردو نظم کی اصلاح کا کام کیا اور جیسے لاجواب نمونے جدید نظم کے پیش کئے وہ آج ہر شخص کے سامنے ہیں۔ فن شعر پر زبردست تنقید انہوں نے کی۔ اردو کے تمام تنقیدی لٹریچر میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

نثر اردو کی درستی میں سرسید کے ساتھ شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ۔ ان کے لائق فرزند مولوی عنایت اللہ۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد۔ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی۔ نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی۔ اور مولوی سید وحید الدین سلیم تھے۔ ان بزرگوں نے جو بہترین ادب پیدا کیا اور جو بے مثل کتابیں مختلف علوم و فنون کی لکھ کر شائع کیں وہ آج بھی ہر شخص سے خراج تحسین وصول کر رہی ہیں۔ شمس العلماء مولانا حالی کی نثری تصانیف بھی اپنی باکمال انشا پردازوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔

ان تمام مصنفین کے شاندار اور قابل قدر کارناموں کا ثواب بلاشک و شبہ سرسید کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔ جس نے اپنے عمل سے ان کو راستہ دکھایا اور ادب اردو کی تجدید کی ترغیب دلائی۔

سرسید گویا ایک سورج تھے چمکدار اور روشن اور سب بزرگ چاند تھے۔ سورج کے گرد رہتے تھے۔ سورج کی تیز کرنیں اور تابناک شعاعیں ہر طرف سے چھوٹ چھوٹ کر نکل رہی تھیں اور تمام چاند ان شعاعوں سے منور ہو رہے تھے۔ آج انہی چاندوں کی فرحت بخش شعاعیں ہم تک پہنچ رہی ہیں اور ہماری زبان ہماری نظم اور ہمارے ادب کو روشن کر رہی ہیں۔

مولانا شبلی نے ۱۹۰۷ء میں بمقام حیدرآباد دکن سرسید کی تصویر رسمی کے موقع پر ایک تقریر کرتے ہوئے بڑی سچی بات کہی تھی کہ ہندوستان میں جس قدر انجمنیں۔ سوسائٹیاں۔ مجالس اور کانفرنسیں قائم ہوئی ہیں۔ جس قدر ہندو اور مسلمانوں نے ملک کے اطراف و جوانب میں مذہبی اور علمی درسگاہیں قائم کی ہیں۔ اور جس قدر اردو۔ ہندی اور سنسکرت میں کتابیں۔ تصنیفات اور اخبار ملک میں شائع ہوتے ہیں۔ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو سب اسی ایک انسان ضعیف البنیان یعنی سرسید ہی کی تحریک کے کرشمے ثابت ہوں گے۔

سرسید کی شخصیت میں سب سے بڑا وصف ان کی دلیری اور بے خوفی تھا۔ وہ جرات و ہمت کے پتلے اور قومی خیر خواہی و ہمدردی کا مجسمہ تھے۔ حق بات کے کہنے میں انہوں نے کبھی ذرہ برابر بھی جان و مال اور عزت و آبرو کے نقصان کی پروا نہ کی۔ ۱۸۵۷ء کا واقعہ مسلمانوں کے لئے ایک عذاب شدید اور قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا۔ جس کے بعد انگریزوں کی غضب آلود نگاہوں میں مسلمان سب سے زیادہ گردن زدنی قوم مجرم اور لائق سزا تھی۔ اس وقت انگریز کے نزدیک

مسلمان اور باغی بالکل ہم معنی لفظ تھے۔ اس وقت مسلمان کے حق میں کوئی کلمۂ خیر کہنا گویا انگریزوں کی آتشِ غضب کو بھڑکانے کے سوا کوئی اور نتیجہ پیدا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اور اس کا انجام پھانسی کا تختہ تھا جس پر ہزاروں مسلمان بے گناہ اور بے قصور بڑی بے پروائی سے چڑھا دیے گئے۔ ایسے پُر آشوب، ایسے ہولناک اور ایسے نفسا نفسی کے زمانہ میں سرسید نے انتہائی دلیری کے ساتھ وہ رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا اور اسے چھپوا کر حکام بالا اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو بھیج دیا۔ جس میں مسلمانوں کی بے گناہی کو نہایت دلائل کے ساتھ ثابت کیا اور فساد کی تمام تر ذمہ داری ناعاقبت اندیش انگریز حکام پر ڈالی۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید ہی جیسا دلیر انسان ایسے خوفناک وقت میں ایسا جرأتناک اقدام کر سکتا تھا۔ ہر شخص کی ہمت نہیں۔

مذہب سے سرسید کو جس قدر محبت تھی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ستودہ صفات سے جتنا عشق تھا اور پھر دونوں امور کے لئے ان میں جتنی غیرت اور حمیت تھی اور اس کی نظیر موجودہ لیڈروں اور راہبروں میں تلاش کرنا ایک فعل عبث ہے۔

مذہب اسلام کے لئے جو غیرت سرسید کے دل میں تھی اس کی مثال میں وہ واقعہ مشہور ہے جب کہ ان کے ایک دوست نے ان کو لکھا کہ میرا انگریز افسر مجھے نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔ سخت مشکل میں ہوں کیا کروں۔ اس کے جواب میں سرسید لکھتے ہیں۔

> ”گو میں کبھی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کبھی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ وہ دو وقتی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں لمبا سفر ہو تو مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی۔ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور کاہلی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے۔ مگر تم نے اس معاملہ میں جو پیچ کیا نہایت برا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے کسی خرابی سے جو ادا کریں یا قضا کریں۔ لیکن کوئی شخص اگر یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو۔ اس کا سننا ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات کسی طرح بھی نہیں جا سکتی میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے۔۔۔۔ مگر کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا اسلام نہیں بلکہ میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی نہ بخشا جائے گا۔ تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جس سے کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی۔ اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لکھنا اور لڑنا تھا اور حضور رخصت ہی دیتے۔ تنخواہ کاٹ لیں کرنا واہیات تھا۔ ملازمت سے استعفے دے دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدا سے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ کہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری جیسی جاتی رہتی، فاقے مر جاتے؛ نہایت اچھا ہوتا۔“
>
> والسلام
>
> خاکسار سید احمد از بنارس، [illegible] جنوری [illegible]

سر ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر یو۔پی نے ”لائف آف محمد“ نامی کتاب لکھی تو اس میں حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہایت رکیک اعتراضات کئے۔ کتاب شائع ہوئی تو سرسید کا دل ان اعتراضات کو دیکھ کر جل گیا۔ اور فوراً اس کا جواب دینے کا ارادہ کیا۔ لیکن جواب کے لئے جن کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت تھی وہ ہندوستان میں مل نہیں سکتی تھیں۔ انھوں نے اس غرض کے لئے لندن جانے کا قصد کیا۔ مگر روپیہ پاس نہ تھا۔ جانے کہاں سے۔ مگر عشق نبی میں سرشار سید نے اس کی کچھ بھی پروا نہ کی۔ تھوڑے عرصہ پہلے تزک جہانگیری بڑے اہتمام سے چھپوائی تھی اور دس روپے فی جلد قیمت رکھی تھی۔ وہ سب جلدیں ایک روپیہ فی جلد کے حساب سے بیچ ڈالیں۔ گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ بھی فروخت کر دیا اور گھر گروی رکھ کر کچھ روپیہ حاصل کیا اور اس طرح لندن روانہ ہو گئے۔ وہاں بیٹھ کر نہایت قابلیت اور خوبی کے ساتھ کتاب کا جواب لکھا۔ مگر اب اس کے چھپوانے کے لئے پیسہ نہ تھا۔ مگر اس عاشق رسول نے ہمت نہ ہاری گھر خط لکھا کہ جو کچھ سامان باقی رہ گیا ہے سب بیچ ڈالو۔ میرا سارا کتب خانہ نیلام کر دو۔ جو ایک گھر باقی ہے اس کو بھی رہن رکھ دو اور مجھے روپیہ بھیجو۔ پھر اپنے خاص خاص دوستوں کو لکھا کہ جو کچھ بھیج سکتے ہو بھیجو۔ اس سلسلے میں اپنے دوست نواب محسن الملک کو خط لکھا کہ ”میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں کتاب لکھی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے قابل ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا۔ حاضر کرو۔ دادا میں تو وہ شہنشاہی

بس است۔"

یہ کتاب تھی جو بعد میں خطبات احمدیہ کے نام سے انگریزی اور اردو میں شائع ہوئی۔

عام طور سے یہ بات مشہور ہے کہ تین باتوں کا کسی آدمی کے ساتھ اجتماع نہیں ہوتا۔ ایک تو بڑے بڑے اونچے خیالات سوچنے والے اور عظیم الشان ہوائی قلعے تعمیر کرنے والے میدانِ عمل میں محض صفر ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو ذہانت کے پتلے اور نہایت ہوشیار ہوتے ہیں وہ بالعموم اچھے حافظے کے مالک نہیں ہوتے۔ تیسرے جو لوگ اچھا بول سکتے ہیں وہ عام طور پر اچھا لکھ نہیں سکتے۔ لیکن اس نظریہ کو سرسید کے وجود نے باطل کر دیا تھا۔ ان میں یہ کمال تھا کہ جو اعلیٰ منصوبے وہ سوچتے تھے ان کو نہایت عزم کے ساتھ عمل کا جامہ بھی پہناتے تھے۔ پھر جیسے وہ ذہین تھے ویسے ہی حافظہ کے زبردست بھی تھے اور جیسے بڑے مقرر تھے ان میں یہ بات تھی کہ جتنی عمدہ اور دلنشین ان کی تقریر ہوتی تھی ایسی ہی نفیس اور شاندار ان کی تحریر ہوتی تھی۔ لیکچر دیتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جنگل میں شیر کی آواز گونج رہی ہے۔ مضمون لکھتے تھے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک قادر الکلام ادیب فصاحت کے دریا بہا رہا ہے۔

ایک بڑا کمال سرسید میں یہ تھا کہ وہ صحیح معنوں میں ہر فن مولا تھے۔ جو کام وہ خود اختیار کرتے تھے یا جو کام ان کے سپرد کیا جاتا تھا اُسے ایسے ذوق و شوق، ایسی دلچسپی اور ایسے انہماک کے ساتھ انجام دیتے تھے کہ گویا اس کام سے زیادہ انہیں اور کسی کام سے لگاؤ نہیں۔ اور پھر وہ اس کام کو کرتے بھی اس جوش اور سرعت کے ساتھ تھے جس کی حد نہیں۔ مثلاً تصنیف و تالیف کو لیجیے۔ جب انھوں نے دلی کے محلات۔ عمارات۔ مقابر اور آثار قدیمہ کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا تو اس دھن میں اپنا تمام وقت اور راحت کو بالکل تج دیا۔ گرمی کی دوپہر ہو یا سردی کی شام وہ باہر دہلی کے قدیم کھنڈروں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ کہیں قدیم مسخ شدہ کتبے کھڑے پڑھ رہے ہیں کہیں عمارات کی تصویریں لے رہے ہیں۔ کہیں کھنڈروں کی تحقیقات کر رہے ہیں کہ یہاں جو محل بنا ہوا تھا وہ کب بنا تھا اور کس نے بنایا تھا۔ کہیں عمارات کے بانیوں کے حالات کتابوں میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ فی الحقیقت یہ ایسا کام تھا جو ناز و نعمت میں پلے ہوئے امیر گھرانے کے ۲۸ سالہ نوجوان مجسٹریٹ کے لئے بڑا ہی مشکل اور صبر آزما تھا۔ مگر سرسید نے لگاتار ڈیڑھ برس کی محنت و تلاش میں اسے انجام دے کر کتاب کو آثار الصنادید کے نام سے شائع کر دیا۔ خود لکھتے ہیں کہ "قطب صاحب کی لاٹھ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے۔ ان کے پڑھنے کے لئے ایک چھینکا دو بلیوں کے درمیان ہر ایک کتبے کے محاذ میں بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربا اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور مارے خوف کے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔"

ایسا ہی جب انھوں نے بائیبل کی تفسیر لکھنی شروع کی تو اس کام میں یہ اتنی محنت و مشقت برداشت کی جس کی انتہا نہیں۔ کئی کئی رات مسلسل جاگتے اور لکھتے رہتے تھے۔ جب نیند بہت زیادہ ستاتی تو وہیں کتابوں پر سر رکھ کر تھوڑی دیر سو رہتے اور پھر اٹھ کر لکھنے لگتے تھے۔

اکثر مصنفوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ تصنیف و تالیف کے وقت کامل سکون چاہتے ہیں۔ اس دوران میں اگر چڑیا بھی ان کے کمرے میں آجائے تو وہ چیخنے لگتے ہیں کہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"۔ خود میری اپنی یہ حالت ہے کہ رات کے پچھلے پہر کے پرسکون لمحات میں جب مضمون لکھنے بیٹھتا ہوں تو گھڑی بھی اٹھا کر دوسرے کمرے میں رکھ آتا ہوں تاکہ اس کی ٹک ٹک میرے سکون میں خلل انداز نہ ہو۔ مگر سرسید کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "مختلف آدمیوں اور مختلف کاموں کے ہجوم میں ان کے خیالات منتشر نہ ہوتے تھے۔ ان کے دفتر کا جو کمرہ جہاں بیٹھ کر کام کرتے تھے صبح سے شام تک وہاں ہر قسم کے لوگ برابر آتے جاتے رہتے تھے اور ہر وقت دوستوں اور ملاقاتیوں اور ماتحت کام کرنے والوں کا مجمع رہتا تھا۔ اسی مجمع میں جہاں وہ اور سب کام کرتے تھے تصنیف و تالیف کا دشوار گزار مرحلہ بھی وہیں طے کیا جاتا تھا۔ مشکل سے مشکل مضامین جو کہ اکثر جمہور کی رائے اور قدیم خیالات کے برخلاف ہوتے تھے اور جن میں قدیم علماء اور مصنفین پر نکتہ چینی کرنے کی ضرورت اور غور و خوض کرنے کی سخت حاجت ہوتی تھی ان کے لکھنے کے لئے کبھی نہیں ہوا کہ وہ خیالات کے مجتمع کرنے کے لئے کسی علیحدہ کمرے میں جا کر بیٹھے ہوں۔ یا اور لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا

دیا ہو۔ یا اُن کے پاس بیٹھنے سے تنگ دل ہو گئے ہوں۔ یا لوگوں کے آ جانے کے انتظار میں مضمون لکھنا شروع کر دیا ہو یا حاضرین کے ہجوم کے سبب اُن کے خیالات پراگندہ ہو گئے ہیں۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ احباب جمع ہیں اور آپس میں دلچسپ گفتگو یا ہنسی چہل کی باتیں کر رہے ہیں جن سے خواہ مخواہ ایک کاہل آدمی کا دھیان بٹ جاتا ہے مگر یہ شخص بدستور اپنے مضمون کی ادھیڑ بُن میں مستغرق ہے۔ کبھی لکھتا ہے کبھی سوچتا ہے اور دوستوں کے حرف و حکایت سے مطلق خبر نہیں ہوتا۔"

حدیث میں آتا ہے کہ خط کا جواب دینا ایسا ہی ضروری ہے جیسے السلام علیکم کا جواب دینا۔ سرسید کا اس حدیث پر پورا پورا عمل تھا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "میرے خط کا جواب مجھے پانی پت میں ہمیشہ تیسرے دن مل جاتا تھا۔ کبھی یاد نہیں کہ جواب پہنچنے میں دیر ہوئی ہو یا بالکل نہ آیا ہو: ہاں جو گمنام لوگوں کے خطوط ان کے نام آیا کرتے تھے ان کا جواب انہوں نے کبھی نہیں دیا۔ اور ان کا جواب ہو ہی کیا سکتا تھا۔ ان کے خطوط میں جو انہوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور ملنے والوں کو ہزاروں کی تعداد میں لکھے انتہائی خلوص، سچی دوستی، بے غرض محبت اور نہایت درجہ بے تکلفی کے ایسے عجیب و غریب نمونے نظر آتے ہیں کہ ان پر ہزاروں فصیح و بلیغ مضامین قربان کئے جا سکتے ہیں۔

جس زمانے میں سرسید ولیم میور کی "لائف آف محمد" کا جواب لکھنے کے لئے لندن گئے تو وہاں سے اپنے دوست نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی کو انہوں نے ایک خط لکھا جو خلوص قلب اور سچی محبت و دوستی کا عجیب مرقع ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

مخدوم و مکرم من

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ حضرت! آپ کے خط نے دل کو باغ باغ کر دیا۔ جس قدر کہ آپ نے مولوی زین العابدین کی محبت کا میری نسبت ذکر کیا ہے وہ درحقیقت بہت کم ہے۔ اس کی شرافت کو، ایمان کو جیسا کہ وہ ہے میں ہی خوب جانتا ہوں۔ اب آپ کو میری طبیعت کا حال بخوبی معلوم ہو گیا ہے۔ میں سچی محبت اور دوستی کے آگے رشتے ناطے کی کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ مولوی سمیع اللہ خاں کو میں اپنے چھوٹے حقیقی بھائی سے کم نہیں سمجھتا تھا اور اب بھی۔ جو ان کی محبت و دوستی پر خوشی، آرام اور دینی و دنیوی عیش کے ایسا ہی سمجھتا ہوں اور ایسا ہی جانتا ہوں۔ آپ یقین کیجئے کہ جس قدر مجھ کو اپنے بھائی کے مرنے کا رنج ہوا تھا اسی قدر یا اس کے قریب مولوی سمیع اللہ خاں کی علیحدگی جو میرے دل میں رنج و ملال آیا ہے اس کا مجھ کو رنج ہوا ہے۔ وہ بیچارے ہیں انہوں نے دنیا نہیں دیکھی۔ دوستی و محبت کے معاملات میں وہ محض ناواقف ہیں۔ کبھی رنڈی پر وہ عاشق نہیں ہوئے کبھی رنڈی ان پر عاشق نہیں ہوئی۔ ان کو مزہ محبت اور دوستی کا مطلق معلوم نہیں ہے۔ سچ ہے جس نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا وہ خدائی دوستی کا مزہ کیا جانتا ہے نہ انسانی اور نہ محبت کے ذوق سے ان کی آنکھ کھلی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کے کچھ کہنے سے ان کی طرف سے رنجیدہ ہوا ہوں۔ میں تو اس شخص کو کافر بے ایمان سمجھتا ہوں جو دوست کی نسبت بد خیال کرے۔ اگر اس نے خلاف دوستی و محبت کے کوئی بات دیکھی ہو تو دوست کی نگاہ سے دیکھے اور نیک گمان اور دوستی پر حمل کرتا ہوں۔ اور درحقیقت دوستی ہی کے سبب سے وہ بات ہوتی ہے۔ مگر جب کہ حقیقت میں خلاف محبت اور دوستی کے کوئی بات ہو تو پھر شیشۂ محبت جو نہایت نازک ہے کسی طرح ثابت نہیں رہ سکتا۔ آپ خیال کیجئے کہ محبت اور دوستی ایسی سخت اور مضبوط چیز ہے کہ کسی طرح نہیں ٹوٹ سکتی اور کوئی اس کو نہیں توڑ سکتا۔ مگر وہ نازک بھی ایسی ہے کہ باریک سے باریک شیشہ اور حباب کو بھی اس سے نسبت نہیں ہے۔ وہ [illegible] اور ایک ادنیٰ سی خلاف محبت کے بات کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اور جوں جوں محبت زیادہ بڑھتی ہے اس کی نزاکت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ مولوی سمیع اللہ خاں کو اب بھی میں اپنے بھائی سے کم نہیں سمجھتا مگر جو ملال میرے دل میں ہوا وہ اب بھی کم نہیں ہوا۔ جو شیشہ ٹوٹ جاوے وہ لاکھ جوڑو [illegible] اس کا نشان جو اس کے دل میں نہیں ہے۔ گل جاوے [illegible] ہے۔ ٹوٹ جاوے وہ [illegible] جو گئے ہوں اس کے

دعا یہی ہے۔ والسلام علیکم و علیٰ من لدیکم۔

خاکسار تابعدار شما بندۂ شما سید احمد از مقام لندن۔ ۲۶ نومبر ۱۸۶۹ء

اسی سلسلہ میں ایک اور خط ملاحظہ فرمائیے جو نواب محسن الملک مولوی مہدی علی کے نام ہے۔ اور سر سید نے روانگیٔ لندن سے قبل لکھا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر سید کا اپنے خاص دوستوں سے کیا برتاؤ تھا اور ان کو کس قدر احترام سے یاد کرتے تھے۔

"بخدمت شریف مخدوم ظاہری و مرشد حقیقی و معنوی مولانا مرشدنا مولوی مہدی علی صاحب

مخدوم و مکرم من سلامت

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۶ اپریل معہ ہنڈی دو سو روپیہ کے پہنچا اور آپ کا شکر کیا اور دعا کی کہ خدا اس کی جزا دے۔ ان دنوں میں کہ طبیعت ایسی رنجیدہ ہے، کتاب (خطبات احمدیہ) کے خرچ کے واسطے انجام ہونے کا دو ہزار روپیہ چاہیے۔ مجھ کو یہاں دو سو روپیہ قرض لینا پڑا۔ چنانچہ تین ہزار روپیہ قرض لینے کی گفتگو ہو رہی ہے۔ خدا راست لاوے۔ آپ نے تمام دوستوں سے جس قدر مدد کی وہ نہایت کام آمد اور بہت ہی غنیمت تھی۔ ورنہ زہر کھا کر مر جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لئے جاری کرانا میں نے تجویز کیا ہے۔ اور "تہذیب الاخلاق" اس کا نام فارسی میں اور "محمڈن سوشل ریفارمر" انگریزی میں رکھا ہے۔ اس کا سرنامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوا لیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں خرید لیا ہے۔ اور یہ سب چیزیں بذریعہ جہاز ۱۰ جولائی روانہ کر دیں کہ میرے وہاں پہنچنے تک پہنچ جاویں گی۔ خرچ ماہواری اجراء سے اس اخبار کا سو روپیہ ہوگا۔ ہم بیس دوست پانچ پانچ روپیہ مہینہ کر دیں گے۔ اور اخبار مفت میں بانٹیں گے اور نصیحت بھی بھیجیں گے۔ اس اخبار میں بجز اس کے کہ خاص مسلمانوں کی دینی و دنیاوی بھلائی کے آرٹیکل ہوں گے اور کچھ نہیں ہونے کا۔

۱۰ اگست ۱۸۷۰ کو انشاءاللہ تعالیٰ میں لندن چھوڑوں گا۔ ایک ہفتہ مصر میں رہوں گا۔ اور انشاءاللہ تعالیٰ شروع اکتوبر ۱۸۷۰ء کو بمبئی میں پہنچوں گا۔ اور چوتھی یا پانچویں کو انشاءاللہ تعالیٰ الہ آباد میں آپ کے جمال مبارک دیکھوں گا۔ امید ہے کہ تم مجھ کو اپنے پاس نہ بیٹھنے دو گے تو جوتیوں کے پاس بیٹھنے دو گے۔ اگر اپنے ساتھ بٹھلا کر کھلانے دو گے تو کتے کی طرح دور ہی رکابی میں رکھ دو گے۔ وہ اور لوگ تو مجھ کو کافر کر دیں گے، پانی دینا ہی کفر سمجھتے ہوں گے۔ ہزار ہزار شکر ہے کہ میرا خدا ایسا نہ ہوا جیسی کی سزا [illegible] کرتے ہیں اور دوزخ دیتا ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ بقول شخصے کہ قیامت کو بھی اپنی مہربانی سے اپنے ساتھ ہی [illegible] بخشائے۔ لیکن اگر وہ بھی میرے بھائی ہیں [illegible] ہم سب مسلمانوں کو اسلام کا قومی کیا کام۔ اس وقت تو مولوی مہدی علی صاحب کا سوا کوئی بھی نہ رہتا۔ واہ واہ کیا میری قسمت ہے۔ میرے خدا نے کیا اچھا خدا مجھ کو دیا ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

مجھ کو تو میں تمہارے ان سب مولویوں سے کچھ ناخوش ہوں۔ ایسا کسی سے ناخوش نہیں۔ زندہ مولویوں اور [illegible] تخمیس و تعظیم کا تو جانی دشمن ہوں اور گذشتہ مولویوں میں سے سوائے چند کے رنجیدہ ہوں۔ کسی کو سوائے چند کے لکھنے اور کتب تصنیف کرنے اور کسی بات کے تحقیق کرنے کا مطلق شوق نہ تھا۔ صرف جنگل میں بیل اور بکری [illegible] چلنے والے تھے۔ خدا ان پر رحم کرے۔ انسان کی تقلید کرنے والے انسانوں کو خدا ہدایت کرے۔ اگرچہ تم ناخوش ہو گے۔ جو [illegible] جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ شخص اسلام کے حق میں تقلید [illegible] زیادہ زہر قاتل ہے۔ بلاشبہ ہم نے [illegible] کر لیا ہے۔ خدا اس گناہ سے سب مسلمانوں کو بچاوے۔ آمین۔ اور میرے دوست [illegible] مولوی مہدی علی میرے پیارے دوست کو سب سے پہلے۔ آمین۔ ثم آمین۔

آپ کا تابعدار غلام سید احمد۔ روز جمعہ تاریخ [illegible] ماہ جون ۱۸۷۰ء

سرسید اپنے نہایت عزیز دوستوں کو بھی بے تکلفی سے خط لکھتے تھے ذیل کا مکتوب اسی کا مظہر ہے۔ یہ سرسید نے اپنے بہت عزیز دوست مخدوم سید زین العابدین کو لکھا تھا۔

مکرمی زینو بھیا

ابھی تمہارا خط پہنچا۔ مجھ کو شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا، مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے، مگر مجھ کو تو اس سے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان گھبراتی ہے اور کوئی بولی نہیں ہے کہ اس کو بیان کروں۔ دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی جہاں نہیں ہے جس پر غصہ اتاروں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی جہاں نہیں جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سنسان نہیں ہوا بلکہ دل سنسان ہو گیا۔ میری کوئی خط ایسا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو جیسا کہ ہرگز فراموشی نہ کرو کا نقشہ ہو گیا ہے۔

قبل روانگی پنجاب میری طبیعت درست نہیں تھی۔ پنجاب میں اور زیادہ مضمحل اور درماندہ ہو گئی۔ لاہور میں زیادہ ٹھیر نہ سکا اور اضلاع پنجاب میں جہاں جہاں جانا تھا جا نہیں سکا۔ واپس چلا آیا۔ لاہور اور اضلاع لاہور میں جو چندہ ہوا اس کی تعداد قریباً ۱۰ ہزار روپیہ کے ہے۔ گھر میں سب طرح خیریت ہے۔ والسلام

خاکسار سید احمد، از علی گڑھ، ۲۶ اپریل ۱۸۸۴ء

سرسید اپنے دوستوں کی ملاقات کے کتنے زیادہ متمنی اور مشتاق رہتے تھے اس کا اندازہ ذیل کے خط سے کیجیے جو انھوں نے اپنے نہایت عزیز دوست شمس العلماء خان بہادر مولانا ذکاء اللہ کو لکھا تھا۔ یہ اور بہت سے دیگر خطوط سرسید کے اپنے ہاتھ کے لکھے مولوی عنایت اللہ مرحوم نے مجھے مرحمت فرمائے تھے۔ میں یہ خط تبرکاً ہو بہو اسی طرز تحریر میں نقل کرتا ہوں جس طرح سرسید نے لکھا تھا۔ ناظرین اصل سے پڑھ لیں۔ جہاں حروف پر اصل خط میں نقطے نہیں ہیں میں نے بھی نہیں دیے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نقل مطابق اصل ہے۔

جناب مولانا شمس العلماء خان بہادر

واہ جناب واہ، اپنے خواجہ وحید الدین سے فرمایا کہ یہ ملنے کا وقت جو بجٹ میٹنگ کے لیے مقرر کیا ہے اچھا نہیں ہے اگر ایک دن کا وقت ہوتا تو اچھا تھا۔ مطلب آپ کا یہ تھا کہ آپ نزدیک دلّی سے چلتی اور اجلاس میں شریک ہو کر اسی دن واپس چلی جاتے یہی آپ کا انصاف ہے۔ آپ سے ملاقات نہیں ہوتی۔ برس میں دو اجلاس ہوتے ہیں جن میں آپ سے ملاقات ہونے کی توقع ہوتی ہے اگر برس میں دو دن بھی آپ ملاقات پسند نہیں کرتے تو مجھ کو اپنی بدقسمتی پر افسوس ہے۔ آپ ضرور تاریخ اجلاس سے ایک روز پہلے تشریف لاویں گا۔ دوسرے دن اجلاس میں شریک ہو کر تشریف لے جائیے گا۔ ایک دن قبل اجلاس کے بہ دو وقت صحبت کا اجلاس ہوگا اور خواجہ سید محمود بھی اس اجلاس میں اور نیز مستقل کے اجلاس میں شریک ہوں گے اور ان سے بھی ملاقات ہو جاوے گی۔ آپ ضرور ایک روز قبل اجلاس کے تشریف لاویں۔ معلوم نہیں کہ عزیزی عنایت اللہ تمہارے پاس واپس آئے یا نہیں۔ والسلام

خاکسار

سید احمد علیگڑھ ۵ جولائی ۱۸۹۶ء

مضمون بہت طویل ہو گیا اور ہم نے ابھی تک سرسید کی شخصیت کے متعلق بہت ہی کم بیان کیا ہے۔ گنجائش ہوتی تو ہم سرسید کی محبت و شفقت، زندہ دلی و خوش طبعی، غیر معمولی ذہانت و طباعی، سچائی و راست بازی، ہمت و استقلال، صاف گوئی و دلیری، عزیزوں کے ساتھ مہربانی، دوستوں کے ساتھ برتاؤ، نوکروں کے ساتھ سلوک، سیر چشمی و فراخ حوصلگی، مستحقین کی امداد و دستگیری، وضعداری، رکھ رکھاؤ، جفاکشی و جانفشانی، فیاضی و داد و دہش، طلب علم کا ذوق و شوق، انتقام و خصومت سے پرہیز، نمائش اور مسکرات سے اجتناب، عالی ظرفی و عالی حوصلگی، عفو و اغماض کی عادت

دلسوزی، بدکلامی و بدراہی اور ہزل و فحش گوئی سے بالکل علیحدگی اور بے تعصبی روا داری وغیرہ فضائل کے متعلق بہت سی باتیں تفصیل کے ساتھ بیان کرتے اور بتلاتے کہ یہ شخص گذشتہ انیسویں صدی میں کیسی عجیب و غریب اور عظیم الشان شخصیت کا مالک تھا۔ اور اس کی واقفیت میں ان اخلاق حسنہ کے تسلیم کرنے اور اختیار کرنے کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ بعلت تنگیٔ گنجائش کے سبب بجائے تمام ضروری امور کو چھوڑتے ہیں اور آخر مضمون میں تبرک کے طور پر سر سید کا پورا ایک سو برس پہلے کا ایک خط قارئین کرام کی خدمت میں ہدیۂ پیش کرتے ہیں۔ یہ خط آج تک غیر مطبوعہ تھا اور کبھی کسی رسالے، اخبار یا مجموعہ میں آج سے پہلے شائع نہیں ہوا۔ اس خط کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ فارسی میں ہے۔ سر سید کی اردو تحریریں تو سینکڑوں ہزاروں آپ کی نظر سے گذری ہوں گی مگر مرحوم کی فارسی تحریر آج کل کے شاید کم لوگوں نے دیکھی ہو۔ اس خط کی عبارت سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سر سید کو جیسا عبور اردو پر تھا ویسی ہی قدرت ان کو فارسی زبان کی تحریر میں حاصل تھی جیسی ان کی اردو تحریر سلیس، عام فہم اور دلچسپ ہوتی تھی وہی بات ان کی فارسی تحریر میں موجود تھی۔ مولوی سید بندہ علی نام ایک صاحب سر سید کے دوست تھے اور عرصہ تک بجنور، شاہجہان آباد اور فرخ آباد وغیرہ مقامات پر منصف اور صدر امین رہے تھے۔ یہ خط ان کے نام سر سید نے فروری ۱۸۵۵ء میں اس وقت لکھا تھا جبکہ وہ بجنور (یو۔ پی) میں صدر امین تھے۔ اس تمہید کے بعد اب یہ سو برس پہلے کا تبرک ملاحظہ ہو۔

جناب سیدی مشفقی مکرمی سلامت

بعد سلام مسنون الاسلام و اشتیاق ملاقات بہجت آیات التماس اینکہ قبل ازیں عریضۂ نیاز بجواب عنایت نامۂ عالی فرستادہ بودم بلاشبہ رسیدہ باشد۔ از قضا و قدر ربانی و تقدیر ازلی و مشیت ایزدی ترقی بندہ بعہدۂ صدر امینی شد و در بجنور صدر امین شدم این ہمہ فضل و کرم حق تعالیٰ است ورنہ این نالائق ہیچ کارہ محض است۔ بفضل و کرم خدا امیدوارم فرمایند کہ چگونہ میگذرد۔ ان شاء اللہ عن قریب خبر خیر اگرچہ مفارقت دلی و احباب طبیعت ناگوار می افتد مگر برضائے او راضی ہستم۔ آب و ہوائی اینجا نہایت در نہایت خوب و مرغوب است و بجنور اگرچہ قصبہ خورد است اما بسیار خوش سواد و جائے [illegible] متعلق عہدۂ صدر امینی و زیب [illegible] کار نمی دارد۔ و در اینجا سوائے مفارقت احباب دیگر ہمہ وجوہ خوش و خرم ہستم۔ اللہ تعالیٰ انجام بخیر گرداند آمین یا رب العالمین۔ ہنگام روانگی از [illegible] صدر الصدور صاحب ہم بالکلیہ صفائی شدہ [illegible] مقتضائے [illegible] نسبت بحال خود [illegible] است [illegible] باعث بسیار خوشی شد امید کہ گاہ گاہ از حال مزاج خود مطلع و مسرور فرمودہ باشند۔

خاکسار

سید احمد۔ از بجنور

۱۰ فروری ۱۸۵۵ء

خان بہادر مولوی بشیرالدین

احمدالدین مارہروی

مولوی بشیرالدین کی شخصیت ہر اس شخص کے لئے جو ان سے پہلی مرتبہ ملتا ایک معمہ بن جاتی تھی۔ چھریرا جسم، پستہ قد، ناتراشیدہ داڑھی کچھ الجھی ہوئی کچھ ہوا میں لہراتی ہوئی، گال پر ایک سیاہ مسّہ، بال بھی باریک ترشے ہوئے، کبھی بہت لمبے، ہڈیاں مضبوط، رفتار اتنی تیز کہ ساتھ چلنا مشکل ہو جائے، گفتگو کے [illegible] کرتے کے سب بٹن کھلے ہوئے یا ٹوٹے ہوئے، ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں ڈبیہ [illegible] ایسے تھے مولوی بشیرالدین جن کی شخصیت، خطابت اور صحافت کی ایک دنیا قائل تھی۔

کلکتہ کے مشہور اخبار، مولوی محمد امین جو خود بھی بہت علم دوست تھے، ان سے اپنی پہلی ملاقات کا حال اس طرح سنایا کرتے تھے کہ گھر میں اطلاع کرنے پر مولوی صاحب اس حلیہ سے نکلے کہ جوتا الٹا پہنا ہوا تھا، بال بکھرے ہوئے اور داڑھی [illegible] سوتی کا ایک پاجامہ اور کرتا زیب تن تھا، ہاتھ میں حقہ تھا جس کو انہوں نے لا کر ایک کرسی پر رکھ دیا اور خود پھرتی سے اندر چلے گئے، پھر پانوں کی تھالی لئے ہوئے آئے اور پان ہر ایک کے ہاتھ میں دے کر نہایت اطمینان سے حقہ گڑگڑانے لگے۔ [illegible] میں سمجھا کہ یہ کوئی ملازم ہے۔ مجھے اس کی بدتمیزی پر بہت غصہ آیا اور جھلا کر کہا جاؤ مولوی صاحب کو بلاؤ۔ اس کے جواب میں انہوں نے بڑی نرمی سے کہا "جی" کہا تو میں سمجھا کہ یہ حضرت بہرے بھی ہیں اس لئے کان کے قریب منہ کر کے کہا کہ جاؤ اور مولوی بشیرالدین کو بھیج دو۔ کہا محمد امین تم آ گئے، [illegible] ایک قہقہہ لگایا، مجھ سے لپٹ گئے، بہت زور سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگے میں ہی بشیرالدین ہوں۔ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور اب بھی شاید یقین نہ آتا اگر وہ نہایت بے تکلفی سے میرے ذاتی معاملات اور دوستوں کے متعلق دریافت نہ کرنے لگتے۔

ظفر عمر مصنف نیلی چھتری اپنا ایک واقعہ سناتے تھے کہ جب میں بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوا تو چونکہ باہر جانے کی اجازت نہ تھی اس لئے لڑکے پیروں سے سیڑھی لگایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کو دیکھ کر میں نے سمجھا کہ یہ بھی ملازم ہیں اور ان سے سگریٹ لانے کے لئے کہا۔ ثقلِ سماعت کی وجہ سے سمجھ نہ سکے تو میں نے دو پیسے ان کے ہاتھ پر رکھ کر سگریٹ کا اشارہ کیا جس کے جواب میں اس زور کا تھپڑ رسید کیا کہ چودہ طبق روشن ہو گئے، بھونچکا رہ گیا۔ مولوی صاحب نے فوراً سپرنٹنڈنٹ کو بلا کر حکم دیا کہ یہ لڑکا سگریٹ پینے کا عادی ہے اس پر

ہر گز سگرٹ نہ پینے دیا۔ اب معلوم ہوا کہ یہی وہ مولوی بشیر الدین ہیں جن کی وجہ سے مجھے اسکول میں داخل کیا گیا ہے۔" کہتے تھے: "مولوی صاحب کے بظاہر کمزور جسم میں بڑی جان تھی اور وہ طمانچہ مجھے آج تک یاد ہے۔"

مولوی صاحب کے مزاج میں لاپروائی کا مادہ بدرجۂ اتم تھا یہی وجہ تھی کہ اکثر ان کی داڑھی الجھی ہوئی اور کپڑے کثیف رہتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں جب ڈھاکہ کے ساتھ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تھا۔ سب لوگ نہایت بیش قیمت اور پر تکلف لباس پہن کر باہر نکلے لیکن مولوی صاحب حسبِ عادت اسی ہیئت کذائی سے گھومتے پھرتے تھے۔ جس روز ان کو تقریر کرنی تھی تو چلتے وقت حاجی ڈاکٹر نذر حسین نے ان کی داڑھی میں کچھ دھاگے الجھے ہوئے دیکھ کر کہا کہ "بھائی بشیر! جہاں آپ اور قومی کاموں کے واسطے چندہ کرتے ہیں وہاں مولوی صاحب کی داڑھی کے واسطے ایک کنگھے کا بھی بندوبست کر دیں۔" ہنس کر کہنے لگے "مگر پھر آپ کو ایک ملازم بھی رکھنا پڑے گا، کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ مجھے کنگھا کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔"

واقعہ بھی یہی ہے کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی مسئلہ میں ایسے الجھے رہتے کہ ان فروعات کی طرف غور کرنے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی۔ ایک سر اور ہزار سودا کی مثل ان پر پوری طرح صادق آتی تھی۔ یوں تو ہر وقت ہی ان کے پیشِ نظر بہت سے کام رہتے تھے لیکن جب ذہن ایک طرف مائل ہو جاتا تو اٹھتے بیٹھتے وہی ایک خیال پیشِ نظر رہا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ لفظ نیشن (NATION) کے معنوں پر بحث ہو گئی۔ میں نے کہا کہ عربی میں "قوم" کا جو مفہوم ہے وہ نیشن کے لفظ سے ظاہر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے دوسرے معنی ہوتے ہیں۔ کہنے لگے ذرا ٹھہرو ——— مختلف کتابیں نکالیں، تمام ڈکشنریاں دیکھیں، لغات میں قوم کے معنی تلاش کئے۔ غرض سارا دن اسی بحث میں ختم ہو گیا۔ وہ تو اطمینان سے بیٹھے حقہ پیتے رہے اور یہاں آنتیں قل ہو اللہ پڑھتی رہیں۔ میں اس زمانہ میں بورڈنگ ہاؤس میں رہا کرتا تھا۔ رات کو دو بجے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی دیکھا تو مولوی صاحب کھڑے ہیں۔ آتے ہی کہنے لگے "تمہارے پاس مولوی عبدالحق کی ڈکشنری ہے۔ دیکھو نیشن کے معنی انہوں نے کیا لکھے ہیں؟ اسے تو دیکھنا بھول ہی گئے تھے۔" معنی دیکھے گئے اور پھر جو بحث کا آغاز ہوا تو صبح ہو گئی اور اگلے روز "البشیر" میں قوم اور نیشن کے مفہوم پر ایک نہایت محققانہ مضمون شائع ہو گیا۔

انہماک کی یہ عادت بعض اوقات خود فراموشی کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ علی گڑھ جا رہے تھے راستے میں کسی علم دوست غیر ملکی کا ساتھ ہو گیا۔ ٹرکی اور انگلستان کے مسائل زیرِ بحث آ گئے۔ انہیں پتہ بھی نہ چلا کہ کب علی گڑھ آیا اور گزر گیا۔ جب گاڑی دہلی پہنچ کر ختم ہو گئی تو معلوم ہوا کہ علی گڑھ تقریباً سو میل پیچھے رہ گیا ہے اور اب دوسری گاڑی سے واپس جانا ہو گا۔

جس زمانہ میں اسکول ہال کی عمارت بن رہی تھی ان کے ہاں مولوی محمد حسین شوق مہمان تھے۔ کھانے کا وقت آیا تو مولوی صاحب ہاتھ دھو کر دسترخوان پر بیٹھے مگر فوراً ہی یہ کہہ کر کہ آپ شروع کیجئے میں ابھی آتا ہوں، کسی طرف چلے گئے۔ دو گھنٹے گزر گئے، کھانا ٹھنڈا ہو گیا۔ شوق صاحب نے بادلِ ناخواستہ کچھ کھایا کچھ نہ کھایا، سونے کو لیٹے تو نیند نہ آئی۔ باہر نکل آئے۔ دیکھا کہ اسکول کی عمارت کے سامنے دھوپ میں ٹہل رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دیواروں پر نقش بنانے کا مسئلہ زیرِ غور ہے اور اپنی دانست میں سمجھ رہے ہیں کہ کھانا کھا آئے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد شام تک کھانا نہیں کھایا۔

کھانے کے بارے میں ان کی یہ لاپروائی آخر تک قائم رہی۔ شاذ و نادر ہی کبھی خود دسترخوان طلب کرتے تھے بلکہ بعض اوقات جب کہا جاتا کہ کھانا تیار ہے تو چونک سے پڑتے تھے۔ اچھا کھانا کھا کر خوش ضرور ہوتے تھے لیکن دسترخوان پر جو کچھ ہوتا وہ بے چون و چرا کھا لیتے۔ کہتے تھے مجھے جب تک بتایا نہ جائے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیا کھا رہا ہوں۔ مسائل ہی ایسے پیچیدہ سامنے آ جاتے ہیں کہ اس طرف خیال کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ لیکن چائے کے معاملے میں حالت بالکل برعکس تھی۔ اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہ تھا نہ مقدار۔ جب بھی چاہا پیتے اور جتنی چاہتے پیتے۔ آخر میں بہت کم کر دی تھی مگر پھر بھی کئی پیالیوں کا دور ہو جاتا تھا۔

باوجود اس انہماک کے وضعداری کا بہت پاس تھا۔ جب کہیں جاتے تو تمام رشتہ داروں سے ضرور ملتے، ان کی اور سارے خاندان کی خیریت دریافت کرتے۔ اگر کوئی مر جاتا تو اس کی تعزیت کرنا اور بچہ پیدا ہوا ہو تو اسے دیکھ کر پیار کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ دیہہ وادیہہ میں بعض اوقات کئی کئی دن لگ جاتے اور استطاعت سے زیادہ روپیہ صرف ہو جاتا تو حتی الوسع پیدل گھومتے تھے، اس کے بعد دوستوں اور ملاقاتیوں کا نمبر آتا جن کی تعداد کسی زمانہ میں بھی کم نہیں رہی۔ جس مقام پر کوئی عزیز بھی ہوتا اور دوست بھی تو ٹھہرتے ہمیشہ عزیز کے ہاں اور رہتے دوست کے ساتھ۔ بعض اوقات ان عزیز اور دوست میں باہم رنجش ہوتی اور ایک دوسرے کی مذمت کرتا تو وہ دونوں کو باہم شیر و شکر کرنے کی کوشش کرتے اور اگر اس میں کامیابی نہ ہوتی تو کہتے کہ تمہاری رنجشیں اپنی جگہ پر اور میرے تعلقات اپنی جگہ پر۔

کانگریسی دوستوں کے ساتھ، مسلم لیگ اور سرکار پرست لیڈروں کے ساتھ ان کے تعلقات یکساں خوشگوار اور استوار تھے۔ اصولی اختلافات کو کبھی ذاتی دوستی میں حارج نہ ہونے دیتے، بلکہ جو لوگ اپنے عقائد میں پختہ ہوتے ان کی دل سے عزت کرتے تھے، زمانہ ساز لیڈروں سے البتہ سخت متنفر رہتے اور کہتے تھے کہ "یہ لوگ لیڈر نہیں گیدڑ ہیں۔ نہ ان میں کیریکٹر ہے نہ قوت کہ حالات کا مقابلہ کریں اور نہ اتنی جرأت ہے کہ شکست کو شکست سمجھ کر تسلیم کریں۔ یہ قوم فروش بھی ہیں اور خود فروش بھی۔"

مولوی صاحب کی خانگی زندگی بھی عجیب مجموعہ اضداد تھی، ان کو اپنے اہل و عیال سے بے انتہا محبت تھی لیکن قومی کاموں کے سامنے اکثر گھر کی ضروریات کو بھول جاتے تھے اور بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں بیوی بچوں سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف اپنے بچوں پر ہی نہیں بلکہ اولاد کی اولاد پر بھی پوری نظر رکھتے تھے، نام خود ہی تجویز کرتے، کپڑوں کا انتظام بھی اپنی ہی زیر نگرانی کرتے اور اگر کوئی بچہ بیمار ہو جاتا تو اس کے معالجہ میں پورے انہماک سے کام لیتے تھے۔ مولوی صاحب کے دو لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں اور سب کا نام بشیر پر تھا۔ انھوں نے ان سب کو اعلیٰ تعلیم دلائی، لڑکیوں کو امور خانہ داری سکھائے اور لڑکوں کو علی گڑھ کالج بھیجا۔ لیکن جدید فیشن کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ بچے علی گڑھ کالج کے مغربی ماحول میں رہتے اور دیسی کپڑے پہنتے تھے جس سے دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی، لڑکیوں کو بھی معمولی کپڑے پہناتے اور زیور کے استعمال کی اجازت نہ دیتے تھے، جب ان کی شادی ہوئی تو اس بات کا خاص خیال رکھا کہ جہیز میں کوئی ولایتی چیز نہ دی جائے۔

ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ساری اولاد ان کی زندگی ہی میں داغ مفارقت دے گئی اور وہ بھی زیادہ تر عین عالم شباب میں۔ مولوی صاحب ان تمام صدمات کو انتہائی صبر و سکون سے برداشت کرتے رہے۔ آخر میں بڑے صاحبزادے بشیر احمد مرحوم کے انتقال پر جب میں نے تعزیت کی تو کہنے لگے "یہ سب دراصل عمر کے ٹیکس ہیں جو مجھے ادا کرنے پڑ رہے ہیں لیکن انسان کو اپنی عمر پر بھی تو اختیار نہیں۔"

مولوی صاحب کو اپنی تمام اولاد میں بشیر پاشا سے سخت محبت تھی۔ جب انھوں نے بی۔ اے پاس کر لیا تو ان کو بی۔ ٹی کرا کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا۔ اس سلسلہ میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ مولوی صاحب اقربا پروری سے بالاتر تھے، اپنے رشتہ داروں کو اسکول اور بورڈنگ ہاؤس میں جگہ تو دیتے مگر ان پر کڑی نگرانی رکھتے اور سب سے زیادہ کام لیتے تھے، تاکہ وہ آزمودہ اور پختہ کار ہو کر اعلیٰ مدارج حاصل کر سکیں۔ جس زمانہ میں مخالفین نے ان کے خلاف الزام تراشی کی مہم تیز کر رکھی تھی تو سر رشتہ تعلیمات سے اس امر کی بھی شکایت کی گئی۔ جواب طلبی ہوئی تو مولوی صاحب نے لکھا کہ "جس تنخواہ پر یہ میرے ہاں کام کر رہے ہیں اگر اس مشاہرہ پر اسی قابلیت کے استاد آپ مجھے دلا سکیں تو میں آج ہی سابقہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کے حکم سے ان کو برطرف کر دوں گا۔ ویسے بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اسکول میں سب سے زیادہ کارگزار یہی استاد ہیں۔" یہ دندان شکن جواب سن کر محکمہ کو بھی خاموش ہو جانا پڑا اور مخالفین کو بھی چپ سی لگ گئی۔

مولوی صاحب کا خیال تھا کہ بشیر پاشا کو اپنا جانشین بنائیں اور مرتے وقت انشاء اللہ اسکول کو ان کے سپرد کر جائیں لیکن افسوس کہ یہ آرزو بھی

پارٹی منظم ہو گئی اور وہ ۱۹۳۳ء میں ایک جانکاہ حادثہ کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گئے۔ کہتے تھے اس واقعہ نے میری کمر ہمت توڑ دی اور اگر میرے سامنے قومی کام نہ ہوتے تو میں اس صدمہ سے ہرگز جانبر نہ ہو سکتا۔ پھر یہ شعر پڑھا کرتے ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

——— کبھی دوسرے مصرعہ میں یوں ترمیم کر دیتے:۔

واقعہ سخت ہے اور عمر طویل

بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ مولوی صاحب کی ایک پارٹی بھی تھی جس کا نام "جہل مرکب" تھا وہ خود اس کے صدر تھے اور ممبران میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، ڈاکٹر سر ضیاء الدین (وائس چانسلر علی گڑھ)، حبیب اللہ خاں (بانی آفتاب ہال)، محمد حسین قریشی، نذر حسین، مولوی طفیل احمد (مصنف "مسلمانوں کا روشن مستقبل")، خان بہادر محمد حسین، میر ولایت حسین اور نظامی بدایونی (ایڈیٹر ذوالقرنین) وغیرہ شامل تھے۔ اردو کالج کے مشرقی میوزیم میں ایک تصویر آویزاں ہے جس کے وسط میں مولوی صاحب اپنی مخصوص وضع میں بیٹھے ہیں اور ان کے گرد عمائدین علی گڑھ کا گروپ ہے۔ کپڑے کی ایک پٹی پر نہایت نستعلیق الفاظ میں "جہل مرکب" لکھا ہوا ہے جو ہر دیکھنے والے کی حیرت کا باعث ہوتا ہے اور اسے سمجھانا پڑتا ہے کہ یہ دراصل قومی رہنماؤں کی ایک جماعت تھی جو اپنی ذات کو فراموش کر چکے تھے اور ہمیشہ قومی مسائل کو حل کرنے کی فکر میں سرگرداں رہتے تھے یہ لوگ ایک دوسرے کو مائی لارڈ کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور اگر ان میں سے دو بھی ایک جگہ مل جاتے تو پھر ان کی گفتگو سننے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ تصویر علی گڑھ یونیورسٹی میں جوبلی کے موقع پر لی گئی تھی اور آج ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ مائی لارڈس کا یہ علم دوست گروپ آج ہم میں موجود نہیں۔ سب ایک ایک کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس محفل کی آخری شمع مولوی بشیر الدین صاحب کی ذات تھی جو پورے سو برس فروزاں رہنے کے بعد ۱۲ر جون ۱۹۵۶ء کو خاموش ہو گئی۔

امیر مینائی

اسمٰعیل احمد مینائی

کہا جاتا ہے کہ زندگی پر نام اور تخلص کا اثر پڑتا ہے مگر امیر مینائی کے یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا۔ ماں باپ نے امیر احمد نام رکھا، انھوں نے امیر تخلص اختیار کیا۔

نام کا نام تخلص کا تخلص ہے امیر
یہ عجب شخص خداداد کے ناداروں میں ہے

لیکن عمر بھر فقیری اور فقیر منشی میں گزری اور گزاری۔

ابھی نوجوان ہی تھے کہ حضرت میاں امیر شاہؒ سے بیعت کرلی اور ان کی نظر کیمیا اثر کے فیض نے سلوک کو جذب میں تبدیل کر دیا۔ اس بیعت کا واقعہ خاصا عجیب ہے۔ خاندانی تعلق کے باعث امیر مینائی درگاہ حضرت شاہ میناؒ میں روز بلکہ دن میں کئی کئی بار حاضری دیا کرتے تھے۔ وہاں اکثر مشائخ وقت سے ملنے جلنے کا موقع ملتا تھا اور امیر مینائیؒ کی سعادت مندی کو دیکھ کر ان میں سے اکثر نے اس کی کوشش کی کہ وہ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو جائیں۔ مگر امیر مینائیؒ کو حضرت مخدوم صاحب کی جانب سے پہلے ہی بشارت دی جا چکی تھی کہ تمہیں اس شکل و صورت اور وضع قطع کے شیخ سے وابستہ ہونا ہے۔ یہ بزرگ میں ان نشانیوں کو تلاش کرتے ان کو ایک مدت ہو گئی، بعض صوفیہ کے جال نے ان کو اپنی جانب کھینچا بھی، مگر مخدوم صاحب کا تصرف باطنی ہر بار آڑے آیا۔ ایک روز نماز عصر و مغرب امیر مینائی حسب معمول مزار مبارک پر حاضر ہوئے تو دیکھا کہ ایک بزرگ منہ لپیٹے مزار مبارک کی جالی سے لگے بیٹھے ہیں ——— ان کو خلوت مطلوب تھی، چند سے انتظار کیا کہ یہ فارغ ہو جائیں تو خود بیٹھیں، مگر وہ بزرگ ذرا جنبش ہی نہ کی ——— یہ ادائے نماز کے لئے برابر والی مسجد میں چلے گئے ——— وہاں سے فارغ ہو کر لوٹے تو دیکھا کہ وہ حضرت بدستور بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کا معمول تھا کہ مزار مبارک کے داہنی جانب سرہانے سے متصل بیٹھ کر پڑھتے تھے، اسی جگہ پر وہ بزرگ ڈٹے بیٹھے تھے۔ غرض ان کو بڑی الجھن ہوئی، ٹہل ٹہل کے کچھ دیر گزاری بالآخر مغرب کا وقت آگیا تو پھر مسجد چلے گئے۔ وہاں سے جب فراغت پاکے آئے تو دیکھا کہ وہ صاحب اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں ہیں۔ اب تو ان سے نہ رہا گیا، پاس جاکے کہا کہ حضرت کیا نماز مغرب کے لئے بھی مسجد نہ جائیے گا۔ انھوں نے منہ کھول کر ایک نظر امیر مینائیؒ کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا اور فرمایا۔ "میاں امیر! اب بھی نہیں پہچانا؟" یہ سننا تھا کہ ان کا عجب حال ہو گیا۔ اب جو غور کر کے دیکھتے ہیں تو وہی شکل و صورت اور وہی حلیہ، جو خواب میں ان کو دکھایا جا چکا تھا ——— بس پھر کیا تھا بیعت

بیقرار ہو کے قدموں سے لپٹ گئے، انہوں نے اٹھا کر سینے سے لگایا، ہم آغوش ہونا تھا کہ دنیا بدل گئی، تقریباً دو برس اسی استغراق اور جذب کے عالم میں گزرے، کسی شے کی فکر نہ تھی، دن رات حضرت مخدوم صاحب کا آستانہ تھا یا میاں امیر شاہ آگے ہوتے تھے، قرآن کی قیام گاہ، لکھنا پڑھنا، شعر شاعری، مجلس محفل سب ترک، سب سے بے نیاز، یہ عالم کہ چار چار روز گھر کی صورت نہ دیکھتے تھے۔ والدہ ان کی اس وقت حیات تھیں، سب سے چھوٹے اور چہیتے فرزند تھے، ماں نے باپ کے گزرنے کے بعد ان کی ہوش مندی قابلیت اور شہرت دیکھ کر ان کی ذات سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ جوانی میں یہ عالم ان سے نہ دیکھا گیا۔ پہلے حضرت مخدوم صاحب کی درگاہ پر حاضر ہو کے دعا کی، پھر میاں امیر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ "حضور میرے امیر کو مجھے واپس دیجئے"۔ میاں صاحب متبسم ہو کر خاموش ہو گئے، تھوڑی دیر بعد جب امیر مینائی درگاہ شریف کا چکر لگا کے پہنچے، از راہ شفقت سے اپنے قریب بلایا اور اپنی ٹوپی جو وقت بیعت ان کے سر پر رکھ دی تھی، وہ بہ سرعت اتار لی، پھر کیا تھا جیسے کسی دیوانے کو ہوش آگیا ہو یا کسی کی سوتے سے آنکھ کھل گئی ہو، جذب و مستی سب رفو چکر ہو گئے، اور سخت بیقراری کا عالم طاری ہو گیا۔ اس بیقراری کو دیکھ کر مرشد نے فرمایا "میاں امیر ماں کی دلجوئی کو مرشد کی اطاعت پر ترجیح ہے۔ جس نعمت سے تم اس وقت محروم کر دیئے گئے ہو، انشاء اللہ آخر عمر میں یہ نعمت پھر تم کو نصیب ہو گی ——— اور تم ولی ہی ہو گے" ——— یہ ہزار تڑپے پھڑکے، مگر میاں صاحب نے ایک نہ سنی اور ماں کے پاس جانے کا حکم دے کر خود گھر کی راہ لی ———

ثاقب گیاوری، جامع مکاتیب امیر مینائی نے لکھا ہے کہ حضرت ایک "عالم نور" تھے۔ راقم الحروف نے ان کو نہیں دیکھا مگر ان کے فرزندوں اور شاگردوں کے علاوہ اغیار نے بھی یہی بیان کیا ہے کہ امیر مینائی رح کی ذات بڑی پاکیزہ و دلکش تھی، چہرے پر ایک معصومیت ایک حیرت کے آثار کا ہلکا سا پردہ پڑا رہتا تھا جو ہر دیکھنے والے اور ملنے والے کو بے اختیار رجھا لیتا تھا۔

سنہ ۱۲۴۴ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، والد کا نام کرم محمد مینائی تھا۔ مینائی سے مراد حضرت شاہ مینا رح کی نسبت ہے۔ جن کی درگاہ لکھنؤ میں آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔

ہر کہ خواہد چشم را بینا کند — سرمہ از خاک در مینا کند

لکھنؤ ہی میں یہاں کے اساتذۂ وقت سے علوم کی تعلیم حاصل کی، طب کی تکمیل کی، اور عنفوان شباب ہی میں اپنی سیادت اور اپنی لیاقت و صلاحیت، اپنی طباعی و ذکاوت کے باعث فرنگی محل اور خانوادۂ اجتہاد، ہر دو میں یکساں مقبول و محترم ہوئے، جلد ہی دربار شاہی میں رسائی ہو گئی، پہلے شاہزادہ نادر مرزا کی اتالیقی سپرد ہوئی، پھر منصب افتا پر فائز ہوئے، واجد علی شاہی ختم ہوئی اور غدر ہوا، تو چند روز کاکوری میں قیام کیا، جہاں حضرت محسنؔ سے یکجائی ہوئی اور نعت گوئی کا چسکا پڑا، جو آخر عمر تک توشۂ آخرت بنا رہا، پھر حکیم پور، کان پور، بنارس کے چکر لگا کے بالآخر اپنے والد کے شاگرد عزیز یوسف علی خاں والئ ریاست رامپور کے ایماء و اصرار پر اپنے مرشد کے وطن ریاست رامپور ہی میں آ کے رہ پڑے، یہیں وحید الزمان خاں ڈپٹی کلکٹر کی لڑکی اور وحید الزمان خاں سفیر ریاست کی بھتیجی سے شادی ہوئی اور یہیں پہلے مفتی عدالت و استاد شاہ، پھر استاد شاہ و مقرب خاص، اور آخر میں صدر نشین مجلس تدوین امیر اللغات رہے، اور یہیں سے بالآخر امیر اللغات کو پورا کرنے کی دھن کے بہانے موت (۷۲) سال کی ضعیف العمری میں ان کو کھینچ کر بماہ اگست سنہ ۱۹۰۰ء حیدرآباد دکن لے گئی اور وہیں سپرد خاک کر دیا، جہاں وہ درگاہ یوسف صاحب شریف صاحب رح کے احاطے میں قیامت کی نیند سو رہے ہیں۔ تعویذ پر سامنے انہیں کے شاگرد جلیل کا قطعۂ تاریخ مرقوم ہے۔

امیرِ کشورِ معنیٰ امیرؔ مینائی — خدا کے عاشقِ صادق و نبی کے فقیر
گئے جو خلد بریں کو تو اُن کی تربت پر — لکھا جلیل نے "یہ روضۂ جناب امیرؔ"

اور پشت پر خود ان کی الہامی بیت، جلی حروف میں کندہ، دل رکھنے والے زائرین کو بے اختیار کھینچ لیتی ہے۔

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں
پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

مولوی شبیر حسن مرحوم نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ میں جب حیدر آباد پہلی بار گیا تو داغ و امیر کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کی نیت سے درگاہ شریف پہنچا۔ خاص درگاہ میں جا کے قبروں کی تلاش کی تو داغ کا مزار قبۂ مبارک کے سامنے ہی مل گیا۔ سوچا کہ فاتحہ پڑھ لوں پھر خیال آیا کہ امیر کا مزار بھی کہیں پاس ہی ہوگا، پہلے اسی کی کوشش کروں پھر فاتحہ پڑھ لوں گا۔ قریب میں تلاش کرنے پر کہیں امیر کی قبر نہ ملی تو جو چند قدم آگے بڑھ گیا، راہ میں ایک آنے والے نے رہبری کی کہ میاں امیر مینائی کی قبر تو درگاہ آنے کے رستے میں ہے واپس جاؤ ——— میں واپس ہوا اور شہر خموشاں میں پھر سے کوشش شروع کی۔ جب امیر مینائی کی قبر سامنے آئی تو سب سے پہلے اسی بیت پر نظر پڑی اور میں نے بے اختیار سبحان اللہ کہہ کر فاتحہ پڑھی پھر داغ کے مزار پر جا کے فرض سے سبکدوش ہوا۔

فی الحقیقت یہ درویشی، بے نفسی اور حبِ رسول کا مسلک، امیر مینائی کے حیات و وجود کا مرکز تھا۔ جس پہلو کو ان کی شخصیت کے جانچا جائے اس کی تہ میں یہی عناصر کارفرما ملیں گے ——— ان جمائی کا حال بسلسلۂ تذکرۂ بیعت آپ سن چکے، نواب کلب علی خاں سے خفا ہو کے جب دو سال کو لکھنؤ چلے گئے تھے، اپنے ایک عزیز کے ایماء پر بسلسلۂ کاروبار، ایک بار ڈسٹرکٹ کورٹ سے ملنے گئے۔ دفتر کچہری کے احاطے ہی میں عدالت کا دفتر تھا، ان کی پالکی واپس ہو رہی تھی کہ احاطۂ عدالت میں ہرکارے نے آواز لگائی "گیا دین حاضر ہے" ——— یہ فوراً واپس ہو گئے اور ان عزیز نے جب تغیر کے بارے میں دریافت کیا تو کہہ دیا کہ میاں یہ آواز مرکوز تھی "گیا دین حاضر" "جس مرحلے میں گیا دین، اس میں میرا کہاں گزر"، یہ مشرب و مسلک ان کا کاروبار یا معاش کے معاملات ہی میں نہیں، ہر رنگ میں تھا۔ ایک بار کسی گلدستہ میں داغ کی غزل شائع ہوئی۔

بتانِ ماہ وش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
کہ جس کی جان لیتے ہیں اسی کے دل میں رہتے ہیں

بیٹے اور شاگرد مصر ہو گئے کہ حضرت اس زمین میں غزل ہونی چاہیے، حضرت ٹالتے تھے کہ برابر ٹالتے رہے، جب اصرار حد سے بڑھ گیا تو فرمایا کہ میاں جلیل ——— مجھے دنیا داغ کا معاصر سمجھتی ہے ان کی غزل پر غزل کہی جائے تو کیا پیروی نہ کہلائے گی، کم از کم اس حیثیت کی تو ہو، یہاں حالت یہ ہے کہ داغ نے غزل نہیں کہی ہے قلم توڑ دیئے ہیں، غزل تو غزل، ایک شعر کا جواب ہونا مشکل ہے ——— میں اس زمین میں شعر کہہ کر داغ کی توہین کرنا نہیں چاہتا ——— یہ تو ایک واقعہ تھا جو شاید دو چار حضرات ہی کو معلوم ہو، انھوں نے اس کے بعد کمالِ ذوق دل سے یہ مقطع بھی لکھا۔

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے
بھنویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں

بعض رسائل میں کبھی کبھی ان کے خلاف مضامین شائع ہوتے تھے یا چند حضرات جا بے جا اعتراضات ان کے کلام پر وارد کرتے تھے، تو عزیز اور چہیتے شاگرد اس پر سخت برہم ہوتے اور جواب لکھنے کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو جاتیں مگر خود ان کو جب اطلاع ہو جاتی یہ شعر پڑھ کر ہر ایک کو روک دیتے۔

ہر کہ او در راہِ ما خارے نہد از دشمنی
ہر گلے کز باغِ عمرش بشگفد بے خار باد

داغ جب دوسری بار حیدر آباد دکن جانے لگے تو امیر سے ملنے رام پور آئے، جلال کو خبر پہنچی تو وہ بھی لکھنؤ سے آ گئے، امیر ہی کے یہاں ٹھہرے، روانگی سے پہلے شام کو ایک مختصر سی صحبتِ شعر و سخن منعقد ہوئی، جلال کے بعد داغ نے غزل شروع کی۔ رسوائی کا، شیدائی کا ——— جب یہ مصرع پڑھا ع ہو گیا پردۂ وحشی سے کچھ اور ہی رنگ ——— تو جلال نے جھوم کر کہا واہ نواب مرزا خاں واہ کیا مصرع کہا ہے ———

ع ہو گیا پردۂ حسن سے کچھ اور ہی رنگ ——— پھر ارشاد ہو، ارشاد ہے اجازت ——— تعریف نہیں ہو سکتی ———

داغ ایک لمحے کے لئے دم بخود ہو گئے —— جلال نے بھی اُن کے اچھے سے اچھے شعر کی اتنی تعریف نہیں کی تھی۔ مقطع جلال کے طباع اور ذہین آدمی، یہ خود حسن کے نقص کو فوراً پا گئے مگر جلدی میں اُس کو دور کرنے کا پہلو نہ سوجھا —— امیر مینائی نے کسی تامل کے بغیر مصرعہ دہرایا۔

ہو گیا پرتو رخسار سے کچھ اور ہی رنگ

اب میاں نواب مرزا —— پھر تو پڑھئے۔ داغ نے اُن کو متشکر نظروں سے دیکھ کر شعر پڑھ دیا۔

ہو گیا پرتو رخسار سے کچھ اور ہی رنگ — میں نے منہ چوم لیا تیرے تماشائی کا

تو شرافت اور پاکیزہ نفسی کا یہ رنگ اُن کی طبیعت کا سب سے نمایاں پہلو تھا اور یہ تمام تر اسی فقیر منشی اور حُبِ رسول کا فیضان تھا۔

میاں جی، تیس سال سے اوپر ان کے خدمت گار خاص رہے، کھانا کھاتے میں پنکھا جھلنا، سواری پر ساتھ جانا، وضو کرانا، بیماری آزاری میں پاؤں دبانا، تیمار داری کرنا، غرض ہر طرح سے خدمت کی۔

جیسے آقا تھے ویسے ہی نوکر —— صوم و صلوٰۃ کے پابند، فجر کی نماز کے بعد امیر مینائیؒ باہر آتے تو سبقت کرکے میاں جی سے پہلے اُن کو سلام کرتے، میاں جی شرمندہ ہو کے چپ ہو جاتے اور دل میں سوچتے کہ انشاء اللہ کل میں میاں کو پہلے سلام کروں گا۔ تیس برس اسی حسرت میں گزر گئے، امیر مینائی دنیا سے جا کے پیوند خاک بھی ہو گئے مگر میاں جی کو سلام میں سبقت کرنے کا موقع نہ دیا ——

دوپہر کا کھانا بیوی خود کھلاتی تھیں، سامنے بیٹھ کے مکھیاں جھلتی جاتیں، یہ کھانا کھاتے جاتے، ماما گرم گرم پھلکے باورچی خانے سے لا کے دیتی جاتی —— تین چار پھلکے —— اس سے زیادہ ان کی خوراک تھی، ایک روز صرف ایک پھلکا کھا کے اٹھ گئے —— بیوی نے پوچھا کیا بات ہے کیا کچھ طبیعت مائل نہیں ہے۔ سیلابچی آفتابہ، ہمیشہ کی طرح پاس رکھا تھا، یہ اُٹھنے لگے تو ٹھوکر لگی آفتابہ الٹ گیا۔ یہ بڑھ کر باورچی خانے کے متصل غسل خانہ تھا اس میں ہاتھ دھونے چلے گئے، بیوی ماما کو آواز دے کر پانی صاف کرانے لگیں، انہوں نے پیچھے سے پکانے والی کو آواز دی، وہ آئی تو کہا —— کھانے میں نمک زہر ہے زہر، جلدی سے پانی ملا دے، اگر تیری بیوی کو خبر ہو گئی تو تیری ابھی جان ایک کر دیں گی" ——

اُن کی تمام زندگی درویشانہ اور فقیرانہ گزری، اور اس کا اثر اُن کے پاس رہنے والوں اور بیٹھنے اُٹھنے والوں سب پر کم و بیش پڑا، اُن کے فیض صحبت سے سب سے زیادہ مستفید حضرت جلیل ہوئے اور جن لوگوں نے حضرت جلیل کی ایک جھلک بھی دیکھی تھی وہ قسم کھا سکتے ہیں کہ جلیل ایک فرشتہ صورت و سیرت بزرگ تھے ——

خود نواب کلب علی خاں، خلد آشیاں کی ذات پر اُن کی شخصیت کا خاصا اثر پڑا، ریاستوں اور رجواڑوں میں والیانِ تخت و تاج کہاں شرع و آئین کی پابندی کرتے ہیں مگر امیر مینائیؒ کے فیض صحبت سے خلد آشیاں کی زندگی میں شرع و آئین کی پابندی کرنے کا میلان واضح طور پر جھلکتا ہے، حرم صرف ایک بیوی پر مشتمل تھا، اُس زمانے کو دیکھتے ہوئے صرف یہی ایک امر خلد آشیاں کی صالحیت و صلاحیت کی مستحکم دلیل ہے اور ایسا صرف دو حضرات کے اثر سے تھا، امیر مینائیؒ اور مولانا ارشاد حسین علیہ الرحمۃ، جن سے خلد آشیاں بیعت بھی تھے —— صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند تھے اچھے بھلے تو مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کرتے تھے پھر محل ہی کے اندر ادا کرنے لگے اور آخر میں پاؤں کے درد کے باعث اکثر پلنگڑی پر بیٹھے بیٹھے پڑھتے تھے۔

پچھلے منقولوں سے شعر کی روش اور تشبیہی صنعت انشا کی خاص پہچان ہے، خلد آشیاں کا نامۂ اعمال اس بارے میں بھی تابناک و درخشاں ہے اور یہاں بھی امیر مینائیؒ کے ہاتھ کا عکس صاف جھلکتا ہے، حضرت ان کے استاد ہی نہیں مشیر و مقرب خاص تھے، اور گو اُن کی استاد مزاجی بالعموم منکسرانہ و مصلحانہ تھی، اور مولانا عبدالحق کی طرح شمشیر برہنہ کبھی نہ تھے، تاہم حق گوئی کا محل آ جائے تو چپ ہو گئے یا ٹال دے جانے کی خو اُن کی بھی نہ تھی۔ خلد آشیاں کے بعد جب فردوس آشیاں بھی جلدی ہی اللہ کو پیارے ہو گئے، اور نواب حامد علی خاں کی کم سنی کے باعث ریجنسی کا دور دورہ ہوا

پر بھی انگریزیت و اسباب جاتے آیا تو امیر اللغات پر بھی آفت آئی ۔ ان کی بجائے باقاعدہ محض سو رہ گئی ۔ امداد و دفتر اس قدر گھٹا دی گئی کہ موقوفی کر معاوضہ دینا دشوار ہو گیا ۔ دفتر کے عمّال جیسے خوش نویس، کاتب، مصحح وغیرہ کی تنخواہیں تک ادا نہیں ہو سکتی تھیں ۔ پہلے انہوں نے جنرل اعظم الدین خاں کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی، وہ اپنی ذات سے اچھے افسر تھے مگر چونکہ طبیعت پر جزرسیت کا تسلط غالب تھا اس لئے امیر اللغات کے معاملے کو کسی طرح مان پر نہ لائے ____ انہوں نے مجبور ہو کے باوصف پیرانہ سالی و عوارض، بہار و بنگال کا ایک سفر اختیار کیا ۔ پٹنے میں سید علی حسن خاں شادؔ کے پاس ٹھیرے اور انہی کے توسط سے حاضرین دربار تک اپنی آواز پہنچائی مگر نہ وہاں دال گلی، نہ ڈھاکے یا مرشد آباد میں، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ان میں سے کسی کی اتنی ہمت اور استطاعت تھی جو اتنے بڑے کام کا مالی بار اٹھاتا ____ ناکام ہو کے یہ رامپور لوٹ آئے ____ اور گو اس پیرانہ سالی میں حیدرآباد جانا نہیں چاہتے تھے مگر امیر اللغات کی لگن نے ایسا کرنے پر بھی آمادہ کر دیا ۔ اس اثنا میں جنرل اعظم الدین خان مارڈالے گئے اور نواب حامد علی خاں با اختیار رئیس بن گئے ۔ ان کو کسی طرح سے اس کی خبر مل گئی کہ حضرت حیدرآباد جانے کی تیاری کر رہے ہیں اور ان سے اجازت لے کر جانا چاہتے ہیں ۔ علم دوستی و صاحب پروری کی خفتہ صلاحیتیں ان میں منوز کما حقہ بیدار نہیں ہوئی تھیں جو بعد کو ان کی حیات رائیگاں کا درخشاں پہلو بنیں ____ کچھ یہ بھی تھا کہ ریاست کی مالی حالت اس وقت اچھی نہ تھی ۔ غرض وہ دفتر امیر اللغات کو برقرار رکھنے پر راضی ہوئے نہ امیر مینائی کو جانے کی اجازت دی ۔ امیر مینائی چاہتے تھے کہ کسی طرح خود اس موضوع پر ایک بار ان سے گفتگو کریں اور وہ ٹالتے تھے ____ آخرکار ایک دن انہوں نے پکڑ ہی لیا ۔ انہوں نے صبر و سکون اور شائستگی سے ان کی گفتگو سنی اور قائل ہو گئے ____ مگر شرط یہ کی کہ "ابھی سیاحت عالم پر جا رہا ہوں، وہاں سے واپس آ جاؤں تو آپ جائیے" ____ انہوں نے دریافت کیا کہ "آپ کی عدم موجودگی میں انتظام کس کے سپرد رہے گا ؟ ایجنسی کونسل کے یا کوئی سربراہ کار ہوگا" ____ غرض ان کی یہ تھی کہ شاید امیر اللغات کے لئے کوئی ہمدرد پیدا ہو جائے ۔ حامد علی خاں یہ سمجھے کہ یہ انتظام مملکت کے نقطۂ نظر سے دریافت کر رہے ہیں ۔ انہوں نے کہا "حضرت آپ تردد نہ کریں میں نے سب انتظام کر دیا ہے ۔ انشاء اللہ خوش اسلوبی سے چلے گا" ____ حضرت نے جواب دیا کہ "نواب صاحب آپ کی موجودگی ہی میں کیا خاک انتظام تھا جو اب آپ کی غیر موجودگی میں بہتر ہوگا" ____ حامد علی خان اٹھنے لگے تھے یہ سن کر پھر بیٹھ گئے، ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "حضرت توجہ کرنے والے اور سرکار کے اقبال سے سب ٹھیک رہے گا ۔ کہنے والے تو ہزاروں ہیں مگر یہ بات کہنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں ۔ پہلے ہی میں اس کا روادار نہ تھا کہ آپ یہاں سے جائیں ۔ اب تو کسی طرح آپ کو جانے نہ دوں گا بلکہ میرے واپس آنے پر امیر اللغات کے لئے کوئی مناسب انتظام بھی کر دیا جائے گا" ____ اس ایک واقعہ سے ان کی صاف گوئی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ۔ کتنا نازک وقت تھا ۔ امیر اللغات کی ناؤ ڈگمگا رہی تھی، والئ ریاست نہ ان کی جانب ملتفت تھا نہ ان کے کام کی جانب، بظاہر مصلحت نہ تھی، تملق کی خواستگار تھی، مگر انہوں نے سچی بات کہنے میں کوئی تامل نہیں کیا ____

تعلّی ایک ایسی شاعرانہ کوتاہی ہے جو کم و بیش ہر شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہے ۔ امیر مینائی کے کلام اور ان کے کوائف حیات میں مگر اس "جمالی سرگرانی" کے بڑے نادر و دلپذیر نمونے ملتے ہیں ۔ مرزا محمد تقی ہوس لکھنوی جماعت شاعری کا ایک بڑا مہرہ تھے ۔ جناب امیرؑ کی منقبت میں ان کا ایک قصیدہ "خلد آشیاں" نے ان سے یا کسی اور سے سنا اور بہت پسند کیا اور جب مغرب بعد اجتماع ہوتا تھا اس میں بار بار مزے لے لے کر اس کی بیتیں دہرائیں، اور بالآخر یہاں تک کہہ دیا کہ "اب منقبت میں ایسا قصیدہ کہنا اور اس زمین میں کسی کے بس کی بات نہیں" ۔ امیر مینائی کو خدا جانے کس وجہ سے یہ بات بہت شاق گزری ۔ دوسری شام کو جب سب جمع ہو چکے تو عرض کیا کہ ایک نیا قصیدہ لکھا ہے جو پیش کرنا چاہتا ہوں ۔ خلد آشیاں نے پوچھا کہ قصیدے کا موضوع کیا ہے ۔ کہا منقبت جناب امیرؑ ____ اور زمین وہی ہے جو مرزا محمد تقی ہوس کے قصیدے کی ہے ۔ خلد آشیاں اور سارے حاضرین ہمہ تن گوش ہو کے سننے بیٹھے ۔ انہوں نے پڑھنا شروع کیا ۔

کیوں فکر نہ کروں طلب معانی کو میں تسخیر
خامہ ہے مرا دستِ یداللہ کی شمشیر
آئے جو تعلّی پہ مری ہمتِ عالی
دشوار نہیں نکتۂ افلاک کی تسخیر
سرکش مرے معنی سے کبھی بڑھ نہیں سکتے
ہر آب کی شعلے کے لئے بھی ہے زنجیر
انصاف کی جو تھے دمِ انشاد رعایت
پیدا نہ کروں میں قلمِ شمع سے تحریر
دل صاف زباں صاف سخن صاف ہے میرا
معنی کی لڑی ہے کہ مسلسل مری تقریر
طائر نظر آتے ہیں ٹھہر جاتی ہیں تحریریں
طاؤس صفت ہے وہ ہر اک کلک میں تاثیر
عکس آئینے میں میرے تخلص کا ہے گویا
لب میرے جو ہلتے ہیں تو بول اٹھتی ہے تصویر
معجزہ وہ علم ہے مری عظمت کا ظاہر
یوسف کی زیارت ہے اگر ہے مرے خواب کی تعبیر
جو بات مرے منہ سے نکل جائے وہی ہو
گویا ہوں زبانِ قلمِ کاتبِ تقدیر
سن سن کے مجھے گرمِ طبیعت ہیں سخنور
دوزخ نے جو پائی ہے تو خورشید سے تنویر
کہتا ہوں وہ کہتا ہوں جو استادِ ازل ہے
ہوں صورتِ طوطی پسِ آئینۂ تقدیر
وہ خسروِ اقلیمِ سخن ہوں کہ جہاں میں
شہرہ ہے مرا علم کے مانندِ جہانگیر
تھے قبضۂ خسرو میں معانی کے جو کشور
سب میں نے کئے تیغِ زباں کھینچ کے تسخیر
جب مصحفی و میر پئے تہنیت آئے
ٹھنڈک کی سی زمیں ہی نہیں ان میں جو اکسیر
ہمارا جو سخن کیا ہے سمجھے گا جو قصیدہ
ایسے تو بہت ہیں مرے گلشن میں عصافیر
البتہ مقابل ہیں مرے عرفی و فیضی
پر فرق ہے اتنا کہ ان ایسے ہیں میں ہوں میر
مطلب سخنِ تازہ کہاں ان کے سخن میں
کہنہ ہوں وہ اشیا تو بدل جاتی ہے تاثیر
دیکھیں جو مذاقِ نہ رکھے مری طبیعت
جڑتی ہے عبث چلئے اگر ہیں کوئی زنجیر
پیدا جو ہوا بعد میں سمجھا کہ گیا ہے
تقدیم کی مانع نہیں کچھ وقت کی تاخیر

اس شعر پر خلد آشیاں نے ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "حضرت جب میں نے دعویٰ کیا تھا کہ منقبت میں اب ایسا قصیدہ کہنا اور اسی زمین میں کسی کے بس کی بات نہیں، تو آپ کو مستثنیٰ کر دیا تھا ——— آپ تو سب کچھ کہہ سکتے ہیں"۔

ایک مرتبہ خلد آشیاں نے طرحی مشاعرہ کیا ——— "دنیائے حسن و عشق کو رنج و محن ہوا"۔ امیر مینائی نے جو غزل کہی تھی وہ مشاعرے سے پہلے خلد آشیاں کے ایما پر ان کو سنائی۔ ان کو پسند نہ آئی تو کہا "حضرت معلوم ہوتا ہے اس غزل کے کہنے میں آپ کا جی نہیں لگا ———" مشاعرے میں تقریباً مہینہ بھر باقی تھا۔ حضرت نے روزانہ ایک غزل اسی زمین میں کہہ کر نواب صاحب کو سنانے کا معمول کر لیا۔ اکیسویں روز جب یہ مطلع پڑھا۔

جس غنچہ لب کو چھیڑ دیا خندہ زن ہوا
جس گل پہ ہم نے رنگ جمایا چمن ہوا

تو خلد آشیاں نے کہا "حضرت ہم غریبوں کے لئے بھی تو کچھ کہنے کو چھوڑ دیجئے"۔ حضرت مسکرائے اور سلسلہ ترک کر دیا۔ مگر بعد کو ریاض کے استفسار پر کہا ——— "بخدا اگر نواب نہ روک دیتے تو مشاعرے کے روز تک اسی طرح غزلیں کہتا رہتا"۔

ان کی استادی محض تقاضائے زمانہ تھی۔ جوہر کامل رکھتے تھے جس فن کو لیا پانی کر دیا۔ اس عہد میں شعر کہنا شرفا کا شعار اور وقار تھا۔

انہوں نے بھی اس کو اختیار کیا اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اپنے معاصرین میں سے کسی سے دب کے نہ رہے۔ داغ کی شعلہ بیانی مسلم، جلال کی تحقیق و تلاش سر آنکھوں پر، مگر امیر مینائی نہ شعلہ بیانی میں کسی سے کم تر نہ تحقیق و تلاش میں کسی کے دریغ، اور پھر جس صنف سخن کو چھوا، اپنے عہد کے اعتبار سے اُس کو ممتاز و منفرد کر دیا۔ ان کے سے قصائد نہ داغ کے دیوان میں ملتے ہیں نہ جلال کے کلیات میں اور نعت گوئی کا امتیاز اس کے ماسوا ——— ہے کوئی ان کا سا کامیاب و مقبول قادر الکلام اُن کے عہد میں ——— جلال و داغ کے لئے صرف اُن کی شاعری اُن کی ناموری کا سرمایہ تھی، امیر مینائیؒ سے شاعری کا طرۂ امتیاز چھین لیا جائے تو بھی وہ نامور رہیں گے۔

اُن کے ذوق و استعداد مکتوب نگاری سے اُن کے دو فاضل شاگردوں، ثاقب [illegible] اور [illegible] کی سعادت مندانہ محنت و صنعت کے طفیل، اہل ذوق اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔ مگر کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سرزمین لکھنؤ کا یہ نامور سپوت گردونِ تذکرہ نگاری کا بھی ایک تابناک ستارہ ہے، اور جیسے میر تقی میر کا تذکرۂ نکات الشعراء فارسی زبان میں اردو شعراء کے متعلق پہلی مستند تصنیف ہے، امیر مینائیؒ کا تذکرۂ انتخاب یادگار غالباً بزبان اردو، شعراء کا ایسا پہلا تذکرہ ہے جس کو مشاہیر اردو شعراء کے منجملہ ایک فرد فرید نے خود مرتب کیا تھا۔ اس تذکرے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عربی، فارسی، اردو اور بھاشا، چاروں زبانوں کے سخنوروں کا حال مرقوم ہے۔

انہوں نے بماہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۰ء (۷۲) سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس طرح سن کے لحاظ سے وہ عمر طبعی کو پہنچ کر مرے، مگر دکن پہنچتے ہی بیمار ہو جانے اور پھر باوجود ہزار علاج ایک مہینے میں وفات پا جانے سے اُن کے انتقال کے بارے میں بہت سے لوگ آج تک خلجان میں مبتلا ہیں۔ یہ خلجان بے جا ہے اور اُن کی موت اُن کی عمر کی طرح بالکل طبعی تھی۔ ہاں یہ بعض مسائل اور محاوروں کے اعتبار سے اُن کی جگہ آج تک خالی ہے۔ اردو زبان و ادب کے سدا بہار چمن میں، جہاں لالہ و گل کی رنگینیاں اور طوطی و بلبل کی زمزمہ آفرینیاں دیکھی نہیں جاتیں، گلچیں و صیاد قریب سے آتے جاتے رہتے ہیں، وہاں نظر باغبانوں کا گزر بیشتر تو نادر رہا ہے، اچھی سے اچھی گل گشت نظر آسان ہے، لیکن چمن کی آبیاری آسان نہیں، اچھی کو سینچنے کے لئے خون دل صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے جو فکر و شعور، علم و فضل کی کسوٹی پہ ذی کمال حیات ہیں، اُن کی کاوش سے شجر اردو کا پروان چڑھنا معلوم ———

امیر مینائیؒ اپنے عہد کے افاضل میں تھے، زبان دانی اُن کی میراث تھی، علم و فضل اُن کا سرمایہ، اور ان دونوں کے امتزاج صحیح نے اُن کی پاکیزہ ہستی میں زبان اردو کی لغت تیار کرنے کے لئے سب سے موزوں اور مستند محقق کو پا لیا تھا۔ متقدمین کا لفظ میں نے بالقصد استعمال کیا ہے۔ امیر مینائیؒ نے امیر اللغات میں اردو کے تمام اساتذہ کے کلام سے سندیں شعر دئے، مگر اپنا ایک شعر بھی پیش نہیں کیا۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے اُن سے ایک بار دریافت کیا کہ "منشی صاحب! جب آپ نے داغ و جلال، امیر و تسلیم کے اشعار سے سند لی ہے تو اپنے اشعار سے استناد میں کیا بات تھی، استادی اور استناد میں تو آپ کا پایہ ان سب پر بھاری ہے؟" حضرت نے فرمایا کہ "ایسا کرنے میں کبر کا پہلو پیدا ہوتا تھا، اور میری اپنی دانست میں یہ بات تقاضائے دیانت کے بھی خلاف تھی کہ میں خود ہی ایک لفظ کے معنی و محل استعمال کی صراحت کروں اور خود اپنے ہی شعر یا مصرعے سے اس کا ثبوت بہم پہنچاؤں ———"

ہم سایہ بھی رہ چکا ہوں، پھر اُن کی اولاد معنوی ہوں، اس لئے مجھ کو یہ بات کہتے ہوئے تامل ہوتا ہے، لیکن دیانت کے ساتھ جو رائے قائم ہو اس کو بیباکی سے بیان نہ کرنا بھی حق گوئی کی توہین ہے۔ میری دانست میں اُن کے بعد سے اب تک، زبان اردو کو ان سے اچھا یا ان سا یگانۂ عصر بھی، لغت کے کام کے لئے نہیں ملا اور یہی باعث ہے کہ میں اُن کی وفات اور ان کے بعد، معنوں کو طبعی مانتے ہوئے فطری نہیں اپنی نظر سے بھی اب تک اُن کا ماتم گسار ہوں۔ لغت کے شعبے میں اردو زبان، فرہنگ آصفیہ، نور اللغات، اور انجمن ترقی اردو کی ڈکشنری کی موجودگی کے باعث تہی مایہ نہ سہی، مگر اس کی کم مائیگی پر کسی صاحب نظر کو کلام ہو سکتا ہے اگر وہ پچھلی آدھی صدی میں اردو زبان و ادب کی اس [illegible]

اور لائق مشاہیر کے گل ہائے وجود سے مالا مال رہا ہے۔ محقق، شاعر، ادیب، سبھی اس آسمان پر جلوہ گر ہوئے۔ شبلی، نذیر احمد، نظم طباطبائی جیسے اہل علم و تحقیق، حالی، اکبر، اقبال، چکبست، اصغر، فانی، ریاض، جگر، جلیل، سیماب سے خوش بیان شعرا، آزاد، مہدی الافادی، رشید، عبد الماجد، سلیمان ندوی، نیاز فتحپوری، ابو الاعلیٰ مودودی، جیسے ادیب، کون سی زبان اور کون سا ادب ہے جو ان پر فخر نہ کرے، اور پھر ان سب کے آخر میں لیکن اُردو کی خدمت کی لگن میں سب سے اوّل بابائے اُردو مولوی عبدالحق انجمن ترقی اُردو ——— جن کے بارِ کرم و احسان سے اُردو سر نہیں اٹھا سکتی ——— مگر ان میں سے کسی نے تالیف لغت اُردو کے سنگ گراں کو چھونے کی جرأت کی؟ ایک لغت کے کام کو سمیٹنے کے لئے بڑا دل گردہ چاہئے اور وقار، عزم و استقلال، بحر آشام جذبۂ تحقیق و جستجو، بے پناہ تبحر علمی، بالغ نظر، اصابت فکر

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے لغت داں

امیر مینائیؒ میں یہ عناصر حیات بڑی حد تک یکجا تھیں۔ اُردو، فارسی، عربی، بھاشا، سنسکرت، ان زبانوں کے وہ عالم تھے۔ نجوم، رمل اور جفر ——— عروض، موسیقی ——— ان فنون کے وہ ماہر تھے۔ مرآۃ الغیب و [illegible] انہی کی تصانیف ہیں۔ ست سئی بہاری کی شرح کے مصنف وہی ہیں اور واجد علی شاہ کی تصنیف نغمۂ قدسی پر شرح صوت المبارک کے نام سے حواشی انہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ فلسفہ، حکمت، طب، ان علوم کی انہوں نے تکمیل کی تھی۔ تفسیر، حدیث اور تصوّف کے بحرِ ذخار میں ان کا مقام شناوری مسلّم ہے۔ ان کے بعد ان جیسا جامع کمالات مشاہیر اُردو کی صف میں ڈھونڈے نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے اُردو کے بہی خواہ ان کی وفات کو بے وقت کہیں تو بے جا نہیں۔ امیر اللغات کا جس قدر کام انہوں نے پورا کر لیا تھا اس میں سے صرف ایک جزو دو جلدوں کی شکل میں شائع ہوا ہے مگر ؎

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

اہل نظر اس سے مؤلف و مصنف کے مرتبہ و مقام کو پہچان سکتے ہیں۔ امیر اللغات کے بعد سے کوئی لغت اس پیمانے اور اس معیار کا آج تک نہ ہو سکا، اور سچ پوچھئے تو یہ کام ایک شخص کے بس کا ہے بھی نہیں۔ خود امیر مینائیؒ کے زمانے میں باقاعدہ طور پر دفتر امیر اللغات قائم تھا اور ایک ادارے کی صورت میں وہاں کام ہوتا تھا۔ آہ، داغ، جلیل، شوق قدوائی، یہ تو مشہور نام ہیں، ان کے سوا بھی ایک خاصہ بڑا عملہ اس پر کام کرتا تھا۔ پھر بھی نہ کام کی مقدار حسبِ دلخواہ ہوئی نہ کام کا معیار۔ بس امیر مینائیؒ کی تنہا ذات تھی جس کے تبحرِ علمی اور پاکیزہ نفسی کے بل بوتے پر اور سچی بات یہ ہے کہ ریاست رام پور کی معارف پروری سے یہ ناؤ اتنی مدت تک چلی۔ خلد آشیاں کے مرتے ہی ڈگمگانے لگی اور امیر مینائیؒ کے پردہ کرتے ہی ڈوب گئی ؎

"خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود"

میری رائے میں امیر اللغات ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، جس کی آب و تاب کو ناتمامی کا داغ اور نصف صدی کی ترقیاں بھی ماند نہیں کر سکیں، اسی لئے میں نے اس کے بیان کو ان کے تذکرے میں زیادہ جگہ دی ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی

مولوی محمد اسلم سیفی

مولانا اسمٰعیل میرٹھی کا زمانۂ حیات ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء تا یکم نومبر ۱۹۱۷ء تھا۔ عیسوی حساب سے ۷۳ اور ہجری حساب سے ۷۵ سال ہوتی۔

اُن کی پیدائش شہر میرٹھ میں ہوئی جہاں ان کے والد نے جولائی ۱۸۴۴ء میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ محلہ مشائخاں کہلاتا تھا۔ اب اس کا نام اسمٰعیل نگر ہے۔ یہ نام کی تبدیلی شہری بلدیہ کی طرف سے عمل میں آئی ہے۔

جب مولانا کا خاندان قصبہ لاوڑ سے یہاں آکر آباد ہوا تو میرٹھ کی آبادی آج کل کے مقابلہ میں ایک چوتھائی تھی۔ اکثر عزیز اور اقارب اور اہل برادری اسی محلہ میں سکونت رکھتے تھے۔ ایک اوسط درجہ کا خاندان تھا جس کے پاس کچھ زمینداری بھی تھی۔ اس زمانہ کے لوگ جب کہ انگریزوں کے تسلط کو ۸۰ سال گزر چکے تھے خاموش زندگی کے عادی تھے۔ پرانے دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم مکاتب میں ہوا کرتی تھی۔ اسمٰعیل کے بڑے بھائی تو ایک ریاست کے ملازم تھے اور مجھلے درس و تدریس کا شغل رکھتے تھے۔ ابتدائی کتابیں ان سے پڑھ کر مرزا رحیم بیگ کے مکتب میں جا داخل ہوئے۔ ان کے والد بہت خاموش اور کم آمیز بزرگ تھے اور اپنے تئیں شہری ماحول میں اجنبی تصور کرتے تھے —— بچپن کے ماحول کا اور اس وقت کی زندگی کا کچھ پتہ نہیں لگتا۔ مولانا اسمٰعیل کی یہ مخصوص صفت دیکھنے میں آئی ہے کہ جو کام کرتے تھے اس پر کامل توجہ دیتے تھے۔ چنانچہ فن خطاطی ایک استاد کامل سے سیکھا اور خود بھی اس میں کمال حاصل کیا۔ مرزا رحیم بیگ فارسی کے مشہور استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا کو بھی فارسی زبان میں دلچسپی انہی کی صحبت میں حاصل ہوئی۔ اُن کے فارسی کلام کی خوبی ان نظموں سے ظاہر ہوتی ہے جو کلیاتِ اسمٰعیل میں درج ہیں۔ مثلاً مثنوی [illegible] اور بہت سی فارسی نظمیں بھی ہیں، غزلیں، قصائد اور قطعات ہیں۔

مئی ۱۸۵۷ء کو ہولناک غدر کا واقعہ پیش آیا۔ اس کی ابتدا میرٹھ ہی سے ہوئی۔ اس وقت اسمٰعیل کی عمر ۱۳ سال تھی۔ اس ہنگامہ کی اہمیت کو کچھ کچھ سمجھ سکتے تھے۔ بہرحال اس کے اثرات کا تذکرہ زبان زد خاص و عام رہا۔ اسی زمانہ میں نارمل اسکول میرٹھ میں قائم کیا گیا تھا۔ اس میں پرائیویٹ طالب علم بن کر ایک سال تعلیم پائی۔ چند شفیق اساتذہ سے مستفید ہوئے۔ خاص کر علم ہندسہ کے استاد سے۔

جو حالت میں نے مشاہدہ کی اس وقت مولانا کی عمر ۷۰ سال کی تھی۔ ایک نہایت متین اور خاموش بزرگ شخص معلوم ہوتے تھے۔ گھر میں کتنا ہی بچے شور و غل مچائیں، خواہ عزیز و اقارب مرد اور عورتیں جمع ہو جائیں اور پوری بلند آوازی سے بات چیت ہوتی ہو مگر وہ سر کے نیچے ہاتھ رکھے

ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر چپ سے بیٹھے رہتے۔ یہی حالت آگرے کے قیام میں ۱۹۲۵ء سے دسمبر ۱۹۳۵ء تک مشاہدہ میں آئی۔ خاندانی احباب سے ملاقات کے شائق نہ تھے۔ کسی موقع پر ملاقات ہو جائے تو ہو جائے۔ کبھی مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ اس دس سال کے زمانے میں اور اس کے بعد کا زمانہ ۱۰ سال کا [illegible] پنشن کے بعد کا میرے علم میں گزرا، وہ زندگی بھی نہایت خاموش تھی۔ جب لوگ ان کو کسی پبلک میٹنگ کی شرکت کے واسطے دعوت دیتے مثلاً فیض عام اسکول کے واسطے کوشش یا اور طریقے کی شرکت تو وہ شرکت فرما لیتے۔ مگر جو کام کرتے نہایت اخلاص کے ساتھ کرتے۔ شہرت اور ناموری کے پاس بھی نہ جاتے تھے۔ آثار سلف اس قدر بلند پایہ نظم ہے مگر وہ لکھ کر بھی ان کے بستے کی زینت رہی۔ یہ وہی نظم ہے کہ جس کے شائع ہونے پر سینکڑوں خطوط اطراف ہند سے ان کے نام آگرے کے قیام میں آئے تھے۔

کچھ رسالے فارسی زبان کے مدارس کے طلبہ کے واسطے لکھے تھے۔ ایک سرکاری اشتہار کی تعمیل میں ایک اخلاقی قصہ "طلسم اخلاق" کے نام سے لکھ کر پیش کیا۔ اس پر دو سو روپیہ انعام ملا۔ ان کا ایک خاص طرز تحریر ہے کہ مضمون نثر میں کچھ اشعار بھی حسب موقع لکھ دیتے ہیں۔ یہ بات اور تحریروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ذاتی اخلاق ایسا تھا کہ جو ملتا تھا وہ گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ملنے والوں کا یہ حال تھا کہ ان سے جاہ و مرتبہ، دولت و ثروت میں کتنے ہی بلند پایہ کیوں نہ ہوں ان کے ساتھ ادب سے پیش آتے تھے۔ ان کے شاگردوں کا حال تو یہ ہوتا تھا کہ پروانوں کی طرح ان کی خدمت پر دوڑتے تھے۔ میں نے ایک بار دیکھا کہ جب وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے تو یک بیک ہیڈ ماسٹر صاحب کھڑے ہو گئے اور جب تک مولانا نے بات چیت کی (اتفاقاً وہ بہت مختصر تھی) ہیڈ ماسٹر صاحب کھڑے ہی رہے۔ ایک ہیڈ ماسٹر ترقی کر کے انسپکٹر آف اسکولز ہو گئے اور میرٹھ بھی آ گئے۔ اکثر ملنے کے واسطے آتے تھے اور اصلاح نظم پر ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔

میرے دیکھنے میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ انہوں نے کسی سے جھگڑا اٹھایا ہو۔ ایک بار ان کے آگرے کے ایک ہم عصر پنڈت بنسی دھر کے لڑکے نے ان پر اس بات کا دعویٰ کر دیا کہ ان کی مشہور اردو زبان کی کتابوں کے حق تصنیف میں پنڈت جی بھی شریک تھے اور یہ مقدمہ میرٹھ کی عدالت میں ہوا۔ بالآخر فیصلہ مولانا کے حق میں ہوا۔ اگرچہ وہ بڑے نقاد تھے مگر معترضانہ تنقید پسند نہیں کرتے تھے کہ جس کی بنا پر بحث کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان کی زندگی پر سب سے بڑا اثر ان کے پیر و مرشد مولانا غوث علی شاہ قلندر قادری قدس سرہ العزیز کی ذات بابرکات تھی۔ ۱۸۸۰ء یا ۱۸۸۱ء میں وہ ملاقات سے مشرف ہوئے اور دس سال تک مستفید ہوتے رہے۔ شیخ کے اشارہ پر ۴۰ رباعیاں لکھیں۔ شیخ کے وصال پر ترکیب بند اردو میں اور مثنوی درد آخر فارسی میں لکھی۔ چند اور فارسی کے قطعے بھی اسی سلسلہ میں لکھے۔ شیخ کے وصال کے بعد جب تذکرۂ غوثیہ کی تدوین کا خیال مولانا شاہ گل حسن رحمۃ اللہ علیہ کو ہوا تو اس کتاب کو جامہ زبان پہنایا۔ یہ ان کی نثر کا پہلا اور نہایت دلفریب نمونہ ہے۔

غزل گوئی میں چونکہ حکمت و فلسفہ کے مضامین کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ یہی امتیاز ان کی نظموں میں نمایاں ہے۔ وہ قوم کی پست حالت دیکھ کر بہت متاثر تھے۔ اپنی نظموں میں جابجا یہ مضمون بہت زور و شور کے ساتھ لائے ہیں۔ مرثیہ سید کے نام سے ایک نظم جس کی ترکیب مرثیہ ہے ۱۸۹۸ء میں لکھی اور دوسری بانگ دہل اور تیسری مسلمان اور انگریزی تعلیم ہے۔ یہ سب نظمیں کلیات میں ہیں۔ مولانا کی زندگی پر تصوف کا رنگ آخر وقت تک غالب رہا۔

کچھ پتہ نہ لگا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب سے تلمذ کس طرح حاصل ہوا۔ مگر خود اس کا نہ صرف اقبال کیا بلکہ استاد کی زمین میں کافی غزلیں لکھیں اور ان کا ذکر بھی کیا کرتے تھے۔

اہل و عیال اور دیرینہ احباب کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے اور مالی امداد بھی در پردہ کیا کرتے تھے۔ خفگی کا اظہار یا ترش کلامی کبھی نہیں کرتے تھے۔ اگر بہت ناراض ہوئے تو کلام کو ترک کر دیتے تھے۔ بہت سے مسودے ان کے میرے پاس ہیں۔ جن میں ایک میر تقی میر کی کلیات کا انتخاب ہے۔ اور اسی طرح اپنے مشہور استاد کے کلام کا بھی۔

میں ان کے نقوش میں سب سے بڑا نقش یہی جانتا کہ وہ ہر وقت کام کرتے رہتے تھے اور کبھی دعویٰ استادی نہیں کیا۔

قول کہ شعرا اگر اصلاح لینے کے واسطے آتے تو انکار کر دیتے۔ ایک واقعہ یاد آگیا۔ مولانا قدرت میرٹھی جو اس زمانہ میں مرتبہ استادی رکھتے تھے، خاص کر صنفِ غزل گوئی میں، ایک بار مولانا کی خدمت میں آئے اور فنِ سخن میں مشورہ چاہا۔ انہوں نے انکار کیا مگر قدرت کے اصرار پر پوچھا کہ اچھا پہلے جنس کا مزا یا الگ کر لاؤ پھر جانیں گے۔ یہ تحفہ مولانا قدرت نے خود بھیج دیا۔ دوسرا لکھا گیا تو بھی مشورہ نہیں ہوا۔ اس کا اظہار ان کے قصیدۂ مجوزہ عبرت سے خوب ظاہر ہوتا ہے۔ مگر دوسرے اشعار میں بھی نمودار ہے۔ وہ شاگرد اپنے ہم عصروں میں بہ لحاظ فیض بھی بہت کامیاب رہے ——— یعنی کسی استاد کو اپنے کلام کی اشاعت سے اتنی منفعت حاصل نہیں ہوئی جتنی انہیں۔ مگر جب وہ دولت مند ہو گئے تھے آخر وقت تک کبھی بھی اپنی وضع نہیں بدلی۔

نقاش سے عمل ہے، کہ ہر نقش نمایاں　　ہیں نقش ہی جلوہ گری کے اوصاف
ہر شے میں عیاں ہے اوصافِ وحدت　　گر وہمِ دوئی دور ہو تو ہے مطلع صاف

اس عقیدہ کو بار بار طرح طرح سے ظاہر کیا ہے اور عمل کی ترغیب دی ہے۔ خود اس پر کاربند تھے۔

جس وجہ ہو مشکلات کی طغیانی　　ہو اہلِ ہمم کو اور بھی آسانی
تیراک اپنا ہنر دکھاتا ہے خوب　　ہوتا ہے جہاں بحر سے اونچا پانی

۱۹۱۰ء کے شروع میں نواب اسد اللہ خاں رئیس میرٹھ کی کوٹھی پر ایک جلسہ منعقد ہوا۔ سوال یہ تھا کہ ذی جنگی کے موقع پر نواب وقار الملک کو میرٹھ آنے کی دعوت دی جائے تاکہ مسلم یونیورسٹی کے واسطے اس موقع پر چندہ فراہم ہو سکے۔ ایک بزرگ سادہ ملبوس میں سر پر ترکی ٹوپی، عمر ۷۰ سال، قد سے ضعیف معلوم ہوتے تھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ کل حاضرین تعظیم کے واسطے کھڑے ہو گئے۔ جلسہ میں تجویز پیش ہوئی کہ تمام سربرآوردہ حضرات اس موقع پر یونیورسٹی کا مطالبہ مناسب نہیں خیال کرتے۔ اس پر ان بزرگ نے ذرا تیز لہجہ میں جواب دیا کہ تمام معززینِ شہر کی خواہش ہے کہ یہی موقع مناسب ہے۔ اس پر سربرآوردہ حضرات خاموش رہ گئے اور یہی رائے پسندِ خاطر رہی۔ یہ مولانا اسمٰعیل تھے۔

انہوں نے ۴۰ سال کی ریسرچ کے بعد جو نصاب اُردو طلبہ کے واسطے مرتب کیا تھا وہ آج تک مقبولِ خاص و عام ہے۔ اسی سے ان کا نام اب تک روشن ہے۔ یہ ادبی خدمت ان کی یاد کو تازہ رکھے گی۔

سر تیج بہادر سپرو

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

بیسویں صدی کے آغاز میں الہ آباد متحدہ ہندوستان کی زمین پر ایک آسمان بنا ہوا تھا۔ متعدد ممتاز ہستیاں مختلف مصلحتوں کی وجہ سے درخشندہ ستاروں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ پنڈت مدن موہن مالوی، پنڈت موتی لال نہرو، سی وائی چنتا منی، اکبر کی شہرت سے تمام ہندوستان گونج رہا تھا۔ وکالت، سیاست، صحافت، ادب چاروں عناصر یہاں کے عوام و خواص کو اپنا گرویدہ بنائے تھے اور یہ متعدد ہستیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ سارا ملک ان کی رہنمائی میں آگے بڑھ رہا تھا۔ پنڈت مدن موہن مالوی قومی سیاسی و سماجی ذہنیت کا مرقع سمجھے جاتے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو اول اول اپنی وکالت کی وجہ سے مشہور ہوئے اور پھر بعد میں سیاسی رہنما بن کر سامنے آئے، سی وائی چنتا منی بحیثیت صحافی کے بے نظیر دل و دماغ کے مالک سمجھے گئے۔ اکبر اپنی مزاحیہ شاعری کا سہارا لے کر دلوں سے خراج تحسین وصول کرنے لگے۔ تیج بہادر سپرو نے یہاں سیاست میں کم عدالت میں زیادہ نام پیدا کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء میں وہ وائسرائے کے یہاں مشیر قانون بنائے گئے۔ اس وقت کے لحاظ سے یہ اقتدار ایک ہندوستانی کے لئے معراج سے کم نہ تھا مگر اس عہدہ پر وہ زیادہ دن تک نہ رہ سکے۔ اختلافات وغیرہ سے ڈیڑھ دو سال کے بعد اسے بھی ترک کر کے پھر الہ آباد ہائیکورٹ میں وکالت شروع کی۔

تیج بہادر سپرو اسی شہر کے باشندے تھے جہاں مولوی نذیر احمد پیدا ہوئے تھے، بجنور سے۔ مگر ۱۸۹۶ء میں انھوں نے الہ آباد میں قیام کیا اور یہ سرزمین ایسی پسند آئی کہ مرتے مرتے اس کا چھوڑنا گوارا نہ ہوا یہاں تک کہ ۱۹۴۹ء میں یہیں انتقال ہوا۔

کشمیری یوں بھی ترقی یافتہ تہذیب کے گرویدہ ہوتے ہیں لیکن تیج بہادر سپرو میں اس کا لگاؤ عشق کے درجہ تک تھا۔ وہ مسلمانوں کی طرز معاشرت، نشست و برخاست، زبان و تاریخ سے بیحد دلچسپی رکھتے تھے۔ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا سب کچھ اسلامی تہذیب کا مرقع تھا۔ چنانچہ ان کے یہاں ایک باورچی مسلمان ضرور رہتا اور وہ طرح طرح کی چیزیں اپنے دسترخوان پر دیکھنا چاہتے تھے جو نوابوں یا مسلمان رؤسا کے یہاں ہوتی تھیں۔ غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ اردو زبان سے بے پایاں محبت کرتے تھے یہ شغف اتنا زیادہ تھا کہ وہ اردو کی کسی برائی کو سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ وہ اتنی شستہ اور پاکیزہ اردو بولتے تھے کہ میں نے کم لوگوں کو اس زمانہ میں اتنی اچھی اردو بولتے سنا ہے۔ شام کو روز مرہ ان کے یہاں دربار ہوتا تھا اس میں خاص خاص لوگ شریک ہوتے تھے اس جلسہ میں عموماً اردو الفاظ، محاورات، شعر و شاعری پر گفتگو ہوتی تھی ان کی رائے اور سوجھ بوجھ ہمیشہ قابل احترام ہوتی تھی۔

اردو کے مشہور شعرا جو بھی الٰہ آباد آتے وہ ایک وقت تیج بہادر کے مہمان ضرور ہوتے تھے اور وہ کلام سن کر جو داد دیتے تھے اس سے یہ یقین تھا کہ وہ نکات شعری سے کما حقہ واقف ہیں۔ پورے انہماک و گہرائی سے شاعر و شعر کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ کبھی کسی شاعر پر اعتراض بھی کرتے تو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ، چونکہ خود ان کا انداز گفتگو نہایت دلکش تھا اس لئے سخت سے سخت اعتراض بھی لہجے کے لحاظ سے ناگوار نہ ہوتا۔

اردو سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ جب مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو علاوہ اور اطبا کے ایک وید صاحب بنارس سے علاج کے لئے بلائے گئے۔ معالج نے سخت ہندی میں ان سے گفتگو شروع کی۔ سپرو کو یہ زبان سوہان روح معلوم ہوئی، نہایت بیباکی کے ساتھ کہہ دیا کہ نہ میں آپ کی زبان سمجھتا ہوں نہ آپ میری زبان سمجھ سکیں گے، آپ تشریف لے جائیے چنانچہ وید صاحب کو مجبوراً واپس جانا پڑا۔ ممکن تھا کہ ان کے علاج سے فائدہ ہوتا مگر زبان کی تلخی سے زیادہ ان کو کوئی مرض بھی تکلیف نہیں دے سکتا تھا۔ انھوں نے مر جانا گوارا کیا مگر محض زبان کی اجنبیت نہ گوارا کی۔ انھوں نے اردو سے اپنی محبت کا اظہار ایک انجمن کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہا تھا چنانچہ ایک ادارہ کی بنیاد "انجمن روح ادب" کے نام سے قائم کی، اس کے واسطے روپیہ بھی فراہم کرنا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑی مدت میں چالیس پچاس ہزار کی رقم جمع بھی کر لی تھی جو آج تک بینک میں اسی انجمن کے نام سے جمع ہے مگر حالات کچھ ایسے ناسازگار ہوئے کہ یہ انجمن وہ صورت نہ اختیار کر سکی جس کی ان کو تمنا تھی۔

ہندوستان میں کم ہی لوگ ان کی قانونی قابلیت کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں چنانچہ انھوں نے جتنا روپیہ کمایا کم ہی وکلاء نے اتنا کمایا ہوگا مگر ان کا خرچ اتنا شاہانہ تھا کہ خرچ ہونے کے بعد کوئی قابل ذکر رقم نہ بچ سکے۔ اس طرح ہی دوسروں سے سلوک کرنے کی بھی عادت تھی اور یہ سلوک بغیر کسی مذہب و ملت کے امتیاز کے تھا۔ میرے ایک کرم فرما قاضی مسعود حسین صاحب ایڈووکیٹ جو اب بھی الٰہ آباد ہائیکورٹ کی نمایاں شخصیتوں میں ہیں وہ تیج بہادر سپرو کے نہایت خاص لوگوں میں سے ہیں ان کا کہنا ہے کہ مجھ کو تو اور لوگ بھی دیکھنے کو ملے ہیں مگر تیج بہادر سپرو کی یہ خصوصیت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی کہ وہ سلوک کر کے اس شخص سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے کہ کسی پر یہ راز ظاہر نہ ہو جائے۔ یہ وہ شریفانہ جذبہ ہے جس کی قدر ہر شریف آدمی کرتا ہے۔

تیج بہادر سپرو کی شہرت قابلیت کے علاوہ دیانت داری کی وجہ سے بھی تھی۔ مثال کے لئے اس وقت کو یاد کرنا کافی ہے کہ جب وہ الٰہ آباد میں پہلے پہل وکالت کے لئے آئے تو ان کا کہنا تھا کہ سات سال تک مجھے ہائیکورٹ میں کوئی مقدمہ نہیں ملا اس لئے کہ دلالوں کو میں نے کبھی منہ نہیں لگایا۔ باوجود اس کے کہ میری مالی دشواریاں بڑھتی جاتی تھیں مگر میں نے کبھی ایمانداری اور وکالت کی سطح کو نیچے نہیں ہونے دیا۔ ان کی روزمرہ کی گفتگو اور عملی زندگی بھی ہر شخص کو یہ محسوس کرنے پر مجبور کرتی تھی کہ وہ نہایت ایماندار اور با اصول آدمی ہیں۔

تیج بہادر سپرو نہایت حساس اور نازک مزاج آدمی تھے۔ عام طور سے مشہور تھا کہ ان کا مزاج شاہانہ ہے وہ ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں تو پھر بڑا ساتھ دیتے ہیں اور ذرا سی بات پر خوش ہو جاتے تو ہر قسم کی بخشش کے لئے ان کو آمادہ سمجھئے۔ باوجود احباب پرستی و دربارداری کے وہ اپنے مطالعہ میں کبھی فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ ہمیشہ کوٹھی کے برآمدے میں سوتے تھے۔ وہیں چار بجے صبح لیڈر اخبار آ جاتا تھا اور وہ پڑھنا شروع کر دیتے تھے پھر قانونی کتابوں اور کاغذات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ہائیکورٹ کا وقت آ جاتا تھا۔ وہاں کی بحث و مباحثہ سے فراغت کے بعد گھر آ کر ناشتہ وغیرہ کر کے ادبی و علمی کتابوں سے دن بھر کی کوفت دور کرنے کی کوشش کرتے۔ لوگ آتے رہتے وہ ملتے رہتے باتیں کرتے رہتے اور موقع ملتا تو پھر کتاب زیر نظر کا مطالعہ شروع ہو جاتا اکثر ایسا ہوتا کہ روز تو آنے والوں کو بھی کتابیں اٹھا کر دے دیتے کہ پڑھئے دیکھئے کتنی اچھی کتابیں ہیں۔ اس طرح صحبت کو بغیر بے لطف کئے ہوئے خود بھی مطالعہ کرتے اور بات کرنے والوں کو بھی چپ کرا دیتے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی تھی صحت خراب ہوتی جاتی تھی مگر باوجود علالت کے بھی مزاج کی شگفتگی کبھی نہ گئی۔ کبھی کبھی دوست احباب ان کو رائے دیتے کہ حضور آپ کچھ ورزش کیا کیجئے تاکہ صحت قائم رہے تو ہنس کر جواب دیتے کہ "اللہ نے مجھے ہر طرح کی راحت دی ہے میں اپنے پر ایک قید ورزش کرنے کی کیوں بڑھا لوں۔ خواہ مخواہ کی یہ زحمت اختیار کروں کون سی عقلمندی ہے۔ رہا صحت قائم رہنے کا سوال سو وہ خود ہی قائم رہے گی۔ خدا داد چیز ہے خدا خود اس کی

حفاظت کرے گا۔"

تیج بہادر سپرو علامہ اقبال کے خاص طور سے معتقد تھے۔ ان کی شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ جب کبھی لاہور جاتے تو اقبال سے ضرور ملتے وہاں سے آ کر ان کی باتیں بڑی دلچسپی لے کر بیان کرتے۔ کہتے تھے کہ سچ پوچھو تو ہم اور اقبال ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں۔ وہ اصلاً کشمیری اور برہمن بھی' اور حسن اتفاق سے نسل کے لحاظ سے اقبال بھی سپرو ہیں اس لئے سمجھا یہ جاتا ہے کہ ہم اور وہ ایک ہی ہیں مذہب نے جدا کر دیا ہے مگر میرے نزدیک اس حقیقی رشتہ کو کوئی مذہب دور نہیں کر سکتا۔

تیج بہادر عرصۂ دراز تک بیمار رہنے کے بعد جنوری ۱۹۴۹ء کو ۷۴ سال کی عمر میں الہ آباد میں دنیا کو چھوڑ گئے۔ اولاد کے لحاظ سے بھی وہ خوش قسمت رہے دو لڑکیاں اور تین لڑکے ان کی اولاد کی فہرست مکمل کر دیتے ہیں۔ اولاد ذکور بھی قابل قدر ہے۔ آپ کے بڑے صاحبزادے پرکاش نرائن صاحب سپرو الہ آباد ہائیکورٹ کے جج تھے، دوسرے لڑکے آنند نرائن صاحب سپرو آئی۔ سی۔ ایس ہیں اور تریجوگی نرائن صاحب سپرو الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں لیکن باوجود قابلیت و کامیابی کے تیج بہادر سپرو کا کوئی نظیر نہ ہو سکا۔ سچ ہے ع

کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

لالہ سری رام دہلوی

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ

لالہ سری رام دہلوی، رائے بہادر مدن گوپال ایم اے بیرسٹر ایٹ لا کے فرزند اور رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب کے بھتیجے تھے۔ آپ دہلی میں ۲۸ دسمبر ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم دہلی اور لاہور دونوں مقامات پر ہوئی۔ ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم دہلی اور لاہور دونوں مقامات پر ہوئی۔ ۱۸۹۶ء میں آپ نے ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کیا اور جلد ہی آپ کا منصف کے عہدہ پر تقرر ہوا۔ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے اس ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ شعر و ادب کا شوق دامنگیر تھا۔ شاعر اور مخزن میں ادبی مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور کلام اپنا زمانہ طالب علمی ہی میں شائع کر چکے تھے۔ واقع دہلوی کے دیوان جناب داغ کے حقوق اشاعت بھی حاصل کئے اور داغ کے کئی غیر مرتب اشعار کو یکجا کرکے ضمیمہ یادگار داغ کے نام سے شائع کیا۔ مرزا محمد تقی بیگ مائل اور بہادر لال مشتاق شاگرد غالب کے دواوین کو بھی مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن فرشتۂ اجل نے مہلت نہ دی۔ کتابوں کو جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ ان کے ذاتی کتب خانہ میں عربی، فارسی، اردو اور ہندی کی ہزاروں نادر اور بیش قیمت کتابیں جمع تھیں۔ ان کے علاوہ سیکڑوں مخطوطات، پانچ سو تصاویر، اعلیٰ ترین خطاطی کے بہترین نمونے اور لاتعداد فرامین و شاہی دستاویزات ان کی وفات کے بعد بنارس ہندو یونیورسٹی کو بطور میراث دے گئے ہیں۔ تعصب یا بغض و عناد کی ہوا انہیں چھو تک نہ گئی تھی۔ نئے شاعروں کی دامے درمے سخنے مدد کرنا اپنا فرض جانتے تھے۔ ان کی مایۂ ناز تصنیف خمخانۂ جاوید کی پہلی جلد ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ ۵ مارچ ۱۹۳۰ء کو جب ان کی موت ہوئی، وہ اس کی چار جلدیں شائع کر چکے تھے۔ پانچویں جلد لالہ کیفی نے ان کی وفات کے بعد شائع کی اور کہا جاتا ہے کہ چھٹی جلد ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ضائع ہو گئی۔

میرے مراسم لالہ سری رام سے نہایت دیرینہ تھے۔ عرصہ تیس سال تک میں ان کی صحبت سے فیض یاب رہا۔ ۱۹۲۲ء میں بڑودہ کے مہاراجہ ہز ہائینس سیاجی راؤ گائیکواڑ کے ان بطور پرائیویٹ سکریٹری کے میری خدمات تفویض تھیں۔ مہاراجہ صاحب بنارس ہندو یونیورسٹی کے سابق چانسلر تھے۔ جلسۂ تقسیم اسناد کا خطبہ پیش کرنے کے لئے وہ بنارس گئے۔ گٹھیا (Gout) کا عارضہ انہیں پہلے سے تھا۔ وہاں

اس کا دورہ پڑا۔ حکیم اجمل خاں صاحب دہلی سے بلائے گئے۔ وہ میرے ساتھ ہی ٹھہرے۔ چار دن علاج جاری رہا لیکن خاص افاقہ نہ ہوا۔ حکیم صاحب کے مشورہ پر مہاراجہ صاحب اُن کے ساتھ دہلی چلے آئے۔ یہاں پرانی دہلی میں بیکانیر ہاؤس میں مقیم ہوئے۔ یہ جگہ مٹکاف ہاؤس (Metcalf House) کے قریب ہے۔ نزدیک ہی علی پور روڈ ہے۔ جہاں لالہ سری رام کی کوٹھی تھی۔ اس علاقے میں ان کی کئی اور کوٹھیاں بھی تھیں جو کرائے پر اٹھا کرتی تھیں۔ مہاراجہ صاحب کے ساتھ ان کا اسٹاف بھی آیا تھا۔ ان سب کے ٹھہرانے کے لئے جگہ کا سوال درپیش تھا۔ یہ مشکل لالہ صاحب کی مدد سے حل ہوئی اور اس طرح ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اب تک مجھے یاد ہے کہ لالہ صاحب سے ملتے ہی میں ان کی شخصیت سے گہرے طور پر متاثر ہوا تھا۔ وہ قدیم تہذیب و شرافت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ نہایت صاف و شستہ ٹکسالی اُردو بولتے تھے۔ خوش مذاق اور خوش مزاج تھے۔ باتیں کیا کرتے گویا پھول جھڑتے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں، میں ان کا گرویدہ ہوگیا اور ان کی دعوتوں پر ان کے ہاں آنے جانے لگا۔

لالہ سری رام مہاراجہ سے ملنے کا اشتیاق رکھتے تھے۔ مہاراجہ صاحب اپنے ترقی پسند خیالات کی وجہ سے کافی مقبول تھے۔ ان کی اعلیٰ انتظامی صلاحیت اور آزادی پسندی کا بھی شہرہ تھا جس کا مظاہرہ انہوں نے دہلی دربار ۱۹۱۱ء کے موقع پر کیا تھا۔ اس وجہ سے وہ ریاستوں کے حکمرانوں کے سرگروہ سمجھے جاتے تھے۔ ملاقات کا وقت میں نے مقرر کرا دیا۔ اس ملاقات سے لالہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ ان دنوں میرا بیشتر وقت لالہ صاحب کی پُرلطف صحبت میں بسر ہوتا تھا اور میں ان کی خوش مزاجی، شرافت نفسی اور مہمان نوازی سے پورا پورا بہرہ مند ہوتا رہا۔

لالہ سری رام کی یہ مستقل دعوت تھی کہ جب کبھی میں دہلی آؤں، ان کے پاس ٹھہروں۔ چنانچہ اس افتخار کو میں نے کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان کی زبان دانی اور خوش بیانی کا نقش میرے دل پر گہرا تھا۔ ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو ہوتی تھی اور عقل کا نچوڑ ہوتا تھا۔ دیدہ و دل دونوں ان سے شاداب ہوتے تھے۔ بہت کم لوگ میں نے ایسے دیکھے ہیں جن کے کلام و بیان میں ایسا چلتا ہوا جادو ہوتا ہے کہ سننے والا مسحور و محو و مستغرق ہو جائے۔ اس لحاظ سے لالہ سری رام کا نام سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر سچدانند سنہا اور سر راس مسعود کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ لاجواب خوش تقریر تھے۔ گفتگو کے وقت چھا جاتے تھے اور باتوں باتوں میں ایسے لطیفے اور چٹکلے چھوڑتے تھے کہ بات چیت باغ و بہار ہو جاتی تھی۔ بولنے کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی جادو بیانی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ پرانے سے پرانے واقعات اور چٹکلوں کو کچھ ایسے انداز سے پیش کرتے کہ وہ نئے اور پُراثر ہو جاتے تھے۔

افسوس ہے کہ دورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ دلکشیاں متروک ہوتی جاتی ہیں۔ اب نہ اگلی سی وہ صحبتیں ہیں اور نہ وہ صحبتیں گھنٹوں جمتی ہیں۔ لالہ صاحب شستہ ٹکسالی اردو میں باتیں کیا کرتے تھے۔ اپنے احباب اور واقعاتِ زندگی کی ایسی مکمل لفظی تصویر پیش کرتے تھے کہ ان کی قدرتِ زبان پر حیرت ہوتی تھی۔ بات بات میں اُردو کے برموقع اشعار موتیوں کی طرح ٹانکتے چلے جاتے تھے۔ ان کا حافظہ غضب کا تھا۔ اور ہزاروں اشعار ان کی نوکِ زبان پر تھے۔ اس لحاظ سے کسی کا شیوۂ گفتار میں ان سے میدان مارنا آسان کام نہ تھا۔

لالہ صاحب اعلیٰ خاندان سے تھے اور اس کا انہیں کافی احساس بھی تھا۔ اپنے بزرگوں میں راجہ ٹوڈرمل اور پیارے لال آشوب کا ذکر بڑے احترام سے کیا کرتے تھے اور وہ خطبہ بھی دکھایا کرتے تھے جو پیارے لال آشوب کو باشندگانِ دہلی نے پیش کیا تھا۔ اس خطبہ میں غالب کی لکھی ہوئی چند سطریں بھی درج ہیں جن میں غالب نے پیارے لال آشوب کی خدمات کو سراہا ہے۔ جہاں ایسا ذکر ہوتا، لالہ صاحب بڑے جوش و خروش سے اپنے حسب نسب، اپنے خاندان کی شہرت اور موروثی جاہ و اقبال کا ذکر کرتے تھے اور اس قسم کے افتخار نے انہیں معمولی اور چھوٹی چیزوں سے بے نیاز کر دیا تھا لیکن اسی نے ان میں احساسِ برتری اور تنگ دلی بھی پیدا کر دی تھی۔ دہلی کی مشہور ہستی حکیم اجمل خاں اور ان کے عزیزوں، ملاقاتیوں اور شہرہ

آفاقی انگلش شاعر اور ناول نگار کپلنگ سے اپنے مراسم اور تعلقات کا ذکر وہ بڑی مسرت سے کیا کرتے تھے۔ کپلنگ نے دہلی میں ان ہی کی کوٹھی میں قیام کیا تھا۔ صاحب ذوق مہمانوں کو لالہ صاحب اکثر وہ کمرہ اور اس میں رکھی ہوئی میز دکھاتے تھے جس پر کپلنگ لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتا تھا۔

لالہ سری رام اردو ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اپنی ملازمت تک کو انہوں نے اس پر قربان کر دیا تھا۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ منصب کے تھکا دینے والے فرائض انجام دے سکنے سے معذور تھے اور شعر و ادب کے گوشہ میں عافیت نشین ہو گئے۔ مصوری، خطاطی اور قلمی نسخوں کا جمع کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے، یہ تمام نوادر اب بنارس ہندو یونیورسٹی کی زینت بنے ہوئے ہیں جہاں لالہ صاحب سے ایک خاص شعبہ منسوب ہے۔

لالہ صاحب اردو زبان و ادب کے عاشقوں میں تھے۔ ان کی تصنیف خمخانۂ جاوید ایک یادگار کارنامہ ہے اور اردو ادب میں اس کی حیثیت انسائیکلوپیڈیا کی ہے۔ اس کی تالیف کے سلسلہ میں، لالہ صاحب نے کئی ادیبوں اور اہل قلم حضرات کو ملازم رکھا۔ پنڈت کیفی مہینوں ان کے یہاں مہمان رہے۔ اس فیاضی کا انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور لالہ صاحب کی وفات کے بعد بھی ان ہی کی کوٹھی پر مقیم رہے۔ پنڈت کیفی لالہ صاحب کے ادبی کاروبار کے حامل تھے۔ خمخانۂ جاوید کی تکمیل کے لئے وہ ایک کثیر رقم وقف کر گئے تھے لیکن بدقسمتی سے یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ملک اور ادب کے لئے یہ ایک ناقابل بیان نقصان ہے۔ لالہ صاحب کی وفات کے کئی سال بعد پنڈت کیفی نے خمخانۂ جاوید کی ایک جلد شائع کی لیکن پہلی جلدوں کے مقابلے میں اس کا رنگ ہلکا ہے۔ نہ وہ اگلا سا معیار ہے نہ ادبی چاشنی۔ خمخانۂ جاوید کی باقی جلدیں اب مکمل نہیں ہو سکتیں اور اس طرح لالہ صاحب کا وقف شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکا۔ کیفی صاحب مستقل طور پر لالہ صاحب کے ہاں رہتے تھے اور ان کے مشورہ سے خمخانۂ جاوید مرتب کرتے تھے۔ گوپی ناتھ امن کے بھتیجے گردھاری لال ادیب ان کے خاص معاون تھے لیکن افسوس کہ خانگی تنازعوں و لواحقان کی عدم دلچسپی سے لالہ صاحب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا اور ان کے وقف کا صحیح مصرف نہیں کیا گیا۔

لالہ سری رام دریا دل تھے لیکن ان کی سخاوت میں مصلحت کو بڑا دخل تھا۔ جو کچھ وہ دیتے اس کا بدلہ بھی چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر خرچ کے حساب میں وہ بڑی احتیاط برتتے تھے۔

ان کی عمر کے آخری سال بیماری کے رنج و غم اور درد و عذاب میں بسر ہوئے۔ خانگی تنازعوں نے ان کی خوشیوں کے سوتوں پر خاک ڈال دی تھی۔ اس دوران میں وہ ڈیڑھ دو برس سے مجھے نہایت طویل خط لکھا کرتے۔ یہاں وہ تبدیلِ آب و ہوا اور علاج معالجہ کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

ان کی شخصیت پیچ در پیچ تھی۔ تہذیب، شائستگی اور شرافت کا وہ نمونہ تھے ایک وضعدار ہندوستانی شریف کی تمام صفات ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ بڑی بڑی ہستیوں سے اور ہندوستانی ریاستوں کے راجاؤں سے راہ و رسم پیدا کرنے اور ان سے تعلقات استوار کرنے کا بڑا شوق تھا۔ خوش سلیقہ، خوش اطوار اور خوش گفتار تھے لیکن مزاج نازک و زود رنج تھا۔ جب غصہ آتا تو طبیعت قابو سے نکل جاتی۔ ضبط، میانہ روی اور اعتدال جو متوازن شخصیت یا سجی سنوری عادتوں میں ہوتا ہے ان کے ہاں کم تھا۔ ان کے دوستوں کا دائرہ بھی محدود تھا اور ان کی دنیا میں صرف خواص کا گزر تھا۔

ان کی وفات پر مرزا فرحت اللہ بیگ نے ایک نہایت موثر مضمون لکھا تھا۔ پنڈت کیفی نے بھی اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں لالہ صاحب پر مضمون لکھے ہیں جو ان کی شخصیت کا عمدہ مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

اپنی تمام خامیوں اور خوبیوں کے باوجود لالہ سری رام دہلی اپنے انداز کی نمایاں شخصیت تھے وہ اردو کے بے مثل مربی تھے اور اردو پر ان کے احسانات بھلائے جانے کی چیز نہیں۔ ان کی موت دہلی اور اردو کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے آہ! ؎ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔

سید علی بلگرامی

غلام پنجتن

کارلائل نے کہا ہے کہ انگریزی زبان میں سوانح عمریاں تو بہت لکھی گئی ہیں لیکن صحت و تسلسل کے ساتھ لکھی ہوئی کسی کی زندگی کی تاریخ بھی بہت کمیاب ہے جتنی کہ کسی کی اعلیٰ مقاصد کے حصول میں گزاری ہوئی زندگی ...... ایسے لوگ تو بہت سے گزرے ہیں جن کی سوانح حیات ترتیب دینا چاہیں مگر ان کے متعلق مفید اور سبق آموز مواد فراہم کرنے کی اہلیت رکھنے والے کم ہیں۔ ان بزرگوں کے ساتھ کے اٹھنے بیٹھنے والے ہی معقول اور صحت مند مواد مہیا کر سکتے ہیں مگر ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں میں چند ہی ایسے ہوتے ہیں جن کو اس بات کی تمیز ہو کہ زندگی میں کیا چیز کیا اہمیت رکھتی ہے۔ پھر جب انسان گزرے ہوئے زمانے کو یاد کرتا ہے تو منتشر خیالات کا سلسلہ اس کے بس میں نہیں رہتا اور یہ بھی ہوتا ہے کہ معمولی سی بات تو حافظے میں جم کر رہ جاتی ہے لیکن اسی زمانے کا اہم واقعہ محو ہو جاتا ہے۔ کبھی عقیدت کی آنکھ ایک ہی رخ دیکھتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قوموں کی تاریخ سے افراد کی تاریخ لکھنا مشکل ہے۔ گزرے ہوئے زمانے کی تاریخ لکھنے کے لئے ریکارڈ بھی ہوتا ہے اور یادگاریں بھی۔ لیکن کسی ایک شخص کی سوانح حیات تو وہی لکھ سکتا ہے جو ذاتی علم رکھتا ہو جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے ایسے لوگ کم ہوتے جاتے ہیں اور وہ وقت بھی آ جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی باقی نہیں رہتا۔ دور گزشتہ کے مشاہیر کے حالات معلوم کرنے کا شوق تو دو چار کو ہوتا ہے مگر ایسے مواقع نہیں رہتے کہ وہ یہ شوق پورا کر سکیں۔ موجودہ دور میں کچھ ایسی ہوا چلی ہے اور ذہنیت کچھ ایسی مفلوج ہوئی ہے کہ پچاس برس پہلے ہم سے جو رنگ جدا ہو چکے ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا۔ مظہر الحق۔ سر علی امام۔ جسٹس شاہ دین۔ سر محمد شفیع۔ مولانا محمد علی۔ حکیم اجمل خاں۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو یاد نہیں کیا جاتا۔ ایسے میں کار پردازان نقوش کا پرانے نقشے پھر نقوش کو ابھارنا قابل ستائش ہے مگر مجھ ایسے ناواقف محض سے کچھ اس سلسلے میں توقع رکھنا محض اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ

اصل کی سی ہی سہی لیکن نسبت تو ہے اعلیٰ سے

سب جانتے ہیں کہ واجد علی شاہ کو مٹیا برج میں لے جانے کے دوسرے سال جب بہادر شاہ ظفر کو رنگون پہنچا دیا گیا تو اودھ وغیرہ

شمالی و مغربی جس کو اب اتر پردیش کہتے ہیں خوب ہی لوٹے گئے۔ دو چار ہی اس وسیع علاقے میں ایسے مسلمان گھرانے ہوں گے جن کو ان حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک سادات بلگرام کا وہ کنبہ بھی تھا جس میں سید علی ۱۸۵۱ء میں پیدا ہو چکے تھے۔ ان کے جدِ امجد مولوی سید کرامت حسین صاحب کمپنی بہادر کی سرکار کے گورنر جنرل کے دربار میں نواب وزیر آف اودھ کے دربار کے نمائندے تھے۔ کرامت حسین صاحب نے اپنے دونوں بیٹوں اعظم الدین حسن اور زین الدین حسن کو کلکتے کے مدرسہ عالیہ میں جو وارن ہیسٹنگز نے قائم کیا تھا تعلیم دلوائی۔ یہ دونوں انگریزی داں ہونے کے علاوہ علوم مشرقیہ کے عالم بھی تھے۔ آگے چل کر ان دونوں کو انگریزی سرکار میں ملازمت بھی ملی۔ اعظم الدین حسن گورنر جنرل کے مشرقی زبانوں کے ترجمان (Oriental Interpreter) کی حیثیت سے اے ڈی سی بنے اور پھر سندھ کے پولیٹیکل ایجنٹ ہو گئے۔ صوبہ بہار میں ڈپٹی کلکٹر اور بندوبست کے حاکم رہے اور سی ایس آئی کا خطاب پایا۔ دوسرے بھائی زین الدین حسن صوبہ بہار و بنگال میں ۱۸۵۸ء میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے ریٹائر ہو کر ریاست حیدرآباد میں کمشنر انعام ہو کر آئے۔ سید علی انہی کے فرزند تھے۔ ان کے بڑے بھائی سید حسین (عماد الملک) نے کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۸۶۶ء میں بی اے کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ اسی سال سید علی فارسی و عربی کی تعلیم گھر پر ختم کر کے انگریزی مدرسے میں داخل ہوئے۔ دو سال انہوں نے کیننگ کالج لکھنؤ میں بھی تعلیم پائی تھی اس کے بعد ۱۸۶۸ء میں پٹنہ کالج سے شریک ہو کر کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔ بی اے میں ان کی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ دو سال قانون و ادب کی تحصیل میں گزار کر انہیں سرکاری اسکالرشپ انجینئرنگ کی تعلیم رڑکی کالج میں حاصل کرنے کے لئے ملا اور یہ وہاں داخل ہو گئے۔ نواب سر سالار جنگ نے ۱۸۷۶ء میں یورپ کا سفر کیا اس سفر میں ان کے بڑے بھائی مولوی سید حسین بلگرامی بھی ہمرکاب تھے۔ اس سفر میں جو کچھ انہوں نے دیکھا اس سے متاثر ہو کر انہوں نے ارادہ کر لیا کہ حیدرآباد سے چند ہونہار نوجوان ہر سال انگلستان تعلیم کے لئے روانہ کئے جائیں جو واپس آ کر ریاست کے مختلف عہدوں کو سنبھال سکیں۔ ایک ایرانی نوجوان مرزا مہدی خان جو اسسٹنٹ انجینئری کے امتحان میں کامیاب ہو چکے تھے ان کے ہمراہ تھے۔ ان کو سر سالار جنگ نے رائل اسکول آف مائنز میں داخل کر دیا اور جب ہندوستان لوٹے سید علی کو رڑکی سے بلا کر پہلے اپنے اسٹاف میں رکھا اور پھر تکمیل تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا جہاں انہوں نے ۱۸۷۷ء میں لندن یونیورسٹی کا امتحان داخلہ اعلیٰ درجے میں پاس کیا اس امتحان میں ان کی اختیاری زبان جرمنی اور فرانسیسی تھی۔ انہوں نے کیمسٹری، طبیعیات، معدنیات اور ان کے متعلقہ مضامین کی تعلیم چند سال میں ختم کر لی۔ اپنی ذہانت و قابلیت کے تحسین صداقت نامے سمیٹے۔ بڑے بڑے با کمال پروفیسروں سے لے کر انگلستان چھوڑا جرمنی فرانس اسپین ہوتے ہوئے کچھ دن اٹلی میں اطالوی زبان سیکھنے کے لئے قیام کیا۔ سنسکرت اور بنگالی تو پہلے ہی سے جانتے تھے حیدرآباد میں انہوں نے مرہٹی اور تلنگی بھی سیکھ لی۔ ان کا حافظہ بڑا زبردست تھا جو ایک دفعہ پڑھ لیتے بھولتے نہ تھے۔ فرانسیسی زبان میں بے تکلف باتیں کرتے تھے۔ اور تحریر رواں و شستہ لکھتے تھے۔ وہ جس زبان کی کتاب پڑھنے بیٹھتے ایک ہی نظر میں معنی و مفہوم سمجھ لیتے تھے۔ چودہ زبانیں ایسے لکھتے پڑھتے تھے کہ یہ سب گویا ان کی مادری زبانیں ہیں۔ بنارس کے پنڈتوں کو ان کے سنسکرت کے لہجے میں ہندی شاستری کی جھلک نظر آتی تھی اور ان کے تلفظ پر پیاسی ہی کا شبہ ہوتا تھا۔ یورپ سے واپسی پر وہ انسپکٹر جنرل معدنیات مقرر کر دیئے گئے۔ انہوں نے اور مرزا مہدی خان نے جو ان سے ایک دو سال پہلے واپس آ چکے تھے مل کر بالخصوص ضلع ورنگل اور رائچور میں معدنی تحقیقات شروع کی۔ جب ان کی رپورٹ پر عمل کا وقت آیا تو وہی ہوا جو ہوتا چلا آ رہا ہے بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

کچھ قدر نہیں اس کی پرسش ہی نہیں اس کی
فیشن کی لیاقت ہی مفلس کی بھلائی ہے

سر سالار جنگ نے جو ریاست کی خوش حالی اور رفاہ عام کے منصوبے باندھے تھے اس میں رکاوٹیں تو انہی کی زندگی میں پیدا ہو گئی تھیں ان کے بعد دیکھئے کیا کیا ہو سکتا تھا کہ سید علی اور مرزا مہدی ایسے کثیر المعلومات نوجوانوں کو زرخیز زمین سے سونا اگلوانے کی بجائے

دی جاتی۔ مانچسٹر کا سوتا ہو یا اورنگل کا کرگہ —— ان کی جستجو اور کاوش کے آگے —— ایں خیال است و محال است و جنوں —— دونوں کو معاون جاتی خدمات سے محروم کر دیا گیا۔ مرزا مہدی علی تو مال۔ اعداد و شمار۔ مردم شماری کے محکموں میں طبقات الارض کی صلاحیتوں کو فنا کرنے کے لئے بھیج دیئے گئے اور سید علی بلگرامی ہوم سیکرٹری۔ تعلیمات اور ریلوے کا چکر کاٹتے رہے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں یہ چکر ختم ہوا اور ۱۹۰۷ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی کے پروفیسر ہو گئے۔ کمال تو ان دونوں کے ہاتھ سے حکومت کی پالیسی نے چلنے نہ دی۔ مگر ان دونوں کے ہاتھوں سے قلم چھین لینے کی قوت کسی میں نہ تھی۔ ملک کو نہ سہی ملک کی زبان کو یہ دونوں ہستیاں مالا مال کر گئیں۔

جس زمانے میں سید علی انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے اسی زمانے میں سر سید احمد خاں نے ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام کی تحریک سرکار انگریزی میں کی تھی جس کا انکاری جواب دیتے ہوئے گورنمنٹ نے ان کو لکھا تھا کہ وہ علوم و فنون کے ہر شعبے میں ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دینا چاہتی ہے جس کے لئے دیسی زبان میں کوئی ذخیرہ موجود نہیں۔ اس لئے کچھ عرصے تک ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی زبان ہی سیکھنا ہوگی اور اسی میں اعلیٰ تعلیم دینا پڑے گی۔ سر سید کو اس طرف توجہ کرنی پڑی۔ سر سید کی اس آواز پر سب سے پہلے لبیک مولوی ذکاء اللہ مرحوم نے کہا۔ اور دہلی کے ماسٹر پیارے لال آشوب اور پنڈت دھرم نرائن اس مقصد کی تکمیل کے لئے اٹھے۔ سید علی صاحب کے دل میں یہ بات بچپن ہی سے بیٹھ گئی اور اسی وجہ سے انہوں نے سنسکرت اور پھر فرنسیسی اور جرمنی اپنی اختیاری زبانیں امتحانات کے لئے چنیں اور ان زبانوں کی کتابوں کے ترجمے اردو زبان میں آگے چل کر کئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اوریجنل ورک کم اور تراجم زیادہ ہیں۔

سالار جنگ ثانی اور نواب سر آسمان جاہ کی وزارت میں وہ جن الجھنوں میں پڑ گئے وہ ان کی علمی اور ادبی زندگی میں بھی رخنہ انداز ہوئیں۔ ان حالات سے بد دل ہو کر انہیں وکالت کا خیال آیا۔ درسگاہوں سے باہر ہو کر جب انسان دنیا کے جھمیلوں میں پڑ جاتا ہے تو وہ امتحان پاس کرنے کا ڈھنگ بھول جاتا ہے۔ یہ کلیہ ان کے حق میں غلط ثابت ہوا۔ کلکتہ یونیورسٹی کے بی ایل کے سنہ ۱۸۸۵ء والے سال کے امتحان میں چار ماہ باقی رہ گئے تھے کہ انہوں نے فیس داخل کر کے امتحان کی تیاری شروع کر دی حالانکہ وہ ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء میں قانون کی تعلیم چھوڑ چکے تھے امتحان میں بیٹھے اور یونیورسٹی بھر میں اول آ کر طلائی تمغے اور یونیورسٹی کے اسکالرشپ کے حقدار قرار پائے۔ اسی زمانے کے لگ بھگ حیدرآباد کے معاملات پر مسٹر مترا نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا۔ ایک گروہ کا خیال یہ تھا کہ اس پمفلٹ کو محسن الملک کی پارٹی نے جس کے وہ مضبوط ستون سید علی بلگرامی اور محمد صدیق انجینئر سمجھے جاتے تھے شائع کرایا ہے۔ ریذیڈنسی کا گمان یہ تھا کہ فتح نواز جنگ کی میم صاحب کی خانگی زندگی کے متعلق جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان کو اس ریاست میں سوائے عماد الملک اور سرور الملک کے کوئی نہیں جانتا اور چونکہ عماد الملک آسمان جاہ کی وزارت کے حامیوں میں سے ہیں۔ اس لئے یہ مواد سرور الملک کے اور کسی نے نہیں دیا۔ اس مقدمے کی پیروی کے لئے مترا کی طرف سے تو مدراس کے مشہور بیرسٹر مسٹر ایرڈلی نارٹن جو اس زمانے میں مدراس میں وکالت کرتے تھے اور بمبئی کے مشہور سالیسٹر ایکلو بلائے گئے یہ مقدمہ ایک کمیشن کے سامنے سنہ ۱۸۹۳ء میں بڑے زور شور سے چلتا رہا۔ یہی مقدمہ حقیقت میں فتح نواز جنگ کو حیدرآباد سے نکالے جانے اور سر آسمان جاہ کی وزارت کے ٹوٹنے کا پیش خیمہ ہوا۔ سنہ ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء میں جب میں بمبئی میں وکالت کرتا تھا ایک مقدمے میں میرا اور مسٹر نارٹن کا اورنگ آباد جانا ہوا۔ اس مقدمے میں میں مسٹر محمد اصغر انصاری بیرسٹر کے (جو بعد کو ہائی کورٹ کے جج ہوئے) جونیئر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اکثر ہم تینوں کی تفریحی صحبتیں رہتی تھیں۔ مسٹر نارٹن بڑے بذلہ سنج اور ہنس مکھ تھے۔ ان میں گورے کالے کی تفریق کا مادہ بہت کم تھا۔ وہ اکثر ان صحبتوں میں بڑی شخصیتوں کا بلا کسی تفریق کے مذاق اڑاتے رہتے تھے اس پمفلٹ اور اس زمانے کی "گندی سیاست" کا تذکرہ کرتے ہوئے نارٹن نے کہا کہ اگر سید علی بی ایل کا امتحان دے کر حیدرآباد واپس نہ آتے اور کلکتے ہی میں رہ جاتے تو وہ بہت

جلد کلکتہ بار میں نمایاں مقام حاصل کر لیتے۔ ان کا حافظہ قوی، ذہن تیز اور نظر وسیع تھی۔ انہیں ہمدردی بھی تھی اور ایسی طبیعت پائی تھی کہ مقدمہ کے واقعات معلوم کرنے میں ہر کل کی پراگندہ خیالی سے ان کا دل اُچاٹ نہ ہوتا اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو قانونی پیشہ کا لازم و شرط کہی گئی ہیں۔

وہ سیاست میں کسی خطاب کے مستحق نہ ٹھہرے مگر گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کی علمی خدمات کا اعتراف شمس العلماء کا خطاب ۱۸۹۳ء میں دے کر کیا۔ اور انگلستانی یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹر اور ڈی لٹ بنا دیا۔ دوران ملازمت میں انہوں نے ایک رسالہ الحقائق نکالا تھا۔ یہ رسالہ عربی زبان میں سہ ماہی تھا اس میں نواب عماد الملک اور علامہ شوستری اور مولوی سید کرامت حسین صاحب کے جو ۱۸۹۱ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ چل نہ سکا اور جلد بند ہو گیا۔ انہوں نے میڈیکل جورس پروڈنس کا ترجمہ اردو میں "اصول قانون متعلق بہ طب" کیا۔ اس کاوش اور محنت کا صلہ سر آسمان جاہ کی وزارت کے زمانے میں سرکار سے چھ ہزار روپیہ ملا۔

نواب وقار الامراء کے زمانے میں وہ طوفان جو سید علی صاحب کو پریشان کرنے کے لئے اٹھایا جاتا تھا بہت کم ہو گیا اور ان کے علمی کاموں میں وقار الامراء سے مدد بھی ملی۔ انہوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر ایک سررشتہ علوم و فنون قائم کرایا اور اپنی نگرانی میں کئی کی تاریخ اور بہت سی کتابیں تالیف و ترجمہ کرائیں۔ انہوں نے مولانا شبلی کا تقرر بحیثیت ناظم سررشتہ علوم و فنون کرایا۔ یہ سررشتہ ایک عرصے تک قائم رہا۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ کو ۵۰ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کرایا۔ ان کی تالیفات پر انعام دینے کے بجائے انہوں نے خود گزارش پیش کی اور سرکار سے ایک گراں قدر رقم منظور کرا کے ان کے حوالے کر دی۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ جو اس زمانے میں علی گڑھ میں ہوا تھا اس میں انہوں نے ایک تحقیقاتی مقالہ "کلیلہ و دمنہ" پر پڑھا۔ انہوں نے بڑی محنت سے یہ پتہ چلایا تھا کہ یہ کتاب اصل میں کہاں سے نکلی کہاں کہاں گھری کس کس زبان میں اس کا ترجمہ ہوا اور اس میں کیا کیا تبدیلی ہوتی گئی اور اصل سے موجودہ نسخے کتنے مختلف ہو گئے۔ وہ انگلستان میں جب کیمبرج کے پروفیسر ہو گئے تو الف لیلے کے متعلق بھی ایسی ہی تحقیقات شروع کی تھی مختلف نسخے اور وہ دوسری کتابیں جن میں الف لیلے کے حوالے یا اقتباسات تھے اور جن زبانوں میں الف لیلے کا ترجمہ ہوا سب اکٹھے کر لئے تھے جن کی تعداد سو سوا سو تھی۔ اس کے کام کو وہاں [illegible] نہ سکے۔ ہندوستان آتے ہی جب وہ ہردوئی میں مقیم ہو گئے تو ان کی ساری توجہ علی گڑھ کی طرف مبذول ہو گئی اور وہ مسلم یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن بنانے میں مشغول ہو گئے اور انہوں نے اس کے مرتب کرنے کے لئے یورپ اور مصر کی یونیورسٹیوں کے طریق کار انتظامی امور اور تعلیمی نصاب کا مطالعہ کیا۔ افسوس ہے کہ وہ زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ بہت ممکن تھا کہ جو کشمکش یونیورسٹی کے متعلق ہوئی اس میں بہت کمی ہو جاتی اور یہ تو مانی ہوئی بات تھی کہ وہی پہلے وائس چانسلر ہوتے۔ علی گڑھ پارٹی کے اعتدالی اور استبدادی دونوں اُن پر بھروسہ کرتے تھے۔

تمدن ہند اور تمدن عرب ان کے دو بڑے شاہکار ہیں جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ ان دونوں کتابوں کا مصنف موسیو لیبان ہے۔ یورپ میں یہ دونوں کتابیں اس جید عالم، ماہر فن کی دماغ سوزی اور انتھک کاوشوں کی یادگار ہیں اور بڑی مستند ہیں۔ ان کتابوں کا ترجمہ انہوں نے اس طرح سے کیا کہ پہلے پیرا گراف پڑھ لیتے تھے پھر قلم اٹھا کر اپنی زبان اردو میں لکھنا شروع کر دیتے تھے اور پھر مجال نہیں کہ مصنف کا منشاء فوت ہو جائے۔ ان عظیم کتابوں کو پڑھتے وقت یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ کسی کتاب کا ترجمہ دوسری زبان سے اردو میں ہے۔ انہیں ہند کے پرانے تمدن سے بڑی دلچسپی تھی۔ اور دکن کے مشہور غاروں کی جن میں بعض تو اس وقت گمنامی میں دبے ہوئے تھے بڑی چھان بین کی اور ان پر کاوش کے طور پر ایک کتاب لکھی جس سے آئندہ چل کر ان لوگوں کو جنہوں نے پرانی یادگاروں کی تحقیق کی بڑی رہنمائی ہوئی۔ انہوں نے فارسی اور سنسکرت کی تعلیمی قواعد کا تقابل کیا اور اس پر ایک پورا رسالہ لکھا۔ حیدرآباد کی اقتصادی حالت اور یہاں کے

سودیات پر جو رسالہ انھوں نے لکھا اس کی اشاعت ابھی تک قائم ہے کاش ان کے نواسے سعادت علی جو لوک سبھا کے ممبر ہیں اور پرائم منسٹر کے پارلیمنٹری سیکرٹری امور خارجہ ہیں اس رسالے کو اپنی ماں کی کتابوں میں سے ڈھونڈ کر ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کے حوالے کر دیں۔

مرحوم کو کتابوں کا بے حد شوق تھا۔ ان کی لائبریری ان کے ڈرائنگ روم سے زیادہ شاندار تھی اور بہت باترتیب۔ انھیں کسی کتاب کے نکالنے میں دقت نہ ہوتی تھی بعض انگریز کتب فروشوں کو انھوں نے مستقل آرڈر دے رکھا تھا۔ یورپ کی کسی زبان میں اسلام کے مذہب یا تاریخ پر کتاب شائع ہوتے ہی ان کے پاس آ جاتی تھی بعض Periodicals کے وہ مستقل خریدار تھے۔ عام طور پر جن لوگوں کو کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے وہ ان کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور کسی کو ان کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے انھیں یہ عادت نہ تھی وہ جس کو اپنے سے زیادہ مشتاق دیکھتے اور اس کو قدردان بھی سمجھتے اپنی کتاب نذر کر دیا کرتے تھے چنانچہ مولانا شبلی کو کئی نادر کتابیں انھوں نے حوالے کر دیں۔ سر سید جب آخری مرتبہ حیدرآباد آئے تو بشیر باغ میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے۔ سید علی صاحب ان کو اپنا کتب خانہ دکھانے کو لائے۔ سر سید کئی گھنٹوں تک ان کے نایاب ذخیرے کو دیکھتے رہے اور مختلف کتابوں پر گفتگو کرتے رہے ایک کتاب کی جو اسپین کے اسلامی دور کی باتصویر تاریخ تھی بہت تعریف کی اور کہا کہ ایسی کتاب تو ہمارے کالج کی لائبریری میں ہونا چاہیے تھی تاکہ ہمارے نوجوانوں کو ہماری عظمت معلوم ہو اور عبرت بھی ہو۔ انھوں نے وہ کتاب نہایت خندہ پیشانی سے سر سید کے حوالے کر دی اور کہا کہ آپ بجا فرماتے ہیں ایسی نایاب کتاب ہماری قومی لائبریری ہی میں رہنی چاہیے۔ انھیں جب کبھی موقع ملا انھوں نے نایاب کتاب کو اور نایاب بنانے کے لیے چھپا کر نہیں رکھا بلکہ اس کو شائع کرنے کی فکر کی۔ کہا جاتا تھا کہ تزک بابری کے اصلی ترکی زبان میں صرف دو نسخے تھے ایک روس کی لائبریری میں اور دوسرا فرانس کے کتب خانے میں۔ اس کا ایک نسخہ انھیں نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں بھی نظر پڑا۔ جب وہ سنہ ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد کو خیرباد کہہ کر انگلستان روانہ ہوئے تو اس نسخہ کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ نواب یوسف علی خاں سالار جنگ ثالث اس وقت نابالغ تھے اور ان کی ہر شے پر کورٹ آف وارڈس کی نگرانی تھی۔ سید علی صاحب کے مخالفین نے ان کے اس فعل کو بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کر کے سرکار سے یہ حکم دلا دیا کہ یا تو سید علی صاحب فوراً اس کتاب کو واپس کریں یا ان کے وظیفہ سے اس کی قیمت محسوب کر لی جائے۔ جب اس حکم کی ان کو اطلاع ملی اس وقت تک یہ کتاب لندن کے قدیم کتابوں کے پرکھنے والوں کی نظر چڑھ چکی تھی اور گب میموریل فنڈ کے خرچ سے اس کی عکسی کاپیاں ہو چکی تھیں۔ مولوی صاحب نے اصل کتاب مع ایک کاپی کے فوراً واپس کر دی اور جواب میں لکھا کہ میرا مقصد اس کتاب کو ہتھیانا نہیں تھا بلکہ سالار جنگ کے کتب خانے کا نام بڑھانا اور اس کتاب کو زندہ کرنا تھا۔

اور اسی پر کل حساب ہو چکا۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ان کی جو عظمت و توقیر تھی اور ان کو عربی ادب کے ساتھ دلچسپی کی جو شہرت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کیمبرج کی لائبریری میں ایک پرانی کتاب "الوصایا" تھی۔ اس قلمی نسخے پر شہاب الدین خفاجی اور امام عبدالقادر کی مہریں تھیں۔ وہ اس قدر بوسیدہ ہو گئی تھی کہ اس کا ورق ورق علیحدہ ہو گیا۔ اس کے سب ورق تقسیم ہو چکے تھے۔ صرف ایک اس پروفیسر صاحب کے پاس رہ گیا تھا جن کا اس سبجکٹ سے تعلق تھا۔ سید علی صاحب سے جب اس کتاب کا تذکرہ آیا تو انھوں نے یہ کہہ کر کہ آپ اس کے مجھ سے زیادہ مستحق ہیں یہ کاپی ان کے نذر کر دی۔ انھیں مصر کی پرانی تاریخ پر ایک نایاب کتاب ہاتھ لگی۔ انھوں نے اس کے صفحے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھپوانا شروع کر دیے۔ انھوں نے کلام پاک کا ایک ایسا انڈکس بنوانا چاہا کہ جس کے ذریعہ سے ہر موضوع پر جو آیت جس سورت میں ہو آیت اور سورت کے حوالے سے مل سکے۔ اسی طرح سے انھوں نے عربی مصنفین کا نام وار ایک انڈکس حیدرآباد ہی میں بنوانا شروع کیا تھا۔ جس سے ہر مصنف کی تحقیقات کا پتہ چل سکے۔ ان دونوں کو ان کا ارادہ بیروت میں طبع کرانے کا تھا مگر یہ کام بھی جوں کا توں ہی رہ گیا۔

فطرت کا یہ اٹل اصول ہے کہ بچہ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ اس کا اثر غیر شعوری طور پر اس کے عادات و خصائل پر ضرور پڑتا ہے۔ سید علی اپنے وطن بلگرام سے دور ایک بڑے عہدہ دار کے گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش فرو ہو جانے کے بعد جب ان کی عمر چھ سات برس کی تھی یہ دیکھا کہ ان کے چچا کی ہر جگہ آؤ بھگت ہوتی ہے۔ اور ان کو [illegible] کا ہیرو اور بچانے والا کہا جاتا ہے۔ وہ جس اسکول میں پڑھے اس کے دروازے محض خوشحال خاندانوں کی اولاد پر کھلے ہوئے تھے۔ ایسے میں انہیں اپنی خاندانی وجاہت کا احساس پیدا ہونا لازمی تھا پھر ان کے اس احساس برتری پر ان کی اسکول کالج اور یونیورسٹی میں نمایاں کامیابیوں نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ بعض لوگ جو ان کے زمانے میں ان کے گھر کے چکر کاٹتے تھے ان کے جانے کے بعد یہ کہنے لگے کہ ان پر جب دولت و جاہ غالب تھی، وہ ان کی فیاضیوں پر بھی یہ کہہ کر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ اکثر ان سے وہی متمتع ہوتے جو چکنے چپڑے ہوتے یا ان کی شہرت میں مدد دیتے۔ چونکہ انہیں تنگدستی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اور لہو و لعب میں نہیں پڑے تھے اس لئے ان کے پاس اتنا تھا کہ جو ان کو دو چار بار مدد کے لئے گھیرے اس کو کچھ نہ کچھ دے کر ٹال دیں۔ جن اشخاص کی انہوں نے مدد کی اس میں علما، مصنفین اور طلبا سے تھے۔ ان چند حوصلہ افزا امداد پر یہ گمان کرنا کہ وہ فقط کتب علماء کو اس وجہ سے دے دیتے کہ ان کا نام ہو کچی سی بات ہے۔ اگر انہیں نام و خطاب و شہرت کی خواہش ہوتی تو اپنی خودداری سے ان راستوں کو اپنے اوپر بند نہیں کر لیتے جو خطاب دینے والوں کے محلوں اور کوٹھیوں کی طرف جاتے ہیں۔ جب وہ اپنی ادبی صحبتوں میں مصروف ہوتے تو ان کے گھر پر بڑے سے بڑا آئے اس کے لئے اس صحبت کو چھوڑ کر ڈرائنگ روم کی طرف کبھی نہیں بڑھے۔ البتہ وہ اچھا کھلاتے تھے اچھا پہنتے تھے اچھے مکان میں رہتے تھے۔ ان کا اخلاق وسیع تھا مگر بڑے درباروں میں جیسی پاسداری ان کو آتی تھی۔ کوئی نہ کوئی مہمان ان کے یہاں آیا ہی رہتا تھا۔ امریکن ہو یا یہودی، ترکی ہو یا مصری ان کے پاس ضرور آتا اور ان سے فرنچ زبان میں گفتگو کا لطف اٹھاتا۔ ان کی بیگم صاحبہ غیر مسلم تھیں۔ تمام عمر شوہر نے ان کی اور انہوں نے شوہر کی رضا جوئی کو مقدم سمجھا۔ اپنے شوہر کے مہمانوں کے لئے عمدہ عمدہ کھانے اپنی نگرانی میں پکواتیں۔ کیمبرج میں بھی ان کے ساتھ گئیں۔ ہندوستانیوں کو جو وہاں آتا ہندوستانی کھانا کھلا دیتیں۔ اس زمانے میں جو طلبا تھے آج تک ان کو محبت و احترام سے یاد کرتے ہیں۔ مگر نہ ہندوستانی لباس پہنا نہ خاندانی رسم و رواج ترک کیا جس طرح حقہ یہاں پیتی تھیں وہاں بھی پیا کیں۔ سید علی صاحب جب تک حیدر آباد میں برسر خدمت رہے۔ جہاں اہل غرض نے ان کو گھیرا وہ اس کی مدد کر دیتے تھے اور سفارش کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ بعض وقت تو اس بارے میں وہ حد سے زیادہ بڑھ جاتے تھے۔ مولوی خدا بخش خاں جن کی پٹنے میں لائبریری مشہور ہے۔ وہاں وکالت کرتے تھے درجہ دوم کی سند تھی۔ حیدر آباد میں ایک مقدمے کے سلسلے میں آئے۔ سید علی صاحب اور ان کے والد دونوں سے ان کی ملاقات تھی اسی وجہ سے وہ مولوی صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے خواہش کی کہ اگر یہاں ان کو درجہ اول کی سند مل جائے تو اچھا ہے۔ سید علی صاحب نے کہا کہ یہ کیا بڑی بات ہے اور مولوی میر افضل حسین صاحب چیف جسٹس کے پاس گئے اور پرانے تعلقات جو ان کے خاندان کے مولوی خدا بخش سے تھے وہ بھی بیان کئے میر صاحب نے ان کو سوکھا جواب دے دیا جب مولوی خدا بخش خاں صاحب کو یہ علم ہوا تو ان کو افسوس ہوا اور سید علی صاحب سے معذرت چاہی کہ آپ کو میری وجہ سے ایسا جواب سننا پڑا۔ سید علی صاحب نے کہا کہ نہیں مولوی صاحب میں آپ کو ایک نہ ایک دن یہاں کا میر مجلس کرا دوں گا۔ چنانچہ جب وقار الامراء کا دور شروع ہوا تو مولوی خدا بخش میر مجلس ہو ہی رہے۔ نواب سر عقیل جنگ بہادر کہتے تھے کہ میں حیدر آباد سے بیزار ہو کر بمبئی جانے والا تھا۔ ملازمت کے وعدے تو بہت سے ہوتے مگر پورا ایک بھی نہیں۔ ایک دن میں اپنے چچا سید علی صاحب سے ملنے گیا اور ان کی دریافت پر کہا کہ کل بمبئی جا رہا ہوں۔ انہوں نے پوچھا کیوں۔ سید عقیل نے کہا کہ میں بمبئی میں جا کر خود نوکری تلاش کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ ایک دن تو اور ٹھہر جاؤ اگر تم کو ملازمت مل جائے تو یہاں رہنا ورنہ آگے چلے جانا۔ کل صبح نو بجے مجھے وقار الامراء کی ڈیوڑھی پر ملو۔ چنانچہ صبح میں گیا۔ چچا بھی آئے

اور اطلاع کرنے کے لئے اے ڈی سی سے کہا اس نے کہا کہ نواب صاحب آج کسی سے نہیں ملیں گے۔ انہوں نے حکم دیا ہے کہ کسی کی اطلاع مت کرو۔ سید علی صاحب نے کہا کہ آپ میری ذمہ داری پر جا کر اطلاع کیجئے کہ نہایت ہی اہم کام ہے۔ سر وقار الامراء کپڑے پہن کر آفس کے کمرے میں برآمد ہوئے اور سید علی صاحب کو بلوایا۔ آپ گئے اور میرے فوری تقرر کے متعلق بعہدہ تعلقداری کا ان کو یاد دلا دیا۔ جاتے حکم لکھا لائے۔ سر وقار الامراء نے چچا سے شکوہ کیا کہ آپ نے بلاوجہ مجھے آج تکلیف دی۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے لئے تو ضرور ذرا سی بات ہے لیکن میرے بھتیجے کا اس طرح چلا جانا تو معمولی بات نہیں۔ ان میں یہ کمزوری ضرور تھی کہ کانوں کے بڑے کچے تھے۔ ذرا کسی طرف سے کسی نے کچھ ایسا لگا دیا جس میں ان کی شکایت مقصود ہو فوراً بگڑ جاتے مگر جب لگانے والوں کی چالاکی کھل جاتی تو صاف بھی ایسے ہو جاتے تھے کہ گویا کبھی دل میں ملال آیا ہی نہ تھا۔

مرزا مہدی خاں کوکب جنہوں نے تمدن یورپ۔ ہندسۂ جدیدہ اور نیچرل فلاسفی ایسی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا تھا۔ سید علی مرحوم کے ساتھ انگلستان میں بھی تھے۔ معدنیات کی تحقیقات میں رات دن ساتھ رہنا پڑا۔ پھر دونوں میں قربت اس طرح سے بھی ہو گئی تھی کہ مرزا صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر کریم خاں (نواب خدیو جنگ) کے ساتھ سید علی صاحب کی بھتیجی طیبہ بیگم کی شادی بھی ہوئی تھی۔ مرزا صاحب سید علی مرحوم کا ذکر بڑی حسرت کے ساتھ کیا کرتے تھے ان کی نظر میں مرحوم کی سب میں بڑی خوبی یہ تھی کہ اپنے ہم عصر علمی خدمات کرنے والوں سے نہ رشک کرتے تھے نہ حسد۔ بلکہ ان کا دل بڑھاتے تھے اپنی کتابیں مستعار دے دیتے تھے جن میں سے بعض تو پھر ان تک واپس پہنچی بھی نہ تھیں۔ بعض وقت ان میں کاہلی بھی عود کر آتی تھی۔ ایک کام میں لگے لگے بیک ایک ان کی طبیعت اُچاٹ ہو جاتی تو اسے چھوڑ کر دوسرے کام میں متوجہ ہو جاتے۔ محنتی و جفاکش نہ تھے۔ مذہبی بحث عامیانہ ہو یا عالمانہ پسند نہیں کرتے تھے۔ ایام عزا کا احترام کرتے تھے۔ اسلام سے واقف اور سچے مسلمان تھے۔ چونکہ انہوں نے تنگ دستی کا منہ نہ دیکھا تھا اس لئے روپیہ کی قدر نہ کرتے تھے۔ امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ اپنے بڑے بھائی کی طرح خاموش طبیعت اور خاموش بیٹھنے والے نہ تھے۔

سید علی صاحب مرحوم اپنے آباؤ اجداد کی طرح مذہباً شیعہ تھے۔ ان کی پالیسی مرنجان و مرنج کی تھی۔ علمی گفتگو خواہ مذہبی ہوں یا تاریخی اسی سے کرتے تھے جن کو ان کا اہل جانتے تھے مگر مناظروں سے دُور بھاگتے تھے۔ ان کی نظر میں مذہب اخلاق کی ایک ایسی زندہ طاقت تھا جس کا اظہار انسان کے اخلاقی کمال میں متواتر ہوتا رہتا ہے ان کے خیال کے مطابق انسان جو کچھ جانتا ہے اور جو نہیں جان سکتا اس کے درمیان جو اعلیٰ ترین اتحاد پایا جاتا ہے اس کے احساس اور علم کا نام مذہب ہے۔ مذہب یہ ہے کہ محدود ارادت کو غیر محدود مشیت کے تابع کر دیا جائے۔ ان کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ اسلام کی عالمگیر تہذیب مسلمانوں کے ہاتھوں بدنام ہو رہی ہے۔ جب وہ کیمبرج کی پروفیسری سے علیحدہ ہو کر واپس آئے تو اس کے کچھ دن پہلے ہی نواب وقار الملک اور سر جان ہیوٹ لفٹننٹ گورنر صوبہ آگرہ و اودھ کے درمیان انگلش اسٹاف کے علی گڑھ کالج میں اختیارات و اقتدار کے متعلق سخت جھگڑا چل رہا تھا اور حقیقت میں اسی کے باعث شیعہ کالج بنانے کی تجویز پیدا کرائی گئی تھی۔ جب ان سے یہ تمام اندرونی باتیں بیان کی گئیں تو انہوں نے اس تحریک کو نہایت بے بنیاد کہا۔ ایک دفعہ مجھ سے فرمانے لگے کہ تمہیں معلوم ہے کہ علی گڑھ کالج میں صرف ایک ہی مسجد کیسے ہے۔ جب سر سید اقامت خانے کا کلاسوں اور دوسرے ہالوں کا نقشہ تیار کرا رہے تھے تو بورڈنگ کے احاطہ میں دو مسجدیں بنوانا چاہتے تھے میرے بھائی نے اس کی سخت مخالفت کی اور سید صاحب سے کہا کہ اگر آپ ہی شیعہ سنی طلباء سے ایک مسجد میں نماز نہ پڑھوا سکے تو جب یہ یہاں سے تعلیم پا کر نکلیں گے تو آپ کے مشن کا کیا حال ہوگا۔ سر سید نے فوراً ہی دو مسجدوں کا ارادہ ترک کر دیا۔ لکھنؤ کے ایک ان کے بڑے بارسوخ دوست نے انہیں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی صدارت کے لئے لکھا کہ آپ شیعہ ہیں، عالم ہیں، صاحب مال و جاہ ہیں اس

عہدے کو قبول کر کے شیعہ قوم کی رہنمائی کیجئے۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ میں شیعہ ضرور ہوں مگر عالم نہیں طالب علم ہوں۔ مالدار نہیں ہوں البتہ فراغت سے کھا پی لیتا ہوں۔ میں اس قسم کی کانفرنسوں کو پسند نہیں کرتا۔ مسلمانوں کے لئے ایک آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس موجود ہے۔

ان کی طبیعت روکھی پھیکی نہ تھی مزاج میں مزاح بھی تھا۔ اجمیر میں خواجہ صاحب کی درگاہ میں فاتحہ پڑھنے کے لئے وہ جا رہے تھے۔ درگاہ میں داخل ہوتے ہی صورت آشنائی دیکھ کر مجاوروں نے انہیں گھیر لیا انہوں نے کہا مجھے کیوں گھیرتے ہو میں تو وہابی ہوں۔ مولوی عبدالحق صاحب بیان کرتے تھے کہ ایک دفعہ وہ مولانا شبلی۔ ظفر علی خاں (ایڈیٹر زمیندار) وغیرہ ان کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے مولانا شبلی نے سید علی صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ عبدالقادر جیلانی نے کوئی کتاب شیعوں کے خلاف نہیں لکھی تو شیعوں کو حضرت کے ساتھ اتنی عداوت کیوں ہے۔ سید صاحب نے جواب دیا کتاب لکھنے نہ لکھنے کا سوال نہیں ہے انہوں نے ہماری آدھی سلطنت چھین لی مولانا نے کہا کہ وہ کیسے انہوں نے جواب دیا کہ اگر وہ نہ ہوتے تو سب ہمارے اماموں ہی کی پرستش کرتے۔ اگر اس طرح آپ کی سلطنت چھین جاتی تو آپ کیا کرتے۔ ایک مولوی صاحب نے آپ سے ایک کمیاب کتاب نقل کرنے کو مانگی مروت کے مارے انکار تو نہ کیا کتاب نکالی اور یہ کہہ کر دینے لگے کہ کتاب تو نایاب ہے مگر جلد سؤر کے چمڑے کی ہے۔ مولوی صاحب نے لاحول ولاقوۃ کہہ کر ہاتھ کھینچ لیا۔ آپ تمدن ہند کا ترجمہ کر رہے تھے ایک دن کچھ دوستوں کو ریڈ انڈین قوم کا حال سنانے لگے ایک صاحب نے کہا کیا یہ قوم باقی ہے۔ اس صحبت میں ایک وجیہ پختہ رنگ مولوی صاحب بھی اتفاق سے موجود تھے مسکرا کر ان کی طرف اشارہ کر دیا۔

گرمیوں کا زمانہ تھا۔ ۲ مئی ۱۹۱۱ء کی رات میں کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے بہنوئی کے مکان میں ٹینس کورٹ پر بیٹھے ہوئے اپنی بہن فاطمہ بیگم، بیگم صاحبہ اور ... ... اپنی بچی رقیہ بیگم اور اپنی بہن کی لڑکی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے کہ جوش بلگرامی کے الفاظ میں:

> "وہ آسمان سے ملک الموت بن کر ایک تارہ ٹوٹا جس کی روشنی سے سب کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں مگر ان کے پلک جھپکاتے ہی ان کی حرکت قلب بند ہو گئی۔ جو امرا چند منٹ پہلے اپنے افراد خاندان سے ہنس بول رہے تھے وہ چیخ چیخ کر رونے لگے جو گھر ابھی عشرت کدہ بنا ہوا تھا وہ ماتم کدہ بن گیا۔"

منشی سجّاد حسین

(ایڈیٹر اودھ پنچ)

ممتاز حسین جونپوری

منشی سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہی سنہ ہے جس میں اودھ کے ادب نواز اور مظلوم فرماں روا جان عالم واجد علی شاہ کے ساتھ ایک سنجیدہ مذاق کیا گیا اور انگریزوں نے انہیں کسی قصور کے بغیر تاج و تخت سے محروم کر کے مٹیا برج میں قید کر دیا۔ ان کے جانے سے لکھنؤ کی بساط ہی اُلٹ گئی اور بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کا شیرازہ بکھر کے رہ گیا۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ بھی گئی تھی وہ ایک برس بعد غدر کے ریلے نے پوری کر دی۔

یہ تھا وہ سیاسی پس منظر جس میں "اودھ پنچ" کے ہونے والے ایڈیٹر منشی سجاد حسین نے آنکھ کھولی۔ جہاں تک ادبی فضا کا تعلق ہے، اس وقت اُردو زبان نئے نئے خیالات کو اپنا چکی تھی اور اس پر انگریزی اثرات نمایاں ہو چکے تھے۔ انگریزی کتابوں اور اخبارات کی اشاعت نے ادبی حلقوں پر فکر و نظر کی راہیں کھول دی تھیں۔ منشی سجاد حسین نے اسی فضا میں پرورش پائی اور بدلتے ہوئے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

ان کے مورثِ اعلیٰ یوں تو بارہ بنکی کے مشہور اور مردم خیز قصبہ ردولی شریف سے تعلق رکھتے تھے لیکن اب روحانی کشش انہیں کاکوری شریف کھینچ لائی تھی۔ یہ دونوں بہت نمایاں اسلامی بستیاں ہیں اور اسلامیانِ ہند کے لئے یکساں باعث عقیدت و احترام۔ منشی سجاد حسین ایک ادبی اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد شیخ منصور علی ڈپٹی کلکٹر اور ماموں نواب رضا حسین لکھنؤ کے بڑے نامی وکیل تھے جو بعد میں ریاست حیدر آباد کی عدالت العالیہ کے چیف جسٹس ہو گئے تھے۔ منشی صاحب نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں اپنے ماموں کے پاس ہی پائی اور اُردو فارسی پر عبور کے علاوہ عربی میں بھی شدبد حاصل کی۔ اس زمانے میں لکھنؤ برباد ہو چکا تھا لیکن بڑے خاندانوں میں بڑی ٹکسالی زبان بولی جاتی تھی۔ بیگمات کی زبان اور محاورات مستند تھے چنانچہ منشی سجاد حسین کو بچپن ہی سے اچھی زبان سیکھنے اور اچھی اُردو پڑھنے کا موقع ملا اور یہی وجہ تھی کہ وہ جوانی ہی میں زبان کے زبردست محقق تسلیم کئے جانے لگے۔ ان کی حیثیت شروع

ہی سے بڑی چلبلی تھی۔ پرانے زمانے کے مولوی صاحبان کی مار اور خوش طبعی کے سلسلے میں کیا ٹھہرتے۔ یہ اکثر اپنے استادوں کو سبق پڑھنے اور یاد کرنے میں چکمے دے جایا کرتے تھے۔

[illegible] میں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے اور کالج میں ایف اے تک پڑھ کے بھاگ نکلے اور فیض آباد میں فوجیوں کو اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ لیکن جلد ہی گوراشاہی اردو اور فوجیوں کی صحبت سے دل اچاٹ ہو گیا اور لکھنؤ کی یاد ستانے لگی۔ آخر کار ایک دن نوکری پر دو حرف بھیج کر گھر چلے آئے۔

مضمون نویسی کا شوق بچپن ہی سے تھا اور چونکہ ذہین اور ہنسوڑ اور بذلہ سنج بھی تھے چنانچہ دوسری نوکری کا خیال ترک کر کے بدایوں کے منشی محفوظ علی (ڈپٹی کلکٹر) جیسے نقاد ادیب کے ڈھارس اور دم دلاسہ دینے پر لندن کے فکاہی اخبار "پنچ" کی طرز پر سنہ ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے ہفت روزہ "اودھ پنچ" نکالا اور اسے چھاپنے کے لئے "شام اودھ" کے نام سے ایک چھاپہ خانہ بھی قائم کیا۔ اس زمانہ میں ان کا قیام کچھ عرصہ لکھنؤ کے محلہ بیرونی خندق میں رہا پھر گولہ گنج منتقل ہو گئے۔

یہ وہ دور تھا جب کہ سودا کی ہجویات، ظرافت اور سید انشا کے چٹکلوں کی جگہ یورپ کا مذاق لکھنؤ کی محفلوں میں بار پا رہا تھا لیکن ابھی پرانا رنگ بالکل مفقود نہیں ہوا تھا۔ اردو محاورات اور چٹخارے چٹخانے والے ادب کا چشمہ لکھنؤ کے چپے چپے سے ابل رہا تھا اور سودا سلف بیچنے والے گلی گلی تشبیہ اور استعارے لٹاتے پھرتے تھے۔ خریداروں کو پھانسنے کے لئے اب بھی ککڑیوں کو لیلیٰ کی انگلیاں اور مجنوں کی پسلیاں یا گنڈیریوں کو نبات اور مصری کی ڈلی کہہ کر نقلوں کی قند بیچی جاتی تھی۔ چھابے فروش بھی مزاح و ظرافت کی دوکان لگائے گاہکوں کی تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔

یہ تھا اس زمانے کا لکھنؤ جب منشی سجاد حسین نے ظرافت کا نیا معیار پیش کیا اور فکاہی ادب میں ایک نئی طرح ڈالی۔ انہوں نے مزاح کے پردے میں زبان اور محاورات کی اصلاح پر سارا زور قلم صرف کر دیا اور اس کوشش میں اخلاق اور سیاسی مقاصد کو بھی پیش نظر رکھا۔ اس لحاظ سے انہیں ایک ایسے سپاہی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس نے اپنے قلم سے جہاد کیا اور ملک کی آزادی اور قوم کی فلاح کے لئے مذاق ہی مذاق میں وہ کچھ کر دکھایا جو بڑے بڑے سیاسی لیڈروں سے نہ ہو سکا تھا۔

منشی سجاد حسین کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسی ادبی اقلیم میں ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا جہاں پھکڑ پن اور پھبتی کا سکہ رائج تھا۔ منشی سجاد حسین نے مذاق اور ظرافت میں سنجیدگی اور توازن پیدا کیا اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ملک کے گوشے گوشے سے چوٹی کے مزاح نگار شاعروں اور ادیبوں کو ڈھونڈ کر انہیں دنیا سے روشناس کرایا۔

"اودھ پنچ" کے سماجی، سیاسی، اقتصادی، علمی اور ادبی مضامین نے دیکھتے دیکھتے معاشرے میں انقلاب برپا کر دیا اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلچل سی مچ گئی۔ یہاں تک کہ اکبر الہ آبادی بھی "اودھ پنچ" کے جادو سے محفوظ نہ رہے۔ وہ اس وقت تک قصبہ کڑا کے مشہور استاد وحید مرحوم سے سنجیدہ غزلوں پر اصلاح لیتے تھے لیکن "اودھ پنچ" ہی کے زیر اثر پارسائی کا خرقہ و جبہ و دستار پھینک اور دقیانوسی رنگ تغزل چھوڑ کر دنیائے ظرافت میں فرد زمان ہو گئے۔

اکبر مرحوم کا پہلا منظوم خط سنہ ۱۸۷۷ء ہی کے اودھ پنچ میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے بڑے پرجوش طریق پر "اودھ پنچ" کا خیر مقدم کیا تھا۔ اسی کے بعد انہوں نے ظرافت کا چولا پہنا۔ اکبر مرحوم اودھ پنچ کے لئے فکاہی مضامین بھی لکھتے تھے۔ جو کبھی ان کے اپنے نام سے اور کبھی فرضی ناموں سے شائع ہوتے تھے۔ اودھ پنچ میں شائع ہونے والا اکبر کا منظوم خط بعد میں ان کے دیوان میں بھی شامل کیا گیا اور اسے کسی شک و شبہ کے بغیر اکبر کی ظریفانہ شاعری کا سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے۔

منشی سجاد حسین کے دوستوں اور نامی ظرافت نگاروں میں سے بہتوں کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ ان میں خدا بخشے نواب آزاد مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، سید اکبر حسین جج، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی احمد علی شوق، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی احمد علی کسمنڈوی۔ اور بابو جوالا پرشاد برق کے علاوہ اودھ پنچ کے بہت اچھے اور پرانے لکھنے والوں میں خان بہادر سید محمد ہادی کلکٹر اور ہمارے استاد پنڈت منشی ہرسرن داس بی اے بھی شامل تھے۔

بہت عرصہ گزرا میرٹھ سے ایک اخبار "طوطی ہند" نکلتا تھا۔ اس سے اور "اودھ پنچ" سے بڑی نوک جھونک رہتی تھی۔ دونوں اخباروں کی علمی اور ادبی جنگ میں بابو ہرسرن داس نے بھی بڑا حصہ لیا۔

"اودھ پنچ" اگرچہ ایک ظریفانہ رسالہ تھا لیکن ملک کے سیاسی اور سماجی رجحانات اور معرکہ آرائیوں سے بے خبر نہ تھا۔ یو پی میں اس اخبار کو کانگریس کا چراغ تصور کیا جاتا تھا اور صوبے کے جن گوشوں میں کانگریس کا گزر نہ تھا وہاں یہی چراغ لوگوں کی ذہنی راہنمائی کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے عزیز دوست پنڈت برج نارائن چکبست کے علاوہ بڑے بڑے جغادری کانگریسی لیڈر منشی سجاد حسین کے مداحوں، قدردانوں اور قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ چکبست نے سچ کہا ہے کہ "اودھ پنچ نے اردو اخبار نویسی کی تاریخ میں اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ معنوی امور کی بنا پر صحافت کا ایک معیار قائم کیا ہے۔"

اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور پر لوگ منشی سجاد حسین کی تحریر اور لطیفوں سے بڑا لطف اٹھاتے تھے۔ جو پھبتی یا لطیفہ "اودھ پنچ" میں شائع ہو جاتا وہ مہینوں لوگوں کی زبان پر رہتا اور ملک کے ہر گوشے میں پھیل جاتا تھا۔

اکبر الہ آبادی اور ظریف لکھنوی انیسویں اور بیسویں صدی کے بہت بڑے اصلاحی شاعر اور ظرافت نگار ہیں۔ ان میں سے ظریف کو ان کے بڑے بھائی صفی لکھنوی کے کہنے پر منشی سجاد حسین ہی نے ظرافت نگاری کے داؤں پیچ بتائے اور اصلاح تخیل، ادب اور حیات وغیرہ میں جنگ و پیکار کے لئے تیار کیا۔

اردو صحافت میں کارٹونوں کے ذریعے اظہار خیال اور حالات حاضرہ پر روشنی ڈالنے کی بنا بھی منشی سجاد حسین ہی نے ڈالی۔ وہ "لندن پنچ" پڑھتے وقت مصور کو پاس بٹھا لیتے اور اسے "لندن پنچ" کی تصویریں دکھا کر کارٹونوں کے رموز بتاتے جاتے تھے۔ کبھی لندن پنچ کے خاکوں ہی میں کانٹ چھانٹ کر لیتے اور کبھی نیا خاکہ بنانے کی ہدایت کرتے تھے، اور یہی تعلیم وہ اپنے بعد ہونے والے ایڈیٹر شیخ ممتاز حسین کو بھی دے گئے۔

منشی سجاد حسین کا جسم دوہرا، قد میانہ، رنگ گندمی اور چہرہ گول تھا۔ چہرے پر مونچھیں اور بڑی بڑی داڑھی بھی موجود تھی۔ ان کے یہاں اکثر بے تکلف دوستوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ منشی سجاد حسین کا مزاج صحافی کی نثر سے بھی زیادہ سادہ تھا۔ عام طور پر شیروانی اور پرانے زمانے کی ٹوپی پہنتے تھے، پاجامہ کبھی چھوٹے پائنچوں کا ہوتا تھا کبھی بڑے کا۔ چہرے سے شگفتگی برستی تھی۔ لہجے میں نرمی اور مٹھاس تھی۔ بات چیت کے طریقے اور اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث ہر فرقے اور طبقے میں یکساں مقبول تھے۔

ایک بار ایک اخبار کے ایڈیٹر پر مقدمہ چلا۔ یہ صفائی کے گواہ تھے۔ مستغیث کے وکیل نے پوچھا "کل کی گواہی کے بعد جب آپ اپنے وکیل سے ملے تو کیا باتیں ہوئیں؟" انھوں نے کہا "جانے دیجئے یہ نہ پوچھئے۔" وکیل صاحب نے جواب دینے پر اصرار کیا تو کہنے لگے "آپ کے متعلق فرماتے تھے کہ آپ ایسا بیوقوف بنایا ہے کہ باید و شاید" ساری عدالت ہنس پڑی اور وکیل صاحب شرما کے بیٹھ گئے۔

منشی سجاد حسین بڑے نڈر، مستقل مزاج اور قانع انسان تھے۔ روپے پیسے کی ذرا بھی پروا نہ کرتے تھے۔ جو کچھ لکھتے سچائی اور دیانت سے لکھتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ انہوں نے ایک ریاست کی بدنظمی کے متعلق پے در پے مضامین لکھے۔ اس ریاست میں ان کے کچھ عزیز بھی اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ چنانچہ انہیں بھی ایک اعلیٰ عہدہ پیش کر دیا گیا لیکن وہ صاف انکار کر گئے اور اپنے مسلک سے ذرا بھی انحراف گوارا نہ کیا۔

منشی سجاد حسین بڑے پکے کانگریسی اور کانگریس کے بڑے جوشیلے رکن تھے۔ سنہ ۱۸۸۵ء میں نیشنل کانگریس میں شامل ہوئے تھے اور ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۱۵ء تک مرتے دم تک اسی کے ممبر رہے۔ ان کے کانگریسی دوستوں میں بڑے بڑے ادیب اور اردو کے پرستار شامل تھے جن میں پنڈت بشن نارائن در، بابو گنگا پرشاد ورما مالک و مدیر "اخبار" "اودھ" کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ مہاراجہ سر علی محمد خان مرحوم والی ریاست محمود آباد ان کے بڑے مخلص قدر دان تھے۔ منشی سجاد حسین اور "اودھ پنچ" نے ایسے نازک وقت میں کانگریس کی مدد کی اور اس کے مقاصد کی نشر و اشاعت میں قلم توڑ کر حصہ لیا جبکہ انگریزوں کا اقبال اپنی بھر پور جوانی پر تھا، اور کوئی آزادی کا خواب بھی دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ چند گنے چنے افراد کے سوا ملک کا ہر شخص خوفزدہ، کانپتا اور معطل تھا۔ اور لکھنؤ میں تو کانگریس کی مخالفت میں ایک باقاعدہ انجمن "اینٹی کانگریس" کے نام سے کام کر رہی تھی۔ منشی سجاد حسین اور ان کے ساتھیوں نے جم کر ان عناصر کا مقابلہ کیا۔

۲۰ دسمبر ۱۸۹۹ء کو لکھنؤ میں کانگریس کا جلسہ ہونے والا تھا۔ اس کے مقابلہ میں اینٹی کانگریس والوں نے بھی ایک جلسے کا اعلان کر دیا اور ایک اشتہار شائع کیا جس میں لوگوں سے شرکت کی اپیل کی گئی تھی۔ اس اشتہار میں کہیں بدقسمتی سے "متعلقین" کا ذکر آ گیا تھا اس پر منشی سجاد حسین نے "اودھ پنچ" میں "انڈے بچے والی چیل جلسہ" کے عنوان سے ایک ایسا چٹ پٹا مضمون لکھا کہ بچارے مخالفوں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔

اینٹی کانگریس والوں نے لکھا تھا "اس جلسے میں گورنمنٹ کے خیر خواہ اپنے اعزا، اقربا، احباب اور متعلقین کے ساتھ شرکت فرمائیں۔"

جواب میں منشی سجاد حسین کے مضمون کی چند سطریں ملاحظہ ہوں ——

"اس نیاز مند کو یہ جتانا ہے کہ قومی کانگریس کے متعلقین کو جو تکلیف دی گئی ہے اس کا انتظام کیا فرمایا گیا ہے کیونکہ اینٹی بھائیوں سے کچھ بعید نہیں کہ انگریزوں کی طرح مع متعلقین جلسے میں موجود ہوں۔

"مشتہرین جانتے ہوں گے کہ متعلقین میں گھر بیبی، لڑکوں کی والدہ، بیگم خانم صاحبہ یعنی جورو بھی شامل ہیں جو معظم فلاں وغیرہ پانچویں انشاء اللہ شمار کی جاتی ہیں۔ جس طرح تھیٹر، گھوڑ دوڑ کے جلسوں میں اکثر اتفاق ہوتا ہے یہاں بھی یہ آ دھمکیں گی اور جب سارا گھر شریک ہوگا تو ضرورت کا سامان بھی ہمراہ ہوگا یعنی چھوٹی ننھی منی، شیر خوار بچہ (جس کے ابھی ٹیکہ لگا ہوگا)، پھر اس کا گہوارہ، پالنا، صحنکی، اتا، پھر جھم، بکری کا بچہ۔ چند قرقل بھی جو ہے، طوطے کا پنجرا (خاص اس مصلحت سے آئے گا کہ بولنے والے کی بولیاں یاد کرے)، یا دوپی ناز کا دیگ، اتا کے صاحبزادے، ننھو، تحقیق کا پاجامہ، لیڈی کتے کا پلا۔ چھوٹی صاحبزادی کی گڑیوں کا پچا، کچھ دنوں کا ایک مرغی کا انڈا، بٹیروں کے تھیلے، بیگم صاحب کا پاندان، طشت، تسلہ، اُگالدان، میرے ایسے کچھ ننھے بچے بھی ہوا چاہیں۔"

اس مضمون سے نہ صرف منشی سجاد حسین کے زور قلم اور بذلہ سنجی کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس زمانے کے لکھنؤ کی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اودھ پنچ میں جب بھی اس طرح کا مضمون شائع ہوتا تو دھوم مچ جاتی۔ منشی سجاد حسین کی اتنی دھاک بندھی تھی کہ ہر شخص ان سے ڈرتا تھا لیکن آخر عمر میں ایسا بانکا و بہادر آدمی بھی فالج سے لاچار ہو کر صورت گلی کا جھول بنا، مدتوں صاحب فراش رہا اور بالآخر دنیا سے بیزار ہو کر ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔

آخری عمر میں انہوں نے کانگریس کے اجلاس کے لئے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے ایک خطبہ لکھا جو ان کی بیماری کے سبب جگیت سے پڑھوایا گیا۔ مرنے سے پہلے یہ اعزاز بھی شاید انہیں آخرت کے خوف سے عطا کیا گیا۔ ورنہ زمانے نے ان کی ناقدری ہی کی۔

اگر وہ انگریزوں کی چاپلوسی کرتے تو کم از کم خان بہادری کا روگ اور کوئی خطاب تو لے ہی مرتے۔ مگر ان کے کردار کی عظمت اور قناعت کا یہ عالم تھا کہ تمام عمر انگریز عہدہ اور خطاب دکھاتے رہے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انہیں قانون کی گرفت سے بچ کر لکھنے کا بھی بڑا سلیقہ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ انگریزی اور حکومت پر بڑی سے بڑی چوٹ کرنے کے باوجود کبھی قانون کی گرفت میں نہ آ سکے۔ البتہ قدرت کے قانون کی گرفت سے وہ نہ بچ سکے اور قضا کا فرشتہ انہیں سب سے بڑی عدالت میں پیش کرنے کے لئے اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی

مانی جائسی

سنہ ۱۹۰۰ء کی بات ہے کہ میں حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ میں دسویں درجے کا متعلم تھا اور شعر بھی کہتا تھا لیکن شاعر کی حیثیت سے میرا حلقۂ تعارف نہایت محدود تھا، میرے مدرسے کے طلبہ اور مکتبیں تک اس حلقے کی وسعت تھی اور بس۔

عزیزؔ صاحب گو عمر میں مجھ سے بڑے تھے مگر ابھی نئے تھے، شاعری کا چرچا ہو چلا تھا اور مجھ تک بھی ان کے شعر کبھی کبھی پہنچ جاتے تھے۔ یہ سب تاہم مجھے حکیم سید علی صاحب آشفتہؔ مرحوم کے ذریعے سے ہوا کرتا تھا جن کا زمانۂ طالب علمی بھی وہی تھا جو میرا، فرق بس اتنا تھا کہ وہ عربی کے طالب علم تھے اور میں انگریزی پڑھتا تھا۔ آشفتہؔ مرحوم مجھ سے کوئی تین برس چھوٹے تھے مگر شعر کا ذوق انہیں بھی تھا اور خود بھی کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ کوئی باقاعدہ استاد تو اس وقت ان کا تھا نہیں، مجھی سے مشورہ کر لیا کرتے تھے، مگر عزیزؔ صاحب سے انہیں خاص عقیدت تھی۔

میں نے لکھنؤ چھوڑا اور اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کب آشفتہؔ صاحب نے عزیزؔ صاحب کا تلمذ اختیار کیا۔ بہرحال انہوں نے اپنے استاد کے فیض سے خوب استفادہ کیا، اچھے بلند پایہ شعرا میں شمار ہونے لگے اور خاصی شہرت حاصل کی۔

بہت سے شعر عزیزؔ صاحب کے میں نے ان سے سنے اور اسی زمانے میں سنے جب عزیزؔ صاحب استاد نہیں بلکہ مبتدی تھے۔ غزلیں تو نہیں ایک قصیدے کے یہ دو مطلع جو آشفتہؔ مرحوم نے سنائے تھے، اب بھی یاد ہیں:

(۱) فراقِ یار میں گھٹ گھٹ کے لبوں پہ اب تو جاں آئی — کہاں تک اے دلِ مجبور حوصلہ شکیبائی
(۲) میانِ دو گھڑی ہے دم بچا ہے تیرا شیدائی — دکھا دے جانے والے آج اعجازِ مسیحائی

پھر میری طالب علمی کے دو سال لکھنؤ میں گزر گئے لیکن میں اور جناب عزیزؔ ایک دوسرے سے روشناس بھی نہ ہو سکے۔ یہ غالباً [illegible] سنہ ۱۹۲۶ء تک رہا۔ اس عرصے میں میں بھی شاعر کی حیثیت سے جانا جا چکا تھا اور ان کا تو ایک مجموعہ بھی "گلکدہ" کے نام سے شائع ہو گیا تھا۔ جناب [illegible] نے سنہ ۱۹۱۹ء کے لگ بھگ مجھے بھوپال بلا بھیجا۔ میں اس زمانے میں نوکری کے سلسلے سے بھوپال ہی میں مقیم تھا۔

اگر حسن اخلاق کے ماتحت کچھ اور نہیں، صرف یہی ایک بات لکھ دی جائے کہ انھوں نے میرے پتے کا پتہ لگانے کی زحمت گوارا کی اور اپنی تصنیف مجھے مرحمت فرمائی، اور جب کہ ذاتی تعارف کیا دید و دید کی نوبت بھی نہ آئی تھی، تو بھی ان کے دامنِ اخلاق کی وسعت ثابت ہو جاتی ہے ——— ہر چند کہ اس ذیل میں اور بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

افسوس ہے کہ چونکہ مدت تک میں ان سے ناآشنا رہا اس لئے اس زمانے کے حالات اور حالات سے ان کی نجی زندگی اور کارنامے کے متعلق نتائج کا استنباط کر کے ان کی تفصیل سے قاصر ہوں۔ اصل میں یہ فرض تو ان کے مخصوص شاگردوں کو ادا کرنا چاہئے تھا جن میں اثرؔ لکھنوی، جوشؔ ملیح آبادی، شکیل سہروردی، آسی لکھنوی اور جگرؔ بریلوی ایسے مشاہیر ادب شامل ہیں ——— خیر، میں بھی اس حق سے سبکدوش ہوتا ہوں جن کی بے پایاں محبت، حسن خلق، انسانیت اور خلوص نے مجھے گرویدہ کر لیا ہے کہ ان کی بناء پر جو نقوش میرے دل پر ابھرے ہیں وہ کبھی محو نہیں ہو سکتے۔

غرض نومبر ۱۹۲۶ء آیا، جوشؔ ملیح آبادی شاگرد عزیزؔ، لکھنؤ کے محلہ گولہ گنج میں مقیم تھے جہاں سے امین آباد میونسپل ہائی اسکول قریب ہے۔ اور عزیز صاحب مدرسے کی درمیانی فرصت میں اور شاگرد نوازی جوشؔ کی استدعا پر اکثر وہاں آ جاتے تھے۔ میں بھی اس زمانے میں آگرے سے لکھنؤ آیا ہوا تھا۔ ایک روز مجھے بھی جوشؔ صاحب اپنے یہاں پکڑ لے گئے۔ ایک بجے دن کے قریب عزیزؔ صاحب تشریف لائے اور جوشؔ صاحب نے میرا تعارف ان سے کرایا۔ یہ پہلا دن ہے کہ مرحوم نے مجھے اور میں نے مرحوم کو دیکھا، بڑے تپاک سے حضرت عزیزؔ ملے اور مجھے بھی دلی مسرت حاصل ہوئی۔ شعراء کے اجتماع کا معروف لازمہ عموماً شعر خوانی ہے سو ہوئی، کچھ میں نے پڑھا کچھ ممدوح مغفور نے ارشاد فرمایا، یہ مختصر سی پُر لطف صحبت برہم ہوئی تو وہ مدرسے واپس تشریف لے گئے اور میں اپنی قیام گاہ پر آ گیا۔

دوسرے دن کٹرہ ابو تراب خاں میں اپنے مکان پر اثرؔ صاحب نے مجھے اور جوشؔ اور جناب عزیزؔ کو مدعو کیا، دن کا کھانا ہوا۔ اور دیر تک شعر خوانی ہوتی رہی، بڑے مزے مزے کی باتیں اور چند چٹکیاں ہوئیں اور بڑی ہی فرحت بخش محفل رہی۔

میری رخصت ختم ہوئی، تیسرے دن میں آگرے واپس گیا مگر سچ یہ ہے کہ حضرت عزیزؔ سے ملنے کے بعد اب کی بار لکھنؤ کو اس قدر جلد چھوڑنا شاق گزر گیا، بہت شاق۔

اس کے بعد لکھنؤ کے بعض مشاعروں اور کبھی کبھی دوسرے مقامات کے مشاعروں میں ملاقاتیں ہوئیں اور ہمیشہ، ہر دفعہ ان کی خوش کرداری کی عظمت دل میں بڑھتی گئی اور محبت، مروت، اخلاص، اخلاق اور نیک نفسی کا سکہ زیادہ نمایاں ہو کر بیٹھتا گیا۔ تا آنکہ ۱۹۳۳ء میں میری طلبی ریاست محمود آباد سے ہوئی اور میں چند روز کے لئے وہاں چلا گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب جناب عزیزؔ راجہ صاحب محمود آباد کو ادبیات اردو و فارسی کی تعلیم دینے پر مامور تھے[1]۔ اس طرح پر کبھی کبھی مجھے بھی ان سے ملنے کی مسرت حاصل ہوتی رہتی تھی۔

درمیان میں میں پھر آگرے چلا گیا اور ۱۹۳۵ء میں ریاست جہانگیر آباد کی مہارانی کے لئے پھر بلایا گیا۔ اس دفعہ جانے سے پہلے چند روز محمود آباد میں قیام رہا مگر عزیزؔ صاحب مغفور وہاں سے جا چکے تھے۔ اور اپنے وطن میں علاج کر رہے تھے۔

صاحب فراش نہ تھے مگر نقاہت بڑھ گئی تھی، اسی حال میں ایک روز راہ میں ملے اور یہ میری ان کی آخری ملاقات تھی جس کے چند ہفتوں کے بعد ۲۹ جولائی ۱۹۳۵ء کو یہ چراغ جس سے محفل شعر و ادب منور تھی ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم کے پس ماندگان میں تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، لیکن ان میں آپ کے نقش ثانی سب سے چھوٹے فرزند مرزا محمد جعفر حیات لکھنوی

---

[1] عزیزؔ صاحب مرحوم کو غالباً ۱۹۲۵ء میں مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب بہادر، کے۔ سی۔ ایس۔ آئی والی محمود آباد نے اس خدمت کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ اس وقت سے آخر عمر تک یہی شغل رہا۔

ہی کو حاصل ہے جو چند سال سے بہ سلسلۂ ملازمت دہلی میں مقیم ہیں۔ انگریزی اخبار "ہندوستان ٹائمز" سے ان کا تعلق ہے۔ بہت خوب شعر کہتے ہیں اور بڑے سلیم المذاق ہیں۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی بڑا دلکش ہے۔ یہ ایک مبارک اقدام بھی کر رہے ہیں یعنی حضرت عزیز مغفور کا غیر مطبوعہ کلام جو سارا غزلیات، نظموں اور قطعات، رباعیات اور قصائد پر مشتمل ہے، عنقریب شائع کرنے والے ہیں۔

حلیہ عزیز صاحب میانہ قامت، گندم رنگ، قبول صورت آدمی تھے، بھرا ہوا گول چہرہ تھا، چیچک کے دو چار داغ چہرے پر تھے جو بھلے معلوم ہوتے تھے۔ نہ دبلے تھے نہ موٹے، بھرے بھرے شانے، ابھرا ہوا سینہ، غرض ایک خوش نما سراپا ان کا تھا۔ سر پر بال گھنے تھے اور بیچ سے مانگ نکالتے تھے۔

لباس نہایت خوش پوشاک آدمی تھے اور دوسرے شہروں میں کیا لکھنؤ میں بھی مشرق و مغرب کے ملبوسات کا مذاق، اچھا ذوق رکھنے والوں سے بہتر شاید ہی کوئی رکھتا ہو۔ میں نے تو جہاں تک دیکھا ہے، نفاست بہت کم دیکھی ہے جو انہیں ملحوظ رہتی تھی۔ ہمیشہ سیاہ ایرانی ٹوپی لگاتے تھے اور اچکن کبھی حیدرآبادی وضع کی (شیروانی) اور کبھی ایسی کہ جس کی چولی یعنی قریب ناف تک ریشمی چھوٹی چھوٹی گھنڈیاں اور تکموں کا ایک سلسلہ ہوتا تھا، پہنا کرتے تھے۔ جامہ زیب ایسے تھے کہ ہر لباس ان پر نہایت موزوں اور بھلا معلوم ہوتا تھا۔

عادات و اخلاق بڑے ہی مہذب، ملنسار، شگفتہ مزاج اور بذلہ سنج تھے، ملاقات کے وقت خفیف سا تبسم دل میں گھر کرتا تھا، باتوں کی گل افشانی ظاہرداری کی نسبت بدرجہا اور موقع موقع سے بے ساختگی کے ساتھ ظرافت کی چاشنی صحبتوں میں گرمی پیدا کرتی اور دلوں کو نہال کر دیتی تھی۔ اہل و عیال کی طرف حد درجہ کا التفات تھا اور ایثار تو گویا ان کا شعار تھا جو اہل و عیال سے تجاوز کر کے احباب بلکہ انسانی برادری کے لئے بھی دریغ نہ کیا جاتا تھا۔

شاگرد اور ان کے ساتھ خصوصی برتاؤ اور شفقت مولانا عزیز کے شاگرد تو بہت سارے ہیں لیکن جن سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا وہ (۱) محبّی جناب راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب بہادر (محمود آباد) (۲) محبّی جناب مہاراج کمار محمد امیر حیدر خاں صاحب (محمود آباد) (۳) جگت موہن لال صاحب رواں (اناؤ) (۴) نواب میرزا جعفر علی خاں صاحب اثر (لکھنؤ) (۵) شبیر حسن خاں صاحب جوش (ملیح آباد) (۶) گوپی ناتھ صاحب امن (لکھنؤ) (۷) سید علی صاحب آشفتہ (لکھنؤ) (۸) ادیب صاحب (لکھنؤ) برادر جناب امن لکھنوی۔ (۹) جگر صاحب (بریلی) اور (۱۰) مرزا التصدق حسین صاحب صدق (جائس ضلع رائے بریلی) ہیں۔ اور میرے نزدیک یہی حضرات حقیقتاً ان کے شاگردوں میں ممتاز ترین درجہ رکھتے ہیں —— ایک صاحب اور بھی ہیں، اقبال ورما سحر قابل ذکر ہیں۔ ان سے میرا تعارف تو کبھی نہیں ہوا لیکن اکثر رسائل میں ان کا کلام دیکھا ہے، وہ بھی عزیز صاحب کے ممتاز شاگردوں کی صف میں آتے ہیں اور اس صف میں بھی امتیاز رکھتے ہیں۔ ان کا کلام مدارس کی بعض نصاب کی کتابوں میں بھی داخل ہے —— وہ ہیں شکیلؔ سہسوانی۔

جن تلامذہ سے ملاقات ہے ان سے جب بھی عزیز صاحب مغفور کا ذکر آیا سب ان کو ایسی محبت سے یاد کرتے ہیں جیسے کوئی اپنے شفیق باپ یا مربی کو یاد کرے۔ جوش صاحب قوم کے پٹھان ہیں اور ایسی باتوں میں یوں بھی کوئی مادی لعنت یا منفعت نہیں، اسی لئے انہیں تو کبھی رنج و الم کے ساتھ استاد کو یاد کرتے نہیں دیکھا، باقی سب کو ان کی شفقت اور شاعرانہ کمالات کا ذکر کرتے ہوئے گویا اشک بدیدہ دیکھا ہے۔

رواں صاحب کا انتقال حضرت عزیز مرحوم کی حیات ہی میں ہو گیا لیکن مسلم یونین دہلی کے ایک مشاعرے میں ان کو میں نے کمال احترام، عقیدت اور خلوص و محبت سے عزیز صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ان کی استادی پر مباہات کرتے ہوئے اور ان کی اصلاحوں کی مدح سرائی کرتے ہوئے سنا ہے۔ معلوم نہیں عزیز صاحب کا ان کے سامنے انتقال ہوتا تو اس صدمے کو وہ کیونکر برداشت کرتے۔

خاندان عزیز صاحب لکھنؤ کے ایک عالی نسب مغل خاندان سے تھے، ان کے والد میرزا محمد علی صاحب کا شمار اسی زمانے کے اکابر علماء

پُر تھا اور صاحبِ تصانیف تھے، ایک کتاب نجوم السماء قرآن کی بڑی مشہور تصنیف ہے۔ مسائلِ علمی کو عزیز صاحب کا پیشۂ خاندانی سمجھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے (جناب عزیز کے) بڑے بھائی مرزا محمد مہدی، لکھنؤ کے حاذق اور مشہور اطبا میں سے تھے اور اسی فن میں ان کے شاگرد بکثرت تھے۔ میں نے بھی بارہا ان کی زیارت کی ہے، ہمیشہ ان کے گرد طالبانِ علم طب کا مجمع دیکھا اور مطب کو مریضوں سے بھرا ہوا پایا۔

علم و فضل اور شاعری

شاعری کا ذکر یہیں کیا کہ ان کے اس کمال کو ہندوستان اور پاکستان کے گوشے گوشے میں شہرتِ تام، قبولِ عام اور بقائے دوام کے درجات حاصل ہیں، البتہ علم و فضل کے حدود عموماً معلوم نہ ہوں گے، سو عزیز صاحب فارسی کے مستند عالم اور عربی کے منتہی فاضل تھے، استعدادِ فطری اور ذہانت خداداد تو تھوڑے ہی سے علم کو بہت کچھ کر دکھاتی ہے، اور یہاں تو فضیلتِ علمی کے ساتھ نظری مطالعہ اور کتب بینی کے انتہائی شوق نے چار چاند لگا کر علماء و فضلاء اور شعراء و ادباء کی صفوں میں ہمیشہ انھیں ممتاز رکھا۔

اس مضمون میں ان کی شاعرانہ خصوصیات کو اجاگر کرنے کی جسارت "نجی زندگی" اور "ذاتی کردار" سے تجاوز کی مرادف اور موضوع سے خارج ہوگی، اس لئے حضرت مولانا عزیزؔ کا یہ تعارف اپنی کوتاہیوں کے اعتراف کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔ بس اتنا ہی اور کہوں گا کہ جناب عزیز شاعری کے اعتبار سے اتنا ہی بلند پایہ رکھتے تھے جتنے بلند وہ خود، حسنِ فطرت اور کمالِ انسانیت کے اعتبار سے تھے —— اور یہ بھی ہے کہ انسانیت اگر کہیں ناقص ہے تو شاعری بھی اسی نسبت سے ناقص ہوگی، ضرور ہو گی، چاہے کوئی ناظم ظاہر میں لفظوں کا طلسم ہی کیوں نہ باندھے یا ابلہ فریبی کے لئے ادھر ادھر سے دزد ربائی کر کے اپنے کو شاعر ثابت کرنے کی ان تھک کوشش ہی کیوں نہ کرے —— صاحب نظر کی بارگاہ سے "انداز فکر" کی شناسائی کا خلعت بہرحال مل جائے گا۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

خواجہ شمس الدین

واہ رے لکھنؤ تیری سرزمین میں کیسے کیسے باکمال اور زندہ دل لوگ پیدا ہوئے کہ زمانہ ان کا مثل و نظیر ڈھونڈے گا اور نہ پائے گا۔ یہاں جو تھا اپنے رنگ میں بے مثل تھا۔ جس نے جو وضع و قطع اور جو طور طریقہ اختیار کیا مرتے دم تک اس کو نباہ گیا۔ حسن اخلاق، خوش مزاجی اور وضعداری تو یہاں کے شرفا کی گھٹی میں پڑی تھی، لطف طبع، مروت، رواداری اور سیر چشمی عام تھی۔ اسی لئے یہاں کا آدمی کہیں بھی جاتا چھپا نہ رہتا اور صاف پہچان لیا جاتا کہ لکھنؤ کا ہے۔ یہاں کے لوگوں کو شاعری، موسیقی، بذلہ گوئی اور ظرافت و خوش طبعی سے فطری لگاؤ تھا۔ زمانہ کے تغیر اور وقت کے انقلاب نے یہاں کے خصوصیات کافی حد تک بدل دیئے ہیں اور کیا عجب ہے کہ تھوڑے دنوں کے بعد لکھنوی اور غیر لکھنوی میں جو امتیاز چلا آتا ہے وہ ختم ہو جائے۔ لکھنوی خصوصیات کے حامل بکثرت یہاں نظر آتے تھے کہ دیکھتے دیکھتے صفحۂ ہستی سے اٹھ گئے اور جو چند باقی ہیں اٹھتے جا رہے ہیں۔ لیکن کیا یہ بے انصافی نہ ہوگی اگر ہم ان مشاہیر کو دلوں سے بھلا دیں اور ان کا تذکرہ ثبت نہ کریں جن سے لکھنؤ کی ادبی روایت تھی اور جن کی بزرگ ہستیوں پر لکھنؤ بجا طور سے فخر کر سکتا تھا۔ ایسے ہی حضرات میں ایک نمایاں اور قابل قدر شخصیت مرحوم خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت کی بھی تھی۔ جن کے ادبی خدمات اور علمی و لسانی کمالات پر اس وقت روشنی ڈالنا نہیں چاہتا کہ یہ ایک مستقل کام ہے جس کے واسطے کافی وقت اور فرصت درکار ہے بلکہ میں ان کے ذاتی اور شخصی حالات اور ان کے اخلاق و عادات پر مختصراً کچھ لکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا تھے اور کن صفات کے انسان تھے۔ اردو لٹریچر کی انہوں نے جو گراں قدر اور عظیم الشان خدمتیں کیں وہ ارباب ادب اور اہل زبان سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اردو کا وہ کون سا رسالہ یا اخبار تھا جس میں ان کے مضامین کثرت کے ساتھ شائع نہیں ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کے تصانیف [illegible] خود گواہ ہیں کہ مرحوم وہ کام کر گئے جو دوسرے نہ کر سکے۔ ان کی سیرت کے متعلق مجھے قلم اٹھانے میں دشواری محسوس نہیں ہوتی وہ میرے ماموں تھے اور میری حقیقی پھوپھی (اللہ ان کا سایہ عاطفت دیر تک قائم رکھے) ان کو منسوب تھیں۔ والد مرحوم خواجہ قطب الدین [illegible] برجیس لکھنؤ کے شاگرد بھی تھے اور ان کو مثل باپ کے سمجھتے تھے۔ اس سن جب سے آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا ان کو دیکھا۔ رہتے

احاطہ خانساماں میں تھے اور چوک میں والد مرحوم نے اپنے نامی پریس کی مطبوعہ کتابوں کی جو دوکان رکھی تھی اس کے تمام انتظامات اور کام ان کے اور ان کے منجھلے بھائی خواجہ غلام محمد مرحوم کے زیر نگرانی کر رکھا تھا یہ دوکان جو ٹھیک وسط چوک میں مارو دو حیدر بخش کی مسجد کے پیچھے واقع تھی، بڑے موقع کی دوکان تھی اس زمانے میں لکھنؤ کا چوک سلطنت شاہی کی یادگار اور گزرگاہ خاص و عام تھا، عہد شاہی سے دستور تھا کہ تمام مجری اور بازاری چوک سے نکلتی تھیں۔ تیسرے پہر سے آدھی رات تک چوک کی گرم بازاری کا وقت تھا، تین بجے سے میونسپلٹی کے بہشتی اکبری دروازہ سے گول دروازہ تک پانی کا چھڑکاؤ کرتے تھے کہ زمین ٹھنڈی رہے اور گرد و غبار بیٹھ جائے۔ پھر سارے شہر کے اشراف، رؤسا اور لکھنؤ کے زندہ دل نوجوان اور ہر فن کے اہل کمال تفریح، ملاقات احباب یا خریداری کے لئے یہاں آتے تھے۔ مختلف دوکانیں ان کی نشست گاہیں تھیں۔ مگر شہر کے اہل علم و ادب اور چیدہ حضرات کی سب سے بڑی نشست گاہ خواجہ صاحب کی دوکان تھی۔ دن کو دوکانداری رہتی تھی مگر شام سے دوکانداری تو بند ہو جاتی تھی۔ اور اہل سخن کا مجمع لگ جاتا تھا میں بھی اکثر جایا کرتا تھا۔ مولانا شرر، ریاض، تسلیم، آغا حشر کاشمیری، رشید، وزیر صاحب عروج، عارف، حسرت موہانی، وفا، مرزا محمد عسکری، شمشاد، عزیز، محشر، وسیم اور خدا جانے کتنے اہل سخن اور شعراء آیا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب مرحوم کہتے تھے کہ مولانا محمد حسین آزاد مصنف آبحیات بھی جب لکھنؤ آئے تھے تو کئی بار آپ بیٹھنے آئے تھے میں نے نہیں دیکھا مگر وہ پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا شبلی اور ابوالکلام آزاد کے متعلق بھی کہتے تھے کہ ان کی دوکان ان حضرات کی نشست گاہ رہ چکی ہے یہاں بیٹھ کر شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا، الفاظ و محاورات کی تحقیق ہوتی تھی اور زبان کے مشکل مسائل حل ہوتے تھے عموماً یہ محفل ۹ بجے شب تک رہتی تھی مگر محرم میں جبکہ چوک کی رونق اور چہل پہل امام باڑوں کی روشنی، عزاداری اور تعزیوں کے جلوسوں کے نکلنے سے بہت بڑھ جاتی تھی خواجہ صاحب کو ۱۱-۱۲ بجے شب تک دوکان کھلی رکھنا پڑتی تھی، وہ آنے والوں کی خاطر و مدارات بھی بہت کیا کرتے تھے بغل ہی میں میاں وزیر پان فروش کی دوکان تھی جن کے ہاتھ کی سفید پانوں کی مسقّف گلوریاں شہر بھر میں مشہور تھیں وہ خود تو پان بہت ہی کم کھاتے تھے مگر دوسروں کی تواضع وزیر کی گلوریوں ہی سے کیا کرتے تھے۔ میں ان کا بھتیجا تھا اور وہ میرے بزرگ تھے مگر جب میں ان کی دوکان پر جاتا اسی وقت وزیر سے پان منگا کر مجھے دیتے تھے، خواجہ صاحب لاولد تھے اور مجھ کو بہت چاہتے تھے میرا بچپن کا زمانہ تھا اکثر ضد کر بیٹھتا تھا اور میں جس بات کی ضد کر بیٹھتا تھا اس کو ضرور پورا کرتے تھے، ان کی والدہ مرحومہ جو شاہی زمانہ کی تھیں مجھ سے بے حد محبت کرتی تھیں جمعہ کی چھٹی میں اکثر انہی کے پاس جا کر رہتا تھا تو برابر میری خاطر داری اور ناز برداری میں لگی رہتی تھیں۔ راتوں کو شاہی دستوں کے قصے سنایا کرتی تھیں اور میں بہت شوق سے سنا کرتا تھا میری مرغوب چیزیں خود اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلاتی تھیں۔ خواجہ صاحب اور ان کے بھائی خواجہ غلام محمد اپنی ماں کے بے حد مطیع اور فرماں بردار تھے اور اس صفت میں میں نے آج تک کسی شخص کو ان کے برابر نہیں پایا ہر کام ماں سے پوچھ کر اور ان کے اشارہ پر کرتے تھے ان کی جدائی کے خیال سے شہر کے باہر کہیں نہیں جاتے تھے، خواجہ صاحب مرحوم کو لکھنؤ سے باہر سفر کرنے کا بہت کم اتفاق ہوا، لکھنؤ کے لوگ یوں بھی سفر کرتے بہت گھبراتے ہیں اور وہ تو پورے لکھنوی اور تمام لکھنؤ کے صفات کے زبردست حامل تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے پٹنہ میں ان پر کوئی جھوٹا دعویٰ کر دیا اور ان کے نام سمن جاری کرا دیا جس کی جواب دہی کے لئے ان کو پٹنہ جانا پڑا، کیا بتاؤں کہ پٹنہ تک جانا ان کو کیسا کھلا ہے اور اس کے لئے کتنے سامان کئے ہیں کہ شاید حج کے سفر کے لئے بھی کوئی اتنے سامان نہ کرتا، وہاں پہنچے تو پٹنہ کے قدر شناس لوگوں نے ان کی حد سے زیادہ آؤ بھگت کی، آنریبل [illegible] صاحب نے اپنا مہمان بنایا اور وہاں کے اکابر و امراء نے ان کی بہت عزت اور تکریم کی بڑے بڑے بیرسٹروں اور وکیلوں نے ان کے مقدمہ کی مفت پیروی کی، ان کے اعزاز میں مشاعرے ہوئے اور دعوتیں ہوئیں۔ آخر مقدمہ میں کامیاب ہو کر گھر واپس آئے۔ اہل عظیم آباد کی اس قدر دانی اور مہمان نوازی کو ہمیشہ یاد کیا کرتے تھے، لکھنؤ کے لوگوں کا جذبۂ حب وطن تو واقعی قابل تعریف ہے اور نہ معلوم یہاں کی زمین میں کیسی مقناطیسی کشش ہے کہ یہاں کے قدیم باشندوں کا تو کیا ذکر باہر کے لوگ آجاتے ہیں تو لکھنؤ سے جانے کو ان کا دل نہیں چاہتا

مگر اس سے لکھنؤ والوں نے نقصان بھی بہت اٹھائے ہیں۔ خواجہ صاحب بات کے بہت پکے اور قول کے بہت سچے تھے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے اور نہ کسی سے وعدہ خلافی کرتے تھے جو وعدہ کر لیا وہ پتھر کی لکیر ہو گیا۔ زبردست سے زبردست طاقت بھی ان کو وعدہ خلافی اور عہد شکنی پر مجبور نہ کر سکتی تھی۔ الیکشن کے زمانہ میں اکثر دیکھا کہ کوئی امیدوار پہلے پہل پہنچ گیا اور اس سے ووٹ دینے کا وعدہ کر لیا پھر دوسرے امیدواروں کے بیسیوں [illegible] ان پر پڑے وہ ٹس سے مس نہ ہوئے اور سب سے کہہ دیا کہ زبان کٹ جائے گی مگر قول سے پھر نہیں سکتا۔ اسی لئے صاف گوئی کی عادت تھی۔ تصنع یا بناوٹ بالکل نہ تھی۔ اس کے ساتھ مروّت دار بھی بہت تھے جو کام کسی کا اپنے بس کا ہوتا اس سے کبھی انکار نہ کرتے اور جذبۂ ایثار و مروّت میں شدید سے شدید نقصان بھی برداشت کر لیتے۔ وضعداری کی صفت اہلِ لکھنؤ کا حصہ تھی اور اس میں بھی خواجہ صاحب بہت ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ وضع، قطع، لباس، طور طریقے جو اختیار کر لئے تھے ان میں کبھی تبدیلی نہ کی۔ دیانت دار ایسے تھے کہ ہر شخص ان کا اعتبار کرتا تھا۔ کسی کا ایک پیسہ اپنے ذمہ باقی نہ رہنے دیتے تھے۔ مزاج میں عجلت پسندی تھی۔ باتیں بہت جلدی جلدی کرتے تھے۔ چلنے میں نہایت تیز رفتار تھے اور پیدل چلنے سے کبھی تھکتے نہ تھے۔ میں جب چھوٹا تھا تو مرحوم کی روشنی دکھانے لے جاتے تھے عشا کے بعد لے کر نکلتے تو صبح تک پھرتے اور میں بھی روشنی دیکھنے کے شوق میں چلا کرتا سارے شہر کے امام باڑے دیکھتے اور دکھاتے۔ اور ہر ایک کے خصوصیات اور تاریخ سمجھاتے۔ لکھنؤ کا واقف کار ان سے بڑھ کر کوئی نہ تھا اسی لئے لکھنؤ کے تمدن، معاشرت اور مشاہیر کے متعلق انہوں نے بے شمار مضامین لکھ ڈالے۔ ان کی دوکان پر یہاں کے اگلے اور شاہی زمانہ کے لوگ اکثر آ کر بیٹھا کرتے تھے ان سے ایک ایک بات پوچھتے اور یادداشت کے طور پر لکھ لیتے تھے پھر انہی یادداشتوں سے مضامین مرتب کرتے خود ان کی والدہ شاہی عہد کی تھیں اور اس زمانہ کے اکثر چشم دید حالات بیان کیا کرتی تھیں۔ خواجہ صاحب کو لکھنؤ سے، یہاں کی زبان سے، یہاں کی بول چال سے، یہاں کی وضع قطع سے یہاں کے معاشرت اور تمدن سے اور یہاں کے باشندوں اور یہاں کی عادتوں سے بے حد عشق تھا اور یہاں کے قدیم حالات جاننے کی ہمیشہ فکر رہتی تھی۔ افسوس یہ ہے کہ انہوں نے یہاں کے متعلق مختلف عنوانوں پر مضامین تو بے شمار لکھے جو تمام ہندوستان کے اخبارات و رسائل میں برابر شائع ہوئے مگر کوئی مستقل کتاب ترتیب نہ دی۔ اب ان مضامین کا کہیں پتہ نہیں کتاب ہوتی تو محفوظ رہتی۔ لوگ ان کے مضامین کے بے حد گرویدہ تھے اور رسائل و اخبارات کے اڈیٹر احباب کی ہمیشہ ان سے طلب جاری رہتی جو کبھی ختم نہ ہوتی۔ ملک بھر کے رسائل و اخبارات ان کے پاس ہمیشہ مفت آیا کرتے تھے کہ پڑھنے کا بھی ان کو موقع نہ ملتا۔ اکثر ان میں سے بنڈل کے بنڈل میں اٹھا لاتا تھا اور پڑھا کرتا تھا خواجہ صاحب مرحوم نے یوں تو ہر موضوع پر مضامین لکھے ہیں لیکن ادب اور لکھنؤ پر انہوں نے جو مضامین تحریر کئے وہ بے حد مقبول ہوئے اور ان کو خود بھی اس موضوع پر زیادہ دلچسپی تھی اور بڑے شوق و ذوق سے اس پر قلم اٹھاتے تھے مجھے یاد ہے کہ جب ان کا ایک مضمون قدسیہ بیگم ملکۂ محبوبۂ نصیر الدین حیدر بادشاہ پر شائع ہوا اور غالباً "زمانہ" کانپور میں وہ نکلا تھا تو تمام ملک میں اس کی دھوم مچ گئی اور بہت سے اخبارات و رسائل نے اس کو نقل کیا۔ اسی طرح غازی الدین حیدر بادشاہ کے جشنِ تاج پوشی کا بھی مضمون تھا۔ ایک مضمون بادشاہ نصیر الدین حیدر پر بھی لکھا تھا جن کے عہد میں لکھنؤ کا پورا شباب تھا۔ ان کی دوکان شہر کے پرانے اور جہاں دیدہ لوگوں کی سب سے بڑی نشست گاہ تھی ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو عہد شاہی کا تماشا تیس تیس چالیس چالیس برس کی عمر تک دیکھے ہوئے تھے خود ان کی والدہ عہد شاہی کی تھیں ان لوگوں سے تمام حالات پوچھ کر قلم بند کرتے جاتے۔ اسی لئے ان کی معلومات بے حد وسیع تھیں اور جب کسی عنوان پر قلم اٹھاتے تو اس کا حق پورا ادا کر دیتے۔ مولانا شرر مرحوم نے بھی لکھنؤ کے تمدن پر بہت لکھا ہے مگر خواجہ صاحب کے معلومات اور مضامین ان سے بہت زیادہ تھے شرر مرحوم کو لکھنؤ سے باہر رہنے کا بیشتر اتفاق رہا تھا اور جہاں تک ہمارا خیال ہے وہ مضافات لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے خواجہ صاحب چند دن کے سوا کبھی لکھنؤ سے باہر نہ گئے اور ان کی ولادت لکھنؤ کے مشہور محلہ احاطہ خانساماں میں ہوئی۔ خانگی تفکرات سے ہمیشہ آزاد رہے۔ اولاد کا جھگڑا نہ تھا گھر کا سارا کام والدہ کے ذمہ تھا جو بڑی منتظم اور محنتی تھیں۔ انگریز افسروں کو اردو پڑھانے کے چند ٹیوشن بیش قرار تنخواہوں پر جب سے مل گئے تھے۔

ملازمت والد مرحوم کی بھی ترک کر دی تھی ، اور چوک میں اپنی ذاتی دوکان کتابوں کی کر لی تھی ، جتنا وقت ملتا تھا زبان کی تحقیقات ، کتابوں کے مطالعہ اور تصنیف و تالیف و تحریر مضامین میں صرف کرتے تھے ۔ اردو کے متعلق ان کی تصانیف بکثرت تھیں جن کو والد مرحوم کے پریس میں چھپواتے اور فروخت کرتے ، مضامین جو رسائل و اخبارات کو بھیجتے ان کا کبھی کوئی معاوضہ نہ لیتے ، شوق تحریر و مطالعہ اتنا تھا کہ آدھی آدھی رات تک جاگا اور لکھا پڑھا کرتے ، وہ ایک ایسے متحرک اور شاغل انسان تھے کہ آرام لینا اور خالی رہنا جانتے ہی نہ تھے جب دیکھو کسی نہ کسی کام میں مشغول ہیں ۔ انہوں نے اپنی زبان یا قلم سے کبھی کسی کی برائی یا عیب گیری نہیں کی اپنے آپ کو نہ کبھی بڑا سمجھا نہ کسی کے سامنے اپنی بڑائی کا ، ہر شخص سے بہت ہی جھک کر ملتے اور انکساری برتتے ، اٹھتے تو لکھنؤ کے مگر کھانے پینے کے یا لباس کے ذرا بھی شوقین نہ تھے ، تندرستی ۶۰ - ۶۵ برس کی عمر تک تو بہت اچھی رہی بیماری کا نام بھی نہ جانتے تھے مگر اس کے بعد ایک بار درد گردہ اٹھا جو پتھری کے سبب سے تھا اور اس کا سلسلہ کچھ ایسا بڑھا کہ ختم ہی نہ ہوا ، درد گردہ کے دوروں نے جو کبھی کبھی پڑتے رہتے تھے ان کی تندرستی بگاڑ دی باوجود اس کے ہمت ایسی تھی کہ جس طرح کام پہلے کرتے تھے اسی طرح جاری رکھا کسی بات میں فرق نہ آنے دیا ، دور دراز مقامات پر انگریزوں کو پڑھانے جانا ، دوکان پر بیٹھنا ، سیکڑوں خطوں کا جواب لکھنا جو ان کے شاگردوں کے یا بیرونجات کے لوگوں کی زبان یا شاعری کے متعلق استفسار کے آتے تھے ، غزلوں پر اصلاح دینا ، مضامین اور تالیفات مرتب کرنا یہ اور ان کے علاوہ بہت سے کام تنہا انجام دیتے رہے ، اور بیماری کی تکالیف کی پروا نہ کی ۔ آخر تو تھک کر وہ پڑتے چلے گئے اور دماغی و اعصابی کمزوری نے پلنگ پر ڈال دیا والدہ کا مدت ہوئی انتقال ہو چکا تھا ، بہن کی شادی ہو چکی تھی ، ان کے غمگسار اور تیمار دار باقی ان کی بیوی تھیں جن کی خود تندرستی بہت خراب رہتی تھی اور یا منجھلے بھائی خواجہ غلام محمد مرحوم تھے جو میونسپلٹی میں ملازم تھے مگر اس میں شک نہیں کہ ہمشیرہ محترمہ نے باوجود اپنی صحت خراب ہونے کے ان کی ایسی خدمت اور رفاقت کی کہ کم کسی بیوی نے اپنے شوہر کی کی ہو گی ۔ آخر کار وقت اجل آپہنچا اور وہ داعی اجل کو لبیک کہہ کر اس عالم فانی سے رخصت ہو گئے ، اور لکھنؤ کا یہ نامور فرزند جو اس پر جان و دل سے نثار رہتا تھا ، اپنے مکان واقع احاطہ خانساماں سے متصل خاندانی قبرستان کے ایک گوشہ میں پہنچ کر قیامت تک کے لئے محو خواب ہو گیا ۔

اے میرے عزیز وطن ! تیرے ایسے چاہنے والے اور تمام ملک میں تیری نیک نامی کو اس طرح پھیلانے والے اب کہاں پیدا ہوں گے ، کیا لوگ تھے اور کیا صورتیں تھیں کہ دیکھتے دیکھتے غائب ہو گئیں ۔ ؎

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

(میر)

مولانا صفیؔ لکھنوی

ممتاز حسن جونپوری

مولانا سید علی نقی صفیؔ ۳ رجنوری ۱۸۶۲ء کو لکھنؤ کی شعر و ادب نواز سرزمین میں پیدا ہوئے اس وقت وہاں اردو کو وزراء کے محلوں اور شاہانِ اودھ کے درباروں میں پرورش پاتے ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا اور وہ سرتاپا پرتکلف، رسمی اور رنگین الفاظ کی خلعت میں ملبوس تھی۔

مولانا صفیؔ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے لکھنؤ کی شاعری میں اصلاح اور ادب میں انقلاب پیدا کرنے کا وہ کام اپنے ہاتھوں میں لیا جو دہلی اور پنجاب میں حالی اور آزاد نے انجام دیا۔ وہاں ان حضرات کو جان گلکرسٹ جیسے ادب پرور حکام اور سرکار کی امداد میسر تھی۔ لیکن ان کی کوششوں کا اثر لکھنؤ پر نہیں پڑ سکا تھا۔ اس ضمن میں مولانا صفیؔ نے جو کوششیں کیں ان میں وہ بہت بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ اس کے ثبوت میں ہم بعض دستاویزی شہادتوں کے علاوہ ان چشم دید گواہوں کو پیش کریں گے .. ..

.. جنہوں نے انیسویں صدی عیسوی میں دبستانِ لکھنؤ کی آخری بہار دیکھی اور جو آج بیسویں صدی کا تین چوتھائی حصہ طے کر کے ستارۂ سحری کی طرح جھلملا رہے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا صفیؔ کے کارناموں سے اردو ادب کی تاریخ خالی ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ صفیؔ نے خود اپنے ساتھ دشمنی کی ہے۔

مولانا صفیؔ ایک خاکسار اور عافیت پسند شاعر تھے۔ آپ ایک گمنام حاتم کی طرح اردو ادب کو بہت کچھ دے گئے لیکن بہت کم لوگ آپ سے روشناس ہو سکے۔ مختلف اصناف میں آپ نے ایک لاکھ سے کم شعر نہ کہے ہوں گے لیکن آج یہ سب قارونوں کے خزانے کی طرح دفینے ہیں۔ چھ سال کی جانکاہ محنت کے بعد آپ نے عمر خیام کی بارہ سو رباعیوں کی صحت کر کے ان کا منظوم ترجمہ کیا اور تصویروں کے خاکے بنائے لیکن ایسی مفید اور بیش بہا چیز بھی شرمندۂ طباعت نہ ہو سکی۔ آپ کی زندگی کا بڑا حصہ ایسی ہی ایک گمنامی میں گزرا کہ اکثر آپ لکھنؤ کے مشاعرے کے لئے غزل لکھتے اور دوسروں کو دے دیتے۔ یہ لوگ مشاعروں میں پہنچ کر یہی غزلیں اپنے نام سے سناتے اور واپس آ کر بڑے فخر کے ساتھ صفیؔ سے اس داد و تحسین کا ذکر کرتے جو مشاعرہ

میں نہیں ملتی تھی۔

صفی نے ساری عمر کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا اور ان کے کلام کا تمام نکھار ان کی اپنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کے ایک نامور شاگرد مولانا عزیز مرحوم نے اس کا اعتراف اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے کہ ؎

اس کا شاگرد ہوں جس کا نہیں استاد کوئی

مولانا صفی نے روٴسا و امراء کی مدح کر کے پیٹ نہیں پالا۔ مشرقی اور مغربی علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ نے [illegible] میں محکمہ دیوانی کی ملازمت کی اور پیشکاری کے عہدہ سے پنشن لے کر علیحدہ ہوئے۔ آپ کا دیوان آپ کی وفات کے بہت دنوں بعد چھپا اور اس وقت کوئی ایسا شخص نہ تھا جو تاریخ اردو ادب کے مؤلفین کے سامنے صفی کی حقیقی شخصیت کو پیش کرتا اور ان کے تاریخی کارناموں پر روشنی ڈالتا۔ یہ بات کتنی ہی افسوسناک کیوں نہ ہو بہرحال اپنی جگہ پر حقیقت ہے۔ تاریخ اردو ادب مرتبہ رام بابو سکسینہ میں بھی اصلاح زبان کے سلسلے میں مولانا صفی کے شاگردوں اور پھر ان شاگردوں کے شاگردوں کا ذکر تو وضاحت سے موجود ہے لیکن انتہائی عبرت اور حیرت کا مقام ہے کہ اس میں خود صفی کا کہیں ذکر نہیں۔ اس اہم واقعہ کی تائید مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ "اردوئے معلّے" میں اور مرزا جعفر علی خاں اثر نے اپنی ایک نظم میں بھی کی ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر آئندہ آئے گا۔

لکھنؤ کی شاعری اور ادب کے رنگ اور اصلاحات کی داستان بہت طویل ہے۔ مشہور یہ ہے کہ ناسخ نے الفاظ کی تراش خراش اور کلام میں ندرت پیدا کرنے کے سلسلے میں بڑا کام کیا ہے اور ان کے ذی علم تلامذہ نے بھی ترتیب لغات میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ لکھنؤ اسکول کے پرانے رنگ کی اصلاح کے لئے مولانا صفی نے بھی ناسخ اور ان کے تلامذہ سے کچھ کم خدمات انجام نہیں دی ہیں۔ ذیل میں ان دونوں مصلحین کا شجرہ پیش کیا جاتا ہے۔

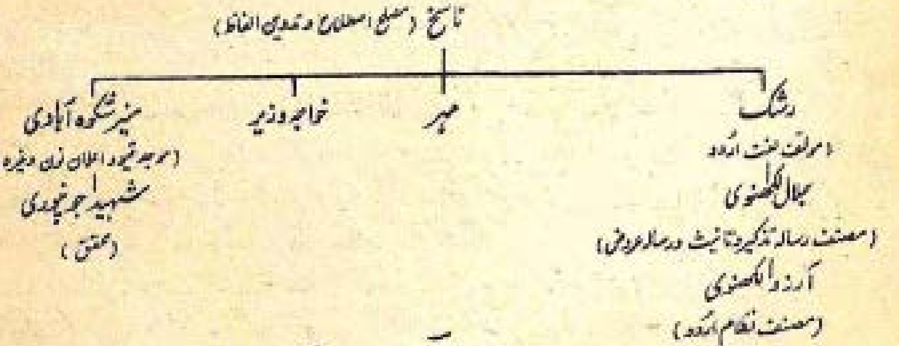
ناسخ (مصلح اصطلاح و تدوین الفاظ)
رشک
(مولف لغت اردو)
جلال لکھنوی
(مصنف رسالہ تذکیر و تانیث و رسالہ عروض)
آرزو لکھنوی
(مصنف نظام اردو)
مہر
خواجہ وزیر
منیر شکوہ آبادی
(موجد قیود اعلان نون وغیرہ)
شہید جونپوری
(محقق)

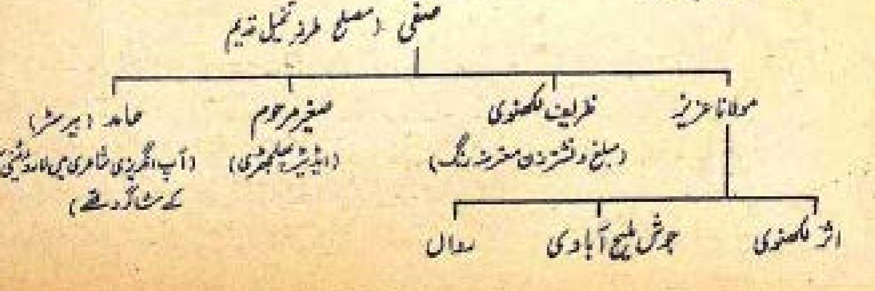
صفی (مصلح طرز تخیل قدیم)
مولانا عزیز
اثر لکھنوی
جوش ملیح آبادی
ظریف لکھنوی
صغیر مرحوم
حامد (بیرسٹر)
(آپ انگریزی شاعری میں لارڈ ٹینی سن کے شاگرد تھے)

مولانا صفی نے لکھنؤ کے رنگ شاعری اور تخیل کی اصلاح کے لئے طرح طرح سے جہاد کیا۔ غدر کے بعد جہاں بڑے بڑے سیاسی انقلاب رونما ہوئے اردو زبان بھی انگریزی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی اور اس میں بھی ایک انقلابی لہر دوڑ گئی منشی سجاد حسین نے سنہ [illegible]ء میں لکھنؤ سے اودھ پنچ نکالا۔ اور صفی لکھنوی نے تین چار انگریزی دان ادیبوں کو ڈھونڈ کر ان کے اصلاح تخیل کا تہیہ کیا۔ ان میں ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا اور منشی سجاد حسین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لکھنؤ کے رنگ قدیم اور تخیل پر ہاتھ ڈالنا آسان کام نہ تھا۔ مدتوں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں لیکن صفی نے ہمت نہ ہاری۔ انہوں نے منشی سجاد حسین کی معیت میں اپنے چھوٹے بھائی ظریف کو تیار کیا اور ظرافت اور مزاح کے ذریعے زلف و رخ والی لکھنوی شاعری پر حملہ شروع کیا۔ اس کی تفصیل کے لئے دیوان ظریف کا مقدمہ ملاحظہ ہو۔

سنہ [illegible]ء میں صفی کے مکان پر دائرہ ادبیہ کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی جس میں نظم کے موضوع دیئے جاتے تھے اور پھر ان پر نظمیں لکھی جاتی تھیں۔ اس سے قبل سنہ [illegible]ء میں صفی نے خود ایک معرکہ آرا قومی نظم "گل فریاد" کے عنوان سے شائع کی تھی۔ اصلاح تخیل کے لئے صفی کے محبوب ترین اور خوش گو شاگرد صفیر مرحوم نے لکھنؤ سے ایک رسالہ "پھلجھڑی" نکالا۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ صفی اپنے عہد کا رنگ تخیل بدلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس ضمن میں مولانا حسرت موہانی مرحوم نے اپنے رسالہ اردوئے معلیٰ میں لکھا ہے:۔

"ناصر الدین حیدر اور غازی الدین حیدر شاہان اودھ کے زمانے میں غزل گویوں کی تخیل کا جو انداز تھا وہ اردو دان اہل ادب و دقیقہ شناس نظروں کے سامنے ہے۔ اس کی تاسی و پیروی میں کیا بلحاظ لفظ و بندش اور کیا بلحاظ تخیل جس طرح شعرائے لکھنؤ منہمک تھے اس میں ترمیم و اصلاح کی ہمت کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ مولانا صفی کی زندگی اور شاعری کا ایک کارنامہ ہے۔"

واقعی مولانا صفی کی شخصیت کا یہ ایک فلک رفعت کارنامہ ہے اور اگر مولانا کی شخصیت میں کوئی اور بات نہ ہوتی تو بھی یہ اصلاح و تصحیح تاریخ ادب میں ان کا نام زندہ اور تابندہ رکھنے کے لئے کافی تھی۔ یقیناً اس سلسلے کی اور کڑیاں بھی ہیں اور معارج اصلاح و ارتقائی منازل ہیں اور دوسروں کے نام بھی نمایاں نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہل کا سہرا ہر حال میں مولانا صفی ہی کے سر رہے گا۔ انہیں اس حق سے کسی صورت محروم نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا کی خدمات سے انکار کرنا یا ان کا اعتراف نہ کرنا ادبی خیانت ہے۔ خاص کر ایسی حالت میں کہ انہوں نے خود [illegible] معیار اصلاح تخیل کے لئے نکالا اور انجمن معیار قائم کی جس کے وہ مرتے دم تک صدر رہے۔ چکبست، علامہ اقبال اور ڈاکٹر مرزا محمد ہادی کے علاوہ ادب کے تمام معیاری اور مستند مبصر مولانا صفی کی عظیم المرتبت شخصیت کے قائل ہیں۔

صفی کی شخصیت میں شاعری کے دریچے اور ان کی دماغی صلاحیتوں کے لحاظ سے ملک و قوم کی اصلاح و ترقی کے اور بھی گوشے تھے ہیں۔ آپ نے لوگوں کے ذہنوں میں مد و جزر پیدا کیا۔ اپنی نظموں کے ذریعے کئی رفاہی منصوبوں کی داغ بیل ڈالی۔ کالج اور سکول کھلوائے یتیم خانہ قائم کرایا اور صنعتی ترقی کے لئے لوگوں کو عملی اقدام کی طرف مائل کیا اور یہ حقیقت ہے کہ آپ نے جو قومی نظمیں لکھی ہیں۔ اردو زبان کی تمام پابندیوں اور خوبیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور ان کی شعری قدر و قیمت کے پیش نظر ہندوستان کے کسی شاعر نے ان سے بہتر نظمیں نہیں لکھی ہیں۔ آپ کی نظموں کے مجموعے "ضرب جگر" اور "صحیفۃ القوم" ہمارے اس دعویٰ کا روشن ثبوت پیش کرتے ہیں۔

مولانا صفی نے ملک کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے لیڈروں اور رہنماؤں کی منظوم سوانح عمریاں بھی لکھیں ہیں اور ایک لحاظ سے اردو میں یہ کام سب سے پہلے آپ ہی نے شروع کیا۔ اس کے علاوہ مولانا نے قومی نظموں میں کارنامہ تاریخی اور جغرافیائی حالات کا ذکر بھی پہیلی بندی کے عنوان سے شروع کیا۔ جیسا کہ آپ نے خود کہا ہے ؎

نظم میں تاریخی و جغرافیائی پہیلیاں
اس پہیلی بندی کا موجد میں ہوں واقف ہے جہاں

مولانا صفی اردو کی طرح فارسی کے بھی بڑے زبردست ادیب اور شاعر تھے۔ میں نے آپ کے صدہا شاگردوں کو سنا ہے لیکن آپ

کی شخصیت کی عظمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جبکہ ان کے ایک شاگرد مولانا عبدالرحمان جعفر خاں نے بتایا کہ مولانا صفی ان کے عربی، فارسی اور اردو کلام پر بیک وقت محققانہ انداز سے اصلاح دیا کرتے تھے اور اب ان کے مرنے کے بعد ایسی جامع شخصیت کا حامل اور کوئی شاعر نہیں ہے۔

ایک قومی جلسے میں صفی مرحوم نے جیسے ہی قومی ترانے کا مطلع پڑھا تو علامہ اقبال جو اس وقت جلسے میں موجود تھے جوش میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور جب تک صفی ترانہ پڑھتے رہے اقبال سر جھکائے کھڑے رہے۔ اس ترانے کے چند شعر یہ ہیں:۔

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو بتا دیں گے — مشرق کا سرا اٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے
دھارے ہیں زمانے کے بجلی کا فوارہ ہے — بجھتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے
ایمان ہو یا شرک دونوں کو مٹا دیکھیں — کیا صفحۂ ہستی سے اسلام مٹا دیں گے
اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے — اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

اس پرجوش نظم کے جواب میں کرسچین سوسائٹی کی طرف سے بھی بعض شاعروں سے منہ چڑانے کی خاطر ایک نظم شائع کی گئی اور انگریز حکام کی طرف سے بھی صفی پر دباؤ ڈالا گیا۔ لیکن صفی کی ہمت، بیباکی اور کردار کی عظمت ملاحظہ ہو کہ آپ نے ایک اس سے بھی زیادہ تند و تیز نظم کہی جسے ہم لوگوں نے چھپنے نہ دیا۔ البتہ ظریف مرحوم نے جواب میں "انجیلیوں کا رجز نامہ" کے عنوان سے ایک بڑی دلچسپ نظم لکھی جو آج بھی ان کے مجموعہ کلام "دیوانگی" میں ہے۔ یہ بھی عیسائیوں کی اسی پھسپھسی نظم پر طنز وارد ہے۔

ایک باکمال اور ذی علم ادیب و شاعر ہونے سے قطع نظر بھی صفی ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ اگر وہ اتنے بڑے شاعر ہوتے ہوئے مختلف تجربات شاعری کو محسوس کرنے اور برتنے کی صلاحیت نہ رکھتے اور دبستان شاعری کی پچھتر سال خوشہ چینی نہ کرتے تو بھی ان کی ذات اتنی ہی قابل احترام اور قابل ستائش ہوتی۔ در اصل ان کی شخصیت کئی جدا جدا شخصیتوں کا مجموعہ تھی۔

انہوں نے عربی اور فارسی پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انٹرنس تک باقاعدہ انگریزی، حساب، جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ سرکاری ملازمت، عدالتی کام، اشعار، آرام اور دیگر ضروریات سے جو وقت بچ رہتا تھا وہ اسے کسی نہ کسی علمی یا ادبی کتاب کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ کتب بینی میں آپ کی ہمہ وقت مصروفیت کی تصویر کشی مشہور ایڈوکیٹ اور ادیب سید کلب عباس صاحب نے اس طرح کی ہے۔

"کسی وقت بھی کوئی جائے ——— وہ مولانا کو کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتا ہوا پاتا تھا۔ اکثر وہ مطالعے میں اتنا مستغرق رہتے تھے کہ جب تک بالکل قریب نہ پہنچ جائے آنے والے کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے۔ مگر جونہی آنکھ پڑ جاتی ان کا شگفتہ چہرہ پھولوں کی طرح متبسم ہو جاتا اور چمکتی ہوئی پر بصیرت آنکھیں اس طرح شگفتگی ظاہر کرتیں کہ گویا انہوں نے اس سے عمدہ منظر کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔"

مولانا صفی ہمیشہ سیر و شکار، تفریح، دوستوں کی کثرت ملاقات، گپ بازی، میلوں، جلسوں اور کھیل تماشوں سے الگ تھلگ رہے۔ آپ سے میرے مراسم کم و بیش ساٹھ سال کے تھے اور اکثر مجھے ان کے یہاں مہینوں رہنے اور ساتھ زندگی بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ ادبی ذوق اور قومی معاملات میں بھی میں ان کا ہم مشرب اور ساتھی رہا۔ بہت سے علمی و ادبی مباحث میں بھی تبادلۂ خیال اور بڑی بے تکلفی سے گفتگو کا موقع ملا۔

اس طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کی زندگی کا کوئی گوشہ مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میرے نزدیک مولانا کی زندگی ایک پرسکون تالاب یا جھیل کی مانند تھی جس کی سطح ہمیشہ ہموار اور دلکش رہتی ہے۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں وہ ایک انتہائی مضبوط کردار کے حامل فرد تھے۔ یہاں تک کہ ان کے قدم جوانی کی عام بدمستی کے عالم میں بھی نہیں بہکے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نوے سال کی عمر تک بھی ان کے چہرے پر جھریوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اور ان کے چہرے کا نکھار آج کل کے بیشتر نوجوانوں کے پرکشش رخسار اور حلقہ گیر تبسم پر طعنہ زنی کرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ تمام دنیاوی امور

سے پوری طرح باخبر تھے اور کسی بھی موضوع کو شاعرانہ جولانیوں کے ساتھ بیان کرنے پر ایسی بلا کی قدرت رکھتے تھے کہ جو کچھ کہتے تھے وہ ان کا اپنا حال معلوم ہوتا تھا۔ مثال کے لئے ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

کل ہم آئینے میں رُخ کی جھریاں دیکھا کئے ۔۔۔ کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

اظہارِ خیال پر کمال قدرت کی سب سے بڑی وجہ غالباً مولانا صفی کا مشغلۂ کتب بینی ہی تھی۔ عروض، شاعری اور فارسی کے لغات بہار عجم اور غیاث اللغات کے صفحات پر ان کی اتنی تحریر کی یادداشتیں درج تھیں کہ یہ صفحات اپنی جگہ ایک دیوان، مدرسہ یا عراق کے درسی خارج کی محبت بن گئے۔

مولانا صفی عام طور پر اپنے گھر کی بیرونی نشست گاہ میں بیٹھا کرتے تھے۔ یہ نشست گاہ کبھی بھیڑوں کی جگہ بنا کرتی تھی۔ اسے آج کے بہت سے نوعمر ادیبوں اور شاعروں نے نہیں دیکھا ہوگا کیوں کہ گزشتہ پچاس سال کے اندر اس میں کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔

مولانا کی حیات میں یہ نشست گاہ ہزاروں اہلِ ذوق کا ماویٰ تھی اور میں نے یہاں مولانا شبلی اور حالی جیسے بلند پایہ حضرات کو خود دیکھا ہے۔ لیکن افسوس کہ آج یہی نشست گاہ پناہ گزیں پردیسیوں کا آستانہ بن کر رہ گئی ہے۔

مولانا کا گھر مسجد کے دروازے کی طرح ہر آنے جانے کے لئے کھلا رہتا تھا۔ آپ انتہائی سادگی کے ساتھ ہر ایک سے یکساں تواضع اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور بڑی سے بڑی فرمائش کی تکمیل کے لئے اس کشادہ دلی سے آمادہ رہتے تھے جیسے اسی کی تنخواہ پاتے ہیں۔ آخر عمر میں آپ فرمایا کرتے تھے کہ اب الفاظ یاد نہیں آتے۔ مفہوم راہ بھولے ہوئے حافظے کے گرد منڈلاتے نظر آتے ہیں اور شعر کہنے میں لطف اور مزے کی بجائے تکلیف ہوتی ہے۔ ایک بار میں نے ایک قومی نظم لکھنے کی فرمائش کی تو مولانا نے معذرت پر معذرت کر کے اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا۔ میری نافہمی اور خود غرضی کہ برابر اصرار کرتا رہا لیکن جب وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئے تو شکستہ دل ہو کر چلا آیا ـــــ ابھی واپس آئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مولانا کا فرستادہ نظم لئے ہوئے پہنچ گیا۔ میں نے اپنی طویل عمر میں اس انتہا درجہ کی وضع داری اور خیالِ خاطرِ احباب کی مثال نہ دیکھی اور نہ سنی۔

ایک بار مولانا کی قوتِ ادراک اور احساسات و معاملات پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ لکھنؤ کے ایک تاجر حکیم صاحب مقوّی ادویہ کے اشتہار والی قسم کی ایک نظم کی خواہش لے کر مولانا کے پاس آئے۔ اور کوئی بھلا آدمی ہوتا تو یا تو صحبت ہی نہ کرتا یا چند شعر کہہ کر ٹال دیتا لیکن مولانا نے نظم کہی اور وہ بھی اس معرکے کی کہ ناری مرحوم نے، جو الٰہ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور ترتیب نصاب کمیٹی کے رکن تھے، طلبہ کے اخلاق کی اصلاح اور ترکِ عادات کے لئے اس نظم کو نصاب میں داخل کرا دیا۔ اس نظم کا عنوان غالباً "ما الحیات" ہے اور پہلا شعر یہ ہے ؎

ہنستی ہے ساری دنیا گلشن ہے زعفرانی ۔۔۔ برباد ہو رہی ہے اٹھتی ہوئی جوانی

یہاں نظم کی بلاغت اور پردہ ہی پردہ میں اظہارِ خیال پر قدرت کا ذکر کرنا مقصود نہیں بلکہ میں صرف مولانا کے کمالِ اخلاق اور منکسر المزاجی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا تھا۔

مولانا صفی نے طلبِ شہرت، اور منفعت غرض کہ کبھی کچھ نہ چاہا تھا اور اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو کسی اور شعبہ میں اپنی عظمت کا لوہا منوا کر رہتے۔ لیکن یہ بھی ان کے کردار کی عظمت ہی کا ایک پہلو ہے کہ انہوں نے لوگوں کو خاموشی کے ساتھ درس دیا۔ وہ نور کا ایک ایسا سرچشمہ تھے جن سے سینکڑوں آفتاب پھوٹے لیکن خود انہوں نے اپنے آپ کو تاریکی اور گمنامی میں رکھنا پسند کیا۔ مولانا صفی لکھنوی پرانے بزرگوں کے اخلاق اور دل پذیر شخصیت کا نمونہ تھے۔ آج کل ریڈیو اسٹیشن جا کر غزل یا نظم پڑھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا لیکن مولانا صفی اس میں شاعری جیسے پاکیزہ فن کی اہانت تصور کرتے تھے اور زیادہ روپے کی ترغیب کے باوجود کبھی گھر سے نہ نکلے۔ منتخب اشعار کا معاوضہ دے کر اشاعت کی اجازت حاصل کرنے کی بارہا خواہش ظاہر کی گئی لیکن وہ عسرت اور احتیاج کے باوصف ہمیشہ ایک گوشہ نشین فقیر کی طرح ہاتھ کھینچے بیٹھے رہے اور دستِ سوال دراز نہ کیا۔

سر تیج بہادر سپرو آنجہانی اور رائے بریلی کے تعلقہ دار راجہ مہندر سنگھ آنجہانی نے کئی بار چاہا کہ مولانا صفی اپنا دیوان ان کی مدد سے چھپوا دیں مگر ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا اور یہی وجہ تھی کہ ان کی وفات اور ان کے دونوں لڑکوں کے مرنے کے بعد مجھے اپنی انجمن [illegible] اردو کی طرف سے ان کا دیوان شائع کرنے کا شرف حاصل کرنا پڑا۔

مولانا زندگی بھر اپنے آرام کے لئے دوسروں پر بار ڈالنے سے گریز کرتے رہے۔ ان کی وفات پر جوش ملیح آبادی نے "آج کل" میں مولانا کی غیور طبیعت اور وضعداری کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ:۔

"طویل عمر اور لمبی علالت کو صبر و شکر کے ساتھ کاٹ دینا مولانا کے سوا کسی اور کا کام نہ تھا اور اگر ان کی سوکھی ہڈیوں کو کچھ اور راحت اور سکون میسر آ جاتا تو ابھی شاید کچھ اور جی جاتے اور اگرچہ عمر طبعی کو پہنچ گئے تھے لیکن ۲۵ جون ۱۹۵۰ء کو یوں نہ مرتے"

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے مولانا دنیا کی صحبتوں اور ناچ رنگ کے جھمیلوں سے بہت دور تھے مگر ہر رنگ سے باخبر تھے۔ ناچ رنگ لکھنؤ کے پرانے نوابوں اور شرفا کی خاص خاص صحبتوں کا لازمہ بن چکا تھا۔ میرے ایک وضعدار شاہی وثیقہ دار کرم فرما اپنی ایک خاص محفل کا ذکر فرماتے تھے کہ اس میں رقاصہ کے سوا سازندوں میں سے کوئی نہ ہوتا تھا۔ بے تکلف اعلیٰ مرتبت ذمہ دار اور صاحب کردار احباب ہوتے تھے۔ کسی کے سامنے طبلہ ہوتا تھا کسی کے ہاتھ میں مجیرا، کسی کے زانو پر سارنگی اور کسی کے پہلو میں ستار یا ہارمونیم۔ ادھر رقاصہ نے غزل چھیڑی ادھر ساز بجنے لگے۔ ایسی ہم مذاق شرفا اور پرانے لکھنؤ کی صحبتوں کا ایک نقشہ تھا جواب نظر نہیں آتا۔

صفی یوں تو موسیقی کے رموز سے واقف اور ایسی صحبتوں سے باخبر تھے لیکن انہوں نے تمام عمر کسی ساز کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس کے باوجود وہ ایسی صحبتوں کا نقشہ تاریخ کے دامن پر اتارنے کے لئے ایک انتہائی یادگار، جاندار اور زندۂ جاوید شعر چھوڑ گئے ہیں ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا   ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

اس شعر پر میں نے اپنے ضعیف العمر نواب صاحب کو بارہا یاد شباب میں سر دھنتے اور آنسو بہاتے دیکھا ہے۔

مولانا صفی ہمیشہ شیروانی، اونچی دیوار کی ایرانی ٹوپی، قمیص اور چھوٹی مہری کا پاجامہ اور بوٹ پہنتے تھے۔ پان بہت کم کھاتے تھے حقہ کے عادی تھے اور کبھی کبھی سگرٹ بھی پی لیتے تھے۔ تمام عمر مسکرات سے دور رہے کبھی کبھی نماز پڑھتے اور دو ایک روزے رکھ لیتے تھے۔ مجالس اور میلاد کی محفلوں میں کم جاتے تھے۔ نہایت غیر متعصب، آزاد طبع اور آزاد خیال تھے۔ مذہب میں ریاکاری کو بہت برا سمجھتے تھے اور نکتہ چینی اور اظہار رائے میں بڑے بے باک تھے۔ بعض شاعروں کی طرح تملق اور دوسروں کی ہجو گوئی یا منقبت کبھی ان کا شعار نہ تھا۔ نہایت ہنس مکھ، خلیق، وضعدار اور نرم دل تھے اور سب کے شریک درد رہتے تھے۔ مرزا جعفر علی خاں اثر نے آپ کی وفات پر ایک مبسوط نظم صفی کے کردار اور شخصیت کے متعلق کہی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں:۔

وضع صفی نہ پوچھو کہ رند پارسا تھا   بیگانہ بھی تھا سب سے پھر سب سے آشنا تھا
خلق خدا کی خدمت مقصد حیات کا تھا   اس کے سوا کوئی مطلب نہ مدعا تھا
بدلہ بدی کا نیکی دشمن کو دیتے دعا   اس منزلت کا بشر پھر کیا کوئی دوسرا تھا
خلق حسن سے اس کے دل کی فروتنی سے   ہر کہ و مہ کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا
صدق و خلوص و ایثار اس کی سرشت میں تھے   جو قول یا عمل تھا بے عیب و بے ریا تھا
ظاہر سے تھی زیادہ باطن کی آب تابی   عارف تھا خود نگر تھا صالح تھا باخدا تھا
غیرت کی پاسداری شیوہ تھا اس جری کا   ایمان حیا کو سمجھا وہ صاحب حیا تھا

نازاں ہیں سب زباں پر تجھ پر زباں تھی نازاں　　رنگ سخن کچھ ایسا تو نے بدل دیا تھا
وہ تیری بذلہ سنجی وہ تیری خوش نوائی　　پڑھتا تھا تیرا کلمہ پڑھتے جو سن چکا تھا

مولانا صفی کی بذلہ سنج طبیعت اور گل کھلانے میں مہارت کے سلسلے میں کئی لطیفے مشہور ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک واقعہ کا ذکر کریں گے جو مولانا کے ایک نیاز مند قدر داں مرزا محمد سجاد نامی بیان کرتے تھے۔

ایک مرتبہ یہ صاحب مولانا کے ہمسایہ پرنس ہمایوں جاہ سے ملنے گئے جو ٹیپو سلطان کے خاندان کے ایک مقتدر فرد تھے۔ ان سے ملاقات کے بعد سجاد صاحب مولانا سے بھی ملنے چلے گئے اور وہاں زبان سے نکل گیا کہ پرنس ہمایوں جاہ سے ملنے آیا تھا۔ سوچا آپ سے بھی مل لوں۔ مولانا نے بڑی خاطر تواضع کی اور جب وہ چلنے لگے تو متبسم ہو کر فرمایا کہ کہئے اب پھر پرنس ہمایوں جاہ سے ملنے کب آیئے گا؟

مولانا صفی کا بے مثل انداز شعر خوانی ایسا تھا کہ اس میں ترنم تھا لیکن اسے موسیقی سے دور کا تعلق نہ تھا۔ اس ضمن میں نے ایک تفصیلی اور مستقل مضمون بھی لکھا ہے

مختصر لفظوں میں مولانا صفی کی شعر خوانی کو انہی کے اس شعر کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے ؎

بہ حسن صورت گو مرغوب ہے طرز غزل خوانی　　نہ لیکن یوں کہ سمجھیں اک مغنی نکتہ داں مجھ کو

مولانا صفی نے اپنی پُر اثر اور ہمہ گیر شخصیت کے بل بوتے پر اپنے لئے ایک خاص مقام تو ضرور پیدا کر لیا تھا لیکن آپ کو جو شہرت حاصل ہونی چاہئے تھی اور ادب کی تاریخ میں آپ کو جو درجہ ملنا چاہئے تھا وہ نہ مل سکا، اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ آپ طبعاً خلوت پسند تھے اور نام و نمود سے گریز کرتے تھے۔ اور دوسری وجہ یہ کہ آپ کے بعض حاسدوں نے لوگوں کے دلوں سے آپ کی حقیقی قدر و منزلت کم کرنے کے لئے بڑی تندہی سے کام کیا اور یہ باور کرا دیا کہ صفی صرف قومی نظمیں اچھی لکھ سکتے ہیں۔ اس طرح گویا ان کا وہ سارا ریاض اکارت گیا جو انہوں نے غزل کو پروان چڑھانے کے لئے کیا تھا۔

بہرحال اردو ادب کے لئے یہ بات ایک المیہ سے کم نہیں کہ صفی جیسا بلند پایہ شاعر جس نے پون صدی تک ہر صنف شعر میں اپنی طبع رواں کے جوہر دکھائے، اتنی جلدی فراموش کر دیا گیا۔ اور اس کی شخصیت اور شاعری یوں برباد ہو گئی کہ صفی قبر کی آغوش سے اپنا یہ شعر سناتے معلوم ہوتے ہیں ؎

یہ صلہ ہے عمر بھر کی محنت برباد کا
سننے بیٹھے ہیں وہ افسانہ دل ناشاد کا

تاجور نجیب آبادی

محمد وارث کامل

علی سائیں کی مسجد کے عقب میں جہاں اپنے آخری موڑ پر ٹیلنگٹن روڈ دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہے کچھ نئی وضع کے مکانات بنے ہوئے ہیں انہی مکانات میں ایک وہ مکان بھی ہے جو ایک مدت تک شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی کی قیام گاہ بنا رہا ہے۔ علامہ سے میری پہلی ملاقات اسی مکان کے ایک کھلے برآمدہ میں ہوئی تھی جب ۱۹۴۲ء کے موسم گرما کا شباب ڈھل چکا تھا لیکن پھر بھی اس یک منزلہ مکان میں دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا گمان تھا، اس بلا کی گرمی اور اس قیامت کا حبس تھا کہ دم گھٹا جاتا تھا۔ علامہ نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے اپنے بھاری بھرکم جسم کی ایک ارتعاشی حرکت سے میرا خیر مقدم کیا اور کسی تمہید کے بغیر مجھ پر طنز و ظرافت سے ملے جلے الفاظ کے تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔

"اچھا تو آپ ہی میرے ہم وطن مولانا محمد وارث کامل ہیں۔ خوب، ماشاء اللہ، آپ تو بڑے مستعلیق دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا! آپ کافی عرصے سے لاہور رہ رہے ہیں کبھی بھولے سے بھی آپ نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔ میرے ڈیل ڈول کا آدمی جو روئے کائنات پر بار گراں بنا ہوا ہو کہاں کہاں جائے اور کس کس سے ملے، پھر کچھ عمر کے تقاضے بھی تو ہوتے ہیں آپ مجھ سے عمر میں کہیں چھوٹے ہیں آپ کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ مجھ سے اولین فرصت میں ملتے۔ تاجور برا ہی سہی لیکن ایسا تو نہیں کہ اچھے اس کے پاس بھی نہ بیٹھیں۔ مولانا میں تو آپ ہی کی برادری کا آدمی ہوں سالہا سال پہلے میں نے دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کی سند لی ہے۔ میں نے خود ہی بلایا تو آپ تشریف لائے۔ مولانا! یہ تو یار سے یار کی ملاقات ہے پھر بھی آپ شکریے کے مستحق ضرور ہیں۔"

میں نے علامہ کی یہ گفتگو خاموشی کے ساتھ سنی اور آخر میں اپنے خطا ہونے پر معذرت طلب کی۔ علامہ سے میری ملاقات شاہکار کی وساطت کے سلسلے میں تھی۔ اگر یہ ماہنامہ پہلے کی طرح علامہ کی ملکیت ہوتا اور کسی شیخ بیہودہ کے ہاتھوں میں اس کی باگ ڈور نہ ہوتی تو میں اس کی وساطت

کو اپنے حق میں ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتا۔ میں نے علامہ کی یہ پیشکش قبول نہیں کی البتہ ان کی یہ متبادل تجویز مان لی کہ مولانا ادارۂ نقوش سے وابستہ ہو جائیں۔ غرض علامہ کی ناگواری خاطر کا خطرہ جاتا رہا اور تعلقات کی خوشگواری میں مطلق کوئی فرق نہیں آیا۔ حادثۂ تقسیم تک علامہ سے ماہ دو ماہ کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب عظیم نے میرے اور ان کے درمیان کچھ ایسا خط فاصل کھینچا کہ مزید ملاقاتوں کے امکانات کچھ کم ہو گئے تھے۔ قیامت تک کے لئے معرض التوا میں جا پڑے۔ پاکستان کی آزادی یا بالفاظ دیگر نوزائیدہ مملکت پاکستان نے ابھی اپنی زندگی کی تین بہاریں دیکھی تھیں کہ علامہ نے آخرت کی راہ لی۔ میں بجنور ہی میں رہا جہاں میں سات سال مدینہ کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتا رہا ہوں۔ یہ خبر وحشت اثر سنی تو ایک تعزیتی جلسہ کا فوری اہتمام کیا اور اس میں علامہ کے حالات زندگی اور ان کی علمی و ادبی خدمات اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر میں نے ارتجالاً یہ دو شعر بھی کہے تھے۔

غضب کی رات ہے تاروں کی چھٹ گئیں نبضیں
جو کچھ رہے ہیں کہیں ٹمٹمائے جاتے ہیں
نظر سے دل کی فضا میں جو کھینچ لیتے ہیں
کہیں جہاں میں وہ انساں بھی پائے جاتے ہیں

علامہ تاجور نجیب آبادی کے ساتھ جو علمی و ادبی صحبتیں گرم رہی ہیں ان کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا البتہ ایک صحبت ایسی ہے جس سے علامہ کی زندہ دلی اور وسیع النظری پر روشنی پڑتی ہے وہ تقاضا کر رہی ہے کہ میں اس کے نقوش ضرور اجاگر کروں۔ اس صحبت کا شرف مجھے حضرت احسان دانش کی پہلی قیامگاہ واقع سید اللہ شاہ مزنگ پر حاصل ہوا۔ علامہ دعوت چائے پر مدعو تھے۔ جس کمرہ میں دعوت کا اہتمام کیا گیا اس میں علامہ کے خیر مقدم کے لئے ایک تو میری خدمات وقف تھیں اور دوسرے ایک مولانا محمد علی سہارنپوری تھے۔ جو ان خدمات کے سلسلہ میں میرے دست راست بنے ہوئے تھے۔ علامہ تشریف فرما ہوئے تو ہم دونوں نے بصد ادب و احترام ان کا استقبال کیا اور اس مسند پر نشست کی درخواست کی جو خاص ان کے لئے آراستہ کی گئی تھی۔ چند لمحات نہیں گزرے تھے کہ خود میزبان حضرت احسان وارد ہوئے اور رسمی علیک سلیک کے بعد اپنے بڑے صاحبزادہ کو حکم دیا کہ چائے کی چینک اور چینی پیالیاں لے آئے۔ ہر چیز تیار تھی اس لئے آن واحد میں حکم کی تعمیل ہو گئی۔ علامہ نے چینک، پرچوں اور پیالیوں پر ایک حسرت آمیز نظر ڈالی اور پھر بڑی سرعت کے ساتھ اس طرح شیشہ گری کا طلسم پاش پاش کر ڈالا۔ احسان صاحب غریب خانہ بدوش تھے مگر ان کی طبیعت پر شکست و ریخت کا یہ جارحانہ عمل گراں نہیں گزرا بلکہ میں نے دیکھا کہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ احسان صاحب کے اس تحمل نے علامہ کے مزاج کا پارہ کچھ اور تیز کر دیا۔ بولے۔

> تو اب بھی اپنے آپ کو شاعر مزدور ہی سمجھتا ہے۔ تجھے اس بات کا مطلق احساس نہیں کہ دنیائے ادب میں تیرا کیا مقام ہے۔ ایسی بھی کیا کم ذوقی کہ روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بھی تیرے گھر میں نہیں یہ پرچیں پیالیاں کیا اس قابل ہیں کہ ان میں کسی مہمان کو چائے پلائی جائے۔ بھدی اور بھونڈی پیالیاں ٹیڑھی ترچھی پرچیں، بے ڈول چینک یہ ہے تیرے ذوق کی کائنات۔ شرم کر۔ میں تجھے اجلے کپڑوں میں دیکھنا چاہتا ہوں اور اس ٹھاٹھ کے ساتھ کہ تیرے گھر میں ہر چیز سلیقے کی اور بڑے قرینے کی ہو۔ جا ابھی نیا سیٹ لا۔

چائے کے سیٹ کا مسئلہ تو حل ہو گیا اور ہم سب نے چائے بھی پی لی لیکن اس دوران میں جو لطف "حدیث بادہ و ساغر" رہا بیان سے باہر ہے۔ علامہ کی زبان سے جو فقرہ بھی نکلتا تھا کبھی طنز و ظرافت کی چاشنی لئے ہوتا اور کبھی قند و نبات کا مزہ دیتا۔ علامہ نے اس دعوتی تقریب میں معاشرتی زندگی کے نشیب و فراز پر اس بالغ نظری کے ساتھ اپنے خیال کا اظہار کیا کہ ہم عش عش کر اٹھے ہم میں سے جب کوئی لب کشائی

کی جسارت کرتا تو علامہ لفظ لفظ پر ٹوکتے کبھی الفاظ کے دروبست پر اور کبھی تراکیب کی تراش خراش پر بڑی بے دردی کے ساتھ تنقید کرتے مجھے یاد ہے کہ علامہ نے مولانا محمد علی سہارنپوری کے ایک جملہ میں تین غلطیاں نکالیں مولانا کا جملہ یہ تھا :-

علامہ! یہ ہماری ناعاقبت اندیشی ہے کہ ہم غریبی کے دن کاٹ رہے ہیں؟

علامہ نے ارشاد فرمایا کہ مولانا 'ناعاقبت اندیشی' غلط ترکیب ہے۔ نفی عاقبت کی نہیں بلکہ اندیشہ کی ہے اس لئے 'نا' کا استعمال 'اندیشی' کے ماقبل ہونا چاہیئے۔ ہم غریبی کے دن کاٹ رہے ہیں، ادبی حیثیت سے یہ جملہ بھی غلط ہے۔ رات کٹتی ہے دن نہیں کٹتا۔ دن بسر ہوتا ہے، گزرتا ہے اور تیر ہوتا ہے۔ غریبی کے دن میں یہ نقص ہے کہ مضاف الیہ غریبی ہو گیا ہے اور اس کا مفہوم عبارت سے کچھ اور ظاہر ہوتا ہے۔ جملہ یوں ہونا چاہیئے تھا 'ہم غریبی میں دن بسر کر رہے ہیں'۔

احسان صاحب تو کاندھلہ کی مخصوص بولی بولتے ہیں لہٰذا علامہ کے تنقیدی نشتر ان پر نہیں چل سکے۔ رہا میں، میرا شغل ایک مدت سے خطابت ہے۔ زبان کھلتی ہے تو پھر میرے سامنے دقتیں ہی دقتیں ہوتی ہیں۔ جن میں نکتہ و مادہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لفظ الفاظ کی نشست و برخاست اور محاورہ بندی پر میری نظر صرف تحریر ہی میں نہیں بلکہ تقریر میں بھی رہتی ہے۔ علامہ سے میری گفتگو بڑی دیر تک ہوتی رہی اور میں کچھ کچھ اسی میں مگن ہو رہا تھا کہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ علامہ ایسا نقاد بھی میرے کسی لفظ اور کسی جملہ پر گرفت نہیں کر سکا۔ شامتِ اعمال کہ باتوں باتوں میں میری زبان سے یہ جملہ نکل گیا "علامہ! سنیاں بہت لذیذ ہوتی ہیں" علامہ ہنس پڑے اور ایسے ہنسے کہ لوٹ پوٹ ہو گئے۔ فرمایا۔ سنیاں! یہ کیا کہا آپ نے یہ کس زبان کا لفظ ہے ہماری نظر سے تو آج تک یہ لفظ نہیں گزرا۔

میں :- علامہ میرے تبرک میں تو آپ نے بھی سنیاں کھائی ہوں گی۔

علامہ :- مولانا، آپ نے لفظ غلط کہا ہے۔ یہ لفظ 'سنیاں' نہیں بلکہ 'سویاں' ہے۔ کچھ سمجھے آپ، اہل زبان ہوتے ہوئے ایسی فاش غلطی، آپ کو تو پنجاب آئے ابھی چند ہی دن ہوتے ہیں۔ ہمیں دیکھئے کہ ہم نے اپنی زبان کو ہر قسم کی دستبرد سے محفوظ رکھا ہے۔ دوسرے لوگ اپنی زبان کے نقش جماتے ہیں کسی کی زبان ہم پر اثر انداز نہیں ہو سکی اردو میر و سودا، مصحفی و انشاء، آتش و ناسخ، غالب و ذوق، انیس و دبیر، داغ و امیر، جوش و جگر، سیماب و احسان، اختر و ماجد کی زبان ہے اور پنجابی وارث شاہ اور بلھے شاہ کی زبان۔ ہر زبان کے استاد الگ الگ ہیں۔

اس صحبت کے جو نقوش میں نے اپنے حافظے کی مدد سے زیبِ قرطاس کئے ہیں ان سے علامہ کی معاشرتی، اخلاقی اور ادبی زندگی کے بہت سے پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔ تاریخ ادب میں ان کا جو مقام ہے اسے سمجھنے کے لئے ہمیں علامہ کی چند خصوصیات پر نظر ڈالنی ہو گی اور وہ بھی ذیلی سرخیوں کے ساتھ تاکہ بعد میں کسی تذکرہ نویس کو زیادہ کاوش نہ کرنی پڑے۔

علامہ فارسی اور عربی علوم میں اتنی کامل دستگاہ رکھتے تھے کہ ان کے اساتذہ کو بھی ان کے تبحر علمی پر ناز تھا۔ مجلہ دیوبند 'القاسم' میں اس بالغ نظر فاضل دیوبند کے جو مضامین کسی دور میں اشاعت پذیر ہوئے ہیں ان سے اگر کہیں دقتِ نظر کا ترشح ہوتا ہے تو کہیں جودتِ فکر نازش کرتی ہے۔ علامہ کو قدرت سے وہ سکون میسر آتا تو معلوم نہیں وہ اپنے ہی ذوق کی تسکین کا سامان کس حد تک فراہم کر جاتے۔ میری علمی اور ادبی زندگی کے عنوان سے علامہ نے ۱۹۱۹ء میں جو سلسلہ مضامین سپرد قلم فرمایا تھا، اس میں ایک جگہ یہ الفاظ بھی نظر آتے ہیں

"عرصۂ مدید سے اس فکر میں ہوں کہ قسمت موجودہ افکار لاحاصل سے رہائی بخشے تو 'ادب العرب' کے نام سے چند مجلدات میں ادب عربی (نظم و نثر) پر ایک ضخیم تصنیف سرانجام دے کر اسے زندگی کی راہ سے منزل کے منزل کو زندگی بنا لوں ...... دیوبند میں رہ کر چند مضامین شروع

ی سے عربی ادب اور فلسفے سے لاہور آیا تو شمس العلما مفتی عبداللہ ٹونکی جیسے عربی کے بے مثل ادیب اور یہیں اتفاق سے شہرت کے فلسفی کا فیض مجھے نصیب ہوا۔ اردو ادب میں میری دلچسپی تفریح کی حد تک رہتی تھی مگر حالات ناساز گار نے اس تفریح کو میری زندگی بنا دیا۔

علامہ کے اندر نثر نگاری کی بے پناہ صلاحیتیں تھیں۔ عقل و ظرافت، بذلہ سنجی، تیز گفتاری، سحر نگاری، شستہ بیانی ان کی دلآویز تحریر کی وہ ادائیں ہیں جن پر ان کے معاصر رشک کرتے تھے۔ ان کی نثر کے دو تین نمونے پیش کرتا ہوں۔ آپ ان سے علامہ کی تحریر کا خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں:۔

> میں زمانے سے دولت و حشمت کا طلب گار نہ تھا کہ میرے آباؤ اجداد اپنی نمائندہ نسلوں کے حصے کی بھی دولت و حشمت صرف کر گئے۔ عیش و راحت کا خوگر بھی نہیں کہ گردش نے اس حسرت نادیدہ سے دوچار ہی نہیں ہونے دیا۔ ورثہ شہرت؟ اس کا آغاز جس قدر مسرور کن نظر آتا تھا اگر اس کے اندر بھی انجام سے باخبر ہوتا تو شہرت کو اپنے لئے شجر ممنوعہ بنا لیتا۔ اردو زبان سے متعلق میرا جنون خدمت، ادب نواز و ادب پرست طبقات کی نگاہ، احسان کا مستحق ہو یا نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ وصالی میرے لئے سوہان روح بن گئی ہے۔ اس شخص کی بدنصیبی سے کون انکار کر سکے گا جس نے زندگی کے پندرہ سال علوم عربیہ کی تحصیل و تکمیل میں اس طرح گزارے ہوں کہ عید بقرعید کے سوا شکم سیر کھانا اور سالم لباس بھی میسر نہیں ہوا، جس کی جوانی کے دن تو اب گلشن اور جامع مسجد کے نفقات تک محدود ہے اور جس نے اپنا عہد طالب علمی اردو سے نفرت اور فارسی سے بیزاری میں اس لئے بسر کیا کہ عربی اور علوم عربیہ کے مقابلہ میں اردو فارسی ادب بے حقیقت [illegible] کیا یہ وقت کی ستم ظریفی نہیں کہ اس نے فارسی کو اس کی زندگی بنا دیا ہے۔ آہ!

اپنے شاگرد چودھری [illegible] کاوش کو ایک خط لکھتے ہیں:۔

عزیز گرامی قدر کاوش

ہزاروں دعائیں، لاکھوں سلام! تمہارا خط ایسے وقت ملا کہ میں تم سے مایوس ہو چکا تھا۔ تمہارے لئے میرے دل میں غیر فانی محبت، دماغ میں تمہارے خیالات اور زبان پر بے تحاشا دعائیں جاری تھیں۔ کاوش! تمہارے مستقل طور پر گم ہو جانے سے دل میں ایک خلا سا محسوس کرتا ہوں۔ لاکھ کی آبادی کا یہ لاہور میرے لئے تو اجاڑ ہو رہا ہے۔ تم یاد آتے ہو، تمہاری والدہ یاد آتی ہیں۔ تمہاری دلہن اور تمہارے حسین بچے یاد آتے ہیں"۔

اپنے بعض معاصرین کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

> علم و ادب کا صحافتی طوفان پانچ سال کے لگ بھگ علم و ادب کی بے کراں وسعتوں میں برپا رہا۔ اکثر معاصرین نے اپنے اپنے ظرف و حوصلہ کے مطابق اس سیلاب کو روکنا چاہا۔ مگر ان کی زمین گیری کے باعث حالات انہیں اس طوفان سے بچا لے گئی ورنہ پانی تو ان کے سر سے گزر چکا تھا۔ اس دور میں پست فطرت معاصرین کی حاسدانہ جد و جہد کے ایسے ایسے انوکھے تماشے دیکھنے میں آئے۔ کہ اکثر نگاہ [illegible] [illegible] بھی ہماری ادبی و صحافتی لائنوں میں [illegible] وبائے عام کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ ادبی دنیا کے عہد عروج میں مجھے اس وبائے عام کو عریاں صورت میں دیکھنے کا موقع ملا

علامہ نے پنجاب میں اُردو شاعری اور انشاپردازی کا کچھ اس شان سے صور پھونکا کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خوابیدہ جذبات بیدار ہو گئے۔ لکھنؤ اور دہلی میں ادبا کی تحریر کا جو رنگ تھا اس کے سانچے میں پنجاب کے ادیبوں کی تحریریں بھی ڈھلنے لگیں۔ رسائل و اخبارات کی زبان میں پہلے جو روکھا پن تھا رفتہ رفتہ اس کی جگہ بانکپن نے لے لی۔ ادبیات اور ٹکسالی زبان کی مجالس جب پنجاب کی اُردو پر پڑی تو زبان کا لطف دوبالا ہو گیا۔ ۱۹۱۰ء میں جب مخزن کی ادارتی باگ ڈور علامہ تاجور نجیب آبادی نے سنبھالی تو پانچ سال تک انہوں نے اس کے ادارتی فرائض اس خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیے کہ ادبی حلقوں میں اس کی مانگ بڑھ گئی۔ علامہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دنیا پیدا کر لی تھی۔ مخزن بھی میرے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا۔ میں اس کے بڑھاپے کو جوانی میں تو تبدیل نہ کر سکا لیکن

"جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا"

کے مقولہ کو مخزن کے حق میں میں نے غلط ثابت کر دیا۔ مخزن کے بعد علامہ تاجور نے ہمایوں کی ادارت سنبھالی پانچ سال اس سے وابستہ رہے اس مختصر سی مدت میں ان کی ادبی شہرت کے آفتاب کی شعاعیں ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی تھیں۔ علامہ نے اپنی صحافتی زندگی کے تیسرے دور میں خود اپنے رسالہ کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ "ادبی دنیا" ۱۹۳۲ء تک شعر و ادب کا علمبردار رہا۔ ۱۹۳۶ء میں علامہ نے شاہکار کے نام سے ایک اور رسالہ نکالا۔ علامہ نے ہفتہ وار اخبار پریم بھی جاری کیا تھا جس کے ذریعہ آپ ملک کے بچوں، بچیوں کے دل میں خدا، مذہب، وطن اور بنی نوع انسان کی محبت اور بلا امتیاز ہر مذہب کے پیشواؤں کی محبت پیدا کرنی چاہتے تھے۔ لاہور میں آمد سے قبل علامہ رسالہ ناقد، جمیل، آفتاب اردو (لدھیانہ) اور رسالہ تاج الکلام (نجیب آباد) کے مدیر رہ چکے تھے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آج پاکستان کے طول و عرض میں جو اردو روزنامے، ہفت روزہ اخبارات اور رسائل جاری ہیں ان کے ادبی محاسن کا سہرا علامہ تاجور نجیب آبادی کے سر ہے۔ خیر و شر کے بارے میں اسلام نے جو نظریہ پیش کیا ہے کہ جو شخص بھی خیر یا شر کی رسم ایجاد کرتا ہے اس کے اعمال پر اس کے مثبت یا منفی اثرات کی پرچھائیں ضرور پڑتی ہے اس کی رو سے بلا شائبہ مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اخبارات و رسائل میں جو اچھوتی تحریریں، لطائف و ظرائف، پرشوکت الفاظ، زبان کے محاورے اور ادب و تنقید کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اشعار جہاں کہیں بھی دیکھنے میں آتے ہیں، وہ زبان حال سے علامہ کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں اور علامہ کی بارگاہ میں یہ خراج عقیدت پیش کرتے ہیں ؎

تیرے نازک لبوں نے سکھایا ہے
ہم نے انداز مسکرانے ...... کا

علامہ کی شاعرانہ خصوصیت کو میں نے اس لئے آخر میں جگہ دی ہے تاکہ ان حضرات سے جو میرے مخاطب ہیں یہ حقیقت مخفی نہ رہے کہ علامہ اپنی اس خصوصیت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ وسعت عمر میں اپنے کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ بھی شائع نہ کر سکے۔ علامہ کا بیشتر غیر مطبوعہ کلام ایسے شعراء کی تحویل میں ہے جو علامہ کے شاگرد ہیں یا عقیدت کیش۔ خدا کرے کہ ان پیارے شعراء کی یہ دوری ہو اور علامہ کا یہ غیر مطبوعہ کلام پوری دیانت و امانت کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ علامہ سے خوش اعتقادی رکھنے والے قدر فہم ہوتے تو کسی کو بھی دستبرد کی جرأت نہ ہوتی۔ علامہ کا مزاج کچھ اس انداز کا تھا جس کی آئینہ داری استاد کے اس شعر سے ہوتی ہے ؎

عظمت پہنچے ہیں ذرہ کشاں خاک کے مول
ہے یہاں سایۂ ہما کا بھی وقار خاک کے مول

علامہ تاجور نجیب آبادی کے تمام [illegible] کے بارے میں اس دور کے ادبا کو بہت کم معلومات ہیں اس لئے میں اُن کی زبانی پیش

ارشادات کئے دیتا ہوں :۔

> میرا نام احسان اللہ خاں، ابوالعرفان کنیت، تاجور تخلص، جائے ولادت نینی تال، تاریخ پیدائش غالباً ۱۸۹۴ء، وطن نجیب آباد ضلع بجنور، قومیت درانی پٹھان، تربیت گاہ، دارالعلوم دیو بند، ذریعہ معاش دیال سنگھ کالج کی پروفیسری۔ وطن اقامت لاہور ہے۔ گورنمنٹ نے میری ادبی خدمات کے صلہ میں ۱۹۳۸ء میں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ انجمن ارباب علم نے ۱۹۲۲ء میں بلیغ الملک کا خطاب دیا تھا۔

علامہ تاجور چند در چند فضائل کے باوصف بڑا منتقم واقع ہوئے تھے۔ اگر کسی کی طرف سے دل میں گرہ بیٹھ جاتی تو پھر مشکل سے نکلتی تھی۔ کانوں کے کچے بھی تھے کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کسی کے خلاف کسی نے علامہ کے کان بھر دیئے اور پھر اس بیچارے کی شامت آئی کہ علامہ اس سے برسوں نہیں بولے۔ مزاج آتش ناک ہونے کے باعث علامہ کے اکثر شاگرد ان کی زندگی ہی میں ان سے کٹ گئے۔ علامہ کی اس کمزوری کا اثر ان کی زندگی کے بڑے حصہ پر چھایا۔ شروع شروع میں اس اثر نے خاندانی کشیدگی کی شکل بھی اختیار کی جب پہلی بیوی سے علامہ کی ناچاقی اور پھر نکاح ثانی ...... یہ بھی علامہ کی اسی کمزوری کا نتیجہ تھا۔ علامہ مستقل مزاج بھی نہیں تھے۔ عمر بھر انہوں نے کوئی کام باضابطگی اور مستعدی کے ساتھ نہیں کیا۔ ذہنی انتشار کا ناسور اس بری طرح ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں بس گیا تھا کہ وہ یکسوئی کے ساتھ کسی موضوع پر ایک مختصر سی تصنیف بھی نہیں پیش کر سکے۔ اپنی طالب علمی کے ابتدائی دور میں علامہ نے جو کچھ پڑھا تھا، بعد کے زمانہ میں اس میں اضافہ تو کیا ہوتا بہت کچھ سہو و نسیان کی نذر ہو گیا تھا۔ صحافتی زندگی کے اس دور میں جب شاہکار کی ادارت ان کے سپرد تھی انہوں نے ایک دفعہ نہایت صفائی کے ساتھ مجھ سے کہا کہ "مولانا اب تو درس نظامی کی ایک بھولی بسری یاد باقی رہ گئی ہے وہ مبلغ علم جس پر مجھے ناز تھا۔ حوادث روزگار کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ اب تو عالم یہ ہے کہ المنتخب کے کسی عربی مضمون کا اردو ترجمہ بھی میرے بس کی بات نہیں۔"

علامہ صرف گفتار کے غازی تھے۔ کردار کا جوہر ان کی زندگی میں نظر نہیں آتا۔ مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ علامہ نے دین کا لبادہ اوڑھا، ایک فاضل دیو بند کی حیثیت سے مذہب کو ان کا اوڑھنا بچھونا ہونا چاہئے تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری طرح جن لوگوں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ علامہ اکثر و بیشتر نماز تک بھی نہیں پڑھتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ انہیں دین سے اتنا بعد ہو گیا تھا کہ وہ علماء کو بھی قدر و منزلت کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ ایک دفعہ رئیس المفسرین مولانا شبیر احمد عثمانی اور سید العلماء، علامہ سید انور شاہ کاشمیری نے علامہ تاجور کی بے عملی پر انہیں سرزنش بھی کی تھی۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے، علامہ کی بے عمل زندگی میں زیادہ دخل اس وابستگی کو تھا جو انہیں اپنے ہندو اور سکھ شاگردوں سے تھی۔ دیال سنگھ کالج کی پروفیسری ان کے حق میں رحمت نہیں بلکہ زحمت ثابت ہوئی۔ ایک تو اس لئے کہ انہوں نے ماحول کا غلط اثر قبول کر لیا دوسرے اس لئے کہ ان کے تعلقات ان مسلمان شاگردوں سے کٹتے چلے گئے جو اگر چاہتے تو علامہ کو دیکھتے اس اعلیٰ ترین مقام تک پہنچا سکتے تھے جس کی بلندیوں تک رسائی ان کے سان گمان میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

اگر جمالیاتی ذوق کوئی عیب ہے تو پھر مجھے یہ بات کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں کہ اس عیب کا داغ بھی علامہ کے دامن پر تھا۔ علامہ میں یہ ذوق اتنا راسخ تھا کہ بھونڈے خدوخال انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ان کے ایک بزرگ مولوی صاحب کسی ضرورت سے ان کے پاس آئے تھے بیچارے کریہہ المنظر تھے۔ میں نے دیکھا کہ جب تک وہ علامہ کے پاس بیٹھے رہے، علامہ کی تیوری چڑھی رہی۔ ملنے کے بعد مجھ سے کہنے لگے کہ یہاں تو کہاں آ مرا، زندہ لاشے تو خانقاہوں اور مقبروں کا مصرف تھا۔ لاہور کا گھر اس قابل کہاں کہ اس پر یہ بلائیں ٹوٹ پڑیں۔ بیچارے مولوی صاحب پر علامہ کی یہ بے رخی نفسیاتی اثر چھوڑ گئی اور انہوں نے بے دلی سے رخصت چاہی۔ علامہ نے سر کی ہلکی جنبش کے ساتھ انہیں الوداع

کہا۔ وہ شخص میرے گھر سے باہر نکلے ہوں گے کہ علامہ کہنے لگے۔ مولانا دیکھا آپ نے کتنا دہریت تھا یہ مولوی۔ قسم اس کی جس نے مجھے نیست سے ہست کیا ہے یہ صدق میرے ذوق لطیف پر سخت گراں گزرتی ہے میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ البتہ جی ہی جی میں یہ ضرور سوچا کہ اگر علامہ صاحب کا ذوق جمال بھی آسمانی بلندی پر پہنچ جاتا تو کیا ہے تو علامہ کے پاس بھی کوئی نہ پھٹکے۔ علامہ خود اتنے بدشکل واقع ہوئے تھے کہ جب بھی کبھی ان پر علامہ جاحظ کا گمان ہوتا تھا۔ علامہ جاحظ کا ذکر آ گیا ہے تو ان کا ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ ایک دفعہ علامہ جاحظ بغداد کی کسی گلی سے گزر رہے تھے کہ پیچھے سے انہیں کسی خاتون نے آواز دی۔ علامہ جاحظ نے مڑ کر دیکھا تو اس خاتون نے جو قریب ہی کھڑی تھی بڑی لجاجت سے یہ درخواست کی کہ آپ ذرا زحمت تو کیجئے ذرا سامنے والی دکان تک میرے ہمراہ چلے چلیں۔ علامہ جاحظ پرلے درجے کے عاشق تھے اور آج تک کبھی انہوں نے کسی کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے تھے لیکن اس خاتون کی لجاجت نے ان پر ایسا جادو کیا کہ بغیر سوچے سمجھے اس کے ساتھ ہو لئے۔ دکان کے پاس پہنچے تو اس خاتون نے دکان دار سے کہا کہ یہ صاحب جو میرے ہمراہ ہیں انہیں دیکھ لیجئے۔ پھر یہ خاتون علامہ جاحظ سے مخاطب ہوئی۔ علامہ! آپ نے میری خاطر بڑی زحمت گوارا کی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ! اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ علامہ جاحظ کھسیا گئے اور انہیں اپنی حماقت پر اتنا غصہ آیا کہ دانت پیسنے لگے۔ خاتون جا چکی تھی۔ وہ دکاندار جو دراصل پیشہ کا سنار تھا بولا کیوں صاحب آپ کو کیا الجھن درپیش ہے؟ علامہ جاحظ نے کہا غصہ کیا ہے دامن گیر ہوتی اس سوچ میں ہوں کہ یہ خاتون مجھے یہاں کیوں لائی تھی؟ کیوں اس نے ....

آپ سے کہا کہ انہیں دیکھ لیجئے اور پھر کیوں میرا شکریہ ادا کیا؟ ان سوالات کا جواب چاہتا ہوں۔ سنار علامہ سے واقف تھا۔ اس نے ادب و احترام کے ساتھ علامہ کی خدمت میں یہ گزارش کی کہ حضرت! یہ خاتون اپنی انگوٹھی کے نگینے پر ابلیس کی تصویر کندہ کرانا چاہتی تھی۔ میں نے اسے مذاق سمجھا اور عذراً اس سے یہ کہہ دیا کہ اگر ابلیس کی تصویر ہی کندہ کرانی ہے تو اسے میرے پاس لے آؤ میں اسے ایک نظر دیکھ لوں۔ آج کئی دن کے بعد یہ خاتون آپ کو ہمراہ لائی اور مجھ سے کہا کہ انہیں دیکھ لیجئے۔ مجھے تو بہرحال حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ علامہ جاحظ یہ سن کر چپ رہ گئے اور زندگی میں پہلی بار انہیں اپنی شکست خوردگی کا احساس ہوا۔ علامہ جاحظ نے یہ لطیفہ خود قلم بند کیا ہے۔ اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ جاحظ کتنے کریہہ المنظر تھے وہاں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنی بدصورتی سے مطلق عار نہ تھی۔ وہ اسے بھی اپنے خالق کی شان خلاقی کا مظہر سمجھتے تھے۔ بہت ممکن ہے علامہ تاجور کا بھی یہی عقیدہ ہو۔ بہرحال یہ ضرور ہے کہ علامہ تاجور کو اپنے بارے میں یہ غلط فہمی ضرور تھی کہ وہ اپنے چہرہ کی تراش خراش کے لحاظ سے ایک مرد معقول ہیں۔ ان کی چمکتی ہوئی آنکھیں ہر شخص سے یہ مطالبہ کرتی تھیں کہ وہ ان کے حسن ذوق کی داد دے۔

میں نے اپنے ممدوح کی شخصیت کے تاریک پہلو اس لئے ابھار کئے ہیں تاکہ اہل ادب پر یہ حقیقت واضح ہو کہ کسی صاحب کمال کی زندگی نقائص سے مبرا نہیں ہوتی۔ البتہ بعض شائستہ اور ذوق پسند تذکرہ نویس یہ پہلو تشنہ چھوڑ دیتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ نقائص سے علامہ کے محاسن پر حرف نہیں آتا بلکہ یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ بہت کچھ تھے لیکن بتقاضائے بشریت ان سے کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں۔

علامہ تاجور آج ہمارے درمیان نہیں لیکن پھر بھی زبان حال سے ہمیں یہ پیغام دے رہے ہیں ؎

بڑے ہیں ہم مگر ایسے بڑے بھی کم ہوں گے
کسی زمانے کے اچھے نہیں کریں گے یاد!

دلؔ شاہجہانپوری

شبنم رومانی

(کراچی)

وہ کون سی خوبی ہے جو دلؔ صاحب میں نہیں ہے۔ وہ بھولے بھالے سے انسان ہیں، دوستوں پر مرمٹنے والے دوست ہیں، مگر بے تکلف تماشہ دیکھنے والے مہربان ہیں، زمیندار ہیں لیکن کاشتکار انہیں اپنا امین اور استاد نہیں سمجھتے ہیں، طبیب ہیں لیکن دوائیں مفت بانٹتے ہیں اور کوئی کچھ نذر کرے تو اس طرح روٹھ جاتے ہیں جیسے ان کی توہین ہو گئی ہو، شکاری ہیں لیکن کوئی خوبصورت ہرنی قریب سے گزر جاتی ہے تو انگلی بندوق کی لبلبی سے پھسل جاتی ہے۔ شاعر ہیں مگر کبھی مصرع نہیں کیا، کوئی تعریف کرتا ہے تو شرما جاتے ہیں، تنقید کرتا ہے تو مسکرا دیتے ہیں، استاد ہیں مگر شاگردوں کو شاگرد نہیں سمجھتے احباب سمجھتے ہیں اور ہر شاگرد کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ بیچارہ خواہ مخواہ انہی کا استاد بننے کا خواب دیکھنے لگے ——— یہی وجہ ہے کہ ملک ان پر افتخار کرتا ہے اور لوگ انہیں "افتخار الملک" کہتے ہیں۔

ہاں ایک خوبی ایسی ضرور ہے جو دلؔ صاحب میں نہیں ہے۔ اگر وہ تھوڑے سے گنگھے مزاج کے انسان بھی ہوتے اور انہیں کبھی کبھار بھی غصہ بھی آجایا کرتا تو پھر قدرت کو مزید انسان پیدا کرنے کی ضرورت باقی نہ رہتی اور اس کا مشن پورا ہو جاتا ——— حضرت آرزو لکھنوی مرحوم نے ایک محفل میں ٹھیک ہی کہا تھا:

> "دو باتیں ہماری سمجھ میں اب تک نہیں آئیں ——— جناب [illegible] سید افضل ہو کر
> اتنے مغلوب الغضب اور دلؔ صاحب افغان افضل ہو کر اتنے حلیم و سلیم کیوں ہیں؟"

دلؔ صاحب کی نشوونما ایسے ماحول میں ہوئی جہاں دن رات شکار کے پروگرام بنتے تھے، مسرور حضرات کا مجمع رہتا تھا، محفل سماع گرم رہتی تھی اور قوالوں کو ریاض کرائے جاتے تھے۔ لہٰذا ان دونوں مشاغل سے آپ کو بھی دلچسپی رہی ہے۔ کافی عرصہ تک سیر و شکار کا شوق رہا۔ پھر وہی بندوق کی لبلبی سے انگلی نہیں ہٹتی تھی۔ خورد و نوش کا سامان ساتھ ہی ہوتا تھا۔ ناشتہ دانوں میں حلوے پوریوں کے علاوہ بھرے ہوتے تھے۔ صبح کو پوری جماعت جنگل میں پہنچ کر ناشتہ کرتی تھی اور پھر سب لوگ شکار کھیلنے نکل جاتے تھے۔ گاؤں کے لوگ بیچ ہو کر جنگل کا "ہنکانا" کرتے تھے۔ جانور نکل نکل کر بھاگتے تھے اور بندوقوں کی گولیاں ملک الموت بن کر ان کے پیچھے دوڑتی تھیں۔ شام کے وقت جو شکار مارا جاتا اس کا گوشت مختلف طریقوں سے پکایا جاتا۔ کوئی اوجھڑی کباب پکاتا،

کوئی گرفتہ کوئی قورمہ ـــــ رات میں سب لوگ ایک ساتھ مل بیٹھتے، کھانا کھاتے اور جنگل میں منگل مناتے۔ آپ کا نشانہ بہت صاف تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک "بھاگتا" شکار کیا تھا جس کے سینگ رتنا جھوٹ نہ بولے، اڑتالیس انچ لمبے تھے۔

ایک شکار میں آپ نے ایک بہت بڑا سانبھر گرایا۔ وہ اس قدر بھاری بھرکم تھا کہ اس کا ذبح کرنا مشکل ہوگیا۔ آپ کے ساتھ جلال آباد کے ایک خان صاحب بھی تھے۔ آپ نے ان سے کہا:

"میں اس کا منہ پکڑتا ہوں تم ذبح کرو۔"

جب وہ چھری پھیرنے لگے تو سانبھر نے اس زور سے گردن ہلائی کہ دل صاحب سنبھل نہ سکے اور گر پڑے۔ خانصاحب نے ہنس کر فرمایا "ہو گیا نا شاہجہان پور کے پٹھانوں کا زور!" اب خان صاحب کی باری تھی۔ دل صاحب نے کہا: "میں چھری پھیرتا ہوں آپ منہ پکڑیے۔" خانصاحب نے اپنے جسم کا پورا زور ڈال کر سانبھر کی گردن دبائی مگر دل صاحب نے جیسے ہی چھری پھیری اس نے گردن کو وہ زور کا جھٹکا دیا کہ خان صاحب دور تک لڑھکتے چلے گئے۔

دل صاحب سے ان کے دیہات کے کاشتکار بہت مانوس ہیں اور ان پر جان چھڑکتے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی شکاری نے ایک نیل گائے پر فائر کیا گولی سے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وہ نیل گائے اتفاق سے آپ کے پاس سے گزری آپ نے گولی چلا کر اسے گرا لیا۔ پھر کیا تھا شکاری صاحب بہت بگڑے۔ "میرا شکار کیوں مار لیا؟ شاہجہان پور کے شکاری بے ایمان ہوتے ہیں۔" اتنا سننا تھا کہ گاؤں والے دل صاحب کے پاس پہنچ گئے اور ان سے کہا: "آپ ہم کو اجازت دیں تو یہاں شکاری صاحب کو مار کر راتوں رات کسی کوئیں میں ڈال دیں۔" شکاری صاحب نے یہ سنا تو دل صاحب کے قدموں پر گر گئے ـــــ آخر دل صاحب کی بڑی سفارشوں پر ان کی جان بچی۔

ایک مرتبہ شکار کے سلسلے میں آپ نیپال کی ترائی تشریف لے گئے۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔ جنگل میں لکڑی کے ایک ٹھیکیدار کا بنگلا تھا آپ وہیں ٹھہرے تھے۔ اسی کا گاڑی بان صبح صبح آپ کو جلد پر شکار کے لئے لے جاتا تھا۔ غریب آدمی تھا صبح کو جب آتا تھا تو صرف ایک چادر اس کے جسم پر ہوتی تھی آپ نے اس سے پوچھا ـــــ "اس سردی میں کیسے گزر ہوتی ہے؟" اس نے جواب دیا: "بڑے جاڑے لگتے ہیں رات بھر جلتا ہوں اور بدن سینکتا ہوں۔" آپ نے گاڑی رکوا دی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ سمجھا اس سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ دل صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اپنی اونی جرسی اور گرم قمیص اتار کر اسے دے دی اور کہا: "اسے پہن لو اور گھر واپس چل کر میں دوسرے کپڑے پہن لوں ـــــ"

میرے ایک خالو نصیر الدین خاں رائے بریلی میں کوتوال تھے اور تقریباً پندرہ سال وہاں رہے۔ جب باہر سے ان کے یہاں مہمان آتے تھے تو تانگہ والوں میں خوب جھگڑا ہوجاتا تھا۔ ہر تانگہ والا یہ چاہتا تھا کہ سواری وہ لے جائے۔ حقیقت یہ تھا کہ تھے تو وہ کوتوال مگر مزاج پایا تھا شاہانہ ـــــ کرایہ آٹھ آنہ ہوتا تھا پانچ روپے دیتے تھے وہ ـــــ یہی حال کچھ دل صاحب کا ہے۔ وہ سرکاری ٹھیکیدار بھی ہیں اور جب کوئی نیا کام نکلتا ہے تو جو مزدور ان کے پاس کام کرتے ہیں ان میں ہمیشہ جھگڑا ہوتا ہے ـــــ اور ہر مرتبہ دل صاحب کو جھگڑا چکانے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔

دل صاحب کا کلام سب سے پہلے "پیام یار" میں چھپا تھا۔ یہ پرچہ لکھنؤ سے نکلتا تھا اس میں اکثر امیر و داغ بھی شرکت فرماتے تھے۔ اسی کے مطالعہ سے آپ کو شعر و سخن کا ذوق ہوا۔ رفتہ رفتہ اس ذوق نے یہاں تک زور مارا کہ آپ نے خود شعر کہنا شروع کر دیا۔ ایک بار "پیام یار" میں طرح نکلی: "جگر دیکھ لینا" "نظر دیکھ لینا"۔ اس میں آپ نے بھی غزل کہی تھی جس کا ایک شعر اب بھی محفوظ ہے۔ یہ شعر ۱۸۹۳ء کا ہے ؎

چلا ہے ابھی تیر مژگاں کسی کا
ذرا اپنا اپنا جگر دیکھ لینا

دل صاحب کی خوش قسمتی کا زمانہ تھا کہ حکیم سید جعفر حسین صاحب جعفر بلاوی شاہجہان پور تشریف لائے۔ موصوف صاحب بزم شاعر بھی تھے۔

کاشف تخلص کرتے تھے اور حضرت اثر لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ دل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک شعر و سخن کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ حکیم صاحب نے آپ کے اشعار سن کر یہ مصرع دیا:

ع ہم رکھ کے کہیں بھول گئے طاق میں جیسے (قافیہ "طاق" وغیرہ اور ردیف "میں جیسے")

اور فرمائش کی کہ اس پر غزل کہہ کر مجھے دکھاؤ۔ دل صاحب نے فوراً قلم سنبھالا اور آدھی گھڑی میں سات شعر کہہ کر ان کے حوالے کر دیے۔ حکیم صاحب نے اشعار دیکھے تو بے ساختہ واہ واہ کر اٹھے۔ فرمایا:

"میں نے تم کو شاگرد مان لیا۔"

انہی دنوں "پیام یار" میں اس طرح پر طبع آزمائی ہو رہی تھی "یہ چوٹ کس سے پیچھے پڑی ہے" امیر، داغ، جلال، رواں سبھی نے اس پر غزل کہی تھی۔ منشی امیر مینائی کا شعر تھا:

پہنچتی ہے یہ گردن تک ہی اس کے
صراحی دخترِ رز سے کچھ بڑی ہے

حکیم صاحب نے اعتراض کیا کہ صراحی شراب سے بڑی کیسے ہو سکتی ہے؟ اسی وقت محمد علی میاں جمال شاہجہانپوری آ گئے۔ جمال صاحب کو عربی فارسی میں کافی دستگاہ تھی۔ شاعری میں انہیں حضرت امیر مینائی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ شعر صحیح کہہ کر اور صاف کہتے تھے۔ دل صاحب نے عربی کی ابتدائی تعلیم انہی سے حاصل کی تھی۔ انہوں نے فرمایا: "معلوم ہوتا ہے حکیم صاحب کو کبھی اس شغل سے واسطہ نہیں پڑا۔ میں خود سیکڑوں بوتلیں لنڈھا چکا ہوں۔ مینا میں شراب ہمیشہ کم ہوتی ہے گردن کا کچھ حصہ خالی رہتا ہے۔"

غالباً ۱۸۹۶ء میں شاہجہانپور میں ادبی و تعلیمی کانفرنس ہوئی تھی جس میں سرسید احمد خاں، مسٹر محمود، وقار الملک، مشتاق حسین، مولانا شبلی، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور نواب محسن الملک وغیرہ تشریف لائے تھے۔ اس کانفرنس کی روحِ رواں مولوی رفعت علی مرحوم تھے۔ انہی کی کوششوں سے یہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کا سلسلہ تین چار روز تک جاری رہا۔ اس کانفرنس میں سرسید اور ان کے رفقاء نے تقاریر کے ذریعہ ترغیب دلائی کہ اربابِ وطن قدامت پرستی کو ترک کر کے دورِ حاضر کے تہذیب و تمدن کو اختیار کریں۔ ——— دل صاحب بھی اس جلسے میں شریک تھے۔

مدت تک کسی استاد کی اصلاح کے بغیر مشاعروں میں غزل پڑھتے رہے مگر دل میں ایک استادِ کامل کی جستجو رہی۔ اس زمانے میں تین استاد مسلم الثبوت تھے۔ امیر مینائی، داغ دہلوی اور جلال لکھنوی۔ حضرت امیر کا پایہ باعتبارِ علم و فن سب سے بلند تھا اس لئے آپ نے انہی کو استاد منتخب کیا۔ منشی صاحب ان دنوں دربارِ رامپور سے وابستہ تھے۔ غزلیں ان کے پاس اصلاح کے لئے جاتی تھیں اور وہ ترمیم فرما کر واپس کر دیتے تھے۔ استاد اور شاگرد میں پہلی ملاقات ۱۸۹۸ء میں ہوئی جب دل صاحب اپنے ماموں کے ہمراہ بتقریبِ عرس بریلی گئے۔ وہاں سے واپسی پر منشی صاحب کی زیارت کے لئے رامپور روانہ ہوئے۔ چونکہ بغیر اطلاع گئے تھے لہٰذا براہِ راست منشی صاحب کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ صبح کو حاضری دی۔ صدر دروازہ کے اندر دو دروازے تھے ایک زنانخانے کا دوسرا نشست گاہ کا۔ نشست گاہ بالائی منزل پر تھی وہاں حضرت جلیل مانکپوری موجود تھے۔ جلیل صاحب نے آپ کی آمد کی اطلاع کر دی۔ حضرت فوراً تشریف لائے اور بڑی محبت سے گلے لگایا۔ فرمایا "یہاں کیوں نہیں قیام کیا؟" مگر دل صاحب کے عذرِ معقول پر چپ ہو گئے اور پھر شعر و ادب اور علم و فن پر گفتگو شروع ہو گئی۔

دل صاحب وہاں سے جا کر قیام پر واپس آئے ہی تھے کہ معلوم ہوا جلیل صاحب تشریف لائے ہیں۔ باہر آ کر دیکھا تو جلیل صاحب تشریف فرما تھے۔ ایک ملازم بھی ساتھ تھا۔ شیرینی کی رکابی اس کے سر پر تھی۔ جلیل صاحب نے فرمایا "قبلہ کعبہ نے یہ شیرینی اور دس روپے ضمیر کو بھیجے ہیں۔"

۱؎ دل صاحب کا اصلی نام حکیم ضمیر حسن خاں ہے۔

دل صاحب نے کہا: یہ تو شاگرد کا فرض تھا کہ استاد کی خدمت میں نذر پیش کرتا، نہ کہ استاد نے شاگرد کو شیرینی اور روپے بھیجے ہیں۔"

جلیل صاحب نے کہا: "منشی صاحب نے ارشاد کیا ہے کہ میں ضمیر کو مثل مسعود احمد کے اپنا بچہ سمجھتا ہوں۔ بچوں کو شیرینی کھلانا بڑوں کا فرض ہے۔"

آخر بڑی بحث کے بعد دل صاحب نے روپے واپس کر دیے اور شیرینی لے لی۔ دوسرے روز پھر حضرت استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دورانِ گفتگو استاد نے فرمایا ــــ "ضمیر! تمہاری شوخیٔ طبع سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیائے شاعری میں تمہارا مستقبل بہت نمایاں ہوگا۔"

اس سلسلے میں حضرت داغ کا ذکر آگیا۔ منشی صاحب نے فرمایا: جو لوگ مجھے خوش کرنے کے لئے میرے سامنے داغ کو برا بھلا کہتے ہیں میرا جی چاہتا ہے کہ ان کا منہ نوچ لوں۔ بھلا داغ کی کوئی ہمسری کر سکتا ہے ــــ ! کوئی اس شان کا شعر کہہ کر تو سنائے ؎

خارِ حسرت بیان سے نکلا
دل کا کانٹا زبان سے نکلا

دل صاحب نے شیکسپیئر کے ایک ڈرامے کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا جس میں تناسخ کے مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی گئی تھی اس کا نام "دل سوز" تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جارج پنجم شہزادے کے روپ میں ہندوستان تشریف لائے تھے اور ان کا ورود لکھنؤ میں ہوا تھا۔ لوگ جارج کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آکر لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے۔

انہی دنوں دل صاحب نے لکھنؤ پہنچ کر مختلف مطابع سے ناول کی اشاعت کے بارے میں بات چیت شروع کی۔ نظیر آباد میں حافظ عبدالحق نامی ایک صاحب رہتے تھے وہ بھی کسی پریس کے ایجنٹ تھے۔ انہوں نے مطالعہ کے بہانے ایک دن کے لئے کتاب مانگی۔ دل صاحب ایسے مرد سادہ کہ کتاب ان کے حوالے کر دی۔ دوسرے دن واپس لینے پہنچے تو حافظ صاحب غائب، تیسرے دن غائب، چوتھے دن غائب، پانچویں دن غائب ــــ اب تو دل صاحب کو فکر لاحق ہوئی۔ اپنے ایک دوست رحمن حسین خاں مرحوم سے ذکر کیا۔ رحمن صاحب زندہ دل، منچلے اور نڈر انسان تھے فوراً آپ کے ہمراہ حافظ صاحب کے مکان پر پہنچ گئے اور کہا: "آپ خاموش رہیں۔" پھر دروازے پر آواز دی: "حافظ صاحب؟" مگر جواب ندارد۔ دوسری بار پھر پکارا مگر کوئی نہ بولا۔ تیسری بار دروازہ پر زور سے دستک دی مگر لاحاصل ــــ آخر تنگ آکر رحمن خاں نے حافظ صاحب کو ایک فصیح و بلیغ گالی کے ساتھ خطاب کیا تو اندر سے حافظ صاحب کی آواز آئی: "کون بدتہذیب ہے؟" رحمن خاں نے چیخ کر کہا: "ذرا باہر تشریف لائیے ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔" حافظ صاحب غصہ میں بھرے ہوئے باہر نکلے اور پھر جو خاں صاحب میں اور ان میں خالص اردوئے معلّٰی شروع ہوئی تو لوگوں نے کانوں پر ہاتھ دھر لئے۔ قریب تھا کہ ہاتھا پائی ہو جائے کہ خاں صاحب نے کہا: "لا، دل صاحب کی کتاب واپس کر۔"

حافظ صاحب جلے بھنے تو تھے ہی فوراً مکان میں گئے اور کتاب لاکر پھینک دی: "یہ لو اپنی کتاب!"

دل صاحب کو صوفیائے کرام سے گہری عقیدت رہی ہے۔ آپ کے نانا حافظ محمد حسین خاں صاحب سلسلہ قادریہ چشتیہ کے بہت بلند پایہ بزرگ گزرے ہیں۔ ان کی بارگاہ میں اکثر باریابی حاصل رہتی تھی۔ ان کا مخصوص قوال گندھیا جو بعد کو ملک میں بہت مشہور ہوا اس کی تربیت میں دل صاحب کا کافی ہاتھ رہا اور اس کو بہت سا کلام کہہ کہہ کر حفظ کرایا۔ ایک مرتبہ اس نے بیران پور کٹرہ کے سجادہ نشین کو جبکہ وہ شطرنج کھیل رہے تھے آپ کا یہ مطلع سنایا ؎

رنگ لایا ہے یہ ضبطِ الفتِ گیسوئے دوست
آخر اپنے ہی پیچ سے پھوٹ نکلی بوئے دوست

قوال نے یہ گایا اثر ہوا کہ شطرنج کی بساط بلا اختیار الٹ دی اور دیر تک عالمِ رقص و وجد میں رہے۔ جب ذرا ہوش آیا تو کہا: ضمیر مجھے [illegible]

انس سے کس عالم میں کہا تھا۔"

حضرت امیر مینائی کی وفات کے بعد آپ نے کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا۔ اپنی ذاتی قابلیت اور مشقِ سخن پر اعتماد کیا۔ چونکہ جوہر شاعرانہ آپ کو قدرت کی طرف سے ودیعت تھا لہٰذا جو شعر بھی کہتے تھے بجا طور پر بہت فصیح و بلیغ ہوتا تھا۔ جلد ہی آپ کی شہرت سارے ملک میں بوئے مشک کی طرح پھیل گئی ——— یہاں تک کہ جب جلیل مانکپوری جانشین امیر ہوئے تو ملک کے بیشتر اساتذہ اور ناقدین کی نظریں دلؔ صاحب کی طرف اٹھی رہ گئیں ——— آخر حضرت جلیل کی رحلت کے بعد انہیں تمام ملک نے متفقہ طور پر جانشین امیر بنا دیا اور بعض بزرگوں نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ "دلؔ صاحب حضرت جلیل کی زندگی میں بھی جانشین امیر تھے"

دلؔ صاحب کی شاعرانہ عظمتوں کا چرچا مشاعروں اور ادبی جرائد تک محدود رہا ہے۔ انھوں نے کبھی اپنی شہرت نہیں چاہی اور ہمیشہ خود نمائی سے دور بھاگے۔ یہی وجہ ہے کہ شہرت کے جس زینے پر وہ آج ہیں وہاں انہیں آج سے چالیس سال پہلے ہونا چاہیے تھا۔

سید التفات رسول صاحب تعلقدار (سندیلہ) ہر سال اپنے والد کا عرس کرتے تھے جس میں مشاعرہ بھی ہوتا تھا۔ دلؔ صاحب اکثر ان کے مشاعرہ میں شرکت فرماتے تھے۔ آپ کے ہمراہ جناب بیتابؔ شاہجہانپوری بھی ہوتے تھے۔ یہ مشاعرہ اعلیٰ پیمانے پر ہوتا تھا اور تین دن تک جاری رہتا تھا۔ التفات رسول صاحب نے تمام عمر اس مشاعرے کو برقرار رکھا۔

۱۹۰۹ء کا ذکر ہے سندیلہ میں محفل شعر گرم تھی جس کا ذکر دلؔ صاحب کے پہلے مجموعۂ کلام "نغمۂ دل" کے تبصرہ میں جناب نیازؔ فتحپوری نے بھی کیا ہے۔ دو نشستوں میں دیگر شعراء نے کلام سنایا۔ تیسری نشست مشاہیر شعراء کے لئے متعین تھی۔ دلؔ صاحب کی غزل جس کا ایک شعر یہ ہے حاصل مشاعرہ رہی ؎

نہ وہ آرامِ جاں آیا، نہ موت آئی شبِ وعدہ!
اسی دھن میں ہم اٹھ اٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں

دلؔ صاحب کے بعد صرف دو حضرات باقی رہ گئے تھے۔ صبح چار بجے کا وقت تھا جب آپ غزل پڑھ چکے تو ان کی باری آئی۔ چونکہ غزل بہت چلی تھی لہٰذا ان حضرات نے یہ عذر پیش کیا کہ تھوڑی دیر کے لئے محفل برخاست کر دی جائے۔ سید محمد عسکری و تسلیمؔ خیرآبادی بھی موجود تھے انھوں نے دلؔ صاحب کے کان میں کہا: "ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ کچھ دیر کے وقفے کے بعد جب پھر مشاعرہ شروع ہوگا تو آپ کی غزل کے اثرات لوگوں کے دلوں سے مٹ جائیں گے اور ان کی غزلیں کامیاب ہو جائیں گی۔" مگر جب بعد میں مشاعرہ شروع ہوا تو ان لوگوں کی غزلیں کوری اتر گئیں۔ ان لوگوں نے لکھنؤ جا کر دلؔ صاحب کے خلاف بہت پروپیگنڈہ کیا اور انجمن بہار ادب کے مشاعرے میں مدعو کیا تا کہ کسی طرح اپنی ناکامی کا انتقام لکھنؤ میں لے سکیں۔

لکھنؤ میں سوائے دو ایک حضرات کے باقی سب دلؔ صاحب کے دوست تھے۔ مشاعرے سے ایک روز قبل نواب محمد عسکری شیخ مرحوم نے آپ کی دعوت کی۔ بعد طعام محفل شعر منعقد ہوئی۔ تمام حضرات نے ایک ایک غزل پڑھی اور دلؔ صاحب سے بہ اصرار سات غزلیں سنی گئیں۔ بعد ختم محفل پروفیسر شادانؔ مرحوم نے فرمایا: "یہ آپ کا امتحان تھا کہ آپ نے صرف ایک غزل اچھی کہہ لی ہے یا آپ واقعی اچھا کہتے ہیں۔ اگر خدا کے فضل سے آپ اس امتحان میں کامیاب ہوئے اور مخالفین کو شکست نصیب ہوئی۔"

اس کے بعد آپ کو بہار ادب کا رکن بنا لیا گیا اور ہر سال مشاعرے میں بلائے جانے لگے۔ مشاعرہ ودھ سرا میں ہوتا تھا۔ ایک سال مشاعرہ "افضل محل" میں ہو رہا تھا۔ دلؔ صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ حضرت صفیؔ، عزیزؔ، یگانہؔ، آرزوؔ وغیرہ کے علاوہ حضرت رشیدؔ جلیل شہری اور سائلؔ دہلوی بھی شریک تھے۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ مشاعرہ اپنے شباب پر تھا کہ یکایک کسی نے بجلی کی روشنی بند کر دی اور پنکھے کھول دیے ——— دسمبر کے

جینے میں ہنگموں کی ہوا ——— دل صاحب کے پاس کمبل تھا انہوں نے وہی لپیٹ لیا۔ پاس ہی رفیع احمد خاں بیٹھے تھے انہوں نے پکارا "دل صاحب! میرے لئے بھی جگہ ہے؟" آپ نے کہا "کیوں نہیں" وہ دوڑ کر بیٹھ گئے اور ان کو کمبل ہی سے ڈھک لیا۔ تھوڑی دیر بعد روشنی ہو گئی تو پیچھے بیٹھے رہنے والوں کا تماشا دیکھنے کے لائق تھا ——— عجیب منظر تھا۔ کوئی قالین اوڑھے تھا کوئی کرسی کے نیچے پڑا تھا۔ جگہ جگہ لوگ ایک دوسرے سے بری طرح چمٹے ہوئے تھے ——— اس واقعہ کے بعد مشاعرہ دو گھنٹے کے بجائے دو منٹ ہی میں ہونے لگا۔

تیمار پور کے ایک مشاعرے میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ پنڈت آنند نرائن ملا مہتمم مشاعرہ تھے۔ دل صاحب کے علاوہ تمام مشاہیر شعراء شریک تھے۔ ملا صاحب نے کارڈ کے علاوہ ٹکٹ کم پاس دئے تھے اس لئے بہت سے لوگ جن کو پاس نہیں ملے تھے ان کے خلاف ہو گئے۔ قریب ۱۰ بجے مشاعرہ شروع ہوا۔ بارہ کا عمل تھا۔ حفیظ جالندھری نظم سنا رہے تھے۔ جب انہوں نے پورے جوش میں یہ مصرعہ پڑھا ؎

بیڑی کیا ہاتھوں میں لگا دیں ہتھکڑی یہ شیروں کی آزادی ہے

تو کار کے شیروں نے دفعتاً بجلی کا تار کاٹ دیا۔ کچھ دیر تک سناٹے کا عالم رہا مگر جب بعد میں لیمپ لائے گئے ہیں تو وہ اودھم مچا ہے کہ ———!!

ہمارا ادب کی ایک اور مسلّمہ محفل کی طرح تھی۔ "غزل تھا، محفل تھا" کی ہزار کا مجمع تھا۔ لکھنؤ میں یہ طریقہ رہا ہے کہ پہلے مقامی شعراء اور مبتدی ناظمین کلام پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد بیرونی شعراء اور صاحبِ شعر خوانی دی جاتی ہے۔ اس مشاعرہ میں دو کا صاحب نیز حضرت پیر ... مرحوم بھی تشریف فرما تھے۔ چپ چاپ نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔ جب قتیل لکھنوی نے غزل پڑھی تو ایک شعر پر وہ صاحب نے نظر اٹھا کر قتیل صاحب کو دیکھا۔ جناب عزیز لکھنوی جو دل صاحب کے قریب ہی بیٹھے تھے کہا: "دل صاحب سمجھا ——— اعتراض ہو گیا۔" بعد میں دل صاحب نے جب اپنی غزل کا یہ شعر پڑھا ؎

پہنچے تک سمجھے کیا کیا امید و بیم کے نقشے
تلاطم میں تھی کشتی سامنے نظروں کے ساحل تھا

تو وہ صاحب نے نظر اٹھا کر دل صاحب کو دیکھا۔ عزیز صاحب نے فوراً کہا "دل صاحب سمجھے ——— آپکے شعر کی داد دی گئی ہے۔"

حضرت بیباک شاہجہانپوری تلمیذ داغ سے دل صاحب کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اکثر مشاعروں میں ساتھ ساتھ جاتے اور ساتھ ہی قیام کرتے تھے۔ بیباک صاحب شاعر ہونے کے علاوہ بڑے سخن فہم تھے۔ جس شعر پر داد دے دیتے تھے بلند پایہ سمجھا جاتا تھا مگر صاف گو اور مغلوب الغضب بھی تھے اس لئے لوگ ان سے بہت ڈرتے تھے۔ سندیلہ کے ایک مشاعرہ میں دل و بیباک کے علاوہ سیف شاہجہانپوری بھی شریک تھے۔ سیف صاحب و بیباک میاں کے قریبی عزیز ہوتے تھے مگر شرے مقتدر پیرزادے تھے۔ بعد مشاعرہ دل صاحب، بیباک میاں اور سیف صاحب سے نواب التفات رسول نے فرمایا کہ ڈپٹی کمشنر و جج ضلع آپ لوگوں کا کلام سننا چاہتے ہیں۔ یہ حضرات انگریز ہیں۔ انہوں نے اردو نظم نہیں سنی لہٰذا آپ شام کو تشریف لا کر اپنا کلام سنائیں۔ جب روانگی کا وقت آیا تو سیف صاحب نے جانے سے انکار کر دیا اور برجستہ کہا "میں وہاں جا کر مسخرہ بننا نہیں چاہتا۔" دل صاحب اس وقت تو خاموش ہو گئے اور بیباک میاں کے ساتھ التفات رسول صاحب کی قیام گاہ پہنچے۔ ڈپٹی کمشنر و جج ضلع کو اپنا کلام سنایا۔ چونکہ وہ اردو سے ناواقف تھے لہٰذا ایک مترجم نے انگریزی میں اشعار کے معنی ان کو سمجھائے۔

واپس آ کر جب دل، بیباک اور سیف اکٹھے ہوئے تو دل صاحب نے چھیڑا ——— "کیوں سیف صاحب! جب آپ ولایت ورزی کی دکان پر جا کر اس کو اپنی غزلیں سناتے ہیں جو بالکل جاہل ہے تو آپ کے لئے فخر کی بات ہوتی ہے مگر جب ایک ڈپٹی کمشنر جس کے اجلاس میں آپ دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں آپ کو نہایت احترام سے اشعار سننے کے لئے مدعو کرتا ہے تو آپ انکار کر دیتے ہیں کہ میں مسخرہ بننا نہیں چاہتا۔" یہ سننا تھا کہ بیباک میاں آگ بگولا ہو گئے۔ "کیوں بے سیف کے بچے! تو نے کیا سمجھ کر کہا، کیا ہم مسخرے ہیں؟ خدا کی قسم اگر تو شاعر نہ ہوتا

میں ہوتا تو میں سینہ پر چڑھ کر تیرے گلے کا خون پی لیتا۔"

مرزا یگانہ اور عزیز لکھنوی مرحوم میں ہمیشہ اختلاف رہا۔ جس مشاعرہ میں دونوں حضرات ہوتے یگانہ صاحب مصر ہوتے کہ میں عزیز کے بعد پڑھوں گا اور مخالف جماعت "معیار ادب" مصر ہوتی کہ عزیز صاحب یگانہ کے بعد پڑھیں۔ یہ کشمکش یہاں تک بڑھتی کہ دونوں بغیر غزل پڑھے اٹھ جاتے اور اہل مشاعرہ سر پیٹتے رہ جاتے۔ ایک بار سیتاپور کے ایک بڑے مشاعرے میں لکھنؤ سے مرزا یگانہ اور ان کی مخالف "معیار ادب" کے اراکین بھی آئے ہوئے تھے۔ تقدیم اور تاخیر کے مسئلے پر دونوں میں اختلاف شروع ہو گیا۔ بانی مشاعرہ نے دل صاحب سے کہا۔ "آپ بیچ میں پڑ کر صلح کرا دیجئے ورنہ مشاعرہ خراب ہو جائے گا۔" لکھنؤ کے ایک استاد شاعر شفیق لکھنوی بھی شریک محفل تھے۔ وہ بالکل غیر جانبدار تھے۔ دل صاحب نے حامی بھری۔ پہلے اراکین "معیار ادب" کے پاس گئے۔ ان کو سمجھا بجھا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ ان کی جماعت کے سب شعراء پہلے پڑھ لیں اس کے بعد مرزا یگانہ اور پھر شفیق لکھنوی۔ چونکہ شفیق صاحب لکھنؤ کے ہیں اور یگانہ کے بعد پڑھیں گے اس لئے جیت اہل لکھنؤ کی ہوگی۔ پھر آپ یگانہ کے پاس گئے اور ان کو سمجھایا کہ آپ غزل ان لوگوں کے بعد ہی پڑھیں گے مگر آپ کے بعد شفیق لکھنوی کو پڑھوا دیا جائے گا جو ایک استاد شاعر ہیں ان کے آخر میں پڑھنے سے آپ کی کوئی توہین نہ ہوگی۔ یگانہ نے بھی یہ تجویز مان لی اور مشاعرہ کی کامیابی نے دل صاحب کو سرخرو بنا دیا۔

شاہجہاں پور کے ایک آل انڈیا مشاعرے میں دل، نوح اور سیماب پاس ہی بیٹھے تھے۔ مشاعرہ جاری تھا۔ فیاض شاہ آبادی نے یہ مصرعہ پڑھا:

ان کے دل کی دھڑکنیں سنتے ہیں اپنے دل سے ہم

سیماب صاحب نے اعتراض داغ دیا۔ "دل کی دھڑکنیں سنی بھی جاتی ہیں؟"

دل صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ "جی ہاں ——— مگر کانوں سے نہیں دل سے۔"

جب فیاض صاحب نے مقطع پڑھا ؏

فیض اے فیاض پاتے ہیں جناب دل سے ہم

تو سیماب صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور معافی مانگ لی۔

الہ آباد کی کسی تقریب میں دل صاحب شریک تھے۔ نجم الدین جعفری بار ایٹ لا بھی قریب ہی بیٹھے تھے۔ دل صاحب نے جعفری صاحب سے پوچھا۔ "آپ مجھ سے واقف ہیں؟"

جعفری صاحب نے فوراً جواب دیا۔ "کیوں نہیں۔ آپ تو ہر وقت میرے بائیں پہلو میں دھڑکتے رہتے ہیں۔"

کانپور کے ایک مشاعرے میں جب دل صاحب کا نمبر آیا تو ناظم مشاعرہ نے کہا۔ "آپ حضرت دل ہیں جو عاشق کے پہلو میں رہتے ہیں؟"

دل صاحب نے برجستہ کہا۔ "اب تو معشوقوں کی گلی میں رہتا ہوں۔"

مراد آباد کے ایک مشاعرہ میں دل صاحب بھی مع ایک شاگرد کے مدعو تھے۔ آپ کو مشاعرے سے قبل ایک میزبان کی تحویل میں دے دیا گیا۔ صبح سے دوپہر تک ملنے والوں کی آمد و رفت جاری رہی۔ دل صاحب چونکہ لمبا سفر طے کر کے آئے تھے اس لئے بھوک نے بہت پریشان کیا۔

مگر انھوں نے تقاضا خلافِ تہذیب سمجھا۔ جب دو بج گئے تو آپ سے ضبط نہ ہوا۔ اپنے شاگرد کو دو روپے دے کر کہا: "ذرا بازار جا کر ایک ٹین بسکٹ اور ایک بوریا لے آؤ۔"

میزبان صاحب نے سنا تو بہت حیران ہوئے۔ وجہ پوچھی تو دل صاحب نے اپنے شاگرد سے کہا: "ہاں ہاں بوریا لے آؤ میری آنتیں اس پر قل ہو اللہ پڑھیں گی۔"

اس پر میزبان بہت جھینپے اور فوراً دسترخوان بچھا دیا گیا۔

سہارن پور کے ایک مشاعرے میں دل صاحب اور نوح صاحب ساتھ ساتھ شریک ہوئے۔ بعد مشاعرہ طلباء ان پہ آٹوگراف کیلئے ٹوٹ پڑے۔ چلتے وقت دل صاحب بیاض وہیں بھول گئے۔ قیام گاہ پہنچ کر یاد آیا تو سخت پریشان ہوئے۔ بہت تلاش کی گئی مگر بیاض نہ ملی۔ سید نثار حمید زیدی اس وقت کلکٹر تھے۔ تمام ضلع میں اطلاعات بھیج دئے گئے کہ بیاض نہ ملی تو سخت مصیبت نازل ہوگی اور جو بیاض ڈھونڈھ کر دے گا اسے انعام دیا جائے گا۔

دوسرے دن جعفر عباس ایڈوکیٹ کے یہاں مشاعرہ تھا۔ دل صاحب کی باری آئی تو انھوں نے بمشکل چند شعر جو یاد تھے سنائے۔ جب مشاعرہ ختم ہوا تو کسی نے کہا: "آپ کی بیاض مل گئی ہے۔"

دل صاحب خوشی سے اچھل پڑے — "کیا واقعی ——؟"

جواب ملا —— "جی ہاں! مگر وہ ایک رقاصہ کے پاس ہے اور اس کی شرط یہ ہے کہ دل صاحب میرے مکان پر تشریف لائیں اپنا کلام سنائیں پھر بیاض ان کو پیش کی جائے گی۔" دل صاحب شرط پر غور کرنے لگے تو نوح صاحب نے ان کے چٹکی لی اور بولے،

"جب میرا گزر مے خانے میں ہوتا ہے، مسجد میں بھی رہتا ہوں، دیر میں بھی جاتا ہوں تو
ایک رقاصہ کے یہاں جانے سے کیا گریز ——"

وقت مقررہ پر جعفر عباس، نوح صاحب اور دل صاحب وہاں پہنچے۔ بڑے تکلف سے چائے پلائی گئی۔ اپنے ہاتھوں سے بنا کر اس فتنۂ روزگار نے دل صاحب کو چائے پیش کی۔ دل صاحب تھے کہ شرم سے دوہرے ہوئے جا رہے تھے اور نوح صاحب آنکھوں کے کونے دبا دبا کر اس کو شرارت پر اکسا رہے تھے۔ چائے کے بعد شعر خوانی ہوئی اور اللہ اللہ کرکے بڑے اعزاز سے بیاض دل صاحب کو پیش کی گئی —— بیاض کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو آگئے اور بیاض رقاصہ کے ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بیاض کسی لڑکے نے مشاعرہ گاہ سے اٹھالی تھی اور بازار میں اسے بیچنے لے گیا تھا۔ اس کی گمشدگی کی باقاعدہ رپورٹ لکھی جا چکی تھی اور پولیس سرگرم تلاش تھی۔ اتفاق سے رقاصہ کا بھائی ادھر آنکلا۔ اس نے لڑکے سے کہا: "میاں صاحبزادے یہ کتاب میرے حوالے کر دو ورنہ گرفتار ہو جاؤ گے۔" لڑکا یہ سنتے ہی بیاض پھینک کے بھاگ کھڑا ہوا۔

دل صاحب انکساری و سادگی کے مجسم اور وضع کے اتنے پابند ہیں کہ خواہ کتنا ہی وقت گزر جائے تا ختم مشاعرہ نہیں اٹھتے۔ جب کسی بیرونی مشاعرہ میں شریک ہوتے ہیں تو میزبان کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور بہ اصرار اپنے یہاں ٹھہرتے ہیں۔ الٰہ آباد کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے آپ گئے تو پروفیسر ضامن علی کے مہمان ہوئے۔ پروفیسر صاحب کے اصرار پر ایک ہفتہ تک قیام رہا۔ اس دوران میں ایک اور شاعر آکر ضامن صاحب کے یہاں ٹھہرے۔ دل صاحب اور وہ ایک ہی کمرے میں سوتے۔ نصف شب کے قریب انھوں نے دل صاحب کو جگایا کہ شمالی ہوا مجھے تکلیف دیتی ہے کسی نوکر کو بلا کر میرے پلنگ کا رخ تبدیل کرا دیا جائے۔ لہٰذا ضامن صاحب کو جگایا گیا۔ ملازم کو سوتے سے اٹھایا گیا اور ان کے

پلنگ کی طرح تبدیل کیا گیا۔ دوسرے دن یہ لطیفہ تمام الہ آباد میں مشہور ہو گیا اور ضامن صاحب نے ان کی بیزبانی سے کان پکڑ لئے۔

ولی صاحب اپنے ہم عصروں میں حضرت بیخود دہلوی کے بعد سب سے معمر ہیں۔ آپ کی عمر اس وقت اسی سے اوپر ہے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ایک باقیات الصالحات کا مشاعرہ نشر ہوا تھا اور حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات نے دستاویزی فلم لی تھی۔ اس مشاعرہ میں وہی مشاہیر شعراء مدعو تھے جن کی عمریں ساٹھ سے اوپر تھی۔ ولی صاحب بھی شریک تھے۔

گذشتہ سال نواب رامپور نے اپنی سالگرہ کے موقع پر قصر شاہی میں شاندار مشاعرہ کیا تھا۔ ولی صاحب بوجہ پیرانہ سالی اب مشاعروں کی شرکت سے گریز کرتے ہیں مگر نواب صاحب کے بھائی ولی میاں کے پیہم اصرار پر شریک ہونا پڑا۔ اس تقریب میں پہلے نواب صاحب کے اعزاز میں اعلیٰ پیمانے پر ایٹ ہوم دیا گیا اس کے بعد علی ظہیر صاحب وزیر یو۔پی کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ منتظم مشاعرہ ساغر نظامی تھے۔ جب سب شعراء پڑھ چکے تو ساغر نے کہا: "اب صرف تین بزرگ شعراء باقی رہ گئے ہیں، قبلہ جوش ملسیانی، قبلہ نوح ناروی اور قبلہ ولی شاہجہانپوری۔ یہ حضرات ترتیب کے متعلق خود فیصلہ کر لیں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" یہ اعلان سنتے ہی جوش صاحب ڈائس پر پہنچ گئے اور غزل شروع کر دی۔ ان کے بعد نوح صاحب چلے مگر ولی صاحب نے گھسیٹ لیا ——— "ٹھہرئیے صاحب میری عمر صرف ۹۰ سال ہے۔ آپ حضرت نوح ہیں آپ کی عمر نو سو سال ہے۔ آپ مجھ سے پہلے کیسے پڑھ سکتے ہیں ———؟"

ولی صاحب میں اگلے وقتوں کی تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یوں تو اہل شاہجہانپور خاطر تواضع میں حاتم طائی کی نسل سے مشہور ہیں، مگر ولی صاحب نے اپنے ہم وطنوں کا ریکارڈ بھی توڑ دیا ہے۔ بقول عطا جالندھری "آپ اتنے مہمان نواز ہیں کہ نووارد مہمان کا جی چاہتا ہے آپ کے دستر خوان کی تمام چیزیں چٹ کر جائے۔" شاہجہانپور میں جب بھی کوئی بڑا مشاعرہ ہوتا ہے اکثر مہمان آپ ہی کے یہاں ٹھہرتے ہیں۔ نواب جعفر علی خاں اثر جب ڈپٹی کمشنر تھے تو سالانہ نمائش کے سلسلہ میں شاہجہانپور آئے تھے مگر کبھی کسی افسر کے یہاں نہیں ٹھہرے سیدھے ولی صاحب کے یہاں پہنچے اور بستر کھلوا دیا۔ نوح صاحب اکثر آپ کے مہمان رہے۔ جگر صاحب جب بھی شاہجہانپور گئے سب سے پہلے ولی صاحب کے یہاں حاضری دی۔ جوش صاحب پچھلے دنوں کراچی آتے ہوئے شاہجہانپور محض اس لئے اترے کہ حضرت عزیز لکھنوی کے دیرینہ دوست اور اردو کے مسلم الثبوت استاد حضرت ولی کے شہر سے ان سے ملے بغیر گذر جانے کو ان کا جی نہ چاہا۔ سچ پوچھئے تو ولی صاحب نے شاہجہانپور کو متعارف کرایا ہے بلکہ شاہجہانپور اسی لئے مشہور ہے کہ وہ ولی صاحب کا وطن ہے۔

اوائل ۱۹۲۷ء میں سردار جگجیت سنگھ اور سید ولی محمد عطا جالندھری بسلسلۂ "ولی نمبر" رسالہ "نئی تعلیم" لاہور سے شاہجہانپور تشریف لائے تھے۔ ان دنوں آموں کی فصل تھی۔ ولی صاحب نے ہر دو حضرات کو اپنے باغات کے آم کھلائے۔ عطا صاحب کا کہنا ہے کہ "جن آموں کا ذکر جلیل صاحب اور داغ صاحب نے اپنے اشعار میں کیا ہے وہ سب حضرت ولی کے باغات میں موجود ہیں۔"

ولی صاحب آموں کے عاشق صادق ہیں۔ فصل میں آپ اپنے احباب کو آم خوری کے لئے لے جاتے ہیں، دعوتیں ہوتی ہیں، ڈال اور پال کے آم کھائے جاتے ہیں، شکار کھیلا جاتا ہے اور شعر پڑھے جاتے ہیں۔

آپ کے ایک دوست آم کھانے باغات میں تشریف لے گئے۔ وہ بمبئی آم سے سخت نفرت کرتے تھے، کہتے تھے "بمبئی تو ایسا برا آم ہے کہ اس کو چھیل کر پیشاب کر دینا چاہئے۔" ولی صاحب کے کانوں تک بھی ان کی یہ بات پہنچی آپ نے ایک خوب تیار بمبئی چھیل کر آگے رکھ دیا۔ انہوں نے مزے لے لے کر کھایا اور بہت تعریف کی۔ نام پوچھا تو ولی صاحب نے کہا: "نادرہ!" بہت حیران ہوئے تو آپ نے فرمایا "سمجھا!"

اُن کی بیماری کے لئے بھی سلیقہ چاہئے یعنی وقت سے پیشتر یا بعد کو کھایا جائے تو یقیناً بدمزہ ہوگا"۔

آپ کا شغل طب صرف رفاہِ عام کے لئے ہے۔ خاص خاص مجربات آپ خود تیار کر کے مفت تقسیم کرتے ہیں۔ لوگوں کے مکانوں پر جا کر مریضوں کو دیکھتے ہیں مگر کبھی کسی سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ ایک بار ایک انگریز کو جو ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا آپ کے علاج سے صحت ہو گئی اس نے پانچ سو روپے بطور نذر پیش کئے مگر آپ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرما گیا اور جب تک بیٹھا رہا معافی مانگتا رہا۔

بڑے بڑے رؤسا اور حکام آپ کے یہاں آتے اور آپ کو اپنے یہاں عزت سے بلاتے ہیں ——— مگر آپ سرکاری تقریبات میں بھی اسی شان سے شریک ہوتے ہیں جس شان سے اپنے مزدوروں کے ساتھ ان کے دوپہر کے کھانے میں۔

مشاعروں کے سلسلے میں شعراء کافی روپیہ پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک ایک آنے کے لئے لڑتے ہیں۔ میں نے مشاہیر شعراء میں اکثر کو "معاوضہ" کے لئے اراکینِ مشاعرہ سے دست و گریبان دیکھا ہے۔ اکثر صف اول کے شعراء تو مقررہ رقم سے بھی زائد طلب کر بیٹھتے ہیں۔ فرماتے ہیں مشاعرہ کیلئے کئی شیروانی سلوائی وہ خرچ ہوئے۔ سوٹ کیس لیا یا اس پر صرف کئے۔ سیکنڈ کلاس کے بجائے فرسٹ میں سفر کیا۔ اتفاق سے گلے والے پانچ سو"۔ یہ مرض صرف پیشہ ور شعراء ہی کو لاحق نہیں ہے کھاتے پیتے سفید پوش شعراء بھی اس میں مبتلا ہیں مگر ولی صاحب نے تو اس روش کا ریکارڈ ہی توڑ دیا۔ آپ نے اراکین مشاعرہ سے کبھی کچھ طلب نہیں کیا۔ یہاں تک کہ بعض بعض جگہ آپ اپنی جیب سے کرایہ آمد و رفت صرف کر کے تشریف لے گئے۔ نواب التفات رسول صاحب نے ہر چند آپ کو زادِ راہ دینا چاہا مگر آپ نے کبھی قبول نہیں کیا۔ ایک مرتبہ بہت مصر ہوئے تو آپ نے فرمایا ——— "آپ مجبور کرتے ہیں تو لئے لیتا ہوں مگر آئندہ آؤں گا نہیں"۔ ——— یہ سن کر التفات رسول صاحب بہت شرمندہ ہوئے اور لفافہ واپس لے لئے۔

ولی صاحب آج بھی شاہجہانپور میں ہیں۔ زمینداری جو ان کا ذریعہ آمدنی تھی، بحق سرکار ضبط کی جا چکی ہے۔ ٹھیکیداری قریب قریب ختم ہو گئی ہے۔ صبح کو مطب کے بعد اصلاح و تصحیح کا شغل اور شام کو لوگوں سے ملنا جلنا اب بھی جاری ہے۔ اب بھی شاہجہانپور کی کسی شاہراہ پر ٹہلنے کی چھڑی بازو میں پھنسائے ہاتھ پشت پر باندھے اور سر جھکائے بے نیازانہ گزرتے ہوئے لوگ انہیں دیکھتے ہیں تو ادب سے ایک طرف ہٹ جاتے ہیں۔ مگر کبھی سلام کا موقع نہیں پاتے۔ کتنوں ہی نے مجھ سے کہا "کاش ہم کبھی ولی صاحب کو پہلے سلام کر سکتے"۔ ولی صاحب خود سلام کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں شاید وہ سارا ثواب خود ہی لوٹنا چاہتے ہیں۔

انقلابات زمانہ نے انہیں نیم جان کر دیا ہے مگر وضع کی پیشانی پر شکن نہیں آئی۔ ان کے بڑے صاحبزادے نصیر حسن خاں بھی کوئی تیس سال کے قریب سے وکالت کرتے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے شفیق حسن خاں جو تیس کے لگ بھگ ہیں گھر کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں اور پچھلے چند برسوں سے شعر بھی کہنے لگے ہیں۔ کبھی کبھار ان کی غزلیں نگار اور ہندوستانی ادب میں نظر آ جاتی ہیں۔

چلتے چلتے حق شاگردی بھی ادا کر دوں۔ میں ان سے بہت قریب رہا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ وہ مکمل انسان ہیں اور مکمل استاد بھی۔ انہوں نے کبھی مصرعہ کاٹ کر مصرعہ اور شعر کاٹ کر شعر نہیں لکھا۔ ان کی اصلاح شاگرد کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے کبھی کسی مبتدی کا شعر آسمان پر نہیں پہنچاتے اس کو خود آگے بڑھنے کا سبق دیتے ہیں۔ شعر میں جتنی فنی اور اصولی احتیاط وہ برتتے ہیں کسی نے نہیں برتی۔ اپنے تلامذہ کے خیال کی بلندی اور پستی، رنگ کلام اور انداز بیان پر وہ اپنے نظریات کا غلاف کبھی نہیں چڑھاتے۔ ان کے تلامذہ میں جہاں خالص کلاسیکی شعراء ملتے ہیں وہاں خالص "انقلابی"، رومانی اور ترقی پسند بھی۔ وہ ہر ایک کو اس کے اپنے انداز فکر کے مطابق راہ دکھاتے ہیں۔ ان کا اصول اصلاح یہ ہے کہ شعر میں فنی خامی یا زبان و بیان کا سقم نہیں رہنا چاہئے۔

ان کی اصلاح اتنی باریک اور اتنی نازک ہوتی ہے کہ دیکھئے اور دیکھتے رہ جائیے۔ بطور مثال ایک شعر پر ان کی اصلاح نقل کرتا ہوں۔ شعر تھا۔

جشنِ فطرت مری ہستی پہ ہے نازاں شبنم
گلِ تر ہیں مرے اشکوں سے جواں ہوتے ہیں

آپ نے لفظ "جشن" میں جیم اور شین کے نقاط کے گرد گھیرا ڈال کر (حسن) شعر کو آسمان پر پہنچا دیا۔ اب شعر پڑھئے اور لطف اٹھائیے

حسنِ فطرت مری ہستی پہ ہے نازاں شبنم
گلِ تر ہیں مرے اشکوں سے جواں ہوتے ہیں

دل صاحب کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہند و پاکستان کے گوشے گوشے میں ان کے عقیدت مند بکھرے ہوئے ہیں مگر فطرتاً بے نیاز ہونے کی وجہ سے وہ اپنے شاگردوں کا ریکارڈ نہیں رکھتے اور اکثر ان کے خطوط پشت پر جواب لکھ کر واپس کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کا نام و پتہ بھی محفوظ نہیں رہتا۔ دورِ حاضر کے بیشتر اساتذہ نے ان سے باقاعدہ اصلاح لی ہے مگر دل صاحب کی وضعداری کو کیا کہا جائے انہوں نے اسے ہمیشہ صیغۂ راز میں رکھا اور آج بھی یہ سطور لکھتے وقت ان کی وضع پرستی میرا قلم روکے ہوئے ہے۔ بہر حال چند نام میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ بابر شاہجہانپوری، اکبری شناس، عیش فیروز پوری، رضا جالندھری، اصغر شاہجہانپوری، شفق گوالیاری، عبرت صدیقی، اشرف مرحومی، راسخ بریلوی، فیاض شاہ آبادی، ساقی جاوید، قیصر جھنجھانوی، تحمل شاہجہانپوری، مستان گوالیاری، عاصی ترمذی، نظیر حسین خاں نظیر، نور شاہجہانپوری، اقبال میانی وغیرہ۔

دل صاحب اب چراغِ سحری ہیں مگر ان کی پیاری شخصیت اور ان کے پاکیزہ افکار انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے خود بقول ان کے ؎

دل ہوں یہی فطرت ہے اے اہلِ نظر میری
میں سینۂ عالم میں ہر وقت دھڑکتا ہوں

فلک پیما

میاں بشیر احمد

مدیر نقوش نے چند ماہ ہوئے مجھے لکھا کہ میں اپنے عزیز ترین دوست میاں عبدالعزیز فلک پیما مرحوم پر چند خیالات کا اظہار کروں۔ پہلے تو کچھ عرصہ میں اس فرمائش پر گھبرایا۔ میں نے سوچا کہ فلک پیما پر لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ فلک پیما کے خیالات کو سمجھنے کے لئے بڑی فلسفیانہ فہم درکار ہے۔ اُن کی گونا گوں شخصیت اور اُن کے کردار کا نقشہ کھینچنے کے لئے بڑے تامل اور تدبر اور تفکر کی ضرورت ہے اور مختلف وجوہ سے میں آج کل اس قابل نہیں کہ یہ دشوار کام اپنے ذمے لے سکوں۔ سو میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں یہ کام نہیں کروں گا۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ اتنے بڑے شخص اور اپنے ایسے دوست کی شان کے شایان کچھ لکھ سکوں تو لکھوں اور نہ لکھ سکوں تو محبت و عظمت کے حضور میں گستاخی اور بے ادبی ہوگی کہ لکھنے کا عزم بھی کروں۔ پھر ایک دن یک لخت دل میں ایک بجلی سی دوڑ گئی اور معلوم ہوا کہ فلک پیما پر میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں، کئی صفحے سیاہ کر سکتا ہوں اور جب کر سکتا ہوں تو حیف ہے کہ ایسا نہ کروں۔ انسانی محبت کا تقاضا ہے، اُردو ادب کی خدمت کا امر ہے کہ میں ایسا کروں۔ میں نے اپنے آپ سے وعدہ کر لیا کہ وقت نکالوں گا اور اطمینان سے لکھوں گا اور اس لکھنے سے اور اس محنت سے فائدہ بھی اٹھاؤں گا اور لطف بھی۔ اُن کی کتاب "مضامین فلک پیما" جو اب نایاب ہے اُسے پڑھوں گا، سمجھوں گا، پھر دہراؤں گا اور لکھوں گا۔ میری طرف اُن کے سینکڑوں خطوط ہیں بڑے پرائیویٹ اور بے تکلف اور بے تحاشا، ان میں انسانی جذبات کی لہریں ہیں، علمیت کے موتی ہیں، فلسفے کے ہیرے ہیں۔ ان کو دیکھوں گا، پرکھوں گا اور دوسروں کو دکھاؤں گا۔ کس قدر شاندار کام ہوگا۔ اور پھر اُن ہزاروں ملاقاتوں پر ایک نگاہ ڈالوں گا جو میری اُن کی ہوئیں۔ انہیں یاد کروں گا، دل کے کانوں سے سنوں گا اور شکریے کی زبان سے دوستوں اور ہم جلیسوں کو سناؤں گا اور مزے لوں گا۔ واہ! کس قدر پُر لطف کام ہوگا!

لیکن صد حیف کہ فرصت نہ ملی۔ پھر نہ ملی حالانکہ مجھ سے آدمی کی بابت یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ "فرصت ہی نہیں ملتی، افکارِ معیشت کے!" پھر کس قدر شرم کی بات ہے کہ میں نے کچھ نہ لکھا۔ ہزاروں کاموں کے اندر بیسیوں بے سود مصروفیتوں اور بے معنی "مصیبتوں" اور "غموں"

کے اندر ڈوبا ہوا پاتا ہوں۔ یہ سوچا کہ دنیا ہی تھا کہ ایک دن ایک خط لکھ کر فلک پیما کی خوبصورتیوں کے چند انمول موتی سمیٹ کے اوپر سے آ کر اور سورج اور چاند کی روشنی میں ان کی چمک سے بعض نگاہوں کو خیرہ اور بعض دماغوں کو مدہوش اور دلوں کو زندہ کر دیتا۔ شاید یہ کام مجھ سے نہ ہوتا تھا نہ ہو سکا۔ تھا صرف اس کی آرزو تھی لیکن حیف کہ وہ بھی اتنی زبردست نہ ہوئی کہ یہ کام مجھ سے ہو جاتا۔ یوں دن گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ شدت کی گرمی پڑنے لگی اور مجھ نازک مزاج کے پہاڑ پر چلے آنے کے دن قریب آ گئے۔ سوچا اب پہاڑ پر فراغت میں ٹھنڈک میں بے خوابی کی راتوں میں جب موقع ملے گا فلک پیما کی کتاب کو پڑھوں اور مطلوبہ مضمون کو ٹھہر ٹھہر کر لکھوں اور "نقوش" کے صفحات پر اس نقش کو ثبت کر دوں۔

لیکن وائے قسمت کہ یہ بھی نہ ہونا تھا اور نہ ہوا۔ پہاڑ پر تو آ گیا تو دو چار روز ہوئے کہ ارادہ کرنا پڑا کہ اس دفعہ اور وہ بھی بہت جلد صحت کے لئے سیر و تفریح کی غرض محض گریز کی خاطر یورپ چل دوں۔ اسی حال میں تھا کہ آج طفیل صاحب کا عنایت نامہ اور شکایت نامہ آ دھمکا۔ میں نے سوچا کہ خیر اب تو یہ کام ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ صرف یہ کہ فلک پیما کی کتاب پاس نہیں ہے نہ ان کے خطوط ہیں اور نہ دل ہی بلکہ اب یہاں (مری) سے جانے میں دو روز رہ گئے ہیں سیکڑوں کام نبٹانے ہیں بیسیوں قسم کی تیاریاں کرنی ہیں ان میں تحریر بھی ہو گی تعطل بھی آئے گا یہ خیال کر کے کہ کاغذ پر کچھ لکھنا چاہیے اس رنگ میں کیوں بھنگ ڈالوں۔ پھر ذرا یہ خیال اور صرف چار سطر کا ایک معذرت نامہ طفیل صاحب کو لکھ دوں کہ قصہ ختم ہو جائے۔

مدیر نقوش کے بھیجے اور مطبوعہ خطوط دونوں پر پھر ایک نظر ڈالی۔ لکھا تھا "میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے فلک پیما پر مضمون لکھ دیں کہ بحیثیت انسان کیسے تھے اور ہیں اور ان میں کیا کیا خوبیاں اور کمزوریاں تھیں یا ہیں۔ ادبی کارناموں پر بحث مقصود نہیں ہے۔" یہ پڑھتے ہی دل نے مجبور کیا کہ اٹھوں اور ابھی میز پر بیٹھ کر کچھ لکھ ڈالوں خواہ وہ چند کلمات یا ایک آدھ ما صفحہ ہی کیوں نہ ہو "دھکوٹ کھنڈ"!

مجھے عزیز کس طرح عزیز تھے اور کیوں اس سادی کہانی کو بیان کرنے کی نہ یہ جگہ ہے نہ اس کی فرصت ہے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ میرے والد محترم جسٹس میاں شاہ دین ہمایوں کے "ہم عصر" اور دوست بھی تھے اور میرے بھی۔ وہ ان کے "ہم عمر" بھی تھے اور میرے بھی بلکہ وہ تو میری بڑی بیٹی رفعت کے ہم عمر بھی تھے مجھ سے زیادہ۔ وہ بڑوں سے سنجیدہ باتوں میں نوجوانوں سے ہنسی مذاق میں اور بچوں سے کھیل کود میں محو ہو سکتے تھے۔ ان کی شخصیت متنوع اور انوکھی تھی۔ اپنی بچی کی اور پچھلی عمر میں وہ صاحب لوگ معلوم ہوتے تھے۔ فیشن ایبل سوٹ بہترین ٹائی ریشمیں رومال جیب سے نکالے بڑے بانکے معلوم ہوتے تھے۔ انہیں مذاق مشاغل اور ایک چھوٹے سے حلقے میں یہ سب کچھ لیکن پھر بھی — DECENCY (پاکیزہ مزاجی) کی تصویر تھے۔ بڑے آزاد خیال کٹر سے مسلمان اپنے مخصوص دائرے میں لیکن بر خلاف انفرادی پر مصر لیکن فلق نیم غش اور پہلے یورپ کے سوسائٹی لوں کی وضع۔ وہ ایشیا والوں کی اس کور ذوقی پر نالاں تھے کہ یہ خوشی کو جہاں دیکھتے ہیں مٹاتے ہیں مسلمانوں کی اس کوتاہ اندیشی پر رنجیدہ تھے کہ یہ پرہیزگاری کا جامہ پہن کر اپنے خدا کی وسیع دنیا میں ان کی قدم قدم پر بکھری ہوئی اور کھلکھلاتی ہوئی مسرتوں اور خوبصورتیوں کا خون کرتے ہیں اور اسے روحانی قربانی کا نام دیتے ہیں۔ فلک پیما کا پیغام یہ تھا اور اسی پر اپنی پختہ سالی میں ان کا عمل تھا کہ زہد و اتقا سے علیحدہ ہو کر حسن دیکھا جائے اور بحث مباحثے سے کنارہ کر کے اپنے چھوٹے چھوٹے معاشرتی حلقوں میں کائنات کی بڑی سے بڑی خوبیوں اور خوشیوں کو ایک دوسرے میں دیکھو اور دکھاؤ۔ زندگی کا ایک یہی پہلو ہے اور وہ پہلو روشن ہے۔ ایک تاریک پہلو بھی ضرور ہے لیکن وہ موت ہے زندگی نہیں!

ایک دفعہ مجھے اپنے ایک خط میں لکھا کہ "بیٹی! مجھے جتنا رنج زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی میں اور زیادہ ہنستا ہوں۔" میں نے ان کی زندگی کو اس خیال کی تصویر پایا جیتی جاگتی بڑھتی چلتی تصویر۔ اکثر اپنی غم پسندی میں مجھے ان کا یہ فقرہ یاد آ گیا اور اس سے نہ صرف میری افسردگی بند ہوئی بلکہ میں بھی بے اختیار ہنس دیا اور اپنے افکار کو بھول گیا۔

اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ فلک پیما ایک عیش پسند اور تنعّم پرست آدمی تھے۔ بطور ایک مال کے اعلیٰ ترین افسر کے بطور ایک رکنِ اسمبلی کے بطور ایک طالب علم فلسفی کے وہ بے حد مصروف اور محنتی اور جفاکش تھے۔ اپنے پچھترویں سال میں عمر کے آخری دنوں تک وہ روزانہ آٹھ دس گھنٹے کام کرتے رہے اور کام سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ یوں وہ ٹینس کے خاصے کھلاڑی تھے "برج" کے خاصے ماہر تھے، لاہور شہر کے اندر جا کر پوری کچوری اور حلوہ کھانے کھلانے کے مشتاق تھے، وہ اس طرح طرح کی باتوں سے لطف اٹھاتے تھے لیکن دراصل ان کی عمر سنجیدہ، باوقار اور متین کاموں میں گزری۔ مگر ایک بڑی بات یہ تھی کہ اکثر دوسرے پڑھے اور مشہور آدمیوں کی طرح جو ایسے کاموں میں مصروف رہتے ہیں ان کاموں کی سنجیدگی اور متانت نے کبھی ان کے دل و دماغ پر قبضہ نہیں کیا وہ کبھی سنجیدگی اور متانت اور عقلمندی کے غلام نہ ہوئے بلکہ انہوں نے ان سے بھی زندگی کی خوشی کا کام لیا۔ خوشی جو بیک وقت سادہ اور اعلیٰ پایہ کی تھی!

باغِ جناح (لاہور) میں سینکڑوں بار وہ اور میں مل کر گھومے اور اکثر میں نے کائنات اور زندگی کے فلسفے کی گفتگو چھیڑی۔ میں چاہتا تھا کہ مجھ سا فلسفہ ناشناس ان سے ماہرِ فلسفہ سے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہے۔ وہ مجھے اپنی مطالعہ کی ہوئی کتابوں کا خلاصہ بتا کر مجھے اپنے علم سے مالامال کرتے رہے۔ بعض دفعہ دیر تک میں سوال جواب کرتا جاتا آخر یک لخت ہنس کر وہ کہہ دیتے "بھئی بشیر دیکھو تو یہ پھول کتنا بے فکر ہے اور کیسی لطیف ہوا چل رہی ہے یا بس چھوڑو بھی اس فلسفے کو!"

ہمایوں جاری ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ کچھ لکھیے۔ کہنے لگے دیکھو میری مضمون نویسی کا زمانہ گزر چکا۔ میں اب بھی خوب لکھ سکتا ہوں اور لکھوں گا لیکن میں مضمون نگار نہیں بننا چاہتا نہ مصنف بننا یا مشہور ہونا چاہتا ہوں، مجھ سے میری آزادی نہ چھینو لیکن محبت سے آزادی سے جو کچھ میں لکھوں گا صرف تمہارے لئے اور ہمایوں کے لئے لکھوں گا اور گمنام رہ کر لکھوں گا۔ میں نے اس شرط کو منظور کر لیا۔ برسوں کے بعد جب یہ راز فاش ہوا اور فلک پیما کی نقاب کشائی ہوئی تو اور لوگوں کے تقاضے بھی بڑھے کہ ہمارے لئے بھی کچھ لکھئے تو یا انکار کیا یا پھر مجھ سے اجازت طلب کی جیسے میں نے فلک پیما کو اپنے لئے Patent (مخصوص) کر رکھا ہو۔ میں حیران ہوتا اور کہتا کہ جیسے آپ کی مرضی۔ وہ کہتے کہ نہیں میں ہمایوں کی محبت کا آزاد غلام ہوں، میں محبت کے لئے لکھتا ہوں کیونکہ میں محبت کے لئے جیتا ہوں۔ ہزاروں باتیں اور ہیں لیکن میں کیا کیا لکھوں اور کس طرح لکھوں نہ فرصت ہے نہ ہمت۔ غنیمت ہے کہ اتنی دیر ہی فلک پیما سے آزاد خیال اور آزاد دل دوست کی بابت کچھ لکھ دیا تا اس سے کئی بندشوں سے آزادی دل کی اور زندگی کی ذرا سی جھلک دیکھ لی!

؎ اس مضمون میں میں نے فلک پیما کے ادبی کارنامے پر نظر ڈالی۔ لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ وہ "اردو کے برنارڈ شا" تھے جنہیں اب تک بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے اور جن کی قدر حقہٗ ابھی تک نہیں ہوئی!

مالک رام

مختار الدین احمد

یہ میرا قاہرہ میں دوسرا دن تھا۔

برابر کے کمرے میں میرے دوست رشاد عبدالمطلب ٹیلیفون پر کسی سے بلند آواز میں بحث و مباحثہ میں مصروف تھے اور عامی لہجے میں عربی بول رہے تھے۔ میں مالک رام صاحب سے ٹیلیفون پر بات کرنی چاہتا تھا جو اسکندریہ میں مقیم تھے۔ کئی نمبر غلط مل چکے تھے، کوئی روئی اور سیمنٹ کا بیوپاری تھا، کوئی [illegible] کی تجارت کرتا تھا۔ ایک صاحب محامی (وکیل) نکلے اور بڑے اخلاق اور شفقت سے انہوں نے گفتگو شروع کی لیکن صحیح حال معلوم ہوتے ہی انہوں نے نجات [illegible] ریسیور رکھ دیا۔ اب جو نمبر ملا تھا تو کوئی اٹھاتا ہی نہ تھا۔ آپریٹر کہہ رہا تھا گھنٹی بج رہی ہے لیکن کوئی ریسیور ہی نہیں اٹھاتا۔ دفتر بند ہوگا، رشاد کہتے تھے۔ آج دفتر کیسے بند ہوگا، تم نے اب کی بھی نمبر غلط دیا ہے۔ آخر قاہرہ میں ایک صاحب سے رجوع کیا گیا۔ ان سے مالک رام صاحب کے گھر کا نمبر معلوم ہوا۔ دوسرے ہی لمحے ٹیلیفون کے دوسرے سرے پر مالک رام صاحب مجھ سے گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے پہلی مرتبہ ان کی آواز سنی۔ نرم اور دلکش لہجے میں انہوں نے میری آمد پر اظہارِ مسرت کیا اور دوسرے دن اسکندریہ فوراً پہنچو۔

دوسرے دن میں نے قاہرہ سے اسکندریہ کا ٹکٹ لیا، پلیٹ فارم پر کچھ مصری اخبارات و رسائل لئے اور ایک ڈبے میں جا بیٹھا۔ [illegible] کے ریگستان کا سینہ چاک کرتی ہوئی ٹرین اسکندریہ سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میں ہم سفروں سے گفتگو کرتا، اخبار رسالے پڑھتا، کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھتا اور تصور میں مالک رام صاحب کے خصائل و عادات کی بابت سوچتا اور تصویریں بناتا رہا۔

ٹرین اسکندریہ پہنچی تو پلیٹ فارم پر درمیانی قد کے ایک وجیہ آدمی عینک لگائے کھڑے تھے، یہ مالک رام تھے۔ مصافحے معانقے کے بعد ہم لوگ ان کے فلیٹ کی طرف چلے جو اسٹیشن کے پاس ہی تھا۔ اسی شام اسکندریہ کے [illegible] کا ایک جلسہ تھا اور ان کے ایک دوست نے بہت سے لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ مالک رام اپنے [illegible] سمیت وہاں موجود تھے۔ سامان رکھ کر شہر کی سیر کرتے ہوئے اور اسکندریہ اور مصر کی عمومی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم لوگ وائی ایم سی اے کے دفتر پہنچے۔ مباحثہ وغیرہ میں تو انہوں نے کچھ حصہ نہ لیا بلکہ خاموش تماشائی کی طرح تقریریں سنتے رہے۔ لیکن دیر تقریروں کے بعد اور چائے کے [illegible] سے معلوم ہوا کہ وہ یہاں بہت ہر دلعزیز ہیں اور مصری سوسائٹی میں انہوں نے اچھی خاصی جگہ بنا لی ہے۔

ڈنر کے دو لطیفے یاد آتے ہیں۔ دعوت میں قبطی، عیسائی، یہودی سبھی تھے لیکن بیشتر تعداد مسلمانوں کی تھی۔ مالک رام کے ساتھ مشروبات خاص کا سلسلہ یہی

تھا۔ میزبان بڑے اخلاق سے ہر میز پر جا کر مہمانوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ وہ جب ہماری میز پر پہنچے تو مالک رام صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے: "آپ بھی کچھ پیجیے"۔ انہوں نے کہا "شکریہ! لیکن میں کچھ بھی نہیں پیتا۔"

میں نے دعوت کے بعد ان سے کہا اگر آپ کے میزبانوں کا اخلاق یہی رہا تو آپ کسی نہ کسی دن ضرور بگڑ جائیں گے۔

مصر میں لوگ دیا سلائی کی ایک تیلی سے تین آدمیوں کی سگریٹ سلگانا نحوست تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پھر آئندہ یہ تینوں ایک جگہ جمع نہ ہو سکیں گے۔ میں نے کھانے کے بعد سگریٹ نکالی اور اپنی میز کے اصحاب کو پیش کی۔ ان کی تعداد بشمول راوی چار تھی۔ میں نے ان سبھوں کی سگریٹیں سلگانی شروع کیں۔ اب تیسرے صاحب کی باری آئی تھی۔ مالک رام صاحب اور وہ میں ہاں ہاں کہتے رہے۔ میں کچھ نہ سمجھا۔ مصری دوستوں نے بھی شاید میری دل شکنی پسند نہ کی۔ سگریٹ سلگ چکی تھی۔ یہ اب پہنچا تو معلوم ہوا یہ بھی گزشتہ اتفاق ہے۔ ہم تینوں ہی ہم کشتی ہیں، مصریوں سے بچھڑ رہے ہیں۔

دعوت کے بعد ہم لوگ گھر پہنچے۔ یہاں پہلے تو بچوں سے ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ انگریزی تو جانتے ہی ہیں عربی بھی خوب بولتے ہیں۔ پھر مالک رام صاحب کے مطالعہ کے کمرے میں آ گئے۔ یہ مضامین اور کتابیں ہی نہیں لکھا کرتے بلکہ انہیں مختلف پڑھنے کے کمرے کو کتاب خانہ بنانے کا بڑا شوق ہے۔ اپنے پیسے خرچ کر کے پر انہوں نے پتا نہیں کہاں کہاں سے کس کس طرح کی کتابیں جمع کر رکھی ہیں۔ اس رات میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انہوں نے سفر کی حالت میں ہندوستان سے دور رہ کر اردو، فارسی اور عربی کا بہترین ذخیرہ اور بیش قیمت نفیس کتب خانہ جمع کر لیا ہے۔ غالب کے سلسلے کی شاید ہی کوئی تصنیف ہو جو ان کے پاس نہ ہو۔ اردو زبان کے شاعروں کے تذکرے بھی جس قدر ان کے پاس ہیں کسی کے پاس کم دیکھنے میں آئے۔ انہیں دو تین تذکروں کا پتہ چلا جو انگلستان میں تھے، فوراً ایک سو پونڈ خرچ کر کے ان کے عکس منگا لیے۔ کتابوں کی خرید اور نقل و عکس میں اچھی خاصی رقم خرچ کرتے رہتے ہیں۔ دوستوں کو کئی دن فرمائشیں کرتے رہتے ہیں کہ یہ کتاب مجھ کو وہ رسالہ تلاش کر دو۔ قیمتیں فوراً چکا دیتے ہیں۔ کسی نے اگر ایک آدھ کتاب دے دی تو بس نذر کر دی اور قیمت نہ لی تو زیر بار احسان ہو جاتے ہیں۔ ایک صاحب سے انہوں نے ایک کتاب خرید کر بھیجنے کی فرمائش کی۔ انہوں نے وہ کتاب حاصل کر کے ان کی نذر کر دی۔ انہیں ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "ہاں میں آپ کا شکریہ ادا کرنا بھول گیا۔ مجھے آپ کا مرسلہ نسخہ "لکھنؤ کا دبستان شاعری" ملا۔ زحمت کے لئے ممنون ہوں لیکن آپ نے یہ کیا مذاق شروع کر رکھا ہے کہ جو کتاب منگاتا ہوں آپ اس پر "اپنے مخدوم اور بزرگ" کا نام لکھ کر ڈاک میں ڈال دیتے ہیں ——— آپ کی یہ روش مجھے آئندہ آپ کو زحمت دینے میں مانع ہوگی۔"

وہ اپنے دارالمطالعہ میں بیٹھے کوئی رات کے ایک بجے تک کتابیں دکھاتے رہے اور ادب کی باتیں کرتے رہے۔ دوسرے دن صبح کی چائے پی کر ایک دو اصحاب سے ملاقات کرائی۔ دار المعارف میں ہم لوگ تازہ مطبوعات دیکھتے رہے۔ کتابوں کا ایک پشتارہ ساتھ آیا۔ طے یہ ہوا کہ کتابیں میں اپنے ساتھ لکھنؤ ہوتے جاؤں، قیمتیں وہ میری طرف سے بعد میں چکاتے رہیں گے۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ دفتری جھمیلوں اور عجیب قسم کی غیر ادبی مصروفیات کے باوجود اتنا وقت ادبی و علمی مضامین لکھنے کے لئے کس طرح نکال لیتے ہیں۔ وہ ذکر غالب پر نظر ثانی و اضافہ کر رہے تھے۔ امام احمد بن حنبل پر ایک مفصل اور جامع کتاب لکھنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ بعض مضامین اور کتابوں کے خاکوں کا خیال ان کا دماغ لئے رہتا تھا۔ پھر بھی جب میں نے غالب کے سلسلے میں اپنے زیر ترتیب مجموعے "گنجینۂ غالب" کے لئے بعض موضوعات کا انتخاب ان کے لئے کیا تو وہ بلا تکلف ان پر مضامین لکھنے کو تیار ہو گئے اور انہوں نے جلد ہی اپنا وعدہ پورا بھی کر دیا۔

چند روز گھنٹے ساتھ گزارنے کے بعد جب ان سے رخصت ہوا تو ایسا محسوس ہوا جیسے ہم لوگ برسوں سے ایک دوسرے سے واقف ہیں۔

مالک رام صاحب سے میری یہ ملاقات جولائی ۱۹۵۸ء کو ہوئی لیکن ان سے میرے تعلقات پہلے سے تھے۔ مجھے اور میں ان سے واقف تو بہت عرصے

سے تھا۔ ملک صاحب سے پہلی مرتبہ میں نے نیرنگ خیال کے اقبال نمبر میں ان کی تصویر دیکھی اور ان کا ترجمہ کیا ہوا ایک مضمون دیکھا جو چغتائی مرحوم کا لکھا ہوا تھا۔ مضمون بجائے خود اچھی چیز تھی اور ملک رام دونوں کا رعب مجھ پر بیٹھ گیا۔ جوں جوں عمر اور سمجھ بڑھتی گئی چغتائی مرحوم سے عقیدت میں کمی آتی گئی لیکن ملک رام کی تحریروں میں دل چسپی روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

ان سے تعلقات کا آغاز ۱۹۴۸ء میں ہوا جب میں علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر کی ترتیب میں مصروف تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ غالبیات کے جملہ ماہروں کو اس نمبر کے لئے لکھنے کی دعوت دوں۔ ملک رام صاحب کی خدمت میں مجھے نیاز حاصل نہ تھا، نہ ان کی افتاد طبیعت کے متعلق کوئی اندازہ تھا۔ خدا بھلا کرے امتیاز علی عرشی صاحب کا، انہوں نے یہ مشکل آسان کر دی۔ میرا ان سے غائبانہ تعارف کرایا اور مضمون لکھنے کی سفارش کی۔ بعض مضمون نگاروں کی طرح نہ تو انہوں نے عدیم الفرصتی کا شکوہ کیا نہ ٹال مٹول کی کوشش کی اور نہ پیشہ ور شاعروں کی طرح مصروفیات، "نزلہ زکام" اور دوسرے افکار کا ذکر ضروری سمجھا۔ ان کا فوراً خط آیا کہ "میں مضمون ضرور لکھوں گا" اور انہوں نے بہت جلد مضمون بھیج کر اپنا وعدہ پورا کیا۔

وہ کئی زبانیں جانتے ہیں۔ اردو، فارسی، انگریزی اور پنجابی سے تو وہ اچھی طرح واقف ہیں ہی۔ عربی سے ان کی دلچسپی قدیم ہے۔ پھر اسلامی ممالک میں طویل قیام کے باعث ان کا مطالعہ اور بھی وسیع ہو گیا ہے۔ وہیں انہیں فرانسیسی سیکھنے کا بھی موقع ملا۔ اور تعجب نہیں یورپ کی کسی اور زبان سے بھی واقف ہوں۔

ان کا ذوق ہمہ گیر قسم کا ہے۔ غالباً وہ اسپیشلائزیشن (تخصص) کے کچھ قائل نہیں —— یوں بھی انہیں صرف ایک چیز پر ہمیشہ جمے رہنا مرغوب نہیں۔ طرح طرح کے موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں۔ کبھی فتوح البلدان کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ کبھی سلیمان تاجر کا سفرنامہ ہند و چین اردو میں منتقل کر رہے ہیں۔ کبھی غالب کے ذکر و اذکار کا مشغلہ ہے، کبھی حدیث اور اسلامی تعلیم کے موضوع پر مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ ایک زمانے میں فارسی کے سارے قصیدہ گویوں کا کلام جمع کر رہے تھے۔ پھر خیال آیا کہ تلامذۂ غالب کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھ رہے ہیں۔ ایک بار انہوں نے اطلاع دی کہ محمد اقبال کے متعلق ایک کتاب زیر ترتیب ہے جس میں ان کے آئین ہیں تو انہیں بھی ترجمہ کر کے شامل کر رہے ہیں۔ پھر سنا کہ افلاطون کی تمام تحریروں کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے لکھا ہے کہ گارساں دتاسی کی تاریخ ادب ہندی و ہندوستانی کے ضخیم مجلدات کا ترجمہ اردو میں کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے انہیں مضمون لکھتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن یہ خیال ہے کہ انہیں اپنے افکار دماغ سے کاغذ تک منتقل کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ ان کی زبان ستھری، بے عیب اور رواں ہوتی ہے۔ وہ اپنے مضامین میں ترتیب کا لحاظ رکھتے ہیں اور اسے دلچسپ بھی بنا دیتے ہیں۔ حسب حال لکھتے ہیں۔ وہ پہلے ہر مضمون کی ابتدا دلی کے مرثیے اور سلطنت مغلیہ کے جھلملاتے ہوئے چراغ سے نہیں کرتے۔ وہ مضامین جو انہوں نے مختلف شخصیتوں پر لکھے ہیں بہت دلچسپ ہیں اور ان مضامین میں طرز تحریر بہت شگفتہ ہے۔ سائل دہلوی اور کیفی پر ان کے مضامین اچھے ہیں لیکن نواب صدر یار جنگ پر جو مضمون انہوں نے لکھا ہے وہ سب سے بہتر ہے۔

آدمی بڑے وضع دار ہیں اور قدیم روایات کے دلدادہ۔ بڑے مروت والے ہیں۔ علمی کام ہوں یا دوسرے جہاں تک ان سے ممکن ہو سکتا ہے وہ دوسروں کو مدد دینے کو تیار رہتے ہیں۔ جب بھی انہیں کسی کتاب یا کسی مخطوطے کے عکس کے لئے لکھا، ہمیشہ مستعد نظر آئے۔ بعض مرتبہ عکس بھی بھجوائے اور قیمت بھی نہ لی۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کو جوالیقی کی المعرب کی ضرورت تھی۔ یہاں بہت تلاش کی۔ متعدد اصحاب کو لکھا۔ کتاب نہ ملی۔ میں نے ملک رام صاحب کو لکھا کہ کتاب چھپ کر غالباً بازار سے نایاب ہو گئی تھی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک نسخہ نکالا اور ڈاکٹر صدیقی کی نذر کیا۔ صدیقی صاحب سے ان کے تعلقات کی ابتدا غالباً یہیں سے ہوئی ہے۔ کتابیں آج کل ہیں ہی مہنگی، وہ ضرورت اور اہمیت کا خیال کر کے کبھی کبھی ایک بڑی رقم خرچ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایک صاحب کو کچھ روپوں کی ضرورت تھی۔ انہیں اطلاع ہوئی تو فوراً روپیہ بھجوا دیے اور لکھا کہ تعلیم کی تکمیل ضروری ہے، واپسی کی فکر نہ کیجئے، چاہے واپس کیجئے یا نہ کیجئے۔

یہی نرمی اور مروت کہیں کہیں ان کے تحقیقی مضامین میں بھی جھلکتی ہے۔ مجھے کبھی کبھی ان کی تحقیق پر ان کی فطری نرمی اور وضعداری غالب آجاتی ہے۔ یہ

اپنے پسندیدہ مصنفین کو صحیح رنگ اور اصلی خد و خال ہی میں نہیں دیکھتے بلکہ ان کی کمیوں اور خامیوں پر بھی نگاہ رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے علی گڑھ میگزین میں غالب سے متعلق ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "کاش کہ ...... غالب کی بابت گرفتاری سے متعلق نہ لکھتے۔ آخر انہیں یہ مضمون لکھنے سے کیا مل گیا؟ — میں خطائے بزرگاں گرفتن خطاست کا قائل نہیں ہوں لیکن گلہ و بے وقت سے فائدہ؟ اگر اس سے ہمارے علم میں یا معلومات میں کچھ اضافہ ہوتا ہو تو ایک عذر بھی ہے ورنہ پردہ پوشی سے کام لینا خداوند کریم کی صفت ستاری و غفاری کا تقاضا ہے۔"

غالب تو خیر ان کا خاص موضوع ہے ویسے بھی جن موضوعات پر وہ مضامین لکھتے ہیں ان پر ان کی اچھی خاصی گرفت ہوتی ہے اور وہ موضوع کے حدود سے بہت اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ اگر ان سے کسی مسئلہ پر اختلاف کیا گیا تو انہوں نے کبھی برا نہ مانا، توجہ سے سنا اور اگر انہوں نے ضروری سمجھا تو اپنی رائے میں تبدیلی بھی کر دی۔

ذکر غالب کے دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ انہوں نے قاضی عبدالودود صاحب کو بھیجا اور ان سے خواہش ظاہر کی اس پر بے لاگ تبصرہ لکھیں۔ ایک طویل تبصرہ معاصر میں شائع ہوا۔ تبصرہ اچھا خاصا سخت تھا لیکن اس کے بعد بھی ان دونوں کے تعلقات زیادہ بڑھے۔ اسی طرح غالب نمبر میں جب ان کا مضمون غالب کے خصائل و عادات پر شائع ہوا تو قاضی صاحب نے بعض امور سے اختلاف کیا۔ میں نے یہ باتیں انہیں لکھ بھیجیں۔ بعض باتوں پر وہ متفق نہ ہو سکے لیکن بعض غلطیاں انہوں نے فوراً مان لیں اور ان کی تصحیح کر دی۔

زندگی میں نفاست اور سلیقے کے بے حد قائل ہیں۔ یہ صفت ان کی زندگی کے تقریباً سارے پہلوؤں میں کارفرما نظر آئے گی۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں، صاف ستھرے مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے ملنے کا کمرہ، مطالعے کا کمرہ، سونے کا کمرہ گرد و غبار سے آپ آلودہ کبھی نہیں پائیں گے۔ بہت اچھے کاغذ پر مضامین اور خطوط لکھتے ہیں۔ قلم، سیاہی ساری چیزیں اچھی ہونی چاہئیں۔ اپنی کتابیں اور مضامین صاف ستھرے طور پر چھپواتے ہیں۔ دوسروں کی مطبوعات بھی اسی طرح صاف ستھری دیکھنی چاہتے ہیں۔ علی گڑھ میگزین غالب نمبر کے مطالعے کے بعد انہوں نے مجھے لکھا:

> "غالب نمبر کچھ ہفتے ہوئے موصول ہوا، شکریہ۔ لیکن یہ آپ نے کیا کیا؟ ایسا گھٹیا اور ایسا ردی کاغذ! یہ ٹھیک ہے کہ معشوق بہر حال معشوق ہے لیکن اگر اس کا لباس اس کی شان کے مطابق نہ ہو تو بے لطفی ضرور ہو جاتی ہے۔ یہی بات اس نمبر پر صادق آتی ہے۔ اتنی محنت سے مضمون جمع کیجئے، اتنا خرچ کیا اور ایسا گھٹیا کاغذ۔ سارا مزا کرکرا کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے کچھ نسخے نسبتاً اچھے کاغذ پر بھی شائع کیے ہوں گے۔ اگر میرا گمان صحیح ہو تو ایک نسخہ اس کا مرحمت ہو۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

> "کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔ دونوں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے حیرت ہوتی ہے۔ پھر کتابت میں یکسانی بھی نہیں رہ سکی۔ رنگدار بلاک، الامان والحفیظ۔ سب مخدوش ہو گئے۔ انہیں پڑھنا کتنا محال ہے۔ یہ آپ کو سوجھی کیا! آخر انہیں سرخ رنگ میں چھاپنے سے فائدہ ہی کیا تھا۔ جتنے بلاک کالی روشنائی میں چھپے ہیں بالکل معقول اور روشن ہیں۔ ایسے ہی دوسرے بھی چھاپ دیے ہوتے۔"

اپنا مضمون "کلامِ غالب" رسالہ اردو ادب میں دیکھ کر لکھتے ہیں:

> "اردو ادب کے دونوں پرچے اور میرے مضمون کی دوسری قسط کے دس نسخے موصول ہوئے۔ دلی شکریہ لیجئے

کر دی جاتی ہے۔ اتنی غلطیاں کتابت کی وہ ختم ہو [illegible] ستم ظریفی کہ نیرنگ خیال میں سے مضمون الٹ پلٹ ہو گیا۔"

مضامین کی اشاعت میں صحت کا بڑا اہتمام رکھتے ہیں:

"مجھے اپنے مضمون سے متعلق دو باتیں یاد آگئیں۔ [illegible] ایام کے حالات میں ایک جگہ میں نے لفظ سانس کا استعمال کیا ہے۔ مجھے اس کی تذکیر و تانیث میں کچھ شبہ سا ہے ...... اگر میں نے مذکر لکھا ہے تو رہنے دیجئے۔ دوسری ایک جگہ مرزا کی زبان سے کہا گیا ہے، "کوئی ڈھب کا مکان نہیں ملا تھا" یہاں ڈھب کی جگہ ڈھنگ بنا دیا جائے۔ اگر کاپی مطبع میں نہیں گئی ہے تو یہ مشکل نہیں ہوگا۔ اگر جا چکی ہو تو پروف پر یہ تبدیلی کرا دیں۔ اگرچہ ڈھب بھی غلط نہیں لیکن ڈھنگ زیادہ فصیح ہوگا۔ یہ دونوں باتیں ضرور دیکھ لیں۔"

ایک ہفتہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ ان کا دوسرا خط اسی موضوع پر ملا:

"میں نے اپنے پچھلے خط میں اپنے مضمون سے متعلق دو باتیں لکھی تھیں۔ پہلی یہ کہ سانس کو مذکر رہنے دیں۔ اب گزارش ہے کہ اسے مؤنث بنا دیں یعنی "سانس پھول گئی" بنا دیں۔ میں ان باتوں میں لکھنوی محاورے کو ترجیح دیتا ہوں اور لکھنؤ میں سانس مؤنث ہی ہے اس لئے اسے مؤنث بنا دیں۔

دوسرے ڈھب کی جگہ ڈھنگ کر دیا جائے۔ امید ہے آپ نے یہ کر دیا ہوگا۔ مہربانی کر کے آپ بھی میری طرح تساہل سے کام نہ لیں گے۔"

جب ان کا مضمون پہنچا تھا تو کچھ ہدایتیں بھی کہ کتابت پر خاص توجہ ہو۔ غالب کی فارسی غزل کو کلیات میں سے دیکھ لیا جائے۔ مضمون کسی جگہ سے شروع نہ کیا جائے، جیسے ۹ [illegible] وغیرہ مقصود یہ کہ [illegible] مضمون کی [illegible] کاپیاں علیحدہ نکلوا لی جائیں۔ کاتب لفظوں کو ملا کے نہ لکھے، جیسے "اسے" "انکو"۔ یہ لفظ الگ لکھے جائیں: "اس لئے" "آج کل" "ان کو" وغیرہ۔

خط و کتابت میں باقاعدگی پر بہت زور دیتے ہیں۔ جواب میں تاخیر ہوتی تو غضب ہوتا ہے:

"ایک درخواست کرتا ہوں کہ خطوں میں زیادہ باقاعدگی کو اپنا شعار بنائیں۔ مجھے اس سے زیادہ دقت کسی بات سے نہیں ہوتی کہ لوگ خطوں کے جواب نہ دیں۔"

ایک مرتبہ ان کے خط کے جواب میں مجھ سے تاخیر ہوئی۔ انہوں نے فوراً لکھا:

"میں نے اتنے دن آپ کو خط نہیں لکھا اس کی دو وجہیں تھیں، اول تو یہ کہ میں اپنے خطوں ... کی رسید کے انتظار میں رہا، دوسرے یہ کہ میں نے خیال کیا کہ میرا خط کہیں باعث ملال نہ ہو۔ جب کوئی مجھے خط نہیں لکھتا یا میرے خط کا جواب نہیں دیتا تو غلط یا صحیح مجھے یہ خیال گزرتا ہے کہ میں خواہ مخواہ مخل و مصروفیت کا باعث ہوا۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"بھائی! آج یہاں عید ہے اس لئے عید مبارک کہتا ہوں۔ آپ کے یہاں تو غالباً کل ہو گی۔ یار شاطر ہوں بار خاطر نہیں بننا چاہتا۔ آپ نے اتنے دن خط نہیں لکھا، یہ بے محل صحبت ہونا پسند نہ کیا۔"

خط کثرت سے لکھتے ہیں اور بڑے شگفتہ انداز میں۔ چند ٹکڑے دیکھئے:

"اب سنیئے معید۔ آپ نے لفافے پر آخری خط پر پتہ لکھا، عربی میں [illegible] اور [illegible] تک۔ آپ کے یہاں ڈاک خانہ والے کچھ زیادہ [illegible] گیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی افسر اعلیٰ سے استصواب

کیا گیا۔ اس اللہ کے بندے نے اس پر لکھ دیا Try Basrah یعنی بصرہ بھیج کے دیکھو۔ وہ غالباً بصرہ کو بغداد سمجھے ہوں گے چنانچہ خط بغداد پہنچ گیا۔ وہاں خیر سے زبان ہی عربی ہے اس لئے وہاں والوں نے اُسے یہاں بھیج دیا۔ یہ وجہ ہوئی تاخیر کی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ ریسرچ کریں تو یہ حضرت اسی قوم ساق کے اخلاف میں سے ہوں گے جنہوں نے قبلۂ نیا ذکستان "گلستان" پڑھ کر غالب کو کالی کی فہرست میں داخل کر دیا تھا۔ بہر خیریت اسی میں ہے کہ آئندہ ہمیشہ پتا انگریزی میں لکھا جائے۔"

اس اطلاع پر کہ میں پھر مصر کیلئے مڈل ایسٹ آ رہا ہوں ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "ہائے کاش کہ آپ میری موجودگی میں یہاں آتے تو چند روز مزے سے گزرتی۔ لیکن آپ نے آنے کا فیصلہ جب کیا ہے کہ یہاں چل چلاؤ کے سامان ہو رہے ہیں۔ اسکندریہ کے دس سالہ قیام کے بعد قاہرہ جانا ایسا ہی ہے جیسے کسی نے کہا تھا "پیچھے ہی پیچھے بنارس ہی"۔ قیام کے خرچ سے متعلق کیا کہوں۔ میرے خیال میں دو ڈھائی سو روپے ماہانہ میں اچھا خاصا خرچ چل سکتا ہے بشرطیکہ آپ قیمتی کتابیں خریدنا شروع کر دیں کیونکہ جو دو ڈھائی ہزار بھی کفایت نہیں کرنے کے۔ اگر آپ فیصلہ کریں کہ کب تک آنا چاہتے ہیں تو ممکن ہے کہ میں بھی آپ کی سکونت میں کچھ مدد کر سکوں۔ یہاں کچھ بچت ہو جائے گی۔ لیکن آپ کا یہاں آنے سے مقصد کیا ہے۔ اگر دارالکتب اور دوسرے کتب خانوں کی سیر مطلوب ہے تو یہ واقعی معقول بات ہے۔ لیکن اگر آپ چاہیں کہ یہاں آکے کچھ علم حاصل کریں تو مجھے اس کا یقین نہیں۔ کہنے کو عربی یہاں کی زبان ہے لیکن کیسی عربی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ان کی مادری عربی سن کر ہنسیں گے۔ ذکلفاً دوست دلچسپ۔ نہ صرف و نحو۔ الا ماشاءاللہ۔ مجھ سے جتنے عالم و جاہل یہی زبان بولتے ہیں۔ البتہ لکھتے درست نحوی ہی ہیں...... ہاں کتب خانوں کی بات دوسری ہے۔ ایسی ایسی نادر کتابوں کے قلمی نسخے پڑے ہیں کہ دیکھنے سے دل و دماغ روشن ہو جائیں۔ لیکن بہ افسوس ہے کہ ان سے استفادہ کرنے والا کوئی نہیں۔ اگر آپ کو سیر کا شوق ہو تو ضرور آئیے اور جلد!
>
> مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
> آنا ہے جو تم کو آ جاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم"

میری یورپ سے واپسی کے وقت وہ دہلی میں مقیم تھے۔ ان کا خط آیا کہ علی گڑھ جاتے وقت مجھ سے ملتے ہوئے جانا۔ میں نے انہیں راستے ہی سے تار دیا اور دہلی کی آمد کے وقت سے انہیں مطلع کیا ہے۔ میرے جہاز کے پہنچنے سے پہلے وہ دہلی کے ایروڈروم پر موجود تھے۔ جب کسٹم وغیرہ کے جھگڑے نپٹ چکے تو وہ انتظار میں کھڑے رہے۔ گھر پہنچے ملنے کے کمرے میں بیٹھے۔ وہاں تمام کتابیں اور رسالے اٹے پڑے تھے۔ کچھ یورپ کی باتیں ہوئیں کچھ مڈل ایسٹ کا چرچا رہا۔ زیادہ تر وہ میرے علمی کاموں کے متعلق پوچھتے رہے۔ پھر ان اساتذہ کے متعلق جن سے یورپ میں ملنے ملانے کے مواقع ملے۔ پھر ہندوستان سے بات دہلی تک پہنچی۔ شاعرِ انقلاب کی ہجرت "جوش صاحب کی مخالفت" کا ذکر ہوتا رہا۔ پھر ذاکر صاحب سے ملاقات کا حال اور انجمن ترقی اردو کی داستان سناتے رہے۔

کھانے کے بعد ہم لوگ صرف غالب پر گفتگو کرنے بیٹھے اور ہم دونوں نے بیک وقت پوچھنا اور سننا شروع کیا کہ غالب کے متعلق اب تک کیا نئی اطلاعیں ہم لوگوں نے حاصل کی ہیں۔ کیا کیا نئے خطوط اور تحریریں ہم لوگوں نے دیکھی ہیں اور کیا کیا نئی کتابیں مرتب کرنے اور شائع کرنے کے

پر کلام جاتے ہیں۔ معلوم نہیں کتنی رات تک یہ باتیں ہوتی رہیں لیکن اگر دوسرے روز انہیں دفتر اور مجھے علی گڑھ نہ پہنچنا ہوتا تو شاید صبح تک اسی طرح باتیں ہوتی رہتیں۔

صبح سویرے ہی بچیوں نے چائے پلائی۔ ان کی بڑی بیٹی اوشا مجھے یاد تھی لیکن اور بچوں کے نام حافظے میں نہ تھے۔ ایک صاحبزادے آئے سلام کر گئے۔ میں نے نام پوچھا۔ بولے، "اقبال"۔ دوسری صاحب زادی گزریں، آداب بجا لائیں۔ انہوں نے نام بشریٰ بتایا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ مالک رام صاحب بھانپ گئے۔ بولے، "آپ کو کچھ تعجب ہوا ان ناموں پر؟" پھر خود ہی انہوں نے بتایا کہ ان کے یہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوتی تھیں۔ انہوں نے اسی زمانے میں ایک بزرگ کے ملفوظات میں پڑھا کہ لڑکی کا نام صدق نیت سے بشریٰ رکھ دیا جائے تو پھر لڑکی کے بجائے لڑکا پیدا ہوگا۔ انہوں نے اپنی لڑکی کا نام بشریٰ رکھ دیا۔ اس کے بعد ان کے یہاں لڑکا ہی پیدا ہوا جس کا نام انہوں نے اقبال رکھا۔ مالک رام صاحب یہ نسخہ کئی اصحاب کو بتا چکے ہیں اور سب اس کے تیر بہدف ہونے کے قائل ہو گئے ہیں۔

وہ اس زمانے کا بہت دلچسپ لطیفہ سناتے ہیں۔ بیٹے کی پیدائش پر مالک صاحب کی والدہ آئیں۔ بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ پوچھا کیا نام رکھا ہے۔ بولے، "اقبال"۔ انہوں نے کچھ منہ بنایا اور کچھ حیرت کا اظہار کیا۔ کہنے لگیں، "یہ نام تو کچھ مسلمانوں جیسا لگتا ہے"۔ بولے، "اماں جان! آپ نے بھی تو میرا نام کچھ مسلمانوں ہی جیسا رکھا ہے"۔

لطیفہ اس وقت مکمل ہوا جب دہلی میں شاہ ابن سعود آئے۔ جس اسکول میں بشریٰ پڑھتی ہے اس میں بھی انہیں آنا تھا۔ شاہ کو ہار پہنانے کے لئے انہی کا انتخاب ہوا۔ ہار پہناتے وقت انہوں نے نہایت فصیح عربی میں انہیں خوش آمدید کہا۔ شاہ بہت حیران ہوئے۔ اور ان کی حیرت اور مسرت اسی وقت اور بڑھ گئی جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کا تعلق ایک ہندو خاندان سے ہے۔

اگر اردو فارسی اور عربی کی طرف ان کی بڑھتی ہوئی دلچسپی اور مسلمانوں سے دوستی اسی طرح قائم رہی تو وہ دن دور نہیں جب وہ مولوی سندر لال، مولوی مہیش پرشاد کی طرح وہ مولوی مالک رام ہو جائیں گے۔

احسان دانش

محمد وارث کامل

علم و فن کی دشوار گذار راہیں ان شہسواروں کی جولانگاہیں رہی ہیں جو اپنے اسلاف کے نقش قدم پر اس شان سے چلتے ہیں کہ ان کی انفرادیت نے منزل کے کسی موڑ پر بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا —— یہ ہے روسو کے اس مقالہ کا نچوڑ جس پر ۱۷۵۰ء میں ڈیژاں (Academy of Dijon) نے اسے انعام دیا تھا۔ روسو کی نظر میں انفرادیت ہی ایک ایسا جوہر ہے جس کے آئینے میں کسی شخص کی عظمت کے خدو خال نظر آ سکتے ہیں۔ تاریخ کے صفحات پر جن شخصیتوں کے نقوش کچھ ابھرے ہوئے سے دکھائی دیتے ہیں یہ وہی منفرد شخصیتیں ہیں۔ جو زندگی کی تیرہ و تار راہوں میں ہر قدم پر روشنی کے مینار نصب کرتی رہی ہیں۔ ہر دور میں ایسی شخصیتوں کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن کچھ تو زمانے کی قدر ناشناسی کے باعث اور کچھ اس سبب سے کہ قسمت اپنے گنج گراں مایہ کی نمائش کے سلسلے میں کچھ زیادہ فیاض واقع نہیں ہوئی ہے۔ ایسی شخصیتیں جہاں کہیں اور جب کبھی منظر عام پر آئی ہیں تو اتنے پردوں میں لپٹی ہوئی آئی ہیں کہ عوام کی اچٹتی نگاہیں ان شخصیات کے ان خلوت کدوں میں بار نہیں پا سکیں جہاں کمالات کے دفینے گڑے پڑے ہیں۔

آج جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ احسان دانش کی تاریخ ساز شخصیت کا جوہر ہنگامہ خیز جلوتوں کے باوصف راز درون پردہ ہے تو میں کبھی کبھی ششدر رہ جاتا ہوں۔ میری حیرت میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے اس چیز سے کہ آسمان شہرت کے اس کوکب درخشاں کی تابانیوں پر ظلمتوں کے اتنے غلاف چڑھے ہوئے ہیں کہ اس کے حاشیہ نشین بھی اسے عریاں نہیں دیکھ سکے۔ احسان دانش کی پراسرار شخصیت دراصل نتیجہ ہے عوام کے ذوق تجسس میں کمی کا۔

احسان دانش کا المیہ کہ وہ اس دور کا انسان ہے جس دور میں حسن یوسف، عشق مجنوں، صورت و حقیقت، لفظ و معنی اور روح و مادہ ایک ہی بھاؤ سے بکتا ہے اور ایک ہی ترازو میں تولے جاتے ہیں۔ اس دور میں سطح پر تیرتے ہوئے خار و خس کی تو قدر و قیمت ہے لیکن اگر وقعت نہیں تو اس گوہر شب چراغ کی نہیں جس کے دامن میں دریا کا اضطراب بھی محو ہو جاتا ہے۔

احسان دانش کے بارے میں اتنا تو سب جانتے ہیں کہ یہ کاندھلہ (مظفر نگر یوپی) کا ایک شاعر مزدور ہے۔ ایک ایسا شاعر جس نے افلاس کی گود میں آنکھیں کھولیں اور سن ۱۹۱۴ء کی اس جنگ عظیم کے پرآشوب ایام میں سن حیات شروع کیا۔ جس کے شعلے مشرق سے مغرب تک

بھولے سب تھے، یہ وہ زمانہ ہے جب ترکی کے مردِ بیمار پر سکرات کا عالم طاری تھا، اور ہندوستان کا کل مسلمان بیمار تھا جس نے اس ملک کی حفظ و بقا کے لئے دعائیں نہ کی ہوں، دعائیں ایک طرف اس موقعہ پر ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکی کی مالی امداد میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رکھا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی کا یہ شعر اسی دور کی یادگار ہے ؎

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ احسان دانش نے شروع شروع میں اپنی گزر بسر کے لئے زندگی کی ان تند ہی ہوئی پگڈنڈیوں پر بھی قدم رکھا ہے جن کا تصور بھی اپنے اندر کچھ کم ہولناکیاں لئے ہوئے نہیں ہے اس شاعر فقیر نے اینٹیں بھی ڈھوئیں، مزدوری بھی کی، درخت بھی چھانٹے، کھیت بھی جوتے، چپراسی بھی کی اور چوکیداری بھی۔ غرض وہ کون سا کام ہے جو احسان دانش نے نہیں کیا۔ بلند معاشرت مخلوق کو اس چیز کا سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ پستی جو ہر لحظہ بلندی کا دامن اپنے دوش پر اٹھائے ہوئے ہے ایک دن اتنی بلند ہو جائے گی کہ بلندیاں اس کی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکیں گی، اور پھر وہ لوگ جن کا نشیمن معاشرت کی بلندیوں پر رہا ہے یہ کہنے پر مجبور ہوں گے ؎

اُن کی پرواز انہیں تا بہ فلک لے پہنچی
ہم بھی سوچ رہے ہیں کہ خیال اچھا ہے

ادبی دنیا احسان دانش سے متعارف ہے لیکن اس تعارف کا مدار صرف یہ ہے کہ احسان دانش کا شمار صفِ اوّل کے شعراء میں ہوتا ہے، نظم و نثر میں اس کی جو تخلیقات ہیں انہیں قبولِ عام کی سند مل چکی ہے۔ نوائے کارگر، چراغاں، آتشِ خاموش، جادۂ نو، زخم و مرہم، مقامات، گورستان، تفسیرِ فطرت، شیرازہ نظم میں لغات الاصلاح، دستورِ اردو، خضرِ عروض، روشنیاں اور طبقات نثر میں احسان کے وہ ادبی کارنامے ہیں جن کی بدولت برصغیر ہند و پاک کے طول و عرض میں اس کا طوطی بول رہا ہے۔ ترقی پسند شعراء انہیں اپنی برادری کا شاعر سمجھتے ہیں اور یہ اس لئے کہ احسان دانش نے اپنی اکثر و بیشتر نظموں میں سماجی زندگی کے وہ گوشے اجاگر کئے ہیں جن کے ڈانڈے اکثر ترقی پسند شعراء کے اشتراکی نظریات سے مل گئے ہیں۔ دوسرے اس لئے بھی کہ احسان کا اندازِ فکر شروع سے انقلابی رہا ہے۔ اصلاحی، تعمیری اور اخلاقی ادب کے علمبردار ادیب و شاعر بھی احسان کو اپنے زمرہ کا شاعر سمجھتے ہیں اور یہ اس لئے کہ احسان کے کلام کا غالب عنصر اصلاح، تعمیرِ اخلاق اور انسانیت کے موضوعات ہیں۔

رجعت پسند شعراء جن کا اوڑھنا بچھونا ادب برائے ادب ہے، احسان دانش کے کلام پر اس لئے سر دھنتے ہیں کہ اس نے اردو ادب کو ایسی اچھوتی بندشیں، ایسے انوکھے استعارات اور ایسی نرالی تشبیہات دی ہیں کہ نئی پود کے شعراء اور ادباء اس مجتہد شاعر کو جتنا بھی خراجِ تحسین ادا کریں تھوڑا ہے۔ عوام احسان دانش پر اس لئے جان چھڑکتے ہیں کہ اس کے اشعار میں خود ان کی زندگی بول رہی ہے۔ ایسے اَن پڑھ لوگ جو احسان دانش کے سیدھے سادے شعر بھی نہیں سمجھ سکتے ان پر احسان کے جبّہ و قفطان کا جادو چل جاتا ہے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ احسان دانش کے پاس ہر مکتبِ خیال اور ہر دبستانِ فکر کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، مفکروں اور فن کاروں کی نشست و برخاست رہتی ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ ملاقاتیوں کا تانتا صبح سویرے سے لگتا ہے اور کافی رات گئے تک یہ سیلاب ختم نہیں ہو پاتا۔ پہلے پہل جب مجھے ملاقاتیوں کا یہ بے پناہ ہجوم دیکھنے کا اتفاق ہوا تو معاً یہ خیال آیا کہ احسان صاحب کی یہ مخلوق فوج بڑے بڑے معرکے سر کرتی ہوگی اور آڑے وقت میں اس فوج کے سپاہی اپنے سپہ سالار کے ساتھ ہر قسم کا تعاون بھی کرتے ہوں گے۔ لیکن چند ہی روز کے تجربہ نے مجھ پر یہ حقیقت منکشف کر دی کہ وہ

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

مجھ پر یہ راز آشکارا ہو گیا کہ اس کچی فوج کے بعض سپاہیوں کا ان نقص بھی اسی سپہ سالار کے ذمہ ہے۔ احسان دانش کے ملاقاتیوں میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی مقصد یا کسی نہ کسی غرض سے آتے ہیں، اور جب تک ان کی غرض پوری نہیں ہو جاتی احسان صاحب کے سر پر آسیب کی طرح سوار رہتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ احسان صاحب ہر ملاقاتی سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اور پہلی ہی ملاقات میں کچھ اس بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے لگتے ہیں کہ اسے اجنبیت وغیرہ کا احساس نہیں ہونے پاتا لیکن یہ واضح رہے کہ ان ملاقاتیوں کے ہجوم و اصرار کے باوجود بھی یہ کبھی نہیں ہوتا کہ احسان صاحب انہیں اپنے کلام سے بھی محظوظ فرمائیں۔ خود ہی کوئی رو آ جائے تو پھر بڑی سے بڑی نظم بھی سنانے میں انہیں مطلق کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اگر کبھی طبیعت جولانیوں پر ہوتی ہے تو اپنے روایتی ترنم کا ساز بھی چھیڑ دیتے ہیں۔ احسان صاحب اپنی مرضی کے مالک اور اپنی دھن کے پکے ہیں اگر کسی کی فرمائش پر کبھی ان کی زبان سے نہیں نکل جائے تو کسی کی سفارش سے بھی بات نہیں بنتی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کراچی سے ایک اُدھیڑ عمر کے بھاری بھرکم رئیس احسان صاحب سے ملنے آئے۔ احسان صاحب نے جیسا کہ ان کا عام قاعدہ ہے مہمان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب انہوں نے کسی غزل یا نظم کی فرمائش کی تو احسان صاحب کے تیور بدل گئے۔ اور یہ فرمایا۔ کیا یہ باتیں جو ہو رہی ہیں کچھ کم اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ غزل یا نظم بھی سنائی جائے ایک اور صاحب نے اس رئیس کی دلداری کی خاطر احسان صاحب پر اپنے دیرینہ تعلقات جتائے اور ان پر بہت کچھ زور ڈالا لیکن کچھ پیش نہ چلی۔ احسان صاحب ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ٹھیک کہا ہے کسی نے ؎

نہیں مُنہ سے جو نکلی پھر کہاں ' ہاں
خدا محفوظ رکھے اس نہیں سے

احسان صاحب کو جن لوگوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے ان کی معلومات کا ماحصل یہ ہے کہ احسان صاحب کسی درسگاہ کے تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ البتہ ۱۹۲۴ء میں انہوں نے پرائمری کا امتحان ضرور پاس کیا تھا۔ دینی مکتب میں احسان صاحب نے قرآن پڑھا اور ایک جید عالم سید حافظ محمد مصطفیٰ سے پڑھا۔ پرائمری میں جب یہ زیر تعلیم تھے تو انہیں منشی عبدالرحیم جلال آبادی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ یہ مؤخر الذکر استاد بھی اچھا خاصا علمی ذوق رکھتے تھے۔ قاضی محمد ذکی صاحب ذکی کاندھلوی کی توجہ سے احسان صاحب کے دل میں شعر گوئی کا ولولہ پیدا ہوا اور یہ چیز کچھ اس انداز کی تھی کہ اس کی بدولت ان کی آنکھوں کے آگے سے ذہنی تاریکیوں کے پردے سرکتے چلے گئے اور یہاں تک کہ ایک وقت آیا جب اس جوہر قابل کی نکھار کے لئے قدرت نے ان کا دامن کہیں اساتذہ فن کی صحبتوں سے اور کہیں کچھ مشق اور اپنی تباہیوں سے متعلق کر دیا۔ احسان صاحب نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں خواجہ عزیز الحسن مجذوب کی آنکھیں دیکھیں۔ یہ شاعر بھی تھے اور صاحب دل مجذوب سالک بھی۔ ان کے اشعار میں بلا کا تیکھا پن ہوتا تھا۔ احسان صاحب پر ان کی نظر پڑی تو آنکھوں آنکھوں میں حریف مئے مردافگنِ عشق، بنا دیا۔

بعد میں شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی نے ان کے اندر زبان و بیان کی شوخیاں بھر دیں۔ ان کی صحبت کا سب سے بڑا فیض احسان صاحب کی شاعری پر یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ ان کے کلام کو شرف قبول کی سند مل گئی۔ لطف ادا، شوکت الفاظ، جودت فکر، معاملہ بندی اور نغز گفتاری کے جو محاسن احسان صاحب کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر بہت بڑی حد تک تاجور کے حسن نظر کی چھاپ ہے علامہ تاجور احسان صاحب سے کافی محبت کرتے تھے اور ان کے ہر قسم کے ناز نخرے بھی سہتے تھے۔ احسان صاحب علامہ تاجور سے کچھ اتنے بے تکلف ہو گئے تھے کہ بعض اوقات خود ان کے منہ پر انہیں کھری کھری سنا دیتے تھے لیکن اپنی اس ' اُفتادِ طبع ' کے باوصف احسان صاحب نے فرق مراتب کا لحاظ ہمیشہ رکھا۔ اگر کبھی کسی نے احسان صاحب کی موجودگی میں علامہ تاجور کے خلاف زبان کھولی تو پھر ان سے رہا نہیں گیا۔

اور جہاں تک اس مخالفت پر رہے کہ آخر کار اسے معذرت طلب کرنی پڑی۔ علامہ تاجور کے دو بیٹوں کی ناگہانی وفات پر جس دلسوزی کیساتھ احسان صاحب نے مرثیہ کہا ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ احسان صاحب کے احساسات و جذبات رہین عقیدت تھے۔ باوجود اس پختہ یقین کے کہ علامہ تاجور کا اس قدر کے قادر الکلام شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ میں بلا خوف مبالغہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ تاجور خود بھی اپنے بیٹوں کا مرثیہ لکھتے تو اس میں سوز و گداز کا وہ امرت نہ ہوتا جو احسان صاحب نے اس میں گھول دیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک تاثرات و مشاہدات کا تعلق ہے۔ احسان صاحب اپنے اساتذہ اور دیگر پختہ فکر شعرا سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ احسان صاحب کی شاعری میں جوش ملسیانی، محروم، پنڈت برج موہن کیفی کی توجہات کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔

احسان صاحب کی نثر نگاری کا خمیر جن ادبائے نظر کیا اشے نے اٹھایا ہے ان میں سر فہرست ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، ل۔ احمد اکبر آبادی، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، کنہیا لال کپور، احتشام حسین کے نام آتے ہیں۔ احسان صاحب کی نظر میں ان کا ادب معیاری ادب ہے۔ احسان صاحب کی ملاقاتیں یوں تو برصغیر ہند و پاک کے تمام مشاہیر سے ہوئی ہیں بلکہ ان میں سے اکثر سے ان کے گہرے روابط بھی رہے ہیں۔ اور ہیں لیکن جن مشاہیر کی ملاقاتوں پر احسان کو فخر ہے وہ ہیں رئیس المفسرین علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا نیاز فتح پوری اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ موخر الذکر سے احسان صاحب کی پہلی ملاقات میری معیت میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کی تحریک میرے ان الفاظ نے کی کہ احسان صاحب! دنیا آنی جانی ہے اور یہ زندگی ایک ڈھلتا سایہ ہے کیا ہی اچھا ہو کہ ہم جماعت اسلامی کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات کریں۔ سننے میں آیا ہے کہ ان کی صحت جواب دے گئی ہے اور وہ آج کل گوال منڈی میں صاحب فراش ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جیتے جی ہمیں کسی کا یہ شعر پڑھنا پڑے ؎

صبح دم وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

احسان صاحب لیت و لعل کے خوگر اور چوں و چرا کے عادی نہیں ہیں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "چلیے مولانا سے ملتے ہیں"۔ غرض ہم دونوں گوال منڈی پہنچے اور دفتر کوثر (اب یہاں دفتر ایشیا اور دفتر جماعت اسلامی ہیں) کے ایک کمرہ میں داخل ہوئے۔ جہاں کچھ ستاروں کی جھرمٹ میں چاند کی چاندنی دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ مولانا مودودی نے مسکراتے ہوئے بوجھل اور جھکی ہوئی آنکھوں سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ میں نے احسان صاحب کا تعارف کرایا تو مولانا نے ان کے نام سے تو میں بہت پہلے سے متعارف ہوں البتہ کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اچھا ہوا یہ خلا آج پر ہو گیا۔

باتوں باتوں میں بحث کا موضوع چھڑ گیا۔ احسان صاحب ٹھہرے اونچے درجے کے منطقی اس موضوع پر اتنا سیر حاصل تبصرہ کیا کہ سامعین (جن میں مولانا نصر اللہ خان عزیز بھی شامل تھے) اور خود مولانا مودودی انگشت بدنداں رہ گئے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

علامہ سید سلیمان ندوی سے احسان صاحب کی ایک ملاقات بڑے عجیب عنوان سے ہوئی تھی۔ احسان صاحب اور علامہ دونوں ٹرین میں سفر کر رہے تھے اور بیٹھے بھی تھے پاس ہی پاس، لیکن نہ معلوم احسان صاحب کن خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے کہ انہیں علامہ کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہو سکا۔ علامہ نے خود ہی مہر سکوت توڑی اور بولے، احسان صاحب! آخر اس نیاز مند سے کیا خطا سرزد ہوگئی ہے کہ اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا جا رہا۔ احسان صاحب پر ان بولتے ہوئے نقوش سلیمانی کا یہ اثر ہوا کہ فوراً با ادب ہو بیٹھے اور پہلے معذرت

جلی کے انداز میں اور پھر نہایت بے تکلفی کے ساتھ علامہ سے مصروفِ سخن رہے۔ علامہ کو تھانہ بھون کے سٹیشن پر اترنا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی اس اسٹیشن پر رکی تو علامہ رخصت ہوئے لیکن اس عالم میں کہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ علامہ نے پائنچے اوپر چڑھائے اور کھیتوں کی ڈول ڈول اس شیا پر پڑنے جو بل کھاتی ہوئی تھانہ بھون لے جاتی اور پھر وہاں سے اس جگہ پہنچا دیتی ہے جہاں اعتدال پسند علما کی تربیت گاہ کے سرپرست مولانا تھانوی کا بیمار وجود رازی و غزالی کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ اور جن کی شخصیت دنیا کو یہ پیغام دے رہی تھی کہ

ایسے بھی ہیں کچھ اپنے سفینے میں مسافر
دنیا کے تلاطم کو جو خاطر میں نہ لائیں

مولانا عبدالماجد دریا بادی کے احسان صاحب سے اچھے خاصے مراسم ہیں پچھلے دنوں جب مولانا لاہور آئے تو ان کی ملاقات احسان صاحب سے نہ ہو سکی مولانا کو اس چیز کا ملال رہا چنانچہ انہوں نے اپنی سرگزشت لاہور میں خصوصیت کے ساتھ یہ لکھا کہ لاہور کی جن دو شخصیتوں سے نہ مل سکنے کی حسرت رہ گئی ان میں ایک حضرت احسان دانش ہیں اور دوسرے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی۔ مولانا نیاز فتح پوری کی ناقدانہ یورشوں سے نہ علما و فضلا بچے ہیں اور نہ شعرا و ادبا لیکن یہ احسان صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ مولانا انہیں اس دور کا شاعر تسلیم کرتے ہیں اور جب بھی ان سے ملتے ہیں بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ ملتے ہیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی بڑی جلالت مآب شخصیت کے مالک تھے علوم عربیہ میں انہیں جو کمال حاصل تھا اس کا اعتراف خود مصر کے فضلا نے کیا۔ صحیح مسلم کی شرح اور وہ بھی عربی میں مولانا نے اس تبحرِ علمی کے ساتھ کی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مولانا تحریر و تقریر دونوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ احسان صاحب کی جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو مولانا نے کلام کی فرمائش کی۔ احسان صاحب نے "گورستان" کے عنوان سے ایک تازہ نظم کہی تھی وہی سنانی شروع کر دی۔ ایک تو نظم تھی خود ان کے اپنے غمگین تاثرات کا نتیجہ اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ احسان صاحب کے گلے کا سوز بھی قیامت ڈھا دیتا ہے مولانا شبیر احمد عثمانی پر رقت طاری ہو گئی اور نظم کے اختتام تک یہی کیفیت رہی۔

یہ تو یاد نہیں پڑتا کہ احسان صاحب کبھی مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے بھی ملے ہیں یا نہیں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ مولانا بھی احسان صاحب سے اچھی طرح متعارف ہیں اور ان کے کلام سے بھی۔ مولانا نے ایک دفعہ ماں کی محبت کے موضوع پر مستورات کے ایک جلسہ میں تقریر کی تو ان کی زبان پر احسان صاحب کا یہ شعر بار بار آیا ؎

اس قدر کر دوں گا ماؤں کی محبت کو بلند
دل کے ٹکڑوں کو شہادت کی دعا دینی پڑے

بہاول پور کے ایک عالم دین مولانا احمد یار بہاول پوری کسی بزم سماع میں شریک تھے۔ قوالوں نے احسان صاحب کی ایک مشہور غزل شروع کر دی۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے ؎

زخم پہ زخم کھا کے جی اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی عشق ہے دل لگی نہیں،

تو مولانا پر اس بلا کی وجدانی کیفیت طاری ہوئی کہ جاں بحق تسلیم ہو گئے۔

اوپر کی سطور میں جو کچھ میں نے تحریر کیا ہے یہ احسان صاحب کی زندگی کا عریاں پہلو ہے اس پر تھوڑی بہت واقفیت کے بعد ہر شخص کچھ نہ کچھ روشنی ڈال سکتا ہے لیکن ان کی وہ خصوصیات جن پر تہیں جمی ہوئی ہیں کہاں کسی کے علم میں آ سکتی ہیں۔ میں اس مضمون کے آخری حصہ میں اس نقاب کشائی کا یہ اہم فریضہ سرانجام دینے کی جسارت کرتا ہوں۔

۱۔ احسان دانش جنہیں لوگ حضرت احسان دانش، احسان صاحب، بھیا احسان، بھائی احسان کہتے ہیں اپنی دانست میں ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ احسان صاحب کا اصل نام قاضی احسان الحق کاندھلوی ہے۔ ان کے والد ماجد قاضی دانش علی اپنی بے علمی کے باوجود علمی ذوق رکھتے تھے اور اس ذوق کی تسکین کا ذریعہ خود احسان صاحب تھے۔ احسان صاحب عہد طفلی میں اردو کی مشہور کتابیں (فسانۂ آزاد، فسانۂ عجائب، آرائش محفل، باغ و بہار، وغیرہ) اپنے والد ماجد کو پڑھ کر اونچی آواز میں سنایا کرتے تھے۔ آس پاس کے دوسرے بزرگ بھی ذوق سماعت کا ثبوت دیتے تھے۔ غالباً یہی کتاب خوانی کا شغل بعد میں ان کی شاعری کا سبب بنا۔ ایک دفعہ احسان صاحب کے نام کے سلسلہ میں ایک عجیب لطیفہ ہوا۔ عشرت کرتپوری سے جو احسان صاحب کے بڑے عقیدت مند شاگرد ہیں، میں نے احسان صاحب کی موجودگی میں کہا۔ عشرت صاحب اگر نغز گو شاعر بننا چاہتے ہو تو قاضی احسان الحق کاندھلوی کے شاگرد بنیں یہ آپ کو ہفت خوان رستم طے کرا دیں گے۔

عشرت صاحب بگڑ کر بولے۔ قاضی واضی میں نے بہت سے دیکھے ہیں۔ یہ جتنے قاضی قسم کے شاعر ہیں میں انہیں برسوں تک شاعری کی تعلیم دے سکتا ہوں۔

میں نے نہایت متانت کے ساتھ کہا۔ برسوں کی بات تو چھوڑیئے آپ میرے اس قاضی کو (احسان صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ایک دو سیکنڈ ہی دیجئے اچھا ہے بیچارہ راہ راست پر آجائے جب عشرت صاحب پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ احسان دانش ہی قاضی احسان الحق کاندھلوی ہیں تو ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

۲۔ احسان صاحب کا شجرہ نسب شیخ حسن زنجانی سے ملتا ہے اور شیخ کا سلسلہ حضرت ابوبکر صدیق رض تک منتہی ہوتا ہے۔ اس نسب اور اس نسبت سے احسان صاحب شیخ صدیقی ہوتے ہیں۔ خاندان قضاۃ جس کی زنجانی شاخیں یو۔ پی کے مغربی اضلاع میں پھیلی ہوئی ہیں ۹۳۵ھ سے ہندوستان کو اپنے علوم و فنون سے فیض یاب کر رہا ہے وہ خاندان ہے جس کے ایک فرد خواجہ شہاب الدین سہروردی بانی سلسلۂ سہروردیہ اور دوسرے وہ امام سعد زنجانی ہیں جن کے حضور مشہور محدث خطیب بغدادی نے بھی زانوئے تلمذ تہ کئے۔

قاضی عبدالشہید زنجانی رح جو امام سلسلۂ چشتیہ خواجہ نظام الدین علی رح کے پیر صحبت ہوتے ہیں اور جنہوں نے اکبر کے دین الٰہی کی شدید مخالفت کی تھی۔ زنجانی سلسلۂ قضاۃ کے مشاہیر میں سے تھے۔ قاضی شہاب الدین ثاقب جو علوم دینیات میں حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کے شاگرد اور مرید اور میر و سودا کے ہمعصر شاعر باکمال تھے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں تذکرۂ طبقات الشعراء میں قدرت اللہ شوق نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ مولوی محمد حسین فراق جو شوق دہلوی کے شاگرد اور صاحب دیوان شاعر ہوئے ہیں اپنے زمانے کے باکمال بزرگ تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم بھی اسی باغ و بہار خاندان کے گل رعنا ہیں (الحاج شجاعت علی صدیقی کنٹرولر پاک ملٹری اکاؤنٹس مرحوم ڈاکٹر بجنوری کے داماد ہیں) میر و سودا کے معاصر قائم چاندپوری بھی قاضیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دہلی کے وزیر حافظ محمد ابراہیم اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی اسی خاندان کے اخلاف ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ احسان صاحب یعنی قاضی احسان الحق کاندھلوی جو آج کل شاعری کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں ایک ممتاز اور علم پرور خاندان کے فرد ہیں۔

۳۔ احسان صاحب کی شخصیت ایک چیستاں بن کر رہ گئی ہے اور وہ اس لئے کہ یہ نہ صرف خلقی بلکہ خُلقی اعتبار سے بھی مجموعۂ اضداد واقع ہوئے ہیں۔ احسان صاحب شاعر بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ناقد بھی ہیں، ادیب بھی ہیں۔ لیکن ایسے ادیب کہ ان کے ادب پر نقد و نظر کا خول چڑھا ہوا ہے۔ کبوتر بازی کا چسکا بھی ہے اور حسن پرستی کی لت بھی۔ منطقی بھی ہیں اور گھڑی ساز بھی، طب، تصوف، اسلامیات، فلسفہ، نفسیات، سائنس، انسانیت سے متعلق جو ذخیرہ علم و ادب ہے اس پر بھی ان کی دسترس ہے۔ ان کی پوری زندگی کرداری کردار

ہے۔ نظری اور نظریاتی انداز انہیں کبھی نہیں بھائے۔ ان کا بیشتر وقت دوسروں کے لئے وقف ہے یہی وجہ ہے کہ زندگی میں انہیں خاطر خواہ معاشی سہولتیں میسر نہیں آسکیں۔ امراء سے ان کی ملاقاتیں غربا پروری کے لئے ہیں نہ کہ خود اپنی ذاتی منفعت کے لئے۔ اس اسباب کی دنیا میں احسان صاحب قطع سبب کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس بے سروسامانی کی حالت میں کہ اگر آج یہ اللہ کو پیارے ہو جائیں تو ان کے گھر سے ایک ماہ کا کرایہ بھی نہ نکلے۔ احسان صاحب کے دامن پر جذبۂ انتقام کی گرد کبھی نہیں بیٹھی۔ کچھ لوگوں نے گزشتہ سالوں میں احسان صاحب کو تحت الثریٰ میں پہنچا دینا چاہا۔ مگر احسان صاحب کی سخت جانی آڑے نہ آتی تو شاید احسان صاحب کبھی کے تیں بول گئے ہوتے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں احسان صاحب نے سنتِ یوسفی بھی ادا کی ہے۔

احسان صاحب نقش پرست تو بے شک ہیں مگر نفس پرستی کے داغ سے ان کا دامن کبھی داغدار نہیں ہوا۔ حسن چاہے پھول کی پتی میں ہو چاہے گھاس کے تنکے میں، احسان صاحب کو اس سے فطرتی اور جذباتی لگاؤ ہے۔ موسیقی، مصوری، باغبانی، مجسمہ سازی ایسے ذوقی مشاغل سے بھی آپ کی دلچسپیاں وابستہ ہیں۔ احسان صاحب حد درجہ آزاد خیال واقع ہوئے ہیں لیکن یہ آزاد خیالی دینی بے راہ روی کا سبب نہیں بلکہ تجسسِ حقیقی کا ثمرہ ہے۔ ان کے ظاہر پر زندیقی کا گمان ہوتا ہے لیکن ان کا باطن ایمان و عرفان کا گنجینہ ہے۔ قریب کے مطالعہ سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ احسان صاحب ایک زاہد مرتاض بھی ہیں اور ایک عابد شب زندہ دار بھی۔ خواب اور بیداری پر انہیں بلا کی قدرت ہے۔ جب اور جس جگہ ان کا دل چاہے سو رہتے ہیں۔ اور پھر اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے بیدار بھی ہو جاتے ہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے، راستہ چلتے چلتے باتیں کرتے کرتے احسان صاحب نیند کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس سمندر کے اچھے خاصے تیراک ہیں۔ رات کو جب ساری دنیا خراٹے لیتی ہے تو احسان صاحب کے کاروبارِ شوق کا دفتر کھلتا ہے۔ حقیقت میں بات بھی یہی ہے کہ دنیا میں جس نے بھی کچھ پایا ہے شب بیداری سے پایا ہے۔ دن کی ہنگامہ خیز مصروفیتوں میں ذہن کی گرہیں کچھ الجھی ہوئی سی رہتی ہیں اور انسان کوئی داخلی کام نہیں کر سکتا۔ ٹھیک کہا ہے کسی نے ؎

جب پچھلے پہر کا سناٹا آلودۂ شبنم ہوتا ہے
اس وقت حقائق کھلتے ہیں ہر چیز نظر آ جاتی ہے

احسان صاحب کی زندگی کا انداز کچھ اتنا سادہ رہا ہے کہ انہیں آج تک قرض لینے کی نوبت نہیں آئی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ آج تک کسی تجارت میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ کیونکہ اس دور میں جتنے بھی کاروبار ہیں وہ قرض کے بل پر چلتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ مکتبۂ دانش جس سے بظاہر ان کی معاشی زندگی وابستہ ہے۔ اس سے اتنی یافت نہیں ہوتی کہ یہ اپنا گذر بسر کر سکیں۔ بلکہ میں جہاں تک سمجھتا ہوں یہ مکتبۂ دانش دل کا بہلاوا ہے یا دوسرے لفظوں میں اسے چند احباب کی نشست گاہ کہہ لیجئے۔ مکتبۂ دانش کی کتابیں غالباً وقف ہیں۔ اس لئے کہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر کتابیں اٹھالی جاتی ہیں اور ان کے گرد پوش باقی رہنے دیے جاتے ہیں۔

۲۔ جیسا کہ میں نے کہیں وسط مضمون میں کہا ہے کہ احسان صاحب عابد شب زندہ دار ہیں۔ اس کی مزید وضاحت اس سے ہو سکتی ہے کہ جب سے ان کا باطنی رابطہ حضرت حافظ اخلاق حسین گھیروی رح سے قائم ہوا ہے ان کی زندگی اصحاب صفہ کی سی زندگی بن گئی ہے۔ فرش یا تخت پر سوتے ہیں۔ صرف ایک وقت کھانا کھاتے ہیں۔ اور وہ بھی بہت سادہ۔ ہر جمعرات کی صبح کو گورستان میانی جاتے ہیں۔ اور گھنٹوں قلندرانہ انداز میں فاتحہ خواں رہتے ہیں۔ شام کے وقت حضرت داتا گنج بخش رح کے مزار پر بلاناغہ حاضری دیتے ہیں۔ احسان صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ میں زندہ مزارات کی عظمت کا قائل ہوں۔ پختہ مزارات کے ہجوم سے مجھے نفرت ہے۔ عورتوں کے مزار بھی میرے نزدیک وقعت نہیں رکھتے۔

احسان صاحب باہمہ وجوہ بے ضرر قسم کے انسان ہیں۔ لوگ اپنی وابستگی کی بنا پر انہیں اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دوسروں کے دوست تو کیا خود اپنے بھی دوست نہیں۔ کسی سے انہیں دشمنی بھی نہیں ہے بلکہ دشمنوں سے بھی دشمنی نہیں رکھتے۔ میرے مطالعہ اور میری تحقیق کا جہاں تک تعلق ہے۔ احسان صاحب کی سب سے بڑی کمزوری شاعرگری اور شاعر نوازی ہے۔ بہت سے نوجوان احسان صاحب کی اس عنایت کے شکار ہیں۔ دوسری کمزوری جس کا تعلق خود ان کی ذات سے ہے وہ ہے مغلظات کا استعمال۔ بات بات میں گالیاں دینا ان کی عادت میں داخل ہو چکا ہے۔ تیسری کمزوری ایک اور بھی ہے اور وہ یہ کہ احسان صاحب کے اندر مردم شناسی کا جوہر نہیں۔ بعض اوقات غلط قسم کے لوگ ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ اور جو ان کی توجہ کے مستحق ہیں انہیں ان کی بارگاہ میں کسی خاص نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ چوتھی کمزوری یہ ہے کہ احسان صاحب اگر کسی کی دعوت کرتے ہیں تو مہمان کی شامت آجاتی ہے اس کے لئے دسترخوان پر اس قسم کے کھانے چنے جاتے ہیں کہ اگر ایک ہفتہ کا بھوکا بھی ہو تو اس کی بھوک اُڑ جاتی ہے۔

[illegible] میں ایک دفعہ مجھے افطار کی دعوت دی۔ میں عزیزی مارتا ہوا ان کے مکان پر پہنچا۔ اس زمانے میں یہ کوٹ عبداللہ شاہ [illegible] میں رہتے تھے۔ افطار کا نقارہ بجا تو مٹی کے ایک لوٹے میں غیر معروف پانی اور ایک مٹی کا سکورا لئے ہوئے احسان صاحب برآمد ہوئے اور بولے بیٹے مولانا روزہ افطار کیجئے۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے صبر کیا اور دل کو یہ دلاسا دیا کہ شاید نماز مغرب کے بعد پرتکلف خوان بچھے۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک چنگیر میں دو مکئی کی روٹیاں اور ایک رکابی میں چنے کا ساگ لایا گیا۔ اور پھر ان الفاظ کے ساتھ مولانا بسم اللہ کیجئے کھانے کا حکم صادر کیا۔ مکئی کی روٹیاں اتنی سخت اور اینٹھی ہوئی کہ چباتے ہی منہ سے دانت باہر آ جائیں اور چنے کے ساگ میں اتنی مرچیں کہ الامان الحفیظ! کھانا تو میں نے کھا لیا۔ لیکن ساتھ ہی دل میں یہ عہد کیا کہ احسان صاحب کی دعوت کبھی قبول نہیں کروں گا۔ چنانچہ آج تک اپنے عہد پر قائم ہوں۔

احسان صاحب میں پانچویں کمزوری یہ ہے کہ وہ کسی کی پوری بات کان دھر کر نہیں سنتے بلکہ بعض اوقات تو ستم ظریفی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص ان کے سامنے اپنا دکھڑا چھیڑتا ہے تو یہ اسے لفظ لفظ پر ٹوکتے اور زبان کی غلطیاں درست کرتے ہیں۔ جب وہ کہتا ہے کہ احسان صاحب اصلاح کا یہ کون سا موقع ہے تو بڑی سنجیدگی سے فرماتے ہیں "اور کیا مرنے کے بعد زبان کی اصلاح کا وقت آئے گا۔" احسان صاحب زبان پر قدرت کے باوجود کاندھلے کی بولی میں بات کرنے کے عادی ہیں اور ان کا یہ انداز گفتگو ان کے نئے ملاقاتیوں پر یہ نقش بٹھا دیتا ہے کہ یہ احسان صاحب جو ہم سے ہمکلام ہیں وہ حضرت احسان دانش نہیں ہیں جن کی زبان ادبا سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔

ان کمزوریوں کے باوجود احسان صاحب بہت کچھ ہیں۔ اس دور کے بہت سے نغزگو شعرا اپنے کلام میں ان سے اصلاح لیتے رہے ہیں اور آج بھی ان سے مشورے لیتے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔

احسان صاحب کے تعلقات تمام شاگردوں سے دوستانہ ہیں۔ بلکہ یہ عجیب بات ہے کہ احسان صاحب کبھی ان شعرا کو اپنا شاگرد نہیں بتاتے اور جب ان سے اس کا سبب پوچھا جاتا ہے تو نظیری کا یہ شعر پڑھ دیتے ہیں ؎

طائرے نیست کہ از تار رشتش بر پا نیست
صید یک مرغ نہ کردم کہ ز پیں وا بستم

احسان صاحب اس دور کی شاگردی اُستادی کے قائل نہیں اور وہ اس لئے کہ اس دور کے شاگرد گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ اور اپنی زندگی کے ہر موڑ پر ایک نئے اُستاد سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ اس دور میں کالجوں اور سکولوں کی طرز تعلیم نے شاگردی کا معیار باقی رکھا ہے نہ اُستادی کا۔ جہاں دو پیریڈ کے بعد اُستاد بدلتے ہوں وہاں کیسی شاگردی اور کہاں کی اُستادی۔ شاگرد تو وہ ہوتے تھے جو عمر بھر کسی ایک اُستاد کے ہو رہتے اور بھول کر بھی دوسری طرف نہ دیکھتے۔ تاریخ ہمیں ایسے شاگردوں اور ایسے اُستادوں کے واقعات سناتی ہے جن کے رشتے اتنے مستحکم ہوتے تھے

کر دوں کے تمام حجابات مرتفع ہو جاتے تھے۔ حکیم ناجیاد بھی مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد و مرید تھے انہیں اپنے استاد کا اس قدر احترام تھا کہ دہلی سے دیوبند ہر جمعرات کو استاد کی خدمت میں پہنچتے اور علوم و معارف کے خزانے لوٹتے تھے۔ احسان صاحب اس گئے گزرے دور میں ایسے شاگردوں کے متمنی ہیں لیکن میرے خیال میں ان کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

عبدالرزاق کانپوری

ابوالخیر مودودی

انیسویں صدی کے آخری قرن کی یادگاروں میں تھے۔ ایسے ماحول میں پرورش پائی جس میں داستان امیر حمزہ، فتوح الشام، قصہ چہار درویش، قصہ حاتم طائی، اگلے وقتوں کی زندگی کی ایسی ہی حکایتیں اور روایتیں ذوق و شوق سے پڑھی سنی جاتی تھیں۔ طبیعت میں ایک جوہر تھا، اس جوہر نے بیان میں داستانی رنگ پیدا کر دیا۔ شعور کی آنکھ ایسے ماحول میں کھلی جس میں زندگی کے نئے تقاضے جھلک رہے تھے۔ تصوف کا ذوق تاریخ کے مطالعے میں منتقل ہو گیا۔ طبیعت کی اپج سے "البرامکہ" لکھی، اور تاریخ نگاری کے نئے ادبی دور میں اپنی ایک جگہ پیدا کر لی۔ یہ کتاب ایسی عام ہوئی کہ بیچاروں کو عبدالرزاق سے "البرامکہ" بنا دیا اور یہ عرف ان پر ایسا سوار ہوا کہ جب تک "نظام الملک طوسی" نہ لکھی نام بخشی نہ ہوئی۔

ان کے آباؤ اجداد فرخ آباد (صوبہ متحدہ) کے رہنے والے تھے۔ سن اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے کے بعد ان کے والد منشی الٰہی بخش نے کانپور کو وطن بنا لیا۔ نسباً فاروقی تھے۔ بدلتے زمانے کا اثر قبول کیا، کرسی یا متصرفی ہو گئے۔ انگریزی لکھنے پڑھنے پر قادر اور اپنے زمانے کے نامی گرامی منجم و رمال تھے۔ اس تقریب سے اخبار چھپائی ان کا مستقل مشغلہ تھا۔

عبدالرزاق صاحب اٹھارہ سو چھیاسٹھ میں یہیں پیدا ہوئے۔ ننھیال والے سید تھے۔ فتح پور ہسوہ (الہ آباد) میں ان کی زمینداری تھی۔ اس تعلق سے نشو و نما فتح پور میں ہوئی۔ وہیں مکتب پڑھا اور عمر کی اٹھارہ منزلیں وہیں طے ہوئیں۔ کہتے تھے، فتح پور میں ایک نامور درویش صوفی میر حسن علی تھے، انہوں نے بسم اللہ پڑھائی، پھر انہی کے مکتب میں فارسی عربی پڑھی۔ یہ مکتب ان کے فرزند مولوی ظہور الاسلام نے قائم کیا تھا۔ وہ اس علاقے میں بڑے نامور اور با اثر عالم تھے۔ جب ندوہ کی تحریک نے جنم لیا تو اس کے سرپرستوں میں ان کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ تحصیلی اسکول میں فارسی کے ایک ادیب منشی امام علی تھے، سکندر نامے تک ان سے فارسی ادبیات پڑھیں۔ عربی متوسطات سے فراغت پائی تھی کہ مولوی ظہور الاسلام صاحب نے اپنے مدرسے میں فارسی، حساب اور ابتدائی درجے کی عربی پڑھانے کا کام سپرد کر دیا۔ والد نے یہ کہہ کر یہ تعلق منقطع کرا دیا کہ میں تم کو ملا بنانا نہیں چاہتا۔ اب خیر سے ملا بننے کانپور آ گئے۔ یہاں کچہری سب دھری لگی پڑی تھی۔ چھ سات برس یہ صحبت کھلی، پھر پیر نسیم میں سرگشتہ رہی، دل کی لگی اور دس برس لگے کا پادری، ان کی صحبت میں منشی رحمت اللہ رعد عرف ننھے کی پریس کی ذات دل چسپی کا واحد سہارا تھی۔ اس دلچسپی نے طبیعت میں شگفتگی پیدا کی۔ ندوۃ العلماء کے ناظم اول مولوی محمد علی صاحب مونگیری سے تھوڑی سی حدیث پڑھی، اور مدرسہ فیض عام

کے مشہور مدرس مولوی لطف حسن منطقی سے درس نظامی کی بقیہ کتابیں تمام کیں۔ ۱۸۹۳ء میں جب وہ زمانے کی کشمکش میں حیدرآباد آئے، یہاں تحصیل داری مل گئی، فراغت نصیب ہوئی، دس برس سے نظام الملک طوسی کی دھن تھی، فراغت نے اس کی تکمیل کا موقع دیا۔ ۱۸۹۴ء میں یہ کتاب شائع ہوئی، ۱۹۰۲ء میں سرکار عالیہ نے بنظر قدر دانی منتظم تاریخ اسلام مقرر فرما دیا۔ "البرامکہ" سے قلم کے مسافر نے سفر شروع کیا تھا، اب تاریخ اسلام کا وسیع میدان ہے، خدا انجام کی توفیق بخشے۔

انہی زمانوں میں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ بلند بالا، اسپ ہیبا داڑھی، خندہ جبیں، کتابی چہرہ، گفتگو میں انشائی اسلوب، پرانے وقتوں کے قصے بڑے مزے سے بیان کرتے، وہ عام و خاص ایک صدی کی شنیدہ و دیدہ تاریخ تھے۔ پرانے معاشرے کا شیرازہ ان کے بچپن و شعور میں بکھرا تھا۔ نئے معاشرے کا شیرازہ ان کی آنکھوں کے سامنے بندھ رہا تھا۔ بزرگوں سے جو کچھ سنا یاد رکھا، اور آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ذہن میں نقش کر لیا۔ نئی پرانی، دونوں باتیں ان میں گھل مل موجود تھیں، جب کوئی پرانی بات چھڑ جاتی یادوں کا چشمہ پھوٹ نکلتا۔

علی گڑھ تحریک سے بہت متاثر تھے، سید صاحب کے فرزند اور ان کی تعلیمی و ادبی تحریک کے بڑے چھوٹے سب لوگوں سے ان کی راہ و رسم رہی تھی۔ تاریخی ذوق کی وجہ سے زیادہ تعلق علامہ شبلی سے تھا۔ جب تک علامہ شبلی ندوۃ العلوم میں بہ حیثیت معتمد رہے باہم آمد و رفت رہی۔ علی گڑھ میں یہ ان کے مہمان، کانپور میں وہ ان کے مہمان، بے تکلف دوستی تھی۔ اس عہد کے علی گڑھ کے قصوں کا ذخیرہ تھا، جب کبھی کھل جاتا، علامہ شبلی سے ملاقات ہو جاتی۔ سرسید کی خدمت میں بھی ان کو نیاز حاصل تھا۔ کہتے تھے کہ مجھ کو صحیح مطالعے کی راہ اسی تحریک نے دکھائی جس کا سرچشمہ سید کی ذات گرامی تھی۔ ۱۸۸۷ء میں لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس تھا، اس میں شمس العلماء شبلی نعمانی نے مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر لکچر دیا۔ اسی سے مجھ کو تاریخ اسلام کے مطالعے کا شوق ہوا۔ چند سال گزرے تھے کہ ہردوئی سے حکیم محمد علی کا ناول "جعفر و عباسہ" نکلا، ناول کیا تھا ایک تیر تھا جو دل میں ترازو ہو گیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ اس کی تردید میں ایک مضمون لکھوں، مگر تاریخ نے مضمون کے تردیدی مضمون کو آل برمک کی پوری داستان بنا دیا۔ سچ پوچھو تو یہ اسی تحریک کا فیض تھا۔ میں نے کہا، اور شبلی صاحب کو بھی سید کے فیض نظر نے علامہ شبلی بنایا، ورنہ "اسکات المعتدی" لکھا کرتے!

عبدالرزاق صاحب دم بھر کو خاموش ہو گئے، ذہن نے کچھ ڈھونڈ کر لیا اور اسے گفتگو میں گھول دیا۔ مجھ کو "اسکات المعتدی" سے وہ سارے مجاہدانہ رسالے یاد آ گئے، جو مشغلے تھے ہمارے علماء کے۔ میرے دوست شمس العلماء شبلی نعمانی نے شروع زمانے میں خود اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ تاریخ کا ذخیرہ انہوں نے اول اول سید صاحب کے کتب خانے میں دیکھا، اور وہ کہتے تھے کہ اس بات کا تو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یورپ والوں نے ہمارے ذخیرہ علوم سے استفادہ کیا ہو گا۔ میرے دوست نے ان صحبتوں میں اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ میں حیرت زدہ نظروں سے یورپ کی مطبوعہ کتابیں عربی کی دیکھ رہا تھا، سید صاحب اپنی میز پر کام میں مشغول تھے، ان کی آواز گونجی، میں نے مڑ کے دیکھا، کام جاری تھا، فرمانے لگے "شبلی! یہ تمہارے کرنے کے کام تھے جو یہ لوگ کر رہے ہیں، اور یہاں تم لوگوں کا مشغلہ کنوئیں میں چوہا گر جائے تو اس کے ڈول گننا ہے، یا استنجے کے ڈھیلے چلانا اور تھپکیاں مارنا!" سید صاحب کی یہ بات سن کر شبلی ذہن میں گڑ گئی — عبدالرزاق صاحب نے کہا، یہ مولوی شبلی صاحب[1] کے جوہر کی بات تھی، کوئی شخص کوئی بھی جوہری ہو بے اثر نہیں رہ سکتا۔

میں نے ایک لطیفہ عرض کیا کہ کہیں کا ماحول حیرت زدہ احساس آپ نے بھی رسائل شبلی کے انہی سطروں میں پڑھا ہو گا — خوش مذاقی ان کے چہرے پر ابھر آئی — "مگر یہ فطری بات تھی" عبدالرزاق صاحب نے کہا، جب آدمی اندھیرے سے دوپہر کی تیز روشنی میں دفعتاً آئے تو چکاچوند ہو ہی جاتی ہے۔

البرامکہ کا مصنف اپنے اصلی قد و قامت سے زیادہ بلند بالا ہو گیا۔ زمانے نے اس کے لئے ایک جگہ منتخب کی — قدرداں ان جگہوں کی تلاش

---

[1] عبدالرزاق صاحب علامہ شبلی کو اکثر اسی لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔

بھرتی ہیں، جن کے لئے دل کا یا دماغ کا دروازہ کھلتا ہے!

پچاس سال ادھر کی بات ہے، علی گڑھ سے مولوی وحیدالدین سلیم "معارف" نام ایک رسالہ نکالتے تھے۔ اس میں ایک عجیب قصہ نظر سے گزرا تھا۔ پامر کی کتاب "ہارون" کے ترجمے پر ریویو کرتے ہوئے صاحب مضمون نے لکھا تھا کہ جب مولوی شبلی صاحب مدرسۃ العلوم میں آئے تو انہوں نے اپنا تحقیقی کام اسی کتاب سے شروع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ قصہ اس وجہ سے عجیب ترین تھا کہ علامہ ممدوح نے "المامون" پر مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی کے تبصرے پر اپنے جوابی مضمون میں ہارون کی بہت مذمت کی تھی اور اس کے جرائم کی ایک لمبی فہرست تحریر فرمائی تھی۔ میں نے عبدالرزاق صاحب سے اس قصے کی اصلیت پوچھی۔ اسی زمانے میں ان کا بھی ایک مسلسل مضمون "آثار عجم" پر "معارف" کے کئی پرچوں میں نکلا تھا۔ عبدالرزاق صاحب نے کہا: "ہارون" کا ماجرا تو مجھ کو یاد ہے، لیکن میں دیکھ لوں کہ ریویو نگار نے کیا لکھا تھا۔ مبادا اس میں کوئی الگ بات ہو، یا میری معلومات سے نامکمل بات ہو اور میں بے دیکھے بھالے تصدیق کر دوں۔" ——— عبارت پڑھی ——— "ہاں! ٹھیک ہے۔ اس میں عجیب بات کیا ہے؟ یہ ۱۸۸۳ء کا قصہ ہے۔ میرے مرحوم دوست کو جب اس کتاب کا علم ہوا تو انہوں نے چند خاص طلبہ سے، جن سے کہ وہ مانوس تھے، اس کے ابواب کا ترجمہ کرایا۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کو اپنے حاشیوں سے مزین کریں۔ خوب چیز ہو جاتی اگر یہ کتاب ان کے حاشیوں کے ساتھ چھپتی۔ مجھ کو بھی یہ ترجمہ دکھایا تھا، اور یہ کہہ کر اپنے نور بصیرت سے بہرہ ور کیا تھا کہ دیکھو! ایک تو ہمارے ہاں تاریخیں لکھی جاتی ہیں، اور ایک ان لوگوں کی تاریخ نگاری کا ڈھنگ ہے۔ پامر نے ڈنک تو مارا ہے، مگر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کہاں کہاں سے موتی اور خزف ریزے نکالے ہیں اور ان کو کس خوبی اور سلیقے سے لڑیوں میں پرویا ہے۔ مگر جب سید صاحب سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ تم ان لوگوں کی تاریخ میں جیا جمی ساکر چلنا چاہتے ہو، یا اگر یہی لکھنے کا جو نیا ڈھنگ ہے وہ تم نے دیکھ لیا، اب اسی ڈھنگ پر تم خود لکھو، اور مسلمانوں پر لکھو۔ ذہنی روشنی زیادہ اسی میں ہے۔ اور ہماری قوم کو زیادہ ضرورت اس وقت اسی چیز کی ہے، کہ ان میں فکری آزادی پیدا ہو اور وہ نئے علوم سیکھے اور نئی روشنیاں حاصل کرے۔—

عبدالرزاق صاحب نے کہا، "سنا نہیں کہ جائے دستار خالی است۔ سید صاحب نے ضرورت اور مصلحت سمجھائی اور لکھنے والے نے اس خیال سے بھی کر لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ یہی تو میرے دوست مرحوم شمس العلما شبلی نعمانی کا خاص جوہر تھا"

عبدالرزاق صاحب آدمی بڑے قرینے اور رکھ رکھاؤ کے تھے۔ وہ یہی احترام ملحوظ رکھتے تھے اور بات بے کم و کاست کہتے۔ نیک نفسی اور کھری قدر شناسی ان کی عام روش تھی۔ مشاہیر ادب میں جتنوں سے ان کے تعلقات تھے اور جتنوں کو انہوں نے دیکھا تھا، وہ ان سب کا ذکر کسی احترام سے کرتے اور تنقیص و ترجیح سے دامن کش رہتے۔ بڑی جان دار خوبی ان میں یہ تھی کہ مشاہیر ادب سے تعلقات کے ہجوم میں جن کی دوستی پیمان کو عمر بھر نبھا دیا وہ ان کی گمنامی کے زمانے کا دوست تھا۔ رحمت اللہ رعد۔ زندگی کے میدان میں وہ منزل بمنزل بڑھتے رہے اور بحیثیت مصنف اس مرتبے کو پہنچے کہ عماد الملک بلگرامی نے قدر افزائی کی —— جن کی قدر افزائی اس عہد کے بڑے بڑے علمی قدر دانوں کے لئے سرمایۂ افتخار تھی۔ لیکن اس قدر افزائی پر بھی ان کو اتنا فخر نہ تھا جتنا کہ رعد سے دوستی پر۔ گفتگو میں جب ان کا ذکر آ جاتا تو کیف خلوص سے آواز میں گھلاوٹ پیدا ہو جاتی۔

انہوں نے عمر بھر کتابوں سے آنکھیں لڑائیں اور مصنفوں سے آنکھیں ملائیں اور دفتر کے دفتر لکھے۔ "تاریخ اسلام" اور "تاریخ جلالی" اور "سفرنامہ خسرو" کی پر حاشیے اور منشی رحمت اللہ رعد کی "نامی حسرتی" کے لئے تاریخی مضامین کے انبار اور "نظام الملک طوسی" جس کو نواب عماد الملک بلگرامی نے سراہا، ان کی یہی دو کتابیں ہیں، ادبی تصنیف "البرامکہ" اور آخری تصنیف "یاد ایام" پر پہنچی اور دائرہ ہو چکی۔ وہ بھی افسانہ با افسانہ، یہ بھی افسانہ با افسانہ! —— ایک داستان میں کتنی داستانیں ہیں جو سراسر بھری چلی آتی ہیں۔ آپ بیتی کی ایک داستان میں افسانہ با افسانہ ایک داستان ہے۔ نواب مرزا داغ کی صحبت میں گھنٹوں میں نے اپنی

یاد رہے کہ اس وقت میرے سامنے ایسے بے شمار پرچے ہیں کہ اوراق ۱۹۳۸ء میں مرحوم نے بھیجے تھے۔ ان میں سے کچھ دنوں کا فاصلہ کم ہی کل آتے ہیں۔ یہ اقتباس انہی ورقوں سے ماخوذ ہے۔ [illegible] تقسیم سے تھوڑی ہی مدت پہلے بھی مرحوم نے لکھا تھا کہ میری [illegible] یادگار ہے [illegible] چہرہ کاری میں آیا تھا [illegible]

زندگی کے ہر دور میں پچاس سال کے اندر ہندوستان کے مشاہیر شعراء کو دیکھا اور ان کی زبان سے ان کا کلام بھی سنا ہے۔ میرے والد منشی الٰہی بخش مضطر رحیم ہندا چونکہ خود شاعر تھے اور انھوں نے آگرہ و لکھنؤ کے باکمال شعراء کو دیکھا تھا، اور مشاعروں میں شریک ہو کر غزلیں پڑھتے تھے، اس سے مجھے ہدایت تھی کہ ادبی مجالس سے استفادہ کروں۔ عجیب اتفاق ہے کہ تعلیم کے زمانے میں بھی ادب سے ہمیشہ دلچسپی رہی، لیکن شاعری کی طرف توجہ نہیں ہوئی، اور تمام عمر سماعت شعر میں گزری ——

اب ملنے کو داغ تک پہنچے رسائی ہوئی تو

ملک میں حضور نظام کی کوٹھی شہر سے الگ تھی اور کئی ہزار گز احاطہ رقبہ کوٹھی سے متعلق تھا جس میں امرائے دولت کے خیمے اور بارگاہیں تھیں۔ صدر پھاٹک پر فوجی سپاہیوں کا پہرہ تھا، ایک کمرے میں پولیس افسر جمع تھے۔ ملاقات کا انتظام جس افسر کے سپرد تھا وہ ایک عرب تھا۔ جب میں نے مرزا داغ سے ملاقات کی خواہش کی تو اس نے وزٹ (ملاقات کا کارڈ) طلب کیا، چند کارڈ پیش کئے گئے اور جواب کے انتظار میں ٹھیرے رہے۔ ایک گھنٹے کے بعد مرزا صاحب کا چوبدار آیا اور ان کی ذاتی ذمہ داری پر کیمپ کے اندر جانے کی اجازت ہوئی۔ رستے میں صدہا خیمے نظر آئے ایک سے بڑھ کر ایک شاندار تھے، ہر خیمے کے دروازے پر شوخ زرد رنگ کی تختی پر سیاہ حروف میں صاحب بارگاہ کا نام لکھا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد نواب فصیح الملک مرزا داغ کا نام نظر آیا۔ ان بارگاہوں کے قریب ہی کوٹھی تھی جس میں حضور نظام خواب راحت میں تھے۔ میرے بوٹ کی چرچراہٹ کی آواز آ رہی تھی، ایک پہرہ دار دوڑتا ہوا آیا، اور شریفانہ انداز میں فہمائش کی، آہستہ آہستہ چلیے، حضور نظام آرام میں ہیں، بوٹ کی آواز خواب گاہ تک کسی طرح نہیں جا سکتی تھی، تاہم حکم کی بسر و چشم تعمیل کی گئی۔ اس وقت مجھے صائب کا یہ شعر یاد آیا اور منشی رحمت اللہ رعد سے ایک پولیس کے پہرہ دار کو مخاطب کر کے پڑھا ؎

اے صبا بر برگ ہائے غنچہ زن آہستہ پا
پاسبان گلہا صائبا خوابیدہ است

الحمدللہ، منزل ختم ہوئی اور داغ کی بارگاہ تک پہنچ گئے۔ صدر دروازے پر ایک چوبدار تھا جس کی زرد مخمل کی وردی پر طلائی زری کا کام تھا چک اٹھائی اور ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ پہلے گول کمرے میں بٹھائے گئے جس میں ایرانی قالین کا فرش تھا اور کرسیاں سیاہ رنگ کی تھیں۔ چند منٹ کے بعد طلبی ہوئی۔ دو درجے طے کر کے جب تیسرے میں پہنچے تو دیکھا ایک بزرگ قوی الجثہ خیمے کی چوب تھام کر ہمارے استقبال کو اٹھ رہے ہیں۔ چلنے میں معذور تھے اور پنڈلیوں پر گرم اونی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، عرق النسا میں مبتلا تھے۔ بھاری بھرکم، رنگ سیاہ اور چہرے پر خفیف سیتلا کے داغ تھے۔ بارگاہ کا یہ حصہ نہایت آراستہ تھا، ایک جانب چاندی کا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ وسط میں قیمتی ایرانی قالین تھا۔ دو راست کر چاندی کی ایک بڑی انگیٹھی میں آگ دہک رہی تھی۔ مرزا صاحب نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا، پھر ہمارے اصرار پر فرش پر بیٹھ گئے۔ کارڈ سے نام تو پہلے ہی معلوم ہو چکے تھے، اب نام بنام تعارف ہوا۔ بیٹھتے ہی میری طرف پیچوان بڑھایا، شغل فرمایئے۔ میں نے عرض کیا: پیر و مرشد، حضور نے اس لت سے بچے اب تک محفوظ رکھا ہے۔ فرمایا کہ اس کا نعم البدل بھی موجود ہے، اجازت ہو تو ایک جام پیش کیا جائے۔ اس لطیفے پر خوب ہنسی رہی۔ میری کتاب ایران کہ ۱۸۹۸ء میں شائع ہو چکی تھی، اور مرزا صاحب پڑھ چکے تھے۔ اس کتاب کے مضامین پر گفتگو ہوتی رہی، اس کے بعد سلطان سنجر سلجوقی کے متعلق مجھ سے چند سوالات کئے، میں نے جو جواب عرض کیا، بہت خوش ہوئے اور حیدرآباد آنے کی دعوت دی۔ پھر فرمایا کہ اپنی تصویر کارڈ پر چھپوا کر بھیجنا۔ میرے بعد منشی رحمت اللہ رعد سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ جناب رعد آپ تو میرے ہم مشرب ہیں کچھ اپنا کلام سنائیے۔ رعد نے معذرت کی کہ مسدس حالی پڑھنے کے بعد شاعری سے تائب ہو چکا ہوں، تاہم دو تین غزلیں سنائیں۔ اس کے بعد موجودہ شاعری پر مناظرہ شروع ہوا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ اگرچہ ہماری شاعری عیوب سے خالی نہیں ہے، لیکن اردو علم ادب

کی ترقی کے لئے شاعری اور مشاعروں کا بقا ضروری ہے، البتہ اس امر کی ضرورت ہے کہ اُردو کانفرنس قائم کر کے اس میں یہ مسئلہ پیش کیا جائے اور جو عیوب ہیں ان کی اصلاح کی جائے۔

جب یہ دلچسپ بحث ختم ہوئی تو میں نے دریافت کیا کہ مولوی سید احمد دہلوی نے تیس سال کی محنت میں فرہنگ آصفیہ لکھی ہے۔ تحقیقات لغات، محاورات اور زبان کی حیثیت سے اس کتاب کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے؟ فرمایا: سید احمد عرب سرائے کے باشندے تھے۔ اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مکرر سوال کرنا ادب کے خلاف سمجھا اور اس جواب سے یہ نتیجہ نکالا کہ تحقیقات لغات میں کوئی اعتراض نہیں ہے، البتہ فرہنگ کی زبان ٹکسال باہر ہے۔ کیوں کہ عرب سرائے کی آبادی بیرون دہلی ہے۔ میں نے سید مرحوم کی چند کتابیں اور مضامین پڑھے ہیں۔ اگر چند غلطیاں ہوں تو قابل معافی ہیں۔ کیوں کہ انار کے چند دانے خراب بھی ہوں تو پورے انار کی لطافت میں فرق نہیں آتا۔

چاندی کی ایک تپائی پر ریشمی بستے میں ایک کتاب رکھی تھی۔ منشی رحمت اللہ نے اجازت لے کر اس کو کھولا۔ اندر سے طلائی کام کی ایک جلد نکلی، رعد نے خیال کیا کہ یہ مصحف ہے، وہ چاہتے تھے کہ آنکھوں سے لگائیں۔ اس پر مرزا صاحب کو ہنسی آگئی اور رعد بھی کچھ سمجھ گئے، سرورق کھولا تو "جناب داغ" کا حلیہ نظر آیا۔ یہ دکن کی پیداوار تھی۔ رعد اپنے تخلص کے اعتبار سے بلند آواز تھے۔ ایک غزل پڑھی۔ حاضرین جلسہ نے بہت داد دی۔ لیکن جناب داغ کی موجودگی میں رعد کی یہ کڑک مجھے پسند نہ آئی۔ میں نے مرزا صاحب سے عرض کیا کہ مسافر نوازی کی یہ نشانی ہے کہ جناب خود بھی کچھ ارشاد فرمائیں۔ درخواست منظور ہوئی۔ رعد سے دیوان لے کر کئی غزلیں سنائیں۔ پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا بیس سالہ نوجوان غزل پڑھ رہا ہے۔ دونوں آنکھیں پھڑک رہی تھیں۔ دونوں ہاتھوں کو حرکت تھی۔ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ شاعر فن کے ساتھ شائع تغیر کیا جاتا ہے۔ میری زبان سے برجستہ نکلا کہ آج میں نے داغ سے نہیں بلکہ ذوق کی زبان سے یہ غزلیں سنی ہیں۔ ذوق کا نام آتے ہی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

چائے کی کشتیاں آئیں، اندرسیوں کے سوا کل سامان ولایتی تھا۔ بسکٹ، کیک، مٹھائیاں، پھل ہر قسم کے تھے، خود شریک نہیں ہوئے۔ کیوں کہ ناشتہ کا وقت گزر چکا تھا۔ تین گھنٹے میں یہ پُر لطف صحبت ختم ہو گئی، چند اصحاب دہلی کے ملاقات کے لئے تشریف لائے، اب ہم رخصت ہوئے، مرزا صاحب نے مصافحہ کیا اور دعائے خیر کے بعد جانے کی اجازت دی۔ افسوس کہ میری یہی پہلی اور یہی آخری ملاقات تھی۔"

«بر سبیل تذکرہ ——— کہانی میں ایک کہانی»

«میرے مرحوم دوست شمس العلماء شبلی نعمانی نے خود بر سبیل تذکرہ فرمایا کہ حیدر آباد میں عید کے دن میں داغ سے ملنے گیا، اور بات اندر پہنچ گئی۔ گفتگو ہو رہی تھی کہ ملاقات کے کمرے میں یکایک ایک بیس سالہ نازنین آگئی جو زرق برق لباس اور زیور میں جنت الفردوس کی حور معلوم ہوتی تھی وہ اس شان سے آئی کہ دوپٹہ شانے سے سرک گیا تھا جس کا عکس اس شباب پر بھی اثر ڈال رہا تھا۔ اس پر اس درجہ بدحواسی چھا گئی کہ نقش دیوار بن کر رہ گئی، نہ اس میں بیٹھنے کی جرأت تھی، نہ واپس جا سکتی تھی، یکایک آ جانے سے مرزا صاحب بھی شرما گئے اور بولے: کم بخت! ذرا دیکھ تو لیا کر کہ میرے پاس کوئی مولوی صاحب موجود ہیں۔ یہ سنتے ہی بجلی پھر چمکی، اور وہ پردے میں غائب ہو گئی۔ قد آدم آئینہ سامنے تھا جس میں اس شوخ کا عکس پڑا، اور داغ نے اسی انتہائی حالت پر ایک برجستہ شعر تصنیف کر دیا۔ افسوس ہے میں وہ نادر شعر بھول گیا، مگر اس کا مضمون ابو نواس کے اس شعر سے ملتا جلتا تھا۔

وقد سقط الرداء عن منكبها   من التخميش وانحل الازار

اس روایت سے ظاہر ہے کہ داغ کے کلام میں شوخی اور عشق و محبت کی رنگینیاں اسی قسم کے لوازم اور خارجی اسباب سے پیدا ہوئی تھیں۔ موصوف نے اپنے خلوت کدے کو ایک پرستان بنا رکھا تھا۔ قلعہ معلی میں بچپن سے جوانی تک اسی ماحول میں پرورش پائی تھی، یہ بات دوسروں کو کہاں میسر ہو سکتی ہے۔ وہ ایک مصور تھے جو ہر ادا کی تصویر برمحل کھینچ لیتے تھے۔ ایک داستان کتابوں سے اور ایک داستان مصنفوں سے۔ یہ تھے عبد الرزاق صاحب! اور کچھ شوق زندہ کہانیوں کا۔ بس یہیں محدود تھی میری ان کی ملاقات!۔

اصغر گونڈوی

صغیر احمد صدیقی

سنہ ۱۹۳۳ء کا ذکر ہے میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا۔ میرا مضمون اردو ادب تھا۔ میں نے ایک مبسوط مضمون بعنوان کلام چکبست پر ایک تنقیدی نظر لکھا۔ احباب نے مشورہ دیا کہ یہ مضمون چھپ جائے۔ رائے ہوئی کہ الٰہ آباد ہی سے جو ایک مستند سرکاری رسالہ ہندوستانی نکلتا ہے اسی میں بھیجا جائے۔ اصغر مرحوم اس وقت اس رسالے کے مدیر تھے۔ میرے ایک دوست جو اصغر مرحوم سے واقف تھے مجھے ان کے پاس لے گئے۔ اس زمانے میں وہ شہر میں رہتے تھے ہم نے مکان پر پہنچ کر آواز دی اور بالا خانہ دیوان کی نشست گاہ میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر میں اصغر صاحب تشریف لائے۔ ادھیڑ عمر کے بزرگ صورت انسان، اکہرا قد، قدرے کھلتا ہوا سانولا رنگ۔ چہرے مہرے پر خوبصورت فرنچ کٹ داڑھی، آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک۔ ڈھیلا کرتا اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ روشن روشن، صاف، صاف، نکھرے نکھرے، گفتگو اور رفتار میں ایک خفیف سا خم جو بقول رشید احمد صدیقی معلوم ہوتا تھا کہ نیکی اور شرافت کے بوجھ سے پیدا ہو گیا ہے۔ متانت اور وقار کے ساتھ چہرے پر ایک تبسم خفیف پھیلا رہتا تھا۔ مختصر یہ کہ شخصیت میں وہ جذب اور کشش جو جاذبیت اور یگانگی کے احساس کی طرح

معمولی رسم تعارف کے بعد میں نے وہ مضمون ان کی طرف بڑھا کر درخواست کی کہ اپنے رسالے میں اس کو جگہ دیں۔ مضمون کو جہاں تہاں سے دیکھ کر بولے کہ زبان اور طرز بیان آپ کے شعرائے اردو کا نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے عرض کیا ”جی اس شعبے سے ابھی تک مستفید نہیں ہو سکا ہوں۔ جو کچھ آپ کے سامنے ہے اپنی کاوش کا نتیجہ ہے۔“ کہنے لگے کہ ”ہمارے یہاں تو بورڈ آف ایڈیٹرز ہے۔ وہ فیصلہ کرے گا کہ مضمون شائع کیا جائے یا نہیں۔ معاوضہ دیا جانا اب بند کر دیا گیا ہے۔ البتہ تجویز ہے جو ابھی منظور نہیں ہوئی ہے کہ پھر معاوضہ دیا جائے۔ آپ چند روز بعد تشریف لائیے تو میں بتا سکوں گا کہ فیصلہ کیا ہوا۔“

میں چند روز بعد گیا تو انھوں نے کہا کہ مضمون اگر آپ چاہتے ہیں تو چھپ سکتا ہے لیکن معاوضے کا مسئلہ ہنوز طے نہیں ہوا ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے مسکراتے ہوئے مضمون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایڈیٹوریل بورڈ کے ایک بزرگ نے جو مجھ سے بخوبی واقف تھے اور مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے بعض حصوں کو حذف کرنے کے لئے نشانات لگا دیے تھے۔ مجھے بہت ناگوار ہوا۔ میرے

پھر سے کا تغیر دیکھ کر مرحوم ہوئے صغیر صاحب قوت تام ضبط کا بے انتشار کا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ آپ کا مضمون اسی رسالے میں چھپے۔ میں آپ کو مولوی عبدالحق صاحب کے نام خط دیتا ہوں۔ آپ اس کو رسالہ اردو کے لئے بھیج دیجئے۔ یہ رسالہ معاوضہ بھی دیتا ہے۔" غرضیکہ وہ مضمون رسالہ اردو میں چھپ گیا اور اس کا معاوضہ بھی مجھے توقع سے زیادہ ملا۔ مگر اس مضمون سے زیادہ، رنج اور اس معاوضہ سے کہیں گرانقدر وہ جو سبق تھا جو اصغر مرحوم سے مجھے ملا اور جسے میں ہمیشہ یاد رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ "قوت تام ضبط کا بے انتشار کا نہیں۔"

مولانا اصغر حسین اصغر گونڈہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی تفضل حسین تھا جو قانون گو تھے۔ ابتدائی تعلیم کی تفصیل نہیں معلوم ہوئی۔ اس کے باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ویسے گورنمنٹ ہائی سکول گونڈہ میں داخل ہوئے تھے مگر آٹھویں جماعت کا امتحان نہ پاس کر سکے۔ ان کے ایک ہم جماعت جناب ڈاکٹر محمد حفیظ سید صاحب کا بیان ہے کہ امتحان میں ناکامیابی کے باوجود ان کی ذہانت و فطانت کے سب معترف تھے۔ اصغر مرحوم کو دل و دماغ کی جو صلاحیتیں فطرت نے ودیعت کی تھیں وہ درس و تدریس، آزمائش و امتحان کے رسوم و قیود کی کب متحمل ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ انہوں نے کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں کو کبھی بھی ان کی اس کمی کا احساس نہیں ہوا۔ ممکن ہے ان کا مطالعہ بہت وسیع نہ رہا ہو لیکن جتنا تھا عمیق تھا۔ وہ جو کچھ پڑھتے اس پر کافی غور کرتے اور ہر موضوع پر اپنی انفرادی رائے رکھتے تھے۔

اصغر صاحب کی ابتدائی زندگی باقاعدہ تعلیم و تربیت سے نا آشنا رہی۔ جوانی میں وہ بے راہ ہو گئے اور جنسیات میں بالکل ڈوب گئے۔ جو لوگ جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے کچھ نہیں چھوڑا۔ میں کہ ان کی زندگی کے آخری تین سالوں میں ان کو کافی قریب سے دیکھ چکا ہوں، آج بھی ان پر حیرت کرتا ہوں۔ وہ شگفتگی اور سنجیدگی کا بے مثل امتزاج، وہ فکر و عمل کی ہم آہنگی اپنے چاروں طرف طہارت و پاکیزگی کی ایک فضا لئے ہوئے ——— کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اپنے سینے سے واقعی "متاع داغ عصیاں" لگائے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جگر ان کے تقدس میں تھا اور جو درگذر اور رواداری ان کے مزاج میں تھی وہ شاید اسی سبب تھی کہ وہ خود لغزش کر کے سنبھل چکے تھے۔

قصہ مختصر ایک دن آیا جب اصغر نے محسوس کیا کہ جسمانی آسودگی روح کی تشنگی کو ناقابل برداشت حد تک تیز کر چکی ہے اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ اصلاح شیخ کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ یہ سراغ میں تھے شیخ محمد عمر صاحبؒ کے جو قاضی عبدالغنی صاحبؒ کے پیر بھائی تھے اور تھانہ بھون میں رہتے تھے۔ مراد آباد پہنچ کر انہوں نے لوگوں سے پتہ پوچھا تو انہوں نے قاضی صاحب کی طرف اشارہ کیا کہ یہ شیخ محمد عمر کا صحیح پتہ بتا سکیں گے۔ قاضی صاحب اس وقت پلیٹ فارم کے ایک گوشہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ ان سے پتہ پوچھ کر اپنی گاڑی کے ڈبے میں آکر بیٹھ گئے۔ کوئی چیز خرید کر پیسے گن رہے تھے جو کچھ ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ فارم پر گر پڑے۔ ٹھیک اسی وقت قاضی صاحب ادھر سے گذرے۔ انہوں نے نہایت بے تکلفی سے کہا کہ ذرا میرے پیسے اٹھا دیجئے۔ قاضی صاحب نے نہایت فراخ دلی سے یہ خدمت انجام دی۔ پیسے چن کر ان کے ہاتھ پر رکھے اور خود بھی اسی ڈبے میں بیٹھ گئے۔ گاڑی جب منزل پہنچی تو قاضی صاحبؒ اتر پڑے اور ساتھ ہی ساتھ اصغر صاحب بھی۔ قاضی صاحب نے کہا میں کہ آپ کو تو آگے جانا ہے تھا۔ اصغر صاحب نے جواب دیا کہ میں نے ارادہ بدل دیا ہے آپ کے ساتھ چلوں گا۔

میں سمجھا تھا مجھے ان کی طلب ہے اصغر — کیا خبر تھی وہی لے لیں گے سراپا مجھ کو

قاضی صاحبؒ نے اسی وقت اپنے ایک مرید تہور علی صاحب تحصیلدار گونڈہ کو لکھا کہ تفضل حسین صاحب کو مطلع کر دیں کہ ان کا لڑکا میرے پاس آگیا ہے۔

اصغر مرحوم نے قاضی عبدالغنی صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے مرید ہو گئے یہی واقعہ وہ نقطہ ہے جہاں سے اصغر کی زندگی مڑتی ہے قطعی طور پر اور ہمیشہ کے لئے۔

اب وہ زماں نہ وہ مکاں، اب وہ زمیں نہ آسماں!
تم نے جہاں بدل دیا آکے مری نگاہ میں!

ان قوتوں اور صلاحیتوں کا جو اصغر صاحب کو معصیات کی انتہائی پستیوں میں کھینچ لے گئی تھی کتنا مکمل اور شاندار ارتفاع ہوا اس کا اندازہ آج بھی "نشاط روح" اور "سرود زندگی" کے صفحات سے کیا جا سکتا ہے جن میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو تہذیب اور اخلاق کے پاکیزہ ترین معیار سے گرتا ہو۔ صرف "نظر" سے اتنے مکمل علاج کی کوئی اور نظیر کم از کم اردو ادب کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اصغر کی زندگی بدل گئی، ان کی شخصیت نے ایک نیا جامہ پہنا اور اپنی عمر کے آخری لمحہ تک وہ ہر حیثیت سے اور ہر معاملہ میں ایک صاحب ذوق و حال رہے۔

گونڈہ واپس ہوئے تو پھر ان کا دامن پکڑا گیا۔ وہ ترغیبیں اپنی پوری طاقت سے ان کو پھر اپنی طرف کھینچنے کے لئے تیار تھیں۔ کشاکش شروع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ تائب ہو کر ان کی نئی زندگی کے شریک ہو گئے۔

اصغر صاحب کو اپنے پیر سے والہانہ شیفتگی تھی اور اکثر حاضری دیا کرتے تھے۔ قاضی صاحبؒ بھی ان کے ساتھ خصوصیت برتتے تھے۔ ان کو بابا اصغر کہا کرتے تھے۔ ایک دن ان سے کہا کہ تہجد کے وقت تمہاری آواز نہیں سنائی دیتی، تم بھی اللہ کا ذکر کیا کرو۔ چنانچہ دوسرے دن سے انھوں نے بھی اوروں کی طرح ذکر کرنا شروع کیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد آواز گلوگیر ہو گئی اور شدت گریہ سے مجبور ہو کر اٹھ آئے اور روتے رہے۔ پھر جب کئی کوششوں کا یہی نتیجہ ہوا تو ذکر کا ترک کر دیا۔ ایک دن قاضی صاحبؒ نے پھر کہا کہ بابا اصغر تمہاری آواز نہیں سنائی دیتی تو جواب دیا "حضرت کیا کروں، مجھ پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور میں ناکام رہ جاتا ہوں"۔ قاضی صاحبؒ نے کہا "اچھا تم ذکر نہ کیا کرو۔ میں مجبور ہوں، فرض، واجب اور سنت کے ترک کی اجازت نہیں دے سکتا۔ لیکن ان کے علاوہ جملہ عبادات ترک کر سکنے کی اجازت دیتا ہوں"۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نے اصغر مرحوم کو کبھی اوراد و وظائف میں مستغرق نہیں پایا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ضرور تھے مگر اس میں کوئی غلو نہیں تھا اور نہ دوسروں سے اس معاملہ میں سخت گیری کرتے تھے۔ خود جتنی بھی عبادت کرتے نفس عبودیت کی انتہائی گہرائیوں کے ساتھ۔

اپنی زندگی کے آخری زمانے میں جب فالج سے صاحب فراش تھے یہ آرزو تھی کہ منگلور جا کر قاضی صاحبؒ کے مزار پر حاضری دیں۔ طبیعت سنبھلی تو روانہ ہو گئے۔ مجھے ساتھ لے لیا۔ میری آزاد خیالی سے واقف تھے۔ راستے میں مسکرا کر بولے "سہیل تو ہیں ہی آپ مگر وہاں تو صوم و صلوٰۃ کی ہے۔ آپ کیا کریں گے؟" میں نے کہا "وہاں پہنچ کر پڑھنے لگوں گا"۔ کہنے کو تو میں کہہ گیا مگر کچھ متفکر سا ہو گیا۔ مسکرا کر بولے "کیا بات ہے؟" میں نے دبی زبان سے پوچھا "فجر کی نماز وہاں کس وقت پڑھی جاتی ہے؟" بہت ہنسے۔ کہنے لگے "فجر کے وقت"۔ میں نے عرض کیا "ایک فجر کا وقت وہ سمجھا جاتا ہے جسے میں رات کا پچھلا پہر کہتا ہوں، جب تارے آسمان پر اپنی پوری تابانی سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ نیچے کالا اندھیرا ہوتا ہے، آنکھیں کھولئے تو مرچیں سی لگتی ہیں۔ پاؤں کہیں ڈالئے پڑتا کہیں ہے۔ دوسرا وقت وہ ہے جسے عرف عام میں صبح کہتے ہیں اور جو طلوع آفتاب سے کچھ قبل ہوتی ہے اور کچھ بعد تک بھی رہتا ہے"۔ ہنس کر بولے "آپ جماعت میں نہ شامل ہوں۔ طلوع آفتاب سے کچھ قبل ہی پڑھ لیں تو بہت ہے"۔ بہر حال منگلور پہنچ کر ہوا یہ کہ اکتوبر کی خنک رات تھی، میں گہری نیند سو گیا۔ اٹھا تو دن کافی چڑھ گیا تھا۔ مولانا سرہانے کھڑے ہنس رہے تھے۔ میں اپنا کمبل اوڑھے ہوئے تھا اور اس پر دوہرا ان کا بھی کمبل پڑا ہوا تھا جو نماز کو جاتے ہوئے انھوں نے میرے اوپر ڈال دیا تھا۔ رواداری یہاں تک تھی کہ خود میری صفائی میں کہا کرتے تھے کہ بھئی کوئی آسانی سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ نماز تو بہت پٹ چکنے کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ اپنے پیر کا انتہائی ادب و احترام کرتے تھے اور اس تعلق کا علی الاعلان ذکر بھی کیا کرتے تھے۔ اپنے کلام میں بھی کہیں واضح طور پر اشارہ نہیں

کیا ہے۔ بے تکلف احباب سے کبھی کبھی ان کے اوصاف کا ذکر کرتے تھے۔ مجھ سے ان کے جس وصف کا اکثر ذکر کرتے تھے وہ وہی تھا جسے کہتے ہیں "درویشی صفت باش و کلاہ تتری دار" قاضی صاحبؒ رئیسانہ شان سے رہتے تھے مگر اس کے باوجود مزاج فقیرانہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ جو نفاست اصغر کی شخصیت میں تھی وہ بھی قاضی صاحبؒ کا طفیل تھا۔ بہت رکھ رکھاؤ سے رہتے تھے جس میں مزاجی خصوصیت زیادہ اور کوشش والتزام کا شائبہ کم پایا جاتا تھا۔ سر پر پٹے اور چہرہ پر فرنچ کٹ داڑھی موزوں و مناسب لباس پاکیزہ اور نفیس، کھانا بھی عمدہ کھاتے تھے اور عمدہ کھلاتے تھے اور بقول شوکت صاحب تکلف کرتے تھے مگر تکلف کی طرح نہیں۔ غرض کہ ان کے چاروں طرف سادگی، نفاست، پاکیزگی کی ایک فضا سی رہتی تھی جو ان کے جمالیاتی ذوق کی آئینہ دار تھی۔

اصغر مرحوم کے جذبات و خیالات میں توازن کے ساتھ، فکر و عمل میں بھی ربط تھا۔ وہ زندگی کو ایک مخصوص "منفرد زاویہ نگاہ" سے دیکھتے تھے اور فرسودہ قدروں سے ہمیشہ دامن بچاتے تھے۔ یہ چیزیں ان کی شاعری ہی میں نہیں ان کے ہر عمل میں ہوتی تھیں۔ زندگی کے ہر معاملے میں وہ ایک بلند کردار اور اونچی شخصیت کا ثبوت دیتے تھے۔ ریلوے انجینئرنگ کے دفتر میں ملازم تھے۔ ایک ٹھیکہ دار نے نذرانہ دیا۔ ان کو لینے میں تکلف ہوا۔ احباب نے مشورہ دیا کہ لے لیجئے یہ رشوت نہیں بلکہ نذرانہ ہے۔ مگر ضرورت مند ہونے کے باوجود آپ کی طبیعت نے گوارا نہ کیا اور وہ روپیہ واپس کر دیا۔ نظم و نثر پر آپ کی یکساں قدرت دیکھ کر بعض اخبارات و رسائل آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر آپ اس خوف سے انکار کر دیا کرتے تھے کہ اختیارات کل نہ ہونے کے سبب ضمیر فروشی کرنی پڑے گی۔ انڈین پریس کے جس شعبہ میں ملازم تھے اس میں تخفیف کی جانے لگی تو چونکہ پریس کے مالک آپ کے کام سے خوش تھے آپ کی بجائے ان صاحب کو برطرف کرنا چاہتے تھے جو آپ سے پہلے سے ملازم تھے۔ آپ رضا مند نہ ہوئے اور کہا کہ برطرف کیجئے تو پہلے مجھے کیجئے کیونکہ میں بعد میں اس شعبہ میں آیا ہوں۔ مجبوراً پریس کو دونوں ہی صاحبان کو رکھنا پڑا۔ رسالہ ہندوستانی کی ادارت کے امیدوار تھے۔ معاملہ صرف اس پر اٹکا تھا کہ آپ انگریزی بھی جانتے ہیں یا نہیں۔ انگریزی کی باقاعدہ تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی۔ کیسے ہاں کر دیتے۔ انکار کر کے چلے آئے۔ بعد میں احباب نے اصرار کر کے سر تیج بہادر سپرو صدر اکیڈیمی کے پاس سر شاہ محمد سلیمان مرحوم کا وہ خط بھیجا جس میں انہوں نے اپنی ایک انگریزی کتاب کا اردو میں ترجمہ کرنے پر اصغر مرحوم کو یہ داد دی تھی کہ اگر میں بھی ترجمہ کرتا تو اس سے بہتر نہ ہو سکتا۔ ملازمت مل گئی مگر اس کو حاصل کرنے کے لئے مولانا کوئی ایسا ادعا کر کے بیٹھتے جس کی اجازت ان کا ضمیر نہ دیتا ہو۔ معاملات زندگی میں تو انتہائی طفلانہ سادگی کا ثبوت دیتے تھے۔ سرود زندگی کی ایک ہزار جلدیں خود چھپائی تھیں۔ معاملے کے تجارتی پہلو سے ناآشنا ہونے کے سبب آٹھ سو جلدیں بیکار پڑی ہوئی تھیں۔ ایک مشہور فرم کے ایجنٹ کے حوالے کیں اور اس کو دوبارہ چھاپنے کی اجازت بھی دی یہ کہتے ہوئے کہ آپ جو مناسب سمجھیں کریں میں ان معاملات میں کوئی دخل نہیں رکھتا۔ اس سادگی کا جو نتیجہ ہوا ہوگا ظاہر ہے۔

اصغر کی شخصیت کے جو خد و خال اوپر بیان کئے گئے ہیں وہی بلا کم و کاست ان کے کلام میں بھی ملتے ہیں۔ زبان اور اسلوب میں ان کے مزاج کی نفاست اور پاکیزگی، موضوع اور مواد میں وہی مخصوص اور منفرد طرز فکر، وہی عام قدروں سے بچ نکلنے کی کوشش۔ اصغر کم گو تھے۔ غزل گو شعراء میں شاید ان کی واحد مثال ہے کہ جو سوچتے تھے اور محسوس کرتے تھے وہی اور اتنا ہی کہتے تھے۔ محض قافیہ و ردیف کے مطالبوں سے مجبور ہو کر یا مشق و مزاولت کے زور میں وہ کبھی کچھ نہ کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام سے ان کا فلسفۂ زندگی آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے اور اگر وہ کچھ مزید کہتے تو صرف اپنے کو دہراتے رہتے۔

ان کے کلام کے مخصوص موضوع اور مضامین کی بنیادی ہم رنگی پر ایک صاحب نے کہا کہ مولانا آپ کے یہاں تنوع نہیں بلکہ ایک ہی قسم کی چیز ملتی ہے۔ جواب ملا تو اس میں برائی کیا ہے جب تک وہ چیز معیار کے مطابق ملتی ہے۔ میری دکان میں ایک ہی قسم کا سامان

ہجوم پہنچاتی ہے اور جب تک وہ سامان معیاری ہے دوکان کی ساکھ بڑھتی جا رہی ہے۔ ہاں البتہ میں مضامین کا کباڑی نہیں ہوں جس کی دوکان پہ بھانت بھانت کی اچھی بری بکثرت قسم کی اشیا رہتی ہیں۔

شاعری پیشہ کے طور پر نہ کرتے تھے اور نہ شاعر کی حیثیت سے اپنے کو پیش کرنا پسند کرتے تھے۔ مشاعروں میں شرکت کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اور اگر کبھی شرکت کرتے بھی تھے تو معاوضہ لینا اپنی شاعرانہ وقعت و شان کے منافی سمجھتے تھے۔ دوسروں کو شاعری کی ترغیب دینے کے بجائے طرح طرح سے روکتے تھے۔ مشاعروں سے ان کی گریز پائی کا ایک ذاتی تجربہ مجھ کو بھی ہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء کا مسلم ہوسٹل کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ مولانا کو میں نے طرح بھجوائی اور انہوں نے غزل بھی کہی۔ احباب کو یقین تھا کہ میری وساطت سے اصغر صاحب کی مشاعرہ میں شرکت ضرور حاصل ہو جائے گی۔ مگر جب وقت آیا۔ اور میں نے کہا کہ چلئے تو اصغر صاحب نے صاف انکار کر دیا اور ایسے سنجیدہ انداز سے جس میں شاعرانہ تکلف کا شائبہ بھی نہ تھا۔ میں اس انکار پر بہت متحیر ہوا۔ پھر میں نے کہا کہ غزل آپ نے کیوں کہی تو بولے کہ جی یہ تقاضا غزل کا ہے بیزار نہیں۔ غزل لیجئے جا کر اسے کسی سے پڑھوا دیجئے۔ میں نے واپس آکر احباب کو یہ خبر دی کہ اصغر صاحب نہیں آرہے ہیں تو لوگوں کو بھی مایوسی ہوئی اور مجھے طعنے دیئے گئے کہ بس رہ گئی صبح و شام کی حاضری اپنا سا منہ لے کر چلے آئے۔ میں واپس ہوا اور مولانا کی نشست گاہ میں پہنچ کر شیروانی کھونٹی پر ٹانگی اور کچھ اس انداز سے بیٹھا کہ مولانا کو پوچھنا پڑا کہ کیا ارادہ ہے۔ میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ دو تین روز بعد جب اس مشاعرہ کی یاد اور وہ سبکی جو اس سلسلے میں میری ہو رہی ہے لوگوں کو فراموش ہو جائے گی تب میں ہوسٹل میں واپس ہوں گا۔ جب تک خدمت میں حاضر رہوں گا۔ اصغر مرحوم بادل نخواستہ تیار ہو گئے۔ محفل میں آکر ڈائس کے پیچھے ایک بنچ پر بے پروائی سے بیٹھ گئے۔ جب ان کی باری آئی غزل جناب حفیظ جالندھری کو پکڑا دی۔ انہوں نے ڈائس پر کھڑے ہو کر مطلع پڑھا۔

وہ نغمہ بلبل رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

اک شور تحسین و آفرین محفل سے جو بلند ہوا تو حفیظ صاحب نے اس داد کو جو انہیں مخاطب کر کے دی جا رہی تھی دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر اصغر صاحب کی طرف پھینکنا شروع کیا۔ پھر کیا تھا لوگوں کا اصرار بڑھا اور صدر مشاعرہ سر تیج بہادر سپرو نے بھی درخواست کی کہ اصغر صاحب ڈائس پر تشریف لائیں۔ کشاں کشاں لائے گئے۔ بہت خاموشی اور وقار سے چہرے پر ایک خفیف سا تبسم لئے بیٹھے رہے۔ وہ شاعرانہ ادائیں کہ یہ شعر ملاحظہ کیجئے گا'' ذرا غور کیجئے گا یہ شعر شاید کسی قابل ہو ان میں کہاں۔ مرصع غزل تھی۔ ہر شعر پر محفل جھوم جاتی تھی۔ یہ کبھی کبھی تسلیم کر لیتے مگر داد طلب انداز سے نہیں۔

اصغر مرحوم وسیع المشرب اور کثیر الاحباب تھے۔ ان کی صحبت میں ہندو بھی شریک ہوتے اور مسلمان بھی۔ آزاد خیال حضرات بھی اور بہت ہی متورع و متقشف قسم کے بزرگ بھی۔ سب کو ان کی ہم نوائی پر ناز تھا۔ اپنے احباب سے بہت خلوص و محبت سے پیش آتے تھے۔ صحبتیں بہت دلچسپ اور مفید ہوتی تھیں۔ موضوعات گفتگو متنوع اور وسیع ہوتے۔ مذہب و فلسفہ، شعر و ادب سبھی پر خیال آرائی ہوتی۔ اصغر مرحوم خوش مذاقی کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ طبیعت بذلہ سنج پائی تھی اور گفتگو کا انداز بہت دلنشیں تھا۔ خود ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے ان کی صحبتوں کی فضا بہت شگفتہ و پرسکون ہوتی اور کوئی بے کیف نہ ہونے پاتا۔

ان کے احباب نے ان کو کبھی مایوس و پریشان، ملول یا افسردہ نہیں پایا۔ یہ بھی قاضی صاحب کا فیض روحانی تھا کہ اصغر صاحب ہر حال میں مسرور و مطمئن اور شگفتہ رہتے تھے۔ یہی نہیں ان کی طمانیت، آسودگی اور سکون ان کے ہم نشینوں میں بھی منتقل ہو جاتا۔ آپ کبھی الجھن یا پریشانی میں ہوتے اگر اصغر صاحب کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے آتے تو دل و دماغ کی فضا بدل گئی۔ حیرت تو اس پر ہے کہ یاد بھی نہ رہ سکے کہ وہ خوش

حالانکہ کبھی کسی نے ان کو تنگدست نہ پایا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ مسرت و طمانیت داخلی کیفیات ہیں جن کو ایک صاحب دل بڑی حد تک خارجی حالات سے بے نیاز بنا سکتا ہے۔

آخری زمانے میں پنڈت شری نرائن مصرا جو اس وقت شعبۂ انگریزی الٰہ آباد یونیورسٹی میں لکچرار تھے اور اب ساگر یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ہیں ان کے بہت قریب آ گئے تھے۔ میں پنڈت جی موصوف کا شاگرد تھا اور اصغر صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دونوں ایک جان دو قالب ہیں۔ پنڈت جی ادب اور فلسفہ کے عالم متبحر ہیں اور شعر و سخن کا بہت سنجیدہ اور بلند مذاق رکھتے ہیں میرا خیال ہے کہ اصغر صاحب کے نظریۂ شعر و ادب پر پنڈت جی کے خیالات کا بھی اثر پڑا ہے۔

اصغر مرحوم جب فالج کے مرض میں مبتلا ہوئے تو ان کی دیکھ بھال اور تیمارداری کی غرض سے پنڈت جی ان کو شہر کے مکان سے منتقل کرا کے اپنے قریب یونیورسٹی کے پڑوس میں لے آئے۔ بلویڈیر پریس کے احاطے میں ایک چھوٹی سی کوٹھی کرائے پر لی گئی۔ ۲۹ نومبر ۱۹۳۶ء کی شب میں جب فالج کا آخری دورہ پڑا پنڈت جی بلائے گئے۔ انھوں نے اصغر صاحب کو بے ہوش پایا۔ پکارا تو آنکھ کھولی، مسکرائے اور پھر ہمیشہ کے لئے بند کر لی۔ صبح کو مجھے جب انتقال کی خبر ملی تو میں نے جا کر دیکھا۔ اس آخری تبسم کی جھلک چہرے پر باقی تھی۔ معاً ان کا یہ شعر یاد آیا۔

کائنات دہر کیا روح الامیں بیہوش تھے
زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

اپنی وصیت کے مطابق مزار شاہ محب اللہ الٰہ آبادی کے پائنتی مدفون ہوئے۔

منشی محمد الدین فوق

محمد عبداللہ قریشی

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد دلی کے آسمانِ ادب کے چند ٹوٹے ہوئے ستارے گردشِ روزگار کے ہاتھوں لاہور پہنچے ان میں مولانا الطاف حسین حالی۔ مولانا محمد حسین آزاد۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور مرزا ارشد گورگانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے دلی مرحوم کی یادیں یہاں بھی شعر و سخن کی محفلیں جمائیں اور اس طرح سرزمینِ پنجاب کے لوگ ان ادبی روایات اور تہذیبی و ثقافتی قدروں سے پہلی مرتبہ واقف ہوئے جو اس سے پیشتر دلی سے نکل کر اودھ۔ مرشد آباد۔ عظیم آباد (پٹنہ) اور حیدر آباد دکن میں اپنا گھر بنا چکی تھیں۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ پنجاب میں پہلی نسل کے لوگوں نے تو حالی۔ آزاد۔ فیض اور ارشد وغیرہ کو اردو پڑھتے ہوئے سنا اور دوسری پشت میں ہمارے ہاں جو لوگ پیدا ہوئے ان میں سر عبدالقادر۔ علامہ اقبال۔ خان احمد حسین خان۔ مولوی ظفر علی خان۔ چوہدری خوشی محمد ناظر۔ میر غلام بھیک نیرنگ۔ میاں شاہ دین ہمایوں۔ مولوی محبوب عالم۔ مولوی انشاء اللہ خاں۔ مولوی محرم علی چشتی۔ پنڈت تیج نرائن شمیم اور منشی محمد الدین فوق وغیرہ کا نام سرفہرست ہے۔ یہ بزرگ اس وقت بھی کمالِ فن کے اعتبار سے استادانِ فن تھے۔ اور آج بھی اس میدان میں ان کا کوئی مدِ مقابل نظر نہیں آتا۔ مولانا فخر الملک علوی مدیر اسٹار لکھنؤ جو مئی یا جون ۱۹۳۵ء میں لاہور آئے پنجاب میں اردو کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "اب سے بیس تیس سال قبل منشی محمد الدین فوق اور میر غلام بھیک نیرنگ کے سوا شاید کوئی تیسرا پنجابی شاعر ایسا نہ تھا جس کا کلام زبان کی معمولی غلطیوں سے پاک اور جس کی انشا صحیح اردو میں شمار ہونے کے لائق ہو۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب اس وقت اہلِ پنجاب میں شمار نہیں کئے جا سکتے تھے۔ مگر نئی نسل نے بہت سے ایسے اہلِ قلم پیدا کر دئے ہیں جن کی نظم و نثر اہلِ زبان کے معیار پر اگر نہیں تو زبان دانوں کے معیار پر ضرور پوری اترتی ہے اور آثار ظاہر بتاتے ہیں کہ ایسے اصحاب کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے گا۔
> (نیرنگِ خیال لاہور بابت اگست ۱۹۳۵ء)

منشی محمد الدین فوق فروری ۱۸۷۷ء میں موضع کوٹلی ہرنارائن (ضلع سیالکوٹ) میں پیدا ہوئے اور ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو لاہور میں وفات

بن گئے۔ انہوں نے ایک صحافی۔ ایک ادیب۔ ایک مورخ اور ایک شاعر کی حیثیت سے اردو زبان کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ وہ اپنے پیچھے اپنے اتنے کارنامے چھوڑ گئے ہیں کہ دنیا انہیں مدتوں نہیں بھلا سکتی۔ ان کی تصانیف کے انتخاب نقوش کو اگر نکھارنے اور اجالنے کا موقع ملا تو وہ ہمارے ادب کا نہایت قیمتی سرمایہ ثابت ہوں گے اور منشی صاحب کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

منشی صاحب سے میرا خون کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ محض دوستی تھی جس میں خود غرضی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ ان سے میری پہلی ملاقات کو بھی ایک اتفاق ہی سمجھنا چاہیے۔ علامہ تاجور نجیب آبادی نے میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز کے سرمایہ کی مدد سے اردو مرکز کی بنیاد رکھ کر ہندوستان کی مقتدر ادبی شخصیتوں اصغر گونڈوی، یاس عظیم آبادی، جگر مراد آبادی اور سیماب اکبر آبادی وغیرہ کو لاہور بلایا۔ اپریل ۱۹۳۲ء میں علامہ سیماب کے نامور شاگرد ساغر نظامی نے مجھے یہ مژدہ سنایا کہ دفتر پیمانہ آگرہ سے مستقلاً لاہور منتقل کر دیا گیا ہے۔ چونکہ علامہ سیماب اور ساغر نظامی سے میرے نیازمندانہ تعلقات تھے۔ اس لئے ان کے لاہور آنے کی خبر میرے لئے مسرت انگیز تھی۔ ایک دن میں ان سے ملنے کے لئے گیا۔ وہ یکی دروازہ کے اندر ایک مکان میں اقامت گزیں تھے۔ یہ مکان اس حویلی کے بالکل قریب تھا جہاں سے کسی زمانے میں منشی ہرسکھ رائے پنجاب کا سب سے پہلا ہفتہ وار اردو اخبار کوہ نور شائع کیا کرتے تھے۔ وہاں سیماب، ساغر اور منظر صدیقی کے علاوہ ایک اور بزرگ تشریف فرما تھے۔ دوہرا جسم۔ میانہ قد۔ کھلتا ہوا رنگ۔ بھرا ہوا صحت مند اور باوقار چہرہ۔ مدور ترشی ہوئی داڑھی جس کے کالے بال کچھ کچھ چمک رہے تھے۔ سادہ لباس۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ یہ ایسی شخصیت تھی جس نے مجھے غیر ارادی طور پر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ تعارف کا مرحلہ آیا تو علامہ سیماب نے ان الفاظ میں ان کی جان پہچان کرائی: ”کیا آپ انہیں نہیں جانتے؟ یہ آپ کے لاہور کے مشہور اخبار نویس اور مورخ منشی محمد الدین فوق ہیں۔“ یہ میری اور منشی صاحب کی پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد میں نے علامہ سیماب، ساغر نظامی اور منظر صدیقی کے اعزاز میں دعوت دی۔ جس میں چوہدری خوشی محمد ناظر، پروفیسر تاثیر، پروفیسر محمد علم الدین سالک، حکیم یوسف حسن اور دیگر دوستوں کے علاوہ منشی محمد الدین فوق بھی شریک تھے۔ اس محفل میں مختلف موضوعات پر بحثیں ہوئیں۔ سب نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ اور پہلی ملاقات میں منشی محمد الدین فوق کے متعلق میرے دل میں جو تاثر پیدا ہوا تھا وہ اور گہرا ہو گیا۔ اور یہی تعلق خاطر مجھے آہستہ آہستہ ان کے قریب لے گیا۔

منشی صاحب شیرانوالہ دروازہ کے باہر رہتے تھے۔ جب تک اخبار کشمیری جاری رہا نیچے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ اس کے بعد مکان کی پہلی منزل میں اپنی نشست کے لئے ایک کمرہ مخصوص کر لیا تھا۔ جس کی بڑی بڑی الماریوں میں ہر قسم کی کتابیں بھری رہتی تھیں۔ ان میں ان کی ذاتی مطبوعات بھی تھیں اور دوسری کتابیں بھی۔ منشی صاحب کو کتابیں جمع کرنے کا اتنا شوق تھا کہ لاہور کے تمام اخبار نویسوں میں مرحوم محبوب عالم مدیر پیسہ اخبار اور مرحوم انشاء اللہ مدیر وطن کے بعد آپ ہی کی ذاتی لائبریری قابل ذکر تھی۔ جس میں ہر سال مفید کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

میرا معمول تھا کہ ہفتہ میں ایک بار ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ پریشان و ملول جاتا تو ان کی صحبت سے ہشاش بشاش اٹھتا۔ جی گھبراتا تو وہاں جاتا اور ان کی پر لطف باتوں سے غم غلط ہو جاتا۔ خالی الذہن جاتا تو معلومات کے ایسے نادر و لطیف نکتوں سے بہرہ مند واپس آتا جو شاید مدتوں کے مطالعہ یا مشاہدہ سے حاصل نہ ہو سکتے۔ خوش ہوتا تو وہاں ضرور جاتا اور جب کہیں اور نہ جانا ہوتا تو وہاں جاتا۔ جب واپس آنے کی اجازت چاہتا تو اٹھنے نہ دیتے۔ چائے، لسی، شربت، میسر جو کچھ ہوتا اس سے تواضع کرتے اور اگر کسی وجہ سے میرے جانے میں ناغہ ہو جاتا تو وہ دوسرے دن خود میرے ہاں تشریف لاتے اور نہ آنے کا سبب دریافت کرتے۔ ان کے اس معمول میں مرتے دم تک فرق نہ آیا۔

فوق صاحب کے پاس اٹھنے بیٹھنے سے کشمیر کی محبت میری رگ رگ میں سما گئی اور میں دن رات کشمیر کے خواب دیکھنے لگا۔ میں ہر سال کشمیر جاتا۔ پروفیسر محمد علم الدین سالک اکثر میرے ساتھ ہوتے۔ کبھی وہ نہ جاتے اور میں اکیلا ہوتا تو فوق صاحب مجھے ہر قسم کا کھانا نہ کھانے دیتے۔

گھر میں جو کچھ پکتا وہ بامزہ کھلاتے تھے۔ کسی عزیز یا دوست کے ہاں دعوت ہوتی تو گھر کے فرد کی طرح مجھے شریک کرتے۔ گاؤں جاتے تو اپنے ہمراہ لے کر جاتے۔ انڈا۔ مرغی۔ سیب۔ ناشپاتی۔ چلغوزہ۔ انار۔ بادام۔ اخروٹ وغیرہ جی بھر کھلاتے۔ پھلوں کے لئے ان کے چچا منشی غلام محمد خادم کا وسیع باغ موجود تھا۔ انڈے مرغی کا انتظام وہ یوں کرتے کہ لاہور سے اپنی روانگی کے تین ماہ قبل کسی عزیز کو لکھ دیتے کہ میرے نام کی ایک دو مرغیاں خرید کر انڈوں پر بٹھائیں اور بچے نکلوائیں۔ اس طرح جب وہ وہاں پہنچتے تو دس بیس مرغیاں تیار ملتیں اور گوشت کی حاجت نہ رہتی۔ یہ ان کی دور اندیشی اور کفایت شعاری کی ایک ادنیٰ مثال تھی۔

فوق صاحب اپنے گھر میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے رہن سہن کے طریقوں میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔ اس کے باوجود ان کی زندگی باقاعدہ اور باوقار نظر آتی تھی۔ عام طور پر علی الصبح بیدار ہو جاتے تھے صبح کی سیر کو جانا ان کی پختہ عادت تھی جسے انہوں نے بیماری کے سوا کبھی ترک نہ کیا۔

لکھنے پڑھنے کے سلسلے میں بھی وہ کوئی خاص اہتمام نہ برتتے تھے۔ کبھی میز کرسی پر بیٹھ کر، کبھی چھوٹی سی پلنگڑی پر نیم دراز ہو کر اور کبھی تخت پوش یا زمین پر دری بچھا کر تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھتے تھے۔ البتہ ایک عادت قابل ذکر ہے کہ جب وہ کوئی کتاب یا رسالہ پڑھتے تو یونہی سرسری طور پر پڑھ کر ایک طرف نہ رکھ دیتے بلکہ اس میں سے قابل استعمال مواد پر نشان کرتے جاتے تھے۔ کس موضوع پر کونسی چیز کہاں استعمال ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں ان کی نظر بہت گہری تھی۔ انہوں نے الگ الگ لفافے بنا رکھے تھے جن میں الگ الگ مضامین کے تراشے جمع کرتے رہتے تھے پھر جب کوئی کتاب لکھتے تو ان تراشوں اور یادداشتوں کی وجہ سے حوالے تلاش کرنے میں انہیں کوئی دشواری نہ ہوتی۔ مہینوں کا کام دنوں میں ختم ہو جاتا۔

گھر والوں سے ان کا سلوک بہت مشفقانہ تھا۔ انہوں نے تین شادیاں کیں۔ پہلی دونوں بیویاں صاحب اولاد تھیں۔ تیسری سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جسے گھریلو جھگڑوں کے لئے معقول وجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ فوق صاحب کی زندگی میں یہ جھگڑے نہایت زور شور سے سر اٹھاتے تھے لیکن ان کا ذہنی توازن ایسے حالات میں برقرار رہتا تھا اور وہ ہر ایک کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرتے تھے۔

فوق صاحب ہنگامہ خیزیوں سے الگ اپنے گوشۂ عافیت میں رہ کر خاموش کام کرنے کے علاوہ خلوص و محبت، استقلال و ہمت، ظرافت و شوخی اور جذبۂ ایثار و شوقِ خدمت کی دولت سے مالامال تھے ؎

بہت لگتا تھا جی صحبت میں ان کی   وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھے

ان کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، خوش اخلاقی، خوش مذاقی اور خوش مزاجی کی وجہ سے ان کے پاس بیٹھنے اٹھنے میں خاص لطف حاصل ہوتا تھا۔

یہ باتیں کچھ میرے ساتھ ہی خاص نہیں تھیں۔ ان کے تمام دوست اور ملنے والے ان کی شگفتہ مزاجی سے متمتع ہوتے تھے۔ وہ بچپن ہی سے ہنس مکھ تھے ایسی بات بناتے اور اس قسم کے برجستہ فقرے چست کرتے تھے کہ بس مزا آ جاتا تھا۔ خود سنایا کرتے تھے کہ جب وہ گھڑتل کا پرائمری سکول پاس کرنے کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے قصبہ جامکے کے مڈل سکول میں داخل ہوئے تو بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ بورڈنگ کی زندگی عام طور پر شرارتوں سے بھری ہوتی ہے۔ دن رات دل لگی، تفریح اور ہنسی مذاق کے سلسلے ہی چلتے رہتے ہیں۔ لڑکے عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ استادوں سے دو دو ہاتھ کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

ایک رات بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے لڑکوں کو شرارت جو سوجھی تو انہوں نے ایک تماشا کیا۔ کوئی استاد بنا، کوئی شاگرد۔ ایک لڑکے نے سبق سنانا شروع کیا اور غلط پڑھا۔ ماسٹر نے ٹوکا۔ اس نے پھر غلط پڑھا۔ استاد نے بنچ پر کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد ایک طالب علم نے دوسرے طالب علم کو چھیڑا۔ اس نے ماسٹر سے شکایت کی۔ ماسٹر نے ایک کو جرمانہ کیا اور دوسرے کو رجسٹر سے نام خارج کرنے کی دھمکی دی۔ پھر

ایک لڑکے نے بتایا کہ گھروں میں جا کر کس طرح جھوٹے بہانے بنائے جاتے ہیں۔ جیب خرچ کے لئے کس طرح پیسے طلب کئے جاتے ہیں۔ کسی نے سیدھے سادھے درویش صفت ہیڈ ماسٹر بابو گنڈا مل کی نقل اتار کر میز پر ٹانگیں پھیلائیں۔ کسی نے بورڈنگ کا نگراں بن کر بورڈنگ کا معائنہ کیا اور لنگر کی روٹیاں دیکھیں۔ غرض کسی نے کوئی حرکت کی اور کسی نے کوئی۔ سب اپنے اپنے جوہر دکھاتے۔ ہنستے اور شور مچاتے رہے اور یہ بھول گئے کہ ان کا کوئی نگراں بھی ہے۔ ابھی یہ کھیل تماشہ ہو ہی رہا تھا کہ کسی نے چغلی کھا کر بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ حافظ اللہ بخش کو اطلاع دی۔ وہ فارسی کے استاد مولوی غلام محی الدین کو ہمراہ لے کر وہاں آ گئے۔ اب جس طرح ہوا کے آتے ہی مچھر غائب ہو جاتے ہیں اسی طرح استادوں کی شکلیں دیکھتے ہی لڑکے تتر بتر ہو گئے۔

فوق صاحب سکول کی چھت پر جا بیٹھے جو لڑکے قابو آ گئے ان کو پٹتے ہوئے دیکھتے رہے اور بغیر پٹے ہی کانپتے رہے۔ صبح ان کی بھی حاضری ہوئی۔ مولوی غلام محی الدین چھڑی لے کر اٹھے۔ فوق صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ گو رات کو مار نہیں پڑی۔ لیکن خدا کی قسم مار کھانے والوں سے زیادہ نادم ہوں اور ان سے زیادہ درد محسوس کر کے رو رہا ہوں۔ مولوی صاحب نے پھر پوچھا۔ جب مار نہیں پڑی تو رونا کس طرح آیا؟ کہا۔ آپ ہی نے تو گلستان میں پڑھایا ہے ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند — کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

مولوی صاحب اس جواب سے ہنس پڑے اور آپ کو سزا سے نجات مل گئی۔ سچ کہا ہے مولانا حالی نے ؎

بڑھاپے کی دانائی سے گر کوئی — بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں

[illegible] کا ذکر ہے فوق صاحب پیسہ اخبار کے دفتر میں ملازم تھے۔ تنخواہ اس وقت دو روپیہ ماہوار تھی۔ بعد میں تو انہوں نے اس سے کئی گنا زیادہ مشاہرے پر خود ملازم رکھے اور لاہور اور کشمیر میں بہت سی جائداد بھی پیدا کر لی۔ بہر حال جیسا کہ عام پرائیویٹ فرموں کا دستور ہے آٹھویں دسویں دن ہر ملازم کو دو دو روپے بطور خرچ ملا کرتے تھے جو مہینے کے آخر میں تنخواہوں سے وضع ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ اکاؤنٹنٹ نے تمام ملازمین کے خرچ کی فہرست بنائی۔ اس میں فوق صاحب نے پانچ روپے اپنے نام لکھوائے حالانکہ جانتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ دو روپے ملیں گے۔ اکاؤنٹنٹ نے اعتراض کیا۔ فوق صاحب نے کہا۔ آپ لکھ دیجئے۔ منیجر صاحب منظور نہ کریں گے تو نہ سہی۔ مولوی محبوب عالم کے چھوٹے بھائی عبد العزیز منیجر تھے۔ ان کے پاس فہرست پیش ہوئی۔ وہ فوق صاحب کے نام پانچ روپے دیکھ کر چونک اٹھے۔ انہیں بلایا اور کہا۔ آپ اس سے پہلے تین روپے لے چکے ہیں۔ اب یک لخت پانچ کس طرح مل سکتے ہیں۔ کیا کسی اور نے بھی پانچ روپے لکھوائے ہیں؟ اس وقت ایک روپیہ سے زیادہ نہیں ملے گا۔ فوق صاحب نے کہا۔ ایک روپیہ کیا۔ میں تو آٹھ آنے قبول کرنے کو بھی تیار ہوں۔ لیکن خواہش صرف یہ ہے کہ ایک مرتبہ زندگی میں پانچ روپے اکٹھے دیکھ لوں۔ منشی عبد العزیز صاحب ہنس پڑے اور ایک کی بجائے دو روپے دے دیئے۔ اس واقعہ سے بھی یہ پتہ چل سکتا ہے کہ ابتداء میں فوق صاحب کی مالی حالت کیا تھی اور کس چھوٹے درجے سے انہوں نے ترقی کی۔

لالہ دینا ناتھ حافظ آبادی جو چند اخبار نویسوں میں بڑے کامیاب اخبار نویس اور جرنلسٹ تھے۔ پیسہ اخبار کے دفتر میں فوق صاحب کے ساتھ کام کرتے تھے۔ انہوں نے [illegible] میں اخبار ہندوستان جاری کیا جس سے ان کی بہت شہرت ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے بھارت اور دیش وغیرہ اخبار بھی نکالے۔ ایک روز فوق صاحب ان سے ملنے گئے۔ وہ ایک گول میز کے گرد چھ سات آدمیوں کے ساتھ بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ان میں دو وکیل بھی تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ فوق صاحب نے مزاج پرسی کے بعد پانی طلب کیا۔ لالہ دینا ناتھ نے کہا پانی تو ہے مگر گھڑے کا جوٹھا ہے۔ فوق صاحب نے کہا۔ کوئی پروا نہیں۔ تمہارا جوٹھا تو نہیں۔ لالہ دینا ناتھ نے جب آپ

کہ اس قسم کا جواب دیا تھا تو سب اہل مجلس حیران تھے کہ پانی کی طلب پھر اس کو یہ مذاق کی کیا سوجھی۔ لیکن جب فوق صاحب نے جملے پر دوہرا مارا تو سب کھل کھلا کر ہنس پڑے اور سمجھ گئے کہ ان دونوں میں بے تکلفی کی وجہ سے باہم مذاق ہے۔ لالہ دینا ناتھ بھی جو بڑے حاضر جواب تھے اس جواب پر نادم ہوئے اور انہوں نے فوق صاحب کے برجستہ اور لطیف فقرے کی داد دی۔

فوق صاحب سیر و سیاحت کے بڑے شوقین تھے۔ ان کی زندگی کا بہت بڑا حصہ سفر میں گزرا۔ کشمیر تو ان کا وطن ہی تھا۔ وہاں وہ ہر سال نہایت باقاعدگی سے جاتے۔ کئی کئی مہینے وہاں رہتے۔ گوشے گوشے میں گھومتے۔ قابل دید مقامات کی سیر کرتے۔ وہاں کے حالات لکھا کرتے اور اپنے تجربات و مشاہدات سے اخبار بین حضرات کو فائدہ پہنچاتے۔

کشمیر کے علاوہ انہوں نے وسط ہند، راجپوتانہ اور کانگڑہ کی ریاستوں مثلاً متھرا، ناگود، میمر، دیوال، جلیکٹ، منڈی وغیرہ شہر لکھنؤ، دہلی، بھوپال، جنگال اور صوبہ سرحد کے بھی متعدد سفر کئے۔ اس سے ان کے دوستوں کا حلقہ وسیع ہو گیا اور اخبار کو بھی فائدہ پہنچا۔

فوق صاحب بڑے محنتی تھے۔ شعر و شاعری کا شوق تو انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا جس کی وجہ سے پڑھائی کی طرف خیال بہت کم رہتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں مڈل کا امتحان دینے کے بعد جو اس وقت یونیورسٹی کا امتحان تھا، سیالکوٹ میں جا کر اخبار کا کام سیکھنا شروع کر دیا۔ پھر وہاں سے کسی اور ملازمت کی توقع پر جموں کا رخ کیا اور کئی ماہ کی لگاتار کوشش سے محکمہ پرمٹ و چونگی میں سردار ہری سنگھ رئیس ٹھیکیدار کے پاس ملازمت حاصل کی۔ جہاں قاضی نظیر علی عاقل کی ہم نشینی میسر آ جانے سے جموں میں چند دن خوب شعر و شاعری کے چرچے رہے۔ جب چونگی کا ٹھیکہ ٹوٹ گیا تو بیکاری کے چند ماہ گھر میں گزار کر ۱۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو اپنے بڑے بھائی کے پاس لاہور چلے آئے۔ یہاں پیسہ اخبار کے دفتر میں ملازمت مل گئی جو چار سال تک رہی۔ اس عرصہ میں اخبار نویسی کی مزید مشق کے لئے اخبار تجارت سیوک جالندھر کی نامہ نگاری بھی کرتے رہے اور اخبار عام اور خالصہ بہادر میں مضامین بھی لکھتے رہے۔ ان کے علاوہ ہر ہفتہ مندرجہ ذیل چار اخبار خود مرتب کرتے رہے۔

(۱) کوہ نور جو پنجاب کا سب سے پہلا اردو ہفتہ وار اخبار تھا اور جس کے آخری ایڈیٹر فوق صاحب تھے۔

(۲) گلزار ہند جو اگست ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا۔

(۳) آفتاب پنجاب جو ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء میں بند ہوا۔

(۴) پٹیالہ گزٹ جو منشی محمد جان قریشی نے عشرہ وار جاری کیا۔

اسی زمانے میں آپ نے شالامار باغ کی سیر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی۔ اس سے حوصلہ اتنا بڑھا کہ کتابوں کی تصنیف و تالیف کا خیال دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ چونکہ ان دنوں ناولوں کی گرم بازاری تھی۔ آپ نے بھی انار کلی، کم نصیب، عصمت آرا اور اکبر وغیرہ چند ناول لکھے جن سے شہرت پر لگا کر اڑنے لگی۔ اور مالی حالت بھی اچھی ہو گئی۔

اکتوبر ۱۹۰۶ء میں آپ نے پیسہ اخبار کی ملازمت ترک کر کے نومبر میں اپنا اخبار اور پریس جاری کیا۔ اس اخبار کا نام پنجہ فولاد تھا۔ پہلا پرچہ صرف پچیس تیس کی تعداد میں چھاپا گیا جس کا افتتاحیہ یہ تھا۔

"خدا کے گھر پر سرکار کا قبضہ"۔

مضمون اس شاہجہانی مسجد کے متعلق تھا جو دائی انگہ کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اور لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب ہونے کی وجہ سے اس وقت محکمہ ریل کے قبضے میں تھی۔ ریل والوں نے اس میں ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کا دفتر قائم کر رکھا تھا۔ اخبار کے آواز اٹھانے پر تمام اخبار نویس دنگ رہ گئے۔ آخر رفتہ رفتہ دیگر اخبارات بھی اس معاملے میں ہمنوا ہوئے اور لارڈ کرزن نے بھی آواز سے متاثر ہو کر اس مسجد کو واگزار کر دیا۔ آج کل یہ مسجد آباد ہے اور اس پر محکمہ آثار قدیمہ کا بورڈ لگا ہوا ہے۔

چھوڑ دو کا مطبع۔ کاغذ اور طباعت چھپائی وغیرہ سب ادھار تھے۔ گویا بغیر کسی سرمایہ کے کام شروع کیا گیا تھا۔ تقریباً نصف پرچے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو مفت دئے گئے تھے۔ باقی لاہور میں تقسیم ہوئے تھے جن کی اس قدر دھوم مچی تھی کہ پرچہ دوبارہ چھاپنا پڑا تھا۔ پہلے پرچہ کی قیمتیں وصول ہو جانے پر دوسرا پرچہ پچاس کی تعداد میں چھاپا گیا۔ اسی طرح دسمبر میں اس کی تعداد بڑھا کر سو کر دی گئی۔ ڈیڑھ ماہ تک یہ اخبار پندرہ روزہ رہا۔ جنوری ۱۹۰۲ء میں ہفتہ وار ہو گیا۔ جولائی ۱۹۰۲ء میں اس کی اشاعت پانچ سو تک پہنچ گئی۔ ستمبر ۱۹۰۲ء میں سات سو ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ اس کی اشاعت اتنی بڑھی کہ دسمبر ۱۹۰۲ء میں بارہ سو سے بڑھ گئی۔ اتنی اشاعت اس زمانے میں بڑی کافی سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ اخبار بینی کا مذاق آج کل کی طرح اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ اخبار کی پالیسی صلح کل تھی۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ اسے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اکثر والیانِ ریاست اور پولیٹکل ایجنٹ اس کی سرپرستی کرتے تھے۔ خریداروں میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو، سکھ اور عیسائی بھی موجود تھے۔ حضرت داغ دہلوی، احسان شاہجہانپوری اور علامہ اقبال نے اس کی تعریف میں نظمیں لکھیں۔ لیکن افسوس کہ وسط ستمبر میں یہ اخبار ایک دوست نما دشمن کی مہربانی سے بند ہو گیا۔

فوق صاحب کا اپنا بیان ہے:۔

> "ایک شخص جو بڑا چالاک اور گرگ باراں دیدہ تھا۔ چند دنوں کی آمد و رفت کے بعد میرا ہمدرد بن گیا۔ وہ ہر روز صبح و شام اور سفر و حضر میں میرے ساتھ رہتا تھا اور ایک معمولی سا اپنے نام پندرہ روزہ اخبار نکال کر بہت ناغے سے ہی رہتا تھا۔ میں نے اس کی گفتگو "سفید پوشی" پر اعتبار کیا اور یہ نہ سمجھا کہ یہ محض "ظلمت فریب" سے عبارت ہے۔ میں اس کے چہرے کو صبح صادق سمجھا رہا حالانکہ وہ محض "مکر چاندنی" کا منظر تھا۔ اس جال کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے اخبار پر ٹکٹیں لگانے کا کام اس کے سپرد کیا اور پھر اخبار شماری بھی اسی کے رحم و کرم پر چھوڑ دی۔ حالانکہ چاہئے یہ تھا کہ ٹکٹیں وہ لگاتا اور اخبار کو گننے والا کوئی اور ہوتا جو دیکھتا کہ اس نے جتنی ٹکٹیں لی تھیں اتنی لگائی بھی ہیں یا نہیں۔ اس طریق سے وہ سفید پوش ٹھگ سال بھر تک بیس روپے ماہوار کے ٹکٹ ہضم کرتا رہا۔ جس کا اثر اخبار پر اس قدر پڑا کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ آخر میں نے مجبور ہو کر مطبع پنجۂ فولاد اور اخبار پنجۂ فولاد دونوں بند کر دئے۔ اسی زمانے کا ایک شعر ہے ؎

اخبار بند ہونے سے جلتے ہیں نازنیں
اے فوق اب وہ پنجۂ فولاد کیا ہوا

۱۹۰۳ء یا ۱۹۰۴ء میں لالہ منشی رام اگروال نے ایک اخبار بنام "اردو اخبار" جاری کیا۔ جس کی ادارت فوق صاحب کے سپرد تھی۔ چنانچہ پنجۂ فولاد کے ساتھ اس اخبار کو بھی چار ماہ تک نہایت قابلیت سے چلاتے رہے۔ مگر بعد میں اپنے کاروباری مشاغل سے مجبور ہو کر اس سے الگ ہو گئے۔

۱۹۰۶ء میں میاں جان محمد گنائی نے "کشمیری گزٹ" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ جسے تین سال تک فوق صاحب مدیر اعزازی کی حیثیت سے مرتب کرتے رہے۔ آخر چوہدری جان محمد گنائی کی وفات کے ساتھ اس رسالے کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ البتہ اس کی راکھ پر ایک اور رسالہ "کشمیری میگزین" نکالا گیا جس کے ایڈیٹر خواجہ کمال الدین بی اے، مسلم مشنری انگلستان اور اسسٹنٹ ایڈیٹر فوق صاحب تھے۔ یہ رسالہ ۱۹۰۸ء تک جاری رہا۔ اس کے بند ہونے کے بعد ۱۹۰۸ء میں آپ نے ماہنامہ "کشمیری میگزین" جاری کیا جو غالباً پنجاب کا سب سے پہلا رسالہ ہے جس نے ہاف ٹون بلاک کی تصاویر چھاپنے کے علاوہ خاص نمبر نکالنے کی جدت شروع کی۔ چنانچہ اس کا ایڈیٹر نمبر جو اردو رسائل و جرائد کے ایڈیٹروں کے حالات زندگی سے متعلق شائع ہوا تھا اب تک ایک یادگار تاریخی پرچہ تصور کیا جاتا ہے۔

۱۹۱۲ء میں کشمیری میگزین نے ماہوار سے ہفتہ وار اخبار "کشمیری" کی شکل اختیار کر لی۔ اور اپنی مفید اور کارآمد تحریروں سے اہل خطہ میں علم و ادب کی روح پھونک دی۔ اس اخبار نے کشمیر میں بیگار کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی اور متواتر کئی سال تک پر زور مخالفت کر کے اس کی منسوخی

کے احکام جاری کرائے۔ ریاست جموں و کشمیر میں ملکی اخبارات ہی کا قیام۔ زمیندارہ سوسائٹیوں کا اجراء اور قانون انتقال اراضی کا نفاذ بھی اسی اخبار کی تحریروں کا ثمرہ ہے۔ ۱۹۱۵ء میں جب سری نگر کی پتھر مسجد کے اندر تھانہ پولیس کے لئے پختہ عمارت بننے لگی تو اسی اخبار نے پبلک کو تیار کر کے اسے رکوایا۔ اب چند برس سے یہ مسجد مسلمانوں کو واپس مل چکی ہے۔ اسی اخبار کی کوششوں سے مسلمانوں کو حکومت کی طرف سے میڈیکل وظائف ملنے شروع ہوئے۔ کشمیر میں زبان اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے بھی اس اخبار نے کچھ کم کام نہیں کیا۔ جب یہ جاری ہوا تو جتنے خطوط اس کے دفتر میں آتے تھے ان میں فیصدی پچاس خط عربی اور فارسی میں ہوتے تھے۔ اب ہر شخص اردو بولتا، سمجھتا اور لکھتا ہے۔ لاہور کی انجمن کشمیری مسلمانان، مسلم کشمیری کانفرنس اور بیرونجات کی کشمیری انجمنوں کا قیام بھی ذوق صاحب ہی کی تحریکوں کا نتیجہ ہے۔ وادی میں آنے والے دنوں کی دھوم اور دھندلی سی تصویر، وہ آج سے پچاس ساٹھ سال پیشتر لوگوں کو اپنی نظم و نثر میں دکھایا کرتے تھے وہ اب بڑا صاف اور روشن نظر آ رہا ہے۔

اخبار کشمیری کے ساتھ ساتھ ذوق صاحب نے یکے بعد دیگرے طریقت اور نظام دو ماہانہ رسالے جاری کئے جو تین چار سال تصوف کی خدمت کر کے بند ہو گئے۔

ذوق صاحب عملی سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے۔ لیکن قومی معاملات کے سلسلے میں ان کا احساس بہت گہرا تھا۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو مسلمانوں کی زبوں حالی سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ بالخصوص کشمیری مسلمانوں کی پستی اور ڈوگرہ شاہی غلامی ان کے لئے سوہان روح کا باعث تھی۔ وہ نسلاً کشمیری تھے۔ اس لئے بھی انہیں کشمیر سے والہانہ عشق تھا۔ انہوں نے ساری عمر کشمیر اور کشمیریوں کی خدمت کی۔ کشمیری تعلیم میں کمزور، اخلاق میں پست اور تہذیب و تمدن میں دنیا کے لوگوں سے بہت پیچھے تھے۔ ذوق صاحب نے انہیں تعلیم کا شوق دلایا۔ ان کو دنیا کی ترقیوں سے آگاہ کیا۔ ان کی سوئی ہوئی قوتوں کو جگایا۔ اور ان کو ترقی یافتہ قوموں کے برابر لا کھڑا کرنے میں اپنی زندگی وقف کر دی۔

ذوق صاحب اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ انہوں نے تخریبی کاموں میں الجھنے کو کبھی پسند نہ کیا۔ اختلاف عقائد کی بنا پر کسی فرقے کو برا بھلا نہ کہا۔ تمام عمر تعمیری اسکیموں کو چلانے میں مشغول رہ کر اپنے آپ کو ایک ایسا ثالث بالخیر ثابت کیا جو حاکم و محکوم کو بہتر سے بہتر مشورہ دے سکتا تھا۔ ان کا منشا صرف یہ تھا کہ کشمیر میں واقفیت عامہ ترقی کرے۔ اہل خطہ روشن خیال ہو جائیں اور واقعات عالم پر ان کی نظریں وسیع ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ توقعات ان کی زندگی ہی میں پوری ہو گئیں۔ اور کشمیر میں ایک وسیع ذہنی، سیاسی اور مجلسی انقلاب پیدا ہو گیا۔

ذوق صاحب نے کشمیر کے متعلق بہت سی کتابیں لکھیں جن میں تاریخ کشمیر۔ مشاہیر کشمیر۔ خواتین کشمیر۔ رہنمائے کشمیر۔ حکایات کشمیر۔ جغرافیہ کشمیر۔ تاریخ اقوام کشمیر۔ اور تاریخ بڈشاہی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے سے انہوں نے کشمیر کے بھولے ہوئے افسانے نوجوانوں کو سنائے۔ کشمیریوں کے شاندار کارناموں سے قوم کو روشناس کیا اور کشمیر کا نام ساری دنیا میں روشن کر دیا۔

اس ادبی اور قومی کام کے علاوہ ذوق صاحب نے کشمیری مزدوروں کو منظم کرنے اور ان کی پریشانیاں دور کرنے کے سلسلے میں بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ غالباً ان کی انہی بے لوث خدمات کا تاثر تھا کہ علامہ اقبال انہیں مجدد کشمیر کہا کرتے تھے۔

ذوق صاحب کی دیانت فکر اور پابندی وضع کا پایہ اتنا بلند تھا کہ اگر وہ کشمیر کے چکر سے نکل کر اپنے محدود دائرہ عمل کو وسعت دیتے تو ہندوستان کے بہترین اخبار نویسوں اور مصنفوں کی صف میں شمار ہوتے۔ لیکن اس صورت میں وطنی تاریخ کی تدوین کا کام معرض التوا میں پڑ جاتا کیونکہ اس دائرے میں بھی ان کا قائم البدل دستیاب ہونا مشکل تھا۔ پھر بھی جب ہم ان کی تصانیف لاہور عہد مغلیہ میں۔ تذکرہ علمائے لاہور۔ یادِ رفتگاں (تذکرہ صوفیائے لاہور) حیات داتا گنج بخش۔ تاریخ مسجد وزیر خاں۔ تذکرۃ الصالحین۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ۔ شالامار باغ۔ مآثر لاہور اور تاریخ ملتان وغیرہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ لاہور اور پنجاب کی تاریخ کے متعلق بھی ان کی معلومات بڑی

دلچسپ تھیں۔ تاریخ حریت اسلام، وجدانی نشتر اور تاریخ اقوام کشمیر بھی ان کی بڑی مقبول کتابیں ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ فوقؔ صاحب انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف نہ تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر اس کا اعتراف کرتے ہوئے خود ہی لکھتے ہیں۔ ؎

انگلش زباں ہی سے جو ناآشنا تھے تم
اے فوقؔ ایڈیٹر اخبار کیوں بنے

اور عربی، فارسی بھی بقدرِ ضرورت ہی جانتے تھے لیکن تجربہ اور مشق سے انہیں اخبار نویسی کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ معمولی معمولی واقعات میں انتہائی دلچسپی پیدا کر دینا ان کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا۔ تاریخ کے خشک واقعات بھی آپ اس خوبی اور ایسے انداز سے لکھتے تھے کہ پڑھنے والا پہروں مزے لیتا رہتا تھا۔ اس لحاظ سے انہیں تاریخ اور صحافت کا بھی انجن کہا جاتا تھا۔ حضرت احسان شاہجہانپوری فرماتے ہیں۔ ؎

فوقؔ کی مضموں نگاری میں کشش ہے چمک کی
خود فدا ہونے کو آتی ہے خبر اخبار پر

یہی وجہ ہے کہ آپ کا دفتر ہمیشہ اخبار نویسی سکھانے کا اسکول بنا رہا ہے۔ یوں تو آپ کے پرتوِ فیض سے سینکڑوں ذرّے آسمانِ ادب و صحافت پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ لیکن مندرجہ ذیل چند نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) چوہدری رحمت علی بی اے۔ جو بعد میں انگلستان چلے گئے اور جنہوں نے "پاکستان" کا لفظ وضع کر کے یورپ میں اس کا پراپیگنڈا کیا۔ (۲) نازش جالندھری (۳) ملک مقبول احمد (جو بعد میں رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز صوبہ کشمیر ہو گئے) (۴) سید حبیب مالک اخبار سیاست لاہور (۵) ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی جنہوں نے بعد میں اخبار پولیس ریویو جاری کیا اور آج کل انگلستان میں ہیں۔ (۶) میر نیاز کاشمیری (۷) مسٹر محمد حنیف محمد (جو نیرنگ خیال۔ شاہکار لاہور اور اخبار ریاست دہلی کے بھی ایڈیٹر رہے) (۸) ماسٹر محمد بخش مسلم بی اے (۹) رشید صحرائی (۱۰) بابو محمد امین بی اے وغیرہ۔

فوقؔ صاحب محض تخلص ہی کے گنہگار نہ تھے۔ بلکہ فطری شاعر تھے اور غزل۔ نظم۔ قصیدہ۔ مرثیہ۔ رباعی وغیرہ تمام اصنافِ سخن پر حاوی۔ ان کے کلام کے دو مجموعے "کلام فوقؔ" اور "نغمۂ گلزار" چھپ چکے ہیں۔ کلام فوقؔ کے محاسن پر اکبر الٰہ آبادی کی اس رائے کے ہوتے ہوئے ایک لفظ کا اضافہ کرنا بھی مشکل ہے۔

> "کلام فوقؔ بلاشبہ قابلِ داد ہے۔ جب خیالات اچھے ہوں تو کلام کیوں نہ اچھا ہو۔ کلام فوقؔ میں فطری آمدیں بھی ہیں۔ شوخی کا انداز بھی۔ قافیے برجستہ ہیں۔ بغیر تکلف کے کلام کا اکثر حصہ ہے۔ اور اثر پیدا کرنا ایسے ہی کلام کا کام ہے۔ بعض اشعار سے دلچسپ شاعرانہ رنگ قطرہ شبنم کی طرح ٹپک رہا ہے۔ کئی اشعار گنجینۂ معانی ہیں۔ اخلاقی و ہمت افزا اشعار کی بھی کمی نہیں۔ بعض اشعار پر تو جی چاہتا ہے کہ داد دوں اور لوٹوں۔ بہت سے اشعار میرے حسبِ حال ہیں۔ نیچرل کیفیتوں کے اظہار اور کشمیر کے نظاروں میں خوب جوش دکھایا ہے۔ اور نظموں کے شانِ نزول نے تو آپ کی جدت طرازی کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔"

محسن الملک

ڈاکٹر سید محمود

نواب محسن الملک کی شخصیت کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے پہلے اس ماحول کا مختصر سا جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں ان کی ذہنی نشو و نما ہوئی اور جو ان کے تمام کارہائے نمایاں کا پس منظر ہے۔ اس سلسلے میں ان شخصیتوں کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے جن سے وہ متاثر ہوئے یا جن کو انھوں نے متاثر کیا۔ اس لئے کہ غیر معمولی شخصیتوں کو بنانے میں ان کے ذاتی صفات اور خصوصیات کے علاوہ اس سیاسی فضا کا بھی زبردست ہاتھ ہوتا ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں اور جس میں رہ کر وہ اصول زندگی اور لائحہ عمل مرتب کرتے ہیں۔

نواب محسن الملک جن کا اصلی نام سید مہدی علی تھا ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء مطابق ۱۲۵۳ھ کو اٹاوہ کے ایک مشہور سادات خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا مولوی محمد علی ایک زبردست عالم اور صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ ایک عرصہ تک ریاست ٹونک میں منصب وزارت پر بھی سرفراز رہے تھے۔

ان کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے دستور کے مطابق فارسی کتب کے علاوہ علماء و فضلاء کے حلقۂ درس میں ہوئی جہاں انھوں نے عربی نحو اور فقہ و تفسیر میں بھی دستگاہ حاصل کر لی۔ انگریزی تعلیم انھوں نے باضابطہ نہیں حاصل کی تھی مگر اپنی غیر معمولی ذہانت اور مشق و مزاولت سے اچھی خاصی لیاقت پیدا کر لی تھی۔ یہاں تک کہ وہ انگریزی اخبار وغیرہ بے تکلف پڑھ اور سمجھ لیتے تھے۔

انھوں نے صرف اٹھارہ برس کی عمر میں دس روپیہ ماہوار سے ملازمت شروع کی اور ۱۸۶۷ء تک سررشتہ داری اور تحصیلداری کے منازل طے کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹری کے درجے تک پہنچ گئے جو اس وقت مسلمانوں کے لئے معراج ملازمت تھی۔ یہ ترقی اس قدر کم مدت میں غیر معمولی تھی لیکن ان کے جیسے ہونہار اور باہر شخص کے لئے لازمی تھی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایک وقت میں کلکٹر ہیوم ان کے بالا دست افسر تھے جو بعد میں انڈین نیشنل کانگریس کے بانی ہوئے اور جنھوں نے ان کی قابلیت کے متعلق کہا تھا کہ باوجود ایسی اعلیٰ درجہ کی لیاقت اور کارگزاری اور ضلعے کا اہتمام کی صلاحیت رکھنے کے ابھی تک وہ ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔

لیکن انھیں ابھی اپنے اصلی جوہر کو دکھانے کا موقع کہاں ملا تھا۔ اس لئے ۱۸۷۴ء میں انگریزوں کی ملازمت سے مستعفی ہو کر انھوں نے نظام حیدرآباد کے یہاں ملازمت کر لی۔ انھوں نے وہاں پہنچ کر انتظامی امور میں ایسا رنگ دکھایا کہ سالار جنگ سے لے کر انگریز ریزیڈنٹ تک سبھی ان کے معترف ہو

تمام ہو گئے اور رفتہ رفتہ وہ محکمہ سیاسیات اور خزانہ کے اہم صیغوں کے معتمد ہو گئے۔ اس طرح عملاً حکومت کی پوری طاقت ان کے ہاتھوں میں آ گئی۔

۲۴ مارچ ۱۸۸۴ء میں ان کو منیر نواز جنگ بہادر، کا خطاب دربار فیروزی کی تقریب پر ملا جس سے ان کی شہرت کو حیدرآباد کے حدود سے آگے بڑھنے میں مدد ملی۔ وہ خود بھی محکمہ سیاسیات کے معتمد ہونے کی وجہ سے اپنی نظر ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے مسائل پر دوڑانے لگے تھے چنانچہ انھوں نے ۱۸۸۵ء میں ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر روسی حملے کے آثار نمایاں دیکھ کر ایک سیاسی مکتوب شائع کیا جس کا عنوان تھا "مسلمان اور روس" جس میں انھوں نے مسلمانوں کی سلطنت برطانیہ سے وفاداری کے مسئلے پر بحث کی تھی، ساتھ ہی ساتھ انھوں نے برطانیہ کی اس پالیسی پر نکتہ چینی کی تھی کہ اس نے ترکی اور ایران سے اچھے تعلقات نہیں رکھے تھے۔ انھوں نے حیدرآباد کی ان تمام سازشوں کو جو ان کے زمانے میں برابر اٹھتی رہیں اس طرح ختم کر دیا کہ ان کے بعض حامیوں کو یہ کہنا پڑا کہ "اگر یہ شخص یورپ میں پیدا ہوتا تو بسمارک اور ڈزرائیلی کا ہم پلہ ہوتا۔"

آخر نظام حیدرآباد نے ستمبر ۱۸۸۴ء میں دوبارہ محسن الدولہ محسن الملک کا خطاب مع تمام لوازمات خطاب کے گورنر جنرل کی سفارش اور منظوری سے دیا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ اپنی قابلیت اور ایمانداری کا سکہ سبھوں کے دلوں میں بٹھاتے گئے جب سر آسمان جاہ وزیر اعظم ہوئے تو انھوں نے نواب محسن الملک کو ایک نازک اور اہم مشن پر لندن بھیجا۔ یہ واقعہ ۱۸۸۸ء کا ہے جب ان کی عمر کوئی ۵۱ برس کی تھی۔ وہاں پہنچ کر انھیں اپنے کام کے سلسلے میں پارلیمان کی جوڈیشل کمیٹی کے سامنے بیان دینا پڑا جہاں انھوں نے اپنی قانونی دسترس کے جوہر دکھائے۔

ان کی صحت چونکہ خراب ہونے لگی اس لئے دوسرے قانونی مشیروں کو چھوڑ کر وہ اکتوبر میں واپس چلے آئے۔ قیام انگلستان کے دوران میں محسن الملک کو وہاں کے بڑے بڑے امرا اور سیاستدانوں مثلاً پرنس البرٹ وکٹر، سرجان اسٹریچی اور لارڈ رپن وغیرہ سے ملنے کا اتفاق ہوا جنھوں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور ان کے ساتھ ان کی سیاسی حیثیت کے مطابق سلوک روا رکھا۔ وہاں انھوں نے کیمبرج کے ہندوستانی طلبا کی سوسائٹی میں تقریر کی اور پھر ہندوستانی طلبا کو نارتھ بروک کلب میں دعوت دی۔ اسی دوران لارڈ لینسڈاؤن وائسرائے ہند مقرر ہوئے تھے ان کے اعزاز میں کی گئی متعدد تقاریب میں وہ شریک ہوئے۔ ایک جلسے میں دادا بھائی نوروجی بھی شریک تھے جنھوں نے لندن میں مقیم ہندوستانیوں کی طرف سے ایک ایڈریس لارڈ لینسڈاؤن کو پیش کیا تھا۔

غرضکہ وہ وہاں کی سیاسی، تہذیبی اور سماجی زندگی سے ذاتی واقفیت لے کر ہندوستان لوٹے اور بعد میں یہی تجربات ان کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔

نظام حیدرآباد ان کو اب بھی سے بڑی جگہ دینے کو تیار تھے کہ یکایک حیدرآباد کی سیاسی فضا پلٹ گئی اور ریذیڈنسی کی طرف سے لگائی گئی سازشوں کی وجہ سے محسن الملک اور سر آسمان جاہ دونوں کو حیدرآباد کی ملازمت سے مستعفی ہونا پڑا۔ وہ حیدرآباد میں بسلسلہ ملازمت تقریباً بیس برس رہے۔

جب انھوں نے حیدرآباد چھوڑا تو خواص اور عوام دونوں کو اس کا بڑا ملال تھا۔ نواب مرزا داغ جو ان دنوں حیدرآباد میں ملک الشعرا تھے اپنے دلی جذبات پر قابو نہ پا سکے اور بے اختیار کہہ اٹھے۔

مہدی کو اگر محسن زماں کہتے ہیں — یا محسن ملک اس کو یہاں کہتے ہیں
زیبا ہے کہیں محسن عالم اسے داغ — جو چاہئے کہنا وہ کہاں کہتے ہیں

اس خیر کا انسان کوئی ہو تو سہی — ایسا مرتبہ ذی شان کوئی ہو تو سہی
ہر شخص کو محو ہے تماشے ان کی — یوں دل کا نگہبان کوئی ہو تو سہی

ایک طرف تو محسن الملک اپنی ملازمت کے سلسلے میں انتظامی امور میں دلچسپی اور حصہ لیتے رہے دوسری طرف سر سید احمد خاں سے ان کے تعلقات

گی گوں منازل طے کرتے رہے۔ شروع میں وہ سرسید کے خیالات اور طریقۂ عمل سے اتفاق نہ رکھتے تھے لیکن سرسید کی شیریں اور نرم گفتاری نے ان کا دل موہ لیا اور بعد میں ان کے مشن کو آگے بڑھانے کا ایسا عہد کیا کہ آخری وقت تک اسی کام میں منہمک رہے۔

سرسید کی زندگی میں وہ ان کی طرح طرح سے امداد کرتے رہے، کبھی مالی امداد کی اور کبھی رسالہ تہذیب الاخلاق میں نہایت سلیس اور آسان زبان میں بہترین اصلاحی اور تحقیقی مضامین لکھ کر ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ سرسید ان کے زبردست تعاون سے اتنے مرعوب ہوئے کہ انھیں 'لحمک لحمی' یعنی اپنا گوشت کہہ دیا اور ان کے نام پر مہدی منزل بطور یادگار تعمیر کر دیا جس کے کتبے میں ان کے محاسن اور امداد کا بڑی محبت سے ذکر موجود ہے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں ۱۸۸۶ء سے شرکت کرنی شروع کی اور ایسی معرکۃ الآرا تقریریں کیں اور ایسے پُرمغز اور تحقیقی مقالے پڑھے کہ مسلمانوں میں ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے سیاسی مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگی اور اس طرح سرسید اور محسن الملک کی ان تھک کوشش سے قومی بیداری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

وہ حیدرآباد سے ۱۸۹۳ء میں مستعفی ہونے کے بعد علی گڑھ ہی میں رہے تاکہ سرسید کے تعلیمی اور اصلاحی مشن میں مدد و معاون ہو سکیں اور ان کی زندگی ہی میں وہ کالج کے تقریباً سب سے اہم ٹرسٹی ہو گئے۔

سرسید کا انتقال ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ہوا۔ اس وقت کالج مالی پریشانیوں میں گھرا تھا جسے انھوں نے سرسید میموریل فنڈ قائم کر کے اپنی کوششوں سے نجات دلائی اور کالج کو یونیورسٹی بنانے کا مسئلہ قوم کے سامنے پیش کر دیا۔

سرسید کے بعد ان کے صاحبزادے جسٹس سید محمود سیکرٹری ہوئے لیکن خرابیٔ صحت کے باعث اس عہدے سے علیحدہ ہو گئے اور ۱۸۹۹ء میں نواب محسن الملک کو یہ عہدہ سپرد کیا گیا۔

اس کے بعد سے ان کی حیثیت کل ہند مسلم رہنما کی ہو گئی اور ہر اعتبار سے وہ سرسید کے جانشین ہو گئے اور باوجود کبرسنی کے خدمتِ قوم میں جوش و خروش کے ساتھ لگ گئے۔

۱۹۰۰ء میں اردو ہندی کا قضیہ چھڑا جس نے یوپی، بہار اور دیگر علاقہ جات میں ہندو مسلم تعلقات میں تلخی پیدا کر دی۔

انھوں نے ایک طرف تو حکومت سے پہلی بار اس مسئلے پر کھلم کھلا ٹکر لی اور دوسری طرف مسلمانوں کو صاف اور کھلے لفظوں میں سمجھایا کہ برادرانِ وطن کے فوائد اور اغراض کے خلاف حملہ آور ہونے سے احتراز کریں۔ انھوں نے جو تاریخی میموریل تیار کر کے مسلمانوں کی طرف سے حکومت میں پیش کیا تھا وہ اس دور کی سیاسی بے چینی کی گویا عکسی تصویر ہے۔ نواب محسن الملک کی زندگی کا آخری دور ہندوستان کی تاریخِ سیاست کا ایک اہم باب ہے اور ہندوستان کی جنگِ آزادی کا ایک ایسا موڑ ہے جسے سمجھے بغیر کوئی آنے والی سیاسی تحریکوں کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکتا۔

یہی زمانہ تھا جب میں علی گڑھ کے ہائی انگلش اسکول میں داخل کیا گیا۔ میں نے شروع ہی سے علی گڑھ کی سیاسی اور ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ کیونکہ میرا مطالعہ عمر کے لحاظ سے وسیع تھا اور میں مولانا حالی، شبلی نعمانی اور مولوی نذیر احمد کی بیشتر تصانیف پڑھ چکا تھا۔ مسدس حالی کا ایک بڑا حصہ اور بہت سی دوسری قومی نظمیں مجھے یاد تھیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ میں آتے ہی یونین کلب کے مقابلے کی تقریروں میں شامل ہونے لگا جہاں پہلے ہی سال میں اسکول کے طلبا میں اول رہا اور کالج کلاسوں کو ملا کر پانچواں بہترین مقرر مانا گیا۔

یہی وجہ تھی کہ کالج کے لائق اور ممتاز طلبا ہی نہیں بلکہ اساتذہ بھی مجھے اپنی صحبتوں میں شرکت کا شرف بخشنے لگے اور جلد ہی میری رسائی نواب محسن الملک تک بھی ہو گئی۔

جو لڑکے ان دنوں کالج کے ممتاز طلبا میں تھے اور جن کے ناموں سے آج بھی علیگڑھ کی تاریخ روشن ہے ان میں عبدالرحمٰن بجنوری جو اس وقت اونچے درجے میں تھے، تصدق احمد خاں شیروانی (جو مجھ سے دو تین درجے آگے تھے)، اور قاضی تلمذ حسین جو اس وقت کالج میں تھے، خاص طور پر

قابل ذکر ہیں۔ قاضی صاحب بڑے سیاستدان گنے جاتے تھے اور کالج میں اردو کے سب سے بہتر مقرر تھے۔ اسی وجہ سے محسن الملک انھیں بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی فاضلانہ تقریروں کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب میرے سیاسی استاد بھی تھے اور انہی کی بدولت میں اوائل عمری میں کانگرس کی طرف مائل ہو گیا۔

ان بزرگ دوستوں کے ساتھ میں نواب محسن الملک کے یہاں حاضر ہوتا۔ اگر ہم لوگ ہفتہ دو ہفتہ ان کے یہاں حاضری نہ دیتے اور نواب صاحب کہیں راستے میں مل جاتے کیونکہ ہر شام کو جا بجا وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر سیر کو جاتے تو فوراً گاڑی روک کر ہم سبھوں کو اپنے ساتھ بٹھا لیتے اور نہایت سخت مگر محبت آمیز الفاظ میں شکایت کرتے کہ تم سب اتنے دنوں سے کہاں تھے؟ کبھی کہتے "تم سب باغی ہو گئے ہو!" ——— "باغی" کا لفظ وہ اس لیے استعمال کرتے کیونکہ ہم لوگ کبھی کبھی سیاست پر گفتگو کرتے تھے اور انگریزوں کو برا بھلا کہتے تھے اور چونکہ میں سب دوستوں میں چھوٹا تھا وہ مجھے چھیڑ کر انگریزوں کے خلاف بولنے پر مجبور کرتے اور کبھی ہنس کر فرماتے کہ یہ لڑکا ضرور کبھی نہ کبھی جیل جائے گا یا پھانسی پڑے گا۔ کبھی ہم لوگوں کو بڑی شفقت سے سمجھاتے کہ تمہاری قوم ابھی ان خیالات کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس وقت ہم لوگ زیادہ تر انگریزوں کی اسلام دشمنی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ قاضی محمد حسین بجنوری نواب صاحب سے کبھی کبھی علمی گفتگو کرتے اور بعض وقت اسلام کے کسی مسئلے کے متعلق اعتراض کرتے، محض اس خاطر کہ نواب صاحب انھیں قائل کرنے کی کوشش کرتے۔ اس وقت محسن الملک کی گفتگو سننے کے قابل ہوتی۔ وہ ایسی خوبی اور متانت کے ساتھ اعتراضات کا جواب دیتے کہ معلوم ہوتا جیسے ان کے منہ سے پھول جھڑتے ہوں۔ یہ بھی ہوتا کہ کبھی وہ جوش میں آ جاتے۔

انہی دنوں یعنی سنہ [illegible] میں نواب صاحب نے مجوزہ یونیورسٹی فنڈ کی غرض سے رنگون کا سفر کیا اور اپنی سحر بیانی اور فصاحت لسانی اور بلند اخلاق و اعلیٰ کردار سے قومی تعلیم اور قومی یونیورسٹی کا خیال ہر مسلمان کے دل میں جاگزیں کر دیا۔ رنگون میں پہلے پہل کامیابی کا امکان نظر نہ آیا تو انھیں بڑی مایوسی ہوئی۔ لیکن ایک جلسے میں بڑی معرکۃ الآرا تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم مسلمان ملکی اور علمی دونوں سلطنتیں کھو بیٹھے ہیں۔ ملکی سلطنت کی نہ ہم کو ضرورت نہ خواہش ہے اور نہ حاصل ہو سکتی ہے لیکن علمی سلطنت کی خواہش بھی ہے اور حاصل بھی ہو سکتی ہے۔ ملکی سلطنت کا آفتاب تو دہلی سے طلوع ہوا اور رنگون میں آ کر غروب ہو گیا۔ کیا اہلِ رنگون اس کے بدلے میں علمی سلطنت کا آفتاب رنگون سے نکال کر علی گڑھ میں نہ روشن کریں گے؟ ——— یہ تقریر کس قدر پُرتاثیر رہی ہو گی اسی ایک خطیبانہ جملے سے ظاہر ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک بہت بڑی رقم اسی وقت جلسے میں جمع ہو گئی۔

سنہ [illegible] میں جبکہ میں تیسرے درجے میں تھا علی گڑھ میں ایک خفیہ سوسائٹی قائم ہوئی جس کے بانیوں میں یہ لوگ تھے: یعنی عبدالرحمٰن بجنوری، تصدق احمد خاں شیروانی، بدرالدین رہنما اور بزرگ مولانا حفظ الرحمٰن جنرل سیکرٹری جمعیۃ العلماء ہند، عزیز الرحمٰن اور راقم الحروف اور بعض دیگر حضرات۔ ان میں صرف عزیز الرحمٰن اور میں زندہ ہوں اور عزیز الرحمٰن ان دنوں ضلع اناؤ (یو۔ پی) میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس سوسائٹی کا مقصد یہی اسلام پروری اور ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنا تھا۔ طلباء کی یہ جماعت بڑی خاموشی کے ساتھ کسی ایک جگہ ملتی تھی۔ ایک آدمی کسی ایک موضوع پر کوئی مقالہ پڑھتا۔ کبھی اس پر سنجیدگی سے بحث ہوتی کہ دنیا کے مسلمانوں کو کیونکر ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جا سکتا ہے اور انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟ یہ جماعت زبانی روزانہ کالج کے طلباء کے درمیان انگریزوں کے خلاف پروپیگنڈا کرتی رہی۔ ممبران خفیہ انجمن نے آگے چل کر ایک موقع پر سرسید کی قبر پر جا کر اس بات کا حلف اٹھایا تھا کہ ہم لوگ جب تک انگریزوں کو ہندوستان سے نکال نہیں لیں گے ہرگز دم نہیں لیں گے اور ان میں سے تقریباً ہر ممبر اپنی قسم پر قائم رہا۔

مسٹر ٹنا اس وقت ہیڈ ماسٹر تھے۔ یہ صاحب بہت بدزبان تھے اور اسی بدزبانی کی وجہ سے طلباء ان سے بہت ناراض تھے۔ ایک روز طلباء کسی کام سے ان کے پاس گئے۔ انہوں نے طلباء کو (Head of Pigs) یعنی سوروں کے سر کہہ کر اپنے بنگلے سے نکلوا دیا۔ اس پر طلباء میں بڑی برہمی پھیلی۔ نواب صاحب تک شکایت پہنچی لیکن اس وقت کے حالات کے لحاظ سے وہ انگلش اسٹاف کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے ——— کسی کے

صلاح و مشورہ کے بعد میں نواب وقار الملک کے پاس اور جب پہنچا، ان سے مارسین صاحب کی بہت سی شکایتیں کیں۔ وہاں اس وقت مسعود شاہی مرحوم بھی پہلے سے موجود تھے۔ یہ نواب صاحب کے دور کے رشتہ دار بھی تھے۔ انہوں نے بھی میرا ساتھ دیا۔ نواب وقار الملک نے فوراً ہم لوگوں کا بیان قلمبند کرایا پہلے تو ہم لوگ سمجھے کہ وہ اپنی یادداشت کے لئے ہم لوگوں کا بیان قلمبند کر رہے ہیں لیکن بیان مکمل کر کے انہوں نے دستخط کے لئے ہمارے آگے بڑھایا تو ہم دونوں خائف ہو گئے اور سمجھے کہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہم لوگ علی گڑھ سے نکالے جائیں گے۔ اس خیال کا اظہار ہم لوگوں نے نواب وقار الملک سے بھی کیا اس پر نواب صاحب نے فرمایا کہ گھبراتے کیوں ہو۔ جو دوسرے لوگ اسکول میں پڑھتا مگر سچی بات کے کہنے میں دریغ نہ کرنا چاہئے اور اس طرح کی بہت سی باتیں سمجھائیں۔ ہم دونوں نے دستخط کر دیئے مگر چند گھنٹوں کے بعد مسعود شاہی نے اپنے بیان کی کچھ تاویلیں کیں، جس پر نواب وقار الملک سے ان کے تعلقات تھے اور میرا بیان لے کر وہ علی گڑھ تشریف لائے اور نواب محسن الملک سے میرے متعلق دریافت فرمایا۔ جب نواب محسن الملک نے میری شکایتیں کیں تو نواب وقار الملک نے میرا وہ بیان دکھلایا جو اردو میں لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد نواب محسن الملک سے کچھ ترش گفتگو ہوئی کہ انہوں نے کالج میں ڈسپلن کو بہت برے درجہ پر پہنچا رکھا ہے۔ پھر وہ بیان ٹرسٹیوں کے پاس بھیج دیا گیا۔ یہ تعطیلوں کا زمانہ تھا۔ جب پرنسپل مارسین صاحب کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو بہت بگڑے ہوئے اور میرے اسکول سے نکالے جانے کا حکم صادر فرمایا۔ نواب محسن الملک بھی مجھ سے کچھ کبیدہ خاطر ہو گئے کیونکہ اس واقعے میں ان کی بھی کچھ توہین ہو گئی تھی لیکن ان کی فیاض طبیعت اور نیک دلی نے گوارا نہ کیا کہ میں اسکول سے نکالا جاؤں۔ انہوں نے مارسین صاحب کو بہت کچھ سمجھا بجھا کر اپنا حکم واپس لینے پر راضی کیا۔ جب میں تعطیلات کے بعد واپس آیا تو ایک موقع پر نواب محسن الملک سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کسی قدر بے رخی برتی اور "آپ" کہہ کر مجھ سے گفتگو کی جو ان کی طبیعت اور عادت کے خلاف بات تھی۔ وہ مجھ سے اور ان تمام طلبا سے جو ان سے مانوس تھے "تم" اور "تو" کہہ کر باتیں کرتے تھے ——— لیکن وہ بہت جلد سب کچھ بھول گئے اور میں پھر حسبِ دستور ان کے یہاں آنے جانے لگا۔

۱۹۰۶ء کا ذکر ہے کہ میں، پروفیسر کریم حیدر اودھی مرحوم، شاہ محمد خاں شیروانی اور نذر الحسن مرحوم کے ساتھ ماڈل گرلز اسکول کی خاطر ڈیپوٹیشن میں بھیجا گیا۔ ہم لوگ کاٹھیاواڑ، گجرات، بڑودہ اور سورت میں کام ختم کر کے جب بمبئی پہنچے تو اس وقت نواب محسن الملک مشہور سیاسی وفد بمبئی میں ترتیب دے رہے تھے جو سر آغا خاں کی سرکردگی میں بہ مقام شملہ لارڈ منٹو کے یہاں حاضر ہوا۔ نواب صاحب نے مجھے بمبئی میں روک لیا اور واٹسن ہوٹل میں بلایا اور ڈیپوٹیشن سے متعلق کچھ معمولی کام میرے سپرد بھی کیا۔ اس سال میں بی اے میں تھا اور میرے سیاسی خیالات میں اب بہت کچھ پختگی آ چکی تھی اور کبھی کبھی نواب صاحب کے ساتھ گستاخانہ بحث کر بیٹھتا تھا جیسے "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ملک اس طرح سے تباہ ہو جائے گا" وغیرہ ——— اس وقت وہ کبھی پیار سے اور کبھی غصہ میں آ کر مجھ کو ڈانٹ دیا کرتے تھے لیکن پھر جب شام کے وقت وہ گاڑی میں سیر کو نکلتے تو اکثر مجھے ساتھ لیتے اور سمجھانا شروع کرتے: "تو سمجھتا ہے کہ میں ایک پیچھے کا آدمی ہوں، انگریزوں سے ڈرتا ہوں، میں انگریزوں کا خوشامدی ہوں" وہ کہتے کہ گو تو یہ الفاظ زبان سے نہیں کہتا لیکن تیرے دل میں یہ باتیں جاگزیں ضرور ہیں۔" پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں سمجھاتے کہ "نہ میں کمزور ہوں اور نہ انگریزوں کا خوشامدی ہوں مگر تیری قوم ابھی ان خیالات کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ کیا تجھ کو یاد نہیں ہے کہ جب سر انٹونی میکڈانل نے ہندی کو رواج دیا تھا تو اس وقت اردو ڈیفنس کمیٹی کا میں صدر بنایا گیا تھا اور مسلمانوں کے بڑے بڑے جلسوں میں جو تقریریں کی تھیں ان سے حکومت لرز گئی، میرے خلاف کالج کے ٹرسٹیوں اور بڑے بڑے مسلمانوں نے شکایتیں کیں، مسٹر میکڈانل علی گڑھ آئے تو ٹرسٹیوں کے جلسے میں کارروائی کر دی اور ٹرسٹیوں نے مجھے اردو ڈیفنس کمیٹی سے استعفا دینے پر مجبور کیا۔ جب تیری قوم کا یہ حال ہے تو پھر تیرے خیالات کو ابھی پھلنے پھولنے کی گنجائش کہاں ہے؟ میں جانتا ہوں کہ ہندوؤں کے جھگڑے سے انگریز زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن مسلمانوں میں اب تک سیاسی شعور نہیں پیدا ہوا ہے کہ اس بات کو سمجھیں۔ جب یہ شعور پیدا ہو جائے گا تو دیکھنا وہ تیری طرح انگریزوں سے کبھی پیچھے نہیں رہیں گے۔" پھر کہتے "کیا تو نہیں جانتا کہ سر سید نے کیا کیا؟" اس پر ایک نے مجھے انگریز دوستی کا طعنہ دیا تو کہنے لگے کہ انگریزوں کے خلاف کیا کیا کام کئے۔ ابھی چند برس پہلے تک انگریز مسلمانوں کے سخت خلاف تھے۔ سر سید اور ان کے ساتھیوں کی مسلسل کوششوں سے

اب جا کر وہ کسی قدر مسلمانوں سے صاف ہوتے ہیں اور مسلمانوں کو ہندوستان میں پیر رکھنے کی اجازت مل رہی ہے۔۔۔ وغیرہ۔

اس طرح نواب محسن الملک مجھے اکثر مسلمانوں کی تباہی، ان کی سیاسی کمزوری اور سرسید کے قصے سنایا کرتے۔

اس ڈیپوٹیشن کی تنظیم میں تقریباً دو مہینے صرف ہوئے انھوں نے اس دوران میں زبردست تنظیمی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ پہلے سر آغا خان ڈیپوٹیشن لے جانے پر راضی نہیں ہو رہے تھے لیکن نواب صاحب نے ایسا دل ہلا دینے والا تار انہیں یورپ بھیجا کہ انہیں یورپ سے واپس آنا پڑا اور ڈیپوٹیشن لے جانا بالآخر انھوں نے منظور کر لیا۔

سرسید کے بعد کالج کے لئے روپیہ جمع کرنے، علماء اور صوفیائے کرام کو کالج کی طرف متوجہ کرانے، عمارات بنوانے، امراء اور والیانِ ریاست، شہزادوں اور حکمرانانِ ملک کو کالج میں مدعو کرنے، کالج میں طلباء کی تعداد بڑھانے کی جو ان تھک کوششیں نواب صاحب نے ضعیفی میں کیں وہ علی گڑھ کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ اگر سرسید کی جانشینی اس وقت نواب محسن الملک کو نہ ملی ہوتی تو یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ علیگڑھ اس درجہ ترقی پر پہنچتا۔ حکومت اور انگریزی حکام کی توجہ بھی انھوں نے کالج کی طرف پورے طور پر مبذول کرائی۔ مسٹر بیک کے مرنے کے بعد مسٹر ماریسن کو جو کالج چھوڑ کر ولایت چلے گئے تھے، جس طرح اصرار کر کے واپس بلایا اور کالج کا پرنسپل بنایا اس سے نواب محسن الملک کی مردم شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کالج کو ترقی دینے، انگریزوں کے خیالات مسلمانوں کی طرف سے صاف کرنے، طلباء سے محبت آمیز اور مربیانہ برتاؤ کرنے اور دیگر انتظامی معاملات میں ماریسن صاحب نے بھی نہایت قابلیت کا ثبوت دیا۔ ان میں اور نواب صاحب میں آخر وقت تک دوستانہ تعلقات قائم رہے اور شاید ہی کسی امر میں اختلاف ہوا ہو۔ ماریسن صاحب انگریز قوم کے ایک رکن تھے اور لازمی اور فطری طور پر وہ ہندوستان میں انگریز قوم کا بھلا بھی چاہتے تھے۔

ماریسن صاحب کے جانے کے بعد ان کی جانشینی کا مسئلہ نہایت سخت تھا۔ ماریسن صاحب ٹپنگ صاحب کو پرنسپل بنانا چاہتے تھے اور ان کو عارضی طور پر چارج بھی دے کر چلے گئے تھے لیکن ٹپنگ صاحب کی بڑی سخت مخالفت تھی اس لئے نواب صاحب کو دوسرے پرنسپل کی تلاش ہوئی اور انھوں نے ایک مسن رسیدہ، تجربہ کار اور تاریخ دان انگریز کیمبرج سے بلوایا جس کا نام آرچبولڈ تھا۔ یہ نیک مزاج آدمی تھے لیکن مزاج میں حد درجہ چڑچڑا پن بھی تھا۔ انھوں نے حتی الوسع مسٹر ماریسن کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی لیکن ان کو ماریسن صاحب کا سا علیگڑھ کا تجربہ، مسلمانوں کے کلچر سے واقفیت اور ان سے ہمدردی کیسے ہو سکتی تھی؟ اس کے علاوہ ان میں ماریسن صاحب جیسی انتظامی قابلیت بھی نہ تھی۔ تبدیل شدہ حالات میں انگلش اسٹاف اور طلباء میں پہلے جیسا برتاؤ بھی باقی نہ رہا تھا۔ مسٹر ٹپنگ کو پرنسپل نہ بنائے جانے کا بھی انگلش اسٹاف پر خاصا اثر تھا۔ چنانچہ طلباء اور انگلش اسٹاف میں ایک کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔

اگرچہ علی گڑھ میں والیانِ ریاست، گورنر اور عمائد رسمی طور پر آیا کرتے تھے لیکن محسن الملک کی مردم شناسی کی بدولت علی گڑھ اس شعر کا مصداق بن گیا ؎

عاقبت مقبولی کالج بایں غایت رسید
زینت گاہ خوبیاں شد گزرگاہ شہاں

جب جارج پنجم اپنی ولی عہدی کے زمانے میں ہندوستان میں بغرض سیر و سیاحت آئے تو ذمہ داران کالج کی کوششوں کے باوجود علیگڑھ ان کے پروگرام میں شامل نہ کیا گیا لیکن نواب صاحب نے سر آغا خان کے ذاتی اثر و رسوخ سے فائدہ حاصل کر کے آخر کار انہیں [illegible] ۱۹۰۶ء کو علی گڑھ بلا ہی لیا۔ ان کی آمد کی یادگار میں سائنس اسکول کے قیام کا اعلان ہوا اور ولی عہد کی موجودگی میں مرحوم [illegible] نے ایک لاکھ دس ہزار روپے کا عطیہ بذریعہ تار بھیجا۔ پرنس آف ویلز نے اسٹریچی ہال اور کالج کا سرسری معائنہ کر کے [illegible] پارک اور بورڈنگ ہاؤس کے چند کمروں کو بھی ملاحظہ فرمایا جن میں سے ایک کمرہ [illegible] بھی تھا۔ اس میں شہنشاہ جرمنی اور کچھ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کی تصویریں بھی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے [illegible] جرمنی کے بادشاہ کو پسند کرتے ہوں گے

جواب دیا "جی ہاں!" وہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کی تصویریں دیکھتے رہے لیکن ان کے متعلق کچھ نہ پوچھا۔

پرنس آف ویلز کا یہ دورہ بظاہر بہت کامیاب رہا اور جب وہ واپس انگلستان گئے تو گلڈ ہال لندن میں دورۂ ہندوستان پر ایک تقریر فرمائی جس میں علیگڑھ کالج کا ذکر بہت شاندار طریقے پر کیا۔ لیکن اندرونی خبر یہ تھی کہ ان پر یہ اثر ہوا کہ یہ کالج بھی باغی سرگرمیوں کا مرکز بن جائے گا۔

دوسری اہم ہستی جس نے علی گڑھ میں قدم رنجہ فرمایا وہ امیر حبیب اللہ خان والیٔ افغانستان کی تھی۔ ۱۶ جنوری ۱۹۰۷ء کو امیر افغانستان بغرض معائنہ تشریف لائے تھے اور تنقیدی نظر لے کر آئے تھے۔ ان کا استقبال مسلموں اور غیر مسلموں دونوں نے شاندار طریقے پر کیا۔ ابھی کالج کے صدر دروازے پر تعارفی سلسلہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ امیر افغانستان کا وہ مکالمہ شروع ہوا جس نے نواب صاحب کو سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ جب نواب صاحب نے کالج کی چیزیں دکھانی چاہیں تو شاہ نے فرمایا کہ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" اور یہ صاف ظاہر کیا کہ وہ کالج سے بدظن ہیں اور یہ بھی فرمایا کہ حضرت علی کا قول ہے کہ سچ اور جھوٹ میں صرف چار انگل کا فاصلہ ہے جو آنکھ اور کان کے درمیان ہے۔ کان سے میں سن چکا ہوں، اب آنکھ سے دیکھنے آیا ہوں۔

نواب محسن الملک نے برجستہ عربی کے یہ اشعار پڑھے ؎

قیل إن الإله ذو ولد　　قیل إن الرسول قد کهنا
(لوگوں نے خدا کو بھی صاحب اولاد کہا　　اور رسول کو جادوگر ——)
ما نجی اللہ والرسول معا　　من لسان الوری فکیف أنا
(جب خدا اور رسول بھی لوگوں کی زبان سے نہ بچے تو ہم کیسے بچ سکتے ہیں ——)

امیر افغانستان نے فرمایا کہ کالج کے ملاحظے کے بعد میں اپنی رائے دے سکتا ہوں، اور نواب صاحب کو طلب فرما کر خاص کر تعلیم دینیات کے متعلق سوالات کئے اور دریافت کیا کہ وہ کالج کو بطور مہتمم دیکھیں یا بطور سیاح؟ نواب صاحب نے یہ تمنا ظاہر کی کہ وہ بطور مہتمم کالج کو ملاحظہ فرمائیں۔

جب ٹرسٹیوں نے امیر کو چائے کی دعوت دی تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ جب تک میری تسلی نہ ہو جائے میں تم لوگوں کے ساتھ شریک طعام نہیں ہو سکتا۔ اس جواب نے نواب صاحب کو انگشت بدنداں کر دیا۔

امیر افغانستان نے پہلے علیحدہ کھانا کھایا اور پھر لچی بارک کی بورڈنگ دیکھی۔ انگلش ہاؤس میں پہنچ کر بچوں کے سونے، کھانے، نماز، غسل اور مطالعہ کے کمرے دیکھے اور فرمایا کہ لوگ مسلمان بچوں کے اس طرح رہنے سہنے پر کیوں معترض ہیں۔ اگر یہ بچے اسلامی عقائد سے واقف ہیں اور ارکانِ اسلام کے پابند ہیں تو اچھا ہے جس طرح چاہیں سوئیں اور رہیں۔"

امیر کو جب وہ الماری دکھائی گئی جس میں قرآن پاک اور سپارے رکھے تھے تو کہنے لگے کہ میں کلام پاک کو بالائے طاق دیکھنے نہیں آیا ہوں بلکہ متلاشی ہوں کہ بچے انہیں پڑھتے ہیں یا نہیں۔ اس بات پر چار لڑکے پیش کئے گئے تو کہنے لگے کہ میں آپ کے منتخب لڑکوں کا امتحان لینا نہیں چاہتا بلکہ میں خود لڑکوں کا انتخاب کروں گا۔ کالج کی مسجد میں انہوں نے نماز ادا کی اور اس کے بعد نظام میوزیم میں طریقِ تعلیم ملاحظہ فرمایا اور پہلے ہی کمرے میں تشریف فرما کر ایک طالب علم علی الدین نامی کو اپنے قریب بلا کر بٹھایا اور فرمایا کہ قرآن مجید میں سے جو کہیں یاد ہو سناؤ۔ خدا کو بھلا کرنا منظور تھا کہ وہ لڑکا اتفاق سے قاری اور خوش الحان تھا۔ اس نے نہایت خوش گلوئی کے ساتھ بعد تعوذ و بسم اللہ سورۂ آل عمران کی یہ رکوع تلاوت کرنی شروع کی:

إن فی خلق السموات والأرض واختلاف اللیل والنهار . . . الخ

دو چار ہی آیتوں کی تلاوت کے بعد ایک عجیب پُراثر سماں بندھ گیا اور ہر شخص پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ادھر شاہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور قطرے ڈھلک ڈھلک کر رخساروں اور داڑھی تک بہتے چلے آئے۔ رکوع ختم ہونے تک کئی رومال آنسوؤں سے تر ہو چکے تھے۔

امیر افغانستان الحمد للہ کہہ کر نہایت جوش میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بار بار کبھی اردو کبھی فارسی اور کبھی انگریزی میں فرمانے لگے: "اس کی جو برائی کی گئی ہے

کہا گیا ہے سب غلط اور جھوٹ ہے۔ "ہمہ دروغ است و کذب و بدگوئی" They are liars یا "یہ بدگوؤں کی زبان بند کرنے کو کافی ہو گا۔"

نواب صاحب کی خوشی کی انتہا نہ تھی اور فرط مسرت سے ان کا چہرہ روشن ہو رہا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ان کی زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔ امیر نواب صاحب سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے کہ "ہم نے امتحان لے کر اپنی پوری تشفی کر لی ہے۔ ہم بڑا کالج اور اسلامی تعریف پائی" وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ نواب صاحب نے عرض کیا کہ اسٹریچی ہال میں تمام ہندوستان کے مسلمان جمع ہیں بڑی عنایت ہو گی اگر آپ وہاں قدم رنجہ فرما کر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں اور امیر نے بخوشی یہ پیشکش منظور کر لی۔

اس وقت سر ہنری میکموہن نے کہا:

No doubt your majesty is a good Mullah.

(اس میں کوئی شک نہیں کہ اعلیٰ جناب ایک اچھے ملا ہیں)

اس کا امیر افغانستان نے برجستہ جواب دیا: 'Yes! I am three things, I am a Mullah, I am a Soldier and I am a King'

(بےشک میں تین چیزیں ہوں۔ میں ایک ملا ہوں، میں ایک سپاہی ہوں اور میں ایک بادشاہ ہوں)

اسٹریچی ہال میں ایڈریس پیش کیا گیا جہاں ہال تالیوں اور نعروں سے گونج رہا تھا۔ شاہ کی تقریر بہت مختصر تھی جس میں انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ "اول کسے کہ درین بدگویان و زبان بند کند او من خواہم بود" اور علی گڑھ کے متعلق تاثرات مختصر طور پر بیان کئے۔ رات کی دعوت کے بعد شاہ نے ٹرسٹیوں کا شکریہ ادا کیا اور مولانا حالی کا قصیدہ سنا جس کا ایک شعر اوپر درج کیا جا چکا ہے وہیں انہوں نے بیس ہزار روپے یکمشت دینے اور چھ ہزار سالانہ وظیفہ کالج کے لئے مقرر کرنے کا اعلان کیا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس موقع پر گرانقدر عطیات دئے۔

ابھی جوش و ولولہ کم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر گوکھلے علی گڑھ تشریف لائے۔ اس وقت علی گڑھ میں مولانا محمد علی مرحوم بھی موجود تھے۔ انہوں نے مسٹر گوکھلے کو فوراً طلباء کی طرف سے کالج میں آنے کی دعوت دے دی۔ پرنسپل آرچبولڈ اس بات پر بہت چیں بجبیں ہوئے اور مسٹر گوکھلے کو لکھا کہ آپ کو طلباء نے بغیر میری اجازت کے مدعو کر لیا ہے۔ اگر پھر بھی آپ تشریف لائیں لیکن مجھے امید ہے کہ آپ صرف تعلیمی مسئلے پر گفتگو کریں گے۔ جب طلباء کو معلوم ہوا تو انہیں بہت غصہ آیا۔ مسٹر گوکھلے نے پرنسپل کو جواب دیا کہ آپ کے کہنے کے مطابق میں صرف تعلیمی مسائل پر طلباء سے گفتگو کروں گا۔ آپ مطمئن رہئے۔

طلباء میں ایسا جوش و خروش تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ شہر جا کر جہاں مسٹر گوکھلے قیام پذیر تھے ان کی گاڑی خود کھینچ کر لائیں۔ بڑی مشکل سے انہیں اس بات سے روکا گیا۔ لیکن جب مسٹر گوکھلے کی گاڑی کالج کے صدر دروازے پر آئی تو طلباء نے ان کی گاڑی کھینچی اور جس جوش و خروش کا اظہار کیا وہ دیدنی تھا۔ مسٹر گوکھلے کو مسلمان نوجوانوں کا سیاسی جوش دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آواز بھر آگئی۔ ان کے ہر ہر لفظ سے دلی جذبات کا اظہار ہو رہا تھا اور ہر ہر جملے پر تالیوں کی گونج اٹھتی تھی اور مشکل سے روکی جا سکتی تھی۔

مسٹر گوکھلے نے وعدے کے مطابق صرف تعلیمی مسائل پر گفتگو کی لیکن اس انداز سے گفتگو کی کہ ان کی ساری تقریر سیاست وقت کی تفسیر تھی۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ ملک کے ایک حصہ دار کی جو صورت افزائی علی گڑھ میں ہوئی ہے اس سے مجھے امید ہو گئی ہے کہ آزادی میں اب زیادہ دیر نہیں ہے اور انہیں معلوم ہوا تھا کہ مسلمان نوجوان بیدار ہو چکے ہیں اور ویسی آگ ان کے سینوں میں بھی لگی ہوئی ہے۔

طلباء مسٹر گوکھلے پر بچھے جاتے تھے اور گوکھلے زندہ باد، ہندوستان زندہ باد کے نعروں سے سارا کالج گونج اٹھتا۔

اسٹریچی ہال میں مسٹر گوکھلے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نواب محسن الملک نے اپنی قومی پالیسی کی صاف لفظوں میں وضاحت کی اور کہا کہ وہ سیاسی معاملے میں اختلاف رکھنے پر مجبور ہیں مگر وہ اپنی قومیت کو نہیں چھوڑ سکتے مگر اہل ملک کے ساتھ دوستی رکھنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ علیگڑھ آنے سے قبل لکھنؤ کے مشہور جلسے میں نواب صاحب نے اپنی سیاسی پوزیشن کی وضاحت میں نہایت اہم تقریر کی تھی اور مسٹر گوکھلے کا خیر مقدم نہایت شاندار طور پر کر چکے تھے جس کا موضوع "ہندو مسلم اتحاد" تھا۔

پرنسپل اور انگلش اسٹاف کو طلباء کا یہ مظاہرۂ جوش بہت ناگوار ہوا اور انگلش اسٹاف اور طلباء کے تعلقات اور بھی زیادہ خراب ہو گئے۔

نواب محسن الملک نے بمبئی میں محمڈن ڈیپوٹیشن کی تیاری کے وقت اپنے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ مجھ کو یاد آ گیا۔ ظاہراً معلوم ہوتا تھا کہ نواب صاحب انگلش اسٹاف سے بہت مرعوب ہیں اور انگریزوں کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہیں کرتے لیکن ان کی تربیت اور طور طریقے سے لڑکوں کو جیسے شہ مل رہی ہو اور روز بروز انگریز دشمنی کا جذبہ اور ملکی آزادی حاصل کرنے کا ولولہ بڑھتا جا رہا تھا۔

اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ۱۹۰۳ء میں ہم چند طلباء نے ایک خفیہ سوسائٹی قائم کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کو کسی صورت سے جلد ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا جائے۔ اس سوسائٹی کے پروپیگنڈا کا چند ہی برسوں میں یہ اثر ہوا کہ ۱۹۰۶ء میں یونین کلب میں کانگریس اور ہندوؤں کو برا بھلا کہنا کسی بڑے سے بڑے مسلمان لیڈر کے لئے آسان بات نہ تھی۔

حکومت نے علیگڑھ کو بھی ہاتھ سے جاتا ہوا دیکھ کر باضابطہ طور پر یہ تجویز پیش کی کہ کالج کو ایک اورینٹل کالج بنا دیا جائے اور عربی تعلیم پر زور دیا جائے۔ یہ ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے۔ نواب محسن الملک کو جب یہ معلوم ہوا تو یونین کلب کے ایک جلسے میں انہوں نے اس تجویز کی نہایت پرزور مخالفت کی اور شبہ ظاہر کیا کہ اس تجویز کا منشا سیاسی معلوم ہوتا ہے۔ حکومت غالباً چاہتی ہے کہ علیگڑھ کو انگریزی تعلیم سے رفتہ رفتہ دور کر دیا جائے تاکہ مغربی علوم و فنون سے جو شورش ہندوستان میں برپا ہو گئی ہے اس کے اثر سے کم از کم علی گڑھ محفوظ رہ جائے۔ پرنسپل مارین نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ حکومت کا یہ منشا نہیں ہے بلکہ حکومت اس کو ایک مکمل مسلمانوں کا دارالعلوم بنانا چاہتی ہے لیکن محسن الملک کی شدید مخالفت کے باعث یہ تجویز آگے نہ بڑھ سکی۔

ہم اپنے رفقاء کے ساتھ جب ان کی خدمت میں حاضر ہو کر مسائل حاضرہ پر بے دھڑک بحث شروع کر دیتے تو وہ ہماری گستاخانہ جرأتوں کو برداشت کرتے ہوئے فرماتے کہ گھبراتے کیوں ہو، بہت جلد یہاں کے طلباء تم لوگوں جیسے خیالات کو ماننے والے ہو جائیں گے۔ گو اس وقت شاید میں زندہ نہ رہوں گا۔ سرسید کا بھی دراصل یہی منشا تھا اور میرا بھی یہی ہے کہ یہاں ملک کے جانباز سپاہی پیدا ہوں لیکن آہستہ خرامی سے کام لینا ہی وقت اور مصلحت کا تقاضا ہے۔ ابھی ہماری قوم میں تیز دوڑنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

عجیب اتفاق کہ مسٹر گوکھلے کے جانے کے کچھ ہی دن بعد علیگڑھ کالج میں ۱۹ فروری ۱۹۰۷ء کو ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ اس نے طلباء کی صفوں میں ہیجان برپا کر دیا۔ راجہ غلام حسین سے جو کالج کے ایک ممتاز طالب علم تھے ایک پولیس کانسٹیبل کا جھگڑا ہو گیا۔ ایسے جھگڑے ہمیشہ ہی ہوا کرتے تھے مگر مسٹر مارین ہمیشہ طلباء کا ساتھ دیتے تھے اور ایسے معاملات رفع دفع کرا دیا کرتے تھے۔ یہ بات کالج کی تقریباً روایت بن چکی تھی لیکن جب راجہ غلام حسین کے معاملے میں سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پرنسپل آرچبولڈ سے شکایت کی تو انہوں نے بلا سوچے سمجھے راجہ غلام حسین کو کالج سے خارج کر دیا۔

انگلش اسٹاف اور طلباء میں کشیدگی تو پہلے ہی سے تھی۔ یہ واقعہ گویا کھلم کھلا جھگڑے کا شاخسانہ بن گیا۔ طلباء میں جوش اور غصے کی لہر پھیل گئی اور انہوں نے بہت زور و شور کے ساتھ احتجاج کا نعرہ بلند کر دیا اور جلسے کرنے شروع کر دیے۔ اس پر کالج کے انگلش اسٹاف کا غصہ اور بھی بڑھ

ایک موقع پر جہاں طلباء کافی تعداد میں جمع تھے انہیں سخت سست کہا۔ بس پھر کیا تھا اس پر طلباء آپے سے باہر ہو گئے اور ان میں سے بعضوں نے انگلش اسٹاف کے خلاف بھی سخت الفاظ استعمال کیے۔ شاہ محمد خان شیروانی (جو ابھی حال تک یو۔ پی میں منسٹر تھے)، جن کے مزاج میں غصہ بہت تھا، ایک انگریز پروفیسر کے یہ کہنے پر کہ ہم تم لوگوں کے ساتھ احسان کرتے ہیں اور تم ایسی گستاخی کرتے ہو" فوراً بول اٹھے کہ تم لوگ یہاں ہندوستان کی دولت لوٹنے آئے ہو کہ ہم لوگوں پر احسان کرنے؟"

اس واقعے سے انگلش اسٹاف نے یہ سمجھ لیا کہ علی گڑھ کے طلباء بھی بنگال والوں کی طرح کھلم کھلا سرکار کے باغی ہو گئے ہیں اور تعجب نہیں کہ ہم سب کو مار ڈالیں۔ چنانچہ گھبراہٹ میں انہوں نے پولیس کو اطلاع دے دی اور سب انگریزوں کے بنگلوں کی مسلح پولیس حفاظت کرنے لگی۔ طلباء کا انگریز پروفیسر کو کسی طرح کی اذیت پہنچانے کا خیال بھی نہ تھا۔ یہ امر اتفاق تھا کہ غصے کی حالت میں کچھ گستاخانہ گفتگو ہو گئی تھی۔ بہر حال اب تو طلباء کو باغی قرار دے دیا گیا تھا۔ چاروں طرف تار دوڑ گئے اور انگریزی اخباروں نے اور نمک مرچ لگا کر مضامین لکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طلباء نے اسٹرائک کر دی۔ باقی مہینہ وہ کالج میں جمع رہے مگر کلاسوں میں نہ گئے اور اپنے اسباب جمع کر کے ان میں آگ لگا دی۔

طلباء کے وفد مختلف مقامات کے لیے روانہ ہو گئے اور نواب وقار الملک کے علاوہ حکیم اجمل خان، مولوی ذکاء اللہ اور مولانا نذیر احمد کے پاس دہلی آئے تاکہ انہیں علی گڑھ لے جائیں۔ نواب وقار الملک خود دہلی تشریف لائے اور حکیم صاحب کو علی گڑھ لے گئے۔ مولوی نذیر احمد طلباء کے بیانات سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ میں علی گڑھ ضرور چلوں گا اور تم لوگوں کی حمایت میں ایک لاکھ روپیہ تک جمع کروں گا۔ نواب محسن الملک تو مصلحت برتتے ہیں میں ہرگز کوئی مصلحت نہیں برتوں گا ـــ طلباء کا وفد ان کے ساتھ علی گڑھ آیا اور ان کو نواب محسن الملک کی کوٹھی تک پہنچا دیا گیا۔

ابھی اس کامیابی پر طلباء بہت خوش تھے لیکن جب دوسرے روز مولوی نذیر احمد طلباء کے سامنے کالج میں آئے تو ان کو مصلحت کا نام لے کر سمجھانے لگے۔ طلباء نے ٹوک دیا کہ مولانا آپ پر بھی نواب محسن الملک کا جادو آخر چل ہی گیا۔

ایک خفیف واقعے سے طلباء، اسٹاف اور ٹرسٹیان کالج میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا اور انگلش اسٹاف نے اس پر جو سیاسی رنگ چڑھا دیا تھا اس نے نواب محسن الملک کو بے انتہا متردد اور بے چین کر دیا تھا۔ بالآخر چند طلباء کالج سے نکالے گئے جن میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، انصاری، محمد شیروانی اور میں بھی تھا۔

ابھی طلباء کی اسٹرائک جاری ہی تھی کہ ایک دن نواب صاحب نے ہم لوگوں کو طلب کیا اور کچھ ایسے دردناک لہجے میں گفتگو کی کہ طلباء کے لیڈر بہت متاثر ہوئے اور ان سے وعدہ کیا کہ ہم لوگ خاموشی سے کالج چھوڑ کر چلے جائیں گے اور اسٹرائک ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اسی دن ہم تین طلباء نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے عرض کیا کہ طلباء کو سمجھانے کا ایک خط لکھ دیں۔ نواب صاحب اسی وقت میز کے سامنے بیٹھ گئے اور ایک طویل خط اپنے ہاتھ سے تحریر کیا جس کی ابتدا "میرے نالائق فرزندو!" سے کی۔

اس فقرے نے اور اس خط کے پورے مضمون نے طلباء پر جادو کا اثر کیا۔ جب نواب صاحب نے وہ خط ختم کیا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ طلباء اب تک دوران اسٹرائک میں بھی نواب صاحب سے خفا تھے اور ان پر الزام دھرتے تھے کہ انگلش اسٹاف کے ساتھ وہ کمزوری برت رہے ہیں اور ہمت کو راہ نہیں دے رہے ہیں لیکن ان کے دو خطوط نے حیرت انگیز طریقے پر طلباء کی ذہنیت تبدیل کر دی۔ ان کی تحریر کے لفظ لفظ سے طلباء کے ساتھ ان کی محبت ٹپکتی تھی۔ اس خط سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ علم نفسیات کے کتنے بڑے ماہر تھے۔ ان کے ان خطوط نے وہ کام کیا جو تمام دھمکیوں اور بڑے طالب علموں کی نصیحتیں نہ کر سکی تھیں ـــــ

ظاہراً تو یہ علی گڑھ کالج کی ایک اسٹرائک تھی لیکن حقیقتاً علی گڑھ کے طلباء کی یہ اسٹرائک مسلمان قوم کی سیاست کی سنگِ بنیاد تھی۔ اس اسٹرائک کے بعد ہی مسلم لیڈروں نے محسوس کر لیا کہ اب مسلمان نوجوان پرانی سیاسی پالیسی سے بیزار ہو چکے ہیں اور ضروری ہو گیا ہے کہ ان کے لیے ایک سیاسی

پلیٹ فارم بنایا جائے۔ چنانچہ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔

اسٹرائک کے کچھ عرصہ بعد ایک دن ہم چند طالب علم صبح کے وقت ان کی کوٹھی پر گئے۔ اس وقت نواب صاحب نوکروں پر خفا ہو رہے تھے۔ نواب صاحب نے ہم لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "تم سب خود باغی ہو اور میرے نوکروں کو بھی باغی کر دیا ہے۔ نہ تم سب بڑوں کا کہا مانتے ہو اور نہ میرے نوکر میرا کہا مانتے ہیں۔" ان سے پوچھا گیا کہ حضور کیا بات ہے تو فرمانے لگے کہ مجھے رات میں پاؤں دبوانے کی سخت عادت ہے۔ کل رات صرف کلن ان کا پرانا نوکر تھا جو گھر رہ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تو جا کر ذرا کالج کے اس بیرے کو جو میری کوٹھی میں رہتا ہے بھیج دے اور اس سے کہہ دے کہ میں اس کو کچھ انعام دوں گا۔ میں نے اس بیرے کو دوبار بلوایا لیکن اس نے آنے سے صاف انکار کر دیا۔ تب مجھ کو غصہ آیا اور میں نے کہلوایا کہ کل صبح میری کوٹھی سے نکل جائے۔ آج صبح کو میرے نوکروں نے جب اس کو مکان سے نکل جانے کو کہا تو برملا کہہ گیا کہ جاؤ سرکار سے کہو کہ کیا رات کی بات ان کو اب تک یاد ہے؟ ـــــــ نوکر بھی تم سبھوں کی طرح مجھ کو کودن سمجھتے ہیں۔" جب ہم سبھوں نے پوچھا کہ پھر کیا ہوا؟ تو فرمایا کہ بچا گیا میں چپ ہو گیا۔

اس ایک واقعے سے نواب صاحب کی مروت، نیکی اور شرافت کا پتہ چلتا ہے جس سے لوگ اکثر ناجائز فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔

ان مختلف تحریکوں اور کالج کی اسٹرائک اور دیگر پیچیدگیوں سے ضعیفی میں نواب صاحب کو کافی صدمے پہنچے مگر باوجود ان تمام باتوں کے وہ قوم کی خدمت کرنے سے باز نہ آئے اور ان کی آخری حالات کا واقعہ بھی اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ انہوں نے خدمت قوم میں جان دے دی۔ آخر ستمبر ۱۹۰۷ء میں وہ وائسرائے سے اصلاحات کی اسکیم میں مسلمانوں کے حقوق کی ترمیم وغیرہ کے لئے ملاقات کرنے شملہ تشریف لے گئے تھے۔ وہیں وہ زبردست طور پر علیل ہوئے۔ وائسرائے نے اپنے خاص ڈاکٹر کو علاج کے لئے مامور کیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو ۶ بجے شام اس حقیقی محسن الملک اور خادم قوم نے بارگاہ قدس میں اپنی زندگی کا اجر حاصل کرنے کے لئے انتقال فرمایا کہ باری عز و جل کا وعدہ ہے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (خدا نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا)

حالی نے چند رباعیات میں نواب محسن الملک کی زندگی کی تصویر کھینچی ہے اس کو بھی سن لیجئے ؎

دم بھر نہ کبھی جسم کو آرام دیا   خدمت کے لئے قوم کی مر مر کے جیا
پیری بھی اسی راہ میں کی نذر مگر   صدیوں کا تھا جو کام وہ برسوں میں کیا

پیری میں جوانوں کو کیا مات اس نے   آرام پہ اپنے ماری لات اس نے
تدبیر سے محنت سے دکھا دی سب کو   کالج کی ترقی میں کرامات اس نے

مدراس میں سوتوں کو جگایا جا کر   نخل علم کا برما میں جمایا جا کر
چھائی ہوئی مردنی جہاں قوم میں تھی   واں آب حیات ان کو پلایا جا کر

مکتبۂ چٹان کی ایک اور پیشکش

شورش کاشمیری کے قلم سے

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری

(نفسیاتی مطالعہ و سوانحی خاکہ)

اردو زبان کے سب سے بڑے عوامی خطیب کی ستر سالہ زندگی کے لیل و نہار
کی سرگزشت جس میں نصف صدی کے سیاسی حالات کی لفظی تصویریں
جگمگاتی نظر آتی ہیں

- شاہ جی کے خاندانی حالات
- شاہ جی کے ذاتی واقعات
- شاہ جی کے خطابی معرکے
- شاہ جی کے صحافتی کارنامے
- شاہ جی کے اساری ہنگامے

(خطیب کی کہانی ادیب کے قلم سے)

سوانحی خطوط کا نیا پیراہن —— اور —— سیاسی حالات کا نیا جائزہ

(زیر طبع)

مکتبۂ چٹان - ۸۸ میکلوڈ روڈ - لاہور

نئے ناول

قمر تسکین کا اسلامی تاریخی ناول

زینب

یہ ترکی کے ان مجاہدین کی کہانی ہے جنھوں نے غلامی پر آزادی کو ترجیح دی اور انتہائی بے سرو سامانی کے باوجود لاکھوں روسیوں کا منہ پھیر دیا۔ اس نئے عظیم اسلامی تاریخی ناول میں شمع آزادی کے پروانوں کی معرکہ آرائیاں اور تلواروں کی چھاؤں میں محبت و نفرت کی کرشمہ سازیاں دلچسپ اور دلکش پیرایہ میں پیش کی گئی ہیں۔ یہ ناول محض ہمارے عظمت ماضی کا افسانہ نہیں ہے بلکہ آج بھی اس سے حب الوطنی کے پاکیزہ جذبات کو سنوارا جا سکتا ہے۔ ضخامت ساڑھے تین سو صفحات سے زائد۔ سرورق چار رنگوں میں۔

قیمت صرف چار روپے بارہ آنے

محمد علی پاشا

قمر تسکین کا ایک اور اسلامی تاریخی ناول

محمد علی پاشا ایک مجاہد، جری، مدبر، بہادر اور باطل شکن معرکہ آرائیوں کی خونابہ بار داستان ہے، جس کو عشق و رومان کے جذبوں نے قوس قزح کا رنگ دیا ہے۔ ضخامت چھ سو صفحات۔

قیمت سات روپے آٹھ آنے

رفعت سلطانہ کا المیہ ناول

اشتیاق

ایک انتہائی دلچسپ اچھوتی داستان ہے جو نامور اور ذہین ناول نگار رفعت سلطانہ نے اپنے منفرد اور موثر انداز میں پیش کی ہے۔ یہ ناول مجبور جوانیوں کی دکھ بھری کہانی ہے جس میں دبی دبی سسکیوں، گرم گرم آنسوؤں اور سرد سرد آہوں کو سمویا گیا ہے۔ یہ عجیب و غریب کہانی کسی ایک فرد کی نہیں بلکہ سماج کے اس بڑے طبقے کی نمائندگی کرتی ہے۔ ضخامت اڑھائی سو صفحات کتابت و طباعت دیدہ زیب، حسین گرد پوش۔

قیمت صرف تین روپے چار آنے

پھول چُنتی رہی

ساحر لدھیانوی نے کہا تھا ؎

میں کھچا تجھ سے مگر تو میری راہوں کے لئے
پھول چنتی رہی، چنتی رہی، چنتی ہی رہی

ف۔ م۔ سرور نے اس شعر کی اس قدر دلنشین، دلچسپ اور موثر انداز میں شرح کی ہے کہ آپ کے منہ سے بے ساختہ کبھی آہ نکلے گی کبھی واہ۔ یہ ایک رومانی ناول ہے جسے ف۔ م۔ سرور نے آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب کر لکھا ہے۔

قیمت صرف تین روپے

ہر اچھے کتب فروش سے خریدیئے یا ہم سے منگوائیے

کتب میعار — ۱۰۔ اے مال روڈ لاہور

پنجابی زبان دا

ادب تے تاریخ

★ گیانی عبدالغفور قریشی دی ورھیاں دی محنت تے کوشش نال پنجابی ادب تے شاعری دے اِک رنگ دی پہلی کتاب جیہدے نال پنجابی ادب دی تاریخی حیثیت وچ بڑا واھدا ہویا اے۔

★ پنجابی بولی دے پرانے تے نویں ادب تے اج تِکر ایہو جیہی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

★ ایہدے وچ پنجابی شاعراں تے ادیباں دے کلام نال اوہناں دی زندگی دے حالات وی دتے گئے نیں۔

★ اِہ کتاب پنجابی عقلاں دا ہار سنگار ای نہیں اوہناں دی زندگی دے واقعیاں دی تاریخ وی اے۔

★ ایہدے وچ شعر شاعری دی ہر لاٹ تے ہر تھوڑاں دا گھوڑا رنگ دے کے اوہدے روپ نوں ہور وی چوکھیرا کر کے دکھایا گیا اے۔

★ ایہدے وچ سیاسی سماجی اتھل پتھل قومی تے مذہبی اثراں دا ویروا اسلامی تے سکھی تے انگریزی حکومتاں دے دور دورے دے رنگ ڈھنگ تے بدل دے سمے نال بدلدے ادب تے شاعری دا سِر کڈھواں ہو ہو ویکھا کے پنجابی نال ہوئی ہر تاریخی واردات دے ودھ کرکے بڑے سوہنے طور طریقے نال لکھے گئے نیں۔

★ دوجیاں کلاسیکل زباناں دے اِک جیہوں ویلے کوئی پنجابی وچ ایہ دس کے اوہدے تاریخی واردے لکھے گئے نیں۔

★ پنجابی بولی دے عام شوقیناں لئی کیہ اوہدے طالب علماں لئی کیہ اِہ کتاب اکو جیہی فائدے والی ہوئی اے۔

★ ایہدا دیباچہ مولانا عبدالمجید سالک ہوراں لکھیا اے تے جناب چوہدری افضل الدین صاحب نے سراہی اے۔

لکھائی چھپائی صاف ستھری تے ڈھکو بڑا سوھنا! کاغذ سفید!

ستھری جلد صفحے [illegible] دو نویں حصے تے مل کل دس روپے

ملن دا پتہ: ملک نذیر احمد پروپرائٹر: تاج بک ڈپو اردو بازار لاہور (پاکستان)